دلخراش اور روح فرسا نظاروں سے بھرپور
رگوں میں سنسنی دوڑاتی دلچسپ و عمدہ تحریر

جادوگر

مکمل ناول

ایم الیاس

دلخراش اور روح فرسا نظاروں سے بھرپور
رگوں میں سنسنی دوڑاتی دلچسپ و عمدہ تحریر

جادوگر

مکمل ناول

ایم الیاس

ڈریمپلی کیشنز
کتاب مارکیٹ نیوار دو بازار کراچی

پیش لفظ

قارئین کرام! یوں تو ایم الیاس صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ پاکستان بھر کے مختلف رسالوں، میگزین وغیرہ میں ان کی بے شمار تحریریں شائع ہوتی رہتی ہیں جنہیں پڑھنے والے بڑی چاہت و رغبت کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ ڈر ڈائجسٹ کے لیے بھی انہوں نے بہت سی کامیاب و مشہور و معروف تحریریں اور سلسلے لکھے ہیں جنہیں قارئین نے بڑی پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا اور بڑی چاہت سے سراہا ہے اور ان تحریروں نے قارئین میں بڑی مقبولیت حاصل کی ہے۔

ڈر ڈرائجسٹ میں ان کے کئی قسط وار سلسلے شائع ہوئے ہیں جن میں سے کئی ایک تو کتابی شکل میں شائع ہو کر مارکیٹ میں آ چکے ہیں۔ لیکن "جادوگر" ان کا ڈر ڈائجسٹ میں شائع ہونے والا سب سے طویل سلسلہ ہے جو کہ اب کتابی صورت میں آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ایم الیاس صاحب نے خصوصی طور پر بڑی محنت کے ساتھ اس سلسلے کو انجام تک پہنچایا ہے اور ڈر کے قارئین نے اس سلسلے کو بہت پسند کیا اور بے حد داد دی ہے۔

یہ کہانی ایک ایسے نیک اور مخلص انسان کی ہے جسے شہرت و دولت جیسی کسی چیز سے رغبت نہیں ہے۔ وہ صرف اور صرف انسانیت کی خدمت کرنا چاہتا ہے۔ لیکن وہ اتنا طاقتور نہیں کہ ایسا کر سکے اس لیے وہ جادوگر بننے کی کوششوں میں مصروف رہا۔ جادوگر بننے کے لیے اس کو کیا کیا تکلیفیں سہنی پڑیں، کیسے کیسے عجیب و غریب، ناقابل فراموش، خون ریز، حیرت انگیز، خوفناک و دہشت ناک حالات و واقعات کا سامنا کرنا پڑا، بہت سے امتحانات سے گزرنا پڑا۔ یہ سب آپ کو اس کہانی میں پڑھ کر ہی پتہ چلے گا کہ اس نے جادوگر بننے کے بعد انسانیت کی خدمت کے لیے کیا کیا کارنامے سرانجام دیئے؟ جو کہ پوری تفصیل کے ساتھ اس کہانی میں موجود ہیں۔

خالد علی

(مینجنگ ایڈیٹر ڈر ڈائجسٹ)

رشید نے کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھ سے کہا۔ ”سکندر! میں تمہارے لیے ایک بہت بڑی خوش خبری لایا ہوں۔“

”کیسی خوش خبری......“ میں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا اور سوچا کہ میرے لیے کیا خوش خبری ہو سکتی ہے۔ میں جن حالات سے دوچار تھا اور میری جو زندگی تھی اس میں دور دور تک کسی خوشی اور خوش خبری کا نام و نشان تک نہ تھا۔

”ایسی خوش خبری کہ سنو گے تو اچھل پڑو گے۔“ اس نے کہا۔ ”تمہیں شاید اس کا یقین نہیں آئے گا۔“

”میرے لیے کوئی خبر کسی خوشی کا باعث نہیں ہو سکتی۔“ میں نے کہا۔ ”تم میری زندگی اور میری بدنصیبی سے اچھی طرح واقف ہو...... پھر بھی تم کہہ رہے ہو کہ میرے لئے ایک بہت بڑی خوش خبری ہے۔ دوست! میرا مذاق تو نہ اڑاؤ۔“

”سکندر! میں تمہارا مذاق اڑا سکتا ہوں؟“ رشید ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ ”میں تمہاری دل آزاری کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ کیوں کہ اس دنیا میں تم میرے دوست ہی نہیں بلکہ ایک سگے بھائی سے بڑھ کر ہو۔ میں تمہیں اللہ رسول کے بعد سب سے زیادہ چاہتا ہوں۔ میرے ایک دوست اختر نے بتایا ہے کہ ایک جادوگر آیا ہوا ہے؟ کیا یہ خوش خبری نہیں ہے؟“

”جادوگر......؟“ میں حیرت اور خوشی سے اچھل پڑا۔ مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ واقعی میرے لیے یہ بہت بڑی خوش خبری تھی۔ میں یہ خبر سننے کے لیے برسوں سے ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ ”کہاں ہے وہ جادوگر......؟“

”میں نے اس کا پتا لے لیا ہے۔“ رشید نے کہا۔ ”وہ یہاں کچھ دنوں کے لیے آیا ہوا ہے۔ وہ صوفی گوٹھ سے پانچ میل دور ایک ویران مکان میں جو ایک ویرانہ میں ہے۔ اس میں بسیرا کئے ہوئے ہے۔ کیا خیال ہے تم اس سے ملنے چلو گے؟“

”کیوں نہیں...... کیوں نہیں......“ میں نے خوش ہو کر اسے بے اختیار چوم لیا۔ ”اندھے کو کیا

چاہیے۔ ’’آنکھیں......‘‘

چوں کہ اس وقت رات کے دس بج رہے تھے جانا ممکن نہیں تھا لیکن اگر مجھے پتا معلوم ہوتا تو میں اسی وقت اس جادوگر سے ملنے چلا جاتا۔ میری بے صبری دیکھ کر رشید نے کہا ہم صبح نو بجے نکل جاتے ہیں۔ میں تمہیں آج ابھی اور اسی وقت لے چلتا۔ چوں کہ اس کا مکان ڈھونڈنا پڑے گا۔ کبھی میں اس طرف گیا نہیں اور اس علاقے سے ناواقف ہوں۔ رات کا وقت ہے۔ کہاں مارے مارے پھریں گے۔ رات کی تو بات ہے صبح صبح نکل پڑتے ہیں۔

میں ساری رات جادوگر سے ملاقات کے خیال سے ٹھیک سے سو نہیں سکا۔ اس جادوگر کے بارے میں رشید مجھے ٹھیک سے کچھ بتا نہیں سکا۔ کیوں کہ وہ خود بھی اس کے متعلق نہیں جانتا تھا۔ اسے بھی اس کے کسی ملنے والے نے بتایا تھا۔ اس جادوگر کے بارے میں اتفاق سے اسے علم ہو گیا تھا۔ وہ جادوگر اپنا کھیل تماشا دکھانا نہیں چاہتا تھا۔ اور کچھ دن رہ کر یہاں سے چلا جانا چاہتا تھا اس لیے دور دراز علاقے میں ٹھہرا ہوا تھا۔

میں ساری رات اس جادوگر کے متعلق ہی سوچتا رہا تھا کہ یہ جانے کیسا ہو۔ معمولی جادوگر ہے یا بڑا جادوگر ہے؟ معلوم نہیں کس طرح پیش آئے......؟ سیدھے منہ بات کرے گا بھی یا نہیں......اور پھر مجھے کیا اپنا شاگرد بنا لے گا؟ اس نے نہیں بنایا تو میں پھر کیا کروں......؟ پھر بھی اس سے ملنے اور بات کرنے میں کیا حرج ہے؟

دوسرے دن صبح نو بجے رشید اپنے ایک دوست سے اسکوٹر مانگ کر لے آیا تھا۔ ہم دونوں ملیر پہنچے جادوگر کا گھر تلاش کرنے میں ایک گھنٹہ لگ گیا۔ یہ ایک پرانا اور بوسیدہ سا مکان تھا۔ معلوم نہیں اس ویرانے میں کیوں اور کس لیے بنایا گیا تھا۔ آس پاس اور دور دور تک کسی مکان اور آبادی کا نام و نشان تک نہ تھا۔

جس وقت ہم اسکوٹر سے اترے تھے اس مکان کا دروازہ بند تھا۔ یہاں عجیب سی مردنی اور وحشت سی ٹپک رہی تھی ویرانی برس رہی تھی۔ اس ماحول نے ایک انجانا سا خوف پیدا کر دیا تھا۔ رشید نے اسکوٹر کو مقفل کرتے ہوئے کہا۔ ’’مجھے ایک نامعلوم سا خوف محسوس ہو رہا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے اس مکان میں کوئی جادوگر نہیں بلکہ کوئی روح رہتی ہے جس نے بھی بتایا اس نے غلط بیانی کی ہے۔ کیا خیال ہے......کیوں نہ ہم واپس چلیں؟‘‘

میں نے اس کی طرف متعجب اور سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ پھر حیرت سے کہا۔ ’’تمہیں کس لیے یقین نہیں آ رہا ہے کہ یہاں کوئی انسان نہیں رہ سکتا؟ کوئی روح رہ رہی ہو گی؟‘‘

’’اس لیے کہ اتنی دور جہاں کوئی مکان یا آبادی اس مکان کے سوا نہ ہو......ویرانہ ہو......یہاں ایک انسان کیسے رہ سکتا ہے جب کہ جادوگر بھی انسان ہوتے ہیں۔ ان کی اپنی ضروریات بھی ہوتی ہیں۔‘‘ رشید نے جواب دیا۔

’’اس کی وجہ جادوگر سے مل کر ہی معلوم ہو سکتی ہے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’جب آئے ہیں تو اس سے مل

کر جانے میں حرج ہی کیا ہے......کتنی مشکل سے تو یہ مکان ملا ہے؟ آ کر ملے بغیر چلے جانا کیا بے وقوفی نہیں ہو گی؟‘‘

’’مجھے لگتا ہے کہ کسی نے بے وقوف بنانے کے لیے میرے دوست سے مذاق کیا۔‘‘ رشید نے کہا۔ ’’اس نے ایک اور بھی بات کہی تھی جو میں تم سے کہنا بھول گیا۔ اب وہ بات یاد آ رہی ہے۔ شاید تم اس بات کا یقین نہ کرو گے؟‘‘

’’کون سی بات......؟‘‘ مجھے ایک ان جانا سا خوف محسوس ہوا اور دل بڑے زور سے دھڑکا۔

’’اس جادوگر کی عمر ایک سو دس برس ہے۔‘‘ رشید نے جواب دیا۔ ’’اس کا نام شاہ جی ہے۔ لیکن وہ شاہ جی فقیر بابا کے نام سے مشہور ہے۔ وہ اپنا نام شاہ جی فقیر بابا بتاتا ہے۔ اپنے آپ کو جادوگر نہیں بلکہ فقیر بابا کہتا ہے۔‘‘

’’ایک سو دس برس کی عمر ہے اس کی......؟‘‘ میں نے تحیر زدہ لہجے میں کہا۔ ’’اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ قبر میں پیر لٹکائے بیٹھا ہو گا۔ کبھی اس کا نام اس کے جادو کے متعلق کبھی نہیں سنا۔ کیا وہ اس مکان میں ایک سو دس برس سے رہ رہا ہے۔‘‘

’’اس عمر کا آدمی بہت بوڑھا اور کم زور......چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو گا۔‘‘ رشید کہنے لگا۔ ’’معلوم نہیں اس کی سماعت کیسی ہو گی۔ وہ شاید بولنے اور سننے کے قابل بھی نہ ہو۔ اس کا نام میں نے بھی تمہاری طرح پہلی بار سنا۔ نہ ہی اس کے جادو کے متعلق کچھ جانتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کبھی یہاں رہتا ہو۔ چوں کہ فقیر بابا کی عرفیت تھی اس لیے لوگوں کا خیال ہو گا کہ یہ جادو بھی جانتا ہو گا۔ یہ بات شاید چالیس پچاس برس پہلے کی بات ہو گی۔ وہ شاید مر کھپ گیا ہو۔ وہ شاید یہاں پہلے رہتا ہو گا۔ اس لیے میرا یہ خیال ہے کہ اس گھر میں اس کی روح ہو گی۔‘‘

’’اس کی روح کیسے ہو سکتی ہے۔‘‘ میں نے تکرار کے انداز میں کہا۔ ’’مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہی نہیں ہے بلکہ قرآن پاک میں بھی اس بات کا ذکر ہے کہ مرنے کے بعد اس کی روح برزخ میں چلی جاتی ہے۔ اور وہ جسد خاکی بن جاتا ہے۔ اب تم ڈرو نہیں......چلو......بفرض محال روح ہو گی تو کیا کر لے گی......؟ روح کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔‘‘

پھر میں مکان کی طرف بڑھا تو رشید بھی میرے پیچھے پیچھے چلا آیا۔ مکان کے دروازے پر جو درختوں سے گھرا ہوا تھا دستک دینے کی نوبت نہیں آئی۔ دروازہ آپ ہی آپ اس طرح سے کھل گیا جیسے کسی نے ہمیں اندر سے مکان کی طرف آتے دیکھا ہو۔ جب ہم مکان میں داخل ہوئے، یہ دیکھ کر حیرت کی انتہا نہیں رہی کہ اس کمرے میں کوئی نہیں ہے۔ خالی پڑا ہے دروازے کے پیچھے بھی کوئی نہیں تھا۔ اس خیال سے میرے جسم پر سنسنی دوڑ گئی کہ کہیں دروازہ ہماری چاپیں سن کر یا ہمیں دیکھ کر روح نے تو نہیں کھولا......؟ اس لیے دروازہ کھولنے والا دکھائی نہیں دے رہا ہے۔

میں نے رشید کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ متغیر ہو گیا تھا اور اس کی آنکھوں سے خوف جھانک رہا تھا۔

"واپس چلو......" رشید نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ "میں نے تم سے نہیں کہا اس مکان میں روح کا بسیرا ہے۔"

میں بھی خوف زدہ سا ہو گیا اور میری رگوں میں لہو منجمد ہونے لگا۔ میں نے اثباتی انداز میں سر ہلا دیا۔

ہم دونوں جیسے ہی مڑے اور دروازے کی طرف بڑھے دروازہ ایک دم سے بند ہو گیا۔ دروازہ بند ہونے ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میری جو حالت تھی وہی رشید کی بھی ہو رہی تھی۔

اس نے دروازے کو پکڑ کر زور سے کھینچا۔ دروازہ بوسیدہ اور بہت ہی قدیم تھا۔ لکڑی کا تھا۔ لیکن دروازہ تھا کہ کھلنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے باہر سے بند کر دیا ہو۔ میں نے بھی زور آزمائی کی لیکن دروازہ نہ کھلنا تھا نہ کھلا۔ ہم دونوں کی حالت غیر ہونے لگی اور پسینہ پھوٹ پڑا۔

"میرا خیال ہے کہ دروازہ ایک لات مارنے سے ٹوٹ جائے گا۔" رشید نے کہا۔ "تم ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو جاؤ۔"

رشید نے پوری طاقت سے دروازے پر ایک لات ماری۔ دروازہ جس طرح سے لگ رہا تھا اور ایسا تھا کہ ایک لات سے ہی ٹوٹ جائے۔ دروازہ بظاہر خستہ حالت میں نظر آ رہا تھا لیکن تھا بے حد مضبوط...... ہم دونوں نے مل کر لاتیں اور کندھے بھی مارے لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔

اب تو خوف و دہشت سے ہم دونوں کا برا حال ہونے لگا۔ ہم ایک بد روح کے جال میں پھنس گئے جس سے نکلنا ناممکن دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے پچھتاوا سا ہو رہا تھا کہ میں نے رشید کی بات کیوں نہیں مانی۔ اس کی بات مان کر لوٹ جاتا تو اس کی نوبت نہیں آتی۔ اب پچھتاوے کیا ہوت...... کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کریں۔ میرا دماغ ماؤف سا ہو گیا تھا۔

"سکندر!" رشید نے میرا حوصلہ بندھایا۔ "ہمت اور حوصلہ نہ ہارو۔ صحن میں چلو عقبی دروازے سے باہر نکلتے ہیں۔"

"اگر وہ دروازہ بھی نہیں کھلا تو......؟" میں نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ "اس بلا نے ہمیں قید کر دیا ہے۔"

"میں نے آتے ہوئے دیکھا تھا کہ اس مکان کے عقبی حصے کی دیواریں زیادہ اونچی نہیں ہیں۔" رشید نے کہا۔ "چلو۔ چل کر دیکھتے ہیں۔ پہلے تو دروازہ کھولنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر وہ نہیں کھلا تو پھر دیوار پر چڑھ کر باہر کود جائیں گے۔"

ہم دونوں جیسے ہی سامنے والے کمرے سے نکل کر صحن میں آئے ایک دم سے ٹھٹک کے رک گئے۔ صحن میں ایک پیپل کا گھنا اور بہت ہی بوڑھا درخت تھا۔ اس کے نیچے چارپائی پڑی تھی۔ اس پر ایک صاف ستھرا بستر بچھا تھا۔ اس پر ایک شخص گاؤ تکیئے کے سہارے نیم دراز بیٹھا ہمیں مسکرا کے دیکھ رہا تھا۔

ہماری نظروں کے سامنے جو شخص تھا وہ شاہ جی فقیر بابا ہی تھا۔ اس کے سر اور داڑھی اور بھنوؤں کے

سفید براق بال بتا رہے تھے کہ اس کی عمر ایک سو دس برس کی ہو گی۔ لیکن چہرے اور جسم سے اس کی عمر کی نفی ہو رہی تھی۔ لیکن حیرت کی اور نا قابل فہم بات یہ تھی کہ وہ نہ صرف توانا، تندرست اور مضبوط جسم کا تھا بلکہ جوانوں کی طرح چاق و چوبند دکھائی دیتا تھا۔ سو برس کا بوڑھا آدمی کیا، ستر اسی برس کا آدمی بھی ایسا توانا اور صحت مند نہیں ہوتا تھا۔ اور نہ ہی مستعد...... جب کہ یہ شخص ایک سو دس برس کا تھا۔ اگر یہ شخص سر، داڑھی کے بال اور بھنویں کالی کر لے تو چالیس برس کا دکھائی دے۔ اس کے چہرے یا پیشانی اور گالوں سے سرخی چھلک رہی تھی۔ سب سے بڑی بات جو اس کے بشرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ یہ تھی کہ وہ خرانٹ قسم کا نہ لگتا تھا۔ نہ ہی چڑچڑاپن ظاہر ہوتا تھا۔

اس کے چہرے پر ایک بزرگ کی سی شفقت اور محبت تھی اور آنکھوں میں ہمارے لیے انسیت سی بھری تھی۔ "آؤ رشید اور سکندر بیٹے!" اس کی محبت سے بھری آواز فضا میں لہرائی۔ "میں تم دونوں کو خوش آمدید کہتا ہوں۔"

ہم اس کی زبان سے اپنا نام سن کر ششدر رہ گئے۔ ہم اس کی طرف بڑھے۔ اس کی چارپائی کے سامنے ایک اور چارپائی پڑی تھی۔ اسے سلام کیا تو اس نے جواب دے کر سامنے والی چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم دونوں چارپائی پر بیٹھ گئے۔ میں نے حیرت آمیز لہجے میں پوچھا۔ "آپ ہم دونوں کا نام کیسے جانتے ہیں؟ جبکہ ہم آپ سے پہلی بار مل رہے ہیں۔ آپ اور ہم اجنبی بھی ہیں۔"

وہ مسکرا دیا۔ "میرے لیے کسی کا نام معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں۔ میں صرف صورت دیکھتا ہوں نام میرے ذہن میں آ جاتا ہے۔ اس طرح میں نے تم دونوں کو باری باری دیکھا اور نام معلوم ہو گیا۔"

"اس طرح تو آپ کو دل کا حال بھی معلوم ہو جاتا ہو گا؟" میری زبان سے غیر ارادی طور پر نکل گیا۔

"کیوں نہیں...... کیوں نہیں......" وہ بولا۔ "مجھے معلوم ہے تم دونوں کس لیے میرے پاس آئے ہو۔"

"اچھا آپ بتائیں ہم دونوں یہاں کس لیے آئے ہیں؟" میں نے حیرت آمیز لہجے میں کہا۔

"تم جادوگر بننا چاہتے ہو......" اس نے جواب دیا۔ "اس لیے تم اپنے دوست کے ساتھ آئے ہو۔"

میں نے اور رشید نے ایک دوسرے کی شکل حیرت سے دیکھی۔ میں نے اقرار میں گردن ہلا دی۔ "آپ سچ کہتے ہیں۔"

"تم کون سا جادو سیکھنا چاہتے ہو بیٹا!؟" شاہ جی فقیر بابا نے مسکرا کر کہا۔

"کون سا جادو کیا مطلب......؟" میں نے متعجب نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی بات عجیب سی لگی۔

"دنیا میں بہت سارے جادو موجود ہیں۔" وہ بولا۔ "ایک جادو تو ہے نہیں۔"

"مگر میں نے تو سنا ہے کہ دنیا میں صرف ایک ہی جادو ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "چھوٹا جادو، معمولی جادو اور بہت بڑا اور خطرناک جادو...... ایک اور جادو کالا جادو جس کے بارے میں سنا ہے کہ اس سے بڑا جادو کوئی اور نہیں ہے۔ وہ دنیا کا سب سے خطرناک ترین جادو ہوتا ہے۔ یہ جادو بہت کم لوگ

جانتے ہیں۔''

''نہیں.....ایسی بات نہیں ہے۔'' وہ کہنے لگا۔''دنیا میں ان گنت جادو موجود ہیں۔وہ اپنی جگہ بڑے ہوتے ہیں۔کوئی جادو عام قسم کا نہیں ہوتا ہے۔جادو بہر حال جادو ہوتا ہے۔کسی پر چل جائے تو اس کا توڑ کرنا اور اتارنا مشکل ہو جاتا ہے۔کالا جادو واقعی بہت خطرناک ہوتا ہے۔ہر کوئی اس جادو میں طاق نہیں ہوتا ہے۔کیوں کہ یہ جادو آسانی سے نہیں سیکھتا ہے۔سیکھنے والے کو بڑے پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں اور اسے سیکھنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی ہے۔جو بہت سارے چھوٹے موٹے اور عام قسم کے جادوگر جو کالا جادو کا علم جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ جھوٹا ہوتا ہے۔''

''وہ کون سے ان گنت جادو ہیں فقیر بابا!'' رشید نے اس سے سوال کیا۔''آپ نے ان کے بارے میں بتایا نہیں۔''

''اس دنیا میں ازل سے آج تک اور تاقیامت تک بہت سارے جادو، جادوگر اور جادوگرنیاں ہیں اور رہیں گی۔'' وہ کہنے لگا۔''ان کے جادو کا توڑ ہے بھی اور نہیں بھی۔دولت کا جادو۔شباب کا جادو، حسن و جمال کا جادو۔آنکھوں اور سراپا اور محبت کا جادو اور بھی جادو ہیں بعض اس جال میں ایسے پھنستے ہیں کہ وہ ساری زندگی اس سے نکل نہیں پاتے ہیں۔ان کے علاوہ سفلی علم بھی ہے۔''

''آپ کیا مجھے وہ جادو سکھا سکتے ہیں جو آپ جانتے ہیں؟'' میں نے ان کی طرف ملتجیانہ نظروں سے دیکھا۔

''نہیں.....'' اس نے سر ہلا دیا۔''میں وہ جادو تمہیں کیا کسی بھی شخص کو سکھا نہیں سکتا ہوں۔''

''وہ کس لیے.....؟'' میں نے حیرت سے کہا۔اس کا جواب سن کر میرے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔

''اس لیے کہ یہاں میرا قیام صرف دو دن کا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔''جادو سیکھنے کے لیے مہینے درکار ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ میرے استاد نے مجھ سے یہ وعدہ لیا ہے کہ میں اپنا جادو کسی کو بھی نہیں سکھاؤں گا۔نہ ہی اس سے انسانیت کو نقصان پہنچاؤں گا۔میں نے جو جادو سیکھا وہ انسانیت کو فائدہ پہنچانے کے لیے۔میں نے اس سے کبھی کوئی غلط کام نہیں کیا۔''

''پھر میں کیا کروں.....؟'' میں نے افسردگی سے کہا۔''میں تو بڑی امیدیں لے کر آپ کے پاس آیا تھا۔''

''میں یہ جانتا ہوں کہ تمہیں جادو سیکھنے کا شوق بچپن سے تھا لیکن اب وہ جنون کی صورت اختیار کر گیا ہے۔'' وہ کہنے لگا۔''تم جو جادو سیکھنا اور قوت حاصل کرنا چاہتے ہو وہ یہاں بہت مشکل ہے۔یہاں جو جادوگر ہیں۔وہ جادوگر نہیں شعبدہ باز، سفلی علوم کے جاننے والے اور فراڈ ہیں جو لوگوں کو بے وقوف بنا کر دونوں ہاتھوں سے لوٹتے ہیں اور لوٹ رہے ہیں۔تمہیں جادو سیکھنا ہے تو افریقہ، مصر یا بنگال جانا ہوگا۔بنگال اور آسام میں ایسے بڑے جادوگر ہیں جن کے جادو کی کاٹ نہیں ہے۔ایسے جادوگر خال خال ہی ملیں گے۔کیوں کہ اب دنیا جادو اور جادوگروں سے خالی ہوتی جا رہی ہے۔میرا مشورہ تو یہ ہے کہ تم بنگال

چلے جاؤ۔ایسے جادوگر کو تلاش کرو جس قسم کا جادو تم سیکھنا چاہتے ہو۔ایسا جادوگر تمہیں آسانی سے نہیں ملے گا۔تمہیں بڑے پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔تمہارے جوتے گھس جائیں گے۔جانے تمہیں کن کن مشکلات اور حادثات سے گزرنا پڑے۔لیکن تم حوصلہ نہیں ہارنا۔اپنا عزم و حوصلہ برقرار رکھنا۔کیوں کہ منزل کبھی آسانی سے نہیں ملتی ہے۔میرے استاد نے مجھے جو جادو سکھایا اس میں پانچ برس کا عرصہ لگا۔لیکن بعض ایسے بڑے بڑے جادوگر ہیں جو صرف پانچ منٹ یا پانچ دن اور گھنٹے میں بھی جادو سکھا سکتے ہیں۔''

''میں افریقہ اور مصر تو کیا افغانستان بلکہ بنگال بھی نہیں جا سکتا۔'' میں نے مایوس سے لہجے میں کہا۔''میں ایک غریب شخص ہوں اور پھر میں اپنی والدہ کو چھوڑ کر جا نہیں سکتا۔کیوں کہ میں اللہ کے بعد ان کا واحد سہارا اور اکلوتا بیٹا ہوں۔میرے والد اس وقت فوت ہو گئے جب میں نو برس کا تھا۔وہ سلائی کر کے مجھے پالتی اور پڑھاتی رہی ہیں۔اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ان کی خدمت کروں۔انہیں آرام اور سکھ پہنچاؤں۔انہوں نے میری پرورش اور مستقبل کی خاطر شادی نہیں کی۔مجھے اعلیٰ تعلیم دلائی اور اپنی ساری زندگی اپنی ممتا کے جذبے سے مجھ پر نچھاور کر دی۔''

''تمہارے اس شہر میں بہت سارے جادوگر موجود ہیں۔اور دکانیں کھولے بیٹھے ہیں کیا کبھی تم ان کے پاس گئے؟'' فقیر بابا نے پوچھا۔

''جی نہیں۔'' میں نے سر ہلایا۔''اس لیے کہ یہ سب ٹھگ اور مکار ہیں۔یہ لوگوں کو بے وقوف بنا کر لوٹتے ہیں۔''

''تم نے اچھا کیا جو ان کے پاس نہیں گئے۔'' اس نے کہا۔''نہ آئندہ ان کے پاس بھولے سے بھی جانا۔اگر گئے تو ان کے چنگل میں پھنس جاؤ گے۔ان کے پاس کچھ ایسے جنتر منتر اور سفلی علوم ہوتے ہیں کہ اس میں ایک بار جو پھنس گیا وہ ساری زندگی کے لیے پھنس گیا۔موت ہی سے انہیں نجات ملتی ہے۔جانے کتنے بدنصیب ان کے ظلم و ستم اور کرتوتوں کی بھینٹ چڑھ گئے۔''

''آپ یہاں کیوں اور کس لیے آئے ہیں؟'' رشید نے سوال کیا۔''اس مکان میں کیوں ٹھہرے ہوئے ہیں؟''

''اس لیے کہ میری اس ملک سے بہت ساری یادیں وابستہ ہیں۔'' وہ بتانے لگا۔''میری عمر ایک سو دس برس سے زیادہ کی ہے۔میں ہندوستان میں پیدا ہوا۔میری زندگی میں جادو سیکھنے سے پہلے بہت سارے پراسرار، حیرت انگیز اور خوفناک قسم کے واقعات نے جنم لیا۔جادو سیکھنے کے بعد میں دنیا کی سیر و سیاحت کے لیے نکل گیا۔کیوں کہ مجھے سیر و سیاحت کا شوق ہی نہیں بلکہ جنون بھی تھا۔میں تقریباً ساری دنیا کی سیر کر چکا ہوں۔مصر، افریقہ، بنگال، امریکہ اور یورپ کے بڑے بڑے جادوگروں سے بھی مل چکا ہوں۔اب میں مصر سے واپس جا رہا تھا۔تو مجھے یہاں اس لیے رکنا پڑا کہ میرے موکل نے بتایا کہ ایک بدنصیب نوجوان لڑکی ایک سفلی علم کے ماہر کے چنگل میں پھنسی ہوئی ہے۔وہ اسے شادی کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔جبکہ وہ لڑکی اس سے سخت نفرت اور اپنے چچازاد سے محبت کرتی ہے اور وہ اس کا منگیتر بھی

ہے۔ میں نے کل ہی اس لڑکی کو اس خبیث شخص کے چنگل سے نجات دلادی۔ میں یہاں کسی وجہ سے تین دن کے لیے رک گیا ہوں۔ میں ہندوستان اس لیے واپس جارہا ہوں کہ وہاں میری ساری یادیں وابستہ ہیں گو کہ میرے گھر والوں اور دوستوں میں اب کوئی بھی زندہ نہیں رہا۔ ان کی شکستہ قبریں ہیں۔ دراصل میری زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں۔ میں زیادہ سے زیادہ پانچ برس اور زندہ رہوں گا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنے ملک میں جا کر مروں۔ میری قبر میرے آباؤاجداد کے ساتھ ہو۔''

''کیا آپ ہمیں اپنی زندگی کا کوئی سب سے عجیب وغریب پراسرار اور حیرت انگیز واقعہ سنانا پسند کریں گے؟'' میں نے اس کی طرف تجسس اور اشتیاق بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ مایوس نہ کریں۔''

''تم لوگ کیوں اور کس لیے ایسا کوئی واقعہ سننا چاہتے ہو؟'' شاہ جی فقیر بابا مسکرا دیا۔

''اس لیے کہ آپ کی عمر ایک سو دس برس سے زیادہ کی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''آپ نے ساری دنیا کی سیروسیاحت کی ہے۔ بقول آپ کے زندگی میں بہت سارے عجیب وغریب، پراسرار اور نجانے کیسے کیسے واقعات پیش آئے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک حیرت اور اچنبھے کی بات ہے کہ آپ صرف سر، داڑھی اور بھنوؤں کے سفید بالوں کی وجہ سے ایک سو دس برس کے دکھائی دیتے ہیں لیکن صحت، صحت مند اور توانا جسم کے باعث آپ جوان معلوم ہوتے ہیں۔''

''میں ایک واقعہ سناتا ہوں لیکن اس سے پہلے تمہاری تسلی کر دوں کہ میری صحت کا راز کیا ہے۔'' وہ بولا۔ ''میں نے ہمیشہ یعنی تیس برس کی عمر کے بعد غذا بہت معمولی سی کر دی۔ مرغن کھانوں سے اجتناب کیا اور پیدل بہت چلا۔ اب بھی چلتا ہوں۔ حالاں کہ میں چاہوں تو اپنے جادو کے زور سے جہاں چاہوں پلک جھپکتے پہنچ جاؤں۔ ایسا میں اس صورت میں کرتا ہوں جب اس کی خاص ضرورت یا پھر کوئی مجبوری ہو اور اس کے سوا چارہ نہ ہو۔ تم لوگ بھی زیادہ سے زیادہ پیدل چلو اور ورزش کرو تو کبھی بوڑھے نہ ہو گے۔ اور ہاں تمباکونوشی اور نشے کے قریب پھٹکنا بھی نہیں۔''

''اس سے پہلے آپ اپنی زندگی کا کوئی پراسرار اور خوفناک واقعہ سنائیں۔ میں ایک بات جاننا چاہتا ہوں۔'' رشید نے کہا۔ ''اس لیے کہ دل میں ایک خلش سی جو ہو رہی ہے۔ اسے دور کر سکوں۔''

''تم یہ معلوم کرنا چاہتے ہو نا کہ مکان کے اندر داخل ہوتے ہی تم دونوں کے دلوں میں روح کا وہم پیدا ہوا اور باہر نکلنے کی کوشش کی تو دروازہ آپ ہی آپ بند ہو گیا۔ باوجود کوشش کے نہ ٹوٹ سکا اور نہ ہی کھل سکا۔ یہ وہم اس لیے پیدا ہوا کہ دروازہ آپ ہی آپ کھل گیا اور دروازہ کھولنے والا نظر نہ آیا تھا؟''

''جی ہاں.....'' رشید نے سر ہلایا۔ ''اب یہ بات سمجھ میں آئی ہے کہ آپ نے یہ اپنے جادو کے زور سے کیا..... ایسا کیوں اور کس لیے کیا.....؟ آپ نے ہمیں باہر نکلنے کیوں نہیں دیا؟ اس کی وضاحت کر سکیں گے؟''

''اس لیے کہ تم دونوں مجھ سے ملنے بہت دور سے آئے اور ملے بغیر جا رہے تھے۔'' وہ وضاحت

کرنے لگا۔ ''دراصل میں سکندر کی رہنمائی کرنا چاہتا تھا کہ اس کا خواب پورا ہو جائے۔''

''اچھا اب آپ وہ واقعہ سنائیں جو سنانا چاہتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میرا اشتیاق بڑھتا جا رہا ہے۔''

''میں جو واقعہ سناؤں گا وہ ایک طویل کہانی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''سکندر! تم ایسا کرو..... سامنے باورچی خانہ ہے۔ اس میں چائے رکھی ہوئی ہے۔ تم لے آؤ تاکہ چائے پیتے جائیں اور میری کہانی بھی سنتے جاؤ۔''

میں اٹھ کر باورچی خانہ کی طرف بڑھا۔ اس کی دہلیز پر ٹھٹک کے رک گیا۔ حیرت سے اس ٹرے کی طرف دیکھنے لگا جس میں تین بڑے بڑے کپ چائے سے بھرے ہوئے رکھے تھے۔ اور ان میں سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ میں حیران وششدر رہ گیا۔ کیا یہ چائے بھی شاہ جی فقیر بابا نے اپنے جادو کے زور سے بنائی ہے۔ میں تو چائے بنانے کے خیال سے آیا تھا۔ جب میں ٹرے اٹھانے کے لیے بڑھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ باورچی خانے میں کوئی ہے اور وہ مجھے نظر نہیں آ رہا ہے۔ مجھے سوندھی سوندھی خوشبو بہت ہی قریب سے محسوس ہوئی۔ میں اس سوندھی سوندھی خوشبو کو جانتا تھا۔ یہ عورت کے بدن سے پھوٹتی ہوئی خوشبو تھی۔ کوئی نادیدہ عورت تھی جو میرے قریب موجود تھی۔ یا روح بھی ہو سکتی تھی۔ وہ جو بھی تھی اس نے چائے بنائی تھی۔ اس جادوگر نے کسی عورت یا عورت کی روح کو مطیع بنا رکھا تھا۔ اسی کے حکم پر اس نادیدہ ہستی نے چائے بنائی تھی۔

جب میں نے ٹرے اٹھائی تو میرے ہاتھ کانپ رہے تھے اور نادیدہ ہستی کے خوف سے میں چل نہیں پا رہا تھا اور میرے قدموں میں لڑکھڑاہٹ سی تھی۔ میں دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ سراسیمگی کی وجہ سے میں ٹھوکر کھا گیا اور توازن قائم نہ رکھ سکا۔ میں ٹرے سمیت فرش پر گرنے لگا اور میرے ہاتھ سے ٹرے چھوٹ گئی۔ نادیدہ ہاتھوں نے ٹرے سنبھال لی۔ یہ جو تین کپ میں چائے بھری تھی۔ اس میں سے ایک قطرہ بھی نہیں گرا۔ چائے کا نہ چھلکنا تعجب خیز تھا۔

میں فرش پر گر گیا تھا۔ دوسرے لمحے سنبھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے کپڑے جھاڑتے ہوئے ٹرے کی طرف دیکھا تو وہ فضا میں معلق تھی۔ میں نے چند لمحوں کے بعد اس ٹرے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو ٹرے میرے ہاتھ میں تھما دی گئی۔ پھر میں چائے لے کر پہنچا اور سارا واقعہ سنایا تو فقیر بابا نے کہا۔ ''میری ایک موکل ہے۔ اس نے یہ چائے بنائی ہے۔ وہی میرے لیے کھانے پکاتی ہے۔ کپڑے دھوتی ہے۔ اس کے علاوہ میری دوسری ضروریات کا بھی خیال رکھتی ہے اور میرے ساتھ ہی سفر کرتی رہتی ہے۔''

''اچھا اب وہ واقعہ سنائیں جو آپ سنانا چاہتے ہیں۔'' میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

میں نے چائے کا ایک گھونٹ لیا تو مزا آ گیا۔ ایسی شان دار چائے میں نے اپنی زندگی میں نہیں پی تھی۔ کیا چائے تھی دل چاہ رہا تھا کہ تین چار کپ اور پینے کو مل جائیں۔

''ہاں بھئی..... اب آپ دونوں ہمہ تن گوش ہو جائیں۔'' وہ چائے کو سپ کرتے ہوئے بولا۔

"مجھے بچپن سے ہی ڈاکٹر بننے کا شوق تھا۔ میرا یہ شوق عمر اور تعلیم کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتا رہا۔ میں نے دل میں عہد کرلیا تھا کہ ہر قیمت پر ڈاکٹر بن کر رہوں گا۔ جو لوگ میرا مذاق اڑاتے ہیں انہیں ڈاکٹر بن کر دکھاؤں گا اور ان کا منہ بند کردوں گا۔ آخر میں ڈاکٹر بن گیا۔ میں ڈاکٹر کیا بنا لوگوں کے سینے پر سانپ لوٹ گئے۔ حسد و جلن سے ان کا برا حال ہوگیا۔ وہ لوگ یہ کہنے لگے کہ جادوگر سیال نے اپنے جادو کے زور اور مدد سے مجھے امتحان میں کامیاب کرایا اور ڈاکٹر بنایا ہے۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہ تھی۔ جادوگر سیال ایک معمولی سا جادوگر اور شعبدہ باز تھا۔ وہ اپنے کمالات دکھا کر اس کی آمدنی سے گزر بسر کرتا تھا۔ اس کا گزارہ بڑی مشکل سے ہوتا تھا۔ میں کبھی کبھار اس کی مالی مدد کردیتا۔ ایک مرتبہ جب وہ سخت بیمار پڑ گیا تو میں اسے اسپتال علاج معالجے کے لیے لے جاتا رہا۔ اس میں صرف ایک اندھا انسانی اور پرخلوص جذبہ کارفرما تھا۔ ایک ڈاکٹر جو ہے وہ صرف ایک ڈاکٹر ہوتا ہے۔ وہ صرف مریض کو دیکھتا ہے۔ مذہب رنگ و نسل اور فرقے کو نہیں دیکھتا ہے۔ چوں کہ مجھے ایک ڈاکٹر بننا تھا۔ اس لیے بھی میں نے انسانی خدمت کو شعار بنالیا تھا۔ میرے دل میں بھولے سے بھی اس بات کا خیال نہیں آیا تھا کہ میں اس جادوگر سے کہوں کہ ڈاکٹری کے امتحان کے وقت میری مدد کرے اور جادو کے زور سے مجھے امتحانی پرچے لادے اور عملی امتحان بھی جادو کے زور سے کامیاب کرادے۔ میں جو کامیاب اور فرسٹ آیا تھا۔ اس میں میری محنت لگن، شوق جنون اور بلند عزائم کا دخل تھا۔ میرا ایمان تھا کہ محنت، اچھی نیت اور کسی بھی کام کی طرف پوری طرح توجہ دینا وہ کبھی رائیگاں نہیں جاتا ہے۔ اس کا پھل ضرور ملتا ہے۔

میرا پیشہ ڈاکٹری تھا اور میں اس کام میں بہت ہی مخلص اور دیانت دار تھا جس کے باعث میری بہت عزت تھی۔ اس کے علاوہ میں ایک کامیاب اور مایہ ناز سرجن بھی تھا۔ لاشوں کا پوسٹ مارٹم کرنا اور مردوں کے کفن اتارنا میرا کام بھی بن گیا تھا۔ اس کا معاوضہ بہت اچھا ملتا تھا۔ یہ پیشہ اس لیے بھی بن گیا تھا کہ سرکاری اسپتال میں میرے علاوہ کوئی اور ڈاکٹر بنا نہیں تھا۔ جو اس کام کو انجام دے۔ اس میں بڑی قابلیت اور مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔

وہ وقت اور دور ایسا تھا کہ جن بھوتوں، بدروحوں اور چڑیلوں کے قصے کہانیاں اور جانے کیسے کیسے واقعات زد عام تھے۔ ان دنوں جہالت کے باعث توہم پرستی عام تھی اور لوگ ضعیف الاعتقاد بھی بہت تھے۔ لیکن میں تو نہ جانے کیوں روحوں کا قائل تھا اور نہ ہی سزا و جزا کا معتقد۔ میں جو واقعات سنا رہا ہوں۔ اس میں بالکل بھی مبالغہ آمیزی اور رنگ آرائی نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان واقعات نے میرے ذہن کو یکسر بدل ڈالا اور ان کے بارے میں مجھے کبھی کبھی سوچ کر حیرت بھی ہوتی ہے۔ وہ دن میرے لیے آج بھی یادگار اور ناقابل فراموش ہے جب ان واقعات کا آغاز ہوا تھا۔

میں اپنے مطب میں بیٹھا ہوا تھا کہ جگ موہن کے ایک ملازم نے آکر مجھ سے کہا کہ سرکار نے آپ کو طلب کیا ہے۔ یہ میرا پہلا اتفاق تھا کہ مجھے ان کی حویلی نما شان دار کوٹھی میں جانا پڑا۔ مجھے کسی تقریب میں نہیں بلکہ معالج کی حیثیت سے طلب کیا گیا تھا۔ یہ میرے لیے ایک اعزاز تھا۔ کیوں کہ دو

ایک مجھ سے بڑے ڈاکٹر صاحبان موجود تھے۔

یہ بات میرے علم میں تھی کہ جگ موہن صاحب ایک لمبے عرصے سے گنٹھیا کے مرض میں مبتلا ہیں۔ نہ جانے انہوں نے کس کس سے علاج نہیں کرایا اور کہاں کہاں نہیں گئے۔ بڑے شہروں کے اسپتالوں اور ڈاکٹروں کے پرائیوٹ کلینک بھی گئے لیکن انہیں بالکل بھی افاقہ نہیں ہوا۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

میں نے کوٹھی کے گیٹ پر لگی، اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ چند لمحوں کے بعد ایک ملازم نے آکر بغلی دروازہ کھولا۔ جب میں اس کے ساتھ کوٹھی کے بائیں باغ سے گزر رہا تھا۔ تو ایک دم سے ٹھٹک کے رک گیا۔ کیوں کہ میری نگاہ ایسے در بے بہا پر پڑی کہ اس نے میری آنکھیں چندھیا دیں۔ میں قدرت کی صناعی پر دل میں اش اش کر اٹھا۔ یوں تو حسین و جمیل اور نوجوان لڑکیوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ لیکن میں نے ایسا تراشیدہ پیکر کب اور کہاں دیکھا جس نے مجھے مسحور کردیا تھا۔ نگاہ تھی کہ اس کے چہرے اور سراپا پر ٹھہرتی نہ تھی۔

یہ در بے بہا لڑکی نوخیز عمر کی تھی۔ وہ گہرے جامنی رنگ کی ساڑھی اور اسی رنگ کے چست وتنگ بلاؤز میں ملبوس تھی۔ انگور کی بیلوں کے نیچے فرشی زمین پر ایسی گہری نیند سو رہی تھی جس سے ایسا لگ رہا تھا کہ اس پر مدہوشی سی طاری ہے۔ اس نے جیسے کوئی نشہ آور دوا پی لی ہو۔ اس کے خم دار سیاہ ابروؤں کے نیچے خوش نما غلافی آنکھیں ہزاروں فسوں چھپائے محو آرام تھیں۔ اس کے سرخ بھرے بھرے گداز ہونٹوں پر جو دل کش تبسم رقصاں تھا اس سے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ سپنوں کی حسین وادی میں کوئی انتہائی دل فریب منظر دیکھ رہی ہے۔ اس کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی جس نے اسے اور بھی دل کش بنادیا تھا۔ اس کی صورت ایسی موہنی اور خدوخال میں ایسا تیکھا پن تھا کہ وہ دل کی اتھاہ گہرائیوں کو چھو رہے تھے۔

میری نگاہ اس کے چہرے پر ایسی جمی کہ میرے لیے ہٹانا بہت ہی مشکل ہوگیا تھا۔ وہ کسی ضدی بچے کی طرح ہٹ دھرمی پر اتر آئی تھی۔ مجھے اس لمحے ایسا محسوس ہوا کہ میں اس موہنی صورت سے مانوس ہوں۔ شناسا ہوں۔ ذہن پر بہت زور دینے اور اس کے تمام گوشوں میں جھانکنے کے باوجود مجھے کچھ بھی یاد نہ آسکا۔ میں نے اس ملازم کی طرف دیکھا جو مجھے اندر کی طرف لے جارہا تھا۔ "یہ لڑکی کون ہے جو یہاں سو رہی ہے؟"

"یہ لڑکی سرکار جگ موہن صاحب کی اکلوتی بیٹی ہے۔" اس نے بتایا۔ "ان کا نام شکنتلا ہے۔"

"مگر یہ یہاں زمین پر بغیر کسی چادر اور بستر کے کس لیے سو رہی ہے؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"کیا بتاؤں صاحب جی!" اس نے قدرے افسردگی سے جواب دیا۔ "بد قسمت لڑکی پاگل ہے۔"

"کیا......؟" میں بھونچکا سا ہوگیا۔ جانے کیوں مجھے اس کی بات کا یقین نہیں آیا۔ "تم سچ کہہ رہے ہو؟"

"جی...... صاحب جی!" اس نے سرہلایا۔ "یہ پاگل نہ ہوتی تو یہاں سوتی نہیں۔ یہ کوئی سونے کی

جگہ تو ہے نہیں۔"

میں جگ موہن کے کمرے میں جانے کے لیے اس کے ساتھ بڑھ گیا۔ لیکن قدرت کی اس ستم ظریفی پر میں دل میں اظہار افسوس کئے بغیر نہیں رہ سکا۔ میں نے جگ موہن کا معائنہ کیا۔ سوچا کہ ان کی پاگل بیٹی کے متعلق بات کروں۔ کچھ پوچھوں لیکن میں نے اس خیال سے ان سے گفتگو نہیں کی کہ اس سے کیا حاصل؟ یوں بھی وہ اس بات پر پہلے سے دکھی ہیں۔ میرا کچھ دریافت کرنا زخموں پر نمک چھڑکنے کے مترادف ہوگا اور شاید وہ اور دکھی اور رنجیدہ ہو جائیں۔

میں دوسرے دن سے روزانہ جگ موہن کے معائنے کے لیے وقت مقررہ پر جانے لگا۔ ان کی خواہش تھی کہ میں روزانہ آ کر انہیں دیکھ جایا کروں۔ مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا کیوں کہ ایک تو مجھے فائدہ یہ تھا کہ بھاری فیس ملتی تھی۔ جب کہ میں روپے پیسے کی کوئی ہوس نہیں رکھتا تھا۔ وہ اپنی مرضی اور خوشی سے دیتے تھے۔ میں نے ان سے نہیں کہا تھا کہ میں اتنی فیس لوں گا۔ دوسرا یہ کہ ان سے میرا دوستانہ ہوتا جا رہا تھا۔ تیسری بات یہ تھی کہ میں شکنتلا کو دیکھنا اور اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ حسین و جمیل اور نوجوان اور پرشباب لڑکی ہے۔ بلکہ اس کا علاج شاید میں کرسکوں تا کہ اس کی زندگی اور مستقبل بن جائے۔

ایک دن جب میں ان کے کمرے کے سامنے پہنچا اور دروازے پر اپنی آمد کی اطلاع دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا کہ اندر سے ایک کرخت آواز سنائی دی تو میں ٹھٹک کے رک گیا۔ میں نے دستک نہیں دی۔

"موہن صاحب!......تم قاتل ہو......قاتل۔"

"آہ بھگوان!......" جگ موہن کی سسکیاں کمرے میں گونجیں۔ "میں بڑا دکھی ہوں۔ تو مجھ پر رحم کر۔"

"ہرگز نہیں۔" دوسری آواز ہذیانی لہجے میں تقریباً چیختی ہوئی تھی۔ "قاتل کی یہی سزا ہے۔ کیوں کہ ایک نہیں۔ دو نہیں۔ بلکہ تم نے اکٹھے تین خون کئے۔ اب تم رحم کی درخواست کر رہے ہو۔ گڑگڑا رہے ہو۔ تمہارا پاپ معافی کے قابل نہیں ہے۔ اسے معاف نہیں کیا جا سکتا۔"

"بھگوان کے لیے تم یہاں سے فوراً ہی چلی جاؤ۔" جگ موہن گڑگڑا کے بولے۔

دوسری آواز کسی عورت کی تھی۔ اس نے ملازم کو بلانے کے لیے گھنٹی بجائی۔ گھنٹی کی آواز باہر گونجی۔ پھر وہ عورت شاید دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔ میں نے چاپوں سے اندازہ کیا تھا۔

یہ گفتگو مجھے سخت گراں گزری تھی اور بے حد پراسراری بھی لگی تھی۔ معلوم نہیں کیا معاملہ تھا۔ جگ موہن صاحب نے ایک نہیں تین قتل کیے تھے۔ وہ کون تھے۔ ایک آواز نے انہیں تین جانوں کا قاتل قرار دیا تھا۔ ان کا یہ کہنا کہ میں بڑا دکھی ہوں اور مجھ پر رحم کیا جائے اس بات کا ثبوت تھا کہ ان پر جو الزام عائد کیا گیا ہے۔ وہ جھوٹا نہیں ہے۔ کیوں کہ انہوں نے اس جرم سے انکار نہیں کیا تھا۔ بلکہ رحم کی بھیک مانگی تھی۔ سب سے حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ اب تک قانون کے ہاتھوں سے کیسے اور کیوں کر بچے ہوئے تھے۔ شاید اس لیے کہ وہ ایک دولت مند شخص تھے۔

یہ بڑے لوگوں کی بڑی باتیں اور ان کے ذاتی معاملات تھے۔ میرا دخل دینا اور ٹانگ اڑانا مناسب

نہیں تھا۔ اس وقت چوں کہ وہ بے حد جذباتی سے بھی تھے۔ اس لیے میں نے سوچا کہ واپس چل دوں اور کسی وقت آ کر انہیں دیکھ لوں۔ میں نے واپسی کا ارادہ کیا ہی تھا کہ ایک ملازم گھنٹی کی آواز سن کر جو آ رہا تھا اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ "ڈاکٹر صاحب!......اندر تشریف لے چلیں۔ سرکار آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" پھر اس نے دروازے پر دستک دی اور دروازہ کھول دیا۔

مجھے مجبوراً اندر داخل ہونا پڑا۔ میں نے انہیں بستر پر نیم دراز دیکھا۔ ان کے چہرے اور آنکھوں سے حزن و ملال ظاہر تھا مجھے دیکھ کر انہوں نے اپنے آپ کو فوراً ہی سنبھال لیا۔ "آیئے ڈاکٹر صاحب! میں آپ کا ہی انتظار کر رہا تھا۔"

جگ موہن کو میرے علاج سے فائدہ ہوا تھا۔ میں انہیں جو دوا اور انجکشن دے رہا تھا۔ اس سے انہیں جو افاقہ ہوا تھا وہ اس کے بارے میں بتانے لگے۔ مگر میرا دھیان کہیں اور تھا۔ وہ کیا کہہ رہے تھے میں جیسے سن نہیں رہا تھا۔ میں تو اس وقت کسی اور ہی خیال کے گرداب میں پھنسا ہوا تھا۔ میرے کانوں میں اس عورت کے الفاظ گونج رہے تھے۔ اس عورت کا لہجہ ہذیانی تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ عورت شاید برابر کے کمرے سے نکل کر آئے گی۔ میرا تجسس اس عورت کو دیکھنے کے لیے بے چین سا ہو رہا تھا۔ میں دس منٹ سے زیادہ رکتا نہیں تھا لیکن کسی نہ کسی بہانے سے میں بیس منٹ رک گیا تھا کہ شاید وہ عورت آ جائے۔ لیکن اس کی آواز اور اس کی موجودگی بالکل بھی برابر کے کمرے میں محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ شاید اس نے میری موجودگی کے باعث خاموشی اختیار کر لی تھی اور کمرے میں نہیں آئی۔

میں نے محسوس کر لیا کہ اگر میں دو گھنٹے بھی بیٹھا رہا تو بھی وہ میرے سامنے نہیں آئے گی۔ پھر میں مجبوراً ان سے رخصت ہو کر باہر آیا تو مجھے آج شکنتلا نظر آئی۔ اتنے دنوں میں آج میں نے اسے دوسری مرتبہ دیکھا تھا۔ میں جب بھی آتا اور باہر جاتا تو میری متلاشی نظریں اس جادوگرنی کو ڈھونڈتی تھیں جس کے سحر نے مجھے مسحور کیا ہوا تھا۔ وہ باغ میں کبوتروں کو دانہ ڈال رہی تھی۔ وہ اس وقت سفید رنگ کی معمولی سی دھوتی باندھے ہوئے تھی۔ بلاؤز بھی سفید ہی تھا جس میں اس کا معصوم حسن اس سادگی میں بھی برق پاشیاں کر رہا تھا۔ اور اس کا جادو اور بڑھ گیا تھا۔

میں دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر قدرت کی صناعی کی اس حسین صورت کو غور سے دیکھنے لگا۔

اسے ایک دم سے احساس ہوا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ وہ برقی سرعت سے مڑی۔ یک بارگی اس کی نظریں میری طرف اٹھیں۔ اف......اس کی آنکھیں کتنی بڑی، گہری سیاہ اور خوبصورت تھیں۔ میں تو ایک لمحے کے لیے اس میں ڈوب سا گیا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی اچھل پڑی۔ پھر وہ دو تین منٹ مجھے ایک ٹک دیکھتی رہی۔ ہم دونوں کی نظریں ایک دوسرے میں پیوست ہو گئیں۔ ان آنکھوں نے مجھ پر جیسے جادو کر دیا تھا۔

دوسرے لمحے وہ بری طرح اور اس طرح سے چونکی جیسے اس نے کوئی ڈراؤنا سا خواب دیکھا ہو۔ وہ پریم۔ پریم۔ کہہ کر چیخیں مارتی ہوئی بے تحاشا اندر کی طرف لپک گئی۔ مجھے اس کی یہ حرکت اور چیخیں کچھ سمجھ میں نہیں آئیں۔ میں خجل سا ہو کر چلا آیا۔ یہ اچھا ہو کہ وہاں یا آس پاس کوئی ملازم وغیرہ نہ تھا۔

میں رات ٹھیک سے سو نہیں سکا۔ وہ میرے دل و دماغ پر چھائی رہی۔ حسن وشباب کے اس جادو نے مجھے ایسا اسیر کیا کہ میں چشم تصور میں اس جادوگرنی اور اس کے حسن کی کرشمہ سازیوں کو دیکھتا رہا اور اس کے بارے میں سوچتا رہا کہ اگر وہ پاگل نہ ہوتی تو اب تک کسی کی جیون ساتھی ہوتی اور وہ شخص دنیا کا خوش نصیب شخص ہوتا۔

دوسرے دن میری تبدیلی کے احکامات آ گئے۔ میں سرکاری اسپتال میں ملازم تھا۔ شام کے وقت میں اپنا مطب چلاتا تھا۔ دو تین دن کے بعد میں آگرہ سے چلا آیا۔ میں دن رات اس قدر مصروف رہا کہ شکنتلا اور اس واقعہ کو بالکل بھول گیا۔ اس کا سحر ماند پڑ گیا اور دل پر جو تصویر نقش ہوئی تھی۔ وہ دھندلا گئی۔

آگرہ سے آئے ہوئے مجھے چھ برس کا عرصہ گزر گیا۔ میں جو واقعہ سنا رہا ہوں۔ تقسیم سے تیس برس پہلے کا ہے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ میری تبدیلی کراچی سے جیکب آباد سندھ میں ہوگئی۔ سندھ خصوصاً جیکب آباد کی گرمی تو ساری دنیا میں مشہور تھی اور آج اب بھی ہے لیکن اس وقت تو گرمی اور بھی قیامت کی تھی۔ میں اندرون سندھ جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے بڑی کوشش کی کہ میرا تبادلہ منسوخ کر دیا جائے۔ لیکن مجھے کامیابی نہ ہوئی تو میں بڑا دل برداشتہ ہوا۔ پھر مجھے ایک اور صورت نظر آئی اور اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔ اس کا مشورہ ایک سندھی دوست نے دیا تھا۔ میں نے تین مہینے کی رخصت لی اور گھر چلا آیا۔

مئی کا مہینہ تھا۔ گرمی اپنے شباب پر تھی۔ اس روز تو گرمی کچھ زیادہ ہی تھی۔ سارا دن لو چلتی رہی۔ شام سے کچھ دیر پہلے میں گھر سے نکلا تاکہ سیر اور ہوا خوری ہو جائے۔ میں یوں بھی شام سے قریب اور سہ پہر ڈھلتے ہی گھر سے نکل جاتا تھا۔ میں منٹ گمری ہال کی طرف بڑھا۔ اس کے سامنے لارنس گارڈن تھا اور یہاں گرمی کی شاموں میں بڑی رونق، چہل پہل اور رنگینی ہوتی تھی۔ تقریباً سارا شہر امڈ آتا تھا۔ کیوں کہ پورے شہر میں یہ سب سے خوبصورت اور سب سے بڑا گارڈن تھا جسے بلدیہ نے خوبصورت بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔

میں لارنس گارڈن کے درمیان میں ایک بنچ پر بیٹھا ہوا سیر کا لطف اٹھا رہا تھا۔ سیر و تفریح کی غرض سے آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ ان میں نہ صرف ہر طبقے کے لوگ جوق در جوق آ رہے تھے۔ بلکہ بچے اور عورتیں بھی شامل تھیں۔ انگریز عورتیں بھی تھیں۔ ہندوستانی لڑکیاں اور عورتیں بھی خوب سج دھج کر آئی تھیں۔

میں مشرق اور مغرب کے حسن کا موازنہ کر رہا تھا۔ عورت کہیں کی بھی ہو عورت ہی ہوتی ہے۔ اس میں بے پناہ مقناطیسی کشش ہوتی ہے۔ سندھ میں یہ بات نہ تھی۔ چھ برس تک سندھ میں رہ کر آیا تو حسن پرست ہو کر رہ گیا تھا۔ میں حسین رنگین نظاروں میں کھویا ہوا تھا کہ پیچھے سے کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں اس پل حیران ہوا کہ یہ کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ خیال آیا کہ شاید کسی ایسی مریضہ کا ہو جو میرے زیر علاج رہی ہو۔ لیکن میری کسی مریضہ سے بے تکلفی نہ تھی۔

ایک مترنم سی آواز نے مجھے مخاطب کیا۔ ”ڈاکٹر شاہ جی!“

میں نے گردن گھما کر دیکھا تو نظروں کو یقین نہیں آیا۔ ایسا لگا جیسے کوئی سندر سا سپنا دیکھ رہا ہوں۔ شکنتلا اپنی پوری رعنائیوں اور دل آویزیوں سے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں جیسے برقی قمقمے روشن تھے۔ میں فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اسے ایک لمحے میں پہچان لیا تھا۔ میں حیران اس بات پر تھا کہ اس نے مجھے کیسے پہچان لیا۔ کیوں کہ اس نے مجھے صرف ایک بار دیکھا اور ہماری ملاقات صرف چند لمحوں کی تھی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی پریم پریم کہہ کر بھاگ گئی تھی۔ شاید اس روز کے بعد میں صرف تین مرتبہ کوٹھی میں گیا تھا۔ شاید اس نے کہیں سے چھپ کر مجھے دیکھا ہو۔

میں رعب حسن سے سٹ پٹا گیا۔ اس نے اپنا نرم و نازک اور خوبصورت سا ہاتھ بڑھا کر مجھ سے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ میں نے اسے ناقدانہ نظروں سے دیکھا۔ وہ ایک قیمتی اور خوش رنگ ساڑھی زیب تن کیے ہوئے تھی جس نے اس کے حسن وشباب کو اور اجاگر کر دیا تھا۔ اس میں الھڑپن نہیں تھا اور نہ ہی لاابالی سی نظر آ رہی تھی۔ اس کے بشرے سے سنجیدگی اور متانت ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ بڑی پروقار سی لگ رہی تھی۔

”ڈاکٹر شاہ جی!“ وہ متبسم سی ہو کر میری آنکھوں میں جھانکتی ہوئی رس بھری آواز میں بولی۔ ”کیا آپ نے مجھے پہچان لیا؟“

”کیوں نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”آپ مس شکنتلا ہیں۔ جگ موہن صاحب کی صاحب زادی۔“

”حیرت کی بات ہے کہ آپ نے چھ برس قبل مجھے صرف چند لمحوں کے لیے دیکھا تھا۔ آپ نے پھر بھی پہچان لیا؟“ اس کی آواز کھنک گئی۔

”میں یہی بات آپ سے بھی کہہ سکتا ہوں۔“ میں نے جواب دے کر دل میں سوچا کہ اس سے کہوں کہ آپ ایسی بت کافر ہیں کہ کوئی آپ کو صرف ایک لمحہ کے لیے بھی دیکھ لے تو وہ ایک صدی تک بھی آپ کو بھول نہیں سکتا۔

”آپ کی یادداشت کا جواب نہیں۔“ وہ تجاہل عارفانہ سے بولی۔ ”چھ برسوں کے بعد بھی میں آپ کو یاد رہی۔“

”میری یادداشت بہت اچھی ہے۔ اور ایک ڈاکٹر کی یادداشت کا اچھا ہونا اچھی بات ہے۔ لیکن آپ کو تعجب کیوں ہو رہا ہے؟“

”اس لیے کہ ایک ڈاکٹر کو نہ جانے روزانہ کتنے مریضوں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ چھ برس کا عرصہ بڑا لمبا ہوتا ہے۔“

”اچھا یہ بتائیں کہ آپ یہاں کیسے تشریف لائی ہیں۔“ میں نے موضوع بدلا۔ ”جگ موہن صاحب اب کیسے ہیں؟“

”وہ بدستور علیل ہیں۔“ وہ کہنے لگی۔ ”آپ واحد ڈاکٹر تھے۔ آپ کے علاج سے انہیں افاقہ ہونے لگا تھا۔ انہوں نے نہ جانے کتنے ڈاکٹروں، ویدوں اور حکیموں سے علاج کرایا۔ بڑے شہروں کے

اسپتالوں کی خاک چھانی۔ آپ کا تبادلہ ہوگیا۔ آپ ہوتے تو وہ اب تک پوری طرح روبہ صحت ہو چکے ہوتے۔ بھگوان کی جانے کیا مرضی ہے۔ میں انہیں میو اسپتال میں داخل کرا کے یہاں آئی ہوں۔ آج کتنی سخت گرمی تھی۔ شام قدرے بہتر ہے۔"

"جی ہاں..... موسم بہتر ہوگیا ہے۔ اور رات تک اور بہتر ہو جائے گا۔" میں نے گردن ہلائی۔

"چلیے چل کر ہوٹل میں بیٹھتے ہیں۔" وہ ساڑھی کا پلو سینے اور شانے پر درست کرتی ہوئی بولی جو پھسل کر اس کے بائیں ہاتھ پر جھول گیا تھا۔

"چلیے....." میں نے کہا۔ "میرا دل بھی کچھ پینے کو چاہ رہا تھا۔"

گارڈن کے ایک کونے میں ایک ہوٹل تھا۔ یہ ایک انگریز کا تھا۔ اس میں ٹھنڈے مشروبات اور آئس کریم کے علاوہ ہر قسم کی اور بڑھیا سے بڑھیا ولایتی شراب بھی موجود تھی۔ ہم دونوں ایک ایسی میز پر بیٹھ گئے جو ایک گوشے میں تھی۔ اس نے ویٹر کے آنے سے پہلے ہال کا جائزہ لیا اور پھر میری طرف مخمور نگاہوں سے دیکھا۔

"ڈاکٹر آپ کیا پینا پسند فرمائیں گے؟ یہاں ہر قسم کی شراب موجود ہے۔ وسکی، شیمپین یا بیئر.....؟"

"آپ جانتی ہیں کہ میں مسلمان ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "مسلمانوں میں شراب حرام ہے۔"

"لیکن میں کچھ ایسے مسلمانوں کو جانتی ہوں جو شراب سے شغل کرتے ہیں؟" وہ بولی۔

"اچھے اور برے ہر مہذب اور فرقے میں ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "میں نے بھی ایسے ہندوؤں کو دیکھا ہے جو گئو ماتا کا گوشت بڑے ذوق وشوق سے کھاتے ہیں۔"

"مجھے بھی نہ شراب پسند ہے اور نہ شرابی لوگ۔" شکنتلا بولی۔ "میں نے اس لیے پوچھا کہ شاید آپ شوق فرماتے ہوں۔ میں آئس کریم منگوا لیتی ہوں۔ وقت اور موسم کے لحاظ سے یہ زیادہ مناسب ہے کیوں؟"

ویٹر آیا تو اس نے میری پسند کی آئس کریم ونیلا اور اپنی پسند کی چاکلیٹ آئس کریم منگوائی۔ رسمی باتوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ اس نے سندھ کی تہذیب اور معاشرت کے بارے میں بڑی دلچسپی سے سوالات کئے۔ اس گفتگو کے دوران میں اس کے چہرے اور سراپا کو نظروں میں جذب کرتا اور اس کی جھیل جیسی آنکھوں کی گہرائیوں میں ڈوبتا اور نکلتا رہا۔ وہ رات کی رانی کی طرح مہک بھی رہی تھی۔ اس کے جسم سے پھوٹتی سوندھی سوندھی خوشبو کی مہک اور قرب نے مجھ پر جیسے جادو کر دیا تھا۔ وہ ایک جادوگرنی ہی تھی۔ جس کے سحر نے مجھے اسیر کر لیا تھا۔ میرا دل کر رہا تھا کہ اسی طرح صدیاں بیت جائیں۔ دن ڈوب کر شام کی آغوش میں چلا گیا۔ آئس کریم کے کوئی تین دور چلے۔ پھر مجھے اچانک یاد آیا کہ ایک مریض کو دیکھنے جانا ہے۔ وقت ہو رہا ہے۔

جب آئس کریم کا تیسرا دور ختم ہوا تو میں نے کہا۔ "کیا مجھے اجازت ہے۔ کیوں کہ ایک مریض کو دیکھنے جانا ہے۔"

"اجازت ہی اجازت ہے۔" وہ دلفریب انداز سے مسکرا کر بولی۔ "میں ایک بہت ہی اہم مسئلے پر جو میری ذات سے متعلق ہے آپ سے گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔ آپ کو اگر زحمت نہ ہو تو کل شام چھ بجے اس جگہ ملیں تو میں آپ سے کچھ عرض کروں۔ کیا آپ میرے لیے وقت نکال سکیں گے؟"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ حکم دیں اور میں اس کی تعمیل نہ کروں۔" میں نے کہا۔ "میں کل حاضر ہو جاؤں گا۔"

"یہ حکم نہیں بلکہ ایک عاجزانہ درخواست ہے۔" وہ بولی۔

میں دوسرے دن اس سے ملنے کا وعدہ کر کے چلا آیا۔ لیکن میں حیران تھا کہ وہ مجھ سے کیا کہنا چاہتی ہے؟ رات جب سونے کے لیے بستر پر دراز ہوا تو میں یہی سوچتا رہا کہ آخر ایسی کیا اہم بات ہو سکتی ہے۔ جب کہ اس سے ایک طرح سے پہلی ملاقات ہے اور وہ مجھے اپنے اعتماد میں لینا چاہتی ہے۔

دوسرے دن ٹھیک چھ بجے میں لارنس گارڈن شکنتلا سے ملنے پہنچا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ میرے انتظار میں کھڑی میری راہ تک رہی ہے۔ اس کی نگاہیں مرکزی داخلی دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ مجھے دیکھ کر خوش ہوگئی اور اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ اس نے کہا کہ ہوٹل مناسب جگہ نہیں ہے۔ کیوں کہ اس کی تمام میزیں بھری ہوئی ہیں۔ پھر ہم دونوں ہجوم سے دور کنج تنہائی میں ہری ہری اور نرم نرم گھاس کے فرش پر بیٹھ گئے۔

"مسٹر شاہ جی!" شکنتلا نے ایک سرد آہ بھری۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں جس موضوع پر آپ سے گفتگو کرنا چاہتی ہوں اس کا آغاز کن الفاظ سے کروں۔"

"آپ بغیر کسی تامل کے جو بات کہنا چاہتی ہیں وہ کہہ دیں۔" میں نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ "آپ مجھ پر بھروسا کریں۔ یہ گفتگو میرے اور آپ کے درمیان تک رہے گی۔ میں اس کے متعلق کسی کو بھی کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

"میری باتیں سن کر آپ مجھے ضرور پاگل سمجھیں گے۔" وہ چند لمحوں کے توقف کے بعد دھیرے سے بولی۔ "لیکن میں ہرگز پاگل نہیں ہوں۔ اور نہ ہی کبھی میں پاگل تھی۔ لیکن مجھے پاگل مشہور کر دیا گیا تھا۔"

"بعض اوقات کسی وجہ سے ایسا ہوتا ہے۔ آپ پاگل نہ سہی اور میں اس بات کو مانتا اور سمجھتا ہوں کہ آپ پاگل نہیں ہیں۔ لیکن لوگ آپ کو دیکھ کر پاگل ہو جاتے ہیں۔" آخری جملہ میری زبان سے غیر ارادی طور پر نکل گیا۔

"آپ شاعرانہ مزاج بھی رکھتے ہیں۔" وہ دھیمی سی مسکراہٹ سے بولی اور سنجیدہ ہوگئی۔ "اس گفتگو سے پہلے میں آپ سے ایک التجا کرتی ہوں۔ آپ کو اس بات کی اجازت ہے کہ آپ مجھے پاگل ہی تصور کریں۔ مگر پھر بھی آپ میری بات اول سے آخر تک غور سے اور دھیان سے سنیں۔ کیوں کہ یہ بہت ہی اہم ہے۔ اس کے بعد آپ کو اختیار ہے کہ اسے درست سمجھیں یا نہ سمجھیں میں آپ کو کسی بھی بات کے لیے مجبور نہیں کروں گی۔"

"آپ مطمئن رہیں۔" میں نے اسے دلاسا دیا۔ "میں آپ کی ہر ایک بات سننے کے لیے تیار ہوں۔"

"یہ ایک ایسا راز ہے جو میں آپ پر آشکارا کر رہی ہوں۔" وہ سرگوشی کے انداز میں دھیمی آواز میں بولی۔ "اس کا تعلق صرف میری اور آپ کی ذات سے ہے۔"

میں اس کی یہ بات سن کر چونکا اور مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ لیکن میں نے اپنی زبان سے کچھ نہیں کہا۔

"مسٹر شاہ جی!......" چند لمحوں تک گہری خاموشی رہی۔ پھر اس نے خود ہی خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ "آپ تو یہ جانتے ہی ہیں کہ میرا نام شکنتلا ہے۔ آپ شاید اس بات کا یقین نہیں کریں گے۔ کیوں کہ آپ مسلمان ہیں۔ آپ کے مذہب میں دوسرے جنم کو مانا نہیں جاتا ہے۔ بہر حال آپ میری بات مان لیں۔ یہ میرا دوسرا جنم ہے۔ پہلے جنم میں میرا نام سرسوتی تھا۔ میرا باپ ایک مندر کا پجاری تھا۔ یہ قدیم اور پرشکوہ ہشت پہلو مندر چاروں طرف سے خوبصورت اور سر بفلک پہاڑوں سے گھری ہوئی حسین اور سندر سپنوں جیسی وادی سے گھرا ہوا تھا۔ یہ جس وادی میں واقع تھا اس کے پہاڑ نہایت سر سبز اور شاداب تھے۔ اس کا حسن دل کی گہرائیوں کو چھو لیتا تھا۔ اس وادی میں سنہری گھاس اگی تھی جس پر جا بجا صد ہا رنگوں کے خودرو پھولوں کی چادریں بچھی رہتی تھیں۔ ان پھولوں پر خوش رنگ تتلیوں کا جم گھٹا بھلا معلوم ہوتا تھا۔ یہ ایسا دل کش نظارہ ہوتا تھا کہ دیکھنے والوں کو اس کا جادو اسیر بنا لیتا تھا۔

مندر سے پچاس گز کے فاصلہ پر پہاڑ کے دامن میں فیروزی رنگ کی ایک خوش نما گہری جھیل تھی۔ جس میں ایک بلند اور شان دار آبشار گرتا تھا۔ یہ جھیل اس وادی میں بالکل ایسی معلوم ہوتی تھی۔ جیسے سونے کی خوش نما انگوٹھی کے درمیان فیروزہ جڑا ہوا ہو۔ اس نیلے رنگ کی جھیل میں ننھی ننھی سنہری مچھلیوں کا تیرنا سونے پر سہاگے کا کام دیتا تھا۔ دل کو موہ لینے والا منظر ہوتا تھا۔

صبح کے وقت جب جھیل پر میں پانی بھرنے کے لیے جاتی تو ان چھوٹے چھوٹے خوبصورت رنگین پرندوں کے گیت سن کر جو بلند درختوں پر اپنی سریلی آواز میں گاتے رہتے۔ مجھ پر ایک عجیب وغریب سا وجد طاری ہو جاتا تھا۔ میں ایک عجیب سا کیف محسوس کرتی جسے میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی۔

رات کے وقت ہوا کے ہلکے اور خوش گوار جھونکے آبشار کی آواز کے ساتھ مل کر ایک دل نشین صورت اختیار کر لیتے تھے۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی نامعلوم مغنیہ اپنے سوز و ساز سے موسیقی کی تانیں اڑا رہی ہو۔ کتنی فرحت سی نہ صرف دل و دماغ میں بلکہ پورے جسم میں محسوس ہوتی تھی۔ دل کرتا تھا کہ یہ مدھر مدھر سر ساری ساری رات فضا میں گونجتے رہیں۔

مندر کے دائیں جانب ہمارا چھوٹا سا گؤ شالہ تھا اور بائیں جانب ہماری سکونت کے لیے کوٹھری بنی تھی۔ مندر کے پچھواڑے کی زمین میں میرا باپ کھیتی باڑی کرتا تھا اور کھیتوں کے اختتام پر ایک فراخ اور ڈھلوان راستہ بھی تھا۔ یہاں سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر ایک ندی بھی تھی۔ جس کے دوسرے کنارے پر ایک گاؤں آباد تھا۔ ندی پایاب تھی۔ اس راستے سے ہم لوگ کبھی کبھی گاؤں جاتے تھے اور سامان رسد وغیرہ خرید کر واپس آجاتے اور گاؤں کے لوگ بھی اس راستے پر مہینے کے نوچندی اتوار کو اس مقدس جھیل

میں اشنان کرنے کے لیے آتے تھے۔

کاش!...... مجھے اور باتوں کی طرح اس پہاڑ اور وادی وغیرہ کا نام بھی یاد ہوتا۔ میری عمر اس وقت اٹھارہ برس کی ہوگی۔ موسم سرما کا آغاز تھا۔ رات کو خوب برف باری ہوئی۔ صبح بیدار ہونے کے بعد جب میں نے باہر دیکھا تو پہاڑ اور درخت برف سے سفید ہو رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ سفید براق سی چادر بچھا دی گئی ہو۔ تمام وادی بھی روئی کے گالوں سے ڈھکی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ میں دیر تک دودھ کے اس منجمد دریا کو دیکھتی رہی۔

جب میں گؤ شالہ کی طرف گئی تو گؤ شالہ کے دروازے پر کوئی چیز گٹھڑی کی طرح پڑی ہوئی دیکھ کر میں نے پتاجی کو بلایا۔ انہوں نے قریب جا کر دیکھا اور گٹھڑی کھولی۔ ایک آدمی شدید سردی کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو گیا تھا اور وہ خوش قسمتی سے زندہ تھا۔

ہم دونوں نے مل کر اسے اٹھایا اور اپنی کوٹھری میں لے جا کر بستر پر لٹا دیا۔ پتاجی نے مزید تسلی کرنے کے لیے اس کی نبض ٹٹول کر دیکھی اور اس کے سینے پر دل کی جگہ اپنا ایک کان رکھ کر دل کی دھڑکنیں سنیں اور مجھ سے کہا کہ زندہ ہے۔ پھر اس پر کمبل اور چیتے کی کھالیں ڈال دیں۔ میں نے جلدی سے آگ روشن کی تاکہ کمرا گرم ہو جائے اور اس کے جسم کو گرمی پہنچے۔ یہی ایک تدبیر تھی جس سے اس کے جسم میں سے سردی ختم ہو سکتی تھی۔ پتاجی نے اس کے منہ میں انگور کا رس ٹپکایا جو شراب کا سا کام دیتا تھا۔ وہ سردی کا قاتل تھا۔

وہ دوسرے تیسرے دن بالکل تندرست ہو گیا۔ اس کی توانائی اور طاقت بحال ہو گئی۔ پتاجی نے ہر چند اس سے ایسے وقت پر آنے کا سبب دریافت کیا اور اس کا حسب نسب بھی جاننے کی کوشش کی۔ اس نے جو کچھ بتایا وہ کسی بھی اعتبار سے تسلی بخش نہ تھا۔

یہ جوان نہایت تومند اور کسرتی بدن کا تھا۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹ جو کاغذی سے لگتے تھے۔ لیکن ایسا لگتا تھا کہ اس میں جیسے رس بھرا ہوا ہو۔ ستواں ناک جو اس کے چہرے کی خوبصورتی میں سندر سا اضافہ تھی۔ صاف وشفاف آئینے کی سی چمکیلی آنکھیں جن میں ایسا جادو تھا کہ دل کو مسخر کر لیتا تھا۔ فراخ پیشانی، سیاہ گھنگریالے بال، گوری رنگت ایسا چوڑا چکلا اور مضبوط سینہ جو عورت کی کمزوری ہوتا ہے اور عورت کے دل میں ایسا سینہ دیکھ کر یہ خواہش ابھرتی ہے کہ وہ ایسے سینے پر سر رکھ کر اس میں جذب ہو جائے اور بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرتی رہے۔

یہ سب چیزیں ایسی تھیں جو اس کی عالی نسبی کا ثبوت دیتی تھیں۔ اس کے چہرے مہرے اور وضع قطع سے یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ ایک باوقار شخص ہے۔ کسی اعلیٰ گھرانے کا چشم و چراغ۔ وہ نہایت غم زدہ اور پریشان معلوم ہوتا تھا۔ اسے کس بات کا صدمہ تھا یہ معلوم نہ ہو سکا۔ کیوں کہ اس نے بتایا نہیں تھا۔ وہ تو بس ایک خول میں بند تھا جسے پتاجی باوجود کوشش کے توڑ نہ سکے۔ وہ چاہتا تو اس خول سے باہر آ سکتا تھا لیکن اس نے باہر نکلنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس نوجوان کا نام پریم تھا۔ وہ نہایت محنتی اور جفاکش تھا۔ مندر اور کھیتی باڑی کا سارا کام اس نے سنبھال لیا۔ اس نے کبھی کام اور محنت سے جی نہیں چرایا تھا۔ وہ بڑا ذے

دار اور فرض شناس تھا۔ وہ اپنا کام نہ صرف بڑی خوش اسلوبی سے کرتا تھا۔ بلکہ پتاجی کی سیوا بڑی عقیدت مندی سے اور ایک پجاری کی طرح کرتا تھا جس کے باعث پتاجی اس پر بہت مہربان ہو گئے تھے اور مجھ سے کہتے تھے کہ پریم ایک ایسا انمول نایاب ہیرا ہے۔ جو قسمت والوں کو ملتا ہے بھگوان نے اسے ہمارے پاس بھیجا ہے۔ شاید اسے کوئی ہماری بات پسند آ گئی۔

مجھے پریم سے پریم ہو گیا تھا۔ لیکن پریم کو مجھ سے پریم نہیں ہوا تھا۔ اگر اسے مجھ سے پریم ہو گیا ہوتا تو وہ اپنے پریم سے بہت فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ لیکن وہ میری طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتا بھی نہیں تھا۔ میں پہلے تو یہ سمجھی تھی کہ اسے اپنی خوبصورتی اور مردانہ وجاہت پر بڑا ناز ہے۔ غرور و تکبر ہے۔ اس لیے وہ مجھے گھاس نہیں ڈالتا ہے۔ کتنی مرتبہ تنہائی میں وہ کوٹھری میں آیا تھا۔ پتاجی کسی کام سے گاؤں اور شہر گئے ہوئے تھے۔ اس کی جگہ کوئی اور نوجوان مرد ہوتا تو وہ جذبات کی رو میں بہہ جاتا۔ میں کوئی بدصورت یا معمولی سی لڑکی نہ تھی۔ میرا حسن و شباب زاہدوں، سنیاسیوں اور پنڈتوں کو بھی بہکا دینے والا تھا۔ میں اس کی جھولی میں کسی پکے پھل کی طرح ٹپک جانا چاہتی تھی۔ لیکن اس نے پھل توڑنے کے لیے ہاتھ ہی نہیں بڑھایا جس پر مجھے بہت غصہ آیا۔ اسے میں نے اپنی توہین سمجھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اس پر مہربان ہو کر اس کا مان توڑ دوں گی۔

مجھے ایک دن اس بات کا احساس ہوا کہ وہ بہت نیک اور شریف شخص ہے۔ وہ میری بہت عزت کرتا ہے۔ اس لیے کہ میں اس کے محسن کی بیٹی ہوں۔ ورنہ اس کے لیے مجھے ایک پھول کی طرح مسل دینا چنداں مشکل نہ تھا۔ وہ کٹھور دل بھی نہ تھا۔ وہ اس لیے مجھ سے پریم نہیں کرتا تھا کہ شاید میں اسے پسند نہیں کرتی ہوں۔

میرے پتاجی کو میری شادی کی بڑی فکر لاحق تھی۔ میرے لیے بہت سارے رشتے آئے تھے لیکن انہیں پسند نہیں آئے تھے۔ انہوں نے ایک روز پریم سے دریافت کیا کہ کیا تم میرا بیٹا بننا پسند کرو گے؟ اس نے رضامندی ظاہر کر دی۔ پتاجی نے مجھے پریم سے بیاہ کر کے اسے اپنا جاں نشین بنا لیا۔

شادی کے بعد میری زندگی کا لطف نہ صرف دوبالا ہو گیا بلکہ وہ بہت حسین اور خوش گوار ہو گئی۔ ایک ایسی رنگینی پیدا ہو گئی کہ میں خواب و خیال میں بھی سوچ نہیں سکتی تھی۔ کیوں کہ وہ میرا سپنا تھا اس لیے میری خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہا تھا۔ شادی کے بعد اس نے مجھے بتایا کہ وہ مجھ سے بے انتہا محبت کرتا تھا۔ پہلے ہی دن وہ مجھ پر ریشہ خطمی ہو گیا تھا اور دل ہی دل میں میری پرستش کرنے لگا۔ رعب حسن کی وجہ سے وہ نگاہ نہیں اٹھاتا اور بات نہیں کرتا تھا۔ وہ مجھے چھپ چھپ کر ندی پر جھیل پر نیند کی حالت میں گھنٹوں دیکھتا تھا۔ بعض اوقات اس کے جذبات مجھے گھر میں دیکھ کر بے قابو ہو جاتے تھے۔ پھر وہ اس وقت تک کے لیے دور چلا جاتا تھا۔ جب تک اس کے جذبات قابو میں نہیں آ جاتے تھے۔ اسے شیطان بہکاتا تھا۔ لیکن وہ کبھی شیطان کے بہکاوے میں نہیں آیا وہ اپنی محبت اور مجھے میلا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

چاندنی راتوں میں ہم دونوں جھیل کے کنارے بیٹھ کر سیر اور چاندنی کا لطف اٹھاتے۔ چاند کا عکس پڑنے سے جھیل بقعۂ نور بن جاتی تھی اور ہم دونوں کی محبت میں جذباتیت پیدا ہو جاتی۔ چاندنی راتوں کا

سماں ہی اور ہوتا ہے۔ جب میری شادی نہیں ہوئی تھی۔ تب میں اس کے تصور میں دیر تک جاگتی رہتی تھی۔ پورنیا کی رات پتاجی مندر چلے جاتے یا پھر پریم سے بات کرنے کے لیے۔ میں بستر پر دیر تک پڑی پریم کے بارے میں سوچتی رہتی۔

پریم جیسا تھا اس کی آواز بھی ایسی ہی تھی۔ پریم ایسی دل کش لے میں پہاڑی گیت گاتا کہ میں بے خودی ہو جاتی۔ اس کے گلے میں بانہیں حمائل کر دیتی تو پریم ہنس کر کہتا۔

"دیکھو سرسوتی!...... اس وقت میرے سامنے تین چاند ہیں۔ ایک آسمان پر۔ دوسرا جھیل میں اور تیسرا میری گود میں ہے اور میرے قابو میں ہے......" پھر وہ میرے چہرے پر جھک جاتا۔

اس کے محبت بھرے الفاظ میرے کانوں میں رس گھول دیتے اور میں مدہوش سی ہو جاتی اور کچھ دیر بعد میں اس کے بازوؤں سے نکل کر دور جا کر کھڑی ہو جاتی۔ "میرے چاند آ جاؤ۔"

"جی نہیں......" میں مصنوعی خفگی سے کہتی۔ "شریف لڑکیاں اس طرح مردوں سے نہیں ملتی ہیں۔"

"تم میری پتنی ہو۔ پتنی ہی نہیں بلکہ محبوبہ بھی ہو۔" وہ پیار سے بلاتا۔ "اب تو آ جاؤ صنم۔"

"صنم بولتے کہاں ہیں۔" میں کہتی۔ "بس تم اتنی ہی دور سے میرا نظارہ کرتے رہو۔"

وہ میری بات سن کر ہنس دیتا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا چاندنی کے دریا میں کسی نے ہلکا سا پتھر دے مارا ہو۔ لہریں ڈولنے لگی ہوں اور میں ان ڈولتی لہروں کا سہارا لے کر اس کی طرف لپکتی اور اس کے بازوؤں میں جھول جاتی۔

صبح کے وقت جب میں جھیل پر پانی بھرنے جاتی تو پریم بھی ساتھ ہوتا تھا۔ ہم دونوں پتی پتنی کم تھے بلکہ نوجوان زیادہ تھے۔ مجھ میں شوخی شرارت بھری ہوئی تھی۔ وہ بھی کسی منچلے جوان کی طرح تھا۔ کبھی تو وہ مجھ پر چھینٹے اڑاتا اور موقع پا کر پانی میں کھینچ لیتا تھا۔ تا کہ میں پانی میں پوری بھیگ جاؤں۔ میں اس کے جواب میں اس پر پانی سے بھری گاگر انڈیل کر خود بھاگ جاتی۔ دور جا کر اس کا منہ چڑانے اور ٹھینگا دکھانے لگتی۔ اس پر وہ مجھے تبسم بھری نگاہوں سے دیکھتا۔ ہاتھ جوڑ کر پیار بھرے لہجے میں کہتا کہ۔ صنم آ جاؤ۔ اس کی محبت کا تیر میرے دل میں پیوست ہو جاتا۔ پھر وہ لپک کر مجھے دبوچ لیتا اور میں جیسے ہار جاتی۔

ہم دونوں اکثر اس پر بہار حسین اور رنگین وادی میں آنکھ مچولی کھیلا کرتے جس میں بڑا لطف آتا اور جب ہم واپس آتے تو میں تھکن سے چور اور نڈھال ہوتی تھی۔ کیوں کہ پہاڑی اور چڑھائی پر چھپنے کے لیے اترنا چڑھنا پڑتا تھا۔ اس وادی میں وقت گزاری اور تفریح کا کوئی سامان نہ تھا۔ میں کھیتی باڑی میں بھی اس کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ برسات کے موسم میں سارا دن بیر بہوٹیاں پکڑنے میں صرف ہو جاتا۔ رات کے وقت جگنو پکڑنے میں مصروف ہو جاتے اور اس میں بھی بڑا لطف آتا تھا۔

جب میں دیوی کی پوجا کے لیے پھول چننے جاتی تو پریم پیچھے سے آ کر میری آنکھیں بند کر لیتا اور بھی گدگدی کرنے لگتا جس سے ہنستے ہوئے میں لوٹنا کبوتر بن جاتی۔ آہ! وہ دن کتنے اچھے سہانے اور انمول اور ناقابل فراموش اور نشاط انگیز تھے۔ مجھے جب پچھلے جنم کے دن گھڑیاں اور لمحات اور پریم یاد آتا

ہے۔تو میرے دل پر چوٹ لگتی ہے اور سینے میں سرد آہوں کا غبار بھر جاتا ہے۔کبھی کبھی تو میری آنکھیں پرنم سی ہو جاتی ہیں۔"

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔اس کے سینے میں سانسوں کے زیر و بم کے تموج سے اور چہرے اور آنکھوں سے بھی اس کے دلی جذبات کا اظہار ہونے لگا۔وہ بے حد دل گرفتہ سی لگ رہی تھی۔

میں نے اس کی کہانی پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔میری نظریں اس کے چہرے پر جمی رہیں۔چند لمحوں تک گہری خاموشی طاری رہی۔"مسٹر شاہ جی!" اس نے کہا۔"کیا آپ میرے پریم کو جانتے ہیں؟"

"میں اسے کیسے جان سکتا ہوں؟" میں نے ہنس کر کہا۔"پچھلے جنم میں میں کہاں تھا۔آپ سے اور اس سے ملاقات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔اس جنم میں صرف آپ سے ملاقات ہوئی ہے۔"

"آپ تو روز ہی آئینہ دیکھتے ہیں۔بارہا دیکھتے ہوں گے۔کیوں......؟" شکنتلا نے سنجیدگی سے کہا۔

شکنتلا کے منہ سے یہ الفاظ سن کر میں چونک اٹھا۔اس لمحے مجھے یاد آیا کہ جب شکنتلا نے مجھے پہلی دفعہ دیکھا تھا تو پریم پریم کہتی ہوئی گھر کے اندر کی طرف بھاگی تھی اور اس وقت میں نے اس کی اس حرکت کے پاگل پن پر غور کیا تھا اور مجھے اس پر بے حد ترس بھی آیا تھا۔ترس دراصل اس کے نوجوان اور حسین ہونے پر آیا تھا کہ یہ کتنی بدنصیب ہے کہ پاگل پیدا ہوئی۔ملازم نے مجھے بتایا تھا کہ شکنتلا پیدائشی پاگل ہے۔

"کیا میری شباہت تمہارے پریم سے ملتی جلتی ہے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"شباہت نہیں ہے۔" وہ کہنے لگی۔"آپ ہو بہو میرے پریم کی طرح ہیں۔ذرہ برابر بھی تو فرق نہیں ہے۔جڑواں کی طرح ہیں۔قد، جسامت، رنگ، روپ، بال چہرہ آنکھیں اور حتیٰ کہ آواز تک بال برابر بھی فرق نہیں ہے۔"

"یہ محض ایک عجیب و غریب سا اتفاق ہے۔قدرت کے کارخانے میں بعض انسان ایک ہی سانچے میں بن جاتے ہیں۔"

"آپ کی داہنی طرف کی پسلیوں پر روپے کے سکے کے برابر چوڑا ایک سفید چاند گرہن کا داغ ضرور ہوگا۔اور اسی طرف ران پر ایک بڑا سا سیاہ داغ اس زخم کا بھی ہوگا جو گائے کی دولتی لگنے سے ہوا تھا۔یہ داغ بالکل جانور کے سم کی طرح درمیان سے پھٹا ہوا ہے۔"

میں یہ سن کر ہکا بکا رہ گیا۔کیوں کہ سچ مچ یہ دونوں نشان میرے بدن پر موجود تھے۔میں بچپن سے دیکھتا آیا تھا۔ماں نے مجھے بتایا تھا کہ یہ نشانات پیدائشی ہیں۔مجھ پر جیسے کوئی بجلی سی آ گری جس نے مجھے گنگ سا کر دیا اور مجھ پر جیسے سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

"ابھی میری کہانی ختم نہیں ہوئی۔" شکنتلا نے ان نشانات کی مجھ سے تصدیق نہیں چاہی۔اس نے بتانا شروع کیا۔"میں اس پر کیف زندگی سے سرشار تھی۔سپنوں سے کہیں حسین زندگی گزار رہی تھی کہ ایک ایسا اندوہناک واقعہ پیش آیا جس نے ساری خوشیوں اور مسرتوں کو ملیا میٹ کرنے کے علاوہ ہماری زندگی

کا بھی خاتمہ کر دیا۔

میری شادی کو تین برس کا عرصہ خوابوں کی طرح گزر گیا۔زندگی ایک طرح سے خواب ناک ہی تھی۔اسوج کی چوتھی تاریخ تھی۔سردی غیر معمولی طور پر بڑھ رہی تھی۔سرد ہوا میں تندی اور ایسی شدت آ گئی تھی کہ ہڈیوں میں چھید کرتی محسوس ہو رہی تھی۔ہوا باہر سائیں سائیں کر رہی تھی۔اندھیری رات تھی۔دروازے کی چرچراہٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔میں نے پریم کو پکارا کوئی جواب نہ ملا۔میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔میں نے اپنے برابر ہاتھ بڑھایا تو وہاں پریم نہ تھا۔پریم سردی کے موسم میں مجھے دبوچ کر سوتا تھا۔مجھے خیال آیا کہ صبح ہو گئی ہے اور پریم کسی کام سے نکل گیا ہے۔اٹھ کر دروازہ کھولا۔لیکن رات بالکل سیاہ اور ہیبت ناک تھی اور صبح ہونے میں بہت دیر تھی۔میں نے پھر پریم کو پکارا۔چند لمحوں کے وقفے کے بعد پھر تیسری مرتبہ پکارا۔اور جواب نہ ملنے پر میں نے اچھی طرح ادھر ادھر جھانک کر دیکھا۔پھر میری نگاہ مندر کی سمت اٹھ گئی۔یہ دیکھ کر مجھے بڑا تعجب ہوا کہ مندر میں دھیمی دھیمی روشنی ہو رہی تھی۔میں نے کبھی اتنی رات گئے مندر میں روشنی نہیں دیکھی تھی۔

میں بڑی حیران ہوئی کہ پریم اس وقت مندر میں کیا کرنے گیا ہے۔چند لمحوں تک میں دروازے میں کھڑی سوچتی رہی۔پھر میں غیر ارادی طور پر مندر کی طرف بڑھ گئی۔دراصل حیرت اور تجسس کشاں کشاں مجھے لے جا رہا تھا۔دروازہ بند تھا۔اندر سے سرگوشیوں کی آواز آ رہی تھی۔میں نے دروازے کے قریب ہو کر درزوں میں سے کمرے میں جھانکا۔میں نے دیکھا تین شخص قریب قریب بیٹھے دکھائی دیئے۔ان میں ایک پریم تھا۔دوسرے پتاجی اور تیسرے کی بابت معلوم نہ ہو سکا۔وہ اور اس آواز میں میرے لیے نامانوس سی تھی۔لیکن وہ اس قدر دھیمی تھی کہ میری سماعت تمیز کرنے سے قاصر رہی تھی۔

میں بہت سٹ پٹائی۔میری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔میں جتنا سوچتی اتنا ہی الجھ جاتی۔ذہن جیسے پریشان اور ماؤف سا ہو کر رہ گیا۔جیسے کسی نے جادو کر دیا ہو۔حیرانی کی بات تھی کہ پریم اور پتاجی اتنی رات گئے مندر میں چراغ جلا کر کس سے سرگوشیاں کر رہے ہیں۔اس راز کو معلوم کرنے کا تجسس اس قدر بڑھا کہ میں نے جاننے کے لیے جستجو شروع کر دی۔مندر کے اردگرد چکر کاٹنے شروع کیے۔مگر بے سود۔مجھے کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا۔مجھے پتاجی اور پریم پر بھی سخت غصہ آیا کہ انہوں نے مجھے کیوں نہ راز داری کے قابل سمجھا اور نہ ہی اعتماد میں لیا۔میں پریم کی پتنی ہم خیال اور ہم راز بھی تھی۔پتاجی کی اکلوتی بیٹی جس کی فطرت اور طبیعت سے وہ واقف تھے۔انہوں نے میری پرورش ماں کی طرح کی تھی اور پھر وہ ہر بات میں مجھ سے مشورہ کرتے اور میرا مشورہ مان لیتے تھے۔میرا غصہ فطری تھا۔کیوں کہ مجھے نظر انداز کر دیا گیا تھا۔

پہلے تو میں نے یہ سوچا کہ دروازہ پیٹ ڈالوں۔پھر خیال آیا کہ پریم اور پتاجی اس بات سے برہم اور سخت ناراض نہ ہو جائیں میں پورے دنوں سے تھی۔دن اور رات کے کسی بھی حصے میں میرا بچہ پیدا ہونے والا تھا۔سردی میں کافی دیر کھڑے رہنے اور مندر کے چکر کاٹنے کی وجہ سے نہ صرف میں بے حد تھک گئی تھی بلکہ طبیعت بھی بگڑنے لگی تھی۔اس لیے میں واپس آ گئی۔میری تکلیف بڑھتی گئی۔کچھ دیر بعد

پریم واپس آیا تو میری حالت ناگفتہ بہ تھی۔ میں نے پریم سے سیدھے منہ بات نہیں کی اور روٹھی رہی اس نے مجھے منانے کی کوشش کی تو میں نے اسے بری طرح جھڑک دیا۔

"تم مندر میں جاکر کس سے باتیں کر رہے تھے؟ نہ تم نے بتایا اور نہ ہی پتا جی نے...... تم مجھ سے بات نہ کرو۔"

"پیاری...... پیاری سرسوتی!" وہ میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر پیار بھرے لہجے میں کہنے لگا۔ "اس میں میرا کوئی دوش نہیں ہے۔ میں خود سے نہیں گیا تھا بلکہ پتا جی نے آ کر مجھ سے کہا تھا کہ میں مندر پہنچوں میں ان کا حکم کیسے ٹال سکتا تھا۔ ان کی طلبی پر پہنچا تھا۔ کیوں کہ ایک اناتھ بدھوا مندر میں پناہ لینے آئی تھی۔ تمہارے پتا جی کو اسے دیوی کی پجارن بنانے پر کچھ رسومات ادا کرنی تھیں۔ میں نے تمہیں جگا کر بے آرام کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ یوں بھی تم گہری نیند میں غرق تھیں۔ اس لیے میں تمہارے پتا جی کے ساتھ خاموشی سے مندر میں چلا گیا۔"

میں پریم کے جواب سے مطمئن ہوگئی۔ اس نے مجھے چوم کر اور منا کر میرا سارا غصہ اتار دیا۔ دن نکلنے کے بعد میں نے ایک بچے کو جنم دیا۔ اس بدھوا پجارن نے میری بڑی سیوا کی۔ ایسی خدمت شاید میری سگی بہن یا کوئی رشتہ دار ہوتی بھی تو نہ کرتی۔ یہ بہت حسین و جمیل اور بڑی نیک عورت تھی۔ اس کی گود میں چھ سات مہینے کا بچہ تھا۔

اس عورت کا نام سرلا تھا اور اس کے بچے کا نام پرکاش تھا۔ وہ ایک گول مٹول اور صحت مند اور خوبصورت سا بچہ تھا۔ سرلا کو چونکہ اس گھر میں پناہ ملی تھی اور اسے ہمارے رحم و کرم پر رہنا تھا اور ایک لحاظ سے وہ ہماری محتاج بھی تھی اس لیے وہ ہر وقت میری خوشنودی حاصل کرنے میں کوشاں رہتی۔ اس بات کی کوشش کرتی کہ اس کی ذات اور اس کے کسی کام سے مجھے شکایت کا موقع نہ ملے۔ وہ بڑی مستعد تھی۔ نفاست پسند بھی تھی۔ مجھے بھی اس سے کچھ ہم دردی ہوگئی۔ اس لیے بھی کہ وہ ایک بدھوا عورت تھی۔ میرا ہر طرح سے خیال بھی رکھتی تھی۔

میں اب ہر وقت اپنے بچے کرن دیوان کو گود میں لیے بیٹھی رہتی۔ کیوں کہ اس کے سوا اب مجھے کوئی کام نہ تھا۔ سرلا مجھے کسی کام کو ہاتھ لگانے نہیں دیتی تھی جیسے میں کوئی راج کماری ہوں اس وادی کی۔ گھر کا سارا کام وہ خود ہی کرلیتی تھی۔ مجھے اپنے بیٹے کرن سے بڑی محبت تھی۔ کیوں نہ ہو میری اولاد جو تھا۔ وہ مجھے پریم سے بھی زیادہ عزیز تھا۔ پریم بھی اپنے بیٹے کو بہت چاہتا تھا۔ اور اسے بڑی دیر تک لیے رہتا اور چومتا جاتا تھا۔

سرلا کا بچہ بھی بہت پیارا اور معصوم سا تھا۔ کرن نے اچھی صحت کے باعث ایک برس کی عمر میں ہی چلنا پھرنا سیکھ لیا تھا۔ جس سے گھر میں بڑی رونق آ گئی تھی۔ جب بھی پریم کرن کو پیار کرنے لگتا تو پرکاش بھی پاس آ جاتا تھا۔ پریم اسے بھی نہ صرف پیار کرتا بلکہ ایک سرد آہ بھر کے اس بچے کے سر پر شفقت اور محبت سے ہاتھ پھیرنے لگتا۔ اور اسے بھی اپنی گود میں ایک طرف بٹھا لیتا اور دوسری طرف کرن کو۔ مجھے

پریم کی یہ حرکت ناگوار ہی نہیں بلکہ زہر لگتی تھی۔

رفتہ رفتہ میں نے محسوس کیا کہ پریم کرن سے زیادہ پرکاش کو چاہتا ہے۔ جیسے وہ اس کا بیٹا ہو۔ یہ بات میرے لیے ناقابل برداشت تھی۔ یہ میرا واہمہ نہیں تھا۔ میں نے پریم کی غیر موجودگی میں پتا جی سے شکایت کی۔ میرا خیال تھا کہ پتا جی میری طرف داری کریں گے اور پریم کو ٹوکیں گے۔ لیکن پتا جی نے الٹا مجھے ہی ملامت کیا اور کہا کہ تم غلط انداز سے سوچ رہی ہو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کوئی باپ اپنی اولاد سے بڑھ کر دوسرے کی اولاد کو چاہ نہیں سکتا۔ پھر انہوں نے مجھے سمجھایا اور نصیحت کی کہ پرکاش بے باپ کا بچہ ہے۔ اس پر رحم کرنا چاہیے۔ چوں کہ وہ بچہ باپ کی شفقت سے محروم ہے اس لیے وہ پریم کے پاس چلا آتا ہے۔ پریم اس سے بھی اس لیے چاہت کا اظہار کرتا ہے کہ اس کی دل شکنی نہ ہو۔ پتا جی کی اس بات نے مجھے لاجواب کر دیا لیکن اس دن پرکاش میری نظروں میں کھٹکنے لگا اور مجھے اس سے نفرت سی ہوتی گئی۔

جوں توں کر کے وقت گزرتا گیا۔ وقت کب رکا ہے اور وقت کب کس کا ہوا ہے۔ حتیٰ کہ کرن ڈیڑھ برس کا اور پرکاش دو برس کا ہوگیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ پرکاش ہرن کے بچے سے کھیل رہا تھا اور کرن جھولے میں سو رہا تھا۔ میں دو دن سے نہائی نہیں تھی۔ سوچا کہ آج چل کر جھیل پر نہا لوں۔ اس وقت وہاں کوئی ہوتا نہیں ہے اور وقت میں بھی یہاں کوئی نہیں آتا تھا۔ یہ جھیل صرف ہمارے تصرف میں تھی۔ میں نہا تو گھر پر بھی سکتی تھی۔ لیکن جھیل میں نہانے کا لطف اور تھا۔ چاروں طرف درختوں سے گھری ہوئی اس جگہ سناٹا اور تنہائی ہوتی تھی۔ سرلا بھی جھیل پر نہا کے آتی تھی۔ جب وہ یا میں نہا کر آتی تو پھر کوئی ہم میں سے جاتا تھا۔ کسی کے نہانے کے بعد کوئی جاتا تھا تاکہ بچوں کا خیال رکھا جاسکے۔ پریم سہ پہر اور دن ڈوبنے کے درمیان لوٹتا تھا۔ سرلا کسی کام سے گاؤں گئی ہوئی تھی۔ پتا جی مندر میں تھے۔ میں تولیا اور ساڑھی لے کر جھیل کی طرف بڑھی۔

میں نرم نرم گھاس پر بے آواز چلتی جھیل کے قریب پہنچی۔ چٹان کے پیچھے سے باتوں کی آواز سنائی دیں تو میں ٹھٹک کے رک گئی۔ میں نے رنگین پھول والے درخت کی ٹہنیاں سرکا حیرت سے دیکھا کہ یہاں اس وقت کون کیوں اور کس لیے آیا ہے۔ جب کہ اس وادی میں جھیلوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ آبشار کے قریب سرلا اور پریم موجود تھے۔ وہ سرلا کے چہرے کو تک رہا تھا۔ وہ دونوں دنیا و مافیہا سے بے نیاز محبت بھرے لہجے میں باتیں کر رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ یہ ملن آج پہلی بار نہیں ہوا۔ جانے کب سے ... آلودہ ہو رہے ہیں۔ وہ ایسے کوڑھ زدہ لگ رہے تھے۔ جن کے وجود سے تعفن اٹھ رہا ہو۔ یہ جذباتی منظر دیکھ کر میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

پریم!...... آہ...... یہ تم ہو پریم! اندر ہی اندر میرا سینہ کٹنے لگا۔ میں اپنا سر پیٹنے لگی، تم محبت پر ایک بہتان ہو۔ ایشور کا عذاب ہو۔ میں وحشت سے لڑکھڑانے لگی۔ تم اتنی دور نکل جاؤ گے۔ مجھ سے اتنا بھیانک مذاق کرو گے۔ میرے دل میں جیسے زہر میں بجھی ہوئی چھری اترنے لگی۔ میں درخت کے تنے کا سہارا نہ لیتی تو گر پڑتی۔ میں نے سرلا کو اس لیے پناہ، محبت اور سہارا نہیں دیا تھا کہ وہ میرا گھر اجاڑ دے۔

اب بھی ہو سکتا ہے کہ تم جس طرح آئے تھے اسی طرح واپس چلے جاؤ۔ میں اپنا چہرہ کھسوٹنے اور پیر پٹخنے لگی۔ کاش ایشور! میں اندھی ہوتی۔ کیا تو نے مجھے اس دن کے لیے بینائی دی تھی؟ یہ میں اپنے آپ سے مخاطب تھی۔ میری آواز ان کی سماعت تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

ایک لمحے کے لیے میرے دل میں نفرت اور غصے کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے سوچا کہ ان کے سامنے چلی جاؤں۔ لیکن مجھے مناسب نہیں لگا۔ کچھ حاصل نہیں تھا۔ کیوں کہ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ وہ واپس نہیں آ سکتا تھا میری نظروں میں وہ آلودہ ہو چکے تھے۔ ان کی پاک بازی ختم ہو چکی تھی۔ ان کے چہروں پر ایسی کالک مل گئی تھی کہ وہ کبھی دھل نہیں سکتی تھی۔

پریم کی بے وفائی سے میرا شیشہ دل ٹوٹ کر چکنا چور ہو گیا اور اس کی کرچیاں میرے وجود میں چبھ گئیں۔ میں رقابت کی آگ میں جل کر بھسم ہو گئی۔ نہانا کیا اپنے آپ کو بھی بھول گئی۔ اپنی بدبختی پر خون کے آنسو بہاتی ہوئی واپس آئی۔ مجھ پر تو بجلی گر پڑی تھی۔ میں کرن کے جھولے کے پاس بیٹھ کر غم اور بحر تفکرات میں ہچکولے کھانے لگی۔ میں سوچ رہی تھی کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ معاً میری نگاہ پرکاش کی طرف اٹھی جو ہرن کے بچے سے کھیل رہا تھا۔ میں نے چونک کر اسے کسی خیال کے زیر اثر دیکھا تو اس کی شکل پریم سے بہت مشابہہ معلوم ہوئی۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں رہا تھا کہ پرکاش، پریم کا ہی خون ہے۔ میں نے پتاجی کو بھی اعتماد میں نہیں لیا۔ اس بات کو دل ہی میں رکھا۔

پہلے سرلا آئی۔ وہ گاگر میں پانی لیے اور نہا کر آئی تھی۔ اور بہت خوش دکھائی دے رہی تھی۔ گزرے وقت کا فسانہ اس کے چہرے پر لکھا ہوا تھا۔ میں نے انجان بن کر پوچھا۔ ”سرلا! کیا بات ہے......؟ آج بہت خوش اور سرشاری دکھائی دے رہی ہو۔ ایسا لگتا ہے کہ تم نے کوئی کھوئی چیز پالی ہو......؟“

”جی... جی......“ پہلے تو وہ سٹ پٹا سی گئی۔ لیکن جلد ہی اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ پھر وہ بولی۔ ”آج پرکاش پورے دو برس کا ہو گیا ہے۔ اس خیال سے میں خوش ہو رہی ہوں۔ دو برس دو مہینے کی طرح بیت گئے۔“

”ہاں......وقت بہت تیزی سے گزر جاتا ہے۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ لیکن وہ سمجھی نہیں۔

جس وقت پریم آیا اس وقت میں اکیلی تھی۔ سرلا بچوں کو سیر و تفریح کرانے لے گئی تھی۔ پریم جس محبت اور گرم جوشی سے پیش آیا میں سمجھ گئی کہ اس میں کون سا جذبہ کارفرما ہے۔ اس میں تصنع اور فریب تھا۔ وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ اسے مجھ سے آج بھی اتنی ہی محبت ہے جتنی کل تھی۔ اگر میں نے ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھا نہ ہوتا تو یہی سمجھتی کہ یہ سچی بات ہے جو آج بھی کل کی طرح ہے۔ وہ ریاکاری اور منافقت سے کام لے رہا تھا۔ اس لمحے اس کا چہرہ اتنا مکروہ اور گھناؤنا لگا کہ میرے دل میں نفرت اور حقارت کی لہر اٹھی۔

جب وہ میرے چہرے پر جھکنے لگا تو میں اسے ایک طرف ہٹا کر چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔

”کیا بات ہے آج تم بہت ہی خوش دکھائی دے رہے ہو......؟ کیا کچھ پا لیا ہے؟“

”فصل بہت اچھی ہوئی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”پتاجی کہہ رہے تھے کہ اب تک ایسی فصل نہیں

ہوئی۔“

اتفاقاً کرن اور پرکاش اسی دن مندر کے دروازے پر بیٹھے کھیل رہے تھے۔ پرکاش نے دروازہ بند کیا تو اس میں کرن کی انگلیاں آ گئیں جس سے کرن کی آدھی چھنگلیا بالکل کٹ کر الگ ہو گئی۔ میں پہلے ہی سے بھری بیٹھی تھی۔ اب تو میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں نے پرکاش کو دھنک کر رکھ دیا اور سرلا کی سخت بے عزتی کی جس کی اسے اور پریم کو بھی توقع نہیں تھی۔ یہ مجبور اور بے غیرت نہ ہوتی۔ پریم سے اس کے تعلقات نہ ہوتے تو وہ یہاں سے چلی جاتی۔

اب میں کسی نہ کسی بہانے سے اس ڈائن سے لڑنے لگی جس نے میرے پتی پر اپنے حسن و شباب کا جادو چلا کر اسیر کر رکھا تھا اور اس کی تلاش میں یہاں آ کر مجھ سے چھین لیا تھا۔ ہر وقت اسے ذلیل کرتی اور گالیاں دیتی رہتی اور ساتھ ساتھ اس کے بچے کو بھی کوستی رہتی۔ لیکن اس نے کبھی میری کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ اف تک نہیں کیا۔ میری ہر گالی اور کوسنے نہایت صبر و تحمل اور ضبط سے سہتی۔ اور میں اس کی خاموشی سے اور زیادہ چراغ پا ہو جاتی۔ پریم کو اب بھی مجھ سے بدستور محبت تھی۔ لیکن میں جانتی تھی کہ اس میں کھوٹ ہے۔ مگر میں اسے ہرجائی سمجھتی تھی۔

آخر ایک دن میرے جبر و زیادتی سے تنگ آ کر سرلا گدھے کے سر سے سینگ کی طرح کہیں غائب ہو گئی۔ کہاں گئی۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ میری بلا سے کہیں بھی گئی۔ میرے دل سے اس کے لیے بددعا نکلی کہ ایشور اسے موت دے دے۔ اس کے جانے کے بعد میرا خیال تھا کہ وہ پھر سے میری طرف متوجہ ہو جائے گا۔ میں اس کا قصور معاف کر دوں گی۔ لیکن سرلا کے جانے کے بعد پریم مغموم رہنے لگا اور اب وہ مجھ سے کھچا کھچا رہتا تھا۔ جواب میں میں بھی اس سے نفرت کرنے لگی۔ میرے اور اس کے تعلقات روز بروز کشیدہ ہوتے گئے۔ تلخیاں گھر کی فضا میں گھلنے لگیں۔ ایک چھت کے نیچے رہتے ہوئے بھی ہمارے درمیان اجنبیت پیدا ہو گئی تھی۔ فاصلہ تھا کہ بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ ہر وقت سرد آہیں بھرتا اور اکثر یاس انگیز گیت گایا کرتا اور شام کے وقت کرن کو لے کر ڈھلوان پہاڑ کے دوسری طرف سیر کو جاتا اور رات کو دیر سے آتا۔

سرلا کو گئے تین برس بیت گئے مگر پریم کی حالت میں فرق نہ آیا۔ ایک روز نہ جانے کیوں میرے دل کے کسی کونے میں شک کی لہر اٹھی تو میں نے اس کے تعاقب کا فیصلہ کر لیا۔ ایک دن وہ کرن کو ہمراہ لے کر سیر کو نکلا تو میں اس کا غیر محسوس انداز سے پیچھا کرنے لگی۔ اس کی نگاہوں سے بچتی درختوں اور چٹانوں کی آڑ لیتی اس کے پیچھے پیچھے ہو لی۔ وہ ندی کے کنارے پہنچا تو میں نے سوچا کہ شاید وہ گاؤں کی طرف جا رہا ہے۔ مگر میرا خیال غلط ثابت ہوا۔ وہ بجائے ندی عبور کرنے کے اس کے کنارے تیزی سے چلتا ہوا ایک گھنے جنگل میں داخل ہو گیا۔

یہ راستہ بہت دشوار گزار اور آڑھا ترچھا تھا۔ لیکن میں نے تہیہ کیا ہوا تھا کہ آج ہر حالت میں پریم کی سیر گاہ کا پتا چلا کر رہوں گی۔ میں اپنا شک دور کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ اس لیے کسی مشکل کی پروا نہیں کی۔ اور گرتی پڑتی اس کا تعاقب کرتی رہی۔ تقریباً دو میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک سرسبز و شاداب

میدان آ گیا جو قدرے چھوٹا تھا۔ جس کے ایک طرف ندی بہتی تھی۔ دوسری طرف پہاڑ بالکل سیدھا اور چٹان کی طرح ایستادہ تھا۔ اس میدان میں ایک بیراگن کی کٹیا تھی جس کے دروازے پر پرکاش کھڑا تھا۔ اس نے کرن...... کرن...... کہہ کر کودنا شروع کر دیا۔ اس کی آواز پر اندر سے سرلا نکل آئی۔ کرن کو گود میں لے کر پیار کرنے لگی۔ بعد ازاں وہ لوگ کٹیا کے پچھواڑے کوئی بیس قدم کے فاصلے پر پہاڑ کے دامن میں جا کر غائب ہو گئے ہیں۔ میں ششدر سی تھی کہ وہ کہاں گئے......؟

میں درختوں میں خاصی دیر تک چھپی رہی۔ کیوں کہ اس روشنی میں وہاں جانا مناسب نہیں تھا۔ اس بات کا خوف اور خدشہ تھا کہ وہ مجھے دیکھ نہ لیں۔ جب دن ڈوب گیا اور شام کا دھندلکا چھا گیا تب میں وہاں سے نکل کر بلی کی طرح دبے پاؤں اس طرف گئی۔ ادھر ایک ایسا غار دکھائی دیا۔ جس کا دہانہ اتنا چھوٹا تھا کہ ایک آدمی بیٹھ کر اندر داخل ہو سکتا ہے۔ وہاں گھاس کی ایک کھڑکی لگی تھی۔ میں نے سوراخوں میں سے جھانک کر دیکھا۔ اندر ایک مشعل روشن تھی جس سے غار کی ہر چیز صاف اور واضح دکھائی دے رہی تھی۔ یہ غار اندر سے بہت وسیع تھا اور باہر سے نہیں لگتا تھا۔ ایک طرف اتنی بڑی چارپائی جتنا چبوترہ بنا ہوا تھا۔ جس پر دو آدمی آسانی سے لیٹ سکتے تھے۔ اس پر کچی مٹی سے نہایت دل فریب لپائی کی گئی تھی۔ چبوترے پر کھالوں کا بستر بچھا تھا۔ ان کے قریب ایک انگیٹھی بھی تھی۔ سرلا کہہ رہی تھی۔

''دیکھو پریم!'' وہ جذباتی لہجے میں بولی۔ ''تم مجھ سے دور مت ہو جانا ورنہ میں۔''

''یہ تم کیسی باتیں کرتی ہو سرلا۔'' پریم نے جھٹ سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''میں تمہارے بغیر جیون بتا نہیں سکتا۔''

ان کی محبت بھری باتیں اور جذبات کی افراتفری میرا دل چھلنی کیے دے رہی تھی۔ میرے کانوں میں گرم گرم سیسہ پگھلنے لگا تھا اور پھر اندھیرا بھی گہرا ہونے لگا تھا۔ میں رک کر ان کی باتیں سن کر اور انہیں دنیا و مافیہا سے بے نیاز دیکھ کر کیا کرتی۔ میں بڑی مشکل سے تاریکی میں ٹھوکریں کھاتی ہوئی گھر پہنچی۔ نفرت حقارت اور غصے سے میری حالت بڑی خراب ہو رہی تھی۔

اب مجھے یقین ہو گیا کہ پریم کا سدھرنا محال ہو گیا ہے۔ وہ اتنی دور جا چکا ہے کہ واپسی مشکل ہے۔ سرلا نے اس پر واقعی جادو کر دیا ہے۔ سرلا نہایت حسین اور پرشباب تھی۔ لیکن اس کا مجھ سے کوئی مقابلہ نہ تھا۔ لیکن اس جادوگرنی نے جادو کے زور سے مجھے پریم کی نظروں میں بے کشش کر دیا تھا اور خود کو اتنا حسین بنا لیا تھا کہ پریم اس کا غلام ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ دہری ازدواجی زندگی گزار رہا تھا۔ ایک طرح سے دونوں میاں بیوی ہی تھے۔ اس میں کسر ہی کیا رہ گئی تھی۔

اب میرا پریم مجھے چاہ نہیں سکتا اس خیال سے میری طبیعت مضمحل سی رہنے لگی۔ غم اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹنے لگا۔ میرا رنگ زرد پڑ گیا۔ میں دبلی اور کمزور ہوتی گئی۔ میری یہ حالت دیکھ کر بھی فکر مند اور پریشان ہو گئے۔ پریم پہلے کی طرح میری دل جوئی کرنے اور محبت سے پیش آنے لگا۔ وہ ہر ممکن طریقے سے مجھے خوش رکھنے کی کوشش کرتا۔ لیکن جو گھاؤ مجھے لگ چکا تھا۔ وہ کیسے بھر سکتا تھا اس کی

محبت گرم جوشی اور لگاوٹ ڈھونگ لگتی تھی۔ وہ میرا دل جیت نہ سکا۔

ہمارے مندر سے دو دن کی مسافت پر ایک شہر آباد تھا۔ جہاں ایک راجہ راج کرتا تھا۔ اس شہر میں ہر برس ساون کے مہینے میں بڑا زبردست میلہ لگتا تھا اور اس میں بڑی رونق ہوتی تھی۔ یہ میلہ صدیوں سے ہوتا چلا آ رہا تھا۔ اس میلے میں کسی دیوتا کے نام کوئی بھینٹ چڑھائی جاتی تھی۔ جواب مجھے بالکل بھی یاد نہیں۔ اس دفعہ پتا جی نے یہ میلہ دکھانے کا ارادہ کیا۔ اس خیال سے کہ میرا دل بہل جائے گا۔ اور غم بھی دور ہو جائے گا۔ میں جانا نہیں چاہتی تھی۔ کیوں کہ پریم کی بے وفائی نے میرا دل توڑ دیا تھا اور ایسا زخم دیا تھا کہ اب میرے لیے دنیا میں کوئی خوشی اور کشش نہیں رہی تھی۔ پتا جی کے اصرار پر میں نے حامی بھر لی۔ میرے اور کرن کے لیے نئے کپڑے سلوائے گئے۔ میرے لیے ایک خوبصورت گھوڑے کا انتظام کیا گیا۔

ہم لوگ دو دن کی مسافت طے کر کے شام کے وقت اس شہر میں پہنچے۔ ایک مندر میں ہم لوگوں نے پڑاؤ ڈالا۔ یہ شہر دو دریاؤں کے بیچ واقع تھا۔ سڑکوں کے اردگرد سرخ پھولوں سے لدی ہوئی خوبصورت اور گھنی جھاڑیاں شہر کو لالہ زار بنا رہی تھیں۔ شہر سے باہر میلوں تک مکئی کے سرسبز کھیت لہلہا رہے تھے۔ جا بجا آبشار جاری تھے۔ گویا نظارہ ہماری پربہار اور حسین وادی کے مقابلے میں کچھ نہ تھا۔ پھر بھی اس شہر کی خوبصورت اور دلکشی قابل دید تھی۔ میں نے پہلی بار اس شہر کو دیکھا تھا۔ پتا جی نے کہا تھا کہ جب میں تین برس کی تھی۔ تب یہاں آئی تھی۔ لیکن مجھے یاد نہیں تھا شہر کی حدود کے سامنے ایک وسیع میدان تھا۔

میلے میں ایسی چہل پہل اور رونق تھی کہ میں اس کی شان و شوکت میں اپنا دکھ بھلا بیٹھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس میلے میں ایسی رنگینی ہو گی۔ دوسرے دن میں صبح سویرے دریا سے اشنان کر کے واپس آ رہی تھی کہ راستے میں مجھے ایک شخص ملا جو بعد میں ہماری تباہی و بربادی کا باعث ہوا۔ اس نے پوچھا۔

''اے عورت!...... تم کہاں کی رہنے والی ہو؟''

میں نے اسے اپنے گاؤں اور مندر والی وادی کا پتا بتایا۔

''وہ گھنگریالے بالوں والا آدمی جو کل میلے میں تمہارے ساتھ تھا وہ کون تھا؟'' اس نے دریافت کیا۔

''وہ میرے پتی ہیں۔'' میں نے اسے بتایا۔ ''تم اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''کیا تمہارے مندر میں کوئی عورت بھی رہتی ہے......؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''ہاں......'' میں نے سر ہلا دیا۔ لیکن میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ اب وہ ساتھ نہیں رہتی ہے۔

اس نے مجھے اس عورت کا حلیہ بتایا۔ میں حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگی۔ کیوں کہ اس نے جو حلیہ بتایا تھا وہ ہو بہو سرلا کا تھا۔ وہ میرے بشرے سے بھانپ گیا یہ ضرور اس سے واقف ہے۔ اس لیے اس نے اپنا سابقہ سوال دہرایا تھا۔ تاکہ اس کی اچھی طرح سے تصدیق کی جا سکے۔

''کیا وہ عورت آپ کی رشتہ دار ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''آپ اس سے واقف ہیں؟''

اجنبی نے اثباتی انداز میں سر ہلا دیا۔ اس پر میں نے اسے جنگل اور غار میں رہائش کا اور صاف

صاف بتا اچھی طرح سے سمجھا دیا تھا تاکہ وہ اس سے ملنا چاہے تو وہاں پہنچنے میں اسے کوئی دشواری نہ ہو۔ اس کے بعد وہ ایک طرف بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ جانے کیوں وہ مجھے پراسرار اور قدرے مشکوک سا لگا۔ میں نے اپنے شک اور ان جانے خیالات کو جھٹک دیا۔ اور پھر میں اپنے ڈیرے پر آ گئی۔

میلے سے واپسی کو آٹھ دس روز گزر گئے تھے۔ ایک دن پریم کرن کو لے کر سیر کے بہانے سے باہر چلا گیا۔ اس دن میں اپنی نفرت اور غصے کو ضبط نہ کر سکی۔ میں پتاجی کے سامنے جا کر زاروقطار رونے لگی۔

''کیا بات ہے سرسوتی......؟'' پتاجی ایک دم سے گھبرا گئے۔ ''یہ تم اس طرح رو کیوں رہی ہو؟''

''آپ نے پریم کو اتنا سر چڑھا کر رکھا ہوا ہے کہ وہ میری بالکل بھی پروا نہیں کرتا ہے۔'' میں سسک پڑی۔

''تم پاگل ہو گئی ہو......'' پتاجی نے میرے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''وہ ہیرا ہے ہیرا۔ تمہیں بہت چاہتا ہے۔''

''کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت وہ کہاں گیا ہے؟'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔

''اس کی مرضی...... جہاں اس کا جی چاہے۔'' پتاجی بولے۔ ''آخر اس میں تمہارا کیا نقصان ہے جو اتنی پریشان ہو رہی ہو۔''

''تو کیا اس میں میرا کوئی نقصان نہیں ہے۔'' میرے اندر جو آتش فشاں دہک رہا تھا۔ وہ ایک دم سے پھٹ پڑا۔ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ ''آپ کہتے ہیں کہ میں پریشان نہ ہوں۔ آپ کو میری حالت کا اندازہ اور احساس نہیں ہے۔ وہ اپنی آشنا سے ملنے جاتا ہے۔ جو پہاڑ کی کھوہ میں رہتی ہے۔ اس کے دکھ میں تو گھل کر میں پارہ ہو گئی ہوں اور موت سے قریب ہوتی جا رہی ہوں۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں اسے اس کمینی اور ذلیل اور بدکار عورت کے پاس جانے سے نہیں روکوں۔''

''شکنتلا!'' پتاجی نے کہا۔ ''ایشور کا خوف کرو۔ ایسی بات منہ سے نکالنا پاپ ہے۔''

''کیا سرلا اس کی ماں یا بہن ہے جس کے پیچھے وہ دیوانہ ہو رہا ہے۔'' میں نے ترش روئی سے کہا۔

''ہاں......'' پتاجی نے سر ہلایا اور چند لمحوں کے بعد بولے۔ ''سرلا اس کی بہن ہے۔ بڑی دکھیا بہن ہے۔''

''بہن......؟'' میں بھونچکی سی رہ گئی۔ پھر میں نے کہا۔ ''آپ نے یہ بات مجھ سے پوشیدہ کیوں رکھی......؟''

''اس بات کو راز رکھنے کے لیے ہی میں نے پریم کو تاکید کی تھی اور اس سے کہا تھا کہ تمہیں کچھ نہ بتائے۔''

''وہ کس لیے......؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔ ''اس سے کیا فائدہ تھا؟''

''اس لیے کہ اس میں ایک گہرا راز تھا جو تم جیسی نادان لڑکی کے سامنے بیان کرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔''

یہ سن کر میں خاموش ہو گئی۔ مجھے اپنی پراگندہ ذہنیت اور سوچ پر بہت افسوس ہوا کہ بھائی بہن کی ملاقاتوں کو ایک سوکن عورت اور میلی نظروں سے دیکھا۔ جانے کیا کیا سوچا۔ میں نے کتنا بڑا پاپ کیا۔ میں کتنی گری ہوئی ہوں۔ میں پشیمان ہو کر اپنی کوٹھری میں چلی گئی۔ اور ندامت سے پانی پانی ہو گئی۔ کچھ دیر تک میں اپنے آپ کو ملامت کرتی رہی۔ میرا دل پریم سے صاف ہو گیا تھا۔ میں نے دل میں عہد کر لیا کہ جب پریم واپس آئے گا تو اس کے قدموں پر گر کر معافی مانگ لوں گی۔ پھر صبح سرلا کو جا کر منالاؤں گی۔ وہ بڑی نرم اور نیک دل ہے۔ وہ مجھے معاف کر کے آ جائے گی۔

رات بہت گزر گئی مگر پریم واپس نہ آیا۔ مجھے بڑی فکر اور پریشانی ہونے لگی۔ وسوسوں اور اندیشوں نے گھیرنا شروع کیا تو میں نے پتاجی کو جا کر بتایا۔ وہ بھی بہت متفکر ہوئے۔ انہوں نے مجھے دلاسا دیا کہ آسمان ابر آلود ہے۔ شاید سرلا نے اسے وہاں ٹھہرالیا ہو۔ تم یہیں آ کر سو جاؤ۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ پریشان نہ ہو۔ میں ان کے کہنے سے لیٹ گئی۔ مگر نیند کوسوں دور تھی۔ یہی حال پتاجی کا بھی تھا۔

جب صبح ہوئی تو میں اور پتاجی پریم کی تلاش میں نکلے۔ مجھے ڈر تھا کہ رات کو کسی جنگلی جانور نے حملہ نہ کر دیا ہو۔ چناں چہ ہم دونوں اس غار کے دہانے تک جا پہنچے۔

غار کی کھڑکی ٹوٹی ہوئی تھی۔ یہ غار بہت تاریک تھا۔ پہلے تو پتاجی نے پریم پریم کہہ کر آوازیں دینی شروع کیں مگر اندر سے کوئی جواب نہیں آیا تو تشویش سی ہوئی۔ البتہ ہماری آوازیں سن کر کٹیا میں سے پرکاش اور ہیرا گن نکل آئے۔ ہم لوگوں نے سمجھا کہ یہ سب لوگ کٹیا میں سوئے ہوں گے۔ ہم نے ادھر کا رخ کیا۔ لیکن ہیرا گن نے بتایا کہ یہاں صرف پرکاش ہی سویا ہے۔ یہ ہمیشہ اس کے پاس سوتا ہے۔

ہم لوگوں نے مشعل جلائی اور غار میں اتر گئے۔ اف مسٹر شاہ جی!...... کیا بتاؤں وہاں کیسا روح فرسا نظارہ تھا۔ ایسا دل خراش کہ دل اچھل کر حلق میں دھڑکنے لگا۔ جگر تھا کہ پاش پاش ہو گیا۔ پتاجی کے ہاتھ سے مشعل چھوٹ کر گر پڑی۔ آہ! ہم لوگوں نے دیکھا کہ پریم، سرلا اور کرن کی لاشیں خاک و خون میں غلطاں پڑی ہیں۔ پریم اور سرلا کی مشکیں کسی ہوئی تھیں۔ انہیں کسی نے نہ صرف بڑی بے دردی سے ذبح کر دیا تھا بلکہ ان کا ایک ایک عضو کاٹ کر انہیں ہلاک کیا تھا۔ ایسی شقی القلبی اور بربریت جیسے وہ درندہ صفت ہو۔

پورا غار خون سے سرخ ہو رہا تھا۔ دیواروں پر جا بجا خون کے چھینٹے پڑے تھے۔ پریم اور کرن کی خون آلود لاشیں دیکھتے ہی میں تیورا کر گری اور بے ہوش ہو گئی۔ پھر مجھے کچھ پتا نہیں چلا کہ پتاجی نے کس طرح ان لاشوں کو ٹھکانے لگایا۔ مسٹر شاہ جی! آپ جانتے ہیں کہ قاتل کون تھا......؟ آہ! یہ میرے موجودہ پتاجی جگ موہن صاحب جی تھے۔ جو اس جنم میں گٹھیا کی بیماری میں مبتلا ہو کر اپنے کرموں کا پھل پا رہے ہیں۔''

میں شکنتلا کی بات سن کر چونک پڑا۔ آج سے چھ برس قبل جگ موہن کو کوئی عورت قاتل کہہ رہی تھی۔ وہ شکنتلا ہی تھی اور اس کا اشارہ انہی تین مقتولوں کے خون کی طرف تھا۔

''آپ کو اس بات کا علم کیوں کر اور کیسے ہوا؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''یہ میرے پچھلے جنم کے پتاجی کی تفتیش کا نتیجہ تھا۔'' شکنتلا نے جواب دیا۔ ''میں نے جب پتاجی سے

اس شخص کے متعلق ذکر کیا جو مجھے میلے میں ملا تھا۔ میں نے ان سے اس شخص سے ملاقات کے بارے میں اس لیے نہیں کہا تھا کہ ذہن سے نکل گیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ وہی شخص پریم، سرلا اور کرن کا قاتل ہے۔"

"مگر آپ کس بنا پر اتنے وثوق سے کہہ رہی ہیں کہ آپ کے موجودہ پتا جی ہی قاتل تھے۔"

"اس طرح جیسے میں نے آپ کو پہچانا۔" شکنتلا کہنے لگی۔ "ایسے ہی ان کو بھی پہچانتی ہوں۔ مسٹر شاہ جی! جب میرے پتا جی مقتولوں کے کریا کرم سے فارغ ہوئے تو ایک روز مندر میں لے جا کر دیا جلایا اور دروازے کے اندر کنڈی لگا کر بیٹھ گئے۔ ان کی یہ حرکت مجھے پر اسرار سی لگی۔ وہ چند لمحوں کے بعد کہنے لگے۔

"سرسوتی! آج میں تمہیں اس مندر میں ایک راز بتانے کے لیے لایا ہوں۔ یہ وہی راز ہے جو تم سے پانچ برسوں پہلے پوشیدہ رکھا گیا تھا۔ مگر اب تم پر ظاہر کرنا ضروری ہے۔ آہ! اس راز کے باعث اتنی خرابیاں پیدا ہوئیں چوں کہ میں چراغ سحری ہوں۔ زندگی کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔ اس لیے یہ کام تمہارے ذمے ایک امانت ہے جو میں تمہیں ورثہ میں دے رہا ہوں۔ تمہیں اسے انجام دینا ہے۔"

"میں کوشش کروں گی کہ آپ مجھے جو ذمے داری سونپ رہے ہیں اسے نبھاؤں۔" میں نے کہا۔

"کوشش نہیں بلکہ ہر قیمت پر پورا کرنا ہوگا۔" پتا جی بولے۔ "وچن دو...... بھگوان کی سوگند کھاؤ۔"

"پہلے آپ اس سربستہ راز سے پردہ تو ہٹائیں......؟" میں نے کہا۔

"اچھا سنو......" پتا جی سنجیدہ ہوگئے۔

"سرسوتی!...... پریم اور سرلا دونوں حقیقی بھائی بہن تھے۔ انہوں نے ایک ہی ماں کی کوکھ سے جنم لیا تھا۔ یہ ذات کے برہمن تھے۔ سرلا ابھی بہت چھوٹی تھی کہ ان کے ماتا پتا جی بہن بھائی کو اتنے بڑے سنسار میں سدا کے لیے چھوڑ گئے۔ بہن کو پالنے کی ذمہ داری پریم کی تھی۔ مصیبت میں کون کام آتا۔ بھائی اپنی بہن کا سہارا اور باپ بن گیا۔ اس نے ایک باپ کی طرح پرورش کی اور ہر طرح سے خیال رکھا اور وہ اس بات کی کوشش کرتا تھا کہ اس کی بہن کو کوئی بھی تکلیف اور احساس محرومی نہ ہو۔ شاید ان کے پتا جی بھی زندہ ہوتے تو اتنا خیال نہ کرتے جتنا پریم اپنی بہن کا کرتا تھا۔ اس وجہ سے بہن بھائی میں اتنی محبت تھی کہ کوئی تصور نہیں کر سکتا تھا۔

جب سرلا نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو اس کا حسن و جمال اور نازک جوانی قیامت بن گئی۔ وہ بچپن سے ہی بہت خوب صورت تھی۔ اس کی خوب صورتی دیکھ کر عورتیں رشک کرتیں اور کہتی تھیں کہ کاش! ان کی بیٹیاں بھی حسین ہوتیں۔ اور پھر یہ بھی کہتی تھیں اس کے ماتا پتا زندہ ہوتے تو اس کے حسن، رنگ و روپ کو دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں سماتے کہ بھگوان نے ان کے ہاں ایک راج کماری کو جنم دیا۔ وہ ایک شاداب بدن کی حسین و جمیل عورت کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ حسن و تناسب کی ایک مثال بن گئی تھی۔

ایک روز سرلا ایک تالاب میں نہانے کے بعد باہر کھڑی اپنے بال دھوپ میں سکھا رہی تھی کہ گاؤں کا سردار جو عمر میں اس کی عمر سے اتنا بڑا تھا جتنا سرلا کے دادا کی عمر کا ہوگا۔ جب اس نے سرلا کو دیکھا تو وہ اس پر ریشہ خطمی ہوگیا۔ اس نے سنا تھا کہ سرلا جوان ہو کر قیامت بن گئی ہے۔ اس نے سرلا کو جوان ہونے

سے پہلے دیکھا تھا۔ جوان ہونے کے بعد اس لیے دیکھ نہیں سکا تھا کہ وہ ایک قریبی گاؤں میں ایک تیرہ برس کی عمر کی لڑکی سے شادی کر کے رہ گیا تھا۔ جب اس کی یہ بیوی اپنے آشنا کے ساتھ بھاگ گئی تو وہ گاؤں لوٹ آیا۔ اس نے سنا کہ سرلا کا حسن و شباب نیندیں اڑا دینے والا ہے۔ اس نے کنوارے لڑکوں اور شادی شدہ مردوں کی نیندیں حرام کر رکھی ہیں۔ جب اس نے سرلا کو دیکھا تو اس کی نیندیں بھی حرام ہوگئیں۔ اس کی سب سے بڑی کم زوری نوجوان اور حسین لڑکیاں تھیں۔

پہلے تو اس نے پریم کو بلا کر کئی ایک خوشامدانہ طریقوں سے سرلا کا رشتہ طلب کیا۔ پریم نے اس سے کہا کہ وہ اس کی پوتی کی عمر کی ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی نوجوان بہن کو اس کے پلے باندھ دے۔ اس نے اپنی بہن کا رشتہ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ پھر اس بوڑھے سردار نے اسے دولت کا لالچ دیا۔ پریم کو اپنی بہن کی زندگی اور عزت دولت سے زیادہ عزیز تھی۔ تب بھی اس نے صاف انکار کر دیا اور یہ بھی صاف صاف کہہ دیا کہ وہ کسی قیمت پر یہ رشتہ قبول نہیں کر سکتا۔

ایک روز وہ کسی کام سے صبح سے ہی دوسرے گاؤں گیا ہوا تھا۔ جب وہ دن ڈوبنے کے بعد گھر پہنچا تو گھر پر سرلا موجود نہیں تھی۔ پہلے تو وہ سمجھا کہ شاید پڑوس میں گئی ہوگی۔ جب وہ خاصی دیر بعد بھی واپس نہیں آئی تو اسے تشویش ہونے لگی۔ جب اس نے پڑوس میں جا کر سرلا کے بارے میں دریافت کیا تو سرلا کی سہیلی کے باپ نے بتایا کہ سہ پہر کے بعد گاؤں کا سردار اپنے آدمیوں کے ساتھ آیا تھا۔ سرلا کو زبردستی اٹھا کر لے گیا ہے۔ ان میں سے کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ سردار کو جبراً لے جانے سے باز رکھ سکیں۔

یہ سن کر پریم کا نفرت اور غصے سے برا حال ہوگیا۔ جب وہ چاقو اٹھا کر سردار کو قتل کرنے کے ارادے سے جانے لگا تو اس کے پڑوسی نے سمجھایا کہ اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ کیوں کہ وہ سردار کا بال تک بیکا نہیں کر سکتا۔ اور پھر اس کی بہن کو سردار نے آلودہ کر دیا ہوگا لیکن وہ نہیں مانا۔ سردار کی حویلی جا پہنچا تا کہ سردار کو قتل کر کے اپنی بہن کو لے آئے۔

جب وہ حویلی میں چوروں کی طرح داخل ہو کر اس کمرے میں پہنچا جو سردار کی خواب گاہ تھی۔ سردار نشے میں دھت بے ہوشی کی سی حالت پڑا تھا۔ اور اس کی بہن مسہری کے کنارے بیٹھی سسکیاں بھر رہی تھی۔ اس نے بستر اور بہن کی حالت سے اندازہ کر لیا کہ اس کی بہن کی عزت لٹ چکی ہے۔ جب وہ سردار کو قتل کرنے کے ارادے سے بڑھا تو بہن اس کے راستے میں حائل ہو کر بولی۔ "اس نے حویلی میں پنڈت کو بلا کر اس سے بیاہ کر لیا ہے اور اب یہ اس کا پتی ہے۔ قسمت کو شاید یہی منظور تھا۔ قتل کرنے سے اس کی عزت واپس آنے سے رہی۔ البتہ اسے پھانسی ہو جائے گی۔ وہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دے۔ وہ کسی نہ کسی طرح زندگی کاٹ لے گی۔"

پریم واپس لوٹ آیا۔ اس نے ذلت اور شرمندگی محسوس کی اور دوسرے دن اپنا گھر بار چھوڑ دیا۔ سفر کی صعوبتیں سہتا اور مقدس جگہوں کی یاترا کرتا ہوا یہاں آ نکلا۔ یہ مندر اسے بہت پسند آیا اور اس نے من میں بڑی شانتی محسوس کی تو اس لیے اس نے یہاں رہائش اختیار کر لی۔ تم دونوں ایک دوسرے کو پسند

کرنے لگے اور پریم مجھے بہت اچھا لگا تو میں نے تم دونوں کی شادی کر دی۔

سرلا بے چاری اپنی زندگی اور اپنی قسمت پر شاکر ہو گئی۔ وہ غریب کر بھی کیا سکتی تھی۔ کیوں اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ لیکن اسے اپنی بھرپور جوانی اور حسن ایک بوڑھے کو دان کر کے بھی کوئی سکھ اور خوشی نہ ملی۔ کیوں کہ سردار کا ایک لڑکا اس کی کسی بیوی سے تھا۔ وہ گاؤں اور جاگیر کا وارث بھی تھا۔ وہ سرلا کے خون کا پیاسا ہو گیا۔ اس کے باپ کے شادی کرنے سے پہلے وہ بھی سرلا کے عاشقوں میں سے تھا۔ اس کے سپنے دیکھا کرتا تھا اور وہ اسے اپنانا چاہتا تھا لیکن اس کا باپ سبقت لے گیا اور سرلا اس کی سوتیلی ماں بن کر آ گئی۔ کئی بار اس کی نیت میں فتور پیدا ہوا۔ پھر اس نے یہ خیال دل سے نکال دیا۔ لیکن وہ سرلا کے خون کا پیاسا ہو گیا۔ اس طرح دو برس کا عرصہ بیت گیا۔ ایک روز اس نے سنا کہ سرلا امید سے ہو گئی ہے۔ اور ایک بچے کی ماں بننے والی ہے۔ یہ خبر اس پر بجلی بن کر گری۔ وہ بہت مشتعل ہوا۔ کیوں کہ گاؤں اور جاگیر کا ایک اور وارث دنیا میں آنے والا تھا۔

اس حویلی میں ایک بہت ہی تیز طرار اور حسین ملازمہ تھی جس سے سردار کے بیٹے کے تعلقات تھے۔ سردار کے بیٹے نے اسے اپنے اعتماد میں لے کر اپنے باپ کو زہر دے دیا۔ یہ ملازمہ کھانا پکاتی تھی۔ دوسری ملازمہ نے بھانڈا پھوڑ دیا۔ جو زہر سردار کو دیا گیا اس سے آدمی فوراً نہیں مرتا تھا۔ ایک دو دن لگتے تھے۔ ویسے بوڑھے سردار نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کا بیٹا اس کا اور سرلا کا دشمن بن گیا ہے۔ اور کسی وقت ان کی جان لے سکتا ہے۔ بوڑھے سردار نے مرنے سے چند گھنٹے قبل ایک وصیت نامہ اور سیاہ رنگ کا ایک ہیرا جوان کے دستور کے مطابق وراثت کی نشانی سمجھا جاتا تھا سرلا کو دیا۔ اور کہا کہ تمہارا بچہ خواہ لڑکا ہو یا لڑکی جب اٹھارہ برس کا ہو جائے تو میرے لڑکے یا پوتے سے آدھی جائیداد بانٹ لے۔

اس وقت اس کا بیٹا گاؤں کے ایک مکان میں اپنی محبوبہ ملازمہ کے ساتھ اس خوشی میں جشن منا رہا تھا۔ کہ اس کا باپ اب چند گھنٹوں کا مہمان ہے۔ اس کے مرنے کے بعد وہ اپنی سوتیلی ماں کو بھی زہر دے دے گا۔ بوڑھے سردار نے اپنے ایک وفادار اور جان نثار کی مدد سے سرلا کو وہاں سے فرار کرا دیا کہ وہ حفاظت سے کسی ایسی جگہ پہنچ جائے جہاں اس کا بیٹا تلاش نہ کر سکے۔ بوڑھے سردار کی موت کی خبر سن کر جب وارث حویلی میں آیا تو اسے معلوم ہوا کہ سرلا غائب ہے۔ سرلا کے غائب ہونے سے اسے بہت خوشی ہوئی اور اس نے سارا الزام اپنی سوتیلی ماں پر تھوپ دیا کہ اس نے اپنے پتی کو زہر دیا ہے۔ لیکن جب اس نے یہ دیکھا کہ سیاہ ہیروں کی جوڑی میں سے ایک ہیرا غائب ہے تو اس کا غصے سے برا حال ہو گیا پھر اس کے بیٹے نے سرلا کی تلاش میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا۔ سردار کے وفادار بوڑھے ملازم نے بھی اپنے مالک سے جو عہد کیا تھا کہ سرلا کی جان کی آخر دم تک حفاظت کرے گا اسے پورا کیا۔ پے در پے سفر کرتا ہوا اس شہر میں پہنچ گیا جہاں ہم میلہ دیکھنے گئے تھے۔ اور بے چارا وہیں مر گیا۔

سرلا در در کی ٹھوکریں کھاتی ہوئی کسی طرح بیراگن کی کٹیا تک پہنچ گئی۔ بیراگن نے اس پر رحم کھا کر اسے اپنے پاس رکھ لیا۔ اور وہیں پرکاش پیدا ہوا۔ جب وہ چھ مہینے کا تھا تو بیمار ہو گیا۔ سرلا اسے لے کر گاؤں

[illegible]یانی عورت کو ملاج معالجے کے لیے دکھانے جا رہی تھی۔ ادھر پریم سودا سلف خرید کر واپس آ رہا تھا۔ راستے میں بہن بھائی نے ایک دوسرے کو دیکھا تو انہیں یقین نہیں آیا انہیں لگا جیسے وہ جاگتے میں سپنا دیکھ رہے ہوں۔ برسوں کے بعد بہن بھائی کا ملاپ ہوا تھا۔ ان کی خوشی کا اندازہ دوسرا کوئی نہیں کر سکتا تھا۔

پریم نے اس روز مجھ سے اپنی بہن سرلا کا ذکر کیا۔ اپنی بدنصیب بہن کی کہانی سنائی کہ اس بدبخت پر کیا بپتا گزری۔ میرے دل پر اس کا بڑا گہرا اثر ہوا۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنی بہن کو پہلی فرصت میں یہاں لے آئے۔ چنانچہ اس رات کو جب میں اور پریم آدھی رات کے وقت مندر میں آئے تھے۔ وہ اس ہیرے اور وصیت نامے ہی کو رکھنے کے لیے آئے تھے۔ اس میں اتنی احتیاط برتی کہ تمہیں بھی اعتماد میں نہیں لیا۔ اسے راز رکھنا ہی بہتر تھا۔"

اس کے بعد پتا جی نے مندر میں کسی جگہ پر کوئی کمانی دبائی جس سے ایک خفیہ خانہ ظاہر ہوا اس میں ایک وصیت نامہ اور سیاہ رنگ کا ہیرا جو انسانی دل کی شکل میں تراشا ہوا تھا۔ محفوظ تھا۔ پتا جی نے مجھے اس خفیہ خانے کو کھولنے اور بند کرنے کی ترکیب بھی بتائی جواب مجھے یاد نہیں رہی۔ لیکن اگر اس مندر میں جاؤں تو شاید مجھے فوراً یاد آ جائے۔ ادھر پتا جی نے مجھے وصیت کی کہ ان کے مرنے کے بعد میں اس وصیت نامہ اور ہیرے کی حفاظت کروں گی۔ اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھوں گی۔ پرکاش کو اپنے بیٹے کی طرح چاہوں گی اور اس کا ہر طرح سے خیال رکھوں گی۔ جب وہ اٹھارہ برس کا ہو جائے گا تو مجھے وصیت نامہ کے مطابق اس کے باپ کی آدھی جائیداد بھی دلانا ہو گی۔

میں نے پتا جی کی اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے جیسے اپنے ہونٹ سی لیے تھے۔ وہ مجھ سے اس ذمہ داری کا اقرار لینا چاہتے تھے۔ ایک طرح سے وچن بھی۔ مگر جوش گریہ سے میری زبان بند ہو چکی تھی۔ میں کیسے اقرار کرتی اور وچن دیتی۔ ویسے اس وقت پتا جی نے صورت حال کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے اصرار کرنا اور کچھ زیادہ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ پھر وہ میری دل جوئی اور صبر کی ہدایت کرتے ہوئے واپس چلے گئے۔ میں نے انہیں روکا بھی نہیں۔ روک کر کرتا بھی کیا تھا۔

اس رات ان باتوں سے میرے دل میں ایسی تکلیف ہوئی کہ اگر چھری بھی اترتی تو شاید اتنی نہ ہوتی۔ دل پر جو چوٹ لگی تھی اس کے بیان کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ مجھے رہ رہ کر خیال آتا تھا کہ کیا مجھے پرکاش کے لیے زندہ رہنا ہو گا۔ پتا جی ایسا کیوں کہتے ہیں۔ کس لیے کہتے ہیں۔ اس سے کوئی خون کا یا کوئی اور رشتہ بھی تو نہیں ہے۔ پرکاش کو مجھ سے ایسی اہم خدمات لینے کا کیا حق حاصل ہے۔ پتا جی کیا پاگل ہو گئے ہیں؟ کیا یہ بہکی بہکی باتیں نہیں ہیں؟

پرکاش میرے لیے بڑا ہی منحوس ثابت ہوا تھا...... آہ! یہ کیا کم ہے کہ میرے جگر کا ٹکڑا کرن دیوان اس پر قربان کر دیا گیا۔ میرے بچے کو پرکاش سمجھ کر ان درندہ صفت قاتلوں نے اسے ذبح کر کے خون پانی کی طرح بہا دیا۔ میں کرن دیوان کے بغیر اٹھارہ برس کیا زندہ رہ سکوں گی......؟ میں تو ایک دن ایک مہینہ بھی شاید زندہ نہ رہ سکوں۔ پتا جی اٹھارہ برس کی بات کر رہے ہیں...... ہائے...... میں اپنے لخت جگر کو کہاں

ڈھونڈنے جاؤں......؟ وہ مجھے کہاں مل سکتا ہے......؟ کیا وہ پھر سے جنم لے سکتا ہے......؟ میری جان......میرے جگر کے ٹکڑے......تو کہاں ہے......؟

بیٹے کا خیال ایسا جگر پاش تھا کہ میں نے اپنے کپڑے اس طرح پھاڑ ڈالے جس طرح ایک بھیڑیا صفت آدمی عورت کے مزاحمت کرنے پر پھاڑ ڈالتا ہے۔ پھر اپنے بالوں کی لٹیں نوچ ڈالیں۔ پھر پاگلوں کی طرح زور زور سے قہقہے لگا کر ہنستی رہی۔ اپنی نیم برہنگی کو دیکھتی رہی اور وحشت ہونے لگی تو پھر بے اختیار مجنونانہ کوٹھری سے باہر نکل آئی۔

چودھویں کا چاند اپنی پوری تابانیوں اور رعنائیوں سے آسمان کے چوڑے چکلے سینے پر رینگ رہا تھا۔ دودھیا چاندنی کا منجمد دریا چاروں طرف دکھائی دے رہا تھا۔ اس ٹوٹ کر برستی چاندنی نے میرے غم میں اور بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔ میں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں شاید میرا لخت جگر کہیں کھڑا ہو۔ میں اس وقت ہوش وحواس کھو بیٹھی تھی۔ پھر میری نظر چاند کی طرف اٹھی۔ یہ دیکھ کر میری حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی کہ میرا لخت جگر کرن دیوان چاند میں کھڑا مسکرا رہا ہے۔

پھر میں نے بے تابانہ انداز سے فضا میں اپنی بانہیں پھیلا دیں۔ میں اسے بلانے لگی۔ میرے چاند۔ میرے جگر کے ٹکڑے آ جا میرے سینے سے لگ جا۔ میں تیری ماں ہوں۔ میری ممتا تڑپ رہی ہے۔ میرے کلیجے کو ٹھنڈک تو پہنچا دے۔ مگر وہ مجھ سے بہت دور تھا۔ میں اسے گود نہ لے سکی۔ اسے آغوش میں لینے کے لیے ترس گئی۔ میں اسے صرف دیکھ ہی سکتی تھی۔ میں اپنی بے بسی پر رونے لگی اور پھر ناشپاتی کے درخت کے ساتھ زور زور سے سر پٹخنا شروع کر دیا تا کہ اسے مجھ پر، اپنی ماں پر ترس آ جائے۔ وہ چاند سے نکل کر میری گود میں آ جائے۔ لیکن وہ نہیں آیا۔ چاند میں کھڑا مسکراتا رہا۔

پھر میں نے ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ میرے عقب میں سے رونے کی آواز آ رہی ہے۔ رونے کی آواز مانوس سی لگی۔ میرے دل کے کسی کونے میں یہ خیال آیا کہ......کہیں یہ کرن دیوان تو نہیں رو رہا ہے۔ میں نے کان اس رونے کی آواز پر لگا دیئے۔ نہیں۔ وہ تو روتا نہ تھا۔ پھر مجھے ایسا لگا کہ وہ مجھے آواز دے رہا ہے۔ پکار رہا ہے۔

میں نے پلٹ کر دیکھا کہ آواز کس سمت سے آ رہی ہے؟ آواز جھیل کی طرف سے آ رہی تھی۔ میں تیزی سے لپک کر جھیل کے کنارے پہنچی۔ کیا دیکھتی ہوں کہ میرا بیٹا جھیل کے وسط میں کنول کے پھولوں پر کھڑا ہے۔ وہ ابھی بھی مجھے پکار رہا تھا۔

''ماں!......میری ماں......'' اس نے اپنی بانہیں پھیلا کر کہا۔ ''آؤ نا ماں!......تم اتنی دور کیوں کھڑی ہو......؟ کیا تم مجھے گود میں نہیں لوگی......؟ مجھے پیار نہیں کرو گی ماں!......؟ ماں!......میری ماں......میری ماں!......''

''میں ابھی آتی ہوں۔'' کہتے ہوئے جھیل میں اتر گئی۔ پھر اس کی طرف دیوانہ وار لپکی۔ میں جوں جوں اس کی طرف بڑھتی گئی وہ توں توں مجھ سے دور ہوتا گیا۔ کچھ دیر کے بعد ایک دم سے مجھ ایسا محسوس ہوا

کہ جیسے میں کسی صندوق میں بند کر دی گئی ہوں۔ میرا دم گھٹ رہا تھا۔ میں نے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے کہ صندوق کھول کر باہر نکل جاؤں۔ لیکن میں تو جنبش تک بھی نہیں کر سکی۔ آخر میں بے ہوش ہو گئی۔

☆......☆......☆

کچھ دیر بعد ناقابل برداشت تپش سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیکھا کہ میں ایک ایسی پرہول وادی میں کھڑی تھی جس کی فضا نہایت گھناؤنی اور نم آلود تھی۔ اس وادی کی زمین دلدلی اور گرم تھی۔ گندھک کی بو سے دماغ پھٹا جا رہا تھا اور دل گھبرا رہا تھا۔ تمام وادی پر بجائے آسمان کے گہرے سرخ سیاہ زرد اور اودے رنگ کے باریک تاروں کا گھنا جال تنا ہوا تھا اور انہی چار رنگوں کی سخت گرم اور آنکھوں کو اندھا کر دینے والی ناگوار شعاعیں اس منحوس وادی پر محیط تھیں۔

ہر طرف خوف وہراس طاری تھا۔ ذرے ذرے پر ہیبت اور نحوست چھا رہی تھی۔ زمین پر ہزار ہا قسم کے کریہہ منظر حشرات الارض تیزی سے رینگتے ہوئے جا رہے تھے۔ ان کی رفتار ناقابل یقین تھی اور پھر بے شمار خوفناک صورت انسان بھی بے تحاشا دوڑتے، ایک دوسرے کو دھکیلتے اور ٹکراتے کسی طرف کو جا رہے تھے۔ کئی ایک نے مجھ سے ٹکریں کھائیں۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ مجھ سے مس نہ ہوئے۔ ہر سمت ایک بھیانک اور لرزہ خیز آواز گونج رہی تھی۔ جو کئی انجنوں کی گڑگڑاہٹ بادلوں کی گرج......کسی ماتمی راگ اور انسانی چیخوں سے ملتی جلتی تھی۔

میں نے خوف زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ میرے جسم پر ایک لرزہ سا طاری تھا۔ اور میں کسی قدر دہشت زدہ بھی تھی۔ مگر مجھے کسی سمت، سوائے چند ایک درختوں کے دھندلے سے نشانات کے جو کئی کوس دور معلوم ہوتے تھے۔ کوئی جائے پناہ دکھائی نہ دیتی تھی۔ نہ ہی کہیں کوئی سائبان نظر آیا تھا۔ یہ ایک بیابان سا لگتا تھا۔ ویرانہ سا تھا۔

میں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ سب جان داران درختوں کے سائے میں پناہ لینے جا رہے ہیں جو کئی کوس کے فاصلے پر نظر آ رہے ہیں۔ میرے پاؤں جل رہے تھے اور مجھے سخت پیاس لگ رہی تھی۔ میں نے بھی اس سمت تیزی سے دوڑنا شروع کر دیا۔

راستہ نہ صرف بہت دشوار گزار بلکہ بے حد تکلیف دہ بھی تھا۔ جا بجا چھوٹی چھوٹی گھنی جھاڑیاں تھیں جن میں گول گول پھل لگے تھے۔ یہ پھل چاروں طرف سے انگشت بھر لمبے اور کانٹوں سے پر تھے۔ وہ ایسے زہریلے تھے کہ جس شخص کو چبھتے وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپنے اور بری طرح کراہنے لگتا اور اس کی دل دوز چیخیں نکل جاتی تھیں جن سے کلیجہ دہل جاتا تھا۔

راستہ پرخار تھا اور بعض بعض جگہ تیرہ وتار غار اور بڑے اور گہرے گہرے گڑھے بھی تھے۔ جن سے ایسا سیاہ اور کڑوا دھواں اٹھ رہا تھا کہ سر چکرانے لگتا۔ جو شخص ان میں گر پڑتا لاکھ کوشش اور جتن کے پھر نہ نکل سکتا۔ کئی آدمی میرے دیکھتے ہی دیکھتے اپنا توازن برقرار نہ رکھنے کے سبب ان غاروں میں گرے تو غائب ہو گئے۔ نہ ان کی آواز سنائی دی اور نہ ہی وہ نظر آئے تھے۔

اکثر مقامات پر گرم اور کھولتے ہوئے پانی کے چشمے تھے۔ یہ پانی پیپ اور خون کے رنگ کا اور نہایت ہی بدمزا اور متعفن تھا۔ گو میں بھی اندھا دھند دوڑ رہی تھی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں کسی غار یا گڑھے میں گرنے سے محفوظ رہی۔ شاید اس لیے کہ میں محتاط تھی اور غار اور گڑھوں سے قدرے ہٹ کر اور ان کے درمیان دوڑ رہی تھی۔

میں نے سوچا کہ یہ خواب ہے یا عالم بے داری؟ کیا کوئی خواب اتنا ڈراؤنا اور طویل ہو سکتا ہے......؟ اگر خواب ہے تو پھر میں بیدار کیوں نہیں ہو جاتی ہوں۔ دفعتاً مجھے یاد آیا کہ یہ خواب نہیں ہے۔ یہ ایک سنگین حقیقت ہے۔ میں اپنے بیٹے کو کنول کے پھولوں پر سے اٹھانے کے لیے جھیل میں اتری تھی۔ شاید اس میں ڈوب کر مر گئی ہوں اور یہ جگہ برزخ ہے۔

میں خوف و دہشت سے سہم گئی اور میری رگوں میں لہو سرد ہونے لگا۔ اور پھر اس ششں و پنج میں پھر بدحواسی سے بھاگنے لگی۔ اور ایک مدت دراز تک اس حالت میں دوڑتی رہی۔ راستہ اتنا لمبا اور کٹھن تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ اس سفر کے دوران میری آتما کو بڑی تکلیف اور اذیت ہوئی تھی۔ میرے دل پر ایک چٹان کا سا بوجھ محسوس ہوتا تھا۔ دماغ نہایت پریشان اور پراگندہ ہو رہا تھا۔ آتما ذہنی کوفت کے ناقابل برداشت حملوں سے مجروح ہو رہی تھی۔ صرف ایک موہوم سی امید تھی جو مجھے اس طرف لیے جا رہی تھی۔ ایک ان جانی سی کوشش تھی جو مجھے اس طرف کھینچ رہی تھی۔

آخر بہ ہزار دقت اور کرب ناک اذیت کے بعد یہ مکروہ راستہ ختم ہوا۔ اور میں ان درختوں کے قریب پہنچ گئی تھی۔ ان کے نیچے چند دیو ہیکل اور عجیب الخلقت انسان کھڑے تھے۔ جنہیں دیکھ کر میرے سارے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ رونگٹے بھی کھڑے ہو گئے۔ جنہوں نے نیزے تان کر ہمیں آگے بڑھنے سے روک دیا۔ انتہائی خوف، دہشت اور کرب کی سی حالت میں ہم لوگ گر گئے اور ایڑیاں رگڑ کر سسکنے اور نہایت عاجزی سے گڑگڑانے لگے۔

''اے خدا......تو ہم پر اتنا ظلم نہ کر۔'' سب نے ایک زبان ہو کر کہا۔ یہ نعرہ بلند ہوتے ہی وہ گرج یک لخت بند ہو گئی جو ایک نیزے والے نے بلند کی تھی۔

ایک دیو ہیکل جوان آدمی جو ان میں سردار معلوم ہوتا تھا۔ اس نے گرج دار آواز میں سب کو مخاطب کر کے کہا۔ ''خدا ظالم نہیں۔ بلکہ تم خود ظالم ہو۔ ادھر دیکھو اس کے بندے کتنے خوش، کتنے سکھی ہیں۔''

اتنا کہہ کر اس نے ہاتھ سے اوپر کی طرف اشارہ کیا۔ یکا یک سفید براق کی سی روشنی ہم لوگوں پر پڑنے لگی۔ جس کی ٹھنڈک سے ہماری تکالیف فوراً رفع ہو گئیں۔ ہم شوق اور وارفتگی سے اوپر دیکھنے لگے۔ رنگین تاروں کے جال میں شگاف پیدا ہو گیا تھا اور یہ تسکین دہ روشنی اس میں سے آ رہی تھی۔ اس شگاف میں ایک ایسی خوب صورت اور وسیع آبادی تھی کہ مندر والی وادی اس کے پاسنگ بھی نہ تھی۔ اس میں نہایت دل فریب، گل پوش اور ثمر دار اشجار تھے۔ اس دل کش وادی کے ذرے ذرے سے روح کو مست کر دینے والی خوشبو دار ہوا کی لپٹیں آ رہی تھیں۔ جا بجا سیم گوں پانی کے چشمے جاری تھے جن کے کناروں پر نہایت

خوبصورتی سے رنگین اور قیمتی پتھروں کے مکانات بنائے گئے تھے۔ وہاں کی ہر چیز ایسی عجائب روزگار تھی کہ دل کو چھو رہی تھی اور نگاہ تھی کہ وہاں سے ہٹنے کا نام نہیں لے رہی تھی اور دل اش اش کیے جا رہا تھا۔

وہاں کے آسمان پر چاند یا سورج کچھ بھی اور کہیں بھی نظر نہیں آیا تھا۔ کسی بھی سمت اور کسی بھی افق پر......دراصل یہ وادی ہی ایک نور تھی۔ جس کی روشنی صاف و شفاف اور سبزی مائل تھی۔ کئی حسین اور نوخیز مرد و زن سروں پر سنہری رنگ کے نورانی تاج اور عجیب قسم کے فاخرانہ نورانی لباس پہنے محو خرام تھے۔ ان کے لباس سے ہلکے رنگوں کی نہایت لطیف انوکھی اور فرحت بخش شعاعیں نکل رہی تھیں۔ ان کی فراخ پیشانیاں چاند کی طرح چمک رہی تھیں وہ سب اوپر کو منہ اٹھائے نہایت اشتیاق سے کسی ایسی چیز کو دیکھ رہے تھے جو ہمیں دکھائی نہیں دیتی تھی۔

ہم سب انہیں حسرت اور رشک بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ہم میں سے ایک نے دریافت کیا۔ ''آہ! یہ خوش قسمت لوگ کون ہیں......؟ اور کس چیز کو دیکھ کر اس قدر خوش اور سرشار ہو رہے ہیں؟''

''یہ صرف ایک خدا کے پجاری ہیں۔'' دیو ہیکل آدمی نے جواب دیا۔ ''خدائے واحد کا جمال دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں۔'' ہم سب نے یک زبان ہو کر کہا۔ ''ہم بھی تو اس کی پوجا کرتے ہیں۔''

''نہیں......'' دیو ہیکل آدمی نے کہا۔ ''کبھی تم نے ایک خدا سمجھ کر اس کی پوجا نہیں کی...... بلکہ پتھروں ......جانوروں......اور چاند سورج ستاروں کو اس کا شریک بنایا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ خدا نہیں ہیں۔ خدا کی ذات صرف ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ پھر بھی اندھے بہرے اور گونگے بنے رہے۔''

پھر ہم سب نے یک زبان ہو کر کہا۔ ''اس کے علاوہ ہم نے ایسا کوئی جرم نہیں کیا۔ جس کے عوض ہمیں اس ذلت کدے میں ایسا دردناک عذاب دیا گیا ہے......آخر کیوں......آخر کس لیے......؟'' ہم سب اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

''سچ پوچھو تو اس رحم کرنے والے مہربان، سچے اور واحد خدائے برتر نے تمہیں کوئی زیادہ عذاب نہیں دیا۔ اس کے رحم اور عذاب کا تم تصور میں نہیں کر سکتے ہو۔ شکر بجا لاؤ کہ دیگر مجرموں سے الگ رکھا گیا ہے۔ مجرموں کی جگہ بہت بری اور تباہی خیز ہے۔ اس سے ڈرو اور پناہ مانگو۔''

''پھر اب ہم لوگ کس جگہ پر ہیں......؟'' ہم سب نے ہمت کر کے اس سے سوال کیا۔ ''کیا تم بتاؤ گے؟''

''جہاں بے ضرر مشرک رکھے جاتے ہیں۔'' دیو ہیکل آدمی نے جواب دیا۔ ''انہیں موقع دیا جاتا ہے کہ اس وادی کو عبور کر کے پھر سے دنیا میں جائیں اور وہاں خدائے واحد کی پرستش کر کے اپنے آپ کو اس خوبصورت وادی میں داخل ہونے کے قابل اور اہل بنائیں جہاں روح کو مکتی حاصل ہوتی ہے اور نور سے نور ہم کنار ہوتا ہے۔ جو بدنصیب اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے اور دوبارہ شرک و کفر کی زندگی بسر کریں گے، وہ پھر اسی جگہ لائے جائیں گے اور اگر شرک و کفر کے ساتھ اور گناہ بھی کریں گے تو ان کا ٹھکانہ بہت برا ہوگا۔''

اس کے بعد وہ شگاف فوراً ہی بند ہوگیا۔ وہ مکروہ شعاعیں بدستور قائم ہوگئیں اور خوف ناک آوازوں کا سلسلہ پھر شروع ہوگیا تھا۔ ہم لوگ ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگے۔ اس دیوہیکل سردار نے ایک مقفل دروازہ جو درختوں کی اوٹ میں تھا کھول دیا اور ہم لوگوں کو اشارے سے ادھر بلایا۔ ہم لوگوں نے فوراً ہی اس کے حکم کی تعمیل کی اندر سے ٹھنڈی اور فرحت بخش ہوا آرہی تھی۔ لوگ دھڑا دھڑ اندر داخل ہونے لگے۔ اندر مکمل تاریکی تھی۔ مگر چوں کہ ٹھنڈک کافی تھی۔ اس لیے میں نے بے دھڑک قدم رکھ دیا۔ پھر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں یکا یک کسی گہرے کنوئیں میں گر گئی ہوں۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

اس بے ہوشی کے دوران مجھے نہایت خوش گوار اور سندر سے خواب دکھائی دیتے رہے۔ میں نے کئی بار دیکھا کہ ایک بوڑھی عورت جس کے ہاتھ ریشم سے زیادہ ملائم اور آنکھیں مہر و محبت کا سرچشمہ تھیں۔ مجھے نہایت میٹھے راگ سنا کر لوریاں دے رہی ہے اور میرے کانوں میں اس کی آواز رس گھول رہی ہے۔

رفتہ رفتہ میں ہوش میں آنے لگی۔ جب میں پوری طرح ہوش میں آگئی تو مجھے معلوم ہوا کہ میں اس دنیا میں جہاں کہیں وہ مندر والی وادی بھی موجود ہے وہاں واپس آگئی ہوں۔

وہ بوڑھی عورت میری نانی اماں تھیں۔ میری ماتا جی مجھے جنم دیتے ہی چل بسی تھیں۔ اس لیے میری نانی اماں میری پرورش کرتی رہی تھیں۔ جب میں چار برس کی ہوئی تو ان کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ میرا باپ گٹھیا کی بیماری میں ...ا ہے۔ لیکن میں نے اپنے باپ کو کبھی نہ دیکھا تھا کیوں کہ وہ دوسرے شہر میں رہتا تھا۔ اور وہاں اس کے خطوط اکثر آتے رہتے تھے۔ یہ میرا دوسرا جنم تھا۔

جب میری عمر پانچ برس کی ہوئی تو نانی اماں مجھے ایک روز ایک پاٹھ شالہ میں لے گئیں جہاں بہت سے لڑکے لڑکیاں مذہبی تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ جب میں وہاں پہنچی تو اس وقت عبادت کی گھنٹی بجی تھی۔ خوش بودار دھونی جل رہی تھی۔ گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ پتھر اور کانسی کی مورتیوں کے سامنے سب بچے ماتھا ٹیک رہے تھے۔ ان کی یہ حرکت دیکھتے ہی میں نے آنکھیں بند کرلیں اور برزخ کا حال بیان کر کے انہیں اس پوجا پاٹھ سے روکا اور ان سے کہا کہ ان کی عبادت نہیں کی جائے۔ یہ کفر اور شرک ہے۔ یہ مورتیاں نہ بول سکتی ہیں نہ سن سکتی ہیں اور ان میں ناک پر سے مکھی اڑانے کی طاقت بھی نہیں ہے۔ پھر میں نے ان سے اس دیوہیکل شخص کا ذکر بھی کیا اور اس وادی نور کا حوالہ دے کر سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر ان پر میری کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ بلکہ انہوں نے الٹا مجھی کو پاگل قرار دے دیا اور میرا مذاق اڑایا گیا۔ لیکن اس واویلا کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ مجھے پھر کبھی وہاں جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ لیکن میری ان باتوں سے لوگ مجھ سے ڈرنے اور خائف رہنے لگے۔ میرے قریب بھی نہ آتے تھے۔ میرے سائے سے بھی دور بھاگتے تھے۔ کیوں کہ ان کے خیال میں مجھ پر بھوت پریت کا سایہ تھا اور اس لیے میں بہکی بہکی باتیں کرتی اور خرافات بکتی رہتی ہوں۔

جب میں سات برس کی ہوئی تو میری نانی اماں بھی مجھے اس دنیا میں چھوڑ کر سدھار گئیں۔ اب مجھے اپنے باپ کے پاس جانا ضروری تھا۔ کیوں کہ اب اس کے سوا دنیا میں کوئی اور نہیں تھا۔ جو میری

پرورش اور نگہداشت کر سکے۔ میں ایک نوکر کے ہمراہ اپنے باپ کے گھر پہنچی۔ مجھے انہیں دیکھنے کا بڑا ارمان اور اشتیاق تھا۔ ایک تجسس کشاں کشاں لے گیا۔ جب میں نے اپنے باپ کو دیکھا تو پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ کیوں کہ میں نے انہیں پہچان لیا۔ یہ وہی شخص تھے جنہوں نے میلے کے موقع پر مجھ سے سرلا کا پتا دریافت کیا تھا۔"

شکنتلا نے اپنی رام کہانی سنانے کے بعد اس کے متعلق میرے خیالات معلوم کرنا چاہے۔ وہ یہ چاہ رہی تھی کہ میں اپنے تاثرات بیان کروں اور تبصرہ کروں۔ مگر میرا دماغ اس عجیب و غریب اور الف لیلیٰ جیسے قصے سے منتشر ہو رہا تھا۔ کچھ کہنے اور اس قصے میں اس کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے سے میں قاصر تھا۔ اس لیے میں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ کچھ دیر کے بعد اس سے کہا کہ مجھے سوچنے کی مہلت دو۔ شکنتلا مجھے اپنی کوٹھی کا پتا دے کر چلی گئی۔

جب میں گھر پہنچا تو دیر ہو چکی تھی۔ لیکن میری بہن راشدہ ابھی تک میرا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگی۔ "بھائی جان! آج تو آپ نے گھر آنے میں تاخیر کی حد ہی کر دی۔ اتنی دیر کہاں رہے آپ؟"

"راشدہ! کچھ نہ پوچھو۔" میں نے جواب دیا۔ "آج میں نے ایک انتہائی عجیب و غریب قصہ سنا ہے۔"

"کیسا قصہ بھائی جان!......؟" راشدہ نے متعجب نظروں سے دیکھا۔ "کیا آپ مجھے سنانا پسند کریں گے؟"

پھر میں نے اسے شکنتلا والا قصہ سنایا وہ خاموشی اور توجہ سے سنتی رہی۔ جب میں نے سرلا اور سیاہ ...ے کا ذکر کیا تو وہ سنتے سنتے ایک دم سے چونک گئی۔ اس کے چہرے کے تاثرات بدلتے رہے۔ اتار چڑھاؤ ہوتا رہا۔ میں نے پوری کہانی سنانے کے بعد اس سے پوچھا۔ "اس شکنتلا کے قصے کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا یہ سچا واقعہ ہے؟"

"جی ہاں......اس کا قصہ بالکل سچا ہے۔" راشدہ نے جواب دیا۔ "اس نے جھوٹ نہیں بولا ہے۔"

"یہ تم کس بنا پر اتنے وثوق سے کہہ رہی ہو؟" میں نے متعجب لہجے میں کہا۔ "اس کی سچائی کا کیا ثبوت ہے؟"

"یہ قصہ بالکل سچا ہے بھائی جان!" وہ بولی۔ "میں اس کی سچائی کا ثبوت پیش کر سکتی ہوں۔"

"وہ کیسے......؟" اس کا جواب سن کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ "یہ ثبوت تمہارے پاس کہاں سے آگیا؟"

"جب ہم لوگ لدھیانہ میں تبدیلی ہو کر رہ گئے تھے تو آپ کو یاد ہوگا کہ اسپتال کے سامنے ایک بوڑھی جاگیردار عورت کی کوٹھی تھی۔"

"ہاں......ہاں......کون وہ رادھا ماتا۔" مجھے یاد آگیا تو میں نے فوراً ہی سر ہلا دیا۔ "جسے خفقان کی بیماری تھی۔ جس کا میں اکثر علاج کیا کرتا تھا۔ اور وہ جو تمہاری منہ بولی ماں تھی اور جس کے خطوط تمہیں اکثر

آتے رہتے تھے۔"

"جی.....جی ہاں وہی۔" راشدہ نے بھی سر ہلایا۔ "میں اس کے بارے میں کہہ رہی ہوں۔ آپ یہ بہت اچھی طرح جانتے ہیں کہ مجھے اس سے کتنی محبت ہے۔ میں اس سے ملنے اکثر جایا کرتی تھی۔ وہ بھی تو مجھے بے حد چاہتی تھی۔ ایک روز جب میں اس سے ملنے اس کے ہاں پہنچی تو میں نے اس کے کمرے سے رونے کی آوازسنی۔ میں سخت متعجب ہوئی کہ یہ کون رو رہا ہے۔ جب میں کمرے میں داخل ہوئی تو دیکھا کہ وہی نہایت مغموم بیٹھی رو رہی ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہے۔ میں نے اپنے دوپٹے سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ آپ کیوں رو رہی ہیں؟ خیریت تو ہے نا.....کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں ہوگئی؟"

"رونے کی بہت بڑی وجہ ہے۔" چند لمحوں کے بعد اس نے سرد آہ بھر کے جواب دیا۔ "کاش! مجھے کوئی ایسا موقع ملتا کہ اپنے باپ کی روح کو مکتی دلا سکتی۔ میں باوجود کوشش کے ان کی مکتی کا باعث نہیں بن سکی۔"

"ماتاجی!" میں نے کہا۔ "آخر ایسا کون سا گناہ آپ کے پتاجی سے سرزد ہوا جس کی تلافی آپ ناممکن سمجھتی ہیں۔"

"راشدہ! یہ ایک بڑی اندوہناک کہانی ہے۔" اس نے کہا۔ "آج بھی میرے سینے میں ایک خلش کسی خنجر کی طرح پیوست ہے۔ جب مجھے وہ سب کچھ یاد آتا ہے۔ تو میرے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ میں بے حد مغموم اور دل گرفتہ سی ہوجاتی ہوں۔"

"اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے وہ کہانی سنادیں۔" میں نے کہا۔ "اگر آپ اسے راز رکھنے کو کہیں تو میں اسے راز بھی رکھ سکتی ہوں۔"

"میں تمہیں وہ کہانی ضرور سناؤں گی اس لیے کہ دل کا بوجھ اور غم کم ہوجائے گا۔" وہ کہنے لگی۔ "یہ ایسی بات نہیں کہ اسے راز رکھا جائے صدیاں گزر گئی ہیں۔ یہ جاگیر جس کی مالک اب میں ہوں اور ایک سیاہ رنگ کے ہیروں کی جوڑی ایک راجہ نے میرے آباؤاجداد میں سے کسی کو انعام میں کسی کارنامے یا سیوا کرنے پر دی تھی۔ ہمارے خاندان میں یہ دستور چلا آتا ہے کہ جس اولاد کو باپ مرتے وقت وہ ہیروں کی جوڑی دیتا ہے۔ وہی اس جاگیر کا مالک ہوتا ہے۔ چنانچہ میرے دادا کے بعد میرا باپ ان چیزوں کا وارث ہوتا۔ مگر قسمت کا لکھا کون مٹا سکتا ہے۔ میرے دادا کو بڑھاپے میں ایک بہت ہی حسین اور کم عمر لڑکی سے عشق ہوگیا جوان کی پوتی کی عمر کی ہوگی۔ لیکن اس کا حسن وشباب اور اٹھان ایسی تھی کہ مردوں کو پاگل کر دیتی تھی اور میرے دادا عیاش قسم کے تھے اور نوجوان اور حسین لڑکیاں ان کی بہت بڑی کمزوری تھیں۔ وہ لڑکی سینکڑوں، ہزاروں میں نہیں بلکہ لاکھوں میں ایک تھی۔ میرے دادا نے اس لڑکی کے بھائی سے جو کہ اس کا وارث تھا رشتہ مانگا۔ لیکن اس نے رشتہ دینے سے صاف انکار کردیا۔ اس لیے کہ کوئی بھی بھائی اپنی بہن کو کنوئیں میں گرانے سے رہا۔ اور پھر وہ اپنی بہن کو بے انتہا چاہتا بھی تھا۔ دادا گاؤں کے سردار تھے۔ انہیں دولت جاگیر اور سرداری پر بڑا گھمنڈ تھا۔ لڑکی کے بھائی کے انکار کو انہوں نے اپنی ذلت

اور توہین سمجھا۔ جب کہ انہوں نے لڑکی کے بھائی کو دولت کا چارہ بھی ڈالا تھا۔ لیکن وہ اس لالچ میں نہیں آیا۔ انہوں نے بھائی کی غیر موجودگی میں اس لڑکی کو جبروزیادتی سے اپنے آدمیوں سے اٹھوالیا۔ جب اس لڑکی کا بھائی آیا اس نے میرے دادا کی اس حرکت کو سنا تو انہیں قتل کرنے ان کی حویلی میں داخل ہوگیا۔ میرے دادا نے فوراً ہی اس لڑکی سے بیاہ کرلیا تھا۔ جب بھائی پہنچا تو وہ ان کی پتنی بن چکی تھی۔ بہن نے سمجھا کر اسے واپس بھیج دیا کہ اب تیر کمان سے نکل چکا ہے۔ واپس نہیں آسکتا۔ چوں کہ وہ بے چارہ ان سے مقابلہ نہیں کرسکتا تھا اور جس طرح اس کی بہن کو اٹھا کر لے جایا گیا تھا وہ اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتا تھا کہ گاؤں والوں کو منہ دکھا سکے۔ ایک طرح سے اس کی بے عزتی ہوئی تھی۔ اس لیے وہ جلاوطن ہوگیا کہ کہیں گاؤں والے اسے بے غیرتی کا طعنہ نہ دیں۔

میرے پتاجی کا دادا کی اس عمر میں اس حرکت پر رنج وغصہ ہونا ایک فطری امر تھا۔ کوئی دو برس کی مدت کے بعد جب میرے پتاجی نے یہ سنا کہ ان کی سوتیلی ماں حاملہ ہے تو ان کے غصے کی انتہا نہ رہی۔ وہ لڑکی برہمن ذات کی تھی۔ انہوں نے طیش میں آکر ایک ملازمہ کی مدد سے اپنے باپ کو زہر دلوادیا۔ انہیں اپنے باپ پر قطعی رحم نہیں آیا تھا۔

میرے دادا کو اس سازش کا علم ہوگیا اور انہوں نے میرے پتاجی کی حرکات وسکنات اور اپنی سوتیلی ماں سے نفرت اور تیور سے بھانپ لیا تھا کہ ان کا بیٹا کسی دن ان کی موت کا سامان کرے گا۔ جب دادا کو کھانے میں زہر دیا گیا تو دوسری باندی نے انہیں بتادیا۔ چوں کہ اس زہر سے چوبیس گھنٹے بعد موت واقع ہوتی تھی اس لیے انہوں نے یہ چال چلی کہ سیاہ ہیروں کی جوڑی میں سے ایک ہیرا اپنی برہمن پتنی کو دے دیا، گویا آدھی جاگیر کا وارث اس بچے کو قرار دے دیا گیا جو برہمن لڑکی کی کوکھ میں تھا اور ایک وصیت نامہ بھی لکھ دیا کہ بچہ پیدا ہونے اور بالغ ہونے کے بعد وہ آدھی جاگیر وصول کرسکتی ہے۔ وہ لڑکی بھاگ کر کسی طرح اپنے بھائی سے جاملی۔ کوئی تین چار برس تک میرا باپ اس برہمن لڑکی کی تلاش میں جانے کہاں کہاں خوار ہوتا رہا۔ آخر میرے پتاجی نے کسی نہ کسی طرح اس کا کھوج لگا ہی لیا اور وہاں جاکر برہمن لڑکی۔ اس کے بچے اور بھائی کو انتہائی سفاکی بربریت اور وحشیانہ طور پر قتل کردیا۔ لیکن وہ ہیرا دستیاب نہ ہوسکا۔ جس کے لیے انہوں نے درندگی کی تھی۔

اس بہیمانہ قتل وغارت گری کے بعد سے ہمارے خاندان پر تباہی نازل ہوگئی۔ اور میرے پتاجی کو گٹھیا کا مرض لاحق ہوگیا۔ میرے اور چار بھائی یکے بعد دیگرے مرگئے۔ اس کے بعد کئی بچے پیدا ہوئے مگر ان میں سے ایک بھی زندہ نہ بچا۔ ان سب کے بعد میں پیدا ہوئی۔ جب میں گیارہ برس کی عمر کی ہوئی تب میرے پتاجی بھی اس گٹھیا کی بیماری سے چل بسے۔

میری ماں بڑی دھرماتما تھی۔ انہوں نے اس جاگیر کو ہمیشہ نفرت اور حقارت کی نظروں سے دیکھا اور دیکھتی تھیں جو انسانی خون کو پانی کی طرح ارزاں بہا کر حاصل کی گئی تھی۔ جب میں نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا اور مجھ میں شعور پیدا ہوا اور میں ایسی سیانی ہوگئی کہ اچھے اور برے کی تمیز کرسکوں تب انہوں نے

مجھے اس کی اصلیت بتائی۔ اس روز سے میرے لیے جا گیرا جیرن ہو گئی ہے۔ اب میں ہمیشہ خواب میں اپنے پتا جی کو دکھ درد اور اذیت میں مبتلا دیکھتی ہوں اور اس وجہ سے بیمار ہوں۔"

"اگر ماتا جی کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ ان کا باپ دوسرے جنم میں اس دنیا میں موجود ہے تو وہ کتنی خوش ہوں گی۔" میں نے کہا۔

"جی ہاں۔" راشدہ بولی۔ "ہمیں ضرور باپ بیٹی کی ملاقات کرانی چاہیے۔ کیوں کہ ان سب کو ایک ہی وقت پھر سے اس دنیا میں بھیجنے کا کوئی زبردست راز پوشیدہ معلوم ہوتا ہے۔ آپ صبح ایک تار میری بیماری کا ماتا جی کو دے دیں تا کہ وہ جلد آ سکیں۔" صبح کے وقت میں نے ایک تار لدھیانہ کے پتے پر دے دیا۔ اس کے آنے کی امید اس لیے تھی کہ وہ راشدہ کو بہت چاہتی تھیں۔ وہ دوسرے دن تشریف لے آئیں۔ وہ راشدہ کو صحیح سالم اور صحت مند دیکھ کر خوش ہوئیں اور انہوں نے حیرت سے کہا کہ انہیں اس بہانے سے کیوں بلایا گیا ہے۔ میں نے کہا کہ دھیرج رکھیں اور آرام فرمائیں میں بتاتا ہوں پہلے ناشتا کر لیں۔

راشدہ نے جب انہیں شکنتلا کا قصہ قدرے تفصیل سے سنایا تو وہ سخت متعجب ہوئیں اور وہ شکنتلا کے پتا جی جگ موہن کو دیکھنے کے لیے بے قرار اور بے تاب ہو گئیں۔ ان کے بس میں ہوتا۔ پتا معلوم ہوتا اور ان کے پر ہوتے تو وہ اڑ کر چلی جاتیں۔ مگر راشدہ کے خیال اور اس کی رائے کے مطابق شکنتلا سے ملاقات ضروری سمجھ کر ایک دعوتی رقعہ شکنتلا کو بھیجا گیا کہ وہ اسے تار سمجھ کر چلی آئے۔ اس کا شدت سے انتظار رہے گا۔ وہ آج ہی ملنے کے لیے آئے۔

سہ پہر کے چار بجے کے قریب ہمارے مکان کے آگے ایک خوبصورت اور شاندار گاڑی آ کر رکی۔ اس میں سے ملکہ حسن شکنتلا بڑی شان اور پروقار انداز سے اتری۔ اس میں ایک راج کماری کی سی تمکنت بھی تھی۔ ہم لوگ اس کے استقبال کو کھڑے ہوئے تھے۔ وہ ہمیں دیکھ کر مسکرائی۔ اس نے ابھی تک ماتا جی کو دیکھا نہیں تھا۔ جیسے ہی اس کی نظر ماتا جی پر پڑی اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ پھر سفید پڑتا چلا گیا۔ پھر وہ فوراً ہی۔ "سرلا دیوی......" کہتی ہوئی ان کے آگے ہاتھ جوڑ کر دوزانو بیٹھ گئی۔ اس نئے گل کھلنے پر ہم لوگ ششدر رہ گئے۔ مبہوت سے دیکھتے رہے۔

پھر ہم سب نشست گاہ میں آ کر بیٹھے۔ جب ہیرے والا قصہ اور ماتا جی کی شخصیت اس کے سامنے بیان کی گئی تو وہ بڑے غور اور توجہ سے سنتی رہی۔ جب راشدہ کہہ چکی تو پھر شکنتلا کہنے لگی۔

"آہ!......خدا کی شان۔ سرلا نے اپنے قاتل کے گھر جنم لیا۔ جب میں نے انہیں دیکھا تھا یہ نوجوان اور بہت ہی سندر تھیں۔ ان کے حسن و شباب کی کیا تعریف کروں۔ ایسی سندر ناریاں صرف مردوں کے خوابوں میں نظر آتی ہیں۔ اور اب اگرچہ میں انہیں ضعیفی کی حالت میں دیکھ رہی ہوں مگر اس کے باوجود ان کی شکل اور خدوخال بالکل بھی بگڑنے نہیں پائے۔ میں انہیں لاکھوں میں بھی پہچان سکتی ہوں کہ یہ سرلا دیوی ہیں۔ ہمارے اس طرح اچانک اور غیر متوقع دوبارہ ملاپ میں قدرت کا کوئی اہم مقصد پوشیدہ ہے۔ جو عنقریب ہم پر ظاہر ہو جائے گا۔ اس کی کوئی بات مصلحت سے خالی نہیں ہے۔"

☆......☆......☆......☆

شام کا جھٹ پٹا تھا۔ تاریکی ہر طرف اپنا تسلط جما رہی تھی۔ جب میں اور ماتا جی شکنتلا کے ساتھ میو اسپتال کے کمرہ نمبر بیس میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ جگ موہن بستر پر دراز ہیں اور بچوں کی طرح رو رہے ہیں اور ایک یوروپین نرس ان کے پاس بیٹھی انہیں تسلیاں دے رہی ہے۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ آج وہ تمام دن معمول سے زیادہ اداس رہے اور گریہ وزاری کرتے رہے۔ نرس انہیں بہت سمجھاتی رہی۔ وہ دن ڈوبنے کے بعد سے پھوٹ پھوٹ کر روتے جا رہے ہیں۔ بتاتے نہیں ہیں کہ کیوں اور کس لیے رو رہے ہیں۔

ہمیں دیکھ کر انہوں نے رونا موقوف کر دیا۔ وہ مجھ سے بہت خوش خلقی کے ساتھ ملے۔ ماتا جی ہمارے پیچھے پیچھے تھیں اس لیے وہ انہیں دیکھ نہیں سکی تھیں۔ شکنتلا ان کا ہاتھ پکڑ کے جگ موہن کے روبرو لے گئیں۔ وہ۔ "پتا جی...... پتا جی۔" کہتے ہوئے ان کے قدموں پر جھک گئیں۔ جگ موہن ان کی حرکتوں کو تعجب سے دیکھنے لگے۔ ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ بات کیا ہے۔ لیکن میں نے انہیں سارا معاملہ سمجھا دیا۔ شکنتلا کی مجذوبانہ باتوں کی تائید کی۔ اس طویل بیماری اور شانتی کی عجیب و غریب باتوں نے ان کے دماغ میں یہ خیال قائم کر دیا تھا کہ ان کی موجودہ زندگی کا دکھ ضرور ان کے کرموں کا پھل ہے۔ انہیں پچھلے جنم کی اصلیت کا یقین ہو چلا تھا۔ جب کہ وہ پہلے یقین کرنے پر تیار نہ تھے۔

ہم لوگوں نے ماتا جی کو بہ مشکل ان کے قدموں پر سے ہٹا کر ان کے قریب ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ اور شکنتلا نے ان کے آنسو پونچھے اور پانی پلایا تو جب کہیں جا کر ان کے آنسو کچھ کم ہوئے۔ کمرے کی فضا بڑی سوگوار ہو گئی تھی۔ ماتا جی کے آنسوؤں نے جگ موہن کے پیروں کو بھگو دیا تھا۔ کچھ دیر تک کمرے میں ایک گہرا سکوت طاری رہا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کمرے میں کوئی موجود نہیں ہے۔

آخر جگ موہن کی گھمبیر آواز نے کمرے میں چھائے ہوئے سکوت کو توڑا۔ وہ ماتا جی کی طرف ٹہلتے ہوئے کہنے لگے۔ "رادھا!......گو پچھلے جنم کی کوئی بات مجھے یاد نہیں آ رہی ہے۔ مگر پھر بھی تمہاری شکل و صورت بڑی مانوس معلوم ہوتی ہے۔"

"مگر پتا جی!" ماتا جی نے کہا۔ "میں نے تو آپ کو پہچان لیا ہے۔ کیوں کہ جس وقت آپ کا انتقال ہوا تھا میں گیارہ برس کی تھی۔"

"پچھلے جنم کی کوئی بھی بات مجھے یاد نہیں آ رہی ہے۔" جگ موہن نے دماغ پر زور دیتے ہوئے کہا "تمہیں یاد ہے۔ بڑی عجیب سی بات ہے۔"

ماتا جی تو اس رات اسپتال میں رک گئیں مگر میں واپس چلا آیا۔ وہاں مزید رک کر کرتا بھی کیا۔ دوسرے دن ہم لوگ جگ موہن کو اسپتال سے لے آئے۔ کیوں کہ ان کی طبیعت قدرے سنبھل گئی تھی اور اب اسپتال میں زیر علاج رہنے کی ضرورت نہ تھی۔ پھر ماتا جی کے بے حد اصرار پر ہم سب انہیں لے کر لدھیانہ چلے گئے۔ میں تین مہینے اپنی بہن راشدہ کے ہاں ہی مقیم رہا۔

جب میری رخصت ختم ہوئی تو ماتا جی نے مجھ سے کہا۔ ”تمہیں ملازمت پر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ استعفیٰ دے کر جاگیر سنبھالو۔“

”نہیں بھائی جان!“ راشدہ نے ان کی تجویز کی سختی سے مخالفت کی۔ ”آپ کسی قیمت پر یہ ملازمت نہ چھوڑیں۔ یہ اچھی ملازمت ہے۔ اس ملازمت سے سینکڑوں مریض شفایاب ہوتے ہیں۔ اور پھر آپ کے ہاتھ میں اللہ نے بڑی شفا دی ہے۔“

راشدہ ترک ملازمت کے چوں کہ سخت خلاف تھی اور اس کی بات میرے دل کو بھی لگی تھی۔ اس لیے میں نے اس کی بات مان لی اور سندھ چلا آیا لیکن ساتھ ساتھ اس کوشش میں لگا رہا اور دوڑ دھوپ کرتا رہا کہ کسی اور جگہ تبادلہ کروالوں۔ میری کوشش اور دوڑ دھوپ رائیگاں نہیں گئی۔ اپریل کے مہینے میں سندھ اور سندھ کی گرمی سے نجات ملی اور میرا تبادلہ ڈلہوزی ہو گیا۔

ڈلہوزی۔ شملہ کے مقابلہ میں کم نہیں ہے بلکہ ایک طرح سے ہم پلہ ہے۔ اس کی بھی کشمیر اور شملہ کی طرح بڑی شہرت تھی۔ قدرت نے اس میں رنگینیاں کوٹ کوٹ کر بھری ہیں جس نے نظاروں میں بڑا حسن اور دل فریبی پیدا کر دی ہے۔ جا بجا سیرگاہیں اور چشمے اس مقام کو رشک جنت بنا رہے تھے۔ جدھر دیکھو تو خدا کی یاد آنے لگتی کہ اس نے دنیا کو اپنی صناعی کا کیا نادر نمونہ بنایا اور اس کی تعریف کا حق تو ہم سے ادا ہو بھی نہیں سکتا۔ اس کی کون سی شے ایسی ہے جو اس کی عظمت کا ثبوت نہ ہو۔

یہاں آ کر ہم لوگ اس قدر مسرور اور شاداں ہوئے جیسے جنت میں آ گئے ہوں۔ ایسی کیفیت شاید ہی کبھی محسوس کی ہو۔ ہر اتوار کو جب ہم لوگ گرد و نواح میں پکنک پر جاتے تھے۔ تو اکثر اس موقع پر راشدہ شکنتلا کو بہت یاد کیا کرتی تھی۔ کیوں کہ اسے شکنتلا سے دلی محبت ہو گئی تھی۔ جیسے وہ اس کی دیرینہ اور بچپن کی سہیلی ہو۔ اس کی شکنتلا سے محبت پر مجھے بڑی حیرت تھی۔

ڈلہوزی سے بیس میل کے فاصلے پر ریاست چنبہ کا خوب صورت پایہ تخت واقع تھا۔ یہ شان دار شہر نہایت دل زیب جگہ پر آباد تھا۔ اور اس کے نیچے گہرائی میں ایک طرف دریائے راوی اپنی پوری شان و شوکت سے بہتا تھا۔ اور دوسری طرف دریائے ساہو شور و غل مچاتا، پتھروں میں سر دھنتا اور جھاگ اگلتا تیز رفتاری سے گزرتا تھا ان دونوں دریاؤں کا مقام استعمال بالکل چنبہ شہر کے پہلو میں واقع ہے۔ اس شہر میں ہر سال ساون کے مہینہ میں ایک بڑا بھاری میلہ لگتا تھا اور اس میلے کا انتظار لوگ ایک ایک دن گن گن کر کرتے تھے۔ شاید اس لیے کہ ان لوگوں کے لیے اور اس زمانے میں ایک بہترین تفریح ہوتی تھی۔ اس میں دریائے راوی کو ایک سانڈ کی قربانی دی جاتی تھی۔ کیوں اور کس لیے۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ یہ روایت تب سے چلی آ رہی جب سے اس میلے کی بنیاد پڑی تھی۔ راشدہ ان پہاڑی لڑکیوں اور عورتوں سے جو کوئلہ بیچنے کے لیے آیا کرتی تھیں، چنبہ کی تعریف سنتی۔ کئی دفعہ اس نے مجھ سے چنبہ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس کا اشتیاق اور تجسس روز بہ روز جیسے دو چند ہو جاتا تھا۔ لیکن میں اسے کسی نہ کسی بہانے سے ٹالتا رہا۔ اس اثنا میں راشدہ نے ماتا جی کو خط لکھا جس میں اس نے ان لوگوں کو ڈلہوزی آنے کی دعوت دی۔ ماتا جی تو خود

جگ موہن کی تیمارداری کی وجہ سے نہ آ سکیں لیکن انہوں نے شکنتلا کو ہمارے پاس بھیج دیا۔ شکنتلا کیا آئی، بہار آ گئی اس نے ماحول کو اور حسین بنا دیا۔ اس کے آنے سے ہمارے گھر میں چہل پہل اور بڑی رونق سی آ گئی۔ شاید اس لیے بھی کہ وہ بے پناہ حسین تھی۔

شکنتلا نے ڈلہوزی کو بہت ہی پسند کیا۔ اس نے کہا کہ اس حسین مقام اور اس کے دل کش نظاروں اور قدرت کی انمول صناعی نے اسے شاعرہ بنا دیا ہے۔ کاش! وہ شاعرہ ہوتی تو ایک دن میں سینکڑوں شعر کہہ دیتی۔ اس کی صحیح تعریف شعروں سے ہی کی جا سکتی ہے۔ ایک روز باتوں باتوں میں راشدہ نے شکنتلا سے کہا۔ ”شکنتلا بہن!......اب تو ان پہاڑوں کی سیر سے جی بھر گیا ہے۔ اب کسی دن چنبہ چلنا چاہیے۔ میں نے اس کی بڑی تعریف سنی ہے۔ اگلے مہینے وہاں ایک میلہ لگے گا جس میں سانڈ کی قربانی ہو گی۔“

شکنتلا چنبہ کا نام سنتے ہی ایک دم سے بڑے زور سے چونکی۔ اس کے چہرے پر لمحہ بھر کے لیے گھٹا سی چھا گئی۔ پھر اس نے تحیر زدہ کئی دفعہ یہی الفاظ دہرائے۔ پھر وہ گہری سوچ میں غرق ہو گئی اور اس کے چہرے پر اس کی سوچ کا عکس ابھرتا اور مٹتا رہا اور اس کی آنکھوں میں گہری سنجیدگی بھر گئی۔ اس نے اپنا سر جھکا لیا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے سر اٹھایا۔ تو اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں اور اس کا حسین چہرہ ایسے دمک اٹھا کہ وہ اور حسین دکھائی دینے لگی۔ ایک عجیب نکھار آ گیا۔ وہ بے تاب ہو کر کہنے لگی۔

”ڈاکٹر شاہ جی!......خدا کے لیے مجھے جلدی سے چنبہ لے چلیں۔ کیوں کہ جہاں تک میرا خیال ہے۔ وہ شہر چنبہ ہی تھا جس میں میں پچھلے جنم میں میلہ دیکھنے گئی تھی۔ میں وہاں پہنچ جاؤں تو میرے لیے اس حسین وادی تک پہنچنا نہایت آسان ہے۔“

میں اس حسین کافرہ کی بات کو کیسے ٹال سکتا تھا۔ اس کی یہ عاجزانہ درخواست اور انکساری میرے لیے حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ میں نے پندرہ دن کی رخصت لی تا کہ وہاں جایا جائے۔ وہاں ایک دو دن نہیں بلکہ جتنے دن بھی گزارے جائیں۔ وہ کم ہی تھے۔ وہ جگہ ہی ایسی تھی۔ دوسرے دن ہم لوگ چنبہ کی مہم پر روانہ ہوئے۔ راستے کے شان دار مناظر اور قدرت کے دلچسپ کرشمے دیکھتے ہوئے شام کے وقت چنبہ شہر میں داخل ہوئے۔ یہ شہر کیا تھا جادو نگری تھی۔ راشدہ بھی خوش تھی کہ شکنتلا کی وجہ سے اس کی تمنا پوری ہوئی۔ شہر کا دروازہ اور چوگان کا میدان دیکھتے ہی وہ اچھل پڑی اور بے اختیار کہنے لگی۔ ”ہاں یہ وہی ہے۔ ہاں یہ وہی ہے۔“

یہ کہہ کر شکنتلا بے قابو ہو کر بے تحاشا ادھر ادھر دوڑنے لگی۔ ہم لوگ بھی اس کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ اس نے ہمیں وہ مندر بھی دکھایا جس میں وہ کسی زمانے میں آ کر ٹھہری تھی۔ پھر اس نے ساہو کے کنارے ہمیں وہ جگہ دکھائی جس جگہ اس نے قاتل کو سرلا کا پتا دیا تھا۔ اس طرح وہ ماری ماری پھرتی رہی اور اس طرح دیکھتی رہی جیسے پچھلے جنم میں پہنچ گئی ہو۔ شام ہو گئی تھی لیکن اس نے ادھر ادھر پھرنا بند نہیں کیا۔ جب شام کے دھندلکے اندھیرے میں مدغم ہونے لگے تب اسے بڑی دقتوں سے ہم ڈاک بنگلہ پر لائے۔

دوسرے دن علی الصباح شکنتلا بیدار ہوتے ہی وادی کی سیر کے لیے مصر ہو گئی۔ مگر ہم لوگوں نے

اسے سمجھا بجھا کر مجبور کرلیا کہ ماتا جی کے بغیر ہمیں اس وادی کا عزم نہ کرنا چاہیے۔ ہمیں چاہیے کہ پہلے انہیں اطلاع کردیں اور ان کا جواب آنے پر پھر کوئی مناسب سا قدم اٹھائیں۔ پھر شکنتلا نے ہماری بات مان لی۔ پھر میں نے اسی وقت ماتا جی کے نام ایک خط لکھا۔

''ماتا جی!...... شکنتلا جس وادی کا حوالہ دیتی تھی اس کا پتا چل گیا ہے۔ اور آپ کوشش کر کے جتنا جلد ہو سکے ڈاک بنگلہ میں آ کر ملیں یا ہمیں وہاں جانے کی اجازت دیں۔ فقط۔ راشدہ۔''

اس خط کو میں نے خاص طور پر پوسٹ آفس میں پہنچایا تا کہ جلد روانہ ہو جائے۔ لیکن خط کو لکھے چار دن گزر گئے۔ جواب نہ آیا۔ یہ دن شکنتلا کے لیے روز حشر سے کم نہ تھے۔ اذیت ناک کربناک صدی کی طرح بھاری تھے۔ وہ گھڑیاں گن گن کر وقت گزار رہی تھی۔ اسے کھانے پینے کا ہوش تک نہ تھا۔ وہ سچ مچ بے حد جذباتی اور دیوانی ہو رہی تھی۔ اور اس کی حالت بھی مجذوبانہ سی ہونے لگی تھی۔ کبھی تو خود بخود پاگلوں کی طرح ہنسنے لگتی اور کبھی روٹھ کر باتیں کرتی۔ ہم لوگ اس کی بے قراری اور ان حرکتوں سے متوحش ہو رہے تھے میں نے اسے دو دن راتوں کو خواب آور گولیاں دیں تا کہ وہ رات کے وقت کہیں وادی کی سیر کو نہ نکل جائے۔

خدا خدا کر کے چوتھے دن شام کے وقت ماتا جی معہ نوکروں چاکروں کے چنبہ پہنچ گئیں۔ ہم لوگوں نے انہیں چوں کہ بالائی منزل سے دور سے آتا ہوا دیکھ لیا تھا اس لیے ان کے استقبال کے لیے بالائی منزل سے اتر آئے۔ اس عرصہ میں ماتا جی ڈانڈی سے اتر چکی تھیں۔ جب ہم قریب آئے تو یہ دیکھ کر ہمارے تعجب کی انتہا نہ رہی کہ دوسری ڈانڈی میں جگ موہن بھی اونی شالوں میں لپٹے ہوئے لیٹے ہیں۔ انہیں دیکھ کر ذہن میں بہت سارے سوال ابھرے تھے لیکن اب اس کا کوئی موقع نہیں تھا کہ انہیں زبان پر لایا جائے۔

ڈانڈی اسی طرح زینے کے راستے ڈاک بنگلہ کی بالائی منزل پر لائی گئی۔ پھر انہیں بڑی احتیاط اور آرام سے بستر پر لٹا دیا گیا۔ وہ اتنے لمبے سفر سے پژمردہ ہو رہے تھے اور ان کے چہرے پر تھکن تھی۔ مگر انہیں کوئی خاص تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ جو کسی پریشانی کا سبب بنے۔ اس کے بعد ڈانڈی والوں اور ملازموں کی رہائش کا بھی مناسب انتظام کیا گیا۔

دوسرے دن صبح نور کے تڑکے ہی ناشتا کر کے ہم لوگ کھانے پینے کا مناسب سامان لے کر اس وادی کی طرف چل پڑے۔ ماتا جی اور جگ موہن ڈانڈیوں پر سوار تھے اور باقی سب گھوڑوں پر۔ تمام دن ہم لوگ گھنے اور تاریک جنگلوں اور دیو صفت پہاڑوں کا سفر کرتے رہے۔ یہ سفر گھوڑوں کی وجہ سے دشوار گزار نہ تھا۔ لیکن جو لوگ ڈانڈیوں کو اٹھائے ہوئے تھے۔ ان کے لیے سخت تھا لیکن وہ ایک طرح سے عادی اور سخت بھی تھے۔ شکنتلا ہماری رہبر تھی۔ منزل ابھی دور تھی۔ شام کو ہم لوگوں نے تارہ پورنامی ایک چھوٹے سے گاؤں کے مندر میں پڑاؤ ڈالا۔ کیوں کہ اندھیرے میں سفر جاری رکھنا دانش مندی نہیں تھی۔ اور پھر بہت ہی مشکل بلکہ ناممکن سا بھی تھا۔

دوسرے دن علی الصباح بیدار ہونے کے بعد ہم سب نے ناشتا کیا۔ ناشتا ماتا جی کے ملازموں نے تیار کیا تھا۔ ناشتے سے فراغت پانے کے بعد پھر ہم نے سفر کا آغاز کیا۔ لیکن آج کا یہ سفر نہایت دل خوش کن تھا۔ ایک عجیب سی فرحت محسوس ہو رہی تھی۔ ہم جوں جوں آگے بڑھ رہے تھے۔ پہاڑوں کا نظارہ نہایت دل فریب ہو رہا تھا اور آنکھوں سے دل کی گہرائیوں میں اتر رہا تھا۔ ہم لوگ پیچ و خم کھاتی ندیوں اور نغمہ ریز چشموں اور چھوٹے چھوٹے آبشاروں کی دید سے لطف اندوز ہوتے ہوئے پر شکوہ پہاڑوں اور جاذب نظر وادیوں کو عبور کر رہے تھے اور پھر ایسی تازہ اور فرحت بخش ہوا چل رہی تھی اور ہمیں بے تحاشا چوم رہی تھی کہ سفر کے دوران تھکن بالکل بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ چنانچہ عصر کے قریب ہمارا قافلہ ایک خوبصورت گاؤں میں پہنچ گیا۔ اس گاؤں کے حسین نظاروں نے دل موہ لیا تھا اور آنکھوں میں بڑی ٹھنڈک سی بھر گئی تھی۔ جی خوش ہو گیا تھا۔

یہ گاؤں ایک ندی کے کنارے آباد تھا۔ یہی وہ گاؤں تھا جس کا ذکر شکنتلا بڑی حسرت سے کیا کرتی تھی۔ وقت کافی تھا ہم لوگ اس وادی تک پہنچ سکتے تھے۔ مگر شکنتلا کا منشا آج رات یہیں بسر کرنے کا تھا۔ سفر اور مہم چوں کہ شکنتلا کی خواہش پر سر کی جا رہی تھی۔ اس لیے اس کی ہر بات کو ماننا اور پورا کرنا ضروری تھا۔ اس لیے وہیں ڈیرا لگایا گیا۔ وہ خوش ہو گئی تھی کہ ہم نے اس کی بات مان کر یہاں بسیرا کر لیا۔

کافی پینے کے بعد شکنتلا نے مجھ سے شوق وارفتگی کے عالم میں اور دزدیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر شاہ جی!...... کیوں نہ ہم دونوں ابھی اور اسی وقت چل کر اپنے محبوب پریم کے وطن کی سیر کریں؟ کیا آپ چلنا پسند فرمائیں گے؟''

اس کی بات سے میں انکار کرنے کی جرأت کیسے کر سکتا تھا اور پھر اس خوبصورت گاؤں کی حسین اور رنگین فضا میں ایک مہ جمال کے ساتھ سیر میرے لیے بڑی پر لطف بات تھی۔ اس کا قرب اور رفاقت خوش نصیبی کی بات تھی۔ یوں بھی وہ ایک ایسا دلکش نظارہ تھی کہ جس میں جاذبیت ہی جاذبیت تھی۔ وہ دل کو چھو لینے والے نظارے سے کم نہیں تھی اور نگاہ تھی کہ اس کے چہرے اور سراپا سے ہٹتی نہیں تھی۔ جی چاہتا تھا کہ بس اسے ہی دیکھتے رہو جب میں نے حامی بھری تو وہ بہت خوش ہو گئی۔ اس پر ایک عجب سی سرشاری کی کیفیت طاری ہو گئی۔ جیسے اس کا پریم زندہ ہو۔ اس کا کسی جگہ پر انتظار کر رہا ہو۔ وہ اس سے ملنے اور اس کی بانہوں میں سما جانے کی منتظر ہو۔ جب ہم وہاں سے نکلے تو وہ معصوم بچوں کی طرح دوڑتی ہوئی بازار کی طرف چلی۔ میں بھی اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

وہ ایک ایک دکان پر کھڑی ہوتی۔ کسی سے سریندر کا پتا پوچھتی۔ کسی سے گوپال اور نندو وغیرہ کے بارے میں اور ان کا حال دریافت کرتی۔ کچھ تو ان ناموں سے قطعی لاعلمی ظاہر کرتے اور معذرت کر لیتے اور کہتے کہ ہم نے یہ نام نہیں سنا۔ شاید کبھی رہے ہوں۔ بعض سخت حیران ہوتے اور کہتے کہ یہ نام تو ہمارے خاندان کے پردادا اور ناناؤں کے نام ہیں۔ آپ انہیں کیسے جانتے ہیں؟ انہیں ایک لمبی مدت ہوئی وہ سورگ باشی ہو چکے ہیں۔ ہمیں یہ نام بھی اس لیے یاد ہیں کہ ہمارے باپ دادا کبھی کبھی کسی بات پر ان کا

ذکر کیا کرتے تھے۔

جب اس طرح سے اسے کوئی کامیابی نہ ہوئی تو اس نے گھروں پر آوازیں دینا شروع کر دیں۔ اس کی آواز سن کئی عورتیں گھروں سے نکل آئیں تو وہ ان سے کہتی کہ فلاں نام کی عورت کو باہر بھیجیں وہ ان سے ملنا چاہتی ہے۔ اس پر عورتیں حیرت سے کہتیں کہ۔ اس نام کی کوئی عورت تو یہاں نہیں رہتی ہے۔ البتہ ہماری بڑی بوڑھیاں اس نام کی تھیں اور انہیں مرے ہوئے جانے کتنے برس ہو گئے۔ اب تو ان کے نام بھی ذہن میں نہیں رہے۔ یاد دلانے پر یاد آ گئے۔ ان کے اس جواب اور باتوں سے شکنتلا بہت مایوس ہوتی۔ ظاہر ہے وہ اب زندہ رہنے سے رہے۔ گاؤں کے لوگوں سے اس حسین وادی اور مندر کا نام دریافت کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ شبھ متھا دیوی کا مندر ہے۔ اور اس وادی کو شبھ متھا استھان کہتے ہیں۔ دوسرے دن نو بجے کے قریب ہم لوگ وہاں سے روانہ ہوئے۔ آج شکنتلا غیر معمولی طور پر خاموش تھی۔ اس کی اداسی دیکھی نہ جاتی تھی۔ اس کی اداسی اور خاموشی نے جیسے ساری فضا اور دنیا کو اداس کر دیا۔ ہم سب نے اس کے بولنے، ہنسنے اور اس کی اداسی اور خاموشی دور کرنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ سب ناکام ہوئیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی بات سے اس کے دل پر چوٹ لگی ہو۔ گیارہ بجے ہمارا قافلہ شبھ متھا میں پہنچ گیا۔ اس وادی کو دیکھ کر ہم لوگ مبہوت اور دنگ رہ گئے۔ ہمارے خواب وخیال میں بھی نہ تھا۔ کہ ایسی بے مثل جگہ اس دنیا میں کہیں ہو سکتی ہے۔ اس جنت ارضی پر قدرت کی بے مثال اور عظیم کاری گری ختم تھی۔

وادی کی لمبی لمبی نرم نرم گھاس جس میں ریشم کا سا گداز محسوس ہوتا تھا۔ جابجا خوبصورت پودے سر اٹھائے کھڑے تھے اور ان پر صد ہا رنگ کے خودرو پھول کھلے ہوئے تھے۔ ان پھولوں کی پتیاں ایسی روغنی اور چکنی تھیں کہ ہر پھول بالکل مخمل معلوم ہوتا تھا۔ ان پھولوں کے رنگ اس قدر عجیب وغریب تھے کہ کوتاہ نظر انسان ابھی تک ان رنگوں کے نام بھی تجویز نہ کر سکا تھا۔ ایک ایک پودے میں کئی کئی رنگوں کے پھول لگے تھے۔ ان فلک بوس پہاڑوں میں گھری ہوئی وادی کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ بڑے بڑے عفریت کوہ قاف کی کسی حسین پری کو اپنی آغوش میں لیے بیٹھے ہیں۔ ایک طرف سبز پوش بلند پہاڑ کے دامن میں ایک نیلے رنگ کی وسیع جھیل تھی۔ اس کا پانی ہاتھ میں لینے پر بالکل صاف وشفاف اور برف کی طرح سفید اور یخ تھا۔ ایک گھونٹ حلق سے اتارتے ہی ایسا لگتا تھا۔ جیسے امرت پی لیا ہو۔ پہاڑ پر سے سفید شفاف اور آئینے کی طرح چمکتا پانی درخشاں آبشار جھیل میں گر کر ایک تلاطم پیدا کر رہا تھا۔ جس کی وجہ سے کنارے کے قریب ننھی ننھی سی پھوار پڑ رہی تھی۔ جھیل میں کہیں کہیں کنول کے بڑے بڑے اور جاذب نظر پھول کھلے تھے۔ تمام فضا میں ہر طرف مست کر دینے والی بھینی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی جس سے وجود بھی مہک اٹھا تھا۔ ایک طرف چھوٹی سی ترنم ریز اور سبک خرام ندی تھی جو اس جھیل سے نکل کر مندر کے پچھواڑے ڈھلوان راستے پر جا رہی تھی اور کوثر و تسنیم پر خنداں تھی۔ وادی کے ہر چہار جانب بلند قامت درخت پہلو بہ پہلو صف بستہ کھڑے نہایت بھلے معلوم ہوتے تھے۔ اس نور کے سانچے میں ڈھلی ہوئی وادی کو دیکھ کر انسان نہ صرف مبہوت ہو جاتا بلکہ اش اش کر اٹھتا تھا اور اس کے خالق کی حمد وثنا کرتا۔ سب لوگ سیر میں

مصروف اور اس سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ میں چپکے سے مندر کی طرف آ نکلا۔ مندر کا پجاری اپنی کوٹھری میں آسن جمائے کونڈی میں کوئی چیز رگڑ رہا تھا۔ وہ بہت عمر رسیدہ آدمی تھا۔ مگر بالکل گیا گزرا بھی نہ تھا۔ لیکن اس کے ست انداز سے پتا چلتا تھا کہ وہ بیمار ہے۔ میں نے اسے آداب کیا تو وہ بہت خوش ہوا اور خندہ پیشانی سے پیش آیا۔

"آپ کا نام کیا ہے؟" میں نے رسمی انداز سے خیریت پوچھنے کے بعد اس سے سوال کیا۔

"مجھے پرکاش کہتے ہیں۔" اس نے بڑی سادگی سے اپنا نام بتا دیا۔

"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ...... آپ سے پہلے کون پجاری تھا......؟" میں نے دریافت کیا۔

"جی ہاں۔" اس نے سر ہلایا۔ "پہلے یہاں کے پجاری کوئی اور نہیں بلکہ میرے پتا جی مہنت تلسی رام جی تھے۔"

"مگر تلسی رام کی تو ایک ہی لڑکی تھی جو جھیل میں ڈوب کر مر گئی تھی۔" میں نے اپنے دلی جوش کو اس ظاہر نہ کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کو یہ کیسے اور کیوں کر معلوم ہوا......؟" پجاری نے ششدر ہو کر میری شکل سوالیہ نظروں سے دیکھی۔

"یہ تو میں بعد میں بتاؤں گا۔ آپ صرف اتنا بتائیں کہ کیا یہ بات بالکل سچ ہے؟" میں نے کہا۔

"جی ہاں...... بالکل سچ ہے۔" وہ تحیر زدہ لہجے میں بولا۔ "بے شک ان کی ایک ہی لڑکی تھی۔ میرے ماموں ان کے داماد تھے جو قتل ہو گئے۔ یہ بڑی لمبی اور بہت پرانی کہانی ہے۔ میرے ماموں آپ سے بالکل مشابہہ تھے۔"

"پرکاش جی!" میں نے اس سے کہا۔ "میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ اسے سننا پسند فرمائیں گے؟"

"کیوں نہیں......؟ کیوں نہیں......؟" پجاری پرکاش نے سر ہلایا۔ "آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں کہیں۔ میں اسے غور سے سنوں گا۔" میں نے شروع سے آخر تک اسے شکنتلا کی کہانی قدرے تفصیل سے سنائی۔ وہ یہ داستان سن کر کچھ بوکھلا سا گیا۔

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔" میں نے اسے دلاسا دیا۔ "کچھ باتیں ایسی ہیں جو دنیا میں ممکن ہیں۔ کیا آپ آواگون کو نہیں مانتے ہیں؟"

"کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔" پجاری کی خوش اعتقادی آڑے آ گئی۔ اسے میری ان باتوں کا یقین آ گیا۔ اس نے سچ مان لیا۔ میں دوڑا دوڑا باہر آیا۔ شکنتلا کو تلاش کرنے لگا۔ کیوں کہ وہ اکیلی کسی سمت نکل گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس کی تلاش میں ندی کی طرف چل پڑا۔ وہ ندی کے قریب کسی گہری سوچ میں فکر میں ڈوبی ہوئی دنیا ومافیہا سے بے نیاز بیٹھی تھی۔

"شکنتلا...... شکنتلا۔" میں نے اس پر نظر پڑتے ہی اسے زور سے پکارا۔

اس نے مڑ کے میری طرف دیکھا۔ پھر وہ اپنا لباس اور سراپا سمیٹ کر میرے پاس آئی۔ ''کیا بات ہے؟''

''تم میرے ساتھ مندر میں چلو۔'' میں نے اس سے کہا۔ ''میں تمہیں لے جانے آیا ہوں۔''

''مندر میں......؟'' اس کے حسین چہرے پر گہرا استعجاب چھا گیا۔ ''وہ کس لیے؟''

''اس لیے کہ پجاری پرکاش مندر میں موجود ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ تمہیں بلا رہا ہے اور اسے یقین نہیں آیا تھا کہ......''

''کیا کہا......؟'' شکنتلا درمیان میں بات کاٹ کر اچھل پڑی۔ ''پرکاش زندہ ہے۔ واقعی آپ سچ کہہ رہے ہیں؟'' وہ بے تابی سے بولی۔ میں اسے لے کر پجاری کے پاس آیا۔ پرکاش دروازے پر کھڑا تھا۔ اس نے شکنتلا کو دیکھتے ہی نعرہ بلند کیا۔ ''شکنتلا دیوی کی جے ہو۔'' جب وہ اس کے پاس جا کھڑی ہوئی تو وہ بے اختیار اس کے پاؤں پر گر کر انہیں چھونے لگا۔

شکنتلا نے اسے روتے ہوئے اٹھایا اور بولی۔ ''پرکاش! جب میں مری تھی تب تم بہت ہی چھوٹے تھے۔ کیا تمہیں یاد ہے؟ کیا تم بتا سکتے ہو؟ میری موت کا پتا جی پر کیا اثر ہوا تھا......؟ ان پر کیا کچھ گزری تھی......؟ تمہیں یاد ہے تو مجھ سے چھپانا نہیں۔ سچ سچ بتا دو۔ میں سننا چاہتی ہوں۔''

''اس بات کو اسّی برس سے زیادہ کا عرصہ بیت چکا ہے۔'' پجاری نے جواب دیا۔ ''ان کی موت کے بعد میں نے یہ دروازہ کبھی نہیں کھولا۔''

''وہ کس لیے......؟'' شکنتلا نے متعجب نظروں سے دیکھا۔ ''آخر ایسی کون سی بات مانع تھی؟ کیا پتا جی نے کوئی وصیت کی تھی؟''

''اس لیے کہ میں نے اس کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔'' پرکاش نے جواب دیا اور پھر اس نے ایک محراب میں سے ایک چابی نکال کر شکنتلا کی طرف بڑھائی۔ ''اب آپ خود دروازہ کھول کر دیکھیں تو ان کی حالت کا اندازہ آپ کو خود بخود ہو جائے گا۔''

☆......☆......☆

شکنتلا نے اس کے ہاتھ سے چابی لے کر اسے جگ موہن سے ملنے کے لیے بھیج دیا۔ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد شکنتلا نے تالا کھولنے کی کوشش کی۔ تالا ایک دو نہیں پورے اسی برس سے مقفل تھا۔ لہٰذا اسے کھولنے میں بڑی دقت پیش آئی۔ میں نے کسی نہ کسی طرح کوشش کر کے تالا کھول دیا۔ واقعی اندر کا منظر کسی دل فگار کی زندگی کا ہو بہو نقشہ تھا۔ اندرونی دیواروں پر جا بجا رنگین قلمی تصویریں بنی ہوئی تھیں جو کسی ماہر اور کہنہ مشق مصور کے قلم کا نتیجہ تھیں میں دل میں ان تصویروں کو دیکھ کر اش اش کر اٹھا۔ ان میں شکنتلا کے بچپن کا زمانہ دکھایا گیا تھا۔ جوانی کا...... کہیں پریم اور شکنتلا کی شادی...... اور ان کی محبت کی زندگی کی تصویر تھی۔ کہیں کرن دیوان کی خوش فعلیوں کے منظر تھے۔ سرلا۔ پرکاش۔ بیراگن اور کنیا اور پہاڑ کی کھوہ اور قتل کا منظر بڑی خوش اسلوبی اور ماہرانہ چابک دستی سے دکھایا گیا تھا۔ شکنتلا کی موت کا منظر چتا

جلتی ہوئی دکھائی گئی تھی۔ یہ کوٹھری کیا تھی۔ شکنتلا کے گزشتہ جنم کی داستان تھی۔

اس کے علاوہ دیواروں پر ہندی زبان میں بہت سے دردناک اشعار لکھے تھے۔ یہ سب چیزیں تلسی رام کے اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی تھیں۔ شکنتلا بڑی مغموم اور دل گرفتہ سی ہو کر سب کچھ دیکھتی جا رہی تھی۔ طاق میں ایک کانسی کا سرپوش رکھا تھا۔ جس پر گرد کی موٹی سی تہہ جمی ہوئی تھی۔ یہ بہت خوبصورت تھا اور اس کا رنگ بھی اڑا نہیں تھا۔

شکنتلا نے اسے اٹھاتے ہوئے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''آہ!...... یہ تو مجھے جہیز میں ملا تھا۔''

پھر وہ اسے کھول کر دیکھنے لگی۔ اس میں چند ایک زیورات اور چند ڈبیاں تھیں۔ ان ڈبیوں میں سے کسی میں سوکھا ہوا کاجل تھا۔ کسی میں سیندور اور کسی میں خوشبودار سفوف، اور بھی ایک دو چیزیں سنگھار کی موجود تھیں۔

''آہ!...... یہ میرے زیور ہیں۔'' شکنتلا نے ایک سرد آہ بھری۔ ''یہ میرے سہاگ کے سنگار کا سامان ہے۔''

پھر اس نے ایک منقش لکڑی کا صندوق کھولا۔ اس میں چند جوڑے کپڑوں کے بڑی نفاست سے لرلے رکھے ہوئے تھے۔ شکنتلا ان کپڑوں کو بڑی محبت سے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ میں ان تصویروں کی سیر میں کھو گیا۔ بعض مناظر ایسے تھے کہ میرے دل کو ایک صدمے کا سا احساس ہوا۔ دل پر ایک چوٹ سی محسوس ہوئی۔ میں بدحواس سا ہو گیا۔ میرے دل میں آیا کہ میں آگے بڑھ کر شکنتلا کو اپنے بازوؤں میں بھر کے اسے اپنے سینے سے لگا کر جذب کر لوں اور اس کے چہرے پر جھک جاؤں۔

وہ مجھ سے صرف ایک قدم پر تھی۔ میں اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بڑھا۔ میں اس وقت بے حد جذباتی ہو گیا تھا۔ مگر اس کی حالت مجھ سے مختلف تھی۔ اس پر حسن و محبت کے افسانے کا کوئی اثر نہ تھا۔ کیوں کہ وہ بچے کی تصویر کو ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھی۔ اور کسی خیال اور کسی ذہنی اذیت سے اس کا رنگ فق ہو رہا تھا۔ چہرہ سفید پڑتا جا رہا تھا۔ وہ بار بار اپنے خشک سرخ گداز ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ میں اس سے اظہار محبت کی جرأت نہ کر سکا۔ میری جذباتی کیفیت جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ اس لیے بھی کہ اس کے چہرے پر جو تغیر و تبدل ابھرا تھا میں اسے دیکھنے لگا۔ یکایک اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امنڈ آیا اور جھڑی سی لگ گئی۔ صاف و شفاف موتیوں جیسے آنسو تھے۔ وہ تصویر کو مخاطب کر کے رندھی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔

''کرن دیوان!...... میری آنکھوں کے تارے کرن!...... میرے جگر کے ٹکڑے کرن جلد آ جاؤ اور اپنے ننھے ننھے سے بازو پھیلا کر میرے سینے سے لگ جاؤ۔ میری ممتا تمہارے لیے تڑپ رہی ہے۔ میں تمہارے بغیر رہ نہیں سکتی۔''

شکنتلا کی یہ غمگین حالت دیکھ کر میرا دل بیٹھ گیا۔ شکنتلا بڑے رقت آمیز لہجے میں کہہ رہی تھی۔ اچانک ا[illegible] نے توتلی زبان میں کہا۔ ''تھوڑا انتظار کریں میں آتا ہوں۔ اس ہرن کو تو باندھ لوں۔''

خیالات کا طلسم ٹوٹ کر بکھر گیا۔ ہم دونوں یہ آواز سن کر تیزی سے پلٹے۔ ایک پانچ برس کا بہت ہی خوبصورت لڑکا اندر آ کر شکنتلا سے چمٹ گیا۔ محبت مادری کا لطیف، اچھوتا اور پاکیزہ جذبہ تو ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے۔ مگر اس وقت جو نظارہ میرے سامنے تھا اس سے میں انگشت بدنداں رہ گیا۔ جیسی حالت اس بچے کی تھی ویسی ہی اس بچے کی بھی تھی۔ وہ جس وارفتگی سے بچے کو پیار کر رہی تھی۔ بچہ بھی اسے ایسی وارفتگی سے پیار کر رہا تھا۔ جب کہ وہ اس کی ماں تھی اور نہ بچہ اس کا بیٹا تھا۔

تھوڑی دیر بعد پرکاش مسکراتا ہوا اندر آیا اور عذر خواہی کے طریقے پر کہنے لگا۔ ''یہ بچہ بہت ہی شریر ہے۔ اتنا شریر کہ آپ تصور نہیں کر سکتے۔ یہ اپنی ماں کے مرنے کے بعد سے بہت شریر ہو گیا ہے۔ آپ لوگ اس کی اس حرکت کا برا نہ منائیں۔ کیوں کہ یہ ہر کسی کو تنگ کرتا ہے۔ یہ ایک طرح سے اس کی عادت بن چکی ہے۔''

''لیکن یہ بچہ ہے کون......؟ کس کا بیٹا ہے......؟'' میں نے دریافت کیا۔

''یہ میرا پوتا ہے۔ اس کا باپ مر چکا ہے۔'' پجاری نے جواب دیا۔ ''یہ یتیم پوتا میرے لیے جگر کا ٹکڑا ہے۔''

اور......'' شکنتلا نے کہا۔ ''اس بچے کا نام کیا ہے؟''

''اس بچے کا نام کرن دیوان ہے۔'' پجاری پرکاش نے جواب دیا۔

''کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ کس کی تصویر ہے؟'' شکنتلا نے دیوار پر بنی ہوئی تصویر کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

''پتا جی کہا کرتے تھے کہ یہ شکنتلا کے بیٹے کی تصویر ہے۔'' پجاری نے جواب دیا۔ ''اتنا ہی معلوم ہے۔''

''پرکاش!'' شکنتلا بولی۔ ''تم اس تصویر کو ذرا غور سے دیکھو اور پھر اس بچے کو بھی دیکھو۔ تمہیں کیا محسوس ہوتا ہے؟''

''اس بچے کی شکل اس تصویر والے بچے سے بہت مشابہ ہے۔'' پرکاش پجاری نے جواب دیا۔

''مشابہ نہیں ہے۔'' شکنتلا نے تکرار کے انداز میں کہا۔ ''بلکہ یہ وہی تصویر والا بچہ ہے۔ وہی چہرہ مہرہ وہی رنگ، ڈھنگ......اور پھر کٹی ہوئی چھنگلیا جو تم نے دروازہ بند کرنے سے کاٹی تھی۔'' وہ اسے تحیر زدہ دیکھ کر بولی۔ ''کیا میں غلط کہہ رہی ہوں ایسا لگ رہا ہے دونوں بھائی جڑواں تھے۔ لیکن جڑواں نہیں ہیں۔ کیوں؟''

شکنتلا نے اسے گود میں اٹھا لیا اور ہمراہیوں کے پاس آئی وہ بہت خوش اور مسرور دکھائی دے رہی تھی۔ سب کے سب اس بچے کرن کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ شام کے وقت جگ موہن کی طبیعت قدرے بگڑ گئی تھی۔ ادھر کرن کو بھی بخار کی حرارت تھی اور اس کا جسم گرم ہو رہا تھا۔ ہم لوگ راشدہ کو ان کے پاس بٹھا کر خود تینوں مندر میں گئے۔ اس مندر کی عمارت بہت کہنہ اور تاریک سی تھی۔ اندر کی دیواروں اور طاقچوں سے تیل، گھی اور باسی پھولوں کی بو نے فضا کو مکدر کر رکھا تھا۔

دیوار کے ساتھ ایک بہت بڑا قد آور سنگین بت کرسی نما نشست پر بیٹھا تھا۔ شکنتلا اس بت کو دیکھ

کر بہت ہچکچائی اور پھر کانپتی ہوئی ادھر ادھر کچھ تلاش کرنے لگی۔ اس دیکھ بھال میں کوئی دو ڈھائی گھنٹے گزر گئے۔ آخر جب وہ دیوی کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ترشول پر جھکے ہوئے بت کا معائنہ کر رہی تھی تو ایک ترشول پر بوجھ پڑنے سے دیوی کی پرشکن پیشانی میں شگاف پیدا ہو گیا۔ شکنتلا نے اس شگاف میں ہاتھ ڈال کر لکڑی کا ایک منقش ڈبا نکالا اور پھر ترشول بدستور اپنی جگہ پر لا کر شگاف بند کر دیا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ شکنتلا کو گزشتہ جنم کی بات یاد آ گئی تھی۔

سب کے چہرے فرط حیرت سے کھل گئے۔ ڈبے سے سیاہ ہیرا نکال کر جگ موہن اور پرکاش کو دکھایا گیا۔ ماتا جی والا ہیرا بھی اس کے ساتھ رکھ کر موازنہ کیا گیا تو یہ دونوں ایک ہی طرح کے ثابت ہوئے۔ ان میں کوئی اور کسی بھی طرح کا فرق نہیں تھا۔

اس کے بعد وصیت نامہ پڑھا گیا۔ جو ایک موٹے اور کھردرے ایسے کاغذ پر ہندی زبان میں سردار رام پرشاد کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا کہ میرے بعد آدھی جاگیر کا مالک میرا لڑکا سردار جانکی پرشاد ہو گا اور آدھی جاگیر کا مالک وہ بچہ ہو گا۔ جو سرلا کے پیٹ میں ہے۔ اگر یہ بچہ زندہ رہے تو اٹھارہ برس کی عمر میں اپنے بھائی سے حصہ لے سکتا ہے۔ اور یہ اس کا قانونی حق ہے۔

جگ موہن ان انکشافات سے بہت متاثر ہوئے۔ وہ آدھی رات تک زار و قطار روتے رہے۔ اپنے گناہوں کی معافی مانگتے رہے۔ انہوں نے بھگوان سے پرارتھنا نہیں کی۔ انہیں اس بات کا یقین ہو چلا تھا کہ پتھر کے صنم ہم نے بنائے ہیں اس سے کیا مانگیں وہ تو نہ کچھ بولتے ہیں اور نہ سن سکتے ہیں اور نہ کچھ کر سکتے ہیں۔ اصل مالک تو وہ ذات ہے جو کسی کو نظر نہیں آتا اور جو ہر چیز پر قادر ہے۔ جب وہ گڑگڑا کے اپنا عرش کے مالک سے دعا مانگنے لگے تو ہم سب پرکاش اور ننھے کرن سمیت ان کے ساتھ دعا میں شریک تھے۔ دوسرے روز علی الصباح ہم لوگ سیر کے واسطے نکل گئے۔ جب واپس آئے تو خلاف معمول جگ موہن کو گہری نیند میں غرق پایا۔ چوں کہ ہم لوگوں نے ناشتا نہیں کیا تھا اور انہیں ناشتے کے لیے جگانا چاہا مگر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر ان کے منہ سے کمبل ہٹایا تو معلوم ہوا کہ وہ ابدی نیند سو رہے ہیں۔ ان کے زردی مائل چہرے پر ایک نور سا برس رہا تھا۔ لگتا نہیں تھا کہ وہ چل بسے ہیں۔

ان کی اس اچانک موت سے سب ہی کو بہت صدمہ ہوا تھا۔ موت کا مزا تو ہر جان دار کو چکھنا ہوتا ہے۔ وہ موت سے بہت عرصے سے لڑتے آ رہے تھے اور آخر کب تک لڑتے رہتے۔ مگر پرکاش پر ان کی موت کا بہت گہرا اثر ہوا۔ وہ پہلے ہی چھ سات دن کے بخار اور ان پے در پے واقعات سے حواس باختہ ہو رہا تھا اور اس نے بہت زیادہ صدمہ دل و دماغ پر لے لیا تھا اس لیے وہ دردناک غم کی تاب نہ لا سکا۔ بخار کے ساتھ ساتھ ذرا سی بے احتیاطی کی وجہ سے اس کی چھاتی میں درد شروع ہو گیا۔ میں نے بہت توجہ سے اس کا علاج کیا۔ چوں کہ اس کا وقت آ پہنچا تھا۔ اس متعین وقت سے کوئی ڈاکٹر لڑ نہیں سکتا تھا اور نہ ہی کوئی علاج کارگر ہو سکا۔ وہ درد نمونیہ کی شکل اختیار کر گیا اور ان کی یعنی جگ موہن کی موت سے آٹھویں دن وہ بھی ان سے جا ملا۔ یوں اس کی اس زندگی کا باب آخر بند ہو گیا۔

میں نے مزید ایک ماہ کی رخصت لے لی۔ جو آسانی سے مل گئی۔ میرے پاس ابھی بھی کئی دن کی رخصت موجود تھی۔ جو میں مزید لے سکتا تھا۔ ہم سب کوئی چالیس دن تک وہاں رہے۔ شکنتلا کا ارادہ اب وہیں مستقل رہنے کا تھا۔ اور واپس جانے کو اس کا دل نہیں کر رہا تھا۔ اس کی اس خواہش کا خیال کرتے ہوئے راشدہ کو اس کے پاس چھوڑ کر میں اور ماتا جی واپس چلے آئے۔ کیوں کہ میری رخصت ختم ہو چکی تھی۔ اور ماتا جی کو جاگیر کا ٹھیکہ وصول کرنا تھا اور وہاں کوئی سرکاری اسپتال نہ تھا۔ ہوتا تو میں اپنا عارضی تبادلہ کروالیتا۔

ڈلہوزی واپس آنے کے بعد ایسا لگتا تھا کہ جیسے میں اپنی کوئی قیمتی شے اور اپنا دل بھی کھو آیا ہوں۔ زندگی بے کیف اور بے جان اور کسی صدی کی طرح بھاری ہو کر رہ گئی تھی۔ وقت تھا کہ گزرنے اور کٹنے کا نام نہ لیتا تھا۔ اب میری طبیعت بہت بے لطف رہتی تھی۔ کسی کام میں جی نہ لگتا تھا۔ مریضوں کو دیکھنے کا جو وقت مقرر تھا وہ بھی بہ مشکل کٹتا تھا۔ میری حالت بھی ایک مریض کی سی تھی۔

جس روز شکنتلا کا خط ملتا اس دن جیسے کچھ سہارا ہو جاتا اور میں اس خط کو نہ جانے کتنی مرتبہ پڑھتا۔ جب کہ وہ محبت بھرا خط نہیں ہوتا تھا لیکن میرے لیے اس خط کے ہر لفظ ہر سطر اور ہر جملے میں محبت کی خوشبو بسی ہوئی تھی اور اس کی مہک میں صاف طور پر محسوس کرتا تھا۔ مگر دوسرے دن پھر وہی بے قراری دامن گیر ہو جاتی۔ شکنتلا کی تصویر صرف دماغ کے گوشوں میں ہی نہیں بلکہ دل کے نہاں خانوں کی گہرائیوں میں بھی نقش ہو چکی تھی اور اس نقش کو میں مٹا نہیں سکتا تھا نہ مٹانا چاہتا تھا۔

میں نے ہر چند کہ دل پر جبر کیا اور اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ کیا میں مجنوں سا بن گیا ہوں۔ میں کوئی نوجوان لڑکا نہیں ہوں۔ جو اس کے فراق میں جل رہا ہوں اور اس کی جدائی میرے لیے سوہان روح بنتی جارہی ہے۔ جب کہ اس کی طرف سے اظہار محبت نہیں ہوا۔ نہ ہی کسی بات اور حرکات وسکنات سے محسوس ہوا۔ جب کہ میں اس کے پریم کی طرح ہوں۔ گزشتہ جنم میں وہ پریم سے ٹوٹ کر محبت کرتی تھی۔ لیکن مجھ سے کیوں نہیں کرتی ہے۔ میرے بازوؤں میں سما کر میرے سینے سے لگ کیوں نہیں جاتی ہے..اور پھر اس کے اور میرے درمیان میں مذہب کی دیوار کھڑی ہے۔ لیکن محبت تو اندھی ہوتی ہے۔ وہ مذہب، رنگ نسل کچھ نہیں دیکھتی ہے۔

اس کی محبت کی آگ میں یک طرفہ جلنے سے بچنے کے لیے اور اس کا خیال دل سے نکالنے کی میں نے بڑی کوشش کی مگر میرے بس کی بات نہیں تھی۔ اس طرح سے تین مہینے تین صدیوں کی طرح بیت گئے۔ یہ صدیاں میں نے کس طرح کاٹیں۔ یہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ میں ایک عاشق زار بن گیا۔ اس کے جنون عشق نے مجھے کہیں کا اور کسی قابل نہیں رکھا اور میری حالت روز بروز خراب ہوتی گئی۔

آخر میں نے ایک روز اپنی چھٹیوں کا حساب کر کے ایک لمبی رخصت لی۔ ہوتا یہ تھا کہ جب کہیں تبادلہ ہوتا تھا تو بہت ساری چھٹیاں بھی بن جاتی تھیں۔ مگر میری یہ دیوانگی اور چھٹی قدرت کے خلاف ثابت ہوئی۔ اس سال اتنی برف باری ہوئی کہ چنبہ کا راستہ مسدود ہو گیا۔ متواتر دو مہینے موسم اسی طرح رہا۔ موسم کو دیکھ کر میں نے واپس رخصت کردی۔ دو مہینے کے بعد جب سفر کا ارادہ کر رہا تھا کہ ماتا جی کا

تار ملا کہ انہیں کرن اور شکنتلا بہت یاد آ رہی ہے۔ اور ان سے ملنے کے لیے بہت مضطرب ہیں اور دو ایک دن میں ڈلہوزی پہنچ رہی ہیں۔

ان کے یہاں پہنچتے ہی ہم دونوں نے بغیر کسی تاخیر کے شبھ متھا کی طرف کوچ کیا۔ میں نے پہلے ہی تیاری کر رکھی تھی تاکہ روانگی میں کسی وجہ سے کسی قسم کی تاخیر نہ ہو۔ گو کہ برف باری بند ہو چکی تھی اور موسم بھی بہت کچھ تبدیل ہو چکا تھا۔ مگر پھر بھی راستے میں بہت ساری دشواریاں پیش آئیں۔ جس سے راستہ اور کٹھن ہو گیا۔ ہمارے بار برداری کے جانور بڑی مشکل سے اس دشوار گزار راستے سے گزرے۔ اور پھر کئی میل تک ہم لوگوں کو برف پر پیدل چلنا پڑا۔ یہ لمبی مسافت قیامت بنتی گئی۔ کسی نہ کسی طرح اور بہ دقت تمام چھٹے دن ہم لوگ شبھ متھا پہنچے۔

شکنتلا نے نہایت محبت اور گرم جوشی سے ہمارا خیر مقدم کیا اور بہت خوش اور مسرور سی ہوئی۔ اسے دیکھا تو ایسا لگا جیسے صدیوں بعد دیکھ رہا ہوں۔ اس میں بہت ہی نمایاں تبدیلی آ گئی تھی۔ پہاڑ کی خنک صحت بخش آب وہوا سے اس کا رنگ وروپ خوب نکھر گیا تھا۔ گلاب کے شاداب پھولوں کی طرح اس کے خوبصورت رخساروں کا رنگ چھلک رہا تھا۔ سمور کے سیاہ ماتمی لباس میں اس کا جوبن پھٹا پڑتا تھا۔ اس کے انگ انگ سے مستی ابلی پڑتی تھی۔ اس کے پر شباب گداز اور پرکشش بدن میں جوانی قیامت بن کر بول رہی تھی۔ اس کی مدھ بھری آنکھیں دل پر بجلیاں گرا رہی تھیں۔ میں اس کے چہرے کو نظر بھر کے دیکھنے کی ہمت نہ کر سکا۔

راشدہ کی صحت بھی بہت اچھی ہو گئی تھی۔ اور اس پر فضا مقام نے اسے یکسر بدل دیا تھا اور یہاں کی آب وہوا بھی اسے خوب راس آئی تھی۔ وہ شکنتلا کے ساتھ رہ کر بہت خوش تھی۔ یہاں جو ملازم تھے وہ بھی خوش اور بشاش تھے۔ شکنتلا نے ان کا بھی خوب خیال رکھا تھا۔ کرن تو سمور کے سوٹ میں بالکل کشمیری معلوم ہوتا تھا۔ وہ اپنی چھوٹی سی برف پر چلنے والی گاڑی میں بیٹھ کر برف میں کھیلتا رہتا تھا۔ گویا شکنتلا کا اس جنگل میں منگل ہو رہا تھا۔ وہ ایک امیر کبیر عورت تھی اس لیے دل کھول کر خرچ کر رہی تھی۔

اس نے مندر کی کوٹھریوں سے علیحدہ ایک موزوں جگہ پر پہاڑی طرز کا خوبصورت دو منزلہ لکڑی کا مکان بنوا لیا تھا۔ جس میں وہ خود معہ کرن اور راشدہ کے ساتھ رہتی تھی۔ مندر کی ملحقہ کوٹھریاں ملازموں اور سامان کے لیے وقف تھیں۔ برف باری کے پیش نظر اناج، گھی اور دوسرا سلف وغیرہ چھ مہینے کے لیے کوٹھریوں میں بھرا گیا تھا۔ اس کے علاوہ راشدہ اور میرے لیے ہرن اور بکرے کا گوشت بھی مسالہ جات لگا کر خشک کیا ہوا تھا اور مرغیاں بھی ذبح کر لی جاتی تھیں۔ ان ملازموں میں دو مسلمان ملازم بھی شامل تھے۔ اس کے علاوہ خشک وتر میوہ جات کا بہت بڑا ذخیرہ اس کے پاس موجود تھا۔ ہم لوگ دن رات آتش دان کے قریب بیٹھے خدا کی ان دی ہوئی عظیم نعمتوں کا لطف اٹھاتے۔ جھیل شیشہ کی طرح بالکل جمی ہوئی تھی اور پہاڑ پر سے گرنے والا آبشار بھی منجمد ہو کر بلوریں ستون کی طرح کھڑا تھا۔ ہر چیز پر برف کی [illegible] تھی۔ دوپہر کے وقت جب ہوا ساکن ہوتی تو ہم لوگ برف پر ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے

اور برف کے گولے بنا کر نشانہ بازی کیا کرتے اور موسم کا پورا لطف اٹھاتے۔

موسم سرما گزر گیا۔ بہار کی آمد سے ہر چیز میں زندگی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ چمک اٹھا۔ قدرت کی رنگینیاں پوری آب و تاب سے آشکارا ہو گئیں۔ ہم لوگ بے فکری، آسودگی اور عیش و عشرت کی زندگی گزار رہے تھے جو ایک خواب ناک زندگی سے کہیں حسین اور رنگین سی تھی۔ یہ قدرت کی مہربانی تھی جس نے اپنی نعمتوں سے ہمیں نوازا تھا۔

شکنتلا سے میری محبت ترقی پذیر تھی۔ کیوں کہ اس کا قرب حاصل تھا۔ ایک ایک لمحہ، گھڑیاں اور دن اس کی معیت میں گزر رہے تھے۔ میں اس پر دیوانہ وار فدا تھا۔ مگر چوں کہ محبوب کی ہم نشینی حاصل تھی اور جمال حسن کا نظارہ میسر تھا۔ اس لیے میری حرکات و سکنات سے بے قراری کا اظہار نہ ہوتا تھا۔ اور نہ ہی میں نے آشکارا کرنے کی ضرورت سمجھی اور میرے متعلق اس قسم کا کوئی خیال کسی کے دل میں پیدا نہ ہوا بلکہ شکنتلا بھی اس معاملے میں بے خبر تھی کہ میں اس کی محبت میں گرفتار ہوں۔

میں نے کئی بار سوچا اور ارادہ کیا کہ شکنتلا پر اپنی محبت کا اظہار کر دوں۔ کوئی ایسا موقع ملا اور نہ ہی اتفاق ہوا اور نہ ایسی تنہائی میسر آئی کہ اس کے سامنے دل نکال کر رکھ دوں۔ حرف مطلب زبان پر نہ آ سکا۔ وہ دل ہی میں تڑپتا اور ترستا رہا۔

ہمیں اس پر کیف زندگی میں سات مہینے گزر گئے۔ قریب میں ایک چھوٹی سی ڈسپنسری حکومت نے قائم کی تھی۔ میں نے وہاں اپنی خدمات پیش کر دی تھیں۔ اس طرح چند گھنٹوں کی مصروفیت بھی ہو جاتی تھی اور چھٹی بھی میرے لیے مسئلہ نہ بن سکی اور رہائش کی بھی سہولت ہو گئی تھی۔ ایک روز ماتا جی مجھ سے کہنے لگیں۔ "پریم!" وہ مجھے اس نام سے مخاطب کرتی تھیں۔ "یہ دنیا فانی ہے۔ انسان بھی فانی ہے۔ بے شک اس دنیا کی مسرت تو خوش قسمتی سے میسر ہوتی ہے۔ مگر پھر بھی ضروری کام اسے چھوڑ کر کرنا پڑتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ کرن کو وارث بنا کر جاگیر اس کے نام کر دوں۔ کیوں کہ قانونی طور پر اس بات کا فیصلہ ہو جانا چاہیے اور میرے خیال میں مجھے دو مہینے کا عرصہ وہاں لگ جائے گا۔ اب اگر آنے میں میں نے دیر کی تو پھر واپس نہ آ سکوں گی۔ کیوں کہ جاڑے کا موسم قریب ہے۔ پھر تو راستے بند ہو جائیں گے۔ اس لیے میں چڑھتے چاند کی تیرہ تاریخ کو یہاں سے واپس جانے کا ارادہ کر رہی ہوں اور کرن کا ساتھ ہے اور خطرہ ہے کہ سفر کی تکلیف سے وہ راستے میں کہیں اداس نہ ہو جائے۔ اس لیے میں تمہیں یہ زحمت دینا چاہتی ہوں کہ تم لدھیانہ تک مجھے چھوڑ آؤ۔ زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ لگ جائے گا۔ پھر تم واپس آ جانا۔ کیا یہ تکلیف کرو گے......؟"

میں جانا تو نہ چاہتا تھا۔ کیوں کہ شکنتلا سے ایک دن کی جدائی بھی میرے لیے ناقابل برداشت تھی۔ مگر میں ان کی درخواست رد کرنے کی ہمت نہ کر سکا۔ شکنتلا نے یہ خبر سنی تو وہ خاموش سی ہو گئی۔ میں نے اس کی خاموشی کو کرن کی جدائی سے منسوب کیا۔ کیوں کہ وہ اسے جس شدت سے چاہتی تھی اس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا وہ جتنا خیال رکھتی تھی اس پر رشک آتا تھا۔ اپنی جان سے زیادہ عزیز

رکھتی تھی۔ اس کی مامتا بے مثال اور عظیم تھی۔ اس کا اداس اور جذباتی ہونا فطری امر تھا۔

راشدہ بھی اپنا کچھ ضروری سامان لینے کے لیے ساتھ چل رہی تھی اور پھر گھر کو جو نوکروں پر چھوڑ کر آئے تھے اسے بھی دیکھنا تھا۔ تیرہ تاریخ کی صبح کو ہمارا قافلہ روانگی کے لیے ہر طرح سے تیار ہو گیا۔ شکنتلا سب سے گلے مل کر بھیگی آنکھوں سے ان سب کو رخصت کر رہی تھی۔ راشدہ اسے چوم اور سمجھا رہی تھی اور دلاسا دے رہی تھی اور وچن دے رہی تھی کہ وہ جلد سے جلد دوبارہ آ جائے گی۔ میں نوکروں سے سامان لدوا رہا تھا۔ میں کسی بہانے سے اندر گیا۔ اس خیال سے بھی کہ شکنتلا بھی کسی بہانے سے اندر آ کر مجھ سے اظہار محبت کرے۔ وہ عورت ہونے کے ناتے اظہار محبت نہیں کرتی۔ لیکن میں تو کرتا۔ میں کھڑکی میں کھڑا اسے دیکھ رہا اور اس کی راہ تک رہا تھا۔ جب وہ لوگ چلتے ہوئے مندر کے پچھواڑے گئے تو میں تیزی سے لپکتا ہوا نیچے آیا اور شکنتلا کی طرف لپک گیا۔ وہ ایک درخت کے سہارے اکیلی کھڑی تھی۔ اس کے سوا اور میرے سوا وہاں کوئی بھی نہ تھا اور اس کی جھیل جیسی گہری اور مدھ بھری آنکھوں میں صاف و شفاف موتی بھرے ہوئے تھے۔ وہ مجھ سے ہاتھ ملا کر لرزیدہ آواز میں کہنے لگی۔

"کاش!.....تم آج کی رات یہاں ٹھہر جاتے۔ تم جا رہے ہو تو میرا سینہ کٹ رہا ہے۔"

میں اس کی بات کا جواب دینے کو تھا کہ ماتا جی کی آواز سنائی دی۔ "پریم! جلدی چلو۔ دیر ہو رہی ہے۔"

میں نے آواز کی سمت پلٹ کر دیکھا۔ ماتا جی مندر کے دوسرے موڑ پر کھڑی تھیں۔ میں کچھ محجوب سا ہو گیا۔ جیسے انہوں نے مجھے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہو۔ ان کے چہرے اور آنکھوں میں شک کی پرچھائیاں نہیں تھیں۔ یوں بھی وہ یہ بات جانتی تھیں کہ میں ایک بلند کردار شخص ہوں اور میری نیت میں فتور نہیں آ سکتا۔ انہوں نے اتنا عرصہ میرے ساتھ رہ کر ایک جوہری کی طرح مجھے پرکھ لیا تھا۔

مجھے تھوڑی دیر کی بھی مہلت مل جاتی تو میں اس سے اظہار محبت کر بیٹھتا۔ اس کے آنسوؤں کو جذب کر لیتا۔ اس نے مجھ سے جیسے التجا کی تھی۔ یہ موقع بھی ملا تو نہ ملنے کے برابر ہی تھا۔ میں اسے الوداع کہہ کر ان لوگوں کے پاس آ گیا۔ وہ سب میرا انتظار کر رہے تھے۔

میں تمام دن خاموش رہا۔ ماتا جی اور راشدہ نے میری اس خاموشی کو اس لیے محسوس نہیں کیا تھا کہ میں ان کے پیچھے چل رہا تھا اور وہ دونوں آگے آگے باتیں کرتی جا رہی تھیں۔ میرا دل بہت پریشان اور وحشت زدہ سا تھا۔ میرے دل کے کسی کونے میں دکھ کی ایک لہر بار بار اٹھتی رہی اور میرے وجود پر ایک چابک بن کر لگتی رہی۔ میں اپنے آپ کو لعنت ملامت بھی کرتا رہا کہ شکنتلا کی التجا اور خواہش کے مطابق کیوں نہ آج کی رات میں رک گیا۔ میں ٹھہر جاتا تو کون سی قیامت آ جاتی۔ ماتا جی سے میں کوئی بہانہ کر سکتا تھا۔ میرے پاس بہانوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ میں ان سے کسی بھی مریض کا بہانہ کر کے رک جاتا کہ اس کی حالت خطرے سے باہر نہیں ہے۔ پھر میں ان سے کہتا کہ آپ لوگ جائیں میں دو ایک دن میں چلا آؤں گا۔ انہیں مجھ پر شک بھی نہ ہوتا اور میرے بغیر یہ قافلہ روانہ ہو جاتا۔

میرے سینے میں ایک خلش کسی خنجر کی طرح پیوست ہو گئی تھی۔ یہ احساس مجھے اندر ہی اندر کسی

زہریلے پھنکارتے سانپ کی طرح ڈس رہا تھا کہ میں نے شکنتلا سے کتنی سرد مہری کا سلوک کیا۔ جو مجھے زیب نہیں دیتا تھا۔ حالانکہ وہ مجھ سے محبت کرتی تھی۔ اس کا ثبوت آج اس کی اداسی اور اس کی آنکھوں میں بھرے ہوئے آنسو تھے۔ یہی خیال میرے دماغ میں جاگزین تھا اور مجھے چین لینے نہیں دے رہا تھا۔
شام کے وقت ہم لوگ تاراپور پہنچے۔ سب میری طرح تھک گئے تھے۔ کھانا کھاتے ہی بستروں میں گھس گئے۔ نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور اور کسی محبوبہ کی طرح روٹھی ہوئی تھی۔ شکنتلا کا اداس چہرہ میرے چشم تصور میں تھا۔ تھوڑی دیر تک میں بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ پھر میں باہر آ کر بیٹھ گیا۔ اس کے درد بھرے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگا۔

”کاش!...... تم آج کی رات یہاں ٹھہر جاتے۔ تم جا رہے ہو تو میرا سینہ کٹ رہا ہے۔“

میرے دل میں پہلا خیال جو آیا وہ یہ تھا کہ اس نے روانگی سے پہلے یہ بات مجھ سے کیوں نہیں کہی۔ وہ کہہ سکتی تھی۔ دوسری بات جس کا مجھے رہ رہ کر خیال آ رہا تھا وہ یہ تھا کہ اس نے مجھے صرف آج کی رات ٹھہرنے کو کہا۔ شکنتلا نے آج ہی کی رات کو اتنی اہمیت کیوں دی؟...... کیا آج کی رات مجھے اس کے ساتھ گزارنا ضروری ہے......؟ شاید اس میں کوئی مصلحت پوشیدہ ہو۔

میں نے سوچا کہ میں ابھی تو صرف پندرہ بیس میل دور ہی ہوں۔ وہاں پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ کارواں جو چلا تو یہاں اس لیے دیر سے پہنچا کہ خواتین بھی ساتھ تھیں۔ بچہ بھی تھا۔ اسباب بھی خچروں پر لدا ہوا تھا۔ دھیرے دھیرے راستہ کاٹنا پڑا۔ میں اکیلا گھوڑے پر تیز رفتاری سے سفر کر کے وہاں پہنچ سکتا ہوں۔ وہاں دو ایک گھنٹے گزار کر سویرے سویرے واپس یہاں پہنچ سکتا ہوں۔

میں نے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ بہت سارے خیالات کے زیر اثر میں نے ایک نوکر کو جگا کر اس سے کہا کہ...... میں ابھی اور اسی وقت واپس جا رہا ہوں۔ سویرے تک واپسی ہوگی۔ کسی وجہ سے سویرے نہ پہنچ سکا تو میرا انتظار نہ کرنا۔ اور روانہ ہو جانا۔ میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔ راشدہ اور ماتا جی کو بتا دینا کہ میں ایک مریض کو دیکھنے گیا ہوں۔

یوں تو سارے گھوڑے ہی دن بھر کے سفر سے چور چور تھے۔ لیکن میرا خیال تھا کہ انہیں چوں کہ خاصا وقت آرام کا مل گیا ہے وہ تازہ دم ہو گئے ہوں گے۔ میں نے جس گھوڑے پر یہاں تک سفر کیا تھا۔ وہ تازہ دم نظر آیا۔ میں نے اسے کھولا اور اس کی پیٹھ تھپتھپا کر کہا۔ ”میرے شہزادے! تمہیں محبت اور وفاداری کی قسم...... میری لاج رکھ لینا اور منزل مقصود تک جلد پہنچا دینا۔“ میرے ان الفاظ نے اس میں جیسے نئی روح پھونک دی۔ میں سوار ہوا تو وہ ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

جب میں شبھ متھا وادی میں داخل ہوا تو اس وقت ساڑھے بارہ کا عمل ہوگا۔ میں نے مندر کے احاطے میں گھوڑے کو چھوڑا اور شکنتلا کے مکان کا رخ کیا۔ میں دل میں خوش تھا کہ میں اس کی بات رکھنے کے لیے آ گیا ہوں اور وہ مجھے اس وقت اپنے سامنے پا کر حیران اور خوش بھی ہو جائے گی۔ میں نے راستے میں سفر کے دوران دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ چاہے کچھ ہو جائے میں اظہار محبت کر کے رہوں گا۔

دل کہ تنہائی اور ایسا سنہرا موقع پھر میسر نہیں آئے گا جس سے میں استفادہ کر سکوں۔ میرے دماغ کے کونے میں پراگندہ خیالات نہیں تھے۔ میں تو پاکیزہ محبت کا قائل تھا۔

مکان کا بیرونی دروازہ نیم وا تھا۔ میں نے دروازے کو آہستگی سے اندر کی طرف دھکیلا تاکہ کوئی آہٹ نہ ہو۔ پھر دھڑکتے دل سے اندر داخل ہوا۔ دبے پاؤں آگے بڑھا۔ اندر ہر طرف گہری تاریکی اور خاموشی تھی۔ اتنی خاموشی تھی کہ کوئی سانس لے تو اس کی آواز سنائی دے جائے۔ ایسا محسوس ہوا کہ کمرے میں شکنتلا موجود نہیں ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے سوچا پھر میں نے ٹارچ نکالی۔ پھر اس کی روشنی میں ایک ایک کمرے کے پاس بے آواز جا کر دیکھ لیا۔ تمام کمرے خالی تھے۔ شکنتلا کا پتا نہیں تھا۔

ایں...... شکنتلا کہاں گئی اور اس وقت کہاں جا سکتی ہے؟ میرے دل کے کسی کونے میں ایک شک کی لہر سانپ کی طرح کنڈلی مار کر بیٹھ گئی کہ...... کہیں وہ کسی سے ملنے کے لیے تو نہیں گئی؟ کیا معلوم کسی کے عشق میں گرفتار ہو گئی ہو؟ لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ راز ظاہر ہو جاتا۔ اس کا یہ عشق اور آشنائی چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ راشدہ اور وہ دونوں ایک ہی کمرے اور ایک ہی مسہری پر سوتی تھیں۔ بفرض محال ایسا ہوتا تو وہ ہم لوگوں کو اتنا عرصہ روکے نہ رکھتی اور جانے پر اداس نہ ہوتی۔ اور مجھے ایک رات رات جانے کے لیے نہ کہتی۔ اس خواہش کا اظہار نہ کرتی آخر وہ گئی کہاں؟ اتنی رات گئے کیوں؟

میں بوکھلایا ہوا سا باہر نکل آیا اور اسے تلاش کرنے لگا۔ چودھویں کا چاند پوری آب و تاب سے آسمان کے چوڑے چکلے سینے پر رونق افروز تھا۔ اپنے پورے جوبن پر تھا کسی دوشیزہ کی طرح...... اس کی روپہلی کرنیں درختوں سے چھن چھن کر گنگا جمنی کا کام کر رہی تھیں اور چاروں طرف دودھیا چاندنی کا منجمد دریا دکھائی دیتا تھا۔ جھیل اس وقت ایک ایسا بڑا سنہری طشت معلوم ہوتی تھی جس میں چاندنی کی بارش ہو رہی ہو۔ آبشار کی ترنم ریز صدا دل کو لبھا رہی تھی۔ درخت معبود حقیقی کی اطاعت میں دست بستہ خاموش کھڑے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ بڑے خضوع و خشوع سے رب العالمین کی عبادت کر رہے ہوں۔ ساری فضا پر ایک گہرا سناٹا طاری تھا اور میں حیران پریشان شکنتلا کو تلاش کر رہا تھا۔

اب میرے لیے اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں رہا تھا کہ وہ یقیناً کسی سے ملنے کے لیے گئی ہے۔ آخر وہ جوان تھی۔ پرشباب تھی۔ اس عمر اور جوانی کے دور میں ایک عورت اپنے جذبات پر پہرے نہیں بٹھا سکتی۔ راشدہ کے اس کے ساتھ رات سونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ بڑی احتیاط برتتی ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ روز روز نہ جاتی ہو۔ اس بات کو بھی خارج از امکان قرار نہیں دیا جا سکتا تھا کہ اس نے راشدہ کو اعتماد میں لے رکھا ہو۔ لیکن ایک اور بات دل و دماغ میں آ رہی تھی کہ وہ اپنے محبوب کو اپنے ہاں بلا سکتی تھی۔ حالاں کہ اتنے بڑے گھر میں کوئی تھا نہیں۔ کوئی رکاوٹ اور دیوار نہیں تھی اور نہ ہی زنجیر تھی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ مایوس ہو کر وہ اپنے محبوب سے مل کر لانے گئی ہو اور اس کے محبوب نے اسے وہیں روک لیا ہو۔

میں ان خیالات اور پریشانی میں غرق سوچ رہا تھا کہ اب مجھے واپس چلنا چاہیے۔ اگر اسے مجھ سے محبت ہوتی تو وہ اس کا اظہار کسی نہ کسی طرح کرتی۔ حالاں کہ میں اس کے پریم کی طرح تھا جس سے وہ

جذباتی ہوئی تھی اور اس نے مجھ سے راہ و رسم بڑھائی۔ مجھے ایک سایہ سا حرکت کرتا دکھائی دیا۔ میں پودوں کی آڑ لیتا دبے پاؤں اس طرف بڑھا۔ یہ خیال آیا کہ شاید شکنتلا کا محبوب اس سے ملنے آیا ہو اور وہ جھیل کے پاس بیٹھی اس کا انتظار کر رہی ہو۔ شاید ملنے کی جگہ ہو۔ میں ایک گل پوش جھاڑی کے پیچھے ہو گیا۔

میں نے وہاں سے دیکھا تو شکنتلا نظر آئی۔ وہ دودھیا چاندنی میں نہا رہی تھی۔ میں اس سے قریب ہی تھا اور یہاں سے وہ بہت صاف دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اس علاقے کے پہاڑی لباس میں ملبوس ایک چھوٹی سی چٹان پر بیٹھی تھی۔ اس شان، وقار اور تمکنت سے کہ جیسے وہ کسی دیس کی راج کماری ہو۔ پریوں کی ملکہ ہو۔ شاید کسی جنم میں رہی ہو۔ اس نے اپنی عنبریں زلفیں عجیب طرز پر گوندھ کر اس طرح شانوں پر پھیلا رکھی تھیں کہ جس طرح مار سیاہ ہوا میں لہرا رہے ہوں۔ اس کی مخمور گہری سیاہ اور بڑی بڑی آنکھوں میں کاجل کی لکیر غضب ڈھا رہی تھی۔ اس کے یاقوتی لب مصنوعی سرخی سے بالکل انار کی کلیاں معلوم ہوتے۔ اس کے شہابی ماتھے پر قشقہ تھا اور مانگ میں سیندور بھری ہوئی تھی جس سے اس کے حسن کا ایک بہت ہی منفرد پہلو سامنے تھا۔

اس نے وہ تمام زیور جو کانسی کے سرپوش میں پڑے تھے۔ بڑی نفاست اور سلیقے سے پہن رکھے تھے۔ وہ ایک خاص قسم کی خوشبو میں بسی ہوئی تھی۔ اس نے یہ خوشبو جو لگا رکھی تھی وہ شاید اپنے ساتھ لے کر آئی تھی یا پھر اس سرپوش میں رہی ہوگی۔ کیوں کہ میں نے اسے کبھی یہ خوشبو استعمال کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ یہ خوشبو مست کر دینے والی تھی اور میرے دل و دماغ پر چھا گئی اور خون کی گردش تیز ہوگئی اور جذبات میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ میں آپے سے باہر ہو جاؤں گا۔ میں نے یہ سن رکھا تھا کہ ماضی میں وہ عورتیں جن کے شوہر دوسری عورتوں کے پاس جاتے تھے اور کسی عورت سے تعلقات رکھتے تھے تو ان کی بیویاں یہ خوشبو رات کے وقت لگا لیتی تھیں یا اس وقت جب وہ اپنی داشتہ یا محبوبہ کے پاس جانے کے لیے تیاری کرتے تھے۔ یہ خوشبو انہیں اپنا اسیر بنا لیتی تھی۔ انہیں کسی اور عورت کی طرف جانے نہیں دیتی تھی۔ یہ خوشبو مرد کے جذبات کو اس قدر بھڑکا دیتی تھی کہ پھر وہ قابو میں نہیں رہتے تھے۔ اور جذبات کی رو میں بہہ کر پھر گھر سے نہیں نکلتے تھے۔ شاید ایسی ہی کوئی خوشبو تھی۔ جو ہوا کے دوش پر میرے وجود پر چھا رہی تھی۔ لیکن اس کا حسن و شباب اور ہیجان خیز سراپا کسی خوشبو کا محتاج نہیں تھا۔ اس کا قرب آدمی کو بہکا دینے اور بھسم کر دینے کے لیے ہی کافی تھا۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ گنگنانے لگی۔ پھر آہستہ آہستہ ایک مشہور پہاڑی گیت گانے لگی جو تقریبات کے موقع پر لڑکیاں اور عورتیں گاتی تھیں۔ اس کی مترنم آواز آبشار کی آواز کے ساتھ مل کر وجدانی سماں پیش کرنے لگی۔ وہ قوس قزح کی جیسی آواز تھی۔ ہر سر میں قوس قزح کا ایک رنگ تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ قوس قزح زمین پر اتر آئی ہو۔

چند لمحوں کے بعد گیت ختم ہو گیا۔ اسے گیت کے تمام بول یاد تھے۔ یہ گیت مجھے بھی یاد تھا اور میں بھی اسے کبھی فرصت یا تنہائی میں گنگناتا رہتا تھا۔ یہ گیت محبت بھرے دلوں کی ترجمانی کرتا تھا۔ اس گیت

کو شکنتلا کی پرسوز آواز نے اور خوبصورت بنا دیا تھا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور چاند کو ٹکٹکی لگا کر دیکھتی رہی۔ پھر وہ اسے مخاطب کر کے کہنے لگی۔

''اے پورنماشی کے حسین چاند!..... تو نے اپنی دیرینہ سالی میں کئی مایوس تمنا دیکھے ہوں گے اور جانے کیا کچھ نہیں دیکھا ہوگا..... مگر سچ بتا کہ..... کیا تو نے مجھ سے بھی کوئی دل فگار ہستی دیکھی ہے۔ جس نے اپنے محبوب سے رات ٹھہرنے کی التجا کی تھی۔ اس بھکارن نے صرف ایک رات کی اس سے بھیک مانگی تھی۔ دل کی جھولی خالی تھی۔ مگر میری تمنا استحقار سے ٹھکرائی گئی۔ کیا میں اس کٹھور دل کے نزدیک ایسی حقیر تھی۔ آہ!..... یہ وہی پریم ہے۔ جس کی یاد مجھے ایک برس سے تڑپا رہی ہے۔ میری حالت ماہی بے آب سے کم نہیں..... آہ!..... وہ پریم جس نے ایک وقت مجھ سے مہر و وفا کے بڑے عہد و پیمان کیے تھے۔ اور مجھ سے اس قدر بیگانہ.....؟ کیا میں محبت کے اور اس کے قابل نہیں رہی ہوں؟

اے روشن چاند!.....

اس نے قدرے توقف کے بعد گہری سانس لی اور بڑے دل گرفتہ لہجے میں کہنے لگی۔ ''میری زندگی کا پر درد ورق میرے مطالعہ سے گزر چکا ہے۔ میں تم سے کیا کہوں.....؟ تم ہی انصاف سے کہو کہ میں کتنی بدقسمت ہوں اور میری زندگی کس قدر بے ربط ہے۔ کیا کوئی مجھ جیسی حسین پرکشش اور بھرپور نوجوان عورت بدبخت ہو سکتی ہے؟..... آج میری سہاگ رات تھی۔ میں دلہن بنی ہوں۔ وہی شادی کا جوڑا پہن رکھا ہے۔ اور وہی زیورات ہیں۔ یہ دیکھو میں نے اپنے ہاتھوں اور پیروں میں مہندی بھی لگا رکھی ہے۔ انہی چیزوں سے میں نے سنگھار کیا ہے جن سے سہاگ رات کو کیا تھا اور ہر لڑکی جب دلہن بنتی ہے تو انہیں چیزوں سے سنگھار کرتی ہے۔

میں ہر لحاظ سے وہی اس ایک صدی پرانی شکنتلا ہوں۔ وہی زمین اور وہی آسمان۔ وہی وادی۔ وہی جھیل۔ مگر میرا سہاگ کہاں ہے.....؟ میرا پران پتی کہاں ہے..... آہ۔ مجھ سے کوسوں دور ہے۔ کاش! آج کی رات وہ میرے ساتھ گزارتا۔ کیا کسی دلہن کے ساتھ ایسا ہوا ہے کہ سہاگ رات اس کا دولہا نہ ہو؟ کیا میں یہ سہاگ رات اپنے جیون ساتھی کے بغیر کاٹ لوں.....؟ یہ کیسے ممکن ہے؟ اس طرح تو ساری رات میں انگاروں پر لوٹتی رہوں گی۔ میرے جذبات اور احساسات ایک لمحے بھی چین لینے نہیں دیں گے۔ میرے کان ترس رہے ہیں میٹھے اور محبت بھرے بول سننے کے لیے۔ میرے ہونٹ بے تاب اور پیاسے ہو رہے ہیں۔ میں اس کی بانہوں میں سما جانے کے لیے تڑپ رہی ہوں۔

اے شریر ستارو!..... تم کیوں آخر میرا تمسخر اڑانے پر تلے ہوئے ہو؟ اے میرے رحم دل چاند! تم کیوں میرے غم میں اپنے چمکتے ہوئے چہرے کو داغ دار بنا رہے ہو۔ اے آبشار! تم کیوں میری سیاہ بختی پر نوحہ کر رہے ہو۔ اے جھیل!..... تمہارا دل اس وسیع آبی چھاتی میں کیوں مضطرب ہے۔ میں محسوس کر رہی ہوں کہ ذرہ ذرہ اور ساری کائنات میرے اس غم میں شریک ہے۔ وہ مجھے دلاسا دے رہی ہے۔

آہ!..... اے سنگ دل پریم!..... شاہ جی!..... ایسے وقت میں جب کہ دنیا کی ہر ایک چیز مجھ سے

ہمدردی کا اظہار کر رہی ہے۔ دل گرفتہ کی مانند ہو رہی ہے۔ تم کیوں نہیں مجھ پر رحم کرتے۔ جب کہ تم میرے سب کچھ ہو۔ میرا سپنا ہو۔ میرے دل کی دھڑکن اور میرا دل اور نہ جانے کیا کیا ہو۔ اے میرے بے رحم محبوب! کیا آج میری سہاگ رات یوں ہی یاس واندوہ میں گزر جائے گی۔ اے مالک! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میرے من کی مراد بر آئے اور میرا محبوب سہاگ رات منانے آ جائے۔"

یہ سن کر میں بے تاب ہو گیا۔ میرے دل میں جو شک وشبہ پیدا ہوا تھا کہ شکنتلا کسی کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ دور ہو گیا۔ وہ میرے فراق میں تڑپ رہی تھی۔ ناامیدی ہو گئی تھی۔ آخر مجھ سے رہا نہ گیا۔ پودے کی شاخیں ہٹائیں اور تیزی سے لپک کر اس کے سامنے جا پہنچا۔ آخر فاصلہ ہی کتنا تھا۔ راستے میں کوئی رکاوٹ بھی تو نہ تھی۔

"شکنتلا!" میں نے اس کے روبرو کھڑے ہو کر کہا۔ "تمہارا پریم...... تمہارے ساتھ سہاگ کی رات گزارنے کے لیے بیس میل کی مسافت طے کر کے حاضر ہو گیا۔ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔ تمہارے دل کی پکار نے میرے دل کو مجبور کر دیا۔ مجھے معاف کر دو شکنتلا! اس وقت مجھے جانے کیا ہو گیا تھا۔ کہ میں تمہاری التجا سن کر رک نہ سکا تھا۔"

شکنتلا نے مجھے دیکھا تو اسے جیسے یقین نہیں آیا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہم دونوں ریشم جیسی گھاس پر کھڑے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کسی بیش قیمت قالین پر ہم کھڑے ہیں وہ خواب کی سی حالت میں دیکھتی ہوئی بولی۔ "پریم! کہیں میں سپنا تو نہیں دیکھ رہی ہوں؟" اس کے چہرے پر شادمانی کی لہر دوڑ گئی۔ "تم بتاؤ کیا یہ حقیقت ہے؟"

"یہ سپنا نہیں ہے شکنتلا!" میں نے کہا۔ "یہ حقیقت ہے تمہارا پریم تمہارے سامنے ہے۔"

اس نے میرے قریب آ کر اپنی مرمریں بانہیں پھیلا دیں اور محبت کے پیاسے اور دھڑکتے ہوئے دل باہم ملے۔ دو بچھڑی ہوئی روحیں ہم آغوش ہوئیں اور ہم دونوں محبت کے بے پایاں سمندر میں ایسے کھوئے کہ دنیا ومافیہا سے بے نیاز ہو گئے۔ یک لخت شکنتلا کے منہ سے ایک دل خراش چیخ نکلی اور وہ تڑپ کر نیچے گر پڑی۔ میں اسے اٹھانے کے لیے جھکا تو ایک پھن دار کالا سانپ پھنکارتا ہوا پاس کی جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔ میں نے اسے اٹھایا تو وہ محبت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھ کر کہنے لگی۔

"پریم! پریشان نہ ہو۔ خدا کی یہی مرضی تھی۔ اب ہم دونوں وادیِ نور میں ملیں گے۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے دم توڑ دیا۔ دنیا میری نظروں میں اندھیر ہو گئی۔ نہ معلوم میں کس طرح اس کی لاش اس کے مکان تک لایا۔ اس کی دل خراش چیخ سن کر تمام نوکر بیدار ہو کر کوٹھریوں سے نکل آئے تھے۔ وادی میں کہرام مچ گیا۔ میں پچھاڑیں کھا رہا تھا اور اپنا سر دیواروں سے پھوڑ رہا تھا۔ ملازم میری اس غیر متوقع موجودگی اور شکنتلا کی اچانک موت پر حیران اور ششدر سے ہو رہے تھے۔ ان کے چہرے سوالیہ نشان تھے۔

میری حالت زار دیکھ کر کلیجے پھٹے جاتے تھے۔ شکنتلا کی موت کا صدمہ میرے لیے جاں گسل تھا۔

[illegible] اجل کے بے رحم ہاتھوں نے میری محبوبہ دل نواز کو میری آغوش محبت سے جدا کر کے نہایت ستم گری کا [illegible] دیا تھا۔ میں اس ناقابل برداشت صدمے سے بالکل دیوانہ ہو گیا تھا۔ صبر وضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا اور میری نظروں کے سامنے تاریکی تھی۔ مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ میری ساری امیدیں [illegible]ائیں اور خواہشیں سب شکنتلا کے ساتھ دفن ہو گئیں۔ میں کبھی قسمت کی نارسائی پر دانت پیستا اور کبھی [illegible] اجل کو کوستا۔ اس حالت میں ضعف اور ناطاقتی نے مجھ پر غلبہ پا لیا اور مجھ پر غنودگی طاری ہو گئی۔

میں نے دیکھا کہ میں ایک نہایت عالی شان اور خوبصورت نیم وا دروازے کے قریب سے اندر کی طرف جا رہا ہوں۔ اندر ایک ایسی عجیب وغریب وادی ہے جس کی مثال آج تک چشم فلک نے دیکھی نہ ہوگی۔ وادی کیا ہے ایک نور کا آئینہ خانہ ہے۔ یہ وہ تھا جس کی تعریف میں انسان کی قوت گویائی بیکار ہو جاتی ہے۔ اور انسان ہوش وحواس کھونے کی زندہ مثال بن جاتا ہے۔ یہ وادی جمال ربی کا دل ربا عکس تھی۔ جس میں قدرت کے گوناگوں جلوے پنہاں تھے۔ اور اس فرحت بخش وادی میں شکنتلا نورانی [illegible]وں کا لباس فاخرانہ پہنے کھڑی تھی۔ جو ستاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ میں نے کوشش کی کہ دروازہ کھول کر اندر جاؤں مگر دروازہ کھل نہ سکا۔ میں نے شکنتلا کو آواز دی۔ وہ میری طرف دیکھ کر دل فریب انداز سے مسکرائی اور بولی۔

"پریم! تم چلے جاؤ۔ ابھی تم پر یہ دروازہ نہیں کھل سکتا۔"

میں نے بڑی منت سماجت کی کہ وہ مجھ پر ایسا ظلم نہ کرے۔ میں تمہارے بغیر پہاڑ سی زندگی کاٹ [illegible]ں ملتا۔

"تم فکر کیوں کرتے ہو۔" شکنتلا بولی۔ "صرف موت ہی ہمیں ملا سکتی ہے۔ میں تمہارا انتظار کروں گی۔"

میری آہ وزاری اور فریاد کا اس سنگ دل پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ کٹھور بنی رہی۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں اس حقیقی دنیا میں موجود تھا۔ میں نے غنودگی میں خواب دیکھا تھا یا وہاں پہنچا تھا اس کی تمیز نہیں کر سکا تھا۔ یہ ہے میری عجیب وغریب کہانی۔"

شاہ جی اپنی کہانی سنا کر خاموش ہو گئے۔ تو رشید نے کہا۔ "شاہ جی! آپ کی یہ کہانی بڑی تحیر انگیز [illegible] اور سنسنی خیز بھی ہے۔"

"ہاں۔" شاہ جی نے سر ہلایا۔ "بہت سارے لوگ اس کہانی کا یقین نہیں کرتے ہیں۔ لیکن مجھے [illegible]وا نہیں۔ تم دونوں کو یقین آیا؟"

"جی ہاں۔ یقین آیا۔" میں نے سر ہلایا۔ "لوگوں کو شاید اس لیے یقین نہ آتا ہو کہ یہ بہت ہی [illegible] وغریب کہانی ہے۔ آپ کی اس کہانی میں قیامت ہی قیامت برپا نظر آتی ہے۔ آپ نے جہنم کا [illegible]ال بھی بیان کیا ہے۔ اور اس طرح جہنم کی سیر ہو گئی ہے۔ جہنم کے متعلق جو تصور تھا وہ اب تک قائم [illegible]ن اس کہانی میں جس جہنم سے کردار دوچار ہوئے ہیں اسے سن کر واقعی روح کانپ گئی ہے۔ ایسی مکمل

تصویر جودیکھی نہ جائے ٗسوس بھی کی جائے۔ یہ کہانی میں شاید ہی کبھی بھول سکوں۔''

''لیکن شاہ جی......'' رشید نے کہا۔ ''آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ کب، کیوں اور کیسے جادوگر بنے تھے......؟''

''میری زندگی میں ایک اور واقعہ پیش آیا جس کے بعد میں نے جادوگر بننے کی ضرورت محسوس کی۔'' شاہ جی نے کہا۔ ''وہ واقعہ اس سے بھی کہیں عجیب وغریب دلچسپ مگر رونگٹے کھڑے کردینے والا ہے۔ کیا تم دونوں سننا پسند کرو گے؟''

''ہاں......ہاں......کیوں نہیں۔'' رشید نے کہا۔ ''دراصل ہم دونوں آپ کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات بھی سننا چاہتے ہیں۔''

''اچھا تو سنو۔ لیکن اس سے پہلے کیوں نہ ہم چائے پی لیں اور کچھ کھا لیں۔'' شاہ جی نے کہا۔ پھر وہ مجھ سے بولے۔ ''سکندر میاں! تم باورچی خانے میں جاؤ۔ ٹرے میں چائے وغیرہ رکھی ہوگی لیتے آؤ۔ اور یہ پیالیاں لے جا کر وہاں رکھ دو۔''

جب میں باورچی خانے میں داخل ہوا تو ایک سلیب پر ایک بہت بڑی ٹرے رکھی نظر آئی۔ اس ٹرے میں گرم گرم چھ عدد بہت بڑے بڑے قیمے کے سموسے رکھے تھے جو چار قیمے کے سموسے کے برابر ایک سموسہ تھا۔ بازار میں اتنے بڑے سموسے نہیں ملتے تھے اور نہ ہی میں نے کبھی اپنی زندگی میں دیکھے تھے۔ بازار میں ملنے والے سموسے سے چار گنا بڑے تھے۔ ایک طشتری میں پودینے کی چٹنی تھی۔ چینی کی ایک منقش کیتلی میں چائے تھی جو قدیم چینی طرز کی تھی۔ ایسی ہی چینی کی تین عدد خوب صورت پیالیاں تھیں۔ باورچی خانے میں کوئی موجود تو نہ تھا لیکن کسی ہستی کی موجودگی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ نادیدہ ہستی تھی۔ لیکن چولھے ٹھنڈے تھے۔ کوئی چائے کے برتن اور کڑاہی بھی نہ تھی۔ معلوم نہیں چائے کہاں سے بن کر آئی اور سموسے کہاں بنائے اور تلے گئے۔ ہمیں آم کھانے سے مطلب تھا۔

میں یہ ٹرے لے کر کمرے میں آیا۔ سموسے اس قدر لذیذ، ذائقہ دار اور مزے کے تھے کہ اپنی زندگی میں کبھی نہیں کھائے تھے۔ دو سموسے کھانے سے پیٹ بھر تو گیا تھا لیکن اور خواہش ہو رہی تھی۔ شاہ جی نے بتایا کہ یہ ہرن کے گوشت کے قیمے کے ہیں۔ چائے بھی بہت عمدہ تھی۔ سموسے اور چائے مزا دے گئے۔ چائے اتنی تھی کہ اس کے دو دور چلے۔ سموسے اور چائے سے فراغت پانے کے بعد شاہ جی کہنے لگے۔

''کئی مہینوں تک میری حالت پاگلوں کی سی رہی۔ شکنتلا کی محبت میں میں ایسا گرفتار ہوا تھا کہ اس کی موت اور دائمی جدائی ناقابل برداشت بن گئی تھی۔ ایک روز میری ملاقات داس گپتا سے ہوئی جو بنگال کا جادوگر تھا۔ اس کی عمر ڈیڑھ سو برس کی تھی۔ لیکن وہ جوانوں کی طرح صحت مند تھا۔ بالکل سیدھا چلتا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کے چہرے پر ایک جھری نہ تھی اور نہ ہی ایک بال بھی سفید تھا۔ اس کے چہرے سے یا کسی چیز اور جسم کے حصے سے عمر ظاہر نہ ہوتی تھی۔ جب اس نے اپنی عمر بتائی تو یقین کرنا پڑا۔ اس نے کہا کہ جادو کے زور سے نہیں بلکہ بنگال میں کچھ ایسی جڑی بوٹیاں پہاڑوں یا جنگلات میں ملتی ہیں جن

...رق پینے سے آدمی جوان دکھائی دیتا ہے۔

اس نے میرے رنج وغم اور دیوانگی کی وجہ دریافت کی تو میں نے اسے اپنی رام کہانی سنائی۔ پھر اس ...میری دوسرے جنم کے بارے میں بحث وتکرار ہوگئی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ دوسرا جنم حقیقت ہے اور یہ ...بھگوان کی طرف سے ہوتا ہے۔ میرے جادو میں یہ اثر ہے کہ میں تمہیں کسی بھی گھر میں دوبارہ بچے کی ...ل میں بھیج سکتا ہوں اور جب تم تیس سال کے ہو جاؤ گے اس وقت تم بالکل اپنے آپ کو اب جیسا ہی ...ں کرو گے۔ میں نے اس سے کہا کہ یہ ناممکن سی بات ہے۔ میں اس پر یقین اور اعتقاد نہیں رکھتا ...وں۔ اس نے کہا کہ اچھا تم اپنی آنکھیں بند کر لو۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

اس پراسرار اور عجیب وغریب دنیا میں بعض لوگوں کو ایسے واقعات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ جس ...تفصیل سن کر انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے اور اس کا یقین ہی نہیں آتا ہے۔ وہ ناقابل فہم اور ناممکنات ...سے لگتے ہیں۔ میں نے یہ کہانی اس ڈر سے کسی کو نہیں سنائی کہ لوگ حیرت کریں گے۔ نہیں ایسی بات ...وں۔ اس خیال سے نہیں سنائی کہ لوگ مذاق اڑائیں گے اور مجھے پاگل کہیں گے۔ اور ایسے لوگوں کو ...نے سے کچھ حاصل نہ تھا۔ اور نہ ہی مجھے کوئی شوق تھا۔ لیکن بقول چاند...... جب میرے سفید بال اس ...ل واقعہ کے میرے پاس موجود ہیں تو پھر کیوں نہ تم دونوں کے سامنے دہرا کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا ...اوں۔ مجھے اندازہ ہے کہ تم دونوں میری اس کہانی کا یقین کرو گے۔ کیوں کہ تم دونوں من کے سچے ... بہت پیارے جوان ہو۔ میرے دوسرے جنم اور دوسری نئی زندگی کی کہانی غور سے سنو۔ اس جادوگر ...اپنے جادو کے زور سے ایسا ہی کر دکھایا جو اس نے کہا تھا۔

میں اب جس گھر میں موجود تھا وہاں میرا نام شفیق احمد تھا اور میرا وطن مالوف مظفر گڑھ۔ میرے والد ... تھے۔ ہم دو بھائی بہن تھے۔ میری بہن کا نام نسرین تھا۔ وہ مجھ سے چھ برس بڑی تھی اور بے حد شریر تھی لیکن اس کی شرارتوں میں معصومانہ پن ہوتا تھا۔ ایسی شرارتیں نہیں کرتی تھی کہ اس سے گھر والے ...ں اور محلے کے لوگ تنگ آجائیں اور اس کی شکایت کریں۔ اس کی شرارتوں سے ایک طرح سے رونق ہو جاتی تھی۔ اسے جانور پالنے کا شوق نہیں بلکہ جنون تھا۔ ہم دونوں بہن بھائی میں بہت محبت تھی اور یہ عمر ...ساتھ ساتھ بڑھتی گئی۔ جب میں ذرا بڑا ہوا تو اس نے مجھے بھی اپنی شرارتوں میں شامل کر لیا۔ وقت ...ی سے گزرتا گیا۔ وقت نہ ہو جیسے خواب ہو۔ جو لمحوں میں بہت کچھ دیکھ لیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم ...بڑے ہوتے گئے حتیٰ کہ میں نو برس کا ہو گیا اور نسرین نے پندرہ برس کی عمر میں قدم رکھ دیا۔ لیکن اس ...شوق اور شرارتوں میں کمی نہ آئی تھی۔

ہمارا مکان بازار کے وسط میں تھا جس کی نچلی منزل میں والد صاحب کا مطب تھا اور بالاخانے پر ہماری رہائش تھی۔ بالاخانے کی کھڑکیوں کے قریب باہر کی طرف ابا کے مطب کا سائن بورڈ لگا تھا جو خاصا ... اس پر اشتہاری سائن بورڈ کا گمان ہوتا تھا۔ ایک دفعہ کسی شامت کی ماری چمگادڑ نے اس سائن ...پیچھے جو جگہ تھی اس میں بچے دے دیئے۔ اتفاق کی بات ہے ایک دن نسرین کی ان پر نظر جا پڑی۔

بس پھر کیا تھا۔ وہ حیرت اور خوشی سے اچھل پڑی اور جیسے ایک طوفان سا آ گیا۔ وہ اس کا بچہ چھیننے پر آمادہ ہوگئی۔ اس نے اس کام میں مجھے بھی شریک کرنا چاہا۔ گو مجھے جانوروں سے اتنی محبت نہ تھی۔ میں نے ڈر کر اس لیے انکار کر دیا کہ میں نے کبھی یہ جانور دیکھا نہ تھا۔

میرے اس انکار پر وہ بہت برافروختہ ہوئی۔ پھر بھی اس نے مجھے آمادہ کرنے کی بہت کوشش کی لیکن میں کسی صورت سے آمادہ نہ ہوا تو وہ مجھ سے روٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی اور اس نے مجھ سے کٹی کر لی۔ پھر بھی میں تیار ہوا نہ ہی اسے منانے کی کوشش کی۔ لیکن اس کی چنچل طبیعت میں سکون کہاں تھا اور کسی پل اسے قرار نہ رہتا۔ یوں بھی وہ ضدی واقع ہوئی اور دھن کی پکی تھی۔ جب بھی کسی کام یا شرارت کا ارادہ کر لیتی تو اسے پورا کئے بغیر نہیں بیٹھتی۔ اسے نچلا بیٹھنا جیسے آتا ہی نہ ہو۔ تھوڑی دیر بعد وہ کمرے سے نکلی تو اس کے ہاتھ میں ابا کی چھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چھڑی دیکھ کر میں اس خیال سے ڈر کر پیچھے ہٹ کر دور جا کھڑا ہوا کہ وہ مجھے حکم عدولی پر پیٹنے آئی ہے۔

گرمیوں کا موسم تھا۔ دوپہر کے وقت تو سورج آگ برساتا تھا اور دوپہر آتشیں بن جاتی تھی۔ آفتاب کرہ نار بنا ہوا تھا۔ در و دیوار تپش سے سیاہ ہو رہے تھے۔ گرمیوں کی دوپہر ایسی ہی ہوتی تھی۔ اور سہ پہر ہونے تک یہی عالم ہوتا تھا۔ نسرین کا چہرہ کچھ گرمی اور کچھ غصے سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ وہ منہ سے کچھ بڑبڑائی اور مجھے سخت ملامت اور شکایتی نظروں سے گھورتی ہوئی کھڑکی میں ایک ٹانگ باہر کی طرف لٹکا کر بیٹھ گئی اور پھر جھک کر اس مضبوط چھڑی سے چمگادڑ اور اس کے بچوں کو کچوکے دینے لگی۔ میں وہیں کھڑا ہوا تھا اور ان جانوروں کی آواز مجھے برابر سنائی دے رہی تھی۔

وہ اپنے کام میں مصروف تھی۔ حتیٰ کہ چمگادڑ تنگ آ کر پریشان ہو کر اور گھبرا کے بچوں کو وہیں چھوڑ کر پھڑ پھڑاتی ہوئی اڑی۔ بچے بے چارے بغیر ماں کے سسکنے لگے۔ نسرین کے دل میں ان پر کوئی رحم اور ترس نہیں آیا تھا۔ اس لیے اس نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ چمگادڑ کے اڑتے ہی فوراً جھک کر اس نے ایک بچے کو اٹھایا اور چھوٹے سے پنجرے میں ڈال کر دروازہ بند کر دیا۔

دن بھر تو وہ چمگادڑ غائب رہی۔ شام کے سائے جب اندھیرے میں مدغم ہونے لگے تو وہ اپنے گھونسلے میں واپس آ گئی اور بچے کو وہاں نہ پایا تو کھڑکی کے ذریعے کمرے میں گھس کر چاروں طرف تیزی سے چکر کاٹنے شروع کر دیئے۔ پنجرہ طاقچے میں پڑا تھا۔ وہ بار بار پنجرے پر بچے کو رہا کرانے کے لیے جھپٹتی اور ناکام ہو کر رہ جاتی۔ لیکن پھر بھی اس نے جیسے ہمت نہیں ہاری۔ اس لیے کہ وہ اس کی ماں تھی۔ ایک ماں آخر ماں ہوتی ہے۔ چاہے وہ انسان کی ہو جانور کی ہو یا اور پرندے کی ہو۔ اس میں ممتا ہوتی ہے۔ ان دنوں میں ایک بچہ تھا۔ مجھے ممتا کیا ہوتی ہے کیا پتا تھا۔ نسرین نے اس بات کی بہت کوشش کی کہ چمگادڑ کسی طرح باہر نکل جائے۔ لیکن وہ اسے باہر نکالنے میں ناکام رہی۔ ایک بار جب وہ پنجرے پر جھپٹی تو نسرین نے اس پر اس زور سے چھڑی کا وار کیا کہ وہ بے دم ہو کر فرش پر گر پڑی۔ پھر نسرین نے غصے میں آ کر مزید ضربوں سے اسے ہلاک کر دیا۔ مجھے نسرین کی یہ وحشیانہ حرکت بہت بری لگی۔ میں نے

ابا سی کہ اسے نہ مارو۔ لیکن وہ باز نہیں آئی۔

خدا کی قدرت..... اس رات نسرین کو تیز بخار چڑھ آیا۔ کھانسی کا شدید دورہ پڑا اور اس نے خون بھی تھوکا۔ والد صاحب نے کہا کہ نسرین کو تپ محرقہ ہو گیا۔ حیرت کی بات اور ناقابل یقین بھی کہ اس مرض میں اچانک کیسے مبتلا ہو گئی جب کہ اس کی ایسی کوئی علامت اس میں موجود نہ تھی۔ والد صاحب بھی چکرا گئے تھے۔ وہ کوئی معمولی حکیم نہ تھے۔ انہوں نے اس مرض پر قابو پانے کے لیے کیا کیا علاج نہ کیا۔ کیسی کیسی دوائیں نہیں دیں۔ افاقہ نہ ہوا دس گیارہ دن تک اذیت اور تکلیفیں اٹھا کے اور تڑپ تڑپ کر اس طرح مر گئی جس طرح وہ چمگادڑ مری تھی۔ ان دونوں کی موت کا منظر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ نسرین جیسی بھی تھی میری بہن تھی۔ اس کی موت کا میں نے بہت صدمہ لیا۔

وقت تیزی سے پر لگا کر اڑتا رہا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس ہولناک واقعہ کو اٹھارہ برس بیت گئے۔ میرے والدین بھی حیات نہ رہے اور وہ مجھے داغ مفارقت دے گئے تھے۔ میرے والد نے مجھے بھی طب کی تعلیم دی۔ اب میں خود حکیم تھا۔ یوں بھی مجھے طب سے بچپن سے ہی دلچسپی تھی اور میں بھی ایک بڑا حکیم بن کر نہ صرف اپنے والد کی طرح نام پیدا کرنا چاہتا تھا بلکہ مریضوں اور انسانیت کی خدمت بھی۔ چوں کہ مجھے علاج معالجے میں خاصی دلچسپی تھی اس لیے میں جڑی بوٹیوں کی تحقیقات کا بڑا شائق تھا۔ میں ان کے اکثر تجربات کرتا رہتا تھا۔

ہمارا ایک ملازم بہت پرانا تھا۔ اس کا نام چاند تھا۔ وہ اس کام میں میرا معاون تھا۔ وہ بہت ذہین اور کار آمد شخص تھا۔ چاند عمر میں مجھ سے پانچ برس بڑا تھا۔ والد مرحوم نے اسے ایک یتیم خانے سے لے کر اپنے بچے کی طرح پرورش کی تھی۔ اور اسے اولاد کی طرح چاہتے تھے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ میرے والد نے چوری چھپے شادی کی ہوئی تھی۔ اس زوجہ کے انتقال کے بعد وہ بچے کو گھر لے آئے۔ ان دنوں دوسری شادی کرنا کوئی معیوب بات نہ تھی۔ اکثر مردوں کی دو دو اور تین تین بیویاں بھی تھیں۔ اگر وہ دوسری شادی کرنا چاہتے تو امی یا کسی کی کیا مجال کہ انہیں باز رکھ سکیں۔ اس شخص نے اپنے آپ کو بڑا اہل ثابت کیا۔ وہ وفادار اور مخلص بھی تھا اور وہ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس وقت میری عمر ستائیس برس کی تھی۔ چاند کی عمر بائیس برس کی تھی۔

میں اور چاند اکثر جڑی بوٹیوں کی تلاش میں جنگلوں اور وادیوں میں بھی مارے مارے پھرتے کسی بھی کام میں صرف دلچسپی اور شوق نہیں بلکہ جنون ہونا چاہیے۔ جبھی بات بنتی ہے۔ میں نے کئی نئی بوٹیاں دریافت کیں جن کی عجیب و غریب خاصیت نے میری حکمت کو چار چاند لگا دیئے اور اس طرح میرا مطلب خوب چل پڑا۔

اس غرض سے میں نے جموں کا سفر کیا۔ کیوں کہ میں نے سنا تھا کہ وہاں بھی جڑی بوٹیاں بہ کثرت پائی جاتی ہیں اور وادی کشمیر کو قدرت نے نہ صرف حسن اور دل کشی سے مالا مال کیا ہوا ہے بلکہ جنت نظیر بنایا ہے بلکہ اس میں ایسے ایسے خزانے بھرے ہوئے ہیں کہ تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ یہ غلط بات نہ تھی۔

ہرلحاظ سے اس وادی پر بڑی مہربانی تھی۔ میں کوئی تین چار ماہ تک اس علاقے میں نئی نئی بوٹیاں تلاش کرتا ہوا ٹیوٹ تک جا پہنچا۔ چاند بھی اس سفر میں میرے ہم راہ تھا اور وہ میرے آرام کا ہر طرح سے خیال رکھتا تھا اور کسی بات کی تکلیف ہونے نہیں دیتا تھا۔ وہ ساتھ نہ ہوتا تو میرے لیے بڑی مشکلات پیدا ہو جاتیں۔ میرے پاس تین گھوڑے تھے۔ جن میں سے ایک پر میں خود سوار ہوتا اور باقی دونوں پر سامان بار برداری لادا جاتا۔ چاند ایک پہاڑی ملازم رامو کے ہمراہ ہمیشہ پیدل چلا کرتا۔ رامو قصبہ رونی کا باشندہ تھا جو رام بن سے دوسو میل جانب غرب، ان دشوار گزار اور پرخطر پہاڑوں کے پیچھے تھا جن کی برفانی چوٹیاں آسمان سے ملی ہوئی نظر آتی تھیں۔ دوران سفر میں ایک دن جب کہ جڑی بوٹیوں کا ذکر ہو رہا تھا۔ رامو نے مجھے بتایا کہ رونی کے قریب کے جنگلوں میں ایک پودا ملتا ہے۔ جس کی جڑ کی خوشبو سے شیر مست ہو جاتا تھا۔ پہاڑی لوگ شیر سے بچاؤ کے لیے اکثر اس جڑ کو اپنے پاس رکھتے ہیں۔ جب وہ کہیں جانے کے لیے نکلتے ہیں تو جڑ ان کے پاس ہوتی ہے۔

رامو چوں کہ رونی کا باشندہ تھا اس لیے بھی اسے اپنے اور دوسرے علاقوں کے بارے میں بھی بہت ساری معلومات تھیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ موضع رونی سے بیس میل پر ایک قصبہ باتھری آباد ہے۔ یہ مسلمانوں کی بستی ہے۔ بہت ہی قدیم اور بڑی خوبصورت سی بستی ہے۔ اس گاؤں کے گردونواح میں روشنی دینے والے درخت پائے جاتے ہیں جو دنیا کے کسی حصے میں نہیں ہیں۔ اس گاؤں کی یہی خوبی اور خصوصیت ہے۔ اس درخت کو پہاڑی زدن کا درخت کہا جاتا ہے۔ اس کا نام شاید کسی بزرگ نے تجویز کیا تھا۔ اس درخت کی روشنی دودھیا چاندنی کی طرح صاف وشفاف ہوتی ہے۔ آپ کو شاید یقین نہ آئے لیکن یہ حقیقت ہے کہ رات کے وقت کسی بھی گھر میں چراغ نہیں جلتا ہے اور شاید ہی کسی دو ایک گھروں میں ہو کیوں کہ لوگ اس درخت کی ٹہنیاں کاٹ کر گھروں میں بطور چراغ کے روشن کرتے ہیں۔ ان میں اتنی روشنی ہوتی ہے کہ کمرے کی ہر چیز صاف اور واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ دو چراغوں کی اتنی روشنی ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ اس علاقے کے غاروں میں ایک خاص قسم کی گھاس بھی پیدا ہوتی ہے۔ اس کی بھی ایک عجیب وغریب خاص بات یہ ہے کہ اسے بھگویا جائے تو اس سے دھواں نکلنا شروع ہو جاتا ہے۔ اور گردوپیش کئی کئی گز تک ایک گہری دھند سی چھا جاتی ہے۔ لیکن باہر کا کوئی آدمی بھی باتھری جانا پسند نہیں کرتا ہے۔

''وہ کس لیے......؟'' رامو نے سانس لینے کے لیے توقف کیا تو میں نے حیرت سے پوچھا۔

''اس لیے کہ اس گاؤں کے قریب ہی بھوتوں کا ایک قصبہ آباد ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ان کی اچھی خاصی آبادی ہے۔''

''بھوتوں کا قصبہ......؟'' میں اور چاند اچھل پڑے۔ ہم پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

''کہیں تم ماضی کی کوئی دل چسپ کہانی تو سنا نہیں رہے ہو......؟'' چاند نے شک دور کرنے کے خیال سے دریافت کیا۔

''جی نہیں......'' اس نے سر ہلایا۔ ''مجھے کیا ضرورت ہے کوئی جھوٹی بات بتانے کی۔ جو سچ ہے وہ [illegible] رہا ہوں۔''

''جب ایک قصبہ بھوتوں کا آباد ہے تو وہاں لوگ کس طرح رہتے ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔ ''کیا [illegible] ڈر اور خوف محسوس نہیں ہوتا؟''

''مجبوری ہے۔'' رامو نے کہا۔ ''لوگ وہاں جانے کب سے آباد ہیں وہ کہاں جاسکتے ہیں گو کہ ان لوگوں نے بھوتوں کی روک تھام کے لیے بہت کچھ انتظام کر رکھا ہے۔ پھر بھی بھوت ان لوگوں کو بہت تنگ اور پریشان کرتے رہتے ہیں۔''

''الف لیلیٰ ہزار داستان میں بھی ایسی کوئی کہانی اور قصہ نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

رامو کی زبانی اس انوکھے طلسماتی گاؤں اور اس کے عجیب وغریب پودوں کا حال سن کر میں ششدر سا رہ گیا۔ اگر کوئی اور شخص سناتا تو میں اسے گپ سن کر خاموش ہو جاتا اور یقین نہیں کرتا۔ کیوں کہ ناقابل یقین سی بات تھی۔ رامو جھوٹ نہیں بول سکتا تھا اور نہ ہی اسے بولنے اور چونکا دینے کی ضرورت تھی۔ وہ ایک سیدھا سادا سا دیہاتی تھا۔ دیہاتی لوگ جھوٹ نہیں بولتے تھے۔

اس رات میں نے ایک خواب دیکھا۔ جب کہ سارا دن میں اس گاؤں کے متعلق سوچتا اور چاند سے بھی باتیں کرتا رہا۔ شاید اس لیے میں نے خواب میں یہ دیکھا کہ میں اور چاند ایک خوبصورت پہاڑی پر [illegible] ہیں جس پر سبزہ اگا ہوا ہے جس کے مقابل ایک دل فریب اور حسین پہاڑی پر ایک گاؤں آباد تھا ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان میں ایک گہرا کھڈ تھا جس میں ایک شور انگیز ندی کف اڑاتی مچلتی ہوئی گزر رہی تھی۔ اس کا پانی بڑا صاف وشفاف اور چمکتا ہوا سا تھا اور چاند اس ندی کو اس طرح سے کچھ دیر تک دیکھتے رہے تھے جیسے اس میں کوئی سحر ہو اور اس نے ہمیں جکڑ لیا تھا۔

اس کھڈ کے اوپر دو پل بنے ہوئے تھے۔ ایک پل گاؤں کی طرف جاتا تھا اور دوسرا ایک عالی شان او[illegible] مکان کے دروازے پر جاکر ختم ہوتا تھا جو دوسری طرف عین کھڈ کے اوپر بنا تھا۔ اس مکان کا [illegible] دم دمہ نما تھا نہایت کاری گری سے کھڈ کی طرف بڑھا کر دو پتھریلی چٹانوں کی چوٹیوں پر ایستادہ کیا گیا تھا۔ یہ چٹانیں جو اس دم دمے کے نیچے ستونوں کا کام دیتی تھیں۔ جہاں پانی گہرا مست ہاتھی کی طرح چٹانوں سے ٹکراتا ہوا جارہا تھا۔ اس پل پر دم دمے کے قریب میری بہن نسرین مغموم کھڑی تھی اس کی گود میں ایک بچہ تھا۔ وہ خوبصورت سا بچہ تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ نہایت عاجزی سے کہنے لگی۔

''شفیق! مجھے بچاؤ۔'' اس کا لہجہ دل گرفتہ سا تھا۔ میرے دل پر ایک چابک سی لگی اور گہرا صدمہ [illegible] ''مجھے بچالو۔''

''نسرین!...... یہ کون سی جگہ ہے۔'' میں نے غم آلود لہجے میں اس سے پوچھا۔ ''تم یہاں کیسے [illegible]؟''

''میں نسرین نہیں ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''میرا نام شاہ جہان ہے۔ اس گاؤں کو باتھری کہتے ہیں۔

کیا تم نہیں جانتے؟"

"نہیں......" میں نے سر ہلایا۔ "میں اس کا نام اور اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا ہوں۔"

"پھر تم یہاں کیوں اور کس لیے آئے ہو اتنی دور سے......؟" اس کے لہجے میں افسردگی تھی۔

"میں جڑی بوٹیوں کی تلاش میں یہاں آیا تھا۔" میں نے کہا۔ "تم سے یہاں ملاقات ہوگئی۔ تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"تم نے اچھا کیا جو یہاں چلے آئے......؟" وہ دکھ بھرے لہجے میں بولی۔ "میں یہاں کی رانی تو ہوں لیکن بڑی مظلوم ہوں۔ میری مدد کرو۔" پھر اس نے توقف کر کے ادھر ادھر دیکھا۔ "خدا کے لیے میری مدد کرو میرے بھائی! مجھے بچالو...... دیر نہ کرو...... ورنہ......"

میں اس کی مدد کو برق سرعت سے آگے بڑھا۔ ایک دم سے سخت اور انتہائی تیز آندھی چلی جس سے وہ پل ٹوٹ گیا۔ لیکن میں کچھ آگے بڑھ چکا تھا۔ نسرین ایک دل خراش چیخ مار کر کھڈ میں جا گری۔ لیکن میں نے برق سرعت سے اس کے بچے کو پکڑ لیا۔

اس دہشت ناک خواب کی گھبراہٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔ دل بڑے زور زور سے اس طرح دھڑک رہا تھا۔ جیسے سینہ شق کر کے باہر نکل آئے گا۔ نہ صرف پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی بلکہ سارے بدن میں ٹھنڈے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ پھر مجھے نیند کہاں آئی۔ وہ کوسوں دور ہوگئی۔ میں بستر پر کروٹیں بدلنے لگا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ نسرین کی موت کے دو ایک ماہ بعد میں نے اسے خواب میں دیکھا تھا۔ لیکن ان اٹھارہ برسوں میں ایک بار بھی وہ خواب میں دکھائی نہیں دی تھی۔ لیکن ایک بہن ہونے کے ناتے کبھی کبھی اس کی یاد آجاتی تھی۔

میں نے صبح ناشتے کے وقت چاند کو اپنا خواب سنایا۔ اس نے سنا لیکن اس پر اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا اور نہ ہی اپنے کسی خیال کا اظہار کیا۔ البتہ صرف اتنا کہا کہ خوابوں کا کیا ہے۔ بعض اوقات ایسے ایسے عجیب وغریب حیرت انگیز اور ڈراؤنے نظر آتے ہیں کہ دیکھنے والا دہشت زدہ ہو جاتا ہے۔ اس کا کوئی نہ کوئی پس منظر وجہ ضرور ہوتی ہے۔ ویسے جو خواب سچے ہوتے ہیں۔ وہ نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں۔

میں نے چاند سے کہا۔ "میں آج ابھی اور اسی وقت باتھری کوچ کرنا چاہتا ہوں۔ لہٰذا تیاری کرو۔" اور تھوڑی دیر بعد ہم یہاں سے روانہ ہوگئے۔ باتھری تک کا سفر آسان نہ تھا۔ کیوں کہ ہمارا راستہ تنگ پیچ در پیچ تھا جو ایک پرخطر کھڈ کے کنارے ہوتا ہوا پہاڑ کی ناہموار اور ناقابل عبور چڑھائی پر جا پہنچا تھا۔ بعض گھاٹیاں اتنی خوف ناک اور اتنی دشوار گزار تھیں کہ گھوڑے اپنے پاؤں زمین پر گاڑ گاڑ کر چلتے تھے۔ ان پہاڑوں پر آمد و رفت بہت محدود اور نہ ہونے کے برابر تھی۔ دوران سفر میں صرف دو دفعہ ہمیں پہاڑیوں کے وہ قافلے ملے جو من ہیش کی طرف تیرتھ یاترا کرنے جا رہے تھے۔ ان میں مرد ہی نہیں بچے نوجوان لڑکیاں اور عورتیں بھی تھیں۔ ان قافلوں کے علاوہ دور دور تک ایک دو آدمی یا مزدور بھی نظر نہیں آئے جو تلاش معاش کے لیے جا رہے ہوں۔

آخر کار تیرہ دنوں کی شبانہ روز صعوبتوں کے بعد ہم یہ راستہ طے کر کے روہنی کے دل کش [illegible] خوبصورت گاؤں میں جا پہنچے۔ رامو نے اپنے گاؤں کی جو تعریف کی تھی وہ اس سے بھی کہیں بڑھ کر تھا۔

اس مسلسل سفر اور کٹھن راتوں نے تکان سے چور چور کر دیا تھا اور ہم بہت نڈھال ہوگئے تھے۔ [illegible] امو نہیں۔ چوں کہ وہ بچپن سے ہی اس سفر کا عادی تھا۔ اس لیے ہم نے دو ایک دن روہنی میں [illegible] کا فیصلہ کیا تا کہ تازہ دم ہو کر چل پڑیں۔ لیکن وہاں کچھ ایسا دل لگا کہ دو ایک دن کے بجائے کوئی [illegible] ٹھہر گئے۔ میں اس دوران وہاں جڑی بوٹیاں تلاش کر کے ان پر تجربہ کرتا رہا تھا۔ کوئی خاص بوٹی [illegible] لگ سکی۔

ایک ہفتہ کے قیام کے بعد ہم باتھری کی طرف روانہ ہوئے۔ رامو نے ہمارے ساتھ جانے سے [illegible] یا۔ کیوں کہ وہ خوف زدہ سا ہو گیا تھا۔ لیکن جب میں نے اس کی یومیہ اجرت ڈیڑھ گنا کر دی تو پھر [illegible] یا۔ میں نے اسے کچھ رقم پیشگی بھی دے دی کہ وہ گھر والوں کو دے دے۔

[illegible] ب ہم روہنی سے روانہ ہوئے تو پھر سمجھ میں آیا کہ رامو نے کس لیے ساتھ چلنے سے انکار کیا تھا۔ [illegible] ف ہی نہیں تھا بلکہ راستہ بھی اس کی وجہ تھی۔ یہ راستہ پہلے سے بھی نہ صرف ناہموار بلکہ شکستہ بھی تھا۔ [illegible] ل اور دقتوں سے اسے طے کر کے دوسرے دن کہیں دوپہر کے وقت ہم لوگ ایک کھلے میدان میں [illegible] منے ایک خوبصورت ٹیلہ تھا۔ اس دیدہ زیب میدان کو دیودار کے شان دار درخت گود میں لیے اس [illegible] ے تھے جیسے مرد نے کسی لڑکی کو آغوش میں لیا ہوا ہو۔ آفتاب عالم تاب کی تابانیوں سے میدان کا [illegible] نور کا ہم سر تھا۔ ادھر دھوپ اپنے جوبن پر تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے متوالے اور سرور بخش جھونکے [illegible] کے خس و خاشاک کی بلائیں لے رہے تھے۔ اس دل فریب اور پرکیف منظر نے ایسا متاثر اور [illegible] نے وہیں ڈیرے ڈال دیئے۔ بھوک کھل اٹھی تھی۔ ہم نے روانگی سے پہلے جو کھانا پکایا تھا اس [illegible] اتنی تھی کہ راستے میں کھانے کے باوجود بھی اتنا کچھ بچ گیا تھا کہ خوب سیر ہو کر کھایا۔ چاند نے کافی [illegible] سے دودھ لے آئے تھے، کھانے سے فراغت پانے کے بعد آرام کرنے لگے۔

سہ پہر کے وقت کافی کا ایک دور چلا۔ پھر میں اور چاند سیر کرتے ہوئے ٹیلے پر جا پہنچے۔ دور ہی [illegible] عورت دکھائی۔ جو درخت کے سائے میں بیٹھی تھی۔ یہ ایک لمبے قد کی گرانڈیل اور مضبوط مگر [illegible] تھی۔ وہ بہت صحت مند اور چاق و چوبند بھی لگتی تھی۔ اس کے بال بہت دراز تھے۔ لیکن بالکل چاندی کے دمکتے تاروں کی طرح...... جن کو کھولے ہوئے وہ کنگھی کر رہی تھی۔

چاند جھجک کر سرگوشی کے انداز میں کہنے لگا۔ "بچپن کی کہانیوں میں بڑی بوڑھیوں سے سنا کرتا تھا [illegible] ؤں اور پہاڑوں میں چڑیلیں رہا کرتی ہیں۔ جن کے بال پاؤں کی ایڑیوں تک لمبے ہوتے [illegible] ورت کے بال سفید بھی ہیں اور اتنے ہی لمبے بھی ہیں۔"

[illegible] اس کی ضعیف الاعتقادی پر مسکراتا اور ہنستا ہوا آگے بڑھ گیا۔ میں اس بات پر یقین اور اعتقاد نہیں [illegible] والی آہٹ پا کر اس نے اپنے نقرئی تاروں کے سے سفید بال چہرے سے ہٹائے اور میری

طرف دیکھا۔ پھر پہاڑی زبان میں پوچھا۔ ”تم لوگ کہاں کے رہنے والے ہو اور یہاں کیسے آنا ہوا......؟“

”میں حکیم ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”جڑی بوٹیوں کی تلاش میں آیا ہوں۔ لیکن کیا تم اس ویرانے میں اکیلی رہتی ہو؟“

اس عورت نے گہرا سانس لیا اور کہنے لگی۔ ”نہیں۔ میں موضع باتھری کی رہنے والی ہوں جو یہاں سے تین کوس آگے ہے۔ میرا نام رخسانہ ہے۔ میں بے اولاد ہوں اس وجہ سے گاؤں کی کئی بے رحم عورتیں مجھے منحوس خیال کرتی ہیں۔ اور میرے شوہر کو میرے خلاف بھڑکاتی رہتی ہیں۔ معلوم نہیں کیوں اور کس لیے...... جب کہ میں نے کبھی کسی کا برا نہیں چاہا۔ اولاد کا ہونا یا نہ ہونا عورت کے ہاتھ میں تھوڑی ہوتا ہے۔ یہ تو قدرت کی مرضی اور خوشی ہوتی ہے۔ وہ جسے چاہے اولاد سے نوازتا ہے۔ اور جسے چاہے نہیں دیتا ہے۔ یہ بات ہر کوئی جانتا ہے۔ پھر بھی مجھے منحوس خیال کرتی ہیں۔ طعنے دیتی رہتی ہیں۔ مجھے ایسی نظروں سے دیکھتی ہیں جیسے کوڑھ زدہ ہوں۔ خیر یہ سب باتیں میرے لیے ناقابل برداشت ہیں بلکہ ہوگئی ہیں اور میں اس کی عادی ہو چلی ہوں۔ لیکن مجھے شوہر کی نفرت اور غصہ برداشت نہیں ہوتا۔ میرا شوہر حبیب خان بہت سخت گیر آدمی ہے کان کا بھی کچا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر مجھے بری طرح زدوکوب کرتا ہے۔ بعض اوقات اس کے تشدد سے تنگ آ کر میں اس جنگل میں آ جاتی ہوں۔ یہاں آ کر مجھے بڑا سکون ملتا ہے اور میں اس کے غصے سے خود کو محفوظ پاتی ہوں۔ اور کچھ دن بعد جب اس کا غصہ سرد پڑ جاتا ہے تو میں واپس چلی جاتی ہوں۔“

وہ بڑی دکھی اور شوہر کے ہاتھوں ستائی ہوئی عورت تھی۔ اس نے اپنی بپتا دل گرفتہ لہجے میں سنا دی تھی۔ میں نے خاموشی سے سنی تا کہ اس کے دل کی بھڑاس نکل جائے۔ شاید کوئی ایسی عورت نہیں تھی جو اس کا دکھ درد بانٹ لے۔ اس لیے اس نے مجھے اپنا ہمدرد سمجھ کر اور اپنائیت سی محسوس کر کے اپنا غم بیان کر دیا جب کہ میں اس کے لیے اجنبی تھا اور شناسائی کو ایک پل ہی تو ہوا تھا۔

”تمہارے شوہر کو تم پر ایسا ظلم نہیں کرنا چاہیے۔“ میں نے اسے دلاسا دیا۔ ”اللہ نے چاہا تو ایک دن اسے اپنے ظلم کا احساس ہو جائے گا۔ جو عورتیں تمہارے خلاف اسے بھڑکاتی رہتی ہیں۔ ایک دن انہیں ان کے کیے کی سزا مل جائے گی۔“

”پہلے تو میں اس کے ظلم وستم سے بہت گھبراتی تھی اور میری حالت غیر ہو جاتی تھی۔“ وہ مجھے اپنا ہمدرد پا کر کہنے لگی۔ ”لیکن اب نہیں میں اس کا ہر ظلم وستم اور تشدد خوشی خوشی برداشت کر لیتی ہوں اور اف تک نہیں کرتی ہوں۔“

”وہ کس لیے......؟“ میں نے متعجب لہجے میں پوچھا۔ ”بڑی عجیب سی بات ہے ایک طرف غم بھی اور دوسری طرف ضبط اور تحمل بھی۔“

”اس لیے کہ جب سے مجھے ایک رشی نے بشارت دی کہ تیرا بیٹا ایک دن گاؤں کا سردار ہوگا تب سے میں مطمئن ہوں۔ خوش بھی ہوں گو کہ میں جانتی ہوں کہ اب میری عمر بچے پیدا کرنے کی نہیں رہی

یہ خودفریبی نہیں ہے۔ بلکہ مجھے اس لیے یقین ہے کہ رشی کی یہ پیشن گوئی ضرور پوری ہوگی۔ اس کی ...گوئیاں کبھی غلط نہیں ہوئی ہیں۔“

میں نے اس سے کچھ دیر تک مختلف موضوعات پر باتیں کرنے کے بعد اندازہ کر لیا کہ رخسانہ نہ ... نیک دل عورت ہے بلکہ مہذب شائستہ اور باادب عورت ہے۔ حیرت اور دکھ کی بات تھی کہ اس کے ...والوں کو اس ہیرے کی بالکل بھی قدر نہ تھی۔

”کیا تم باتھری کے حالات کے بارے میں کچھ بتانا پسند کرو گی؟“ میں نے کہا۔ ”میں نے سنا ہے ...قصبہ بھوتوں سے آباد ہے۔ یہ بھوت لوگوں کو بہت تنگ پریشان اور ہراساں کرتے رہتے ہیں۔ اس ...میں کتنی سچائی ہے؟“

”اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ یہ قصبہ بھوتوں کے ظلم وستم کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔“ رخسانہ ...لگی۔ ”اس کی وجہ موجودہ سردار کا ظلم وستم ہے جو اس نے گاؤں کے اصل وارث اور اس کے حامیوں ...تھا۔“

”لیکن یہ بات کب کی ہے؟“ میں نے سوال کیا۔ ”مجھے ذرا تفصیل سے بتاؤ۔ میں حقائق جاننا ...ہوں تا کہ کچھ صحیح اندازہ ہو سکے۔“

”میں بتاتی ہوں۔“ اس نے کہنا شروع کیا۔ ”آج سے نصف صدی پیشتر موضع باتھری ان کالے ...اونچے پہاڑوں کے دامن میں ایک وادی میں آباد تھی۔ اس گاؤں کی آبادی تقریباً تین ہزار نفوس پر ...تھی۔

اس وقت موجودہ سردار کا چچا سلمان خان گاؤں کا حاکم تھا۔ اس سردار کو شکار کا شوق آغاز نوجوانی ...تھا۔ اسے اس وقت تک چین نہیں آتا تھا جب تک وہ شکار پر نہ جائے۔ وہ ایک ماہر شکاری تھا۔ وہ ...بالکل خالی ہاتھ نہیں لوٹتا تھا۔ اس گاؤں میں یوں تو اور بھی شکاری تھے لیکن اس پائے کا کوئی بھی نہ ...دفعہ جب وہ شکار کھیلنے جا رہا تھا۔ اس کا گھوڑا ایک دشوار گزار گھاٹی سے بھڑکا جس کے باعث ...سوار اپنا توازن قائم نہ رکھ سکے، گھوڑا قابو میں نہ رہا اور سوار سمیت گہرے کھڈ میں گر کر ہلاک ...ی حیرت کی بات اس لیے تھی کہ وہ بارہا اس گھاٹی سے اسی گھوڑے پر سوار ہو کر گزر چکا تھا۔

اس کے بعد سلمان خان کا چھوٹا بھائی نعمت خان جو موجودہ سردار کا باپ ہے کو یہاں کا عارضی حاکم بنایا ...متوفی سردار کا بیٹا رحمت خان صرف ایک برس کی عمر کا بچہ تھا۔ جب تیرہ برس کے بعد جمعہ خان کا ...اس کے لڑکے سلطان خان نے جو رحمت خان سے عمر میں پانچ برس بڑا تھا۔ اس نے رحمت خان کو ...ہلاک کر دیا اور خود حاکم بن بیٹھا۔ اس پر رحمت خان کے حامیوں نے شورش مچائی اور ایک طوفان ...سلطان خان برداشت نہ کر سکا۔ اس نے انہیں بھی چن چن کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اس دن سے موضع باتھری پر آفت نازل ہوگئی اور اس نے تباہی پھیلا دی۔ یعنی تمام بے گناہ ...روحیں بھوت بن کر گاؤں والوں کو ستانے پریشان اور ہراساں کرنے لگیں اور چین وسکون

غارت کر کے رکھ دیا۔ خصوصاً ان لوگوں کو جو سلطان خان کے حامی تھے اور جنہوں نے اس خون خرابے اور قتل و غارت گری میں ساتھ دیا تھا۔ ان لوگوں کو نہیں جو ان میں شامل نہ تھے۔

سلطان خان انہی بھوتوں کی چیرہ دستیوں سے تنگ آ کر ایک درے کے راستے اپنی رعایا اور حامیوں کے ساتھ بھاگ آیا۔ اس پہاڑ کے اس طرف ایک جگہ موجودہ باتھری آباد کیا۔ پھر اس پہاڑی درے کو ایک پتھریلی دیوار بنا کر جو کئی گز اونچی ہے بند کر دیا۔ اب یہ بھوت گاؤں کا رخ نہیں کرتے ہیں۔ لیکن جب کوئی مرجاتا ہے تو اس کی لاش قبر سے نکال کر کھا جاتے ہیں۔"

رامو نے یہ کہانی نہیں سنائی۔ کیوں کہ وہ اس کہانی سے ناواقف تھا۔ تھوڑا بہت جانتا تھا لیکن اسے یہ کہانی معلوم نہیں تھی۔ جب رخسانہ کہانی سنا چکی تو میں نے اس سے پوچھا۔ "رخسانہ! اچھا یہ بتاؤ کہ باتھری کے لوگ مسافروں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں؟"

"اول تو بھوتوں کے ڈر اور خوف سے اس طرف کوئی مسافر یا سیاح نہیں آتا ہے۔ البتہ کبھی کبھی کشمیری بردہ فروش یا انہیں سوداگر کہہ لیں وہ ایسی حسین و جمیل لڑکیوں کو سردار کے پاس لا کر فروخت کر دیتے ہیں۔ جو غربت و افلاس کی ماری ہوتی ہیں۔ وہ ان لڑکیوں کو ان کے والدین سے خرید کر لاتے ہیں یا پھر سبز باغ دکھا کر...... افلاس بڑی ظالم اور بے رحم چیز ہے۔ یہ سب اس لیے ہوتا ہے کہ یہاں صرف اور صرف سردار کا قانون چلتا ہے۔ آپ حکیم ہیں...... یہاں کوئی حکیم ہی نہیں ہے۔ یہاں جنگلوں اور کچھ جڑی بوٹیوں سے علاج کیا جاتا ہے۔ اگر آپ عمدہ عمدہ اور مقوی دوائیں سردار کو بہ طور تحفہ پیش کرو گے تو وہ آپ کی بڑی عزت اور قدر کرے گا۔"

شام کے قریب ہم لوگ رخسانہ کی معیت میں باتھری کی طرف روانہ ہو گئے۔ پھر ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں خواب کا سا منظر اور سارا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ وہ میرے ذہن پر چھایا ہوا تھا۔ جسے میں نکال نہیں سکتا تھا۔ بلکہ نقش بن گیا تھا۔ کیوں کہ میں نے لڑکی کو دیکھا تھا۔ ہم لوگ اس وقت ایک ایسی پہاڑی پر کھڑے تھے جس کے مقابل کی دوسری پہاڑی پر گاؤں آباد تھا۔ وہی ندی...... وہی کھڈ...... وہی دو پل...... وہی دم دمہ نما مکان...... جس کا آدھا حصہ کھڈ کے درمیان سنگی چٹانوں پر قائم تھا۔ میں بھونچکا سا ہو کر خواب والی حسین لڑکی کی جستجو میں اس خوب صورت پل کی طرف دیکھنے لگا۔

رخسانہ نے میرے بشرے سے جیسے دل کی حالت بھانپ لی تھی۔ وہ میری بدحواسی پر بہت متعجب ہوئی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ میری ایسی کیفیت ہو رہی ہے۔ کیوں کہ میں نے اسے اپنے خواب کے بارے میں بالکل بھی نہیں بتایا تھا اور بتانے سے کچھ حاصل نہ تھا۔ کیوں کہ خواب بہرحال ایک خواب ہی ہوتا ہے۔ ہر کوئی خوابوں پر اس لیے بھی یقین نہیں کرتا ہے کہ طرح طرح کے خوابوں کا سوچ اور ذہن میں خیالوں کی یلغار سے تعلق ہوتا ہے کچھ لوگ خوابوں کو بڑی سنجیدگی سے بھی لیتے ہیں۔ رخسانہ کو بتاتا تو شاید میرے خواب کا یقین نہیں کرتی۔ ابا مرحوم کہا کرتے تھے کہ خواب ہر کس و ناکس کو سنایا نہ جائے۔ بہرحال میں دیر تک پاگلوں کی طرح کھڑا رہا اور ادھر ادھر کے مناظر دیکھتا رہا۔

جب شام کے سائے تاریکی کی آغوش میں چلے گئے۔ تب ہم باتھری کی حدود میں داخل ہوئے۔ رامو اور گھوڑوں کو رخسانہ نے اپنے مویشی خانے میں جگہ دے دی۔ یہاں چوں کہ کوئی سرائے نہ تھی اس لیے میں اور چاند مسجد میں جا کر سوئے۔ عشاء کی نماز ہوئے بہت دیر ہو چکی تھی۔ مسجد میں کوئی نہ تھا۔ فجر کی نماز کے بعد مسجد کے مولوی صاحب سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ مجھے اور چاند کو دیکھ کر حیران ہوئے اور چونکے بھی تھے۔ کیوں کہ یہاں مسافر بہت کم بلکہ آتے ہی نہ تھے اور سیاحوں کو اس مقام کے بارے میں کچھ معلوم بھی نہ تھا۔ اور پھر کسی کو کیا ضرورت پڑی کہ اتنا لمبا دشوار گزار اور خطرناک راستہ طے کر کے آتے۔ جب میں نے انہیں یہاں آنے کی وجہ اپنا پیشہ بتایا تو وہ بہت خوش ہوئے اور انہوں نے اگلے دن سردار سے ملانے کا وعدہ کیا۔

ان مولوی صاحب کا نام عبدالجبار تھا۔ گاؤں میں نہ صرف ان کی بہت عزت تھی بلکہ بڑا احترام بھی کیا جاتا تھا۔ ان کی اپنی ایک حیثیت بھی تھی۔ ان کا رتبہ سردار کے بعد دوسرے درجہ پر سمجھا جاتا تھا۔ وہ بااخلاق ملنسار اور مہمان نواز بھی تھے۔ وہ ہمیں اپنے گھر لے گئے۔ بہت تواضع سے پیش آئے جس کی ہمیں توقع نہ تھی۔ ان کے اخلاق اور خلوص نے ہمیں جیسے بن مول خرید لیا اور گرویدہ کر دیا تھا۔

تین دن تک ہم مولوی صاحب کے ہاں مہمان رہے۔ میں نے ان تین دنوں میں دو ایک مریضوں کو مولوی صاحب کے کہنے پر دیکھا۔ وہ ایک ہی دن میں صحت یاب ہو گئے۔ میں ہمیشہ سفر میں کچھ ضروری دوائیں رکھتا تھا کہ جانے کب اور کس وقت ان کی ضرورت پڑ جائے۔ چوتھے دن جمعہ تھا۔ جمعہ کی نماز کے بعد انہوں نے سردار سے میرا تعارف کرایا۔ سردار جس کی عمر دراصل پچپن اور ساٹھ برس کے درمیان تھی مگر دیکھنے میں وہ چالیس برس کی عمر کا ایک مضبوط اور طاقت ور آدمی معلوم ہوتا تھا۔ دراز قد تھا۔ اس کی کاٹھی جوانوں کی طرح تھی۔ اس کا رنگ سفید تھا مگر نقش و نگار بھدے تھے بشرے سے [illegible] ٹپکتی تھی اور اس کی آنکھوں سے کینہ پن جھانک رہا تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں اس نے اپنا اچھا تاثر نہیں چھوڑا۔ میرے دل کے کسی کونے میں نفرت سانپ کی طرح کنڈلی مار کے بیٹھ گئی۔ میں نے دل میں کہا کاش! میں اس سے نہ ملتا تو بہتر ہی تھا۔

وہ میرے باتھری آنے کے متعلق بہت دیر تک باتیں کرتا رہا۔ سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ میں نے اس کے ہر سوال کا جواب بڑے سکون اور اطمینان سے دیا۔ پھر میں نے دواؤں کا ایک بکس اسے بطور تحفہ دیا اور بتایا کہ اس میں کس قسم کی مختلف دوائیں ہیں۔ وہ میرے اس نذرانے سے خوش ہی نہیں بلکہ [illegible] پھر اس نے مجھے شاہی مہمان قرار دے کر شاہی مہمان خانے میں رہنے کا بندوبست کر دیا۔

شاہی مہمان خانہ وہی دم دمہ نما عمارت تھی جو کھڈ کے عین اوپر بنی ہوئی تھی۔ خوبصورت پل اس مہمان خانے کے دروازے پر جا کر ختم ہوتا تھا۔ بڑے دروازے کے اندر ایک کھلا صحن تھا۔ جس کے چاروں پہلوؤں پر لمبے لمبے برآمدے تھے اور ان کے پیچھے کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ یہ کوٹھریاں تعداد میں [illegible] تھیں یعنی بارہ ایک پہلو پر اور بارہ دوسرے پہلو پر اور دونوں پہلوؤں پر چھ چھ کوٹھریوں کے

درمیان ایک بہت بڑا کمرا تھا۔ یہ دونوں کمرے مقفل تھے۔ مہمان خانے کے اختتام پر پھر ایک بڑا دروازہ تھا۔ اس کے آگے ایک بہت وسیع احاطہ جس کے چاروں طرف بڑی بڑی کوٹھریاں تھیں۔ یہ شاہی اصطبل تھا۔ اس احاطے میں زون کے درخت لگے ہوئے تھے۔ جو فی الحقیقت صرف رات کو روشنی دیتے تھے لیکن اندھیرا ہوتے ہی چراغوں کی طرح جل اٹھتے تھے۔ اس مہمان خانے کی ایک کوٹھری میں ہم رہنے لگے۔ جو نہایت آراستہ تھی اور ضرورت کی ہر چیز اس میں موجود تھی۔ یہ کوٹھری کشادہ، روشن اور ہوادار تھی۔ میں اکثر مولوی عبدالجبار صاحب سے ملنے جایا کرتا تھا۔ کیونکہ وہ ایک شناسا بن گئے تھے اور کوئی دوسرا نہیں تھا کہ اپنا وقت اس کی معیت میں گزاردوں۔ بہت ہی پیارے آدمی تھے۔ ایک روز میں نے دوران گفتگو ان سے کہا۔

''میں نے بھوتوں کے بارے میں سنا ہے کیا یہ روایت صحیح ہے یا قصہ کہانیاں ہیں......؟ کیا آپ اس پر کچھ روشنی ڈال سکتے ہیں؟''

''بھوتوں کے متعلق جتنی روایات مشہور ہیں اور آپ نے بھی سنی ہیں وہ بالکل سچی ہیں۔'' وہ بولے۔ ''ان بھوتوں کی وجہ سے سردار اپنا آبائی گاؤں چھوڑ کر یہاں آباد ہوا ہے اور یہاں آباد ہونے کے بعد وہ ایک بار بھی اپنے گاؤں نہیں گیا۔''

''میں آپ کی بات کو سچ مانے لیتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''یہ سنی سنائی باتیں ہیں یا آپ نے بھی بھوتوں کو دیکھا ہے؟''

''یہاں جو قبرستان ہے اس میں رات کے وقت بھوت پھرتے رہتے ہیں۔'' مولوی عبدالجبار نے جواب دیا۔ ''چنانچہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے ایک بھوت کو دیکھا تھا۔ میں نے اس بھوت کو پہچان لیا تھا۔ یہ رحمت خان کے مقتول حامیوں میں سے ایک کا بھوت تھا۔ سردار پر ان مقتولوں کی ایسی لعنت اور پھٹکار اور نحوست پڑی ہے کہ وہ اب تک بے اولاد ہے۔'' مولوی عبدالجبار بتانے لگے۔ ''اس کی عورتیں چونکہ دوسرے ملکوں کی ہوتی ہیں جن کو بردہ فروش سردار کے پاس فروخت کر جاتے ہیں اس لیے وہ کچھ عرصے بعد محل سے بھاگ جاتی ہیں۔ سردار ہاتھ ملتا رہ جاتا ہے۔ وہ جو بھی عورتیں بردہ فروشوں سے خریدتا ہے بہت حسین اور نوجوان ہوتی ہیں۔ سینکڑوں میں ایک ہوتی ہیں۔''

''کیا سردار نے ان کی روک تھام کے لیے کوئی انتظام نہیں کیا اور کر نہیں سکتا؟'' میں نے دریافت کیا۔

''کیوں نہیں کیا......؟ اس نے کیا کیا تدبیریں نہیں کیں لیکن جو بھی آئی ہرجائی نکلی......اسے یوں بھی زیادہ فکر اس لیے نہیں کہ بردہ فروش نئی نئی لڑکیاں لاتے ہیں......حالانکہ وہ انہیں شہزادیوں کی طرح رکھتا ہے لیکن وہ پھر بھی فرار ہو جاتی ہیں۔''

میں نے سوچا ان کے گاؤں کی ہر بات انوکھی ہے۔

شام کا پژمردہ وقت تھا......ہوا میں افسردگی سی محسوس ہو رہی تھی جو خزاں کی آمد کا پتا دے رہی تھی۔ پت جھڑ سے درخت بے رونق اور مردہ ہو رہے تھے۔ پہاڑوں کی اودی اودی چوٹیاں سر پر غرور کو

بعد شان وشوکت اٹھائے تماشائے لیل ونہار میں مصروف تھیں۔ سرمئی آسمان پر دور دراز تک سفید بگلوں کی قطاریں......گھونسلوں میں پرندوں کی سوکھی پھڑپھڑاہٹ......جنگلی گدھوں کی منحوس اور بھونڈی آواز ایک ہیجانی کیفیت پیدا کر رہی تھی......خوں خوار ندی کا پانی سیاہ ناگن کی طرح اپنی زبان خارشگاف سے پتھروں کو چھیدتا تیزی سے رواں تھا۔ اردگرد کی فضا نہایت اداس تھی۔ جس نے دل میں نہ جانے کیسی اداسی سی بھر دی تھی یہ ماحول کا اثر تھا شاید۔

میں مولوی عبدالجبار سے ملاقات کر کے واپس آتے ہوئے موسم کے انقلاب سے بہت متاثر ہوا اور بددلی سے قدم اٹھاتا ہوا مہمان خانے کی طرف واپس جا رہا تھا۔ میں نے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ سردار سے رخصت حاصل کر کے واپس چلا جاؤں کیونکہ جاڑا بہت قریب آ گیا تھا۔ جاڑے میں واپسی بہت ہی مشکل بلکہ ناممکن سی تھی۔ برف باری سے راستے بند ہو جاتے ہیں اور شدید ترین سردی میں سفر نہیں کیا جا سکتا۔ جوں ہی میں نے پل پر قدم رکھا ایک دم سے ٹھٹک کے رک گیا اور میرے جسم پر ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ کیونکہ میری نظر ایک لڑکی پر پڑی تھی جو پل کے آخری سرے پر بڑے وقارانہ تمکنت سے کھڑی تھی۔ میں جلدی جلدی پل عبور کر کے قریب پہنچا تو میرا دل دھڑکنے لگا۔ کیونکہ یہ لڑکی بالکل نسرین کی شکل تھی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ خوب صورت آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے جو آب دار موتی معلوم ہو رہے تھے۔ یکایک بڑے دروازے سے دو آدمی نکلے۔ ایک آدمی جو بہ نسبت اپنے ساتھی کے خوش پوش تھا لڑکی سے کہنے لگا۔

''شاہ جہاں! تم یہاں کھڑی ہو اور ہم تمہیں مہمان خانے میں تلاش کر رہے تھے......اندر چلو......سردی ہو رہی ہے......یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں ہے......کہیں ایسا نہ ہو کہ ٹھنڈ لگ جائے۔ ٹھنڈ بڑی خراب چیز ہے۔ کیا تم نے سنا نہیں شاہ جہاں!......''

میں شاہ جہاں کے نام پر دوبارہ بری طرح چونکا۔ اپنے خواب کو الہام تصور کرنے لگا۔ وہ خواب کیسے بھول سکتا تھا۔ اسے دیکھے بہت دن بھی تو نہیں ہوئے تھے۔ لڑکی چپ چاپ متوحش نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتی ہوئی اندر چلی گئی میں کچھ کہہ سکا اور نہ ہی روک سکا۔ میں دیر تک دریائے حیرت میں ڈوبا ہوا وہیں کھڑا رہا۔ میں ایک بت کی طرح سا ہو گیا۔ جب میں اندر گیا تو مہمان خانے میں بڑی رونق، گہما گہمی اور چہل پہل تھی۔ مجھے چاند دکھائی دیا تو میں نے اس سے پوچھا۔ ''یہ اچانک یہ سب کچھ کیا ہے؟''

''ایک کشمیری سوداگر سردار کے پاس لڑکیاں فروخت کرنے آیا ہوا ہے۔ اس لیے چہل پہل ہو رہی ہے۔''

دوسرے دن رخسانہ کی زبانی معلوم ہوا کہ لڑکیوں کا سوداگر جو سات لڑکیاں لے کر آیا تھا ان میں ان لڑکیاں تو سردار نے خرید لیں جن میں سے ایک شاہ جہاں بھی ہے۔ باقی ماندہ لڑکیاں گاؤں کے لوگوں نے خرید لی ہیں۔ تیسرے دن وہ سوداگر چلا گیا اور تمام کوٹھریاں خالی ہو گئیں۔

گو کہ میرا دل بہت اداس تھا اور مجھ پر ایک گہری یاسیت سی طاری ہو گئی تھی اور دل اب یہاں ایک دن

بھی ٹھہرنے کو نہیں چاہ رہا تھا مگر میں نے واپسی کا ارادہ ترک کر دیا کیونکہ اس الہامی خواب کے زیر اثر مجھے یقین ہو چکا تھا کہ شاہ جہاں کو ایک نہ ایک دن میری مدد کی ضرورت ہوگی۔ کچھ دن بعد سخت سردی پڑنے لگی اور برف باری بھی شروع ہو گئی تھی۔ ہر طرف برف کے انبار دکھائی دینے لگے۔ برف کا ایک منجمد دریا تھا جو نظروں کو بڑا بھلا دکھائی دیتا تھا۔ ندی کا پانی یخ بستہ ہو کر رہ گیا تھا کہ اس کی سطح پر چہل قدمی کر سکتے تھے۔ میں اور چاند جو اتنی شدید سردی کے عادی نہ تھے رات دن اونی کمبلوں اور لحافوں میں دبکے پڑے رہتے۔ قہوہ، چائے اور کافی پیتے رہتے اور جہاں بھر کی باتوں سے وقت گزاری کرتے۔ ایسا موسم تھا کہ ہم ایک میل کی مسافت بھی طے نہیں کر سکتے تھے۔ برف باری سے راستے بند ہو چکے تھے اور ہم جیسے قیدی بن گئے تھے۔

خدا خدا کر کے سردی کا موسم گیا۔ برف باری پہلے ہی بند ہو چکی تھی اور برف پگھل بھی گئی تھی۔ موسم بہار کا آغاز ہوا۔ ہوا میں طراوٹ اور خوشگواری پیدا ہونے لگی۔ بلند و بالا پہاڑ جو آج سے چند دن پہلے بگلا بنے ہوئے تھے سفید نقاب اتار کر سیاہ دیوؤں کی صورت اختیار کرنے لگے۔ اب پہاڑوں کی برف آہستہ آہستہ پگھل رہی تھی۔ ندی نالوں کی گنگناہٹ اور پرندوں کے شیریں گیت کائنات میں نئی زندگی کا پیام دینے لگے۔

ایک دن صبح دروازے پر دستک سن کر چاند نے دروازہ کھولا۔ خیال یہ تھا کہ ملازم شاید ناشتا لایا ہو گا۔ اتنی جلدی...... ہم ناشتا دیر سے ہی کرتے تھے۔ دروازے پر رخسانہ کھڑی تھی۔ اسے اتنے سویرے دیکھ کر حیرانی ہوئی۔ وہ سہمی ہوئی سی اندر آئی تو وہ کانپ رہی تھی۔ اس کا چہرہ برف کی طرح سفید ہو چلا تھا اور لہو کی ایک بوند بھی معلوم نہ ہوتی تھی۔ اس کی آنکھوں سے خوف و دہشت جھانک رہی تھی۔

''رخسانہ!'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''اس وقت کیسے آنا ہوا اور تم اس قدر خوفزدہ اور ہراساں کیوں ہو رہی ہو؟''

''آج میں نے ایک گہری سازش کا پتا چلایا ہے۔'' وہ دروازہ بند کر کے سرگوشی میں بولی۔ ''میں اس کے بارے میں بتانے کے لیے آئی ہوں۔''

''سازش!'' میں چونکا۔ ''کیسی سازش......؟ کیا تمہارے خلاف تمہارے دشمن کوئی سازش کرنا چاہتے ہیں؟''

''سازش...... میرے خلاف نہیں بلکہ آپ لوگوں کے خلاف ہو رہی ہے۔'' رخسانہ نے جواب دیا۔ ''اس لیے میں خبردار کرنے آئی ہوں۔''

''میرے خلاف سازش؟'' میں ششدر سا رہ گیا۔ مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا؟ کس نے بتایا؟''

''جی ہاں آپ کے خلاف۔'' رخسانہ نے سر ہلایا۔ پھر وہ سرگوشی میں آہستگی سے کہنے لگی۔ ''سنیے...... آج رات کو جب میں اپنی کوٹھری میں بے خبر سو رہی تھی تو میری آنکھ کسی آہٹ سے کھل گئی۔ میں نے دیکھا کہ میرا شوہر باہر جا رہا ہے۔ میں بڑی حیران ہوئی اور چکرا سی گئی کہ اتنی رات کو وہ

کہاں اور کیوں باہر جا رہا ہے۔ حیران اس لیے بھی تھی کہ ہمارے گاؤں میں رات کے وقت کوئی آدمی گھر سے باہر نہیں نکلتا اور نہ ہی میں نے کبھی اپنے شوہر کو نکلتے دیکھا۔ میرے دل میں ایک زہریلے سانپ کے سے وسوسے اور اندیشے نے سر اٹھایا، کہیں وہ کسی عورت سے ملنے تو نہیں جا رہا ہے۔ ایک خیال اور دل میں آیا کہ بردہ فروشوں سے گاؤں والوں نے جو چار لڑکیاں خریدی ہیں شاید ان میں سے کسی ایک لڑکی کو میرے شوہر نے کسی مرد سے ساجھے میں یا اسے آڑ بنا کر خریدا ہو۔ اس کا رات کو چوروں کی طرح گھر سے باہر جانا میرے لیے غیر معمولی بات تھی اور میں اسے نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ گو کہ وہ اس قسم کا مرد نہ تھا۔ لیکن عورت ایک ایسی چیز ہے کہ مرد اسے پا کر پھسل بھی سکتا ہے۔

میں اس بات کو برداشت نہ کر سکی۔ گو کہ میرا شوہر مجھے مارتا پیٹتا اور مجھ پر تشدد کرتا تھا لیکن اس کے باوجود میں اسے کسی غیر عورت کے پہلو میں کیسے دیکھ سکتی۔ میں نے سوچا کہ میں ان دونوں کو بے نقاب بلکہ ذلیل و خوار کروں گی۔ یہ سب کچھ میں نے ایک پل میں سوچ لیا اور اس کے تعاقب میں دل کڑا کر کے غیر ...وس انداز میں چل پڑی۔ میں بہت محتاط تھی۔ ذرا سی بے احتیاطی اسے باخبر کر دیتی۔ اس لیے دبے پاؤں چل رہی تھی۔

وہ گاؤں میں کسی عورت کے گھر جانے کے بجائے سردار کے محل کی طرف بڑھا تو میرے دل کے کسی کونے میں خیال آیا کہ کہیں ان تینوں لڑکیوں میں سے ایک لڑکی جو سردار نے منتخب کی ہے۔ میرے شوہر کے لیے تو نہیں ہے۔ میرے شوہر کی سردار سے گہری دوستی ہے اور وہ اکثر سردار کے کام آتا رہتا ہے۔ اس نے پچھواڑے کے دروازے پر پہنچ کر ایک دروازہ جو چھوٹا سا تھا اس پر مخصوص انداز میں دستک دی۔ دروازہ فوراً ہی کھل گیا اور اسے دوسری دستک دینے کی نوبت نہیں آئی۔ ایسا لگا جیسے کوئی اس کے انتظار میں پہلے سے ہی دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔ میرے دل کے کسی کونے میں پھر شک کی لہر اٹھی کہ یہ دروازہ یقیناً اس لڑکی نے کھولا ہے جو میرے شوہر کو سردار نے دی ہوئی ہے۔ میرا شوہر اندر چلا گیا۔ جب دروازہ کھلا تھا اور روشنی باہر آئی تھی۔ تو میں نے دیکھا اندرزون درخت کی روشنی ہو رہی تھی۔ اس درخت کی شاخ اندر تھی۔ میں نے دروازہ بند کرنے والے کی ایک جھلک دیکھ لی۔ وہ سردار تھا۔

میں لپک کر دروازے پر پہنچی۔ دروازے میں تین سوراخ تھے۔ ان میں ایک سوراخ اتنا بڑا تھا کہ اندر کا منظر اس سوراخ سے دیکھا جا سکتا تھا۔ سردار نہایت مضمحل اور پریشان سا دکھائی دے رہا تھا اور اس کا چہرہ زرد سا ہو رہا تھا۔ آنکھیں لال ہو رہی تھیں۔

''حبیب خان! دونوں کا خاتمہ ہو جانا چاہیے۔'' سردار کہہ رہا تھا۔ ''اس روز نوکر رامو کو چھوڑ دیا چاہیے۔''

''سردار......'' حبیب خان نے کہا۔ ''صبر سردار! صبر...... ہمیں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے اور پھر ان دونوں کی ایک ہی وقت میں موت دلوں میں شبہات پیدا کر دے گی۔ ان دونوں کا خاتمہ کرنے میں کم از کم ایک مہینے کا وقفہ ضرور ہونا چاہیے۔''

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" سردار نے کہا۔ "پھر ایسا کرو کہ دو تین دن میں ان میں سے ایک کو تو جہنم رسید کر دو۔ یہ تو کر سکتے ہو کیوں؟"

"یہ بھی اتنی جلدی نہیں ہو سکتا سردار!" حبیب خان نے کہا۔ "اس کے لیے مزید کچھ اور دن صبر کرنا ہو گا۔"

"وہ کس لیے......؟" سردار نے بے چین ہو کر بے صبری سے کہا۔

"اصل بات یہ ہے کہ ندی میں پانی تھوڑا سا ہے۔ پہاڑوں کی جو برف پگھل رہی ہے اس کا پانی آنے اور زور پکڑنے پر دس پندرہ دن لگیں گے۔ ابھی لاش ندی میں پھینکنے سے پڑی سڑتی رہے گی۔"

"اچھا......" سردار کا منہ لٹک گیا۔ پھر اس نے مضطرب ہو کر کہا۔ "پندرہ بیس دن تو بہت ہوتے ہیں۔ کیا کیا جائے...... مجبوری ہے۔ صبر کے سوا چارہ بھی نہیں ہے۔ لیکن تم ندی کے پانی پر نظر رکھو اور تم اس کل کو درست کر کے رکھو جو ان کی موت کا باعث ہو گا۔"

"اچھا تو اب اجازت ہے۔" حبیب خان نے کہا۔ "آپ اب بے فکر ہو جائیں۔ ان دونوں کو ٹھکانے لگانا میرا کام ہے۔ میں ان سے نمٹ لوں گا۔"

"میں نے تمہارے اور اپنے لیے چائے بنا کر رکھی ہوئی ہے۔" سردار نے کہا۔ "وہ پی کر چلے جانا۔ یہ خاص چائے کی پتی کی ہے۔" پھر میں رکی نہیں۔ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی گھر واپس پہنچی۔ اس کے کچھ دیر بعد آہٹ سن کر جھوٹ موٹ خراٹے لینے لگی۔"

رخسانہ جھوٹ نہیں بول سکتی تھی۔ اسے ضرورت بھی کیا تھی اور پھر اس کی باتوں سے صداقت کی بو آ رہی تھی۔ لیکن دوسری طرف یہ بات میری سمجھ سے بالاتر تھی کہ ہمیں ٹھکانے لگانے میں سردار کا کیا فائدہ ہے۔ ہم نہ تو اس کے دشمن ہیں اور نہ ہی اس کے خلاف کسی کو بھڑکا رہے ہیں۔ میں اور چاند اپنا سارا وقت جڑی بوٹیوں کی تلاش اور اس کے تجربے میں گزارتے ہیں اور پھر میں نے سردار کے ذاتی معاملات میں کوئی دخل نہیں دیا۔ اس نے جو تین حسین لڑکیاں خریدی تھیں ان سے راہ و رسم نہیں بڑھائی اور نہ ہی انہیں دیکھنے کی کوئی کوشش کی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ رخسانہ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہو۔ بہرحال میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ہم محتاط رہیں گے۔

اس بات کو تقریباً ایک ہفتہ گزرا تھا۔ جمعہ کی نماز کے بعد سردار نے کہا۔ "مہمان خانے کی مرمت کروانی ہے۔ برسوں سے رنگ و روغن نہیں ہو سکا۔ وہ بھی کروانا ہے۔ آپ برا نہ مانیں...... پل کی دوسری طرف اس خوبصورت جھونپڑے میں چلے جائیں جو میں نے آپ کے لیے خاص طور پر بنوایا ہے اور اس میں ہر طرح کی سہولت ہے اور وہ آراستہ بھی ہے۔"

سردار کی اس بات سے رخسانہ کی باتوں کی تصدیق ہو گئی اور اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں رہا کہ سردار کی نیت اچھی نہیں ہے۔ شبہات اور بھی مضبوط ہو گئے۔ ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ مہمان خانہ خالی کر کے اس جھونپڑے میں منتقل ہو جائیں۔ ہماری مجبوری یہ تھی کہ برف ابھی تک پوری طرح

[illegible] ں تھی۔ راستے خطرناک تھے اور جا نہیں سکتے تھے۔ اگر یہ مجبوری نہ ہوتی تو پھر رخت سفر باندھ [illegible] ہم لوگ رخسانہ کی رائے کے مطابق دن بھر تو اس جھونپڑے میں رہتے لیکن رات کو ایک محفوظ جگہ [illegible] تے یہ جگہ ہمیں رخسانہ نے بتائی تھی۔ یہاں ہم ہر طرح محفوظ تھے۔ ہم دوسروں کو دیکھ سکتے تھے لیکن [illegible] لوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہ ایک جھونپڑی تھی جو گاؤں سے پرے ویران جنگل میں خوفناک درے کے [illegible] واقع تھی۔ درختوں سے اس طرح گھری ہوئی تھی کہ اس کا پتا نہیں چلتا تھا اور نہ باہر سے نظر آتی تھی۔ یہ [illegible] ی اس رشی کی تھی جس نے رخسانہ کو بشارت دی تھی کہ تیرا بیٹا ایک دن اس گاؤں کا سردار ہو گا۔

رشی اس دنیا میں موجود نہ تھا۔ اس کی موت کو کئی برس بیت چکے تھے لیکن جھونپڑی بہت اچھی حالت [illegible] اس لیے کہ رخسانہ نے اس کی موت کے بعد معمول بنا لیا تھا اور وہ ہر روز صبح کے وقت جھونپڑی کو [illegible] صاف کرتی جہاں رشی بیٹھا کرتا تھا۔ اس جگہ کو پھولوں سے سجاتی۔ پھر دروازہ مقفل کر کے واپس آ [illegible] ب کبھی اس کا شوہر مارتا پیٹتا تو وہ یہاں آ کر اس وقت تک پھوٹ پھوٹ کر روتی تھی جب تک [illegible] ہو جائے۔

اس طرح ہمیں چھ سات دن اور گزر گئے۔ ابھی تک راستہ سفر کے قابل نہ ہوا تھا۔ ایک دن صبح کے [illegible] ں نے یہ خبر سنی کہ ان لڑکیوں میں سے جو بردہ فروش لائے تھے ایک لڑکی زرتاج خان سردار کے محل [illegible] ھاگ گئی۔ حالانکہ سردار نے بڑا زبردست پہرا لگا رکھا تھا اور چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی تھی لیکن اس [illegible] اس کی تدابیر ناکام ہو گئی تھیں اور یہ لڑکی کسی نہ کسی طرح فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی اور اس نے [illegible] ح سردار کا منہ چڑا دیا تھا اس کا غصے سے برا حال تھا۔ سردار نے اس کی تلاش میں مختلف راستوں پر [illegible] ائے پھر بھی اس لڑکی کا پتا نہ چل سکا۔ اس خوفناک جنگل کی بھی خاک چھان لی گئی۔ حیرت کی [illegible] ھی کہ ایک نوجوان لڑکی پیدل خطرناک راستوں پر اس قدر تیزی سے چل کر کہاں چلی گئی۔ رخسانہ کا [illegible] تھا کہ وہ شاید کسی جگہ روپوش ہو گئی ہو گی۔ اس کی تلاش دوسرے دن بھی زور شور سے جاری رہی۔ اس [illegible] ہر کے وقت یاتری سے دو کوس پرے ندی کے بہاؤ پر پانی میں سے کسی شخص کو ایک حاملہ عورت کی [illegible] س کی کھال پتھروں کی رگڑ سے ادھڑ چکی تھی۔ جب اس لاش کو شناخت کیا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ [illegible] لی لاش ہے۔ اس کی موت پر آنسو بہانے والا بھی کوئی نہ تھا۔

اس لڑکی کی دردناک موت پر دفعتاً میرے دماغ میں ایک خیال کوندا بن کر لپکا۔ مجھے یقین ہو گیا [illegible] ازش جو سردار اور حبیب خان کر رہے تھے وہ ناحق ہم سے منسوب کر دی گئی۔ وہ ان مظلوم عورتوں [illegible] تیار کی گئی تھی کیونکہ حبیب خان کی گفتگو سے ظاہر تھا کہ وہ کس کو ندی میں پھینک کر ہلاک کرنا [illegible] اں۔ میں نے رخسانہ پر اپنے ان خیالات کا اظہار کیا تو وہ کہنے لگی۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے...... کیونکہ سردار کی تمام زندگی میں یہی دو عورتیں بار آور ہوئی تھیں۔ یعنی ایک [illegible] اور دوسری شاہ جہاں...... سردار کی تمام امیدیں انہی سے وابستہ تھیں ایسی صورت میں زرتاج کو [illegible] کے منہ میں دھکیلا جا سکتا تھا۔"

رخسانہ کے منہ سے شاہ جہاں کے حاملہ ہونے کا سن کر میں چونک اٹھا اور میری رگوں میں لہو ابلنے لگا۔ میں نے ہذیانی لہجے میں کہا۔ ''رخسانہ! تم ٹھیک کہتی ہو۔ اب دوسری موت واقع ہو گی...... تم میری یہ بات گرہ میں باندھ لو۔''

''لیکن اس کی وجہ......؟'' رخسانہ کے چہرے پر ایک گہرا استعجاب چھا گیا۔ اس نے پلکیں جھپکائیں۔

''وجہ یہی ہے کہ وہ حاملہ ہے......'' میں نے جواب دیا۔ ''وہ ظالم ہمیشہ اپنی ان مظلوم عورتوں کو جو حاملہ ہوتی ہیں ہلاک کر کے مشہور کر دیتا ہے کہ وہ بھاگ گئی ہیں حالانکہ ان راستوں سے ایک اکیلی عورت کا فرار کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟''

''اس سے پہلے جو عورتیں فرار ہو گئی تھیں وہ حاملہ نہ تھیں۔'' رخسانہ نے کہا۔ ''اور پھر ہر ایسی عورت جو حاملہ ہو گئی ہو وہ کیوں اور کس لیے فرار ہو گی؟''

''وہ کس لیے فرار نہیں ہو سکتی......؟'' میں نے پوچھا۔

''اس لیے کہ ایسی صورت میں وہ کہاں جا سکتی ہے؟'' رخسانہ نے جواب دیا۔ ''ایسی عورت کو کون پناہ دے گا؟ ایسی عورت بڑی گنہگار سمجھی جائے گی۔''

''یہ بات تو ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن تم نے دوسرے پہلو پر غور نہیں کیا...... کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ انہیں ابتدائی ایام میں ہلاک کروا دیتا ہو؟ اب چونکہ یہ حالات موسم سرما میں رونما ہوئے ہیں۔ جبکہ ندی کا پانی منجمد تھا اس لیے اس کام کو جلدی انجام نہ دیا جا سکا اور حمل ظاہر ہو گیا۔''

میرے سمجھانے سے رخسانہ قائل ہو گئی۔ اس نے میرے خیالات کی تائید کی۔ پھر کہا۔ ''کیا آپ شاہ جہاں کو بچانا چاہتے ہیں؟''

''ہاں۔'' میں نے سر ہلایا۔ ''اس غریب کو ہر صورت میں وہاں سے نکالنا ہے۔ ورنہ یہ ظالم سردار اسے بھی موت کی بھینٹ چڑھا دے گا۔''

''آپ بے فکر رہیں۔'' رخسانہ نے مجھے جیسے دلاسا دیا۔ ''میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ شاہ جہاں کو بچانے کی کوئی نہ کوئی تدبیر ضرور کروں گی۔ میرا خیال ہے کہ ہم اسے سردار کے چنگل سے جلد ہی نکال لیں گے۔ یہ کام کچھ مشکل تو ہے لیکن ناممکن نہیں۔ آپ اللہ اور مجھ پر بھی بھروسا کر سکتے ہیں۔''

وہ آج کل اپنے شوہر سے کسی بات پر روٹھ کر آئی تھی اور ہمارے ساتھ ہی اس جھونپڑی میں رہ رہی تھی اور رات گئے تک باتیں کرتی رہتی تھی۔ سردار اور اس کے شوہر کو اس بات کا علم نہ تھا کہ وہ یہاں رہ رہی ہے۔ اس نے ٹھیک ہی کیا تھا کہ اپنے شوہر کو اپنی روپوشی کے بارے میں بتایا نہیں تھا اور اس کے شوہر کے علم میں یہ جھونپڑا نہیں تھا۔ اگر اسے معلوم ہو جاتا تو شاید کوئی طوفان کھڑا کر دیتا۔

دوسرے دن صبح سویرے وہ بیدار ہو کر چلی گئی اور ہم حسب معمول اس جھونپڑے میں آئے جو سردار نے رہائش کے لیے ہمیں دیا ہوا تھا۔ چاند نے ناشتا تیار کیا۔ رخسانہ دوپہر اور رات کے کھانے میں

شریک ہوتی تھی۔ اس کا ناشتا برائے نام ہی ہوتا تھا۔ وہ دن بھر گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب تھی۔ رات کے کھانے پر بھی اس کا بڑا انتظار کیا تھا۔ میں یہی سمجھ سکا کہ شاید اس کے شوہر نے اسے منا لیا ہو گا۔ اس لیے وہ نہیں آئی۔ ہم نے رات کا کھانا کھایا پھر اس جھونپڑے سے نکل کر سونے کے لیے اس جھونپڑی میں پہنچے اور سونے کی تیاری کر رہے تھے کہ وہ واپس آ گئی۔ ہم تو اس کی آمد سے ناامید ہو گئے تھے۔ اس کے ہونٹوں پر فاتحانہ تبسم کھیل رہا تھا۔ چہرہ دمک رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی بھری ہوئی تھی۔ میں اسے خوش دیکھ کر خوش ہو گیا۔ اس بات سے دل کو تسلی ہوئی کہ اس پر کوئی افتاد نازل نہیں ہوئی اس لیے وہ خوش نظر آ رہی تھی۔

''رخسانہ! تم سارا دن کہاں غائب رہیں......؟'' میں نے دریافت کیا۔ ''تمہارے نہ آنے سے ہم سخت پریشان ہو گئے تھے۔''

رخسانہ نے میری بات سن کر کوئی جواب نہ دیا پھر اس نے لمبے لمبے کرتے کی آستین سے کسی پودے کے بیج نکال کر میرے سامنے رکھ دیئے۔ ''یہ کیا چیز ہے......؟'' میں نے اسے اور بیجوں کو حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ بیج کس لیے لائی ہو؟''

''یہ زہر ہے......'' اس نے سرشاری کے لہجے میں جواب دیا۔ ''بڑے کام کی چیز ہے۔''

''زہر......؟ یہ تم کس لیے لائی ہو......؟'' میں بھونچکا سا ہو گیا۔ ''کیا سردار کو زہر دینے کے لیے......؟''

''یہ ایک خاص قسم کا زہر ہے جو میں شاہ جہاں کو دینے کے لیے لائی ہوں۔'' وہ معنی خیز انداز سے مسکرائی۔

''کیا......؟'' میں اچھل پڑا۔ ''کل تک اسے بچانے کے بارے میں سوچا جا رہا تھا اور آج تم اسے ہلاک کرنے کے بارے میں سوچ رہی ہو......؟ رخسانہ! یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے...... ہوش کے ناخن لو۔ کہیں تم پر کسی بھوت کا سایہ تو نہیں ہو گیا ہے؟ تم اس کی دشمن ہو گئی ہو۔''

''میں اس زہر کی خصوصیت آپ کو بتاتی ہوں۔'' رخسانہ کہنے لگی۔ ''میں شاہ جہاں کو ہلاک کرنے کے لیے نہیں بلکہ اسے بچانے کے لیے سوچ رہی ہوں۔ یہ زہر ہی اسے بچائے گا اور ایک نئی زندگی دے گا۔ میں اس کی دشمن نہیں ہوں۔''

''زہر سے موت واقع ہوتی ہے۔'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔ میں سمجھ گیا کہ اس کا دماغ چل گیا ہے اس لیے وہ بہکی بہکی باتیں کر رہی ہے۔ یقیناً اس پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔ میں نے سر پیٹ لیا کہ کیا سوچا تھا، کیا ہو گیا۔ اب کیا کیا جائے۔ ''ہمیں ہلاک تھوڑی کرنا ہے شاہ جہاں کو۔''

''تو پھر......!'' میں نے چونک کر کہا۔

''یہ زہر ایسا ہے جو شاہ جہاں کو زندگی دے گا۔ ایک انوکھا زہر...... آپ بہت بڑے حکیم ہیں...... معالج ہیں لیکن ایسے اور اس زہر کے بارے میں آپ اور شہر کے لوگ بھی نہیں جانتے ہیں۔ اس گاؤں میں بڑی انوکھی باتیں اور چیزیں پائی جاتی ہیں۔ اس زہر کے کھانے سے آدمی بظاہر مر تو جاتا

ہے۔لیکن صرف تین دن کے لیے......اسے آپ بے ہوشی نہیں کہہ سکتے ہیں۔آدمی جب کسی بھی وجہ سے بے ہوش ہو جاتا ہے تو اس کا قلب اپنی حرکت نہیں روکتا ہے لیکن اس زہر سے اس کے قلب کی حرکت اتنی ہلکی ہو جاتی ہے کہ ایک معالج یہی سمجھتا ہے کہ وہ بند ہو گئی ہے۔درحقیقت ایسا نہیں ہوتا ہے۔پورے تین دن کے بعد دل کی دھڑکن میں تیزی آجاتی ہے۔اس کی نبض بھی چلنے لگتی ہے اور دل کی دھڑکنیں معمول پر آجاتی ہیں۔کیا آپ نے اس زہر کے بارے میں سنا ہے؟"

"یہ بڑا عجیب وغریب اور واقعی انوکھا زہر ہے۔" میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔"لیکن کیا سردار شاہ جہاں کی موت سے یہ نہیں سمجھ جائے گا کہ شاہ جہاں نے شاید یہ زہر دھوکا دینے کے لیے کھایا ہے؟ وہ اس زہر کے بارے میں جانتا ہوگا۔"

"نہیں......" رخسانہ نے سر ہلایا۔"اس زہر کا اس کے فرشتوں کو بھی نہیں معلوم کہ ایسا زہر بھی پایا جاتا ہے۔"

"پر تمہیں اس زہر کے بارے میں کس نے بتایا؟" میں نے متعجب لہجے میں دریافت کیا۔

"رشی نے......" رخسانہ نے جواب دیا۔"رشی بہت ساری جڑی بوٹیوں کے بارے میں جانتے تھے۔"

"جاننا اور بات ہے اور اس کا تجربہ کر کے دیکھنا اور بات ہے۔" میں نے کہا۔"کیا کبھی اس کا کسی پر تجربہ کیا گیا؟"

"ہاں......" رخسانہ کہنے لگی۔"ایک نوجوان لڑکی شگوفہ پر......یہ ان دنوں کی بات ہے جب رشی حیات تھے۔باتھری میں ایک لڑکی شگوفہ رہتی تھی۔وہ بہت حسین وجمیل اور بلا کی پرکشش لڑکی تھی۔اتنی حسین لڑکی باتھری میں پیدا ہوئی اور نہ ہوگی۔وہ صرف حسین ہی نہیں بلکہ بڑی سیدھی سادی، بھولی بھالی اور بہت ہی معصوم تھی۔جیسے اللہ میاں کی گائے وہ اور نذیر ایک دوسرے سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔نذیر بہت خوبصورت نہیں تھا بلکہ وجیہہ تھا۔لیکن وہ بڑا نیک اور اچھا شخص تھا۔ان کی شادی ہوگئی۔ان کا نکاح مولوی عبدالجبار نے پڑھایا تھا۔ان کی شادی کے دوسرے دن سردار کا ایک رشتہ دار آیا۔جب اس نے شگوفہ کو دیکھا تو وہ اس پر ریشہ خطمی ہو گیا۔پہلے تو اس نے نذیر سے کہا کہ وہ شگوفہ کو طلاق دے دے۔نذیر نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے بے انتہا محبت کرتے ہیں۔ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ان کی شادی کو دوسرا دن ہے یہ ہونا ناممکن سی بات ہے۔وہ مر جائے گا لیکن اسے طلاق نہیں دے گا......نذیر کے انکار پر اس نے ایک شخص سے مل کر منصوبہ بنایا......وہ یہ کہ رات کے وقت شگوفہ کو اغوا کر کے ایک درے میں پہنچا دیا جائے گا۔وہ علی الصبح شگوفہ کو لے کر یہاں سے چلا جائے گا۔نذیر کو رات کے وقت قتل کر دیا جائے گا۔اس سردار کے بھتیجے کا نام رازق خان تھا اور اس شخص کا نام جس کی خدمات حاصل کی گئی تھیں، قاسم تھا۔قاسم کی بیوی صنوبر نے اس منصوبے کو سن لیا تھا۔وہ شگوفہ کو اپنی بہن سے بڑھ کر چاہتی تھی۔اس نے آکر مجھے اس سازش کے بارے میں بتایا تھا۔اس نے مجھ سے کہا کہ

[illegible] لیے کچھ کرو۔اس کمینے سے انہیں بچاؤ۔شگوفہ اور نذیر گاؤں سے ہٹ کر ایک مکان میں تنہا رہ [illegible] تھے۔اس مکان میں ان کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔وہ شادی کی خوشیاں منا رہے تھے۔میرا بس چلتا تو [illegible] رازق خان کو قتل کر دیتی لیکن اسے قتل کرنا میرے بس کی بات کہاں تھی۔

مجھے رشی کا خیال آیا تو میں دوڑی دوڑی ان کے پاس پہنچی۔انہیں اس سازش سے آگاہ کیا اور ان [illegible] التجا کی کہ اس جوڑے کو کسی طرح اس ذلیل اور کمینے سے بچالیں۔رشی نے یہ بیج دے کر مجھے سمجھایا کہ [illegible] کیا کرنا ہے۔پھر میں شگوفہ کے مکان پر پہنچی اور انہیں اس سازش سے آگاہ کیا، شگوفہ رونے لگی۔پھر میں [illegible] انہیں سمجھایا اور بتایا کہ کیا کرنا ہے۔پھر ان دونوں کو وہ بیج دودھ کے ساتھ کھلا دیئے۔جب رازق خان [illegible] ساتھ وہاں پہنچا تو کمرا زون کی شاخوں سے منور ہو رہا تھا۔قاسم نے ان کی نبض دیکھی اور رازق [illegible] کہا کہ......انہیں کسی طرح اس سازش کا علم ہو گیا ہے اور ان دونوں نے خودکشی کر لی ہے۔رازق [illegible] اور قاسم اس رات وہاں سے واپس آگئے۔دوسرے دن وہ دونوں جموں جا رہے تھے کہ راستے میں [illegible] کھائی میں گر کر مر گئے۔اس بیج کے بارے میں میں نے قاسم کی بیوی کو بھی نہیں بتایا۔میں نے اس [illegible] کہا [illegible] بڑے پیر کی منت مانو۔وہ جوڑا سلامت رہے گا۔رشی نے مجھے منع کیا ہوا تھا کہ میں اس بیج کے [illegible] کسی کو بھی نہ بتاؤں۔شاہ جہاں کی زندگی کے لیے آپ کو بتا رہی ہوں۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔واقعی ایک طرح سے یہ بڑے کمال کی چیز ہے۔" میں نے کہا۔"لیکن سوال یہ [illegible] اس سے کیوں کر فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔"

"جب یہ بیج کھا لے گی تو بظاہر موت سے ہم کنار ہو جائے گی۔" وہ کہنے لگی۔"بعد میں اسے [illegible] آنے سے پہلے قبر سے نکال کر راتوں رات فرار ہو سکتے ہیں۔کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی کہ شاہ [illegible] ہے اور فرار ہوگئی ہے۔چونکہ اس کا اثر تین دن رہتا ہے۔اب آپ ایک حکیم ہونے کے ناتے [illegible] نکالنے کے بعد ہوش میں لے آئیں یا اسے گھوڑے پر لاد کر لے جائیں۔"

"تمہاری تدبیر تو بہت شاندار ہے۔" میں نے کہا۔"شاہ جہاں کو ہوش میں لانا اور لے جانا مسئلہ [illegible] ایک مسئلہ ہے۔"

"وہ مسئلہ کیا ہے......!" رخسانہ نے کہا۔"میرے خیال میں ایسا کوئی مسئلہ تو مجھے نظر نہیں آتا ہے؟"

"مسئلہ یہ کہ اس زہر کا اثر اس پر یا اس کے بچے پر نہ پڑے۔" میں نے کہا۔"ابتدائی دنوں کا حمل [illegible] ہے۔"

"بالکل بے ضرر قسم کا زہر ہے۔" رخسانہ نے مجھے یقین دلایا۔"اگر اسے کوئی نقصان پہنچا تو اس [illegible] ہوں۔"

[illegible] دن علی الصبح بیدار ہوتے ہی سب سے پہلے ان بیجوں کو پیس کر سفوف بنایا گیا۔رخسانہ نے [illegible] ایک کپڑے میں باندھ کر گریبان میں اس طرح ٹھونس لیا کہ وہ کسی کو نظر نہیں آسکتا تھا اور نہ [illegible] تھا۔

ناشتے سے فراغت پانے کے بعد میں نے اس سے کہا۔ ’’اب یہ بتاؤ کہ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا؟‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘ اس نے چائے کا گھونٹ لے کر مجھے ساکت پلکوں سے دیکھا۔ ’’میں آپ کی بات نہیں سمجھی؟‘‘

’’مطلب یہ ہے کہ تم یہ زہر شاہ جہاں کو کس طرح دو گی......؟‘‘ میں نے جواب دیا۔ ’’تم اسے اعتماد میں لو گی تو وہ شاید اس کے لیے تیار نہ ہو گی۔ کیونکہ زہر کا نام سنتے ہی اس کے اوسان خطا ہو جائیں گے۔ اسے اس بات کی بالکل ہوا نہ لگے کہ اسے زہر دیا جا رہا ہے۔‘‘

’’سردار کے ہاں میری ایک رشتہ دار بہن ہے جو گھر کے کام کاج کرتی ہے اور کھانا بھی پکاتی ہے۔‘‘ رخسانہ بولی۔ ’’میں اسے اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کروں گی کیونکہ اسے شاہ جہاں بلکہ ہر اس لڑکی سے ہمدردی ہوتی ہے جسے سردار بردہ فروشوں سے خریدتا ہے۔‘‘

’’کیا ایسا ممکن نہیں کہ شاہ جہاں کو یہ زہر دینے کے بجائے سردار کو دے دیا جائے۔‘‘ چاند نے تجویز پیش کی۔

’’اس سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔‘‘ رخسانہ نے کہا۔ ’’اس لیے کہ سردار کی موت کے بعد وہاں پہرہ داروں کا جو سردار ہے وہ شاہ جہاں کو یرغمال بنا لے گا...... وہ کوئی اچھا آدمی نہیں ہے، وہ گاؤں کی دو ایک لڑکیوں کی عزت سے کھیل چکا ہے۔ شاہ جہاں کو زہر دینا ہی مناسب ہو گا۔‘‘

رخسانہ وہ سفوف لے کر سردار کے محل نما مکان کی طرف چلی گئی۔ ہم اس کی کامیابی کے لیے دعا اور اس کا بے تابی سے انتظار کرنے لگے۔ وہ سہ پہر میں بھی نہیں آئی تو ہم نے یہ سمجھ لیا کہ رخسانہ کو کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کی ناکامی بہت بڑا مسئلہ کھڑا کر سکتی تھی۔ ہم شاہ جہاں کو کسی اور طرح وہاں سے اس لیے نہیں نکال سکتے تھے کہ سخت پہرا تھا اور چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی تھی۔

جب دن ڈوب گیا اور شام کے دھندلکے اندھیرے کی آغوش میں جانے لگے تب وہ ہمیں آتی دکھائی دی۔ ہماری جان میں جان آئی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی آ رہی تھی۔ جب وہ قریب آئی تو میں نے پوچھا۔ ’’رخسانہ کیا ہوا؟ کچھ کام بن گیا؟‘‘

رخسانہ سر ہلا کر بولی۔ ’’ہاں اسے زہر دے دیا گیا ہے۔ یہ کچھ دیر پہلے کی بات ہے۔ یہ کام حسب منشا تو ہو جائے گا۔ مگر......‘‘

’’مگر کیا......؟‘‘ میں نے گھبرا کر پوچھا۔ ’’کیا اس راز کے افشا ہو جانے کا خطرہ ہے؟‘‘

’’نہیں...... یہ بات نہیں۔‘‘ وہ بولی۔ ’’تشویش کی بات یہ ہے کہ میں نے اس کام میں عجلت کر کے بڑی غلطی کی۔‘‘

’’کیسی غلطی......؟‘‘ میں نے کہا۔ ’’ہم نے جو منصوبہ بنایا اس میں کوئی عیب یا نقص بالکل نہیں ہے۔‘‘

’’دراصل یہ بات ذہن میں نہیں آئی کہ...... اس سے قبل ہمیں کوئی محفوظ جگہ تلاش کر لینی چاہیے تھی

جہاں اسے بھوتوں کے آنے سے پیشتر قبر سے نکال کر لے جاتے۔ اس کام میں دیر ہونے سے ہماری محنت اور کوشش اکارت ہو جائے گی۔‘‘

’’اب بھی وقت ہے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے۔ ابھی جا کر انتظام کر لیں گے تم فکر کیوں کرتی ہو؟‘‘

’’کیا آج ابھی اور اسی وقت قبرستان جانے کا ارادہ ہے؟‘‘ رخسانہ تحیر زدہ لہجے میں بولی۔ وہ خوفزدہ سی ہو رہی تھی۔

’’ہاں...... ابھی اور اسی وقت......‘‘ میں نے جواب دیا۔ ’’اس وقت قبرستان جانے میں کیا حرج ہے؟‘‘

وہ بولی۔ ’’خوف اور خدشہ اس بات کا ہے کہ ہم بھوتوں سے بچ کر نہیں آ سکیں گے۔ وہ ہمارے پیچھے پڑ جائیں گے۔‘‘

’’آج بھوت کیسے اور کیوں آئیں گے؟‘‘ چاند نے کہا۔ ’’تم نے شاید کہا تھا کہ جب کسی کی تدفین ہوتی ہے تو بھوت آتے ہیں۔‘‘

’’آج گاؤں میں ایک عورت مر گئی ہے...... اس کی تدفین دوپہر میں ہوئی ہے۔ کیا معلوم ابھی اس کی لاش پر بے شمار بھوت جمع ہو رہے ہوں۔‘‘

میں چونکہ بھوت پریت کا معتقد نہ تھا اور ان سے متعلق جو روایات، جو قصے اور کہانیاں تھیں انہیں [illegible] حقیقت نہیں کہتا تھا۔ ان میں کوئی صداقت نہیں ہوتی تھی۔ رنگ آمیزی کر کے کہانیاں سنائی جاتی تھیں۔ اس لیے میں نے بے پروائی اور بے خوفی سے کہا۔

’’آج میں دیکھوں گا کہ ان بھوتوں کی اصلیت کیا ہے۔ درحقیقت بندر قسم کے دو ایک جانور ہوں جو بھوک سے بے تاب ہو کر قبرستان آ نکلتے ہوں گے۔ تازہ قبر سے لاش نکال کر لے جاتے ہیں۔ یہ عام بندر ہوں گے۔‘‘

میں نے بندوق اٹھا کر اسے لوڈ کیا اور کچھ کارتوس جیب میں رکھ لیے اور وزنی لکڑیوں کا ایک ٹکڑا دوسری جیب میں رکھ لیا۔ پھر میں اکیلا ہی چل پڑا۔ مجھے اس طرح جاتے دیکھ کر چاند بھی چپ چاپ ساتھ ہو لیا۔ جب ہم گاؤں والے پل پر پہنچے تو رخسانہ ہانپتی کانپتی ہم سے آ ملی جس کی مجھے توقع تھی۔ وہ ایک ذہین ہی نہیں بلکہ بہادر اور نڈر عورت تھی۔ یہ چھوٹا سا قافلہ تیزی سے چلا جا رہا تھا۔ ہم خاموشی سے گاؤں کے باہر مولوی عبدالجبار کے مکان کی طرف جا کر ایک گھاٹی سے گزرتے ہوئے [illegible]لی طرف بڑھے۔ تھوڑی دیر بعد قبرستان میں داخل ہوئے۔

چاند کی چھٹی تاریخ تھی۔ اس کی پھیکی پھیکی چاندنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ قبرستان میں [illegible] اس کثرت سے اگے ہوئے تھے کہ ان کے سائے سے قبرستان بے حد تاریک ہو رہا تھا۔ اس وقت [illegible] بھی ابر آلود تھا۔ چاند کبھی کبھی بادلوں میں چھپ جاتا اور نمودار ہوتا۔ گھنے درختوں کی شاخوں سے

اس کی دھیمی روشنی قبروں پر پڑ کر نہایت بھیانک سماں پیش کرتی۔

قبرستان کے ایک کونے میں جہاں درخت کم گھنے تھے وہاں ایک بڑا احاطہ بنا ہوا تھا جس میں ایک پہلو پر دو کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ رخسانہ نے مجھے بتایا کہ وہ شاہی قبرستان ہے۔ ہم لوگ اس احاطے میں داخل ہوئے۔ دونوں کوٹھریوں کو کھول کر دیکھا۔ ایک کوٹھری میں قبر کھودنے کے اوزار اور لکڑی کے خالی تابوت رکھے تھے۔ دوسری کوٹھری میں ایک ایسی چارپائی پڑی ہوئی تھی جس پر میت رکھی جاتی ہے۔ یہ چارپائی والی کوٹھری ہمارے کام کے لیے بہت ہی مناسب اور موزوں تھی۔

رخسانہ نے فوراً ہی اس چارپائی کو اچھی طرح سے صاف کیا اور یہ فیصلہ ہوا کہ کل شاہ جہاں کو رات یہاں رکھا جائے گا۔ اس سے محفوظ ترین جگہ کوئی نہیں ہے۔ یہاں گاؤں کے کسی بھی شخص کے آنے کی ہمت نہیں ہوسکتی۔ صبح کے وقت جب پو پھٹ رہی ہوگی تب شاہ جہاں کو رشی کی جھونپڑی میں لے جائیں گے۔ اس بات کو طے کر کے ہم احاطے سے نکلے۔

جب ہم اس نئی قبر کے قریب ہوئے جس میں آج نئی میت دفن کی گئی تھی۔ یک لخت، رخسانہ میرا ہاتھ پکڑ کے پیچھے کی طرف کھینچنے لگی۔ تو میں نے فوراً ہی پلٹ کر اس کی طرف حیرت سے دیکھا۔ "یہ تم کیا کر رہی ہو......؟ خیریت تو ہے رخسانہ!"

وہ سرگوشی میں کہنے لگی۔ "وہ دیکھیں...... نئی قبر کے پاس کیا چیز ہے......؟ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے؟"

اس وقت گہرے بادلوں کی آغوش میں چاند جکڑا ہوا تھا۔ بہت تاریکی تھی اس لیے کچھ واضح نہیں ہو رہا تھا۔ یک لخت بادل چھٹ گئے۔ پھر چاند کی ملگجی روشنی شاخوں سے چھن کر قبر پر پڑی۔ میں نے اس روشنی میں جو منظر دیکھا تو اچھل پڑا۔

میں نے دیکھا کہ کوئی چار پانچ عجیب ساخت کے آدمی قبر کو پنجوں سے کھود رہے ہیں۔ شاید ان لوگوں نے میری آواز سن لی یا پھر چاند کی روشنی یا پھر ہماری آہٹ نے انہیں متوجہ کرلیا۔ ان میں سے ایک اپنا کام چھوڑ کر ہماری طرف بڑھنے لگا۔

میں نے ایک ہاتھ میں بندوق سنبھالی اور دوسرے ہاتھ میں زون کی لکڑی پکڑ کے اسے اس کی روشنی میں دیکھا۔ اف...... میرے سامنے پانچ گز کے فاصلے پر ایک لاش جس کی آنکھیں بے نور اور ڈراؤنی تھیں اور جس کے سر کے تمام بال کھڑے تھے...... جس کے نوکیلے دانت ہڈیوں کی طرح باہر نکلے اور جسم لکڑی کی طرح اکڑا ہوا تھا اپنے استخوانی پنجے پھیلائے ہماری طرف آرہا تھا۔

میں فطرتاً دلیر واقع ہوا ہوں۔ میں نے کبھی اپنی زندگی یا خواب میں ایسا ہولناک منظر نہیں دیکھا تھا۔ اس منظر کو دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے اور ہوش ہی نہیں رہا۔ رگوں میں لہو یخ ہونے لگا۔ زون کی لکڑی میرے ہاتھ سے گر گئی لیکن میں نے بندوق مضبوطی سے تھام لی اور اسے گرنے نہیں دیا۔ کبھی میری حالت ایسی غیر یا دگرگوں نہیں ہوئی تھی میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں۔ میں فائر کرنا ہی بھول گیا۔ عین اس وقت رخسانہ کا ہاتھ فضا میں لہرایا۔ رخسانہ نے اپنا ہاتھ اونچا کر کے کوئی چیز لاش کی طرف

پوری طاقت سے پھینکی۔ ایسا لگا جیسے پتھر پھینکا ہو۔ یہ پتھر نہ تھا۔ فوراً ہی ہمارے اور اس کے درمیان ایک سیاہ دھند سی چھا گئی۔

رخسانہ مجھے اور چاند کو گھسیٹتی ہوئی احاطے کی طرف لے گئی۔ مجھے کچھ معلوم نہ تھا اور نہ ہی خبر تھی اور نہ ہی کوئی ہوش تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ ہم لوگ اس کے اشارے پر اندھا دھند دوڑتے ہوئے احاطے میں داخل ہوئے اور چارپائی والی کوٹھری میں داخل ہو کر اندر سے دروازہ بند کرلیا۔ چاند خوف و دہشت سے نیم بے ہوش سا ہو رہا تھا اور اس کا چہرہ سفید چادر کی طرح پڑتا چلا جا رہا تھا۔ میری حالت بھی بہت بری تھی اور دل تھا کہ بڑے زور زور سے دھڑک رہا تھا اور حلق خشک ہو رہا تھا۔ ہوا میں خنکی تھی۔ لیکن میں پسینے میں شرابور تھا۔ حیرت و تعجب کی بات یہ تھی کہ رخسانہ کی حالت میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ اس کے اوسان پوری طرح قابو میں تھے۔

تمام رات ہم نے دم سادھ کر اس کوٹھری میں گزاری جو صدی کی طرح بھاری ہو رہی تھی۔ ایک ایک لمحہ کٹ نہیں پا رہا تھا۔ ہر آہٹ پر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ زندہ لاشیں اس طرف آرہی ہوں۔ پتا بھی کھڑکتا تو دل اچھل کر حلق میں آجاتا۔ رخسانہ نے ہمارے بشروں سے دلی کیفیت کو بھانپ لیا تھا۔ وہ سرگوشی میں بڑی آہستگی سے ہمیں دلاسا دیتی اور اشاروں سے کہتی کہ گھبرائیں نہیں۔ اللہ بہت بڑا ہے۔

جب صبح ہوئی اور اس کا اجالا پھیلا تو جان میں جان آئی۔ یہ رات تو ہم نے آنکھوں میں کاٹی تھی۔ سب سے پہلے رخسانہ دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ اس نے ایک جائزہ لیا۔ پھر مجھے اور چاند کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ ہم لرزتے ہوئے وہاں سے نکلے۔ سہمے ہوئے سے اس نئی قبر کو دیکھنے کے لیے بڑھے جو کل بنی تھی اور رات کو بھوتوں نے اس پر حملہ کر دیا تھا۔ قبر درمیان سے شق تھی۔ اردگرد گیلی مٹی کے تودے لگے تھے اور قبر میں سے لاش غائب تھی۔ خوف و ہراس سے پہلے ہی ہماری زبانیں گنگ ہو رہی تھیں۔ اور اب قبر کی حالت دیکھ کر ہمارے رہے سہے اوسان بھی گم ہوگئے۔ لیکن رخسانہ نے خود پر قابو پایا ہوا تھا۔

قبر اژدہے کی طرح منہ کھولے ہوئے تھی جیسے ہم سب کو نگلنا چاہتی ہو...... اور بھوتوں کے پاؤں کے نشان زمین پر صاف نظر آتے تھے۔ ہم لوگ وہاں ایک پل بھی نہیں ٹھہرے۔ رک کر کرنا بھی کیا تھا۔ ہم لوگ لڑکھڑاتے ہوئے قبرستان کی یاس آمیز بھیانک فضا جو کسی عفریت کی طرح تھی سے نکل کر گھاٹی پر پہنچے۔

راستے میں ایک آدمی نے رخسانہ کا راستہ روک کر کہا۔ "بہن! سنا آپ نے...... آج رات سردار کی رانی شاہ جہاں فوت ہوگئی۔"

"اچھا......" رخسانہ نے انجان بن کر کہا۔ "بڑی افسوسناک خبر ہے۔ وہ اچھی تھی لیکن اچانک فوت کیسے ہوگئی؟"

"یہ ہم کیا جانتے ہیں کہ وہ اچھی تھی یا بری تھی...... موت آئی اور اسے دنیا سے لے کر چلی گئی۔" اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

جھونپڑی میں گھستے ہی میں اور چاند بے جان سے ہو کر اپنے اپنے بستر پر گر پڑے۔ گو کہ رخسانہ

سہمی ہوئی تو تھی لیکن ہماری طرح وہ دہشت زدہ نہ تھی۔ پھر وہ قہوہ بنا کر لائی۔ مجھے اور چاند کو تسلی دینے لگی۔ وہ قہوہ ہمارے ساتھ پینے لگی۔ "رخسانہ...... یہ تو بتاؤ کہ کل رات ہم اس بھوت سے کیسے بچے؟" میں نے پوچھا۔ "تم نے کیا کیا تھا؟"

"میں نے شاید آپ کو بتا دیا تھا کہ ہمارے علاقے میں ایک عجیب و غریب اور خاص قسم کی گھاس پیدا ہوتی ہے۔" رخسانہ نے جواب دیا۔ "اس گھاس کو بھگونے سے دھند چھا جاتی ہے۔ ہمارے گاؤں کے لوگ خصوصاً ایسی لڑکیاں اور جوان عورتیں اپنے پاس رکھتی ہیں جو اکیلی چشموں جھیل یا کسی جگہ جانے کے لیے ویرانے سے گزرتی ہیں تو کسی سانپ یا ناگ فطرت آدمی سے واسطہ پڑے تو اپنی عزت بچا سکیں۔ یہ گھاس محافظ بن جاتی ہے۔ چنانچہ رات میں آپ کے ساتھ گئی تو گھاس میرے پاس موجود تھی۔ پھر میں نے آپ کی دواؤں کے بکس سے ایک خالی بوتل لی اور اس میں پانی بھر کے ساتھ رکھ لیا۔ پھر دوڑتی، ہانپتی، کانپتی آپ کے ساتھ آ ملی تھی۔"

اس چارپائی والی کوٹھڑی میں میں اور چاند پل بھر کے لیے بھی اس خوف سے سو نہ سکے تھے کہ وہ بھوت دروازہ توڑ کر اندر نہ آ جائیں۔ میرا دل ساری رات خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرزتا اور کانپتا رہا تھا۔ ایسی ہی خوف و دہشت کی کیفیت سے چاند بھی دوچار تھا۔ رخسانہ عورت ہوتے ہوئے بھی خود کو قابو میں کیے ہوئے تھی۔ ہم تینوں نے چارپائی پر بیٹھ کر دیوار سے ٹیک لگائی ہوئی تھی اور میری نگاہیں دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ لیکن میں نے بندوق کی نال کا رخ دروازے کی طرف کیے رکھا تھا۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ بھوتوں نے دروازہ توڑا اور اندر گھسے تو ان پر فائر کھول دوں گا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان پر گولی اثر نہیں کرے گی۔ وہ رات کٹ گئی تھی۔ اب بڑے زوروں کی نیند آ رہی تھی۔ رخسانہ نے کہا تھا کہ میں ناشتا بنائے دیتی ہوں۔ لیکن ہم سونا چاہتے تھے۔ یوں بھی بھوک اڑ گئی تھی۔ رخسانہ کو بھی نیند آ رہی تھی۔ ہم اپنے اپنے بستر پر دراز ہو گئے۔

نیند کے دبوچنے میں کچھ دیر لگی۔ نیند آنے تک بھی میں رخسانہ کے بارے میں سوچتا رہا تھا کہ کیا ذہین اور بہادر عورت ہے۔ دور اندیش بھی ہے۔ اگر وہ اپنے ساتھ یہ گھاس اور پانی نہ لاتی تو ہمارا کیا ہوتا۔ ہم بھوتوں کی غذا بن چکے ہوتے اور وہ ہمیں مزے لے لے کر کھاتے۔

جب میں بیدار ہوا تو دوپہر ڈھل چکی تھی۔ چار چھ گھنٹے کی نیند نے سابقہ طبیعت بحال کر دی تھی۔ اب ذہن پر وہ خوف و دہشت نہیں رہی تھی۔ میں نے چاند کو بیدار کیا۔ سونے کی وجہ سے چاند بھی پوری طرح سنبھل چکا تھا اور اس کے دل سے بھی ڈر و خوف نکل چکا تھا۔ وہ مطمئن معلوم ہوتا تھا۔ جھونپڑی میں رخسانہ موجود نہیں تھی۔ وہ پراسرار طور پر غائب تھی۔ کہاں گئی تھی؟ کیوں اور کس لیے گئی تھی؟ ہم دونوں میں سے کسی ایک کو جگا کر بتا کر بھی نہیں گئی تھی۔ جس سے تشویش ہو رہی تھی۔ طرح طرح کے وسوسے اور اندیشے ڈس رہے تھے کہ کوئی بھوت اسے اٹھا کر تو نہیں لے گیا تھا۔ لیکن دن میں بھوت نہیں آتے تھے۔ البتہ اس بات کا امکان تھا کہ شاید وہ اپنے گھر چلی گئی ہو اپنے ناراض پتی کو منانے۔

میں اور چاند اس کے متعلق باتیں کر رہے اور سوچ رہے تھے کہ اپنے جھونپڑے پر چلتے ہیں اور کھانے کا بندوبست کرتے ہیں۔ بڑے زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ اس جھونپڑے میں کھانے کی ہر چیز اور ہرن کا گوشت بھی روسٹ کیا ہوا تھا جو سردار کا ملازم دے گیا تھا۔ ہم اٹھنے ہی والے تھے کہ رخسانہ اندر داخل ہوئی۔ اس نے مکئی کی گرم گرم روٹیاں، گھی، مکھن اور شہد لا کر ہمارے سامنے رکھا۔ پراٹھے اور ہرن کا روسٹ کیا ہوا گوشت بھی تھا۔ یہاں پر گوشت کو مٹی کی ہانڈی میں سیاہ مرچ اور نمک سے روسٹ کی طرح بنایا جاتا تھا۔ ہم تینوں نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ قہوہ یہاں بنانے کا انتظام رخسانہ نے اس روز سے کیا ہوا تھا جب سے یہاں راتیں گزارنے آئے تھے۔ کچھ دیر بعد رخسانہ جا کر خبر لائی کہ ظہر کی نماز کے بعد شاہ جہاں کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ یہ خبر سننے کے بعد ہم تینوں رات کی مہم کے لیے تیار ہو گئے۔ کچھ دیر بعد رخسانہ شاہ جہاں کی قبر بھی دیکھ آئی تا کہ اسے ڈھونڈنے میں وقت نہ لگے۔

☆......☆......☆

شام قریب تھی۔ دن بھر کے تھکے ماندے سورج کی حالت ایک دم توڑتے ہوئے مریض کی سی ہو رہی تھی۔ وہ کچھ دیر کا مہمان تھا۔ درختوں کے سائے غیر معمولی لمبے ہو کر سورج کی زرد اور مرجھائی ہوئی کرنوں میں متحرک تھے۔ پہاڑ غول بیابانی کی طرح کھڑے تھے۔ فرحت بخش ہوا بھی چل رہی تھی۔ لیکن رات کی آمد کے ساتھ ساتھ ہمارے حوصلے پست ہو رہے تھے۔ لیکن کوئی پراسرار طاقت ہمیں کشاں کشاں قبرستان کی طرف کھینچ رہی تھی اور ہمیں جیسے اپنے آپ پر کوئی بس نہیں رہا تھا۔

جب ہم شاہی قبرستان کے احاطے میں داخل ہوئے تو سورج کی آخری ٹمٹماتی ہوئی کرن بھی غائب ہو گئی۔ مشرقی افق پر تاریک بادل چھا گئے۔ "یہ بادل ہمارے لیے بہت مفید ہیں۔" رخسانہ بولی۔ "ہمیں اپنا کام ابھی اور اسی وقت شروع کر دینا چاہیے تا کہ رات کی تاریکی پھیلنے سے پہلے ہی شاہ جہاں کو نکال لیا جائے۔ یہ ایک سنہرا موقع ہے اور بھوتوں کے آنے میں ابھی بہت دیر ہے۔"

ہم تینوں کدالیں لے کر قبر کھودنے میں مصروف ہو گئے۔ کیوں کہ قبر تازی تھی۔ اس لیے زیادہ دشواری نہیں ہوئی اور محنت نہیں کرنا پڑی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ رخسانہ مردوں کی طرح کام کر رہی تھی۔ اس کے نازک ہاتھوں میں بڑی جان اور طاقت تھی۔ ہم نے شاہ جہاں کو قبر سے نکال لیا۔ "میری ایک تجویز ہے۔" رخسانہ بولی۔ "خلاف توقع کام بہت جلد اور بڑی آسانی سے انجام پا گیا ہے۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ شاہ جہاں کو کیوں نہ ابھی اور اسی وقت رشی کی جھونپڑی میں لے چلیں۔ اس نیک کام میں دیر ہو جائے تو بہتر ہے۔"

"اس وقت خاصی تاریکی ہے۔" چاند نے کہا۔ "کیوں نہ ہم شاہ جہاں کو کوٹھڑی میں لے جائیں۔ سحر کے وقت جھونپڑی میں لے چلیں۔"

"یہ کوٹھڑی زیادہ محفوظ نہیں ہے۔" رخسانہ بولی۔ "بھوتوں کو شاہ جہاں کی موت اور تدفین کی خبر ہو چلی ہو گی۔ وہ رات قبرستان آئیں گے اور میت نہ پا کر تلاش کرنے لگیں گے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بھوت

یہاں آ کر کوئی نیا گل کھلائیں؟"

رخسانہ کا مشورہ معقول تھا اسے کسی صورت رد نہ کیا جا سکتا تھا۔ میں نے شاہ جہاں کو اپنے کندھے پر اٹھالیا اور گھاٹی عبور کر کے جنگل کی طرف بڑھے۔ اس جھونپڑی میں پہنچنے میں کوئی ایک گھنٹہ لگ گیا۔ کیوں کہ رات تاریک تھی۔ راستہ پرخطر تھا۔ زون کی لکڑی بھی تھی۔ اس کی روشنی ہونے کے باوجود سنبھل سنبھل کر اور بڑے محتاط انداز سے چلنا پڑا تھا۔ ذرا سی بھی بد احتیاطی گھاٹی اور موت کی نذر کر سکتی تھی۔ ہم جھونپڑی میں ابھی داخل ہی ہوئے تھے کہ رم جھم مینہ برسنا شروع ہوا۔ ہم نے دروازہ اندر سے ایک آہنی کھٹکے سے بند کر لیا۔ شاہ جہاں کو گھاس کے بستر پر لٹا دیا گیا۔ میں اپنا ایک جوڑا ساتھ لایا تھا۔ میں اور چاند دوسرے کمرے میں چلے گئے تو رخسانہ نے اس کا کفن اتار کر میرے کپڑے پہنا دیئے۔ ہم لوگ اپنی کامیابی پر مسرور تمام رات جاگتے رہے۔

صبح ہوئی تو رخسانہ کہنے لگی۔ "آپ اپنی جائے اقامت پر واپس جائیں۔ کیوں کہ میرا شوہر یا سردار کا کوئی ملازم کسی بہانے دیکھنے آ سکتا ہے کہ آپ ہیں یا کہیں چلے تو نہیں گئے۔ آپ دونوں کو نہ پا کر انہیں شک وشبہ ہو سکتا ہے۔ اس کا انہیں موقع ہی کیوں دیا جائے؟"

"شاہ جہاں کے پاس کون رہے گا؟" میں نے کہا۔ "کیا ہم اسے یہاں اکیلا چھوڑ جائیں گے؟ کیا تم اپنے گھر جاؤ گی؟"

"میں شاہ جہاں کے پاس رہوں گی۔" وہ بولی۔ "ابھی میرے گھر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں شوہر کو اور ترسانا چاہتی ہوں۔"

میں اور چاند جانے لگے تو اس نے چاند سے کہا۔ "تم رات آؤ تو میرے لیے کھانا لیتے آنا..... دوپہر کو کوئی ضرورت نہیں۔"

آسمان پر اور اس کے کسی افق پر بادل کا ایک ٹکڑا بھی نہ تھا۔ آسمان صاف وشفاف تھا اور نکھرا پڑا تھا۔ ہم گھر کو روانہ ہوئے۔ اس وقت بڑی فرحت بخش ہوا چل رہی تھی۔ رات کو مینہ برسنے کی وجہ سے موسم بڑا خوش گوار اور سہانا ہو گیا تھا۔ میرے منع کرنے کے باوجود رخسانہ کچھ دور تک ہمارے ساتھ آئی۔ ہم جھونپڑی سے کوئی تیس گز کے فاصلے تک آ گئے ہوں گے کہ وہ ایک دم سے ٹھٹک کے رک گئی۔ پھر وہ جھک کر حیرت سے بہ غور زمین کی طرف اس طرح دیکھنے لگی جیسے کھوئی ہوئی کوئی چیز تلاش کر رہی ہو۔ اس جگہ مٹی بہت چکنی اور ملائم تھی۔ اس پر بہت سارے بے ڈھنگے اور عجیب وغریب پاؤں کے نشانات تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی لاش کے قدموں کے نشان تھے۔

ہم حیران اور خوف زدہ ہو کر ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔ ہماری آنکھیں پھیل سی گئی تھیں۔ رخسانہ کہنے لگی۔ "ضرور بھوت یہاں کفن کی بو پر آئے ہیں..... مگر بارش کی وجہ سے اور رشی بابا کے سحر کی وجہ سے ان کو یہ جھونپڑی دکھائی نہ دے سکی..... پہلے خیال آتا تو کفن وہیں پھینک کر اور کپڑے پہنا کر آتے....."

"اب کیا کیا جائے۔" میں نے مضطرب ہو کر کہا۔ "یہ تو بہت برا ہوا۔ ساری محنت خاک میں مل جائے گی اور شاہ جہاں کو بھوت کھا لیں گے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" اتنا کہہ کر وہ سوچ میں پڑ گئی۔ پھر کچھ دیر بعد کہنے لگی۔ "مجھے یاد آیا۔ ان اونچے اونچے پہاڑوں میں ایک غار ہے۔ وہ مجھے معلوم ہے۔ یہ غار بہت بڑا ہے۔ اس میں دس بارہ آدمی اور رک سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بہت محفوظ بھی ہے۔ اگر اس میں داخل ہو کر اس کے چھوٹے سے دہانے پر پتھر چن دیئے جائیں تو باہر سے انہیں کوئی ہٹا نہیں سکتا۔ ایک دو انچ بھی نہیں..... اس لیے آج شاہ جہاں کو سر شام ہی اس غار میں پہنچا دیا جائے تو کیا یہ بات بہتر نہیں ہو گی۔"

"وہ غار یہاں سے کتنی دوری پر واقع ہے؟" میں نے پوچھا۔ "بہت زیادہ دور تو نہیں ہے؟"

"نہیں..... یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "یہاں سے زیادہ سے زیادہ کوس بھر کے فاصلے پر ہو گا۔ آپ چاہیں تو ابھی اور اسی وقت چل کر دیکھ سکتے ہیں۔ اس وقت چل کر دیکھنے کا فائدہ ہو گا کہ دوبارہ جلد پہنچ جائیں گے۔"

"میرے خیال میں ابھی چل کر دیکھ لینا ہی مناسب ہو گا۔" میں نے کہا۔ "کوس بھر کا فاصلہ کوئی زیادہ نہیں۔"

وہ واپس مڑی اور جھونپڑی کی طرف لپکتی ہوئی گئی اور اس کا دروازہ مقفل کر کے آئی اور آگے آگے چلنے لگی۔ جنگل کے کناروں پر گھومتے ہوئے ہم پہاڑوں کے دامن میں پہنچے۔ یہ زمین سنگلاخ اور راستہ دشوار تھا۔ مگر طوہاً وکرہاً اس غار تک جا ہی پہنچے۔

یہ غار واقعی ہر لحاظ سے محفوظ تھا اور اندر سے وسیع اور صاف ستھرا بھی تھا۔ ایک طرف بڑی بڑی سلیں تھیں جو غار کا منہ بند کرنے کے لیے بہت موزوں تھیں اور انہیں باہر سے ہٹانا ناممکن سا تھا۔ غار اندر سے اتنا لمبا تھا کہ اس کا دوسرا سرا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ "رخسانہ! کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ غار کہاں جا کر ختم ہوتا ہے؟" میں نے پوچھا۔ "کیا تم اس کے دوسرے سرے پر کبھی گئی تھیں؟"

"نہیں....." رخسانہ نے جواب دیا۔ "اس لیے اس کا دوسرا سرا نہیں دیکھا کہ اس کی ایسی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔" پھر میں اور چاند زون کی لکڑی ہاتھ میں لیے غار کا اچھی طرح سے معائنہ کرنے لگے۔ اس کا دوسرا سرا کہاں ختم ہوتا ہے وہ دیکھنا تھا۔

رخسانہ کو اندازہ نہ تھا کہ یہ غار اتنا لمبا ہو گا۔ اس نے غار کو صرف باہر سے دیکھا ہوا تھا۔ تقریباً دو فرلانگ کے بعد راستہ اتنا نیچا ہو گیا کہ ہمیں جھک کر چلنا پڑا۔ ہمارے سامنے کسی زمین دوز آبشار کے گرنے کی آواز سنائی دینے لگی اور ہماری پنڈلیوں تک پانی آ پہنچا تھا۔ آگے پانی کے اور گہرا ہونے کا خطرہ تھا اور ہم مزید آگے بڑھتے تو اس میں ڈوب جاتے۔ گو اس طرف سے کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ یہ اطمینان کرنے کے بعد ہم واپس آ گئے۔ رخسانہ شاہ جہاں کے پاس چلی گئی اور ہم دونوں اپنی جھونپڑی میں آ گئے۔ گھر پہنچ کر میں نے غسل کیا اور کپڑے تبدیل کر کے سردار کے پاس جھوٹی تعزیت کے لیے گیا۔

وہاں اور بھی لوگ موجود تھے اور سردار سے تعزیت اور غم کا اظہار کر رہے تھے۔ سردار غم زدہ اور اس بات پر سخت حیران تھا کہ اس کی شاہ جہاں جو اچھی بھلی تھی اچانک فوت کیسے ہوگئی۔ شاہ جہاں کی موت اس کے لیے معمہ بنی ہوئی تھی۔ بڑے بوڑھے اس سے کہہ رہے تھے کہ زندگی کا کیا بھروسا۔ یہ تو پانی کا ایک بلبلہ ہے۔ موت کا وقت متعین ہے۔ اب تم صبر کرو۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

میں دوپہر کے قریب وہاں سے واپس آیا۔ چاند نے کھانا تیار کر رکھا تھا۔ ہم دونوں نے کھانا کھایا۔ پھر میں سو گیا۔ پھر چار بجے کے قریب بیدار ہوا۔ ساتھ لے جانے کے ضروری سامان کا بندوبست کر کے میں اور چاند وقت کا انتظار کرنے لگے۔ خدا خدا کر کے دن ختم ہوا جو بڑا کرب ناک سا بن گیا تھا۔ سورج گوشہ مغرب میں غروب ہونے والا تھا کہ ہم لوگ اس طرف چل کھڑے ہوئے۔ شام کے پہلے ستارے نے آسمان کی کھڑکی سے جھانکا تو ہم جھونپڑی تک پہنچ چکے تھے اور ادھر رخسانہ بھی ہماری راہ تک رہی تھی۔

رخسانہ نے سامان خورد و نوش سنبھالا۔ میں اور چاند باری باری شاہ جہاں کو کندھے پر اٹھائے غار کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ چونکہ ہم پہلے دیکھ اور اس پر سے گزر چکے تھے اس لیے نہایت تیزی کے ساتھ طے کر کے منزل مقصود تک جا پہنچے۔ باہر اندھیرا ہونے کی وجہ سے غار بھی بہت تاریک ہو رہا تھا۔ اس خیال سے پہلے ہی سے ہم زدن کی کچھ ٹہنیوں کا بندوبست کر کے لائے تھے انہیں باہر نکالا جس سے غار روشن ہو گیا۔ شاہ جہاں کو ایک طرف لٹا دیا۔ پھر دہانے کو سلوں سے بند کر کے اطمینان سے کھانا کھایا۔ میں نے شاہ جہاں کی نبض دیکھی اور اس کے دل کی دھڑکن بھی سنی۔ وہ حیات تھی۔ یہ بیج ایسے تھے کہ ان کا زہر سائنس اور طب کی دنیا میں ایک تہلکہ مچا سکتا تھا۔ نبض اور دھڑکن کی رفتار ایسی اور اتنی تھی کہ ایک عام ڈاکٹر محسوس نہیں کر سکتا تھا۔

پھر ہم نے پہرا دینے کا فیصلہ کیا کہ ہم باری باری جاگ کر شاہ جہاں کی حفاظت کریں۔ گو کہ یہاں کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن پھر بھی احتیاط لازم تھی۔ کیوں کہ مقابلہ انسانوں سے نہیں بلکہ بھوتوں اور بدروحوں سے تھا۔ یہ آدم خور روحیں تھیں۔ روحیں کہیں بھی پہنچ سکتی تھیں اور ہر بات کا پتا چلا سکتی تھیں۔ پہلے تین گھنٹے چونکہ چاند کی باری تھی اس لیے ہم دونوں میں اور رخسانہ سونے کے لیے اپنے اپنے بستر پر دراز ہو گئے۔

نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی اور چائے کی طلب ہو رہی تھی اور رخسانہ کشمیری چائے بہت اچھی بناتی تھی۔ اس لیے اس نے غار کے ایک کونے میں آگ روشن کی۔ وہاں لکڑیاں پڑی تھیں۔ ادھر پہلے بھی آگ روشن کر کے کھانا گرم کر چکے تھے۔ وہ چائے بنا رہی تھی اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ کہیں کسی بھوت نے ہمیں دیکھ تو نہیں لیا ہوگا؟ ہم سنسان اور ویرانے سے گزر کر یہاں تک پہنچے تھے۔ بھوت اندھیرا ہوتے ہی نکل آتے تھے اور اس لیے بھی تلاش میں ہوں گے کہ ہم نے ان کا نوالہ چھین لیا تھا۔

رخسانہ چائے بنا کر لے آئی تو میں نے چائے سپ کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا شوہر تمہیں تلاش تو نہیں کرتا پھر رہا ہوگا؟“

”وہ سردار کے کسی کام سے کچھ دنوں کے لیے ایک قریبی گاؤں گیا ہوا ہے۔“ رخسانہ نے کہا۔

”جب تم اس سے کسی بات پر لڑ جھگڑ کر روپوش ہو جاتی ہو تو اسے کوئی شک وغیرہ تو نہیں ہوتا؟“ میں بولا

”نہیں......“ رخسانہ نے سر ہلایا۔ ”اسے میری ذات اور میرے کردار پر اعتماد ہے۔ وہ شکی مزاج نہیں ہے اور یوں بھی ایک طرح سے دل کا اچھا ہے۔ وہ کسی کا برا نہیں چاہتا اور نہ ہی اس نے کبھی کسی سے [illegible]نی کی۔“

”لیکن سردار نے اسے ہماری جان لینے کے درپے کر دیا۔“ میں نے کہا۔ ”تمہارے شوہر نے حامی بھر لی۔ اس نے ایسا کیوں کیا؟“

”سردار...... ایک بادشاہ کی طرح ہوتا ہے۔“ وہ کہنے لگی۔ ”یہاں اس کا قانون چلتا ہے۔ کوئی [illegible]شاہ کی کسی بات کو انکار کر دے تو اس کی سزا موت ہوتی ہے۔ وہ کسی نہ کسی طرح اسے مروا دیتا ہے۔ [illegible]دار نہ صرف بہت ظالم اور سفاک ترین شخص ہے۔ اس کا اندازہ آپ کو بھی ہو چکا ہے۔ لیکن میرا خیال [illegible] شاید میرا شوہر ایسا نہ کرے۔ کیوں کہ اس سے آپ کی کوئی دشمنی نہیں ہے۔“

”لیکن مجھے قتل نہ کرنے کی صورت میں اس کی شامت آ جائے گی اور وہ سردار کے عتاب سے کیا [illegible]جائے گا؟“ میں نے کہا۔

”وہ راتوں رات آپ کو فرار کرا کے سردار سے کہہ دیتا کہ میں نے قتل کر کے ان کی لاشیں ندی میں بہادی ہیں۔“ رخسانہ کہنے لگی۔ ”سردار اس کی بات کا یقین کر لیتا۔ کیوں کہ وہ اس کی ہر بات پر یقین کرتا اور پھر سردار تصدیق کرنے سے رہا۔“

”اسے اس بات کی خبر نہیں کہ تم ہمارے ساتھ رہ رہی ہو۔“ رخسانہ سے میں نے پوچھا۔

”نہیں......“ رخسانہ نے جواب دیا۔ ”میں نے بہت احتیاط برتی ہوئی ہے۔ آپ اس سے کوئی [illegible]لریں۔“

چائے بہت اچھی تھی۔ اس کے دو دور چلے۔ پھر ہم دونوں اپنے اپنے بستر پر دراز ہو گئے۔ تھوڑی [illegible]میری آنکھ لگ گئی۔ پھر میں نے ایک بے حد عجیب و غریب اور ڈراؤنا سا خواب دیکھا۔ میں ایک [illegible]وادی میں پہنچ گیا جو بھوتوں کی ہے۔ وہاں چڑیلیں بھی ہیں۔ بھوتوں اور چڑیلوں میں ہر عمر کے ہیں۔ [illegible] چٹان پر کھڑا بھوتوں اور چڑیلوں کی بستی کو دیکھ رہا ہوں۔

[illegible]ایا دیکھتا ہوں کہ ایک طرف سے شاہ جہاں اندھا دھند بھاگتی ہوئی آ رہی ہے۔ اس کے تعاقب [illegible] بھوت اور ایک چڑیل ہے۔ شاہ جہاں میری طرف آ رہی ہے۔ سراسیمگی سے اور وہ حد درجہ [illegible]ی تھی۔ اس کے اور ان کے درمیان خاصا فاصلہ تھا۔ شاہ جہاں نے جیسے ہی مجھے دیکھا اس نے اپنی [illegible]تیز کر دی۔ میرے پاس پہنچ کر وہ رک گئی۔

”آپ...... آپ...... مجھے ان سے بچائیں......“ وہ پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بولی۔ ”یہ [illegible]“

اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں نے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ دھلی ہوئی چادر کی طرح سفید ہو رہا تھا اور لہو کی ایک بوند بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ مجھے خوف و دہشت کی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں پھٹی پھٹی سی تھیں۔ اس کا جسم بھی دہشت سے لرز رہا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ درمیانی فاصلہ کم ہو رہا ہے تو وہ میرے پیچھے کھڑی ہو گئی اور اس نے مجھے ڈھال بنا لیا۔

میرے کندھے سے بندوق لٹک رہی تھی اسے اتار کر میں نے ان کی طرف نشست باندھ لی۔ وہ سامنے اور قدرے قریب آ کر رک گئے۔ بھوت نے مجھ سے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔ ''اس کھلونے کو ہٹا لو اور اس لڑکی کو ہمارے حوالے کر دو۔ ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔''

''تم اس لڑکی کے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہو......؟'' میں غرایا۔ ''اس نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟''

''میں اس کا خون پینا چاہتی ہوں۔'' چڑیل کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''میں اپنی پیاس اس کے خون سے بجھاؤں گی۔''

''یہ خون پانی نہیں ہے جو تم اپنی پیاس بجھانا چاہتی ہو۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''اگر تمہیں پیاس لگی ہے تو پانی جا کر پیو...... انسانی خون پینے سے کہیں پیاس بجھتی ہے۔''

''پانی......؟'' وہ قہقہہ مار کر بڑے زور سے ہنسی۔ ''ہماری وادی میں ندی اور جھیل ہے لیکن اس میں پانی نہیں ہوتا۔''

''جھیل اور ندی میں پانی نہیں تو اور کیا ہوتا ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''اس میں خون ہوتا ہے...... ان انسانوں کا جو حادثوں میں...... قتل و غارت گری میں مر جاتے ہیں۔ ہمارا دیوتا ان کے خون سے جھیل اور ندی بھر دیتا ہے۔ اس طرف دیکھو......'' اس نے بائیں جانب اشارہ کیا۔ میں نے اس سمت دیکھا۔ ایک طرف بہت بڑی جھیل تھی جس کا پانی سرخ ہو رہا تھا۔ اور دوسری طرف سبک خرام ندی تھی جس کا پانی بھی لال ہو رہا تھا۔ یہ انسانی خون تھا۔ اتنا خون میں خواب و خیال میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

''جب جھیل اور ندی انسانی خون کی ہے تو اپنی پیاس وہاں جا کر بجھاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''اس غریب کو پریشان کیوں کر رہی ہو؟''

''ہمارے دیوتا کا حکم ہے کہ ایک انسان کا پورا خون پی جاؤ...... آدھا خون اس ندی یا جھیل میں اگل دو۔'' وہ کہنے لگی۔ ''اس وادی میں جتنی چڑیلیں ہیں وہ ایسا ہی کرتی ہیں۔ جب پیاس لگتی ہے تو ندی یا جھیل پر جا کر نہ صرف پیاس بجھا لیتی ہیں بلکہ نہاتی بھی ہیں...... تیرتی ہیں...... اس میں جو مزہ آتا ہے اسے تم محسوس نہیں کر سکتے۔ تازہ خون پینے کی بات ہی اور ہے۔ پہلے میں اس کا خون پیوں گی۔ پھر تمہارا۔ میں پانچ آدمیوں کا خون پی سکتی ہوں۔''

''جب یہ چڑیل تم دونوں کا خون پی لے گی تو میں تمہارا اور اس لڑکی کا گوشت کھا جاؤں گا۔'' بھوت نے کہا۔ ''دنیا میں انسانی گوشت سے زیادہ لذیذ اور مزے دار گوشت کوئی نہیں ہوتا ہے۔ کیا تم نے

...ی انسان کا گوشت کھایا ہے۔''

''انسان...... انسان کا نہیں جانوروں کا گوشت کھاتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''انسان کو کیا ضرورت ...انسانی گوشت کھایا جائے...... اس لیے کوئی انسان انسانی گوشت نہیں کھاتا ہے۔''

''اگر تم صرف ایک بار کسی انسان کا گوشت کھا لو تو پھر ساری زندگی کسی جانور اور پرندے کا گوشت ...ں کھاؤ گے۔'' بھوت نے کہا۔ ''کہو تو تمہیں انسانی گوشت کھلاؤں۔ کھا کر دیکھو گے کہ کیسا ہوتا ہے؟''

''مجھے نہیں کھانا ہے......'' میں نے بگڑ کر کہا۔ ''اب تم دونوں دفع ہو جاؤ۔ ورنہ بھون کر رکھ دوں گا۔''

وہ دونوں بے تحاشا ہنسنے لگے۔ چڑیل لڑکی کی طرف بڑھنے لگی تو میں نے چیخ کر کہا۔ ''رک جا... اگر تم نے اس کی طرف بڑھنے کی کوشش کی تو میں تمہیں گولی سے اڑا دوں گا۔'' پھر میں نے شاہ ...ہاں کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''آؤ چلو......''

چڑیل پر میری دھمکی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے ایک قدم اور بڑھایا تو پھر میں نے اس کی گردن کا ...ا کر گولی چلا دی۔ گولی نے گردن اڑا دی۔ سر فضا میں گیند کی طرح بلند ہوا پھر اس کی گردن سے جڑ ...گا۔ ایسا ہی نہیں تھا کہ سر تن سے جدا ہو گیا تھا۔ وہ سابقہ حالت میں کھڑی ہنس رہی تھی اور بھوت بھی کھی کھی ...کے ہنسنے لگا۔

پھر میں نے دوسری گولی سے اس کا نشانہ لیا۔ وہ الٹ کر کھائی میں جا گری۔ مگر دوسرے لمحے پھر وہ ...تھی۔ وہ چیخنے لگی۔ ''میری بہنو آؤ...... ایک نوجوان لڑکی ملی ہے۔ کیا اس کا خون نہیں پینا ہے۔''

''میرے دوستو...... گوشت کھانے آ جاؤ...... دو دو انسان موجود ہیں۔'' بھوت نے بھی چلاتے ...کہا۔

میں نے فوراً ہی بندوق لوڈ کی۔ دیکھا تو میرے ہاتھ سے بندوق چھوٹتے چھوٹتے بچی۔ کیوں کہ ...مت سے کوئی دس بارہ بھوت اور دوسری سمت سے بیس پچیس چڑیلیں چلی آ رہی تھیں۔ شاہ جہاں میرا ...چھوڑ کر دوسری سمت دہشت زدہ ہو کر بھاگی۔ لیکن اسے چڑیلوں نے گھیر لیا وہ اس پر جھپٹنے لگیں تو اس ...ایک دل خراش چیخ ماری۔ ''مجھے بچاؤ......''

اس دم میری آنکھ کھل گئی۔ میں اور رخسانہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ میں نے جو دل خراش چیخ سنی تھی وہ ...لی نہ تھی۔ اس غار میں گونجی تھی۔ میری نگاہ سب سے پہلے چاند پر پڑی۔ وہ فرش پر بے ہوش ...تھا میں یہ سمجھا کہ شاید سانپ انسانی بو سونگھ کر اندر آ گیا۔ سانپ کے لیے اندر آنا کچھ مشکل نہ تھا۔ ...ب سے آ گئے تھا۔ میں اور رخسانہ اس کی پشت پر سو رہے تھے۔ میں دو زانو ہو کر اسے دیکھنے کے لیے ...ہا تھا کہ رخسانہ بھی کسی الو کی طرح زور زور سے چیخنے لگی۔ میں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا کہ اسے ...لہیں سانپ نے اس پر بھی حملہ تو نہیں کر دیا۔

رخسانہ کے منہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس کے گلابی ہونٹ سوکھ کر خشک ہو رہے تھے۔ اس کی آنکھیں پھٹی پھٹی اور منجمد سی ہو رہی تھیں اور اس کا بدن دہشت سے لرزہ براندام تھا۔ وہ غار کے اندرونی

حصے کی طرف اشارہ کر کے بے تحاشا چیخ رہی تھی۔ میں نے تیزی سے گھوم کر اس جانب دیکھا۔

"آہ...... میرے معبود!" میری زبان سے بے اختیار نکل گیا۔ ایسا جگر پاش اور حوصلہ شکن نظارہ میری نظروں کے سامنے تھا کہ مجھ پر خوف و دہشت سے کوئی بجلی سی آ گری۔ اور پھر میری رگوں میں لہو منجمد ہو گیا۔ ایسا لگا جیسے میرا سارا وجود مفلوج ہو گیا ہو۔ گلا ایسا خشک ہوا کہ کانٹے چبھنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ چار پانچ انسانی لاشیں جن کی شکلیں مسخ شدہ، بے حد ڈراؤنی اور کریہہ تھیں۔ غار کے اندرونی حصے سے نکل کر ہماری طرف آ رہی تھیں۔ ان کی بڑی بڑی اور لال لال آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔

رخسانہ کی چیخیں اب بند ہو چکی تھیں۔ وہ بے حس و حرکت پڑی تھی۔ رخسانہ بڑے مضبوط اعصاب کی مالک تھی۔ لیکن وہ خوف و دہشت سے بے ہوش ہو چکی تھی۔ میں نے بہ وقت تمام اپنے حواس پر قابو پایا اور اپنی طاقت کو جمع کیا۔ جب میں نے بندوق اٹھائی تو میرا ہاتھ مرتعش ہو رہا تھا۔ میں نے ایک لاش کی پیشانی کا نشانہ باندھ کر گولی داغ دی۔ میرا نشانہ بہت اچھا ہے۔ وہ خطا نہیں ہوتا۔ اس بار بھی خطا نہیں ہوا۔ جب کہ میں حد درجہ خائف اور سراسیمہ تھا۔ گولی ٹھیک نشانے پر بیٹھی تھی۔ اس لاش کا آدھا سر اڑ گیا۔ مگر وہ بدستور آگے بڑھ رہی تھی۔ پھر یہ ہوا کہ وہ لاشیں میرے بالکل قریب آ گئیں۔ شاید میرا گوشت کھانے کے لیے......

یہ گوشت خور روحیں تھیں۔ میں نے تو سنا تھا کہ چڑیلیں اور بد روحیں خون پیتی ہیں لیکن یہ گوشت کھاتی تھیں۔ میں ان کی خوراک بننے سے نہ تو بچ سکتا تھا اور نہ ہی اب میرے پاس فرار کی کوئی راہ رہی تھی۔ میرے ہاتھ پیروں میں نہ سکت رہی تھی اور نہ ہی جان۔ جو میں حرکت کرتا یا جنبش کرتا۔ نس نس میں خون برف کی طرح یخ تھا۔ میں برف کا بت بن گیا تھا۔ بڑھتی ہوئی مایوسی اور بے بسی سے میرا دل بیٹھا جا رہا تھا اور دھڑکن رفتہ رفتہ کم ہونے لگی تھی۔ میرا سر چکرایا، لگا کہ میں پیروں پر کھڑا نہیں رہ سکتا۔ میں فوراً ہی دیوار کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ ہر لمحے ایسا لگا کہ میں تاریکیوں میں ڈوبتا جا رہا ہوں۔ جب میں بے ہوشی میں ڈوب رہا تھا صرف اتنا یاد رہا تھا کہ کوئی یخ بستہ سخت چیز میرے جسم سے مس ہوئی اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہیں رہا لیکن یہ احساس بے ہوش ہوتے ہوئے رہا کہ میں موت کی آغوش میں جا رہا ہوں۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں نے کچھ دیر تک آنکھیں نہیں کھولیں کیونکہ میری پلکیں منوں بھاری ہو رہی تھیں اور غنودگی سی طاری تھی۔ غشی کا غلبہ تھا۔ چند لمحوں کے بعد میں نے اپنی اس کیفیت پر قابو پا لیا لیکن اس وقت میں بالکل خالی الذہن تھا۔ سر بھاری ہو رہا تھا۔ تاہم میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ میں نے دیکھا کہ میں اور چاند ایک بڑے وسیع ہال میں پہلو بہ پہلو ایک چٹائی پر پڑے تھے۔ چاند کے بال دودھ کی طرح ہو چکے تھے۔ حیرت کی بات تھی کیونکہ اس کے سر کے بال ایک دم گھرے سیاہ تھے ان میں ایک بال بھی سفید نہیں تھا لیکن اب اس کے بال سفید سو برس کے بوڑھے کی طرح ہو چکے تھے۔ اس پر اب بھی غشی طاری تھی۔ وہ بے سدھ سا پڑا ہوا تھا۔ کچھ فاصلے پر رخسانہ بھی بے ہوش پڑی تھی۔ کمرے میں زون کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ایک طرف بڑے سے گول دائرے کی صورت میں دھیمی آگ جل رہی

تھی۔ اس دائرے کے درمیان ایک پلنگ بچھا تھا جس پر ایک لڑکے کی لاش پڑی تھی۔ یہ لاش بالکل تازہ معلوم ہوتی تھی۔ لاش کے قریب ایک سفید ریش بوڑھا جو بے حد صحت مند اور تندرست و توانا تھا اس لاش کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔ ایسا لگا کہ جیسے وہ اس لاش کو کھانے کی تیاری کر رہا ہو۔ وہ لاش کو شاید اسے یہاں لایا ہے کہ سکون اور اطمینان سے کھا سکے۔

میرا ذہن پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ اس لاش کو دیکھ کر مجھے وہ غار والا منظر یاد آ گیا۔ میرے جسم [illegible] جھرجھری سی ہوئی اور ایک کپکپاتی ہوئی چیخ میرے منہ سے غیر ارادی طور پر بے اختیار نکل گئی۔ پھر میں نے فوراً ہی منہ پر ہاتھ رکھ لیا کہ پھر چیخ نہ سکوں۔ میری چیخ اس ہال کے گہرے سکوت میں بڑے زور سے گونجی تھی۔ میری چیخ سن کر وہ بوڑھا میری جانب پلٹا اور آگ کا دائرہ پھاند میری طرف تیزی سے آیا قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک خوب صورت شخص تھا اور اس کے چہرے سے رعب و دبدبہ نمایاں تھا۔ پھر میں نے سوچے سمجھے بغیر خوف و دہشت سے چیخ کر کہا تو میری آواز لرزہ براندام تھی۔

"اے شاہ جنات! آپ ہم پر رحم فرمائیں۔" میں گڑگڑایا۔ "میں...... مم...... میں معافی چاہتا ہوں۔"

"خوف نہ کرو جوان!" اس نے بڑے نرم لہجے میں تسلی دی۔ "میں کوئی جن نہیں بلکہ تمہاری طرح ایک انسان ہوں۔ تم یہاں ہر طرح سے بالکل محفوظ ہو۔" یہ سن کر میری جان میں جان آئی۔ میں تو یہ سمجھا تھا کہ ان لاشوں نے مجھے اور چاند کو اپنے سردار کے پاس اس لیے پہنچایا کہ مجھے سزا دی جائے کیونکہ میں نے ان سے مقابلہ کیا تھا اور ایک لاش کا سر بندوق سے فائر کر کے اڑا دیا تھا۔ خدا معلوم میرا کیا حشر نشر کیا جائے گا۔

وہ شخص اتنا کہہ کر سامنے والے کمرے کی طرف بڑھا تو میرے دل میں تشویش اور خوف کی لہر اٹھی اور خدشات کے زہریلے پھنکارتے سانپ مجھے ڈسنے لگے۔ گو کہ اس نے مجھے تسلی دی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ کمرے سے باہر آیا تو اس کے ہاتھ میں چاندی کا ایک بڑا سا پیالہ تھا۔ وہ میرے پاس آیا اور بولا۔ "اٹھو جوان...... اب اٹھ کر بیٹھ جاؤ یہ دودھ پی لو تا کہ تمہاری توانائی بحال ہو جائے۔"

میں اٹھ کر ستون کے سہارے بیٹھ گیا اور اس کے ہاتھ سے پیالہ لے لیا۔ اس پیالے میں کوئی آدھا سیر سے زیادہ دودھ تھا۔ دودھ کیا تھا امرت تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسا عمدہ، گاڑھا، ذائقہ دار اور مزے دار دودھ نہیں پیا تھا یہ کس کا دودھ تھا معلوم نہ ہو سکا۔ شاید گائے یا بکری کا ہو گا۔ اس علاقے میں ایک بھی بھینس نہیں تھی۔ رخسانہ مجھے یہ بتا چکی تھی۔ دودھ تو میں نے ایک ہی سانس میں پی لیا۔ لیکن تشنگی باقی رہی۔ اس دودھ کے جسم میں اترتے ہی فوراً توانائی سی محسوس ہوئی۔ دل میں جو ڈر، خوف اور خدشات تھے وہ قدرے کم ہو گئے۔ یہ دودھ امرت سے بھی بڑھ کر تھا۔ پھر مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ یہ بوڑھا شخص میری طرح ہی انسان ہے لیکن میرے دل کے کونے میں ایک تجسس سا تھا اور حیران بھی تھا کہ اس شخص نے مجھے کیسے اور کیوں کر ان زندہ لاشوں سے بچایا جو مجھے کھانے کے لیے بڑھ رہی تھیں۔ میں، رخسانہ اور چاند بھی ان لاشوں سے محفوظ ہو گئے تھے، زندہ سلامت تھے۔

اس بوڑھے شخص نے میرے پاس بیٹھ کر بڑی اپنائیت سے کہا۔ "ہاں! شفیق میاں! اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ کیا محسوس کررہے ہیں؟"

"بہت بہتر محسوس کررہا ہوں۔" میں نے جواب تو دے دیا لیکن دوسرے لمحے بھونچکا سا ہوگیا کہ اس بوڑھے شخص کو میرا نام کیسے معلوم ہوا؟ جب کہ رخسانہ اور چاند بھی بے ہوش پڑے ہیں۔ اس شخص سے کبھی کہیں ملاقات بھی نہیں ہوئی۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔

"تم اس بات پر سخت حیران ہو کہ میں تمہارا نام کیسے جانتا ہوں۔" اس بوڑھے شخص نے میرے بشرے سے میری حیرت جیسے بھانپ لی تھی۔ "اس میں حیران ہونے کی ایسی کوئی بات نہیں؟" اس نے کہنا شروع کیا۔ "رخسانہ کی زبانی تمہارا نام اور وہ سب قصہ جس کی وجہ سے تم مصیبتوں میں مبتلا ہوئے سن چکا ہوں۔ شاید کسی وجہ سے رخسانہ نے تمہیں میرے بارے میں نہیں بتایا۔ میں بتاتا ہوں۔ میں کون ہوں۔"

چند لمحوں کے توقف کے بعد ایک سرد آہ بھر کے کہنے لگا۔ "میں سلطان خان کا بدقسمت چچا ہوں۔ میرا نام سلمان خان ہے اور یہ جگہ باتھری کا قدیم گاؤں ہے جہاں تم اس وقت بیٹھے ہو۔ آج سے پچاس برس پیشتر میں یہاں کا حاکم تھا۔ مجھے شکار کا بہت شوق تھا بلکہ جنون تھا۔ اس کے علاوہ مجھے کسی اور چیز کا شوق نہیں تھا یہ کیوں اور کیسے ہوا؟ شاید اس لیے کہ میرے دادا اور پردادا بھی اس جنون میں مبتلا تھے۔ ہر ایک دو مہینے میں دو تین مرتبہ شکار پر جاتا تھا۔ ایک دفعہ جب میں گھوڑے پر سوار شکار کے لیے جا رہا تھا تو میرے ساتھ دو ایک ملازم تھے۔ میں ایک کھڈ کے کنارے پر سے گزر رہا تھا تو ایک ملازم نے مجھے غیر محسوس انداز سے دھکا دے کر کھڈ میں پھینک دیا۔ وہ سمجھے کہ میں موت سے ہم کنار ہو گیا۔ مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہوتا ہے۔ میری زندگی باقی تھی اور میری موت کا وقت نہیں آیا تھا۔ آدمی کی زندگی موت کی امانت ہوتی ہے۔ موت مقررہ وقت تک اس کی حفاظت کرتی ہے۔ میرے سر میں جو اندرونی چوٹ آئی تھی وہ بڑی شدید تھی۔ جسم کی اندرونی چوٹیں بھی شدید تھیں۔ اس لیے میں سات دن تک بے ہوش رہا۔ آٹھویں دن مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو ایک سادھو کی کٹیا میں پایا وہ سادھو مجھے اٹھا کر اپنی کٹیا میں لایا تھا۔ ایک لمبے عرصے تک میں صاحب فراش رہا۔ اس سادھو نے میری بہت خدمت کی۔ اگر وہ مجھے ہوش میں لانے کے لیے جتن نہ کرتا، علاج نہ کرتا تو شاید میں بے ہوشی کی حالت میں ہی داغ مفارقت دے جاتا۔ اس سادھو نے میری جو خدمت کی شاید وہ میرا بیٹا یا باپ یا سگا بھائی ہوتا تو بھی نہ کرتا۔ کسی انسان کی بے لوث اور بے غرض خدمت کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی ہے۔ اس کی توجہ اور کوششوں نے مجھے ایک نئی زندگی دی اور اللہ کو شاید میری کوئی نیکی پسند آگئی تھی۔

جب میں مکمل طور پر صحت یاب ہوگیا اور میری توانائی لوٹ آئی تو اس سادھو کے ذریعے سے معلوم ہوا کہ میری جگہ میرا چھوٹا بھائی جمعہ خان میرے لڑکے رحمت خان کے زمانہ بالغی تک حاکم قرار پایا ہے۔ میری بابت گاؤں میں یہ کہانی مشہور کردی گئی تھی کہ مجھے کھڈ میں کسی نادیدہ ہستی نے دھکا دے کر گرا دیا تھا اور میرا جسم اور میری ہڈیاں چکنا چور ہوگئیں۔ اس کے باوجود میری لاش نہ ملنے سے میرے بھائی کو میری

طرف سے اندیشہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں روپوش ہوگیا ہوں۔ کبھی اور کسی وقت بھی زندہ سلامت آسکتا ہوں۔ دراصل اس کی سازش سے مجھے موت سے ہمکنار کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس نے گاؤں میں یہ مشہور کردیا کہ میری روح بھوت بن گئی ہے۔ مجھے بھائی کی شقاوت قلبی سے بہت دکھ ہوا۔ یہ صدمہ ناقابل برداشت تھا۔ لیکن اس کا یہ سلوک دیکھ کر میرا دل اس لیے بھی ٹوٹ گیا کہ مجھے اس سے بہت محبت تھی۔

اب مجھے حکومت سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ میں چاہتا تو پھر جا کر حکومت سنبھال سکتا تھا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ مجھے پھر ایک نہ ایک دن جان سے مار دیا جائے گا۔ اس لیے میں حکومت کا خیال ترک کر کے اس سادھو کے پاس رہنے لگا۔ یہ سادھو کوئی عام قسم کا نہ تھا بلکہ ایک زبردست عامل تھا۔ اس میں جو قابلیت اور صلاحیت تھی وہ غیر معمولی سی تھی۔ اس کے علاوہ اسے علم طب میں بھی یکساں کمال حاصل تھا اس لیے تو اس کے علاج نے مجھے ایک نئی زندگی بخشی تھی۔ میں بے کار رہ کر کیا کرتا۔ جینے کے لیے سو حیلے بہانے ہوتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ میں سادھو کی ذات سے فائدہ اٹھاؤں۔ اس کی ہم نشینی میں مجھے علوم فن کی خواہش پیدا ہوئی۔ سادھو نے میری خواہش، جذبات اور احساسات کی بڑی قدر کی اور وہ بہت خوش بھی ہوا۔ اس کی شاگردی میں رہ کر چند برسوں کے عرصے تک میں بھی ایک زبردست عامل بن گیا۔ میری ظاہری موت سے تیرہ برس کے بعد میرے بھائی جمعہ خان کا انتقال ہوگیا۔ اس وقت میرے بیٹے رحمت خان کی عمر چودہ برس کی تھی اور جمعہ خان کا بیٹا بیس برس کا تھا۔ یہ لڑکا اپنے باپ سے بھی زیادہ سنگدل ثابت ہوا اس نے رحمت خان کو زہر دے دیا اور اس کے جو ہمدرد اور خیر خواہ اور حامی تھے انہیں بھی چن چن کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ خبر مجھ پر بجلی بن کر گری اور ساری دنیا میری نظروں میں اندھیر ہوگئی۔ میں چاہتا تو سلطان خان سے سخت انتقام لے سکتا تھا۔ میرے لیے کچھ مشکل نہ تھا۔ جانے کیا بات تھی کہ میں نے اسے نقصان پہنچانا پسند نہ کیا یا سادھو نے میرے جذبہ انتقام کی آگ کو سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کر دیا تھا۔ پھر میں نے صبر کرلیا اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

ان دنوں میں اور سادھو مل کر لاشوں کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش میں ان پر عمل کیا کرتے تھے۔ کیوں کہ بہت سارے لوگ ایسے تھے کہ وہ موت سے ہم کنار نہیں ہوتے تھے۔ دراصل ان کی ایسی گہری بے ہوشی ہوتی تھی کہ سانس کی آمد و رفت محسوس نہ ہوتی تھی۔ نبض رک رک کر چلتی تھی۔ جسم سرد ہو جاتا تھا لوگ یہ سمجھتے تھے کہ موت واقع ہوگئی ہے اسے تم کالا جادو، سفلی علم یا کچھ بھی سمجھ لو۔ اس لیے میں اپنے بیٹے کی لاش کو قبر سے نکال لایا۔ چنانچہ یہ لاش جو سامنے پلنگ پر پڑی ہے میرے بیٹے رحمت خان کی ہے۔

"آپ کے بیٹے رحمت خان کی لاش......؟" میں بھونچکا ہو کر بولا۔ "یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"

"کیوں نہیں ہوسکتا......؟" اس نے تعجب خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے پلکیں جھپکائیں۔

"اس لیے کہ یہ چالیس برس پرانی لاش ہے۔ بقول آپ کے اسے چالیس برس قبل قتل کیا گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"تمہیں اس لیے حیرت ہو رہی ہے کہ چالیس برس پرانی لاش اب تک تروتازہ کیسے معلوم ہو رہی

ہے؟“ وہ کہنے لگا۔ ”اصل بات یہ ہے کہ کوئی نہ کوئی لاش کسی نہ کسی وجہ سے گلنے سڑنے سے رہ جاتی ہے۔ ہاں تو میں یہ بتا رہا تھا کہ کئی برسوں کی تگ و دو کے بعد ہمیں صرف اتنی قوت حاصل ہوئی کہ ہم لوگوں نے لاشوں کو اپنی دماغی قوت کے ماتحت انہیں اس طرح زیر اثر کیا کہ وہ ہمارے تابع ہو گئیں۔ ہم ان سے ہر طرح کی خدمت لینے لگے۔ کبھی ایسا نہ ہوا کہ لاشوں نے ہماری کسی بات اور حکم کی تعمیل نہ کی ہو۔ یعنی جس کام کا ہم خیال کرتے لاشیں فوراً ہی ہمارے عمل کے زور سے وہ کام انجام دینے لگیں۔ لیکن ہم اس سے مطمئن نہ تھے۔ ہم کچھ اور ہی سوچ رہے تھے۔ جو کچھ سوچ رہے تھے وہ ناممکنات میں سے تھا لیکن ہم اسے ممکن بنانا چاہتے تھے اور کسی ناممکن بات کے قائل نہ تھے۔ ہم کیا چاہتے تھے تم شاید یقین نہ کرو۔ ہم چاہتے تھے کہ لاشوں میں اصلی روحیں ڈال کر زندہ کیا جائے۔ اس لیے ہم نے اپنا عمل جاری رکھا۔ میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہ جانتا تھا کہ آدمی کے مرنے کے بعد اس کی روح برزخ میں چلی جاتی ہے لیکن سادھو ہندو تھا اس لیے وہ کہتا تھا کہ روحوں کو بلایا جا سکتا ہے۔ وہ پرلوک میں جاتی ہیں۔ ہم دونوں کے خیالات اور نظریات الگ الگ تھے لیکن اس کے باوجود اپنی کامیابی کی دھن میں ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔ جب کبھی کوئی گاؤں میں مر جاتا تھا تو ہم اپنے تخیل کے ذریعے ان خدمت گار لاشوں کو حکم دیتے اور وہ مردے قبر سے نکال کر ہمارے پاس لے آتیں۔

ابتداء میں جن لاشوں کو ہم نے معمول بنایا ان میں زیادہ تر رحمت خان کے حامیوں کی لاشیں تھیں۔ جب ان لاشوں کی تعداد بڑھ گئی تو ان کی رہائش اور اپنے عمل کے لیے کسی وسیع عمارت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ہمارے مطلب کی کوئی ایسی عمارت کہیں نہ تھی۔ اس لیے ہم دونوں کئی دنوں تک غور و خوض کرتے رہے۔ کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ آخر ایک روز سادھو کے ذہن میں ایک ایسی تدبیر آئی کہ میں اسے سن کر حیرت اور خوشی سے اچھل پڑا۔ وہ بڑا ذہین تھا اور اس کی ذہانت کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم تھی۔ اس کی تدبیر یہ تھی کہ...... لاشوں کو حکم دیا جائے کہ ہر رات کو بارہ بجے کے وقت ایک گھنٹہ تک باتھری کے گلی کوچوں میں آزادانہ اور دندناتے ہوئے پھریں تا کہ ان لاشوں کو دیکھ کر لوگ ڈر کر گاؤں خالی کر دیں۔

چنانچہ ان لاشوں کو ہم نے اپنی قوت تخلیہ کے ماتحت وہاں جانے کا حکم صادر کیا کہ وہ بے دھڑک گاؤں میں داخل ہو جائیں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ جب گاؤں کے لوگوں نے ان لاشوں کو دیکھا تو ان کے اوسان خطا ہو گئے۔ خوف و دہشت نے انہیں لرزہ براندام اور بے جان کر دیا۔ ان میں کئی ایک تو خوف سے ہی مر گئے۔ کئی تو اپنے اپنے مکانوں میں چھپ گئے یا کسی ایک مکان میں جمع ہو گئے کہ لاشیں شاید انہیں نقصان نہ پہنچا سکیں اور پھر انہوں نے دن میں بھی گھر سے نکلنا چھوڑ دیا۔ حالانکہ لاشیں صرف رات بارہ بجے کے بعد ہی گلی کوچوں میں گھومتی تھیں۔ ان کی رات کی نیندیں، دن کا چین و سکون حرام ہو گیا اور بھوک و پیاس اڑ کے رہ گئی اور وہ سب جیسے لرزے کے مریض بن گئے۔

یہ تدبیر بڑی کارگر اور مؤثر رہی تھی۔ سلطان اتنا دہشت زدہ ہوا کہ اپنی رعایا سمیت گاؤں خالی کر کے بھاگ گیا اور ایک درے کو جو یہاں سے قریب ہے عبور کر کے نیا باتھری آباد کیا اور اس خوف و خیال

... لاشیں یہاں بھی دندناتی ہوئی نہ آ جائیں اس درے کو ایک نہایت بلند سنگی دیوار بنا کر بند کر دیا جب لوگ یہاں سے ہجرت کر کے چلے گئے تو ایک نیا مسئلہ آن کھڑا ہوا۔ اس کے بارے میں میں نے پہلے ... تھا کہ یہ مسئلہ آ سکتا ہے۔ گو کہ اس تدبیر کی وجہ سے میں نے سلطان خان سے یہ قلعہ اور گاؤں جیت لیا تھا اور اسے بدترین شکست دی تھی۔ اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ یہ کس وجہ سے ہوا اور کس کا ... نامہ ہے۔ مسئلہ تھا لاشوں کے حصول کا...... ہمیں اپنے عمل کے لیے نئی لاشوں کو حاصل کرنے میں بہت ... محسوس ہونے لگی۔ لیکن ہم نے جلد ایک ایسا راستہ تلاش کیا جو پایاب ندی کے زمین دوز منبع کے قریب ... ہوتا ہوا ایک وسیع غار میں کھلتا تھا اور نئی باتھری کا قبرستان بھی اس جگہ سے صرف میل بھر کے فاصلے پر تھا۔ اب ہمیں اپنے کام میں بہت آسانی اور سہولت پیدا ہو گئی۔ ہم لوگ اس خفیہ راہ سے ان لاشوں کو ... ان میں بھیج دیتے جو نئی قبر سے مردہ نکال کر لے آتیں۔ اب وہ سادھو بھی طبعی موت مر چکا ہے۔ دنیا ... اب میری صرف یہی آرزو ہے کہ انسان کی فرار شدہ روحیں دوبارہ تن خاکی میں داخل کرنے میں ... بی حاصل کروں تا کہ اپنی زندگی کے ختم ہونے سے پہلے ایک بار اپنے بیٹے کو زندہ دیکھ سکوں۔ گو مجھے ... لگاتار کوشش کے باوجود ابھی تک کامیابی حاصل نہیں ہو سکی مگر امید پر دنیا قائم ہے اس لیے امید ... ہے کہ ایک دن میں اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

پرسوں یہ لاشیں ایک تابوت کھود کر لائیں۔ تابوت میں صرف شاہی خاندان کے لوگ ہی رکھے جا ... ہیں۔ اس لیے تابوت کو دیکھ کر میرا دل دھڑکنے لگا لیکن جب تابوت کا ڈھکنا اٹھایا گیا تو تابوت خالی تھا ... میں سوچنے لگا کہ لاش کہاں جا سکتی ہے؟ ایسا ہونے سے رہا کہ لاش میں جان آ گئی ہو وہ تابوت اور قبر ... نکل کر چلی گئی ہو۔ یہ بات ناممکنات میں سے تھی اس لیے مجھے یہ معمہ حل کرنے کی جستجو ہوئی۔ اس لیے ... لاشوں کو حکم دیا کہ اس تابوت کی آرام گاہ میں سونے والا جہاں کہیں ہو لے آؤ اور کسی نے اس کام ... مزاحمت کی تو اسے بھی پکڑ لاؤ۔ چنانچہ جب تم لوگ غار میں پناہ گزیں تھے یہ لاشیں شاہ جہاں کی تلاش ... باتھری جانے کے لیے اس غار سے گزریں اور شاہ جہاں کے علاوہ تم لوگوں کو بھی جو بے ہوش تھے اٹھا ... لیکن شاہ جہاں نے ان لاشوں کو نہیں دیکھا اور نہ ہی اسے ان لاشوں کا کچھ علم ہے۔ وہ یہی سمجھتی ہے ... تم لوگ اسے یہاں لائے ہو۔ میں نے اسے ایک آرام دہ کمرے میں رکھا ہے جہاں ان لاشوں کا گزر ... وہ اس وقت پوری طرح ہوش میں ہے لیکن بہت ہی کمزور ہے۔ اس میں اتنی سکت نہیں ہے کہ اٹھ ... اور چل پھر سکے۔“ ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ چاند کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ ہم دونوں اس کی ... متوجہ ہوئے۔ وہ ہوش میں آ چکا تھا لیکن اس کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ کسی زخمی پرندے کی طرح ... پھڑا رہا تھا۔ بے چینی اور وحشت کے عالم میں سر کو ادھر ادھر پٹخ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی ... اس کے دماغ میں اترتی جا رہی ہو جس کی تکلیف اور درد سے تڑپ رہا ہو۔

اس کی نگاہ جیسے ہی مجھ پر پڑی تو وہ اس قدر دہشت زدہ ہوا کہ اس کی آنکھیں حلقوں سے پھوٹ کر ... اور اس کا چہرہ مردے کی طرح سفید پڑتا چلا گیا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ معاملہ کیا

ہے۔ میری حیرانی بڑھتی جارہی تھی۔ یکایک اس نے میرے سر کی طرف اشارہ کیا تو میرا ہاتھ بے اختیار سر کی طرف اٹھ گیا۔ مجھے اپنے سر پر کوئی خوف ناک بات محسوس نہ ہوئی۔ سلمان خان کہنے لگا۔ ''وہ تمہارے سر کے بالوں سے ڈر رہا ہے جو رات کو غار والا خوفناک منظر دیکھنے سے بالکل سفید ہو چکے ہیں اور کوئی بات نہیں ہے تم فکر مند اور پریشان نہ ہو۔'' اس کی بات سن کر میں بھی اچھل پڑا لیکن اس سے کہا۔

''چاند! ہم لوگ بالکل محفوظ ہیں۔'' میں نے اسے دلاسہ دیا۔ ''گھبراؤ مت...... جس طرح میرے سر کے بال سفید ہو چکے ہیں، اسی طرح تمہارے سر کے بال بھی سفید ہیں جس کی وجہ رات والا انتہائی صدمہ ہے۔ ناقابل برداشت صدمہ جس نے بالوں کو متاثر کیا ہے۔''

پھر میں نے سلمان خان سے اس کا تعارف کرایا۔ ''یہ میرا بہت ہی دیرینہ ملازم ہے لیکن میں اسے گھر کے فرد کی طرح سمجھتا ہوں۔'' پھر میں نے چاند کو مختصر الفاظ میں سلمان خان والا قصہ بیان کر کے اسے بھوتوں کی اصلیت سے آگاہ کیا۔ سلمان خان نے ہمیں اپنے قلعے کے ایک پر سکون گوشہ میں ایک نہایت پر سکون اور آرام دہ کمرہ جو ہر طرح سے آراستہ تھا، رہنے کے لیے دیا۔ پھر کمرے میں انواع انواع قسم کے کھانے بھی لا کر دیئے جو ہم نے خوب سیر ہو کر کھائے بے حد لذیذ اور ذائقہ دار کھانے...... ان میں ہرن کا گوشت اور بٹیر بھی تھے۔ کھانا کھانے سے طبیعت اور توانائی بحال ہو گئی۔ اس کمرے کے دروازے ہم نے کسی خیال کے پیش نظر اندر سے بند کر لئے۔ چاند نے یہ کہا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لاشیں اس کمرے میں آ جائیں۔ ہم کچھ دیر تک جاگتے اور آپس میں باتیں کرتے رہے اور پھر گہری نیند نہایت اطمینان سے سو گئے۔ جانے کب تک سوتے رہے۔ سہ پہر کے وقت دروازے پر دستک ہوئی تو بیدار ہوئے۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو سلمان خان کھڑا تھا۔ پہلے تو اس نے رسمی باتیں کیں پھر اس نے کہا۔ ''تم چلو۔ میں تمہیں شاہ جہاں سے ملواتا ہوں۔''

ایک نہایت آراستہ اور بڑے کمرے میں شاہ جہاں اور رخسانہ موجود تھیں۔ اس نے بڑے مؤدبانہ انداز سے سلام کیا۔ رخسانہ نے چوں کہ اسے ہماری خدمت گزاری اور جان جوکھوں میں ڈالنے سے آگاہ کر رکھا تھا اس لیے وہ ہمیں دیکھ اور مل کر بہت خوش ہوئی تھی۔ اس نے بڑی ممنونیت کا اظہار کیا اور پھر دیر تک شکریہ ادا کرتی رہی۔

☆......☆......☆

دوسرے دن سلمان خان نے کہا۔ ''تم لوگوں کی زبانی یہ سن کر کہ سلطان خان اپنی حاملہ بیویوں کو حبیب خان کے ہاتھوں ہلاک کروا رہا ہے میں سخت متعجب ہوا۔ ایک طرح سے یقین نہ آیا لیکن یہ بھی سوچا کہ تم لوگوں کو غلط بیانی سے کیا حاصل؟ میری خدمت گار لاشیں...... تم انہیں لاشیں نہیں مؤکل ہی سمجھ لو۔ حبیب خان کو اٹھا لائی ہیں۔ میں اس کا بیان لینے والا ہوں۔ میں اسے صفائی کا موقع فراہم کرنا چاہتا ہوں۔ میں یک طرفہ کارروائی پر یقین نہیں رکھتا ہوں۔ اس سے آپ لوگ ہرگز یہ مراد نہ لیں کہ مجھے آپ کے بیان پر شک ہے۔ اگر آپ چاہو تو یہ کارروائی دیکھنے کے لیے میرے ساتھ چل سکتے ہو۔''

''کیا وہ لاشیں بھی وہیں ہوں گی؟'' میں نے دریافت کیا۔ ''یا آپ انہیں بلائیں گے؟''

''میں نے بلایا نہیں۔'' سلمان خان نے جواب دیا۔ ''وہ ہر وقت موجود رہتی ہیں۔ اس دن صرف ہماری خاطر ہٹا دیا تھا۔''

ہم دونوں ان خوفناک لاشوں کے تصور سے نہ صرف گھبرا گئے بلکہ ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں کچھ کہتے ہوئے ہچکچایا۔ سلمان خان نے ہمارے بشرے سے دل کی کیفیات کو بھانپ لیا اور ہمیں جز بز دیکھ کر اسے احساس ہو گیا کہ ہم لاشوں کی موجودگی میں اس کے ساتھ جانا نہیں چاہتے ہیں۔ لاشوں کے تصور سے چہرے زرد پڑ گئے ہیں۔

''اگر تم لاشوں کی موجودگی سے خوف کھاتے ہو تو اس کا حل میرے پاس ہے۔'' وہ بولا۔ ''میں تمہیں ایسی جگہ بٹھا سکتا ہوں جہاں سے تم سب کچھ دیکھ سکو اور اس کی باتیں سن سکو۔ کیا اس صورت میں جانا پسند کرو گے؟''

میں نے حامی بھر لی تو وہ ہمیں ایک برج میں لے گیا جس میں نیچے اترنے کے لیے ایک تنگ زینہ بنا ہوا تھا۔ اس زینہ کے ذریعے ہم ایک گیلری میں اتر گئے۔ یہ چھت کے ساتھ ملی ہوئی جالی دار گیلری اس کے ستون کے گرد بنائی گئی تھی جو ہال کے کمرے میں ایستادہ تھا۔ ہمیں وہاں چھوڑ کر سلمان خان چلا گیا اور ہم دونوں لکڑی کی ایک نشست پر بیٹھ کر دیکھنے لگے۔ ہال کمرا اس وقت ہمارے قدموں کے نیچے تھا۔ ہم یہاں سے سب کو دیکھ سکتے تھے لیکن وہ لوگ ہمیں دیکھ نہیں سکتے تھے۔

حبیب خان اس ستون کے قریب ایک چٹائی پر بے ہوش پڑا ہوا تھا...... اس سے قدرے فاصلے پر لاشوں کی ایک جماعت دیوار سے پشت لگائے کھڑی تھی۔ آگ کا دائرہ جو جل رہا تھا وہ اس وقت برابر جل رہا تھا ایسا لگ رہا تھا کہ یہ جلتا رہے گا اور کبھی بھی بجھ نہ سکے گا۔ چند لمحوں کے بعد سلمان خان ہال میں داخل ہوا۔ سلمان خان کو دیکھ کر ہماری حالت قدرے سنبھلی۔ ان لاشوں کو دیکھ کر ہم خوف زدہ سے ہو رہے تھے۔ سلمان خان نے حبیب خان کو ابھی تک بے ہوش پا کر دوا اس کے منہ میں ٹپکائی جس کے اثر سے وہ چند ثانیوں کے بعد ہوش میں آ گیا۔ اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ جب اس نے سر اٹھا کر چاروں طرف دیکھا تو لاشوں کو دیکھتے ہی اس کے ہوش اڑ گئے۔ ایسا لگا جیسے وہ پھر بے ہوش ہو جائے گا۔ بے ہوش تو نہیں ہوا البتہ لاشوں کی اس جماعت کو دیکھ کر چیخیں مارنے لگا۔ ''مجھے بچاؤ...... جانے دو...... جانے دو......''

''اس چیخ و پکار سے کوئی فائدہ نہیں حبیب خان!'' سلمان خان نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''اگر تمہیں اپنی زندگی عزیز ہے اور تم جان کی امان چاہتے ہو تو میری ایک شرط پوری کرنا ہو گی۔ ورنہ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔''

''آپ کی کیا شرط ہے خان؟'' حبیب خان نے خود کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔ ''میں آپ کی ہر شرط پوری کر دوں گا۔''

''میری شرط صرف ایک ہے۔'' سلمان خان نے گرج دار آواز میں کہا۔ ''میں جو دریافت کروں تم

سچ سچ بتا دینا۔ اگر تم نے ٹھیک نہیں بتایا اور مجھ سے چھپایا تو پھر سن لو...... میں تمہیں ان لاشوں کے حوالے کردوں گا۔"

"آپ...... آپ...... مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟" حبیب خان نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"میں نے سنا ہے کہ سلطان خان اپنی عورتوں کو جو حاملہ ہو جاتی ہیں انہیں تمہارے ہاتھوں قتل کروادیتا ہے۔" سلمان خان نے کرخت لہجے میں پوچھا۔ "کیا یہ سچ ہے......؟ یہ جھوٹ تو نہیں ہے؟"

"جی ہاں...... بالکل سچ ہے۔" حبیب خان نے سہم کر خوف زدہ لہجے میں بتایا۔ "میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں۔"

"اچھا تو پھر یہ بتاؤ کہ وہ کمینہ درندہ صفت ایسا گھناؤنا اور بہیمانہ فعل کیوں اور کس لیے کرتا ہے؟" سلمان خان نے کہا۔

"کسی نجومی نے اس کا ہاتھ دیکھ کر اسے بتایا تھا کہ تمہارے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوگا جس کی پیدائش کے بعد تم جلد مر جاؤ گے۔"

"لیکن حاملہ عورتوں کو قتل کر کے غائب کرنے کی کیا تدبیر کی جاتی تھی؟" سلمان خان نے دریافت کیا۔

"اس غرض سے سردار نے کھنڈ کے اوپر ایک مہمان خانہ بنوار کھا ہے جس میں آمنے سامنے دو ہال نما کمرے ہیں۔" حبیب خان بتانے لگا۔ "ان کمروں کے درمیان ایک زمینی خفیہ کمرہ کھنڈ کی خوفناک گہرائی پر بنایا گیا ہے۔ اس خوفناک کمرے میں ایک عجیب وغریب کل لگی ہوئی ہے۔ ان دونوں کمروں میں ایک کمرہ تو قتل گاہ ہے اور دوسرے میں اس کل والے کمرے میں جانے کا خفیہ راستہ ہے جو انگیٹھی میں ایک کمانی دبانے سے کھلتا ہے۔ جو کمرہ قتل گاہ کا کام دیتا ہے اس میں ایک مسہری ہے۔ یہ مسہری جو پتھر کی معلوم ہوتی ہے دراصل لکڑی کے دو تختے ملا کر بنائی گئی ہے۔ اس پر شیر کی خوبصورت کھال اس صفائی، باریکی اور مہارت سے منڈھی ہوئی ہے کہ بالکل دو حصوں کا نشان دکھائی نہیں دیتا۔ ان دو تختوں کے نیچے زنجیریں لٹک رہی ہیں۔ کل کا ہینڈل دبانے سے تختے جدا ہو جاتے ہیں اور اس پر سونے والا تحت الثریٰ میں گر کر ہلاک ہو جاتا ہے۔

سردار جب اپنی کسی حاملہ عورت یا ایسی عورت جس سے اس کا دل بھر گیا ہو اور وہ اپنی کشش کھو دیتی ہو تو اس سے پیچھا چھڑانے کے لئے جان لینے کا ارادہ کر لیتا ہے پھر ایک منصوبہ بناتا ہے کیوں کہ منصوبے کے بغیر جان لینا آسان نہیں ہوتا ہے۔ اس میں یہ ڈر ہوتا ہے کہ دنیا والوں کو علم اور شک ہو سکتا ہے۔ وہ اس لڑکی کو پل کی سیر کے بہانے لے کر محل سرا کے پچھلے دروازے کے مہمان خانے میں اس طرح آتا ہے کہ کسی اور کو خبر نہیں ہو پاتی ہے۔ پھر اس سے پیار ومحبت کی باتیں کرتا ہے۔ جذبات کی رو میں بہہ کر لڑکی کو ایک خاص قسم کی شراب پلاتا ہے۔ جس سے وہ تھوڑی دیر بعد گہری نیند سو جاتی ہے پھر وہ اسے بے لباس کر دیتا ہے اس لیے کہ اگر اس پر اتفاقیہ کسی کی نظر پڑے تو وہ یہ سمجھ لے کہ کسی درندہ صفت شخص نے اس کی

وری اور کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اسے بے آبرو کیا اور افشائے راز کے خوف سے گلا گھونٹ کر اس کی لاش پانی میں بہا دی۔ سردار اسے بے لباس کرنے کے بعد مسہری پر لٹا دیتا ہے اور الو کی سی آواز نکالتا ہے جس سے میں جو پہلے ہی سے اس کے کہنے پر کان لگائے بیٹھا ہوتا ہوں اور اس کی آواز سن کر اشارہ سمجھ لیتا ہوں اور بہت سے مشین کا ہینڈل دبا کر اس لڑکی کو کھنڈ میں گرا دیتا ہوں۔ اس طرح وہ فوراً ہی ہلاک ہو کر پانی میں بہہ جاتی ہے اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔

پھر اس کے بعد یہ مشہور کر دیا جاتا ہے کہ وہ لڑکی جو حاملہ تھی بھاگ گئی۔ شاید اس کا کوئی آشنا سے تلاش کرتا ہوا نکل آیا ہوگا۔ سردار اپنا جرم چھپانے اور دنیا والوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے آدمیوں کو اس کی تلاش میں دوڑا دیتا ہے۔ اس لڑکی کی لاش تیز پانی کے بہاؤ میں اتنی دور ایک رات میں نکل جاتی ہے کہ کسی کو نظر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں اس جرم میں شریک ضرور ہوں لیکن میں قاتل نہیں ہوں۔ میں اس لیے بھی قابل معافی ہوں کہ یہ سب اس کے حکم پر کرتا تھا۔ نہ کرنے کی صورت میں وہ مجھے کسی بہانے سے قتل کر کے میری لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کتوں کو کھلا دیتا۔ میں اس کے ڈر اور خوف کی وجہ سے ایسا کرنے پر مجبور رہتا تھا۔"

حبیب خان کا بیان سن کر سلمان خان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ غیظ وغضب سے اس کا سارا جسم کانپنے لگا اور آنکھوں میں شعلے ابلنے لگیں۔ اس نے تند وتیز لہجے میں کہا۔ "خدا کی قسم میں سلطان خان کو قید کر کے اس کی بربریت کا خاتمہ کر دوں گا وہ ہرگز ہرگز حکومت کرنے کے قابل نہیں ہے۔ اس خون آشام بھیڑیئے نے کتنی ہی معصوم لڑکیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔"

ایک روز میرے پاس سلمان خان نے آ کر کہا۔ "میں نے سلطان خان کی گرفتاری کے لئے لاشوں کو تلاش کرایا تھا اور وہ دو روز سے برابر اس کی تلاش میں جا رہی ہیں لیکن وہ ابھی تک ہاتھ نہیں آیا۔ کیوں کہ حبیب خان کی اچانک پراسرار گمشدگی سے خوف کھا کر گاؤں کے لوگوں نے جگہ جگہ آگ کے الاؤ جلا رکھے ہیں ایسی حالت میں لاشیں اسے لئے وہاں نہیں جا سکتی ہیں کہ ان کے جل جانے کا اندیشہ ہے۔ اس لیے میں کچھ دن اور انتظار کروں گا۔ آخر وہ جائے گا کہاں...... اور الاؤ کتنے دن تک جلا کر رکھیں گے۔"

☆......☆......☆

ہمیں اس غیر آباد قلعے اور پرانے علاقے میں آئے ڈیڑھ مہینہ بیت گیا تھا۔ یہ خاصا عرصہ تھا۔ یہ میں اس لیے بھی رک گیا تھا کہ مجھے یہاں بہت ساری مفید جڑی بوٹیاں ملی تھیں اور اس معاملے میں بڑا زرخیز تھا اور سلمان خان بھی چونکہ سادھو سے علم طب سیکھا ہوا تھا اس لیے اس وجہ سے مجھے فائدہ اٹھانا تھا میں کچھ دن اور رک کر واپس جانے کی سوچ رہا تھا۔

ایک دن صبح گل رخسانہ نے ہمیں شاہ جہاں کے ہاں فرزند ہونے کی خوش خبری سنائی۔ ہم اس کے بچے کو دیکھنے کے لیے گئے۔ سلمان خان وہاں پہلے سے ہی موجود تھا اور وہ بچے کو دیکھ کر نہال ہو رہا تھا۔ پرشکوہ محل سے رونما ہونے والا آفتاب اپنی کرنوں سے اس کے چہرے کو شادمانی کی جلا دے رہا تھا۔ ویران

گاؤں کے کھنڈروں میں رونق و برکت جھلک رہی تھی۔ کائنات کی ہر ایک چیز تبسم کی پتیاں بکھیر رہی تھی۔ ہم سب کے دل مسرت سے بھرپور تھے۔ تھوڑی دیر بعد سلمان خان چلا گیا۔ مگر ہم دونوں تمام دن وہیں رہے کیونکہ شاہ جہاں تیز بخار میں مبتلا تھی۔ میں اس کا علاج کرتا رہا۔ اس کی طبیعت قدرے سنبھلتی اور پھر کچھ بگڑ جاتی تھی۔ بخار بھی اترتا چڑھتا رہا تھا۔ شام کے وقت اس کا بخار پوری طرح اترا نہیں تھا لیکن اس کی طبیعت کافی بہتر ہو گئی تو رخسانہ کو میں ضروری ہدایات دے کر چاند کے ہمراہ اپنی جائے قیام کی طرف روانہ ہوا۔ جب ہم صدر دروازے کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ لاشوں کی ایک پوری جماعت دروازے میں داخل ہو رہی ہے۔ ان میں سے دو لاشوں کے کندھوں پر ایک بڑا سا بنڈل تھا۔ ہم دونوں گھبرا کر ایک طرف ہٹ گئے خون خشک ہو گیا۔ دوسرے لمحے سنبھل گئے کیوں کہ سلمان خان کے حکم کے بغیر وہ ہماری طرف نظر اٹھا کے دیکھ بھی نہیں سکتی تھیں۔ وہ جماعت ہمارے پاس سے گزر کر سیدھی ہال میں چلی گئی۔

"یہ لوگ بنڈل میں کیا لائے ہوں گے؟" چاند خود پر قابو پا کر تجسس آمیز لہجے میں بولا۔

"چلو چل کر دیکھتے ہیں کہ اس بنڈل میں کیا ہے۔" میں نے کہا۔ "گیلری میں سے سب کچھ دکھائی دے جائے گا۔"

چنانچہ ہم گیلری میں چڑھ گئے۔ آتشیں دائرہ بدستور جل رہا تھا۔ سلمان خان اپنے لڑکے کی لاش پر عمل کرنے میں مصروف تھا۔ ستون کے قریب لاشوں نے اپنے کندھوں سے بوجھ اتارا اور کپڑوں میں لپٹی ہوئی چیز کو کھول دیا۔ ہم دیکھ کر چونک پڑے۔ یہ سلطان خان تھا اسے لاشوں نے چٹائی پر ڈال دیا اور خود سامنے والی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئیں۔ ہم دونوں ہی بڑی دلچسپی، تجسس اور اشتیاق سے اس انتظار میں یہ دیکھ رہے تھے کہ چچا، بھتیجے کی ملاقات کس طرح ہوتی ہے اور اس ملاقات کا ان دونوں پر کیا اثر ہوتا ہے لیکن سلمان خان اپنے کام میں اس قدر منہمک تھا کہ اسے اپنی کارروائی کا خود احساس نہیں تھا۔ وہ جیسے دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا اسے کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہا ہے۔ سلطان خان کے چہرے کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا وہ ابھی تک غشی کی حالت میں تھا۔ تھوڑی دیر بعد اسے ہوش آیا تو انگڑائی لے کر ستون کے سہارے بیٹھ گیا۔ سب سے پہلے اس کی نظر اپنے چچا پر پڑی۔ جو اپنے لڑکے کی لاش کے پاس کھڑا اس پر عمل کر رہا تھا۔ وہ بھی ایک طرح سے بت بنا بیٹھا تھا۔

وہ کچھ دیر تک سلمان خان کو اس طرح دیکھتا اور گھورتا رہا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر دفعتاً کسی فوری جوش اور غصے کی حالت میں گھونسا تان کر حملے کی نیت سے اٹھا۔ جب اس کی نظر سامنے دیوار کے ساتھ کھڑی ہوئی لاشوں پر پڑی تو وہ اس طرح سے اچھلا جیسے اسے برقی جھٹکا لگا ہو۔ پھر وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا۔ وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ اور رنگ جو پہلے زرد تھا پھر نیلا ہو کر مرجھا گیا۔ اس کی گناہ گار روح جسم سے علیحدہ ہو چکی تھی اس نے جو، ان لاشوں کو دیکھا تو انہیں پہچان لیا تھا اسی نے تو انہیں قتل کیا تھا۔ انہیں دیکھ کر اس نے جان لیا تھا کہ اب اس کی خیر نہیں اور وہ پرتشدد موت کا نشانہ بنے گا اس خوف نے اس کی جان لے لی تھی۔ سلمان خان اب تک ان واقعات سے بے خبر اپنے کام میں

مصروف تھا۔ کچھ دیر بعد دفعتاً لڑکے کی لاش میں زندگی کے آثار ظاہر ہونے لگے اور وہ یکایک آنکھیں کھول کر خشم ناک نگاہوں سے اسے گھورنے لگا اور وہ ایک دم بپھر کر اٹھا اور کسی بھوکے شیر کی طرح جھپٹا اور اس نے اپنی انگلیاں بوڑھے کے گلے میں پیوست کر دیں۔ یہ منظر دیکھ کر فوراً ہی ایک خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں آیا تو میں نے اوپر سے چلا کر کہا۔

"آہ! یہ فتح تمہاری مکمل شکست ہے سلمان خان!..... تمہارے بیٹے کے جسم میں سلطان خان کی روح آ گئی ہے جو ابھی ابھی مرا ہے۔ تم نے تو اس کی طرف دیکھنا تک گوارہ نہیں کیا تھا..... تم نے ایسی بے پروائی کیوں کی؟"

اس نے میری آواز سن لی تھی اور وہ ادھر ادھر پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے لگا۔ جیسے ہی اس کی نگاہ سلطان خان کی لاش پر پڑی تو سارا معاملہ اس کی سمجھ میں آ گیا۔ لیکن اسے ہوش میں آئے دیر ہو چکی تھی۔ اب وہ اپنا گلا چھڑانے کی ناکام جدوجہد چھوڑ کر لاشوں کی جماعت کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ یہ نظریں بے معنی نہ تھیں۔ وہ ان لاشوں کو دشمن پر ٹوٹ پڑنے کا حکم دے رہا تھا۔ یک لخت لاشیں آگ کا دائرہ پھاند کر پل پڑیں اور لڑکے کی لاش کی تکا بوٹی کر دی۔ لیکن اس کی انگلیاں بدستور اس بوڑھے سلطان خان کے گلے میں جکڑی رہیں۔ دوسرے لمحے وہ مردہ ہو کر فرش پر گر گیا۔ یہ سب کچھ جتنا خوف ناک تھا اتنا ہی لرزہ خیز اور ناقابل یقین بھی۔ کسی ڈراؤنے خواب کی طرح تھا۔

سلطان خان کے مرنے سے لاشوں کی قوت بھی قائم نہیں رہی۔ جیسے وہ سلمان خان کے جادو اور اس کی قوت کے زیر اثر تھے۔ سلمان خان کے مرتے ہی اس کا طلسم بھی بکھر کر ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔ لاشیں بھی خزاں رسیدہ پتوں کی طرح اوندھی گر گئیں۔ میں اور چاند بھی اس ناگہانی واقعہ سے سہم گئے اور ہماری رگوں میں لہو منجمد ہو گیا۔ یہ خوف دامن گیر ہو گیا کہ کہیں یہ لاشیں ہمیں نقصان نہ پہنچائیں کیونکہ اب وہ آزاد ہو چکی تھیں اور اب سلمان خان کے تابع نہ رہی تھیں۔ وہ ہماری بھی اسی طرح تکا بوٹی کر سکتی تھیں جس طرح انہوں نے اس لڑکے کی، کی تھی جس میں سلطان خان کی روح سما گئی تھی۔ چاند نے لرزہ براندام ہو کر میرا ہاتھ تھاما تو اس کا ہاتھ برف ہو رہا تھا۔

اچانک ان لاشوں نے آگ کا دائرہ پھاندا۔ شاید وہ ہماری طرف پیش قدمی کرنے والے تھے۔ ہمیں خطرے کا احساس تھا لیکن اب وہ خطرہ حقیقت میں بدل چکا تھا۔ جب اوپر والا حفاظت کرتا ہے تو پھر کوئی بھی نہ نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ ہی موت کا سبب بن سکتا ہے جب ان لاشوں نے آگ کا دائرہ پھاندا تو ان کے کفنوں میں آگ لگ گئی۔ پھر یہ آگ ہال کی چٹائیوں اور دوسری چیزوں تک پہنچ گئی۔ تمام کمرہ گہرے دھوئیں سے بھر گیا اور ہم اس سے فائدہ اٹھا کر بھاگے اور وہاں سے بمشکل جان بچا سکے۔ پھر [illegible] کہ شاہ جہاں کے کمرے کی طرف بھی آگ تیزی سے پھیل رہی ہے میں نے اس کی جان بچانے کا [illegible] کر لیا۔ اسے مرنے کے لیے چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ ہم فوراً ہی اس کے کمرے کی طرف بجلی کا کوندا بن کر لپکے۔ آگ سے دامن اور اپنے آپ کو بچاتے ہوئے اس کے کمرے میں گھس گئے۔ اس کے کمرے میں

رخسانہ موجود نہ تھی۔ وہ شاید کسی کام سے یا کچھ لینے گئی ہوئی تھی۔ شاہ جہاں بخار میں تپ اور کراہ رہی تھی اوراس کا بچہ سو رہا تھا۔ میں نے شاہ جہاں اور چاند نے بچے کو اٹھالیا اور انہیں اس کمرے سے نکال لیا۔

آگ اب جنگل کی آگ کی طرح تیزی سے پھیل رہی تھی اور اس کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ ہم دونوں شاہ جہاں اوراس کے بچے کو لے کر بھاگے اور زون کی ٹہنی کی مدد سے اس کھوہ میں داخل ہو گئے جس میں سے ندی نکل رہی تھی۔ زون کی ٹہنی کی روشنی رہنمائی کر رہی تھی۔ جب ہم زمین دوز راستے کے قریب گئے تو ایک طرف ہمیں ایک نیچا اور لمبا سرنگ نما راستہ دکھائی دیا۔ اس میں کمر کمر تک پانی تھا جس میں ہم کافی دیر تک چلتے رہے اور بہ دقت تمام اس راستے کو طے کر کے اس غار میں پہنچے جہاں سے ہمیں لاشیں پکڑ کر لے گئی تھیں اور جسے ہم نے پناہ گاہ بنایا ہوا تھا۔

ہم لوگ پانی میں شرابور تھے۔ شاہ جہاں بھی...... اس کا بچہ بھی...... میں نے شاہ جہاں کو پانی سے بچانے کی بہت کوشش کی تھی لیکن یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی تھی کیونکہ ایک تو ہم سراسیمہ، بدحواس اور خائف تھے۔ ان لاشوں سے موت کے خوف سے اور پھر ایک افراتفری سی بھی تھی۔ اب یہاں کسی بات کا خوف و خطرہ نہیں رہا تھا۔ لاشیں اب یہاں نہیں آسکتی تھیں اور نہ وہ باقی رہی ہوں گی۔ آگ نے انہیں جلا کر خاکستر کر دیا ہوگا۔ ہم نے سکون و اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن یہ بات دکھ کا باعث بن گئی کہ شاہ جہاں جو پہلے ہی تیز بخار کی حالت میں تھی۔ وہ بھیگ جانے سے نمونیے کے حملے سے بچ نہ سکی تھی۔ اس وقت نہ کوئی دوا میرے پاس تھی اور نہ ہی علاج کا کوئی دوسرا ذریعہ تھا اور نہ ہی اب میں جا کر اپنے اس کمرے سے دوا لا سکتا تھا۔ آگ جلائی گئی تا کہ شاہ جہاں کے بدن کو ٹھنڈک سے محفوظ رکھا جا سکے۔ لیکن اس سے کچھ نہ ہو سکا اور اس کی حالت بگڑنے لگی اور رات کے آخری پہر وہ موت کی آغوش میں جا کر میٹھی نیند سو گئی۔

اس کی دردناک موت کا اس قدر قلق ہوا کہ میری اور چاند کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ صبح ہوتے ہی میں بعد حزن و ملال مولوی عبدالجبار صاحب کے پاس گیا۔ وہ اس وقت مسجد سے فجر کی نماز پڑھ کر اور تلاوت قرآن پاک کر کے لوٹے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ وہ تمام واقعات جو میں نے دیکھے اور سنے تھے ان کے گوش گزار کر دیئے۔ اتفاقیہ وہ جمعہ کا دن تھا۔ مولوی عبدالجبار صاحب نے مجھے تسلی دی اور کہا کہ میں فکرمند اور پریشان نہ ہوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ نماز جمعہ میں مسجد لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ مولوی عبدالجبار صاحب نے جماعت پڑھانے کے بعد دعا سے قبل یہ اعلان کیا کہ نمازی حضرات موجود رہیں۔ دعا کے بعد ایک بہت ہی ضروری اور اہم اعلان ہوگا۔ پھر انہوں نے دعا کے بعد کھڑے ہو کر وہ قصہ سنایا جو میں نے سنایا تھا۔ گاؤں والے اپنے سردار کی اچانک اور پراسرار گمشدگی پر حیران اور ہراساں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ سردار کی کسی بیوی کے آشنا نے اسے اغوا کر کے قتل کر کے اس کی لاش ندی میں بہا دی یا پھر لاشیں جو کسی طرح بھٹک کر ادھر آنکلی ہوں گی۔ انہوں نے اسے کھا لیا ہوگا۔ یہ قصہ سن کر ان کی جان میں جان آئی اور انہوں نے سکون کا سانس لیا۔ گو انہیں سردار کی عبرت ناک موت سے یک گونہ رنج تو ہوا مگر بھوتوں کے خاتمے کی خوش خبری اور بچے کے دیکھنے سے سب مطمئن ہو گئے۔ سہ

...وقت شاہ جہاں کو دفن کر دیا گیا اور بچے کا نام بھی شاہ جہاں مولوی عبدالجبار صاحب کی خواہش پر ...یا اور اس کے سن بلوغت تک انہیں عارضی حاکم اور بچے کا اتالیق مقرر کیا گیا۔ رخسانہ رشی کی ...لی کے مطابق ننھے سردار کی ماں بنائی گئی۔

شاہ جہاں کی موت سے میرا دل اچاٹ ہو گیا تھا اور پھر اب وہاں مزید رہ کر کرنا بھی کیا تھا، واپس ...تھا۔ میری بڑی طویل غیر حاضری ہو گئی تھی اور پھر مجھے ایسی ایسی نایاب اور نادر جڑی بوٹیاں ہاتھ لگی ...ں لہٰذا ہم وہاں سے واپس چلے آئے۔ پھر مجھے ان لوگوں کے متعلق کچھ نہ معلوم ہو سکا اور نہ ہی میں نے ...دوبارہ وہاں جانا پسند کیا۔ ویسے مجھے رخسانہ اور وہ لاشوں کا شہر اور اندوہناک واقعہ یاد آتا رہا جس نے ...ے اور چاند کے بال سفید کر دیئے تھے۔ گو کہ بالوں کو سیاہ کرنے کے لیے میں نے بہت سی دوائیں ...ئیں لیکن اس سے کچھ نہ ہوا۔ پھر بالوں پر خضاب لگا کر سفید بالوں کو چھپانے لگے۔

کوئی ایک برس کے بعد اس جادوگر نے مجھے سابقہ حالت میں لا کر پوچھا تھا۔ ”کیا اب تمہیں یقین ...؟ وہ زندگی یاد ہے؟“

میں نے جواب دیا اور اقرار کیا اور کہا۔ ”ہاں! مجھے وہ ساری زندگی اور تمام واقعات اس طرح یاد ...یے کل کی بات ہو۔“

”یہ رونگٹے کھڑے کر دینے والے واقعات۔“ شاہ جی نے کہا۔ ”میں نے انہیں اب تک فراموش ...ں کیا۔“

”اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ قصہ سن کر الاماں الحفیظ میرے جسم کے تمام رونگٹے کھڑے ہو گئے۔“ ...نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ ”ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک قبرستان کے تمام مردے چاروں ...ے دانت نکال کر اس مکان کو گھیرے ہوئے ہیں۔“

”آپ کو جادوگر بننے کا شوق کیوں اور کس لیے ہوا؟ کیا آپ بتانا پسند کریں گے؟“

”وہ اس لیے کہ اس جادوگر نے اپنے جادو کے زور سے مجھے ایک گھر میں بچہ بنا دیا تھا...... اس کے اس جادو کے کمال نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ اس لیے میں نے جادو سیکھنے کا فیصلہ کیا۔ جادو بڑے کمال کی ...اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے اچھے اور برے کام لئے جا سکتے ہیں۔ بڑے کمالات ...جا سکتے ہیں۔ یہ جادو اچھا بھی ہے اور بہت برا بھی......“

”کیا ہر جادوگر بڑے بڑے کمالات دکھا سکتا ہے؟“ میں نے دریافت کیا۔

”نہیں......“ شاہ جی نے نفی کے انداز میں سر ہلایا۔ ”یہ بھی ایک علم ہے۔ جو جادوگر جتنا علم جانتا ...وہ اس سے زیادہ جادو دکھا نہیں سکتا۔ بڑا جادوگر بننے کے لیے بڑے علم کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر ...بڑا علم نہیں جانتا ہے۔ اس میں بے پناہ قوت نہیں ہوتی ہے۔ مجھے لوگوں نے بھی منع کیا تھا کہ میں ...ھوں لیکن میرا جنون مجھے باز رکھ نہیں سکا میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ تم میں جادوگر بننے کا جو جنون ہے ...دماغ میں جو نا سور سمایا ہے اس سے کوئی باز نہیں رکھ سکتا تم ضرور جادو سیکھو۔“

"کیا مصر میں اب بھی بڑے بڑے جادوگر ہیں؟" رشید نے سوال کیا۔

"میں نے بتایا تھا نا کہ اب بھی دنیا کے ہر کونے میں جادوگر ہیں لیکن بڑے جادوگر بہت کم ہیں۔ آٹے میں نمک کے برابر۔" شاہ جی نے جواب دیا۔

"میرا مخلصانہ مشورہ تو یہ ہے کہ تم بنگال یا آسام چلے جاؤ وہاں کسی بڑے جادوگر کا پتہ چلا کر اس کی شاگردی قبول کرلو۔ اس کے بعد تم مصر، افریقہ، یونان اور روم جا کر مزید جادو سیکھ لینا۔ جب تم بڑے جادوگر بن جاؤ یا معمولی جادوگر...... جادوگر، جادوگر ہی ہوتا ہے۔ تم اپنے جادو سے انسانیت کی خدمت کرنا۔ اس سے کوئی ناجائز فائدہ کبھی بھی کسی بھی حالت میں نہیں اٹھانا۔ جادو کا کوئی سا بھی علم سیکھنے کے بعد شیطان اور اس کے چیلے غلط راستے پر ڈالنے کی بہت کوشش کرتے ہیں۔ کالی ماتا بھی تمہیں ورغلانے کی کوشش کرے گی۔ یہ راہ اس شخص کے لیے بہت کٹھن، صبر آزما اور امتحان لینے والی ہے جو مثبت سوچ رکھتا اور بھلائی اور نیکی کے لیے زندگی وقف کر دیتا ہے۔ تم جادو کو اپنا مستقبل بنانے کے لیے بھی سوچتے ہو اور چاہتے ہو۔ اس لیے بھی کہ جادو بڑے کمالات دکھاتا ہے۔ تمہارے دل میں دولت کی اور دنیا کی حرص و طمع نہیں ہے۔ یہ بہت اچھی بات ہے۔ مجھے تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔"

ہم دونوں کچھ دیر اور شاہ جی کے پاس بیٹھ کر چلے آئے۔ کیوں کہ ان سے ملنے کوئی اور آ گیا تھا۔ شام بھی ہو رہی تھی۔

☆......☆......☆

میری اور رشید کی دوستی کا آغاز اسکول کے زمانے بلکہ بچپن سے ہوا تھا۔ ہم دونوں چوتھی جماعت کے طالب علم تھے۔ اس اسکول میں صرف متوسط طبقے کے ہی نہیں بلکہ بڑے گھرانوں کے لڑکے اور لڑکیاں بھی پڑھتی تھیں کیونکہ اسکول پڑھائی کے لحاظ سے بہت اچھا اور ہر لحاظ سے معیاری بھی تھا۔ اس لیے امیر کبیر گھرانوں کے لوگ اپنے بچوں کو اس اسکول میں پڑھانے پر مجبور تھے۔ ہم دونوں نے امیر گھرانوں کے لڑکوں سے دوستی اس لیے نہیں کی تھی کہ ان میں ابھی سے دولت مند ہونے کا بڑا غرور اور گھمنڈ تھا۔ ان کی گاڑیاں دیکھ کر احساس محرومی بڑھ جاتا تھا۔ ان کی اور ہماری زندگی میں زمین آسمان جیسا فرق تھا۔ میرے گھر کے حالات درست نہ تھے۔ میرے والد حیات نہ تھے۔ میں اپنی ماں کی ایک ہی اولاد تھا۔ میری ماں سلائی کر کے مجھے پڑھا رہی تھی تا کہ میرا مستقبل تابناک ہو جائے۔ میری اور رشید کی دوستی روز بروز پروان چڑھتی رہی۔ برسوں گزر گئے آخر وہ دن آ ہی گیا جب ہم دونوں نے گریجویشن کر لیا۔

یوں تو میں بچپن سے ہی جادوگر بننے کا جو خواب دیکھ رہا تھا اس کی خواہش دل میں پنپ رہی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے بچپن میں جادوگروں کے کمالات دیکھے تھے جو اسکول کی سالانہ تقریب میں پیش کرتے تھے۔ سربازار اور گلی کوچوں میں بھی...... اس کے علاوہ فلموں میں بھی...... اور پھر میں نے جادوگری کے متعلق قصے کہانیاں، بہت پڑھی تھیں۔ اس کے باوجود میں نے رشید کے ساتھ مل کر ملازمت کی بہت کوشش کی۔ کراچی شہر میں بیروزگاری اس لیے زیادہ تھی کہ اندرون ملک سے لوگ اس شہر کو دبئی سمجھ

ار چلے آرہے تھے۔ اچھی نوکری اگر ملتی بھی تھی تو بڑے گھرانوں کے یا پھر ایسے لڑکوں کو جن کے پاس سفارش اور اثر ورسوخ ہوتا تھا۔ بیرون ملک ملازمت کرنے کے لیے وسائل نہ تھے۔ تا ہم کوشش جاری تھی۔ ایک روز رشید نے مجھ سے کہا کہ بنگلہ دیش میں میرے ایک دور کے رشتہ دار ہیں۔ انہوں نے خط میں لکھا ہے کہ تم یہاں آ جاؤ تو تمہارے لیے کوشش کرتا ہوں تم بھی ساتھ چلو۔

میں رشید کے ساتھ بنگلہ دیش اس لیے نہیں جا سکتا تھا کہ میں اپنی بیمار اور بیوہ ماں کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ان کی بیماری اور مامتا میری ترقی کے راستوں میں زبردست رکاوٹ تھی۔ میں ان بیٹوں کی طرح خود غرض بے پرواہ اور بے حس نہیں تھا کہ ماں جیسی عظیم ہستی کو تنہا اور دنیا کے رحم و کرم پر چھوڑ کے دولت کمانے اور اپنا مستقبل تابناک بنانے کے لیے غیر ممالک کو چلے جاتے تھے۔ دنیا میں ماں سے بڑھ کر کوئی نعمت اور دولت نہیں ہے۔ ماں کی مامتا میرے لیے کسی انمول خزانے سے کم نہیں تھی۔ ماں نے بیماری سے قبل جانے کس طرح سے اتنی رقم پس انداز کی ہوئی تھی کہ وہ رقم ان کی بیماری اور گھر کے اخراجات کے لیے کام آتی رہی۔ مجھے جز وقتی رقم ملی تھی لیکن میں اس رقم سے مطمئن نہیں تھا اور نہ ہی میں ماں کا علاج کسی اچھے اسپتال یا کلینک میں کروا سکتا تھا۔ کوئی ایک برس کے بعد میری ماں کا ایک طویل علالت کے بعد انتقال ہو گیا تو میں ان کی محبت، شفقت اور مامتا کے گھنے سائے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہو گیا۔ مجھے اپنی دنیا اندھیر، ویران اور اجاڑ سی نظر آنے لگی۔ دل اچاٹ ہو کر رہ گیا تھا۔ میں نہایت اداس اور غمگین رہنے لگا۔ اگر رشید ہوتا تو میرا غم بہت ہلکا ہو جاتا کیونکہ وہ میرا بڑا ہمدرد، سچا اور گہرا دوست تھا۔ رشید کو میں نے ماں کی موت کی دکھ بھری خبر دے دی تھی۔ اس سے میری خط و کتابت جاری تھی۔ میری والدہ کی وفات کی اطلاع پانے کے ایک ماہ بعد اس نے مجھے لکھا کہ میں فوراً اس کے پاس آ جاؤں۔ گویا ڈوبتے کو تنکے کا سہارا اور اندھے کو بینائی ملی۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ ایک بینک میں آسامی ہے وہ آسام میں ملازمت کر رہا ہے۔ میں ایسا کروں کہ ڈھاکہ آ جاؤں۔ وہاں سے چٹاگانگ چلا جاؤں۔ چٹاگانگ میں میرے ایک رشتہ دار تاج الدین ہیں ان سے رابطہ کر کے قیام کروں۔ ان کی معرفت تم آسام پہنچ جاؤ گے اگر رقم کی ضرورت ہو تو لکھو۔ میں کسی نہ کسی طرح کسی نہ کسی ذریعے سے پہنچا دوں گا۔ تم نے اور میں نے ساتھ جو پاسپورٹ بنوایا تھا وہ آج تمہارے کام آ جائے گا۔

میں جس شخص کے پاس جز وقتی ملازمت کر رہا تھا وہ مجھ سے بہت کام لیتا تھا۔ ایک طرح سے میرا خون چوس رہا تھا۔ میری مجبوری سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔ کنجوس اور مکھی چوس بھی تھا۔ کسی بھی ہندو بنیے اور یہودی سے کم نہ تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں شاید ہی ایسا خود غرض اور کینہ پرور شخص دیکھا ہو۔ جب اس نے میرے ہاتھ پر تنخواہ رکھی اور میں نے اس سے کہا کہ کل سے کام پر نہیں آؤں گا تو وہ اچھل پڑا اور مجھ پر بگڑا کہ میں نے اسے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ اگر میں بتاتا تو وہ میری تنخواہ روک لیتا۔ پھر اس نے مجھ سے کہا کہ میں نوکری نہ چھوڑوں۔ تو وہ تنخواہ میں دس روپے اضافہ کر دوں گا۔ میں نے اسے بتایا کہ وہ ایک ہزار روپے بھی بڑھا دے تو میں نوکری نہیں کروں گا کیونکہ مجھے بنگلہ دیش میں ہزاروں روپے کی ملازمت

دوں۔ میں نے اس سے کہا کہ ڈائننگ ہال میں۔ میں ابھی آرہا ہوں۔ جب میں ڈائننگ ہال میں پہنچا تو وہ کھڑکی کے پاس والی میز پر کھانا چن رہا تھا۔ کھانے سے فراغت پانے کے بعد میں نے چائے پیتے ہوئے دادو سے پوچھا۔ ''کیا یہ سچ ہے کہ رنگا ماٹی کے جنگلات میں جادوگر اور جادوگرنیاں رہتی ہیں؟''

''جی صاحب!'' اس نے جواب دیا۔ ''جنگل سے دس میل اندر جائیں تو وہاں سے اور دو تین جنگل شروع ہو جاتے ہیں جو جنوب اور شمال میں واقع ہیں۔ وہاں صرف جادوگر اور جادوگرنیوں کی بستیاں ہیں۔ ان کی آبادیوں کی خوبصورتی ایسی ہے کہ وہ ہر سیاح اور ہر شخص کو اپنے طلسم میں قید کر لیتی ہے۔ دراصل ان جادوگروں نے اور جادوگرنیوں نے اپنے جادو کے زور سے ان آبادیوں اور مقام کو اس قدر دلکش، خوبصورت، جاذب نظر اور نظاروں کو ایسا دل فریب بنا دیا ہے کہ جو دیکھتا ہے وہ نہ صرف مبہوت ہو جاتا ہے بلکہ کشاں کشاں اس جانب چلا جاتا ہے پھر وہاں جا کر اس طرح جال میں پھنس جاتا ہے جس طرح مکڑی کے جالے میں مکھی...... اس کا دل وہاں سے واپس آنے کے لیے نہیں کرتا ہے۔ دراصل وہ جادو کے زیر اثر آجاتا ہے۔''

''کیا یہ بات سچ ہے کہ وہاں اور بنگال میں ایسی جادوگرنیاں ہوتی ہیں جو، ان مردوں کو جانوروں، پرندوں اور مکھیوں کے وجود میں لے آتی ہیں جن پر وہ مرتی ہیں تا کہ ان کے ساتھ راتیں گزاری جاسکیں۔ وہ انہیں کھلونا بنا کر رکھ لیتی ہیں۔''

''ہاں صاحب! یہ بالکل سچ بات ہے۔'' دادو کہنے لگا۔ ''لیکن ساری جادوگرنیاں ایسی نہیں ہوتی ہیں۔ جو شادی شدہ ہوتی ہیں وہ غیر مردوں کے بارے میں کوئی غلط بات نہیں سوچتی ہیں جبکہ جنگلات میں کوئی قانون، تہذیب اور اخلاق نہیں ہوتا ہے۔ انسانیت کا دور ہی نہیں ہے اور نہ ہی اس نے اخلاق کو چھوا ہے۔ ان میں اور جانوروں کی زندگی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ عزت و آبرو کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اچھے اور برے کی تمیز نہیں ہے۔ وہ گندے تالاب کی طرح ہیں اور اس کی ساری مچھلیاں گندی ہیں۔ چونکہ بے پناہ غربت ہے اس لیے ہر نوجوان لڑکی، خوبصورت عورت ہر اس مرد کی طرف راغب ہو جاتی ہے جو اس کی کوئی بھی ضرورت پوری کر سکے۔ یوں تو لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں صرف دال، بھات اور لال مرچ کی کاشت کرتے ہیں...... دریا، جھیل اور تالابوں میں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں پکڑ کر انہیں بھون کر بھات کے ساتھ کھاتے ہیں۔ موسمی پھلوں پر گزارہ کرتے ہیں...... ان کے لیے کوئی چیز سونے سے زیادہ قیمتی ہے؟ تو وہ ہے نمک......''

''نمک......؟'' میں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا نمک وہاں نہیں ملتا، وہ اتنا مہنگا کیوں ہے؟''

''اس لیے کہ ان کے پاس پیسے کہاں ہیں جو وہ نمک خریدیں۔'' دادو بتانے لگا۔ ''وہ کوئی چیزیں بنا کر فروخت بھی نہیں کرتے ہیں جتنا اناج وہ کھیتی باڑی سے پیدا کرتے ہیں خود ان کے لیے کافی ہوتا ہے۔ صرف چکمہ اور مکھ کی دو ایک آبادیاں ہیں جو سگار اور دست کاری اور چٹائیاں بن کر فروخت کرتی ہیں۔ اب تو ان چٹائیوں کی پہلی جیسی مانگ نہیں رہی ہے کیونکہ اب ان کی جگہ نائیلون کی چٹائیوں نے

لے لی ہے۔ بس وہ سارا دن اور رات اپنے جادو کی مشق اور کمالات سے خوش ہوتے رہتے ہیں۔''

''کیا وہ اپنے جادو کے زور سے کوئی بھی چیز حاصل نہیں کر سکتے......؟'' میں نے کہا۔ ''جادو سے بہت کچھ پایا جاسکتا ہے؟''

''تین سو برس پہلے ایک بزرگ جن کا نام قطب الدین تھا وہ ہندوستان سے یہاں اسلام کی تبلیغ کے سلسلے میں آئے تھے۔ اس وقت بنگال جادوگروں کا خصوصاً رنگا ماٹی کے جنگلات گڑھ تھے۔ انہوں نے اپنی روحانی قوت سے ان جادوگروں اور جادو کو وہیں تک محدود کر دیا تھا۔ وہاں سے کوئی جادوگر کسی اور جگہ جا کر اپنے جادو اور کمالات کا مظاہرہ کرے تو کر سکتا ہے لیکن جادوگر اب جاتے نہیں ہیں کیونکہ بہت سے ختم ہو چکے ہیں اور بہت سے بوڑھے ہو گئے ہیں۔ ان کی اولادیں معاش کے چکر میں اندرون اور بیرون ملک چلے گئے ہیں۔ اس لیے اب جادوگر مرد آٹے میں نمک کے برابر ہیں البتہ عورتوں کی بہت بڑی اکثریت موجود ہے۔ اس لیے وہ مردوں کو شکار کرتی ہیں۔ اپنا غلام اور تابع بنا کر رکھتی ہیں، وقت گزارتی ہیں۔''

''لیکن اس میں کتنی صداقت ہے؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''ایسا تو نہیں کہ یہ صرف کہانیاں ہوں؟''

''اس میں صداقت تو ہے۔'' وہ کہنے لگا۔ ''ایسا صدیوں پہلے بہت ہوتا تھا اور ثبوت یہ ہے کہ دو ایک سیاح جو کسی نہ کسی طرح ان کے چنگل سے بچ کر نکل آئے انہوں نے پولیس اور اخبارات کو بتایا۔ یہ زیادہ پرانی نہیں تین برس پہلے کی بات ہے۔''

''کیا تم کسی ایسے جادوگر کو جانتے ہو جو اپنا علم سکھاتا ہو اسے جو یہ علم سیکھنا چاہتا ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''میں دو ایک جادوگروں کو جانتا تو ہوں......؟'' اس نے جواب دیا۔ ''وہ کوئی بہت بڑے جادوگر نہیں ہیں۔ ایک تو جادو سیکھنا اتنا آسان نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ اس میں بہت وقت لگتا ہے۔ تیسرا یہ کہ یہ جادوگر ہر کسی کو جادو نہیں سکھاتے اور نہ ہی شاگرد بناتے ہیں اور پھر یہ لالچی بھی بہت ہوتے ہیں۔ وہ اپنے شاگردوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹتے رہتے ہیں۔''

''لیکن میں نے یہ سنا ہے کہ جادوگر چاہے تو...... ایک دن اور دو گھنٹوں میں بھی جادو سکھا سکتا ہے؟''

''یہ تو جادوگر پر منحصر ہے۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن میں نے جو سن رکھا تھا وہ میں نے آپ کو بتا دیا۔ مجھے صرف اتنا ہی علم ہے۔''

''میں جنگل کی سیر کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''کیا تم مجھے اپنے ساتھ لے جانا پسند کرو گے؟ میں تمہیں اس کا معاوضہ دوں گا۔ میں چونکہ یہاں پہلی بار آیا ہوں اس لیے اکیلے جنگل کی سیر کرنے جانا نہیں چاہتا ہوں۔''

''آپ جنگل کی سیر کیوں اور کس لیے کرنا چاہتے ہیں؟'' اس نے دریافت کیا۔ ''آپ موٹر بوٹ

اس علاقے کی سیر کیجئے؟"

"میں ایک سیاح ہوں اور سیاحت کی غرض سے آیا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "یہاں کے جنگلات کی بڑی تعریف سنی ہے اور پھر یہاں سے جو جنگل دکھائی دے رہا ہے۔ اس کا نظارہ کتنا دل فریب ہے۔ اس کے علاوہ میں جنگل میں مقیم ان لوگوں کو بھی دیکھنا چاہتا ہوں جو صدیوں سے اپنی ہی تہذیب کے رنگ میں بسے ہوئے ہیں اور کوئی بات نہیں ہے۔"

"اگر ایسی بات ہے تو پھر ہم کل صبح سویرے ہی چلتے ہیں۔" اس نے کہا۔ "میں اپنے صاحب سے کل ایک دن کی چھٹی لے لوں گا۔ لیکن آپ کو مجھے دو سوٹا کا دینے پڑیں گے اس کے علاوہ جو اخراجات ہوں گے وہ آپ برداشت کریں گے۔"

"دو سوٹا کا کس لیے .....؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "تم بہت زیادہ رقم مانگ رہے ہو۔ کیا سوٹا کا کافی نہیں ہوں گے؟"

"ہمارا صاحب بہت ہی سخت آدمی ہے۔" وہ کہنے لگا۔ "میں اس کے پاس تین برس سے کام کر رہا ہوں۔ وہ مہینے میں صرف دو دن کی چھٹی دیتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور دن چھٹی لو تو سوٹا کا کاٹ لیتا ہے۔ میں ایک ہفتہ پہلے ہی دو دن چھٹی کر چکا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "دو سوٹا کا دوں گا۔ دیگر اخراجات میں برداشت کروں گا۔ وہاں کوئی خطرہ تو نہیں ہو گا نا؟"

"میں جو ساتھ ہوں گا۔" وہ بولا۔ "وہاں خطرے والی کوئی بات نہیں ہو گی۔ وہ لوگ بڑے سیدھے سادھے قسم کے ہیں۔ بے ضرر ہیں۔ میرا خاندان بھی پہلے جنگل میں رہتا تھا۔ پھر یہاں آ گیا۔ وہاں میرے رشتہ دار ہیں اور ہاں آپ دستی بیگ میں دو کلو نمک، دردسر، بخار، ملیریا اور فلو اور خواب آور گولیاں ساتھ لے چلیں۔ سگریٹ کے دو ایک پیکٹ بھی۔ وہاں سردار اور کچھ لوگوں کو یہ چیزیں تحفے کے طور پر پیش کر دیں۔ وہ بہت خوش ہو جائیں گے اور آپ کی بڑی عزت کریں گے۔"

سہ پہر کے وقت دادو نے مجھے موٹر بوٹ میں سیر کرائی۔ اس وقت موسم بھی بڑا سہانا تھا۔ خوش گوار ہوا چل رہی تھی۔ دھوپ میں بڑی نرمی تھی۔ پہاڑی ٹیلوں پر ایک کالونی بسی ہوئی تھی۔ وہ مجھے رنگامائی کے مہاراجا کے محل کے پاس لے گیا جو قدیم اور خوبصورت بھی تھا اور آج بھی نیا تعمیر کیا ہوا معلوم ہوتا تھا اور بھی بہت سارے ٹیلے خالی پڑے تھے۔ دو ایک بہت ہی بڑے بڑے ٹیلوں پر ہوٹل تعمیر کئے جا رہے تھے۔ دن ڈوبنے سے تھوڑی دیر پہلے ہم اپنے ہوٹل آ گئے اور اس کی چھت پر جا کر سورج کے ڈوبنے کا منظر دیکھا جو بہت ہی دل فریب لگا پھر میں اس کے ساتھ بازار گیا۔ اس نے جو فہرست بتائی تھی اس کے مطابق خریداری کی۔ جب میں ڈاک پر موٹر بوٹ میں سوار ہو کر موٹل کی طرف جا رہا تھا تو ٹیلوں پر آباد مکانوں، ہوٹلوں اور موٹلوں کی روشنیاں جل اٹھی تھیں ایسا لگ رہا تھا جیسے لاکھوں دیئے جل اٹھے ہوں۔

صبح کا اجالا پھیلتے ہی ہم دونوں نے ناشتا کیا۔ میں دستی بیگ اٹھا کر اس کے ساتھ ڈاک پر آیا۔ اس

موٹر بوٹ سے ہم جنگل جا نہیں سکتے تھے کیونکہ یہ ہوٹل والوں کی ملکیت تھی۔ مسافروں اور گاہکوں کی آمد و رفت کے لیے تھی۔ دوسری طرف ایک ڈاک اور بنا ہوا تھا جہاں سے کشتیاں جنگل کی طرف جاتی تھیں۔ جنگل سے سامان فروخت و خرید کے لیے لوگ رنگامائی آتے تھے۔ کشتیوں کی آمد و رفت صبح سے شام تک جاری رہتی تھی۔ ایک بوڑھے کشتی والے سے دادو نے کرایہ طے کیا۔

رنگامائی اور جنگل کے درمیان ایک میل کا فاصلہ بمشکل ہو گا۔ جنگل کے کنارے اترنے کے بعد میں نے کرایہ ادا کیا۔ پھر ہم دونوں جنگل کی طرف بڑھے۔ سب سے پہلے ننگ دھڑنگ بچے جو دس بارہ ہوں گے انہوں نے ہمیں دیکھا تو ایک طرف کھڑے ہو کر حیرت بھری نظروں سے دیکھنے لگے۔ میں نے بچوں کے خیال سے ٹافیاں اور بسکٹ خرید لیے تھے۔ میں نے ان بچوں کے پاس جا کر ان میں ٹافیاں تقسیم کیں تو وہ بہت خوش ہو گئے پھر ہم دونوں آگے بڑھے۔ کوئی سو گز کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ پندرہ سولہ مکان دکھائی دیئے جن کے باہر کچھ لڑکیاں اور عورتیں کھڑی تھیں۔ انہوں نے پتوں اور بوسیدہ کپڑوں سے ستر پوشی کی ہوئی تھی۔ بالائی حصہ بے لباس ہی تھا۔ وہ مجھے حیرت سے دیکھنے لگیں۔ ان میں سے ایک بوڑھی عورت نکل کر ہماری طرف آئی۔ وہ دادو سے اپنی زبان میں بڑی محبت اور گرم جوشی سے بات کرنے لگی۔ دادو نے مجھے بتایا کہ یہ اس کی رشتہ دار عورت ہے۔

دادو مجھے پہلے ملانے کے لیے اپنے سردار کے پاس لے گیا۔ وہ اردو اور کچھ انگریزی جانتا تھا۔ وہ مجھ سے کچھ دیر باتیں کرتا رہا۔ میں نے دو کلو نمک جو خریدا تھا اس کے ڈھائی سو گرام کے آٹھ پیکٹ بنائے تھے۔ میں نے اسے ایک پیکٹ اور دردسر کی گولیوں کا ایک پتا اور پانچ عدد سگریٹ پیش کیں تو وہ بہت خوش ہو گیا۔ پھر وہاں سے دادو مجھے ایک بہت بڑی جھونپڑی میں لے گیا جس میں تین چار بڑے بڑے کمرے تھے۔ ان کمروں میں صرف لڑکیاں اور عورتیں تھیں جو چادروں اور میز پوشوں پر کڑھائی کر رہی تھیں۔ یہ بھی سب نیم برہنہ تھیں۔ ایک کمرے میں سگار بنائے جا رہے تھے۔ میں نے ایک میز پوش خریدا اور ان عورتوں کو ایک ایک سگریٹ پیش کیا۔ وہ اتنی خوش ہو گئیں جیسے میں نے انہیں ہیرے پیش کئے ہوں۔ پھر میں نے نمک کے دو پیکٹ دے کر کہا کہ وہ آپس میں برابر برابر تقسیم کر لیں۔ نمک پا کر وہ اور بھی خوش ہو گئیں۔ ان میں ایک نوجوان لڑکی نے مجھے بکری کا تازہ دودھ لا کر پیش کیا تو میں نے پی لیا۔

اس جنگل میں جو مرد، لڑکے، بچے، لڑکیاں اور عورتیں تھیں ان پر جاپانی اور چینی عورتوں کا دھوکا ہوتا تھا کیونکہ ان کا رنگ دودھ کی طرح تھا۔ ناک نقشہ، قد اور جسامت میں ہو بہو ایسی ہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ چینی اور جاپانی نسل کے ہیں۔ غربت و افلاس نے انہیں لباس اور تہذیب و تمدن سے دور اور پس ماندہ رکھا ہوا تھا لیکن رنگامائی میں جو چکمہ اور مگھ قبیلے کی عورتیں اور مرد تھے وہ مہذب اور تعلیم یافتہ بھی تھے۔ ان کے اور جنگل کے باشندوں کے درمیان آج بھی صدیوں جیسا فاصلہ تھا۔

دادو مجھے ایک جھیل پر لے گیا جہاں مرد اور عورتیں مچھلیاں پکڑ رہے تھیں۔ ہم دونوں کوئی ایک بجے تک جنگل کی سیر کرتے ہوئے ایک ایسی جگہ پر آئے جو گھنے درختوں سے گھری ہوئی اور ایک تالاب کے

پاس تھی۔ان درختوں کے نیچے ایک بڑی سی کٹیا تھی۔تالاب پر کوئی نہیں تھا۔دادو نے مجھے بتایا کہ یہاں سے شمال کی جانب صرف تین میل کے فاصلے پر جادوگروں کی بستی واقع ہے۔اس کٹیا میں فرش پر ایک چٹائی بچھی ہوئی تھی جو گرد آلود ہو رہی تھی۔ایک مٹکی اور گلاس کونے میں رکھا ہوا تھا۔دادو نے اپنے رومال سے چٹائی صاف کی۔پھر وہ مٹکی اور گلاس لے کر تالاب پر پانی لانے چلا گیا۔میں چونکہ بہت تھک چکا تھا اس لیے چٹائی پر دراز ہو گیا۔بھوک بھی بڑی سخت لگ رہی تھی۔دستی بیگ میں سینڈوچز اور پیٹیز بھی تھے جو موٹل سے چلتے وقت لے کر چلے تھے کیونکہ جنگل اور یہاں کے لوگوں کا کھانا میں کھا نہیں سکتا تھا۔وہ پانی لے آیا پھر ہم دونوں نے کھانا کھایا۔وہ کھانے کے بعد بولا کہ صاحب! آپ یہاں آرام کریں میں ایک گھنٹے میں اپنے رشتہ داروں سے مل کر آتا ہوں۔

اس کے جانے کے بعد میں چٹائی پر لیٹ گیا اور سرہانے دستی بیگ رکھ کر اس پر سر رکھ لیا۔میں نے نیم برہنہ مرد،عورتوں اور لڑکیوں کو دیکھا تھا جس سے میرے جذبات بھڑک اٹھے تھے۔میں جب تک ان کے اور وہ میرے سامنے رہیں میں نے ان کی طرف دیکھنے سے اجتناب کیا۔ان کی بے حجابی تھی اور شرم مجھے آ رہی تھی لیکن میری موجودگی ان کے لیے شرم کی بات نہ تھی۔ان کی قوم کے اور ہر عمر کے مرد تھے اور دادو بھی میرے ساتھ تھا۔میں نہ تو ان سے نظریں ملا رہا تھا اور نہ ہی ان کے جسموں کی طرف دیکھنے کی کوشش کی تھی۔جب تک میں ان کے سامنے رہا اس وقت تک خود کو ایک کڑے امتحان میں پایا تھا اور کبھی ایسی آزمائش سے گزرنے کا کوئی اتفاق نہیں ہوا تھا۔میں اور رشید اس قماش کے لڑکے نہ تھے جو لڑکیوں میں دل چسپی لیتے ہیں اور ان کے پیچھے بھاگتے اور سر پر عشق کا بھوت لیے پھرتے ہیں۔دادو نے مجھ سے کہا بھی تھا کہ آپ کو ان میں سے جس عمر کی جوڑی پسند ہو بتا دیں۔اسے آپ دو عدد سگریٹ یا ایک نمک کی تھیلی کے عوض حاصل کر سکتے ہیں۔میں نے دادو کو سختی سے ڈانٹ دیا کہ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو عیاشی کرتے ہیں۔اس نے مجھ سے معافی مانگی اور کہا کہ یہاں جو سیاح آتے ہیں وہ صرف عورتوں اور لڑکیوں کے حصول کے لیے۔

میں ان عورتوں اور ان کی غربت وافلاس کے بارے میں سوچ رہا تھا جس نے انہیں پانی سے بھی ارزاں کر دیا تھا۔دفعتاً کسی بچے کے رونے کی آواز سنائی دی تو میں اچھل پڑا۔پہلے تو اس کے رونے کی ہلکی ہلکی آواز سنائی دی۔پھر اس کے رونے کی آواز تیز ہوتی گئی۔ایسا لگا کوئی لڑکی رو رہی ہو۔میں گھبرا کے کٹیا سے باہر آیا تو دیکھا کہ ایک چار برس کی ننگ دھڑنگ بہت خوبصورت لڑکی تالاب کے پاس کھڑی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہے اور ایک ہاتھ سے ایک آنکھ بھی مل رہی ہے۔میں اسے اکیلا دیکھ کر حیران و پریشان سا ہوا کہ یہ لڑکی ادھر کیسے آ نکلی۔یہ سنسان اور ویران علاقہ تھا۔میں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں کہ شاید اس کا باپ یا ماں یا کوئی بہن بھائی دکھائی دے جائے۔دور دور تک کسی آدم زاد کا نام ونشان نہ تھا۔خاموش فضا میں اس کی آواز گونج رہی تھی جو بڑی جگر خراش تھی۔اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ رہا تھا۔میں لپک کر اس کے پاس پہنچا یہ چکمہ قبیلے کی لڑکی تھی۔گوری چٹی......اس کا ناک نقشہ

ہی بتائے دے رہا تھا۔ان جنگلات میں چکمہ اور مگھ قبیلے کے لوگوں کے علاوہ کوئی اور قومیں نہیں رہتی تھیں ایک بنگالی بھی نہیں۔

وہ مجھے دیکھ کر چونکی اور سہم سی گئی۔پھر اس نے رونا موقوف کر دیا۔میں نے اس کے گالوں سے آنسو پونچھے اس کے سر کے بالوں کو چہرے پر سے ہٹا کر درست کیا پھر اس کا رخسار چوم کر پوچھا۔"کون ہو تم؟ تم یہاں کیسے آ گئیں؟"

"ماں..."اس نے صرف اتنا کہا۔وہ میری زبان اور میں اس کی زبان سمجھنے سے قاصر تھا۔

"ماں!......ماں!......؟"میں نے اتنا کہہ کر اشارہ سے پوچھا۔"کہاں ہے تمہاری ماں؟"

اس نے مخالف سمت اشارہ کیا اور صرف اتنا کہا۔"ماں!......بابا!......"

میں سمجھ گیا اس سمت شاید اس کا گھر ہے۔وہ یہاں جانے کیسے اور کس طرح آ گئی ہے۔راستہ بھول گئی ہے یا پھر جنگل بیابان کی وجہ سے گھر جانے سے ڈر رہی ہے۔میں نے اسے گود میں اٹھا لیا اور کٹیا میں آیا۔اپنا دستی بیگ اس خیال سے اٹھا کر کندھے سے لٹکایا کہ اسے اس کے گھر پہنچا کر آنے میں جانے کتنی دیر لگے۔کہیں ایسا نہ ہو کہ میری غیر موجودگی میں کوئی ادھر آ نکلے اور بیگ اٹھا کر چلتا بنے جبکہ دادو کے آنے میں بھی دیر ہے اسے گئے ہوئے ابھی دس منٹ بھی تو نہیں ہوئے ہیں۔

وہ نہ صرف پھولوں کی طرح ہلکی پھلکی بلکہ ایسی پیاری اور ایسی موہنی شکل اور بے حد سیاہ چھوٹی چھوٹی آنکھوں کی تھی کہ اس پر جاپانی گڑیا کا دھوکا ہوتا تھا۔وہ جاپانی گڑیا سے بھی کہیں دل کش تھی۔اس نے اپنی ایک بانہہ میرے گلے میں حمائل کر رکھی تھی۔دوسرے ہاتھ کی انگلی سے اشارہ کر کے بتا رہی تھی کہ اس کا گھر اس طرف ہے۔میں اسے اٹھائے اور اس سے باتیں کرتا چلا گیا اور مجھے کسی بات کا خیال اور ہوش ہی نہیں رہا تھا۔درختوں سے چھن چھن کر روشنی آ رہی تھی۔مجھے کچھ اندازہ نہ ہو سکا تھا کہ میں نے کتنی مسافت طے کر لی ہے۔

دادو نے مجھے بتایا ہوا تھا کہ جہاں یہ حدود ختم ہو کر جادوگروں کی آبادی،بستی کی حدود شروع ہوتی ہے ادھر ایک بڑا سا کتبہ نصب ہے جس پر ایک کھوپڑی بنی ہوئی ہے۔اس حدود میں داخل ہونے کے بعد وہاں جادوگروں کا حکم اور قانون چلتا ہے اور ان کی حکمرانی ہے وہ اپنی حدود سے باہر اپنے جادو سے کام نہیں لے سکتے۔خلاف ورزی کی صورت میں انہیں آگ جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔بہت سارے جادوگر اور جادوگرنیاں نیست ونابود ہو چکی ہیں۔یہ حد فاضل اس بزرگ کی کھینچی ہوئی ہے۔

ایک دم سے مجھے احساس ہوا کہ میں حد فاضل عبور کر کے جادوگروں کی بستی میں قدم رکھ چکا ہوں اور یہ بچی انگلی سے اشارہ کر کے یہاں لے آئی ہے یہ کسی جادوگرنی کی بیٹی ہے۔اس خیال کے آتے ہی میں نے اسے گود سے اتار کر پلٹنا چاہا۔اس سے پہلے کہ میں اسے گود سے اتارتا وہ میرے بازوؤں میں تڑپی اور کسمسائی۔دوسرے لمحے میں کیا دیکھتا ہوں کہ میرے بازوؤں کے حصار میں ایک بہت ہی حسین و جمیل اور پرشباب بدن کی نوجوان عورت قید ہے۔اس لحظہ یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ بچی ہی عورت بن گئی

ہے۔اس عورت نے بچی بن کر مجھے شکار کرلیا ہے۔ یہ جادوگرنی ہے جس نے مجھے مکروفریب سے ورغلایا اور مجھے اپنی حدود میں لانے میں کامیاب ہوگئی۔ میں نے اسے بازوؤں سے نکال دیا۔ بلاشبہ وہ بہت ہی حسین وجمیل اور لاجواب عورت تھی۔ ہر لحاظ سے بھرپور تھی۔ وہ میرے دل پر قیامت بن کر ٹوٹی تھی اور اس کے حسن وشباب نے مجھ پر بجلی گرادی تھی۔ اس کے انگ انگ سے مستی کا جادو ابلا پڑ رہا تھا۔ وہ ایک ایسا جادو تھا جس نے مجھے اسیر اور مبہوت کردیا تھا۔ میں ایک بت کی طرح منجمد ہوگیا تھا۔ بے جان سا، میں خود کو فراموش کر بیٹھا تھا۔ اس لمحے مچھر نے بڑے زور سے میرے گال پر کاٹا تو مجھے ایک دم سے ہوش آگیا۔ پھر یہ خیال آیا کہ جادوگرنیاں مردوں کو اپنا غلام بنالیتی ہیں۔ اسے انسان سے مکھی، پرندہ یا حیوان بنادیتی ہیں۔ گو اس کے پرشکوہ سراپا اور بدن کے جادو نے مجھے منجمد سا کردیا تھا لیکن یہ خیال بڑا روح فرسا تھا کہ میں ساری زندگی اس کا اسیر اور غلام بنا رہوں گا۔ اس خیال کے آتے ہی میں برق سرعت سے پلٹا اور اس کتبہ کی طرف دیکھا جہاں حد فاضل تھی۔ یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ میرے راستے میں دیوار بن کر کھڑی معنی خیز انداز میں مسکرا رہی ہے۔ میں نے اسے زور سے دھکا دے کر ایک طرف ہٹانا چاہا لیکن میں خود ہی لڑکھڑا کر گرا اور بے ہوش گیا۔ اس نے اپنے جادو کے زور سے مجھے بے ہوش کردیا تھا۔ ورنہ میں گر کر بے ہوش ہونے سے رہا میں کوئی شیر خوار نہ تھا۔

میں شاید کئی گھنٹے بے ہوش رہا تھا۔ اس نے شاید کسی وجہ سے مجھے بے ہوش رکھا تھا۔ اس کا اندازہ اس لیے ہوا تھا کہ جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک کمرے میں بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کمرے میں ایک بڑا سا مٹی کا دیا جل رہا تھا اور کمرے میں اندھیرا تھا اور جو کھڑکی کھلی ہوئی تھی اس میں سے گہرا اندھیرا جھانک رہا تھا۔ گویا کافی رات ہوچکی تھی۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرے میں میرے سوا کوئی نہ تھا اور میرا دستی بیگ میرے پاس ہی رکھا ہوا تھا۔ وہ جادوگرنی کمرے میں نہیں تھی۔ میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ اس وقت میرا سر بھاری ہورہا تھا۔ میں نے سوچا کہ موقع بہت اچھا ہے کیوں نہ میں بھاگ نکلوں۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہ جادوگرنی کمرے میں تمام حشر سامانیوں کے ساتھ داخل ہوئی۔ اس ملگجی روشنی میں اس کا حسن اور نکھر گیا تھا۔ وہ میرے پاس لہراتی بل کھاتی اور مستانہ خرامی سے آئی۔ اس کے بھرے بھرے سرخ ہونٹوں پر تبسم رقصاں تھا اور چہرہ دمک رہا تھا اور اس کی بڑی بڑی گہری سیاہ آنکھوں میں جیسے ہزاروں دیئے برقی قمقموں کی طرح روشن تھے۔ اس کے ہاتھ میں دودھ سے بھرا گلاس تھا۔ اس نے گلاس بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”لو یہ دودھ پی لو۔ تمہاری تھکن دور ہو جائے گی۔ تم مجھے گود میں اٹھا کر دو میل تک چلتے رہے ہو...... تم تھک گئے ہوگے۔“ اتنا کہہ کر وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی اس کی طرح رسیلی اور خوصورت تھی۔ کمرے کے سکوت میں اس کی ہنسی کی گونج جل ترنگ کی طرح بج اٹھی تھی۔

”تم ہو کون......؟“ میں نے انجان بن کر کہا۔ ”تم کیا بلا ہو؟ یہ تم نے کیا حرکت کی......؟ تم نے بچی بن کر مجھے دھوکا دیا......؟ یہ تم بچی سے عورت کیسے بن گئیں......؟ کیا تم کوئی جادوگرنی ہو......؟ جادوگرنی ہو تم......“

”میں جادوگرنی ہوں اور میرا نام رشنا ہے۔“ وہ مجھے محبت بھری نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی۔ ”میں کوئی چڑیل نہیں ہوں جو تم مجھے بلا کہہ رہے ہو۔ میں ایک حسین بلا ہوں میں نے یہ حرکت تمہیں پانے کے لیے کی...... میں نے بچی کا بہروپ بھرا...... اگر میں یہ حرکت نہ کرتی تو تمہیں حاصل نہ کرپاتی۔ اس علاقے میں جادو سے کام نہیں لے سکتی تھی اس لیے ایک بچی کا سوانگ رچانا پڑا۔ میں ایک جادوگرنی ہوں تم بھی تو کسی جادوگر سے کم نہیں ہو۔ تم نے میرا دل لوٹ لیا۔ اس لیے میں نے تمہیں لوٹ لیا۔“

”تم یہ بتاؤ کہ...... تم مجھے یہاں کیوں اور کس لیے لائی ہو؟“ میں نے پوچھا۔ ”تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟“

”میں تمہیں یہاں اس لیے لائی ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔“ وہ مجھے مستی بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔ ”اب تم یہاں میرے دیوتا اور میرے پتی بن کر رہو گے۔ میں ہر روز رات کو تمہاری سیوا اور پرستش کروں گی میں یہی چاہتی ہوں کہ تم میرے دل کے ارمان پورے کرتے رہو۔ میرے ساتھ اپنی ساری زندگی بتادو...... زندگی بہت حسین ہے۔ اس سے فائدہ اٹھاؤ۔ یہاں تم آئے ہو اپنی خوشی سے اور جاؤ گے میری مرضی سے...... میں تمہیں کہیں جانے نہیں دوں گی اس لیے کہ تم بہت ہی خوبصورت ہو...... ہمارے بچے بھی تمہاری طرح خوبصورت ہوں گے اب تم اپنے آپ کو اور اپنے گھر کو بھول جاؤ۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”تم مجھے جبروزبردستی سے روک کر فائدہ نہیں اٹھاسکتی ہو۔“ میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ”میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ تم مجھے روک نہیں سکتی ہو...... اگر تم نے میرے راستے کا پتھر بننے کی کوشش کی تو سمجھ لو کہ تمہارے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔“

”تم نہ تو یہاں سے جاسکتے ہو اور نہ ہی میرا بال بیکا کرسکتے ہو۔“ وہ ہنسی۔ ”اس لیے کہ میں تمہیں پرندہ بنا کر رکھوں گی۔“

”پرندہ......؟“ میرے جسم میں لہو خشک ہوگیا میری حالت غیر ہونے لگی۔ میں نے خود کو فوراً سنبھال کر کہا۔ ”انسان کبھی پرندہ بنا ہے؟“

”کیوں نہیں...... کیوں نہیں......“ وہ معنی خیز انداز سے ہنسی۔ ”میں تمہیں کبوتر، مرغی اور فاختہ ہی نہیں بلکہ ہاتھی، شیر، گینڈا اور گھوڑا بھی صرف چند لمحوں میں بنا سکتی ہوں لیکن نہیں...... میں تمہیں کبوتر بناؤں گی۔ کبوتر جو محبت کا پیغام رساں ہوتا ہے۔ تمہیں کبوتر بنا کر پنجرے میں قید رکھوں گی۔ رات کو پھر انسان بنادوں گی۔ سورج نکلنے تک تم انسان رہو گے۔“

”تم مجھے کچھ نہیں بنا سکتی ہو......؟“ میں نے تکرار کی۔ ”اور نہ ہی مجھے جانے سے روک سکتی ہو۔ مجھے جانے دو۔“

”اچھا تمہیں میری بات کا یقین نہیں آرہا ہے اور تم مجھے جھوٹا سمجھ رہے ہو؟“ وہ دودھ کا گلاس ایک طرف رکھ کر بولی۔ ”یہ لو......“ اس نے فوراً ہی کوئی منتر پڑھ کر مجھ پر پھونک ماری دوسرے لمحے واقعی میں

کبوتر بن گیا۔ پھر اس نے مجھے اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھالیا اور میرے پاس منہ لا کر بولی۔ ”اب یقین آیا میری بات کا۔ اب تم اس وقت کہیں جا نہیں سکتے ہو میں پھر تمہیں انسان بنادوں گی۔ کل صبح تمہیں کبوتر بنا کر پنجرے میں ڈال دوں گی۔ جب کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ تم میں قوت پرواز نہیں ہو گی۔ پنجرے میں اس لیے قید کروں گی کہیں تمہیں بلی نہ کھا جائے یا عقاب نہ لے کر اڑ جائے۔“

میں کبوتر بنا اس کی باتیں سنتا رہا۔ میں انسان کی زبان نہیں بول سکتا تھا۔ غٹر غوں غٹر غوں کر کے رہ گیا۔ میں بے بس اور مجبور سا ہو گیا تھا۔ ہر بات سن اور محسوس کر رہا تھا لیکن انسان کی گویائی سے محروم تھا۔

میں اس کے خوبصورت، سڈول اور مرمریں ہاتھوں میں اس کے رحم و کرم پر تھا۔ وہ میری گردن مروڑ سکتی اور مجھے ذبح بھی کر سکتی تھی۔ میں انسانی حالت میں اندر ہی اندر تڑپ رہا تھا وہ میرے سر کو سہلانے لگی۔ میں انسانی بولی کا ایک ایک لفظ سن رہا تھا وہ محبت بھرے الفاظ میرے کان میں انڈیل رہی تھی اور آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد اس نے مجھے بستر پر کھڑا کیا پھر مجھ پر منتر پڑھ کر پھونکا تو میں صرف ایک لحظہ میں انسانی شکل میں آ گیا۔ پھر وہ ہنس کر اور مجھے تیکھی نظروں سے دیکھتی ہوئی کہنے لگی۔ ”میرے پریمی! اب تمہیں یقین آ گیا کہ میں کیا کچھ کر سکتی ہوں؟ میں تمہیں ہر چیز لمحوں میں بنا سکتی ہوں۔

”اچھا اب تم دودھ پی لو......“ اس نے گلاس اٹھا کر میری طرف بڑھایا۔ ”آج کی رات ہم دونوں ایک ہو جائیں گے۔ ہم دونوں ایک نئے جیون کا آغاز کریں گے۔ ہماری پہلی سہاگ رات ہو گی۔“

میرے بدن میں ایک جھرجھری سی آ گئی۔ میرے سامنے جو حسین و جمیل خوبصورت عورت تھی اس کا چہرہ اور جسم اصل نہیں تھا۔ اس نے جادو کے زور سے اپنے آپ کو ایک جوان اور حسین عورت کے روپ میں ڈھال لیا تھا کہ میں اس پر مائل ہو جاؤں۔ میں اس سے نجات پانے کی تدبیر سوچنے لگا۔ گو کہ اس کا ظاہری حسن و شباب اور جسم کی کرشمہ سازیاں مجھے ورغلا رہی تھیں اور اس کا طلسم مجھے جکڑ رہا تھا۔ میرے ذہن میں ایک تدبیر آئی تو میں نے بیگ سے خواب آور گولیوں کی شیشی نکالی۔

”یہ کیا ہے؟“ اس نے میرے ہاتھ سے گولیوں کی شیشی لے لی اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ ”کیا کوئی دوا ہے؟“

”ہاں...... یہ دوا ہے۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”اسے روزانہ ایک ہفتے تک کھانے سے بیس برسوں تک جوانی سدا بہار کی طرح رہتی ہے۔ میں اسے دو تین دن سے کھا رہا ہوں اس دوا کی دوسری خوبی ہے اسے کھانے والا کبھی بیمار نہیں ہو پاتا ہے؟“

”سچ؟“ حیرت اور خوشی سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ”کیا میں بھی اسے استعمال کر سکتی ہوں؟ مجھے بھی ایک گولی دے دو۔“

میں نے شیشی میں سے چھ گولیاں نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیں۔ ”تم اسے دودھ کے ساتھ کھا لو۔ پھر میرے لیے بھی دودھ لیتی آنا۔“

مجھے توقع نہیں تھی کہ اسے میری بات کا یقین آ جائے گا۔ میرے فریب کے جال میں پھنس جائے گی۔ میرا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا جب اس نے چھ گولیاں دودھ کے ساتھ اتار لیں تو میری جان میں جان آئی۔ یوں تو اس کے لیے دو گولیاں ہی کافی تھیں لیکن اسے نیند آنے میں ایک گھنٹہ لگ جاتا۔ لیکن میں یہاں سے جتنا جلد ہو سکے نکل جانا چاہتا تھا۔ اس لیے کہ یہ عورت مجھے آلودہ نہ کر دے۔

وہ دودھ لانے کے لیے کمرے سے نکل گئی۔ دفعتاً میری نظر ایک لاٹھی پر پڑی جو دروازے کے پاس رکھی ہوئی تھی۔ اتنی دیر میں میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ اس جھونپڑی میں ہم دونوں کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔ مجھے یہ خوف دامن گیر ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو جب اس پر نیند کا غلبہ ہونے لگے تو وہ جادو کے زور سے اسے دور کر لے۔ میری ساری تدبیر الٹ جائے گی۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے وہ لاٹھی اٹھالی پھر دروازے کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے قدموں کی چاپیں سنائی دیں وہ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئی تو میں نے پوری طاقت سے لاٹھی کی ضرب اس کے سر پر لگائی۔ اس کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ کر فرش پر گر گیا۔ اس کے منہ سے چیخ بھی نہ نکل سکی۔ وہ تیورا کر فرش پر ڈھیر ہو گئی۔ اس کے سر سے خون کی ایک دھار نکل کر اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ وہ کسی لاش کی طرح ساکت تھی لیکن اس کا دھڑکتا سینہ بتا رہا تھا کہ وہ زندہ ہے۔

میں فوراً ہی اپنے دستی بیگ کی طرف بڑھا۔ دستی بیگ اٹھا کر جیسے ہی پلٹا اور دروازے کی طرف بڑھا ایک دم سے ٹھٹک کے رک گیا۔ مجھے یقین نہیں آیا۔ میری آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔ فرش پر حسین رشنا کی جگہ ایک بوڑھی عورت پڑی تھی۔ وہ زخمی ہوتے ہی اپنی اصل حالت میں آ گئی تھی۔ وہ اتنی بدصورت اور خوفناک تھی کہ شاید چڑیل بھی نہ ہو گی۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

میں اسے پھلانگ کر باہر آیا تو گھپ اندھیرا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے بائیں کندھے پر دستی بیگ لٹکا رکھا تھا اور دائیں میں لاٹھی تھی جسے میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر ساتھ لے لیا تھا۔ میں آنکھیں پھاڑے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ دائیں جانب بہت ساری جھونپڑیاں تھیں ان جھونپڑیوں میں سے کسی کسی جھونپڑی میں سے روشنی دروازوں اور کھڑکیوں سے جھانک رہی تھی۔ فضا پر ایک گہرا سکوت طاری تھا پھر میں اندازے سے ایک سمت بڑھ گیا۔ رات کے وقت جنگل میں سفر کرنا آسان نہ تھا۔ میرے پاس ٹارچ بھی نہ تھی۔ میں نے صرف فلموں میں جنگل دیکھے تھے۔ خوابوں میں نہیں...... مجھے موت کا ڈر خوف نہیں تھا۔ جادوگرنیوں کا تھا۔ رشنا کا نہیں تھا۔ اس کا دو ایک دن تک ہوش میں آنا مشکل تھا کیونکہ لاٹھی کی ضرب سے اسے اندرونی چوٹ آئی تھی۔ اس نے طاقت ور نیند کی گولیاں کھائی تھیں۔ مجھے اتفاق سے ایک ایسی پگڈنڈی مل گئی جس پر چلنا میرے لیے دشوار نہیں رہا۔ ایک گھنٹے تک اندھیرے میں چلنے سے میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہو چکی تھیں پھر بھی میں ہوشیار، چوکنا اور محتاط تھا۔ دادو نے بتایا تھا کہ جنگل میں صرف گیدڑ اور ہر قسم کے سانپ موجود ہیں۔ سانپ بھی اس وقت آدمی کو ڈستے ہیں جب وہ ان سے کوئی خطرہ محسوس کرتے ہیں۔ انہیں نہ چھیڑیں تو وہ حملہ آور

نہیں ہوتے ہیں۔ کچھ دیر بعد آسمان پر آخری تاریخوں کا چاند طلوع ہوا تو اس کی ملگجی روشنی میرے لیے غنیمت بن گئی ایک جگہ پر میری نظروں کے سامنے سے ایک دس بارہ فٹ لمبا کوبرا سانپ گزرا تو دل اچھل کر حلق میں دھڑکنے لگا تھا۔ مجھے خوف ہوا کہ کہیں وہ آگے جا کر پلٹے اور مجھ پر حملہ آور نہ ہو جائے وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ کچھ دیر بعد سانپوں کا ایک جوڑا گزرا لیکن میں محفوظ رہا۔ میں مسلسل چلتا رہا۔ صرف دو دفعہ ایک کھلی جگہ پر ستانے کے لیے رکا تھا۔ گو کہ اب کسی جادوگرنی کا خوف نہیں رہا تھا لیکن سانپوں کا تھا۔ سانپ موذی جانور تھا اس پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا تھا۔ چاندنی راتوں میں سانپ اپنے بلوں سے نکل آتے تھے۔ اب تک میں تین سانپ دیکھ چکا تھا۔ شاید میری کوئی نیکی کام آ گئی تھی جس نے مجھے ان موذی جانوروں سے محفوظ رکھا تھا۔ جب پو پھٹ رہی تھی تب مجھے دریا کی موجوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں نے دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کہ میں صحیح سمت چلا آیا تھا۔ یہ مدد من جانب اللہ ہی تھی۔ جب میں دریا کے کنارے پہنچا تو اس وقت سورج طلوع ہونے والا تھا۔ اجالا پھیل رہا تھا۔ مجھے کنارے ایک کشتی نظر آئی۔ دور سے ایسا لگ رہا تھا کہ اس میں کوئی سو رہا ہے۔ میں نے قریب جا کر دیکھا اس میں دو آدمی سو رہے تھے۔ یہ دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ ان میں دادو بھی تھا۔ دادو کو دیکھ کر میری تھکن اتر گئی۔ میں نے اسے بیدار کیا تو وہ مجھے دیکھ کر بہت حیران اور خوش بھی ہوا۔ اس نے بتایا کہ وہ مجھے کٹیا میں نہ پا کر بہت خوف زدہ ہوا رات تک جنگل میں تلاش کرتا ہوا ادھر آنکلا۔ صبح پھر مجھے تلاش کرنے کے لیے نکلنے والا تھا۔ میں نے اسے موٹل پہنچ کر سارا واقعہ سنایا۔ میں نے سارا دن اور ساری رات موٹل میں گزاری۔ دوسرے دن صبح چٹاگانگ روانہ ہو گیا۔ اس روز جمعہ تھا۔ بنگلہ دیش میں ہفتہ وار چھٹی جمعہ کو ہوتی تھی۔ تاج الدین گھر پر تھے۔ انہوں نے جلدی واپس آنے کی وجہ دریافت کی تو میں نے ان سے اتنا کہا کہ اکیلا ہونے کے باعث تفریح میں لطف نہیں آیا۔

جب میں رنگامائی سے چٹاگانگ کوچ میں آ رہا تھا سارا راستہ اس جادوگرنی رشنا کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ نہ صرف بہت بڑی بلکہ بہت خطرناک اور خوفناک جادوگرنی بھی تھی۔ اسے جادو میں بڑا ملکہ حاصل تھا۔ وہ آدمی کو جو چاہے بنا سکتی تھی۔ اس نے مجھے کبوتر بنا کر اپنی بات اور اپنا جادو سچ کر دکھایا وہ اور بھی جادو جانتی تھی۔ اس نے اپنے جادو کے زور سے اپنے آپ کو بھی یکسر بدل لیا تھا پہلے اس نے ایک بچی اور پھر ایک جوان عورت کا روپ دھارا تھا۔ جبکہ وہ اسی برس کی انتہائی بدصورت بڑھیا تھی۔ اگر میں تدبیر نہ کرتا اور خواب آور گولیاں نہ لے گیا ہوتا تو میں ساری زندگی کے لیے اس کا غلام بن گیا ہوتا۔ میں بھی رشنا جیسا ہی جادوگر بننا چاہتا تھا۔ تاج الدین اور ان کے دوست بھی کسی جادوگر کے بارے میں نہیں جانتے تھے۔ کسی ایسے جادوگر کو تلاش کرنا جو استادوں کا بھی استاد ہو جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔

کوئی ساتویں دن ہی تاج الدین کے دوست ایجنٹ نے آسام کا ویزا لا کر دے دیا۔ ایجنٹ کی فیس اور سفر کے تمام اخراجات تاج الدین نے ہی ادا کر کے مجھے بن مول خرید لیا تھا۔ وہ بڑے نیک، مخلص اور انسان دوست تھے۔ اس عظیم شخص کے جذبے کی جتنی تعریف کی جائے کم تھی۔ میں ان کی بے لوث محبت کو

کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ وہ میرے ساتھ ایک بڑے بھائی کی طرح پیش آتے رہے تھے۔

رشید مجھے لینے کے لیے ایئر پورٹ آیا ہوا تھا۔ مجھے کلکتہ کے راستے جانا پڑا تھا۔ بنگلہ دیش سے کوئی براہ راست جہاز نہیں جاتا تھا۔ رشید سے میری دو برس کے طویل عرصے کے بعد ملاقات ہوئی تھی۔ ہم دونوں شدت جذبات سے مغلوب ہو کر ملے اور آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ ایسا لگا تھا جیسے دو صدیوں کے بچھڑے ہوئے ملے ہوں۔ ایک وقت تھا کہ ہم دونوں کو ملے بغیر چین نہیں آتا تھا۔ شاید ہی کبھی ایک دن کا ناغہ ہوا ہو۔ لیکن مجبوری اور حالات نے ہمیں دو برس تک ایک دوسرے سے جدا رکھا تھا۔ اب اس سے ملاقات ہوئی تو یہ سب کچھ ایک خواب لگا تھا۔

میں نے ایئر پورٹ سے گھر جاتے ہوئے اسے رنگامائی میں پیش آنے والا واقعہ سنایا کہ میں کس طرح سے رشنا جادوگرنی کے جال میں پھنس کر اپنی تدبیر اور ذہانت سے نکل آیا ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ کیا جادوگرنی تھی۔ رشید نے کہا کہ آسام میں بھی جادوگروں کی بہتات ہے لیکن رشنا جیسا جادوگر ڈھونڈنا پڑے گا۔ پہلے تم ملازمت کرو۔ اپنے آپ کو یہاں کے حالات میں ڈھال لو۔ جادوگر بننے کی ایسی بھی کیا جلدی ہے اطمینان اور سکون سے تمہارے مطلب کے جادوگر کو ڈھونڈتے ہیں۔

رشید کے توسط اور سفارش سے مجھے بینک میں ملازمت مل گئی۔ اتنی اچھی اور ایسی ملازمت کی توقع نہیں تھی اور تنخواہ بھی اتنی کہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا جبکہ مجھے کسی بینک یا فرم میں ملازمت کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ رشید کی محبت میں یہاں نہ صرف دوچند اضافہ ہو گیا تھا بلکہ اس نے میری دل جوئی میں بھی کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ وہ کسی بات کی تکلیف نہیں ہونے دیتا تھا۔ ذرا ذرا سی بات کا خیال رکھتا تھا۔ رشید نے جو مکان کرائے پر لے رکھا تھا اس میں کل تین کمرے تھے۔ اس نے مجھے رہائش کے لیے اوپر والا کمرہ دے دیا تھا۔ جو نہایت آراستہ تھا میں یہاں آ کر بہت خوش ہوا تھا۔ دو ایک مہینے کے بعد ایک نئے مسئلے سے دوچار ہو گیا۔ اس کی وجہ رشید کی آسامی بیوی فردوس تھی۔

فردوس آسامی حسن و جمال کا ایک نادر نمونہ تھی۔ ایک پرکشش عورت...... اس میں ایسی دل فریبی جاذبیت تھی کہ وہ قدرت کا بہترین شاہکار معلوم ہوتی تھی۔ ایسی حسین عورت کسی کی زندگی میں آجائے تو وہ دنیا کا خوش نصیب ترین شخص بن جاتا ہے۔ اس لحاظ سے رشید بھی بڑا خوش نصیب تھا۔ وہ ایک متوسط گھرانے کی بیٹی تھی۔ اس کے والدین حیات تھے لیکن وہ اپنی اوقات بھول چکی تھی اور وہ اب ایک بدمزاج اور تند خو عورت تھی۔ رشید نے یہاں آنے اور ملازمت کرنے کے ایک ماہ بعد ہی شادی کر کے گھر بسا لیا تھا کیونکہ اس کی عمر اور ضروریات ایک جیون ساتھی کی متقاضی تھیں اور وہ یہاں آ کر میرے بغیر ایک خلا سا بھی محسوس کرنے لگا تھا۔

فردوس کی ایک چھوٹی بہن فرزانہ تھی۔ جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تو اس کے حسن و شباب سے بہت متاثر ہوا اور اس کے سحر کا میں اسیر ہو گیا تھا۔ میں اس پر ریشہ خطمی ہو گیا تھا۔ یہ پہلی لڑکی تھی جس نے میرے دل و دماغ پر قبضہ جما لیا تھا۔ جب میں رات سونے کے لیے بستر پر دراز ہوتا، چشم تصور میں

اس کا حسین چہرہ اور ہیجان خیز سراپا لہرانے لگتا۔ وہ اپنی بڑی بہن سے بھی زیادہ حسین تھی۔

فردوس چاہتی تھی کہ میں فرزانہ سے شادی کر لوں۔ میں بھی یہ سوچنے لگا تھا کہ کیوں نہ میں فرزانہ سے شادی کر کے گھر بسا لوں اور جادوگر بننے کا احمقانہ خیال دل سے نکال پھینکوں۔ میں جادوگر نہ سہی لیکن فرزانہ کسی جادوگرنی سے کیا کم ہے۔ جس تے مجھے پاگل کیا ہوا ہے۔ میں نے رشید کو یہ نہیں بتایا تھا کہ فرزانہ میری کمزوری بن گئی ہے اور میں اس کے بغیر رہ نہیں سکتا۔ میں شادی کر کے گھر بسانا چاہتا ہوں۔ راستے میں کوئی دیوار نہ تھی۔ فرزانہ سے شادی کرنے کے لیے فردوس نے مجھے غیر محسوس انداز سے اشارے کنائیے میں عندیہ دیا تھا۔ شاید اس نے رشید سے بھی کہا ہو۔ رشید نے کسی وجہ سے اس موضوع پر مجھ سے بات نہیں کی کیوں......؟ یہ بات وہ خود بہتر سمجھتا تھا۔

ایک روز میں فرزانہ کے سحر سے نکل آیا۔ اس کا سحر ٹوٹ گیا کیونکہ میں نے اس کی باتوں اور حرکات و سکنات سے صاف محسوس کر لیا تھا کہ وہ ایک خودسر اور آزاد خیال لڑکی ہے۔ اس کے علاوہ اسے گھر سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں ایک ایسی لڑکی سے شادی کر کے گھر کیسے بسا سکتا تھا جو ایک تتلی کی مانند ادھر ادھر اڑتی پھرتی تھی۔ اس میں شرم و حیا بالکل نہ تھی اس کی دوستی لڑکیوں کے مقابلے میں لڑکوں سے زیادہ تھی۔ مجھے ایک گھریلو لڑکی اور شوہر پرست بیوی کی ضرورت تھی۔ میں بستر کی زینت بنانے کے لیے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا جبکہ اس کے خواب بہت اونچے تھے۔ ایک روز فردوس بھابھی نے رشید اور اپنی بہن کی غیر موجودگی میں مجھ سے کہا۔ ”سکندر! تمہیں اچھی ملازمت مل گئی ہے...... اور تنخواہ بھی تمہاری اچھی ہے تم کیوں نہیں شادی کر کے گھر بسا لیتے ہو۔“

”بھابھی!“ میں نے کہا۔ ”ابھی آپ مجھے پیروں پر کھڑے ہونے اور ایک معقول رقم جمع کرنے دیں۔ جب وقت آئے گا میں آپ سے کہہ دوں گا کہ میرے لیے کوئی اچھی سی لڑکی تلاش کر دیں۔ میں آپ کو انعام و اکرام بھی دوں گا۔“

”میں نے ابھی سے تمہارے لیے ایک اتنی اچھی اور پیاری اور بہت ہی حسین لڑکی تلاش کر رکھی ہے۔“ فردوس نے کہا۔ ”ایسی لڑکیاں چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی ہیں۔ وہ چودھویں کا چاند ہے چاند...... اس کے لیے رشتوں کی بھرمار ہے۔ میں نے اسے تمہارے لیے روکا ہوا ہے۔ تم آج ابھی اور اسی وقت جواب دو۔“

”وہ لڑکی ہے کون......؟“ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ اپنی بہن کی تعریف کر رہی ہے۔

”وہ میری چھوٹی بہن فرزانہ ہے۔“ فردوس نے جواب دیا۔ ”وہ بہت حسین نہیں ہے کیا؟“

”اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کی بہن ہزاروں میں نہیں بلکہ لاکھوں میں ایک ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”وہ شخص بڑا خوش نصیب ہوگا جس کی یہ شریک حیات بن جائے۔ ابھی میرا ارادہ دو تین برس تک شادی کرنے کا نہیں ہے۔“

میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا تھا۔ جلتی پر جیسے تیل گر گیا تھا۔ وہ میری اور رشید کی دوستی سے نہ صرف بدظن بلکہ سخت متنفر ہو گئی۔ اس لیے وہ میرے ساتھ سرد مہری سے پیش آتی اور اس کا سلوک روز بروز حقارت آمیز ہوتا گیا۔ اس کے برعکس رشید کا رویہ انتہائی محبت آمیز تھا اور اس کی ہر ممکن یہ کوشش ہوتی تھی کہ میں اس کی بیوی کی کسی بھی بات کا برا نہ مانوں۔ اس کی باتیں اس کان سے سنوں اور اس کان سے نکال دوں۔ میں نے رشید سے کہہ دیا کہ تم کچھ خیال نہ کرو۔ انشاءاللہ ہماری دوستی میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔

لیکن مجھے اس بات کا خوف و خدشہ تھا کہ فردوس کی سرد مہری اور نفرت ایک دن یقیناً کوئی رنگ لائے گی۔ میرا قیاس درست ثابت ہوا۔ اس روز شام کے وقت رشید کسی کام سے گیا ہوا تھا۔ فردوس نیچے تھی۔ جب میں اوپر اپنے کمرے میں داخل ہوا تو دہلیز پر ٹھٹک کے رک گیا۔ میرے بستر پر ایک زہریلی ناگن مجھے ڈسنے کے لیے بے تاب ہو رہی تھی۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

اگر وہ سچ مچ کی ناگن ہوتی تو شاید میں اس سے ڈر نہ جاتا اور نہ ہی اتنا خوفزدہ اور دہشت زدہ ہو کر ٹھٹک کے رک جاتا۔ میری رگوں میں لہو جم نہ جاتا۔ لیکن یہ ناگن نہ تھی لیکن ناگن سے بھی کہیں خطرناک اور زہریلی تھی۔ ناگن سے تو بچا جا سکتا تھا لیکن اس سے بچنا بہت ہی مشکل اور ناممکن بھی تھا۔ مجھ میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ میں ایک قدم پیچھے ہٹوں اور دروازہ بند کر کے بھاگ نکلوں تاکہ وہ مجھے ڈس نہ لے۔ میری آنکھیں تھیں کہ اس پر جمی ہوئی تھیں۔

وہ ناگن فرزانہ تھی۔ وہ جس حالت اور جس عالم میں تھی اس کے متعلق میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ فردوس نے رشید کی غیر موجودگی میں فرزانہ کو اس بے حجابی کی حالت میں میرے کمرے میں بھیجا کہ میں اس کے حسن و شباب کے جادو میں جکڑ کر رہ جاؤں۔ میں ایک مرد تھا، اس حالت میں فرزانہ کو دیکھ کر میرا پیر پھسل جاتا۔ میری جگہ کوئی اور مرد ہوتا وہ جذبات کے طوفان کے آگے ٹھہر نہ پاتا۔ تنکے کی طرح اڑ جاتا۔ میں نے دو عورتوں کو ایک کمرے میں دیکھا تھا۔ وہ کمرہ نیچے تھا۔ فردوس نے میرے خلاف ایک سازش تیار کی ہوئی تھی۔ اس مقصد کے تحت اس نے دو عورتوں کو بلایا ہوا تھا کہ جب میں غلاظت کے دلدل میں دھنس جاؤں تو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا جائے اور یہ عورتیں گواہ بن جائیں۔ پھر میرے لئے اس کی بہن سے شادی کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہے۔ اس نے زبردست مگر بڑا گھناؤنا منصوبہ بنایا ہوا تھا۔ میری چھٹی حس نے مجھے اس خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔ ورنہ شاید میں آلودہ ہو جاتا۔ کیونکہ میں کوئی برف کا تودہ نہ تھا اور پھر وہ جس حالت میں تھی۔ زاہد کی پارسائی بھی متزلزل ہو جاتی۔ چھٹی حس نے مجھے بچا لیا تھا۔

فرزانہ جیسا کہ اپنی بہن سے نہ صرف بہت حسین تھی اور بے پناہ پرکشش تھی...... سراپا بھی ہیجان انگیز تھا...... لیکن اس کی آوارگی نے اس کے حسن اور اس کی تمام خوبیوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اس عالم میں مجھے ایک زہریلی ناگن کی طرح ڈسنا چاہتی ہے اور پھر میں نے اس کے متعلق جو کچھ سنا تھا اس کے پیش نظر میں مکھی کیسے نگل سکتا تھا۔ رات کا وقت، تنہائی اور روشنی نے اسے اور خطرناک حد تک حسین بنا دیا تھا۔ دوسری طرف شیطان مجھے ورغلا رہا، اکسا رہا اور ترغیب دے رہا تھا کہ

کنواں چل کر پیاسے کے پاس آیا ہے۔

میں نے دروازہ بند نہیں کیا اسے کھلا ہی رہنے دیا۔ پھر میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے نرمی سے کہا۔ ”فرزانہ! تمہیں اس حالت میں اور اس وقت میرے کمرے میں نہیں آنا چاہئے تھا...... یہ تمہیں زیب نہیں دیتا۔“

”سکندر!“ وہ بستر سے نکل کر اٹھ کھڑی ہوئی، اپنا لباس درست کیا، بال درست کئے پھر وہ مجھے مخمور نگاہوں سے دیکھتی ہوئی بولی۔ ”بات یہ ہے کہ تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو، اس لئے میں تم سے بات کرنے آئی ہوں۔“

”اگر تم مجھ سے باتیں کرنا چاہتی ہو تو ایسا کرو کہ نیچے جاؤ، لباس تبدیل کرو اور ڈھنگ کا جوڑا پہنو۔“ میں نے کہا۔ ”میں تھوڑی دیر میں نیچے آتا ہوں۔ بھابھی بھی نیچے موجود ہیں۔ تم چائے بنانا پھر ہم تینوں چائے بھی پئیں گے اور باتیں بھی کریں گے۔“

”میں آپا کے سامنے تم سے بات کرنا نہیں چاہتی۔“ وہ میرے پاس آ کر بولی۔ ”یہاں بھی تو باتیں کی جاسکتی ہیں۔“

”وہ کس لئے......؟“ میں نے انجان بن کر حیرت کا اظہار کیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ تنہائی میں مجھ سے کسی قسم کی باتیں کرنا چاہتی ہے۔

”اس لئے کہ آپا کو یہ بات بالکل پسند نہیں ہے کہ ہم دونوں کھل کر باتیں کریں۔ میں اور تم ان کے سامنے محبت بھری باتیں کیسے کر سکتے ہیں؟“

”یہ باتیں واقعی مناسب نہیں ہیں۔ ہم اسے کسی اور دن پر اٹھا رکھتے ہیں۔ جب رشید اور بھابھی گھر پر نہ ہوں۔“ میں نے ٹالنے کے خیال سے کہا۔ ”ہم کسی اور موضوع پر بات کریں گے۔ میں اس شرط پر نیچے آؤں گا کہ تم لباس کوئی اور پہن لو۔“

”اس لباس میں کیا خرابی ہے؟“ فرزانہ نے اپنے لباس پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا اور پھر یکایک ہنسی۔ ”کیا میں اس میں بدصورت لگ رہی ہوں؟“

”خرابی یہ ہے کہ اس میں کوئی اچھائی بھی نہیں ہے اور شریف گھرانے کی لڑکیاں ایسا لباس نہیں پہنتیں جو انہیں بے حجاب کر دے۔“

”یہ علاقائی لباس ہے......“ وہ دلفریب انداز سے مسکرائی۔ پھر مجھے تیکھی نظروں سے دیکھنے لگی۔ ”یہاں کی لڑکیاں اور شادی شدہ عورتیں بھی پہنتی ہیں اور مرد بھی چاہتے ہیں کہ عورتیں ایسا لباس پہنیں، کیونکہ اس میں بہت حسین نظر آتی ہیں۔“

”لیکن میں اس بات کو بالکل بھی پسند نہیں کرتا ہوں کہ کوئی لڑکی رات کے وقت اس لباس میں میرے کمرے میں آ جائے...... فرزانہ ایک بات سن لو...... اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ میں تمہارے اس سحر کا اسیر بن جاؤں گا اور تمہیں مہربان ہونے دوں گا تو...... یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ میں ان مردوں میں سے نہیں ہوں

جو تم سے کھیل رہے ہیں اور تم انہیں خوش کر رہی ہو۔ تم نے مجھے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ اگر تم کمرے سے نہیں گئیں تو پھر میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ نیچے بیٹھ کر رشید کا انتظار کروں گا۔“ میں نے تیز لہجے میں صاف گوئی سے کہہ دیا۔

”تم...... تم میری عزت و آبرو پر بہتان لگا رہے ہو؟“ وہ یکلخت بگڑ کر بولی۔ اس کا چہرہ تمتمانے لگا۔ ”میں تمہاری زبان کھینچ لوں گی۔“

”یہ میں نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ تمہارے محلے کے لوگ ہی کہہ رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اس میں شاید غلط بیانی نہیں ہے۔ میں ان لوگوں کے نام بتا سکتا ہوں جنہوں نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا۔ لیکن میں نے ان کی کسی بات کا یقین نہیں کیا تھا۔ کیونکہ مجھے تم پر پورا اعتماد تھا کہ تم ہرگز ایسی لڑکی نہیں ہو سکتی...... لیکن اب اس وقت اور قابل اعتراض لباس کے عالم میں اور تمہاری پیش قدمی سے ان کی باتوں کی تصدیق ہو گئی ہے۔“

اس وقت میں نے چاپیں سنیں۔ فردوس ان عورتوں کو کسی بہانے سے اوپر اور اس خیال سے لے کر آئی تھی کہ فرزانہ کا جادو مجھ پر چل چکا ہوگا۔ ہم دونوں غلاظت کے دلدل میں دھنسے ہوئے ہوں گے۔ وہ ان عورتوں کو بتائے گی کہ میں نے اس کی بہن کی جبر و زیادتی سے بے حرمتی کی ہے۔ اس حرکت کی معافی اور تلافی کی ایک ہی صورت ہے کہ میں کل ہی فرزانہ سے شادی کر لوں۔ لیکن یہاں معاملہ برعکس تھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں فرزانہ سے بہت دور کھڑا تھا اور اس سے کہہ رہا تھا۔ ”میں ایسا شخص نہیں ہوں جو اپنی بھابھی کی بہن کی عزت پر ڈاکہ ڈالوں۔“

فرزانہ مجھ سے مایوس ہو کر تین چار دنوں کے بعد ایک شادی شدہ شخص کے ساتھ کلکتہ ہوتے ہوئے فلمی اداکارہ بننے کے شوق میں بھاگ گئی۔ اسے فلمی اداکارہ بننے کا شوق ہی نہیں جنون بھی تھا۔ چونکہ اسے اب تک ایسا کوئی مرد نہیں ملا تھا جو بمبئی لے جاتا۔ جو شخص اسے لے گیا وہ نہ صرف فراڈ بلکہ اوباش اور بھونرا فطرت کا تھا۔ اس نے فرزانہ کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا تھا۔ اسے بے وقوف بنا کر لے گیا تھا۔ اسے فریب دے کر فائدہ اٹھاتا رہے گا۔ فرزانہ نے اس کے جھانسے میں آ کر اپنی زندگی تباہ کر لی تھی۔

فردوس کو معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی بہن کیسی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اسے کسی قسم کی کوئی شرمندگی نہیں ہوئی بلکہ اس کی بدمزاجی کم ہونے کے بجائے روز بروز اور بڑھتی ہی گئی۔ گھر کی فضا میں تلخیاں گھلتی گئیں۔ اس کا بس چلتا تو وہ مجھے قتل کر دیتی۔ میں نے ایسے آدمی سے بھی اسے ملتے جلتے دیکھا جو سفلی علم کا ماہر تھا۔ وہ شاید یہ چاہتی تھی کہ میرے اور رشید کے درمیان نفرت اور دشمنی کی دیوار کھڑی ہو جائے اور میں یہاں سے چلا جاؤں۔ ان تمام باتوں کو دیکھتے اور محسوس کرتے ہوئے میں نے ایک روز رشید سے کہا بھی کہ میں ایک کمرے کا مکان لے کر رہ جاتا ہوں۔ لیکن اس نے میری ایک نہ مانی اور نہ ہی مجھے کہیں اور رہنے کی اجازت دی اور ڈانٹ دیا۔

میں ہر وقت کی بک بک سے نہ صرف گھبرا گیا تھا بلکہ عاجز بھی آ گیا تھا۔ میری کچھ سمجھ میں

نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ آخر اس کا علاج کیا ہے۔ ایسا کب تک ہوتا رہے گا۔ ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ کیا ایسی کوئی صورت نہیں ہوسکتی کہ یہ سلسلہ بند ہوجائے۔ آخر ایک روز رات کے وقت بستر پر دراز ہوکر سوچتے سوچتے ذہن میں ایک تدبیر آئی تو میں خوشی سے اچھل پڑا۔ اس طرح سانپ بھی مرجائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی۔ میں یہ کرنے لگا کہ دفتر سے واپسی اور چھٹی والے دن اپنا دل بہلانے اور وقت گزارنے کے لئے شہر سے باہر نکل جاتا تھا کہ میاں، بیوی کو تنہائی میسر ہو۔ وہ سکون واطمینان سے محبت میں ڈوبے رہیں۔ زیادہ سے زیادہ وقت ایک ساتھ اور تنہائی میں گزار سکیں۔ آخر وہ میاں بیوی ہیں۔

آسام نہ صرف بہت خوبصورت ملک ہے بلکہ بڑا زرخیز ہے۔ میں جہاں جاتا تھا وہاں نشیب وفراز کی خوشگوار تنہائیوں، پرسرور خاموشیوں اور سحر آمیز یکسوئیوں میں بیٹھ کر ہری بھری وادیوں کے قدرتی حسن اور ان کے دلکش نظاروں سے لطف اٹھاتا تھا...... اور ان میں کھو جاتا تھا اور پانی کی بیلوں سے لدی ہوئی خوبصورت جنگلی پھلواری میں سکون روح تلاش کرتا۔ ساگودانہ کے تناور اشجار اور سپاری کے طرح دار درخت میرے ساتھی ہوتے اور میں اس وقت سبزے کی نرم نرم آغوش کو آغوش مادری سمجھ کر ایک غیر فانی سکون سا محسوس کرتا۔ اس وقت میں ایک عجیب وغریب سی فرحت سے سرشار ہوجاتا اور یہ کیفیت میرے لئے نشے کی سی ہوتی۔

مجھے خیال آتا کہ کیا میرا جادوگر بننے کا ارمان کبھی پورا نہ ہوگا؟ یہاں آئے اتنے دن ہوگئے یہاں کچھ جادوگروں کا پتا چلا تھا لیکن وہ اس پائے کے جادوگر نہ تھے جو میں چاہتا تھا اور جن کی ضرورت تھی۔ کچھ عام قسم کے جادوگر تھے۔ لیکن میں عام قسم کا جادوگر بننے کے مقابلے میں اسی طرح رہنا پسند کرتا تھا۔ ویسے رشید بھی بڑے جادوگروں کے بارے میں معلوم کرتا پھر رہا تھا۔ یہ جو جادوگر، شعبدہ باز اور سفلی علم کے ماہر تھے وہ کسی قیمت پر کسی بڑے جادوگر کا پتا بتانے پر تیار نہیں تھے۔ کیونکہ وہ بزعم خود اپنے آپ کو بڑا جادوگر سمجھتے تھے اور دوسرا یہ چاہتے تھے کہ میں ان کی شاگردی قبول کرکے نذرانہ پیش کرتا رہوں اور وہ مجھے اسی بہانے لوٹتے رہیں۔

سوہا...... شیلانگ سے 18 کلومیٹر پر ایک ایسا گاؤں تھا جس کی خوبصورتی کے چرچے عام تھے۔ یہ جگہ مجھے دوسرے تفریحی مقامات سے زیادہ پسند تھی۔ یہ مقام گویا حسن وتجلیات کا مرقع تھا۔ یہاں کے ذرے ذرے میں ایسی دلکشی اور جاذبیت تھی کہ وہ قدرت کا آئینہ دار معلوم ہوتی تھی۔ اس کے اطراف وجوانب کوسوں دور تک سبزے کی روئیدگی لمبے چوڑے دامن پھیلائے بشاشت ریز تھی...... جھیل نما چمکتی دمکتی رنگین شعاعوں سے ہولی کھیلتی ہوئی سحر آفرین رنگینیاں بکھیرتی تھیں جن کے کناروں پر لمبی لمبی تر وتازہ گھاس میں چمکیلے پروں والے جنگلی مرغ اپنے شوخ رنگ کے ساتھ سینہ تان کر نہایت خوش الحانی سے بانگ دیتے اور کبھی یونانی دیوتاؤں کی طرح حسین پروں کو ہوا میں پھیلا کر اڑنے لگتے۔ یہ ایک دلکش سا نظارہ ہوتا۔

میں اکثر یہاں اتوار کے روز آتا تو اس رومانی سرزمین اور خوبصورت خطے میں تنہا بیٹھ کر قدرت کی صناعی کا مطالعہ کرتا...... بعض اوقات میں یہ بھی دیکھتا کہ کوئی جوڑا یہاں اس کے سحر سے ایسا بہکتا کہ اسے

کسی بات کا ہوش نہیں رہتا۔ میں انہیں طوفان کی زد میں دیکھ کر وہاں سے چل دیتا۔ یہاں آزادانہ میل جول کوئی معیوب سی بات نہ تھی۔

ایک زمانہ تھا جب آسامی قوم میں جو ہندو مذہب کے تھے ان لوگوں میں مردہ دفن کرنے یا جلانے کا رواج بالکل نہ تھا...... یہ لوگ مردے کو علاقائی آخری رسوم کی ادائیگی کے بعد کسی خوش نما گھنے پیڑ کے نیچے رکھ دیتے جہاں وہ جنگلی جانوروں کی خوراک بن جاتا تھا۔ اب بھی کچھ لوگ ایسا کرتے ہیں۔ یہ رواج بالکل ختم نہ ہوا تھا۔ تاہم مجھے حیرت اور دکھ ہوتا کہ وہ انسانی مردے کو جانوروں کی خوراک کیوں بناتے ہیں۔ میں نے ایک شخص سے سوال کیا اور پوچھا بھی تھا۔ اس کا جواب میری تسلی وتشفی نہ کرسکا۔ اس نے کہا تھا کہ ان کے آباؤ اجداد سے یہ سلسلہ چلا آرہا ہے۔ وہ دیوتا کی خوشنودی کے لئے مردے کو جانوروں کی خوراک بناتے ہیں۔

اس لئے ان درختوں کے کنارے پر اکثر ڈھانچے بکھرے ہوئے اور شکستہ کھوپڑیاں پڑی ہوئی ملتی تھیں۔ ایک روز میں ایک خوبصورت دلدل کے کنارے بیٹھا رشید اور اس کی بیوی کے لئے مرغوں کے رنگین پر جمع کررہا تھا۔ قریب ہی ایک کہنہ سر پڑا تھا۔ میں نے غیر ارادی طور پر اسے اس لئے اٹھالیا تھا کہ اس میں پروں کو بھروں۔ پھر اس میں پروں کو بھرتا رہا۔ کیونکہ اس کام کے لئے میرے پاس کوئی اور چیز نہ تھی۔ ایسے سروں کو میں روزانہ دیکھتا رہتا تھا۔ اس لئے ڈر اور ناگواری کی بات نہ تھی۔

لیکن جب میں نے ایک شغل سے فارغ ہوکر کھوپڑی سے پر نکالے تو مجھے خیال آیا کہ یہ بھی میرے جیسے کسی انسان کا سر ہے۔ پھر میں نے سوچا کہ نہ جانے یہ شخص اپنی زندگی میں اپنے سر کو کس قدر اونچا کرکے چلتا ہوگا اور اکڑتا ہوگا...... اور نہ معلوم اس کے دماغ میں کیا کیا جوہر بھرے ہوں گے۔ پھر اس دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ میرے سامنے آگیا۔ انسانی زندگی کا ایسا دردناک انجام......؟ ہم بھولے سے بھی اپنے انجام کے بارے میں نہیں سوچتے۔ میرا دل بجھ گیا اور میں دیر تک اس کا سر پکڑے اسرار عجب پر غور کرتا رہا اور میرے دل ودماغ میں عجیب عجیب خیالوں کی یلغار ہوتی رہی۔

دفعتاً مجھے ایک عجیب وغریب خیال آیا...... امی جان مجھے بچپن میں عجیب وغریب، ڈراؤنی، دیومالائی، بے حد پراسرار اور جادوگروں کی کہانیاں سناتی تھیں۔ جنہیں سن کر نہ صرف رونگٹے کھڑے ہوجاتے تھے بلکہ میں خوفزدہ ہوجاتا تھا۔ لیکن تجسس برقرار رہتا تھا۔ وہ یہ بتایا کرتی تھیں کہ ہر انسان کی پیشانی کی ہڈی پر قسمت کا حال لکھا ہوتا ہے۔ اس تحریر کو پڑھنا انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ امی جان کی اس بات کا خیال آتے ہی میں نے اس خیال سے فوراً ہی پیشانی کی ہڈی کو غور سے دیکھا۔

پہلے جب مجھے امی کی اس بات کا خیال آتا تھا میرا دل اس بات کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ امی جان یہ بات زیب داستان کے لئے کہتی ہیں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے اور یہ بات ان کو کس نے بتائی۔ میں نے کبھی بھی اس کے متعلق ان سے دریافت نہیں کیا تھا۔ لیکن میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کھوپڑی کی پیشانی کی ہڈی پر کچھ حروف کندہ تھے اور یہ حروف نامعلوم زبان میں لکھے ہوئے تھے۔ پھر یہ خیال

آیا کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ...... یہ لکیریں شاید ہڈی کے تڑخ جانے سے بن گئی ہوں۔ شاید یہ کوئی تحریر نہ ہو۔ لہٰذا مجھے جستجو اور تجسس ہوا تو میں نے قریب ہی پڑی ہوئی دو اور کھوپڑیوں کو اٹھالیا اور ان کا بہ غور معائنہ کیا۔ ان پر بھی پہلی کھوپڑی کی طرح کچھ مرقوم تھا۔ سب کا انداز تحریر ایک ہی تھا۔ مگر حروف ہر ایک کے جدا جدا تھے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ ان کی اپنی اپنی قسمت قدرے مختلف اور الگ تھی...... امی جان نے بہر حال غلط نہیں کہا۔ آج اس کی تصدیق ہوگئی۔

میں تھوڑی دیر تک سوچ و بچار کرنے کے بعد ان تینوں کھوپڑیوں کو ساتھ لے آیا۔ میں بچپن سے پر تجسس واقع ہوا تھا اور میرا اشتیاق حد سے بڑھا ہوا تھا...... جب کوئی نئی اور انہونی چیز میرے سامنے آتی تھی اس کے بارے میں جاننے کے لئے میرا اشتیاق جنون اختیار کر جاتا تھا۔ میرے لئے فرصت میں ایک مشغلہ جیسے ہاتھ آ گیا تھا اور اس سے میرا وقت آسانی سے کٹنے لگا۔

میں روزانہ رات کے وقت تنہائی میں بیٹھ کر ان تحریروں پر دماغ سوزی کرنے لگا۔ میرے لئے وہ ایک معمہ تھا۔ میں نے اپنے کچھ دوستوں سے ذکر کیا اور ان کی توجہ اس جانب مبذول کرائی۔ لیکن وہ بھی کچھ سمجھ نہ سکے اور یہ معمہ حل نہ ہو سکا۔

دیکھتے ہی دیکھتے آٹھ نو ماہ کا عرصہ بیت گیا۔ اس دوران بینک کی جانب سے ایک منعقدہ تقریب میں میری ملاقات راحت سے ہوئی۔ اس کی عمر پچیس، چھبیس برس کی ہوگی...... وہ خوبصورت اور وجیہہ جوان تھا...... اس کے والد تجارت پیشہ تھے...... جب وہ یہاں پہلی دفعہ دہلی سے تجارت کی غرض سے آئے تو انہیں آسام بہت پسند آیا۔ اس کی دل کشی اور قدرتی نظاروں کی رعنائیوں کی وجہ سے یہاں نہ صرف مستقل سکونت اختیار کر لی بلکہ دکان بھی خرید لی تھی۔ آسام نے ان پر جیسے جادو کر کے اسیر بنا لیا تھا۔

راحت نے مجھے بتایا تھا کہ وہ دہلی میں محکمہ سراغ رسانی میں ملازم تھا...... اس نے ایک بہت ہی حسین اور نوجوان برمی لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ دراصل وہ اس سے ابھی شادی نہ کرتا کیونکہ اتنی جلدی شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے حسن و شباب کے جادو نے اسے پاگل کر دیا۔ اصل بات یہ تھی کہ اس کی شادی کرنے کے لئے اس کے والدین بہت بے چین تھے۔ اس کے ساتھ وہی کھیل کھیلا گیا جو فرزانہ کی بہن نے میرے ساتھ کھیلا تھا کہ میں فرزانہ کو آلودہ کردوں اور پھر وہ میرے سر تھوپ دی جائے۔ وہ بہت خوش تھا کہ ایک حسین اور پر شباب لڑکی جو ہزاروں میں ایک ہے۔ اس کی بیوی بن گئی۔ ایسی حسین لڑکی تو خوابوں میں بھی نہیں ملتی۔ دو تین ماہ تو بڑے ہنسی خوشی سے گزرے۔ پھر ایک دن اس کی زندگی میں دھماکا سا ہوا، بھونچال سا آ گیا۔ تب اسے پتا چلا کہ اس کی شادی پھانس کر دنیا کی حسین ترین لڑکی سے کیوں کر دی گئی تھی۔ انکشاف ہوا کہ وہ تپ دق کی مریضہ ہے۔ پھر بھی اس نے اس صدمے اور غم کے باوجود کہ اس کے ساتھ دھوکا کیا گیا اپنی بیوی کا بہت علاج کرایا۔ پھر وہ ایک برس کے بعد مر گئی۔ لیکن جاتے جاتے اسے تپ دق کی موذی بیماری دے گئی۔ وہ کیا کرتا۔ پانی سر سے گزر چکا تھا۔ لیکن بیوی نے مرنے سے قبل بہت معافی مانگی تو اس نے کہا کہ معاف کرنے والا اوپر بیٹھا ہے۔

اس کی پرورش اور تعلیم و تربیت اس کے چچا نے کی تھی۔ کیونکہ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ وہ اپنے محکمے میں ایک قابل ترین سراغ رساں مانا جاتا تھا...... اس نے ایسے ایسے پیچیدہ کیس حل کئے اور خطرناک ترین مجرموں کو گرفتار کر کے کیفر کردار تک پہنچایا کہ کوئی اور سراغ رساں ساری زندگی نہیں کر سکتا تھا۔ چونکہ وہ ایک ایسے موذی مرض میں مبتلا تھا کہ اسے مجبوراً ملازمت سے سبکدوش کر دیا گیا جبکہ وہ خود بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس کے مرض میں اور لوگ مبتلا ہو جائیں۔ پھر وہ آسام باپ کے پاس چلا آیا۔

ڈاکٹروں نے اس کی مکمل صحت یابی کے لئے شوء کی آب و ہوا مفید قرار دی تھی۔ یہ حقیقت تھی کہ یہاں تپ دق کے مریض بلاشبہ صحت یاب ہو جاتے تھے اور بہت سارے مریض شفایاب ہو کر جا چکے تھے۔ اس لئے اس کے باپ نے موضع شوء سے قریب قدرتی مناظر سے بسی ہوئی جگہ پر خودرو پھولوں کے ایک خوبصورت جنگل سے قدرے فاصلے پر ایک دیدہ زیب جھونپڑا بنا دیا تھا۔ جہاں وہ ایک پرانے ملازم کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کا ملازم اس کا ہر طرح خیال رکھتا اور اس کی خوب خدمت کرتا تھا۔

اس سے میری دوسری دفعہ ملاقات دلدل میں ہوئی تھی جہاں وہ مرغ کا شکار کرنے آیا تھا...... اسے مرغ کا گوشت بہت مرغوب تھا۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ میں نے اپنی زندگی میں کبھی ایسا عمدہ، لذیذ اور ذائقہ دار گوشت نہیں کھایا تھا۔ اس گوشت کو کھانے کے بعد آدمی سارے گوشت بھول جاتا تھا۔ اسے صرف آسامی لوگ ہی اچھا پکا سکتے تھے۔ رشید کی بیوی اس گوشت کو ایک خاص انداز اور مسالوں سے پکاتی تھی اور میں انگلیاں چاٹ لیتا تھا۔ یہ گوشت اس کی صحت کے لئے مفید بھی تھا۔

ہم دونوں کی روزانہ اس جگہ پر ملاقاتیں ہونے لگیں...... ہماری ملاقاتیں بہت جلد گہری دوستی میں تبدیل ہو گئیں۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے ایک بہت بڑا جادوگر بننے کا شوق ہے اور زندگی کا یہی مقصد ہے۔ لیکن اب تک ایسا کوئی جادوگر نہیں ملا جس سے میں جادو سیکھ سکوں۔

اس نے مجھے بتایا کہ آسام میں بھی بنگال کی طرح جادوگر اور جادوگرنیاں موجود ہیں۔ بہر حال میں کسی بہت بڑے اور ماہر جادوگر کے بارے میں معلوم کر کے بتاتا ہوں...... پھر ایک روز میں نے باتوں باتوں میں اسے اپنے خبط کے بارے میں بتایا، یعنی کھوپڑیوں کے بارے میں۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں یہ کھوپڑیاں کسی مردہ زبانوں کے ماہر کے پاس بھیج دوں...... وہی اس مسئلے کو حل کر سکتا ہے۔

بینک میں میرا ایک دوست تھا، اس نے پروفیسر ولیم جونز کا ذکر کیا جو اتفاق سے ان دنوں کلکتہ شہر ہی میں موجود تھا۔ وہ لندن نہیں گیا تھا۔ وہ اس کا طالب علم رہ چکا تھا۔ میرے دوست نے ایک سفارشی رقعہ بھی لکھ کر دیا۔ میں نے دوسرے ہی دن چند کھوپڑیاں پروفیسر ولیم جونز کو بذریعہ پارسل بھیج دیں اور میں نے انہیں ایک خط بھی لکھ کر ساتھ ہی رکھ دیا۔

میرے اس دوست جس نے ولیم جونز کا پتا دیا اور اس کے متعلق بتایا تھا اس کا نام سعید کبیر تھا۔ اس نے پروفیسر ولیم جونز کے بارے میں بتایا کہ اس نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ مردہ زبانیں سیکھنے میں گزار دیا تھا...... مجھے اس بات کی توقع تھی کہ اس ضمن میں اس بوڑھے پروفیسر سے بہت ملے گی۔ اس لئے میں بے

صبری سے اس کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

دو ماہ کے کربناک انتظار کے بعد پروفیسر کا خط آیا تو میری خوشی کی انتہاء نہ رہی۔ اس نے مجھے مفصل خط لکھا تھا...... اس نے اپنے اس خط میں اپنی ناکامی کا اعتراف کیا تھا اور لکھا تھا کہ اس کی نظر سے پہلی بار ایسی تحریر گزری ہے۔ پھر اس نے بہت تحقیق کی۔ یہ زبان تو دنیا کے کسی بھی حصے میں موجود نہیں ہے اور نہ ہی کسی کتاب میں اس کا تذکرہ ملا۔ اس کے باوجود وہ اس تحریر کو پڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

ایک روز میں سویرے ہی گھر سے روانہ ہوا...... کوئی دس بجے شوء پہنچ گیا...... راحت کا گھر یہاں سے تین میل کے فاصلے پر واقع تھا...... وہ ہمیشہ دلدل پر بارہ بجے آیا کرتا تھا...... میں اس کے انتظار میں ایک درخت کے نیچے سبزے کے مخملی فرش پر پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا۔ جہاں میرے سامنے ایک کھوپڑی تھی ...... کوئی درخت ایسا نہ تھا جس کے سامنے کھوپڑیاں نہ پڑی ہوں۔

میرے سامنے جو کھوپڑی پڑی تھی وہ جسامت میں دوسری کھوپڑیوں کے مقابلے میں قدرے بڑی تھی ...... مجھے خیال آیا کہ یہ کھوپڑی کسی عالی دماغ شخص کی ہوگی۔ مگر اس کی شکستگی اور زبوں حالی سے میرے دل پر ایک چوٹ سی لگی ...... مجھے نہ جانے کیوں ایسا صدمہ ہوا کہ اس نے میری آنکھیں نم کر دیں۔ میں نے چند لمحوں کے بعد اسے اٹھا لیا اور ایک پاگل کی طرح مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

''اے دوست ...... ! تم کیوں اتنے خستہ ہو رہے ہو......؟ وہ کون سی ایسی زبردست طاقت ہے جس نے تمہیں اس قدر پسپا کر دیا۔ آہ! تم موت کا زہریلا جام پی چکے ہو...... کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ اس کا ذائقہ کیسا تھا؟''

عین اس وقت ایک آبی پرندہ جو درخت کی شاخ پر بیٹھ کر میری طرف دیکھ رہا تھا وہ نہایت رقت آمیز آواز سے بے اختیار چیخنے لگا۔ ''تلخ...... تلخ......'' میں ایک دم سے کانپ اٹھا اور حیات فانی کی بے مائیگی پر بے اختیار رونے لگا۔

راحت کے آنے کا وقت قریب تھا...... میں نے سوچا کہ اس کھوپڑی کو پھینک دوں۔ جب میں نے اسے پھینکنا چاہا تو ایسا محسوس ہوا کہ وہ کھوپڑی مجھے اپنے اندر بے اختیار جذب کر رہی ہے اور اس نے ایک پھندا میرے گلے میں ڈال دیا ہے اور میں اس کے شکنجے میں کستا جا رہا ہوں۔ یہ سب کچھ اچانک اور دہشت زدہ کرنے والا تھا۔ میں نے سوچا کہ کہیں یہ میرا وہم تو نہیں ہے۔

اس وقت دوپہر ہو چکی تھی...... سنسان سبزہ اور خاموشی جو سارے ماحول پر طاری تھی۔ وسیع دلدل، بے حس و حرکت اشجار...... اور ہوا میں ہلکی ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔ جس سے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہوا دم توڑتی جا رہی ہے۔ چاروں طرف سناٹا اور مکمل تنہائی تھی...... اتوار کا دن تھا مگر آج کوئی ایک جوڑا بھی دکھائی نہ دیا۔ جبکہ عموماً ہر اتوار دو ایک جوڑے آ کر ایسے گوشوں میں جو درختوں میں گھرے ہوتے تھے جذبات کی رو میں بہہ جاتے۔ دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو جاتے۔ اس ویرانے کی تنہائی میں دو محبت بھرے دل آ کر محبت کو اور اپنی آتما کو بھی آلودہ کر جاتے تھے ...... یہ پہلا اتفاق تھا کہ اس اتوار کو ایک بھی جوڑا

اپنے آپ کو میلا کرنے نہیں آیا تھا۔

اس شکستہ کھوپڑی کے لمس میں جانے کیا بات تھی کہ مجھے سخت جاڑا محسوس ہونے لگا...... میرے ہاتھ پاؤں اینٹھ گئے...... خون کی گردش اور حرارت میں کمی آنے لگی...... سانس رک رک کر چلنے لگا۔ گو میری آنکھیں کھلی تھیں مگر اس پر ایک دھندی چھا رہی تھی اور آنکھوں میں غنودگی بھرنے لگی...... میں ایسا محسوس کرنے لگا کہ میں غنودگی کے گہرے سمندر میں ڈوبتا جا رہا ہوں اور بے بس سا ہو گیا ہوں۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں نرم نرم ریشمی گھاس پر دراز تھا اور میرا سر راحت کے زانو پر تھا...... وہ ایک پتے کو چمچہ بنا کر میرے منہ میں پانی ڈال رہا تھا۔ اگر وہ مجھے پانی نہ پلاتا تو معلوم نہیں میرا کیا حشر ہوتا...... یہ پانی میرے لئے امرت پانی سے کم نہیں تھا۔

جب میرے اکڑے ہوئے جبڑے ذرا نرم ہوئے تو میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے نقاہت سے پوچھا۔ ''راحت! ...... میں اس وقت کہاں ہوں......؟ یہ مجھے کیا ہو گیا تھا......؟ میں اس وقت بہت ہی شدید کمزوری محسوس کر رہا ہوں۔''

''خدا کا شکر ہے کہ تمہاری جان بچ گئی۔'' اس کے لہجے میں بے پایاں محبت نمایاں تھی۔ ''اگر میں وقت پر نہ آتا تو زندگی محال تھی...... میں تم سے ایک التجا کروں اے دوست! ...... خدا کے لئے ان منحوس کھوپڑیوں کا خیال دل سے نکال دو، ورنہ خود آسیب زدہ ہو کر رہ جاؤ گے۔''

میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ اس وقت خاموش رہا کیونکہ اس کی نصیحت یا مشورہ کھوپڑیوں کے ضمن میں ناقابل قبول تھا۔ میں نے جو ارادہ کر لیا تھا وہ مجھے اس سے باز نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس موضوع پر اس سے بات اور بحث و تکرار کرنا فضول تھا۔ وہ واپسی سے کچھ دیر قبل ایک مرغ پکڑنے کے لئے تیزی سے اس کے پیچھے لپکا تو وہ کھوپڑی جس کے طلسمی اثر سے تھوڑی دیر پہلے میں بے ہوش ہوا تھا۔ اسے فوراً ہی اٹھا کر اپنے سفری بیگ میں رکھ لیا۔ وہ معلوم نہیں کس طرح دو مرغ پکڑ لایا۔ جس میں سے مجھے ایک دے دیا۔ پھر وہ گھر چلا آیا۔

میں نے دوسرے دن رات کو نیم خوابی کی حالت میں اپنے کمرے کے اندر ایک سایہ چلتے پھرتے دیکھا...... خوف سے میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے اس کھوپڑی کے متعلق واہمہ پیدا ہوا...... میں نے سوچا کہیں یہ اس کھوپڑی کی کارستانی تو نہیں ہے......؟ لہٰذا اس کھوپڑی کو باہر پھینکنے کے ارادے سے بیگ کھولا تو میرا سینہ دھک سے رہ گیا۔ کیونکہ کھوپڑی غائب تھی۔

میرے دماغ پر اور دل میں ایک ایسا خوف چھا گیا کہ ساری رات میں بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ رگوں میں لہو سرد ہو گیا تھا۔ دہشت میرے اعصاب پر اس طرح چھا گئی تھی کہ نیند آنکھوں سے کوسوں دور ہو گئی۔ جوں ہی آنکھیں بند کرتا تو وہ کھوپڑی دکھائی دیتی۔ رات تھی کہ گزرنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ یہ سوہان روح بن گئی تھی۔

صبح میں نے کسی ضرورت سے بیگ کھولا تو کھوپڑی موجود تھی۔ بہت دیر تک سوچنے کے بعد اس

نتیجے پر پہنچا کہ رات کو شاید گھبراہٹ کی وجہ سے اچھی طرح بیگ نہیں دیکھا۔

میں تمام دن اس کھوپڑی کے خیال میں کھویا رہا...... رات پھر میرے ساتھ وہی معاملہ پیش آیا۔ میں نے اپنا شک رفع کرنے کی غرض سے فوراً ہی اٹھ کر بیگ کھولا تو کھوپڑی غائب تھی۔ رات جوں توں کر کے گزری...... صبح جب میں نے آزمائش کرنے کے لئے بیگ دیکھا تو اس میں کھوپڑی موجود تھی۔ ایک تماشا تھا جو میرے ساتھ ہو رہا تھا۔

میں بہت زیادہ دہشت زدہ ہو گیا اور اب میں اسے ایک لمحے کے لئے بھی اپنے پاس رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے اسے اٹھا کر مکان کے پچھواڑے بدھوں کے شکستہ اور قدیم مندر کی طرف پھینک دیا اور اطمینان کا سانس لیا۔ یہ میری بھول تھی، کیونکہ اس کے باوجود وہ سایہ نہیں ٹلا جس کی وجہ سے میں بہت متفکر ہوا...... خوف و ہراس میں مبتلا ہو گیا، مگر میں نے پھر بھی کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا۔ میرے خیال میں مناسب نہیں تھا۔

آخر ایک دن وہی ہوا جس کا مجھے ڈر، خوف اور اندیشہ تھا۔ میرے دل میں ایک کھٹکا لگا ہوا اور ایک پھانس سی گڑی محسوس ہوتی تھی کہ یہ کھوپڑی کسی دن کوئی گل کھلائے گی۔ ایک دن عجیب و غریب واقعہ رونما ہوا...... آدھی رات کا وقت تھا...... میں تھوڑی دیر پہلے ہی سویا تھا...... رشید کی خواب گاہ سے فردوس کی دل خراش چیخوں کی آوازیں بلند ہوئیں...... پورے گھر میں کھلبلی سی مچ گئی تھی...... میں بدحواسی کے عالم میں ننگے پاؤں دوڑتا ہوا اس کی خواب گاہ تک پہنچا۔ اس لمحے میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ فردوس کیوں چیخ رہی ہے...... کہیں کوئی سانپ یا ناگ تو کمرے میں گھس نہیں آیا۔

کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا...... کمرے میں تیز روشنی ہو رہی تھی...... رشید، فردوس کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا...... فردوس بستر پر پڑی بری طرح چیخ رہی تھی اور وہ اس کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ میں نے رشید کے کہنے پر فردوس کو سنبھالنا چاہا تو اس کا بدن یخ بستہ ہو رہا تھا وہ جیسے برف کی سل ہو یا پھر سرد لاش۔

کچھ دیر بعد فردوس کی حالت آپ ہی آپ سنبھل گئی اور اس کی چیخیں بند ہو گئیں۔ لیکن وہ بہت خوفزدہ تھی...... اس کا چہرہ سفید پڑ گیا اور لہو کی ایک بوند تک نہیں تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کے اوسان پوری طرح بحال ہوئے اور وہ بولنے کے قابل ہوئی۔

اس نے رشید کے پوچھنے پر بتایا کہ...... اسے نیند کی حالت میں ایک دم سے خون منجمد کر دینے والی سردی محسوس ہوئی جو اس کے لئے ناقابل برداشت ہونے لگی۔ جب اس نے کپکپا کر آنکھیں کھولیں تو یہ دیکھ کر اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا کہ ایک سفید سایہ اس پر جھکا ہوا ہے۔

میں نے کافی بنا کر رشید اور فردوس کو پلائی اور خود بھی پی...... جب فردوس کی طبیعت قدرے بہتر ہو گئی تو میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ میں سونے کے لئے بستر پر دراز ہوا تو بھی سو نہ سکا...... ساری رات ایک پریشان کن الجھن میں مبتلا رہا اور ساری رات اس واقعے پر غور کرتا رہا کہ اس سفید سائے سے کیسے چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے۔ میں اس کھوپڑی کو چونکہ پھینک چکا تھا، جس کا اس واقعہ سے تعلق جوڑا جا سکتا

تھا۔ یہ سفید سایہ کیوں اور کس لیے آیا اور اس نے فردوس کو کیوں پریشان کیا، یہ بات سمجھ سے بالاتر تھی۔

نیند نہیں آ رہی تھی اور صبح ہونے والی تھی۔ اس لئے میں بستر سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ رشید میرے کمرے میں آیا...... وہ کچھ مغموم اور پریشان دکھائی دیتا تھا۔ اس کی پریشانی مجھ سے دیکھی نہیں گئی۔ آخر وہ میرا دوست تھا۔ تاہم میں اس کی پریشانی کی وجہ سمجھ گیا۔ پھر وہ مجھ سے سراسیمگی سے کہنے لگا۔

''رات والے واقعے کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ تم نے اس کے بارے میں کچھ سوچا؟ کیا کسی نتیجے پر پہنچے ہو؟''

''کچھ بھی نہیں...... بھابھی کسی واہمہ سے ڈر گئی تھی۔'' میں نے سنبھلتے ہوئے جواب دیا۔ ''بھابھی نے شاید...... کوئی ڈراؤنا خواب......''

''نہیں......'' رشید نے میری بات کاٹتے ہوئے جواب دیا۔ ''صرف تمہاری بھابھی کے ساتھ ہی ایسا نہیں ہوا، بلکہ میرے ساتھ بھی یہ واقعہ پیش آ چکا ہے۔ میں نے تمہیں اس لئے نہیں بتایا...... کہ میں نے اپنا وہم سمجھتے ہوئے اسے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔''

میں نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور نہ ہی کوئی رائے دی۔ کیونکہ اب مجھے یقین ہو چکا تھا کہ یہ ساری مصیبت اسی کھوپڑی کی وجہ سے نازل ہو رہی ہے۔ اگر میں اسے بتاتا تو وہ اس بات کا شاید نہ یقین کرتا۔ رشید کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے سکوت کو توڑا۔

''میں سوچ رہا ہوں کہ اس مکان کو چھوڑ دینا چاہئے...... یہ مکان ضرور آسیب زدہ ہے...... میں تو فوراً ہی اس مکان کو تبدیل کر لوں، لیکن دفتری کام کی اس قدر بھرمار ہے کہ سر کھجانے تک کی فرصت نہیں ہے۔ اس لئے میں یہاں کچھ دن رہنے پر مجبور ہوں...... مگر میں نے فردوس کے متعلق فیصلہ کر لیا ہے کہ اسے میکے بھیج دوں۔ جب تک دوسرا مکان تلاش نہیں کر لیتا اسے وہیں رہنے دوں...... وہ کس قدر خوفزدہ ہے میں بتا نہیں سکتا۔ مجھ سے اس کی حالت دیکھی نہیں جا رہی ہے۔ بڑی مشکل سے اسے سلا کر آیا ہوں۔ تم مکان کے بارے میں کیا کہتے ہو؟''

''مجھے تم سے اتفاق نہیں ہے۔'' میں نے سمجھاتے اور دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں اور فردوس کو اس قدر گھبرانے اور خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ چونکہ اس نے اس واقعہ کا کچھ زیادہ ہی اثر لے لیا ہے۔ اس لئے اس قدر دہشت زدہ سی ہو گئی ہے اور تم بھی پریشان۔''

''نہیں دوست!'' رشید نے تکرار کی۔ ''فردوس بھی اب یہاں کسی قیمت پر رہنا نہیں چاہتی۔ میں بھی فرصت پاتے ہی دوسرا مکان تلاش کروں گا۔''

اس واقعے کے دوسرے تیسرے دن ان کے ملازمین بھی اس سفید سائے کی شکایت کرنے لگے۔ اس کے ملازمین اس کے گھر کے عقب میں ایک جھونپڑے میں رہتے تھے۔ تمام لوگوں میں خوف اور اداسی کی لہر دوڑ گئی...... سبھی دہشت زدہ اور سہمے سہمے سے دکھائی دینے لگے۔

ایک روز میں نے کسی خیال کے زیر اثر اپنا بیگ کھولا تو اچھل پڑا۔ دہشت سے میرا بدن لرزنے

لگا۔ کیونکہ وہ کھوپڑی بیگ میں موجود تھی۔ یا پھر شاید اس کھوپڑی کو کسی نے لاکر میرے بیگ میں رکھ دیا تھا۔ سوال یہ تھا کہ اسے لانے والا کون تھا؟"

☆......☆......☆

فردوس، موضع پٹلنگ کے ایک زمیندار کی بیٹی تھی...... اچانک اس کا باپ زمین دار کیسے بن گیا تھا اور اس کے پاس دولت کہاں سے آئی یہ ایک راز تھا۔ موضع پٹلنگ شیلانگ سے سات میل کے فاصلے پر پہاڑوں کے دامن میں واقع تھا...... رشید اپنی بیوی کو لے کر اپنے سسرال جا رہا تھا۔ سرشام ہی اسباب بندھ گیا تھا اور رات کو تمام لوگ سکھ اور آرام کی نیند سو گئے تھے۔ لیکن صبح جب فردوس بیدار ہوئی تو اس نے دیکھا کہ الماری کھلی پڑی ہے اور چابیوں کا گچھا تالے میں لٹک رہا ہے...... وہ صندوقچہ جس میں فردوس کے زیورات رکھے ہوئے تھے۔ وہ صندوقچہ سمیت غائب تھے۔ اس کا سینہ دھک سے ہو کر رہ گیا تھا۔

یہ بہت قیمتی زیورات تھے جو شادی کے بعد اس کے باپ نے زمیندار بننے کے بعد دیئے تھے۔ ایک روز مجھے رشید نے اعتماد میں لے کر بتا دیا تھا کہ اس کے سسر کو کوئی مدفون خزانہ ملا ہے جس نے اس کی حالت ایک دم بدل دی۔ وہ راتوں رات ایک ایسا اور اتنا بڑا دولت مند بن گیا کہ اس علاقے میں اس کا شاید ہی کوئی ہمسر ہو۔

فردوس کے باپ نے دو باغ اور بہت ساری زمینیں بھی خرید لی ہیں اور اب وہ ایک حویلی نما بہت بڑے مکان میں رہائش پذیر ہے۔ اس نے اپنی بیٹی کو جو زیورات دیئے ہیں وہ قدیم معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی بناوٹ اور ڈیزائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کسی شاہی محل سے چرا کے زمین میں دفن کر دیئے گئے تھے...... جس نے ان زیورات کو دفن کیا تھا وہ یا تو وہ جگہ بھول گیا یا پھر مر گیا...... یہ زیورات اس لئے بھی قیمتی تھے کہ ان میں ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ بیش قیمت ہی نہیں بلکہ خوبصورت اور نادر قسم کے تھے۔

فردوس زیورات کا صندوقچہ نہ پا کر صدمے سے بے ہوش ہو گئی تھی۔ عورتوں کو زیورات سے جتنا جذباتی لگاؤ اور اس کے استعمال کا شوق اور جنون ہوتا ہے شاید ہی کسی اور سے ہو۔ زیورات ان کی سب سے بڑی کمزوری ہوتی ہے۔ پورے گھر میں ایک بھونچال آ گیا اور شور سا مچ گیا تھا...... کچھ دیر بعد اسے ہوش آیا تو ملازموں کو بلا کر پوچھ گچھ کی گئی یہ ضروری تھا۔

اس کے ملازم بہت ہی ایماندار تھے اور ایسی مذموم حرکت نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ایسا کوئی راستہ نہ تھا کہ جس سے چور تو کیا ملازم بھی داخل ہو سکے...... فردوس نے بتایا کہ اس نے رات بستر پر دراز ہونے سے قبل صندوقچہ اور ان میں رکھے ہوئے زیورات کو ایک دو مرتبہ دیکھا اور صبح پہن کر جانے کے لئے ایک سیٹ کا انتخاب بھی کیا تھا اور پھر اس نے چابیوں کا گچھا سرہانے رکھا تھا...... اس نے کمرے کو اچھی طرح بند کر کے چٹخنی بھی لگائی تھی۔ جب سے اس کے پاس زیورات آئے تب سے وہ ان کا بڑا خیال رکھتی اور حفاظت کرتی تھی۔ پھر پولیس کو بھی اس چوری کی واردات کی اطلاع دی گئی۔ پولیس نے آ کر سب سے پہلے ملازمین سے پوچھ گچھ کی، کیونکہ پولیس کو پہلے ملازمین ہی پر شک ہوتا ہے۔ لیکن وہ

ان پر شک نہ کر سکی۔ پھر اس نے اچھی طرح سے محل وقوع کا جائزہ لیا۔ مکان کے اندر اور باہر بھی پیروں کے نشان نہ ملے۔ چور نے اپنے کسی قسم کے نشان اور اپنا سراغ نہ چھوڑا تھا۔ پولیس نے تحقیقات میں کوئی تین گھنٹے صرف کئے۔ بہت جھک ماری مگر وہ کسی نتیجے پر پہنچ نہ سکی۔ آخر اس نے اپنی ناکامی کا اعتراف کر لیا اور جاتے جاتے اتنا کہہ گئی کہ یہ کسی بہت بڑے چور کا کام ہے۔

فردوس روتی دھوتی مایوس ہو کر میکے چلی گئی۔ کیونکہ پولیس نے کہہ دیا تھا کہ چور کو پکڑنے میں تین دن بلکہ تیس دن بھی لگ سکتے ہیں۔ شاید وہ کہیں مسروقہ زیورات بیچتا ہوا پکڑا جائے۔ اس کے سوا چارہ بھی نہ رہا تھا کہ وہ چلی جائے۔ کیونکہ اب چور مل سکتا تھا اور نہ ہی زیورات...... پولیس نے یہ امید اپنی نااہلی اور ناکامی پر پردہ ڈالنے کے لئے دلائی تھی۔

میرے دل کے کسی کونے میں ایک خوف بھی دامن گیر ہو گیا تھا کہ کہیں فردوس مجھ پر شک نہ کرے اور مجھے مورد الزام نہ ٹھہرا دے۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا...... میں دل میں خدا کا شکر بجا لایا۔ کیونکہ اس کے دل میں میرے خلاف جو نفرت بھری تھی وہ بڑھی تھی کم نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ اس کی بہن کے کسی آشنا کے ساتھ بھاگنے کا ذمے دار وہ مجھے گردانتی تھی۔ کیونکہ میں نے اس سے شادی نہیں کی تھی۔

رشید کا معمول یہ تھا کہ وہ ہر ہفتہ کی شام اپنے سسرال چلا جاتا تھا اور اتوار کا دن گزار کر پیر کی صبح وہاں سے واپس آ جاتا تھا۔ چونکہ پولیس کی تحقیقات کا سلسلہ ابھی جاری تھا اس لئے میرا گھر پر رہنا ضروری تھا۔ پولیس اس کیس میں اس لئے دلچسپی لے رہی اور سرگرمی دکھا رہی تھی کہ فردوس نے زیورات کی بازیابی پر پولیس کو نقد انعام دینے کا اعلان کیا ہوا تھا۔ میں پولیس کی آمد و رفت کے باعث کئی اتوار راحت سے ملنے نہ جا سکا۔ پولیس اتوار کے دن ہی آ ٹپکتی تھی۔ میرا دل اس سے ملنے کے لیے بے چین ہوا جاتا تھا۔

آخر ایک روز میں نے تنگ آ کر پولیس انسپکٹر سے کہا کہ میں اتوار کو گھر پر نہیں رہوں گا۔ گھر کی چابی ملازم کے پاس ہوگی۔ آپ اس سے کہیں گے تو وہ گھر کا دروازہ کھول دے گا۔ پھر میں اتوار کے دن راحت کے گھر کی طرف چل پڑا۔ مجھے اس بات پر دکھ اور حیرت ہوئی تھی کہ راحت مجھ سے ملنے کے لئے کیوں نہیں آیا جبکہ ہم دونوں ایک دوسرے کے گہرے دوست بن چکے تھے۔ میرا نہ آنا اس کے لئے تشویش کا باعث کیوں نہ بنا...... میں نے سوچ لیا تھا کہ نہ صرف شکوے شکایتوں کا پٹارہ کھول دوں گا بلکہ اس کی خوب خبر لوں گا۔

اس کے گھر کی طرف جاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ میں جادوگر بننے کی حسرت دل میں لئے تو میں مر جاؤں گا۔ میرا خواب پورا ہونے کا دور دور تک کوئی امکان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پھر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اب میں خود کسی بڑے جادوگر کی تلاش میں سرگرداں ہو جاؤں گا۔ اب میرے پاس اتنی بڑی رقم پس انداز ہو چکی تھی کہ میں دنیا کے کسی کونے میں بھی جا سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ مصر یا افریقہ جانا زیادہ بہتر ہوگا۔ ان دونوں ممالک میں آج بھی ہر قسم کے جادوگروں کی بہتات ہے۔ رشید اور راحت نے بھی اس سلسلے میں میری کوئی مدد نہیں کی تھی۔ میرے لئے اب ایک ایک دن کسی صدی کی طرح بھاری اور

اذیت ناک ہوتا جارہا تھا۔ صبر نہیں ہو رہا تھا۔

جب میں نے راحت کے گھر کے دروازے پر دستک دی تو دروازہ تھوڑی دیر میں کھلا۔ میں ایک دم سے اچھل پڑا۔ جیسے برقی جھٹکا لگا ہو۔ مجھے لگا کہ دروازے پر لاش کھڑی ہو۔ اسے دیکھتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور ایک سنسنی میری ریڑھ کی ہڈی میں کسی چاقو کی نوک کی طرح اتر گئی اور رگوں میں خون منجمد ہونے لگا۔ میں مضبوط اعصاب کا مالک نہ ہوتا تو غش کھا جاتا۔

چند لمحوں کے بعد احساس ہوا کہ یہ لاش نہیں ہے بلکہ راحت ہے۔ وہ یکسر پہچانا نہیں جاتا تھا...... اس کا جسم سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا اور وہ ہڈیوں کا پنجر لگ رہا تھا۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی دمک اور ایک غیر مرئی رونق دکھائی دیتی تھی اور آنکھوں میں بجلی کی سی چمک تھی۔

جب اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو وہ سرد نہیں گرم تھا۔ وہ مجھے اندر لے گیا۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ کہتا اس نے شکوے شکایتوں کا دفتر کھول دیا۔ میں نے اس سے کہا کہ اس نے یہ اپنی حالت کیا بنا رکھی ہے تو اس نے کہا۔

"میں کوئی دس دنوں تک بخار کی حالت میں تپا اور ہذیان بکتا رہا ہوں...... بخار تھا کہ اترنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ ڈاکٹر کی دوا اور انجکشن سے بھی کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ پھر میں نے ایک سنیاسی کو دکھایا۔ اس کی ایک ہی پڑیا سے بخار اتر گیا...... اب مجھے بھوک بھی خوب لگتی ہے، پیٹ بھر کر تینوں وقت کوئی تین دن سے کھانے لگا ہوں۔ اب صرف کمزوری رہ جاتی ہے۔ سنیاسی کا کہنا ہے کہ مجھے مکمل صحت یاب ہونے میں چھ سات دن لگ جائیں گے۔ میں پھل زیادہ سے زیادہ کھاؤں۔"

میں سورج ڈوبنے سے کچھ دیر پہلے تک اس کے پاس رہا۔ دوران گفتگو جب میں نے اسے رشید کے ہاں پراسرار اور سنسنی خیز چوری کا احوال سنایا تو اس نے ایک سراغ رساں کے انداز میں سارا واقعہ سنا...... پھر اس نے مجھ سے کچھ سوالات کئے۔ پھر وہ کسی گہری سوچ میں غرق ہو گیا۔ پھر کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ پھر ایک لمبی سرد آہ بھر کے کہنے لگا۔

"کاش! مجھ میں اتنی طاقت اور سکت ہوتی کہ میں تمہارے ساتھ اس وقت چل کر وہاں جا سکتا۔ پولیس ساری زندگی اس واردات کا سراغ نہیں لگا سکتی، کیونکہ اس کی سوچ اور طریقہ تفتیش فرسودہ ہے...... انہیں صرف شک کرنا اور بے مقصد لوگوں کو پکڑ کر حوالات میں بند کرنا اور تشدد کرنے اور ایذائیں پہنچانے کا فن آتا ہے۔ تم میری صحت کے لئے دعا کرو کہ میں جلد اچھا ہو جاؤں، میں وہاں آ کر نہ صرف چٹکیوں میں سراغ لگا لوں گا بلکہ مسروقہ مال بھی برآمد کرادوں گا۔ یہ کون سی بڑی بات ہے۔ تمہاری بھابھی نے زیورات کی بازیابی پر جو انعام مقرر کیا ہے وہ تم لے لینا۔"

اس نے مجھے اپنی پیشہ وارانہ زندگی میں پراسرار چوریوں کے سنسنی خیز واقعات سنائے جو ناقابل یقین قسم کے تھے۔ جس کے اس نے فوراً سراغ لگا لئے تھے...... اس کے ان واقعات سننے میں آسانی سے وقت کٹ گیا۔ وہ واقعات بے حد دلچسپ بھی تھے۔ میں اس کی ذہانت پر عش عش کر اٹھا تھا۔ اگر وہ بیمار نہ

ہوتا اور ملازمت کر رہا ہوتا تو وہ شرلاک ہومز جیسا مقام حاصل کر لیتا۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ صحت یاب ہونے کے بعد وہ واقعات کہانی کی شکل میں لکھ کر کسی اخبار یا رسالے کو بھیج دے۔

راحت سے ملاقات کے پورے سات دن کے بعد یعنی ہفتہ کی سہ پہر کو رشید اپنی بیوی کے پاس سسرال چلا گیا...... اس نے مجھ سے کہا بھی تھا کہ میں بھی اس کے ساتھ سسرال چلوں۔ چونکہ فردوس کو ہم دونوں کی دوستی ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ اس لئے میں نے جانے سے گریز کیا۔ فرزانہ سے چھوٹی اس کی ایک بہن تھی۔ اس کا نام شمشاد تھا۔ وہ ایک روز اپنی بڑی بہن سے ملنے کسی رشتہ دار عورت کے ساتھ آئی۔ وہ خریداری کے لئے آئی تو ادھر بھی کچھ دیر کے لئے آئی تھی۔ وہ سولہ برس کی تھی لیکن اس کی اٹھان بیس برس کی لڑکی کی سی تھی۔ اس سن میں وہ بڑی پرشباب گداز بدن کی تھی۔ شعلہ جسم تھی، آفت تھی، قیامت تھی، دونوں بہنوں کے مقابلے میں بے انتہا حسین اور پرکشش...... حالانکہ وہ زیادہ دیر نہیں رہی لیکن جتنی دیر بھی رہی مجھے تیکھی اور خود سپردگی کی نظروں سے دیکھتی اور اپنی نمائش کرتی رہی۔ وہ فرزانہ سے بھی دو ہاتھ آگے تھی۔ میں محض اس کے خیال سے بھی نہیں گیا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ رات کے کسی وقت میرے گھر میں آ کر مجھے ڈس لے اور وہ میرے پلے باندھ دی جائے۔ وہ اس قسم کی تھی کہ مجھ پر مہربان ہونے سے نہیں چوکتی۔

اور پھر میں اتوار کا دن راحت کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا اور اس سے وعدہ کر کے بھی آیا تھا۔ رشید کے جانے کے بعد میں اکیلا تھا۔ بینک میں کام سے فارغ ہو کر گھر آیا تو بے حد تھکا ہوا تھا۔ اس لئے بستر پر دراز ہو گیا' پھر ایسی گہری نیند سویا کہ کچھ ہوش ہی نہیں رہا۔ رات کے دس بجے تک گھوڑے بیچ کر سوتا رہا...... اگر مجھے ملازم کھانے کے لئے جگاتا نہیں تو شاید دوسری صبح ہی آنکھ کھلتی۔

کھانے سے فراغت کے بعد میں کھڑکی کے سامنے بیٹھا سگار پی رہا تھا۔ یہ آسامی قبائل کا بنایا ہوا سگار تھا جو میں کبھی کبھی رات کے وقت کھانا کھانے کے بعد پی لیتا تھا۔ اس سگار کی بڑے بڑے ملکوں میں مانگ تھی۔ یورپ اور امریکہ بھی برآمد کیا جاتا تھا۔

چاندنی رات تھی اور چاند اپنے پورے جوبن پر تھا۔ دودھیا چاندنی کا منجمد دریا چاروں طرف دکھائی دیتا تھا۔ فرحت بخش ہوا کے لطیف جھونکے روح کو تازگی بخش رہے تھے...... نس نس میں ایک انوکھا اور لطیف سا ماحول بھر گیا تھا...... مجھ پر پرانی شراب کا خمار چھایا ہوا تھا۔ بعض اوقات میں ایسی کیفیت سے دوچار ہو جاتا تھا۔ اس طرح بیٹھے بیٹھے وقت گزرنے کا احساس بالکل بھی نہیں ہو سکا۔ ملازم بھی جا کر گہری نیند سو گیا۔ ایک بج گیا تھا۔ پورے گھر پر ایک ویرانی اور سناٹا چھا گیا۔

دفعتاً مجھے ہوا کے سن سناتے جھونکوں سے ایک ملی جلی خفیف سی آواز سنائی دی...... مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی میرا نام سرگوشی کے انداز میں پکار رہا ہے...... میں نے سوچا کہ کون ہو سکتا ہے؟ اس وقت کون آ سکتا ہے؟ میں نے اسے اپنا واہمہ سمجھ کر جھٹک دینا چاہا۔ لیکن پھر دوبارہ خفیف سی آواز سنائی دی۔ میں نے سوچا کہیں بینک میں کام کرنے والا کوئی ملازم نہ ہو...... کیوں کہ آج بینک کے کھاتے میں گڑبڑ ہو گئی تھی۔ اس کا خیال آتے ہی میں فوراً ہی نیچے تیزی سے آیا۔ جب میں نے دروازہ کھول کر دیکھا تو وہاں کوئی بھی موجود نہ

تھا۔ جب میں دروازہ بند کر کے واپس جانے لگا تو ایک ہلکی سی کھڑکھڑاہٹ محسوس ہوئی۔

یہ آواز مکان کے عقب سے سنائی دی تھی۔ کسی نے عقبی دروازے پر دستک دی تھی۔ پھر میں کمرے اور صحن سے ہوتا ہوا دروازے پر پہنچا۔ میں نے دروازہ کھولنے سے پہلے یہ نہیں پوچھا کہ کون ہے؟ میں نے بے دھڑک دروازہ کھول دیا۔

ہمارے اس مکان کے پیچھے بدھوں کا ایک ویران، قدیم اور شکستہ مندر تھا۔ جس کے بیرونی احاطے میں گنجان درخت تھے۔ خودرو گھاس اونچی اونچی اگی ہوئی اور بے ترتیب سی تھی۔ گو کہ چاندنی رات تھی۔ تاحد نگاہ تک دودھیا چاندنی کا منجمد دریا دکھائی دیتا تھا۔ مگر آسمان پر گہرے کالے بادلوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے...... کوئی کوئی ٹکڑا چند لمحوں کے لئے چاند کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیتا تو اس کے دھندلے سائے چاند کی دودھیا روشنی کو داغدار بنا دیتے تھے۔ چاروں طرف ایک ایسی ہولناک خاموشی طاری تھی جو دل پر ہیبت طاری کر رہی تھی۔ ایک پراسرار اور انجانا سا خوف محسوس ہو رہا تھا۔

آسام کی تمام آبادی سکوت اور ابدی نیند میں جیسے مدہوش تھی...... پتوں کی کھڑکھڑاہٹ سے ایسا لگا تھا کہ کوئی بدروح درختوں پر بسیرا کئے ہوئے ہے۔ عقبی دروازے پر کوئی موجود نہ تھا۔ شاید میری سماعت کا فتور تھا۔

جب میں چاروں طرف کا بغور جائزہ لے چکا تو معاً میری نگاہ مندر کے احاطے کی شکستہ دیوار کی منڈیر پر پڑی تو میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا...... میں نے ایک سفید سایہ دیکھا جو واضح نہیں تھا...... خوف کی ایک لہر نے میرا خون خشک کر دیا...... میں ڈر کر دروازہ بند کرنے ہی والا تھا کہ نادیدہ آواز نے پھر میرا نام لے کر پکارا۔

کیا یہ آواز کسی انسان کی ہو سکتی ہے......؟ میرے دل نے کہا۔ یہ آواز ایسی بے رس، ویران اور کھوکھلی تھی جیسے قبروں کی تہہ سے نکلی ہو یا کسی گہرے کنویں کی تہہ سے پکارا گیا ہو...... اس آواز کو سن کر میں دہشت زدہ ہو گیا اور میرا بدن لرزنے لگا۔ تاہم میں نے حوصلہ کر کے اپنے حواس قابو میں کئے۔ اپنی طاقت مجتمع کی، پھر اس پراسرار کھوپڑی کا خیال آیا...... کہیں وہ تو نہیں پکار رہی ہے؟ میں نے سوچا کہ پوچھوں تو سہی کہ وہ کون ہے جو اس پراسرار اور وحشت ناک انداز سے پکارے جا رہا ہے۔

"تم کون ہو......؟" میں نے ہمت کر کے لرزیدہ سی آواز میں پوچھا۔ "تم کہاں ہو؟...... سامنے آؤ؟"

"میں راحت ہوں......" اس بھونڈی کرخت اور بے کس آواز نے جواب دیا۔ "کیا تم نے میری آواز نہیں پہچانی......؟"

"راحت......!" حیرت اور تعجب کے ملے جلے احساس سے میں کانپ اٹھا...... میں نے سوچا کہ کیا کروں؟ پھر مجھے دوستی اور مروت کے خیال سے آواز کی سمت بڑھنا پڑا...... سفید سایہ متحرک تھا۔ لیکن مجھے اس کے قریب جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اس خیال سے کہ اس کھوپڑی کا نہ ہو۔ مجھے یاد آیا کہ اس کھوپڑی نے مجھے کس شکنجے میں کسا تھا۔

پھر میں نے اسے شناخت کر لیا۔ وہ سفید سایہ کسی بدروح کا نہیں تھا۔ وہ سچ مچ راحت ہی تھا۔ قریب پہنچ کر اس کی پہچان ہو گئی تھی۔ میں نے بہ مشکل اپنی آواز میں نرمی پیدا کرتے ہوئے پوچھا۔ "یار راحت!...... تم اتنی رات کو یہاں کیسے آئے......؟"

"میں تمہارے دوست کا مسروقہ مال برآمد کرنے آیا ہوں۔" راحت نے چند لمحوں کے بعد کہا۔

"لیکن یار! یہ کوئی وقت ہے آنے کا......؟ تم دن یا شام میں سے کسی بھی وقت آ سکتے تھے......؟"

"کیا میں نے تم سے وعدہ نہیں کیا تھا کہ صحت یاب ہوتے ہی سب سے پہلے تمہارا یہ کام کروں گا؟" راحت نے جواب دیا۔ "میں جس سے ایک بار کوئی وعدہ کر لیتا ہوں تو اسے پورا کرنے کے لئے یہ نہیں دیکھتا کہ دن ہے یا رات، طوفان ہے یا بارش......"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے میں تمہارے اس جذبے کی قدر کرتا ہوں۔" میں نے اس کی باتوں سے متاثر ہو کر کہا۔ "لیکن ایک بات تو بتاؤ؟"

"ایک نہیں دس باتیں پوچھو، بتاؤں گا۔" راحت سپاٹ لہجے میں بولا۔ "تم کیا معلوم کرنا چاہتے ہو؟"

"دراصل میں یہ بات معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ...... یہ تم اس راستے سے اس قدر پراسرار انداز سے کیوں آئے؟" میں نے پوچھا۔

"تمہیں ایسا محسوس ہوا ہے...... جبکہ اس میں نہ تو حیرت کی بات ہے اور نہ ہی کوئی پراسراریت اور کون نسا راستہ تھا......؟"

"اچھا یہ تو بتاؤ کہ تمہاری آواز کو کیا ہو گیا؟ وہ اس قدر بدل کیوں گئی ہے؟"

"میری آواز کو کیا ہو گیا ہے......؟" اس نے متعجب لہجے میں پوچھا۔ "کیا تم میری آواز میں کوئی تبدیلی محسوس کر رہے ہو؟"

"ہاں......" میں نے سر ہلاتے ہوئے اثباتی لہجے میں کہا۔ "میں تمہاری آواز پہچان نہیں سکا...... نہ صرف اجنبی بلکہ یکسر بدلی ہوئی اور عجیب سی محسوس کی...... اب بھی ایسا لگ رہا ہے کہ تمہارے گلے میں سے کسی اور کی آواز نکل رہی ہے۔"

"ایک منٹ ابھی اس کا سبب بتاتا ہوں۔" اس نے قدرے دیر بعد کہا۔ "اس سنیاسی نے مجھے آج جو دوا دی ہے وہ اس قدر کڑوی اور گرم تھی کہ بتا نہیں سکتا...... پگھلے ہوئے سیسے کی طرح گرم تھی۔ اس نے میرے تن بدن کو جیسے اندر سے بری طرح کھولا دیا اور اس کے اثر سے میری آواز بھی بدل گئی ہے...... اف! اس کے تلخ اور ناگوار ذائقے کا اثر اب تک میری زبان پر موجود ہے...... اس نے میری آواز بھونڈی، بے ہنگم اور پھنسی پھنسی سی بنا دی۔ میں کیا کروں دوست......؟"

اس وقت راحت کا آنا مجھے سخت ناگوار اور گراں گزرا تھا...... اور پھر عجیب اور پراسرار انداز بھی، جس سے میں نے ایک خوف سا بھی محسوس کیا تھا...... اس کے علم میں یہ بات تھی کہ راشد سہ پہر کے وقت اپنے سسرال چلا جاتا ہے...... میں شام سے صبح تک گھر میں اکیلا ہوتا ہوں...... اتوار میں گھر میں گزار

تاہوں...... میں جو چوری کے اس واقعے کے بعد کئی اتوار اس سے ملنے نہیں گیا۔ اس بات نے اس کے دل میں شک پیدا کر دیا تھا کہ میں ہفتہ کی رات اور اتوار کا دن اور رات شراب سے دل بہلاتا ہوں۔ کیونکہ میں مرد ذات ہوں۔ تجرد کی زندگی گزار رہا ہو۔ اس عمر میں مرد لوگ عورت کے بغیر رہ نہیں پاتے ہیں۔

میں نہ تو رنگین مزاج تھا اور نہ ہی اس قماش کا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر میں فرزانہ کو دل بستگی کا سامان سمجھ لیتا۔ اور پھر ان حسین اور نوجوان اور کمسن آسامی لڑکیوں سے اپنی راتیں حسین کرتا اور اپنا دامن داغ دار کرتا جاتا۔ یہ حقیقت تھی کہ آسام اور بنگال میں عورت بہت حقیر اور پانی سے بھی ارزاں تھی۔ اس کے باوجود میں نے اپنے آپ کو آلودہ نہیں کیا تھا۔ میں ہر عورت کو عزت واحترام سے دیکھتا تھا۔ وہ جسم فروش عورتیں اور لڑکیاں مجھے دعوت گناہ مالی مجبوریوں کی بناء پر دیتی تھیں۔ میں انہیں اتنی رقم دے دیتا تھا۔ میری اس شرافت کی وجہ سے یہاں میری بہت عزت تھی۔ شاید یہ دیکھنے کے لئے راحت اچانک اور غیر متوقع طور پر آیا تھا کہ کہیں میں غلاظت کے دلدل میں تو دھنسا ہوا نہیں ہوں؟

''چلو......'' میں نے اس سے کہا۔ ''گھر میں چل کر بیٹھو۔'' اس خیال سے میں نے کہا کہ اس کے دل میں کوئی شک ہو تو وہ دور ہو جائے۔ ''میں تمہارے کے لئے کافی بناتا ہوں جو میرے دوست نے خاص طور پر کلکتہ سے لا کر دی ہوئی ہے۔''

''نہیں دوست!'' راحت نے معذرت کے انداز میں کہا۔ ''میں نہ تو اندر جاؤں گا اور نہ ہی کافی پیوں گا۔'' وہ بے حد سنجیدہ ہو رہا تھا۔

''یقین کرو کہ کافی اتنی اچھی ہے کہ ایک کپ پینے کے بعد دوسرے اور پھر تیسرے کی فرمائش کرو گے۔ ایسی کافی تم نے شاید ہی پی ہوگی۔''

''دراصل کافی، چائے اور کسی بھی قسم کا مشروب پینے سے سنیاسی نے مجھے بڑی سختی سے منع کیا ہوا ہے۔'' وہ بولا۔

''یہ کیا بات ہوئی۔'' میں نے متعجب لہجے میں کہا۔

''چلو...... کافی چائے نہ پیو...... لیکن گھر کے اندر چل کر بیٹھنے میں اور بات کرنے میں حرج ہی کیا ہے؟''

''دراصل میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ میں صبح تک رہوں۔'' اس نے کہا۔ ''کیونکہ مجھے پو پھٹنے سے پہلے ہر قیمت پر واپس جانا ہے۔''

''اگر ایسی بات ہے تو تم کیوں آئے......؟'' میں نے قدرے تلخی سے کہا۔ ''تمہاری باتیں گول مول اور سمجھ سے بالاتر ہیں۔''

''میں نے تم اسے ابھی کہا ہے نا کہ میں تمہارے عزیز دوست کی بیوی کے مسروقہ زیورات برآمد کرانے آیا ہوں۔ تم سے وعدہ کیا تھا نا؟'' وہ بولا۔

''مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ تم اپنے گھر والوں سے چوری چھپے آئے ہو۔'' میں نے کہا۔ ''کیا

تمہارے گھر والے دہلی سے آئے ہوئے ہیں......؟''

وہ میری بات سن کر خاموش رہا۔ نہ جانے کیوں اس نے میری اس بات کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ وہ عجیب اور پر اسرار سا ہو گیا تھا...... میں نے چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد کہا۔ ''تو کیا تم ابھی اور اسی وقت واپس چلے جاؤ گے......؟ رات میرے ہاں رکو گے نہیں......؟''

''ہاں......'' راحت نے سر ہلا کر کہا تو اس کی آواز بہت پست تھی۔ ''ایسا کرو تم فوراً ہی میرے ساتھ چلو، ورنہ پھر بہت دیر ہو جائے گی۔''

نہ جانے کیوں مجھ پر خوف وہراس طاری ہو گیا...... جب میں اس کے ساتھ چلنے لگا تو میرے قدم لڑکھڑانے لگے۔ مجھے اپنے پیر نہ صرف منوں بھاری لگ رہے تھے بلکہ بے جان بھی...... اس نے میری یہ حالت بھانپ لی، پھر اس نے افسوسناک لہجے میں کہا۔

''کیا تمہیں میری ذات سے خطرہ محسوس ہو رہا ہے؟ تمہارا چہرہ زرد پڑ گیا ہے، میں تمہارا دوست نہیں ہوں کیا؟''

''نہیں دوست......!'' میں نے دل کڑا کر کے کہا۔ آواز گلے میں پھنس سی رہی تھی۔ ''ایسی کوئی بات نہیں۔ لیکن یہ بتاؤ کہ جانا کہاں ہے؟''

''بس تم میرے سنگ خاموشی سے چلو۔'' وہ قہقہہ مار کر ہنسا تو اس کی ہنسی بھونڈی، بے ہنگم اور سماعت پر گراں گزری۔ ''تمہیں خود ہی معلوم ہو جائے گا۔''

میں لاجواب ہو گیا۔ چونکہ ساتھ چلنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ اس لئے طوعاً و کرہاً اس کے ہمراہ ہو لیا۔ وہ میرے کام سے آیا تھا اور ان مسروقہ زیورات کی بازیابی بہت ضروری تھی۔ اس لئے نہیں کہ وہ بیش قیمت اور میرے دوست کی بیوی کے تھے، اس لئے کہ میری پوزیشن نازک تھی۔ فردوس کا شک شاید مجھ پر ہی تھا اور وہ میرے دوست کی وجہ سے خاموش تھی۔ کیونکہ رشید میرے خلاف کچھ نہیں سن سکتا تھا۔

☆......☆......☆

بدھ کا یہ شکستہ و ویران اور غیر آباد مندر اپنی کہنگی اور قدامت کے لحاظ سے مافوق الفطرت خیال کیا جاتا تھا۔ اس کے بارے میں بہت ساری کہانیاں زبان زد عام تھیں۔ جسے سن کر ایک خوف اور دہشت سی محسوس ہوتی تھی۔ لوگ اسے بھوت پریت کا مسکن کہتے تھے اور کہتے تھے یہاں خوفناک شکل کی چڑیلیں چاندنی راتوں میں آتی ہیں اور مندر کے اندر ہال میں صبح ہونے تک رقص کرتی ہیں اور لاشیں لا کر خون پیتی رہتی ہیں۔ اگر بھولے سے کسی نے چڑیل دیکھ لی تو وہ اس کی خوفناک اور مکروہ شکل دیکھ کر نہ صرف بے ہوش ہو جاتا تھا بلکہ ایسا تیز بخار چڑھ جاتا تھا جو دو مہینے تک رہتا اور کسی علاج سے بھی ٹھیک نہیں ہو پاتا۔

اس کے علاوہ اس آبادی کے بڑے بوڑھے حلفیہ کہتے تھے کہ انہوں نے دن دہاڑے درختوں پر سینکڑوں اور ہزاروں چراغ جلتے دیکھے۔ ان کی روشنی اس قدر تیز ہوتی ہے کہ آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ اس کے متعلق بہت ساری روایتیں مشہور تھیں۔

میں نے ہمیشہ ان روایات اور سنسنی خیز اور تحیر انگیز کہانیوں کا مذاق اڑایا تھا۔ کیونکہ انہیں عقل تسلیم نہیں کرتی تھی۔ میں تو ہم پرست نہیں تھا۔ میں نے جدید تعلیم حاصل کی ہوئی تھی۔ میں فرسودہ باتوں اور واقعات کو من گھڑت قرار دیتا تھا۔ لیکن اس وقت راحت مندر کے احاطے میں داخل ہو رہا تھا تو وہ تمام روایتیں نقوش ذہن کی سطح پر ابھر ابھر کر پائے استقلال کو لڑکھڑا رہے تھے۔ میں اندر ہی اندر بڑا خوفزدہ اور پریشان ہو رہا تھا۔ میں جو بڑا تیس مار خان بنتا تھا، اب میری حالت ایک بزدل کی سی ہو رہی تھی۔

وہاں ایسی پر ہیبت خاموشی، ہولناک سناٹا اور بھیانک ویرانی تھی کہ میرے لئے ایک قدم اٹھانا بھی منوں بھاری لگ رہا تھا۔ ایسی پراسرار فضا طاری تھی کہ دل بیٹھا جا رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں نے کس معیبت کو دعوت دے دی۔ کاش! میں نہ آتا۔ مجھے مسروقہ مال سے زیادہ اپنی جان عزیز تھی۔ مجھے پچھتاوا ہو رہا تھا کہ میں نے کیوں اس کے ساتھ چلنے کی حامی بھر لی اور پھر اس نے مجھے کیوں ساتھ لے لیا۔ اگر وہ سراغ رساں تھا تو وہ میری غیر موجودگی میں بھی مسروقہ مال لا کر دے سکتا تھا۔ میں اب اکیلا واپس بھی تو نہیں جا سکتا تھا۔

میں چلتے چلتے رک گیا تو راحت نے بھی رک کر حیرت سے میری شکل دیکھی۔ ”کیا ہوا میرے دوست!...... تم رک کیوں گئے؟“

”یار! لعنت بھیجو مسروقہ مال پر......“ میں نے کہا۔ ”واپس چلتے ہیں۔ مجھے جانے کیوں خوف محسوس ہو رہا ہے۔“

”جب میں ساتھ ہوں تو اس میں ڈرنے اور گھبرانے کی کیا بات ہے؟“ راحت نے ہمت بندھائی۔ ”خاموشی سے چلتے رہو۔ تمہارا بال تک بیکا ہونے نہیں دوں گا۔ اس مندر کے متعلق جو روایات مشہور ہیں وہ سب جھوٹی اور بے سروپا ہیں۔ ان کے بارے میں نہ سوچو۔“ راحت نے میرا حوصلہ کچھ ایسا بڑھایا تھا کہ میں اس کے ساتھ چلنے پر مجبور ہو گیا۔ اس کی موجودگی سے بھی حوصلہ ہو رہا تھا۔

مندر کے احاطے میں درختوں کی کثرت، جھاڑیوں اور بیلوں کی افراط کی وجہ سے گھپ اندھیرا تھا۔ ایسا اندھیرا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ میں آنکھیں پھاڑے دیکھتا جا رہا تھا اس کے علاوہ اونچی اونچی گھاس جو قد آدم بھی تھی۔ اس میں چلنا دشوار تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا...... چل رہا تھا اور مجبور تھا۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ راحت اس طرح اس مقام پر چل رہا تھا جیسے وہ تارکول کی سڑک پر چل رہا ہو۔ اسے کوئی رکاوٹ نہیں لگ رہی تھی۔ نہ اس پر کسی چیز کا اثر ہو رہا تھا۔ وہ بے پرواہ اور بے نیاز سا تھا۔

لیکن میں اس کے برعکس اندھوں کی طرح ٹٹولتا اور بری طرح ڈگمگاتا ہوا چلنے لگا۔ خاردار جھاڑیوں کی رگڑ سے میرے کپڑے پھٹ گئے۔ جبکہ راحت کے کپڑے ہر طرح سے محفوظ رہے۔ اور ان پر ایک رگڑ تک نہیں آئی جو میرے لئے تعجب خیز تھا۔ میرے منہ اور ہاتھ پر بھی خراشیں آ گئیں۔ اگر میں اپنے آپ کو سنبھال کر احتیاط سے نہیں چلتا تو پھر میں شاید شدید زخمی ہو جاتا۔ کبھی کبھی میں اس طرح جھاڑیوں کے ساتھ ٹکراتا کہ جنگلی پرندے خوفزدہ ہو کر پھڑپھڑاتے ہوئے گھونسلوں سے باہر نکل آتے اور چیخنے بھی لگتے تھے۔

آخر ایک جگہ راحت میری نظروں سے اچانک غائب ہو گیا۔ کس سمت میں...... مجھے کچھ اندازہ نہ ہو سکا۔ ایسا لگا جیسے اسے کسی بھوت نے نظروں سے غائب کر دیا ہو۔ یہ حرکت کسی چڑیل کی بھی ہو سکتی تھی۔

میں دم بخود سا تھا اور میرے پیر ساکت و جامد ہو کر زمین کا حصہ بن گئے تھے۔ میرے خیال میں راحت کو کسی بد روح ہی نے اٹھا لیا تھا۔ اس میں شک وشبہ اس لئے بھی نہیں تھا کہ وہ اچانک اس طرح غائب ہو گیا تھا جیسے گدھے کے سر سے سینگ...... میں نے جو سنا ہوا تھا وہ یہ تھا کہ اس مندر میں بھوت بسیرا کرتے ہیں انہیں کسی انسان کا مندروں کے احاطے میں رکنا سخت ناگوار لگتا تھا۔ شاید انہوں نے اس لئے راحت کو غائب کر دیا تھا۔ مجھے اس لئے غائب نہیں کیا تھا کہ راحت مجھے ساتھ لے کر آیا تھا۔ بھوتوں کو ہر بات کا علم ہو جاتا ہے۔

میں نے چاہا کہ بھاگ جاؤں۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا کس سمت جاؤں۔ واپسی کا راستہ کون سا ہے...... گھپ اندھیرے کی وجہ سے باہر نکلنے کا راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا...... درخت، گھاس اور جھاڑیاں سب سے بڑی رکاوٹ تھیں۔ اس مندر کا احاطہ بہت بڑا اور چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ اس میں اتنے درخت اور جھاڑیاں تھیں کہ اس کی عمارت نظر نہیں آتی تھی...... میں نہ صرف حیران و پریشان بلکہ خوفزدہ بھی تھا اور میری رگوں میں لہو برف کی طرح یخ ہو رہا تھا۔

پھر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ راحت کا انتظار کرنے کے بجائے مجھے واپس جانا چاہئے...... اندازے سے تو میں جا سکتا ہوں۔ چاند کے طلوع ہونے میں ابھی کچھ دیر باقی ہے۔ پھر میں اس کی چاندنی کی رہنمائی میں آسانی سے اس احاطے سے باہر نکل جاؤں گا۔

جب میں نے واپسی کی کوشش کی تو باوجود پوری قوت صرف کرنے کے میں مڑ نہ سکا...... مجھے ایسا لگا کہ کسی نادیدہ طاقت نے مجھے بری طرح بے بس کر دیا ہے۔ میں اس کے رحم و کرم پر ہوں...... میں نے وہیں کھڑے کھڑے راحت کو دو ایک مرتبہ آواز دی کہ وہ اندھیرے کے باعث مجھ سے بچھڑ کر بھٹک گیا ہے۔ شاید اندھیرے میں مجھے تلاش کر رہا ہو۔ لیکن مجھے کوئی جواب نہیں ملا۔

تھوڑی دیر تک میں خود فراموشی کی حالت میں کھڑا رہا۔ میرے دل کی حالت غیر ہو رہی تھی اور نبض ڈوبتی محسوس ہو رہی تھی...... ایک عجیب سی بات یہ ہوئی کہ میں نے آگے کی جانب قدم بڑھایا تو کوئی رکاوٹ نہ ہوئی...... نہ ہی اس نادیدہ طاقت نے مجھے روکا۔ لیکن جب میں نے واپس ہونا چاہا تو اس طاقت نے واپس نہ ہونے دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ نادیدہ طاقت مجھے کشاں کشاں آگے کی طرف کھینچ رہی تھی۔

یکا یک اس خاموش اور ہولناک فضا میں چیخوں کی آواز بلند ہوئی۔ میں ایک دم سے اس طرح اچھل پڑا جیسے ہزار وولٹ کا شدید جھٹکا لگا ہو یا پھر نادیدہ طاقت نے مجھے اچھال دیا ہو...... یہ آواز ایسی دلخراش اور لرزہ خیز تھی کہ کوئی کمزور دل کا آدمی سنتا تو بے ہوش ہو جاتا۔ یہ آواز کچھ ایسی تھی جیسے کسی متورم گلے یا زخمی دہن سے نکل رہی ہو۔ میرا دل اچھل کر حلق میں دھڑکنے لگا اور میرے پسینے چھوٹ گئے۔

یہ چیخ کسی انسان کی ہو ہی نہیں سکتی تھی...... کوئی زخمی درندہ تھا یا پھر کوئی بد روح...... میرا خیال

یکا یک راحت کی طرف چلا گیا کیونکہ اس کی بدلی ہوئی آواز ایسی بھونڈی، کرخت اور بے روح تھی کہ سماعت پر بہت ہی گراں گزرتی تھی۔

چند لمحوں کے بعد میں نے محسوس کیا کہ نادیدہ طاقت مجھے کشاں کشاں آگے کی طرف لئے جا رہی ہے۔ مجھے اپنے آپ پر اختیار نہیں رہا تھا۔ یہ اسرار میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ میں نے اپنے آپ کو آگے بڑھنے سے روکنے کے لئے اپنی پوری طاقت جمع کر لی۔ لیکن اس سے کچھ بھی حاصل نہ ہو سکا۔ عجیب سی بات یہ تھی کہ میں نے اپنے بدن اور ہاتھ پر کچھ بھی محسوس نہیں کیا تھا۔ میں چلتا گیا۔ میری حالت ایسی ہو رہی تھی کہ میں کسی بھی لمحے زمین پر کسی کٹے ہوئے درخت کی طرح گر سکتا تھا۔ کچھ دور آگے جا کر مجھے صاف زمین دکھائی دی...... یہاں جو فرش تھا وہ پتھر کا تھا، جس کے درمیان بوسیدہ اور قدیم ترین مندر کھڑا تھا۔ اس کی تعمیر اور اینٹیں بتا رہی تھیں کہ وہ کس قدر قدیم ہے۔

عین اس وقت چاند نے اپنے اوپر سے نقاب کا کونا سرکایا تو چاروں طرف دودھیا چاندنی بکھر گئی...... اس کپکپاتی چاندنی میں، میں نے جو کچھ دیکھا اس نے مجھے بھونچکا کر دیا...... وہ منظر میرے لئے ناقابل یقین تھا۔ میں نے دیکھا کہ راحت ایک تناور درخت کے قریب کسی سے دست و گریبان ہے...... میرے دل کی دھڑکن خطرناک حد تک تیز ہو گئی۔ ایسا لگا جیسے میرا سینہ شق ہو جائے گا۔ دل باہر پھڑپھڑاتا ہوا نکل آئے گا۔ میرے پاؤں کو زمین نے جیسے اپنے شکنجے میں کس لیا تھا اور میں اپنی جگہ سے جنبش تک نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ دلخراش چیخوں کی آواز انتہائی حد تک خطرناک تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی خبیث روح آہنی زنجیروں میں جکڑی ہوئی چیخ رہی ہے۔ میں ایسا حواس باختہ اور دہشت زدہ ہوا کہ ایک قدم بھی آگے نہ جا سکا۔

راحت چونکہ سفید براق لباس میں تھا، اس لئے وہ سفید سائے کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن وہ جس سے دست و گریبان تھا وہ اس لئے دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ اس کا لباس سیاہ تھا اور شاید وہ خود بھی سیاہ تھا۔ اس کے علاوہ اس کی جانب گھنا درخت اور گہرا اندھیرا تھا...... وہ یقیناً کوئی خبیث روح ہی تھی کیونکہ میں نے ایک دو مرتبہ اس کے لمبے سفید دانت اندھیرے میں چمکتے دیکھے تھے...... لیکن کیا ایک انسان خبیث قسم کی روح سے نبرد آزما ہو سکتا ہے......؟ وہ حریف شاید روح نہ ہو اور اس نے ایسا لبادہ پہن رکھا ہو کہ اندھیرے میں مجھے اس کے دانت ایک روح کی طرح محسوس ہو رہے ہوں۔ پھر بھی ماجرا میری کچھ سمجھ میں نہیں آ سکا۔

تھوڑی دیر بعد راحت کا حریف چیختا چلاتا ہوا ایک جانب بھاگ گیا۔ پھر فضا پر سناٹا چھا گیا۔ ماحول پہلے جیسا ہو گیا۔ پھر میں راحت کی جانب تیزی سے بڑھا۔ راحت نے درخت کی کھوہ میں ہاتھ ڈال کر کچھ نکالا۔ وہ کیا چیز تھی، مجھے اندھیرا ہونے کے باعث نظر نہ آ سکی۔ پھر وہ برق سرعت سے گھوما اور برق سرعت سے ہی واپس چلنے بھی لگا۔ واپسی میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ میں نے چلتے ہوئے راحت سے دو ایک سوال کئے۔ اس نے میرے ایک سوال کا جواب بھی نہیں دیا۔ اس کی خاموشی نہ صرف بہت پراسرار تھی بلکہ مجھے زہر بھی لگ رہی تھی۔

جب ہم دونوں مندر کے احاطے سے باہر آئے تو اس نے ایک سیاہ چرمی تھیلی میری طرف بڑھا دی۔ ”یہ لو...... میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔“

”کیسا وعدہ......؟“ میں نے اس کے ہاتھ سے چرمی تھیلی لیتے ہوئے اس سے حیرت سے پوچھا۔ تھیلی پھولی ہوئی اور وزنی تھی۔

”اس میں تمہارے دوست رشید کی بیوی فردوس کے چوری ہونے والے زیورات ہیں۔“ راحت نے جواب دیا۔ ”چور نے زیورات صندوقچے میں سے نکال کر اس چرمی تھیلی میں رکھ دیئے تھے تا کہ وہ اور حفاظت سے رہ سکیں۔“

میں نے تھیلی کا منہ کھول کر اندر جھانکا...... تین زیورات جو ہیرے جواہرات کے تھے جگمگا رہے تھے۔ ”کیا چور نے یہ زیورات اس مندر کے احاطے میں چھپا رکھے تھے؟“ میں نے تھیلی کا منہ بند کرتے ہوئے پوچھا۔ ”یہاں کس لئے......؟“

”ہاں...... اس لئے کہ اس سے محفوظ جگہ کوئی اور نہیں ہو سکتی تھی۔“ راحت نے جواب دیا۔ ”پولیس کو کیا اس کے فرشتوں کو بھی خیال نہیں آ سکتا تھا کہ مسروقہ مال یہاں چھپایا جا سکتا ہے اور پولیس کو خیال آتا بھی تو وہ ادھر کبھی نہ آتی۔“

”لیکن تمہیں اس بات کا کیوں کر خیال آیا کہ چور نے مسروقہ زیورات یہاں چھپائے ہوئے ہوں گے؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”تم جانتے ہو کہ میں ایک بہترین سراغ رساں رہ چکا ہوں۔ میں دوسرے سراغ رسانوں سے ہٹ کر سوچتا ہوں۔“ راحت نے جواب دیا۔ تم مجھے ایک حکیم سراغ رساں سمجھ لو۔ میں نے تمہاری زبانی چوری کا احوال سنا تو میرا ذہن مندر کی طرف چلا گیا۔“

”لیکن تمہاری باتیں سمجھ سے بالاتر ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔ آج میں نے تمہارا نیا اور غیر معمولی روپ دیکھا ہے۔“

”دوست! بات صرف اتنی سی ہے کہ میں کچھ سفلی علوم بھی جانتا ہوں۔“ راحت مسکرایا۔ لیکن اس کی یہ مسکراہٹ مجھے بڑی عجیب اور پراسرار سی لگی۔ ”میں نے ایک آسامی جادوگر سے کچھ علوم سیکھے۔ اس نے یہ علوم مجھے اس لئے سکھائے تھے کہ میں نے اس کی جوان بیٹی کا اپنے خرچ پر آپریشن کرایا تھا۔ وہ برسوں سے بیمار چلی آ رہی تھی۔ اس سے میں نے بہت فائدہ اٹھایا سراغ رسانی میں بھی۔ اچھا اب اجازت دو۔ میں چلتا ہوں۔“

”ایسی بھی کیا جلدی ہے صبح چلے جانا۔“ میں نے کہا۔

”گھر چلو...... وہاں چل کر بیٹھتے اور باتیں کرتے ہیں۔“

”نہیں...... نہیں......“ وہ بدحواس سا ہو کر بولا اور اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اس کے سراپے میں ایک ارتعاش سا اٹھا۔ ”ایک مجبوری ہے۔“

"گھر میں نہ بیوی نہ بچے......" میں نے ہنس کر کہا۔ "صرف تمہارے والدین آئے ہوئے ہیں ......شاید تم اس لئے صبح جانا نہیں چاہتے ہو کہ انہیں شک ہو جائے گا کہ تم اپنی کسی محبوبہ سے ملنے گئے ہو۔ یہاں حسین اور جوان لڑکیوں کی بڑی بہتات ہے اور ان کا کردار بھی اچھا نہیں۔"

"چلو......تم یہی سمجھ لو۔" اب جو وہ مسکرایا تو اس کی مسکراہٹ معنی خیز تھی۔ "اس لئے میں واپس جانا چاہتا ہوں۔ والدین جوان بیٹوں پر شک کرتے ہیں خصوصاً راتوں کو گھر سے غیر حاضر رہنے پر......جبکہ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں تم سے کیا وعدہ پورا کرنے آیا تھا۔ تمہیں شاید اس کا یقین نہ آئے۔"

"لیکن یہ تو بتاتے جاؤ کہ چور کون تھا......؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔ "کیا تم بتا سکتے ہو، اس کے بارے میں؟"

"تم چور کے بارے میں جان کر کیا کرو گے......؟" راحت نے جواب دیا۔ "کیا یہ کافی نہیں کہ زیورات سارے مل گئے۔ کیا یہ خوشی کی بات نہیں؟"

"یہ نہایت ضروری ہے۔" میں نے تکرار کرتے ہوئے کہا۔ "ایک تجسس سا ہے اور اشتیاق بھی ہے چور کے بارے میں جاننے کا۔ کہیں گھر کا کوئی ملازم تو نہیں ہے......اگر ہے تو اسے نکالا جائے۔ تاکہ پھر کبھی ایسی واردات کی نوبت نہ آئے۔ اسے سزا تو ملنی چاہئے نا؟"

"اچھا......" وہ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا......دیوار کے ساتھ جو چبوترہ تھا وہ مجھے لے کر اس پر بیٹھ گیا۔ "اس چوری کی واردات میں گھر کا کوئی ملازم شامل نہیں ہے۔ وہ سارے ملازم ایماندار اور شریف ہیں۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ میں سنائے دیتا ہوں۔"

اتنا کہہ کر راحت خاموش ہو گیا اور کچھ سوچنے لگا۔ پھر اس نے سوچوں کی دنیا سے نکل کر کہنا شروع کیا۔

"آج سے دس برس پہلے کی بات ہے۔ موضع پٹلنگ میں ایک لڑکی رہتی تھی۔ وہ بہت ہی حسین وجمیل تھی۔ اس کے چہرے کے خدوخال میں ایسا تیکھا پن اور ایسی جاذبیت تھی کہ وہ دل کی اتھاہ گہرائیوں کو چھو لیتی تھی۔ اس کی ستواں ناک اس کے چہرے کی سندرتا میں اضافہ تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں بہت ہی سیاہ اور چمکدار تھیں۔ اس کے گھنے چمکدار سیاہ بال اتنے لمبے تھے کہ کمر پر چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح بل کھاتے تھے......اس کے حسن کی کرشمہ سازیاں واضح تھیں اور سراپا بے مثال تھا۔ وہ حسن وجمال کا ایسا شاہکار تھی کہ اسے جو دیکھتا دل تھام لیتا تھا۔ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے صرف لڑکے ہی نہیں شادی شدہ مرد بھی بے تاب رہتے تھے۔

اس میں پندارِ حسن بھی اس قدر تھا کہ وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ اس کے عشق میں بہت سارے نوجوان گرفتار تھے۔ لیکن اسے کوئی جوان پسند نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ کو کسی شہزادی یا مہارانی سے کم نہیں سمجھتی تھی۔ اس نے بڑے بڑے زمینداروں اور دولت مند گھرانوں کے لڑکوں کے رشتے بھی ٹھکرا دیئے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ اس سے شادی کرنے کوئی شہزادہ آئے گا۔ وہ اس کے سپنے دیکھا کرتی تھی۔

ایک تو وہ گھر سے بہت کم نکلتی تھی۔ جب نکلتی تھی تو مردوں کے دل دھڑکنا بھول جاتے تھے......جو لڑکے اس کی محبت کی آگ میں جل رہے تھے وہ یکطرفہ عشق تھا۔ محبت پر کسی کا زور اور بس نہیں چلتا۔ بدقسمتی سے اس کے عشق میں ایک ایسا جوان بھی گرفتار تھا جو ایسے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا لیکن وہ مفلس وقلاش تھا۔ مگر وہ بہت خوبصورت، وجیہہ اور دراز قد بھی تھا۔ اس پر بہت ساری لڑکیاں فدا تھیں۔ لیکن وہ ان لڑکیوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ لڑکی اس کے دل ودماغ پر بری طرح چھا گئی تھی۔

ایک روز اس لڑکے نے ویرانے میں موقع پاکر اس لڑکی کو روک لیا۔ لڑکی اس کی جرأت پر حیران رہ گئی اور اسے غصہ بھی آ گیا۔ کیونکہ کسی مرد اور لڑکے میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس کا راستہ روک لے۔ وہ تنک کر بولی۔ "میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔"

"میں ایک شرط پر تمہارے سامنے سے ہٹ سکتا ہوں۔" لڑکے نے اس کے غصے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بڑے پرسکون لہجے میں کہا۔

"کیا شرط ہے تمہاری......؟" لڑکی پھنکاری اور اس کی خوبصورت آنکھیں شعلے برسانے لگیں۔ "جلدی سے بتاؤ اور نظروں کے سامنے سے دفع ہو جاؤ۔"

"میری شرط یہ ہے کہ تمہیں میری پوری بات سننا ہو گی۔" لڑکے نے جواب دیا۔ "میں تمہیں اس وقت تک جانے نہیں دوں گا جب تک تم میری پوری بات سن نہیں لو گی......صرف پانچ سات منٹ لوں گا۔ پھر کبھی تمہیں تنگ نہیں کروں گا۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو، جلدی بکو......" لڑکی نے تیز وتند لہجے میں بڑی ناگواری سے کہا۔ "میرے پاس بالکل وقت نہیں ہے۔"

"مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔" لڑکے نے ہمت کر کے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "میں تم سے شادی کر کے گھر بسانا چاہتا ہوں۔"

"محبت......؟" وہ قہقہہ مار کر بڑے زور سے ہنسی اور تمسخر سے بولی۔ "کیا تمہیں محبت کے ہجے بھی معلوم ہیں؟ کیا تم جانتے ہو کہ محبت کسے کہتے ہیں؟"

"محبت ایک پاکیزہ جذبے کا نام ہے۔" لڑکے نے جواب دیا۔ "میں جانتا ہوں کہ محبت کسے کہتے ہیں اور تمہیں محبت کرنا سکھا بھی سکتا ہوں......جب دل سے دل مل جائے تو تب محبت دل کی اتھاہ گہرائیوں میں جنم لیتی ہے۔ تم نے میرے دل میں محبت کی جوت جگا دی ہے اس لئے مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے......محبت کی نہیں جاتی، ہو جاتی ہے......اس پر دل کو کوئی اختیار نہیں ہوتا ہے۔"

"لیکن میرے دل میں تمہارے لئے کوئی محبت نہیں ہے۔ ذرہ برابر تو کیا اس کی رمق بھی نہیں ہے۔" وہ پھر تمسخر سے بولی۔ "چونکہ تمہارا دماغ سوچتے سوچتے یا رومانی کتابیں کہانیاں پڑھ کر خراب ہو گیا ہے اس لئے تم بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔ اپنے دماغ کا علاج کراؤ۔"

"لیکن تم اپنے دل میں میرے لئے محبت کو جنم دے سکتی ہو۔" لڑکے نے کہا۔ "محبت کرنا مشکل تو

نہیں...... اپنے دل میں میرے لئے جگہ تو دے کر دیکھو۔"

"لگتا ہے تم نے آئینے میں کبھی اپنی شکل نہیں دیکھی۔" لڑکی استہزائیہ لہجے میں بولی۔ "میں تم سے محبت نہیں نفرت کر سکتی ہوں...... آخر میں تم سے محبت کیوں اور کس لئے کروں؟ تم ایک مفلس و قلاش شخص ہو...... چلو میرے سامنے سے ہٹ جاؤ اور جانے دو۔"

"محبت اندھی ہوتی ہے۔" لڑکے نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "وہ ذات پات اور دولت نہیں دیکھتی، صرف جذبے کو محسوس کرتی ہے۔"

لڑکی نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ دے مارا۔ اسے لڑکے پر بہت غصہ آیا تھا...... مگر وہ اس کی جرأت اور بے باکی پر بڑی حیران ہوئی تھی...... کیونکہ یہ پہلا لڑکا تھا جس نے نہ صرف اس سے بات کی تھی...... بلکہ کھل کر اظہار محبت بھی کر دیا تھا۔ آج تک کسی لڑکے کو اس سے بات کرنا تو درکنار اس کے سامنے آنے کی ہمت بھی نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی کی تھی...... وہ اسے دور سے دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھر کر رہ جاتے تھے...... اسے اس وقت تک دیکھتے رہتے جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو جاتی یا پھر غیر محسوس انداز سے اس کا تعاقب کرتے۔ اب اسے اس بات کی امید نہیں تھی کہ وہ لڑکا اس کے سامنے آئے گا اور اس سے اظہار محبت کرے گا۔ کیونکہ اس نے لڑکے کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ رسید کر کے اس کے ہوش ٹھکانے لگا دیئے تھے۔ اس کے نزدیک ایک مفلس لڑکے کی محبت بے حقیقت اور بے قیمت تھی۔ اور پھر اس نے اس لڑکے کے اظہار محبت کو دماغ کا خلل سمجھ کر خاموشی اختیار کر لی اور مطمئن بھی ہو گئی۔

یہ اس کی خوش فہمی تھی...... کیونکہ وہ لڑکا باز نہیں آیا تھا۔ وہ میدان عشق کا جاں باز تھا۔ اس نے دو تین مرتبہ پھر تنہائی میں مل کر نہ صرف اظہار محبت کیا بلکہ یہ بھی کہا کہ وہ اسے ہر قیمت پر اپنا کر رہے گا۔ اس لڑکی نے نہ صرف اس کی توہین و تذلیل کی تھی بلکہ اس کے منہ پر طمانچے بھی رسید کئے تھے۔ کیونکہ لڑکے نے اسے دبوچ بھی لیا تھا اور ہونٹوں کی مٹھاس چرالی تھی...... لڑکی کو اندازہ نہیں تھا کہ لڑکا محبت میں اس قدر ثابت قدم اور بے باک ہو گا۔ وہ سائے کی طرح اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ اس سے تنہائی میں ملنے، دبوچنے اور بات کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

لڑکی نے اس بات کو بڑی شدت سے محسوس کیا تھا کہ وہ اس لڑکے سے جتنی نفرت کرنے لگی ہے لڑکا اس سے اسی قدر محبت کرنے لگا ہے۔ وہ بہت پریشان ہو گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے اور اس لڑکے کو کس طرح اس کے اظہار محبت، بے باکی اور جرأت سے باز رکھے۔ گو کہ لڑکا بہت خوبصورت تھا لیکن وہ چاہتی تھی کہ اس کا جو بھی جیون ساتھی ہو وہ دولت مند بھی ہو۔ وہ ایک خوابناک اور پر تعیش زندگی گزارنا چاہتی تھی۔ چونکہ وہ نہایت حسین و جمیل تھی اس لئے ایک رنگین اور حسین زندگی کی تمنائی تھی۔

ایک روز وہ رات کے وقت گھر پر اکیلی تھی۔ اس کی بوڑھی ملازمہ دوسرے کمرے میں گہری نیند سو رہی تھی۔ اس کے گھر والے ایک رشتہ دار کے ہاں شادی کی تقریب میں گئے ہوئے تھے۔ وہ شادی بیاہ

کی تقریبات میں جانے سے احتراز کرتی تھی۔ کیونکہ اس کا حسن و شباب وہاں ایک نازک مسئلہ بن جاتا تھا...... مرد اور عورتیں اسے اس طرح گھیرے رہتی تھیں جیسے وہ کوئی مہارانی ہو۔ وہ گہری نیند میں سپنوں میں کسی شہزادے کے ساتھ ان جانی وادیوں میں گھوم رہی تھی کہ اسے کسی نے جگا دیا۔ وہ حقیقی دنیا میں بغیر شہزادے کے آ گئی۔

بیدار ہونے کے بعد اپنی نظروں کے سامنے وہ اپنے کمرے میں لڑکے کو دیکھ کر حیران رہ گئی اور برہم ہو گئی۔ "تم......؟" لڑکی نے نفرت و حقارت اور غصے سے بھرے لہجے میں کہا۔ "تم نے میرے گھر میں گھسنے کی جرأت کیسے کی؟"

"اس لئے کہ میں نے تمہیں دو دن سے نہیں دیکھا۔" لڑکے نے سینے پر ہاتھ رکھ کر ایک عاشق کے انداز میں کہا۔ "میں تمہیں دیکھنے کے لئے آیا ہوں۔"

"میں کہتی ہوں تم چلے جاؤ۔" لڑکی بستر سے نکل کر لباس درست کرتی اور بالوں کو سمیٹتی ہوئی ہذیانی لہجے میں چیخی۔ پھر اس نے کمرے کی دیوار پر ٹنگی ہوئی شکاری بندوق اٹھا لی۔ "اگر تم نہیں گئے تو میں تمہیں گولی مار کر موت کی نیند سلا دوں گی...... ذلیل...... کمینے...... تم نے گھر میں قدم رکھنے کی جرأت کیسے کی...... تم نے مجھے کیا سمجھا ہوا ہے؟ کیا میں دو ٹکے کی ہوں؟"

"چلو...... مجھے گولی مار دو......" لڑکا اس کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ "محبت کرنے والے موت سے نہیں ڈرتے...... میں آج یہ فیصلہ کر کے آیا ہوں کہ تم سے ہر قیمت پر شادی کر کے رہوں گا...... اگر تم نے شادی سے انکار کیا تو پھر میں تمہیں اٹھا کر لے جاؤں گا...... مجھے تمہیں لے جانے سے کوئی بھی نہیں روک سکتا۔ جس کسی نے روکنے کی کوشش کی اس کی جان لے لوں گا۔ تم شادی کرو گی کہ نہیں......؟"

لڑکی نے دیکھا اور سوچا کہ اگر اس نے شادی کرنے سے انکار کیا تو کہیں وہ واقعی اسے اٹھا کر نہ لے جائے۔ لڑکے کے تیور دیکھ کر وہ دل میں بری طرح گھبرا گئی تھی کیونکہ ایک تو وہ لڑکی ذات تھی، گھر میں اکیلی تھی، بوڑھی ملازمہ کا ہونا نہ ہونا بیکار ہی تھا۔ یہ عام قسم کا لڑکا نہ تھا۔ بے حد مضبوط جسم اور چوڑے چکلے سینے کا مالک تھا۔ وہ اسے ایک بچی کی طرح اٹھا سکتا تھا اور پھر جو بندوق تھی وہ خالی تھی۔ اس میں کارتوس نہ تھے۔ اگر اس میں کارتوس ہوتے تو شاید وہ لڑکے کو بلا تامل گولی بھی مار دیتی اور اس پر اس لئے الزام نہ آتا کہ اس نے اپنی عزت بچانے کے لئے اسے جان سے مار دیا۔

لڑکی نے دل میں سوچا کہ اس وقت نرمی اور محبت سے کام لے کر لڑکے کو بھگا دینا چاہئے۔ ورنہ وہ اس کی عزت کے لئے خطرہ بن سکتا ہے۔ وہ اس کے ہاتھوں اپنی عزت بچا بھی نہیں سکے گی...... اس کے ذہن میں ایک تدبیر بجلی کی طرح آئی تو اس نے لڑکے سے کہا۔

"میں تمہاری محبت اور اس جذبے کی قدر کرتی ہوں...... میں اس بات کی قائل ہو گئی ہوں کہ تم واقعی مجھ سے سچی محبت کرتے ہو...... تم مجھے والدین سے اجازت لینے اور انہیں راضی کرنے کے لئے دو دن دو۔ تیسرے دن دوپہر کے وقت جھیل پر ملو تاکہ تمہیں خوشخبری سنا سکوں۔"

لڑکے نے اس کی یہ بات سنی تو وہ خوش ہوگیا۔ وہ کچھ دیر اظہار محبت کر کے اور اس کی بات کا یقین کر کے چلا گیا۔ تیسرے دن سہ پہر کے وقت لڑکی جھیل پر پہنچی تو لڑکا بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ لڑکی نے لڑکے کی رسمی محبت اور باتوں کے بعد اس کے بازوؤں سے نکل کر کہا۔

''دنیا میں اس کی کوئی عزت نہیں جو قطعی قلاش ہوتا ہے...... یہ بتاؤ کہ مجھ سے شادی کرنے کے بعد ہم گزارہ کیسے کریں گے؟''

''میں محنت مزدوری کر کے گھر چلاؤں گا اور تمہیں کبھی بھوکا نہیں رکھوں گا۔ ایک شہزادی کی طرح رکھوں گا۔'' لڑکے نے پرعزم لہجے میں کہا۔

''محنت مزدوری سے پیٹ نہیں بھرتا ہے۔'' لڑکی نے کہا۔ ''پھر تم مجھے ایک شہزادی کی طرح کس طرح رکھ سکتے ہو؟''

''تم کسی بات کی فکر اور پرواہ مت کرو۔'' لڑکے نے پراعتماد لہجے میں کہا۔ ''میں کہیں نہ کہیں سے دولت لا کر تمہارے قدموں میں ڈال دوں گا۔''

''میرے والدین اس شادی کے لئے راضی ہیں اور میں بھی تم سے شادی کرنے کے لئے تیار ہوں۔'' لڑکی بولی۔ ''مگر اس شادی کے لئے ایک شرط ہے کہ تم شادی سے پہلے ایک کثیر رقم لا کر بینک میں میرے نام جمع کرادو۔ ورنہ میں اس کے بغیر تم سے شادی نہیں کروں گی۔''

''تمہارا یہ وعدہ پکا ہے نا......؟'' لڑکے نے تصدیق چاہی۔ ''بعد میں تم مکر تو نہیں جاؤ گی......؟ تمہارے والدین بھی......''

''میں اور میرے والدین مکرنے کیوں لگے......؟'' لڑکی نے کہا۔ ''تمہارے دل میں ہمارے خلاف شک کیوں پیدا ہو رہا ہے۔''

''اس لئے کہ تمہیں اور تمہارے والدین کو دولت کا لالچ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی ہے۔'' لڑکے نے بڑی صاف گوئی سے کہا۔ ''جنہیں دولت کا لالچ ہوتا ہے وہ قابل بھروسا نہیں ہوتے ہیں۔ یہ میرا تجربہ ہے۔ آج کل دنیا میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ میں نے کوئی نئی بات نہیں کہی۔''

''تم ہمیں غلط سمجھ رہے ہو۔'' لڑکی نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''اصل بات یہ ہے کہ میں اور میرے والدین چاہتے ہیں کہ شادی کے بعد ہم ایک خوشگوار زندگی گزاریں۔ جس میں مسرت ہی مسرت ہو۔ اس کے لئے دولت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب تم ایک کثیر رقم بینک میں جمع کرادو گے تو بینک اس رقم پر جو منافع دے گا اس سے ہم ایک خوشحال زندگی گزار سکیں گے۔ پھر تمہیں محنت مزدوری یا کوئی کام کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

لڑکے کی سمجھ میں یہ بات آ گئی۔ اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ لیکن تم اپنی زبان سے صرف ایک بار کہہ دو کہ مجھے تم سے محبت ہے۔''

لڑکی یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ لڑکا ساری زندگی ایک کثیر رقم کا بندوبست نہیں کر سکتا۔ اس نے

سوچا کہ اظہار محبت کرنے میں حرج ہی کیا ہے۔ جبکہ اس لڑکے نے تنہائی میں دو ایک بار اس کے ہونٹوں پر مہر محبت ثبت کی تھی۔ گو کہ لڑکے کی من مانی کے باوجود اس نے کوئی تعرض نہیں کیا اور نہ ہی حد سے تجاوز کیا۔ اگر اس نے زبان سے اقرار نہیں کیا تو ہو سکتا ہے کہ شیطان بن جائے۔ رات کا وقت ہے اور اس کا زیادہ برکنا خطرے کو دعوت دینا ہے۔

اس لئے اس نے بڑے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں دل و جان سے اقرار کرتی ہوں کہ تم سے سچی محبت کرتی ہوں...... تم میری زندگی اور کائنات ہو...... تم سے یہ میری پہلی اور آخری محبت ہے...... اور میں تمہارے سوا کسی اور کو دل میں نہیں بساؤں گی۔ تمہارے لئے میری جان بھی حاضر ہے۔ یہ میرا وعدہ ہے۔''

پھر ان دونوں کے بیچ آخر شیطان آ گیا۔ جب وہ طوفان اور دھول بھرے راستے سے واپس ہوئے تو لڑکی نفرت بھرے لہجے میں بولی۔ ''یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔''

''یہ میں نے بہت سوچ کر کیا ہے۔ کیونکہ اس طرح اب تم صرف اور صرف میری ہوگئی ہو۔'' لڑکے نے کہا۔ ''اب تم کسی اور کی ہو نہیں سکتی ہو...... اب تمہارے دل میں صرف میری محبت پرورش پاتی رہے گی...... اگر تم نے کسی اور سے شادی کی تو اسے بتادوں گا کہ تم میری ہو چکی ہو...... تم اس بات کا اقرار کئے بغیر نہیں رہ سکتی ہو...... اگر تم نے جھوٹی سوگند کھائی تو ارہانہ دیوتا غضب ناک ہو کر تمہیں چڑیل بنادے گا۔''

آسام میں یہ دستور ہے کہ جب کوئی ہندو آسامی لڑکی اپنا تن من کسی کو سونپ دیتی ہے تو اس کی مثال ایک پتی کی سی ہو جاتی ہے۔ چاہے اس کی عزت جبر و زیادتی کا ہی نشانہ کیوں نہ بنی ہو۔ پھر وہ کسی دوسرے مرد سے نہ تو محبت کر سکتی ہے اور نہ ہی بیاہ...... اگر اس نے اس مرد سے بے وفائی کی تو پھر ان کا ارہانہ دیوتا غضب ناک ہو کر اس عورت کو چڑیل بنا دیتا ہے۔ یہ آسامیوں کا عقیدہ ہے۔ ارہانہ دیوتا محبت کا دیوتا سمجھا جاتا ہے۔

لڑکی کو اس بات کی توقع نہیں تھی اور نہ ہی اندازہ تھا کہ لڑکا اس قدر ہوشیار، چالاک اور شاطر ثابت ہوگا۔ اسے جبر و زیادتی سے اپنا بنا لے گا...... اب وہ نہ کسی کی ہو سکتی تھی اور نہ ہی کسی سے شادی کر سکتی تھی۔ اب وہ مجبور اور بے بس ہو کر اس لڑکے کے رحم و کرم پر ہوگئی تھی۔ ایک طرح لڑکے نے اس سے ان تھپڑوں کا انتقام بھی لیا تھا جو اس نے لڑکے کے منہ پر مارے تھے۔ اب وہ اس دن کا انتظار کرنے لگی۔

اس نوجوان لڑکے نے مطلوبہ کثیر رقم کے حصول کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ اس کے لئے اتنی بڑی رقم کا حصول ممکن نہیں تھا۔ لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ عجب حوصلے کا آدمی تھا۔ اس نے دولت کے حصول کے لئے بڑی تدبیریں کیں...... جانے کیا کیا منصوبے بنائے...... اس کی اس سے بڑی بدنصیبی کیا ہو سکتی ہے کہ قسمت اور حالات ساتھ نہیں دے رہے تھے...... وہ اس لئے بھی رات دن کوشاں تھا کہ جتنا جلد ہو سکے اس لڑکی سے شادی کر کے اسے اپنا بنانا اور گھر میں لانا چاہتا تھا...... اس روز لڑکی کے حسن و شباب کے جادو، جذبات کے طوفان اور قرب کے لمحات نے اسے دیوانہ بنا دیا تھا۔ اس کے لئے ایک ایک دن کی جدائی بھی شاق اور روح فرسا تھی...... فراق کی آگ اسے جیسے بھسم کئے دے رہی تھی۔ اس

نے مطلوبہ رقم کے لئے خون پانی ایک کردیا۔لیکن ایسی کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی۔صرف ایک دوسو روپے ہو سکے۔ان دنوں دوسو کی رقم بھی بہت بڑی تھی۔لیکن بینک کے نزدیک دو کوڑی بھی نہ تھی۔

لڑکی نے اس رقم کے بارے میں سن کر اس کا خوب مذاق اڑایا اور کہا کہ پیر کی جوتی کے لئے بھی یہ ناکافی ہے۔لڑکی کے دل میں اس کے خلاف نفرت روز بروز اس لئے بھی بڑھتی جارہی تھی کہ وہ جب بھی جھیل پر یا گھر کی تنہائی میں اس سے ملتا تو محبت کے نام پر من مانی کرتا تھا۔اور وہ دیوتا کے قہر سے بچنے کے لئے اس کے رحم وکرم پر تھی۔

ایک روز لڑکی نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر اس نے ایک مہینے کے اندر اندر رقم کا بندوبست نہیں کیا تو وہ شیلانگ کے زمیندار کے بیٹے مادھو سے شادی کر کے گھر بسا لے گی اور وہ دیوتا کے قہر کی پرواہ نہیں کرے گی۔ایک مہان پنڈت نے کہا ہے کہ وہ دیوتا کے قہر سے بچنا چاہتی ہے تو وہ دو بھیڑوں کی بھینٹ دے دے۔بھگوان دیوتا اسے معاف کردیں گے......اور اب اگر اس نے ملاقات کے موقع پر اپنی محبت حد سے تجاوز کی،تو اس کے سینے میں خنجر گھونپ دے گی......اور مادھو کو اس نے اعتماد میں لے کر سب کچھ بتا دیا ہے اس کے باوجود مادھو اس سے شادی کرنے کے لئے تیار ہے۔

وہ کسی قیمت پر اس حسن کی دیوی سے محروم ہونا نہیں چاہتا تھا۔لڑکی کی اس دھمکی نے اسے مشتعل کردیا۔اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔وہ ہر بات برداشت کرسکتا تھا لیکن یہ برداشت نہیں کرسکتا تھا کہ حسن کی دیوی کا یہ پرشباب چندر بدن مادھو کی ملکیت بن جائے اور وہ انگاروں پر لوٹتا رہے۔پورے آسام میں ایسی حسن کی دیوی نہ تھی۔پے در پے ناکامیوں سے اس کے خیالات باغیانہ ہوگئے۔بہت سوچ بچار کے بعد اسے ایک آسان اور شارٹ کٹ راستہ یاد آیا......اس نے چوری اور رہزنی کا پیشہ اختیار کیا......اسے کچھ رقم اور زیورات ہاتھ لگے۔جس سے اس کا حوصلہ اور بڑھا۔ایک روز اس نے سنار کی دکان پر نوٹوں کی بہت ساری گڈیاں دیکھیں......ایک زمیندار نے اپنی بیٹی کی شادی کے لئے اس سنار سے زیورات بنوائے۔وہ ان زیورات کی رقم تھی اور پھر ایک دوست سے اس کے علم میں یہ بات آئی تھی کہ زمیندار اپنی تجوری میں نہ صرف رقم بلکہ ہیرے جواہرات کے قیمتی زیورات بھی رکھتا ہے۔اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔اس نے سوچا کہ اونچا ہاتھ مارنے سے اس کی زندگی حسین ہوجائے گی اور ساری زندگی عیش میں گزرے گی۔اس نے چشم تصور میں اس لڑکی کو دلہن کے روپ اور زیورات سے لدے پھندے ہوئے دیکھا اور اس کا جی خوش ہوگیا۔

اس رات اس نے سنار کے گھر پر ڈاکا ڈالنے کا منصوبہ بنالیا......وہ رات کے وقت چوروں کی طرح سنار کے کمرے میں داخل ہوا۔اس وقت سنار اپنی خواب گاہ میں بے شمار رقم گن رہا تھا۔اس کی تجوری کھلی پڑی تھی۔اس نے یہ نہیں دیکھا کہ سنار کی بیوی کہاں ہے۔وہ رسوئی میں اپنے پتی کے لئے چائے بنارہی تھی۔اس نے موقع غنیمت جانا۔چونکہ سنار اسے پہچانتا تھا اور وہ اس وقت منہ پر ڈھاٹا باندھے ہوئے تھا۔اس لئے اس نے سنار پر خنجر سے پے در پے وار کر کے اسے قتل کردیا۔اس وقت وہ منہ سے ڈھاٹا اتار

کر رقم تھیلے میں ڈال رہا تھا کہ اس کی بیوی پتی کی چیخیں سن کر بھاگی آئی......سنار کی پتنی پتی کی لاش دیکھ کر خوف و دہشت سے بے ہوش ہوگئی۔لڑکے نے چونکہ اس کی بیوی کو نہیں دیکھا تھا اس لئے وہ بچ گئی تھی ورنہ لڑکا اسے بھی قتل کردیتا۔سنار کی پتنی نے پولیس کو بتادیا۔پولیس نے لڑکے کو گرفتار کر کے رقم اور زیورات بھی برآمد کرلئے۔پھر اس لڑکے پر مقدمہ چلا۔پھر عدالت نے اس لڑکے کو قتل کے جرم میں سزائے موت سنادی۔

اس حسین لڑکی کو اس لڑکے سے نجات مل گئی جو اس کے لئے کسی موذی سانپ سے کم نہ تھا اور وہ کسی نہ کسی بہانے اسے ڈستا رہتا تھا۔اب وہ کہیں بھی اور کسی سے بھی شادی کرنے کے لئے آزاد تھی۔پھر اس لڑکی کی شادی ایک بڑے گھرانے میں بڑی دھوم دھام اور روایتی انداز سے ہوگئی۔وہ دلہن کے روپ میں اس قدر حسین لگی تھی کہ جس نے بھی دیکھا وہ دیکھتا رہ گیا تھا۔

اس لرزہ خیز قتل نے لوگوں کے دلوں پر خوف و دہشت کو ایک عرصے تک مسلط کئے رکھا تھا......لیکن رفتہ رفتہ خونی واردات دلوں سے محو ہوگئی۔وہ واقعہ قصہ پارینہ بن گیا۔کسی کسی کو یہ واقعہ یاد آتا تو وہ دانستہ اس کے ذکر سے گریز کرتا تھا۔

محبت بھی بڑی نازک،عجیب اور اچھوتی شے ہے......وہ مٹ کر فنا ہو کر بھی اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہتی۔اس نے آخر میں اپنا اثر دکھایا۔ایک سفلی علم کے ماہر کو اس لڑکے کی کھوپڑی مل گئی۔ہوا یہ تھا کہ اسے پھانسی دینے کے بعد اس کی لاش آسام کے رسم ورواج کے مطابق ایک جھیل کے کنارے لاکر رکھ دی گئی۔یہ وہی جھیل تھی جہاں اس لڑکے اور لڑکی کی ملاقاتیں ہوتی تھیں۔اتفاق سے وہ گھر جس میں وہ شخص کھوپڑی کو لے کر آیا تھا اس گھر میں اس نوجوان کی محبوبہ بھی رہتی تھی۔

اس نوجوان کی روح اپنی کھوپڑی کی تلاش میں اس جگہ پہنچی اور اپنی محبوبہ کو وہاں دیکھا......اس وقت تمہارے دوست راحت نے اس مکان کو کرایہ پر نہیں لیا تھا......اس روح کے مجرمانہ جذبات پھر عود کر آئے۔کیونکہ مرتے وقت جو خیالات انسانی دماغ میں ہوں،موت کے بعد بھی روح پر ان کا اثر رہتا ہے۔اس کی روح نے نوجوان محبوبہ کو تنگ کرنا شروع کردیا۔اس لڑکی کی زندگی جیسے عذاب بن گئی۔اس لڑکی نے اپنے پتی کو اعتماد میں نہیں لیا۔بھلا وہ کیسے لے سکتی تھی۔پتی اس کی بات کا کیسے اور کب یقین کرتا......کہ ایک بدروح کسی کو آلودہ بھی کرسکتی ہے۔یہ روح اس کے پتی کی غیر موجودگی میں آتی اور اس کے ساتھ وقت گزار کر چلی جاتی۔وہ بدروح انسانی شکل میں ظاہر ہوتی تھی۔وہ غریب اس روح کا کیسے مقابلہ کرتی۔مجبوری اور اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ اس لڑکے کی بدروح کی ہر بات مانے......اس لڑکی نے اپنے پتی سے کہا تھا کہ اس گھر میں آسیب ہے۔لیکن وہ نہ مانا،پھر ایک روز اس نے روح کو دیکھ لیا جو اس کی پتنی کو دبوچنا چاہتی تھی۔پھر اس کے پتی نے ایک پجاری کی خدمات حاصل کرلیں۔پجاری کے مشورے پر وہ اپنی حسین اور نوجوان پتنی کو لے کر کسی دوسری جگہ چلا گیا۔

جب تم اس نوجوان لڑکے کی کھوپڑی لے آئے تو اس کی روح نے اس گھر کا رخ کرلیا......تمہارے

بیگ سے اس کی کھوپڑی غائب ہو جاتی اور آ جاتی تھی...... تم نے اسے ایک روز مندر کے احاطے میں پھینک دیا۔ لیکن روح اس گھر میں آتی رہی۔ اپنی محبوبہ کو نہ پا کر وہ مشتعل ہو گئی...... وہ اس موقع کی تلاش میں تھی کہ کسی دن فردوس کو نشانہ بنائے...... فردوس بھی اس کی محبوبہ کی طرح بہت حسین تھی اور اس لڑکی سے جڑواں بہنوں جیسی مشابہت رکھتی تھی۔ روح کسی نہ کسی وجہ سے اپنے مذموم ارادے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

اس روز رات کے وقت روح پھر آئی تا کہ فردوس کو نشانہ بنا سکے۔ لیکن جب اس نے رشید کو بیوی کے ساتھ دیکھا تو اس کی ہمت نہیں ہوئی۔ پھر اسے کسی طرح چابیوں کا گچھا نظر آ گیا۔ لہٰذا وہ چوری کر کے فردوس کو ستانے پر مجبور ہو گئی۔ چوری کے بعد اس نے مال مسروقہ پرانے مندر کے احاطے میں درخت میں چھپا دیا۔ میں نے آوارہ اور چور بد روح سے یہ تھیلی چھینی ہے۔"

"کیا کہا......؟" میں اچھل پڑا۔ میں بھونچکا ہو کر بولا۔ "مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ وہ کوئی روح تھی؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میرے عزیز دوست!" راحت نے پر اعتماد انداز میں کہا۔ "تم جانتے ہو کہ میں جھوٹ نہیں بولتا۔"

"لیکن دوست!...... روح تو ایک لطیف اور غیر مرئی چیز ہے۔" میں نے کہا۔ "بھلا اس سے کون لڑ سکتا ہے؟"

"روح کی لطافت، کثافت...... نیکی اور بدی پر منحصر ہوتی ہے۔" وہ بے پروائی سے شانے اچکا کر بولا۔ "گناہگار کی روح کثیف اور بوجھل ہوتی ہے...... وہ مقام بالا تک نہیں جا سکتی۔ یہ ایک حقیقت ہے جسے بہت کم لوگ جانتے اور سمجھتے ہیں۔"

"لیکن تم نے مجھے جو باتیں بتائی ہیں کیونکر اور کیسے تمہارے علم میں آئیں؟" میں نے بے اعتباری سے پوچھا۔

"ایک تجربے کار سراغ رساں کے لئے یہ کچھ مشکل نہیں ہے۔" وہ کہنے لگا۔ "اگر اس وقت وہ کھوپڑی تمہارے پاس موجود ہو جس کے اثر سے تم ایک دفعہ وادی کے کنارے بے ہوش ہو گئے تھے تو میں اس کی پیشانی کی تحریر پڑھ کر تمہیں مطمئن کر دیتا۔"

"کیا تم ان تحریروں کے راز سے واقف ہو؟" میری حیرت دو چند ہو گئی۔ "تم نے کیا ان تحریروں کا راز پا لیا ہے؟"

"ہاں دوست!" راحت نے سر ہلایا۔ "اب میں ہر کھوپڑی کی پیشانی پر لکھی تحریر پڑھ سکتا ہوں۔"

میں اس کی بات سن کر سخت متحیر ہوا۔ "تم نے مجھے پہلے بتایا کیوں نہیں......؟ اب بتا رہے ہو......؟ کیا یہ کوئی راز ہے......؟"

راحت نے جانے کیوں اس کا اور کسی دوسرے سوال کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ خاموش ہو گیا تھا۔ میں نے بھی اس وقت کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔ میں نے اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔ اس چاندنی میں جو چاروں طرف کھل کر برس رہی تھی اس کا چہرہ مدقوق، لاغر اور خوفناک

لگا کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور رگوں میں لہو منجمد ہونے لگا...... ایسا لگ رہا تھا کہ وہ قبر سے نکلا ہوا کوئی مردہ ہے۔ دراصل وہ ابھی تک پوری طرح صحت یاب نہیں ہوا تھا۔ بیماری نے اسے دیمک کی طرح چاٹ لیا تھا اور اندر سے کھوکھلا سا ہو رہا تھا۔

راحت نے میرے چہرے سے بھانپ لیا تھا کہ میں اس کی صورت دیکھ کر خوفزدہ ہو رہا ہوں۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا اور دھیرے سے بولا۔ "اچھا دوست! اب اجازت دو۔ مجھے دیر ہو رہی ہے...... ہاں ایک اور بات...... شمال میں قصبہ نارنگ ہے۔ اس میں ایک جادوگر شوتم نام کا ہے۔ اس کی عمر ایک سو دس برس کی ہے۔ آسام میں اس سے بڑا کوئی جادوگر نہیں ہے۔ یہ سمجھو کہ اس دنیا کا سب سے بڑا اور آخری جادوگر وہی ہے۔ وہ گمنامی کی زندگی موت کے انتظار میں کاٹ رہا ہے۔ وہ آدمی بہت اچھا ہے وہ مصر، یونان، افریقہ، ہندوستان، بنگال اور جانے کہاں کہاں جا کر جادو سیکھ کر آیا ہوا ہے۔ اگر اس نے تمہیں جادو سکھا دیا تو پھر تم سے بڑا جادوگر اس دنیا میں کوئی نہ ہو گا۔ وہ تمہیں ایسا جادو سکھائے گا کہ تم عش عش کر اٹھو گے۔ تم اس سے فوراً ہی مل لینا...... اس کی ایک اور بہت بڑی خوبی ہے کہ وہ دنیا کی ہر زبان روانی سے بول سکتا ہے۔ دنیا میں صرف یہ ایک شخص ہے جو جادو تمہیں صرف دو دن میں سکھا سکتا ہے۔ اگر اس نے نہیں سکھایا تو پھر تم کبھی بھی جادو نہیں سیکھ سکو گے۔"

اپنی بات ختم کر کے اس نے مجھ سے مصافحہ تک نہیں کیا۔ جب وہ مخالف سمت بڑھا تو ایک آوارہ کالے بادل کے بہت بڑے ٹکڑے نے چاند کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ جب چاند اس کی آغوش سے نکلا تو وہ نظر نہیں آیا۔ وہ میری نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ اس کے جانے کے بعد مجھ پر ایک لرزہ خیز خوف طاری ہو گیا...... خدا جانے میں کس طرح اپنے کمرے میں پہنچا۔

میں نے بستر پر دراز ہونے سے پہلے چرمی تھیلی کا منہ کھول کر بستر پر الٹ دیا...... ان زیورات کو دیکھ کر میری آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ میں نے اپنی زندگی میں کب ایسے خوبصورت اور شاندار زیورات دیکھے تھے۔ راحت نے مجھے سخت تاکید کی تھی کہ اس مسروقہ مال کے بارے میں پولیس کو ہوا تک نہ لگنے دی جائے...... اگر بتایا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ وہ بہت تنگ اور ہراساں کرے گی۔

میرے لئے ان زیورات کے بازیاب ہونے سے بھی بڑی خوشی کی بات یہ تھی کہ راحت نے مجھے ایک ایسے جادوگر کا نام پتا بتا دیا تھا جو چاہے تو مجھے دنیا کا بہت بڑا جادوگر بنا سکتا ہے۔ ایک ایسا جادوگر جو دنیا میں موجود نہیں ہے۔ دنیا میں اس کے پائے کا اب کوئی جادوگر نہیں ہے۔ بنگال، آسام میں بھی نہیں۔ راحت نے اس جادوگر کے بارے میں جو کچھ کہا اور بتایا وہ غلط نہیں ہو سکتا تھا۔ میرا بس چلتا تو میں اس شوتم جادوگر سے ملنے اسی وقت روانہ ہو جاتا۔ بے صبری اور بے چینی بڑھنے لگی۔ اس قصبہ نارنگ کا پتا بھی مجھے معلوم نہ تھا۔ معلوم بھی ہوتا تو میں جا نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ یہ امانت رشید کے سسرال جا کر پہنچانی تھی۔

☆......☆......☆

خوابناک رات کا سحر ٹوٹتے ہی صبح کے اجالے کے حسن نے ساری دنیا کے دامن کو جیسے نور سے منور

کردیا تھا۔ نسیم سحر کے تر و تازہ جھونکوں نے میرے سوئے ہوئے دماغ میں نہ صرف ایک نئی روح پھونک دی تھی بلکہ وہ لوریاں دے کر تھپک کر سلا رہی تھی۔ جب سورج کی تیز کرنیں میرے چہرے پر پڑیں تو میں جیسے مدہوشی کی کیفیت سے نکل پڑا۔ میرا بدن تھکن سے چور چور تھا اور جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ میں کچھ دیر تک خلا میں خالی الذہن گھورتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد رفتہ رفتہ یکے بعد دیگرے مجھے رات کی ساری باتیں ایک ایک کر کے یاد آنے لگیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ رات میں نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔ لیکن جب میری نگاہ زیورات کی تھیلی پر پڑی تو مجھے یقین کرنا پڑا...... کہ وہ خواب نہیں ایک حقیقت تھی۔ میں رات کے واقعے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ ملازم چائے لے کر آ گیا۔ جس کے پینے سے دماغ کے انتشار میں کچھ کمی واقع ہوئی۔

میں ناشتہ کرنے کے بعد فوراً ہی رشید کے سسرال کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں نے اس ڈر سے گھر میں رکنا اور رشید کا انتظار کرنا مناسب نہیں سمجھا کہ وہ بدروح مجھ سے زیورات نہ چھین لے۔ زیورات کا ایک خالی ڈبہ گھر میں موجود تھا۔ میں نے زیورات تھیلی سے نکال کر اس ڈبے میں رکھ دیئے۔ جب تک میں رشید کے سسرال نہیں پہنچا اس وقت تک بدروح کے خیال سے خوف و دہشت میں مبتلا رہا۔ سارے راستے مجھے ایسا محسوس ہوتا رہا کہ وہ روح ڈبہ چھیننے کے لئے میرے تعاقب میں لگی ہوئی ہے۔

جب میں نے رشید کے سسرال کے گھر پر دستک دی تو میری جان میں جان آئی۔ فردوس نے مجھے دیکھ کر برا سا منہ بنایا۔ البتہ اس کے گھر والے اور رشید بہت خوش ہوئے۔ فردوس کی سب سے چھوٹی بہن تو کھل اٹھی تھی۔ جب میں نے زیورات فردوس کے ہاتھ میں دے دیئے تو اس کی اور اس کے گھر والوں کی خوشی اور حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب مجھ سے پوچھا گیا کہ کہاں سے اور کیسے ملے تو میں نے صرف اتنا کہا کہ یہ سب میرے ایک سراغ رساں دوست کا کارنامہ ہے۔ میری بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ میں چونکہ لمبی مسافت پیدل طے کر کے آیا تھا اور دوپہر کے کھانے میں کچھ دیر تھی اس لئے میں آرام کرنے اوپر کمرے میں چلا گیا۔ مجھے کھانا کھاتے ہی یہاں سے روانہ ہونا تھا۔ میں بستر پر دراز ہو کر رات کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ آہٹ سی ہوئی۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا تو فردوس کی سب سے چھوٹی بہن شمشاد تھی۔

میں ہڑبڑا کر بستر سے نکل آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک صندوقچہ تھا۔ اس نے بستر کے پاس آ کر وہ صندوقچہ کھول کر بستر پر الٹ دیا۔ بستر کی چادر پر ہیرے جواہرات کے زیورات جگمگا رہے تھے۔

''یہ کیا......؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''یہ آپ کس لئے لائی ہیں؟''

''آپ کو معلوم ہے یہ زیورات کتنی مالیت کے ہوں گے؟'' وہ رسیلی آواز میں بولی۔

''جی نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں ایک غریب آدمی ہوں۔ میں ایک انگوٹھی خریدنے کے قابل نہیں ہوں، نہ کبھی خریدی...... اس لئے ان زیورات کی مالیت کے بارے میں کیسے کچھ بتا سکتا ہوں؟''

''یہ دس لاکھ کی مالیت کے زیورات ہیں۔'' وہ فخر سے بولی۔ ''ابو نے میرے لئے رکھے ہیں۔''

''بہت خوب......'' میں نے کہا۔ ''آپ کو مبارک ہو۔''

''یہ زیورات آپ کے ہو سکتے ہیں۔'' وہ سرخ ہو کر بولی۔

''وہ کیسے......؟'' میری زبان سے غیر ارادی طور پر نکل گیا۔

''وہ ایسے کہ آپ مجھ سے شادی کر لیں......'' اس نے میرے قریب آ کر اپنی مرمریں باہیں میرے گلے میں حمائل کر دیں۔

''شادی......؟'' میں نے تحیر زدہ لہجے میں کہا اور اس کے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کر دیں۔ ''آپ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہیں؟''

''جی ہاں...... آپ سے...... صرف آپ سے......؟'' شمشاد میری آنکھوں میں جھانکتی ہوئی بولی۔ ''میں آپ کے سوا کسی اور سے شادی نہیں کروں گی۔''

''آپ مجھ سے کس لئے شادی کرنا چاہتی ہیں؟'' میں نے کہا۔ ''آخر مجھ میں آپ کو ایسی کیا خاص بات نظر آ رہی ہے؟''

''اس لئے کہ آپ بہت خوبصورت ہیں اور میرے خوابوں کے شہزادے کی طرح بھی ہیں۔'' وہ رسیلی آواز میں بولی۔ ''آپ جیسا اب تک کہیں نظر آیا اور نہ ملا...... نہ ہی ملے گا...... فرزانہ آپ کی بہت تعریف کرتی تھی اور آپ کی محبت میں گرفتار تھی۔ لیکن آپ نے اس کا دل توڑ دیا تو وہ آپ کی ذات سے ناامید ہو کر بھاگ گئی۔ لیکن آپ میرے ساتھ ایسا نہیں کریں گے اور نہ ہی میں آپ کو دل توڑنے دوں گی...... آپ سے ہر قیمت پر شادی کر کے رہوں گی۔ مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے۔''

''لیکن شمشاد! آپ میری ایک بات تو سنیں......؟'' میں نے اس کی مرمریں باہوں کو تھام لیا جو غیر محسوس انداز سے اپنا ریشمی حلقہ تنگ کر رہی تھیں۔

''شادی کے بارے میں، میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ شادی میں......'' میں نے اتنا کہہ کر اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

اس کی آنکھوں میں خود سپردگی اور والہانہ پن بھی تھا۔ میں نے اس کے دلی ارادوں کو بھی بھانپ لیا تھا وہ مجھ پر مہربان ہونے آئی تھی اور مجھ سے شادی کرنے کے لئے بہت ہی سنجیدہ تھی۔ میرے شادی سے انکار کرنے پر وہ شور مچا دیتی یا پھر کوئی اور حربہ استعمال کرتی۔ وہ اس وقت ایسے لباس اور ایسی حالت میں تھی اس کے گھر والے یہ سمجھتے کہ میں اس کی عزت لوٹنے کے درپے ہو گیا اور پھر مجھے شمشاد سے شادی کرنے پر مجبور کیا جاتا اور شاید اسی وقت ازدواجی بندھن میں باندھ دیا جاتا۔ وہ اس وقت عورت نہیں ایک زہریلا سانپ تھا۔ میرے ذہن میں فوراً ہی ایک تدبیر آئی جس سے سانپ بھی مرجاتا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹتی۔

میں نے اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں لے لیا اور اس کی آنکھوں میں محبت بھری نظروں سے جھانکتے ہوئے اس کے چہرے پر جھک گیا۔ جیسے اس پر مہر محبت ثبت کر رہا ہوں۔ ہم دونوں تھوڑی دیر کے لئے دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو گئے۔ میں اس بات کے لئے مجبور تھا اور اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا! وہ جوانی کے جنگل میں مجھے ساتھ لے کر بہت دور جانا چاہتی تھی تا کہ عین وقت پر اس کے گھر

والے رنگے ہاتھوں پکڑ لیں۔ میں نے کمرے کے باہر ایک سایہ دیکھ لیا تھا۔ یہ اس کی کسی سہیلی یا ملازمہ کا تھا۔ وہ ہم دونوں کو طوفان کی زد میں دیکھ کر اس کے گھر والوں کو بتانے چلی جاتی۔۔۔۔۔۔ شمشاد اسی مقصد کے لئے اسے لائی تھی۔ اب میں سب کچھ سمجھ گیا تھا۔ میں نے اسے اپنے سے جدا کر کے کہا۔

"شمشاد! شادی گڈے گڑیا کا کھیل نہیں ہے۔۔۔۔۔۔ میں تم سے ہی شادی کروں گا۔ کیوں کہ تم جیسی حسین اور شعلہ مجسم مجھے نہیں مل سکتی۔۔۔۔۔۔ تم ایک اعلیٰ گھرانے کی لڑکی ہو۔ تمہاری عزت اور مقام ہے۔ میں باعزت طریقے سے تمہارا رشتہ تمہارے والدین سے رشید کی معرفت مانگوں گا۔۔۔۔۔۔ لیکن شادی کے لئے مجھے تین دن کی مہلت چاہیئے تاکہ میں تیاری کر سکوں۔ تم کیا کہتی ہو؟"

"سچ!" شمشاد ایک دم سے خوش ہو گئی۔ اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ پھر وہ شرما سی گئی۔ "تمہاری بات میری سمجھ میں آ گئی۔"

پھر وہ تھوڑی دیر اظہار محبت کرنے کے بعد چلی گئی تو میں نے سکون و اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ پھر دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میں راحت سے مفصل حالات دریافت کرنے کے تجسس اور اشتیاق میں موضع شوء کی طرف روانہ ہو گیا۔ کیوں کہ راحت نے مجھے وضاحت سے کچھ نہیں بتایا تھا۔ بہت ساری باتیں راز میں تھیں اور معمہ بنی ہوئی تھیں اور میں اس راز سے پردہ اٹھانا اور معمہ حل کرنا چاہتا تھا۔

دو تین دن پہلے جو موسلا دھار بارش ہوئی تھی اس وجہ سے ابھی تک راستے بہت خراب ہو رہے تھے۔۔۔۔۔۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔۔۔۔۔۔ خنک بوجھل ہوا، گندے پانی میں سڑی ہوئی گھاس اور تالابوں کی مچھلیاں جو کنارے پر مری پڑی تھیں۔ ان کی بساند طبیعت کو مکدر کر رہی تھی۔ مینڈکوں کے شور نے تمام وادی سر پر اٹھا رکھی تھی۔

کئی ایسی جگہوں پر جہاں دلدل، جھیل اور درخت تھے وہاں انسانی کھوپڑیاں بکھری پڑی نظر آئیں۔ انہیں دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے ان میں شاید اس لڑکے کی کھوپڑی ہے جس کی روح اپنی محبوبہ کی تلاش میں ہے۔۔۔۔۔۔ راحت نے اس روح کو بھگا تو دیا تھا لیکن اس بات کا قوی امکان تھا کہ وہ روح دوبارہ آ جائے۔ کیوں کہ اسے قید یا کسی بوتل میں بند نہیں کیا گیا تھا۔ شاید اس کی کھوپڑی بھی تنگ کرے۔ لیکن میں یہ جانتا تھا کہ آیت الکرسی اور آیت کریمہ کی وجہ سے روح اور کھوپڑی گھر میں گھس سکتی ہے اور نہ ہی ہراساں تنگ اور پریشان کر سکتی ہے۔ میں کھوپڑی جس دن مندر کے احاطے میں پھینک کر آیا تھا۔ اس دن سے کھوپڑی نظر نہ آئی تھی۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ رات سوتے وقت کلام الٰہی پڑھ کر اپنے اوپر دم کر لیا کرتا تھا۔ اگر میرا یہ عمل جاری نہ رہا ہوتا تو پھر وہ کھوپڑی اور بدروح شاید میرا اور رشید کا جینا حرام کر دیتی۔ میں بلا خوف و خطر راحت کے مکان کی طرف کشاں کشاں چلا جا رہا تھا۔

میں نے کس طرح اور کیسے یہ ناہموار، دشوار گزار، پانی اور کیچڑ سے بھرا راستہ طے کیا یہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ جب میں نے اس کے گھر کے سامنے رک کر سانس بحال کی تو قدرے سکون سا محسوس ہوا۔۔۔۔۔۔ جب میں اس کے گھر کے احاطے میں داخل ہوا تو اس کا نقشہ یکسر بدلا ہوا پایا۔ پہلے تو یہ خیال آیا کہ میں

غلطی سے کسی اور گھر پر آ گیا ہوں۔ لیکن ایک نشانی ایسی تھی جس سے میں دھوکا نہیں کھا سکتا تھا۔ اس کے گھر کے دروازے کے پاس ایک چبوترا بنا ہوا تھا۔ جو کسی اور گھر کے باہر نہیں تھا۔

بیل پوش منڈیر بھی ننگی ہو رہی تھی۔ سبزہ اجاڑ اور پامال ہو چکا تھا۔ بارش نے اسے کسی مفتوحہ علاقے کی طرح تاخت و تاراج کر کے رکھ دیا تھا اور کثرت بارش سے پھول دار پودے زمین پر لیٹے ہوئے تھے۔۔۔۔۔۔ بدشگونیوں کے آثار دیکھ کر نہ صرف میرے دل پر چوٹ لگی بلکہ میں سخت بدحواس اور پریشان بھی ہوا تھا۔ پھر میں وحشت زدہ ہو کر جھونپڑے کی طرف لپکا۔ مگر جھونپڑا بھی اسی طرح ویران اجاڑ اور سنسان سا تھا جیسے یہاں کسی انسان کا گزر ہی نہ ہوا ہو۔۔۔۔۔۔ ہر طرف موت کی سی خاموشی اور قبر کا سا سکوت طاری تھا۔۔۔۔۔۔ تمام کمرے بند تھے اور جو کمرا ان میں سب سے بڑا تھا۔ اس کے گھر کے دروازے پر باہر سے کنڈی چڑھی ہوئی تھی۔ راحت کی اس کمرے میں رہائش تھی اور شاید وہ کہیں گیا ہوا تھا۔

میں نے سوچا کہ اب آیا ہوں تو کیوں نہ اس کا انتظار کر ہی لوں۔ وہ شاید تھوڑی دیر میں آتا ہو گا۔ اس خیال سے کنڈی کھول کر جیسے ہی میں کمرے میں گھسا ایک دم سے اچھل پڑا۔ کیوں کہ اس کمرے میں ایک بڑی سی قبر دکھائی دی جو بالکل تازہ بنی ہوئی تھی۔۔۔۔۔۔ اس قبر کو دیکھ کر میں کانپ گیا۔۔۔۔۔۔ طرح طرح کے وسوسوں اور اندیشوں کے زہریلے ناگ پھنکارنے لگے۔۔۔۔۔۔ میرا دماغ ماؤف ہو گیا اور آندھیاں سی چلنے لگیں۔۔۔۔۔۔ یہ کس کی قبر ہو سکتی ہے؟ میں سوچنے لگا۔

چند لمحوں کے بعد راحت کا بوڑھا ملازم کمرے میں داخل ہوا۔۔۔۔۔۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ جیسے وہ کثرت سے روتا رہا ہو۔ "آپ۔۔۔۔۔۔؟ آپ۔۔۔۔۔۔؟" جب اس نے مجھے مخاطب کیا تو اس کا گلا بیٹھا ہوا تھا۔

"راحت کہاں ہے۔۔۔۔۔۔؟" میں نے اس سے سوال کیا۔ "یہ کس کی قبر ہے۔۔۔۔۔۔؟"

"وہ وفات پا گئے۔" اس نے غمگین لہجے میں جواب دیا۔ "یہ ان کی ہی قبر ہے۔"

"کیا۔۔۔۔۔۔؟" مجھے اس کی بات کا یقین نہیں آیا۔ مجھے اپنے سینے میں چھری سی اترتی محسوس ہوئی "کب انتقال ہوا۔۔۔۔۔۔؟"

"کل شام۔" اس نے بتایا۔ "آج صبح فجر کی نماز کے بعد ان کی تدفین ہوئی۔۔۔۔۔۔ ان کی والدہ ...ے سے بیمار ہو گئیں تو ان کے والد انہیں اسپتال لے گئے ہیں۔۔۔۔۔۔ مجھے وہ یہاں قبر کی نگہبانی کے لئے ... گئے ہیں۔ اس لئے میں یہاں رہ گیا ہوں۔"

میں کتنی ہی دیر سکتے کی سی حالت میں کھڑا رہا۔ میری آنکھوں سے آنسو سیلاب کی طرح بہتے رہے اور ... سے دل ٹکڑے ٹکڑے ہوئے جا رہا تھا۔ ایک دوست کی موت پر میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ ... ہی نہیں محسن بھی تھا۔ اس کا احسان میں کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ میرا اس بات پر ایمان تھا کہ کسی نے اپنی زندگی میں کوئی احسان کیا ہے تو اسے فراموش نہ کیا جائے۔ احسان چھوٹا ہوتا ہے نہ ہی بڑا ہوتا ہے۔ احسان، احسان ہی ہوتا ہے۔ جو احسان فراموش ہوتے ہیں وہ ساری زندگی کبھی خوش نہیں رہ سکتے۔

میں نے فاتحہ پڑھی اور اس کے لئے دعائے مغفرت کی۔ میں یہی کچھ کر سکتا تھا۔ میں گھر واپس جاتے ہوئے سوچنے لگا کہ رات راحت نہیں بلکہ اس کی روح آئی تھی۔ اس لئے اس کی آواز یکسر بدلی بے حد عجیب اور پھٹی ہوئی سی تھی۔ وہ سفید سایہ بنی ہوئی تھی اور پھر اس نے اس لئے ہی مصافحہ نہیں کیا۔ گھر کے اندر اس لئے نہیں آیا کہ آئینہ میں روح کا عکس نظر نہیں آتا اس طرح یہ پتا چل جاتا کہ وہ روح ہے اور اسے جانے کی جلدی اس لئے بھی تھی کہ اس کی فجر کے وقت تدفین ہونے والی تھی اور پھر اس کا چہرہ کیسا خوف ناک اور بے حد ڈراؤنا سا ہو گیا تھا۔ اس لئے اس کھوپڑی کی روح اس پر حاوی نہ ہو سکی اور میدان چھوڑ کر بھاگ گئی۔

☆......☆......☆

دوسرے دن میں دیر تک سوتا رہا۔ بیدار ہوا تو دن چڑھ آیا تھا اور دفتر جانے کا وقت نکل گیا تھا اور پھر اب میں دفتر جانے اور ملازمت کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ کیوں کہ راحت نے مجھے جس آسامی جادوگر کا پتا اور اس کے متعلق بتایا تھا میں اس سے فوراً ملنا چاہتا تھا۔ کیوں کہ وہی میری منزل تھی۔ یہاں آ کر ملازمت کرنے کا مقصد کسی بڑے پائے کے جادوگر سے ملنا اور جادو سیکھنا تھا۔ نوکری تو ایک بہانہ تھا...... لیکن یہاں آتے ہی ایک نہیں دو جادوگرنیوں سے واسطہ پڑا تھا۔ ایک تو فرزانہ سے اور دوسری شمشاد سے...... وہ حسن و شباب کشش، جوانی اور ابلتے شباب کے جادو سے مجھے اپنا اسیر بنانا چاہتی تھیں۔ ان کے جادو سے میرا دامن آلودہ نہ ہو سکا اس بات سے مجھے جو خوشی ہوئی اس کا اندازہ کوئی دوسرا نہیں کر سکتا تھا۔ میری پاک بازی قائم رہی تھی۔

جب میں نیچے آیا تو فردوس نے میرے لئے پر تکلف ناشتا بنا کر رکھا ہوا تھا۔ وہ بہت خوش تھی۔ اس کا رویہ یک سر بدلا ہوا تھا۔ کیوں کہ اس کے زیورات واپس مل گئے تھے۔ اب اس کے دل میں میرے لئے کوئی نفرت اور کدورت نہیں رہی تھی۔

جب میں ناشتا کرنے لگا تو وہ میز پر آ کر بیٹھ گئی اور اس نے بڑے میٹھے لہجے میں کہا۔ ”تم شمشاد سے شادی کرنے کے لئے تیار ہو نا؟“ میں اس کی بات سن کر چونکا۔ پھر میں نے کہا۔ ”نہیں...... میں شمشاد سے کیا کسی بھی لڑکی سے شادی کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔“

”کیا کہا......؟“ وہ اچھل پڑی۔ ”تم کس لئے اس سے شادی کرنا نہیں چاہتے ہو؟ کیا وہ حسین اور نوجوان نہیں ہے؟“

”اس لئے کہ مجھے اپنے پیروں پر کھڑے ہونا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں جب تک کھڑا نہ ہو جاؤں اس وقت تک شادی نہیں کروں گا۔“

”اگر ایسی بات تھی تو تم نے کل دوپہر شمشاد سے نہ صرف اظہار محبت کیا بلکہ شادی کا وعدہ بھی کیا۔“ وہ تنک کر بولی۔ ”ایسا کیوں کیا؟“

”میں نے اسے ٹالنے کے لئے ایسا کیا تھا۔“ میں نے جواب دیا تھا۔

”لیکن اس نے رات مجھ سے کہا کہ تم نے اس سے اظہار محبت کیا اور محبت کا فریب دے کر اسے آلودہ کر دیا۔“ فردوس نے تیز لہجے میں کہا۔

”جی نہیں...... آپ کی بہن نے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں اس قماش کا نہیں ہوں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ میں بہک جاتا۔ یہ سراسر بہتان ہے۔ تہمت ہے، بڑے دکھ اور افسوس کی بات ہے کہ آپ کی بہن نے ایک شرم ناک اور بے حیائی کی بات آپ سے کہی۔ بالفرض محال وہ داغ دار ہو بھی گئی تھی تو کیا ایسی بات اپنی بہن سے کہی جاتی ہے...... فرزانہ نے بھی مجھ پر تہمت لگائی تھی اور آپ اس سے میری شادی کر دینا چاہتی تھیں...... آپ شمشاد کی کسی بات کا یقین اور اعتبار نہ کریں۔ وہ محبت کے اندھے جنون میں مبتلا ہو کر اس لئے ایسا کر رہی ہے کہ آپ لوگ زبردستی اس سے میری شادی کر دیں۔ وہ ہر قیمت پر مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ جب کہ میں ابھی شادی کرنا نہیں چاہتا۔“

”تمہیں اس سے شادی کرنا ہو گی۔“ فردوس نے تیز لہجے میں کہا۔ ”اس لئے کہ تم نے اس کی عزت کو پامال کیا ہے...... اب وہ تمہارے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔ تم نے اس کے حسن و جوانی اور کشش سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اس غریب نے ساری رات رو رو کر اپنا برا حال کر لیا ہے۔“

”آپ جو قسم چاہیں لے لیں میں نے اس کی عزت کو ہاتھ تک نہیں لگایا اور وہ داغ دار نہیں ہوئی ہے۔“ میں نے کہا۔

”یہاں پر ایک زنانہ اسپتال ہے۔ وہاں اس کا طبی معائنہ کروائیں۔ اگر اس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اس کی عزت آلودہ ہو چکی ہے تو پھر میں اس سے شادی کر لوں گا۔ آپ میری عزت اور رشید سے جو دوستی ہے اسے بدنام اور رسوا نہ کریں۔ اس طرح تو عورت بدنام ہوتی ہے۔ مرد کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اپنی بہن کو سمجھائیں۔ آپ کو مجھ سے اچھے رشتے مل جائیں گے۔“

میری بات سنتے ہی اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور کمرے سے نکل گئی۔ میں بھی اپنے کمرے میں آ گیا۔ اب میں ابھی اور اسی وقت اپنے مشن پر روانہ ہونا چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے اپنے دستی بیگ میں دو جوڑے رکھے۔ کچھ ادویات رکھیں جو موسمی بخار میں کام آتی تھیں بسکٹ کے دو ایک پیکٹ رکھے اور فردوس کی نظروں سے بچتا ہوا گھر سے نکل گیا۔ میں اس کی نظروں میں اس لئے آنا نہیں چاہتا تھا کہ وہ یہ سمجھتی کہ میں نے واقعی اس کی بہن کی عزت داغ دار کی ہے۔ اس لئے گھر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔

جب میں گھر سے نکل کر کچھ دور چلا تو میرے بینک کا بوڑھا چپراسی مل گیا وہ سائیکل پر بینک کی ڈاک لے کر پوسٹ آفس سے آ رہا تھا اور بینک جا رہا تھا۔ اس کا نام جگن ناتھ تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر میرے پاس آیا۔ سائیکل سے اتر کے پہلے تو اس نے مجھے نمسکار کیا۔ پھر میری خیر خیریت دریافت کی۔ دفتر نہ آنے کی وجہ دریافت کی۔ پھر اس نے بیگ دیکھ کر پوچھا۔ ”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

”میں قصبہ نارنگ جا رہا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اس لئے میں نے آج دفتر سے چھٹی کی ہے۔“

”قصبہ نارنگ......؟“ چپراسی جگن ناتھ کے چہرے پر گہرا استعجاب سا چھا گیا۔ ”سر! آپ وہاں

کس لئے جارہے ہیں؟"

"سیر وتفریح کے لئے......؟" میں نے کہا۔ "میں نے سنا ہے کہ وہ آسام کا سب سے خوبصورت سرسبز وشاداب علاقہ ہے۔"

"وہ سرسبز وشاداب اور بہت ہی خوبصورت علاقہ تو ہے......" چپراسی جگن ناتھ نے کہا۔ "لیکن وہ یہاں سے بہت دور ہے رستہ بھی اچھا نہیں ہے۔ لیکن وہاں کی ایک بات بہت مشہور ہے۔ کیا آپ نے سنی ہے......؟ کہیں اس لئے تو نہیں جارہے ہیں؟"

"کون سی بات جگن ناتھ......؟" میں نے اس کی طرف متعجب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "میں نے اس کی خوبصورتی کے علاوہ کوئی اور بات نہیں سنی؟"

"وہ ایک ایسی بات ہے کہ جو وہاں جاتا ہے پھر کبھی واپس نہیں آتا۔" چپراسی جگن ناتھ نے کہا۔ "میرا مشورہ تو یہ ہے کہ آپ نہ جائیں تو بہتر ہے۔"

"وہ کس لئے واپس نہیں آتا؟" میری حیرت دوچند ہوگئی۔ "کیا وہ جگہ بھوتوں، چڑیلوں اور جنون کا مسکن ہے؟"

"اس لئے کہ وہاں کی عورتیں اور لڑکیاں بے حد حسین ہیں۔" چپراسی جگن ناتھ کہنے لگا۔ "ایسی حسین اور پرکشش اور پرشباب لڑکیاں پورے آسام میں کیا، بنگال میں کیا بلکہ ساری دنیا میں بھی نہیں ہوں گی۔ جو جاتا ہے وہ ان کے جال میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔"

"کیا وہ لڑکیاں اور عورتیں جادوگرنیاں ہیں جو مردوں کو اپنے جال میں پھانس لیتی ہیں؟" میں نے تجسس سے دریافت کیا۔

"حسن وشباب سے بڑا جادو کوئی نہیں ہے......؟" جگن ناتھ نے کہا۔ "وہ لڑکیاں اور عورتیں طبعاً بہت اچھی ہوتی ہیں۔ مرد ان کے اسیر ہوکر ان کی محبت اور حسن کے جادو سے ایسے متاثر ہوتے ہیں کہ وہ خود آنا بھی چاہیں تو آ نہیں سکتے ہیں۔ ان کا حسن اور جسم اس قدر بھرپور اور پرکشش ہوتا ہے کہ مرد دیوانے ہوجاتے ہیں۔ پھر وہ ایسی محبت کرتی ہیں جو مرد کے پیروں کی زنجیر بن جاتی ہے۔"

"بڑی حیرت کی اور عجیب سی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا اتنی حسین ہوتی ہیں کہ وہ مرد اپنے گھر والوں کو بھول جاتا ہے اور خود غرض بن جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔ وہ جادو ٹونا جانتی ہوں گی۔ اس لئے شادی کرنے کے بعد اسے جادو کے زیر اثر کرلیتی ہوں گی۔"

"وہاں شادی بیاہ نام کی کوئی چیز نہیں اور نہ ہی مذہب، رنگ ونسل کی کوئی بات ہے۔" چپراسی جگن ناتھ نے کہا۔ "وہاں جو مرد جس لڑکی یا عورت کا ہاتھ تھام لیتا ہے وہ اسے سویکار کرلیتی ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتی ہے کہ مرد کیا ہے...... بوڑھا ہے یا جوان ہے...... آسامی ہے یا بنگالی یا کسی اور ملک وقوم کا...... بس انہیں ایک مرد کی رفاقت چاہیے۔ وہ رنگ روپ بھی نہیں دیکھتی ہیں۔"

"یہ بڑی عجیب وغریب اور پراسراری بات ہے؟" میں نے کہا۔ "یہ نہیں ہوسکتا کہ گھر کی یاد اس

شخص کو ستائے...... اور ہاں...... مرد کا دل عورت سے جلد ہی بھر جاتا ہے۔ چاہے وہ کتنی ہی حسین، جوان اور پرکشش کیوں نہ ہو۔ جب یہ سحر ماند پڑجاتا ہے تو وہ اس سے نہیں نکل سکتا ہے۔"

"آپ بالکل درست فرمارہے ہیں......" چپراسی جگن ناتھ نے کہا۔ "لیکن وہاں ایک ایسا جادو ہے کہ جس سے کوئی نکل نہیں پاتا ہے۔"

"میں نے کہا نا کہ کوئی نہ کوئی ایسا جادو ہے جس سے وہ مرد کو سدا کے لئے اپنا غلام بنا کر رکھ لیتی ہیں۔" میں نے کہا۔

"میں آپ کو اس جادو کے بارے میں بتاتا ہوں۔" چپراسی جگن ناتھ کہنے لگا۔ "دراصل وہاں اس بات کی آزادی ہے کہ وہ جس کی بھی عورت کے ساتھ جب اور جس وقت چاہے جتنے دن چاہے بسر کرسکتا ہے۔ ان عورتوں میں آپس میں بڑی محبت اور میل جول ہے۔ حسد وجلن کیا ہے وہ بالکل بھی نہیں جانتی ہیں۔ اس لئے ایک بھی مرد وہاں سے نہیں آتا ہے کہ وہاں ایک سے ایک اور ہر عمر کی لڑکی اور عورت موجود ہے۔"

"یہ تم نے صرف سنا ہی ہے یا اس میں کوئی صداقت بھی موجود ہے؟" میں نے کہا۔ "جانے کیوں مجھے یقین نہیں آرہا ہے اس بات کا......"

"جب میں اٹھارہ برس کی عمر کا تھا تب میں اس گاؤں میں گیا تھا۔" چپراسی جگن ناتھ کہنے لگا۔ "مجھے کسی نے بتایا تھا کہ اس گاؤں میں حسین وجمیل عورتوں اور لڑکیوں کی دنیا آباد ہے۔ ایک لڑکی اور عورت بھی ایسی نہیں ہے کہ جسے بدصورت یا قبول صورت کہا جائے۔ نہ صرف رنگ وروپ بلکہ خدوخال بھی...... جسم بھی...... ہر لحاظ سے مکمل...... میں پتاجی کی کسی بات سے ناراض ہوکر نارنگ قصبے کی طرف فرار ہوگیا تھا۔ یہ گاؤں جس میں عورتوں کی آبادی اور حکومت ہے قصبہ نارنگ سے کوئی میل بھر پہلے ہے۔ میں تیس برس پہلے کی بات بتارہا ہوں۔ میں نے اس قصبے کے بارے میں سن رکھا تھا اور اس کے متعلق جانے کیسی کیسی کہانیاں مشہور تھیں۔ جب میں نے اس گاؤں کی حدود میں قدم رکھا تو سب سے پہلے ایک تالاب نظر آیا۔ اس تالاب کے دوسری طرف ایک سبک خرام ندی تھی۔ تالاب اور ندی کے درمیان ایک پگ ڈنڈی تھی۔ تالاب پر تین چار نوجوان لڑکیاں نہارہی تھیں اور تیر رہی تھیں۔ ندی کنارے عورتیں اور لڑکیاں کپڑے اور برتن دھورہی تھیں۔ کھیتوں میں کچھ مرد ہل چلارہے تھے۔ تالاب پر جو لڑکیاں نہارہی تھیں ان کی نظر جیسے ہی مجھ پر پڑی وہ میری طرف لپکیں...... تالاب کی لڑکیوں کو میری طرف جاتا ہوا ندی کی لڑکیوں اور عورتوں نے بھی دیکھ لیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں ان کے گھیرے میں تھا۔ وہ اس طرح سے لپک کر آئی تھیں اور مجھے اس طرح دیکھ رہی تھیں کہ جیسے میں کسی دور دیس سے آیا ہوا راج کمار ہوں۔

میں نے ان نوجوان لڑکیوں اور ان پچیس سے تیس برس کی عورتوں کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ میں ان دنوں اور اس عمر میں آسام بنگال گھوم چکا تھا۔ دل پھینک بھی واقع ہوا تھا۔

میں چند لمحوں تک ان حسین لڑکیوں کے چہرے باری باری دیکھتا رہا تھا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ ان میں سے کس کا انتخاب کروں۔ ان کے چہرے میں یکساں دل کشی تھی۔ ان کے جسم بھی متناسب اور

قامت اور نقش و نگار بھی تیکھے اور ایک جیسے ہی تھے۔ ان لڑکیوں نے میری طرف اپنے اپنے ہاتھ بڑھائے کہ ان میں سے کسی ایک کا ہاتھ تھام لوں۔ آخر میں نے ایک سولہ برس کی لڑکی کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا نام مونی تھا۔ جب میں نے اس کا ہاتھ تھاما تو اس کی ساتھی لڑکیوں نے اسے چوم چوم کر مبارک باد دی۔ پھر وہ لڑکی مونی میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے تالاب پر لے گئی تاکہ میں نہالوں۔ کیوں کہ میں ایک لمبا اور دشوار گزار سفر کر کے یہاں پہنچا تھا۔ میرا لباس گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا اور چہرے پر گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ جب میں نہا کر فارغ ہوا تو وہ مجھے اپنے گھر لے گئی۔ وہ اپنے ماں باپ، ایک بھائی اور دو جوان بہنوں کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کے گھر والے مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور میرا خیر مقدم کیا۔

میں نے چھ مہینے اس لڑکی کے ساتھ گزارے۔ وہ بلا کی حسین و پر شباب تھی۔ اس کی محبت میں ایسی گرم جوشی، والہانہ پن اور وارفتگی تھی کہ میں نے کسی اور عورت اور لڑکی کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ جب کہ وہاں کے دستور اور آزادی کے مطابق میں کسی بھی لڑکی سے محبت کر سکتا اور رات گزار سکتا تھا۔ میں اس کی محبت میں ایسا گرفتار ہوا تھا کہ کسی اور لڑکی کی طرف خیال ہی نہیں جاتا تھا۔ ایسے مرد جن کی عمریں تیس اور چالیس کے درمیان تھیں ان کے نزدیک یہ لڑکیاں اور عورتیں رنگین کھلونا تھیں۔ جس کا دل کرتا ان کے ساتھ کھیلتے رہتے۔

چھ ماہ کا عرصہ بیت گیا تھا۔ میں اس عرصے میں اپنے گھر والوں، دوستوں اور رشتہ داروں کو تقریباً بھول چکا تھا۔ اس لڑکی نے کچھ ایسا پیار دیا تھا مجھے، اس لئے بھی گھر والے یاد نہ آسکے۔ اس کی محبت میں اس لئے بھی شدت تھی کہ میں نے اس کی بہنوں کو بھولے سے ہاتھ لگایا اور نہ ہی کسی اور عورت کو میلا کیا تھا۔ جب کہ اس سے بھی حسین لڑکیاں اور عورتیں موجود تھیں۔ وہ مجھے پیاسی نگاہوں سے دیکھتی تھیں۔ شاید اس لئے کہ اس وقت گاؤں میں، میں تمام مردوں میں سب سے کم عمر تھا۔ لیکن اس کے باوجود کسی عورت نے مجھے ورغلانے کی کوشش کی اور نہ ہی بہکایا۔ اگر کوئی لڑکی یا عورت میری طرف پیش قدمی کرتی تو شاید میں خود پر قابو نہ رکھ پاتا اور وہ میری جھولی میں پکے پھل کی طرح ٹپک پڑتی۔

ایک روز میں نے رات سوتے وقت خواب میں اپنی ماں کو دیکھا۔ وہ بہت پریشان نظر آئیں اور مجھے یاد کر کے رو رہی تھیں۔ میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے اپنی ماں سے بڑی محبت تھی اور ماں بھی مجھے بہت چاہتی تھیں۔ میرے دل کے کسی کونے میں جو ماں کی محبت تھی حالات نے اسے تھپک کر سلا دیا تھا وہ ایک دم سے بیدار ہو گئی۔ میرا دل ماں کو دیکھنے اور ملنے کے لیے تڑپنے لگا۔ پھر میں نے بیدار ہو کر پہلو میں سوتی ہوئی محبوبہ پر ایک نظر ڈالی۔ اس کے حسن و شباب اور حسن کی کرشمہ سازیوں نے میری ماں کی محبت کے جذبے کو سرد کر دیا۔

میری نیند چوں کہ اچاٹ ہو چکی تھی اس لئے میں باہر کھلی فضاء میں آ گیا۔ اس وقت آسمان کے چوڑے چکلے سینے پر چاند مسکرا رہا تھا اور دودھیا چاندنی چاروں طرف کھل کر برس رہی تھی۔ میں گھر سے باہر بنے چبوترے پر آ کر بیٹھ گیا۔ میں چاند کی طرف دیکھ رہا تھا تو ایسا لگا کہ کوئی عورت چاند سے نکل کر

زمین کی طرف آ رہی ہے۔ پھر میں نے دیکھا کہ وہ مجھ سے خاصے فاصلے پر کھڑی ہے۔ وہ سفید لباس میں ملبوس تھی۔ میں نے اسے اپنا واہمہ سمجھا۔ نیند کی جھپکی میں جیسے سپنا دیکھ لیا تھا۔ لیکن جب میں نے غور سے اس عورت کی طرف دیکھا تو اچھل پڑا۔ وہ عورت کوئی اجنبی یا غیر نہیں تھی۔ میری ماں تھی۔ میں ماں کہہ کر بڑے زور سے اندھا دھند بھاگا۔ مجھے ایک زبردست ٹھوکر لگی۔ میں گر پڑا۔ میرا سر زمین سے ٹکرایا تھا جس سے میں نیم بے ہوش ہو گیا۔ میں نے اس نیم بے ہوشی کی حالت میں دیکھا کہ میری ماں نے مجھے اس طرح سے گود میں اٹھا لیا ہے جیسے میں شیر خوار بچہ ہوں۔ تھوڑی دیر بعد میں گہری بے ہوشی میں ڈوب گیا۔

جب مجھے پوری طرح ہوش آیا تو میں اپنے گھر سے چند قدم پر تھا۔ میرے گھر کے اندر ایک کہرام سا مچا ہوا تھا۔ میری ماں ہذیانی لہجے میں چیخ رہی تھی۔ میرا جگن ناتھ کہاں ہے؟ میرا بیٹا کہاں ہے؟ اسے بلاؤ۔ میں مرنے سے پہلے اسے دیکھنا چاہتی ہوں تاکہ سکون سے مر سکوں...... دیکھو...... وہ گھر سے باہر کھڑا ہے...... اسے اندر بلاؤ...... میرے بیٹے اندر آؤ۔ میرے لال اندر آؤ......

میں فوراً ہی اندر بھاگا۔ میری ماں بستر مرگ پر تھی اور آخری سانسیں گن رہی تھی۔ اس نے مجھے سینے سے لگا لیا اور دیوانہ وار چومنے لگی۔ چند لمحوں کے بعد وہ موت کی آغوش میں چلی گئی۔ ان کے کریا کرم کے بعد میری بہن نے مجھے بتایا کہ میرے آنے سے پہلے ماں چل بسی تھی۔ ڈاکٹر نے آ کر ان کی موت کی تصدیق بھی کر دی تھی۔ لیکن آدھے گھنٹے بعد انہیں پھر سے زندگی مل گئی۔ یہ ایک بڑی عجیب سی بات تھی۔ وہ آپ کو پا کر کلیجے سے لگا کر سکون سے مر گئیں...... پھر مجھے خیال آیا اور یہ معمہ حل ہو گیا کہ جب وہ پہلی بار مری تھیں تو ان کی آتما مجھے وہاں سے لے کر آئی اور پھر ان کے جسم میں داخل ہو گئی۔ ان کی آتما نے بھگوان سے پرارتھنا کی ہو گی کہ تھوڑی دیر کی زندگی اور دے دے تاکہ وہ اپنے بیٹے کو گلے سے لگا لیں۔ بھگوان نے ان کی بنتی سن لی اور ممتا کی فریاد کو ٹھکرا نہ سکے۔

ماں کی موت نے مجھے غم و صدمے سے نڈھال کر دیا تھا۔ میں کئی دنوں تک اس سے دوچار رہا۔ ایک بار بھی مجھے مونی کا خیال آیا اور نہ ہی میں نے اس کے پاس جانے کے بارے میں بھولے سے بھی سوچا۔ جب میں اس غم کی کیفیت سے پوری طرح نکل آیا تو مونی اور اس کا حسن و شباب مجھے بہت یاد آیا۔ اس کا خیال بہت ستانے لگا۔ ادھر میری بہن اور میرے پتا جی نے ایک لڑکی پسند کر لی تھی۔ میں اس لڑکی سے شادی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں مونی کے پاس جانا چاہتا تھا۔ لیکن مجھے اس کا موقع نہیں مل سکا۔ میری شادی کر دی گئی۔ جب میں نے سہاگ کی پہلی رات اپنی دلہن کا گھونگھٹ بے دلی سے اٹھایا تو اچھل پڑا۔ مجھے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا۔ وہ مونی تھی۔ سچ مچ کی مونی...... یہ جادو کا کمال تھا۔ مونی جادوگر شوتم کے پاس گئی اور اس نے میرے متعلق بتایا تو اسے رحم آ گیا۔ یہ راز میں اور مونی جانتے ہیں اور تیسرے شخص آپ ہیں۔ میں اور مونی محبت بھری زندگی گزار رہے ہیں۔ ہمارے تین بچے ہیں۔ یہ ہے میری آپ بیتی......"

پجاری جگن ناتھ نے اپنی جو کہانی سنائی تھی وہ نہ صرف بے حد دلچسپ بلکہ تحیر انگیز بھی تھی۔ میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ "تم نے جو اپنی کہانی سنائی ہے وہ تیس برس پہلے کی ہے...... کیا آج اب بھی اس

گاؤں کا وجود ہے؟ ایسی حسین عورتیں موجود ہیں؟"

"جی ہاں۔" چپراسی جگن ناتھ نے اپنا سر ہلا دیا۔ "یہ گاؤں صدیوں سے آباد ہے۔ آج بھی ہے اور صدیوں تک رہے گا۔"

"لیکن میں وہاں نہیں جا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں نارنگ قصبہ جادوگر شوتم سے ملنے جا رہا ہوں۔ میں نے اس کی بڑی تعریف سنی ہے۔"

"جادوگر شوتم سے ملنے......؟" وہ بڑے زور سے چونکا۔ حیران بھی ہوا، پھر اس نے پوچھا۔ "کس لئے آپ اس سے ملنا چاہتے ہیں؟"

"اس لئے کہ میں نے اس کا بڑا نام، شہرت اور تعریف سنی ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "اس کے علاوہ مجھے جادو اور جادوگروں سے بہت دلچسپی ہے اور جادوگروں سے ملنے کا بڑا اشتیاق ہے۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ وہ قصبہ نارنگ میں رہتا ہے اور اس کی عمر ایک سو دس برس کی ہے۔"

"میرے پتاجی ہی نہیں بلکہ بہت سارے لوگ کہتے تھے کہ شوتم جیسا با کمال اور بڑا جادوگر آسام میں پیدا ہوا نہ ہوگا۔" اس نے کہا۔ "اس کے مرتے ہی ایک بہت بڑا باب بند ہو جائے گا۔ وہ جتنا بڑا جادوگر ہے اتنا ہی بڑا اور اچھا آدمی ہے۔ لیکن مدت سے کسی نے اس کی شکل نہیں دیکھی۔ وہ گوشہ گمنامی میں زندگی گزار رہا ہے۔ لیکن اس سے جا کر ملنا اتنا آسان نہیں ہے۔"

"آسان کیوں نہیں ہے......؟" میں نے حیرت سے اس کی شکل دیکھی۔ "کیا اب وہ کسی سے ملتا نہیں ہے؟"

"اس لئے کہ قصبہ نارنگ جاتے وقت سنا ہے کہ کچھ بلائیں راستے کا پتھر بنتی ہیں۔ مسافروں کو اس قدر ہراساں اور پریشان کرتی ہیں کہ وہ الٹے قدموں لوٹ آتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ اس گاؤں کی حسین عورتیں ہیں۔ یہ بلائیں نہیں چاہتی ہیں کہ کوئی مرد اس گاؤں میں جا کر عیش کی زندگی گزارے۔ یہ بلائیں کسی اور جگہ سے آئی ہوئی ہیں۔ انہوں نے وہاں بسیرا کر لیا ہے۔" وہ بولا۔

"کچھ بھی ہو جائے۔" میں نے بڑے عزم و حوصلے سے کہا۔ "میں ہر قیمت پر جادوگر شوتم سے مل کر آؤں گا۔ میں بلاؤں سے ڈرتا نہیں ہوں...... بلائیں میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتی ہیں۔ کیوں کہ میری نیت صاف ہے۔ جس کی نیت صاف ہو، جذبہ اچھا ہو اسے کسی بلا سے ڈرنا نہیں چاہئے اور پھر میں یہ جانتا ہوں اور اس بات پر میرا ایمان ہے کہ مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہے۔"

"ہو سکتا ہے کہ بلاؤں کا وجود نہ ہو۔" چپراسی جگن ناتھ نے کہا۔ "آپ بہت اچھے آدمی ہیں۔ بھگوان آپ کی رکھشا کرے...... لیکن راستہ بہت ہی خراب، دشوار گزار اور ناہموار بھی ہے۔ قصبہ نارنگ ایک طویل مسافت پر ہے۔"

چپراسی جگ ناتھ کو چوں کہ بہت کام تھا۔ اس نے اپنی کہانی سنانے میں خاصا وقت صرف کر دیا تھا اس لئے وہ بینک چلا گیا اور میں نے اپنی راہ لی۔ لیکن میں اس کی کہانی کے بارے میں سوچتا رہا کہ کیا واقعی

ایسا گاؤں اور ایسی عورتیں موجود ہو سکتی ہیں؟ اس کی کہانی بڑی حیرت انگیز تھی۔ میں نے دل میں طے کر لیا کہ میں اس گاؤں اور وہاں کی عورتوں کو ضرور دیکھوں گا۔

کوئی ایک گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد میں ایک درخت کے نیچے کچھ دیر ستانے اور پانی پینے کے لئے بیٹھ گیا۔ میں نے ایک بوتل میں پانی بھر کے اپنے بیگ میں رکھ لیا تھا۔ میں پانی پینے کے بعد چند قدم چلا تھا کہ ایک جوان شخص نظر آیا، وہ بھی شمال کی طرف جا رہا تھا۔ شاید راستے میں اس کا گاؤں ہوگا۔ اس کی عمر تیس بتیس برس کی ہوگی۔ اس نے مجھے دیکھ کر نمسکار کیا۔ وہ اپنے چہرے مہرے اور وضع قطع سے دیہاتی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے مجھے حیرت سے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور کہا۔

"آپ نہ تو بنگالی معلوم ہوتے ہیں اور نہ ہی آسامی؟ کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"میں ایک سیاح ہوں۔" میں نے اسے جواب دیا۔ "میں قصبہ نارنگ جا رہا ہوں جس کی میں نے بہت تعریف سنی ہے؟"

"قصبہ نارنگ جا رہے ہیں یا چندانگر......؟" اس کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔ اسے جیسے میری بات کا یقین نہیں آیا تھا۔

"چندانگر......؟" میں نے دریافت کیا۔ "یہ کون سا گاؤں ہے؟ کیا یہ قصبہ نارنگ سے زیادہ خوبصورت ہے؟"

"چندانگر قصبہ نارنگ سے پہلے آتا ہے۔" وہ بتانے لگا۔ "اس کا نام چندانگر اس لئے رکھا گیا ہے کہ اس گاؤں میں چاند جیسی اور دنیا کی حسین ترین لڑکیاں اور عورتیں رہتی ہیں۔ وہاں آج تک بدصورت یا دائی شکل وصورت کی کوئی عورت پیدا نہیں ہوئی۔ کچھ مرد وہاں جاتے ہیں اور ان عورتوں کے ایسے اسیر اور دیوانے ہو جاتے ہیں کہ پھر وہ وہاں سے نہیں لوٹتے ہیں۔"

"نہیں...... میں چندانگر نہیں جا رہا ہوں بلکہ قصبہ نارنگ جادوگر شوتم سے ملنے جا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں ہزاروں میل دور سے اس کی شہرت اور اس کے جادوئی کمالات کے بارے میں سن کر آ رہا ہوں۔ کیا تم بھی قصبہ نارنگ میں رہتے ہو؟"

"آج تک کوئی بھی سیاح یا عام آدمی اس سے ملنے نہیں آیا۔" وہ متعجب لہجے میں کہنے لگا۔ "آپ پہلے آدمی ہیں جو اس سے ملنے جا رہے ہیں۔ میں قصبہ نارنگ میں ہی رہتا ہوں۔ میں کسی کام سے شیلانگ گیا تھا۔ واپس جا رہا ہوں...... لیکن آپ سچ سچ بتائیں کہ آپ اس سے ملنے کیوں اور کس لئے آئے ہیں......؟ جب کہ اس سے ملنے مقامی لوگ بھی نہیں آتے ہیں۔ اسے بھول گئے ہیں اور بھولتے ہی جا رہے ہیں۔ اب کوئی اس کو عزت اور قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتا ہے۔ کتنے دکھ اور افسوس کا مقام ہے۔"

"بھائی میرے......! سچی بات تو یہ ہے کہ میں اس سے جادو سیکھ کر ایک بڑا اور اس کے جیسا ہی جادوگر بننا چاہتا ہوں۔" میں نے سچ سچ بتا دیا۔

"اچھا......" اس کی حیرت دوچند ہوگئی۔ "لیکن آپ جادوگر بن کر کریں گے کیا......؟ جادو کا فن سیکھنے میں کیا رکھا ہے؟"

"میں جادوگر بن کر انسانیت کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "کیوں کہ دنیا میں دہشت گردی، قتل وغارت گری، ظلم وستم، لوٹ کھسوٹ اور اتنی ساری برائیاں بڑھ گئی ہیں کہ ان کی روک تھام اور خاتمے کے لئے ایک موثر قوت اور ایک ہتھیار کی ضرورت ہے۔ میرے خیال میں آج کے دور میں اس سے بڑا ہتھیار کوئی اور نہیں ہوسکتا۔ اس سے بڑے سے بڑے شیطان کو ٹھیک کیا جاسکتا ہے۔"

"آپ جادو دولت کے حصول کے لئے سیکھنا چاہتے ہیں یا انسانیت کی خدمت کے لئے......؟" اس نے مشکوک لہجے میں دریافت کیا۔

"نہیں...... دولت کے لئے نہیں......" میں نے جواب دیا۔ "مجھے کبھی دولت کی خواہش رہی اور نہ اب ہے...... اس دور میں دولت کا حصول زیادہ مشکل نہیں ہے۔ اگر کسی کو دولت کمانا ہے تو وہ اپنے ضمیر کا گلا گھونٹ دے اور اندر کے آدمی کو مار دے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک آدمی کے دل میں دولت کی خواہش موجود نہ ہو۔" وہ بولا۔ "آج دنیا میں ہر شخص دولت کے لئے پاگل ہے اور اس کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔ خون خرابا کررہا ہے۔ میں نے کلکتہ میں دیکھا کہ لوگ دولت کے لئے کیا کچھ نہیں کررہے ہیں۔"

"میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ مجھے دولت کی کوئی ضرورت ہے اور نہ ہی کوئی خواہش ہے۔" میں نے کہا۔ "تم میری بات کا یقین کیوں نہیں کرتے ہو؟"

"اس لئے کہ مجھے آج تک آپ جیسا ایک شخص بھی نہیں ملا جس نے کہا ہو کہ دولت کی تمنا بالکل بھی نہیں ہے۔" اس نے کہا۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ شوتم جادوگر کے شاگرد وغیرہ بھی ہیں؟" میں نے موضوع بدلا۔ "کیا وہ کسی کو یا مجھے جادو سکھانا پسند کریں گے؟"

"انہوں نے شاید دو ایک لوگوں کو اس شرط پر جادو سکھایا تھا کہ وہ دولت نہیں کمائیں گے۔" اس نے کہا۔ "یہ آج سے تیس چالیس برس پہلے کی بات ہے۔ لیکن انہوں نے عہد شکنی کی، کمزوروں اور دشمنوں کو ہراساں اور پریشان کیا اور شاید موت کی نیند بھی سلا دیا۔ پھر انہوں نے ان لوگوں کو جادو سے محروم کردیا۔ اس کے بعد انہوں نے کسی کو جادو سکھایا اور نہ شاگرد بنایا...... یہ بات میں لوگوں سے سنتا آرہا ہوں۔ مگر وہ چاہتے تو اپنے جادو کے بل بوتے پر کیا کچھ نہیں کرسکتے تھے۔ ایک مہاراجا کی سی زندگی گزار سکتے تھے...... وہ ایک عظیم جادوگر ہی نہیں ایک عظیم انسان بھی ہیں۔"

"میں ان سے گزارش کروں گا کہ وہ مجھے اپنا شاگرد بنالیں؟" میں نے کہا۔ "دیکھیں وہ کیا کرتے اور کہتے ہیں؟"

"کوشش کرکے دیکھ لیں......" اس نے کہا۔ "لیکن وہ شاید آپ کا کوئی امتحان لیں اور ہر طرح کی

آزمائش کریں؟"

"میں ان کے ہر امتحان میں پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔" میں نے کہا۔ "ہر آزمائش میں ثابت قدم رہوں گا...... میں یہ جادو اپنی ذات کے فائدے کے لئے سیکھنا نہیں چاہتا ہوں۔ یہ بات تمہیں بتاچکا ہوں۔ دیکھو...... شوتم مجھ سے ملنے کے بعد کیا فیصلہ کریں گے۔"

ہم دونوں ایک تالاب کے قریب درختوں کے نیچے بیٹھ گئے۔ اس نے زمین پر اپنی چادر بچھادی تھی۔ وہ تو لیٹ گیا تھا لیکن میں تنے کے سہارے بیٹھا رہا۔ پھر میں نے بسکٹ نکال کر اسے بھی دیئے۔ اسے پانی بھی پلایا۔ ہم دونوں خاصی دیر بیٹھے رہے۔ پھر چل پڑے۔ چند قدم چلنے کے بعد وہ ایک گڑھے کے پاس ٹھٹک کے ایک دم سے رک گیا۔ دوسرے لمحے میری طرف تیزی سے گھوم کر بولا۔ "ادھر فوراً آئیں......"

جب میں اس کے سامنے پہنچا تو اس نے گڑھے کی طرف اشارہ کیا۔ میں دوسرے لمحے اچھل پڑا۔ میری نظروں کو یقین نہیں آیا۔ میری آنکھیں ایک لمحے کے لئے خیرہ ہوگئیں۔ اس گڑھے میں نہ صرف بہت سارے ہیرے جگ مگا رہے تھے بلکہ ہیرے جواہرات کے زیورات بھی پڑے ہوئے تھے۔ یہ زیورات دس بارہ کلو سے زیادہ کے ہوں گے۔ ان کی ساخت، بناوٹ اور نمونے بتارہے تھے کہ یہ قدیم شاہی زیورات ہیں۔ اس گڑھے میں اتنے سارے زیورات پتھروں کی طرح بھرے ہوئے تھے کہ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ میں مبہوت سا کھڑا رہا۔

اس شخص نے جس کا نام مونگا تھا وہ اس گڑھے کے منہ کے پاس زمین پر دوزانو ہوکر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے جھک کر ان زیورات میں سے ہیروں کی ایک مالا نکالی جس میں بیش قیمت اور انمول قسم کے ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ اس نے مالا کو چمکتی نظروں سے دیکھا۔ پھر اس نے مجھ سے کہا۔ "صاحب جی! آپ جانتے ہیں اس مالا کی کیا قیمت ہوگی؟ اس کے ایک ایک ہیرے کی کیا قیمت ہوگی؟"

"جی نہیں......" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہ مجھے سونے کی قیمت کا اندازہ ہے اور نہ ہی میں ہیروں کے متعلق کچھ جانتا ہوں۔"

"ایک ہیرا ایک لاکھ سے کم کا نہیں ہے۔" اس نے کہا۔ "اس مالا میں بیس ہیرے ہیں۔ یہ بیس لاکھ روپے کے ہوئے۔"

"ایک ہیرا ایک لاکھ روپے کا......؟" میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔ "یہ بیس لاکھ روپے کی مالا ہے؟ لیکن اس کی قیمت کا اندازہ......؟"

"میں کلکتہ میں ایک بہت بڑے سنار کی دکان پر دس برس تک کام کرتا رہا ہوں۔" مونگا نے جواب دیا۔ "اس لئے مجھے ان کی قیمت کا اندازہ ہے اور میں ایک ہی نظر میں دیکھ کر معلوم کرلیتا ہوں کہ ہیرا اصلی ہے یا نقلی، اس طرح سونے میں بھی...... میری آنکھوں کو دھوکا نہیں ہوگا۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم ایک جوہری بھی ہو......" میں نے کہا۔ "تمہارے خیال میں یہ جو خزانہ ہے وہ کتنی مالیت کا ہوگا؟"

"یہ کسی بھی طرح دو کروڑ روپے سے کم نہ ہوگا۔" اس نے جواب دیا۔ "مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میں سندر سپنا دیکھ رہا ہوں۔"

"دوست! یہ سپنا نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ ایک خزانہ ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ کیا اس خزانے پر کسی کی نظر نہیں پڑی اور جانے کتنے لوگوں کی نظروں سے محفوظ رہا۔ سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ یہاں کیسے ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ کسی نے کبھی یہ خزانہ کہیں سے یہاں لا کر گڑھا کھود کر چھپا دیا ہوگا......" مونگا کہنے لگا۔ "وہ بھول گیا ہوگا یا پھر زندگی سے محروم ہوگیا ہوگا۔ بارشوں نے آخر اس گڑھے کے منہ کی مٹی کو بہا دیا ہوگا۔ تین دن پہلے کیسی زبردست بارش ہوئی تھی۔"

"تم کیا کرو گے اب......؟" میں نے اس سے سوال کیا۔ "کیا پولیس کو اس خزانے کے بارے میں بتا دو گے کہ وہ اسے تحویل میں لے لے۔"

"نہیں......نہیں......" مونگا نے نفی کے انداز میں سر ہلایا۔ "پولیس کو کیوں بتاؤں......؟ یہ خزانہ تو میں نے دریافت کیا ہے۔ اس خزانے میں سے میں تمہیں دو ایک چھوٹی موٹی چیزیں دے دوں گا۔ اس کے علاوہ میں کچھ اور نہ دوں گا۔"

"نہیں دوست! مجھے کچھ بھی نہیں چاہئے۔" میں نے کہا۔ "یہ خزانہ تمہیں ہی مبارک ہو؟ لیکن میرے خیال میں یہ خزانہ حکومت کو دے دینا ہی بہتر ہے۔ کیوں کہ یہ حکومت کی امانت ہے۔ تمہاری مرضی جو آئے کرو۔ میں کچھ دخل نہیں دوں گا۔"

"کہیں تمہاری نیت میں تو فتور نہیں آ رہا ہے؟" اس نے چوکنا ہو کر مشکوک لہجے میں کہا۔ پھر وہ مجھے گھورنے لگا۔

"یہ خیال تمہیں کس لئے آیا......؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "کیا تمہیں اندازہ نہیں ہوا کہ میں کیسا آدمی ہوں......؟"

"دولت ایک ایسی چیز ہے کہ نہ باپ بیٹے پر بھروسا کرتا ہے اور نہ بیٹا باپ پر......" اس نے جواب دیا۔ "ایک ایک تولے پر خون خرابہ ہو جاتا ہے۔ نیت میں فرق آ جاتا ہے۔ جب کہ یہ کروڑوں کی مالیت کا خزانہ ہے۔ اس لئے میں تم پر بھروسا نہیں کر سکتا...... میں سمجھ گیا ہوں کہ تم مجھے فریب اور دھوکے سے مار دو گے اور سارا خزانہ ہتھیا لو گے...... تم مجھے چالباز شخص دکھائی دیتے ہو۔"

"تم مجھ سے قسم لے لو مجھے اس میں سے رتی برابر سونا نہیں چاہئے اور نہ ہی کوئی زیور۔" میں نے کہا۔ "تم سارا خزانہ لے لو...... میں چلتا ہوں۔ میرے لئے اس خزانے سے بڑھ کر شوتم جادوگر ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ تم یہ خزانہ لے کر جہاں جانا چاہو چلے جانا......"

"اگر ایسی بات ہے تو رکو۔" اس نے کہا۔ "یہ میرے لئے بڑی حیرت کی اور ناقابل یقین بات ہے کہ تمہیں دولت کی ذرہ برابر بھی ہوس نہیں ہے۔ شاید تم دنیا کے پہلے آدمی ہو جسے دولت سے کوئی دلچسپی

نہیں ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں تم جیسا آدمی نہیں دیکھا۔"

"اس دنیا میں ایسے بہت سارے لوگ موجود ہیں اور تمہیں ملیں گے۔ جنہیں دولت سے کوئی دلچسپی نہیں اور نہ ہی ان کے دل میں ہوس ہوگی۔" میں نے کہا۔ "کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ دولت جتنی اچھی چیز ہے اتنی ہی بری بھی...... یہ آدمی کو فرعون بنا دیتی ہے۔ خود غرض اور دولت پرست، وہ اچھے برے کی تمیز کھو بیٹھتا ہے...... اتنی ساری دولت اس کے کسی کام کی نہیں ہوتی ہے۔ آدمی کے پاس اتنا کچھ ہو کہ وہ دو وقت پیٹ بھر کے کھا سکے۔ اگر اس کے پاس ضرورت سے زیادہ ہو تو وہ ضرورت مندوں اور محتاجوں کو بھی دے۔ جو دل کھول کر غریبوں کی مدد اور خیرات کرتا ہے۔ اللہ اسے اور بھی دیتا ہے...... محنت، دیانت داری سے جو کمایا جاتا ہے اس میں خیر و برکت بھی ہوتی ہے اور وہ دولت راس بھی آتی ہے۔ مفت کی حرام کی اور راستے کی دولت بھی راس نہیں آتی۔"

"بکواس اور اپنا فلسفہ بند کرو۔" وہ دہاڑا اور اس نے اپنی جیب سے چشم زدن میں چاقو نکال لیا۔

"تم میری چادر میں یہ سارا خزانہ رکھ کر باندھو۔ مجھے دولت کی ضرورت ہے۔ دولت کے بغیر میں ایک اچھی زندگی گزار نہیں سکتا۔ چلو جلدی کرو۔"

میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ میں چاہتا تو اسے بڑی آسانی سے قابو بھی کر سکتا تھا۔ اسے زخمی یا بے ہوش کر سکتا تھا۔ زمین پر بہت سارے ہر سائز کے پتھر پڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک پتھر بھی اٹھا کر اس کے منہ یا سر پر دے مارتا کہ اس کی کھوپڑی گھوم جاتی۔ وہ یقیناً بے ہوش ہو جاتا۔ لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ کیوں کہ میرے دل میں دولت کی خواہش یا ہوس بالکل بھی نہیں تھی۔

جب میں نے اس کی چادر میں تمام زیورات گڑھے سے نکال کر رکھ کے چادر باندھ دی تو وہ بہت خوش ہو گیا۔ پھر اس نے مجھ سے کہا۔

"چوں کہ تم واقعی ایک شریف اور ایمان دار نوجوان ہو اس لئے میں تمہیں قتل نہیں کروں گا...... میں ابھی یہاں سے روانہ ہو رہا ہوں۔ تم آدھے گھنٹے کے بعد روانہ ہونا...... قصبہ نارنگ پہنچ کر کسی سے نہ تو میرا پتا پوچھنا اور نہ ہی اس خزانے کے بارے میں کسی کو کچھ بتانا......" پھر اس نے رک کر ایک زوردار قہقہہ مارا۔ "تم نارنگ پہنچ ہی نہیں پاؤ گے۔ لہٰذا مجھے تم سے ڈرنے کی کیا ضرورت؟"

"میں نارنگ کیوں نہیں پہنچ سکتا......؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"اس لئے کہ چندا نگر کی عورتوں کے حسن و شباب کے جادو سے نکل کر تم نہیں جا سکو گے۔" وہ معنی خیز انداز سے مسکرایا۔ "تم ان کے جادو کے زور سے نہ صرف اپنے آپ کو بلکہ اپنے گھر والوں کو بھی بھول جاؤ گے۔ تمہیں یہ یاد ہی نہیں رہے گا کہ تم نارنگ کس لئے جا رہے تھے؟"

"ہو سکتا ہے کہ میں ان کے حسن و شباب کے جادو سے نکل جاؤں۔" میں نے کہا۔ "تمہیں مجھ سے خوف زدہ اور پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ میں شوتم سے ملنے جا رہا ہوں اور اس سے مل کر واپس چلا جاؤں گا۔ لہٰذا تم مجھ سے بے فکر رہو۔"

اس نے اپنی گٹھڑی اٹھا کر اپنے کندھے پر رکھی اور ایک ہاتھ سے چاقو فضاء میں لہراتے ہوئے کہا تو اس کا لہجہ بڑا کرخت تھا۔ "اگر تم میرے تعاقب میں آئے تو میں تمہیں چاقو مار دوں گا۔ تم آدھے گھنٹے تک اپنی جگہ سے نہیں ہلو گے۔ چلو بیٹھ جاؤ۔"

میں درخت کے نیچے خاموشی سے بیٹھ گیا۔ وہ مخالف سمت میں آگے بڑھ گیا۔ نظروں سے اوجھل ہونے تک مڑ مڑ کے مجھے دیکھتا رہا کہ کہیں میں اس کے تعاقب میں تو نہیں آ رہا ہوں۔ میں بڑے سکون واطمینان سے بیٹھا رہا۔ مجھے نہ تو اس کے تعاقب میں جانا تھا اور نہ ہی ایسی کوئی جلدی تھی۔ مجھے اطمینان اس لئے تھا کہ راستہ قصبہ نارنگ کا معلوم تھا۔ میں دیر سویرے وہاں پہنچ سکتا تھا۔

میں کوئی آدھے گھنٹے کے بعد اٹھا اور اپنا بیگ کندھے سے لٹکا کر چل پڑا۔ میں نے ایک میل کی مسافت طے کی تھی کہ دائیں جانب ایک تالاب دکھائی دیا۔ تالاب درختوں سے گھرا ہوا تھا۔ ایک درخت کے پاس ایک شخص زمین پر لیٹا دکھائی دیا اور ایک گٹھڑی سی دکھائی دی۔ میں نے لباس سے اسے پہچان لیا۔ یہ شخص مونگا تھا۔ شاید تھک ہار کے لیٹ گیا تھا۔ ظاہر ہے پندرہ سولہ کلو وزن کندھے پر اٹھا کر چلنا آسان نہیں تھا۔ زیادہ دیر تک چلنے سے تھک جانا لازمی تھا۔ وہ تھک کر لیٹ گیا تھا کہ کچھ دیر سستا کر چل پڑے۔ مجھے اس کا چاقو بھی نظر آیا جو اس کے پیروں کے پاس پڑا تھا۔ مجھے اس کا سر اور بدن دکھائی نہیں دیا تھا۔ صرف پیر اور وہ گٹھڑی نظر آئی تھی۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ اس کا چاقو اپنے قبضے میں لے لوں اور اس چاقو کے زور پر نارنگ تک پہنچوں۔ میں دبے قدموں اور آہٹ پیدا کئے بغیر بڑھا۔ میں بڑا احتاط تھا۔ کیوں کہ جاگتے ہی وہ مجھے چاقو مار سکتا تھا۔

مگر میں اس کے چاقو اور پیروں کے پاس پہنچتے ہی ایک دم سے ٹھٹک کے رک گیا اور میرے سارے بدن میں خوف ودہشت کی لہر بجلی کی تیز رو کی طرح سن سناتی ہوئی اترتی چلی گئی۔ میری رگوں میں خون برف کی طرح سرد ہونے لگا۔ میری نظروں کے سامنے ایک ایسا دل خراش منظر تھا جس نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیئے۔ مونگا مر چکا تھا اور اس کا جسم نیلا ہو رہا تھا۔ اس کے جسم سے سانپ اور بچھو اور کن کھجورے چپٹے ہوئے تھے۔ اس گٹھڑی میں زیورات کے بجائے چھوٹے بڑے سانپ بھرے تھے۔ اس میں ایک بھی زیور موجود نہیں تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ زیورات کیڑے اور زہریلے سانپ بن گئے اور انہوں نے مونگا کو ڈس لیا۔

زیورات کا خزانہ جسے پا کر وہ خوشی سے پھولا نہیں سمایا تھا اور اسے اپنی ملکیت سمجھ لیا تھا وہ اس کے لئے موت کا باعث بن گیا تھا۔ معلوم نہیں یہ خزانہ کس کا تھا۔ شاید کسی جادوگر کا تھا یا کسی بدروح کا...... اس لئے اس نے مونگا کو خزانہ چرانے پر موت کی نیند سلا دیا۔ وہ زیورات سانپ اور زہریلے کیڑے بن گئے تھے تا کہ کوئی اور ان زیورات کو ہاتھ لگانے کی کوشش نہ کرے۔

میں زیادہ دیر وہاں کھڑا نہ رہ سکا۔ مونگا کے عبرت ناک انجام پر کف افسوس ملتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ وہاں کچھ دیر اور کھڑے رہنا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ سانپ مجھے بھی ڈس سکتے تھے۔ مونگا میری

بات مان لیتا تو اس کی نوبت نہیں آتی۔ میں چلتے چلتے چندانگر کی حسین وجمیل لڑکیوں اور عورتوں کے حسن وشباب کے جادو کے توڑ کے بارے میں سوچتا رہا۔

ناہموار اور دشوار گزار راستے سے گزرتا ہوا جب میں ایک جھیل کے پاس پہنچا تو اس سے کوئی سو قدم پر ایک سبک خرام ندی دکھائی دی۔ چپراسی جگن ناتھ نے مجھے بتایا تھا کہ اس گاؤں کے باہر ایک جھیل ہے اور وہاں سے ایک بہتی ندی دکھائی دے گی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں چندانگر کے گاؤں پہنچ گیا تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میں نے سوچا کہ یہاں کی عورتوں کے حسن وشباب کے سحر سے کیسے اور کیوں کر بچوں۔

قصبہ نارنگ جانے کے لئے کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ اگر تھا تو مجھے اس کا علم نہیں تھا۔ یقیناً کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ اس گاؤں سے گزرنا مجبوری تھا۔ چوں کہ میں مسلسل پانچ میل تک چلنے سے بے حد تھک گیا تھا۔ نہ صرف بڑے زور کی پیاس بلکہ بھوک بھی لگ رہی تھی۔ میں جھیل کے پاس والے درخت کے نیچے لمبی لمبی خودرو گھاس پر بیٹھ گیا تا کہ بسکٹ کھا کر اور پانی پی کر اپنا سفر جاری رکھ سکوں۔ چندانگر یہاں سے نصف فرلانگ پر تھا اور چندانگر سے قصبہ نارنگ ایک میل دور تھا۔ پیاس اور بھوک نے مجھے سخت نڈھال کر دیا تھا۔ میں جاں بلب ہو رہا تھا۔

میں نے بیٹھ کر سانس بھی نہیں لیا تھا کہ ایک بوڑھا شخص جانے کہاں سے آ کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کی عمر اسی برس سے کم نہ ہو گی۔ وہ بہت کمزور اور لاغر لگ رہا تھا۔ اس کا چہرہ جھریوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ ایک دم دھپ سے زمین پر بیٹھ گیا اور بولا۔

"بیٹا! کچھ کھانے کے لئے ہے تو دے دے...... میں دو دن سے بھوکا ہوں...... پیاس سے میری جان نکلی جا رہی ہے۔"

میں نے اب تک جھیل کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ جھیل میں پانی نہیں کیچڑ تھا۔ وہ ایک طرح سے [illegible]ک پڑی تھی۔ ندی بھی یہاں سے بہت دور تھی۔ مجھ میں اتنی ہمت اور سکت نہیں رہی تھی کہ چند قدم بھی چل سکوں۔ بھوک سے میرا خود برا حال ہو رہا تھا۔ ایک دو دن سے بھوکا فقیر میرے سامنے تھا۔ اس کی حالت بھی ایسی تھی کہ دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ اسے دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا اگر اسے کچھ کھانے کو نہیں ملا تو وہ [illegible]پ تڑپ کر اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کے مر جائے گا۔ میں نے بیگ میں سے بسکٹ نکالے تو وہ صرف چار عدد [illegible] میں نے سوچا کہ میں کسی نہ کسی طرح بھوک پیاس برداشت کر لوں گا۔ روزوں میں ایسی صورت حال سے دوچار ہونا پڑتا تھا جب رمضان میں سخت گرمی ہوتی تھی۔ چوں کہ میں بچپن سے روزے رکھتا آیا تھا [illegible] بھوک پیاس برداشت کرنے کا عادی تھا۔ میں اس وقت خود غرضی کا مظاہرہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کیوں [illegible]ے سامنے ایک اجنبی بوڑھا تھا۔ اس سے میرا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ انسانیت کا رشتہ تھا۔ میں نے [illegible] بسکٹ اس کی طرف بڑھا دیئے۔ وہ ان پر ٹوٹ پڑا۔ واقعی وہ دو دن سے بھوکا معلوم ہوتا تھا۔ جب [illegible] نے بسکٹ کھا لیے تو میں نے پانی کی بوتل بھی اس کی طرف بڑھا دی۔ اس میں نصف بوتل پانی تھا جو

اس نے ایک ہی سانس میں غٹاغٹ پی لیا پانی پینے کے بعد اس نے آنکھیں بند کر کے سکون واطمینان کا ایک گہرا سانس لیا جیسے اسے بڑا سکون اور ایک نئی زندگی اور نئی توانائی ملی ہو۔ چند لمحوں کے بعد اس نے آنکھیں کھول دیں اور میری طرف پلکیں جھپکاتے ہوئے دیکھتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں بولا۔

"بیٹا! تمہیں ایشور! سدا سکھی اور خوش رکھے...... اگر تم نے بسکٹ اور پانی نہ دیا ہوتا تو میں بھوک پیاس سے مرجاتا...... تم نے مجھ پر جو دیا کی ہے میں اسے آخری سانس تک نہیں بھلاؤں گا۔ میں ایشور سے پرارتھنا کروں گا کہ وہ تمہاری ہر مصیبت کو ٹال دے اور تمہاری ہر تمنا پوری کرے۔"

"میں نے کوئی دیا نہیں کی تم پر......" میں نے جواب دیا۔ "میں نے تمہیں ایک انسان سمجھ کر اپنا فرض ادا کیا ہے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ تمہاری جان بچ گئی...... میرے پاس جو کچھ تھا وہ میں نے تمہیں دے دیا...... کاش! میرے پاس اور بھی کچھ ہوتا تو وہ بھی تمہیں دان کر دیتا۔"

"تم بہت بھوکے اور پیاسے معلوم ہوتے ہو......" بوڑھے نے کہا۔ "تم نے مجھے کھلا دیا لیکن تم بھوکے رہے۔ ایسا کیوں کیا......؟ جب کہ لوگ دوسرے لوگوں کے منہ سے نوالہ چھین لیتے ہیں...... تم کتنے اچھے اور نیک آدمی ہو۔ اجنبی معلوم ہوتے ہو دور دراز سے آئے ہو نا......؟"

"ہاں...... اچھا آپ ایک بات تو بتائیں؟" میں نے موضوع بدلا۔ "کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ چندانگر کی لڑکیوں اور عورتوں کے حسن وشباب کے جادو کا توڑ کیا ہے؟ میں نے سنا ہے کہ اس کا ایک توڑ ہے۔ آپ یہاں کے آدمی ہیں۔ آپ جانتے ہوں گے؟"

"نہیں...... میں نہیں جانتا......؟" اور بوڑھے نے نفی کے انداز میں سر ہلایا۔ "میں نے سنا تو ہے۔ میں یہاں نہیں رہتا ہوں۔ میں کلکتہ شہر میں رہتا ہوں۔ میں یہاں تھوڑے دن پہلے اپنے ایک دوست سے ملنے آیا تھا جو بیس برس پہلے چندانگر آ کر بس گیا تھا۔ اس نے گھر کی کوئی خبر نہیں لی۔ اس کے ماں باپ اس کی جدائی کے غم میں گھل کر مر گئے۔ یہاں آیا تو پتا چلا کہ اسے مرے ہوئے تین برس ہو چکے ہیں۔ میں واپس جا رہا تھا کہ مجھے چند بدمعاشوں نے اغواء کر کے تین دن تک قید میں بھوکا پیاسا رکھا اور میرا سب کچھ چھین کر لا کر یہاں چھوڑ گئے۔"

"آپ کے ذہن میں ایسی کوئی تدبیر ہے جو میں ان عورتوں اور لڑکیوں کے حسن وشباب کے جادو سے بچ سکوں؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"تم...... تم...... آخر کس لئے ان کے حسن وشباب کے جادو سے بچنا چاہتے ہو؟" بوڑھے نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔ "میں کچھ سمجھا نہیں تمہاری بات۔"

"میں عورتوں اور نوجوان لڑکیوں سے دور ہی رہنا چاہتا ہوں تاکہ انسانیت کی خدمت کر سکوں۔" میں نے جواب دیا۔

"تم بڑے عجیب وغریب نوجوان ہو۔" بوڑھا کہنے لگا۔ "ابھی بھی بہت سارے لوگوں کو چندانگر کے بارے میں نہیں معلوم...... جو کوئی بھی سنتا ہے اس بات کا یقین نہیں کرتا اور اسے مذاق سمجھتا ہے۔ لیکن

یہ مذاق نہیں ہے۔ نہ ہی من گھڑت کہانی ہے۔ حسن وشباب کی جادونگری ہے۔ ایسی نگری دنیا میں کہیں بھی نہیں ہے۔ خوابوں میں بھی نہیں...... دنیا کی سب سے حسین، نوجوان اور پرشباب لڑکیاں...... ایک مرد چاہے تو بیک وقت کئی لڑکیوں اور عورتوں کے ساتھ زندگی گزار سکتا ہے...... لیکن اس کی پتنی کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا...... کیا یہ خوش نصیبی کی بات نہیں ہے کہ ایک مرد اپنی ہر رات ایک نئی عورت اور لڑکی کے ساتھ گزارے۔ لیکن تمہیں یہ بات پسند نہیں...... کیوں؟"

"میں اس کی وجہ بتا چکا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اب مجھے جانے دیں۔ میں دن ڈوبنے سے پہلے قصبہ نارنگ پہنچنا چاہتا ہوں۔"

وہ بوڑھا مشرق کی سمت چلا گیا اور میں قصبہ نارنگ کی سمت بڑھ گیا۔ کچھ دور چلنے کے بعد بھوک پیاس سے میرا دم نکلا جا رہا تھا۔ پھر میں ایک ایسی پگ ڈنڈی پر آ گیا جس کے بائیں جانب ایک بڑا سا تالاب تھا اور دائیں جانب ایک جھیل تھی اور جھیل سے کچھ ہی فاصلے پر سبک خرام ندی تھی۔ یہی وہ تالاب جھیل اور ندی تھی جس کے متعلق چپراسی جگن ناتھ نے بتایا تھا۔ اتفاق سے یہاں کوئی عورت یا لڑکی نظر نہیں آئی۔ میں جھیل کی طرف بڑھا تاکہ پانی پی کر ہی بھوک مٹالوں، بھوک پیاس کے باعث ایک ایک قدم چلنا عذاب سا لگ رہا تھا۔ پیروں میں جان ہی نہیں رہی۔ وہ منوں بھاری ہو رہے تھے۔ مرتا کیا نہ کرتا کسی نہ کسی طرح جھیل تک اپنے آپ کو گھسیٹتا ہوا پہنچ گیا۔ ویرانہ اور سناٹا سا تھا۔ میں نے بیگ سے بوتل نکال کر جھیل میں سے پانی بھرا اور بوتل منہ سے لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

پانی کی قدر و قیمت کا اندازہ تو روزے کی حالت میں بھی ہو جاتا ہے۔ اس وقت جو اندازہ ہوا اس نے خلیفہ ہارون رشید کے واقعے کی یاد دلا دی۔ اس کے دربار میں ایک بزرگ نے سوال کیا کہ...... تم کسی صحرا میں پیاس سے بے تاب ہو رہے ہو تب ایک گلاس پانی کی کیا قیمت دینا پسند کرو گے......؟ خلیفہ ہارون رشید نے جواب دیا کہ پوری سلطنت دے دوں گا۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ پیاس ایسی چیز تھی کہ برداشت نہیں ہوتی تھی۔ اس کے لئے ایک کیا دو سلطنتیں بھی قربان کی جا سکتی تھیں۔ پانی امرت بن کر میرے حلق سے اترا۔ اس نے مجھے ایک نئی توانائی اور زندگی بخشی اور ایک عجیب سی فرحت میرے سارے بدن میں دوڑ گئی۔

"یہ لیجئے...... کچھ کھا لیجئے...... آپ صبح سے بھوکے معلوم ہوتے ہیں......؟" ایک رسیلی اور گداز آواز میرے کانوں میں نغمہ بن کر گونجی۔ یہ آواز میرے عقب سے آئی تھی۔ میں نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا اور میرے ہاتھ سے بوتل چھوٹ کر زمین پر گر گئی۔

میری نظروں کے سامنے ایک بہت ہی حسین وجمیل لڑکی اپنے ہاتھ میں ایک سینی لیے کھڑی تھی جس میں کچھ پھل میٹھا اور رس گلے بھی رکھے ہوئے تھے۔ اس کی عمر سولہ سترہ برس کی ہوگی۔ سچ پوچھئے تو میں نے اپنی زندگی میں کبھی اتنی حسین لڑکی کسی رسالے، فلم اور خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ ہر لحاظ سے بھرپور اور مکمل تھی۔ اس میں کہیں کوئی عیب اور خامی اور کمی نہیں تھی۔ اس کا شباب ابلتا ہوا تھا۔ خال وخد میں بڑا تیکھا پن تھا۔ جو شاید ہی میں نے کسی عورت میں دیکھا ہو۔ اس کی رنگت دودھیا تھی۔ وہ چھریرے

اور متناسب بدن کی تھی۔ اس کے جسمانی نشیب و فراز بھی بڑے دل کش اور جاذبیت بھرے تھے۔ اس کی آنکھیں بیضوی، اتنی بڑی اور سیاہ تھیں کہ میں نے شاید ہی دیکھی ہوں۔ اس کے گہرے سیاہ بال اتنے لمبے تھے جو اس کے کولھوں سے بھی نیچے چلے گئے تھے۔ میں اس کی کس کس چیز کی تعریف کروں۔ اس کے لئے میرے پاس الفاظ ہی نہیں ہیں۔

اس کا بدن بھیگا ہوا تھا اور کپڑے بدن سے چپکے ہوئے تھے۔ یہ ایک دل فریب ہی نہیں بلکہ ہیجان خیز منظر تھا۔ اس لمحے میں سب کچھ بھول گیا تھا۔ بھوک کا کوئی احساس نہیں رہا۔ وہ میری طرف دل کش انداز سے مسکرا کے دیکھ رہی تھی۔

ویرانہ...... تنہائی...... اس لڑکی کا حسن، نازک جوانی...... انگ انگ سے ابل پڑتی مستی...... پرشباب گداز بدن، یہ سب شیطان بن کر مجھے بہکانے لگے...... آگے بڑھو۔ اس لڑکی کو دبوچ لو...... اس کی آنکھوں میں خود سپردگی بھری تھی۔ چہرے پر سرخی دمک رہی ہے۔ لب بھی انجانی دعوت دے رہے ہیں...... وہ بھی تم پر مہربان ہونے کے لئے بے چین ہے۔ کیا تمہیں اس کے چہرے، آنکھوں اور ہونٹوں سے اندازہ نہیں ہو رہا ہے...... تم پتھر یا برف کا تودہ نہیں ہو...... اس لمحے سے فائدہ اٹھاؤ۔ تم دونوں کے سوا کوئی نہیں ہے۔

وہ لڑکی شعلہ مجسم تھی۔ صرف ایک سفید ساری میں ملبوس تھی جس میں اس کا بھیگا بدن آتشیں بن گیا تھا اور اس کے بدن سے مست کر دینے والی سوندھی سوندھی خوشبو اٹھ کر میرے دماغ کو معطر کر رہی تھی۔ نس نس میں کوئی چیز زن زن کرتی اتر رہی تھی مجھے اپنے بھڑکتے جذبات پر قابو پانا ناممکن سا لگ رہا تھا وہ بے لگام گھوڑے کی طرح ہو رہے تھے۔ ایک افراتفری کی اور دوغلی کیفیت سی ہو رہی تھی۔

اس لڑکی نے سینی میں سے ایک رس گلہ اٹھایا، پھر مجھے مخمور نگاہوں سے دیکھا۔ دل چاہا کہ ان آنکھوں کی گہرائیوں میں سدا کے لئے ڈوب جاؤں۔ پھر اس کے رس بھرے سرخ گداز ہونٹوں پر ایک دل فریب تبسم ابھر آیا تو سوچا کہ اسے اپنے ہونٹوں میں جذب کرلوں۔ اس نے اپنا نازک سا ہاتھ میرے ہونٹوں کی طرف بڑھایا اور میرے منہ میں رس گلہ رکھ دیا۔ یہ رس گلہ اس قدر رس بھرا اور مزے دار تھا کہ میری طلب بڑھ گئی۔ اس میں ایک اور رس گلہ تھا اس نے شاید میرے بشرے سے بھانپ لیا تھا کہ رس گلہ پسند آیا ہے۔ اس نے دوسرا بھی کھلا دیا۔ پھر اس نے مٹھائی جو قلاقند تھی۔ وہ بھی کھلا دی اور ایک پھل جو سیب سے مشابہ تھا وہ بھی کھلا دیا۔ چوں کہ میں بھوکا تھا اس لئے مٹھائی، پھل اور رس گلے بھی کھا لیے تھے۔ یہ پھل شاید آم تھا کیوں کہ اس کا ذائقہ اور مزا اور اس کی مٹھاس بالکل آم جیسی تھی۔ یہ سب کھانے سے میرے جسم میں ایک نئی طاقت اور توانائی آ گئی۔ کمزوری اور نقاہت کہاں گئی کچھ پتا نہیں چلا۔ میں ایک دم سے تازہ دم ہو گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا میں ایک فرلانگ بھی نہیں چلا ہوں۔

اس نے خالی سینی زمین پر رکھ دی اور پھر میرے گلے میں اپنی سنگ مرمر جیسی مرمریں بانہیں حمائل کر کے خود سپردگی سے میری آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ "میرے سپنوں کے راج کمار...... میں کب سے

تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ آخر آج میرا سپنا پورا ہو گیا۔ تم کتنے سندر ہو......؟"

اس لمحے ایک دم سے مجھے جیسے ہوش آ گیا۔ میں نے کس مشکل سے خود پر قابو پایا یہ میں ہی جانتا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں ڈوبتے ہوئے کہا۔ "تم نے مجھے جو کچھ کھلایا میں اس کے لئے تمہارا بہت ممنون اور مشکور ہوں۔ مجھے تم جانے دو...... تمہاری بڑی دیا ہوگی۔"

"کیا تم اتنے سنگ دل اور کٹھور ہو......" وہ رسیلی آواز میں بولی۔ اس کی ساری کا پلو غیر محسوس انداز سے پھسل کر زمین پر گر گیا جسے اس نے اٹھا کر سینے اور شانے پر درست کرنے کی کوشش نہیں کی۔ "میں تمہیں جانے نہیں دوں گی۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے......؟"

"میں نہ تو سنگ دل ہوں اور نہ ہی کٹھور ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں ایک مسافر ہوں مجھے اپنی منزل پر پہنچنا ہے۔"

"یہاں کی روایت ہے کہ مہمان کی میزبانی روایتی انداز سے کی جائے۔" وہ محبت بھرے لہجے میں بولی۔ "ہم مسافروں کو بغیر مدارات کے جانے نہیں دیتے ہیں...... میں آپ کو ایسے جانے نہیں دوں گی۔ کیوں کہ میں آپ کو سوئیکار کر چکی ہوں۔ آپ کی داسی ہوں، آپ کی ملکیت ہوں۔ آپ جو بھی حکم دیں گے میں دل و جان سے بجالاؤں گی...... وہ سامنے میری جھونپڑی ہے......" اس نے جھونپڑی کی طرف اشارہ کیا۔ جو دو سو قدم پر ہوگی۔ "آپ وہاں چلیں...... وہاں ہم دونوں کے سوا کوئی نہ ہوگا۔"

میرے ذہن میں ایک تدبیر آئی میں نے کہا۔ "ایک گلاس دودھ مل سکتا ہے؟ مجھے دودھ کی طلب ہو رہی ہے۔"

"کیوں نہیں......؟ کیوں نہیں......؟" وہ مسکرائی اور اس نے اپنی بانہیں میرے گلے سے نکال کر ساری کا پلو جو زمین پر لہرا رہا تھا اسے اٹھا کر سینے اور شانے پر درست کیا۔ پھر وہ میرا ہاتھ تھام کر مجھے جھونپڑی تک لے گئی۔ اندر اس نے بٹھا کر کہا۔ "تھوڑی دیر انتظار کریں...... میں گاؤں سے جا کر بکری کا دودھ لے آتی ہوں۔"

جیسے ہی وہ باہر نکلی۔ میں نے دروازے پر آ کر باہر جھانکا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی آبادی کی طرف جا رہی تھی۔ میں فوراً ہی جھونپڑی کے عقب میں آیا اور قصبہ نارنگ کی طرف دوڑ لگائی۔ اس کے واپس آنے تک میں کافی دور نکل سکتا تھا۔

کافی دور نکل آنے کے بعد مجھے ایک طرح بڑا افسوس اور پچھتاوا سا ہوا کہ میں نے کیا کیا......؟ مجھے اس کی محبت، مہربانی اور میزبانی کو ٹھکرانا نہیں چاہئے تھا۔ ایسی حسین ترین اور پرشباب لڑکی جس کے جادو نے مجھے پاگل کر دیا میں کیوں نکل آیا......؟ وہ کتنی حیران ہوئی ہوگی......؟ اسے کس قدر دکھ اور افسوس ہوا ہوگا کہ میں نے اس کی کوئی قدر نہیں کی۔

دوسری طرف مجھے جیسے ہوش آیا اور مجھے ایک عجیب طرح کی خوشی سی محسوس ہوئی کہ میرا دامن اور وجود داغ دار ہونے سے بچ گیا۔ اس کے حسن و شباب کا جادو مجھ پر چل نہیں سکا۔ شاید یہ میری مرحومہ ماں

کی دعاؤں کا اثر ہوگا جو ہر نماز میں رب العزت کے حضور گڑگڑا کے دعا مانگتی تھی کہ...... میرے رب! میرے مولا...... یا رحیم یا کریم...... تو میرے بیٹے کو دنیا کی ہر مصیبت اور ہر برائی سے محفوظ رکھ...... شاید یہ میری ماں کی دعاؤں کا اثر تھا کہ جس نے تین زہریلی ناگنوں کے ڈسنے سے مجھے بچایا تھا۔

میں تیزی سے چلا جا رہا تھا کہ کسی لڑکی کے رونے کی آواز سنائی دی۔ میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ ایک عمر رسیدہ شخص درخت کے نیچے لیٹا کراہ رہا ہے اور اس کے پاس ایک بارہ برس کی لڑکی کھڑی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہے۔

''صاحب جی...... صاحب جی......!'' وہ لڑکی مجھے دیکھ کر رونا موقوف کر کے بولی۔ ''میرے بابا جی کی طبیعت بہت خراب ہوگئی ہے...... انہیں بہت تیز بخار ہے۔ آپ انہیں گھر پہنچا دیجئے...... آپ کی بڑی دیا ہوگی۔ ان سے ایک قدم بھی نہیں چلا جا رہا ہے......''

''ہاں بیٹا......!'' وہ عمر رسیدہ شخص کراہتے ہوئے بولا۔ ''مجھے ملیریا ہوگیا ہے۔ میں اپنی بیٹی کے سسرال سے ہو کر گھر جا رہا تھا کہ ایک دم سے تیز بخار چڑھ آیا ہے۔ جاڑا بھی لگ رہا ہے۔ میرے لئے ایک قدم چلنا بھی دوبھر ہو رہا ہے...... تم مجھے گھر پہنچا دو کہیں میں بخار کی حالت میں مر نہ جاؤں...... یہ بڑا جان لیوا مرض ہے۔ مجھے لال مچھر نے کاٹا ہے۔''

''کیا تم قصبہ نارنگ میں رہتے ہو......؟'' میں نے اس سے پوچھا۔ ''میں تمہیں وہاں تک پہنچا دوں گا۔ تم چنتا نہ کرو۔''

''نہیں...... میں قصبہ نارنگ میں نہیں بلکہ موضع رہانہ میں رہتا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''نارنگ تو یہاں سے تھوڑی دور ہے۔''

''تمہارا گاؤں یہاں سے کتنی دور ہے......؟'' میں نے دریافت کیا۔ ''مجھے کسی گاؤں کے بارے میں کچھ نہیں پتا۔ کیوں کہ میں سیاح ہوں۔''

''یہاں سے دس میل دور ہے۔'' اس عمر رسیدہ شخص کے بجائے اس کی بیٹی نے جواب دیا۔ ''مشرق کی طرف ہے۔ یہ راستہ جاتا ہے۔''

''دس میل دور......؟'' میں چونک پڑا۔ ''یہ تو بہت دور ہے......؟ تمہارے بابا جی میرے سہارے پیدل چل سکیں گے؟''

''وہ ایک دو قدم بھی پیدل نہیں چل سکتے......؟'' لڑکی بولی۔ ''آپ کیا انہیں پیٹھ پر لاد کر گاؤں نہیں پہنچا سکتے......؟''

''ایک یا دو میل کی بات ہوتی تو میں پہنچا دیتا۔'' میں نے کہا۔ ''دس میل بڑا لمبا فاصلہ ہے۔ وہاں پہنچتے پہنچتے صبح ہو جائے گی۔''

''بیٹا......!'' اس بوڑھے نے میرے پیر پکڑ لیے۔ اس کے ہاتھ انگاروں کی طرح دہک رہے تھے۔ واقعی اسے بہت تیز بخار تھا۔ ایشور کے لئے مجھ پر یہ دیا کرو مجھے یہاں مرنے کے لئے نہ چھوڑو بیٹا!

میں ایک غریب آدمی ہوں۔ مجھ پر رحم کھاؤ۔'' وہ سسک پڑا۔

میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ اگر اس شخص کی جگہ میرا باپ، بھائی یا ماں ہوتی تو کیا میں اسے ایسی حالت میں بے یار و مددگار چھوڑ دیتا......؟ ہرگز نہیں۔ یہ شخص بہت بوڑھا ہے۔ بہت کمزور ہے اور تیز بخار میں اس کا بدن پھنک رہا ہے۔ انسانیت کے ناتے میرا فرض بنتا ہے کہ میں اس کی مدد کروں۔ اسے اس کے گھر پہنچاؤں۔ ورنہ یہ یہاں سسک سسک کر مر جائے گا۔

میرے بیگ میں موسمی بخار کی گولیوں کے جو پتے تھے ان میں ملیریا کے بخار کے پتے بھی تھے۔ میں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں تو مجھے قریب ہی تالاب دکھائی دیا۔ میں اپنی بوتل میں پانی بھر لایا اور اسے دو گولیاں کھلا دیں۔ تھوڑی ہی دیر میں اسے پسینہ چھوٹا اور اس کا بخار اتر گیا۔ لیکن کمزوری اور نقاہت بدستور تھی۔ میں نے دستی بیگ لڑکی کے حوالے کیا اور اس بوڑھے شخص کو پیٹھ پر سوار کر لیا اور لڑکی کی رہنمائی میں چل پڑا۔

میں کبھی اپنی زندگی میں ایک آدمی کو پیٹھ پر کسی بوری کی طرح لاد کر لے جانا تو درکنار چار کلو وزن بھی کندھے پر اٹھا کے نہیں چلا تھا۔ یہ بوڑھا شخص دبلا پتلا تھا۔ پھر بھی ایک آدمی کا وزن تھا۔ تھوڑی دور چل کر میں تھک جاتا اور اسے پیٹھ سے اتار دیتا۔ پھر تھوڑی دیر بعد چل پڑتا۔ دس فرلانگ کا فاصلہ ہوتا تو اب تک طے ہو چکا ہوتا۔ دو ایک میل چلنے کے بعد میں جیسے اس بوڑھے شخص کے بوجھ کا عادی ہو گیا تھا۔ سورج اور دن ڈوبا، شام ہوئی، رات ہوئی، جب میں اسے اور اس کی بیٹی کو لے کر اس کے گاؤں میں داخل ہوا تو آدھی رات بیت چکی تھی۔ اس وقت میں نہ صرف بہت بری طرح تھک چکا تھا بلکہ بھوک پیاس سے برا حال ہو رہا تھا۔ چند قدم چلنے کی سکت بھی نہیں رہی تھی۔ اس شخص کی بیوی، جوان بیٹا اور بہو اس بوڑھے اور لڑکی کے گھر نہ پہنچنے پر سخت فکر مند اور پریشان تھے۔ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ جب انہیں بتایا کہ میں دس میل سے اسے کمر پر لاد کر لایا ہوں تو وہ بہت خوش ہوئے۔ میرا بہت شکریہ ادا کیا اور میری بڑی آؤ بھگت کی۔ کھانا کھا کر جو سویا تو دوسرے دن دوپہر کے وقت ہی بیدار ہوا۔

پھر میں دوپہر کا کھانا کھا چکا اور جانے کی تیاری کرنے لگا تو اس بوڑھے نے پوچھا۔ ''تم قصبہ نارنگ کس سے ملنے جا رہے ہو؟''

''شوتم جادوگر سے......'' میں نے جواب دیا۔ ''میں جو اتنی دور سے آیا ہوں وہ صرف شوتم سے ملنے کے لئے......''

''آخر تم اس سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟'' اس نے حیرت سے دریافت کیا۔ ''آخر ایک جادوگر سے مل کر کرو گے کیا؟''

''اس لئے کہ میں اس کا شاگرد بن کر جادو سیکھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے اسے بتایا۔ ''مجھے جادوگر بننے کا بڑا شوق ہے۔ ارمان ہے۔''

''میں تمہیں ایک مشورہ دوں تو کیا تم اسے مانو گے اور اس پر عمل کرو گے؟'' بوڑھے نے سوالیہ

نظروں سے دیکھا۔

"کیوں نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "تمہارا مشورہ قابل قدر میرے حق میں بہتر معلوم ہوا تو اس پر ضرور عمل کروں گا۔"

"بہتر یہ ہے کہ تم شوتم سے ملنے کا خیال دل سے نکال دو اور جس طرح آئے ہو اسی طرح واپس چلے جاؤ۔" اس نے کہا۔

"وہ کس لئے......؟" میں نے تحیر زدہ نظروں سے دیکھا۔ "کیا وہ کوئی اچھا آدمی نہیں ہے لیکن میں نے اس کی بڑی تعریف سنی ہے۔"

"اس لئے کہ تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا اور وہ تمہیں بھولے سے بھی شاگرد نہیں بنائے گا اور نہ ہی جادو سکھائے گا۔" اس نے کہا۔ "اس بات میں کوئی شک نہیں کہ شوتم بہت اچھا آدمی ہے۔ اب تک جانے کتنے لوگوں نے شوتم کا شاگرد بننے کی کوشش کی لیکن اس نے کسی ایک کی بھی بات نہیں مانی۔ صاف انکار کر دیا۔ جس کسی نے اسے بہت تنگ کیا تو کئی دن کے لئے اسے جانور بنا دیا۔ اس نے اس طرح ان لوگوں کو سزا دی۔ اب کوئی اس کے پاس جا کر اس سے جادوگر بننے کے لئے نہیں کہتا ہے۔"

"آخر وہ کس لئے کسی کو اپنا شاگرد اور جادوگر بنانے کے لئے تیار نہیں ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔ "اس کی وجہ جانتے ہو؟"

"وہ کہتا ہے آج کل دنیا ایسی نہیں ہے جیسی نظر آتی ہے۔" بوڑھے نے کہا۔ "اس کا خیال ہے کہ اس کے جادو سے اس کے شاگرد غلط فائدہ اٹھائیں گے۔ وہ اپنا فن اور جادو دنیا سے لے کر چلا جانا چاہتا ہے۔ اب اسے لوگوں پر کوئی بھروسا نہیں رہا۔"

بوڑھا کے منع کرنے کے باوجود میں شوتم سے ملنے روانہ ہو گیا۔ اس خیال سے کہ اسے کسی نہ کسی طرح شاگرد بنانے پر راضی کرنے کی کوشش کروں۔ اگر اس نے صاف انکار کر دیا اور وہ اپنی ضد پر قائم رہا تو واپس چلا جاؤں گا۔ وہ بہت ضدی بھی معلوم ہوتا تھا۔ لیکن ایک طرح سے اس کا خیال اور کہنا بھی صحیح تھا۔ اس کے جادو سے غلط اور ناجائز فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔

میں ان خیالوں میں گم ایک ویرانے سے گزر رہا تھا۔ یہاں گہرے سناٹے کا راج تھا۔ پھر میں نے مخالف سمت سے ایک لڑکی کو بدحواسی کے عالم میں بھاگتے ہوئے میری طرف آتے دیکھا تو ٹھٹک کے رک گیا۔ وہ مڑ مڑ کے دیکھتی ہوئی بے تحاشا بھاگتی چلی آ رہی تھی۔ وہ اس قدر بدحواس اور دہشت زدہ تھی کہ اس نے مجھے دیکھا نہیں اور مجھ سے ٹکرا کے زمین پر گر گئی۔ اس نے مجھے جیسے ہی دیکھا اس کا چہرہ ایک مردے کی طرح سفید پڑتا چلا گیا۔ اس کی آنکھیں خوف و دہشت سے پھیل گئیں۔

"تت......تت......تم کون ہو......؟" وہ فوراً ہی سنبھل کر کھڑی ہوتی ہوئی بولی سانسیں اس کی آواز کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ اس کے سینے میں سانسیں بری طرح پھول رہی تھیں۔ سانسوں کا زیر و بم بتا رہا تھا کہ وہ بہت دور سے بھاگتی ہوئی آ رہی ہے۔

میں نے اس کی بدحواسی، دھلے ہوئے چہرے اور خوف و دہشت کی کیفیت سے اندازہ کر لیا تھا کہ اس کا تعاقب شاید بدمعاش کر رہے ہیں اور وہ شاید اس کی عزت کے درپے ہیں۔ وہ اپنی عزت اور جان بچانے کے لئے ان سے بچنے اور پناہ کے لئے دوڑ رہی تھی مجھے اس کے تعاقب میں بدمعاش یا کوئی بھی فرد واحد نظر نہیں آیا۔ وہ انہیں چکمہ دے کر شاید ادھر آ نکلی تھی۔

"میں ایک مسافر ہوں۔ گھبراؤ نہیں۔" میں نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ "کیا بات ہے......؟ تم کس سے ڈر کر بھاگ رہی ہو؟"

"تین مسلح بدمعاش میرا تعاقب کر رہے ہیں۔" وہ دھڑکتے سینے پر ہاتھ رکھ کر سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی اور اس نے پھٹی پھٹی نظروں سے اس سمت پلٹ کر دیکھا جس سمت سے بھاگی آ رہی تھی۔ "بھگوان کے لئے مجھے ان سے بچا لیں......وہ میری عزت اور جان کے دشمن بنے ہوئے ہیں...... ان کے ہاتھوں میں تیزاب کی بوتلیں بھی ہیں جو وہ میرے چہرے پر پھینک دینا چاہتے ہیں۔"

"میں یہاں کے کسی بھی گاؤں اور علاقے سے واقف نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ میں تمہیں ان سے کیسے بچا سکتا ہوں۔ کہاں لے جا کر چھپا سکتا ہوں۔ کیا کوئی ایسی جگہ یا تمہارا گھر قریب میں ہے؟ کہ میں تمہیں وہاں لے جا کر چھپا دوں......"

"اس طرف ایک جھونپڑی ہے۔" اس نے فوراً ہی میرا ہاتھ تھام لیا۔ "میں وہاں چھپ سکتی ہوں۔ پہلے ہم وہاں چل کر چھپتے ہیں تاکہ ان بدمعاشوں کی نظروں میں نہ آ سکیں......پھر میں آپ کو بتاتی ہوں کہ آپ میری کس طرح مدد کریں۔"

وہ دائیں جانب بھاگنے لگی۔ میں بھی اس کے ساتھ بھاگنے لگا۔ بھاگتے بھاگتے یہ بات سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ میرا قصبہ نارنگ جانا اور شوتم سے ملنا بھی ایک مسئلہ بن گیا ہے۔ راستے میں ایسے ایسے واقعات قدم قدم پر پیش آ رہے ہیں کہ منزل قریب ہو کر بھی دور ہوتی جا رہی تھی۔ رکاوٹیں پیدا ہو رہی تھیں۔ میں بھی بے بس اور مجبور ہو گیا تھا۔ ان کی مدد کرنا میرا فرض بن گیا تھا۔ میں خودغرض نہیں تھا جو انہیں بیچ منجدھار میں چھوڑ دیتا۔ اس لڑکی کی عزت اور جان بچانا بھی بے حد ضروری تھا۔ میں پیچھے ہٹنا نہیں چاہتا تھا۔

کوئی ایک فرلانگ تک دوڑنے کے بعد وہ ایک تالاب کے پاس رکی۔ اس تالاب پر کوئی موجود نہ تھا۔ وہ سنسان اور ویران پڑا تھا۔ گھنے درختوں سے گھرا ہوا تھا۔ ایک طرف بہت سارے درخت تھے۔ ان کے بیچوں بیچ ایک کٹیا سی موجود تھی جو باہر سے نظر نہیں آتی تھی۔ وہ لڑکی مجھے اس کٹیا کے اندر لے گئی۔ اس کٹیا میں ایک چوکی اور قدرے صاف ستھرا سا بستر اس پر بچھا ہوا تھا۔ ایک کونے میں پانی کا مٹکا، مٹی کا پیالہ تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک چولہا، پلاسٹک کے ڈبے ان میں شاید چینی اور چائے کی پتی وغیرہ ہوگی۔ ایک چھوٹا سا کنستر بھی تھا جس میں سے مٹی کے تیل کی بو آ رہی تھی۔ قریب ہی ماچس بھی پڑی تھی۔ ایک کدال اور ایک لاٹھی بھی کونے میں رکھی تھی۔ یہ چوکی ڈبل بیڈ سے بھی بڑی تھی جس پر بیک وقت تین آدمی بہ آسانی سو سکتے تھے۔

یہ کٹیا خاصی بڑی تھی۔ اس کے اندر گھستے ہی لڑکی دیوار کے سہارے کھڑی ہوگئی۔ آنکھیں بند کرکے سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کررہی تھی۔ ابھی تک اس کی سانسیں اس لئے قابو میں نہیں آئی تھیں کہ ہم تیزی سے کہیں رکے بغیر دوڑتے ہی رہے تھے۔ وہ ان بدمعاشوں سے بہت زیادہ خوف زدہ تھی۔ میں نے دستی بیگ چوکی پر رکھدیا اور چوکی پر ہی بیٹھ گیا۔ یہ کٹیا کس کی تھی یہ لڑکی ہی جانتی تھی اس لئے اسے محفوظ پناہ گاہ سمجھ کر لے آئی تھی۔ ان بدمعاشوں کو شاید معلوم نہیں تھا۔ میں نے اب تک لڑکی کو غور سے اور تنقیدی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ اب اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی عمر اٹھارہ اور بیس برس کے درمیان کی ہوگی۔ وہ جتنی بھرپور اور خوبصورت تھی اتنی ہی پرکشش بھی تھی۔ وہ عام آسامی لڑکیوں کی طرح درمیانہ قد کی نہ تھی۔ اس کا قد نکلتا ہوا تھا۔ اس کی رنگت گندمی اور نکھری ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں بھی متوالی تھیں۔ اس کا لباس جابجا سے پھٹا ہوا تھا اور چیتھڑے کی طرح لٹک رہا تھا۔ ان بدمعاشوں نے اسے قابو میں کرنے کے لئے شاید جبر و زیادتی سے کام لیا تھا اور لڑکی نے شاید مزاحمت کی تھی۔ اس کش مکش میں شاید اس کا لباس پھٹ گیا تھا۔ پھٹے ہوئے لباس میں سے اس کا بدن جھانک رہا تھا۔ اس کے بال شانے، چہرے اور پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ مقامی لباس میں تھی۔ گھاگھرا اور بلاؤز میں......

"سنو......" میں نے آہستگی سے اسے مخاطب کیا۔ "تم ادھر آؤ اور چوکی پر آرام سے بیٹھ جاؤ۔ اب خطرے والی کوئی بات نہیں ہے۔" میری آواز سن کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ پھر وہ آکر چوکی پر بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور پسینے میں بھیگ رہا تھا اور سانسیں قدرے اعتدال پر آگئی تھیں۔ میں نے اس بوڑھے کے ہاں سے چلتے وقت بوتل میں پانی بھر لیا تھا کیوں کہ تالابوں کا پانی صاف نہیں ہوتا تھا۔ صرف جھیل اور ندی کا پانی صاف شفاف اور پینے کے قابل ہوتا تھا۔ میں نے بیگ سے پانی کی بوتل نکال کر اس کی طرف بڑھائی تو اس نے مجھے ممنون نظروں سے دیکھا اور میرے ہاتھ سے بوتل لے کر اسے منہ سے لگا لیا۔ وہ بے حد پیاسی تھی اور اس کا حلق بھی بہت خشک ہو رہا تھا۔ اس بوتل میں پانچ گلاس پانی کی گنجائش تھی۔ اس نے ایک ہی سانس میں نصف بوتل سے زیادہ پانی پی لیا۔

پانی پی لینے کے بعد اس نے پانی کی بوتل میری طرف بڑھائی تو میں نے کہا۔ "کچھ دیر ٹھہر کر اور پی لینا...... اسے پاس ہی رکھو۔"

"نہیں...... نہیں......" اس نے مجھے اپنی خوبصورت اور بڑی بڑی سیاہ مدھ بھری آنکھوں سے دیکھا۔ "میں نے بہت پی لیا۔ میرا پیٹ بھر گیا۔"

"اچھا یہ بتاؤ کہ یہ بدمعاش کون ہیں؟" میں نے بوتل اس کے ہاتھ سے لے کر چند گھونٹ خود بھی پیئے۔ "وہ تمہاری عزت اور جان کے دشمن کس لئے بنے ہوئے ہیں...... اور ان کے ہاتھوں میں تیزاب کی بوتلیں کس لئے ہیں......؟ کیا وہ تیزاب تمہارے منہ پر پھینکنا چاہتے ہیں؟"

"یہ بدمعاش......؟" اس کا چہرہ نفرت اور غصے سے سرخ ہوگیا۔ اس کی آنکھوں سے حقارت جھانکنے لگی۔ پھر وہ زہر خند کہنے لگی۔ "یہ ایک لمبی اور بڑی دردناک کہانی ہے...... ایسی شرم ناک کہانی ہے

کہ آپ سن کر کیا کریں گے؟ مجھے سناتے ہوئے شرم آئے گی۔"

"میں تمہاری کہانی صرف اس لئے سننا چاہتا ہوں کہ میں تمہاری مدد کرسکوں۔" میں نے جواب دیا۔ "ان بدمعاشوں سے بچا کر تم جہاں کہو وہاں پہنچا سکوں......"

"اچھا......" اس نے اپنی پلکیں جھپکائیں اور بڑی حیرت سے بولی۔ "آپ واقعی میری عزت اور جان ان بدمعاشوں سے بچائیں گے؟"

"ہاں...... ہاں......" میں نے کہا۔ "کیا تمہیں میری بات کا یقین نہیں آرہا ہے......؟ کیا میں اچھا آدمی نہیں لگ رہا ہوں؟"

"جی ہاں...... مجھے آپ کی کسی بات کا یقین نہیں آرہا ہے۔" اس نے بڑی صاف گوئی سے کہا۔ "اب مجھے دنیا کے کسی مرد پر بھروسا نہیں رہا۔"

"مجھ پر کس لیے بھروسا نہیں ہے؟" میں نے متعجب لہجے میں پوچھا۔ "تم مجھے کس لیے شک و شبے کی نظروں سے دیکھ رہی ہو؟ میں نے کیا کیا ہے؟"

"اس لئے کہ میں نے ایک مرد پر بھروسا کیا تو اس نے مجھے کسی ناگ کی طرح ڈسنے کی کوشش کی تھی۔ اب کیا مردوں پر بھروسا کروں؟" وہ تلخی سے بولی۔

"اگر تمہیں دنیا کے کسی مرد پر بھروسا نہیں ہے تو پھر تم نے میری مدد قبول کیوں کی......؟" میں نے کہا۔ "مجھے یہاں لے کر آئیں...... اب تم کیا میرے رحم و کرم پر نہیں ہو......؟ میں تمہیں قابو میں کرکے بے بس نہیں کرسکتا...... اس وقت تم جس حالت میں ہو کیا اس سے مرد کے جذبات بھڑک نہیں سکتے۔"

"اگر آپ میری بے بسی اور مجبوری اور اس تنہائی سے فائدہ اٹھا کر ان بدمعاشوں سے بچائیں گے تو میرے لئے یہ سودا برا اور مہنگا نہیں ہے۔" وہ کہنے لگی۔ "میں ایک پڑھی لکھی اور حقیقت پسند لڑکی ہوں۔ آپ مجھ سے ایک بار فائدہ اٹھائیں گے...... لیکن میرے چہرے پر تیزاب تو نہیں پھینکیں گے......؟ اور میں یہ جانتی ہوں کہ میں مرد کے سہارے کے بغیر اپنے گھر جا نہیں سکتی...... ایک مرد میری حفاظت کی پوری قیمت وصول کرے گا...... چوں کہ مجھے پنی عزت اتنی پیاری نہیں جتنی جان ہے...... اور میں اپنی عزت کی قربانی دے کر اس لئے بھی زندہ رہنا چاہتی ہوں کہ ان ناگوں سے انتقام لوں۔ ان کے سر کچل دوں ..ہوں نے میرے ساتھ ذلالت کی...... آپ کی جو بھی شرط، خواہش اور ارمان ہے میں اس شرط کو خوشی ..ی پورا کروں گی کہ آپ مجھے کسی طرح میرے میکے پہنچا دیں۔"

"تم یقین کرو کہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے......؟" میں نے کہا۔ "میں تمہیں اپنی جان پر کھیل کر عزت سے تمہارے میکے پہنچا دوں گا...... تم بڑے سکون اور اطمینان سے یہاں اس وقت تک بیٹھی رہو ...تک یہ خطرہ ٹل نہیں جاتا......"

"آپ نہ تو بنگالی ہیں، نہ ہی آسامی، بلکہ ہندوستانی باشندے لگ رہے ہیں۔ آپ یہاں کیا ..رہے ہیں؟" اس نے تعجب سے پوچھا۔

"میں جادوگر شوتم سے ملنے کے لئے بہت دور سے آیا ہوں اور اس سے ملنے جا رہا تھا کہ تم سے مڈبھیڑ ہوگئی۔" میں نے جواب دیا۔

"جادوگر شوتم سے ملنے......؟" اس کے حسین چہرے پر گہرا استعجاب چھا گیا۔ "آپ اس جادوگر سے مل کر کیا کریں گے......؟"

"میں اس کا شاگرد بننا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں نے سنا ہے کہ وہ بہت بڑا اور عظیم جادوگر ہے۔ مجھے بھی جادوگر بننے کا جنون ہے۔"

"اس بات میں ذرہ برابر بھی شک اور مبالغہ نہیں ہے کہ وہ بہت بڑا اور عظیم جادوگر ہے۔" وہ کہنے لگی۔ "بنگال اور آسام میں جانے کتنے بڑے بڑے اور پائے کے جادوگر گزرے لیکن ان میں سے ایک بھی اس کے پائے کا نہ تھا...... لیکن وہ آپ کو ہرگز ہرگز شاگرد بنائے گا اور نہ ہی جادو سکھائے گا۔ اس نے اپنی اولاد کو نہیں سکھایا تو آپ کو کیا سکھائے گا؟ اس کے تین لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ اس نے اپنے سب سے بڑے بیٹے کو جادو سکھایا تھا۔ لیکن دو برس کے بعد اسے جادو سے محروم کر دیا۔ کیوں کہ اس کے بیٹے نے جادو سے لوگوں کو بہت تنگ اور پریشان کیا اور ناجائز فائدہ اٹھایا۔ اس نے اپنے لڑکوں سے کہا کہ محنت کر کے کھاؤ۔"

"کیا اس جادوگر کی اولاد زندہ ہے؟" میں نے پوچھا۔ "وہ لوگ کہاں رہتے ہیں؟ کیا تم ان کا پتا بتا سکتی ہو؟"

"نہ تو اس کی بیوی زندہ ہے اور نہ ہی اولاد میں سے کوئی ہے...... ان سب کو مرے پچاس برس ہو رہے ہیں۔" وہ بولی۔

"میرا خیال ہے کہ میں کسی نہ کسی طرح شاید اسے شاگردی میں لینے پر آمادہ کر لوں گا...... اگر وہ نہیں مانا تو واپس چلا جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "اب اس موضوع کو چھوڑو...... تم مجھے اپنے اوپر بیتے ہوئے ظلم و ستم کی کہانی سناؤ تاکہ میں مدد کی کوئی صورت نکال سکوں۔"

"میں نے صبح سے کچھ کھایا پیا نہیں...... بڑی سخت بھوک لگ رہی ہے۔" وہ بولی۔ "یہاں چائے پتی اور چینی موجود ہے...... بغیر دودھ کی چائے بن جائے گی۔ چائے پینے سے بھوک مر جائے گی۔ آپ چائے بھی پیتے جائیں اور میری کہانی بھی سنتے جائیں۔ میں چائے بناتی ہوں۔"

"یہ کٹیا کس کی ہے اور اس کے بارے میں تمہیں کیسے اور کب سے معلوم ہے؟" میں نے کہا۔ "اس کا علم بدمعاشوں کو تو نہیں ہے؟"

"یہ کٹیا میری ایک سہیلی کے محبوب کی ہے۔" اس نے کہا۔ "وہ دونوں یہاں ملنے اور وقت گزارنے کے لئے آتے ہیں...... اس کا علم میرے سوا کسی اور کو نہیں ہے...... ان بدمعاشوں کو بھی نہیں معلوم...... وہ یہاں میری تلاش میں آنے سے رہے۔"

پھر وہ چولہے کے پاس بیٹھ گئی۔ جس وقت وہ چائے بنا رہی تھی تب میں نے اس سے پوچھا۔ "تمہارا

نام کیا ہے؟ تم نے اپنا تعارف نہیں کرایا؟"

"میرا نام مدھروتی ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "چوں کہ تم اس علاقے اور یہاں کے گاؤں جگہوں سے ناواقف ہو اس لئے اس طرح سمجھاتی ہوں کہ میرا میکہ جنوب میں ہے اور میری سسرال مشرق میں ہے۔ ان کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔"

وہ میری بات کا جواب دے کر چائے بنانے لگی۔ لیکن اس نے میرا نام نہیں پوچھا۔ دو مٹی کے پیالوں میں چائے لے کر چوکی پر آ کر بیٹھ گئی تو میں نے بیگ میں سے بھنے چنے اور کاجو نکال کر اس کے سامنے رکھ دیئے جو چلتے وقت اس بوڑھے کی بہو نے دیئے تھے۔ پہلے تو اس نے بہت سارے کاجو کھا لیے۔ پھر بھنے چنوں سے پیٹ بھرا۔ واقعی وہ بہت ہی بھوکی تھی۔

اس نے چائے کا ایک گھونٹ لیا اور کہنے لگی۔ "میں آپ کو اپنا نام تو بتا چکی ہوں۔ میرے ماں باپ بہت ہی غریب آدمی ہیں۔ کھیتی باڑی سے گزارہ ہوتا ہے۔ مجھے چوں کہ پڑھنے کا شوق ہی نہیں بلکہ اعلیٰ تعلیم کا جنون تھا اس لئے میری آرزو پوری کی۔ پھر میری شادی کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ لیکن شادی کے لئے جہیز کی ضرورت تھی۔ میری خوبصورتی اور یہ حسن و شباب ایسی دولت نہ تھی کہ کوئی مجھے بیاہ کر لے جاتا۔ غریب کی بیٹی کتنی ہی حسین اور پرکشش کیوں نہ ہو وہ جاڑے کی چاندنی ہوتی ہے۔ میں جاڑے کی چاندنی تھی۔

میرے حسن و شباب کا چرچا اس علاقے میں ہی نہیں بلکہ کئی شہروں اور قصبوں میں ہوتا تھا۔ رشتوں کی کمی نہ تھی۔ لیکن جب میرا باپ کہتا کہ میرے پلے میں لڑکی کی شادی کے لئے کچھ نہیں ہے تو وہ لوگ واپس چلے جاتے۔ وہ شادی مجھ سے نہیں بلکہ جہیز سے کرنا چاہتے تھے۔ ایک روز راجن نام کا شخص آیا جس کا گھر مشرق میں واقع ایک گاؤں میں تھا۔ اس نے بغیر جہیز کے اپنے بیٹے سے شادی کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی پسند کر لیا تھا اور میرے پتا جی کو پانچ ہزار کی رقم دی تاکہ شادی کی تیاری کی جا سکے۔

اس کے بیٹے رام دیال سے میری شادی ہو گئی۔ میں رام دیال کو پا کر کتنی خوش ہوئی بتا نہیں سکتی۔ اس نے مجھے اپنی محبت اور پریم سے جیسے سدا کے لئے خرید لیا۔ میری ساس اور نند بھی خوش تھی۔ میری نند کی شادی ہو چکی تھی۔ دن ہنسی خوشی سے گزرنے لگے۔ لیکن جانے کیوں مجھے اس بات کا احساس ہونے لگا کہ میرے سسر راجن کی آنکھوں میں میلا پن ہے۔ وہ مجھے میلی نظروں سے دیکھتا رہتا ہے۔ گھر کے پیچھے تالاب تھا۔ جب میں نہانے جاتی تو اس کی آنکھوں میں ہوس سی محسوس ہوتی۔ میں نے دو ایک بار محسوس کیا کہ وہ مجھے چھپ کر دیکھتا ہے۔ میں نے اسے واہمہ کہا۔ کیوں کہ وہ میری عمر کی بیٹی کا باپ ہے اور عمر میں میرے باپ سے بھی بڑا ہے۔ میں اس کی بہو ہوں۔ بیٹی کی طرح ہوں۔ دو ایک بار نہیں کئی بار ایسا ہوا کہ گھر میں میرے اور میرے سسر کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ میری ساس میری نند کے ساتھ کہیں گئی ہوئی تھی۔ اس نے نہ تو مجھے ہوس کی نظروں سے دیکھا اور نہ ہی ایسی کوئی حرکت کی جو معیوب سی ہو بلکہ تھوڑی دیر بعد گھر سے کسی کام کا کہہ کر چلا گیا۔ میرا پتی بھی گھر میں نہیں تھا۔ اگر اس کی نیت میں کوئی فتور ہوتا تو وہ جانے کیا کر بیٹھتا۔ پھر اس کے خلاف میرے دل میں شک نہ رہا۔

ایک روز میں نے اسے کالی ماں کے گھر جاتے ہوئے دیکھا تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ یہ ایک بوڑھی جادوگرنی ہے۔ سفلی علم جانتی ہے۔ بہت سی ایسی عورتیں اس کے پاس جاتی ہیں جن کی کوئی اولاد نہیں یا جن کے پتی ان سے محبت نہیں کرتے یا غیر عورتوں سے میل جول رکھتے ہیں اور مرد بھی جاتے ہیں...... جنہیں دولت اور عورت کی ضرورت ہے اور جائداد کو ہضم کرنے کے لئے اپنے بھائی اور بہنوں کو راستے سے ہٹانا چاہتے ہیں۔ میں ایک تجسس کے زیر اثر کالی ماں کے اس کمرے کے عقب میں اس کھڑکی کے پاس کھڑی ہو گئی جس میں وہ بیٹھتی تھی۔ پھر میں نے سنا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ...... مجھے اب کوئی گنڈا یا سفوف دو جس سے وہ مجھ سے محبت کرنے لگے۔ میرے قابو میں آ جائے۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میری نیندیں حرام ہو کر رہ گئی ہیں۔ دن کا چین سکون لٹ گیا ہے۔ کالی ماں نے اس کی باتیں سن کر کہا کہ...... اسے قابو میں کرنا اور محبت کرنے پر مجبور کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ اس کا دل جیتنے کے لئے تمہیں بہت کچھ دان دینا ہوگا۔ سب سے پہلے تم کالا مندر جا کر دیوتا کی مورتی کے چرنوں میں اپنا سر رکھ کر دس دنوں تک شام کے سمے دو گھنٹے تک روزانہ پرارتھنا کرو۔ میں تمہیں جو چیزیں بتا رہی ہوں وہ لا کر دو اور پانچ سو روپے میری نذر کرو۔ سات جوڑے بھی لا کر دو تا کہ میں ان پر منتر پڑھ کر پھونک ماروں۔

پھر میں وہاں سے چلی آئی۔ میں دل میں حیران تھی کہ وہ کس عورت پر مرتا ہے۔ میری ساس بھی اس عمر میں ایسی بے کشش نہیں ہوئی تھی کہ وہ کسی دوسری عورت کو اس عمر میں دل میں بسا لے۔ پھر مجھے دو عورتیں یاد آئیں۔ ان میں ایک ودھوا ہے۔ وہ تیس برس کی عمر میں ودھوا ہو گئی تھی۔ اس کے دو بچے ہیں وہ بہت خوبصورت عورت ہے۔ وہ گھر میں چٹائیاں بن کر اپنا اور بچوں کا پیٹ پال رہی ہے۔ دوسری عورت کرشنا جس کی شادی ایک بوڑھے شخص سے ہو گئی۔ اس کی عمر بھی تیس بتیس برس کی ہے۔ وہ تو اس قدر حسین ہے کہ اس عمر کی شاید ہی کوئی عورت گاؤں میں ہو۔ گو کہ اس کا شوہر بہت بوڑھا ہے۔ لیکن وہ اس کا بڑا خیال رکھتی ہے اور اسے چاہتی ہے۔ وہ ان میں سے کسی ایک کو یا دونوں ہی کو شکار کرنا چاہتا تھا۔ میرے سسر کی ان کے ہاں آمد و رفت تھی۔ وہ عورت جو پڑوس میں ہے اس کا نام کانتا بالا ہے۔ میرا سسر اس سے چٹائیاں خرید کر بازار میں بیچتا ہے۔ کرشنا اس لئے آتی ہے کہ اونی شالوں پر کڑھائی کر کے میرے سسر کو بیچتی ہے۔ ایک روز میں نے اپنے بستر کے نیچے ایک گنڈا دیکھا جس پر کالا دھاگا لپٹا ہوا تھا۔ میں حیران تھی کہ یہ کہاں سے آ گیا۔ پھر مجھے اپنی ساس کا خیال آیا۔ میرے بچہ نہ ہونے سے وہ بہت پریشان تھی اور کالی ماں کے پاس جاتی تھی۔ شاید اس نے رکھا ہو۔ جب سے میرا سسر کالی ماں کے ہاں سے ہو کر آیا تھا تب سے کانتا اور کرشنا سے بہت بے تکلف ہو گیا تھا۔ کل کی بات ہے جب میں کرشنا کے ہاں کسی کام سے گئی تھی میری ساس نند کے ساتھ بڑی بیٹی کے ہاں دو تین دن کے لئے گئی ہوئی تھی۔ اس کے ہاں بچہ ہونے والا تھا۔ میں نے دیکھا کہ کرشنا ایک کمرے کے کونے میں کھڑی رو رہی ہے اور میرا سسر اس سے کہہ رہا ہے کہ...... تو اور تیرا پتی میری رقم ہضم کر بیٹھے ہیں۔ چار ہزار روپے کا قرض ہے...... تم دونوں ساری زندگی قرض ادا نہیں کر سکتے...... یہ قرض اسی صورت میں ادا ہو سکتا ہے کہ تو میری بات مان لے......

ایک برس تک تجھے اس جھونپڑی میں مجھ سے ملنے آنا ہوگا جو میں نے آم کے باغ میں بنا رکھی ہے۔ تو نے میری بات نہیں مانی تو تم دونوں کو پولیس کے حوالے کر دوں گا...... اور سن میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔ اس لئے میں تجھے حاصل کئے بغیر نہیں رہوں گا۔"

میرے سسر نے میری آہٹ پا کر مجھے جو دیکھا تو وہ بری طرح چونک پڑا اور پھر اس نے غصے سے کہا کہ...... تو یہاں کیوں آئی......؟ تو نے ساری باتیں سن لی ہیں...... اگر تو نے اپنی ساس سے یہ بات کہی تو میں تجھے بخشوں گا نہیں۔ چل تو جا...... مجھے اس سے باتیں کرنی ہیں۔ کرشنا کا حلیہ بتا رہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ شاید بدتمیزی کر چکا ہے۔ میں نے کہا...... یہ بہت بری بات ہے۔ میں کرشنا بھابھی پر آنچ آنے نہیں دوں گی۔ اگر تم نے ان کے ساتھ ایسی ویسی کوئی حرکت کی تو میں شور مچا دوں گی۔ وہ میری بات سن کر غصے کی حالت میں گھر سے نکل گیا۔ کرشنا نے مجھے بتایا کہ وہ دو ایک مرتبہ مجھے اور کانتا کو شربت لا کر پلا چکا ہے۔ کئی دنوں سے ہم دونوں محسوس کر رہی ہیں کہ اس کی نیت ہم پر خراب ہو رہی ہے۔ اگر تم نہ آتیں تو میں اس کے ہاتھوں برباد ہو چکی ہوتی۔ وہ کانتا کی عزت کا بھی دشمن بن گیا ہے۔

میں نے کرشنا سے کہا کہ وہ دروازہ بند کر کے بیٹھے اور اسی وقت کھولے جب اس کے پتی آئیں۔ ویسے اب میرا سسر جرأت اور غلط حرکت نہیں کرے گا۔ پھر میں گھر آ گئی۔ میرا سسر گھر میں نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس گاؤں کا ایک بدمعاش گھر میں دندناتا ہوا گھس آیا۔ اس وقت میں اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر میں حیران ہوئی اس کے اس طرح آنے پر غصہ بھی آیا۔ میں اسے اس کی اس بدتمیزی پر ڈانٹ رہی تھی کہ میرا سسر اندر آیا تو اس کے ساتھ ایک اور بدمعاش تھا۔ میرے سسر نے چھوٹتے ہی کہا...... بدچلن...... فاحشہ...... تو اس شخص کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہی ہے...... تجھے شرم نہیں آتی......؟ تیری اس سے کب سے آشنائی ہے؟ میں نے غصے سے کہا کہ مجھ پر تہمت مت لگاؤ۔ یہ شخص خود ہی ابھی ابھی اندر گھس آیا ہے...... اس شخص نے میرے سسر سے کہا...... یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ اس نے مجھے بلایا تھا۔ ہم دونوں تو ایک سال سے آشنا ہیں۔ اس پر میرے سسر نے کہا کہ...... یہ خوب رہی۔ میں تجھے بغیر جہیز کے اس لئے لایا تھا کہ تو مجھے خوش کیا کرے گی۔ میرا تجھ پر حق ہے تو جانتی ہے کہ آسام کا دستور ہے کہ شادی بیاہ میں جو عورت پر زیادہ خرچ کرتا ہے اس پر اس مرد کا حق ہوتا ہے۔ اب تجھے میری ہر بات ماننا ہو گی۔ اگر تو نے انکار کیا تو اچھا نہ ہوگا...... اور پھر تو میرے دونوں دوستوں کو بھی خوش کرے گی۔

میں نے ان دونوں کو دھکا دے کر دروازہ بند کر لیا۔ پھر کمرے کی کھڑکی سے کود کر بھاگ نکلی۔ میرا سسر دروازہ پیٹ رہا تھا۔ اسے اس حرکت کا شاید خیال نہیں آیا تھا کہ میں کھڑکی کے راستے کود کر بھاگ سکتی ہوں۔ میں بھاگ کر سونا بھابھی کے ہاں پہنچی۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتی تھیں اور ایک اچھی عورت تھیں۔ اپنے جوان بیٹے کے ساتھ رہتی تھیں۔ مجھے توقع تھی کہ وہ میری کہانی سن کر مجھے میرے میکے پہنچا دیں گی۔ اس طرح میری عزت محفوظ رہے گی۔ میں نے انہیں اعتماد میں لے کر ساری کہانی سنا دی۔ انہوں نے مجھے دلاسا دیا کہ میں کسی بات کی چنتا نہ کروں۔ وہ کل اپنے بیٹے کے ساتھ مجھے میکے بھیج دیں گی۔

ان کے بیٹے نے جو اٹھائیس برس کا ہوگا رات یہ خبر لایا تھا کہ میرا سسر میری تلاش میں میرے میکے بھی گیا تھا۔ وہاں نہ پا کر اس نے میرے گھر والوں سے اور اپنے بیٹے سے بھی کہہ دیا کہ میں کسی آشنا کے ساتھ بھاگ گئی ہوں۔ مجھے اپنے پتی کی کوئی فکر نہ تھی۔ میں اسے بہت اچھی طرح سمجھ چکی تھی۔ وہ مجھ سے بدگمان ہوسکتا تھا اور نہ ہی ان باتوں کا یقین کر سکتا تھا۔ کیوں کہ مجھے اس سے بہت محبت ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے پر اندھا اعتماد کرتے ہیں۔ سونا بھابھی کے بیٹے نے یہ بھی بتایا کہ میرا سسر گاؤں میں کہتا پھر رہا ہے کہ میں ایک بدچلن عورت ہوں۔ میری بہت سے مردوں سے دوستی ہے۔ ان الزامات نے میرا خون کھولا دیا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ چاہے کچھ ہو جائے میں اپنے سسر سے بدلہ لے کر رہوں گی۔ ایک پاک دامن عورت کے لئے اس سے بڑی اور تہمت کیا ہوسکتی ہے کہ اسے فاحشہ اور بدچلن کہا جائے۔

دوسرے دن صبح میں سونا بھابی کے لڑکے انیل کے ساتھ اپنے میکے جانے کے لئے نکل رہی تھی تو سونا بھابھی نے اس سے کہا تھا کہ یہ تمہاری بہن کی طرح ہے اسے تم حفاظت سے اس کے میکے پہنچا دینا۔ انیل نے اپنی ماں سے کہا کہ...... ماں! تم کوئی چنتا نہ کرو۔ یہ میری بہن سے بھی بڑھ کر ہے اپنی بہن کو حفاظت سے گھر پہنچا کر لوٹوں گا۔ اس پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا۔ اس کی عزت کی رکھشا کے لئے جان دے دوں گا۔

جب ہم دونوں ایک ویرانے میں جھیل کے پاس پہنچے تو اس کی نیت میں فتور آ گیا۔ اس نے میری عزت سے کھیلنا چاہا تو میں نے اس سے کہا۔ بھیا! تم نے مجھے اپنی بہن کہا۔ کیا کوئی اپنی بہن کی عزت پر ہاتھ ڈالتا ہے......؟ اس نے کہا کہ تم کیسے میری بہن ہو گئیں......؟ منہ سے کہہ دینے سے کیا تم میری بہن ہو گئیں...... سنو...... تم میری بات مان لو۔ تم بچ کر نہیں جا سکتیں...... اب تمہیں کوئی کیا بھگوان بھی بچا نہیں سکتا؟ اگر تم نے میری بات نہیں مانی تو پھر تمہاری عزت بچ سکتی ہے اور نہ ہی جان...... یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میں تمہیں تمہارے سسر کے حوالے کر دوں...... تمہارا سسر اور وہ دونوں بدمعاش نہ صرف چاقوؤں سے مسلح ہیں بلکہ ان میں سے ہر ایک کے پاس تیزاب کی بوتلیں ہیں۔ وہ تمہاری عزت سے کھیلنے کے بعد تیزاب تمہارے چہرے اور جسم پر پھینک دیں گے تاکہ تم تڑپ تڑپ کر مرو۔

مجھے یقین نہیں آیا کہ یہ شخص اس قدر ذلیل اور کمینہ ہے۔ نفرت او[illegible]صے سے میرا بدن کھولنے لگا۔ میرا دنیا کے ہر رشتے اور مرد پر سے یقین اٹھ گیا۔ میں سوچنے لگی کہ میں کیا کروں۔ کس طرح سے اس شیطان سے بچوں۔ مجھے اس شیطان سے بچنا محال لگ رہا تھا۔ پھر میرے ذہن میں ایک تدبیر آئی۔ قریب ہی ایک دس بارہ فٹ گہرا گڑھا تھا۔ اس کے قریب لمبی لمبی گھاس اگی ہوئی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر بڑے پیار سے اس کا ہاتھ تھام لیا اور اسے خود سپردگی کی نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی کہ پہلے وچن دو کہ تم مجھے میکے پہنچا دو گے......؟ اس نے وچن دیا۔ پھر میں نے اسے گڑھے کے کنارے اشارہ کر کے کہا کہ...... ادھر چلو...... وہ جگہ زیادہ اچھی ہے۔ ادھر سایہ اور گھاس بھی ہے۔

میں نے گڑھے کے دہانے کے قریب پہنچ کر اس کے گلے میں اپنی بانہیں ڈال دیں۔ اس سے

پہلے کہ وہ میرے چہرے پر جھکتا...... میں نے اس کے سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر اپنی ساری طاقت جمع کی اور اسے گڑھے میں دھکا دے دیا۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ گڑھے میں چیختا چلاتا گر پڑا۔ گرتے ہی بے ہوش ہو گیا۔ اس کے سر میں چوٹ آئی تھی۔ اس کے زخم سے خون بہہ کر چہرے پر پھیلنے لگا۔

میں نے اپنا لباس اور بال درست کئے۔ پھر اکیلی ہی اپنے گاؤں کی طرف بڑھی۔ کالا مندر کے قریب پہنچی تھی کہ مجھے سسر اور دونوں بدمعاش دکھائی دیئے جو شکاری کتوں کی طرح میری بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ میں ان سے بچنے کے لئے مندر میں گھس گئی۔ کرشنا کی مورتی کے سامنے پجاری کھڑا ہوا تھا۔ میری آہٹ سنتے ہی اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ وہ تینوں چوں کہ اسی طرف آ رہے تھے اس لئے میں بری طرف خوف زدہ سی ہو رہی تھی۔ پجاری نے حیرت سے مجھے دیکھا اور قریب آ کر پوچھا کہ کیا بات ہے۔ تم اس قدر خوف زدہ کیوں ہو رہی ہو؟

میں نے اسے بتایا کہ میرا سسر اپنے دو دوست مسلح بدمعاشوں کے ساتھ میری تلاش میں مندر کی طرف ہی آ رہا ہیں۔ وہ میری عزت کے درپے ہیں...... آپ مجھے ان سے بچا لیں۔ ورنہ ان کے ہاتھوں سے میری عزت نہ بچ سکے گی۔ کیوں کہ وہ درندے بنے ہوئے ہیں۔ آپ نے مزاحمت کی تو وہ آپ کو بھی جان سے مار ڈالیں گے۔ اس لئے آپ مجھے جلدی سے کہیں چھپا دیں۔ بھگوان کے لئے جلدی کریں۔

پجاری نے سامنے والی کوٹھری میں مجھے بند کر کے دروازے پر کنڈی لگا دی اور باہر سے تالا لگا دیا۔ تھوڑی دیر بعد مندر کے ہال میں چاپیں سن کر میں نے کوٹھڑی کے دروازے کی جھری میں سے جھانکا۔ میرا سسر اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ کھڑا تھا اور پجاری سے کہہ رہا تھا...... میری بہو ایک بدچلن اور فاحشہ عورت ہے۔ وہ گھر سے بھاگ گئی ہے۔ ہم اس کی تلاش میں ہیں تاکہ اسے اس کے میکے لے جا کر اس کے ماں باپ کو اس کی بدکاری کے بارے میں بتائیں۔ کیا آپ نے اسے دیکھا؟ پجاری نے جواب دیا کہ نہیں...... یہاں کل سے کوئی عورت نہیں آئی۔ تب میرے سسر نے اس سے کہا کہ...... اگر وہ آئے تو اسے میرے پاس لے آئیں اور ہم آپ کو انعام بھی دیں گے۔

جب وہ چلے گئے تو ایک شخص پرساد لے کر آیا تھا۔ اس نے پوجا پاٹ کی۔ اس کے جانے میں آدھے گھنٹے سے زیادہ لگ گیا۔ اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد پجاری نے میرے کمرے کا تالا اور دروازے کی کنڈی کھولی۔ میں فرش پر لیٹی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا تو اس کی آنکھوں میں دل کا میل نظر آیا اور اس کی آنکھوں میں ایک ہولناک چمک پیدا ہوئی۔

”تم کتنی سندر ہو......؟“ پجاری نے میرا سراپا اپنی نظروں میں جذب کرتے ہوئے دیکھا۔ ”گڑیا سی معلوم ہو رہی ہو......“

”بھگوان نے مجھے سندر بنایا ہے۔ کاش! وہ مجھے اتنا سندر نہ بناتا، مجھے ایک بدصورت عورت بناتا۔“ میں نے افسردگی سے کہا۔

”ہر عورت کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ بہت سندر ہو......“ پجاری نے کہا۔ ”تم اتنی سندر ہو کر بدچلن

کیوں بن گئی ہو۔"

"یہ جھوٹ ہے۔" میں نے کہا۔ "میرے سسر کی نیت مجھ پر خراب ہو گئی ہے۔ چوں کہ میں نے اس کی بات نہیں مانی اس لئے وہ مجھ پر جھوٹے الزام لگا رہا ہے۔ بدنام کر رہا ہے تا کہ میں اس کے پاس چلی جاؤں۔ لیکن میں اس کے پاس نہیں بلکہ اپنے ماں باپ کے پاس جاؤں گی۔"

"سچی بات تو یہ ہے کہ تمہیں دیکھ کر میری نیت بھی خراب ہو رہی ہے۔" وہ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے مجھے ہولناک نظروں سے گھورنے لگا۔ "میں پوجا کر کے تمہارے سارے پاپ صاف کرا دوں گا تم یہاں دو دن میرے ساتھ رہ جاؤ۔ پھر تم پر کوئی گناہ نہیں رہے گا۔"

"تم ایک مندر کے پجاری ہو کر ایسی باتیں زبان سے نکال رہے ہو؟" میں نے ہذیانی لہجے میں کہا۔ مجھے غصہ آ گیا۔ "میں نے کوئی پاپ نہیں کیا...... اور تمہیں شرم آنی چاہیئے۔ تمہارے سر کے سارے بال سفید ہو چکے ہیں۔ تم میرے باپ کی عمر کے ہو......"

"تم جیسی پاپی لڑکی کے ساتھ وقت گزاری پاپ نہیں ہے جو جانے کتنے مردوں سے منہ کالا کر چکی ہے۔" اس نے کہا۔

وہ میری طرف بڑھا تو مجھے ایسا لگا کہ کوئی بھیڑیا میری طرف بڑھ رہا ہو۔ وہ جیسے ہی میرے قریب آیا میں نے پوری طاقت سے اسے دیوار کی طرف دھکا دیا اور اس کا سر دیوار سے بری طرح ٹکرایا۔ پھر میں نے ایک پل کی بھی دیر نہیں کی۔ میں کوٹھری سے باہر آئی۔ اس کا دروازہ بند کر کے اس کی باہر سے کنڈی لگا دی اور مندر سے باہر نکل آئی۔ مجھے اس کمینے کے ہاتھوں سے بچ جانے کی بڑی خوشی ہو رہی تھی۔

جب میں کھیتوں سے نکل کر جا رہی تھی تب میری نظر ان تینوں پر پڑی جو تالاب کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں انہیں دیکھ کر بگٹٹ بھاگی۔ مجھے ایسا لگا جیسے ان میں سے کسی نے مجھے دیکھ لیا ہے۔ پھر آپ سے میری مڈبھیڑ ہو گئی۔ یہ ہے میری کہانی......"

"واقعی آپ کی کہانی بڑی دردناک ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن آپ بہادر اور نڈر لڑکی ہیں۔ آپ کی عزت درندوں کے ہاتھوں محفوظ رہی۔"

"آپ کی بڑی کرپا ہو گی مجھے کسی نہ کسی طرح میرے میکے پہنچا دیں۔" وہ کہنے لگی۔ "مجھے میرے پتی پر بھروسہ ہے کہ وہ مجھ سے ملنے ضرور آئے گا۔ وہ میرے سسر اور ان بدمعاشوں کی باتوں پر وشواس نہیں کرے گا۔ کیوں نہ ہم چل پڑیں۔ وہ کہیں اور بھٹک رہے ہوں گے۔" تھوڑی دیر بعد میں اور مدھروتی باہر آئے۔ پھر ہم نے تھوڑی دیر تک چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ جب کوئی دور دور تک نظر نہ آیا تو ہم چل پڑے۔ لیکن چوکنا تھے اور چاروں طرف دیکھتے ہوئے پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہے تھے کہ کہیں ان بدمعاشوں سے سامنا نہ ہو جائے۔

"آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ کا لباس کس نے تار تار کیا......؟" میں نے پوچھا۔ "یہ حرکت کس نے کی......؟"

"یہ حرکت میرے سسر کی ہے۔" اس نے کہا۔ "میں نے دانستہ نہیں بتایا۔ جب اس نے میرا لباس تار تار کرنا شروع کیا تو میں کمرے میں گھس گئی تھی۔"

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کسی مکان میں جا کر ان سے لباس مانگ لیا جائے؟" میں نے کہا۔ "کہیں رسی پر کپڑے سوکھ رہے ہوں تو ایک جوڑا اچرا لیا جائے...... پھر آپ کسی دن آ کر اس کا جوڑا لے جا کر واپس کر دیں۔ آپ کی اس حرکت کو وہ معاف کر دے گی وجہ بتانے پر۔"

"لیکن آپ کس لئے ایسا چاہتے ہیں؟" پھر اس کا چہرہ کسی خیال سے سرخ ہو گیا اور اس نے اپنی پلکیں نیچی کر لیں۔ "دراصل میں بھول ہی گئی تھی کہ میں کس حالت میں آپ کے سامنے اور قریب موجود ہوں۔ لیکن آپ بہکے نہیں۔ آپ واقعی بہت شریف آدمی ہیں۔"

"اس لئے کہ کوئی اس حالت کا مجھے موردِ الزام نہ ٹھہرا دے اور شک میں پڑ جائے۔" میں نے کہا۔ "دن کا وقت ہوتا تو کوئی اور بات ہوتی۔" ہم نے کوئی نصف گھنٹے کی مسافت طے کی تھی کہ لمبی لمبی خاردار جھاڑیوں کے عقب سے تین آدمی نکل کر سامنے آ گئے۔ ان کے سامنے آتے ہی مدھروتی نے ایک چیخ ماری اور مجھ سے لپٹ گئی اور خوف زدہ لہجے میں بولی۔ "یہی ہیں وہ حرام زادے......"

وہ تینوں بدمعاش ہمارا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے اور ہمارے درمیان پندرہ سولہ گز کا فاصلہ ہو گا۔ ان میں سے ایک شخص جو نمایاں تھا اس کی عمر پچپن ساٹھ برس کے لگ بھگ ہو گی۔ لیکن اس کی کاٹھی بڑی مضبوط تھی اور وہ دراز قد بھی تھا۔ اس کے چہرے سے خباثت ٹپک رہی تھی۔ اس کی سور جیسی آنکھیں تھیں۔ وہ اپنے چہرے مہرے اور وضع قطع سے خبیث لگ رہا تھا...... وہ دونوں بدمعاش جو اس کے ساتھ تھے وہ چھٹے ہوئے بدمعاش دکھائی دے رہے تھے۔ وہ تینوں مدھروتی کو سامنے پا کر کھل اٹھے تھے۔

ان کے ہاتھوں میں کولڈ ڈرنک کی تین بوتلیں تھیں۔ ان میں تیزاب بھرا ہوا تھا۔ انہوں نے اپنی جیبوں سے چاقو نکال کر اس کے بٹن دبا کر کھول لیے تھے۔ اب ان کے ہاتھوں میں چاقو تڑپ رہے تھے۔ ان کی تیز دھار چمک رہی تھی۔ مدھروتی ان کے ہاتھ میں کھلے چاقو دیکھ کر اس قدر دہشت زدہ ہو گئی کہ اس کا بدن لرزنے لگا اور اس نے میرے پیچھے کھڑے ہو کر مجھے ڈھال بنا لیا۔

"سنو...... تم اس لڑکی کو کہاں لیے جا رہے ہو؟" مدھروتی کے سسر نے مجھے کرخت لہجے میں مخاطب کیا۔ "تم کیا اس کے عاشق ہو؟"

"میں اسے اس کے میکے پہنچانے جا رہا ہوں کیوں کہ تم تینوں اس کی عزت کے درپے ہو۔" میں نے بھی سخت لہجے میں جواب دیا۔ "کس قدر شرم کی بات ہے کہ ایک سسر اپنی بہو کی عزت کا دشمن بن جائے...... ڈوب مرنے کی بات ہے...... میں اس کا عاشق نہیں ہوں۔ میں ایک مسافر ہوں جو قصبہ نارنگ جا رہا تھا کہ یہ لڑکی مل گئی۔ اس نے مجھ سے بنتی کی کہ میں اسے اس کے گھر پہنچا دوں۔"

"اس لڑکی کو ہمارے حوالے کر دو اور اپنی راہ لو۔" اس کے سسر نے کہا۔ "ہمارے جھگڑے میں اپنی ٹانگ نہ اڑاؤ......"

"میں نے اسے وچن دیا ہے کہ میں اسے اس کے گھر پہنچا کر ہی جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "بہتر ہے تم ہمیں جانے دو اور ہاں اس کے گھر جا کر جو بھی جھگڑا ہے اسے نمٹا لینا...... لڑکی تم سے کسی قیمت پر بات کرنے اور ساتھ جانے کے لئے تیار نہیں ہے۔"

"ایسا لگتا ہے کہ تمہیں اپنی جان عزیز نہیں ہے۔" ایک بدمعاش نے کہا۔ "ہم تین ہیں۔ ہمارے پاس چاقو ہیں اور ان بوتلوں میں تیزاب بھی ہے۔ یہ بہو سسر کا جھگڑا ہے۔ تمہیں اس میں دخل دینے اور بولنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اصل بات کیا ہے تم نہیں جانتے؟"

"اصل بات یہ ہے کہ ایک شیطان اپنی بہو کی عزت پر ہاتھ ڈالنا چاہتا ہے۔ اس لئے یہ بھاگ کر اپنے میکے جا رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"سسر صاحب نے اس کی شادی اپنے خرچ پر اپنے بیٹے سے کی ہے۔ انہیں اس بات کا حق ہے کہ وہ جو چاہیں کریں۔" دوسرا بدمعاش بولا۔

"فرض کرو کہ...... ان کی بیٹی کا سسران کی بیٹی کے ساتھ بھی ایسا سلوک کرے تو کیا یہ بے غیرت پسند کرے گا؟" میں نے کہا۔

میری بات سنتے ہی مدھروتی کے سسر کی آنکھیں لال ہو گئیں۔ اس نے تیزاب کی بوتل گھما کر میرا نشانہ لے کر مجھ پر پھینکی۔ اس کا نشانہ خطا ہو گیا۔ وہ ایک درخت کے تنے سے ٹکرا کر ٹوٹ گئی۔ پہلے بدمعاش نے بھی میرا نشانہ لیا۔ میں مدھروتی کو تیزی سے لے کر ایک طرف ہٹ گیا۔ اس کا نشانہ بھی خطا ہو گیا۔ تیسرے بدمعاش نے بوتل پھینکی تو میں نے اسے کرکٹ کی گیند کی طرح کیچ کر لیا۔ پھر میں نے وہ بوتل گھما کر اس پر زور سے پھینکی تو وہ اس کے گھٹنے سے جا لگی۔ وہ ٹوٹی تو نہیں البتہ اس کا ڈھکن کھل گیا۔ تیزاب اس کے کپڑوں پر گر گیا۔ پھر کیا تھا وہ چیخنے چلانے اور مجھے گالیاں بکنے لگا۔ اس کے ہاتھ سے چاقو چھوٹ کر زمین پر گر گیا۔ پہلا بدمعاش چاقو لہراتا ہوا میری طرف بڑھا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر حملہ کرتا، اس نے ایک زوردار چیخ ماری اور زمین پر گر کر لوٹنے لگا۔ ایک کالا سانپ جو جھاڑیوں سے نکلا تھا اس نے اس بدمعاش کو ڈس لیا تھا۔ یہ سانپ بہت ہی زہریلا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس بدمعاش کا بدن نیلا پڑ گیا۔ منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ اس نے دم توڑ دیا اور اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ وہ سانپ جھاڑیوں میں گھس گیا۔

اس کے سسر نے جو یہ دیکھا تو وہ اور مشتعل ہو گیا۔ فضا میں چاقو لہراتا ہوا میری طرف وحشیانہ طور پر لپکا۔ میں نہتا تھا اس لمحے میری نظروں کے سامنے ان فلموں کے مناظر گھومنے لگے جن میں ہیرو نہتا ہوتا تھا اور بیک وقت چار چار بدمعاشوں سے مقابلہ کرتا تھا۔ وہ ہیرو ہوتا تھا میں تو ہیرو نہ تھا۔ ایک عام آدمی تھا۔ آج تک میری کسی سے لڑائی نہیں ہوئی تھی۔ جب اس نے مجھ پر حملہ کیا تو میں ایک طرف تیزی سے ہٹ گیا اور اس سے چار پانچ قدم دور کھڑا ہو گیا۔ اس کے چاقو کا پھل زہر میں بجھا ہوا لگ رہا تھا۔

اس نے میرے قریب آ کر جھپٹ کر میرا گریبان پکڑ لیا پھر اس نے چاقو لہرایا اور میرے سینے میں گھونپنا چاہا کہ اس کے ہاتھ سے چاقو چھوٹ کر گر پڑا...... پھر میرا گریبان بھی چھوٹ گیا۔ پھر وہ بھی گر

پڑا۔ خیال آیا کہ کہیں پھر اسے اس کالے سانپ نے تو ڈس نہیں لیا تھا۔ اسے سانپ نے نہیں ڈسا تھا۔ ایک زہریلی ناگن نے ڈسا تھا...... اور وہ زہریلی ناگن مدھروتی تھی۔ اس نے ایک بدمعاش کا چاقو اٹھا کر اپنے سسر کی پشت میں بھونک دیا تھا۔ وہ زمین پر گر کر درد اور تکلیف سے تڑپنے لگا۔

"آپ قصبہ نارنگ اور میں اپنے گاؤں جاتی ہوں۔" مدھروتی بولی۔ "اب کوئی خطرہ نہیں رہا۔ یہ مردود بھی مر جائے گا۔ آپ جلدی سے جائیں۔ کوئی ہمیں دیکھ نہ لے...... میں آپ کی یہ کرپا کبھی نہیں بھولوں گی۔" اس نے آگے بڑھ کر میرا رخسار چوما تو اس کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو تھے۔ پھر وہ گاؤں کی سمت روانہ ہو گئی اور میں قصبہ نارنگ کی طرف چل پڑا۔

☆......☆......☆

میں سہ پہر کے وقت بنگال اور آسام کے سب سے بڑے، عظیم اور آخری جادوگر شوتم کے سامنے کھڑا تھا جس کی عمر ایک سو بیس برس کی تھی۔ جس کے سر جسم اور بھنوؤں کے بال روئی کی طرح سفید تھے۔ لیکن اس کی آنکھوں میں بجلی کی سی چمک تھی۔ وہ مجھے ایک ٹک دیکھ رہا تھا......

جادوگر شوتم کی آنکھوں میں ایک سحر انگیز چمک سی تھی۔ اس کے چہرے پر کسی راجہ کا سا دبدبہ تھا۔ میں دنیا کے سب سے بڑے جادوگر کے دربار میں کھڑا تھا۔ وہ بے تاج مہاراجا تھا۔ میں اس کی ذات اور شخصیت سے بڑا متاثر اور بے حد مرعوب سا تھا۔ آخر کیوں نہ ہوتا، وہ کوئی عام انسان نہ تھا۔ دنیا کی ایک ایسی عظیم ہستی تھی۔ ایک ایسی ہستی جو ساری دنیا کو آن واحد میں تہ وبالا کر سکتی تھی۔

اس کے بڑے سے کمرے میں کوئی بارہ پندرہ افراد موجود تھے جو بڑے خاموش اور مؤدب کھڑے تھے۔ ان میں مرد، لڑکیاں بچے اور عورتیں بھی موجود تھیں۔ ان سب کی نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں۔ وہ سب مجھے اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے میں کوئی دنیا کا عجوبہ ہوں۔ وہ میرے لئے اجنبی تھے اور میں ان کے لئے۔ یہ سب شاید شوتم کے خاندان کے فرد معلوم ہوتے تھے۔ میں جیسے ہی ایک ہی شخص کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا تو کمرے میں جو بھنبھناہٹ ہو رہی تھی وہ گہرے سکوت میں ڈھل گئی تھی۔ اس وقت میرے دل و دماغ کی ایک عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ میرا دل اتنے زور سے دھڑک رہا تھا کہ اس کی صدا سنائی دے رہی تھی۔ مجھے یہ سب کچھ کسی خواب کی طرح لگ رہا تھا۔ یقین نہیں آیا تھا کہ میں واقعی جادوگر شوتم کے سامنے کھڑا اسے دیکھ رہا ہوں۔

"آؤ بیٹے سکندر! میں تمہیں خوش آمدید کہتا ہوں۔" دوسرے لمحے جادوگر شوتم کی محبت بھری نظروں نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور مٹھاس سے بھرے لہجے نے کمرے میں چھائے ہوئے گہرے سکوت کو توڑ کر میری بہت ہی بڑی مشکل حل کر دی تھی۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا کہ میں اسے کیسے، کس طرح اور کن الفاظ سے مخاطب کروں۔ کیوں! اس کا رعب مجھ پر طاری تھا۔

"سکندر!" دوسرے لمحے اس نے میرا جواب نہ پا کر سابقہ لہجے میں مخاطب کیا۔ "مجھے تم سے مل کر

اور اپنی نظروں کے سامنے پا کر کتنی خوشی ہو رہی ہے میں بتا نہیں سکتا۔ ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے میں کوئی سندر سا سپنا دیکھ رہا ہوں، لیکن یہ حقیقت سپنے سے سندر ہے۔"

مجھے شوتم کی زبان سے اپنا نام سن کر اتنی حیرت اور خوشی نہیں ہوئی۔ کیوں کہ وہ دنیا کا عظیم اور سب سے بڑا...... اس کے لئے میرا نام جاننا اور میرے بارے میں سب کچھ جاننا کچھ مشکل نہ تھا۔ شاہ جی جیسے جادوگر نے میرا اور میرے دوست رشید کا نام اور آمد کا مقصد بھی جان لیا تھا۔ حیرت اور خوشی اس بات کی تھی کہ اس نے جن محبت بھرے الفاظ سے میرا پرتپاک استقبال کیا تھا مجھے اس سے اس بات کی ذرہ برابر بھی توقع نہ تھی یہ نا قابل یقین امر تھا۔

میرا خیال تھا کہ وہ شاید مجھ سے ملنا اور بات کرنا تک پسند نہیں کرے گا اور شاید مجھے اندر گھسنے بھی نہ دے۔ کیوں کہ اس کے متعلق لوگوں کی اچھی رائے نہ تھی۔ کئی لوگوں نے کہا تھا کہ وہ انتہائی بد مزاج اور چڑچڑا واقع ہوا ہے۔ کسی سے سیدھے منہ بات تک نہیں کرتا ہے۔ اسے ایسے لوگوں سے سخت چڑ اور نفرت تھی جو اس سے جادو سیکھنے کے لئے ملنا چاہتے تھے۔ وہ انہیں بری طرح جھاڑ دیتا تھا اور کہتا تھا کہ جب اس نے کہہ رکھا ہے کہ وہ کسی کو جادو نہیں سکھائے گا۔ شاگرد نہیں بنائے گا اور پھر اس نے اپنی اولاد اور خاندان کے کسی فرد کو جادوگر نہ بنانے کی سوگند کھا رکھی ہے تو پھر اسے تنگ اور پریشان کیوں کیا جاتا ہے۔ اس نے یہ بھی کہہ رکھا تھا کہ کسی نے اسے زیادہ تنگ اور پریشان کیا تو وہ اسے جانور یا پرندہ بنا کر جنگل میں بھیج دے گا۔

لیکن شوتم جادوگر نے جس محبت، والہانہ انداز اور گرم جوشی سے میرا پرتپاک خیر مقدم کیا تھا ایک لمحے کے لئے میرا دل بہت خوش ہو گیا تھا۔ "مجھے بھی آپ سے مل کر کتنی خوشی ہو رہی ہے بیان سے باہر ہے۔" میں نے قدرے پر جوش لہجے میں کہا۔ "در حقیقت مجھے یہ سب کچھ کسی سپنے کی طرح لگ رہا ہے۔ آپ سے ملنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ پھر بھی میں جیسے جوئے شیر لے آیا ہوں۔"

"یہ تو بتاؤ نوجوان!" شوتم نے کہا۔ "آخر تمہیں بچپن سے ہی جادوگر بننے کا شوق کیوں تھا؟ کیا یہ عجیب بات نہیں ہے؟"

"میں بچپن میں اپنی مرحومہ ماں سے جادوگروں، پریوں، جن بھوتوں کی کہانیاں سنتا تھا۔" میں نے کہا۔ "ان پراسرار اور جادوئی کہانیوں میں، میں نے ایسا تجسس، سنسنی خیزی اور دلچسپی پائی کہ میرے دل میں جادوگر بننے کا شوق جاگا۔ عمر کے ساتھ ساتھ میرا شوق بڑھتا گیا۔ اس میں شدت پیدا ہوتی گئی۔ یہ شوق ایک اندھا جنون بن گیا۔ بس...... یہ بات ہے۔"

"کیا تمہارے ملک میں جادوگر نہیں تھے جو تم نے اتنے دور دراز کا سفر کیا؟ اپنا قیمتی وقت ضائع کیا؟" شوتم نے کہا۔

"آج کل جادوگر رہے کہاں؟" میں نے کہا۔ "آج کل جو جادوگر ہیں وہ شعبدہ باز، لٹیرے، دھوکے باز ہیں۔ انہوں نے کچھ سفلی علوم سیکھ لیے ہیں جس سے انہوں نے معصوم اور سادہ لوح مرد اور عورتوں کو لوٹنے کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔"

"شاید تم بھی اس لئے تو جادو ٹونا نہیں سیکھنا چاہتے ہو کہ اسے ذریعہ معاش بناؤ؟" شوتم نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"اس دنیا میں سادہ اور معصوم لوگوں کو لوٹنے کے لئے جادو سیکھنے کی کیا ضرورت ہے؟" میں نے کہا۔ "اس کے لئے ایک ہزار ایک طریقے ہیں۔"

"لگتا ہے کہ تم بہت ہی بڑے جادوگر بننا چاہتے ہو؟" شوتم نے کہا۔ "اس لئے تم بنگال اور پھر آسام آئے کیوں؟"

"جی ہاں۔" میں نے کہا۔ "بنگال اور آسام میں عام اور درمیانہ قسم کے جادوگروں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ لیکن میں عام یا معمولی جادوگر بننا نہیں چاہتا ہوں۔ اس سے تو بہتر ہے کہ یہ فن سیکھنا ہی نہیں چاہتا ہوں۔ میں نے عہد کیا ہے کہ اگر جادوگر بنوں گا تو بڑا جادوگر، ورنہ معمولی جادوگر نہیں...... اس لئے میں نے بنگال کے کسی جادوگر کی شاگردی نہیں کی؟"

"آخر تم کتنا بڑا جادوگر بننا چاہتے ہو؟" شوتم نے کہا۔ "تمہارے دماغ میں کیا تصور ہے؟ کس قسم کے جادوگر کا......؟"

"میں آپ جیسا بڑا جادوگر بننا چاہتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "میں نے آپ کی بہت تعریف سنی ہے۔"

"مجھ جیسا جادوگر......؟" شوتم مسکرا دیا۔ "تم نے میری تعریف سنی لیکن کیا یہ نہیں سنا کہ میں نے کسی کو شاگرد نہ بنانے کا عہد کیا ہوا ہے؟"

"ہاں...... میں نے سنا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں نے یہ بھی سنا ہے کہ آپ نے اپنی اولاد اور خاندان کے کسی فرد کو شاگرد نہیں بنایا؟"

"تم نے سچ سنا ہے۔" شوتم نے سر ہلایا۔ "لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم اتنا بڑا جادوگر بن کر کیا کرو گے؟ اس سے کیا حاصل ہوگا؟"

"میں نے بچپن سے لے کر نوجوانی کے آغاز تک شعبدہ بازی اور جادوگروں کے حیرت انگیز اور محیر العقول کمالات دیکھے جنہوں نے میرے شوق کو ہوا دی۔" میں کہنے لگا۔ "لیکن میں جس نیک مقصد کے لئے جادو سیکھنا چاہتا ہوں اس جادو سے کام نہیں چل سکتا۔ میں آپ جیسا بڑا جادوگر اس لئے بننا چاہتا ہوں کہ برائیوں کے خلاف جنگ لڑوں۔ برے لوگوں کے خلاف محاذ بناؤں۔ انسانیت کی بقا کے لئے اپنی زندگی وقف کر دینا چاہتا ہوں۔ اس سے دولت کمانا، پرتعیش اور بدکاری کی زندگی نہیں گزارنا ہے۔"

"اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم میرے شاگرد بننے کے بعد انسانیت کی خدمت کرو گے اور غلط راستے پر نہیں جاؤ گے؟"

"میری زبان اس بات کی ضمانت ہے کہ میں کبھی بھولے سے بھی اس جادو سے غلط فائدہ نہیں اٹھاؤں گا۔" میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"یہ میرا بڑا پوتا ہے۔" شوتم نے ایک ساٹھ برس کے بوڑھے کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کے باپ نے بھی مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میں جادو سیکھنے کے بعد انسانیت کے خلاف کام نہیں کروں گا۔ ان جانے راستوں پر نہیں جاؤں گا۔ نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھوں گا۔ پھر اس نے مہاتما گوتم بدھ کی سوگند کھائی۔ دیوتاؤں کی سوگند کھائی۔ میں نے اسے صرف نصف جادو سکھایا۔ جانتے ہو اس نے کیا کیا......؟ وہ صرف تین ماہ تک بھلائی کے لئے کام کرتا رہا۔ تین ماہ کے بعد اس نے دوسرے شہروں میں جا کر اپنے جادو کو غلط استعمال کیا۔ وہ جادوگر کے بجائے لٹیرا بن گیا۔ دولت اور لڑکیوں کا لٹیرا...... اس کے علاوہ اس نے لوگوں کو طرح طرح سے ستانا شروع کیا۔ جب مجھے اس کی کارستانیوں کا علم ہوا تو پھر میں نے نہ صرف اس سے جادو چھین لیا بلکہ اسے ساری زندگی کے لئے اپاہج بنا ڈالا۔ میں اسے یہی سزا دے سکتا تھا۔ وہ دس برس تک سسک سسک کر مر گیا۔ اس لئے میری اولاد اور خاندان کے فرد میں کسی کی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ میری شاگردی قبول کریں۔ میرا خاندان جادوگروں کا خاندان ہے۔ سات پشتوں سے جادو میراث رہا ہے۔ میں نے اپنے خاندان کے ہر فرد کو جادو کے فن سے محروم کر دیا۔ گو کہ وہ بہت بڑے بڑے جادوگر نہ تھے لیکن اتنی مہارت اور قوت ضرور رکھتے تھے کہ اس سے غلط فائدہ اٹھا سکیں۔ میری موت کے ساتھ ہی اس خاندان کا جادو ختم ہو جائے گا۔"

"اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ صرف ایک عظیم جادوگر ہی نہیں بلکہ ایک بلند ترین انسان بھی ہیں۔" میری یہ تعریف محض رسمی نہیں خالص گہرے جذبے کی عکاس تھی۔ "آپ نے اپنے بیٹے کو وہ سزا دی جس کا واقعی وہ مستحق تھا۔ ہر کسی باپ کے بس کی بات نہیں ہوتی ہے۔ کیوں کہ اپنے خون پر ترس آ ہی جاتا ہے۔ لیکن اس طرح یہ فن اور اپنی عظمت آپ ساتھ لے جائیں گے۔ دنیا میں جہاں اچھے بھی ہیں وہاں بہت برے بھی ہوتے ہیں۔ آپ نے کسی اچھے آدمی کو تلاش کیوں نہیں کیا؟ اسے آزمایا کیوں نہیں؟"

"میں ایک باپ اور جادوگر کے علاوہ ایک انصاف پسند شخص ہوں۔" شوتم کہنے لگا۔ "میرے پتا جی نے مجھ سے وچن لے کر جادو سکھایا تھا۔ وہ ایک سو ساٹھ برس کی عمر میں مرا۔ میرے باپ نے مجھے کسوٹی پر ہر طرح سے خوب پرکھا تھا۔ میں نے بھی اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنی اولادوں اور خاندان کے ہر فرد کو آزمایا۔ لیکن کوئی بھی آزمائش پر پورا نہیں اترا۔ میں کیا کروں...... بنگال میں میرے پائے کا کوئی جادوگر نہیں اور نہ ہی آسام میں...... میری موت کے بعد چھوٹے موٹے اور معمولی قسم کے جادوگر رہ جائیں گے۔ لیکن انہیں جادوگر کہنا...... جادو کی توہین ہوگی۔ کیوں کہ جادو کے بھی اصول اور آداب ہوتے ہیں اور ان کی اپنی ایک عظمت ہوتی ہے۔"

شوتم کی باتوں نے میری نہ صرف حوصلہ شکنی کر دی تھی بلکہ دل بھی توڑ دیا تھا۔ میں پھر مایوسی کے اندھیرے میں ڈوب گیا تھا۔ چاروں طرف تاریکی کے سوا کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اب میں کیا کروں۔ اسے راضی کرنے کی کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اب جب کہ میں یہاں آیا تھا تو میں کسی قیمت پر یہاں سے خالی ہاتھ جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس طرح میرا دیرینہ خواب ادھورا رہ جاتا۔ یہ کتنے دکھ کی بات تھی کہ میں منزل پر پہنچ کر بھی تہی دامن تھا۔ منزل تھی کہ قریب ہوتے ہوئے کوسوں دور ہو گئی تھی۔

"شوتم صاحب! میرے دوست کی آتما نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا تھا اس لئے میں بڑی امیدیں لے کر آیا تھا...... کاش! اس نے بتایا نہ ہوتا اور نہ ہی ادھر آتا۔ آپ نے میرا دل توڑ دیا...... آپ کے مذہب اور اس قصبے کی روایات کے مطابق کسی مہمان کا دل توڑنا بہت بڑا پاپ ہے۔ کیا آپ کا یہ پاپ بھگوان شما کر دے گا۔"

"سکندر! تم بہت ذہین اور ہوشیار آدمی ہو۔" شوتم مسکرایا۔ "تم اپنے اس دوست راحت کی آتما کے بارے میں بتا رہے ہو جس نے تمہارے دوست کا مسروقہ سامان ایک قدیم مندر سے ایک چور بدروح سے لے کر دیا تھا۔ اس نے تم سے رخصت ہوتے وقت میرے متعلق کہا تھا اور تم ایک لمبا اور دشوار گزار سفر کر کے میرے قصبے پہنچ گئے تاکہ میں تمہیں اپنا شاگرد بنا لوں۔"

"جی ہاں۔" میں نے سر ہلایا۔ "آپ نے میرے بارے میں بھی اتنا کچھ کیسے معلوم کر لیا؟" میں نے تعجب خیز لہجے میں کہا۔ "آپ ایک جادوگر ہیں۔ آپ نے میرا ذہن پڑھ کر سب کچھ معلوم کر لیا...... کیوں یہی بات ہے نا......؟"

"میں نے ذہن پڑھ کر نہیں تمہیں اور تمہارے دوست کی روح کو میں نے اس میں دیکھا تھا اور تم دونوں کی ساری باتیں سنی تھیں۔" اس نے میز پر رکھے ایک سفید گولے کی طرف اشارہ کیا جو فٹ بال سے دگنے سائز کا تھا۔ "یہ ہم جادوگروں کا ٹی وی ہے جو ہم نے ہزاروں برس قبل ایجاد کیا تھا۔ جدید دنیا کی ٹیکنالوجی نے اسے دیکھ کر ٹی وی بنا لیا۔"

"میں اتفاق سے ایک ایسا ہی شخص ہوں جیسا آپ چاہتے تھے۔" میں نے اپنے ترکش کا آخری تیر چلایا۔ "آپ کیوں نہیں میری آزمائش کر کے مجھے اپنا شاگرد بنا لیتے۔ آپ کو جس شخص کی تلاش رہی شاید وہ شخص میں ہی ہوں۔"

"سکندر بیٹے!" شوتم مسکرا دیا۔ "میں نے جب سنا...... میری موکل بدروحوں نے بتایا کہ ایک شخص جادوگر بننے کے شوق میں بنگال سے آسام آیا ہوا ہے۔ تب سے میں اس گولے میں تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ تمہاری باتیں سن رہا ہوں۔ تمہیں سب سے پہلے فرزانہ نے اپنے حسن وشباب کے جادو سے مسحور کرنا چاہا۔ پھر شمشاد نے جب تم نے اس کی بہن کا مسروقہ زیور برآمد ہونے کے بعد پہنچایا۔ تمہاری راحت سے آخری ملاقات کو بھی...... میں اس گولے میں سارے جہاں کو اس طرح دیکھتا رہتا ہوں جس طرح ٹی وی پر لوگ دیکھتے ہیں اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس طرح میں وقت گزاری کرتا رہتا ہوں۔ جب میں نے تمہیں دیکھا کہ تم قصبہ نارنگ کی طرف چل پڑے ہو تو میں نے تمہاری آزمائش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ کیوں کہ میرے باپ کی آتما نے آ کر مجھ سے کہا کہ یہ شخص بہت اچھا، نیک، مخلص اور انسانیت کا پجاری ہے۔ تم ہر طرح سے اس کی آزمائش کرو۔ جب یہ تمہاری آزمائش پر پورا اترے تو اسے اپنا شاگرد بنا کر تمام جادو سکھا دینا۔"

"سچ......" میں ایک دم سے اس بچے کی طرح خوش ہو گیا جسے بہت ساری ٹافیاں مل گئی ہوں۔

’’میں اس کے لئے تیار ہوں۔‘‘

’’لیکن اس کی کوئی ضرورت نہیں۔‘‘ شوتم نے نہایت بے پروائی سے کہا۔ ’’مجھے تمہاری کوئی آزمائش نہیں کرنا ہے۔‘‘

’’ضرورت کیوں نہیں......؟‘‘ میں اچھل سا پڑا۔ حیرت اور دکھ سے بولا۔ ’’کیا آپ کو اپنے پتا جی کی بات سے اختلاف ہے؟‘‘

’’نہیں...... یہ بات نہیں سکندر بیٹے!‘‘ وہ محبت بھرے لہجے میں بولا۔ ’’دراصل بات یہ ہے کہ میں نے تمہاری آزمائش کرلی ہے؟‘‘

’’آپ نے میری آزمائش کرلی ہے......؟‘‘ میں نے چونک کر سخت تعجب سے کہا۔ ’’کب اور کیسے......؟ سچ سچ بتائیں۔‘‘

’’میں نے ایک دفعہ نہیں بلکہ تین دفعہ تمہاری آزمائش کی ہے سکندر بیٹے!‘‘ شوتم نے مسکرا کے کہا۔ ’’سب سے پہلی آزمائش تمہاری مونگا سے کی...... ہیرے جواہرات کا خزانہ دیکھ کر تمہارے دل میں ذرہ برابر بھی اس کے حصول کا لالچ نہیں ہوا۔ تم نے اس کی خواہش بھی ظاہر نہیں کی...... لیکن اس کے باوجود مونگا نے تم پر بھروسا نہیں کیا اور وہ تمہاری جان کا دشمن بن گیا تھا۔ اس نے تمہاری نیت پر شک بھی کیا جب کہ تمہاری نیت بالکل صاف تھی اور تم نے اس سے کہہ بھی دیا تھا کہ تم سارا خزانہ لے جاؤ۔ میں اس میں سے رتی برابر زیور نہیں لوں گا۔ وہ یہ سمجھا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو اور تم موقع پا کر اسے قتل کر کے اس کے اس خزانے پر قبضہ کرلو گے۔ لہٰذا وہ ایک جگہ گھات لگا کر بیٹھ گیا تا کہ تمہیں موت کی نیند سلا سکے۔

مونگا نے تم سے یہ بھی کہا تھا کہ چندا نگر کی عورتوں کے حسن و شباب کے جادو سے کوئی مرد مہمان یا اجنبی نہیں بچ سکتا۔ کیوں کہ وہ اس قدر حسین اور پرکشش ہوتی ہیں کہ مرد بے قابو ہو جاتے اور ان کے غلام بن جاتے ہیں۔

میں اس جادو کے گولے میں سب کچھ دیکھ اور تم دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔ مجھے اس بات سے خوشی ہوئی تھی کہ تمہیں واقعی خزانے سے کوئی دلچسپی اور سروکار نہ تھا۔ پھر میں نے جادو کے زور سے اس خزانے کو سانپوں، ناگوں اور بچھوؤں میں تبدیل کر دیا جنہوں نے اسے ڈس لیا اور پھر وہ موت کی آغوش میں چلا گیا اور اس کا وجود ان کی غذا بن گیا۔ اس کی حسین اور پرشباب پتنی جو چندا نگر کی تھی وہ قصبہ نارنگ میں رہتی ہے۔ میں نے اسے اس کے پتی کی موت کی خبر دے دی تو وہ اپنے میکے چندا نگر چلی گئی۔

جب تم ناہموار اور نہایت دشوار گزار رستے سے گزرتے ہوئے ایک جھیل کے پاس پہنچے۔ وہاں سے چند قدم کے فاصلے پر تمہیں ایک سبک خرام بہتی ندی دکھائی دی۔ چپراسی جگن ناتھ نے تمہیں بتا دیا تھا کہ اس گاؤں کے باہر ایک جھیل اور وہاں سے ایک ندی دکھائی دے گی تو سمجھ لو کہ آپ چندا نگر پہنچ گئے۔

تمہارا دل بڑی تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ تم نے دل میں یہ سوچا کہ میں یہاں کی عورتوں کے حسن و شباب کے سحر سے کس طرح سے اپنے آپ کو بچاؤں۔ تمہاری جگہ کوئی اور نوجوان ہوتا تو یہ سوچتا کہ کیوں

نہ وہ چندا نگر کی حسین و جمیل لڑکیوں کے ساتھ کچھ دن رہ کر اپنی راتیں رنگین کرے۔ لیکن تم چندا نگر کی حسین اور زہریلی ناگنوں سے اپنے آپ کو ڈسنے سے بچانا چاہتے تھے۔ ایک عجیب اور ناممکن سی بات تھی۔ کیوں کہ دنیا کے ہر مرد کی سب سے بڑی کمزوری نوجوان اور حسین عورت ہے۔ وہ بھی مفت میں آسانی سے اس طرح مل جائے جیسے راستے کا مال ہو۔

قصبہ نارنگ جانے کے لئے کوئی اور راستہ نہیں تھا اگر تھا بھی تو تمہیں اس کا علم نہیں تھا۔ اس لئے اس گاؤں سے گزرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا لہٰذا مجبوری تھی اور تم بے حد تھک گئے تھے۔ کیوں کہ مسلسل پانچ میل تک چلتے رہے تھے اور تمہیں بڑے زور کی بھوک اور پیاس لگ رہی تھی اور تم نڈھال سے ہو رہے تھے۔ جھیل کے پاس جو ایک درخت تھا تم اس کے نیچے ستانے اور بسکٹ کھانے کے لئے بیٹھ گئے...... تا کہ کھا پی کر تازہ دم ہو کر اپنا سفر جاری رکھ سکو۔ نصف فرلانگ پر چندا نگر اور ایک میل پر وہاں سے قصبہ نارنگ تھا۔ ابھی تم نے سانس بھی نہیں لیا تھا کہ نہ جانے کہاں سے ایک بوڑھا شخص تمہارے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اسی برس کی عمر کا تھا۔ اس نے تم سے کہا کہ وہ دو دن سے بھوکا ہے۔ کچھ کھانے کو ہے تو دے دو۔ ورنہ وہ مر جائے گا۔ اس وقت تمہاری حالت بھی دو دن کے بھوکے شخص کی سی تھی۔ لیکن تم بھوکے رہے اور اسے کھلا دیا۔ پانی پلا دیا۔ وہ تمہیں دعائیں دیتا چلا گیا۔ تم نے اس بوڑھے سے بھی کہا تھا کہ چندا نگر کی عورتوں کے حسن کے جادو کے توڑ کے بارے میں بتاؤ۔ اسے تمہاری بات سن کر بڑی حیرت ہوئی تھی کہ تم کیسے جوان ہو جوان سے بچنا چاہتے ہو۔

جب بوڑھا چلا گیا اور تمہاری نظروں سے اوجھل ہو گیا تو تم چل پڑے۔ تمہارا بھوک و پیاس سے دم نکلا جا رہا تھا۔ تم ایک ایسی پگ ڈنڈی پر چل پڑے جس کے بائیں جانب ایک بڑا سا تالاب تھا اور دائیں جانب جھیل تھی۔ جھیل سے کچھ ہی فاصلے پر سبک خرام ندی تھی۔ جس کے متعلق تمہیں چپراسی جگن ناتھ بتا چکا تھا۔ اتفاق سے تمہیں وہاں کوئی لڑکی دکھائی نہیں دی۔ تم جھیل کی طرف بڑھے تا کہ پانی پی کر ہی پیاس اور بھوک مٹالو۔ تم کسی نہ کسی طرح جھیل تک پہنچے۔ پانی کی خالی بوتل میں پانی بھر کے اسے ہونٹوں سے لگا لیا اور آنکھیں بند کرلیں۔ پھر تمہارے کانوں میں ایک رسیلی آواز گونجی۔ تم نے دیکھا ایک سترہ برس کی لڑکی سینی میں پھل اور مٹھائی لیے کھڑی تھی۔ اس کے حسن و شباب اور پرشباب گداز بدن نے تمہیں مبہوت کر کے رکھ دیا۔ اس نے تمہیں اپنا اسیر بنانے کے لئے خود سپردگی سے تمہاری طرف پیش قدمی کی۔ وہ تم پر مہربان ہونا چاہتی تھی۔ کوئی اور ہوتا تو اس کا پیر پھسل جانا یقینی ہو جاتا۔ لیکن تم نے خود پر قابو رکھا۔ اس سے دودھ کے لئے کہا۔ جب وہ دودھ لینے گئی تو پھر تم وہاں سے بھاگ کر چندا نگر کی حدود سے نکل آئے۔ تم نے اپنے کردار سے اس جادو کا توڑ کیا۔

پہلے تو ایک لمحے کے لئے پچھتاوا اور افسوس ہوا کہ ایسی حسین لڑکی سے سرفراز کیوں نہیں ہوئے۔ پھر خوشی بھی ہوئی کہ غلاظت کے دلدل سے نکل آئے۔ پھر تمہاری ملاقات ایک بوڑھے شخص اور ایک کم سن لڑکی سے ہوئی جو بیمار تھا۔ پھر تم اس بوڑھے کو جو بیمار اور چلنے سے قاصر تھا اپنی کمر پر لاد کر دس میل تک چلے اور اس

کے گھر اسے پہنچایا۔ اس زمانے میں کون ایسا ہے جو ایک اجنبی کے ساتھ انسانیت آمیز سلوک کرے۔ ہر شخص خودغرض ہے۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ اس بوڑھے کو پیٹھ پر لاد کر سو قدم بھی نہیں چلتا۔

وہ بوڑھا جسے تم نے بسکٹ کھلایا اور پانی پلایا وہ میں ہی تھا۔ بیمار بوڑھا بھی میں ہی تھا۔ تم پہلے شخص ہو جو میری آزمائش پر پورے اترے۔ خزانے کا لالچ نہ کرنا، خود بھوکا رہ کر بھوکے کو کھلا دینا۔ ایک بیمار کو پانچ میل تک پیٹھ پر لاد کر اس کے گھر پہنچانا جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تم انسانیت کے لئے بہت کچھ کر سکتے ہو۔ ایک بے لوث، بےغرض اور عظیم انسان ہو...... لہٰذا میں، میں تمہیں اپنا شاگرد بناؤں گا۔ اپنا تمام جادو تمہیں سکھادوں گا...... تم سکندر اعظم ساری دنیا سے برائی کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینکنا۔"

☆......☆......☆

شوتم سے جادو سیکھنے کے لئے مجھے تین ماہ نارنگ میں رہنا پڑا۔ شوتم نے بڑی عرق ریزی سے مجھے اپنا سارا جادو سکھادیا۔ اس نے مجھے جو جادو سکھایا وہ میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔ ایسا ایسا جادو جس نے مجھے بھونچکا کردیا اور کوئی اس بات کو مان نہیں سکتا کہ دنیا میں ایسا جادو بھی موجود ہے۔ اب ایسا کون سا جادو تھا جو مجھے نہیں آتا تھا اور دنیا کا بڑے سے بڑا جادوگر مجھ پر اپنا جادو چلا نہیں سکتا تھا۔ نہ ہی زیر کرسکتا تھا۔ اب دنیا کا ہر جادوگر میرے سامنے طفلِ مکتب تھا۔

اس نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ میں ٹی وی کو جادو کے گولے کے طور پر استعمال کرسکتا ہوں۔ اس نے اپنے جادو کے گولے میں وہ کچھ دکھایا جو میں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس میں، میں نے اپنے شہر کراچی کو اور دوستوں کو دیکھا۔ رشید اور اس کی بیوی کو بھی...... پھر میں نے فرزانہ کو دیکھا۔ فرزانہ بمبئی شہر کی ایک کوٹھری میں کسم پرسی کی زندگی گزار رہی تھی۔ اس کا آشنا اسے ہیروئن بنانے کا فریب دے کر بمبئی شہر لے گیا تھا۔ وہ اس وقت تک اس کے ساتھ رہا تھا جب تک اس کا جی سیر نہیں ہوگیا۔ پھر اس نے فرزانہ کو مختلف حیلے بہانوں سے اور سبز باغ دکھا کر انجانے راستے پر چلا کر خوب دولت کمائی۔ پھر ایک روز اسے تنہا چھوڑ کر اور اس کے تمام زیورات لے کر گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہوگیا اور پھر کسی نئے شکار کی تلاش میں نکل پڑا اب وہ ایکسٹرا گرل تھی اور ان جانے راستے پر چل رہی تھی۔ یہ سارا کیا دھرا اس کی بڑی بہن کا تھا جس کی وجہ سے اس کی زندگی اور مستقبل تباہ و برباد ہوگیا تھا۔ اس کے والدین بھی ذمے دار تھے جنھوں نے اسے ڈھیل دے رکھی تھی۔

جب میں جادوگر بن گیا تو قصبہ نارنگ میں اس روز زبردست جشن منایا گیا۔ ساری رات کنواری لڑکیوں کا رقص ہوتا اور شراب کا دور چلتا رہا۔ لیکن میں نے شراب کا ایک قطرہ بھی نہیں چکھا۔ چندانگر کی تمام لڑکیوں اور عورتوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ شوتم نے بتایا کہ اس نے اپنے جادو کے زور سے ایسا توڑ کیا ہوا ہے کہ چندانگر کی عورتیں اور لڑکیاں قصبہ نارنگ اور آس پاس کے گاؤں اور دیہاتوں کے مردوں اور جوانوں پر اپنا جادو چلا نہیں سکتیں۔ شوتم نے کہا کہ اگر میں نے یہ توڑ نہ کیا ہوا ہوتا تو پھر اس اور دوسرے قصبے کی لڑکیاں بیٹھی رہ جاتیں، توڑ یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو بہت ہی بدصورت اور بےکشش دکھائی

دیتے ہیں۔ چندانگر کی لڑکیوں اور عورتوں کے جال میں اجنبی مسافر اور چالیس میل دور کے لوگ پھنس جاتے ہیں۔ مونگا نے چندانگر کی عورت سے شادی چالیس میل سے باہر کی تھی۔

شوتم نے مجھے رخصت کرتے وقت کہا۔ "دیکھو سکندر بیٹے......! میں نے تمہیں وہ سب کچھ دیا جو میں جانتا تھا اور اب میرے پاس تمہیں سکھانے کے لئے کچھ رہا نہیں۔ تم کبھی بھولے سے بھی اس کام سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا۔ اگر تم نے ایسا کیا تو پھر یہ سارا جادو ایک لمحے میں ختم ہوجائے گا۔ میرے اس جادو سے ساری دنیا اور انسانیت کو فائدہ پہنچانا۔"

شوتم نے مجھے جو جادو سکھایا تھا اس کی مدد سے میں پل بھر میں دنیا کے کسی ملک کے کسی بھی حصے میں پہنچ سکتا تھا۔ حاضر غائب ہوسکتا تھا۔ مرد، عورت اور لڑکے کے جسم میں بھی داخل ہوسکتا تھا۔ ٹیلی پیتھی بھی آگئی تھی۔ میں جادو کے ایسے ایسے کمالات دکھا سکتا تھا جو محیرالعقول اور ناقابل یقین بھی تھے۔ کیا کیا بتاؤں اور سناؤں۔ آگے چل کر سب کچھ آپ کے علم میں آتا جائے گا۔

شوتم نے مجھے نہ صرف شاگرد بلکہ ایک بیٹے کی طرح سمجھا تھا۔ اس نے بڑا پیار دیا تھا۔ اس نے مجھ پر جو احسان کیا تھا وہ میں ساری زندگی بھول نہیں سکتا۔ میں نے خواب وخیال میں بھی نہیں سوچا تھا کہ شوتم جیسے بڑے اور عظیم جادوگر سے ملاقات ہوگی۔ میں اتنا بڑا جادوگر بننا بھی نہیں چاہتا تھا لیکن میں تصور سے کہیں بڑا جادوگر بن گیا۔ اس سے رخصت ہوتے وقت میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ مجھے روتا دیکھ کر شوتم اور قصبے کے تمام لوگ بھی جذباتی ہوگئے تھے۔

میں وہاں سے غائب ہوکر رشید کے ہاں پہنچا۔ سہ پہر ڈھل چکی تھی۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ رشید دروازہ کھول کر باہر آیا۔ وہ بہت پریشان اور متفکر سا دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی خوش ہوکر لپٹ گیا اور بولا۔

"سکندر! یہ تم بتائے بغیر اچانک کہاں غائب ہوگئے تھے؟ میں بہت پریشان ہوگیا تھا۔"

تھوڑی دیر بعد میں اپنے کمرے میں بیٹھا اسے ساری کہانی تفصیل سے سنا رہا تھا۔ وہ غور سے سن رہا تھا۔ جب میں اپنی کہانی سنا چکا تو رشید نے کہا۔ "مبارک ہو دوست! تمہاری سب سے بڑی دیرینہ آرزو پوری ہوگئی۔ تمہاری نیکی اور لگن نے تمہیں آج دنیا کا سب سے بڑا جادوگر بنادیا۔ اب تم سکندر اعظم بن کر برائیوں کو جڑ سے کاٹنے کی کوشش کرنا۔ تم اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاؤ۔ اب تمہارے کیا ارادے ہیں؟"

"میں یہاں سے چٹاگانگ جاؤں گا۔ پھر وہاں سے کراچی چلا جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "ویزا، پاسپورٹ اور امیگریشن کی خانہ پری بہت ضروری ہے۔ ورنہ میں یہاں سے غائب ہوکر پل بھر میں کراچی پہنچ سکتا ہوں۔"

"ہاں یہ بہت ضروری ہے کہ جس طرح آئے ہو اسی طرح ہی واپس جاؤ۔" رشید نے کہا۔ "ورنہ تم حکومتوں کے درمیان قانونی دردسری بن جاؤ گے۔" میں نے رشید کو یہ نہیں بتایا تھا کہ ٹیلی پیتھی بھی سیکھ چکا ہوں۔ میں نے انجان بن کر اس سے دریافت کیا۔

”رشید! کیابات ہے۔تم بہت پریشان اور متفکر دکھائی دے رہے ہو۔ مجھے بتاؤ کہ مسئلہ کیا ہے؟“

”بینک میں میری دراز سے پانچ لاکھ کی رقم چوری ہوگئی ہے۔“ رشید نے جواب دیا۔ ”یہ کل شام کی بات ہے۔ بینک میں لین دین بند ہوچکا تھا اور اسٹاف اپنا اپنا کام سمیٹ رہا تھا کہ ایک ہندو کاروباری پانچ لاکھ کی رقم جو بڑے نوٹوں کی شکل میں تھی بینک لے کر آیا۔ اس وقت اسٹرانگ روم بند کیا جاچکا تھا اور دوبارہ اس لئے نہیں کھولا جاسکتا تھا کہ جنرل منیجر اسے مقفل کر کے اس کی چابیاں تجوری میں رکھ کر جاچکا تھا۔ وہ رقم گھر اور دکان میں اس لئے نہیں رکھنا چاہتا تھا کہ رقم نہ صرف بڑی تھی بلکہ چوری ہونے کا بھی خطرہ تھا۔ میں نے وہ رقم اپنی میز کی دراز میں رکھ کر اسے مقفل کردیا۔ یہ بات اس کے، منیجر اور میرے علاوہ کسی اور کے علم میں نہیں تھی۔ آج صبح جب میں بینک پہنچا تو بینک میرے سامنے کھولا گیا۔ میں نے اپنی میز کی دراز کھولی تاکہ اس کی رقم بینک میں کیشئر کے پاس جمع کرادوں۔ جب میں نے دراز کھولی تو میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی اور میں بے ہوش ہوتے ہوتے رہ گیا۔ رقم غائب تھی۔ میں دراز مقفل کر کے گیا تھا۔ میں نے ایک ہنگامہ کھڑا کردیا۔ چوکی دار سے پوچھا۔ اس نے صاف لاعلمی ظاہر کردی۔

منیجر نے اس لئے پولیس میں رپورٹ درج نہیں کرائی کہ اس سے نہ صرف بینک کی بدنامی ہوتی بلکہ اس کا کاروبار متاثر ہونے کا اندیشہ تھا اور گاہکوں کا اعتماد اٹھ جاتا۔ سارا شک چوکی دار پر جارہا ہے۔ اسے ہر طرح سے سمجھایا ڈرایا اور دھمکایا بھی کہ وہ شرافت سے رقم واپس کردے۔ اسے نہ تو ملازمت سے برطرف کیا جائے گا اور نہ ہی پولیس کے حوالے کیا جائے گا۔ وہ یہی کہہ رہا ہے کہ اس نے رقم چوری نہیں کی۔ اگر اس نے اتنی بڑی رقم چوری کی ہوتی تو وہ اسی وقت بھاگ کر کلکتہ وغیرہ چلا جاتا۔ اس کے گھر جا کر تلاشی لی گئی۔ رقم وہاں سے بھی برآمد نہیں ہوئی۔ ایک خیال یہ ہے کہ اس نے یہ رقم شاید اپنے کسی دوست کے ساتھ مل کر چوری کی ہوگی۔ کیوں کہ چوکیدار کی چار جوان لڑکیاں ہیں اور وہ ان کی شادی کے لئے بہت فکرمند اور پریشان ہے۔ اس لئے اس نے چوری کی واردات کسی دوست یا جاننے والے کے ساتھ مل کر کی ہے۔

چوکیدار کوئی بیس برس سے اسی بینک کی چوکیداری کررہا ہے۔ بہت شریف، نیک اور ایماندار بھی ہے۔ نمازی متقی اور پرہیزگار بھی ہے۔ ان بیس برسوں میں دو ایک مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ کیشئر اپنی دراز کھلی رکھ گیا تھا جس میں تین لاکھ کی رقم موجود تھی جو اسٹرانگ روم بند ہونے کے بعد کاروباری حضرات دے گئے تھے۔ لیکن اس میں سے رقم بالکل بھی چوری نہیں ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ ایک بار اسے راستے میں ایک بڑا زنانہ پرس عشاء کی نماز مسجد سے پڑھ کر بینک جاتے وقت ملا تھا۔ اس میں بیس طلائی کڑے، ایک نیکلس اور ٹیکہ تھا اور اس کے علاوہ ایک لاکھ کی رقم بھی تھی۔ لیکن اس نے یہ پرس اس کی مالکن کو دوسرے دن تلاش کر کے پہنچادیا تھا۔ یہ پرس رکشا میں گھر جاتے وقت بچے نے ماں کی نظر بچا کر پھینک دیا تھا۔ مجھے اس پر شک نہیں ہے۔“

”کیا اس رقم کی چوری کی اطلاع تم نے اس کاروباری کو دے دی؟“ میں نے دریافت کیا۔

”ہاں۔“ رشید نے سر ہلادیا۔ ”اسے بڑا افسوس ہوا لیکن اس کا کہنا ہے کہ اسے دو دن میں رقم

چاہیے۔ کیوں کہ کاروباری لوگوں کو ادائیگیاں کرنی ہیں۔ میں سخت پریشان ہوں۔ میں پانچ لاکھ کی رقم کہاں سے لاؤں۔“

”یار رشید! تم فکرمند اور پریشان نہ ہو۔ اللہ نے چاہا تو رقم شام تک مل جائے گی۔“ میں نے دلاسا دیا۔ ”تم مجھے اس شخص کے پاس لے چلو جس کی یہ رقم تھی۔ میں اس سے ایک بار ملنا چاہتا ہوں۔“

”لیکن یار! یہ رقم تم کیسے اور کہاں سے برآمد کرسکو گے؟“ رشید نے کہا۔ ”تم کوئی سراغ رساں تو نہیں ہو؟“

”تم یہ کام مجھ پر چھوڑ دو اور یہ دیکھو کہ میں یہ رقم کیسے اور کہاں سے برآمد کرسکتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”رقم بڑے پراسرار انداز سے چوری ہوئی ہے۔ بینک کی چابیاں تمہارے پاس ہوتی ہیں۔ چوکیدار صرف بینک سے باہر ساری رات چوکیداری کرتا ہے۔ کسی ایک دروازے کا تالا بھی ٹوٹا ہوا نہیں ہے بقول تمہارے...... اور پھر چوکیدار ایک نیک اور ایماندار اور بہت ہی پرانا ملازم ہے۔ اسے اس بات کا علم نہیں ہے کہ اس کاروباری شخص نے پانچ لاکھ کی رقم لا کر دی۔ دوسری طرف اس رقم کی چوری کا شک تم پر ہی کیا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ چابیاں تمہارے پاس تھیں۔ اس کے باوجود تم چور نہیں ہو۔ کیوں کہ اس چوری سے تمہیں کچھ حاصل نہیں ہے۔ اس لئے یہ رقم بینک میں ڈپازٹ نہیں ہوئی اور نہ ہی کیشئر نے وصول یابی کی رسید دی۔ میں سراغ رساں نہیں تو کیا ہوا؟ ایک جادوگر تو ہوں۔ دیکھنا ہے کہ میرا جادو کیا کام دکھاتا ہے۔“

رشید مجھے لے کر اس شخص کی دکان پر پہنچا جس نے پانچ لاکھ کی رقم بینک لا کر رشید کو دی تھی۔ اس کا نام سیٹھ چمن داس تھا۔ اس کی شہر میں کپڑے کی بہت بڑی دکان تھی۔ اس وقت اس کی دکان پر بہت رش بھی تھا۔ لیکن دکان پر چمن داس موجود نہ تھا وہ کسی کام سے گھر گیا ہوا تھا۔ اس دکان کا منیجر رام پال ایک جوان شخص تھا۔ اس کی عمر کوئی تیس برس کی ہوگی۔ وہ بہت خوبصورت اور وجیہہ تھا۔ بہت ذہین اور تیز بھی دکھائی دیتا تھا۔

جب ہم سیٹھ چمن داس کے گھر پہنچے تو وہ موجود تھا۔ اس نے ہمیں نشست گاہ میں لا کر بٹھایا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی بیٹی شونا ہمارے لئے مٹھائی، کچوری اور چائے لے کر آئی۔ شونا بیس برس کی ہوگی۔ وہ اتنی خوبصورت نہ تھی جتنی پرکشش تھی۔ اس کی سیاہ آنکھیں بہت بڑی بڑی اور خوبصورت بھی تھیں۔ میں چند لمحوں تک اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ جب وہ کمرے سے چلی گئی تو میں نے چمن داس سے کہا کہ کیا وہ کچھ دیر کے لئے اپنی دکان سے منیجر رام پال کو بلاسکتے ہیں۔ میں اس سے یہاں کچھ دیر بات کرنا چاہتا ہوں۔ سیٹھ چمن داس نے دکان فون کر کے کہا کہ رام پال ابھی اور اسی وقت یہاں پہنچے۔ سیٹھ چمن داس نے فون کرنے کے بعد مجھ سے پوچھا۔ ”آپ نے اسے یہاں کس لئے بلایا ہے؟“

”اس لئے کہ اس نے آپ کی پانچ لاکھ کی وہ رقم جو آپ نے رشید صاحب کے پاس بطور امانت رکھوائی تھی وہ رات اس نے بینک سے اڑالی۔ آپ کا منیجر رام پال چور ہے۔ وہ رقم اس کے پاس موجود ہے۔“

”رام پال اور چور......؟“ سیٹھ چمن داس اچھل پڑا۔ پھر اس نے سر ہلاتے ہوئے حیرت سے

کہا۔ "جی نہیں صاحب! ایسا نہیں ہوسکتا۔ رام پال بڑا قابل بھروسا اور ایماندار شخص ہے۔ وہ تین برس سے میری دکان پر ملازمت کررہا ہے۔ وہ کیش کے تمام معاملات خود ہی کرتا ہے اور میں گلہ اس کے حوالے چھوڑ دیتا ہوں۔ اس نے آج تک ایک روپے کی بھی بے ایمانی نہیں کی۔ اگر وہ روزانہ سینکڑوں روپے بھی جیب میں ڈال کرلے جائے تو مجھے پتا نہ چلے۔ لیکن اس نے کبھی میرے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی اور پھر وہ ایک غریب ماں کا اکلوتا بیٹا ہے اور میں اسے تن خواہ بھی بہت اچھی دیتا ہوں۔ اس میں کاروباری سوجھ بوجھ مجھ سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کی ذات سے میرے کاروبار کو چار چاند لگے ہیں۔ وہ مجھ سے بھی بڑا کاروباری آدمی ہے۔"

"رام پال آپ کی نظر میں یقیناً ایک اچھا اور قابل بھروسا شخص ہوگا۔" میں نے کہا۔ "لیکن آدمی کو بدلتے دیر نہیں لگتی ہے وقت، کوئی نہ کوئی بات، واقعہ اور حالات ایک آدمی کو پل بھر میں بدل دیتے ہیں۔"

"آخر اسے چوری کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟" سیٹھ چمن داس نے تکرار کی۔ "اس شریف آدمی پر آپ یہ گھناؤنا الزام نہ لگائیں۔"

"سیٹھ صاحب! پانچ لاکھ کی رقم کم نہیں ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔ "لوگ ایک ایک ہزار کے لئے اپنا ایمان اور دھرم بیچ دیتے ہیں۔"

"آپ کچھ بھی کہہ لیں۔ میں آپ کی بات ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ وہ ایک قابل، محنتی اور ایماندار شخص ہے۔" سیٹھ چمن داس نے کہا۔ "اس کی عزت اور قدر میرے دل میں کتنی ہے میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔ ایسے جوان کم ہوتے ہیں؟"

"اگر وہ ایسا ہی نوجوان ہے تو کیا اسے آپ اپنا داماد بنانا پسند فرمائیں گے؟" میں نے ان کے چہرے پر نظریں مرکوز کرکے پوچھا۔

"جی نہیں۔" ان کے چہرے کا رنگ ایک دم بدل گیا۔ انہوں نے سر ہلا کر جواب دیا۔ "میں اسے داماد کیوں بناؤں؟"

"اس لئے کہ اس نوجوان میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک داماد میں ہونی چاہئیں۔ آخر اسے داماد بنانے میں حرج ہی کیا ہے۔ ایسے نوجوان تو گوہر نایاب ہوتے ہیں اور پھر آپ کے دل میں اس کی بڑی عزت اور قدر بھی ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ لاکھ خوبیوں کا مالک سہی۔" سیٹھ چمن داس نے ہذیانی لہجے میں کہا۔ "آخر ایک ملازم ہے۔ میں ایک ملازم کو داماد کیوں بناؤں؟"

"اس نے اسی لئے اتنی بڑی رقم چوری کی ہے کہ وہ آپ کا داماد بن سکے۔" میں نے کہا۔ "دراصل اسے چور بنانے میں آپ بھی برابر کے شریک ہیں بلکہ اس کے قصوروار ہیں۔ کاش! آپ نے سوجھ بوجھ سے کام لیا ہوتا؟"

سیٹھ چمن داس میری بات کا جواب دینے والے ہی تھے کہ رام پال نے کمرے میں داخل ہوکر

ہمیں نمسکار کیا۔ میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جب وہ بیٹھ گیا تو میں نے سیٹھ چمن داس سے کہا۔

"زحمت نہ ہو تو آپ اپنی بیٹی شونا کو تھوڑی دیر کے لئے بلالیں؟"

"وہ کس لئے......؟" سیٹھ چمن داس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ "میری بیٹی کا اس چوری کی واردات سے کیا تعلق ہے؟"

"بڑا گہرا تعلق ہے۔" میں نے بڑے پرسکون لہجے میں کہا۔ "میں یہ تعلق ابھی ثابت کئے دیتا ہوں۔"

چمن داس نے اپنی نوجوان بیٹی شونا کو آواز دی تو وہ فوراً ہی کمرے میں آگئی۔ اس کا چہرہ زرد پڑا ہوا تھا۔ وہ شاید چھپ کر ہماری گفتگو سن رہی تھی۔ وہ اپنے پتا جی کے پاس بڑے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کے سراپا میں ایک ارتعاش سا تھا۔

"رام پال!" میں نے بغیر کسی تمہید کے اسے مخاطب کیا۔ "تمہیں یہاں اس لئے بلایا گیا ہے کہ تم نے رات کے وقت اپنے ایک دوست......اسے دوست نہیں بلکہ ایک جعل ساز اور جرم پیشہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس کا نام سری رام ہے۔ اس کے ساتھ مل کر بینک میں چوری کی واردات کی ہے۔ پورے پانچ لاکھ کی وہ رقم لے اڑے جو تمہارے سیٹھ چمن داس بینک میں ڈپازٹ کرنے گئے تھے تو وقت ختم ہوچکا تھا۔ اسٹرانگ روم بھی بند کیا جاچکا تھا اس لئے رشید صاحب نے اس رقم کو اپنی میز کی دراز میں رکھ لیا۔ جب صبح انہوں نے دیکھا تو رقم غائب تھی۔ دراز رقم نکالنے کے بعد پھر سے مقفل کردی گئی تھی۔"

"سکندر صاحب......" رام پال اس طرح سے اچھل پڑا۔ جیسے اسے زبردست برقی جھٹکا لگا ہو۔ اس کا چہرہ دھلی چادر کی سفید پڑتا چلا گیا۔ "آپ زبان سنبھال کر بات کریں۔ آپ کو یہ بات شوبھا نہیں دیتی ہے کہ ایک شریف آدمی پر بہتان لگائیں۔"

"سنو رام پال!" میں نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔ "اب بھی معاملہ نہیں بگڑا ہے۔ ہم اس کیس کو پولیس کے پاس لے جانا نہیں چاہتے ہیں۔ تم رقم لاکر دے دو بات ابھی ختم ہوجاتی ہے۔ ورنہ تم حوالات کی ہوا کھاؤ گے۔ پانچ برس کی سزا ہوسکتی ہے۔"

میں نے یہ کہہ کر کن انکھیوں سے شونا کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بھی سفید پڑ گیا تھا۔ وہ خود پر قابو پانے کی جدوجہد کررہی تھی۔ "آپ کے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ میں نے یہ چوری کی واردات ایک بدمعاش کے ساتھ مل کر کی ہے؟" وہ تیز لہجے میں بولا۔

"ثبوت......؟" میں بولا۔ "ثبوت میرے پاس موجود ہے......ایک ایسا ٹھوس ثبوت جسے جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ تمہاری اسی میں بھلائی اور عزت ہے کہ چوری کی وہ رقم جو تم نے گھر میں چھپا رکھی ہے جاکر ابھی اور اسی وقت لے آؤ۔ پولیس کو زحمت نہ دو۔"

"میں جانتا ہوں کہ آپ کے پاس کوئی ثبوت وغیرہ نہیں ہے۔" رام پال ہذیانی لہجے میں بولا۔ "آپ صرف نفسیاتی حربے آزما رہے ہیں اور اندھیرے میں تیر چلا رہے ہیں۔ میں آپ کی دھونس دھمکیوں

میں آنے والا نہیں ہوں...... لیکن ایک بات یاد رکھیں...... میرے مالک کی اس شہر کی سب سے بڑی کپڑے کی دکان ہے۔ یہاں پولیس افسران اور ان کی بیگمات بھی خریداری کے لئے آتی ہیں۔ میرے ان سے روابط ہیں۔ وہ مجھے جانتے ہیں اور میں انہیں جانتا ہوں۔ میں ایک بڑی دکان میں منیجر ہوں۔ میری بھی بڑی عزت ہے۔ آپ نے میرے خلاف اوچھے ہتھکنڈے استعمال کیے تو میں رشید صاحب پر ہتک عزت کا دعویٰ کردوں گا...... آپ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ مجھے چوری کرنے کی کیا ضرورت پڑ گئی؟"

"لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے ہیں؟" میں نے تیز لہجے میں کہا۔ "میں یہاں تم سے بحث وتکرار اور تمہاری صفائی سننے کے لئے نہیں بیٹھا ہوں۔ سیدھی طرح سے یہ بتاؤ کہ تم اپنی چوری کا اقرار کرتے ہو کہ نہیں؟ رقم لاتے ہو کہ نہیں......"

"سکندر صاحب! آخر آپ مجھے صرف باتوں سے چور ثابت کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہیں؟ ثبوت کیوں نہیں پیش کرتے ہیں۔" وہ تلخ لہجے میں بولا۔ "یہ سارا کھیل، ڈراما رشید صاحب کا ہے پانچ لاکھ کی رقم حاصل کرنے کا......"

"بکواس بند کرو۔" رشید کو غصہ آ گیا۔ "بے وقوف اس رقم کے چوری ہو جانے سے سیٹھ چمن داس مجھے بخش دیں گے؟ انہوں نے کہا ہے کہ میں تین دن کے اندر انہیں رقم لا کر دوں۔ میں اگر چور اور بے ایمان ہوتا اور یہ رقم ہڑپ کرنا ہوتی تو صاف مکر جاتا کہ انہوں نے مجھے کوئی رقم لا کر نہیں دی۔ یہ بات چوں کہ تم جانتے تھے کہ سیٹھ صاحب بینک میں رقم جمع کرانے لے گئے۔ رقم جمع نہ ہو سکی لیکن میں نے اسے اپنی میز کی دراز میں رکھ لیا۔ تمہارے ذہن میں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ یہ رقم اڑا لی جائے۔ آخر تم نے ایک منصوبہ بنا کر ایک جرائم پیشہ شخص کی مدد سے اڑا لی۔"

رام پال غصے سے لال ہو کر رشید کو کچھ کہنا چاہتا تھا۔ کہ میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ "تمہیں ثبوت چاہیئے نا......؟ میں ایک ثبوت پیش کر رہا ہوں۔ آج تک کسی نے اس انداز سے ثبوت پیش نہیں کیا ہوگا؟ یہ دیکھو......؟"

"یہ دیکھو......" میں نے میز پر رکھے ہوئے اکیس انچ سائز کے بڑے ٹی وی کی طرف اشارہ کیا۔ سبھی سوائے رشید کے مجھے اس طرح دیکھنے لگے کہ جیسے میں پاگل ہو گیا ہوں۔ ٹی وی آف تھا۔ میری اس حرکت نے انہیں حیرت زدہ کر دیا تھا۔

میں نے فوراً ہی غیر محسوس انداز سے منتر پڑھ کر ٹی وی کے اسکرین پر ایک پھونک ماری۔ دوسرے لمحے اسکرین پر روشنی نمودار ہوئی۔ پھر شونا اور رام پال دکھائی دینے لگے۔ منظر چاندنی رات اور تالاب کے کنارے کا تھا۔ رام پال اور شونا تالاب کے کنارے بیٹھے تھے۔ شونا کہہ رہی تھی تو اس کا لہجہ افسردہ سا تھا۔

"رام پال! رات ماتا جی نے میرے پتا جی سے تمہارے متعلق کہا کہ...... شونا اب شادی کے قابل ہو گئی ہے۔ اس نے گریجویشن بھی کر لیا ہے۔ اب اس کا بیاہ کر دینا چاہیے۔ جوان بیٹی کو کب تک گھر بٹھا کر رکھیں اور پھر ہمارے پاس کس چیز کی کمی ہے۔ میری نظر میں تین لڑکے ہیں تمہ ایک تو دکان کا منیجر رام پال

ہے۔ دوسرا سنتوش ہے جو زمین دار کا بیٹا ہے لندن سے لوٹا ہے۔ تیسرا کرن دیوان مکھیا کا بیٹا ہے...... ان میں سے آپ کو کون سا لڑکا پسند ہے؟

پتا جی کہنے لگے کہ رام پال لڑکا تو اچھا ہے لیکن میرا ملازم اور غریب کا بیٹا ہے۔ اسے داماد بنانا شان کے خلاف ہے۔ اگر وہ دولت مند گھرانے کا ہوتا تو میں اسے اپنا داماد بنا لیتا...... شونا کی ماں دولت کو دیکھنا پڑتا ہے۔ کیوں کہ دولت بہت سارے عیب چھپا لیتی ہے۔ تم اس کے بارے میں بالکل بھی نہ سوچو۔

سنتوش لندن گیا تھا تعلیم حاصل کرنے لیکن وہ وہاں کی تمام برائیاں سیکھ کر آیا ہے۔ اس نے دو تین لڑکیوں کی عزت بھی خراب کر دی ہے...... میں اس بات کو اس لئے بھی برداشت کرنے کو تیار ہوں کہ وہ بڑے باپ کا بیٹا ہے۔ اس کے باپ کے پاس مجھ سے زیادہ دولت اور زمین ہے۔ لیکن سنتوش کی عمر چالیس برس کی ہے اور ہماری شونا بیس برس کی۔ ان کا آپس میں کوئی جوڑ نہیں ہے۔ جب شونا چالیس برس کی ہوگی وہ تب ساٹھ برس کا ہو چکا ہوگا۔

کرن دیوان مجھے بہت پسند تھا۔ تین دن پہلے کی بات ہے سدھیر لالہ کلکتہ سے ہو کر آئے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے کرن دیوان کو ایک بہت خوبصورت اور بلا کی جاذب نظر عورت کے ساتھ دیکھا جس کی عمر چھتیس برس کی ہوگی۔ انہوں نے ان کا پیچھا کیا۔ پتا چلا کہ یہ عورت کلب میں ناچنے والی ہے اور کرن دیوان سے عمر میں دس برس بڑی ہے اور کرن دیوان نے اس سے بیاہ رچا رکھا ہے۔ ان کی دو برس کی بچی بھی ہے۔ اب مجھے کرن دیوان سے نفرت ہو گئی۔

ماتا جی نے پتا جی سے کہا کہ پھر تو ان سے رام پال ہی اچھا ہے۔ اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ پتا جی کو ماتا جی کی بات سن کر غصہ آ گیا۔ وہ بگڑ کر برہمی سے کہنے لگے یہ تم بار بار رام پال کا نام کیوں لے رہی ہو؟ اس کی وکالت کیوں کر رہی ہو...... اری او بے وقوف...... غریب ہونا سب سے بڑی برائی ہے۔ تم شونا کی شادی کی فکر نہ کرو اور نہ ہی ہلکان ہو۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے...... کوئی دولت مند گھرانہ یا لڑکا ملے۔ چاہے اس کے پاس دولت چوری کی ہو۔ منشیات یا اسمگلنگ کی ہو۔ حرام کی ہو...... ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں۔ بس اس کے پاس پانچ لاکھ روپے تو ہوں؟"

رام پال نے یہ ساری باتیں سن کر کہا۔ "میری پیاری شونا! اب تم بتاؤ، ہم کیا کریں؟ ہماری محبت کا کیا ہوگا؟ میں نہ تو تمہارے بغیر رہ سکتا ہوں اور نہ ہی تم میرے بغیر رہ سکتی ہو۔ میں پانچ لاکھ جتنی بڑی رقم کہاں سے لاؤں؟"

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ محبت کی خاطر تم کہیں ڈاکہ مارو...... میرے پتا جی کی دکان پر...... دکان میں روزانہ ہزاروں کا مال فروخت ہوتا ہے۔ تم نے کہا تھا کہ دکان میں لاکھوں کی رقم ہوتی ہے۔ کیا تجوری میں پانچ لاکھ روپے نہیں ہوتے ہیں؟" شونا نے کہا۔ "تم دکان پر نہ سہی بینک پر تو ڈاکہ مار سکتے ہو؟ بینک میں سنا ہے کہ کروڑوں روپیا بھی ہوتا ہے۔"

"تمہارے پتا جی تین چار ماہ پہلے دکان میں پانچ سات لاکھ کی رقم رکھتے تھے۔" رام پال کہنے لگا۔

"جب سے سنار سندر لال کی دکان پر چوری ہوئی اور ڈاکو تجوری ہی اٹھا کر لے گئے تب سے تمہارے پتا جی اپنی رقم بینک میں رکھنے لگے ہیں اور پھر میں دکان میں ڈاکہ ماروں اور انہیں پانچ لاکھ کی رقم دکھاؤں تو شک ہو جائے گا۔ لہٰذا میں دکان پر نہیں بینک میں ڈاکہ مار سکتا ہوں۔ اس کے لئے سوچنا پڑے گا۔ کچھ دن صبر کر لو۔ میں نے سنا ہے کہ سری رام کلکتہ کی جیل سے تین برس کی سزا کاٹ کر رہا ہوا ہے۔ وہ دو ایک دن میں آنے والا ہے۔ میں اس سے مل کر منصوبہ بناتا ہوں۔"

رام پال جیسے ہی شونا کو بازوؤں میں لے کر اس کے چہرے پر جھکا بادل کے ایک بڑے ٹکڑے نے چاند کو اپنی آغوش میں لے لیا اور اندھیرا سا چھا گیا جس سے رام پال نے فائدہ اٹھایا کچھ دیر بعد شونا بال اور لباس درست کرتی گھر جا رہی تھی۔

دوسرے لمحے منظر بدلا۔ رام پال اور شونا ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ رام پال کا گھر تھا۔ اس وقت رام پال کی ماں گھر پر موجود نہ تھی۔ رات کا وقت تھا۔ رام پال شونا کے لانبے سیاہ ریشمی کھلے بالوں کو سہلاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "میری جان، میری پیاری شونا! میں نے تمہیں یہاں بات کرنے اس لئے بلایا ہے کہ تمہیں خوش خبری سناؤں...... میں نے ماتا جی کو ایک بہانے سے بھانجے کے ہاں بھیج دیا ہے۔ اب وہ صبح ہی آئیں گی۔ اب میری بات غور سے سنو...... خوش خبری یہ ہے کہ تمہارے پتا جی آج بینک میں پانچ لاکھ کی رقم جمع کرنے گئے تو وقت ختم ہو چکا تھا اور اسٹرانگ روم بند ہو چکا تھا۔ انہوں نے آفس انچارج رشید سے کہا کہ یہ رقم آپ بینک میں رکھ لیں۔ دکان اور مکان میں رکھنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ صبح آپ میرے اکاؤنٹ میں جمع کرا دیں۔ رشید صاحب نے وہ رقم لے کر اپنی میز کی دراز میں رکھ لی ہے۔ اس رقم کو اڑانے کا میرے ذہن میں ایک زبردست منصوبہ آیا ہے ایسا سنہرا موقع زندگی میں نہیں مل سکتا ہے۔ میں نے سری رام سے بات کر لی ہے۔ وہ ایک لاکھ روپے اس میں سے حصہ مانگ رہا ہے۔"

"لیکن تم بینک میں کیسے چوری کرو گے؟" شونا نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "بینک پر رات کو چوکیدار پہرہ دیتے ہیں۔ تم نے انہیں قابو میں کر لیا تو کل بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ پولیس تمہیں گرفتار کر لے گی۔ وہ مسلح ہوتے ہیں۔ ان کے پاس بندوق ہوتی ہے۔ تم نے یہ بات بھی سوچی ہے؟ اس کا خیال آیا؟"

"میں نے ہر پہلو پر اچھی طرح سوچ لیا ہے۔" رام پال کہنے لگا۔ "چوکیدار بیڑی بہت پیتا ہے۔ رات کو وہاں سے گزرتے ہوئے انہیں ایک بیڑی یہ کہہ کر پیش کروں گا کہ مدراس کی چاند مارکہ بیڑی ہے۔ وہ خوشی خوشی بیڑی لے لے گا۔ کیوں کہ یہ بہت مشہور بیڑی ہے۔ آسام میں نہیں ملتی ہے۔ لوگ اس کے لئے ترستے ہیں۔ سری رام اس کے تمباکو میں کوئی ایسی چیز ملا دے گا جس سے اس پر غنودگی طاری ہو جائے گی اور وہ بے ہوش ہو جائے گا۔ تین گھنٹے بے ہوشی کی حالت میں پڑا رہے گا۔ اس کی بے ہوشی سے ہم فائدہ اٹھائیں گے۔ راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہے گی۔"

"کیا بینک کے گیٹ اور دروازوں کی چابیاں چوکیدار کے پاس ہوتی ہیں؟" شونا نے پوچھا۔

"نہیں...... اس کی چابیاں رشید صاحب کے پاس ہوتی ہیں۔" رام پال نے جواب دیا۔ "وہ بینک کھولتے اور بند کرتے ہیں۔"

"پھر کیا تالا توڑو گے؟" شونا نے چونک کر حیرت سے پوچھا۔ "تالا توڑتے ہوئے تمہیں کوئی دیکھ بھی سکتا ہے؟"

"نہیں...... تالا توڑنے کی نوبت نہیں آئے گی۔" رام پال نے اس کے بالوں کو چومتے ہوئے کہا۔ "اس لئے کہ سری رام کا سات برس پہلے تالا سازی کا کام تھا۔ وہ چابی ساز تھا۔ وہ ہر قسم کا تالا کھولنے میں بڑی مہارت رکھتا ہے۔ اس لئے کوئی مشکل اور دقت پیش نہیں آئے گی۔ صرف دس منٹ میں بینک کے اندر سے ہم رقم نکال لائیں گے۔ پانچ لاکھ روپے میرے ہوں گے۔"

"پانچ لاکھ نہیں چار لاکھ روپے۔" شونا نے تصحیح کی۔ "کیا اس نے ایک لاکھ روپے بہت زیادہ طلب نہیں کئے ہیں؟"

"میں اسے ایک لاکھ کیا ایک روپیہ بھی نہیں دوں گا میری جان!" رام پال نے پیار سے شونا کا گال تھپتھپایا۔

"کیا کہا......؟" شونا کی خوبصورت آنکھیں پھیل گئیں۔ "تم یہ کیوں بھولتے ہو کہ سری رام ایک خطرناک شخص ہے۔ تم اسے اس کا حصہ وعدے کے مطابق نہیں دو گے تو وہ پولیس کو جا کر ساری بات بتا دے گا یا پھر تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا۔"

"اس کی نوبت نہیں آئے گی میری جان...... سیٹھ چمن داس کی بیٹی......" رام پال قہقہہ مار کر بڑے زور سے ہنسا۔ "میں سری رام کا بھی باپ ہوں۔ میں نے ایک ایسی تدبیر سوچی ہے کہ مجھ پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ جب ہم بینک سے رقم لے کر اور مقفل کر کے نکلیں گے تب میں کچھ دور جا کر سری رام کی کھوپڑی پر ایسی جگہ پتھر دے ماروں گا کہ وہ مرے گا تو نہیں لیکن اپنی یادداشت سے ساری زندگی کے لئے محروم ہو جائے گا۔ پھر میں ساری رقم لے کر گھر آ جاؤں گا۔ ٹھیک ہے نا؟"

"واقعی تم نے منصوبہ بڑا لاجواب بنایا ہے۔" شونا خوش ہو کر بولی۔ "جب تم یہ رقم ظاہر کرو گے کیا پتا جی کو شک نہیں ہو گا؟"

"میں کوئی بے وقوف تھوڑی ہوں۔" رام پال کہنے لگا۔ "تمہارے پتا جی سے کہوں گا کہ مجھے ایک دور کے رشتے کے چچا نے جو کلکتہ میں رہتے ہیں۔ وہ دولت مند آدمی ہیں۔ انہوں نے مجھے بلایا ہے۔ میں ایک ماہ بعد تمہارے پتا جی کی دکان کے سامنے والی دکان کرائے پر لے کر کاروبار شروع کر دوں گا۔ میرے کلکتہ کے کاروباری لوگوں سے بڑی دوستی اور تعلقات ہیں اور پھر مجھے کاروبار میں بڑی مہارت حاصل ہے۔ گاہکوں سے بھی میری بڑی دوستی ہے۔ صرف چھ ماہ میں تمہارے مغرور، بددماغ اور گھمنڈ والے پتا جی کا کاروبار ٹھپ ہو جائے گا۔ تب میں دیکھوں گا وہ تمہارا رشتہ کیسے نہیں دیتے ہیں۔" پھر میں نے فوراً ہی اس منظر کو ہٹا دیا۔ کیونکہ رام پال بہکنے لگا تھا اور یہ بات مناسب نہ تھی کہ باپ ایسا منظر دیکھے۔ پھر تیسرا منظر شروع ہوا۔ سری

رام اور رام پال بینک کی طرف جا رہے تھے۔ چوکیدار نے صرف رام پال کو سلام کر کے ہاتھ ملایا۔ رام پال نے اسے بیڑی پیش کی تو اس نے لے لی اور رام پال نے فوراً ہی دیا سلائی دکھائی اور آگے بڑھ گیا۔ پھر وہ دونوں قدرے دور جا کر کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر بعد وہ بینک پر آئے تو چوکیدار چارپائی پر بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ سری رام نے جیب سے تاروں کا گچھا نکال کر عقبی دروازے کا تالا کھولا اور وہ دونوں تیزی سے اندر گھس گئے۔ رام پال نے دروازہ بند کر کے اندر سے چٹخنی لگا دی۔ پھر اس نے جیب سے پنسل ٹارچ نکالی۔ پھر اس کی روشنی کی لکیر میں رشید کے کمرے میں پہنچا۔ اس کے پیچھے پیچھے سری رام تھا۔ سری رام نے جیب سے تاروں کا گچھا نکال کر میز کی دراز کھولی تو رام پال نے اس میں سے چرمی پھولا ہوا تھیلا نکالا اور اسے میز پر رکھا۔ پھر اس کا منہ کھولا۔ تھیلا بڑے بڑے نوٹوں کی گڈیوں سے بھرا ہوا تھا۔ رام پال نے اس کا منہ بند کیا۔ سری رام نے اس میز کی دراز مقفل کر دی اور دونوں باہر نکلے۔ سری رام نے پھر ایک تار کی مدد سے تالا مقفل کر کے جیب سے رومال نکال کر اس پر سے انگلیوں کے نشان مٹا دیئے۔

پھر دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے چلنے لگے۔ تھوڑی دور جا کر ایک ویرانے میں ایک درخت کے نیچے پہنچ کر سری رام نے چشم زدن میں جیب سے چاقو نکال لیا اور رام پال کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

”لاؤ دوست! یہ تھیلا مجھے دے دو۔“

سری رام کے ہاتھ میں چاقو دیکھ کر رام پال خوف زدہ ہو کر ایک قدم پیچھے ہٹا۔ ”یہ کیا حرکت ہے؟ میں تمہیں تمہارا حصہ دے رہا ہوں۔“

”مجھے صرف ایک نہیں بلکہ پوری رقم چاہیے۔“ سری رام نے استہزائی لہجے میں کہا۔ ”کیوں کہ اس میں صرف میری محنت شامل ہے۔“

”نہیں...... نہیں...... میں تمہیں پوری رقم نہیں دوں گا۔“ رام پال نے کہا۔ ”وعدے کے مطابق ایک لاکھ روپے دوں گا۔ کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں؟“

”میں نے کبھی اپنے باپ پر بھروسا نہیں کیا۔“ سری رام مکروہ لہجے میں کہنے لگا۔ ”وہ ہمیشہ یہ کہتا تھا کہ پیسے کے معاملے میں اپنے باپ پر بھی بھروسا نہیں کرنا۔ کیوں کہ پیسہ سانپ ہوتا ہے اور کسی وقت بھی ڈس سکتا ہے۔ مجھے تم پر کوئی بھروسا نہیں ہے۔“

”سنو سری رام......“ رام پال بولا۔ ”میں تمہیں پوری رقم نہیں دوں گا۔ دو لاکھ روپے دوں گا۔ بولو...... منظور ہے؟“

”نامنظور......“ سری رام نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”میں پوری رقم لے جاؤں گا۔ مجھے تم کیا تمہارا باپ بھی نہیں روک سکتا۔“

”تم پوری رقم لے گئے تو پھر میں پولیس کو سب کچھ بتا دوں گا۔“ رام پال نے اسے دھمکی دی۔ ”تم یہ رقم ہضم نہ کر سکو گے۔ پھر جیل چلے جاؤ گے۔“

”پولیس کو بتا دو گے؟“ سری رام ہنسا اور چاقو کو انگلیوں پر نچاتے ہوئے بولا۔ ”میں بتانے کے

لئے تمہیں زندہ کب رہنے دوں گا۔“ سری رام نے اپنا جملہ پورا کیا ہی تھا کہ رام پال نے پوری قوت سے نوٹوں سے بھرا تھیلا اس کے منہ پر دے مارا تو وہ اپنا توازن برقرار رکھ نہ سکا۔ زمین پر گر گیا۔ اس کا چاقو ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا پڑا۔ رام پال نے اسے اٹھنے اور سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ زمین سے ایک اینٹ اٹھا کر اس کی کھوپڑی کے عقبی حصے پر دو تین ضربیں لگائیں تو وہ بے ہوش ہو گیا۔ جب وہ گھر پہنچا تو شونا اس کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ وہ رام پال کے ہاتھ میں نوٹوں سے بھرا تھیلا دیکھ کر خوشی سے دیوانی ہو گئی۔ رام پال نوٹوں کا تھیلا لے کر اس کوٹھری میں گھس گیا جس میں غلہ اور خالی بوریاں پڑی تھیں۔ اس نے وہ تھیلا ایک خالی بوری میں رکھ کر اس کا منہ باندھ کر بند کیا اور اسے ایک بھری بوری کے پیچھے چھپا کر بند کیا۔ پھر وہ اور شونا کمرے میں آ کر جشن منانے لگے تو میں نے اس منظر کا اختتام کر دیا۔

اور پھر شونا غش کھا گئی۔ رام پال کا چہرہ ایک مردے سے بھی بدتر ہو رہا تھا۔ سیٹھ چمن داس تحیر زدہ ہو کر رہ گئے تھے۔ نفرت اور غصے سے برا حال ہو رہا تھا۔ لیکن سب کے سب حیران تھے کہ یہ سب کچھ آف ہوئے ٹی وی پر ایک فلم کی طرح کس طرح دکھائی دے گیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس کہانی کی عکس بندی کی گئی ہے۔ یہ سب کچھ سچ مچ کی فلم لگ رہی تھی۔

”رام پال!“ میں نے کہا۔ ”اب تم کیا کہتے ہو......؟ کیا تمہیں اب بھی انکار ہے؟ کیا میں یہ فلم پولیس کو بھی دکھا دوں؟“

”نہیں...... نہیں......“ وہ ہذیانی لہجے میں بولا۔ ”اس کی کوئی ضرورت نہیں...... میں اپنے جرم کا اقرار کرتا ہوں۔ میں نے یہ جرم اس لئے کیا کہ میں شونا سے محبت کرتا ہوں۔ اس کے پتا جی نے میری شادی اس سے کرنے سے انکار کر دیا۔ اگر وہ شادی کے لئے تیار ہو جاتے تو میں ایسا قدم بھولے سے بھی نہیں اٹھاتا۔ آپ لوگ بیٹھیں میں رقم لا کر دیتا ہوں۔“

”اس کی کوئی ضرورت نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”میں اور رشید صاحب بھی تمہارے ساتھ چل رہے ہیں، چلو۔“

☆......☆......☆

وہ رقم لا کر سیٹھ چمن داس کو دے کر ہم گھر آ گئے۔ رشید خوش تھا۔ کیوں کہ اسے ایک بہت بڑے عذاب سے نجات ملی تھی۔ اس نے میرے کمرے میں بیٹھ کر کہا۔ ”سکندر! تمہارے جادو نے واقعی کمال کر دیا۔ تم بروقت نہ آتے تو میں بری طرح لٹ چکا ہوتا...... تم بہت زبردست جادو سیکھ کر آئے ہو۔ یہ تو بتاؤ کہ تم نے اتنا کچھ کیسے اور کس طرح سے معلوم کر لیا؟ کیا جادو کے زور سے......؟“

”یہ سب کچھ جادو ہی تھا۔“ میں نے کہا۔ ”انسانی آنکھیں ایک وڈیو کیمرے کی طرح ہوتی ہیں۔ وہ جو کچھ دیکھتی ہیں اسے اپنی آنکھوں میں محفوظ کر لیتی ہیں۔ میری آنکھوں نے رام پال اور شونا کی آنکھوں میں محفوظ وڈیو فلم کی کاپی بنالی اور اسے ٹی وی کی اسکرین پر میں نے چلا دیا۔ آڈیو اور وڈیو کے ساتھ...... بعض مناظر جو نامناسب تھے وہ مجھے سنسر کرنا پڑے۔“

"اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟" رشید نے پوچھا۔ "کیا تم دوبارہ بینک میں ملازمت کر کے یہیں مستقل رہ جاؤ گے؟"

"میرا پروگرام کراچی واپس جانے کا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "تم جانتے ہو کہ میں جادو سیکھنے کی غرض سے بنگال اور آسام آیا۔ اب جبکہ میرا خواب پورا ہو چکا ہے اور مجھے اس کی شرمندہ تعبیر مل چکی ہے۔ میں نے اپنی منزل پالی ہے تو میں یہاں اب رہ کر کیا کروں۔ میں اس لئے بھی واپس جانا چاہتا ہوں کہ برائیوں کے خاتمے اور مظلوموں کے کام آؤں...... میں یہاں سے چٹا گانگ جاؤں گا۔ پھر وہاں سے کراچی چلا جاؤں گا۔ تم خوشی سے مجھے جانے کی اجازت دے دو۔"

☆......☆......☆

میں دوسرے دن چٹا گانگ شہر میں تھا۔ تاج الدین مجھ سے دوبارہ مل کر دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ ان کی خواہش تھی کہ میں کچھ دنوں کے لئے رک جاؤں۔ میں خود بھی یہاں کچھ دن رہ کر رنگا ماٹی اور کاکس بازار کی سیر وتفریح کرنا چاہتا تھا۔ کاکس بازار کا ساحل دنیا کا سب سے بڑا ساحل سمندر تھا۔ یوں بھی چٹا گانگ ایک بہت ہی خوبصورت اور سرسبز وشاداب شہر تھا۔ رنگا ماٹی تو پرفضا مقام تھا جو اپنے اندر بڑی انفرادیت، قدرت اور حسن رکھتا تھا۔ یہاں دل فریب قدرتی نظاروں کی بھرمار تھی۔

میرے پاس پس انداز کی ہوئی اتنی رقم تھی کہ دو ایک برس تک میں خوب آرام، سکون اور اطمینان سے اپنی گزر بسر کر سکتا تھا۔ رشید نے میرے منع کرنے کے باوجود مجھے ایک لاکھ روپے امریکی ڈالر کی صورت میں دیئے جو اس نے آسام میں غیر ملکی سیاحوں سے خرید کر رکھے ہوئے تھے۔ رشید مالی طور پر بہت خوش حال اور مستحکم بھی تھا۔ اس نے یہ رقم مجھے اپنی بیوی کی نظروں سے بچا کر دی ہوئی تھی۔ اس رقم سے میری مالی حالت اور بھی مستحکم اور بہت اچھی ہوگئی۔ مجھے اب کسی قسم کی کوئی مالی پریشانی اور کسی قسم کی کوئی فکر نہ رہی تھی۔

میں دوسرے دن شام کے وقت دن ڈوبنے سے پہلے مارکیٹ تاج الدین کی دس برس کی عمر کی بیٹی فیروزہ کے لئے تحفہ خریدنے اکیلا ہی چلا گیا۔ ان کے دونوں بیٹے گھر پر موجود نہیں تھے۔ یہ مارکیٹ اس شہر کی سب سے بڑی، خوبصورت اور کئی منزلہ پرشکوہ عمارت ہے۔ اس مارکیٹ میں ہر قسم کی دکانیں موجود ہیں۔ جب میں اس کی عمارت میں گھسا تو دیکھا کہ بڑی رونق، گہما گہمی ہے۔ خریداری زوروں پر بلکہ اپنے عروج پر تھی جس سے اس ملک کی خوش حالی کا اندازہ ہوتا تھا۔

میں نے تاج الدین کی بیٹی جس کا نام فیروزہ تھا لیکن گھر والے اسے گڑیا کہہ کر پکارتے تھے اور وہ لگتی بھی تھی گڑیا کی طرح...... میں نے اس کے لئے سونے کے ٹاپس خریدے۔ چائے کی طلب ہونے لگی تو میں اس عمارت میں واقع ریسٹورنٹ میں داخل ہو گیا۔ اس وقت تقریباً ساری میزیں بھری ہوئی تھیں۔ معاً میری نگاہ کونے کی ایک میز پر پڑی جس کے گرد دو کرسیاں تھیں۔ ایک کرسی پر جوان لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ میں اس میز کی طرف بڑھا۔ میرے بیٹھتے ہی ویٹر آرڈر لینے آ گیا۔ میں نے اسے چائے اور سموسے کا

آرڈر دے دیا۔

اس ریسٹورنٹ کا ماحول بڑا رنگین اور خواب ناک تھا۔ اس کی فضا لڑکیوں اور عورتوں کی مترنم اور رسیلی ہنسی اور آواز سے گونج رہی تھی۔ جوان جوڑے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ڈوب سے گئے تھے۔ یہ نوجوان لڑکا افسردہ اور دل شکستہ بیٹھا سوچوں میں گم تھا۔ اس کے سامنے چائے رکھے رکھے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ اس نے اس کا گھونٹ بھی نہیں لیا تھا۔

جب ویٹر نے میرے سامنے چائے اور دو سموسے لا کر رکھے تو میں نے اسے ایک چائے اور دو سموسے لانے کے لئے کہا جو وہ فوراً ہی لے آیا۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے اس نوجوان لڑکے کا بازو ہلایا۔

"کیا بات ہے دوست! تم بہت پریشان لگ رہے ہو؟"

لڑکے نے چونک کر اور خیالوں کی دنیا سے نکل کر میری شکل دیکھی۔ "کیا کہا آپ نے......؟ میں نے کچھ سنا نہیں۔" وہ بولا۔

"پہلے یہ سموسے کھا کر چائے پی لو۔ پھر میں تم سے کچھ باتیں کروں گا۔ میں نے تم سے چائے پینے کے لئے کہا تھا۔"

"سموسے اور چائے......؟" اس نے حیرت سے ان دونوں پلیٹوں کی طرف دیکھا۔ "یہ تو میں نے نہیں منگوائے ہیں؟"

"یہ میں نے تمہارے لئے منگوائے ہیں۔" میں نے اپنی پلیٹ سے سموسہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"میرے لئے......؟" اس کے چہرے پر حیرت سی چھا گئی۔ "وہ کس لئے......؟"

"اس لئے کہ تم نہ صرف حد سے زیادہ پریشان ہو بلکہ بھوکے بھی لگ رہے ہو۔" میں نے کہا۔ "تم سموسے کھا کر چائے پی لو۔ پھر تم سے بات ہوگی۔"

اس نے مجھے خالی خالی نظروں سے دیکھا۔ اسے تذبذب سا ہو رہا تھا۔ میں نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "تم مجھے اپنا دوست اور ہمدرد سمجھو...... ایک دوست کے ناتے میں نے تمہارے لئے چائے اور سموسے منگوائے ہیں۔"

پھر اس نے ایک سموسہ اٹھا کر کھانا شروع کیا۔ ہم دونوں نے خاموشی سے سموسے کھائے اور ریسٹورنٹ کی رونق دیکھتے رہے۔ "کیا تم اپنا تعارف کرانا پسند کرو گے؟"

میں نے چائے سپ کرتے ہوئے کہا۔ "میرا نام سکندر ہے، میں پاکستانی ہوں۔ اپنے دوست سے ملنے آسام گیا تھا۔ اب واپس جا رہا ہوں۔ یہاں میں اپنے دوست کے ہاں ٹھہرا ہوا ہوں۔"

"میرا نام شجاع ہے۔" اس نے کہا۔ "میں کامرس کالج میں پڑھتا ہوں۔ میرے والد حیات نہیں ہیں۔ جب میں دس برس کی عمر کا تھا وہ طوفان اور سیلاب کی نذر ہو گئے۔ مجھ سے تین برس چھوٹی ایک بہن ہے۔ میری ماں سلائی کر کے گھر چلا رہی ہے اور میرے تعلیمی اخراجات بھی وہی برداشت کر رہی ہے۔ وہ

چاہتی ہے کہ میں بڑا آدمی بن جاؤں۔ بڑے سے مراد دولت مند نہیں ہے۔ ایک ایسا آدمی جو اس ملک وقوم کا نام اور اپنا نام بھی روشن کرے۔ لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ میں اپنی ماں کی خدمت کروں۔ مجھے اس بات سے بڑا افسوس اور دکھ ہوتا ہے کہ میری ماں میرا بوجھ اٹھا رہی ہے۔ جب کہ اب اس کے آرام کا وقت ہے۔ میری ماں نے بڑی تکلیف اٹھائی ہے۔ بڑی سردیاں اور گرمیاں دیکھی ہیں۔"

"بہت خوب......" میں نے تعریفی لہجے میں اس کی سوچ، خیالات اور جذبے کو سراہا۔ "تم بہت اچھے اور ایک حساس قسم کے نوجوان ہو۔ فکر نہ کرو۔ اللہ پر توکل کرو۔ صبر اور نماز سے کام لو۔ بہت جلد تمہارے دن پھر جائیں گے۔ تمہاری ماں قابل فخر ہے۔ جس نے تم جیسے بیٹے کو جنا ہے...... لیکن یہ بتاؤ کہ تم یہاں کیسے اور کیوں آئے ہو؟"

"آپ کی اس بات کا جواب دینے کے لئے تفصیل میں جانا ہوگا۔" وہ کہنے لگا۔ "شاید آپ کو ناگوار محسوس ہو اور پھر آپ کو بھلا میرے اس مسئلے سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ کیوں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "میں نے تمہیں جب اپنا دوست اور ہم درد سمجھا ہے تو دلچسپی کا ہونا فطری امر ہے۔ ہم دونوں کے درمیان کوئی اور کسی قسم کی اجنبیت نہیں رہی ہے۔ اب ہم خلوص کے رشتے میں بندھ گئے ہیں۔"

"آپ کی اس بات نے میرا دل خوش کر دیا۔" وہ خوش ہو گیا۔ "بات یہ ہے کہ میں نے میٹرک اور انٹر کے امتحان میں ٹاپ کیا۔ اس سال بھی میری خواہش تھی کہ میں فائنل امتحان میں ٹاپ کروں۔ میں جس کالج میں پڑھتا ہوں اس میں اکثریت اعلیٰ گھرانوں کے لڑکوں اور لڑکیوں کی ہے۔ میرے ہم جماعت بھی دولت مند گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ہیں۔ اس لئے کہ میں غریب ہوں۔ وہ میری تعلیمی قابلیت کی برابری نہیں کر سکتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے ہیں کہ میں اس امتحان میں ٹاپ کروں اور گریجویشن کی سند حاصل کرلوں۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ کوئی امیر گھرانے کا لڑکا یا لڑکی ٹاپ کرے۔ ان کے نزدیک ایک غریب کو پڑھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ انہوں نے میرے خلاف سازش کی اور ایک منصوبہ بنایا۔ میری ایک ہم جماعت لڑکی شہناز نے مجھے اپنی سالگرہ میں مدعو کیا۔ ایک منصوبہ کے تحت مجھے مٹھائی میں ملا کر کوئی ایسی چیز کھلا دی گئی کہ رات گھر پہنچا تو اچانک میری طبیعت بگڑ گئی۔ مجھے اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ میں چھ ماہ اسپتال میں زیر علاج رہ کر چھ سات دن پہلے ہی گھر آیا ہوں۔ گو کہ میری ماں نے امتحان کی فیس بھر دی لیکن میں امتحان دینے کے قابل نہیں رہا ہوں۔ میں کسی بھی صورت میں پاس نہیں ہو سکتا۔ یہ میرا پورا سال برباد ہوا۔ میری ماں نے میرے علاج معالجے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ وہ مقروض بھی ہو گئی ہے۔ میری بیماری نے اسے بھی ایک طرح سے بیمار کر دیا ہے۔"

"تمہارا پہلا پرچہ کب ہے؟" میں نے اس سے دریافت کیا۔

"کل......" اس نے جواب دیا۔ "میں امتحان دینا نہیں چاہتا ہوں۔ کیوں کہ پاس ہونے کے ایک فیصد امکانات بھی نہیں ہیں؟"

"لیکن تم یہاں کیوں اور کس لئے آئے ہو؟" میں نے سوال کیا۔ "ایسا لگ رہا ہے کہ یہاں تم کسی کا انتظار کر رہے ہو؟"

"جی ہاں...... میں جانو نامی شخص کا انتظار کر رہا ہوں۔" شجاع نے بتایا۔ "اس نے جو وقت دیا ہے اسے ایک گھنٹہ گزر چکا ہے۔"

"یہ جانو کون ہے......؟" میں نے کہا۔ "کیا تمہارا دوست یا ہم جماعت ہے؟"

"جانو بہت پہنچا ہوا شخص ہے۔" شجاع کہنے لگا۔ "اس کا کام پرچے آؤٹ کرنا ہے۔ وہ کوئی دس برسوں سے یہ کام کرتا چلا آ رہا ہے۔ وہ لڑکے اور لڑکیاں جو پڑھائی میں کمزور اور چور قسم کے ہوتے ہیں وہ اس سے پرچے خریدتے ہیں۔"

"تو تم بھی اس سے پرچے خرید رہے ہو......؟" میں نے پوچھا۔ "کیا اس نے تمام پرچے لاکر دینے کا وعدہ کیا ہے؟"

"جی ہاں۔" شجاع نے اثبات کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں نہیں چاہتا تھا۔ کیوں کہ یہ پیسے بہت مانگ رہا تھا۔ میری ماں نے کہا کہ میں پرچے خرید لوں۔ اس طرح ایک سال بچ جائے گا اور تم نوکری پر بھی لگ جاؤ گے۔"

"وہ تمام پرچوں کی کیا قیمت مانگ رہا ہے؟" میں نے کہا۔ "کوئی حرج نہ ہو تو مجھے بھی بتا دو۔ میں یہاں اجنبی ہوں۔"

"بیس ہزار کا......" اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سرگوشی میں بڑی آہستگی سے کہا۔ "ورنہ وہ پچیس ہزار کا پر بضد تھا۔"

"بیس ہزار کا......؟" میں نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔ "یہ تو تمہاری ماں کے لئے بہت بڑی رقم ہے۔ کیا اتنی رقم موجود ہے؟"

"میری ماں کے پاس شادی کے وقت کے زیورات ہیں جو اس نے بہن کی شادی کے لئے رکھ چھوڑے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "اس میں سے بیس ہزار کی مالیت کے زیورات فروخت کئے جائیں گے۔ میں ان زیورات کو فروخت کرنے لایا ہوں اور میری جیب میں رکھے ہوئے ہیں۔ میں تمام پرچے چیک کرنے کے بعد اس مارکیٹ میں کسی جیولری شاپ پر پہنچ کر ادائیگی کروں گا۔"

"چلو تم نے ایک عقل مندی کی کہ زیورات کو فروخت نہیں کیا۔" میں نے کہا۔ "عموماً دکان دار جب زیورات خریدتے ہیں تو اس کی نصف مالیت بھی نہیں ملتی ہے اور پھر جانو جیسے شخص قابل بھروسا نہیں ہوتے ہیں۔ وہ فراڈ اور جعل ساز ہوتے ہیں۔"

میری اس بات کے جواب میں شجاع کچھ کہنے والا تھا کہ ایک شخص ہماری میز کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی عمر اڑتالیس پچاس برس کی ہوگی۔ وہ ایک صحت مند اور توانا بدن کا شخص تھا۔ وہ اپنے چہرے اور وضع قطع سے ایک اچھا شخص نہیں لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے سے خباثت ٹپک رہی تھی۔ اس کی

آنکھوں سے عیاری اور مکاری جھانک رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں بریف کیس تھا۔ اسے دیکھتے ہی شجاع کا چہرہ دمک اٹھا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے سلام کر کے گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔ "آیئے جانو صاحب! میں کب سے آپ کا انتظار کر رہا تھا۔ آپ کی آمد سے ناامید ہو کر گھر جانے والا تھا......"

قریب کی میز کی ایک کرسی خالی پڑی تھی۔ جانو اسے کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اس نے میری طرف مشکوک نظروں سے دیکھا تو شجاع نے کہا۔

"یہ میرے کزن مسٹر سکندر ہیں...... آپ ان کے سامنے کھل کر بات کر سکتے ہیں۔ میں آپ کے بارے میں انہیں بتا چکا ہوں۔"

"آپ بیس ہزار کی رقم لائے ہیں نا......؟" جانو نے بڑے کاروباری لہجے میں دریافت کیا۔ "سودا نقد ہے...... آپ کو یاد ہے نا؟"

"آپ رقم کی بالکل بھی فکر نہ کریں۔" شجاع نے کہا۔ "میرے اور آپ کے درمیان جو معاملات طے ہوئے ہیں میں ان پر کاربند ہوں۔"

"مجھے دیر اس لئے ہو گئی کہ ان کاغذات کا حصول آسان نہیں ہے۔" اس نے بریف کیس گود میں رکھ کر کھولتے ہوئے کہا۔ "یہ مرغی کے انڈے یا سبزی ترکاری نہیں ہیں اور ان کے حصول کے لئے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے۔"

اس نے اپنی بات ختم کر کے ایک خاکستری رنگ کا لفافہ نکال کر شجاع کی طرف بڑھایا۔ "چیک کر لیں۔" پھر اس نے بریف کیس بند کر کے میز پر رکھ دیا۔ میں نے چائے کے لئے پوچھا تو اس نے کہا۔

"شکریہ! میں بہت جلدی میں ہوں۔ مجھے جلد فارغ کر دیجئے۔"

شجاع نے لفافہ لے کر اسے کھولا۔ اس میں سے کاغذات نکالے...... چھ سات امتحانی پرچے تھے۔ لیکن وہ امتحانی پرچے کہاں تھے۔ بالکل سفید سادے کاغذات تھے۔ ان میں ایک کاغذ بھی چھپا ہوا نہیں تھا۔ شجاع نے ایک ایک کر کے سارے کاغذات دیکھ ڈالے۔

"جانو صاحب! یہ کیا مذاق ہے؟" شجاع نے اس کی طرف کاغذات بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ تو بالکل سادے ورق ہیں؟"

"کیا کہا......؟ سادے ورق ہیں......؟" جانو نے اس کے ہاتھ سے کاغذات لے کر دیکھے تو اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے......؟" پھر اس نے بریف کیس کو میز پر رکھ کر کھولا۔ اس میں اسی طرح پھولے ہوئے تین لفافے رکھے ہوئے تھے اس نے بدحواسی کے عالم میں ایک ایک لفافہ چیک کیا۔ ان سب میں سے ایک جیسے ہی سفید اور سادے کاغذات برآمد ہوئے۔ ایک بھی امتحانی پرچہ موجود نہیں تھا۔ اس ایئر کنڈیشنڈ ہال میں اسے پسینے آ گئے۔

"امتحانی پرچے کہاں گئے......؟" وہ بری طرح بوکھلا گیا۔ اس نے بریف کیس کے تمام کاغذات میز پر نکال کر رکھ دیئے۔ تین لفافوں کے علاوہ کوئی اور لفافہ نہ تھا۔ جو کاغذات تھے وہ کسی کمپنی کے لیٹر پیڈ

وغیرہ تھے۔

"میں...... میں...... میں نے ان تین لفافوں کے تیس ہزار ٹکا دیئے تھے...... کہیں اس ارشد چودھری نے میرے ساتھ فراڈ تو نہیں کیا تھا......؟ اگر اس نے فراڈ کیا ہے تو اس حرام زادے کو جان سے مار دوں گا۔"

پھر اس نے جلدی سے لفافے اور تمام کاغذات سمیٹ کر بریف کیس میں رکھے اور جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا تو میں نے جیسے جلتی پر تیل گرا دیا۔ "جانو صاحب! ایسی بھی کیا جلدی ہے......؟ یہاں کے سموسے تو بہت مشہور ہیں۔ مزے دار اور ذائقہ دار اور چٹ پٹے بھی ہیں...... جسے دیکھئے وہ سموسے کھا رہا ہے۔ آپ دو تین سموسے کھا کر اور چائے پی کر چلے جائیں......"

جانو نے بریف کیس مقفل کرتے ہوئے میری طرف گھور کر دیکھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ بریف کیس میرے سر پر دے مارتا۔ "جانو صاحب!" میں نے جیسے اس کے وجود پر دہکتا انگارہ رکھ دیا۔ "آپ کب تک پرچے لا رہے ہیں؟ کل پہلا پرچہ ہے۔"

"یو شٹ اپ......" وہ دہاڑا اور لال لال آنکھوں سے گھورتا اور ایک جھٹکے سے بریف کیس اٹھا کر نکل گیا۔ میں نے تمام امتحانی پرچے سادے کاغذ میں تبدیل کر دیئے تھے۔ اب کوئی پرچہ آؤٹ نہیں ہو سکتا تھا۔

"اللہ کا شکر ادا کرو کہ تمہاری ماں کی شادی کی نشانی کے زیورات کوڑیوں کے مول بکنے سے رہ گئے۔" میں نے کہا۔

"میری ماں کو سن کر بہت دکھ اور افسوس ہو گا کہ امتحانی پرچے حل نہ سکے۔" شجاع نے کہا۔ "نہ جانے یہ کیسے ہو گیا۔ جانو اس بات کے پیسے تو بہت لیتا ہے لیکن کبھی غلط پرچے لاتا ہے اور نہ ہی بدعہدی کرتا ہے۔"

"خیر...... اب چھوڑو ان باتوں کو......" میں نے کہا۔ "کل تم پورے اعتماد کے ساتھ پرچہ دینے جاؤ۔ کسی بات کی فکر نہ کرو۔ کل تمہیں کوئی مشکل انشاء اللہ پیش نہیں آئے گی۔ تمہارے تمام پرچے نہ صرف اچھے ہوں گے بلکہ تم ٹاپ بھی کرو گے؟"

"ٹاپ کرنا تو دور کی بات ہے میں تو ایک پرچہ میں بھی کامیاب نہیں ہو سکتا سکندر صاحب!" اس نے افسردگی سے کہا۔

"آخر تم اس قدر مایوسی کی باتیں کیوں کر رہے ہو اور کس لئے اتنے دل برداشتہ ہو رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"اس لئے کہ میری ایک دن کی بھی تیاری نہیں ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "میرا دماغ سلیٹ کی طرح صاف ہو چکا ہے۔"

"اچھا...... میری ایک بات غور سے سنو اور اپنی ماں اور بہن کو تمام پرچے حل ہونے تک اعتماد میں

نہیں لینا۔" میں نے کہا۔ "جب تم پرچہ حل کرنے بیٹھو گے تب تمہارے میز پر وہ تمام نوٹس اور جوابات ایک کاغذ پر لکھے سامنے آ جائیں گے۔ تم نہایت سکون اور اطمینان سے اپنا پرچہ حل کرنا۔ کسی خوف وڈر اور گھبراہٹ کی ضرورت نہیں۔"

"کیا......؟" شجاع نے اچھل کر حیرت سے میری شکل اس طرح سے دیکھی جیسے میں اور میری عقل ٹھکانے نہیں رہی۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں آپ کو کچھ خبر بھی ہے۔ مجھے نقل کرنے کے الزام میں نہ صرف کلاس سے نکالا جا سکتا ہے بلکہ گرفتار بھی......"

"تمہیں نقل کرتے ہوئے کون دیکھے گا اور کون پکڑے گا میرے دوست!" میں مسکرا دیا۔ "تم میری بات کا یقین کرو۔ یہ نہ سمجھو کہ میں غلط کہہ رہا ہوں اور میری عقل ٹھکانے نہیں رہی۔ میں بالکل صحیح الدماغ ہوں۔"

"نہ صرف ممتحن صاحب بلکہ کمرے میں موجود تمام امتحان دینے والے لڑکیاں اور لڑکے......" اس نے کہا۔

"ان میں سے کسی کی کیا مجال کہ تمہیں پکڑیں اور نقل کرتے ہوئے دیکھیں؟" میں ہنس دیا۔

"یہ آپ کیسی بات کر رہے ہیں......؟" وہ ششدر ہو کر بولا۔ "وہ لوگ اندھے نہیں ہیں؟ تین تین آدمی نگرانی کرتے ہیں۔"

"وہ تو تمہیں اس وقت پکڑیں گے نا جب انہیں نوٹس اور وہ کاغذات نظر آئیں گے جن پر جوابات لکھے ہوئے ہوں گے۔"

"کیا انہیں وہ نوٹس اور جوابات کے کاغذات نظر نہیں آئیں گے۔" اس نے شدید حیرانی سے پوچھا۔

"بالکل بھی نظر نہیں آئیں گے۔" میں نے کہا۔ "انہیں صرف تم دیکھ اور پڑھ سکتے ہو۔ تمہارے سوا کوئی اور نہیں......"

"کیا آپ یہ بات نہیں جانتے ہیں کہ امتحانی کمرے میں داخل ہونے سے پہلے جامہ تلاشی لی جاتی ہے۔" شجاع نے کہا۔ "کیوں کہ امتحانات میں نقل کا رجحان بہت بڑھ گیا ہے۔ اس لئے تلاشی لینے پر وہ لوگ مجبور ہیں۔"

"تمہیں وہ چیز اپنے ساتھ چھپا کر لے جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی؟" میں نے کہا۔

"تو کیا پھر آپ اسے کسی نہ کسی طرح پہنچائیں گے؟" وہ تحیرزدہ لہجے میں بولا۔ "کیا آپ کی پہنچ ہے؟"

"نہیں......" میں نے کہا۔ "جب تم پرچہ حل کرنے بیٹھو گے تب وہ آپ ہی تمہاری میز پر آ جائیں گے۔"

"وہ کس طرح......؟" اس کا دماغ بری طرح چکرا سا گیا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"آپ مجھے پاگل کر دیں گے۔"

"تمہیں آم کھانے سے مطلب ہے یا پیڑ گننے سے......؟" میں نے قدرے تیز لہجے میں پوچھا۔ "تم میری بات کا یقین کیوں نہیں کر رہے ہو...... بس میں جو کہہ رہا ہوں تم اسے مانو گے یا نہیں......؟"

"اچھا سکندر صاحب!" وہ قدرے سہم کر بولا۔ "میں آپ کی ہر بات پر یقین کئے لیتا ہوں۔"

"یہ ہوئی نا بات دوست!" میں نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔ "تم صبح امتحان دینے جاؤ اور تماشا دیکھو......"

☆......☆......☆

میں دوسرے دن صبح اس امتحانی سینٹر میں تھا جہاں شجاع کو پرچہ دینا تھا۔ میں کسی کو دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شجاع جب امتحانی کمرے میں تلاشی دینے کے بعد داخل ہوا تو اس کے چہرے پر دل شکستگی تھی۔ وہ بڑا مایوس سا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے امتحانی سینٹر کی عمارت میں داخل ہو کر مجھے تلاش بھی کیا تھا۔ میں اس سے صرف چند قدم کے فاصلے پر تھا۔

جب وہ اپنی میز پر بیٹھا تو ابھی امتحان شروع ہونے میں دس منٹ باقی تھے۔ کمرے میں ممتحن صاحب موجود نہ تھے وہ پرچہ لانے گئے ہوئے تھے۔ اس کمرے میں شجاع کے ہم جماعت لڑکے لڑکیاں موجود تھیں۔ وہ سب شجاع کا تمسخر اڑا رہے تھے۔ معنی خیز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ دو ایک نے اس سے کہا بھی کہ کیوں امتحان دے کر اپنی عزت اور وقت برباد کر رہے ہو۔ اس سے تو بہتر تھا کہ رنگا ماٹی جا کر تبدیلی آب وہوا ہی کر آتے۔ شجاع ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح خاموشی سے سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ان کی طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ اس کے ہم جماعتوں نے اس کی دلی کیفیت چوں کہ بھانپ لی تھی اس لئے وہ اور خوش ہو رہے تھے اور اس کا کھلم کھلا مذاق اڑا رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ممتحن صاحب پہلا پرچہ لیے کمرے میں داخل ہوئے تو ایک دم سے سناٹا چھا گیا۔ انہوں نے کمرے میں موجود تمام طلباء وطالبات میں بڑی تیزی سے پرچہ تقسیم کیا۔ وہ پرچہ لے کر پڑھنے لگے۔ پھر انہوں نے لکھنا شروع کیا۔ شجاع نے تمام سوالات پڑھنے کے بعد لکھنے کے لئے قلم نکالا تو یہ دیکھ کر وہ بھونچکا سا ہو گیا کہ اس کی میز پر نوٹس کی کاپی اور جواب کے کاغذات رکھے ہوئے ہیں۔ اس نے گھبرا کے ممتحن، لڑکوں اور لڑکیوں کی طرف دیکھا۔ کوئی اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔ جب ممتحن اس کے پاس سے گزرے تو اس کا دل اچھل کر حلق میں دھڑکنے لگا۔ جب اس نے دیکھا کہ ممتحن صاحب خاموشی سے گزر گئے ہیں تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ اس کی پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی۔ وہ ایک عجیب سی ذہنی کش مکش میں مبتلا ہو گیا تھا۔

"شجاع!" میں نے اس کی میز کے پاس جا کر سرگوشی کی۔ "تم بے فکر ہو کر پرچہ حل کرنے کی کوشش کرو۔ ڈرو نہیں...... نوٹس کی کاپی اور جوابات شدہ کاغذات کسی کو تمہارے سوا نظر نہیں آ رہے ہیں۔ اطمینان سے نقل کرو۔"

اس نے ادھر ادھر گردن گھما کر دیکھا۔ میں نظر نہ آیا تو وہ اور حیران ہوا۔ پھر اس نے پرچہ حل کرنا

شروع کردیا۔ پرچہ دو گھنٹے کا تھا۔ لیکن اس نے ڈیڑھ گھنٹے میں حل کرلیا۔ وہ بہت خوش تھا۔ کیوں کہ پرچہ بہت ہی اچھا ہوا تھا۔ میں نے اس کے ان ساتھیوں کا پرچہ خراب کردیا اور ان کے لئے مشکل بنادیا...... کیوں کہ انہوں نے شجاع کو سازش کا نشانہ بنایا تھا اور اس کی تضحیک بھی کی تھی۔ مذاق اڑایا تھا۔ وہ سات سوالوں میں تین سوال بھی حل نہ کرپائے تھے کہ وقت ختم ہوگیا۔ شجاع جب امتحانی سینٹر کی عمارت سے نکلا تو اس کا چہرہ ایک طرح سے دمک رہا تھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور اس کا خوشی سے برا حال تھا اور دوسری طرف وہ دل میں بڑا حیران تھا کہ آخر اس کے ساتھ یہ کیسا واقعہ پیش آیا ہے۔ کہیں اس نے کوئی سپنا تو نہیں دیکھا......؟ ہاں...... یہ سپنا ہی تھا۔ اس وقت بھی وہ سپنے کی سی حالت میں ہے......اس کے دشمنوں کے چہرے اترے ہوئے تھے اور ان کی حالت بڑی غیر ہورہی تھی۔ وہ ہنسنا، بولنا اور مسکرانا بھول گئے تھے۔ وہ سخت حیران اور پریشان بھی تھے۔

میں اس کا باہر منتظر تھا مجھے دیکھتے ہی لپک کر وہ میرے پاس آیا اور مجھے سلام کرکے گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے مسرت بھرے لہجے میں بولا۔ ”سکندر صاحب! کمال ہوگیا۔ آپ نے جیسا کہا تھا بالکل ویسا ہی ہوا...... پرچہ اس قدر شاندار ہوا کہ میں بتا نہیں سکتا۔ میں نہ صرف ٹاپ کروں گا بلکہ وہ نمبر لوں گا جو آج تک کسی نے بی کام میں نہیں لیے ہوں گے۔ لیکن سکندر صاحب......!“

ایک دم سے اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اس کا چہرہ بجھ گیا اور اس کے چہرے پر ندامت کی سرخی پھیل گئی۔ ”لیکن کیا......؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”کیا تمہارے خیال میں ایسا ہونا مشکل ہے جو تم سوچ رہے ہو؟“

”جی نہیں...... یہ بات نہیں۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”میں اس طرح سے ٹاپ کروں گا تو مجھے روحانی خوشی نہ ہوگی۔“

”وہ کس لئے......؟“ میں اس کی بات کی تہہ میں تو پہنچ گیا تھا لیکن پھر بھی انجان بنا رہا۔

”اس لئے کہ بغیر نقل کرکے پاس ہونے اور ٹاپ کرنے میں جو بات اور خوشی ہے وہ نقل کرنے میں کہاں؟“ اس نے جواب دیا۔ ”سکندر صاحب ساری زندگی میرے سینے میں خلش کا خنجر پیوست رہے گا اور میں اسے نکال نہ سکوں گا اور پھر میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہے گا۔ طعنہ دیتا رہے گا کہ میں نقل کرکے پاس ہوا ہوں۔ اپنی ہی نظروں میں ذلیل و رسوا ہوتا رہوں گا۔“

”میرے دوست شجاع!“ میں نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔ ”مجھے اندازہ نہ تھا کہ تم اس قدر بلند نوجوان ہو۔ ایک عظیم قوم کے نوجوان ایسے ہی ہوتے ہیں۔ میں بتا نہیں سکتا کہ مجھے تمہارے خیالات جان کر کتنی خوشی ہوئی۔ تم ایک قابل فخر نوجوان ہو...... اللہ تمہارا یہ جذبہ سدا سلامت رکھے...... لیکن میرے دوست! اس کے سوا کوئی چارہ کار بھی تو نہیں...... تم ایک غریب بیوہ ماں کے بیٹے ہو۔ آخر وہ غریب کب تک تمہاری تعلیم کے اخراجات کا بوجھ اٹھاتی رہے گی اور پھر تمہاری ایک جوان بہن ہے جس کے گھر بسانے اور اس کا مستقبل بنانے کی ذمے داری تمہاری اپنی ہے ایک بھائی ہونے کے ناتے، ایک فرض جو

صرف تمہیں ادا کرنا ہے۔

میں بھی اس بات کو سخت ناپسند کرتا ہوں اور میرے نزدیک ایسے لڑکوں اور لڑکیوں کی کوئی عزت نہیں ہے جو امتحان میں نقل کرکے پاس ہوتے ہیں۔ وہ نہ صرف اپنی ذات، اپنے گھر والوں بلکہ ملک و قوم کے لئے بدنما داغ ہوتے ہیں۔ میں نے تمہاری مدد اس لئے ہی نہیں کی کہ تم ایک بیوہ ماں پر بوجھ ہو بلکہ اس لئے کی کہ تم بہت ذہین، محنتی اور قابل ترین طالب علم ہو۔ تم ابتدائی جماعتوں سے لے کر میٹرک اور انٹر کے امتحان میں بھی ٹاپ کرتے رہے ہو۔ تمہارے ہم جماعت دوستوں نے تمہارے خلاف گھناؤنی سازش نہ کی ہوتی اور تم ان کی وجہ سے بیمار نہ ہوگئے ہوتے تو یقین کرو میں تمہاری بالکل بھی مدد نہ کرتا۔ لہٰذا تمہیں نادم ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے تمام پرچے اسی طرح حل ہوں گے۔ تم ملازمت میں بھی ایک کامیاب شخص ثابت ہوگے۔“

”آپ نے میری مدد کی......؟“ اس نے حیرت سے دیکھا۔ ”آپ نے مجھ سے امتحان کے کمرے میں آکر بات بھی کی...... لیکن آپ مجھے دکھائی نہیں دیئے...... آخر یہ کیا اسرار تھا؟ کیا آپ مجھے بتانا پسند فرمائیں گے؟“

”اصل بات یہ ہے کہ میں معمولی سا جادو جانتا ہوں اور میں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے خوشی ہے کہ میرا یہ جادو ایک باصلاحیت اور قابل ترین نوجوان کے کام آیا۔ چلو...... چل کر چائے پیتے ہیں۔“

قریب میں ایک ایئرکنڈیشنڈ کیفے تھا۔ ہم دونوں اس میں گھس گئے۔ اس میں دو ایک میزیں خالی پڑی تھیں۔ ہم ایک میز پر جا بیٹھے۔ ہمارے قریب والی میز پر شجاع کے ہم جماعت لڑکے اور لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے ان کی نظر بندی کردی کہ وہ شجاع کو اور مجھے نہ دیکھ سکیں۔ میں نے چائے اور آلو چانپ (کٹلس) کا آرڈر دیا اور ان کی باتیں سننے لگے۔

ایک لڑکی جو بڑی طرح دار تھی وہ کہہ رہی تھی۔ ”او مائی گاڈ...... کتنا مشکل پرچہ تھا۔ مجھ سے کسی طرح حل ہوا نہیں جارہا تھا...... جانے کیوں...... میں نے کسی نہ کسی طرح تین سوال حل کرڈالے۔ چوتھا سوال حل کرنے والی تھی کہ وقت ختم ہوگیا۔“

”میں تو تین سوال بھی حل نہیں کرپایا۔“ اس کے برابر بیٹھے ہوئے لڑکے نے کہا۔ ”مجھے ان سوالوں کے نوٹس نیلم نے دیئے تھے۔ جب میں لکھ رہا تھا تو مجھ سے لکھا ہی نہیں جارہا تھا۔ نہ قلم ساتھ دے رہا تھا اور نہ دماغ کام کررہا تھا۔“

”میرا تو پورا سال اور سال بھر کی محنت ہی ضائع ہوگئی۔“ دوسری لڑکی روہانسی ہوگئی۔ ”اب میں کیا کروں؟“

”پرچہ میں نے آؤٹ کیا اور تم لوگوں کو ایک ایک نقل فوٹو اسٹیٹ بنا کردی۔“ دوسرے لڑکے نے کہا ”تم لوگوں نے دیکھا نا کہ آؤٹ پرچہ تھا...... ہمارے کالج کی پوری کلاس ہی فیل ہوگئی۔ میری ابھی

ہمارے ہم جماعتوں کے موبائل پر جو بات ہوئی وہ بھی یہی کہہ رہے تھے۔ ان سب کے پرچے خراب ہو گئے...... یار! کیا یہ حیرت کی بات نہیں؟ یہ کیسے ہو گیا؟"

"تم لوگوں نے اس شجاع کے بچے کو دیکھا......؟" تیسری لڑکی دانت پیس کر بولی۔ "اس نے کتنے مزے سے تمام سوالات حل کر ڈالے تھے میں نے اس کی میز کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ ایک نہیں، دو دفعہ نہیں اس کے پرچے ختم ہونے تک اس کی کاپی دیکھتی رہی تھی۔"

"ہاں...... میں نے بھی اس بات کو نوٹ کیا تھا۔" پہلی لڑکی بولی۔ "حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اس نے چھ ماہ تک کالج کی شکل نہیں دیکھی اور اسپتال میں زیرِ علاج رہا۔ اس نے امتحان کی کوئی تیاری نہیں کی تھی اور کہا تھا کہ اس سال امتحان نہیں دے گا۔ یہ سن کر کتنی خوشی ہوئی تھی...... اب ایسا لگ رہا ہے کہ اس نے اسپتال میں علاج کے دوران تیاری کر لی چوری چوری تیاری کر لی...... بڑی کمینی چیز ہے۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ وہ ٹاپ کر کے رہے گا...... ہم نے جو منصوبہ بنایا وہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔"

"اگر اس نے ٹاپ کر لیا تو جانتی ہو کیا ہو گا؟" پہلے لڑکے نے کہا۔ "سب سے پہلے اسے ایسٹرن بنگال ریور یا منیجر کی ملازمت اور چالیس ہزار ٹاکا تن خواہ، بنگلہ اور گاڑی بھی ملے گی۔ اس بات کا اعلان بیس دن پہلے اسی کمپنی سے ہو چکا ہے۔"

"ہم لوگوں نے اس کا برا چاہا مگر ہمارا برا ہو گیا۔" ایک لڑکی بولی۔ "میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ وہ غریب کا بیٹا ہے۔ اس کی زندگی خراب کرنے کی کوشش نہ کرو۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو اس کی بہن اور ماں پر قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ ہمیں ہمارے برے کیے کی سزا مل رہی ہے۔"

"یہ سب کچھ تیری وجہ سے ہوا ہے۔" پہلی والی لڑکی نے کہا۔ "تو نے ہی تو کہا تھا نا......؟ یہ ہم نے اس لئے کیا تھا کہ اتنے بڑے خاندانوں میں سے کوئی ایک خاندان کا فرد ٹاپ کرے۔ کیا یہ شرم کی بات نہیں ہے کہ ہم لوگ ٹیوشن پڑھتے ہیں۔ کوچنگ سینٹر جاتے ہیں۔ پھر بھی ٹاپ نہیں کر سکتے۔ جبکہ وہ ٹیوشن پڑھتا ہے اور نہ ہی کوچنگ سینٹر جاتا ہے۔ پھر بھی کلاس میں سب سے اچھا طالب علم ہے۔"

"چلو...... چلو......" ایک لڑکی کھڑی ہو گئی۔ "گھر چلتے ہیں۔ میں گھر جا کر پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتی ہوں۔"

☆......☆......☆

میں نے تاج الدین سے یہ بہانہ کر کے ہوٹل میں رہائش اختیار کر لی کہ میرے دو دوست کراچی سے سیر و تفریح کی غرض سے آ رہے ہیں۔ میں نے اس لئے یہ کمرا لیا تھا کہ میں یہاں کچھ عرصہ اور قیام کرنا چاہتا تھا۔ تاکہ شجاع کے امتحان ختم ہونے کے بعد اس کے ساتھ سیر و تفریح کرتا پھروں۔ میں تاج الدین کے ہاں اس لئے بھی رہنا نہیں چاہتا تھا کہ وہ میری بہت ہی زیادہ خاطر مدارات کر رہے تھے۔ ذرا ذرا سی بات کا خیال رکھ رہے تھے۔ میں ان پر مزید بوجھ بننا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بڑے بااخلاق اور مخلص شخص تھے۔ دس دن کے بعد شجاع اپنے فائنل امتحان سے فارغ ہو گیا۔ جس روز وہ آخری پرچہ دے کر نکلا اس

نے مجھ سے ساتھ گھر چلنے کے لئے کہا۔ وہ اپنی ماں اور بہن سے مجھے ایک دوست اور استاد کی حیثیت سے ملانا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی ماں سے کہا ہوا تھا کہ میں اسے روزانہ شام کے وقت رضا پارک میں لے جا کر تیاری کروا رہا ہوں جس سے اسے بڑی مدد مل رہی ہے۔ میری وجہ سے پرچے بہت ہی اچھے ہوئے ہیں۔ اس بات کا سو فیصد امکان ہے کہ وہ ٹاپ کر جائے گا۔ شجاع کی ماں میرے متعلق سن کر بہت خوش ہوئی تھی۔ اس نے مجھ سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا تھا۔ میں نے شجاع سے وعدہ کیا ہوا تھا کہ میں امتحان ختم ہونے کے بعد چلوں گا۔

امتحانی سینٹر سے نکل کر میں شجاع کو ساتھ لے کر مکہ ریسٹورنٹ آیا۔ میں نے اس ہوٹل سے کھانا پارسل کروانا چاہا تو شجاع نے یہ کہہ کر روک دیا کہ ماں نے کچھ پکا کر رکھا ہو گا۔ آپ نے وہ کھانا نہیں کھایا اور ہوٹل سے کھانا لے گئے تو میری ماں کے دل کو ٹھیس پہنچے گی کیوں کہ وہ ایک جذباتی اور حساس قسم کی عورت ہے۔ اس کے جذبات و احساسات کا خیال کریں۔ شجاع نے اپنی ماں کے متعلق جو کچھ کہا تھا وہ بالکل درست تھا۔ میں نے ایک غریب بیوہ ماں کے جذبات کا خیال کرتے ہوئے کھانے پارسل نہیں کروائے۔ البتہ پھل اور مٹھائی خرید لی اور اس کے ساتھ سائیکل رکشا میں اس کے گھر پہنچا۔

شجاع کا مکان لال ڈگی میں تھا۔ مکان کیا تھا ایک طرح سے کوارٹر نما تھا اور ناریل اور سپاری کے درختوں سے گھرا ہوا تھا۔ شجاع نے اپنے گھر کے دروازے پر دستک دی تو چند لمحوں کے بعد دروازہ کھلا۔ ایک نوجوان لڑکی کا سراپا ابھرا۔ اس کا نام آمنہ تھا۔ وہ سولہ برس کی ایک بہت ہی حسین و جمیل لڑکی تھی۔ اس کی صاف و شفاف زیتونی رنگت تھی۔ چہرے کے نقش و نگار میں بڑا تیکھا پن اور جاذبیت تھی جس نے اس میں ایک عجیب سانکھار اور دلکشی پیدا کر دی تھی۔ اس کے ریشمی، گھرے، سیاہ، لانبے اور چمکدار بال چوٹی میں بڑی نفاست سے گندھے ہوئے تھے۔ اس کی بڑی مدھ بھری سیاہ آنکھیں بھی بہت خوبصورت تھیں۔ اس کا قد عام بنگالی لڑکیوں کے مقابلے میں نکلتا ہوا تھا۔ وہ زلفِ بنگال کا ایک نادر نمونہ تھی۔

اس نے شجاع کے ساتھ مجھے دیکھ کر پہچان لیا اور بڑے تپاک سے سلام کیا اور دروازے سے ہٹ کر اندر چلی گئی۔ شاید وہ اپنی ماں کو میری آمد کی اطلاع دینے گئی تھی۔ میں شجاع کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ گو کہ یہ کوارٹر تھا لیکن بہت بڑا تھا۔ اس میں تین مگر بہت بڑے بڑے کمرے تھے۔ ایک کشادہ صحن میں کٹھل، ناریل اور آم کے پیڑ بھی تھے۔

اس کمرے میں ایک بہت بڑی چوکی تھی۔ اتنی بڑی چوکی تھی کہ چار پانچ آدمی نہ صرف بیٹھ سکتے تھے بلکہ لیٹ بھی سکتے تھے۔ اس پر چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں لکھنے کی بڑی سی میز تھی۔ جس پر نصابی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ دو کرسیاں بھی تھیں۔ بھائی بہن اس میز پر لکھنے پڑھنے کا کام کرتے تھے۔ آمنہ فرسٹ ائیر میں تھی۔

گھر سے اور آمنہ اور شجاع کے لباس سے زبوں حالی ظاہر ہوتی تھی۔ چند لمحوں کے بعد شجاع کی ماں آئی تو زبوں حالی کا احساس اور شدید ہو گیا۔ دوسرے کمرے میں سلائی کی مشین اور سلائی کے کپڑے

رکھے ہوئے تھے جو اس کمرے سے دکھائی دے رہے تھے۔

شجاع کی ماں بھی ساری اور بلاؤز میں تھی جو نہایت معمولی قسم کی تھی۔ شجاع کی ماں سکینہ کو دیکھ کر مجھے اپنی مرحومہ ماں یاد آ گئی۔ کیوں کہ ان آنکھوں میں مجھے اپنی ماں کی سی ممتا محسوس ہوئی۔ چہرے پر وہی محبت اور شفقت تھی جو میری ماں کے چہرے پر ہوتی تھی۔ جب میں نے انہیں سلام کیا تو انہوں نے آگے بڑھ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور میرا ماتھا چوم لیا۔ تب میں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ میری آنکھیں چھلک پڑیں۔ انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے چوکی پر بٹھا دیا اور خود فرش پر بچھی چٹائی پر بیٹھ گئیں۔ میں کیسے بے ادبی کر سکتا تھا۔ یہ میری ماں کی جگہ تھیں۔ جب میں چوکی سے اتر کر فرش کی چٹائی پر بیٹھا تو وہ بولیں۔

"نہ بیٹا! نہ...... تم اوپر ہی بیٹھو...... اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم میرے بیٹے کی جگہ ہو۔"

"آپ میری ماں کی جگہ ہیں۔" میں نے کہا۔ "کبھی میری ماں کی زندگی میں ایسا نہیں ہوا کہ وہ نیچے بیٹھی ہوں اور میں اوپر...... اور پھر میں کبھی بھی ماں کے سامنے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر نہیں بیٹھا ہوں۔ میں نے ہمیشہ اپنی ماں کی بڑی عزت کی آپ کی کیسے نہ کروں۔"

"اللہ تمہیں سدا خوش رکھے بیٹا!" وہ بولیں۔ "تم نے میرے بیٹے کی امتحان کی تیاری کروا کے جو احسان کیا ہے وہ میں اور آمنہ کبھی نہیں بھول سکتیں...... اس کا سال برباد ہو جاتا اگر تم اس پر محنت نہ کرتے...... میں ایک غریب اور بیوہ ماں ہوں بیٹا...... میرے پاس تمہیں دینے کے لئے دعاؤں کے سوا اور کچھ نہیں ہے...... کاش! میں اس قابل ہوتی کہ تمہیں کچھ دے سکتی؟"

"ایک بھائی کو پڑھانا کیا احسان ہوتا ہے؟ میں نے کچھ نہیں کیا۔ ایک بھائی ہونے کے ناتے اپنا فرض پورا کیا...... دنیا میں دعاؤں سے زیادہ انمول اور قیمتی کوئی چیز نہیں ہے۔ دنیا میں ہر چیز خریدی جا سکتی لیکن دعائیں نہیں...... میرے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ آپ نے مجھے بیٹا کہا اور بیٹا بنا لیا اور پھر آمنہ جیسی پیاری بہن مل گئی۔ میری کوئی بہن نہیں ہے لیکن اب میری ایک بہت ہی سندر سی بہن ہے۔" کچھ دیر تک بڑی محبت بھری باتیں ہوتی رہیں۔ پھر آمنہ نے دسترخوان بچھا کر کھانا چن دیا۔ کھانا کیا تھا۔ مونگ کی دال...... چاول جو سیلا اور بہت موٹے موٹے تھے۔ میں نے ایسے چاول دو تین مرتبہ آسام میں کھائے تھے۔ بہت ہی غریب لوگ یہ چاول کھاتے تھے اور چھوٹی چھوٹی تلی ہوئی (پلا) مچھلی...... پاپڑ اور اچار بھی تھا۔ سلاد بھی تھی۔

کھانا اتنا ہی سادہ تھا جتنا ایک غریب کے ہاں ہوتا ہے۔ بڑی سادگی سے کھانا رکھ دیا گیا تھا۔ یعنی جو تھا پکایا گیا تھا۔ کوئی تکلف نہیں برتا گیا تھا۔ نہ ہی وہ برتا جا سکتا تھا۔ اس لئے کہ ان کی مالی حیثیت اور آمدنی اتنی اور ایسی نہیں تھی کہ کچھ اہتمام کیا جا سکے۔

کھانا اس قدر عمدہ، لذیذ اور مزے دار تھا کہ میں نے شاید کسی گھر میں انواع واقسام کے کھانوں میں ایسی لذت محسوس کی ہو۔ میں نے اپنی انگلیاں چاٹ لیں۔ اس کھانے میں ایک خوشبو تھی۔ وہ خوشبو تھی خلوص ومحبت کی...... گہرے رشتوں کے جذبوں کی۔ وہ مجھے میرے پاس بیٹھ کر اس طرح کھلا رہی تھیں

جیسے میری ماں کھلاتی تھی۔ اس گھر میں میری ماں کی محبت کی خوشبو اور عکس نظر آتا تھا۔

شوتم نے رخصت ہونے سے ایک دن قبل مجھ سے کہا تھا۔ "سکندر بیٹے! دنیا میں اب شاید ہی میرے پائے کے جادوگر ہوں گے...... لیکن تمہیں مجھ سے بھی بڑے جادوگر کہیں کہیں اور کبھی ملیں گے جن کے آگے میرا جادو بھی ہیچ اور کچھ نہیں ہے...... جس کا توڑ نہ میرے پاس ہے...... نہ کسی دیوتا...... بھگوان...... یا ایشور کے پاس...... اس کا توڑ کسی نے جنم ہی نہیں دیا......"

"وہ کون سے جادوگر ہیں......؟" مجھے شوتم کی بات ناگوار لگی تھی۔ کیوں کہ اس نے بہت بڑی بات کی تھی۔ "وہ کون سا جادو ہے؟"

"محبت کا......" شوتم نے جواب دیا۔ "ازل سے ابد تک محبت کا جادو رہے گا۔ اس محبت کے جادوگر ہیں۔ ان کی محبت کا جادو سب سے بڑا ہے۔ اس کا کوئی توڑ نہیں ہے۔ جو یہ جادو سیکھ لے وہ دنیا کا سب سے بڑا جادوگر ہے...... لیکن لوگ محبت کا جادو سیکھنے کی کوشش نہیں کرتے ہیں...... تمہارے پاس یہ جادو ہے۔ تم اس جادو کی ہر وقت رکھشا کرنا......"

اس گھر کے ماحول میں، فضا میں، محبت کا جادو تھا جس نے مجھے اپنا اسیر بنا لیا۔

☆......☆......☆

میں دوسرے دن سہ پہر کے وقت شجاع کو لینے ہوٹل سے نکلا۔ اس کے محلے کے بازار میں رکشا سے اتر گیا تا کہ کچھ سودا سلف، گوشت، انڈے یا مرغی لے کر جا کر رات کے پکانے کے لئے دے دوں۔ میں نے ایک بہت ہی بڑی دکان کے آگے بھیڑ دیکھی۔ اس بھیڑ سے ہٹ کر ایک بوڑھا باریش شخص کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اس کے پاس جا کر اسے سلام کیا اور پوچھا۔ "بابا! کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے؟"

اس بوڑھے شخص نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ میرے سلام کا جواب دے کر کہا۔ "لگتا ہے کہ اس محلے میں پہلی بار آئے ہو؟"

"جی ہاں...... یہی سمجھ لیں۔" میں نے کہا۔ "میں پہلی بار یہ دکان دیکھ رہا ہوں۔ لیکن آپ اسے گالیاں کیوں دے رہے ہیں؟"

"اس لئے کہ یہ یہودی فطرت کا ہے۔ ایسے یہودی قسم کے لوگ ایک ہزار ذلیل لوگ مرنے کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔" وہ شاید لال میاں کے ہاتھوں چوٹ کھایا ہوا تھا دل کی بھڑاس نکال رہا تھا۔ "اس علاقے میں اس کی سب سے بڑی دکان ہے۔ اس محلے میں غریب اور محنت کش لوگ بھی رہتے ہیں۔ رکشا چلانے والے، خوانچہ فروش، مزدوری اور ملازمت پیشہ...... یہ محلے کے ہر کسی کو ادھار پر سودا سلف دیتا ہے جب کہ دوسرے دکاندار صرف اچھے کھاتے پیتے لوگوں کو دیتے ہیں۔ اس لئے یہ غریب لوگ اس سے ادھار پر سودا سلف لیتے ہیں...... لیکن یہ حرام زادہ...... ادھار کیا دیتا ہے غریبوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹتا ہے اور حساب میں گڑبڑ کرتا رہتا ہے۔ میں تمہیں اپنی مثال دوں۔ میں نے کئی بار اس بات کو نوٹ کیا۔ اپنے ہاں حساب لکھ کر رکھا۔ جب ادھار کرتے وقت توازن کیا تو دوسوتا کا زیادہ تھے۔ اس طرح وہ میرے

اور کسی کے حساب کو نہیں مانتا۔ بحث و تکرار کرتا اور کہتا ہے کہ تم لوگ ادھار لے کر بھول جاتے ہو...... اس بات پر اس کا ہر کسی سے جھگڑا ہوتا۔ جو الجھتا ہے، انہیں ذلیل کرتا ہے۔ کوئی اس سے اس لئے لڑ نہیں سکتا اور اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا کہ اس علاقے کا ایس ایچ او اس کا بڑا بھائی ہے۔ اس لئے اس سے سب ڈرتے ہیں۔ اس سالے کے پاس دس برس پہلے کیا تھا۔ ایک بہت چھوٹی دکان تھی۔ لیکن آج اس کی دکان اتنی بڑی ہے کہ اناج کی سینکڑوں بوریاں، ٹنوں تیل اور دوسری اشیاء لاکھوں ٹاکا کی ہیں۔ ایک نہیں پورے بارہ نوکر کام کرتے ہیں۔ وہ صرف ادھار پر ماہانہ دس لاکھ کا سودا سلف دیتا ہے۔"

"لیکن یہ بھیڑ کس لئے ہے؟" میں نے پوچھا۔ "کیا لوگ ادھار سودا سلف لینے کے لئے کھڑے ہوئے ہیں؟"

"اس لئے ہے کہ اس محلے کی ایک غریب بیوہ عورت سکینہ ہے۔" وہ کہنے لگا۔ "بے چاری سلائی کر کے گھر چلاتی ہے۔ بڑی نیک عورت ہے۔ سارا محلہ انہیں آپا کہتا ہے۔ آپا اپنے دو بچوں کو پڑھا رہی ہے۔ اس کا بیٹا شجاع چھ سات مہینے سخت بیمار اور سرکاری اسپتال میں زیر علاج رہا۔ اس غریب عورت کے بیٹے کے علاج معالجے پر بہت خرچ ہو گیا جس کی وجہ سے وہ سخت مالی مشکلات کا شکار ہو گئی۔ دو تین مہینے سے وہ ادھار ادا نہ کر سکی۔ اس لئے وہ اسے اور اس کی بیٹی کو ذلیل کر رہا ہے...... دوسری اصل بات یہ ہے کہ اس سور کی دو بیویاں اور چھ بچے ہیں۔ اس نے آمنہ کا رشتہ مانگا تھا۔ آپا نے صاف انکار کر دیا اس لئے وہ انہیں ذلیل کر رہا ہے۔"

یہ سنتے ہی میرا دماغ سن سنا گیا۔ پھر میں رکا نہیں۔ کمان سے نکلے ہوئے تیر کی مانند بھیڑ کو چیرتا ہوا دکان پر پہنچا۔ سکینہ ماں رو رہی تھی۔ آمنہ کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ وہ ذلیل لال میاں کہہ رہا تھا۔ "میں کچھ نہیں جانتا آپا...... تین ہزار چھ سو دس ٹاکا کا ادھار سودا تم نے لیا ہے...... تین مہینے سے تم نے ایک کوڑی بھی ادا نہیں کی۔ اب میں کچھ نہیں جانتا۔ تم اپنا گھر بیچو...... یا سہاگ کے زیورات...... اگر کل شام تک میری رقم مجھے نہیں ملی تو میں تمہارے بیٹے کو اندر کروا دوں گا آپا! تم مجھے جانتی ہو...... میں کیسی حرامی چیز ہوں۔"

"ہاں...... اس میں کوئی شک نہیں تم واقعی بڑی حرامی چیز ہو۔" میں نے کہا۔ "تمہیں زبان سے کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ تمہارا چہرہ کہہ رہا ہے۔" اس نے اور لوگوں نے چونک کر مجھے دیکھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ سکینہ ماں اور آمنہ نے مجھے چونک کر دیکھا۔ آمنہ کے منہ سے نکلا۔ "بھیا!"

"کیا کہا تم نے......؟" لال میاں نے طیش میں آ کر میرا گریبان پکڑ لیا۔ "تمہاری مجال یہ کہ تم مجھے حرامی چیز کہو۔"

"میں کہتا ہوں تم میرا گریبان چھوڑو۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑے پرسکون لہجے میں کہا۔

"نہیں...... میں نہیں چھوڑوں گا۔" وہ اکڑ گیا۔ "پہلے تم یہ کہو کہ تم نے مجھے حرامی چیز کیوں کہا؟"

"میں نے نہیں تم نے خود اپنی زبان سے کہا کہ...... آپا! تم جانتی ہو، میں کیسی حرامی چیز ہوں۔ قسم

کھاؤ۔ تم نے نہیں کہا تھا؟"

پھر اس نے جھنجلا کر میرا گریبان چھوڑ دیا۔ آمنہ میرے پاس آ کر رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

"آپ گھر جائیں۔ ہم آتے ہیں۔"

"آمنہ...... تم ماں کو لے کر گھر جاؤ......" میں نے کہا۔ "میں اس سے بات کر کے تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔ شجاع سے کہنا میں آ رہا ہوں۔"

"آپا! میں تم دونوں کو اس وقت تک یہاں سے جانے نہیں دوں گا جب تک کل شام تک ادائیگی کا وعدہ نہیں کرو گی۔" لال میاں نے کہا۔

"ان کا حساب لاؤ۔" میں نے کہا۔ "میں چیک کر کے تمہارا ادھار ابھی اور اسی وقت ادا کئے دیتا ہوں۔ حساب کہاں ہے؟"

"نہیں بیٹا! نہیں......" سکینہ ماں نے میرا بازو پکڑ لیا۔ "تم ہمارا حساب کیوں ادا کرو گے۔ نہیں...... تم گھر چلو...... میں زیور بیچ کر سارا قرض چکا دوں گی۔"

"زیور بیچنا ہو تو میرے پاس لے آنا......" لال میاں نے کہا۔ "تم جانتی ہو کہ میں زیور اور مکان بھی خرید لیتا ہوں۔"

"ماں جی!" میں نے کہا۔ "آپ گھر چلیں۔ آپ اطمینان سے زیور بیچ کر میری رقم مجھے ادا کر دیں۔"

کاؤنٹر پر ایک طرف بیس پچیس کھاتوں کے بہت ہی موٹے رجسٹر رکھے ہوئے تھے۔ ہر رجسٹر کا وزن پانچ کلو سے کم نہ ہو گا اور صفحات دو ہزار کے قریب تھے۔ اس نے سب سے اوپر رکھا ہوا رجسٹر اٹھا کر اسے کھولا۔ اس رجسٹر کے ورق بالکل سادہ تھے۔ وہ انہیں الٹتا پلٹتا جا رہا تھا اور اس کی آنکھیں پھیلتی جا رہی تھیں۔ "ایں...... یہ کیا......؟ لکھا ہوا کیسے مٹ گیا......؟ کیسے مٹ گیا......؟ اس میں تین سو افراد کا حساب لکھا ہوا تھا۔ ایک کا بھی حساب نہیں ہے......"

پھر اس نے اور اس کے تمام نوکروں نے مل کر سارے رجسٹروں کو کھول کر اور ان کے اوراق الٹ پلٹ کر دیکھے۔ سارے اوراق ان کا منہ چڑا رہے تھے......

"میں...... مم...... مم...... میں مر گیا۔" لال میاں غش کھا گیا۔ اس کا چہرہ سفید پڑتا چلا گیا۔ "یہ کیا......؟ یہ کیسے ہو گیا؟" وہ سینے پر ہتڑ مارنے لگا۔ "ایک دو نہیں پورے تین سو آدمیوں کا کھاتہ ہے۔ یہ کیسے صاف ہو گیا......؟ حرام زادو......" وہ نوکروں کی طرف منہ کر کے بولا جو اس سے کہیں زیادہ حیران و پریشان اور بھونچکے ہو کر کھڑے تھے۔ "کسی نے رات میں آ کر رجسٹر تو بدل نہیں دیئے...... یقیناً ان کھاتہ دار حرامیوں کی حرکت ہے...... میں ایک ایک کو جیل میں سڑا دوں گا...... گولی مار دوں گا...... یہ نہیں جانتے ہیں کہ میں کیسی حرامی چیز ہوں...... میرا بھائی ایس ایچ او کیسا حرامی ہے......"

"تم پھر نہ صرف اپنے آپ کو بلکہ اپنے پولیس افسر بھائی کو بھی حرامی کہہ رہے ہیں۔" میں نے اس کے زخم پر نمک پاشی کر دی۔

اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے نوکروں سے کہا۔ "یہ سارے رجسٹر چیک کرو۔"

ایک بوڑھے سفید باریش شخص نے جس کی ناک پر عینک ٹکی ہوئی تھی جو اپنی وضع قطع اور چہرے مہرے سے منشی معلوم ہوتا تھا اس کے قریب آ کر قدرے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ "یہ سارے رجسٹر ہمارے اپنے ہیں...... کوئی کیسے بدل سکتا ہے بڑے صاحب! کس کی کیا مجال کہ بند دکان میں داخل ہو جائے۔ بیس عدد تالے اور دو مسلح چوکیدار پہرہ دیتے ہیں...... اور پھر تھوڑی دیر پہلے تک رجسٹروں میں کھاتہ لکھا ہوا تھا۔ میں نے خود بیس آدمیوں کا ادھار کھاتہ رجسٹروں پر لکھا تھا۔"

"سور...... کتے......" لال میاں آؤٹ ہو رہا تھا۔ "تو...... تو...... مجھے بے وقوف بنا رہا ہے؟"

منشی سہم گیا! بے چارے کے منہ سے ایک لفظ نہ نکلا تو میں کہے بغیر نہ رہ سکا۔ "اس شخص کی عمر کا نہ سہی اس کی سفید داڑھی کا خیال کر لو۔ یہ تمہارے باپ کی عمر کا ہے۔ کیا اس عمر کے لوگوں کو گالیاں دیتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی ہے۔"

"تو...... کون ہے جو مجھے سبق سکھا رہا ہے۔" لال میاں بدتمیزی پر اتر آیا۔ "میں لٹ گیا...... تیس لاکھ ٹا کا حساب غائب ہو گیا...... میرے خلاف سازش ہوئی ہے۔ کیا میں انہیں سینے سے لگاؤں...... پیار کروں؟"

"یہ تو...... تا، سے بات نہ کرو۔" میں نے تیز لہجے میں کہا۔ "میں تیرا اور تیرے باپ کا نوکر نہیں ہوں۔" میں نے اس کی زبان میں بات کی۔

"کیا...... کیا...... تو میرے باپ کا نام لے رہا ہے......" وہ ایک جھٹکے سے کھڑا ہوا اور اس نے میرا گریبان پکڑ لیا۔ "تو کیا سمجھتا ہے اپنے آپ کو...... میں تیری کھال ادھیڑ کے رکھ دوں گا۔ حوالات میں سڑا دوں گا۔"

"تیرے دل میں جو ارمان ہیں وہ پورے کر لینا۔" میں نے کہا۔ "تو میرا گریبان چھوڑ...... ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔"

"میں نہیں چھوڑتا...... تو کیا کر لے گا؟" لال اکڑ گیا۔ وہ غصے، نفرت اور صدمے سے پاگل ہو رہا تھا۔ میں نے جواب دینے کے بجائے اس کے منہ پر ایک ایسا زوردار تھپڑ رسید کیا کہ اسے تارے نظر آ گئے ہوں گے۔ اس تھپڑ سے اس کے منہ سے خون نکل آیا۔ اس کا جبڑا سوج گیا اور وہ دہشت زدہ ہو کر ایک قدم پیچھے ہٹا اور اس نے گریبان چھوڑ دیا پھر وہ مجھے پھٹی پھٹی نظروں سے اس طرح دیکھنے لگا جیسے میں کوئی عفریت ہوں۔ کیوں کہ ایسا زبردست اور طاقتور تھپڑ کسی عام آدمی کا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس تھپڑ نے اس کے دماغ کی چولیں تک ہلا دی تھیں۔

"لاؤ حساب دو......" میں نے اس سے کہا۔ "تاکہ تمہارا ادھار ادا کیا جا سکے...... آئندہ کسی شریف سے نہیں الجھنا......"

"تین ہزار چھ سو دس ٹا کا حساب ہے۔" ایسا لگ رہا تھا کہ وہ رو دے گا۔ "لاؤ...... یہ رقم دے دو۔"

"جب تک تم سارا حساب لکھ کر نہیں دو گے اس وقت تک تمہیں ایک کوڑی بھی نہیں ملے گی۔" میں نے کہا۔

"تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ سب کا حساب صاف ہو گیا ہے۔" وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔ "لہٰذا ادھار لینے والوں کو چاہئے کہ وہ ایمانداری سے اپنا اپنا حساب چکتا کر دیں...... ورنہ میں تباہ ہو جاؤں گا۔"

"ایمانداری......؟" میں نے اسے سوالیہ نظروں سے گھورا۔ "یہ کس چڑیا کا نام ہے؟ اسے تم کب سے جانتے ہو؟" لال میاں لاجواب سا ہو گیا۔

چند لمحوں تک کچھ نہیں بولا۔ پھر اس نے کہا۔ "جن لوگوں نے ادھار سودا لیا ہے انہیں چاہیے وہ ایمانداری سے ادھار ادا کر دیں۔ اپنا حساب صاف کر دیں۔ ورنہ بے ایمانی انہیں لے ڈوبے گی۔"

"اب تمہیں ایمان اور ایمانداری یاد آ رہی ہے۔" ایک شخص نے جو میرے پیچھے کھڑا ہوا تھا مجھ سے پہلے بول اٹھا۔ "بے ایمان آدمی...... تو نے کب ہم سے ایمانداری کی...... تو خود سب سے بڑا بے ایمان آدمی ہے...... تو نے ہمیشہ حساب میں بے ایمانی کی...... ہیرا پھیری کی...... غلط حساب اور ٹوٹل سے ہم غریبوں کو لوٹا...... تیرے ادھار نے کتنے گھروں کو برباد کیا...... وہ لوگ فاقہ کشی کرنے پر مجبور ہو گئے...... دیکھ لے۔ تیری بے ایمانی آج تجھے کیسے لے ڈوبی ہے...... تو نے ہم سب کی بددعائیں لی ہیں۔"

"ہم لوگ اس وقت تک ادھار ادا نہیں کریں گے جب تک تو کاغذ پر لکھ کر پہلے کی طرح نہیں دے گا۔" دوسرے شخص نے اکڑ کر کہا۔

"تم لوگ کیسے ادھار ادا نہیں کرو گے......؟ میں ایک ایک کوڑی وصول کر لوں گا۔" لال میاں نے کہا۔

"تمہارے پاس حساب نہیں لکھا ہے۔" تیسرے آدمی نے کہا۔ "کس حساب سے تم ادھار کی رقم لو گے؟"

"میں عدالت میں جاؤں گا اور تم سب پر مقدمہ دائر کر دوں گا۔" لال میاں نے پاگلوں کی طرح کہا۔

"یہ سالا پاگل ہو گیا ہے......" پیچھے سے کسی نے اونچی آواز میں تمسخر سے کہا۔ "لالو میاں عدالت ثبوت مانگتی ہے...... تمہارے پاس کیا ثبوت ہے...... اب ہم تمہیں ایک ٹا کا بھی نہیں دیں گے؟ اور نہ ہی تم سے سودا لیں گے۔ جو کرنا ہے کر لو۔"

"بڑے صاحب! آپ فکر کیوں کر رہے ہیں۔ پریشان کیوں ہو رہے ہیں۔" ایک نوجوان لڑکے نے کہا۔ "میں روزانہ کا حساب کمپیوٹر میں فیڈ کرتا ہوں۔ اس میں ہر ایک ادھار لینے والے کا حساب موجود ہے۔ کہیں کس کا حساب لے آؤں۔"

میرے پاس آگے اور پیچھے جتنے لوگ کھڑے تھے ان کے منہ لٹک گئے۔ لال میاں حیرت اور خوشی سے اچھل پڑا۔ "ارے میں تو یہ بات ہی بھول گیا تھا...... تم جا کر سکینہ بیگم کا حساب لے آؤ۔ یہ ان کا رشتہ دار بڑا چہک رہا تھا۔ اب بولو بیٹا!"

جوان لڑکا جو لال میاں کا اکاؤنٹنٹ تھا تیزی سے اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جو کونے میں تھا جس

میں کمپیوٹر رکھے دکھائی دے رہے تھے۔ بھیڑ چھٹی نہیں تھی۔ لوگ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کمپیوٹر میں حساب موجود ہے یا نہیں...... وہ تھوڑی دیر بعد کمرے سے نکل کر آیا تو اس کے چہرے پر بارہ بج رہے تھے۔ وہ آتے ہی بولا۔ ”بڑے صاحب! وائرس نے سب کچھ صاف کر دیا ہے۔ کسی ایک کا حساب بھی موجود نہیں ہے...... شاید یہ سارے کھاتے بھی کسی وائرس نے ہی صاف کیے ہوں گے؟“

”کیا بکتے ہو......؟“ لال میاں کا پارہ ایک دم سے چڑھ گیا۔ ”کیا ایسا کوئی وائرس ہے جو کاغذ پر لکھے کو مٹا دے؟“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ وہ سٹپٹا کے بولا۔ ”میری عقل کام نہیں کر رہی ہے کہ کاغذ پر لکھا سارا کیسے اور کیوں کر مٹ گیا۔ کمپیوٹر پر کوئی نہ کوئی وائرس آ کر تباہی پھیلا دیتا ہے۔ شاید اب کاغذ کا وائرس بھی پیدا ہو گیا ہو۔“

لوگ یہ جان کر کہ وائرس نے کمپیوٹر میں جو حساب فیڈ تھا اسے صاف کر دیا ہے خوش ہو گئے۔ تالیاں بجانے اور ناچنے لگے۔ وہ لوگ بے ایمان یا دھوکے باز نہ تھے۔ عام لوگ تھے۔ سیدھے سادے اور محنت کش تھے۔ لال میاں نے پورے دس برس انہیں لوٹا تھا اور آج وہ خود معہ سود کے لٹ گیا تھا۔ لیکن پھر بھی یہ نقصان کچھ نہ تھا۔ کیوں کہ وہ خود غرض، لالچی اور یہودی فطرت کا تھا یہ نقصان قابل برداشت تھا۔ اس نے اتنا کچھ ان غریبوں سے لوٹ کر کمایا ہوا تھا کہ وہ برسوں عیش کی زندگی گزار سکتا تھا۔

جب اس نے لوگوں کو خوش ہوتے اور ناچتے دیکھا تو جلتی پر جیسے تیل گر گیا تھا۔ وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے میز کی دراز میں سے ریوالور نکال لیا تاکہ مجھے اور خوش ہوتے ہوئے لوگوں کو نشانہ بنا سکے۔

سب سے پہلے اس نے مجھے نشانے کی زد میں لیا تو سکینہ ماں ایک دم سے میرے سامنے آ کر ڈھال بن گئیں۔ ”نہیں...... نہیں...... میرے بیٹے کو نہ مارو......“ وہ ہذیانی لہجے میں بولیں۔ ”اس نے کیا کیا......؟ اس کا کیا قصور......؟ گولی مارنا ہے تو مجھے مارو......“

”نہ...... نہ......“ پھر آمنہ بھی ڈھال بن گئی۔ ”ہم تمہاری کوڑی کوڑی ادا کر دیں گے۔“

”سکینہ ماں! آپ گھبرائیں نہیں...... پریشان نہ ہوں۔“ میں نے دلاسا دیا۔ ”اس کا ریوالور خالی ہے۔ اس میں ایک گولی بھی نہیں ہے...... آمنہ بہن! یہ شخص بڑا خبیث ہے۔ جب یہ تک حساب کی تفصیل لکھ کر نہ دے تم اور کوئی بھی رقم نہ دے۔“

”ہاں...... ہاں......“ میرے عقب میں دو تین آوازیں گونجیں۔ ”یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ جب تک یہ حساب اور ثبوت نہیں دے گا اسے ایک ٹکا بھی نہیں دیں گے۔ کیوں دیں۔ یہ ہمیشہ سے بے ایمانی اور حساب میں گڑبڑ کرتا آیا ہے۔ سالا بے ایمان......“

”لال میاں...... لال میاں!“ کسی نے ہذیانی لہجے میں چیخ کر کہا۔ ”تم گولی نہ چلانا۔ کوئی مر گیا تو تمہیں پھانسی ہو جائے گی۔“

”نہیں...... میرا کچھ نہیں بگڑے گا...... میرا بھائی انسپکٹر ہے۔ ایس ایچ او ہے۔ وہ مجھے بچا لے گا۔“

لال میاں نے غصے سے جواب دیا۔ ”سکینہ آپا! میں تمہیں گولی مار دوں گا۔ تم سامنے سے ہٹ جاؤ میں پہلے اس بدمعاش کو ختم کروں گا۔“

میں نے سکینہ ماں کو ایک طرف ہٹا دیا اور اس کی طرف بڑھ کر بولا۔ ”چلو...... اپنے دل کی حسرت پوری کر لو۔“

لال غصے کے جنون میں اندھا ہو چکا تھا۔ اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے میرے سینے کا نشانہ لے کر ریوالور کی لبلبی دبائی۔ کلک...... کلک...... کی آواز گونج کر رہ گئی۔ اس نے پورا راؤنڈ چلا دیا۔ گولی ہوتی تو چلتی۔ ریوالور میں ایک گولی بھی نہ تھی۔ اس کے ریوالور کی چھ کی چھ گولیاں میری جیب میں تھیں۔ اسے یقین نہیں آیا۔ اس کی حیرت اور غصہ مزید بڑھ گیا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے......؟ کیسے ہو سکتا ہے......؟“ اس نے غصے سے ریوالور کا چیمبر کھول کر دیکھا تو اسے صاف گولیاں دکھائی دیں۔ اس نے فوراً ہی چیمبر بند کر کے میرا نشانہ لیا اور لبلبی دبائی۔ پہلے کی سی بات ہوئی۔ اس میں سے ایک گولی بھی نہیں نکلی۔

”سالا لال میاں پاگل ہو گیا ہے۔“ کسی نے بلند آواز میں کہا۔ لوگ ہنسنے اور قہقہے لگانے لگے۔

”اسے پاگل خانے لے جاؤ۔ واقعی اس کی حالت پاگلوں کی سی ہو رہی تھی۔“ ایسا لگ رہا تھا واقعی وہ پاگل ہو جائے گا۔ وہ ریوالور لے کر نوکروں کی طرف گھوما اور ان پر برس پڑا۔ ”اس ریوالور میں سے کس حرام زادے نے گولیاں نکال لیں۔ بتاؤ...... وہ سور کون ہے؟“

”چلیے...... ہم گھر چلتے ہیں۔“ میں نے آمنہ اور سکینہ ماں سے کہا۔ ”یہاں کھڑے رہنے سے کچھ حاصل نہیں۔“

میں نے آمنہ اور سکینہ ماں کو ایک بہانے سے گھر بھیج دیا۔ میں بکرے کا گوشت، تیل کا ایک ڈبا اعلیٰ قسم کا چاول پانچ کلو اور کچھ سودا سلف لے کر شجاع کے ہاں پہنچا تو آمنہ اپنے بھائی کو لال میاں کی دکان پر رونما ہونے والا واقعہ مزے لے لے کر سنا رہی تھی۔ یہ سامان دیکھ کر سکینہ ماں ناراض ہو گئیں۔

”بیٹے!“ ان کی آواز بھرا سی گئی۔ ”تم ہمیں شرمندہ نہ کرو۔ ہم پہلے ہی تمہارے احسان تلے دبے ہوئے ہیں۔ تم نے لال میاں کی خبر لے کر ہماری عزت رکھ لی...... لیکن یہ سب کچھ کیا تھا بیٹے......! ہماری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔“

”سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ جب آپ نے بیٹا کہا ہے تو میرا بھی فرض ہے کہ میں اس گھر کو اپنا گھر سمجھوں۔“ میں نے کہا۔ ”لال میاں کو شاید قدرت نے اس کے کیے کی سزا دی ہے۔ وہ کیا کچھ نہیں کر سکتا...... اسے جو یہ سزا ملی ہے وہ بہت ہی کم ہے۔ آپ ادھار ادا نہ کریں۔ کیوں کہ اس نے ہر ایک حساب میں بے ایمانی اور گڑبڑ کر کے خوب کمایا ہے۔ کوئی بھی اس کا حساب بے باق نہیں کرے گا۔ لہٰذا اس سے ڈرنے اور خوف زدہ ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ وہ آپ کا بال تک بیکا نہیں کر سکتا۔“

آمنہ اور سکینہ سامان لے کر باورچی خانے میں کھانا تیار کرنے چلی گئیں تو شجاع نے پوچھا۔ ”اب

"آپ کب تک یہاں ہیں؟"

"میں دو ایک دن کے بعد واپس جانے کا سوچ رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "یہ تم کس لئے پوچھ رہے ہو؟"

"میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ کچھ دن اور یہاں رک جائیں۔ آپ سے میری درخواست نہیں التجا ہے۔"

"وہ کس لیے دوست......!" میں نے کہا۔ "میں یہاں رک کر کیا کروں گا اور پھر یہاں میرے لئے کوئی کام نہیں ہے۔"

"اس لئے کہ آئندہ ہفتے آل بنگلہ دیش اولمپک گیمز منعقد ہونے والے ہیں جو ہر پانچ برس میں ایک بار منعقد ہوتے ہیں۔" شجاع کہنے لگا۔ "یہ مقابلے بڑے زبردست ہوتے ہیں۔ اس میں دیش کے تمام چھوٹے بڑے شہروں کی یونیورسٹی اور کالجوں کے طلباء طالبات حصہ لیتے ہیں۔ اس میں نہ صرف طلائی، چاندی اور کانسی کے تمغے دیئے جاتے ہیں بلکہ نقد انعامات بھی دیئے جاتے ہیں۔ رقم بہت بڑی ہوتی ہے۔ میں ہر مقابلے میں حصہ لینے کا اہل ہوں۔ کالج میں لیتا رہتا ہوں جو سال میں ایک بار ہوتے ہیں۔ فارم جمع کرانے کی کل آخری تاریخ ہے۔ لیکن مجھے بہت کم امید ہے کہ مجھے موقع دیا جائے گا۔ نا اہل لڑکے لڑکیوں کو زیادہ سے زیادہ موقع دیا جائے گا۔ کیوں کہ وہ بڑے گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں اور پھر وہ با رسوخ اور با اثر بھی ہیں۔ یہ بات مجھ پر پہلے ہی کمیٹی کے چیئر مین نے واضح کر دی کہ فارم جمع کرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ لا حاصل ہوگا۔"

"تم ان کی بات سے دل برداشتہ نہ ہو۔" میں نے اسے دلاسا دیا۔ "تم کل فارم جمع کرا دو اللہ کا نام لے کر۔ تمہارا نام آ جائے گا۔" شجاع نے مجھے بتایا کہ وہ فٹ بال بہت اچھا کھیلتا ہے۔ ایک اچھا ایتھلیٹ بھی ہے۔ تیراکی کے مقابلوں میں وہ دوئم سوئم آتا رہا ہے۔ چار سو میٹر کی دوڑ میں بھی وہ تیسری پوزیشن لے چکا ہے۔ ٹیبل ٹینس اور ہاکی میں بھی ایک اچھا کھلاڑی سمجھا جاتا۔ والی بال بھی خوب کھیل لیتا ہے۔ اس کے علاوہ نہ صرف بہترین مقرر ہے بلکہ ایک اچھا گلوکار بھی ہے۔ اس نے لانگ جمپ اور ہیمر تھرو میں اول دوئم نہیں بلکہ تعریفی اسناد وصول کئے ہیں۔ اس میں بھرپور صلاحیتیں موجود ہیں۔ وہ ان تمام مقابلوں میں حصہ لینا چاہتا ہے۔ مقابلے بڑے سخت ہوتے ہیں۔ لیکن اسے امید ہے کہ وہ کسی نہ کسی مقابلے میں دوسرا تیسرا انعام لے ہی لے گا۔ گزشتہ اولمپک میں اسے موقع نہیں دیا گیا۔ اس لئے کہ وہ ایک غریب کا بیٹا ہے۔

دوسرے دن شجاع کے ساتھ میں یونیورسٹی گیا فارم جمع کرانے...... آخری تاریخ تھی۔ بہت سارے طلباء و طالبات پہلے ہی فارم جمع کرا چکے تھے اس لئے رش نہ تھا۔ تھوڑے بہت جو رہ گئے تھے۔ وہ جمع کرا رہے تھے۔ فارم وصول کرنے والے شخص نے بھی شجاع سے کہا کہ کیوں اپنا وقت اور پیسہ برباد کر رہے ہو۔ دو سو دس فارم جمع ہو چکے ہیں۔ صرف بیس کا انتخاب کیا جائے گا۔ تمہارا تو دور دور تک پتا نہیں ہوگا۔ تم یہ بات جانتے ہو کہ سفارش اور اثر و رسوخ والوں کے نام آئیں گے۔

شجاع اس کی بات سن کر دل برداشتہ سا ہو گیا تھا۔ دوسرے دن صبح دس بجے ناموں کی فہرست بورڈ

پر آویزاں کر دی گئی۔ شجاع نے اس میں اپنا نام دیکھا تو اسے یقین نہیں آیا۔ وہ حیرت اور خوشی سے اچھل پڑا۔ اس کا نام دیکھ کر اس کے ہم جماعتوں، دوستوں اور دوسرے لڑکوں کو بھی یقین نہیں آیا۔ بہت سارے حسد و جلن سے جل کر رہ گئے۔

☆......☆......☆

جس روز آل بنگلہ دیش اسٹوڈنٹس اولمپک گیمز کا افتتاح تھا اس روز نیاز اسٹیڈیم کو دلہن کی طرح سجایا ہوا تھا۔ اسٹیڈیم کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ تقریب کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ پھر وزیر اعظم نے جو مہمان خصوصی تھے انہوں نے کوئی دس بارہ منٹ تک بنگلہ زبان میں تقریر کی اور کھلاڑیوں سے کہا کہ کھیل اور ہر قسم کے مقابلوں میں ہار جیت ہوتی ہے۔ ایک طرح سے ہار بھی جیت ہی ہوتی ہے۔ ان کھلاڑیوں کو جو ہار جائیں دل چھوٹا نہ کرنا چاہیے۔ وہ کھلاڑی جو جیت جائیں اپنے فاتحانہ انداز اور غرور سے ہارنے والے کی دل شکنی نہ کریں۔ صحت مند روایت کو برقرار رکھیں اور نظم و ضبط کی پابندی کریں۔ اس سے ان کا اور دیش کا نام روشن ہوگا۔

ان کی تقریر کو پر جوش تالیاں بجا کر سراہا گیا اور خیر مقدم کیا گیا۔ طالبات نے مختلف قبیلوں اور اس دیش کے روایتی رقص کو دل کش انداز سے پیش کر کے خراج تحسین حاصل کیا۔ کچھ گلوکاراؤں نے اپنی آواز کا جادو جگا کر ایک سماں باندھ دیا۔ ان کی مدھر آواز کا جادو ذہنوں کو مسحور کئے رہا۔

پھر اس کے بعد دیش کے مختلف شہروں کے ان کھلاڑیوں نے مارچ پاسٹ کیا جن کا تعلق یونیورسٹیوں اور کالجز سے تھا۔ ہر دستہ کے آگے ایک نوجوان اور حسین لڑکی جو سفید ساڑھی اور سفید بلاؤز میں ملبوس تھی آگے آگے چل رہی تھی۔ یہ دستہ مارچ پاسٹ کرتا اور وزیر اعظم کو سلامی دیتا ہوا اپنے پویلین میں جا رہا تھا۔ یہ رنگا رنگ تقریب جاری تھی کہ شام ہو گئی۔ اس تقریب کے آغاز سے قبل کوئی ایک ہزار کبوتر فضا میں چھوڑے گئے تھے۔ جیسے ہی اندھیرا گہرا ہوا آتش بازی چھوڑی گئی جس نے پورے شہر کو منور کر کے حسین بنا دیا۔

اس روز صرف دو مقابلے ہوئے۔ ایک تیر اندازی اور بندوق کی نشانہ بازی کا...... شجاع نے یہ دونوں مقابلے جیت لیے اسے پہلا انعام طلائی تمغہ دونوں مقابلوں میں الگ الگ ملا تھا۔ کیمرے حرکت میں آ گئے تھے۔ دوسرے دن صبح کے تمام اخبارات، ریڈیو اور ٹی وی کی خبروں نے اُسے زبردست کوریج دی۔ ٹی وی اور اخبارات نے اس کی تصویریں شائع کیں۔ یہ پندرہ روز تک جاری رہنے والے گیمز تھے۔

دوسرے دن چار سو میٹر کی دوڑ شجاع نے پلک جھپکتے جیت کر سنسنی پھیلا دی اور ہر کسی کو انگشت بدنداں کر دیا۔ کیوں کہ آج تک کسی نے بھی اتنی تیز رفتاری سے یہ دوڑ نہیں جیتی تھی۔ اس نے ایک ایسا ریکارڈ قائم کیا تھا جو مستقبل میں کوئی توڑ نہیں سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے ہزار گز کی ریس میں بھی ایک نیا ریکارڈ قائم کیا...... دوسرے دن اس نے تین مقابلوں میں حصہ لے کر تین گولڈ میڈل حاصل کئے تھے۔

اس نے پندرہ مقابلوں میں حصہ لے کر پندرہ گولڈ میڈل حاصل کر کے ایک نیا ریکارڈ قائم کیا تھا۔

آج تک کسی طالب علم نے تین سے زیادہ گولڈ میڈل حاصل نہیں کئے تھے۔ آخری دن فٹ بال میچ تھا۔ کامرس کالج کی ٹیم کا مقابلہ یونیورسٹی کی ٹیم سے تھا جو بہت مضبوط تھی۔ یہ فائنل میچ تھا۔ کامرس کالج کی فٹ بال ٹیم کسی نہ کسی طرح فائنل میں پہنچنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ وہ پوائنٹس پر آ گئی تھی۔ جب کہ ڈھاکا یونیورسٹی کی ٹیم نے اپنے ہر حریف کو چھ سات گول سے ہرا دیا تھا۔ شجاع چوں کے دوسرے مقابلوں میں حصہ لے رہا تھا اس لئے وہ ایک میچ بھی کھیل نہ سکا۔ اس وقت کامرس کالج شجاع کی وجہ سے گولڈ میڈل حاصل کرنے میں سرفہرست تھا۔ شجاع نے اس کالج کا نام روشن کر کے اس میں چار چاند لگا دیئے تھے۔ ڈھاکا یونیورسٹی کی ٹیم سب سے زیادہ فیورٹ تھی۔ اس میں فٹ بال کے مایہ ناز کھلاڑی شامل تھے۔ جب سے بنگلہ دیش بنا تھا اور جب سے یہ گیمز کے مقابلے ہو رہے تھے تب سے یہ ٹیم گولڈ میڈل اور ٹرافی لے جا رہی تھی۔ آج تک کوئی ٹیم بھی اسے ہرانا تو در کنار اس کے خلاف ایک گول بھی نہ کر سکی تھی۔ ہر کسی کا خیال تھا کہ ڈھاکا یونیورسٹی کی ٹیم جیت جائے گی۔ آج اس فائنل میچ کو دیکھنے کے لئے صرف وزیر اعظم ہی نہیں اسمبلی کے تمام اراکین اور پوری کابینہ بھی موجود تھی۔ صنعت کاروں، فلمی فن کاروں اور شو بزنس کی مشہور و معروف شخصیات کے علاوہ صنعت کار اور تاجروں کے ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے کے علاوہ طلبا وطالبات کی بھی بہت بڑی تعداد تھی۔ وہ سب ڈھاکہ کی فٹ بال ٹیم کو سپورٹ کر رہے تھے۔

میں شروع دن سے یہ گیمز دیکھ رہا تھا اور شجاع کو کامیابی دلانے میں پیش پیش رہا تھا۔ آج بھی اسے ایسی کامیابی اور شہرت سے ہم کنار کرنا چاہتا تھا کہ لوگ اس پر عش عش کر اٹھیں اس کی شہرت بام عروج پر تھی۔ پندرہ گولڈ میڈل حاصل کر کے پورے بنگلہ دیش میں اس کا ڈنکا بج رہا تھا۔ جب وہ اپنے کالج کی ٹیم کے ساتھ میدان میں اترا تو تماشائیوں نے بھرپور تالیوں سے اس کا خیر مقدم تو کیا تھا لیکن وہ ڈھاکہ ٹیم کی حمایت میں تھے۔ حالاں کہ انہیں اپنے شہر کے کالج کی ٹیم کو بھرپور طریقے سے خوش آمدید کہنا تھا۔ لیکن وہ کھیل کے تناظر میں اسے زیادہ سپورٹ نہیں کر رہے تھے کیوں کہ کامرس کالج کی ٹیم کو کھیل نے نہیں بلکہ قسمت نے پہنچایا تھا۔ جب کہ ڈھاکہ ٹیم اپنے اعلیٰ ترین کھیل کی بدولت فائنل میں پہنچی تھی اور اس نے اپنے بہترین کھیل سے فٹ بال کے شائقین کا دل جیت لیا تھا۔

کھیل شروع ہوا۔ وقفہ تک ڈھاکا کی ٹیم کھیل پر حاوی رہی تھی۔ اگر میں نے ان کے گول اور شارٹ ضائع نہ کرائے ہوتے تو چھ سات گول کا ہو جانا یقینی تھا۔ عام تماشائیوں کا خیال تھا کہ مقامی ٹیم نہیں کھیل رہی ہے بلکہ ان کی قسمت کھیل رہی ہے اور ان کا ساتھ دے رہی ہے۔ کامرس کی فٹ بال ٹیم کا کھیل اور دفاع بھی بہت ہی کمزور تھا۔

وقفہ کے بعد کھیل شروع ہوا۔ فٹ بال کے فائنل میچ کو نہ صرف ٹی وی پر دکھایا جا رہا تھا بلکہ ریڈیو پر اس کی رننگ کمنٹری بھی ہو رہی تھی۔ شائقین کا جوش و خروش بڑھتا جا رہا تھا اور وہ ڈھاکا ٹیم کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ صرف کامرس کالج کے طلبا و طالبات اور اساتذہ اپنی ٹیم کی حوصلہ افزائی کر رہے ہے اور ہمت بڑھا رہے تھے۔ لیکن وہ ایک لاکھ شائقین کے مقابلے میں آٹے میں نمک کے برابر تھے۔ پھر بھی وہ کیا

کرتے۔ اس کے لئے مجبور تھے۔

شجاع سینٹر فارورڈ کھلاڑی کی حیثیت سے کھیل رہا تھا۔ ڈھاکہ ٹیم کا سینٹر فارورڈ حمید گیند لے کر اپنی حریف ٹیم کے قریب پہنچا اور گول یقینی تھا۔ لیکن شجاع نے فوراً ہی بجلی کی سرعت سے اچھل کر اور گول کے سامنے آ کر اسے روکا۔ پھر وہ گیند لے کر دو تین کھلاڑیوں کو ڈاج دیتا ہوا حریف ٹیم کے گول کی طرف بڑھا۔ وہاں بھی اس نے تین کھلاڑیوں کو اس خوب صورتی اور مہارت سے ڈاج دیا کہ شائقین داد دینے پر مجبور ہو گئے۔ پھر اس نے ایک زوردار کک لگا کر گیند کو گول میں پھینکا۔ گول کیپر نے گیند کو پکڑنے کے لئے ہاتھ فضا میں پھیلا دیئے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ گیند سیدھے اس کے ہاتھوں میں آ رہی ہے وہ اسے پکڑ لے گا۔ لیکن پکڑ نہ سکا۔ کیوں کہ گیند بندوق کی گولی کی طرح ان کے کورٹ میں پہنچ گئی اور گول ہو گیا۔

گول ہوتے ہی ڈھاکا ٹیم کے شائقین کو ہی نہیں اس ٹیم کے کھلاڑیوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ ایک لمحہ سناٹا چھایا رہا۔ دوسرے لمحے کامرس کالج کے طلباء و طالبات نے زوردار تالیاں بجا کر داد دی اور نوجوان لڑکیاں رقص کرنے لگیں تو لڑکے بھی ساتھ دینے لگے۔ گول کیپر اور کھلاڑی حیران تھے کہ گول کیسے ہو گیا۔ گیند کیسے ہاتھ میں نہ آ سکی۔

جب دوبارہ کھیل شروع ہوا تو شجاع نے تیسرے منٹ میں ڈھاکا ٹیم کے خلاف دوسرا گول سر سے گیند کو مار کر گول کر دیا۔ گیند بندوق کی گولی کی طرح کئی کھلاڑیوں کے درمیان گول کیپر کے سر پر سے زن سے گزرتی گئی تھی۔ اس گول نے ایک لمحے کے لئے سب کو چکرا دیا اور وہ بھونچکے سے رہ گئے تھے۔ اسٹیڈیم کے تمام تماشائیوں نے اس خوبصورت گول کی داد پرجوش انداز سے تالیاں بجا کر دی۔ شجاع نے تیسرا گول جو کیا تھا وہ بڑا زبردست اور سنسنی خیز تھا۔ جب وہ گیند لے کر مخالف ٹیم کے ہاف میں پہنچا تو چار کھلاڑی گیند چھیننے کے لئے لپکے تو اس نے وہیں سے گول کی طرف زوردار کک لگا دی۔ گول کیپر نے گیند پکڑنے کی کوشش کی تو گیند نے اسے دھکا دے کر ایک طرف گرا دیا۔ گیند گول کے اندر پہنچ گئی۔

گول کیپر دوسرے لمحے اٹھ کھڑا ہوا تو وہ سخت خوف زدہ تھا اور اس پر اس طرح سے سکتہ چھایا ہوا تھا جیسے اس پر کوئی بجلی سی آ گری ہو۔ اس کی آنکھیں دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ بھونچکا سا ہو کر گیند کی طرف اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے وہ کوئی عفریت ہو۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ گیند نے اسے دھکا دے کر کیسے گرا دیا ہے۔ گیند تو ایک بے جان کی چیز ہے۔ چند ثانیوں کے بعد متحیر اور سراسیمہ سا ہو کر گراؤنڈ سے نکل گیا۔ اس کے کپتان نے دوڑ کر اسے پکڑ لیا اور اسے روکنے کی کوشش کی تو وہ رکا نہیں۔ وہ حیران و پریشان اور دہشت زدہ سا ہو کر بدحواسی کے عالم میں چلا گیا لیکن جاتے جاتے اپنا سر ہلاتا اور شانے اچکاتا گیا۔ تین گول ہو چکے تھے۔ میں نے سوچا تھا کہ ڈھاکا کی ٹیم کا تیل نکال دینا چاہیئے۔ کیوں کہ مسلسل اور زبردست فتوحات نے ان کا دماغ خراب کر دیا تھا۔ انہیں نہ صرف بڑا فخر اور غرور ہو گیا تھا بلکہ اس بات کا بھی زعم تھا کہ پورے بنگلہ دیش میں ان کے پائے کا کوئی کھلاڑی نہیں ہے۔ کل جب ہوٹل میں کچھ لڑکوں نے ان کے آٹوگراف لینے چاہے تو دھتکارا اور جھڑک دیا تھا اور ان سے سیدھے منہ بات

کرنا تک گوارا نہیں کیا تھا۔ لہٰذا انہیں ایسا سبق دینا ضروری تھا کہ سدھر جائیں اور ساری زندگی یاد رکھیں۔

جب بھی شجاع گیند لے کر گول کی طرف جاتا تھا تو سارے کھلاڑی اس کے پیچھے گیند چھیننے کے لئے اور فاؤل مارنے کے لئے پڑ جاتے تھے۔ لیکن وہ ان سب کو ڈاج دیتا اور کیری کرتا ہوا کبھی آگے جاتا کبھی پیچھے جاتا۔ پھر سارے گراؤنڈ کے گرد چکر کھلاتا۔ ایک طرح سے نچا رہا تھا جس سے شائقین کی شجاع کو داد مل رہی تھی اور وہ بہت خوش ہو رہے تھے۔ اسٹیڈیم میں موجود تماشائیوں نے شجاع کو ہیرو تسلیم کر لیا تھا۔ اب وہ اس کے حق میں ہو گئے تھے۔ وہ لوگ اس سے ایک بار بھی گیند چھین نہ سکے۔ شجاع نے جس کارنر اور سینٹر سے گیند کو فری کک لگا کر گول کی طرف پھینکا گول ہو گیا جس نے نہ صرف کھلاڑیوں بلکہ تماشائیوں کو بھی انگشت بدنداں کر دیا۔ ہر پانچ منٹ میں ایک گول شجاع کر رہا تھا۔

کھیل ختم ہونے سے پندرہ منٹ پہلے ڈھاکا فٹ بال ٹیم کے کھلاڑیوں کی یہ حالت ہو رہی تھی کہ وہ بری طرح ہانپ رہے تھے اور پسینے میں نہا رہے تھے۔ شجاع نے انہیں تگنی کا ناچ نچا کر تیل نکال دیا اور ادھ موا بھی کر دیا تھا۔ اب ان میں اتنی ہمت اور سکت نہیں رہی تھی کہ کھیل سکیں اور گیند کو کک مار سکیں۔ پھر وہ گراؤنڈ سے باہر چلے گئے۔ شجاع نے ایک درجن گول کر کے ان کا بھرکس نکال دیا تھا۔ ایسی بدترین اور شرمناک شکست آج تک کسی بھی فٹبال ٹیم کو نہیں ہوئی تھی۔

اسٹیڈیم میں بھرے تماشائیوں نے ہی نہیں بلکہ وزیراعظم، ان کی کابینہ، تمام ممبران اسمبلی نے اس وقت کھڑے ہو کر شجاع کو تالیوں سے خراج تحسین پیش کیا جب کھلاڑیوں نے اسے اپنے کندھوں پر اٹھا کر گراؤنڈ کا چکر لگایا تھا۔ لڑکیاں اور لڑکے جو کامرس کالج کے تھے انہوں نے گراؤنڈ میں آ کر رقص کرنا شروع کر دیا۔ مقامی لوگ بہت خوش تھے کہ شجاع نے ان کے شہر کا نام اونچا کر دیا تھا۔ وہ قومی ہیرو بن گیا تھا۔ آنکھوں کا تارا، اسے زبردست خراج تحسین پیش کیا جا رہا تھا۔

اس کی اختتامی تقریب میں اسے نہ صرف ایک گولڈ میڈل بلکہ پندرہ لاکھ ٹاکا نقد یعنی چیک کی صورت میں دیا گیا۔ وزیراعظم اور وزراء نے اس کے ساتھ تصویریں کھنچوائیں۔ دوسرے دن نہ صرف سرکاری تعطیل بلکہ جشن منانے کا اعلان کیا گیا۔ جب میں اور شجاع گھر پہنچے تو اس کے گھر کے باہر محلے کے لوگ جمع تھے اور مبارک باد اور مٹھائی دینے آ رہے تھے۔ رات ایک بجے ہمیں جا کر فرصت ملی۔ ایک تانتا بندھا ہوا تھا۔ میں نے شجاع سے کہہ دیا تھا کہ اس راز سے اسے پردہ اٹھانے، ماں اور بہن کو اعتماد میں لینے کی ضرورت نہیں۔ تم قومی ہیرو بن گئے ہو اور ہو سکتا ہے کہ دو ایک دن نہ صرف مزید انعامات اور رقم ملے بلکہ اس کے علاوہ اسے ملازمت کی پیش کش بھی ہو گی۔ جو اچھی ملازمت ملے اسے قبول کر لینا۔ ملک کے تمام اخبارات میں شجاع کی نہ صرف تصویریں شائع ہوئی تھیں بلکہ اس کا انٹرویو بھی تھا اور کچھ بڑی فرموں نے اپنی طرف سے اس کے لئے انعامات کا اعلان کیا تھا جو رقم کی صورت میں تھا۔ کوئی ایک ہفتہ تک اس کے اعزاز میں کالج اور مختلف اداروں کی جانب سے دعوتوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ دو تین فرموں کی جانب سے اسے ملازمت کی پیش کش بھی ہوئی لیکن اس نے اس لیے انکار کر دیا کہ وہ میری غیر موجودگی کے باعث

ایسے کھیل کا مظاہرہ کرنے سے رہا اس لئے وہ گم نامی میں جانا چاہتا تھا۔ اس کے پاس بیس لاکھ کی رقم جمع ہو چکی تھی اس لئے وہ کاروبار کرنا چاہتا تھا۔ ماں کے ساتھ مل کر ایک بوتیک کھولنے کا اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کی ماں کی یہ دیرینہ آرزو تھی۔ میرے نزدیک بھی یہ کاروبار بہتر ہی تھا۔

شجاع کی نجی مصروفیت ایسی تھی کہ میں دانستہ اس سے نہیں ملا تھا۔ میں تیسرے دن سکینہ ماں اور شجاع سے ملنے پہنچا۔ میں ان سے اجازت لینے گیا تھا تاکہ کراچی چلا جاؤں۔ میں یہاں بہت دن رک گیا تھا۔ جب میں گھر پہنچا تو سکینہ ماں گھر میں اکیلی تھیں۔ آمنہ اور شجاع گھر میں نہیں تھے۔ سکینہ ماں نے سسکیوں کے درمیان جواب دیا۔ ”وہ سہیلی سے ملنے گئی تھی جو اسی محلے میں رہتی ہے۔ وہ اس سے نوٹس لینے اور یہ کہہ کر گئی تھی کہ دس پندرہ منٹ میں آ جائے گی۔ تین بجے تک نہیں آئی تو میں پریشان ہو گئی۔ میں اس کی سہیلی کے ہاں پہنچی تو اس کی سہیلی نے بتایا کہ وہ تو نہیں آئی یہاں...... پھر شجاع آیا تو اسے بھیجا کہ اسے اور سہیلیوں کے ہاں دیکھ آئے۔ وہ اور سہیلیوں کے ہاں بھی نہیں تھی۔ ان کے ہاں گئی ہی نہیں تھی۔“

”شجاع کہاں ہے......؟“ میں نے دریافت کیا۔ ”کہیں وہ تھانے میں رپورٹ درج کرانے تو نہیں گیا ہے؟“

”وہ آمنہ کی ایک بہت ہی گہری سہیلی کے ہاں گیا ہے جو چندن پور میں رہتی ہے۔“ سکینہ ماں بولی۔ ”لیکن مجھے امید نہیں ہے کہ وہ وہاں ہو گی۔ کیوں کہ وہ ایک ذمے دار لڑکی ہے۔ جہاں کے لئے کہہ کر جاتی ہے وہیں جاتی ہے۔“

”کہیں محلے میں کوئی ایسا لڑکا تو نہیں جس پر آپ کو شک ہو کہ وہ اس کے ساتھ سہیلی کے ہاں جانے کے بہانے فلم دیکھنے گئی ہو؟“

”نہیں بیٹا! وہ ایسی لڑکی نہیں ہے۔“ سکینہ ماں بولی۔ ”البتہ مجھے لال میاں پر شک ہو رہا ہے کہ اس نے کوئی حرکت نہ کی ہو...... اس روز سے وہ ہمارا دشمن بن گیا ہے۔ وہ کل اس وقت گھر پر آ دھمکا تھا جب میں اکیلی تھی۔“

”وہ کمینہ شخص یہاں کیوں اور کس لئے آیا تھا؟“ میں نے چونک کر حیرت آمیز لہجے میں پوچھا۔

”اس لئے کہ ادھار کا تقاضا کرے۔“ سکینہ ماں کہنے لگی۔ ”اس نے کہا کہ میرے اندازے اور حساب کے مطابق تم پر بارہ ہزار نو سو ٹاکا نکلتے ہیں۔ مجھے اس بے ایمان کی بات پر غصہ آ گیا۔ میں نے کہا کہ تین ہزار چھ سو دس...... اس نے جیب سے ایک پرچا نکال کر بڑھایا۔ اس میں ایسا سامان بھی تھا جو میں نے ابھی بھی اس کی دکان سے نہیں لیا تھا۔ پھر میری اس سے تلخ کلامی ہو گئی۔ اس نے مجھے دھمکی دی کہ عدالت میں بند کرا دوں گا۔ پھر اس نے کہا کہ...... ہر ایک سے اندازے سے ادھار وصول کر رہا ہوں...... ایک شرط پر تمہارے ساتھ رعایت کر سکتا ہوں۔ یعنی یہ کہ آمنہ سے میری شادی کر دو۔ میں سارا قرض معاف کر دوں گا۔ میں نے اسے بری طرح جھڑک دیا اور کہا کہ تمہیں شرم نہیں آتی؟ وہ تمہاری بیٹی کی عمر کی ہے۔ میں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر تم نے اب کبھی اس دہلیز پر قدم رکھا تو مجھ سے

برا کوئی نہ ہوگا۔ وہ خاموشی سے چلا گیا۔ میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ ہو نہ ہو اس نے میری بیٹی کو اغوا کیا ہے۔ اس کی بدمعاشوں اور غنڈوں سے بڑی دوستی ہے اور ایک طرح سے اس نے ادھار کی وصول یابی کے لئے بدمعاش پال رکھے ہیں۔ غریب اور شریف لوگوں کو وہ ڈرا دھمکا کر من مانی ادھار وصول کرتا پھر رہا ہے۔ اللہ جانے میری بیٹی کہاں اور کس حالت میں ہوگی۔"

"سکینہ ماں!" میں نے دلاسا دیا۔ "آپ بالکل بھی فکر نہ کریں۔ اللہ نے چاہا تو آمنہ پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔"

"میری بیٹی!" سکینہ ماں نے ساڑھی کے پلو میں منہ چھپالیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پھر وہ سسکیوں کے درمیان بولیں۔ "وہ ایک نمبری شیطان ہے۔ اس کا کوئی بھروسا نہیں بیٹا! وہ کچھ بھی کرسکتا ہے۔ وہ میری معصوم بچی کی عزت خاک میں ملادے گا۔"

"ماں جی!" میں نے بڑی محبت اور نرمی سے کہا۔ "آپ اللہ پر بھروسا رکھیں۔ وہ ایک شریف اور نیک بچی ہے۔ اس پر آنچ بھی نہیں آسکتی اور نہ کوئی کچھ کرسکتا ہے...... انشاء اللہ وہ خیریت سے شام تک گھر آجائے گی۔ آپ یہ بتائیں کہ آپ کو اللہ کی ذات پر بھروسا ہے کہ نہیں......؟"

"کیوں نہیں ہے بیٹا!" وہ اپنی سسکیوں اور آنسوؤں پر قابو پاتے ہوئے بولیں۔ "اس کے بھروسے پر تو زندگی کاٹ رہی ہوں۔ اس کے مجھ پر اس قدر احسانات ہیں کہ میں اس کا ہزاروں برس بھی شکر ادا کروں تو شکر ادا نہ ہو۔ اس نے مجھے ہر مشکل سے نکالا ہے۔"

"جب اس نے آپ کو ہر مشکل سے نکالا ہے تو انشاء اللہ اس مشکل سے بھی نکال دے گا۔" میں نے کہا۔ "بس آپ ایک کام کریں۔ شجاع ابھی آتا ہوگا۔ اللہ کرے کہ اس کے ساتھ آمنہ بھی ہو مجھے آپ کے ہاتھ کی چائے کی بڑی طلب محسوس ہورہی ہے۔ بڑی مہربانی ہوگی ایک کپ چائے پلادیں۔"

"اس میں مہربانی کی کیا بات ہے بیٹے!" انہوں نے ساڑھی کے پلو میں آنسوؤں کو جذب کرتے ہوئے کہا۔ "ابھی لائی......"

آمنہ اور سکینہ ماں دونوں واقعی بہت اچھی چائے بناتی تھیں۔ انہیں چائے کے بہانے کمرے سے باہر بھیجنے کا مطلب یہ تھا کہ دیکھوں کہ آمنہ کہاں، کس حال میں اور کس کے پاس ہے۔ میں نے ٹی وی کی اسکرین پر ایک پھونک ماری۔ اسکرین پر فلم کا سا منظر ابھر آیا۔ ایک مکان کے کمرے میں آمنہ چوکی پر اکڑوں دیوار کے سہارے بیٹھی رو رہی تھی۔ چوکی پر بڑا صاف ستھرا اور نرم وگداز بستر بچھا ہوا تھا۔ وہ رو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ اس نے رو رو کر اپنی آنکھیں سجالی تھیں۔

اس کے سامنے لال میاں کھڑا کہہ رہا تھا۔ "میری جان! اب رونے دھونے سے کوئی فائدہ نہیں...... اب تھوڑی دیر بعد میرا آدمی قاضی صاحب کو لے کر پہنچنے والا ہے...... میں نے اب تک ان لڑکیوں کی عزت خراب کی جنہوں نے مجھ سے شادی سے انکار کیا۔ لیکن میں تمہارے ساتھ ایسا نہیں کروں گا۔ نکاح پڑھواؤں گا۔ شرعی طریقے سے شادی کروں گا۔ بیوی بناؤں گا۔ پھر تم اور تمہارے گھر والے کچھ نہ کرسکیں

گے۔ کیوں کہ تم میری ہو جاؤ گی اور میں تمہارا...... شرعی اور قانونی طور پر میری بیوی...... اس بات کا ثبوت نکاح ہوگا جسے عدالت، تمہارے گھر والے اور دنیا والے جھٹلا نہیں سکتے۔ تم اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لو۔"

"لیکن ایک لڑکی کو شرعی طور پر یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی پسند کی شادی کرے۔" آمنہ جو اپنے آنسوؤں اور ہچکیوں پر قابو پاچکی تھی اور اتنی دیر میں سنبھل چکی تھی تڑ سے بولی۔ "قانون نے لڑکی کو حق دیا ہے۔ میں تم سے کسی قیمت پر شادی نہیں کروں گی۔"

"میری جان!" وہ قہقہہ مار کر بڑے زور سے ہنسا۔ "تمہارے کہنے یا نہ کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ یہ شادی ہوکر رہے گی اور میں ہر قیمت پر کرکے رہوں گا۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھے تم سے شادی کرنے سے باز نہیں رکھ سکتی ہے۔ تم میری بیوی بن کر رہوگی۔ میرے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں ہے۔ میں نے اپنی ساری دولت دکان کی تجوری میں رکھی ہوئی ہے۔ ایک کروڑ بیس لاکھ ٹاکا...... تیس لاکھ کے وہ زیورات جو میں نے ادھار والوں سے کوڑیوں کے مول خریدے اور میری دکان میں اس وقت ایک کروڑ کا مال ہے...... ادھار لینے والوں نے مجھ سے تیس لاکھ کا ادھا لے رکھا تھا جو کھاتوں اور کمپیوٹر سے مٹ گیا لیکن اب میں اپنا حساب بنا کر ان سے ساٹھ لاکھ روپے وصول کروں گا۔ اگر کسی نے میرے حساب سے رقم ادا نہیں کی تو اسے کسی نہ کسی جرم میں جیل میں سڑادوں گا۔ میرا بھائی پولیس افسر ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ ہم دونوں کتنے بڑے حرامی ہیں...... میرا بھائی تو اتنا بڑا حرامی ہے کہ ہر شریف آدمی اور عورت اس کا نام سن کر تھر تھر کانپتی ہے۔"

آمنہ کچھ کہنے والی تھی کہ صحن میں چاپیں سنائی دیں۔ سکینہ ماں میرے لئے چائے لے کر آرہی تھیں۔ میں نے ٹی وی اسکرین پر پھونک ماری تو آواز اور تصویر غائب ہوگئی۔ چند لمحے بعد سکینہ ماں کمرے میں داخل ہوئیں اور حیرت سے بولیں۔ "سکندر بیٹے! تم کس سے بات کررہے تھے؟ میں نے مرد اور لڑکی کی آواز سنی۔ میں سمجھی آمنہ اور شجاع آگئے؟"

"جی نہیں سکینہ ماں!" میں نے کہا۔ "میں ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ کوئی ڈرامہ دکھایا جارہا تھا؟"

اس اثنا میں شجاع اندر داخل ہوا تو وہ متوحش ہورہا تھا۔ چہرہ زرد تھا۔ اس نے مجھے سلام کیا اور ماں سے کہا۔ "ماں میں نے چندن پور کی سہیلی کے ہاں اور بھی کئی سہیلیوں کے ہاں دیکھ لیا۔ آمنہ ان کے ہاں نہیں آئی۔"

"آپ ایک کپ چائے شجاع کو بھی دے دیں۔ ہم دونوں چائے پی کر اس کی تلاش میں جاتے ہیں...... انشاء اللہ اسے شام تک تلاش کرکے لے آئیں گے۔ آپ دعا کریں اور خود کو قابو میں رکھیں۔" میں نے انہیں دلاسا دیا۔

میں نے اور شجاع نے چائے پی اور گھر سے نکلے۔ باہر آکر اس سے کہا۔ "لال میاں نے آمنہ کو اغوا کرلیا ہے۔ وہ اسے اس مکان میں لے گیا ہے جو دو ہزاری کو جاتا ہے۔ وہ زبردستی شادی کرنے والا ہے۔ چلو...... ہم وہاں چلتے ہیں۔"

"یہ آپ کو کس نے بتایا؟" اس کے چہرے پر حیرت چھا گئی۔ "آپ کو کس طرح سے معلوم ہوا؟"

وہ آنکھیں پھاڑ کے دیکھنے لگا۔

"اب جب کہ میں تمہیں اپنے بارے میں بتا چکا ہوں اور تم یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی مجھ سے پوچھ رہے ہو!" میں نے کہا۔

"معاف کیجئے سکندر بھائی!" وہ خجل سا ہو کر بولا۔ "دراصل آمنہ کے نہ ملنے سے اس قدر پریشان ہو گیا ہوں کہ......"

پھر ہم نے ایک آٹو رکشا لیا اور اس طرف روانہ ہو گئے۔ اس گھر سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر اتر کے رکشا کو کرایہ ادا کیا۔ پھر اس طرف پیدل چل پڑے۔ یہ ویرانہ تھا۔ یہاں کھیت اور آلو کے باغ تھے۔ وہ مکان دور سے نظر آ رہا تھا۔

اس مکان کے باہر ایک چارپائی پڑی ہوئی تھی۔ تین مسلح بدمعاش پہرہ دے رہے تھے۔ ان میں سے ایک کے پاس ایک بڑی مضبوط لاٹھی تھی۔ دوسرے کے پاس کھلا ہوا چاقو تھا جو اس نے اپنے ہاتھ میں تھاما ہوا تھا اور اسے انگلیوں پر نچا رہا تھا۔ تیسرے کے پاس پستول تھا۔ وہ جرائم پیشہ تھے۔ ان کے چہروں پر سفاکی اور خباثت چھائی ہوئی تھی اور آنکھوں سے درندگی جھانک رہی تھی۔ وہ چوکنا اور ہوشیار تھے۔ معاً ان کی نظر جیسے ہی ہم پر پڑی وہ مستعد ہو گئے جیسے مقابلہ کرنے والے ہوں۔ جب ہم قریب پہنچے تو چاقو والے بدمعاش نے ہمارا راستہ روک لیا اور مجھ سے بڑی بدتمیزی سے بولا۔ "کون ہے تو......؟"

"کیا تم تمیز سے بات نہیں کر سکتے......؟" میں نے کہا۔ "آدمی دیکھ کر بات کی جاتی ہے۔ تمہیں آدمیوں کی بھی تمیز نہیں ہے؟"

"تو کیا مجھے تمیز سکھانے کے لئے آیا ہے؟" وہ اور بدتمیزی پر اتر آیا۔ "تمیز کے بچے تجھے ایسی تمیز سکھاؤں گا کہ تجھے تیرے باپ نے بھی کبھی سکھائی نہیں ہوگی...... میں نے اب تک نہ جانے کتنے لوگوں کو تمیز سکھا دی ہے۔ تو کیا پیچتا ہے سور کی اولاد......" شجاع کو ایک دم غصہ آ گیا۔ وہ اس بدمعاش کو مارنے کے لئے بڑھا تو اسے میں نے روک کر پیچھے کر لیا۔ "نہیں شجاع نہیں...... یہ جو بک رہا ہے اسے بکنے دو۔ اس لئے کہ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ کیوں کہ اس کے ماں باپ نے اسے تمیز نہیں سکھائی...... ورنہ یہ ایسی باتیں نہ کرتا۔ اسے یہ بتانا ہے کہ ہم تمیز سیکھنے نہیں لال میاں سے بات کرنے آئے ہیں۔ لال میاں نے ہمیں بلایا ہے۔" لال میاں کا نام سن کر وہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ پھر بولا۔ "تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ لال میاں اندر ہے جاؤ۔"

اس اثناء میں ایک گاڑی دھول اڑاتی اس طرف آتی دکھائی دی۔ جب وہ گاڑی آ کر رکی تو اس میں سے ایک قاضی صاحب اترے انہوں نے بغل میں ایک چرمی بیگ داب رکھا تھا۔ وہ شکل وصورت سے بہت ہی شریف آدمی دکھائی دے رہے تھے۔ اس گاڑی سے اور دو آدمی اترے۔ یہ اپنی وضع قطع اور چہرے مہرے سے چھٹے ہوئے بدمعاش لگ رہے تھے۔ جب وہ قاضی صاحب کو لے کر اندر داخل ہوئے تو لاٹھی والے بدمعاش نے آگے بڑھ کر ہم دونوں کو روک لیا۔ "ارے تم لوگوں نے اس قومی ہیرو کو نہیں

پہچانا...... یہ شجاع ہے۔ آمنہ کا بھائی...... لیکن یہاں یہ کیسے آ گیا......؟" وہ حیرت سے بولا۔ "اسے کس نے بتایا کہ اس کی بہن اغوا کر کے یہاں لائی گئی ہے؟ ہم لوگوں کے سوا کوئی نہیں جانتا ہے کہ لڑکی یہاں ہے۔"

"ہمیں کسی نہ کسی طرح پتا چل گیا اس لئے ہم یہاں آمنہ کو اپنے ساتھ لے جانے آئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہمیں اندر جانے دو......"

"تم تو کیا تمہارا باپ اور فرشتے بھی اندر نہیں جا سکتے......" لاٹھی والے بدمعاش نے لاٹھی فضا میں بلند کی۔ ان تینوں نے ہمیں نرغے میں لے لیا تھا۔ چاقو والے بدمعاش نے مجھ پر چاقو تان لیا تھا۔ پستول والے بدمعاش نے شجاع کو نشانے کی زد میں لے لیا تھا اور پستول کی نال موت کے فرشتے کی طرح اسے گھور رہی تھی۔ "لال میاں نے کسی غیر شخص کو اندر جانے سے منع کیا ہے......" لاٹھی والے نے تیز لہجے میں کہا۔ "جس طرح آئے ہو اسی طرح شرافت سے واپس چلے جاؤ...... ورنہ......"

"اگر تم دونوں کو اپنی زندگی اور جوانی پیاری ہے تو چلتے پھرتے نظر آؤ۔" پستول والے نے سفاک لہجے میں کہا۔ "تمہاری بہن کو لال میاں سے شادی کرنے دو۔ آمنہ خود بھاگ کر آئی ہے لال میاں کے ساتھ...... اب دفع ہو جاؤ...... کل لال میاں کے ہاں جا کر اپنی بہن سے مل لینا......"

شجاع اس بدمعاش کی باتیں سن کر آپے سے باہر ہو گیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور آنکھیں انگاروں کی طرح دہکنے لگیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرتا اس کا بازو پکڑ کے میں اسے واپس لے گیا۔ وہ ایک غیرت مند بھائی تھا۔ اس کی بہن کے متعلق اس بدمعاش نے جو باتیں کیں وہ ناقابل برداشت تھیں۔ وہ اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا کہ پتھر اٹھا کر دے مارے۔ لیکن اس سے کچھ حاصل نہ تھا۔ پستول والا گولی چلا دیتا۔ میں اسے گھسیٹتا ہوا اتنی دور اور ایسی جگہ لے گیا کہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ایک تالاب کے پاس پہنچ کر رک گیا۔

"سکندر بھائی!" شجاع گڑگڑاتے ہوئے بولا۔ "کچھ کیجئے نا...... وہ کمینہ لال میاں آمنہ سے شادی کر رہا ہے۔ قاضی صاحب بھی آ گئے۔"

"شجاع!" میں نے اسے سمجھایا۔ "میرے ہوتے ہوئے کچھ بھی نہ ہوگا۔ بس تم صبر کرو اور خاموشی سے تماشا دیکھتے جاؤ۔"

میں اسے تالاب کے کنارے لمبی لمبی گھاس پر لے کر بیٹھ گیا۔ تالاب کے پانی کی سطح پر سکون تھی۔ میں نے ایک پتھر اٹھا کر سطح پر دے مارا۔ اس میں ایک ہلچل سی ہوئی۔ پھر سابقہ حالت میں آ گئی۔ شجاع مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "اب ذرا تالاب میں تماشا دیکھو۔"

اس گھر کے اس کمرے کا منظر پانی کی سطح پر ٹی وی کے اسکرین پر دکھائی دینے والا منظر بن گیا۔

لال میاں نے قاضی صاحب اور ان کے ساتھ آئے بدمعاشوں کو کمرے میں بٹھایا اور ان سے کہا کہ وہ بیٹھیں۔ وہ لڑکی کو تیار کروا کے آتا ہے آپ اس وقت تک نکاح نامہ پر کریں۔ لڑکی کا نام آمنہ بیگم

ہے۔اس کے باپ کا نام ناظم الدین مرحوم ہے۔عمر سولہ برس کی ہے۔میرا نام لال میاں ہے۔میرے باپ کا نام کالو میاں ہے۔میری عمر پچاس برس کی ہے۔ان کے نام وکیل اور گواہ میں لکھ لیں۔ایک اور گواہ باہر کھڑے میرے آدمیوں میں سے بلالیں۔وکیل جو ہیں وہ لڑکی کے ماموں ہیں۔گواہ چچا اور پھوپھا ہیں۔"

اتنا کہہ کر لال میاں اس کمرے میں داخل ہوا جس میں آمنہ چوکی کے بستر پر بیٹھی ہوئی تھی۔بڑی اداس اور خاموش تھی۔اس نے کمرے کی میز پر رکھا ہوا ایک شاپنگ بیگ اٹھایا اور آمنہ کے پاس جا کر بولا۔"اس میں عروسی لباس اور میک اپ کا سامان ہے۔جلدی سے دلہن بن کر تیار ہو جاؤ...... قاضی صاحب آگئے ہیں۔اگر تم نے قاضی صاحب یا وکیل کے سامنے شادی سے انکار کیا تو میں تمہارے چہرے اور پورے جسم پر تیزاب پھینک دوں گا۔" پھر اس نے الماری میں سے تیزاب کی بوتل نکال کر دکھائی۔

آمنہ نے اس کے ہاتھ سے لباس کا بیگ لیا اور غسل خانے میں گھس گئی۔آدھا گھنٹہ گزر گیا۔اور اس آدھے گھنٹے میں لال میاں نے بھی شیو کر کے دوسرے غسل خانے میں جا کر نہا کر کپڑے بدلے اور دولہا کی طرح بن کر تیار ہو گیا۔پھر وہ آمنہ کے کمرے میں گیا تو اسے غسل خانے میں سے آمنہ اور ایک مرد کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔وہ دونوں دھیمے آپس میں کھسر پھسر کر رہے ہوں۔آمنہ کی شوخ ہنسی اور پھر یہ جملہ سنائی دیا۔"یہ کیا حرکت ہے میں لال میاں کی بیوی بننے والی ہوں۔چلو ہٹو...... مجھے تنگ نہ کرو......" پھر مرد کی آواز سنائی دی۔اس نے کہا۔

"تم شادی لال میاں سے ضرور کرنا...... لیکن تم شادی کے بغیر میری بیوی بن کر رہوگی...... نکاح کی کیا ضرورت ہے۔میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔"

لال میاں کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔دوسری طرف وہ حیران تھا کہ یہ کون شخص ہے۔غسل خانے میں کیسے گھس گیا؟ کہاں سے آ گیا؟ کب آیا؟ جب کہ اس نے ایک نہیں تین مسلح بدمعاش پہرے پر کھڑے کئے ہوئے ہیں۔پھر اس نے بڑے زور سے غسل خانے کے دروازے پر دستک دی۔"کون ہے اندر......؟ آمنہ باہر آؤ...... یہ تم کس حرام زادے سے باتیں کر رہی ہو۔"

"وہ تمہارے باپ سے بات کر رہی ہے۔" مرد کی آواز نے استہزائی لہجے میں کہا۔"لال میاں...... اب تو گھر جا...... آمنہ میری ہے۔"

"میں کہتا ہوں...... تو جو کوئی بھی ہے...... اور ہاں آمنہ تم بھی باہر آ جاؤ۔" لال میاں نے تڑختے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اگر ہم دونوں باہر نہیں آئے تو تم کیا کرو گے خبیث کی اولاد!" اندر سے مرد کی آواز نے تمسخر سے پوچھا۔

"میں کیا کروں گا......؟" لال میاں نے تڑختے لہجے میں جواب دیا۔"تمہیں جان سے مار دوں گا اور لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کتوں کو کھلا دوں گا...... میں بڑی کمینی چیز ہوں...... تم مجھے نہیں جانتے ہو۔"

لال میاں کی دھمکی کام کر گئی...... دوسرے لمحے دروازہ چرچراتا ہوا کھلا۔آمنہ عروسی لباس میں

ماوس دلہن بنی باہر آئی۔اس نے لمبا سا رنگین گھونگھٹ نکال رکھا تھا جس میں اس کا چہرہ چھپ گیا تھا۔اس کے بدن پر وہ قیمتی زیورات سجے ہوئے تھے جو لال میاں لایا تھا۔وہ ایک طرف لجائی اور شرمائی ہوئی کھڑی ہو گئی۔اس نے چہرے سے گھونگھٹ نہیں ہٹایا۔

"تو کس سے باتیں کر رہی تھی......؟" لال میاں نے لال ہو کر اس کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔"کون مردود تھا وہ......؟"

"وہ آپ کی روح تھی......" آمنہ نے رسیلی آواز میں جواب دیا۔"وہ مجھے دکھائی نہیں دی تھی۔"

"نہیں...... تو جھوٹ بول رہی ہے۔" لال میاں نے تڑختے ہوئے لہجے میں کہا۔"میں اس سور کو ابھی دیکھتا ہوں۔" دوسرے لمحے لال میاں آگے بڑھا۔پھر بھونچکا ہو کر دو قدم تیزی سے پیچھے ہٹا۔کیوں کہ دو اور دلہنیں عروسی لباس میں ملبوس گھونگھٹ میں چہرہ چھپائے ہوئے باہر آ رہی تھیں۔پھر وہ دونوں آمنہ کے پاس جا کر کھڑی ہو گئیں۔

لال میاں بری طرح چکرا گیا تھا اور اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ایک شد نہ دو شد بلکہ تین تین شد...... یہ تین تین دلہنیں کہاں سے اور کیسے آ گئیں...... ان میں سے آمنہ کون ہے؟ یہ دونوں کون ہیں؟ پھر اس نے غسل خانے میں جھانک کر دیکھا۔وہ خالی پڑا تھا۔اس میں کوئی مرد نہیں تھا۔غسل خانے میں جو روشن دان تھا وہ اتنا چھوٹا تھا کہ اس میں سے ایک بچہ بھی اندر نہیں آ سکتا تھا۔اس میں سلاخیں بھی لگی ہوئی تھیں۔مرد کو نہ پا کر وہ پاگل سا ہو رہا تھا۔آخر یہ کس مرد کی آواز تھی۔وہ کہاں چلا گیا اور پھر یہ دونوں دلہنیں کہاں سے اور کیسے آ گئیں؟ کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا تھا۔

وہ بری طرح الجھا ہوا تھا کہ ان میں سے ایک دلہن نے کہا۔"لال میاں! آپ مجھ سے بھی شادی کر لیں...... میں آمنہ سے کہیں حسین ہوں اور پھر میری عمر تیرہ برس کی ہے۔آپ کو اس عمر کی لڑکیاں تو بہت پسند ہیں نا......؟ میں پرکشش بھی ہوں۔"

لال میاں نے کچھ کہنے کے لئے زبان کھولی تھی کہ دوسری دلہن کے سراپا میں ایک ارتعاش سا پیدا ہوا۔وہ بولی۔"لال میاں! لال میاں...... میں بھی آپ سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔میری عمر صرف سولہ برس کی ہے۔میں آمنہ اور اس لڑکی سے بھی کہیں خوبصورت ہوں۔آپ مجھے بیوی بنا کر دنیا کے خوش نصیب ترین شخص بن جائیں گے۔"

لال میاں ایک طرف بہت خوش تھا تو دوسری طرف اس قدر الجھا ہوا تھا کہ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں اس کی نظریں دھوکا تو نہیں کھا رہی ہیں؟ کہیں اس کے دماغ پر شراب کا نشہ تو نہیں چھایا ہوا ہے۔اس نے آج صبح شراب تو پی تھی، لیکن تھوڑی سی، یوں تو وہ ہر روز ہی پیتا تھا لیکن اپنے حواس میں رہتا تھا۔نشہ نہیں چڑھتا تھا۔

"کیا آپ اس بات پر حیران ہو رہے ہیں کہ ہم کون ہیں؟" ان میں سے ایک دلہن بولی۔"ہم کیسے، کس طرح سے یہاں آ گئی ہیں، آخر ہم آپ سے کس لئے آمنہ کے ساتھ ساتھ شادی کرنا چاہتی ہیں؟"

”ہاں...... ہاں۔“ لال میاں نے سر ہلا دیا۔ ”میں یہاں صرف آمنہ کو لایا تھا۔ تم دونوں اپنے بارے میں جلدی سے بتاؤ کہ کون ہو......؟ اس غسل خانے میں کیسے آ گئیں؟ اس میں صرف ایک آمنہ تیار ہونے کے لئے گئی تھی؟“

”ہم سکینہ ماں کی بہنوں کی لڑکیاں ہیں۔ ایک چھوٹی بہن کی اور ایک بڑی بہن کی۔“ دوسری دلہن کہنے لگی۔ ”ہمارے ماں باپ کے مالی حالات بہت خراب تھے اس لئے انہوں نے بڑی پھوپھی کے ہاں بھیج دیا جو کومیلا شہر میں رہتی ہیں۔ آمنہ کا بھائی شجاع قومی ہیرو بنا تو ہم ان سے ملنے آئے۔ پتا چلا کہ آپ نے آمنہ کو اٹھوا لیا ہے۔ ہم یہاں آ گئے تاکہ آپ سے شادی کر لیں۔ ہمارے سرپرست ہماری شادی نہیں کر سکتے۔ ہم کسی نہ کسی طرح یہاں پہنچ گئیں۔ دراصل جس گاڑی میں آمنہ کو لے جایا جا رہا تھا وہ ہم نے دیکھ لی تھیں۔ ہم تعاقب کر کے یہاں پہنچ گئیں۔ اتفاق سے پچھلا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ہم اندر داخل ہوئیں اور غسل خانے میں چھپ گئیں۔ اب آپ کے سامنے موجود ہیں۔“

”لیکن یہ ایک جیسا لباس اور زیورات کہاں سے آئے؟“ لال میاں نے کہا۔ ”اصل بات کچھ اور ہے۔ تم جھوٹ بول رہی ہو۔“

”یہ ایک راز کی بات ہے۔“ تیسری دلہن بولی۔ ”جب آپ ہم تینوں سے شادی کر لیں گے تب ہم پردہ اٹھائیں گی۔“

”اچھا یہ بتاؤ کہ وہ مرد کون تھا جو تم سے غسل خانے میں باتیں کر رہا تھا؟“ لال میاں مشکوک، ششدر اور حیران تھا۔

”وہ مرد نہیں تھا بلکہ وہ میں تھی۔“ دوسری دلہن نے کہا۔ ”میں نے اداکاری سیکھی ہوئی ہے۔ ریڈیو اور اسٹیج پر کئی ڈرامے کر چکی ہوں۔ میں ہر عمر کے مرد کی آواز کی بھی نقل کر سکتی ہوں۔ لو سنو۔“ اس نے مرد کی آواز نکال کر سنائی۔

”مجھے تو صرف آمنہ سے شادی کرنا ہے۔“ لال میاں نے کہا۔ ”میں صرف اس کا عاشق ہوں۔“

”آپ ہم دونوں سے بھی شادی کر لیں نا......؟“ تیسری دلہن گڑگڑائی۔ ”آپ دنیا کے خوش قسمت ترین شخص ہیں جس کی شادی بیک وقت دنیا کی تین حسین ترین اور نوجوان لڑکیوں سے ہو رہی ہے۔ ہم نے جب سے آپ کو دیکھا۔ آپ پر مرمٹی ہیں۔ اس شادی سے ساری دنیا میں آپ کی شہرت ہو جائے گی اور آپ اس سے دولت بھی کما سکتے ہیں۔“

”اچھا تو تم دونوں اپنے اپنے مکھڑے دکھاؤ......؟“ لال میاں خوش ہو کر بولا۔ ”میں دیکھوں تم دونوں کیسی ہو؟“

”ہم نکاح کے بعد ہی اپنے مکھڑے دکھائیں گے۔“ دوسری دلہن بولی۔ ”کیا آپ کو ہمارے گورے گورے سڈول اور خوبصورت ہاتھوں اور پیروں سے اندازہ نہیں ہو رہا ہے؟“

لال میاں نے ان کے خوبصورت ہاتھوں کو دیکھا تو اس کا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ وہ خیالی

آئینے میں ان کے حسین چہرے اور سراپا دیکھ کر ان کی حشر سامانیوں میں ڈوب رہا تھا۔ گورا رنگ اس پر نشہ بن کر چھا رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد قاضی صاحب نے اس کمرے میں لال میاں کا نکاح ان لڑکیوں سے پڑھا دیا اور وہ اپنی مٹھائی لے کر یعنی اپنی فیس لے کر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد اس کمرے میں لال میاں اور دلہنیں رہ گئیں۔ ان میں سے اب تک کسی دلہن نے گھونگھٹ نہیں اٹھایا تھا۔ لال میاں نے ایک دلہن کا گورا گورا سڈول ہاتھ تھام لیا۔

”اچھا...... میں اب باری باری تم تینوں کا گھونگھٹ اٹھاتا ہوں۔“ لال میاں نے کہا۔ ”تمہارے چہرے دیکھنے کے لئے تڑپ رہا ہوں۔ اب مزید انتظار کی تاب مجھ میں نہیں رہی ہے۔ تم تینوں میرے چاند ہو۔“

”آپ یہ زحمت نہ کریں......“ اس دلہن نے لال میاں کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا کر کہا۔ ”اب ہم خود ہی الٹ دیتے ہیں۔“ پھر ان تینوں نے باری باری اپنے اپنے رنگین گھونگھٹ الٹ دیئے۔ لال میاں نے انہیں پر اشتیاق نظروں سے دیکھا۔ دوسرے لمحے اس پر جیسے کوئی بجلی سی آ گری۔ اس پر سکتہ سا چھا گیا۔ پھر وہ بھونچکا ہو کر بولا۔ ”تم...... تم...... تم......؟“ لال میاں کو اپنی آنکھوں پر جیسے یقین نہیں آیا...... کیوں کہ تینوں دلہنیں ان کی بیویاں تھیں۔

”ہاں...... ہم......“ ان میں سے پہلی بیوی بولی۔ ”آخر یہ سب کیا ہے؟ یہ تم نے ہمارے ساتھ کیسا ڈراما کیا؟“

”ڈراما......؟“ لال میاں، لال ہو کر بولا۔ ”یہ بتاؤ کہ تم تینوں یہاں آئیں کیسے......؟ یہاں کون لایا......؟ آخر یہ سب کیا ہے......؟ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا......“

”ہمیں عامل شکور صاحب نے یہاں لا چھوڑا اور کہہ گئے کہ تمہارا میاں بیک وقت تین لڑکیوں سے شادی کر رہا ہے۔“ دوسری بیوی بولی۔ ”پھر انہوں نے ہمیں اپنے علم کے زور سے ایسا بنا دیا تاکہ شادی نہ کر سکو...... آخر تم اس عمر میں کتنی شادیاں کرو گے...... شرم کرو شرم...... تمہارے سر کے بال سفید ہو گئے ہیں اور بیٹیاں جوان......“

”اپنی بکواس بند کرو......“ لال میاں دہاڑا۔ ”میں عامل صاحب اور ان کے باپ کو بھی دیکھ لوں گا۔ آمنہ کہاں ہے؟“ پھر اس نے اپنے بدمعاشوں کو آوازیں دیں۔ ان میں سے ایک بھی اندر نہ آیا۔ وہ کمرے سے پیچ و تاب کھاتا ہوا باہر آیا۔ اس نے دیکھا کہ اس کے مسلح بدمعاش بے ہوشی کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس کی تینوں بیویاں باہر آ کر بولیں۔ ”ہم یہاں آئی تھیں تو یہاں کوئی لڑکی نہ تھی...... تم پاگل ہو گئے ہو۔ گھر چلو۔“

☆......☆......☆

جب ہم اس مکان میں پہنچے تھے تو کسی کو نظر نہیں آئے۔ نہ کوئی ہمیں دیکھ سکتا تھا اور نہ ہماری آواز

سن سکتا تھا۔ لیکن ہم سب کو دیکھ اور سن سکتے تھے۔ آمنہ نے ہماری چاپیں سن کر گھٹنوں سے سر نکالا۔ آمنہ لال میاں کی تینوں بیویوں کی نظروں سے بھی اوجھل رہی تھی۔ ہم دونوں کو دیکھتے ہی وہ تڑپ کر اٹھی اور شجاع سے لپٹ کر رونے لگی۔ ہم دونوں نے اسے سمجھایا کہ گھبرانے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ خطرہ اور مصیبت ٹل گئی ہے۔ باہر آئے۔ لال میاں کی تینوں بیویاں اپنے شوہر کو ساتھ لے گئی تھیں۔ ہم نے مین روڈ پر آکر ٹیکسی لی اور سیدھے گھر پہنچے۔ آمنہ ماں کے گلے سے لگ کر رونے لگی۔ سکینہ ماں بھی رونے لگیں۔ لال میاں نے عامل شکور صاحب کو بہت تلاش کیا تاکہ ان کی خبر لے۔ کیوں کہ انہوں نے اس کا سارا منصوبہ چوپٹ کر دیا تھا۔ عامل شکور صاحب تو باری سال میں تھے۔ ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ ان کے ہم شکل نے کیا کارنامہ انجام دیا۔

سکینہ ماں، دوسرے دن آمنہ کو لے کر اپنی بڑی بہن کے ہاں جزیرہ سندیپ چلی گئی جو چٹا گانگ سے قریب تھا تاکہ آمنہ بہل جائے۔ آمنہ اغوا کے واقعہ سے بہت گھبرا گئی تھی۔ شجاع نے مجھے دو ایک دن کے لئے روک لیا تھا۔ وہ بھی خوف زدہ اور پریشان ہو گیا تھا۔

ادھر لال میاں نے محلے میں غنڈہ گردی اور دہشت گردی کر رکھی تھی۔ اس نے ادھار لینے والوں کو تنگ اور ہراساں کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ پولیس کے دو تین سپاہیوں کو لے کر ان کے گھروں پر پہنچ جاتا تھا ادھار کی وصولی یابی کے لئے...... وہ ان سے ادھار سے دگنی چوگنی رقم کا مطالبہ کرتا تھا۔ ایک دو نے ادا کر دیا۔ ہر کوئی ادا نہیں کر سکتا تھا۔ قسطوں میں ادا کرنے کا وعدہ کیا تو ان سے لکھوا لیا۔ اس محلے میں وکیل صاحب تھے انہوں نے لال میاں پر مقدمہ دائر کر دیا۔ دوسرے ہی دن عدالت نے سب کھاتوں کے رجسٹروں اور کمپیوٹر سمیت اسے عدالت میں طلب کر لیا۔ لال میاں خود یہ تمام لے کر آیا تھا کہ عدالت کو بتا سکے کہ اس نے کمپیوٹر میں جو حساب فیڈ کیا تھا وائرس نے اسے تباہ کر دیا۔ رجسٹروں میں سے لکھا ہوا کس طرح مٹ گیا۔ اس کے تمام رجسٹروں کے کاغذ سادے ہو گئے ہیں۔

اس روز عدالت میں شجاع بھی محلے والوں کے ساتھ موجود تھا اور لال میاں کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وکیل صاحب نے محلے کے کچھ لوگوں کو پیش کیا۔ انہوں نے عدالت میں بیان دیا کہ لال میاں سے ان لوگوں نے جو ادھار سودا سلف لیا تھا اس کے پاس حساب نہ ہونے کے سبب وہ اندازے سے پانچ گنا رقم وصول کرنا چاہتا ہے۔ اس کا بھائی چوں کہ ایس ایچ او ہے وہ اس کا نام لے کر دھمکاتا ہے۔ ساتھ میں سپاہی بھی لے کر پہنچ جاتا ہے۔ دہشت گردی مچا رکھی ہے۔ اسے باز رکھا جائے۔ صحیح حساب پیش کرے۔ اگر اس کے پاس حساب نہیں ہے تو اسے جو حساب اور رقم دی جائے وہ لے لی جائے۔

شجاع جب جج کے سامنے پیش ہوا تو اس نے کہا۔ ”لال میاں جھوٹ بولتا ہے۔ یہ شخص دھوکے باز، لالچی ہے۔ اسے دولت کی بہت ہوس ہے۔ اس کے کھاتوں کے رجسٹروں میں حساب لکھا ہوا ہے۔ مٹا نہیں ہے۔ کمپیوٹر میں فیڈ ہے غریب لوگوں کو لوٹنے کے لئے جھوٹ بول رہا ہے۔ اس وقت کمپیوٹر اور اس کے رجسٹر چیک کئے جائیں۔“

جب جج اور وکیل نے کھاتے کے رجسٹر چیک کئے تو اس میں حساب لکھا ہوا تھا۔ کمپیوٹر میں بھی حساب فیڈ تھا۔ لال میاں سکتے میں آ گیا۔ اس کی ایسی بے عزتی ہوئی اور اس قدر ذلیل ہوا کہ ہر طرف سے شیم شیم کی آوازیں گونجنے لگیں۔ وہ دم بہ خود تھا اور اس کی حالت مردے سے بھی بدتر تھی۔ جج صاحب نے اسے خوب لتاڑا...... اسے تنبیہہ کی اور اس پر تیس ہزار کا جرمانہ کیا اور پر عدالت نے کہا کہ حساب نہ ہونے کے بہانے اس نے ادھار لینے والوں سے منہ مانگی رقم وصول کرنے کی کوشش کی یا ہراساں کیا تو وہ اسے پانچ برس کے لئے اندر کر دیں گے۔ یہ سزا قید بامشقت ہو گی۔ اس نے جن لوگوں سے من مانی رقم وصول کی اور تحریر لکھوائی وہ واپس کرنے کا حکم دے کر عدالت کی کارروائی برخاست کر دی۔ وکیل صاحب بھی اس کی دکان سے سودا سلف لیتے تھے۔ لال میاں نے انہیں چھیڑ کر پیروں پر کلہاڑی ماری تھی۔

جب لال میاں کمپیوٹر اور کھاتوں کے رجسٹروں کے ساتھ دکان پہنچا تو پھر سارا حساب صاف تھا۔ کمپیوٹر سے اور رجسٹروں سے...... اس نے سر پیٹ لیا۔ تاہم اسے شجاع پر سخت غصہ آیا تھا۔ کیوں کہ آمنہ سے اس نے جو شادی کا خواب دیکھا تھا وہ پورا نہیں ہوا...... شجاع نے اسے بھری عدالت میں بری طرح ذلیل و خوار کر دیا تھا۔

دوسرے دن رات کے وقت میں گھر پر اکیلا تھا۔ شجاع اپنی ماں اور بہن سے ملنے صبح کے وقت سندیپ جزیرہ چلا گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اس کی واپسی دس گیارہ بجے تک ہو گی۔ میں گہری نیند سو گیا تھا۔ صبح آنکھ کھلی۔ اس وقت دن چڑھ آیا تھا۔ شجاع گھر پر نہیں تھا۔ میں یہ سمجھا کہ ماں اور بہن نے اسے ایک دن کے لئے روک لیا ہو گا۔ میں منہ ہاتھ دھو کر محلے میں آیا۔ ایک ہندو مرن چند کی حلوہ پوری کی دکان تھی۔ وہ پوری، حلوہ اور ترکاری اتنی اچھی بناتا تھا کہ لوگ انگلیاں چاٹ لیتے تھے اور بڑا رش ہوتا تھا۔ میں اور شجاع دو ایک مرتبہ اس دکان پر ناشتا کر چکے تھے۔ میں اس کی دکان پر ناشتا کرنے چلا گیا۔

میزیں بھری ہوئی تھیں۔ ایک ایسی میز نظر آئی جس کی ایک کرسی خالی تھی۔ تین کرسیاں جو خالی نہیں تھیں ان پر محلے کے تین نوجوان بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔ میں بھی حلوہ پوری اور ترکاری منگوا کر ناشتا کرنے لگا۔ ان میں سے ایک لڑکے نے چونک کر مجھے دیکھا اور پوچھا۔ ”آپ شجاع کے دوست ہیں ......؟“ میں نے سر ہلایا تو اس نے کہا۔ ”اس کا کیا حال ہے؟“

”اس کا حال ٹھیک ہی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”وہ اپنی ماں اور بہن سے ملنے سندیپ گیا ہوا ہے۔ رات اسے آنا تھا نہیں آیا۔“

”رات وہ آیا تھا۔“ دوسرے لڑکے نے کہا۔ ”وہ گھر جانے کے بجائے تھانے پہنچ گیا۔ اسے پولیس گرفتار کر کے لے گئی۔“

”کیا......؟“ میں ایک دم سے چونک پڑا۔ ”وہ کس لئے؟“ پھر مجھے ایک دم سے لال میاں کا خیال آیا۔ یہ اس کی حرکت ہو گی۔

”اس لئے کہ رات گیارہ بجے اس نے ایک گھر میں گھس کر ایک لڑکی کی عزت لوٹنے کی کوشش کی

تھی۔'' تیسرے لڑکے نے کہا۔'' وہ اس لڑکی کے پیچھے بہت دنوں سے پڑا ہوا تھا۔ وہ لڑکی کسی اور محلے کی ہے۔ وہ یہاں آئی ہوئی تھی۔ جن کے ہاں وہ ٹھہری ہوئی تھی وہ لوگ کسی تقریب میں گئے ہوئے تھے۔ لڑکی نے مزاحمت کی۔ اس کے قابو میں نہیں آئی تو اس کے سینے میں چاقو گھونپ دیا۔''

''کیا وہ لڑکی مرگئی......؟'' میں نے چونک کر حیرت سے پوچھا۔ مجھے اس بات پر یقین نہیں آیا۔ یہ ناممکن سی بات تھی۔

''یہ تو مجھے اور میرے دوستوں کو نہیں معلوم کہ وہ لڑکی زندہ ہے یا مرگئی؟'' پہلے لڑکے نے کہا۔''اس وقت پولیس کی موبائل گشت پر اتفاق سے آنکلی تھی۔ ایمبولینس منگوا کر لڑکی کو سرکاری اسپتال بھیج دیا گیا۔ شجاع کو پولیس گاڑی میں بٹھا کر تھانے لے گئی۔''

''لیکن شجاع ایسا لڑکا نہیں ہے کہ گھر میں گھس کر کسی لڑکی کی عزت پر ہاتھ ڈالے؟'' میں نے کہا۔ ''کیا آپ لوگ نہیں جانتے وہ کیسا لڑکا ہے۔ شریف اور نیک ماں کا سعادت مند اور نیک بیٹا...... اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ آپ کیا کہتے ہیں؟''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔'' دوسرے لڑکے نے تائیدی لہجے میں کہا۔'' محلے اور کالج میں اس کا ریکارڈ ہمیشہ اچھا ہی رہا۔ اس نے کبھی کسی لڑکی کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ دراصل یہ لڑکی اس کی فین تھی۔ سترہ اٹھارہ برس کی ہوگی۔ اس نے بات کرنے شجاع کو اندر بلایا تھا۔ جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ تنہائی شیطان ہوتی ہے۔ شجاع بہک گیا اور اس پر شیطان سوار ہوگیا...... یہ گھر لال میاں کے مکان کے سامنے ہے۔ لال میاں گواہ ہے۔ اس نے شجاع کو اس گھر میں گھستے دیکھا تھا۔''

میں کچھ سمجھا اور کچھ نہیں سمجھا۔ میں وہاں سے سیدھا تھانے پہنچا اور سیدھا ایس ایچ او کے کمرے میں گھس گیا۔ اس کا نام لال تھا۔ وہ ایک ہٹا کٹا شخص تھا۔ حرام کی کھا کھا کر سور ہو رہا تھا۔ وہ پولیس انسپکٹر کم ایک ڈاکو اور پیشہ ور مجرم لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خباثت تھی اور آنکھوں سے سفاکی جھانک رہی تھی۔ اس کے جسم پر سیروں چربی ہوگی۔ اس کی توند باہر کو مٹکے کی طرح ہو رہی تھی۔ اس کی سفاک آنکھیں شراب کی وجہ سے سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ گینڈے کی طرح لگ رہا تھا۔

''کون ہو تم......؟'' اس نے مجھے اوپر سے نیچے دیکھا اور غرایا۔''تم اجازت کے بغیر اندر کیسے آگئے......؟''

''میرا نام سکندر ہے۔'' میں نے اسے جواب دیا اور ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔''عوام کے جو خادم اور قانون کے محافظ ہوتے ہیں ان کے کمرے میں جانے کے لئے اجازت کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ اس لئے کہ عوام ٹیکس جو دیتے ہیں۔ وہ عوام کے ملازم ہیں۔''

''یوشٹ اپ......'' وہ دہاڑا۔''میں تمہارے باپ کا نوکر نہیں ہوں۔ نکل جاؤ میرے کمرے سے...... اور!''

''میں شجاع کا کزن ہوں۔'' میں نے کہا۔''مجھے تھوڑی دیر پہلے معلوم ہوا کہ رات آپ لوگوں نے

اسے گرفتار کر کے حوالات میں ڈال دیا ہے......''

''شجاع کے کزن......؟'' انسپکٹر نے ایسے انداز اور لہجے میں کہا جیسے میں شجاع کا نہیں شیطان کا کزن ہوں۔ اس مردود کا چہرہ ایک دم سے دمک اٹھا اور اس کی آنکھیں کسی وحشی بھوکے درندے کی طرح چمکنے لگیں۔ اس کے لہجے میں زہر بھرا ہوا تھا۔

''جی ہاں...... میں شجاع کا کزن ہوں۔'' میں نے سر ہلایا۔''میں دراصل یہ معلوم کرنے حاضر ہوا ہوں کہ اسے کس جرم کی پاداش میں گرفتار کیا گیا ہے؟ اس پر کیا الزام لگایا گیا ہے۔ کیا آپ بتانے کی زحمت گوارا کریں گے۔ آپ کی بڑی نوازش ہوگی۔''

''آپ کے کزن شجاع نے کھیل کے میدان میں بڑے کارنامے انجام دیئے اور وہ ہیرو بن گیا۔ قومی ہیرو۔'' اس نے مجھے آپ سے مخاطب کیا تھا اس میں طنزیہ تمسخر بھی تھا۔''آپ جانتے ہیں...... رات اس نے ایک عظیم کارنامہ انجام دیا اس میں بھی وہ ہیرو بن گیا ہے؟''

''آپ بتایئے ناسر! کہ اس کا جرم کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔''وہ ہرگز ایسا نہیں ہے کہ اسے کسی الزام کے تحت گرفتار کیا جائے؟''

''رات گیارہ بجے جب وہ گھر جا رہا تھا اور جس گلی سے گزر رہا تھا وہ ویران اور سنسان پڑی تھی اور اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔'' انسپکٹر کہنے لگا۔''اتفاق سے ایک گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ شاید ہوا سے کھل گیا۔ اس گھر میں ایک لڑکی جو کومیلا سے آئی ہوئی تھی ٹھہری ہوئی تھی۔ اس کے میزبان کسی دعوت میں شرکت کی غرض سے گئے ہوئے تھے۔ وہ طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے جانہ سکی تھی۔ اس قومی ہیرو نے کسی طرح معلوم کرلیا کہ یہ لڑکی گھر میں اکیلی ہے۔ چوں کہ لڑکی نے بڑی مزاحمت کی۔ وہ لڑکی کو بے بس کر کے قابو میں کرنا چاہتا تھا۔ لڑکی نے اپنی عزت بچانے کے لئے چیخ و پکار شروع کردی۔ اس نے چاقو نکال کر لڑکی کے سینے میں اتار دیا۔ اتفاق سے رات میں، میں موبائل گاڑی میں گشت پر نکلا ہوا تھا۔ ہم لوگوں نے لڑکی کی چیخ و پکار سنی۔ اس قومی ہیرو نے اس کے سینے سے چاقو نکال لیا تھا۔ میں نے فوراً اسپتال ایمبولینس منگوائی۔ لڑکی زخمی اور بے ہوش ہوچکی تھی۔ پھر ہم اس ہیرو کو لے کر تھانے پہنچے اور اسے ی مہمان بنالیا۔ میں نے تمہیں بہت تفصیل سے سارا واقعہ سنا دیا ہے۔ ہم تمہارے اور کسی کے باپ کے نوکر نہیں ہوتے ہیں جو اس قدر تفصیل سے بتائیں۔ میں نے کوئی بات نہیں چھپائی۔ یہ ایک سیدھا سادا ں ہے۔ اس واقعہ کا ایک گواہ میرا بھائی لال میاں بھی ہے۔''

''آپ کی اس نوازش کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے اس حقیر کو اس قابل جانا۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔''میں آپ سے ایک اور بات معلوم کرنے کی زحمت چاہتا ہوں۔ آپ یہ بتائیں کہ وہ لڑکی ہ ہے یا مرگئی ہے، اس کی عزت پر آنچ تو نہیں آئی......؟''

''ڈاکٹر لوگ اس بدنصیب لڑکی کی زندگی بچانے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔'' انسپکٹر نے جواب دیا۔ ''اس کا بیان لیا نہیں جا سکا ہے۔ جب وہ بیان دینے کے قابل ہو جائے گی تب معلوم ہوگا کہ اس کی عزت

پر آنچ آئی کہ نہیں...... میرا خیال ہے کہ اس کی عزت لٹ گئی ہے۔"

"کیا میں اپنے کزن سے ملاقات کر سکتا ہوں؟" میں نے کہا۔ "میں صرف تھوڑی دیر کے لئے اس سے ملنا اور بات کرنا چاہوں گا۔"

"ضرور...... ملاقات کریں۔" انسپکٹر نے کہا۔ "اسے یہ سمجھائیں کہ وہ میری بات مان لے۔ اس میں اس کی بھلائی ہے...... لیکن اس سے ملاقات کرنے کے لئے تھانے کے دستور اور روایت کے مطابق ہماری خدمت میں نذرانہ پیش کرنا ہوگا۔ جبھی اجازت ملے گی۔"

"آپ حکم فرمائیں...... آپ کی خدمت میں کیا نذرانہ پیش کروں؟" میں نے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ اس کے بغیر کوئی کام ہو نہیں سکتا۔"

"سکندر اعظم! تو نے اپنا یہی نام بتایا نا......؟" انسپکٹر ہنس کر بولا۔ "تم بہت سمجھدار اور معقول آدمی ہو۔ تم صحیح شخص ہو...... اچھا ہی ہوا تم آ گئے...... معاملات بخیر و خوبی طے پا جائیں گے۔ آپ صرف دو سو ٹاکا عنایت فرمائیں۔" وہ بے غیرت ہنس پڑا۔

اس کی ایک جیب میں رشوت کے پانچ ہزار ٹاکا رکھے تھے۔ صرف ایک لحظہ میں وہ پانچ ہزار میری جیب میں آ چکے تھے۔ وہ سو سو ٹاکا کے نوٹ تھے۔ اسے احساس بھی نہ ہو سکا۔ میں نے اس میں سے اسے دو سو ٹاکا دیئے تو اس نے وہ نوٹ میز کی دراز میں رکھ دیئے۔ پھر ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے چپراسی رامو کو آواز دی۔ وہ اندر آیا تو بولا۔ "اسے شجاع صاحب کے پاس لے جاؤ۔ میں تھوڑی دیر میں ایس پی صاحب سے مل کر آ رہا ہوں...... سکندر صاحب جو بھی بات کریں، حکم دیں۔ اسے بجا لانا۔ انہیں شکایت کا موقع نہ دینا۔"

انسپکٹر بھی میرے ساتھ کمرے سے نکلا اور مجھے کہا۔ "تم جانا نہیں۔ میری واپسی کا انتظار کرنا۔ تم سے معاملات طے کرنا ہیں۔"

رامو مجھے اپنے ہمراہ لے کر تہ خانے میں پہنچا۔ یہ تہ خانہ نہیں ٹارچر سیل تھا۔ یہاں وہ ہر چیز موجود تھی جس سے قیدیوں پر تشدد کیا جا سکے۔ ٹارچر سیل دیکھتے ہی بے گناہ اور شریف آدمیوں کی روح فنا ہو جائے۔ اس ٹارچر سیل میں شجاع کو ایک ستون سے پابہ زنجیر کیا ہوا تھا۔ شجاع پر تشدد کیا ہوا تھا جس نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ نہ صرف اس کے جبڑے سوجے ہوئے تھے بلکہ نچلا ہونٹ کٹ گیا تھا اور زخم سے نکلا خون جم گیا تھا۔ آنکھیں بھی سوجی ہوئی تھیں۔ اس کے کپڑے پھاڑ دیئے گئے تھے۔ اس کے جسم پر تشدد سے جو نشان اور زخم آئے تھے وہ لباس سے جھانک رہے تھے۔ وہ نڈھال، تھکن اور زخموں سے چور چور تھا۔ اس کا سر ڈھلکا ہوا تھا اس پر غشی سی طاری تھی۔ اس نے چاپیں سن کر آنکھیں کھول کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن اس کی آنکھیں کھل نہیں سکیں۔

شجاع کے مقابل میں چند قدم پر ایک نوجوان سی لڑکی کو کرسی سے باندھا ہوا تھا۔ اس پر بھی تشدد کیا گیا تھا دکھ اور حیرت کی بات تھی کہ ایک نوجوان لڑکی کو ٹارچر سیل میں لا کر اسے تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ وہ

بہت حسین تھی۔ اس میں بڑی جاذبیت اور کشش اور ایک عجب سی دل کشی تھی۔

اس لڑکی کی بڑی بڑی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ اس کا ایک رخسار بھی سوجا ہوا تھا۔ وہ ہوش میں تھی۔ اس کے چہرے پر نفرت چپکی ہوئی تھی اور آنکھوں سے حقارت جھانک رہی تھی۔ وہ اپنی وضع قطع اور چہرے مہرے سے کسی اچھے اور تعلیم یافتہ گھرانے کی لگ رہی تھی۔ یہ بات سمجھ سے بالاتر تھی کہ اسے یہاں کس لئے لایا گیا تھا اور کس جرم کی سزا دی گئی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر میرا دل بری طرح دکھ گیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ پولیس والے ہلاکو اور چنگیز خان کی روح کو بھی شرما دیتے ہیں۔

اس ٹارچر سیل میں تین خون آشام بھیڑیے موجود تھے۔ ایک کا قد نکلتا ہوا سا تھا۔ وہ بڑا خبیث دکھائی دے رہا تھا۔ دوسرا جو تھا وہ گنجا اور بھاری بھرکم جسم کا تھا۔ چہرے مہرے سے ہی پیشہ ور قاتل دکھائی دیتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں انگارے دہک رہے تھے۔ اس کے ہاتھ فولادی لگتے تھے۔

اس لڑکی اور ان تینوں بدمعاشوں نے میری طرف دیکھا۔ راہ داری میں، میں نے اپنے ساتھ آنے والے سپاہی کی سو ٹاکا سے مٹھی گرم کر دی تھی۔ اس لئے وہ بولا۔

"انسپکٹر صاحب نے شجاع سے بات چیت کرنے بھیجا ہے۔ یہ جو بھی بات کہیں مان لی جائے کسی بات سے انکار نہ کیا جائے۔"

"کیا شجاع کو رہا کرنے کا یہ حکم دیں تو اسے رہا کر دیا جائے؟" کانے نے پوچھا۔ "یہ شخص شجاع کا کون ہے؟ کیا بڑا بھائی ہے؟"

"نہیں رہا کرنے کے لئے نہیں کہا ہے۔" رامو نے جواب دیا۔ "وہ ایس پی صاحب کے دفتر ان سے ملنے گئے ہیں۔ وہ وہاں سے یہاں آ کر شجاع کے بارے میں ان سے معاملات طے کریں گے۔ ان کا نام سکندر ہے۔ یہ شجاع کے کزن ہیں۔ انہیں ملنے کی اجازت دی جائے۔"

جب وہ دونوں آپس میں باتیں کر رہے تھے تب میں نے اس لڑکی اور شجاع کے چہرے سے اندازہ کر لیا کہ یہ دونوں بھوکے پیاسے ہیں۔ انہیں بھوکا رکھا گیا ہے۔ میں نے جیب سے سو سو ٹاکا کے دو نوٹ نکال کر رامو کی طرف بڑھائے۔ "سنو...... سب کے لئے حلوا، پراٹھا، قیمہ، انڈوں کا آملیٹ، مکھن، سلائس اور چائے لیتے آنا...... میرے خیال میں یہ رقم کافی ہوگی۔ کم تو نہیں پڑے گی۔"

"دو سو ٹاکا اور دیں صاحب!" رامو ان تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "ہم تینوں، چاروں ہی دو سو ٹاکا کا مال کھا جائیں گے۔"

میں نے اسے اور دو سو ٹاکا دے دیئے۔ یہ کون سا میرے باپ کا مال تھا۔ جب وہ جانے لگا تو کانا بولا۔ "ٹھہرو......" رامو رک گیا۔ میں سمجھا شاید وہ اپنی پسند کی کوئی چیز منگوانا چاہتا ہے۔ پھر وہ میری طرف متوجہ ہو کر بولا۔ "آپ دو سو ٹاکا دیں گے تو ان کے لئے ناشتا آئے گا۔"

میں نے دو سو ٹاکا کی بجائے تین سو ٹاکا اس کی طرف بڑھائے تو وہ حرام زادہ خوش ہو گیا۔ رامو تیزی سے چلا گیا۔ میں لڑکی کی طرف بڑھا۔ کیوں کہ اس کی حالت زیادہ قابل رحم تھی۔ وہ ایک کومل سی لڑکی

تھی۔ جیب سے رومال نکال کر اس کا چہرہ صاف کیا تو میری اس ہمدردی پر اس کا دل بھر آیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ میں نے اس کے موتیوں جیسے صاف وشفاف آنسوؤں کو رومال میں جذب کرتے ہوئے سرگوشی کی۔ ''بہن! فکر نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''آپ نہیں جانتے...... یہ درندے ہیں...... یہ جانتے ہی نہیں ہیں کہ عورت اور انسانیت کیا ہوتی ہے۔'' وہ سسک پڑی۔

''میں جانتا ہوں یہ کیسے لوگ ہیں......؟ آپ فکر نہ کریں۔'' میں نے اسے دلاسا دیا۔ ''میں آپ کو بھی یہاں سے نکال کر لے جاؤں گا۔''

''یہ ناممکن ہے......'' وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ ''یہاں جو آتا ہے انہیں موت ہی نجات دلاتی ہے۔ یہاں سے لاش جاتی ہے۔''

''اب جبکہ میں یہاں آ گیا ہوں تو ایسا نہیں ہوگا۔ اللہ پر بھروسا رکھیں۔'' میں نے کہا۔ ''آپ کا نام کیا ہے؟ آپ کو یہاں کس لئے لایا گیا ہے؟''

''ایک بدنصیب لڑکی...... میرا نام صبا ہے۔'' وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔ ''میں یہاں کل سے قید ہوں۔ بھوکی پیاسی ہوں۔ ان درندوں نے ایک گھونٹ پانی تک نہیں پلایا۔ پیاس سے دم نکلا جا رہا ہے۔ آپ پانی پلا دیں۔''

قریبی میز پر ایک کولر اور دو تین گلاس رکھے ہوئے تھے۔ میں نے کولر کے پاس جا کر ایک گلاس میں پانی بھرا۔ پانی ٹھنڈا تھا۔ میں گلاس لے کر صبا کی طرف بڑھا۔ کانا میری راہ میں حائل ہو گیا۔ ''لایئے...... یہ گلاس مجھے دے دیں۔ میں اسے پانی پلا دوں۔ اس کی پیاس بجھا دوں۔''

میں چوں کہ بحث کرنا اور الجھنا نہیں چاہتا تھا...... اور مجھے انسپکٹر کا بھی انتظار تھا۔ اس لئے میں نے گلاس اسے تھما دیا۔ وہ گلاس لے کر صبا کی طرف بڑھا۔ پھر وہ اسے بری نگاہوں سے دیکھتا ہوں بولا۔ ''تم ایک گلاس پانی کی قیمت جانتی ہونا...... صرف...... ایک گلاس پانی......'' صبا نے اس سے کچھ کہا تو وہ اپنا چہرہ صبا کے قریب لے گیا۔ لیکن اس نے کانے کے منہ پر تھوک دیا۔ کانا مشتعل ہو گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ فضا میں لہرایا صبا کے منہ پر تھپڑ مارنے کے لئے، میں نے لپک کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''نہیں دوست! ایسا نہ کرو۔''

''آپ نے دیکھا نہیں کہ اس کتیا نے میرے منہ پر تھوکا۔'' کانا طیش میں بولا۔ ''میں اسے بخشوں گا نہیں...... یہ کتیا کیا سمجھتی ہے اپنے آپ کو، میں نے اپنے باپ کو نہیں بخشا...... اسے بھی نہیں بخشوں گا۔''

''شانتی...... شانتی......'' میں نے اس کی پشت تھپتھپائی۔ ''یہ تمہاری قید میں ہے۔ بعد میں جس طرح اور جیسا چاہے گن گن کر بدلہ لینا۔ ابھی صبر کر لو۔ یہ بھاگی تو نہیں جا رہی ہے۔ لاؤ یہ گلاس مجھے دے دو۔ میں اسے پانی پلا دوں۔ اسے سخت پیاس لگ رہی ہے۔ برا حال ہو رہا ہے۔''

''یہاں ایک گلاس پانی سوٹا کا ہے۔'' کانے نے کہا۔ ''مفت میں پانی ہم اپنے باپ کو بھی نہیں پلاتے ہیں۔ اس کتیا کو کیوں پلاؤں؟''

''یہ لو......'' میں نے جیب سے سوٹا کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا اور پھر اس کے ہاتھ سے گلاس لے کر صبا کی طرف بڑھا۔

صبا کی چوں کہ مشکیں کسی ہوئی تھیں۔ اس لئے وہ نہ تو پانی پی سکتی تھی اور نہ ہی ہاتھوں کو حرکت دے سکتی تھی، میں نے اسے پانی پلایا تو وہ ایک ہی سانس میں پورا گلاس غٹاغٹ پی گئی۔ پھر میں نے اس سے پوچھا کہ کیا ایک اور گلاس؟ اس نے سر ہلایا۔ میں نے سوٹا کا نوٹ دے کر ایک گلاس پانی اور لیا۔

دو گلاس پانی پینے کے بعد صبا نے آنکھیں بند کر کے اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔ پانی نے اسے بڑا سکون اور توانائی دی تھی۔ اس میں جیسے ایک جان سی آ گئی تھی۔ اسے دو دن سے ان تینوں بدمعاشوں نے بھوکا پیاسا رکھا تھا۔

''یہ اپنے کزن سے ملنے اور اس کی خبر لینے آیا تھا لیکن اس لڑکی کو دیکھ کر اپنے کزن کو بھول گیا۔'' گنجے نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

''لڑکی نوجوان ہے اور پھر حسین بھی بہت ہے۔'' لنگڑے نے کہا۔ ''اس سے ہمدردی کے بہانے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ ڈورے ڈال رہا ہے۔''

''دیکھونا...... دو سوٹا کا دے کر دو گلاس پانی خرید کر پلا دیا۔'' کانے نے کہا۔ ''سالا اندر آتے ہی اس پر مرمٹا اور یہ لڑکی بھی۔ لیکن یہ جو اس لڑکی کے متعلق سپنا دیکھ رہا ہے وہ کہاں پورا ہوگا۔ ابھی تو ہمیں اپنے سپنے پورے کرنے ہیں اور مجھے اس سے اپنی بے عزتی کا بدلہ بھی لینا ہے۔''

میں ان کی باتوں کو نظر انداز کرتا ہوا شجاع کی طرف بڑھا۔ سوٹا کا ایک نوٹ دے کر ایک گلاس پانی خریدا۔ پہلے تو میں نے شجاع کے چہرے اور جسم پر پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے کچھ پڑھ کر پھونکا۔ پھر رومال کا کونا پانی میں بھگو کر صاف کیا۔ وہ نہ صرف ہوش میں آ گیا بلکہ اس طرح سے ہو گیا جیسے تشدد ہی جاری تھا۔ اس کا چہرہ بھی سابقہ حالت میں ہو گیا۔ چہرے پر تشدد کے اور زخم کے نشان نہ رہے۔ اس کا درد اور تھکن بھی دور ہو گئی۔ اس نے آنکھیں کھول کر مجھے جو دیکھا تو اس کے چہرے پر حیرت اور خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ پیاس سے اس کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ میں نے اس کے منہ سے گلاس لگا دیا۔

''سکندر بھائی! آپ......؟'' وہ حیرت سے بولا۔ ''لیکن آپ یہاں کیسے......؟ کہیں آپ کو گرفتار تو نہیں کیا ہے ان لوگوں نے......؟''

''میں انسپکٹر کی اجازت سے یہاں تم سے ملنے اور بات کرنے آیا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''تھوڑی دیر میں وہ آئے گا معاملات طے کرنے......''

اس اثنا میں قید خانے کا دروازہ کھلا۔ رامو اور ایک سپاہی دو بڑی بڑی ٹرے میں ناشتا لے کر داخل ہوئے اور میز پر رکھ کر چلے گئے۔ ان تینوں کے لئے ایک ٹرے میں ناشتا تھا۔ دوسری ٹرے میں صبا اور شجاع کے لئے، کانے نے اپنی ٹرے اٹھالی۔ شجاع اور صبا رسیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ اس لئے وہ ہاتھوں سے کھانے سے قاصر تھے۔ میں نے کانے سے کہا۔ ''ناشتا کرنے تک ان کی مشکیں کھول دو۔ یہ

کیسے ناشتا کر سکیں گے؟"

"مشکیں کھولی تو جا سکتی ہیں۔" گنجے نے کہا۔ "لیکن اس کے لئے پانچ سو ٹا کا دینے ہوں گے۔ نہیں دے سکتے تو اپنے ہاتھ سے کھلا دو۔" میں نے سو سو ٹا کا کے پانچ نوٹ جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے۔ "یہ لو...... اب جلدی سے ان کی مشکیں کھول دو تا کہ ناشتا کر لیں۔" ان تینوں نے مل کر شجاع اور صبا کی مشکیں کھول دیں۔ ناشتا کرنے کے لئے ایک کونے میں بٹھا دیا جوان سے دس بارہ قدم ہوگا۔ وہ دروازے کے پاس بیٹھ کر ناشتا کرنے لگے۔ دوسرے گلاس کے پانی میں، میں نے پڑھ کر پھونکا تھا جس سے صبا کی حالت بہتر ہوگئی تھی۔ اب اسے درد اور تکلیف نہیں ہو رہی تھی۔

"اب آپ کیسا محسوس کر رہی ہیں......؟" میں نے پوچھا۔

"دو گلاس پانی پیتے ہی مجھے بڑا سکون ملا اور میرے اعصاب قابو میں آ گئے اور ایسا لگا جیسے مجھ پر کوئی تشدد ہی نہیں ہوا تھا۔" صبا نے کہا۔

"آپ تو فرشتہ بن کر آئے۔ آپ نے ایک اجنبی لڑکی کی خاطر رقم کی بھی پروا نہیں کی...... ان دونوں نے میرے ساتھ جو ناشائستہ حرکتیں کیں......" وہ یک لخت خاموش ہوگئی۔ اس کی آواز بھرا گئی اور اس کی خوبصورت آنکھیں چھلک پڑیں۔ وہ سسکیاں بھرنے لگیں۔

"صبا بہن!" میں نے رومال میں اس کے آنسوؤں کو جذب کرتے ہوئے کہا۔ "غم کے بادل چھٹ جائیں گے۔ ہم ان سے گن گن کر بدلہ لیں گے۔"

"ناممکن ہے بھیا!" وہ زخم خوردہ لہجے میں بولی۔ "ہم ان مسلح درندوں سے کیسے بدلہ لے سکتے ہیں...... تھانے میں بند ہیں اور یہ ٹارچر سیل ہے۔ یہاں تو چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی۔ حرام زادے یہ کہہ رہے تھے کہ یہاں جو آیا اس کی لاش ہی گئی ہے۔"

"آپ دیکھتی جائیں اور دیکھیں گی کہ ان سے کیا بدلہ لیتے ہیں۔" میں نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔ "ناشتا کر لیں...... پھر باتیں ہوں گی۔"

میں ناشتا کر کے آیا تھا لیکن ان کا ساتھ دینا پڑا۔ صبا غم و صدمے سے نڈھال تھی اور اس کی بھوک اڑ گئی تھی۔ لیکن میں نے اصرار کر کے اسے بہت کچھ کھلا دیا۔ شجاع میرے آنے سے بہت خوش تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں اسے اور صبا کو نکال لے جاؤں گا۔ اتفاق تھا کہ صبا اس کی ہم جماعت تھی۔

تھرماس بڑا تھا اور اس میں کافی بھری ہوئی تھی۔ کافی پیتے ہوئے میں نے صبا سے پوچھا۔ "آپ کو پولیس نے گرفتار کیوں کیا......؟ کس جرم کی پاداش میں...... اور ٹارچر سیل میں لا کر تشدد بھی کیا...... میں حیران ہوں۔ یقین نہیں آ رہا ہے کہ ایک لڑکی کے ساتھ بھی......"

"ان درندوں کے نزدیک ہم انسان نہیں ہوتے ہیں۔" صبا کہنے لگی۔ "بہت ہی حقیر ہوتے ہیں۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ انسپکٹر کا ایک رشتہ دار لڑکا امریکہ سے آیا ہوا ہے۔ ایک تقریب میں دیکھ کر مجھ پر لٹو ہو گیا۔ اس نے شادی کا پیغام دیا۔ اس کی کزن نے بتایا کہ وہ نہ صرف بدکردار

بلکہ شادی شدہ بھی ہے۔ امریکہ میں اس کی امریکن بیوی اور دو بچے ہیں۔ اس نے گاؤں میں بھی ایک شادی کی تھی۔ سات مہینے تک اس کے ساتھ رہا اور پھر امریکہ چلا گیا۔ وہ مجھ سے شادی نہیں بلکہ میری دولت سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں۔ میرے والدین دولت مند ہیں۔ دو کروڑ کی جائیداد میرے نام لکھی ہوئی ہے۔

میں نے شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس نے انسپکٹر شامو لال سے کہا کہ کسی طرح اس لڑکی سے میری شادی کرا دو۔ دس لاکھ ٹا کا دوں گا۔ انسپکٹر نے مجھے پہلے تو سمجھایا کہ میں اس لڑکے سے شادی کر لوں۔ انکار کی صورت میں اچھا نہیں ہوگا۔ میں نے انکار کر دیا۔ انسپکٹر نے مجھے سرِ راہ فحش حرکات کے الزام میں گرفتار کر لیا اور ٹارچر سیل میں لا کر ڈرایا دھمکایا۔ میں نے اس سے کہا کہ مر جاؤں گی لیکن اس ذلیل شخص سے شادی نہیں کروں گی۔ انسپکٹر نے ان تینوں درندوں کو حکم دیا کہ یہ جب تک شادی کے لئے تیار نہیں ہو جاتی اسے بھوکا پیاسا رکھو اور اس کا دماغ درست کرو۔ پھر ہم اس کی فلم بنا کر اس کے والدین کو راضی کریں گے۔ والدین بھی نہیں مانے تو پھر اس کی لاش گھر پہنچا دیں گے۔"

"دولت کے لالچ نے قانون کے ایک محافظ کو اندھا کر دیا۔" میں نے کہا۔ "آپ فکر نہ کریں۔ آپ دیکھیں گی کہ کس کی فلم بنتی ہے۔"

"مجھے لال میاں نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اپنے بھائی کی مدد سے پھنسوایا ہے۔" شجاع کہنے لگا۔ "میں محلے میں داخل ہوا تو رکشا کا ٹائر پنکچر ہو گیا۔ پھر میں گھر پیدل روانہ ہو گیا۔ ایک اندھیری گلی سے گزر رہا تھا کہ ایک گھر سے ایک لڑکی کی آواز سنائی دی۔ بچاؤ...... بچاؤ...... اس گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں فوراً ہی گھر میں گھس گیا۔ دیکھا کہ اس کمرے میں ایک لڑکی فرش پر پڑی تڑپ رہی ہے۔ اس کے سینے میں چاقو پیوست ہے۔ میں اس کے پاس فرش پر دو زانو ہو کر بیٹھ گیا اور چاقو کا دستہ نکالنے کے لئے پکڑا ہی تھا کہ ایک دم سے کمرے میں کوندا لپکا۔ میں نے دیکھا کہ کھڑکی میں سے کسی نے میری تصویر اتار لی۔ یہ تصویر شاید ایسی آئی ہو گی جیسے میں نے اس لڑکی کے سینے میں چاقو گھونپا ہو۔ میں چاقو نکال کر بھاگا تو تصویر اتارنے والا غائب ہو چکا تھا۔ پر میں کمرے میں داخل ہوا۔ وہ لڑکی بے ہوش ہو چکی تھی۔ اس کے زخم سے خون بہہ رہا تھا۔ اس وقت پولیس موبائل گھر کے سامنے آ کر رکی۔ اندر انسپکٹر اور سپاہی داخل ہوئے تو میرے ہاتھ میں چاقو تھا۔ مجھے گرفتار کر کے تھانے لے جایا گیا۔ میں نے انسپکٹر کو اصل واقعہ بتایا تو اس نے کہا کہ میں تمہیں ایک شرط پر پھانسی کے پھندے سے بچا سکتا ہوں۔ اپنی بہن آمنہ کی شادی میرے بھائی سے کر دو۔ میں نے انسپکٹر سے کہا کہ...... یہ کیسے ممکن ہے۔ یہ کیسے مناسب ہوگا۔ ان کی عمروں کے فرق کو دیکھیں...... پھر اس نے ایک کاغذ میرے سامنے رکھا کہ میں دستخط کر دوں۔ اس میں میری اور میری ماں کی طرف سے آمنہ کے رشتے کی منظوری لال میاں سے تھی۔

میں نے صاف انکار کر دیا۔ کیوں کہ میں اپنی معصوم بہن کی زندگی کو جہنم بنانا نہیں چاہتا تھا اور نہ ہی مستقبل تاریک کرنا...... پھر مجھے اس ٹارچر سیل میں لایا گیا۔ صبا پہلے سے یہاں موجود تھی۔ اس کے ساتھ

بڑا ظلم کیا جا رہا تھا۔ اس کے منہ پر تھپڑ اور گھونسے بھی مارے گئے۔ یہ غریب سب کچھ سہتی اور لڑتی رہی پھر تینوں مجھ پر پل پڑے۔ مجھے کوڑے مارے گئے۔ لاتوں، جوتوں اور گھونسوں سے پٹائی کی اور کپڑے بھی پھاڑ دیئے لیکن میں نے انسپکٹر کی بات نہیں مانی۔۔۔۔۔۔"

"اب تم دونوں کا بال تک بیکا نہیں ہوگا۔" میں نے انہیں دلاسا دیا۔ "میں بڑی آسانی سے تمہیں نکال لے جاؤں گا۔ پہلے حساب تو بے باق کرلوں۔" اس وقت انسپکٹر تہ خانے میں آیا۔ رامو اور ایک اور سپاہی بھی تھا۔ اس نے ہم سب کو اور اپنے آدمیوں کو ناشتا اڑاتے ہوئے دیکھا تو وہ کانے سے برہمی سے بولا۔

"یہ تینوں ناشتا کیسے اڑا رہے ہیں۔۔۔۔۔ تم نے ان دونوں کو کھانے پینے اور ناشتا کرنے کیوں دیا؟"

"رامو نے آکر کہا تھا کہ سکندر صاحب کی ہر بات مانی جائے۔" کانے نے جواب دیا۔ "اس لئے ناشتا منگوالیا سکندر صاحب کے کہنے پر۔۔۔۔۔"

"یہ حکم میں نے صرف شجاع کے لئے دیا تھا اس لئے کہ وہ اسے راہ راست پر لے آئیں۔ اس لڑکی کے لئے نہیں۔" انسپکٹر بگڑ کر بولا۔ "میری اجازت کے بغیر کھانا کھلا دیا۔۔۔۔۔ تم لوگوں نے سکندر صاحب سے وصول پائی نہیں کی۔۔۔۔۔ یہ کس کی طرف سے ناشتا آیا؟"

"میری طرف سے۔۔۔۔۔" کانے سے پہلے ہی میں بول اٹھا۔ "میں نے چار گلاس پانی چار سو ٹاکا دے کر خرید کر ان دونوں کو پلایا۔۔۔۔۔ ناشتے کے لئے چار سو ٹاکا دیئے۔۔۔۔۔ یہاں بیٹھ کر کھانے کے لئے پانچ سو ٹاکا۔۔۔۔۔ آپ کانے سے پوچھ لیں؟"

"کیا یہ سچ کہہ رہے ہیں؟" انسپکٹر نے کانے کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ "تم لوگوں نے تیرہ سو کی رقم وصول کرلی۔"

"جی سر!" کانے نے جواب دیا۔ "اس میں ناشتا پر چار سو روپے خرچ ہوئے ہیں۔ رامو سے پوچھ لیں۔ ناشتا چار سو ٹاکا کا ہے۔"

"ناشتا صرف ایک سو دس ٹاکا کا ہے۔" رامو نے کہا۔ "باقی رقم اس نے مجھ سے لے لی۔" رامو نے گنجے کی طرف اشارہ کیا۔

"لاؤ۔۔۔۔۔ ساری رقم مجھے دے دو۔" انسپکٹر نے تیز لہجے میں کہا۔ "ایس پی صاحب کے دفتر میں کسی نے میری جیب کاٹ لی۔ اس میں پانچ ہزار ٹاکا تھے۔۔۔۔۔ آج تک کوئی دس ٹاکا کا نوٹ نکال نہ سکا مجھے راستے میں آتے ہوئے پتا چلا۔۔۔۔۔"

رقم کانے کے پاس جمع تھی۔ اس نے رقم انسپکٹر کو دے دی اور دل میں وہ مجھ پر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ میری کھال ادھیڑ دیتا۔

"کیا تم نے اپنے بھائی کو سمجھایا کہ وہ ہماری بات مان لے۔" انسپکٹر نے رقم جیب میں ٹھونستے ہوئے کہا۔

"جی نہیں۔" میں نے کہا۔ "اسے سمجھانے کی ضرورت اس لئے نہیں ہے کہ آپ نے میرے کزن

کو اس قتل کے کیس میں اس لئے پھنسوایا ہے کہ اپنی بہن کی شادی آپ کے ذلیل درندہ صفت اور حرامی بھائی سے کردے۔" میرا لہجہ تلخ ہوگیا۔ "آپ کان کھول کر سن لیں۔ آپ میرے بھائی کا بال تک بیکا نہیں کرسکتے۔ کیوں کہ اس کے خلاف کوئی ثبوت آپ کے پاس نہیں ہے۔ عدالت ٹھوس ثبوت مانگتی ہے۔"

"تمہیں ثبوت چاہیئے۔۔۔۔۔ یہ تصویر دیکھو۔۔۔۔۔" انسپکٹر نے جیب سے تصویر نکال کر میری طرف بڑھائی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے تصویر لے کر دیکھی۔ شجاع اس لڑکی کے سینے سے چاقو نکال رہا تھا۔ لیکن تصویر سے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے چاقو لڑکی کے سینے میں گھونپ دیا ہے۔

"یہ کوئی ثبوت نہیں ہوا انسپکٹر!" میں نے کہا۔ "قانون تو تھوڑا بہت میں بھی جانتا ہوں۔ آپ نے اب تک اس کی ایف آئی آر کیوں نہیں درج کی اور پریس کو پریس ریلیز جاری کیوں نہیں کیا۔۔۔۔۔ اور پھر وہ لڑکی کہاں ہے جس پر شجاع نے قاتلانہ حملہ کیا۔ سرکاری اسپتال یا کسی اور بھی اسپتال میں اس لڑکی کو داخل نہیں کیا گیا ہے۔ اس لڑکی کو ایمبولینس سے اتار کر بھگا دیا گیا۔ وہ کلکتہ کے بازار حسن کی تھی جو یہاں سیر و تفریح کے لئے آئی تھی اس کا نام امرتا تھا۔ وہ کل ہی واپس کلکتہ چلی گئی۔ اس کے متعلق آپ عدالت کو کیا بتائیں گے۔۔۔۔۔؟ آلہ قتل ایک نقلی چاقو ہے۔ لڑکی نے بلاؤز کے اندر ایک کپڑے کی تھیلی باندھ رکھی تھی۔ جس میں جانور کا خون تھا۔ وہ چاقو کپڑے کی تھیلی میں اس طرح سے پھنسا دیا گیا تھا کہ ذرا مشکل سے نکل سکے۔ جس نے آپ کے کہنے پر تصویر بنائی اس کا نام سہراب ہے۔ وہ ایک کمرشل فوٹو گرافر ہے۔ وہ شہر میں رہتا ہے۔ اس وقت کہاں سے آ گیا۔۔۔۔۔ وہ عدالت میں آپ کا بھانڈا پھوڑ دے گا۔ آپ پر حبس بے جا کا کیس بنتا ہے۔ آپ اپنی ملازمت سے بھی جائیں گے۔ لہٰذا شجاع اور صبا کو بھی جانے دیں۔ صبا اس شخص سے شادی نہیں کرے گی۔"

انسپکٹر بھونچکا سا ہوگیا۔ اس پر اس طرح سکتہ سا چھا گیا جیسے کوئی بجلی سی آ گری ہو۔ پھر وہ چونک کر بولا تو اس کی آواز میں ارتعاش تھا۔ "یہ سب کچھ تمہیں کس نے بتایا۔۔۔۔۔؟ ان کا علم کیسے اور کیوں کر ہوا۔۔۔۔۔؟ سچ سچ بتانا۔۔۔۔۔ ورنہ کھال ادھیڑ دوں گا۔"

"مجھے سویرے جیسے ہی محلے والوں سے اس واقعہ کا علم ہوا میں نے فوراً ہی تفتیش کی۔" میں نے کہا۔ "میں ڈھاکا میں ایک پرائیوٹ سراغ رساں کے پاس چار برس ملازمت کرچکا ہوں۔ قتل کے تین چار کیس ان کے ساتھ حل کرچکا ہوں۔؟"

"ایسی صورت میں تم تینوں کا زندہ سلامت واپس جانا میرے لئے مصیبت کھڑی کردے گا۔" انسپکٹر نے کہا۔ "اب تمہاری لاشیں جائیں گی۔"

"انسپکٹر!" میں نے کہا۔ "تم ہم تینوں کو شرافت سے جانے دو۔ ہم وعدہ کرتے ہیں تمہارے خلاف ایک لفظ نہیں کہیں گے کہ اس شرط پر کہ آمنہ کی شادی [illegible]ل میاں سے کرنے پر زور نہ دو گے اور صبا کی شادی اس سیاہ کار سے جو تمہیں دس لاکھ روپے دینے والا تھا۔"

"تو مجھے بلیک میل کر رہا ہے؟" انسپکٹر نے غضب ناک ہو کر کہا۔ "میں تجھے شوٹ کردوں گا۔"

"بلیک میل، میں نہیں تم کر رہے ہو؟" میں نے بڑے پرسکون لہجے میں کہا۔ "تم ہمارا بال تک بیکا نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ ہمارے خلاف تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ الٹا تم پھنس جاؤ گے ہمارے خلاف کارروائی کر کے اور تمہارے چہرے پر سارے زمانے کی کالک مل جائے گی۔ تمہارا چہرہ ویسے ہی کسی شیطان کا چہرہ ہے یہ اور خوبصورت ہو جائے گا۔"

"یو شٹ اپ۔" انسپکٹر دھاڑا۔ "میں تیری ایسی خبر لیتا ہوں کہ تو ساری زندگی یاد کرے گا۔"

"سر!" گنجے نے کہا۔ "کیوں نہ ہم انہیں شاہی مہمان خانے لے چلیں......؟ وہاں تو ان کے فرشتے بھی سدھر جائیں گے۔"

"جی ہاں سر!" لنگڑے نے تائید کی۔ "وہاں چل کر ہم فلم کی شوٹنگ کریں گے جس میں یہ سکندر صاحب ہیرو...... صبا ہیروئن ہوگی۔"

"وہاں چل کر صبا تو کیا صبا کی ماں بھی شادی کرنے پر تیار ہو جائے گی۔" گنجے نے کہا۔ "آمنہ کا بھائی اپنی بہن کی شادی کر دے گا۔ اگر یہ دونوں تیار ہوئے تو پھر ہارر فلم بنالیں گے۔"

"مجھے تو شاہی مہمان خانے کا بالکل بھی خیال نہیں آیا۔" انسپکٹر خوش ہو کر بولا۔ "چلو...... جلدی کرو۔"

ہم تینوں کے چہروں کو نقاب اوڑھا دی گئی۔ ایک بند وین میں لے جایا گیا۔ کوئی ایک گھنٹے کے سفر کے بعد وین ایک جگہ رکی۔ ہمیں وین سے اتارا گیا۔ یہ ایک ویران اور سنسان جگہ تھی۔ ہمیں وین سے اتارا گیا۔ پھر ایک مکان کے اندر لے جایا گیا۔ جب ہمارے چہروں کو بے نقاب کیا تو ہم لوگوں نے اپنے آپ کو ایک بڑے کمرے میں پایا ہمارے ہاتھ پیچھے لے جا کر روانگی سے قبل ہی باندھ دیئے گئے تھے۔

ہمیں اس کمرے سے ایک اور بڑے کمرے میں لے جایا گیا۔ اس کمرے کے نصف حصے میں فرش سے لے کر چھت تک گرل لگی ہوئی تھی اور اس گرل پر لوہے کے موٹے تاروں کی جالی لگی تھی جس میں سے مکھی بھی اندر نہیں جا سکتی تھی۔ اس میں ایک دروازہ تھا۔ جو مقفل تھا۔ ایک چھوٹی سی کھڑکی بھی تھی۔ اس کا پٹ بھی بند اور مقفل تھا۔

اس کمرے میں جو قید خانے کی طرح تھا سینکڑوں چوہے بھرے ہوئے تھے۔ یہ چوہے عام قسم کے نہ تھے۔ وہ جسامت میں بلی جتنے تھے۔ وہ سیاہ خونخوار اور آدم خور تھے۔ ہم لوگوں کو دیکھتے ہی چوہے غرانے، اچھل کودنے اور گرل کے پاس جمع ہونے لگے۔ اگر انہیں چھوڑ دیا جاتا تو وہ ہماری تکا بوٹی کر دیتے۔

"یہ تین دن سے بھوکے ہیں۔" انسپکٹر نے کہا۔ "انہیں ہر تیسرے چوتھے دن کھانے کے لئے دیا جاتا ہے۔ آج چوتھا دن ہے۔ یہ چار دن کے بھوکے ہیں۔ یہ آدم خور ہیں۔ ان کا مرغوب ترین سوپ انسانی خون اور گوشت ہے۔ جانور بھی بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ لنگڑے! کھیت میں سور ہوں گے۔ ایک کو پکڑ تو لاؤ......"

لنگڑا اور کانا دونوں ہی سور لانے چلے گئے تو انسپکٹر نے کہا۔ "تم لوگوں نے بات نہیں مانی تو پھر ان

کی غذا بن جاؤ گے۔ دوسرے کمرے میں وڈیو کیمرہ رکھا ہے۔ ہم اس کی فلم بنا کر ہالی ووڈ بھیج دیں گے۔ ڈالر مل جائیں گے۔ بولو...... کیا بولتے ہو؟"

صبا اور شجاع کے چہرے فق ہو گئے۔ صبا تو ان چوہوں کو دیکھ کر کانپ گئی تھی اور دہشت سے اس کا بدن لرزنے لگا تھا۔ میں نے کہا۔ "انسپکٹر! ہمیں چوہوں کی غذا بن جانا منظور ہے۔ تم ہمیں خوف زدہ نہ کرو۔"

اس اثنا میں لنگڑا اور کانا ایک ایک موٹے تازے سور اٹھا کر لائے۔ انہیں کھڑکی کی راہ سے اندر ڈال دیا گیا۔ پھر تمام چوہے ان پر وحشی بھوکے درندوں کی طرح ٹوٹ پڑے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان دونوں سوروں کو جو ڈیڑھ ڈیڑھ من کے تھے اس طرح چٹ کر گئے کہ ان کا نام ونشان تک نہ رہا......

یہ ایک ایسا بھیانک دل خراش اور روح فرسا منظر تھا جس نے رونگٹے کھڑے کر دیئے اور نس نس میں کوئی گرم گرم سیال جیسے زن زن کرتا اترتا چلا گیا، صبا اور شجاع کے چہرے کفن کی طرح ہو گئے۔ ان پر ایسا سکتہ سا طاری ہو گیا جیسے بجلی آ گری ہو۔ وہ اس طرح بے حس وحرکت، ساکت وجامد ہو گئے کہ ان پر پتھروں کے مجسموں کا دھوکا ہونے لگا۔ وہ ذرا سی دیر کے لئے سانس لینا بھی بھول گئے اور ان کی آنکھوں سے جو منجمد سی ہو گئی تھیں خوف ودہشت جھانک رہی تھی۔

انسپکٹر اور اس کے دونوں ماتحتوں پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے یہ منظر اس طرح سے دیکھا تھا جیسے کوئی بات نہ ہو۔ اس لئے کہ یہ منظر ان کے لئے نیا نہیں تھا۔ وہ جانے کتنی بار دیکھ چکے اور دیکھتے رہتے تھے۔ ہمیں خوف زدہ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ سب سے زیادہ خوش تو انسپکٹر ہو رہا تھا۔ اس وقت وہ بھی کسی آدم خور اور خونخوار موٹے تازے چوہے کی طرح لگ رہا تھا۔

چوہوں نے جس وقت ان سوروں پر حملہ کیا اور انہیں کھانے لگے تھے اور سور جس بری طرح تڑپ رہے اور چیخیں مار رہے تھے اس نے دل پر بہت اثر کیا تھا۔ اگر ہم مضبوط دل اور اعصاب کے مالک نہ ہوتے تو نہ جانے کیا ہوتا۔ صبا تو غش کھاتے کھاتے رہ گئی تھی۔

"سر!" لنگڑے نے انسپکٹر سے کہا۔ "یہ چوہے ابھی بہت بھوکے ہیں۔ کیا دو سور اور پکڑ لائیں؟"

"یہ تین سور کس لیے ہیں......؟" انسپکٹر نے ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہم ان کی غذا بنانے تو لائے ہیں؟"

"کیا تم ہمیں ان چوہوں کے آگے ڈال دو گے انسپکٹر!" میں نے ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "کیا تم سنجیدہ ہو؟"

"ہاں......" انسپکٹر نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہماری شرائط پوری نہ کرنے کی صورت میں تم تینوں کا بھی وہی حشر ہوگا جو ان سوروں کا ہوا۔"

شجاع نے ہمت کر کے کہا۔ "ہم مجرم ہیں تو عدالت میں لے جاؤ...... سزا کا دینا یا نہ دینا عدالت کا کام ہے۔ ملزم اور مجرم کو پکڑ کر عدالت میں پیش کرنا تمہارا کام ہے۔ تم نے قانون کو کیا مذاق سمجھ رکھا ہے؟"

"تو مجھے قانون سکھا رہا ہے......؟" انسپکٹر نے خشونت بھرے لہجے میں کہا۔ "اب میں دیکھتا ہوں کہ تجھے میری سزا سے کون سی عدالت بچاتی ہے...... تم لوگ میرے مجرم ہو...... تم لوگوں کو سزا دینے کا اختیار مجھے ہے۔ میں اپنی عدالت کا جج ہوں۔"

"تم نے کیا سنا نہیں کہ مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہوتا ہے۔" صبا بولی۔ "ہم تمہارے مجرم نہیں ہیں۔ کیوں کہ ہم نے تمہارا کچھ نہیں بگاڑا ہے۔ تم صرف اپنے ذاتی مفاد کے لئے ناجائز اختیارات سے کام لے رہے ہو۔"

"بکواس بند کرو......" وہ دھاڑا۔ "میں تم لوگوں کو دس منٹ کی مہلت دیتا ہوں۔ دس منٹ کے اندر فیصلہ کر کے بتاؤ...... موت یا تختہ...... اگر تم دونوں نے میری بات نہیں مانی تو پھر میں تینوں کو چوہوں کی غذا بنا دوں گا۔ تم لوگوں نے دیکھ لیا ہے نا کہ چوہے کس قدر خطرناک اور بھوکے ہیں۔ ان سوروں کو کیسے کھا گئے؟ یہ تم لوگوں کو اور مزے لے کر کھا جائیں گے۔ یہ انسانوں کا گوشت بڑی رغبت سے کھاتے ہیں۔

"یہ بات تم اس طرح کہہ رہے ہو جیسے تم نے ان چوہوں کو آدمیوں کو کھاتے دیکھا ہو......؟" میں نے کہا۔ "یہ تم کیا اپنا خیال بتا رہے ہو...... بھلا ان چوہوں کو انسانوں کو کھانے کا موقع کہاں ملا ہوگا......؟ کون ظالم انہیں انسانوں کو کھلائے گا؟"

"میں نے ایک نہیں دو تین مرتبہ دیکھا ہے......" وہ استہزائیہ لہجے میں بولا۔ "بلکہ میں نے اور کانا نے ان چوہوں کی خاطر تواضع انسانوں سے کی ہے۔ اب تک دس بارہ آدمیوں کو کھلا چکے ہیں۔ ان میں دو عورتیں بھی تھیں......"

"تم نے انسانوں کو ان کی خوراک بنا دیا......؟"

شجاع پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔ "کیا اس ظلم پر کسی نے تمہارے خلاف ایکشن نہیں لیا...... تمہارے محکمے کے اعلیٰ افسروں نے...... کسی عدالت یا عوام نے......؟ اتنی بڑی درندگی اور بربریت پر خاموش رہ گئے؟"

"ہم تینوں کے سوا کسی کے فرشتوں کو خبر نہ ہو سکی جو ہمارے خلاف ایکشن لیا جاتا۔" انسپکٹر نے تمسخر سے کہا۔ "تم لوگوں کے بارے میں بھی کسی کو بالکل بھی پتا نہیں چل سکے گا...... یہ راز ہم تینوں کی ذات تک رہے گا۔ تم لوگوں کا نام و نشان تک نہ رہے گا۔"

"اچھا انسپکٹر! یہ تو بتاؤ کہ تم نے جن بارہ انسانوں کو ان آدم خور چوہوں کی خوراک بنایا ان کا جرم کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ان کا جرم......؟" وہ بڑے زور سے ہنسا۔ "ان کا جرم ناقابلِ معافی تھا...... ان کا جرم یہ تھا کہ ان لوگوں نے میری رشوت خوری، آبرو ریزی...... میں نے تلاشی کے بہانے جو گھروں سے رقم اور زیورات جبر و زبردستی سے حاصل کئے تھے...... اس کے خلاف ان سب نے مل کر پولیس کمشنر، گورنر...... اور صدر کو خطوط لکھے تھے۔ حکومت نے تحقیقات کے لئے دو افسروں کا ایک کمیشن بٹھایا تھا۔ اتفاق سے یہ دونوں

افسران زر و زن کے رسیا تھے...... میں نے ان کی خواہش پوری کر دی اور انہوں نے مجھے ان الزامات سے بری کر دیا۔ میرے خلاف چھ، سات افراد نے شکایت کی تھی۔ باقی افراد پانچ تھے جنہوں نے اس کمیشن کی رپورٹ کے خلاف ایک جلوس نکالا اور ان دو افسروں کو جنہوں نے میرے حق میں فیصلہ دیا ان پر جانب داری کا الزام لگایا...... طوفان اور سیلاب اور بارشوں کی وجہ سے یہ معاملہ دب گیا۔ میں نے ان تمام کی ایک فہرست بنائی۔ میں نے لنگڑے اور کانا سے کہا کہ انہیں فریب دے کر لے آؤ۔ ان میں جو دو عورتیں تھیں وہ بڑی جوان اور حسین تھیں۔ پہلے تو ہم نے انہیں قید خانے میں ڈال دیا۔ روزانہ دو، دو تین، تین آدمیوں کو ان کی خوراک بناتے رہے اور ان عورتوں سے دل بہلاتے رہے...... لیڈیز فرسٹ کے بجائے لیڈیز لاسٹ کیا...... ویسے جو لطف ان عورتوں کی چوہوں کی خوراک بناتے ہوئے آیا وہ میں آج تک نہیں بھول سکا...... اب اس لڑکی کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوگا......

میں نے جو مہلت دی تھی وہ ختم ہو چکی ہے۔ اب بتاؤ کا ی میری بات ماننے کے لئے تیار ہو۔

"ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تمہاری کوئی بات نہیں مانیں گے......؟" میں نے بڑے پرسکون لہجے میں اعتماد سے کہا۔ "یہ ہمارا فیصلہ ہے۔"

"لگتا ہے تم خوف و دہشت سے پاگل ہو گئے ہو......؟" انسپکٹر نے مجھے گھور کر اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ "تم کو عقل نہیں آئی جو یہ فیصلہ کیا ہے۔"

"تم طاقت کے نشے اور گھمنڈ میں پاگل ہو گئے ہو انسپکٹر!" میں نے کہا۔ "تمہاری باتیں سن کر مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم ایک جنونی پاگل ہو۔ تم نے دس مردوں اور عورتوں کو ان آدم خور چوہوں کی غذا بنا دیا۔ اب ایسا نہیں ہوگا؟"

"ہاں...... میں جنونی ہوں......" وہ زوردار قہقہہ مار کر بولا۔ "تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟ اب ایسا نہیں ہوگا تو کیا ہوگا؟"

"ہوگا یہ کہ ان چوہوں کی خوراک ہم نہیں تم بنو گے......؟" میں مسکرا دیا۔ "تم ہم میں سے کسی ایک کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔"

"لنگڑے اور کانا......" انسپکٹر بولا۔ "تم اسے سب سے پہلے کوٹھری میں دھکیل دو۔ میں دیکھتا ہوں اس کا خدا اسے کیسے بچاتا ہے اور یہ مجھ سے اور چوہوں سے کیسے بچتا ہے۔ یہ سارے فساد کی جڑ ہے...... لنگڑے تم کوٹھری کا تالا کھولو۔"

لنگڑے نے دروازے کے پاس پہنچ کر جیب سے چابی نکالی۔ انسپکٹر اور کانا ایک ایک طرف سے میرے بازو پکڑ کر مجھے گھسیٹ کر کوٹھری کے دروازے کے پاس لے گئے۔ صبا اور شجاع چیخنے اور چلانے لگے۔ "نہیں...... نہیں...... ہم تمہاری بات مان لیتے ہیں۔"

"نہیں صبا! نہیں شجاع!" میں نے کہا۔ "تھوڑی دیر صبر سے کام لو۔ یہ کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ صرف خالی خولی دھمکی ہے۔ نفسیاتی حربہ آزما رہا ہے۔ اس کا دماغ ٹھکانے پر ہے...... بس تم دونوں خاموشی سے

تماشادیکھو۔"

لنگڑے نے تالا کھولنے کی کوشش کی۔ تالا تھا کہ کھلنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اس نے سارا زور لگا دیا۔ وہ حیران تھا کہ تالا کیوں نہیں کھل رہا ہے......؟ جب کہ چابی سوراخ میں پوری گھوم رہی تھی۔ یہ دیکھ کر کانا آگے بڑھا۔ اس نے بڑی کوشش کی۔ سارا زور لگا دیا پھر بھی تالا نہیں کھلا۔ ان کی حیرانی پریشانی اور جھنجلاہٹ میں تبدیل ہوگئی۔ انہوں نے کئی طریقے آزمائے۔ کوئی کامیاب نہ ہوسکا۔

"سر! معلوم نہیں تالا کیوں نہیں کھل رہا ہے؟" لنگڑے نے انسپکٹر کے پاس آ کر کہا۔ "جب کہ اس میں چابی لگ بھی رہی ہے۔"

"کہیں غلط چابی تو نہیں ہے؟" انسپکٹر نے کہا۔ "اچھی طرح سے دیکھو۔ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔ تالا بھی چائنا کا ہے۔"

"نہیں سر! چابی غلط نہیں ہے۔" لنگڑے نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس کی چابی کھونٹی میں لگی ہوئی تھی جو میں نے نکال کر جیب میں رکھ لی تھی۔"

"اچھا لاؤ...... چابی مجھے دے دو اور انہیں بھاگنے نہ دو۔" انسپکٹر اس کے ہاتھ سے چابی لیتے ہوئے بولا۔ "اگر ان میں سے کسی نے بھاگنے کی کوشش کی تو انہیں بلا تامل گولی مار دینا...... گولی پیروں پر مارنا۔ دل یا سینے میں نہیں...... انہیں سخت سزا دینی ہے۔"

انسپکٹر نے اپنے ہولسٹر سے ریوالور نکال کر لنگڑے کی طرف بڑھا دیا اور کوٹھری کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ لنگڑے نے صبا اور شجاع کو نال کی زد میں لے لیا۔ کانا مجھے پکڑے کھڑا تھا۔ میں بڑے سکون واطمینان سے کھڑا تھا جس نے کانا کو شک وشبے میں ڈال دیا تھا۔

انسپکٹر نے تالے کے سوراخ میں چابی ڈال کر دو تین مرتبہ دائیں اور بائیں گھمایا۔ تالے کو نہ کھلنا تھا نہ کھلا۔ اس کے چہرے پر الجھن کے آثار پیدا ہوئے۔ پھر اسے حیرت اور غصہ آیا۔ اس نے دو ایک مرتبہ چابی نکال کر دیکھی بھی تھی۔ پھر اس نے طیش میں آ کر چابی پوری طاقت سے گھمائی...... چابی ٹوٹ گئی۔ آدھی سوراخ میں پھنس گئی اور آدھی اس کے ہاتھ میں رہ گئی۔ اس نے چابی غصے میں آ کر فرش پر پھینک دی۔ پھر دروازے پر ایک زوردار لات رسید کی۔ پھر درد اور تکلیف سے تڑپ اٹھا۔ اس نے ایک سسکی لی۔

"اب کیا ہوگا......؟" انسپکٹر بھناتے ہوئے بولا۔

"دروازہ کیسے کھلے گا...... تالے کو توڑ دو۔"

"یہاں ایسا کوئی ساز وسامان نہیں ہے جس سے تالا توڑا جائے۔" کانا نے کہا۔

"وین میں ایک ہتھوڑی اور کدال رکھی ہوئی ہے۔"

انسپکٹر بولا۔ "کانا تم جا کر یہ دونوں چیزیں لے آؤ......" کانا تیزی سے باہر کی طرف لپک گیا۔

چند لمحوں کے بعد آیا تو اس کے ایک ہاتھ میں لوہے کی بہت مضبوط اور بڑی ہتھوڑی اور دوسرے ہاتھ میں کدال تھی۔ انسپکٹر نے اس کے ہاتھ سے ہتھوڑی لے کر اسے بڑی مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس کا پھل

بہت موٹا تھا وہ عام ہتھوڑیوں سے بڑی تھی۔ انسپکٹر نے پوری قوت سے تالے کے منہ پر ایک بھرپور ضرب لگائی۔ اس کا تالے پر کوئی اثر نہ ہوا۔ البتہ ہتھوڑی کا پھل کسی شیشے کی طرح ٹوٹ گیا اور اس کی کرچیاں فرش پر بکھر گئیں۔ لوہے کی اس مضبوط اور موٹی ہتھوڑی کو ریزہ ریزہ دیکھ کر اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ ششدر سا ہوگیا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہوگیا۔ یہ ہتھوڑی کیسے ٹوٹ گئی۔ ادھر لنگڑا اور کانا بھی پھٹی پھٹی نظروں سے ہتھوڑی کا حشر دیکھ رہے تھے۔

پھر انسپکٹر نے کانا کے ہاتھ سے کدال لے لی۔ کدال کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اس نے تالے پر اس کا پھل دے مارا۔ کدال کا پھل بھی اسی طرح ٹوٹ گیا جس طرح ہتھوڑی کا پھل ٹوٹا تھا۔ تالے پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ تالا اپنی جگہ جوں کا توں تھا اور ان کا منہ چڑا رہا تھا۔

"اسے اٹھا کر کھڑکی سے اندر پھینک دو۔" انسپکٹر جھنجلا کر بولا۔ "سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ یہ دونوں چیزیں ایک ہی چوٹ پر کیسے ٹوٹ گئیں۔"

"جی سرکار!" لنگڑے نے سر ہلا کر تحیر زدہ لہجے میں کہا۔ "ان کے ٹوٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں بھی حیران ہوں کہ......"

"اب باتیں نہ کرو...... جلدی سے کھڑکی کھول کر اسے اندر پھینک دو۔" انسپکٹر نے تیز لہجے میں کہا۔ "بہت دن ہوگئے دلچسپ تماشا دیکھے......" کھڑکی فرش سے پانچ فٹ اوپر تھی۔ اس میں صرف ایک کنڈی لگی ہوئی تھی۔ تالا لگا ہوا نہیں تھا۔ چوہے کھڑکی تک نہیں آ سکتے تھے۔ وہ چڑھ نہیں سکتے تھے۔ اس کھڑکی سے ہی ان دونوں سوروں کو اندر ڈالا گیا تھا۔ ایک آدمی کو بہ آسانی کھڑکی کے راستے اندر پھینکا جا سکتا تھا کھڑکی خاصی بڑی تھی۔ اس کا ایک ہی پٹ تھا۔ مجھے دھکا دے کر کھڑکی کے پاس لے جایا گیا۔ وہ تینوں مجھے اٹھا کر کھڑکی کے راستے اندر پھینکنا چاہتے تھے۔

کانا نے کھڑکی کی کنڈی کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ کھلی نہیں۔ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ وہ اس بری طرح جام ہوگئی تھی کہ کھل ہی نہیں سکتی تھی۔ کانا نے پورا زور لگا دیا۔ پھر لنگڑے اور انسپکٹر نے بھی زور آزمائی کی۔ کنڈی ایک انچ بھی سرکی نہیں۔ ایسا لگ رہا تھا اسے ویلڈنگ کر دیا گیا ہے۔

"یہ تھوڑی دیر پہلے کیسے کھل گئی تھی......؟" انسپکٹر حیران وپریشان تھا۔ "اسے کھول کر تو سوروں کو اندر پھینکا گیا تھا۔ یہ جام کیسے ہوگئی؟"

"سر!" کانا بولا۔ "میں بتاؤں کہ یہ ہتھوڑی اور کدال کیسے ٹوٹ گئی؟ کنڈی کھل کیوں نہیں رہی ہے؟ یہ جام کیسے ہوگئی؟"

"ہاں...... ہاں بتاؤ۔" انسپکٹر نے کہا۔ "میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا ہے؟ یہ کیا تماشا ہو رہا ہے؟ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا......؟ کیوں؟"

"سر! میرے خیال میں اس کمرے میں کوئی آسیب ہے جو ہمیں تنگ اور پریشان کر رہا ہے۔" کانا نے سرگوشی میں کہا۔

''دہشت......'' انسپکٹر نے کہا۔ ''کوئی آسیب وغیرہ نہیں۔ جب میں خدا کو نہیں مانتا ہوں تو آسیب کو کیسے مان سکتا ہوں۔ یہ تمہارا وہم ہے۔''

''سر!'' لنگڑے نے تائیدی لہجے میں کہا۔ ''آپ مانیں یا نہ مانیں...... اس کمرے میں واقعی کوئی آسیب ہے۔ ہم واپس چلیں۔''

اس اثنا میں موبائل فون بجنے لگا جو انسپکٹر کی جیب میں تھا۔ اس نے ایک طرف جا کر کچھ دیر تک بات کی۔ پھر اس نے لنگڑے کے پاس آ کر کہا۔ ''ابھی تو ہم واپس چلتے ہیں۔ کیوں کہ ایس پی صاحب آدھے گھنٹے کے بعد انسپکشن کے لئے آ رہے ہیں۔ جب ایس پی صاحب چلے جائیں تو تم ایک قفل ساز لے کر یہاں آنا۔ اس کا تالا نکال کر پھینک دینا۔ کنڈی بھی ٹھیک کروا لینا۔ دروازے میں دوسرا تالا لگانے کی ضرورت نہیں۔''

پھر ہمیں واپس اس وین میں تھانے لایا گیا۔ جس وقت ہم وین سے اتر رہے تھے اسی وقت ایک جیپ میں ایس پی صاحب آ گئے۔ وہ جیپ سے اترے تھے کہ صبا ان کی طرف تیزی سے لپکی۔ ''انکل...... انکل...... پلیز! مجھے بچا لیجئے۔''

''صبا بیٹی تم......؟'' ایس پی صاحب اسے دیکھ کر حیرت سے بولے۔ ''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ یہ تمہیں وین میں کہاں سے لایا گیا ہے؟ یہ دونوں کون ہیں؟''

''انسپکٹر نے ہم تینوں کو جھوٹے الزام میں حبس بے جا میں رکھا ہوا ہے۔'' صبا بولی اور اس نے مختصراً سارا واقعہ سنایا۔

''اچھا......'' ایس پی صاحب نے حیرت اور غصے سے انسپکٹر کی طرف دیکھا جس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ ''آپ لوگ میرے ساتھ آئیں...... مسٹر شجاع آپ...... آپ تو ہمارے قومی ہیرو ہیں......'' پھر وہ انسپکٹر سے بولے۔ ''یہ میں کیا سن رہا ہوں؟ چلو...... تم بھی اندر چلو۔''

انسپکٹر کے کمرے میں پہنچ کر ہم سب بیٹھ گئے۔ میں نے، صبا نے اور شجاع نے قدرے تفصیل سے انہیں بتایا کہ کیا گزری ہے۔ انسپکٹر نے اپنا دفاع کیا۔ ہم تینوں پر جھوٹے اور سنگین الزامات عائد کئے۔ جب ایس پی صاحب نے ایف آئی آر رجسٹر منگوایا تو انسپکٹر بغلیں جھانکنے لگا۔ جب وہ رجسٹر آیا تو ہم میں سے کسی کے خلاف کوئی ایف آئی آر درج نہیں تھی۔ ایس پی صاحب صبا کے رشتہ دار تھے۔ وہ چٹاگانگ میں موجود نہیں تھے۔ کسی کام سے ڈھاکا گئے ہوئے تھے۔ وہ تھوڑی دیر پہلے ڈھاکا سے آئے تھے۔ وہ یہاں کسی کیس کے سلسلے میں آئے تھے۔

''انسپکٹر!'' ایس پی صاحب نے کہا۔ ''اوہ میرے خدایا میں کیا سن رہا ہوں۔ تم نے خونخوار آدم خور چوہے پال رکھے ہیں...... تم انہیں ان کی خوراک بنا رہے تھے۔ تم دس بارہ آدمیوں کو جن میں دو عورتیں تھیں ان چوہوں کی خوراک بنا چکے ہو...... یہ لنگڑا اور کانا بھی اس ظلم میں برابر کے شریک ہیں...... تم تینوں اس قابل ہو کہ سرعام گولیوں سے بھون دیا جائے۔ میں تمہیں بخشوں گا نہیں...... تم تینوں کو کیفر کردار تک

پہنچاؤں گا۔ تم تینوں انسانیت اور قانون پر داغ ہو۔''

''سر! ان لوگوں نے سراسر غلط بیانی کی ہے۔'' انسپکٹر نے اپنا دفاع کیا تو اس کا لہجہ بڑا کمزور سا تھا۔ ''ان کے پاس کیا ثبوت ہے......؟ یہ حقیقت ہے کہ اس قومی ہیرو نے رات کے وقت گھر میں گھس کر ایک جوان لڑکی کو اکیلا پا کر اس کی بے حرمتی کی...... اس لڑکی نے اپنے محبوب کو اس لئے قتل کر دیا کہ وہ اس کی سہیلی میں دلچسپی لے رہا تھا۔ یہ شخص......'' اس نے میری طرف اشارہ کیا۔ ''یہ مجھے رشوت دے کر اپنے دوست کو رہا کرانے آیا تھا۔ میں انہیں اقرار جرم کرنے کے لئے تھانے سے دور لے گیا تھا۔ آدم خور چوہوں کا کوئی وجود نہیں ہے۔''

''تمہارے پاس کیا ثبوت اور گواہ موجود ہیں؟''

ایس پی صاحب نے تیز لہجے میں کہا۔ ''تم نے ایف آئی آر کیوں نہیں کاٹی؟''

''میں نے ایف آئی آر کاٹی تھی۔ اس کا رجسٹر ادھر ادھر ہو گیا ہے۔'' انسپکٹر نے کہا۔ ''میں اس کے خلاف گواہ مقدمات میں پیش کروں گا۔''

''سنو...... تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔'' ایس پی صاحب نے بگڑ کر کہا۔ ''میں تمہارے خلاف شکایات درج کر رہا ہوں کہ تم کس طرح اپنے اختیارات کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہو۔ معصوم اور شریف لوگوں کو تنگ اور ہراساں کر کے ان سے بھاری رشوت لیتے ہو۔ یہ صبا میری بھتیجی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ جھوٹ نہیں بول سکتی...... میں ان تینوں کو رہا کر رہا ہوں کیوں کہ تم نے بغیر کسی گواہ اور ثبوت کے انہیں گرفتار کیا ہے...... اور تم، لنگڑا اور کانا اپنے آپ کو زیر حراست سمجھو...... تم نے ان معصوموں پر نہ صرف تشدد کیا بلکہ بھوکا پیاسا بھی رکھا۔''

ایس پی صاحب نے گھنٹی بجائی۔ چپراسی آیا تو اس کے ذریعے سب انسپکٹر کو بلایا اور اس سے کہا کہ انسپکٹر، لنگڑے اور کانا کو حوالات میں بند کر دو۔ میں نے ان تینوں کو رہا کر دیا ہے۔ یہ بے قصور ہیں اور ان کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔ ان تینوں کو حوالات میں بند کر کے مجھے رپورٹ دو...... کسی نے ان تینوں کو رہا کیا۔ انہیں کھانے، پینے کو دیا تو مجھ سے کوئی برا نہیں ہوگا اور ہاں ہیڈ محرر کو بھیج دو تا کہ ان کے بیانات کو قلم بند کیا جا سکے۔''

سب انسپکٹر جب انسپکٹر کو لے جانے لگا تو انسپکٹر نے غصہ بھرے لہجے میں کہا۔ ''ایس پی صاحب آپ جو میری توہین و تذلیل کر رہے ہیں آپ کو اس کی سزا ضرور ملے گی۔ آپ جانتے ہیں کہ میرا کس قدر اثر و رسوخ ہے۔ میں ایک ٹیلی فون کروں گا تو آپ نہ صرف اندر ہو جائیں گے بلکہ نوکری سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں گے...... آپ کو اس بات کا حق اور نہ اختیار ہے کہ مجھے حوالات میں بند کر دیں۔''

''یہ ٹیلی فون رکھا ہوا ہے۔'' ایس پی صاحب نے کہا۔ ''چلو اپنی حسرت پوری کر لو۔ میں دیکھتا ہوں تم میرے خلاف کیا کچھ کر سکتے ہو؟''

''میرے پاس موبائل فون ہے۔'' انسپکٹر نے کہا۔

"میں حوالات سے رابطہ کروں گا۔ آپ دیکھیں گے کہ میں آپ کا کیا حشر نشر کرسکتا ہوں۔"

"میرے حشر نشر سے پہلے اپنے حشر نشر کی فکر کرو۔"

ایس پی کہنے لگے۔ "تم تو کسی وحشی درندے سے بھی سفاک اور ظالم ہو...... غضب خدا کا...... کیا کسی سے ایسا بہیمانہ اور بربریت بھرا انتقام لیا جاتا ہے...... انسپکٹر! تمہیں اس وقت خوف خدا بھی نہیں ہوا؟ ان انسانوں پر ذرہ برابر بھی رحم نہیں آیا...... اوہ میرے خدایا...... میں تو اس درندگی کے تصور سے لرزہ براندام ہوں...... تم نے ہلاکو، چنگیز خان اور خون آشام بھیڑیوں کو بھی مات دے دی...... اگر تمہیں ان چوہوں کے سامنے ڈال دیا جائے تو کیسا رہے گا۔"

"میں نے کہا نا کہ ان آدم خور چوہوں کا کوئی وجود نہیں ہے......" وہ کمینہ بڑی ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔ "ساری کہانی ان کی اپنی گھڑی ہوئی اور مجھے پھنسانے اور اپنے آپ کو بچانے کے لئے ہے...... ان کے خلاف جو گواہ اور ٹھوس ثبوت ہیں میں انہیں عدالت میں پیش کروں گا۔"

"یہ ذلیل شخص جھوٹ بول رہا ہے انکل!" صبا ہذیانی لہجے میں بولی۔ "آپ لنگڑے اور کانے کو بلا کر ان آدم خور چوہوں کے بارے میں معلوم کرلیں۔ وہ ٹارچر سیل نہیں بلکہ موت کا سیل ہے۔ انکل! میں آپ کو بتا نہیں سکتی وہ آدم خور چوہے کتنے بڑے ہیں۔ ان چوہوں نے جن کی تعداد چالیس کے لگ بھگ ہوگی، دیکھتے ہی دیکھتے دو سوروں کو جو ڈیڑھ دو من کے ہوں گے چٹ کر گئے...... خون بھی پی گئے۔"

"مسٹر جبار!" ایس پی صاحب نے سب انسپکٹر سے کہا۔ "اسے ابھی یہاں رہنے دو۔ اس سے ریوالور لے لو...... لنگڑے اور کانا کو یہاں لے آؤ...... انہیں بالکل بھی نہیں بتانا کہ میں نے انہیں یہاں کیوں اور کس لئے طلب کیا ہے۔" جب سب انسپکٹر کمرے سے نکل گیا تو شجاع نے انسپکٹر کی طرف ایک نگاہ ڈالی اور ایس پی صاحب سے کہنے لگا۔

"ایس پی صاحب! یہ انسپکٹر خدا کے وجود کا منکر ہے۔ اس کے دل میں خوف خدا کہاں سے ہوسکتا ہے...... خوف خدا اگر ہوتا تو وہ ان معصوم لوگوں کو آدم خور چوہوں کے سامنے نہیں ڈالتا۔ ان چوہوں کو اس نے ایک کوارٹر نما مکان کے ہال روم میں رکھا ہے...... وہ مکان سنسان اور ویران علاقے میں اس لئے ہے کہ دوسرے لوگ انسانی چیخیں نہ سن سکیں۔ یہ ذلیل اور کمینہ اللہ کا مذاق بھی اڑا رہا تھا۔"

اس سے پہلے کہ انسپکٹر یا ایس پی صاحب شجاع کی بات کا جواب دیتے، سب انسپکٹر لنگڑے اور کانا کو لے کر اندر داخل ہوا تو ایس پی صاحب نے لنگڑے سے پوچھا۔ "سچ بتانا کیا انسپکٹر...... یعنی تمہارے اس ایچ ایس او نے کسی ویرانے میں آدم خور چوہوں کو پال رکھا ہے اور اب تک بارہ آدمیوں کو جن میں دو عورتیں تھیں ان کی خوراک بنایا جاچکا ہے۔؟"

"جی نہیں صاحب!" لنگڑے نے کمال ڈھٹائی سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "بالکل غلط ہے۔ آدم خور چوہے کہاں سے آ گئے؟"

"کانا! تم بتاؤ......" ایس پی صاحب نے کہا۔ "کیا ان تینوں کو وہاں ان چوہوں کے آگے ڈالنے

کے لئے لے جایا گیا تھا...... کسی وجہ سے دروازے کا تالا اور کھڑکی کی کنڈی نہ کھل سکی جس کی وجہ سے انہیں ان کے آگے ڈالا نہ جاسکا تھا۔ پھر میرا فون آ گیا تھا۔"

"جی نہیں صاحب! یہ جھوٹ ہے۔" اس نے بھی سفید جھوٹ بولا۔ "آپ سے جس نے بھی کہا وہ سفید جھوٹ ہے۔ قسم لے لیں جو ان کا وجود ہو۔"

"تم دونوں نے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔" ایس پی صاحب نے کہا۔ "کیا یہ تینوں جھوٹے ہیں؟ انہوں نے جو کچھ بتایا اس میں سچائی نہیں ہے۔"

"جی ہاں صاحب......!" لنگڑے نے سر ہلایا۔ "یہ لوگ جھوٹ بول رہے ہیں۔ آپ ان کی باتوں پر نہ جائیں......"

"جھوٹ تم دونوں ہی نہیں بلکہ ایس ایچ او بھی بول رہا ہے جب تم تینوں کی کھال ادھیڑی جائے گی تب تم لوگ سچ بولو گے...... مسٹر جبار! انہیں لے جا کر حوالات میں بند کردیں۔ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔"

سب انسپکٹر ان تینوں کو اپنے ہمراہ لے کر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہیڈ محرر قلم اور کاغذات لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ وہ صبا کا بیان لے رہا تھا کہ ایک دم سے انسانی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ جو بڑی دل خراش اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی تھیں۔ کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کون کیوں اور کس لئے چیخیں مار رہا ہے۔ اتنے میں ایک سپاہی دوڑا ہوا آیا۔ وہ نہ صرف حد درجہ خائف تھا بلکہ سراسیمہ بھی تھا اور اس کی آنکھوں سے دہشت جھانک رہی تھی اور چہرہ دھلی ہوئی سفید چادر کی طرح ہو رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ غش کھانے والا ہے۔ اس کی سانس اس طرح پھول رہی تھی جیسے بہت دور سے بھاگتا ہوا آیا ہو...... وہ کرسی کی پشت پکڑ کر ہانپنے لگا۔

"کیا بات ہے......؟" ایس پی صاحب نے پوچھا۔

"یہ کون لوگ ہیں جو اس طرح بری طرح چیخ رہے ہیں......؟ ایسا لگ رہا ہے جیسے انہیں قتل کیا جارہا ہو؟"

"سر...... سر!" وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ "بلی سے بھی بڑے بڑے چوہے حوالات میں گھس آئے ہیں...... انہوں نے ایس ایچ او، لنگڑے اور کانا پر حملہ کردیا ہے اور انہیں نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں...... اوہ میرے خدا...... کیا خوف ناک منظر ہے......"

"چوہوں نے حملہ کردیا ہے......؟" ایس پی صاحب حیرت سے بولے۔ "لیکن یہ چوہے تھانے اور حوالات کے اندر آ کیسے گئے؟"

"حوالات کی ایک دیوار جو باؤنڈری وال کی طرف ہے اس میں ایک سوراخ کوئی دو مہینے سے ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "اس میں سے حوالات میں آ گئے...... سر! وہ...... وہ...... چوہے آدم خور معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ ان تینوں کا گوشت کھا رہے ہیں؟"

چونکہ اس کی بات کا یقین نہیں آیا اس لئے ہم سب لپک کر وہاں پہنچے۔ اس سپاہی نے غلط نہیں کہا تھا۔ کوئی تیس، چالیس چوہے تھے۔ انہوں نے ان تینوں کو اپنی زد میں لیا ہوا تھا۔ اب صورت حال ایسی تھی کہ انہیں بچایا بھی نہیں جاسکتا تھا اور نہ ہی ان پر فائر کیا جاسکتا تھا۔ فائر کرنے کی صورت میں وہ گولیوں کی زد میں آ جاتے۔ وہ تینوں بری طرح تڑپ رہے تھے، چیخیں مار رہے تھے، اور ان چوہوں سے لڑ رہے تھے۔ ایس پی صاحب کے حکم پر حوالات کے دروازے کی سلاخوں میں سے ہوائی فائر کیے گئے۔ لیکن ان چوہوں پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ جیسے بہرے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان چوہوں نے ان تینوں کو چٹ کر دیا...... اب تینوں کے ڈھانچے رہ گئے تھے۔

ایک عجیب سی بات جو دیکھنے میں آئی تھی کہ چوہے ان تینوں کا گوشت کھانے کے بعد جس راستے سے جس طرح آئے تھے۔ اسی راستے اسی طرح واپس بھی چلے گئے تھے۔ اس بات کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں وہ دوبارہ حملہ نہ کر دیں۔ لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ آخر کار وہ کیفر کردار کو پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے جو بویا تھا وہ کاٹا تھا۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ انہیں دنیا میں بھی سزا مل گئی تھی۔ آخرت میں بھی انہیں اس سے سخت سزا ملنے والی تھی۔ یہ واقعی کسی بھیانک خواب کی طرح تھا۔

دوسرے دن پورے ملک کے تمام اخبارات میں ریڈیو اور ٹی وی پر بھی اس ہولناک واقعہ کی خبر نشر ہوئی تھی۔ لوگوں کو یقین نہ آتا تھا...... لوگ جب ان ڈھانچوں کی تصویروں کو دیکھتے تھے تب انہیں یقین آتا۔ جب پولیس نے اس مکان کا پتا چلایا جس میں وہ آدم خور چوہے موجود تھے۔ تو اس مکان کو بم سے اڑا کر ان آدم خور چوہوں کا خاتمہ کر دیا گیا۔ پولیس کے لئے حیران کن بات یہ تھی کہ یہ چوہے اس کوٹھری سے کیسے اور کس طرح نکل کر تھانے تک آئے۔ جب کہ اس کوٹھری میں ان کے نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا اور پھر تھانہ اس مکان سے کوئی پانچ میل کے فاصلے پر تھا۔ ان چوہوں نے تھانے آ کر صرف اور صرف ان تینوں کو ہی نشانہ کس لئے بنایا تھا؟ یہ ایک معمہ تھا جسے حل کرنے کی عوام اور پولیس نے بڑی کوشش کی لیکن حل نہ ہو سکا۔ صرف ایک اخبار نے لکھا کہ یہ مکافات عمل تھا۔

اس واقعے نے لال میاں کو دہلانے کے بجائے اور ظالم بنا دیا تھا۔ اس واقعے کے کوئی تیسرے دن اس کی دکان کا سارا اناج وغیرہ غائب ہو گیا۔ اس میں کوئی ایک چیز بھی نہ رہی تھی۔ اس کی دکان بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ اس کی دکان کا تمام سودا سلف ان لوگوں کے ہاں غیب سے پہنچ گیا تھا جنہیں اس نے لوٹا اور پریشان کیا تھا۔ اس کے دوسرے دن اس کی دکان میں آگ لگ گئی۔ پھر وہ جل کر خاکستر ہو گئی۔ اب وہاں ملبہ کے سوا کچھ نہ رہا تھا۔ لال میاں کو دل کا دورہ پڑا تو اسے اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔

اب چوں کہ چٹاگانگ میں میرا کوئی کام نہ رہا تھا۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا وہ میں نے کر دیا تھا۔ پھر میں دوسرے دن شجاع اور اس کے گھر والوں سے مل کر ریل گاڑی سے ڈھاکا جا رہا تھا تو نہ صرف شجاع کے گھر والے اور شجاع مجھے رخصت کرنے آئے تھے۔ بلکہ صبا بھی آئی تھی۔ میں نے صبا اور شجاع کے چہروں سے اندازہ کر لیا کہ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے محبت جنم لے رہی تھی۔

☆......☆......☆

میں ڈھاکا سے لمحوں میں اپنے شہر پہنچ سکتا تھا۔ لیکن میں اس طرح جانا نہیں چاہتا تھا۔ کیوں کہ میں پاسپورٹ اور ویزے پر آیا تھا۔ اگر میں اس طرح پہنچ جاتا تو امیگریشن کا مسئلہ پیدا ہو جاتا اور پھر میرے پاس واپسی کا ہوائی جہاز کا ٹکٹ بھی تھا۔ اس لئے میں نے ہوائی جہاز سے واپس اپنے ملک جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میری فلائٹ تین دن بعد کی تھی۔

میں دوسرے دن ڈھاکا کے سب سے خوبصورت اور بڑے پارک رمنا گرین چلا گیا۔ سہ پہر ڈھل چکی تھی۔ سورج کے غروب ہونے میں خاصی دیر باقی تھی۔ پارک میں بڑی رونق اور گہما گہمی تھی۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اور نوجوان جوڑے جن سے اس پارک کی فضا مہک اٹھی تھی جیسے وہ تر و تازہ کلیاں اور مہکتے پھول ہوں۔ بچے اور ہر عمر کے مرد اور عورتیں بھی تھیں۔ ان میں اکثر جوان جوڑے وہ تھے جو محبت کی دنیا میں قدم رکھ چکے تھے۔ وہ محبت بھری باتیں کرنے، وقت گزارنے، تفریح اور ہوٹل کے سبزہ زار پر بیٹھ کر چائے پینے آئے تھے۔

اس پارک میں کچھ گوشے ایسے تھے جن کی تنہائی میں نوجوان جوڑے تجدید محبت بڑے جذباتی انداز سے کرتے تھے اور یہ مناظر عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہتے تھے۔

میں ایک خالی بنچ پر گرم گرم پاپ کارن لیے آ بیٹھا۔ میرے پاس بنچ کے کنارے پر ایک شخص آ بیٹھا۔ اس کی عمر چالیس برس کے لگ بھگ دکھائی دے رہی تھی لیکن وہ پچاس برس سے زیادہ ہی کا تھا۔ وہ کچھ پریشان اور متفکر سا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ گیٹ کی سمت دیکھ رہا تھا۔ اسے شاید کسی کا انتظار تھا۔ میرا خیال درست ثابت ہوا۔ تھوڑی دیر بعد ایک شخص آتا دکھائی دیا تو بنچ پر بیٹھے شخص کا چہرہ دمک اٹھا۔ وہ شخص بھورے رنگ کی پتلون اور سفید شرٹ میں تھا۔ میرے پاس جو بیٹھا تھا وہ کرتہ، پاجامہ میں تھا۔ پتلون والا شخص قریب آیا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”طاہر صاحب! آپ ٹھیک وقت پر آ گئے......!“

”کیوں نہ حاضر ہوتا جناب!“ اس نے جواب دیا۔ ”زمان صاحب! میں وقت کی پابندی کا بڑا خیال رکھتا ہوں۔“

”چلیے...... ہوٹل میں چل کر بیٹھتے ہیں۔“ طاہر نے تجویز پیش کی۔ ”وہیں چائے بھی پئیں گے اور اطمینان سے باتیں بھی ہوں گی۔“

زمان نے بنچ پر بیٹھتے وقت مجھ پر نظر نہیں ڈالی تھی بلکہ اس کی نگاہیں داخلی گیٹ پر جمی ہوئی تھی۔ اس گیٹ سے لوگ اندر آ رہے اور باہر بھی جا رہے تھے۔ طاہر نے بھی میری طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ مجھے طاہر اچھا شخص نہیں لگا۔ اس کے چہرے پر بڑی خباثت تھی۔ وہ کینہ پرور تیز اور عیار قسم کا شخص صاف محسوس ہوا تھا۔ اس کی خصلت اس کی آنکھوں سے عیاں تھی۔ وہ بھی پچاس برس سے زیادہ کا تھا لیکن اس کا جسم تنومند تھا۔ لمبے قد کا تھا۔ اس کے لمبے لمبے بال گردن تک پھیلے ہوئے تھے۔ اس کا لباس اور جوتے بھی عمدہ اور قیمتی تھے۔ اس کے ہاتھ میں ایک سیاہ رنگ کا چرمی بیگ تھا۔ اس میں شاید کاغذات تھے۔

زمان اس کے برعکس سیدھا سادا سا شخص تھا۔ میں کسی تجسس اور کسی خیال کے زیر اثر غیر محسوس انداز سے ان کے پیچھے ہولیا۔ وہ دونوں ہوٹل کے سبزہ زار کے اس گوشے میں آبیٹھے جہاں قریب اور آس پاس کی چھ، سات میزیں خالی پڑی تھیں۔ میں تھوڑی دیر بعد اس میز کی قطار اور ان کی میز کے پیچھے والی میز پر پشت کر کے بیٹھ گیا تھا تاکہ انہیں اس بات کا احساس نہ ہو کہ میں انہیں دیکھ رہا اور ان کی باتیں سن رہا ہوں۔ تاہم ان کی پشت بھی میری جانب ہی تھی۔ وہ دونوں مقابل بیٹھنے کے بجائے ساتھ ساتھ ہی بیٹھے تھے۔ میں ان کی شکلیں دیکھنے نہیں بلکہ ان کی باتیں سننے کے لئے بیٹھا تھا نہ کہ ان کی شکلیں دیکھنے کے لئے۔

"طاہر صاحب!" زمان کہہ رہا تھا۔ "عبدالرشید صاحب نے آپ کی بہت تعریف کی اور یہ بتایا تھا کہ آپ بہت پہنچے ہوئے آدمی ہیں۔ آپ نہ صرف سفلی علم کے ماہر ہیں بلکہ نورانی عملیات کے بھی ماہر ہیں۔ کالے جادو کا توڑ بھی جانتے ہیں۔ آپ ہی مجھے اس مشکل سے نکال سکتے ہیں اور آپ کی شہرت صرف ڈھاکا تک نہیں بلکہ چٹا گانگ، باری سال اور کھلنا تک پہنچی ہوئی ہے۔ بعض اوقات کلکتہ سے بھی لوگ آپ کی خدمات حاصل کرنے آتے ہیں، کیا یہ سچ ہے؟"

"سو فیصد سچ ہے....." طاہر نے جواب دیا۔ "عبدالرشید صاحب میرے دیرینہ دوست ہیں اس لئے میں نے آپ کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا ہے..... ورنہ میں بہت مصروف ترین شخص ہوں۔ میں نے دفتر میں آپ کو ملنے کا وقت اس لئے نہیں دیا کہ وہاں مجھے سر کھجانے تک کی فرصت نہیں ہوتی۔ روزانہ کا حال یہ ہے کہ محبت کی ماری چھ، سات لڑکیاں، آٹھ دس وہ شادی شدہ عورتیں جن کے شوہر غیر عورتوں کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔ بے اولاد عورتیں جو اولاد کے لئے تعویذ لینے آتی ہیں۔ کچھ مرد جو اپنے کاروبار میں نقصان اور دفتروں کی سیاست کا شکار ہوتے ہیں اور ان کی نوکریاں خطرے میں پڑی ہوتی ہیں۔"

"یہ آپ کی بڑی نوازش ہے جو آپ نے اپنا قیمتی وقت نکالا....." زمان نے ممنونیت سے کہا۔ "اور آپ نے صرف میری خاطر میمن سنگھ کی روانگی ملتوی کردی۔ شاید آپ اپنی بیوی، بچوں سے ملنے جارہے تھے۔ میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔"

"اس میں احسان کی کوئی بات نہیں ہے۔" طاہر نے بڑی انکساری سے جواب دیا۔ "کسی مصیبت زدہ اور پریشان حال کے کام آنا فرض سمجھ کر میں کرتا ہوں۔ میں نے انسانیت کی خدمت کو برسوں سے شعار بنایا ہوا ہے۔ بیوی، بچوں سے ملنے اور کسی دن چلا جاؤں گا۔"

اس وقت ویٹر آرڈر لینے پہلے ان کی میز پر پہنچا۔ زمان نے طاہر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کے لئے کیا منگواؤں.....؟ چائے، کافی، کولڈ ڈرنک، سموسے یا پیٹیز کھانے کے لئے منگوا لوں؟"

"میں دفتر میں تھوڑی دیر پہلے تک اس قدر مصروف رہا کہ لنچ نہیں کرسکا۔" طاہر نے جواب دیا۔ "اب اس وقت بھوک محسوس ہورہی ہے۔ آپ کوارٹر چکن بروسٹ اور کلب سینڈوچ اور فالودہ آئس کریم منگوا لیں..... یا پھر فل بروسٹ چکن..... آپ اپنے لئے جو منگوانا چاہیں منگوا لیں۔ مجھے یہاں کے کلب

سینڈوچ اور چکن بروسٹ دونوں ہی پسند ہیں۔"

زمان نے اس کے لئے کوارٹر چکن بروسٹ اور کلب سینڈوچ کا آرڈر دیا۔ اپنے لئے کلب سینڈوچ اور کافی منگوائی اور اس کے لئے فالودہ آئس کریم..... طاہر نے ویٹر سے کہا۔ "چکن بروسٹ میں دیر ہو تو میرے لئے دو عدد کلب سینڈوچز لیتے آنا....."

زمان نے آرڈر لکھوا دیا۔ میں نے میز کے شیشے اور سفید میز پوش کے درمیان دبے ہوئے مینو اور ان کی قیمتیں دیکھیں۔ اس پارک میں دو ریسٹورنٹ تھے۔ ایک عام قسم کا تھا اور یہ اعلیٰ درجے کا تھا۔ یہ مہنگا ترین ریسٹورنٹ تھا۔ کلب سینڈوچ ایک نوے ٹاکا کا تھا۔ جب ویٹر میرے پاس آرڈر لینے آیا تو میں نے بھی اسے کلب سینڈوچ کا آرڈر دیا۔ شاید یہ اس ہوٹل کی بہترین ڈش تھی۔ کیوں کہ اکثر لوگوں کی میزوں پر کلب سینڈوچز رکھے ہوئے تھے۔ طاہر نے زمان کے لئے تین سو روپے کا نسخہ بنا دیا تھا۔ وہ موقع سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔

"جی جناب مسئلہ کیا ہے آپ کا.....؟" طاہر نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگاتے ہوئے پوچھا۔ "اب آپ بتائیں..... تفصیل سے....."

"میں نے بارہ سال قبل پہلی شادی کی تھی۔" زمان کہنے لگا۔ "میں نے دس برس تک اس کے ساتھ زندگی گزاری۔ ازدواجی زندگی بڑی کامیاب اور خوش و خرم رہی..... لیکن دس برس کے بعد میں نے اسے طلاق دے دی۔ کیوں کہ وہ میرے بچے کی ماں نہ بن سکی۔ حالانکہ میں نے اس کا علاج حکیم، ڈاکٹروں اور ویدوں سے کرایا۔ مزاروں پر جاکر منتیں مانگیں..... آخر میں پتا چلا کہ وہ بانجھ ہے۔ خامی اس میں ہے مجھ میں نہیں ہے۔ پھر مجھے مجبوراً اسے طلاق دینا پڑی۔ میں اسے طلاق دینا نہیں چاہتا تھا۔ کیوں کہ مجھے اس سے بہت محبت تھی۔ لیکن وہ سوکن کو کسی قیمت پر برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ پھر میں نے اسے طلاق دینے کے بعد دوسری شادی کرلی۔ میری خوش قسمتی کہیے کہ میری بیوی جوان اور بہت حسین ہے۔ ہم دونوں کی عمروں کے درمیان پچیس برسوں کا فرق ہے۔ اس کے باوجود وہ مجھ سے اتنی محبت کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ آپ تصور نہیں کرسکتے..... جب کہ میں اس کے سامنے بے جوڑ معلوم ہوتا ہوں، مجھے اپنے آپ پر رشک آتا ہے کہ میں اس قدر حسین عورت کا شوہر ہوں..... اس نے شادی کی پہلی رات مجھ سے ایک درخواست کی کہ پانچ برسوں تک میں بچے کا نام نہ لوں..... میں نے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ..... شاید میں ایک سال میں ہی بچوں کی ماں بن جاؤں..... لیکن ماں بنتے ہی میری ساری توجہ بچے کی طرف ہو جائے گی۔ میں آپ کا وہ خیال نہ کرسکوں گی اور نہ ہی پورے جذبے اور گرم جوشی سے محبت و خدمت کرسکوں گی۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ پانچ برسوں تک ہم بے فکری، پرسکون اور خواب ناک زندگی گزاریں۔ ہم نے بچے پیدا کرنا شروع کردیئے تو پھر ازدواجی زندگی کا لطف نہ اٹھا سکیں گے۔ بچوں کی پرورش اور ان کی بیماریوں کے جھن جھٹ میں پڑ جائیں گے۔

اس کی یہ باتیں میرے دل کو لگیں۔ اس کے حسن و رعنائی کو دیکھتے ہوئے یہ خیال آتا تھا کہ مجھے کوئی

خزانہ ہاتھ لگا ہے۔ میرے دوست احباب ملنے والے اور محلے کے لوگ کہتے تھے کہ میں بیوی کے معاملے میں دنیا کا خوش نصیب ترین شخص ہوں۔

میری بیوی جس کا نام شکیلہ ہے اس نے کچھ عرصہ پیشتر مجھ سے کہا کہ میں گھر جلد آجایا کروں۔ میں عموماً گھر جلد ہی آجاتا تھا۔ ہم شام کے وقت گھر سے نکلتے۔ کسی ہوٹل میں کھانا کھاتے...... یا پھر اس رمنا گرین پارک میں آکر گھاس پر بیٹھ کر محبت بھری باتیں کرتے۔

اس کی کہانی کے دوران ویٹر کلب سینڈوچز وغیرہ لے آیا تھا۔ وہ لوگ کھا بھی رہے تھے اور زمان کہانی بھی سناتا جارہا تھا۔

"سوا مہینے پہلے کی بات ہے اس روز میں نے اسے بہت پریشان اور متفکر پایا۔ اس نے جو جلدی گھر آنے کے لئے کہا تھا۔ مجھے حیرانی اور تشویش بھی ہوئی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے......؟ پہلے تو وہ ٹالتی رہی۔ پھر اس نے بتایا کہ مکان کے پچھواڑے میں کوئی تین چار دن سے دن ڈوبنے کے بعد ایک مردانہ آواز میرا نام لے کر پکارتی ہے۔ شکیلہ! تم کہاں ہو؟ تم میری جان ہو...... جان؟"

میں پہلے تو یہ سمجھی کہ محلے کا کوئی بدمعاش ہے جو مجھ سے چھیڑ خانی کررہا ہے۔ تنگ کررہا ہے۔ کیوں کہ محلے میں اس جیسی حسین اور جوان لڑکی کوئی نہیں ہے۔ پہلے دن وہ خاموش رہی۔ دوسرے دن پھر اسے یہ آواز سنائی دی تو اس نے ڈنڈا اٹھایا اور اس کا سر پھاڑنے کے لئے دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ باہر اندھیرا تھا۔ اسے کوئی دکھائی نہیں دیا۔ پھر اس نے ایک بار ہنسی کی آواز سنی۔ اسے ایسا لگا کہ جیسے کوئی اس کے پاس کھڑا ہنس رہا ہے اور پھر اس نے اس نادیدہ ہستی کی گرم گرم سانسیں اپنی گردن پر محسوس کیں تو اس نے واہمہ سمجھا۔

میں ایک بات آپ کو بتادوں اور آپ بھی اس بات کو خوب اچھی طرح سمجھتے اور جانتے ہیں کہ ڈھاکا شہر میں شاید کہیں کچھ تالاب مکانوں کے پیچھے باقی رہ گئے ہیں۔ اس گھر کے پیچھے ایک تالاب ہے جو جھاڑیوں اور درختوں سے گھرا ہوا ہے۔ جس سے راستہ بند ہے۔ کوئی اور وہاں آکر نہا نہیں سکتا۔ تالاب پر نہانے کے لئے جانا ہو تو ہمارے گھر میں سے ہو کر جانا پڑے گا۔ شکیلہ کو جب بھی نہانا ہوتا ہے تو وہ تالاب پر جاکر نہ صرف نہاتی ہے بلکہ گرمیوں میں تیرتی رہتی ہے۔ ایک روز میں نے اسے دن میں تالاب پر آزادی سے نہاتے دیکھا تو اسے منع کیا کہ اس حالت میں نہیں نہایا کرو۔ لیکن اس نے ہنس کر ٹال دیا۔ میں نے پھر اس سے کچھ نہیں کہا...... کوئی دو دن پہلے اس نے مجھ سے کہا کہ...... میں آپ کو بہت کچھ بتانا چاہتی ہوں۔ آپ اس کا کوئی غلط مطلب نہیں لیں گے؟ مجھ پر شک تو نہیں کریں گے؟ میں نے کہا کہ نہیں...... پھر اس نے ایک کہانی سنائی۔

شادی سے ایک برس پہلے کی بات ہے کہ مجھ میں ایک بری عادت تھی۔ وہ یہ کہ میں رات کو دیر تک جاگتی رہتی۔ خصوصاً چاندنی راتوں میں صحن میں چارپائی پر لیٹ جاتی تھی۔ امی منع کرتی تھیں کہ ایک جوان لڑکی کا کھلے آسمان کے نیچے لیٹنا اچھی بات نہیں ہے۔ کیوں کہ رات کے وقت بلائیں گھومتی رہتی ہیں۔ میں ان کی بات کو ہنس کر ٹال دیتی تھی اور کہتی تھی کہ یہ تو وہم پرستی ہے۔ ایک رات میں صحن میں چارپائی پر

لیٹے لیٹے گہری نیند سوگئی۔ پھر ایک دم سے بیدار ہوگئی۔ پھر میں نے اپنے کانوں میں ایک آواز سنی...... میری شہزادی...... میری جان...... تم کتنی حسین ہو......؟ مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے...... میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ مجھے کوئی نظر نہیں آیا...... میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ جب امی کی بات یاد آئی۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ صحن میں چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں دہشت زدہ ہو کر اندر کی طرف لپکی تو اس نادیدہ ہستی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا...... تم کہاں جارہی ہو......؟ ٹھہرو...... بستر پر بیٹھ جاؤ میری چاند! ابھی میرا دل بھرا کہاں۔ میں تمہیں جی بھر کے دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں خوف و دہشت سے بے ہوش ہوگئی۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو اپنے کمرے میں بستر پر پایا۔ اس نادیدہ ہستی نے مجھے بے ہوشی کی حالت میں بستر پر لا ڈالا تھا۔ صبح میں نے امی کو رات کا واقعہ سنایا تو انہوں نے کہا کہ یہ کوئی جن زادہ ہے جو تم پر عاشق ہوگیا ہے۔ میں نہ کہتی تھی کہ تم رات کو چاندنی راتوں میں کھلے آسمان کے نیچے لیٹا نہ کرو۔ اب اس سے چھٹکارا مشکل ہے۔ امی نے سچ ہی کہا تھا۔ وہ راتوں کو بھی میرے کمرے میں بستر پر آجاتا تھا۔ مجھ سے پریم کی باتیں کرنے لگتا تھا۔ اس بات کا شہرہ محلے میں ہوگیا۔ کہاں تو مجھ سے شادی کرنے کے لئے کتنے لوگ بے چین تھے۔ جب ان لوگوں نے سنا کہ مجھ پر جن زادہ عاشق ہوگیا ہے تو شادی کرنے سے صاف انکار کردیا۔ ادھر جن زادے نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے شادی کی تو اس سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ آخر امی نے ایک بڑے عامل کی خدمات حاصل کیں۔ انہوں نے اپنے عمل سے اس جن زادے کو بھگا دیا اور میرے والدین سے کہا کہ وہ میری شادی فوراً کردیں۔ اس لئے انہوں نے آپ کا رشتہ آتے ہی عمروں کے فرق کو نظر انداز کر کے شادی کردی۔ اب وہ جن زادہ پھر سے مجھے تنگ کرنے لگا ہے۔ وہ مجھے تنہا نہاتے ہوئے دیکھ کر اور چاندنی راتوں میں تالاب پر دیکھ کر اپنے جذبات پر قابو نہیں پاسکا اور کہا...... اب تم اپنے شوہر سے طلاق لے لو۔ ورنہ میں تمہارے شوہر کو تمہارے خلاف ایسا بدگمان کردوں گا کہ وہ تمہیں طلاق دینے پر مجبور ہوجائے گا......

میری بیوی اس کی حرکتوں سے سخت نالاں اور پریشان ہے۔ اس کی حرکتیں اب بڑی ناشائستہ ہونے لگی ہیں۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو وہ کسی دن حد سے تجاوز کرجائے گا۔ وہ نامناسب سی حرکتیں اس لئے کررہا ہے کہ میں اسے طلاق دے دوں...... میں نے بھی تہیہ کرلیا ہے کہ چاہے کچھ ہوجائے میں اپنی بیوی کو طلاق نہیں دوں گا...... میں نے دو ایک عاملوں کی خدمات حاصل کیں لیکن ان کی ایک نہ چلی۔ ان کے عمل اس جن زادے کو بھگانے اور اس پر قابو پانے میں ناکام رہے ہیں۔

میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ میری بیوی کو اس جن زادے سے بچائیں۔ اسے بھگادیں اور اس پر قابو پالیں۔ اب وہ کمینہ ہم دونوں کو قریب ہونے نہیں دیتا۔ دیوار بن گیا ہے۔ کبھی وہ کمرے میں اتنی روشنی کردیتا ہے کہ شکیلہ شرم سے دہری ہوجاتی ہے اور کبھی کمرے میں ایسا گھپ اندھیرا کردیتا ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا ہے۔ وہ اندھیرے میں مجھے ایک طرف ہٹا کر شکیلہ کے قریب آجاتا ہے۔ شکیلہ چوں کہ آیۃ الکرسی پڑھتی رہتی ہے۔ اسی وجہ سے اس کی عزت ابھی تک محفوظ ہے۔ ہم دونوں کہیں بھی جائیں وہ وہاں پہنچ

جاتا ہے۔اس نے ہمارا جینا حرام کر رکھا ہے۔زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی ہے...... خدارا کچھ کیجئے طاہر صاحب!"

طاہر نے اس کی بپتا سننے کے بعد ایک لمبی سی ڈکار لی۔پھر اس نے فالودہ آئس کریم پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔" زمان صاحب! آپ کسی بات کی فکر نہ کریں...... یہ حرام زادہ جن زادہ کیا سمجھتا ہے، میں اس کے باپ کو بھی قابو میں کرلوں۔"

"خدا کے لئے اس ذلیل اور کمینے جن زادے سے ہمیں نجات دلا دیں۔" زمان نے کہا۔

"یہ جن زادہ جو بھی ہے ایک عام قسم کا جن زادہ نہیں ہے۔" طاہر کہنے لگا۔" اس بات کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اسے دو تین عامل مل کر قابو میں نہیں کرسکے۔یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔" طاہر نے فوراً ہی پٹری بدلی۔" مجھے اسے قابو کرنے کے لئے بہت جدوجہد کرنا ہوگی...... کیوں کہ اسے ایسا قابو میں کروں گا کہ وہ پھر کبھی بھول کر بھی آپ دونوں کو پریشان نہیں کرے گا۔ہاں تو آپ کیا کرتے ہیں؟"

"میری ٹھٹھری بازار میں ایک چھوٹی سی دکان ہے۔"

زمان نے بتایا۔" مرغی کے انڈوں کی...... میں ہول سیل کا کام کرتا ہوں۔"

"لیکن اس کام پر دس ہزار ٹا کا خرچ ہوں گے......"

طاہر نے خالص کاروباری لہجے میں کہا۔" شاید دو تین ہزار اور دینے پڑیں گے۔"

"دس ہزار روپے......؟" زمان کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔" کیا جن کو قابو میں کرنے میں اتنی زیادہ رقم خرچ ہوگی؟"

"جی ہاں......" طاہر نے سر ہلا دیا۔ویٹر خالی برتن لینے آیا تو اس نے ویٹر سے ایک اور فالودہ آئس کریم لانے کے لئے کہا۔جب ویٹر چلا گیا تو وہ کہنے لگا۔" اس جن زادے کے بھگانے کے لئے کچھ سامان خریدنا پڑے گا۔جو بہت مہنگا آتا ہے۔میں تو عبدالرشید صاحب کی وجہ سے آپ سے پندرہ ہزار کی رعایت کر رہا ہوں۔میں پچیس ہزار سے کم رقم نہیں لیتا ہوں۔کیوں کہ اس میں جان جانے کا بہت خطرہ ہوتا ہے۔"

"طاہر صاحب!" زمان قدرے تذبذب سے بولا۔

"دس ہزار کیا بہت زیادہ نہیں ہیں؟ آپ اس میں کچھ رعایت کردیں تو نوازش ہوگی۔"

"اس میں دس ٹا کا کی بھی رعایت نہیں ہوسکتی......" طاہر سپاٹ لہجے میں بولا۔" اگر آپ دس ہزار ٹا کا نہیں دے سکتے ہیں تو مجھے اجازت دیں۔"

"اچھی بات ہے جناب!" زمان نے گہری سانس لی۔" جب آپ جن زادے کو قابو میں کرلیں گے تو میں دس ہزار رقم یک مشت ادا کردوں گا۔"

"یہ میرے اصول کے خلاف ہے......" طاہر اور کاروباری ہوگیا۔" میں پوری رقم پیشگی لوں گا۔تب میں اپنا عمل شروع کروں گا۔"

"جب میں آپ کی خدمت میں دس ہزار کی رقم پیش کردوں گا تو کیا آپ اس وقت میرے ساتھ گھر چلیں گے؟" زمان نے کہا۔

"جی ہاں......" اس نے کہا۔" پہلے تو میں چل کر آپ کی بیوی سے ملوں گا۔ان سے کچھ سوالات کروں گا تنہائی میں...... کیوں کہ وہ آپ کی موجودگی میں میرے سوالوں کا جواب نہ دے سکیں گی۔جھجک جائیں گی۔پھر میں دوسرے دن آ کر اپنا عمل شروع کردوں گا۔"

"بفرض محال...... جن زادہ آپ کے قابو میں نہیں آیا......؟" زمان نے سوال کیا۔" اس صورت میں کیا آپ رقم واپس کردیں گے......؟"

"جن کے قابو میں نہ آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔" طاہر نے کہا۔" اس لئے کہ میں جو کیس لیتا ہوں وہ بہت سوچ سمجھ کر اور یہ دیکھ کر کہ یہ میرے بس اور اختیار کا ہے کہ نہیں...... میرے بس سے باہر ہے تو معذرت کر لیتا ہوں۔مگر آج تک ایسا کبھی نہیں ہوا......"

"ٹھیک ہے...... میں آپ کو ابھی اور اسی وقت دس ہزار ٹا کا پیشگی دے دیتا ہوں۔" اس نے کہا۔

"آپ میرے ساتھ گھر چلیں گے نا......؟"

"کیوں نہیں...... کیوں نہیں......" طاہر خوش ہو کر بولا۔اس کا چہرہ دمک گیا۔اس نے سگریٹ کا کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑا۔

زمان نے بٹوا نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا، دوسرے لمحے وہ حواس باختہ ہو کر اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا۔" ایں...... بٹوا......؟ کہاں گیا......؟ اس میں بارہ ہزار کی رقم تھی میں دکان سے لے کر نکلا تھا۔"

"کہیں رکشا میں تو نہیں گر گیا یہاں آتے ہوئے؟"

طاہر نے کہا۔" اچھی طرح سے یاد کریں۔کہیں دکان میں تو بٹوا نہیں بھول آئے؟"

"میں نے رکشا کو بٹوے میں سے پندرہ ٹا کا کے نوٹ پارک کے گیٹ کے سامنے نکال کر دیئے۔" زمان نے کہا۔" دکان میں بھول کر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا...... ہاں یاد آیا...... راستے میں، میں نے ایک دکان دار سے ایک ہزار ٹا کا لے کر بٹوے میں رکھے تھے۔"

"میرے خیال میں بٹوا گیٹ کے باہر ہی کہیں گر گیا اور آپ کو خبر نہیں ہوئی۔" طاہر نے کہا۔" عموماً ایسا ہو جاتا ہے۔"

ویٹر بل لے آیا تو زمان نے فق چہرے سے بل کو دیکھا اور ویٹر سے بولا۔" بل رکھ کر جاؤ۔تھوڑی دیر بعد آجانا......" جب ویٹر چلا گیا تو زمان نے کہا۔" اب آپ کے کیا ارادے ہیں......؟ آپ میرے ساتھ گھر چل رہے ہیں نا......؟"

"آپ جب تک دس ہزار ٹا کا پیشگی نہیں دے دیتے تاوقتیکہ میں چلنے سے معذور ہوں۔" طاہر نے کہا۔" پلیز! کچھ خیال نہ کریں۔"

"میں صبح دس بجے بینک جا کر اپنے اکاؤنٹ سے رقم نکال کر لادوں گا۔" زمان نے بڑی عاجزی سے کہا۔" آج کچھ ایسا کردیں کہ وہ رات کو ہمیں تنگ اور پریشان نہ کرسکے۔ہم سکون سے رات ہو سکیں۔ہماری راتیں بڑی عذاب ناک گزرتی ہیں۔"

"سوری مسٹر زمان۔" وہ بڑے سرد لہجے میں بولا۔

"یہ میرے کاروباری اصول کے خلاف ہے میں بہت اصولی شخص ہوں۔"

"اچھا......" زمان نے سر ہلایا۔ "آپ ایسا کریں ...... یہ تین سو پچیس ٹا کا بل ادا کر دیں۔ کیوں کہ اس وقت میری جیب میں ایک ٹا کا بھی نہیں ہے......کل صبح میں دس ہزار کی رقم لے کر آؤں گا تو ساتھ میں یہ رقم بھی لیتا آؤں گا۔"

"آئی ایم سوری مسٹر!" وہ اپنا چرمی دستی بیگ اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ "میرے پاس صرف پچاس ٹا کا ہیں...... آپ ایسا کریں اپنی دستی گھڑی اور یہ سونے کی انگوٹھی ہوٹل کے منیجر کے پاس کل تک کے لئے گروی رکھ دیں۔ پھر اسے رقم دے کر اپنی چیزیں واپس لے لیں......"

پھر وہ تیزی سے پلٹا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا مین گیٹ کی طرف بڑھا۔ وہ اپنی جیبیں ٹٹولتا بھی جا رہا تھا۔ وہ ایک دم سے ٹھٹک کے رک گیا۔ پھر وہ بجلی کی سرعت سے واپس آیا۔ میز اور کرسیوں کے نیچے جھانک جھانک کر دیکھنے لگا۔ اس کا چہرہ فق ہو رہا تھا۔

"کیا ہوا مسٹر طاہر!" زمان جو اس کی کمینگی اور خود غرضی پر کھول رہا تھا۔ پھر بھی اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"خیریت تو ہے کیا دیکھ رہے ہیں؟"

"میرا بٹوا......؟" وہ افسردگی سے بولا۔ "نہ جانے کہاں گر گیا......؟ کسی جیب کترے نے اڑا لیا۔ اس میں اٹھارہ ہزار روپے تھے۔"

"مگر ابھی تو آپ نے یہ کہا تھا کہ میرے پاس صرف پچاس ٹا کا ہیں۔" زمان نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اتنی بڑی رقم کہاں سے آ گئی......؟"

"وہ میری نہیں بلکہ ایک شخص کی امانت کی رقم تھی۔"

زمان کہنے لگا۔ "آپ کا یہ دعویٰ ہے کہ آپ کے پاس موکل ہیں۔ آپ روحوں کو بلا سکتے ہیں۔ ان کے ذریعے سے......آپ غیب کا علم بھی جانتے ہیں۔ جب آپ اتنے بڑے عامل ہیں تو کیا اپنا بٹوا میرا بٹوا کسی موکل سے......"

زمان کی بات ادھوری رہ گئی۔ کیوں کہ طاہر دانت پیستا اور پیچ و تاب کھاتا گیٹ کی طرف بڑھ گیا تھا۔ واقعی زمان نے سادگی میں بڑے پتے کی بات کہی تھی۔ جب ایک عامل روحوں کو بلانے پر دسترس رکھتا ہے تو اپنا بٹوا بھی جیب کترے سے حاصل کر سکتا ہے۔ یہ ایک طرح سے بڑا آسان کام ہے۔

جب طاہر نظروں سے اوجھل ہو گیا تو میں اپنی میز سے اٹھ کر زمان کی میز پر گیا۔ "کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں......؟"

زمان جو گہری سوچ، فکر اور پریشانی میں بل ادا کرنے کے لئے بتلا تھا اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ "بیٹھ جایئے......آپ کیوں نہیں بیٹھ سکتے......"

اس وقت ویٹر بل لینے آیا تو میں نے اپنی جیب سے بٹوا نکالا جو طاہر کا تھا۔ اس میں اٹھارہ ہزار کی رقم تھی۔ طاہر نے غلط بیانی نہیں کی تھی۔ ویٹر کو دیکھ کر میں نے بٹوے میں سے رقم نکال کر زمان کا بل ادا کیا۔ میں اپنا بل پہلے ہی ادا کر چکا تھا۔ اسے بیس ٹا کا کی بخشش بھی دے دی۔

"ایں......" زمان نے حیرت سے میری شکل دیکھی...... "یہ آپ نے میرا بل کیوں ادا کر دیا......؟ کیا آپ مجھے جانتے ہیں؟"

"اس لئے کہ آپ کے پاس بل ادا کرنے کے لئے رقم نہیں ہے اور آپ کا بٹوا کہیں گر گیا ہے؟" میں نے کہا۔

"ویسے یہ بل طاہر کی رقم سے ادا ہوا ہے...... یہ اس کا بٹوا ہے......اس میں اس کی رقم اٹھارہ ہزار موجود ہے۔ اس نے جھوٹ بولا تھا کہ اس کے پاس صرف پچاس ٹا کا ہیں۔ حالانکہ اس کی اوپر والی جیب میں پانچ سو ٹا کا کا ایک نوٹ تھا۔ وہ چاہتا تو اس سے بل ادا کر سکتا تھا۔ لیکن اس نے آپ پر اعتبار نہیں کیا......؟"

"لیکن اس کا بٹوا آپ کے پاس کیسے آیا......؟" زمان نے مجھے متعجب نظروں سے دیکھا۔

"جب آپ اسے اپنی کہانی سنا رہے تھے تب اس نے اپنی جیب سے رومال نکالا تھا۔ تب یہ بٹوا نکل کر گر پڑا تھا۔ میں نے اسے اٹھا لیا تھا۔" میں نے کہا۔

"لیکن آپ نے اس کا بٹوا واپس کیوں نہیں کیا؟ وہ بہت پریشان ہو رہا تھا کہ بٹوے میں کسی کی امانت کی رقم تھی۔" زمان نے کہا۔

"اس لئے کہ وہ شخص کوئی اچھا آدمی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "ریاکار، منافق......خود غرض......دھوکے باز فراڈی......وہ عامل نہیں ہے۔ اس نے تھوڑا بہت سفلی علم سیکھ رکھا ہے۔ جو عورتیں اولاد کے لئے جاتی ہیں، شوہروں کے ہرجائی پن سے نجات پانا چاہتی ہیں......جو پسند کی شادی اور کسی وجہ سے شادی نہ ہونے یا شادی کی خواہش مند ہوتی ہیں۔ وہ انہیں اپنے فریب کے جال میں پھانس کر ان سے فائدہ اٹھاتا ہے......کچھ جمتی قسم کی عورتیں اس کے فریب میں آ جاتی ہیں......اس شخص نے بہت ساری عورتوں اور لڑکیوں کی زندگی خراب کی ہے۔ میں ایک ایسے شخص کا بٹوا واپس کر دوں...... میں اس بات کا انتظار کروں گا کہ اس کا موکل بٹوا لینے آئے۔"

"عبدالرشید صاحب نے اس کی بہت تعریف کی تھی۔" زمان نے کہا۔ "اور بھی لوگ اس کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ کیا آپ نے اس کی تعریف نہیں سنی......"

"دراصل وہ لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں جنہیں کبھی اس سے واسطہ نہیں پڑا۔" میں بولا اور جیب سے اس کا بٹوا نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ "یہ رہا آپ کا بٹوا۔"

وہ اپنا بٹوا دیکھ کر خوشی سے پھولا نہیں سمایا۔ "آپ کا بہت بہت شکریہ......لیکن یہ آپ کو کہاں ملا؟"

"اس بنچ کے نیچے جہاں آپ نے بیٹھ کر طاہر کا انتظار کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "آپ کا بٹوا دینے میں بھی یہاں آ گیا۔"

"آپ نے مجھے فوراً ہی بتوا کیوں نہیں دیا......؟" وہ حیرت سے بولا۔ "اتنی دیر تک آپ نے اسے پاس رکھا ہوا تھا۔"

"اس لئے کہ آپ اس فراڈی کو دس ہزار کی رقم دے دیتے۔" میں نے جواب دیا۔ "وہ آپ کو بے وقوف بنا رہا تھا۔"

"جناب! آپ نہیں جانتے مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔ میری بیوی کس عذاب میں مبتلا ہے۔" زمان نے کہا۔ "میں اسے دس ہزار کی رقم دے کر ایک بہت بڑے عذاب سے نجات پانا چاہتا تھا...... اب جب کہ رقم مل گئی ہے تو میں اسے جا کر دے آؤں۔"

"میں نے آپ کی وہ ساری کہانی سن لی ہے جو آپ نے اسے سنائی تھی۔" میں نے کہا۔ "آپ یہ رقم حرام میں نہ ڈالیں...... اس لئے کہ وہ اس جن کو بھگا نہیں سکتا بلکہ جن اسے بھگا دے گا۔ البتہ میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں اس جن سے نجات دلانے میں......"

"کیا...... کیا...... آپ بھی کوئی عامل ہے......؟" زمان کے چہرے پر گہرا استعجاب چھا گیا۔

"میں کوئی عامل تو نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ میں اسے کسی تدبیر اور ذہانت سے بھگا سکتا ہوں۔"

"سچ......" اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ "اگر آپ اس جن کو بھگا دیں میری بیوی کو نجات دلا دیں تو میں دس ہزار ٹکا دوں گا۔"

"مجھے دس ہزار کیا...... دس ٹکا بھی نہیں چاہئیں۔"

میں نے اسے دلاسا دیا۔ "میرا معاوضہ یہ ہے کہ آپ میاں بیوی کو سکون نصیب ہو۔"

زمان مجھے اپنے ہمراہ لے کر اپنے مکان پر پہنچا جو ہتواٹولی میں تھا۔ اس کی بیوی شکیلہ واقعی بلا کی حسین اور نہایت پرکشش تھی۔ وہ اس کے سامنے بدصورت اور گدھا دکھائی دیتا تھا۔ بڑی بے جوڑ شادی تھی۔ بہرکیف اب جو بھی تھی جیسی بھی تھی وہ اس کی بیوی تھی۔ بقول زمان کے وہ اسے بہت چاہتی اور بے پناہ محبت کرتی تھی۔ یہ ایک بہت اچھی بات تھی۔ لیکن ایک بات میں سوچے بغیر نہیں رہ سکا کہ یہ بوڑھے اور بدصورت مرد حسین اور جوان لڑکیوں سے شادی کیوں کر لیتے ہیں۔

شکیلہ نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔ "یہ کون صاحب ہیں؟ کیا یہ عامل صاحب ہیں جو جن کو بھگانے آئے ہیں؟"

"یہ میرے بہت پرانے دوست ہیں۔" زمان نے میرا تعارف کرایا۔ "ان کا نام سکندر ہے لیکن یہ عامل نہیں ہیں۔"

میں نے پتا چلا لیا کہ یہ مکان آسیب ہے۔ جن زادہ نے اس پر اپنا تصرف کیا ہوا ہے۔ اس وقت جن زادہ مجھے دیکھ رہا تھا اور میں اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کا یہ خیال تھا کہ وہ مجھے نظر نہیں آ رہا ہے۔ میں اسے ابھی اسی خوش فہمی میں رہنے دینا چاہتا تھا۔

"کیا تم واقعی اپنے شوہر کو بے پناہ چاہتی ہو؟" میں نے اس کے حسین چہرے پر نظریں مرکوز کر کے پوچھا۔

"ہاں......" شکیلہ نے اثباتی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں ان کے لئے اپنی جان قربان کر سکتی ہوں۔"

"خیر...... اس کی نوبت نہیں آئے گی۔" میں نے کہا۔ "اچھا یہ بتاؤ کہ کبھی تمہارے سامنے جن حاضر ہوا......؟ تم نے اسے کبھی دیکھا ہے؟"

"دیکھا تو نہیں البتہ اسے محسوس ضرور کیا ہے۔" شکیلہ نے جواب دیا۔ "اس نے مکان میں ڈیرہ ڈال رکھا ہے۔"

"کس طرح سے محسوس کیا ہے کیا تم بتانا پسند کرو گی......؟" میں نے کہا۔ "جھجکنے کی چنداں ضرورت نہیں...... جن اس مکان میں موجود ہے تو ڈرنے کی ضرورت نہیں...... کیوں کہ اب اس کی مجال نہیں کہ تمہارے ساتھ کوئی ناشائستہ حرکت کرے۔ اب تو وہ تمہارے قریب بھی نہیں آ سکتا۔"

میری یہ بات سن کر جن کا چہرہ لال ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا تھا۔ لیکن وہ چپ کر کھڑا رہا۔ "میں کیا بتاؤں......" وہ سرخ ہو کر سر جھکا کر بولی۔ "اس نے مجھ سے بہت من مانی کی اور اب بھی کرتا ہے...... اب تو وہ میری عزت کے درپے ہے۔ میں اب تک بے عزت ہونے سے محفوظ رہی ہوں۔ لیکن اب ایسا لگتا ہے کہ میں اس کے ہاتھوں سے بچ نہ سکوں گی۔"

"جن دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک شریف اور ایک بدکار...... بدمعاش اور ذلیل قسم کے...... جنات کو ان کے سرداروں کا حکم ہے کہ وہ انسانوں کو تنگ نہ کریں۔ لیکن ان میں سے کچھ باز نہیں آتے ہیں۔ اس وقت اور کئی دنوں سے یہاں جو جن ہے اور ناشائستہ حرکتیں کر رہا ہے۔ وہ انتہائی ذلیل قسم کا ہے لیکن اب وہ ایک دن بھی یہاں نہیں رہے گا۔ اسے جانا ہی پڑے گا۔"

میں نے بڑے سخت لہجے میں کہا۔ جن کو سنانے کے لئے...... میری یہ باتیں سن کر شکیلہ نہ صرف خوش ہو گئی بلکہ اس کا حوصلہ بھی بڑھ گیا۔ دوسری طرف جن غضب ناک ہو گیا۔ اسے کسی عامل نے اس انداز سے مخاطب نہیں کیا تھا۔ وہ میری طرف بڑھا تاکہ مجھے اٹھا کر فضا میں گھما کر دیوار پر دے مارے۔ میں خاموش کھڑا رہا۔ لیکن اس کی طرف دیکھا نہیں۔ اگر میں اس کی طرف دیکھنے لگتا تو وہ سمجھ جاتا کہ میں اسے دیکھ رہا ہوں۔ میں اس پر ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے مجھے اٹھانے کی اس طرح سے کوشش کی جیسے میں کوئی پلاسٹک کا کھلونا ہوں۔ جنات بہت زیادہ طاقتور ہوتے ہے وہ منوں بھاری چیز صرف ایک ہاتھ سے اٹھا سکتے ہیں۔ وہ مجھے اٹھانا تو در کنار ہلا تک نہیں سکا۔ وہ بڑا حیران ہوا۔ پھر اس نے اپنی ساری طاقت جمع کی۔ پھر بھی وہ مجھے اٹھا نہیں سکا۔ جس پر وہ بڑا حیران اور خوف زدہ سا ہو گیا۔

"اس وقت وہ کمینہ اور ذلیل جن زادہ اس کمرے میں موجود ہے اور ہماری باتیں سن رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن ڈرنے کی ضرورت نہیں۔"

''آپ کو کیسے پتا چلا کہ جن اس وقت اس کمرے میں موجود ہے؟'' زمان نے کہا۔ ''وہ سارا دن صحن میں جو نیم کا پیڑ ہے اس پر رہتا ہے اور شام کے وقت...... دن ڈوبتے ہی گھر میں گھس آتا ہے پھر شکیلہ کو اپنی ناشائستہ حرکتوں سے تنگ کرتا ہے۔ ابھی دن ڈوبنے میں دیر ہے۔''

''وہ ایسے کہ ان کے جسموں میں ایک عجیب قسم کی بو بسی ہوتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ بو ہر کوئی محسوس نہیں کرتا۔ جن کی بو صرف جن ہی سونگھ سکتا ہے۔'' جن نے جب دیکھا کہ وہ مجھے اٹھا نہیں سکا تو وہ شکیلہ کی طرف بڑھا تا کہ اسے بری نیت سے اٹھا کر لے جائے۔ لیکن جن اسے بھی میری طرح اٹھا نہ سکا۔ شکیلہ نے اس کے ہاتھ کا لمس محسوس کر کے ایک چیخ ماری اور وہ اپنے شوہر کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی اور خوف زدہ لہجے میں بولی۔ ''یہ کمینہ جن...... مجھے گود میں اٹھا کر لے جانے کی کوشش کر رہا ہے آج اس کے ارادے اچھے نہیں لگ رہے ہیں۔''

''تمہیں گھبرانے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے اسے دلاسہ دیا۔ ''وہ تمہیں اٹھا سکتا ہے اور نہ ہی ہاتھ لگا سکتا ہے...... نہ ہی من مانی کر سکتا ہے...... مسٹر زمان! ایک بڑی سی بوتل لاؤ جو شربت کی بوتل کے سائز کی ہو تا کہ اس بوتل میں جن کو بند کر سکوں۔''

جن یہ سنتے ہی گھبرا گیا۔ اس نے جان لیا کہ میں عامل ہی نہیں بلکہ کوئی توپ قسم کی چیز ہوں۔ وہ سوچنے لگا کہ میرے ساتھ کیا حرکت کرے۔ مجھے کسی طرح سے یہاں سے بھگا دے وہ یہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ آخری لمحے تک مجھ سے مقابلہ کرنا چاہتا تھا۔ تا کہ زمان اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔ اب سارا کھیل میری سمجھ میں آ گیا تھا کہ یہ سب کچھ کس کے اشارے پر ہو رہا ہے۔ یہ جن کس کے تابع ہے۔ جن دراصل مہرہ تھا۔ ایک کٹھ پتلی کی طرح تھا۔ اس کی ڈوریاں کسی اور کے ہاتھ میں تھیں۔ وہ بھی اس وقت دیکھ رہا تھا کہ اس کا مہرہ میرے آگے مات کھا چکا ہے۔''

''سنو جن زادے......'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں دیکھ سکتا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔ تم شاید میری بات کا یقین نہیں کر رہے ہو...... لیکن میں ذرا تمہارا حلیہ بتائے دیتا ہوں۔ تمہیں پھر میری بات کا یقین آ جائے گا۔ ایک تو تم انتہائی کالے رنگ کے ہو...... تمہاری پیشانی پر ایک سفید سا داغ ہے۔ تمہاری ایک آنکھ بہت چھوٹی اور دوسرے بہت بڑی ہے۔ اسی طرح تمہارا دایاں ہاتھ چھوٹا اور بایاں ہاتھ دوسرے ہاتھ کے مقابلے میں قدرے بڑا ہے۔ تم سات فٹ کے قد کے ہو...... کیا یہ حلیہ صحیح ہے یا نہیں......؟''

یہ سنتے ہی جن زادہ کا چہرہ فق ہو گیا۔ پھر اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ ''تم ہو کون......؟ یہ تم مجھے کس طرح سے دیکھ سکتے اور دیکھ رہے ہو......؟ تم نے میرا حلیہ بالکل صحیح بتایا ہے...... اس میں ایک بات بھی غلط نہیں ہے۔''

''میں کون ہوں کیا ہوں؟ تمہیں کس طرح دیکھ رہا ہوں......؟ یہ تو میں نہیں بتاؤں گا......'' میں نے کہا۔ ''تم ابھی اور اسی وقت اسی طرح اس کمینے، خبیث اور مردود کے پاس جاؤ جس نے تمہیں یہاں

بھیجا تھا۔ اس سے یہ بھی کہہ دینا کہ میں اس سے دو دو ہاتھ کرنے کے لئے آ رہا ہوں...... اگر تم نہیں گئے تو میں تمہیں بوتل میں بند کر دوں گا ...... پھر یہ بوتل سمندر میں پھینک دوں گا۔ لیکن یہ بوتل قیامت تک نہ تو کھل سکے گی، نہ ہی اسے کوئی کھول سکے گا اور نہ ہی کسی کے ہاتھ لگ سکے گی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ بوتل بہتے بہتے بہت دور اور ایسی جگہ نکل جائے جہاں شارک مچھلیاں ہوتی ہیں اور وہ اس بوتل کو نگل لیں......

''تم میرے مالک کو نہیں جانتے ہو......؟'' جن زادے نے خشونت سے کہا۔ ''بنگلہ دیش میں اس سے بڑا جادوگر کوئی نہیں ہے۔ اگر تم نے اس سے ٹکر لینے کی کوشش کی تو وہ تمہیں پاش پاش کر دے گا...... تمہاری خیریت اور زندگی کی سلامتی اسی میں ہے کہ یہاں سے ابھی اور اسی وقت دفع ہو جاؤ...... زمان کا بچہ بڑا بے غیرت و بے شرم اور کمینہ ہے۔ اس نے اپنی بیوی کو طلاق نہیں دی جب کہ میں نے شکیلہ سے بہت من مانی کی۔ نامناسب اور ناشائستہ حرکات کیں...... کوئی اور ہوتا تو وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا یا قتل کر دیتا...... لیکن اس نے ایسا نہیں کیا......''

''یہ بات کان کھول کر سن لو کہ زمان صاحب کبھی بھول کر، ڈر کر یا کسی بھی وجہ سے اپنی بیوی کو طلاق نہیں دیں گے۔'' میں نے کہا۔ ''اس لئے کہ میاں، بیوی ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں۔ وہ یک جان دو قالب ہیں۔ لیکن یہ بتاؤ کہ طلاق میں ایسا کون سا راز پوشیدہ ہے؟''

''ہاں...... ایک راز ہے۔'' اس نے گردن ہلا کر اقرار کیا۔ ''میں اس لئے نہیں بتا سکتا کہ میں جانتا نہیں ہوں۔ میرا مالک حاتم جانتا ہے۔''

''لیکن میں جان چکا ہوں کہ وہ راز کیا ہے؟'' میں نے کہا۔ ''سنو...... بہتر ہے تم واپس چلے جاؤ...... اس لئے کہ تمہارے نہ جانے سے تمہیں بوتل میں بند کر دوں گا۔ یہ تمہیں آخری وارننگ دے رہا ہوں۔''

اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ پھر چند لمحوں تک ہنستا رہا۔ پھر اس نے بڑے مغرورانہ انداز سے کہا۔ ''اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ مجھے بوتل میں بند کر سکتے ہو تو کر کے دیکھ لو...... میرا مالک تمہارے اس عمل کو ناکارہ کر دے گا اور تم مجھے ڈرا دھمکا رہے ہو۔''

میں نے اس سے بحث و تکرار کرنا مناسب نہیں سمجھا وقت ضائع کرنے والی بات تھی۔ میں نے زمان سے بوتل منگوائی۔ میں اس جن زاد کی اکڑ نکالنا چاہتا تھا۔ وہ اس لئے اکڑ رہا تھا کہ اس نے میری اکڑ کو خالی خولی دھمکی سمجھا تھا۔ میں نے خالی بوتل کا ڈھکن کھول کر اسے کمرے کے وسط میں رکھ دیا۔ زمان اور شکیلہ کو ایک طرف کھڑے ہو جانے کے لئے کہا۔ پھر میں نے ایک منتر پڑھ کر اس پر پھونکا۔ دوسرے لمحے وہ ایک کثیف دھوئیں میں تبدیل ہوتا گیا۔ وہ دھواں ان دونوں کو بھی نظر آنے لگا۔ جب وہ دھوئیں میں تحلیل ہو گیا تو وہ دھواں بوتل میں آہستہ آہستہ اترنے لگا۔ جب سارا دھواں بوتل میں چلا گیا تو میں نے فوراً ہی اس کا ڈھکن بند کر دیا۔ چند لمحوں کے بعد وہ جن اپنی ظاہری شکل میں آ گیا۔ اب وہ ایک بالشت بونے کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔

شکیلہ اور زمان آنکھیں پھاڑ کے اسے دیکھ رہے تھے۔ اس کی مکروہ شکل دیکھ کر دونوں خوف زدہ

ہو گئے۔ شکیلہ کے سارے بدن پر ایک جھرجھری سی آ گئی تھی کہ...... یہ بدصورت اس کے ساتھ ناشائستہ حرکتیں کرتا تھا...... بعض اوقات وہ بے خودی بھی ہو جاتی تھی۔ پھر اسے فوراً ہی ہوش آ جاتا۔ وہ آیۃ الکرسی پڑھنے لگتی تھی تو اس کی گرفت اور اثر سے نکل آتی تھی۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں نہ صرف خوف و دہشت بھری تھی بلکہ نفرت اور حقارت بھی...... اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ پھر اس کی آنکھیں شعلے برسانے لگیں۔ "سکندر صاحب!" شکیلہ مجھ سے بولی۔ "کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ میں اسے بھڑکتی آگ کے شعلوں کی نذر کر دوں۔"

نفرت اور غصے سے سانس اس کے سینے میں دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ اس کے خوبصورت چہرے پر جسم کا سارا خون سمٹ آیا تھا۔ نس نس میں لہو ابلنے لگا تھا۔ وہ اس جن کی نامناسب حرکات کا بدلہ لینا چاہتی تھی...... ادھر زمان کی کیفیت بھی شکیلہ سے مختلف نہ تھی۔ ایک غیرت مند شوہر ایسی باتیں کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ وہ جن بوتل میں بند ہاتھ جوڑ رہا تھا۔

"اب آپ اس کا کیا کریں گے......؟" زمان نے پوچھا۔ "کیا اس بوتل کو سمندر میں لے جا کر پھینک دیں۔ یہاں تو سمندر نہیں ہے؟"

"میں اسے اب آزاد کر رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "وہ بوتل سے باہر آ جائے گا لیکن اب وہ پھر کسی کو نظر نہیں آئے گا۔"

"آپ...... اسے آزاد کیوں کر رہے ہیں......؟"

شکیلہ نے دہشت زدہ لہجے میں پوچھا۔ "یہ پھر کہیں مجھے تنگ کرنا شروع نہ کر دے۔"

"نہیں...... اب ایسا نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔

"اسے آزاد کرتے ہی وہ کسی کتے کی طرح دم دبا کر بھاگ جائے گا۔ پلٹ کر بھی نہیں دیکھے گا۔"

"لیکن آپ نے اسے بند کیوں کیا تھا......؟" شکیلہ مجھے متوحش نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی۔ "جب بند کیا تو اس خبیث کو بند ہی رہنے دیتے۔"

"اس لئے کہ اسے پتا چل سکے کہ وہ ہمیں کمزور نہ سمجھے۔" میں نے کہا۔ "اب اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کا کس سے پالا پڑا ہے۔" پھر میں نے بوتل کا ڈھکن کھول دیا۔ بوتل میں سے کثیف سا دھواں اٹھا۔ پھر وہ کھڑکی کے راستے نکل گیا۔ پھر میں نے بوتل اٹھا کر زمان سے کہا۔

"اب یہ بلا ہمیشہ کے لئے چلی گئی ہے...... اب یہاں نہیں آئے گی۔ وہ تنگ پریشان اور ہراساں نہیں کرے گی۔ آپ تسلی رکھیں۔"

"آخر یہ کیا سارا چکر تھا......؟" زمان نے کہا۔ "وہ طلاق کے لئے اس قسم کی حرکتیں کر رہا تھا۔ شکیلہ کو طلاق دینے سے کس کو کیا فائدہ تھا؟"

"یہ بڑا لمبا چکر تھا۔" میں نے کہا۔ "یہ طلاق کا چکر اس لئے چلایا گیا تھا کہ کسی کو اس سے فائدہ پہنچے۔ ورنہ بغیر فائدے کے کون ایسا کام کرتا ہے۔"

"اس کم بخت جادوگر کو کیا فائدہ تھا......؟" زمان نے کہا۔ "میں اس سور کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس سے ہر شریف آدمی ڈرتا ہے اور لوگ اس کے گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں۔ ایک نمبر کا اوباش، غنڈا اور ڈفر کی اولاد ہے۔ اس نے اپنے جادو سے اپنے محلے والوں اور شریف آدمیوں کو پریشان کر رکھا ہے...... کیا وہ شکیلہ کو مجھ سے طلاق دلوا کر اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔"

"نہیں...... یہ کوئی اور ہی چکر ہے۔" میں نے کہا۔ "تم فکر نہ کرو کہ میں اسے ایسا سبق دوں گا کہ وہ ساری زندگی مجھے یاد کرتا رہے گا۔"

"کیا آپ مجھے بتانا پسند کریں گے کہ یہ کیا چکر ہے؟" زمان نے حیرت بھری نظروں سے دیکھا۔ "آپ تو بڑے چھپے رستم نکلے...... سچ سچ بتائیں کہ آخر آپ ہیں کیا......؟ مجھے تو بہت بڑے عامل معلوم ہوتے ہیں۔ اس وقت آپ نے جو کارنامہ انجام دیا وہ......"

"یہ کیا چکر تھا یہ تو میں بعد میں بتاؤں گا......" میں نے جواب دیا۔ "آپ مجھے ایک عام سا عامل ہی سمجھ لیں۔ دراصل میں نے تدبیر اور ذہانت سے بھی کام لیا ہے...... آپ ایسا کریں کہ تھوڑی دیر کے لئے مجھے اور شکیلہ کو تنہا چھوڑ دیں۔ میں آپ کی بیوی سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن آپ ان باتوں کو سننے کی کوشش نہیں کریں گے۔ آپ اس بات کا مجھ سے وعدہ کریں......"

"آپ بے فکر رہیں......" زمان نے کہا۔ "میں مکان کے باہر جا کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔ آپ جتنی دیر چاہیں شکیلہ سے بات کریں۔ آواز دیں گے تو واپس آ جاؤں گا۔"

زمان کے جانے کے بعد میں نے شکیلہ سے کہا۔ "تم میرے سوالوں کا ٹھیک جواب دینا۔ جھوٹ نہیں بولنا...... کوئی بات چھپانے کی کوشش بھی نہ کرو گی...... اگر تم نے مجھ سے غلط بیانی کی تو پھر میں تمہاری کوئی مدد نہیں کروں گا۔ وہ جن پھر سے یہاں آ کر بسیرا کرے گا۔"

"میں آپ کے ہر سوال کا صحیح صحیح جواب دوں گی۔" اس نے اثباتی انداز میں سر ہلایا۔ "آپ سے کوئی بات نہیں چھپاؤں گی۔"

"کیا آپ واقعی اپنے شوہر سے سچی محبت کرتی ہیں؟"

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"جی ہاں......" اس نے میری نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنی پلکوں کی چلمن گرا کے سر ہلایا۔

"نہیں......" میں نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔ "تم مجھ سے جھوٹ بول رہی ہو...... تم نے میرے پہلے ہی سوال کا غلط جواب دیا۔"

"جی...... جی...... نہیں...... یہ آپ نے کیسے کہہ دیا کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں۔"

"تمہارا چہرہ اور تمہاری آنکھیں جھوٹ کی چغلی کھا رہی ہیں۔" میں نے کہا۔ "چہرہ اور آنکھیں دل کا آئینہ ہوتی ہیں۔ جھوٹ کی لکیریں تمہارے چہرے پر پڑ گئی ہیں...... سنو یہ گفتگو صرف میرے اور تمہارے درمیان رہے گی۔ تم مجھ پر بھروسا رکھو...... میں تمہارے شوہر کو اس کے متعلق کچھ نہیں بتاؤں گا اور

نہ ہی تم بتاؤ گی۔"

"یہ سچ ہے کہ میں اپنے شوہر سے اتنی محبت نہیں کرتی ہوں جتنا ہر بات سے اس پر ظاہر کرتی ہوں۔" شکیلہ نے کہا۔

"پھر تم کس سے محبت کرتی ہو......؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں مرکوز کر کے پوچھا۔ "مجھے اس کا نام بتادو۔ وہ کون ہے؟"

"ہاں...... میں کسی دوسرے شخص سے محبت کرتی ہوں۔"

اس نے اثباتی انداز میں سر ہلا کر اقرار کیا۔ "آپ اس کا نام جان کر کیا کریں گے؟"

"تم مجھے اس کا نام نہیں بتاؤ کوئی حرج نہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ اگر زمان نے تمہیں طلاق دے دی تو اس سے شادی کرلوگی؟"

"جی......" اس نے چند لمحوں کے بعد قدرے تذبذب سے کہا۔ "جی ہاں...... میں اس سے شادی کرلوں گی، وہ میرا خواب ہے......"

"اس کے باوجود کہ زمان تم سے شدید محبت کرتا ہے۔" میں نے گہرا سانس لیا۔ "وہ تمہاری جدائی برداشت نہیں کر سکے گا۔"

"اس لئے کہ اس کی اور میری عمروں میں جو فرق موجود ہے وہ آپ جانتے ہیں۔" شکیلہ کہنے لگی۔ "دراصل اسے مجھ سے محبت نہیں ہے۔ اسے میرے جسم سے محبت ہے۔ اسے میری روح سے کوئی محبت نہیں ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ ایسا سو فیصد نہیں ہے۔" میں نے اسے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ "دنیا میں ہر شخص حسن پرست ہوتا ہے۔ وہ ہر خوبصورت چیز کو پسند کرتا ہے۔ اگر وہ تم سے اس لئے محبت کرتا ہے کہ تم بہت حسین ہو تو یہ ایک فطری امر ہے کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے۔ لیکن تم نے اس سے جھوٹی محبت کی اور اس کا ڈھونگ رچایا جس کے باعث وہ تم سے ٹوٹ کر محبت کرنے لگا۔ اگر تم اپنی محبت میں گرم جوشی اور وارفتگی پیدا نہ کرتیں تو پھر شاید وہ تم سے اتنی محبت نہ کرتا......"

اور تمہیں اس لئے اس سے محبت نہیں ہے کہ وہ ایک عام سا شخص ہے۔ ایک غریب آدمی ہے۔

"نہیں...... نہیں......" وہ ہذیانی لہجے میں بولی۔

"اس کی غربت کی وجہ سے نہیں۔ اس کی عمر کی وجہ سے اس سے مجھے محبت نہیں......"

"دیکھو...... تم پھر جھوٹ بول رہی ہو۔" میں نے اسے ٹوکا۔ "لیکن تم جس سے محبت کرتی ہو وہ شخص کون سا جوان اور کم عمر ہے۔ وہ بھی تمہارے شوہر کی عمر کا ہے بلکہ اس سے دو تین برس بڑا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ دولت مند شخص ہے۔"

"آپ...... اسے جانتے ہیں؟" شکیلہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "آپ کو میرے محبوب کے بارے میں کس نے بتایا......؟"

"کسی نے بھی بتایا......؟ یہ بات سچ ہے نا کہ وہ شخص دولت مند ہے۔" میں نے کہا۔ "نہ صرف دولت مند ہے بلکہ ایک بڑی شخصیت ہے...... اس کے علاوہ وہ شادی شدہ بھی ہے۔ اس کی تین بیویاں اور سات بچے ہیں۔"

"میرے خیال میں آپ کو شاید زمان نے بتایا ہوگا۔"

وہ حیران ہو کر بولی۔ "اس نے اس کا شاید کھوج لگالیا ہوگا۔"

"زمان کے فرشتوں کو بھی تمہارے اس عشق اور ہرجائی پن کی خبر نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ میری معلومات ہیں۔"

"یہ سچ ہے کہ مجھے اس شخص سے محبت ہے۔" شکیلہ بولی۔ "اس لئے کہ اس کے پاس دولت ہے۔ دولت سے مجھے وہ خواب مل سکتے ہیں۔ جس کی تمنا میرے دل میں اس وقت سے پرورش پارہی ہے۔ جب میں نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تھا۔ دنیا میں سب کچھ دولت ہی ہے۔ دولت سے ہی دنیا کی ہر چیز خریدی جاسکتی ہے۔ خواب اور ارمان بھی خریدے جاسکتے ہیں۔"

"لیکن تم نے یہ بھی سوچا کہ وہ تم سے کیوں اور کس لئے شادی کرنا چاہتا ہے۔ جب کہ وہ تین بیویوں کا شوہر اور سات بچوں کا باپ ہے...... اس لحاظ سے اس کی عمر تمہارے باپ کی عمر سے بھی زیادہ ہوئی......"

"وہ مجھ سے اس لئے شادی کرنا چاہتا ہے کہ شادی سے پہلے اسے مجھ سے محبت ہوگئی تھی اور وہ مجھے بھی بہت پسند آیا تھا۔" شکیلہ بولی۔

"اس وجہ سے وہ تم سے شادی نہیں کرنا چاہتا ہے۔" میں نے کہا۔ "دراصل اسے تمہارے حسن وشباب نے متاثر کیا۔ تم نہ صرف غیر معمولی طور پر نہایت حسین ہو بلکہ لاکھوں میں ایک ہو اور تم اس کی دولت اور شہرت پر ریجھ گئیں۔ اس کی تینوں بیویاں بھی اپنے وقت کی حسین ترین عورتیں تھیں...... ان میں ایک اداکارہ بھی ہے۔ اب چوں کہ اس کا ان تینوں سے دل بھر چکا ہے اس لئے وہ تم سے شادی کررہا ہے۔ اس لئے نہیں کہ اسے تم سے محبت ہے۔ اس کی مثال ایک لومڑی کی سی ہے۔ جب تم سے اس کا دل بھر جائے گا تو وہ پانچویں شادی کرے گا...... پھر تم اس کی زندگی میں ایک فالتو پرزہ بن جاؤ گی...... یہ حسن وشباب اور جوانی چار دن کی چاندنی ہوتی ہے۔"

"آپ کچھ بھی کہہ لیں میں اس سے ہر قیمت پر شادی کر کے رہوں گی......" وہ بڑے عزم سے بولی۔ "میں اپنے راستے کی ہر دیوار کو گرادوں گی۔"

"تمہارا اور تمہارے محبوب کا یہ خیال تھا کہ تمہارے ساتھ پیش آنے والے واقعات سے تنگ آ کر زمان طلاق دے دے گا۔ لیکن اس کا الٹا اثر ہوا۔ زمان کی محبت میں کمی آنے کے بجائے اضافہ ہوتا گیا۔ وہ تم سے جتنی محبت کرتا ہے تم اس کا ایک فیصد بھی نہیں کرتی ہو...... تم نے زمان کو جن کی حرکتوں کے بارے میں جو قصے سنائے اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو تمہیں طلاق دے چکا ہوتا...... لیکن تم نے پھر بھی اپنے اس عظیم شوہر کی کوئی قدر نہیں کی......"

"ہاں...... مجھے خود حیرت ہے کہ وہ مجھ سے پہلے سے زیادہ محبت کیوں کرنے لگا...... میرا محبوب بھی اس بات پر شدید حیران تھا۔" وہ بولی۔

"اچھا...... یہ بتاؤ کہ تم نے اس جن کو بوتل میں قید دیکھ کر اس قدر شدید نفرت اور غصے کا اظہار کیوں کیا تھا جب کہ اس جن کو تمہارے محبوب نے یہاں اس لئے بھیجا تھا کہ زمان تم سے بدظن ہو جائے...... کیا تمہیں اس کی حرکتیں ناپسند تھیں اور زہر لگتی تھیں؟" میں نے سوال کیا۔

"میں نہیں بتاؤں گی۔" شکیلہ بولی۔ "میں آپ کے اس سوال کا جواب کسی وجہ سے دے نہیں سکتی...... لہٰذا اس کے جواب کے لئے اصرار نہ کریں۔"

میں نے کہا۔ "میں بتاتا ہوں...... تمہارے محبوب نے جادوگر سے مل کر کہا کہ زمان کو کسی طرح اپنی بیوی سے اس طرح سے بدظن کرو کہ وہ طلاق دے دے۔ اس منصوبے کے تحت وہ جن تم پر آ گیا۔ تمہارے محبوب نے تم سے یہ کہا تھا کہ وہ فرصت کے اوقات اس جن کی جگہ لے لے گا...... تم سے پیار و محبت کی باتیں کرے گا۔ لیکن ظاہر نہیں ہو گا اس لئے کہ کسی کی نظر پڑ گئی تو وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔ بڑی بدنامی اور رسوائی ہو گی...... وہ آ جاتا تھا۔ حاتم کے جادو کے زور سے...... پھر تم دونوں بہک جاتے...... اتفاق کی بات ہے کہ جب بھی اس نے حد سے تجاوز کرنے کی کوشش کی زمان آ گیا۔ اس لئے تمہاری عزت محفوظ رہی۔ تم نے کئی بار اپنے شوہر سے کہا کہ...... جن ناقابل برداشت ناشائستہ حرکتیں کرتا رہتا ہے۔ تم اس بات کو اور بڑھا چڑھا کر پیش کرتی تھیں...... اصل جن کو کبھی نصیب نہیں ہوا کہ تمہیں چھو لے...... چونکہ سارا کھیل جادوگر کھیل رہا ہے اس لئے زمان کے آتے ہی تمہارا محبوب غائب ہو جاتا ہے...... میں سچ کہہ رہا ہوں نا؟ کیوں؟"

شکیلہ بھونچکی سی ہو گئی اور اس کی آنکھوں سے خوف و ہراس جھانکنے لگا۔ اس کی زبان گنگ سی ہو گئی۔ چند لمحوں تک اس پر سکتہ طاری رہا۔ جب وہ بولی تو اس کی آواز بڑی ویران، کھوکھلی اور بہت دور سے آتی سنائی دی۔ "تو آپ یہ سب کچھ جانتے ہیں...... آپ نے اپنے علم سے ان تمام باتوں کا پتا چلا لیا...... اوہ میرے خدا...... اب میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں...... ؟ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔"

"اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے......" میں نے کہا۔ "میں یہ ساری باتیں زمان کے علم میں نہیں لاؤں گا۔ تم اپنے محبوب کا خیال دل سے نکال دو۔ وہ شخص خود غرض ہے۔ وہ تمہیں بے وقوف بنا رہا ہے۔ شادی کا جھانسا دے رہا ہے۔ وہ تم سے شادی نہیں کرے گا۔ تمہیں کھلونا بنا کر اس وقت تک کھیلتا رہے گا جب تک اس کا جی نہیں بھر جاتا...... اس کی تینوں بیویاں اسے تم سے شادی کرنے نہیں دیں گی۔ دو مہینے کے بعد الیکشن ہونے والے ہیں۔ اس نے تم سے شادی کی تو وہ اس شادی کے خلاف ایک طوفان کھڑا کر دیں گی۔ جس سے وہ ہار جائے گا۔ لیکن اسے کسی قیمت پر الیکشن ہارنا منظور نہیں ہے...... کیوں کہ وہ وزیر بننا چاہتا ہے...... اس کی چال بازی کا اندازہ تم اس طرح سے کر سکتی ہو کہ اس نے جادو کے زور پر غائب ہو کر تم سے کھیلنا چاہا...... لیکن شوہر کی موجودگی کے باعث وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ کیا ایسا فریبی، کمینہ اور ذلیل

شخص تم سے شادی کر سکتا ہے؟"

وہ چند لمحوں تک سوچتی رہی...... پھر اس نے کہا۔ "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آپ کی باتیں میری سمجھ میں آ رہی ہیں......؟" اس نے رک کر گہرا سانس لیا۔

"اب اس کا خیال دل سے نکال دو...... زمان بہت نیک اور اچھا شخص ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ تمہیں بہت پیار دے گا۔ اب بھی تمہارا کتنا خیال رکھتا ہے...... جب تم اس کے بچے کی ماں بن جاؤ گی تو محبت کا یہ بندھن اور مضبوط ہو جائے گا۔"

"لیکن آپ کا کیا خیال ہے میرا محبوب مجھے اس آسانی سے بخش دے گا......؟" شکیلہ کہنے لگی۔ "اس نے حاتم جادوگر کو پچیس ہزار نوٹا کا صرف اس کھیل اور منصوبے کے لئے دیئے ہیں۔ میرے حسن کی حشر سامانیوں نے اسے پاگل کر رکھا ہے۔"

"یہ سب کچھ تم مجھ پر چھوڑ دو......" میں نے کہا۔ "مجھے تم صرف اس بات کی ضمانت دو کہ اپنے آشنا کا خیال دل سے نکال دو گی...... خواب دیکھنا بند کر دو گی...... خواب بڑے دغاباز ہوتے ہیں اور تم اپنے شوہر سے ٹوٹ کر محبت کرو گی...... میں تمہیں اس بات کی ضمانت دیتا ہوں کہ تم پر کبھی کوئی آنچ نہیں آئے گی...... جادوگر تمہارا بال تک بیکا نہیں کر سکے گا...... ایک بات اور سنو...... سب سے اچھی زندگی سادگی اور قناعت کی ہوتی ہے...... ان خوابوں میں کیا رکھا ہے......؟ عورت کے لئے سب سے بڑا زیور اور دولت اس کا شوہر ہے۔"

پھر ہم دونوں نے اپنی گفتگو ختم کی...... پھر میں نے دروازہ اور کھڑکیاں کھول دیں۔ زمان گھر کے باہر جو چبوترا تھا اس پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اسے اندر بلا کر کہا۔ "اب یہ کھیل ختم ہو چکا ہے...... تم میرے ساتھ تھوڑی دیر کے لئے چلو۔ مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں......"

میں اسے ساتھ لے کر ایک قریبی پارک کے ساتھ والے ہوٹل میں آیا۔ چائے پیتے ہوئے اس سے کہنے لگا۔

"شکیلہ کی کہانی میں تمہیں سنا رہا ہوں کہ وہ جن کے جال میں کیسے پھنسی...... تمہاری شادی سے ڈیڑھ برس پہلے کی بات ہے کہ اسمبلی کے ایک ضمنی انتخاب میں چوہدری خان بھی اپنی پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑنے کھڑا ہوا تھا۔ شکیلہ کے محلے میں اس کی ایک کارنر میٹنگ بھی تھی۔ اس میٹنگ میں شکیلہ اپنے محلے کی کچھ لڑکیوں کے ساتھ شرکت کرنے گئی۔ وہ عورتوں کی سیٹوں پر سب سے اگلی قطار میں بیٹھی تھی، جو اسٹیج سے بہت ہی قریب تھی۔ چوہدری خان کی اس پر تقریر کے دوران نظر پڑی تو وہ نہ صرف ریشہ خطمی ہو گیا بلکہ تھوڑی دیر کے لئے تقریر بھی بھول گیا۔ وہ شعلہ مجسم اس کے دل پر بجلی بن کر گری تھی۔ شکیلہ کا حسن اتنا خطرناک اور قاتل تھا کہ وہ ساری رات ایک پل کے لئے سو نہ سکا۔ اس کی صورت، حسن، سراپا اور شباب اس کی نظروں میں گھومتا رہا۔

پھر وہ شکیلہ کے حصول کی تدبیریں سوچنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ دولت میں اتنی طاقت ہے کہ اس

سے دنیا کی ہر چیز خریدی جاسکتی ہے۔ وہ لکھ پتی نہیں کروڑ پتی تھا۔ اس کے ملازم خاص نے غیر محسوس انداز سے اس کے لئے رشتہ مانگا۔ لیکن گھر والوں نے صاف انکار کردیا۔ لیکن وہ ہمت ہارنے والوں میں سے نہ تھا۔ ایک روز جب اس کی تینوں بیویاں اور ان کے بچے چٹا گانگ چار، پانچ دنوں کے لئے گئے ہوئے تھے...... اس نے شکیلہ کو ایک بہانے سے اپنی کوٹھی میں بلایا تو شکیلہ چلی آئی۔ پھر وہ اسے اپنی مخصوص خواب گاہ میں لے گیا جو نہات خوبصورتی سے آراستہ و پیراستہ تھی۔ جس نے شکیلہ کو بڑا متاثر کیا۔ اس کمرے میں ایک الماری سائز کی تجوری موجود تھی۔ اس نے تجوری کھول کر دکھائی تو شکیلہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کیوں کہ اس کے پہلے خانے میں نوٹوں کی گڈیاں بھری ہوئی تھیں...... دوسرے خانے میں ہیرے جواہرات کے زیورات جگ مگا رہے تھے...... شکیلہ نے اپنی زندگی میں کیا خواب میں بھی اتنی رقم اور زیورات...... وہ بھی ایسے قیمتی، خوبصورت اور نادر قسم کے نہیں دیکھے تھے۔ رقم سے زیادہ دلچسپی اسے زیورات میں ہونے لگی تھی۔ احساس محرومی کسی زہریلے سانپ کی طرح ڈسنے لگی تھی۔ وہ ایک اسکول ماسٹر کی بیٹی تھی۔ اس کی ماں کے پاس زیورات تھے جو اس نے بیٹی کی شادی کے لئے اٹھا رکھے تھے۔ لیکن وہ زیورات بہت ہی معمولی تھے۔ تجوری میں جو زیورات بھرے ہوئے تھے ان کے سامنے اس کی ماں کے زیورات کوڑے کرکٹ کا ڈھیر معلوم ہوتے تھے۔

چوہدری خان کے پاس جو رقم تھی وہ کالے دھندے کی کالی رقم تھی جو اس نے تجوری میں رکھ چھوڑی تھی۔ یہ زیورات بھی ناجائز آمدنی سے خرید کر رکھے ہوئے تھے۔ وہ کروڑ پتی ایسے نہیں بنا تھا۔ وہ دو تین دفعہ الیکشن میں جیت کر اسمبلی میں پہنچا تھا۔ اس کی پارٹی اقتدار میں تھی اس نے اس وجہ سے ہر طرح سے فائدہ اٹھایا۔ وہ لکھ پتی سے کروڑ پتی بن گیا۔ اس کے علاوہ اس کی دو سافر لانچیں اور تین اسٹیمر بھی ہیں جن سے وہ ماہانہ لاکھوں ٹاکا کماتا ہے...... اس نے شکیلہ کو دیکھا جس کی آنکھیں رقم اور زیورات دیکھ کر چکا چوند ہو رہی تھیں۔ چوہدری خان کی تینوں بیویاں بہت حسین ہیں۔ اس نے اپنی تینوں بیویوں کو بھی رقم اور زیورات کی جھلک دکھا کر مرعوب و متاثر کیا تھا۔ وہ ایک گھاگ شکاری ہے۔ اس نے شکار پھانسنے کے لئے یہ چارہ رکھا ہوا ہے۔

یہ سب میں آپ کو اس لئے سنا رہا ہوں کہ شکیلہ سے بدظن نہ ہوں اور اس سے نفرت نہ کرنے لگیں اور اس کھیل کا پس منظر سمجھ میں آجائے۔ یہ پتا چل جائے کہ اس سارے کھیل میں کس کا قصور زیادہ ہے۔ شکیلہ کس طرح اس شخص کے فریب میں آئی۔ شکیلہ اس کی دولت اور زندگی سے کس طرح بڑی مرعوب و متاثر ہوئی تھی۔ شکیلہ نے اس سے کچھ زیورات پہن کر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ چوہدری خان خود بھی یہی چاہتا تھا۔ اس نے اپنی ایک بیوی کا عروسی جوڑا نکال کر دیا جو وہ کبھی کبھی کسی کسی شادی میں پہن کر جاتی تھی۔ اس نے شکیلہ سے کہا کہ یہ لباس پہن کر زیورات پہنو تو بات بنے گی۔ میک اپ کرنا چاہو تو میک اپ بھی کر لینا۔

شکیلہ نے عروسی جوڑا زیب کیا اور زیورات بدن پر سجائے آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے آپ کو ناقدانہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ دلہن کے روپ میں اپنے آپ کو دیکھ کر دل میں اش اش کر اٹھی۔ وہ اس

قدر حسین اور ایسے انوکھے اور دل کش روپ میں نظر آنے لگی جو اس نے خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا۔ اس کا حسن و جمال اس قدر بے مثال ہے۔ اس کے حسن و شباب کے ان گنت روپ ہیں۔

چوہدری خان نے جو دیکھا تو وہ تھوڑی دیر کے لئے مبہوت سا ہو گیا تھا۔ شکیلہ کے وحشی حسن نے اسے اور گھائل کر دیا تھا۔ وہ بغیر میک اپ کے تھی۔ لباس اور زیورات کی وہ اور اس کا حسن محتاج نہ تھا۔ اس لباس اور زیورات نے بلاشبہ شکیلہ کے حسن میں چار چاند لگا دیئے تھے۔

"تمہیں یہ لباس اور زیورات پسند آئے......؟"

چوہدری خان نے شکیلہ کے قریب ہو کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ "کیسے ہیں؟"

"بہت پسند آئے......" شکیلہ نے سر ہلاتے ہوئے تعریفی لہجے میں کہا۔ "عروسی جوڑا اور زیورات بہت ہی خوبصورت اور زبردست ہیں۔"

"میں تمہارے لئے اس سے بھی زبردست ایک نہیں...... دس عروسی جوڑے بنا سکتا ہوں۔" چوہدری خان نے کہا۔ "تمہیں یہ زیورات پسند آئے ہیں جو دس لاکھ کی مالیت کے ہیں۔ یہ بھی تمہارے ہو سکتے ہیں...... کیا تمہیں یہ تمام زیورات چاہئیں......؟"

"سچ......" شکیلہ کا چہرہ حیرت اور خوشی سے کھل اٹھا۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "واقعی آپ مجھے یہ تمام زیورات دے دیں گے؟"

"ہاں...... ہاں۔" چوہدری خان نے سر ہلایا۔ "اس کے علاوہ اس تجوری میں جتنے زیورات ہیں وہ بھی تم جب چاہو پہن سکتی ہو...... لیکن میری ایک شرط ہے۔ وہ شرط پوری کر دو تو نہ صرف زیورات استعمال کر سکتی ہو بلکہ یہ رقم بھی...... جتنی چاہو...... جب بھی چاہو......"

"کیا شرط ہے آپ کی......؟" شکیلہ نے مچل کر بڑی معصومیت سے پوچھا۔ "جلدی سے بتائیں...... میں آپ کی ہر شرط پوری کرنے کے لئے تیار ہوں۔"

"میری شرط یہ ہے کہ تمہیں مجھ سے شادی کرنا ہوگی......" چوہدری خان نے اس کے کندھوں پر دونوں ہاتھ رکھ کے جواب دیا۔

"شادی......؟" شکیلہ ایک دم سے اچھل پڑی۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ پھر اس نے سنبھل کر کہا۔

"ہماری شادی کیسے ہو سکتی ہے؟"

"کیوں نہیں ہو سکتی؟" چوہدری خان نے کہا۔ "تم تیار...... میں تیار...... قاضی صاحب نکاح پڑھا دیں گے۔ تم میری دلہن بن کر اس کمرے میں آجاؤ گی۔"

"لیکن آپ تو شادی شدہ ہیں اور پہلے سے ہی آپ کی ایک نہیں تین بیویاں اور سات بچے بھی ہیں ان سے......" شکیلہ نے کہا۔

"مذہب نے مردوں کو چار شادیوں کی اجازت دے رکھی ہے۔" چوہدری خان بولا۔ "میں چوتھی

شادی کر سکتا ہوں۔ مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔"

"لیکن میرے گھر والے آپ سے میری شادی کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے......؟" شکیلہ نے کہا۔ "کیوں کہ آپ شادی شدہ اور بچے والے ہیں۔"

"لیکن میں دولت مند ہوں...... ایک مشہور سیاست دان اور سماجی کارکن ہوں۔ پورے دیش میں میرا ایک مقام اور حیثیت بھی ہے۔" وہ بولا۔

"وہ سب کچھ ٹھیک ہے۔" شکیلہ کہنے لگی۔ "آپ میرے والدین کو نہیں جانتے ہیں۔ وہ نہ صرف بڑے ضدی بلکہ خوددار بھی ہیں۔ میں کوئی بدصورت اور بے کشش تو ہوں نہیں جو میری شادی نہ ہو سکے اور میرے لئے رشتے نہ آئیں۔ چوں کہ میں بہت حسین ہوں اس لئے میرے لئے رشتوں کی بھرمار ہے ہیں۔ ان میں بڑے گھرانوں کے رشتے بھی ہیں...... میرے والدین اب تک کوئی فیصلہ نہ کر سکے۔ لیکن اب فیصلہ کرنے والے ہیں اور پھر وہ آئے دن جو میرے لئے رشتے آ رہے ہیں ان سے سخت پریشان ہیں اور تنگ آ چکے ہیں۔"

"چلو...... میں یہ مسئلہ بھی حل کرلوں گا۔" چوہدری خان بولا۔ "لیکن تم یہ بتاؤ کہ تم مجھ سے شادی کرنے پر تیار ہو کہ نہیں......"

"تیار کیوں نہیں ہوں......؟" شکیلہ گلابی ہو کر بولی۔ "میں تو آپ سے ابھی اور اسی وقت شادی کرنے کے لئے تیار ہوں۔"

"سچ......" چوہدری خان اس بچے کی طرح خوش ہو گیا جسے بہت ساری مٹھائی مل گئی ہو۔ "میں کل ہی اپنے ملازم کو تمہارے گھر بھیجتا ہوں۔ وہ بہت ہوشیار، ذہین اور تیز ہے۔ وہ غیر محسوس انداز سے تمہارے والدین سے بات کرلے گا۔ پھر انہیں راضی کرلے گا۔"

"آپ کل ہی بھیج دیں۔" شکیلہ بولی۔ "اس نیک کام میں دیر نہ کریں۔ چٹ منگنی اور پٹ بیاہ...... کیوں؟"

"ہاں...... وہ کل ہی جا کر تمہارے ماں، باپ سے بات کرے گا۔ وہ انکار نہیں کریں گے اور نہ کر سکتے ہیں۔" چوہدری خان نے کہا۔ "ایک بات سنو......"

"شکیلہ! دو ایک دن میں ہماری شادی ہو جائے گی...... لیکن یہ دو دن بھی دو صدیوں سے کم نہیں ہیں...... میں چاہتا ہوں کہ تم آج کی رات میرے ہاں رک جاؤ...... کیوں نہ ہم زندگی کا یہ نیا سفر شروع کردیں۔ کیا کرے گا قاضی...... جب میاں، بیوی راضی......"

زمان کے چہرے کی رنگت زرد پڑ گئی۔ "کیا شکیلہ نے اس کی بات مان لی؟" اس نے پھنسی پھنسی آواز میں پوچھا۔ پیشانی عرق آلود ہو گئی۔

"تمہارا اندازہ اور خیال کیا ہے؟" میں نے اس سے سوال کیا۔ "کیا تمہارے خیال میں شکیلہ نے اس کی بات مان لی ہوگی؟"

"جی ہاں......" زمان نے اثباتی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "شکیلہ نے اس کی بات نہ مانی ہوگی؟ اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"نہیں دوست!" میں نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔ "شکیلہ ایک نوجوان اور حسین لڑکی ہے۔ نوجوان لڑکیوں کے بڑے حسین اور رنگین سپنے ہوتے ہیں جو وہ دن رات سوتے اور جاگتے دیکھتی رہتی ہیں اور انہیں پانے کے لئے اندھا دھند دوڑتی ہیں۔ دولت کی چمک دمک انہیں اندھا کر دیتی ہے۔ پھر وہ اپنے جذبات کی رو میں بہہ کر سپنے پانے کے لئے غلاظت کے دلدل میں گر پڑتی ہیں...... لیکن شکیلہ نے اس کی بات ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ چوہدری خان نے اسے فریب، لالچ دیا۔ بہت ورغلایا۔ لیکن وہ یہ بات جانتی اور سمجھتی تھی کہ عورت کی عزت ہی سب سے بڑی دولت ہوتی ہے۔"

"آپ سچ کہہ رہے ہیں؟" زمان کا چہرہ یک لخت دمک اٹھا اور اس کی آنکھوں سے خوشی جھانکنے لگی۔ "کہیں آپ میرا دل رکھنے کے لئے تو نہیں کہہ رہے ہیں؟"

"ہاں...... میں سچ کہہ رہا ہوں۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "وہ بڑے مضبوط کردار کی لڑکی ہے۔ وہ عام قسم کی لڑکیوں میں سے نہیں ہے۔"

"آپ کہتے ہیں تو میں آپ کی بات کا یقین کئے لیتا ہوں۔" زمان نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "مجھے اس بات سے، بہت خوشی تو ہوئی لیکن......"

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے پر ایک کرب سا چھا گیا۔ اس پر اداسی سی چھا گئی۔ میں نے پوچھا۔ "لیکن کیا......؟"

"وہ مجھ سے اتنی محبت نہیں کرتی جتنی میں اس سے کرتا ہوں۔" اس نے مردہ لہجے میں کہا۔ "وہ کسی اور کی محبت میں گرفتار ہے؟ ایسا کیوں اور کس لئے ہے؟"

"ہاں...... یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔" میں نے کہا۔ "آخر کو وہ ایک نوجوان لڑکی ہی نہیں بلکہ نہایت حسین بھی ہے۔ ایسی لڑکیاں آسائش اور پرتعیش زندگی کی آرزومند ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ایک شہزادے کا خواب دیکھتی ہیں۔ ان کا کوئی مرد آئیڈیل ہوتا ہے۔ تم نے ایک ایسی حسین اور جوان لڑکی سے شادی کر کے اپنی زندگی کی فاش غلطی کی۔ تم نے عمروں کے فرق کا بھی خیال نہیں کیا۔ نہ تم نے آئینے میں اپنی شکل دیکھی؟"

"کیا میں اسے طلاق دے دوں......؟" زمان نے حسرت زدہ لہجے میں کہا اور ایک گہری سانس لی۔ "آپ کا مشورہ کیا ہے......؟"

"تم اسے طلاق دینے کے بارے میں کیوں سوچ رہے ہو؟" میں نے متعجب نظ[illegible]ے اس کی متوحش نظروں میں جھانکا۔

"اس لئے کہ اب جب کہ اسے مجھ سے محبت نہیں ہے تو میں اس کے ساتھ زندگی گزار کر کیا کروں گا؟" زمان کہنے لگا۔ "میں جبر و زیادتی سے زندگی گزارنے کا بالکل بھی قائل نہیں ہوں۔ ایک چھت کے

بیوپار اجنبیوں کی طرح نفرت بھری تلخ زندگی گزاریں؟ اس سے بہتر ہے کہ میں اسے طلاق دے دوں۔"

"ایسی باتیں نہ سوچو......" میں نے کہا۔ "اب وہ صرف اور صرف تم سے محبت کرے گی۔ جب عورت اپنے جیون ساتھی کو اپنا تن من سب کچھ سونپ دیتی ہے تو پھر وہ کسی اور مرد کی طرف نہیں دیکھتی۔ شکیلہ اب کسی کی طرف نہیں دیکھے گی اور نہ ہی کوئی اسے للچائی اور میلی نظروں سے دیکھے گا۔ کیوں کہ شکیلہ دنیا کے کسی بھی مرد کو...... سوائے تمہارے حسین وجمیل اور پرکشش دکھائی نہیں دے گی۔ نہ ہی اسے کوئی مرد تمہارے مقابلے میں اچھا لگے گا۔ تم اسے دنیا کے سب سے خوبصورت اور وجیہہ جوان نظر آؤ گے۔ وہ تم سے اس طرح محبت سے پیش آئے گی کہ تم اس کا تصور بھی نہ کر سکو گے اور تم دونوں ایک حسین اور خوش گوار زندگی آخری سانس تک گزارو گے۔"

"سچ......" زمان کا چہرہ دمک اٹھا پھر وہ تحیر زدہ لہجے میں بولا۔ "کیا یہ بات ممکن ہے؟ ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے؟"

"دنیا میں کیا چیز ممکن نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"میں نے اس پر ایک ایسا منتر پڑھ کر پھونک دیا ہے کہ وہ صرف اور صرف تمہیں حسین اور پرکشش دکھائی دے گی۔ غیر مردوں کو بدصورت اور بے کشش، کوئی مرد اس کی طرف دیکھنا کیا بات کرنا بھی گوارا نہیں کرے گا۔ اس منتر کی بدولت تم اسے بہت خوبصورت دکھائی دو گے۔ اب میری بات سمجھ میں آئی کہ نہیں......؟"

"ہاں...... ہاں...... میں سمجھ گیا۔" وہ فوراً خوشی سے بولا۔ "آپ کا یہ احسان ہم دونوں ساری زندگی نہیں بھولیں گے۔ آپ تو ہمارے لئے مسیحا بن کر آئے۔"

"یہ ایک راز ہے جو تمہارے سینے میں آخری سانس تک رہنا چاہئے۔" میں نے کہا۔ "اگر تم نے اس راز سے شکیلہ یا کسی اور کو آگاہ کر دیا تو پھر اس منتر کا اثر ختم ہو جائے گا۔ پھر تمہاری ازدواجی زندگی تلخ اور محرومیوں کا شکار ہو جائے گی اور ہو سکتا ہے کہ شکیلہ کسی دوسرے کی بیوی بن جائے۔"

"میں آخری دم تک اس راز کی حفاظت کروں گا۔"

زمان نے کہا۔ "کیوں کہ اس راز میں میری ساری خوشیاں اور ایک پرمسرت زندگی پوشیدہ ہے۔"

☆......☆......☆

میں زمان سے رخصت ہو کر جادوگر حاتم کے ٹھکانے کی طرف چل دیا۔ اس وقت بنگلہ دیش میں یہی ایک بڑا جادوگر رہ گیا تھا۔ کوئی اور دوسرا جادوگر اس کے مقابلے کا نہ تھا۔ شوتم نے مجھے نصیحت کی تھی اور اس بات کا عہد لیا تھا کہ میں ایسے جادوگروں کو جو انسانیت کے ماتھے پر داغ ہیں اور جس سے وہ ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں اور لوگوں کی زندگیوں سے کھیل رہے ہیں اور سیاہ سفید کے مالک بنے ہوئے ہیں۔ انہیں ان کے جادو اور سفلی علوم سے محروم کر دوں۔ شوتم نے مجھے جادو کی جو شکتی دی تھی میں اس کی بدولت ایسا کر سکتا تھا۔ حاتم گو کہ بہت بڑا جادوگر تھا لیکن شوتم کی گرد بھی نہیں تھا۔ شوتم نے مجھے جو جادو سکھایا تھا اب

ایسا جادو کوئی نہیں جانتا تھا اور اس جادو کا مقابلہ حاتم جیسے دس جادوگر بھی نہیں کر سکتے تھے۔

حاتم کا ٹھکانہ جیداد پور میں تھا۔ جیداد پور ڈھاکا شہر سے بارہ میل دور تھا اور مضافات میں تھا۔ لیکن اب جیداپور پر ایک چھوٹے سے شہر کا دھوکا ہوتا تھا۔ وہ بہت پھیل گیا تھا۔ لیکن حاتم آبادی سے دور ہٹ کر ایک درمیانہ، خوبصورت اور عالی شان مکان میں رہتا تھا۔ اس مکان کے باہر دوئی گاڑیاں کھڑی تھیں لیکن یہ اس کی نہ تھیں۔ ان لوگوں کی تھیں جو اس سے ملنے کے لئے آئے ہوئے تھے۔

اس کا ایک ملازم جو مکان سے باہر کھڑا ہوا تھا وہ مجھے اندر لے گیا۔ یہ ایک بہت بڑا ہال تھا۔ جس میں ایک بہت بڑی چوکی پر بچھے ہوئے بیش قیمت قالین پر حاتم براجمان تھا۔ اس کے پیچھے جو دیوار تھی اس پر ایک پینٹنگ آویزاں تھی جس پر انسانی کھوپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ اس کے دائیں ہاتھ پیتل کے دو بڑے بڑے برتن رکھے تھے جو تعویذ گنڈوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ان برتنوں کے درمیان ایک بہت بڑی لکڑی کی ٹرے رکھی تھی اور اس میں لکڑی کی بنی ہوئی بہت چھوٹی مورتیاں ترتیب سے رکھی تھیں۔ یہ مورتیاں مختلف رنگوں کی تھیں۔ کوئی تین درجن کے قریب ہوں گی۔ اس کے بائیں ہاتھ پر ایک بہت بڑا لکڑی کا پیالہ تھا جس پر چار انچ سے لے کر چھ انچ لمبی سوئیاں بھری پڑی تھیں۔ اس کے قریب ہی ایک قدیم طرز کا جادو کا گوالا رکھا تھا۔ میں نے حاتم کو دیکھا۔ اس کی عمر ساٹھ برس کی ہوگی۔ وہ ایک لحیم شحیم شخص تھا۔ اس کے لمبے لمبے بال تھے۔ اس نے اپنی زلفیں پیٹھ تک بڑھا رکھی تھیں۔ اس کی لمبی گھنی داڑھی تھی۔ اس نے اپنے بال کالے کئے ہوئے تھے۔ اس عمر میں سفید بال نکل آتے ہیں۔ اس نے اپنے آپ کو جوانوں کی طرح بنا رکھا تھا۔ وہ دیکھنے میں خبیث اور کینہ پرور دکھائی دیتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سے جو کینہ جھانک رہا تھا اس سے صاف محسوس ہوتا تھا کہ وہ کس قماش کا ہے۔ اس کا لباس بے حد صاف ستھرا تھا اور قیمتی بھی...... اس کے گلے میں جو مالائیں تھیں وہ مختلف رنگوں کی تھی۔ اس کے ہاتھ میں جو تسبیح تھی وہ لکڑی کے موٹے موٹے دانوں کی تھی۔ وہ مخملی گاؤ تکیے کے سہارے بڑے تکبر اور رعونت سے بیٹھا ہوا تھا۔

ملاقاتیوں کے لئے کرسیاں اور صوفے دورویہ تھے۔ اس وقت اس ہال میں کل سات افراد موجود تھے۔ جب کہ کرسیاں اور جو صوفے تھے ان پر کوئی تیس افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ جس وقت کمرے میں، میں داخل ہوا ایک فیشن ایبل قسم کی عورت جو اپنی وضع قطع اور چہرے مہرے سے امیر کبیر دکھائی دیتی تھی۔ حاتم کی چوکی کے پاس جو اکلوتی کرسی تھی اس پر بیٹھی ہوئی اس سے کچھ کہہ رہی تھی۔ وہ آنکھیں بند کئے سن رہا تھا۔ ان سات افراد میں دو مرد اور باقی پانچ عورتیں تھیں۔ یہ مرد تیس اور چالیس برس کی عمر کے درمیان ہوں گے۔ ان پانچ عورتوں میں ایک تیس برس کی عورت تھی جو رئیس زادی معلوم ہوتی تھی۔ وہ عورت جو حاتم سے مخاطب تھی اس کی بھی یہی عمر ہوگی۔ دونوں عورتوں کا حسن و جمال بڑا ہی جاذب نظر تھا۔ تین نوجوان لڑکیاں تھیں جو اٹھارہ سے بائیس برس کی تھیں۔ یہ تعلیم یافتہ اور اچھے گھرانوں کی لگ رہی تھیں۔

میں اس کی چوکی کی طرف بڑھا۔ اس کے قریب جو ذاتی کرسی تھی اس پر بیٹھ گیا۔ میں اندر داخل ہونے کے بعد کسی کو نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ عورت حاتم سے جو کہہ رہی تھی وہ مجھے بہت صاف سنائی دے

رہا تھا۔ جب کہ اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔ وہ اس خیال سے سرگوشی کے انداز میں کہہ رہی تھی کہ کوئی اور سن نہ لے اس کی پشت میری طرف تھی۔ وہ اپنی بپتا سنانے میں لگی ہوئی تھی اور وہ کہہ رہی تھی۔ ''میرا شوہر اپنے ایک دوست کی مطلقہ بہن میں دلچسپی لے رہا ہے جو دو مہینے پہلے لندن سے آئی ہے۔ اس کا نام نو بہار ہے۔ وہ اب تک تین شادیاں کر چکی ہے۔ اس کی تینوں شادیاں ناکام ہو چکی ہیں۔ اسے کسی شوہر سے اولاد نہیں ہے۔ پانچ، چھ برس میں اس نے تین شادیاں کیں۔ وہ صرف امیر کبیر مردوں کو پھانستی ہے۔ ان سے شادی کر کے ان سے خوب مال بٹورتی ہے۔ پھر انہیں کسی نہ کسی چکر میں پھانس کر طلاق دینے پر مجبور کر دیتی ہے اور مہر کی رقم بہت دگنی وصول کرتی ہے۔ بلیک میل کر کے جائیداد میں حصہ بھی بٹوا لیتی ہے۔ اب وہ میرے شوہر پر ڈورے ڈال رہی ہے اور گن سن ملی ہے کہ میرا شوہر مجھے طلاق دے کر اس سے شادی کرنے والا ہے۔ آپ اس کمینی اور فاحشہ سے میرا سہاگ بچائیں۔''

''اس عورت کی عمر کیا ہوگی......؟'' حاتم نے آنکھیں کھولے بغیر تسبیح کے دانے پھیرتے ہوئے پوچھا۔

''اس کی صحیح صحیح عمر بتائیں اگر معلوم ہو تو؟''

''وہ عورت میری عمر کی بلکہ تیس برس کی ہوگی۔'' اس عورت نے جواب دیا۔

''اچھا تو آپ کے شوہر کا کاروبار وغیرہ کیا ہے اور آپ کی رہائش کہاں ہے؟'' اس نے آنکھیں بدستور بند رکھیں۔ ''ان کا نام اور عمر کیا ہے؟''

''میرے شوہر کی پلاسٹک پائپ کی کمپنی ہے اور تاج برانڈ کے نام سے پائپ فروخت ہوتے ہیں۔'' عورت نے بتایا۔ ''گلشن میں چار ہزار گز کی ایک کوٹھی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی جائیداد ہے۔ ان کا نام سراج الاسلام ہے۔ عمران کی چالیس برس کی ہے اور ہمارے دو بچے ہیں۔ ایک لڑکی دس برس کی ہے اور ایک لڑکا سات برس کا ہے۔ وہ دونوں زیر تعلیم ہیں۔''

''وہ عورت جس کا نام نو بہار ہے اس کی مستقل رہائش کہاں ہے؟'' حاتم نے اسی حالت میں سوال کیا۔ ''کیا وہ بہت حسین ہے؟ آپ سے زیادہ حسین ہے؟''

''نو بہار دھان منڈی میں ایک فلیٹ میں کرائے پر رہتی ہے اور اپنے بھائی اور بھابھی بچوں کے ساتھ اس لئے نہیں رہتی ہے کہ وہاں اس کا شکار پھانسنا مشکل ہو جائے گا۔'' وہ کہنے لگی۔ ''اس کی مستقل رہائش کہیں نہیں ہے۔ وہ مجھ سے حسین تو نہیں ہے لیکن نہایت پرکشش ہے۔ میرے شوہر کو اس لئے پھانسا ہے کہ وہ کروڑ پتی ہے۔''

''آپ اس عورت اور اپنے شوہر کی تصویر لائی ہیں؟'' حاتم نے آنکھیں کھول کر عورت کو دیکھا۔ ''میں نے کہلوایا تھا کہ آپ دونوں کی تصویر ضرور لائیں۔ کیوں کہ انہیں دیکھے بغیر بات نہیں بنے گی اور میں انہیں جا کر دیکھنے سے رہا۔ کیوں کہ مجھے فرصت بالکل بھی نہیں ملتی ہے۔''

''جی ہاں...... میں ان کی تصویر لائی ہوں؟''

عورت نے گود میں سے اپنا سیاہ چرمی پرس اٹھا لیا۔ پھر اس میں سے تصویریں نکال کر بڑھائیں۔ تصویر لیتے وقت حاتم سے تصویریں چھوٹ کر چوکی پر اس کے پیروں کے پاس گر پڑیں۔ عورت انہیں اٹھانے کے لئے جھکی۔ چند لمحوں کی مہلت میں، میں نے نو بہار اور اس عورت کے شوہر کی تصویر دیکھ لی۔ اس عورت کا شوہر خاصا خوبصورت اور وجیہہ تھا۔ دوسری تصویر نو بہار کی تھی۔ وہ پوسٹ کارڈ سائز کی اور رنگین تھی۔ چوں کہ وہ لندن میں رہ چکی تھی، شکار کرتی رہتی تھی اور مردوں کو متوجہ کرنے کے لئے بھڑکیلا لباس پہنتی تھی۔ یہ بھڑکیلا لباس ہی تھا کہ اس کے حسن کی کرشمہ سازیاں واضح تھیں اور انگ انگ سے مستی ابلی پڑتی تھی۔

عورت نے دونوں تصویریں اٹھا کر حاتم کی طرف بڑھا دیں۔ حاتم نے ان تصویروں کو باری باری دیکھا۔ پھر اس نے بے پروائی کے انداز میں ایک طرف رکھ دیں اور اس عورت سے کہا۔ ''حلیمہ بیگم! آپ کا شوہر آپ کو واپس مل جائے گا۔ لیکن آپ کو پچاس ہزار ٹاکا دینے ہوں گے۔ میں پچاس ہزار ٹاکا سے ایک ٹاکا بھی کم نہیں لوں گا۔ یہ بات آپ اچھی طرح سوچ لیں۔''

''پچاس ہزار ٹاکا......'' حلیمہ بیگم کا چہرہ فق ہو گیا۔ وہ چند لمحے کی خاموشی کے بعد بولی۔ ''میں اتنی بڑی رقم کہاں سے لاؤں؟''

''یہ میں نہیں جانتا......'' حاتم نے قدرے سرد مہری سے کہا۔ ''یہ آپ کا مسئلہ ہے۔ اگر آپ اس رقم کا بندوبست نہیں کر سکتیں تو پھر آپ تشریف لے جائیں۔ آپ میرا وقت خراب مت کریں۔ مجھے اور لوگوں کی بھی خدمت کرنا ہے۔ وہ اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں۔''

''میں آپ کو زیادہ سے زیادہ پچیس ہزار ٹاکا دے سکتی ہوں۔'' حلیمہ بولی۔ ''آپ پچاس ہزار ٹاکا، کیا زیادہ رقم نہیں مانگ رہے ہیں؟''

''میں نے آپ نے کہہ دیا کہ پچاس ہزار ٹاکا سے ایک ٹاکا کم نہیں لوں گا پھر بھی آپ مول تول کر رہی ہیں۔'' حاتم بگڑ کر برہمی سے کہنے لگا۔ ''میں کاروبار نہیں کر رہا ہوں۔ یہاں لوٹ کھسوٹ کرنے نہیں بیٹھا ہوں۔ میں جادوگر نہیں ایک عامل ہوں۔ آپ ایک کروڑ پتی کی بیوی ہیں۔ آپ کے لئے پچاس ہزار کیا ایک لاکھ ٹاکا بھی کم ہیں...... آپ کو نہیں معلوم کہ نو بہار کیا بلا ہے۔ اس نے ایک پنڈت کے ذریعے سے آپ کے شوہر پر کالا جادو کیا ہوا ہے۔ کالا جادو کا توڑ آسان نہیں ہے۔ اس کے لئے بہت خرچ ہوگا۔''

''میں ایک کروڑ پتی کی بیوی تو ہوں۔'' حلیمہ بے بسی سے بولی۔ ''لیکن مجھے ہر ماہ دس ہزار ٹاکا جیب خرچ ملتا ہے۔ میرے پاس دو لاکھ ٹاکا تھے لیکن میں اسے خرچ کر چکی ہوں۔ اب اگر اپنے شوہر سے اتنی بڑی رقم کسی کام کے بہانے مانگوں تو وہ صاف انکار کر دیں گے۔ جب سے وہ نو بہار کی محبت اور اس کے حسن وشباب کے اسیر ہوئے ہیں مجھ سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتے ہیں۔''

''آپ سوچیں اور یہ دیکھیں کہ یہ مسئلہ کس طرح حل کیا جا سکتا ہے؟'' وہ اکھڑے لہجے میں بولا ''آپ کے پاس زیورات بھی تو ہیں؟''

''زیورات......؟'' حلیمہ اس کی بات سن کر بڑے زور سے چونکی۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس

نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہاں ہیں تو سہی۔"

"آپ پچیس ہزار کی رقم نقد دے دیں۔" حاتم نے کہا۔ "باقی پچیس ہزار کی مالیت کے زیورات دے دیں جو اس وقت آپ کے پرس میں موجود ہیں جو آپ کسی کام سے سنار کے پاس لے جارہی ہیں۔ شوہر کو ان زیورات کے بارے میں بتانے کی ضرورت نہیں۔"

"لیکن آپ کو ان زیورات کے بارے میں کیسے اور کیوں کر علم ہوا؟" حلیمہ کی حیرت دو چند ہوگئی۔ "میں نے اس کے بارے میں آپ کو بتایا نہیں تھا؟"

"کیا آپ کو اس بات کا احساس اور اندازہ نہیں ہو رہا ہے کہ ہم کس قدر پہنچے ہوئے ہیں۔" حاتم کہنے لگا۔ "ہم غیب کا حال جانتے اور بتاسکتے ہیں۔ لوگوں نے مجھے خوامخواہ جادوگر مشہور کر رکھا ہے۔ بدنام کردیا ہے۔ میں برگزیدہ بزرگ ہوں۔ ایک عامل ہوں۔ سفلی علم اور کالا جادو کے توڑ کا ماہر ہوں...... میں اس وقت بتاسکتا ہوں کہ یہ جو لوگ یہاں بیٹھے ہوئے ہیں کون ہیں۔ ان کے نام کیا ہیں اور میرے پاس کس لئے آئے ہیں۔ یہ جو تین لڑکیاں ہیں یہ یونیورسٹی کی طالبات ہیں۔ ان میں ایک سال فائنل امتحان میں ٹاپ کرنا چاہتی ہے اور یہ ایک لیڈر کی بیٹی ہے۔ دوسری لڑکی کا نام شہناز ہے یہ اپنی پسند کے لڑکے سے شادی کرنا چاہتی ہے لیکن اس کا باپ اس شادی کے خلاف ہے۔ کیوں کہ اس کا محبوب پہلے ایک شادی کر کے اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے چکا ہے۔ وہ شہناز سے اس لئے شادی کرنا چاہتا ہے کہ وہ اپنے دولت مند باپ کی اکلوتی بیٹی ہے۔ دس کروڑ کی جائیداد کی مالیت کی تنہا وارث ہے۔ تیسری لڑکی فلمی ہیروئن بننا چاہتی ہے۔

یہ جو دو مرد ہیں آپس میں سگے بھائی ہیں۔ باپ کے مرنے کے بعد اس کے ایک بھائی، ماں اور دو بہنوں نے مل کر بیس کروڑ کی جائیداد پر قبضہ کرلیا ہے۔ مقدمہ عدالت میں زیر سماعت ہے۔ یہ چاہتے ہیں کہ میں ان کے بھائی، ماں اور بہنوں کو پاگل کردوں تاکہ انہیں جائیداد آسانی سے مل جائے۔ وہ اس کام کے لئے مجھے پانچ لاکھ ٹکا دیں گے...... یہ جو عورت ہے وہ ہاشم بیگ کی دوسری بیوی نجمہ ہے۔ ہاشم بیگ جو ڈھاکا شہر کا سب سے بڑا دولت مند شخص ہے۔ اس کی شادی کو سات برس ہورہے ہیں لیکن یہ ماں نہ بن سکی۔ ہاشم بیگ کی پہلی بیوی سے دس برس تک کوئی اولاد نہیں ہوئی تو اس نے دوسری شادی کرلی۔ اب سترہ برسوں کے بعد اس کی پہلی بیوی امید سے ہوئی۔ نجمہ نے اپنا علاج کرایا تھا۔ ڈاکٹروں نے اسے بانجھ قرار دے دیا۔ نجمہ نہیں چاہتی کہ اس کی سوکن کو اولاد ہو۔ اگر ہو تو مردہ...... وہ بھی مجھے پانچ لاکھ ٹکا دینے آئی ہے۔ ایک آپ ہیں کہ پچاس ہزار کی رقم دینے کے لئے جان نکلی جارہی ہے۔ جب کہ میں آپ کے ساتھ خاص رعایت کررہا ہوں اور آپ کا کام سب سے مشکل ہے۔" اس نے اتنی آہستگی سے کہا تھا کہ وہاں موجود مردوں اور عورتوں میں سے کوئی بھی ایک لفظ سن نہیں پایا تھا۔ کیوں کہ وہ تمام لوگ اس سے بہت دور بیٹھے ہوئے تھے اور اس نے جو کچھ کہا تھا وہ جھوٹ کا پلندا تھا۔

"ٹھیک ہے میں رقم اور پرس میں جو تیس ہزار مالیت کے زیورات ہیں وہ آپ کی نذر کرتی ہوں۔" حلیمہ نے کہا۔ "آپ کسی طرح میری مشکل حل کریں گے؟"

حاتم نے جواب دینے کے بجائے ٹرے میں سے دو مورتیاں اٹھائیں جو ایک عورت اور مرد کی تھی۔ اس نے پہلے تو ان دونوں مورتیوں میں سے ایک مورتی اٹھالی۔ یہ عورت کی مورتی تھی۔ اس نے چند لمحوں تک ایک منتر پڑھا اور مورتی پر پھونک دے ماری۔ چند لمحوں کے بعد اس مورتی کی رنگت اور روپ بدلنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد وہ مورتی نوبہار بن گئی۔ اس تصویر کی طرح جو حلیمہ ساتھ لائی تھی۔ اس میں اور نوبہار میں ذرہ برابر فرق نہیں تھا۔ وہ اس کا عکس تھی۔ پھر اس نے اس مورتی کو اپنے سامنے رکھا۔ اس کے ہونٹ بدبدائے۔ وہ دوسرا منتر پڑھ رہا تھا۔ پھر اس نے منتر پڑھ کر مورتی پر پھونک دیا۔ اس بے جان مورتی میں جان آگئی۔ وہ متحرک سی ہوگئی۔

"نوبہار!" حاتم نے بڑے رعب دار لہجے میں مورتی سے کہا۔ "کیا یہ سچ ہے کہ تم حلیمہ کے شوہر سراج الاسلام سے شادی کرنا چاہتی ہو؟"

"ہاں...... یہ سچ ہے۔" ایک مترنم سی آواز فضا میں لہرائی۔ اس مورتی نے اپنی پلکیں جھپکائیں۔ "آئندہ ماہ ہماری شادی کی تاریخ طے ہوگئی ہے۔"

"آخر تم اس سے شادی کیوں کرنا چاہتی ہو؟" حاتم نے پوچھا۔ "کیا تم نہیں جانتی ہو کہ وہ شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ ہے؟"

"اس لئے کہ ہم دونوں آپس میں ایک دوسرے سے شدید محبت کرتے ہیں۔" مورتی نے جواب دیا۔ "سراج کے شادی شدہ اور دو بچوں کے باپ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ سراج اپنی بیوی کو طلاق دے دے گا۔ پھر ہم دونوں عیش و عشرت کی زندگی گزاریں گے۔"

"میں کہتا ہوں کہ تم حلیمہ کے اور اس کے بچوں کے راستے سے ہٹ جاؤ۔" حاتم کی آواز کرخت ہوگئی۔ "ایک عورت ہو کر عورت کا گھر نہ اجاڑو......"

"جس طرح لوہے کو لوہا کاٹتا ہے اس طرح ایک عورت کا گھر عورت ہی اجاڑتی ہے۔ ہم دونوں میں اتنی محبت ہوگئی ہے کہ اب ہم ایک ہو کر ہی رہیں گے۔"

"جسے تم محبت کا نام دے رہی ہو وہ محبت نہیں ہے۔"

حاتم بولا۔ "تم سراج سے نہیں بلکہ اس کی دولت سے محبت کرتی ہو۔ تم فریبی ہو۔"

"تم کچھ بھی کہو۔" مورتی نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔ "ہم دونوں شادی کر کے رہیں گے۔ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں اس شادی سے باز نہیں رکھ سکتی۔"

"میں بھی دیکھتا ہوں کہ تم دونوں کی شادی کیسے ہوگی؟" حاتم نے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ تم کس لئے اتنا اکڑ رہی ہو۔ تم نے ایک کالا جادو کے علم کے ماہر کی خدمات حاصل کر کے سراج پر کالا جادو کر کے اسے بیوی اور بچوں سے متنفر کردیا ہے۔ میں اس جادو کا توڑ کر کے رہوں گا۔"

"اونہہ......" مورتی ایک زوردار قہقہہ مار کر بڑے زور سے ہنسی۔ پھر زہرخند بولی۔ "یہ وہ کالا جادو ہے جس کا توڑ کسی کے پاس نہیں ہے؟"

حاتم نے پھر ایک منتر پڑھ کر اس مورتی پر پھونکا تو بہار کی مورتی اگلے لمحے بے جان سی ہوگئی لیکن اس کا نوبہار والا روپ برقرار رہا۔ حاتم نے دوسری مورتی پر منتر پڑھ کر پھونک ماری۔ دوسرے لمحے دوسری مورتی ہو بہو سراج کی سی ہوگئی۔ پھر اس نے منتر پڑھ کر پھونکا تو اس میں جان آ گئی۔

''کیا یہ سچ ہے کہ تم نوبہار کی محبت میں گرفتار ہو گئے ہو؟'' حاتم نے پوچھا۔ ''یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ مطلقہ ہے اور اچھی عورت نہیں ہے؟''

''ہاں...... میں اس سے محبت کرتا ہوں۔'' سراج نے جواب دیا۔ ''اس میں ذرہ برابر بھی جھوٹ نہیں ہے۔ وہ بھی مجھ سے بہت محبت کرتی ہے؟''

''لیکن تمہاری بیوی بھی تم سے محبت کرتی ہے اور تم بھی اس سے محبت کرتے تھے۔'' حاتم کہنے لگا۔ ''تم دونوں کی محبت کی شادی ہے۔ دو بچوں کی ماں ہوتے کے باوجود تمہاری بیوی کی خوبصورتی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ آج بھی بہت حسین ہے۔ تم اپنی بیوی کی کوئی قدر نہیں کر رہے ہو۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ نوبہار سے تمہیں محبت نہیں ہے۔ تمہیں اس کے بدن سے محبت ہے۔ تم اس کے اسیر ہو گئے ہو؟''

''ہاں...... وہ بہت خوبصورت بدن کی مالک ہے۔'' مورتی نے کہا۔ ''ہم دونوں ایک دوسرے کو بے انتہا چاہتے ہیں اور اسی لئے شادی کرنے والے ہیں۔ ہم اب ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔''

''اصل بات کیا ہے میں بتاتا ہوں۔'' حاتم بولا۔ ''نوبہار نے تم پر کالا جادو کر کے اپنا اسیر بنا لیا ہے تاکہ تم سے شادی کر کے تمہاری جائیداد اور کاروبار پر قابض ہو جائے۔ اس لئے وہ تمہیں مجبور کر رہی ہے کہ تم اپنی بیوی حلیمہ کو طلاق دے دو۔ اسے تم سے نہیں تمہاری دولت سے محبت ہے۔''

''ہاں...... میں اس بات کو خوب سمجھتا ہوں کہ نوبہار کی نیت کیا ہے اور اس کے دل میں کیا ہے؟'' مورتی نے کہا۔ ''میں اس قدر بے وقوف نہیں جتنا وہ مجھے سمجھ رہی ہے۔ میں اپنی دولت اور جائیداد اس کے نام کسی صورت اور قیمت پر نہیں کروں گا۔ اگر وہ یہ سمجھتی ہے کہ شادی کے بعد وہ میری ساری دولت اور جائیداد پر قابض ہو جائے گی تو یہ اس کی بہت بڑی بھول ہے۔ میں اس بات سے بہ خوبی واقف ہوں کہ اس نے اپنے سابقہ شوہروں کے ساتھ کیا کیا۔ کس طرح ان کی دولت پر قبضہ کیا۔ اس کے لئے انہیں بلیک میل کیا۔ ان پر جادو ٹونہ کیا۔ اس طرح آج وہ ان کی بدولت دولت مند بن گئی ہے۔''

''تم یہ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی نوبہار کے جال میں پھنس رہے ہو؟'' حاتم متعجب لہجے میں بولا۔ ''اندھے کنوئیں میں کود کیوں رہے ہو؟ کیا بے وقوفی نہیں ہوگی؟''

''میں کنوئیں میں چھلانگ نہیں لگا رہا ہوں بلکہ نوبہار کو اس بات کا سبق دینا چاہتا ہوں کہ ہر مرد بے وقوف نہیں ہوتا ہے۔ میں اسے اس وقت بے وقوف بناؤں گا جب تک اس سے میرا دل نہیں بھر جاتا۔ پھر اسے طلاق دے کر دودھ میں گری مکھی کی طرح نکال کر پھینک دوں گا۔''

''لیکن یہ تم بھول رہے ہو کہ وہ ایک عیار چالاک اور شاطر قسم کی عورت ہے۔'' حاتم نے کہا۔ ''اس کی مثال ایک صحرائی لومڑی کی طرح ہے اور پھر وہ جادو ٹونہ بھی جانتی ہے۔ اس کے پاس ایک ایسا سفوف

ہے۔ جسے وہ گھول کر پلا دے تو آدمی اس کا غلام اور پالتو کتے کی طرح ہو جاتا ہے۔''

''میں اس کے توڑ کے لئے حاتم جادوگر کے پاس جاؤں گا۔'' مورتی نے کہا۔ ''میں نے سنا ہے کہ بنگلہ دیش میں یہ واحد جادوگر ہے جو سفلی علوم کا ماہر ہے اور کالے جادو کا ماہر ہے۔ میں اس کی خدمات حاصل کر کے نوبہار کے منصوبے کو خاک میں ملا دوں گا۔ پھر اس کا کوئی جادو نہ چل سکے گا۔''

''تم اپنی بیوی کو طلاق دینے کی بجائے اسے کہیں اور کیوں نہیں رکھ چھوڑتے؟'' حاتم نے مشورہ دیا۔ ''جب تمہارا دل نوبہار سے بھر جائے گا تب تم سے اپنے پاس رکھ لو۔ آخر تمہارے دو معصوم بچے بھی تو ہیں۔ اتنی شدید نفرت تو نہ کرو اپنی بیوی سے...... اس لئے کہ وہ تم سے بہت محبت کرتی ہے۔''

''اصل بات یہ ہے کہ مجھے حلیمہ سے شدید محبت رہی ہے اور رہے گی لیکن اس نے میرا دل توڑ دیا۔'' مورتی کہنے لگی۔ ''کوئی دو ایک برسوں سے اسے میری ذات سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ وہ صرف پارٹیوں کی ہو کر رہ گئی ہے۔ بھڑکیلے اور قیمتی ملبوسات اس کی کمزوری بن گئے ہیں۔ اسے دعوتوں اور سیر و تفریح سے دلچسپی ہے۔ کبھی سہیلیوں کے ساتھ رنگا ماٹی جا رہی ہے تو کبھی کاکس بازار، کبھی کلکتہ، ممبئی تو کبھی سنگاپور اور ہانگ کانگ...... اور پھر اسے بچوں کی تعلیم و تربیت کی کوئی فکر نہیں رہی۔ وہ ان سے بھی بے پرواہ ہوگئی۔ بچے ماں کی محبت اور قربت کو ترسنے لگے ہیں۔ اس کا یہ خیال ہے کہ وہ رات کو صرف بستر کی زینت بننے کے لئے ہے۔ مجھے اس سے نہیں بلکہ اس کے حسن و شباب اور جسم سے محبت ہے بالکل غلط ہے۔ میں نے اسے کئی بار سمجھایا کہ وہ بیوی، عورت، اور بچوں کی ماں بن کر زندگی گزارے۔ لیکن میری اس نصیحت کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ جس سے تلخیوں نے جنم لینا شروع کیا۔ ایک روز اس نے کسی بات پر مجھ سے یہ کہہ دیا کہ تم مجھے چھوڑنا چاہو تو چھوڑ دو۔ لیکن میں یہ پارٹیاں اور تفریح نہیں چھوڑوں گی۔ دراصل اس کی ان باتوں نے مجھے نوبہار کی طرف متوجہ کیا۔ ہم دونوں میں محبت ہوگئی اور ہم نے آپس میں شادی کا فیصلہ کر لیا۔''

''فرض کرو کہ تمہاری بیوی حلیمہ تم سے معافی مانگ لیتی ہے اور تم سے وعدہ کرتی ہے کہ اب وہ پارٹیوں اور سیر و تفریحات سے توبہ کر لیتی ہے تمہارا اور بچوں کا خیال رکھتی ہے کیا اس صورت میں تم اسے معاف کر دو گے اور نوبہار سے شادی سے انکار کر دو گے؟'' حاتم نے پوچھا۔

''ہاں...... یہ ممکن ہے۔'' مورتی نے کہا۔ ''لیکن مجھے اس کی امید نہیں ہے۔ کیوں کہ وہ ایک ضدی عورت ہے۔ کاش! وہ راہ راست پر آ جائے۔''

''نہیں...... نہیں...... ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔'' نوبہار کی مورتی جو خاموش اور بے جان ہو کر ساری گفتگو سن رہی تھی اس میں ایک دم سے جان پڑ گئی اور بولی۔ ''اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ تم مجھ سے شادی نہ کرو اور اپنی بیوی کو معاف کر کے اس کے ساتھ زندگی گزارو۔ میں حلیمہ کو بھسم کر دوں گی۔''

''لیکن تم ایسا کیوں اور کس لئے کرو گی......؟''

سراج کی مورتی بولی۔ ''اب جب کہ مجھے تمہاری اور تمہیں میری نیتوں کا حال معلوم ہو چکا ہے۔''

''میں تم سے پہلے حاتم جادوگر سے رابطہ کروں گی۔''

نوبہار کہنے لگی۔ ''میں حاتم کو جانتی ہوں۔ حاتم بہت بڑا جادوگر ہے اور کالے جادو کا ماہر ہے۔ مجھے جب پہلے شوہر سے نجات پانا تھی تو میں اسی کے پاس گئی تھی۔ میں نے اسے اپنا جسم اور ایک لاکھ ٹاکا پیش کیے تو اس نے میرے پہلے شوہر پر ایسا جادو کیا کہ اس نے نہ صرف دس لاکھ ٹاکا بلکہ شانتی نگر کا فلیٹ میرے نام کر دیا۔ پھر اس نے دوسری شادی پر مجھے ایک سفوف ایک لاکھ ٹاکا کے عوض دیا۔ جسے پلا کر میں نے دوسرے اور تیسرے شوہر کو بھی غلام بنالیا تھا۔ میں پھر اس کے پاس جاؤں گی۔''

''تم سے پہلے میں اس کے پاس جاؤں گا اور اسے پانچ لاکھ ٹاکا دوں گا۔'' سراج نے کہا۔ ''یہ بہت بڑی رقم ہے۔ کیا تم اسے پانچ لاکھ ٹاکا دے سکتی ہو؟''

''حاتم کیا ہے کیسا ہے تم مجھ سے زیادہ نہیں جانتے.....؟'' نوبہار کہنے لگی۔ ''میں نہ صرف اسے دس لاکھ دوں گی بلکہ اس کے ساتھ دس دن بھی رہوں گی۔ وہ ایک بڑا خبیث قسم کا شخص ہے۔ کمینہ خصلت، عیار اور ماہر نفسیات بھی ہے۔ ایک بہت بڑا شیطان ہے۔ عورت اور دولت اس کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اس کے پاس اب تک جو لڑکیاں اور عورتیں آئیں اپنی عزت بچا کر لے جا نہیں سکیں۔ وہ ان پر جادو کر کے بے بس اور مجبور کر دیتا ہے کہ اس کی ہر بات مان لیں اور اسے خوش کر دیں۔ اس سے بڑا ذلیل اور حرام زادہ پورے بنگلہ دیش میں نہ ہوگا۔ اس نے دولت کے لالچ اور ہوس میں اندھا ہو کر کتنی زندگیاں برباد کر دیں۔ وہ گھر اجاڑ دیئے جو بسے بسائے تھے۔ وہ اپنے علم سے تمہارا ذہن ایسا مفلوج کر دے گا کہ تم میری ہر بات ماننے پر مجبور ہو جاؤ گے..... اس وقت یہاں جو لڑکیاں اور عورتیں موجود ہیں۔ ان میں تمہاری بیوی بھی ہے۔ انہیں کوئی اور دن اور وقت بلا کر کسی بہانے سے ان کی عزت پامال کر دے گا۔''

یہ ساری گفتگو پورے ہال میں گونج رہی تھی۔ نوبہار کی مورتی نے اس کا باطن ظاہر کر دیا تھا۔ حاتم کا چہرہ لال ہو گیا اور اس کی آنکھیں شعلے برسانے لگیں۔ وہ حیران اور پریشان تھا کہ اس مورتی نے یہ کیا بک دیا۔ اس کی اصلیت بتا دی۔

اصل قصہ یہ تھا کہ میں نے اس وقت سے جب اس نے ان دو مورتیوں کو نوبہار اور سراج کا روپ باری باری دیا تھا۔ پہلے اس نے نوبہار کا روپ دیا۔ تب میں نے خود نوبہار میں سما کر بات کی اور سراج سے بھی..... اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔ بالکل برعکس ہو رہا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا۔ سن رہا تھا۔ لیکن اس کے بس میں نہیں تھا کہ کوئی حرکت اور جادو کرے۔ میں نے نوبہار سے اس کی شیطانیت اور اصلیت موجود لوگوں پر ظاہر کر دی تھی تاکہ وہ یہاں سے چلے جائیں اور ان کی عزت محفوظ رہے۔

آخر وہی ہوا جو میں چاہتا تھا۔ اس اپنے اپنے جادو کے زور سے لوگوں کو روکنے اور ساکت و جامد بنانے کی بہت کوشش کی لیکن میری وجہ سے اس کا جادو کسی ایک پر بھی چل نہ سکا۔ وہ ششدر اور بھونچکا سا تھا کہ یہ کیا ہو گیا ہے۔ اس کا جادو کام کیوں نہیں کر رہا ہے؟ اور پھر ان مورتیوں کو کیا ہوا تھا۔ وہ اس کے جادو کے زیر اثر کیوں نہیں رہیں؟ وہ سوچ سوچ کر پاگل سا ہو رہا تھا۔ اسے اپنی زندگی میں کبھی ایسے واقعہ سے واسطہ نہ پڑا تھا۔ وہ شعبدہ باز نہ تھا بلکہ ایک جادوگر تھا۔

پھر اس نے اپنے جادو کے زور پر اپنے ایک موکل کو بلانے کی کوشش کی۔ لیکن میں نے اس کی یہ کوشش بھی بے اثر کر دی۔

اس بات نے اسے اور چکرا دیا تھا۔ اس کی اب بھی کچھ سمجھ میں نہیں آیا اور اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ پھر دوبارہ اس نے کوئی منتر پڑھنے کی کوشش کی لیکن یہ منتر بھی وہ بھول سا گیا تھا۔ اس کو پسینے آ گئے اور اس کی حالت پاگلوں کی سی ہو گئی۔ ''یہ کیا..... میں جادو کیسے بھول گیا.....؟ یہ مورتیاں کس کے زیر اثر آ گئی ہیں.....؟'' وہ متوحش ہو کر بڑبڑانے لگا۔ ''یہ مجھے کس نے کیوں اور کس طرح بے حس و حرکت کر دیا تھا۔ میرے اندر کون سا کر مورتیوں سے باتیں کر رہا تھا.....؟ کون.........؟ مجھ سے بڑا جادوگر تو پورے بنگلہ دیش میں نہیں ہے جو مجھے قابو میں کرے..... میں اپنے سارے علوم کیسے بھول گیا ہوں؟''

''میں نے تمہیں سارے علوم سے محروم کر دیا ہے.....'' میں نے کہا۔ ''اب تم جادوگر نہیں رہے۔ اب تم صرف ایک عام شخص ہو حاتم؟''

''کک..... کک..... کون ہو تم.....؟'' وہ بدحواس ہو کر سراسیمگی سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ ''سامنے کیوں نہیں آتے ہو؟''

''حاتم! میں وہی ہوں جس نے شکیلہ کو تمہارے جادو سے بے اثر اور چوہدری خان کے خواب چکنا چور کر دیئے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''حاتم! میں تم سے بھی بڑا جادوگر ہوں۔ تم نے اپنے جادو سے غلط فائدہ اٹھایا۔ تم نے بڑی ذلالت اور شیطانیت کی.....''

''ہاں..... ہاں..... واقعی تم بہت بڑے جادوگر معلوم ہوتے ہو؟'' وہ خوف زدہ لہجے میں بولا۔ ''میں مانتا ہوں۔ مجھے اس سے انکار نہیں۔ میں تمہارا جادو اور تمہاری طاقت دیکھ چکا ہوں۔ لیکن میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے جو تم نے مجھے اس جادو سے محروم کر دیا۔''

''تم نے جو کچھ کیا ہے تمہارے وہ سارے کرتوت تمہیں اس جادو کے گولے میں ایک ایک کر کے دکھا دیتا ہوں۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''تم جیسا ذلیل، کمینہ خصلت اور شیطان اس پورے دیش میں نہیں ہے۔ تم نے جو کچھ کیا ہے اس کی سزا یہ ہے کہ سرعام پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔ سزا و جزا دینے والا اوپر بیٹھا ہے۔ میں تمہیں ایسی سزا دوں گا کہ مرتے دم تک اذیت سے زندگی گزارو، ذلت کی زندگی گزارو۔''

''تم مجھے کوئی سزا نہیں دے سکتے..... تم نہیں جانتے کہ مجھے کالی ماتا کی آشیرباد حاصل ہے۔ میں اس کے زیر اثر ہوں۔'' وہ بولا۔

''تمہاری اور تمہاری کالی ماتا کی ایسی کی تیسی.....'' میں نے نفرت اور غصہ بھرے لہجے میں کہا۔ ''تمہاری سزا صرف اتنی سی ہے کہ تمہارا یہ گھر جل کر خاکستر ہو جائے گا۔ کیوں کہ تم نے نہ صرف بہت سارے دل جلائے بلکہ گھر بھی اجاڑ دیئے۔ متاثرہ لوگوں کی زندگی عذاب ناک بن گئی۔ ان پر کیا گزری اور کیا گزرے گی تمہیں کبھی اس کا احساس نہیں ہوا۔ لیکن آج اب ہوگا۔''

اس ہال سے ملحق اس کی خواب گاہ تھی جس میں اس نے نہ جانے کتنی ہی عورتوں کی عزت بھری زندگی کو

پامال کیا۔ اس میں ایک تجوری بھی تھی جس میں اس کی دولت کرنسی اور زیورات کی شکل میں موجود تھی۔ اس کے کپڑے اور ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ میں نے اس کمرے کی طرف منہ کر کے زوردار پھونک ماری۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کمرے میں آگ لگ گئی۔ دوسرے لمحے بڑے زور سے بھڑکی اور اس نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ چند لمحوں کے بعد اس کمرے میں شعلے بھڑک رہے تھے اور یہ آگ اس ہال میں پھیلنے لگی۔

آگ دیکھ کر حاتم کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ اس کمرے کی طرف لپکا اور دو قدم جا کر ٹھٹک کے رک گیا۔ آگے جانے کی ہمت نہیں ہوئی اور نہ جا سکتا تھا۔ کیوں کہ آگ تیزی سے بھڑکتی اور پھیلتی جا رہی تھی۔ میں پہلے ہی باہر آ چکا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ پاگلوں کی طرح چیختا چلاتا باہر نکل آیا۔ ''آگ بجھاؤ...... آگ بجھاؤ......'' پھر اس نے اپنے ملازم سے کہا جو مکان کو جلتا ہوا دیکھ کر حیران اور دہشت زدہ سا ہو رہا اور اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایک دم سے یہ آگ کیسے لگ گئی؟ اس کا مکان آبادی سے قدرے ہٹ کر تھا۔ آگ کے شعلے دیکھ کر بہت سارے لوگ اس مکان کے جلنے کا تماشا دیکھنے آ گئے تھے۔ اس آبادی کے لوگ اسے بالکل بھی پسند نہیں کرتے تھے اور اس کی ذات سے شدید نفرت کرتے تھے۔ اس لئے کسی نے نہ تو آگ بجھانے کی کوشش کی اور نہ ہی اس بات کی ہمدردی ظاہر کی۔ البتہ ملازم نے دوڑ کر فائر بریگیڈ کو فون کر دیا۔ اس اثنا میں حاتم نے یہ حرکت کی۔ وہ اپنی خواب گاہ کے عقبی دروازے کی طرف تجوری دیکھنے گیا۔ اس کی تجوری اور تجوری میں رکھی ساری دولت جل کر خاک ہو چکی تھی۔ اس کمرے کی آگ بجھ چکی تھی۔ اسے کمرے کے درمیان سونے کا ایک بڑا گولا دکھائی دیا۔ وہ اسے اٹھانے کے لئے اندر لپکا تو کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر گرا۔ فرش پر جو انگارے پڑے تھے انہوں نے اسے بری طرح جھلسا دیا۔ اس کی چیخوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔

جتنی دیر میں فائر بریگیڈ انجن آیا اس کا خوبصورت اور شان دار مکان ملبے کے ڈھیر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ چوں کہ جھلسنے کے بعد چیختا اور چلاتا ہوا باہر آ گیا تھا اس لئے وہ ملبے کے نیچے دفن ہونے سے رہ گیا۔ اسے اسپتال لے جایا گیا۔ میں نے ایک مہینے کے بعد جادو کے زور سے اس کے بارے میں معلوم کیا تو پتا چلا کہ وہ ایک آنکھ اور ایک ہاتھ سے معذور ہو گیا ہے اور بھیک مانگ کر گزارہ کر رہا ہے۔

میں سہ پہر کے بعد بیت المکرم مارکیٹ آیا۔ یہاں بڑی خوبصورت اور شان دار دکانیں ہر قسم کی ہیں۔ بڑی رونق اور چہل پہل تھی۔ زیادہ تر خریدار لڑکیاں اور عورتیں تھیں۔ اس مارکیٹ کے باہر بھکاریوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی جو ایک قطار میں بیٹھی تھی۔ ایک عورت جس کی عمر چالیس برس سے زیادہ ہوگی جو اپنی وضع قطع اور چہرے مہرے سے مال دار دکھائی دے رہی تھی وہ ان بھکاریوں میں دس، دس ٹاکا کے نوٹ بچوں، جوان لڑکیوں، عورتوں، بوڑھے مردوں کو دے رہی تھی۔ اس نے تمام بھکاریوں کو خیرات دی تھی۔ ان کی تعداد پچاس کے لگ بھگ ہو گی۔ ان میں سے دو ایک اور عورتوں نے اسے گھیر لیا۔

وہ ان سے چھٹکارا پا کر فٹ پاتھ پر آ کر آگے بڑھ رہی تھی کہ ایک گاڑی میرے قریب آ کر رک گئی۔ میں فٹ پاتھ پر کھڑا تھا۔ وہ عورت میری سمت آ رہی تھی۔ چشم زدن میں اس گاڑی کے تین

دروازے کھلے۔ اس میں سے تین مسلح بدمعاش باہر آئے۔ چوتھا بدمعاش جو تھا وہ اسٹیئرنگ سنبھالے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا انجن اسٹارٹ تھا۔ وہ عورت جیسے ہی قریب آئی ان میں سے ایک بدمعاش نے اسے دبوچ کر اس کی کنپٹی پر ریوالور کی نال رکھ دی اور غرایا۔ ''شور مچانے کی ضرورت نہیں۔ شرافت سے گاڑی میں چل کر بیٹھ جاؤ۔ ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔''

عورت اس اچانک اور غیر متوقع حملے کے لئے ذہنی طور پر تیار نہ تھی۔ وہ دہشت زدہ ہو گئی لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کرنے لگی تو دوسرے بدمعاش نے جس کے ہاتھ میں تیز دھار والا خوف ناک قسم کا چاقو تھا اس نے عورت کا ہاتھ پکڑ کر گاڑی کے دروازے کی طرف کھینچا تا کہ اسے اندر دھکیل دے۔ لیکن اس عورت نے مزاحمت کی اور اس کا ہاتھ بری طرح جھٹک دیا۔ تیسرا بدمعاش اس عورت کے قریب گیا تو عورت نے اس کے منہ پر اپنا پرس پوری قوت سے دے مارا اور اس بدمعاش کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی جس نے اسے دبوچ رکھا تھا۔ دونوں بدمعاشوں نے عورت کے دونوں ہاتھ دونوں طرف سے پکڑے تو عورت کے ہاتھ سے پرس چھوٹ کر فرش پر گر پڑا۔ سارے بھکاری اور راہ گیر تماشا دیکھ رہے تھے کہ دن دہاڑے ایک عورت کو اغوا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ان میں سے کسی کی ہمت نہ تھی کہ آگے بڑھ کر بدمعاشوں سے اس عورت کو نجات دلائے۔ اس لئے بھی کہ یہ بدمعاش مسلح تھے اور یہ مسلح نہ ہوتے تو شاید لوگ ان پر ٹوٹ پڑتے۔ ایک بدمعاش ریوالور سے دو بدمعاش چاقوؤں سے مسلح تھے۔

ان بدمعاشوں نے اس عورت کو قابو میں کر کے اسے بے بس کر لیا اور گاڑی کی طرف بڑھے، میں جادو کے زور پر ان بدمعاشوں سے اس عورت کو نجات دلا سکتا تھا۔ ان بدمعاشوں پر قابو پا سکتا تھا۔ میں نے ان بدمعاشوں کو للکارا۔

''خبردار...... ٹھہرو...... چھوڑ دو۔''

ان بدمعاشوں نے مجھے اپنی طرف بڑھتا ہوا دیکھا اور پھر یہ دیکھ کر کہ میں نہتا ہوں میری پروا کئے بغیر عورت کو گاڑی کی طرف لے جانے لگے۔ میں اس بدمعاش کے سر پر جا پہنچا جس نے عورت کو دبوچ رکھا تھا اور ریوالور کی نال عورت کی کنپٹی پر رکھی ہوئی تھی۔ اس نے عورت کی کنپٹی پر سے ریوالور ہٹا کر مجھے دیکھ کر میرا نشانہ لیا اور لبلبی دبائی، لبلبی پھنس گئی۔ اس لئے گولی چل نہ سکی۔ عورت کو ایک طرف ہٹا کر پھر اس نے لبلبی دبائی۔ میں نے چشم زدن میں اس کے ہاتھ سے ریوالور جھپٹ لیا اور اس کی نال پکڑ کے اس کا دستہ اس کے سر کے عقبی حصے پر پوری طاقت سے دے مارا تو وہ لٹو کی طرح گھوم گیا۔ اس نے اپنا سر پکڑ لیا۔ فرش پر گھٹنے ٹیک دیئے۔ دوسرے بدمعاش نے مجھ پر چاقو سے حملہ کیا میں نے اس کے پیٹ پر زور سے لات رسید کی تو وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ تیسرے بدمعاش کے اوپر جا گرا۔ اس کے ہاتھ سے چاقو چھوٹ کر گاڑی کے نیچے چلا گیا۔ تیسرے اور اس دوسرے بدمعاش نے اٹھنے کی کوشش کی تو میں نے اس کا موقع نہیں دیا۔ تیسرے بدمعاش کے ہاتھ پر زوردار لات رسید کی تو اس کے ہاتھ سے بھی چاقو چھوٹ گیا۔ میں نے بھکاریوں اور ان لوگوں کو اشارہ کیا جو ایک طرف کھڑے اس طرح سے اس واقعے کو

دیکھ رہے تھے جیسے کسی فلم کی شوٹنگ دیکھ رہے ہوں۔ میرا اشارہ پاتے ہی بھکاری اور راہ گیران بدمعاشوں پر ٹوٹ پڑے۔ ان کی لاتوں اور گھونسوں سے زبردست خاطر مدارت ہونے لگی۔

اس عورت نے اپنا پرس اٹھالیا تھا۔ وہ میرے پاس آ کر بولی تو اس کی سانس پھول رہی تھی۔ "پلیز! کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ مجھے گھر پہنچا دیں......؟"

وہ عورت ان بدمعاشوں سے نجات پانے کے باوجود بہت خوفزدہ ہو رہی تھی۔ اس کا چہرہ دھلی چادر کی طرح سفید ہو رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے دہشت جھانک رہی تھی۔ اس نے ایک لمحے کے لئے پھٹی پھٹی نظروں سے ان بدمعاشوں کی طرف دیکھا جن کی درگت بن رہی تھی۔

"اب آپ گھبرائیں نہیں اور پریشان نہ ہوں۔"

میں نے اس عورت کو دلاسا دیا۔ "ابھی پولیس کو بلا کر ان کے حوالے کر دیں گے؟"

"پولیس......؟" اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "نہیں......نہیں...... میں پولیس کے چکروں میں پڑنا نہیں چاہتی۔"

"آخر اس میں حرج ہی کیا ہے؟" میں نے متعجب نظروں سے دیکھا۔ "آپ کو اغوا کرنے کے الزام میں وہ حوالات میں اندر ہو جائیں گے۔"

"میں آپ کو گھر چل کر بتاؤں گی کہ میں کس لئے اسے پولیس کیس بنانا نہیں چاہتی ہوں۔" اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ "جلدی سے چلئے......" میں بادل نخواستہ اس کے ساتھ ہولیا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیوں اور کس لئے ان بدمعاشوں کے خلاف رپورٹ کرنا نہیں چاہتی ہے۔ میں اس کے ساتھ ہولیا۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتی جارہی تھی اس کی گاڑی پارکنگ لاٹ پر کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے پرس سے گاڑی کی چابیاں نکالیں۔ چند لمحوں کے بعد تیز رفتاری سے اس کی گاڑی دوڑنے لگی۔ گو اب کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں رہا تھا۔ پھر بھی وہ متوحش نظروں سے عقبی آئینے میں دیکھ رہی تھی۔ کوئی گاڑی تعاقب میں آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیوں کہ بھکاریوں اور راہ گیروں نے انہیں اس قابل نہ چھوڑا ہوگا کہ وہ اپنی جگہ سے ہل بھی سکیں۔ وہ بہت شدید زخمی اور بے ہوش ہو گئے ہوں گے۔ بنگلہ دیش میں عوام بدمعاشوں کی ایسی زبردست پٹائی کرتے تھے کہ ان کا کچومر نکل جاتا تھا اور پھر میں نے ان کی گاڑی کے چاروں ٹائر پنکچر کر دیئے تھے۔

دو میل کی مسافت طے کرنے کے بعد اس نے گاڑی کی رفتار میں کمی کر لی۔ وہ دو تین سگنل بھی توڑ چکی تھی۔ اب اس کا خوف و ہراس دور ہو چکا تھا۔ وہ گاڑی خاموشی اور قدرے پرسکون انداز سے چلاتی رہی۔ اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ میں بھی خاموش ہی رہا۔ جب کہ میرے ذہن میں ان گنت سوال اٹھ رہے تھے۔ میں چاہتا تو اس کا ذہن پڑھ کر سب کچھ معلوم کر سکتا تھا۔ شوتم نے مجھے ٹیلی پیتھی کا علم بھی سکھایا تھا۔ کون سا ایسا جادو تھا جو اس نے مجھے نہیں سکھایا۔ میں ٹیلی پیتھی کے علم کو ہر موقع پر استعمال کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کیوں کہ ایک طرح سے معیوب سی بات تھی کہ کسی بھی شریف اور اچھے آدمی کا ذہن ہر وقت پڑھا جائے۔ میں اپنے دشمن اور جادوگروں اور بدمعاشوں کا ذہن اس لئے پڑھتا تھا کہ وہ کوئی نقصان نہ

پہنچا سکیں۔ میں نے حاتم کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا تھا اور اس کا ذہن مفلوج کر کے اسے سفلی علوم اور کالا جادو سے محروم کر دیا تھا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے...... ہر انسان کے ذہن میں یادداشت کا ایک دریچہ ہوتا ہے۔ اسے اگر بند کر دیا جائے پھر اسے کوئی علم اور بات یاد نہیں رہتی۔ اب حاتم کے عبرت ناک انجام کے بعد یہاں کے لوگوں کو جیسے سکون مل گیا تھا۔

گاڑی ڈھاکا شہر کے ایک اعلیٰ رہائشی علاقہ میں داخل ہو کر ایک خوبصورت اور عالی شان کوٹھی کے گیٹ پر رکی۔ یہ کوٹھی کوئی چار ہزار گز کے رقبے پر بنی تھی۔ اس علاقے میں جتنے بنگلے اور کوٹھیاں تھیں ان کے احاطوں کی دیواریں دو فٹ سے زیادہ اونچی نہیں تھیں۔ اس کوٹھی کی چار دیواری بھی دو فٹ اونچی ہی تھی۔ احاطے میں دو گاڑیاں پارک تھیں۔ برآمدے میں ایک بوڑھا ملازم کرسیوں کی صفائی کر رہا تھا۔ ہارن کی آواز سنتے ہی وہ لپک کر آیا۔ اس نے گیٹ کھول دیا۔ عورت نے گاڑی پورچ میں لے جا کر روک دی۔ میں بھی گاڑی سے اتر آیا۔ جب وہ دروازہ بند کر کے میرے پاس آئی تو میں نے اس سے کہا۔ "اچھا اب آپ مجھے اجازت دیں۔ آپ خیریت سے گھر پہنچ گئیں۔"

"تمہارا بہت بہت شکریہ بیٹا!" عورت نے ساڑی کا پلو شانے پر درست کیا اور پھر اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"میں تمہیں ایسے تھوڑی جانے دوں گی۔"

"اس میں شکریہ کی کیا بات ہے۔" میں نے کہا۔ "میں نے اپنا فرض ادا کیا۔ میں نے یہ سب کچھ کسی صلے کی تمنا کے لئے تھوڑی کیا؟"

"انکساری کی باتوں کو رہنے دو۔" وہ میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے برآمدے کی طرف لے کر بڑھی۔ "تم اپنی جان پر کھیل گئے۔ وہاں کتنے سارے لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ سارا واقعہ اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے کسی فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہو۔ وہ چاہتے تو مجھے بچا سکتے اور بہادری کا مظاہرہ کر سکتے تھے۔ ان میں سے چھ، سات آدمی بھی پتھر اٹھا کر ان بدمعاشوں پر حملہ کر دیتے تو وہ بھاگ نکلتے۔"

برآمدے کی سیڑھیاں پار کر کے وہ مجھے سامنے والے کمرے کے دروازے کی طرف لے گئی۔ وہ ایک بہت بڑی اور کشادہ سی نشست گاہ تھی جسے بڑی خوبصورتی اور نفاست سے آراستہ کیا ہوا تھا۔ جس سے اس گھر کے مکین کے ذوق کا اندازہ ہوتا تھا۔ اس کا ماحول بڑا خواب ناک تھا۔

"بیٹے!" وہ بڑی اپنائیت کے لہجے میں بولی۔ پھر صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ "تم بیٹھو! میں تھوڑی دیر میں ایک فون کر کے آتی ہوں۔" اس عورت نے اے سی آن کیا اور مخالف سمت بڑھ گئی۔ وہاں اندر جانے کا ایک دروازہ تھا۔ اس کی دہلیز پر ریشمی پردہ پڑا ہوا تھا۔ وہ پردہ ہٹا کر اندر چلی گئی۔ میں صوفے پر بیٹھ کر اس نشست گاہ کا تنقیدی نظروں سے جائزہ لے رہا تھا کہ سامنے والے کمرے کی دہلیز کا پردہ ہلا۔ ملازمہ ایک ٹرے میں میرے لئے لیموں کا تازہ جوس لے کر آئی تھی۔ وہ جوس کا گلاس دے کر، جس طرح آئی تھی اسی طرح واپس چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ عورت آئی۔ وہ منہ ہاتھ دھوکر اور کپڑے بدل کر آئی۔ اس کے چہرے پر شادابی تھی اور وہ پہلے کی نسبت زیادہ پرسکون تھی۔ وہ میرے مقابل رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ''میرا خیال ہے کہ میں اپنا تعارف پہلے کرا دوں۔ میرا نام مہ ناز بیگم ہے۔ میں ایک بیوہ عورت ہوں۔ میں ایک فرم کی مالک ہوں، جس کی چھ مسافر لانچیں اور دا سٹیمر چل رہے ہیں۔ میرا ایک بیٹا ہے جو کینیڈا میں مقیم ہے۔ اس نے ایک مقامی لڑکی سے شادی کرلی ہے۔ میری ایک بیٹی ہے اس کا نام اروناہے۔ وہ وزیر تعلیم ہے۔ یونیورسٹی میں پڑھ رہی ہے۔''

''میرا نام سکندر ہے۔'' میں نے اپنا تعارف کرایا۔ ''میں یہاں ایک دوست سے ملنے، سیر و تفریح اور سیاحت کے لئے آیا ہوں۔''

''واقعی میں تم سکندر اعظم ہو۔'' مہ ناز بیگم نے تعریفی لہجے میں کہا اور پرستائش نظروں سے دیکھا۔

''تم بنگلہ دیش میں کتنے دن قیام کرو گے؟''

''میں کل کی فلائٹ سے واپس جا رہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں آسام بھی گیا تھا۔ وہاں سے لوٹ کر آیا ہوں۔''

''تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔'' مہ ناز بیگم نے کہا۔ ''کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تم کچھ دن میرے ہاں قیام کرو یعنی میرے مہمان رہو۔ اتفاق کی بات ہے کہ میں اور میری بیٹی کل پرفضا مقام رنگامالی جا رہی ہیں۔ اگر تم ساتھ چلو تو اچھا رہے گا۔ مجھے ایک بیٹے کی کمی محسوس نہ ہوگی۔''

''میرا خیال ہے کہ اب آپ مجھے جانے ہی دیں۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے یہاں رہتے ہوئے بہت دن ہوگئے ہیں۔''

''بیٹا!'' انہوں نے پرس سے ایک لفافہ نکال کر میری طرف بڑھایا تو میں نے حیرت سے دیکھا۔ وہ بولی۔ ''یہ دو لاکھ ٹاکا ڈالر کی شکل میں ہیں۔ یہ میں اپنی خوشی سے دے رہی ہوں۔ سچ پوچھو تو دس لاکھ بھی دوں تو کم ہے۔ کیوں کہ تم نے اپنی جان کی پروا نہیں کی۔ انسانی جان اس سے کہیں قیمتی ہے۔ اس کے باوجود تمہارا احسان مجھ پر اور میری بیٹی اور اس گھر پر رہے گا۔ تم یہ سمجھ کر رقم قبول کرلو کہ تمہیں ایک ماں دے رہی ہے۔''

''آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔'' میں نے کہا۔ ''اللہ آپ کو بہت دے۔ اللہ نے آپ کو نہ صرف بہت کچھ دیا ہے بلکہ بہت بڑا دل بھی دیا ہے۔'' میں اس سے لفافہ نہیں لینا چاہتا تھا لیکن اس نے زبردستی میری جیب میں ٹھونس دیا۔

''سفر میں یہ رقم کام آئے گی۔ اسے رکھ لو۔''

مہ ناز بیگم نے میری جیب میں لفافہ ٹھونس دیا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی بڑی رقم انعام میں دیں گی۔ مجھے خوشی ہوئی، اس لئے نہیں کہ میں جو جان پر کھیل گیا تو وہ کسی صلے کے لئے، میں نے جادو کے زور سے ان بدمعاشوں پر قابو پایا تھا۔ خوشی اس بات سے ہوئی تھی کہ مجھے بہت بڑی رقم ملی تھی۔ میں سیر و تفریح اور سیاحت بڑے سکون سے کرسکتا تھا اور اطمینان سے رہ سکتا تھا۔

''کیا آپ یہ بتانا پسند کریں گی کہ یہ بدمعاش کون تھے اور وہ کس لئے آپ کو اغوا کرنا چاہتے تھے؟'' میں نے پوچھا۔ ''کہیں تاوان کے لئے تو نہیں؟''

''اس لئے کہ میرے شوہر کے چچازاد بھائی کا ایک لڑکا ہے۔ اس کا نام نبیل ہے۔'' مہ ناز بیگم نے کہا۔ ''وہ میری بیٹی اروناسے شادی کرنا چاہتا ہے۔ میں نے گزشتہ برس اس کی منگنی اپنی بیٹی اروناسے کردی تھی۔ اس نے شادی کے لئے دو شرطیں رکھیں۔ پہلی شرط یہ کہ تمام جائیداد بیٹی کے نہیں اس کے نام کردوں۔ دوسری شرط یہ کہ تمام بزنس بھی اس کے نام لکھ دوں...... میں شاید کر بھی دیتی۔ لیکن مجھے بعد میں پتا چلا کہ اس کے ایک فلمی اداکارہ سے تعلقات ہیں اور وہ دونوں چوری چھپے ملتے ہیں اور ساری ساری رات ایک ساتھ گزار دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ جوا بھی کھیلتا ہے۔ دس لاکھ ٹاکا کا مقروض بھی ہوچکا ہے۔ شرابی کبابی بھی ہے۔ ان تمام باتوں کا پتا میری بیٹی ارونا نے لگایا۔ پھر میں نے ایک پرائیویٹ جاسوس کی خدمات حاصل کیں تو اس نے ان تمام باتوں کی تصدیق کی اور پھر اس جاسوس نے یہ بھی بتایا کہ نبیل تمام جائیداد اور کاروبار اپنے نام کرنے کے لئے دستاویزات بنا رہا ہے اور ان پر دستخط لینے کے لئے مجھے اغوا کرنے والا ہے۔ میں نے فوراً ہی قانونی مشیر عبدالرب کی مدد اور تعاون سے اپنی بچی کے نام تمام جائیداد اور بزنس کردیا جس کی اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہے۔ اس نے ان بدمعاشوں کو اس غرض سے بھیجا کہ مجھے اغوا کر کے لے آئیں لیکن تم نے ان کی کوشش ناکام بنادی۔ لوگوں نے ان بدمعاشوں کا جو حشر نشر کیا مجھے اس کا اندازہ ہے۔ لوگوں نے ان کی پسلیاں توڑ دی ہوں گی۔ انہیں معذور کردیا ہوگا۔ وہ کسی قابل نہیں رہے ہوں گے۔''

''اب اس ناکامی کے بعد وہ کیا کرے گا......؟'' میں نے سوال کیا۔ ''کیا اس بات کا امکان ہے کہ وہ دوبارہ یہ ذلیل حرکت کرے؟''

''وہ بہت کچھ کرسکتا ہے۔'' مہ ناز بیگم کہنے لگی۔ ''کیوں کہ میرا کل اثاثہ اکیس کروڑ کا ہے۔ جائیداد کا کرایہ اور ماہانہ آمدنی ملا کر بیس لاکھ ٹاکا ہے۔ وہ بھی امیر باپ کا بیٹا ہے۔ جوئے میں دس لاکھ کا مقروض ہوا تو کیا ہوا۔ وہ کوئی بھی گھر بیچ کر دے سکتا ہے۔ ویسے اس نے شراب کے جوئے اور اس فاحشہ کے پیچھے کافی دولت لٹادی ہے۔ پہلے وہ اچھا لڑکا تھا لیکن اس فاحشہ نے اسے بگاڑ دیا۔''

''آخر اس کا کیا علاج آپ کی نظر میں ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔ ''وہ دوبارہ آپ کو اغوا کرنے کی کوشش کرے گا؟ یہ آپ نے سوچا؟''

''ابھی تو اس کا کوئی علاج میرے دماغ میں نہیں ہے۔'' مہ ناز بیگم نے جواب دیا۔ ''رنگاماٹی چل کر سکون سے سوچیں گے۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہے۔''

میں مہ ناز بیگم کے کہنے پر گاڑی میں جا کر ہوٹل سے اپنا سامان لے آیا۔ تھوڑی دیر بعد ان کی بیٹی ارونا جو ایک سہیلی سے ملنے گئی ہوئی تھی وہ واپس آگئی۔ وہ ایک حسین و جمیل لڑکی تھی۔ اس میں بڑی جاذبیت اور دل کشی تھی۔ اس کی عمر بیس برس کی تھی۔ بڑی ہنس مکھ، با اخلاق اور ملنسار تھی۔ اس میں نہ تو

پندار حسن تھا اور نہ ہی دولت کا تکبر اور غرور اس کی شخصیت اور باتوں نے مجھے بہت متاثر کیا۔

اروناکو کھانے پکانے کا بہت شوق تھا اور طرح طرح کی ڈشیں بڑی دلچسپی اور توجہ سے بناتی تھی۔ سہیلی کے ہاں سے آتے ہوئے وہ بازار سے مچھلی لے آئی تھی۔ گھر میں ایک خانساماں بھی تھی اور تین ملازمائیں اور ایک مرد ملازم بھی۔ کھانا اس نے بہت اچھا بنایا تھا۔ اس نے مچھلی کا سالن بنایا تھا۔ رات کھانے کے بعد ہم لوگوں نے کافی دیر تک گپ شپ کی۔ چائے پینے کے دوران مہ ناز بیگم نے اپنی بیٹی کو اس لرزہ خیز واقعے کے بارے میں بتایا تو وہ میری بڑی ممنون ہوئی اور میری بہادری اور ایثار پر عش عش کر اٹھی۔

صبح نو بجے ناشتے سے فراغت پانے کے بعد مہ ناز بیگم انڈیا ویزا آفس لے گئی۔ واقعی ان کی بڑی عزت تھی۔ احترام کیا جاتا تھا۔ مجھے ویزا ملنے میں دس منٹ بھی نہیں لگے۔ پھر ہم گیارہ بجے کی فلائٹ سے چٹاگانگ پہنچے، مہ ناز بیگم کی فرم کا ذیلی دفتر چٹاگانگ میں بھی تھا۔ ایئرپورٹ پر ان کی فرم کی گاڑی لینے آئی ہوئی تھی۔ اس گاڑی سے سیدھے رنگاماٹی پہنچے۔ رنگاماٹی میں اونچے اونچے اور بہت بڑے بڑے ٹیلے تھے ان پر بنگلے، کوٹھیاں اور آٹھ دس کمروں کے ہوٹل اور ریسٹورنٹ بھی تھے۔ یہاں پر ان کا اپنا بنگلہ بھی تھا۔ جو چار سو گز کے رقبے پر بنا ہوا تھا۔ ہم بڑی موٹر بوٹ سے بنگلے پر پہنچے۔ اس بنگلے پر ایک ملازم تھا جو خانساماں بھی تھا اور صاف صفائی اور چوکی داری کے کام پر مامور تھا۔ اس کا تعلق مگھ قبیلے سے تھا۔

دوپہر کا کھانا خانساماں نے تیار کیا ہوا تھا۔ اس نے کھانا مزے دار بنایا تھا۔ سہ پہر کے وقت میں مہ ناز بیگم اور ارونانے موٹر بوٹ پر شام ہوتے تک سیر کی۔ رنگاماٹی بہت ہی خوبصورت اور پرفضا مقام تھا۔ بہت سارے غیر ملکی سیاح مرد اور عورتیں بھی آئی ہوئی تھیں۔ ہم لوگ رات کے کھانے کے بعد اس بنگلے کے ٹیرس میں بیٹھے نبیل کے بارے میں سوچتے رہے کہ اس سے کیسے نمٹا جائے؟ کسی نتیجے پر پہنچ نہ سکے۔

رات کے گیارہ بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ ایسی فرحت بخش اور خوش گوار ہوا چل رہی تھی کہ نیند کے جھونکے آنے لگے، نیند کا غلبہ اس طرح سے مدہوشی طاری کرنے لگا جیسے پرانی شراب کا خمار ذہن پر چھا رہا ہو۔ پھر ہم سونے کے لئے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ کیوں کہ نیند سے لڑنا بس کی بات نہیں رہی تھی۔ چند لمحے بھی جاگ نہیں سکتے تھے۔ آخر ہم نے شکست مان لی تھی۔

میں گہری نیند سو رہا تھا کہ کسی نے میرا شانہ بری طرح جھنجھوڑ دیا، مجھے بیدار کرنے کے لئے......
اس وقت مجھ پر نیند کا ایسا غلبہ طاری تھا کہ آنکھ کھل نہیں پا رہی تھی اور پلکیں منوں بھاری ہو رہی تھیں۔ میں نے بدقت پلکیں اوپر اٹھائیں۔ مہ ناز بیگم مجھ پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے لرزاں تھے، آنکھیں منجمد سی تھیں اور چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی۔ ہونٹ کپکپا رہے تھے۔

میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ ماجرا کیا ہے؟ دوسرے لمحے جو خیال آیا وہ یہ تھا کہ کہیں نبیل تو بدمعاشوں کے ساتھ آ دھمکا نہیں ہے؟ میں نے پوچھا۔ ”آنٹی کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے؟ آپ اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہیں......؟“

”بیٹے......ارونا......؟“ ان کی آواز حلق میں اٹک رہی تھی۔ ”ارونا نہیں ہے......“

”کیا مطلب......؟“ میں بستر سے نکل آیا۔ مہ ناز بیگم کے سینے میں سانس پھول رہی تھی۔ میں نے انہیں کرسی پر بٹھا کر پانی پلایا۔ ”اب بتائیں۔“

”بیٹے! ارونا اپنے کمرے میں نہیں ہے؟“ وہ پھولی ہوئی سانس پر قابو پا کر بولی۔ ”ایسا لگ رہا ہے کہ نبیل کے آدمی رات اسے اٹھا کر لے گئے؟“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ میں نے شدید حیرانی سے کہا۔ ”اسے کیا معلوم کہ ہم رنگاماٹی آئے ہوئے ہیں۔ آپ نے کسی کو بتایا تو نہیں تھا......؟“

”اس بات کا علم میرے گھر کے نوکروں کو تو تھا۔“ مہ ناز بیگم نے جواب دیا۔ ”وہ بڑا شاطر قسم کا ہے۔ اس نے کچھ آدمی ہمارے پیچھے لگا رکھے ہیں جو اسے پل پل کی خبر پہنچاتے رہتے ہیں۔ میں کوئی دس دن سے دو تین مشکوک آدمیوں کو دیکھ رہی ہوں۔“

میں ان کے ساتھ ارونا کے کمرے میں آیا۔ ارونا کے بستر کی چادر پر ایک شکن تک نہ تھی۔ جیسے وہ بستر پر لیٹی تک نہیں تھی۔ اس کمرے میں مزاحمت اور زبردستی کے کوئی آثار بھی نہ تھے۔ مہ ناز بیگم نے بتایا۔ ”حیرت کی بات یہ ہے کہ دروازہ اندر سے بند تھا۔ چٹخنی لگی ہوئی تھی۔ میں پہلی گھنٹی پر بیدار ہوئی۔ ٹیلی فون ارونا کی ایک سہیلی شیلنا کا تھا جو چٹاگانگ شہر میں اپنے شوہر کے ساتھ رہتی ہے۔ میں نے ارونا کے کمرے کے دروازے پر دو، تین بار زور زور سے دستک دی وہ ایسی گہری نیند سونے والی نہیں تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے ایک دم سے تشویش ہوئی۔ وسوسے اور اندیشے ڈسنے لگے۔ میں نے خانساماں سے کہا وہ چھت پر جا کر روشن دان سے جھانک کر دیکھے۔ اس نے جھانک کر دیکھا تو ارونا نہیں تھی۔ وہ چوں کہ بہت دبلا پتلا ہے روشن دان سے کمرے میں کود گیا اور پھر اس نے دروازہ کھول دیا۔ یہ دیکھ کر حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ارونا بستر پر نہیں ہے۔ میں نے ملحقہ واش روم میں بھی جھانکا۔ وہ اس طرح سے غائب ہو گئی۔ جیسے گدھے کے سر سے سینگ ...... میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے آخر یہ سب کیا ہے؟“ مہ ناز بیگم اپنا سر پکڑ کے کرسی پر بیٹھ گئی۔

خانساماں اور وہ بوڑھا ڈرائیور جو ایئرپورٹ سے رنگاماٹی تک یہاں لایا تھا، وہ دونوں ایک طرف کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے روشن دان کی طرف دیکھا۔ واقعی وہ بہت چھوٹا تھا اور ایک آدمی بہ آسانی ہی گزر سکتا تھا۔ ڈرائیور نے میرے پاس آ کر کہا۔

”صاحب! میں ایک بات کہوں؟ میرا دل کہہ رہا ہے کہ چھوٹی بیگم صاحبہ کو جادو کے زور سے غائب کر دیا گیا ہے۔“

”ہشت......“ مہ ناز بیگم نے کہا۔ ”کوئی جادو، وادو نہیں ہے۔ نبیل نے ایسا کوئی چکر کیا ہے۔ اسے جادو کہاں آتا ہے؟“

”جادو کا وجود کیوں نہیں ہے۔ بیگم صاحبہ!“ وہ بولا۔ ”پورے بنگال میں ہے اور ساری دنیا میں بنگال کا جادو مشہور ہے۔ رنگاماٹی میں بہت سارے جادوگر ہیں...... ہو سکتا ہے جس نے یہ حرکت کی ہے اس نے

کسی جادوگر کی مدد حاصل کی ہو۔ اس جادوگر نے اپنا کمال دکھایا ہوگا۔ کسی جادوگر کے نزدیک یہ ایک چھوٹا سا کمال ہے۔ رنگاماٹی کے مضافات میں چک اور مگھ قبیلے کے بہت سارے سردار جادوگر ہیں۔"

"مجھے بھی ان باتوں اور قصہ کہانیوں پر یقین نہیں رہا ہے۔" مہ ناز بیگم نے تکرار کے انداز میں کہا۔ "میں پولیس کو ٹیلی فون کر کے بلاتی ہوں۔"

"بیگم صاحبہ رامو سچ کہہ رہا ہے۔" خانساماں نے کہا۔ "جادو کے وجود اور جادوگروں سے آپ انکار نہیں کر سکتیں...... رات میں نے جو کچھ دیکھا وہ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ اسے آپ جھوٹ کہیں یا سچ، رات جب آپ سب سونے کے لئے چلے گئے تب میں باورچی خانے کا سارا کام نمٹا کر ڈرائنگ روم کے سامنے والی راہ داری میں لیٹا ہوا تھا۔ میں نے ٹیرس کا اور باہر کا دروازہ اچھی طرح سے بند کر کے اس کی چٹخنی لگائی اور فرش پر چٹائی بچھا کر لیٹ گیا۔ اس وقت نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے پہلے ایسا محسوس کیا کہ کوئی دروازے کو دھکا دے کر یہ دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے کہ کھلا ہے کہ نہیں۔ پھر دوسرے لمحے ایسی ہی کوشش باہر کے دروازے کی طرف کی گئی۔ میں سمجھا کہ کوئی چور ہے۔ میں اٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ باہر کے دروازے کے نیچے سے ایک کثیف سا دھواں راہ داری میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ یہ ایسا دھواں تھا کہ اس میں کوئی بو باس نہیں تھی۔ دھواں میں کاغذ، کپڑے یا کسی بھی چیز کے جلنے کی علامت ہوتی ہے۔ میں حیران تھا کہ یہ دھواں کس چیز کا ہے۔ کہیں باہر کوئی چیز جل تو نہیں رہی ہے؟ میں سوچ ہی رہا تھا کہ خاصا دھواں اندر داخل ہو کر ایک بہت بڑے مرغولے کی شکل میں چھت کی طرف بلند ہوا۔ کوئی چار پانچ فٹ بلند ہونے کے بعد وہ ایک ہیولے کی شکل بن گیا۔ میں خوف و دہشت سے چیخ مارنے والا تھا۔ لیکن میری آواز گلے میں اٹک گئی۔ اگر میں مضبوط دل کا نہ ہوتا تو شاید غش کھا جاتا۔ ایک انتہائی مکروہ شکل میرے سامنے تھی۔ اس کی تین آنکھیں تھیں۔ تیسری آنکھ اس کی پیشانی پر تھی۔ دو آنکھیں تو مرغی کے انڈے کے سائز کی تھیں۔ اس قدر لال لال تھیں کہ ان میں جیسے خون ٹپک رہا تھا۔ اس کا چہرہ گدھے سے بھی بڑا تھا۔ لیکن اس کی ناک چھوٹی تھی لیکن اس میں تین نتھنے تھے۔ اس کا دہانہ اور دانت بہت بڑے بڑے تھے۔ ہونٹ بھی لال، بہت موٹے اور بے انتہا بھدے بھی تھے۔ اس کی زبان گز بھر لمبی ہوگی اور اس میں کیڑے مکوڑے رینگتے دکھائی دیئے۔ کان، ہاتھی جتنے بڑے تھے۔ اس کی جسامت ہاتھی کی طرح بھاری بھرکم تھی۔ وہ برہنہ تھا۔ اس کے جسم پر بہت ہی لمبے لمبے گھنے اور سیاہ بال تھے جنہوں نے سارے بدن کی ستر پوشی کی ہوئی تھی۔ ناخن چھ، سات انچ لمبے اور خنجروں کی طرح تھے۔ وہ ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ دوسرے لمحے پھر ایک اور سفید سا دھواں دروازے کے نیچے سے آیا۔ پھر وہ ایک انسان کے ہیولے میں تبدیل ہو گیا۔ لیکن یہ انسان کسی خبیث سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ میں تھر تھر کانپ رہا تھا۔ بدن میں لہو منجمد ہو رہا تھا۔ میں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑے انہیں دیکھے جا رہا تھا۔

دفعتاً اس بدروح نے اس شخص کو جو شیطان کی طرح لگ رہا تھا۔ مخاطب کر کے پوچھا۔ "لڑکی اندر ہی ہے دروازہ اندر سے بند ہے۔ قابو مہاراج! کیا حکم ہے...... کیا اس لڑکی کو ختم کر دوں یا اس کی صورت کو

اس طرح مسخ کر دوں کہ اس کی ماں بھی پہچان نہ سکے۔"

"پاگل ہو گئے ہو کیا......؟" اس خبیث شخص نے خشونت سے کہا۔ "ہم اسے زندہ اٹھا کر لے جانے آئے ہیں۔"

پھر وہ بدروح کمرے میں دروازے کے نیچے سے جیسے ہی داخل ہوا چھوٹی بیگم صاحبہ کی چیخ بلند ہوئی۔ پھر دوبارہ چیخ سنائی نہیں دی۔ وہ شاید خوف و دہشت سے بے ہوش ہو گئی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا تو میں نے دیکھا کہ کمرے میں روشنی ہو رہی ہے۔ چھوٹی بیگم صاحبہ فرش پر بے ہوش پڑی ہیں۔ وہ خبیث شخص کمرے میں داخل ہوا۔ بدروح سابقہ صورت میں آ گئی تھی۔ اس نے چھوٹی بیگم صاحبہ کو گود میں اس طرح اٹھا لیا جیسے وہ بچی ہوں۔ پھر اس نے خبیث شخص سے پوچھا۔ "کیا حکم ہے؟"

"حکم کیا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "ہم اسے کلکتہ کے پچھم میں نیلا مندر میں گروجی کے پاس لے جائیں گے۔ یہ ان کی امانت ہے۔"

بدروح چھوٹی بیگم صاحبہ کو گود میں لیے کمرے سے باہر آئی۔ پھر دروازہ بند ہو گیا۔ وہ خبیث شخص چٹخنی لگا کر دھوئیں کی شکل میں دروازے کے نیچے سے آیا۔ پھر دونوں چشم زدن میں نظروں سے غائب ہو گئے اور میں بے ہوش ہو گیا۔ صبح بیدار ہوا تو مجھے بیگم صاحبہ جگا رہی تھیں۔ میں نے ایسا محسوس کیا کہ رات میں نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔ لیکن اب چھوٹی بیگم صاحبہ کو غائب دیکھ کر ایسا لگا یہ خواب نہیں ایک حقیقت تھی۔ میں نے جو دیکھا وہ بیان کر دیا۔ اس میں ذرہ برابر بھی مبالغہ یا گپ نہیں ہے۔"

"اس جدید سائنسی دور میں ایسی باتوں کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔" مہ ناز بیگم نے کہا۔ "تم نیند کی گولیاں کھا کر سوئے ہو۔ میں تمہاری کسی بات کا یقین کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ میں پولیس کو بلاؤں گی۔ وہی بتائیں گے کہ اصل حقیقت کیا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ خانساماں نے جو واقعہ بیان کیا ہے وہ جھوٹ یا خواب پر مبنی نہیں ہے۔" میں نے خانساماں کی تائید کی۔ "آپ اس بات سے انکار نہیں کر سکتیں کہ جادو ایک حقیقت ہے اور اس کا وجود ہے۔ امریکہ اور یورپ والے بھی جادو کی حقیقت سے انکار نہیں کرتے ہیں۔ وہاں بھی جادو اپنے رنگ دکھاتا ہے۔ آپ اس کے بیان کو سچ تسلیم کر لیں ان دو میں سے ایک بدروح تھی جو ہندوستان کے شہر کلکتہ کے کسی جادوگر کی موکل تھی۔ خبیث انسان اس جادوگر گرو کا نائب ہوگا۔"

"لیکن سوال یہ ہے کہ بدروح اور وہ خبیث شخص جس کا نام قابو مہاراج ہے میری بیٹی کو کس لئے اور کیوں اغوا کر کے لے گئے؟"

مہ ناز بیگم نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "کہیں وہ اروناکو اس لئے تو نہیں لے گئے کہ وہ بہت حسین ہے۔ میں نے سنا ہے لیکن مجھے کبھی اس بات کا یقین نہیں آیا لیکن آج یقین آ گیا ہے۔ کہ ماضی میں بلائیں حسین اور جوان لڑکیوں پر عاشق ہو جاتی تھیں اور انہیں اٹھا کر لے جاتی تھیں۔ ہم نے یہاں آ کر بڑی غلطی کی۔ لیکن ہم اکثر آتی رہتی ہیں لیکن کبھی ایسا تو نہیں ہوا؟"

”یہ ان بلاؤں کی حرکت نہیں ہے۔ یہ اس سب سے بڑی بلا کی حرکت ہے جو آپ کی بدترین دشمن ہے اور جو آپ کی جان کے درپے ہے۔“

”کون سی بلا ہے وہ؟“ مہ ناز بیگم کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ ”میں نے کسی بلا کا کیا بگاڑا جو میری دشمن بن گئی اور جان کے درپے ہو گئی۔“

”وہ بلا ہے نبیل......“ میں نے کہا۔ ”یہ میرا اپنا خیال ہے۔ اس واقعہ میں مجھے اس کا ہاتھ معلوم ہوتا ہے۔ یہ کمینگی اسی نے کی ہے۔“

”میرے دماغ میں جو بات آئی ہے۔ وہ یہ کہ نبیل نے کلکتہ جا کر نیلا مندر کے جادوگر کی خدمات حاصل کیں جو گرو کہلاتا ہے۔ وہ شاید نیلا مندر میں رہتا ہے۔“

”لیکن نبیل کو اس جادوگر کی خدمات حاصل کرنے کی کیا ضرورت آن پڑی؟“ مہ ناز بیگم کے چہرے پر گہرا استعجاب چھا گیا۔ ”وہ جادوگر کیا کرے گا؟ کیا کر سکتا ہے؟ زبردستی شادی کرنے کی اگر بات تھی تو وہ اروناکہ یہاں بھی اغوا کر کے کر سکتا تھا؟“

”دراصل نبیل نے یہ دیکھ لیا اور محسوس کر لیا ہو گا کہ اسے اپنے گھناؤنے مقصد میں کامیاب ہونا آسان نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ اس نے پہلے بھی کوئی کوشش کی اور وہ ناکام رہا ہو۔ بہر حال اسے کسی دوست یا ملنے والے نے مشورہ دیا ہو گا کہ قابو مہاراج کے گرو سے وہ رابطہ کرے جو کلکتہ میں رہتا ہے۔ گرو اس کے سارے کام بڑی آسانی سے کر دے گا۔ اس کے علاوہ کوئی اور نہیں کر سکتا اور بنگلہ دیش میں ایسا کوئی جادوگر نہیں ہے۔ اس لئے وہ کلکتہ جا کر اس گرو سے بات کر آیا۔ اس کی بڑی شہرت ہو گی۔“

”جی ہاں اس کی بڑی شہرت ہے۔“ خانساماں نے کہا۔ ”ڈھاکا کے حاتم جادوگر سے بھی چار گنا زیادہ۔ اسے بدروحوں کا مہاراج کہا جاتا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ جتنی طاغوتی طاقتیں ہیں اس کے زیر اثر اور تابع ہیں۔ کالی ماتا نے ایک ایسی شکتی دی ہے کہ اس پر کوئی دوسرا قابو نہیں پا سکتا۔“

”اس ذلیل اور کمینے نبیل نے ارونا سے شادی کرنے اور مجھ سے بدلہ لینے کے لئے اتنی دور جا کر اس جادوگر سے رابطہ کیا؟“ مہ ناز بیگم نے غصے سے کہا۔

”صرف شادی کرنے کے لئے ہی نہیں بلکہ آپ کو تنگ و ہراساں اور پریشان کرنے کے لئے۔“ میں نے کہا۔ ”آپ کو بلیک میل کرنے کے لئے ارونا کو اغوا کیا گیا ہے۔ ابھی تک شاید اس کے علم میں یہ بات نہیں آئی کہ آپ نے ارونا کے نام تمام اثاثے منتقل کر دیئے ہیں۔ لیکن اب یہ بات اس کے علم میں آ جائے گی اور وہ ارونا سے دستخط کرا لے گا اسٹامپ پیپر کا اس نے پہلے سے ہی بندوبست کر رکھا ہو گا جو بنگلہ دیش کا ہو گا اور پھر جادو کے زور سے ارونا کہ ہمنوا بنا لے گا اور شادی بھی کر لے گا۔ جادو سے ہر بات ممکن ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ وہ شاید کلکتہ میں ہو اور ارونا کا منتظر ہو۔“ میں نے وضاحت کی۔

”تم نے ان تمام پہلوؤں کا جو جائزہ لیا ہے۔ وہ میری سمجھ میں آ گیا ہے۔“ مہ ناز بیگم سر پکڑ کے

کرسی پر ڈھیر ہو گئی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کا حوصلہ اور اعصاب جواب دے گئے تھے۔ میں نے دلاسا دیا۔ ”آنٹی! آپ ہمت اور حوصلہ رکھیں۔ اللہ نے چاہا تو وہ اپنے مذموم ارادوں میں کامیاب نہ ہو گا۔ رونے دھونے اور حوصلہ ہارنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ بلکہ ہمیں کوئی تدبیر کرنی ہو گی۔“

”اب کچھ بھی نہیں ہو گا۔“ مہ ناز بیگم نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ اس کی آواز بھرا گئی۔ ”وہ اپنے گھناؤنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا۔“

مہ ناز بیگم کے پھر آنسو نکل آئے۔ ”ہائے میری بدنصیب بچی......اس ذلیل اور دولت نے تیری زندگی غارت کر دی۔ خدا نبیل کو غارت کرے۔“

”آپ کسی بات کی فکر نہ کریں اللہ پر بھروسا رکھیں۔“ میں نے پھر مہ ناز بیگم کو دلاسا دیا۔ ”میں آج ہی کلکتہ جاتا ہوں۔ وہاں جا کر پہلے تو گرو جادوگر اور اس کے ماتحت اور شاگرد قابو مہاراج سے ملتا ہوں جو شاید خود بھی بہت بڑا جادوگر ہے۔ انہیں نبیل سے زیادہ رقم کی پیش کش کرتا ہوں۔ شاید وہ میری بات مان لیں۔ اگر ان دونوں نے میری بات مان لی تو میں آپ کو فون کر دوں گا۔ آپ ان کی مطلوبہ رقم لے کر پہنچ جائیں۔“

”بالفرض محال اس نے آپ کی کوئی بات نہیں مانی تو آپ کیا کریں گے؟“ خانساماں نے کہا۔ ”وہ بڑا کمینہ شخص ہے آپ وقت ضائع کریں گے۔“

”میرے خیال میں ایک کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”ایسے لوگ دولت کے حریص ہوتے ہیں۔ ان کا ایمان صرف دولت ہے۔ وہ دولت کے لئے جیتے اور مرتے ہیں۔ دوسرے کو بھی مارتے ہیں۔“

”بیٹے! تم اللہ کا نام لے کر جاؤ اور کوشش کر کے دیکھو۔“ مہ ناز بیگم نے آنسوؤں کو ساڑی کے پلو میں جذب کرتے ہوئے کہا۔ ”تم رقم کی بالکل بھی فکر نہ کرو۔ اگر اس نے بیس لاکھ کی رقم بھی طلب کی تو مان جاؤ۔ تمہارا فون آتے ہی میں رقم لے کر پہنچ جاؤں گی۔“

مہ ناز بیگم کے بیڈ روم میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے کی آواز گونجی تو وہ تیزی سے لپک گئی۔ دوسرے لمحے خانساماں نے مجھ سے سرگوشی میں کہا۔

”صاحب! ایک بات کہوں تو آپ میری بات کا بالکل بھی برا نہ منائیں۔ کیا کروں، دل کی بات کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتا۔ آئندہ مہینے میری بیٹی کی شادی ہونے والی ہے۔ میں نے پندرہ دن پہلے جب وہ یہاں آئی تھیں، ان سے بیس ہزار روپے بیٹی کی شادی کے لئے مانگے تو صاف انکار کر دیا۔ یہ کہا کہ شادی سے ایک ماہ پہلے دو ہزار روپے لے لینا۔ لیکن اپنی بیٹی کو مصیبت سے نکالنے کے لئے بیس ہزار نہیں بلکہ بیس لاکھ خرچ کرنے کو تیار ہیں۔“

”یہ دولت مند لوگ ایسے ہی خود غرض ہوتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”جب ان کی کہیں گوٹ پھنستی

ہے تو وہ پیسہ پانی کی طرح بہاتے ہیں۔ بیس ہزار ٹاکا ان کے لئے کیا ہے۔ لیکن ان لوگوں کے دلوں میں غیروں اور غریبوں کے لئے ہمدردی کا گوشہ نہیں ہوتا ہے۔ تم کب سے ان کے ہاں ملازم ہو؟"

"میں کوئی بیس برس سے اس خاندان کی خدمت کر رہا ہوں۔" خانساماں نے جواب دیا۔ "میں نے پہلی بار بیس ہزار ٹاکا مانگے تھے۔"

"میں بھی بیگم صاحبہ کے ہاں اس دن سے ملازمت کر رہا ہوں۔ جب یہ بیاہ کر آئی تھیں۔" ڈرائیور نے کہا۔ "دو برس پہلے مجھے یہاں تبادلہ کر دیا گیا۔ میری بیوی دو ماہ سے شدید بیمار ہے۔ کمپنی کی طرف سے کوئی طبی سہولت نہیں ہے۔ میں اس کا علاج کراتے کراتے پندرہ ہزار ٹاکا کا مقروض ہو گیا۔ میں نے بھی بیگم صاحبہ سے بیس، پچیس ہزار روپے قرض مانگے تھے تو انہوں نے بری طرح ڈانٹ دیا تھا۔ ان کے دل بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔"

"تم دونوں فکر نہ کرو میں ان سے رقم وصول کر کے دلاتا ہوں۔" میں نے کہا۔ پھر میں نے خانساماں سے پوچھا۔ "اچھا یہ بتاؤ کہ اس مندر کا نام نیلا مندر کیوں ہے اور کس نے یہ نام رکھا ہے۔ جبکہ میں نے کسی سے نہیں سنا کہ نیلے رنگ کا مندر بھی ہوتا ہے۔ کالا مندر نام ضرور ہوتا ہے۔"

"اس مندر کا نام نیلا مندر کوئی دو سو برس پہلے پڑا ایک دیوتا یہاں سے گزرا تھا اس نے مندر اور بتوں کو نیلا کر دیا تھا۔" خانساماں بولا۔

"اچھا اب یہ بتاؤ کہ یہ مندر کلکتہ شہر سے کتنی دور واقع ہے؟" میں نے پوچھا۔ "تم اس مندر کے بارے میں کیا کچھ جانتے ہو؟"

"نیلا مندر کلکتہ شہر سے کوئی ساٹھ میل دور ہے۔" خانساماں جب بتا رہا تھا تب مہ ناز بیگم اپنے بیڈ روم سے آ کر ایک طرف کھڑی ہو کر سننے لگی۔ "یہ ایک ویران اور سنسان سا علاقہ ہے۔ یہاں لوگوں کی آمد و رفت نہیں ہے۔ لوگ مندر کے قریب جاتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ اس مندر سے کوئی سو قدم پر ایک بہت بڑا اور قدیم شمشان گھاٹ ہے۔ یہ روحوں اور چڑیلوں کا مسکن ہے جو انسانی خون کی پیاسی ہیں۔ اس مندر کے قریب سے گزر کر کوئی شمشان گھاٹ جاتا ہے تو بد روحیں اور چڑیلیں اس کا خون پی جاتی ہیں اور گوشت کھا جاتی ہیں۔ مندر سے کوئی ایک میل پہلے ایک آبادی ہے جس میں چالیس، پچاس گھر ہیں۔ یہ مندر کوئی سات سو برس قدیم اور سات ہزار گز کے رقبے پر بنا ہوا ہے۔ قدیم ہونے کے باوجود یہ آج بھی بڑا مضبوط اور پرشکوہ اور ایسی حالت میں ہے جیسے اس کی تعمیر کو زیادہ سے زیادہ ساٹھ، ستر برس ہوئے ہوں۔ وہ بالکل نیا مندر معلوم ہوتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ بد روحیں جو گرو جادوگر اور قابو مہاراج کے تابع ہیں وہ اس مندر کا رنگ روغن ہر پانچ سال بعد کرتی ہیں۔ لیکن یہ مندر بڑا پراسرار اور خوفناک قسم کا ہے۔ وہاں کوئی پوجا پاٹ کے لئے نہیں جاتا ہے۔ دو ایک مرتبہ سیاح عورتیں جو یوروپین تھیں ادھر نکل گئی تھیں۔ اس بات کو دس برس کی مدت بیت چکی ہے۔ لیکن آج تک ان کا پتا نہیں چل سکا۔ ان دونوں جادوگروں کی شہرت بھی زیادہ اچھی نہیں ہے۔ شہر سے جو لڑکیاں پراسرار طور پر لاپتا ہو جاتی ہیں وہ ان کی

وجہ سے ہے۔ اس میں کتنا سچ ہے کتنا جھوٹ ہے۔ یہ اللہ ہی جانتا ہے۔ ایک جوان لڑکی کسی نہ کسی طرح وہاں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس نے بتایا کہ کچھ مرد اور عورتیں جو وہاں نہ جانے کس طرح لائی گئی تھیں انہیں جادوگروں نے نشانہ بنایا۔ کئی دنوں تک رکھا۔ پھر ان عورتوں اور مردوں کو بد روحوں کے حوالے کر دیا۔"

"لیکن ان تمام باتوں کا علم تمہیں کیوں کر اور کیسے ہوا؟" میں نے پوچھا۔ "جب کہ تم رنگا ماٹی میں رہتے ہو۔ کلکتہ ہندوستان میں ہے؟"

"میں دس برس تک کلکتہ کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں باورچی رہا ہوں۔" خانساماں نے جواب دیا۔ "میں پھر واپس اپنے دیش آ گیا۔"

"اس مندر تک جانے اور ان دونوں جادوگروں سے رابطہ کرنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کلکتہ میں ایک علاقہ بن گاؤں ہے جو بنگلہ دیش کی سرحد کو جاتا ہے۔" خانساماں نے کہا۔ "وہاں ایک نیپالی جادوگر اپنی دکان کھولے بیٹھا ہے۔ اپنے آپ کو سفلی علوم کا ماہر اور کالا جادو کے توڑ کا جادوگر کہتا ہے۔ آپ اسے کچھ رقم دے دیں تو وہ لے جائے گا۔ اس کا نام راموہے۔" میں نے ناشتے کی میز پر مہ ناز بیگم سے کہا۔ "میں اروناکو اس جادوگر اور نبیل کے چنگل سے نکال لانے کے لئے اپنی جان خطرے میں ڈالنے کے لئے تیار ہوں۔ آپ کو پانچ لاکھ کی رقم خرچ کرنا ہو گی جو بہت بڑی رقم ہے۔ میں یہ رقم پیشگی لوں گا۔ اس رقم میں ہی سارا معاملہ بخیر و خوبی نمٹا دوں گا۔ آپ کو بیس لاکھ ٹاکا خرچ کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیا آپ پانچ لاکھ کا رسک مول لینے کو تیار ہیں؟"

"مجھے تم پر بھروسا ہے بیٹا!" مہ ناز بیگم نے میز پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں ابھی تمہیں پانچ لاکھ کی رقم لا کر دیتی ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد وہ دو پھولے ہوئے لفافے لے کر آئیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ اپنے ساتھ لاکھوں کی رقم لیے پھرتی تھیں ایک لفافہ میری طرف بڑھایا۔ "اس میں امریکی ڈالر ہیں جو تین لاکھ ٹاکا کے برابر ہیں۔ اس میں بنگلہ دیشی دو لاکھ ٹاکا ہیں۔" دوسرا لفافہ بڑھایا۔

دوسرا لفافہ جس میں بنگلہ دیشی دو لاکھ ٹاکا تھے۔ مہ ناز بیگم کی غیر موجودگی میں اس میں سے ایک، ایک لاکھ ٹاکا نکال کر ڈرائیور اور خانساماں کو دے دیئے۔ میں مہ ناز بیگم سے پانچ لاکھ نہیں لیتا۔ مجھے اس بات پر غصہ آیا تھا کہ ایک ارب پتی عورت کا دل اتنا چھوٹا......؟ مہ ناز بیگم نے اپنے چٹاگانگ آفس ٹیلی فون کر کے کلکتہ کے لئے ٹکٹ بک کرنے کے لئے کہہ دیا۔ دوپہر ایک بجے کی فلائٹ تھی۔ ہم یہاں سے ساڑھے گیارہ بجے روانہ ہوئے۔ خانساماں اور ڈرائیور نے مجھے بے شمار دعائیں دے ڈالیں۔ ہم پتنگا ایئرپورٹ ساڑھے بارہ بجے پہنچ گئے۔ مہ ناز بیگم نے مجھے نبیل کی تصویر ڈھاکا میں دکھائی تھی جو ارونا اور اس کی منگنی کے موقع پر اتاری گئی تھی۔

میں ٹھیک دو بجے کلکتہ کے ایک شاندار اور درمیانہ قسم کے ہوٹل کے کمرے میں تھا۔ میں نے دوپہر کا کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کیا۔ جو ویٹر میرے لئے کمرے میں کھانا لایا تھا میں نے اس سے نیلا مندر کے متعلق دریافت کیا تو اس نے بھی وہی باتیں بتائیں جو خانساماں نے بتائی تھیں۔ میں چائے پی کر کمرے سے نکلا، نیچے آ کر ایک ٹیکسی والے سے بن گاؤں جانے کی بات کی۔ کرایہ طے کر کے بیٹھ گیا۔

کوئی ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت کے بعد بن گاؤں پہنچا۔ کلکتہ شہر سے 'بسیں' کوچز اور ریل گاڑی بھی جاتی تھی۔ اس نے مجھے بازار کے ٹیکسی اسٹینڈ پر اتار دیا۔ میں نے ایک دکان دار سے رامو جادوگر کا پتہ پوچھا تو اس نے مجھے حیرت سے دیکھا اور ہمدردانہ لہجے میں بولا۔

''لگتا ہے کہ آپ کلکتہ شہر سے آئے ہیں۔ وہ بڑی کمینی چیز ہے۔ عموماً نیپالی بڑے سیدھے سادھے اور شریف لوگ ہوتے ہیں۔ لیکن یہ سالا جادوگر کم ڈاکو زیادہ ہے۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ اس کے سائے سے بھی بچیں اور اس سے بہت ہوشیار رہیں۔''

چوں کہ اس دکان دار نے پتا بتا دیا تھا لہٰذا میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کی دکان سے سو روپے کے بسکٹ کے پیکٹ خرید کر بھکاریوں کے چھوٹے چھوٹے بچوں اور ان کی ماؤں میں بانٹ دیئے پھر میں رامو کے ٹھکانے کی طرف بڑھا جو یہاں سے نصف فرلانگ پر واقع تھا۔ اس کا دفتر بالائی حصے پر تھا۔ نیچے تین دکانیں تھیں۔ اس کے دفتر کی بالکنی پر کوئی دس فٹ لمبا چوڑا سائن بورڈ لگا ہوا تھا جس پر بنگلہ نیپال اور انگریزی زبان میں اس کا نام پروفیسر رامو، ماہر عملیات، سفلی علوم اور کالا جادو جلی حروف میں لکھا تھا۔ ملنے کے اوقات شام پانچ بجے سے رات دس بجے۔ دن میں صبح دس بجے سے ایک بجے دوپہر تک، اس وقت چار بج رہے تھے۔

ایک دکان پرچون کی تھی۔ باقی دو دکانیں ٹیلرنگ کی تھیں۔ پوری عمارت لکڑی کی بنی ہوئی تھی۔ بالائی حصے میں صرف اس کا بہت بڑا دفتر تھا۔ اسے وقت ملاقات میں ایک گھنٹہ باقی تھا لیکن میں زینہ طے کر کے اوپر پہنچ گیا۔ دفتر کھلا ہوا تھا۔ اس کے دفتر کا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ اس پر تالا لگا ہوا نہیں تھا اور یہ دفتر کوئی تین کمروں پر مشتمل تھا۔ شاید اس میں اس کی رہائش تھی۔ بیرونی دروازے کے باہر ایک اسٹول تھا جس پر شاید دفتر کے اوقات میں ملازم بیٹھتا تھا۔ راہداری سنسان اور ویران پڑی تھی۔

میں نے غیر محسوس انداز سے بڑی آہستگی سے دروازے کو اندر کی طرف دھکیلا۔ دروازہ اتنا کھلا کہ ایک آدمی باآسانی اندر داخل ہو سکتا تھا۔ میں نے اندر داخل ہو کر دروازے کو بھیڑ دیا۔ میں جس کمرے میں کھڑا تھا اس میں چھ عدد بید کی کرسیاں اور دو صوفہ سیٹ پڑے ہوئے تھے جو ملاقاتیوں کے لئے تھے کہ وہ اس پر بیٹھ کر انتظار فرمائیں اپنی باری کا۔ سامنے جو کمرہ تھا اس کے دروازے پر پروفیسر رامو کے نام کی تختی نصب تھی۔ اس کمرے کے برابر جو کمرہ تھا اس میں سے ایک عورت کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں نے دروازے کے قریب جا کر کان لگا دیئے، عورت کہہ رہی تھی۔

''میرا پتی مجھے طلاق دے دے گا اگر میں ماں نہیں بنی...... اس نے مجھے چھ ماہ کی مزید مہلت دی

ہے۔ تم مجھے چھ ماہ سے بے وقوف بنا رہے ہو۔ تمہارا تعویذ کسی کام کا نہیں......''

''اگر تم چھ ماہ میں ماں نہیں بنیں تو میرا نام بدل کر رکھ دینا۔'' مرد کی آواز گونجی۔ ''ستارے بتا رہے ہیں کہ تم کامیاب ہو جاؤ گی۔''

''اچھا...... اچھا......'' عورت جیسے خوش ہو گئی۔ اس کی آواز کھنک گئی۔

یہ پروفیسر رامو بڑی کمینی چیز تھی۔ اس عورت کو آس پر رکھ کر چھ ماہ سے بے وقوف بنا رہا تھا۔ میں نے دروازے پر دستک دی اور اس کا ہینڈل گھما کر دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ بڑا رومانی اور جذباتی منظر تھا۔ عورت جوان اور خوبصورت تھی۔ پچیس برس کی ہوگی۔ جلدی سے اس کے بازوؤں سے نکلی اور ملحقہ کمرے کا دروازہ کھول کر اس کمرے میں گھس گئی۔ پروفیسر رمو نے حیرت اور غصے سے مجھے گھورا۔

''کون ہو تم......؟ اندر کیسے آئے......؟''

''میں اس عورت کے پتی کا دوست ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں پیدل اور بیرونی دروازے سے آیا ہوں اور کیسے آتا؟''

''کیا......؟'' اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ وہ پچاس برس کی عمر کا اور بڑا صحت مند بھی تھا۔ ''تت...... تت...... تم کس لئے آئے ہو؟'' اس کی گھگی بندھ گئی۔

''مجھے بہت دنوں سے شک تھا کہ تم اس عورت کی کمزوری اور مجبوری سے فائدہ اٹھا رہے ہو۔'' میں نے میز کے پاس جا کر کرسی کھینچی اور بیٹھ گیا۔ ''آج میرا شک دور ہو گیا۔ میں نے تم دونوں کو جس حالت میں دیکھا وہ اس کے پتی کو بتا دوں گا تو وہ اپنی پتنی کی خبر بعد میں لے گا۔ وہ پہلے تم سے نمٹے گا۔ تم جانتے ہو اس کا پتی کتنا ظالم اور سخت گیر ہے۔ تم نے اس کی حسین پتنی کو دھوکا دیا۔ وہ کلہاڑی سے تمہیں فالودہ بنا دے گا۔''

میں نے اندھیرے میں تیر چلائے تھے۔ جو اپنے نشانے پر ایک ایک کر کے جا لگے۔ اس کی حالت مردنے سے بھی بدتر ہو گئی۔ وہ میرے پیروں میں آ کر گر پڑا۔ گڑگڑانے لگا۔ ''بھگوان کے لئے مجھ پر دیا کرو...... میں بھگوان کی سوگند کھاتا ہوں۔ وچن دیتا ہوں کہ کبھی عورت کی عزت برباد نہیں کروں گا اور ہاں تم اس کے پتی کو کچھ نہ بتانا......؟''

''چلو میں تمہاری بات پر وشواش کئے لیتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''میں اس کے پتی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ تمہیں صرف ایک شرط پر معاف کر سکتا ہوں۔''

''کیا شرط ہے......؟'' وہ اپنے کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں آپ کی ہر شرط پوری کرنے کے لئے تیار ہوں۔ بہت سخت شرط نہ ہو۔''

''تم مجھے ابھی اور اسی وقت نیلا مندر لے چلو۔'' میں نے کہا۔ ''آج تم اپنے دفتر کو تالا لگا دو اور اس عورت سے کہو کہ وہ گھر جائے۔''

''نیلا مندر......؟'' وہ بڑے زور سے چونکا۔ ''اچھا ایک منٹ ٹھہریں۔ میں مالنی کو جانے کے لئے

کہہ دوں۔ وہ پریشان ہو رہی ہوگی۔" اس نے اس کمرے کے دروازے کے پاس جا کر دروازہ کھولا۔ پھر وہ کمرے میں چلا گیا۔ چند لمحوں کے بعد وہ عورت باہر آئی تو اس کا سر ندامت سے جھکا ہوا تھا۔ وہ لمبا گھونگھٹ نکال کر چہرہ چھپا کے کمرے سے نکل گئی۔ پھر رامو باہر آیا۔ "آپ کس لئے وہاں جانا چاہتے ہیں؟"

"تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہئے۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "تم مجھ سے فضول سوالات نہ کرو۔ تم نے پس و پیش کیا تو میں مالنی کے پتی......"

"چلیں......" اس نے کہا۔ "لیکن وہاں جانے کے لئے ٹیکسی والا دو سو روپے لے گا۔ واپسی میں پیدل آنا پڑے گا۔ کیوں کہ ٹیکسی وہاں رکتی نہیں ہے۔"

"تم مجھے وہاں چھوڑ کر اس ٹیکسی سے چلے آنا۔" میں نے کہا۔ "میں ٹیکسی کا کرایہ ادا کر دوں گا۔ تمہیں وہاں تک چلنا ہے پھر تمہارا کام ختم......"

"کیا آپ کو میں قابو مہاراج اور گرو جادوگر سے بھی ملاؤں......؟ یا نیلا مندر پر چھوڑ کر چلا آؤں؟" اس نے پوچھا۔ وہ آپ کہہ کر بات کر رہا تھا۔

"ان دونوں سے ملا کر چلے آنا۔" میں نے کہا۔ "اچھا یہ بتاؤ کہ کچھ دنوں پہلے ایک جوان شخص......" میں نے نبیل کا حلیہ بتا کر کہا۔ "نیلا مندر جا کر ان دونوں سے ملنے کے لئے تمہارے پاس آیا تھا؟ تم اسے ان دونوں سے ملانے کے لئے لے گئے تھے؟"

"ہاں...... وہ آیا تھا۔" رامو نے حیرت سے کہا۔ "یہ بات آپ کو کس نے بتائی؟ اس نے یہ بات راز رکھنے کے لئے کہی تھی۔ اس نے مجھے ایک ہزار روپے دیئے تھے۔"

"اسی نے بتائی تھی۔" میں نے کہا۔ "میں تمہیں ایک پیسہ بھی نہیں دوں گا بلکہ تمہیں دینا چاہئے کہ میں مالنی کے پتی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

دو تین ٹیکسی والوں سے بات کی، وہ تیار نہیں ہوئے۔ آخر ایک ٹیکسی والا تین سو روپے میں جانے کے لئے تیار ہوا۔ دو گھنٹے کی مسافت کے بعد ہم نیلا مندر پہنچے۔ اس مندر سے ایک میل پہلے ایک آبادی راستے میں آتی تھی جو کسانوں کی تھی۔ دور دور تک چاروں طرف جو لہلہاتے ہوئے کھیت تھے یہ ان کی محنت اور دم سے تھے۔ بچے، مرد اور عورتیں گھروں سے باہر کھڑی ٹیکسی کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔

نیلا مندر کی عمارت واقعی بڑی مضبوط اور شاندار تھی۔ یقین نہیں آتا تھا کہ یہ سات سو برس قدیم مندر ہے۔ اس کا احاطہ بھی بہت ہی بڑا تھا۔ اس میں اس قدر بوڑھے اور گھنے درخت تھے کہ اس پر ایک جنگل کا سا دھوکا ہو رہا تھا۔ رامو نے راستے میں بتایا تھا کہ مندر کے احاطے میں سانپ، اژدھے اور ناگ بھی موجود ہیں۔ یہ سب بہت ہی زہریلے اور خطرناک ہیں۔

مندر کے باہر جو ایک پیپل کا درخت تھا اس کے نیچے ایک بڑا چبوترا تھا جس پر چھ سات آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ اس پر ایک پجاری لیٹا ہوا تھا۔ ٹیکسی کو آتے دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ پجاری نے بتایا کہ قابو

مہاراج اور گرو جادوگر آرام کر رہے ہیں۔ وہ ایک گھنٹے سے پہلے کمروں سے باہر نہیں آئیں گے۔ یہ سن کر رامو نے کہا۔ "اچھا اب مجھے اجازت دیں۔ میں ایک گھنٹہ رک نہیں سکتا۔"

میں اسے ٹیکسی کا کرایہ روانگی سے پہلے ہی دے چکا تھا۔ وہ ٹیکسی کی طرف بڑھا تو مجھے احساس ہوا کہ میرا بٹوا غائب ہے جس میں دس ہزار کی رقم تھی۔ رامو بھی جادوگر تھا۔ اس نے جادو کے زور سے میرا بٹوا پار کر لیا تھا۔ میں خاموش پجاری کے پاس چبوترے پر بیٹھا ٹیکسی کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جب ٹیکسی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو میں مسکرا دیا۔ اس لمحے میری جیب میں نہ صرف میرا بٹوا آ گیا بلکہ اس کا بھی جس میں سات سو روپے تھے۔ تین سو روپے جو میں نے ٹیکسی کے کرائے کے لئے دیئے تھے۔ اس نے وہ نوٹ الگ اوپر والی جیب میں رکھ لئے تھے۔

پجاری نے تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد پوچھا۔ "تم کس کام کے لئے آئے ہو......؟ کیا رقم لائے ہو یا خالی ہاتھ آئے ہو؟"

"میں جس کام سے آیا ہوں اور جس سے میرا کام ہے اسے ہی بتاؤں گا کہ میرا کام کیا ہے؟" میں نے کہا۔ "رقم تو لایا ہوں۔ ظاہر ہے اس کے بغیر کام نہ ہوگا۔"

"تمہارے پاس جتنی رقم ہے مجھے دے دو۔" پجاری کا لہجہ ایک دم کرخت ہو گیا۔ "رقم دے کر چلتے بنو۔ کیوں کہ تمہارا کوئی کام نہ ہوگا۔"

"میں تمہیں ایک کوڑی بھی نہیں دوں گا۔" میں نے بھی تیز لہجے میں جواب دیا۔ "میں قابو مہاراج اور گرو جادوگر سے ملے بغیر نہیں جاؤں گا۔" پجاری یک لخت چبوترے سے اترا۔ اس نے جیب سے چاقو نکال کر اس کا بٹن دبایا تو وہ کھل گیا۔ اس نے میرا گریبان پکڑ کر میرے گلے کے نیچے چاقو کی نوک رکھ دی۔ پھر وہ کرخت لہجے میں بولا۔ "جلدی سے رقم میرے حوالے کر دو۔ ورنہ میں تمہارا خون کر دوں گا۔"

"میری جیب میں صرف ایک پانچ کا نوٹ پڑا ہوا ہے۔" میں نے کہا۔ "تمہیں یقین نہیں آ رہا ہے تو میری جیبوں کی تلاشی لے لو۔"

اس نے میری تمام جیبیں ٹٹول کر دیکھ لیں اوپر والی جیب میں صرف پانچ کا نوٹ تھا۔ اسے میرا بٹوا ملا اور نہ ہی رامو کا، اسے غصہ آ گیا۔ اس نے مجھے چاقو مارنے کے لئے ہاتھ فضا میں بلند کیا تھا کہ ایک گرج دار آواز گونجی۔ "رام داس! یہ کیا ہو رہا ہے؟ اسے کیوں مار رہے ہو؟"

اس آواز کو سنتے ہی پجاری کا ہاتھ فضا میں ہی معلق ہو گیا اور اس نے میرا گریبان چھوڑ دیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا ایک خبیث صورت کا شخص کھڑا تھا۔ یہ وہ شخص تھا جسے خانساماں نے دیکھا تھا۔ اس کا نام قابو مہاراج تھا۔ بدروح نے اسے اسی نام سے مخاطب کیا تھا۔

"یہ مجھے اس لئے قتل کر دینا چاہتا ہے کہ میرے پاس سے رقم نہیں نکلی۔" میں نے اس کے پاس جا کر کہا۔ "کیا خالی جیب ہونا جرم ہے۔"

"تم کون ہو اور یہاں کیوں اور کس لئے آئے ہو؟ اور کس کے ساتھ آئے ہو؟" اس نے ایک ہی

سانس میں سوالات کی بوچھاڑ کردی۔

”میرا نام سکندر ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں آپ سے اور گرو جادوگر سے ایک ضروری کام کے لئے ملنے آیا ہوں مجھے پروفیسر رامو چھوڑ گیا ہے۔“

”اچھا.....“ اس نے سر ہلایا۔ ”چلو گرو جادوگر آرام کر چکے ہیں۔ یہ رامو واپس کیوں چلا گیا؟ وہ ہم سے ملا کیوں نہیں؟“

وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر مندر کے اندر داخل ہوا۔ اندر سے اس مندر کی چھت، فرش اور دیواریں ساری نیلی نیلی تھیں۔ یہ بہت ہی بڑا ہال تھا۔ اتنا بڑا وسیع اور کشادہ کہ ہزار آدمی آسانی سا جائیں۔ دائیں اور بائیں جانب کمرے بنے ہوئے تھے۔ ہال کے اختتام سے پہلے اسٹیج نما ایک اونچی جگہ تھی۔ اس پر دو بڑی بڑی مورتیاں رکھی تھیں۔ جو بارہ فٹ اونچی تھیں۔ ایک مورتی دیوتا کی اور دوسری مورتی کسی دیوی کی تھی۔ وہ بھی نیلے رنگ کی تھیں۔ بائیں جانب جو تیسری کوٹھڑی تھی اس کا دروازہ منقش تھا۔ وہ مجھے لے کر اس کوٹھڑی میں گیا۔ یہ کوٹھڑی خاصی کشادہ اور نہایت آراستہ تھی۔ اس کوٹھڑی سے ملحق ایک اور کوٹھڑی تھی جس کا دروازہ بند تھا۔ اس کوٹھڑی میں تین کرسیاں اور ایک بڑا صوفہ پڑا تھا۔ صوفے پر ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ وہ باریش تھا۔ اس کی عمر ساٹھ برس کی ہوگی۔ وہ دراز قد اور بھاری بھرکم جسامت اور تندرست شخص تھا۔ اس نے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”اس کا نام سکندر ہے۔“ قابو مہاراج نے کہا۔ ”یہ ہم سے ملنے کے لئے آیا ہے۔ رامو کی معرفت، رامو اسے یہاں پہنچا کر چلا گیا ہے۔“

”تم کس لئے آئے ہو؟“ گرو جادوگر نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”پھر اس نے ایک خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ”بیٹھ جاؤ۔“

”میں اس لئے آیا ہوں کہ رات قابو مہاراج اور بدروح ارونا کو رنگاماٹی سے اٹھا کر آپ کے پاس لائے ہیں۔ میں اسے لے جانے آیا ہوں۔“ ان دونوں نے چونک کر حیرت سے ایک دوسرے کی شکل دیکھی۔ پھر گرو جادوگر نے میری طرف دیکھا۔ ”یہ بات تمہیں کس نے بتائی؟ کیا رامو نے.....؟“

”یہ ایک ملازم نے بتائی جو اتفاق سے اس وقت جاگ رہا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اس نے ان دونوں کی گفتگو نہ صرف سن لی تھی بلکہ اس نے ارونا کو اٹھا کر لے جاتے ہوئے دیکھا بھی تھا۔ پھر وہ خوف و دہشت سے بے ہوش ہو گیا۔ اس نے سارا واقعہ صبح بتایا۔“

”قابو.....!“ گرو جادوگر نے اس کی طرف تیز نظروں سے دیکھا۔ ”کیا تم نے گھر میں موجود سارے لوگوں کو بے ہوش کیا تھا؟“

”کیا تھا گرو.....“ قابو مہاراج نے سر ہلایا۔ ”ہم نے نیند کا کچھ ایسا سحر پھونکا کہ سب کو نیند کے جھونکے اور نشہ آنے لگا۔ سب سونے کے لئے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تھے۔ میرے خیال میں وہ ملازم شاید کہیں اور رہ گیا تھا اس لئے وہ اس نیند کے سحر سے بچ گیا ہوگا۔“

”ارونا ابھی تک بے ہوشی کی حالت میں پڑی ہے اور ہم نے اسے بے ہوش ہی رکھا ہوا ہے۔“ گرو جادوگر نے کہا۔ ”وہ اس وقت تک بے ہوش رکھی جائے گی جب تک کہ نبیل نہیں آ جاتا۔ ہم نبیل کے کہنے پر اسے وہاں سے اٹھا کر لائے ہیں۔ وہ نبیل کی امانت اور ملکیت ہے۔“

”نبیل نے اسے اس لئے اغوا کرایا ہے کہ اس کی دولت اور جائیداد پر قبضہ کر لے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ ایک معصوم لڑکی کی زندگی سے کھیل رہا ہے۔ وہ ایک اوباش اور بدکار شخص ہے۔ لہٰذا آپ اس لڑکی کو میرے ساتھ بھیج دیں۔ اس کی ماں اپنی بیٹی کے لئے تڑپ رہی ہے۔“

”تم سچ کہہ رہے ہو.....؟“ گرو جادوگر نے کہا۔ ”اس بات کا کیا ثبوت ہے اور ہم اس بات کا کیسے اور کیوں کر یقین کر لیں۔“

”ثبوت چاہئے آپ کو تو آپ ارونا کو ہوش میں لا کر معلوم کر لیں۔“ میں نے کہا۔ ”اس کے سوا میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔“

”یہ ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے گرو۔“ قابو مہاراج نے کہا۔ ”ہمیں اس کی بات کا یقین کر لینا چاہئے ارونا جو کہے گی وہی سچ اور حقیقت ہوگی۔“

”نبیل نے ہم سے غلط بیانی کی کہ اس کی ماں ان دونوں کی شادی کرنا نہیں چاہتی ہے۔“ گرو جادوگر کہنے لگا۔ ”اس نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ اور ارونا ایک دوسرے سے شدید محبت کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس لئے ارونا کو جادو کے زور سے یا کسی نہ کسی طرح اٹھوا کر منگوا لیں تا کہ وہ کلکتہ شہر جا کر لو میرج کر لیں گے۔ ارونا کی ماں لو میرج ہونے کے بعد ہم دونوں کو معاف کر دے گی اور قبول کر لے گی۔“

”جی ہاں..... یہ سراسر غلط بیان ہے۔ اس میں ذرہ برابر بھی صداقت نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”آپ لوگ بڑے دیالو معلوم ہوتے ہیں۔ بڑے انصاف پسند بھی..... اس لئے آپ سے میری عاجزانہ درخواست ہے کہ دو دلوں کو جدا نہ کریں۔ ہم ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہ جدائی عذاب سے کم نہ ہوگی۔“

”ہم لوگ محبت کرنے والوں پر کبھی بھی ظلم و ستم کے پہاڑ نہیں توڑتے ہیں۔“ قابو مہاراج بولا۔ ”اس لئے کہ ہم محبت آشنا ہیں۔ اس جذبے کو خوب سمجھتے ہیں۔“

”وہ ذلیل اور کمینہ نبیل کہاں ہے؟“ گرو جادوگر نے قابو مہاراج سے کہا۔ ”اسے بلاؤ تا کہ اس کی خبر لیں کہ اس نے ہمیں بے وقوف بنایا۔ دھوکا دیا۔“

”وہ اسٹامپ پیپر لینے گیا ہوا ہے۔“ قابو مہاراج نے جواب دیا۔ ”وہ بنگلہ دیش سے لے کر آئے گا۔ شاید کل صبح پہنچے۔ ویسے اسے آج شام آنا تھا۔“

”اب مجھے نبیل سے کیا لینا دینا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میری ارونا کو میرے حوالے کر دیں تا کہ میں اسے لے کر یہاں سے جتنا جلد ہو سکے نکل جاؤں۔“

"کیوں نہیں...... کیوں نہیں......" گرو جادوگر نے اثباتی انداز میں سر ہلایا اور قابو مہاراج سے بولا۔ "تم جلدی سے جا کر اروناکو لے آؤ......اس کا یہ کہنا بھی سچ ہے کہ نبیل سے کیا لینا دینا ہے۔ اصل میں یہ دونوں محبت کے متوالے ہیں۔ نبیل کل آئے تو اسے بھگا دینا کہ اروناا پنے گھر چلی گئی۔"

قابو مہاراج، ارونا کو لانے کے لئے بغلی کمرے میں چلا گیا اور اس نے دروازہ بند کرلیا۔ اس کمرے میں اس اندرونی کمرے کو راستہ جاتا ہوگا جس میں ارونا بے ہوشی کی حالت میں پڑی تھی۔ گرو جادوگر مجھ سے میری اور ارونا کی محبت کے بارے میں پوچھتا اور رشک کرتا رہا۔ اس کا کہنا تھا کہ ارونا جتنی حسین ہے اتنی ہی معصوم اور سیدھی سادی ہے۔ اس نے اپنی زندگی میں ایسی حسین اور نازک اندام اور پرکشش لڑکیاں بہت کم دیکھی ہیں۔ میں محبت اور لڑکی کے معاملے میں بڑا خوش نصیب واقع ہوا ہوں۔ پھر اس نے مجھے مشورہ دیا کہ ڈھاکا پہنچتے ہی میں ارونا سے شادی کرلوں۔ ورنہ نبیل کوئی غلط حرکت کرسکتا ہے۔

تھوڑی دیر بعد ملحقہ کمرے کا دروازہ کھلا۔ ارونا اور قابو مہاراج کمرے سے باہر آئے۔ قابو مہاراج کوئی بیس منٹ کے بعد ارونا کو لے کر آیا تھا۔ ارونا کی نظر جیسے ہی میرے چہرے پر پڑی وہ ایک دم سے نوشگفتہ کلی کی مانند کھل اٹھی۔

"سکندر! تم......؟" وہ رسیلی آواز میں بولی۔ "کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں......؟ تم مجھے لینے آئے ہو؟ آئی لو یو سکندر! تم نے میرے لئے کتنی مشکل اٹھائی ہے میری جان!"

مجھے اس لمے ارونا کی زبان سے محبت بھرے الفاظ اور انداز محبت پر بڑی حیرت ہوئی۔ جس کی مجھے کوئی توقع نہیں تھی۔ یہ اچانک تھا۔ میں صرف دو ایک دن تو مہ ناز بیگم اور ارونا کے ساتھ رہا تھا۔ اس دوران ہم دوستوں کی طرح رہے تھے۔ محبت کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔ گو کہ وہ بے انتہا حسین اور پرکشش تھی۔ اس کے باوجود میں اس کی طرف مائل نہیں ہوا تھا۔ وہ ایک ماڈرن لڑکی تھی۔ وہ میری بڑی احسان مند تھی کہ میں نے اپنی جان پر کھیل کر اس کی ماں کی زندگی اور اغوا ہونے سے بچایا تھا۔ اگر میں اس کی طرف پیش قدمی کرتا تو وہ پس و پیش نہ کرتی۔

دوسرے لمحے میری سمجھ میں یہ آیا کہ ارونا اس انداز سے اس لئے پیش آرہی تھی کہ ان دونوں کو دھوکا دیا جاسکے۔ وہ محبت کی بہترین اداکاری کررہی تھی شاید اسے قابو مہاراج نے بتایا ہوگا کہ میں اسے لینے کے لئے آیا ہوں۔ وہ میری طرف بڑے والہانہ پن اور وارفتگی سے لپکی اور میرے گلے میں اپنی سڈول اور مرمریں بانہیں حمائل کردیں۔ اس کا فرط خوشی سے یہ حال تھا کہ اس پر جیسے ایک دیوانگی سی طاری ہوگئی تھی۔ اس نے ان دونوں کی کوئی پروا نہیں کی اور میرے چہرے پر جھک گئی۔

اس کے علیحدہ ہونے پر جادوگر نے کہا۔ "اب واقعی اس بات کا سو فیصد یقین آگیا ہے کہ تم دونوں واقعی آپس میں سچی محبت کرتے ہو......نبیل جھوٹا ہے۔ اگر نبیل دھوکا دے کر تمہیں حاصل کرلیتا تو بڑا دکھ ہوتا۔ اچھا اب تم دونوں جاؤ۔"

میں نے باری باری قابو مہاراج اور گرو جادوگر سے گرم جوشی سے ہاتھ ملا کر شکریہ ادا کیا۔ قابو مہاراج ہم دونوں کو رخصت کرنے مندر کے باہر آیا۔ ابھی دن ڈوبنے میں خاصی دیر باقی تھی۔ کلکتہ شہر یا بن گاؤں جانے کے لئے کسی سواری کے ملنے کا نام و نشان تک نہ تھا۔ بن گاؤں جانے کی کوئی ضرورت بھی نہ تھی۔ مجھے رامو کو لے کر یہاں آنے کے لئے جانا پڑا تھا۔ بن گاؤں اور کلکتہ دونوں ہی ساٹھ میل کی مسافت پر تھے۔

"کلکتہ شہر کون سا راستہ جاتا ہے؟" میرے بجائے ارونا نے فوراً ہی قابو مہاراج سے پوچھا۔ "کوئی ایسا شارٹ راستہ بتائیں کہ ہم جلد شہر پہنچ جائیں؟"

"اس مندر کے احاطے میں جو درخت وغیرہ ہیں ان کے درمیان سے گزر جائیں۔" قابو مہاراج نے جواب دیا۔ "دو میل کی مسافت طے کرنے کے بعد ٹرنک روڈ آجائے گا۔ اس روڈ پر سے ٹرک، کوچز، بسیں اور پرائیویٹ گاڑیاں گزرتی ہیں۔ وہ سب کلکتہ ہی جاتی ہیں۔"

ہم اس کا شکریہ ادا کرکے احاطے کی طرف بڑھے۔ یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ہم مندر کے عقبی حصے کے درختوں کے درمیان سے گزرنے لگے تو ارونا مطلق نہیں گھبرائی۔ میرا خیال تھا کہ وہ تاریکی، پراسرار اور خوف ناک ماحول سے خوف زدہ ہوجائے گی۔ راستہ بہت تنگ تھا۔ بھول بھلیاں بھی تھیں۔ وہ بے خوفی سے اس طرح چل رہی تھی جیسے کسی پارک کی پختہ روش چل رہی ہو۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ پھونک پھونک کر قدم رکھنا۔ کیوں کہ یہاں سانپ، اژدہے اور ناگ ہوتے ہیں۔ اسے میری بات کا نہ جانے کیوں یقین نہیں آیا۔

میں اس ماہ رخ کے سنگ سنگ چلتا ہوا کبھی کبھی اس کی طرف دزدیدہ نظروں سے دیکھ لیتا جس کی کامیاب اداکاری نے جادوگر اور شیطان کے چنگل سے آزادی دلادی تھی۔ لیکن اس اداکاری نے میرے روئیں روئیں میں چنگاریاں بھڑکا دی تھیں۔

اس میں بڑی عجیب سی شوخی تھی اور وہ بڑی چہک رہی تھی جس نے مجھے ایک طوفان کی خبر دے دی مجھے محتاط اور سنبھل کر رہنے کی ضرورت تھی۔ یہ بڑی عجیب سی بات تھی کہ ارونا مغرب زدہ ہونے کے باوجود اپنی ماں کی موجودگی میں بڑی سنجیدہ رہی تھی لیکن اب اس خول سے جیسے باہر نکل آئی تھی۔ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں میرا پیر پھسل نہ جائے۔ وہ باتونی بھی بہت تھی۔ جانے کیا کچھ بول رہی تھی۔ ایک جگہ چلتے چلتے رک گئی تو میں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"وہ......وہ......وہ دیکھئے......" اتنا کہہ کر وہ مجھ سے چمٹ گئی اور اس نے سامنے والے درخت کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ سامنے دیکھئے......"

میں نے چونک کر سامنے کی طرف دیکھا۔ چند قدم پر جو ایک گھنا درخت تھا اس کی شاخ پر ایک خوبصورت ناگن بیٹھی تھی۔ وہ ہمیں دیکھ کر درخت سے نیچے اترنے لگی۔ ارونا خوف و دہشت سے میرے سینے میں جیسے جذب ہونے لگی۔ میں نے اسے ایک طرف ہٹانا چاہا لیکن وہ مجھ سے الگ ہونا نہیں چاہتی

تھی۔ میں اس پتھر کو اٹھانا چاہتا تھا جو قدموں کے قریب پڑا تھا۔ یہ پتھر ہی ایسا ہتھیار تھا جس سے مقابلہ کیا جاسکتا تھا۔ غیر محسوس انداز سے پتھر کو استعمال کر کے اس ناگن کا سر کچل دینا چاہتا تھا اور یہ علم ہونے نہیں دیتا کہ میں نے جادو سے کام لیا ہے۔

لیکن ناگن کا سر کچلنے کی نوبت نہیں آئی۔ کیوں کہ وہ درخت سے نیچے اترنے کے بعد ایک طرف تیزی سے چلی گئی اور نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ اس کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی اروناالگ ہو کر بولی۔ ''کتنی حسین اور پیاری تھی۔''

''اتنی ہی زہریلی اور خطرناک بھی......'' میں نے کہا۔ ''اس کا کاٹا ہوا آدمی پانی بھی نہیں مانگتا ہے۔ حیرت ہے کہ اس نے ڈسا کیوں نہیں؟''

''وہ شاید دو انسانوں کو دیکھ کر ڈر گئی۔'' اروناشوخ لہجے میں بولی۔ ''اگر ہم میں سے کوئی اکیلا ہوتا تو وہ اسے ضرور ڈس لیتی......''

اس نے پھر میرے گلے میں اپنی بانہیں حمائل کر دیں تو میں نے بانہوں کے حلقے سے نکلتے ہوئے کہا۔ ''مس ارونا! یہ کوئی پبلک پارک نہیں ہے، اندھیرا بہت گھپ ہونے لگا ہے۔ ہمیں یہاں سے جلد سے جلد نکل جانا چاہئے۔ ورنہ کسی موذی جانور کا نشانہ بن جائیں گے۔ اس محبت کو بعد کے لئے اٹھا رکھئے۔''

ایک تو بھول بھلیاں تھیں دوسری بات یہ تھی کہ ارونا مجھے اس طرف جانے نہیں دیتی تھی جس طرف میں جانا چاہتا تھا۔ وہ کہتی تھی کہ ادھر گھپ اندھیرا ہے۔ راستہ نہیں ہے۔ وہاں کوئی دلدل نہ ہو۔ اس طرف چلو......اس طرف تاریکی بھی نہیں ہے مجھے مجبوراً اس کی بات ماننا پڑتی تھی۔ لیکن ہوا یہ تھا کہ ہم کوئی ڈیڑھ گھنٹے سے بھٹک رہے تھے۔ گھوم پھر کے اسی طرف آجاتے تھے۔ لحظہ بہ لحظہ اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ اس لئے کہ دن ڈوب چکا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ ہم واپس چلتے ہیں۔ مندر میں بہت ساری کوٹھڑیاں ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کوٹھڑی میں رات رک جاتے ہیں۔ صبح چل پڑتے ہیں۔ وہ اس کے لئے تیار نہ ہوئی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ وہ دونوں جادوگر بڑے خطرناک ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ رات ان کی نیت میں فتور پیدا ہو جائے اور میں اپنی عزت بچا نہ سکوں اور تم اکیلے ان کے ہاتھوں سے بچ نہ سکو گے اور پھر وہ جادوگر ہیں۔ وہ تمہیں جادو کے زور سے بے بس بھی کر سکتے ہیں۔ تم ان کا بال تک بیکا نہیں کر سکتے۔

پھر میں نے دوسری تجویز یہ پیش کی کہ گاؤں چلتے ہیں جو مندر سے کوئی دو تین میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ میں نے ٹیکسی میں یہاں آتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس گاؤں میں کسی کے ہاں رات گزار لیں گے۔ میزبان کی خدمت میں کچھ رقم پیش کر دیں گے وہ خوش ہو جائے گا۔ نہ صرف بستر فراہم کر دے گا بلکہ کھانے کو بھی کچھ مل جائے گا۔ وہ اس کے لئے تیار ہوگئی۔ لیکن واپسی کا راستہ بھی ہم بھول گئے تھے۔ اندازے سے جاتے اور بھول بھٹک کر اس تالاب پر آجاتے جو درختوں کے درمیان تھا۔ ارونا نے مجھ سے کہا تھا کہ کیوں نہ ہم اس تالاب میں تھوڑی دیر نہالیں۔ کیوں کہ گرمی پسینے اور تھکن سے برا حال ہو رہا ہے لیکن میں نہانے کے لئے تیار نہیں ہوا۔ کیوں کہ نہانے سے قیامت آجاتی۔ ارونا کے حسن و

شباب کا جادو کسی زہریلی ناگن کی طرح ڈس لیتا اور ہم دونوں جذبات کی رو میں بہہ جاتے۔ ایک تو اس تالاب کا ماحول بڑا ہی خواب ناک تھا۔ یہاں بڑا سکون اور تنہائی تھی اور پھر اس تالاب کا پانی اس قدر صاف وشفاف دکھائی دیا تھا جیسے وہ کوئی آئینہ ہو۔ ایک بہت ہی عجیب اور حیرت انگیز بات جو میں نے محسوس کی تھی وہ یہ کہ ارونا کی محبت شدید سے شدید ہوتی جا رہی تھی۔ وہ مجھ پر بری طرح مرمٹی تھی۔ اس کی جذباتیت بڑھتی ہی جا رہی تھی جب کہ یہ ایسا وقت نہیں تھا۔ کوئی اور لڑکی اس کی جگہ ہوتی تو ہر لمحہ اس پر خوف ودہشت کی کیفیت سوار رہتی اور بری طرح سہمی ہوئی ہوتی۔ لیکن اسے جیسے کسی بات کی کوئی پروا نہیں تھی۔ بس اس پر تو محبت اور مہربان ہونے کا موڈ طاری تھا۔ جیسے جیسے اس جنگل میں خوف و وحشت اور ایک خوفناک قسم کی پراسراریت بڑھتی جا رہی تھی۔ ویسے ویسے ارونا خوش ہوتی جا رہی تھی۔ آسمان پر چاند نکل آیا تھا اور اس کی دودھیا روشنی درختوں سے چھن چھن کر آنے لگی۔ اب اس روشنی میں اس بات کا امکان تھا کہ مندر کی اونچی عمارت شاید دکھائی دے جائے۔ ہمیں ایک سمت سے سرسراہٹ سی سنائی دی تو ایک دم سے ٹھٹک کے رک گئے۔ ایسا لگا جیسے کوئی اژدہا آ رہا ہو۔ ارونا بے خوفی سے کھڑی اس طرف دیکھ رہی تھی۔ چند لمحوں کے بعد ادھر سے ایک ہیولا نمودار ہوا۔ پھر چاندنی میں اس کی شکل اور خدوخال واضح ہوگئے۔

وہ اس مندر کا پجاری تھا جس نے مجھ پر چاقو سے قاتلانہ حملہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ قابو مہاراج کے آنے سے وہ بھاگ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑی سی کلہاڑی تھی جس کا پھل چمک رہا تھا اور اس کی دھار خطرناک حد تک تیز تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور اس کے چہرے پر درندگی چھائی ہوئی تھی۔

''اس لڑکی کو میرے حوالے کر دو......'' پجاری غرایا۔ اس نے مجھے خشمگیں نظروں سے گھورا۔ ''تم اسے مندر سے بھگا کر لے جا رہے ہو؟ میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔''

''میں اس لڑکی کو کیوں اور کس لئے تمہارے حوالے کر دوں؟'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ارونا میرے پیچھے آکر کھڑی ہوگئی۔ اس نے مجھے اپنی ڈھال بنالیا تھا۔

''اس لئے کہ مندر میں جو لڑکی بھی لائی جاتی ہے اس پر میرا بھی حق ہوتا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''حیرت کی بات ہے قابو مہاراج اور گرو جادوگر نے اس لڑکی کو لے جانے کی کیسے اجازت دے دی۔''

''تم ان سے جا کر پوچھو کہ انہوں نے کیوں اور کس لئے اسے میرے حوالے کر دیا؟'' میں نے کہا۔ ''میں اسے لینے آیا تھا اور ان کی اجازت سے لے جا رہا ہوں۔''

''میں ان کے باپ کا نوکر ہوں اور نہ تمہارے باپ کا۔'' وہ خشونت بھرے لہجے میں بولا۔ ''اگر تمہیں اپنی جان پیاری ہے تو اس لڑکی کو میرے حوالے کر کے چل دو اور پانچ دن بعد آکر لے جانا۔''

''پانچ دن کیا...... پانچ گھنٹے کیا...... میں پانچ منٹ کے لئے بھی اسے تمہارے حوالے نہیں کر سکتا۔'' میں نے سخت لہجے میں جواب دیا۔

''تم میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔'' پجاری نے فضا میں کلہاڑی لہراتے ہوئے تڑختے ہوئے لہجے

میں کہا۔ "ورنہ تمہارے دو ٹکڑے کر دوں گا۔"

وہ غضب ناک ہو کر میری طرف بڑھا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا تھا اور اس کے چہرے پر درندگی تھی۔ دوسرے لمحے وہ بری طرح چکرایا اور اس کے ہاتھ سے کلہاڑی چھوٹ کر زمین پر گر پڑی اور وہ خود ہی اپنا سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔ پھر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے سر سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔ اروںا میرے پیچھے سے نکل کر آ گئی اور پجاری کو دیکھنے لگی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پتھر تھا۔

اروںا نے جب پجاری کو میری طرف کلہاڑی لہرا کے بڑھتے ہوئے دیکھا تو اس نے فوراً ہی زمین پر سے ایک پتھر اٹھا لیا اور تاک کر اس کے سر پر دے مارا تھا جس سے وہ توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ وہ گر کر بے ہوش ہو گیا۔ اس وقت اروںا کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور اس کی حسین اور بڑی بڑی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ اروںا نے میرے روکنے اور منع کرنے کے باوجود دوسرا پتھر بھی اس کے چہرے پر دے مارا جس نے ان کی ناک پھوڑ کر چہرے کا نقشہ ہی بگاڑ دیا۔ چہرہ بھی اس کا لہولہان ہو کر مسخ ہو گیا۔

قریب ہی ایک بیس فٹ گہرا گڑھا تھا۔ اروںا نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کے اسے گڑھے کی طرف اس آسانی سے گھسیٹا جیسے وہ کوئی بچہ ہو اور پھر اسے گڑھے میں لڑھکا دیا جیسے پتھر لڑھکایا جاتا ہے۔ پھر وہ مجھ سے بولی۔ "کمینہ...... مجھے لے جا کر ہوس کا نشانہ بنانے آیا تھا...... پورے پانچ دن کے لئے...... جیسے میں کوئی بدچلن ہوں...... اب یہ پانچ دن تک اس گڑھے میں سسک سسک کر مر جائے گا۔"

نفرت، غصے اور حقارت نے اس کے سینے میں سانسوں کا طلاطم پیدا کر دیا تھا۔ پھر ہم دونوں چل پڑے اس سمت جس سمت سے وہ پجاری آیا تھا۔ اروںا نے وہ کلہاڑی اٹھا کر مجھے دے دی تاکہ کوئی موذی جانور نقصان پہنچانے کی کوشش کرے تو اس کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔ ہم دونوں کوئی ایک گھنٹے تک ادھر ادھر بھٹکتے رہے۔ نہ مندر نظر آیا اور نہ راستہ ملا۔ گھوم پھر کے تالاب پر پہنچ گئے۔

"میرا خیال ہے کہ اب ہمیں نہا کر تازہ دم ہو جانا چاہئے۔" اروںا بولی۔ "میں بے حد تھک گئی ہوں۔ نہانے سے تھکن دور ہو جائے گی...... تالاب کا پانی کس قدر صاف وشفاف ہے اور ٹھنڈا بھی معلوم ہوتا ہے۔ چلو...... تم پہلے نہالو......"

"لیڈیز فرسٹ۔" میں نے کہا اور اسے گود میں اٹھا لیا۔

"نہیں...... نہیں......" وہ میری گود میں مچلنے اور بازوؤں کی گرفت سے نکلنے کے لئے ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگی۔ "مجھے نیچے اتار دو...... میں اس طرح نہیں نہاؤں گی۔ میرے کپڑے بھیگ جائیں گے......"

وہ کہتی رہی...... میں نے تالاب کے کنارے جا کر پوری قوت سے اسے تالاب میں اچھال دیا اور بجلی کی سرعت سے کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ پانی میں گرتے ہی ایک دم سے پانی میں آگ لگ گئی اور شعلوں نے اروںا کو لپیٹ میں لے لیا۔ اس نے شعلوں سے نکلنا چاہا تو شعلوں نے جو اسے حصار میں لے لیا تھا نکلنے نہیں دیا اور وہ بری طرح ہاتھ پیر مار رہی تھی۔

"یہ...... یہ...... کیا ہو رہا ہے؟" میرے عقب میں ایک تیز آواز گونجی۔ میں نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا۔ قابو مہاراج کھڑا تھا۔ "اروںا جل رہی ہے؟" وہ تحیر زدہ لہجے میں بولا۔ "لیکن اسے اس تالاب میں نہانے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ تالاب آگ کا ہے......"

"مجھے اور اروںا کو کیا معلوم تھا......؟" میں نے کہا۔ "وہ چوں کہ بے حد تھک گئی تھی اور اس کا جی نہانے کو چاہا تھا۔ جب کہ میرا ارادہ نہیں تھا۔"

"مجھے بچاؤ...... بچاؤ......" وہ ہذیانی لہجے میں چیخ کر بولی۔ "کیا دیکھ نہیں رہے ہو کہ میں جل رہی ہوں...... مر رہی ہوں؟"

قابو مہاراج نے فوراً ہی اپنا ہاتھ اٹھا کر اس سمت رخ کر کے گھورا پھر اس نے منتر پڑھ کر پھونکا۔ اس کے ہاتھ کی انگلیوں سے شعاعیں نکلیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ آگ بجھ گئی۔ اروںا کی چیخ و پکار بند ہو گئی۔ پھر وہ تیزی سے تیرتی ہوئی تالاب سے نکلی اور کنارے کھڑی ہو گئی۔ لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔ میں اور قابو مہاراج اس کی طرف بڑھے۔ اس آگ سے نہ تو اس کا چہرہ جھلسا تھا اور نہ ہی بدن...... ایک آبلہ بھی کپڑوں سے بے نیاز حصوں پر نظر نہ آیا۔ یہ حیرت کی بات تھی...... لیکن حیرت کی بات اس لئے نہ تھی کہ قابو مہاراج نے اپنے جادو کے زور سے نہ صرف آگ بجھا دی تھی بلکہ اس کے جھلسے بدن اور چہرہ کو بھی ٹھیک کر دیا۔ اس کے چہرے پر جلن اور تکلیف کے کوئی آثار نہ تھے۔ وہ اس طرح کھڑی تھی جیسے اسے کچھ ہوا نہیں تھا۔ وہ جیسے ٹھنڈے پانی سے نہا کر نکلی ہو۔ ساڑی اس کے بدن سے چپک گئی تھی جس نے اسے اور خطرناک اور قیامت بنا دیا تھا۔ اس کے گیلے لانبے سیاہ بالوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ اس عالم میں وہ اور حسین اور پرکشش دکھائی دے رہی تھی۔ نگاہ تھی کہ اس کے جسم کے کسی حصے پر ٹھہرتی نہ تھی۔ چہرے پر ایک عجیب سا نکھار آ گیا تھا۔

"اگر آپ بروقت نہ آتے تو اروںا جل کر خاک ہو چکی ہوتی۔" میں نے قابو مہاراج سے کہا۔ "آپ نے بڑی دیا کی جو اپنے جادو کے زور سے اروںا کو بچا لیا اور اس کے جھلسے ہوئے چہرے اور جسم کو جادو کے زور سے ٹھیک بھی کر دیا۔ اس کے بال جو جل گئے تھے وہ بھی محفوظ ہو گئے...... آپ واقعی بڑے مہان جادوگر ہیں۔ آپ کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ آپ نے جو یہ دیا کی ہے ہم اسے ساری زندگی کبھی بھی بھلا نہ سکیں گے۔"

"میں اتفاق سے گزر رہا تھا تو مجھے اچانک اروںا کی دل خراش چیخیں سنائی دیں۔" قابو مہاراج نے جواب دیا۔ "میں فوراً ہی ادھر آ گیا۔ اگر میں نہ آتا تمہاری اروںا جل کر مر جاتی...... یہ آگ کا تالاب ہے۔ یہ ایک سراب ہے۔ اس کا پانی صاف وشفاف اور ٹھنڈا ٹھنڈا سا معلوم ہوتا ہے۔ یہ خونی تالاب ہے۔ اب تک یہ نہ جانے کتنے انسانوں اور جانوروں کو کھا چکا ہے۔ یہ جو تمہیں دکھائی دے رہا ہے یہ پانی نہیں ہے۔ دراصل خون ہے۔ یہ دو ہزار انسانوں اور جانوروں کا خون ہے جو پانی کی صورت میں نظر آتا ہے۔ یہ انسانوں اور جانوروں کو فریب دیتا ہے۔"

اروںا مجھ سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے قابو مہاراج کی بات سن کر کہا۔ "خونی تالاب......؟ کیا

تالاب بھی درندوں کی طرح انسانی اور جانوروں کے خون کے پیاسے ہوتے ہیں......؟ بڑی عجیب سی بات ہے۔ میں نے تو یہ سنا ہے کہ دلدل انسانوں اور جانوروں کو کھا جاتے ہیں۔ لیکن تالاب کے بارے میں نہیں سنا......"

"میں نے بتا دیا اور تم نے بھی دیکھ لیا کہ اس تالاب میں گرتے ہی تمہارے جسم میں آگ لگ گئی۔" قابو مہاراج کہنے لگا۔ "میرے جادو کے زور نے تمہارے بدن، چہرے بالوں اور کپڑوں کو جلانے سے محفوظ رکھا۔ اگر مجھے چند لمحوں کی دیر ہو جاتی تو تم تالاب کا شکار بن چکی ہوتیں۔"

"کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ یہ تالاب خونی کیوں اور کس لیے ہے؟" میں نے اس سے سوال کیا۔ میرے لہجے میں حیرت اور تجسس سا تھا۔ "ایک طرح سے یہ تالاب آدم خور ہوا......؟ شاید کسی نے کسی وجہ سے اس تالاب کو خونی اور آدم خور بنایا ہوگا۔ ورنہ یہ خود سے کیسے آدم خور بن سکتا ہے؟"

"تمہارا اندازہ درست ہے۔" قابو مہاراج نے سر ہلاتے ہوئے تائیدی لہجے میں کہا۔ "سات سو برس پہلے کی بات ہے۔ جب نیلا مندر تعمیر کیا جا رہا تھا تب اس مہاراجا کی نوجوان لڑکی جو یہ مندر تعمیر کروا رہا تھا ادھر اکیلی گھومتی ہوئی آ نکلی۔ ایک افسر سپاہی نے اسے اس طرف جاتے دیکھا تو اس کی نیت میں فتور پیدا ہو گیا۔ راج کماری پندرہ برس کی تھی۔ لیکن وہ بے حد حسین تھی تالاب کو دیکھ کر اسے نہانے کی خواہش ہوئی۔ یہ تالاب اور اس کا پانی خوبصورت اور ٹھنڈا محسوس ہوا۔ جب اس نے پانی میں ہاتھ ڈال کر دیکھا تو اس کے سارے جسم پر ایک عجیب سی فرحت دوڑ گئی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے نہانے سے پہلے چاروں طرف کا اچھی طرح سے جائزہ لیا۔ وہ نہانے سے پہلے اس بات کی تسلی کرنا چاہتی تھی کہ کوئی نہانے سے پہلے اسے دیکھے گا تو نہیں......! جب اسے اچھی طرح سے اطمینان ہو گیا تو اس نے اپنا لباس تہ کر کے ایک طرف رکھا اور اس پر پتھر رکھ دیا کہ کہیں وہ ہوا سے اڑ کر بکھر نہ جائے۔ پھر وہ تالاب میں اتر گئی۔ تالاب کے ٹھنڈے میٹھے پانی میں نہاتے ہوئے اسے بڑا عجیب اور فرحت بخش کیف آ رہا تھا۔ اسے نہانے میں کبھی ایسا سرور نہیں ملا تھا۔ وہ بڑے سکون، اطمینان اور آزادی سے نہا رہی تھی۔ مہاراجا کی فوج کا افسر ایک درخت کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا اور اسے نہاتے ہوئے دیکھنے لگا۔ وہ راج کماری کو دیکھ سکتا تھا لیکن راج کماری اسے دیکھ نہیں سکتی تھی اور وہ اس کی موجودگی سے بے خبر تھی۔ نہاتے نہاتے وہ ایک دم سے چونکی۔ کیوں کہ اس کی چھٹی حس بیدار ہو گئی۔ اسے ایسا لگا کہ کوئی مرد اسے چھپ کر نہاتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ اس احساس کے ہوتے ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس نے خوفزدہ اور متوحش نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ اس کا سینہ دھک سے ہو کر رہ گیا تھا اور دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس کی حالت غیر ہونے لگی۔

جب اسے کوئی کسی سمت دکھائی نہ دیا تو وہ تالاب سے نکلی۔ وہ سہمی ہوئی سی تھی۔ اس کا دل ابھی بھی بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ وہ سہمی ہوئی چڑیا کی مانند خوف زدہ نظروں سے دیکھتی ہوئی اپنے کپڑے اٹھانے کے لئے بڑھی تو اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے اور اس کی رگوں میں لہو منجمد ہو رہا تھا۔ وہ اپنے کپڑوں کے پاس پہنچی۔ جب وہ جھک کر اٹھانے لگی تو اس سپاہی نے

جس کا نام رام تھا درخت کی آڑ سے نکل کر چشم زدن میں اسے دبوچ لیا۔ وہ غش کھاتے کھاتے رہ گئی لیکن اس نے جلد ہی کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھال لیا۔

جب راج کماری نے اس کی شکل دیکھی تو اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "رام......تم! تمہاری یہ مجال چھوڑو مجھے۔ تم نے یہ حرکت کیسے کی؟"

"نہیں راج کماری!" اس نے کہا اور اپنا سر نفی کے انداز میں ہلانے لگا۔ "اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ کو میری ہر بات ماننا ہوگی۔"

"اگر تم نے مجھے نہیں چھوڑا تو میں مہاراج سے تمہاری شکایت کر دوں گی۔" وہ اس کے مضبوط بازوؤں کے حصار میں کسمساتے ہوئے اور اس حصار کو توڑنے کی جدوجہد کرتے ہوئے بولی۔ "کیا تم نہیں جانتے ہو کہ میں کون ہوں؟ پھر بھی تم نے یہ نیچ حرکت کی ہے؟ چھوڑو مجھے......"

"راج کماری جی!" رام کہنے لگا۔ "زندگی میں ایک ایسا سنہرا موقع ملا ہے تو میں ایک راج کماری سے فائدہ کیوں نہ اٹھاؤں۔ اگر میں نے اس موقع سے فائدہ نہ اٹھایا تو پھر دنیا میں مجھ سے بڑا بے وقوف اور احمق ترین شخص کوئی نہ ہوگا۔ آپ کس منہ سے میری شکایت کریں گی۔ مہاراج الٹا آپ کو الزام دیں گے۔ کہیں گے کہ اس میں سراسر تمہارا اپنا دوش ہے۔ تالاب پر اکیلی جا کر نہانے کی کیا ضرورت تھی۔ میں اس پاپی کو اس لئے سزا نہیں دے سکتا کہ اس سے تم اور ہم بدنام، رسوا اور ذلیل ہو جائیں گے۔ کلنک کا ٹیکہ لگنے کے بعد تم سے کون شادی کرے گا؟

لہٰذا آپ میری بات ٹھنڈے دل سے سنیں، ہم دونوں ایک دوسرے کو دل و جان سے سویکار کر لیتے ہیں۔ اس طرح ہم پتی اور پتنی بن جائیں گے۔ بیاہ کی، کسی پنڈت کے منڈپ کی اور اگنی کے سات پھیرے لگانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اصل میں دل سے خوشی سویکار کرنا ضروری ہوتا ہے۔"

"اپنی بکواس بند کرو۔" راج کماری پھنکاری۔ "میں جان دے دوں گی لیکن تمہاری باتوں کے فریب میں آ کر اپنی عزت پر آنچ نہیں آنے دوں گی۔ مجھے چھوڑ دو اور میری نظروں کے سامنے سے دفعان ہو جاؤ۔ اگر تم نے مجھے بے عزت کیا تو پتا جی تمہاری گردن اڑا دیں گے......وہ تمہاری لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کتوں کو کھلا دیں گے۔ تمہارا سر کسی نیزے میں لگا کر اسے مندر کے سامنے گاڑ دیں گے۔"

"مجھے ان باتوں سے ڈرانے اور خوف زدہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" وہ ہنس کر بولا۔ "میں تمہیں اس وقت تک یہاں سے جانے نہیں دوں گا جب تک تم میری بات نہیں مانو گی۔ مجھے کسی انجام کی کوئی پروا نہیں۔ مجھے دنیا کی کوئی طاقت میرے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتی۔"

راج کماری کی خوبصورت آنکھیں شعلے برسانے لگیں۔ "تو مجھے کیا سمجھتا ہے، میں پہلے عورت ہوں، پھر راج کماری...... ہر عورت کو اپنی عزت جان سے پیاری ہوتی ہے۔ میں جان دے دوں گی پر تیرے ناپاک ارادوں کو پورا ہونے نہیں دوں گی۔ چھوڑ مجھے......"

راج کماری نے اس کے منہ پر تھوک دیا اور اس کے بازوؤں کے حصار سے نکلنے کی کوشش کی۔ وہ

ایک سپاہی تھا۔ فوج میں افسر تھا۔ نہ صرف دراز قد تھا بلکہ مضبوط جسم اور چوڑے چکلے سینے کا تھا اور اس کے بازو بھی فولادی تھے۔ راج کماری جب اس کے بازو کا حلقہ توڑ نہ سکی تو اس نے سپاہی کے بازو میں دانت گاڑ دیئے۔ لیکن اس مردود دلملعون سپاہی پر کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ ہنستا ہی رہا۔

اس وقت اس کے ذہن میں اچانک ایک خیال بجلی کی طرح اپنی عزت بچانے کا آیا۔ اس تدبیر کے آتے ہی اس نے فوراً ہی اپنی مرمریں باہیں سپاہی کے گلے میں حمائل کر دیں۔ اس نے خود سپردگی کی نظروں سے سپاہی کی آنکھوں میں جھانکا۔ پھر محبت بھرے لہجے میں بولی۔ "رام! میں تمہاری محبت اور جذبے کا امتحان لے رہی تھی۔ تم کتنے سندر ہو...... کتنے طاقتور ہو...... کسی راج کمار سے کم نہیں ہو۔ لیکن میں ایک شرط پر تمہاری ہر بات مان سکتی ہوں۔ تم وہ شرط پوری کرنے کا وچن دو تو میں اپنے آپ کو تمہارے حوالے کر دوں گی۔"

"سچ راج کماری!" وہ بچوں کی طرح خوش ہو گیا۔ اسے جیسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ "میں ایک کیا دس شرائط پوری کرنے کے لئے تیار ہوں۔"

"کیا تم مجھے یہاں سے کسی اور دیش کو لے جا سکتے ہو؟ کسی ایسے دیش کو جو دور دراز ہو اور میرے پتا جی ہم دونوں تک نہ پہنچ سکیں؟"

"کیوں نہیں...... کیوں نہیں......" رام نے خوش ہو کر اثباتی انداز میں سر ہلایا۔ "میں تمہیں یہاں سے اتنی دور لے جاؤں گا جتنی دور زمین سے آسمان ہے......"

"میں محل سے ہیرے جواہرات اور اتنے زیورات لے آؤں گی کہ ہم ساری زندگی عیش اور مزے سے گزاریں گے۔" راج کماری بولی۔

"مال و دولت کی تو سخت ضرورت پڑے گی۔" رام نے کہا۔ "اس کے بغیر تو ہم زندگی نہیں گزار سکتے۔ ہم کل رات ہی یہاں سے چل پڑیں گے...... میں دو گھوڑے تیار رکھوں گا جو انتہائی تیز رفتار ہیں اور تم یہاں آ جانا۔ میں انتظار کروں گا۔"

رام نے اسے اپنے بازوؤں کی گرفت سے آزاد کر دیا۔ راج کماری نے دیکھ لیا تھا کہ سامنے والے درخت کے نیچے گھاس پر اس کے کپڑے، تلوار اور خنجر رکھے ہوئے ہیں۔ راج کماری اسے مخمور نگاہوں سے دیکھتی ہوئی لے کر وہاں پہنچی۔ اس نے موقع پاتے ہی خنجر اٹھا کر رام پر حملہ کر کے اسے زخمی کر دیا۔ رام کو راج کماری کے فریب اور چال بازی پر غصہ آ گیا۔ اس نے راج کماری سے خنجر چھین لیا۔ راج کماری تالاب کی طرف بھاگی، رام نے اسے تالاب کے کنارے جا لیا۔ قابو میں کر کے بے بس کر دیا۔ رام نے اس پر فتح پانے کے بعد خنجر سے اسے موت کی نیند سلا دیا اور پھر اس کی لاش تالاب میں پھینک دی۔ پھر وہ واپس چلا گیا۔ وہ بہت خوش تھا کہ اس نے راج کماری جیسی حسین اور جوان لڑکی پر فتح پائی۔

راج کماری کی تلاش ہوئی، اس کے کپڑے جو تالاب کے کنارے تھے وہ مل گئے۔ پھر دوسرے دن اس کی لاش تالاب کے پانی کی سطح پر ابھر آئی۔ مہاراجا کے وزیر نے کہا کہ...... راج کماری تالاب پر اکیلی نہا رہی ہوگی۔ یہاں سے کسی راکھشش کا گزر رہا ہوگا۔ اس نے زیادتی کا نشانہ بنا کر جان سے مار

دیا ہوگا۔ مہاراجا نے وزیر کی بات کا یقین کر لیا۔ پھر راج کماری کی لاش کا کریا کرم کر دیا گیا۔

اس روز کے تیسرے دن رام کسی شکار کی تلاش میں نکلا تو اسے ایک نوجوان باندی خیمہ سے نکل کر تالاب کی طرف جاتی دکھائی دی۔ آسمان پر چاند مسکرا رہا تھا۔ اس کی دودھیا چاندنی چاروں طرف کھل کر برس رہی تھی۔ جس میں دور دور کی ہر چیز صاف اور واضح دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ باندی تالاب پر نہانے جا رہی ہے۔ باندی تالاب میں اتر کے نہانے اور مچھلی کی طرح تیرنے لگی۔ رام دل میں حیران تھا کہ دو دن پہلے جو واقعہ اس تالاب پر راج کماری کے ساتھ رونما ہوا تھا اس کا اسے کوئی ڈر اور خوف نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ شاید باندی کو اس کا علم نہ ہو یا پھر اس نے کوئی اور تالاب سمجھا ہوگا۔

جب وہ نہا کر نکلی تو رام نے اسے پیچھے سے جا کر دبوچ لیا جس طرح اس نے راج کماری کو دبوچا تھا۔ باندی نے کوئی مزاحمت کی اور نہ ہی اس کا نازک بدن رام کے بازوؤں میں کسمسایا۔ رام یہ سمجھا کہ باندی اپنی مرضی اور خوشی سے اپنے آپ کو سونپ رہی ہے۔ جب باندی اس کی طرف گھومی تو تب رام نے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ ایک دم سے دہشت زدہ ہو کر پیچھے ہٹا۔ اسے اپنے بازوؤں کی گرفت سے نکال دیا۔ اپنی جگہ جامد و ساکت ہو گیا۔ اس میں اتنی سکت اور ہمت بھی نہیں رہی کہ اپنی جگہ سے حرکت کر سکے۔ وہ حیرت اور خوف سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔

"تت...... تت...... تم کیا راج کماری ہو؟" رام بری طرح ہکلایا اور اس کا چہرہ سفید پڑتا چلا گیا۔ پھر آواز حلق میں پھنس گئی۔

"ہاں...... میں راج کماری ہوں۔" اس نے اثباتی انداز میں سر ہلایا۔ "تم یقین کیوں نہیں کر رہے ہو؟ مجھے ذرا غور سے اور قریب ہو کر دیکھو۔"

"لیکن تم راج کماری کیسے ہو سکتی ہو......؟" رام بہ مشکل بولا۔ "میں...... میں نے تو تمہیں قتل کر دیا تھا اور تمہاری لاش تالاب میں پھینک دی تھی اور تمہاری چتا جلا کر اس کی راکھ اس تالاب میں ڈال دی گئی تھی اور تمہاری کوئی جڑواں بہن بھی تو نہیں ہے......؟"

"چلو...... تم نے اپنی زبان سے اپنے قتل کا اعتراف کر لیا۔" راج کماری ہنس کر بولی۔ "میں تم سے یہی کہلوانا چاہتی تھی۔ تم نے مجھے اس لئے قتل کیا کہ میں نے اپنی عزت بچانے کے لئے تم پر حملہ کیا تھا۔ لیکن وار خطا ہونے سے تم بچ گئے۔ صرف زخمی ہو گئے۔ پھر تم نے میری عزت تباہ کر دی۔ تم نے جس بے رحمی، سفاکی اور بربریت سے مجھے قتل کیا میں اس کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی...... اب میں تم سے اور ان مردوں سے بدلہ لینے دنیا میں آئی ہوں جو جبر و زیادتی سے عورت کی آبرو لوٹتے ہیں۔ میں اس عورت کی بھی دشمن ہوں جو مردوں کو ورغلاتی ہے۔ مجھے میرے دیوتا نے اس تالاب تک محدود کر دیا ہے۔ میں اس تالاب پر آ کر پانی پینے والے مرد و عورتوں اور جانوروں کا خون پی سکتی ہوں۔ میں نے اسے آگ کا تالاب بنا دیا ہے۔ میں پہلے تو اسے جلاؤں گی اور پھر اس کا خون جسم سے نکال کر اسے تالاب کے پانی میں ملا دوں گی۔ اس تالاب کو نہ صرف انسانوں بلکہ جانوروں کے خون سے بھی بھرتی رہوں گی۔ اس تالاب

کے پانی میں جتنا انسانی خون، جانوروں کا خون شامل ہوگا اس میں اتنی ہی خوبصورتی پیدا ہوتی جائے گی۔ اس خوبصورتی کے فریب میں آ کر وہ نہانے کے لئے تالاب میں اترے گا تو جل کر بھسم ہو جائے گا۔“

پھر راج کماری رام کی طرف بڑھی۔ رام نے پلٹ کر بھاگنا چاہا لیکن اس کی ساری طاقت سلب ہو کر رہ گئی تھی۔ اسے ایسا لگا تھا کہ جیسے کسی نے اس کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی ہوں۔ اس نے رام کو اپنے بازوؤں کے حصار میں اس طرح لے لیا جیسے وہ کوئی بچہ ہو۔ راج کماری کے بازو لمبے ہو گئے تھے۔ فولاد کی طرح سخت اور مضبوط...... رام کی سانسیں سینے میں گھٹنے لگیں۔ پسلیاں کڑکڑانے لگیں۔ اس نے بازوؤں کا حصار توڑنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ توڑ نہ سکا۔ پھر راج کماری کا چہرہ بدل گیا۔ اب وہ چہرہ راج کماری کا نہ تھا۔ ایک چڑیل کا تھا، ایک بدروح کا تھا۔ اس کے لمبے لمبے نوکیلے دانت نکل آئے...... پھر اس کی انڈوں سے بھی بڑی بڑی سرخ آنکھیں...... اس کے ہاتھوں کے لمبے لمبے نوکیلے ناخن جو سوئیوں کی طرح تھے۔ وہ رام سے بولی کہ میں تمہیں تڑپا تڑپا کر، سسکا سسکا کر ماروں گی۔ ایسی اذیت، سفاکی اور بے رحمی سے کہ شاید آج تک کسی نے کسی دشمن کو نہیں مارا ہوگا۔ ایسی ایذائیں نہیں دی ہوں گی۔ پہلے تو اس نے ایک ایک کر کے رام کے ہاتھ پیروں کی انگلیاں توڑ دیں۔ رام دکھ، درد اور تکلیف سے تڑپتا رہا۔ پھر اس نے بازو اس طرح توڑ ڈالے جس طرح درخت سے پھل توڑے جاتے ہیں۔ اس طرح اس نے ٹانگیں بھی توڑ کر پھینک دیں۔ راج کماری کی روح نے اسے بے ہوش اور مرنے نہیں دیا۔ اس کی چیخوں نے آسمان کو سر پر اٹھا لیا۔ کوئی قریب تھا نہیں جو اس کی دل دوز چیخیں سنتا، پھر اس نے رام کا گلا دبانا شروع کیا۔ اس کی آنکھیں ابل پڑیں۔ پھر وہ مر گیا۔ اس نے رام کا سارا خون پی لیا۔ پھر اس کا دھڑ اور اعضا بیٹھ کر اس اطمینان سے کھانے لگی جیسے اس کی مرغوب غذا ہو۔ پھر اس روز سے آج تک نہ جانے کتنے انسانوں اور جانوروں کا خون یہ تالاب پی چکا ہے۔ کچھ کو جلا بھی چکا ہے۔ لیکن راج کماری تالاب کے اندر ہی رہتی ہے۔ وہ باہر نہیں آتی ہے۔ شکار کی تلاش میں رہتی ہے۔ میرے جادو منتر نے بہت سارے لوگوں کی جانیں بچائیں...... اب تم دونوں جتنا جلد ہو سکے یہاں سے نکل جاؤ۔“

”قابو مہاراج! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ ہمیں اس جنگل سے باہر نکال دیں تاکہ ہم گاؤں جا سکیں جو قریب ہی ہے۔“ ارونا بولی۔ ”ہم وہاں رات گزار کر صبح کلکتہ چلے جائیں گے۔ آپ ہم پہ یہ دیا کریں نا...... بڑی کرپا ہوگی۔“

”مجھے افسوس ہے کہ میں تم دونوں کی اس سلسلے میں کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔“ قابو مہاراج نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

”وہ کس لئے......؟“ ارونا نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”آپ نے مجھے آگ میں جلنے اور مرنے سے بچا کر ایک نیا جیون دیا۔ آپ نے جو دیا کی ہے مجھ پر، میں کبھی اسے بھول نہ سکوں گی۔ ہم بہت دیر سے یہاں بھٹک رہے ہیں۔ آپ نے کوئی مدد نہیں کی تو ہم بھٹکتے ہی رہیں گے۔ اس لئے کہ یہاں بھول بھلیاں ہیں اور پھر شام ہونے میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ رات ہوتے ہی گھپ اندھیرا پھیل جائے گا۔“

”میں اس لئے تم دونوں کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گا کہ میں گرو کے ایک نہایت ضروری کام سے جا رہا ہوں۔“ قابو مہاراج نے کہا۔ ”گرو نے جو کام مجھے سونپا ہے اگر اسے میں نے وقت پر انجام نہ دیا تو نہ صرف اس کا بہت حرج ہوگا بلکہ گرو ناراض بھی ہو جائیں گے۔ یوں بھی اس راج کماری کی کہانی سنانے میں خاصا وقت بیت گیا۔ البتہ میں رہنمائی ضرور کر سکتا ہوں۔ پھر جنگل سے نکلنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔“

”چلئے یہی سہی......“ میں نے کہا۔ ”ہم اگر آپ کی رہنمائی سے یہاں سے نکل گئے تو بڑی اچھی بات ہوگی۔ ہم کس سمت سے جائیں؟“

”اس سمت سے......“ قابو مہاراج نے ہاتھ اٹھا کر ہمارے دائیں ہاتھ کی سمت اشارہ کیا۔ ”میں کچھ نشانیاں اور اتا پتا بھی بتائے دیتا ہوں۔ یہاں سے کوئی دو تین سو قدم چلنے کے بعد ایک چھوٹا سا حویلی نما محل ملے گا۔ اس کے عقب میں بہت بڑا میدان واقع ہے۔ جب یہ میدان پار کر لیں گے تو دائیں جانب ایک ندی ملے گی۔ اس کے بائیں جانب ایک گھنا جنگل ہے۔ جب ندی پار کر کے دو میل چلیں گے تو ایک پگ ڈنڈی ملے گی۔ وہاں سے کھیتوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ وہاں سے نصف میل پر گاؤں واقع ہے۔ جو نظر آ جائے گا۔“

قابو مہاراج اتنا کہہ کر پل بھر کے لئے بھی رکا نہیں۔ وہ جدھر سے آیا تھا اس سمت تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا جنگل میں گھس کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اب یہاں ہم دونوں کے سوا کوئی نہ تھا۔ ہم اس خونی تالاب سے قدرے دور کھڑے تھے اور اس تالاب کی طرف دیکھ رہے تھے جس میں راج کماری کی بدروح کا بسیرا تھا۔ قابو مہاراج نے راج کماری کی جو کہانی سنائی تھی وہ بڑی عجیب و غریب تھی۔ ایک اور عجیب سی بات یہ تھی کہ اس تالاب کی خوبصورتی اور اس کا ماحول جو بڑا ہی خواب ناک سا تھا وہ نہانے کے لئے اکسا رہا تھا۔ شاید وہ بدروح چاہ رہی تھی کہ ہم نہانے کے لئے اس تالاب میں اتر جائیں اور وہ ہمارا خون پی جائے۔ موت کی آغوش میں پہنچا دے۔

میں نے تالاب پر سے نگاہیں ہٹا کر ارونا کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ کسی ان جانے خیال سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ خوبصورت آنکھوں میں ایک عجیب سا نشہ تیر رہا تھا۔ ارونا نے جتنی جلدی اپنے خوف و ہراس پر قابو پایا تھا وہ ناقابل یقین سا تھا۔ اس کے علاوہ دو ایک باتیں اور بھی ناقابل یقین تھیں۔ تالاب میں اس کے گرتے ہی پانی میں آگ لگ گئی تھی اور وہ آگ کی لپیٹ میں آ گئی تھی۔ وہ کوئی چھ سات منٹ تک شعلوں میں گھری رہی۔ نہ تو اس کے کپڑوں میں آگ لگی اور نہ ہی بالوں میں...... اور نہ جسم بھی جھلسا تھا۔ چونکہ وہ شعلوں میں اس طرح گھری ہوئی تھی کہ وہ بالکل بھی نظر نہیں آئی تھی۔ وہ اگر چیخیں نہ مار رہی ہوتی تو کوئی بھی دیکھنے والا یہ سمجھتا کہ یہ مصنوعی آگ ہے جو جلا نہیں رہی ہے۔ شاید آگ بھی لگ گئی تھی۔ اس کے کپڑے اور بال بھی جل گئے تھے اور چہرہ اور جسم بھی جھلس گیا ہوگا۔ لیکن قابو مہاراج نے اپنے جادو منتر کے زور سے نہ صرف آگ بجھا دی تھی بلکہ سب سابقہ حالت میں کر دیا تھا۔ زخم بھی مندمل ہو گئے تھے۔ جب وہ تالاب سے باہر آئی تو ایسا لگ رہا تھا کہ آگ میں نہیں بلکہ تالاب کے ٹھنڈے پانی میں سے نہا کر نکلی ہو۔ اس واقعہ سے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ قابو مہاراج کوئی

عام یا معمولی قسم کا جادوگر نہیں ہے۔ اس نے اپنے جادو کا جو کمال دکھایا تھا وہ اش اش کر دینے والا تھا۔

”اب تم کیسا محسوس کر رہی ہو؟“ میں نے پوچھا۔ ”جلن، زخم، تکلیف اور جسم کے کسی حصے میں درد تو محسوس نہیں ہو رہا ہے؟“

”میں یہ سب کچھ بالکل بھی محسوس نہیں کر رہی ہوں۔“ اروناؔ نے جواب دیا۔ ”ایسا لگ رہا ہے کہ کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ جلتے وقت میں نے بہت زیادہ تکلیف محسوس کی ہو۔ ماہی بے آب کی طرح تڑپی ہوں، چیخیں ماری ہوں۔ لیکن اب یہ سب کچھ زائل ہو چکا ہے۔ دل و دماغ پر کسی قسم کا احساس طاری نہیں ہے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ بس وہ ایک ڈراؤنا سا خواب تھا جو میں نے دیکھا تھا اور اب میرے دل کے کسی کونے میں کسی قسم کا خوف اور ڈر اور دہشت نام کی ایک رمق بھی نہیں ہے۔ میرے حوصلے بہت بلند ہیں۔“

مجھے اندازہ نہ تھا کہ اروناؔ اس قدر حوصلہ مند اور بہادر لڑکی ہے۔ اس کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو خوف و دہشت سے کئی دنوں میں بھی سنبھل نہ پاتی۔ اس کے حواس اور اعصاب بحال ہونے میں کئی دن لگ جاتے۔ اس نے خوف اور ڈر چند لمحوں میں یک سر بھلا دیا تھا۔

یہ ویرانہ تھا۔ سنسان جنگل تھا، لیکن ماحول بڑا خواب ناک اس واقعہ کے بعد محسوس ہو رہا تھا۔ ہوا میں بڑا رومان تھا۔ وہ ایک ٹک تالاب کی طرف چمکتی ہوئی آنکھوں سے نہ جانے کیا دیکھ رہی تھی اور کس لئے کھڑی ہوئی تھی۔ کیوں دیکھ رہی تھی۔ یہ عجیب سی بات تھی۔

”کیا چلنا نہیں ہے؟“ میں نے اس کے قریب جا کر کہا۔ ”کیا پھر نہانے کو دل کر رہا ہے جو یہاں جم کر کھڑی ہو گئی ہو۔ لیکن ایک بات سوچ لو۔ دوبارہ قابو مہاراج تمہیں بچانے آنے سے رہا۔ وہ کسی کام سے کہیں گیا ہے۔ کیا تمہیں گود میں اٹھا کر پھر سے تالاب میں پھینک دوں؟“

”تم نے مجھے گود میں اٹھا کر کیوں اور کس لئے تالاب میں پھینکا تھا؟“ اروناؔ نے مجھے تیکھی تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے پیار بھری خفگی سے پوچھا۔

”اس لئے کہ تم بہت تھکی ہوئی تھیں اور نڈھال ہو رہی تھیں۔ گرمی سے برا حال ہو رہا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تم نہانا اور تیرنا بھی چاہ رہی تھیں۔ تم میں اتنی سکت بھی نہیں رہی تھی کہ دو چار قدم چل سکو...... اس لئے میں نے تمہاری مشکل حل کی اور تالاب میں پھینک دیا۔“

”میں اب اور اس وقت بھی بہت کمزوری محسوس کر رہی ہوں۔“ وہ کہنے لگی۔ ”کیا تم مجھے گود میں اٹھا کر چل سکتے ہو؟“ اروناؔ نے شوخی بھری نظروں سے میری آنکھوں میں جھانکا۔

”کیوں نہیں......“ میں نے کہا۔ پھر میں نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ لیکن میرے تعجب کی انتہا نہ رہی کہ وہ بہت ہی ہلکی پھلکی سی تھی۔ اتنی ہلکی کہ پھول کا ہار اس سے کہیں وزن کا ہوگا۔ ایک نوزائیدہ بچے سے بھی بہت ہی کم...... یہ کیا اسرار ہے؟ کہیں یہاں کوئی جادو وغیرہ تو نہیں جس کا یہ اثر ہو یا پھر قابو مہاراج نے جب اسے اغوا کرنے کی نیت سے رنگا ماٹی سے اٹھایا تھا تب اسے پھول سے بھی ہلکا کر دیا ہوگا۔ یہ صورت حال ابھی تک برقرار ہے۔ پھر مجھے یکا یک یاد آیا کہ جب میں نے اسے گود میں اٹھا کر تالاب

میں پھینکا تھا تب بھی اس کا وزن اتنا ہی تھا۔ میں اسے گود میں لے کر میلوں چل سکتا تھا۔ کیوں کہ وہ ایک دستی رومال کی طرح میری گود میں تھی۔ میں تیز تیز قدموں سے چل پڑا تا کہ جنگل سے جتنا جلد ہو سکے نکل جائیں۔ کوئی دو سو قدم چلنے کے بعد گھنے گھنے، بوڑھے بوڑھے اور بلند قامت درختوں سے گھرا ایک چھوٹا سا محل نظر آیا تو میں رک گیا اور اروناؔ میری گود سے اتر گئی، محل بہت خوبصورت اور طرزِ تعمیر کا بہترین نمونہ تھا۔ اس کی بناوٹ کی داد نہ دینا بدذوقی تھی۔

”قابو مہاراج نے اس محل کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟“ میں نے کہا۔ ”کتنا خوبصورت شاندار اور پرشکوہ ہے۔ گو کہ چھوٹا سا ہے۔“

”کیا نہیں بتایا......؟“ اروناؔ نے اپنا لباس اور بکھرے بالوں کو درست کرتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ ”کیا اس نے اس محل کے بارے میں کہا نہیں تھا کہ ایک چھوٹا سا محل راستے میں ملے گا اور اس کے عقب میں جو میدان ہے اسے پار کر کے ندی پر جانا ہے۔“

”میری مراد اس محل سے ہے کہ یہ کس راجہ مہاراجا کا تھا......؟ اُسے جنگل میں کس لئے بنایا گیا......؟ کس لئے بنایا ہوگا......؟ دیکھنے میں یہ محل بھی قدیم اور سات سو برس پرانا لگ رہا ہے۔ یہ بھی نیلے رنگ کا ہی ہے۔ کیا جنگل میں کوئی محل بناتا ہے؟“

”جس مہاراجا راجہ نے یہ نیلا مندر بنایا تھا اس نے یہ محل اس لئے بنایا کہ وہ مندر کی تعمیر اپنی نگرانی اور نظروں کے سامنے کروانے کے لئے اس میں رہائش رکھ سکے۔“ اروناؔ بولی۔ ”پہلے تو شاہی خیمے نصب کئے گئے تھے۔ لیکن جب مہاراجا کو بتایا گیا کہ اس مندر کی تعمیر میں سات سے دس برس کا عرصہ لگ سکتا ہے تو پھر اس نے محل بنا لیا۔ جب مندر تعمیر ہو گیا تو وہ یہاں سے چلا گیا۔“

”تمہیں یہ سب کچھ کیسے اور کیوں کر معلوم ہوا......؟ تمہیں یہاں آئے ہوئے دو دن بھی نہیں ہوئے۔“

”میں جب یہاں لائی گئی تھی تب میں نے قابو مہاراج اور گرو جادوگر کو اس کے متعلق گفتگو کرتے سنا تھا۔“ اروناؔ بولی۔

”تمہاری یہ بات تو میری سمجھ میں آ گئی۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ مہاراجا نے یہ محل آخر جنگل میں کیوں بنایا......؟ وہ مندر کے سامنے بھی بنا سکتا تھا۔ وہاں بہت ساری جو جگہ خالی پڑی تھی وہ اب بھی موجود ہے، بہت بڑا میدان بھی تو ہے۔“

”سات سو برس پہلے جس جگہ مندر بنایا گیا تھا اس کے سامنے کھلے میدان میں ایک بہت بڑی آبادی تھی۔“ اروناؔ بتانے لگی۔ ”جہاں اب محل ہے وہ جگہ جنگل نہ تھا۔ اس لئے وہاں محل بنایا گیا۔ وقت کے ساتھ آبادی طوفانوں، سیلاب بارشوں اور سماوی آفات کی نذر ہو کر تباہ و برباد ہو گئی۔ آبادی کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔ صرف ایک گاؤں دو ایک میل کے فاصلے پر رہ گیا۔ بھگوان نے اس کا کسی وجہ سے وجود رکھا۔ ادھر جنگل پھیلتا گیا اور محل اس کے حصار میں آ گیا۔“

”سات سو برس پہلے کیسے کیسے ماہر تعمیرات موجود تھے۔“ میں نے کہا۔ ”محل باہر سے جتنا خوبصورت ہے اندر سے بھی ہوگا۔“

”یقیناً اندر سے بھی بہت خوبصورت ہے۔“ اروناا اپنی رو میں کہہ گئی۔ پھر اس نے بات بدلی۔ ”میرا مطلب یہ ہے کہ اندر سے محل واقعی بہت خوبصورت ہوگا۔ کیوں کہ اس زمانے کے لوگ بڑا نفیس ذوق رکھتے تھے۔ سنا ہے کہ یہ محل تین سو برس تک آباد رہا...... کیوں نہ ہم محل کے اندر چل کر دیکھیں...... میں نے اپنی زندگی میں محل اندر سے نہیں دیکھا۔ صرف فلموں میں دیکھا ہے۔ میں اس محل کے اندر چل کر اس کا فلموں کے محل سے موازنہ کرنا چاہتی ہوں۔ کیا تم نے کبھی اپنی زندگی میں محل وغیرہ دیکھا ہے۔“

”اتفاق سے آج تک میں کسی محل کو دیکھنے نہیں گیا۔“ میں نے کہا۔ ”اس لئے کہ مجھے محلوں سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ محل دیکھ کر کرنا بھی کیا ہے؟“

”بڑی عجیب سی بات ہے۔“ وہ مجھے شوخ نظروں سے دیکھنے لگی۔ پھر وہ بڑے زور سے چہکی۔ ”پھر تمہیں کس سے دلچسپی ہے؟“

”تم جیسی حسین اور جوان لڑکیوں سے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”کیوں کہ دنیا میں حسین لڑکیوں سے کوئی چیز خوبصورت اور دلکش نہیں ہے؟“

”تو کیا میں حسین اور جوان لڑکی نہیں ہوں؟“

”کیوں نہیں...... “ میں نے کہا۔ ”تمہارا حسن اور یہ رنگین شباب لاکھوں میں ایک ہے۔ تم ایک بے مثل لڑکی ہو۔ کسی راج کماری کی طرح......“

”لیکن اس کے باوجود تم نے میری محبت اور جذبات کی قدر نہیں کی۔“ وہ بولی۔

”بات یہ ہے اروناا!“ میں کہنے لگا۔ ”تم یہ چاہ رہی تھیں کہ ہم بہک جائیں اس لئے تم نے تالاب میں نہانے کی تجویز پیش کی۔ نہانے کی صورت میں ہم بہت دور چلے جاتے۔ لیکن میرا ایسا کوئی دور دور تک ارادہ نہ تھا۔ میں تم پر کوئی داغ لگا کر گناہگار ہونا نہیں چاہتا اور نہ ہی تمہاری ماں کو دھوکا دینا چاہتا ہوں۔ تم ایک امانت کی طرح ہو جسے میں جوں کا توں تمہاری ماں تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ تم مجھے بددیانتی پر مت ورغلاؤ؟“

”اس میں بددیانتی اور فریب کی کیا بات ہے؟“ اروناا نے مجھے وارفتہ نگاہوں سے دیکھا۔ اس کے نازک لبوں پر مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔

”میرے ذمے جو مشن سونپا گیا ہے وہ یہ ہے کہ میں تمہیں بہ حفاظت پہنچاؤں نہ کہ کامیابی کی صورت میں تم سے دل بہلاؤں؟ اور اب میں ایک اس خطرے کی وجہ سے پریشان ہو رہا ہوں۔“

”کیسا خطرہ......؟“ اروناا کے حسین چہرے پر گہرا استعجاب چھا گیا۔ اس نے منجمد نظروں سے دیکھا۔ ”مجھے تو کوئی خطرہ محسوس نہیں ہو رہا ہے۔“

”یہ خطرہ میری ذات کا نہیں بلکہ تمہاری ذات کو لاحق ہوگا۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں مرکوز کر کے کہا۔ ”اس لئے جلد نکل چلو۔“

”تمہیں وہم ہو گیا ہے۔“ اروناا ہنس کر بولی۔ ”میری ذات کو کیا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ تم خوامخواہ ہراساں اور پریشان ہو رہے ہو۔“

”یہ میرا وہم نہیں ہے۔“ میں نے تکرار کے انداز میں کہا۔ ”تم بلا کی حسین ہی نہیں بلکہ پرشباب بھی ہو...... تم میں اتنی کشش، دلکشی اور جاذبیت ہے کہ قابو مہاراج اور گرو جادوگر کی نیت میں فتور آ گیا ہے۔ میں حیران ہوں کہ انہوں نے تمہیں میرے حوالے بغیر چوں چرا کے کیسے کر دیا؟ تم سے فائدہ کیوں نہیں اٹھایا...... لیکن اب وہ پچھتا رہے ہوں گے۔ تمہاری یاد تڑپا رہی ہوگی، وہ اب تمہاری تلاش میں نکل سکتے ہیں۔ اگر تم ان کے ہاتھ لگ گئیں تو پھر وہ تمہیں ساری زندگی اپنی دسترس میں رکھیں گے۔ موت ہی تمہیں ان سے نجات دلا سکے گی۔“

”وہ ایسا ہرگز نہیں کریں گے تم اطمینان رکھو۔“ وہ بولی۔ ”تم ان کا ڈر اور خوف دل سے نکال دو۔ صرف میرے بارے میں سوچو۔“

”میں تمہارے بارے میں یہ سوچ رہا ہوں کہ کیوں نہ تمہاری محبت، دوستی اور مہربانی کو قبول کرلوں۔“ میں نے کہا۔ ”ہم جب یہاں سے نکل کر کلکتہ پہنچیں گے تو وہاں کسی اچھے ہوٹل میں دو تین دن ٹھہر جائیں گے۔ چلو...... اب تو تم خوش ہو نا؟“

”سچ سکندر!“ اروناا خوشی سے دیوانی ہو گئی اور اس کا چہرہ گلابی ہو گیا۔

اروناا بے خود ہونے لگی تو میں اسے لے کر تیزی سے محل کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ معلوم نہیں کیوں اس کا ذہن اس قدر پراگندہ ہو رہا تھا کہ وہ مجھے غلاظت کے دلدل میں گرانے کے لئے تلی ہوئی تھی۔ اس لئے میں چاہ رہا تھا اسے سرسری محل کی سیر کرا کے نکل جاؤں۔ مجھے محل دیکھنے کی ایسی کوئی خواہش نہیں تھی اور نہ ہی دلچسپی...... اسے بڑا اشتیاق ہو رہا تھا۔ اگر میں اسے باز رکھنے کی کوشش کرتا تو وہ باز نہیں آتی...... اور پھر اس بات کا کوئی احساس اور ڈر اور خوف نہیں تھا کہ قابو مہاراج اور گرو جادوگر اسے پھر اغوا کرلیں۔ وہ بے خوف سی تھی۔ میرے احساس دلانے پر اس نے کوئی اثر نہیں لیا تھا۔

محل کا داخلی دروازہ بڑی مضبوط لکڑی کا اور منقش تھا۔ سات سو برس گزر جانے کے باوجود وہ آج بھی ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے کل ہی بنا ہو۔ یہ دروازہ کوئی بیس فٹ اونچا اور اتنا ہی چوڑا ہوگا۔ اس میں لکڑی کا بنا ہوا ایک گول ہینڈل تھا۔ گاڑی کے اسٹیئرنگ کی طرح...... اروناا نے آگے بڑھ کر اسے دائیں طرف گھمایا تو چند لمحوں کے بعد دروازہ ذرا سا کھل گیا۔ یہ لکڑی کا دروازہ اتنا بھاری تھا کہ ایک عام آدمی کا اندر کی طرف دھکیل کر کھولنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ کم از کم دو آدمی جو بہت قوی ہوں وہی کھول سکتے تھے۔ لیکن اروناا نے اسے صرف ایک ہاتھ سے بڑی آہستگی سے اندر کی طرف دھکا دیا تو وہ اس طرح سے کھل گیا جیسا کوئی عام قسم کا دروازہ ہو۔ دروازہ صرف اتنا کھلا تھا کہ دو تین آدمی بیک وقت اندر جا سکیں۔ دروازے کے کھلتے ہی روشنی باہر آئی جیسے اندر کوئی مشعل جل رہی ہو۔ جب ہم دونوں اندر داخل ہوئے تو روشنی کی وسعت کی لپیٹ میں آ گئے۔ یہ ایک بہت بڑا ہال تھا۔ اس میں مہاراجا دربار لگاتا تھا اور بالکل

سامنے ایک اونچی جگہ تھی جس پر ایک تخت شاہی رکھا ہوا تھا۔ اس کے دائیں بائیں اونچی کرسیاں تھیں جن کی گدیاں مخمل کی بنی ہوئی تھیں۔ تخت اور کرسیاں ہی نہیں بلکہ اس ہال کی دیواریں بھی نیلے رنگ کی تھیں۔ اس محل کے راجہ کو شاید نیلا رنگ بہت پسند تھا۔

اس ہال میں ایک دو نہیں بلکہ کوئی دس بارہ بڑی بڑی مشعلیں روشن تھیں۔ جس سے زندگی کے آثار مل رہے تھے۔ یہ محل جو صدیوں سے بند پڑا تھا اس کے ہال میں جلتی مشعلیں دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ پھر میں نے اپنے جادو کے زور سے معلوم کیا کہ قابو مہاراج اور گرو جادوگر یہ مشعلیں جلاتے ہیں۔ اس پورے ہال میں ایک عجیب اور پراسراری خاموشی چھائی ہوئی تھی اور دل دہلا دینے والا سناٹا پورے ماحول پر مسلط تھا۔ ہر چیز سے دہشت سی ٹپک رہی تھی۔ ایک ان جانی طاقت تھی جو باہر کی طرف غیر محسوس انداز سے دھکیل رہی تھی۔ قابو مہاراج نے شاید یہ سوچا نہیں ہوگا کہ ہم محل اندر سے دیکھنے بھی جا سکتے ہیں۔ کیوں کہ ہم نے اس سے کہا تھا کہ ہم جتنا جلد ہو سکے۔ جنگل سے نکل جانا چاہتے ہیں۔ اندھیرے اور رات ہونے کے خیال سے خوفزدہ اور پریشان ہیں۔ اس لئے اس کا خیال اس طرف گیا نہیں ہوگا۔ اگر اسے اس بات کا ذرا برابر بھی اندازہ ہو جاتا کہ ہم محل اندر سے دیکھنے کی کوشش کریں گے تو پھر وہ شاید ڈراتا اور کہتا کہ بھولے سے بھی محل کے اندر قدم رکھنے کی کوشش نہ کرنا۔ اس محل میں بلائیں ہیں جو تمہیں موت کے گھاٹ اتار دیں گی۔

دیواروں پر دیوی اور دیوتاؤں کے علاوہ مرد اور عورتوں کی نیم برہنہ اور ایسی لغو قسم کی تصویریں بڑے ماہرانہ انداز سے بنائی ہوئی تھیں کہ مرد اور عورتوں کے جذبات قابو میں نہ رہ سکیں اور وہ بہک جائیں۔ ارونا ان تصویروں کو قریب سے اور بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ جس سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور اس کی بڑی بڑی خوبصورت سیاہ آنکھوں میں گلابی ڈورے تیرنے لگے تھے اور خود سپردگی بھی جھانک رہی تھی۔ اس کے سینے میں سانسوں کا تلاطم ہچکولے کھا رہا تھا۔ وہ ان تصویروں میں ایسی کھوئی ہوئی اور ان جانے تصورات میں جانے کہاں بھٹک رہی تھی کہ اسے اپنی سدھ بدھ نہیں رہی تھی۔ ارونا کے بشرے سے اس کی دلچسپی حیرت اور تجسس ظاہر ہو رہا تھا۔ ایسے ماحول میں اس کا خوف زدہ نہ ہونا، بے فکری اور تعجب کی ہی بات تھی۔

میں ان واہیات تصویروں سے نظریں بچا رہا تھا۔ راجہ مہاراجا بڑے عیاش پرست ہوتے تھے۔ عورت اور شراب ان کی کمزوری ہوتی تھی۔ انہیں رنگینیوں اور عورتوں کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا۔ ایسی تصویریں جو ان کے جذبات کو تسکین پہنچاتی تھیں وہ ان کے کمروں میں آویزاں ہوتی تھیں۔ نیلا مندر اور نیلے محل کا راجہ اور اس کی پشت بھی عیاش اور حسن پرست گزری تھی اس لئے ان تصویروں کا وجود تھا۔

میں ارونا کی طرف بڑھا تا کہ اسے ان تصویروں کے طلسم سے نکالوں جن کی وہ اسیر ہو کر رہ گئی ہے۔ اسے کسی بات کا ہوش اور جلد سے جلد محل دیکھ کر نکل جانے کا خیال ہی نہیں رہا ہے۔ میری آہٹ پا کر اس نے میری طرف مڑ کر دیکھا اور دل فریب انداز میں مسکرائی۔

''سکندر!'' اس نے وارفتہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''ان تصویروں کو دیکھا تم

نے......؟ تمہارا ان تصویروں کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''مجھے ان تصویروں سے چوں کہ ذرہ برابر بھی دلچسپی نہیں ہے اس لئے میں نے انہیں دیکھا نہیں ہے۔'' میں نے قدرے بیزاری اور اکتاہٹ سے کہا۔ ''اگر تم اس تصویر کو اس طرح دیکھتی رہیں تو پھر صبح ہو جائے گی۔ جلدی سے محل دیکھ کر نکل پڑو۔ مجھے ایک خوف سا آ رہا ہے۔''

''میں تو ایسی کوئی بات محسوس نہیں کر رہی ہوں۔'' ارونا بولی۔ ''یہ تمہارا واہمہ ہے...... اچھا ایسا کرو کہ وہ جو تخت رکھا ہے اس کے دائیں اور بائیں جانب دروازے ہیں جو یہاں سے نظر آ رہے ہیں۔ تم ایسا کرو کہ میں دائیں دروازے سے محل کے اندر جاتی ہوں۔ تم بائیں دروازے سے جاؤ۔ صرف آدھا گھنٹہ دے دو۔ آدھے گھنٹے میں جتنی محل کی سیر کر سکتی ہوں کر کے ہال میں آ جاؤں گی۔ کسی وجہ سے شاید پانچ سات منٹ دیر ہو جائے تو انتظار کر لینا...... لیکن دیر نہیں ہوگی۔ اگر تمہیں کسی وجہ سے دیر ہو جائے تو میں تمہارا انتظار کروں گی۔ کیوں ٹھیک ہے نا سکندر......!''

میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور بائیں بغلی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ پھر ایک دم سے ٹھٹک کے رک گیا۔ میں رکا نہیں تھا بلکہ کسی نادیدہ ہستی نے جیسے میرے قدم جکڑ لیے تھے اور پھر میرے کانوں میں ایک کرخت آواز گونجی۔ ''اے مورکھ...... تو محل سے نکل جا ورنہ تو زندہ نہیں بچے گا...... اور ہاں آگے جانے کی ضرورت نہیں۔ ورنہ بھسم ہو جائے گا۔ تیری یہ کیسی ہمت ہے کہ تو محل دیکھنے اندر جا رہا ہے۔''

میں نے ارونا کی طرف دیکھا۔ وہ دائیں جانب والے بغلی دروازے میں داخل ہو کر میری نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ مجھے کوئی خوف تو محسوس نہیں ہوا لیکن حیرت اور تجسس اس بات پر ہوا کہ اس نادیدہ ہستی نے ارونا کو اندر جانے سے کیوں نہیں روکا۔ ہو سکتا ہے کہ ارونا کو بھی روکا ہو...... ارونا نے یہ گونجتی ہوئی آواز ضرور سنی ہوگی، گو کہ اس آواز نے صرف مجھے مخاطب کیا تھا۔ ارونا کا سنی ان سنی کر کے جانا حیرت کی ہی بات تھی۔

میں تھوڑی دیر تک وہیں کھڑا رہا۔ جیسے میں نے اس نادیدہ ہستی کی بات سنی نہ ہو۔ وہ نادیدہ آواز بار بار مجھ سے محل سے باہر جانے کو کہہ رہی تھی۔ دھمکیاں دے رہی تھی۔ ڈرا رہی تھی۔ میں تھا کہ ٹس سے مس ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ پھر مجھے ایک خیال آیا تو میں بھی تیزی سے دائیں والے دروازے کی جانب لپکا تو پھر وہی آواز للکارنے لگی۔ ''میں کہتا ہوں رک جا...... رک جا...... ورنہ تجھے بھرشٹ کر دوں گا...... باز آ جا اندر جانے سے......''

میں نے اس کی دھمکی کی کوئی پروا نہیں، چند لمحوں کے بعد میں ایک لمبی سی راہ داری میں تھا۔ دو رویہ کمرے بنے ہوئے تھے۔ میں نے درمیان کے ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا کہ شاید اس کمرے میں ارونا ہو۔ مجھے راہ داری میں ارونا دکھائی نہیں دی تھی۔ اس کمرے کا دروازہ میں نے اس لئے کھولا تھا کہ اس کا دروازہ تمام کمروں کے دروازوں کے مقابلے میں بڑا منقش اور خوبصورت تھا۔ یہ کمرہ ایک نہایت آراستہ خواب گاہ تھا۔ یہ خواب گاہ راج کمار یا راج کماری کی رہی ہوگی۔ میں ابھی اس خواب

گاہ کا جائزہ لے رہا تھا کہ پشت پر سسکیوں کی آواز سنائی دی۔

میں اس خواب گاہ کی دہلیز پر کھڑا ہوا تھا۔ یہ آواز سامنے والے کسی کمرے سے آئی تھی۔ میں دروازہ بند کر کے پلٹا، کوئی لڑکی سسکیاں لے رہی تھی۔ جب میں اس کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا جس میں سے سسکیوں کی آواز آ رہی تھی تب میرے کانوں میں پھر ایک عورت کی آواز لہرائی۔

''تم اس کمرے میں نہ جاؤ...... یہ کسی بدروح کے رونے کی آواز ہے یہ تمہیں دھوکے سے بلا رہی ہے۔ اس ویران اور سنسان محل میں، بدروحوں کا بسیرا ہے...... اگر تم اس کمرے میں گئے تو اس کمرے میں بدروحیں موجود ہیں، وہ تمہارا خون پی جائیں گی۔''

اس آواز پر ارونا کی آواز کا دھوکا ہو رہا تھا۔ جو عورت بول رہی تھی اور مجھے اس کمرے میں جانے سے روک رہی تھی وہ ارونا کے لہجے کی نقل اتار رہی تھی۔ یہ ارونا نہیں بلکہ کوئی بدروح ہی تھی۔ میں نے بلند آواز میں کہا۔ ''محل میں بدروحوں کا کیا کام؟ تم جھوٹ بول رہی ہو......؟''

''وہ گھر جو دو ایک برس بالکل خالی اور ویران رہے اس میں بدروحوں کا بسیرا ہو جاتا ہے۔ جب کہ یہ محل صدیوں سے غیر آباد اور ویران پڑا ہوا ہے۔''

''لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم کون ہو اور مجھے اس کمرے میں جانے سے کیوں منع کر رہی ہو؟'' میں نے پوچھا۔ ''یہ ہمدردی کس لئے جب کہ میں تمہیں جانتا تک نہیں......''

''دراصل میں ایک اچھی روح ہوں۔'' وہ بولی۔ ''میں اچھے لوگوں کی مدد کرتی ہوں اور انہیں بدروحوں سے بچاتی ہوں جو انسانی خون کی پیاسی ہوتی ہیں۔ جب کوئی سیاح، اجنبی اور بھولا بھٹکا مسافر اس محل میں اسے دیکھنے کے لئے آتا ہے ان بدروحوں کی بڑی کوشش ہوتی ہے وہ اسے کسی فریب اور دھوکے سے اسے کمرے میں بلا لیں۔ کئی دفعہ ہوا کہ کچھ لوگوں نے میری بات نہیں مانی وہ کمرے میں اس خیال سے گھس گئے کہ اس لڑکی کی مدد کریں۔ انہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ وہ بدروحیں نہ صرف اس کا خون پی گئیں بلکہ اسے کھا بھی گئیں۔''

''لیکن میرا دل اندر سے کہہ رہا ہے کہ یہ کوئی دکھیاری ہے۔ جو اپنی بے بسی پر رو رہی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ کوئی بدمعاش اس عورت کو کہیں سے اغوا کر کے لایا ہے اور کمرے میں بند کر کے چلا گیا ہے کہ رات کو آ کر اس کے ساتھ اپنے دل کے ارمان پورے کرے۔''

''کسی بھی بدمعاش کو اتنی دور کسی عورت کو لا کر یرغمال بنا کر رکھنے کی کیا ضرورت پڑی۔'' اس نادیدہ ہستی نے تکرار کے انداز میں کہا۔ ''کیا اسے کسی عورت کو لانے کے لئے یہی ایک جگہ رہ گئی ہے۔ تم اس کے بارے میں غلط سوچ رہے ہو۔ یہ بڑی مکار بدروح ہے۔''

''تم کچھ بھی کہہ لو......'' میں نے کہا۔ ''میں اس کمرے میں ہر صورت میں جاؤں گا۔ کیوں کہ بدروح میرا بال تک بیکا نہیں کر سکتی...... یہ عورت جو سسکیاں بھر رہی ہے یہ بدروح نہیں ہو سکتی...... اور مجھے بدروحوں پر قابو پانا آتا ہے۔ تم مجھے ان سے خوف زدہ نہیں کرو۔''

جب میں دروازے کی کنڈی کھولنے لگا تو وہ ایک دم سے جیسے انگارہ بن گئی۔ میں نے اس کنڈی کو اس طرح پکڑے رکھا جیسے وہ کوئی برف کا ٹکڑا ہو۔ اس نادیدہ ہستی نے اسے انگارے جیسا اس لئے بنا دیا تھا کہ میں کنڈی کھول کر اندر جا نہ سکوں۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کا ہاتھ بری طرح جھلس جاتا۔ وہ کھول نہ پاتا وہ نہیں چاہتی تھی کہ میں اندر جاؤں۔ جب میں نے کنڈی کھول دی تو اس نے دروازہ جام کر دیا۔ اس ہستی کو نہیں معلوم تھا کہ اس کا واسطہ کس سے پڑا ہے۔ وہ اپنی ان حرکتوں سے میرا راستہ روک نہیں سکتی تھی۔ میرے ایک ذرا سا دھکا دینے پر دروازہ کھل گیا۔

دہلیز پار کر کے میں کمرے میں داخل ہوا تو دروازہ دھڑ سے آپ ہی آپ بند ہو گیا۔ پھر ایک نسوانی قہقہہ فضا میں بلند ہوا۔ پھر اس نسوانی آواز نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ''اب میں دیکھتی ہوں تم کیسے باہر نکلتے ہو...... گرو جادوگر رات کو آئیں گے تو دیکھنا تمہارا حشر کیا ہو گا؟''

میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ اس بے وقوف نادیدہ ہستی کو اب بھی اس بات کا اندازہ نہیں ہوا تھا کہ میں کیا ہوں۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرے کے ایک کونے میں جو ایک لمبی چوڑی مسہری تھی اس پر کوئی تین چار لڑکیاں فکر مند اور پریشان بیٹھی ہوئی تھیں۔ فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔ اس پر کوئی چار عورتیں بیٹھی تھیں۔ وہ شادی شدہ معلوم ہو رہی تھیں۔ ان میں سے ایک عورت رو رہی تھی۔ یہ تمام لڑکیاں اور عورتیں بلا کی حسین تھیں۔ انہوں نے مجھے چونک کر دیکھا تھا اور نادیدہ ہستی کی آواز سن کر بھی وہ چونکی تھیں۔ جو عورت رو رہی تھی اس نے رونا موقوف کر دیا اور آنسو پونچھ کر مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے اس لڑکی کے پاس جا کر ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔ ''کیا بات ہے، تم رو کیوں رہی ہو؟ تم سب کو کس نے یہاں بند کیا ہوا ہے؟''

''قابو مہاراج اور گرو جادوگر نے......'' اس عورت نے ایک سسکی بھری۔ ''مجھے آج صبح ہی اٹھا کر یہاں لایا گیا ہے تاکہ میری عزت تار تار کی جا سکے۔ ان سب کو وہ دونوں اٹھا کر لائے ہیں اور بہت دنوں سے بند کر کے رکھا ہوا ہے اور ان کی عزت سے کھیلا جاتا ہے...... بھگوان کے لئے آپ یہاں سے ہمیں نکال دیں۔ ان شیطانوں نے ہمیں کھلونا بنا رکھا ہے۔ وہ ہم پر بہت ظلم کرتے ہیں۔''

''تم لوگ گھبراؤ نہیں......'' میں نے ان سب کو دلاسا دیا۔ ''تم لوگوں کو بہت جلد آزادی نصیب ہو گی۔ میں تمہیں یہاں سے نکال لے جاؤں گا۔''

میری بات سن کر سب کے چہرے دمک اٹھے۔ لیکن ان میں سے ایک عورت نے افسردگی سے کہا۔

''یہ ناممکن ہے۔ اب تو آپ کو بھی قید کر دیا گیا ہے۔''

''ناممکن کیوں ہے؟'' میں نے کہا۔ ''کوئی بات ناممکن نہیں ہے۔ تم لوگ وشواش رکھو۔ مجھے قید نہیں کیا گیا، نہ اب تم لوگ قید ہو۔''

''اس لئے کہ قابو مہاراج اور گرو جادوگر نہ صرف بہت بڑے جادوگر ہیں، بلکہ خطرناک اور شقی القلب بھی ہیں۔ آپ ان سے ٹکر نہیں لے سکتے۔''

"میرے لئے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ کیا ہیں اور کیا نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن تم یہ بتاؤ کہ آج تم صرف یہاں لائی گئی ہو یا کوئی اور بھی تھی؟"

"میرے پڑوس میں ایک نوجوان لڑکی کامنی تھی اسے بھی میرے ساتھ ہی لایا گیا۔ وہ صبح میرے ساتھ ہی بازار جانے نکلی تھی۔" عورت نے کہا۔

"کامنی کون ہے......؟ کہاں ہے وہ......؟" میں نے ان تمام لڑکیوں اور عورتوں پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈال کر پوچھا۔

"ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک بہت ہی خوبصورت نوجوان لڑکی آئی تھی۔" وہ بولی۔ "وہ اسے یہاں سے یہ کہہ کر لے گئی کہ قابو مہاراج نے بلایا ہے۔"

"اچھا......" میں نے یہ کہہ کر ایک پل میں چشم تصور میں دیکھا۔ اروna اس لڑکی کو محل کے پائیں باغ کی طرف تیزی سے لے جا رہی ہے۔ میں نے دوسرے پل چشم تصور سے نکل کر کہا۔ "میں کامنی کو لانے جا رہا ہوں۔ میرے آنے تک کوئی یہاں سے نہیں جائے گا۔ میں آ کر تم سب کو نکال لے جاؤں گا۔"

"لیکن قابو مہاراج......؟" دوسری عورت نے دہشت زدہ ہو کر کہا۔ "وہ آپ کو زندہ نہیں چھوڑے گا نہ ہی یہاں سے جانے دے گا۔"

"تم اس کی کسی بات کی چنتا نہ کرو۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "میرے ہوتے ہوئے تم سب کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور نہ ہی یہاں سے جانے سے روک سکتا ہے۔" میں نے دروازے کے پاس جا کر ایک پھونک ماری تو دروازہ آپ ہی آپ کھل گیا۔ وہ نادیدہ ہستی اب یہاں نہیں تھی۔ میں نے اسے دیکھ لیا تھا لیکن اس پر اس وقت یہ ظاہر ہونے نہیں دیا تھا کہ میں نے اسے دیکھ لیا ہے اور دیکھ سکتا ہوں۔ وہ ایک بدروح تھی جو محل میں قابو مہاراج نے ان عورتوں اور لڑکیوں کی نگرانی اور پہرے کے لئے رکھ چھوڑی تھی کہ وہ یہاں سے فرار ہونے کی کوشش نہ کریں۔

میں جب محل کے پائیں باغ میں پہنچا تو دیکھا کہ وسیع و عریض سبزہ زار جو درختوں سے گھرا ہوا تھا وہاں اروna اور کامنی اس پر دراز تھیں۔ اروna کی آغوش میں وہ لڑکی سحر زدہ سی ہو کر بے جان سی پڑی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس نے اپنے آپ کو پوری طرح اروna کے حوالے کر دیا تھا۔ اپنا تن من جیسے پوری طرح سونپ دیا تھا۔ اب وہ پوری طرح اروna کی دسترس میں تھی۔ اروna اس کے رخساروں پیشانی اور ہونٹوں پر بوسے ثبت کر رہی تھی جس سے اس لڑکی پر ایک نشہ سا طاری ہو رہا تھا۔ جب اروna نے دیکھا اور محسوس کیا کہ کامنی پوری طرح مدہوش ہو چکی ہے تو یک لخت اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اس کا چہرہ خوفناک اور بے حد مکروہ ہو گیا۔ اس کی آنکھیں ایسی لال لال ہو گئیں جیسے ان میں جسم کا سارا خون سمٹ آیا ہو پھر ان میں ایک سفاکانہ سی چمک پیدا ہوئی۔ پھر وہ کامنی کو اس طرح گھورنے لگی جیسے کئی دنوں کا بھوکا درندہ اپنے شکار کو گھورتا ہے۔ پھر اس نے کامنی کو اوپر سے نیچے تک للچائی ہوئی نظروں سے ایک ندیدے کی طرح دیکھا۔ پھر وہ کامنی کے چہرے پر جھکنے لگی تو اس کے چار نوکیلے دانت نکل آئے جو تین

انچ کے تھے۔ ان کی نوکیں نیزے کی انی کی طرح تیز تھیں اور چمک رہی تھیں۔ وہ اپنے دانت اس کی گردن میں گاڑنے والی تھی کہ میں چلایا۔

"رک جاؤ اروna...... خبردار جو تم نے اس کا خون چوسنے کی کوشش کی...... اسے چھوڑ دو۔"

اروna اس طرح اچھل پڑی جیسے اسے ہزار وولٹ بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ اس نے کامنی کو اپنی آغوش سے نکال کر سرعت سے میری طرف پلٹ کر دیکھا۔ اس کی لال لال آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر بیک وقت نفرت، حقارت اور غصے کی لکیریں ابھر آئیں۔

"تم...... تم...... یہاں کیسے آ گئے؟" اروna کو بڑی حیرت ہو رہی تھی۔ "کیا تمہیں گیتو نے نہیں روکا......؟ میں نے اس سے کہا تھا کہ تمہیں روکے رکھے۔"

"میں کیسے آیا یہ تم جان کر کیا کرو گی؟" میں نے کہا۔ "تمہاری گیتو نے مجھے کمرے میں قید کر دیا تھا لیکن میں نہ صرف اس کمرے سے نکل آیا بلکہ الٹا اسے تہ خانے میں قید کر دیا...... اب تم یہ ناٹک بند کرو۔ کامنی کو چھوڑ دو...... میں تمہیں اس کا خون پینے نہیں دوں گا۔"

"میں جب تک اس کا اور دو اور کنواری لڑکیوں کا خون نہ پی لوں شانت نہیں ہو سکتی۔" وہ خشونت بھرے لہجے میں بولی۔ "میں کوئی ناٹک نہیں کر رہی ہوں...... کامنی کے بعد میں تمہارا پھر اس کے بعد لڑکیوں کا خون پیوں گی۔ تم میرے ہاتھوں سے بچ نہیں سکتے......"

"سنو......" میں کہنے لگا۔ "تم کیا...... تمہارا گرو جادوگر اور قابو مہاراج بھی مل کر میرا بال تک بیکا نہیں کر سکتے...... جب قابو مہاراج تمہیں اروna کے روپ میں لایا تو میں نے اسی وقت جان لیا تھا کہ تم اروna نہیں ہو۔ میں تمہیں وہاں سے اس لئے لے کر چلا تھا کہ تمہارا حشر نشر کر دوں اور تمہیں ختم کر دوں۔ اس لئے تمہیں میں نے گود میں اٹھا کر آگ کے تالاب میں پھینک دیا تھا۔ قابو مہاراج نے تمہیں بچا لیا ورنہ تم اس آگ کے تالاب میں ہی ختم ہو جاتیں۔ مجھے تم پر اسی وقت شبہ ہو گیا تھا جب میں نے تمہیں گود میں اٹھا کر تالاب میں پھینکا تھا کہ تم لڑکی نہیں بلکہ بدروح ہو، اس وقت بھی جب تمہیں گود میں اٹھا کر محل تک لایا تھا۔ تم نے اپنی باتوں اور حرکتوں سے اس بات کی کوشش کی تھی کہ میں جذبات کی رو میں بہہ جاؤں اور تم اس ے ندہ اٹھا کر میرا خون پی جاؤ اور مجھے ختم کر کے شمشان گھاٹ لے جا کر پھینک دو تاکہ وہاں جو بدروحیں ہیں میں ان کی خوراک بن جاؤں...... تم محل میں بھی اس لئے لائی تھیں لیکن کامنی کو دیکھ کر سوچا کہ پہلے اسے شکار کروں...... کیا تمہیں ان باتوں سے انکار ہے......؟ اب میں نے تمہاری شکتی ختم کر دی ہے۔ اب تم صرف ایک بدروح ہو۔ تم کسی کا اب کچھ نہیں بگاڑ سکتی......"

"مجھے قابو مہاراج اور گرو جادوگر نے شکتی دی ہوئی ہے۔" وہ غرائی۔ "مجھے تمہارا اور کامنی کا خون چاہیئے۔ وہ میں پی کر رہوں گی۔"

"اگر یہ بات ہے تو تم پہلے کامنی کا خون پی کر دکھاؤ......؟" میں نے کہا۔ "پھر تم میرا خون مزے لے کر پی لینا۔ میں تمہیں خون پینے سے روکوں گا نہیں۔"

’’تمہیں...... میری بات کا یقین نہیں آ رہا ہے؟‘‘ وہ تنک کر بولی۔ ’’ٹھیک ہے میں تمہیں کامنی کا خون پی کر دکھاتی ہوں۔ یہ دیکھو......‘‘

یہ کہہ کر اس نے کامنی کو اپنی آغوش میں بھر لیا۔ دوسرے لمحے وہ کامنی کے چہرے پر جھکی، اس نے جیسے ہی کامنی کی گردن میں دانت پیوست کرنے چاہے ایک جھٹکے سے الگ ہوگئی۔ اس کے دانت ٹوٹ کر گر گئے اور اس کے منہ میں آگ بھر گئی۔ اس کے سارے جسم میں آگ لگ گئی۔ میں نے فوراً ہی تیزی سے لپک کر کامنی کو بچا لیا تاکہ وہ جھلسنے سے بچ جائے۔ اس کے سارے بدن میں آگ بھڑکتی گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے شعلوں میں بدل گئی۔ پھر وہ ہذیانی لہجے میں چیخنے چلانے لگی...... ’’بچاؤ...... قابو مہاراج...... گرو جادوگر...... میں جل رہی ہوں...... اس کمینے سکندر نے مجھے جلا دیا...... مجھے بھسم کر دیا ہے...... میں تڑپ رہی ہوں۔‘‘

میں نے چوں کہ اس کی آواز کی ناکہ بندی کر دی تھی اس لئے وہ ان دونوں تک پہنچ سکتی تھی اور نہ ہی انہیں اس بات کی خبر ہو سکتی تھی۔ اب بدروح خاک ہو چکی تھی۔ اب راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہی تھی۔ قابو مہاراج اور گرو جادوگر نے مجھے بے وقوف بنایا تھا۔ لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ میں نے انہیں بے وقوف بنایا ہے۔ میں ان دونوں کو بے بس اور ناکارہ کر سکتا تھا۔ لیکن اس لئے نہیں کیا کہ انہیں غلط فہمی میں مبتلا رکھوں۔ یوں بھی وہ مجھے کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے اور میں یہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ میرے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہیں۔

اس بدروح نے کامنی کو منتر پڑھ کر بے ہوش کیا ہوا تھا۔ میں نے اس پر منتر پڑھ کر پھونکا تو کامنی پر سے اس بدروح کا سحر ٹوٹ گیا۔ بدروح نے اس پر جو مدہوشی طاری کی تھی وہ بے ہوشی کی سی صورت تھی تاکہ کامنی کا خون پی سکے اور من مانی بھی کرے۔ کامنی نے مجھے ہوش میں آتے ہی دیکھا تو وہ خوف زدہ سی ہوگئی اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ ’’وہ...... وہ عورت کہاں ہے؟‘‘

’’وہ عورت بھاگ چکی ہے۔‘‘ میں نے اس سے کہا۔ ’’وہ عورت نہیں تھی ایک بدروح تھی جو تمہیں یہاں اس لئے لائی تھی کہ تم سے کھیل سکے اور تمہارا خون پی جائے...... لیکن میں نے اسے بھگا دیا۔ تمہارا خون پینے نہیں دیا۔ چلو...... میرے ساتھ چلو۔ اب تم خیریت سے ہو۔‘‘

’’وہ عورت بھاگ گئی......‘‘ کامنی نے حیرت اور خوشی سے کہا۔ ’’اوہ بھگوان...... وہ کیسی عورت تھی۔ جتنی حسین تھی اتنی ہی فاحشہ قسم کی تھی۔ اس نے میرے ساتھ ایسی ناشائستہ حرکتیں کیں کہ مجھے بتاتے ہوئے لاج آ رہی ہے...... کوئی عورت ایسی رذیل ہو سکتی ہے۔‘‘ کامنی کا چہرہ کسی ان جانے خیال سے سرخ ہوگیا۔

جب میں اسے محل کے اندر کی طرف لے جانے لگا تو وہ چلتے چلتے ایک دم سے ٹھٹک کر رک گئی۔ ’’یہ آپ مجھے کہاں لے کر جا رہے ہیں؟‘‘ وہ خوف زدہ ہو کر بولی۔ ’’نہیں...... نہیں...... میں محل میں نہیں جاؤں گی۔ آپ مجھے میرے گھر لے جا کر چھوڑ دیں۔ محل میں پھر قید ہو جاؤں گی۔‘‘

’’میں تمہاری پڑوسن دیدی کے پاس لے جا رہا ہوں۔‘‘ میں نے اسے تسلی دی۔ ’’وہاں تمہارا انتظار

ہو رہا ہے۔ تمہیں اور وہاں قید عورتوں اور لڑکیوں کو میں نکال کر لے جانے آیا ہوں۔ گھبراؤ نہیں...... میں تم سب لوگوں کو تمہارے گھروں کو پہنچا دوں گا۔ اب تم لوگ محفوظ ہو۔‘‘

’’لیکن آپ ان دو جادوگروں سے مجھے اور دیدی اور دوسری عورتوں اور لڑکیوں کو بچا کر کیسے لے جا سکتے ہیں؟‘‘ وہ خائف سی ہو رہی تھی۔ ’’ان دونوں بدمعاش جادوگروں نے تو مجھے اور دیدی کو اغوا کیا اور اس محل کے ایک کمرے میں لا کر قید کر دیا۔ وہ بہت ظالم اور اوباش ہیں۔ عورتیں بتا رہی تھیں۔‘‘

’’ان دونوں جادوگروں نے تم دونوں کو کس طرح اغوا کیا......؟‘‘ میں نے پوچھا۔ ’’کیا تم مجھے بتانا پسند کرو گی؟‘‘

’’میں اور دیدی بازار سودا سلف لینے نکلی تھیں۔‘‘ کامنی نے جواب دیا۔ ’’ہم دونوں ایک سنسان اور ویران گلی سے گزر رہی تھیں کہ وہ دونوں اچانک جانے کہاں سے سامنے آ گئے۔ ان میں سے ایک نے کہا...... ’’تم دونوں کتنی سندر ہو...... راج کماری اور مہارانی کی طرح...... تم ہمارے ساتھ نیلا محل چلو...... ہم تمہیں خزانے میں سے سونے اور ہیرے جواہرات کے زیورات دیں گے۔ زیورات ایسے خوبصورت اور قیمتی ہیں کہ تم نے خواب میں بھی نہیں دیکھے ہوں گے...... وہ زیورات تمہیں ہمیشہ کے لئے دے دیں گے۔ ان زیورات کو پہن کر تم دونوں بہت حسین نظر آؤ گی۔‘‘

زیورات کا سن کر میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ میرے پاس سونے کے زیورات نہیں ہیں۔ میری شادی اس لئے نہیں ہو پا رہی تھی کہ پتا جی غریب آدمی ہیں۔ وہ زیورات بنانا تو درکنار میرے لئے سونے کی ایک انگوٹھی تک خرید نہیں سکتے ہیں۔ یہ ہمیں بہت سارے زیورات دینے کی بات کر رہے تھے۔ میں نے دیدی سے کہا...... ’’یہ مفت میں زیورات دے رہے ہیں، کیوں نہ ہم لے لیں...... ہم چلتے ہیں محل......‘‘

’’جانتی ہو یہ زیورات کے بدلے میں کیا لیں گے؟‘‘ دیدی نے مجھے گھور کر دیکھا۔ ’’تم بچی ہو، ان باتوں کو سمجھ نہیں سکتیں۔‘‘

’’ہم غریب ہیں دے بھی کیا سکتے ہیں۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’یہ غریب جان کر ہماری مدد کرنا چاہتے ہیں۔ دیدی! یہ لوگ کتنے اچھے ہیں؟‘‘

’’پگلی...... یہ ہماری عزت کے عوض زیورات دان کرنا چاہتے ہیں۔‘‘ دیدی بولی۔ ’’ایک عزت ہی تو ہمارے پاس ہے، تمہاری خوبصورتی اور جوانی نے انہیں پاگل کر دیا ہے۔ وہ میری سندرتا کے بھی متوالے ہو گئے ہیں۔ تم ان کی باتوں میں نہ آؤ۔ یہ سبز باغ دکھا رہے ہیں۔‘‘

’’ہاں...... یہ بات سچ ہے۔‘‘ دوسرے نے کہا۔ ’’ہم تمہیں سونے کا زیور دے کر اس کے عوض عزت کا زیور لیں گے۔ کیا یہ سودا برا ہے؟‘‘

’’ہماری نظروں کے سامنے سے دفعان ہو جاؤ۔‘‘ دیدی نے ہذیانی لہجے میں چیخ کر کہا۔ ’’تمہارے زیورات کی ضرورت نہیں۔ ہماری عزت سستی نہیں ہے۔‘‘

دوسرے والے نے دیدی کی بات سن کر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ پھر بڑے زور سے ہنسا۔ پھر ایک

دم سے سنجیدہ ہوگیا۔ اس کا چہرہ خوف ناک ہوگیا۔ وہ کسی راکشش کی طرح دکھائی دینے لگا۔ ”ہمیں تمہیں لے جانے سے کوئی طاقت نہیں روک سکتی...... ہم تم جیسی سندر ناریوں کے قدر دان ہیں اور ان کی تلاش میں رہتے ہیں۔ تم دونوں کو آج کی رات ہم دلہنیں بنائیں گے۔ زیورات بدن پر سجائیں گے۔ تم دونوں کو لے جانا کون سا مشکل کام ہے۔“

اتنا کہہ کر اس نے کوئی منتر پڑھا اور ہماری طرف بڑھ کر باری باری ہم پر پھونکا۔ ہم دونوں بے ہوش ہوگئیں۔ پھر ہمیں کچھ خبر نہیں رہی۔ ہوش آیا تو محل کے اس کمرے میں تھیں جس کمرے میں اور لڑکیاں اور عورتیں قید تھیں۔“

جب میں اسے لے کر کمرے میں پہنچا تو اس کی دیدی اسے دیکھ کر رونا دھونا بھول گئی اور اسے اپنے سینے سے لگا کر خوب پیار کیا۔ دوسری لڑکیاں اور عورتیں بھی خوش ہوگئیں۔ میں نے کامنی کی دیدی اور دوسری عورتوں سے کہا۔ ”اب آپ لوگ یہاں سے نکلنے کی تیاری کریں۔ دن ڈوب چکا ہے، اندھیرا گہرا ہونے لگا ہے اور پھر تھوڑی دیر میں قابو مہاراج اور گرو جادوگر بھی آنے والا ہے۔ آپ لوگ اس سے پہلے نکل جائیں۔“

”اس اندھیرے میں جنگل سے باہر کیسے جائیں گی؟“ ایک عورت بولی۔ ”کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ جنگل سے باہر تک ہمیں پہنچادیں۔ آپ کی بڑی کرپا ہوگی۔ ہم ساری عورتیں اور لڑکیاں قریب قریب کے گاؤں میں دیہات میں رہتی ہیں جو یہاں سے پانچ سات میل دور ہوگا۔“

”ہال میں بہت ساری مشعلیں جل رہی ہیں ان میں سے تین مشعلیں میں نکال کر دے دوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”میں جنگل سے باہر جانے کا راستہ بھی بتادوں گا۔ لیکن میں کسی وجہ سے آپ لوگوں کو جنگل سے باہر تک نہیں لے جاسکتا۔ پھر آپ دن نکلنے سے پہلے ہی گھروں کو پہنچ جائیں گی۔“

”لیکن اس جنگل میں بہت سارے موذی جانور ہیں۔“ دوسری عورت نے کہا۔ ”ہم ان سے کیسے بچ سکیں گی۔ ہمارے پاس کوئی ایسی چیز بھی نہیں ہے کہ جس سے ہم اپنی حفاظت کرسکیں اور موذی جانوروں کو بھگا سکیں۔ اس جنگل میں سانپ اور بچھو تو کثرت سے ہیں۔“

”یہ جو مشعلیں ساتھ ہوں گی وہ حفاظت کے لئے کافی ہیں۔“ میں تے کہا۔ ”سانپ، ناگ اور بچھو آگ سے بہت ڈرتے ہیں۔ اس کے علاوہ میں ایک چھڑی دوں گا۔ یہ جادو کی چھڑی ہوگی۔ راستے میں اگر کسی موذی اور خطرناک سے خطرناک جانور نے پریشان کیا اور نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو اس چھڑی کا رخ اس کی طرف کردیں۔ وہ خوف زدہ ہوکر بھاگ نکلے گا۔ اس میں سے ایسی تیز شعاع نکلے گی کہ وہ اس کو دیکھ کر گھبرا جائے گا۔ جب جنگل سے باہر نکل آئیں اور کوئی خطرہ نہ رہے تو اس چھڑی کو پھینک دیں۔ کیوں کہ وہ چھڑی پھر کسی کام کی نہیں رہے گی۔“

پھر میں ان تمام لڑکیوں اور عورتوں کو ساتھ لے کر محل کے دربار میں آیا۔ تین جلتی ہوئی مشعلیں نکال کر ان میں سے ایسی تین عورتوں کے حوالے کیں جو صحت مند، ہوشیار اور چاق و چوبند بھی تھیں۔ ایک چھڑی جو ایک کونے میں رکھی ہوئی تھی اسے اٹھا کر کامنی کی دیدی جس کا نام راگنی تھا اس کے ہاتھ میں

تھمادی۔ یہ جادو کی چھڑی جو تھی وہ قابو مہاراج کی تھی جس سے وہ بہت سارے کام لیتا تھا۔ اس چھڑی سے ان سرکش لڑکیوں اور عورتوں کو سدھارتا تھا جو رقص کے لئے اس کی نامناسب باتوں کو نہیں مانتی تھیں۔ جب وہ اس چھڑی کا رخ اس کی بات نہ ماننے والی لڑکی کی طرف کرتا تو وہ لڑکی فوراً ہی پالتو بلی بن جاتی اور اس کی ہر بات بلا چوں و چرا مان لیتی تھی۔ میں نے اس پر ایک منتر پڑھ کر پھونک بھی دیا تھا۔ اب ان کے پاس ایک ایسا مہلک ہتھیار تھا جس سے وہ اپنی حفاظت بہ خوبی کرسکتی تھیں۔

میں ان سب کو محل سے باہر لے آیا۔ اس وقت اندھیرا بہت گہرا اور خوفناک سا ہوگیا تھا۔ میں نے انہیں بتادیا کہ انہیں اس سمت سے ناک کی سیدھ میں جانا ہے۔ راستے میں ایک تالاب اور جھیل بھی ملے گی۔ وہ نہ تو اس میں نہانے کی کوشش کریں اور نہ ہی اس کا پانی پئیں۔ اس کا پانی نہ صرف زہریلا ہے بلکہ اس میں بدروحوں کا بسیرا ہے۔ بس خاموشی اور تیزی سے گزر جائیں۔

وہ سب باری باری میرا شکریہ ادا کرکے اس سمت چل پڑیں۔ ان میں سے دو ایک لڑکیوں اور عورتوں نے میرے پیر چھونے کی کوشش کی تو میں نے انہیں سختی سے منع کردیا۔ میں اس قافلے کو اس وقت تک جاتے دیکھتا رہا جب تک وہ نظروں سے اوجھل اور اندھیرے میں گم نہ ہوگیا۔ یہ عورتیں بڑی ستم رسیدہ تھیں۔ قابو مہاراج اور گرو جادوگر نے جو کچھ کیا وہ اچھا نہیں کیا تھا۔ کامنی اور اس کی دیدی راگنی خوش نصیب تھیں کہ ان دونوں ناگوں کے ڈسنے سے بچ گئی تھیں۔ راگنی دو چھوٹے اور پیارے پیارے بچوں کی ماں تھی۔ وہ بہت ہی خوبصورت اور پرکشش عورت تھی۔ اس کی خوبصورتی اس کے لئے عذاب بن گئی تھی۔

میں نیلا مندر جاکر اروناکو وہاں سے نکالنے کے بارے میں سوچ رہا تھا جسے گرو جادوگر نے بے ہوشی کی نیند سلا رکھا تھا۔ تب میں نے آہٹ سنی۔ قابو مہاراج اور گرو جادوگر آرہے تھے۔ میں ہال میں آگیا اور اپنے آپ کو غائب کرلیا تاکہ ان کی باتیں سن سکوں۔ چند لمحوں کے بعد دونوں اندر داخل ہوئے اور سیدھے تخت کی طرف بڑھے۔ ان کے پاس شراب کی دو بڑی بڑی بوتلیں تھیں جو تپائی پر رکھ دیں۔ وہ دونوں ہی تخت پر بیٹھ گئے۔ قابو مہاراج نے کہا۔ ”صبح دس گیارہ بجے تک نبیل رقم لے کر پہنچ رہا ہے۔ کیا تم اروناکو اس کے حوالے کردو گے؟“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ہم اروناکو اس کے حوالے کردیں۔“ گرو جادوگر نے کہا۔ ”اسے بھی اس طرح بے وقوف بنانا ہے جس طرح سکندر کو بنایا۔ روشی بدروح کو ارونا کے روپ میں بھر کر نبیل کے ساتھ بھیج دیں گے اس سے رقم وصول کرکے...... روشی اس کا کریا کرم کرکے آجائے گی۔“

”لیکن تم نے تو نبیل سے وعدہ کرلیا تھا کہ رقم لے کر اروناکو اس کے حوالے کردیں گے؟ کیا تم اپنا وچن نہیں نبھاؤ گے؟“ قابو مہاراج حیرت سے بولا۔

”وچن...... ؟ کیسا وچن...... ؟“ گرو جادوگر بڑے بھونڈے پن سے ہنسا۔ ”ارونا جیسی حسین لڑکی جو خواب میں بھی نہیں ملتی ہے اسے دے دیں؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تم جانتے ہو کہ ہم ایسے نایاب نگینوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ہم اسے اس وقت تک رکھیں جب تک دل نہیں بھر

جاتا...... پھر حاتم کو بلا کر اس کے ساتھ اس کی ماں کے پاس بھیج دیں گے۔''

''یہ تم نے بہت اچھی بات سوچی ہے۔'' قابو مہاراج نے کہا۔ ''سکندر اروناکو لینے آیا تھا۔ زنگی، سکندر کا کریہ کرم کرنے اسے ساتھ لے گئی تھی وہ ابھی تک نہیں لوٹی ہے۔ لگتا ہے کہ وہ سکندر کے ساتھ جنگل میں ہنی مون منا رہی ہے۔ کیوں کہ سکندر بہت خوبصورت جو ٹھہرا......''

''راگنی اور کامنی کے بارے میں کیا حکم ہے گرو!'' قابو مہاراج نے موضوع بدلا۔ ''میں ان دونوں کو یہاں لے آؤں تاکہ انہیں بستر پر لے جانے سے پہلے ان کا ناچ دیکھیں۔ جلوے دیکھیں۔ میں نے جوگی سے سنا تھا کہ وہ دونوں ناچنے میں اتنی مہارت رکھتی ہیں کہ دیکھنے والے عش عش کر اٹھتے ہیں۔ ان کے بدن کے لوچ سے مدہوش ہو جاتے ہیں۔ ہر مہینے ان کے گاؤں کے باہر میدان میں ان کا ناچ دیکھنے کے لئے بھیڑ لگ جاتی ہے۔ نہ صرف اس کے گاؤں کے بلکہ آس پاس کے دیہات اور گاؤں کے مرد اور عورتیں لڑکیاں بھی جوق در جوق آتی ہیں۔ وہ گھنٹوں ناچتی ہیں۔ کمال یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی تھکتی بالکل بھی نہیں ہے۔''

''ہاں...... میں نے بھی یہ بات پجاری سے سنی تھی۔'' گرو جادوگر نے کہا۔ ''تم جا کر ان دونوں کو لے آؤ...... ہم ان کا ناچ ایک نئے انداز اور زاویے سے دیکھیں گے......''

قابو مہاراج اس کا حکم سنتے ہی فوراً بغلی دروازے سے ان دونوں کو لانے لپک گیا۔ گرو جادوگر نے شراب کی ایک بوتل اٹھائی، اس کا ڈھکن کھول کر منہ سے لگایا۔ دو تین گھونٹ لینے کے بعد اس نے بوتل رکھ دی۔ اس کے ہونٹوں پر مکروہ مسکراہٹ ابھر آئی اور چہرہ دمک اٹھا اور اس کی آنکھوں میں شیطانیت ناچنے لگی۔ پھر وہ ان جانے تصورات میں کھو کر دور تک چلا گیا۔ وہ شاید کامنی کا سپنا دیکھ رہا تھا۔

''مالک...... مالک!'' قابو مہاراج گرتا پڑتا بدحواسی کی حالت میں بغلی دروازے سے نمودار ہوا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔

''کیا ہوا خیریت تو ہے......؟'' گرو جادوگر نے سپنوں کی دنیا سے نکل کر اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا ان دونوں نے یہاں آنے سے انکار کر دیا......؟''

''نہیں......'' قابو مہاراج کی سانس بری طرح پھول رہی تھی۔ ''وہ دونوں کمرے میں نہیں...... دوسری تمام لڑکیاں اور عورتیں بھی غائب ہیں؟''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' گرو جادوگر ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''ہم نے دروازے کی کنڈی میں آگ بھر دی تھی۔ اسے کھولنا تو درکنار اس پر کوئی ہاتھ تک رکھ نہیں سکتا تھا...... اور ہم نے گیتو کو اس کمرے کی نگرانی اور پہرے پر رکھا تھا۔ وہ کمینی کہاں ہے؟ اس سے تم نے پوچھا نہیں کہ یہ کیا ہے؟''

''گیتو کا کچھ پتا نہیں کہ وہ کہاں گئی......؟ میں نے اسے بہت آوازیں دیں۔'' قابو مہاراج نے جواب دیا۔ ''انہیں کوئی نکال کر لے گیا ہے؟''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے......؟'' گرو جادوگر بگڑ کر بولا۔ ''کس کی کیا مجال ہے کہ وہ محل کے اندر قدم رکھ سکے۔ عورتوں کو نکال کر لے جائے؟''

''یہ دیکھئے......'' قابو مہاراج ایک دم سے اچھل پڑا۔ ''چھڑی اور تین بڑی مشعلیں بھی غائب ہیں۔ یقیناً یہ کسی کی حرکت ہے؟''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمام لڑکیاں اور عورتیں جنگل کے راستے نکل گئی ہیں......'' گرو جادوگر تیز لہجے میں بولا۔ ''لیکن یہ چھڑی کون اور کیوں لے گیا۔ کسی کو کیا معلوم کہ یہ چھڑی جادو کی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم نے کل رات اس لڑکی کو بتا دیا جسے اپنے کمرے میں لے گئے تھے؟''

''نہیں......'' قابو مہاراج نے نفی کے انداز میں سر ہلایا۔ ''مجھے کیا ضرورت پڑی تھی کہ میں بتاؤں...... لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ کنڈی کس نے کھولی۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ آپ نے کنڈی لگائی تھی اور اس پر منتر پڑھ کر پھونکا تھا۔ مجھے تو یہ پجاری کی حرکت معلوم ہوتی ہے۔''

''ہاں...... پجاری کے سوا کوئی اور یہ حرکت نہیں کر سکتا۔'' گرو جادوگر نے کہا۔ ''یہ اس کمینے کی حرکت معلوم ہوتی ہے۔ اس نے یہ کمینگی کیوں کی...... جب کہ دو ایک مرتبہ میں نے ایک عورت کو ساتھ لے جانے کی اجازت دی تھی اور پھر شراب بھی دیتا رہتا ہوں اور پھر اسے ان تمام عورتوں کو لے جانے کی کیا ضرورت تھی...... شاید اس نے کسی اور کے ساتھ مل کر سازش کی ہوگی۔ وہ انہیں دھوکے سے کہیں قید کر کے لے گیا ہے تاکہ موج اڑائے...... تم جلدی سے گولہ لے آؤ...... میں دیکھوں تو سہی...... یہ پجاری اور عورتیں کہاں ہیں؟ وہ کون لوگ ہیں جو انہیں لے گئے۔''

تھوڑی دیر میں قابو مہاراج شیشے کا ایک سفید جادوئی گولا لے آیا۔ جو ایک بڑے مٹکے کے سائز کا تھا۔ اس وقت وہ دونوں سخت اذیت اور ہیجان میں مبتلا تھے۔ غصے سے ان کے چہرے سرخ ہو رہے تھے۔ ان کے دلوں پر تازیانے لگ رہے تھے۔ عورتوں کا یہاں سے نکل جانا ان کے لئے ایسی چوٹ تھی جس کی تکلیف، درد اور جلن ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ شکار ہاتھ سے نکل جائیں گے۔

گرو جادوگر آنکھیں بند کر کے چند لمحوں تک منتر پڑھتا رہا۔ پھر اس نے آنکھیں کھول کر گولے پر تین مرتبہ پھونکا۔ دوسرے لمحے ٹی وی کے اسکرین کی طرح جنگل کا منظر دکھائی دیا۔ عورتوں اور لڑکیوں کا قافلہ جنگل کے اندھیرے میں مشعلیں لیے گزر رہا تھا۔ ان کی روشنی میں لڑکیوں اور عورتوں کے چہرے، خدوخال اور سراپا بہت صاف اور واضح دکھائی دے رہے تھے۔ ہر کوئی صاف پہچانی جا رہی تھی۔ راگنی کے ہاتھ میں جادو کی چھڑی تھی۔ وہ سب سے آگے آگے چل رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک عورت مشعل اٹھائے ہوئے تھی۔ پھر ایک دم سے راگنی اور مشعل اٹھائے ہوئے عورت ٹھٹک کے رک گئی۔ کیوں کہ ان کے سامنے اچانک ایک کالا ناگ آ گیا تھا جس کا پھن بہت چوڑا اور خوفناک تھا اور وہ کوئی بیس فٹ لمبا ہوگا۔

''اب ان سب کی شامت آ گئی......'' قابو مہاراج استہزائیہ لہجے میں بولا۔ ''اب وہ واپس بھاگ کر آئیں گی۔''

''لیکن سب سے آگے تو راگنی کھڑی ہے۔'' گرو جادوگر نے کہا۔ ''کہیں وہ اسے ڈس نہ لے...... اگر اسے ڈس لیا تو بہت برا ہوگا۔''

”وہ دیکھو...... وہ کتنی بہادری سے کھڑی ناگ کو گھور رہی ہے۔“ گرو جادوگر حیرت سے بولا۔

”معلوم نہیں یہ بات اس کے علم میں کیسے آ گئی کہ یہ جادو کی چھڑی ہے...... یہ ساری کارستانی پجاری کی ہے...... لیکن پجاری ہے کہاں...... وہ تو کہیں دکھائی نہیں دے رہا ہے۔“

اس کالے ناگ کو دیکھ کر لڑکیوں اور عورتوں کی چیخیں نکل گئی۔ خوف و دہشت سے ان کے جسم لرز رہے تھے۔ یہ جنگل تھا اور ہر طرف گھپ اندھیرا سا تھا۔ صرف وہیں روشنی تھی جہاں تک مشعلوں کی روشنی تھی۔ وہ ایک دوسرے سے چمٹ کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے کالا ناگ کو دیکھ رہی تھیں۔ راگنی نے چھڑی اٹھا کر کالا ناگ کی طرف نشست باندھی۔ دوسرے لمحے اس میں سے ایک شعاع نکلی اور اس نے کالا ناگ کو لپیٹ میں لے لیا۔ دیکھتے ہی کالا ناگ جل کر بھسم ہو گیا۔ اب اس جگہ اس کی راکھ کے سوا کچھ نہ تھا۔

یہ دیکھ کر لڑکیوں اور عورتوں کی جان میں جان آئی اور ان سب نے سکون و اطمینان کا سانس لیا پھر ان کے چہرے خوشی سے دمک اٹھے۔ پھر وہ آگے بڑھنے لگیں۔ وہ دونوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر حیرت اور غصے سے اس قافلے کو جاتے ہوئے دیکھنے لگے۔

”اس جادو کی چھڑی نے انہیں بچا لیا۔“ قابو مہاراج بولا۔ ”یہ تو بہت برا ہوا۔ اگر کالا ناگ ایک دو کو ڈس لیتا تو وہ سب کی سب اس طرف آ نکلتیں۔“

”مجھے تو رہ رہ کر اس بات پر حیرت ہو رہی ہے کہ پجاری اور اس کے وہ آدمی دکھائی نہیں دے رہے ہیں جو انہیں نکال کر لے گئے۔“ گرو جادوگر بولا۔

”مجھے ایسا لگتا ہے کہ ان عورتوں اور لڑکیوں نے مل کر ان کا قصہ ختم کر دیا ہو گا۔“ قابو مہاراج نے خیال ظاہر کیا۔ ”کیونکہ انہیں شک ہو گیا یا کسی طرح یہ بات معلوم ہو گئی ہو گی کہ انہیں فریب دے کر ایک زندان سے نکال کر دوسرے زندان میں لے جایا جا رہا ہے۔“

”تمہاری یہ بات دل کو لگ رہی ہے۔“ گرو جادوگر نے کہا۔ ”یہ عورتیں دیکھنے میں بڑی معصوم اور سیدھی سادی سی دکھائی دیتی ہیں لیکن اندر سے کتنی ہوشیار تیز اور مکار ہوتی ہیں۔ پجاری جس عورت کو لے گیا تھا اس نے پجاری کو ورغلایا ہو گا۔ پجاری اس کے فریب میں آ گیا۔ اس نے درگا مندر کے پجاریوں کو ملا لیا ہو گا۔ عورتوں کا چارہ ڈالا ہو گا، وہ بھی تو بڑے کمینے اور عورتوں کے رسیا ہیں۔“

”مالک......!“ قابو مہاراج بولا۔ ”وہ دیکھئے...... جھیل نظر آ رہی ہے۔ تھوڑی مسافت کے بعد جنگل کی حدود ختم ہو جائے گی۔ وہ خیریت سے نکل جائیں گی۔ اب ان کے لئے کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں رہا ہے۔ آپ انہیں جلدی سے جادو کے زور سے روکیں...... کیوں کہ وہ جنگل سے نکلتے ہی اپنے اپنے گھروں اور گاؤں چلی جائیں گی۔ اگر ان میں ، ایک بھی اپنے گھر پہنچ گئی تو بہت برا ہو گا۔ ہماری شامت آ جائے گی۔ ہمارا بھرم ختم ہو جائے گا اور پارسائی کا بھانڈا پھوٹ جائے گا...... ہم کسی کو منہ دکھانے اور مندر میں رہنے کے قابل نہیں رہیں گے۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو......“ گرو جادوگر نے کہا۔ ”ان میں سے ایک بھی اپنے گھر پہنچ گئی تو ہمارے

خلاف طوفان کھڑا ہو گا۔ یہ لوگ ہمیں جان سے مار دیں گے۔ میں انہیں ابھی روکتا ہوں۔ کسی کو بھی اس کے گھر تک پہنچنے نہیں دوں گا۔“

گرو جادوگر فوراً ہی آنکھیں بند کر کے تیزی سے کوئی منتر پڑھنے لگا تا کہ اپنے جادو کے زور سے ان لڑکیوں اور عورتوں کو جہاں اس وقت وہ موجود ہیں جام کر دے وہ اپنی جگہ سے حرکت نہ کر سکیں۔ ساکت و جامد ہو جائیں۔ ان پر پتھروں کے منجمد مجسموں کا دھوکا ہو۔ وہ اپنے جادو کے کارن ایسا کر سکتا تھا۔

واقعی وہ ایک بڑا جادوگر تھا۔ اس پائے کا جادوگر مغربی بنگال کے اس شہر کلکتہ میں کوئی نہ تھا۔ ان تمام لڑکیوں اور عورتوں کو ساکت و جامد کرنے کے بعد پھر اپنے دوسرے منتر سے انہیں واپس عمل میں لانے کی طاقت رکھتا تھا۔ میں کسی قیمت پر نہیں چاہتا تھا کہ یہ بدقسمت لڑکیاں اور عورتیں پھر سے زندان میں آ جائیں۔ اس کے جادو کو بے اثر بڑی آسانی سے کر سکتا تھا۔ یک لخت میرے ذہن میں ایک انوکھا سا خیال بجلی کا کوندا بن کر لپکا۔ میں نے سوچا کہ تھوڑی بہت تفریح سہی، ایک دلچسپ پرتجسس اور حیرت انگیز تماشا سہی۔ ان دونوں کو میں پس پردہ رکھ کر اپنی جادوگری کا ایک معمولی سا کمال دکھاؤں۔ دیکھوں تو گرو جادوگر کی جادوگری میں کتنی طاقت ہے۔

گرو جادوگر نے چند لمحوں تک منتر پڑھنے کے بعد آنکھیں کھولیں۔ اس وقت اس بڑے سے جادو کے گولے میں جنگل کا منظر ہی تھا۔ وہ تمام لڑکیاں اور عورتیں راگنی کی رہنمائی میں بڑے محتاط انداز سے سہمی ہوئی چلی جا رہی تھیں۔ کالا ناگ جو نمودار ہو گیا اس سے ان کے دلوں میں جو ہیبت بیٹھی تھی وہ ابھی تک موجود تھی۔ حالاں کہ وہ سب جادو کی چھڑی کا کمال دیکھ چکی تھیں اور انہیں کسی بات کا ڈر اور خوف نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ اس نے گولے پر کوئی تین مرتبہ پھونکا۔ اس کے پھونکتے ہی جنگل کا منظر اس طرح سے غائب ہو گیا جیسے بجلی چلی گئی ہو۔ گولے میں گھپ اندھیرا سا چھا گیا۔

”ایں یہ کیا......؟“ گرو جادوگر حیرت سے اچھل پڑا۔ اسے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا۔ وہ بولا۔ ”تم دیکھ رہے ہو؟ یہ جنگل کا منظر کیسے غائب ہو گیا؟“

”ہاں مالک۔“ قابو مہاراج نے ششدر ہو کر کہا۔ ”میری خود سمجھ میں نہیں آ رہا ہے...... یہ کیا......؟ گولے میں روشنی نظر آ رہی ہے؟“

اب اس گولے میں جنگل کے منظر کی بجائے ساحل سمندر کے منظر نے لے لی۔ یہ کسی مغربی یا یوروپی ملک کا ساحل سمندر تھا۔ ساحل سمندر پر سفید فام مرد اور عورتیں تھیں۔ نوجوان لڑکیاں اور ہر عمر کی عورتیں پیراکی کے مختصر سے لباس میں ملبوس تھیں۔ تیر رہی اور نہا رہی تھیں۔ مردوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ جس سے یہ کسی پرستان کا ساحل سمندر لگ رہا تھا۔ قابو مہاراج بھی بت بنا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ فلم ابھی چل رہی تھی۔ اس میں رومان اور جذباتی مناظر کی بھرمار تھی۔ تاہم میں نے اسے ختم کر دیا۔ گولے میں پھر اندھیرا سا چھا گیا۔

ان دونوں نے چونک کر حیرت سے ایک دوسرے کی شکلیں دیکھیں۔ ”یہ سب کچھ کیا تھا......؟“

گرو جادوگر نے کہا۔ ”کبھی اس گولے میں ایسا منظر نہیں دیکھا...... ان بیس برسوں میں بیسیوں مرتبہ گولے میں جادو سے وہی دیکھا جو چاہا...... یہ جنگل کا منظر کیوں نہیں آیا؟“

”یہ کسی انگریزی فلم کے مناظر تھے۔“ قابو مہاراج نے تحیر زدہ لہجے میں کہا۔ ”یہ گولا ٹی وی بن گیا تھا...... لیکن اس گولے میں یہ فلم کہاں سے اور کیسے آ گئی......؟ ایسا لگ رہا ہے کہ آپ نے کوئی اور ہی منتر پڑھ دیا۔ غلط منتر...... کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟“

”ہاں...... یہ انگریزی فلم ہی تھی۔“ گرو جادوگر نے اثباتی انداز میں سر ہلایا۔ ”زندگی میں کبھی انگریزی فلمیں دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ کلکتہ میں، میں نے بہت ساری میمیں دیکھیں...... یہ بیس برسوں پہلے کی بات ہے لیکن کبھی انہیں ایسی بے باک اور سنسنی خیز حالت میں نہیں دیکھا۔“

”مالک......“ قابو مہاراج بولا۔ ”یہ فلم گولے میں کیسے آ گئی بعد میں سوچیں گے۔ پہلے آپ ان عورتوں کو تو روکیں۔ کہیں وہ......؟“

”اوہ...... میں تو ان رنگین تتلیوں کو دیکھ کر انہیں بھول ہی گیا۔“ اس نے کہا۔ پھر وہ آنکھیں بند کر کے منتر پڑھنے لگا تو اس کے چہرے پر الجھن کے سے آثار پیدا ہوئے۔ دوسرے لمحے اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ”مجھے منتر یاد نہیں آ رہا ہے۔ میں بھول گیا ہوں......؟ یہ کیا ہو گیا ہے مجھے......؟“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے مالک کہ آپ اور منتر بھول جائیں؟“ قابو مہاراج حیرانی سے اس کی شکل دیکھنے لگا۔ ”آپ تو اس دیش کے مہان جادوگر ہیں۔“

”ہاں...... میں واقعی منتر بھول چکا ہوں۔“ وہ تشویش ناک لہجے میں بولا۔ ”ایسا کبھی نہیں ہوا......؟“

”آپ نے جو فلم دیکھی شاید اس کا اثر ذہن پر چھا گیا ہے اس وجہ سے آپ کو منتر یاد نہیں آیا۔“ قابو مہاراج نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”ایسا کرو تم جلدی سے منتر پڑھ کر پھونک کر انہیں روکو......“ گرو جادوگر نے کہا۔ ”واقعی ان تتلیوں نے میرا ذہن مفلوج کر دیا ہے...... میں صرف ایک نہیں تمام منتر بھول چکا ہوں۔ مجھے ایک بھی منتر یاد نہیں آ رہا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ کسی بات پر ناراض ہو کر کالی ماتا نے مجھے جادو منتروں سے محروم کر دیا ہے۔“

”ٹھیک ہے......“ قابو مہاراج نے سر ہلایا۔ ”میں منتر پڑھتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ وہ اب تک جنگل میں ہی موجود ہوں گی۔“

یہ کہہ کر قابو مہاراج نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ منتر پڑھنے لگا۔ دوسرے لمحے اس کے چہرے پر حیرت، خوف اور الجھن کے آثار پیدا ہوئے۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور بدحواس سا ہو کر بولا۔ ”مالک! میں بھی سارے منتر بھول چکا ہوں مجھے بھی ایک منتر بھی یاد نہیں آ رہا ہے۔“

”اب کیا ہو گا؟“ گرو جادوگر نے سر پیٹ لیا۔ ”یہ تو بہت برا ہوا۔ اب ان لڑکیوں اور عورتوں کے گھر والے آ کر ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

”اب ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے۔“ قابو مہاراج نے کہا۔ ”ہم واپس مندر چلتے ہیں۔ ان

لڑکیوں اور عورتوں کے آدمی ہماری خبر لینے کل شام سے پہلے نہیں آ سکتے۔ نبیل صبح دس گیارہ بجے تک رقم لے کر پہنچے گا۔ ہم رقم لے کر ارونا اس کے حوالے کر کے بنارس چلتے ہیں۔ ہم وہاں چل کر بڑے مندر کے پجاری سے ملتے ہیں۔ پھر ہم اس کی آشیرواد سے ایک خاص تپسیا کا پربندھ کرتے ہیں۔ ہم دیوتاؤں سے وہ منتر اور جادو مانگیں گے جو بھول چکے ہیں۔“

”تم نے بڑا صحیح اور بروقت مشورہ دیا ہے۔“ گرو جادوگر بولا۔ ”اب اس کے سوا چارہ بھی نہیں رہا کہ ہم یہاں سے بوریا بستر لپیٹیں، نبیل سے رقم لے کر...... ان لڑکیوں اور عورتوں کے گھر والے ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے جن کی عزت پر داغ لگا دیا۔ چلو...... مندر چلیں۔“

”لیکن مالک!“ قابو مہاراج کو اچانک کچھ یاد آ گیا تو وہ بولا۔ ”ارونا کو تو آپ نے جادو کے زور سے بے ہوشی کی نیند سلا دیا۔ لیکن آپ اسے ہوش میں کیسے لائیں گے......؟ جب کہ آپ کو اور مجھے بھی کوئی منتر یاد نہیں رہا۔ وہ بغیر منتر کے ہوش میں نہیں آئے گی۔“

”میں نے اس کے بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔“ گرو جادوگر نے کہا۔ ”میرے ذہن میں ایک تدبیر آ رہی ہے۔ سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی۔ ہم نبیل سے رقم وصول کرنے کے بعد اسے اس کمرے میں لے جائیں گے جہاں ارونا بے ہوشی کی حالت میں سو رہی ہے۔ اس سے کہیں گے کہ ارونا سو رہی ہے۔ کچھ دیر بعد جاگے گی۔ پھر اسے چائے پلانے کے بہانے اپنے کمرے میں لے آئیں گے۔ اس کی چائے میں بے ہوشی کی دوا ملا کر پلا دیں گے۔ وہ چھ سات گھنٹے تک بے ہوش رہے گا۔ اس کے ہوش میں آنے تک ہم ریل گاڑی میں بہت دور نکل چکے ہوں گے۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ جانے اور اس کی محبوبہ ارونا جانے...... کیوں کیسی ہے یہ تدبیر......؟“

پھر وہ دونوں فوراً ہی محل سے نکل گئے۔ جادو کا گولا بھی چھوڑ گئے۔ میں نے منتر پڑھ کر گولے پر پھونکا۔ لڑکیوں کا یہ قافلہ جنگل سے نکل کر ٹولیوں کی شکل میں اپنے اپنے گاؤں جا رہا تھا۔ یہ لڑکیاں اور عورتیں جو تھیں ان کا تعلق تین گاؤں سے تھا۔ راگنی اور کامنی بھی اپنے گاؤں جا رہی تھیں۔ ان میں وہ متفکر اور پریشان تھیں جن کی عزت داغ دار ہو چکی تھی۔ گھر والے جانے کیا سمجھیں؟ کیا کہیں؟ کیا انہیں قبول کر بھی لیں گے یا نہیں...... راگنی نے ان لڑکیوں اور عورتوں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنے گھر والوں کو ہرگز ہرگز یہ نہیں بتائیں کہ ان کی عزت لٹ چکی ہے۔ انہیں صرف یہ بتائیں کہ نیلے مندر کے پنڈت گرو جادوگر اور پجاری قابو مہاراج نے انہیں اس لئے اغوا کیا تھا کہ انہیں کسی غیر ملک میں لے جا کر بیچ دیں لیکن وہ موقع پا کر فرار ہو کر آ گئیں اور ان کی عزت پر کوئی آنچ نہیں آئی...... دانش مندی کا یہی تقاضا تھا۔ راگنی کا مشورہ انہیں پسند آیا تھا اور انہوں نے اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

میں نے رات محل میں ہی گزاری۔ سورج طلوع ہوتے ہی نیلا مندر جا پہنچا۔ گرو جادوگر کے کمرے [illegible] قابو مہاراج بھی تھا۔ وہ دونوں اتفاق سے کمرے سے نکل کر اس وقت مندر کی عمارت سے باہر چبوترے [illegible] کے لئے آئے تھے جو پیپل کے درخت کے نیچے تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر بڑے زور سے چونکے اور ان

کے چہرے زرد پڑ گئے۔ گرو جادوگر کے منہ سے غیر ارادی طور پر نکلا۔ ”تم کیسے......؟؟ ارونا کہاں ہے؟“

”میں ارونا ہی کو تو لینے آیا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”مجھے دیکھ کر تم دونوں اس قدر حیران اور پریشان کیوں ہو رہے ہو؟“

”ارونا کو تو تم کل ساتھ لے گئے تھے......؟“ گرو جادوگر بولا۔ ”تم نے بتایا نہیں کہ ارونا کہاں ہے؟ ارونا یہاں تو نہیں ہے؟“

”ہاں...... میں جس ارونا کو لے گیا تھا وہ ارونا نہیں بلکہ بدروح تھی......“ میں نے کہا۔ ”اصل ارونا تو اندر کمرے میں موجود ہے۔“

”تم سے کس نے کہا وہ بدروح تھی؟“ قابو مہاراج نے کہا۔ ”کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟ اندر ارونا ورونا نہیں ہے۔“

”اسی نے کہا تھا اور میں اسے جلا کر خاک میں ملا چکا ہوں۔“ میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ”تم دونوں نے مجھے دھوکا دیا اور ایک بدروح کو ارونا کے روپ میں بھر کے میرے حوالے کر دیا تا کہ جنگل میں لے جا کر وہ مجھے موت کی نیند سلا دے۔ لیکن معاملہ الٹا ہو گیا۔ ارونا اندر ہے۔ تم نے جادو کے زور سے اسے بے ہوشی کی نیند سلا رکھا ہے تم دونوں نبیل کا انتظار کر رہے ہو تا کہ اس سے رقم بٹور کر بنارس چلے جاؤ۔“

”یہ تمہیں کس نے بتایا کہ ارونا اندر بے ہوشی کی حالت میں موجود ہے اور ہم نبیل کا انتظار کر رہے ہیں تا کہ رقم بٹور کر بنارس چلے جائیں؟“ گرو جادوگر حیرت سے بولا۔ ”یہ تم اندازے سے کہہ رہے ہو؟ اندھیرے میں تیر چلا رہے ہو؟ تم بہت ذہین اور چالاک ہو۔ ارونا کو قتل کر کے اپنا جرم چھپانے آئے ہو۔ ہم کو اس جرم میں پھنسانے آئے ہو۔ لیکن تم اس جرم سے اپنا دامن بچا نہیں سکتے......“

”یہ مجھے کسی نے نہیں بتایا بلکہ میں نے خود تم دونوں کی گفتگو رات محل میں سنی تھی۔“ میں نے کہا۔ ”میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ سننا پسند کرو گے؟“ میں نے ساری رام کہانی سنائی تو وہ دونوں ششدر رہ گئے...... گرو جادوگر تحیر زدہ لہجے میں بولا۔ ”تم نے ان لڑکیوں اور عورتوں کو بھگا دیا۔ لیکن تم نے اس کمرے کی کنڈی کیسے کھول لی جبکہ وہ اتنی گرم تھی کہ ہاتھ کیا لوہا پگھل جائے۔ پھر جادو کی چھڑی کے بارے میں بھی کیسے پتا چلا...... اور پھر تم نے جادو کے گولے کا وہ منظر جو جنگل کا تھا اسے فلمی منظر میں تبدیل کر دیا اور ہمیں جادو سے محروم کر دیا...... آخر تم ہو کون......؟ یہ سب کچھ ایک عام شخص نہیں کر سکتا......؟ کہیں تم کسی بڑے جادوگر کے مہرے تو نہیں ہو؟“

”میں خود جادوگر ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”تم شرافت سے اصل ارونا کو میرے حوالے کر دیتے تو یہ نوبت پیش نہ آتی...... لیکن ایک طرح سے میرا آنا...... اور جو کچھ ہوا وہ اچھا ہی ہوا۔ ان بدنصیب لڑکیوں اور عورتوں کو تم سے نجات ملی اور اب میں ارونا کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔ نبیل نہیں آئے گا۔ کیوں کہ پولیس نے اسے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا ہے۔ تم جو خواب دیکھ رہے ہو وہ پورا نہیں ہوگا۔“

”تم جادوگر ہو......؟“ گرو جادوگر کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ”اتنی سی عمر میں اتنے بڑے جادوگر؟

نہیں...... تم جھوٹ بول رہے ہو تمہارے پیچھے کوئی اور جادوگر ہے جو تم سے کام لے رہا ہے۔ وہ کسی وجہ سے سامنے آنا نہیں چاہتا ہے۔“

”مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا میں تم سے ڈرتا ہوں جو جھوٹ بولوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن میں تمہیں اتنا بتا دوں کہ مجھے شوتم نے اپنا تمام جادو سکھا دیا ہے۔ شوتم جادوگر کے بارے میں تم جانتے ہو گے۔ اس کا نام اور اس کے جادو کے بارے میں سنا تو ہوگا؟“

”تم...... تم...... شوتم کے شاگرد ہو......؟“ گرو جادوگر ہکلایا۔ ”اس کے بارے میں کون نہیں جانتا ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ اس نے اپنا جادو تمہیں سکھا دیا؟ جب کہ اس نے سوگند کھائی ہوئی تھی کہ وہ کسی کو اپنا شاگرد نہیں بنائے گا۔ کسی کو جادو نہیں سکھائے گا۔ تم اس معاملے میں بڑے خوش نصیب نکلے۔ شوتم جادوگر نہیں بلکہ جادوگروں کا دیوتا ہے۔“

”اس نے مجھے اپنا سارا جادو اس لئے سکھا دیا کہ وہ موت سے قریب ہوتا جا رہا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس نے میرا بڑا سخت امتحان لیا تھا۔ ہر طرح سے میری آزمائش کی تھی۔ میں ثابت قدم رہا تھا۔ اس نے مجھے اس شرط پر جادو سکھایا کہ میں انسانیت کی خدمت کروں اور تم جیسے بدمعاشوں اور جادوگروں کو کیفر کردار تک پہنچاؤں۔ تم نے ان عورتوں اور لڑکیوں کے ساتھ جو کچھ کیا وہ ایک ناقابل معافی جرم ہے۔ اس لئے میں نے تم دونوں کو جادو سے محروم کر دیا۔ اب تم دونوں عام قسم کے آدمی ہو۔ اب تم دونوں اپنے کئے کا خمیازہ بھگتو گے۔ میں تم دونوں کو پیپل کے اس درخت سے الٹا لٹکا کر جا رہا ہوں تا کہ ان لڑکیوں اور عورتوں کے گھر والے جن کی عزت تم نے تباہ و برباد کی اور انہیں قید کر کے رکھا تمہیں سزا دیں۔ وہ مشتعل لوگ سہ پہر تک پہنچیں گے۔ تم دونوں اسی لائق ہو کہ اس عبرت ناک انجام تک پہنچو۔“

میں نے جادو کے زور سے انہیں اس درخت سے الٹا لٹکا دیا جس کے نیچے ہم کھڑے تھے۔ ان دونوں نے میری بڑی منتیں سماجتیں کیں۔ گڑگڑائے اور معافیاں مانگنے لگے۔ میں نے ان کی ایک نہ سنی اور نہ ہی ان پر ذرہ برابر بھی رحم آیا۔ وہ چیختے چلاتے رہے۔ میں اندر گیا۔ ارونا جو جادو کے زیر اثر گہری نیند سو رہی تھی اسے اس جادو کے اثر سے نکالا۔ ارونا نے ہوش میں آتے ہی مجھے حیرت اور خوشی سے دیکھا۔ پھر میں نے نبیل، گرو جادوگر اور قابو مہاراج کے بارے میں مختصر طور پر بتایا۔ جب میں ارونا کو مندر سے لے کر باہر آیا تو وہ دونوں پھر آہ و زاری کرنے لگے۔ ان سے کوئی بات کئے بغیر ہم گاؤں کی جانب چل دیئے۔ وہاں ایک دو سائیکل رکشا والے موجود تھے جو روزی کمانے کے لئے شہر کی طرف روزانہ جاتے تھے۔ پھر ہم دونوں رکشا سے شہر اس ہوٹل میں پہنچے۔ میں نے ارونا کے لئے ایک کمرے کا بندوبست کر دیا۔ ارونا نے اپنی ماں سے فون پر رابطہ کیا۔ وہ شام تک پہنچ گئیں۔ انہوں نے ساری کہانی سننے کے بعد مجھے مزید ایک لاکھ روپے دیئے۔ جو ہندوستانی کرنسی تھی۔ دوسرے دن صبح کی فلائٹ سے وہ واپس ڈھاکا چلی گئیں۔

......❄......❄......❄......

کلکتہ شہر میں ذکریا اسٹریٹ پر ایک بہت بڑی قدیم ذکریا مسجد ہے۔ جمعہ کا روز تھا۔ میں نے نماز

جمعہ اس مسجد میں پڑھی تو دل اور روح کو جو سکون اور طمانیت ملی وہ لاکھوں روپے کا خزانہ ملنے سے بھی نہیں مل سکتی ہے۔ میں مسجد میں اس وقت تک بیٹھا تسبیح اور قرآن شریف پڑھتا رہا جب تک مسجد خالی نہ ہوگئی۔ میرے علاوہ دوایک لوگ بھی مسجد میں موجود تھے۔

جب میں مسجد سے باہر آیا تو بڑے زور کی بھوک لگی۔ سامنے ہی ایک ہوٹل تھا۔ اس ہوٹل میں بڑا رش تھا۔ رش سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ اس ہوٹل کے کھانے بہت اچھے ہوتے ہیں۔ جب میں ہوٹل کی طرف جارہا تھا مجھ سے ایک شخص ٹکرایا اور معذرت کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ لیکن میں نے اسے لپک کر جالیا۔ کلکتہ میں جرائم پیشہ افراد کی کوئی کمی نہیں ہے۔ جیب کترے، اجرتی قاتل، غنڈے بدمعاش، ڈکیت اور رہزنوں سے قدم قدم پر واسطہ پڑتا ہے۔ یہ جیب کترا تھا جس نے بڑی مہارت سے ہاتھ کی صفائی دکھائی تھی۔ اس کی حالت ایک فقیر کی سی ہورہی تھی۔ کپڑے میلے کچیلے تھے اور چہرے اور بالوں پر گرد جمی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں وحشت اور ویرانی برس رہی تھی۔ اس نے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''کیا بات ہے بھائی صاحب! آپ نے مجھے کیوں روکا ہے؟ میرا بازو تو چھوڑ دیں۔''

''تم میرا بٹوا واپس کردو......'' میں نے نرمی سے کہا۔ ''میں نہیں چاہتا کہ تمہیں پولیس کے حوالے کروں۔ وہ دیکھو...... سامنے سپاہی کھڑا ہوا ہے۔'' اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اس کی آنکھوں میں گہری اداسی چھاگئی۔ اس نے تھوک نگلتے ہوئے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

''میں آپ کو ایک شرط پر بٹوا دے سکتا ہوں کہ نہ صرف مجھے کھانا کھلا دیں بلکہ میرے گھر والوں کے لئے بھی کھانا دلوادیں؟''

''منظور!'' میں نے کہا۔ ''تم میرے ساتھ ہوٹل چلو۔ میں بھی اس وقت کھانا کھانے کے لئے جارہا تھا۔ ہم دونوں کھانا کھالیتے ہیں۔''

اس نے میرا بٹوا مجھے واپس کردیا۔ میں اسے ہوٹل لے آیا۔ دو پلیٹ مرغ بریانی کا آرڈر دیا۔ تھوڑی دیر میں بریانی آگئی۔ اس نے پلیٹ کی طرف ہاتھ بڑھاتے بڑھاتے روک لیا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر آنکھوں پر رکھ لیا۔

''کیا بات ہے رشید!'' میں نے ویٹر کو آرڈر دینے کے بعد اس سے اس کا نام پوچھ لیا تھا۔ ''رو کیوں رہے ہو؟ کھانا کھاؤ......؟''

''میں نے تم سے کہا ہے نا کہ میں تمہارے گھر والوں کے لئے کھانا پارسل کروادوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''تم جلدی سے کھانا کھا کر گھر کھانا لے جانا۔'' پھر وہ کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ واقعی وہ دو دن کا بھوکا لگ رہا تھا۔ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے اپنی پلیٹ صاف کردی۔ میں نے اس کے لئے ایک اور پلیٹ بریانی منگوائی۔ وہ پھر آرام آرام سے کھانے لگا۔ میں بھی خاموشی سے کھاتا رہا۔ اس دوران میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ کھانا کھانے سے اس کے چہرے میں قدرے جان سی آگئی تھی اور اس کی وحشت میں بھی رفتہ رفتہ کمی آنے لگی۔

''حیرت کی بات ہے کہ ایک جیب کترے ہو کر بھی دو دن سے تم اور تمہارے گھر والے فاقے سے ہیں؟'' میں نے چائے پینے کے دوران کہا۔

''جی صاحب جی!'' اس نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''یہ میری بدقسمتی ہے کہ کوئی ایسا شکار اتفاق سے ہاتھ نہیں لگا۔ ایک بٹوا ملا جس میں تین سو کی رقم اور ایک منی آرڈر فارم تھا۔ اس فارم میں لکھا ہوا تھا کہ...... ماں کی طبیعت کا سن کر دل بہت پریشان ہوا۔ مجھے دفتر سے قرض نہیں ملا۔ تنخواہ ملنے میں سولہ دن باقی ہیں۔ تین سو روپے سود پر قرض لے کر بھیج رہا ہوں۔ کسی دوست سے قرض مل گیا تو وہ رقم بھی منی آرڈر کردوں گا...... یہ پڑھ کر میرے دل پر چوٹ لگی صاحب جی...... میں نے اسی وقت جا کر وہ رقم منی آرڈر کردی۔ مجھے ایسا لگا تھا کہ جیسے اس کی نہیں میری ماں بیمار ہے۔ میں نے اور شکاروں پر ہاتھ ڈالے تھے۔ دو مرتبہ پکڑا گیا۔ انہوں نے مار پیٹ کر چھوڑ دیا۔ وہ پولیس کے حوالے کردیتے تو حوالات میں کھانا مل جاتا۔ لیکن ماں بہن کا کیا ہوتا۔ وہ فاقوں سے مرجاتیں۔''

''تم جوان اور پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو۔'' میں نے کہا۔ ''تم نے ملازمت اور محنت مزدوری کی بجائے یہ پیشہ اختیار کرلیا؟''

''اتنے بڑے شہر میں میں ایک نہیں سینکڑوں، ہزاروں بلکہ لاکھوں بے روزگار ہیں۔'' وہ بولا۔ ''کسی قسم کا روزگار نہیں ملتا ہے۔ میں نے جیب تراشی کا فن سیکھ تو لیا ہے۔ لیکن سچ پوچھئے...... جب میں کسی کی جیب کاٹتا ہوں تو اندر سے میرا دل بھی کٹ جاتا ہے۔ البتہ بڑے لوگوں کی جیب کاٹ کر کوئی دکھ اور غم نہیں ہوتا بلکہ ایک طرح سے خوشی ہوتی ہے۔ کیوں کہ یہ دوسروں کی جیب کاٹتے ہیں۔''

''تمہارے اندر کا انسان ابھی زندہ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کیا تم یہ پیشہ ترک کرکے سبزی ترکاری پھل، چاٹ وغیرہ نہیں بیچ سکتے؟''

''میں نے بھی یہ سوچ رکھا ہے کہ ہزار دو ہزار کی رقم ملے تو کسی چیز کا خوانچہ لگالوں۔'' وہ بولا۔ ''مگر ایسا کوئی شکار ہاتھ نہیں لگا۔''

''اگر میں تمہیں چھوٹے موٹے کاروبار کے لئے پانچ ہزار روپے دوں تو کیا تم یہ پیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دو گے؟'' میں نے کہا۔

''پانچ ہزار روپے......؟'' اس کا چہرہ دمک گیا۔ ''میں اللہ رسول کی قسم کھا کر وعدہ کرتا ہوں کہ کبھی اس کی طرف دیکھوں گا بھی نہیں۔'' میں نے چار پلیٹ بریانی، دوایک سالن اور روٹیاں پارسل کروادیں۔ پانچ ہزار کی رقم بھی اسے دے دی۔ وہ خوش خوش رکشا میں بیٹھ کر گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ مجھے اس بات سے خوشی ہوئی تھی کہ ایک انسان سیدھے راستے پر آگیا تھا۔

***

میں دوسرے دن ریل گاڑی سے میسور شہر دیکھنے کے لئے روانہ ہوگیا۔ میسور شہر دیکھنے اور اس کی سیر و تفریح اور سیاحت کی آرزو بچپن سے لے کر جوانی اور آج بھی میرے دل میں تھی۔ وہ ٹیپو سلطان اور

حیدرعلی شہید کا وطن تھا۔شیر۔سور ٹیپو سلطان اور ان کے والد حیدرعلی نے انگریزوں سے جنگ آزادی لڑکر شہادت پائی تھی اور ان کے نام تاریخ میں سنہری حرفوں سے لکھے ہوئے ہیں۔ان کی بہادری اور عظمت کے ترانے آج بھی گائے جاتے ہیں۔انگریز ٹیپو سلطان سے جتنا ڈرتے تھے وہ کبھی کسی دشمن سے اتنا نہیں ڈرے تھے۔وہ اپنے بچوں کو ان کا نام لے کر ڈراتے تھے۔ان کے مزار میسور اور بنگلور کے نواح وزنگا پٹم میں تھے۔مجھے ان سے بڑی محبت اور عقیدت تھی۔میں ان کے مزاروں پر پہنچ کر فاتحہ خوانی کرنا چاہتا تھا اور ان عظیم شہیدوں کے مزار دیکھنا چاہتا تھا۔

میں یوں تو چند لمحوں میں غائب ہو کر میسور شہر پہنچ جاتا۔لیکن مجھے ریل گاڑی کے سفر کا شوق نہیں بلکہ ایک طرح جنون سا تھا۔اس سفر میں جو لطف آتا تھا وہ ہوائی جہاز اور بحری جہاز میں بھی نہیں آسکتا۔ ریل گاڑی ایک تو بہت سارے اور معروف شہروں سے گزرتی تھی۔یہ خاصا لمبا سفر تھا۔لیکن مجھے بہت لطف آیا۔میں نہ تو بور ہوا اور نہ ہی اکتایا۔کیوں کہ گاڑی میں بیٹھے جن جن شہروں کے ریلوے اسٹیشن آئے اور ان شہروں کے کچھ حصے بھی نظر آئے۔ایک طرح سے ان شہروں کی سیر ہوگئی۔مسافروں کی رفاقت میں سفر کا لطف دوبالا ہو گیا تھا۔

میں میسور صبح پہنچا تھا۔وہاں سے یعنی ریلوے اسٹیشن سے ہی ایک ٹیکسی کر کے وزنگا پٹم روانہ ہو گیا۔ایک ہم سفر نے بتایا کہ سیاحوں کے لئے کاٹیج اور مکانات بھی کرائے پر مل جاتے ہیں جن میں تمام سہولتیں موجود ہوتی ہیں اور وہ آراستہ بھی ہوتے ہیں۔

میں نے سرنگا پٹم پہنچ کر ایک چھوٹا سا بہت خوبصورت اور نہایت آراستہ مکان کرائے پر لے لیا جس میں تقریباً سہولتیں موجود تھیں۔اس میں ایک فریج بھی تھا۔مالک مکان کا نام برکت اللہ تھا۔وہ بڑے اچھے، بااخلاق، ملنسار اور خوش گفتار شخص تھے۔ان کا گھر تھوڑی دور تھا۔انہوں نے کہا کہ وہ تینوں وقت کے کھانے کا بھی بندوبست کر سکتے ہیں۔لیکن میں نے معذرت کر لی۔میں نے یہاں تین دن کے قیام کا پروگرام بنایا تھا۔اس میں روزانہ ٹیپو سلطان اور حیدرعلی کے مزاروں پر حاضری اور نواحی علاقوں کی سیاحت بھی تھی۔پھر میسور اور بنگلور جانے کا پروگرام تھا۔میں نے سفر میں مسافروں سے بنگلور شہر کی آب وہوا اور خوبصورتی کی بہت تعریف سنی تھی۔

میں نے ناشتا کر کے آرام کیا۔پھر میں ان کے مزاروں پر پہنچا۔فاتحہ پڑھی۔

رات دس بجے میں ایک مسلمان کے ہوٹل میں کھانا کھا کر تھوڑی دیر تک چہل قدمی کرتا رہا۔پھر گھر کی طرف چل دیا۔گھر میں داخل ہو کر میں نے اندر سے چٹخنی لگائی۔پھر اندھیرے میں راستہ ٹٹولتا سونے کے کمرے میں پہنچا اور سوئچ بورڈ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔دوسرے لمحے کمرا روشن ہو گیا۔پھر میں ایک دم سے اس طرح اچھل پڑا جیسے سن سنا دینے والا برقی جھٹکا لگا ہو۔میرے سارے جسم میں سنسنی زن زن کرتی اترتی چلی گئی......

کمرے کے وسط میں ایک عورت اپنے ہاتھ میں ایک خوف ناک قسم کا چھرا لئے کھڑی تھی۔اس کا

چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے وحشیانہ پن جھانک رہا تھا۔اس کے سینے میں سانس بری طرح پھول رہی تھی جیسے وہ بہت دور سے دوڑتی ہوئی چلی آرہی ہو۔اس کا لباس اور بال بھی بے ترتیب ہو رہے تھے جیسے کسی نے اس کے ساتھ ناشائستہ حرکت کی ہو۔وہ ننگے پاؤں تھی۔

مجھے دیکھتے ہی وہ مجھ پر حملہ آور ہونے کے لئے تیزی سے بڑھی لیکن دوسرے ہی لمحے ٹھٹک کے رک گئی۔پھر اس کے چہرے پر حیرت چھا گئی۔پھر اس نے مجھے پھیلی ہوئی آنکھوں سے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔اس طرح سے کہ پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔"آپ......آپ......کون ہیں؟"اس نے تیز و تند لہجے میں پوچھا۔"کہیں آپ مہیش لال کے آدمی تو نہیں ہیں؟"

"میں ایک کرایہ دار ہوں اس مکان میں۔"میں نے جواب دیا۔"تم کون ہو؟ یہاں کیا کر رہی ہو؟ یہ مہیش لال کون ہے؟"

"میں ایک بدبخت عورت ہوں۔"اس نے جواب دیا۔

"میرا نام پریا ہے۔میں......میں نے بدمعاشوں سے بچنے کے لئے یہاں پناہ لی ہوئی ہے۔وہ میرے تعاقب میں ہیں۔میں نے دروازہ بھڑا ہوا دیکھا تو اندر گھس آئی۔"اس نے اپنی پھولی سانسوں کے درمیان کہا تھا۔پھر اس نے سانسوں پر قابو پانے کے لئے توقف کیا۔پل بھر کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر اس نے اپنی آنکھوں پر سے پلکوں کی چلمن اٹھائی۔وہ کسی حد تک سانسوں پر قابو پا چکی تھی۔پھر وہ بولی۔" مہیش لال ایک دولت مند شخص ہے۔وہ اور اس کے بدمعاش آدمی میرا تعاقب کر رہے ہیں......ہوسکتا ہے کہ انہوں نے شاید مجھے آپ کے مکان میں گھستے ہوئے دیکھ لیا ہے۔مجھے کہیں جلدی سے چھپا دیں۔"

وہ چوں کہ بہت خوف زدہ تھی اس لئے میں نے اس سے یہ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا کہ اس کا تعاقب کیوں اور کس لئے کیا جا رہا ہے۔میں نے دلاسا دیا۔"تمہیں گھبرانے......پریشان اور ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں۔اطمینان رکھو۔چلو بیٹھ جاؤ۔"میں نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔"البتہ یہ چھرا دے دو۔ایسے ہتھیار عورتوں کے ہاتھوں میں اچھے نہیں لگتے ہیں اور نہ ہی تمہیں بدمعاشوں سے یہ چھرا بچا سکے گا۔"

"مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ بدمعاش مجھے ڈھونڈتے ڈھونڈتے آپ کے گھر میں گھس آئیں گے۔" وہ مایوس ہو کر بولی۔"آپ نے ٹھیک ہی کہا کہ یہ چھرا مجھے بدمعاشوں کے ہاتھوں سے بچا نہ سکے گا۔لیکن آپ بھی ان سے مجھے بچا نہ سکیں گے۔کیوں کہ وہ مسلح ہیں چھ سات بدمعاش ہیں۔لیکن میں ان کے ہاتھ لگنے سے پہلے سوچتی ہوں کہ کیوں نہ ان میں سے دو ایک کو اس چھرے سے موت کی نیند سلا دوں۔"

"اگر وہ بدمعاش تعداد میں چھ سات ہیں اور مسلح بھی ہیں تو تم ان میں سے دو ایک کو قتل تو کیا زخمی تک نہیں کر سکو گی۔"میں نے کہا۔"کہنا بہت ہی آسان ہے۔تم اطمینان سے بیٹھو۔اگر وہ آئے بھی تو میں ان سے نمٹ لوں گا۔تم ان کی فکر میں اپنے آپ کو ہلکان نہ کرو۔"

"میں......میں یہ نہیں چاہوں گی کہ میری وجہ سے آپ کو کچھ ہو جائے۔"اس نے کہا۔"آپ ان

سے نہ انجیں مجھے چھپا دیں۔"

"تم میری فکر نہ کرو...... وہ میرا بال تک بیکا نہیں کر سکتے۔ ٹھہرو۔ میں تمہارے لئے پانی لے آؤں۔" میں نے کہا۔

میں اتنا کہہ کر فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل اور باورچی خانے سے خالی گلاس لے آیا۔ وہ بے حد پیاسی ہو رہی تھی۔ اس نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔ اتنی دیر میں وہ اپنے حواسوں اور سانسوں پر پوری طرح قابو پا چکی تھی۔

"میں کافی بنا کر لاتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "پھر میں تمہاری کہانی سنوں گا کہ تم پر ایسی کیا افتاد پڑی کہ بدمعاش تمہارے تعاقب میں ہیں؟"

"نہیں...... نہیں...... آپ تکلیف نہ کریں۔" وہ جلدی سے بولی۔ "مجھے یہ بتائیں کہ باورچی خانہ کہاں ہے۔ میں کافی بناتی ہوں۔ مجھے چائے کافی کی بڑی طلب ہو رہی ہے۔ میں چائے اور کافی بہت اچھی بناتی ہوں۔"

میں اسے باورچی خانے میں لے گیا۔ اس نے چولہا جلا کر کیتلی رکھی تھی کہ باہر کا دروازہ کسی نے بری طرح پیٹ ڈالا تو وہ ایک دم سے اچھل پڑی۔ اس کا چہرہ فق ہو گیا اور اس کی آنکھوں سے دہشت جھانکنے لگی۔ "آخر وہ بدمعاش آ گئے؟ اب کیا ہو گا؟

"کچھ نہ ہو گا۔" میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "تم اپنا کام کرتی رہو۔ یعنی کافی یا چائے بناؤ...... اور ہاں اگر یہ بدمعاش باورچی خانے میں آئیں تو تم ان کی آمد سے بوکھلا نہیں جانا اور اپنا کام کرتی رہنا۔ ان کی طرف دیکھنا بھی نہیں۔ میں دروازے پر جا رہا ہوں۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" وہ کچھ حیران، کچھ پریشان اور قدرے خوف زدہ ہو کر بولی۔ "وہ کیا مجھے دیکھ کر کچھ نہیں کہیں گے......؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے، وہ کتے تو میری تلاش میں نکلے ہیں، میرا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک آ پہنچے ہیں۔ وہ مجھے دیکھ کر خاموش رہ جائیں گے؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا...... اور پھر آپ اکیلے آدمی ہیں۔ نہتے ہیں۔ نہ تو آپ ان سے مقابلہ کر سکتے ہیں اور نہ ہی انہیں مجھے اٹھا کر لے جانے سے روک سکتے ہیں۔"

وہ بری طرح چکرا گئی۔ اس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میں کوئی پاگل یا خبط الحواس ہوں۔ میں اسے حیران و پریشان چھوڑ کر دروازے کی طرف لپک گیا۔ وہ دروازہ بری طرح پیٹ رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے دروازہ توڑ دیں گے۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ پہلے جو بدمعاش اندر آیا اس نے مجھے بڑے زور سے دھکا دے کر ایک طرف ہٹایا۔ چوں کہ میں اس کی اس حرکت کا متوقع تھا اس لئے گرا نہیں۔ پھر اس کے پیچھے ایک ایک کر کے کوئی چھ بدمعاش اندر داخل ہوئے۔ وہ اپنی وضع قطع اور چہرے مہرے سے چھٹے ہوئے بدمعاش لگ رہے تھے۔ وہ پوری طرح مسلح تھے۔ کسی کے ہاتھ میں چاقو چھرے تھے اور کسی کے ہاتھ میں پستول اور ریوالور بھی تھے۔ صرف ایک کے ہاتھ میں خوف ناک قسم کا خنجر تھا۔

"کون ہو تم لوگ......؟" میں نے غصے سے کہا۔ "کیا چاہتے ہو......؟ یہ کیا بدتمیزی ہے؟ کیا کسی کے گھر میں اس طرح گھسا جاتا ہے؟"

"بکواس بند کرو۔" سب سے پہلے گھسنے والا بدمعاش دھاڑا۔ وہ ان کا سرغنہ معلوم ہوتا تھا۔ "وہ لڑکی کہاں ہے جو تمہارے گھر میں گھسی تھی؟"

"کون لڑکی..... ؟" میں نے انجان بن کر پوچھا۔ "تمہیں وہم ہوا ہے۔ یہاں کوئی لڑکی گھسی نہیں ہے؟ نہ ہی یہاں کوئی لڑکی رہتی ہے۔"

"تم ہمیں بے وقوف نہیں بنا سکتے؟" سرغنہ نے غراتے ہوئے جواب دیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ "میں نے اسے دور سے ہی اس گھر میں گھستے دیکھا ہے۔"

"میں تمہیں کیوں بے وقوف بنانے لگا بچو!" میں نے قدرے شوخ لہجے میں کہا۔ "تمہاری نظروں نے دھوکا کھایا ہے...... تم کس لڑکی کی بات کر رہے ہو۔"

"پریا کی...... وہ لڑکی دو آدمیوں کا خون کر کے فرار ہوئی ہے۔" سرغنہ نے کہا۔ "ہم اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔ ہم پولیس کے آدمی ہیں۔ وہ کہاں ہے؟"

"کیا...... اس حسین اور جوان لڑکی نے ایک نہیں دو آدمیوں کا خون کر دیا ہے......؟" میں نے حیرت اور خوف کے عالم میں کہا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"اس کے ہاتھ میں ایک خوف ناک قسم کا چھرا ہے جس سے اس نے دو آدمیوں کو قتل کیا۔" سرغنہ بولا۔ "وہ قاتل اور خطرناک عورت ہے۔"

"لیکن اس نے دو آدمیوں کا خون کیوں اور کس لئے کیا......؟" میں نے کہا۔ "ایک عورت بیک وقت دو آدمیوں کو قتل کر دے۔ یقین نہیں آیا۔"

"اس لئے کہ اس کے تعلقات کسی غیر مرد سے تھے۔" سرغنہ نے کہا۔ "اس کے پتی اور دیور نے ان دونوں کو ساتھ دیکھ لیا تھا۔ اس کے پتی اور دیور نے دونوں کو سخت برا بھلا کہا اور پولیس کے حوالے کرنے کی دھمکی دی تو آشنا کے پاس چھرا تھا۔ وہ چھرا لے کر اس نے نہ صرف اپنا سہاگ اجاڑ دیا بلکہ دیور کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جب ہمیں اطلاع ملی تو ہم نے اس کی تلاش شروع کر دی۔ وہ ہاتھ لگی تھی۔ ہم نے اسے پکڑ بھی لیا تھا۔ لیکن وہ ایسی عیار اور خطرناک نکلی کہ ہمیں چکمہ دے کر بھاگ نکلی، ہم اسے کوئی تین گھنٹے سے تلاش کر رہے ہیں۔"

"آپ لوگ پولیس والے ہیں یقین نہیں ہو رہا ہے؟" میں نے کہا۔ "میں نے کبھی پولیس والوں کو ایسی وضع قطع میں نہیں دیکھا۔ پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔"

"ہم سادہ لباس میں اسے اس لئے تلاش کر رہے ہیں کہ وہ ہمیں وردی میں دیکھ کر اور محتاط ہو جائے گی۔" سرغنہ نے کہا۔ "وہ ہے کہاں؟"

"میں نے کہا نا کہ میرے گھر میں کوئی حسین اور جوان لڑکی چھپی نہیں۔"

”سردار!“ پیچھے سے دوسرے بدمعاش نے کہا۔ ”اس نے اس لڑکی کو چھپا دیا ہوگا۔“

”ہاں...... تم ٹھیک کہتے ہو۔“ سرغنہ نے اس کی طرف گھوم کر اسے جواب دیا۔

”تم لوگوں میں سے صرف دو آدمی اس گھر کی تلاشی لے سکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”یہ اتنا بڑا گھر نہیں ہے کہ پوری ٹیم اس کی تلاشی لے۔“

”ہاں آپ ٹھیک کہتے ہیں۔“ سرغنہ نرم پڑ کر شائستگی سے بولا۔ ”آپ کے اس تعاون کا بہت بہت شکریہ...... آپ کو بھی شاید اس لڑکی کی موجودگی کا علم نہیں ہوگا۔ کیوں کہ اس کے گھر میں گھسنے کے تھوڑی دیر بعد آپ باہر سے آئے ہیں۔ ہم نے گاڑی میں سے دیکھا تھا۔“

سرغنہ اتنا کہہ کر اپنے ساتھیوں کی طرف گھوما جو اس کے پیچھے کھڑے ہوئے تھے اور ان سب کی نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں۔ سرغنہ نے انہیں مخاطب کیا۔ ”شیام اور کمار گھر کی تلاشی لیں۔ وہ اگر کہیں چھپی ہوئی ہے تو اسے کھینچ کر لے آئیں۔ خبردار تم دونوں میں سے کسی نے اس سے دست درازی کی کوشش کی۔ اگر اس نے مزاحمت کی اور حملہ کیا تو ہمیں آواز دے لینا۔ اس بات کا خیال رکھنا کہ اس کے پاس چھرا ہے۔ کہیں وہ تمہیں بھی قتل نہ کر دے۔“

کمار اور شیام ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے اور مسکراتے ہوئے اندر چلے گئے۔ ان کی نیت کا فتور ان کی آنکھوں سے جھلک رہا تھا۔ ان کے ارادے یہ تھے کہ وہ پریا کو قابو میں کر کے من مانی کر کے لے آئیں۔ وہ اس رنگین خواب کو آنکھوں میں لئے تیزی سے اندر گئے تھے۔ وہ مسکرائے تھے اور میں بھی دل میں مسکرا رہا تھا۔ صرف چند لمحوں کی بات تھی۔ ایک ایسا تماشا ہونے والا تھا جو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

تھوڑی دیر بعد باورچی خانے سے پریا کی ہذیانی انداز میں آواز سنائی دی...... ”یہ کیا حرکت ہے......؟ بدتمیزی ہے......؟ شرم نہیں آتی......؟“

سرغنہ اور اس کے ساتھی اچھل پڑے۔ ان کا ایک ساتھی بولا۔ ”سردار! تم سن رہے ہو۔ ان دونوں حرام زادوں نے اس کے ساتھ شاید من مانی شروع کر دی۔“

سرغنہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ابھی وہ اندر جانے والا ہی تھا کہ وہ دونوں چیختے چلاتے ہوئے آئے۔ ان میں ایک جو کمار تھا وہ لڑکھڑا کر فرش پر گرا۔ دوسرا دیوار سے ٹکرایا۔ وہ دہشت زدہ تھے اور ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں، ان کے چہروں اور گردنوں پر خراشیں پڑی ہوئی تھیں اور ان میں سے خون رس رہا تھا۔

”میں نے کیا تم دونوں سے نہیں کہا تھا کہ سنبھل کر جانا اور پریا سے ہوشیار رہنا اور اس کے ساتھ ایسی ویسی کوئی حرکت نہیں کرنا؟“ سرغنہ بگڑ کر بولا۔

کمار دوسرے لمحے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اس نے کہا تو اس کی آواز میں سے خوف ظاہر ہو رہا تھا۔ ”سردار! اندر پریا نہیں بلکہ چڑیل ہے؟“

”کیا کہا چڑیل ہے......؟“ سرغنہ نے حیرت سے کہا۔ ”دماغ خراب ہو گیا ہے کیا...... یہ کیا بک

رہے ہو؟ چڑیل کہاں سے آ گئی۔ سچ سچ بتاؤ کہ اصل بات کیا ہے۔ تم دونوں نے یقیناً اس کے ساتھ دست درازی کی ہوگی۔ ہم سب نے اس کی آواز سن لی تھی۔“

”کمار ٹھیک کہہ رہا ہے سردار......؟“ شیام نے تائیدی لہجے میں کہا۔ ”ہم دونوں اسے تلاش کرتے ہوئے باورچی خانے میں گئے تو ایسا لگا کہ پریا کھڑی چائے بنا رہی ہے۔ جب میں نے اس کے پاس جا کر اس کا بازو پکڑا تو وہ بگڑ گئی۔ پھر اس نے میرے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ پھر میری گردن میں دانت گاڑ دیئے...... پھر اس نے اپنے تین انچ لمبے ناخنوں سے میرے چہرے پر خراشیں ڈال دیں۔ پھر اس نے فوراً ہی مجھے چھوڑ کر کمار کو دبوچ لیا اور بولی کہ مجھے خون پینے دو...... تم دونوں کا خون کتنا مزے دار اور ذائقہ دار ہے، ہم مشکل سے جان چھڑا کر آئے ہیں۔“

”چڑیل کہاں سے آ گئی......؟“ سرغنہ کو یقین نہیں آیا۔ ”بات کچھ اور ہے۔ اصل بات تم مجھ سے چھپا رہے ہو۔ بے وقوف بنا رہے ہو؟“

”تمہارے آدمی نشہ تو نہیں کرتے ہیں؟“ میں نے سرغنہ سے پوچھا۔ ”پریا جس کی تمہیں تلاش ہے شاید وہ باورچی خانہ میں چھپی ہوئی ہو...... لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے......؟ اس مکان میں میں اکیلا رہتا ہوں...... ابھی جو آواز سنی وہ میری دوست لڑکی کی تھی۔ ان دونوں نے اس کے ساتھ کوئی بدتمیزی کی ہوگی۔ تب اس نے چھری اٹھا کر اس کی نوک سے خراشیں اور زخم ڈال دیئے۔ وہ اس حسین لڑکی کو چڑیل کہہ رہے ہیں۔“

”وہ واقعی چڑیل ہے سردار!“ کمار نے کہا۔ ”آپ سب لوگ میرے ساتھ چلیں میں دکھاتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں ہم نشے میں نہیں ہیں اس وقت۔“ اتنے میں پریا ایک ٹرے میں دو کپ بھاپ اڑاتی کافی لے کر داخل ہوئی۔ میں نے اس کی شکل یکسر بدل دی تھی۔ ایک بلا کی حسین لڑکی بنا دیا تھا۔ ایک ایسی حسین لڑکی کہ لوگ اس کی طرف دیکھتے ہی رہ جائیں۔ سرغنہ اور اس کے تمام ساتھی اندر کمروں میں گھس گئے۔ صرف کمار اور شیام رہ گئے۔ وہ کچھ دیر بعد واپس آئے۔ سرغنہ شیام اور کمار پر بگڑ گیا۔ ”حرام زادو...... وہاں کسی چڑیل کا نام و نشان نہیں ہے پچھلا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ شاید وہ تمہاری حرکتوں اور تمہیں زخمی کرنے کے بعد بھاگ گئی ہے۔ اب اتنی رات میں وہ مل بھی نہیں سکتی۔ ہم اسے کہاں تلاش کریں گے؟“

”سردار! اس لڑکی سے پوچھیں...... کیا اس نے پریا کو دیکھا تھا؟“ سرغنہ کے ساتھی نے کہا۔ ”یہ اندر سے تو آ رہی ہے۔ یہ شاید بتا سکے؟“

”کیا تم نے باورچی خانے یا کمرے میں کسی جوان لڑکی کو دیکھا تھا......؟“ سرغنہ نے پوچھا۔ ”وہ بھی تمہاری طرح حسین تھی؟“

”ہاں...... دیکھا تو تھا۔“ اس نے اثباتی انداز میں سر ہلا کر جواب دیا۔ ”میں پڑوس میں چائے بنانے کے لئے گئی تھی جب نکل رہی تھی تو ایک لڑکی کو اس مکان کے پچھلے دروازے سے نکل کر بھاگتے دیکھا اور بس میں سے اترتے ہوئے شخص نے ایک ٹیکسی روک کر اسے اس میں ساتھ بٹھا لیا تھا۔ پھر میں یہ دیکھ کر اندر آ گئی۔ حیران ہوں کہ یہ لڑکی کون تھی؟ مجھے پڑوس میں گئے صرف پندرہ منٹ ہوئے......“

''وہ کوئی حسین اور جوان لڑکی تھی یا چڑیل تھی؟'' سرغنہ نے پوچھا۔ ''کیا تم نے اس لڑکی کو اچھی طرح سے دیکھا تھا۔ ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔''

''وہ بہت حسین اور نوجوان لڑکی تھی......'' اس نے جواب دیا۔ ''وہ راج کمار کی طرح تھی۔ البتہ اس کے ہاتھ میں ایک خون آلود چھرا تھا۔''

''تم دونوں نے مجھ سے جھوٹ بولا کہ باورچی خانے میں چڑیل تھی۔'' سرغنہ کا پارہ چڑھ گیا۔ ''میرے منع کرنے کے باوجود تم دونوں نے اسے تنگ کیا۔''

''بھگوان کی سوگند لے لیں سردار!'' شیام نے بے بسی سے کہا۔ ''یہ عورت جھوٹ بول رہی ہے۔ آپ اس کی بات کا بالکل یقین نہ کریں۔''

''وہ کسی کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ کر چلی گئی۔'' سرغنہ اپنے پیر فرش پر پٹخنے لگا۔ ''اب کیا ہوگا؟ بڑے صاحب کے پاس کیا منہ لے کر جائیں گے؟''

''اب تو اس لڑکی کو جلدی پانا بہت مشکل ہے سردار!'' اس کے ایک ساتھی نے کہا۔ ''اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ ہم اس لڑکی کو اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ یہ پریا سے دگنی حسین ہے۔ جب تک پریا نہیں مل جاتی صاحب اس سے دل بہلاتے رہیں گے۔ ہماری بات بھی رہ جائے گی۔''

''سری رام! تم نے کیا اچھی بات بتائی ہے۔'' سرغنہ ایک دم سے خوش ہوگیا۔ ''بڑے صاحب تو اسے پا کر پریا کو بھی بھول جائیں گے۔''

سرغنہ پریا کی طرف بڑھنے لگا تو میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''یہ تمہارے یا سری رام کے باپ کا مال نہیں ہے۔ خبردار! جو تم نے اسے ہاتھ لگایا۔''

''اس سالے کو ختم کردو...... چاقو گھونپ دو...... گولی ماردو۔ اسے کتے کی موت ماردو۔ زندہ نہ چھوڑو۔'' سرغنہ چیخا۔

وہ میری طرف چاقو، چھرے اور خنجر لہراتے اور پستول اور ریوالور سے نشانہ لیتے بڑھے۔ ان کی حالت خون آشام بھیڑیوں کی طرح ہورہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ حملہ آور ہوتے اور نشانہ بناتے وہ ایک دم سے خوف و دہشت سے اچھل پڑے اور چیخیں مارنے لگے۔ ان کے ہاتھوں میں جو اسلحہ تھا وہ سانپ بن کر ان کے جسموں کے گرد لپٹ گیا اور وہ سانپ پھنکارنے لگے۔ یہ دیکھ کر ان کے اوسان خطا ہوگئے۔ وہ بدحواس ہوکر چیخیں مارتے ہوئے گھر سے نکل گئے۔ ان کی چیخیں گلی کی فضا میں گونجتی رہیں اور رفتہ رفتہ معدوم ہوگئیں۔

پریا میرے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی اور اس پر غنودگی سی طاری ہوگئی۔ میں اسے سابقہ حالت اور ہوش کی حالت میں لے آیا۔ وہ ہڑبڑا سی گئی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ آنکھیں ملیں۔ پھر وہ حیرت سے بولی۔ ''مجھے جھپکی سی آ گئی تھی۔ اس پل میں میں نے بڑا عجیب سا خواب دیکھا۔''

''خواب بڑے عجیب سے ہوتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''ایک پل میں آدمی نہ صرف بہت کچھ دیکھ لیتا ہے بلکہ اس کا دورانیہ طویل بھی ہوجاتا ہے۔''

''وہ بدمعاش شاید گھر میں گھس آئے تھے......؟'' وہ بولی۔ ''میں نے ان کی آواز سنی تھی۔ آپ سے تیز تیز لہجے میں باتیں کررہے تھے۔''

''میں نے انہیں بھگا دیا۔ وہ تمہاری تلاش میں آئے تھے۔ میں نے ان سے کہہ دیا کہ یہاں کوئی لڑکی نہیں آئی۔'' میں بولا۔ ''انہوں نے میری بات کا اعتبار کرلیا۔ میں نے ان سے کہا بھی تھا کہ وہ چاہیں تو گھر کی تلاشی لے کر اپنا اطمینان کرسکتے ہیں۔''

''اوہ ایشور! تم نے بڑی دیا کی......'' وہ بولی۔ ''آپ کے کارن میری عزت ان بھیڑیوں کے ہاتھوں بچ گئی۔'' اس نے اطمینان کی سانس لی۔

''اچھا تم کافی پیو......'' میں نے کہا۔ ''کافی جلدی ٹھنڈی ہوجاتی ہے۔ کافی پی کر تم اپنی فرار کی کہانی سنانا پسند کرو تو سنا دینا۔ ہوسکتا ہے کہ شاید میں کچھ تمہاری مدد کرسکوں۔ ان بدمعاشوں سے بچاؤں جو تمہاری عزت لوٹنے کے درپے ہیں۔''

''سچ......'' اس کا چہرہ دمک اٹھا اور اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس کے چہرے پر رونق آ گئی۔ ''آپ بہت اچھے اور مخلص آدمی معلوم ہوتے ہیں جو میری اس مصیبت میں مدد کرنا چاہتے ہیں۔ جب کہ اس دنیا میں اپنے کسی کو مصیبت میں دیکھ کر دور بھاگ جاتے ہیں اور پلٹ کر خبر نہیں لیتے ہیں۔'' دوسرے لمحے اس کا چہرہ کسی بلب کی طرح فیوز ہوگیا۔ ''وہ لوگ بہت خطرناک، ظالم اور سفاک ہیں۔ آپ ان سے ٹکر نہیں لے سکیں گے۔ لڑ نہیں سکیں گے۔ کون کسی کے لئے اپنی جان خطرے میں ڈالتا ہے۔ یہ وقت اور دور ایسا ہے کہ ہر شخص مدد کی آڑ میں کوئی نہ کوئی غرض رکھتا ہے۔ کہیں آپ اس بہانے......''

اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا، میں سب کچھ سمجھ گیا کہ اس کی باتوں کی تہہ میں کیا ہے۔ اس نے میرے بارے میں کوئی غلط رائے قائم کی تھی تو اس میں اس کا کوئی کوئی دوش نہیں تھا۔ کیوں کہ اس کے ساتھ ایسا ہوا تھا۔ بہت دھوکے کھا چکی تھی۔ ایک زخمی عورت تھی۔ اس کے وجود پر بہت سارے زخم تھے۔

''تمہیں اس لئے میری ذات پر شک ہورہا ہے کہ میں اس تھوڑی دیر میں تمہاری مدد کرنے کے لئے تیار ہوگیا۔'' میں نے کہا۔ ''چوں کہ تم بہت حسین ہو اس لئے تمہارا یہ خیال ہے کہ میں اس بہانے تم سے فائدہ اٹھاؤں گا۔ اور پھر تم نے میرے ہاں پناہ لے رکھی ہے۔ تم ایسی حسین عورت ہو کہ ایک مرد تمہیں اکیلا پا کر بہک جائے۔ تمہاری مجبوری اور بے بسی سے فائدہ اٹھائے۔ لیکن میں بہرحال ایسا نہیں ہو۔ تم مجھ پر بھروسہ کرسکتی ہو۔''

''عورت پہلی ہی نگاہ میں مرد کے چہرے اور اس کی آنکھوں سے جان لیتی ہے کہ مرد کے دل میں کیا ہے۔'' وہ کہنے لگی۔ ''اس کے دل میں جو میل ہوتا ہے وہ اس کے چہرے اور آنکھوں میں آجاتا ہے۔ چہرہ دل کا آئینہ ہوتا ہے۔ آپ کے دل میں میلا پن نہیں ہے یہ تو لگ رہا ہے۔ لیکن آپ بہت ہی سیدھے سادے قسم کے ہیں۔ معلوم نہیں کیسے اور کس طرح ان خطرناک اور خون آشام بھیڑیوں سے مقابلہ کریں گے۔''

''چوں کہ تم نہیں جانتی ہو کہ میں کون اور کیا ہوں۔ اس لئے یہ بات کہہ رہی ہو۔'' میں مسکرا دیا۔

"تم ایسا کرو جلدی سے اپنی کافی ختم کرلو۔ پھر اپنی کہانی سناؤ۔ پھر دیکھو۔ میں تمہارے لئے کیا کرتا ہوں اوران سے کیسے مقابلہ کرتا ہوں جو تمہاری عزت کے درپے ہیں۔"

پھر ہم دونوں خاموشی سے کافی پینے لگے۔ پریا واقعی بہت حسین عورت تھی۔ اس میں بڑی جاذبیت اوردل کشی تھی جو دل موہ لیتی تھی۔ وہ شعلہ مجسم تھی جو دلوں پر بجلی گراتی پھرتی ہوگی۔ کافی پینے کے بعد وہ پیالیاں باورچی خانے میں رکھ آئی اوراس نے اپنی کہانی سنانا شروع کی۔

"میں آپ کو اپنا نام تو بتا چکی ہوں۔ میرا نام پریا ہے۔ میرے گھر والے نہ تو امیر ہیں اور نہ ہی بہت غریب...... آپ میرے گھر کو متوسط گھرانہ کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اس مہنگائی اور دولت کی ریل پیل کے دور میں ایک متوسط گھرانا کیا حیثیت رکھتا ہے۔ بھگوان کسی غریب اور متوسط گھرانے میں عورت کو جنم نہ دے اگر لڑکی دے تو پھر اسے حسن نہ دے۔ بس وہ ایک ایسی عام سی اور واجبی شکل وصورت کی لڑکی ہو جو مردوں کو اپنی طرف متوجہ نہ کرسکے۔ بھگوان غریب کو دولت دے دے۔ اس کی غریبی دور کردے۔ اس کی محتاجی اوراحساس محرومی کی زندگی نہ ہو۔ پر حسین بیٹی نہ دے۔ کیوں کہ دولت مند اسے مفت کا مال اوراپنی جاگیر سمجھ لیتے ہیں۔

مجھے کہ تعلیم حاصل کرنے کا شوق نہیں بلکہ جنون تھا۔ میری ماں کہتی تھی کہ...... تو پڑھ لکھ کر کرے گی کیا؟ تعلیم پر جو خرچ ہوگا اسے تیرے باپ کو بچا کر رکھنا چاہئے تاکہ تیری شادی بیاہ کے لئے کام آئے۔ کیوں کہ تو غریب کی بیٹی ہے۔ پڑھ لکھ کر تو کوئی تیر نہیں مارے گی۔ تو حسین ہوئی تو کیا ہوا۔ تو جاڑے کی چاندنی ہے۔ حسن پر ناز نہ کر۔ تو کسی بڑے گھر کی بہو بننے سے رہی...... تیری شادی ہم جیسے ہی کسی خاندان کے لڑکے سے ہوگی۔ باورچی خانے میں بھاڑ جھونکے گی اور بچے پیدا کرے گی۔ کسی دن بوڑھی ہوکر مر جائے گی۔

میرے پتا جی چوں کہ ایک پرائمری اسکول میں پڑھاتے تھے۔ وہ گاؤں میں ماسٹر جی کے نام سے مشہور تھے۔ اس لئے انہوں نے میری خواہش اور تعلیم پر توجہ دی۔ میں بہت خوب صورت پیدا ہوئی تھی۔ عمر کے ساتھ ساتھ میری خوب صورتی میں اضافہ ہوتا گیا۔ میرے پتا جی سیدھے سادے اور شریف آدمی تھے۔ وہ کسی کے معاملات میں دخل نہیں دیتے تھے۔ ان کے نزدیک تعلیم او[علم] کی بڑی اہمیت تھی۔ وہ اسی دنیا میں مگن رہتے۔ انہوں نے کبھی میرے حسن اوراٹھان پر توجہ نہ دی اور نہ ماں کی طرح کوئی احساس اور فکر تھا۔ ان پر صرف ایک دھن سوار تھی کہ گاؤں کا ہر بچہ بچہ تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوجائے۔

میں جس گاؤں کی رہنے والی ہوں وہ یہاں سے چار پانچ میل دور ہے۔ ایک غیر معروف سا گاؤں ہے۔ اس کا نام ہری پور ہے۔ اس گاؤں پر دو آدمیوں کا راج ہے۔ ایک تو پولیس انسپکٹر جو تھانے میں ایس ایچ او ہے۔ اس کا نام پرتاب سوامی ہے وہ بہت ہی سور، کمینہ، بدخصلت، سفاک اور بڑا ظالم ہے۔ اس کی نظروں میں غریب لوگ بڑے حقیر، کم تر اور ذلیل ترین ہیں۔ غریب لوگوں کی عورتوں اور لڑکیوں کی عزت اس کے نزدیک ایسی ہے کہ جب جی چاہے اس سے کھیل لیا جائے۔

دوسرے شخص کا نام مہیش لال ہے۔ اس گاؤں کا سب سے بڑا دولت مند، بااثر اور بارسوخ شخص

ہے۔ صوبائی اسمبلی کا ممبر ہے۔ اس کی پتنی جو بہت حسین تھی اسے چھوڑ کر اس کی سیاسی پارٹی کے سیکریٹری کے ساتھ دو برس پہلے بھاگ گئی جس کا آج تک پتا نہیں چلا۔ اس غریب عورت نے اپنے پتی کے ساتھ بائیس برس کا لمبا سفر یہ سوچ کر کاٹا تھا کہ وہ اس کا اپنا ہے۔ لیکن اس کا پتی اوباش شخص ہے صوبائی اسمبلی کا ممبر بنتے ہی وہ راجہ اندر بن بیٹھا۔ اس کی پتنی نے اسے کہا کہ وہ رنگ رلیاں منانا چھوڑ دے، کیوں کہ وہ ایک لڑکی کا باپ ہے۔ دولت مند اور بڑا آدمی ہوا تو کیا ہوا آخر باپ ہے۔ پاپ باپ ہی ہوتا ہے۔ وہ پاپی بن کر دنیا والوں کی نظروں میں رسوائی مول لے رہا ہے۔ لیکن اس نے پتنی کی بات نہیں مانی۔ اس کان سے سنتا تھا اس کان سے اڑا دیتا تھا۔ وہ ایک دو برس تک اپنے پتی کو سمجھاتی رہی اور کچھ لڑکیوں کی عزت بھی بچاتی رہی۔

جب وہ ایک رات گھر نہ آیا تو اس نے اپنے پتی کی عزت اور وجود پر انگارہ رکھ دیا۔ خود بھی پاپ کر بیٹھی۔ کیوں کہ اس کا پتی اسے طلاق دینے پر آمادہ نہ تھا۔ اس نے اپنے پتی کے جوان سیکریٹری کو شیشے میں اتارا۔ وہ کیوں نہیں اس عورت کا غلام بنتا۔ وہ بہت حسین تھی۔ اس کا آشنا عمر میں اس سے پانچ برس بڑا تھا۔ وہ جاتے جاتے اتنا زیور اور رقم لیتی گئی جو دس برس کے لئے کافی تھا۔ مہیش لال نے یہ مشہور کردیا کہ اس کی پتنی لندن اپنے میکے گئی ہوئی ہے۔ لڑکی اپنے باپ کے ساتھ رہنے لگی۔ وہ اپنے باپ کو بہت چاہتی ہے۔

جب میٹرک کے امتحان کا نتیجہ آیا تو اس کی بیٹی شکنتلا اور میں نے ٹاپ کیا تھا۔ پورے صوبہ کرناٹک میں اس گاؤں کی عزت اور شہرت میں بے پناہ اضافہ ہوا تھا۔ مہیش لال نے پورے گاؤں میں جشن منانے کا حکم دیا اور اس نے اپنی حویلی میں ایک تقریب کا اہتمام کیا۔ شکنتلا نے مجھے بھی اور میرے گھر والوں کو بھی اس تقریب میں شرکت کی دعوت دی۔ میں نے مہیش لال کو کئی برسوں پہلے دیکھا تھا۔ اس طرح اس نے بھی مجھے نہیں دیکھا تھا۔ میں اس روز خصوصی طور پر تیار ہوکر اس تقریب میں پہنچی تھی۔

اس تقریب میں شکنتلا نے جب اپنے پتا جی مہیش لال سے ملایا اور تعارف کرایا تو وہ بہت خوش ہوا۔ وہ ایک لمحے کیلئے مجھے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ اس نے مجھے جن نظروں سے دیکھا تھا اس سے میں نے اپنے سارے بدن پر ایک سنسنی سی محسوس کی اوران جانا خوف محسوس ہوا۔ میں نے اسے واہمہ سمجھ کر جھٹک دیا۔ پھر مہیش لال نے مجھے سونے کا ایک لاکٹ تحفے میں اس لئے دیا کہ میں نے بھی ٹاپ کر کے گاؤں کا نام روشن کردیا تھا اور ایک مثالی لڑکی بن گئی تھی۔ میں جب تک تقریب میں موجود رہی مہیش لال کسی نہ کسی بہانے سے میرے قریب رہا۔ اس نے میری کامیابی کے ساتھ ساتھ میرے حسن کی بھی بڑی تعریف کی تھی۔ غیر محسوس انداز سے اس نے دو ایک موقع پر میرے شانے اور پشت پر ہاتھ رکھا تھا۔ میں نے اس بات کا کوئی خیال نہیں کیا۔

اس تقریب کے دوسرے دن پتا جی گھر میں داخل ہوئے تو وہ بہت گھبرائے ہوئے اور پریشان تھے۔ ماں جی اور میں بھی ان کی یہ حالت دیکھ کر گھبرا گئیں۔ کیوں کہ پتا جی کبھی ایسی حالت میں گھر میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے اس کمرے میں رکنے کے لئے کہا اور ماں کو وہ دوسرے کمرے میں لے گئے تو مجھے بھی تجسس ہوا۔ میں دروازے کے پاس اس طرح کھڑی ہوگئی کہ انہیں نظر نہ آسکوں۔ پھر

میں نے کان لگا دیئے۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ''رتنی! مہیش لال نے پریا کے لئے اپنا رشتہ بھیجا ہے۔''

''کیا......؟'' ماں بھونچکی ہو کر پتا جی کی شکل سکتے کی سی حالت میں دیکھنے لگیں۔ انہیں جیسے یقین نہیں آیا تھا۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہو؟''

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔'' پتا جی نے اپنی گردن اثبات کے انداز میں ہلائی۔ ''میں جب اسکول میں بچوں کو پڑھا رہا تھا ان کا آدمی ہری رام آیا۔ اس نے کہا کہ مہیش لال کو تمہاری بیٹی بہت پسند آئی ہے۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتے ہیں...... یہ بات اس نے مجھے الگ لے جا کر کہی تھی۔ مجھے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔ میں نے اس سے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ پچپن ساٹھ برس کے ہیں، میری بیٹی سترہ برس کی ہے۔ ان کی بیٹی شکنتلا بھی میری بیٹی کی ہم عمر ہے۔ کیا جوڑ ہے ان کا اور میری بیٹی کا...... یہ عمر تو نانا اور دادا کے عمر کی ہوتی ہے......''

میرا جواب سن کر ہری رام کو بہت غصہ آیا۔ وہ بگڑ کر بولا۔ ''کیا بے وقوفی کی بات کرتے ہو ماسٹر جی...... یہ رشتہ ایسا ہے کہ خوش قسمتی کے ساتوں در کھول دے گا۔ وہ ایک راج کماری کی طرح عیش کرے گی عیش...... تم عمروں کے فرق کو نہ دیکھو......؟ مہیش لال دو لاکھ بھی دے گا تاکہ تم اس کی شادی دھوم دھام سے کر سکو۔ دو لاکھ میں سے تم ایک لاکھ خرچ کر کے ایک لاکھ روپے بچا لینا۔''

پتا جی سانس لینے کو رکے تو ماں نے گھبرا کے پوچھا۔ ''تم نے کیا جواب دیا؟ کہیں ہاں تو نہیں کر لی؟ اے بے وقوف انسان!''

''کیا تم مجھے بچہ سمجھتی ہو......؟'' پتا جی نے تیز لہجے میں جواب دیا۔ ''میں نے اس سے کہا کہ اپنی پتنی سے مشورہ کر لوں اور بیٹی سے رائے لے لوں۔ تم کیا کہتی ہو؟''

''میں یہ کہتی ہوں کہ مٹی ڈالو اس رشتے پر...... اس رزیل، کمینے اور بدکار کو شرم نہیں آئی ہماری پری جیسی بیٹی کا رشتہ مانگتے ہوئے۔'' ماں نے تنک کر کہا۔ ''تم نے ہری رام سے کیوں نہیں کہا کہ وہ اپنی چھوکری کو کیوں نہیں بیاہ دیتا۔ وہ تو بڑی خوبصورت ہے۔ نوجوان ہے۔''

''اصل بات یہ ہے کہ مہیش لال کا دل ہماری بیٹی پر آ گیا ہے۔'' پتا جی قدرے نرم پڑ کر بولے۔ ''میرا خیال ہے کہ مہیش لال کو داماد بنا لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ وہ راج کماری کی طرح زندگی گزارے گی اور عیش کرے گی۔ تم عمروں کے فرق کو نہیں مال و دولت کو دیکھو۔''

''ایں...... تم ماسٹر صاحب ہو کر یہ بات کہہ رہے ہو؟'' ماں حیران رہ گئی۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔''

''میں اپنی بیٹی کے مستقبل کے خیال سے کہہ رہا ہوں۔'' پتا جی نے کہا۔ ''ہمارے پاس اس کی شادی کرنے کے لئے رکھا ہی کیا ہے یہ تم نے سوچا۔''

''اس سے میری بچی کا بیاہ کرنے سے تو بہتر ہے کہ کسی روز کنویں میں ڈال آؤ۔'' ماں غصے سے پھنکارنے لگی۔ ''وہ سیاہ کار ہے۔ اس کے قصے کیا تم نے نہیں سنے......؟ اس نے کتنی لڑکیوں اور

عورتوں کی عزت پر ڈاکہ مارا۔ وہ پریا سے شادی کر کے دو تین برس تک اس سے کھیلتا رہے گا۔ پھر دودھ میں گری مکھی کی طرح نکال کر پھینک دے گا اس سے حسین لڑکی ملنے پر...... وہ ہر تین مہینے میں ایک لڑکی بدلتا رہتا ہے......''

ادھر ماں اور پتا جی میں میرے رشتے کے بارے میں بحث و تکرار ہو رہی تھی۔ ادھر میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا کہ کہیں مہیش لال کا رشتہ منظور نہ کر لیا جائے۔ کیوں کہ میرے من میں تو کوئی اور بسا ہوا تھا۔ میرا سپنا کوئی اور تھا۔ آخر پتا جی کو ماں جی کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ انکار کر دیا گیا۔ اس انکار کو مہیش لال نے اپنی بے عزتی، توہین اور ذلت سمجھا۔ اس نے سب سے پہلے پتا جی کو نشانہ بنایا اور انہیں اسکول کی ملازمت سے بھی نکال دیا۔ مہیش لال میرے خلاف کوئی منصوبہ بنا رہا تھا۔ معلوم نہیں کس نے اسے مشورہ دیا کہ وہ مجھ سے جبر و زیادتی سے شادی نہ کرے۔ کیوں کہ اس طرح وہ میری محبت اور والہانہ وارفتگی سے محروم رہے گا۔ اصل بات عورت کا جسم جیتنا نہیں بلکہ اس کا من جیتنا ہوتا ہے۔ پھر اسے مشورہ دیا گیا کہ وہ اس جادوگرنی سے جس کا نام کویتا ہے۔ جو میسور کے جنگل کی پٹی پر ایک کٹیا میں رہتی ہے اس سے مل کر بات کرے۔ وہ لڑکی کا دل نہ صرف موم کر دے گی بلکہ شادی پر بھی آمادہ...... وہ بہت پہنچی ہوئی ہے۔ لیکن وہ اس کام کے دس ہزار روپے بھی لیتی ہے۔ مہیش لال کے لئے دس ہزار، دس روپے کے برابر تھے۔

مہیش لال دوسرے دن ہی کویتا کی کٹیا میں پہنچا۔ سارا ماجرا کہہ سنایا اور دس ہزار کی رقم اس کی بھینٹ چڑھا دی۔ کویتا سے ہر کوئی خوف کھاتا تھا۔ کیوں کہ وہ اچھی عورت نہیں تھی۔ اس نے اپنے جادو ٹونے سے لوگوں کو پریشان کیا ہوا تھا۔ اس کا دھرم صرف پیسہ تھا۔ وہ اس کے لئے کچھ بھی کر سکتی تھی۔

اس کے دوسرے دن میں کیا دیکھتی ہوں کہ مہیش لال مجھے ویرانے میں اکیلا مل گیا۔ وہ اس لمحے مجھے اتنا خوب صورت لگا کہ میرا دل اس پر بے اختیار آ گیا۔ میں اس سے محبت بھری باتیں کرنے لگی۔ اسے یقین دلایا کہ میں اس سے ہر قیمت پر شادی کروں گی۔ میں اپنی ماں کو سمجھا کر شادی پر راضی کر لوں گی۔ اگر میری ماں نے راستے میں روڑے اٹکائے تو پھر میں اپنا گھر بار چھوڑ کر چلی آؤں گی۔ پھر تم بیاہ کر لینا مجھ سے...... مہیش لال میری یہ بات سن کر چلا گیا۔ میں اس وقت اپنا پریم اور اپنے پریمی کو بھی بھول گئی۔ میرے دل کے کسی کونے میں اس کی محبت کی رمق نہ رہی جس سے میں ٹوٹ کر محبت کرتی چلی آئی تھی۔

میں حیران تھی کہ یہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ مہیش لال نے مجھ پر اپنی محبت کا کیا جادو کیا تھا جو میں اس کی داسی کی طرح بن گئی تھی۔ میں نے اس کی محبت بھری باتیں سن کر اس سے اقرار محبت کر لیا۔ وہ فی الوقت جس خواہش کا بھی اظہار کرتا میں شاید انکار نہ کرتی۔ اور پھر وہ کتنا سندر آدمی ہے۔ اس کے متعلق لوگ جانے کیا کیا کچھ کہتے پھرتے ہیں۔ وہ ایسا نہیں ہے۔ اگر وہ ایسا ہوتا تو وہ مجھے کلی کی طرح مسل دیتا۔ میں خوش ہو جاتی۔ اور پھر وہ کتنا خوب صورت بھی لگا تھا۔ میں ان خیالوں میں مگن خوش تھی اور سوچ رہی تھی کہ اس کی پتنی بننے کے بعد میں نہ صرف اس کے دل کی ملکہ بن جاؤں گی بلکہ اس کی ساری دولت بھی میری اپنی ہو گی۔ میں مہارانی کی سی شان اور آرام سے رہوں گی۔ اور پھر مہیش لال نے یہ وچن بھی دیا تھا کہ وہ

مرتے دم تک کسی دوسری عورت کی طرف نہیں دیکھے گا۔ آخر اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔ جب کہ اسے دنیا کی حسین ترین لڑکی مل گئی۔ وہ دنیا کا خوش نصیب ترین انسان ہے۔

مجھے دور سے ایک سادھو آتا دکھائی دیا۔ دراصل اس سادھو کو مہیش لال نے اس سمت آتے دیکھا تو وہ مخالف سمت تیزی سے چل کر میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ مجھے اس سادھو کا اس طرف آنا سخت ناگوار لگا تھا۔ کیوں کہ اس نے رنگ میں بھنگ ڈال دیا تھا۔ سادھو میرے پاس آ کر رک گیا۔ اس نے مجھے اوپر سے نیچے تک گہری نظروں سے دیکھا اور میں بھی اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ بہت ہی بوڑھا تھا۔ نہ صرف اس کے سر کے تمام بال دودھ کی طرح سفید تھے بلکہ اس کی بھنویں بھی سفید ہو چکی تھیں۔ اس کی عمر سو برس سے کم نہ ہو گی۔ اس کا چہرہ جھریوں سے بھرا ہوا تھا۔

”تمہارا نام پریا ہے نا......؟“ سادھو نے بڑے نرم اور محبت بھرے لہجے میں کہا۔ ”تم ماسٹر کشور کی بیٹی ہو؟“

”جی......جی۔“ میں اس کے منہ سے اپنا نام سن کر بڑی حیران ہوئی اور اپنا سر اثباتی انداز میں ہلا دیا۔ ”آپ کیسے جانتے ہیں؟“

”میں اس لئے جانتا ہوں کہ ایک سادھو ہوں۔ سادھوؤں سے کوئی بات بھی کسی کے متعلق چھپی نہیں رہ سکتی۔“ وہ بولا۔ ”یہ شخص کون تھا؟“

”آپ میرے بارے میں تو جانتے ہیں لیکن ان کے بارے میں نہیں۔“ میں حیا آلود ہو کر بولی۔

”ان کا نام مہیش لال ہے، اس گاؤں کے ٹھاکر ہیں۔“

”میں اس کے بارے میں اتنا کچھ جانتا ہوں کہ وہ خود بھی نہیں جانتا ہو گا۔“ سادھو نے جواب دیا۔ ”میں نے تم سے یہ بات کسی اور وجہ سے معلوم کی۔ یہ وہی شخص ہے جس نے تمہارے لئے اپنا رشتہ بھیجا۔ تمہاری ماں نے اس لئے انکار کر دیا کہ وہ ایک اوباش شخص ہے۔ بھونڈا فطرت کا ہے۔ تمہیں بھی اس شخص سے نفرت تھی۔ کیوں کہ ایک تو تمہارا اور اس کا کوئی جوڑ نہیں تھا وہ تمہارے باپ کی عمر کا تھا۔ ایک بدکار شخص......اور پھر تم نے کسی اور کو دل دیا ہوا تھا۔ لیکن آج ابھی اور اس وقت تمہاری یہاں اس سے ملاقات ہوئی تو تمہاری نفرت ایک دم سے محبت میں بدل گئی۔ تم محبت بھری دنیا میں کھو گئیں......اس کی محبت بھری باتوں نے تمہارا دل جیت لیا۔ تمہارا دل اندر سے باغ باغ ہو گیا۔ تم نے اپنے پریمی کو بھی بھلا دیا۔“

میں سادھو کی زبان سے یہ ساری باتیں سن کر بھونچکی سی ہو گئی۔ میں اس طرح کے سکتے میں آ گئی جس طرح بجلی گرنے سے ہو جاتا ہے۔ میں ساکت و جامد اور بے حس و حرکت ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ اس نے ایک بات بھی غلط نہیں کہی تھی۔ وہ دل کی بات سے بھی واقف تھا۔

”وہ مہیش لال نہیں تھا۔“ سادھو نے کہا۔ ”اس لئے وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان کر اور گھبرا کے چلا گیا اور نظروں سے غائب ہو گیا۔“

”وہ مہیش لال نہیں تھا......؟“ میں چونک کر حیرت سے بولی۔ ”وہ مہیش لال نہیں تھا یہ آپ غلط کہہ

رہے ہیں۔ وہ مہیش لال ہی تھا۔“

”میں تمہیں بتاتا ہوں وہ کون تھا......؟“ سادھو کہنے لگا۔ ”مہیش لال نے تم سے شادی کرنے کے لئے اپنا رشتہ بھیجا تھا۔ تمہارے گھر والوں نے انکار کر دیا تو وہ چراغ پا ہو گیا۔ اس نے تمہیں اغوا کر کے یرغمال بنا کر بستر کی زینت بنانے اور تم سے ایک کھلونے کی طرح اس وقت تک کھیلنے کا منصوبہ بنایا جب تک اس کا دل نہیں بھر جاتا۔ تمہارے گھر والے اس کا بال تک بیکا نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ قانون دولت مندوں کے آگے بے بس ہے۔ مہیش لال کے ایک آدمی نے سمجھایا کہ وہ یہ غلط قدم نہ اٹھائے۔ کیوں کہ وہ جسم کا مالک تو بن جائے گا لیکن دل کا نہیں، اس کا دل جیت لو تو وہ تمہیں ہر طرح خوش کرتی رہے گی اور زندگی حسین اور خوش گوار ہو جائے گی۔ اس کے لئے تم جادوگرنی کویتا سے ملو۔ وہ پریا کے دل میں تمہارے لئے محبت کو جنم دے دے گی۔ پریا اپنے ماں باپ کو تم سے شادی کرنے پر آمادہ کر لے گی۔ پھر وہ کویتا سے ملا۔ یہ کویتا تھی جس نے تمہیں جادو کے زور سے اس ویرانے میں بلایا اور تم سے مہیش لال بن کر ملی اور اس کی محبت کا اسیر بنا لیا۔ اب تمہارے دل میں مہیش لال کے خلاف نفرت بالکل بھی نہیں ہے۔“

میں اس کی باتیں سن کر متحیر سی رہ گئی۔ تیز لہجے میں پھر بولی۔ ”میں مہیش لال سے محبت کرتی ہوں۔ آپ مجھے اس کے خلاف کس لئے ورغلا رہے ہیں؟“

سادھو نے میری بات کا جواب دینے کے بجائے ایک منتر پڑھ کر مجھ پر پھونکا۔ دوسرے لمحے میں کویتا کے جادو کے جال سے نکل آئی۔ میرے دل میں مہیش لال کے خلاف نفرت کی شدید لہر اٹھی۔ مجھے میرا پریمی یاد آیا۔ کویتا نے واقعی مجھ پر جادو کر دیا تھا۔

”سادھو مہاراج؟“ میں جذباتی ہو کر ممنونیت سے بولی۔ ”آپ نے مجھ پر بڑی دیا کی جسے میں ساری زندگی بھول نہیں سکتی۔...... لیکن اب آپ یہ بتائیں کہ میرے دوبارہ شادی کرنے سے انکار کرنے پر کویتا اپنے جادو کے زور سے مجھے پھر مہیش لال سے محبت اور شادی کرنے پر مجبور تو نہیں کر دے گی؟“

”وہ ایسا ضرور کرے گی۔“ سادھو نے کہا۔ ”کیوں کہ مہیش لال اسے بیس ہزار کی رقم اس کے عوض دے چکا ہے۔ شادی ہو جانے کی صورت میں اتنی ہی مزید رقم دینے کا وعدہ کر چکا ہے۔ ظاہر ہے کویتا اپنا سارا زور لگا دے گی کہ تمہاری شادی اس سے ہو جائے۔“

”او بھگوان!“ میں ایک دم سے کانپ اٹھی۔ ”سادھو مہاراج اب کیا ہو گا۔ میں اس ڈائن کے جادو منتر سے کیسے بچ سکوں گی؟“

”تم اس کی چنتا نہ کرو۔“ سادھو نے اپنے ہاتھ کو جیب میں ڈالا۔ پھر ایک گنڈا نکال کر مجھے دیا اور کہا۔ ”تمہارے گھر والوں کے دوبارہ انکار پر وہ اور مہیش لال غضب ناک ہو جائیں گے۔ کویتا اپنے جادو کے زور پر تمہیں تنگ اور ہراساں کر کے مہیش لال سے شادی کرنے پر مجبور کرے گی۔ جب تک یہ گنڈا تمہارے پاس موجود ہے کویتا کا کوئی جادو تم پر ذرہ برابر بھی اثر نہیں کرے گا۔ تم اسے حفاظت سے ہر وقت اپنے پاس رکھنا۔ گلے یا بازو میں باندھ لینا۔“

اتنا کہہ سادھو نظروں سے غائب ہوگیا۔ میں نے گھر آ کر ماں کو سارا قصہ سنایا۔ ماں نے اس گنڈا کو میرے گلے میں ڈال دیا۔ دوسرے دن پھر مہیش لال نے اپنا رشتہ بھیجا۔ صاف انکار کر دیا گیا جس پر واقعی کویتا اور مہیش لال غضب ناک ہو گئے۔ اس رات کویتا نے مجھے ہراساں کرنے کے لئے ایک کھیل کھیلا۔

شاید کویتا کے علم میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ سادھو مہاراج نے مجھے گنڈا دیا ہے۔ جس کے باعث مجھ پر کوئی جادو اثر نہیں کرسکتا۔ شاید اس نے اپنے علم سے یہ بات معلوم کرنے کی کوشش کی ہوگی کہ میرے اور سادھو مہاراج کے درمیان کیا گفتگو ہوئی اور مہاراج نے اس کے جادو کو بے اثر کرنے کے لئے کیا کوئی چیز وغیرہ دی۔ سادھو مہاراج کے جادو نے اس کے جادو کو کچھ معلوم کرنے نہیں دیا ہوگا۔ ورنہ وہ میرے خلاف کوئی کھیل نہیں کھیلتی اور نہ ہی مجھ پر اپنا جادو چلاتی۔ وہ سادھو مہاراج کے بارے میں جانتی ہوگی کہ کتنے مہان ہیں۔ اس لئے انہیں دیکھتے ہی وہ چل پڑی تھی۔

رات میں سونے کے لئے بستر پر دراز ہوئی تو نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ چاندنی رات تھی۔ کھڑکی کی راہ سے چاندنی کمرے میں آ کر پھیل گئی۔ اس چاندنی کے دریا میں میرا انگ انگ نہا رہا تھا۔ میں کویتا کے جادو اور مہیش لال کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ کھڑکی میں کوئی آیا تو میں اچھل سی پڑی اور میرا سینہ دھک سا ہوگیا۔ دوسرے لمحے جان میں جان آئی۔ میری سہیلی روپا تھی۔ وہ چاندنی راتوں میں آ جاتی تھی تاکہ ہم چاندنی راتوں سے لطف اندوز ہوسکیں۔ بعض وقت ایک دو سہیلیاں اور بھی آ جاتی تھیں لیکن روپا تو ابتدائی چاندنی راتوں سے لے کر بائیس راتوں تک کو باقاعدگی سے آتی تھی۔ گھر سے باہر درخت کے باہر جو چبوترا بنا ہوا تھا اس پر دو تین گھنٹوں تک بیٹھی دنیا جہاں کی باتیں کرتی رہتی تھی، وہ گاؤں کے ایک لڑکے انوپم سے محبت کرتی تھی۔ وہ اپنے محبوب سے ملاقاتوں کے قصے مزے مزے لے کر سناتی تھی۔ ان کی محبت بڑی بے باک اور آزادانہ قسم کی تھی۔ انوپم کو اس بات کا انتظار تھا کہ وہ بی اے فائنل کا امتحان دے دے۔ پھر اپنا رشتہ بھیجے۔ آج چوں کہ روپا کا خیال نہیں رہا تھا اس لئے میں بستر پر چلی گئی تھی۔ جب میں باہر آئی تو دیکھا کہ وہ بڑی گلابی ہو رہی ہے۔ اس کی نظریں جھکی جا رہی ہیں۔ بال بکھرے ہوئے ہیں۔ میں سمجھ گئی کہ وہ انوپم سے مل کر آ رہی ہے۔ اس ملاقات کا فسانہ اس کے چہرے پر لکھا ہوا تھا۔ پھر اس نے اس محبت بھری ملاقات کا اقرار کیا۔

وہ اور میں چبوترے پر بیٹھ کر باتیں کر رہی تھیں کہ روپا پر اچانک غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ اس نے کہا کہ اسے بڑے زور کی نیند آ رہی ہے اور میں اسے گھر پہنچا دوں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ مجھے اس طرح اس کے نیند کی سی حالت میں ڈوبنے پر بڑی حیرت ہوئی۔ اس کا گھر زیادہ دور نہ تھا۔ میں اسے سہارا دے کر اس کے گھر کی طرف لے چلی۔ اس کی نیند کافور ہوگئی۔ لیکن پھر بھی اس پر نیند کا غلبہ سا تھا۔ جب میں واپس ہوئی تو مجھے ایک عورت کا سا ہیولا نظر آیا۔ یہ ویران سا راستہ تھا۔ اس وقت ایک گہرا سناٹا فضا پر چھایا ہوا تھا۔ پوری بستی سوئی پڑی تھی۔ رات خاصی بیت چکی تھی۔ جب میں نے اس عورت کو دیکھا تو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ کون ہو سکتی ہے۔ اس وقت کہاں جا رہی ہوگی؟ جب کہ اس سے کوئی لڑکی اور عورت گھر

سے نہیں نکلتی تھی۔ میں نے اسے پہچاننے کی کوشش کی لیکن پہچان نہ سکی۔ جیسے جیسے اس کے اور میرے درمیان فاصلہ کم ہوتا گیا ویسے ویسے اس کے خال وخد نمایاں ہوتے گئے۔ وہ ایک جوان، خوبصورت اور بھرپور قسم کی عورت تھی۔ جانے کیوں وہ مجھے مشکوک سی لگی۔ لیکن یہ عورت اس بستی کی نہ تھی۔ میں اس گاؤں کی ایک ایک عورت کو جانتی اور پہچانتی تھی۔ میں اسے دیکھ کر رک گئی۔

”پریا!“ اس عورت نے میرا نام لے کر مجھے مخاطب کیا۔ میری حیرت دوچند ہوگئی۔ ”سنو...... میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔“ میں دنگ ہوگئی کہ یہ میرا نام کیسے جانتی ہے۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہیں مرکوز کر کے پوچھا۔ ”آپ کون ہیں؟ میں نے پہچانا نہیں۔“

”میرا نام ونلا کماری ہے۔ میں رامانند صاحب کی سالی ہوں۔“ اس نے اپنا تعارف کرایا۔ رامانند صاحب پڑوسی تھے۔ لیکن میں نے اسے کبھی ان کے ہاں نہیں دیکھا تھا۔ ”میں شہر سے دو دن پہلے آئی ہوں۔ نیند نہیں آ رہی تھی تو باہر ٹہلنے کے لئے نکل آئی اور چاندنی رات کا نظارہ کرنے لگی...... شہر میں چاندنی رات کے ایسے دل فریب نظارے کہاں؟ لیکن میں اس سے بھی حسین نظارہ دیکھ رہی ہوں۔“

”اس سے حسین نظارہ کون سا ہے؟“ میں نے متعجب لہجے میں پوچھا۔ ”پہاڑوں کا جو یہاں سے بہت دور ہیں؟“

”نہیں...... تمہارا......؟“ وہ ہنس کر بولی۔ اس کی ہنسی بہت دل کش تھی۔ ”تم چاند سے بھی زیادہ حسین ہو۔ میں نے شاید ہی تم جیسی لڑکی دیکھی ہو۔“

”اچھا......“ میں بھی کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ ”آپ میری اتنی تعریف نہ کریں کہ دماغ خراب ہو جائے۔ میں کیا دنیا کی کوئی لڑکی یا عورت چاند سے زیادہ حسین نہیں ہوسکتی اور پھر میں نے اپنے آپ کو کبھی حسین سمجھا ہی نہیں۔ بھگوان نے جیسا بنایا ویسی ہی ہوں۔“

”ہم کیوں نہ اس چبوترے پر بیٹھ کر کچھ دیر باتیں کریں۔“ ونلا کماری بولی۔ ”مجھے تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔“

ہم اس چبوترے پر آ بیٹھے جس پر میں اور روپا چاندنی راتوں کے سمے بیٹھ کر گھنٹوں باتیں کرتے تھے۔ اس کے اور میرے درمیان رسمی انداز سے باتیں ہوتی رہیں۔ اس نے بتایا کہ وہ اپنی دیدی سے ملنے پہلی بار آئی ہے۔ پھر اس نے اچانک موضوع بدلا۔

”میرے بہنوئی رامانند صاحب بتا رہے تھے کہ مہیش لال کا رشتہ دو مرتبہ آیا تھا جسے تمہاری ماں نے واپس کر دیا۔“ وہ بولی۔ ”کیا یہ سچ ہے......؟ وہ تو صوبائی اسمبلی کے ممبر ہیں۔ دولت مند ہیں اور اس بات کا امکان ہے کہ دو ایک سال بعد انہیں وزیر بنا دیا جائے۔“

”جی ہاں یہ بالکل سچ ہے۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلا کر جواب دیا۔ ”آپ یہ سب کچھ جانتی ہیں۔ لیکن یہ نہیں جانتی ہیں کہ وہ کیسے آدمی ہیں۔ وہ ایک سیاہ کار شخص ہیں۔“

”تم جو بات کر رہی ہو یہ اگلے وقتوں کی ہے۔“ وہ سمجھانے کے انداز میں کہنے لگی۔ ”اب ہر چیز

بدل گئی ہے۔ بدل رہی ہے۔ وہ وقت اور زمانہ نہیں رہا جو ہمارے باپ دادا کے دور میں تھا۔ دنیا بہت تیزی سے آگے جارہی ہے جس کا اندازہ یہاں بیٹھ کر نہیں ہوسکتا ہے، شہروں میں کیا جاسکتا ہے۔ شہر کی لڑکیاں آج بہت حقیقت پسند ہیں۔ گو کہ میں شادی شدہ ہوں۔ اگر مہیش لال مجھ سے شادی کرنے کی خواہش کرے تو میں اپنے پتی سے طلاق لے کر اس سے شادی کرلوں۔ کیوں کہ میرا پتی ایک دفتر میں کام کرتا ہے، اس کی تنخواہ چار ہزار روپے ہے۔ لیکن اس تنخواہ سے کیا ہوتا ہے۔ کوئی مستقبل نہیں ہے۔ بچے ہوتے تو جانے کیسے گزارہ ہوتا۔ اگر مہیش لال شہر کی کسی بھی حسین لڑکی کو شادی کا پیغام دے تو وہ انکار نہیں کرے گی۔ کیوں کہ وہ اس کی عمر نہیں دولت اور حیثیت دیکھے گی۔ وہ جانتی ہے کہ مہیش لال کے مرنے کے بعد اس کی ساری دولت اور جائیداد اسے مل جائے گی۔ اگر تم کسی عام آدمی سے شادی کرلو گی تو تمہارا کوئی مستقبل نہیں ہوگا۔ وہ تمہارے حسن، شباب اور دلکشی کو کسی دیمک کی طرح چاٹ لے گا۔ تمہاری زندگی اس کے چھ سات بچوں کو پالنے میں گزر جائے گی۔ دکھ اور احساس محرومیوں کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ تم چالیس برس کی عمر میں ساٹھ برس کی دکھائی دو گی۔“

وملا کماری نے جو کچھ کہا تھا اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ بڑی حقیقت پسندانہ باتیں تھیں لیکن میرا دل جانے کیوں پھر بھی اس شخص کو قبول کرنے اور شادی کرنے کے لئے تیار نہ ہوسکا۔ میں اس کی باتیں سن کر خاموش ہوکر کچھ سوچنے لگی۔

”میرا مخلصانہ مشورہ تو یہ ہے کہ تم مہیش لال سے شادی کر کے گھر بسالو۔“ اس نے کہا۔ ”اپنا حسن و شباب برباد نہ کرو۔ یہ ایک ایسی دولت ہے جو عورت کو بار بار نہیں ملتی۔ یہ ایک خزانہ ہوتا ہے جو ڈھیرے ڈھیرے حالات کے تحت لٹتا رہتا ہے۔“

”آپ اس شخص کا میرے سامنے نام بھی نہ لیں۔“ میں نے کہا۔ ”کچھ بھی ہو۔ میں اس شخص سے ہرگز ہرگز شادی کرنے کو تیار نہیں ہوں۔“

”تمہیں اس شخص سے اتنی نفرت اور حقارت کیوں ہے......؟“ وہ متعجب نظروں سے میری آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ ”تم اس سے شادی کرلو۔ یہ سنہرا موقع ہے۔ سنہرا موقع زندگی میں صرف ایک بار آتا ہے۔ کاش! وہ مجھ سے شادی کرنے کے لئے تیار ہوجائے، میں کل ہی اس سے شادی کرلوں۔“

”سنیے......آپ بہت حسین اور انتہائی پرکشش بھی ہیں۔ آپ اس سے مل کر بات کریں ہوسکتا ہے وہ آپ سے شادی کرنے کو تیار ہوجائے۔“

”تم سے کیا چھپانا......“ وہ ایک سرد آہ بھر کے بولی۔ ”میں اس سے آج ملی تھی۔ اس پر صرف تمہارا بھوت سوار ہے۔ تم نے اسے پاگل کردیا ہے۔“

”اچھا اب چلتے ہیں۔“ میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں اس موضوع پر اس سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔ ”مجھے بڑے زور کی نیند آرہی ہے۔“

”ایسی بھی کیا جلدی ہے میری جان!“ وملا کماری بھی کھڑی ہوگئی۔ اس نے میری کمر میں ہاتھ

ڈال کر مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔

”یہ کیا حرکت ہے آپ کی......؟“ میں اس کی اچانک اور غیر متوقع حرکت پر ششدر رہ گئی۔ میں اس کے بازوؤں میں کسمسائی۔ ”آپ مجھے چھوڑ دیں۔“

”میں دراصل تمہارا خون پی کر تم میں اپنا خون منتقل کرنا چاہتی ہوں تاکہ تم مہیش لال سے شادی کرنے پر آمادہ ہوجاؤ۔“ وہ بولی۔

”تم کیا کوئی چڑیل ہو جو میرا خون پیو گی......؟“ میں نے نفرت اور غصے سے کہا اور اس کے بازوؤں کا حلقہ توڑنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ تو لوہے کے کسی شکنجے کی طرح تھا۔ کسی انسان میں اتنی طاقت نہیں ہوسکتی تھی۔ میں نے پورا زور لگادیا لیکن بری طرح ناکام رہی اور یہ بات میرا دل ماننے کے لئے تیار نہ تھا کہ یہ حسین عورت چڑیل ہوسکتی ہے۔ بچپن میں سنا کرتی تھی کہ بدروح کوئی سا بھی روپ بھر سکتی ہے۔

جب وہ میری گردن پر جھکنے لگی تو اس کا روپ یک سر بدل گیا۔ حلیہ اور چہرہ بدل گیا۔ اس کا چہرہ بڑا مکروہ، بھیانک اور بے حد سیاہ ہوگیا۔ اس کی آنکھیں انڈوں سے بھی بڑی ہوگئیں۔ چہرہ اور منہ بھی بڑا ہوگیا۔ ہونٹ بہت ہی موٹے موٹے اور بھدے ہوگئے۔ دانت دو دو انچ لمبے ہوگئے تھے۔ جب اس نے منہ کھول کر زبان باہر نکالی تو میں خوف و دہشت سے لرزنے لگی۔ اس کی زبان نہیں تھی بلکہ وہ سانپ تھا جو پھنکار رہا تھا۔ اس سانپ نے میری گردن پر اپنا پھن مارا۔ پھر اس نے اپنے لمبے لمبے دانت میری گردن میں گاڑ دیئے۔ میری رگوں میں لہو ایسا سرد ہوگیا تھا کہ میں بے جان سی ہوگئی۔ اب اس چڑیل کے رحم و کرم پر تھی۔ اس نے میری گردن میں اپنے دانت پوری قوت سے گاڑنے کی کوشش کی لیکن وہ گاڑ نہ سکی۔ میں نے محسوس کیا کہ میری گردن پتھر کی طرح سخت ہوگئی ہے۔ اور میرے بدن پر دانت گاڑنے کی بڑی کوشش کی لیکن وہ دانت گاڑ نہ سکی۔ پھر میرا پورا جسم پتھر کا سا ہوگیا تھا۔ مجھے یہ بات سمجھتے دیر نہیں لگی کہ یہ سارا کھیل اس کویتا جادوگرنی کا ہے، یا تو اس نے کسی چڑیل کو بھیجا ہے یا پھر وہ خود ہی وملا کماری اور چڑیل کے روپ میں آئی ہے اس کا بس اور جادو مجھ پر اس لئے نہیں چل رہا ہے کہ میرے پاس سادھو مہاراج کا دیا ہوا گنڈا ہے۔ خوف و دہشت سے میری حالت ایسی ہو رہی تھی کہ جیسے کسی بھی لمحہ میری جان ہی نکل جائے گی۔ لیکن جیسے کویتا اور گنڈا کا خیال آیا اور یہ احساس ہوا کہ یہ میرا بال تک بیکا نہیں کرسکتی تو میری جان میں جان آئی۔ میری طاقت لوٹ آئی اور ہمت پیدا ہوئی اور نس نس میں جو خون سرد ہوگیا تھا اس میں حرارت پیدا ہوگئی۔ میں نے جیسے نیا جنم لیا ہو۔ جب میں نے ساری طاقت جمع کر کے بازوؤں کا حصار توڑا تو وہ ٹوٹ گیا۔

”کیا تم کویتا ہو......؟“ میں نے نفرت اور حقارت بھرے لہجے میں کہا۔ ”تم کچھ بھی کرلو۔ میں مر جاؤں گی لیکن اس کمینے سے شادی نہیں کروں گی۔“

”ہاں......ہاں......میں کویتا ہوں۔“ وہ وملا کماری کے روپ میں آکر بولی۔ ”تمہیں سادھو نے شاید کوئی ایسی چیز دی ہے جس سے تم قابو میں نہیں آئی ہو......؟ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر میں تمہاری شادی مہیش لال سے نہیں کراسکی تو پھر یہ کام ہی چھوڑ دوں گی۔“

اتنا کہہ کر وہ نظروں کے سامنے سے غائب ہوگئی۔ میں فوراً ہی گھر کی طرف لپکی۔ کیوں کہ میرا لباس تار تار ہو کر جھول رہا تھا۔ اس حالت میں گھر والے اور کوئی بھی دیکھ کر مشکوک ہو سکتا تھا۔ میں نے گھر آ کر دوسرا جوڑا نکال کر پہنا۔ اس جوڑے کو اچھی طرح سے لپیٹ کر ... دیا کہ کل کسی وقت اسے ٹھکانے لگا دوں گی۔ میں یہ لباس کسی وجہ سے ماں کو بھی دکھانا نہیں چاہتی تھی۔

وہ سادھو نہیں بھگوان کا کوئی اوتار تھا جس نے مجھے گنڈا دے کر کویتا کے ہاتھوں سے محفوظ رکھا تھا۔ گو کہ میں اس چڑیل کے ہاتھوں سے محفوظ رہی جو میرا خون پی کر میرے جسم کی رگوں میں کوئی ایسا خون داخل کرنا چاہتی تھی جس سے میں مہیش لال کی دیوانی ہو کر اس سے شادی کرنے یا اس کے پاس جا کر ساتھ رہنے پر مجبور ہو جاؤں۔ مجھے اس چڑیل سے نجات تو مل گئی تھی لیکن اب بھی میں خوف و دہشت سے لرزاں تھی یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس گنڈے کی موجودگی سے مجھ پر کوئی مصیبت نازل نہیں ہو سکتی تھی۔

گو کویتا مجھے ایک طرح سے چیلنج کر گئی تھی۔ لیکن مجھے ڈر اور خوف اس لئے نہیں تھا کہ میرے پاس سادھو مہاراج کا دیا ہوا گنڈا تھا۔ لیکن پھر بھی مجھے محتاط اور چوکس رہنے اور اس گنڈے کی حفاظت کرنے کی ضرورت تھی۔ معلوم نہیں اب وہ کس روپ میں آ کر مجھے اپنا اسیر بنانے اور مہیش لال سے شادی کرنے پر رضامند کر لے۔ وہ ایک جادوگرنی تھی۔ میرا اس کا کیا مقابلہ تھا۔ لیکن اس گنڈے کی بدولت میں ہر طرح سے محفوظ تھی، کویتا کیا نیا ہتھکنڈہ استعمال کرتی ہے دیکھنا تھا۔ ہوشیار رہنے کی اشد ضرورت تھی۔

دو دن خیریت سے گزر گئے۔ تیسرے دن میرے پریتم کی ماں رشتہ لے کر آئی۔ اس نے کہا کہ چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کر دیں۔ کیوں کہ اس کے بیٹے کو کویت میں ملازمت مل گئی ہے۔ وہ بیاہ کر کے پاسپورٹ بنانے کی درخواست دے کر چلا جائے گا۔ پھر وہاں سے ویزا بھیج کر بلا لے گا۔ میری ماں میری فوری شادی کے لئے اس لئے تیار نہ تھی کہ کوئی تیاری اور رقم نہ تھی۔ اس کی ماں نے پچیس ہزار کی رقم دے کر کہا کہ اسے رکھ لو۔ کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں۔ بیاہ بڑی سادگی سے ہوگا۔ میں بارات میں دو عورتیں، چار پانچ مرد لے کر آؤں گی۔ پھر اس نے زیور کا ایک سیٹ بھی شادی کے لئے دیا، کیوں کہ ماں نے کہا تھا کہ اس کے پاس ایک تولہ سونا بھی نہیں ہے اس کی شادی کا جو زیور تھا وہ بیچ کر مکان لے لیا گیا تھا۔ میرے پریتم کو اس بات کا احساس اور اندازہ تھا کہ میرے ماں باپ کی مالی حالت زیادہ اچھی نہیں ہے۔

اس کے چوتھے دن میرا بیاہ میرے پریتم سے ہو گیا۔ میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ میں نے اپنی محبت اور سپنا پا لیا تھا۔ پریتم سے بیاہ ہونے کے بعد اب مہیش لال چپ بیٹھ جائے گا۔ جو میں نے سوچا یہ میری بھول تھی۔ شادی کی رات سے ہم دونوں نے نئے جیون کا آغاز کیا۔ جب میں صبح نہانے کے لئے غسل خانے میں گھسی تو گنڈا کمرے میں رکھ کر گئی۔ گرم گرم پانی سے نہاتے ہی ساری تھکن اتر گئی۔ بدن میں چستی سی آ گئی۔ ایک تازگی سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے بالوں کو جھاڑ کر اچھی طرح خشک کیا۔ بال کھلے ہی رہنے دیئے۔ ابھی اجالا نہیں ہوا تھا۔ پو پھٹ رہی تھی۔

میں نے سوچا کہ کیوں نہ چائے بنا کر پی لوں۔ اس وقت چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ میں نے

ایک نظر پریتم کے چہرے پر ڈالی۔ وہ اتنا سندر لگا کہ میں نے اس کا ماتھا بے اختیار چوم لیا۔ پھر دروازے کی طرف بڑھی۔ اس کی چٹخنی بے آواز کھول دی۔

دروازہ کھلتے ہی میں ایک قدم گھبرا کے پیچھے ہٹی۔ میں سمجھی کہ میری نند ہوگی وہ میری نند نہیں تھی۔ یہ میری نظروں کا فریب تھا۔ وہ وملا کماری تھی۔ کویتا جادوگرنی کے روپ میں پھر آئی تھی۔ میں نے اسے دیکھتے ہی تیزی سے پلٹ کر بھاگنے کا ارادہ کیا تا کہ وہ گنڈا اٹھا لوں جو سادھو مہاراج نے دیا تھا تا کہ اس کا جادو منتر اثر نہ کر سکے۔ وملا کماری نے نہ جانے مجھ پر کیا جادو منتر پڑھ کر پھونکا کہ میں اپنی جگہ سے حرکت اور جنبش تک نہ کر سکی۔ میت بن کر رہ گئی۔ میں صرف دیکھ اور سن بول سکتی تھی۔

”وملا کماری...... تم ...... تم؟“ میں نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ ”تم...... تم کس لئے آئی ہو اب......؟ میری شادی ہو گئی ہے؟“

”تم نے بیاہ اور اگنی کے سات پھیرے کے وقت بھی گنڈے کو باندھا ہوا تھا اس لئے تمہارا بیاہ ہو گیا اور تم نے سہاگ رات بھی منا لی۔“ وہ استہزائی لہجے میں بولی۔ ”میں وملا کماری ہوں اور نہ بدروح جو تم نے اس دن دیکھی تھی۔ میں کویتا ہوں۔ میں جس روپ میں چاہے آ سکتی ہوں۔ جب میں نے بدروح بن کر تمہارا خون پینے کی کوشش کی تھی تب میرے جادو نے کوئی اثر نہیں کیا تھا۔ میں حیران تھی۔ پھر میں نے پتا چلایا کہ اس سادھو مہاراج نے تمہیں ایک ایسا گنڈا دیا ہے کہ کالا جادو کیا دنیا کا کوئی سا بھی جادو اثر نہیں کر سکتا۔ میں اس کمرے میں اس وقت آئی تھی جب تم نہانے جا رہی تھی۔ جب تم نہا رہی تھیں تب میں نے دیکھا کہ وہ گنڈا تمہارے پاس نہیں ہے۔ اب میں تمہیں لے جانے آئی ہوں۔ میں تمہیں مہیش لال کی حویلی پہنچا دوں گی۔ پھر میرا کام ختم...... اب تم جانو اور مہیش لال جانے...... میں نے اپنے پیسے تو کھرے کر لئے۔ مہیش لال کے آدمی باہر کھڑے ہیں...... وہ تمہیں لے جائیں گے...... اگر یہ گنڈا تمہارے پاس نہ ہوتا تو سہاگ کی پہلی رات تم مہیش لال کے ساتھ گزارتی...... خیر کوئی بات نہیں...... ساری زندگی پڑی ہے سہاگ راتیں گزارنے کے لئے...... میں نے جو کہا آخر پورا کر دکھایا نا......؟“

میں نے اپنے پریتم کو آواز دے کر جگانا چاہا تو آواز گلے میں پھنس کر رہ گئی۔ وہ ایک قہقہہ لگا کر تمسخرانہ لہجے میں بولی۔ ”اس سے کوئی فائدہ نہیں...... میں نے نہ صرف تمہارے پتی کو بلکہ تمہاری ساس اور نند کو بھی بے ہوشی کی نیند سلا دیا ہے...... اب یہ لوگ سہ پہر سے پہلے بیدار نہ ہوں گے۔ میں تمہیں بھی بے ہوشی کی نیند سلا رہی ہوں تا کہ مہیش لال کے آدمی تمہیں آسانی سے اٹھا کر لے جا سکیں۔ لیکن تم جلد ہی ہوش میں آ جاؤ گی۔ کیوں کہ مہیش لال بڑی بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں......“

اس نے مجھ پر کوئی منتر پڑھ کر پھونکا۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں دوسرے لمحے چکرا کر فرش پر گرنے والی تھی کہ وملا کماری نے تیزی سے آگے بڑھ کر مجھے بازوؤں میں سنبھال لیا۔ پھر مجھے کچھ یاد نہیں رہا کہ مہیش لال کے کتنے آدمی مجھے لے جانے آئے تھے۔ انہوں نے مجھے کیسے اور کس طرح سے حویلی پہنچایا کچھ خبر نہیں...... جب میری آنکھ کھلی تو میں نے اپنے آپ کو مہیش لال کی خواب گاہ میں اس کی لمبی

چوڑی مسہری کے بستر پر پایا وہ ایک کرسی پر بیٹھا مجھے اس طرح مغرور مسکراہٹ سے دیکھ رہا تھا جس طرح ایک شکاری اپنے شکار کو دیکھتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں وحشیانہ چمک تھی۔ اسے دیکھ کر میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی۔ میں نے اسے بڑے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ ”یہ کیا حرکت ہے تمہاری...... ذلیل انسان یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں کسی کی ہو چکی ہوں...... تم نے مجھے اس کمینی جادوگرنی اور اپنے آدمیوں کی مدد سے اغوا کیا۔ میں تمہیں بخشوں گی نہیں......“

”غلط حرکت میں نے نہیں تم نے کی ہے......“ بے غیرت شخص بے غیرتی سے بولا۔ ”میں نے پہلے شرافت سے اپنا رشتہ بھیجا...... تمہاری ماں اور تم نے واپس کر دیا۔ آج میں تمہارے ساتھ اپنی رات مناؤں گا۔“

”کمینے...... ذلیل......“ میں برافروختہ ہو گئی۔ ”تو نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے۔ میں مر جاؤں گی لیکن تیری آرزو پوری نہیں ہونے دوں گی۔“

”میری جان پریا......“ مہیش لال نے بڑے پیار بھرے لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔ ”تم یہ جذباتی باتیں رہنے دو...... جذبات کی بجائے عقل سے کام لو...... تم اس وقت میری قید میں ہو...... تمہاری مثال ایک پنچھی کی سی ہے، تمہارے پر کاٹ دیئے گئے ہیں۔ تم نے فرار ہونے کی کوشش کی تو اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ میرے سات آدمی باہر پہرہ دے رہے ہیں۔ یہ ساتوں پیشہ ور قاتل ہیں اور جیلوں میں دس دس برس کی سزا کاٹ کر آئے ہیں۔ اس قدر بے رحم اور سفاک ترین ہیں کہ تم تصور تک نہیں کر سکتی ہو۔ ان کے نزدیک کسی کو قتل کر دینا ایسا ہی ہے جیسے راستے کے پتھر کو ٹھوکر مار کے ہٹا دینا...... آؤ...... میں تمہیں ان کی شکلیں دکھاؤں......“

مہیش لال میرا بازو پکڑ کے مجھے کھڑکی کے پاس لے گیا۔ اس کے سات آدمی جو غنڈے بدمعاش اور بے رحم قاتل تھے وہ مسلح تھے اور صحن میں چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے تاش کھیل رہے تھے اور ساتھ ساتھ شراب سے بھی شغل کر رہے تھے۔ ہر ایک کے ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی۔ ان کی وضع قطع اور چہرے مہرے دیکھ کر میرا جسم اور آتما بھی کانپ گئی۔ وہ خوں خوار درندے لگ رہے تھے۔ پھر مہیش لال نے مجھے مسہری پر لا کر بٹھا دیا۔ ”تم اور تمہارا باپ یہ کہتا ہے کہ وہ پولیس کے پاس دہائی لے کر جائے گا تو اس سے بڑا اور بے وقوف کوئی نہ ہوگا، کیوں کہ ایس ایچ او ایک پالتو کتے کی طرح ہے۔ وہ صرف مالک کا حکم مانتا اور اشاروں کو سمجھتا ہے۔ کیوں کہ میں شراب اور شباب کی ہڈی ڈالتا رہتا ہوں۔ وہ تمہارے باپ کے خلاف کسی بھی جھوٹے کیس میں اندر ڈال دے گا۔ لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔“

”تمہیں اپنے رتبے، دولت اور حیثیت کا بڑا گھمنڈ ہے اس لئے تم ایسی باتیں کر رہے ہو۔“ میں بھڑک کر بولی۔ ”لیکن تم بھگوان کو بھول رہے ہو۔ تم نے ایک نئی دلہن کو اس کے پتی سے چھین کر مہا پاپ کیا ہے۔ بھگوان تمہیں معاف نہیں کرے گا۔ یہ بات سن لو۔“

”بھگوان......؟“ وہ قہقہہ مار کر بڑے زور سے ہنسا۔ ”تم کس بھگوان کی بات کر رہی ہو؟ گاؤں میں بھی تو ایک شخص بھگوان داس رہتا ہے۔ وہ لوہار ہے وہ تمہاری مدد کر سکتا ہے؟ اگر اوپر والے بھگوان کی

بات کر رہی ہو تو اسے فرصت کہاں ہے۔ ایک وقت میں وہ لاکھوں اور کروڑوں کی کیسے سن سکتا ہے؟ اس نے کبھی کسی کی مدد کی ہے جو تمہاری سنے گا۔ تم اس پر وشواس نہ کرو۔“

اس وقت دروازے پر کسی نے دستک دی تو اس نے کہا۔ ”کون ہے؟ اندر آ جاؤ...... کیا بات ہے؟“ دروازہ کھلا ایک جوان ملازمہ داخل ہوئی۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ اس کا نام بسنتی تھا۔ وہ گاؤں کی تھی۔ اسے مہیش لال نے اپنی بیٹی کے کام کے لئے رکھا تھا لیکن اس کی بیٹی شہر اپنے کسی رشتہ دار کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ مہیش لال نے اس سے کہا کہ وہ میرے لئے ناشتا لے کر آئے۔ جب وہ کمرے سے نکل گئی تو مہیش لال نے کہا۔ ”تم آج سے ابھی سے میرے دل کی رانی اور پتنی ہو۔ اب تم اپنے پتی کا خیال دل سے نکال دو۔“

اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ کہتی دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھول کر جھانکا۔ باہر کوئی آدمی تھا۔ صرف اس کی آواز سنائی دی تھی لیکن شکل نظر نہ آئی۔ وہ کمرے سے نکل گیا۔ دروازہ بند کر کے باہر سے کنڈی لگا کر چلا گیا۔ جاتے جاتے اس نے میری طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔

اس وقت میں انتہائی بھیانک اور دل خراش صورت حال سے دوچار تھی۔ مہیش لال نے جادو کی مدد سے مجھے اغوا کر لیا تھا۔ مجھے میرے پتی، میرے جیون ساتھی اور سپنے سے دور کر کے مجھ پر جو انیائے کیا وہ جان لیوا صدمہ تھا۔ میرے ارمانوں کا خون کر دیا تھا۔ میں زندہ در گور کر دی گئی تھی۔ میرا دل اندر ہی اندر خون کے آنسو رو رہا تھا اور چاروں اطراف اندھیرا تھا اور مجھے اپنی دنیا بھی اندھیر نظر آ رہی تھی۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں کتنی بدنصیب تھی کہ ایک راون نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ میں نے سوچا۔ کیا اس سنسار میں اوروں کے ساتھ ایسا ہوتا ہوگا؟

روتے روتے مجھے یک بیک یہ احساس ہوا کہ رونے دھونے سے کیا میں مہیش لال کے پنجے سے بچ جاؤں گی اور مجھے میرا پتی اور میرا سپنا مل جائے گا؟ نہیں...... رونے سے تقدیریں نہیں بدلتی ہیں۔ مجھے ایک فلمی گانے کے بول یاد آئے...... میرے دل کے کونے میں ایک نادیدہ آواز نے کہا تم ہمت و حوصلے...... اور سوچ بچار سے کام لو تو اس درندے کے ہاتھوں سے بچ سکتی ہو۔ اس کے سارے خواب چکنا چور کر سکتی ہو۔ یہاں سے فرار ہو کر جا سکتی ہو...... یہ بدمعاش تمہارا بال تک بیکا نہیں کر سکتے...... پریا! سوچو تو سہی۔ تم کیا کر سکتی ہو؟

میں نے اپنے آنسوؤں کو ساڑی کے پلو میں جذب کیا اور آئینہ کے سامنے کھڑی ہو کر حلیہ درست کیا۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا۔ بسنتی میرے لئے ایک ٹرے میں ناشتا لے کر اندر داخل ہوئی۔ اس نے تپائی پر رکھی پھر دروازہ بھیڑ کر آئی۔ میں نے اس سے سرگوشی میں کہا۔

”بسنتی بہن! میری مدد کرو...... تمہیں میرے بارے میں پتا ہے نا کہ مجھ پر کیسا ظلم ہوا ہے۔ کل بیاہ ہوا تھا۔“

”پریا بہن!“ بسنتی نے بھی سرگوشی میں آہستگی سے کہا۔ ”مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ سارا کیا دھرا

اس کمینی کو بتا کا ہے۔ لیکن میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی......؟ کیوں کہ یہاں چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی...... یہ جو محافظ ہیں بڑے ظالم ہیں۔"

"بسنتی...... بھگوان کے لئے میری مدد کرنے کے بارے میں سوچو...... یا پھر ایسا کوئی راستہ بتا دو کہ میں آسانی سے فرار ہو سکوں......" میں نے اس سے التجا کی۔ "کاش! بہن میں آپ کی کوئی مدد کر سکتی۔" بسنتی بولی۔ "کیوں کہ حویلی کے داخلی دروازے پر کڑا پہرہ ہوتا ہے۔ ایک نہیں پورے سات محافظ ہوتے ہیں۔ میں آپ کی صرف اتنی مدد کر سکتی ہوں کہ حویلی کا جو عقبی دروازہ ہے اس کا تالا کھول کر رکھ دوں۔ آپ اس دروازے سے نکل جائیں۔ کوئی خطرہ نہیں ہے۔ میں رات بارہ بجے اس دروازے کا تالا لگا دوں گی تا کہ صبح کسی کو یہ شک نہ ہو کہ آپ اس راستے سے فرار ہوئی ہیں۔ ورنہ میری شامت آ جائے گی۔ میں دن کے ڈوبتے اور اندھیرا پھیلتے ہی اس کا تالا کھول دوں گی۔ یہ اب آپ کا کام ہے کہ اس پچھلے دروازے سے نکل جائیں۔"

"تمہارا بہت بہت شکریہ میری بہن!" میں نے اسے گلے سے لگا کر چوم لیا۔ "لیکن حویلی کے پچھلے دروازے پر میں کس راستے سے جاؤں؟"

"جب آپ اس کمرے سے باہر نکلیں گی تو دائیں طرف جو سب سے آخری زینہ ہے وہ زینہ اتر کے سب سے نیچے جائیں۔ عمارت سے باہر نکلتے ہی سامنے دروازہ ہے۔" میں نے ناشتا خوب ڈٹ کر کیا تا کہ توانائی برقرار رہے۔ اور پھر نہ جانے مجھے کتنا جاگنا پڑے۔ کیسے واقعات پیش آئیں۔ بسنتی برتن لے کر باہر نکلی اور کنڈی لگا کر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں اس کمرے سے رہائی کے بارے میں سوچنے لگی۔ لیکن ذہن میں کوئی تدبیر نہیں آ رہی تھی۔ اور پھر دن میں فرار بے وقوفی تھا۔ شام کے اندھیرے میں فرار ہونا بہتر تھا۔ اندھیرا ساتھ دے سکتا تھا۔ میں تدبیر سوچ رہی تھی کہ نیند نے مجھے آغوش میں لے لیا۔

چوں کہ میں رات بھر کی جاگی ہوئی تھی اور میں نے سیر ہو کر ناشتا بھی کیا ہوا تھا اس لئے گہری نیند آ گئی اور میں گھوڑے بیچ کر سو گئی تھی۔

جب بیدار ہوئی تو دن ڈوب چکا تھا۔ شام ہو چکی تھی۔ کمرے میں میرے سوا کوئی نہ تھا۔ وقت کا کچھ اندازہ نہ ہو سکا۔ اس کمرے میں ہر چیز موجود تھی۔ لیکن گھڑی نہ تھی۔ مسہری کے سرہانے جو بڑی سی میز تھی اس پر ایک پیتل کا بیڈ لیمپ رکھا ہوا تھا۔ میں نے ملحقہ غسل خانے میں جا کر منہ دھویا، بال اور کپڑوں کی شکنیں درست کیں، پھر ایک دم سے اس موذی سانپ سے نجات پانے کا خیال آیا۔ میں سوچ رہی تھی کہ بسنتی رات کا کھانا لے کر آئی۔ اس نے بتایا کہ اس نے پچھلا دروازہ کھول دیا ہے۔ کوئی ایک گھنٹے کے بعد مہیش لال دلہا بن کر آ رہا ہے۔ وہ میرے لئے عروسی جوڑا اور زیورات بھی لے کر آ رہا ہے اور سنگھار کا سامان بھی کہ میں دلہن بن جاؤں۔ وہ مجھے دلہن کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہے۔

میں نے جیسے تیسے کر کے کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران بسنتی بھی مجھے یہاں سے نکلنے کی تدبیر بتا نہ

سکی۔ بس وہ میرے یہاں سے کامیابی سے فرار ہونے کی بھگوان سے پرارتھنا کرتی رہی۔ میں بھی سوچتی رہی۔ بسنتی جب برتن لے گئی تو میں نے اس کھڑکی سے باہر جھانکا جہاں بدمعاش پہرہ دے رہے تھے۔ وہ بدمعاش چار پائیوں پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ باہر گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ جہاں بدمعاش بیٹھے تھے وہاں روشنی ہو رہی تھی۔ کئی بلب جل رہے تھے۔ ان کی روشنی میں وہ اور خطرناک اور خوف ناک دکھائی دے رہے تھے۔ وہ کسی بات پر قہقہے لگا رہے اور ہنس بھی رہے تھے۔

ایک گھنٹہ بیت گیا۔ میرے ذہن میں یہاں سے فرار ہونے اور موذی جانور سے نجات پانے کی تدبیر نہ آ سکی۔ میں رفتہ رفتہ اس خیال سے خوف زدہ اور ہراساں ہوتی رہی کہ میں اپنی عزت کیسے بچاؤں، مہیش لال پونے چھ فٹ کا تھا۔ جسامت میں بھی بھاری بھر کم تھا۔ اس عمر میں بھی وہ توانا اور تندرست تھا۔ آخر کیوں نہ ہوتا۔ دولت کی فراوانی اور آسودگی تھی۔ کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ شراب اور شباب اس کی کمزوری تھی۔ جس سے وہ بوڑھا ہونے کے بجائے اور صحت مند ہوتا جا رہا تھا۔ آدمی کو کسی بھی طرح خوشی ملے بے فکری ہو تو وہ کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ وہ جوان اور صحت مند ہوتا جاتا ہے۔

مجھے رات کے اس سناٹے میں چاپیں سنائی دیں۔ یہ بھاری بوٹوں کی آواز تھی۔ میں سمجھ گئی کہ مہیش لال آ رہا ہے۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ دوسرے لمحے مہیش لال کنڈی کھول کر اندر آیا۔ وہ کسی جوان دلہا کی طرح بن سنور کر آیا تھا۔ خوشبوؤں میں نہا رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پھول تھے اور دوسرے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس تھا۔ اس نے پھول مسہری کے بستر پر رکھ دیئے۔ اٹیچی کیس بستر پر رکھ کر اسے کھولا۔ اس میں ایک لال رنگ کی ساڑی، بلاؤز، پیٹی کوٹ تھا۔ یہ جوڑا بہت قیمتی لگ رہا تھا۔ میں نے ایسا خوبصورت اور قیمتی جوڑا سپنے میں بھی نہیں دیکھا ہوگا اور اس میں ایک بڑا ڈبا بھی رکھا تھا جس کا ڈھکن مخملی تھا۔ جب اس نے ڈبا بھی نکال کر کھولا تو میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ یہ ہیرے، جواہرات کے زیورات کا سیٹ تھا۔ میں تو چند لمحوں کے لئے اس کی خوبصورتی کے سحر میں ایسی کھوئی کہ اپنا ہوش ہی نہیں رہا۔ زیور عورت کی سب سے بڑی کمزوری ہوتی ہے۔ میں زیورات کو دیکھ رہی تھی کہ اپنی گردن پر میں نے گرم گرم سانسیں محسوس کیں۔ مہیش لال میری پشت پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے میرے دونوں شانے تھام کر مجھے اپنی طرف گھمایا اور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ "یہ لباس اور زیورات پسند آئے؟"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا، اپنے شانے تراش لئے اور اس سے دو تین قدم دور کھڑی ہو کر اسے کسی سہمی ہوئی ہرنی کی طرح دیکھنے لگی۔ "یہ لباس اور زیورات آج سے ابھی سے تمہاری ملکیت ہیں۔" اس نے کہا۔ "تمہیں ایسے سینکڑوں لباس اور زیورات کے کئی سیٹ بھی خرید کر دوں گا۔"

میری جگہ شاید کوئی اور عورت ہوتی تو پھسل جاتی۔ مگر میرے لئے تو یہ دولت میرے پریتم کے آگے کچھ نہ تھی۔ اصل دولت وہ اور اس کی محبت تھی۔ میں نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ "میں تمہارے اس جوڑے اور زیور کو لات مارتی ہوں...... کیا تم مجھے کوئی طوائف یا فاحشہ سمجھ رہے ہو جو ان کے عوض خریدنا چاہتے ہو؟ میرا سودا کر رہے ہو؟ میں لات مارتی ہوں ایسے لباس اور زیور۔ مجھے نہیں چاہئے۔"

"یہ تم جذباتی باتیں کر رہی ہو۔" مہیش لال نے کہا۔ "یہ بات تو تم بھول جاؤ کہ اب وہ تمہارا ہو سکتا اور تم اس کی...... اب تم پر کلنک کا ٹیکہ لگ چکا ہے۔ تمہارے سسرال والے کہہ رہے ہیں کہ تم اپنے کسی آشنا کے ساتھ بھاگ گئی ہو۔ تم پورے گاؤں میں بدنام ہو چکی ہو۔"

"مجھے اپنی بدنامی، ذلت و رسوائی کی کوئی پروا نہیں......" میں نے تنک کر کہا۔ "اگر مجھے میرے گھر والوں، میرے پتی اور ساس نند نے قبول نہیں کیا تو کیا ہوا تمہارا اصل چہرہ جو بڑا گھناؤنا ہے وہ دنیا والوں کے سامنے بے نقاب کر دوں گی۔ ویسے لوگ جانتے ہیں کہ تم ایک سیاہ کار شخص ہو۔ تم نے گاؤں کی بہت ساری لڑکیوں اور شادی شدہ عورتوں کی بے عزتی بھی کی ہے۔ وہ اس لئے زبان نہیں کھولتی ہیں کہ وہ غریب ہیں۔ تم نے پولیس کو بھی خرید رکھا ہے۔ میں تھوکتی ہوں تم پر اور تمہارے بستر کی زینت پر...... تم شیطان ہو...... انسان نہیں......"

"تم غصے میں کتنی حسین لگ رہی ہو۔" وہ بے غیرت ہنس کر بولا۔ "اس لباس میں بھی تم بڑا غضب ڈھا رہی ہو۔ شعلہ مجسم لگ رہی ہو۔ تمہارے انگ انگ سے مستی ابل رہی ہے۔ تم اس لباس اور ان زیورات کو پہنو یا نہ پہنو۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا!......"

"سنو......" میں نے غصے اور حقارت سے کہا۔ کیوں کہ وہ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ "میرے قریب نہ آنا اور نہ مجھے چھونے کی کوشش کرنا۔" وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ اسے کچھ خیال آیا تو وہ میرے بجائے الماری کی طرف بڑھا۔ اس میں سے شراب کی بوتل نکالی۔ پھر اس نے کہا۔

"سنو پریا! تم مجھے کسی بات سے روک نہیں سکتی ہو نہ ہی تم مجھ سے مقابلہ کر سکتی ہو۔ اس ضد اور ہٹ دھرمی سے تمہیں کچھ حاصل نہ ہوگا۔ میں ایک مرد ذات ہوں۔ تم ایک کمزور اور نازک سی عورت ہو۔ میرے رحم و کرم پر ہو۔ تم پر قابو پا کر تمہیں بے بس کرنا میرے لئے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ تم جیسی کتنی ضدی اور سرکش لڑکیاں میری زندگی میں آ چکی ہیں۔ انہوں نے بھی ایسی ہی باتیں کی تھیں۔ انہیں بلآخر ہار ماننا پڑی۔ جیت میری ہی ہوئی۔ یہاں تمہاری مدد کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ نہ تو شنکر بھگوان آ سکتا ہے نہ ہی شیواجی...... اس بے جا ضد سے کیا حاصل۔"

اس لمحے میرے ذہن میں ایک خیال کوندا بن کر لپکا۔ وہ کہہ تو ٹھیک رہا تھا۔ وہ مجھے بہ زور بازو فتح کرنا چاہتا تھا۔ سچ یہ تھا کہ میں اس سے مقابلہ نہیں کر سکتی تھی اور نہ ہی جیت سکتی تھی۔ مجھے کسی مفتوحہ علاقے کی طرح تاخت و تاراج کرنا اس کے لئے چنداں مشکل نہ تھا۔ میری عزت خطرے میں تھی۔ میں ایک عورت تھی۔ جب عورت، عزت بچانے پر آتی ہے تو جان پر کھیل جاتی ہے اور آخری سانس تک مقابلہ کرتی ہے۔ یہ حقیقت تھا کہ یہاں میری مدد کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ بھگوان آنے سے رہا۔ مجھے اپنی عزت کی حفاظت خود کرنی تھی۔ بے جا ضد اور ہٹ دھرمی بھی فضول تھی۔ لیکن اس وقت میرے ذہن میں جو تدبیر آئی تھی وہ میری عزت بچا سکتی تھی۔ اس شیطان اور درندے سے نجات مل تو سکتی تھی لیکن اس کے لئے احتیاط و ہوشیاری اور ہمت و حوصلے کی ضرورت تھی۔ محبت اور فریب کا ناٹک کھیلنا ضروری بھی تھا۔

"سنو مہیش لال!" میں نے کہا۔ "اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم مجھے ساری زندگی پتنی کی طرح بنا کر رکھو گے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ کچھ دنوں تک کے لئے اور جی بھرنے کے بعد مجھے دودھ میں گری مکھی کی طرح نکال کر پھینک دو۔ کیونکہ تم ایک عیاش فطرت آدمی ہو۔"

"یہ بات تم شاید اس لئے کہہ رہی ہو کہ میری زندگی میں بہت ساری حسین اور جوان لڑکیاں آئیں۔ میں نے کچھ دنوں کے بعد اپنی زندگی سے نکال دیا۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ ان میں ایک بھی تمہاری طرح حسین اور پرکشش نہ تھی۔ سچ پوچھو تو میں اس کھیل سے تھک چکا ہوں اور سخت بیزار ہو گیا ہوں۔ اب میں مرتے دم تک صرف ایک عورت کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔

اس نے تپائی کے پاس جا کر خالی گلاس میں شراب انڈیلی اور اس کا ایک گھونٹ لے کر گلاس تپائی پر رکھ دیا۔ پھر میں نے اس کے پاس جا کر کہا۔ "میں ایک شرط پر تمہاری ہر بات مان سکتی ہوں۔ مجھے ابھی اور اسی وقت ایک لاکھ کی رقم دو جو میں اپنے ماں باپ کو دوں گی۔ آج نہیں کل کسی وقت...... پھر میں اپنے پتی سے طلاق لے کر تم سے شادی کر لوں گی...... شادی ہونے تک میں تمہاری غیر قانونی پتنی رہوں گی اور تمہاری ہر طرح سے سیوا کرتی رہوں گی۔ بولو منظور ہے؟"

وہ خوش ہو کر میرے چہرے پر جھکنے لگا تو میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "پہلے ایک لاکھ روپے میرے ہاتھ پر رکھو۔"

مہیش لال مجھے اپنے بازوؤں کی گرفت سے آزاد کر کے الماری کی طرف بڑھا۔ میرے لئے یہ ایک نادر موقع تھا اپنی تدبیر پر عمل کرنے کا...... میں نے میز پر سے پیتل والا بیڈ لیمپ اٹھایا اور پوری طاقت جمع کر کے اس کی کھوپڑی پر ضرب لگائی۔ اس کے منہ سے آواز بھی نہیں نکلی وہ فرش پر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ میں نے اچھی طرح سے اپنی تسلی کر لی۔ پھر میں نے ایک پل بھی ضائع نہیں کیا۔ الماری کی دراز کھولی تو اس میں سو سو کے نوٹوں کی بہت ساری گڈیاں رکھی تھیں۔ میں نے اس میں سے ایک گڈی نکالی۔ بستر پر جو چادر تھی اس کی لمبی دھجی پھاڑی۔ پھر اس گڈی کو پنڈلی پر گھٹنے سے اوپر کس کر اچھی طرح سے باندھ لیا۔ مزید کچھ سو سو کے نوٹ دوسری گڈی سے نکال کر بلاؤز کے گریبان میں ٹھونس لئے تاکہ وقت ضرورت کام آئیں۔ راستے میں مجھے رقم کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ اس وقت میں نہ تو ماں کے گھر جانا چاہتی تھی اور نہ ہی اپنی سسرال...... میں دونوں جگہ محفوظ نہیں رہ سکتی تھی۔ سب سے پہلے یہاں سے نکلنا شرط تھا۔ میں دروازہ کھول کر باہر آئی۔ راہ داری سن سان اور اندھیرے میں ڈوبی پڑی تھی۔ میں اس زینے کی طرف بڑھ گئی جس کے بارے میں بسنتی نے بتایا تھا اور جو عقبی دروازے کو جاتا تھا۔ میں اس زینے کی طرف لپکی اور تیزی سے سیڑھیاں اترتی ہوئی نیچے آئی۔ وہاں ایک دروازہ تھا۔ دروازہ کھول کر باہر آئی تو عمارت سے باہر تھی۔ میری نظروں کے سامنے حویلی کا عقبی دروازہ تھا۔ بسنتی نے اس کا دروازہ کھول کر رکھا ہوا تھا۔

میں نے باہر نکل کر دروازہ بھیڑ دیا۔ ہر سمت اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ اب مجھے فیصلہ کرنا تھا کہ کہاں جانا ہے۔ اس لمحے مجھے یقین نہیں آیا تھا کہ میں آزاد ہوں۔ میں اس شیطان اور درندہ صفت مہیش لال

کے چنگل سے نہ صرف بچ نکلی تھی بلکہ میں نے اپنی حاضر دماغی سے، تدبیر اور قوت ارادی سے کام لے کر اس عزت کے ڈاکو کو اس کمرے میں قید کر دیا تھا جس کمرے میں اس نے مجھے قید کر دیا تھا۔ میں نے کمرے سے نکل کر باہر سے کنڈی بھی لگا دی تھی۔

پہلے تو میں نے یہ سوچا کہ یہاں سے تو نکلوں۔ دوسرے لمحے میں بھیڑیوں کے خون آشام گروہ کے چنگل سے نجات پانے کی کوشش کرنے والی معصوم ہرنی کی طرح بھاگ چلی جا رہی تھی۔ یہ حویلی بہت بڑی نہیں تھی۔ اس پوری عمارت میں اور بھی بہت سارے کمرے تھے۔ لیکن اس حویلی میں یہ کمرہ نہایت آراستہ تھا۔ اس کی آرائش و زیبائش اور بستر وغیرہ سے ایسا لگتا تھا کہ اس شیطان نے اسے اپنا عشرت کدہ بنا رکھا ہے۔ اس کمرے کی ایک الماری شراب کی بوتلوں سے بھری ہوئی تھی۔ میرا جی کر رہا تھا کہ اس حویلی کو آگ لگا دوں۔ لیکن یہ میرے بس میں نہیں تھا۔ اور نہ ہی میرے پاس وقت اور نہ ہی اس عمارت کو آگ لگانے کا سامان تھا۔

عورت کی فطری جبلت کے تحت میں سانس پھولنے کی وجہ سے رک گئی اور گھوم کر اس حویلی کی عمارت کی طرف دیکھا جہاں تھوڑی دیر قبل قفس میں بند فاختہ کی طرح پھڑ پھڑا رہی تھی اور ایک باز پر پھیلائے مجھے دبوچنے کا مصمم ارادہ کر چکا تھا۔ حویلی پر سناٹے کا راج تھا۔ اور وہ اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ شاید ابھی تک ہوش میں نہیں آیا تھا اس لئے وہاں سکوت سا تھا۔ اگر وہ ہوش میں آ گیا ہوتا تو اب تک ایک بھونچال سا آ گیا ہوتا۔ حویلی میں گھوڑے بھی تھے۔ جیپ اور موٹریں بھی تھیں۔ اس کے آدمی کسی نہ کسی صورت میں بھی میری تلاش میں نکل کھڑے ہوتے۔

میں جہاں سانسوں پر قابو پانے کے لئے کھڑی تھی وہاں ایک درخت تھا۔ اس کے تنے کے سہارے کھڑی ہو کر سانسوں پر قابو پاتے ہوئے سوچنے لگی کہ کہاں جاؤں...... مجھے کس گھر میں پناہ مل سکتی ہے۔ یک لخت مجھے کامنی کا خیال آیا جو میری پڑوسی اور بچپن کی سہیلی بھی تھی۔ تین برس پہلے وہ بیاہ کر ارجن پور گئی تھی جہاں وہ اپنی بوڑھی ساس اور ایک بچے کے ساتھ رہ رہی تھی۔ اس کا پتی بمبئی شہر میں کام کرتا تھا۔ تین مہینے میں ایک مرتبہ ایک ہفتے کی چھٹی پر گھر آتا تھا۔ ارجن پور ہمارے گاؤں سے کوئی سات آٹھ میل فاصلے پر ہے۔ میں نے سوچا اس کے ہاں چل کر پناہ لینی چاہئے۔ اس کے ہاں پناہ مل جائے گی۔ اس کی ساس بڑی سیدھی سادھی عورت تھی۔ میں اس سے کئی بار مل چکی تھی۔ اس کا شوہر شاید بمبئی میں ہی ہو۔

میں نے ایک دم سے گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز سنی تو اچھل پڑی اور میری جان ہی نکل گئی۔ میں سمجھی کہ کوئی بدمعاش میرے تعاقب میں آ رہا ہے۔ میں نے آواز کی سمت دیکھا تو جان میں جان آئی۔ قریب ہی درخت کے پاس ایک بھورے رنگ کا گھوڑا کھڑا تھا جو درخت سے بندھا ہوا تھا۔ میری بدقسمتی تھی کہ میں اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتی تھی۔ میں نے گھڑ سواری کبھی نہیں کی تھی۔ میں گھوڑے پر سوار ہو کر آدھے گھنٹے میں وہاں پہنچ جاتی۔ جو میری منزل اور پناہ گاہ تھا۔ میں نے مایوس نظروں سے گھوڑے کو دیکھا اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کر تیز تیز قدموں سے چل پڑی۔

تھوڑی دیر کی مسافت کے بعد سامنے ایک میدان آ گیا جو چاروں سمت حد نگاہ تک پھیلا ہوا تھا۔ میدان بہت سرسبز تھا جو ستاروں کی روشنی میں نظر آ رہا تھا۔ میں نے نصف میدان چلنے کے بعد رک کر حویلی کی طرف دیکھا تو ایک کمرے سے روشنی جو دکھائی دے رہی تھی وہ شاید اسی کمرے کی تھی جس میں میں قید تھی۔ اب میرے اور حویلی کے درمیان خاصا فاصلہ تھا۔ اگر وہاں کوئی نقل و حرکت ہو رہی ہو گی تو مجھے یہاں سے پتا نہیں چل رہا تھا۔

اب میں چوں کہ آزاد تھی اور حویلی سے خاصی دور تھی اس لئے قدرے پرسکون تھی۔ دل کو ایک اطمینان سا تھا لیکن میرے ذہن میں رہ رہ کر اس مہیش لال کا نام گونج رہا تھا۔ وہ اسمبلی کا ممبر، دولت مند اور بوڑھا بھی تھا اور اپنے بڑھاپے کی قربان گاہ پر میرے حسن و شباب کی بھینٹ مانگ رہا تھا۔ اس سے انکار کرنے پر اس نے پتا جی کی برسوں کی نوکری کا خیال نہیں کیا اور انہیں نکال دیا تھا۔ میری شادی کیا ہوئی اس کے وجود پر انگارہ رکھ دیا۔ اس نے اس سے پہلے کویتا کو بھاری رقم دی۔ اس کویتا کی وجہ سے میں اغوا ہو کر وہاں پہنچ گئی تھی۔

مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ مہیش لال کے درندہ صفت پالتو کتوں جیسے پہرہ دار اور محافظ میری تلاش میں کسی بھی وقت یہاں آ سکتے ہیں۔ سوچوں کی گرہ اور خطرے کے احساس نے مجھے تیز تیز چلنے پر مجبور کر دیا تھا جس سے میں بھی بہت تھک گئی تھی اور میری سانس بھی پھول رہی تھی۔ جب مجھے وہ حویلی دکھائی نہیں دی تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ اب خطرے والی بات، نہ رہی تھی۔ کیوں کہ میں کافی دور نکل آئی تھی۔ میں ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ کر اپنی حالت درست کرنے لگی۔ زندگی میں کبھی اس قدر نہیں چلی تھی۔ اس لئے میری حالت بے حد دگرگوں تھی۔ ٹانگیں تھک کر پھوڑا بن گئی تھیں۔ لباس جسم پر ایک بوجھ گراں محسوس ہو رہا تھا۔ میری جگہ کوئی مرد ہوتا تو وہ لباس نکال دیتا۔ چوں کہ میں عورت تھی ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ یہ بوجھ برداشت کرنا تھا۔ میں ساڑی نکال سکتی تھی کیوں کہ پیٹی کوٹ اور بلاؤز تھا۔ لیکن اس حالت میں صرف گھر میں رہا جا سکتا تھا۔

اب تو حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ پیاس اور تھکن نے تو میری بری حالت کر دی تھی۔ دور دور تک کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میدان کہاں ختم ہو گا۔ گو کہ یہ میدان میرے گاؤں میں واقع تھا اور لوگ اسے بڑا میدان کہتے تھے۔ لیکن مجھے کبھی اس میدان سے گزرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ یہ میدان گھر سے کوئی ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ لیکن میں کوئی دو تین میل چل آئی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ طوفانی میدان کسی اور گاؤں کا بھی حصہ تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میں ایک خطرے سے نکل کر دوسرے خطرے میں پھنستی جا رہی ہوں۔ میں اندازے سے ارجن پور کی طرف چل پڑی تھی۔ مجھے ارجن پور جانے کا بھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ لیکن اتنا جانتی تھی کہ مغرب کی سمت میں واقع ہے۔ اندھیرے میں میں نے جس سمت کو مغرب سمجھا تھا وہ غلط ثابت ہو گئی تھی۔

میدان کی رات ظاہر کر رہی تھی کہ اب میں کسی اور گاؤں کی حدود میں ہوں۔ میں صبح کا انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ اگر میں نے جلد از جلد میدان پار کر کے کسی آبادی میں پناہ نہ لی تو خدشہ تھا کہ مہیش لال کے

پالتو کتے آجائیں گے۔ خاصا وقت نکل گیا ہے۔ شاید وہ کمینہ ہوش میں آچکا ہوگا۔ اس نے میری تلاش میں آدمی دوڑا دیئے ہوں گے۔ پہلے تو وہ میرے اور میرے پتی کے گھر جائیں گے۔ مجھے وہاں نہ پا کر ان کا خیال اس میدان کی طرف جائے گا۔ وہ جیپ یا تیز رفتار گھوڑوں پر پورے میدان میں پھیل جائیں گے اور میں ایک بار پھر ڈار سے بچھڑی ہوئی ہرنی کی طرح ان کے چنگل میں پھنس جاؤں گی۔ مہیش لال دوبارہ پکڑے جانے کی صورت میں میرا کیا حشر کرے گا اس کا مجھے اندازہ تھا۔

خطرے کا شدید احساس پوری طرح میرے ذہن میں اجاگر ہو گیا تھا۔ میں فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ میری تھکی ہوئی ٹانگوں نے اس پر احتجاج کیا۔ لیکن یہ موقع ان کی فریاد پر کان دھرنے کا نہیں تھا۔ میں نے رات جو کھانا کھایا تھا وہ بھی کب کا ہضم ہو چکا تھا۔ میں اپنی قوت ارادی اور خطرے کے احساس کے زیر اثر بھوکی پیاسی آگے بڑھتی رہی۔ بھوک اب خوب چمک گئی تھی۔ اور اس کے ساتھ پیاس نے مل کر اور غضب ڈھا دیا تھا۔ لیکن میں جیسے تیسے چلتی رہی اور چلتی کیا رہی یوں ہی رینگتی سی رہی تھی۔ اگرچہ میدان میں بہت سارے درخت تھے لیکن ان میں ایک بھی درخت نہ تھا جس کا پھل میں توڑ کر کھا لیتی۔ پیاس بجھا لیتی۔

وقت کا پرندہ دھیرے دھیرے کائنات کی وسعتوں میں پرواز کرتا رہا۔ پھر میں تھک کر ایک درخت کے سہارے جو بیٹھی تو نیند نے دبوچ لیا۔ نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے۔ جب بیدار ہوئی تو دیکھا کہ صبح ہو چکی ہے اور دن چڑھ آیا ہے۔ غور کیا تو پتا چلا کہ سہ پہر ڈھل چکی ہے۔ میں حیران تھی کہ میں اتنی دیر تک کیسے سو گئی۔ یقین نہ آیا۔ بھوک کی حالت میں بے ہوشی کی نیند سونا ناقابل یقین تھا۔ میں کبھی بھی اتنی لمبی نیند نہیں سوئی تھی۔ اس لمبی نیند کی شاید یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ رت کے آخری پہر سوئی تھی۔ درخت کے نیچے جو لمبی گھاس تھی اس پر...... پھر میں چل پڑی۔ میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ اگر یہاں سے کوئی مرد گزرتا تو مجھے نیند کی حالت میں دیکھ کر ناگ بن جاتا۔ بھگوان کی کرپا تھی جس نے مجھے محفوظ رکھا تھا۔

میں مخالف سمت چل پڑی۔ میں سورج کے پہلو بہ پہلو مرے مرے قدموں سے چل رہی تھی۔ سورج نے مغربی افق کے کونوں میں پہنچنے کی جان توڑ کوشش کر رہا تھا۔ دن کی چمکیلی اور تیز روشنی ماند پڑتی جا رہی تھی اور شام کے سائے بڑی خاموشی کے ساتھ دھرتی پر اتر رہے تھے سرسبز میدان میں دن رات کا ملاپ ہونے والا تھا۔ لیکن مجھے اس وقت اتنا ہوش کہاں تھا کہ اس ملاپ کا منظر جو انتہائی خوش نما اور دلفریب تھا اس خوب صورت منظر کی نزاکتوں اور لطافتوں سے محظوظ ہو سکوں۔ گھنٹوں چلتے رہنے کی تھکن اور بھوک پیاس جو لمبی نیند بھی کم نہ کر سکی تھی اس نے میرے ہوش و حواس چھین لئے تھے لیکن اس کے باوجود میرے ذہن میں مہیش لال کے بدمعاشوں کا خوف اس قدر جڑ پکڑ چکا تھا کہ اس نیم بے ہوشی کی حالت میں بھی کوئی ان جانی قوت کشاں کشاں لئے بڑھ رہی تھی۔

یہ ان جانی قوت بھی میرا ساتھ کہاں تک دیتی۔ آخر وہ لمحہ بھی آ گیا جس کا میں غیر شعوری طور پر کافی دیر سے انتظار کر رہی تھی۔ میری ٹانگوں نے بالآخر میری قوت ارادی کا ایک خود غرض انسان کی طرح ساتھ چھوڑ دیا۔ میں اپنا توازن باوجود کوشش کے برقرار نہ رکھ سکی اور میں لڑکھڑا کے گر پڑی۔

اب میں انتہائی بے بسی کے عالم میں پر کٹی کبوتری کی مانند زمین کے سخت سینے پر پڑی مچل رہی تھی۔ اگرچہ میری ٹانگوں نے میرا ساتھ چھوڑ دیا تھا لیکن اس گئی گزری حالت میں بھی میرا ذہن کسی نہ کسی حد تک میرا ساتھ دے رہا تھا۔ میں زمین پر تڑپ رہی تھی اور ضبط کے باوجود میرے حلق سے چیخوں کا فوارہ ابل رہا تھا۔ میں مدد کے لئے چلا رہی تھی۔ میرا ذہن ڈوبنے لگا اور اب تو یہ جی چاہ رہا تھا کہ مہیش لال یا اس کے آدمی مجھے تلاش کرتے ہوئے یہاں آ پہنچیں اور مجھے اس ہولناک اذیت سے نجات دلائیں لیکن اتنے بڑے میدان میں میرے علاوہ کوئی انسان دور دور تک موجود نہ تھا جو میری مدد کو پہنچتا۔ یہ ایک صحرا کی مانند تھا لیکن اس صوبے میں کوئی صحرا نہیں تھا۔ چیختے چیختے میری خشک زبان اینٹھ کر تالو سے چپک گئی۔

کیا میں اس سنسان اور ویران میدان میں یوں ہی تڑپ تڑپ کر مر جاؤں گی...... سسک سسک اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے دوں گی؟ اس روح فرسا خیال نے میرے دل و دماغ کو بری طرح جھنجھوڑ دیا...... اور میں نے زمین سے اٹھنے کی آخری کوشش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ کانپتا ہوا ہاتھ بہ مشکل زمین پر ٹیک کر میں نے اپنی پیٹھ زمین سے اٹھا لی اور پھر میں نے اپنی بے جان ٹانگوں پر پورا زور ڈال دیا لیکن مجھے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ ٹانگوں نے میرا بوجھ برداشت کرنے سے انکار کر دیا اور میں نے اپنی یہ کوشش بھی ترک کر دی۔ دوبارہ ایک اور کوشش کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ کیوں کہ اس سے کچھ حاصل نہ تھا۔ اب مجھے یقین ہو چکا تھا کہ سسک سسک کر مر جانا میرا مقدر ہو چکا ہے۔ کیوں کہ کچھ دیر بعد اندھیرا پھیلنے والا تھا اور کسی بھولے بھٹکے مسافر کے آنے کے جو امکانات تھے وہ ختم ہو جاتے۔ جو مسافر بھی یہاں سے گزرے گا وہ اجالے ہی میں......

ساری امیدیں خواب اور خوش فہمیاں دم توڑ چکی تھیں اور میں نیم غنودہ ذہن کے ساتھ موت کا انتظار کر رہی تھی۔ میری نگاہیں ڈوبتے ہوئے سورج پر منجمد ہو کر رہ گئی تھیں۔ جب میں بیدار ہو کر چلی تھی تب میری آرزو تھی کہ یہ سورج جلد از جلد غروب ہو جائے لیکن اب میری یہ خواہش تھی کہ یہ سرخ انگارہ سورج کبھی غروب نہ ہو لیکن سورج میری خواہشوں کا پابند نہ تھا۔ وہ تیزی کے ساتھ اپنی کمین گاہ کی طرف جا رہا تھا۔

میں ٹکٹکی باندھے سورج کو دیکھ رہی تھی کہ اچانک میں نے دیکھا کہ سرخ سورج کے سینے میں شگاف پڑ گیا اور پھر فوراً ہی اس شگاف سے انسانی قد و قامت کا ہیولا برآمد ہوا۔ وہ ہیولا تیزی کے ساتھ ہوا کے دوش پر اڑتا ہوا میری طرف آنے لگا۔ چند لمحوں میں اس ہیولے کے انسانی نقوش واضح ہونے لگے۔ نقوش کچھ جانے پہچانے سے تھے اور اب وہ ہیولا باقاعدہ ایک انسانی روپ میں ڈھل چکا تھا۔ وہ بڑے بڑے پائنچوں کا سفید پاجامہ اور کرتے پر کالے رنگ کا کوٹ پہنے تھا۔ اس کے بڑے بڑے بال ہوا میں لہرا رہے تھے اور اس کی بھوری آنکھوں میں ایک میٹھا سا نرم سا سکون بسا ہوا تھا۔ سرخ و سفید چہرے پر پتلی سی ستواں ناک اور کشادہ ٹھوڑی اسے ایک مردانہ وقار اور حسن عطا کر رہی تھی۔ اب میری دم توڑتی ہوئی امیدیں پھر سنبھالا لے رہی تھیں۔ کیوں کہ اب میں اسے پہچان چکی تھی۔ وہ وہی تھا...... میری محبت اور سپنا جو میرا شریک سفر بن چکا تھا۔ شادی سے پہلے جب ہم دونوں تنہائی میں ملتے تھے تو اس کے چوڑے اور مضبوط سینے میں سمٹ جانے کی

خواہش انگڑائیاں لیتی تھی تو وہ انکار نہ کرتا تھا۔ ہماری سہاگ رات محبت اور عہد و پیمان میں گزری تھی۔ وہ پل کی پل میں میرے قریب پہنچ کر ٹھہر گیا۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر ایک جاندار مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے میری سمت اپنا ہاتھ بڑھایا۔ نہ جانے اس کے ہاتھ میں کون سی قوت پوشیدہ تھی کہ میرا تھکا ہوا جسم ایک دم ہلکا ہلکا ہو گیا۔ بس ایسا انوکھا اور لطیف سا تھا کہ ہونٹوں اور زبان پر چبھتے ہوئے کانٹے یک لخت ٹوٹ گئے اور میں نہایت سبک خرامی کے ساتھ اٹھ کھڑی ہو گئی۔ اس نے نرمی سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ پھر اسے آہستگی سے دبایا۔ اس کی اس شرارت پر میں شرم سے دوہری ہو گئی اور اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑا کر اپنا چہرہ دوبارہ دونوں بازوؤں میں چھپا لیا۔ پھر وہ بڑے شوخ انداز سے کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ عجیب تھی اس کی ہنسی...... گونج دار اور بے پروا ہنسی...... وہ ہنستا رہا اور میں سمٹی رہی۔ کافی دیر تک میں انتظار کرتی رہی کہ وہ بڑھ کر مجھے اپنے سینے میں چھپا لے لیکن وہ ہنستا رہا۔ تھک کر میں نے خود ہی اپنا چہرہ اٹھایا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ وہاں نہ تھا لیکن اس کی ہنسی چاروں سمت سے امڈ رہی تھی۔ میری آنکھیں چھلک گئیں۔ پریتم!...... ہم دونوں ایک دوسرے کے ہو چکے ہیں۔ میں نے تمہیں اپنی محبت اور اپنا سب کچھ سونپ دیا۔ یہ تم کہاں چلے گئے؟ کیوں غائب ہو گئے؟ کیا تم نے مجھے سویکار نہیں کیا تھا؟

میں نے اپنے دل کو تسلی دی کہ...... پریا! تم تو پگلی ہو جو ایک سراب کے پیچھے دوڑ رہی ہو۔ ایک تصور میں غرق ہو۔ بھلا کبھی تصور بھی حقیقت کا روپ دھارتے ہیں پگلی......؟ یہ تم اپنے آپ کو دھوکا دے رہی ہو؟ میرا پریتم آیا اور چلا بھی گیا۔ میں اب پھر اکیلی تھی اور بھیانک موت کا انتظار کر رہی تھی ذہن بھی رفتہ رفتہ ساتھ چھوڑتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ میں سورج غروب ہونے سے پہلے ہی گہرے اندھیروں میں اتر گئی۔ پھر مجھے ہوش کہاں رہا۔

وہ بہت سے لوگوں کی ملی جلی آوازوں کا شور ہی تھا جسے سن کر میں ہوش میں آئی تھی۔ میں نے اپنی آنکھوں پر بھاری پلکوں کی چلمن اٹھائی۔ میرے گرد بہت سے مرد اور عورتیں کھڑی سرگوشیاں کر رہی تھیں کہ اچانک میرے عقب سے ایک آواز آئی۔

''ارے...... ارے...... دیکھو...... یہ لڑکی تو ہوش میں آ گئی ہے......؟ اس نے آنکھیں کھول دی ہیں۔''

آواز کو سن کر سب لوگ یک لخت خاموش ہو گئے اور ایک بوڑھی عورت جو صحت مند اور چاق و چوبند سی تھی بھیڑ کو چیر کر میرے سامنے سرہانے آن کھڑی ہوئی۔ وہ اس طرح سے میرے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی جیسے میں اس کی سگی بیٹی کی طرح ہوں۔

وہ ایک دیہاتی طرز کا کچی مٹی سے بنا ہوا کشادہ مکان تھا۔ جس پر چھت کی بجائے سرکنڈوں کا چھپر پڑا تھا۔ کچی دیوار میں بنے ہوئے ایک طاق میں تیل کا چراغ جل رہا تھا جس کی میلی روشنی میں وہ سب موٹے کھجور کے بان کی بنی ہوئی اس چارپائی کے گرد جمع تھے جس پر میں لیٹی ہوئی تھی۔ میں مکمل طور پر ہوش میں آ چکی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اب مجھے اپنے جسم میں نقاہت کا ذرہ برابر بھی احساس نہیں تھا۔ بھوک اور پیاس میں نمایاں کمی محسوس ہو رہی تھی۔ ورنہ بے ہوش ہونے سے پہلے میری حالت دم توڑتے

ہوئے شخص کی سی تھی۔

کمرے میں جمع جو مرد اور عورتیں کھڑی ہوئی تھیں وہ مجھ پر طرح طرح کے سوالات کی بوچھاڑ کیے جا رہی تھیں۔ ان کے بے سرو پا بے تکے اور فضول قسم کے سوالات سن کر ان کا منہ تک رہی تھی۔ اس بوڑھی عورت نے جیسے میری پریشانی بھانپ لی ہاتھ اٹھا کر سب کو ڈانٹا۔

''چلو رے...... چلو سب یہاں سے...... کیا واہیات سوال کر رہے ہو تم لوگ...... بچی پریشان ہو رہی ہے۔''

بڑھیا کی ڈانٹ ڈپٹ کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ وہ سب ایک ایک کر کے کمرے سے جانے لگے۔ آخر کمرے میں ایک بوڑھا مرد اور ایک جوان لڑکا رہ گیا جو لمبا تڑنگا تھا۔ اس کا جسم کسرتی تھا۔ اس پر ایک پہلوان کا دھوکا ہوتا تھا۔ بڑھیا اس سے بولی۔

''موہن!...... جا...... جا کر...... جلدی سے بکری کا تازہ دودھ لے آ...... یہ بے چاری بڑی بھوکی پیاسی لگ رہی ہے۔''

وہ لڑکا اس کی بات سن کر فوراً ہی کمرے سے نکل گیا۔ بڑھیا نے لکڑی کی ایک پیڑی کھینچی اور میرے پاس بیٹھ گئی۔ پھر مجھ سے بولی۔ ''بیٹی! تم کسی اچھے گھر کی معلوم ہوتی ہو...... تم برا نہ مانو تو مجھے اپنا نام بتاؤ۔ کیا نام ہے بیٹی تمہارا......؟''

''میرا نام پریا ہے......'' مجھے دوسرے لمحے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ مجھے اپنا اصل نام نہیں بتانا چاہئے تھا۔ کیوں کہ مہیش لال کے آدمی میری تلاش میں یہاں آئے تو انہیں پتا چل جائے گا۔ اب کیا ہو سکتا تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ میں کوئی اور نام لیتی تو پھر اسے شک سا ہو جاتا۔ پھر اس کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی میں نے اس سے سوال کیا۔ ''یہ کون سی جگہ ہے؟''

''یہ شام گڑھ ہے۔'' بڑھیا نے بتایا۔ مجھے یاد آ گیا کہ شام گڑھ اس قصبے کی حدود سے باہر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ جو چاول کی کاشت کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ یہ تو میرے گاؤں سے کوئی پندرہ سولہ میل دور ہے۔ میں حیران تھی کہ میں یہاں کیسے پہنچ گئی؟ مجھے کون لایا ہو گا؟ یہ بات صرف بڑھیا ہی بتا سکتی تھی۔ میں نے یہ سوچ کر بڑھیا سے پوچھا۔ ''چاچی! میں یہاں کیسے پہنچی؟ مجھے کون لایا؟''

''بیٹی! میرا بیٹا موہن ایک ہفتہ پہلے اپنے چچا کے لڑکے کی شادی میں شرکت کے لئے میسور گیا تھا۔ کل شام واپسی پر اس نے بیل گاڑی میں گاؤں آتے ہوئے تمہیں میدان میں دیکھا۔ یہ بیل گاڑی بس اڈے کے پاس ایک دوست کے ہاں چھوڑ گیا تھا۔ وہ تمہیں اس بیل گاڑی میں ڈال کر لے آیا۔ موہن دوڑ کر وید جی کو لے آیا اور انہوں نے تمہاری نبض دیکھ کر بتایا کہ تم کئی وقت کے فاقے، پیاس اور مسلسل چلتے رہنے کی وجہ سے بے ہوش ہو گئی ہو۔ انہوں نے ایک بوٹی عرق میں گھول کر تمہیں پلائی اور اوپر سے ایک گلاس دودھ پلایا اور کہا کہ تمہارا سونا زیادہ بہتر ہے اور کل شام تک ہوش آئے گا۔ سونا اس کے لئے بہت بہتر ہے۔ جب تک تم خود ہی بیدار نہ ہو سونے دینا۔''

بڑھیا نے مجھے بڑی تفصیل سے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ ایک سیدھی سادھی محبت کرنے والی عورت ہے۔ اس کا نام سرستی ہے اور اس کے پتی کا نام نارائن تھا۔ وہ ایک کسان تھا۔ اور گاؤں کے ہندو زمین دار کی زمین پر ہل چلا کر زمین سے سونا اگاتا تھا۔ لیکن خود اس کے کچے گھر کے در و دیوار سے غربت ٹپک رہی تھی۔ وہی غربت جو ہندوستان کے کروڑوں کسانوں کے گھر میں راج کرتی ہے۔ دنیا میں ہر حکم ران کا راج ناپائیدار ہوتا ہے لیکن اس کا بیٹا یا بھائی اس کی پشت میں خنجر گھونپ کر اس کا راج ختم کر دیتا ہے اور کبھی طبعی موت اس کا راج چھین لیتی ہے۔ اور پھر اسے دھرتی کی گہرائیوں میں پہنچا دیتی ہے۔ ازل سے یہی ہوتا آ رہا ہے۔ ہاں...... حکم رانوں کے نام بدلتے رہے ہیں۔ کبھی وہ سردار کہلاتے تھے۔ پھر بادشاہ بنے۔ کوئی راجہ کہلایا تو کوئی مہاراجہ...... لیکن غربت کا راج آج تک نہیں بدلا۔ یہ راج تو ابتدائے آفرینش سے جاری و ساری ہے۔

میرے ذہن میں تلخیاں بھر گئی تھیں۔ اور میں غربت و امارت کے تضاد پر غور کر رہی تھی کہ موہن ہاتھ میں دودھ سے لبالب بھرا گلاس اور ہونٹوں پر مسکراہٹ لئے داخل ہوا۔ بڑھیا نے اس کے ہاتھ سے گلاس لے لیا اور بڑی محبت سے مجھ سے بولی۔

''لو بیٹی...... یہ دودھ پی لو۔ اس سے تمہاری کمزوری اور نقاہت دور ہو جائے گی۔ دودھ میں بہت توانائی ہوتی ہے۔''

اگرچہ مجھے خود بھی ہلکی ہلکی بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اس انداز سے انکار کرتے ہوئے کہا۔

''معلوم نہیں کیوں کچھ کھانے پینے کو دل نہیں کر رہا ہے۔''

''نہیں بیٹی! تم دودھ پی لو۔ کیوں کہ وید جی جاتے وقت سخت تاکید کر کے گئے تھے جیسے ہی تمہیں ہوش آئے فوراً ہی بکری کا تازہ دودھ پلا دینا...... کیونکہ تم کئی وقتوں سے بھوکی ہو۔ اس لئے تمہیں کھانا پہلے دینا مناسب نہیں ہے۔ اس لئے میں نے دودھ تمہارے لئے منگوایا۔''

بڑھیا کے لہجے میں ممتا بھری ہوئی تھی اور وہ بڑے خلوص سے بولی تھی اس لئے میں نے زیادہ انکار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ دودھ کا گلاس اس کے ہاتھ سے لے کر گھونٹ گھونٹ کر کے پی لیا۔ دودھ پی کر مجھے توانائی کا احساس ہوا۔ میں چارپائی پر پیر لٹکا کر بیٹھ گئی۔

''اب تمہاری طبیعت سنبھل گئی ہے بیٹی!......'' بڑھیا جسے میں چاچی کر کے مخاطب کر رہی تھی وہ بولی۔ ''مجھے بڑی فکر لگی ہوئی تھی۔ بھگوان نے بڑی کرپا کی۔''

''ہاں چاچی!...... تم لوگوں کی بڑی مہربانی...... تم لوگوں نے میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے میں اسے زندگی بھر فراموش نہیں کر سکتی۔'' میں نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''تم نے جو کیا وہ شاید میری ماں بھی نہیں کرتی...... تمہاری دیا نے مجھے سدا کے لئے خرید لیا ہے۔''

''ارے نہیں پریا بیٹی!'' چاچی نے انکساری سے کہا۔ ''میں نے کوئی دیا نہیں کی...... میں نے جو کچھ کیا تمہیں اپنی بیٹی سمجھ کر کیا۔''

اتنے میں باہر سے کسی نے بڑے زور سے نعرہ لگایا۔ ''اوہ موہن...... اوہ نارائن...... گھر میں کیا کر رہے ہو۔ باہر تو آؤ۔'' باپ بیٹے کمرے سے نکل گئے۔ ''بیٹی یہ بات مناسب تو معلوم نہیں ہوتی ہے لیکن چوں کہ تم صورت شکل سے کسی اچھے گھرانے کی اور شہری لڑکی معلوم ہوتی ہو اس لئے اگر تم بہتر سمجھو تو اپنے بارے میں بتاؤ...... میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ تم جو کچھ بھی بتاؤ گی میں اسے اپنے سینے میں راز رکھوں گی۔''

بڑھیا جاہل اور دیہاتی ضرور تھی لیکن اسے بات کرنے کا سلیقہ آتا تھا۔ میرے پتا جی ماسٹر تھے۔ وہ کہتے تھے کہ...... میں نے زندگی بھر کے تجربے سے اندازہ لگایا ہے کہ بات کرنے کا سلیقہ علم سے آتا ہے اور علم کے لئے ضروری نہیں کہ انسان موٹی موٹی کتابیں گھول کر پی لے بلکہ زندگی کے تجربوں سے سبق حاصل کرنے والے لوگوں کو بھی ایک بڑا علم حاصل ہو جاتا ہے۔ بڑھیا سرستی بھی ان پڑھ لوگوں میں سے تھی جنھوں نے زندگی کی کتاب کے ایک ایک ورق کو پڑھ رکھا ہے۔ اور پھر وہ دور اندیش اور بے حد سمجھ دار عورت بھی تھی۔

میں نے اسے جواب دینے اور اپنے بارے میں بتانے سے تامل نہیں کیا۔ میں چاہتی تھی کہ وہ میرے متعلق تمام باتیں جان لے تاکہ کسی بھی کڑے وقت میں وہ میرے کام آ سکے۔ اسے اعتماد میں لینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے اسے بڑی تفصیل سے اپنے اوپر گزرنے والی قیامت خیز مصیبت سے آگاہ کیا۔ میری بپتا سن کر سرستی آبدیدہ ہو گئی۔ اس لئے کہ وہ بھی عورت تھی۔ اس کے چہرے کے نقوش اور رنگت سے ایسا لگتا تھا کہ وہ جوانی میں بہت خوب صورت رہی ہو گی۔ حسین ہونے کی وجہ سے جانے کن کن حادثات کی زد میں رہی۔ ایک غریب عورت کا حسین ہونا کسی مصیبت اور عذاب سے کم نہیں ہوتا ہے۔ وہ اس کے لئے وبال بن جاتا ہے۔ جیسا کہ میرے ساتھ، میں ایک اذیت ناک عذاب سے گزر رہی تھی۔ اس نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا اور دیر تک تسلی دیتی رہی۔ اس کے سینے میں ممتا کی گرمی پا کر میں پگھل گئی اور میری آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ اس اجنبی مکان کے ایک کمرے میں اس بڑھیا نے اپنے دوپٹے کے کونے سے میرے آنسو صاف کئے۔ مجھے چوما اور پھر مجھے دلاسا دیتے ہوئے کہنے لگی۔

''پریا بیٹی! گھبراؤ مت...... بھگوان سے پرارتھنا کرو اور اس پر بھروسا کرو...... صبح ہوتے ہی میں تمہیں موہن کے باپ کے ساتھ ارجن پور سہیلی کے ہاں بھیج دیتی۔ لیکن انہیں زمین دار کے ایک ضروری کام سے میسور شہر جانا ہے۔ اس کی واپسی کے بعد تمہیں بھیج دوں گی۔''

پھر وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑائی۔ ''میں تمہیں موہن کے ساتھ ہی بھیج دیتی...... لیکن وہ جوان بچہ ہے...... لوگ اعتراض کر سکتے ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ تم اس کے ساتھ ارجن پور پہنچو تو وہاں کے لوگ تم پر انگلیاں اٹھائیں۔''

''آپ ٹھیک کہتی ہیں چاچی!'' میں نے کہا۔ ''آپ کسی بات کی چنتا نہ کریں۔ چاچا دو دن! میں آئیں یا تین دن میں، میں ان ہی کے ساتھ جاؤں گی۔''

میرے جواب سے سرستی مطمئن ہو گئی اور اس کے چہرے سے تفکرات کے بادل چھٹ گئے۔ وہ

میرے لئے یوں پریشان تھی جیسے کوئی بوڑھی ماں اپنی جوان بیٹی کے لئے پریشان ہوتی ہے۔ میں نے دل میں سوچا کہ ابھی دنیا اچھے اور غلط لوگوں سے بالکل ہی خالی نہیں ہوگئی ہے۔ اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو انسانی ہمدردی کے جذبے سے معمور ہیں اور اس جذبے کے لئے پڑھے لکھے یا ان پڑھ شہری یا دیہاتی کی کوئی تخصیص نہیں، ایشور جسے بھی عطا کردے یہ تو ایک ایسی دولت ہے جو ہر کسی کو نہیں ملتی ہے۔

ہم دونوں باتیں کرتے رہے۔ دنیا جہاں کی باتیں، ایسی باتیں جو عورتیں اکثر آپس میں کرتی ہیں۔ وہ میری باتیں بڑی دلچسپی اور اشتیاق سے سن رہی تھی کہ موہن کمرے میں آیا اور اپنی ماں سے مخاطب ہو کر بولا۔ "ویدجی آئے تھے اور انہیں پوچھ رہے تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ ہوش میں آنے کے بعد دودھ دیا تھا...... کوئی ایک گھنٹہ سے زیادہ ہوگیا ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ کھانا کھلا کر سلا دیں اور انہیں گہری نیند سونے دیں۔"

"ہاں...... ہاں...... میں بھی کتنی پاگل ہوگئی ہوں۔ باتیں کرنے بیٹھ گئی۔" اس نے اپنا ماتھا پیٹ ڈالا۔ "مجھے کھانے کا خیال ہی نہیں رہا۔ میں کھانا ابھی لاتی ہوں...... تھوڑی دیر صبر کرنا...... کھانا تیار ہی ہے۔ معاف کرنا بیٹی......"

تھوڑی دیر بعد وہ آئی تو سینی میں دو پراٹھے، سرسوں میتھی کا ساگ، انڈوں کا آملیٹ اور دہی تھا۔ اس نے کھانا مجھے اپنے ہاتھ سے کھلایا۔ جب میں کھانا کھا چکی تو وہ بولی۔ "اچھا بیٹی! اب تم سو جاؤ...... مجھے سویرے اٹھنا ہے تاکہ موہن کے باپ کو ناشتا بنا کر دوں۔"

یہ کہہ کر اس نے مجھے بڑی محبت سے پیار کیا، بستر پر لٹایا۔ وہ خلوص ومحبت کی پیکر دروازہ بھیڑ کر نکل گئی۔

مجھے فوراً ہی رقم کا خیال آیا۔ میں نے دیکھا تو وہ رقم جوں کی توں موجود تھی۔ شاید اس لئے کہ موہن کے ساتھ ایک عورت بھی بیل گاڑی میں موجود تھی۔ اگر وہ عورت ساتھ نہ ہوتی تو موہن بے ہوشی سے فائدہ اٹھا کر جانے کیا کچھ کرتا۔ رقم نکال کر مجھے میدان میں ہی چھوڑ کر چلا آتا۔ نیند میرے انگ انگ میں ڈول رہی تھی لیکن اجنبی جگہ ہونے کے باعث میں کافی دیر تک سو نہ سکی۔ کیوں کہ میرے چشم تصور میں میرے گھر والوں کے چہرے...... میرے پریتم کا چہرہ گھومتا رہا۔ انہوں نے میری پراسرار گمشدگی کو کیا رنگ دیا ہوگا۔ مجھے بدچلن کہا ہوگا کہ میں کسی آشنا کے ساتھ فرار ہوگئی...... کیا یہ صدمہ میرے گھر والے اور پریتم برداشت کرسکے گا؟ کچھ بھی ہو...... میں نے سوچا۔ جو ذلت رسوائی ملی سو ملی۔ لیکن میں مہیش لال کو نہیں چھوڑوں گی۔ میں اسے قتل کردوں گی اور میرے ذہن میں اسے قتل کرنے کی ایک ایسی نادر تدبیر آئی کہ سانپ بھی مرجائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی۔ میں حیرت اور خوشی سے اچھل پڑی۔

میرے ذہن میں مہیش لال کو قتل کرنے کی جو تدبیر آئی تھی وہ یہ تھی کہ میں موہن کو اپنے اعتماد میں لے کر ایک پستول خرید لوں تاکہ اس پستول کی مدد سے چھپ کر میں مہیش لال کو گولی مار کر اسے ختم کردوں۔ یہ بات میرے علم میں تھی کہ وہ کبھی رنگ رلیاں منانے راتوں کو حویلی سے نکل کر ایسی عورتوں کے ہاں بھی جاتا ہے جو کسی وجہ سے اس کی حویلی میں نہیں آسکتیں۔ اور پھر حویلی میں میرے لئے داخل ہونا ایسا مشکل بھی نہ

تھا۔ میری یہ مشکل بسنتی حل کرسکتی تھی۔ میرے پاس مہیش لال کی خاصی بڑی رقم موجود تھی۔ گو کہ میں نے ابھی تک اس کی گنتی نہیں کی تھی لیکن وہ بہرحال ایک لاکھ سے زیادہ ہی تھی۔ "وہ بہت غریب ہے۔ اس رقم میں سے اسے پچیس تیس ہزار کی رقم میں دے دوں تو میرے لئے کیا فرق پڑے گا۔ بےچاری، بہت غریب ہے اور پھر بسنتی کا اس رقم پر حق بھی اس لئے ہے کہ وہ اس درندے کی زیادتی کا نشانہ بن چکی ہے۔" مجھے اس بات پر کف افسوس ہونے لگا کہ اس وقت مجھے بسنتی کا خیال آجاتا تو اس میں سے سو یا پانچ سو روپوں کی ایک گڈی اس کے لئے بھی اٹھا لیتی۔ چوں کہ اس وقت مجھ پر سراسیمگی اور خوف سوار تھا۔ مجھے اپنی جان بھی بچانا تھی اس لئے مجھے بسنتی کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔ میں رات کے اندھیرے میں تنہائی میں بسنتی سے مل کر اور اسے کہتی کہ حویلی کا راستہ کھلا رکھنا تمہارا کام ہے۔ باقی کام میرا ہے۔ میں اس ناگ کا سر کچل دوں گی۔

کیا موہن میری بات مان لے گا۔ وہ پستول خرید کر لا کر دینے پر آمادہ ہوجائے گا؟ اس کے لئے پستول خرید کرلا دینا کچھ مشکل اس لئے نہیں ہوگا کہ اسلحہ چوری چھپے فروخت ہوتا تھا اور خریدا بھی جاتا تھا۔ اس کے تیار نہ ہونے کی صورت میں بھی اس پر پیسوں کا جادو چلاؤں گی۔ اسے ہزار روپے الگ سے دے دوں گی۔ پھر وہ کیا اس کا باپ بھی تیار ہوجائے گا۔ کیوں کہ دولت میں بڑی ت ہے۔ ہزار روپے دولت ہی تو ہے۔

میں مہیش لال سے انتقام لینے اور اس کے قتل کا منصوبہ بنا رہی اور سوچ رہی تھی کہ میرے چشم تصور میں پریتم ابھرنے لگا۔ جو میرا پتی دیو تھا۔ پہلی سہاگ رات میں، میں نے اپنا سب کچھ اسے سونپ دیا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی ذات کا جزو بن گئے۔ سدا کے جیون ساتھی بن گئے تھے۔ اب کسی بات کا ادھیکار نہیں تھا کہ میری عزت، میرے جسم اور میری جان کو اپنی ملکیت بنالے۔ اب میں اس کی امانت تھی۔ مجھے اپنی جوانی کی حفاظت کرنا تھی۔ میرے پریتم پر کیا گزر رہی ہوگی؟ وہ کیا سوچ رہا ہوگا؟ چشم تصور میں وہ مجھے بہت اداس اور غمگین دکھائی دے رہا تھا۔ وہ جیسے ساری دنیا سے چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ میری پریا ایسی نہیں ہے کہ مجھے چھوڑ کر چلی جائے۔ دھوکا دے۔ وہ کسی یونانی دیوتا کی طرح کھڑا تھا۔ دراز قد...... چوڑا چکلا سینہ...... اس وقت نہ جانے کیوں میرے دل کو یقین تھا کہ یہ میرا تصور نہیں ہے۔ وہ حقیقت میں میرے پاس ہے۔ پہلو میں دراز ہے۔ میں اس کی خوشبو محسوس کررہی ہوں۔ میری سانسوں میں وہ خراماں خراماں اتر رہا ہے۔ وہ میرے تصور میں مجسم بن کر نہیں آیا ہے بلکہ اس کا لمس اس کے وجود کی خبر دے رہا ہے۔ میں اس کے خیالوں میں محو تھی۔ میں صرف اور صرف اس کے بارے میں سوچے جارہی تھی۔ حالات کی نزاکت سے بےپروا ہو کر میرا دل اس کی آرزو میں دھڑک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ مجھے اپنے گالوں، پلکوں، ہونٹوں اور بالوں میں محسوس ہونے لگے۔ مجھے ایسا لگا وہ میرے کان میں رس انڈیل رہا ہے۔ پریا! پریا!

میں نے کھڑکی میں سے باہر جھانکا۔ پو پھٹ رہی تھی۔ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوسکا۔ گائے اور بیلوں کے ڈکرانے کی آواز فضاؤں میں گونج رہی تھی۔ ان آوازوں نے میرے لئے لوری کا سا کام کیا تھا اور نیند نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا تو پھر مجھے کسی بات کا ہوش نہیں رہا۔

جب میرا تھکا ماندہ جسم پوری طرح نیند کے مزے لوٹ چکا اور میرے دکھتے بدن سے تھکن کا ذرہ ذرہ نچڑ گیا تو خود بہ خود میری آنکھ کھل گئی۔ میں کچھ دیر تک بے سدھ ہی لیٹی رہی۔ ذہن بھی اس وقت کورے کاغذ کی طرح تھا۔ پھر ایک دم سے ذہن کے دریچے کھلے تو بہت کچھ یاد آتا گیا۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرے میں جلتا ہوا چراغ گم تھا اور کمرے میں دھوپ بھر گئی تھی۔ اب میری چارپائی وہاں موجود نہ تھی جہاں رات کو بچھی ہوئی تھی۔ شاید صبح کو سرسوتی نے میری بے آرامی کے خیال سے چارپائی کو وہاں سے آہستگی سے اٹھوا کر کونے میں بچھوا دیا تھا۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ میں کتنی بے خبر سو رہی تھی۔ ظاہر ہے چارپائی کو اکیلی سرسوتی نے تو اٹھایا نہ ہوگا۔ شاید موہن نے بھی ہاتھ لگایا ہوگا۔ یہ سوچ کر میں شرم سے دہری سی ہو گئی۔ میں نے بستر پر لیٹے لیٹے اپنا جائزہ لیا۔ بالوں کو سمیٹا جو بکھرے ہوئے تھے۔ ان کا جوڑا بنایا۔ پھر میں چارپائی پر بیٹھ کر دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ میں کافی دیر یوں ہی بیٹھی دہلیز کی طرف دیکھتی رہی۔ لیکن کمرے میں کوئی نہیں آیا۔ میں سمجھ گئی کہ سرسوتی اب تک شاید یہ سوچ رہی ہوگی کہ میں سو رہی ہوں گی۔ وہ مجھے اس وقت سونے دینا چاہتی ہوگی جب تک میں خود سے بیدار نہ ہو جاؤں۔ اس لئے مجھے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ تب میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے خود اٹھ کر صحن میں جانا چاہئے۔ میں اس طرح یہاں کب تک بیٹھی انتظار کرتی رہوں۔

تھوڑی دیر بعد میں صحن میں آئی لیکن صحن میں کوئی نہ تھا۔ ایک کونے میں شاید باورچی خانہ بنا تھا۔ جہاں سے گاڑھا گاڑھا دھواں اٹھ رہا تھا۔ میں اس طرف بڑھ گئی۔ سرسوتی اپلوں کے چولہے پر کھانا پکا رہی تھی۔ دھوئیں کی شدت سے اس کی آنکھوں میں آنسو بہہ رہے تھے۔ میرے قدموں کی آواز پر اس نے مڑ کر دیکھا اور مجھے موجود پا کر تیزی سے میری طرف لپکی۔ پھر بڑی نرمی سے میرا بازو تھام لیا۔ پھر وہ مجھے لے کر دوبارہ کمرے کی طرف بڑھی۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے بڑے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"پریا! بیٹی!...... تم جاگ گئی تھیں تو تم نے مجھے آواز کیوں نہ دے لی......؟ میں خود چلی آتی۔ تمہیں آرام کرنا چاہئے تھا؟"

"جی چاچی!...... میں لیٹے لیٹے تھک چکی تھی۔" میں نے جواب دیا۔ "کتنا آرام کرتی۔ خوب سو کر اٹھی ہوں۔ سوچا کہ ذرا گھوم پھر لوں۔"

"چلو...... تم نے اچھا کیا۔" سرسوتی نے کہا۔ "میں نے اجالا ہونے کے بعد دو تین مرتبہ کمرے میں جھانکا بھی تھا۔ تم گہری نیند سو رہی تھی۔ اس لئے میں نے تمہیں جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ آرام کرنے اور نیند کی وجہ سے تمہارے چہرے پر سرخی بھی آ گئی ہے۔ تم تازہ دم لگ رہی ہو۔"

میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تو اس نے مجھے بستر پر بٹھا دیا۔ میرا ماتھا چوما۔ پھر اس نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ "پریا! تم بہت دیر تک سوتی رہی ہو۔ تمہیں اس وقت بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہوگی۔ تم آرام سے بیٹھو۔ میں تمہارے لئے کھانا لاتی ہوں۔"

سرسوتی یہ کہہ کر میرے جواب کا انتظار کئے بغیر تیزی سے کمرے سے نکل کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ میں چارپائی پر بیٹھی پیر جھلانے اور اپنے گورے گورے خوب صورت، چکنے اور سڈول پیروں کو

دیکھنے لگی۔ دوپہر کا وقت تھا اور میری شدید ترین خواہش تھی کہ جلد سے جلد یہ دن گزر جائے۔ شام ہو جائے اور پھر دوسرا دن جلد طلوع ہو جائے تاکہ میں یہاں سے نکل کر اپنی سہیلی کے ہاں پہنچوں۔ اسے اعتماد میں لوں، وہ بھروسے کے قابل تھی۔ میں اس کی بھی مالی مدد کرنا چاہتی تھی۔ اور پھر میرے سینے میں مہیش لال کے خلاف نفرت اور انتقام کی آگ ایک آتش فشاں بن چکی تھی۔ اس میں ایک ایسا لاوا پک رہا تھا جس کا اندازہ صرف اور صرف مجھے ہی تھا۔ یہ آگ اس وقت تک سرد نہیں ہو سکتی تھی جب تک اس ذلیل، کمینے اور درندے کو اپنے ہاتھوں سے موت کے گھاٹ نہ اتار دوں، میں بے بس اور مجبور تھی۔ اکیلی جا نہیں سکتی تھی۔ کیوں کہ میں راستوں سے ناواقف تھی۔ اب مجھے کل تک صبر ہی کرنا تھا۔

میں ان خیالوں کی نفرت اور انتقام کی بھٹی میں پک رہی تھی کہ سرسوتی میرے لئے کھانا لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔ سرسوں کا ساگ، مکھن، بیسن کی روٹی کے ساتھ سرخ مرچوں اور لہسن کی چٹنی تھی۔ ایسا کھانا کئی دنوں کے بعد نصیب ہوا تھا۔ یہ کھانا بڑا لذیذ اور ذائقہ دار بھی تھا مجھے بھوک نہ تھی لیکن دو ایک نوالوں نے میری بھوک بڑھا دی۔ میں نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ سرسوتی بھی کھانے میں میرے ساتھ شریک تھی اور مجھے اس طرح سے اصرار کر کے کھلا رہی تھی جیسے میں اس کی بیٹی ہوں۔ سسرال سے آج ہی میکے آئی ہوں۔

اتنی چاہت اتنا خلوص اور اتنا پیار ایک ایسی لڑکی کے لئے جس سے اس کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ سمبندھ نہیں تھا۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھے۔ اس کے دل میں میرے لئے ہمدردی اور محبت کے جذبات شاید اس لئے موجزن تھے کہ میں ایک دکھی عورت تھی۔ حادثات کی زد پر تھی۔ وہ ایک عورت تھی۔ عورت ہونے کے ناطے وہ مجھ پر نچھاور ہو رہی تھی۔ یہ بہت بڑی بات تھی۔

دن دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ کچھوے کی چال کی سی رفتار سے ایک طرح سے میرے لئے گزرتا وقت صدی کی طرح بھاری لگ رہا تھا۔ سرسوتی نے مجھے اپنی محبت کی چادر میں باندھ لیا تھا۔ گویا بھی جادوگرنی تھی۔ سرسوتی بھی جادوگرنی ہی تھی۔ لیکن ان کے جادوؤں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ سرسوتی گھر کے کام کاج بھی کرتی رہی اور مجھ سے باتیں بھی کرتی رہی۔ میں نے کئی بار چاہا کہ میں بھی اس کے کام میں ہاتھ بٹاؤں لیکن ہر بار اس نے بڑی نرمی اور بڑے پیار کے ساتھ مجھے منع کر دیا۔ اس عمر میں بھی وہ بڑی چاق و چوبند عورت تھی۔

اس دوران صرف ایک بار موہن گھر آیا تھا۔ وہ بھی دوپہر کا کھانا کھانے کے لئے۔ روز تو سرسوتی ہی اسے کھیتوں پر کھانا پہنچا دیتی تھی۔ لیکن آج میری تنہائی کے خیال سے وہ اپنے بیٹے کے لئے کھانا لے کر نہیں گئی تھی۔ اس لئے وہ اپنی ماں کا انتظار کر کے آ گیا تھا۔ اس وقت میں صحن میں بیٹھی سرسوتی سے باتیں کر رہی تھی اور میری ساڑھی کا پلو گود میں گرا ہوا تھا۔ وہ دروازہ کھلا ہونے کے باعث سیدھا اندر آ گیا تھا۔ میں نے چوں کہ اسے اندر آتے نہیں دیکھا تھا اس لئے پلو اٹھا کر سینے اور شانے پر درست کرنے میں چند لمحات بیت گئے وہ شرمیلا معلوم ہوتا تھا اس نے مجھے اس حالت میں دیکھ کر سر جھکا لیا۔ اس کی جگہ کوئی اور

ہوتا۔ گھورتا ہی رہ جاتا۔ اور پھر اس نے رات سے اب تک مجھ سے براہ راست کوئی بات نہیں کی تھی۔ جس وقت سرسوتی نے اسے کھانا لا کر دیا وہ سامنے والی چارپائی پر بیٹھ کر کھانے لگا۔

جس وقت وہ کھانا کھا رہا تھا تب میں نے اسے غور سے اور ناقدانہ نظروں سے دیکھا تھا۔ وہ مضبوط جسم اور مناسب نقوش کا حامل ایک بھرپور مرد تھا۔ گو وہ چپ چاپ کھانا کھاتا رہا لیکن میں نے دو ایک مرتبہ اس کی نظروں کی چوری غیر محسوس انداز سے پکڑ لی۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد میں اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ چوں کہ میں بہت حسین اور انتہائی پرکشش ہوں اس لئے وہ مجھے دیکھنے پر مجبور ہے۔

موہن نے اپنی آنکھیں سینکنے کی غرض سے دیر تک روٹی کھائی تھی۔ پھر وہ کھیتوں پر چلا گیا۔ محلے اور پڑوس کی بہت سی ہندو مسلم عورتیں میرے متعلق کریدنے کے خیال سے سرسوتی کے گھر میں جمع ہو گئیں۔ ممکن تھا کہ میں انہیں سب کچھ صحیح صحیح بتا دیتی لیکن نوراں نے مجھے آنکھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ ان سے یہ کہا کہ یہ میری دور کی رشتہ دار کی بہن کی بیٹی ہے اور اس کا نام پرسنا ہے۔ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ ایک گاؤں جا رہی تھی کہ ان سے بچھڑ کر ادھر آ نکلی تھی اور راستے میں بھوک پیاس سے بے ہوش ہو گئی۔ انہوں نے پھر بھی مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی تھی لیکن میں نے ان کی باتوں کو اڑا دیا۔ انہیں وہی کچھ بتایا جو سرسوتی نے بتایا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ چلی گئیں۔

سرسوتی کی ایک بڑی بیٹی تھی جو موہن سے سات برس بڑی تھی۔ بیاہ کر میسور چلی گئی۔ اس کے تین بچے تھے۔ اس کا پتی تین ماہ سے بیکار تھا۔ سرسوتی کی بڑی بیٹی ﷺ میلا گزشتہ برس آئی تھی۔ اس کا داماد ساجن اس کی بیٹی کی چٹھی لے کر آیا تھا کہ کچھ مالی مدد کر دیں۔ بے روزگار ہونے کے سبب بڑی مشکل ہو رہی ہے۔ زیور بھی ایک ایک کر کے بک رہا ہے کیوں کہ کوئی قرض دینے کو تیار نہیں ہے ساجن مہیش لال کے کپڑے کے کارخانے میں کام کرتا تھا۔ مہیش لال نے اسے اس لئے ملازمت سے نکال دیا تھا کہ اس نے اپنی جان پر کھیل کر کارخانے میں کام کرنے والی سولہ برس کی عمر کی لڑکی کی عزت بچائی تھی۔ کارخانے کے باہر اس لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ مہیش لال کے پالتو بدمعاش تھے اور اس لڑکی کو مہیش لال کے لئے اغوا کرنے والے تھے۔

میں نے ساس اور داماد کی تمام گفتگو سن لی تھی۔ میں نے اس گڈی میں سے پچیس ہزار کی رقم نکالی جو میں مہیش لال کے ہاں سے لے کر آئی تھی۔ میں نے سرسوتی کو اندر بلا کر رقم اس کے ہاتھ پر رکھی تو وہ بھونچکی سی ہو گئی۔ میں جو مہیش لال کے ہاں سے رقم لائی تھی اس کے بارے میں اسے نہیں بتایا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ...... داماد کو رقم دے کر رخصت کر دو۔ یہ بات موہن اور پتی کو بھی نہیں بتانا۔

اس کے داماد کے جانے کے تھوڑی دیر بعد موہن آیا تو سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ وہ کھیتوں سے آیا تھا اور بہت تھکا ہارا لگ رہا تھا۔ میں صحن میں اکیلی بیٹھی سوچوں کی گرداب میں گھری ہوئی تھی۔ سرسوتی باورچی خانے میں تھی اور رات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی۔ وہ بہت خوش تھی کہ میں نے اس کی بیٹی کی بہت بڑی مصیبت دور کر دی۔ پچیس ہزار کی رقم کوئی معمولی نہ تھی۔ میں نے دس ہزار کی رقم بھی اسے دی

تھی۔ میں نے اس معاملے میں اسے کچھ کہنے اور پوچھنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ میں نے یہ رقم اس لئے بھی دان کر دی تھی کہ اتنی بڑی رقم ساتھ لے کر چلنا بہت مشکل تھا۔ اتنی بڑی رقم دان دینے کے بعد اب بھی میرے پاس ساٹھ ہزار روپے بچے تھے۔ مجھے اپنی سہیلی کی بھی تو مدد کرنی تھی۔

موہن صحن میں بے چینی سے ادھر ادھر ٹہلنے لگا تو مجھے بڑی حیرت ہوئی اس کی کچھ وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا تو اس کے ہر انداز میں ایک بے چینی، وحشت اور اضطراب نمایاں تھا۔ سرسوتی نے جو اسے اس عالم میں دیکھا تو وہ باورچی خانے سے نکل آئی۔

''موہن! کیا بات ہے تم بہت پریشان دکھائی دے رہے ہو؟'' سرسوتی نے پوچھا۔ اس کی آواز میں ماتا کی چاشنی بھری ہوئی تھی۔

''معلوم نہیں ماں! کیوں آج جی بہت گھبرا رہا ہے۔'' اس نے اکھڑے لہجے میں جواب دیا اور مجھ پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔

موہن اس طرح اس بے چینی کی حالت میں ٹہلتے ٹہلتے کبھی کبھی نگاہیں اٹھا کر میری سمت دیکھ لیتا تھا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں وہی چمک تھی جو کبھی سر راہ کے مردوں اور کبھی اس شیطان مہیش لال کی آنکھوں میں مجھے نظر آتی تھی۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ اچانک گھر سے باہر نکل گیا۔ سرسوتی اپنے بیٹے کو آواز دیتی رہ گئی۔ لیکن وہ دروازے سے ہی ''ابھی آتا ہوں ماں'' کہہ کر چلا گیا۔

''پتا نہیں اسے یہ اچانک بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا؟'' سرسوتی فکرمندی سے اور تشویش بھرے لہجے میں بولی پھر سر جھٹک کر کھانا پکانے میں مشغول ہو گئی۔

موہن کے اس رویے نے نہ صرف مجھے مشکوک کر دیا تھا بلکہ میری بے قراری میں بھی اضافہ کر دیا تھا۔ میں دل ہی دل میں خوف زدہ سی تھی اور میری حالت ایک پنچھی کی سی تھی جس کے پر کاٹ دیئے گئے ہوں۔ موہن کا باپ کسی وجہ سے اب تک لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ وہ آ جاتا تو دل کو کچھ ڈھارس سی بندھ جاتی۔ باپ کی موجودگی میں موہن کی مجال نہیں تھی کہ وہ مجھ پر بری نگاہ ڈالے۔

آہستہ آہستہ شام کے سرمئی سائے پھیل رہے تھے۔ پھر دن بھی ڈوب گیا۔ سرمئی سائے اندھیرے کی آغوش میں مدغم ہو گئے تھے۔ اندھیرا فضاؤں پر مسلط ہو کر گہرا ہونے لگا تھا۔ یہاں تک کہ رات نے اپنے کالے پر پوری دھرتی پر پھیلا دیئے تھے۔ گھر میں کڑوے تیل کا چراغ جل چکا تھا۔ موہن اور اس کے پتاجی ابھی تک نہیں لوٹے تھے۔ سرسوتی رات کا کھانا پکا کر فارغ ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے محبت بھرے انداز میں کئی بار مجھ سے اصرار کیا تھا کہ میں کھانا کھا لوں۔ لیکن میری بھوک بالکل اڑ چکی تھی۔ دوپہر کا کھانا ابھی تک میرے سینے پر دھرا ہوا تھا۔ نہ صرف میں نے سیر ہو کر کھایا تھا بلکہ کھانا مرغن بھی تھا۔ اس کے ہضم ہونے میں ابھی دیر تھی۔ ''چاچی!'' میں نے محبت سے ان کے ہاتھ تھام کر محبت بھرے لہجے میں کہا۔ ''مجھے بالکل بھی بھوک نہیں ہے۔ یقین مانیے۔ بھلا میں کیوں تکلف کرنے لگی؟''

''ہاں بیٹی! تم ٹھیک کہتی ہو؟'' سرسوتی نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ''جو جوان لڑکی ماں باپ

کی نگاہوں سے دور ہو جاتی ہے اور شادی کے دوسرے دن اغوا کر لی جاتی ہے اس کی بھوک پیاس اڑ جاتی ہے۔'' اس کے لہجے میں اپنائیت بھری تھی۔

یک لخت مجھے مہیش لال کا خیال آیا۔ اس نے ہوش میں آنے کے بعد میری تلاش شروع کر دی ہوگی۔ میں نے نہ صرف اس کے سارے خواب چکنا چور کر دیئے تھے بلکہ سہاگ رات کو غم کی رات میں تبدیل کر دیا تھا اور ایک لاکھ سے زائد رقم لے کر فرار ہوگئی تھی۔ وہ کویتا کے پاس بھی یقیناً یہ معلوم کرنے گیا ہوگا کہ میں بھاگ کر کہاں گئی ہوں۔ کویتا جادو کے زور سے معلوم کر کے بتائے۔ شاید وہ بتا بھی دے۔ اگر مہیش لال اپنے آدمیوں کو میری تلاش میں بھیج دیتا ہے تو پھر میں بھاگ کر کہاں جاؤں گی؟

دن کو بیتے گھنٹوں ہو چکے تھے۔ دھیرے دھیرے رات کھسک رہی تھی۔ میری پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ پریشانی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ موہن کا باپ نارائن بھی نہیں لوٹا تھا۔ موہن بھی گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب تھا۔ وہ دل کی آگ بجھانے نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ اب تو سرسوتی بھی بہت پریشان اور متفکر نظر آ رہی تھی۔ موہن سے زیادہ وہ اپنے پتی کے نہ آنے سے سخت پریشان تھی۔ اس کی تشویش میں لحظہ بہ لحظہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ کیوں کہ علی الصباح وہ جاتے وقت سرسوتی سے کہہ گیا تھا کہ وہ سورج چھپنے سے پہلے گاؤں واپس پہنچ جائے گا۔ اب خاصی رات بیت چکی تھی۔ نارائن کا بھی کہیں پتا نہیں تھا۔ سرسوتی کا خیال تھا کہ کام مکمل نہ ہونے کے سبب وہ وہیں کہیں ٹھہر گیا ہوگا۔ لیکن مجھے یہ تشویش ہو چلی تھی کہ نارائن اگر آج رات نہ آیا تو پھر کل صبح کیوں کر میں اپنی سہیلی کے گاؤں جا سکوں گی۔ میں اب یہاں کسی بھی قیمت پر کل ایک دن کیا ایک گھنٹہ بھی رکنا نہیں چاہتی تھی۔

ان ہی پریشان کن خیالات نے میری نیند اڑا دی تھی۔ سرسوتی نے زبردستی مجھے بستر بچھا کر لٹا دیا تھا۔ لیکن میری آنکھوں میں تو نیند کے بجائے اور تشویش بھری ہوئی تھی۔ سرسوتی میری دل جوئی کے خیال سے مسلسل باتیں کیے جا رہی تھی۔ بے معنی باتیں...... وہ گاؤں کے اور اپنے ماضی کے ایسے قصے سنا رہی تھی جو میری دلچسپی کا باعث نہیں تھے۔ لیکن اس کی یہ فضول سی باتیں بھی میری پریشان خیالی میں کوئی کمی نہ کر سکیں۔ رہ رہ کر پریتم کا خیال میرے دل میں ڈنک بن کر چبھ رہا تھا اور مہیش لال کے خلاف میرے دل میں جو نفرت، حقارت اور غصہ تھا وہ میں ہی جانتی، سمجھتی تھی اور محسوس بھی کر رہی تھی۔ میں یہ سوچ رہی تھی کہ میرے ہاتھ میں ایک ایسا خطرناک خنجر آ جائے جس کا پھل زہر میں بجھا ہوا ہو اور مہیش لال سامنے آ جائے تو میں کیا کروں گی......؟ میں اس خنجر سے اس کے ٹکڑے کر کے اس کا گوشت کتوں اور جانوروں کو کھلا دوں گی۔ وہ تھا بھی اس قابل کہ اس کا گوشت جانوروں کو کھلایا جائے۔

میں اس وقت تک پریتم سے ملنا نہیں چاہتی تھی جب تک مہیش لال سے حساب بے باق نہ کر لوں۔ میں نہیں جانتی تھی کہ میری پراسرار گمشدگی سے پریتم نے میرے بارے میں کیا رائے قائم کی ہوگی۔ وہ سمجھ گیا ہوگا کہ یہ کسی بدمعاش کی حرکت ہے۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ یہ حرکت مہیش لال نے کی ہوگی۔ میں نے اسے نہیں بتایا تھا کہ میرے لئے مہیش لال کا رشتہ آیا تھا میں نے اور پتا

جی نے ٹھکرا دیا تھا۔ پتا جی بھی سمجھ گئے ہوں گے کہ میرے اغوا ہونے میں مہیش لال کا ہاتھ ہے۔ مگر وہ اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

کمرے میں چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ لیکن میرے دل میں تو اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ اے میرے ایشور! میں کیا کروں...... میرے پر لگ جائیں اور میں اڑ کر اپنی سہیلی کے گھر پہنچ جاؤں۔ میں ابھی اپنے اور پریتم کے گھر اس لئے بھی نہیں جا سکتی تھی کہ مہیش لال کے کتے میری تلاش میں ہوں گے۔ میرے اور پریتم کے گھر کی نگرانی بھی کی جا رہی ہوگی۔ وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

سرسوتی اور میں ایک ہی کمرے میں سو رہی تھیں۔ سرسوتی نے اس لئے بھی میرے کمرے میں اپنا بستر لگا لیا تھا کہ میں ایک جوان لڑکی ہوں۔ گھر میں اس کا جوان بیٹا بھی رہتا ہے۔ میں اپنے بے چین خیالات میں گھری سرسوتی کی بے معنی پرخلوص باتوں پر سر ہلا رہی تھی کہ اچانک کسی نے صحن کا دروازہ زور زور سے بھڑ بھڑانا شروع کر دیا۔ جلدی سے سرسوتی اٹھی اور لپکتی ہوئی صحن میں چلی گئی۔ چند لمحوں بعد ہی اس نے دروازہ کھول دیا۔ میں تو یہ سمجھی کہ اس کا پتی نارائن آیا ہوگا۔ اس خیال سے اس نے زور سے دروازہ بھڑ بھڑایا ہوگا کہ سو رہے ہوں گے۔ میرا خیال غلط نکلا وہ نارائن نہیں تھا بلکہ موہن تھا اور سرسوتی اور موہن آپس میں زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔

ہوں تو موہن واپس آ گیا۔ لیکن مجھے موہن کے آنے سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ میں تو اس کے باپ کا بڑے کرب سے انتظار کر رہی تھی۔ ''پریا بیٹی! ذرا جلدی سے باہر آنا......؟'' سرسوتی نے آواز بلند کہا۔ اس کے لہجے سے گھبراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔

میں نے دل ہی دل میں ایشور سے التجا کی کہ کوئی مصیبت نہ نازل ہوئی ہو۔ پھر میں جلدی سے چارپائی سے اتر کر صحن میں پہنچی۔ دروازے کے پاس ہی سرسوتی اور موہن کھڑے تھے۔ سرسوتی کے چہرے کا رنگ فق تھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا کہیں اس کا پتی کسی حادثے کا شکار تو نہیں ہو گیا؟ موہن بھی بہت پریشان دکھائی دیا۔ وہ ہراساں سا لگ رہا تھا۔ اچانک فضا میں مجھے غیر معمولی روشنی کا احساس ہوا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے باہر گلیوں میں بہت سی مشعلیں روشن ہوں۔ اس سے قبل کہ میں اس کے بارے میں سرسوتی سے کچھ معلوم کرتی باہر ملی جلی آوازوں کا شور سنائی دیا۔ بھانت بھانت کی آوازیں سنائی دیں۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے بہت سارے گھوڑے گلیوں میں دوڑ رہے ہوں۔ ان آوازوں کو سن کر سرسوتی کے انداز میں اور گھبراہٹ بڑھ گئی۔ اس کا چہرہ سفید پڑتا چلا گیا۔

مجھے ڈاکوؤں کا خیال آیا۔ ڈاکو رات کو گاؤں اور بستیوں پر شب خون مارتے تھے تاکہ لوٹ مار کریں۔ وہ نہ صرف اجناس لے جاتے تھے بلکہ زیور اور کپڑے بھی اور پھر ان لڑکیوں اور شادی شدہ عورتوں کو بھی جو بہت حسین، جوان اور پرکشش ہوتی تھیں۔ اس خیال نے مجھے خوف و ہراس میں مبتلا کر دیا۔ پھر میں نے یہ سوچ کر بھی خود کو دلاسا دیا کہ شاید کوئی اور بات ہے۔ شاید کسی کی کسی سے ذاتی دشمنی ہو۔ وہ اس کا بدلہ لینے اور قتل و غارت گری کرنے آئے ہوں۔ گاؤں کے لوگوں میں زن، زر اور زمین کے

معاملے میں خون خرابے ہوتے تھے۔

''کیا بات ہے چاچی! آپ اس قدر پریشان کیوں ہو رہی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔ ''یہ کیسی آوازیں آ رہی ہیں؟'' میری چھٹی حس مجھے آگاہ کر رہی تھی کہ کوئی ایسا خطرہ گاؤں والوں کے سر پر آن پہنچا ہے جس سے سب خوف زدہ اور پریشان ہو گئے ہیں۔

''بیٹی پریا!'' سرسوتی نے سرگوشی کے انداز میں میرے قریب آ کر کہا۔ ''ڈاکوؤں نے گاؤں پر حملہ کر دیا ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ یہاں پر ایک لڑکی روپوش ہے۔ اگر اس کا نام پریا ہے تو ہمارے حوالے کر دی جائے۔ ورنہ ہم خود تلاشی لے کر اسے لے جائیں گے۔''

سرسوتی کی بات سن کر مجھے تھرتھری چھوٹ گئی۔ میں سمجھ گئی کہ مہیش لال نے میری تلاش کا کام ان ڈاکوؤں کو بھاری رقم دے کر سونپا ہے۔ ڈاکوؤں کا کوئی دھرم ایمان تو ہوتا ہے نہیں۔ ان کی زندگی کا مقصد لوٹ مار اور عورتوں کو اٹھا کر لے جانا ہوتا ہے۔ دولت کا اس قدر لالچ ہوتا ہے کہ وہ اس کے عوض اپنی بہنوں، بیٹیوں اور ماؤں کو بھی بیچ دیں۔ مہیش لال بھی ایک مہذب ڈاکو تھا۔ یہ بھیڑیے میری تلاش میں یہاں آن پہنچے تھے۔ اوہ ایشور!...... کیا میں ان درندوں کی دسترس سے پاتال میں بھی بچ سکوں گی؟ کہیں میں دوبارہ اس موذی مہیش لال کے چنگل میں پھنس گئی تو وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟ اس کا تصور ہی اس قدر لرزہ خیز تھا کہ میں غش کھانے والی تھی۔ میں نے بہ دقت تمام اپنے آپ کو سنبھالا اور حواس کو قابو میں رکھا۔

''چاچی!'' میں نے بے اختیار ان کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''آپ کو بھگوان کا واسطہ...... مجھے کسی طرح ان ڈاکوؤں سے بچائیں...... آپ مجھ پر دیا کریں۔ معلوم نہیں انہیں کس نے خبر کر دی یا کس طرح پتا چل گیا کہ میں یہاں چھپی ہوئی ہوں۔''

میں مزید کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن میری آواز حلق میں پھنس گئی اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ میرے اس طرح سے ہاتھ جوڑنے پر سرسوتی تڑپ اٹھی۔ اس نے تیزی سے بڑھ کر مجھے سینے سے لگا لیا اور میرے آنسوؤں کو اپنی ساڑھی کے پلو میں جذب کرنے لگی۔

''پریا بیٹی! یہ تم کیا کہہ رہی ہو......؟ میں تمہیں بیٹی کہہ چکی ہوں۔'' سرسوتی درد بھری آواز میں کہنے لگی۔ ''بیٹی کی زندگی اور اس کی عزت کی حفاظت ماں پر فرض ہوتی ہے اور پھر تم ہماری محسن بھی ہو۔ تم نے جو احسان کیا ہے اسے تو میں آخری سانس تک بھلا نہیں سکتی......؟'' سرسوتی جس وقت یہ بات کہہ رہی تھی موہن لفظ احسان پر بری طرح چونکا تھا کہ میں نے کیا احسان کیا۔ احسان تو وہ کر رہے تھے۔ سرسوتی نے اسے بتایا نہیں تھا کہ اس کا بہنوئی مالی مدد لینے کے لئے آیا تھا اور میں نے پچیس ہزار کی رقم دی اور اسے دس ہزار روپے الگ دیئے۔ میں نے سرسوتی کو سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ یہ بات اپنے پتی اور بیٹے کو نہ بتائے۔ چوں کہ یہ موقع نہیں تھا اس لئے موہن نے نہیں پوچھا کہ میں نے ایسی کون سی دیا کی جو میں اس گھر کی محسن بن گئی۔

''بیٹی!'' سرسوتی لمحاتی توقف کے بعد بولی۔ ''یہ ڈاکو جو تمہاری تلاش میں آئے ہیں وہ بہت خوف ناک، سفاک اور وحشی درندے ہیں۔ ان کے نام سے نہ صرف پولیس بلکہ ارد گرد کے لوگ بلکہ شیطان بھی

کانپتا ہوگا۔ کیوں کہ خاص طور پر ان کا سردار درندوں سے بھی کہیں بے رحم، بلکہ شیطان ہے پورا شیطان۔ اس نے تو اپنے باپ پر رحم نہیں کھایا اور بہن کو آشنائی کے شک پر کلہاڑی سے قتل کر دیا۔ اس کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کتوں کو کھلا دیا...... پولیس ان پر اس لئے ہاتھ نہیں ڈال سکتی کہ بہت سے وزیر اور بڑے بڑے نیتا اس کی پشت پر ہیں اور اس کی سرپرستی کے علاوہ اسے شباب اور شراب سے بھی نوازتے ہیں۔''

سرسوتی نے جو انکشاف کیا تھا مجھے اس پر ذرا بھی تعجب یا حیرانی نہیں ہوئی۔ اگر یہ بڑے لوگ جن کا کردار بڑا گھناؤنا ہے چہرے مکروہ ہیں اور اثر و رسوخ ہے وہ ان ڈاکوؤں کی سرپرستی نہ کریں تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ دیہاتوں اور ریاستوں میں ڈاکو دہشت گردی پھیلا کر شریفوں کی جان و مال اور عزت لوٹ سکیں اور ان پر کوئی آنچ آئے۔

بہر حال یہ وقت معاشرے کی اس لعنت کے اسباب پر غور و فکر کرنے اور اس پر بحث کرنے کا نہیں تھا۔ میرے فرار پر مہیش لال نے مشتعل ہو کر ان ڈاکوؤں کو میرا کھوج لگانے کو کہا۔ پھر ان ڈاکوؤں نے کھوج لگایا ہوگا کہ میں کہاں ہوں۔ اور جب انہیں یہ اطلاع ملی ہوگی کہ کل رات ایک لڑکی بے ہوشی کی حالت میں یہاں لائی گئی ہے تو وہ فوراً سمجھ گئے ہوں کہ وہ لڑکی کون ہو سکتی ہے۔ اس لئے انہوں نے مجھے برآمد کرنے کے لئے گاؤں پر دھاوا بول کر ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔

سرسوتی تذبذب کے عالم میں ساکت و جامد کھڑی پتھر کی مورت لگ رہی تھی۔ اس کے سینے میں سانسوں کا تلاطم ہچکولے کھا رہا تھا۔ اور چہرے پر سوچ کی گہری لکیریں ابھر آئی تھیں۔ جس سے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ تیزی سے کسی فیصلے پر پہنچنے کے لئے سوچ رہی ہے۔ چند لمحات اس سوچ و بچار میں گزر گئے۔ باہر جو شور ہو رہا تھا وہ لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جا رہا تھا۔ سرسوتی کا گھر گاؤں کے آخری کونے پر تھا۔ اس کے گھر سے دس قدم کے فاصلے پر ہرے بھرے کھیتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ شکر اس بات کا تھا کہ گاؤں والوں کو میرا صحیح نام معلوم نہیں تھا۔ ایک اور اتفاق ہوا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ کسی قریبی گاؤں کی ایک سولہ برس کی عمر کی حسین لڑکی کھیتوں میں دو بدمعاشوں کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔ وہ کسی نہ کسی طرح ان بدمعاشوں کے ہاتھوں سے اپنی عزت بچا کر بھاگ نکلی۔ خوف اور بدحواسی کی حالت میں اپنے گاؤں جانے کے بجائے اس گاؤں کی طرف آ نکلی۔ ٹھوکر کھا کر گر پڑی تو بے ہوش ہو گئی۔ کھیت میں اسے بے ہوشی کی حالت میں ان عورتوں نے دیکھ لیا جو اپنے آدمیوں کے لئے کھانا لے جا رہی تھیں۔ وہ اسے اٹھا کر گھر لے آئیں۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ ہوش میں آئی تو دہشت اور صدمے سے برا حال تھا کیوں کہ ان وحشی مردوں نے اس کے مزاحمت کرنے پر خوب مارا تھا۔ اس نے ان دونوں بدمعاشوں کے سروں پر پتھر مار کر بے ہوش اور زخمی کر دیا تھا۔ وہ اکیلی یا کسی کے ساتھ اپنے گھر جانے کے لئے تیار نہ تھی۔ چوں کہ رات ہو گئی تھی اس لئے فیصلہ کیا گیا تھا کہ صبح اس کے گاؤں جا کر اس کے گھر والوں کو اطلاع دی جائے گی۔ گاؤں والوں کا خیال اس لڑکی کی طرف چلا گیا تھا۔ اس لئے اب تک ڈاکو ادھر آئے اور نہ ہی گاؤں والوں نے شاید میری بابت بتایا ہوگا۔ چوں کہ ان ڈاکوؤں نے میری شکل نہیں دیکھ رکھی تھی۔ گاؤں والے

خود حیران و پریشان ہو رہے تھے کہ...... یا ہو رہے ہوں کہ ڈاکو کس لڑکی کی بات کر رہے ہیں۔ لیکن یہ کوئی مسئلہ یا مشکل نہ تھی۔ کسی کو بھی اس بات کا خیال آ سکتا تھا ہے کہ کل رات نارائن کے گھر جو لڑکی لائی گئی تھی وہ بھی بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ اس بات کا علم ہوتے ہی ڈاکو اس مکان کو بھی گھیر لیتے اور بہ زور بندوق گھر میں گھس کر مجھے گھسیٹتے ہوئے باہر لے جاتے۔ موہن اور سرسوتی مزاحمت کرتے تو پھر وہ بلا تامل ان دونوں کو بھون کر ان کا قصہ ہی ختم کر دیتے۔ چند لمحوں کی سوچ نے تجربہ کار اور دور اندیش اور نڈر سرسوتی کو کسی فیصلے پر پہنچا دیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

"بٹی پریا!...... اس وقت میری عقل میں اس کے علاوہ کچھ نہیں آ رہا ہے کہ...... تم موہن کو ساتھ لے کر فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔ کھیتوں سے ہوتے ہوئے اس گاؤں میں پہنچنے کی کوشش کروں جہاں تمہاری عزیز ترین ہم جولی کا گھر ہے۔ اس کے سوا کوئی اور صورت نظر نہیں آتی۔ موہن کا باپ ہوتا تو شاید وہ کوئی اور حل نکالتا۔ اچھا...... اب تم بولو...... کیا میری بات سمجھ میں آ رہی ہے؟"

سرسوتی نے عجلت میں جو یہ سوچا اور فیصلہ کیا وہ خاصا معقول تھا۔ ان حالات میں اس سے بہتر فیصلہ ممکن بھی نہ تھا۔ اس صورت میں ایک مرتبہ پھر مجھے صعوبتیں اٹھانا پڑتیں۔ لیکن اب میرے سامنے دو ہی راستے تھے یا تو خود کو ان ڈاکوؤں کے حوالے کر دوں یا پھر موہن کے ساتھ چھپ چھپا کر سہیلی کے گھر پہنچنے کی کوشش کروں۔ لمحوں میں ہی میرے ذہن نے یہ فیصلہ کر لیا کہ مجھے موہن کے ساتھ نکل جانا چاہئے۔ ان ڈاکوؤں کے حوالے ہونے سے یہ بہتر ہے کہ کسی کنوئیں میں کود کر جان دے دو۔ اور میں نے اپنے فیصلے کا سرسوتی چاچی پر اظہار کر دیا۔

"ٹھیک ہے چاچی!" میں نے اثباتی انداز میں سر ہلا کر جواب دیا۔ "میں آپ کے بیٹے کے ساتھ جانے کو تیار ہوں۔"

میرا جواب سنتے میں سرسوتی لپک کر کمرے میں گئی اور دوسرے لمحے بجلی کی سی سرعت سے واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک چادر تھی جو اس نے مجھے اوڑھا دی۔ پھر اس نے ایک لمحہ رکنے کا اشارہ کیا اور باورچی خانہ میں جا گھسی اور فوراً ہی دستر خوان میں لپٹی ہوئی تمام روٹیوں پر پکی ہوئی سبزی انڈیلی اور اس نے یہ دستر خوان موہن کی طرف بڑھاتے ہوئے تنبیہ کے انداز میں کہا۔

"دیکھ موہن!...... میں نے پریا کو اپنی بیٹی کہا ہے۔ تو اس رشتے کی لاج رکھنا اور اس کی حفاظت میں جان کی بازی لگا دینے سے پیچھے نہ ہٹنا۔" یہ الفاظ کہتے وقت سرسوتی کی آواز گلے میں رندھ گئی۔ پھر اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ اس کی یہ بے نظیر محبت دیکھ کر میرا دل بھی بھر آیا...... اور میں...... اچھی چاچی...... کہہ کر اس سے لپٹ گئی۔ اور اس نے میرے آنسو پونچھے۔ ہلکے سے پیٹھ تھپکی اور مجھے سینے سے جدا کرتی ہوئی بولی۔

"اچھا بیٹی پریا...... جاؤ بھگوان تمہاری رکھشا کرے۔ کبھی میری یاد آئے اور موقع ملے تو تم آ کر مجھ سے مل لینا۔"

موہن نے بڑھ کر دروازہ کھولا اور گھر سے نکل گیا۔ میں نے اس گھر کے در و دیوار پر الوداعی نظریں ڈالیں جس نے برے وقت میں مجھے پناہ دی۔ میری حفاظت کی۔ میرا ساتھ دیا۔ پھر اس عظیم عورت کی طرف دیکھا جس کی محبت اور عظمت کا نقش آج اب بھی میرے دل پر ثبت ہے۔ میں نے لرزتی آواز میں اس سے کچھ کہنا چاہا۔ کہہ نہ سکی۔ کھلے دروازے سے باہر نکل گئی جہاں موہن بے چینی سے میرا منتظر تھا۔

شور و غل کی آوازیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ گاہے گاہے کوئی چیخ کی آواز بھی ابھر آتی جو رات کے سناٹے میں بھیانک لگ رہی تھی۔ شاید ڈاکوؤں نے گاؤں والوں پر میرا اپنا معلوم کرنے کے لئے تشدد کا آغاز کر دیا تھا۔ ابھی ڈاکو اس گلی تک نہ پہنچے تھے جہاں سرسوتی کا گھر تھا۔ وہ جو دوسری لڑکی تھی وہ ان کی مطلوبہ نہیں تھی اس لئے وہ مجھے تلاش کر رہے تھے۔ مہیش لال نے انہیں میرا حلیہ بتایا ہوگا۔ میری شناخت یہ تھی کہ میری ٹھوڑی پر ایک تل ہے جس نے میری خوب صورتی میں بے پناہ اضافہ کر دیا ہے۔ میں نے لمحے کے لئے سوچا کہ جب کسی کے بتانے پر ڈاکو سرسوتی کے ہاں مجھے بازیاب کرنے کے لئے پہنچیں گے تو سرسوتی انہیں میری غیر موجودگی کے بارے میں کیا بتائے گی......؟ کیا عذر پیش کرے گی......؟ وہ ایک ہوشیار اور ذہین عورت ہے۔ وہ یہ کہہ کر انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کرے گی کہ میں دن میں کسی وقت یہاں سے چلی گئی ہوں۔ اپنے گاؤں اپنے پریتم کے ہاں گئی ہوں۔

چند قدموں کے فاصلے پر کھیتوں کا وہ لامتناہی سلسلہ تھا جو اس وقت ہمارا سب سے بڑھ کر ہمدرد اور معاون تھا۔ ویسے تو کھیت ازل سے ہی انسان کے ہمدرد اور معاون رہے ہیں۔ لیکن اس وقت خاص طور پر یہ کھیت ہمارا استقبال کر رہے تھے۔ جیسے کہہ رہے تھے کہ آؤ...... آؤ...... ہم تمہیں پناہ دیں گے۔ تمہاری حفاظت کریں گے۔ ہم تیزی کے ساتھ اندھیرے میں ڈوبے ہوئے کھیتوں میں داخل ہو گئے۔

مگر یہ کھیت میرے لئے تو ذرا اجنبی تھے لیکن موہن تو ان کھیتوں کی رگ رگ سے واقف تھا۔ اسے بخوبی علم تھا کہ کون سا کھیت بڑے زمین دار کا ہے اور کون سا چھوٹے چھوٹے زمین داروں کا...... کہاں کہاں پانی کی نکاسی کی نالیاں ہیں۔ کس جگہ میٹھے پانی کے کنوئیں ہیں...... کس کنوئیں کا پانی کھارا ہے...... بیل اس وقت کہاں بندھے ہوں گے...... اور ان کھیتوں میں کہاں سے اچانک راستہ پھوٹتا ہے اور کس گاؤں میں جاتا ہے۔ وہ ان سب سے واقف تھا بالکل اس طرح جیسے وہ اپنے ہاتھوں کی لکیروں سے واقف تھا۔ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ پانی کی نالیوں پر بنی ہوئی منڈیروں پر احتیاط سے قدم رکھتا ہوا آگے کی سمت بڑھ رہا تھا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے بڑی احتیاط سے چل رہی تھی اور ادھر ادھر دیکھتی بھی جا رہی تھی۔

اب ہم تیزی سے چلتے ہوئے اتنی دور آ گئے تھے کہ شور و غل کی آوازیں اب بالکل سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ میری آنکھیں جلد ہی اندھیرے سے مانوس ہو گئی تھیں اور میں اب اندھیرے میں ڈوبے ہوئے کھیتوں میں دور دور تک دیکھ سکتی تھی۔ موہن ایک کسان کا بیٹا تھا۔ وہ بھی کسان ہی تھا۔ اس کی ہڈیاں چوڑی اور ٹانگیں مضبوط بھی تھیں۔ چناں چہ وہ بڑے سکون کے ساتھ ان اونچے نیچے راستوں پر تیزی کے ساتھ چل رہا تھا۔ یوں تو میں بھی ایک گاؤں کی لڑکی تھی پھر بھی اس کی رفتار کا ساتھ دینا میرے لئے بھلا

کہاں ممکن تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ موہن مجھ سے کافی آگے نکل گیا اور میں اس سے خاصی پیچھے رہ گئی۔ ایسے موقعوں پر موہن رک کر میرا انتظار کرتا اور جب میں اس کے قریب پہنچ جاتی تو وہ پھر آگے چل دیتا اور میری خاطر اپنی رفتار سست کر دیتا۔

گھنٹوں ایک مضبوط مرد اور ایک نازک لڑکی گہرے اندھیروں میں ڈوبے ہوئے کھیتوں میں سفر کرتے رہے۔ ابھی منزل دور تھی۔ چاند کی ابتدائی تاریخیں تھیں اس لئے ان کی روشنی نہ ہونے کے برابر تھی۔ آسمان پر ستارے بےشمار ہے تھے۔ پتوں کی معمولی سی سرسراہٹ پر بھی پلٹ کر دیکھتی رہی۔ ہر آن دل کو یہ دھڑکا سا لگا ہوا تھا کہ کہیں وہ سنگ دل ڈاکو نہ آ پہنچیں۔ لیکن انہیں نہ پا کر اور گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں نہ سن کر میری جان میں جان تو آ جاتی۔ لیکن پھر بھی اطمینان نصیب نہ تھا۔

جانے کیوں مجھے موہن سے ایک ان جان سا خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ کسی کسی لمحے جب میرے دل میں ایک نامعلوم سا خوف دامن گیر ہوتا تو ایسا لگتا کہ میرے ساتھ آدمی نہیں ناگ چل رہا ہے کیوں کہ ہم دونوں گھنٹوں سے ایک دوسرے کے ہم سفر تھے۔ اور پھر یہ بڑی عجیب سی بات تھی کہ اب تک ہم دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ یہ خاموشی سنگین اور کسی طوفان کا پیش خیمہ تھی۔ اگر وہ مجھ سے باتیں کرتا ہوا چلتا تو میرے دل میں ان جانے خوف وخدشات جنم نہیں لیتے۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی نیت میں فتور آ رہا ہے۔ وہ مجھے فتح کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ اگر وہ یہ بات سوچ رہا ہے تو یہ اس کی بےوقوفی ہوگی۔ گو میں ویرانے سے گزر رہی تھی۔ دور دور تک میری مدد کے لئے چیخ وپکار سننے والا کوئی نہ تھا۔ لیکن میں اپنی عزت بچانے کے لئے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کر چکی تھی۔ میں نے ایک کرکٹ بال کے سائز کا پتھر اٹھا کر اس ہاتھ کے پلو میں چھپا لیا تھا جس میں پتھر تھا۔

میرے دل کے کسی کونے میں یہ خیال آیا کہ موہن نے کسی برے ارادے سے پیش قدمی کی۔ میں نے اس کے سر کا نشانہ لے کر پتھر دے مارا۔ نشانہ چوک جاتا ہے اگر......؟ تو پھر وہ مجھے قابو میں کر کے بے بس کر سکتا ہے؟ میں نے دوسرے لمحے خیالوں کے سپنوں کو مار دیا۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اس تنہائی، ویرانے اور سناٹے سے کب کا فائدہ اٹھا چکا ہوتا۔ میں بہر حال ایک نازک بدن لڑکی تھی اس کڑیل جوان سے مقابلہ نہیں کر پاتی اور مجھے اس ملاح کی طرح اپنی کشتی موجوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دینا پڑتی جو طوفان کے آگے بےبس ہو جاتا ہے۔

بظاہر اب ڈاکوؤں کا خطرہ ٹل چکا تھا۔ کیوں کہ اگر انہیں اب اس بات کا پتا چل جاتا کہ میں کس راستے سے فرار ہوئی ہوں تو یقیناً وہ میرا تعاقب کرتے جب کہ وہ گھوڑوں پر سوار تھے اور ہم پیدل تھے اور ان کے پاس روشنی کا بھی ایک معقول انتظام تھا۔ اس لئے اس صورت میں یہ ناممکن تھا کہ وہ ہمیں پا لیتے۔ لیکن ہری پور کی سمت سے اب کسی قسم کی نقل وحرکت کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس لئے میری سوچ بجا تھی کہ ہم خطرے کی حدود سے نکل آئے ہیں۔ کافی دیر تک تو میں ڈاکوؤں کے خوف کے سبب تیز تیز چلتی رہی تھی۔ لیکن اب جوں ہی یہ احساس ہوا کہ ڈاکوؤں کا خطرہ سر دست ٹل چکا ہے مجھے شدید تھکن کا احساس

ستانے لگا۔ سرسوتی ڈاکوؤں کو بتا نہیں سکتی تھی کہ میں کس سمت اور کس گاؤں کو گئی ہوں۔ تو اس نے میرے گاؤں کا بتا کر جان چھڑوالی ہوگی۔ حقیقت یہ تھی کہ اسے خود نہیں پتا تھا اور نہ ہی موہن نے چلتے وقت بتایا تھا کہ وہ مجھے کس راستے سے لے جائے گا۔ ڈاکو سرسوتی کی بات کا یقین کر کے میرے گاؤں چلے گئے شاید۔

ان دونوں میں میں، مہیش لال کے چنگل سے نکل کر اور آج جو چلی تھی کہ ڈاکوؤں کی گرفت میں نہ آ سکوں اس قدر میں اپنی زندگی میں کبھی نہیں چلی تھی۔ جان سے زیادہ مجھے اپنی عزت بچانے کا خیال تھا۔ میری محبت، میرا جسم اور میری آتما پریتم کی ملکیت تھی۔ میں کیسے اپنی عزت ان درندوں کو سونپ کر اسے پامال ہونے دیتی۔ میں کافی دیر سے سوچ رہی تھی کہ موہن سے کہوں کہ کسی محفوظ جگہ ٹھہر کر کچھ دیر ستانا چاہئے تا کہ بقایا سفر کے لئے ہم ایک دفعہ پھر تازہ دم ہو سکیں۔ لیکن میری جانب سے موہن کی مکمل سرد مہری کے باعث میری انا یہ گوارہ نہیں کر رہی تھی کہ میں از خود اس سے بات کروں۔ یہ تو خود موہن کو احساس کرنا چاہئے تھا کہ اس کے ساتھ کوئی کڑیل مرد سفر نہیں کر رہا ہے بلکہ ایک خوب صورت اور نازک بدن سی لڑکی سفر کر رہی ہے۔ میرا حوصلہ بڑھانے کے لئے تسلی کے چند میٹھے بول بولنے تو چاہئیں۔ لیکن وہ گنوار کسان تو مٹی کا تودہ بنا تیر کی طرح ناک کی سیدھ میں جا رہا تھا۔ اسے کسی بات کی تمیز تھی اور نہ ہی ہوش تھا۔

جس وقت سرسوتی نے یہ تجویز پیش کی کہ ڈاکوؤں کی دست برد سے بچنے کے لئے مجھے موہن کے ساتھ نکل جانا چاہئے تو میرے خوف زدہ ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ موہن کل سے میرا پرشباب بدن دیکھ کر ویسے ہی بےچین ہوا جا رہا تھا اور شاید اس کوشش میں بھی تھا کہ اسے کوئی موقع ملے تو فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے۔ شاید سرسوتی نے بھی اپنے بیٹے کی آنکھوں میں میلا پن دیکھ لیا تھا یا محسوس کر لیا تھا اس لئے رات وہ میرے ساتھ سوئی تھی اور اس نے رات کے کسی حصے میں مجھے اکیلا نہیں چھوڑا تھا۔ رات کے اندھیرے اور میری قربت سے تو نہ جانے اس کی کیا حالت ہو جائے۔ اس لئے میں بہت محتاط اور اس ہرن کی طرح چوکنا تھی جو شکاری کو دیکھ کر ہو جاتی ہے۔ کہیں وہ کسی وحشی درندے کی طرح مجھ پر ٹوٹ نہ پڑے جو کئی دنوں کا بھوکا ہو۔ لیکن موہن کے رویے نے میرے تمام خدشات کو ریت کے تودے کی طرح ڈھا دیا تھا۔ میں جان چکی تھی کہ یہ ایسا شخص نہیں ہے جیسا میں نے اس کے بارے میں سوچا اور اندازہ لگایا تھا۔

مگر اب مجھے اس بات پر غصہ آ رہا تھا کہ وہ میری طرف سے اس قدر بےپرواہی کا مظاہرہ کیوں کر رہا ہے۔ مجھے جیسے تو بہ شکن حسن اور جسم کی کشش اور دل کشی دیکھ کر تو زاہدوں کی آنکھیں بھی چکا چوند ہو جائیں اور ان کے توبہ کے عزم بھی ٹوٹ جائیں لیکن یہ اجڈ اور گنوار دیہاتی جو کل شام تک مجھے دیکھ کر قابو سے نکلا جا رہا تھا اس وقت یوں پرسکون ہے جیسے اس کے ساتھ کوئی خوب صورت لڑکی نہیں بلکہ سو برس کی کوئی بڑھیا ہو۔ اور اسے میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں ہے۔

میں عورت تھی۔ عورت بہت ساری باتیں برداشت کرتی ہے۔ موہن کی یہ بےرخی میرے غرور حسن پر نہ صرف ایک بھرپور چوٹ تھی بلکہ توہین بھی تھی۔ وہ کوئی آسمان سے اترا ہوا راج کمار نہیں جسے ایشور نے اپنے ہاتھوں سے بنا کر سنسار میں بھیجا ہو۔ میں دل ہی دل میں تلملا رہی تھی۔ بری طرح جھن

جھلا رہی تھی۔ نس نس میں لہو ابل رہا تھا۔ کیوں کہ ایک تو وہ کچھ ضرورت سے زیادہ ہی۔ بے نیاز نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دوسرے میری ٹانگیں جواب دیئے جارہی تھیں۔ اور مجھے یہ محسوس ہورہا تھا کہ اب کسی بھی لمحے میں تھک کر گر پڑوں گی۔ کیوں کہ میری ٹانگیں میرا وزن سہار نہیں پارہی تھی۔ لیکن میں نے بھی دل میں طے کرلیا تھا کہ کسی صورت میں بھی اس بے نیاز اور مغرور شخص سے ٹھہرنے کی درخواست نہیں کروں گی چاہے مجھے گھسٹ گھسٹ کر ہی کیوں نہ چلنا پڑے۔

جس وقت ہم کھیتوں کے اس طویل سلسلے میں داخل ہوئے تھے کافی رات بیت چکی تھی اور اب ابتدائی تاریخوں کا اداس چاند بھی ڈوب چکا تھا۔ چاند کا ہم سفر تارا بھی اب ماند پڑتا جارہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ پو پھٹنے والی ہے۔ سحر کی آمد آمد ہے۔ چپ چاپ ایستادہ درختوں پر سوئے ہوئے معصوم پرندے بھی آنکھیں مسل مسل کر بیدار ہورہے تھے اور اپنی اپنی بولیوں میں بنانے والے کی شاید عبادت کررہے تھے۔ مشرقی افق پر چھائے ہوئے بادلوں کے آوارہ ٹکڑے آہستہ آہستہ اپنی جگہ بدل رہے تھے۔ اگر چہ اندھیرا ابھی تک پھیلا ہوا تھا لیکن اس کی سیاہی اب ہلکی پڑتی جارہی تھی۔ لیکن موہن اسی سکون اور مستقل مزاجی کے ساتھ چل رہا تھا مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ کہیں وہ نیند کی حالت میں تو نہیں چل رہا ہے۔

میری آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی اور ستارے گھومنے لگے تھے۔ اچانک موہن چلتے چلتے اس طرح ٹھٹک کے رک گیا جیسے اس نے خطرے کی بو سونگھ لی ہو یا پھر اسے کوئی موذی جانور نظر آ گیا ہو۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ کوئی چیز تلاش کررہا ہے۔ اس میں چند لمحے بیت گئے جس سے میری بوجھل ٹانگوں کو معمولی سا سکون مل گیا۔

پھر جیسے موہن کو اپنی تلاش کا حاصل مل گیا تھا۔ پھر اس نے دائیں سمت چلنا شروع کیا۔ وہ عام راستہ چھوڑ کر سیدھے ہاتھ پر کھیتوں کے اندر چلنے لگا۔ کھیت میں ہل نہیں چلایا گیا تھا۔ موہن اسی خاموشی کے ساتھ ایک سمت کو بڑھتا رہا۔ میں بھی بادل نخواستہ اس کے پیچھے پیچھے ایک طرح سے رینگ سی رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ سیدھا راستہ چھوڑ کر آخر موہن ادھر کیا لینے جارہا ہے۔ یہ بات اس وقت میری سمجھ میں آئی جب میں نے اس کچی مٹی سے بنی ہوئی کوٹھری کو دیکھا جو ایک بڑے اور گھنے درخت کے زیر سایہ بنی ہوئی تھی...... اس قسم کی کوٹھریاں کھیتوں میں جابجا بنی دکھائی دیتی ہیں۔ کیوں کہ فصل کی بوائی اور کٹائی کے زمانے میں کسان اپنی کچی کوٹھریوں میں رہ کر نگرانی کا کام کرتے ہیں۔ پھر فصل کی کٹائی کے بعد فاضل غلہ بھی اکثر ان کوٹھریوں میں بھر دیتے ہیں۔ میں سمجھ گئی کہ موہن اس کوٹھری میں پناہ لینا اور آرام کرنا چاہتا ہے۔

لکڑی کے تختوں کو جوڑ کر یوں ہی رسم پوری کرنے کے لئے ایک دروازہ کوٹھری کا بنا دیا گیا تھا۔

موہن نے بے دھڑک ہو کر دروازے پر زور سے ہاتھ مارا۔ چوں چرا...... چوں چرا...... کی آوازیں نکالتا ہوا دروازہ کھل گیا۔ پھر اس نے اندر گھس کر جیب سے دیا سلائی نکال کر جلائی۔ میں ابھی تک باہر کھڑی تھی۔ میں نے اس کی تقلید اس لئے نہیں کی کہ روشنی تو ہو جائے۔

تھکن کے باوجود میرا غصہ نہیں اترا تھا۔ کسی حسین عورت کے لئے اس سے زیادہ اور غصہ کی بات

کیا ہوسکتی ہے کہ گھنٹوں تنہائی اور اندھیرے میں یک جا رہنے کے بعد مرد اسے بالکل بھی گھاس نہ ڈالے۔ میں تو یہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ مجھ پر نظر التفات ڈالے لیکن یہ تو چاہتی تھی کہ میری عزت تو کرے۔ مجھے کچھ اہمیت دے۔ کچھ تو سمجھے۔ میں اس کی نوکرانی یا کوئی حقیر شے نہیں ہوں۔

موہن نے جب دیکھا کہ میں کوٹھری میں نہیں آئی ہوں تو اس نے باہر آ کر اس پورے سفر کے دوران پہلی مرتبہ مجھے مخاطب کیا۔ ”پریا صاحبہ! اندر آجایئے نا......؟ یہ آپ باہر کیوں رک گئی ہیں......؟“

”خوب...... تو تمہیں بولنا بھی آتا ہے میرے شیر!...... میں تو سمجھی تھی کہ تم نے اپنی زبان ہی کھو دی ہے۔“

میں نے دل ہی دل میں کہا اور ایک ادائے بے نیازی سے چلتی ہوئی اس اجنبی کوٹھری میں داخل ہوگئی۔ جیسے گویا میں موہن کے کہنے پر آرام کرنا چاہتی ہوں جب کہ میری جو حالت ہورہی تھی میں خود ہی بہتر جانتی ہوں۔ موہن کے ہاتھ میں جلتی ہوئی دیا سلائی کی مدھم روشنی میں میں نے اس مختصری کوٹھری کا جائزہ لیا۔

کوٹھری میں کسی قسم کا سامان موجود نہ تھا۔ ہاں ایک کونے میں تھوڑا سا گنا اور ڈھیر سارے گنے کے پتے پڑے ہوئے تھے۔ دروازے کے ساتھ والی دیوار میں ایک طاق بنا ہوا تھا لیکن اس میں رکھا ہوا چراغ زمین پر اوندھا پڑا تھا۔ موہن نے بڑھ کر چراغ اٹھالیا اور اسے ہلا جلا کر دیکھا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ اس چراغ میں نہ جانے کب کا بچا کھچا تیل باقی تھا۔ موہن کے ہاتھ کی دیا سلائی بجھ چکی تھی۔ اس نے دوسری دیا سلائی جلائی اور چراغ روشن کردیا۔

چراغ کے روشن ہوجانے سے کوٹھری کی اجنبی وحشت کچھ کم ہوگئی تھی۔ کیوں کہ اندھیرا وحشتوں کو جنم دیتا ہے اور اجالا سکون کو...... چراغ جلا کر موہن نے بڑھ کر ان گنے کے پتوں کو ہاتھوں سے ٹٹولنا شروع کردیا۔ میں سمجھ گئی کہ وہ دیکھ رہا ہے کہ ان پتوں کے ڈھیر میں کہیں کوئی کیڑا مکوڑا تو نہیں چھپا ہے۔ لیکن کوئی کیڑا برآمد نہیں ہوا۔ موہن نے پتوں کے اس ڈھیر کو ایک ترتیب کے ساتھ بکھیرنا شروع کردیا۔ ان میں دبے ہوئے گنے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے نکال کر ایک طرف رکھ دیئے اور اب ان پتوں کا ایک بستر سا تیار ہوگیا تھا۔ موہن نے بڑی مہارت سے جلدی سے یہ ایک آرام دہ سا بستر تیار کردیا تھا۔

میں نیم وا آنکھوں سے ساری کارروائی غور سے دیکھ رہی تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ موہن بلا کا جفاکش ہے۔ کئی گھنٹوں مسلسل چلنے کے باوجود اس کے کسی انداز سے تھکن کا اظہار تک نہیں ہورہا تھا۔ لیکن میں نے دل میں یہ کہہ کر اس حیرت کو کم کردیا کہ موہن ایک جوان کسان ہے اور کسان کو بچپن سے جوانی تک اور جوانی سے بڑھاپے تک اور بڑھاپے سے سادھی تک محنت اور صرف محنت کرنی ہوتی ہے۔ شدید ترین محنت...... اس لئے موہن کی مضبوط ٹانگوں نے اس سفر جو طویل تھا اس کی تھکن کو اپنے اندر جذب کرلیا تھا۔

میں انہی سوچوں کے بھنور میں گم کھڑی تھی کہ موہن میری جانب مڑا اور ایک نگاہ مجھ پر ڈالی۔ چند لمحوں تک وہ مجھے یوں ہی دیکھتا رہا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہ رہا ہے۔ کیا کہنا چاہتا ہے اس کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔

''ادھر بیٹھ جایئے۔'' دفعتاً اس گہرے سکوت میں اس کی آواز بہت دور سے آتی سنائی دی۔

میں بھگوان سے دل میں کہہ رہی تھی کہ موہن مجھے صرف ایک بار بیٹھنے کے لئے تو کہے۔ پھر میں معقول وقار کے ساتھ اس بستر پر بیٹھ گئی۔ آپ میری اس مسرت اور راحت کا اندازہ نہیں کر سکتے جو میرے تھکن سے چور بدن کو اس وقت محسوس ہوئی۔ میں نرم بستروں پر سونے کی عادی تھی لیکن اس وقت سوکھے پتوں کا ڈھیر مجھے کسی ملائم، نرم و گداز بستر سے زیادہ خوش گوار محسوس ہو رہا تھا۔

موہن بھی سامنے والی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا۔ ہم دونوں خاصی دیر تک بالکل خاموش بیٹھے رہے۔ موہن نے اپنی آنکھیں موند لی تھیں اس لئے میں غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے نقوش میں کوئی جاذبیت اور کشش نہیں تھی۔ رنگت بھی سانولی تھی۔ البتہ اس کے چہرے پر مردانہ پن اور مضبوط جوانی کی گہری چھاپ لگی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ لیکن اس کا چہرہ صاف چغلی کھا رہا تھا کہ وہ گہری سوچوں میں گم ہے۔ اس کے چہرے کی سانولی رنگت میں خفیف سی سرخی رچی ہوئی تھی جو اس بات کی غماز تھی کہ وہ کسی ہیجان خیز ان جانے خیال میں غرق ہے۔

کافی دیر تک وہ اسی طرح آنکھیں موندے سوچتا رہا اور میں بھی اسے نیم وا آنکھوں سے ایک ٹک دیکھتی رہی۔ اس ناخواندہ دیہاتی نوجوان کا رویہ میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ اپنی ماں سرسوتی کی ہدایت بلکہ حکم پر اپنی جان خطرے میں ڈال کر مجھے ان خوفناک ڈاکوؤں کے چنگل سے نکال لایا تھا اور اب ڈاکوؤں کا خطرہ ٹل چکا تھا اور وہ ہماری گرد بھی نہیں پا سکتے تھے۔

میرا ذہن موہن کے بارے میں سوچے جا رہا تھا کہ...... یہ کیسا عجیب و غریب نوجوان ہے۔ مرد تو حسین اور نوجوان لڑکیوں سے باتیں کرنے کے لئے نہ صرف ترستے ہیں بلکہ ایک خاص قسم کی لذت سی محسوس کرتے ہیں اور ان سے باتیں کرنے کے موقعے تلاش کرتے رہتے ہیں لیکن اس شخص کو اس بات کے تمام مواقع حاصل ہیں۔ پھر بھی یہ اپنے ہونٹ سیئے بیٹھا ہے۔

اچانک ایک دم سے موہن نے اپنی آنکھیں کھول دیں میں اس وقت غور سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ کیوں کہ کوٹھری میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جو دیکھتی۔ بہر حال وہ مرد تھا۔ مرد کیسا ہی کیوں نہ ہو ایسے لمحے وہ عورت کی توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا ہے کہ وہ مرد کو پسند کر چکی ہے اور اپنے آپ کو اس کے حوالے کرنے یا ٹوٹ کر چاہنے کی آرزو کر رہی ہے۔ اگر میں پریتم سے محبت نہیں کرتی ہوتی اور میرا اس سے بیاہ نہ ہو گیا ہوتا تو شاید موہن کو محبت بھری نظروں سے دیکھتی۔ عشق سے اداؤں سے اس کا دل موہ لینے کی کوشش کرتی۔ وہ بہر حال ایک ایسا بھرپور جوان مرد تھا کہ لڑکیاں اس پر مرتیں۔

میں اس لمحے اپنی نگاہیں اس کے چہرے سے اس لئے نہیں ہٹا سکی تھی کہ اس کی یہ حرکت غیر متوقع تھی۔ میں بری طرح سٹ پٹا گئی۔ میری حالت اس چور کی سی تھی جو رنگے ہاتھوں پکڑا جاتا ہے۔ میں نے گھبرا کر منہ پھیر لیا اور بلا مقصد اپنی انگلیوں کے ناخنوں کو تکنے لگی۔ موہن اب ایک دم سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے بڑھ کر کوٹھری کے کواڑ بھیڑ دیئے۔ اس کی اس حرکت پر میں سر سے پاؤں تک لرز گئی۔ اس نے

جیسے میرے فرار کی تمام راہیں مسدود کر دی تھیں۔ اس نے ایک گھاگ شکاری کی طرح مجھے پھانسنے کے لئے جو جال پھیلایا تھا کہ میں اس میں اس طرح پھنس گئی تھی کہ اس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس کوٹھری میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس سے میں اس درندے کا مقابلہ کر سکوں۔ ایسی کوئی چیز ملتی تو میں اسے موت کی نیند سلانے سے بھی دریغ نہیں کرتی۔

میری توقع کے برعکس اس نے میرے قریب آ کر مجھ سے کہا۔ ''آپ کو بھوک لگی ہے تو میں کھانا نکالوں؟'' اس کی آواز صاف اور کسی بھی جذباتی لرزش سے پاک تھی۔ مجھے اپنے بے ہودہ خیالات پر خود ہی ندامت ہونے لگی کہ میں خواہ مخواہ اس شریف نوجوان کے خلاف دل میں بدگمانی کا شکار ہو رہی تھی۔ میں نے دل میں خود کو بڑی ملامت کی اور بڑی شرمسار بھی تھی۔ کیوں کہ ابھی تک اس کی کسی حرکت سے اس بات کا اظہار نہیں ہو رہا تھا کہ وہ میرے بارے میں کوئی غلط اقدام کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اگر وہ چاہتا تو کھیتوں میں سفر کرتے ہوئے مجھ پر دست درازی کی کوشش کر سکتا تھا۔ میں ایک کمزور اور سہمی ہوئی لڑکی کہاں تک مزاحمت کر سکتی تھی لیکن اس نے کوئی غلط حرکت کرنا تو درکنار غلط بات بھی نہیں کی تھی لہٰذا اب کوٹھری میں میرے دل میں اس کے خلاف کسی قسم کا کوئی خوف بالکل بھی اس لمحے محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

''آپ نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔'' اس نے پھر کہا۔ ''آپ کو بھوک لگی ہے تو کھانا نکال لوں؟'' اس نے مجھے خیالوں میں ڈوبا ہوا دیکھ کر مخاطب کیا۔ اس کا لہجہ مؤدب تھا۔ یہ دیہاتی نوجوان بھی خوب ہوتے ہیں۔ خود تو بڑی بے تکلفی سے آپس میں گفتگو کرتے ہیں۔ گفتگو کیا ہوتی ہے؟ کیسی ہوتی ہے؟ یہ میں نے کئی بار چھپ کر سنا ہے۔ میں اسے بیان نہیں کر سکتی۔ صرف اتنا بتا دوں کہ ان کا موضوع عورت ہوتا ہے۔ وہ لڑکی کیسی ہے؟ کس سے محبت کرتی ہے؟ کہاں اور کب چھپ کر ملتی ہے۔ عورتوں کے آشنا کون کون ہیں...... پھر ان کی باتیں لغو بے ہودہ ہوتی ہیں۔ منہ سے گالیوں کے فوارے ابل پڑتے ہیں۔ ان میں نہ تو تمیز ہوتی ہے اور نہ ہی کسی آداب سے واقف ہوتے ہیں۔ لڑکیوں اور عورتوں سے بھی تمیز سے بات نہیں کرتے ہیں لیکن شہری لوگوں کے سامنے ان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے انداز گفتگو کو مہذب بنائیں۔ میرے خیال میں یہ احساس کمتری کی نشانی ہے۔ یا پھر وہ میرے حسن و شباب کی وجہ سے احساس کمتری میں مبتلا ہو کر اپنے آپ کو مہذب ظاہر کر رہا تھا۔

''ہاں...... ہاں کھانا نکال لو۔'' میں نے موہن کے دوبارہ پوچھنے پر اثباتی انداز میں سر ہلا کر جواب دیا۔ ''اس میں پوچھنے کی بات کیا ہے؟'' چونکہ میں نے کل رات سے کھایا نہیں تھا اس لئے بھوک کھل اٹھی تھی۔ رہی سہی کسر اس طویل سفر نے پوری کر دی تھی اور اب اس سے میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ میں نے تکلف کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ بھوک سے لڑنا آسان نہیں ہوتا ہے۔

موہن نے کوٹھری میں آ کر کھانے کا دسترخوان جو چلتے وقت نیک دل سرسوتی نے دیا تھا اٹھا کر چراغ والے طاق میں رکھ دیا تھا اب اس نے وہ دسترخوان ان ہی پتوں پر بچھا دیا تھا اور پھر اس نے کھانے کے لئے اشارہ کیا۔ لیکن موہن نے کھانے میں حصہ نہیں لیا۔ چوں کہ اب میرے دل سے موہن کے

خلاف غصہ اتر چکا تھا اس لئے میں نے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔

''موہن! کیا بات ہے؟ تم کھانا کیوں نہیں کھا رہے ہو؟ کیا بھوک نہیں لگی ہے؟''

میرے نام لے کر مخاطب کرنے پر وہ چونک اٹھا۔ شاید اسے توقع نہیں تھی کہ میں اسے اس لہجے میں اور اس طرح سے مخاطب کروں گی۔ وہ بوکھلاہٹ میں ایک بڑا سا نوالہ کھا گیا۔ جب نوالہ اس کے حلق میں پھنس گیا تو میرے ہونٹوں پر اس کی بدحواسی دیکھ کر مسکراہٹ بکھرنے لگی۔ میری مسکراہٹ دیکھ کر وہ اور بھی زیادہ بدحواس ہو گیا۔ مجھے اس کا بدحواس اور پریشان چہرہ دیکھ کر اس پر ترس آنے لگا۔ اب تو اس سے سلسلہ کلام بھی شروع ہو گیا تھا۔ چناں چہ میں نے اس کا دھیان ہٹانے کی غرض سے کہا۔

''اطمینان سے کھاؤ...... اور ہاں یہ بتاؤ کہ ہم اس وقت کہاں ہیں اور کس گاؤں میں ہیں؟''

میرا سوال سن کر موہن کے چہرے پر بشاشت دوڑ گئی۔ دراصل گاؤں کے لوگوں سے آپ گاؤں، کھیتوں اور توہمات بھرے قصوں کی باتیں کرتے رہیں تو وہ بڑے خوش رہتے ہیں۔ سورج ڈوبنے کے بعد کسی کسان کے بڑے مکان میں یہ سب جوان بوڑھے اکٹھے ہو کر باتیں کرتے ہیں تو ان کی باتیں سننے والی ہوتی ہیں۔ بالکل سادہ اور معصوم باتیں...... شہر والے تو ان کی باتیں سن کر ہنس پڑتے ہیں۔ لیکن دراصل یہی باتیں ایک سچی زندگی کی عکاسی کرتی ہیں۔

''یہ دھیرج نگر ہے۔'' موہن نے ایک بڑا سا لقمہ منہ میں رکھتے ہوئے بتایا۔ ''آپ نے یہ نام سنا تو ہوگا؟''

''دھیرج نگر......؟'' میں ہنس پڑی۔ ''بڑا عجیب نام ہے۔ نہیں۔ میں نے کبھی یہ نام نہیں سنا؟'' میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

موہن مجھے ہنستا دیکھ کر مبہوت سا ہو گیا۔ معاملہ پھر نازک ہو رہا تھا۔ موہن کی مردانہ حس مجھے ہنستا دیکھ کر پھر بیدار ہونے لگی تھی۔ کیوں کہ سنا ہے کہ جب خوب صورت عورت ہنستی ہے تو مرد کے کانوں میں گھنٹیاں سی بجنے لگتی ہیں۔ میں نے یہ بھی سنا تھا کہ وہ خود فریبی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ غلط اندازے قائم کر لیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ عورت اس پر ریجھ گئی ہے۔ اس لئے میں نے فوراً اپنی ہنسی روک دی۔ میری ہنسی کوٹھری کی خاموش فضا میں جل ترنگ کی کھنک کی طرح بج اٹھی تھی۔

''جی ہاں...... یہ ایسا نام ہے جو بھی پہلی بار سنتا ہے اسے بڑا عجیب سا لگتا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''جیسے آپ کو لگا؟''

''لیکن یہ نام کیوں اور کس لئے رکھا گیا؟'' میں نے سوال کیا۔ ''کیا اس کی کوئی ایسی وجہ ہے؟ تم جانتے ہو کیا؟''

''دراصل اس گاؤں کے لوگ ذرا کاہل واقع ہوئے ہیں۔ ہر کام کل پر یا کچھ دنوں بعد پر ٹالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اب دیکھئے کہ یہ کھیت ویران پڑا ہے۔ جب کہ راستے میں کوئی اور کھیت ویران نہیں ملے گا اس لئے ارد گرد کے گاؤں اسے دھیرج نگر کے نام سے پکارتے ہیں۔''

''کیا تم بتا سکتے ہو یہاں سے ارجن پور کتنی دور ہے؟'' میں نے دھڑکتے دل سے سوال کیا۔ ''اس گاؤں میں جانے کے لئے کوئی سواری ہے یا پھر پیدل ہی چلنا ہوگا......؟ کیا تم کبھی ارجن پور گئے ہو؟''

''ارجن پور......؟'' وہ چند لمحوں کے لئے گہری سوچ میں ڈوب گیا جس سے لگا کہ وہ کبھی گیا نہیں۔ ''اس گاؤں سے بہت زیادہ دور نہیں ہے۔ لیکن پیدل بڑا لمبا راستہ ہے۔ اس گاؤں سے تھوڑی دور جانے پر ایک پکی سڑک ملتی ہے۔ وہاں سے جو بھی بسیں گزرتی ہیں وہ محمد پور جا کر رک جاتی ہیں۔ وہاں سے دوسری بس لینا ہوگی۔ وہ تین چار گھنٹے میں ارجن پور پہنچا دے گی۔''

یہ سن کر میری جان میں جان آئی۔ میں نے سکون واطمینان کا سانس لے کر کہا۔ ''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر ہم صبح ہوتے ہی یہاں سے چل پڑیں تو کل شام تک پہنچ جائیں گے؟'' میں نے منٹوں میں حساب کتاب جوڑ لیا۔

''اگر ہم لاریوں کے بجائے بس سے سفر کریں تو کل رات ہی ہم ارجن پور میں ہو سکتے ہیں۔'' موہن نے جواب دیا۔ ''مجبوری یہ ہے کہ ہم لاریوں سے سفر کر سکتے ہیں بسوں سے نہیں۔ اس لئے کل رات کے بجائے ہم دوسرے دن سہ پہر ہی پہنچ سکیں گے۔''

''بسوں میں سفر کرنے میں کیا کوئی خطرہ لاحق ہے؟'' میں نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔

''لاریوں میں سفر کیوں اور کس لئے کریں؟''

''خطرہ تو کوئی لاحق نہیں ہے۔'' وہ قدرے جھجکتے ہوئے بولا۔ ''ہم لاریوں میں سفر اس لئے نہیں کر سکتے ہیں کہ گھر سے نکلتے وقت میں کچھ اس قدر پریشان اور بدحواس تھا کہ پیسے لینا بھول گیا۔ یوں بھی لاری والے مفت نہیں بٹھاتے ہیں۔ شاید کوئی مفت میں لے جانے پر تیار ہو جائے۔ لہٰذا ہمیں پیدل چلنا پڑے گا۔''

موہن کے اس انکشاف پر میرا دل ڈوب گیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اوپر والے کا ان دیکھا ہاتھ مجھے گیند کی طرح ادھر ادھر اچھال رہا ہے۔ کبھی میں مہیش لال کے چنگل میں پھنس جاتی ہوں اور اس کے چنگل سے نکل جاتی ہوں۔ پھر پیدل میلوں چل کر بے ہوش ہو جاتی ہوں۔ ایک ان جانا سا خوف دامن گیر تھا۔ وہ خوف یوں پورا ہوا کہ رات ڈاکو میری تلاش میں آ گئے۔

میں موہن کو نہ بتانا چاہتی تھی اور نہ رقم دینا چاہتی تھی۔ میں اسے بتا دیتی کہ میرے پاس بہت بڑی رقم موجود ہے تو شاید اس کی نیت میں فتور پیدا ہو جاتا۔ وہ مجھے اور میری رقم لوٹ کر فرار ہو جاتا۔ اس لئے بھی کہ میں ایک مجبور اور بے کس عورت تھی اور اب اس کے رحم و کرم پر تھی اور میں اس کے تعاقب اور تلاش میں گاؤں جا نہیں سکتی تھی۔ ایک تو مجھے اس کے گاؤں کا پتا نہیں معلوم تھا۔ کیوں کہ رات کے اندھیرے میں یہاں تک آئی تھی اور پھر اس کی تلاش میں جانے سے راستے میں کوئی درندہ مجھے اکیلا پا کر فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میں رقم اور عزت سے ہاتھ دھو بیٹھوں۔ مجھے پیدل چلنا اور صعوبت اٹھانا گوارا تھا۔

''آپ فکرمند اور پریشان نہ ہوں۔'' اس نے مجھے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ''اب ہم تھوڑی دیر

آرام کر کے دوپہر کے قریب یہاں سے نکل پڑیں گے اور کھیتوں کا راستہ چھوڑ کر سڑک سڑک سفر کریں گے شاید کوئی لاری والا ترس کھا کر بٹھا لے۔"

موہن کی تجویز ان حالات میں یہی ہو سکتی تھی اور میں بھی اس پر سر ہلانے کے علاوہ کیا کر سکتی تھی۔

اب پھر خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ ہم دونوں اپنے اپنے خیالات میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اب پھر مجھے شدت سے پریتم کی یاد آنے لگی۔ اس کی محبت بھری باتیں، عہد و پیمان، مستقبل کے منصوبے جو ہم نے بنائے تھے جس کے سپنے شادی سے پہلے دیکھتے رہے تھے...... پھر گھر والے یاد آئے اور کمینہ خصلت، شیطان مہیش لال...... میں مہیش لال سے فوری انتقام لینا چاہتی تھی لیکن یہ آرزو جلد پوری ہونے والی نہ تھی۔ کیوں کہ پیدل سفر کرنے کا مطلب یہ تھا کہ ہم تین دن سے پہلے ارجن پور نہیں پہنچ سکتے۔ بہت سوچنے پر میرا دماغ پکنے لگا۔ اور دماغی اور جسمانی تھکن کے باعث مجھے نیند آنے لگی۔ باہر صبح ہو رہی تھی لیکن میری آنکھوں میں نیند اتر رہی تھی۔ میری پلکیں منوں بھاری ہو رہی تھیں۔ چند لمحوں کے بعد میں نے بہ دقت تمام آنکھیں کھول کر موہن کی طرف دیکھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا۔ میں نے مطمئن ہو کر اپنا پورا جسم پتوں کے اس بستر پر پھیلایا اور سکون کی ایک گہری سانس لے کر دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو گئی۔

انسان کا ذہن پریشان ہو تو اسے سوتے میں بھی وہی خیالات روپ بدل بدل کر پریشان کرتے ہیں۔

تین دن سے میں بھی اپنی زندگی کے بدترین حالات سے دوچار تھی۔ وہ خطرناک ڈاکو مہیش لال کے مٹھی گرم کرنے پر میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے تھے۔ اب خواب میں بھی کبھی وہ زوردار، بے ہنگم اور بھونڈے قہقہے لگا کر ڈراتے اور کبھی میری عصمت کا کنول کچلنے کے لئے مجھ پر حملہ کرتے۔ کبھی سرسوتی نظر آتی کبھی ماں...... کبھی پتاجی...... اس عالم میں دکھائی دیتے کہ میرا سینہ شق ہو کر رہ جاتا۔ کبھی پریتم نظر آتا جس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں محبت اور خود سپردگی کی چنگاریاں نظر آتیں اور میری جانب بازو پھیلائے بڑھ رہا ہوتا۔

پھر میں نے پتاجی کو دیکھا انہیں مہیش لال نے پکڑ کر ایک ستون سے باندھ رکھا ہے اور بہت سارے مسلح ڈاکو کھڑے ہیں۔ ایک جلاد صفت ڈاکو ان کے بدن پر کوڑے برسا رہا ہے۔ پتاجی کا لباس تار تار ہو گیا ہے۔ وہ بری طرح چیخ رہے ہیں۔ لیکن وہ ڈاکو ان پر ذرہ برابر بھی ترس نہیں کھاتا ہے۔ اچانک مہیش لال جس کی قید سے میں فرار ہوئی تھی ہاتھ اٹھا کر اس جلاد کو روک دیتا ہے۔ پھر وہ سخت آواز میں پتاجی سے پوچھتا ہے۔ "بتاؤ...... پریا کہاں ہے؟ اسے تم نے کہاں چھپا رکھا ہے؟"

مہیش لال کی زبان سے میرا نام سن کر پتاجی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ وہ چیخ کر ہذیانی لہجے میں بولے۔ "مجھے نہیں معلوم ذلیل...... کمینے اور شیطان کی اولاد...... اگر مجھے معلوم بھی ہوتا تو تجھے ہرگز نہیں بتاتا۔"

مہیش لال یہ سنتے ہی غضب ناک ہو گیا۔ اس نے جلاد سے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "یہ تم دیکھ اور کیا سن رہے ہو؟ چاقو کی نوک سے اس گستاخ کی آنکھیں نکال دو تا کہ یہ اپنی غیرت اپنے سینے سے کھرچ کر پھینک دے۔"

وہ جلاد تو گویا اس حکم کا منتظر ہی تھا۔ اس نے اپنی پیٹی میں اڑسا ہوا دو دھاری خنجر نکال لیا اور اسے

لہراتا ہوا پتاجی کی طرف بڑھا...... اور پھر اس نے چشم زدن میں پتاجی کی دونوں آنکھیں نکال لیں۔ پتاجی کی دل دوز چیخ نے میرے کانوں میں جیسے گرم گرم سیسہ انڈیل دیا اور میرے حلق سے بھی ایک فلک شگاف چیخ نکلی کہ فضا دہل کر رہ گئی تھی۔

اس کے ساتھ ہی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ گویا کوئی بھاری جسامت کا درندہ میرے جسم پر سوار ہو گیا ہے جس سے میری سانس سینے میں گھٹنے لگی ہے۔ میں نے فوراً تڑپ کر آنکھیں کھول دیں۔ یہ دیکھ کر تعجب اور خوف سے میری آنکھیں پھیل گئیں کہ فرشتہ صفت سرسوتی چاچی کا خاموش طبع بیٹا موہن جو ڈاکوؤں کے چنگل سے میری عصمت بچا کر لایا تھا وہ خود ہی اس وقت میری عزت کا لٹیرا بنا ہوا ہے۔ مجھے آنکھیں کھولتے دیکھ کر اس نے مجھ پر اپنی گرفت تنگ کر دی۔ یہاں تک کہ مجھے اپنے جسم کی ہڈیاں چٹختی ہوئی محسوس ہونے لگیں...... میں اس کی گرفت سے نکلنے کی جتنی کوشش کرتی وہ اپنے بازوؤں کا حلقہ اور تنگ کر لیتا۔

میں سوچنے لگی کہ یکا یک یہ موہن کو کیا ہو گیا ہے......؟ اچھا خاصا میرے سامنے تو سو گیا تھا۔ شاید کسی مچھر یا چیونٹی نے اسے نیند کی حالت میں کاٹا ہو گا تو وہ نیند سے بیدار ہو گیا تھا۔ پھر اس نے مجھے گہری نیند کی حالت میں دنیا و مافیہا سے بے خبر دیکھا اور چوں کہ میں ایک انتہائی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی تھی اس لئے میرے تنفس کی رفتار تیز ہو گئی اور سانسوں کی تیزی کی وجہ سے میرے چہرے پر تمازت پھیلی ہوئی ہو گی۔ عورت جب گہری نیند سوئی ہوئی ہوتی ہے تو اسے نہ تو اپنا ہوش ہوتا ہے اور نہ ہی لباس کا...... اور پھر رات کے وقت ملگجے اندھیرے میں اس کا حسن و شباب زہریلی ناگن کی طرح ڈسا ہوا ہو جاتا ہے۔ رات، تنہائی اور سناٹا شیطان بن گیا اور اسے بہکا دیا اور ورغلایا ہو گا۔ اس کے وجود میں شیطان سما گیا ہو گا۔ اس لئے وہ خود پر قابو نہیں پا سکا اور جذبات کی رو میں بہہ گیا۔ اب مجھے اس بپھرے ہوئے سانڈ سے ہر قیمت پر اپنی عزت بچانا تھی۔ گو کہ میں اس کے مقابلے میں ایک پھول جیسی عورت تھی۔ اس کی آنکھیں انگیٹھی میں چٹختے ہوئے انگاروں کی مانند دہک رہی تھیں۔

"موہن! یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" میں نے اسے پرے دھکیلنے کی ایک ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "ہوش میں آؤ۔ سنا تم نے؟"

لیکن اس نے میری اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس پر جنون سوار تھا۔ اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

"موہن!" میں نے ہذیانی لہجے میں بلند آواز سے کہا۔ "تم اپنی عظیم اور نیک ماں کی ہدایت کو بھول رہے ہو؟"

میں نے ایک موہوم امید کے سہارے موہن کو اس کی ماں کی بات یاد دلائی تھی کہ شاید ماں کے تقدس کے حوالے سے اس پر سے شیطان اتر جائے۔ لیکن موہن کو تو شیطان نے جیسے گونگا اور بہرا بنا دیا تھا۔ وہ بدستور اس کوشش میں لگا ہوا تھا کہ میری مزاحمت دم توڑ دے تا کہ وہ من مانی کر سکے۔ لیکن میری جانب سے نہ صرف دفاع بلکہ شدید ترین مزاحمت ہو رہی تھی۔ کیوں کہ میں کسی کی امانت تھی اور اس امانت

کی آخری سانس تک حفاظت کرنی تھی۔ یہ اس کی امانت تھی جس کی محبت نے میری زندگی کو مہکا دیا تھا۔ وہ میرا سب کچھ تھا۔ اس کی خاطر تو میں نے دولت کے نشے میں سرشار مہیش لال کو ٹھکرا دیا تھا اور اس کی قید سے فرار ہو کر شدید ترین مصائب برداشت کئے تھے۔ میں بھلا کس طرح آسانی کے ساتھ جذبات کے ہاتھوں مغلوب ہو جانے والے موہن کو کامیاب ہونے دیتی۔

میری مزاحمت اس کی راہ میں رکاوٹ بن گئی تو اسے طیش آ گیا اور اس نے دانت پیستے ہوئے الٹے ہاتھ سے ایک زور کا تھپڑ میرے گالوں پر رسید کیا۔ مجھے اپنی آنکھوں میں تارے ناچتے نظر آنے لگے اور میں نے درد کی شدت سے گھبرا کر ایک زوردار چیخ ماری۔ بھڑے ہوئے دروازے کی جھریوں اور کوٹھری کی دیواروں میں بنے ہوئے چھوٹے سوراخوں سے دن کی روشنی ابل ابل کر پھیل رہی تھی۔ طاق میں رکھا ہوا چراغ بجھا ہوا تھا۔ شاید اس کا تیل ختم ہو گیا تھا۔ کوٹھری کا دروازہ بند تھا اس لئے اندھیرا سا تھا۔ میں بیدار ہوئی تو یہ سمجھی تھی کہ رات ہے اور اس وقت ذہن بری طرح ماؤف سا بھی ہو گیا تھا۔

میرا خیال تھا کہ میری چیخ سن کر شاید کوئی ادھر آ نکلے۔ لیکن میرے چیخنے چلانے کا کوئی اثر نہیں ہوا اور نہ ہی اسے ڈر اور خوف محسوس ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ میں ایک تھپڑ کھا کر ہتھیار ڈال دوں گی۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ میں مزاحمت ترک کر کے اسے ہر بات کی اجازت دے دوں میں کافی دیر تک اس توقع پر اس شیطان موہن کا مقابلہ کرتی رہی کہ شاید کوئی بھولا بھٹکا کسان میری چیخیں سن کر میری مدد کو آن پہنچے لیکن باہر کے سناٹے سے یوں لگتا تھا اردگرد میلوں تک کوئی انسان موجود نہیں ہے۔ یوں بھی کسان اجالا ہوتے ہی کھیتوں میں آ جاتے ہیں۔ ورنہ میں نے جو مسلسل مدد کے لئے چیخنا چلانا شروع کیا تھا اس کی آواز باہر کے سناٹے میں یقیناً دور تک سنائی دے رہی تھی۔ اگر کوئی سن لیتا تو اس کا آنا یقینی تھا۔ عورت کی چیخ سن کر انجان نہیں بنتا۔ اس کوٹھری میں چوہے بلی کا سا کھیل ہو رہا تھا۔ میں ادھر ادھر بھاگ کر اس کی گرفت سے بچتی ہوئی تھک کر چور ہو چکی تھی اور میرا سانس بری طرح پھول رہا تھا۔ اس کے جوش و خروش اور جنون میں ذرا بھی کمی نہیں ہوئی تھی۔ اس کا یہ خیال تھا کہ میں بچ کر کہاں جاؤں گی۔ تاہم وہ اس بات کی کوشش کر رہا تھا کہ کوٹھری سے باہر نکلنے میں کامیاب نہ ہو سکوں۔ باہر نکلنے کی صورت میں ایک تو اس کے ہاتھ نہ آ سکوں گی اور دوسرا کوئی بھی دیکھ کر میری مدد کے لئے آ سکتا ہے۔ اس لئے وہ دروازے کے پاس سے ہٹنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ وہ ایک پل کے لئے ہٹ جاتا تو پھر وہاں کھڑا ہو جاتا۔ جیسے فٹ بال کے کھیل میں گول کیپر مستعد کھڑا ہوتا ہے تاکہ گول نہ ہو۔ میں نے باہر نکلنے کی بڑی کوشش کی۔ جھانسہ دیا۔ تدبیریں کیں لیکن وہ تو مجھ سے کہیں تیز اور ہوشیار تھا۔

''پریا جانی!'' موہن نے مجھے بھوکی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے چیخنے چلانے سے کوئی تمہاری مدد کو نہیں آئے گا......؟ ایشور بھی تمہاری مدد کرنے سے رہا۔ اسے فرصت کہاں ہے اور پھر وہ تمہاری آواز سننے سے رہا۔ فی الوقت جانے کتنی سینکڑوں اور ہزاروں عورتیں تمہاری طرح شکار ہو رہی ہوں گی وہ مدد کے لئے چلا رہی ہوں گی۔ آخر وہ کس کس کی سنے گا؟ اس لئے یہ ضد اور ہٹ دھرمی چھوڑ دو۔ میں ایک مرد ہوں اور تم عورت ہو۔ تم کیا دنیا کی کوئی عورت مرد سے جیت نہیں سکتی۔''

''سنو موہن!'' میں نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ میں نے ایک لمحے میں سوچا کہ اسے باتوں میں لگاؤں تاکہ میری توانائی اور سانسیں بحال ہوں اور اس طرح مجھے اپنی طاقت اور حواس جمع کرنے کے لئے جو مہلت درکار ہے۔ وہ مل جائے گی۔ ''ایشور میری ضرور مدد کرے گا...... کسی نہ کسی طرح اور کسی نہ کسی صورت سے...... ایسی صورت سے کہ تمہارے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا۔ تم اس قدر مغرور نہ ہو...... تم ایشور سے ٹکر نہیں لے سکتے...... یہ تم مجھے جو ڈرا رہے ہو میں ڈرنے والی نہیں ہوں۔ تم یہ سمجھتے ہو مجھ پر قابو پا لو گے اور مجھے بے بس کر دو گے یہ تمہاری بھول ہے۔ خود فریبی ہے۔ تم مجھے اتنا کمزور نہ سمجھو۔''

تم کچھ بھی کہہ لو میری جان اس سے کچھ حاصل نہیں۔'' موہن نے تمسخر سے کہا۔ ''سچ پوچھو تو میں تمہیں ہر قیمت اور ہر طرح سے حاصل کر کے رہوں گا۔ اب ہم اس کوٹھری میں تین چار دن گزار دیں گے۔ پھر میں تمہیں ارجن پور پہنچا دوں گا۔''

''ذلیل...... کمینے...... حرام زادے...... سوّر......'' میرے منہ سے گالیوں کا فوارہ ابل پڑا۔

''تمہاری ماں ایک شریف عورت ہے...... اس کی کوکھ میں ایک سنپولیا نے جنم لیا۔ تم نے میرے حصول کے لئے اپنی نیک ماں کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگایا؟ یہ کتنے دکھ اور افسوس کی بات ہے۔ تمہاری ماں کو معلوم ہو جاتا کہ تم نے یہ ذلیل حرکت کی ہے تو وہ شاید تمہیں قتل کر دیتی۔''

''تمہارے منہ سے گالیاں بھی کتنی اچھی لگ رہی ہیں اور غصے میں بھی کتنی پیاری لگ رہی ہو۔''

وہ توقف کر کے قہقہہ مار کر بڑے زور سے ہنسا۔ اس کی ہنسی اور جملہ مجھے اس قدر زہریلا لگا کہ میرے تن بدن میں ایک آگ سی لگ گئی۔ میرے پاس چھری نہ تھی ورنہ میں اس کے سینے میں دل میں اتار دیتی۔

ادھر یہ بکواس کر رہا تھا کہ مجھے اچانک ہی یوں لگا کہ میرا پریتم...... میرا پتی دیوراج، کمار مجسم بن کر کوٹھری میں آ گیا ہے۔ اس کی آنکھوں سے قہرناک شعلے نکل رہے ہیں۔ اسے اپنے سامنے موجود پا کر میری دم توڑتی ہوئی ہمت میں پھر سے جان پڑنے لگی۔ میں بڑے جوش و خروش سے اور تازہ دم سی ہو کر اس کے مقابلے کے لئے تیار ہو گئی۔ میری اس کایا پلٹ اور چہرے پر عزم و حوصلے کی سرخی بھانپ کر موہن بھی حیران رہ گیا۔ اسے یقین نہیں آیا۔ وہ تو اپنے تئیں یہ سمجھ رہا تھا کہ بس اب میں اپنی ہار مان کر کسی پکے پھل کی طرح اس کی جھولی میں گرنے والی ہوں۔ اور پھر اسے ہر معاملے میں میری طرف سے اجازت مل جائے گی۔

پریتم کی آنکھیں برابر شعلے برسا رہی تھیں۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر بڑا افسوس اور صدمہ ہوا کہ وہ ایک طرف خاموش کھڑا ہم دونوں کے درمیان کی جنگ کو دیکھ رہا تھا۔ ایسا کیوں اور کس لئے کر رہا ہے۔ یہ میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ میری آرزو تھی کہ وہ موہن کی خبر لے اور اس پر اتنے مکے برسائے کہ موہن خون تھوک تھوک اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اس کے قدموں میں جان دے دے لیکن وہ تو خاموش بت بنا میری بے بسی کا منظر دیکھ رہا تھا۔ پھر مجھے غصہ آیا لیکن میں چپ رہی۔

میں نے جو کچھ دیکھا وہ ایک سپنا سا تھا۔ دراصل نیند کی ایک جھپکی سی آئی تھی جس میں میں نے اپنے

پریتم کو دیکھا تھا۔ میں جیسے ہی نیند کی آغوش سے نکلی موہن نے میری نیند کی مہلت سے فائدہ اٹھا کر مجھ پر ایک چیتے کی طرح جست لگائی۔ دوسرے لمحے میں اس کے بازوؤں کے حصار میں قید ہو چکی تھی۔ وہ میرے چہرے پر جھکنے لگا۔ اس کے ناپاک اور بھدے ہونٹ بتدریج میرے لرزتے ہوئے ہونٹوں کی سمت بڑھ رہے تھے۔ اس نے بھی اندازہ کرلیا تھا کہ اب میں تسخیر ہو چکی ہوں۔ میں نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ وہ اب فاتح تھا اور میں مغلوب...... پھر اس نے میری آنکھوں میں ڈوبتے ہوئے کہا تو اس کے لہجے میں استہزائیہ انداز تھا۔ ''کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ کوئی عورت مجھ سے جیت نہ سکی اور بالآخر جیت میری ہوئی۔ اب تم ہار گئی ہو پریا!...... اب تم اپنی عزت بچا نہیں سکتی ہو اور نہ ہی ایشور تمہاری کوئی مدد کرے گا؟''

میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ میرا دل صدمے سے بھر گیا اور اپنی بے حسی کے احساس سے میری آنکھیں بھر آئیں۔ اور میں نے اپنے آنسو چھپانے کے لئے آنکھیں بند کرلیں اور سختی سے ہونٹ بھینچ لئے۔ لیکن دوسرے لمحے میں نے ایک دل دوز چیخ سے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ موہن مجھے اپنے بازوؤں کے حصار سے نکال کر ایک طرف کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے حلق سے ہول ناک چیخیں نکل رہی تھیں اور وہ شرابیوں کی طرح جھوم رہا تھا۔ پھر ایسا لگا ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا ہو۔

اس لمحے میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ موہن کو ایک دم سے کیا ہو گیا ہے۔ میں نے فوراً اپنے بال اور لباس کو درست کیا۔ میں نے کوٹھری کا جائزہ لیا۔ کوٹھری خالی تھی اور وہاں کوئی بھی موجود نہ تھا۔ موہن کے حلق سے اب بھی اذیت ناک چیخیں نکل رہی تھیں یوں لگ رہا تھا کہ کوئی نادیدہ ہستی اس پر آتشیں کوڑے برسا رہی ہو۔ وہ کھڑا رہنے کی کوشش میں لہرا رہا تھا۔ میں گھبرا کر ایک کونے میں دبک کر کھڑی ہو گئی۔ اچانک موہن اپنا پاؤں زور زور سے پٹخنے لگا۔ کچھ دیر تک وہ اوندھی سیدھی حرکتیں کرتا رہا۔ اس کی یہ حرکتیں دیکھ کر میں خوف زدہ سی ہوئی جا رہی تھی۔ نہ جانے اسے یہ کیسا جنون سوار ہو گیا؟ اس کا چہرہ بھی خوف ناک ہو رہا تھا۔ کافی دیر تک اس کی یہ اچھل کود کراہ اور چیخوں کے ساتھ جاری رہی۔ پھر اس کے منہ سے اچانک خون بہنے لگا۔ جیتا جاگتا سرخ خون...... آہستہ آہستہ وہ سست پڑتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ کٹے ہوئے درخت کی مانند زمین پر گر پڑا اور زور زور سے گردن زمین پر پٹخنے لگا۔ جیسے موت کا فرشتہ اس کی جان کھینچ رہا ہو۔ چند لمحوں تک وہ کسی مجذوب کی طرح گردن پٹختا رہا اور پھر ایک دم سے اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ پھر اس کی کھلی آنکھیں بے نور سی ہو گئیں۔

موہن میرے حسن کی کرشمہ سازیاں دیکھ کر جذبات کے ہاتھوں مغلوب ہو کر میرے ساتھ زیادتی کرنے کے درپے تھا لیکن اب وہ مر چکا تھا اور کمر کے بل چت لیٹا اپنی بے نور آنکھوں میں منجمد اذیت لئے کوٹھری کی چھت کو گھور رہا تھا...... میں حیران تھی کہ موہن آخر ایک دم کیوں مر گیا؟ اس کی موت اچانک کیوں ہوئی۔ اس کا سبب کیا ہوگا؟

لیکن میرے اس سوال کا جواب جلد ہی مل گیا۔ میں نے مردہ موہن کی ٹانگوں کے نیچے سے ایک پہاڑی سیاہ بچھو کو نکلتے دیکھا۔ موہن کے نیچے دب جانے سے وہ بھی ادھ مرا ہو گیا تھا۔ اب میری سمجھ میں آیا

کہ جب موہن میرے ہونٹ آلودہ کرنے کے لئے مجھ پر جھکا تو اس وقت اس بچھو نے اس کے جسم پر چڑھ کر اسے کاٹ کھایا تھا۔ اس لئے موہن اذیت ناک چیخیں مارنے اور ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا تھا۔

بچھو خاصا بڑا تھا جہاں تک مجھے علم تھا اتنے بڑے بچھو خشک پہاڑوں پر پائے جاتے ہیں اس لئے یہ حیرت ناک بات تھی کہ کھیتوں میں یہ بچھو کہاں سے آ گیا۔ اور یہ بچھو سانپ سے کہیں خطرناک ہوتے تھے اور اس سے کہیں زہریلے بھی...... لیکن یہ وقت ان سب باتوں پر غور کرنے کا نہیں تھا۔ لیکن یہ بچھو میرا محسن تھا۔ اس نے میری عزت بچائی تھی۔ ایشور نے شاید اسے میری مدد کے لئے بھیجا تھا۔ موہن نے چیلنج کے انداز میں کہا تھا کہ ایشور بھی مجھے اس کے ہاتھوں سے میری عزت لٹنے سے بچا نہیں سکتا۔ اسے تکبر اور گھمنڈ کی سزا ملی تھی۔

لیکن یہ وقت ان باتوں پر غور کرنے کا نہیں تھا۔ بچھو بہ مشکل تمام مردہ موہن کے وزنی جسم کے نیچے سے نکل آیا...... لیکن چند قدم رینگنے کے بعد وہ بھی ڈھیر ہو گیا۔ اس وقت کوٹھری کے فرش پر دو لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک بھیڑیئے نما انسان اور دوسرا محسن بچھو کی......

اب اس کوٹھری میں میں اکیلی کھڑی تھی۔ میں نے ان دونوں کی لاشوں سے نگاہیں ہٹائیں لیکن میری نگاہ موہن پر پھر پڑی۔ موہن کے چہرے کی رنگت تیزی سے نیلی پڑتی جا رہی تھی اور میں سوچ رہی تھی کہ ایشور نے میرے نصیب میں کیا لکھا ہے اور اب مجھے کہاں کہاں بھٹکنا ہوگا۔ کیوں کہ موہن مر چکا تھا اب پھر میں بے آسرا ہو چکی تھی۔ فرط غم سے میرے آنسو نکل آئے۔ اے ایشور!...... اے بھگوان!...... بس میں اتنا ہی کہہ سکی۔ میرے دل نے مجھے ٹوک دیا کہ مجھے فریاد کرنے سے کیا فائدہ؟ وہ سب دیکھ رہا ہے۔

''خیر...... جو ہوگا وہ دیکھا جائے گا۔'' میں نے دل کو تسلی دی۔ پھر لباس کی شکنیں اور بکھرے بالوں کو درست کیا۔ سرسوتی کی دی ہوئی چادر خوب جھاڑ کر اچھی طرح اوڑھ لی اور موہن پر آخری نگاہ ڈال کر کوٹھری سے نکلی اور اس کا دروازہ بھیڑ دیا۔

میں چاروں سمتوں کا جائزہ لینے لگی۔ ہر سمت کھیت ہی کھیت، پگڈنڈیاں اور درختوں کا ایک سلسلہ تھا جو حد نگاہ تک پھیلا ہوا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کس سمت جاؤں۔ کسی سمت دور دور کوئی آبادی اور بستی بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ سرسوتی کے گاؤں چلی جاؤں۔ میں اندازے سے جا تو سکتی تھی۔ اب وہاں کوئی خطرہ نہیں رہا تھا۔ ڈاکو وہاں سے مجھے نہ پا کر جا چکے ہوں گے۔ وہاں امن قائم ہو چکا ہوگا۔ وہ نہ جانے مجھے کہاں تلاش کر رہے ہوں گے۔ میں اب ان سے محفوظ تھی۔

لیکن میں وہاں کس منہ سے جاؤں گی۔ ایک عورت کو اور اس کی ممتا کو کیا بتاؤں گی کہ اس کا جوان بیٹا موت کے منہ میں جا چکا ہے۔ اس نے میری عزت سے کھیلنے کی کوشش کی تھی۔ ایشور نے اسے موت کی سزا دے کر کیفر کردار تک پہنچا دیا۔ کیا وہ میری بات کا یقین کرے گی؟

میں ابھی سوچ رہی تھی کہ مجھے اچانک مغرب کی سمت سے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں سنائی دیں تو میں گھبرا کر دہشت زدہ سی ہو گئی۔ میں سمجھ گئی کہ ڈاکو میری تلاش میں ادھر آ نکلے ہیں۔ اس سے پہلے

کہ میں دوڑ کر اس کوٹھری میں پناہ لیتی۔ چھ عدد گھوڑے نمودار ہوئے۔ صرف پانچ گھوڑوں پر مسلح ڈاکو سوار تھے۔ ان کے ہاتھوں میں بندوقیں، ایک گھوڑے پر زین کسی ہوئی تھی۔ کوئی سوار نہ تھا۔ ان کے چہرے مہرے اور وضع قطع صاف بتا رہی تھی کہ یہ ڈاکو ہی ہیں۔ میں اپنی جگہ جامد و ساکت کھڑی ہو گئی اور میرے پیر زمین کا حصہ بن گئے۔ میری رگوں میں لہو منجمد ہو گیا۔ اب مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ کوٹھری میں جا چھپوں۔ اس میں پناہ لینا فضول ہی تھا۔

گھوڑے مجھ سے چند قدم پر رک گئے۔ ایک ڈاکو گھوڑے سے اتر کر میری طرف تیزی سے بڑھا۔ اس نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا وہ ان ڈاکوؤں کا سردار معلوم ہوتا تھا اس کے چہرے پر درندگی اور آنکھوں میں وحشیانہ چمک سی تھی۔

''او لڑکی! تیرا نام کیا ہے......؟'' وہ غرایا۔ ''تو بہت خوب صورت ہے......تو یہاں کیا کر رہی ہے؟ کیا تو اس میں رہتی ہے؟''

''میرا جو بھی نام ہے تمہیں اس سے کیا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں یہاں اپنے پتی کا انتظار کر رہی ہوں۔ یہ میرا گھر ہے۔''

اسی اثنا میں ایک ڈاکو گھوڑے سے اتر کر کوٹھری میں گھس گیا۔ چند لمحوں کے بعد آ کر اپنے سردار سے بولا۔

''سردار! یہ وہی لڑکی ہے جس کی ہمیں تلاش ہے۔ اس کا نام پریا ہے۔ مہیش لال نے بتایا تھا کہ وہ بہت حسین ہے۔ اس کی ٹھوڑی میں گڑھا ہے اور اس گڑھے میں تل ہے۔ موہن کی لاش کوٹھری میں پڑی ہے۔ قریب ہی کالا پہاڑی بچھو مرا پڑا ہے۔ موہن اسے کوٹھری میں شاید لے گیا ہوگا۔ بچھو نے اسے ڈنک مار کر ختم کر دیا۔ اب لڑکی کو لے چلو......شکر ہے یہ ہمیں مل گئی۔''

''چلو......اس گھوڑے پر سوار ہو جاؤ۔'' سردار نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''تم نے ہمیں بہت خوار کیا ہے۔ ہم تمہیں لے جانے آئے ہیں۔''

''نہیں......نہیں......میں نہیں چلوں گی۔'' میں نے ہمت کر کے کہا۔ ''میں کیوں چلوں۔ یہ مہیش لال کون ہوتا ہے جو مجھے......''

''تم تو کیا تمہارا باپ بھی چلے گا۔'' ڈاکو کے سردار نے کہا۔ ''تم کو چلنا ہوگا۔ ہم تمہیں لے جا کر رہیں گے۔ سمجھیں۔''

چشم زدن میں جو کچھ ہوا مجھے اس کی توقع نہیں تھی۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر میرے منہ پر رکھا۔ یہ رومال کلوروفارم میں بھیگا ہوا تھا۔ اس کے منہ پر رکھتے ہی میں تاریکیوں میں ڈوبتی چلی گئی۔ پھر مجھے کسی بات کا ہوش اور خیال نہیں رہا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک نہایت آراستہ کمرے میں ایک لمبی چوڑی مسہری پر پڑی تھی۔ اس کمرے میں میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ دروازہ بند تھا۔ باہر سے اس کی کنڈی لگی ہوئی تھی۔ میں ایک دم سے

ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھی۔ مسہری سے اتر کر لباس درست کیا تھا کہ چاپیں سنائی دیں۔ ایسا لگا کہ پانچ چھ آدمی آ رہے ہیں۔ چند لمحوں کے بعد دروازہ کھلا۔ یکے بعد دیگرے چھ آدمی گھس آئے۔ یہ وہ ڈاکو نہیں تھے جو مجھے لائے تھے۔ یہ مہیش لال کے آدمی تھے۔ یہ کمرہ وہ نہیں تھا جس میں پہلے قید کی گئی تھی۔ ان میں سے ایک بدمعاش نے کہا۔ ''او پریا جی! اب یہاں سے بھاگنے کی کوشش نہ کرنا۔ یہاں چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی۔''

''مہیش لال کہاں ہے؟'' میں نے سوال کیا۔ ''وہ ڈاکو کہاں ہیں جو مجھے یہاں لائے تھے؟ وہ نظر نہیں آ رہے ہیں۔''

''مہیش لال جی، سرکار کی ایک میٹنگ میں شرکت کرنے گئے ہوئے ہیں۔'' دوسرے بدمعاش نے کہا۔ ''وہ شام کو آئیں گے۔ ڈاکو تمہیں ہمارے حوالے کر کے چلے گئے......ان کا کام ختم ہو گیا۔ اب ہمارا کام ہے کہ ہم تمہیں قید کر کے رکھیں۔''

''بسنتی کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا...... ''اگر وہ گھر میں موجود ہے تو اسے بلاؤ۔ میں اس سے بات کرنا چاہتی ہوں۔''

''وہ حویلی میں ہوتی ہے یہاں نہیں۔'' تیسرے نے جواب دیا۔ ''یہاں صرف ہم ہیں۔ یہ مہیش لال کا نیا مکان ہے۔''

''تم بسنتی کو کس لئے اور کیوں یاد کر رہی ہو؟'' پہلے والے بدمعاش نے کہا۔ ''وہ ہمیں بھی بہت پسند ہے۔ کھانے بہت اچھے پکاتی ہے۔''

''اس لئے کہ مجھے بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''تم لوگ میرے لئے کھانا لے کر آؤ۔ ورنہ میں بھوک سے مر جاؤں گی۔''

''کھانا......؟'' دوسرے بدمعاش نے سر کھجایا۔ ''صبح ہم لوگوں نے ہوٹل میں ناشتا کر لیا تھا۔ دوپہر کا کھانا......ہم باورچی خانے میں جا کر تیار کرنے والے تھے......کہو تو چائے اور بسکٹ لا دیں۔ باورچی خانے میں بسکٹ رکھے ہیں۔ دودھ ہے۔ دوپہر کے لئے سبزی ترکاری بھی......''

''تم لوگ مجھے باورچی خانے میں لے چلو۔'' میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کا کوندا بن کر لپکا تو میں نے کہا۔ ''میں نہ صرف اپنے لئے بلکہ تم لوگوں کے لئے بھی چائے بنا دوں گی......پھر دوپہر کا کھانا بھی تیار کر دوں گی۔ پھر ہم سب مل کر کھانا کھائیں گے۔ منظور ہے۔''

''منظور ہے۔'' تیسرے بدمعاش نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ''لیکن مہیش لال جی تم سے سخت ناراض ہیں۔ تم نے ان کے ساتھ کیا حرکت کی تھی؟''

''یہ میرا اور ان کا معاملہ ہے۔'' میں نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔ ''میں انہیں منا لوں گی۔ تم لوگ مجھے باورچی خانے میں لے چلو......''

''وہ بتا رہے تھے کہ تم ان کی تجوری سے تین لاکھ روپے لے کر بھاگ گی تھیں؟'' دوسرے بدمعاش نے کہا۔ ''وہ رقم کہاں ہے؟ تمہارے پاس تو نہیں ہے۔ مہیش لال جی نے ہم سے کہا تھا کہ تم ہاتھ لگو تو تین

لاکھ کی رقم بھی برآمد کر لینا۔ وہ رقم تم نے کہاں چھپائی ہوئی ہے؟"

"وہ رقم تو وہ ڈاکو لے گئے جو مجھے یہاں لائے؟" میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ "کیا ان بدمعاشوں نے وہ رقم تمہیں نہیں دی؟"

"نہیں تو......؟" اس نے سر ہلایا۔ "تین لاکھ کیا تین سو روپے بھی نہیں دیئے بلکہ الٹا مہیش لال جی سے ایک لاکھ کی رقم لے گئے۔"

"یہ ڈاکو تو بڑے حرامی نکلے۔" چوتھا بدمعاش دانت پیستے ہوئے بولا۔ "اب تو ان سے تین ہزار روپے بھی نکالنا مشکل ہے۔"

"تم لوگ یہ کیا باتیں لے بیٹھے ہو؟" میں نے تنک کر کہا۔ "مجھے بھوک لگی ہے۔ میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں تم لوگوں کو اس کی کوئی فکر نہیں...... میں مہیش لال جی سے تمہاری شکایت کر دوں گی۔ مجھے جلدی سے باورچی خانہ میں لے چلو۔"

وہ مجھے باورچی خانہ میں اپنے حصار میں لے آئے۔ اتفاق سے ان میں سے ایک بھی مسلح نہ تھا۔ وہ اپنی بندوقیں جانے کہاں رکھ آئے تھے۔ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ چوں کہ وہ کل چھ عدد ہیں اس لئے میں فرار ہو کر اور ان کے چنگل سے نکل کر جا نہ سکوں گی۔ باورچی خانہ بہت بڑا تھا۔ میں نے اس کا اندر اور باہر سے جائزہ لے لیا تھا۔ یہ ایک بنگلہ تھا۔ ان کے سوا اس بنگلے میں کوئی اور نہ تھا۔ اور پھر مجھے فرار ہونے اور اپنی تدبیر پر عمل کرنے کی ایسی کوئی جلدی نہیں تھی۔ عجلت سے کام خراب ہو سکتا تھا۔ صبر اور تحمل سے کام لینے کی ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ انہیں لبھا کر اپنے اعتماد میں لینا تھا۔ اس کے لئے عشوے اور ادائیں تھیں جو انہیں رام کر سکتی تھیں۔ عورت کے پاس اس سے بڑا ہتھیار کوئی نہ تھا۔

جس وقت وہ مجھے باورچی خانے میں لے گئے تھے ان میں سے ایک نے میری کمر پر ہاتھ رکھا تھا۔ کسی نے دبوچنا چاہا۔ کچھ نامناسب سی حرکتیں بھی کیں جس پر میں نے غصے اور برہمی ظاہر نہیں کی اور نہ ہی ان کو جھڑکا۔ کہا جاتا ہے کہ عورت بڑی احمق ہے۔ لیکن عورت کے معاملے میں مرد بہت جلدی احمق بن جاتا ہے۔ اس وقت یہ بدمعاش نہیں بلکہ الو کے پٹھے معلوم ہو رہے تھے۔ ان سے بڑا چغد کوئی نہ تھا۔

میں نے ان کے لئے چائے بنائی۔ باورچی خانے کے دروازے کے باہر انہوں نے دو چار پائیاں لا ڈالیں اور اس پر بیٹھ گئے۔ میں نے باری باری ہر ایک کو چائے پیش کی۔ چائے کی پیالی بڑھاتے وقت میری ساڑھی کا پلو شانے اور سینے سے پھسل کر میرے ہاتھوں پر پڑا رہا جس سے ان کے لئے ایک خوش کن اور دل فریب نظارہ بن گیا تھا۔ میں نے پھر باورچی خانہ میں آ کر درد انڈے کا آملیٹ بنایا۔ ڈبل روٹی سے آملیٹ اور مکھن بھی کھایا۔ پھر بڑے مگ میں چائے پی۔ ناشتے سے فراغت پانے کے بعد میں نے دیکھا کہ وہ چائے پی چکے ہیں۔ میں نے ان سب کو باورچی خانہ کے اندر بلایا۔ ایک کو میں نے پیاز کاٹنے پر، دوسرے کو سبزی صاف کرنے، تیسرے کو چاول چننے کے لئے دیا۔ چوتھے سے کہا کہ وہ دال صاف کرے۔ پانچویں کو برتن دھونے پر لگا دیا۔ چھٹے سے کہا کہ وہ چولہے جلا دے اور ان میں مٹی کا تیل بھر دے۔ جب وہ

سب اپنے اپنے کام میں جت گئے تو میں فوراً ہی موقع پا کر باورچی خانہ سے نکلی اور دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ ان کے لئے باہر آنے کا کوئی اور راستہ نہ تھا۔ دروازہ بے حد مضبوط تھا۔ چھ کیا دس آدمی بھی مل کر اسے توڑ نہیں سکتے تھے۔ دوسرے ہی لمحے وہ چیخنے چلانے، دروازہ پیٹنے اور گالیاں بکنے لگے۔ پھر میں اس وقت بھاگ کھڑی ہوئی۔ بگٹٹ میں بھاگی جا رہی تھی کہ راستے میں اچانک بسنتی دکھائی دی۔ وہ مجھے دیکھ کر خوش ہو گئی۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں دوبارہ مہیش لال کے چنگل سے نکل کر بھاگی ہوئی آ رہی ہوں تو وہ مجھے اپنے ساتھ ایک ایسے گھر میں لے گئی جو اس کے ماموں کا تھا اس کا ماموں، ممانی اور بچے بنگلور ایک شادی کی تقریب میں شرکت کی غرض سے تین دن کے لئے گئے ہوئے تھے۔ یہ گھر خالی تھا۔ بسنتی نے حفظ ماتقدم کے طور پر باہر سے تالا لگا دیا اور پچھلے دروازے سے اندر آ گئی۔ بسنتی کا خیال تھا کہ کہیں وہ ڈاکو میری تلاش میں اس کے اور ماموں کے گھر نہ آ جائیں۔ وہ ان کے ڈر خوف سے اپنے گھر مجھے نہیں لے گئی تھی۔ میں نے اس سے پہلے اپنے پریتم کے متعلق دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ...... پریتم اور گھر والوں کا کہنا ہے کہ مجھے ڈاکو اغوا کر کے لے گئے ہیں اور میرے پتا جی اور ماتا جی کا بھی یہی خیال ہے۔ لیکن مہیش لال اور اس کے آدمیوں نے یہ اڑا دیا کہ میں اپنے آشنا کے ساتھ بھاگ گئی ہوں اور زیورات بھی لے گئی ہوں۔ جب کہ پریتم کے گھر والوں اور پریتم کا کہنا ہے کہ وہ زیورات تو کیا ایک انگوٹھی تک نہیں لے گئی۔ بسنتی نے پریتم کو اعتماد میں لے کر اور بھگوان کی سوگند کھا کر یقین دلایا کہ میں کسی آشنا کے ساتھ نہیں بھاگی ہوں بلکہ مہیش لال نے کویتا جادوگرنی کی مدد سے اغوا کیا۔ میں مہیش لال کے چنگل سے نکل کر کہیں روپوش ہو گئی ہوں۔ کچھ دنوں میں واپس آ سکتی ہوں۔ بسنتی نے مجھے مشورہ دیا کہ...... میں ابھی تو میکے جاؤں اور نہ ہی سسرال، کیوں کہ مہیش لال کے آدمی پریتم اور تمہارے پتا جی کو قتل کر دیں گے۔

میں نے دوبارہ مہیش لال کے چنگل میں پھنسنے کی کہانی سنانے کے بعد بسنتی سے کہا۔ "مہیش لال نے اپنے آدمیوں سے کہا ہوا ہے کہ میں اس کی تجوری سے تین لاکھ روپے چوری کر کے لے بھاگی ہوں جبکہ ایک لاکھ دس ہزار کی رقم میں نے چوری کی۔ وہ جھوٹ کہہ رہا ہے کہ میں نے تین لاکھ......"

"وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔" بسنتی نے درمیان میں بات کاٹ کر معنی خیز لہجے میں کہا۔ "کل رقم تین لاکھ پینتیس ہزار ہے۔"

"سوا تین لاکھ اور دس ہزار روپے...؟" میں نے کہا۔ "بھگوان کی سوگند لے لو۔ ایک لاکھ دس ہزار سے زیادہ رقم نہیں تھی وہ۔"

"سوا دو لاکھ کی رقم میں لے گئی......" بسنتی نے سرگوشی کی۔ "یہ رقم میں نے چوری کی۔ میں نے یہ ڈاکہ اس لئے مارا کہ اس نے میری عزت پر بھی تو ڈاکہ مارا...... میں نے ڈاکہ مار کر اتنی بڑی رقم حاصل کر لی۔ اسے میں نے چھپا کر رکھ دیا ہے اور حویلی میں کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔"

"یہ تم نے بہت اچھا کیا بسنتی!" میں نے خوش ہو کر کہا۔ "تم نے یہ خبر سنا کر میرا دل باغ باغ کر دیا۔ تم نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا۔ غریب کی عزت کی ان لوگوں کے نزدیک کوئی وقعت نہیں۔ یہ

بتاؤ کہ یہ رقم تم نے کیسے، کب اور کس وقت اس کی تجوری سے نکالی؟''

''تمہارے فرار ہونے کے بعد جب میں مہیش لال کے کمرے میں آئی تو وہ فرش پر بے ہوش پڑا ہوا تھا۔'' بسنتی بتانے لگی۔ ''تجوری کھلی پڑی تھی۔ کچھ نوٹوں کی گڈیاں بھی فرش پر پڑی ہوئی دکھائی دیں مجھے وہ رات یاد آ گئی جب مہیش لال کے آدمیوں نے مجھے اغوا کر کے اس کے ہاں پہنچا دیا۔ پھر مہیش لال نے میری عزت تباہ کرنے کے بعد مجبور کیا تھا کہ میں اس کی حویلی میں ملازمت کرلوں۔ ورنہ وہ مجھے جیل میں مروا دے گا۔ میں نے اس کی بات مان لی تھی۔ میں جتنی گڈیاں اٹھا سکتی تھی اٹھا لیں۔ پھر مجھے ایک تھیلی نظر آئی۔ میں نے اسے لے جا کر اپنے کمرے میں چھپا لیا۔ میں دو دن کے بعد کوڑے کرکٹ کی ٹوکری میں رقم اور تھیلی لے گئی۔ پھر میں نے گھر لے جا کر رقم گنی تو وہ سوا دو لاکھ تھی۔ اس تھیلی میں سونے کے زیورات تھے۔ ایک ہار، ایک نیکلس، بارہ چوڑیاں، تین تین تولے کے چار کڑے اور ہیروں کی چار انگوٹھیاں...... حیرت کی بات یہ ہے کہ اس نے سونے کے زیورات کی چوری کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ شاید اسے خیال نہیں آیا۔ کیوں کہ وہاں کچھ ایسی اور بھی تھیلیاں موجود تھیں۔ ہم لوگ سوچ رہے ہیں کہ بنگلور چلے جائیں۔ ماموں کے آنے کے بعد اس بات کا فیصلہ کیا جائے گا۔''

بسنتی نے مجھے مشورہ دیا کہ میں آٹھ بجے بس اسٹاپ چلی جاؤں۔ سوا آٹھ بجے ایک رانی کوچ ارجن پور جاتی ہے۔ میں جب بس اسٹاپ کے قریب پہنچی تو مہیش لال کے آدمیوں کو دیکھا جو ایک جیپ گاڑی میں میری تلاش میں نکلے تھے۔ اتفاق سے ان میں سے ایک بدمعاش نے مجھے دیکھ لیا۔ وہ میرا تعاقب کرنے لگے۔ میں کسی نہ کسی طرح ان سے بچتی رہی۔ پھر آپ کے گھر میں گھس گئی۔''

پریا نے مجھے اپنی جو رام کہانی سنائی تھی وہ بڑی لمبی تھی۔ اس کے ساتھ بڑا ظلم ہوا تھا۔ وہ جتنی حسین تھی اتنی ہی بدنصیب بھی...... میں نے اس سے کہا کہ تم دوسرے والے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔ رات کافی ہو چکی ہے تمہیں کل تمہارا پریتم اور گھر والے مل جائیں گے۔ مہیش لال اور کویتا تمہارا بال تک بیکا نہیں کرسکیں گے۔ تم پر اور پریتم پر بھی کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ پریا پھر دوسرے کمرے میں سونے چلی گئی۔

میں نے تھوڑی دیر بعد ٹی وی اسکرین پر ایک منتر پڑھ کر پھونکا۔ دوسرے لمحے اسکرین پر مہیش لال اور کویتا نظر آئے۔ کویتا اپنے علم کے زور پر اسے بتا رہی تھی کہ...... پریا اس جگہ روپوش ہے۔ وہ کل کسی بھی وقت پریتم سے ملنے جائے گی۔ تب میں پریا کے سامنے ظاہر ہو جاؤں گی۔ کس روپ اور کس حالت میں یہ ابھی نہیں بتا سکتی۔ کل جہاں کہو گے وہاں میں اسے پہنچا دوں گی۔ ابھی تم جا کر سو جاؤ...... تم حویلی میں انتظار کرنا۔ میں پریا کو لے کر پہنچ رہی ہوں۔ پچاس ہزار روپے دیتے جاؤ۔ میری فیس کے...... مہیش لال اس طرح کی شیروانی پہنتا تھا جو سیاسی لیڈر پہنتے ہیں۔ مہیش لال نے شیروانی کی جیب سے پانچ سو روپے کے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور کویتا کی طرف اچھال دی۔ اس نے پچاس ہزار کی اتنی بڑی رقم پریا کے حصول کے لئے اس طرح سے دے دی جیسے وہ پچاس روپے ہوں۔ اس کے نزدیک یہ رقم پچاس روپے ہی کے برابر تھی۔ اس لئے کہ اس کے پاس کالا دھن تھا۔ جس کے پاس کالا دھن ہو اسے کالے کاموں پر

کالا دھن لٹاتے ہوئے ذرہ برابر بھی دکھ نہیں ہوتا۔ اس کے پاس ناجائز دولت اس طرح ابل رہی تھی جیسے اسے سونے کی کان ہاتھ لگی ہو۔ اس نے اپنا کالا دھن کئی جگہوں پر چھپا رکھا تھا۔

پریا کے حصول کے لئے وہ پاگل ہو رہا تھا کہ ایک تو وہ بہت حسین تھی۔ اس کا حسن و شباب ہر عمر کے مرد کو پاگل کر دینے والا تھا۔ گو اس کی زندگی میں پریا سے بھی کہیں حسین، جوان اور پرکشش کنواری لڑکیاں اور شادی شدہ عورتیں آتی تھیں اور موجود بھی تھیں۔ لیکن پریا نے اس کے رشتے کو ٹھکرا کر جو اس کی توہین کی تھی وہ اسے برداشت نہیں کرسکا تھا۔ اسے ایسا لگا تھا کہ پریا نے اور اس کے باپ ماسٹر جی نے اس کے منہ پر تھپڑ دے مارا ہو...... اور پھر اس نے ایک عام آدمی سے شادی کر کے اس کا مذاق اڑایا تھا۔ اور پھر جب کویتا کی مدد سے اس کے کمرے میں رات گزاری کے لئے پہنچائی گئی تو وہ اسے بے ہوش کر کے اور اس کی لاکھوں کی رقم لے کر فرار ہوگئی۔ اب وہ یہ چاہتا تھا کہ پریا سے وہ اس وقت ایک کھلونے کی طرح دل بہلاتا رہے گا۔ جب تک اس کا دل نہیں بھر جاتا۔ پھر وہ اپنے پالتو بدمعاشوں کو بطور تحفہ دے گا کہ اس عورت سے جی بھر کے کھیلیں۔ پھر اسے انتہائی بے رحمی سے قتل کر کے اس کی لاش کسی گڑھے میں دبا دیں۔

جادوگر مردوں کی ابھی بھی ہندوستان، بنگلہ دیش، مغربی بنگال اور آسام میں کمی نہ تھی۔ لیکن پائے کے جادوگروں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ اس طرح جادوگرنیاں بھی موجود تھیں۔ لیکن ان میں چند ایک جادوگرنیاں ایسی تھیں جو تمام علوم کی ماہر ہوں۔ ان میں ایک کویتا بھی تھی۔ وہ ہر قسم کے جادو اور علوم کی ماہر تھی لیکن وہ کسی پائے کے جادوگر سے مقابلہ کرنے کی اہل نہیں تھی۔ لیکن وہ جو کچھ جانتی تھی اس سے بہت کچھ کرسکتی تھی۔ اس نے جادو کے زور سے یہ پتا چلا لیا تھا کہ پریا نے مہیش لال کے آدمیوں کو بے وقوف بنا کر فرار ہو کر میرے ہاں پناہ لی ہوئی ہے۔ لیکن اس کے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ میں بھی ایک جادوگر ہوں۔ اس نے میرے بارے میں جان کاری کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ صرف اس کے علم میں یہ بات آئی تھی کہ میں ایک سیاح ہوں۔ اگر وہ میرے متعلق جاننے کی کوشش کرتی تو اسے ناکامی ہوتی۔ کیوں کہ میں نے ایک ایسا حصار کھینچا ہوا تھا کہ وہ کچھ معلوم نہیں کرسکتی تھی۔ رات جب پریا مجھے اپنی کہانی سنا رہی تھی [illegible] وکلہ کو میرے ہاں بھیجا تھا۔ میں نے اس کی نظر بندی ایسی کر دی تھی کہ اسے میں اور پریا اپنے اپنے کمروں میں سوتے دکھائی دیئے تھے۔

میرے لئے ٹی وی اسکرین جادو کا گولہ تھا۔ قدیم زمانے میں اور آج ماہر اور بڑے پہنچے ہوئے جادوگر اور جادوگرنیاں جادو کے گولہ میں جو دیکھنا چاہتے تھے وہ دیکھ سکتے تھے۔ ان کا یہ کمال اور جادو صرف اس گولہ تک محدود تھا۔ اس سے آگے ان کے بس کی بات نہ تھی۔ مگر میں نے اسے جدید اور ترقی یافتہ شکل جو دی وہ یہ تھی کہ جو کچھ دیکھنا اور دکھانا چاہوں وہ نہ صرف جادو کا گولہ بلکہ ٹی وی اسکرین پر، پانی سے چھوٹے چھوٹے بھرے برتن، ندی، سمندر، دریا اور تالاب کی پرسکون سطح حتی کہ ایک گلاس پانی میں دیکھ اور دکھا سکتا تھا۔ وہ دنیا کے کسی کونے اور خطے میں ہی کیوں نہ ہوں۔

اس وقت بھی میں ٹی وی اسکرین پر کویتا کو دیکھ رہا تھا۔ ٹی وی پر جیسے اس کی فلم چل رہی ہو۔ اور براہ

راست دکھائی جارہی ہو وہ اس بات سے بے خبر تھی۔ مہیش لال کو رخصت کرنے کے بعد اس نے اپنی تجوری رقم رکھنے کے لئے کھولی تو اس میں نہ صرف چھوٹے بڑے نوٹوں کی گڈیاں بلکہ زیورات بھی رکھے ہوئے تھے۔ پھر تجوری بند کر کے کمرے میں وحشت واضطراب سے ٹہلتی رہی۔ وہ بڑی پریشان اور متفکر تھی اور اس کی آنکھوں میں سوچ بھی بھری ہوئی تھی۔ وہ جو کچھ سوچ رہی تھی اس کے چہرے اور آنکھوں سے صاف عیاں تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے رک کر اس نے ایک گلاس پانی پیا اور سامنے والے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

وہ اس کمرے میں بیٹھ کر عملیات کرتی تھی۔ اس کمرے میں ایک طرف قطار میں کوئی گیارہ عدد مورتیاں رکھی ہوئی تھیں جو ایک سائز کی اور مختلف شکل وصورت کی تھیں۔ ایک طرف کھوپڑیاں رکھی ہوئی تھیں وہ بھی گیارہ عدد تھیں۔ ان کے پاس دنیا بھر کی اور چھوٹی اور بڑی پڑیاں ایک بہت بڑے مٹکے میں بھرے ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سارے وہ لوازمات تھے جو جادو منتر میں کام آتے تھے۔ اس کے دائیں ہاتھ پر ایک درمیانہ سائز کی میز پر رکھی تھی جس پر فٹ بال سائز کا گولا رکھا تھا۔ وہ کمرے میں رکھی اکلوتی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ پھر اس نے ایک منتر پڑھ کر گولہ پر پھونکا۔ دوسرے لمحے گولے میں روشنی سی ہوئی۔ دوسرے لمحے اس گولے میں ایک منظر آیا جو میرے گھر کے کمرے کا تھا جس میں پریا گہری نیند سو رہی تھی۔ وہ چند لمحوں تک پریا کو دیکھتی رہی۔ اس کا خیال یہ تھا کہ یہ میرے کمرے، میرے بستر پر میرے ساتھ ہوگی اور ہم دونوں رات کو حسین اور رنگین بنا رہے ہوں گے۔

پھر اس نے منتر کے زور سے منظر بدلا۔ پھر جو منظر دکھائی دیا وہ پریتم کے کمرے کا تھا۔ پھر اسے پریتم دکھائی دیا جو پریا کے فراق میں جاگ رہا اور سرد آہیں بھر رہا تھا۔ وہ بڑی دیر تک پریتم کو محبت بھری نظروں سے محویت کے عالم میں دیکھتی رہی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ اسے ساری زندگی اسی طرح دیکھتی رہتی۔ پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر وہ منظر غائب کر دیا۔

پھر اپنے بیڈروم میں آ کر سونے کے لئے بستر پر دراز ہوگئی۔ پھر اس طرح سے کروٹیں بدلتی رہی جیسے دہکتے انگاروں پر لوٹتی رہی ہو۔ تھوڑی دیر تک اس کی یہی کیفیت رہی۔ پھر کچھ خیال آتے ہی بستر سے ہڑبڑا کر نکلی۔ پھر وہ دوسرے کمرے سے جا کر ایک مورتی لے آئی اور فرش پر رکھ کر اس کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر تک منتر پڑھ کر اس پر زور سے پھونک ماری۔ یہ مورتی جو بہ مشکل ڈیڑھ فٹ کی اور ایک گڑیا کے سائز کی جسامت کی تھی۔ چند لمحوں کے بعد وہ مورتی بڑی ہوتی گئی۔ پھر جب اس کا قد ایک عام عورت جتنا ہو گیا تو بڑھتا ہوا رک گیا۔ پھر اس کی جسامت بھی ایک چھریرے اور متناسب بدن کی عورت ہوگئی۔ پھر وہ واپس اسی کمرے میں گئی جس کمرے سے اس مورتی کو لائی تھی۔ اس کمرے میں ایک بہت بڑی الماری تھی۔ اس نے اس الماری کو کھولا۔ اس الماری کی سب سے اوپر والی دراز میں بڑی بڑی سات بوتلیں تھیں اور ان میں انسانی خون بھرا ہوا تھا۔ دوسری دراز میں سات عدد مرتبان تھے جن میں جوان مردوں کے سر رکھے ہوئے تھے۔ یہ ان مردوں کے سر تھے جنہوں نے اس سے شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ وہ کئی دنوں تک اس کے بستر کے ساتھی بنے رہے تھے۔ اس الماری میں دو

درازیں اور بھی تھیں۔ ان میں بہت ساری الم غلم چیزیں رکھی ہوئی تھیں جو عام قسم کے جادوگر اور شعبدہ با
کام میں لاتے تھے۔

خون کی بوتل نکالنے کے بعد الماری بند کر کے اپنے بیڈروم میں آئی۔ پھر وہ اس خون سے اس
مورتی کو نہلانے لگی جو اس وقت ایک انسان کے سائز میں تھی۔ اس نے بوتل کا کارک نکال کر اس کے منہ
سے خون آہستہ آہستہ سر پر ڈالنا شروع کیا اور ساتھ ساتھ منتر کا جاپ کرنے لگی تھی۔ ایک ایک قطرہ خون
سر سے لے کر انگ انگ اور پیروں میں جذب ہوتا رہا۔ ایک قطرہ خون بھی فرش پر نہیں گرا اور نہ ہی اس
نے ضائع ہونے دیا۔

کویتا نے اسے خون سے نہلانے کے بعد بوتل کا منہ بند کر کے اسے ایک طرف رکھ دیا۔ تھوڑی د
بعد اس مورتی میں زندگی کے آثار پیدا ہونے لگے۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہ ایک بدروح کی شکل میں موجو
تھی۔ کویتا نے پھر اس پر کوئی منتر پڑھ کر پھونک ماری۔ پھر اس بدروح نے دیکھتے ہی دیکھتے پریا کا روپ
دھار لیا۔ اس میں اور پریا میں کوئی فرق نہیں تھا۔ وہ ہو بہو پریا تھی۔

''سنو رکمنی!'' کویتا بڑے سپاٹ اور ہر قسم کے جذبات سے عاری لہجے میں بولی۔ ''میں نے تمہیں
آزادی اور ایک حسین عورت پریا کا یہ روپ اس لئے دیا ہے کہ میں جو کام اور ذمے داری تمہیں سونپ ر
ہوں اسے تم اچھی طرح سے انجام دوگی۔ میں تمہیں اس بڈھے اور بے وقوف مہیش لال کے پاس اس
بھیج رہی ہوں کہ اسے سات دن تک ہر طرح سے خوش کرتی اور اس کا خون پیتی رہو۔ پھر جب یہ بڈ
بیمار ہو جائے گا تو تم واپس آ جاؤ گی۔ پھر میں تمہیں آزادی دے دوں گی۔''

''جو حکم مہارانی۔'' رکمنی نے بڑے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔ ''اب میں نہ تو سرکشی کروں گی اور نہ آ
کی حکم عدولی...... میں نے جو غلطی کی میں اس پر نادم اور شرمسار ہوں۔ مجھے اس مہیش لال کے پاس کر
اور کس وقت جانا ہے۔''

''ابھی آج اور تھوڑی دیر بعد۔'' کویتا نے کہا۔ ''میں بھی پریا کا روپ دھار لوں۔ پھر دونوں سا
چلتے ہیں۔''

''کیا ہم دونوں مہیش لال کے پاس خوش کرنے جائیں گی؟'' رکمنی نے حیرت سے کہا۔

''نہیں...... تم مہیش لال کے پاس جاؤ گی اور میں پریتم کے پاس۔'' کویتا بولی۔

''آپ کو پریا کا روپ دھار کر پریتم کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے؟'' رکمنی نے کہا۔ ''آ
خود بھی تو بہت حسین ہیں اور یہ پریتم کون ہے......؟ کیا یہ کوئی نیا شکار ہے؟''

''اس لئے میں پریتم کے پاس جارہی ہوں کہ پریا بن کر اس کے ساتھ سات دنوں تک رہوں
کویتا کہنے لگی۔ ''یہ پریا کا پتی ہے۔ لیکن میرا دیرینہ سپنا ہے۔ وہ پریا سے بہت محبت کرتا ہے۔ میں کتنی
حسین بن کر اس کے سامنے کیوں نہ جاؤں۔ وہ پریا کی محبت سے دستبردار نہ ہوگا۔ وہ صرف اس صو
میں میرا ہو سکتا ہے کہ میں اس کا روزانہ خون پی کر اس پر منتر پھونکتی رہوں۔ مجھے یہ عمل سات دنوں تک

ہوگا۔ میں اس کے حصول کے لئے سات دن کیا سات برس تک بھی اس کا خون پی سکتی ہوں۔ میں اس کے بغیر اب نہیں رہ سکتی۔"

دوسرے لمحے کویتا، پریا کے روپ میں رکنی کے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ کویتا کے لئے کسی بھی روپ میں آجانا اور کسی کا روپ تبدیل کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ پریا خود بھی اسے اور رکنی کو دیکھتی تو دیکھتی رہ جاتی اور اس کی نظروں کو یقین نہیں آتا۔ وہ یہی سمجھتی کہ یہ دونوں اس کی ہمزاد یا جڑواں بہنیں ہیں۔ اس کا پتی پریتم ہی نہیں بلکہ ماں، باپ بھی دھوکا کھا جاتے۔ وہ جو خود اور رکنی پریا کے روپ میں آئی تھی۔ ذرہ برابر بھی ان میں فرق نہیں تھا۔ آواز اور لب ولہجہ تک پریا کا تھا۔ وہ ہر بات کا خیال رکھتی تھی کہ کہیں اس سے چوک نہ ہوجائے۔ کیوں کہ ذرا سی بھی غلطی سے سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

انسان کو مکھی، مچھر، جانور اور پرندوں کے قالب میں ڈھالنا اس کا ایک شوق ہی نہیں بلکہ جنون بھی تھا۔ وہ اپنے ان عاشقوں کو پرندے بنا چکی تھی۔ جنہوں نے اس سے شادی کرنے سے انکار کردیا تھا۔ کچھ کو تو کسی وجہ سے آزاد کردیا تھا۔ لیکن جو بہت ہی خوبصورت، جوان، دراز قد اور وجیہہ تھے انہیں طوطا بنا کر رکھا ہوا تھا۔ جب بھی اسے طلب اور ضرورت محسوس ہوتی اور اسے اس کے مطلب کا شکار نہ ملتا تو وہ ان میں سے کسی ایک کو شکار کرنے کے لئے ساری رات کے لئے انسان کے روپ میں لے آتی۔ پھر صبح ہوتے ہی اسے طوطا بنا کر پنجرے میں قید کردیتی۔

اس کی قید میں کل دو کبوتر اور پانچ طوطے تھے جو مختلف ممالک کے معلوم ہوتے تھے۔ ان کی جسامت اور رنگ و روپ بھی ایک دوسرے سے قطعی مختلف تھے۔ کوئی آسٹریلیا کا تھا تو کوئی افریقہ کا..... کوئی یورپی تو کوئی عربی نسل کا۔ یہ کوئی جانتا نہیں تھا کہ یہ جوان مرد ہیں۔ وہ انہیں خوب کھلاتی پلاتی اور ان کی صحت کا بڑا خیال بھی رکھتی تھی۔ جب ان میں سے کوئی انسانی روپ میں آتا تو وہ اس کے جادو کے زیر اثر ہوتا تھا اور ایک کٹھ پتلی ہوتا۔ اس کی ڈوریاں کویتا کے ہاتھ میں ہوتیں۔ اس لئے اس کے فرار ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

کویتا نے گھر سے نکلنے سے پہلے پھر جادو کے گولے پر منتر پڑھ کر پھونکا۔ اس نے پریا کو نیند کی حالت میں دیکھا۔ پھر اس نے ایک اور منتر پڑھا اور پھونک ماری۔ چند لمحوں کے بعد پریا ایک بدصورت عورت کے روپ میں آگئی۔ اس کا حلیہ اور جسامت بالکل ہی بدل گئی۔ اب وہ کہیں سے بھی پریا معلوم نہیں ہوتی تھی۔ کویتا نے جب پریا کو دوسرے روپ میں دیکھا تو گولے سے یہ منظر غائب کردیا۔ وہ بہت خوش اور سرشاری ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ میں جب اسے دیکھوں گا تو کوئی اور عورت سمجھ کر گھر سے نکال دوں گا اور پھر پریا جب اپنے پریتم اور والدین کے گھر جائے گی تو وہ اسے نہ صرف پہچاننے سے انکار کردیں گے بلکہ دھکے دے کر گھر سے نکال دیں گے۔ اس طرح کویتا کو پریتم اور پریا کے والدین پریا سمجھیں گے۔ اصل پریا لاکھ یقین دلائے اسے پریا نہیں مانا جائے گا اور جب پریا آئینے میں اپنی صورت دیکھے گی تو اسے یقین نہیں آئے گا۔ وہ سمجھ جائے گی کہ یہ کس کی حرکت ہے۔

کویتا نے رکنی سے کہا کہ وہ مہیش لال کے ہاں جائے۔ وہ ایک گھنٹے کے بعد پریتم کے پاس جائے گی۔ رکنی ایک لمحے میں مہیش لال کے گھر پہنچ گئی۔ مہیش لال کے آدمی گھر سے باہر چارپائی پر بیٹھے گپ شپ کررہے تھے۔ انہیں یقین نہیں تھا کہ پریا آسکتی ہے۔ کیوں کہ پریا نے انہیں بڑی چالاکی سے بے وقوف بنایا تھا اور چکمہ دے کر فرار ہوگئی تھی اور وہ ہاتھ ملتے رہ گئے تھے۔

انہوں نے اچانک پریا کو نظروں کے سامنے پایا تو انہیں یقین نہیں آیا۔ وہ ہڑبڑا کر چارپائی سے نیچے اتر آئے۔ وہ ایسی حشر سامانیوں سے آئی تھی کہ وہ چند لمحوں کے لئے مبہوت ہوگئے تھے۔ ان میں سے ایک نے دل پر پتھر رکھ کر اسے مہیش لال کے کمرے میں پہنچایا جو کمرے میں وحشت اور انتظار کے اذیت ناک کرب سے ٹہل رہا تھا۔

وہ دروازہ بند کرکے وارفتگی سے رکنی کی طرف بڑھا۔ پھر کچھ خیال آتے ہی ٹھٹک کے رک گیا۔ پھر اس نے رکنی کو اوپر سے نیچے تک دیکھا اور پھر بولا۔ "پریا یہ بتاؤ کہ تم نے مجھے جان سے کس لیے مارنے کی کوشش کی.....؟ میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا.....؟"

"اس لیے کہ آپ نے شادی کے دوسرے ہی دن مجھے اغوا کرلیا..... یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں کسی کی ہوچکی ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "میں نے آپ کو جان سے مارنا نہیں چاہا تھا بلکہ اپنی عزت بچائی تھی۔ ایسا نہ کرتی تو آپ مجھے ایک ناگ کی طرح ڈس لیتے..... کیا ایک عورت سے ایسا سلوک کیا جاتا ہے؟"

"لیکن تم یہ بھول رہی ہو کہ میں نے پہلے شادی کا پیغام دیا تھا لیکن تمہارے باپ اور تم نے میرا رشتہ ٹھکرا دیا تھا۔" مہیش لال نے تلخ لہجے میں کہا۔ "تم نے ایک معمولی آدمی کو مجھ پر ترجیح دی اور اس سے شادی کرلی۔ وہ تمہیں کیا دے سکتا تھا جو میں دے سکتا ہوں۔"

"میں چوں کہ اس سے محبت کرتی تھی اس لئے میں نے اس سے شادی کرلی۔" وہ کہنے لگی۔ "آپ میں ایک سب سے بڑی خرابی یہ تھی اور اب بھی ہے کہ آپ نے بہت ساری لڑکیوں کی عزت کو داغ دار کیا اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ آپ بھی میرے ساتھ ایسا ہی کرتے۔ دل بھرنے کے بعد دودھ میں گری مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیتے۔ ایک عورت اس بات کو بالکل بھی پسند نہیں کرتی کہ اس کی تذلیل و توہین اور اس کی بے حرمتی کی جائے۔"

"لیکن میں چوں کہ تم سے سچی محبت کرنے لگا تھا اس لیے تم سے شادی کرکے شریفانہ زندگی گزارنے کا خواہش مند تھا۔" مہیش لال نے کہا۔ "لیکن تم نے شادی کرکے میرا دل توڑ دیا اور پھر مجھے زخمی اور بے ہوش کرکے میری تین لاکھ کی رقم چرا کر بھاگ گئیں۔"

"میں اب آپ کے سامنے ہوں۔" وہ بولی۔ "ایک ان جانی طاقت مجھے آپ کے پاس کشاں کشاں لے آئی ہے۔ اب آپ کیا چاہتے ہیں؟ میں آپ کو یہ بھی بتادوں کہ مجھے آپ سے محبت ہوگئی ہے۔ میرے دل کے ہر کونے میں کسی اور کے خلاف نفرت بھرگئی ہے۔ یہ آپ نے کیا جادو کردیا ہے؟"

مہیش لال ایک دم سے خوش ہوگیا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ کارنامہ کویتا نے انجام دیا ہے۔ مہیش لال اس

کے قریب ہو کر اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا اور اس کے شانے مضبوطی سے تھام لیے۔ اسے یقین نہیں آیا تھا کہ یہ پریا ہی ہے۔ اس کے دل کی دھڑکن ہے۔ جس کے لیے وہ پاگل ہو رہا ہے اسے یہ سب کچھ کسی خواب کی طرح لگ رہا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی اور رگوں میں خون کی حرارت بڑھ گئی۔

"میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" مہیش لال نے کہا۔ "بہت عیش کر لیے۔ میں تمہیں وچن دیتا ہوں کہ تم سے شادی کرنے کے بعد ساری زندگی تمہارا غلام بن کر رہوں گا۔ تمہیں ایک رانی کی طرح رکھوں گا۔"

"لیکن پریتم میرا پتی ہے اور مجھ سے وہ بہت محبت کرتا ہے۔" اس نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔ "وہ کسی صورت میں مجھے طلاق نہیں دے گا نہ چھوڑے گا۔"

"اگر میں اسے دو، تین لاکھ روپے دے کر کہوں کہ وہ تم سے دستبردار ہو جائے اور طلاق دے دے تو کیا وہ تیار ہو جائے گا؟"

"نہیں......" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس کے نزدیک مجھ سے بڑی دولت کوئی نہیں ہے۔ آپ دس لاکھ روپے دیں گے تو بھی وہ نہیں مانے گا؟"

"پھر اس سے نجات پانے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟" مہیش لال نے الجھ کر کہا۔ "تمہارے دماغ میں کوئی بات آ رہی ہے تو بتاؤ......؟"

"میرے پتی سے چھٹکارا پانے کی ایک ہی صورت ہے۔" وہ مہیش لال کے گلے میں اپنی مرمریں بانہیں حمائل کر کے بولی اور اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔

"کون سی صورت میری جان!" مہیش لال بے تابی سے بولا۔ "جلدی سے بتاؤ۔"

"وہ صورت یہ ہے کہ تم مجھے بیوہ کر دو۔" اس نے بڑی سنجیدگی سے ایسے لہجے میں کہا کہ مہیش لال چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

"کیا......؟" مہیش لال اچھل پڑا۔ "کیا یہ بات تم دل سے کہہ رہی ہو......؟ مذاق تو نہیں کر رہی ہو؟" وہ بڑا ششدر ہو رہا تھا۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔ یہ مذاق نہیں ہے۔" اس نے حیرانی سے کہا۔ "تمہیں میری بات کا یقین کیوں نہیں آ رہا ہے؟"

"اس لیے کہ تم اس سے محبت کرتی ہو...... اور اس کی پتنی ہو۔" مہیش لال بولا۔ "یہ تم کیسے چاہو گی کہ میں اسے قتل کر دوں۔"

"میں پہلے محبت کرتی تھی لیکن اب میرے دل میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے بلکہ نفرت بھر گئی ہے۔ یہ بات میں ابھی کہہ چکی ہوں۔" وہ کہنے لگی۔ "چوں کہ وہ مجھے طلاق نہیں دے گا اور تم طلاق کے بغیر مجھ سے شادی نہیں کر سکتے۔" وہ مہیش لال کو تم سے مخاطب کئے جا رہی تھی۔ "کیوں کہ تم بہت بڑے اور مشہور آدمی ہو۔ اسے قتل کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے اور پھر اسے قتل کرنا تمہارے لیے کون سا مشکل ہے۔"

"میں اپنے ایک آدمی جگو سے کہہ دوں گا۔" مہیش لال کہنے لگا۔ "جگو نہ صرف پیشہ ور قاتل ہے بلکہ بڑا خطرناک آدمی ہے۔ وہ اب تک میرے اشارے پر دس قتل کر چکا ہے۔"

"نہیں...... اسے جگو نہیں تم قتل کرو گے۔" وہ بولی۔ "کیوں کہ اس سے جو مجھے مسرت ہو گی تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے......"

"میری جان! تمہارا حکم سر آنکھوں پر......" مہیش لال سرشاری سے بولا۔ "میں تمہاری کوئی بات ٹال نہیں سکتا۔ میں تمہارے لیے جان بھی دے سکتا ہوں۔"

"مجھے تمہاری جان کی نہیں بلکہ پریتم کی جان کی ضرورت ہے۔" وہ کہنے لگی۔ "کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ تم دن دہاڑے دنیا والوں کے سامنے گولی مار کر اسے ہلاک کر دو...... اس طرح میں دنیا والوں سے کہہ سکوں گی کہ میرے عاشق نے میری لاج رکھ لی۔"

"کیوں نہیں......" مہیش لال نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے بازوؤں میں بھر لیا۔ "تم ایک پریتم کا کہہ رہی ہو۔ میں اس کے گھر والوں کو بھی گولیوں سے بھون سکتا ہوں۔ میں کل ہی پریتم کا قصہ تمام کر دوں گا۔ تم کسی بات کی چنتا نہ کرو۔"

"اگر تمہیں پولیس والوں نے پریتم کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا تو میرا کیا ہو گا؟" وہ بولی۔ "یہ بات تم نے سوچی... ؟"

"پولیس... " وہ قہقہہ مار کر بڑے زور سے ہنسا۔ "میں دس قتل بھی کر دوں تو پولیس نہ تو میرا بال بیکا کر سکتی ہے اور نہ ہی مجھ پر ہاتھ ڈال سکتی ہے۔"

"لیکن... یہ قتل دنیا والوں کے سامنے ہو گا۔ لوگ تمہارے خلاف گواہی دیں گے۔ پھر تم گرفتار کر لیے جاؤ گے؟" اس نے خوف و خدشے کا اظہار کیا۔

"پولیس میرے بجائے کسی اور کو پریتم کے قتل کے الزام میں گرفتار کر کے اسے جیل میں ڈال دے گی۔" مہیش لال نے اسے دلاسا دیا۔ "تم کسی بات کی چنتا نہ کرو۔ میں سب کچھ ٹھیک کر لوں گا۔ تمہارے پتی کو خون میں نہلا دوں گا۔"

مہیش لال نے اتنا کہہ کر رکمنی کو اپنی گود میں اٹھا لیا اور اسے لے کر بستر کی طرف بڑھا۔ میں نے جھٹ سے چینل بدلا۔ میں وہ مناظر دیکھنا نہیں چاہتا تھا اور پھر کویتا اب پریتم سے ملنے پریا کے روپ میں جانے والی تھی۔ اس نے ایک دلہن کا سا بناؤ سنگھار کیا۔ وہ پریتم کو کب کا طوطا یا کبوتر بنا کر رکھ دیتی۔ اگر اس کے گلے میں وہ لاکٹ نہ ہوتا جو اسے سادھو نے دیا تھا جس نے ایک گنڈا پریا کو دیا تھا۔ دراصل وہ سادھو بہت مہان تھا۔ اس کے علم میں یہ بات تھی کہ کویتا کس قسم کی عورت ہے۔ وہ کویتا کے جادو کا توڑ اس صورت میں کر سکتا تھا کہ اس کا جادو کسی پر نہ چلے۔ اس کے بس میں نہیں تھا کہ وہ ان نوجوانوں کو جنہیں کویتا نے پرندے بنا رکھا ہے انہیں انسانی حالت میں لا کر آزاد کر دے۔ لیکن وہ جو گنڈا یا کوئی چیز جس پر منتر پڑھ کر پھونک دیتا تھا اس پر کویتا کا بڑے سے بڑا جادو بھی اثر نہیں کرتا تھا۔ اب وہ اس لئے جا رہی تھی کہ پریتم کے گلے سے کسی

نہ کسی طرح وہ لاکٹ نکال کر پھینک دے اور پھر اسے کوئی پرندہ بنا کر لے آئے۔ اسے پریا سے سخت نفرت تھی۔ کیوں کہ پریتم پر پریا کے حسن کا جادو چڑھا ہوا تھا۔ اس لیے اس نے اپنے جادو کے زور سے پریا کو بدصورت بنا کر دل کی بھڑاس نکالی تھی۔ جب کہ میں پریا کو پھر سے اس کی اصلی حالت میں لا چکا تھا۔ کویتا نے آئینے میں ناقدانہ نظروں سے اپنا چہرہ اور بناؤ سنگھار دیکھا اور پریتم کے گھر جا پہنچی۔

اس وقت پریتم اپنے گھر میں اکیلا تھا۔ اتنی رات بیت جانے پر بھی وہ جاگ رہا تھا۔ اس کے دل میں محبت کا درد بھی جاگ رہا تھا۔ وہ چشم تصور میں پریا کو دیکھ رہا تھا۔ سہاگ رات کو پریا جب دلہن بن کر اس کی زندگی میں سدا کے لئے آئی تھی۔ لیکن بہار کے جھونکے کی طرح اس کے جسم کو مہکا کر اور رات کو یادگار بنا کر چلی گئی تھی۔ اسے ڈاکو اغوا کر کے لے گئے تھے۔ کون ڈاکو تھے اور کہاں سے آئے تھے وہ نہیں جانتا تھا۔ اگر وہ جانتا ہوتا تو اپنی جان پر کھیل کر پریا کو وہاں سے نکال لاتا۔ ویسے اس نے بہت کھوج لگایا تھا لیکن اسے پریا کا کچھ پتا نہ چل سکا تھا۔ پھر بسنتی نے اسے بھگوان کی سوگند دے کر جو کچھ بتایا تھا اس نے اس بات کو غلط ثابت کر دیا تھا کہ پریا اپنے کسی آشنا کے ساتھ زیورات سمیت فرار ہو گئی ہے۔ جب کہ سارے زیورات میز پر موجود تھے۔ وہ انہیں اتار کر نہانے گئی تھی۔ لیکن اب وہ کویتا اور مہیش لال سے ٹکر نہیں لے سکتا تھا۔ وہ کئی دنوں سے سوچ رہا تھا کہ پریا کو کہاں جا کر تلاش کرے۔ کیوں کہ اسے بسنتی نے بتایا تھا کہ وہ دوبارہ مہیش لال کے چنگل سے نکل کر کسی نامعلوم جگہ روپوش ہے۔ پریا کہاں روپوش ہے وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی ہے۔

پریتم نے محسوس کیا کہ کوئی دروازے پر مسلسل دستک دے رہا ہے۔ وہ ہڑبڑا کر سوچوں کی دنیا سے نکل آیا۔ وہ دل میں حیران ہوا کہ اس وقت کون ہو سکتا ہے۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو اسے یقین نہ آیا۔ اس نے سمجھا کہ یہ اس کا واہمہ ہے۔ اس کی پریا، اس کی محبت اس کی جان تمنا اور جیون ساتھی پریا یہ دلہن کے روپ میں سامنے کھڑی تھی۔ وہ جیسے ہی اندر آئی پریتم نے دروازہ بند کر کے اسے بازوؤں کی گرفت میں لے لیا۔ پھر وہ تھوڑی دیر کے لئے دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد پریتم نے اسے بازوؤں کے حصار سے نکالا اور پھر اس کا نرم و نازک اور سڈول ہاتھ پکڑ کر اسے بستر پر لا کر بٹھایا۔ پھر اس نے کویتا کی بڑی بڑی خوبصورت اور سیاہ آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ”پریا میری جان! یہ کیا ہوا تھا؟“

پھر کویتا نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اس کے بالوں کو سہلایا۔ پھر اس کے کندھے پر اپنا سر رکھ دیا۔ اس کے سینے کے گھنگھریالے سیاہ گھنے بالوں میں اپنی مخروطی انگلیاں پھیرنے لگی۔ پھر بتانے لگی کہ کس طرح اسے مہیش لال کے غنڈوں نے اغوا کر کے حویلی پہنچایا۔ پھر کس طرح وہاں سے مہیش لال کو زخمی کر کے وہ بھاگی۔ پھر ایک گاؤں میں پہنچ کر ایک بڑھیا کے ہاں پناہ لی۔ وہاں ڈاکو اس کی تلاش میں آئے تو فرار ہو کر پھر وہ یہاں آ گئی۔ وہ ڈاکو مہیش لال کے تھے۔ پھر وہ ایک دن ایک گھر میں روپوش رہی۔ یہ گھر خالی تھا۔ اب وہ ملنے چلی آئی ہے۔ اس سے رہا نہ گیا اور اس نے مہیش لال کی کوئی پرواہ نہیں کی۔

میں نے تھوڑی دیر بعد ٹی وی آف کر دیا۔ کیوں کہ دونوں جذبات کی رو میں بہہ کر دور نکل گئے تھے میں چاہتا تو انہیں اس سے باز رکھ سکتا تھا۔ لیکن دانستہ کسی وجہ سے میں خاموش رہا۔ میں نے صبح کا اجالا ہونے سے پہلے ٹی وی آن کر کے منتر پڑھ کر پھونکا۔ وہ دونوں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے ساری رات جاگ کر گزاری تھی۔ ان کی آنکھوں میں نیند کا خمار چھایا ہوا تھا۔ دل و دماغ پر ایک نشہ اور سرشاری دونوں ہی محسوس کر رہے تھے۔ کویتا اس پر مہربان ہو کر بہت ہی خوش تھی۔

”پریا......!“ یک لخت پریتم چونک کر بولا۔ ”میں نے تم میں ایک عجیب سی بات محسوس کی ہے۔ شاید یہ میرا واہمہ ہو؟“

”کون سی عجیب سی بات......؟“ کویتا نے بھی چونک کر ساکت پلکوں سے اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہوا کہ تم پریا نہیں بلکہ کوئی اور ہو۔“ پریتم نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا۔

”میں پریا نہیں تو کیا اس کی آتما یا ہمزاد ہوں؟“ کویتا کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ ”یہ تم بہکی بہکی باتیں کیوں کرنے لگے ہو؟“

”میں بہکی بہکی نہیں بلکہ ہوش کی باتیں کر رہا ہوں۔“ پریتم نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ ”کہیں ایسا تو نہیں کہ تم کویتا ہو اور تم نے پریا کا روپ دھار لیا ہو......؟ کیوں کہ تمہارے بدن کی خوشبو اور پریا کے بدن کی خوشبو میں بہت فرق ہے۔“

”میں کویتا نہیں ہوں بلکہ پریا ہوں۔“ کویتا نے تکرار کی۔ ”چوں کہ تم نے پی رکھی ہے اس لیے ایسا محسوس ہو رہا ہے۔ ہر عورت کے بدن میں ایک ہی خوشبو ہوتی ہے جو اس کے بالوں سے بھی پھوٹتی ہے۔ تمہیں ساری رات اس کا خیال نہیں آیا۔ یہ اچانک احساس کیوں اور کس لیے......؟ یقین کرو...... میں پریا ہوں۔ تم یہ خیال اور وہم دل سے نکال پھینکو۔“

”مجھے سادھو مہاراج کی آواز کانوں میں گونجتی محسوس ہو رہی ہے۔“ پریتم کہنے لگا۔ ”اس وقت بھی میں نے ان کی آواز سنی جب تم نے مجھے جذبات کے اندھے جنون میں بہا دیا تھا۔ ان کی آواز جو میں نے سنی تھی وہ یہ تھی کہ ہوش میں آؤ۔ یہ پریا نہیں ہے، سراب ہے، فریب ہے، لیکن مجھے کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ میں نے اسے اپنی سماعت کا فتور سمجھ کر جھٹک دیا تھا۔ دراصل ایک روز میری ملاقات سادھو مہاراج سے ہوئی تھی۔ سادھو مہاراج کا بھوک سے برا حال ہو رہا تھا۔ میں نے انہیں بھوجن کرایا تھا جس سے انہوں نے خوش ہو کر مجھ سے کہا تھا کہ...... تم بہت اچھے دل کے ہو۔ بہت ہی خوبصورت ہو، کسی دیس کے راج کمار کی طرح...... تم کویتا جادوگرنی کے سائے سے بھی دور رہنا۔ وہ تمہاری پریا کو تم سے محروم کر دینے اور تمہیں اپنا بنانے کی سوچ رہی ہے۔ میں نے سادھو مہاراج سے کہا کہ میں اس ڈائن سے کیسے بچ سکتا ہوں۔ کیوں کہ وہ ایک مرتبہ وہ مجھے اپنی میلی نگاہوں سے ان جانے پیغام دے چکی ہے۔ سادھو مہاراج نے مجھے دلاسا دیا

کہ تم اس کی چتا نہ کرو۔ میں تمہیں پیتل کا ایک لاکٹ دیتا ہوں۔ اسے ہر وقت گلے میں پہنے رہنا۔ دیکھو یہ ہے وہ لاکٹ۔" پریتم نے گلے کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن وہ لاکٹ نہیں تھا۔ پھر وہ سراسیمہ سا ہو کر لاکٹ ڈھونڈنے لگا۔ "رات تو میرے گلے میں ہی تھا۔ اب کہاں گیا......؟ میں نے اتارا تو نہیں تھا۔"

"یہ رہا تمہارا وہ لاکٹ......؟" کویتا نے اپنے گریبان سے لاکٹ نکال کر اس کی نظروں کے سامنے لہرایا اور اس کے ہونٹوں پر ایک مغرورانہ مسکراہٹ ابھر آئی اور آنکھوں میں وحشیانہ چمک کوند گئی۔ "اس سادھو نے جو کچھ کہا وہ بالکل ٹھیک تھا...... وہ کمینہ میرا ازلی دشمن ہے۔ تم ٹھیک سمجھے۔ لیکن تمہیں بہت دیر ہو چکی ہے۔ میں واقعی کویتا ہوں۔ تمہاری پریا نہیں ہوں۔ اب تم میرے ہو چکے ہو۔"

"نہیں...... نہیں...... میں کبھی تمہارا نہیں ہو سکتا اور نہ ہی ہوؤں گا۔" پریتم نے بدحواس ہو کر کہا۔ میری پریا کہاں ہے؟ بتاؤ...... وہ کہاں ہے؟"

"اب پریا تمہاری بیوی نہیں بلکہ میں تمہاری بیوی ہوں۔" کویتا نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "میں نے کیا اپنا سب کچھ تمہیں سونپ نہیں دیا؟"

"یہ بتاؤ مکہ تم نے پریا کا روپ کیوں اور کس لیے بھرا......؟" پریتم نے تیز لہجے میں کہا۔ "تم میرے پیچھے کس لیے پڑی ہوئی ہو؟"

"اس لیے کہ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔" کویتا نے جواب دیا۔ "میں تمہیں ہمیشہ کے لئے اپنانا چاہتی ہوں۔ اب تم پریا کو ہمیشہ کے لئے بھول جاؤ۔"

"نہیں...... میں تم سے محبت نہیں کر سکتا؟" پریتم ہذیانی لہجے میں بولا۔ "وہ میری آتما ہے۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ ہم دونوں کی محبت امر ہے۔"

"اب تمہاری پریا ایک بدصورت عورت بن چکی ہے۔" کویتا استہزائیہ لہجے میں بولی۔ "تم اس سے محبت کرنا تو کیا اس کی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرو گے۔"

"وہ بہت حسین ہے تم اس کے پیر کی جوتی بھی نہیں ہو......" پریتم دہاڑا۔ "اس کا حسن کوئی نہیں چھین سکتا......؟"

"میں نے اسے دنیا کی بدصورت ترین عورت بنا دیا ہے۔" کویتا نے کہا۔ "جب وہ تمہاری نظروں کے سامنے آئے گی تم اسے دیکھ کر منہ پھیر لو گے۔"

"تم جھوٹ بول رہی ہو......" پریتم نے تکرار کی۔ "ایک خوبصورت عورت کو تم بدصورت کیسے بنا سکتی ہو، یہ ناممکن ہے۔"

"مجھے کیا ضرورت پڑی کہ میں تم سے غلط بیانی کروں۔" کویتا نے جواب دیا۔ "تم جانتے ہو کہ میں ایک جادوگرنی ہوں۔ میں بہت کچھ کر سکتی ہوں۔ تمہیں میری بات کا یقین نہیں آیا ہے۔ لو میں بتاتی ہوں اور دکھاتی ہوں کہ میں نے تمہاری پریا کو کیسا بنا دیا ہے، یہ دیکھو!"

اس نے ایک منتر پڑھ کر اپنے آپ پر پھونکا۔ چند لمحوں کے بعد وہ ایک بدصورت عورت بن گئی۔

ایسی ہی بدصورت عورت اس نے پریا کو رات کے وقت نیند کی حالت میں بنا دیا تھا۔ پریتم اسے دیکھ کر بھونچکا اور خوف زدہ سا ہو گیا۔ اسے ایسی گھن اور نفرت سی محسوس ہوئی کہ اس نے منہ پھیر لیا۔ اگلے لمحے وہ پھر پریا کے اصل روپ میں آ گئی اور بولی۔ "پریتم! تم نے دیکھ لیا نا میرے جادو کا کمال......"

"ہاں...... ہاں...... دیکھ لیا۔" وہ نفرت اور غصے بھرے لہجے میں بولا۔ "لیکن میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تم میری پریا کو اس کی اصلی حالت میں لے آؤ۔ تم لاکھ پریا سے حسین بن جاؤ میں تم سے کبھی محبت نہیں کر سکتا۔ پریا میری محبت اور آتما ہے تم اسے چھین نہیں سکتی ہو۔ تم ایک بدکردار عورت ہو۔ بدچلن ہو، سادھو مہاراج نے مجھے بتایا تھا کہ تمہارا کام جوانوں سے دل بہلا کر انہیں آلودہ کرنا ہے۔ میں ایسی چڑیل عورت کے ساتھ اپنی زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا...... مجھے میری پریا چاہیے اور کوئی عورت نہیں چاہے وہ دنیا کی حسین ترین عورت ہی کیوں نہ ہو!"

"پریتم! تم نے میری ذات پر رکیک قسم کے جملے کہہ کر میری توہین کی ہے۔ مجھے ذلیل کیا ہے۔" کویتا بولی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ "لیکن اس کے باوجود میرے دل میں تمہارے لیے جو محبت موجود ہے تم اس کی حد کا اندازہ نہیں کر سکتے...... لیکن میں تمہیں یہ بتا دوں کہ تمہاری پریا کیسی عورت ہے۔ وہ اس وقت کہاں ہے۔ دراصل اس کے مہیش لال سے تعلقات تھے۔ وہ اس سے چوری چھپے راتوں کو ملتی تھی۔ اس نے محض دولت کی خاطر تمہیں چھوڑ دیا۔ وہ تم سے محبت ڈھونگ رچا کر ملتی تھی۔ شادی کی پہلی رات منانے کے بعد وہ مہیش لال کی حویلی پہنچ گئی۔ اس نے تم سے شادی اس لیے کی تھی کہ اپنا وچن پورا کر لے اور تمہیں خوش کرے۔ اس نے تمہیں اپنا سب کچھ سونپ دیا تھا۔ اسے اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ تم اس کے خوبصورت بدن اور جوانی سے پیار کرتے ہو، اس کی آتما سے نہیں۔ وہ کہیں نہیں گئی۔ وہ اس وقت مہیش لال کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہی ہے۔"

"یہ جھوٹ ہے...... سراسر بہتان ہے کمینی عورت۔" پریتم ہذیانی لہجے میں چیخ کر بولا۔ "مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرو۔"

"اگر میں تمہیں اس کی بدکاری اور بدچلنی کا ثبوت پیش کر دوں تو کیا تم میرے ساتھ زندگی گزارنا پسند کرو گے؟" کویتا نے پوچھا۔

"ہاں...... میں تم سے شادی کر لوں گا۔" پریتم نے اثباتی انداز میں سر ہلا دیا۔ "لیکن مجھے تمہاری بات کا یقین نہیں آ رہا ہے؟"

"تم ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ چلو۔" کویتا بولی۔ "میں تمہیں دکھاتی ہوں کہ وہ مہیش لال کے ساتھ موجود ہے۔"

کویتا اسے اپنے ہم راہ لے کر مہیش لال کے ہاں پہنچی۔ اس وقت مہیش لال کے آدمی گہری نیند سو رہے تھے۔ کویتا کے لئے اندر جانا کچھ مشکل نہ تھا۔ پھر اس نے پریتم کو اس کمرے کی کھڑکی کے باہر کھڑا کر دیا تھا جس میں رکمنی پریا کے روپ میں مہیش لال کے ساتھ موجود تھی۔ اس نے راستے میں پریتم سے یہ وعدہ لیا تھا

کہ وہ پریا اور مہیش لال کو ساتھ دیکھ کر خاموش رہے گا۔ شور نہیں مچائے گا۔ وہاں سے خاموش چلا آئے گا۔ اسے پریا سے بے وفائی اور بدکاری کا بدلہ لینا ہے تو کسی اور وقت پر۔ وہ اس کی ہر طرح سے مدد کرے گی۔

اس نے پریا کو مہیش لال کے ساتھ جس حالت میں دیکھا وہ اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ اس کی پریا اس کی محبت اور اس کا سپنا ایسی بدکار اور بدچلن ہے۔ فاحشہ ہے اور پھر سب سے زیادہ دکھ اسے اس بات سے ہوا تھا کہ اس وقت بھی رکمنی مہیش لال سے پریتم کو قتل کرنے کے موضوع پر بات کر رہی تھی۔ وہ مہیش لال سے کہہ رہی تھی کہ تم پریتم کو قتل کردو گے تو ہمارے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ دور ہو جائے گی۔

پریتم کے دل میں تو آیا کہ وہ اسی وقت کمرے میں گھس کر پریا کو گلا گھونٹ کر جان سے مار دے۔ کویتا نے اسے باز رکھا اور اسے گھر سے باہر لے آئی۔ پریتم اندر ہی اندر نفرت اور غصے سے کھول رہا تھا اور اس کی رگوں میں لہو ابلنے لگا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

”تم نے کہا تھا کہ میں نے پریا کو دنیا کی بدصورت عورت بنا دیا ہے۔ وہ چڑیل کی طرح ہوگئی ہے۔“ پریتم نے سینے میں پھولتی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا۔ ”اسے دنیا کا کوئی مرد بھی دیکھنا پسند نہیں کرے گا۔ لیکن وہ ویسی کی ویسی ہی حسین ہے۔ اس میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا۔“

”ہاں میں نے یہ اس لیے کہا تھا کہ تم اس کا خیال دل سے نکال دو۔“ کویتا بولی۔ ”میں ایسا کرسکتی ہوں، تم نے مجھے اس روپ میں بھی دیکھا نا...... میں نے جو تمہیں دکھایا تھا۔ میں جب اور جس وقت چاہوں اسے ایک چڑیل کی طرح بنا سکتی ہوں۔ یہ میرے لیے کچھ مشکل نہیں ہے۔“

”تم اسے ابھی اور اسی وقت چڑیل بنا دو تاکہ مہیش لال اسے دھکے دے کر گھر سے نکال دے۔“ پریتم نے غصے اور نفرت سے کہا۔

”ابھی نہیں......“ کویتا مسکرائی اور چلتے چلتے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ ”یہ میں اسی وقت کروں گی جب تم مجھ سے محبت کرو۔“

”اب میرے دل کے کسی کونے میں پریا کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔“ پریتم کہنے لگا۔ اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ ”اب اس سے محبت کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ میرے جیون کی دشمن بن چکی ہے۔ مجھے مہیش لال کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتار دینا چاہتی ہے۔ میں ایک ایسی فاحشہ سے کیسے محبت کرسکتا ہوں۔ اس نے دولت کی خاطر نہ صرف محبت بلکہ اپنا جسم اور اپنی آتما بھی بیچ دی ہے۔ وہ کمینی، بدذات اور طوائف ہے۔“

”اچھا ہوا تمہیں اس کی بدکاری کا ثبوت مل گیا اور تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ وہ کس باطن کی ہے۔“ کویتا نے اس کے زخموں پر جیسے نمک چھڑکا۔ ”اس نے نہ تو تمہاری محبت کی قدر کی اور نہ ہی تمہاری خوبصورتی کی...... اسے صرف دولت کی ہوس تھی۔“

”لیکن تمہارے بارے میں سادھو مہاراج نے جو کچھ کہا اس میں کتنی سچائی ہے؟“ پریتم نے

پوچھا۔ ”کیا تم واقعی ایسی ہی عورت ہو......؟“

”اس کمینے سادھو نے میرے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس میں ذرہ برابر بھی سچائی نہیں ہے۔“ کویتا بولی۔ ”بات دراصل اتنی سی ہے کہ وہ میری ماں پر عاشق ہوگیا تھا۔ ان دنوں میرے باپ نے دنیا کا سب سے بڑا جادوگر بننے کے لئے ایک بہت ہی خطرناک عمل کیا۔ وہ عمل الٹ ہوگیا اور اس نے اس کی جان لے لی۔ باپ کی موت کے بعد اس سادھو نے میری ماں کو شادی کی پیش کش کی۔ وہ بہت خوبصورت تھا اور میری ماں سے محبت کرتا تھا۔ اس لیے میری ماں کے دل میں اس کے لئے نرم گوشہ تھا۔ ماں نے اس سے شادی کرلی۔ وہ کوئی تین برس تک میرا سوتیلا باپ رہا۔ میری ماں ایک روز ہیضہ کی وبا کی نذر ہوگئی۔ پھر اس نے دو برس کے بعد مجھ سے شادی کرنا چاہی۔ میں نے نہ صرف اسے دھتکار دیا بلکہ گھر سے بھی نکال دیا۔ پھر وہ میری عزت کے درپے ہوگیا اور آج بھی ہے۔ اس لیے وہ مجھے بدنام کرتا پھر رہا ہے۔ آج تک میری زندگی میں کوئی مرد نہیں آیا اور میں آج بھی ایک باعزت لڑکی ہوں۔ میں نے اس لیے اب تک شادی نہیں کی کہ مجھے اپنی پسند کا مرد نہیں ملا۔ تم پہلے مرد ہو جو مجھے پسند آئے۔ سادھو نے اپنا یہ روپ اس لیے دھارا ہوا ہے کہ وہ سیدھی سادی لڑکیوں اور عورتوں کو فریب دے کر فائدہ اٹھائے۔ اس کے ظاہر پر نہ جاؤ۔ وہ بڑا ہی بدکار اور سیاہ کار مرد ہے۔ تم اس کے سائے سے بھی بچ کر رہنا۔“

کویتا باتوں باتوں میں اسے اپنے گھر لے آئی۔ پریتم نے کہا۔ ”تم اپنے اصل روپ میں آجاؤ مجھے پریا کا یہ روپ بالکل بھی پسند نہیں۔“

کویتا اپنے روپ میں آگئی۔ پریتم کو اس کی باتوں پر یقین آگیا۔ ابھی صبح ہونے میں بہت دیر تھی۔ وہ پریتم پر ایسی مہربان ہوئی کہ اسے گھر جانے کا خیال ہی نہیں رہا۔ صبح جب وہ سرشار ہو کر جانے لگا تو کویتا اسے روک لیا۔ ”اب تم نہ جاؤ...... میرے پتی بن کر رہو۔“

”اگر ایسی بات ہے تو میں گھر جا کر اپنے کپڑے وغیرہ لیتا آؤں۔“ پریتم نے بستر سے نکل کر کہا۔ ”میں گھنٹے دو ایک گھنٹے میں واپس آتا ہوں۔“

”نہیں...... نہیں...... تم گھر سے باہر مت جانا۔“ کویتا نے بھی بستر سے نکل کر کہا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”میں تمہیں جانے نہیں دوں گی۔ تم رات کو جانا۔“

”ابھی جانے میں کیا حرج ہے؟“ پریتم نے کہا۔ ”گھر کھلا پڑا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کچھ چوری ہو جائے۔ میں رات اسے مقفل کرنا بھول گیا تھا۔“

”تمہارا اس وقت جانا خطرے سے خالی نہیں ہے۔“ کویتا بولی۔ ”مہیش لال تمہارے خون کا پیاسا ہو رہا ہے۔ وہ تمہیں دیکھتے ہی شوٹ کر دے گا۔“

”مجھے تو اس بات کا خیال ہی نہیں رہا۔“ پریتم چونک کر بولا۔ ”یہ تم نے اچھا کیا جو یاد دلا دیا۔ وہ واقعی میرے خون کا پیاسا ہو رہا ہے۔“

اس نے پریتم کو بستر پر بٹھا دیا اور بولی۔ ”دن کے بارہ بج رہے ہیں۔ تم یہاں بیٹھو۔ میں ناشتا بنا کر

لاتی ہوں۔ مجھے بھی بھوک لگ رہی ہے۔"

تھوڑی دیر بعد وہ بدحواس ہو کر کمرے میں آئی اور سراسیمگی سے بولی۔ "پریتم! غضب ہو گیا، مہیش لال اور اس کے آدمی یہاں تمہاری تلاش میں آ رہے ہیں...... یہ اچھا نہیں ہوا، وہ تمہیں یہاں دیکھ کر گولی مار دیں گے۔ تمہاری لاش کے ٹکڑے کر کے کتوں کو کھلا دیں گے۔"

"وہ کمینہ...... حرام زادہ...... یہاں کیوں آ رہا ہے؟" پریتم خوف زدہ ہو کر بولا۔ "اسے کیسے معلوم ہو گیا کہ میں یہاں موجود ہوں؟"

"جب بھی اسے کوئی کام آ پڑتا ہے سیدھا میرے پاس آتا ہے۔" کویتا نے جواب دیا۔ "وہ مجھ سے معلوم کرنے کے لئے آ رہا ہے کہ تم کہاں ہو؟"

"میں کیا کروں...... ؟ کہاں جاؤں...... ؟" پریتم کی حالت غیر ہونے لگی۔ "کویتا! مجھے جلدی سے کہیں چھپا دو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ مجھے......"

"تم گھبراؤ نہیں...... پریشان نہ ہو۔" کویتا نے دلاسا دیا۔ "میں تمہیں پرندہ بنا دوں گی، ہدہد بنا کر پنجرے میں رکھ دوں گی۔ مہیش لال تو کیا اس کے فرشتے بھی تمہیں پہچان نہیں سکیں گے۔ جب وہ چلے جائیں گے تو پھر میں تمہیں انسانی شکل میں لے آؤں گی۔"

پریتم نہ نہ کہتا رہا لیکن کویتا نے اس کی ایک نہ سنی۔ اس پر منتر پھونک کر اسے ہدہد بنا دیا۔ پریتم ہدہد بنتے ہی اڑ کر اس کے ہاتھ کی انگلی پر آ کر بیٹھ گیا۔ پھر وہ اسے لے کر اس کمرے میں آ گئی جس میں بارہ پنجرے ایک بانس سے لٹکے ہوئے تھے۔ سات پنجروں میں سے دو پنجروں میں دو مختلف رنگوں کے کبوتر تھے۔ باقی پانچ پنجروں میں طوطے تھے۔ آٹھویں پنجرے میں اس نے ہدہد کو بند کر دیا۔

اس پنجرے میں بند کرنے کے بعد کویتا نے پنجرے کے پاس منہ لے جا کر استہزائیہ لہجے میں کہا۔

"میرے پریتم! تم مجھے فریب دے کر گھر مقفل کرنے کے بہانے سے جا رہے تھے نا...... کیا میں بچی ہوں جو تم چال چل کر مجھے بے وقوف بنانا چاہتے تھے...... تم نے رات اور صبح تک مجھے ایک کھلونا سمجھ کر کھیلا...... اور تم گھر اس لیے جانا چاہ رہے تھے کہ سادھو کا لاکٹ پہن لو۔ وہ لاکٹ تو میں بھی وہیں بھول گئی...... مہیش لال آ رہا ہے اور نہ اس کی روح...... اب تم اس پنجرے میں آرام سے رہو...... جب کبھی بھی مجھے تمہاری محبت، قرب اور پیار کی طلب ہو گی میں تمہیں انسانی شکل میں لے آؤں گی۔ اب تم ان پرندوں سے دوستی کرو اور باتیں کرو...... یہ بھول جاؤ کہ تم سب آزاد ہو جاؤ گے...... تم سب کو موت ہی اس قید سے نجات دلائے گی۔ لہٰذا آزادی کو بھول جاؤ۔"

پھر میں نے چینل بدلا مہیش لال اور رکنی نظر آئے۔ اس وقت مہیش لال اپنا پستول لوڈ کر رہا تھا۔ اس نے پستول جیب میں رکھ کر رکنی سے کہا۔ "پیاری پریا! میں تمہارے پریتم کا قصہ ختم کرنے جا رہا ہوں، تھوڑی دیر میں واپس آ جاؤں گا......"

اتنا کہہ کر مہیش لال کمرے اور گھر سے باہر نکلا، اس کے ہمراہ اس کے مسلح آدمی بھی تھے۔ میں نے

فوراً ہی ٹی وی آف کیا۔ پریا کو جگایا اور اس سے کہا کہ میں پریتم کو لینے جا رہا ہوں۔ میں تمام معاملات ٹھیک کر کے آتا ہوں۔ کھانا میں نے باورچی خانے میں ہوٹل سے لا کر رکھا ہوا ہے۔ تم کھا لینا، میری واپسی میں دیر ہو سکتی ہے تم پریشان نہ ہونا، گھبرانا نہیں، اب کسی خطرے کا نام ونشان نہیں رہا۔"

جب میں بھرے بازار میں پہنچا تو دیکھا کہ مہیش لال ایک طرف اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھڑا ہوا ہے۔ اس سے کچھ قدم پر ایک ہوٹل تھا۔ پریتم اس ہوٹل سے باہر آیا تو مہیش لال کے ایک آدمی نے اس سے کہا۔ "سرکار...... سرکار...... وہ دیکھئے۔ پریتم آ رہا ہے۔"

مہیش لال نے اس سمت دیکھا۔ پریتم کو دیکھتے ہی اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ اس وقت دور سے پولیس وین آ رہی تھی جو گشت پر ہوتی تھی۔ مہیش لال نے اس وین کو نہیں دیکھا۔ اس نے فوراً ہی جیب سے پستول نکال لیا۔ پریتم ہاتھ فضا میں لہراتا ہوا انہی کی طرف آ رہا تھا۔ مہیش لال نے پریتم کا نشانہ لینے اور فائر کرنے میں لمحے کی بھی دیر نہیں کی۔ اس نے چھ کی چھ گولیاں یکے بعد دیگرے اس کے سینے میں اتار دیں۔ جس وقت وہ گولیاں چلا رہا تھا تب اس کے ایک آدمی نے چیخ کر کہا۔ "صاحب! یہ آپ کیا کر رہے ہیں، اسے کیوں مار رہے ہیں...... یہ تو اپنا جگو ہے...... آپ تو پریتم کو مارنے نکلے ہیں...... آپ نے اسے قتل کر دیا؟ یہ آپ نے کیا کیا...... ؟"

"نہیں یہ جگو نہیں ہے پریتم ہے۔" مہیش نے نفرت اور حقارت بھرے لہجے میں کہا۔ "میں جگو کو بھلا قتل کیوں کرنے لگا؟"

جگو دراز قد تھا۔ کوئی چھ فٹ کا ہو گا، بڑا سخت جان تھا۔ چھ گولیاں کھا کر بھی وہ تڑپ رہا تھا۔ تڑپتے تڑپتے اس نے جیب سے چاقو نکال کر اسے کھولا اور کسی نہ کسی طرح لڑکھڑاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے مہیش لال کے سینے پر دل کی جگہ کا نشانہ لے کر چاقو پھینکا۔ وہ تیر کی طرح آ کر مہیش لال کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ مہیش لال بھونچکا سا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ سے پستول چھوٹ کر زمین پر گر گیا۔ پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے چاقو کا دستہ پکڑ کر نکالا تو خون کا فوارہ ابل پڑا۔ وہ لڑکھڑایا اور زمین پر گر کر ٹھنڈا ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد دو لاشیں خون میں لت پت پڑی تھیں۔ پولیس کی وین قریب پہنچ کر رکی اور بھیڑ جمع ہونے لگی۔ جگو اور مہیش لال بھی اپنے انجام کو پہنچ گئے تھے۔ مہیش لال کی کہانی اور اس کی زندگی کا باب بند ہو گیا تھا۔ وہ کسی کی جان لینے آیا تھا خود اپنی جان گنوا بیٹھا تھا۔ میں نے جگو کو پریتم کا ہم شکل بنا دیا تھا۔ لیکن وہ مرتے ہی اپنی شکل میں آ گیا۔ میں نے مہیش لال کو دھوکا دینے کے لئے اس کی نظر بندی کی تھی۔ وہ قانون کے ہاتھوں سے بچا ہوا تھا۔ اس کی اور مہیش لال کی یہی سزا تھی۔

میں کویتا کے گھر پہنچا۔ اس کے گھر کا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ میں اندر گھس گیا۔ اس وقت کویتا آئینے کے سامنے کھڑی کسی بات پر دل فریب انداز سے مسکرا رہی تھی۔ رکنی بھی اپنی اصل حالت میں موجود تھی۔ وہ چارپائی پر بیٹھی تھی۔ وہ دونوں مجھے دیکھ کر چونکیں۔

کویتا کو میرا اس طرح سے اندر گھس آنا سخت ناگوار لگا۔ آئینے کے سامنے سے ہٹ کر وہ میرے

سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ ”کون ہو تم؟“ وہ غرائی۔ پھر اس نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا مجھے اس طرح دیکھ کر اس کی آنکھوں میں دزدیدگی بھر گئی۔ پھر نرمی سے بولی۔ ”معاف کیجئے۔ کیا آپ کسی کام سے آئے ہیں......؟ میں آپ کی کیا سیوا کرسکتی ہوں...... آپ ملاقات والے کمرے میں تشریف لے چلیں......؟“

میرے علم میں تھا کہ وہ کمرا کہاں ہے جس میں پرندوں کے پنجرے موجود ہیں۔ میں نے انجان بن کر پوچھا۔ ”پرندوں والے پنجرے کہاں ہیں؟“

”کون سے پنجرے...... کیسے پرندے......؟“ وہ جادوگرنی بڑی اداکارہ بھی تھی۔ اس کے حسین چہرے پر معنوی استعجاب سا چھا گیا۔

”وہی پنجرے جس میں تم نے خوبصورت پرندوں کو برسوں سے قید رکھا ہوا ہے؟“ میں نے جواب دیا۔ ”زیادہ انجان اور اداکارہ نہ بنو...... اپنی اداکاری رہنے دو...... میں جانتا ہوں کہ تم ایک مکار عورت ہو۔ لیکن میں تمہاری ان باتوں میں نہیں آنے والا......“

”مجھے کیا ضرورت پڑی ہے۔ پرندوں کو قید رکھنے کی۔“ وہ تنک کر بولی۔ ”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے یا کسی نے تمہارے کان بھرے ہیں؟“

میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”تم نے جوان مردوں کو پرندے بنا کر ان سب کو پنجروں میں قید کیا ہوا ہے۔ جب دل بہلانا ہوتا ہے تو اس پنجرے سے نکال لیتی ہو اور صبح پھر سے پرندہ بنا کر قید کردیتی ہو۔“

”بہت خوب...... بہت خوب......“ وہ بڑے زور سے ہنسی۔ ”یہ کس نے تمہیں میرے خلاف بھڑکایا ہے...... شاید اس سادھو نے جو......“

”اس سادھو نے نہیں......“ میں نے کہا۔ ”میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔ تم سیدھی طرح راستے پر آتی ہو یا میں ٹیڑھی انگلی سے گھی نکالوں؟“

”تم اتنی دیر سے نہ جانے کیا بکواس کئے جارہے ہو......؟“ وہ تیز لہجے میں بولی۔ ”میں کہتی ہوں نکل جاؤ میرے گھر سے...... دفع ہوجاؤ......“ جب میں اس کمرے کی طرف بڑھا جس میں پنجرے تھے کویتا ایک دم سے میرا راستہ روک کر کھڑی ہوگئی۔ ”یہ تم کہاں جارہے ہو......؟“ میں نے منہ سے جواب دینے کی بجائے ہاتھ سے جواب دیا۔ بائیں ہاتھ کا ایک تھپڑ اس کے منہ پر رسید کیا تو وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی فرش پر گر کر بکھر گئی۔ وہ اور اس کی ساڑی کا پلو فرش پر بکھر گیا۔ لباس اور وہ خود بھی بے ترتیب ہوگئی۔ ایک لمحے کے لئے وہ بھونچکی سی ہوگئی۔ اس پر سکتہ سا چھا گیا۔ وہ دم بہ خودی ہوگئی تھی۔ اس کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ کوئی اس کے منہ پر تھپڑ بھی مار سکتا ہے یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ایک خطرناک اور بہت بڑی جادوگرنی ہے۔ آج تک کوئی یہ جرأت نہ کرسکا۔

جب وہ فرش پر گر گئی تو میں دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ فوراً ہی سنبھل کر اٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے چیخ کر کہا۔ ”رکمنی اسے روکو......“

رکمنی فوراً ہی دروازے کے سامنے دیوار بن کر کھڑی ہوگئی۔ وہ اپنی اصلی حالت یعنی ایک چڑیل کے

روپ میں آگئی۔ اس کا یہ خیال تھا کہ اسے دیکھتے ہی میرے اوسان خطا ہوجائیں گے میں یا تو بے ہوش ہوجاؤں گا یا پھر دہشت زدہ ہوکر بھاگ جاؤں گا۔ پہلے تو میں نے اس کے منہ پر ایک ایسا زوردار تھپڑ رسید کیا کہ اس کے ہوش ٹھکانے آگئے۔ پھر میں نے اسے اپنے ہاتھوں میں اس طرح اٹھالیا جیسے وہ پلاسٹک کی بنی ہوئی ہو۔ میں نے اسے پوری قوت سے دیوار پر دے مارا۔ دیوار سے ٹکراتے ہی اس کے جسم کے کئی ٹکڑے ہوگئے۔ دوسرے ہی لمحے وہ نظروں سے غائب ہوگئی، اپنے جسم کے تمام ٹکڑوں سمیت۔

کویتا ششدر ہوکر یہ سب دیکھ رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آیا کہ میں نے اس بلا سے دہشت زدہ ہونے کی بجائے اسے اٹھا کر دیوار پر دے مارا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کردیئے۔ پھر وہ بلا دہشت زدہ ہوکر غائب ہوگئی۔ اس نے فوراً ہی دروازے کی طرف منہ کرکے کچھ پڑھا اور پھونک ماری، بجلی کا سا کوندا چمک کر دروازے میں سما گیا۔ دروازہ لکڑی کی بجائے لوہے کا ہوگیا اور مقفل بھی۔

میں نے دروازے پر ایک لات رسید کی تو وہ فرش پر آرہا۔ یہ دیکھ کر کویتا متحیر سی ہوگئی۔ پھر اس نے فوراً ہی وہ منتر پڑھا جو انسان کو پرندہ بنا دیتا تھا۔ لیکن مجھ پر اس منتر کا کوئی اثر نہیں ہوا جو بجلی کا کوندا بن کر میرے بدن سے ٹکرایا تھا۔ جب اس کے اس منتر نے مجھ پر کوئی اثر نہ کیا تو اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا تھا کہ میں کیا چیز ہوں، وہ دنگ ہورہی تھی۔

”تم...... تم...... کون ہو......؟“ اس کی آواز حلق میں پھنس رہی تھی اور اس کی منجمد آنکھوں سے خوف و دہشت جھانک رہی تھی۔

”میں جو کوئی بھی ہوں تمہیں اس سے کیا......؟ میں نے کرخت لہجے میں کہا۔ ”تمہیں اندازہ ہوگیا ہوگا کہ میں کیا چیز ہوں......؟“

”تم یہاں کیوں اور کس لیے آئے ہو......؟“ وہ پھنکاری۔ ”تم کیا چاہتے ہو......؟ تم میرے معاملے میں داخل کیوں دے رہے ہو؟“

”میں یہاں اس لیے آیا ہوں کہ ان جوانوں کو آزاد کراؤں جو پرندوں کی صورت میں برسوں سے تمہاری قید میں ہیں اور تمہاری بدکاری کی بھینٹ چڑھتے رہے ہیں۔ تم نہ صرف جادوگرنی بلکہ ایک فاحشہ اور طوائف سے بھی بدتر ہو۔ تم بھی اپنی ماں پر گئی ہو...... میں یہاں اس لیے بھی آیا ہوں کہ تمہاری کہانی ختم کردوں۔ تمہیں جادو سے محروم کردوں تاکہ تم کسی کی زندگی سے نہ کھیل سکو۔“

”میں سمجھ گئی کہ سادھو نے پٹی پڑھا کر اور تمہیں کچھ جادو کے زیر اثر بھیجا ہے اس لیے تم مجھ پر بہتان لگا رہے ہو۔“ وہ کہنے لگی۔ ”یہ پرندے ہیں، انسان نہیں ہیں۔ سادھو میرا دشمن ہے۔ وہ میری عزت کا بھی دشمن ہے۔ تم جاؤ یہاں سے......“

”میں کسی سادھو کو نہیں جانتا۔“ میں نے کہا۔ ”اگر یہ پرندے انسان نہیں ہیں تو پھر تم مجھے اندر جانے کیوں نہیں دے رہی ہو؟“

”اس لیے کہ یہ بہت ہی قیمتی اور نایاب پرندے ہیں۔ میں نے انہیں اندر بڑی حفاظت سے رکھا ہوا

ہے کہ کہیں چوری نہ ہو جائیں۔"

"سنو کویتا!" میں نے تیز لہجے میں کہا۔ "چوں کہ تم مجھے نہیں جانتی ہو کہ میں کون ہوں کیا ہوں اس لیے مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہی ہو...... تم خود غرض، مکار اور ذلیل قسم کی عورت ہو۔ تم نے پریا اور پریتم پر بڑا ظلم ڈھایا ہے۔ تم نے اپنے جادو کے زور سے پریا کو بدصورت بنا دیا لیکن میں اسے اصل حالت میں لاچکا ہوں۔ تم نے پریتم کے حصول کے لئے بڑا گھناؤنا کھیل کھیلا۔ تمہارے گھر کے ایک کمرے میں جو مورتیاں ہیں وہ بدروح عورتوں کی ہیں۔ تم نے رکمنی کو آزادی دے کر اسے اپنا مہرہ بنا کر پریا کے روپ میں مہیش لال کے ہاں بھیجا...... پھر تم نے پریا کا بہروپ بھرا اور پریتم کے ہاں پہنچیں۔ پھر اسے فریب سے یہاں لائیں۔ پھر اسے ہدہد بنا کر پنجرے میں قید کر دیا...... کیا یہ سب کچھ جھوٹ ہے؟ تم ان باتوں سے انکار کر سکتی ہو؟ کیا تم نے جوانوں کو پرندہ نہیں بنایا۔"

"تمہیں یہ ساری باتیں کس نے بتائیں......؟" وہ ششدر ہو کر بولی۔ "یقیناً اس سادھو حرام زادے نے......؟ یہ اسی کی حرکت ہے۔"

"اس سادھو کو دوش مت دو......" میں نے برہمی سے کہا۔ "وہ نہ تو مجھے جانتا ہے اور نہ ہی میں اسے جانتا ہوں میں بھی ایک ماہر جادوگر ہوں۔ میں نے اپنے علم اور جادو سے سب کچھ معلوم کر لیا ہے۔ میں ان جوانوں کو تمہارے جادو کے اثر سے نکال کر لے جانے آیا ہوں۔ اب تمہارا کھیل ختم ہو چکا ہے۔"

"اوہ تم جادوگر ہو......؟" استہزائیہ لہجے میں بول کر اس نے ایک قہقہہ لگایا۔ "اگر تم جادوگر ہو تو پھر اپنا جادو دکھاؤ۔ ان پرندوں کو انسان بنا کر لے جا سکتے ہو تو لے جاؤ...... میں بھی دیکھوں کہ تم کتنے پانی میں ہو، کیا تیر مار سکتے ہو؟"

"تمہیں اب بھی اس بات کا یقین نہیں آیا کہ میں بھی ایک جادوگر ہوں۔" میں نے کہا۔ "جب کہ میں نے تمہاری نظروں کے سامنے تمہاری رکمنی کا جو حشر کیا وہ ہر کوئی نہیں کر سکتا۔ صرف ایک جادوگر ہی کر سکتا ہے۔ اگر میں ایک عام سا شخص ہوتا اور جادوگر نہ ہوتا تو اس بدروح کو دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتا اور چیخیں مارتا ہوا بھاگ جاتا یا پھر بے ہوش ہی ہو جاتا۔ تمہیں پھر بھی یقین نہیں آیا کہ میں بے خوفی سے اور اطمینان سے کھڑا ہوا ہوں۔"

"تم یقیناً جادوگر ہو۔" اس کا لہجہ تمسخرانہ تھا۔ "لیکن ایک عام قسم کے جادوگر...... تم جیسے سینکڑوں جادوگر ابھی بھی ہندوستان، بنگال، آسام اور دنیا میں کہیں نہ کہیں موجود ہیں۔ اس وقت ایشیا میں نہ تو کوئی جادوگر ایسا ہے اور نہ ہی جادوگرنی جو میرے مقابلے کی ہو۔" اس نے توقف کر کے ایک لمبا سا سانس لیا۔ "چوں کہ تم بھی ایک جادوگر ہو۔ اس لیے میں تمہارے ساتھ اتنی رعایت کروں گی کہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچاؤں۔ تمہیں جانے کی اجازت دے دوں۔"

میں نے کہا۔ "تمہیں اپنے جادو جاننے پر بڑا گھمنڈ اور ناز ہے۔ یہ تمہاری خوش فہمی ہے کہ تم اس وقت دنیا کی سب سے بڑی جادوگرنی ہو اور تمہاری لاعلمی ہے جو اپنے آپ کو سب سے بڑا سمجھ رہی ہو۔

ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اب بھی ایسے ایسے جادوگر اور جادوگرنیاں ہیں کہ تم ان کی جوتی بھی نہیں ہو...... کیا تم نے شوتم کا نام سنا ہے؟"

"شوتم......؟" لمحے کے لئے اس کا حسین چہرہ متغیر ہو گیا۔ پھر وہ سنبھل کر بولی۔ "کیوں نہیں...... کیوں نہیں...... میرا باپ بھی اس کا شاگرد رہا تھا اور میری ماں بھی...... اس نے کسی بات پر میرے ماں، باپ سے ناراض ہو کر انہیں نکال دیا۔ وہ تو جادوگروں کا دیوتا ہے۔ لیکن وہ زندہ کہاں ہے؟"

"وہ زندہ ہے اور میں اس سے آسام میں مل کر آ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "پھر تم یہ دعویٰ کس طرح کر سکتی ہو کہ تم دنیا کی سب سے بڑی جادوگرنی ہو...... مجھے تمہاری کسی بھی رعایت کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی میں تمہاری اجازت کا محتاج ہوں......"

"اگر تم نے شرافت سے میری بات نہیں مانی تو میں تمہیں بھی پرندہ بنا دوں گی۔" وہ غصے سے بولی۔ "اب تم یہاں سے جا نہیں سکتے ہو۔ میں اب تمہیں جانے نہیں دوں گی...... کیوں کہ تم جیسے مرد میری کمزوری ہیں۔ جو ایک بار میرے جال میں پھنس گیا، وہ ساری زندگی کے لئے پھنس گیا۔"

اتنا کہہ کر وہ میرے اتنے قریب آ گئی کہ ہمارے درمیان کوئی فاصلہ نہیں رہا۔ پھر اس نے میری گردن میں اپنی مرمریں سڈول اور عریاں بانہیں حمائل کر دیں۔

میں نے اسے گود میں اٹھا لیا اور پھر اسے اس کے سونے کے کمرے میں لے گیا تو وہ خوش ہو گئی۔ وہ سمجھی کہ میں اسے خوش کرنے کے ارادے سے لے جا رہا ہوں۔ اسے اس لیے غلط فہمی ہوئی تھی کہ میں مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ پھر میں نے اسے بستر پر زور سے پٹخ دیا اور بولا۔ "سنو...... تمہارا کوئی حربہ چل نہیں سکتا۔ نہ ہی جادو...... اب تم یہاں آرام کرو، میں جس کام سے آیا ہوں وہ کرنے دو۔"

اتنا کہہ کر میں اس کے کمرے سے نکل آیا۔ اور نہ ہی اس کے جواب کا انتظار کیا، اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کی آنکھیں چنگاریاں برسانے لگیں۔ میں نے اس کی نفرت اور غصے کی بالکل بھی پرواہ نہیں کی۔ کمرے سے نکلا۔ وہ ہڑبڑا کر بستر سے نکلی اور اس کمرے کی طرف لپک گئی جس میں مورتیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے وہاں کوئی منتر پڑھ کر اس کمرے کی طرف پھونک دیا جس میں پرندے بند تھے اور جس کی طرف میں بڑھ رہا تھا۔ دروازے اور میرے درمیان آگ کا ایک بگولہ سا آ گیا۔ میں ٹھٹک کے رک گیا۔ اس آگ کے بگولے میں تین شیطانی چہرے والی کھوپڑیاں مجھے گھور رہی تھیں۔ قہقہے لگا رہی اور ہنس رہی تھیں۔ پھر ان کی آنکھوں سے شعلے نکل کر میری طرف لپکنے لگے۔

یہ کھوپڑیاں بہت ہی خوفناک اور فٹ بال سے دگنی بڑی تھیں۔ وہ مجھے ڈرانے اور دھمکانے لگیں۔ پھر انہوں نے اپنے منہ کھول دیئے۔ ان میں بھی آگ بھری ہوئی تھی۔ وہ میری طرف منہ سے آگ کے گولے پھینکنے لگیں۔ اگر میں نے جادو کے زور پر ان شعلوں اور بگولوں کو روک نہ دیا ہوتا تو پھر وہ مجھے جلا کر خاک کر دیتے۔ میں چند لمحوں تک بڑے سکون اور اطمینان کی حالت میں کھڑا ان کھوپڑیوں کی حرکتوں اور آگ کے حملوں کو دیکھتا رہا۔ کویتا میرے عقب میں اپنے کمرے کے دروازے کی دہلیز پر

کھڑی تماشا دیکھ رہی تھی۔ وہ سخت حیران تھی کہ کھوپڑیاں میرا بال تک بیکا نہیں کر پا رہی ہیں۔ میں نے سب سے پہلے ایک کھوپڑی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جو آگ میں جلنے لگے۔ جب اسے ٹکڑے کر رہا تھا تب اس نے اتنے زور سے چیخیں ماری تھیں کہ زمین لرزنے لگی۔

پہلی کھوپڑی کا یہ حشر دیکھ کر دوسری کھوپڑی اس آگ کے شعلوں میں سے نکل آئی اور وہ ایک انسانی جسم کی حالت میں آ گئی۔ اس کے تین ہاتھ دائیں اور تین بائیں ہاتھ تھے۔ وہ دس، بارہ فٹ کا ہیولا تھا۔ اس کی کھوپڑی اور دگنی ہو گئی۔ اس کی آنکھیں فٹ بال سائز کی ہو گئیں اور ناک بھی بہت بڑی ہو گئی۔ دس انچ موٹی، کان بھی پریوں کے پروں کی طرح تھے۔ وہ برہنہ سا تھا۔ اس کے جسم پر بے حد سیاہ، لمبے، گھنے اور تاروں کی طرح سخت بال تھے۔ جسم کے ان بالوں نے اس کی ستر پوشی کی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ کوئی دو دو گز لمبے اور ایک ناگ کی طرح موٹے اور پتھر کی طرح سخت لگ رہے تھے۔ وہ پورا دیو کا دیو لگ رہا تھا۔

اس کھوپڑی نے اس حالت میں آ کر غراتے ہوئے مجھے دبوچنے کی خاطر قدم بڑھایا کہ مجھے کچا چبا اس آگ میں بھون کر کھا جائے جو ابھی بھی جل رہی تھی اور جس میں ایک کھوپڑی موجود تھی۔ اس آگ نے تینوں کھوپڑیوں کو جلا کر بھسم نہیں کیا تھا۔ ان کھوپڑیوں پر آگ بالکل بھی اثر نہیں کر رہی تھی۔ لیکن یہ آگ ایسی تھی کہ ایک انسان یا جانور کو بھون سکتی تھی۔ میں ایک دم سے فضا میں دس فٹ اوپر اچھلا اور دونوں لاتیں پوری طاقت سے اس کے سینے پر جما دیں۔ وہ الٹ کر فرش پر گرا تو زمین دہل کر رہ گئی۔ دوسرے لمحے وہ سنبھل کر اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے اپنا ہاتھ میری گردن کی طرف بڑھایا تو میں نے پکڑ لیا او راسے کمرے میں چکر دینے لگا۔ جیسے وہ کوئی ڈنڈا ہو یا ہلکی پھلکی چیز ہو۔ اس کا وزن تین من سے کسی طرح کم نہیں ہوگا لیکن میرے لیے تو تین کلو سے کم تھا۔ میں نے تین چار منٹ اسے خوب گھمایا اور پوری قوت سے دیوار پر دے مارا۔ اس کی چیخیں نکل گئیں اور دوسرے ہی لمحے نظروں سے غائب ہو گیا۔ پھر تیسری کھوپڑی یہ سب کچھ دیکھ کر میدان چھوڑ کر غائب ہو گئی اور آگ بھی بجھ گئی۔

ادھر نفرت اور غصے سے کویتا کا برا حال ہو رہا تھا۔ اب اسے اندازہ ہوا تھا کہ اس کا پالا کس سے پڑا ہے اور میں کیا چیز ہوں۔ کوئی عام قسم کا اور ایسا جادوگر نہیں ہوں جو اس نے سمجھا ہوا تھا۔ پھر اس نے یہ کیا کہ ان دس مورتیوں کو جو بدروحیں تھیں انہیں سابقہ حالت میں لا کر اس کمرے میں بھیج دیا اور اب میں دس بدروحوں کے نرغے میں تھا۔ وہ ساری کی ساری چڑیلوں کے روپ میں تھیں۔

کویتا ہر صورت میں مجھے شکست دینا اور اپنا اسیر بنانا چاہتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ میں اس کے دام سے بچ نکلوں اور میں تمام پرندوں کو انسانی حالت میں لا کر آزاد کر دوں۔ اس لیے اس نے میرے خلاف اپنا سارا زور، قوت اور طاقت لگا دی تھی۔ یہ اس کا آخری حربہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں ان دس بد روحوں سے مقابلہ نہیں کر سکوں گا۔ اس کا غصہ انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا، ورنہ وہ میرا ایسا حشر کرتی کہ میں ساری زندگی بھول نہیں سکتا تھا۔

ایک طرح سے اس وقت بھی صورت حال بڑی سنگین، خطرناک اور بدترین قسم کی تھی۔ اس نے پوری

طاقت یکجا کر لی تھی۔ اس کے پاس کل گیارہ مورتیاں جو تھیں وہ سب مہلک ترین ہتھیار تھے۔ ان میں سے ایک مورتی رکنی تھی جس کا میں نے ایسا حشر نشر کیا تھا کہ وہ بھاگ گئی تھی۔ اب دس مورتیاں جو تھیں وہ چڑیلوں کے روپ میں آ چکی تھیں۔ میرے بجائے اگر کوئی عام شخص ہوتا یا معمولی سا بھی جادوگر بھی ہوتا تو وہ صرف ایک بدروح سے کام لے کر اس کا کام تمام کر چکی ہوتی۔ اب چوں کہ اسے احساس ہو چکا تھا کہ میں کوئی عام جادوگر نہیں ہوں اس لیے وہ خم ٹھونک کر آ گئی تھی۔ میں نے اسے ابھی نہیں بتایا تھا کہ میں شوتم کا شاگرد ہوں۔ پھر اس کے ذہن میں ایک تدبیر آئی۔ اس نے ساتوں بدروحوں کو اشارہ کیا اور منتر پڑھ کر پھونکا۔ ان کے ہاتھوں میں زہر میں بجھے ہوئے چھوٹے بڑے خنجر آ گئے۔

”سنو.....“ کویتا نے مجھے مخاطب کیا تو اس کی آواز میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔ ”اب تک تم بچ گئے۔ لیکن اب کسی صورت میں قتل ہونے سے بچ نہیں سکتے ہو۔ لیکن میں تم پر اور تمہاری جوانی پر رحم کھا کر ایک موقع دے رہی ہوں اور پھر یہ کہ تم ایک جادوگر بھی ہو۔ اس لیے سلامتی کی رعایت دے رہی ہوں۔ اس شرط پر تمہاری جان نہیں لی جائے گی کہ تم الٹے قدموں لوٹ جاؤ۔“

”نہیں..... میں ان پرندوں اور پریتم کو آزاد کیے اور انہیں انسان بنائے بغیر نہیں جاؤں گا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”یہ تم مجھے دھمکا کیوں رہی ہو؟ کس بات کی رعایت دے رہی ہو؟ میں نے تم سے رحم کی بھیک نہیں مانگی۔ تم اپنی خیر مناؤ۔ تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی ہو۔“

”لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے ہیں.....؟“ کویتا تنک کر بولی۔ پھر اس نے سات بد روحوں کو مجھ پر حملہ کرنے کے لئے اشارہ کیا۔ وہ تمام بدروحیں مجھ پر ٹوٹ پڑیں اور خنجروں سے حملہ کرنے لگیں۔ کویتا نے غلط کہا تھا۔ وہ ہتھیار بڑے مہلک اور خطرناک تھے ان کی دھاریں زہر میں بجھی ہوئی تھیں۔ اس کی معمولی سی خراش بھی انسان کو پل بھر میں موت کی نیند سلا سکتی تھی۔ وہ خنجر میرے لیے پھول بن گئے تھے۔ میرے سینے اور پیٹھ پر ان خنجروں کو گھونپا جا رہا تھا۔ خنجر ایک، ایک کر کے ٹوٹ گئے تھے۔ لیکن میرے جسم سے ایک قطرہ خون بھی نہ نکلا۔ یہ دیکھ کر کویتا کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ تمام بدروحیں ایک دم سے غائب ہو گئیں۔ میں نے پرندوں والے کمرے کی طرف بڑھ کر دروازے پر ایک لات ماری، دروازہ ٹوٹ کر فرش پر آ رہا۔ وہ میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی اور بولی۔ ”یقیناً تم بہت بڑے جادوگر ہو۔ لیکن پھر بھی تم میرے جادو کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ میں تمہارا جادو دیکھنا چاہتی ہوں۔ جبکہ تم اب تک صرف میرا جادو دیکھتے رہے ہو۔ اب تم اپنا جادو دکھاؤ۔ میں..... صرف میں..... انسانوں کو پرندے اور جانور بنانے اور انہیں پھر انسانی حالت میں لانے کا جادو جانتی ہوں اور کوئی نہیں..... تم ان پرندوں کو انسانی حالت میں لا کر لے جا سکتے ہو تو لے جاؤ.....“ پھر وہ استہزائیہ انداز سے ہنسنے لگی۔

”تم مجھے چیلنج کر رہی ہو.....؟“ میں نے کہا۔ ”میرے کمالات دیکھنے کے باوجود..... ٹھیک ہے۔ میں ان پرندوں کو دوبارہ انسان بنا دوں گا۔ جب یہ انسانی حالت میں آ جائیں گے تب تمہیں پرندہ بنا دوں گا..... پھر تم کبھی بھی انسانی حالت میں نہیں آ سکو گی۔ تمہاری زندگی اسی طرح کٹ جائے گی۔ میرے

خیال میں تم مینا بن کر زیادہ اچھی لگو گی......"

وہ میری بات سن کر بڑے زور سے ہنسنے لگی۔ اس کی ہنسی ویران اور کھوکھلی تھی۔ شکست خوردگی کا احساس بھی اسے ہو رہا تھا۔ لیکن وہ ظاہر نہیں کر رہی تھی۔ پھر وہ خشونت آمیز لہجے میں بولی۔ "تم کسی اور کو بے وقوف بنانا اور دھمکانا...... یہ مذاق نہیں ہے...... یہ جادو ہے جو ہر جادوگر نہیں جانتا ہے۔ یہ جادو میرے باپ نے سکھایا تھا۔ میری ماں بھی یہ جادو جانتی تھی۔"

میں نے کمرے میں داخل ہو کر ان تمام پنجروں کے منہ ایک، ایک کر کے کھول دیئے۔ تمام پرندے ایک، ایک کر کے نکل آئے اور فرش پر ایک جگہ ایک ساتھ اور ایک قطار میں بیٹھ گئے۔ ادھر کویتا نے اپنے جادو کا سارا زور لگا دیا کہ میرا جادو کام نہ کر سکے۔ اس نے منتروں کی بارش شروع کر دی۔ لیکن اس کا بس نہ چل سکا۔ میں جس جس پرندے پر پڑھ کر پھونکتا گیا وہ انسانی شکل میں آتا گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں سب انسانی شکل میں آ گئے۔ ایک جوان بھی پرندہ نہ رہا۔

میں نے کویتا کی طرف دیکھا جس کا چہرہ پنجرے خالی دیکھ کر کفن کی طرح ہو رہا تھا۔ پھر میں نے اسے فوراً ہی مینا بنا دیا۔ وہ مینا بنتے ہی اڑتی ہوئی گھر سے نکل گئی۔ میں نے ان جوانوں سے جو انسانی حالت میں آ جانے سے حیرت اور خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے کہا۔

"دوستو! اب تم آزاد ہو ڈائن جادوگرنی کا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ اب تم لوگ اپنے، اپنے گھروں کو جاؤ...... لیکن جانے سے پہلے اس کی دولت لیتے جاؤ جو اس نے برسوں سے جمع کر رکھی ہے۔ اس لیے کہ اس نے تم لوگوں کو بہت اذیت دی۔ برسوں قید میں رکھا۔"

میں نے کویتا کے کمرے میں رکھی تجوری میں سے رقم نکال کر ان سب میں مساوی طور پر تقسیم کر دی۔ اس میں سے پریتم کو کچھ بھی نہ دیا۔ کیوں کہ آج ہی اور تھوڑی دیر پہلے ہی وہ کویتا کا اسیر بنا تھا۔ یہ جو سات جوان تھے برسوں سے اس کی قید میں تھے۔ پریتم کو اس کا مکان دے دیا، کیوں کہ اس کا کوئی وارث نہ تھا۔ اس مکان کے جو کاغذات تجوری میں تھے وہ پریتم کو دے دیئے۔ پریتم کو مکان کی کوئی خواہش یا لالچ نہ تھا۔ اس کے لئے سب سے بڑی دولت وہ آزادی تھی جو اسے ملی تھی اور پھر اس کے پاس اتنا کچھ تھا کہ وہ آسودگی، بے فکری اور اطمینان سے زندگی گزار سکتا تھا۔

جب سب لوگ چلے گئے تو میں نے پریتم سے کہا۔ "اب تم میرے ساتھ چلو...... میں تمہیں لینے آیا تھا۔ تمہارے لیے ایک خوشخبری ہے۔"

"کہاں چلوں......؟" اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس کا لہجہ مایوس کن تھا اور اس کی آنکھوں میں غم کے سیاہ بادل تھے۔

"تمہاری پتنی پریا کے پاس......" میں نے جواب دیا۔ "وہ تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ ایک، ایک لمحہ صدی کی طرح کاٹ رہی ہے۔"

"پریا...... وہ بدکار، بدچلن اور فاحشہ......؟" پریتم نے نفرت اور حقارت سے کہا۔ "میں تو اب اس

کی شکل دیکھنا بھی نہیں چاہتا ہوں۔ اگر وہ مجھے دکھائی دے گی تو میں اسے جان سے مار دوں گا۔ اس کا گلا گھونٹ دوں گا، آپ اس کا نام بھی میرے سامنے نہ لیں۔ کیونکہ......" پھر اس نے ساری باتیں بتائیں۔

"دوست! تم یہ ساری باتیں اس لیے کہہ رہے ہو کہ تم اصل حالات کے بارے میں ذرہ برابر بھی نہیں جانتے ہو۔" میں کہنے لگا۔ "میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اصل بات کیا ہے؟ سچی کہانی کیا ہے؟ وہ پریا نہیں تھی جسے تم نے مہیش لال کے ساتھ دیکھا۔ وہ کویتا کے زیر اثر بدروح تھی۔ اس نے کوئی گیارہ بدروح عورتوں کو اپنا تابع بنا کر انہیں مورتیاں بنا رکھا ہے جن سے وہ کام لیتی رہتی تھی۔"

پھر میں نے اسے پریا کی کہانی سنائی کہ وہ کن حالات کی زد میں رہی۔ کویتا نے کیا گل کھلائے اور پھر مہیش لال کے حیرت ناک انجام اور موت کا واقعہ بھی سنایا جسے سن کر وہ بہت خوش ہوا۔ پھر میں نے اپنے عمل سے کویتا کی اس بدروح کو بلایا اور پھر اس نے بتایا کہ کویتا نے اسے پریا کے روپ میں مہیش لال کے پاس بھیجا تھا۔ پھر میں نے اس بدروح کو تھوڑی دیر کے لئے پریا بنا کر پھر اس کے روپ میں لا کر اسے واپس جانے دیا۔ پھر تمام دوسری دس مورتیوں کو بھی آزاد کر دیا۔ آخر پریتم کو یقین آ گیا۔ اس کے دل میں کویتا نے پریا کے خلاف جو نفرت پیدا کی تھی وہ نکل گئی۔ اس کا دل صاف ہو گیا اور اس کے دل میں پریا کے لئے پھر سے محبت جاگ اٹھی۔

میں اسے اپنے ساتھ لے کر اپنے ہاں پہنچا۔ میں نے اسے اندر بھیج دیا اور خود کچھ دیر تک باہر کھڑا رہا۔ میں ان کی جذباتی محبت کے منظر میں خلل ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ کچھ دیر بعد جب میں اندر گیا تو ان دونوں کی خوشی اور سرشاری دیکھنے کے قابل تھی۔

☆......☆......☆

میں دوسرے دن صبح بنگلور کے ریلوے اسٹیشن پر اترا۔ بنگلور ہندوستان کے بہت بڑے شہروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ صوبہ میسور جے کرناٹک کہا جاتا ہے اس کا یہ شہر آخری سرے پر واقع ہے۔ یہ آب و ہوا کے لحاظ سے جو خصوصیت رکھتا ہے وہ کسی اور شہر کو نصیب نہیں ہے۔ رات بارہ بجے موسم ایک دم بدل جاتا ہے۔ جون اور جولائی میں لحاف اور کمبل کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ گرمی زیادہ ہوتے ہی بارش ہو جاتی ہے۔ جس سے موسم ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔

اس شہر کی حیثیت ایک بین الاقوامی شہر کی سی ہے۔ یہاں بلند و بالا عمارتیں، پرشکوہ اور اعلیٰ درجے کے ہوٹل اور دفاتر بھی ہیں۔ ایئر کرافٹ فیکٹری جو صرف اس شہر میں ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بڑے بڑے کارخانے اور ہر قسم کی فیکٹریاں بھی ہیں۔ ٹیلی فون اور موبائل اور کمپیوٹر بھی تیار ہوتے ہیں۔ یہ ایک جدید ترین تیزی سے ترقی کرتا ہوا شہر ہے۔ بنگلور کی آبادی میں گزشتہ بیس برسوں میں جس تیزی سے اضافہ ہوا وہ ہندوستان کے کسی بھی شہر میں نہیں ہوا اور نہ ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں روزگار بہت ہے اور ہندوستان کے کونے کونے سے نہ صرف مزدور کاریگر اور ہنرمند بلکہ تجارت پیشہ اور صنعت کار بھی چلے آ رہے ہیں۔ بمبئی شہر کے تمام بڑے فلمی ستاروں اور پروڈیوسروں نے یہاں نہ صرف کوٹھیاں، بنگلے

بنا رکھے ہیں بلکہ کاروبار میں بھی سرمایہ لگا رکھا ہے اور پھر وہ یہاں آرام اور پر تعیش زندگی گزارنے کے لیے آتے رہتے ہیں اور ان کے عشرت کدے بھی ہیں۔

بنگلور میں گھوڑوں کی ریس بہت مشہور ہے۔ عموماً فلمی ستارے یہاں کھیلنے ہر اتوار کو آتے ہیں۔ بہت بڑا ریس کورس ہے۔ اتوار کے دن جو ریس ہوتی ہے اس میں ڈیڑھ دو کروڑ کی شرطیں لگتی ہیں۔ ریس کورس میں اس دن دیکھنے کا سماں ہوتا ہے۔

جہاں دولت کی ریل پیل ہوتی ہے وہاں برائیاں بھی اتنی ہی جنم لیتی ہیں۔ یہاں چھوٹے بڑے گھٹیا اور اعلیٰ درجے کے شراب خانوں کی بھرمار ہے۔ ماضی میں ایک وقت تھا کہ بمبئی، دہلی اور دیگر بڑے شہروں میں شراب نوشی ممنوع تھی۔ شوبزنس کے مرد اور عورتیں یہاں شراب نوشی کے لئے آتے تھے۔ یہاں کبھی شراب پر پابندی نہیں رہی۔ اس شہر میں ہر قسم اور ہر درجے کے ہوٹل موجود ہیں۔ نائٹ کلب، قحبہ خانے اور عشرت کدے بھی ہیں۔ اس کے علاوہ جوئے خانے بھی ہیں۔ یہ ایک طرح سے ایک مغربی اور یورو پی شہر ہے جہاں ہر بات کی آزادی ہے۔ اس آزادی سے ہر کوئی فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس لیے انسانی اور ہندوستانی اقدار اور تہذیب مسخ ہو رہی ہے۔

بنگلور شہر دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک سٹی اور ایک کنٹونمنٹ کا علاقہ ہے۔ جب انگریزوں کا یہاں تسلط تھا تب انگریزوں کی چھاؤنی تھی۔ چھاؤنی کے علاقے کو لشکر کہا جاتا ہے۔ انگریزوں نے اس چھاؤنی کے علاقے کو بہت خوبصورت اور دل کش بنایا تھا۔ وہ باقیات آج بھی ہیں۔ لشکر میں مسلمانوں کی آبادی اتنی ہے کہ ہندوؤں کی اکثریت سے کم نہیں ہے۔ گلی گلی میں مسجدیں اور مدرسے ہیں۔ گو معاشی، سماجی اور معاشرتی زندگی نے مسلمانوں کو متاثر کیا، فلمیں اور ہندو کلچر بھی اثر انداز ہو رہا ہے۔ اس کے باوجود مومن قسم کے مسلمانوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ روزے، نماز، پنج گانہ اور پردے کا بھی سخت رواج ہے۔ یہاں جو قریشی خاندان اور برادری ہے وہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ ان میں جو گاؤ قصاب ہیں وہ اہل حدیث ہیں۔ جو بکر قصاب ہیں وہ اہل سنت۔ یہاں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی اور دوسرے مذاہب کے لوگ مل جل کر رہتے ہیں۔ مقامی لوگ بڑے با اخلاق، ملنسار، سیدھے سادے اور نرم مزاج کے ہیں۔ یہاں جتنے سینما ہال ہیں ہندوستان کے کسی بڑے شہر میں بھی نہیں ہیں۔ اس طرح پارک بھی موجود ہیں۔ ان بڑے پارکوں میں ہر اتوار کی شام کو موسیقی کا پروگرام ہوتا ہے جس میں نئے اور پرانے گلوکار اپنے فن کا جادو جگاتے ہیں۔ سامعین انہیں دل کھول کر داد دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ پارکوں میں اور بھی بہت ساری تفریحات عوام کے لئے موجود ہیں۔

یہاں جرائم کی بہتات بھی ہے۔ جرائم پیشہ زیادہ تر غیر مقامی ہیں۔ غیر مقامیوں نے ہی نائٹ کلب، جوئے خانے اور قحبہ خانے کھولے ہوئے ہیں...... سٹی کا علاقہ اور مضافات میں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ نئی آبادیاں اور کالونیاں بھی ہیں۔ سٹی کے علاقے میں مسلمانوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ اس کے مضافات نے بھی ہر لحاظ سے بڑی ترقی کی۔ لشکر کے علاقے میں مسلمانوں کے بہت سارے ہوٹل ہیں۔ ان کے کھانے بھی بڑے ذائقہ دار، مزے دار اور لذیذ ہوتے ہیں۔ یہ شہر اور شہروں کے مقابلے میں بہت سستا

ہے۔ یہاں برہمن کے جو ہوٹل ہیں ان کا تعلق مدراس شہر ہے۔ مدراسیوں نے یہاں ہر شعبہ میں اپنے پنجے گاڑھے ہوئے ہیں۔ وہ بری طرح چھائے ہوئے ہیں۔ خصوصاً ہوٹلوں کے کاروبار میں ان کی اپنی مناپلی ہے۔ لیکن مسلمانوں کی پسند کے جو کھانے ہیں وہ ہندو یا برہمن ذات کے ہوٹلوں میں نہیں ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کے اپنے ہوٹل ہیں۔ بنگلور میں مسجد اعظم کے سامنے ایک ہوٹل ہے اس کا نام تاج ہوٹل ہے جو خوب چلتا ہے۔ چانپ، دال، چاول، ہرے مصالحے کا سالن، خشکہ اور قورمہ (یہ قورمہ دہلی کے قورمے سے مختلف ہوتا ہے) جو خشکہ اور پودینے کی چٹنی کے ساتھ بڑا مزہ دیتا ہے۔ کچے ناریل کا استعمال بہت ہے۔ میں نے کوئی تین دن تک ایک ٹیکسی کرائے پر لے کر اس شہر کی خوب سیر کی۔ ٹیکسی ڈرائیور کا نام جلیل احمد تھا۔ اس کی عمر کوئی تینتیس برس کی ہوگی۔ بہت نیک، مخلص اور ایماندار اور متقی پرہیز شخص تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کا باپ بھی ٹیکسی چلاتا تھا۔ وہی ٹیکسی اب وہ بھی چلا رہا ہے۔ چوں کہ اس کی ٹیکسی پرانی ہو چکی ہے اس لیے بہت کم لوگ اور مجبوری کی صورت میں بیٹھتے ہیں۔ اس کی بیوی اور دو بچے ہیں۔ اس کا ایک مکان اولڈ پور ہاؤس روڈ پر ہے۔ دو کمرے ہیں۔ اس کے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ وہ نئی ٹیکسی خرید سکے اس پرانی ٹیکسی کو بیچ کر...... اس کے دو ایک دوست اور دوسرے غیر قوم کے جو ٹیکسی والے ہیں ان کی نئی ٹیکسیاں اس لیے ہیں کہ وہ غلط کام کرتے ہیں۔ وہ نہیں کرتا ہے۔ اس لیے اس کی زندگی بڑی سادگی، قناعت اور تنگ دستی سے گزر رہی ہے۔ اس کے باوجود ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہے کہ اس نے کبھی اسے اس کی بیوی اور بچوں کو بھوکا نہیں رکھا۔ اس کا ضمیر مطمئن ہے کہ اس نے کبھی غلط اور گھناؤنا کام نہیں کیا۔ وہ میرے لیے ایک طرح سے ٹورسٹ گائیڈ ثابت ہوا۔ وہ مجھے سب سے پہلے میوزیم لے گیا تھا۔ یہ بہت بڑا اور خوبصورت میوزم تھا۔ اس کی عمارت بہت شان دار تھی۔ یہ بھی انگریزوں کی باقیات میں سے تھی۔ اس میوزیم کو دیکھنے میں مجھے پورے تین گھنٹے لگ گئے۔ بہت پسند آیا۔ اس میں ایسی ایسی نادر تاریخی اشیاء تھیں جو میں نے خواب میں بھی نہیں دیکھی تھیں۔ تین دن میں جلیل احمد نے مجھے پورا شہر اچھی طرح سے گھما دیا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ کئی مسجدوں میں نماز پڑھی۔ ہوٹلوں میں کھانا کھایا۔ تفریحی مقامات پر گیا۔ بازاروں میں بھی گیا۔ میں نے اس کی بیوی اور بچوں کے لئے بھی شاپنگ کی۔ اس نے تیسرے دن مجھے اپنے ہاں رات کے کھانے پر مدعو کیا۔

وہ اس بات سے بہت خوش تھا کہ میں پاکستانی ہوں۔ اس کا گھر دو کمروں پر مشتمل تھا۔ زبوں حالی اس کے در و دیوار سے ظاہر تھی۔ اس کی بیوی سکینہ بڑی بھولی بھالی اور قبول صورت اور پر کشش سی عورت تھی۔ اس کی بڑی بیٹی نوشابہ سات برس کی تھی۔ اس کا بیٹا زاہد پانچ برس کا تھا۔ اس نے جو کھانا پکایا تھا۔ وہ اتنا مزے دار تھا کہ اس کا ذائقہ میں ساری زندگی نہیں بھول سکتا۔ کھانے میں مونگ مسور کی دال، مرغی کا سالن، پودینے کی چٹنی اور خشکہ تھا۔ میں نے رخصت ہوتے وقت سکینہ کے ہاتھ پر ہزار روپے رکھے اور بچوں کو پانچ، پانچ سو روپے دیئے۔ سکینہ یہ رقم لینے کے لئے کسی صورت سے تیار نہ تھی۔ میرے اصرار پر اسے رقم قبول کرنا پڑی۔ سکینہ اور جلیل احمد کی آنکھیں میری محبت کے اس اظہار پر نم ہو گئیں۔ وہ دونوں بے حد جذباتی ہو گئے تھے۔ میں نے جلیل احمد سے یومیہ کرایہ ہزار روپے طے کیا ہوا تھا۔ میں رات اسے

کرایہ دے دیتا تھا۔ اس نے چوتھے دن ہوٹل آ کر مجھے بتایا کہ وہ اپنی بیوی بچوں کو لے کر دیلور شہر جا رہا ہے۔ وہاں اس کی سسرال ہے۔ رات بارہ بجے پڑوس میں اس کی سسرال سے ٹیلی فون آیا تھا۔ اس کی ساس کی طبیعت بہت خراب ہے۔ میں نے اشوکا ہوٹل میں کمرہ لیا ہوا تھا۔ اشوکا ہوٹل فور اسٹار تھا۔ لیکن کسی بھی فائیو اسٹار ہوٹل سے کم نہیں تھا۔ خاصا مہنگا ہوٹل تھا۔ میرے پاس پیسوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ میں اچھے ہوٹل میں رہ کر لطف اٹھانا چاہتا تھا۔ مجھے بنگلور شہر بہت پسند آیا۔ اس لیے میں نے یہاں کچھ اور دن رہنے کا فیصلہ کرلیا۔ ویسے میں جلیل احمد کی کمی بری طرح محسوس کر رہا تھا۔ میں رات سونے کے لیے بستر پر دراز ہوا تو اس کا، اس کی بیوی اور بچوں کے چہرے میری نظروں میں گھومتے رہے۔ جلیل احمد کو پرانی ٹیکسی بیچ کر نئی ٹیکسی خریدنے کے لئے پانچ لاکھ کی رقم کی ضرورت تھی۔ مجھے نیند دیر سے آئی تھی۔ نیند آنے تک میں یہ سوچتا رہا کہ اس کا مسئلہ کیسے حل ہو سکتا ہے۔

دوسرے دن صبح گیارہ بجے وہ مجھ سے آ کر ملا۔ اس نے بتایا کہ اس کی ساس طبیعت اب بہت بہتر ہے۔ ایک ہفتہ کے لئے بیوی بچوں کو سسرال چھوڑ کر آیا ہے۔ اس روز چوں کہ اتوار تھا۔ میں ناشتا کرنے کے بعد ریس دیکھنے اس کے ساتھ ریس کورس چلا گیا۔

ریس کورس پر اس قدر لوگوں کا رش تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ سارا شہر ہی ریس کھیلنے کے لئے اٹھ آیا ہے۔ نہ صرف مردوں اور جوان لڑکوں کا ہجوم تھا بلکہ ان میں نوجوان لڑکیاں، شادی شدہ اور دفتروں میں کام کرنے والی اور گھریلو عورتیں بھی تھیں۔ یہاں بڑی رونق گہما گہمی اور چہل پہل بھی تھی۔ ایک جشن کا سماں تھا۔ وہاں ہندوستانی فلم انڈسٹری کے بہت سارے معروف اداکار اور اداکارائیں بھی نظر آئیں۔ دو ریسیں ہو چکی تھیں اور ابھی کل چار ریسیں باقی تھیں۔ تیسری ریس شروع ہونے میں ابھی پندرہ، بیس منٹ باقی تھے۔

میں یہاں ریس کھیلنے نہیں بلکہ دیکھنے آیا تھا۔ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد بھی ریس کھیلنے آئی ہوئی تھی۔ یہ حیرت اور دکھ کی بات نہ تھی۔ ہندو کیا، مسلمان کیا...... ہر قوم میں برائیوں نے اپنی جڑیں پھیلا دی تھیں۔ سبھی بے راہ روی اور غلط کاموں کا شکار تھے۔ دولت کا لالچ، راتوں رات بڑا بننے کا خواب، انہیں یہاں کشاں کشاں کھینچ لاتا تھا۔ واقعی دولت سے بڑی چیز کوئی نہیں ہے۔ جلیل احمد نے اپنی زندگی میں ریس نہیں کھیلی تھی۔ نہ ہی کبھی اس کے دل کے کسی کونے میں ریس کھیلنے کی خواہش ہوئی تھی۔ جبکہ وہ ریس کورس سواریوں کو چھوڑنے اور یہاں سے اٹھانے آتا تھا۔ جبکہ اسے نئی ٹیکسی خریدنے کی بڑی آرزو تھی۔ نئی ٹیکسی قسطوں پر بھی مل جاتی تھی۔ اس لیے اس نے ٹیکسی قسطوں پر نہیں لی تھی کہ اس کی آمدنی کم تھی اور گزارہ مشکل سے ہو رہا تھا اور وہ مقروض بھی تھا۔

میں نے بھی اپنی زندگی میں کبھی ریس کھیلی اور نہ ہی دیکھی تھی۔ زندگی میں پہلی بار کسی ریس کورس میں آیا تھا اور پھر مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ ریس کس طرح کھیلی جاتی ہے۔ لیکن اتنا تو جانتا تھا کہ جس گھوڑے پر رقم لگائی جائے وہ اگر اول آ جائے تو جتنی رقم لگائی جاتی ہے اسی حساب سے اتنی ہی رقم بھی ملتی ہے۔ یعنی لگائی جانے والی رقم سے زیادہ۔ گھوڑا نہ جیتنے پر رقم ڈوب جاتی ہے۔

میں اور جلیل احمد ریس کورس کی کینٹین میں چائے پینے کے لئے آئے مجھے جلیل احمد یہ کہہ کر چائے پلانے لایا تھا کہ یہاں بہت اچھی چائے ملتی ہے۔ ایسی عمدہ چائے شہر کے کسی ہوٹل میں ملتی ہے اور نہ ہی گھر میں بن سکتی ہے صرف دو، تین میزوں پر دو لوگ بیٹھے تھے جو اپنی خالی جیبیں کر چکے تھے اور یہاں شراب سے اپنا غم غلط کر رہے تھے۔ سیلف سروس تھی۔ جلیل احمد چائے لانے چلا گیا۔

دائیں جانب جو میز قریب تھی اس پر ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی عمر پچاس، باون برس کی ہوگی۔ اس کی عمر کا اندازہ اس کے سر کے سفید کالے بالوں اور چہرے سے بھی ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے اور چہرے سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ لیکن اس کے چہرے کے تاثرات سے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ سخت ذہنی دباؤ کا شکار ہے۔ میں چوں کہ ذہن پڑھنا بھی جانتا تھا اس لیے میں نے جان لیا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ وہ جو کچھ بھی سوچ رہا تھا اور اس نے جو فیصلہ کیا تھا وہ بڑا خطرناک تھا۔ اس لیے بھی کہ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں اسے اس ارادے سے باز رکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس کی میز پر جا بیٹھا تو اس نے آہٹ پا کر مجھے اس طرح سے دیکھا جیسے میں کوئی شاطر ہوں۔ اس کے پاس ایک بریف کیس تھا۔ جو اس نے برابر والی کرسی پر رکھا ہوا تھا۔ اس نے فوراً ہی بریف کیس اٹھا کر گود میں رکھ لیا اور مجھے مشکوک نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر جو زردی تھی وہ سفید پڑتی چلی گئی۔

”آپ کیا کسی اور میز پر نہیں بیٹھ سکتے؟“ اس شخص نے برہمی سے کہا۔ ”کتنی ساری میزیں خالی پڑی ہیں۔ آپ کے کیا ارادے ہیں؟“ میں اسے جواب دینے والا تھا کہ اس اثنا میں جلیل احمد چائے لے کر میز پر آ گیا۔ وہ پیالیاں رکھ کر کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ جیسے ہی اس کی نظر اس شخص پر پڑی وہ بری طرح چونکا اور بولا۔ ”عبدالغنی صاحب! آپ...... آپ پھر ریس کھیلنے آ گئے......؟“

عبدالغنی نے جواب دینے سے پہلے نظروں ہی نظروں میں میری طرف اشارہ کر کے جیسے پوچھا......

”تمہارے ساتھ یہ کون ہے؟“

”یہ صاحب پاکستانی سیاح ہیں اور ہندوستان کی سیر و سیاحت کے لیے آئے ہیں۔ ان کا نام سکندر ہے۔“ جلیل احمد نے جواب دیا۔ ”انہیں بنگلور آئے چار دن ہو گئے ہیں۔ چوں کہ انہیں بنگلور بہت ہی پسند آیا ہے اس لیے وہ یہاں مزید کچھ دن اور قیام کریں گے۔“

”اچھا...... اچھا......“ عبدالغنی نے بڑے افسردہ لہجے میں کہا۔ ”سنو...... تم میرے لیے بھی ایک کپ چائے لے آؤ۔“

جلیل چائے لانے کے لئے فوراً ہی اٹھ گیا تو میں نے اس سے کہا۔ ”آپ بہت ہی پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔ ایسا لگ رہا ہے کہ بہت بڑی رقم ہار بیٹھے ہیں۔ کچھ رقم بچ گئی ہے اسے بھی لگا دینا چاہتے ہیں۔ ہارنے کی صورت میں شاید آپ......“

”یہ بات آپ کو کس نے بتائی کہ میں ریس میں بہت بڑی رقم ہار چکا ہوں......؟“ عبدالغنی نے بڑی ناگواری سے گھورا۔

”آپ کا چہرہ بتا رہا ہے...... آپ کی آنکھیں کہہ رہی ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”چہرہ دل کا آئینہ ہوتا ہے۔ میں یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ آپ کے پاس جو رقم بچی ہے اسے بھی لگا دینا چاہتے ہیں۔ ہارنے کی صورت میں آپ کا ارادہ خود کشی کر لینے کا ہے۔“

وہ ایک دم سے اس طرح سے اچھل پڑا جیسے اسے سنسنا دینے والا جھٹکا لگا ہو۔ اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ اس اثنا میں جلیل احمد چائے لے کر آ گیا۔

جلیل احمد بھی اس کا چہرہ دیکھ کر بری طرح چونکا۔ پھر اس نے عبدالغنی سے کہا۔ ”کیا آپ آج پھر بہت بڑی رقم ہار چکے ہیں؟“

”ان کا چہرہ اور آنکھیں بتا رہی ہیں کہ یہ آج بھی بہت بڑی رقم ہار چکے ہیں۔“ میں نے جلیل احمد سے کہا۔ ”یہی بات میں ان سے کہہ رہا تھا۔“

”عبدالغنی صاحب ہمارے محلے میں رہتے ہیں۔“ جلیل احمد نے کہا۔ ”انہیں گزشتہ مہینے وراثت میں پندرہ لاکھ روپے ملے تھے۔ کروڑ پتی بننے کے شوق میں گزشتہ سے گزشتہ اتوار یہ دس لاکھ کی رقم ریس میں ہار گئے۔“

”جلیل!“ عبدالغنی نے تیز لہجے میں کہا اور اسے گھورا۔ ”تمہیں یہ بات ان صاحب کو بتانے کی کیا ضرورت تھی؟“

”غنی صاحب!“ جلیل احمد نے خجل ہو کر اپنا سر کھجایا۔ ”میری زبان سے بلا ارادہ نکل گیا۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ محلے میں یہ بات سبھی لوگ جانتے ہیں۔“

”جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں۔“ عبدالغنی کو غصہ آ گیا۔ ”یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ یہ میرا پیسہ تھا۔ میں جو چاہے کروں۔ میری مرضی......“

”غنی صاحب!“ میں نے بڑے نرم لہجے میں انہیں مخاطب کیا۔ ”آپ اس غریب پر برہم نہ ہوں۔ یہ شخص نہ صرف بہت سیدھا سادا بلکہ ایک طرح سے مخلص بھی ہے۔ اس نے یہ بات ہمدردی میں کہی ہے اور پھر آپ کے چہرے سے بہت کچھ عیاں ہے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ اب آپ کے پاس دو ایک لاکھ کی رقم رہ گئی ہے۔ اسے ہارنے کی صورت میں آپ نے خود کشی کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

”جی......“ غنی صاحب پھر اچھل پڑے، ان کی آنکھیں پھیل گئیں اور چہرہ زرد پڑ گیا۔ ”یہ...... یہ...... یہ بات آپ کیسے جانتے ہیں؟“

”جب ایک شخص اپنی ساری پونجی داؤ پر لگا دیتا ہے اور اس کے پاس جب کچھ نہیں بچتا ہے تو اس کے پاس صرف دو صورتیں رہ جاتی ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”وہ یا تو خود کشی کر لیتا ہے یا پھر صبر کر کے بیٹھ جاتا ہے۔ آپ کے چہرے سے یہی ظاہر ہو رہا ہے کہ آپ زندہ رہنا نہیں چاہتے ہیں۔“

”جی ہاں۔“ عبدالغنی نے اثباتی انداز میں اپنا سر ہلا کر اقرار کیا۔ ”آپ نے خوب اندازہ لگایا۔

آپ قیافہ شناس معلوم ہوتے ہیں۔ گزشتہ اتوار کی ریس میں، میں دس لاکھ کی رقم کروڑ پتی بننے کے چکر میں ہار گیا۔ آج میں پانچ لاکھ کی رقم لے کر آیا۔ تین لاکھ روپے میں دو ریسوں میں لگا کر ہار گیا ہوں، اب میرے پاس صرف دو لاکھ روپے بچے ہیں۔ اس لیے میں نے یہاں بیٹھ کر یہ فیصلہ کیا کہ تخت یا تختہ...... تیرہ لاکھ کی رقم کے لیے میں یہ دو لاکھ روپے لگا دوں گا۔ تیرہ لاکھ نہ سہی آٹھ لاکھ ہی آ جائیں۔ یعنی کل دس لاکھ روپے ہی ہو جائیں۔ پانچ لاکھ کا نقصان برداشت کر لوں گا۔“

”فرض کیجیے کہ میں آپ کی رقم سے ریس کھیلتا ہوں اور پندرہ لاکھ روپے جیت لیتا ہوں تو کیا اس میں سے آپ پانچ لاکھ روپے مجھے دینا چاہیں گے؟“

”کیوں نہیں...... کیوں...... کیوں نہیں۔“ عبدالغنی نے سر ہلایا۔ ”میں خوشی سے پانچ لاکھ کی رقم دے دوں گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔“

”اگر آپ مکر گئے تو اس کا کیا علاج ہے......؟“ میں نے پوچھا۔ ”کیوں کہ پانچ لاکھ کی رقم بہت بڑی ہوتی ہے۔ جبکہ آدمی کسی کو پانچ روپے بھی نہیں دیتا ہے۔ فی الوقت آپ وعدہ کر رہے ہیں۔ بعد میں آپ نے اتنی بڑی رقم دینے پر انکار کر دیا تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟“

”آپ کہیں تو میں ایک تحریر لکھ کر آپ کو دے دوں......؟“ عبدالغنی نے جواب دیا۔ ”پھر آپ میری بات کا یقین کر لیں گے؟“

عبدالغنی نے ایک سادے کاغذ پر ایک تحریر لکھ کر دی کہ...... تیرہ لاکھ کی رقم جیتنے کی صورت میں وہ پانچ لاکھ روپے دے دیں گے۔ تیرہ لاکھ کی رقم جیتنے کی صورت میں اس کے پاس کل پندرہ لاکھ روپے ہو جاتے تھے۔ میں نے وہ رسید لے کر جیب میں رکھ لی۔

میں پانچ لاکھ کی رقم جلیل احمد کو دینا چاہتا تھا تا کہ وہ ایک نئی ٹیکسی خرید لے۔ میں نے یہ بات کسی وجہ سے ظاہر نہیں کی۔ ہم ہوٹل سے باہر آئے۔ تیسری ریس شروع ہونے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی۔ عبدالغنی نے مجھے ایک کتاب دکھائی جس میں ریس کے ان گھوڑوں کے بارے میں لکھا تھا جو آج حصہ لے رہے تھے۔ ان میں چار گھوڑے ایسے تھے جو کئی ریسیں جیت چکے تھے۔ لوگ زیادہ تر ان ہی گھوڑوں پر شرطیں لگا رہے تھے۔ میں نے جس گھوڑے پر شرط لگانے کے لیے کہا اس کا نام جیون تھا۔ عبدالغنی اس کے لیے کسی صورت سے تیار نہ تھا۔ کیوں کہ اس گھوڑے پر شرطیں لگانے والے آٹے میں نمک کے برابر تھے۔ جب میں نے بہت اصرار اور مجبور کیا تو وہ رقم لگا آیا۔

ریس شروع ہوئی، جیون سب سے پیچھے تھا۔ باقی وہ چار گھوڑے جن پر لوگوں نے شرطیں لگائی تھیں سب آگے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اصل مقابلہ ان کے درمیان ہے۔ لوگوں نے جن جن گھوڑوں پر رقمیں لگائی تھیں وہ ان گھوڑوں کی ہمت بڑھا رہے تھے اور بہت سارے خاموش اور دھڑکتے دلوں سے یہ ریس دیکھ رہے تھے اور اپنے اپنے گھوڑوں کی جیت کے لیے دعائیں مانگ رہے تھے۔ ادھر عبدالغنی کی حالت بھی بڑی خراب تھی۔ کیوں کہ ان کا گھوڑا تمام گھوڑوں سے پیچھے تھا اور ان تمام گھوڑوں کے مقابلے میں

ٹوسا لگ رہا تھا۔ سب سے آگے جو گھوڑا تھا اس کا نام شیر بنگال تھا۔ میں نے ریس کورس گراؤنڈ میں لوگوں کے ہجوم میں ہندوستان کی فلم انڈسٹری کے چوٹی کے اداکاروں اور اداکاراؤں کو بھی دیکھا جو ریس کھیلنے بنگلور آئے ہوئے تھے۔

عبدالغنی کے چہرے پر بارہ بج رہے تھے۔ وہ بہت مایوس اور غم زدہ سا ہوگیا تھا۔ وہ اپنا سر تھامے کھڑا اور دل ہی دل۔ میں مجھے کوس رہا تھا۔ جلیل احمد بھی فکر مند اور پریشان تھا۔ اسے ریس کی شد بد تھی۔ اس کی نگاہیں جیون پر جمی ہوئی تھیں۔ جب رننگ پوائنٹ سو قدم پر تھا تب اچانک جیون کے جسم میں جیسے بجلی بھر گئی۔ وہ برق رفتاری سے تمام گھوڑوں کو پیچھے چھوڑتا ہوا آگے نکل گیا۔ پھر وہ سب سے آگے پہنچ گیا اور اس نے یہ ریس جیت لی۔ عبدالغنی کو یقین نہیں آیا۔ دوسرے لمحے وہ حیرت اور فرط خوشی سے جلیل احمد سے لپٹ گیا۔

میں نے ان عورتوں اور مردوں سے جو متوسط گھرانوں کے اور ملازم پیشہ تھے اور ریس کھیلنے آئے تھے اور خاصی رقم ہار چکے تھے ان سے کہا تھا کہ وہ فلاں فلاں گھوڑے پر شرطیں لگائیں۔ اس مشورے پر صرف چند ایک نے عمل کیا اور باقی نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھا، جو جیت گئے انہوں نے میرا شکریہ ادا کیا۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ آئندہ ریس کے قریب نہ آئیں۔ لیکن جنہیں لت پڑ چکی ہو وہ نہ تو نصیحت قبول کرتے ہیں اور نہ ہی باز آتے ہیں۔ جو ہار گئے تھے انہیں پچھتاوا ہوا تھا کہ انہوں نے میری بات کیوں نہیں مانی۔ مجھ پر شک کیوں کیا۔

باقی چار ریسوں میں صرف وہی گھوڑے جیتے تھے جن کے جیتنے کے دو فیصد امکانات بھی نہیں تھے۔ میں نے اپنے جادو کے زور سے انہیں جتا دیا تھا۔ ان کی جیت سے نہ صرف دھوم مچ گئی تھی بلکہ ریس کھیلنے والے سخت حیران تھے۔ ہارنے والوں کو یقین نہیں آیا تھا کہ بہترین اور برق رفتار گھوڑے عام گھوڑوں کے مقابلے میں کیسے ہار گئے۔ تاہم وہ لوگ جنہوں نے میرے مشورے پر عمل کیا وہ لکھ پتی بن گئے تھے اور انہیں یہ سب کچھ کسی خواب کی طرح لگ رہا تھا اور انہیں یقین نہیں آیا تھا۔ وہ اس خوشی میں مجھے ہزاروں کی رقم دینا چاہتے تھے لیکن میں نے قبول نہیں کیا۔

عبدالغنی کے پاس اب بائیس لاکھ کی رقم تھی۔ ہم ریس کورس سے کینٹین میں آ کر ایک کیبن میں بیٹھ گئے۔ چائے کا آرڈر دینے کے بعد میں نے عبدالغنی سے کہا۔ ”اب آپ پانچ لاکھ روپے جلیل احمد کو دے دیں۔ دو لاکھ روپے مجھے، پندرہ لاکھ کی رقم آپ کی ہے۔ اسے گھر لے جائیں۔“

”میں کیوں دوں......؟“ عبدالغنی کی نیت میں فتور آ گیا۔ ”میں نے اپنا روپیہ لگایا اور میں جیت گیا۔ میں دو لاکھ ہار جاتا تو آپ کہاں سے دیتے؟ کیا دو لاکھ کی رقم مجھے دے دیتے......؟ آپ نے مجھ سے یہ نہیں کہا تھا کہ ہارنے کا ذمے دار میں ہوں گا۔“

”دیکھئے عبدالغنی صاحب!“ میں بڑی سنجیدگی سے کہنے لگا۔ ”یہ نہ صرف بڑے افسوس اور دکھ کی بات ہے کہ آپ اپنی بات پر قائم نہیں ہیں۔ آپ کی نیت میں فتور آ گیا ہے...... آپ کو چاہیے تھا کہ پہلے یہ دریافت کرتے دو لاکھ کی رقم ہار گیا تو کیا آپ ذمے دار ہوں گے؟ جب ہم ہوٹل میں چائے پینے کے لئے

آئے تھے تب آپ بڑبڑا رہے تھے کہ میں یہ دو لاکھ کی رقم ہار گیا تو پھر میں خودکشی کر لوں گا۔ کیوں کہ بیوی اور بچے اور رشتہ دار اور میرے بھائی بہن طعنے دے دے کر میری زندگی حرام کر دیں گے۔ اس جینے سے مر جانا بہتر ہے...... آپ کے یہ الفاظ سن کر مجھے آپ پر رحم آ گیا اور پھر آپ جلیل احمد کے دوست نکلے۔ ہم محلہ ہیں، اس لیے میں نے آپ کی مدد کی تھی۔“

”آپ کچھ بھی کہہ لیں میں ایک پیسہ بھی نہیں دوں گا۔“ عبدالغنی نے اکڑ کر کہا۔ ”آپ میرا کیا بگاڑ لیں گے......؟ کیا کر لیں گے؟“

میں نے جیب سے کاغذ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ ”آپ نے نہ صرف زبانی وعدہ کیا بلکہ یہ تحریر بھی لکھ کر دی۔“

”اس کاغذ کی حیثیت ہی کیا ہے؟“ عبدالغنی نے وہ کاغذ اٹھا کر پھاڑ کر پھینک دیا۔ ”یہ ایک پرزہ تھا، وہ بھی نہیں رہا۔“

”آپ جیسے آدمی کو بدنیتی زیب نہیں دیتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”آپ نے جو وعدہ کیا ہے وہ پورا کریں مجھے سات لاکھ روپے دے دیں۔“

”یہ ٹھینگا......؟“ عبدالغنی نے مجھے ٹھینگا دکھایا اور ایک جھٹکے سے کھڑا ہوا اور تیر کی طرح ہوٹل سے باہر نکل گیا۔

”سکندر صاحب جانے دیں۔“ جلیل احمد نے کہا۔ ”عبدالغنی صاحب کبھی بھی کسی سے بھی لین دین اور دیگر معاملات میں ٹھیک نہیں رہے انہوں نے اپنے بھائیوں اور بہنوں سے بھی بددیانتی کی۔ وہ ہم سے بھلا اپنا وعدہ پورا کیسے کرتے...... آپ نے بیس لاکھ کی رقم جتوا دی انہوں نے آپ کا شکریہ ادا تک نہیں کیا اتنی بڑی رقم پا کر ان کے دل میں فتور پیدا ہوگیا۔ دراصل انہیں شیطان نے بہکا دیا۔“

”میں نے انہیں صرف تمہاری خاطر جتوایا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”میں چاہتا تھا کہ تم ایک نئی ٹیکسی خرید لو، تم ضرورت مند بھی ہو۔“

”آپ کا بہت، بہت شکریہ سکندر صاحب!“ اس کی آواز بھرا گئی اور اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ ”آپ کتنے اچھے نیک اور مخلص ہیں۔ جب کہ آپ سے نہ تو میری دوستی ہے، نہ رشتہ داری ہے، میرے دو بھائی ہیں، مالی طور پر بہت مستحکم ہیں۔ ان کے پاس اللہ کا دیا اتنا کچھ ہے کہ وہ ایک کیا دو ٹیکسیاں اور ایک مکان بھی خرید کر دے سکتے ہیں۔ ٹیکسی خرید کر دینا تو درکنار کچھ مالی مدد بھی نہیں کرتے ہیں۔ اگر دیں بھی تو میں نہیں لوں گا۔ میں ایک خوددار شخص ہوں۔ میں نے اللہ کے سوا کبھی کسی اور کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔“

”دراصل میں نے پہلے ہی دن جان لیا تھا کہ تم بہت اچھے آدمی ہو۔“ میں نے کہا۔ ”تعلیم یافتہ بھی ہو، تم نے مجھے بتایا تھا کہ ایم اے پاس ہو، ملازمت نہ ملنے کے سبب تم ٹیکسی چلانے پر مجبور ہوگئے۔ تمہارے والد مرحوم نے بھی ٹیکسی کی آمدنی سے پڑھایا لکھایا۔ میرے نزدیک ہر وہ پیشہ قابل احترام ہے جس میں عزت کی روٹی ملتی ہے۔ رزق حلال میں بڑی برکت ہے۔ آسودگی ہے، میں نئی ٹیکسی اس لیے دلانا چاہتا

ہوں کہ تمہاری آمدنی میں اضافہ ہو۔ ایک سے دو، دو سے تین ٹیکسیاں ہو جائیں۔ ایک دن تمہارے پاس بھی ایک اچھا مکان ہو اور تمہارے بچے اچھے اسکولوں میں پڑھیں۔ تمہارے اور تمہاری بیوی کے جو خواب ہیں وہ پورے ہوں۔ انشاءاللہ پورے ہوں گے۔ اس لیے کہ تم اللہ پر بھروسا کرنے والوں میں سے ہو۔"

"اچھا آپ یہ تو بتائیں کہ آپ نے اتنی بڑی رقم ایسے گھوڑوں پر لگوا کر جتادی جو کسی صورت میں اول آ ہی نہیں سکتے تھے۔" اس نے متعجب لہجے میں کہا۔ "وہ گھوڑے جو تمام گھوڑوں سے پیچھے تھے یک لخت انہوں نے برق رفتاری دکھائی، سب کو پیچھے چھوڑ دیا، وہ کیسے......؟"

"دراصل گھوڑوں کو جتوانے میں جوکیوں کا کمال اور ہاتھ ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ لوگ عموماً شہرت یافتہ گھوڑوں پر زیادہ توجہ دیتے ہیں جو کئی ریسوں میں حصہ لے کر تھک جاتے ہیں۔ میں نے جن گھوڑوں کی نشان دہی کی تھی۔ انہوں نے بہت ہی کم ریسوں میں حصہ لیا تھا۔ وہ تازہ دم بھی تھے۔ میرے اندازے، خیال اور تجربے کے پیش نظر وہ جیت سکتے تھے۔ بس اتنی سی بات تھی۔ لوگ ایسی باتوں کے بارے میں کم دھیان دیتے ہیں۔" رات دس بجے جلیل احمد نے مجھے ہوٹل پر اتارا تو اس نے مجھ سے کہا۔ "میں کل سے آپ سے یومیہ ہزار روپے نہیں بلکہ صرف چار سو روپے لوں گا۔"

"وہ کس لیے......؟" میں نے متعجب لہجے میں پوچھا۔ "کیا تمہارے ہاتھ قارون کا خزانہ لگ گیا ہے؟ یہ فیاضی کیوں بھئی......؟ کیا بیوی بچوں کو بھوکا مارو گے؟"

"اس لیے کہ ہزار روپے بہت زیادہ ہیں۔" جلیل احمد نے جواب دیا۔ "سچ پوچھیے تو میں نے آپ سے زیادتی کی ہے۔ جب کہ میری ٹیکسی پرانی اور کھٹارہ بھی ہے۔"

"ہزار روپے کرایہ میں نے طے کیا تھا تم نے نہیں۔" میں نے کہا۔ "تم نے کوئی زیادتی نہیں کی۔ میرے پاس بہت کچھ ہے کسی چیز کی کمی نہیں۔ اب تم گھر جا کر آرام کرو۔ ٹیکسی کے کھٹارہ اور پرانی ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ اصل بات آدمی کی ہوتی ہے۔ تم بہت بلند ہو اور نیک آدمی ہو۔"

میں نے اپنے کمرے میں پہنچ کر کپڑے تبدیل کیے۔ بستر پر دراز ہوتے وقت میں نے ریموٹ لے لیا۔ ٹی وی پر منتر پڑھ کر پھونکا۔ پھر آن کر دیا۔ اب میرے سامنے عبدالغنی اور اس کے گھر کا منظر تھا۔ عبدالغنی نے شام کے وقت گھر پہنچ کر نوٹوں سے بھرا بریف کیس اپنی الماری میں رکھ دیا۔ اس وقت اس کا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ رات دس بجے جب تمام مہمان چلے گئے تو اس کی بیوی اور بچے دوسرے کمرے میں سونے کے لئے چلے گئے۔ کیوں کہ عبدالغنی نے اپنی بیوی سے کہا تھا کہ اسے کچھ ضروری کام ہے، تم ایسا کرو کہ رات بچوں کے کمرے میں جا کر گزارنا۔ جب اس کی بیوی کپڑے بدل کر کمرے سے نکل گئی تو اس نے دروازہ بند کر کے اندر سے چٹخنی لگا لی۔ پھر اس نے کھڑکیاں بند کیں اور ان کے پردے بھی درست کیے۔ پھر وہ بریف کیس لے کر بستر پر بیٹھ گیا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ ابھر آئی۔ وہ بریف کیس کے کوڈ نمبر سیٹ کرتے ہوئے تمسخرانہ لہجے میں بڑبڑانے لگا۔ "وہ سالا اسکندر...... کہتا تھا کہ بائیس لاکھ کی رقم ہے۔ اس میں سے پانچ لاکھ روپے میں اس ٹیکسی ڈرائیور جلیل احمد کو دے دوں

اور دو لاکھ اس پاکستانی کو...... جیسے اس کے باپ کا مال ہو...... ٹھیک ہے اس نے جن گھوڑوں پر شرطیں لگانے کے لئے کہا میں نے لگا دیں...... لیکن رقم تو میری تھی جس سے میں نے ریس کھیلی...... میں ان سالوں کو ایک کوڑی بھی نہیں دوں گا۔ کل ہی بائیس لاکھ روپے بینک میں جمع کرا دوں گا۔"

اس نے بریف کیس کھولنے سے پہلے دروازے کی طرف دیکھا کہ کہیں جھری میں سے کوئی جھانک تو نہیں رہا ہے......؟ جب اس نے اچھی طرح سے اپنا اطمینان کر لیا تب اس نے بریف کیس کا ڈھکن اٹھایا اور چمکتی آنکھوں سے دیکھا۔ دوسرے لمحے اس کی آنکھیں حیرت اور وحشت سے پھیل گئیں...... یہ کیا......؟ نوٹوں کی گڈیاں کہاں گئیں......؟ یہ ردی کہاں سے آ گئی......؟ اس میں تو نوٹوں کی گڈیاں تھیں......؟"

بریف کیس میں ردی بھری ہوئی تھی۔ اس کی حالت پاگلوں کی سی ہو گئی۔ وہ بریف کیس سے ردی نکال نکال کر بستر پر ڈالنے لگا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انہیں دیکھے جا رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آیا کہ نوٹوں کی گڈیاں ردی کیسے بن گئیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کی غیر موجودگی میں اس کے کمرے میں کوئی آ کر اس کا بریف کیس لے گیا اور دوسرا بریف کیس رکھ کر چلا گیا۔ پھر اسے خیال آیا کہ وہ جب سے آیا ہے تب سے اس کمرے میں موجود ہے ایک لحظہ کے لیے بھی نہیں گیا...... یہ سب کیسے اور کیوں کر ہو گیا؟ وہ جتنا سوچتا رہتا تھا۔ اتنا ہی چکراتا جا رہا تھا۔ اس کا دماغ جیسے معطل ہو چکا تھا۔

"اسے کہتے ہیں لالچ بری بلا ہے......" ایک نادیدہ آواز کمرے کی خاموشی میں گونجی۔ "یہ تم نے اچھا نہیں کیا عبدالغنی......؟"

اس آواز کو سنتے ہی وہ اس طرح اچھل پڑا جیسے اسے ہزار وولٹ کے بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ خوف و دہشت سے اس کا چہرہ سفید پڑتا چلا گیا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اس کی گھگی بندھ گئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ غش کھا جائے گا۔ چند لمحوں تک اس کی حالت بڑی غیر رہی۔ اس کی رگوں میں لہو منجمد ہو گیا۔ پھر اس نے پھنسی پھنسی آواز میں پوچھا۔ "آپ کون ہے......؟"

"جن ماموں جان......" اسے جواب ملا۔ "بھانجے جان! یہ تم نے کیا بدنیتی کی......؟ تم نے سات لاکھ کی رقم ہڑپ کیوں کر لی؟ یہ بے ایمانی کس لیے کی؟"

"جن ماموں...... میں...... مم...... میں نے کوئی بے ایمانی نہیں کی؟" عبدالغنی بری طرح ہکلایا۔ "یہ میری پوری رقم تھی۔ میں نے اپنی رقم سے ریس کھیلی تھی۔"

"بکومت......" جن ماموں نے کرخت لہجے میں کہا۔ "تم مجھے بے وقوف بنا رہے ہو۔ مجھے...... جن ماموں کو...... کیا تم نے اس سے وعدہ نہیں کیا تھا کہ میں بیس لاکھ جیت گیا تو میں پندرہ لاکھ کی رقم جو میں ریس میں ہار چکا ہوں اسے لے کر باقی تمام رقم انہیں دے دوں گا۔ کیا تم نے نہیں کہا تھا؟ وعدہ نہیں کیا تھا......؟"

"جی...... جی...... نہیں...... جی ہاں...... جی ہاں کیا تھا؟" وہ بری طرح بوکھلا رہا تھا اور اس کے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

"پھر تم نے اپنے پندرہ لاکھ رکھ کر اسے باقی رقم کیوں نہیں دی؟" جن ماموں کڑک کر بولے۔

''بڑی اکڑ دکھا کر رقم لے آئے۔ کیا تم نے کمینگی نہیں کی......''

''جن ماموں! جن ماموں...... مجھے معاف کر دیں۔'' عبدالغنی گڑگڑایا۔ ''واقعی میں نے بے ایمانی کی۔ میرے دل میں فتور آ گیا تھا۔''

''جب ساری رقم ردی بن گئی تو تم معافی مانگ رہے ہو......'' جن ماموں گرجے۔ ''یہ تمہارے لیے سزا ہے۔ تم پوری کے چکر میں آدھی روٹی سے بھی رہ گئے۔''

''میری عقل اور میری نیت کو جانے کیا ہو گیا تھا۔'' عبدالغنی رو پڑا۔ ''اب تو میرے پاس بائیس لاکھ کیا بائیس روپے بھی نہیں رہے۔''

''اب تمہاری نیت اور عقل ٹھکانے آ گئی کہ نہیں......؟'' جن ماموں کے لہجے میں غصہ بھرا تھا۔ ''اب سڑکوں پر جا کر بھیک مانگو۔ شاید بیس روپے مل جائیں؟''

''جی...... جی...... مجھے بہت بڑا سبق مل گیا......'' اس کی آواز بھرا گئی۔ ''بڑے لوگ سچ کہتے ہیں لالچ بری بلا ہے، یہ بلا مجھے کھا گئی......''

''اب تمہیں ایک شرط پر بائیس لاکھ کی رقم مل سکتی ہے۔'' جن ماموں کا لہجہ قدرے نرم پڑ گیا۔ ''کیا تم اس شرط کو صدق دل سے پورا کرو گے؟''

''ایک نہیں...... میں دس شرطیں پوری کرنے کے لئے ہر طرح سے تیار ہوں۔'' عبدالغنی نے بڑی عاجزی وانکساری سے کہا۔ ''آپ بتائیں کیا شرط ہے......؟''

''شرط صرف اتنی سی ہے کہ تمہیں بائیس لاکھ کی رقم تھوڑی دیر میں مل جائے گی۔'' جن ماموں نے جواب دیا۔ ''اس میں سے پانچ لاکھ روپے جلیل احمد کو اور دو لاکھ روپے سکندر کو جو پاکستانی ہے ابھی اور اسی وقت پہنچا دو گے۔ اس نیک کام میں دس منٹ کی بھی دیر نہیں کرو گے۔''

''میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ بائیس لاکھ کی رقم ملتے ہی اس میں سے سات لاکھ روپے لے جا کر ان دونوں کو دے دوں گا۔'' عبدالغنی خوش ہو کر بولا۔

''لیکن ایک بات یاد رکھو۔'' جن ماموں نے تڑختے لہجے میں کہا۔ ''تم نے پھر وعدہ خلافی اور بے ایمانی کی تو یہ رقم پھر غائب ہو جائے گی۔ پھر تمہیں بائیس روپے بھی نہیں ملیں گے...... بائیس لاکھ کی رقم میں ان دونوں کو دے دوں گا۔ تمہیں ایک ویرانے میں لے جا کر بائیس دنوں کے لیے الٹا لٹکا دوں گا۔''

''آپ مجھ سے جو چاہیں قسم لے لیں میں بالکل بھی بدنیتی نہیں کروں گا۔'' عبدالغنی نے کہا۔ ''اگر میں نے وعدے کی خلاف ورزی کی تو مجھے الٹا لٹکا دیں۔''

''اچھا تو پھر ایسا کرو کہ یہ ساری ردی جو تم نے کمرے میں بکھیر دی ہے اسے سمیٹ کر بریف کیس میں رکھو اور بریف کیس فرش پر نیچے رکھ دو۔''

عبدالغنی نے فوراً ہی جن ماموں کی ہدایت پر عمل کیا۔ جن ماموں نے اس سے کہا۔ ''اب تم پانچ قدم پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو جاؤ۔''

عبدالغنی ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ بریف کیس میں سے ایک نیلا دھواں اٹھا۔ وہ آہستہ آہستہ بلند ہوتا گیا اور چھت تک پہنچ گیا۔ اس دھوئیں میں بریف کیس اور اس میں رکھی ہوئی ردی پوری چھپ گئی۔ عبدالغنی یہ سب کچھ حیرت اور سکتے کی سی حالت میں دیکھتا رہا۔ اس کا دل اندر سے بری طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ ساکت و جامد اور بے حس وحرکت ہو گیا۔ اس پر کسی بت کا سا دھوکا ہونے لگا۔ وہ منجمد آنکھوں اور ساکت پلکوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

کوئی دس منٹ کے بعد دھواں آہستہ آہستہ کم ہوتا گیا۔ چند لمحوں کے بعد دھوئیں کا غبار کم ہو کر نظروں سے غائب ہو گیا۔ بریف کیس میں سو اور پانچ سو کے نوٹوں کی گڈیاں بھری ہوئی تھیں۔ نوٹوں کی گڈیاں دیکھتے ہی عبدالغنی کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے فوراً ہی لپک کر بریف اٹھا لیا۔ پھر اس نے بریف کیس بستر پر رکھا اور رقم گننے لگا۔ گنتی کرنے میں سے اس بیس منٹ لگ گئے۔ پھر اس نے پندرہ لاکھ کی رقم اپنی الماری کی تجوری میں رکھ کر اسے مقفل کیا۔ پھر سات لاکھ کی رقم اس نے بریف کیس میں رکھی اور جلیل احمد کے گھر پہنچا۔ اس وقت جلیل احمد جاگ رہا تھا۔ دروازے پر دستک سن کر اس نے دروازہ کھولا۔

اس وقت دروازے پر عبدالغنی کو دیکھ کر اسے بڑی حیرت ہوئی اور یقین نہیں آیا کہ عبدالغنی آ سکتا ہے۔ اس نے اندر داخل ہو کر کہا۔

''مجھے اس بات کا بہت افسوس ہے کہ میں نے تمہارے پاکستانی دوست اور محسن سے وعدہ خلافی کی...... لالچ نے مجھے بہکا دیا تھا۔ مجھے میرے ضمیر نے ملامت کی...... تمہارے دوست سکندر صاحب نے کہا تھا کہ تمہیں پانچ لاکھ دے دوں۔ دو لاکھ روپے تمہارے دوست کو...... وہ کہاں ہیں؟''

''میں اس میں سے پانچ لاکھ کیا پانچ روپے بھی نہیں لوں گا۔'' جلیل احمد نے کہا۔ ''ساری رقم آپ سکندر صاحب ہی کو دے دیں۔''

''تم کس لیے اتنی بڑی رقم نہیں لو گے؟'' عبدالغنی نے متعجب لہجے میں پوچھا۔ ''یہ ساری رقم سکندر صاحب کو کس لیے دے دوں؟''

''اس لیے کہ ساری محنت اور تدبیر ان کی اپنی ہے۔'' جلیل احمد نے کہا۔ ''اتنی رقم کے وہ حق دار ہیں۔ میں نے کیا کیا جو اتنی بڑی رقم قبول کر لوں۔''

''تم کہتے تو ٹھیک ہو۔'' عبدالغنی نے کہا۔ ''تم مجھے ان کے پاس لے چلو میں انہیں یہ رقم دے دوں گا۔ پھر تم جانو اور وہ جانیں۔''

تھوڑی دیر بعد عبدالغنی، جلیل احمد کے ساتھ آیا تو اس میں مجھ سے نظریں ملانے کی تاب نہیں تھی۔ بڑا نادم سا ہو رہا تھا۔ وہ زیادہ بیٹھا نہیں۔ مجھ سے اپنی حرکت کی معافی مانگ کر اور رقم دے کر چلا گیا۔ جلیل احمد کا دل بڑا ابھی تھا۔ خوبصورت بھی۔ وہ اتنی بڑی رقم لینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ میرے شدید اصرار پر اس نے اتنا کہا کہ میں اس میں سے دس، بیس ہزار روپے دے دوں۔ میں نے اسے بہ مشکل پانچ لاکھ روپے لینے پر راضی کیا۔ اس سے کہا کہ کل ہی ٹیکسی خرید لے۔

دوسرے دن جلیل احمد نے اپنی ٹیکسی اسی ہزار روپے میں بیچ دی۔ پھر اس نے اسی ہزار اور پانچ لاکھ روپے کا بینک ڈرافٹ بنایا۔ رات کی گاڑی سے وہ بمبئی شہر روانہ ہوگیا۔ کیوں کہ وہاں ٹیکسیاں جو دو ایک برس چلی ہوئی ہوتی تھیں اور اچھی حالت میں بھی ہوتی تھیں بہت سستی مل جاتی تھیں۔ نئی گاڑیوں کے دام بھی بنگلور شہر کے مقابلے میں کم تھے۔ میں اسے رخصت کرنے ریلوے اسٹیشن بھی گیا تھا۔ وہ میرا بہت ممنون ہو رہا تھا۔

☆......☆......☆

میں سہ پہر کے وقت ہوٹل سے نکل کر کمرشل اسٹریٹ آ گیا۔ یہ لشکر کے علاقے کا قدیم بازار تھا۔ تقسیم سے قبل انگریزوں کی دکانیں تھیں۔ آج بھی کمرشل اسٹریٹ کی بڑی اہمیت تھی۔ یہاں بڑی بڑی دکانیں تھیں۔ ہر طرح کی دکانیں تھیں۔ کمرشل اسٹریٹ کے قریب ہی ابراہیم صاحب اسٹریٹ تھی۔

ابراہیم صاحب اسٹریٹ پر ایک بہت بڑا ہوٹل ہے۔ یہاں مدراسی ناشتے، کھانے اور مختلف ڈشیں ملتی ہیں، مصالحہ دوسا اسپیشل ڈش ہوتی ہے۔ جلیل احمد مجھے یہاں دو تین مرتبہ لے آیا تھا۔ میں نے پیپر مصالحہ دوسا کا آرڈر دیا۔ وہ کھا کر اور کافی پی کر نکلا، پھر چہل قدمی کرتا ہوا کبن پارک کی طرف چل پڑا جو یہاں سے خاصی دور تھا۔ میں فٹ پاتھ پر شہر کی رونقیں دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ پھر میں سڑک پار کرنے کے لئے فٹ پاتھ پر کھڑا ہوگیا۔

اس سڑک پر ٹریفک کا سیلاب تیزی سے بہہ رہا تھا۔ سامنے والے فٹ پاتھ پر ایک جوان عورت ایک میڈیکل اسٹور سے نکلی اور کھڑی ہوگئی۔ میرے عقب میں ایک بہت ہی بڑا اور خوبصورت سا ریسٹورنٹ تھا جس کا نام کامنی تھا۔ اس عورت کے حسن و شباب نے نہیں بلکہ اس کے غم زدہ چہرے اور آنسوؤں نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا۔ ایک پل میں سب کچھ واضح ہوگیا۔ وہ عورت اس میڈیکل اسٹور میں خواب آور گولیوں کی شیشی خریدنے گئی تھی۔ سیلز مین نے بغیر نسخے کے دینے سے صاف انکار کردیا تھا۔ وہ صرف ایک گولی دے سکتا تھا۔ جبکہ اسے پوری شیشی کی ضرورت تھی تاکہ وہ ساری گولیاں کھا کر خودکشی کرلے۔ ہندوستان میں بھی خودکشی کا رجحان بہت تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ اس کی سرح میں تیزی سے ہر سال اضافہ ہو رہا تھا۔ عورتوں میں خودکشی کا رجحان زیادہ تھا۔ پھر اس جوان عورت نے جو چہرے مہرے اور وضع قطع سے کسی اچھے خاندان کی فرد لگ رہی تھی اور شادی شدہ بھی لگ رہی تھی کسی تیز رفتار گاڑی کے نیچے آ کر اپنی زندگی ختم کرنے کا فیصلہ اچانک ہی کیا تھا۔ اس وقت سگنل بند ہوگیا۔ اس لیے کسی سمت سے گاڑیاں نہیں آ رہی تھیں۔

پھر ہوا یہ کہ ایک منچلے نوجوان نے جو اسکوٹر پر تھا اس نے سگنل توڑا اور ٹریفک سارجنٹ کے ڈر سے تیز رفتاری سے اسکوٹر چلاتا ہوا اس طرف آ رہا تھا کہ کہیں وہ پکڑا نہ جائے۔ اس عورت نے اس اسکوٹر کے نیچے آنے کا ارادہ کرلیا۔ اس طرح وہ خود بھی مر جاتی اور اس لڑکے کو بھی لے مرتی۔ شاید لڑکا بچ جاتا۔ کیوں کہ اس لڑکے نے ہیلمٹ پہن رکھی تھی۔ اس شہر میں ہر موٹر سائیکل اور اسکوٹر والے کو ہیلمٹ پہننا لازمی تھا۔ یہاں لڑکیاں اور عورتیں بھی ہیلمٹ پہن کر اسکوٹر چلاتی تھیں۔ وہ لڑکا شاید بچ جاتا۔ لیکن اس کے جسم کی ہڈیاں سلامت نہ رہتیں۔ وہ ایک معصوم جوان کی زندگی سے کھیلنا چاہتی تھی۔

وہ فٹ پاتھ سے اتر کے سڑک پر اس انداز سے آ گئی کہ اسکوٹر کی زد میں آ جائے۔ چوں کہ اس کا سارا دھیان اس اسکوٹر والے کی طرف تھا اس لیے اس نے مجھے دیکھا نہیں تھا۔ میں اس کی طرف بڑھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اسکوٹر کی زد میں آتی۔ میں نے اس کا بازو پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اگر ایک لحظہ کی بھی دیر ہو جاتی تو حادثہ پیش آ چکا ہوتا۔ چوں کہ دونوں چوراہوں کے سگنل کھل چکے تھے میں اسے کھینچ کر فٹ پاتھ پر لے آیا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے......؟" اس نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑایا اور تیز لہجے میں بولی۔ "تمہیں شرم نہیں آتی عورتوں کو چھیڑتے ہوئے۔"

"بدتمیزی نہیں ہے بلکہ میں نے آپ پر دیا کی ہے شریمتی جی!" میں نے اس کے چہرے پر نگاہیں مرکوز کر کے کہا۔ "آپ اسے چھیڑنے کا نام دے رہی ہیں۔ آپ کو تو میرا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ میں نے آپ کی اور معصوم لڑکے کی جان بچائی جسے آپ اپنے ساتھ لے کر مرنا چاہ رہی تھیں۔"

"کیا مطلب......؟" وہ تنک کر بولی اور مجھے تیز نظروں سے گھورتی ہوئی ساڑی کا پلو اور اپنی سانسیں ٹھیک کرنے لگی۔

"مطلب یہ ہے کہ آپ خودکشی کرنے والی تھیں اس لیے میں نے آپ کو بچالیا۔" میں نے جواب دیا۔ "کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"یوشٹ اپ......" وہ بگڑ کر بولی۔ "مجھے کیا ضرورت پڑی تھی کہ میں خودکشی کروں۔ یہ آپ سے کس نے کہہ دیا؟"

"آپ کے غم زدہ چہرے اور آنسو بھری آنکھوں نے......" میں نے کہا۔ "ضرورت تھی اس لیے آپ خودکشی کرنے پر تلی ہوئی تھیں...... اگر آپ کو مرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو خوشی سے مریں تاکہ اس دنیا پر سے ایک آدمی کا بوجھ کم ہو۔ مہنگائی میں کمی آئے...... لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے کہ...... ہم تو ڈوبے ہیں صنم تجھے بھی لے ڈوبیں گے...... کسی گاڑی کے نیچے آنے سے اس پر بھی مصیبت آ جاتی ہے...... خودکشی کرنے کے لئے کیا یہ بلند و بالا عمارتیں کم ہیں۔ اس علاقے میں پانچ منزل سے لے کر تین تین منزل کی عمارتیں موجود ہیں۔ آپ کے لئے تیسری منزل ہی کافی ہے۔"

"یہ آپ کیا اول فول بک رہے ہیں......؟" وہ بڑی طرح جھن جھلا گئی۔ "میں آپ کو جانتی تک نہیں ہوں۔ آپ مجھ سے اس طرح باتیں کر رہے ہیں جیسے میں آپ کی دوست ہوں...... یہ عورتوں سے دوستی کرنے کا بھونڈا اور فلمی طریقہ ہے۔ میں آپ سے دوستی یا عشق لڑانے سے رہی۔ میں شادی شدہ عورت ہوں۔"

"میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ جو آپ سمجھ رہی ہیں۔" میں نے کہا۔ "آپ مجھے اپنا دوست سمجھیں...... کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ آپ خودکشی کے ارادے سے نکلی ہوئی ہیں۔ آپ میڈیکل اسٹور سے خواب آور گولیوں کی شیشی خریدنے گئی تھیں...... سیلز مین نے بغیر نسخہ کے دینے سے منع کر دیا۔ پھر آپ نے اس لڑکے کے اسکوٹر کے نیچے آ کر خودکشی کرنے کا فیصلہ کرلیا...... کیا اس سے انکار ہے؟"

"جی...... انکار نہیں ہے۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "اگر آپ مجھ سے دوستی کرنا چاہتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ میں آپ کو اپنا دوست سمجھوں تو پھر میری مدد کریں۔ مجھے ایک مصیبت سے نجات دلائیں...... مصیبت میں دوست ہی کام آتے ہیں۔ سچ پوچھیے تو میرا کوئی دوست نہیں ہے۔ میرا پتی بھی نہیں۔ مجھے ایک دوست کی اشد ضرورت ہے۔"

"اگر ایسی بات ہے تو میں حاضر ہوں۔" میں نے کہا۔ "چلئے...... سامنے ہوٹل ہے۔ وہاں چل کر بیٹھتے ہیں۔ پھر آپ بتائیں کہ کیا مسئلہ ہے؟"

"ہوٹل میں نہیں......" اس نے کہا۔ "اس ہوٹل کے پیچھے جو عمارت ہے اس میں میرا فلیٹ ہے۔ وہاں چل کر بیٹھتے ہیں۔ چائے بھی پیتے ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد میں اس کے نہایت آراستہ پیراستہ اور شان دار قسم کے لگژری فلیٹ میں تھا۔ اس فلیٹ سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ایک امیر کبیر عورت ہے۔ اس فلیٹ میں ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ وہ ایسی حسین اور پرکشش عورت تھی کہ تنہائی میں مرد اسے دیکھ کر بہک جائے۔

"آپ تشریف رکھیں...... میں ابھی آتی ہوں۔" اس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا اور بیڈروم کی طرف بڑھ گئی۔ چند لمحوں کے بعد وہ بیڈروم سے آئی تو اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ اس نے مجھ پر پستول تان لیا۔

پستول کی نال مجھے موت کے فرشتے کی طرح گھور رہی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور اس کے سینے میں سانسوں کا تموج ہچکولے کھا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سے درندگی جھانک رہی تھی۔ اس کی انگلی لبلبی پر تھی اور کسی بھی پل وہ لبلبی دبا سکتی تھی۔

میں نے اس سے بڑے سکون واطمینان سے پوچھا۔ "کیا آپ یہ مہمان نوازی کر رہی ہیں؟ کیا اس شہر میں اس طرح مہمان نوازی کی جاتی ہے......؟"

"جی ہاں......" اس نے اثباتی انداز میں سر ہلایا۔ "آپ اسے مہمان نوازی سمجھیں یا موت نوازی...... آپ کو موت سے نوازنا ہے۔"

"آپ ایک نردوش آدمی کو کس لیے مارنا چاہتی ہیں؟" میں نے پوچھا۔ "کیا کسی کی زندگی بچانا پاپ ہے؟ بری بات ہے؟"

"اس لیے کہ آپ نے مجھے مرنے جو نہیں دیا۔" اس نے ہذیانی لہجے میں جواب دیا۔ "یہ آپ سے کس نے کہا تھا مجھے مرنے سے بچائیں؟"

"کیا میں کوئی آپ کا جانی دشمن تھا جو آپ کو مرنے دیتا؟" میں نے جواب دیا۔ "میں نے تو ایک انسان ہونے کے ناتے آپ کی جان بچائی...... خیر آپ تو انسان ہیں۔ اگر آپ کی بجائے بلی یا کتے کا پلا بھی ہوتا تو میں اسے بچا لیتا۔"

"ہاں آپ میرے لیے جانی دشمن سے بھی بڑھ کر ہیں۔" اس نے ہیجانی لہجے میں کہا۔ "کیونکہ

آپ نے مجھے مرنے جو نہیں دیا۔"

"اس لیے کہ...... آپ نہ صرف خود مر رہی تھیں بلکہ دوسروں کے لیے بھی مصیبت اور موت کا سبب بن رہی تھیں؟ اس طرح کیوں مر رہی تھیں؟"

"کیونکہ یہ آسان موت تھی۔ بہت ہی آسان۔" وہ خشونت سے بولی۔ "آپ کی حماقت کی وجہ سے مرنا نصیب نہیں ہوا۔"

"مرنے کے لیے کوئی طریقہ اور وقت مقرر تھوڑی ہے۔ یہ مرنا نہیں بلکہ خودکشی کرنا ہوا۔ جو خودکشی کر کے مرنا چاہے شوق سے مرے۔"

"لیکن آپ نے مجھے خودکشی کر کے مرنے نہیں دیا۔" اس نے تمہیدہ لہجے میں کہا۔ "شاید اس لیے کہ میں آپ پر مہربان ہو جاؤں گی۔"

"جو عورت موت کے منہ اور آغوش میں خود سے جانا چاہتی ہے اسے بچایا جائے تو وہ مہربان نہیں ہوتی ہے...... مہربان تو وہ ہوتی ہے جو مرنا نہیں چاہتی اور موت اس کے سامنے کھڑی ہو اور اسے کوئی موت کے منہ سے نکال لے۔ مجھے کوئی خواہش نہیں ہے کہ آپ مجھ پر مہربان ہو جائیں اور نہ ہی میں نے اس غرض سے آپ کی جان بچائی...... ایک بات تو بتائیں کہ آپ پہلے خواب آور گولیاں کھا کر مرنا چاہ رہی تھیں...... جب گولیاں نہیں ملیں تو گاڑی کے نیچے آ کر مرنا چاہا۔ یہ آسان موت کیسے ہوئی......؟ کیا اس کے علاوہ مرنے کے لیے کوئی اور راستہ نہیں تھا جو اسے اختیار کیا تھا؟ آخر کیوں اور کس لیے......؟"

"یہ دو ہی طریقے ایسے ہیں کہ موت بغیر کسی تکلیف اور اذیت کے اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "آدمی بڑی آسانی سے مر جاتا ہے۔"

"یہ آپ سے کس نے کہہ دیا شریمتی جی!" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "موت اور آدمی کی آغوش میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ آپ کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ خواب آور گولیاں کھانے سے آدمی بے ہوشی کی حالت میں مر جاتا ہے۔ اسے کوئی تکلیف اور کسی بات کا درد اور احساس نہیں ہوتا۔ اس میں بھی تکلیف ہوتی ہے جو بہ ظاہر دیکھنے والے کو محسوس نہیں ہوتی ہے۔ جس پر بیتتی ہے وہی جانتا ہے کہ موت آسانی سے نہیں نکلتی ہے۔ گاڑی کے نیچے آنے سے کوئی ضروری نہیں کہ آدمی فوراً مر جائے۔ وہ شدید زخمی بھی ہو سکتا ہے۔ اور پھر اس کے ہاتھ پیر ٹوٹ سکتے ہیں۔ جسم کی ہڈیاں بھی ٹوٹ پھوٹ جاتی ہیں۔ اور پھر اس صورت میں ساری زندگی کے لیے معذور اور اپاہج ہو کر رہ جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے یہ سب کچھ نہیں سوچا؟ مرنے کا فیصلہ کر لیا اگر آپ دونوں پہلوؤں پر سوچتیں تو شاید یہ قدم نہیں اٹھاتیں۔"

"مجھے آپ کے کسی خیال سے اتفاق نہیں۔" وہ تکرار کے انداز میں بولی۔ "آپ بیچ میں نہ آتے تو میں مر چکی ہوتی۔"

"میں تو یہ کہوں گا کہ آدمی اپنی طبعی موت سے پہلے حادثاتی موت کو دعوت نہ دے۔" میں نے کہا۔ "طبعی موت مرنے میں ہی اس کا بھلا ہے...... اوپر والا آدمی کو نہ تو ایک منٹ پہلے بلاتا ہے اور نہ ایک

منٹ دیر سے۔ جب تک اس کا دانہ پانی دنیا میں موجود ہے وہ دنیا میں ہی رہتا ہے۔"

"آپ شاید مسلمان ہو اس لیے مسلمانوں کی سی باتیں کر رہے ہو؟" وہ چونک کر بولی۔ "میری ایک مسلمان سہیلی ہے وہ بھی آپ کی جیسی باتیں کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ ہمارے مذہب میں خودکشی حرام موت ہے۔ خدا کو یہ پسند نہیں ہے کہ اپنے ہاتھوں سے اپنی جان لے لے۔ اس نے موت اپنے ہاتھ میں رکھی ہے۔"

"ہاں...... میں مسلمان ہوں۔" میں نے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا۔ "آپ کی مسلمان سہیلی نے جو موت کے بارے میں کہا وہ بالکل ٹھیک ہے۔ ہمارے مذہب میں خودکشی جائز نہیں۔ یہ حرام موت ہوتی ہے۔ لیکن آپ یہ بتائیں کہ آپ مجھے کیوں مارنا چاہتی ہیں......؟ کیا آپ کے دھرم میں بھلائی کرنے والے کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا ہے۔ اس کا یہ صلہ ہوتا ہے...... کیسا دھرم ہے یہ...... دھرم ہے یا......"

"سنو...... ہمارا دھرم یہ نہیں کہتا ہے اور آپ دھرم کو بیچ میں نہ لائیں۔" وہ بولی۔ "میں آپ کو یہاں مارنے نہیں بلکہ آپ کے سامنے خودکشی کرنے آپ کو لائی ہوں تاکہ آپ دنیا والوں کو بتا سکیں کہ مجھے قتل نہیں کیا گیا ہے بلکہ میں نے خودکشی کی ہے۔"

"بہت خوب......" میں مسکرایا۔ "خودکشی کرنے کا یہ کون سا طریقہ ہے۔ سیدھا سادا اور آسان طریقہ یہ ہے کہ آپ خودکشی کرنے سے قبل اپنے پتی کے نام چٹھی لکھیں اور اسے بتائیں کہ آپ کیوں اور کس لیے خودکشی کر رہی ہیں؟ اس طرح آپ مجھے مصیبت میں پھنسا دیں گی۔ کیونکہ کوئی بھی میری بات کا یقین نہیں کرے گا۔ ہر کوئی یہی سمجھے گا کہ میں نے آپ کو بے آبرو کر کے قتل کر دیا۔ کیونکہ آپ نہایت حسین اور جوان عورت ہیں۔ آپ کو خودکشی کرنے کا شوق ہو رہا ہے تو خودکشی کر لیں اور اس خاکسار کو جانے دیں۔ میں ایک سیاح آدمی ہوں کچھ دنوں بعد یہاں کی سیر وسیاحت کر کے چلا جاؤں گا۔"

"نہیں...... نہیں آپ نہیں جا سکتے...... میں پتی یا کسی کے بھی نام کوئی چٹھی نہیں لکھوں گی۔ میں خودکشی کروں گی...... آپ کے سامنے۔" اس نے ہذیانی لہجے میں کہا اور پستول کی نال کنپٹی پر رکھی۔

دراصل صدمے نے اسے پاگل کر دیا تھا۔ وہ آپے میں نہیں تھی۔ اور اسے کسی بات کا ذرہ برابر بھی ہوش نہیں تھا۔ اس لیے وہ بہکی بہکی قسم کی باتیں کر رہی تھی۔ میں نے اس کے پستول کی ساری گولیاں غائب کر دیں۔ اب وہ میری جیب میں تھیں۔ عجیب بے وقوف عورت تھی۔ اسے جانے کیا سوجھی تھی جو ایک اجنبی کے سامنے خودکشی کر رہی تھی۔

"چلیے...... جلدی سے آپ اپنی خودکشی کا شوق پورا کر لیں تاکہ میں سیر کے لیے جا سکوں۔" میں نے خوش دلی سے کہا۔

"کیا آپ میری بات کو مذاق سمجھ رہے ہیں؟" وہ تیز لہجے میں بولی۔ "یہ مذاق نہیں ہے۔ میں بالکل ہی سنجیدہ ہوں۔ سمجھے آپ......؟"

"میں مذاق تو نہیں سمجھ رہا لیکن یہ ضرور دیکھنا چاہتا ہوں کہ آپ کنپٹی پر پستول رکھ کر اپنے آپ کو کیوں شوٹ کرنا چاہتی ہیں......؟" میں نے کہا۔ "اس طرح آپ کی خوبصورت کھوپڑی میں ایک

سوراخ ہو جائے گا۔ ساری خوبصورتی خاک میں مل جائے گی۔"

"اب مجھے اپنی خوبصورتی سے کیا لینا دینا ہے۔" وہ بولی۔ "مرنے کے بعد خوبصورتی کا کیا کام ہے۔ لاش چتا کی نذر ہو جائے گی۔"

"آپ کے مرنے کے بعد اخبار والے آپ کی تصویریں اتاریں گے۔ آپ اس میں ایک بدصورت عورت کی طرح نظر آئیں گی۔"

"میں بدصورت نظر آؤں یا چڑیل، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ چونکہ مجھے مرنا ہے لہٰذا میں مر کے ہی رہوں گی۔"

"میں نے سنا ہے کہ آپ کے دھرم میں جب کوئی عورت خودکشی کر لیتی ہے، اسے قتل کر دیا جاتا ہے یا وہ حادثاتی موت کا شکار ہو جاتی ہے تو وہ چڑیل بن جاتی ہے، بدروح بن جاتی ہے۔ جو عورت طبعی موت مرتی ہے وہ سورگ میں ایک اپسرا کی طرح ہوتی ہے۔"

"میں اس لیے تو خودکشی کر رہی ہوں کہ بدروح بن کر ان لوگوں سے انتقام لوں جن کی وجہ سے خودکشی کی نوبت آئی ہے؟" وہ بولی۔

"وہ کون لوگ ہیں اور انہوں نے آپ کے ساتھ کیا کیا جو آپ چڑیل بن کر ان سے بدلہ لینا چاہتی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ میں آپ کو اپنی رام کہانی سناؤں۔" وہ ہذیانی لہجے میں بولی۔ "مجھے دیر ہو رہی ہے۔" دوسرے ہی لمحے اس نے لبلبی دبا دی۔ ایک بار...... دوسری بار...... تیسری بار...... ہر بار کلک کلک کی آواز گونج کر رہ گئی۔

"یہ کیا......؟" اس نے تحیرزدہ لہجے میں کہا اور کنپٹی سے پستول ہٹا کر اسے دیکھا۔ "یہ خالی کیسے ہے؟ میں نے اسے کل ہی بھرا تھا؟" پھر اس نے پستول کا چیمبر کھول کر دیکھا۔ وہ خالی پڑا تھا۔ وہ پستول کو الٹ پلٹ کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر اس نے پستول صوفے پر پھینک دیا اور بالکنی کی طرف لپکی۔ اس کے دروازے پر چٹخنی لگی تھی۔ اسے کھولنے لگی۔

وہ بالکنی سے چھلانگ لگا کر خودکشی کرنا چاہتی تھی۔ میں نے لپک کر اسے دبوچ لیا تو وہ ہاتھ پیر مارنے لگی۔ "آپ چھوڑ دیں مجھے...... مجھے مرنے دیں...... اب میں زندہ نہیں رہنا چاہتی۔ آپ مجھ پر دیا کریں...... مجھے مرنے دیں۔"

میں اسے گود میں اٹھا کر بیڈروم میں لے آیا اور بستر پر بٹھا دیا۔ لیکن وہ فوراً ہی اٹھی اور آگے کی طرف لپکی تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھا دیا۔ "ہٹ جاؤ...... مجھے مرنے دو......" اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور اس کی حالت پاگلوں کی سی ہونے لگی۔

اسے خودکشی سے باز رکھنے کی ایک ہی صورت، تدبیر اور علاج تھا۔ میں نے اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ رسید کیا تو اس نے اپنے گال پر اپنا ہاتھ رکھ لیا۔ اس کی آنکھیں دہشت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

اسے جیسے یقین نہیں آیا کہ میں اس پر ہاتھ اٹھا سکتا ہوں۔ چند ثانیوں تک وہ مجھے حیرت اور دہشت سے گھورتی رہی۔ پھر وہ ایک دم سے کسی شیرنی کی طرح بپھر کر اٹھی اور غضب ناک ہوگئی۔ میرے پاس آئی اور اس نے میرے سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر مجھے اتنی زور سے دھکا دیا کہ میں اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا۔ میں لڑکھڑاتا ہوا دیوار سے جالگا۔ قریب والی میز سے ٹکراتا ہوا بال بال بچ گیا۔ ورنہ میز الٹ جاتی اور ساری چیزیں ٹوٹ جاتیں۔

وہ ساڑی کا پلو سنبھالتی، سینے اور شانے پر درست کرتی ہوئی بیڈروم سے کسی سنسناتے ہوئے تیر کی مانند نکلی جیسے فلیٹ سے باہر نکل کر شور مچادے گی کہ بچاؤ...... بچاؤ...... میرے فلیٹ میں ایک ناگ گھس آیا ہے۔ وہ مجھے ڈس لینا چاہتا ہے۔ میری عزت خطرے میں ہے۔ لیکن بات یہ نہ تھی۔ وہ سیدھا باورچی خانہ میں گھس گئی تھی۔ چند لمحوں کے بعد باہر آئی تو سبزی ترکاری کاٹنے والی تیز چھری اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس کی دھار بہت تیز تھی اور چھری بھی تقریباً ایک فٹ لمبی تھی۔ وہ سبزی ترکاری کیا کسی انسان اور مویشی کی گردن بھی گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیتی۔ یہ عام چھری سے قدرے مختلف تھی۔

''تم...... تم نے مجھے تھپڑ مارا......؟'' وہ ہیجانی لہجے میں بولی۔ اس کی آنکھوں سے وحشیانہ پن جھانک رہا تھا اور چہرے پر سفاکی ابھر آئی تھی۔ ''تمہاری یہ مجال...... میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ میں تمہاری گردن کاٹ کر باہر پھینک دوں گی۔''

''میں نے تمہیں اس لیے تھپڑ مارا کہ تم ہوش میں آجاؤ...... تمہاری عقل ٹھکانے آجائے۔'' میں نے کہا۔ ''کیونکہ تم پر ایک اندھا جنون سوار ہوگیا تھا۔ اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ میں تم پر ہاتھ اٹھاؤں۔ مجھے ایک عورت پر ہاتھ اٹھانا اچھا نہیں معلوم ہوتا......'' میں نے توقف کر کے کہا۔ ''اور نہ ہی یہ مردانگی ہے۔ میں نے کبھی کسی عورت پر آج تک ہاتھ نہیں اٹھایا۔ یہ مجبوری تھی اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔''

''اس کے سوا چارہ نہیں تھا۔ مجبوری تھی۔ یہ تم نے کیا رٹ لگا رکھی ہے۔'' اس نے نفرت اور غصے بھرے لہجے میں کہا۔ ''پہلے تو میں تمہارا یہ ہاتھ کاٹ دوں گی جس سے تم نے مجھے تھپڑ مارا ہے۔ پھر تمہارا سر تن سے جدا کردوں گی۔''

''تم ہاتھ کاٹنا اور میرا سر جدا کرنا تو درکنار ایک انگلی تک نہیں کاٹ سکتی ہو۔'' میں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ''بہتر ہے کہ تم خود کو سنبھالو اور ہوش میں آنے کی کوشش کرو۔ اس لیے کہ ان باتوں سے کچھ حاصل نہیں۔ تم میرا بال تک بیکا نہیں کرسکتیں۔''

''تم یہ چاہتے ہو کہ مجھے قابو میں کر کے بے بس کردو۔'' وہ وحشت زدہ لہجے میں بولی۔ ''میں تمہارا یہ ارمان پورا ہونے نہیں دوں گی۔''

''اگر میری نیت بری ہوتی اور میں اس ارادے سے تمہارے ساتھ آیا ہوتا تو میں اب تک تمہیں فتح کرچکا ہوتا۔'' میں نے کہا۔ ''یہ تمہارا وہم ہے۔ وہم کا علاج کسی کے پاس بھی نہیں ہے۔ میرے لیے کسی عورت کو بے بس کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔''

''مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش نہ کرو۔'' اس نے تکرار کے انداز میں کہا۔ ''تم مرد لوگ عورت کو بے وقوف اسی طرح بناتے ہو۔ اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اسے کھلونا بنالیتے ہو۔ تم نے مجھے فوراً ہی قابو میں اس لیے نہیں کیا کہ کہیں میں شور نہ مچادوں۔''

''میں تمہیں بھی یہ الزام دے سکتا ہوں کہ تم مجھے یہاں بہانے سے لائی ہو۔'' میں نے کہا۔ ''میری نیت صاف تھی اور میں تم سے ہوٹل میں جا کر بات کرنا چاہتا تھا۔ لیکن تم نے میری یہ تجویز نہیں مانی۔ اب یہاں آکر تم نے جو ڈراما کیا کھیل کھیلا اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ تم مجھے یہ الزام دے رہی ہو کہ میں تمہیں کھلونا سمجھ کر کھیل کر دل کا ارمان پورا کرنا چاہتا ہوں۔''

''ہاں...... ہاں......'' وہ ہیجانی لہجے میں چیخی۔ اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ چہرہ سرخ ہوگیا۔ وہ مجھ سے دو قدم پر میرے روبرو تھی۔ وہ اپنے آپ میں نہیں تھی۔ وہ غضب ناک شیرنی کی طرح مجھ پر ٹوٹ پڑی۔

پہلے تو اس نے میرا دایاں ہاتھ تھام کر چھری سے میری کلائی کاٹنے کی کوشش کی۔ میں خاموش کھڑا رہا۔ میں جادو سے کام نہ لیتا تو میرا ہاتھ کسی پھل کی طرح کٹ چکا ہوتا۔ جب اس نے دیکھا تو وہ بڑی حیران ہوئی۔ اس نے میرا ہاتھ کاٹنے کے لیے پورا زور لگادیا تھا۔ ہاتھ تھا کہ کٹنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ جب میرا ہاتھ کاٹنے کی کوشش میں وہ ناکام ہوگئی تو اس نے پھر چھری کے دستے کو مضبوطی سے تھام لیا۔ پھر پوری قوت سے میرے سینے میں دل کی جگہ پر بھونک دیا۔ چاقو کی نوک جیسے کسی سخت چٹان سے ٹکرائی۔ اس کا آدھا حصہ ٹوٹ کر فرش پر گر گیا۔ اس نے حیرت وخوف سے اپنی ٹوٹی ہوئی چھری کو دیکھا اور پھر اس نے مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں۔

اسے یقین نہیں آیا تھا۔ اس نے یکبارگی ٹوٹی ہوئی چھری کو دیکھا پھر مجھے دیکھا۔ پھر وہ دوڑ کر بستر پر کٹی پتنگ کی طرح گری اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے ٹوٹی ہوئی چھری اور اس کے آگے کا حصہ فرش پر سے اٹھایا اور میز پر رکھ دیا۔ میں اسے روتا ہوا دیکھتا رہا پھر وہ روتے روتے بے ہوش ہوگئی اور بستر سے گر کر فرش پر بکھر گئی۔ صدمے نے اسے بے ہوش کردیا تھا۔

میں اسے فرش پر جوں کا توں پڑا رہنے دیتا۔ کیونکہ وہ فرش پر بکھری کچھ ایسی حالت میں تھی کہ وہ خود دیکھتی تو اسے شرمساری سی ہوتی۔ اب اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ میں اسے فرش سے اٹھا کر بستر پر لٹا دوں۔ میں نے اسے گود میں اٹھا کر بستر پر لٹادیا۔ اس کا لباس اور بال درست کر کے اس کی ساڑی کے پلو سے اس کے آنسو پونچھے۔ اسے چند لمحوں بڑے غور سے دیکھتا رہا۔

میں بیڈروم سے نکل کر کچن میں آیا۔ کچن خاصا بڑا تھا۔ انتہائی صاف ستھرا بھی تھا۔ ہر چیز اپنی اپنی جگہ بڑی قرینے اور سلیقے سے رکھی ہوئی تھی۔ لہٰذا مجھے کافی اور شکر تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ چائے کی پتی بھی موجود تھی لیکن میں نے کافی بنانا مناسب سمجھا۔ میں نے دو کپ کافی بنائی۔ فریج میں سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی اور ایک گلاس میں پانی بھرا۔ پھر پانی اور کافی لے کر اس کے بیڈروم میں آیا۔

ابھی وہ ہوش میں نہیں آئی تھی۔ اس کے حسین چہرے پر کرب اور زردی سی تھی۔ پلکوں کے دریچے بند کیے اس بے ہوشی کی حالت میں سپنوں کی وادی میں بھٹک رہی تھی۔ اس کے سینے میں سانسوں کا تموج ہچکولے کھا رہا تھا۔ کوئی بدنیت شخص ہوتا تو وہ اپنے جذبات پر قابو نہیں پا سکتا تھا۔ اس تنہائی اور اس کی بے ہوشی کی حالت میں فائدہ اٹھاتا۔ کیونکہ اس کا حسن وشباب اور سراپا بہکا دینے والا تھا۔

میں نے ٹرے میز پر رکھ دی۔ اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ چند ثانیوں کے بعد اس کے جسم میں حرکت اور سراپا میں ارتعاش سا پیدا ہوا۔ پھر اس کا سراپا بستر پر اس طرح کسمسایا جس طرح بازوؤں میں کسمساتا ہے۔ پھر اس نے رفتہ رفتہ پلکوں کی چلمن اوپر اٹھائی۔ پھر آنکھیں کھول دیں اور ایک ٹک چھت کو گھورنے لگی۔ اس لمحے اس کا ذہن بالکل خالی تھا۔ اس کی پلکیں ساکت اور آنکھیں منجمد سی تھیں۔

''شریمتی جی!'' میں نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

میری آواز سن کر وہ اس طرح سے اچھل پڑی جیسے اسے برقی جھٹکا لگا ہو۔ اس نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا اور ایک دم سے ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھی اور اس نے مجھے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھا اور سراسیمگی سے بولی۔ ''تم...... تم کیا کر رہے ہو؟ تم گئے نہیں؟ کہیں تم نے......''

''میں تمہیں ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں اس لیے نہیں گیا کہ تمہاری مدد کروں......'' میں نے اسے مشکوک پا کر کہا۔ ''تم پریشان نہ ہو میں نے تمہاری بے ہوشی سے فائدہ اٹھا کر کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کی...... اگر میں نے کوئی ناشائستہ حرکت کی ہوتی تو پھر میں اس وقت یہاں موجود نہ ہوتا...... اب آپ اٹھیں یہ پانی پی لیں۔ پھر کافی...... میں کافی بنا کر لایا ہوں۔ اس کے پینے سے طبیعت بہل جائے گی۔''

میں نے اس کی طرف پانی کا گلاس بڑھایا۔ اس نے میرے چہرے کو پڑھا۔ اس کے بشرے سے ایسا لگا جیسے وہ میری بات کو تول رہی ہو۔ پھر اسے جیسے میری بات کا یقین آ گیا۔ اس نے میرے ہاتھ سے گلاس لے لیا۔ اسے ایک ہی سانس میں خالی کر دیا جیسے پیاس سے برا حال ہو رہا ہو۔ ''پلیز! آپ مجھے شما کر دیں۔'' اس نے گلاس واپس کرتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر ندامت کی سرخی پھیل گئی۔ ''میں نے آپ کو غلط سمجھا۔''

میں نے گلاس اس کے ہاتھ سے لے کر ٹرے میں رکھ دیا اور کافی کا کپ اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ''شکر ہے آپ کی غلط فہمی دور ہو گئی۔''

پھر میں اپنا کپ لے کر اس کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اس نے کافی کا سپ لیا۔ پھر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''آپ اس شہر میں اجنبی اور ایک سیاح ہیں۔ آپ میری مدد کر سکتے ہیں؟ میرا تو خیال یہ ہے کہ میری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔''

''آپ کی بات اپنی جگہ بجا ہے۔'' میں نے کافی کا ایک گھونٹ لے کر کہا۔ ''دراصل میں ایک بنجارا ہوں۔ بستی بستی، شہر شہر اور جانے کہاں کہاں گھومتا رہتا ہوں۔ دراصل میرا اپنا ایک مشن ہے۔ ہر اس شخص

کی مدد کرنا جو کسی نہ کسی مصیبت میں پھنس جاتا ہے۔ جو مظلوم اور حالات کے ہاتھوں ستایا ہوا ہو۔ جو کسی بھی پریشانی میں کیوں نہ ہو۔ کیسی آفت اور افتاد کیوں نہ ہو میں اسے نجات دلا دیتا ہوں۔ میں آپ کی ہر مشکل دور کر سکتا ہوں۔''

''اچھا یہ بتائیں کہ میں نے اپنی پوری قوت سے آپ کی کلائی کاٹنے کی کوشش کی اور آپ کے سینے میں چھری بھونکی تھی۔'' وہ تحیر زدہ لہجے میں بولی۔ ''آپ کی کلائی کٹنا تو درکنار اس پر ایک ہلکی سی خراش بھی نہیں آئی۔ سینے پر حملہ کیا تو چھری ٹوٹ گئی...... آخر یہ سب کیا ہے؟ میں بھوت پریت پر یقین نہیں رکھتی ہوں۔ لیکن ایسا لگ رہا ہے کہ آپ انسان نہیں کوئی روح ہیں۔''

''میں کوئی روح ہوں اور نہ ہی بھوت پریت......'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''میں بھی آپ کی طرح ایک انسان ہوں دراصل بات یہ ہے کہ میں نے اپنے ہاتھوں پر ایسا روغن لگا رکھا ہے کہ اس پر کوئی تیز دھار چیز اور آگ اثر نہیں کر سکتی۔ میں نے اندر ایک ایسی جیکٹ پہن رکھی ہے کہ گولی یا چاقو چھری اثر نہیں کر سکتی۔ وہ اس لیے کہ کبھی کسی کی مدد کرتے وقت مجھ پر حملہ ہوا تو مجھ پر کوئی آنچ آنے نہ پائے۔ میں ہر طرح سے محفوظ رہوں۔''

''مجھ پر جو افتاد آن پڑی ہے وہ ایسی ہے کہ آپ کسی طرح بھی میری مدد نہیں کر سکتے۔؟'' وہ بولی۔ ''یہ کچھ عجیب ہی قسم کی افتاد ہے۔ بڑی خطرناک قسم کی۔''

''آپ اپنی افتاد بتائیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں دیکھتا ہوں کہ یہ کس قسم کی ہے۔ کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکوں گا اور اس سے نجات دلا سکوں گا۔''

''ایسا کریں...... چل کر نشست گاہ میں بیٹھتے ہیں۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''میں اور کافی بنا لاتی ہوں۔ کافی کے دوران آپ میری بپتا بھی سنتے جائیں۔''

''میرا نام کامنی دتہ ہے۔'' تھوڑی دیر بعد نشست گاہ میں بیٹھ کر کافی پیتی ہوئی وہ کہنے لگی۔ ''میرے پتی کا نام رام دتہ ہے۔ وہ ایک کروڑ پتی آدمی ہیں۔ کاروباری ہیں۔ بڑے سخت مزاج کے ہیں۔ ہماری شادی کو چار برس ہو رہے ہیں۔ دنیا میں ان کے سوا اب میرا کوئی نہیں ہے۔ جب میں سولہ برس کی تھی، میں اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ ہماری شادی لو میرج کا نتیجہ ہے۔ میرے پتی ایک ہفتہ قبل کاروباری دورے پر یورپ گئے ہیں اور ایک ماہ بعد ان کی واپسی متوقع ہے۔ بات یہ ہے کہ میں پچاس لاکھ کی رقم جوئے میں ہار چکی ہوں۔'' وہ اتنا کہہ کر رک گئی۔ کیونکہ اس کی آواز حلق میں پھنس گئی تھی۔ اس نے فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کر منہ سے لگا لی۔

''پچاس لاکھ روپے......؟'' میں نے تحیر زدہ لہجے میں تب کہا جب اس نے بوتل منہ سے ہٹا لی۔ ''یہ تو بہت بڑی رقم ہے۔ کیا یہ آپ کی ذاتی رقم تھی؟''

''جی نہیں......'' اس نے نفی کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''یہ میرے پتی کی رقم تھی۔ اگر میری ہوتی تو دکھ کس بات کا تھا۔ میرے پاس دو تین لاکھ کی رقم ہے جو بینک میں موجود ہے۔ یہ تین

لاکھ کی رقم میری ماں نے مجھے دی تھی۔ میرے پتی کو اس رقم کا کوئی علم نہیں ہے۔ لیکن انہیں اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ وہ مجھے جیب خرچ کے لیے ماہانہ دس ہزار روپے دیتے ہیں جو میں اڑا دیتی ہوں۔ میرا ہاتھ ذرا کھلا ہے۔ میں سوشل عورت جو ٹھہری۔"

"کیا پچاس لاکھ کی رقم آپ کے پتی نے کاروبار کے سلسلے میں آپ کو دی تھی جو آپ نے جوئے میں ہار دی؟" میں نے کہا۔ "آپ کو اس غم نے خودکشی پر مجبور کیا ہے؟"

"کاروبار کے لیے نہیں دی تھی بلکہ انہوں نے گھر میں انکم ٹیکس بچانے کے لیے رکھی ہوئی تھی۔" کامنی بولی۔ "اگر کاروبار کے لیے دی ہوئی ہوتی پھر کس بات کی چنتا اور غم تھا۔ میں نقصان کا بتا کر اپنی جان چھڑا لیتی۔ لیکن وہ جب سنیں گے کہ میں نے جوئے میں ان کی رقم ہار دی ہے تو وہ مجھے طلاق دے دیں گے۔ اس لیے کہ میں نے بددیانتی کی۔ انہوں نے مجھ سے کہہ رکھا ہے کہ میں اس رقم کے بارے میں کسی کو بھی نہ بتاؤں۔ میں نے ساری رات بہت سوچا کہ کیا کروں؟ میں اپنے پتی سے معافی مانگ لوں۔ لیکن میں جانتی ہوں وہ مجھے معاف نہیں کریں گے کیونکہ دولت ان کی کمزوری ہے۔ ہر شخص میں کوئی نہ کوئی کمزوری اور خامی ہوتی ہے ان کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ دولت کی بڑی خواہش ہے۔ ہوس اور لالچ ہے۔ حالانکہ وہ کروڑ پتی ہیں۔ انہیں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ ان کے نزدیک پچاس لاکھ کی رقم کوئی حیثیت نہیں رکھتی ہے...... لیکن اس کے باوجود پیسے پر جان دینے والے ہیں۔"

"میں نہیں کہتا کہ وہ آپ جیسی حسین، اور محبت کرنے والی پتنی کو طلاق دے دیں۔" میں نے کہا۔ "یہ وہم دل سے نکال دیں۔ ان سے معافی مانگ لیں۔"

"اصل بات کیا ہے میں بتاؤں۔" کامنی کہنے لگی۔ "جس کے پاس دولت ہوتی ہے تو اس معاشرے میں اسی کی عزت کی جاتی ہے۔ یہاں اچھے انسان اور دیوتا کی نہیں بلکہ دولت کی پوجا کی جاتی ہے...... اور پھر حسین اور جوان لڑکیاں اور عورتیں شہد کی مکھیاں بن کر بھن بھناتی ہیں۔ میرے پتی نہ صرف بہت خوبصورت ہیں بلکہ اسمارٹ بھی ہیں ان کی سب سے بڑی خوبصورتی اور کشش ان کی دولت ہے۔ شوبزنس کی لڑکیاں بھی ان کے گرد گھیرا ڈالے رہتی ہیں چونکہ وہ مرد ہیں۔ شاید وہ کبھی کبھی کسی سے دل بہلا لیتے ہوں گے۔ لیکن میں نے ان پر کوئی شک وشبہ نہیں کیا اور نہ ہی تعرض...... اس لیے کہ وہ مجھ سے بہت پریم کرتے ہیں۔ ان کی والہانہ محبت میں وارفتگی ہے اور میرا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ میں اس لیے بھی کچھ باتوں کو نظر انداز کر دیتی ہوں کہ اس میں میرا نقصان ہے۔ زندگی جب تک سکون سے گزر رہی ہے گزرنے دو۔ چھتے میں ہاتھ نہ ڈالو۔"

"آپ بڑی حقیقت پسند عورت ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن آپ نے اتنی بڑی رقم ہار دی۔ آپ نے اتنا بڑا جوا کیوں کھیلا؟ کیا آپ کو اس کھیل کی لت پڑی ہوئی تھی؟ یقین نہیں آتا کہ آپ جیسی سنجیدہ اور شائستہ عورت اتنی بڑی رقم کا جوا کھیل سکتی ہے؟"

"میں آپ کو بتاتی ہوں کہ قصہ کیا ہے؟" کامنی کہنے لگی۔ "میں نے آپ کو بتایا نا کہ میں ایک سوشل عورت ہوں۔ ہر قسم کی تقریبات میں شرکت کرتی ہوں اور مجھے اس لیے مدعو کیا جاتا ہے کہ میں ایک

بڑی سرمایہ دار کی پتنی ہوں۔ ہائی سوسائٹی میں میرا اٹھنا بیٹھنا ہے۔ ہم کچھ سہیلیاں کلب میں رمی، برج یا فلیش کھیلتی ہیں۔ مجھے فلیش کھیل بہت پسند ہے۔ میں اس کھیل میں بہت ماہر ہوں۔ میں شاید ہی کبھی ہاری ہوں۔ جب بھی اٹھی دو تین ہزار روپے جیت کر اٹھی۔ دو ایک مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ جب کسی سہیلی کے ہاں تاش کے کھیل کی بیٹھک ہوئی۔ دس پندرہ ہزار کی رقم جیت کر اٹھی۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کسی کھیل یعنی رمی، برج اور فلیش میں میں دو تین سو روپے بھی ہاری ہوں۔

میری ایک سہیلی ہے اس کا نام مالا ہے۔ اس کی عمر بائیس برس کی ہوگی۔ وہ اس صوبے کرناٹک کی مشہور و معروف ترین اور بہت ہی بے باک قسم کی ماڈل گرل ہے۔ کوئی تین برس سے وہ شوبزنس کی دنیا میں دھوم مچا رہی ہے اور شاید ہی کوئی اس کی ہم پلہ ہو۔ اس کے اتنے کمرشل ہیں کہ آج تک کسی کو نصیب نہیں ہوئے ہیں۔ جس اشتہار میں دیکھیں وہی نظر آئے گی۔ وہ اس لیے بہت کامیاب ہے۔ اسے عزت شہرت اور جو دولت نصیب ہے اس کی وجہ، وہ کمرشل اور اشتہار بنانے والے کی ہر مانگ پوری کرتی ہے۔ اس کی زندگی میں اتنی کالی راتیں آئی ہیں کہ وہ خود بھی نہیں جانتی اور اس کی زندگی میں آنے والے مردوں کے چہرے بھی اسے یاد نہیں، وہ صرف اور صرف دولت کی بھوکی ہے۔ اس لیے بدنامی، رسوائی اور ذلت سے ڈرتی نہیں ہے۔ لوگ اس کے کردار پر انگلیاں اٹھاتے اور کیچڑ بھی اچھالتے ہیں لیکن وہ کسی بات کی پروا نہیں کرتی۔ دو ایک مرتبہ وہ میرے پتی کی دعوت بھی قبول کر چکی ہے۔ میں بھی انجان رہی اور وہ بھی...... میں جانتی ہوں کہ دونوں کو کچھ کہنا اور سننا فضول ہے۔

اس سے میری گہری دوستی کی وجہ یہ ہے کہ اس کی بڑی بہن تلنی میری کلاس فیلو رہ چکی ہے۔ وہ دو برس پہلے منشیات لے کر لندن گئی تو پکڑی گئی اور اسے سات برس کی سزا ہو گئی۔ وہ بھی ماڈلنگ کرتی ہے اور میری سب سے عزیز سہیلی ہے۔ مالا کو بھی جوئے کا شوق نہیں بلکہ جنون اور لت ہے لیکن وہ دولت مند جواری مرد اور عورتوں، اداکار، اداکاراؤں اور کالا دھن والوں کے ساتھ کھیلتی ہے۔ اس کے پاس مال و دولت کی کوئی کمی نہیں ہے۔ جوئے، کالی راتوں اور ماڈلنگ کی آمدنی نے اسے تقریباً کروڑ پتی بنا دیا ہے۔ معلوم نہیں وہ بے پناہ دولت لے کر کیا کرے گی۔ اس کے باوجود کہ وہ رسوائے زمانہ ہے اس کے لیے ان جوان مردوں کی کوئی کمی نہیں ہے جو اس کی نجی زندگی کے بارے میں جانتے ہوئے بھی سدا کے لیے اس کا ہاتھ تھام لینا چاہتے ہیں۔ اس کی کڑی شرائط سن کر بھاگ جاتے ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ کوئی میری شرائط پر اور معیار پر پورا نہیں اترتا ہے اس لیے شادی کرنے کا کوئی موڈ نہیں نہ ہی کوئی تیار ہوگا۔ اس لیے میں جتنی دولت کما سکتی ہوں کما لوں تاکہ بڑھاپا سکون سے اور پر تعیش گزرے۔ بنگلور شہر میں ایک کیسینو ہے جو بہت بڑا ہے اور بھی کیسینو ہیں جہاں وہ اکثر شامیں جا کر گزارتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ ایک نائٹ کلب میں مہینے میں پروگرام کرتی ہے جو صرف مخصوص دولت مند لوگوں کے لیے ہوتا ہے۔ اس کے عوض اسے ایک لاکھ روپے ملتے ہیں۔ دیکھا جائے تو ایک طرح سے وہ راج کماری کی سی زندگی گزار رہی ہے۔ اس کی پانچ کی بجائے دس انگلیاں گھی میں ہیں۔

ایک روز یعنی میرے پتی کی یوروپ روانگی سے تین دن پہلے اس نے مجھے فون کر کے کہا کہ تمہارا

پتی ایک نئی ماڈل امرتا کے ساتھ ہوٹل اشوکا کے کمرہ نمبر تین سو دس میں قید ہے۔ یعنی بند ہے۔ تم اپنی تسلی کرنا اور ثبوت چاہتی ہو تو میں پیش کر سکتی ہوں۔ میں نے اس سے کہا کہ مجھے اس بات کی کوئی چنتا اور پروا نہیں ہے تم ایسا کرو کچھ دیر کے لیے میرے ہاں آ جاؤ۔ اگر فرصت ہو تو...... اس نے مجھ سے کہا کہ ایک کمرشل کی شوٹنگ ہو رہی ہے۔ میں اس سے فارغ ہو کر رات دس بجے تک پہنچ رہی ہوں۔ میرے پتی یہ کہہ کر گئے تھے وہ ایک ضروری کام سے دو دن کے لیے مدراس جا رہے ہیں۔ امرتا بھی بہت حسین اور خوبصورت تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ اپنے پتی کو رنگے ہاتھوں پکڑوں۔ اس سے بات اور خراب ہو جاتی۔ عقل مندی کا تقاضا تھا کہ خاموش رہوں۔

مالا ٹھیک رات دس بجے میرے فلیٹ پر پہنچ گئی۔ دراصل مجھے ایک بات پریشان کر رہی تھی آخر یہ سلسلہ کب تک چلتا رہے گا۔ اس بات کا امکان نظر آ رہا تھا کہ مجھے کسی دن طلاق مل سکتی ہے کیونکہ میں اب تک ماں نہیں بنی تھی۔ میرے پتی کو بچوں کی بڑی خواہش تھی۔ وہ بچوں کے بہانے مجھے چھوڑ سکتے تھے۔ یہ تشویش لاحق تھی۔ میں مالا سے مشورہ کرنا چاہتی تھی۔ میں نے مالا سے مشورہ کیا کہ طلاق ہونے کی صورت میں میں کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔ ابھی نہیں دو ایک برسوں میں بچہ نہ ہونے کی صورت میں شاید وہ مجھے چھوڑ کر دوسری عورت سے شادی کر لے جو اس کے لیے بچے پیدا کر سکے۔ مالا نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تمہارے پاس رقم ہے۔ تمہارا بینک بیلنس کتنا ہے۔ میں نے کہا کہ تم کیوں پوچھ رہی ہو؟ میرے پاس کل تین لاکھ کی رقم ہے جو میں نے بینک میں رکھی ہوئی ہے۔

میں اس لیے پوچھ رہی ہوں کہ میں تمہیں مشورہ دوں کہ کرنا کیا ہے۔ سب سے پہلی بات جو تم بھی جانتی ہو وہ یہ کہ دولت میں کتنی طاقت، کیسا جادو اور کیسی کشش اور دلفریبی ہے۔ باپ بڑا نہ بھیا سب سے بڑا روپیہ...... دولت عورت اور مرد کا سہارا ہوتی ہے۔ خصوصاً عورت کے لیے...... دولت ہو تو پھر تم ساری زندگی کسی نہ کسی طرح نہ صرف پر تعیش ہو گی بلکہ غیر محتاجی بھی۔ تمہیں کسی کے آگے جھولی پھیلانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ تم جانتی ہو کہ میں کس طرح سے چاروں طرف سے دولت سمیٹ رہی ہوں۔ اچھے برے کی تمیز ہی نہیں رہی۔ کس لیے ایسا کر رہی ہوں اپنے بڑھاپے اور مستقبل کے لیے۔ تم بھی ایسا کرو۔ جتنی دولت سمیٹ سکتی ہو سمیٹ کر آئندہ کے لیے اٹھا رکھو۔

میں نے اس سے کہا کہ میں تمہاری طرح دولت کمانے سے رہی۔ تم میں اور مجھ میں بڑا فرق ہے اور پھر مجھے کتنی دولت کی ضرورت ہو گی......؟ اس نے کہا کہ کم از کم پچاس لاکھ روپے...... پچاس لاکھ روپے......؟ میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ہاں...... اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا کہ پورے پچاس لاکھ روپے۔ تم اسے بینک میں ڈپازٹ کروا دو۔ دس بارہ برسوں میں وہ پھل پھول کر ایک کروڑ تک ہو جائے گا۔ رہا سوال یہ کہ پچاس لاکھ آئیں گے کہاں سے، تم ایسا کرو پانچ، دس لاکھ روپے لے کر میرے ساتھ کیسینو چلو وہاں رمی، فلیش اور پانسہ کا کھیل ہوتا ہے۔ تم رمی کھیلو یا فلیش...... وہاں دولت مند مرد ہی نہیں عورتیں بھی آتی ہیں جو ایک ساتھ اور الگ الگ بیٹھ کر کھیلتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ کچھ دن کھیل کر تم بآسانی چالیس پچاس لاکھ کی

رقم جیت سکتی ہو۔ میں نے اس سے کہا کہ میں دو تین لاکھ روپے سے فلیش کا کھیل تو کھیل سکتی ہوں مگر پانچ دس لاکھ کی رقم کہاں سے لاؤں۔ اس نے میری بات سن کر کہا کہ تم ایک لاکھ روپے لے کر بھی کھیلنے بیٹھ سکتی ہو۔ وہاں کھیلنے والے ہر کھلاڑی کو ایک لاکھ کی رقم ٹیبل شو کرنا پڑتی ہے۔ تم نے مجھے ایک روز بتایا تھا کہ تمہارے پتی نے پچاس لاکھ کی رقم گھر میں رکھی ہوئے ہے۔ وہ دو چار دن میں یورپ جانے والا ہے۔ تم اس رقم سے اپنی قسمت آزمائی کرو۔ تمہیں رقم کی کیا ضرورت ہے۔ گھر میں تو موجود ہے۔

جب میرے پتی یورپ کے دورے پر چلے گئے تب میں نے مالا کے ساتھ کیسینو جانے کا پروگرام بنا لیا۔ میں پہلی بار کیسینو آئی تھی۔ میں امریکہ، یورپ اور اٹلی کے شہر کے کیسینو فلموں میں دیکھ چکی تھی۔ ایک غریب ملک کا کیسینو بھی ان سے کم نہیں تھا۔ عالی شان پرشکوہ اور چار منزلہ عمارت میں واقع تھا۔ ہر منزل الگ الگ کھیل کے لیے مخصوص ہے۔ چھت پر کمرے بنے ہوئے ہیں جس میں جوڑے ٹھہر سکتے ہیں۔ شراب پی سکتے ہیں اور رات گزاری بھی کر سکتے ہیں۔ ہر منزل پر ایک شراب خانہ بھی ہے۔ یہ عمارت چار ہزار گز پر بنی ہوئی ہے۔ اس میں کمرے پارٹیشن سے بنائے گئے ہیں۔ لیکن صرف دوسری منزل کے ہال میں ایک بہت بڑی میز ہے...... جس کے گرد کوئی چالیس کرسیاں ہیں۔ اس میز کے درمیان میں ایک چکر بنا ہوا ہے۔ اس میں ایک تیر نصب ہے۔ میز پر ایک سے لے کر سو تک کے نمبر بڑے بڑے خانوں میں لکھے ہوئے ہیں۔ کسی بھی نمبر پر قسمت آزمانے کے لیے اس نمبر پر کوائن رکھے جاتے ہیں۔ اس کیسینو کا ایک آدمی جو میز پر ہوتا ہے وہ بٹن دباتا ہے۔ تیر جس نمبر پر رکتا ہے وہ جیت جاتا ہے۔ کیسینو کا آدمی اس میں صرف ایک خانے کے کوائنز رکھ لیتا ہے باقی جیتنے والے کو دے دیتا ہے۔ یہ کوئنز ایک کمرے میں بنے ہوئے کاؤنٹر پر ملتا ہے۔ جب کوائنز واپس کئے جاتے ہیں تو رقم دی جاتی ہے۔ ایک کوائن دس ہزار کا ہوتا ہے۔ خوش قسمت جیتتا ہے تو لاکھ دو لاکھ روپے جیت لیتا ہے۔ پانچ سے دس لاکھ روپے بھی جیتا ہے۔ یہ اس بات پر منحصر ہے کہ کتنے قسمت آزماتے ہیں۔ جتنے زیادہ ہوتے ہیں اتنا ہی فائدہ ہوتا ہے۔ مردوں سے زیادہ عورتیں اور لڑکیاں یہ کھیل کھیلتی ہیں۔

جب میں نے اس کیسینو میں قدم رکھا تو کتنی ہی دیر تک میری آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ ایک رنگین اور سندر سا سپنا لگ رہا تھا۔ یہ جو دنیا تھی اور یہاں جو لوگ تھے وہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق لگ رہے تھے۔ ایسی رونق، خوابناک ماحول اور حسین و رنگین فضا میں نے کب دیکھی تھی۔ ہر ایک کے چہرے پر تبسم اور آنکھوں میں سینکڑوں طاقت ور برقی قمقمے روشن تھے۔ غم جیسے انہیں چھو کر بھی نہیں گیا تھا۔ مرد کیا، نوجوان لڑکیاں اور عورتیں بھی وقت اور رات کی بانہوں میں خوش تھیں فضا ان کے جسم اور لباس سے پھوٹتی خوشبو سے مہک رہی تھی کوئی شراب پی رہا تھا، کوئی قسمت آزما رہا تھا۔ کوئی تاش کی بازی جمائے ہوئے تھا۔ مالا نے مجھے پہلے چاروں منزلوں کی سیر کرائی۔ وہاں اس کے جاننے والے مرد اور عورتوں کی کمی نہ تھی۔ میں یہاں آ کر اپنے آپ کو جیسے بھول گئی تھی۔

اس جوئے خانے میں صرف اس شہر کی عورتیں اور مرد نہیں تھے بلکہ ہندوستان کے بڑے بڑے

شہروں مدراس، کول کتا، دہلی، ممبئی، کھٹمنڈو، امرتسر اور کونے کونے سے آئے ہوئے تھے۔ بالی وڈ، مدراس اور کول کتا کے فلم ساز اداکار اور اداکارائیں بھی تھیں۔ یہ سارے کالے دھن کے لوگ تھے منشیات فروش، اسمگلرز اور ڈکیت، ان کی بیگمات، لڑکیاں محبوبائیں اور فاحشائیں بھی تھیں...... اس کے علاوہ غیر ملکی سرمایہ دار وغیرہ بھی تھے۔ عرب ریاستوں کے شیخ بھی...... وہ اس لیے یہاں آتے ہیں کہ یہاں شراب اور شباب سے دل بہلانے پر کوئی پابندی نہیں۔ یہاں وہ شخص قدم ہی نہیں رکھ سکتا جو عزت اور محنت سے کماتا ہو۔ میں کس قدر حیرت سے اس دنیا کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے بارے میں سنا تو کرتی تھی لیکن اندازہ نہ تھا یہ اتنی حسین، رنگین، خوشنما اور دل فریب جگہ تھی۔ یہ میرے لیے دنیا کا نواں عجوبہ تھا۔

مالا مجھے اس کمرے میں لے گئی جس میں تین بڑی بڑی گول میزیں تھیں۔ ہر میز کے گرد دس دس کرسیاں تھیں۔ دو میزوں پر اداکارہ، اداکارائیں ماڈل گرلز اور سرمایہ دار مرد تھے۔ ان سرمایہ دار مردوں میں سے میں صرف دو کو اس لیے پہچانتی تھی کہ یہ میرے شہر کے تھے اور ان سے کلب اور تقریبات میں ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں اور یہ میرے پتی کے دوست بھی تھے۔ ایک میز پر جو کہ تیسری تھی اس میں تین مقامی یعنی ہندوستانی مرد، دو شیخ، کرناٹکی اداکارہ جو بہت مشہور ہے ایک اور عورت بیٹھی تھی۔ وہ سب فلیش کھیل رہے تھے۔ میز کے بیچ رنگ برنگی کوائنز کا ڈھیر تھا۔ میں نے اور مالا نے ایک ایک لاکھ روپے کے کوائنز لیے تھے۔ وہ سب کھیل رہے تھے اور شراب اور سگریٹ بھی پی رہے تھے۔ اس جوئے خانے میں ویٹرسیں جو تھیں وہ سفید ساڑیوں اور بغیر آستینوں کے بلاؤز میں ملبوس تھیں...... اس میں جو بار اور ریسٹورنٹ تھا وہاں ہر قسم کی شراب، کافی، چائے، سینڈوچز اور چکن بروسٹ بھی دستیاب تھا۔ جو آرڈر پر میز پر پہنچا دیا جاتا تھا۔ یہ ویٹرسیں جوان اور حسین تھیں اور پریوں کی طرح نظر آ رہی تھیں۔ ویٹر بھی سفید لباس میں تھے لیکن ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ لیکن یہ سب بڑے خوبصورت، دراز قد اور وجیہہ بھی تھے۔ یہاں جو مرد اور عورتیں آتی تھیں وہ ان کی دل بستگی کا سامان بھی فراہم کرتے تھے۔

مالا کو دیکھ کر سب بہت خوش ہو گئے۔ مالا نے ان سب سے میرا تعارف کرایا۔ اس میز پر ایک اور شخص کو دیکھا اس کا نام برانیم تھا۔ یہ میرے شہر کا ہی تھا۔ یہ کون اور کیا تھا معلوم نہ ہو سکا۔ جو بھی تھا صاحب حیثیت تھا۔ جب میں کھیل کر اٹھی تو ساٹھ ہزار روپے جیتی تھی۔ مالا نے دو لاکھ اور برانیم چار لاکھ...... ایک اور نے بھی اونچا ہاتھ مارا تھا۔ میں بہت خوش تھی۔

میں تین دن تک مسلسل جیتتی رہی۔ جیتنے والوں میں، مالا اور برانیم تھے۔ میں دوسرے دن دو لاکھ اور تیسرے دن ایک لاکھ اسی ہزار روپے جیتی تھی۔ میں کس قدر خوش تھی بتا نہیں سکتی۔ چوتھے دن مالا کھیل میں شریک نہیں ہوئی۔ ایک شیخ کے ساتھ وقت گزاری کے لیے ہوٹل میں چلی گئی تھی۔ اس رات اس کا نائٹ کلب میں شو بھی تھا۔ میری برانیم سے دوستی ہو گئی تھی۔ چوتھے دن کھیل میں میں نے تین لاکھ نوے ہزار کی رقم جیتی تھی۔ کھیل کر اٹھنے کے بعد برانیم اور میں وہسکی پینے بار میں آ گئے۔

برانیم نے وہسکی پینے کے دوران مجھے بتایا کہ کویت کے تین بڑے شیخ آئے ہوئے تھے۔ وہ سات

دن تک رہیں گے۔ میری کوٹھی پر سات دن تک تاش کی محفل جمے گی۔ وہاں صرف امریکی کرنسی میں کھیل ہو گا۔ مگر بیس لاکھ کی رقم ٹیبل پر شو ہو گی۔ بیس لاکھ کی رقم کے امریکی ڈالر بازار سے مل جائیں گے۔ آپ چوں کہ بہت اچھا کھیلتی ہیں آپ بھی چاہیں تو اس کھیل میں شریک ہو سکتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ کروڑ ڈیڑھ کروڑ کی رقم آپ باآسانی جیت سکتی ہیں۔ کیونکہ آپ فلیش کے کھیل میں بڑی ماہر ہیں۔ یہ شیخ ارب پتی ہیں۔ میں خوش ہو گئی۔ کروڑ ڈیڑھ کروڑ...... میرے دل میں لالچ آ گیا۔ کون کروڑ پتی بننا نہیں چاہتا۔ میں نے رضامندی ظاہر کر دی۔ برانیم نے کہا کہ ایک مسئلہ ہے۔ ان شیخوں کو دو ایک دن جتانا ہو گا۔ اس لیے کہ وہ یہ نہ سمجھیں گے کہ ہم انہیں لوٹ رہے ہیں اور نوسر باز ہیں۔ آپ دو دن بیس لاکھ کی رقم ہاریں۔ تیسرے دن آپ کروڑ کی رقم جیت لیں۔ پھر ادھر کا رخ نہ کریں۔ مالا بھی کھیلے گی۔ وہ بھی ہار اور جیت کے لیے تیار ہے۔

میں اس کے لیے تیار ہو گئی...... میں نے پتی کی رقم پچاس لاکھ نکالی جوئے میں جو رقم کیسینو میں جیتی تھی وہ آٹھ نو لاکھ تھی۔ میں نے مالا کے توسط سے ساٹھ لاکھ کی رقم کو امریکی ڈالر میں تبدیل کروا لیا۔ برانیم کی کوٹھی راجہ جی نگر میں تھی۔ دو ہزار گز کے رقبے پر بنی ہوئی پرشکوہ کوٹھی۔ اس کھیل میں ان تین شیوخ کے علاوہ مالا، برانیم اور اس کا ایک دوست راجیش جو مدراس کا صنعت کار تھا شریک تھا۔ کیونکہ برانیم کی ہدایت تھی اس لیے مجھے ہار کا خیال ذہن میں رکھنا پڑا۔ کھیل کے دوران موبائل فون پر مالا کو شوٹنگ کے لیے بلاوہ آ گیا۔ وہ اس وقت ایک لاکھ روپے جیت چکی تھی۔ کھیل ختم ہوا تو میں بیس لاکھ کی رقم ہار چکی تھی۔ تینوں شیوخ پانچ اور دس لاکھ کے درمیان جیت چکے تھے۔ برانیم دو لاکھ...... سب سے زیادہ رقم راجیش نے جیتی تھی چالیس لاکھ...... دوسرے دن برانیم پچاس لاکھ، مالا دو لاکھ، راجیش دو لاکھ...... تیسرے دن میں باوجود کوشش کے جیت نہ سکی ایک دو لاکھ بھی نہیں۔ میں صدمے سے بے ہوش ہو گئی۔ تیسرے دن مالا کھیل میں شریک نہیں رہی۔ میں نے کھیل کے دوران برانیم سے جو پانچ لاکھ کی رقم قرض لی تھی اس سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں برانیم کے کمرے میں بستر پر پڑی تھی۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھا وہسکی پی رہا تھا۔ میرے ہوش میں آتے ہی اس نے مجھے وہسکی پلائی۔ بستر کے عین سامنے سنگھار میز تھی۔ میں نے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا۔ میرا لباس بے ترتیب سا تھا۔ میری اس وقت جو حالت تھی اس نے مجھے خوفزدہ کر دیا۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ برانیم ایسی ذلیل، قبیح اور گھناؤنی حرکت کر سکتا ہے۔ گو کہ میری عزت پر کوئی آنچ نہیں آئی لیکن جو کچھ ہوا تھا وہ کیوں اور کس لیے......؟ دل کے ایک کونے میں یہ خیال آیا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ میں نشے کی حالت میں خود ہی بے قابو ہو گئی۔ میں نے کھیل کے دوران ہارنے کے بعد خوب پی تھی۔ مجھے کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ مجھے صرف اتنا یاد تھا کہ برانیم اور ایک شیخ غشی کی حالت میں سہارا دے کر گاڑی کی پارکنگ پر لائے تھے۔ برانیم اپنی گود میں اٹھا کر اپنی کوٹھی کے بیڈ روم میں لایا۔ میں رونے، بال نوچنے اور کپڑے پھاڑنے کی کوشش کی، حالت پاگلوں کی سی ہونے لگی تھی۔ پھر میں ملحقہ واش روم میں گئی اور بال اور لباس درست کیا۔ واش بیسن کے آئینے میں چہرہ دیکھا تو اپنے آپ کو پہچان نہ سکی۔ میں ساٹھ برس کی بڑھیا کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔

چہرہ کفن کی طرح سفید تھا۔ میں جب واش روم سے نکلی تو قدموں میں جیسے جان ہی نہیں رہی تھی۔

برانیم نے مجھے وہسکی کا ایک پیگ اور پلایا تو میرے بدن میں قدرے توانائی آ گئی۔ پھر اس نے مجھے میرے فلیٹ لے جا کر چھوڑ دیا۔ اب میرے ہر سمت اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ میں ساٹھ لاکھ کی رقم ہار چکی تھی جس میں پچاس لاکھ میرے پتی کے تھے اور مزید پانچ لاکھ جو میں نے کھیل میں برانیم سے لیے تھے۔ برانیم نے اس موضوع پر مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں پھوٹ پھوٹ کر بہت دیر تک روتی رہی۔ پھر روتے روتے سو گئی۔ ڈراؤنے خواب دیکھتی رہی۔

میں سہ پہر میں بیدار ہوئی ذہن پر ایک بوجھ تھا اور سینے میں دکھ چٹان کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے واش روم میں جا کر بہت دیر تک غسل کیا۔ جس سے طبیعت قدرے ہلکی ہو گئی۔ لیکن میرے سینے میں خلش جو کسی خنجر کی طرح پیوست ہو گئی تھی اس کا کیا کروں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ پچاس لاکھ کی رقم کا کہاں سے اور کیسے بندوبست کروں۔ بینک میں تین لاکھ کی رقم تھی اور سونے کے زیورات پانچ لاکھ کی مالیت کے تھے لیکن اس سے کوئی بات بنتی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ میں نے مالا کو فون کیا تو اس نے کہا وہ اس وقت سیٹ پر ہے۔ رات نو بجے سے پہلے نہیں آ سکتی۔ میں مالا سے مشورہ لینا چاہتی تھی۔

سات بجے شام اطلاعی گھنٹی بجی تو میں سمجھی کہ شاید مالا اپنی شوٹنگ ملتوی کر کے آ گئی ہے۔ میں نے لپک کر دروازہ کھولا۔ باہر برانیم کھڑا تھا۔ اسے اندر لا کر بٹھایا۔ میں سمجھ گئی کہ وہ اپنی رقم کا مطالبہ کرنے آیا ہے۔ میرا دل سینے میں تیزی سے دھک دھک کرنے لگا۔ چند لمحوں تک اس نے رسمی باتیں کیں پھر یکایک اس نے پوچھا کہ آپ میری پانچ لاکھ کی رقم کب ادا کر رہی ہیں۔ میں نے اس سے کہا کہ دو لاکھ کی رقم آپ کل لے لیں۔ باقی تین لاکھ کی رقم کے لیے کوشش کرتی ہوں۔ مجھے دو ماہ کی مہلت دے دو اس نے کہا کہ میں دو دن سے زیادہ کی مہلت نہیں دے سکتا۔ میں نے اسے جواب دیا کہ یہ میرے لیے ناممکن ہے۔ جب وہ مجھ پر بہت زور دینے لگا اور میں ذہنی دباؤ میں آ گئی تو میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس سے پوچھا کہ آپ کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے۔ میری بات سنتے ہی غصہ میں آنے کی بجائے اسے بڑے زور کی ہنسی آ گئی۔ اس نے کہا کہ آپ کا جواب میرے لیے غیر متوقع نہیں ہے۔ بہر حال میں یہ رقم معہ سود در سود وصول کر کے رہوں گا۔ آپ کیا آپ کی آتما بھی یہ رقم ادا کرے گی۔ مسز کامنی! میں نے اپنی زندگی میں کبھی کچی گولیاں نہیں کھیلیں۔ پھر اس نے اپنی جیب سے ایک لفافہ نکال کر میری طرف بڑھایا اور کہا کہ آپ کے لیے اس میں سرپرائز ہے۔ اس سرپرائز سے آپ نہ صرف اپنا غم بھول جائیں گی بلکہ راہ راست پر بھی آ جائیں گی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے لفافہ لے کر دیکھا۔ اس میں کل بارہ عدد تصویریں تھیں۔ پوسٹ کارڈ سائز کی...... دوسرے لمحے میرے ہاتھ سے لفافہ چھوٹ گیا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ جب اندھیرا چھٹا تو وہ ان تصویروں کو جو فرش پر بکھر گئی تھیں سمیٹ کر لفافے میں رکھ رہا تھا۔

ان تصویروں کو دیکھنے کے بعد اب مجھے دور جانے کی ضرورت نہ تھی۔ ساری بات سمجھ میں آ گئی تھی۔ برانیم نے بڑی کمینگی کی تھی اور میری بے ہوشی سے فائدہ اٹھا کر ایسی ناشائستہ تصویریں اتار لی تھیں

کہ مجھے بلیک میل کیا جا سکے۔ میں کتنی ہی دیر تک سناٹے میں رہی۔ ایک غم کیا کم تھا کہ یہ دوسرا غم کا پہاڑ مجھ پر ٹوٹ پڑا تھا۔ میں نے رو رو کر برا حال کر لیا اور اسے زار و قطار روتے ہوئے صورت حال بتائی تو اس نے مجھے دلاسا دیا کہ میں کسی بات کی چنتا نہ کروں۔ یہ پانچ لاکھ کی رقم اس طرح ادا ہو سکتی ہے کہ میری چند شرائط مان لیں۔ آپ بہت حسین عورت ہیں۔ آپ کے لیے اس رقم کی ادائیگی کچھ مشکل نہیں ہے۔ آپ کیش ہو سکتی ہیں۔ عورت ایک کرنسی کی طرح ہوتی ہے۔ انٹرنیشنل کرنسی جو دنیا کے کسی بھی ملک میں چل سکتی ہے۔ یہ جو تینوں شیخ تھے انہیں آپ کا حسن، آپ کی موہنی صورت اور شباب خوب بھایا ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ آپ انہیں کمپنی دیں۔ میں نے انہیں یہ باور کرا دیا ہے کہ آپ غیر شادی شدہ ہیں آپ کی زندگی میں کوئی مرد نہیں آیا۔ آپ کو باری باری ان کے پاس ایک ایک رات کا دان دینا ہوگا۔ اس کے بعد مہینے میں دو مرتبہ آپ میرے بیڈ روم کو رونق بخشیں گی۔ میں جا رہا ہوں تاکہ آپ ٹھنڈے دل سے اور ایک حقیقت پسند عورت کی طرح سوچ بچار کر لیں۔ میں کل شام آپ کو لینے آؤں گا تیار رہیں۔

وہ کمینہ، رذیل اور سؤر اتنا کہہ کر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر چلا گیا۔ نو بجے مالا آئی تو میں نے برانیم کی کمینگی اور ساری صورت حال سے آگاہ کیا تو مالا نے مشورہ دیا کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ تم برانیم کی بات مان لو۔ یہ تصویریں تمہارے لیے زہر قاتل ہیں۔ تمہارا شوہر تمہیں بخشے گا نہیں۔ جب تک اس کے پاس ان تصویریوں کے نیگیٹو ہیں اس وقت تک تم اس کی محتاج، ملکیت اور کٹھ پتلی کی طرح ہو۔ تمہاری ڈور اس کے ہاتھ میں ہے تم ایک کٹی پتنگ کی طرح ہو۔ میں تمہاری جگہ ہوتی تو اس کی بات مان لیتی۔ اب اس کے سوا چارہ بھی نہیں ہے۔ پچاس لاکھ کی رقم کے بارے میں پھر سوچتے ہیں۔

میں ساری رات ایک پل کے لیے بھی سو نہ سکی۔ میری دنیا اندھیر ہو چکی تھی۔ میں ان شیوخ کے بستر کی زینت بن جاؤں اور اپنا وجود میلا کر لوں یہ بات مجھے کسی قیمت پر پسند نہیں تھی۔ مالا اور مجھ میں فرق تھا۔ وہ ہر ماڈل گرل کی طرح جسم فروش بھی تھی۔ اس کی زندگی کا مقصد صرف اور صرف روپیہ تھا۔ عزت سے جینا اسے پسند نہ تھا۔ پھر میں اس نتیجے پر پہنچی کہ میری موت ہی میرے سارے مسائل کا حل ہے۔ میں نے خودکشی کا فیصلہ کر لیا۔ پھر میں خواب آور گولیاں خریدنے اس دکان پر پہنچی۔ گولیاں اس لیے نہ مل سکیں کہ ڈاکٹر کا نسخہ نہ تھا۔ میں نے اسکوٹر کی زد میں آنے کی کوشش کی تو آپ نے مجھے بچا لیا۔“

وہ اپنی کہانی سنا کر خاموش ہو گئی۔ یہ عورت معصوم، سیدھی سادی اور نیک تھی۔ اس کی دردناک بپتا نے مجھے بہت متاثر کیا۔ واقعی وہ بہت مظلوم تھی اور ہر طرح کی مدد کی مستحق تھی۔ میں نے اس کی حتی الامکان مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ”آپ کسی بات کی فکر نہ کریں۔“ میں نے اسے دلاسا دیا۔ ”نہ صرف برانیم کا قرض اتر جائے گا بلکہ ساٹھ لاکھ کی رقم جو آپ نے ہاری ہے وہ بھی مل جائے گی۔ اب آپ کو خودکشی کرنے کی ضرورت نہیں۔ زندگی اتنی ارزاں نہیں کہ اسے ختم کر دیا جائے۔“ ”وہ کس طرح......؟“ اس کی آنکھوں میں حیرانی بھر گئی۔ اسے جیسے میری بات کا اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا تھا۔

”وہ کس طرح...... یہ تو میں آپ کو بتاؤں گا......؟“ میں نے کہا۔ ”لیکن آپ کو میری ایک شرط

پوری کرنی ہوگی۔"

"شرط...... کیسی شرط......!" اس کا چہرہ انجانے خیال سے بجھ گیا۔ "کیا...... کیا آپ مجھ سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں......؟"

"جی نہیں......" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "آپ جو سمجھ رہی ہیں وہ غلط ہے۔ میری شرط صرف یہ ہے کہ جب آپ کو اپنی رقم واپس مل جائے گی تو آپ نہ تو جوئے کے قریب پھٹکیں گی اور نہ مالا جیسی عورتوں سے دوستی رکھیں گی۔ آپ کو بھگوان کی سوگند کھا کر اقرار کرنا ہوگا کہ مرتے دم تک تاش کے پتوں کو ہاتھ نہیں لگائیں گی، بولیے منظور ہے۔"

"میں بھگوان کی سوگند کھا کر آپ کو وچن دیتی ہوں کہ تاش کے پتوں کو ہاتھ لگانا تو درکنار اس کے قریب بھی نہیں جاؤں گی اور اس کی طرف دیکھوں گی بھی نہیں......" اس نے مجھے پورے اعتماد سے یقین دلایا۔ "مجھے جو ٹھوکر لگی ہے اسے مرتے دم تک بھی بھول نہیں سکتی اور نہ ایک دن بھی بھولوں گی۔ اتنی بڑی رقم کس طرح سے واپس ہوگی؟ پینسٹھ لاکھ روپے جب کہ پینسٹھ ہزار روپے بھی مشکل ہیں۔"

"میں اس وقت ہی بتا سکوں گا جب آپ رقم کا بندوبست کر لیں گی۔" میں نے کہا۔ "ابھی بتانا قبل از وقت ہوگا۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی؟" کامنی نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔ "آپ کو کتنی رقم درکار ہے......؟"

"رقم میرے لیے درکار نہیں ہے بلکہ اس رقم کے لیے درکار ہوگی جو آپ جوئے کی میز پر ہار چکی ہیں۔" میں نے کہا۔ "چالیس لاکھ روپے چاہئیں۔ اس کے بغیر بات نہیں بنے گی اور نہ ہی ہاری ہوئی رقم واپس ہوگی۔ یہ اچھی طرح سوچ لیں۔"

"چالیس لاکھ کی رقم کس لیے......؟" اس نے مشکوک ہو کر مجھے دیکھا۔ "یہ بہت ہی بڑی رقم ہے۔ کیا آپ نے مجھے کروڑ پتی سمجھ لیا ہے۔ میں چالیس لاکھ روپے ہار چکی ہوں اور مجھ پر قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ میں صرف تین چار لاکھ کی رقم کا بندوبست کر سکتی ہوں۔"

"ہاں...... یہ میں بھی جانتا ہوں کہ یہ بہت بڑی رقم ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ مشکوک نہ ہوں۔ یہ فراڈ نہیں ہے میں کوئی فراڈی نہیں ہوں۔ آپ جانتی ہیں ناکہ روپے کو روپیہ کھینچتا ہے۔ میں آپ کو شاید کروڑ ڈیڑھ کروڑ کی رقم دلا دوں۔"

"شاید کہیں سے تین چار لاکھ مل جائیں؟" وہ سوچنے لگی۔ "دس لاکھ بھی مشکل ہیں۔ آپ چالیس لاکھ کی بات کر رہے ہیں؟"

"آپ کی سہیلی مالا کروڑ پتی ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا وہ صرف ایک رات کے لیے چالیس لاکھ روپے قرض نہیں دے سکتی؟"

"مالا میری سہیلی ہے لیکن صرف دوستی کی حد تک......" کامنی کہنے لگی۔ "وہ مشورہ تو دے سکتی ہے

لیکن اس مصیبت میں کام نہیں آ سکتی۔ کیا میں نے اس مشورے کے بارے میں نہیں بتایا تھا؟ اس کا کہنا تھا کہ میں برانیم کی بات مان لوں اور بلیک میل بھی ہوتی رہوں۔"

"دماغ لڑائیے...... سوچیے...... صرف ایک رات کے لیے اتنی بڑی رقم کہاں سے، کیسے اور کس طرح بندوبست ہو سکتا ہے......؟"

"اس وقت تو میرا دل دماغ بالکل بھی کام نہیں کر رہا ہے۔" وہ بولی۔ "کیا آپ اتنی بڑی رقم سے جوا کھیلیں گے؟ اس لیے چاہیے؟"

"آپ ٹھیک سمجھیں...... یہ رقم جوا کھیلنے کے لیے ہی چاہیے۔" میں نے کہا۔ "اس رقم سے صرف میں ہی نہیں بلکہ آپ بھی جوا کھیلیں گی۔ ان لوگوں کے ساتھ جن کے ساتھ کھیل کر آپ اپنی ساری پونجی ہار چکی ہیں۔ ہم دونوں بیس بیس لاکھ روپے لے کر بیٹھیں گے۔"

"نہیں...... ان سے جیتنا بہت مشکل ہے۔" وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔ "وہ بڑے اونچے کھلاڑی ہیں۔ میں ان سے جیت ہی نہیں سکتی...... خیر یہ تو اس وقت کی بات ہے جب نو من تیل ہوگا اور رادھا ناچے گی۔ یہ سب کچھ سوچنا فضول ہے۔"

"اچھا یہ بتائیں کہ یہ فلیٹ کس کے نام پر ہے؟" میرے ذہن میں ایک خیال آیا تو میں نے پوچھا۔ "آپ کے یا آپ کے پتی کے نام......؟"

"یہ میرے نام ہے۔ میرے پتی نے کیا ہوا ہے تاکہ انکم ٹیکس اور دولت ٹیکس سے بچ سکیں۔" کامنی نے جواب دیا۔ "میرے نام ہو تو اس سے کیا ہوگا؟"

"بہت کچھ ہوگا۔" میں نے کہا۔ "آج اب آپ یہ بتائیں کہ اس فلیٹ کی مالیت اندازاً کیا ہو گی......؟ یہ خاصا بڑا فلیٹ ہے۔"

"یہ فلیٹ گزشتہ برس میرے پتی نے اسی لاکھ روپے میں خریدا تھا۔" کامنی نے بتایا۔ "اس وقت ایک کروڑ سے کم کی مالیت کا نہیں ہے۔"

"آپ کیوں نہیں مالا کے پاس یہ فلیٹ رہن رکھوا کر چالیس لاکھ روپے لے لیتیں؟" میں نے اسے مشورہ دیا۔ "وہ تیار ہو جائے گی۔"

"نہیں...... میں ایک کروڑ کا فلیٹ چالیس لاکھ روپے میں رہن رکھ دوں۔" وہ کانپ کر بولی۔ "اگر یہ رقم بھی ہار گئی تو میرے پتی مجھے شوٹ کر دیں گے...... میں اتنا بڑا خطرہ مول نہیں لے سکتی۔ بھگوان کے لیے مجھے معاف کر دیں۔ شما کر دیں......"

"دیکھیے رقم کا بندوبست نہ ہونے سے ہر صورت میں آپ کو اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا ہی دھونا ہے۔ کیونکہ اتنی بڑی رقم کا آپ بندوبست نہیں کر سکتی ہیں...... اور پھر آپ برانیم کا قرض بھی ادا نہیں کر سکتیں۔ اس کے پاس آپ کی ایسی تصویریں ہیں جو ایک شریف عورت کے لیے انتہائی شرمناک اور زہر قاتل ہیں۔ آپ کے پتی یہ تصویریں دیکھ کر آپ کو قتل کر دیں گے۔ کیوں نہ آپ ایک آخری جوا

کھیلیں...... تخت یا تختہ...... ویسے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ نہ صرف وہ شرمناک تصویریں بلکہ آپ کی ساٹھ لاکھ کی رقم بھی واپس آ جائے گی۔ آپ ٹھنڈے دل سے سوچیں میں کافی بنا کر لاتا ہوں۔‘‘

جب میں کافی بنا کر لایا تو اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ’’آپ کی بات میری سمجھ میں آ گئی ہے۔‘‘ اس نے توقف کر کے کہا۔ ’’کیا مالا مجھے اتنی بڑی رقم دے گی؟‘‘

’’کیوں نہیں دے گی؟‘‘ میں نے کہا۔ ’’اسے آپ ٹیلی فون کر کے کہیں مجھے چالیس لاکھ کی رقم امریکی ڈالر کی صورت میں چاہیے جوا کھیلنے کے لیے۔ صرف ایک رات کے لیے...... میں اپنا مکان تمہارے پاس رہن رکھوا رہی ہوں...... تم رقم لے آؤ اور گھر کے کاغذات فائل زرِ ضمانت کے طور پر لے جاؤ۔ اگر میں ہار گئی تو تم میرا فلیٹ فروخت کرنے یا اس کی ملکیت کی مجاز ہو گی۔‘‘

’’لیکن اس میں اس کا کیا فائدہ جو وہ تیار ہو جائے گی؟‘‘ کامنی بولی۔ میں اسے رہن کے عوض سود تو دے نہیں رہی ہوں......‘‘

’’وہ یہ سوچ کر دے گی کہ آپ پہلے کی طرح ہار جائیں گی اور اس کی رقم دے نہ سکیں گی اور وہ چالیس لاکھ روپے کے عوض ایک کروڑ کی مالیت کے فلیٹ کی مالک بن جائے گی۔ وہ اس طرح ساٹھ لاکھ روپے کے فائدے میں ہو گی۔‘‘ میں نے کامنی کو سمجھایا۔

’’آپ کی بات میری سمجھ میں آ گئی۔‘‘ کامنی نے کافی کا سپ لے کر سر ہلایا۔ ’’ٹھیک ہے میں کافی ختم کر کے اسے فون کرتی ہوں۔‘‘

’’اور آپ برانیم کو بھی ٹیلی فون کریں اور اس سے کہیں کہ میری تصویروں کے نیگیٹوز لے کر آپ کھیل کے وقت آ جائیں۔ میں آج رات کھیلنے کے لیے آ رہی ہوں۔ میں وہاں آپ کو پانچ لاکھ کی رقم ادا کر دوں گی۔ آپ تصویریں اور نیگیٹوز دے دینا۔‘‘

کامنی نے اپنی کافی ختم کر کے مالا سے موبائل پر رابطہ کر کے اس سے کہا کہ وہ اپنا فلیٹ چالیس لاکھ میں رہن رکھنا چاہتی ہے۔ تم چالیس لاکھ کی رقم امریکی ڈالر میں لے کر پہنچو۔ وہ اپنی رقم حاصل کرنے کے لیے آخری جوا کھیلنا چاہتی ہے۔ مالا فوراً تیار ہو گئی۔ اس نے کہا کہ وہ ایک گھنٹے میں رقم لے کر پہنچ رہی ہے۔ فائل تیار رکھنا...... وہ اسٹامپ پیپر لے کر آ رہی ہے اس پر وکیل سے عبارت ٹائپ کروا کر...... پھر اس نے برانیم سے رابطہ کر کے کہا کہ وہ نیگیٹوز اور تصویریں لے کر رات کیسینو پہنچ جائے۔ وہ پانچ لاکھ کی رقم لے کر پہنچ رہی ہے۔ برانیم کو پہلے تو یقین نہیں آیا پھر اس نے وعدہ کر لیا۔

جب مالا ایک گھنٹے بعد آئی تو میں دوسرے بیڈ روم میں چھپ گیا اور اس دروازے کے چابی کے سوراخ سے نشست گاہ میں جھانکنے لگا۔ مالا حسین نہیں تھی بلکہ ایک بلا تھی۔ کامنی نے اس کے حسن و شباب کی جو تعریف کی تھی اس میں اس نے بخل سے کام نہیں لیا تھا۔ وہ آئی تو اس کا چہرہ دمک رہا تھا اور اس پر ایک ایسی سرشاری طاری تھی جو ایک فاتح کے چہرے پر ہوتی ہے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی بہت بڑا محاذ فتح کر کے آئی ہو۔ اس کے لیے محاذ دولت مند آدمی ہی تھے۔

مالا نے بریف کیس نما چرمی پرس سے ڈالر کے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر تپائی پر رکھیں۔ پھر اس نے دو اسٹامپ پیپر نکال کر کامنی کے سامنے رکھے کہ ان پر دستخط کر دے۔ کامنی نے ان کی عبارت پڑھے بغیر ان پر دستخط کر دیئے جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ کامنی اس سے کتنی محبت اور اندھا اعتماد کرتی ہے لیکن مالا کو کامنی پر جیسے بھروسا نہیں یا پھر اس کا یہ خیال تھا کہ کامنی چونکہ اتنی بڑی رقم ہار چکی ہے لہٰذا اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ جیت جائے۔ حالانکہ اس نے مالا کو یقین دلایا تھا کہ وہ اس کی زبان پر بھروسا کرے۔ ہارنے کی صورت میں وہ یہ فلیٹ بیچ کر اسے اس کی رقم دے دے گی۔ لیکن مالا اس پر بھروسا کرنے کو تیار نہیں ہوئی تھی۔

ہم دونوں ٹھیک دس بجے گولڈن کیسینو پہنچے۔ کامنی نے اس کے بارے میں جیسا بتایا تھا وہ اس سے بڑھ کر تھا۔ ایسی رونق اور رنگینی تھی کہ خوابوں میں بھی نظر نہ آئے۔ مرد، عورتیں اور ہر عمر کے جوڑے جوق در جوق چلے آ رہے تھے۔ محض تفریح کرنے نہیں بلکہ دولت کے حصول کے لیے...... یہ وہ لوگ تھے جن کے پاس دولت کی کمی نہ تھی۔ دولت کی ہوس انہیں کھینچ لائی تھی۔ ہزاروں لاکھوں ہار جاتے تھے تو انہیں کوئی دکھ نہیں ہوتا تھا۔ لیکن کسی محتاج یا ضرورت مند کو سو روپے کیا دس روپے دیتے ہوئے بھی جان جاتی تھی۔ یہاں کوئی غم نہ تھا۔ یہاں دل گیر ہونا گناہ تھا۔ خوشی ہی خوشی تھی۔ یہ سارے لوگ خوشی کی فرحت انگیز اور خوبصورت بانہوں میں جکڑے ہوئے تھے۔

کامنی مجھے اس کمرے میں لے گئی جہاں مالا، برانیم، راجیش اور تینوں شیخ ہمارے انتظار میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ پی بھی رہے تھے۔ کامنی نے کیسینو میں داخل ہوتے ہی کاؤنٹر پر سے امریکی ڈالرز کے عوض کوائنز لے لیے تھے۔ کیونکہ رقم سے جوا کھیلنے کی ممانعت تھی۔ کیسینو سے جب رقم لی جاتی تھی تب وہ اپنا کمیشن کاٹ کر رقم واپس دیتے تھے۔ دنیا کے ہر کیسینو میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ اب میرے اور اس کے پاس جو ڈالر تھے وہ ہندوستانی کرنسی بیس بیس لاکھ روپے کے مساوی تھے۔ ان شیوخ کی شرط یہ تھی کہ کم سے کم بیس لاکھ کی رقم ہو۔

کامنی نے ان لوگوں سے میرا تعارف اپنے ہونے والے پتی کے دوست کی حیثیت سے کرایا تھا کیونکہ برانیم ان سے کہہ چکا تھا کہ کامنی کنواری ہے اور ان سے کہا کہ دبئی میں میرا ایک ڈپارٹمنٹل اسٹور ہے۔ ان سب سے میں نے باری باری ہاتھ ملایا۔ سبھی نے بڑی گرمجوشی اور تپاک سے میرا استقبال کیا۔ برانیم نے میرے لیے وہسکی منگوانا چاہا تو میں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ میں اس سے بہت دور ہوں۔ انہیں اس بات پر بڑی حیرت ہوئی کہ میں شراب نہیں پیتا۔ دبئی میں اپنا کاروبار اور دکان کا ہونا بڑی بات تھی۔ جس سے وہ بہت خوش ہو گئے تھے کہ ایک بہت بڑا مرغا تو پھنسا۔ انہوں نے مجھے بھی شیخ ہی سمجھ لیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد کھیل شروع ہوا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ مالا، برانیم اور راجیش چالیس چالیس لاکھ کی رقم لے کر بیٹھے تھے۔ شاید اس لیے ان شیخ کو احساس ہو کہ یہ لوگ کسی کروڑ پتی سے کم نہیں ہیں۔ میں کچھ دیر تک مسلسل تیل اور تیل کی دھار دیکھتا رہا۔ میں ہارتا چلا گیا۔ ادھر کامنی نے دو ایک بازیاں جیتی تھیں۔ کھیل میں بڑے نشیب و فراز آتے رہے۔ یہ اس کھیل کا ایک حصہ ہے۔ قسمت کی دیوی کبھی مالا پر تو

کبھی کسی شیخ پر، کبھی برانیم پر، کبھی مجھ پر تو کبھی راجیش پر...... اور کوئی دو گھنٹے تک ان تینوں شیخوں پر باری باری خاصی مہربان ہوتی رہی۔ میں نے محسوس کیا کہ کھیل کے دوران وہ تینوں شیخ کھیل سے زیادہ کامنی میں بہت زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں۔ کیونکہ کامنی کا غیر شادی شدہ ہونا بڑا ہیجان خیز تھا اور پھر وہ کامنی کی وہ تصویریں بھی دیکھ چکے تھے جو برانیم نے اس کی بے ہوشی کا فائدہ اٹھا کر کھینچی تھیں۔ کامنی مالا یا کسی بھی حسین اور جوان عورت سے کشش میں کم نہ تھی۔ اس میں مردوں کو متوجہ کرنے والی جاذبیت تھی۔ ایک بات اور یہ بھی تھی کہ وہ بے حد شائستہ، نفیس مزاج کی ہی نہیں تھی بلکہ عمدہ جامہ زیب بھی تھی۔

ایک مرحلہ ایسا آیا کہ کامنی اٹھارہ لاکھ روپے ہار گئی۔ اور میرے پاس صرف ایک لاکھ روپے رہ گئے۔ کامنی کی حالت غیر ہونے لگی۔ اس کا چہرہ دھلی چادر کی طرح نظر آنے لگا۔ وہ میرے مقابل بیٹھی تھی۔ ایئر کنڈیشنڈ کمرا ہونے کے باوجود اس کی پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے رو دے گی یا پھر صدمے سے بے ہوش ہو جائے گی۔ جب کہ میں اس طرح سکون و اطمینان سے بیٹھا تھا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ میرے ہارنے سے میری صحت پر کیا اثر پڑے گا۔ یہ کون سا میرے باپ کا روپیہ تھا۔ میں نے سوچا کہ اسے اشارے کنائے میں دلاسا دوں۔ اس خیال سے چپ رہا کہ شاید کامنی انہیں نہ سمجھے۔ اس وقت مالا، راجیش، برانیم اور ایک شیخ پندرہ سے بیس لاکھ جیت میں تھے۔ کھیل میں بڑی تیزی اور گرمی تھی۔

جب کھیل ختم ہونے میں ایک گھنٹہ باقی رہ گیا تب کامنی کا چہرہ مردے سے بھی بدتر تھا۔ ان تینوں شیخ نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ ٹھیک ایک بجے اٹھ جائیں گے۔ اس لیے کہ وہ یہاں صرف جوا کھیلنے نہیں بلکہ اور بھی تفریحات کے لیے آئے ہیں۔ پھر کھیل کا رنگ اور پانسہ پلٹنے لگا۔ قسمت کی دیوی مجھ پر، کامنی پر اور ایک شیخ پر مہربان ہونے لگی۔ جب کھیل ختم ہوا تو مالا تیس لاکھ اور راجیش چھبیس لاکھ اور برانیم تیس لاکھ...... میں نے کامنی کی رقم بچالی تھی۔ یعنی صرف ایک لاکھ روپے جیتے تھے۔ جب کہ دونوں شیخ پندرہ پندرہ لاکھ روپے ہارے۔ صرف ایک شیخ دس لاکھ جیت سکا۔ سب سے زیادہ جیتنے والی کامنی تھی۔ ایک کروڑ پچاس لاکھ روپے...... میں نے دیکھا کہ کامنی کو یقین نہیں آیا۔ وہ خواب کی سی حالت میں تھی۔

راجیش اور برانیم دونوں ہی نوسرباز تھے۔ مالا اور وہ دونوں مل کر کھیل رہے تھے۔ انہوں نے آپس میں ساجھا کیا ہوا تھا۔ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ان شیوخ کے علاوہ کامنی کو بھی جال میں پھانسا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے ان تینوں ویٹرسوں کو خرید رکھا تھا جو میز پر شراب اور مشروبات سرو کر رہی تھیں۔ جب کوئی پتے اٹھاتا تھا وہ کسی نہ کسی طرح انہیں موبائل پر آگاہ کر دیتی تھیں۔ ان کے ذمے صرف ایک گھنٹے کی ڈیوٹی تھی۔ ان کی خدمات کی ضرورت یوں بھی نہ تھی کہ برانیم اور راجیش نوسرباز تھے۔ تاش کی دو گڈیاں تھیں جو ایک ایک گھنٹے بعد بدل دی جاتی تھیں۔ ان دونوں پر نشان جو تھے وہ ان دونوں نے لگائے تھے جس کی ان شیوخ کے فرشتوں تک کو خبر نہیں تھی۔ اور پھر ان دونوں نے پتے کوٹ کی آستینوں میں بھی چھپا رکھے تھے۔ اس لیے وہ جب بھی کیسینو میں آ کر کھیلتے تھے تو ان کے ہارنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہمیشہ جیت کر اٹھتے تھے۔ یہ ساجھے کی ہنڈیاں برسوں سے تھی۔

تاش کا کھیل میز پر جو ہو رہا تھا اس میں سنسنی خیزی بھی تھی اور پرجوش انداز اور گرما گرمی بھی...... دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی تھی اور خون بھی نس نس میں تیزی سے گردش کرنے لگتا تھا کسی کا چہرہ دمک اٹھتا اور کسی کا بلب کی طرح فیوز ہو جاتا۔ لیکن دوسری طرف ایک کھیل اس کھیل کے دوران جاری رہا تھا جسے صرف میں کھیل رہا تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ کھیلنے والے تمام کٹھ پتلیاں تھیں اور ان کی ڈوریاں میرے ہاتھ میں تھیں۔ دوسروں کو بے وقوف سمجھنے والے خود سب سے بڑے بے وقوف تھے۔ دوسروں کو دھوکا دینے والے خود دھوکا کھا رہے تھے۔ وہ یہ بھول گئے تھے کہ سو دن چور کے ایک دن بادشاہ کا ہوتا ہے۔

کامنی خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی۔ اس پر شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری تھی۔ میں اور کامنی انہیں ریسٹورنٹ میں چھوڑ کر کاؤنٹر پر گئے۔ کوائنز دے کر ڈالر لے لیے تاکہ بازار میں فروخت کر کے ہندوستانی کرنسی لے لیں۔ اس لیے بھی کہ اس کے پتی کی کرنسی پچاس لاکھ کی جو تھی وہ ہندوستانی کرنسی کی صورت میں تھی۔ پانچ لاکھ اور چالیس لاکھ روپے برانیم اور مالا کو ڈالر میں ادا کرنا تھا۔ میں نے جو ایک لاکھ کی رقم جیت میں حاصل کی تھی اسے ڈالر کی صورت میں رہنے دیا اسے اپنے پاس رکھ لیا۔ وہ میرا حق تھا۔

جب ہم ریسٹورنٹ میں آئے تو مالا، راجیش اور برانیم ایک میز پر سر جوڑ کر بیٹھے پراسرار انداز میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ کامنی نے بیک وقت برانیم اور مالا کو مخاطب کر کے کہا۔ ”آپ دونوں تصویریں اور فائل دے دیں اور اپنی اپنی رقم لے لیں۔“

”وہ دونوں چیزیں برانیم کی کوٹھی میں رکھی ہوئی ہیں۔“ مالا نے جواب دیا۔ ”وہ لینے کے لیے تمہیں وہاں چلنا ہوگا۔“

”لیکن میں نے تو کہا تھا کہ یہاں لیتے آنا۔“ کامنی نے کہا۔ ”وہاں کیوں چھوڑ آئیں......؟“

”اس لیے نہیں لائے کہ تمہارے جیتنے کی خوشی میں جشن منایا جا سکے۔“ برانیم نے کہا۔ ”تم نے اتنی بڑی رقم جیتی، ہم بھلا تمہیں اتنا سستا چھوڑ دیں گے۔ اس خوشی میں تمہیں شیمپین پلاؤں گا۔ تم کل ہم سب کو کاک ٹیل پارٹی دو گی۔ تم ابھی اور اسی وقت چلو اور پی پلا کر اپنی چیزیں لے کر چلی جانا...... چلو...... ہم چلتے ہیں۔“ میں اور کامنی تیار ہو گئے۔ مالا اور راش برانیم کے ساتھ اس کی گاڑی میں آئے تھے۔ وہ دونوں اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئے۔ میں کامنی کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔

اس وقت رات کا آخری پہر تھا۔ جب یہ دونوں گاڑیاں راجہ جی نگر برانیم کی کوٹھی کی طرف روانہ ہوئیں۔ فضا پر سناٹا مسلط تھا، ویرانی اور تاریکی بھی تھی۔ برانیم کی گاڑی آگے تھی۔ ہم بہت پیچھے تھے۔ برانیم کے بارے میں کامنی نے راستے میں بتایا کہ اس کی بیوی بھی ایک حرافہ ہے۔ فاحشہ ہے لیکن اس نے سوسائٹی میں ایک شریف زادی کا بہروپ بھرا ہوا ہے۔ بلیک میلنگ کے گھناؤنے کاروبار میں شریک کار ہے اور شکار پھانستی ہے۔ اس کے علاوہ برانیم منشیات فروش بھی ہے۔

ہم دونوں کوئی پندرہ منٹ دیر سے کوٹھی پہنچے تھے۔ سڑکیں سنسان پڑی تھیں پھر بھی کامنی بہت آہستہ آہستہ گاڑی چلا رہی تھی اور خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی۔ اس نے نہ جانے کتنی مرتبہ میرا شکریہ ادا

کیا کہ میں نے اس کا گھر اجڑنے سے بچا لیا۔نشست گاہ میں وہ تینوں بے چینی سے ہمارے منتظر تھے۔کامنی ابھی اور اسی وقت اپنی تصویریں اوران کے نیگیٹو ز لینے پہنچی تھی کیونکہ وہ انتہائی شرمناک حالت کی تھیں۔وہ چاہتی تھی کہ یہ غلاظت برانیم سے لے کر جلا ڈالے،جلد سے جلد...... جتنا جلد ہو سکے۔

ان تینوں کے چہروں سے صاف اندازہ ہو رہا تھا ان کے کیا ارادے ہیں۔برانیم اور مالا کی نیت میں فتور آ چکا تھا۔راستے میں ان تینوں نے مل کر میرے اور کامنی کے خلاف ایک منصوبہ بنا لیا تھا۔اس وقت بریف کیس میں ایک کروڑ پانچ لاکھ کی جیتی ہوئی رقم کے علاوہ چالیس لاکھ کی وہ رقم بھی تھی جو مالا سے لی ہوئی تھی اور کھیلنے کے لیے لے گئے تھے۔ان کے چہروں پر درندگی اور سفا کی تھی۔آنکھوں سے وحشیانہ پن جھانک رہا تھا۔ان کے چہرے اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

کامنی نے نشست گاہ میں داخل ہونے کے بعد بڑے صوفے پر بیٹھ گئی اوراس نے بریف کیس گود میں رکھ کر برانیم سے کہا۔"آپ پانچ لاکھ روپے لے لیں...... میری تصویریں اوران کے نیگیٹو دے دیں جو آپ نے میری بے ہوشی سے فائدہ اٹھا کر بنائے تھے۔"

"پانچ لاکھ روپے تو میں نے قرض دیا تھا۔" برانیم نے عیاری سے کہا۔"آپ اپنا قرض ادا کر دیں۔جلدی سے ادا کریں......"

"لیکن آپ نے کہا تھا کہ میں اس وقت تصویریں دوں گا جب میرا قرض ادا کر دیا جائے گا۔" کامنی نے یاد دلایا۔

"جی ہاں...... میں نے اس لیے کہا تھا کہ مجھے امید نہیں تھی کہ آپ میرا قرض ادا کریں گی اور پھر آپ نے ثبوت مانگا تھا۔" برانیم کہنے لگا۔"اس کا ان تصویروں سے کوئی تعلق نہیں۔اس صورت میں آپ کو تصویریں مل سکتی ہیں کہ ایک کروڑ رقم ادا کریں۔"

"کیا کہا......؟" کامنی بڑے زور سے اچھل پڑی اوراس کا چہرہ متغیر ہو گیا۔"ایسی تو کوئی بات نہیں ہوئی تھی؟"

"ہاں...... اس روز نہیں ہوئی تھی۔" برانیم تمسخر سے بولا۔"لیکن آج ابھی ہو رہی ہے۔میں اس سے کم پر راضی نہیں ہوں......"

"برانیم! یہ کمینگی ہے...... تم ذلیل اور بڑے حرام زادے ہو۔" کامنی کو غصہ آ گیا۔وہ اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکی۔"حرامی...... تم حرامی ہو تمہارا باپ بھی حرامی تھا اور تمہاری ماں تو تھی ہی طوائف...... اب تم میری کمزوری سے اور ایک کروڑ کی رقم دیکھ کر پھیل رہے ہو۔میں کہتی ہوں تم شرافت سے میری تصویریں دے دو ورنہ میں تمہیں بخشوں گی نہیں۔"

"تم غصے میں کتنی پیاری لگ رہی ہو کامنی!" وہ کامنی کی گالیاں سن کر مشتعل ہونے کی بجائے بے غیرتی سے ہنسنے لگا۔"تمہاری گالیاں بھی تمہاری طرح پیاری لگ رہی ہیں۔جب میں نے تمہاری تصویریں بنائی تھیں تب میری پتنی موجود تھی۔اس لیے میں نے صرف تصویریں اتارنے پر اکتفا کیا تھا۔

خیر کوئی بات نہیں اب تم بچ کر کہاں جاؤ گی۔رقم بھی دو گی۔پھر تصویریں ملیں گی۔"

"مسٹر برانیم! یہ آپ کامنی کے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔"ان سے جو وعدہ کیا ہے اسے پورا کریں۔"

"آپ ہماری درمیان مت بولیں۔" برانیم نے جواب دیا۔"کامنی کو اگر اپنی عزت پیاری ہے تو اس کا باپ بھی ایک کروڑ دے گا۔"

"اچھی بات ہے۔" میں نے کامنی کے ہاتھ سے بریف کیس لے کر کہا۔"آپ تصویریں اوران کے نیگیٹو ز دے دیں۔"

"سکندر صاحب......!!" کامنی بھونچکی ہو کر مجھ سے مخاطب ہوئی۔"یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔اس میں ایک کروڑ پچاس لاکھ روپے ہیں۔مالا کو چالیس لاکھ دے کر اپنے فلیٹ کے کاغذات لینے ہیں۔یہ ساری رقم اسے کیوں دے رہے ہیں آپ......؟"

"کامنی صاحبہ!" میں نے کہا۔"عزت سے بڑی کوئی چیز نہیں ہے۔ایک کروڑ کی رقم دے دیں اور مس مالا کو پچاس لاکھ دے کر فائل لے لیں۔کوئی بات نہیں انہیں دس لاکھ زیادہ مل جائیں......" پھر میں نے مالا کی طرف دیکھا۔"آپ ان کی فائل لا کر دے دیں۔آپ اپنا وعدہ پورا کریں۔"

"ہرگز ہرگز میں تمہیں فائل نہیں دوں گی۔" مالا نے نخوت سے کہا۔"اب تم اس فائل اور فلیٹ کو بھول جاؤ۔"

"تم مجھے فائل کیوں نہیں دو گی مالا!" کامنی نے تحیر زدہ لہجے میں کہا۔"فائل اور وہ اسٹامپ پیپر بھی دے دو۔میں تمہاری رقم دینے آئی ہوں۔تمہیں معلوم ہے کہ میرے بریف کیس میں ڈیڑھ کروڑ کی رقم موجود ہے۔"

"اس لیے کہ وہ فلیٹ اب میرا ہو چکا ہے۔" مالا نے بے اعتنائی سے کہا۔"تم نے وہ اسٹامپ پیپر نہیں پڑھا دستخط کرنے سے پہلے۔"

"مالا......!" کامنی سناٹے میں آ گئی۔پھر چند لمحوں کے بعد بولی۔"یہ تم...... تم کہہ رہی ہو مالا! میں نے تم پر اندھا دھند وشواش کر کے اس پر دستخط کر دیئے تھے۔پتا نہیں تم کیا لکھوا کر لائی تھیں۔وہ ایک کروڑ کی مالیت کا فلیٹ ہے چالیس لاکھ کا نہیں......"

"ہاں...... یہ میں کہہ رہی ہوں۔" مالا استہزائیہ لہجے میں کہنے لگی۔"کیا میں نے تم سے کہا تھا کہ تم پڑھے بغیر دستخط کر دو۔مجھ پر اندھا وشواس کرو۔اب وہ فلیٹ میرا ہے۔تم تین دن میں اسے خالی کر دو۔ورنہ میں تمہیں عدالت سے نوٹس بھجواؤں گی خالی کرنے کا......"

"مالا......! تم بڑی کمینی اور بدذات نکلیں...... کیوں نہ ہو آخر فاحشہ،بدکار اور طوائف جو ہو۔کال گرل ہو۔" کامنی نے بگڑ کر نفرت اور حقارت سے کہا۔پھر اس کی آواز بھرا سی گئی۔پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

تمہارے خلاف استعمال کر سکتے ہیں۔ صاف پتا چل رہا ہے کہ تم ہیروئن بیچ رہے ہو...... اب اجے تمہیں بلیک میل کر سکتا ہے۔"

"سوال یہ ہے کہ اس لفافے کو میرے کمرے کی الماری میں کون اور کس لیے رکھ گیا؟" وہ ابھی بھی حیران اور غصے میں تھا۔

"اس کے بارے میں بعد میں سوچیں گے کہ یہ کس کی حرکت ہے؟" مالا بولی۔ "پہلے تم اس سے نمٹو۔ وہ تصویریں اور ان کے نیگیٹوز لا کر اس کے منہ پر مارو...... جلدی سے رقم لے کر فٹافٹ کرو۔ شبھ کام میں دیر کرنا اچھی بات نہیں ہوتی۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو......" برانیم نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا...... "میں ابھی ایک منٹ میں الماری سے اس کی تصویریں لاتا ہوں۔" برانیم سامنے والے بیڈروم میں گیا اور واپس آیا تو اسے پانچ منٹ بھی نہیں لگے۔ پھر اس نے لفافہ میری طرف بڑھایا۔

میں نے لفافے میں سے تصویریں نکال کر دیکھیں۔ پھر برانیم سے کہا۔ "مجھے کامنی کی تصویریں چاہئیں نہ کہ تمہاری پتنی کی...... شاید یہ تمہاری پتنی ہوگی؟" میں نے کامنی کو تصویریں دکھا کر تصدیق چاہی کامنی نے کہا۔

"یہ برانیم کی پتنی ہے اور اس کے ساتھ اجے ہے۔ بلیک گینگ کا سرغنہ جو روپوش ہے۔ اس پر متعدد کیس چل رہے ہیں۔"

گو کہ یہ تصویریں فحاشی کی زد میں نہیں آتی تھیں لیکن رومانی مناظر جیسی تھیں۔ ایسے رومانی مناظر جو فلموں میں دکھائے جاتے ہیں۔ اور پھر اس کی پتنی اور اجے ساحل سمندر پر سن باتھ لے رہے تھے۔ یوں بھی ایک مجرم کے ساتھ برانیم کی پتنی کی تصویریں...... میاں بیوی کے لیے سنگین خطرے کی بات تھی۔ اس کی بیوی ان تصویروں میں اجے کی محبوبہ دکھائی دے رہی تھی۔

میں نے لفافہ اس کی طرف بڑھایا تو وہ غصے سے بولا۔ "یہ تم میرے ساتھ کیا مذاق کر رہے ہو، یہ کامنی کی تصویریں ہیں۔"

"مسٹر برانیم!" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "مذاق میں نہیں کر رہا ہوں بلکہ تم کر رہے ہو...... یہ دیکھو......"

میں نے تصویروں والا لفافہ اس کے ہاتھ میں تھمانے کی بجائے تمام تصویریں نکال کر فرش پر پھیلا دیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

یہ ساری تصویریں رنگین اور پوسٹ کارڈ سائز کی تھیں ان تینوں نے مل کر فرش سے اٹھالیں۔ وہ تصویریں دیکھنے لگے۔ برانیم کا چہرہ متغیر سا ہو گیا۔ اسے یقین نہیں آیا۔ وہ بھڑک اٹھا۔ "اس کمینی کی یہ مجال کہ وہ اجے کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی پھر رہی ہے...... میں اس حرام زادی کو قتل کر دوں گا۔ یہ...... یہ تصویریں اس کے ساتھ مجھے بھی پولیس اسٹیشن پہنچا دیں گی۔"

"مالا تم نے اپنی سہیلی کے ساتھ بڑی بددیانتی کی ہے۔" میں نے کہا۔ "تم نے اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا کر اچھا نہیں کیا۔ یہ اس لیے رو رہی ہے۔ کتنے دکھ اور افسوس کا مقام ہے۔ تمہارے پاس کس چیز کی کمی ہے جو تم دھوکے سے اس کا فلیٹ ہتھیا رہی ہو......؟"

"میں نے جوئے میں کبھی اتنی بڑی رقم نہیں ہاری۔" وہ تنک کر بولی۔ "میں اس فلیٹ سے اپنا نقصان پورا کروں گی۔ اسے بیچ دوں گی۔"

"اچھا تو مسٹر برانیم!" میں نے مالا کی بات کا جواب نہیں دیا اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "آپ تصویریں لا دیں اور رقم سے بھرا بریف کیس لے لیں...... یہ آپ نے وعدہ خلافی کر کے اچھا نہیں کیا۔ یہ آپ کو زیب نہیں دیتا۔"

برانیم نے میری بات کا جواب دینے کی بجائے جیب سے ایک لفافہ نکال کر بڑھایا جو پھولا ہوا تھا۔ پھر اس نے اپنا دوسرا ہاتھ بریف کیس لینے کے لیے بڑھایا تو میں نے کہا۔ "ایک منٹ صبر کریں۔ میں تصویریں اور ان کے نیگیٹوز چیک کر لوں۔"

میں نے لفافے میں سے تمام تصویریں نکال کر دیکھیں یہ کامنی کی تصویریں نہیں تھیں۔ یہ برانیم کی تصویریں تھیں۔ وہ ایک ہوٹل کے کمرے میں دو حسین لڑکیوں اور دو مردوں کے ساتھ تھا۔ وہ انہیں منشیات کے پیکٹ دے رہا تھا اور ان سے رقم بھی لے رہا تھا۔ ان بارہ عدد تصویروں میں اسے منشیات بیچتے اور رقم وصول کرتے دکھایا گیا تھا۔ اس میں ایک تصویر بھی کامنی کی نہیں تھی۔ میں نے کامنی کا شانہ ہلایا۔ "کامنی! ایک منٹ کے لیے ادھر دیکھو اور بتاؤ کہ یہ مرد اور لڑکیاں کون ہیں؟"

کامنی نے چہرے پر سے ہاتھوں کو ہٹایا۔ ساڑی کے پلو سے آنسو پونچھے۔ اس نے میرے ہاتھ سے پہلے ایک تصویر لی۔ جب اس نے دیکھا کہ یہ تصویریں اس کی نہیں ہیں تو اس نے ایک ایک کر کے تمام تصویریں دیکھیں پھر بولی۔ "یہ دونوں لڑکیاں اور دونوں مرد ایک گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو جرائم پیشہ ہے۔" کامنی کہنے لگی۔ "یہ منشیات فروخت کرتے ہیں۔ کوئی بیس دن قبل ان چاروں نے ایک بینک پر ڈاکہ مارا تھا۔ دس لاکھ روپے لوٹ کر لے گئے۔ بینک میں نصب خفیہ کیمرے نے ان کی تصویریں اتار لیں اور وہ تمام اخبارات میں چھپی تھیں۔ یہ چاروں ملزم پولیس کو مطلوب ہیں۔"

برانیم نے جو یہ سنا تو پہلے یہ سمجھا کہ کامنی مذاق کر رہی ہے۔ اس نے چونک کر میرے ہاتھ سے لفافہ چھین لیا۔ تصویریں دیکھتے ہی اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ بھونچکا سا ہو گیا۔ ایک ایک تصویر دیکھتا گیا۔ پھر وہ بڑبڑایا۔ پھر وہ مالا اور راجیش کی طرف گھوم گیا اور تحیر زدہ لہجے میں بولا۔ "یہ تصویریں کس نے کھینچیں؟ میری الماری میں کیسے آ گئیں؟ کس نے رکھی ہوں گی؟ اگر پولیس کے ہاتھ لگ گئیں تو پھر میں مر گیا۔ دس برسوں کے لیے اندر ہو جاؤں گا۔"

راجیش اور مالا نے بھی یہ تصویریں دیکھیں پھر مالا بولی۔ "یہ ساری کارستانی اجے کی ہو گی...... یہ اجے گینگ کے تو ہیں ان میں سے کسی ایک نے خود کار خفیہ کیمرے سے یہ تصویریں اتاری ہیں یہ پولیس کو

‘‘اب تمہارا بدترین دشمن بن گیا ہے برانیم......!’’ راجیش نے کہا۔‘‘اس نے تمہاری بیوی کو ورغلا لیا ہے۔اس کے ساتھ پینگیں بڑھا رہا ہے۔تمہاری بیوی نے تمہاری پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا ہے۔اجے نہیں چاہتا ہے کہ تم آزادی کی زندگی گزارو۔ اس لیے اس نے یہ تصویریں تمہارے ہاں پہنچا دیں...... پہلے والی جو تصویریں یہاں آئی ہیں وہ بھی تمہاری بیوی کی حرکت معلوم ہوتی ہے۔’’

‘‘کامنی کی تصویریں شاید تمہاری بیوی لے گئی ہو؟’’ مالا نے کہا۔‘‘اس میں سراسر تمہاری اپنی غلطی ہے جو تم نے اسے حد سے زیادہ ڈھیل دے دی۔یہ تمہارے ذاتی معاملات ہیں۔میں اس میں بالکل بھی دخل نہیں دوں گی۔’’

‘‘میں نے اسے اس لیے ڈھیل نہیں دی کہ وہ اجے سے عشق لڑاتی پھرے۔’’ برانیم نے غصے سے کہا۔‘‘کیا وہ بچی ہے؟ نہیں جانتی کہ اجے کتنا بڑا مجرم اور کیسا خطرناک شخص ہے۔وہ ڈوبے گا تو ہمیں بھی لے ڈوبے گا۔میں اسے بخشوں گا نہیں۔’’

‘‘تم اپنی پتنی کی فکر چھوڑو اور اس کی فکر کرو۔’’ مالا نے کہا۔‘‘کامنی کی تصویریں تمہاری پتنی لے گئی ہے۔اب ہمیں ان تصویروں کا کیا اچار ڈالنا ہے۔سیدھے سیدھے بریف کیس لو اور ان دونوں کا دی اینڈ کردو۔نہ رہے گا بانس،نہ بجے گی بانسری......’’

‘‘مالا ٹھیک کہہ رہی ہے۔’’ راجیش تائیدی لہجے میں بولا۔‘‘اس بریف کیس میں ڈیڑھ کروڑ کی رقم موجود ہے پھر دیر کس بات کی......؟’’

‘‘اور پھر اس کا ایک کروڑ کا فلیٹ اس وقت خالی ملے گا جب یہ نہ رہے۔’’ مالا نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔‘‘خالی تو اس کے باپ کو بھی کرنا ہوگا۔ کیونکہ فلیٹ کی فائل اور کاغذات پر دستخط موجود ہیں......شاید یہ اڑنگا لگائے۔میں تھوڑی سی پریشانی بھی اٹھانا نہیں چاہتی۔’’

‘‘تم......تم لوگ مجھے قتل کردو گے؟’’ کامنی ہذیانی لہجے میں بولی۔‘‘کتیا......’’ پھر وہ مالا سے بولی۔‘‘تم لوگ ایسا نہیں کرسکتے۔’’

‘‘صرف تمہیں ہی نہیں...... بلکہ تمہارے اس آشنا کو بھی......’’ مالا نے زہرخند کہا۔‘‘ہمیں افسوس ہے کہ یہ شخص مفت میں مارا جارہا ہے۔’’

برانیم نے میز کی دراز سے پستول نکالا۔اس میں سائی لینسر نصب تھا۔مجھ سے بولا۔‘‘لاؤ یہ بریف کیس دے دو......اور مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔’’

‘‘سنو برانیم......!’’ میں نے کہا۔‘‘مجھے تم لوگوں سے ایسی امید ہرگز نہیں تھی۔تم نے دھوکا دیا۔یہ رزالت اور گھٹیا حرکت ہے۔’’

‘‘میں یا مالا......ہرگز ایسے نہیں ہیں کہ اچھی توقعات رکھی جائیں۔’’ برانیم قہقہہ مار کر ہنسا۔‘‘تم دونوں کو ختم کرنے کے سوا چارہ بھی نہیں ہے۔کاش! تم اس کے ساتھ تاش کھیلنے نہیں آتے۔کیا کریں گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔’’

‘‘کیا......ہمیں محض اس دولت کی خاطر قتل کیا جارہا ہے؟’’ میں نے پوچھا۔مالا اور راجیش کی طرف دیکھا۔‘‘کیا یہ سچ ہے......؟’’

‘‘ہاں......’’ مالا نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر جواب دیا۔‘‘اس میں کسی شک وشبے کی ذرا برابر بھی گنجائش نہیں ہے۔’’

‘‘پھر تو یہ ساری دولت اور گھر کی فائل اور کامنی کی تصویریں بھی رکھ لو اور ہمیں جانے دو۔’’ میں نے کہا۔‘‘ہمیں قتل کرنے سے تمہیں کیا ملے گا۔ہوسکتا ہے کہ تم لوگ قتل کے الزام میں دھر لیے جاؤ۔پولیس کے ہاتھوں سے تم لوگ نہیں بچ سکتے۔’’

‘‘بات تو تمہاری بڑی معقول ہے۔’’ مالا نے کہا۔‘‘لیکن تم دونوں پر بھروسا بھی تو نہیں کیا جاسکتا۔تم دونوں سانپوں کی طرح ڈس بھی سکتے ہو؟’’

‘‘ہم مزاحمت تو نہیں کررہے ہیں اور نہ ہی تم لوگوں کے خلاف رپورٹ کرنے تھانے جاسکتے ہیں۔’’ میں نے کہا۔

‘‘یہ شخص ٹھیک کہہ رہا ہے۔’’ راجیش بولا۔‘‘اس سے بریف کیس لے لو اور انہیں جانے دو اور اس سے کہو کہ ایک شرط پر جانے دیا جائے گا کہ فلیٹ کی چابی کل شام تک مالا کو دے دی جائے گی......کامنی اپنا کہیں اور انتظام کرلے۔’’

پھر وہ تینوں بیڈروم میں جاکر آپس میں صلاح مشورہ کرنے لگے۔کامنی حیرت سے بولی۔‘‘یہ آپ کیا کررہے ہیں،وہ ساری رقم بھی دے رہے ہیں......گھر کی فائل اور دستخط شدہ اسٹامپ پیپرز بھی اس طرح دے رہے ہیں جیسے مفت کا مال ہو۔میں کہاں جاؤں؟ کیا کروں؟ اب تو میں زندہ نہیں رہ سکتی میں اپنے پتی کو کیا جواب دوں گی؟ یہ کمینہ،رذیل ان تصویروں سے مجھ سے فائدہ اٹھاتا رہے گا۔نہیں......نہیں......’’ کامنی ہیجانی لہجے میں بولی۔‘‘اس سے مرجانا بہتر ہے۔میں خودکشی کرلوں گی۔’’

‘‘آپ اس قدر مایوس اور دل برداشتہ نہ ہوں۔’’ میں نے اسے دلاسا دیا۔‘‘آپ کی عزت پر نہ تو کوئی آنچ آئے گی نہ رقم ڈوبے گی اور نہ ہی اس شیطان کے ہاتھوں آپ بلیک میل ہوں گی۔میں سب ٹھیک کرلوں گا۔سب ٹھیک ہوجائے گا۔شانتی رکھیں۔’’

‘‘مجھے ان کمینوں سے اس بات کی توقع نہیں کہ وہ زندہ چھوڑ دیں گے۔’’ کامنی نے کہا۔‘‘وہ ہمیں موت کی نیند سلادیں گے۔مجھے مرنے کا کوئی خوف نہیں۔میں خود بھی چاہتی ہوں کہ مرجاؤں......دکھ اور افسوس اس بات کا ہے کہ میری وجہ سے وہ آپ کو بھی مارنا چاہتے ہیں۔میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں کس طرح انہیں باز رکھوں۔باز رکھنے کے لیے مجھے اپنی عزت کا دان بھی دینا پڑا تو دے دوں گی۔اپنی جان پر کھیل جاؤں گی۔جو کچھ میرے بس میں ہے وہ کرگزروں گی۔’’ اس کی آواز بھرا سی گئی۔

‘‘پلیز کامنی......! آپ حوصلہ نہ ہاریں۔’’ میں نے دلاسا دیا۔‘‘ہم دونوں میں سے کسی ایک کا بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔بس آپ خاموشی اور صبر سے تماشا دیکھیں۔اگر انہوں نے ہمیں قتل کیا تو یہ سمجھیں کہ

اپنے پیروں پر کلہاڑی مار لی۔''

پھر وہ تینوں بیڈروم سے نکل کر آئے تو ان کے چہرے بتا رہے تھے کہ انہوں نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ ان کی آنکھوں سے سفاکی جھانک رہی تھی۔ پستول مالا کے ہاتھ میں تھا۔ وہ خشونت آمیز لہجے میں بولی۔ ''ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تم دونوں کو موت کی آغوش میں سدا کے لیے پہنچا دیں۔ پھر تم دونوں کی لاشیں کسی ویرانے میں لے جا کر پھینک دیں۔ یہ کیسا فیصلہ ہے؟''

''فیصلہ تو بہت اچھا اور بروقت ہے......'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''لیکن تم ایک بات بھول رہی ہو کہ قانون کے ہاتھوں سے بچ نہ سکو گی۔ کوئی مجرم قانون کے ہاتھوں سے بچ نہیں سکا ہے۔ اس میں دیر سویر تو ہو جائے گی مگر......!''

''اگر مگر کیا......؟'' برانیم ہنسا۔ ''ہم تم دونوں کی لاشیں کسی گڑھے میں دفن کر دیں گے۔ پھر کبھی تم دونوں کی لاشوں کا پتہ نہیں چل سکے گا۔''

''ایک بات بھول رہے ہو کہ ہم ایک پیش بندی کر کے آئے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں جس ہوٹل میں ٹھہرا ہوں میں نے اس کے منیجر کو بتا دیا تھا کہ میں کامنی کے ساتھ کیسینو جا ر[illegible] جہاں مالا ماڈل گرل، برانیم اور راجیش جو کامنی اور مالا کے دوست ہیں ان کے ساتھ ر[illegible] رہم کسی وجہ سے واپس نہ آئے تو پولیس کو اطلاع کر دینا۔ اگر میری بات کا یقین نہیں آ رہا ہے [illegible]ے بھوٹ سمجھ رہے ہو تو ایسا کر و ابھی اور اسی وقت ہوٹل ٹیلی فون کر کے منیجر پردیپ کمار سے رابطہ کر کے علوم کر لو...... ہاتھ کنگن کو آرسی کیا...... میں ایک کاروباری شخص ہوں۔ جہاں بھی جاتا ہوں کسی نہ کسی کو بتا کر ضرور جاتا ہوں۔'' میں نے اندھیرے میں تیر چلایا تھا کہ یہ نشانے پر ضرور جا کر لگے گا۔

''تم اس کی باتوں کے فریب میں نہ آؤ مالا!'' برانیم بولا۔ ''یہ نفسیاتی حربہ آزما رہا ہے۔ جھوٹ بول رہا ہے۔ تم انہیں جلدی سے گولی مار دو۔ کیونکہ ہمیں ان کی لاشیں گاڑی میں کسی دور دراز علاقے میں لے جا کر کسی گڑھے میں دفن کر کے اجالا ہونے سے پہلے واپس آنا ہے۔''

''کیا جھوٹ ہے کیا سچ ہے اس کی کوئی بحث نہیں۔'' میں نے بڑے پرسکون لہجے میں کہا۔ ''مالا...... برانیم تمہیں پھنسا رہا ہے۔ تمہارے ہاتھوں قتل کروا کر...... پولیس کو منیجر بتا دے گا۔ پولیس تمہیں قتل کے الزام میں گرفتار کر لے گی۔ تمہیں زیادہ سزا ہوگی۔ یعنی پھانسی چڑھ جاؤ گی۔ برانیم تمہیں پھنسا دے گا۔ راجیش بھی اس کا ساتھ دے گا۔ دونوں تمہارے خلاف گواہی دیں گے۔ قانون گواہی کو اہمیت دیتا ہے۔ انہیں پھانسی کی سزا نہیں ہوگی۔ زیادہ سے زیادہ دو ایک برس ہوگی۔ تمہاری یہ بھرپور جوانی اور خوابناک زندگی کیا اس لیے ہے کہ کال کوٹھڑی میں مقدمے کا فیصلہ ہونے تک گزرے۔ پھر تمہیں پھانسی پر چڑھا دیا جائے۔ اس سے کہو کہ وہ کیوں ہمیں قتل نہیں کر رہا ہے۔ تمہارے ہاتھوں قتل کیوں کروا رہا ہے؟ کیا اس سے اس شخص کی چالاکی، ذلالت اور بد دیانتی ظاہر نہیں ہو رہی ہے؟''

''میں نے کرینہ کو بھی بتایا ہوا ہے کہ میں تمہارے اور ان دونوں کے ساتھ کھیلنے جا رہی ہوں۔ وہاں

شیوخ بھی ہوں گی۔'' کامنی کہنے لگی۔ ''سچ پوچھو تو میں مرنا چاہتی ہوں۔ میں خودکشی کرنے والی تھی لیکن سکندر صاحب نے بچا لیا۔ اس لیے کہ میں نے اپنے پتی کی رقم ہار دی...... پھر میری بے ہوشی سے فائدہ اٹھا کر اس ذلیل، کمینے اور حرام زادے برانیم نے میری ایسی تصویریں اتاریں کہ میں دنیا اور پتی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔ اس سوئر نے مجھے بلیک میل کرنے کے لیے یہ حرکت کی...... بھلے مجھے گولی مار دو لیکن سکندر صاحب کو نہیں۔ ان کے کارن میں نے یہ رقم جیتی ہے۔''

''میں اب بھی کہتا ہوں کہ ان دونوں کو جانے دو۔'' راجیش نے کہا۔ ''یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور پھر یہ سب کچھ دینے کو تیار جو ہیں۔''

''ٹھیک ہے......'' مالا نے سر ہلایا۔ ''یہ بریف کیس مجھے دے دو اور کل شام تک فلیٹ خالی کر دینا۔ ورنہ تمہاری تصویروں کے پرنٹ بنوا کر تمہارے سرکل میں تقسیم کر دوں گی پھر تم جیتے جی مر جاؤ گی۔ میرا مخلصانہ مشورہ تو یہ ہے کہ تم زہر کھا کر مر ہی جاؤ۔ کیونکہ تمہاری زندگی سے کسی کو کوئی فائدہ نہیں......''

میں اٹھ کھڑا ہوا تو کامنی بھی کھڑی ہو گئی۔ میں نے خاموشی سے بریف کیس مالا کی طرف بڑھا دیا۔ پھر کامنی کو باہر لے آیا۔ جب وہ اپنی گاڑی کے اسٹیئرنگ پر بیٹھ گئی تو میں نے دروازہ بند کیا۔ پھر اس سے پوچھا۔ ''آپ کو رات کے اس سمے اکیلے گھر جاتے کوئی ڈر اور خوف تو محسوس نہیں ہوگا......؟''

''کیا آپ میرے ساتھ نہیں چل رہے ہیں؟'' کامنی نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''مجھے ڈر تو نہیں لگے گا۔ میں چاہتی ہوں آپ سے مشورہ کروں۔ کیونکہ اس اتنے بڑے سنسار میں صرف آپ ہی ایک مخلص، ہمدرد اور سچے دوست اور بے غرض انسان ہیں۔ آپ سے مشورہ کر کے دل کو ڈھارس ہوگی۔''

''میں ذرا ان سے نمٹ کر رقم اور آپ کی فائل اور تصویریں لے کر آؤں گا۔'' میں نے کہا۔ ''آپ جا کر آرام کریں۔ آپ بہت پریشان، خوفزدہ اور تھکی تھکی سی لگ رہی ہیں۔ آپ کسی بات کی فکر مت کریں۔ وہ میرا بال تک بیکا نہیں کر سکتے۔ مجھے وہ کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔''

میں اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر تیزی سے گھوما اور واپس نشست گاہ میں پہنچا۔ بریف کیس میز پر رکھ کر وہ اسے کھولنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہیں بریف کیس کھولنے کا کوڈ نمبر کامنی سے پوچھنا یاد نہیں رہا تھا۔ میری آہٹ سن کر وہ میری طرف گھومے اور حیرت سے مجھے دیکھا۔

''تم یہاں کس لیے آئے ہو؟'' مالا غرائی۔ ''کامنی کہاں ہے؟ کہیں وہ پولیس لانے کے لیے تو نہیں گئی ہے؟'' وہ مشکوک سی ہو کر دیکھنے لگی۔

''میں اس لیے آیا ہوں کہ یہ بریف کیس، فائل اور تصویریں لے جاؤں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اس لیے کہ یہ تینوں چیزیں تمہارے کسی کام کی نہیں۔''

''یہ چیزیں تم کیا تمہارا باپ بھی نہیں لے جا سکتا۔'' برانیم نے کرخت لہجے میں کہا۔ ''بہتر ہے کہ تم فوراً ہی نظروں کے سامنے سے دفع ہو جاؤ۔''

''میرے نہیں تم اپنے باپ کی بات کرو۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''مجھے یہ چیزیں لے جانے سے

تمہارا باپ بھی نہیں روک سکتا۔ تم اپنے باپ کو بلا کر دیکھ لو......"

"لگتا ہے تمہاری موت تمہیں یہاں کھینچ لائی ہے۔" مالا نے پستول اٹھا لیا جو اس نے میز پر رکھا ہوا تھا۔ "ہمت ہے تو لے جا کر دکھاؤ......"

"یہ چیزیں لے جانے کے لیے کسی ہمت اور طاقت کی مجھے کوئی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں تم تینوں کو موت سے ہمکنار کر سکتا ہوں لیکن کسی کی جان لینے کا قائل نہیں ہوں۔ میں دراصل تم تینوں کو ایک ایسا سبق دینے آیا ہوں جو ساری زندگی کے لیے عبرت ناک ہوگا۔"

"راجیش یار! کیا خیال ہے۔" برانیم اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ "لگتا ہے کہ اس کے ہوش ٹھکانے نہیں ہیں......؟ ٹھکانے لگا دیں......"

"کیوں نہیں......" راجیش نے کہا۔ "اسے اٹھا کر چھت پر لے جاتے ہیں اور اس کے پچھلے حصے میں پھینک دیتے ہیں پھر اسے عقل آ جائے گی۔"

مالا نے آگے بڑھ کر میری کنپٹی پر پستول کی نال رکھ دی۔ پھر ان دونوں نے مجھے بازوؤں سے پکڑا۔ وہ مجھے زینے کی طرف لے کر بڑھے۔ میرے پیچھے مالا تھی اور اس نے مجھے پستول کی زد میں لے رکھا تھا۔ میں نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ میں ان کے ساتھ بڑی شرافت سے چل پڑا۔ وہ حیران تھے ۔انہیں یقین نہیں آیا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں تم لوگوں کے ساتھ تعاون کر رہا ہوں۔"

"ہوشیار رہنا......" راجیش بولا۔ "یہ کوئی چال چل رہا ہے......؟"

"تم چنتا نہ کرو۔" مالا نے کہا۔ "اگر اس نے ہوشیاری دکھائی تو میں اس کی ٹانگ میں گولی مار دوں گی۔"

پھر وہ مجھے چھت پر لے کر پہنچے۔ راجیش نے میری دونوں ٹانگیں اور برانیم نے میری بغلوں میں ہاتھ دے کر اٹھا لیا۔ چھت کی منڈیر کے پاس لے گئے۔ اس کوٹھی کے عقبی حصے میں جھاڑیاں تھیں جو اندھیرے میں بھیانک دکھائی دے رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے جھولا جھلایا اور ان جھاڑیوں کی طرف اچھال دیا۔ میں ان جھاڑیوں کے درمیان اس طرح کھڑا ہو گیا جیسے پیراشوٹ سے اترا ہوں۔ مجھے ایک خراش تک نہیں آئی تھی۔ نہ وہ مجھے نظر آ رہے تھے اور نہ ہی میں انہیں نظر آ رہا تھا۔ چند لمحوں بعد میں نے مالا کی آواز سنی۔

"شاید زمین پر گرتے ہی وہ بے ہوش ہو گیا ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ اس کا سر زمین سے ٹکرایا تو وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس کے لیے اس کے منہ سے آواز تک نہیں نکلی۔" برانیم نے کہا۔ "نیچے چلو......"

جب وہ نیچے پہنچے تو مجھے صوفے پر بیٹھا دیکھ کر بھونچکے ہو گئے۔ ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ برانیم تحیر زدہ لہجے میں بولا۔ "تم......تم زندہ ہو......لیکن تم اتنی جلدی اندر آ بھی گئے لیکن تم کیسے سلامت ہو......؟ تمہیں چوٹ نہیں آئی؟ حیرت کی بات ہے......"

"میں تم لوگوں کی حیرت میں مزید اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "بریف کیس، فائل اور

تصویریں دے دو......"

"کیسی حیرت......؟" مالا نے پوچھا۔ "کیوں نہ ہم تمہاری حیرت میں اضافہ کر دیں۔"

"حیرت کی بات یہ ہے کہ اس بریف کیس میں رقم نہیں بلکہ ردی بھری ہوئی ہے۔" میں نے کہا۔ "جو تم گھر کی فائل لے کر آئی ہو اس میں گھر کے کاغذات نہیں بلکہ کامنی کی سہیلیوں کے خطوط ہیں۔ اس کا جو تصویروں والا لفافہ ہے میں اسے دیکھ کر بتا سکوں گا کہ اس میں کس کی تصویریں ہیں۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو......بکواس کر رہے ہو...... مجھے بے وقوف بنا رہے ہو۔" مالا بولی۔ "بریف کیس میں رقم موجود ہے......میں نے خود اس کی فائل چیک کی ہے۔ اسٹامپ پیپرز پر اس کے دستخط لیے ہیں۔ میں اندھی نہیں ہوں جو دھوکا کھا جاؤں۔"

"ہاتھ کنگن کو آرسی کیا......بریف کیس کھول کر دیکھ لیں۔" میں نے کہا۔ "کامنی آپ لوگوں کو بے وقوف بنا کر آنکھوں میں دھول جھونک کر چلی گئی۔"

راجیش بریف کیس کھولنے کے لیے آگے بڑھا۔ پہلے ان سے بریف کیس اس لیے نہیں کھلا تھا کہ اس کا کوڈ معلوم نہیں تھا اور میں نے اسے جادو سے بند کیا ہوا تھا۔ پھر میں نے اسے جادو سے کھول دیا۔ راجیش نے جیسے ہی ڈھکن اٹھایا اخبار کی ردی اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ ان کے چہرے سرخ ہو گئے اور آنکھیں شعلے برسانے لگیں۔ انہیں یقین نہیں آیا۔ برانیم نے ساری ردی نکال کر میز پر ڈال دی۔ اس میں ایک ڈالر بھی نہیں تھا۔ برانیم میز پر مکے مارتے ہوئے بولا۔ "وہ کمینی کہاں ہے......؟ وہ رقم والا بریف کیس کہاں ہے؟"

"وہ کمینی تو کہیں اور چلی گئی ہے تاکہ رقم چھپا کر رکھ سکے اور تم لوگوں کے ہاتھ نہ لگ سکے۔" میں نے کہا۔ "رقم والا بریف کیس اس نے ڈگی میں رکھ دیا تھا اور یہ بریف کیس تم لوگوں کو الو بنانے لائی تھی۔"

وہ کہاں گئی؟ کہاں روپوش ہو گئی؟ اس نے مجھے بتایا نہیں اور میں نے پوچھا نہیں۔"

"اسے تلاش کرنا کچھ مشکل نہیں۔" مالا بولی۔ "وہ بھلا کہاں چھپ سکتی ہے اور کب تک چھپی رہ سکتی ہے۔ میں اسے دیکھتے ہی گولی مار دوں گی۔"

"اچھا اب تم اپنی فائل بھی چیک کر لو اور اسٹامپ پیپرز بھی......" میں نے کہا۔ "تم نے کہا تھا کہ وہ فائل یہاں رکھی ہوئی ہے۔"

"تم کہتے ہو تو میں ابھی تمہارے سامنے فائل چیک کر کے بتاتی ہوں۔" مالا نے جواب دیا۔ "میں نے اس فائل کو یہاں لا کر کسی وجہ سے رکھ دیا تھا۔"

اس نے میز کی دوسری دراز سے فائل نکالی اور بڑی میز پر بریف کیس کے پاس رکھی تو میں نے ردی اٹھا کر واپس بریف کیس میں رکھ دی۔ بریف کیس بند کر دیا۔ اس اثناء میں مالا نے فائل کھولی اور برانیم کامنی کی تصویروں والا لفافہ بھی لے آیا تھا۔ میری بات درست نکلی تھی۔ یہ گھر کے کاغذات کی فائل نہیں تھی بلکہ خطوط کی فائل تھی۔ اسٹامپ پیپرز کی جگہ سادے کاغذ تھے۔ ان پر کچھ بھی تحریر نہیں تھا۔

"یہ کامنی نے ہاتھ کی صفائی کب، کیسے اور کس وقت دکھائی تھی۔" مالا حیران ہو کر غصے سے

بولی۔ ''مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ مجھے دھوکا دے گی۔''

''تم فائل اور اسٹامپ پیپرز پر دستخط کرانے کے بعد جب واش روم گئی تھیں تب اس نے ہاتھ کی صفائی دکھائی تھی۔'' میں نے کہا۔

''یہ بات تم کیسے جانتے ہو......؟'' مالا نے مشکوک نظروں سے گھورا۔ ''کیا کامنی نے تمہیں یہ بات بتائی تھی؟''

''میں اس وقت اس کے فلیٹ میں موجود تھا۔ جب تم رقم لے کر پہنچی تھیں۔'' میں نے اسے بتایا۔ ''کامنی نے مجھے ایک بیڈروم میں چھپا دیا تھا میں وہاں سے ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ تمہارے جاتے ہی وہ فائل اور کاغذات لے کر کسی کے ہاں رکھنے چلی گئی اور کوئی ایک گھنٹے بعد واپس آئی۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' مالا بولی اور اس نے کامنی کی تصویروں والا لفافہ برانیم کے ہاتھ سے لے کر میرے سامنے ڈال دیا۔ ''یہ جب ہمارے پاس ہے اسے ہماری ہر بات ماننا ہوگی۔ وہ ساری رقم، فلیٹ کی فائل سب کچھ دے دے گی۔''

میں نے تصویروں والا لفافہ اٹھایا۔ اس میں تصویریں اور نیگیٹوز بھی تھے۔ میں نے تصویریں نکال کر ایک ایک تصویر کو بڑے غور سے دیکھا اور مسکرا دیا۔ مالا کی طرف دیکھا اور اس کی طرف بڑھائیں۔ وہ مجھ پر پستول تانے کھڑی تھی کہ کہیں میں کوئی گڑبڑ نہ کردوں۔

''یہ کسی چڑیا گھر کی تصویریں ہیں؟'' میں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''میں نے اپنی زندگی میں کبھی ایسے خوبصورت اور پیارے پرندے نہیں دیکھے۔ کیا تم نے دیکھے ہیں؟ جس نے بھی یہ تصویریں اتاریں وہ بڑا فن کار معلوم ہوتا ہے۔ یہ دیکھیں کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''یہ پرندوں کی نہیں بلکہ تمہاری محبوبہ کی تصویریں ہیں۔'' مالا ہنس کر بولی۔ ''اپنے پتی کی غیر موجودگی میں تمہیں اپنے ہاں رکھا ہوا ہے۔''

''اس شریف عورت پر تم جیسی عورت کا بہتان لگانا زیب نہیں دیتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس میں اور تم میں زمین آسمان کا فرق ہے...... کیا یہ تصویریں برانیم نے اتاری ہیں؟ اگر ایسا ہے تو اسے فلمی دنیا میں کیمرہ مین بن جانا چاہیے۔ ذرا یہ تصویریں تو دیکھیں......''

میں نے اس کی نظروں کے سامنے تصویریں لہرائیں اس نے میرے ہاتھ سے تصویریں لے لیں تو میں نے نیگیٹوز اپنی جیب میں رکھ لیے۔ مالا نے ایک ایک کر کے تمام تصویریں دیکھیں۔ اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اس نے برانیم کی طرف گھوم کر دیکھا۔ ''یہ تم کیا اٹھا لائے؟ کامنی کی تصویریں کہاں ہیں؟''

''میں خود کامنی کی تصویریں چیک کر کے لایا ہوں۔'' برانیم نے اس کے ہاتھ سے تصویریں لے کر دیکھیں۔ ''یہ تصویریں میرے پاس کہاں سے آ گئیں۔ معلوم نہیں یہ کیا چکر ہے......؟ میری نظریں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔'' اس نے غصے سے تصویریں میز پر پٹخ دیں۔

میں نے دیکھنے کے بہانے سے وہ تصویریں اٹھائیں اور جیب میں رکھ لیں اور کہا۔ ''میں جانتا

ہوں کہ تم لوگوں کے پاس کامنی کی ایک تصویر بھی نہیں ہے......''

''نہیں...... نہیں......'' برانیم ہذیانی لہجے میں بولا۔ ''ابھی تو میں نے دراز سے اس کی تصویروں کا لفافہ نکالا تھا۔ میں نے اس کی تصویریں دیکھ کر اپنی تسلی کی تھی۔ لیکن یہ بدل کیسے گئیں؟ صرف چند لمحوں میں......'' وہ ہکا بکا ہو رہا تھا۔ ''آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ وہ رقم والا بریف کیس ہم سب کو بے وقوف بنا کر لے اڑی...... فائل کے کاغذات خطوط کی شکل میں بدل گئے اور اس کی تصویریں بدل گئیں۔''

''آپ لوگ اپنی آنکھوں اور دماغ کا علاج کرائیں۔'' میں نے کہا۔ ''تم لوگوں نے دوسروں کے لیے گڑھا کھودا اور خود اس میں جا گرے......''

''میں سمجھ گیا اصل بات کیا ہے؟'' راجیش نے کہا۔ ''کامنی نے شاید کسی جادوگر کی خدمات حاصل کی ہوں گی؟ یہ سارا کھیل اس جادوگر کے کارن ہے۔ اس لیے ہمارے ہاتھ کچھ نہیں لگا۔ اس شہر میں دو ایک بڑے جادوگر ہیں۔ وہ بڑے باکمال اور کالا جادو کے ماہر ہیں۔''

''یہ تمہارا وہم ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اگر ایسی بات ہوتی تو وہ جوئے میں ہارتی نہیں۔ نوبت یہاں تک نہ آتی۔''

میں نے بریف کیس میں فائل رکھ لی۔ میں نے بریف کیس کو مقفل کیا اور جانے لگا تو مالا بولی۔ ''تم کہاں جا رہے ہو؟ یہ ردی اور فائل کیوں لے جا رہے ہو؟''

''میں اپنی چیزیں لے جا رہا ہوں جو کامنی نے مجھ سے لی تھیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اب یہ تمہارے کس کام کی ہیں۔''

''میرا خیال ہے کہ تمہی جادوگر ہو؟'' راجیش نے مشکوک لہجے میں کہا۔ ''یہ حرکت اور کرتوت تمہارے ہیں اور تم معصوم بن رہے ہو؟''

''مالا......!'' برانیم بڑے زور سے چلایا۔ ''راجیش ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ جادوگر ہے۔ اس نے کامنی کو جتایا...... فائل کے کاغذات بدل دیئے اور کامنی کو کہیں چھپا دیا۔ اسے جانے نہ دو۔ اسے گولی مار دو۔ یہ زہریلا سانپ ہے اس کا سر کچل دو۔ ورنہ ہم سب کو ڈس لے گا۔''

''رک جاؤ سکندر......!'' مالا نے لبلبی پر انگلی رکھ کر کہا۔ ''تم کچھ دیر کے مہمان ہو۔ کامنی کہاں ہے بتاؤ......''

''اب جب کہ تم لوگوں کے علم میں یہ بات آ گئی ہے کہ میں جادوگر ہوں تو سن لو۔ میں نے کامنی کی انسانیت کے ناتے مدد کی۔ اس لیے کہ تم لوگوں نے اس غریب پر ظلم و ستم کا پہاڑ توڑا...... اس کا گھر اس کی سہیلی نے اجاڑنے کی کوشش کی جس سے اس نے ٹوٹ کر محبت کی اور اندھا اعتماد کیا۔'' میں کہنے لگا۔ ''برانیم تم نے اس کے ساتھ جو ذلالت کی وہ قابل معافی نہیں ہے...... راجیش تم بہت نوسرباز ہو۔ اس لیے تم نے بھی تاش کے کھیل میں شکست نہیں کھائی۔ تم تینوں نے مل کر ان شیوخ کے علاوہ کامنی کو بھی لوٹنے کی کوشش کی۔ پتوں پر نشان لگائے، آستین میں پتے چھپائے لیکن یہ سب کچھ دھرا رہ گیا۔ میں نے کھیل کے دوران تم تینوں

کی ہر چال ناکام بنادی۔ پتے نہیں بدلے بلکہ ان کے نمبر بدل دیئے تا کہ تم لوگ خوش فہمی میں مبتلا رہو۔ اور اس بریف کیس میں جو رقم تھی اسے ردی بنادیا...... لیکن درحقیقت یہ رقم ہے یہ دیکھو......" میں نے بریف کیس کھول کر نوٹوں کی گڈیوں کی جھلک دکھائی۔ پھر مالا کو فائل دکھائی۔ "یہ دیکھو اس میں خطوط نہیں گھر کے کاغذات اور اسٹامپ پیپرز ہی ہیں۔ کامنی کو بالکل بھی خبر نہیں ہے کہ یہاں کیا کھیل ہو رہا ہے۔"

"اب تم بریف کیس کے پاس سے ہٹ جاؤ ورنہ گولی ماردوں گی......" مالا نے پستول فضا میں لہراتے ہوئے ہذیانی لہجے میں کہا۔

"لیکن تم میں سے جس نے بھی رقم اور فائل کو ہاتھ لگایا وہ پھر سے سابقہ حالت میں آجائے گی۔ ردی اور خطوط کے علاوہ کچھ نہ ہوگا۔" میں نے کہا۔

"اس لیے تو میں کہوں کہ میں نے گڈی پر جو نشان لگائے وہ دھوکا کیوں دے رہے ہیں......؟" راجیش کہنے لگا۔ "اس کے نمبر کیوں بدل رہے ہیں۔" راجیش کہنے لگا۔ "اس کے نمبر کیوں بدل رہے ہیں؟ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے غلطی کی ہو...... گویا یہ ساری کارستانی تمہاری تھی؟ تم جادوگر ہو یا بدمعاش......؟"

"سب سے بڑے بدمعاش اور ڈاکو تو تم ہو جو اپنے ہاتھ کی صفائی سے معصوم لوگوں کو لوٹتے ہو۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "یہ کھیل کے اصول کے خلاف ہے۔ معلوم نہیں تم نے اب تک کتنے لوگوں کو بے رحمی اور درندگی سے برباد کیا تم شیطان ہو...... لعنت ہے تم پر......"

"مالا!" برانیم چلایا۔ "تم اسے جلدی سے گولی مار دو تا کہ یہ فائل اور نوٹوں کو ردی میں تبدیل نہ کر سکے۔"

مالا نے فوراً ہی میرے سینے کا نشانہ لیا۔ اس نے ایک پل کی بھی تاخیر نہیں کی۔ اس کے چہرے پر ایک پیشہ ور قاتل کی سی درندگی ابھر آئی تھی۔ وہ لبلبی پے در پے فائر کرنے کے لیے متواتر دباتی چلی گئی۔ کلک کلک کلک کی آواز کمرے کے سکوت میں گونج کر دم توڑ گئی۔ جب وہ چھ مرتبہ لبلبی دبا چکی اور اس میں سے ایک مرتبہ بھی گولی نہیں نکلی تو اس نے حیران ہو کر پستول کو دیکھا۔ پھر اس کا چیمبر کھولا۔ اس میں ایک گولی بھی نہ تھی۔ وہ خالی پڑا تھا۔ میں نے اس کی حیرت دور کرنے کے لیے اپنی جیب سے پستول کی گولیاں نکال کر میز پر ڈال دیں۔

"مالا......! تم جو گولیاں پستول میں دیکھ رہی ہو وہ یہ ہیں...... دل کی حسرت پوری کرنی ہے تو انہیں پستول میں لوڈ کرلو۔"

مالا کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں...... اسے یقین نہیں آیا وہ سمجھ گئی کہ یہ میرے جادو کا اثر ہے۔ میں نے جادو کے زور سے گولیوں کو پستول کے چیمبر سے غائب کردیا تھا۔ راجیش اور برانیم بت بنے دیکھ رہے تھے۔ یکایک برانیم نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ اس نے مالا کے ہاتھ سے پستول جھپٹ لیا اور میز کی طرف بڑھا تا کہ میز پر بکھری پڑی گولیاں اٹھا کر لوڈ کرلے۔ اس نے جیسے ہی ایک گولی اٹھائی

ایک دم سے اسے جھٹک دیا جیسے اس کے ہاتھ میں دہکتا ہوا انگارہ آگیا ہو۔ اس کا ہاتھ جھلس گیا ہو۔ اس کا چہرہ سفید پڑتا چلا گیا۔

"کیا ہوا......؟" مالا نے اس کے قریب آکر پوچھا۔ "یہ تم نے گولی کیوں پھینک دی؟ کیا یہ گولیاں اس پستول کی نہیں ہیں؟"

برانیم کے بتانے سے پہلے ہی مالا نے اس کے ہاتھ سے پستول لے کر ایک گولی اٹھالی تھی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے برانیم کی طرح ہاتھ جھٹک دیا اور اس کے ہاتھ سے پستول چھوٹ کر فرش پر گر پڑا۔ اس کے چہرے پر دہشت سی چھا گئی۔ "یہ انگارے کی طرح دہک رہی ہے۔" مالا نے خوف اور تحیر کے ملے جلے لہجے میں کہا۔ "یہ کمینہ ہمیں اپنے جادو سے پریشان کر رہا ہے۔"

"میں نے اب تم تینوں کے لیے سزائیں تجویز کی ہیں جو کہ بہت ضروری ہیں تا کہ تم لوگ آئندہ معصوم لوگوں کی زندگی سے نہ کھیل سکو۔" میں نے کہا۔ "مالا! جب تم اپنے فلیٹ پر پہنچو گی اور جیسے ہی سورج طلوع ہوگا تم ایک پچاس برس کی بڑھیا بن جاؤ گی...... تمہاری یہ جوانی، حسن و شباب، سب غارت ہو کر رہ جائے گا۔ تم نہ صرف بوڑھی بلکہ اتنی بدصورت ہو جاؤ گی کہ تمہارے کسی ملنے اور جاننے والے کو یقین نہیں آئے گا۔ اور پھر کوئی مرد تمہاری طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرے گا۔ اور دوسری سزا جو ہے وہ یہ کہ تم نے اپنے گھر میں اپنی کالی آمدنی رکھی ہوئی ہے وہ ایک کروڑ دس لاکھ کی ہے وہ ردی بن جائے گی۔ سونے کے جو زیورات ہیں وہ نقلی ہو جائیں گے۔ انہیں کوئی ایک ہزار روپے میں بھی خریدنا پسند نہیں کرے گا۔ تمہارے جو قیمتی ملبوسات ہیں وہ ایک دم سے معمولی اور عام قسم کے ہو جائیں گے۔ تمہیں کبھی بھی قیمتی اور بھڑکیلے ملبوسات پہننے نصیب نہیں ہوں گے۔ تم کو اپنی گزر اوقات کے لیے دوسروں کے گھروں میں نوکرانی کا کام کرنا ہوگا اور مرتے دم تک کرتی رہو گی۔ تمہیں فلیٹ میں رہنا نصیب نہیں ہوگا۔ ایک بوسیدہ سی جھونپڑی میں رہو گی۔ تین دن کے بعد تمہارے فلیٹ کا مالک تم سے فلیٹ خالی کروالے گا۔ کیونکہ تم کرایہ ادا کرنے کے قابل نہیں رہو گی۔ بینک میں تمہارے ایک کروڑ ستر لاکھ جمع ہیں۔ تم نے جتنی دولت کمائی وہ صرف ماڈلنگ سے نہیں بلکہ کالی راتوں اور منشیات ہائی سوسائٹی میں فروخت کر کے...... بینک میں جمع شدہ تمہاری رقم محکمہ انکم ٹیکس ضبط کر لے گا۔ کیونکہ تم نے گزشتہ چار برسوں سے ٹیکس ادا نہیں کیا۔"

"لگتا ہے کہ تم پاگل ہو گئے ہو......؟" برانیم قہقہہ مار کر ہنسا۔ "تم شعبدہ باز ہو۔ اپنی شعبدہ بازی رہنے دو۔"

"اب تم اپنے بارے میں سن لو۔" میں نے کہا۔ "تین دن کے بعد تم سرکاری مہمان بن جاؤ گے...... پولیس تم کو آبروریزی، اغواء، منشیات فروشی اور منشیات اسمگلنگ کے الزام میں گرفتار کرلے گی۔ چونکہ تمہارے خلاف اب تک کوئی ثبوت نہیں تھا اس لیے پولیس تم پر ہاتھ نہیں ڈال سکی۔ لیکن تمہاری پتنی جو اجے کی محبوبہ ہے اس نے تمہارے خلاف پولیس کو ثبوت فراہم کردیئے ہیں۔ کیونکہ تم نے اپنی پتنی کو ایک روز کسی بات پر دھنک کر رکھ دیا تھا۔ وہ تمہارے جیل جانے کے بعد اجے سے شادی کرلے گی۔ حکومت تمہاری

ساری املاک اور بینک میں جو رقم موجود ہے ضبط کرلے گی۔ تمہیں عدالت سے اپنے جرائم کی پاداش میں لمبی سزا ہوجائے گی۔ تم نے لوگوں کو ستا کر، بے وقوف بنا کر اور انہیں لوٹ کر بہت عیش کیے۔ اور پھر معصوم لڑکیوں اور شادی شدہ عورتوں کو بلیک میل کر کے ان کی زندگی اجیرن کر دی۔ ان کی بددعائیں رنگ لائی ہیں۔ اب تمہاری زندگی جیل میں گزرے گی اور اسی میں سڑتے رہو گے۔ تم تینوں کامنی اور اس کی دولت کو بھول جاؤ۔ تم میں سے کوئی بھی اس کا بال تک بیکا نہیں کر سکتا اس لیے بھی کہ تم تینوں کسی قابل نہیں رہے۔

راجیش! اب تم اپنی سزا کے بارے میں بھی سن لو۔ تمہاری سب سے بڑی سزا یہ ہے کہ اب تم حرام کی نہیں کھا سکو گے۔ محنت مزدوری کر کے پیٹ پال سکتے ہو۔ تم ابھی اور اسی وقت سے نوسر باز نہیں رہے۔ زیر زمین اور جرائم کی دنیا میں نوسر بازی ایک فن ہے۔ حقیقت میں بھی یہ ایک فن ہے تم نے بارہ برسوں کی کوشش سے یہ فن سیکھا اور اپنے قیمتی بارہ برس ضائع کر دیئے۔ وہ مٹی میں مل گئے۔ میں نے تمہیں اس فن سے محروم کر دیا ہے۔ تم پچاس برس بھی جھک مارلو تو یہ فن سیکھ نہیں سکتے۔ اب تم کبھی بھی نوسر بازی نہ کر سکو گے اور نہ ہی اسے ذریعہ معاش بنا سکو گے۔ یہ سب کچھ بھول جاؤ۔ تم نے جو کچھ کما کر رکھا ہے اسے بھی بھول جاؤ۔ کیونکہ تم گھر جاؤ گے تو وہ مال چوری ہو چکا ہوگا۔"

میں نے اپنی بات ختم کر کے بریف کیس اٹھایا وہ تینوں بری طرح چونکے اور بیک وقت زور زور سے چلانے لگے۔ "اسے پکڑو...... جانے مت دو...... یہ سارا مال ہڑپ کر کے جا رہا ہے۔ وہ یہ مال کامنی کو نہیں دے گا۔ اکیلا ہضم کر لے گا۔"

مالا دوڑ کر باورچی خانے سے سبزی ترکاری کاٹنے کی چھری اٹھا لائی۔ برانیم اپنے کمرے سے ریوالور لے آیا اور راجیش نے کرسی اٹھالی۔ وہ تینوں مجھ پر حملہ آور ہونے کے لیے آگے بڑھے۔ لیکن وہ اپنا ایک قدم بھی نہ بڑھا سکے کیونکہ یکا یک فرش سے ایک گاڑھا سیاہ دھواں اٹھا اور چھت تک چلا گیا۔ انہیں کچھ نظر نہیں آیا۔ وہ کھانسنے لگے۔ دھواں تھا کہ ان کے منہ، ناک اور آنکھوں میں گھستا چلا گیا۔

میں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر دوسرے ہی لمحے ان کے سامنے سے غائب ہو گیا اور غائبی حالت میں کامنی کے بیڈروم میں آ گیا۔ کامنی گہری نیند میں غرق تھی۔ اس کے حسین چہرے پر کرب، اذیت اور تفکرات کی گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ وہ اس وقت ایک بہت ہی ڈراؤنا سا خواب دیکھ رہی تھی۔ جس میں مستقبل اور اندیشے کے زہریلے ناگ ڈس رہے تھے۔ اسے کہیں پناہ دکھائی نہ دے رہی تھی۔ وہ غم کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ مالا مار آستین نکلی تھی۔ صرف اس کی وجہ سے اسے یہ دن دیکھنا پڑا تھا۔ مالا نے اسے اپنی غرض کے لیے تباہی و بربادی کے دہانے پر پہنچانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ لیکن اس کا سارا کھیل بگڑ گیا تھا۔ سب کچھ الٹا ہو گیا تھا۔

میں نے بریف کیس اس کے سرہانے والی میز پر رکھ دیا۔ پھر اس میں سے گھر کی فائل اور اسٹامپ پیپرز نکال کر بریف کیس کے ساتھ رکھ دیئے...... تاکہ جب وہ بیدار ہو گی تو اپنا سارا غم بھول جائے گی اور اسے ایک نئی مسرت ہی نہیں بلکہ ایک نئی زندگی بھی ملے گی۔ میں نے اسے بیدار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

چونکہ میں نے اس کی کھوئی ہوئی منزل پر اسے پہنچا دیا تھا اب میرا کام ختم ہو چکا تھا۔

جب میں اپنے ہوٹل کے کمرے میں پہنچا تو بڑے زور کی نیند آ رہی تھی۔ پھر میں سونے کے لیے بستر پر دراز ہو گیا۔ لیکن بہت دیر تک کامنی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کی مدد کر کے مجھے ایک عجیب سی مسرت ہو رہی تھی۔ شروع شروع میں میرے دوست مجھ سے کہتے تھے کہ تمہیں جادو سیکھنے کا اتنا جنون کیوں ہے؟ تم اسے سیکھ کر کیا کرو گے؟ کیا دولت کے حصول کے لیے؟ میں انہیں بتاتا تھا کہ میں جادو اس لیے سیکھنا چاہتا ہوں کہ اس دنیا میں جدھر دیکھو برائی ہی برائی نظر آتی ہے میں اسے ختم کرنے کی کوشش کروں گا۔ میرے دل کے کسی کونے میں دولت کی خواہش ذرہ برابر بھی نہیں ہے...... اگر میں نے شوتم سے جادو سیکھا نہ ہوتا اور جانتا نہ ہوتا تو کیا میں کامنی کی مدد کر سکتا تھا۔ جو بہت بڑی مصیبت میں پھنس گئی تھی۔ ایک سکندر کی طرح اس کے دشمنوں پر فتح پائی تھی اور میری فتوحات کا سلسلہ جاری تھا اور اسے اس وقت تک جاری رکھنا چاہتا تھا جب تک مجھ میں آخری سانس باقی تھی۔

یہ دنیا اچھی بھی تھی اور بری بھی...... اس دنیا میں...... بدروحیں، راکشش اور بلائیں انسان کے روپ میں بھری ہوئی تھیں جو انسانوں کے خون کی پیاسی تھیں۔ وہ بڑی خوبصورت نظر آتی تھیں۔ مالا بھی ایک حسین چڑیل تھی اور برانیم کسی راکشش سے کم نہ تھا۔ انسان نے نہ جانے کیسے کیسے روپ دھار رکھے تھے۔ کتنے مجبور، بے کس اور لاچار انسان ان کے آگے بے بس تھے اور ان کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اور پھر دنیا خود غرضی سے بھری ہوئی بھی تھی اور پھر انسان کا انسان پر سے بھروسا ختم ہوتا جا رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ انسان کہاں جا رہا ہے......؟

☆......☆......☆

میں سہ پہر تک سوتا رہا۔ شام کے وقت کیسینو دیکھنے چلا گیا۔ کیونکہ اسے ٹھیک سے پورا نہیں دیکھ سکا تھا۔ صرف سرسری انداز سے دو ہی فلور دیکھے تھے۔ ایک اشتیاق اور تجسس لے آیا تھا۔ میں ہوٹل سے نکل کر کیسینو میں پہنچ گیا۔ اس وقت وہاں کی رونق اپنے جوبن پر تھی۔ آج چونکہ ہفتہ کی رات تھی اور کل اتوار کی چھٹی کا دن تھا۔ ہفتہ کی رات لوگ کیسینو آتے تھے اور اتوار کے روز ریس کھیلنے ریس کورس گراؤنڈ جاتے تھے۔ کل بہت بڑی ریس تھی۔ اس لیے شو بزنس کے سارے لوگ موجود تھے۔

سب سے زیادہ رش اس میز پر تھا جس پر نمبر لکھے ہوئے تھے اور پانسہ سے قسمت آزمائی کی جا رہی تھی۔ اس میز کے گرد جو کرسیاں تھیں اس پر مرد اور عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ جنہیں کرسی نہیں ملی تھی وہ کھڑے کھڑے ہی اپنی قسمت آزمائی کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ دوسرے ہال میں بھی ایک ایسی میز تھی لیکن اس میں جو چکر تھا اس میں ایک تیر تھا جو کسی ایک نمبر پر گھوم کر رک جاتا تھا۔ اس میز پر بھی رش تھا لیکن اس پر کچھ ہی رش تھا۔ میں اس میز پر دو عورتوں کے پیچھے جا کھڑا ہوا جو قسمت آزما رہی تھیں۔ ان کے چہروں سے عیاں تھا کہ وہ کافی رقم ہار چکی ہیں۔ کوئی تین مرتبہ قسمت آزمائی کرنے کے بعد ایک عورت جو سفید ساڑی میں تھی اپنی ساتھی عورت سے جو کالی ساڑی میں تھی بولی۔ "ساوتری! ریسٹورنٹ چلتے ہیں درد

سے سر پھٹا جا رہا ہے۔ کافی پیتے ہیں پھر کچھ سوچتے ہیں۔"

اس میز پر جو چکر چل رہا تھا اسے میں نے تاڑ لیا تھا۔ میں اس سے ان عورتوں کو باخبر کرنا چاہتا تھا تاکہ وہ اپنی ساری پونجی نہ ہار جائیں۔ جب وہ ریسٹورنٹ کی ایک میز پر جا بیٹھیں تو میں بھی ان کے قریب والی میز پر جا بیٹھا۔ میں نے بھی اسی ویٹرس کو کافی کا آرڈر دیا جس کو انہوں نے دیا تھا۔ جب ویٹرس چلی گئی تو ساوتری نے اپنی ساتھی سے کہا۔ "شلپا! یہ تو بہت برا ہوا۔ ایک لاکھ روپے پانی ہو گئے۔"

"تم نے ایک بات نوٹ کی؟" شلپا نے کندھے پر ساڑی کا پلو درست کرتے ہوئے کہا۔ "اتنے سارے لوگوں میں دو لڑکیاں اور دو مرد ہی جیت رہے تھے۔ کبھی ایک مرد جیت جاتا تو کبھی ایک لڑکی...... گھوم پھر کے وہ چاروں باری باری جیت رہے تھے۔"

"نہیں...... میں نے اس بات کو نوٹ نہیں کیا۔" ساوتری بولی۔ "میں تو مسلسل ہارنے اور ایک بار بھی نہ جیتنے سے فکرمند اور پریشان ہو رہی تھی۔"

"اچھا اب یہ بتاؤ کہ اب ایک لاکھ روپے رہ گئے ہیں کیا کریں؟" شلپا نے پوچھا۔ "کھیلیں یا گھر واپس چلیں؟"

"میرا خیال ہے کہ یہ ایک لاکھ روپے کھیل ہی لیں۔" ساوتری نے کہا۔ "دو تین بازیاں بھی جیت گئیں تو دو ایک لاکھ روپے تو مل جائیں گے۔ اتنے میں ویٹرس میری اور ان کی کافی لے آئی۔ میں نے ایک لمحے میں ان دونوں کا تنقیدی نظروں سے جائزہ لیا۔ ساوتری کوئی چالیس برس کی اور شلپا چھتیس سینتیس برس کی ہوگی۔ یہ دونوں خاصی قبول صورت، سنجیدہ اور بردبار اور مہذب لگ رہی تھیں۔ لیکن اپنی وضع قطع سے امیر کبیر دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ متوسط گھرانے کی لگ رہی تھیں ایک لاکھ کی رقم ان کے لیے ہار جانا بڑی تکلیف دہ بات تھی۔ وہ پھر کھیل کر ایک لاکھ سے ہاتھ دھونا چاہتی تھیں۔ پہلے میرے دل میں یہ خیال آیا کہ کہیں وہ دو لاکھ کے دس بارہ لاکھ بنانے تو نہیں آئیں تاکہ اپنی لڑکیوں کی شادی میں شاندار جہیز دے سکیں۔ اس لیے انہوں نے یہ جوا کھیلا تھا اور مزید کھیلنا چاہتی تھیں۔ مجھے ان سے ایسی حماقت کی توقع نہیں تھی۔

میں نے اپنا کافی کا مگ اٹھایا اور ان کی میز پر جا پہنچا۔ "آپ کچھ خیال نہ کریں تو میں بیٹھ جاؤں؟"

"کیوں نہیں......" ساوتری نے بڑے شائستہ لہجے میں کہا۔ "اس کے لیے اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے۔ دو کرسیاں خالی پڑی ہیں۔"

"شکریہ......" میں نے کہا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ساوتری......" شلپا نے اس کی طرف پوری طرح متوجہ ہو کر کہا۔ "میرا خیال اور مشورہ تو یہ ہے کہ ہم یہ ایک لاکھ کی رقم لے کر گھر چلیں۔ ہم جیت نہ سکیں...... ایک لاکھ بھی گئے تو کتنا دکھ ہوگا...... یہ دو لاکھ دو ہزار آدمی کو زندگی دے سکتے تھے۔ یہ ایک لاکھ بھی کافی ہے۔ اس سے ہزار نہ سہی پانچ سات سو کو تو زندگی مل سکتی ہے۔ تم جو پچاس لاکھ کا خواب دیکھ رہی ہو وہ کبھی پورا نہ ہوگا۔ وہ اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے کہ ہم......" شلپا نے میری موجودگی کا خیال کر کے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"آپ مجھ سے اور میری موجودگی سے بالکل بھی نہ گھبرائیں اور نہ ہی پریشان ہوں۔" میں نے کہا۔ "اپنی بات بلاخوف و خطر پوری کر لیں...... میری ذات سے آپ لوگوں کی ذات کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ کیوں کہ میں ایک عام سا سیاح ہوں اور یہاں سیر و سیاحت اور تفریح کی غرض سے آیا ہوں...... مجھے افسوس ہے کہ میں بڑے غلط موقع پر آپ کی میز پر آ گیا......"

شلپا اور ساوتری نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ شلپا ذرا تیز لہجے میں بولی۔ "یہ ہماری نجی گفتگو ہے۔ آپ مشورہ کیوں دے رہے ہیں؟"

"دراصل میں آپ کی باتوں کی تہہ میں پہنچ گیا ہوں۔ اس لئے میں نے یہ بات کہی ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ لوگوں کی گفتگو سن کر آیا ہوں تاکہ......"

"دیکھئے مسٹر!......" ساوتری الجھ کر بولی۔ "یہ آپ کو زیب نہیں دیتا ہے کہ ہماری نجی گفتگو اور معاملات میں دخل دیں۔ جبکہ آپ سیاح اور اجنبی بھی ہیں۔ آپ کو ہماری باتوں سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہئے۔ ہمیں آپ سے کسی مشورے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"میرے مشورے کی اس لئے بھی سخت ضرورت ہے مس شلپا کہ آپ رقم کے حصول کے لئے منفی انداز سے سوچ رہی ہیں؟" میں نے اطمینان سے کہا۔

"کیا کہا آپ نے......؟" شلپا اچھل پڑی۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "آپ میرے نام سے واقف ہیں...... میری سوچ کو منفی بھی......"

"میں آپ کے عقب والی میز پر بیٹھا ہوا آپ کی گفتگو سن رہا تھا جس میں آپ دونوں نے ایک دوسرے کو ناموں سے مخاطب کیا تھا۔" میں نے کہا۔

"لیکن آپ میری سوچ کو منفی سوچ کس بنا پر کہہ رہے ہیں......؟" شلپا نے اپنی پلکیں جھپکائیں۔ "آپ نے یہ اندازہ کیسے کیا......؟"

"آپ دونوں جب کھیل رہی تھیں تب میں آپ دونوں کے پیچھے ہی کھڑا ہوا تھا اور آپ دونوں کو بھی کھیلتا ہوا دیکھ رہا تھا۔" میں نے اثباتی انداز میں سر ہلا کر جواب دیا۔ "اور مشین میں کھیل کر آپ دونوں مسلسل ہارتی رہی تھیں۔ ایک لاکھ روپے ہار گئیں اور اب ایک لاکھ کی رقم بچی ہے۔ آپ دونوں کافی پینے اور یہ فیصلہ کرنے یہاں آئیں کہ...... ایک لاکھ کی رقم جو بچی ہے اسے بھی کھیل دیں یا واپس چلی جائیں۔ کیوں کہ قسمت کی دیوی مہربان نہیں ہو رہی ہے۔ مس ساوتری یہ چاہتی ہیں کہ واپس چلا جائے۔ اس ایک لاکھ کی رقم کو داؤ پر لگانے سے بہتر ہے کہ اس سے انسانیت کو فائدہ پہنچایا جائے...... جبکہ آپ دو لاکھ سے پچاس لاکھ بنانے آئی تھیں۔ اب صورت حال ایسی ہو رہی ہے کہ وہ روپے بچا کر لے جا نہیں سکتی ہیں۔ چوں کہ لاکھوں کی رقم کی سخت ضرورت ہے اس لئے مس شلپا چاہتی ہیں کہ کسی اور ترکیب سے یہ رقم حاصل کی جائے۔ ظاہر ہے یہ ترکیب غلط، ناجائز اور غیر قانونی ہی ہوگی۔"

"جی ہاں......" شلپا نے اثبات میں سر ہلا کر بڑی سچائی سے اعتراف کیا۔ "آپ کا قیاس درست

ہے۔ میں اس بات سے انکار نہیں کروں گی۔"

"لیکن یہ بتائیں کہ آپ لوگوں کو پچاس لاکھ کی رقم کی ضرورت کس لئے ہے؟" میں نے سوال کیا۔ "کیا ساری دنیا کی سیروسیاحت کے لئے......؟"

"جی نہیں...... آپ غلط سمجھے۔" ساوتری نے نفی کے انداز میں سر ہلایا۔ "میں اور شلپا ڈاکٹر ہیں۔ ہم دونوں نے مل کر ایک ذاتی پلاٹ پر جو شلپا کا ہے اور وہ تقریباً تین ہزار گز کا ہے اس پر ایک اسپتال بنایا ہے۔ میرے اور شلپا کے پتاجی نے ہماری شادی کے لئے سات لاکھ کی رقم رکھی تھی وہ ہم نے اسپتال کی تعمیر پر لگا دی جبکہ ہم اس اسپتال کو ایک میڈیکل کمپلیکس بنانا چاہتے ہیں۔"

"آپ دونوں نے شادی کر کے گھر بسانے کے بجائے اسپتال کیوں بنایا۔" میں نے کہا۔ "تین ہزار گز کا پلاٹ شاید ایک کروڑ میں بک جاتا؟"

"اس لئے کہ انسانیت کی خدمت کی جائے۔" شلپا نے جواب دیا۔ "شادی کا کیا ہے۔ آج نہیں پانچ برس بعد بھی ہو جائے گی۔"

"انسانیت کی خدمت تو آپ کسی بھی اسپتال میں ملازمت کر کے کر سکتی ہیں؟" میں نے کہا۔ "اس کے لئے کیا اپنا اسپتال ہونا ضروری ہے۔"

"ہم نے ہاؤس جاب کرتے ہوئے یہی سوچا تھا۔" ساوتری کہنے لگی۔ "لیکن روز بہ روز سرکاری اسپتالوں کا نظام اور ماحول بہت خراب ہوتا جا رہا ہے۔ مریضوں کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ دوائیاں بھی ایسی دی جاتی ہیں جو ایک طرح سے ناقص اور غیر معیاری ہوتی ہیں۔ بہت سی اچھی اور جان بچانے والی ادویات چوری ہو جاتی ہیں یا انہیں بڑے ڈاکٹرز جن کی اپنی ڈسپنسریاں اور کلینک ہیں۔ وہ ہضم کر کے لے جاتے ہیں۔ انہیں دکان داروں کو اونے پونے فروخت کر دیا جاتا ہے۔ کس کس بات کا رونا رویا جائے۔ ڈاکٹرز بھی ناتجربہ کار اور جونیئرز زیادہ ہیں۔ مریض ان کے تجربے کا نشانہ بنتے ہیں۔ تربیت یافتہ نرسیں صرف ان مریضوں کی خدمت کرتی ہیں جو ان کی مٹھی گرم کرتے ہیں۔ بڑے ڈاکٹروں کا بھی یہی حال ہے۔ نرسیں مریضوں کے بجائے ڈاکٹروں کی سیوا کرتی ہیں اور انہیں خوش کرنے میں لگی رہتی ہیں تاکہ ان کی ترقی ہو جائے۔ اسپتال گندے تالاب بن کر رہ گئے ہیں جو بڑی افسوسناک بات ہے۔"

ساوتری سانس لینے کو رکی تو شلپا نے بات کو مزید آگے بڑھایا۔ "پرائیویٹ اسپتالوں اور کلینک کی کوئی کمی نہیں ہے لیکن یہ سب کمرشل بن چکے ہیں۔ مریضوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا جاتا ہے۔ غریب مریضوں کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ آج انسانیت بڑی دکھی ہے۔ اس لئے ہم مریضوں کے مفت علاج کے لئے ایک بہت بڑا اسپتال بنانا چاہتی ہیں۔ اس کے لئے ہمیں پچاس لاکھ کی سخت ضرورت ہے۔ جس میں سے پچیس لاکھ کی رقم سے اس اسپتال کو اور وسعت دیں گے اور ساز و سامان اور ادویات کی خریداری کریں گے۔ باقی پچیس لاکھ سے آپریشن تھیٹر، لیبارٹری اور ایکسرے اور ایمبولینس کا انتظام کریں گے۔ ہم مریضوں سے برائے نام رقم چارج کریں گے۔ اس میں اس وقت ایک زچہ خانہ ہے جس میں صرف چھ بستر ہیں۔ صرف دو

نرسیں ہیں۔ لیبر روم ہے۔ لیکن میجر آپریشن کے لئے ہم انہیں ایک اسپتال بھیج دیتے ہیں...... اس لئے ہمیں پچاس لاکھ روپے چاہئیں۔ میں اس کے حصول کے لئے ڈاکہ کے لئے بھی تیار ہوں......" وہ جذباتی ہو گئی۔

"کیا آپ نے اس اسپتال کے سلسلے میں مخیر حضرات اور عام لوگوں سے کوئی اپیل وغیرہ نہیں کی؟" میں نے شلپا سے پوچھا۔

"اس میں ہمیں کوئی خاص کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ چند ایک نے صرف بیس ہزار روپے دیئے...... صرف تین افراد نے جو کروڑ پتی ہیں۔" اتفاق سے وہ تینوں بھی جوا کھیلنے اس کیسینو میں آئے ہوئے ہیں اور ہر ہفتہ آتے ہیں۔" ساوتری بولی۔

"آپ دونوں زیادہ پریشان اور فکر مند نہ ہوں۔" میں نے انہیں دلاسا دیا۔ "آپ ایک لاکھ سے ایک کروڑ بنا سکتی ہیں۔"

"ایک کروڑ......؟" بیک وقت شلپا اور ساوتری نے کہا۔ ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "وہ کیسے......؟" شلپا نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ سب مت پوچھیں......" میں نے کہا۔ "آپ دونوں کھیلیں گی، پچاس، پچاس ہزار روپے لے کر...... لیکن میری ایک شرط ہے۔"

"ہم آپ کی ہر شرط پوری کرنے کے لئے تیار ہیں بشرطیکہ آپ ہمیں ایک کروڑ جتا دیں گے تو......؟" ساوتری بولی۔

"آپ کی یہ شرط نامناسب اور ناقابل عمل تو نہیں ہو گی......؟" شلپا نے مشکوک ہو کر پوچھا۔ اس کا حسین چہرہ بجھ سا گیا۔

"آپ کے خیال میں میری کیا شرط ہو سکتی ہے......؟" میں نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ ان کی نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

"آپ شاید یہ چاہتے ہیں کہ...... ہم دونوں باری باری آپ کو خوش کر دیں۔" شلپا بولی۔ "مہربان ہو جائیں اور ہر بات مانیں۔"

"میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں اور نہ ہی میری ایسی کوئی شرط ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ کو میں ایک کروڑ دس لاکھ کی رقم جتوا دوں گا۔ وہ کیسے، کس طرح یہ میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔ دس لاکھ کی رقم میری ہو گی۔ اسے آپ کمیشن سمجھ لیں۔ اسے آپ بلا چون و چرا دیں گی۔ آپ انکار نہیں کریں گی...... اگر آپ کی نیت میں فتور پیدا ہوا تو پھر آپ ساری رقم سے ہاتھ دھو بیٹھیں گی۔ یہ شرط منظور ہے......؟"

"بالکل منظور ہے......" شلپا پر جوش لہجے میں بولی۔ اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ حسین آنکھوں میں دیئے جل اٹھے۔ اس وقت ویٹرس برتن لینے آئی تو میں نے اسے مزید تین کپ کریم کافی کا آرڈر دیا۔ وہ چلی گئی تو میں نے ان سے کہا۔

"آپ دونوں باری باری رقم لگائیں گی...... جب شلپا رقم لگائے گی ساوتری نہیں لگائے گی۔ جب

ساوتری لگائے گی تب شلپا نے اپنا ہاتھ روک لینا ہے۔ صرف آپ دونوں ہی باری باری مسلسل جیتتی رہیں گی۔ صرف دوایک مرتبہ ہاریں گی۔''

میں نے دونوں کو بڑی وضاحت سے سمجھا دیا۔ ان کی سمجھ میں آ گیا۔ ہم دونوں کافی پی کر اٹھے۔ ایک لاکھ میں سے پچاس، پچاس ہزار کے کوئینز دونوں نے آپ ہی آپ گن کر رکھ لئے تھے۔ ایرو گیم کی میز پر پہنچے۔ شلپا نے ان تینوں کی طرف اشارہ کیا جو کروڑ پتی تھے جنہوں نے بیس ہزار کی رقم اسپتال کے لئے دی تھی وہ لڑکیاں اور مرد بھی تھے جو باری باری جیت رہے تھے۔ باقی دوسرے سب ہار رہے تھے۔

میں نے میز کے قریب ایک طرف کھڑے ہو کر شلپا کو اشارہ کیا کہ وہ تیرہ نمبر پر کوئینز رکھے۔ اس نمبر پر کسی نے بازی نہیں لگائی تھی۔ گیم کھلانے والے نے بٹن دبایا تیر (ایرو) زور سے گھوما۔ پھر رفتہ رفتہ اس کی رفتار میں کمی آتی گئی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ سولہ نمبر پر رکے گا۔ لیکن وہ تیرہ نمبر پر آ کر رکا تو ان لڑکیوں اور مردوں اور گیم کھلانے والے کو یقین نہیں آیا۔ ان کے چہروں سے حیرت صاف عیاں تھی۔ کوئی بھی ان کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ ساوتری نے اکیس نمبر پر کوئینز رکھے۔ وہ تیر سولہ پر رکتے رکتے اکیس نمبر پر آ کر رکا...... اس طرح یہ کھیل دو گھنٹے جاری رہا۔ ساوتری اور شلپا کی قسمت نے صرف ایک مرتبہ ساتھ نہیں دیا۔ وہ مرد اور لڑکیاں جو مسلسل جیت رہی تھیں۔ اب وہ ہار چکی تھیں۔ جب کوئینز دے کر رقم کیش کرائی گئی تو وہ ایک کروڑ سولہ لاکھ تھی۔ اس کیسینو کا مالک رمیش پٹیل بھی آ گیا تھا۔ وہ ہم تینوں کو آنکھیں پھاڑ کر کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔ اسے ہماری جیت کا یقین نہیں آ رہا تھا۔

میں نے صرف دس لاکھ کی رقم لے کر اسے ڈالرز میں تبدیل کروالیا۔ ساوتری نے بھی ایسا ہی کیا۔ انہوں نے بھی میری پیروی کی۔ رقم ان دونوں نے اپنے تھیلے نما چرمی پرس میں رکھ لی۔ جس وقت ہم تینوں جیت کی خوشی میں کافی پی رہے تھے۔ رمیش پٹیل ہماری میز پر آ گیا۔

''آج تک کوئی بھی اتنی بڑی رقم جیت کر اس کیسینو سے نہیں گیا۔'' رمیش پٹیل نے کہا۔ ''تم دونوں کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔''

''لیکن تمہیں بڑا دکھ اور افسوس ہو رہا ہو گا ان کے جیتنے پر......'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اور تم دل میں حیران اور پریشان بھی ہو۔''

''مجھے بھلا کیوں دکھ اور افسوس ہونے لگا۔'' اس نے چونک کر میری شکل دیکھی۔ ''جیتی ہوئی رقم کون سی میرے باپ کی تھی۔''

''اس میں سے اسی لاکھ کی رقم تمہاری تھی جو تمہارے آدمی لے کر میز پر بیٹھے تھے۔'' میں نے کہا۔ ''تم نے کوئی ایسے تیس آدمی جن میں پندرہ لڑکیاں اور پندرہ مرد ہیں پال رکھے ہیں جو بدل بدل کر اس میز پر آ کر کھیلنے والوں کو لوٹتے ہیں اور ان کے سوا کوئی جیت نہیں پاتا ہے۔''

وہ ایک لمحے کے لئے بھونچکا سا ہو گیا اور اس پر اس طرح سکتہ چھا گیا جیسے اس پر کوئی بجلی سی آ گری ہو۔ لیکن اس نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ وہ ایک نمبری کائیاں اور ایک جرائم پیشہ شخص تھا۔ وہ

لاکھوں روپے یہاں آ کر کھیلنے والوں سے یومیہ کسی نہ کسی طریقے سے، بہانے سے ہر کھیل میں کماتا تھا۔ اس کے فراڈ، چال بازی اور شاطرانہ حرکتوں سے کوئی واقف نہ تھا۔ وہ ایک ارب پتی تھا۔ اس کی ساری دولت اس کیسینو میں تجوریوں میں محفوظ تھی۔ یہاں سے جو لوگ جیت کر جاتے تھے واجبی سی رقم ہوتی تھی۔

''مسٹر!'' وہ بگڑ کر برہمی سے بولا۔ ''تم غلط بیانی سے کام لے رہے ہو...... مجھ پر بہتان لگا رہے ہو۔ تمہارے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ وہ میرے آدمی ہوتے ہیں جو جیتتے ہیں اور کسی کو جیتنے نہیں دیتے ہیں۔ تمہیں میری ہتک کرتے وقت یہ سوچنا چاہئے تھا کہ میں کون ہوں۔ میں ایک مہذب اور باعزت شخص ہوں۔''

''اگر میں تمہارے فراڈ اور چال بازی کا ٹھوس ثبوت پیش کر دوں تو کیا اس بات کو سچائی سے تسلیم کرو گے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''میں کسی پر جھوٹے اور بے سروپا الزامات عائد نہیں کرتا۔ میں یہ بات بڑے وثوق سے کہہ رہا ہوں۔''

''کیوں نہیں...... کیوں نہیں......'' اس نے نفی کے انداز میں سر ہلایا۔ ''لیکن یہ بات یاد رکھو کہ مجھے تم بلیک میل نہیں کر سکتے ہو۔''

''مجھے کیا ضرورت پڑی کہ میں تمہیں بلیک میل کروں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن میری ایک شرط ہے۔ اگر میں نے تمہارے خلاف ثبوت پیش کر دیا تو مجھے تین کروڑ روپے دو گے...... میں ناکام ہونے کی صورت میں تمہیں ایک کروڑ دوں گا۔''

''منظور ہے۔'' وہ ایک دم سے خوش ہو کر بولا اور اس نے گرم جوشی سے ہاتھ ہلایا۔ ''میں دو نہیں بلکہ تین کروڑ روپے دوں گا۔''

''آخر تم چاہتے کیا ہو......؟'' وہ ایک دم سے نرم پڑ کر بولا۔ کیوں کہ میں اسے جو آئینہ دکھا رہا تھا۔ وہ اندر ہی اندر گھبرا سا گیا تھا۔

پھر میرے کہنے پر اس نے جھنجھلا کر ایک ویٹرس سے قلم اور کاغذ منگوایا اور ہم نے انہیں شرط کی تحریری شکل میں لا کر اس کا تبادلہ کر لیا۔ رمیش پٹیل اٹھا اور اس ہال کی طرف بڑھا۔ میں، ساوتری اور شلپا اس کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔ شلپا بولی۔ ''سکندر صاحب! یہ آپ نے کیا کیا...... اس کے ساتھ اتنی بڑی شرط لگا لی......؟ اگر آپ شرط ہار گئے تو پھر اتنی بڑی رقم سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔''

''یہ شرط میں نے آپ لوگوں کے فائدے کے لئے لگائی ہے......'' میں نے کہا۔ ''کیا تین کروڑ کی رقم جو مفت میں ہاتھ لگ رہی ہے وہ بری ہے؟ بلکہ میری تو یہ کوشش ہے کہ آپ لوگوں کو دس پانچ کروڑ مل جائیں۔ کیوں کہ آپ نے بیڑا اٹھایا ہے دکھی انسانیت کی خدمت کے لئے...... کیوں کہ خیراتی اسپتال چلانا کوئی کھیل نہیں...... آپ نے یہ بھی تو سوچا کہ اس کے اخراجات کیسے اور کہاں سے پورے ہوں گے۔ جبکہ آپ کی پشت پر کوئی سرمایہ دار اور بڑا آدمی نہیں ہے۔ مفت کا علاج کرنے کے لئے یومیہ ہزاروں روپے درکار ہوں گے۔''

”میرے اور شلپا کے بھائی امریکہ اور کینیڈا میں مقیم ہیں۔“ ساوتری بولی۔ ”وہ دونوں ڈاکٹر ہیں اور ہم دونوں کے منگیتر بھی ہیں...... ہر ماہ بیس، بیس ہزار بھیجا کریں گے۔ اس کے علاوہ ذہن میں کچھ ایسے منصوبے بھی ہیں۔ جس سے مفت علاج کا مسئلہ نہیں ہوگا۔“

ہم تینوں ہال میں داخل ہو چکے تھے۔ وہ خالی پڑا ہوا تھا۔ رمیش پٹیل ٹیبل کے پاس رک گیا۔ اس نے میری طرف گھوم کر دیکھا۔ ”اچھا اب تم بتاؤ کہ میں نے ایسا کون سا نظام قائم کر رکھا ہے جس سے میں کھیلنے والوں سے فراڈ کرتا اور انہیں ہرا دیتا ہوں؟“

”اس میز کے اوپر جو یہ فانوس لگا ہوا ہے اس میں آنکھ کے سائز کے خفیہ کیمرے نصب ہیں۔“ میں نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”کل بارہ کیمرے ہیں۔ یہ کنٹرول روم میں ٹی وی اسکرین پر اس کھیل کو بہت صاف اور واضح طور پر دکھاتے ہیں کہ کس شخص نے کس نمبر پر کوئنیز رکھا ہے اور تمہارے آدمیوں نے کس نمبر پر...... تیر چلانے پر جو شخص مامور ہے وہ بٹن دبا دیتا ہے جس سے ایرو یعنی تیر حرکت میں آجاتا ہے۔ کنٹرول روم میں ایک شخص جس کا نام گنیش ہے وہ اپنے ہاتھ میں ریموٹ کنٹرول لیے بیٹھا رہتا ہے۔ وہ ریموٹ سے اس تیر کو کنٹرول کرتا ہے۔ جس نمبر پر چاہے وہ تیر کو روک سکتا ہے۔ اس سے صرف تمہارے آدمی جیتتے ہیں؟ کیا یہ غلط ہے؟“

ایک لمحے کے لئے رمیش پٹیل کا چہرہ سفید پڑتا چلا گیا۔ اس کی پیشانی عرق آلود ہوگئی۔ اس نے خود کو فوراً ہی سنبھال لیا۔ پھر وہ کرخت لہجے میں بولا تو اس کی آواز ویران اور کھوکھلی تھی اور دور سے آتی سنائی دے رہی تھی۔ ”تم...... بکواس کر رہے ہو...... ایسا ہو نہیں سکتا۔ یہ کوئی ثبوت نہیں ہے...... کوئی کنٹرول روم نہیں ہے۔ کوئی خفیہ کیمرے نہیں ہیں۔ یہ تمہارے ذہن کی اختراع ہے...... مجھے بچہ سمجھتے ہو...... جو میں تمہاری باتوں میں آ کر بے وقوف بن جاؤں گا۔“

”میں بکواس نہیں کر رہا ہوں۔“ میں نے تیز لہجے میں کہا اور اسے گھورا۔ ”رمیش پٹیل!...... تم اب اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ میں تمہیں ٹھوس ثبوت پیش کر چکا ہوں۔ ایک ایسا ٹھوس ثبوت جسے تم کسی صورت میں جھٹلا نہیں سکتے ہو...... اور تم شرط ہار چکے ہو...... اب تمہیں مزید ثبوت کیا چاہئے۔ لہٰذا اب تم ایک بے ایمان کی طرح جھوٹ سے کام نہ لو۔ شرافت سے اور معاہدے کی رو سے تم تین کروڑ کی رقم ابھی ا ور اسی وقت میرے حوالے کر دو۔ اس کی ادائیگی کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔“

”یہاں نہ تو کیمرے نصب ہیں اور نہ ہی اس عمارت میں کوئی کنٹرول روم موجود ہے۔“ اس نے جیب سے رومال نکال کر چہرے اور پیشانی سے پسینہ پونچھا۔ یہ کمرہ ایئر کنڈیشنڈ تھا۔ اس میں بڑی خنکی بھی تھی۔ ”اگر ہم کنٹرول روم سے اس کھیل کو کنٹرول کرتے ہیں۔ جیسا کہ تمہارا خیال اور الزام ہے تو اس صورت میں تم لوگ اتنی بڑی رقم کیسے جیت سکتے تھے؟ تم لوگ کھیلنے کے لئے جتنی رقم لے کر بیٹھے تھے اس سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے۔“

”میں ایک اور ثبوت پیش کر دوں۔“ میں نے کہا۔ ”ہم نے یہ رقم کس طرح اور کیسے جیتی یہ تمہیں

بتاؤں گا نہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے رقم جیتتے ہی تمہارے کنٹرول روم میں ایک کھلبلی سی مچ گئی اور تمہیں مطلع کیا گیا تو تم بھاگے بھاگے یہ جاننے کے لئے ہمارے پاس آئے کہ یہ رقم ہم نے کس طرح جیتی۔ یہ ایک ذہانت تھی جس نے ہمیں جتا دیا۔“

میں نے اس کے جواب کا انتظار نہیں کیا۔ اپنی بات پوری کر کے فوراً ہی میز پر چڑھ گیا۔ فانوس میں سے ایک خفیہ کیمرہ نکال کر نیچے اتر آیا۔ پھر میں نے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ رہا ثبوت...... کہو تو گیارہ عدد کیمرے جو نصب ہیں وہ بھی نکال کر پیش کر دوں۔“

رمیش پٹیل کے چہرے پر پسینہ پھوٹ پڑا۔ اس کی حالت اندر سے بڑی غیر ہو رہی تھی اور وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر پسینہ اس میں جذب کرتے ہوئے کہا۔ ”دراصل یہ حفاظتی اقدامات کے طور پر خفیہ کیمرے نصب ہیں۔ کیوں کہ یہاں لکھ پتی اور کروڑ پتی کھیلنے کے لئے آتے ہیں۔ وہ لاکھوں کی رقم اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ ان خفیہ کیمروں کی مدد سے ہم جرائم پیشہ لوگوں کی حرکات و سکنات پر کڑی نظر رکھتے ہیں۔ کیسینو میں کسی بھی شخص کے داخلے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ کسی کی پیشانی پر لکھا نہیں ہوتا ہے کہ وہ کون ہے۔ لیکن یہ بات ہم جانتے ہیں کہ یہاں جرائم پیشہ بھی آتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ان خفیہ کیمروں کی مدد سے ہم کھیل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ میز کے تیر کو کنٹرول کرتے ہیں۔ ریموٹ کنٹرول سے...... یہ تمہارا وہم ہے۔ وہم کا علاج دنیا میں کسی کے پاس نہیں ہے اور نہ ہی میرے پاس ہے۔“

”لیکن آپ تھوڑی دیر پہلے تو ان خفیہ کیمروں کی موجودگی سے صاف انکار کر رہے تھے۔“ شلپا بولی۔ ”اب یہ کیمرے کہاں سے آ گئے ہیں...... آپ کا جھوٹ پکڑا گیا۔ آپ نے دھوکے بازی کا ایک جال بچھا رکھا ہے۔“

”ہم خفیہ کیمروں کی موجودگی کو اس لئے خفیہ رکھتے ہیں اور اسے کسی پر اس لئے ظاہر نہیں کرتے ہیں کہ یہ حفاظتی اقدامات کا ایک حصہ ہے۔“ رمیش پٹیل نے شلپا کو جواب دیا۔ ”یہ رازداری اس لئے برتی جاتی ہے کہ جرائم پیشہ افراد کو بالکل بھی خبر نہ ہو۔“

”میں تمہاری اس بات اور دلیل کو نہیں مانتا ہوں۔“ میں نے تکرار کے انداز میں کہا۔ ”تم سراسر جھوٹ بول رہے ہو۔ غلط بیانی سے کام لے رہے ہو۔ ان خفیہ کیمروں سے کوئی تو کہیں سے نگرانی کرتا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے ایک کنٹرول روم ضروری ہوتا ہے...... تاکہ پل پل کی خبر ہو سکے۔ خفیہ کیمرے صرف اس کمرے میں نہیں ہوں گے۔ اس پوری عمارت میں اس کا جال بچھایا گیا ہوگا۔ کیوں کہ ہر جگہ حفاظتی اقدامات ضروری ہیں۔ اس لئے کہ جرائم پیشہ اور دولت مند بھی آتے ہیں۔ تم یہ کہتے ہو کہ خفیہ کیمرے جرائم پیشہ افراد پر نظر رکھنے کے لئے ہیں تو ہمیں اس کنٹرول روم میں لے چلو اور ہمیں تسلی کرنے دو کہ اس کنٹرول روم سے کھیل پر اثر انداز ہونے کا کام نہیں لیا جاتا ہے۔“

”اچھا......“ اس نے کہا۔ ایک لمحہ کچھ سوچا۔ پھر اس نے جیب سے موبائل فون نکال کر نمبر ڈائل کیا۔

رابطہ ہونے پر اس نے کہا۔ ''گنیش! میں اپنے معزز مہمانوں کو لے کر آ رہا ہوں۔ ان کا خیال ہے کہ ہم نے جو خفیہ کیمرے نصب کر رکھے ہیں اس سے ہم ایرو گیم پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اپنے لوگوں کو میز پر بٹھا کر انہیں جتاتے ہیں۔ ایرو کو ہم کنٹرول روم سے کنٹرول کرتے ہیں۔ ان کی تسلی کر دینا۔''

رمیش پٹیل نے اپنا موبائل فون آف کر کے جیب میں رکھ لیا۔ پھر اس نے ہم لوگوں کی طرف گھوم کر چلنے کا اشارہ کیا۔ پھر وہ ہمیں لے کر لفٹ کی طرف بڑھا۔ اس نے گنیش کو چوکنا اور ہوشیار کر دیا تھا، تاکہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکیں اور اس کا بھانڈا نہ پھوڑ سکیں۔ ہم نے جو شرط لگائی ہے وہ ہار جائیں۔ وہ بڑا خبیث ہی نہیں لالچی بھی تھا۔ دولت کی ہوس میں وہ اندھا ہو چکا تھا۔ وہ اس بات کی کوشش کرتا تھا کہ یہاں جو لوگ جوا کھیلنے آتے ہیں ان سے جتنی رقم اینٹھی جا سکتی ہے۔ اینٹھ لی جائے۔ اس کے پاس حیلے بہانوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ اس نے اپنے مہرے ہر جگہ اتار رکھے تھے اور وہ انہیں کمیشن بھی دیتا تھا۔ جو اپنے کمیشن کے چکر میں شکار کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔

رمیش پٹیل ہمیں ساتھ لے کر چوتھی منزل پر پہنچا۔ اس منزل پر کل دس کمرے بنے ہوئے تھے۔ ان میں سات بیڈ روم تھے جو نہایت آراستہ و پیراستہ تھے۔ یہ بیڈ روم ان لوگوں کے لئے تھے جو وقت گزاری کرنا چاہتے تھے۔ انہیں ہر قسم کی سہولت مہیا کی جاتی تھی۔

اس راہ داری میں جو آخری کمرہ تھا وہ کنٹرول روم تھا۔ وہ کمرہ ہال نما تھا۔ یہاں جو کمرے تھے ان میں سب سے بڑا تھا۔ کنٹرول روم کے دروازے پر کوئی تختی لگی ہوئی نہیں تھی۔ صرف ایک سو بیس نمبر لکھا تھا۔ اس دروازے پر...... رمیش پٹیل نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ دوسرے لمحے دروازہ کھل گیا ایک شخص سامنے کھڑا ہوا تھا۔ یہ شخص گنیش تھا۔ اس کی عمر چالیس برس کی ہوگی۔ وہ دراز قد اور گٹھے ہوئے جسم کا تھا۔ چہرے مہرے سے جرائم پیشہ لگتا تھا اور اس کی آنکھیں لال لال سی ہو رہی تھیں۔ چہرے سے خباثت ٹپک رہی تھی۔ اس نے ایک طرف ہٹ کر ہمیں اندر آنے کا راستہ دیا۔ جب ہم کمرے میں داخل ہوئے تو اس نے دروازہ بند کر دیا اور ایک طرف آ کر کھڑا ہو گیا۔

''یس باس! کیا حکم ہے؟'' اس نے رمیش پٹیل سے پوچھا۔ ''ان لوگوں کی کیا خدمت کی جائے؟'' اس کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔

''میں نے تمہیں فون پر بتایا تھا کہ ان لوگوں کو ہم پر شک ہے کہ ہم اس کمرے سے ایرو کو کنٹرول کر کے اپنے آدمیوں کو ایرو لکی گیم میں جتاتے ہیں...... فانوس میں اس مقصد کے لئے خفیہ کیمرے نصب کر رکھے ہیں۔'' رمیش پٹیل کہنے لگا۔ ''میں نے انہیں بتایا کہ اصل بات یہ نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم ان خفیہ کیمروں سے نگرانی کرتے ہیں۔ کیوں کہ یہاں جرائم پیشہ افراد بھی آتے ہیں۔ کہیں وہ دولت مندوں کو لوٹنے کی کوشش نہ کریں۔ لیکن انہیں اس بات کا یقین نہیں آتا۔ ہمارے درمیان ایک شرط بھی لگی ہوئی ہے۔ اگر انہوں نے یہ ثابت کر دیا کہ ہم خفیہ کیمروں سے کھیل پر نظر رکھتے ہیں اور ایرو کو کنٹرول کر کے جتاتے ہیں تو میں انہیں تین کروڑ کی ادائیگی کروں گا۔ یہ شرط ہارنے کی صورت میں ایک

کروڑ کی رقم دیں گے۔''

رمیش پٹیل جب گنیش کو شرط اور ہمارے شک و شبہات کی تفصیلات بتا رہا تھا تب میں نے اس کمرے کا جائزہ لے لیا۔ دس عدد ٹی وی سیٹ رکھے تھے جو کیس ایکس انچ کے تھے۔ ایک چالیس انچ کا ٹی وی سیٹ تھا۔ سارے ٹی وی آن نہیں تھے۔ صرف دو ٹی وی آن تھے۔ بیرونی دروازے اور شراب خانے کا منظر ان پر آ رہا تھا۔ چالیس انچ کا ٹی وی آف تھا۔ میں نے گنیش سے کہا۔

''تم اس ٹی وی کو آن کرو...... ایرو لکی گیم کے کمرے کو اسکرین پر دکھاؤ۔''

گنیش نے میز پر رکھا ہوا ایک ریموٹ اٹھا کر اسے آن کیا۔ پھر ایک نمبر کا بٹن آن کیا تو ایرو لکی گیم کا منظر اسکرین پر دکھائی دینے لگا۔ یہ کمرہ خالی پڑا تھا۔ اس میں کوئی بھی شخص موجود نہ تھا۔ صرف ایک میز دکھائی دے رہی تھی۔ وہ میز کلوز اپ میں نظر آ رہی تھی۔ تیر اور میز پر جو نمبر تھے وہ بہت صاف، واضح اور کلوز اپ میں تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے ہم میز پر بیٹھے ہوئے ہیں۔

''صرف میز اور تیر اور نمبر نظر آ رہے ہیں۔'' گنیش نے کہا۔ ''ہم لوگ صرف کھیل دیکھتے ہیں اور دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ کھیلنے والوں اور کھیل دیکھنے والوں پر نظر رکھتے ہیں۔ کہ کھیل دیکھنے والوں میں سے کوئی جیب کترا تو نہیں ہے۔ مشکوک لوگوں پر نظر رہتی ہے۔''

میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ میز پر ایک لال رنگ کا ریموٹ رکھا ہوا تھا۔ اسے اٹھا کر دبایا تو اس میز کا تیر گھومنے لگا۔ پھر میں نے گنیش اور رمیش کی طرف دیکھا۔ ''اس ریموٹ کی مدد سے تیر کو جس نمبر پر چاہے روکا جا سکتا ہے۔ اب دیکھو میں اسے دس نمبر پر روکتا ہوں۔ یہ دس نمبر پر رک جائے گا۔'' یہ کہہ کر میں نے دس نمبر کا بٹن دبایا۔ تیر تیزی سے تیز رفتاری سے گھوم رہا تھا۔ اس کی رفتار میں کمی آتی گئی۔ پھر وہ چند لمحوں کے بعد دس نمبر پر آ کر رک گیا۔ میں نے ان کی طرف دیکھا۔ ''اب کیا کہتے ہو......؟''

وہ دونوں بھونچکے ہو کر مجھے دیکھ رہے تھے اور ان کے چہرے ایسے زرد پڑ گئے تھے جیسے ان پر کوئی بجلی سی آ گری ہو۔ ادھر ساوتری اور شلپا خوش ہو رہی تھی کہ ہم نے شرط جیت لی۔ میں نے رمیش پٹیل سے کہا۔ ''کہو تو دوبارہ یہ عمل کر کے بتا دوں تاکہ کوئی شک و شبہ نہ رہے۔''

گنیش نے جھپٹ کر میرے ہاتھ سے ریموٹ لے لیا۔ ''یہ تم کیسے جانتے ہو......؟ یہ تمہیں کس نے بتایا؟'' وہ غرایا۔

میں نے اس بات کا جواب نہیں دیا۔ رمیش پٹیل سے کہا۔ ''میں نے ٹھوس ثبوت پیش کر دیا۔ اب تم تین کروڑ کی رقم میرے حوالے کر دو......''

''تم میری بات کا جواب دو۔'' گنیش نے لال لال آنکھوں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا تو اچھا نہ ہوگا۔''

''تم کون ہوتے ہو مجھ سے پوچھنے اور حکم دینے والے......'' میں نے کہا۔ ''معاملہ تمہارے باس کے درمیان ہے......''

"میں...... میں کون ہوں۔" اس نے میرا گریبان جھپٹ کر پکڑ لیا۔ "میں تمہارا باپ ہوں...... تمہیں بتانا پڑے گا...... کیوں کہ یہ بات صرف میں اور میرا باس جانتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی تیسرا آدمی نہیں...... جب یہ دونوں پہلی بار کھیلنے بیٹھی تھیں تو تب تم ان کے ساتھ نہیں تھے اور یہ ایک لاکھ روپے ہار کے اٹھ گئیں۔ تھوڑی دیر بعد آئیں تو تم ان کے ساتھ تھے۔ پھر یہ دونوں مسلسل جیتنے لگیں اور میرا ریموٹ ناکارہ ہوگیا۔ اس نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ تیر مطلوبہ نمبروں پر رکنے نہیں لگا۔ یہ ساری کارستانی تمہاری معلوم ہوتی ہے۔ یقیناً تم نے کچھ کیا تھا؟"

"میں کہتا ہوں میرا گریبان چھوڑ دو۔" میں نے کرخت لہجے میں کہا۔ "میں یہ بدتمیزی پسند نہیں کرتا اور نہ میں تمہارے باپ کا نوکر ہوں جو جواب دوں؟"

میری بات سن کر اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اس نے مجھے مارنے کے لئے اپنا ہاتھ فضا میں بلند کیا۔ قبل اس کے کہ وہ میرے منہ پر مکا رسید کرتا۔ میں نے پوری طاقت سے اس کے جبڑے پر ایک مکا رسید کیا۔ یہ جادوئی مکا تھا جس نے اسے تارے دکھادیئے۔ وہ تیزی سے لڑکھڑاتا ہوا ٹی وی والی میز پر جا گرا۔ اس کا سر بیک وقت دو تین ٹی وی سے جا ٹکرایا۔ اس کا نہ صرف جبڑا ٹوٹ گیا بلکہ دو تین دانت باہر نکل کر فرش پر گر پڑے اور اس کے منہ سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔ وہ فرش پر گر کر کراہنے لگا۔

اس نے حیرت اور خوف سے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ اس کی آنکھیں دہشت سے پھٹ گئیں۔ اسے لگا تھا کہ اس کے منہ پر فولادی مکا رسید ہوا ہے اور ایک عام شخص سے اس مکے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ "رمیش پٹیل!" میں نے اپنا گریبان درست کرتے ہوئے کہا۔ "اب تم سیدھی طرح تین کروڑ کی رقم دے دو۔ تم شرط ہار چکے ہو۔"

رمیش پٹیل نے جواب دینے کے بجائے جیب میں ہاتھ ڈال کر ریوالور نکال لیا۔ پھر اس نے مجھے نشانے کی زد میں لیتے ہوئے کہا۔ "اگر تم تینوں کو اپنی زندگی عزیز ہے تو جیتی ہوئی رقم شرافت سے نکال کر میز پر رکھو اور چلتے پھرتے نظر آؤ۔ اگر تم نے میری بات نہیں مانی تو......" اس نے رک کر دوسری جیب سے سائی لینسر نکال کر ریوالور کی نالی پر نصب کیا۔ پھر وہ سفاک لہجے میں بولا۔ "میں تم تینوں کو شوٹ کردوں گا۔ تم تینوں کی لاشیں دنیا والوں کو رشتہ داروں کو دیکھنے کو بھی نہیں ملیں گی۔ ان کا بھی پتا نہیں چلے گا۔"

"تم بڑے کمینے اور ذلیل آدمی ہو......؟" شلپا سے رہا نہ گیا۔ وہ بول پڑی۔ "تم تین کروڑ کی رقم دینا نہیں چاہتے نہ دو...... لیکن ہماری جیتی ہوئی رقم تو لے جانے دو...... اس رقم پر ہمارا حق ہے۔ یہ ہم نے اپنی قسمت سے جیتی ہے۔"

"نہ صرف جیتی ہوئی رقم بلکہ تم لوگ جو دو لاکھ کی رقم کھیلنے کے لئے لائی تھیں وہ بھی چھوڑ کر قلاشوں کی طرح جاؤ۔" رمیش پٹیل نے ایک قہقہہ لگایا اور پھر بڑے زور سے ہنسا۔

"ہم پر آپ ایسا ظلم نہ کریں۔" ساوتری جو بہت دیر سے خاموش تھی اس نے التجا بھری نظروں سے رمیش پٹیل کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہمیں اپنی اصل رقم لے جانے دیں۔ یہ رقم اسپتال کی ہے۔ ہم اسے لئے

اس یہاں کھیلنے کے لئے لائی تھیں کہ جیتنے کی صورت میں رقم مریضوں پر خرچ ہوگی۔ ہمارا جو اسپتال ہے اس میں مریضوں کا مفت علاج کیا جاتا ہے۔ آپ یہ رقم رکھ لیں گے تو ہزاروں مریض متاثر ہوجائیں گے۔"

"مجھے نہ تو مریضوں سے دلچسپی ہے اور نہ ہی تم دونوں سے...... جب کہ تم دونوں بہت حسین، جوان اور پرکشش بھی ہو۔ دل تو میرا بہت کر رہا ہے کہ تم دونوں کو مہمان بناؤں دو ایک دن کے لئے...... لیکن میں اس جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتا۔ میرے لئے یہ دو لاکھ کی رقم ہی کافی ہے۔"

"میں تم سے بنتی کرتی ہوں کہ یہ رقم نہ لو......"

ساوتری اس کی منت سماجت کرنے لگی۔ "یہ مریضوں کی امانت ہے۔ غریب مریضوں کا......"

"ساوتری......" شلپا نے درمیان میں تیزی سے بات کاٹی۔ "یہ تم کس مردود سے التجا کر رہی ہو؟ یہ انسان نہیں ایک شیطان ہے۔"

"میں تم لوگوں پر دیا کروں اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" رمیش پٹیل کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ شلپا کی بات اسے زہر لگی تھی۔ کیوں کہ اس نے رمیش پٹیل کو مردود اور شیطان کہہ دیا تھا۔ اس کے لہجے میں طیش تھا۔ "تم لوگ اس قابل نہیں ہو کہ کوئی رعایت کی جائے...... تم لوگ مجھے لوٹنے آئے تھے اس لئے اب یہاں سے خالی ہاتھ جاؤ چلو...... جلدی کرو...... ساری رقم نکال کر ٹیبل پر رکھ دو۔"

"نہیں...... میں اس میں سے ایک پیسہ بھی نہیں دوں گی۔" شلپا نے پرس کو سینے سے چمٹا لیا جو رقم سے بھرا ہوا تھا۔ "یہ تمہارے باپ کا مال نہیں ہے۔"

"گنیش!" رمیش پٹیل نے ہذیانی لہجے میں کہا۔ "یہ کبوتری بہت چہک رہی ہے۔ ہے بھی کیا چیز...... تم اس سے پرس چھین لو۔"

گنیش اس دوران سنبھل چکا تھا اور مجھے غضب ناک نظروں سے گھور رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ وہ کس طرح سے مجھ سے بدلہ لے۔ میرے ایک مکے نے اس کا دماغ درست کردیا اور میری اس کے دل پر ایسی ہیبت بٹھادی تھی کہ مجھ پر حملہ کرنے کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی۔ اپنے باس کا حکم سن کر وہ شلپا کی طرف بڑھا۔

"تم ایک طرف ہٹ جاؤ۔" رمیش پٹیل نے تڑختے ہوئے لہجے میں کہا اور ریوالور کی نال کا رخ میری کھوپڑی کی طرف کردیا۔ "سنا نہیں تم نے......؟"

"میں ہٹ جاؤں گا اور ہم ساری رقم تمہارے حوالے کرکے چلے جائیں گے۔" میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔ "تمہیں ہماری رقم بہت مہنگی پڑے گی۔ کیوں کہ اس رقم کے عوض تمہیں اپنی ساری دولت سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ یہ بات تم اچھی طرح سوچ لو۔ میں تم سے مذاق نہیں کر رہا ہوں اسے مذاق مت سمجھنا۔"

"میری دولت......؟" وہ بڑے زور سے ہنسا۔ "کیا تم جانتے ہو کہ میری دولت کتنی ہے؟ وہ کہاں محفوظ ہے......؟ اس عمارت میں کہاں رکھی ہے؟"

"ہاں...... میں جانتا ہوں کہ تمہاری دولت کتنی ہے...... وہ کروڑوں کی ہے۔ نصف سے زیادہ امریکی ڈالر ہیں، باقی ہندوستانی کرنسی کی شکل میں...... وہ تم نے ایک کمرے میں تجوری میں رکھی ہوئی

ہے۔یہ تجوری کوڈ نمبروں سے کھلتی ہے۔اس کمرے میں تمہارے سوا کوئی قدم نہیں رکھ سکتا۔کیوں کہ اس کا فولادی دروازہ ریموٹ سے کھلتا ہے اور اس کمرے کے باہر دو مسلح پہرے دار موجود ہیں۔تم نے حکم دیا ہوا ہے کہ اجنبی کو دیکھتے ہی گولی ماردو۔اس سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں کہ کون ہے؟ ان تمام حفاظتی انتظامات کے باوجود تمہاری رقم تجوری میں سے غائب ہوجائے گی اور تمام انتظامات دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔" میں نے کہا۔" اور یہ تمہارا کیسینو ملبے کے ڈھیر میں بدل جائے گا۔کیوں کہ تم نے جو کچھ کمایا دھوکے بازی، فراڈ اور دل دکھا کر...... حرام کی دولت اور کوئی بھی چیز زیادہ عرصہ تک ساتھ نہیں دیتی ہے۔اب تم اپنے کیے کا خمیازہ بھگتو گے......"

"بہت خوب...... بہت خوب......" رمیش پٹیل زور سے ہنسنے لگا۔" تم بہت دلچسپ باتیں کرتے ہو۔میں نے آج تک کسی سے ایسی دلچسپ اور سنسنی خیز باتیں نہیں سنی ہیں۔رات زیادہ ہوگئی ہے۔مجھے بھی نیند آرہی ہے اور تمہیں بھی آرہی ہوگی۔لہٰذا جلدی سے دفع ہوجاؤ۔"

"کیسینو تمہارے ہی ہاتھوں سے تباہ ہوگا۔" میں نے کہا۔" شلپا! یہ رقم والا بیگ اس کتے کے منہ پردے مارو۔" میں نے گنیش کی طرف اشارہ کیا۔" تم فکر نہ کرو...... اس سے دس، پندرہ گنا زیادہ رقم میں تمہیں دلادوں گا۔ہم خالی ہاتھ گھر نہیں جائیں گے۔"

شلپا نے مجھے بے یقینی کی نظروں سے دیکھا۔اب رقم ان کے حوالے کرنے کے سوا چارہ نہیں تھا۔اس لیے کہ رمیش پٹیل ہاتھ میں ریوالور لیے کھڑا ہوا تھا۔وہ جان سے مارنے کی دھمکی بھی دے چکا تھا اور پھر ہم اس کی عمارت میں موجود تھے۔مسلح پہرے دار منزل پر موجود تھے۔اس نے قدرے تذبذب کے بعد اپنا دستی بیگ جو بڑے پرس کی طرح تھا نفرت، حقارت اور غصے سے رمیش پٹیل کے قدموں میں پھینک دیا۔ساوتری کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔اندر سے اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔شلپا کا لہو اس کی رگوں میں ابلنے لگا تھا۔

ہم تینوں دروازے سے باہر آئے۔میں نے دروازہ بھیڑ کر شلپا کی طرف دیکھا اور مسکرایا۔" آپ نے بڑی جلدی حوصلہ ہار دیا...... مایوس ہو رہی ہیں...... ساوتری! اس میں رونے کی کیا بات ہے؟ کیا رونے سے ہمیں رقم واپس مل جائے گی؟"

"آپ نہیں جانتے کہ اس وقت میرے دل پر کیا بیت رہی ہے؟" شلپا سسک پڑی۔" اگر یہ رقم صرف قسمت آزمائی کے لیے ہوتی تو اس کے ہار جانے اور چلے جانے کا بالکل بھی دکھ نہ ہوتا۔دکھ اس بات سے ہو رہا ہے کہ یہ دو لاکھ کی رقم کھودی۔سینکڑوں مریض علاج معالجے سے محروم ہوجائیں گے۔اس کے ذمے دار ہم ہیں۔ہم یہاں نہ آتیں اور نہ ہی ان حالات سے دوچار ہوتیں۔"

"میں نے کیا کہا تھا......؟" میں نے کہا۔" میں نے کہا تھا نا کہ ہم خالی ہاتھ نہ جائیں گے...... چلیں...... ہم دولت سمیٹ کر لاتے ہیں؟"

"کہاں......؟" ساوتری نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میرا دماغ چل گیا ہو۔" ہم دولت

کہاں سے سمیٹیں گے......؟"

"آپ دونوں میرے ساتھ خاموشی سے اور بلاخوف وخطر چلیں......" میں نے کہا۔" آپ دیکھتی جائیں میں کیا کرتا ہوں...... آپ کو اتنی بڑی رقم ملے گی جو خواب میں بھی نہیں مل سکتی۔یہ محض ایک اتفاق ہے جس نے ایسے حالات پیدا کردیئے کہ قسمت کی دیوی مہربان ہوگئی۔"

ہم تینوں لفٹ سے سب سے اوپر یعنی چھت پر پہنچے۔چھت پر ایک طرف دو بڑے بڑے کمرے بنے ہوئے تھے۔ایک چبوترے پر دو مسلح پہرہ دار بیٹھے بیٹھے سو گئے تھے۔وہ بڑی گہری نیند سو رہے تھے۔ان کی بندوقیں ان کی گود میں رکھی ہوئی تھیں۔ان پہرہ داروں کو دیکھتے ہی ساوتری اور شلپا خوف زدہ ہوکر رک گئیں۔میں نے ان دونوں پہرہ داروں کو بے ہوشی کی نیند سلا دیا تھا۔اگر ان کے جسموں میں خنجر بھی گھونپ دیا جاتا تو وہ بیدار نہ ہوتے۔میں نے ان دونوں کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

ایک کمرے کے آہنی دروازے کے سامنے پہنچ کر اس کا ہینڈل گھمایا تو وہ بغیر کسی ریموٹ کے کھول گیا۔میں پہلے اندر داخل ہوا۔اندر تیز روشنی ہو رہی تھی۔پھر میں نے ان دونوں کو بلایا اور دروازہ بند کردیا۔اس کمرے میں کل تین تجوریاں تھیں۔دو تجوریاں چار، چار فٹ کی تھیں۔تیسری جو تجوری تھی کوئی چھ فٹ لمبی اور چار فٹ چوڑی الماری کی مانند تھی۔تینوں الماریوں کی فولادی چادریں تھیں۔یہ کوڈ نمبر سے کھلنے والی جدید ترین ساخت کی تھیں۔انہیں نمبروں کے بغیر کھولا نہیں جاسکتا تھا۔

میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔وہ دونوں بھی میری طرح ہی جائزہ لے رہی تھیں۔اس کمرے کے فرش پر بڑا بیش قیمت ایرانی قالین بچھا ہوا تھا۔ایک کونے میں بڑی مسہری تھی اور اس پر صاف ستھرا بستر بچھا ہوا تھا۔اس کے قریب ہی سنگھار میز اور ایک صوفہ سیٹ تھا۔ایک الماری تھی جس میں شراب کی بوتلیں قیدیوں کی طرح مجبور نظر آرہی تھیں۔سرہانے والی میز پر ٹائم پیس، بیڈ لیمپ اور تین مختلف رنگوں کے ٹیلی فون تھے۔ایک اور الماری تھی جس کے درازوں میں متعدد بریف کیس اور چرمی دستی بیگ ہر سائز کے موجود تھے۔

میں تجوری کی طرف بڑھا۔مجھے کوڈ نمبر سیٹ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ساوتری اور شلپا کی وجہ سے میں نے دو تین لمحوں تک نمبر سیٹ کیے۔پھر اس کا ہینڈل گھمایا تو تجوری کا دروازہ کھل گیا۔تجوری میں کل چار درازیں تھیں۔دو درازوں میں امریکی ڈالر تھے۔ایک دراز میں ریال، دینار، درہم اور پاؤنڈ بھی تھے۔اس میں ہندوستانی کرنسی نہ تھی۔میں نے اشارے سے انہیں تجوری کے پاس بلایا۔

ان دونوں نے غیر ملکی کرنسی کے نوٹوں کے بنڈل دیکھے تو بھونچکی ہوگئیں اور ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔چند لمحوں تک ان پر سکتے کی سی کیفیت طاری رہی۔میں نے شلپا سے کہا۔" اس الماری سے تین بریف کیس نکال کرلے آؤ...... دو بریف کیس میں جتنی رقم آسکتی ہے بھرلو اور اسی طرح تیسرا بریف کیس بھی بھر لینا...... نوٹوں سے بھرا ایک بریف کیس میں لے جاؤں گا...... باقی دو بریف کیس تم دونوں لے جاؤ گی۔اس نیک کام میں دیر نہ کرو۔لیکن سکون واطمینان سے بھرنا۔گھبرانے، خوف زدہ ہونے اور عجلت کی قطعی ضرورت نہیں......"

صرف دس منٹ میں تینوں بریف کیس نوٹوں کی گڈیوں سے لبالب بھر گئے۔ پھر ہم کمرے سے باہر آئے۔ دونوں پہرے دار گہری نیند میں غرق تھے۔ وہ لفٹ ابھی تک کھڑی تھی جس میں ہم اوپر آئے تھے۔ اس عمارت میں کل چار لفٹیں تھیں۔ یہ لفٹ صرف رمیش پٹیل کے لئے مخصوص تھی۔ ہم تینوں سوار ہوگئے۔ چوتھی منزل پر میں نے لفٹ رکوائی۔ پھر میں اس کمرے میں گیا جس میں رمیش پٹیل اور گنیش موجود تھے۔ جو کنٹرول روم تھا۔ وہ دونوں اسی حالت میں کھڑے ہوئے تھے جس حالت میں ہم چھوڑ گئے تھے۔ وہ کھڑے کھڑے سو رہے تھے۔ میں نے رقم والا بریف کیس اٹھالیا اور باہر آ کر لفٹ میں سوار ہوگیا۔ پھر ہم نیچے آئے۔ اس وقت اکا دکا لوگ باہر نکل رہے تھے۔ کیسینو بند ہونے والا تھا۔ پارکنگ لاٹ پر دس گاڑیاں موجود تھیں جن میں سات رمیش پٹیل اور اس کے آدمیوں کی تھیں۔ باقی میں ہماری اور کیسینو میں آنے والوں کی تھیں۔ گاڑی چلاتے وقت شلپا کا خوشی سے برا حال ہو رہا تھا۔ یہی کیفیت ساوتری کی بھی تھی۔ انہیں یقین نہیں آیا تھا۔ وہ اسے ایک سپنا سمجھ رہی تھیں۔ وہ مجھے اپنے ہاں لے جانا چاہتی تھیں تاکہ میری خاطر تواضع کرسکیں اور ان کے ذہن میں جو بہت سارے سوالات اس کارنامے سے متعلق گردش کر رہے تھے ان کا جواب حاصل کرسکیں۔ میں نے ان سے کہہ دیا کہ مجھے ہوٹل پر اتار دیں۔

شلپا نے ہوٹل پر گاڑی روک دی۔ جب میں اترنے لگا تو وہ بولی۔ ”سکندر صاحب! اب ایک بات سے مجھے بہت ہی ڈر لگ رہا ہے؟“

”کس بات سے......؟“ میں نے پوچھا۔ ”اب جو اتنی بڑی رقم ملی ہے اس سے اپنا سپنا پورا کریں۔ جشن منائیں۔“

”ڈر اور خوف اس بات کا ہے کہ کل رمیش پٹیل اور اس کے آدمی ہماری تلاش شروع کردیں گے۔“ شلپا نے جواب دیا۔ ”اور پھر وہ پولیس میں ہمارے خلاف رپورٹ درج کرادے گا۔ دونوں صورتوں میں ہمارا بچنا بہت مشکل ہوگا۔ لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔“

”اس کے پاس ہمارے خلاف ثبوت کیا ہے؟“ میں نے دلاسا دیا۔ ”وہ ہمارا بال تک بیکا نہیں کرسکتا...... آپ فکر مند، پریشان اور ہراساں نہ ہوں...... اور ہاں سب سے پہلے رقم گن کر مجھے ٹیلی فون پر بتادیں کہ کل کتنی ہے۔“

میں اپنے کمرے میں پہنچا۔ میں نے کپڑے تبدیل کئے۔ پھر ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھ کر میں نے اسے آن کیا۔ اس وقت ایک انگریزی فلم آرہی تھی۔ میں نے ایک منتر پڑھ کر پھونک ماری۔ فلم میں جو منظر تھا وہ غائب ہوگیا۔ اس کی جگہ کیسینو کے کنٹرول روم کا منظر آگیا۔ ابھی تک رمیش پٹیل اور گنیش کھڑے کھڑے گہری نیند میں غرق تھے۔ میں نے پھر ایک منتر پڑھ کر پھونکا۔ دونوں نیند کی حالت سے ہڑبڑا کر نکل آئے تھے۔ رمیش پٹیل نے ریوالور جیب میں رکھتے ہوئے ایک جمائی لی۔ اسے اور گنیش کو ابھی تک خبر نہیں ہوئی تھی کہ رقم والا بیگ غائب ہے۔ وہ تو یہ سمجھ رہے تھے کہ انہیں نیند کی ایک جھپکی سی آئی تھی۔ وہ سو نہیں گئے تھے۔ رمیش پٹیل نے سخت لہجے میں کہا۔

”گنیش! تم نے کسی باہر کے آدمی یا اپنی محبوبہ کو تو نہیں بتایا ہوا تھا کہ ایرولکی گیم میں ہم لوگ کیا کرتے ہیں......؟“

”نہیں باس!“ گنیش نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ بات ہمارے ان آدمیوں کے علم میں بھی نہیں ہے جو میز پر بیٹھ کر کھیلتے ہیں؟“

”پھر یہ بات اس شخص کے علم میں کیسے آئی......؟“ رمیش پٹیل حیرت سے بولا۔ ”مجھے ایسا لگا کہ اس نے کسی سراغ رساں کی طرح اس کا کھوج لگایا ہے۔ جبھی تو اس نے اتنی باتیں کیں۔ اس نے جو جو بات کہی وہ بالکل غلط نہ تھی۔ یہ شخص ہماری پریشانی کا باعث بن سکتا ہے۔ اگر اعلیٰ حکام سے رابطہ کرلیا تو ایک مصیبت کھڑی ہوجائے گی۔ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کیسینو کا لائسنس بھی کینسل ہوجائے۔“

”آپ کسی بات کی چنتا نہ کریں۔“ گنیش بولا۔ ”کل صبح ہوتے ہی سب سے پہلے اسے تلاش کرکے اس کا قصہ ہی ختم کردوں گا۔“

”اور اس کی ساتھی عورتوں کا کیا کرو گے......؟“

رمیش پٹیل نے کہا۔ ”وہ اپنے ساتھی کی موت کو برداشت نہ کرسکیں گی۔“

”اس کے ساتھ ہی ان کا قصہ بھی ختم ہوجائے گا۔“ وہ سفاک لہجے میں بولا۔ ”ایک ہی گڑھے میں تینوں کو دفن کردیں گے۔“

”ہاں...... یہ بہت ضروری ہے۔“ رمیش پٹیل نے کہا۔ ”لیکن اس سے یا اس کی ساتھی عورتوں کو مارنے سے قبل یہ ضرور دریافت کرلینا کہ انہوں نے جب دوبارہ کھیل میں حصہ لیا تو انہوں نے کیا کیا تھا...... کس طرح سے ہمارا انتظام مفلوج کردیا اور لاکھوں کی رقم جیت لی؟“

”باس!“ گنیش بولا۔ ”رقم کا بیگ دکھائی نہیں دے رہا۔ کیا آپ نے اسے کہیں اور اٹھا کر رکھ دیا ہے؟“

”رقم کا بیگ......؟“ رمیش پٹیل نے ادھر ادھر دیکھا۔

”نہیں میں نے تو نہیں اٹھایا......؟ وہ یہیں تو رکھا ہوا تھا۔“

”پھر وہ گیا کہاں......؟“ گنیش نے چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنے ایک جبڑے پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ کیوں کہ ابھی بھی اس کا جبڑا سخت درد کررہا تھا اور وہ مجھے دل میں گالیاں بھی بکتا جارہا تھا۔ آج تک کسی نے اس کی ایسی درگت نہیں بنائی تھی۔ ”کہیں نظر نہیں آرہا ہے باس! مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ وہ اپنے ساتھ لے گئے۔ ان کے علاوہ کوئی بیگ لے جا بھی نہیں سکتا۔ کیوں کہ کوئی اور ادھر آیا بھی نہیں تھا۔“

”کیسے لے جاسکتے ہیں۔“ رمیش پٹیل نے کہا۔ ”وہ بیگ میرے قدموں کے پاس پڑا ہوا تھا۔ میں نے انہیں خالی ہاتھ جاتے ہوئے دیکھا۔“

”مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ سفید ساڑھی والی عورت جو بہت بول رہی تھی اس نے اندر آ کر بیگ اٹھایا اور نکل گئی۔“ گنیش نے کہا۔

”ناممکن سی بات ہے۔“ رمیش پٹیل نے کہا۔ ”کیوں کہ ان کے باہر نکلتے ہی تم نے اندر سے چٹخنی

لگادی تھی...... کھڑکیاں ساری بند ہیں اور پھر تمام کھڑکیوں میں گرل لگی ہوئی ہے۔ کسی کے اندر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"اب ساری بات میری سمجھ میں آرہی ہے۔" گنیش ایک دم سے چونک کر بولا۔ "ان عورتوں کے ساتھ جو آدمی تھا وہ کوئی شعبدہ باز تھا اور ہپناٹزم کا ماہر تھا۔ اس نے ہمیں ہپناٹائز کر دیا تھا اور بیگ لے کر نکل گیا۔ آپ نے ایک بات محسوس کی......؟ جب وہ باہر نکلے تو آپ اور مجھ پر ایک غنودگی سی طاری ہوگئی تھی اور اس عالم میں کھڑے رہے۔ وہ نکلتے وقت بیگ لے کر نکل گئے۔ اس آدمی نے ہماری نظر بندی کر دی تھی۔ اس لئے ہمیں پتا نہیں چلا کہ وہ بیگ لے گئے ہیں اور آپ نے اس کی دھمکی نہیں سنی...... جو اس نے جاتے وقت دی تھی...... میرا خیال ہے بلکہ مجھے یقین ہے کہ جاتے وقت وہ ہمارا اور بھی مال سمیٹ کر لے گیا ہے۔"

اسی لمحے رمیش پٹیل کا موبائل فون بجنے لگا۔ اس نے جیب سے نکال کر کان سے لگایا۔ دوسرے لمحے اس کے ہاتھ سے موبائل چھوٹ کر فرش پر گر گیا۔ وہ بڑے زور سے اچھلا تھا۔ اس کا چہرہ سفید پڑتا چلا گیا۔ وہ بدحواس ہو کر بولا۔

"نارائن کا فون تھا...... وہ کہہ رہا ہے کہ کمرہ اور بڑی تجوری کھلی پڑی ہوئی ہے۔ آپ شاید بند کرنا بھول گئے ہیں...... چلو اوپر چل کر دیکھتے ہیں وہ بدمعاش وہاں کوئی حرکت کر گیا ہے...... پہرہ داروں کو بھی اس نے......"

رمیش پٹیل اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر دروازے کی طرف لپکا۔ چیختی گرائی اور لفٹ کی طرف دوڑا۔ گنیش بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ وہ اوپر پہنچے۔ دونوں پہرہ دار خوف زدہ سے کھڑے ہوئے تھے۔ رمیش پٹیل جیسے ہی دہلیز پر پہنچا بجلی چلی گئی اور اندھیرا چھا گیا۔ ایسا گھپ اندھیرا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ رمیش پٹیل نے اندر داخل ہونے کی کوشش کی تو اس کا سر دہلیز کی چوکھٹ سے ٹکرایا تو وہ بری طرح چیخا۔ "یہ جنریٹر آن کیوں نہیں ہوا...... گنیش موبائل سے معلوم کرو۔ یہ حرام زادے سو گئے کیا......؟" گنیش نے جیب سے موبائل نکال کر جنریٹر روم کا نمبر ملایا اس کے سپروائزر سے بات کر کے رمیش پٹیل سے بولا۔

"سری ناتھ کہہ رہے ہیں کہ بجلی کے جاتے ہی اس میں اچانک خرابی پیدا ہوگئی ہے...... جبکہ یہ آٹو میٹک سسٹم کا ہے اور پھر صرف اس عمارت کی بجلی گئی ہے جبکہ قرب و جوار کی تمام عمارتوں اور سڑکوں پر بجلی ہے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ یہ کیا چکر ہے۔"

"ارے کوئی جلدی سے جا کر موم بتی لے آؤ۔" رمیش پٹیل چیخا۔ "میں نے کتنی بار کہا ہے کہ ایمرجنسی لائٹ لگاؤ۔ لیکن کوئی سنتا ہی نہیں...... سری ناتھ کہتا ہے کہ جب آٹو میٹک جنریٹر سسٹم موجود ہے تو ایمرجنسی لائٹ کی کیا ضرورت ہے...... الو کا پٹھا......"

اتنی دیر میں ایک پہرہ دار نے دیا سلائی جلائی اور اپنی کوٹھری میں گھس گیا۔ دوسرے لمحے باہر آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک فٹ لمبی اور چار انچ موٹی موم بتی جل رہی تھی۔ رمیش پٹیل نے اس کے ہاتھ سے موم بتی لی اور وہ کمرے میں گھس گیا۔ گنیش بھی اس کے پیچھے گھس گیا۔ رمیش پٹیل نے اپنی خالی تجوری دیکھی جو اس کا

منہ چڑا رہی تھی۔ اس میں جیسے کسی نے جھاڑو پھیر دی ہو۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں دھڑکنے لگا تو اس کے ہاتھ سے موم بتی چھوٹ کر فرش پر گر گئی۔ اور وہ سن ہو کر کھڑا رہا۔ پھر جتنی دیر میں اس نے جھک کر موم بتی اٹھائی اتنی دیر میں کارپٹ نے آگ پکڑ لی۔ پھر تیزی سے پھیلنے لگی۔ اسی وقت بجلی آگئی۔ آگ نے بڑی شدت اختیار کر لی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے نہ صرف کھڑکیوں کے ریشمی پردوں بلکہ فرنیچر کو بھی لپیٹ میں لے لیا۔ کمرے میں آگ اور دھوئیں کے سوا کچھ نہ تھا۔ رمیش پٹیل اور گنیش گھبرا کر کھانستے ہوئے باہر نکل آئے تو ایک پہرہ دار چیخ کر بولا۔ "باس! آگ نے چوتھی منزل کو بھی پکڑ لیا ہے......"

پندرہ منٹ کے بعد اس عظیم الشان کیسینو کی پرشکوہ بلند و بالا اور خوب صورت عمارت میں ایک قیامت کا سا سماں تھا۔ بھگدڑ اور افراتفری سی مچی ہوئی تھی۔ لفٹوں سے لوگ جن میں مرد اور لڑکیاں اور عورتیں تھیں باہر آرہے تھے۔ وہ حد درجہ خائف تھے اور ان پر سراسیمگی سی طاری تھی۔

کوئی چھ عدد فائر بریگیڈ آگ پر قابو پانے کے لئے ہر ممکن کوشش اور جدو جہد کر رہے تھے۔ آگ نے پوری عمارت کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ اسے جیسے کسی عورت کی طرح دبوچ رکھا تھا جو اس کی گرفت سے نکل نہیں پا رہی ہو۔ شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ آگ بجھنے کے بجائے بھڑکتی جا رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ آگ پر پانی نہیں بلکہ تیل کی دھار گر رہی ہو۔ عمارت میں اب کوئی مرد اور عورت نہ رہی تھی سبھی باہر آچکے تھے۔ وہ ایک طرف کھڑے ہوئے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

رمیش پٹیل ایک طرف کھڑا اپنے کیسینو کے جلنے کا ہولناک منظر دیکھ رہا تھا۔ اسے دو آدمی سنبھالے کھڑے ہوئے تھے۔ وہ پاگلوں کی طرح چیخ رہا تھا۔ "میں برباد ہو گیا...... میرے کروڑوں روپے جل گئے...... تیس کروڑ کی عمارت بھی جل رہی ہے...... کاش! میں نے انشورنس کروالیا ہوتا...... اب میں کیا کروں...... معلوم نہیں...... کس کمینے نے میرے کیسینو کو آگ لگا دی......؟"

"اسے تمہارے ہی ہاتھوں سے آگ لگی ہے مسٹر رمیش پٹیل!" اس کے کانوں میں ایک آواز آئی۔ "جلتی موم بتی تمہارے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گری اور اس نے قالین میں آگ پکڑ لی...... تم کسی اور کو دوش نہ دو...... تمہیں ایک دن تباہ ہونا ہی تھا۔ کیوں کہ تم نے بہت سے گھروں اور لوگوں کو تباہ کیا۔ ان کے گھر جلا دیئے...... اس لئے تمہارا کیسینو جل رہا ہے...... جل چکا ہے...... اب وہ ملبے کے ڈھیر میں تبدیل ہو رہا ہے...... غلط کام غلط ہوتا ہے...... تم اپنے کئے کا خمیازہ بھگت رہے ہو......"

میں نے ٹی وی آف کر دیا مجھے اس بات سے بڑی خوشی ہوئی تھی کہ کیسینو نذر آتش ہو گیا۔ میں نے جو کچھ کیا تھا۔ وہ ہر لحاظ سے ٹھیک ہی تھا۔ میں نے ایسے ہی لوگوں کو جادو کے زور پر سبق دینے اور عبرتناک انجام تک پہنچانے کا بیڑہ اٹھایا ہوا تھا گو کہ میں ساری دنیا کی برائیاں ٹھیک نہیں کر سکتا۔ لیکن جو کچھ کر سکتا تھا وہ میں نے کرنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔ میں یہ کہتا کہ اس کیسینو کو تباہ و برباد کرنے میں میرا ہاتھ ہے تو کوئی یقین نہیں کرتا اور نہ ہی مجھے کسی کی طرف سے یقین اور تعریف کی سند کی ضرورت تھی۔ اس لئے کہ میں انسانیت کے لئے کام کر رہا تھا۔

میں نے ریموٹ ایک طرف رکھا ہی تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ریسور اٹھایا تو دوسری طرف شلپا تھی۔ وہ آداب کہہ کر بولی۔

”سکندر صاحب! میں نے اور ساوتری نے مل کر رقم گنی ہے...... وہ رقم ہندوستانی کرنسی میں نو کروڑ بنتی ہے۔“ اس کے لہجے میں سرشاری تھی۔

”مبارک ہو......“ میں تے جواب میں کہا۔ ”اب آپ دونوں کا سپنا پورا ہوگیا۔ اسے احتیاط سے خرچ کریں۔ فضول نہ بہائیں۔ کیوں کہ ایسے سنہرے مواقع سپنوں میں بھی نہیں ملتے ہیں۔ اتنی بڑی رقم جس کے بارے میں خواب وخیال میں بھی نہیں سوچا تھا شاید اس لئے ملی ہے کہ دکھی انسانیت کے کام آئے، غریب لوگ علاج معالجے کے لئے بہت پریشان ہیں۔“

”آپ کسی بات کی بالکل بھی چنتا نہ کریں۔“ شلپا بولی۔ ”ہم اس کی ایک ایک پائی اسپتال کی تعمیر، ساز وسامان اور ادویات پر خرچ کریں گے۔“

”لیکن مجھے خوف واندیشہ پریشان اور ہراساں کر رہا ہے کہ کل رمیش پٹیل کے آدمی ہماری تلاش میں تو نہیں نکل پڑیں گے؟“ ساوتری نے کہا۔ ”شلپا بھی اس بات سے بہت پریشان ہے۔ ہم اس معاملے پر بھی آپ سے گفتگو کرنا چاہتی ہیں؟“

”رمیش پٹیل کی کہانی کا باب اب بند ہو چکا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اب آپ کو فکر مند اور پریشان ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔“

”کیا مطلب......؟“ شلپا کے لہجے میں حیرت اور خوشی کے جذبات لپک پڑے۔ ”میں آپ کی بات کچھ سمجھی اور کچھ نہیں سمجھی......“

”مطلب یہ ہے کہ ہمارے وہاں سے آنے کے بعد...... یعنی آدھا گھنٹہ پیشتر کیسینو کی بجلی فیل ہوگئی۔“ میں اسے بتانے لگا۔ ”رمیش پٹیل ایک بہت بڑی موم بتی جلا کر ایک کمرے میں گیا۔ اس کے ہاتھ سے موم بتی چھوٹ کر فرش پر گری تو قالین پر آگ لگ گئی۔ پھر یہ آگ اس تیزی سے پھیلی کہ اس نے غالباً شارٹ سرکٹ کر دیا۔ پھر آگ نے دیکھتے ہی دیکھتے پوری عمارت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ یہ دیکھ کر رمیش پٹیل حواس کھو بیٹھا۔ اس عمارت کی ایک، ایک چیز جل کر راکھ ہوگئی۔ پر شکوہ، خوب صورت، بلند وبالا اور عظیم الشان عمارت ملبے کا ڈھیر بن گئی اور رمیش پٹیل ذہنی توازن کھو کر پاگل ہوگیا۔“

”سچ......“ شلپا خوش ہوگئی۔ اس نے فرط مسرت سے پوچھا۔ ”آپ کو کیسے پتا چلا؟ کس نے بتایا؟ یہ تو بہت بڑی خوشخبری ہے۔“

”تھوڑی دیر پہلے مقامی ٹی وی پر ایک بلیٹن نشر کیا گیا جو اس عمارت کے آگ لگنے سے متعلق تھا۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے ہوٹل کے کمرے کی کھڑکی سے دیکھا۔ اس میں سے ابھی بھی آگ کے شعلے اور دھواں اٹھتا دکھائی دے رہا ہے۔ آپ بھی اپنے مکان کی چھت سے دیکھیں۔“

”آپ نے یہ خبر سنا کر بہت بڑا بوجھ ہلکا کر دیا...... اب ہم بڑے سکون سے اپنا کام کر سکیں گی۔“ شلپا بولی۔ ”یہ تو بہت ہی اچھا ہوا۔ اس شہر میں ابھی بھی بہت سارے چھوٹے بڑے قمار خانے موجود ہیں۔ کاش یہ بھی کسی دن اسی طرح جل کر بھسم ہو جائیں۔ ایک بھی نہ رہے۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ ناممکن سی بات ہے...... اچھا یہ بتائیں۔ یہ جو آگ لگی۔ کہیں یہ بھی آپ ہی کا کارنامہ تو نہیں ہے۔“

”میرا کارنامہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں تو آپ لوگوں کے ساتھ ہی وہاں سے نکلا تھا اور آپ لوگوں نے مجھے ہوٹل پر ڈراپ کیا...... اور میں اس وقت سے ہوٹل میں موجود ہوں۔ ایک لمحے کے لئے باہر نہیں نکلا۔ اب سونے جا رہا ہوں۔“

”جانے کیوں میرا من کہہ رہا ہے کہ یہ شبھ کارنامہ آپ ہی کا ہے۔“ شلپا بولی۔ ”کیوں کہ آپ مجھے ایک غیر معمولی ذہین آدمی لگے۔ آپ بڑے مہان ہیں۔ آپ نے ایک طرح سے انسانیت کے لئے اور غریبوں کے لئے جو دیا کی ہے ہم کبھی نہیں بھول سکتیں۔“

”اچھا...... اب اجازت دیں۔“ میں نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔ ”بڑے زور کی نیند آرہی ہے...... رہی من کی بات یہ تو بڑا پاگل ہوتا ہے۔ جانے کیا کچھ کہتا ہے۔ اس کی بات نہ مانیں...... لیکن آپ اس بات سے انکار نہیں کر سکتیں کہ جو کچھ بھی ہوا وہ ہر لحاظ سے اچھا ہی ہوا۔ رمیش پٹیل اسپتال کے فنڈ میں دس روپے بھی نہیں دیتا لیکن اس کی نو کروڑ کی رقم مل گئی...... اس بات اور راز کا علم آپ کے اپنے فرشتوں کو بھی نہ ہو۔ حسد وجلن والوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ پولیس کے کان میں اس واقعہ کی بھنک بھی پڑ گئی تو وہ آپ کی زندگی حرام کر دے گی۔ لینے کے دینے پڑ جائیں گے...... یہ بات ذہن نشین رکھیں۔“

میں نے شلپا کی بات کے جواب کا انتظار نہیں کیا۔ سلسلہ منقطع کر دیا۔ پھر میں نے فون پر ریسٹورنٹ والوں سے رابطہ کر کے چائے اور سینڈوچز منگوائے۔ تھوڑی دیر بعد ایک مسلمان ویٹر چائے اور سینڈوچز لے کر آیا۔ وہ بہت پریشان اور متفکر سا دکھائی دیا۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ وہ اس وقت بہت مصروف تو نہیں ہے۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر باتیں کر سکتا ہے۔ پھر برتن لے جائے۔ اس نے کہا کہ تھوڑی دیر میں ریسٹورنٹ بند ہو جائے گا۔ برتن لے جانے کے بعد اس کی چھٹی ہو جائے گی۔ وہ فرصت میں ہے۔

سینڈوچز کی پلیٹ میں چار عدد سینڈوچ تھے اور چائے کی مقدار اتنی تھی کہ دو آدمی بہ آسانی پی سکتے تھے۔ میں نے اسے چائے اور سینڈوچ میں شریک ہونے کی دعوت دی تو اس نے تکلف سے کام لیتے ہوئے انکار کر دیا۔ مگر میرے شدید اصرار پر وہ شریک ہوگیا۔ وہ خود ہی یہ چکن سینڈوچز بنا کر لایا تھا۔ وہ بڑا حیران بھی ہوا تھا کہ میں نے اسے اتنی عزت اور اہمیت دی۔ جبکہ مسافر حقارت سے دیکھتے تھے۔ مسافروں کے نزدیک ان کی کوئی عزت نہ ہوتی تھی۔ اس لئے بھی کہ اس ہوٹل میں باحیثیت لوگ ٹھہرتے تھے۔ متوسط طبقے کے نہیں۔ کیوں کہ یہ شہر کے مہنگے ترین ہوٹلوں میں سے ایک تھا۔ یہاں بڑے سرمایہ دار، صنعت کار، اداکار اور کاروباری لوگ ہی ٹھہرتے تھے جو اندرون ملک سے آتے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”تمہارا نام کیا ہے...... تم اس قدر پریشان اور متفکر کیوں ہو......؟ کیا منیجر نے تم سے کچھ کہا؟“

"جی نہیں......" اس نے نفی میں سر ہلا کر جواب دیا۔ "میرا نام قمر ہے۔ منیجر صاحب بہت اچھے آدمی ہیں۔ وہ مجھ سے بہت اچھی طرح پیش آتے ہیں۔"

"پھر تم اس قدر پریشان کیوں لگ رہے ہو؟" میں نے اس کے چہرے پر نگاہیں مرکوز کر کے کہا۔ "کہیں یہ تھکن کا اثر تو نہیں ہے؟"

"جی نہیں۔ یہ تھکن کا اثر نہیں ہے۔" اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "میں گھریلو مسائل کی وجہ سے سخت پریشان ہوں۔"

"اچھا تو تم نے تعلیم کہاں تک حاصل کی ہوئی ہے؟" میں نے سوال کیا۔ "تمہارے والد کیا کرتے ہیں۔ تم لوگ کتنے افراد ہو؟"

"میں نے تین برس پہلے ایم اے فرسٹ کلاس سے پاس کیا۔" وہ کہنے لگا۔ "میرے والد مسلمانوں کے ایک اسکول میں استاد ہیں۔ انہیں پندرہ سو روپے ماہوار ملتے ہیں۔ دو، تین جگہ ٹیوشن کر کے بارہ، پندرہ سو روپے کما لیتے ہیں۔ اس طرح گھر کے اخراجات پورے ہوتے ہیں۔ مجھے یہاں بارہ سو روپے ملتے ہیں۔ روزانہ سو ڈیڑھ سو بخشش بھی مل جاتی ہے...... میری والدہ حیات ہیں۔ میری دو چھوٹی مگر جوان بہنیں ہیں۔ ایک بہن کا رشتہ طے ہو گیا ہے۔ دوسری کی منگنی بھی ہو چکی ہے۔ آئندہ ہفتے میری بہن کی شادی ہونے والی ہے لیکن لڑکے والوں نے آج ایک فہرست لا کر دی جسے دیکھ کر ہمارے ہوش اڑ گئے۔ والدہ غش کھا گئیں۔ بہنیں رونے لگیں...... والد کا صدمے سے برا حال ہے کیوں کہ جہیز اس فہرست کے مطابق نہ ہوا تو پھر شادی نہ ہو سکے گی۔"

"سب سے پہلے تو میرے اس سوال کا جواب دو کہ تم نے ایم اے فرسٹ کلاس پاس کرنے کے بعد ویٹر کا پیشہ اختیار کیوں کیا......؟" میں نے دریافت کیا۔ "جب کہ تم کسی بھی اچھی فرم میں بہ آسانی ملازمت حاصل کر سکتے تھے۔ تم اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص ہو۔ جوان ہو۔"

"آپ چوں کہ پاکستانی ہیں اور یہاں سیر و سیاحت کے لئے آئے ہیں اس لئے یہاں کے سماجی و معاشرتی اور اقتدار کا علم نہیں ہے۔" قمر کہنے لگا۔ "ہندوستان میں بڑی بے روزگاری ہے۔ لوگوں کو ملازمت آسانی سے نہیں ملتی ہے اگر کوئی آسامی کہیں خالی ہوئی تو مقامی ہندو کو ترجیح دی جائے گی۔ کسی مسلمان کو نوکری مل جائے تو یہ اس کی خوش نصیبی ہے اور اسے معجزہ کہا جا سکتا ہے۔ صرف میں ایک کیا سینکڑوں ہندو مسلم لڑکے لڑکیاں جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ روزانہ ملازمت کے حصول کے لئے دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔ غربت اور مہنگائی نے پیس کر رکھ دیا ہے۔ کتنے گھرانے پریشان ہیں۔ ایک بات میں آپ کو بتاؤں۔ آپ شاید اس بات کا یقین نہیں کریں گے۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ صرف اس شہر اور صوبے میں ہی نہیں...... ہندوستان کے ہر چھوٹے بڑے شہروں میں بے روزگاری کے ہاتھوں ستائی ہوئی غیر مسلم لڑکیاں عصمت فروشی کرتی ہیں۔ میں نے مجبوراً ہوٹل میں ملازمت کر لی۔ میں اس طرح ہر ماہ سات سے دس ہزار روپے گھر لے جاتا ہوں۔ جبکہ ایک گریجویٹ اور ایم اے کو چار ہزار روپے بھی نہیں ملتے ہیں۔"

"لڑکے والوں نے رشتہ طے ہوتے وقت کیا لین دین کے بارے میں کوئی معاملات طے نہیں کئے تھے......؟" میں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "اگر بہ فرض محال کئے تھے تو اب فکر اور پریشانی کی کیا بات ہے۔ انہوں نے یاددہانی کے لئے فہرست دی ہوگی؟"

"جی نہیں...... انہوں نے لین دین کے کوئی معاملات طے نہیں کئے تھے۔" قمر نے جواب دیا۔ "اگر وہ اس وقت اپنی شرائط اور معاملات بتاتے تو ہم رشتہ طے کرنے سے صاف انکار کر دیتے۔ ہم نے دو برسوں میں بہنوں کے لئے جو جہیز جوڑا ہے۔ وہ بہت ہی مناسب ہے لڑکے کی ماں، بہنوں، لڑکے اور اس کے باپ نے یہ کہا تھا کہ ہمیں کوئی لین دین اور جہیز نہیں چاہئے۔ صرف لڑکی کی ضرورت ہے۔ جوڑے کی رقم صرف پانچ ہزار روپے دے دیں۔ ہمارے نزدیک لڑکی کا اصل جہیز اس کی شرافت، نیک سیرت اور سلیقہ مندی ہے۔"

"خیر......" میں نے کہا۔ "یہ بڑی افسوسناک بات ہے...... اچھا تو اب تم لوگوں نے کیا فیصلہ کیا......؟ کیا رشتہ توڑ دو گے؟"

"ہاں...... توڑنا ہی پڑے گا۔ شاید نہ بھی توڑیں۔" وہ غم زدہ لہجے میں بولا۔ "ہم لوگ ایک الجھن اور افتاد میں پھنس گئے ہیں۔"

"ایسا رشتہ توڑ دینا ہی مناسب ہے۔" میں نے اسے مشورہ دیا۔ "کیوں کہ یہ مطالبات بقول تمہارے تم لوگوں کی دسترس سے باہر ہیں۔"

"سچ بات تو یہ ہے کہ اسے ختم کر دینا ہی بہتر ہے۔" وہ بولا۔ "والد کہتے ہیں کہ جذباتی فیصلہ اور رشتہ توڑ دینا نقصان دہ ہی نہیں بلکہ بدنامی، ذلت اور رسوائی کا سبب ہوگا۔ اس لئے کل مغرب کی نماز کے بعد سوچیں گے کہ کیا کرنا ہے شاید رشتے والے بھی آئیں۔ کل میری چھٹی ہے۔"

باتوں باتوں میں، میں نے اس سے والد کا نام اور گھر کا پتا غیر محسوس انداز سے معلوم کر لیا۔ پھر اسے بل کی رقم اور سو روپے ٹپ دی تو وہ خوش ہو کر سلام کر کے چلا گیا۔ میں بستر پر سونے کے لئے کپڑے بدل کر لیٹ گیا۔ میں رمیش پٹیل کے بارے میں سوچتا ہوا سو گیا۔

صبح بیدار ہو کر نہایا۔ ناشتا کیا۔ ناشتا کرنے کے بعد میں نے رقم گنی۔ وہ چھ کروڑ ستر لاکھ بیس ہزار روپے تھے...... میں نے سوچا کہ ایک وقت تھا کہ سو روپے کی رقم بڑی ہوتی تھی۔ پھر ہزار...... پھر لاکھ...... آج کے لاکھوں روپے کل کے ہزاروں سے بھی کم تھے۔ اب کروڑ کا دور تھا۔

میں نے خاصی رقم اپنے پاس رکھ کر باقی رقم یہاں مسلمانوں کے جو فلاحی ادارے اور اسپتال تھے ان میں...... غریبوں، ضرورت مندوں اور محتاجوں اور مستحق لوگوں میں تقسیم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں بہت ساری رقم اس لئے بھی اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا کہ جانے کب کس وقت اور کس موقع پر فیاضی سے خرچ کرنے کی نوبت آ جائے۔

ابراہیم صاحب اسٹریٹ میں بہت ساری ہر طرح کی دکانیں تھیں۔ اس کے عقب میں مکانات بنے ہوئے تھے۔ اس علاقے کے ایک مکان میں قمر اپنے والد پرویز صاحب کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کے

والد کو لوگ پرویز صاحب نہیں بلکہ ماسٹر صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔ مجھے مکان تلاش کرنے میں اس لئے دشواری نہ ہوئی کہ بچہ بچہ ان کے نام سے واقف تھا۔

جب میں نے قمر کے مکان کے دروازے پر دستک دی تو اس وقت سہ پہر کے چار بج رہے تھے۔ دروازہ کھلا دروازے پر ایک نوجوان اور حسین لڑکی کا چہرہ نمودار ہوا۔ وہ چودھویں کے چاند کی طرح تھی۔ اس کا کتابی چہرہ دوپٹے کی محراب میں بہت پیارا لگا۔ اس کی عمر اٹھارہ، انیس برس کی ہوگی لیکن یہ چاند بہت اداس نظر آیا۔ اس کی بڑی بڑی خوب صورت سیاہ آنکھوں میں گھٹا سی چھائی ہوئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ یہ گھٹا کسی بھی لمحے برس سکتی ہے۔ اس کے ہونٹ بھی گلابی گلابی تھے۔ وہ نکلتے ہوئے قد کی تھی۔ اس کے سراپا میں بڑی دل کشی اور جاذبیت تھی۔ وہ ہزاروں میں نہیں، لاکھوں میں ایک تھی۔ ایسی نازک اور مہ جبین کہ پھول سے تشبیہ دی جاسکتی تھی۔ اس کی سیاہ زلفیں بھی کسی ناگن جیسی تھیں۔

اس نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور چونکی۔ پھر اس کی خوب صورت اور مترنم آواز ابھری۔

''آپ کو کس سے ملنا ہے؟''

''کیا ماسٹر صاحب گھر پر تشریف رکھتے ہیں......؟'' میں نے اس کے چہرے کو نظروں کی گرفت میں لے کر پوچھا۔ ''مجھے ان سے ملنا ہے۔''

''جی نہیں...... وہ گھر پر موجود نہیں ہیں ایک ضروری کام سے گئے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''پندرہ، بیس منٹ میں آئیں گے۔ آپ کون ہیں؟''

''قمر صاحب تو ہوں گے......؟'' میں نے کہا۔ ''میں قمر کا دوست ہوں۔ ان سے کہیں کہ سکندر ملنے کے لئے آئے ہیں۔''

''بھائی جان بھی ابو کے ساتھ گئے ہوئے ہیں۔'' اس نے مترنم لہجے میں کہا۔ ''وہ دونوں ایک ساتھ ہی آئیں گے۔''

''کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ میں ان کا گھر میں بیٹھ کر انتظار کرلوں......؟'' میں نے کہا۔ ''کیوں کہ مجھے ان سے اور قمر سے ضروری کام ہے؟''

اسے جواب دینے میں تامل ہوا۔ ''ایک منٹ۔'' اتنا کہہ کر اس نے دروازہ بند کیا اور اندر چلی گئی۔ چند لمحوں کے بعد دروازہ کھلا ایک عورت جس کی عمر پچاس برس کے لگ بھگ ہوگی وہ دروازے پر نمودار ہوئی اس کے پیچھے لڑکی تھی۔ وہ قمر کی ماں تھی۔ اس نے پوچھا۔ ''آپ ہیں کون صاحب......؟''

''میں قمر کا دوست ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں پاکستانی ہوں۔ پاکستان سے آیا ہوں۔ اس ہوٹل میں ٹھہرا ہوں جس میں قمر کام کرتے ہیں۔''

''آپ پاکستانی ہیں اور پاکستان سے آئے ہیں......؟'' عورت کا چہرہ حیرت اور خوشی سے دمک اٹھا۔ ''آیئے آیئے......''

اس عورت نے ایک طرف ہٹ کر مجھے اندر آنے کا راستہ دیا۔ مجھے صحن سے گزار کر نشست گاہ کی

طرف لے کر ماں، بیٹی بڑھیں۔ میں نے ایک اور لڑکی کو دیکھا جو کمرے کے باہر کھڑی ہوئی تھی۔ وہ سولہ برس کی ہوگی۔ اس نے مجھے دیکھ کر بڑے تپاک سے سلام کیا۔

ان دونوں نے مجھے نشست گاہ میں لاکر بٹھایا۔ قمر کی ایک بہن کا نام زلیخا تھا اور دوسری کا نام جمیلہ تھا۔ ماسٹر صاحب کی بیوی کا نام بدرالنساء تھا۔ بیگم بدرالنساء مجھے بتارہی تھیں کہ کراچی میں ان کے ایک بھائی اور دو خالہ زاد بہنیں رہتی ہیں جو ہر دو تین برسوں میں دو ایک مہینے کے لئے آتی رہتی ہیں۔ دوران گفتگو جمیلہ چائے بنا کر لے آئی۔ چائے پیتے اور باتیں کرتے وقت میری نگاہ بار بار زلیخا کی طرف اٹھ جاتی تھی۔ وہ سر جھکائے اداس وملول سی بیٹھی تھی۔ اس کے بشرے سے اس کے دل کی کیفیت صاف عیاں تھی۔ اندر ہی اندر اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ سینہ کٹ رہا تھا۔ اس لئے ان باتوں میں وہ دلچسپی نہیں لے رہی تھی۔ اس کی چائے رکھے رکھے ٹھنڈی ہوگئی تھی۔ زمین کے چاند کو اداس دیکھ کر میرا دل بھی اداس ہوگیا تھا۔ وہ کیا سوچ رہی تھی اس کی سوچ اسے متفکر اور پریشان کررہی تھی۔ اس کے کرب اور اداسی میں اضافہ ہورہا تھا۔

بیگم بدرالنساء کو بلانے پڑوس کا ایک بچہ آیا تو وہ اٹھ کر چلی گئیں۔ وہ معذرت کرگئیں کہ تھوڑی دیر میں آتی ہیں۔ جمیلہ پاٹ کے برتن اٹھا کر لے گئی تو زلیخا نے فوراً ہی دبی زبان سے کہا۔ ''سکندر صاحب! آپ فرشتہ بن کر آئے ہیں...... آپ سے ایک التجا ہے...... میرے ابو اور بھائی جان کو سمجھائیں کہ میری شادی نذیر سے نہ کریں...... میں نجم پاشا......''

زلیخا کہہ رہی تھی کہ جمیلہ اندر داخل ہوئی تو اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ چند لمحوں کے بعد بیگم بدرالنساء آئیں تو ان کے پیچھے قمر اور ماسٹر صاحب تھے۔ قمر مجھے دیکھ کر چونکا۔ پھر اس کا چہرہ حیرت اور خوشی سے دمک اٹھا۔ اسے یقین نہیں آیا تھا کہ میں آسکتا ہوں۔ پھر کمرے سے ماں اور بیٹیاں نکل گئیں۔ میں نے ماسٹر صاحب کو سلام کرکے ان سے مصافحہ کیا۔ وہ ساٹھ برس کی عمر کے ہوں گے۔ ان کے سر کے سارے بال سفید تھے۔ کلین شیو تھے۔ قد بھی دراز تھا۔ صحت بھی اچھی تھی۔

''ابو...... آپ سکندر ہیں جو پاکستان سے آئے ہوئے ہیں اور میرے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔'' قمر نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''آپ بڑے اچھے آدمی ہیں۔ رات انہوں نے مجھے سینڈوچ کھلائے چائے بھی پلائی۔''

''تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی بیٹے!'' انہوں نے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے بڑی اپنائیت کے انداز سے کہا۔

''سکندر صاحب! آپ تشریف رکھیں۔'' قمر بولا۔ ''آپ نے ہمیں جو عزت بخشی ہے میں اسے کبھی نہیں بھول سکتا۔ میں چائے ناشتا کے لئے کہہ آتا ہوں۔''

''ابھی میں نے چائے پی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''آپ کی والدہ اور بہنوں نے یہ سن کر کہ میں پاکستان سے آیا ہوں مجھے عزت سے بٹھایا اور چائے بھی پلائی۔''

''تھوڑی دیر بعد سہی......'' ماسٹر صاحب نے کہا۔ ''بیٹے! حالاں کہ تم ہمارے اور ہم تمہارے لئے

اجنبی ہیں۔تم نے یہاں جوقدم رنجہ فرمایا ہے میں بتا نہیں سکتا......“

”دراصل میں آپ کے ایک بہت ہی ذاتی اوراہم معاملے میں بات کرنے آیا ہوں۔“ میں نے کہا۔”ایک اجنبی ہونے کے ناطے مجھے اس بات کا کوئی حق نہیں پہنچتا کہ آپ کے ان معاملات میں دخل دوں......رات اس موضوع پر قمر سے بات ہوئی تھی۔اسے بے حد پریشان،اداس اور متفکر پایا۔“

”کون سا معاملہ......؟“انہوں نے حیرت سے اپنے بیٹے کی شکل دیکھی۔”قمر بیٹے!تم نے ان سے کس معاملے کی بات کی جو انہوں نے یہاں زحمت کی۔“

”آپ کی بیٹی کی شادی کا معاملہ جو آئندہ ہفتہ میں ہونے والی ہے اور کسی وجہ سے منسوخ ہونے والی بھی ہے۔“قمر کے بجائے میں نے جواب دیا۔

”اوہ......“ماسٹر صاحب کے چہرے پر یک لخت زردی سی ابھر آئی۔”کچھ دیر میں لڑکے والے اس سلسلے میں بات کرنے آنے والے ہیں۔ وہ ہماری مجبوری اور کمزوری سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔شادی کے دعوت نامے بھی تقسیم ہو چکے ہیں۔قمر نے آپ کو تمام باتیں بڑی تفصیل سے بتائی ہوں گی۔“

”جی ہاں۔“میں نے اثبات میں سر ہلایا۔”اس لئے میں حاضر ہوا ہوں۔شاید اس سلسلے میں آپ کو کوئی صلاح مشورے دے سکوں۔ مدد کر سکوں۔کیا آپ وہ فہرست دکھانا پسند کریں گے جو انہوں نے عین وقت پر بھجوائی ہے۔میں اسے ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔آپ مجھے بھی اپنے گھر کا فرد سمجھیں......“

ماسٹر صاحب نے ایک سرد آہ بھری۔ جیب سے تہہ کیا ہوا ایک کاغذ نکال کر میری طرف بڑھایا۔

”میری چھوٹی بیٹی جمیلہ کی جس گھرانے میں منگنی ہوئی ہے۔انہوں نے وہاں بھی یہ فہرست بھیج دی جس سے ان کے دماغ بھی خراب ہو گئے۔ جمیلہ کی شادی میری سگی بہن کے لڑکے سے طے پائی ہے۔ابھی اس شادی کو ایک برس باقی ہے۔انہیں میری حیثیت کا پتا ہے۔پھر بھی وہ کہہ رہے ہیں کہ اسی صورت میں جمیلہ سے ان کے بیٹے کی شادی ہوگی کہ جو جہیز بڑی بیٹی کو دیں گے وہی چھوٹی کو دیں گے اب میری اس بیٹی کی منگنی اور مستقبل بھی خطرے میں پڑ گیا ہے۔“

میں نے وہ فہرست لے کر دیکھی۔سب سے پہلے لکھا ہوا تھا۔فیٹ گاڑی،دس دس تولے کے زیورات کے چار سیٹ،پانچ تولے کے دو سیٹ،دو نندوں کو......ایک سیٹ بہو کو،دس تولے کا سیٹ ساس کو،پچاس ہزار روپے دولہا کے جوڑے کے لئے......جیٹھ،سسر اور دیور،ساس،نندوں اور بہو کے لئے جوڑے......فرنیچر ایک لاکھ روپے کی مالیت کا ہو......برتنوں میں ڈنر اور دوسرے تمام سیٹ......چار سو براتی ہوں گے۔کھانے میں دو تین ڈشیں......اور بھی کچھ چیزیں لکھی ہوئی تھیں۔جن کی مالیت بیس،تیس ہزار بنتی تھی۔ فہرست بناتے وقت انہوں نے ماسٹر صاحب کی حیثیت کو پیش نظر نہیں رکھا تھا۔نہ ہی عقل اور بخل سے کام لیا تھا۔

میں نے فہرست پڑھ کر اسے تہہ کیا اور مسکرا دیا۔”ان لوگوں نے شاید آپ کو کروڑ پتی سمجھ لیا ہے۔“ میں نے کہا۔”کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اس بہانے شادی نہ کرنا چاہتے ہوں......؟اس لئے وہ عزت سے کھیل رہے ہوں۔اس کی تہہ میں کون سا جذبہ کارفرما ہے آپ کو کچھ اندازہ ہوا؟“

”دراصل ان کی نظر میرے اس مکان پر ہے۔“ ماسٹر صاحب نے بتایا۔”یہ کارنر ہے۔دو ایک پارٹیوں نے پیشکش کی ہے۔اس کے دام سوا کروڑ روپے لگائے ہیں۔وہ میرے مکان کو خرید کر دس منزلہ پلازہ بنانے کے لئے بے چین ہیں۔جب کہ میں اس کے لئے تیار نہیں ہوں۔میں اپنا آبائی مکان کیوں بیچوں......اس کے دام سن کر لڑکے والوں کے منہ میں پانی آ گیا۔وہ چاہتے ہیں کہ مکان بیچ کر ان کے مطالبات پورے کردوں۔“

”ایسے لالچی لوگ ہیں تو آپ شادی سے انکار کیوں نہیں کر دیتے......؟“ میں نے کہا۔”اینٹ کا جواب پتھر سے دیں۔ان پر لعنت بھیجیں۔“

”ہماری بیٹی کی عزت کا سوال ہے۔“ماسٹر صاحب غم زدہ لہجے میں بولے۔”یہاں کا معاشرہ بڑا عجیب ہے۔کسی لڑکی کا رشتہ ٹوٹ جائے تو پھر اس کی شادی کا ہونا ناممکن ہو جاتا ہے۔میں سوچ رہا ہوں کہ ان کی بات مان لوں۔جانے کیوں دل نہیں مانتا۔میری بیوی تیار ہے۔لیکن قمر تیار نہیں ہے۔“

”اچھا تو آپ کے ہونے والے داماد کیا کرتے ہیں......؟“میں نے پوچھا۔”کیا وہ دولت مند گھرانا ہے جس سے اس کا تعلق ہے؟“

”وہ ایک کمپیوٹر بنانے والی کمپنی میں انجینئر ہے۔“ماسٹر صاحب نے جواب دیا۔”اس کی تنخواہ دس ہزار روپے ہے۔باپ کی کپڑے کی دکان ہے جس میں بڑا اور چھوٹا بیٹا ساتھ ہے اور پھر یہ لوگ دور کے رشتہ دار بھی ہیں۔“

اس وقت قمر نے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔”ابو لڑکے کے والد،دونوں بھائی،بہنیں اور والدہ اور ان کے چچا آ گئے ہیں۔“

قمر یہ کہہ کر انہیں لانے چلا گیا تو میں نے ماسٹر صاحب سے کہا۔”آپ لڑکے والوں سے کہیں کہ لین دین کے معاملے پر مجھ سے بات کریں۔“

تھوڑی دیر بعد مرد حضرات نشست گاہ میں آ گئے۔عورتیں دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔زلیخا اور جمیلہ اپنے کمرے میں۔ ماسٹر صاحب نے لڑکے والوں سے یہ کہہ کر میرا تعارف کرایا کہ کراچی میں ان کے جو بھائی ہیں میں ان کا بیٹا ہوں۔یہاں شادی میں شرکت کی غرض سے آیا ہوا ہوں۔

تھوڑی دیر بعد آپس میں رسمی انداز سے باتیں ہوتی رہیں۔لڑکے کا باپ اور چچا شکل سے ہی خبیث اور عیار دکھائی دیتے تھے۔لڑکے کا بڑا اور چھوٹا بھائی کاروباری خصلت کے تھے۔بڑے شاطر سے لگ رہے تھے۔چرب زبان بھی تھے۔اپنے آپ کو عقل کل سمجھ رہے تھے۔

”اچھا تو ماسٹر صاحب!“لڑکے کے باپ نے سیاسی موضوع سے ہٹ کر پوچھا۔”آپ کو فہرست تو مل گئی تھی نا......؟آپ نے کیا فیصلہ کیا؟“

”ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آپ کے تمام مطالبات مان لیں۔“میں نے ماسٹر صاحب کے بجائے جواب دیا۔ ”مزید کوئی مطالبہ رہ گیا ہو تو بتائیں۔“

ماسٹر صاحب اور قمر نے ایک دم سے چونک کر حیرت سے میری شکل دیکھی۔ وہ سناٹے میں آ گئے۔ میں نے ان سے نظریں نہیں ملائیں۔

"بیچ......" بیک وقت ان لوگوں کی زبان سے نکلا۔ پھر لڑکے کے باپ نے پوچھا۔ "کیا اس کے لئے آپ لوگ مکان بیچ رہے ہیں؟"

"مکان بیچیں یا نہ بیچیں یہ ہمارا مسئلہ ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم اس کے لئے قرض بھی تو لے سکتے ہیں۔ آپ لوگوں کو اس پر اعتراض تو نہیں؟"

"ہمیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے......؟" لڑکے کے چچا نے کہا۔ "ہمیں آم کھانے سے مطلب ہے۔ پیڑ گننے سے نہیں۔ آپ لوگوں نے اچھا فیصلہ کیا؟"

"ان مطالبات کے مقابلے میں ہمارے بھی دو مطالبات ہیں۔" میں نے کہا۔ "آپ وہ پورے کر دیں۔ ہم آپ کے تمام مطالبات پورے کر دیں گے۔"

"وہ کیا دو مطالبات ہیں......؟" لڑکے کے باپ نے پوچھا۔ "ہم اسے پورا کر دیں گے۔"

"مہر پانچ لاکھ روپے ہو گا جو رخصتی سے قبل ادا کر دیا جائے گا۔" میں نے کہا۔ "یہ ایک نمبر ہے۔ دوسرا یہ کہ لڑکی کو ایک اپارٹمنٹ منہ دکھائی میں دیں گے تاکہ یہ شادی نہایت خوشی اور خیر و برکت کا باعث ہو۔ دلہا، دلہن کی محبت میں اضافہ ہو گا۔"

"کیا کہا......؟ پانچ لاکھ روپے حق مہر......؟" لڑکے کے باپ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس کے ساتھ آنے والے چونک پڑے اور حیرت سے ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے...... پھر انہیں غصہ بھی آ گیا۔ لڑکے کا باپ بھنا کر بولا۔ "شرعی حق مہر بتیس روپے کا ہوتا ہے۔ ہم بتیس روپے رکھیں گے...... حضورؐ کے زمانے میں بتیس روپے حق مہر رکھا جاتا تھا۔ پانچ لاکھ روپے کا حق مہر زیادتی ہے۔"

پھر میں نے جیب سے ان کی دی ہوئی فہرست نکال کر ان کی نظروں کے سامنے لہرائی۔ "یہ مطالبات کیا شریعت کے مطابق ہیں...... سیدھی اور صاف سی بات یہ ہے کہ اسلام، شریعت اور اللہ رسول کی بات کرتے ہیں تو آپ کے علم میں ہو گا کہ ہمارے حضورؐ نے اپنی بیٹی کو جہیز میں کیا دیا تھا۔ شریعت کی بات اور دعویٰ کرتے ہیں تو اس پر عمل کریں...... دنیاوی بات ہے تو پھر ہمارے دو مطالبات پورے کریں ورنہ راستہ لیں...... ہماری لڑکی لاکھوں میں ایک ہے۔ پورے شہر میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گی۔ خدانخواستہ وہ کوئی لولی لنگڑی، معذور یا اپاہج نہیں ہے جو آپ سانپوں کی طرح اس کے ماں، باپ کو ڈسنے آئے ہیں...... تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ ہم آپ کا کوئی نیا مطالبہ پورا نہیں کریں گے۔ سنا آپ نے......؟"

وہ سب ایک دم غصے کی حالت میں کھڑے ہو گئے۔ لڑکے کا چچا رعونت سے بولا۔ "ہم بھی دیکھتے ہیں لڑکی کی شادی کیسے ہوتی ہے......؟"

پھر مرد اور ان کی عورتیں چلی گئیں تو بیگم بدرالنساء کمرے میں آ گئیں۔ وہ وحشت زدہ تھیں۔ "یہ کیا ہوا......؟ وہ چلے کیوں گئے......؟"

قمر نے اپنی ماں کو پوری روداد سنائی تو وہ بولیں۔ "یہ بہت برا ہوا۔ بیٹی کی ذات پر دھبہ آ جائے گا شادی نہ ہونے کی صورت میں...... خاندان رسوا ہو جائے گا...... انہیں جا کر منا کر لائیں۔ انہیں کسی نہ کسی طرح دو ایک مطالبات پر تیار کر لیتے ہیں۔"

"امی جان!...... جو کچھ ہوا ایک طرح سے بہت ہی اچھا ہوا۔" قمر نے کہا۔ "اللہ کی اس میں کوئی بہتری ہو گی...... یہ لوگ لالچی، خود غرض اور دولت پرست تھے۔ ہمارے پاس نو دس لاکھ کیا ایک لاکھ بھی نہیں ہیں۔ دس تولے سونے کے زیورات کا ایک سیٹ کیسے بناتے...... انہوں نے جو فہرست دی ہے وہ نوے لاکھ روپے کے برابر ہے...... زلیخا کی شادی کے لئے مکان بیچ دیں......؟ پھر کہاں رہیں......؟ جمیلہ کی بھی تو شادی کرنی ہے...... اس کے لئے کہاں سے رقم لائیں گے...... یہ لوگ تو ہمیں بھکاری بنانا چاہتے ہیں۔ اللہ نے بچا لیا۔ سکندر صاحب نے ان کی بولتی بند کر دی۔"

"قمر ٹھیک کہہ رہا ہے بیگم!" ماسٹر صاحب بولے۔ "ہمارے پاس اسی ہزار کی رقم موجود ہے اس میں شادی کرنا تھا...... کیسے کرتے...... ایمان داری کی بات ہے کہ میرا دل خود مکان فروخت کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اس کی اونچی بولی لگ رہی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اسے بیچ دیں۔"

"میں نے اس لئے آپ لوگوں سے کہا تھا کہ زلیخا کی شادی نجم پاشا سے اور جمیلہ کی شادی ساجد سے کر دیں۔" قمر بولا۔ "لیکن آپ نے میری ایک نہ سنی...... ان کے رشتے منظور نہیں کئے۔ دونوں لڑکے اچھے نیک اور برسر روزگار ہیں۔ ہم انہیں برسوں سے جانتے ہیں۔ وہ تو ایک جوڑے میں بھی بیاہ کر لے جانے کے لئے تیار تھے۔ آج کل ایسے باکردار لڑکے کہاں ملتے ہیں...... ہم نے ہیروں کی قدر نہیں کی۔ پتھر کو ہیرا سمجھ لیا......"

"اب تم نشتر زنی نہ کرو۔" بیگم بدرالنساء سینہ دبا کر بولیں۔ "میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ میری بیٹیوں کا کیا بنے گا......؟ ان کی کہیں شادی نہ ہو سکے گی۔ جو سنے گا کہ رشتہ ختم ہو گیا ہے دانتوں میں انگلیاں دبا لیں گے۔ تمہاری بیٹیوں پر کیچڑ اچھالیں گے۔"

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ نجم پاشا اور ساجد کے گھر والے آپ کی لڑکیوں سے شادی کے لئے تیار ہو جائیں......؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں بیٹے!" ماسٹر صاحب بولے۔ "یہ ناممکن سی بات ہے۔ ہم نے ان کا رشتہ قبول نہ کر کے ان کی بے عزتی کی ہے۔ ان کے تیار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"اگر میں ذاتی طور پر ان سے مل کر انہیں دونوں لڑکیوں سے شادی کرنے پر تیار کر لوں تو آپ لوگوں کو اعتراض تو نہ ہو گا؟" میں نے کہا۔

"اعتراض کس بات کا......؟" قمر بولا۔ "بہت خوشی ہو گی...... آپ کا یہ احسان ہم ساری زندگی نہ بھول سکیں گے۔ وہ شاید ہی تیار ہوں۔"

"آپ مجھے ان کے گھر کا پتہ بتا دیں...... میں ان سے مل کر خود ہی بات کروں گا۔" میں نے کہا۔

"خدا کی ذات سے ناامید نہیں ہونا چاہئے۔"

اتفاق سے یہ دونوں گھرانے محلے ہی میں موجود تھے...... میں جب قمر کے ہاں ان لڑکے والوں سے معاملات طے کر کے پہنچا تو رات کے دس بج رہے تھے۔ میں نے انہیں خوشخبری سنائی کہ وہ تین دن کے اندر شادی کرنا چاہتے ہیں۔ ماسٹر صاحب، قمر اور اس کی ماں خوش تو ہو گئیں لیکن ماسٹر صاحب بولے۔

"تین دن تو بہت کم وقت ہیں...... لیکن اس وقت تو صرف زلیخا کی شادی کی تیاری ہے۔ کل مجھے ایک جگہ سے پچاس ہزار روپے قرض ملے گا جو میں نے زلیخا کی شادی پر خرچ کرنے کے لئے ایک ماہ پہلے مانگا تھا۔ میرے پاس ایک لاکھ روپے تھے جو میں نے سونے کے زیورات، فرنیچر، برتن اور دیگر چیزوں پر خرچ کر دیئے۔ اس پچاس ہزار میں سے پچیس ہزار لڑکے کے جوڑے میں دینا تھا۔ جمیلہ کی شادی کے لئے کہاں سے لاؤں ڈیڑھ لاکھ روپے...... اور پھر تین دن میں تیاری کہاں سے ہوگی۔ جب کہ اس کی شادی کے لئے ایک جوڑا ابھی تیار نہیں ہے۔" ماسٹر صاحب بولے۔

"آپ اس کے لئے اس قدر پریشان ہو رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "آج دنیا کہاں سے کہاں جا چکی ہے...... تین گھنٹے کے نوٹس پر ہر چیز کا بندوبست ہو سکتا ہے۔ ریڈی میڈ ملبوسات کی ایک نہیں جانے کتنی دکانیں ہیں جن میں ہر سائز اور ہر طرح کا لباس مل جاتا ہے۔ اس کی خریداری کے لئے ایک گھنٹہ کافی ہے اور سونے کے زیورات کے سیٹ بھی مل جاتے ہیں۔ تین تولے سے لے کر دو سو تولے کے بھی...... فرنیچر اور برتن بھی دستیاب ہیں۔ پھر آپ پریشان کیوں ہو رہے ہیں۔"

"بیٹے! یہ سارا کھیل پیسے کا ہے۔" ماسٹر صاحب بولے۔ "پیسہ ہوتا تو کیا بات تھی اور پھر لڑکے کو جوڑے کی رقم بھی تو دینا ہوگی۔ تین دن میں شادی ناممکن ہے۔"

"دنیا میں کوئی بھی چیز ناممکن نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "قدرت کوئی نہ کوئی وسیلہ بنا دیتی ہے۔ خصوصاً لڑکیوں کی شادی کے معاملے میں...... میں دونوں لڑکوں کو جوڑے کی رقم دے آیا ہوں......" میں نے توقف کر کے جیب سے ایک لفافہ نکال کر ان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔" اس میں تین لاکھ کی رقم ہے۔ اب آپ جمیلہ کی شادی کی تیاری کریں۔ کل صبح ہوتے ہی سب سے پہلے شادی ہال بک کر کے شادی کے دعوت نامے چھپنے دیں۔ پھر ملبوسات کی خریداری، فرنیچر اور برتنوں کے......"

"بیٹے......!" ماسٹر صاحب بھونچکے سے ہو گئے۔ خواب کی سی حالت میں کھڑے مجھے دیکھنے لگے...... بیگم بدر النساء کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ قمر متاثر ہو گیا تھا لیکن اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا...... پھر میری نگاہ برابر والے کمرے کی طرف اٹھ گئیں۔ وہاں زلیخا اور جمیلہ کھڑی تھیں ان کی آنکھوں میں بھی آنسو لرزاں تھے۔ حیرت اور خوشی کے...... میرے جذبے پر ان کا دل بھر آیا تھا۔ وہ دونوں نجم پاشا اور ساجد سے محبت کرتی تھیں۔ "تین لاکھ کی رقم بہت بڑی ہے۔" بیگم بدر النساء کی آواز بھرا سی گئی۔ "رشتہ داروں میں کوئی تین ہزار کیا تین سو دینے کو تیار نہیں...... تم ایک اجنبی ہو۔ تم سے کوئی رشتہ ناتا نہیں...... اور پڑوسی ملک سے سیر و تفریح کے لئے آئے ہو۔ اتنی بڑی رقم جذباتی ہو کر دے رہے ہو؟ نہیں بیٹے...... نہیں......"

"اصل بات یہ ہے کہ دہلی میں میرے والد مرحوم کا ایک مکان اور تین دکانیں تھیں۔" میں نے مبالغے سے کام لیا۔ "مجھے ورثہ میں دس لاکھ کی رقم ملی۔ پاکستان میں میرے پاس کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ تین لاکھ روپے دے دینے سے مجھ پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مجھے بھی تو قمر سمجھ کر اسے قبول کر لیں۔"

ماسٹر صاحب کی آنکھیں بھر آئیں......

بیگم بدر النساء پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ خاصی دیر تک جذباتی فضا اور کیفیت سی رہی۔ پھر مجھے رات کے کھانے پر روک لیا گیا۔ اس وقت جب ہم چائے پی رہے تھے تب نجم پاشا کے گھر والوں نے قمر کے والدین کو بات چیت کرنے کے لئے بلایا تو وہ چلے گئے۔ قمر کا کوئی دوست اس سے ملنے آیا تو وہ باہر چلا گیا۔ اس کمرے میں صرف ہم تین رہ گئے۔ میں نے زلیخا سے کہا۔ "اللہ نے آخر تمہارا رشتہ نجم پاشا سے جوڑ دیا اور جمیلہ کا ساجد سے...... اللہ تم دونوں کا جوڑا سلامت رکھے...... مجھے دعاؤں میں یاد کر لیا کرنا...... میں تم لوگوں کے لئے دعا کرتا رہوں گا۔"

دونوں بہنیں، بہنوں کی طرح میرے گلے لگ کر رونے لگیں...... تھوڑی دیر بعد ماسٹر صاحب اور بیگم بدر النساء آ گئیں۔ وہ بولیں۔ "تم نے تین دن میں شادی پر زور کس لئے دیا ہے؟"

"اس لئے کہ ان لوگوں کو پتا چل سکے کہ رشتہ ٹوٹنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ لڑکیاں انمول ہیرا ہیں۔ ان کے لئے شہزادوں کی کمی نہیں ہے۔"

تیسرے دن زلیخا اور جمیلہ کی شادی روایتی انداز سے ہو گئی۔ میں جب نجم پاشا اور ساجد کے ہاں معاملات طے کرنے گیا تھا انہیں اعتماد میں لے کر دو، دو لاکھ کی رقم دے آیا تھا تا کہ وہ شادی کی تیاری کریں۔ اس رقم کی بدولت وہ تین دن میں شادی کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ وہ لوگ جن کا رشتہ زلیخا اور جمیلہ سے طے ہو کر ٹوٹا تھا انہیں یقین نہیں آیا تھا کہ دونوں بہنوں کی شادی تین دن میں شاندار طریقے سے ہو سکتی ہے۔ ان کے سینوں پر سانپ لوٹ گئے تھے۔ میں نے ان کی شادی کی خوشی میں سینکڑوں بھکاریوں اور مساکین کو کھانا کھلایا تھا۔ یہ شادی یادگار بن گئی تھی۔

☆......☆......☆

میں ولیمے کے دوسرے دن الور شہر کی طرف نکل گیا الور بنگلور کے مضافات میں تھا۔ وہاں ایک میلہ لگا ہوا تھا۔ قمر نے بتایا تھا ہر سال وہاں میلہ لگتا ہے۔ اس میلے میں بڑی رونق رہتی ہے۔ الور میں مسلمانوں کی خاصی بڑی آبادی ہے۔ وہاں ایک پیر کا مزار ہے مجھے مزاروں سے کوئی دلچسپی نہ تھی تاہم میں ان کا احترام کرتا تھا۔ اس موضوع پر میں کسی سے بحث و تکرار نہیں کرتا تھا اور نہ ہی الجھتا تھا۔ اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔

الور سے چار میل پہلے بس کا انجن خراب ہو گیا۔ مسافر اس ہوٹل میں گھس گئے جو چند قدم پر تھا۔ اس بس میں کل چالیس سے زائد مسافر تھے۔ مسافروں کو کسی اور بس میں اس لئے نہیں بٹھایا جا سکتا تھا کہ جو بھی بس آ رہی تھی اور الور کی طرف جا رہی تھی بھری ہوئی تھی۔ ڈرائیور نے کہا کہ اس کے ٹھیک ہونے میں ایک گھنٹہ لگ جائے گا۔ مسافر اتنی دیر میں دوپہر کا کھانا کھا لیں۔ ان مسافروں سے ہوٹل بھر گیا۔ یہ چھپر ہوٹل

تھا۔اس میں ایک میز اور کرسی بھی خالی نہ تھی۔ مجھے بھوک بھی نہیں تھی۔کیوں کہ میں نے دیر سے ناشتا کیا ہوا تھا۔چار میل کا فاصلہ ہوتا ہی کتنا ہے۔میں چل پڑا۔میں غائب ہو کر ایک پل میں پہنچ سکتا تھا۔لیکن اس لئے پیدل چل پڑا کہ وہ راستہ جس گاؤں سے ہو کر گزرتا تھا وہ بڑا خوبصورت تھا۔اس میں پکے مکانات، تھانے، اسکول اور سرکاری دفاتر کی عمارتوں کے علاوہ ایک بڑی حویلی بھی نظر آرہی تھی۔ کچے پکے مکانات جو چھوٹے چھوٹے تھے وہ سب سے زیادہ تھے اور چار سمتوں میں پھیلے ہوئے تھے۔اس کے علاوہ ایک مندر بھی دکھائی دیا۔اس کا مطلب یہ تھا کہ اس گاؤں میں مسلمانوں کی آبادی نہیں تھی ورنہ مسجد ضرور ہوتی۔

میں پکی سڑک کے بجائے بیچ راستے سے گزرنے لگا۔میں ایک کھیت سے گزر کر ایک باغ سے گزرنے لگا جو آم کا تھا۔یہ ویران اور سنسان پڑا تھا۔میں ادھر ادھر دیکھتا جا رہا تھا کہ میرے کانوں میں دور سے ایک لرزتی ہوئی سی آواز گونجی۔”پانی......پانی......پانی......“ یہ مردانہ آواز تھی۔

میں چلتے چلتے ٹھٹک کے رک گیا۔اتفاق سے میں نے ایک فلاسک لیا ہوا تھا جس میں منرل واٹر بھرا تھا۔قمر نے ہی مجھے فلاسک میں پانی بھر کے لے جانے کے لئے کہا تھا۔میں نے آواز کی سمت دیکھا۔کوئی تیس، چالیس قدم پر ایک درخت کے نیچے جوٹی کا ڈھیر تھا اس پر ایک جوان لڑکا جس کی عمر اٹھارہ، بیس کے درمیان ہوگی وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔پیاس کی شدت سے بے تاب ہو کر تڑپ رہا تھا۔پیاس کی وجہ سے موت سے قریب ہو رہا تھا۔

میں تیزی سے اس کی جانب لپکا۔پھر میں نے فلاسک کے گلاس میں پانی بھرا جو ٹھنڈا تھا۔پھر میں نے اسے سہارا دے کر پانی پلایا تو جیسے اس کی جان میں جان آئی۔وہ نڈھال سا ہو کر مٹی کے ڈھیر پر لیٹ گیا۔پھر اس نے ایک لمبا سانس لیا اور آنکھیں بند کرلیں۔ میں نے اسے ایک گلاس پانی اور پلایا۔ دوسرے گلاس پانی سے اس کی توانائی لوٹ آئی۔پھر وہ متوحش نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔اس کے چہرے پر خوف ابھر آیا۔”کیا بات ہے تم بہت ہراساں ہو رہے ہو......؟“میں نے اس سے پوچھا۔” کیا کوئی بدمعاش تمہارے تعاقب میں ہے؟“میں نے ادھر ادھر دیکھا۔

”پہلے آپ یہ بتائیں کہ آپ ہیں کون......؟“اس نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھا اور سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔اس کی سانسیں ابھی پوری طرح بحال نہیں ہوئی تھیں اور اس کے چہرے پر خوف اور زردی تھی۔وہ بہت بری طرح دہشت زدہ تھا اور اس کی نگاہیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

”میں ایک مسافر ہوں اور میں الور کے بسنتی میلے میں شرکت کے لئے جا رہا تھا کہ راستے میں ہوٹل سنگرام کے سامنے بس خراب ہوگئی۔“میں نے کہا۔”لہٰذا میں پیدل ہی الور کی طرف چل پڑا۔کیوں کہ بس کے ٹھیک ہونے میں ایک ڈیڑھ گھنٹہ لگے گا۔میں یہاں سے گزر رہا تھا کہ تمہاری آواز سن کر چلا آیا۔“

”آپ نے مجھ پر بڑی دیا کی ہے۔“وہ ممنونیت سے بولا۔”بھگوان بھی آپ پر دیا کرے گا۔آپ میرے دیوتا بن کر آئے۔پانی پلا کر مجھے ایک نئی زندگی دی۔“

”میں نے تم پر کوئی دیا نہیں کی بلکہ ایک انسان کی طرح اپنا فرض ادا کیا۔“میں نے کہا۔”اگر میری

جگہ ہوتے تو کیا تم مجھے پانی نہیں پلاتے......؟“

اس نے مجھے ایک لحظہ کے لئے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔پھر اس نے کہا۔”کیا آپ مجھے اپنا نام بتائیں گے......؟“

”کیوں نہیں......؟“میں مسکرایا۔”میرا نام سکندر ہے اور میں بنگلور سے آرہا ہوں۔“

”میرا اندازہ درست نکلا۔“اس نے کہا۔”کہ آپ مسلمان ہیں۔ہندو نہیں ہیں۔آپ کی وضع قطع بتاتی ہے کہ آپ مسلمان ہیں اور چہرے مہرے سے بھی لگتا ہے۔“

”اب بتاؤ کہ بات کیا ہے؟“میں نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔”مجھ سے ڈرنے اور خوف کھانے ضرورت نہیں۔میں ایک سیاح ہوں۔“

”پولیس کے دو سپاہی کوئی تین گھنٹے سے مسلسل میرے تعاقب میں ہیں؟“اس نے جواب دیا۔پھر اس نے بیٹھے بیٹھے چاروں طرف گھوم کر دیکھا۔

”کیا تم کوئی جرم کر کے بھاگے ہو......؟“میں نے کہا۔”اگر تم نے واقعی کوئی سنگین جرم کیا ہے تو پھر اپنے آپ کو قانون کے حوالے کردو۔کیوں کہ مجرم کبھی قانون کے ہاتھ سے بچ نہیں سکتا......اس کے آہنی ہاتھ اسے جکڑ لیتے ہیں۔خود کو قانون کے حوالے کرنے سے عدالت اس کی سزا میں کچھ رعایت برتتی ہے۔“

”میرا جرم یہ ہے کہ میں نچلی ذات کا ہندو ہوں۔“لڑکا کہنے لگا۔”میں پہلے آپ کو اپنا نام بتادوں۔ میرا نام پرساد ہے۔آپ جانتے ہیں کہ برہمن اور اونچی ذات کے ہندو ہم ہریجنوں کو کتنی نفرت اور حقارت سے دیکھتے ہیں۔وہ ہمیں اچھوت سمجھتے ہیں۔ہم ان کی نظروں میں پاپی ہیں۔میں آپ کو بتادوں کہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا......کوئی پاپ نہیں کیا......آپ مسلمانوں میں یہ بڑی اچھی بات ہے کہ ہندوؤں کی طرح ذات پات نہیں ہے۔فرقے ضرور ہیں۔طبقے ہیں۔کچھ اونچ نیچ ہے۔سید، شیخ، انصاری، ملک اور جانے کیا کیا خاندان ہیں۔ان تمام باتوں اور فرق کے باوجود ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔شادی بیاہ کی تقریبات میں شرکت کرتے ہیں۔لیکن ہم ہندوؤں میں ایسا نہیں ہوتا ہے۔نہ کبھی ہو سکتا ہے...... ہندوستان نے ہر شعبے میں کتنی زبردست اور انقلابی ترقی کی ہے اور یہ دنیا کے بڑے، ترقی یافتہ اور عظیم ملکوں میں شمار ہونے لگا ہے۔لیکن ذات پات کی تفریق کو ختم نہیں کر سکا اور نہ ہی کبھی کر سکے گا۔

یہاں سے ایک میل کے فاصلے پر چک بالاپور ایک قصبہ ہے جو اس باغ کے باہر سے جنوب کی سمت دکھائی دیتا ہے۔میں وہاں رہتا ہوں۔ہم نچلی ذات کے ہندوؤں کے وہاں بہت سارے مکانات بھی ہیں۔اونچی ذات کے ہندو بھی ہیں۔وہاں ایک بہت بڑی حویلی ہے۔وہ ٹھاکر رام داس کی ہے۔

سب سے پہلے آپ کو ٹھاکر رام داس کے بارے میں بتادوں۔کیوں کہ وہی فساد کی جڑ ہے۔ٹھاکر برہمن ذات کا ہے۔اس کے دو بڑے لڑکے ہیں جو شادی شدہ ہیں۔دو بیٹیاں ہیں۔بڑی بیٹی کی تین برس پہلے شادی ہو چکی ہے۔اس کے دو بچے ہیں۔وہ گھر جوائی ہے۔ٹھاکر کی چھوٹی بیٹی نروپا اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ گئی۔چار برسوں کے بعد واپس آئی۔امریکہ جا کر اس کی سوچ، مزاج اور نظریات میں بڑا فرق آیا۔

وہاں کی آزاد فضا میں اس نے جو کچھ سیکھا وہ یہ تھا کہ ہر انسان برابر ہے۔ کوئی چھوٹا ہے نا بڑا۔ انسان تو کیا جانور کو بھی حقیر اور فقیر نہیں سمجھنا چاہئے۔

شکنتلا کی عمر بائیس، تیئس برس کی ہے۔ وہ بہت حسین ہے۔ اتنی حسین ہے کہ اس کے حسن کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ میرے بھیا ارجن بنگلور سے ایم اے پاس کر کے گھر آئے ہوئے تھے۔ وہ بہت خوبصورت ہیں۔ قصہ کہانیوں کے راج کمار کی طرح...... انہیں اتنا خوب صورت بھگوان نے بنایا۔ اس طرح میری ایک بہن پاربتی بھی بہت خوبصورت ہے۔ ہمارے گھر کی عورتوں اور مردوں کی خوبصورتی نے برہمن ذات والوں کو جلا کر خاک کر دیا۔ میرے پتاجی بھی بہت خوبصورت ہیں۔

ایک بار میری ماں کسی کام سے حویلی گئی تو ٹھاکر رام داس کی آنکھوں میں میل آ گیا۔ مگر میری ماں کسی نہ کسی طرح اپنی عزت بچا کر آ گئی۔ ٹھاکر نے میری ماں کو رام کرنے کے لئے لالچ بھی دیا اور ڈرایا دھمکایا بھی تھا، لیکن عورت کی عزت عورت کو بہت پیاری ہوتی ہے۔ ماں نے اس کے منہ پر ایک تھپڑ بھی دے مارا جس نے ٹھاکر کو آگ بگولہ کر دیا ایک نچلی ذات کی عورت کی یہ مجال کہ اس کے منہ پر تھپڑ دے مارے۔ وہ اس روز سے میری ماں کے پیچھے پڑ گیا کہ اپنے دل کا ارمان پورا کر کے رہے گا۔ لیکن اسے موقع نہ مل سکا۔ وہ اپنے آپ کو اس طرح بچاتی رہی کہ جیسے آدمی اپنے آپ کو ایک بھیڑیے سے بچاتا ہے۔ ٹھاکر کی بیوی بھی میری ماں کی خوبصورتی سے جلتی ہے۔ اس نے ایک بار اپنی ایک نورانی کو پیسے اور تیزاب کی بوتل دے کر کہا کہ میری ماں کے چہرے پر پھینک دے لیکن وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکی۔ ٹھاکرانی اس لئے میری ماں سے جلتی اور خوفزدہ ہے کہ کہیں ٹھاکر میری ماں سے تعلقات قائم نہ کر لے۔

یہ تمام باتیں تو بتانے کی نہیں ہیں لیکن اس لئے بتا رہا ہوں کہ گاؤں میں سبھی جانتے ہیں۔ نروپا ایک روز شام کے وقت سیر کے لئے نکل گئی۔ میرے بھیا بھی جنگل شکار کھیلنے گئے ہوئے تھے۔ نروپا کی چیخیں سن کر وہ وہاں پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ نروپا کی جان خطرے میں ہے۔ ایک درندہ اس پر حملہ کرنے والا ہے۔ بھیا نے جان پر کھیل کر نروپا کی جان بچالی اور اس درندے کو ہلاک کر دیا۔ ان کی اس بہادری نے نروپا کا دل جیت لیا۔ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔ ان کا بیاہ اور دلوں کا ملاپ ہو نہیں سکتا تھا کیوں کہ ان کے درمیان ذات پات کا فرق تھا۔ نروپا لاکھ آزاد خیال سہی آخر برہمن تھی۔ بھیا نچلی ذات کے اور اچھوت چوں کہ محبت اندھی ہوتی ہے۔ اس نے ذات پات نہیں دیکھی۔ ایک روز بھیا کسی کام سے بنگلور گئے۔ دس دنوں کے بعد یعنی تین دن پہلے گاؤں میں دو چٹھیاں آئیں۔ ایک چٹھی ٹھاکر کے نام جوان کی بیٹی نروپا نے لکھی تھی۔ دوسری چٹھی میرے پتاجی کے نام جو بھیا نے لکھی تھی۔ نروپا بھابھی...... میں انہیں بھابھی ہی کہوں گا۔ انہوں نے اپنے پتاجی کو لکھا کہ میں نے ارجن ناتھ سے اپنی خوشی سے دہلی کی عدالت میں سول میرج کر لی ہے۔ کوئی سات دن قبل ہم دونوں ہنی مون منانے ایک پر فضا مقام پر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ دنیا بہت آگے جا چکی ہے۔ سوائے ہندوستان اور ہندوؤں کے ذات پات کی تفریق اور اونچ نیچ کہیں نہیں رہی ہے۔ لہٰذا ہم دونوں کے اس بندھن کو دل سے سوئیکار کر لیں۔ ہم دونوں

ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ ہمیں دنیا کا کوئی قانون اور طاقت ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتی۔ ہم دونوں ہنی مون بنانے کے بعد ہندوستان سے باہر یورپ چلے جائیں گے۔"

بھیا نے اپنی چٹھی میں یہ لکھا تھا کہ میں نے ٹھاکر کی بیٹی نروپا سے شادی کر لی ہے۔ وہ اب آپ کی بہو ہے۔ ہم کسی دن رات کے اندھیرے میں ملنے آئیں گے۔ آشیرواد لینے کے لئے۔ ٹھاکر صاحب کو غصہ تو بہت آئے گا۔ لیکن کسی دن ٹھنڈا ہو جائے گا۔

ٹھاکر کو جب اپنی بیٹی کا خط ملا تو حویلی میں ایک بھونچال سا آ گیا۔ اس نے اپنی بندوق اٹھالی تا کہ میرے گھر والوں کو خون میں نہلا کر موت کی نیند سلا دیا جائے لیکن اس کی بیوی اور گھر جوائی اور بہو نے سمجھایا کہ وہ ایسی حماقت نہ کرے۔ اس طرح ایک نہ ایک دن اسے گرفتار کر کے پھانسی کے تختے پر چڑھا دیا جائے گا۔ انہیں ایسی عبرتناک سزا دی جائے کہ وہ ذلیل ہو جائیں اور دنیا والوں کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں۔ ذلت و رسوائی کا داغ انہیں مرتے دم تک کرب اور درد دیتا رہے۔

یہ بات ٹھاکر کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ ہمارے ہاں دندناتا ہوا آیا اور اس نے میری ماں اور میرے گھر والوں کو خوب گالیاں دیں۔ میرے پتاجی پر ہاتھ بھی اٹھایا۔ پھر چلا گیا۔ آج صبح اس نے پنچایت بٹھائی جو اونچی ذات کے ہندوؤں کی تھی۔ وہاں ہم نیچی ذات کے ہندوؤں کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ لیکن میں پہنچ گیا۔ پھر میں ایسی جگہ چھپ گیا جہاں مجھے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن میں سب کو دیکھ اور ان کی باتیں سن سکتا تھا۔ وہ لوگ ہمارے خلاف منصوبے بناتے رہے۔ وہاں اور بھی برہمن ذات کے تھے۔ آخر پنچایت نے یہ فیصلہ دیا کہ میری ماں اور جوان بہن کو برہنہ کر کے گاؤں میں گھمایا جائے۔ پھر انہیں حویلی لے جایا جائے جہاں ٹھاکر اس کے دونوں بیٹے اور گھر جوائی ماں اور بہن کی عزت کو پامال کریں۔ پھر انہیں گاؤں کی چوپال پر لے جائیں۔ گھر کی عورتیں ان کے جسموں پر تیزاب چھڑکیں۔ اس لڑکے کے گھر والوں اور ان کی عورتوں کو اپنے حسن پر بڑا ناز ہے۔ ان کا غرور خاک میں ملا دینا چاہئے۔ ان کے ساتھ کوئی نرمی اور رعایت نہ برتی جائے۔ اس ملیچھ نے نروپا سے شادی کر کے ہم سب کی بے عزتی کی ہے۔

میں یہ سن کر کانپ اٹھا۔ میری ماں اور بہن کو دنیا والوں کے سامنے بے لباس گھمایا جائے گا۔

پنچایت کے ایک آدمی نے ٹھاکر کو مشورہ دیا کہ وہ ابھی اور اسی وقت تھانے جا کر انسپکٹر سے بات کرے اور اعتماد میں لے کہ وہ ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرے۔ پھر اس کی مٹھی گرم کر دے۔ پھر ٹھاکر، اس کے دونوں بیٹے اور گھر جوائی تھانے پہنچے۔ ٹھاکر نے انسپکٹر کی طرف لفافہ بڑھا کر کہا کہ وہ کیوں اور کس لئے آیا ہے۔ پھر اس نے بتایا کہ وہ کل کیا کرنے والے ہیں......

انسپکٹر اور ٹھاکر کی باتیں سن کر میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میں انسپکٹر کے کمرے کی وہ کھڑکی جو احاطے میں کھلتی تھی۔ وہاں کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ میں گھوم کر آیا اور انسپکٹر کے کمرے میں گھس گیا اور دہلیز کے پاس کھڑے ہو کر نفرت اور غصہ بھرے لہجے میں کہا۔ "ذلیل، کمینے انسان...... تم انسپکٹر ہو کہ ڈاکو...... میں نے تم سب کی ساری باتیں سن لی ہیں۔ میں بنگلور جا کر پولیس کمشنر

اور پریس کو بتاؤں گا کہ تم لوگ میری ماں اور بہن کے ساتھ کیا کرنے والے ہو...... اب یہ بدمعاش اور قانون کی بے حرمتی نہیں چلے گی۔ تم سب اندر رہو جاؤ گے۔" یہ سنتے ہی انسپکٹر چلایا۔ اس لڑکے کو پکڑلو......" دو سپاہی میری طرف مجھے دبوچنے کے لئے لپکے تو میں نے انہیں اتنے زور سے دھکا دیا کہ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکے اور ان کے سر دیوار سے ٹکرائے اور وہ گر پڑے۔ میں نے فوراً ہی اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ احاطے کی دیوار پھاند کر دوسری طرف کودا اور دوڑنے لگا۔ کچھ دور جانے کے بعد میں نے پلٹ کر دیکھا اور انہیں تعاقب میں آتے دیکھا۔ پھر میں کسی نہ کسی طرح ان کی نظروں سے بچ کر یہاں آ نکلا۔"

"اب تمہارے کیا ارادے ہیں......؟" میں نے پوچھا۔ "کیا تم بنگلور جاؤ گے...... پولیس کے اعلیٰ حکام سے ملو گے؟ پریس سے رابطہ کرو گے؟"

"جی ہاں......" اس نے سر ہلایا۔ "اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ اگر میں نہیں گیا تو پھر میری ماں اور بہن کی عزت محفوظ نہیں رہے گی۔"

ایک جوان لڑکا تیزی سے ہماری طرف آتا دکھائی دیا۔ پرساد نے کہا۔ "یہ میرا دوست شیام ہے۔ شاید وہ کوئی خبر لایا ہے۔"

شیام ہمارے پاس آ کر رکا تو اس کی سانسیں پھول رہی تھیں۔ کیوں کہ وہ بہت دور سے دوڑتا ہوا آیا تھا۔ اس نے سانسوں پر قابو پانے کے بعد کہا۔ "تمہارے گھر پر ٹھاکر نے اپنے مسلح آدمیوں کا پہرہ لگا دیا ہے...... باہر کسی کو نکلنے کی اجازت نہیں ہے...... پولیس اور ٹھاکر کے آدمی تمہیں تلاش کر رہے ہیں بس کے اڈوں پر بسوں کی تلاشی لی جا رہی ہے اور وہاں پر پولیس والوں کو کھڑا کر دیا ہے۔ انسپکٹر کا خیال ہے کہ تم گاؤں میں چھپے ہوئے ہو۔ اس لئے ہماری برادری کے ایک، ایک گھر کی تلاشی لی جائے گی۔ تم ایسا کرو کہ اپنے آپ کو پولیس والوں کے حوالے کر دو۔ اس طرح ہم سب ایک بڑی مصیبت سے بچ جائیں گے۔"

"میں اپنے آپ کو ان کے حوالے تو کر دوں......" پرساد نے کہا۔ "لیکن پولیس والے مار مار کر میرا بھرکس نکال دیں گے۔ میں شاید زندہ نہیں بچ سکوں گا...... خیر کوئی بات نہیں...... میں اپنی عورتوں کی عزت کے لئے اپنی زندگی کا دان دوں گا۔ چلو......"

"ایک منٹ ٹھہرو......" میں نے کہا۔ "شیام! پرساد کو لے جا کر کل صبح تک کہیں چھپا دو...... کل ایک بڑا عجیب و غریب تماشا ہوگا۔ تم دونوں دیکھنا...... میں گاؤں جا رہا ہوں پولیس اور ٹھاکر کے آدمیوں سے میں نمٹ لوں گا۔ تمہاری برادری کی عورتوں اور لڑکیوں پر آنچ اور کوئی مصیبت نہیں آئے گی۔ گھر بھی محفوظ رہیں گے...... خوف زدہ ہونے اور پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔"

"کیا تماشا......؟ کون سا تماشا؟" شیام اور پرساد کی زبان سے بے اختیار نکلا۔

"کل ٹھاکر اپنی طاقت دکھائے گا اور میں اسے اپنا کمال دکھاؤں گا...... اسے ایسا سبق دوں گا کہ وہ بھی مرتے دم تک یاد رکھے گا۔" میں نے کہا۔

"آپ کریں گے کیا......؟" پرساد نے پوچھا۔ "آپ ہیں کیا جو ٹھاکر اور پولیس سے نمٹ لیں

گے......؟"

"یہ تو میں تمہیں کل ہی بتاؤں گا اور تمہیں کل ہی پتا چلے گا......" میں نے کہا۔ "کوشش کرنا کہ کل صبح تک چھپے رہو۔ اچھا یہ بتاؤ کہ گاؤں میں تمہارا بدترین دشمن کون ہے۔ جس نے تمہیں بہت تنگ اور پریشان کیا۔ اور پیٹا ہو۔ تم اس سے بدلہ نہیں لے سکے؟"

"ٹھاکر کے بڑے بیٹے کا سالا تلسی رام...... جو میرا ہی ہم عمر ہے۔ وہ ہماری ذات کے لڑکوں کا بدترین دشمن ہے۔ اس نے مجھے اور شیام کو ٹھاکر کے آدمیوں سے صرف اس لئے پٹوایا تھا کہ ہم نے اس کی ایک بات ماننے سے انکار کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ہم اس کے جوتے صاف کریں۔ اس بری طرح پٹوایا تھا کہ ہم دونوں پورے چھ گھنٹے تک بے ہوش رہے تھے۔"

"اچھا اب تم دونوں جلدی سے جاؤ۔" میں نے کہا۔ "کہیں ایسا نہ ہو کہ پولیس گھروں کی تلاشی لینے نکل کھڑی ہو۔ پولیس تمہیں اور شیام کو دیکھ لے۔"

وہ دونوں مشرق کی سمت لپک گئے۔ میں اس گاؤں میں داخل ہو گیا۔ اس وقت پولیس کی ایک بھاری نفری نچلی ذات کے ہندوؤں کے گھروں کا محاصرہ کرنے اور تلاشی لینے کے لئے تھانے سے نکل رہی تھی۔ انہیں پرساد کی تلاش تھی۔ انسپکٹر اور حاکم بھی ڈر گیا تھا۔ میں نے حویلی کے باہر کھڑے ہو کر اس طرف منہ کر کے ایک منتر پڑھ کر پھونکا۔ چند لمحوں کے بعد تلسی رام حویلی سے باہر آ گیا۔ وہ شکل و صورت سے ہی بڑا کمینہ لگ رہا تھا۔ اس وقت دو پولیس کی گاڑیاں آتی دکھائی دیں۔ تلسی رام سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر دیکھنے لگا۔ پہلی گاڑی میں سپاہیوں کے ساتھ ٹھاکر، اس کے دونوں بیٹے اور انسپکٹر بھی تھا۔ پیچھے جو ٹرک آ رہا تھا اس میں پولیس کے تیس آدمی بھرے ہوئے تھے۔ انسپکٹر نے گاڑی روک لی۔ کیوں کہ ٹھاکر ہذیانی انداز میں تلسی رام کی طرف دیکھ کر چیخا۔ "یہ رہا پرساد! حرام زادہ یہاں کس مزے سے کھڑا ہوا ہے۔"

میں نے تلسی رام کو پرساد کا ہم شکل بنا دیا تھا۔ چند لمحوں کے بعد ٹھاکر، اس کے دونوں بیٹے اور انسپکٹر اس پر ٹوٹ پڑے تھے۔ دونوں طرف سے جوتوں اور گھونسوں کی بارش اس پر ہونے لگی تھی۔ وہ چلا رہا تھا۔ "میں پرساد نہیں ہوں...... تلسی ہوں...... تلسی رام ہوں......" لیکن اس بات کا کوئی یقین نہیں کر رہا تھا۔

"یہ حرامی لاتیں اور جوتے کھا کر بھی کہہ رہا ہے کہ میں پرساد نہیں تلسی رام ہوں۔" ٹھاکر نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "بڑا سخت جان اور ڈھیٹ ہے۔"

"یہ نچلی ذات کے بڑے حرامی ہوتے ہیں۔" ٹھاکر کے بڑے بیٹے نے ایک لات تلسی رام کی کمر پر رسید کی۔ "ان سے نرمی نہیں کرنا چاہئے۔"

"واقعی یہ تو بڑا ہی ڈھیٹ اور سخت جان ہے۔" انسپکٹر نے کہا۔ "اتنی پٹائی اگر کسی پیشہ ور مجرم کی ہو جائے تو اس کے بارہ بج جائیں۔ اس نے جرم نہیں کیا ہے بھی تو جرم کا اقرار کر لے۔ ہم جو کہیں وہ کہے، دن کو رات، رات کو دن...... پتا نہیں کیا کھاتے ہیں، سالے کو دیکھو۔ کیسا تندرست و توانا اور جان دار ہے۔ گینڈے کی طرح...... کوئی بات نہیں...... تھانے لے جا کر اس کی مزاج پرسی کی جائے گی تو پھر وہ

پرساد، پرساد کہے گا۔"

تلسی رام پر نیم بے ہوشی طاری تھی۔ وہ ادھ موا ہو چکا تھا۔ اس میں اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ ہل جل سکے۔ اس کی ناک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کی ہڈی پسلیاں ایک ہو چکی تھیں۔ وہ بے ہوشی کی حالت میں کراہ رہا تھا اور زمین پر منہ کے بل لیٹا ہوا پڑا تھا۔ حویلی کی بالکنی میں ٹھاکرانی اس کی بیٹی اور دونوں بہوئیں کھڑی ہوئی یہ سارا تماشا دیکھ رہی اور خوش بھی ہو رہی تھیں۔ ادھر ٹھاکر، گھر جوائی اور دونوں بیٹے بھی...... دوسری طرف نچلی ذات کے لوگ بھی ایک طرف خاموشی سے کھڑے ہوئے یہ ظلم وستم اور بربریت کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ ان کے دل خون کے آنسو رو رہے تھے۔ ان سے یہ سب کچھ دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ وہ بے بس اور مجبور تھے۔ اس ظلم کے خلاف آواز نہیں اٹھا سکتے تھے۔ احتجاج نہیں کر سکتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جس نے بھی احتجاج کیا اس کا حشر اس سے بھی برا ہوگا۔ غریب ہونا کتنا بڑا جرم ہے۔ بد نصیبی ہے۔ آخر انہیں اس بچے پر رحم کیوں نہیں آتا۔ یہ ایک نوجوان لڑکا ہے۔ اس کی عمر ہی کیا ہے۔ یہ انسان ہے۔ کوئی حیوان نہیں۔ شاید جوان کے ساتھ بھی ایسا بے رحمانہ سلوک نہیں کیا جاتا۔ آخر ایسا کب تک ہوتا رہے گا۔ یہ انسپکٹر بھی اس لڑکے کو کس بربریت سے مار رہا ہے۔ لوگ سوچ رہے تھے۔

"کیا انہیں اس بات کا کوئی احساس نہیں ہو رہا ہے کہ یہ بچہ بے ہوش ہو گیا ہے۔" ایک بوڑھے شخص نے کہا۔ "کیا انہیں اس کے درد اور تکلیف کا کوئی احساس نہیں ہو رہا ہے۔ اگر کوئی ان کے بچے کو اس طرح مارے تو کیا وہ یہ برداشت کر سکیں گے......؟ یہ انیائے ہے۔ انیائے......" اس کی آواز بھرا گئی۔

"اس وقت تک رہے گا جب تک کوئی ایسا دیوتا...... اوتار آکاش سے نہیں آ جاتا۔" دوسرے بوڑھے نے کہا۔ "یہ انیائے تم اور میں بچپن سے دیکھتے چلے آ رہے ہیں۔ ہماری ان آنکھوں نے کیا کچھ نہیں دیکھا؟ جو کچھ دیکھا وہ دل پر نقش ہو چکا ہے۔ ہم بھول سکتے ہیں نہ اسے کھرچ سکتے ہیں۔"

"ٹھاکرانی بھی کھڑی کس مزے سے اس طرح یہ سب کچھ دیکھ رہی ہے جیسے کوئی تماشا ہو۔" ایک عورت بولی۔ "آخر وہ بھی تو عورت ہے۔ کیا اس میں ممتا نہیں ہے۔ ہر عورت میں جو ممتا ہوتی ہے وہ صرف اپنے بچے کے لئے نہیں ہوتی ہے۔ ہر بچے کے لئے ہوتی ہے۔ لگتا ہے یہ کوئی چڑیل ہے۔"

"اری آہستہ بول۔" دوسری عورت نے اسے سرگوشی کے انداز میں ٹوکا۔ "ٹھاکر کے آدمیوں نے سن لیا تو پھر سب کے سامنے تیری عزت لٹ جائے گی۔ کیا تجھے اپنی جان اور عزت پیاری نہیں ہے؟"

"اری اوراگنی......" ایک عورت نے پاس کھڑی عورت سے پوچھا۔ اس کے لہجے میں دکھ بھرا تھا۔ "کیا تو بتا سکتی ہے کہ پرساد کو کیوں اتنی بے دردی سے مارا گیا ہے۔ وہ بے ہوش ہو گیا ہے۔ کہیں وہ مر نہ جائے۔ اس کا جرم کیا ہے۔ اس کی حالت دیکھ کر میرے دل کو ہول آ رہا ہے۔"

"میں نے تو صرف اتنا سنا ہے کہ پرساد نے تھانے میں ٹھاکر اور انسپکٹر کو کسی بات پر گالیاں دی تھیں۔" وہ بتانے لگی۔ "اس لئے کہ اس کے بھائی نے ٹھاکر کی بیٹی سے شادی کر لی۔ ٹھاکرانی کا کہنا ہے کہ پرساد کے بھائی ارجن نے اس کی بیٹی پر جادو ٹونا کر کے پہلے تو اس کی عزت سے کھیلا۔ اس کی بیٹی نے جب دیکھا کہ اس

کی عزت لٹ چکی اور وہ کسی کے لائق نہیں رہی تو پھر اس نے لٹیرے سے شادی کر لی اور کیا کرتی۔"

"دیدی! یہ سب جھوٹ ہے اور یہ بات ٹھاکرانی نے پھیلائی ہے۔" ایک جوان عورت نے سرگوشی میں بڑی آہستگی سے کہا۔ "ارجن بھیا! ایسے نہیں ہیں وہ کیسے ہیں یہ ہم سب جانتے ہیں ٹھاکرانی کی بیٹی خود ارجن بھیا پر مرمٹی تھی۔ اس لئے کہ ایک روز ارجن بھیا نے اس کی جان جنگل میں بچائی تھی۔ ایسا ہونا لازمی تھا اور پھر ارجن بھیا ہیں کیسے خوب صورت پیارے...... اسی لئے وہ انہیں دل دے بیٹھی۔"

"نروپا بھی بہت پیاری ہی نہیں بلکہ نرم مزاج کی سیدھی سادی سی ہے۔" ایک اور عورت نے کہا۔ "امریکہ سے پڑھ کر آنے کے بعد اس نے ذات پات کو ماننا بند کر دیا۔ ایک روز وہ میری ساس سے ملنے اور دیکھنے آئی تھی۔ کیوں کہ میرا پتی حویلی میں مالی ہے۔ وہ ہمارے ہاں آئی تو اس نے چائے پی تھی جو میں نے بنائی تھی۔ سوجی کا حلوہ بھی کھایا تھا۔ بھگوان نے اسے دیوی بنایا ہے۔ اس کی تو پرستش کرنا چاہئے۔"

"ارجن بھیا کا اور اس کا بہترین جوڑ ہے۔" ایک اور عورت نے کہا۔ "بھگوان سے میری پرارتھنا ہے کہ وہ سدا سکھی رہے اس پر کوئی مصیبت نہ آئے۔"

"یہ تو بہت اچھا ہوا کہ ٹھاکر نے پرساد کے ماں باپ اور بہن کو گھر میں بند کیا ہوا ہے۔" ایک بوڑھی عورت بولی۔ "اگر اس کی ماں اپنے بیٹے پر یہ انیائے دیکھ لیتی تو اس کا کلیجہ پھٹ جاتا ہم عورتوں کا یہ حال ہے تو اس کا کیا نہیں ہو جاتا......"

"اری یہ باتیں اور کھسر پھسر بند کرو۔" ایک عورت نے تیز لہجے میں بولی۔ "دیکھو ذرا سامنے دیکھو...... یہ دیکھو پولیس والے اب کیا کرتے ہیں؟" صرف ٹھاکر ہی نہیں بلکہ اس کے جوائی، ٹھاکرانی، دونوں بیٹوں اور ان کی پتنیوں نے بھی باری باری پرساد کے پاس جا کر اس پر تھوکا، لاتیں ماریں، جو منہ کے بل زمین پر پڑا خاک چاٹ رہا تھا اور کراہنے لگا تھا۔ اسے جیسے ہوش آنے لگا۔ اپنی سب سے زیادہ نفرت اور غصے کا اظہار ٹھاکر اور ٹھاکرانی نے کیا تھا۔ ٹھاکر نے اس کے سر اور گردن پر پیر رکھ کر دبایا اور زور سے دو تین لاتیں بھی ماری تھیں۔ پھر اس کے سر کے بال پکڑ کر اتنے زور سے زمین پر دے مارا تھا کہ اس کا ماتھا پھٹ کر خون بہہ نکلا اور وہ پھر بے ہوش ہو گیا۔ ٹھاکرانی نے زمین پر پڑا ہوا ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر اس کی کمر میں پوری قوت سے دے مارا تھا۔ ان کا بس چلتا تو وہ اسے قتل بھی کر دیتے۔ انہوں نے اسے جان سے مار دینے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ لیکن وہ زندہ تھا۔ اگر اس پر تشدد کا یہ سلسلہ جاری رہتا تو پھر وہ مر جاتا۔

انسپکٹر کے ذہن میں ایک آوارہ سا خیال آیا کہ وہ پرساد کو تھانے لے جا کر حوالات میں کیوں نہ بند کر دے۔ پھر اس کی حسین و جمیل ماں کو بلا کر اس کے بیٹے کی حالت دکھائے۔ ممتا تڑپ اٹھے گی۔ وہ اپنے بیٹے کی سلامتی کے لئے اس کی ہر بات مان لے گی۔ یہ سوچ کر وہ ٹھاکر سے بولا۔ "ٹھاکر صاحب! میں اس حرام زادے کو تھانے لے جا رہا ہوں تا کہ اسے ہوش میں لا کر روایتی میزبانی کروں...... ایسی میزبانی جس سے شیطان بھی پناہ مانگتا ہے۔ وہ مر گیا تو ہم اس کی لاش چوپال پر پھینک دیں گے۔"

"آپ ایسا ہی کریں انسپکٹر!" وہ پرساد کو حقارت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ کتے کا

بچہ جتنا تڑپ تڑپ کر مرجائے اتنا ہی اچھا ہے...... وہ کتا ارجن بھی مل جائے تو میں اس کا اس سے بھی برا حشر کروں گا۔"

"آپ چنتا نہ کریں ٹھاکر صاحب!" انسپکٹر نے دلاسا دیا۔ "میرے ذہن میں ایک تدبیر ہے۔ آپ اپنی بیٹی اور ارجن کو معافی دینے کے بہانے سے بلائیں...... وہ آجائیں گے۔ پھر اس کمینے ارجن کو میرے حوالے کر دیں، دیکھیں میں کیا کرتا ہوں۔"

"ہاں...... ہاں......" ٹھاکر خوش ہو گیا۔ "تم نے کیا لاجواب تدبیر سوچی ہے۔ ہم پھر بات کریں گے۔ اس کتے کے بچے کو لے جاؤ۔"

انسپکٹر پرساد کے پاس گیا۔ اس کے سر کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر کھڑا کیا اور دو سپاہیوں نے بڑھ کر اسے دونوں طرف سے پکڑ لیا۔ اس کے چہرے پر ماتھے کے زخم کا خون لکیروں کی صورت میں بکھرا ہوا تھا۔ میں نے اسے تلسی رام بنا دیا۔ اب وہ پرساد نہ تھا۔ ٹھاکرانی جو اسے پرساد سمجھ کر اس کے منہ پر تھوکنے جا رہی تھی ایک دم سے ٹھٹک کے رک گئی۔ "تلسی! میرا بیٹا......"

پھر وہ ٹھاکر کی طرف گھومی۔ "یہ پرساد نہیں...... یہ میرا بیٹا تلسی ہے۔" وہ ہذیانی لہجے میں چیخی۔

"تلسی ہے......؟" ٹھاکر آگے بڑھا۔ اسے ایک لمحے کے لئے یقین نہیں آیا۔ "ہاں...... ہاں...... یہ تلسی ہے۔ میرا بیٹا تلسی......"

"لیکن...... یہ کیسے ہو سکتا ہے......؟" بڑے بیٹے نے قریب آ کر کہا۔ "ہاں یہ تو تلسی ہے۔" وہ بری طرح چکرا گیا۔

"میرے لال......" ٹھاکرانی نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ وہ سسک پڑی۔ پھر وہ ساڑھی کے پلو سے اس کا چہرہ پونچھنے لگی۔

"ہم سب کی نظریں دھوکا کیسے کھا گئیں......؟" انسپکٹر بھونچکا ہو کر بولا۔ "کیا میں آپ کے بیٹے کو نہیں پہچانتا...... اور آپ لوگ......"

"میں بتاتا ہوں کیا بات ہوئی۔" گھر جوائی تیزی سے درمیان میں بولا۔ "اس کی پرساد سے خاصی مشابہت ہے اور ان کی عمریں بھی ایک ہیں۔ نفرت اور غصے میں ٹھاکر صاحب کو کچھ سجھائی نہیں دیا۔ انسپکٹر صاحب اور ہم سب لوگوں کو بھی...... ہم نے جلد بازی کی۔"

"باتیں بند کرو......" ٹھاکر غرایا۔ "جلدی سے گاڑی نکالو۔ میرے بیٹے کو اسپتال لے جاؤ۔ ورنہ یہ مر جائے گا۔"

"میرا بیٹا...... میرا لال......" ٹھاکرانی رو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ وہ اسے بے تحاشا چوم رہی تھی۔ "یہ ہم سب نے مل کر کیا کیا......؟ ہم نے تمہیں موت کے کنارے پہنچا دیا۔ ہائے بھگوان...... میرے لال، میرے بیٹے۔" وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ بین کر رہی تھی۔ سینہ کوبی کرنے لگی۔ گھر جوائی گاڑی لانے دوڑ گیا تھا۔ دونوں بیٹوں نے تلسی رام کو سنبھال لیا۔ ادھر انسپکٹر ابھی

تک سکتے کی سی حالت میں کھڑا ہوا تھا۔ ٹھاکر کو اس بات پر غصہ آ رہا تھا کہ پرساد کے بجائے تلسی رام کی درگت بن گئی۔ حشر نشر ہو گیا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ پرساد کو وہ گولی مار دے گا۔

جوائی موٹر لے آیا۔ تلسی رام کو پچھلی نشست پر لٹا دیا۔ آگے کی نشست پر اسٹیئرنگ پر بڑا بیٹا اور تلسی رام کی بڑی بہن بیٹھ گئی۔ گھر جوائی جیپ نکال لایا تھا۔ اس میں گھر کی عورتیں بیٹھ گئیں۔ ٹھاکرانی کی حالت بہت خراب ہو رہی تھی۔ اس کی بہوئیں اسے سمجھا رہی تھیں۔

وہ غریب لوگ جو حیرت، دکھ اور غم زدہ سا ہو کر تماشہ جو ظلم و ستم اور پرتشدد تھا دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہرے زرد پڑے ہوئے تھے۔ سفید ہوتے چلے گئے تھے جیسے ان کا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔ کیوں کہ وہ سب پرساد سے پیار کرتے تھے۔ بہت چاہتے تھے۔ اچھا لڑکا تھا۔ سب کے کام آتا تھا۔ اس نے کبھی ان کے کسی کام کرنے سے انکار نہیں کیا تھا اور پھر یہ کہ وہ ان کی برادری کا تھا۔ اچانک جو منظر بدلا اور انہوں نے پرساد کے بجائے تلسی رام کو دیکھا تو پہلے انہیں یقین نہیں آیا۔ جب یقین آیا تو ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ لیکن وہ اپنی خوشی کا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔ کیوں کہ ٹھاکر اور انسپکٹر کھڑے ہوئے تھے۔ بہت سارے سپاہی بھی موجود تھے۔ ٹھاکر اور انسپکٹر باتیں کر رہے تھے۔ ایک عورت نے سرگوشی میں کہا۔

"ٹھاکرانی نے اپنے بیٹے کی درگت دیکھی تو ممتا تڑپ اٹھی۔ بھگوان نے کیسی اسے سزا دی۔"

"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا ہے کہ یہ تلسی رام پرساد کیسے بن گیا؟" دوسری عورت نے کہا۔ "ہم تو اسے پرساد ہی سمجھ رہے تھے۔"

"یہ بھگوان کی لیلا ہے۔" ایک بوڑھی عورت بولی۔ "اس نے تلسی رام کو پرساد اس لئے بنا دیا کہ اسے سزا مل جائے۔ وہ کمینہ کون سا اچھا ہے۔ اس نے ایک روز پرساد کو کیسا مارا تھا اور پھر جب اس نے میری نوجوان پوتی سے بدتمیزی کی تھی ہم صبر کر کے بیٹھ گئے۔ اس کی ماں کے پاس شکایت لے کر جاتے تو وہ اسے آوارہ اور بدچلن کہتی۔ پھر اس کی عزت کسی کے ہاتھ برباد کروا دیتی...... یہ اچھا ہی ہوا کہ میری پوتی عزت بچا کر لے آئی اور پھر ہمارے مردوں اور لڑکوں کو غلام بنا رکھا تھا۔"

"میری آتما کتنی خوش ہوئی میں بتا نہیں سکتی۔" دوسری عورت بولی۔ "تلسی رام کا بڑا ٹھیک ٹھاک حشر ہوا۔ اس کے گھر والوں کو جو تکلیف پہنچی اس نے میرا رواں رواں خوش کر دیا۔ بھگوان ٹھاکر اور اس کے پورے خاندان کو تباہ کر دے تو مجھے بڑی خوشی ہو گی۔"

ادھر انسپکٹر سپاہیوں سے کہہ رہا تھا۔ "کتے کا بچہ پرساد یہیں کہیں چھپا ہوا ہو گا۔ تم لوگ جا کر گھروں کی تلاشی لو...... ان کے ہاں جتنا زیور اور پیسہ ملے ایک جگہ جمع کر کے لیتے آنا۔"

ان غریب بے چاروں نے اور بدنصیبوں نے انسپکٹر کا حکم سن لیا تو ایک ہڑبونگ اور افراتفری سی مچ گئی ان میں...... وہ سب سر پر پیر رکھ کر گھروں کی طرف بھاگے لیکن ان میں صرف ایک بوڑھا شخص کھڑا رہ گیا۔ وہ اپنے گھر جانے کے بجائے انسپکٹر اور ٹھاکر کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر ان دونوں کو نمسکار کیا اور کہا۔ "پرساد کے گھر والوں نے جو کچھ کیا اس کی سزا ہم سب غریبوں کو کیوں دیتے ہو۔ میں بھگوان کی سوگند

کھا کر کہتا ہوں کہ پرساد یہاں نہیں ہے۔ وہ شاید بنگلور چلا گیا ہے یا پھر کہیں چھپا ہوگا۔ اسے تلاش کرو۔"

"او بڈھے...... تیری یہ ہمت اور تیری یہ مجال کہ ہمیں حکم دے۔" انسپکٹر نے اس کے منہ پر ایک الٹا ہاتھ رسید کیا۔ وہ غریب اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا۔ زمین پر گر گیا۔ لیکن اگلے لمحے وہ کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

"سرکار! میری کیا مجال کہ میں کوئی حکم دوں۔" بوڑھے شخص نے لجاحت سے کہا تو اس کی آواز بھرا رہی تھی۔ "آپ ضرور تلاشی لے لیں۔ لیکن آپ سے ایک پرارتھنا ہے کہ ان غریبوں کا مال اور عورتوں اور لڑکیوں کی عزت نہ لوٹیں۔ ہم غریبوں کے پاس عزت ہی تو......"

"رامو......" انسپکٹر نے بوڑھے سے کچھ کہنے کے بجائے قریب کھڑے سپاہی کو مخاطب کیا۔ "کیا تم اسے اور اس کا گھر جانتے ہو؟"

"یہ نریش بابا ہے۔" اس سپاہی نے جواب دیا۔ "اسے کون نہیں جانتا ہے۔ میں اس کا گھر جانتا ہوں۔ تالاب کے پاس اس کا مکان ہے۔"

"کیا اس بڈھے کے گھر میں جوان لڑکیاں اور عورتیں ہیں؟" انسپکٹر نے سوال کیا۔ "تم نے اس کے گھر کی عورتوں کو دیکھا بھی ہے؟"

"کیوں نہیں صاحب!" سپاہی نے سر ہلایا۔ "اس کی بہو تو چالیس برس کی ہے۔ اس کی دو پوتیاں ہیں۔ ایک چودہ برس اور دوسری سولہ برس کی...... اس کی بڑی پوتی کی شادی آئندہ ماہ ہونے والی ہے۔ چھوٹی کی منگنی ہو چکی ہے اس کا بیاہ آئندہ برس ہوگا۔"

"عمریں تو بہت ہی اچھی ہیں۔" انسپکٹر کی کسی بھیڑیئے کی طرح رال ٹپک پڑی۔ "لیکن وہ شکل و صورت کی کیسی ہیں......؟"

"بڑی سندر ہیں۔" سپاہی نے بتایا۔ "اس لئے تو ان کی شادی اتنی جلدی ہو رہی ہے۔ پڑھی لکھی بھی ہیں دونوں......"

"ایسا کرنا...... جب تلاشی لے چکو تو ان دونوں کو ساتھ لے کر آ جانا...... پھر اس نے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ وہ کسی فوج کی طرح اس بستی پر حملہ آور ہونے کے لئے تیزی سے بڑھے۔ پرساد کی تلاش ایک بہانہ تھا۔ وہ تو عورتوں اور لڑکیوں کی عزت اور مال و زر لوٹنے کا سپنا لے کر دھاوا بولنے والے تھے۔ پھر ٹھاکر اور انسپکٹر حویلی کی طرف بڑھ گئے۔ میں نے دیکھا ادھر کوئی نہ تھا۔ ویرانی اور سناٹا تھا۔ میں جواب تک سب کی نظروں سے غائب تھا ظاہر ہو گیا۔ پھر اس بوڑھے کی طرف بڑھا جو درد سے تڑپ رہا اور بچوں کی طرح رو رہا تھا۔

"بابا!" میں نے اٹھا کر بٹھایا۔ پھر فلاسک اس کی طرف بڑھایا۔ "لو پانی پی لو۔ روؤ نہیں بابا۔ رونے سے کچھ نہیں ہوتا ہے۔"

"تم کون ہو بیٹے!......" بابا نے چونک کر مجھے دیکھا۔ وہ اپنا غم اور درد بھول کر مجھے دیکھنے لگا۔ "تم پانی پلانے کے بجائے زہر کھلا دو۔"

"میں ایک سیاح ہوں بابا!" میں نے جواب دیا۔ "میں میلے میں جا رہا تھا۔ تمہیں دیکھ کر ادھر چلا آیا...... زہر کس لئے کھانا چاہتے ہو؟"

"زہر کس لئے کھایا جاتا ہے؟" نریش بابا نے کہا۔ "مرنے کے لئے...... میں خودکشی کرنا چاہتا ہوں تاکہ میری آتما کو شانتی ملے۔"

"تم کس لئے مرنا اور خودکشی کرنا چاہتے ہو بابا!" میں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "کیا کوئی بہت بڑی مصیبت آن پڑی ہے؟"

"اس لئے کہ انسپکٹر میری دو جوان پوتیوں کی عزت سے کھیلنا چاہتا ہے۔" وہ کہنے لگا۔ پھر اس نے مجھے مختصر طور پر پرساد کی کہانی سنائی اور بتایا کہ ابھی ابھی ہماری بستی پر پولیس کے سپاہی دھاوا بولنے جا رہے ہیں۔ "وہ دیکھو......" اس نے بستی کی سمت اشارہ کیا۔

سپاہی بڑے جارحانہ انداز سے جاتے دکھائی دیئے۔ میں نے کہا۔ "نریش بابا! شانتی رکھو۔ میری بات کا یقین کرو۔ اس بستی اور اس بستی کی کسی لڑکی اور عورت کی عزت پر نہ کوئی آنچ آئے گی اور نہ ہی ان کے مال و زر کو وہ لے جا سکیں گے......"

نریش بابا کو میری بات کا یقین نہیں آیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ میں کوئی پاگل، خبطی سیاح ہوں۔ میں نے اسے ایک درخت کے نیچے ایک بڑے پتھر پر بٹھا دیا۔ یہ درخت اس کی بستی کے باہر تھا۔ وہ یہاں سے ان سپاہیوں کی کارروائی دیکھ سکتا تھا۔

میں نے ان سپاہیوں کو ایک طرح سے حیران و ششدر اور پاگل سا کر دیا تھا۔ اگر یہ کھیل جو میں نے ان کے ساتھ کھیلا تھا کسی فلم میں پیش کیا جائے تو تماشائی بڑے محظوظ ہو سکتے ہیں۔ جب وہ دو دو کی ٹولی بنا کر گھروں میں گھسے تو انہیں یقین نہیں آیا۔ وہ عورتوں کی بے حرمتی پہلے کرنا چاہتے تھے۔ جوان عورتیں اتنی بوڑھی، بے کشش اور مکروہ صورت کی سی دکھائی دینے لگیں کہ ان کے قریب جانے اور انہیں چھونے کی ہمت نہیں ہوئی۔ پھر انہوں نے رقم اور زیور کے لئے صندوق اور الماریاں کھول کر دیکھیں۔ زیور جھینگر بنے ہوئے تھے اور رقم کاغذ کے ٹکڑے اور سکے پتھروں میں تبدیل ہو گئے۔ یہ ہر ٹولی کے ساتھ ہوا تھا۔ انہیں ایک بھی لڑکی اور عورت نظر نہیں آئی جسے وہ آلودہ کر سکیں اور نہ ہی انہیں مال ہاتھ لگ سکا۔ کوئی ایک گھنٹے تک وہ حیران و پریشان سے ہو کر کارروائی کرتے رہے۔ جب وہ نریش بابا کے گھر میں گھسے تو اس کی دونوں پوتیوں کو چیچک نکلی ہوئی تھی۔ ایک سپاہی نے حویلی جا کر انسپکٹر کو اس بستی کا احوال سنایا تو اسے یقین نہیں آیا۔ وہ دندناتا اور غصے میں بھرا ہوا آیا۔ پھر اس نے ایک ایک گھر میں گھس کر خود عورتوں کو دیکھا اور تلاشی لی، اسے کچھ نہ ملا، ان عورتوں میں ایک عورت بھی اسے اچھی نہیں لگی۔ جب وہ نریش بابا کے گھر میں گھسا تو اس کی پوتیوں کے چیچک دیکھ کر فوراً ہی باہر آ گیا۔

سوچ سوچ کر اس کا دماغ چکرایا اور یقین نہیں آیا کہ آخر یہ سب کیا ہے۔ سب سے پہلا واقعہ تلسی رام کا پیش آیا تھا جس پر پرساد کا دھوکا ہوا تھا۔ اس دھوکے میں نہ صرف اس نے بلکہ تلسی رام کے گھر والوں

نے تلسی رام کو مار مار کر نہ صرف اس کی ہڈی پسلی ایک کر دی بلکہ اس کا بھرتہ بنا دیا تھا۔ اب اس بستی کی تمام لڑکیاں اور عورتیں بدصورت اور مکروہ سی دکھائی دی تھیں۔ کسی ایک کے گھر سے ایک تولہ زیور اور دس کا نوٹ بھی نہیں نکلا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ ان لوگوں نے رقم اور زیور ایسی جگہ چھپا دیا ہے کہ ہاتھ نہ لگ سکے۔

خیر کوئی بات نہیں...... وہ سوچنے لگا۔ کل جب پرساد کی ماں اور اس کی جوان بہن کو گاؤں والوں کے سامنے بے لباس کرنے اور گھمانے کے بعد جب حویلی لے جائے گا تو ٹھاکر اور اس کے بیٹے اور گھر جوائی ماں بیٹی کو بے عزت کرنے کے بعد جب گھر کی عورتیں ان دونوں پر تیزاب پھینک دیں گی تب وہ ان اچھوتوں کی بستی میں آگ لگا دے گا۔ پھر ان کا مال اسباب جل کر راکھ بن جائے گا۔

میں نے نریش بابا کو بستی کی طرف جانے نہیں دیا۔ اسے اس وقت تک روکے رکھا جب تک انسپکٹر اور تمام سپاہی بستی سے نکل کر تھانے کی طرف چل نہیں دیئے۔ وہ سب بڑے مایوس اور دل برداشتہ تھے۔

ان کے جانے کے بعد لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکل آئے تھے۔ مرد اور عورتیں ایک دوسرے سے پوچھ رہی تھیں۔ کچھ ہوا تو نہیں...... عزت اور زیور اور پیسہ محفوظ رہا کہ نہیں...... جب انہوں نے سنا کہ وہ کچھ نہیں ہوا جس کی توقع تھی تو بہت حیرت اور خوشی ہوئی تھی یقین بھی نہ آتا تھا۔ انہیں اس بات کا احساس نہیں ہو سکا تھا کہ ان کی شکلیں اور روپ کیسے ہو گئے تھے جس سے سپاہی متنفر ہو گئے اور ان کی رقم اور زیور سپاہیوں کو کیڑے مکوڑے لگے تھے۔ انہیں ایسا لگا کہ انہوں نے ایک خواب دیکھا تھا۔

”نریش بابا! اٹھو چلو......“ میں نے کہا۔ ”میں تمہیں گھر پہنچا دوں...... وہ دیکھو، وہ لٹیرے جا چکے ہیں۔ اب ان کا سایہ بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔“

”معلوم نہیں ان لٹیروں نے میری پوتیوں کا کیا حشر کیا ہوگا؟“ نریش بابا نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ ”میرا دل اندر سے روئے جا رہا ہے۔“

”ان پر کوئی آنچ نہیں آئی ہے اور نہ ہی بستی کی کسی لڑکی اور عورت پر بھی...... باقی سب خیریت سے ہیں۔ چلو چل کر دیکھ لو۔“

میں نریش بابا کو ساتھ لے کر اس کے گھر پہنچا۔ لوگ سبھی اپنے اپنے گھروں میں چلے گئے تھے۔ باہر کوئی نہیں تھا۔ ایک سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔ وہ لپک کر اپنے گھر میں گھس گیا۔ جب اس نے اپنی بہو اور پوتیوں اور پتنی کو ٹھیک ٹھاک دیکھا تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اسے یہ دیکھ اور جان کر خوشی ہوئی کہ پولیس والوں نے لوٹ مار نہیں کی۔ صرف تلاشی لی تو اسے اور خوشی ہوئی۔ میں نے اس کے باہر آنے کا انتظار نہیں کیا۔ وہاں سے چلا آیا۔ کیوں کہ اب وہاں میرا کوئی کام نہیں تھا مجھے جو کچھ کرنا تھا وہ میں نے کر دیا تھا۔

میں پرساد کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اس کے گھر کے چاروں طرف بڑا سخت پہرہ تھا۔ مسلح سپاہی اور ٹھاکر کے آدمی کھڑے تھے۔ وہ ادھر سے کسی کو گزرنے بھی نہیں دے رہے تھے۔ جب میں وہاں سے گزرنے لگا تو مجھے ڈانٹ کر بھگا دیا۔ میں ایک ایسی جگہ آ گیا جہاں کوئی نہ تھا۔ ان کی نظروں سے غائب ہو کر ایک پل میں پرساد کے گھر میں حاضر ہو گیا۔ ایک کمرے میں پرساد کے گھر والے پریشان اور متفکر

بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھوں سے خوف و ہراس جھانک رہا تھا۔ چہروں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ انہیں اس خیال نے دہشت زدہ کر رکھا تھا کہ کل انہیں بے لباس کر کے سارے گاؤں میں گھمایا جائے گا۔ ماں بیٹی کی عزت سے کھیلا جائے گا۔ ٹھاکر کے گھر کی عورتیں ان کے جسموں پر تیزاب پھینکیں گی۔ یہ بات انہیں بتا دی گئی تھی۔ اس لئے وہ لرزاں تھے اور انہیں پرساد کی بھی فکر اور پریشانی تھی۔ اس کی کوئی خبر انہیں نہ تھی۔

میری آہٹ سن کر انہوں نے میری طرف دیکھا اور اچھل پڑے۔ ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور چہروں پر استعجاب چھا گیا۔ وہ مجھے ٹھاکر کا آدمی اس لئے سمجھے تھے کہ کوئی اور اندر نہیں آ سکتا تھا۔ اس خیال نے خوف زدہ کر دیا تھا کہ جانے میں کس لئے اور کیوں آیا ہوں۔

”آپ کون ہیں؟“ پرساد کے باپ نے لرزیدہ آواز میں پوچھا۔ ”کیا آپ کو ٹھاکر نے بھیجا ہے؟“

”میں ایک سیاح آدمی ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ٹھاکر کیوں اور کس لئے مجھے آپ لوگوں کے پاس بھیجے گا؟“

”لیکن آپ اندر آئے کیسے......؟“ پرساد کا باپ حیرت سے بولا۔ وہ قدرے مشکوک بھی ہو رہا تھا۔ پرساد کی ماں اور اس کی بہن بھی۔ ”باہر بڑا سخت پہرہ ہے۔ آگے اور پیچھے کے دروازے بند کر کے باہر سے نہ صرف کنڈی لگا دی گئی ہے بلکہ تالے بھی ڈال دیئے گئے ہیں۔ ایسے سخت پہرے میں کسی کا مکان میں داخل ہو جانا تو دور کی بات ہے چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی۔ صرف ٹھاکر اس کا کوئی آدمی یا انسپکٹر ہی اندر آ سکتا ہے۔“

”میں اندر کس طرح آ گیا......؟ بس آ گیا۔ اپنی ذہانت سے ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر، دیوار پھاند کر۔“ میں نے کہا۔

”لیکن آپ اندر آ تو گئے لیکن باہر نہیں جا سکیں گے۔“ پرساد کی ماں نے کہا۔ اس کی آواز میں کرب اور دکھ بھرا تھا۔ ”ان لوگوں نے کہا ہوا ہے کہ ہم میں سے کسی نے فرار ہونے کی کوشش کی تو گولی مار دی جائے گی۔ بیٹا یہ تو بتاؤ کہ تم اپنی جان خطرے میں ڈال کر آئے کیوں؟“ پرساد کی ماں نے پوچھا۔ ”ایک تو تم اس گاؤں کے نہیں ہو۔ تمہیں پہلی بار دیکھ رہے ہیں اور پھر سیاح ہو۔ ہم سے تمہارا کیا رشتہ تعلق ہو سکتا ہے۔“

”پرساد نے مجھے بھیجا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”آپ لوگ مجھے اپنا خیر خواہ اور دوست سمجھیں۔ آپ کا دشمن میرا دشمن ہے...... انسانیت کے ناتے آپ لوگوں سے میرا رشتہ ناتا ہے۔ میں اس لئے بھی آیا ہوں کہ آپ لوگوں کی مدد کروں۔ ظالموں اور ان کے ظلم سے بچاؤں۔“

”پرساد نے بھیجا ہے......؟ میرے بیٹے نے بھیجا ہے......؟“ پرساد کی ماں ہیجانی لہجے میں کہنے لگی۔ ”جلدی سے بتاؤ میرا بیٹا کہاں ہے......؟ میرا پرساد کہاں ہے......؟ وہ خیریت سے تو ہے نا......؟ اسے کچھ ہوا تو نہیں نا......؟ وہ تم سے کب ملا تھا؟“ اس نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

”میری اس سے دوپہر کے وقت ایک باغ میں ملاقات ہوئی تھی۔“ میں نے بتایا۔ ”وہ پولیس سے بچ کر بھاگ نکلا تھا۔ پولیس اور ٹھاکر کے آدمی اسے تلاش کر رہے تھے۔ اس کے خون کے پیاسے ہیں۔ ابھی بھی اسے بڑی سرگرمی سے تلاش کیا جا رہا ہے۔“

"کیا اس نے کسی کو قتل کر دیا جو اس کی سرگرمی سے تلاش کی جا رہی ہے؟" پرساد کا باپ تحیر زدہ لہجے میں بولا۔ "وہ ارجن کی شادی کا بدلہ نہ صرف ہم سے بلکہ اس سے بھی لینا چاہتے ہیں۔ ہم نے ایسا کون سا قصور کیا۔ قصور تو ٹھاکر کی بیٹی کا بھی ہے جو اس نے میرے بیٹے سے محبت کی شادی کی...... معلوم نہیں یہ ٹھاکر اور انسپکٹر کیا سزا دینا چاہتے ہیں؟ ہمیں جو مکان میں بند کر دیا گیا۔ ہمیں کچھ خبر نہیں۔"

"میں آپ کو بتاتا ہوں جو مجھے پرساد نے بتایا۔" میں نے کہا۔ "ذرا دل مضبوط کر کے سنیں۔ ٹھاکر اور انسپکٹر کے کیا ارادے ہیں۔ پرساد کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ اس نے انسپکٹر اور ٹھاکر کی ساری گفتگو اور منصوبہ نہ صرف سنا بلکہ دھمکی دی کہ وہ بنگلور جا کر پولیس کو بتائے گا۔ اس دھمکی نے انہیں پرساد کا جانی دشمن بنا دیا۔ انسپکٹر نے اپنے آدمیوں کو یہ حکم بھی دیا ہوا ہے کہ پرساد جہاں کہیں نظر آئے اسے شوٹ کر دیا جائے۔"

پھر میں نے انسپکٹر اور ٹھاکر کی ساری گفتگو اور مذموم منصوبہ بتا دیا جو پرساد نے مجھے بتا دیا تھا۔ وہ تینوں یہ سن کر سناٹے میں آ گئے۔ ان پر چند لمحوں تک ایسا سکتہ چھایا رہا جیسے کوئی بجلی سی آ گری ہو۔ پھر پرساد کی بہن اور ماں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ پرساد کے پتا جی کی حالت بھی غیر ہونے لگی۔ ان کا چہرہ سفید دھلی چادر کی طرح ہو گیا۔ پھر وہ بھی رو پڑے۔ "آپ لوگ میری بات سنیں اور رونا بند کریں۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "رونے سے کچھ حاصل نہیں ہے۔ رونے کے بجائے اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ اس ذلت و رسوائی سے کس طرح بچا جا سکتا ہے؟ کیا صورت اور تدبیر ہو سکتی ہے؟"

"کوئی صورت اور ایسی تدبیر نہیں ہے جو اس شیطان کے ہاتھوں سے بچا جا سکے۔" پرساد کی ماں غم زدہ لہجے میں کہنے لگی۔ "اس سے بڑا خبیث یہ حرام زادہ، کمینہ اور رذیل پولیس انسپکٹر ہے۔ ٹھاکر اور یہ ہم دونوں کے بدترین دشمن ہیں۔ میں کیا بتاؤں۔ کیا کہوں۔ یہ بات چھپانے کی نہیں ہے۔ بیٹی بھی جانتی ہے۔ پتی بھی جانتے ہیں۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ وہ دونوں ہی میری عزت و آبرو کے دشمن ہیں۔ اس کے حصول میں برسوں سے درپے ہیں۔ میں ان زہریلے ناگوں سے کسی نہ کسی طرح بچتی اور بچاتی رہی لیکن اب نہ بچ سکوں گی۔"

"آپ بھگوان پر بھروسا رکھیں۔" میں نے اسے دلاسا دیا۔ "وہ اب بھی ان ناگوں سے بچا لے گا۔ آپ پر آنچ نہیں آئے گی۔"

"بھگوان غریبوں کا، اچھوتوں کا نہیں ہوتا ہے۔" وہ جذباتی لہجے میں کہنے لگی۔ "اس نے کبھی مظلوم اور ستم زدہ لوگوں پر دیا نہیں کی اور پھر یہ پہلی بار نہیں ہو گا کہ ماں اور اس کی جوان بیٹی کو بے لباس کر کے سارے گاؤں میں گھمایا جائے گا۔ حویلی لے جا کر اس کی عزت سے کھیلنے کے بعد اس حویلی کی عورتیں چہرے اور بے لباس بدن پر تیزاب چھڑک دیں گی۔ کل ہمارے ساتھ ایسا ہو گا تو اس گاؤں میں بیس برسوں میں چوتھا واقعہ ہو گا۔ چار برس پہلے ایک ایسا ہی واقعہ ہاری کی بیوی اور جوان بیٹی کے ساتھ پیش آ چکا ہے۔ ٹھاکر کے بڑے بیٹے نے ہاری کی بیوی کو میلا کیا تو اس کا پتی پولیس کے پاس چلا گیا۔ پھر کیا تھا ماں بیٹی کی شامت آ گئی۔ پھر ماں بیٹی نے سنکھیا کھا کر اس اذیت ناک اور بھیانک زندگی سے نجات

پالی۔ ٹھاکر کے خلاف کوئی کارروائی نہ ہو سکی۔" پھر وہ زار و قطار رونے لگی۔ پرساد کی بہن ابھی بھی روئے جا رہی تھی۔ پرساد کی بہن کی آنکھوں میں آنسو مجھ سے دیکھے نہیں جا رہے تھے۔ میں اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اس کے آنسو اپنے رومال میں جذب کرتے ہوئے بولا۔

"کل یہ کہانی دہرائی نہیں جائے گی اور نہ پھر کبھی۔" میں اسے دلاسا دینے لگا۔ "تم کسی بات کی چنتا نہ کرو۔ تمہاری اور تمہاری ماتا جی کی عزت پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ دس ٹھاکر اور پولیس انسپکٹر بھی بال بیکا نہیں کر سکتے۔ تم میری بات کا وشواس کرو۔"

"آپ مجھے بہلائیں نہیں۔" پرساد کی بہن ہچکیوں کے درمیان بولی۔ "آپ سیاح ہیں۔ ان کے خلاف کیسے لڑ سکتے ہیں؟"

"میں بہلا نہیں رہا ہوں بلکہ سچ کہہ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں سیاح تو ہوں۔ لیکن بہت کچھ ہوں۔ غریبوں، مظلوموں اور محتاجوں کا دوست...... تم لوگ گھر میں نظر بند ہو۔ تمہیں کچھ نہیں پتا کہ کیسے عجیب و غریب واقعات رونما ہو چکے ہیں۔"

"آخر آپ ہیں کیا جو ہمیں ان ظالموں سے بچالیں گے......؟" پرساد کی بہن ہچکیوں پر قابو پا کر بولی۔ "سچ سچ بتائیں۔"

"تم مجبور کر رہی ہو تو میں بتا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اس شرط پر کہ تم تینوں یہ بات کسی کو نہیں بتاؤ گے۔ میں اس راز کے افشا سے ڈرتا نہیں ہوں۔ لیکن کسی وجہ سے ساری دنیا کو بتانا نہیں چاہتا ہوں۔ میں جو کچھ بھی کرتا ہوں وہ پس پردہ اور غائب رہ کر کرتا ہوں۔ سامنے ظاہر ہو کر نہیں...... کیوں کہ مجھے نام و نمود اور شہرت پسند نہیں۔ میں یہ سب کچھ کسی انسانی جذبے کے تحت کرتا ہوں۔ میں ایک جادوگر ہوں۔ میرے پاس جادو کی طاقت ہے۔ تم لوگ میرا جادو دیکھ چکے ہو۔ میں گھر میں سخت پہرے کے باوجود آ گیا ہوں۔"

"آپ جادوگر ہیں......؟" پرساد کی بہن رونا بھول گئی۔ اس کی ماں اور پتا جی بھی مجھے ششدر ہو کر دیکھنے لگے۔ پھر میں نے ان تینوں کو پہلے وہ قصہ سنایا جس میں تلسی رام کو میں نے پرساد کی صورت میں ڈھال دیا۔ تلسی رام کا کیا حشر نشر ہوا تھا۔ اس کے گھر والوں اور پولیس انسپکٹر کے ہاتھوں...... ان لوگوں نے پرساد سمجھ کر اس کی درگت بنا ڈالی۔ کس سفاکی اور بربریت سے اس پر تشدد کیا گیا تم لوگ تصور نہیں کر سکتے۔ جب اس کی خوب درگت بن گئی تب میں اسے اس کی اصلی حالت میں لے آیا۔ یہ دیکھ کر ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا یہ کیا اور کیسے ہو گیا۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ نظر کے دھوکے سے انہوں نے تلسی رام کو پرساد سمجھ لیا۔

دوسرا واقعہ بھی سنایا جسے سن کر وہ تینوں بہت خوش ہوئے۔ گھر کی فضا جو سوگوار ہو گئی تھی اسے خوشی میں بدل دیا۔ پھر میں نے ان کے ساتھ کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد میں نے ان سے کہا کہ کل جب ٹھاکر اور پولیس گھر سے باہر نکالے گی خاموش رہنا اور تماشا دیکھنا۔

صبح نو بجے پرساد کے مکان کے سامنے جو میدان تھا وہ حویلی کے سامنے اور قریب بھی تھا۔ چوں کہ یہ بات جنگل کی آگ کی طرح آس پاس کے تمام گاؤں میں پھیل چکی تھی کہ پرساد کی ماں اور نوجوان بہن

کو برسرعام بے لباس کر کے گاؤں میں گھمایا جائے گا۔ یہ تماشا دیکھنے کے لئے سینکڑوں مرد اور عورتیں جمع ہوگئی تھیں۔ پولیس کی بھاری جمعیت بھی موجود تھی کہ ممکنہ اشتعال انگیزی کو دبا سکے۔ وہ سب کے سب بندوقوں اور رائفلوں سے مسلح تھے۔ انسپکٹر نے کہا ہوا تھا کہ کسی نے بھی مداخلت کرنے کی کوشش کی تو اسے بلا تامل گولی ماردی جائے۔ انسپکٹر نے یہ اعلان زور سے اور کرخت آواز سے کیا تھا۔

سوا نو بجے پانچ چھ سپاہی پرساد کے پتاجی، ماتاجی اور اس کی بہن کو لے آئے۔ اس وقت ٹھاکرانی، اس کی بیٹی اور دونوں بہوئیں اور لڑکے اور گھر جوائی بھی ایک طرف کھڑے ہوئے تھے۔ پرساد کے پتاجی کے ہاتھ پیچھے لے جا کر باندھے ہوئے تھے۔ انہیں ایک جگہ زمین پر بٹھا دیا گیا تا کہ وہ تماشا دیکھ سکے۔ اپنی پتنی ہی کو نہیں بلکہ اپنی جوان بیٹی کو بھی بے لباس دیکھ سکے۔

اس وقت فضا بڑی زہر آلود تھی۔ اچھوتوں کی بستی کے تمام گھروں کو خالی کروالیا گیا تھا۔ انہیں دھونس اور دھمکی سے مجبور کیا گیا تھا کہ وہ تماشا دیکھنے آئیں۔ اگر کوئی نہیں آیا اور وہ گھر میں چھپا بیٹھا رہا تو اسے درخت سے الٹا لٹکا دیا جائے گا۔ چاہے وہ عورت ہی کیوں نہ ہو۔ اس لئے اس بستی کی ساری بستی کی نوجوان لڑکیاں ایک جگہ کھڑی ہوگئی تھیں۔ ان سے قدرے فاصلے پر بوڑھی اور شادی شدہ عورتیں کھڑی تھیں۔ ان کی گودوں میں بچے تھے۔ وہ بچے جو چل پھر سکتے تھے انہیں ساتھ ہی کھڑا کرلیا تھا۔ نوجوان لڑکوں اور مردوں نے بھی اپنی اپنی الگ ٹولیاں بنوالی تھیں۔ ان اچھوتوں کو مسلح سپاہیوں نے بندوقوں کی زد میں لیا ہوا تھا اور ان کی نالیں موت کے فرشتوں کی طرح گھور رہی تھیں۔ قرب و جوار کی بستیوں سے زیادہ تر مرد اور جوان لڑکے آئے تھے۔ یہ تماشا چار برسوں بعد ہو رہا تھا۔ بوڑھوں اور عورتوں اور لڑکیوں کو بھی عورت کی بے حرمتی پسند نہ تھی۔ پرساد کی ماں اور بہن کو بیچوں بیچ کھڑا کردیا گیا۔ ان دونوں کو دیکھتے ہی ٹھاکرانی غضبناک ہوکر ان کی طرف بڑھی۔ پھر وہ ہذیانی لہجے میں چیخ کر بولی۔ ”پرساد کی ماں! کیا تجھے معلوم ہے کہ تجھے اور تیری بیٹی کو کیا سزا دی جانے والی ہے؟“

”پہلے معلوم نہیں تھا لیکن اب یہاں لانے والے سپاہیوں نے بتا دیا تھا کہ ٹھاکر اور انسپکٹر کیا سزا دینے والا ہے۔“ پرساد کی ماں نے جواب دیا۔ ”تم لوگ کر بھی کیا سکتے ہو۔ غریبوں اور مظلوموں کو دبانا تم دولت مندوں کا شیوہ رہا ہے۔“

”یہ عبرتناک سزا اس لئے دی جا رہی ہے کہ تیرے بیٹے نے میری معصوم بیٹی کو محبت کے جال میں پھانس لیا۔ محبت کے نام پر فریب دے کر اس کی عزت لوٹ لی تا کہ تیرے بیٹے سے شادی کر سکے اور پھر اس پر جادو منتر کر کے باندی بنالیا۔“ ٹھاکرانی تیز لہجے میں بولی۔

”یہ جھوٹ ہے۔ میرے بیٹے نے تیری بیٹی کی عزت کو پامال نہیں کیا اور نہ ہی جادو منتر کیا......“ پرساد کی ماں نے جواب دیا۔ ”محبت کرنا پاپ نہیں ہے ان دونوں نے محبت کی۔ ان کی محبت پوتر ہے۔ محبت اندھی ہوتی ہے۔ محبت کے جادو نے ایک دوسرے کو جیون ساتھی بنا دیا۔“

”او کتیا!...... تو بڑی چڑھ کر بول رہی ہے......“ ٹھاکرانی بگڑ گئی۔ ”تو اپنے حرامی بیٹے کی تعریف

کر رہی ہے۔“

”ٹھاکرانی!“ پرساد کی ماں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے خوفی سے بولی۔ ”تم مجھے کتیا نہ کہو...... میں اچھوت عورت ضرور ہوں۔ لیکن تمہاری طرح عزت دار بھی ہوں۔ میرا بیٹا حرامی نہیں ہے...... یہ مت بھولو کہ اب وہ تمہارا داماد......“

”میں ایک حرامی کو...... ایک کمینی کے بچے کو اپنا داماد کہوں۔“ ٹھاکرانی کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ ”اگر تو یہ کہتی ہے کہ میری بیٹی تیری بہو ہے تو یہ تیری بھول ہے...... وہ ایک حرامی کی پتنی ہے اور نہ کمینی کی بہو...... نہ وہ حرام زادہ میرا داماد......“

”ٹھاکرانی!“ پرساد کی ماں کو بھی غصہ آ گیا۔ ”تم اپنی زبان کو لگام دو۔ بار بار میرے بیٹے کو حرامی اور مجھے کمینی کہہ کر ایک عورت، ماں اور اس کی ممتا کی توہین نہ کرو۔ ارجن ایک شریف ماں باپ کا بیٹا ہے اس کی رگوں میں اس کے باپ کا خون دوڑ رہا ہے۔“

”وہ ہے حرامی تو اسے حرامی کیوں نہ کہوں......“ ٹھاکرانی اکڑ گئی۔ ”میں ایک بار نہیں دس بار کہوں گی کہ تیرا بیٹا حرام کی اولاد ہے۔“

”میرا بیٹا نہیں بلکہ تیرا بڑا بیٹا شیکھر...... تیری بیٹی سرلا...... یہ دونوں حرام کے ہیں۔“ پرساد کی ماں ہذیانی انداز میں بولی۔ ”میں بتا دوں ان کا باپ کون ہے...... بڑودہ کے رائے بہادر جو تین چار سال تمہاری حویلی میں مہمان رہے۔ یہ ان دنوں کی یادگار ہیں...... کیا میں غلط کہہ رہی ہوں...... میرے پاس اس کا ثبوت بھی ہے۔ ان دونوں کا اور رائے صاحب کا خون ٹیسٹ کروالو پتا چل جائے گا۔“

ٹھاکرانی ایک لمحے کے لئے بھونچکی سی ہوگئی۔ پرساد کی ماں نے غلط نہیں کہا تھا۔ یہ حقیقت بھی تھی۔ جب رائے بہادر میسور کے جنگل میں شکار کے لئے آئے تو انہوں نے ٹھاکر کی حویلی میں قیام کیا۔ تب انہوں نے ٹھاکرانی کو شکار کیا تھا۔ ٹھاکرانی بھی ان پر مہربان ہوگئی تھی۔ میں یہ باتیں پرساد کی ماں کی زبان سے کہلوا رہا تھا۔ پرساد کی ماں اس کی خاموشی سے فائدہ اٹھا کر بولی۔ ”ٹھاکرانی! تجھے سانپ کیوں سونگھ گیا ہے۔ تیری حویلی کی دو داسیاں وہ زندہ ہیں جو تیری بدکاری، بدچلنی اور بے وفائی کی گواہ ہیں۔ وہ کہاں رہ رہی ہیں یہ میں جانتی ہوں۔ تو نہیں جانتی...... انہیں بلا کر پیش کردوں؟“

ٹھاکرانی چونک کر بولی۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ پھر سفید پڑتا چلا گیا۔ وہ دل میں ششدر تھی کہ اتنا بڑا راز پرساد کی ماں کے علم میں کیسے آ گیا۔ دوسری بات جو حیرت کی اور ناقابل یقین تھی وہ یہ تھی کہ پرساد کی ماں نہ صرف اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے خوف ہوکر باتیں کر رہی تھی بلکہ اسے ”تو، تا“ سے بھی باتیں کر رہی تھی۔ پرساد کی ماں نے سب کے سامنے اس کے احترام کو بھی ختم کردیا تھا۔ اس سے یہ سب کچھ برداشت نہ ہو سکا۔ اس نے ایک زوردار تھپڑ پرساد کی ماں کے منہ پر رسید کردیا۔ پرساد کی ماں کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے منہ پر پھول دے مارا ہو لیکن ٹھاکرانی کو ایسا لگا جیسے اس کے ہاتھ نے انگارے کو چھو لیا ہو۔ وہ دنگ رہ گئی۔ اگلے لمحے اس نے پرساد کی ماں کے منہ پر تھوکا لیکن وہ تھوک اس کے

منہ پر آپڑا۔اس طرح جس طرح آسمان پر تھوکا منہ پر آ جاتا ہے۔وہ پلٹ کر اپنے پتی سے بولی۔"مجھے کوئی چاقو دے دو۔میں اس کا سر کاٹ کر پھینک دوں...... آپ دیکھ رہے ہیں یہ حرام زادی...... مجھ پر کیسے کیسے بےہودہ الزامات لگا رہی ہے۔مجھے ذلیل ورسوا کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔"

"ٹھاکرانی! اتنی بڑی گالی مجھے نہ دو۔"پرساد کی ماں بڑے سکون واطمینان سے بولی۔"تم نے مجھے جو کہا اور گالی دی اصل میں تم وہی ہو۔جو جیسی ہوتی ہے وہ ساری دنیا کو اپنے جیسا ہی سمجھتی ہے۔تم میرا منہ نہ کھلواؤ۔میں تمہارے چلن ایک ایک کر کے دنیا کو بتا دوں گی تو تم تمہارے چہرے پر اتنی کالک آ جائے گی کہ تم ایک طوائف سے بھی بدتر ہو جاؤ گی......"

ٹھاکرانی پرساد کی ماں پر جھپٹی تو ٹھاکر تیزی سے ان کے درمیان آ گیا۔پتنی کو روک لیا۔"دھیرج ٹھاکرانی! دھیرج......"وہ بڑے ٹھنڈے لہجے میں بولا۔"یہ کمینی اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ذلیل ورسوا کر رہی ہے۔تم اسے جان سے مارو گی تو وہ تماشا نہ ہو سکے گا جو میں دنیا والوں کو دکھانا چاہتا ہوں۔حویلی چل کر اس کے سارے جسم پر ہی نہیں بلکہ اس کے منہ کے اندر بھی تیزاب ڈال دینا۔بدلہ لو تو ایسا لو کہ مرنا چاہے تو مر بھی نہ سکے۔ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے۔جان سے مار دو گی تو تھوڑی دیر میں مر جائے گی۔یہ موت اس کے لئے آسان اور خوشی کی ہوگی۔ایسی اذیت اور عذاب دو کہ تڑپتی رہے۔"

پھر ٹھاکر اپنی پتنی کو وہاں سے ہٹا کر لے گیا۔پرساد کی ماں کی باتوں نے پورے مجمع میں سنسنی پھیلا دی تھی۔ان لوگوں نے اس کی بات کا یقین کر لیا تھا۔لوگ ٹھاکرانی کے چال چلن سے واقف تھے۔اپنی زبان اس لئے نہیں کھولتے اور اس موضوع پر بات نہیں کرتے تھے کہ ٹھاکر انہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔وہ پرساد کی ماں سے یہ باتیں سن کر خوش ہو گئے تھے لیکن دوسری طرف حیران بھی تھے کہ پرساد کی ماں جو ایک سیدھی سادی سی عورت تھی آج تو وہ شیرنی بن گئی ہے۔یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کے اور اس کی بیٹی کے ساتھ کیا کچھ پیش آنے والا ہے کیسی نڈر اور بے خوف سی ہو گئی ہے۔کیسی طمانیت سے کھڑی ہوئی ہے۔

ٹھاکر انسپکٹر کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور اس سے بولا۔"تماشا شروع ہو۔شبھ کام میں دیر کیسی انسپکٹر!"

انسپکٹر نے چھ سپاہیوں کو حکم دیا کہ ماں اور بیٹی کو بے لباس کر دیا جائے۔وہ ان کی طرف بڑھے تھے کہ میں نے ان سپاہیوں اور مجمع کی نظر بندی کر دی۔ماں بیٹی ان سب کی نظروں سے غائب ہو گئیں۔وہ دونوں ایک ایسی جگہ جا کر کھڑی ہو گئیں کہ وہاں ان کے سوا کوئی نہ تھا۔دوسرا منظر جو نہایت دلچسپ، حیرت انگیز اور سنسنی خیز اور ناقابل یقین تھا وہ یہ تھا کہ انسپکٹر اور ٹھاکر...... ٹھاکرانی اور اس کے بیٹے اور بہوئیں...... سب بے لباس ہو گئیں۔ان میں سے کسی ایک کے جسم پر کپڑا تو در کنار ایک دھجی تک نہ تھی جو ستر پوشی کرے۔انہوں نے اپنے آپ کو جو اس عریاں حالت میں دیکھا تو یقین نہ آیا۔پھر ان کے چہرے سرخ ہو گئے۔شرم سے ان کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔وہ زمین میں گڑتے جا رہے تھے۔آس پاس کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں وہ اپنے آپ کو چھپا سکتے۔وہ جانوروں کی طرح تھے۔وہ حیرت اور غصے سے دیکھ رہے تھے کہ یہ کیسے اور کیوں کر ہو گیا؟ کس نے انہیں بے لباس کر دیا ہے۔ٹھاکرانی اور اس کی بیٹی اور دونوں بہوئیں مردوں اور ایک دوسرے کے

پیچھے اپنے آپ کو چھپانے لگیں۔لیکن سب کچھ لاحاصل تھا۔وہ اس مجمع کے سامنے بے حجاب تھیں۔مجمع یہ عجیب وغریب تماشا دیکھ رہا تھا۔سپاہی بھی...... آنکھیں پھاڑے دیکھ رہے تھے۔کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔پھر ٹھاکرانی، اس کی بیٹی اور بہوئیں عورتوں کی طرف لپکیں تاکہ ان کے درمیان اپنے آپ کو چھپا لیں۔میں نے انہیں جو لپکتے دیکھا تو ان کے قدم روک دیئے۔وہ اس طرح کھڑی ہو گئیں جیسے ان کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی گئی ہوں۔ان میں اتنی سکت بھی نہ تھی کہ وہ اپنی جگہ سے حرکت کر سکیں۔اب سارا مجمع انہیں دیکھے جا رہا تھا۔ان عورتوں کے اور ان کے مردوں کے دلوں پر کیا بیت رہی تھی یہ وہی جانتے تھے۔عورتوں کی ایسی اور اس طرح کی بے حرمتی ٹھاکر نے کی تھی۔لیکن آج خود اس کے گھر کی عورتیں دنیا کے سامنے بے حجاب تھیں وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔وہ بے بس تھا بالکل اسی طرح ان عورتوں کے مردوں کی طرح جن کی عورتوں کو اس نے بے لباس کیا تھا۔ان بے حجاب عورتوں میں اس کی بیوی ہی نہیں جوان بیٹی اور بہوئیں بھی تھیں۔لڑکیاں اور عورتیں ہی نہیں نوجوان لڑکے اور مرد بھی دیکھ رہے تھے۔ٹھاکر نے پرساد کی ماں اور بیٹی کا تماشا دکھانے بلایا تھا لیکن خود تماشا اس کے گھر کی عورتیں بن گئی تھیں۔وہ خشونت بھرے لہجے میں چیخا۔"حرام زادو...... کمینو...... تم لوگ دفع ہو جاؤ...... عورتوں سے کہو کہ وہ میرے گھر کی عورتوں کو اپنے حصار میں لے لیں...... آگے بڑھ کر...... کوئی ان کے لئے کپڑے لا دے...... ہمارے لئے بھی......" کچھ عورتیں اور لڑکیاں بڑھیں۔کوئی عورت کسی بھی عورت کو اس حالت میں دیکھ نہیں سکتی۔ان کی راہ میں ایک آگ سی بھڑکی جس سے وہ خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئیں۔وہ آگ ایسی تیز تھی کہ جلا سکتی تھی۔

"ٹھاکر!" میں نے اونچی آواز میں اسے مخاطب کیا۔"اب تم کیسا محسوس کر رہے ہو اپنی عورتوں کو اس حالت میں دیکھ کر......؟" میری آواز سن کر وہ بری طرح اچھل پڑا۔میری آواز فضا میں گونجی اور ہوا کے دوش پر سارے مجمع کو سنائی دی وہ اور انسپکٹر اور اس کا گھر جوائی اور بیٹے خلا میں دیکھنے لگے کہ یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے۔میں ان کے قریب ہی کھڑا ہوا تھا لیکن میں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ان سب کی حالت غیر ہونے لگی اور وہ پسینے میں نہا گئے۔

"کک...... کک...... کون ہو تم......؟" ٹھاکر ہکلایا۔"کہاں ہو تم......؟ سامنے تو آؤ......؟"

"میں ان اچھوتوں کا دیوتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔"میں سامنے آ گیا تو تم بے ہوش ہو جاؤ گے...... شاید مر بھی جاؤ۔میں اتفاق سے ادھر سے گزر رہا تھا۔تماشا دیکھنے رک گیا۔میں تمہارے بارے میں برسوں سے سنتا آ رہا ہوں کہ تم بہت ظالم شخص ہو۔"

"نہیں...... نہیں......" ٹھاکر گڑگڑایا۔"یہ جھوٹ ہے۔میں نے کسی پر ظلم نہیں کیا۔میں بڑا رحم دل ہوں۔"

"اگر تم رحم دل ہو تو پرساد کی ماں اور اس کی جوان بیٹی کو بے لباس کر کے اسے بے عزت کیوں کرنے والے تھے......؟"

"میں اپنی بیٹی کی بے حرمتی کا بدلہ لے رہا تھا۔" ٹھاکر بولا۔"پرساد کے بڑے بھائی نے میری بیٹی

کو ورغلایا۔اس کی عزت تباہ کی اور جادو منتر کرا کے اس سے شادی کر لی اس کے ماں باپ مجھے ذلیل اور رسوا کر رہے ہیں۔“

”ہم جانتے ہیں ارجن نے ایسا نہیں کیا...... ان دونوں نے ایک دوسرے سے محبت کی اور شادی کر لی۔تھوڑی دیر کے لئے ہم یہ مان لیتے ہیں کہ ارجن نے تمہاری بیٹی کو فریب دے کر پاپ کیا...... لیکن تم نے جو پاپ کئے اس کے بارے میں کیا کہتے ہو...... تم حویلی کی دس نوکرانیوں اور گاؤں کی بہت ساری لڑکیوں کی عزت سے کھیلتے رہے۔یہ تم نے اتنے سارے جو پاپ کئے ہیں۔کیا وہ اچھی بات تھی۔اگر وہ اچھی بات تھی تو ارجن نے بھی اچھا ہی کیا......“

”یہ جھوٹ ہے......“ ٹھاکر نے تکرار کی۔”میں نے اپنی بیوی کے سوائے کسی اور عورت کی طرف دیکھا بھی نہیں......“ میں نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر اتنے زور سے تھپڑ رسید کیا کہ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔پندرہ بیس قدم لڑکھڑاتا ہوا دور جا گرا۔اسے دن میں تارے نظر آ گئے۔اس تھپڑ نے نہ صرف اس کی کھوپڑی ہلا کر رکھ دی بلکہ اس کا جبڑا اور دانت بھی توڑ دیئے تھے۔دماغ کی چولیں تک ہل گئی تھیں۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

میں نے کچھ کہنے سے پہلے ایک خالی جگہ پر ایک منتر پڑھ کر پھونکا۔زمین سے ایک نیلا سا دھواں اٹھا اور بلند ہوتا گیا۔کوئی بیس فٹ بلند ہو کر رک گیا۔اس قدر گاڑھا دھواں تھا کہ اس کے اندر کون ہے۔کیا ہے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ایک غبار سا بن گیا تھا۔اس دھوئیں کو دیکھ کر سب پر حیرت، خوف اور ہیبت طاری ہو گئی۔اپنی اپنی جگہ بے حس وحرکت اور جامد سے ہو کر رہ گئے۔ایسا لگ رہا تھا کہ سارا مجمع جو ہے وہ پتھر کے بتوں کا ہے لوگ تو سانس لینا بھی بھول گئے تھے۔انسپکٹر، ٹھاکر اور سپاہیوں کی سٹی گم ہو چکی تھی۔

”ٹھاکر! تم نہ صرف بے غیرت، بے شرم بلکہ ایک رذیل اور ڈھیٹ بھی ہو۔ایک دیوتا سے جھوٹ بول رہے ہو۔“ میں نے کرخت لہجے میں کہا۔”تم ہمیں بے وقوف بنانا چاہتے ہو۔کیا تم نے ہمیں بچہ سمجھ رکھا ہے۔اسے مذاق اور ناٹک سمجھ رہے ہو۔تم نے جن لڑکیوں اور عورتوں کے ساتھ پاپ کیا وہ اس وقت بھی اس مجمع میں موجود ہیں۔“

”مجھے شما کر دیجئے دیوتا مہاراج! میں بڑا پاپی ہوں۔میں نے بہت برا کیا...... بہت پاپ کئے ہیں۔“ وہ دھوئیں کے غبار کے آگے کھڑے ہو کر ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے اور رونے لگا۔”میں اب کوئی پاپ اور انیائے نہیں کروں گا۔“

”کیا تمہارے پاپ ایسے ہیں کہ معاف کر دیئے جائیں......؟“ میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”انسان سے ایسی غلطی اور انیائے غصے کی حالت میں ہو ہی جاتا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”آپ معاف کر دیں۔“

”اگر ایسی بات ہے تو تمہاری نظروں کے سامنے تمہاری بیٹی کے ساتھ ابھی اور اس وقت کوئی ایسا پاپ کرے گا۔“ میں نے کہا۔”وہ پاپ کرنے کے بعد ہم سے معافی مانگتا ہے۔ہم اسے معاف کر دیتے

ہیں۔تم بھی کیا اسے معاف کر دو گے؟“

ٹھاکر جواب کیا دیتا۔اس کے پاس کہنے کے لئے تھا ہی کیا۔وہ خاموش ہو گیا جیسے اس کی زبان تالو سے چپک گئی ہو۔”ہر عورت کی عزت ہوتی ہے۔آبرو ہوتی ہے۔چاہے وہ برہمن ہو، راج کماری ہو، داسی، باندی اور اچھوت کسی بھی غریب گھر کی ہو اور کسی بھی ذات کی کیوں نہ ہو۔“ میں نے گرج دار آواز میں کہا۔”لیکن تمہارے نزدیک صرف برہمن ذات تمہارے گھر اور خاندان کی لڑکیاں اور عورتیں عزت دار ہیں۔باقی کسی اور عورت کی کوئی عزت آبرو نہیں ہوتی۔

ٹھاکر! ذرا ماضی میں لوٹ جاؤ۔ذرا وہ دن یاد کرو جب تم نے معصوم اور غریب عورتوں کو نشانہ بنایا...... انہیں جسمانی اذیتیں دیں...... وحشیانہ سلوک کیا...... ان کے چہروں اور جسموں پر تیزاب چھڑکا گیا...... ان بدنصیبوں نے تمہاری کتنی منتیں سماجتیں نہیں کیں...... بھگوان کے واسطے نہیں دیئے...... لیکن تم ہنستے اور قہقہے لگاتے رہے۔ایک درندے کی طرح بے بس جیسے تمہارے سینے میں دل نہیں پتھر ہو۔واقعی پتھر ہی ہے۔

آج تم وہی کہانی دہرانے والے تھے جو بیس برسوں سے دہراتے چلے آ رہے ہو۔پرساد کی ماں اور اس کی جوان بیٹی کے ساتھ...... تم نے اور انسپکٹر نے مل کر منصوبہ بنایا۔انسپکٹر نے تم سے پانچ ہزار کی رقم طے کر کے کہا پریشان اور فکرمند نہ ہو۔میں کس لئے بیٹھا ہوں۔میں پولیس کے اعلیٰ افسران کو جواب دے دوں گا۔وہ میری ہر بات مان لیں گے۔انہیں ماننا پڑے گا۔اس لئے کہ اس محکمے کی عزت اور وقار کا سوال ہوتا ہے۔اس محکمے کے ایک شخص پر بھی دھبا آتا ہے تو پورے محکمے اور اس کے اعلیٰ حکام پر بھی آ جاتا ہے۔ اسی لئے وہ سیاہ کو بھی سفید بنا دیتے ہیں...... پریس کو سنبھالنا اور اس سے نمٹنا آتا ہے۔تم دونوں کے درمیان یہ طے پایا کہ جب پرساد کی ماں اور بہن کو بے لباس گاؤں میں گھمانے کے بعد ماں بیٹی کو حویلی میں منہ کالا کرنے کی غرض سے لے جایا جائے گا تو وہ بھی منہ کالا کرے گا ماں بیٹی کے ساتھ...... بہت پہلے سے وہ پرساد کی ماں پر مرمٹا چلا آ رہا ہے۔تم نے ہاں کر لی۔کیوں کہ وہ تمہاری ماں نہیں تھی۔بیوی بیٹی نہیں تھی...... اپنے ارمان پورے کرنے کے بعد پھر تمہاری عورتیں ان کے جسموں پر تیزاب پھینکنے والی تھیں۔ تمہاری عورتیں بھی کیسی ہیں جو مردوں کا اچھوت عورتوں کو ہاتھ لگانا گوارا تھا اور اس کی اجازت دے دی۔

کیا محبت کرنا بہت بڑا جرم ہے......؟ پاپ ہے......؟ لیکن تم نے اسے بہت سنگین جرم بنا دیا۔اس لئے کہ ارجن اچھوت ذات کا تھا اور تمہاری بیٹی نرو پا برہمن ذات کی۔تم نے یہ دیکھا کہ اچھوت اور برہمن ذات ہے...... لیکن یہ نہیں دیکھا کہ دونوں انسان ہیں۔دل کا معاملہ ہے۔محبت اندھی ہوتی ہے۔لیکن تم نے اسے ایک گھناؤنا اور بدترین جرم بنا دیا۔جس نے جرم کیا ہے سزا انہیں دو جو تمہاری نظر میں دوشی ہیں۔ لیکن ان نردوشیوں کو کیوں دے ہو۔رذیل اور کمینے...... تو اتنا بڑا امور کھ بن گیا کہ تیرے دل میں جو آئے وہ سزا ان معصوموں کو دو۔تم پرساد کی ماں اور اس کی جوان بیٹی کو اس بات کی سزا دے رہے ہو کہ ارجن اور نرو پا نے شادی کر لی۔شادی انہوں نے کی اور سزا انہیں مل رہی ہے۔سزا بھی کیسی...... ایک شخص کی بیوی اور بیٹی کو بڑے مجمع کے سامنے بے لباس کرنا چاہتے تھے...... اب بتاؤ...... تمہارے ساتھ کیا کیا جائے۔تم

خود ہی اپنے لئے سزا تجویز کرو۔" ٹھاکر سکتے کی سی حالت میں تھا جیسے اس پر کوئی بجلی سی آ گری ہو۔ اس وقت عورتوں کے مجمع میں سے ایک عورت بھیڑ کو چیرتی ہوئی نکلی اور دھوئیں کے منجمد غبار کے سامنے آ کر اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔

"دیوتا مہاراج! یہ کیا بتائے گا۔ میں بتاؤں گی اسے کیا سزا دی جائے؟" وہ ٹھاکر کی طرف نفرت و حقارت سے دیکھتی ہوئی بولی۔ پھر اس نے ٹھاکر کے قریب جا کر اس کے منہ پر تھوکا۔ پھر وہ دھوئیں کے غبار کے سامنے آ کھڑی ہوگئی۔ ٹھاکر اپنی اس ذلت اور خواری پر تلملا کر رہ گیا۔ وہ دیوتا کی موجودگی میں اس عورت کے خلاف کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔

"میرے سینے میں بیس برسوں سے نفرت وانتقام کی آگ بھڑک رہی ہے۔" وہ کہنے لگی۔ ہم انہیں معاف نہیں کریں گی...... یہ ٹھاکرانی...... ان کی دونوں بیٹیوں میں صرف ایک نروپا ایسی ہے جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ وہ دیوی ہے۔ ہیرا ہے ہیرا......

"دیوتا مہاراج! اس ظالم کو اور اس کے گھر کی عورتوں کو معاف نہ کریں۔ کرن دیدی نے جو کچھ کہا اس میں کوئی جھوٹ نہیں ہے۔ میں بھی جو کہہ رہی ہوں وہ غلط نہیں ہے...... جب میں اس گاؤں میں بیاہ کر آئی تو اس کے سات دن بعد ٹھاکر نے مجھے اپنے پتی کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھ لیا۔ پھر اس کی نیت خراب ہوگئی۔ میں دوسرے دن ٹھاکرانی سے ملنے حویلی گئی۔ جب اس سے مل کر راہ داری سے نکل رہی تھی ٹھاکر ایک کمرے سے نکلا۔ مجھے دیکھ کر وہ مجھے ایک کمرے میں لے گیا۔ اس کمرے میں ایک ڈنڈا رکھا ہوا تھا۔ میں نے اپنی عزت بچانے کے لئے اسے ڈھال بنا لیا اور اس کے سر پر ڈنڈا دے مارا۔ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ مجھے اس کے تیسرے دن اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ دوسرے دن ٹھاکر چار مسلح آدمیوں کو لے کر آیا۔ میری ساس، سسر، پتی اور دادی کے سامنے بے عزت کیا اور چلا گیا۔ جب میں نے ٹھاکرنی سے شکایت کی تو اس نے ویشیا کہا اور مجھے برہنہ کر کے بید سے اتنا مارا کہ میں بے ہوش ہوگئی۔ جب ہوش میں آئی تو بڑی بیٹی اور دونوں بہوؤں نے مارا۔ میں پھر بے ہوش ہوگئی۔ بنگلور کے ایک سرکاری اسپتال میں ڈیڑھ ماہ زیر علاج رہی۔ میرا پتی مجھے بروقت نہیں لے جاتا تو پھر میں مر جاتی۔" نوجوان لڑکیوں کی بھیڑ میں سے ایک لڑکی نکل کر آئی۔ اس نے دھوئیں کے غبار کو پرنام کرنے کے بعد کہا۔

"دیوتا مہاراج! اس پولیس انسپکٹر کو بھی آپ سزا دیں۔ اس نے مجھ سے فائدہ اٹھانے کے لئے میرے پتا جی کو ایک جھوٹے کیس میں پھنسا کر حوالات میں بند کر دیا۔ مجھے ڈرایا دھمکایا کہ میں نے اس کی بات نہ مانی تو میرے پتا جی کو پھانسی دلوا دے گا...... پھر میری نظروں کے سامنے میرے پتا جی کو اتنا مارا کہ مجھ سے دیکھا نہ گیا۔ میں نے اس کی ہر بات مان لی۔ میرے پتا جی تیسرے دن سورگباش ہوگئے۔ میں نے پولیس افسروں سے بنگلور جا کر فریاد کی۔ واپس آئی تو اس نے مجھے سزا کے طور پر پورا ایک مہینہ رکھا۔"

انسپکٹر کے چہرے پر بارہ بجنے لگے۔ میں نے انسپکٹر سے کہا۔ "انسپکٹر تم نے جس طرح لوگوں کو ستایا اس کی مثال نہیں ملتی۔ تم قانون اور عورتوں کی عزت کی دھجیاں اڑاتے آ رہے ہو۔ لہٰذا اب تمہاری بیٹی کی

عزت کی بھی دھجیاں اڑائی جائیں گی۔"

"میری بیٹی تو ممبئی کے کالج میں پڑھ رہی ہے۔" وہ بولا۔ "میں نے قانون کی دھجیاں نہیں اڑائیں بلکہ قانون کا پاس کیا۔ صرف ان لوگوں کو سزائیں دیں جنہوں نے قانون کو پامال کیا۔ یہ لڑکی مجھ پر سراسر بہتان لگا رہی ہے۔"

"تمہاری بیٹی دنیا کے کسی کونے میں کیوں نہ ہو میرے لئے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "کیا میں نہیں جانتا کہ تمہارے کیا کیا جرائم ہیں۔ تمہاری بیٹی پڑھ نہیں رہی ہے۔ رنگ رلیاں منا رہی ہے۔ آخر وہ تمہارا خون ہے۔ کاش! وہ ایک اچھی لڑکی ہوتی...... تم نے اچھی لڑکیوں اور عورتوں کو برباد کیا۔ ان پر اور ان کے گھر والوں پر کیا بیتی اس کا احساس دلانے کے لئے، وہ اذیت جو انہوں نے اٹھائی تم ابھی اٹھاؤ۔ جو بوتا ہے وہ کاٹتا ہے۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی......"

"تم بھگوان نہیں دیوتا ہو...... تمہارے پاس وہ شکتی کہاں جو بھگوان کے پاس ہے۔" انسپکٹر استہزائی لہجے میں بولا۔ "میری بیٹی کا تم کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ اس کی عزت سے کوئی کھیل نہیں سکتا۔ تم مجھے خوف زدہ نہیں کر سکتے......"

"تو میری شکتی سے ناواقف ہے۔ وہ سامنے دیکھ...... تیری نوجوان بیٹی مالنی چلی آ رہی ہے...... مجمع دیکھ کر آ رہی ہے۔ وہ حیران ہو رہی ہے کہ وہ یہاں کیسے آ گئی...... وہ تو اس وقت اپنے دوست لڑکے کے ساتھ جا رہی تھی سیر و تفریح کے لئے......" انسپکٹر نے اس سمت دیکھا۔ واقعی اس کی بیٹی کچے راستے سے آ رہی تھی۔ انسپکٹر اس طرح اچھل پڑا جس طرح برقی جھٹکا لگنے سے آدمی اچھلتا ہے۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور چہرہ سفید پڑتا چلا گیا۔ لمحے کے لئے اسے یقین نہیں آیا وہ اس جگہ آ کر ٹھٹک کے رک گئی۔ اگلے لمحے وہ بھونچکی سی ہوگئی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ یہ کہاں اور کون سی جگہ آ گئی ہے۔ وہ تو اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ ممبئی شہر کی ایک مصروف ترین سڑک سے گزر رہی تھی کہ اسے چلتے چلتے نیند کا ایک جھونکا سا آیا۔ جب وہ جھونکا گزر گیا تو اس نے اپنے آپ کو یہاں پایا۔ پھر اس نے اس جگہ کو پہچان لیا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں کے تھانے میں اس کا باپ ایس ایچ او تھا۔ وہ دو ایک مرتبہ آ چکی تھی۔ لیکن وہ یہاں ایک پل میں آ کیسے گئی...... جب کہ چک بالا پور اور ممبئی میں دو دن کی مسافت ہے۔

کہیں وہ سپنا تو نہیں دیکھ رہی ہے...... ہاں یہ سپنا ہی ہے۔ اس نے اپنے دوست کے ساتھ خوب پی تھی جس سے نشہ طاری ہوگیا۔ وہ چند قدم آگے بڑھی۔ اس نے ایک عجیب سا منظر دیکھا۔ ایک طرف مردوں اور سپاہیوں اور جوان لڑکوں کا مجمع ہے۔ ان کے درمیان چند قدم کا فاصلہ ہے...... ان کے بائیں جانب لڑکیاں اور عورتیں کھڑی ہوئی ہیں اور ان سب کی نگاہیں مخالف سمت اٹھی ہوئی ہیں۔ ان سب کے چہروں پر خوف اور حیرت اور سناٹا چھایا ہوا ہے۔ بہت سے چہرے سرخ ہیں...... تمتما رہے ہیں۔ سامنے ایک نیلے دھوئیں کا منجمد غبار ہے جو بیس فٹ اونچا ہے اور اس کے سامنے تین عورتیں کھڑی ہیں۔

جب اس کی نظر ٹھاکرانی، اس کی بیٹی اور بہوؤں پر پڑی تو وہ بری طرح چونکی۔ اس نے ان چاروں کو

پہچان لیا۔ آخر کیوں نہ پہچانتی...... وہ اپنے پتاجی کے ساتھ دو ایک مرتبہ حویلی جا کر ان سے نہ صرف ملی تھی بلکہ ان کے ساتھ کھانا بھی کھایا تھا۔ یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ چاروں بے لباس کھڑی ہوئی ہیں اور ایک دوسرے کو چھپا رہی ہیں۔ مردوں اور لڑکوں کا، لڑکیوں اور عورتوں کا مجمع بھی انہیں دیکھے جا رہا ہے۔

ان سے چند قدم پر چار مرد بھی بے لباس کھڑے تھے اور ان میں اس کا باپ بھی شامل تھا۔ اس کے باپ نے اسے دیکھ کر اپنی پشت پھیر لی تھی جیسے وہ اپنی برہنگی کو بیٹی کی نظروں سے چھپانا چاہتا ہے۔ ایک طرف مسلح سپاہی بھی موجود تھے۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ قصہ کیا ہے۔ پھر اسے یاد آیا کہ وہ شراب کے نشے کی حالت میں سپنا دیکھ رہی ہے سپنے ایسے ہی عجیب و غریب ہوتے ہیں۔ وہ عورتوں کے مجمع میں جانے کے بجائے ٹھاکرانی کی طرف بڑھی۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ اس کے جسم پر بھی لباس نہیں ہے۔ وہ گدھے کے سر کے سینگ کی طرح غائب ہو چکا ہے۔ اب اس میں اور ان عورتوں کی حالت میں کوئی فرق نہیں رہا ہے۔ انسپکٹر ذرا سا گھوما اور اپنی بیٹی کو جو دیکھا تو اس کی کھوپڑی بھک سے اڑ گئی۔ اسے طیش آ گیا۔ اس نے بالکل بھی پروا نہیں کی کہ وہ کس حالت میں ہے۔ وہ دھوئیں کے غبار کی طرف بڑھا۔ اس وقت اس کی حالت پاگلوں کی سی ہو رہی تھی۔ اس نے کرکٹ کی گیند سائز کے تین چار پتھر اٹھائے اور منجمد دھوئیں کے غبار پر دے مارے۔ لیکن وہ پتھر پلٹ کر اس کے آ لگے۔ ایک پتھر اس کے گھٹنے پر، دوسرا چھاتی پر، تیسرا کندھے پر اور چوتھا کھوپڑی پر...... کھوپڑی پر پتھر لگا تو اس پر زخم آ گیا اور اس میں سے خون بہہ کر چہرے اور گردن پر پھیلنے لگا۔

مالنی نے جو یہ حالت دیکھی تو تڑپ اٹھی۔ لیکن اس کی مجبوری اور بے بسی یہ تھی کہ وہ اور اس کا باپ ایسی حالت میں تھے کہ ایک دوسرے کے سامنے نہیں آ سکتے تھے۔ وہ ششدر اور خوف زدہ تھی کہ یہ پتھر اس کے باپ نے دھوئیں کے غبار پر کس لئے مارے تھے کیا اس دھوئیں کے غبار میں کوئی چھپا ہوا ہے جس نے جوابی حملہ کیا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ وہ ابھی بھی اسے سپنا ہی سمجھ رہی تھی۔ یک بارگی اسے کچھ خیال آیا تو اس نے اپنے بدن پر چٹکی لی۔ میں نے اسے یہ سب کچھ سپنا ہی سمجھنے پر مبتلا کر رکھا۔ اس لئے چٹکی اسے بیدار نہ کر سکی۔

گو یہ بات زیب نہیں دیتی تھی کہ ان عورتوں کی بات مان لی جائے جو انتقام لینا چاہتی تھیں۔ وہ بدلہ لینے پر تلی ہوئی تھیں، انصاف کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ ان عورتوں کی بات مان لی جائے۔ اسی طرح ان کے انتقام کی آگ بجھ سکتی تھی۔ کلیجے میں ٹھنڈک پڑ جاتی اور ان کی آتما کو شانتی ملتی۔ یہ درندے اور ان کی عورتیں معافی کے قابل نہیں تھیں۔ اب مجھے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ میں ایک ناگوار لیکن ایک ایسا فیصلہ کروں کہ ستم زدہ، ستائے ہوئے، متاثرہ اور مظلوموں کے دلوں میں نفرت و انتقام کی جو آگ بھڑک رہی ہے اسے سرد کر دوں تاکہ ان کے کلیجوں میں ٹھنڈک پڑ جائے، ان کی آتما کو شانتی ملے اور وہ سکون کی نیند سو سکیں۔ ان کا سکون واپس مل جائے جو غارت ہو چکا تھا۔

یہ خون آشام بھیڑیئے تھے۔ انہیں کیفر کردار تک پہنچانا ضروری تھا اس لئے بھی کہ آئندہ وہ کسی غریب کو ستا نہ سکیں۔ وہ ہمیشہ اپنے اثر و رسوخ اور دولت کے بل بوتے پر قانون کے ہاتھوں سے بچتے

آ رہے تھے۔ ان کا بال تک بیکا نہ ہو سکا تھا الٹا ستم زدہ لوگوں کو تنگ ہراساں اور پریشان کرتے رہے۔ ان پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے۔

کچھ دیر بعد میں نے ان مردوں کو جن کی عورتوں کو بے عزت کیا گیا تھا۔ مردوں کے مجمع میں سے باہر آنے کے لئے کہا۔ جب وہ باہر آ گئے تو میں نے ان سے کہا کہ وہ ان عورتوں کو اس طرح ہانکیں جس طرح جانوروں کو ہانکا جاتا ہے۔ ان کا چاروں طرف گشت کروائیں۔ وہ پانچ مرد تھے۔ انہوں نے ایک ایک عورت کا بازو تھام لیا۔ ان عورتوں نے مزاحمت کرنے کی بڑی کوشش کی لیکن وہ کر نہ سکیں۔ کیونکہ میں نے ان کی ساری طاقت سلب کر لی تھی۔ وہ ان عورتوں کو قربانی کے جانوروں کی طرح مجمع کے سامنے لے کر بڑھے۔ انسپکٹر ٹھاکر چیخے۔ انسپکٹر نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ ان مردوں کو جان سے مار دو۔ ان پر گولیاں برساؤ۔ میں نے تڑختے لہجے میں کہا۔ ”اگر کسی نے اپنی جگہ سے ہلنے اور فائر کرنے کی کوشش کی تو وہ جل کر بھسم ہو جائے گا۔“ پھر دھوئیں کے غبار سے آگ کے شعلے ان کی طرف لپکے۔ ”دیکھا تم لوگوں نے...... یہ آگ اسے جلا دے گی جو فائر کرے گا۔“

آگ کے شعلے دیکھ کر ان کے اوسان خطا ہو گئے۔ کتنے سپاہیوں کے ہاتھوں سے بندوقیں گر گئیں۔ ادھر انسپکٹر اور ٹھاکر اور اس کا گھر جوائی اور بیٹے خوف و دہشت سے لرزنے لگے۔ ان کی رگوں میں لہو منجمد ہو گیا اور چہرے سفید پڑ گئے تھے۔ ٹھاکر نے جس طرح دوسری عورتوں کو ذلیل و رسوا کیا تھا آج اس کی عورتوں کے ساتھ ویسا ہی ہو رہا تھا۔ کچھ عورتوں نے مجمع میں سے نکل کر ٹھاکرانی اور دوسری عورتوں کے منہ پر بھی تھوکا تھا۔ ایک طرف جو برہمن اور اونچی ذات کے مرد اور عورتیں کھڑی ہوئی تھیں ان کے خون اس ذلالت پر کھول رہے تھے۔ جب ان عورتوں کا اچھی طرح گشت کرایا گیا تب انہیں حویلی لے جا کر ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ کچھ مردوں نے انسپکٹر ٹھاکر، اس کے گھر جوائی اور بیٹوں کو حویلی لے جا کر ان کی مشکیں کس دیں۔ پھر ان عورتوں کو ان کے سامنے لایا گیا۔ پھر وہ ہرایا گیا جو ٹھاکر، اس کے گھر جوائی اور بیٹے دہراتے آئے تھے۔ پرساد کی ماں اور بہن کے ساتھ دہرانا چاہتے تھے۔

جب انتقام اور بدلہ لے لیا گیا تب نادیدہ آواز اس کمرے میں گونجی۔ ”انسپکٹر...... ٹھاکر!...... تم نے کیا محسوس کیا......؟ تمہیں بہت اچھا لگا ہو گا یہ منظر دیکھ کر...... بہت لطف آیا ہو گا۔“

ان میں سے کسی نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ جواب کیا دیتے۔ ان کے پاس کہنے کے لئے تھا ہی کیا۔ انہوں نے جو کچھ دیکھا اور اندر ہی اندر اس بات پر پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ ان کی رگوں میں لہو ابل رہا تھا کہ نچلی ذات والوں نے اونچی ذات کی عورتوں کی پامالی کر دی تھی۔ اس سے بڑی ذلت کوئی نہ تھی۔ ان اچھوتوں نے پوری برہمن قوم کے منہ پر تھپڑ رسید کیا تھا جس کی جلن، درد اور اذیت انہیں محسوس ہو رہی تھی۔ ان کے وجود پر انگارے دہک رہے تھے۔

انسپکٹر کی نظروں میں وہ عورتیں اور لڑکیاں ایک ایک کر کے فلمی مناظر کی طرح آ رہی تھیں جن سے اس نے ناجائز فائدہ اٹھایا تھا۔ آج اس کی اپنی جوان بیٹی بھی اس کی نظروں کے سامنے شکار ہو گئی تھی۔ اس

نے جو بویا تھا وہ کاٹنا پڑا تھا۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی...... قدرت کا یہ اٹل قانون تھا۔ اس سے کوئی بچ نہیں سکتا تھا۔ اب وہ دل میں مجھے گالیاں دے رہا تھا کہ میں کہاں سے آنکلا اور اس نے کاش ٹھاکر سے سودے بازی نہیں کی ہوتی۔

اس وقت کمرے میں وہ عورتیں اور لڑکیاں داخل ہوئیں جن کے جسموں پر ٹھاکرانی، اس کی بیٹی اور بہوؤں نے تیزاب چھڑکا تھا۔ ان کے ہاتھ میں تیزاب سے بھری بوتلیں تھیں۔ انہیں دیکھ کر ٹھاکر کی عورتیں رونے اور چیخنے لگیں۔ وہ منتیں اور سماجتیں کرنے لگیں۔ لیکن وہ عورتیں انہیں معاف کرنا نہیں چاہتی تھیں کیوں کہ وہ...... وہ دن نہیں بھولی تھیں۔ آج وہ سب کچھ اس طرح سے یاد آ گیا تھا جیسے کل ہی کی بات ہو۔ انہوں نے ان کے چہروں اور جسموں پر تیزاب چھڑکا۔ حویلی ان کی دل خراش چیخوں سے گونجنے لگی۔ انسپکٹر کی بیٹی مالنی کو انہوں نے نشانہ نہیں بنایا۔ کیوں کہ مالنی موجود نہیں تھی۔ وہ اس بربریت میں شامل نہیں تھی۔ اسے اپنے باپ کے کرتوتوں کی سزا اس لئے دی گئی تھی کہ باپ کو احساس ہو کہ اس کے دل پر اس درندگی سے کیا گزرتی ہے۔ چوں کہ اس نے کسی بہن، بیٹی اور بیوی پر ترس نہیں کھایا تھا اس لئے اس کی بیٹی پر بھی ترس نہیں کھایا گیا۔ اذیت کے جہنم میں اس لئے پھونک دیا گیا تھا کہ وہ ساری زندگی جلتا رہے۔

ٹھاکرانی کے ساتھ مالنی کے علاوہ دوسری عورتیں درد، جلن اور تکلیف سے ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھیں ان میں سے ایک عورت بولی۔ ''کیوں ٹھاکرانی! تیزاب سے جلنا کیسا لگ رہا ہے؟ کیا میں اور تیزاب چہرے پر پھینک دوں...... چہرے پر نہیں تو جسم پر سہی۔ تمہارے، تمہاری بیٹی اور تمہاری بہوؤں کے جسم پر جو بہت نازک اور گورے ہیں یہ داغ اور آبلے کتنے سندر لگ رہے ہیں۔ ایک طرح سے ڈیزائن لگ رہے ہیں......''

''نہیں...... نہیں......'' ٹھاکر کی بڑی بہو گڑگڑائی۔ ''بھگوان کے لئے ایسا نہ کرو۔ رحم کرو۔ دیا کرو۔''

''رحم کردیں...... دیا کردیں......؟'' وہ قہقہہ مار کر ہنسی۔ ''تم لوگوں نے تو ہم پر ذرہ برابر بھی رحم نہیں کھایا۔ ہم نے کتنا ہاتھ پیر جوڑے...... منتیں کیں۔ ہم پر دیا کرنے کے بجائے قہقہے لگائے۔ ہنستی رہی تھیں۔''

''یہ ہم نے اپنی مرضی اور خوشی سے نہیں کیا تھا۔'' چھوٹی بہو بولی۔ ''یہ ہمارے شوہروں اور ٹھاکر کا حکم تھا...... اگر ہم ایسا نہیں کرتیں تو ٹھاکر اور ہمارے پتی اور ٹھاکرانی نہ جانے کیا کرتیں۔ ہم مجبور تھیں ان کا حکم ماننے پر......''

''اب تم عورتیں باہر جاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''تم لوگوں نے ان سے بدلہ لے لیا۔ چھوٹی بہو سچ کہہ رہی ہے لیکن وہ انکار کرسکتی تھی۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ یہ تازیانہ ان کی ساری زندگی کے لئے کافی ہے۔''

وہ عورتیں باہر نکل گئیں۔ پھر ان تمام مردوں کو جو حویلی میں تھے ان کی مشکیں کھول کر باہر لایا گیا۔ پھر میں نے کہا۔ ''ہم واپس جارہے ہیں۔ ٹھاکر اور انسپکٹر سن لو...... تم ان اچھوتوں کو نہ تو ستاؤ گے۔ نہ ان سے بدلہ لو گے۔ انہیں اپنے جیسا ہی انسان سمجھو گے۔ ان کی عورتوں کی بے حرمتی نہیں کرو گے...... جو ہوا اسے بھول جاؤ گے۔''

دھوئیں کا غبار گھٹتا اور تحلیل ہوتا گیا۔ ادھر جو مرد بے لباس تھے اور عورتیں بھی...... وہ بھی اب لباس میں ملبوس تھیں۔ لیکن وہ حویلی میں تھیں جلن اور زخموں نے ان کا برا حال کر رکھا تھا۔ ان کی ٹھکرانیاں انہیں سنبھال رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد ٹھاکر نے انسپکٹر سے کہا۔ ''یہ دیوتا مہاراج جاچکا ہے میں یہ چاہتا ہوں کہ ان حرام زادوں کو چن چن کر ختم کردیا جائے...... ایک عورت، ایک مرد اور بچہ زندہ نہ رہے۔ سانپ کا بچہ سنپولیا ہوتا ہے...... تم نے دیکھا...... ان سوروں اور رذیلوں کی وجہ سے جو ذلت اور رسوائی ہوئی اسے بھلایا نہیں جاسکتا...... ان لوگوں کے ہاتھ کاٹ دو جنہوں نے ہماری عورتوں کی آبروریزی کی۔ اس کام میں دیر نہ کرو انسپکٹر!''

''ٹھاکر...... وہی ہوگا جو تم چاہتے ہو...... سب سے پہلے اپنے ایک آدمی کو بھیج کر اسپتال سے ایمبولینس منگواؤ...... تاکہ ان عورتوں کے زخموں کا علاج ہوسکے۔ انہیں فرسٹ ایڈ دی جاسکے۔'' گھر جوائی اور دونوں بیٹے حویلی کی طرف لپک گئے۔

ٹھاکر ایک ملازم کو بلا کر بولا کہ وہ اسپتال ٹیلی فون کرکے دو تین ایمبولینس منگوائے۔ ادھر انسپکٹر نے سپاہیوں کو حکم دیا۔ ''اس طرف سارے اچھوت مرد اور عورتیں، لڑکیاں اور بچے کھڑے ہیں انہیں بھون دو...... ایک بھی زندہ نہ بچے...... ٹھاکر صاحب تم سب کو انعام دیں گے۔ فی سپاہی ایک ہزار روپے ملیں گے......''

دیوتا کے جاتے ہی ان کے اوسان بحال ہوئے تھے۔ وہ سپاہی تھے۔ ان کے افسر کا حکم تھا۔ افسر کا ہر حکم بجالانا ان کا فرض تھا۔ دھوئیں کا غبار نہیں تھا اس لئے وہ یہ سمجھے کہ دیوتا نہیں رہے۔ دھوئیں کے غبار سے جو آگ کے شعلے نکل کر ان کی طرف لپکے تھے اس نے انہیں دہشت زدہ کردیا تھا اور پھر افسر نے حکم کے ساتھ ساتھ ایک ہزار روپے کے انعام کا اعلان کیا تھا۔ ایک طرح سے لالچ دیا تھا۔ ان اچھوتوں کے دشمن تو وہ بھی تھے۔ لہٰذا انہوں نے صف بنا کر اچھوتوں کو نشانہ لیا۔ عورتوں، مردوں اور لڑکوں کے مجمع کی طرف بندوقوں کو تان لیا۔ ان لوگوں نے انسپکٹر کا حکم سن لیا تھا۔ ان میں ایک بھگدڑ سی مچ گئی۔ ان کا منہ جدھر اٹھا وہ ادھر بھاگے۔ بوڑھے مرد اور عورتیں چوں کہ بھاگ اور تیز دوڑ نہیں سکتی تھیں اس لئے وہ اس افراتفری اور دھکم پیل میں گر پڑے تھے۔ جتنی دیر میں سپاہیوں نے صف بندی کرکے فائرنگ شروع کی اتنی دیر میں بیشتر اپنے گھروں میں گھس چکے تھے۔ اپنی بستی میں داخل ہوگئے تھے اور درختوں کی آڑ میں ہوگئے۔ گرے پڑے مرد اور عورتوں پر گولیاں برسائی گئیں لیکن میں نے ان کے نشانے خطا کردیئے۔ وہ لوگ خوف و دہشت سے بے ہوش ہوگئے تو انسپکٹر ٹھاکر اور سپاہی یہ سمجھے کہ وہ مر گئے۔ وہ چھ سات نفر تھے۔ باقی سارے ان سب کی نظروں سے اوجھل ہوچکے تھے۔

''دو سو مرد اور عورتوں میں سے صرف چھ سات مرے ہیں۔'' ٹھاکر نے کہا۔ ''میں یہ چاہتا ہوں کہ ان میں سے ایک بھی زندہ نہ رہے۔''

''کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ ان کی بستی سے گھروں سے نکال کر ایک ایک کو مار دیا جائے؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''ہاں......'' ٹھاکر نے سر ہلایا۔ ''یہ زیادہ بہتر ہوگا۔ اس طرح ایک بھی زندہ نہ بچے گا۔ ان

سانپوں کا پھن کچل ہی دو۔"

"میرے خیال میں یہ زیادہ مناسب نہ ہوگا۔" انسپکٹر کہنے لگا۔ "ان کی طرف سے مزاحمت اور لڑائی بھی ہوسکتی ہے۔ ہر ایک کو اپنی جان پیاری ہوتی ہے...... اور پھر یہاں آس پاس گاؤں کے لوگ بھی موجود تھے۔ ان میں سے کچھ جا چکے ہیں اور کچھ موجود ہیں۔ ان میں برہمن ذات کے علاوہ ہریجن بھی تھے۔ کہیں وہ پریس اور اعلیٰ پولیس افسران کو نہ بتا دیں۔ دو چار آدمیوں کی موت پر میں پردہ ڈال سکتا ہوں۔ دو سو مرد، عورتوں کو مار دینا مذاق نہیں ہے۔"

"اس بات کو میں بھی سمجھتا ہوں انسپکٹر!" ٹھاکر کہنے لگا۔ "تمہاری بیٹی اور میری عورتوں کے ساتھ جو کچھ ہوا کیا اسے برداشت کیا جاسکتا ہے۔ ان کے کہنے پر دیوتا مہاراج نے ہمیں ذلیل و رسوا کیا۔ ان کے ہاتھوں سے بے عزت کروایا۔ ہماری نظروں کے سامنے جو کچھ ہوا انتہائی شرم ناک تھا۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس بستی اور اس کے رہنے والوں کا وجود سدا کے لئے مٹا دیا جائے۔"

"میرے ذہن میں ایک زبردست ترکیب آ رہی ہے۔" انسپکٹر خوش ہو کر بولا۔ "اس بستی کو آگ لگا دی جائے۔ سانپ بھی مر جائے گا۔ لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی۔ اس طرح ایک آدمی بھی اپنی جان بچا کر نہ جاسکے گا۔

"ترکیب تو بہت اچھی ہے۔" ٹھاکر نے کہا۔ "آگ لگنے کی صورت میں زیادہ آدمی مر نہ سکیں گے۔ وہ اپنی جانیں بچا کر نکل جائیں گے۔ البتہ ان کا مالی نقصان زیادہ ہوگا۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ ان میں سے ایک بھی نہ بچ سکے۔"

"آگ لگانے سے پہلے میرے سپاہی اس بستی کا محاصرہ کرلیں گے۔" انسپکٹر نے کہا۔ "جو بستی سے نکل کر بھاگنے کی کوشش کرے گا میرے سپاہی اسے بھون دیں گے۔ اس طرح ایک بچہ بھی زندہ نہیں بچے گا۔ میں بھی ان کمینوں سے بدلہ لینا چاہتا ہوں۔"

انسپکٹر کے حکم سے بستی کا محاصرہ کرلیا گیا۔ پھر کچھ گھروں کو چار اطراف سے تیل چھڑک کر آگ لگائی گئی۔ بستی میں آگ کیا لگتی حویلی میں آگ لگ گئی۔ انسپکٹر اور ٹھاکر نے حیرت و خوف سے دیکھا۔ ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ حویلی کے اندر جو موجود تھے وہ چیختے ہوئے باہر آ ئے۔ اس وقت دو ایمبولینس آتی دکھائی دیں۔ ان دونوں ایمبولینسوں میں زخمی عورتوں کو سوار کرا دیا گیا کیوں کہ ان کی حالت بڑی ابتر ہو رہی تھی۔ ان سے درد، جلن اور تکلیف برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ دونوں ایمبولینس چلی گئیں۔ مالنی ساتھ نہیں گئی۔ کیوں کہ وہ زخمی نہیں ہوئی تھی اور نہ اس پر تیزاب پھینکا گیا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس حویلی کو چاروں طرف سے آگ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے تھے۔ لوگ گھروں سے باہر نکل آئے تھے۔ لیکن اس آگ کو بجھانا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ بستی میں باوجود کوشش کے آگ نہ لگ سکی تھی۔ ٹھاکر کی نہ صرف حویلی بلکہ اس کا سارا اثاثہ جل کر خاک ہو چکا تھا۔

ٹھاکر کو پاگل ہونا تھا وہ پاگل ہوگیا تھا۔ حویلی کے ملبے کا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ انسپکٹر یہ سب کچھ دیکھ کر خوف زدہ، حیران و پریشان ہو کر مالنی کو لے کر ایک طرف کھڑا ہوگیا۔ اس نے تمام سپاہیوں کو واپس چلنے کا حکم دیا۔ وہ اپنی بیٹی کو لے کر جیپ کی طرف بڑھا۔ وہ جیپ خود چلا رہا تھا اور اس کے دماغ میں ایک ہیجان سا برپا تھا۔ وہ اس شخص کے بارے میں سوچ رہا تھا جس نے اس کی بیٹی کو زیادتی کا نشانہ بنا دیا تھا۔ دو برس پہلے اس نے اس شخص کی بہن کو بے عزت کیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کل وہ اس شخص کے گھر جا کر اسے شوٹ کردے گا۔ اس سوچ میں وہ ایسا گم تھا کہ اس نے کنارے والی کھڈ نہیں دیکھی۔ جب اس نے سڑک کے کنارے والی کھڈ دیکھی تو اسے دیر ہو چکی تھی۔ گاڑی بے قابو ہو کر اس کھڈ میں جا گری۔

جب اسے ہوش آیا تو وہ اسپتال میں تھا۔ اس کے دماغ میں اندرونی طور پر چوٹیں آئی تھیں۔ اس کے دونوں پیر ٹوٹ چکے تھے۔ پوری زندگی کے لئے وہ عبرت کا نشان بن چکا تھا۔ وہ پل پل مرتا اور پل پل زندہ ہوتا، ایک ناقابل برداشت اذیت میں مبتلا ہو چکا تھا۔ نالی کے ایک گندے کیڑے سے بھی بدتر تھا۔ اس کی بیٹی اس لئے بچ گئی تھی کہ اس نے جیپ سے چھلانگ لگا دی تھی۔ وہ معمولی سی زخمی ہوئی تھی۔

چک بالا پور کی اس بستی میں جو کچھ ہوا تھا اور ہو رہا تھا وہ ٹھاکر اور انسپکٹر کی ملی بھگت سے تھا۔ ٹھاکر کے پاگل ہونے اور حویلی کے جل کر خاکستر ہونے سے ظلم و ستم بھی ختم ہو چکا تھا۔ اب وہ نہ صرف ایک بھکاری بلکہ ایک اچھوت سے بھی بدتر تھا۔ اس کے گھر کے لوگ بھی بھکاری بن چکے تھے۔ اب اچھوتوں کو کوئی خطرہ نہیں رہا تھا۔ اس روز رات کے وقت اتفاق سے ارجن چوری چھپے اپنی بیوی کو اپنے ماں باپ سے ملانے لایا تھا۔ نروپا اور ارجن کو کچھ خبر نہ تھی کہ یہاں کیا واقعہ پیش آچکا ہے۔ نروپا نے جب اپنی ساس اور نند کی زبانی سنا تو اسے باپ کے پاگل ہونے، ماں، بڑی بہن، بہنوئی اور بھائیوں کے ساتھ جو کچھ ہوا سن کر صدمہ نہیں ہوا۔ اس کا کہنا تھا کہ انہیں کئے کی سزا ملی ہے بلکہ وہ اس قابل تھے کہ انہیں پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔ ان کا جرم سنگین، شرم ناک اور گھناؤنا تھا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر وہ موجود ہوتی تو اپنے باپ کو اپنے ہاتھوں سے شوٹ کردیتی اور اس انسپکٹر کو بھی۔ اب امن ہی امن تھا۔

☆......☆......☆

میں الور کے میلے میں پہنچا۔ وہاں بڑی رونق، رنگینی، چہل پہل اور گہما گہمی تھی۔ یہ ایک بڑے رقبے پر میلا لگا ہوا تھا۔ اس کا رقبہ نصف میل سے زیادہ ہی تھا۔ اس میلے میں کیا کچھ نہ تھا۔ جھولے اور کھیل، تفریح کا ہر سامان موجود تھا۔ جوئے کے اسٹال بھی تھے۔ ملبوسات، کپڑے اور ہر قسم کی دکانیں بھی لگی ہوئی تھیں۔ موت کا کنواں بھی تھا۔ اس کے علاوہ ناچ گانے کے تھیٹر بھی تھے۔ جو ناچ گانے کے شو ہو رہے تھے وہ لچر اور فحش قسم کے تھے۔ ہر اسٹال پر، ہر تھیٹر، ہر دکان اور ہوٹل پر رش تھا۔ کرناٹکی کھانے تھے۔ کرناٹکی کھانے مجھے بہت پسند تھے۔ خصوصاً مسالہ دوسا اور اٹلی سانبھر...... یہ مقامی کھانے تھے۔ اس میلے میں صرف ہندو، برہمن اور مدراسیوں کے ہوٹل نہ تھے بلکہ مسلمانوں کے بھی تھے میلے میں ہر مذہب، قوم اور فرقے کے لوگ بھی اپنی وضع قطع میں دکھائی دے رہے تھے۔ مسلمانوں کے ہوٹلوں میں بھی بھی

بھیڑ تھی۔ گاہکوں میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو، کرسچن اور سکھ بھی تھے۔

اس میلے میں امیر غریب تھی۔ سب اپنی اپنی حیثیت کے مطابق خرچ اور تفریح کر رہے تھے۔ دو نوجوان سے لڑکے اور ان کے ساتھ ایک عورت تھی جوان بچوں کی ماں معلوم ہوتی تھی۔ وضع قطع اور چہرے مہرے سے وہ مسلمان لگ رہے تھے۔ لیکن ان کی غربت اور احساس محرومیاں ان کے چہرے، آنکھوں اور لباس سے عیاں تھیں۔ وہ ایک مسلمانوں کے ہوٹل کے سامنے کھڑے ہوئے حسرت بھری نگاہوں سے گرل، سیخ کباب، چکن تکوں اور بکرے کی چانپیں اصلی گھی میں جو فرائی کی جا رہی تھیں انہیں دیکھ رہے تھے۔ ان کے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔ جب کہ عورت بڑی افسردہ اور مغموم سی کھڑی تھی۔ اس کا دل جیسے اندر سے رو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر دکھ اور کرب کی پرچھائیاں تھیں۔ اس نے اپنے دونوں بچوں کے بازو پکڑ کر ان سے غم زدہ لہجے میں کہا۔ ”اب چلے بھی چلو...... ہمارے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ اس ہوٹل سے کچھ خرید کر کھا سکیں۔ یہ بہت مہنگا ہوٹل ہے۔“

”کیا ماں!...... تم اس ہوٹل سے ایک چیز بھی نہیں خرید کر کھلا سکتی ہو؟“ بڑے لڑکے نے کہا۔ جس کی عمر پندرہ برس کی تھی۔ ”اس ہوٹل میں سب سے زیادہ رش ہے۔ ابھی ایک آدمی جو اس ہوٹل سے کھانا کھا کر نکلا تھا وہ کیا کہہ رہا تھا۔ تم نے سنا نہیں ماں! کتنی تعریف کر رہا تھا اس ہوٹل کے کھانوں کی......؟“

”رشید بیٹے!“ ماں نے اس کا بازو چھوڑ کر اس کے سر کے بالوں کو سہلایا۔ ”ہاں اس ہوٹل کے کھانے بہت مزے دار اور ذائقہ دار ہیں۔ یہ بات تو عابدہ خالہ نے بھی کہی تھی جو کل اس میلے کی سیر کرنے آئی تھیں۔ اس لئے میں بھی دو سو تیس روپے لے کر آئی تھی۔ تم نے دو سو روپے کھو دیئے ہیں جو میں نے اس میلے میں کھانے کے لئے تین مہینے سے پائی پائی جوڑ کر جمع کئے تھے۔ اس میں سے کچھ پیسے بچ جاتے تو کوئی چھوٹی موٹی چیز یا تمہاری بہن کے لئے ایک ساڑھی ہی خرید لیتی۔ تیس روپے میں سے دس روپے واپسی کا کرایہ ہے۔ بیس روپے میں ہم کیا کھا سکتے ہیں؟“

”بیس روپے میں ایک سیخ کباب تو آ سکتا ہے۔“ رشید نے کہا۔ ”تم بیس روپے دے دو۔ میں ایک سیخ کباب بھی لیتا آؤں۔“

ماں نے بیٹے کو بیس روپے کا نوٹ دے دیا۔ وہ نوٹ لے کر لپک گیا۔ میں ایک طرف اور ان سے قدرے قریب غیر محسوس انداز سے کھڑا ہو گیا۔ لڑکا تھوڑی دیر میں ایک سیخ کباب پارسل لے آیا۔ لڑکے نے ماں سے اصرار کیا کہ وہ بھی کھائے۔ سیخ کباب کی مقدار ہی کیا تھا۔ ایک پانچ چھ برس کا بچہ بھی ایسی تین سیخیں کھا لے تو اس کا پیٹ نہ بھرے۔ ماں نے بہانہ کیا کہ اس کا پیٹ خراب ہے اور اسے بھوک بالکل بھی نہیں ہے۔ بڑے بیٹے نے کہا چکھ تو لیں...... لیکن ماں نے انکار کر دیا۔ وہ بڑی حسرت سے بچوں کو دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ کاش پیسے ہوتے تو بچوں کو وہ پیٹ بھر کر کھلا تو سکتی۔ وہ اپنا دل مسوس کر رہ گئی۔ یک لخت اس کا دل بھر آیا تو اس کی آنکھوں میں موتی دمکنے لگے۔

میں سوچنے لگا کہ میں کس بہانے سے اس عورت اور اس کے بچوں کو ہوٹل میں لے جا کر کھلاؤں۔

ہم ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھے اور پھر یہ عورت جو چھتیس برس کی ہوگی۔ اس کے تین بچے تھے۔ ایک بڑی بیٹی تھی جو کسی وجہ سے نہیں آئی تھی اور پھر یہ عورت خوب صورت بھی تھی۔ اگر میں کھانے کے لئے مدعو کرتا تو وہ مشکوک سی ہو جاتی۔ میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ ایک عورت اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ جو گزر رہی تھی اس کے پاس آئی۔ رشید کی ماں نے اس عورت کے شوہر اور بچوں کی ماں کو سلام کیا۔ وہ عورت رشید کی ماں سے بغل گیر ہو گئی۔ ”نجمہ آپا! آپ کیسی ہیں؟“ رشید کی ماں نے پوچھا۔ ”آپ بہت دنوں سے آئی نہیں...... خالہ جان کیسی ہیں؟“

”میں تو ٹھیک ہوں۔“ نجمہ نے جواب دیا۔ ”خالہ جان بھی ٹھیک ہیں وہ تمہیں بہت یاد کرتی رہتی ہیں۔ سلیم بھائی نظر نہیں آ رہے ہیں؟“

”ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لئے وہ نہیں آئے اور بتول بھی اسی لئے نہیں آئی وہ باپ کے پاس رک گئی۔“ رشید کی ماں نے جواب دیا۔ ”میلے میں آنے کا ارادہ نہیں تھا۔ رشید کے باپ نے کہا کہ بچوں کو میلہ دکھانے لے جاؤ۔ تین دن بعد ختم ہو جائے گا۔ اس وقت تک شاید میری طبیعت ٹھیک نہ ہو اور پھر رشید اور مجید بھی میلہ میں جانے کے لئے بہت ضد کر رہے تھے۔ اسی لئے میں لے آئی۔“

”تم نے اچھا کیا زلیخا!“ نجمہ نے کہا۔ ”اس لئے کہ اب میلہ آئندہ برس ہی لگے گا۔ ہاں بتول کی شادی کب کر رہی ہو؟ اس کی منگنی کو ایک برس ہو رہا ہے۔“

”ہم خود بہت پریشان ہیں۔“ زلیخا کہنے لگی۔ ”ان کے بڑے بھائی، حلیم بھائی جو پاکستان میں ہیں انہوں نے کہا تھا کہ میں ایک لاکھ روپے ایک دوست کے ہاتھ دو ایک مہینے میں بھیجوں گا۔ چھ مہینے ہو گئے۔ نہ تو انہوں نے رقم بھیجی اور نہ ہی ان کی کوئی خبر ہے...... میرے شوہر تو ان سے ناامید ہو گئے ہیں۔ تین چار خط لکھ چکے ہیں۔ ان کا جواب ابھی تک موصول نہیں ہوا۔ لڑکے والوں نے تین ماہ کی مہلت دی ہوئی ہے۔ اگر ہم نے تین مہینے میں شادی نہیں کی تو پھر وہ منگنی توڑ دیں گے۔ وہ زیادہ انتظار نہیں کر سکتے۔ یہ بات انہوں نے صاف صاف کہہ دی ہے۔ وہ اس فکر میں بیمار اور پریشان ہو گئے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں۔ آپا آپ دعا کریں۔ اللہ ہماری مشکل آسان کرے۔“

”اللہ پر بھروسا رکھو...... وہ بڑا اسبب والا ہے۔“ نجمہ نے اسے دلاسا دیا۔ ”نماز، صبر اور دعا کا دامن مضبوطی سے پکڑے رکھو۔ اللہ تمہاری ہر مشکل آسان کرے گا۔ تم کسی دن میرے ہاں آؤ۔ سوچتے ہیں کہ کیا کریں۔ یہ مسئلہ کیسے حل کریں۔“

وہ دونوں کچھ دیر تک مختلف موضوعات پر گفتگو کرتی رہیں۔ پھر نجمہ، اس کے شوہر اور بچے آگے بڑھ گئے۔ جب وہ خاصی دور چلے گئے۔ تو میں زلیخا کی طرف بڑھا۔ اس نے مجھے اب تک نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی اس کے کسی بچے نے۔ میں نے پوچھا۔ ”آپ سلیم صاحب کی بیوی زلیخا صاحبہ ہیں......؟“

”جی...... جی ہاں......“ زلیخا نے چونک کر مجھے حیرت سے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ ”آپ کون ہیں؟ میں نے آپ کو پہچانا نہیں......“

”لیکن میں نے آپ کو اندازے سے پہچان لیا۔“ میں نے کہا۔ ”میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ کیوں نہ ہوٹل میں چل کر بیٹھیں۔“

”لیکن بھائی! میں نے آپ کو نہیں پہچانا......“ وہ قدرے مشکوک سی ہو کر بولی۔ ”معافی چاہتی ہوں۔ میں آپ کے ساتھ ہوٹل میں چل نہیں سکتی۔“

”میں پاکستان سے آیا ہوا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”کراچی میں آپ کے جیٹھ حلیم صاحب رہتے ہیں۔ انہوں نے زبانی طور پر ایک پیغام آپ کے شوہر سلیم صاحب کے نام بھیجا ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں ہوٹل میں چل کر بات کرتے ہیں۔ میری طرف سے چائے کی دعوت قبول کریں۔“

”لیکن آپ نے مجھے کیسے پہچان لیا......؟“ زلیخا نے پلکیں جھپکائیں۔ اس کے چہرے پر گہرا استعجاب چھا گیا۔

”حلیم صاحب نے آپ کی بیٹی کی منگنی کی تصویریں دکھائی تھیں۔“ میں نے کہا۔ ”اس لیے آپ کو پہچان لیا۔ اچھا ہوا میلے میں آپ سے ملاقات ہوگئی۔ میں بنگلور میں ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ وہاں آپ کے گھر کا پتا بھول آیا تھا یہ کتنا اچھا اتفاق ہے کہ آپ سے میلے میں ملاقات ہوگئی۔“

قدرے تذبذب اور جھجک کے بعد زلیخا ہوٹل میں چل کر بات کرنے اور چائے پینے کے لیے تیار ہوگئی۔ ہوٹل میں داخل ہوئے۔ اندر بہت رش تھا۔ ساری میزیں بھری ہوئی تھیں۔ اتفاق سے ایک کونے والی میز خالی ہونے لگی تو رشید نے لپک کر اس میز پر قبضہ کر لیا۔ وہ بہت ذہین لڑکا تھا۔ میز پر بیٹھنے کے بعد میں نے بچوں سے پوچھا۔ ”ہاں بھئی...... پیارے پیارے بچو! آپ کیا کھانا پسند کریں گے؟“

”ہم لوگ صرف چائے پئیں گے۔“ بچے کچھ کہتے کہ جھٹ سے زلیخا بول پڑی۔ ”آپ تکلف مت کریں۔ ہاں یہ بتائیں کہ حلیم بھائی جان نے کیا کہا......؟“

”یہ کھانے کا وقت ہے کھانا کھائیں گے۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے بڑے زور کی بھوک لگی ہے۔ پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔ آپ لوگوں کے چہروں سے بھی ایسا لگ رہا ہے کہ آپ لوگوں نے بھی کچھ کھایا پیا نہیں ہے۔ تکلف کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں حلیم صاحب کا پڑوسی اور دوست بھی ہوں۔“

رش کی وجہ سے ویٹر بہت مصروف تھا۔ اس میز پر آنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ میں اٹھ کر کیش کاؤنٹر پر گیا۔ وہاں آرڈر لکھوا کر میز پر آ گیا۔

”حلیم بھائی جان کیسے ہیں......؟ وہ خیریت سے تو ہیں نا......“ زلیخا بولی۔ ”ہم نے تین چار ماہ میں چار پانچ خط لکھے لیکن ایک کا جواب بھی نہیں آیا۔“

”دراصل دونوں ملکوں کے درمیان ڈاک کا نظام بڑا ناقص ہو گیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”حلیم صاحب کو بھی تشویش تھی کہ ان کے خطوں کا جواب کیوں نہیں آ رہا ہے۔ وہ بہت پریشان تھے۔ اب میں انہیں جا کر بتا دوں گا کہ آپ کے ہاں سب خیریت ہے۔ فکر اور پریشانی کی کوئی بات نہیں۔“

”آپ کی جو کرکٹ ٹیم ہے نا وہ بہت اچھی ہے۔“ رشید نے کہا۔ ”مجھے شاہد آفریدی بہت پسند

ہے۔ وہ بہت اچھا کھیلتے ہیں۔“

”مجھے بھی انکل......“ اس کے چھوٹے بھائی مجید نے کہا۔ ”میں بڑا ہو کر شاہد آفریدی کی طرح چھکوں چوکوں کی بارش کر دوں گا۔“ ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ویٹر بڑی ٹرے میں کھانا لے کر آ گیا۔ وہ میز پر کھانا چننے لگا۔ میں نے گرل چاپنیں فرائی، مرغی فرائی، مرغ بریانی، سیخ کباب، پراٹھے، اور سویٹ ڈش بھی منگوائی تھی۔

”ایں...... آپ نے اتنا سارا کھانا منگوا لیا......؟“ زلیخا نے حیرت بھری نظریں کھانے پر سے ہٹا کر مجھے دیکھا۔ ”یہ کیا کیا آپ نے......؟“

”ہم سب ہی کو بڑے زوروں کی بھوک لگ رہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ ختم ہو جائے گا تو اور منگوا لوں گا۔ پیٹ بھر کے کھائیں......“

”سکندر صاحب......“ زلیخا بولی۔ میں نے اپنا نام بتا دیا تھا۔ ”آپ نے ہمیں شرمندہ کر دیا۔ آپ ہمارے مہمان ہیں۔ ہمیں آپ کو......“

”پیارے بھتیجو......“ میں نے دونوں لڑکوں سے کہا۔ ”تم اپنی امی کی باتیں نہ سنو۔ یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔ بسم اللہ کہہ کر شروع کرو۔ ہم تمہارے انکل ہیں...... پاکستانی انکل...... کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف ویٹر کو بلا کر آرڈر دے دینا۔“

لڑکوں نے بڑے ادب اور تمیز سے کھانا شروع کر دیا۔ حالانکہ وہ بہت بھوکے ہو رہے تھے۔ زلیخا نے اپنی رکابی میں کچھ نہیں ڈالا۔ اس نے پہلے تو ہاتھ بڑھایا۔ پھر کچھ سوچ کر روک لیا۔ اس کے چہرے پر ایک کرب اور افسردگی سی چھا گئی۔ میں سمجھ گیا بات کیا ہے۔ بات کی تہہ میں پہنچتے دیر نہیں لگی۔ میں نے کہا۔ ”بھابھی! آپ سلیم صاحب اور بتول کی فکر مت کریں۔ گھر جاتے وقت ان کے لیے بھی کھانا ساتھ لیں گے۔ میں ان کے لیے بھی یہی ڈشیں پارسل کروا دوں گا۔ مجھے بھی آپ ہی کی طرح ان کا بھی خیال ہے۔“

پھر زلیخا نے کھانا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد زلیخا نے مجھ سے پوچھا۔ ”آپ نے بتایا نہیں کہ حلیم بھائی جان نے کیا پیغام بھیجا ہے۔“

”پیغام بھی اور دو لاکھ کی رقم بھی بتول کی شادی کے لیے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ان کا کہنا ہے کہ ایک ہی بیٹی ہے اس کی شادی اچھی طرح کریں۔ لیکن فضول خرچی، دکھاوا نہ کریں۔ اس میں سے کچھ بچوں کی تعلیم کے لیے بھی اٹھا رکھیں۔ بتول کی شادی کی تاریخ طے کر کے اطلاع دیں تو وہ بھی بیوی بچوں کے ساتھ شرکت کرنے کے لیے پہنچیں گے۔ لیکن ایک ماہ پہلے اطلاع دیں۔“

”سچ......“ زلیخا کا چہرہ دمک اٹھا اور اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھر گئے۔ ”یا اللہ تیرا جتنا شکر کروں کم ہے۔“ اس کی آواز بھرا سی گئی۔ ”میں ان سے کہتی تھی کہ اللہ کی ذات سے مایوس نہ ہوں۔ بھائی جان نے ایک لاکھ کی بجائے دو لاکھ روپے بھیج دیئے۔“

میں نے کھانے کے دوران باتوں ہی باتوں میں زلیخا سے اس کے گھر کے نجی حالات معلوم کر

لیے۔ میرے دستی بیگ میں لاکھ لاکھ روپے کے تین لفافے موجود تھے۔ کھانے سے فراغت پانے کے بعد میں نے دو لفافے نکال کر زلیخا کو دیئے۔ پھر حمید اور رشید کو سو سو روپے دیئے۔ زلیخا کو دو سو روپے دیئے کہ وہ ٹیکسی کر کے گھر چلی جائے۔ میں کل کسی دن اس کے گھر آ کر اس کے شوہر سے مل لوں گا۔ میں نے باپ بیٹی کے لیے کھانے پارسل کرا دیئے۔

ان کے جانے کے بیس منٹ بعد میں ایک دوسرے ہوٹل میں جا کر جس میں رش بہت کم تھا۔ ایک گلاس پانی لے کر ایک کونے والی میز پر بیٹھ گیا۔ میں نے ایک منتر پڑھ کر اس پر پھونکا تو وہ منظر ابھر آیا میں جو دیکھنا چاہتا تھا۔ اس وقت زلیخا اپنے بچوں کے ساتھ ٹیکسی سے اتر رہی تھی۔ وہ کرایہ ادا کر کے گھر میں گھسی تو ایک دم سے ٹھٹک کے رک گئی۔ نشست گاہ میں اس کے جیٹھ حلیم بھائی، جیٹھانی اور بچے بیٹھے اس کی بیٹی اور شوہر سے باتیں کر رہے تھے۔ زلیخا ایک دم سے بھونچکی ہو گئی۔ اسے یقین نہیں آیا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔

ان لوگوں سے ملنے ملانے کے بعد اس نے اپنی جیٹھانی، جیٹھ اور شوہر کو میلے میں اس کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ سنایا۔ حلیم صاحب نے حیران ہو کر کہا۔ ”میں نے کسی کو دو لاکھ کیا دو ہزار روپے بھی نہیں دیئے...... یہ دو لاکھ کی رقم میرے نام سے کون اور کیوں دے گیا......؟“

”تم نے لفافے میں دیکھا کہ رقم ہے یا کاغذ کے ٹکڑے بھرے ہیں۔“ سلیم صاحب بولے۔ ”تمہیں کسی نے بیوقوف تو نہیں بنایا......؟“

”نہیں......“ زلیخا نفی میں سر ہلا کر بولی۔ اس نے لفافے اپنے بیگ سے نکال کر اپنے شوہر کی طرف بڑھا دیئے۔ ”آپ دیکھیں......“

سلیم صاحب نے اس کے ہاتھ سے دونوں لفافے لے لیے۔ ایک لفافہ اس نے اپنے بھائی کی طرف بڑھا دیا۔ دونوں نے لفافے کھول کر دیکھے۔ پھر اس میں سے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر میز پر رکھ دیں اور ان کے آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ پھر رقم گنی۔ ”ہاں...... پورے دو لاکھ روپے ہیں۔“

حلیم صاحب نے کہا۔ ”کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا چکر ہے۔ وہ کس لیے بتول کی شادی کے لیے رقم دے گیا؟ سوال یہ ہے کہ کیوں اور کس لیے دے گیا...... کہیں کوئی فراڈی تو نہیں تھا؟“

”فراڈی رقم لوٹ لیتے ہیں رقم دے کر نہیں جاتے ہیں۔“ زلیخا بولی۔ ”وہ شخص بڑا نیک ملنسار اور شریف آدمی لگتا تھا۔“

”وہ شاید کوئی بزرگ تھے جو تم لوگوں کی مدد کر گئے۔“ حلیم صاحب کی بیوی بولی۔ ”باپ نیک، ماں نیک اور بتول ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں ایک...... تم لوگوں کے صبر قناعت اور بیٹی کی سیرت اور اس کی تربیت کا انعام ہے۔ تم لوگوں نے ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کیا۔ کبھی ناشکری ناقدری اور نافرمانی نہیں کی۔ یہ مدد غیبی ہے۔ اللہ نے اس شخص کے بہانے نوازا ہے......“

☆......☆......☆

میں وہاں سے چائے پی کر نکلا۔ ایک جگہ بہت اونچا اسٹیج بنا ہوا تھا جو کشتی کے دنگل کے لیے بنا ہوا

تھا۔ اس وقت دو پہلوان فری اسٹائل کشتی لڑ رہے تھے۔ سب سے زیادہ بھیڑ اس اسٹیج پر تھی۔ اس کے چاروں طرف لوگ کھڑے بڑی دل چسپی اور اشتیاق سے یہ کشتی دیکھ رہے تھے۔ اس اسٹیج اور بھیڑ بھاڑ سے ہٹ کر دو نوجوان کھڑے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ ان کی عمریں پندرہ سولہ برس سے زیادہ نہ تھیں۔ ان دونوں پہلوانوں میں ایک پہلوان لمبا تڑنگا تھا۔ اس کا قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا۔ اس کی جسامت دیو جیسی تھی۔ رنگت سیاہ اور چہرے سے وہ کسی خبیث کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے سر کے بال بہت چھوٹے تھے۔ گردن گینڈے کی طرح موٹی تھی ناک بھی بہت موٹی تھی۔ اس کے ہاتھ پیر بہت مضبوط تھے۔ وہ کسی بھی طرح تین من وزن سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہی ہوگا۔

اس کے مقابلے میں جو پہلوان تھا وہ بہ مشکل ساڑھے پانچ فٹ کا ہوگا۔ اس کی رنگت گندمی تھی۔ وہ بھی مضبوط اور کسرتی بدن کا تھا۔ وہ زیادہ بھاری بدن کا نہیں تھا۔ اس کا اور کالے پہلوان کا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ لیکن وہ کالے پہلوان سے لڑ رہا تھا۔ اس لیے کہ ایک بینر اسٹیج پر لگا ہوا تھا۔ اس پر جلی حرفوں سے لکھا ہوا تھا۔ ”جو جگو پہلوان کو کشتی میں ہرا دے گا اسے دس ہزار روپے کا انعام دیا جائے گا۔“

جگو پہلوان اس کالے پہلوان کا نام تھا۔ وہ اپنے حریف پر بھاری پڑ رہا تھا۔ وہ دونوں لڑکے جو آپس میں باتیں کر رہے تھے میں ان کی باتیں سننے لگا۔ ان میں سے ایک لڑکا کہہ رہا تھا۔ ”پرکاش! کوئی ایسا پہلوان جگو پہلوان کے مقابلے پر آ جائے اور اس کی ہڈی پسلی ہی نہیں ہاتھ پیر بھی توڑ کر رکھ دے۔ یہ کیسا سوّر لگ رہا ہے۔ جب سے میلہ لگا ہے تب سے وہ بیس پہلوانوں کو ہرا چکا ہے۔“

”رام ناتھ!“ پرکاش بولا۔ ”یار! ایک بات تو بتاؤ۔ تمہیں جگو پہلوان سے اتنی نفرت کیوں ہے...... کل بھی تم کہہ رہے تھے کہ یہ کمینہ مرتا کیوں نہیں ہے۔ یہ پہلوان ہے۔ پورے کرناٹک میں بہت مشہور ہے۔ اس سے ہر پہلوان ڈرتا ہے۔“

”یہ پہلوان نہیں بلکہ ایک نمبری بدمعاش اور غنڈہ شخص ہے۔“ پرکاش نے جواب دیا۔ ”اس لیے لوگ اس سے ڈرتے ہیں۔ خوف کھاتے ہیں۔“

”یہ چونکہ تمہارے محلے میں رہتا ہے۔ اس لیے تم اس کے بارے میں بہت اچھی طرح سے جانتے ہو کہ یہ کیسا شخص ہے۔“ رام ناتھ کہنے لگا۔ ”لیکن تم نے اس سے پہلے کبھی مجھ سے نہیں کہا کہ یہ پہلوان نہیں ایک نمبری غنڈہ اور بدمعاش شخص ہے۔ یہ بات تم آج کس بنا پر کہہ رہے ہو؟“

”رام ناتھ!“ وہ بڑی افسردگی سے کہنے لگا۔ ”بات دراصل یہ ہے کہ یہ کمینہ میری ماں کو بہت تنگ و ہراساں کر رہا ہے۔ پتا جی کو سورگباش ہوئے ایک برس ہی تو ہوا ہے۔ یہ بات تم بھی جانتے ہو۔ وہ میری ماں کے پیچھے پڑا ہوا ہے کہ مجھ سے شادی کر لو۔ تم ودھوا ہو چکی ہو۔ تم سے کون شادی کرے گا...... ماں نے اس سے ایک بار نہیں کئی بار کہا کہ میں تم سے ہرگز شادی نہیں کروں گی مجھے اپنی شادی کی نہیں بلکہ لڑکے کی تعلیم اور اس کے مستقبل کی فکر ہے۔ میں تم سے کسی قیمت پر شادی نہیں کروں گی۔ تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ شادی کا خیال دل سے نکال دو۔

ماں کے انکار نے جیسے جلتی پر تیل گرادیا۔ چھ سات دن پہلے اس نے میری ماں کو ایک مہینے کی مہلت دی کہ وہ شادی کا فیصلہ کرلے اور وہ ایک مہینے بعد بارات لے کر گھر پر آرہا ہے۔ اس دوران ماسٹر جی آنند صاحب نے ماں سے شادی کی خواہش ظاہر کی اپنا رشتہ بھیجا۔ ان کی پتنی کا چھ ماہ پہلے دیہانت ہوگیا۔ ان کی ایک نو برس کی بیٹی ہے۔ اس لیے انہیں ایک جیون ساتھی کی ضرورت ہے جو گھر بار اور ان کی بیٹی کو سنبھالے ۔ماسٹر صاحب بہت شریف اور اچھے آدمی ہیں۔ یہ سارے لوگ جانتے ہیں۔ ماں نے یہ رشتہ قبول کرلیا۔ وہ ان سے شادی کرنے پر رضامند ہوگئیں۔ مجھے بھی ماسٹر جی بہت پسند ہیں۔ اس کمینے نے جب یہ سنا کہ میری ماں ماسٹر جی سے شادی کرے گی۔ تو وہ چراغ پا ہوگیا۔ اس نے کہا بلکہ دھمکی دی ہے کہ اگر ماسٹر جی نے میری ماں سے شادی کی تو وہ ان کی ٹانگیں توڑ دے گا اور ماں کو اپنے گھر میں لاکر ڈال لے گا۔

گاؤں کے پرکھوں نے اس کمینے کو بہت سمجھایا کہ میری ماں کو ماسٹر جی سے شادی کرنے دے۔ وہ ان کے راستے میں نہ آئے۔ اس کے لیے عورتوں کی کیا کمی ہے۔ لیکن اس نے کہا کہ وہ میری ماں سے ہی شادی کرے گا۔ میں دیکھتا ہوں مجھے کون اس سے شادی کرنے سے روک سکتا ہے۔ ماسٹر جی اس سے کیسے شادی کرتے ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے ماں سے شادی کرنے سے کیسے روکا جائے۔ ماں بھی بہت پریشان ہے۔"

"جب تمہیں اس شخص سے اتنی نفرت ہے تو تم یہاں کیوں آئے اور اس کی شکل کیوں دیکھ رہے ہو......؟" رام ناتھ نے پوچھا۔

"دراصل میں میلے میں ماں سے بچھڑ گیا ہوں......" پرکاش نے کہا۔ "انہیں تلاش کرتا ہوا ادھر آنکلا ۔میں واپس جارہا تھا کہ تم مل گئے۔ میں یہ کشتی اس لیے دیکھنے لگا کہ شاید یہ پہلوان جو اس سے لڑ رہا ہے اس کی ٹانگیں توڑ دے اور اسے ہرا کر دس ہزار روپے کا انعام حاصل کرلے لیکن یہ غریب اس کا مقابلہ نہیں پارہا ہے۔ لگتا ہے کہ وہ ہار جائے گا۔ میں اس امید پر کھڑا ہوں کہ شاید کوئی اسے ہرا دے۔ اسے بڑا تکبر بھی تو ہے۔ یہ کہتا ہے کہ اب تک کوئی ایسا مائی کا لال پیدا نہیں ہوا جو اسے ہرا دے۔ اگر کسی نے اسے ہرا دیا تو پھر وہ کشتی لڑنا چھوڑ دے گا۔ کاش! میں اور ذرا بڑا ہوتا۔ میرے بس میں ہوتا اور میں پہلوانی جانتا ہوتا تو اس کے ہاتھ پیر توڑ کر رکھ دیتا۔"

"تم اب بھی اس کے ہاتھ پیر توڑ سکتے ہو......" میں نے کہا۔ "اسے ہرا کر دس ہزار روپے کا انعام بھی جیت سکتے ہو......"

رام ناتھ اور پرکاش نے پلٹ کر مجھے حیرت سے دیکھا۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ "کیا ......آپ نے یہ بات مجھ سے کہی ہے؟" پرکاش نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ہاں......" میں نے مسکراتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "میں نے یہ بات تم سے ہی کہی ہے۔ کیا تمہیں میری بات کا یقین نہیں آیا؟"

"جی ہاں......" اس نے سر ہلا دیا۔ "آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں ایک نوجوان لڑکا ہوں۔ جب کہ وہ

مجھ سے تین گنا جسمانی طور پر بڑا ہے۔ دیو کی طرح ہے۔ انتہائی طاقتور بھی ہے۔ وہ مجھے اٹھا کر فرش پر پٹخ دے گا تو میں شاید زندہ نہ بچوں......اور پھر میں پہلوانی کی الف ب تک نہیں جانتا ہوں۔ میرا اس کا کیا مقابلہ......نہیں میں اس سے مقابلہ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا...... یہ ریسلنگ ہے۔ فری اسٹائل......وہ اپنی جسامت اور طاقت سے حریف کو زیر کرلیتا ہے اور اسی لیے آج تک اس سے کوئی بھی جیت نہیں سکا۔"

"ذہانت سے بڑی طاقت کوئی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "اس سے بڑا ہتھیار اور فن دنیا میں نہیں ہے۔ شرط صرف اتنی سی ہے کہ اس سے کیسے کام لیا جائے۔ تم اپنی ذہانت سے اسے بہ آسانی ہرا سکتے ہو۔ اسے ہرانے کے لیے طاقت اور ریسلنگ جاننا ضروری نہیں ہے۔"

"آپ جو بات کہہ رہے ہیں وہ بالکل صحیح ہے۔" رام ناتھ نے کہا۔ "دنیا میں ذہانت سے بڑی چیز کوئی نہیں ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کس طرح سے ذہانت کو کام میں لاکر اسے ہرایا جاسکتا ہے۔ اس کے ہاتھ پیر توڑ کر مفلوج کیا جاسکتا ہے؟"

"میں ترکیب بتاتا ہوں......" میں نے کہا۔ "لیکن اس کے لیے خود اعتمادی کی ضرورت ہے۔ ہمت کی بھی......یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔"

میں نے جو ترکیب بتائی اسے سن کر پرکاش اور رام ناتھ خوش ہوگئے۔ اندرونی طور پر میں پرکاش کے ذہن کو اپنے تابع کرچکا تھا۔ پرکاش بولا۔ "انکل ٹھیک ہے۔ میں اس خبیث سے مقابلہ کروں گا۔"

جگو پہلوان سے جو پہلوان مقابلہ کررہا تھا وہ ہار چکا تھا۔ جگو پہلوان نے اسے دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھالیا۔ پھر اس کو ہاتھوں میں اٹھائے رنگ کا ایک چکر لگایا۔ پھر اسے رنگ سے باہر پھینک دیا۔ وہ زمین پر جا گرا اور بے ہوش ہوگیا۔ لوگوں نے یہ دیکھ کر بڑے زور زور سے تالیاں بجا کر اسے داد دی۔ پھر وہ اکڑتا ہوا رنگ کی ریلنگ کے پاس سینہ تان کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے ایک حقارت بھری نظر لوگوں پر ڈالی پھر اس نے بڑی فرعونیت سے کہا۔

"کوئی ہے ایسا مائی کا لال جس نے اپنی ماں کا دودھ پیا ہو۔ وہ مجھ سے مقابلہ کرے۔ میں انعامی رقم دگنی کرتا ہوں جو مجھے ہرا دے گا اسے بیس ہزار کی رقم ملے گی۔ یہ رقم اس میلے کے منیجر کے پاس رکھی ہوئی ہے جو مجھے ہرانے پر فوراً دے دی جائے گی۔"

پرکاش فوراً ہی بھیڑ کو چیرتا ہوا رنگ میں پہنچ گیا۔ اس نے تماشائیوں پر ایک نظر ڈالی اور بولا۔ "میں جگو پہلوان کا چیلنج قبول کرتا ہوں...... میں اس سے مقابلہ کرنے آیا ہوں۔ میں اسے ہرا کر اس کی ساری اکڑ نکال دوں گا۔" تماشائیوں نے اسے پہلے تو بڑی حیرت سے دیکھا۔ انہیں جیسے پہلے تو یقین نہیں آیا۔ پھر انہوں نے بڑے زور زور سے تالیاں بجائیں۔ ان میں بہت سارے ہنس پڑے۔ کچھ لوگوں نے اسے اشارے اور بلند آواز سے کہا کہ وہ یہ حماقت نہ کرے۔ اتر کر آجائے۔

جگو پہلوان نے اسے چونک کر دیکھا۔ اسے یقین نہیں آیا۔ پھر اس نے کہا۔ "پرکاش! کیا تم مجھ سے مذاق کرنے آئے ہو؟"

"مذاق کرنے نہیں...... بلکہ تم سے لڑنے آیا ہوں۔" پرکاش نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "میں تم سے مذاق کیوں کرنے لگا۔"

"سنو...... بے وقوفی کی باتیں نہ کرو اور چلتے پھرتے نظر آؤ۔" جگو پہلوان نے تیز لہجے میں کہا۔ "یہ بچوں کا کھیل نہیں ہے۔"

"لگتا ہے تم مجھ سے ڈر گئے ہو۔" پرکاش نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اس لیے مقابلہ کرنا نہیں چاہتے ہو۔ میدان چھوڑ کر بھاگ رہے ہو۔"

"میں دنیا میں کسی سے اور بھگوان سے بھی نہیں ڈرتا ہوں تو تم سے کیا ڈروں گا۔" جگو پہلوان رعونت سے بولا۔ "میں کبھی میدان چھوڑ کر نہیں بھاگا...... البتہ بہت سارے پہلوان بھاگ چکے ہیں۔ تم کیا چیز ہو۔ تم میرا ایک مکا تک برداشت نہیں کر سکتے۔"

"یہ فضول باتیں چھوڑو اور مجھ سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ......" پرکاش نے چیلنج کے انداز میں کہا۔ "لڑ نہیں سکتے ہو تو ہار مان لو اور بیس ہزار کی رقم دے دو۔"

"میں تمہیں آخری بار سمجھا رہا ہوں۔ ان دونوں کے درمیان تیز تیز لہجے میں باتیں ہو رہی تھیں۔ اس مجمع میں پرکاش کے گاؤں والے بہت سارے لوگ موجود تھے۔ وہ سب جانتے تھے اور انہیں ہر بات کا علم تھا کہ جگو پہلوان پرکاش کی ماں سے شادی کرنے کے لیے اسے تنگ اور ہراساں کر رہا ہے۔ وہ غریب سخت پریشان ہے۔ وہ اس بدمعاش سے شادی کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ ماسٹر جی کو بھی وہ دھمکیاں دے رہا ہے۔ جس کے باعث وہ بھی سخت پریشان تھے۔

اتنے میں ایک عورت آ کر رام ناتھ کے پاس کھڑی ہو گئی۔ وہ بے حد خائف اور سراسیمہ ہو رہی تھی۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور آنکھوں سے وحشت جھانک رہی تھی۔ وہ اڑتیس برس کی خوبصورت اور جاذب نظر عورت تھی۔ بڑی سیدھی سادی اور ایک معصوم سی عورت...... اس کی وضع قطع ہی بتا رہی تھی کہ وہ ایک عام گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس وقت اس کی حالت بڑی قابل رحم تھی۔

"رام ناتھ بیٹے......!" اس نے پھٹی پھٹی نظروں سے رنگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ پرکاش رنگ میں اس کمینے سے کیوں الجھ رہا ہے۔"

"آنٹی......" رام ناتھ بولا۔ "وہ جگو سے کشتی لڑنے اور بیس ہزار کی رقم جیتنے کے لیے گیا ہے۔"

"کیا......؟" پرکاش کی ماں اس طرح اچھل پڑی جیسے اسے کرنٹ لگا ہو۔ "اس کمینے سے پرکاش لڑے گا۔ کیا اس کی عقل ماری گئی ہے؟"

"وہ صرف بیس ہزار کی رقم جیتنے ہی نہیں بلکہ اس کے ہاتھ پیر بھی توڑنے کے لیے گیا ہے۔" رام ناتھ نے اسے مزید بتایا۔

"او بھگوان!" پرکاش کی ماں نے اپنا ماتھا پیٹ لیا اور سانسوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "کہیں اس نے بھنگ تو نہیں پی لی۔ وہ چوہے جیسا ہے۔ اس دیو سے کیسے مقابلہ کرے گا۔ وہ تو اسے مار مار کر اس کی

ہڈیاں چورا چورا کر دے گا۔ وہ کس لیے ایسا کرنا چاہتا ہے؟"

"وہ کہہ رہا تھا کہ یہ کمینہ جگو پہلوان آپ سے زبردستی شادی کرنا چاہتا ہے اس لیے وہ اس کی ہڈیاں توڑ دے گا۔" رام ناتھ نے کہا۔

"بیٹے! تم جلدی سے جاؤ اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے جلدی سے کھینچ لاؤ۔" پرکاش کی ماں تڑپ کر بولی۔ "وہ تو اسے جان سے مار دے گا۔ اس سے کس نے کہا اور مشورہ دیا کہ وہ جگو پہلوان سے لڑے۔ یہ میرا معصوم بیٹا ہے۔ ایک ہی تو میرا سہارا اور کلیجے کی ٹھنڈک ہے۔"

"انکل نے پرکاش اور ہم سے جب یہ سنا کہ جگو شادی کرنے کے لیے آپ کو تنگ اور پریشان کر رہا ہے اور ماسٹر جی سے شادی نہیں ہونے دے رہا ہے تو انہوں نے پرکاش سے کہا کہ وہ جا کر اس سے لڑے اور اس کے جسم کی ہڈیاں توڑ کر اسے مفلوج کر دے۔"

پرکاش کی ماں نے گھوم کر مجھے دیکھا اور اس کے چہرے پر حیرت چسپاں ہو گئی۔ "آپ کون صاحب ہیں اور آپ نے اسے یہ مشورہ کیوں دیا ہے؟" پرکاش کی ماں کا لہجہ سخت ہو گیا۔ "کیا آپ میرے اور میرے بیٹے کے دشمن ہیں کیا آپ کو اس بات کا احساس نہیں ہے کہ میرا بیٹا مر جائے گا۔"

"میں ایک سیاح ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "بلکہ ایک بنجارا ہوں۔ گاؤں گاؤں گھومتا رہتا ہوں تاکہ ایسے لوگوں کی مدد کروں جو پریشان اور کسی نہ کسی مصیبت میں گرفتار ہوئے ہیں۔ میں نے رام ناتھ اور پرکاش کی گفتگو سنی جس سے پتا چلا کہ آپ پر بہت بڑی مصیبت ٹوٹ پڑی ہے۔ اس مصیبت سے نجات دلانے اور جگو کا حشر نشر کرنے کے لیے میں نے اس کو ایک زبردست ترکیب بتائی ہے۔"

"میرے ذہن میں بھی ایک زبردست ترکیب ہے۔" وہ بولی۔ اس کا لہجہ پراسرار سا ہو گیا۔ "آپ میرے بیٹے کو رنگ سے بلا کر لے آئیں۔ میں آج کی رات اس مردود سے نجات پا لوں گی۔ میرا بیٹا اس سے جیت نہ سکے گا۔"

"وہ کیا ترکیب ہے۔ کیا آپ مجھے بتانا پسند کریں گی؟" میں نے پوچھا۔ "آپ مجھے اپنا ہمدرد اور ایک مخلص سمجھیں......"

اس نے جواب دینے سے پہلے ادھر ادھر دیکھا۔ تمام لوگ رنگ میں پرکاش اور جگو پہلوان کی طرف متوجہ تھے پھر اس نے ساڑی کو دائیں پیر کی طرف اٹھایا۔ میں نے اور رام ناتھ نے بھی دیکھا۔ اس نے اپنی سڈول پنڈلی پر ایک ریوالور کو چرمی بیلٹ سے باندھ رکھا تھا۔

"وہ اپنے گھر میں اکیلا رہتا اور سوتا ہے۔" پرکاش کی ماں نے سرگوشی میں کہا۔ "میں آدھی رات کو جا کر اسے گولی مار کر قتل کر دوں گی اور بھاگ کر گھر آ جاؤں گی...... کسی کو پتا نہیں چلے گا کہ اسے کس نے قتل کیا ہے......؟"

"اس ترکیب کا جواب نہیں۔" میں نے کہا۔ "واقعی بڑی آسانی سے آپ اسے قتل کر دیں گی لیکن آپ نے بہت ساری دوسری باتیں نہیں سوچیں جو آپ کو بہت بڑی مصیبت میں پھنسوا سکتی ہیں۔ بس آپ

نے ایک سیدھی سادی اور آسان سی ترکیب سوچ لی کہ سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی۔ لیکن آپ کی اس ترکیب میں بہت ساری ایسی خامیاں موجود ہیں جو آپ کے ذہن میں نہیں آئیں۔"

"میں کیسے اور کیوں نہیں کرسکتی ہوں؟" وہ حیرانی سے بولی اور اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "مجھے اس میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی ہے۔"

"سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ جرم کرنا آسان ہے لیکن اس سے بچنا بہت مشکل ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "کبھی کوئی مجرم قانون کے لمبے ہاتھوں سے نہیں بچا۔ لہٰذا آپ بھی نہیں بچ سکیں گی۔ آپ نے شاید اس پہلو پر نہیں سوچا؟"

"میں تو قانون کے ہتھے اس وقت چڑھوں گی نا جب کوئی مجھے قتل کرتے ہوئے دیکھ لے۔" پرکاش کی ماں نے تکرار کے سے انداز میں کہا۔ "قانون اس وقت تک کسی پر ہاتھ نہیں ڈالتا جب تک اس کے ہاتھ ٹھوس ثبوت نہ ہو۔ میں تو کوئی ثبوت چھوڑنے سے رہی۔"

"یہ آپ کی بھول ہے جو آپ اس طرح سوچ رہی ہیں۔" میں نے کہا۔ "جہاں قتل ہوتا ہے وہاں قاتل ہستی اپنا نشان چھوڑ جاتی ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ رات کے سناٹے میں ریوالور سے اپنے دشمن کو نشانہ بنائیں گی۔ ظاہر ہے اسے ایک نہیں دو چار گولیاں بلکہ چھ کی چھ گولیاں مار کر ختم کرنے کی کوشش کریں گی۔ اس لئے کہ آپ کے خیال میں یہ دیوزاد پہلوان ایک گولی سے نہیں مرے گا۔ آپ نفرت سے اور مشتعل ہو کر اسے ہلاک کریں گی۔ غصے میں آدمی کو کسی بات کا خیال اور ہوش نہیں رہتا ہے۔ آپ اسے اپنی نظروں کے سامنے تڑپ تڑپ کر مرتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہیں۔ کیوں کہ اس نے آپ کو بہت دق اور پریشان کیا اور ہراساں بھی کرتا رہا۔

پستول اور ریوالور کی آواز میں بہت فرق ہوتا ہے۔ پستول کی آواز، ریوالور کی آواز کے مقابلے میں کم ہوتی ہے۔ اس کی خوف ناک آواز جب فضا میں گونجے گی تب لوگ گھروں سے نکل آئیں گے۔ کوئی ضروری تو نہیں کہ اس وقت ہر شخص سو رہا ہو چھ گولیوں کی تیز اور سخت آواز گونجنے تک۔ بہت سارے لوگ نکل آئیں گے۔ اس آواز کی سمت دوڑیں گے اور آپ کو نکلتے ہوئے دیکھ لیں گے۔

فرض کیجئے کہ کسی نے اتفاق سے آپ کو گھر سے نکلتے نہیں دیکھا اس سے بھی آپ بچ نہیں سکیں گی۔ پولیس جب تفتیش کرے گی تو وہ آپ کے پیروں کے نشانات اور ریوالور پر انگلیوں کے جو نشانات ہوں گے اس سے بھی اس کا سراغ مل جائے گا۔ کیوں کہ آپ اسے قتل کرنے کے بعد خوف و دہشت اور عجلت سے ریوالور وہیں پھینک آئیں گی...... اگر آپ ریوالور لے بھی آتی ہیں اور کسی کی نظر میں نہیں آتی ہیں تو پھر بھی بچ نہ سکیں گی۔ کیوں کہ جب پولیس کے علم میں یہ بات آئے گی کہ مقتول آپ کو تنگ اور ہراساں کرتا تھا اور شادی کے لئے مجبور کر رہا تھا۔ آپ کی کمزوری سے فائدہ اٹھا رہا تھا جب کہ آپ اس سے سخت نالاں تھیں اور اس کی دشمن بن گئی تھیں وہ آپ سے یقیناً پوچھ گچھ کرے گی۔ پھر آپ قانون کے آگے بے بس ہو کر اپنے جرم کا اقرار کرلیں گی۔"

"او بھگوان......!" پرکاش کی ماں کا چہرہ متغیر ہوگیا۔ "میں نے تو ان باتوں کے متعلق سوچا بھی نہیں تھا۔ مگر اب کیا کروں؟"

"اب آپ خاموش، صبر اور اطمینان سے کشتی دیکھیں۔" میں نے جواب دیا۔ "آپ کا بیٹا آپ کے راستے کے پتھر کو ہٹا دے گا۔"

اس وقت کشتی شروع ہوئی۔ جگو نے جب دیکھا کہ پرکاش کسی طرح اور کسی صورت سے کشتی لڑنے سے باز نہیں آرہا ہے تو وہ مقابلے پر تیار ہوگیا۔ پرکاش نے اس کے منہ پر تھوک دیا تھا۔ کیونکہ جگو نے کہا تھا کہ تیری ماں کو آج ہی رات لے جاؤں گا۔ میں دیکھتا ہوں مجھے کون روکتا ہے اور تیری ہڈی پسلی ایک کردوں گا۔ تو اسپتال میں اور تیری ماں میرے ساتھ ہوگی۔

پرکاش کا جگو کے منہ پر تھوکنا تھا کہ وہ ایک دم مشتعل ہوگیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہوگیا اور آنکھیں شعلے برسانے لگیں۔ وہ پرکاش کو دبوچنے کے لئے بڑھا۔ پرکاش پہلے سے تیار، چوکنا اور مستعد تھا اسے غچہ دے کر نکل گیا۔ پھر وہ باڑھ کی طرف بھاگا تو جگو اس کے پیچھے پیچ و تاب کھاتے ہوئے لپکا۔ جگو اپنے بھاری بھرکم جسم کی وجہ سے تیز دوڑ نہیں سکتا تھا۔ اس لئے وہ پرکاش کو پکڑ نہ سکا۔ وہ دوڑتا رہا اور اس نے بڑی کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح پرکاش کو پکڑ لے لیکن پرکاش اس کے ہاتھ نہ آیا۔ کوئی تین چکر تک دوڑنے کے بعد جگو بری طرح ہانپنے لگا۔ وہ اکھاڑے کے درمیان میں کھڑا ہوگیا۔ اس کی سانسیں بری طرح پھول رہی تھیں وہ ان پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پرکاش اس کے مقابل چند قدم پر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ جگو کو اس کی مسکراہٹ بڑی زہر لگ رہی تھی۔ کیوں کہ یہ اس کا تمسخر اڑا رہی تھی۔ تماشائیوں کے سامنے اسے ذلیل کر رہی تھی کہ وہ ایک بچے کو قابو نہیں کرسکا۔ پکڑ نہ سکا اور اس بچے نے اسے نچا دیا۔

"کیا ہوا جگو بیٹے!" پرکاش نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔ "اتنی جلدی ہانپنے لگے؟ یہ تمہاری توند کس طرح ہل رہی ہے؟"

جگو کے چہرے اور جسم سے پسینہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ اس کی حالت بڑی دگرگوں ہو رہی تھی۔ وہ چاہ رہا تھا کہ پرکاش کسی طرح اس کے ہاتھ لگ جائے تو اسے کچا چبا کر کھا جائے۔ سب سے زیادہ غصہ اسے اس بات پر آرہا تھا کہ اس کی ذلت آمیز ہنسی اڑ رہی تھی۔ لوگوں کی ہمدردیاں پرکاش کے ساتھ تھیں۔ وہ تالیاں بجا بجا کر پرکاش کو داد دے رہے تھے اور خوب تفریح بھی لے رہے تھے۔ "یہ کیا تو چوہے کی طرح بھاگ رہا ہے۔" جگو نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا۔ "مرد کا بچہ ہے تو سامنے آکر مقابلہ کر......"

"میں چوہے کی طرح بھاگ رہا ہوں لیکن تو تو شیر ہے شیر...... کیا مجھے پکڑ نہیں سکتا؟ کیوں بے جگو!" پرکاش تمسخر سے بولا۔ جگو اس لائق تھا کہ اس کی تضحیک کی جائے۔ میں نے پرکاش سے کہا ہوا تھا کہ اس کی جتنی تضحیک کرسکتے ہو۔ مذاق اڑا سکتے ہو اڑاؤ...... تاکہ وہ مشتعل ہوجائے۔ غصے کی حالت میں آدمی کا دماغ کسی قابل نہیں رہتا۔ جب کسی قابل نہیں ہوتا تو وہ کچھ بھی نہیں کرسکتا۔

یہ ایک فری اسٹائل کشتی تھی۔ اس کے کوئی اصول اور آداب نہیں ہوتے ہیں۔ اخلاق نہیں ہوتے

ہیں۔ اس میں انسان حیوان بن جاتا ہے۔ جگو کی جتنی تضحیک کی جاسکتی تھی، دق کیا جاسکتا تھا کسی بھی صورت سے وہ اس کشتی کا ایک حصہ تھا۔ پرکاش سمجھ دار ہی نہیں بلکہ ذہین بھی تھا۔ اس نے اچانک برق سرعت سے گھوم کر اور جگو کے پیچھے جا کر اس کی کمر کے نیچے اپنی پوری طاقت جمع کر کے ایک زوردار لات رسید کی۔ جگو اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا دو قدم پر زمین بوس ہوگیا۔ پرکاش دھان پان سا تھا۔ جب کہ جگو کا وزن تین من سے زیادہ ہی تھا۔ اسے گدھا گھوڑا بھی لات مارتا تو وہ اس طرح نہ گرتا جس طرح پرکاش کی لات کھا کر گرا۔ پرکاش کا وزن ہی کیا تھا۔ وہ ایک دبلا پتلا اور کمزور سا لڑکا تھا۔

پہلے تو پرکاش کی ماں اور رام ناتھ ہی کو نہیں بلکہ تماشائیوں میں سے بھی کسی کو یقین نہیں آیا۔ خود پرکاش کو بھی نہیں۔ اس نے جب جگو کے لات ماری تو اسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے اس نے فٹ بال کو کک ماری ہو۔ سارے لوگ ششدر رہ گئے۔ دوسرے لمحے وہ سب ہنسنے، قہقہے مارنے اور تالیاں بجا کر پرکاش کو داد دینے لگے۔ "شاباش بیٹے!......شاباش ایک اور لات۔"

جگو کو ایسا لگا جیسے اسے پرکاش نے نہیں بلکہ ہاتھی نے لات ماری ہو وہ گرا تو اس کی نظروں کے سامنے تارے ناچ گئے اور اس کی کمر میں درد کی شدت کی ایسی لہر اٹھی جس نے اسے بری طرح تڑپا دیا اور سارے جسم میں پھیل گئی۔ وہ بری طرح کراہا۔ اس میں اتنی سکت بھی نہیں رہی کہ اپنی جگہ سے حرکت کر سکے۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھتا اور سنبھلتا پرکاش نے ایک اور ضرب اس کے متاثرہ حصے پر لگائی تو وہ اسے برداشت نہ کر سکا۔ بلبلا اٹھا اور زخمی پرندے کی طرح لوٹنے لگا۔ اسے سنبھلنے اور اٹھنے میں کوئی دس منٹ لگ گئے۔ چوں کہ وہ سخت جان تھا اس لئے یہ چوٹیں برداشت کر گیا۔ وہ پرکاش کو غضبناک نظروں سے دیکھتے ہوئے غرایا۔ وہ اب بھی حیران اور ہراساں تھا کہ اسے یہ کیا ہوگیا تھا جو وہ پرکاش کی لات کی ضربیں برداشت نہ کر سکا۔ کہیں یہ اس کا وہم تو نہیں ہے یا اس کا درد جو کچھ دنوں پہلے تھا جس نے زمین بوس کر دیا تھا۔

"سن جگو......" پرکاش نے اپنے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر سخت لہجے میں کہا۔ "تو شرافت سے مجھے بیس ہزار روپے دینے کے لئے منیجر سے کہہ دے کہ میں اپنی ہار مانتا ہوں اور ہاں تو بھگوان کی سوگند کھا کر کہہ کہ نہ میں تمہاری ماں کی طرف دیکھوں گا۔ نہ اسے تنگ اور ہراساں کروں گا شرافت کی زندگی گزاروں گا۔"

"ابے او لونڈے۔" جگو غضبناک ہو کر بولا۔ "کیا تو یہ کہتا ہے کہ میں تیری لات کھا کر گرا تھا۔ نہیں...... کمینے کی اولاد...... میں مذاق میں گرا تھا...... بیس ہزار روپے کیا تجھے بیس روپے بھی نہ دوں گا۔"

جگو کا جملہ پورا بھی نہیں ہو پایا تھا کہ پرکاش نے تیزی سے آگے بڑھ کر اچھل کر ایک زوردار مکا اس کے منہ پر رسید کیا۔ یہ مکا ایسا زوردار تھا کہ اس کے دماغ کی چولیں ہل گئیں اور اس کے کئی دانت باہر آ گئے اور منہ سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔ اس کا منہ لہولہان ہوگیا تھا۔ جب اس نے اپنے کئی دانت باہر اور منہ سے پانی کی طرح بہتا خون دیکھا تو وہ اور غضب ناک ہوگیا اس نے لپک کر پرکاش کو دبوچ لیا۔ اس وقت فضا اور لوگوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ ہر کوئی یہی سمجھا کہ اب پرکاش کی خیر نہیں۔ جگو اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ بڑی سفاکی، بربریت اور بہیمانہ انداز سے اس پر تشدد کرے گا۔ مقابلہ کرنے کے بجائے

ایذائیں دے کر ختم کر دے گا۔ جب کہ اس کشتی میں حریف کی جان لینے کی ممانعت تھی۔ البتہ اسے معذور کیا جا سکتا تھا۔ ہڈیاں توڑی جا سکتی تھیں۔ پرکاش کی ماں نے جب اپنے بیٹے کو جگو کی گرفت میں دیکھا تو وہ تڑپ اٹھی اور اس کا چہرہ متغیر ہوگیا تھا۔ اس سے رہا نہ گیا اس نے فوراً ہی جھک کر ریوالور نکالنے کی کوشش کی تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے پیچھے لے گیا۔ "آپ ہوش میں تو ہیں......؟" میں نے اسے ڈانٹا اور پھر قدرے قریب ہو کر کہا۔ "یہ آپ کیا کر رہی ہیں......؟"

وہ مجھ سے ہاتھ چھڑا کے ہذیانی لہجے میں بولی۔ "ہاں...... میں ہوش میں نہیں ہوں۔ آپ کیا دیکھ نہیں رہے کہ اس نے میرے بیٹے کو کس بری طرح جکڑ کر رکھا ہوا ہے۔ وہ اسے جان سے مار دے گا۔ مجھے جیل جانے اور پھانسی چڑھنے کی پروا نہیں...... میں اسے گولی مار دوں گی۔"

"شانتی شریمتی جی!" میں نے اسے دلاسا دیا۔ "پرکاش کو کچھ نہیں ہوگا۔ اس کا بال تک بیکا نہیں ہوگا۔ وہ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ آپ میری بات کا وشواس کریں۔ صرف خاموشی سے تماشا دیکھتی جائیں۔ ایسا تماشا جو آپ نے کبھی زندگی میں دیکھا نہیں ہوگا اور نہ ہی اس تماشے کے بارے میں کسی نے سنا ہوگا۔ ایک حیرت انگیز، سنسنی خیز اور ناقابل یقین اور بے حد دلچسپ تماشا۔"

"کیا میں کوئی بچی ہوں جو آپ مجھے بے وقوف بنا رہے ہیں؟" پرکاش کی ماں کو غصہ آ گیا۔ "وہ دیکھیے......؟" اس نے اکھاڑے کی طرف اشارہ کیا۔ اس وقت جگو نے پرکاش کو دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھا رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر سفاکی تھی اور اس کی آنکھوں سے درندگی جھانک رہی تھی۔ وہ ایک وحشی درندہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ خون خوار ہو رہا تھا۔

"اس کے باوجود آپ کو کوئی چنتا کرنے کی قطعی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "بس اب خاموشی سے دیکھتی اور ان کی باتیں سنتی جائیں۔"

"بیس ہزار روپے چاہئیں تمہیں......؟" جگو نے حقارت بھرے لہجے میں کہا۔ "تو بڑا شیر بن کر آیا تھا۔ اب میں دیکھتا ہوں تو کیسے بچتا ہے؟؟"

"کیوں نہیں......" پرکاش نے جواب دیا۔ "میں شیر ہوں۔ تیری طرح گیدڑ نہیں ہوں۔ کیا تو میری لات اور مکا بھول گیا؟"

"تیری لات اور مکا......؟" جگو گرجا۔ "تو نے مجھے جو لات اور مکا مارا ہے میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ یہ تجھ میں اتنی شکتی کہاں سے آ گئی تھی؟ سچ سچ بتا...... ورنہ میں تیری کھال کھینچ لوں گا۔ کھال میں بھس بھروا دوں گا۔ ہڈیاں توڑ ڈالوں گا۔"

"شاید یہ شکتی شنکر دیوتا نے دی ہو۔" پرکاش بولا۔ "مندر میں ان کی مورتی جو رکھی ہے۔ کیا لات اور مکا بہت زوردار تھا؟"

"حرام زادے انجان بنتا ہے۔" جگو بری طرح بگڑ گیا۔ "تو نہیں بتائے گا تو کیا ہوا تیری ماں آج رات بتا دے گی...... تو نے نہ صرف میری کمر بلکہ دانت بھی توڑ کے رکھ دیئے...... اب دیکھ میں کیا کرتا

ہوں تیرے ساتھ......"

جگو نے اپنے آدمی جو اکھاڑے سے باہر کھڑے ہوئے تھے ان کو اکھاڑے میں بلا لیا وہ بھی چہرے مہرے اور وضع قطع سے چھٹے ہوئے بدمعاش دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی جسامت بھی بھاری بھرکم اور قدآور تھے۔ جگو نے پرکاش کو فضا میں ان کی طرف اچھال دیا تو ان دونوں نے فوراً ہی آگے بڑھ کر تھام لیا اور اسے زمین پر گرنے نہیں دیا تھا۔

"ستو......" جگو نے ان دونوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "سب سے پہلے تم دونوں اس کے دونوں ہاتھ بغل سے توڑ کر پھینک دو۔ پھر بعد میں بتاتا ہوں کہ اس کی ٹانگیں کس طرح توڑنی ہیں اور اس کی گردن بھی مروڑنا ہے۔"

ایک نے پرکاش کا دایاں بازو اور دوسرے بدمعاش نے بایاں بازو پکڑ لیا۔ پرکاش مطلق نہ گھبرایا۔ نہ اس نے کوئی مزاحمت کی بلکہ بڑے سکون واطمینان سے کھڑا اور انہیں مسکرا کے دیکھنے لگا۔

تماشائیوں میں سے ایک نے چیخ کر ہیجانی لہجے میں کہا۔ "یہ کیا حرام زدگی ہے کہ ایک بچے سے تم تین تین مل کر لڑ رہے ہو؟"

"جگو! تجھے شرم نہیں آتی......؟ تیری بہادری کہاں گئی جو تو ایک بچے سے ڈر گیا۔ سالے تیری تو ہوا نکل گئی۔" یہ دوسری آواز تھی۔

"تو ہار گیا ہے...... تو اپنی ہار مان لے...... او نیجر! تم اس بچے کو بیس ہزار روپے دے دو۔" یہ تیسری آواز تھی۔

"سور...... تو مرد کا بچہ ہے تو اس بچے سے اکیلا لڑ کر دکھا......" یہ چوتھی آواز ایک عورت کی تھی جو ہذیانی لہجے میں چیخ کر بولی تھی۔

"جگو! تو میری چوڑیاں پہن لے اور چلو بھر پانی میں جا کر ڈوب مر۔" ایک عورت نے اتنا کہہ کر اپنی چوڑیاں نکال کر اس پر پھینک دیں۔

"ابے او گیدڑ کی اولاد!...... کیا تیری ماں نے ایک گیدڑ جنا ہے جو تو ایک بچے سے ڈر گیا۔" یہ ساتویں آواز تھی۔

"پرکاش! پرکاش بیٹے! تو ہمت نہ ہار...... کسی طرح ان بدمعاشوں کی گرفت سے نکل اور انہیں مزا چکھا دے۔" یہ آٹھویں آواز تھی۔ بھگوان تیری رکھشا کرے گا۔ تجھے اتنی شکتی دے گا کہ یہ تیرا کچھ بھی نہ کر سکیں گے۔ ان حرام زادوں کے منہ پر تھوک دے۔"

پرکاش نے ایک جھٹکے سے ان دونوں کے ہاتھوں سے اپنے بازو چھڑا لئے۔ پھر اس نے دائیں طرف والے بدمعاش کے ایک مکا اور پھر دوسرے بدمعاش کے منہ پر بھی مکا رسید کیا۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکے۔ کئی قدم لڑکھڑاتے ہوئے جا گرے، جگو کی طرح ان کے بھی کئی دانت ٹوٹ کر باہر آ گئے اور منہ سے خون کے فوارے ابل پڑے۔ ایک تو وہ سخت حیران ہوئے۔ انہیں یقین نہیں آیا کہ ایک بچے کا مکا ان

کے دانت توڑ سکتا ہے۔ انہوں نے جگو کا جو حشر نشر دیکھا تھا تو یقین نہیں آیا تھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اب خود کا حشر نشر ہوا تو یقین نہیں آیا تھا۔ دوسرا درد کی شدت نے انہیں بلبلا دیا اور ان کے کپڑے خون میں تر ہو رہے تھے۔ انہوں نے جو خون اور دانت ٹوٹے دیکھے تو وہ غضب ناک ہو کر پرکاش کی طرف بڑھے اور اسے نرغے میں لیا تو پرکاش نے ایک پل کی بھی دیر نہیں کی اس نے دونوں ہاتھوں سے ان کے سر کے بالوں کو پکڑا اور ان کے سر آپس میں اس زور سے ٹکرائے کہ فضا آواز سے گونج اٹھی۔ ایسا لگا ان کی کھوپڑیاں چیخ گئی ہوں۔ وہ لٹو کی طرح گھومنے لگے۔ چند لمحوں تک سر پکڑے گھومتے رہے۔ پھر زمین پر گر گئے۔ ان پر کچھ لمحوں تک غشی طاری رہی۔ وہ بے حس وحرکت تھے۔ ان میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ اٹھ سکیں۔

لوگوں نے بڑے پرجوش انداز میں داد دی اور بڑے زور سے تالیاں بجائیں۔ خوشی ومسرت اور حیرانی کی لہر تماشائیوں میں پھیل گئی۔ ادھر صرف پرکاش کی ماں ہی نہیں بلکہ رام ناتھ بھی بھونچکا تھا۔ پرکاش کی ماں منجمد نظروں سے بیٹے کو دیکھ رہی تھی۔ پھر دوسرے لمحے اس کے چہرے پر خوشی چھا گئی اور اس کی آنکھوں میں ہزاروں دیے جل اٹھے۔

"پرکاش میں اتنی شکتی کہاں سے آ گئی؟" اس نے میری طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ میں کوئی سپنا اپنے بیٹے کی بہادری کا دیکھ رہی ہوں......؟ کہیں یہ سپنا تو نہیں ہے؟"

"یہ تو آپ کو اپنا بیٹا ہی بتا سکتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "جب کھیل ختم ہو جائے گا تب آپ خود ہی اپنے بیٹے سے پوچھ لیں۔"

ان دونوں بدمعاشوں کا اپنے جیسا حشر نشر دیکھ کر جگو حیرت، خوف ودہشت اور سراسیمگی کی حالت میں ان کے پاس پہنچا اس نے اپنے ساتھیوں کو آوازیں دیں۔ تھوڑی دیر بعد انہیں ہوش آ گیا۔ پھر وہ ایک دم سے کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے پرکاش کی طرف دیکھا جو ایک طرف سکون واطمینان سے کھڑا ہوا ان کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

"تم دونوں مل کر بھی اس چھوکرے کو قابو نہ کر سکے۔" جگو غصے سے بولا۔ "بڑے بدمعاش بنتے تھے۔ کہاں گئی تمہاری بدمعاشی......"

"اور تم بھی تو بڑے نامی گرامی سورما ہو۔" ایک نے استہزائی لہجے میں جواب دیا۔ "تم بیک وقت دو تین پہلوانوں سے فری اسٹائل کشتی لڑ کر نام اور پیسہ بھی کما چکے ہو۔ ایک بارہ برس کے چھوکرے سے لڑ نہ سکے۔ اس نے تمہارا تیاپانچہ کر کے رکھ دیا۔"

"اب تم دیکھنا میں اس کی کیسی خبر لیتا ہوں۔" جگو لال ہو کر بولا۔ "میں نے بچہ سمجھ کر اس پر رحم کیا تو اس نے فائدہ اٹھایا۔"

"بچہ......؟ یہ کیسا بچہ ہے۔" دوسرے بدمعاش نے جبڑے پر متاثرہ جگہ ہاتھ رکھ کر کہا۔ پھر وہ کراہا۔ "میں مر گیا۔ یہ اس کا کیسا مکا تھا جس نے تمام دانت توڑ دیئے...... فولادی مکا تھا۔ ایسا لگا کہ کسی

نے منہ پر لوہے کا گولہ دے مارا ہو۔"

"ہاں...... مجھے بھی ایسا ہی لگا تھا اور درد کی شدت سے میری حالت نا قابل برداشت ہو رہی ہے۔" جگو بولا۔ "اس سے بدلہ لینا ہے۔ اسے چھوڑنا نہیں ہے۔ جان سے مارنا ہے۔ کیوں کہ اس نے ہمارے تمام دانت توڑ دیئے۔ اب ہم کوئی چیز کھا بھی نہیں سکیں گے۔ چلو میرے ساتھ...... ہم تینوں مل کر اس سے بدلہ لیتے ہیں۔"

"نہیں...... نہیں......" پہلے والے بدمعاش نے پرکاش کی طرف دیکھا پھر وہ خوف زدہ لہجے میں بولا اور نفی کے انداز میں سر ہلانے لگا۔ "ہم اس شیطان بچے سے نہیں لڑیں گے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس کے شریر میں شیطان کی آتما آ گئی ہے۔"

"یہ تمہارا وہم ہے۔" جگو نے کہا۔ "میں تم دونوں کو پانچ پانچ ہزار روپے دوں گا۔ اس لڑکے کی زندگی ختم کرنے کے لئے......"

"تم پانچ ہزار کیا...... دس ہزار روپے بھی دو تو ہم پرکاش سے نہیں لڑیں گے۔ ہم اسپتال جا رہے ہیں۔" دوسرے بدمعاش نے کہا۔

پھر دونوں بدمعاش بدحواسی اور سراسیمگی سے اکھاڑے سے نکل بھاگے۔ جگو نے انہیں روکنے کی بہت کوشش کی۔ وہ نہ تو رکے اور نہ ہی انہوں نے مڑ کے جگو کی طرف دیکھا تھا۔ وہ سر پر پیر رکھ کر اس طرح بھاگے تھے جیسے کوئی عفریت ان کے تعاقب میں ہو۔

اب اکھاڑے میں جگو اور پرکاش رہ گئے تھے۔ پرکاش اس کی طرف بڑھا۔ جگو کو اس کے چہرے پہ اور آنکھوں میں جانے کیا نظر آیا کہ وہ ایک دم سے گھوم کر بھاگا تو پرکاش نے لپک کر اس کی کمر پر ایک زور دار لات رسید کی تو وہ منہ کے بل گرا۔ گرتے ہی اٹھا۔ نہ صرف اس کی ناک پھٹ گئی تھی بلکہ ماتھا بھی پھٹ گیا اور ان زخموں سے لہو رسنے لگا۔ اس کے چہرے کا نقشہ بدل گیا تھا۔ پھر وہ اکھاڑے کی طرف بھاگا تو پرکاش نے اس کی کمر کی طرف سے لنگوٹ میں ہاتھ ڈال کر روک لیا۔ پھر اسے دونوں ہاتھوں پر اس طرح سے اٹھا لیا جیسے وہ کوئی نوزائیدہ بچہ ہو۔ جگو ہاتھ پیر چلانے لگا اور خوف و دہشت سے چیخنے لگا۔ "مجھے چھوڑ دو...... جانے دو...... میں اپنی ہار مانتا ہوں...... منیجر اسے بیس ہزار روپے دے دو۔"

پرکاش نے اسے اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیا تھا۔ اس نے پرکاش کی ماں اور تماشا دیکھنے والوں کو بھی محو حیرت کر دیا تھا۔ انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ ایک کمزور سا بچہ منوں وزن کو اس طرح اور اس آسانی سے اٹھا سکتا ہے جیسے وہ کوئی گڈا ہو۔ تماشائیوں پر چند لمحوں تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر وہ پر جوش انداز سے تالیاں بجانے اور خوشی کے نعرے لگانے لگے۔ پرکاش نے اسے اپنے ہاتھوں پر اسی طرح اٹھائے اکھاڑے میں چاروں طرف ایک چکر لگایا۔ پھر اکھاڑے کے درمیان آ کر اس نے اپنی پوری طاقت جمع کر کے پھر چکر لگایا اور اسے زمین پر دے مارا۔ جس بری طرح اسے پٹخا گیا اس نے جگو کے جسم کی ہڈیاں توڑ دیں۔ اس کی ایک ہڈی بھی سلامت نہ رہی۔ وہ ایک دل خراش چیخ مار کر بے ہوش ہو گیا۔ اب وہ

معذور اور اپاہج ہو کر رہ گیا ساری زندگی کے لئے، اسے ایسی سزا ملی تھی جس کا وہ مستحق تھا۔ کیوں کہ اس نے اپنی زندگی میں کسی کے ساتھ بھلائی نہیں کی تھی۔ کسی غریب اور مظلوم پر ترس نہیں کھایا تھا۔

اس اکھاڑے کے منیجر نے سب کے سامنے پرکاش کو بیس ہزار کی رقم ایک لفافے میں رکھ کر پیش کی۔ پرکاش کی ماں اپنے لخت جگر کی زندگی اور کامیابی پر خوشی سے پھولی نہیں سمائی۔ وہ رام ناتھ کا ہاتھ پکڑ کر اکھاڑے میں پہنچ گئی۔ اس وقت اکھاڑے میں لوگوں کی ایک بھیڑ تھی جو پرکاش کو مبارکباد دے رہے تھے اور اس کی طاقت پر دنگ بھی تھے اور اس سے طرح طرح کے سوالات بھی کئے جا رہے تھے۔ آخر اس نے کس طرح جگو اور ان بدمعاشوں کے دانت توڑ دیئے۔ کس طرح اس نے جگو کو اٹھا لیا۔

"جب میں یہاں آیا تو سخت پریشان تھا کہ کسی طرح سے جگو کو کشتی میں ہرا دوں تا کہ وہ میری ماں سے دور رہے۔" پرکاش کہنے لگا۔ "میری ماں کی شادی ماسٹر جی سے ہونے والی تھی، وہ دھمکیاں دے رہا تھا کہ ماسٹر جی سے شادی نہیں کرنے دوں گا۔ میں رام ناتھ کے ساتھ اس درخت کے نیچے کھڑا باتیں کر رہا تھا۔ تب وہاں ایک پردیسی آیا۔ اس نے میری اور رام ناتھ کی ساری باتیں سن لی تھیں۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں تمہیں ایک ترکیب اور منتر بتاتا ہوں۔ تم اس کی مدد سے نہ صرف بیس ہزار کی رقم جیت سکو گے بلکہ جگو کو معذور اور اپاہج بھی کر دو گے۔ یہ سب کچھ اس کے کارن ہے۔"

"کہاں ہے وہ پردیسی......؟" بیک وقت کئی آوازوں نے پرکاش سے پوچھا۔ "ہمیں بھی اس سے ملاؤ......؟"

میں اس لمحے ان سب کی نظروں کے سامنے سے غائب ہو گیا۔ لیکن اس بھیڑ میں ہی موجود تھا۔ ان سب کی باتیں سن رہا تھا۔ میں ظاہر نہیں ہونا چاہتا تھا۔ مجھے ظاہر ہو کر کرنا بھی کیا تھا۔ ایک طرح سے میں نے غریب اور مظلوم عورت کی مدد کی۔ میرا کام ہی جادو منتر سے ستائے ہوئے اور پریشان لوگوں کی مدد کرنا تھا۔ اگر میں یہاں نہ آتا تو پرکاش اور اس کی ماں پر ایک قیامت گزر جاتی۔ کیوں کہ پرکاش کی ماں جگو کو قتل کر دیتی اور قانون کے ہتھے چڑھ جاتی۔ پرکاش کا مستقبل تاریک ہو جاتا۔

بھیڑ چھٹ جانے کے بعد پرکاش کی ماں اپنے بیٹے اور رام ناتھ کو لے کر اپنے گھر کی طرف چل پڑی۔ وہ بہت خوش تھی۔ کیوں کہ اس کی جھولی میں جہاں بھر کی خوشیاں بھر گئی تھیں۔ ایک خوشی تو یہ تھی کہ جگو جیسے اوباش اور خبیث آدمی سے نجات مل گئی تھی۔ ماسٹر صاحب سے وہ اپنے تحفظ اور بیٹے کے مستقبل کے لئے شادی کرنے والی تھی۔ اب اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہی تھی۔

وہ تینوں اپنے گھروں کی طرف جا رہے تھے تو میں بھی ان کے ساتھ تھا لیکن غائب تھا۔ وہ مجھے نہیں لیکن میں انہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں اس لئے ساتھ ساتھ چل رہا تھا کہ ان کے تعاقب میں تین بدمعاش لگے ہوئے تھے جس کی انہیں خبر نہیں تھی۔ وہ بیس ہزار کی رقم ہتھیا لینا چاہتے تھے۔ جب پرکاش، اس کی ماں اور رام ناتھ ویران اور سنسان راستے پر آئے تو وہ تینوں ایک دم سے ان کے سامنے آ گئے اور انہیں حصار میں لے لیا تو پرکاش، اس کی ماں اور رام ناتھ ٹھٹک کے رک گئے۔

ان تینوں کے ہاتھوں میں خوف ناک قسم کے چاقو اور چھرے تھے نیم اندھیرے میں ان کی دھاریں چمک رہی تھیں۔ ان کے چہرے بھی خوفناک اور مکروہ قسم کے تھے۔ پرکاش کی ماں پہلے تو یہ سمجھی کہ وہ اسے اغوا کرنا چاہتے ہیں۔ جب ایک بدمعاش نے رقم والا لفافہ مانگا تو اس نے خاموشی سے وہ لفافہ نکال کر ایک بدمعاش کی طرف بڑھا دیا۔ کیوں کہ دو ڈاکوؤں نے پرکاش اور رام ناتھ کو دبوچ کر ان کے گلے پر چاقو رکھ دیئے تھے کہ رقم نہیں دی گئی تو وہ ان کی گردن کاٹ دیں گے۔

اس بدمعاش نے پرکاش کی ماں سے لفافہ لینے کے بعد اس کا منہ کھول کر اندر ہاتھ ڈال کر نوٹ نکالے۔ وہ نوٹ نہیں تھے بلکہ نوٹ سائز کے سادے کاغذ تھے۔ وہ گڈیوں کی شکل میں تھے۔ اس نے تمام گڈیاں نکال کر دیکھیں۔ وہ سب سادے کاغذ کی تھیں۔

"نوٹوں کی گڈیاں کہاں ہیں؟" اس بدمعاش نے غراتے ہوئے پرکاش کی ماں سے سخت لہجے میں پوچھا۔

"کیا یہ نوٹوں کی گڈیاں نہیں ہیں......؟" پرکاش کی ماں نے حیرت سے پوچھا۔ پرکاش کی ماں کو دور سے اور اندھیرے کے باعث معلوم نہ ہو سکا تھا کہ یہ سادے کاغذ کی نوٹوں کے سائز کی گڈیاں ہیں۔ بدمعاش کی بات سن کر حیران ہوئی تھی۔ "پھر کیا ہیں؟"

"یہ سادے کاغذ کی گڈیاں ہیں۔" اس بدمعاش نے ایک ایک گڈی کر کے تمام گڈیاں پرکاش کی ماں کی طرف اچھال دیں۔ پرکاش کی ماں نے ایک ایک کر کے تمام گڈیاں اٹھا کر دیکھیں۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ پلکیں جھپکانا بھول گئی۔

"رقم والا لفافہ کہاں ہے؟" دوسرے ڈاکو نے پوچھا۔ "کہیں تم نے اسے چھپایا ہوا تو نہیں ہے؟ سچ سچ بتاؤ۔"

"یہی ایک لفافہ تو تھا جو منیجر نے تمام لوگوں کے سامنے یہ کہہ کر دیا تھا کہ اس میں بیس ہزار کی انعامی رقم ہے۔" پرکاش کی ماں بولی۔ "اس نے ہمیں دھوکا دیا۔ یہ ہماری بھول یا اس پر وشواس تھا کہ ہم نے لفافہ دیکھا نہیں...... اس نے جیسا لفافہ دیا ویسا لے کر رکھ لیا۔ ہم نے راستے میں بھی اسے کھول کر نہیں دیکھا...... آپ نے دیکھا تو ہمیں بھی پتا چلا کہ منیجر نے ہمارے ساتھ دھوکا بازی کی ہے۔ اس نے خود ہی وہ رقم ہڑپ کر لی ہے...... بھیا! تمہیں ہماری بات کا یقین نہیں آ رہا ہے تو تم ہم سب کی تلاشی لے سکتے ہو۔"

"ہاں یار! یہ سچ کہہ رہی ہے۔" دوسرے بدمعاش نے کہا۔ "منیجر نے دھوکا دیا ہے سالا...... وہ بھی تو ایک نمبری بدمعاش ہے۔"

پھر وہ تینوں اس سمت تیزی سے چلے گئے جس سمت سے آئے تھے۔ وہ تینوں کچھ دیر ساکت و جامد اور خوف زدہ سے کھڑے رہے۔ پرکاش کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ سسک پڑا۔ "ماں اس خبیث شخص نے ہمارے ساتھ کتنا بڑا دھوکا کیا ہے۔"

"کوئی بات نہیں میرے لعل!" پرکاش کی ماں نے بیٹے کے پاس جا کر اسے گلے سے لگا لیا۔ پھر دوپٹے میں اس کے آنسو جذب کرنے لگی۔ یہ ہمارے نصیب میں نہ تھے۔ اگر ہوتے تو بھی اس سے کیا

حاصل ہوتا۔ یہ بدمعاش چھین کر لے جاتے اور ہم منہ دیکھتے رہ جاتے...... جو نصیب میں نہ ہو اس کا کیا دکھ اور غم...... ہمارے لئے سب سے بڑی خوشی اور دولت جگو سے نجات ہے۔ یہ لاکھوں کی دولت سے بھی بڑھ کر ہے۔ روپے کا کیا ہے وہ خرچ ہو جاتا ہے۔ کوئی چھین کر لے جاتا ہے۔ اصل دولت سکون ہے بیٹے جو لاکھوں سے بھی بڑھ کر ہے۔ ہمیں ایک ایسا سکون نصیب ہوا جو ساری زندگی ایک بیش بہا دولت کی طرح ہے۔"

"ہاں ماں!...... تم ٹھیک کہتی ہو۔" پرکاش نے کہا۔ پھر جھک کر لفافہ اٹھایا اور اس میں سادے کاغذ کی گڈیاں رکھنے لگا۔

"یہ کیا کر رہے ہو بیٹے!" اس کی ماں بولی۔ "ان سادے کاغذ کی گڈیوں کو گھر لے جا کر تم کیا کرو گے؟"

"کل میں منیجر کو لے جا کر یہ گڈیاں دے کر اس سے کہتا ہوں کہ یہ تم نے ہمارے ساتھ اتنا بڑا دھوکا کیوں کیا؟" پرکاش نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔" پرکاش کی ماں بولی۔ "کل تم جاؤ تو رام ناتھ اور ماسٹر صاحب کو ساتھ لیتے جانا۔ اگر وہ شرافت اور ایمان داری سے بیس ہزار کی رقم دے دیتا ہے تو ٹھیک ہے۔ مکر جاتا ہے دینے سے انکار کر دیتا ہے تو اس سے الجھنا نہیں۔ واپس چلے آنا۔"

وہ گھر چلے گئے۔ پڑوس میں رام ناتھ کا گھر تھا۔ وہ اپنے گھر چلا گیا۔ پرکاش کی ماں بیٹے کے ہاتھ سے لفافہ لے کر میز پر رکھنے لگی تو لفافہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گرا تو اس میں سے دو ایک گڈیاں باہر نکل آئیں۔ پرکاش وہ گڈیاں اٹھا کر لفافے میں رکھنے کے لئے بڑھا۔ جیسے ہی اس کی نظر ان گڈیوں پر پڑی اسے یقین نہیں آیا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ حیرت سے بڑبڑایا۔ وہ سادے کاغذ کی گڈیاں نہ تھیں۔ نوٹوں کی گڈیاں تھیں۔ اس کی آنکھیں دھوکا نہیں کھا رہی تھیں۔

"ماں!...... ماں......" وہ ہذیانی لہجے میں چیخا۔ "ماں! یہ دیکھو...... یہ سادے کاغذ کی نہیں۔ نوٹوں کی گڈیاں ہیں......"

اس کی ماں نے اس کے پاس آ کر دیکھا۔ اسے نظروں پر یقین نہیں آیا۔ واقعی یہ سادے کاغذ کی گڈیاں نہ تھیں۔ نوٹوں کی ہی گڈیاں تھیں۔ پھر پرکاش نے لفافے میں سے باقی گڈیاں نکالیں وہ بھی نوٹوں کی گڈیاں تھیں۔ ماں بیٹے نے رقم گنی پوری بیس ہزار تھی۔

"ماں! یہ کیا چکر ہے؟" پرکاش تحیر زدہ لہجے میں بولا۔ "بدمعاشوں کے ہاتھوں میں پہنچ کر یہ سادے کاغذ کی گڈیاں بن گئیں۔"

"میرے خیال میں بیٹے یہ چکر نہیں ہے بلکہ اس پردیسی کا منتر ہے جس نے ہمیں بہت بڑی مصیبت سے نکالا۔ وہ کوئی مہان شخص تھا......"

❄......❄......❄

میں وہاں سے واپس میلے میں آ گیا۔ کوئی ایک ڈیڑھ گھنٹے تک گھومتا رہا۔ وہیں ایک ہوٹل تھا۔ اس

میں کمرا لے کر ٹھہر گیا۔ میں گیارہ بجے سو کر اٹھا۔ ناشتا کر کے بنگلور شہر واپس جانے کے لئے بس اڈے کی طرف چل پڑا۔ میں نے چند قدم طے کئے تھے کہ ایک طرف سے دھول اڑتی دکھائی دی۔ اس سمت سے گھوڑے سوار آ رہے تھے۔ میں ایک درخت کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ دھند چھٹی تو میں نے دیکھا۔ وہ بیس بائیس گھڑسوار تھے۔ جدید ترین بندوقوں سے مسلح تھے۔ بڑے تندرست و توانا، بلند قد و قامت، انہوں نے منہ پر ڈھاٹے باندھے ہوئے تھے۔ وہ اپنی وضع قطع سے ڈاکو ہی لگ رہے تھے۔ وہ جس انداز اور جس طرح سے جا رہے تھے اس سے ایسا لگ رہا تھا کہ ان کے ارادے اچھے نہیں ہیں جس تیز رفتاری سے وہ گھوڑے دوڑا رہے تھے اس سے ان کے تیور ظاہر تھے۔ وہ شاید کسی قریبی بستی میں لوٹ مار کرنے جا رہے تھے۔ وہ بستی زیادہ دور نہیں تھی۔ یہاں سے صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ کچا راستہ چھوڑ کر اسی بستی میں گھس گئے۔

جب میں اس گاؤں کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ ان مسلح ڈاکوؤں نے اس گاؤں کا محاصرہ کیا ہوا ہے۔ گاؤں کی آبادی اپنے اپنے گھروں سے نکل آئی ہے۔ مرد ایک طرف کھڑے ہوئے تھے۔ لڑکیاں، عورتیں اور بچے دوسری طرف...... ڈاکوؤں کا سردار ان مردوں اور عورتوں کے بیچ کھڑا ہوا بڑے کرخت لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ”گوتم کی بیوی کرن دیوی کہاں ہے......؟ اسے بلاؤ۔“

ایک جوان اور بہت خوبصورت عورت جس کی عمر چوبیس پچیس برس کی ہو گی وہ بھیڑ میں سے نکلی۔ اس کی گود میں ایک برس کا بہت ہی خوب صورت اور گول مٹول سا بچہ تھا۔ پیپل کے گھنے درخت کے نیچے کچھ چھوٹے بچے بیٹھے کھیل رہے تھے۔ اس نے اپنے بچے کو ان بچوں کے ساتھ بٹھا دیا۔ پھر وہ اپنے سر پر ساڑی کا پلو درست کرتی ہوئی سردار کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔

”گوتم کہاں ہے......؟“ سردار نے اسے قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔ اس کا لہجہ تڑختا ہوا تھا۔

”سرکار وہ کام کے تلاش میں بنگلور گیا ہوا ہے۔“ کرن نے سہمی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ”ایک ہفتہ ہو رہا ہے۔“

”کام کے تلاش میں گیا ہے یا ہماری مخبری کرنے اور ہمارے ٹھکانوں کا پتا بتانے......“ سردار نے گرج دار آواز میں کہا۔

”نہیں سرکار! وہ ایسا نہیں کر سکتا۔“ کرن نے بڑی لجاجت سے کہا۔ ”اس نے دو برس آپ کا نمک کھایا ہے۔ وہ نمک حرام نہیں ہو سکتا۔“

”اس نے نمک حرامی کی ہے کرن دیوی!“ سردار نے چراغ پا ہوتے ہوئے کہا۔ ”کیا تو مجھے بے وقوف سمجھتی ہے۔“

”میں بھگوان کی سوگند کھا کر کہتی ہوں وہ ایسا کر نہیں سکتا۔“ وہ آہستہ سے بولی۔ ”وہ جب تک آپ کے ساتھ رہا بڑا وفادار رہا......“

”اس کی وفاداری کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس نے رام دیال کو گرفتار کرا دیا اس

کے گھر سے۔“ سردار بولا۔

”نہیں...... گوتم! ایسا نہیں کر سکتا...... سردار! تم یہ بات بہت اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ رام دیال کا بچپن کا دوست ہے۔ اس نے ایک نہیں دو مرتبہ اپنی جان پر کھیل کر پولیس سے اس کی جان بچائی۔“ کرن نے کہا۔ ”وہ اسے کیسے پھنسا سکتا ہے۔“

”اب تو بہت بولنے لگی ہے۔“ سردار نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ”سن...... میں تجھے بتاتا ہوں کہ گوتم...... مجھے، رام دیال اور میرے دو اور ساتھی جگن ناتھ اور رام سروپ اور میرے گروہ کو قانون کے ہاتھوں کس لئے گرفتار کرانا چاہتا ہے۔ میرے سر کی قیمت دس لاکھ روپے ہے، رام دیال، جگن ناتھ اور رام سروپ کی قیمت پانچ پانچ لاکھ...... یہ تو ہوئے پچیس لاکھ...... اور میرے گروہ کے باقی بیس ساتھیوں کو گرفتار کرانے پر بیس لاکھ روپے...... کیا پینتالیس لاکھ روپے کم ہوتے ہیں......؟ یہ بات تو بھی اچھی طرح جانتی ہے۔ شاید تو بھی چاہتی ہے یہ لاکھوں روپے کی رقم ہاتھ آ جائے تاکہ ساری زندگی سکون و آرام سے گزر جائے۔“

”نہیں سردار! نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ تم مجھ سے مندر میں چل کر بھگوان کی سوگند لے لو۔“ کرن کہنے لگی۔ ”وہ احسان فراموش نہیں ہے۔ نہ میں اور نہ ہی اس بستی کا کوئی فرد...... تمہارے آدمی غلط فہمی کی بنا پر گاؤں کی عورتوں کو اٹھا کر لے گئے تھے۔ تب بھی ہم میں سے ی نے تمہاری اور تمہارے ٹھکانوں کی مخبری نہیں کی...... پھر بھی تم میرے پتی پر شک کرتے ہو۔ کیا یہ افسوس اور دکھ کی بات نہیں ہے۔“

”کیا تو ہم پر اپنا اور گاؤں والوں کا احسان جتا رہی ہے۔“ سردار بگڑ کر برہمی سے بولا۔ ”میں پہلے یہ بات کہہ چکا ہوں اور ساری دنیا جانتی ہے کہ جب بھی کسی گاؤں کے ایک آدمی نے بھی ہماری مخبری کی ہم نے اس گاؤں کو جلا کر خاک کر دیا اور ان کی عورتوں کو اٹھا کر لے گئے۔ میں نے کبھی کسی دشمن پر رحم نہیں کھایا اور نہ ہی اس کے ساتھ رعایت کی...... لیکن تیرے پتی پر ضرور رحم کھاؤں گا اگر وہ صرف ایک بار کہہ دے کہ اس نے رام دیال کو نہیں پھنسایا تھا۔ یہ تو رام دیال کی قسمت اچھی تھی کہ وہ جیل سے فرار ہو گیا...... ہاں میں چار دن کی مہلت دے کر جا رہا ہوں۔ اگر گوتم مجھ سے ملنے نہیں آیا تو پھر اس گاؤں میں رات کے وقت اتنی روشنی ہو جائے گی کہ سارا آسمان روشن ہو جائے گا اور اس کی روشنی اور شعلے اور چمک میلوں دور سے دیکھے جا سکیں گے۔

اور ہاں...... تو بڑی سندر ہے۔ اس گاؤں میں بڑی سندر ناریاں ہیں اور کئی کنواری بھی ہیں۔ یہ اور شادی شدہ عورتیں بھی میرے گاؤں لے جائی جائیں گی۔ میرے گاؤں میں مرد زیادہ ہیں اور عورتیں کم ہیں۔“

”سردار! وہ کچھ بتا کر نہیں گیا ہے کہ کب تک لوٹے گا ورنہ میں کسی کو بھیج کر اس کے ہاتھ تمہارا سندیسہ بھیج دیتی۔“ کرن بولی۔ ”اگر وہ نہیں آتا ہے تو اس کی سزا تم گاؤں والوں، معصوم لڑکیوں اور عورتوں کو کیوں دو گے؟ انہوں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟“

”یہ میں نہیں جانتا...... ہمیشہ سے یہ میرا اصول رہا ہے۔“ وہ سفاک لہجے میں بولا۔ ”میں نے اپنے باپ اور بھائی کو نہیں بخشا...... اس لئے میں کسی کو بھی نہیں بخشتا ہوں۔ میں وہی کرتا ہوں جو میرے جی میں آتا ہے۔ تیرے کہنے سے کچھ نہیں ہو گا۔“

"یہ سراسر ظلم اور زیادتی ہے سردار!" کرن اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر بولی۔ "تم انسان ہو۔ حیوان نہیں...... شاید حیوان بھی انسانی آبادیاں اس طرح نہیں اجاڑتے ہیں۔ بھگوان کے لئے ہم سب پر رحم کھاؤ۔" اتنا کہہ کر وہ سسک پڑی۔

"تو مجھے حیوان سے بدتر سمجھ رہی ہے؟" سردار نے غضب ناک ہو کر کہا۔ "چل ایسا ہی سہی...... میں ایسا حیوان بن کر دکھاؤں گا کہ تو سوچ بھی نہیں سکے گی...... آج تک کسی نے ایسی مثال قائم نہیں کی ہوگی جو میں کروں گا۔ ہلاکو کی آتما بھی کانپ جائے۔"

"نہیں...... سردار نہیں۔" وہ ہذیانی لہجے میں بولی۔ "میں نے تمہیں حیوان نہیں کہا۔ میرے پتی کی سزا چلو مجھے دے دو......"

"وہ تو تجھے بھی دوں گا......" سردار نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "چوں کہ میں نے چار دن کی مہلت دے دی ہے اس لئے کسی کو کوئی سزا نہیں دے رہا۔ میں نے تجھے بتا دیا ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ چار دن بعد واپس آؤں گا۔"

"سردار! تم بہت ظالم ہو۔" کرن نے ہیجانی لہجے میں کہا۔ "تم سن لو۔ میں یہ ظلم ہونے نہیں دوں گی۔ اگر تم نے مجھ پر اور اس گاؤں پر کوئی مصیبت نازل کی تو پھر گوتم تمہیں اور تمہارے کسی آدمی کو بخشے گا نہیں۔ تم یہ بات بہت اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ مجھ سے کتنی محبت کرتا ہے اپنے گاؤں کے ایک ایک آدمی کو اپنے سن سنار کا کہتا ہے۔ اگر تم نے اور تمہارے آدمیوں نے کوئی نقصان پہنچایا تو اس کی ساری ذمے داری تم پر ہوگی۔" کرن بڑی جذباتی ہوگئی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

"اچھا...... اب چیونٹی کے بھی پر نکل آئے......؟" سردار نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔ "تو مجھے دھمکیاں دے رہی ہے۔"

"میں دھمکیاں نہیں دے رہی۔" وہ بولی۔ "میں یہ کہہ رہی ہوں کہ گوتم تمہارے ظلم کے خلاف کیا قدم اٹھائے گا۔"

"اچھا اب میں جا رہا ہوں......" سردار نے گھوڑے کی باگیں کھینچتے ہوئے کہا۔ "میں نے آج تک کسی کی اتنی باتیں نہیں سنی ہیں تیری جگہ کوئی اور ہوتا تو اسے اب تک خون میں اشنان کروا دیتا۔ گوتم چار دن کے اندر اندر نہ آیا تو پھر تم سب اپنے انجام کے لئے تیار رہنا۔"

اتنا کہہ کر اس نے اپنا گھوڑا دوڑایا اور اس طرف لے گیا جہاں کرن کا بچہ اور بچوں کے ساتھ بیٹھا ہوا کھیل رہا تھا۔ اس نے گھوڑا بچے کے پاس لے جا کر اس کا ایک بازو پکڑ کر اٹھایا اور جدھر سے آیا تھا ادھر گھوڑا سرپٹ دوڑاتا ہوا نکل گیا۔ یہ سب کچھ چشم زدن میں ہوا۔ کرن سکتے کی سی حالت میں آگئی۔ جب وہ اس کے پیچھے دوڑی تو سردار اپنے ساتھیوں سمیت بہت دور نکل گیا تھا۔ کرن گرتی پڑتی دوڑ رہی تھی اور چلا رہی تھی۔ "میرا بیٹا...... میرا بیٹا......" پھر وہ ٹھوکر کھا کر گری، روتے روتے بے ہوش ہوگئی۔

کچھ عورتیں اس کی طرف تیزی سے لپکیں۔ پھر وہ اسے بے ہوشی کی حالت میں سہارا دیتی ہوئی

لے گئیں۔ مرد لوگ جو درخت کے نیچے کھڑے ہوئے تھے وہ آپس میں باتیں کرنے لگے۔ ان پر خوف و دہشت طاری تھی اور ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ بہت پریشان تھے۔ جب میں ان کی طرف بڑھا تو ان لوگوں نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ اس لئے کہ میں ان کے لئے اجنبی تھا۔

"یہ ڈاکو کون تھے......؟" میں نے ایک عمر رسیدہ شخص سے پوچھا۔ "وہ اس عورت کے بچے کو کیوں لے گیا؟"

"آپ اسے نہیں جانتے؟" اس عمر رسیدہ شخص نے کہا۔ "اس کا نام سورج ہے۔ وہ سورج ڈاکو کے نام سے مشہور ہے۔"

"سورج ڈاکو کرناٹک کا خطرناک، بے رحم اور سفاک ترین شخص ہے۔" دوسرے شخص نے کہا۔ "اس کے جرائم کی فہرست اتنی لمبی ہے کہ آپ خواب و خیال میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ اس پر ایک الزام نہیں ہے۔ وہ حکومت کو ڈکیتی، لوٹ کھسوٹ، دہشت گردی، قتل و غارت گری، آبروریزی اور نہ جانے کن کن جرائم میں مطلوب ہو۔ اس نے کئی بستیوں اور گھروں کو نذر آتش بھی کیا...... اس کے گروہ میں صرف گوتم ہی ایک ایسا شخص ہے۔ جس کے ہاتھ صاف رہے۔ اس کا صرف ایک ہی جرم ہے وہ یہ کہ اس گروہ میں دو برس تک شامل رہا۔ اس کا کام صرف مخبری تھا۔ وہ سورج کو اطلاعات فراہم کرتا تھا جس سے وہ فائدہ اٹھاتا تھا۔ پھر اس نے اچانک ہی یہ گروہ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ کیوں کہ وہ اس مجرمانہ زندگی سے تنگ آ چکا تھا۔ ڈرتا تھا کہ کہیں اس سے کسی دن ایسا کوئی سنگین جرم سرزد نہ ہو جائے جو اسے ساری زندگی جیل میں گزارنا پڑے۔ بیوی اور بچے اور ان کے مستقبل کے خیال نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن سورج کو اس کا الگ ہونا ناگوار لگا۔ جب پولیس نے رام دیال کے گھر پر چھاپہ مار کر اسے گرفتار کیا تو سورج کو گوتم پر شک ہوگیا کہ وہ پولیس سے ملا ہوا ہے۔ سورج آج گوتم کو لے جانے آیا تھا کہ اپنا شک دور کر سکے۔"

"گوتم اگر چار دن کے اندر اندر اس کے ہاتھ نہ لگا تو پھر ہماری، ہماری عورتوں کی اور گاؤں کی خیر نہ ہوگی۔" عمر رسیدہ شخص نے تشویش سے کہا۔ "وہ جو دھمکی دے گیا ہے۔ وہ خالی خولی نہیں ہے۔ وہ نہ صرف بڑا کمینہ ہے بلکہ ذلیل اور حرامی شخص ہے۔"

"چاچا!" دوسرے شخص نے فوراً ہی اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا۔ "شش آہستہ بولو۔ کہیں تمہاری بات اس تک نہ پہنچ جائے۔"

"تم میری بات کی نہیں بلکہ اس بات کی فکر کرو کہ اب کیا ہوگا؟" چاچا نے کہا۔ "گوتم نہ پہنچا تو بڑی مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔"

اس وقت ایک نوجوان لڑکے نے آ کر کہا۔ "نارائن بھیا! برانیم بابو نے آپ دونوں کو اپنے ہاں بلایا ہے۔ میٹنگ کرنے کے لئے۔"

جب چاچا اور نارائن بھیا مجھ سے ہاتھ ملا کر جانے لگے تو میں نے کہا۔ "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں بھی آپ لوگوں کی میٹنگ میں شریک ہو جاؤں۔ شاید میرا مشورہ آپ لوگوں کے کام آ جائے۔ آپ

لوگوں کو اس مصیبت سے نجات مل جائے۔"

"کہیں آپ سیاح کے بھیس میں سورج کے آدمی تو نہیں ہیں؟" چاچا نے مجھے مشکوک نظروں سے گھورا۔

"جی نہیں۔" میں ہنس پڑا۔ "کہیں تو میں آپ کو اپنی شناخت کرادوں۔ میں ایک غیر ملکی سیاح ہوں۔ پڑوسی ملک کا......" پھر میں نے اپنا پاسپورٹ دکھایا تو ان کو تسلی ہوئی۔ وہ پھر مجھے اپنے ہمراہ برانیم کے ہاں لے آئے۔

برانیم بابو کوئی چالیس برس کی عمر کے لگ بھگ ہوں گے۔ وہاں ایک اور شخص رام داس بھی تھا جو پچاس برس کا تھا۔ برانیم بابو اسکول ماسٹر تھے۔ چاچا اور نارائن بھیا کی زمینیں تھیں۔ رام داس کی پرچون کی دکان تھی۔ یہ سب اس لئے جمع ہوئے اور بیٹھک کر رہے تھے کہ کسی صورت سے گوتم کو تلاش کر کے چار دن کے اندر اندر اسے سورج کے ٹھکانے پر جانے کے لئے کہا جائے۔

میں نے ان لوگوں سے کہا۔ "کیا ایسا ممکن نہیں ہے۔ بنگلور کے ہوم سیکریٹری سے مل کر سورج کی دھمکی کے بارے میں بتایا جائے۔"

"سورج اور اس کے آدمیوں نے پولیس کا ایسا ناک میں دم کر رکھا ہے کہ پولیس اس کا نام سن کر کانپنے لگتی ہے۔" برانیم بابو کہنے لگے۔ "اس نے متعدد پولیس افسروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کے علاوہ شہر کے بینکوں سے کروڑوں روپے لوٹ چکا ہے۔ اس کی وارداتوں سے حکومت میسور نے اس کے اور اس کے ساتھیوں کے سروں کی قیمت مقرر کر چکی ہے۔ زندہ یا مردہ کسی بھی صورت میں وہ حکومت کو مطلوب ہے۔ فوج بھی اس پر قابو پانے اور پکڑنے پر نا کام ہو چکی ہے۔ اس کے پاس نہ صرف جدید ترین ہتھیار ہیں بلکہ اس کے ہر گاؤں اور ہر شہر میں مخبر موجود ہیں۔ ان کے پاس موبائل فون ہے جس سے پولیس کی نقل و حرکت اور پل پل کی خبر ملتی رہتی ہے۔ اس وجہ سے وہ آج تک پولیس اور فوج کے ہتھے چڑھ نہ سکا کہ اس گاؤں میں بھی اس کے مخبر ہیں۔ اس نے پولیس کی کالی بھیڑیں بھی خرید کر رکھی ہوئی ہیں۔ انہیں ہر ماہ باقاعدگی سے تنخواہ بھی دیتا ہے۔"

"اس کے ٹھکانے کے بارے میں کیا پولیس واقف نہیں ہے؟" میں نے سوال کیا۔ "اس ٹھکانے کو بمباری سے بھی تو ختم کیا جا سکتا ہے۔"

"اس کے دو ٹھکانے ہیں۔" نارائن بھیا نے کہا۔ "یہ ٹھکانے اس نے جنگل میں بنا رکھے ہیں۔ ایک ٹھکانے میں جدید ترین اسلحہ رکھا ہوا ہے۔ یہ اسلحہ اس نے اسمگلروں سے خریدا ہوا ہے۔ دوسرا ٹھکانہ جو ہے وہ ایک گاؤں ہے۔ یہ گاؤں بھی جنگل میں ہی ہے۔ اس گاؤں یا ٹھکانے کے بارے میں اس کے قابل اعتماد ساتھی ہی جانتے ہیں۔ اس نے زیر زمین صرف اپنا ٹھکانہ بنایا ہوا ہے۔ اس لئے پولیس اس کے ٹھکانے کو پانے اور تباہ کرنے میں نا کام رہی ہے۔ اگر اس کا اسلحہ خانہ تباہ کر دیا جائے تو اس کی کمر ٹوٹ سکتی ہے۔"

"حیرت کی بات ہے کہ دنیا اور ہندوستان اتنا ترقی کر چکا ہے اس کے باوجود ایک ڈاکو گرفتار نہ کیا

جاسکا؟" میں نے کہا۔

"ہاں جی یہ بڑے دکھ اور حیرت کی بات ہے کہ حکومت ایک ڈاکو کو چار برسوں میں بھی گرفتار نہ کر سکی۔" رام داس نے ایک سرد آہ بھری۔ "اس نے نیندیں حرام کی ہوئی ہیں۔ اس کے آدمی نہ صرف اس گاؤں اور میری دکان سے بلکہ ہر گاؤں اور چھوٹے شہروں سے زبردستی مفت میں سینکڑوں اور ہزاروں کا اناج لوٹ کر لے جاتے ہیں۔"

"اصل بات یہ ہے کہ سورج بڑا ذہین، چالاک اور شاطر ذہن کا مالک ہے۔" برانیم کہنے لگا۔ "وہ تعلیم یافتہ بھی ہے۔ جینئس ہے۔ شیطان جینئس جس کی وجہ سے اس نے قانون کو بے بس کر رکھا ہے۔ وہ بنگلور اور میسور شہروں کے بڑے بڑے بینک لوٹ چکا ہے۔ اب تک اس کے پاس بے پناہ دولت جمع ہو گئی ہوگی۔"

"اب آپ لوگ کیا کریں گے......؟" میں نے پوچھا۔ "کس طرح سے گوتم کو تلاش کریں گے۔ اس کے نہ ملنے کی صورت میں کیا ہوگا؟"

"میں تو سوچ رہا ہوں کہ تین دن میں گوتم کا پتا نہ چلا اور وہ سورج کے پاس نہیں گیا تو ہم لوگ گاؤں خالی کر کے اپنی عورتوں کو لے کر عزت سے نکل جائیں۔" چاچا نے کہا۔ "اس کے علاوہ چارہ بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ گوتم ملنے سے رہا۔ سنا ہے کہ وہ کوئی بہروپ بھر کر شہر گیا ہے تاکہ سورج کے آدمی اس کی شناخت نہ کر سکیں۔ لہٰذا ہم اسے کیسے تلاش کر سکیں گے۔"

"کیا سورج ہم لوگوں کو اتنی آسانی سے گاؤں خالی کر کے جانے دے دے گا؟" رام داس نے سوال کیا۔ "اسے فوراً ہی خبر ہو جائے گی۔"

"ایک ہی صورت رہ جاتی ہے کہ ہم کچھ لوگ آج ابھی اور اسی وقت بنگلور شہر چلتے ہیں۔" نارائن بھیا نے تجویز پیش کی۔ "ہم شہر میں چاروں طرف پھیل جائیں گے۔ اس کی بیوی کرن نے میری پتنی اور سورج کو بھی تو بتایا کہ وہ روزگار کے سلسلے میں بنگلور گیا ہوا ہے۔"

"کیا اس بات کی امید و آس ہے کہ ہم لوگ اسے ایک دو دن میں ڈھونڈ نکالیں گے؟" رام داس نے خیال ظاہر کیا۔

"ہمیں ہر قیمت پر اسے تلاش کرنا ہوگا۔" نارائن بھیا نے کہا۔ "بنگلور بہت بڑا شہر ہے۔ اس لئے دن رات ایک کرنا ہوگا۔ اس کے مل جانے پر، بھگوان کرے وہ مل جائے۔ ہم اس سے کہیں گے کہ وہ ہمارے ساتھ گاؤں چلے۔ پھر وہاں سے وہ سورج کے پاس چلا جائے۔"

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ ہماری بات مان لے گا؟" چاچا نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "جبکہ اسے خطرہ ہے سورج سے......"

"کیوں نہیں مانے گا۔" برانیم بابو بولے۔ "وہ ایک شریف اور سیدھا سادا آدمی ہے؟ بے غرض اور بے لوث بھی ہے۔"

"میرا دل کہہ رہا ہے کہ وہ لاکھوں کی آبادی میں ہفتوں میں بھی نہیں ملے گا۔" چاچا نے کہا۔ "ہم

اس کی تلاش میں پریشان اور الگ خوار ہوں گے۔ کیا برا وقت آن پڑا ہے۔ بھگوان اس شیطان کو غارت کرے جس نے دنیا کا جینا حرام کر رکھا ہے۔"

"لیکن ہمیں بہرحال کوشش تو کرنی ہوگی۔" نارائن بھیا نے کہا۔ "اس لئے بھی کہ ہمیں اصل میں عورتوں اور لڑکیوں کی عزت و آبرو کی چنتا ہے۔ ہمیں اپنے گھروں اور مال اور زندگی کی چنتا نہیں...... اس رذیل کے علم میں یہ بات ہے کہ کتنی لڑکیاں کنواری اور کتنی شادی شدہ عورتیں ہیں۔"

"ذرا یہ بھی تو سوچو کہ ہم اسے بہروپ میں کیسے پہچانیں گے؟" چاچا بولے۔ "یہ بھی تو پتا نہیں کہ اس نے کون سا بہروپ بھرا ہوا ہے؟"

"وہ کسی بھی بہروپ میں ہو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" برانیم بابو بولے۔ "ہم اسے نہ پہچان سکیں لیکن وہ تو ہمیں پہچان لے گا۔"

"میرے خیال میں گوتم کو شہر میں جا کر تلاش کرنے سے تو بہتر ہے کہ ہم اپنی لڑکیوں اور عورتوں کو لے کر رات کے اندھیرے میں نکل جائیں۔" چاچا نے کہا۔ "میسور یا بنگلور کے کسی پولیس ہیڈ کوارٹر میں انہیں ٹرک میں سوار کروا کر لے جائیں گے۔ وہاں سورج کچھ نہ کر سکے گا۔"

"ہمارے گاؤں میں سورج کا ایک مخبر ہے جس کے بارے میں گوتم کو بھی ٹھیک سے پتا نہیں ہے۔" نارائن بھیا کہنے لگا۔ "لیکن گوتم اور مجھے ہمیشہ جے راج پر شک رہا ہے۔ میں نے بھی اس کی حرکات و سکنات کو مشکوک سا محسوس کیا ہے۔ یہاں سے عورتوں اور لڑکیوں کو نکال لے جانا آسان نہیں۔ کیوں کہ جے راج فوراً ہی سورج کو خبر کر دے گا۔ اس لئے سب سے پہلے جے راج کو قابو میں کرنا ہوگا۔ سانپ بھی مر جائے گا لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی۔"

"اگر جے راج کو قابو میں کر لیا گیا تو پھر سارا گاؤں راتوں رات خالی کیا جا سکتا ہے۔" رام داس نے کہا۔ "اس طرح ہم اس ظالم کے ہاتھوں بچ جائیں گے۔"

"آپ سب لوگ گھر بار چھوڑ کر چلے تو جائیں گے لیکن کب تک اور کہاں رہیں گے؟" میں نے پوچھا۔ "گاؤں خالی کر جانا یہ حل تو نہیں ہے؟"

"پھر کیا کریں......؟" رام داس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "اس کے سوا چارہ نہیں۔ عورتوں کی عزت آبرو کے لئے ہم ایسا قدم اٹھانے پر مجبور ہیں۔"

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ سورج کا مقابلہ کیا جائے؟" میں نے تجویز پیش کی۔ "کسی نہ کسی طرح سورج کو مار دیا جائے یا پکڑ لیا جائے تو پھر یہ گروہ اپنی موت آپ مر جائے گا۔ یہ گروہ کسی مالا کی طرح ٹوٹ کر بکھر جائے گا۔ یہ گروہ صرف اور صرف سورج کی وجہ سے زندہ ہے۔"

"سورج سے مقابلہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے آسمان کے سورج کو چراغ دکھانا۔" چاچا بولے۔ "ایک تو ہمارے پاس ہتھیار نہیں ہیں۔ کچھ لوگوں کے پاس جو بندوقیں ہیں وہ شکار کھیلنے کے لئے ہیں۔ اس پر جب فوج اور پولیس قابو نہیں پا سکی ہے تو ہم کیا بیچتے ہیں۔ ہم تو اسے خواب میں بھی ختم نہیں کر سکتے ہیں۔"

"حکومت نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو زندہ یا مردہ گرفتار کرنے پر جو لاکھوں کے انعامات رکھے ہیں صرف اس لئے کہ وہ کسی نہ کسی طرح ختم ہو جائیں۔" برانیم بابو نے کہا۔ "انعام کے لالچ میں کچھ لوگوں نے اسے مارنے کی کوشش کی لیکن وہ سورج کے ہاتھوں مارے گئے۔ ان میں سے ایک بھی زندہ نہ بچا۔"

اس وقت ایک ادھیڑ عمر کی عورت کمرے میں آئی تو چاچا نے اس سے دریافت کیا۔ "کرن دیوی کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

"اس پر بار بار غشی کے دورے پڑ رہے ہیں۔" عورت نے جواب دیا۔ "جب بھی ہوش میں آتی ہے تو میرا بیٹا کہہ کر بے ہوش ہو جاتی ہے۔ زار و قطار رونے لگتی ہے۔ اس کی حالت کسی سے دیکھی نہیں جا رہی ہے۔ وید جی آ کر دیکھ گئے۔ لیکن پھر بھی کوئی افاقہ نہیں ہوا۔"

عورت اتنا بتا کر چلی گئی تو چاچا نے کہا۔ "یہ سورج کیسا شقی القلب ہے اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے۔ وہ اس معصوم بچے کو رہن رکھنے کے لئے لے گیا ہے۔ اگر گوتم نہیں پہنچا تو وہ اس بچے کو قتل کر کے اس کی لاش گاؤں میں لا کر اس کی ماں کی گود میں ڈال دے گا۔ یہ سنگ دل کتنی ہی گودیں اور سہاگ اجاڑ چکا ہے۔ نہ جانے بھگوان کیوں اس سے دنیا کو پاک نہیں کر دیتا۔"

"آپ لوگ اب کسی بات کی چنتا نہ کریں۔" میں نے انہیں دلاسا دیا۔ "سورج کے دن گنے جا چکے ہیں۔ آپ لوگوں کو گاؤں چھوڑ کر جانے کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ ہی اس سے ڈرنے اور خوف کھانے کی ضرورت ہے۔"

"کیا مطلب؟" چاچا نے چونک کر پوچھا۔ دوسرے لوگ بھی چونک کر مجھے حیرت سے دیکھنے لگے۔

"مطلب صاف اور واضح ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "میں آپ لوگوں کو سورج کے گروہ سے نہ صرف نجات دلا دوں گا بلکہ کرن کا بیٹا بھی زندہ سلامت واپس لا دوں گا۔ سورج اور اس کا گروہ قانون کے ہاتھوں سے بچ نہ سکے گا۔"

"ایسا کیوں کر اور کیسے ممکن ہے؟" برانیم بابو نے تحیر زدہ لہجے میں پوچھا۔ "آپ کی بات کا یقین نہیں آ رہا ہے۔"

"ایسا صرف اور صرف ذہانت سے ہی ممکن ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "میں یہ بات بڑی سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔"

"کیا آپ کے خیال میں پولیس اور فوج نے اب تک ذہانت استعمال نہیں کی؟" چاچا نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"جی ہاں۔" میں نے اپنا سر اثبات میں ہلایا۔ "ان دونوں اداروں نے ذہانت کے بجائے طاقت کا استعمال کیا ہے۔ یہ صرف طاقت پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ ہر مسئلے کا حل طاقت سمجھتے ہیں۔ اس وجہ سے انہیں ناکامی ہوتی ہے۔ یہاں بھی دراصل یہی ہوا ہے۔ اگر ذہانت اور تدبر سے کام لیا جاتا تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ سورج اور اس کے گروہ کو پھانسی ہو چکی ہوتی۔"

"مجھے آپ کی اس بات سے اتفاق ہے۔" برانیم بابو کہنے لگے۔ "حقیقت میں دشمن سے یا کسی سے بھی مقابلہ کیا جائے تو تدبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ پولیس اور فوج کو صرف اسلحہ اور طاقت پر ناز اور گھمنڈ ہوتا ہے۔ وہ اس کے نشے میں ایسے مست ہوتے ہیں کہ انہیں کچھ سجھائی نہیں دیتا ہے۔ اس وجہ سے ہی وہ دشمن سے شکست کھا جاتے ہیں۔ ذہانت سے بڑا ہتھیار کوئی نہیں ہے۔"

"آپ کس طرح سے سورج اور اس کے گروہ پر قابو پائیں گے؟" چاچا نے حیرت سے سوال کیا۔ "کیا آپ بتانا پسند کریں گے؟"

"میں معذرت چاہتا ہوں قبل از وقت یہ بتا نہیں سکوں گا۔" میں نے کہا۔ "یہ زہریلا ناگ مرجائے گا جو ڈستا چلا آرہا ہے۔"

"کیا آپ کو گاؤں کے جوانوں اور اسلحے کی ضرورت پیش آئے گی؟" نارائن بھیا نے پوچھا۔ "گاؤں میں کچھ جوان ایسے ہیں جو سورج کے سخت دشمن ہیں۔ وہ اسے ختم کرنے کے لئے جان بھی دینے کے لئے تیار ہیں۔ وہ آپ کا ساتھ دے سکتے ہیں؟"

"مجھے ان میں سے کسی ایک کی مدد کی بھی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں اکیلا ہی سورج کے ٹھکانے پر جاؤں گا۔"

"ایں...... آپ اکیلے جائیں گے؟" رام داس ششدر ہوگیا۔ "کیا آپ کے پاس ایسا کوئی ہتھیار ہے جس سے اس کا مقابلہ کرسکیں۔"

"میرے پاس ایک ایسا ہتھیار ہے جس کا وہ اور اس کے آدمی مقابلہ نہیں کرسکتے۔" میں نے کہا۔ "میں اس ہتھیار سے ان پر قابو پاؤں گا۔"

"کون سا ہتھیار ہے وہ......؟" رام داس نے اشتیاق اور تجسس سے پوچھا۔ "کیا آپ اسے دکھانا پسند کریں گے؟"

"وہ ذہانت ہے۔" میں مسکرایا۔ "میں نے ابھی ابھی آپ لوگوں سے کہا نا کہ ذہانت سے بڑا ہتھیار کوئی نہیں ہے؟"

"تو آپ نہتے سورج سے مقابلہ کرنے جائیں گے؟" چاچا نے اپنائیت کے لہجے میں کہا۔ "وہ بڑا ظالم اور بے رحم ہے۔"

"جی ہاں۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میرے ساتھ میرا خدا ہوگا جو مجھے اپنی امان میں رکھے گا۔ ذہانت میری مدد کرے گی۔ ذہانت بھی اللہ کی دین ہے جو وہ ہر انسان کو عطا کرتا ہے۔ اس سے جو جتنا فائدہ اٹھاتا ہے اتنا ہی فائدہ پہنچتا ہے۔"

"بیٹا! تم جذباتی نہ بنو۔" چاچا مجھے سمجھانے لگے۔ "ایک تو تم غیر ملکی سیاح ہو۔ اگر تمہیں کچھ ہوگیا تو دونوں ملکوں کے مابین ایک مسئلہ کھڑا ہوجائے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ تم نوجوان ہو۔ تم نے ابھی دنیا کہاں دیکھی ہے۔ یہ ہمارا مسئلہ ہے ہم اسے حل کرلیں گے۔"

"میں انسانیت کے ناتے جذباتی ہوگیا ہوں۔" میں کہنے لگا۔ "دراصل میں نے اپنی زندگی کا ایک مقصد بنایا ہوا ہے۔ میرا مشن انسانیت اور مظلوموں کی مدد کرنا ہے۔ یہ جو طاقت ور لوگ کمزوروں پر ظلم ڈھاتے ہیں انہیں ستاتے ہیں میں ان کی مدد کرتا ہوں۔ زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ہم مسلمانوں کا ایمان ہے کہ موت کہیں بھی کبھی بھی اور کسی بھی لمحے آسکتی ہے۔ موت کا ایک دن متعین ہے۔ وہ نہ تو ایک لمحے پہلے آتی ہے اور نہ ایک لمحے بعد...... اگر میری موت سورج کے ہاتھوں لکھی ہے تو پھر میں اس سے بچ نہیں سکتا۔ میں شاید اس معاملے میں ہاتھ نہ ڈالتا اگر سورج کرن کے معصوم بچے کو نہ لے جاتا۔ اس نے مامتا پر جو ظلم کیا ہے وہ مجھ سے دیکھا نہیں گیا۔ وہ انسان نہیں بلکہ درندہ ہے۔ اس لئے میں اسے کیفر کردار تک پہنچانا چاہتا ہوں۔"

"بھگوان تمہاری رکھشا کرے بیٹا؟" چاچا نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا۔ "ہم تمہاری کامیابی کے لئے بھگوان سے پرارتھنا کرتے رہیں گے۔"

"آپ مجھے کرن دیوی کے پاس لے چلیں۔" میں نے کہا۔ "میں رخصت ہونے سے پہلے کرن دیوی سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"لیکن اس پر تو غشی کے دورے پڑ رہے ہیں۔" نارائن بھیا نے کہا۔ "وہ کوئی بات کرنے کے قابل ہی نہیں ہے۔ آپ کو اس کی حالت سنبھلنے تک انتظار کرنا ہوگا۔ اس میں پانچ چھ گھنٹے بھی لگ سکتے ہیں اور شاید ایک دن بھی لگ جائے۔"

"میرے پاس فرسٹ ایڈ کا کچھ سامان ہے۔" میں نے کہا۔ "میں اسے نہ صرف ہوش میں لے آؤں گا بلکہ اسے پرسکون بھی کردوں گا۔"

چاچا مجھے لے کر کرن کے ہاں پہنچا وہ جس کمرے میں بستر پر بے ہوش پڑی تھی اس کمرے میں کچھ عورتیں اس کے پاس بیٹھی ہوئی اسے ہوش میں لانے کی کوشش کررہی تھیں۔ میں نے اپنے بیگ سے سرنج اور انجکشن کی شیشی نکالی۔ پھر اسے انجکشن لگایا۔ چند لمحوں کے بعد وہ رفتہ رفتہ ہوش میں آگئی۔ اس نے ہوش میں آتے ہی ادھر ادھر دیکھا۔ پھر رونے، چیخنے، چلانے اور سینے پر تھپڑ مارنے لگی۔ "کہاں ہے میرا لعل......؟ میرا منوہر...... بھگوان کے لئے اسے لے آؤ......"

"شانتی...... شانتی بیٹی!" چاچا نے کہا۔ "دیکھو یہ صاحب آئے ہیں۔ یہ پولیس افسر ہیں۔ یہ تمہارے بیٹے کو سورج کے ہاں سے نکال لائیں گے...... حوصلہ کرو کرن! رونے دھونے سے کچھ نہ ہوگا۔ کیوں اپنی جان خراب کرتی ہو۔" چاچا نے اسے دلاسا دیا۔

"اس مردود، ظالم اور خبیث کے ہاں سے اسے لانا بہت مشکل ہے۔" کرن بین کرنے لگی۔ "وہ میرے بیٹے کو جان سے مار دے گا۔ کوئی گوتم کو بلا کر لے آؤ۔ اسے بتادو کہ اس کے بیٹے کو سورج اٹھا کر لے گیا ہے۔ جان سے مارنے کے لئے......"

میں نے ایک گلاس پانی منگوایا۔ ایک بوڑھی عورت جو اسے سمجھا رہی تھی میرے کہنے پر اس نے

میرے ہاتھ سے گولی لے کر کرن کو کھلا دی۔ گولی کھانے کے تھوڑی دیر بعد کرن قدرے پرسکون ہو گئی۔ حالت بھی قدرے سنبھل گئی تھی۔ تب میں نے چاچا اور عورتوں سے کہا کہ کچھ دیر کے لئے ہم دونوں کو تنہا چھوڑ دیں۔ میں اس سے کچھ دریافت کرنا چاہتا ہوں۔

چند لمحوں کے بعد ہم دونوں کمرے میں اکیلے رہ گئے۔ کرن اٹھ کر بیٹھ گئی۔ مجھے منجمد آنکھوں سے گھورنے لگی۔ ''آپ کون ہیں؟''

''میں نہ صرف تمہارا، تمہارے پتی اور تمہارے بچے بلکہ سارے گاؤں والوں کا ہمدرد ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''سورج کا بدترین دشمن ہوں۔ میں اسے قانون کے حوالے کرنا چاہتا ہوں تاکہ اسے اور اس کے تمام ساتھیوں کو پھانسی پر چڑھا دیا جائے۔ اس کے لئے تمہیں مجھ سے تعاون کرنا ہوگا۔ میرے ہر سوال کا ٹھیک ٹھیک جواب دینا ہوگا۔ اس صورت میں تمہارا بیٹا تمہیں زندہ سلامت مل سکتا ہے۔''

''سورج کو نہ تو پولیس قابو کر سکی اور نہ ہی اس کے دشمن آپ کیا کر سکیں گے؟'' وہ مایوسی سے بولی۔

''آپ مجھے جھوٹا دلاسا نہ دیں۔''

''اچھا آپ یہ بتائیں کہ کیا گوتم پولیس کو سورج کے ٹھکانے اور اس کے اسلحہ کے گودام کے بارے میں بتانے گیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں...... نہیں......'' وہ ایک دم سے گھبرا گئی۔ ''وہ کام کی تلاش میں گیا ہے۔ یہ آپ سے کس نے کہہ دیا؟''

''اگر یہ بات تھی تو وہ بہروپ بھر کے کیوں گیا؟'' میں نے اس کے زرد ہوتے ہوئے چہرے پر نگاہیں مرکوز کر دیں۔

''اس لئے کہ سورج کے ساتھی اور مخبر اس کی موجودگی کی اطلاع سورج کو نہ دے دیں۔'' اس نے نگاہیں نیچی کر کے جواب دیا۔

''سورج کو گوتم کا اس کے گروہ سے الگ ہونا بڑا ناگوار لگا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ گوتم پھر سے اس کے گروہ میں شامل ہو جائے۔''

''کیا یہ بڑی عجیب سی بات نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔ بنگلور میں اسے ہر وقت خوف، دھڑکا اور یہ اندیشہ لاحق رہے گا کہ کہیں وہ پہچان لیا نہ جائے گا۔ اگر اسے محنت، مزدوری کرنا ہی تھی تو وہ مدراس بھی جا سکتا تھا۔ مدراس میں سورج کے گروہ کا ایک آدمی اور مخبر بھی نہیں ہے۔ وہ صرف اس شہر میں آزادی اور سکون سے کام کر سکتا ہے۔''

''وہ اس لئے بنگلور گیا ہے کہ یہ شہر بہت قریب ہے۔'' وہ دفاع کرتی ہوئی بولی۔ ''صرف دو گھنٹے کی مسافت پر ہے۔ کوئی بات ہو تو فوراً ہی پہنچا جا سکتا ہے۔ شام آکر صبح جا سکتا ہے جبکہ مدراس شہر بس سے دس گھنٹوں کی مسافت پر ہے اور پھر وہ ایک اجنبی شہر ہے۔ وہ وہاں کے موسم کی وجہ سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہاں دسمبر میں بھی سخت گرمی پڑتی ہے۔''

''کرن! تم نہ صرف جھوٹ بول رہی ہو بلکہ بہت ساری باتیں چھپا رہی ہو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ میری نگاہوں کی تاب نہ لا سکی۔ اپنی نگاہیں جھکا لیں۔ ''اس سے تمہارا نقصان ہوگا میرا نہیں...... سورج تمہارے پتی کو معاف کرنے والا نہیں۔ اس کے آدمی اسے نہ صرف ڈھونڈ نکالیں گے بلکہ ختم بھی کر دیں گے۔ اس لئے کہ اب وہ پولیس سے کہیں خطرناک اور موذی سانپ کی طرح ہو گیا ہے اور پھر تمہارے لخت جگر کو مار کر تمہاری نظروں کے سامنے لا ڈالے گا۔ کیا تم چاہتی ہو کہ سورج تمہارا سہاگ اجاڑ دے اور گود خالی کر دے...... یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ بھیڑیا صفت تمہیں بھی اٹھا کر لے جائے تم سے کھیلنے کے لئے......''

''نہیں...... نہیں......'' کرن دہشت زدہ ہو گئی۔ اس کے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اس کا چہرہ سفید پڑتا چلا گیا۔

''سنو کرن!'' میں نے بڑی نرمی سے کہا۔ ''میں تمہارا سہاگ اور تمہارے منوہر کو اس درندے سے بچانا چاہتا ہوں اور پھر میری بات کا صحیح جواب دینے میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔ کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ تمہیں ڈرنے اور خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''ٹھیک ہے......'' کرن برف کی طرح پگھل گئی۔ ''آپ پوچھئے۔ میں آپ کی ہر بات کا سچ سچ جواب دوں گی۔ کوئی بات نہیں چھپاؤں گی۔''

''کیا گوتم پولیس کے اعلیٰ حکام سے ملنے اور انہیں اعتماد میں لینے کے لئے گیا ہے تاکہ سورج کا قلع قمع کیا جا سکے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی...... جی......'' کرن نے قدرے تذبذب سے سر ہلا کر جواب دیا۔ ''اس نے مجھے ایشور کی سوگند دی تھی کہ......''

''اس کی چنتا نہ کرو کیوں کہ سوگند توڑنے میں اسی کا فائدہ ہو رہا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کیا وہ انعام کے لالچ میں پولیس سے تعاون کر رہا ہے۔ پولیس نے ان مجرموں کو زندہ یا مردہ گرفتار کرنے پر لاکھوں روپے کا انعام رکھا ہے۔''

''نہیں...... وہ انعام کے لالچ میں نہیں بلکہ انسانیت کی خاطر گیا ہے۔'' کرن بولی۔ ''سورج نے ظلم، بربریت اور دہشت گردی کی حد کر دی ہے۔ وہ نہیں چاہتا ہے کہ سورج انسان کے خون کو پانی سے بھی ارزاں سمجھ کر بہائے۔''

''میں صرف اتنا ہی معلوم کرنا چاہتا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''میں اب سورج کے ٹھکانے کی طرف جا رہا ہوں۔ تمہارا بیٹا تمہیں جلد مل جائے گا۔''

''میں مندر جا کر پوجا اور بھگوان سے آپ کی کامیابی کے لئے پرارتھنا کروں گی۔'' وہ بولی۔ اچانک اس کے حسین چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ ''کیا آپ سورج کا ٹھکانہ جانتے ہیں؟ نہیں تو آپ اسے کیسے تلاش کریں گے؟''

"میں نہیں جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "ڈھونڈنے سے خدا بھی مل جاتا ہے۔ میں گھوڑوں کے ٹاپوں کے نشانات دیکھتا ہوا پہنچ جاؤں گا۔ وہ میری رہنمائی کریں گے۔ وہ نشانات تازہ ہیں۔ ایک دو گھوڑے کے نہیں پورے بیس بائیس گھوڑوں کے۔ لہٰذا مجھے وہاں تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ اس کا ٹھکانہ یہاں سے کتنی دور ہوگا؟"

"یہاں سے پانچ میل کے فاصلے پر ہے۔" کرن کہنے لگی۔ "گوتم نے مجھے دو ایک مرتبہ بتایا تھا۔ یہاں سے دو میل پر ایک کالا مندر ہے۔ وہ جنوب میں ہے۔ کالا مندر پہنچ کر شمال کی طرف چل دیں۔ ایک میل چلنے کے بعد ایک چھوٹا سا گاؤں ملے گا۔ یہ گاؤں رمنا جادوگر کا ہے اور یہاں سورج کے آدمی بھی ہوتے ہیں۔ وہ ہر وقت مسلح رہتے ہیں۔ اس گاؤں کے ہر مکان میں اسلحہ موجود ہے۔ پولیس یا فوج کی گاڑی آتی دکھائی دیتی ہے تو وہ فوراً ہی فائرنگ شروع کر دیتے اور موبائل فون پر سورج کو اطلاع کر دیتے ہیں۔ لیکن اس کی نوبت کم ہی آتی ہے کیوں کہ اس گاؤں میں جو رمنا جادوگر ہے۔ وہ اپنے جادو کے زور سے فوج اور پولیس کو بھاگنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ وہ کالے جادو کا ماہر ہے۔ وہاں تک پولیس اب تک صرف ایک مرتبہ آسکی تھی کیوں کہ مندر میں جو طاغوتی طاقتیں ہیں وہ رمنا جادوگر کی تابع ہیں۔ لہٰذا وہ پولیس، فوج اور اس طرف جانے والے کسی بھی اجنبی کو بھگا دیتی ہیں جس سے وہ راستہ بھول کر واپس چلا جاتا ہے سورج اس جادوگر کو گرو مانتا ہے۔ اس کا بڑا خیال رکھتا اور سیوا کرتا ہے۔ شراب اور شباب اس جادوگر کی کمزوری ہے۔ میں نے گوتم سے سنا بھی ہے کہ صرف اس جادوگر کے کارن پولیس کبھی بھی اس ٹھکانے پر پہنچ نہیں پائے گی۔ لیکن پولیس جادو کی قائل نہیں ہے۔ جب تک جادو کا توڑ نہیں ہوگا اس وقت تک پولیس کامیاب نہیں ہوگی۔ گوتم پولیس کو سمجھائے گا۔ زور دے گا کہ رمنا جادوگر کا توڑ کرنے کے لئے کسی بڑے جادوگر کی خدمات حاصل کی جائیں۔ مشکل یہ ہے کہ پولیس توہمات پر یقین نہیں کرتی اور آپ کو مندر میں بلاؤں سے واسطہ پڑے گا۔ وہاں سے کسی نہ کسی طرح نکل گئے تو رمنا جادوگر اور سورج کے آدمی آپ کا راستہ روک لیں گے۔"

"تم نے بہت ساری ایسی باتیں بتا دی ہیں جس سے میری مشکل آسان ہوگئی ہے۔" میں نے کہا۔ "تم اب بچے کی یاد میں رونا دھونا نہیں۔ بہت سکون اور حوصلے سے رہنا، دس سورج مل کر بھی تمہارے بیٹے کا بال بیکا نہیں کر سکتے۔"

میں نے کرن اور دوسرے لوگوں کو منع کر دیا تھا کہ وہ میرے بارے میں کسی کو نہ بتائیں کہ میں سورج کے ٹھکانے پر جا رہا ہوں لیکن چاچا، براہیم بابو، نارائن بھیا اور رام داس حیران تھے کہ میں اکیلا اور نہتا جا کر اتنے بڑے ڈاکو سے کیسے اور کس طرح سے مقابلہ کروں گا اور اسے قابو میں کر کے پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ کرن کے بیٹے کو بھی ان خطرناک اور شقی القلب ڈاکوؤں کے چنگل سے نکال دوں گا۔ انہوں نے مجھے روکا اور سمجھایا بہت لیکن میں نے انہیں دلاسا دیا کہ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔

چاچا نے بھی ان باتوں کی تصدیق کی تھی جو کرن نے مجھے سورج ڈاکو کے ساتھی رمنا جادوگر کے متعلق بتائی تھیں۔ چاچا کا کہنا تھا کہ اس رمنا جادوگر کی بدولت سورج قانون کے ہاتھوں سے بچا ہوا ہے اور

پولیس اور فوج نہ اس پر ہاتھ ڈال سکی اور نہ اس کے گروہ کا قلع قمع کر سکی۔ جس طرح قصہ کہانیوں میں کسی جادوگر کی جان کسی پرندے میں ہوتی تھی اسی طرح سورج کی جان اور سلامتی بھی اس رمنا جادوگر کے ہاتھوں میں تھی۔ سورج کا جو دست راست رام دیال پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہوا تھا اسے جیل سے فرار کرانے میں رمنا جادوگر کے جادو نے کام کیا تھا۔ اس قدر سخت پہرے میں ایک قیدی کا جیل سے فرار ہونا ناممکن تھا۔ ایک پرندہ بھی وہاں پر نہیں مار سکتا تھا۔ ان تمام باتوں سے اندازہ ہوا کہ رمنا جادوگر بہت بڑا جادوگر ہے۔

پولیس رمنا جادوگر اور اس کے متعلق جو باتیں عام تھیں انہیں سرے سے مانتی ہی نہیں تھی اور انہیں قصہ کہانیاں کہتی تھی۔ جبکہ اس کے کتنے آدمی کالے مندر اور گاؤں کے پاس سورج سے مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے تھے۔ پولیس کی بھاری نفری بھی سورج کو اور اس کے ایک آدمی کو بھی زخمی نہ کر سکی تھی اس کی وجہ رمنا جادوگر ہی تھا۔

میں ان سے رخصت ہو کر کالے مندر کی طرف چل پڑا جو دو تین میل کی مسافت پر تھا۔ ان لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد میں وہاں سے غائب ہو کر کالے مندر سے فرلانگ بھر پہلے ظاہر ہو گیا۔ یوں تو میں سورج کے ٹھکانے اور اس کی خفیہ پناہ گاہ میں بھی ظاہر ہو سکتا تھا لیکن میں کالے مندر کی ان بلاؤں سے بھی نمٹنا چاہتا تھا جو وہاں سے کسی اجنبی اور مسافر کو گزرنے نہیں دیتی تھیں اور پھر رمنا جادوگر سے بھی دو دو ہاتھ کرنے تھے۔ میں جہاں ظاہر ہوا تھا وہاں گھنے درختوں سے گھرا ہوا ایک تالاب تھا۔ یہ ایک ویرانہ تھا۔ یہاں بڑا سکون تھا اور فرحت بخش ہوا چل رہی تھی۔ میں تالاب کے کنارے آ گیا۔ اس کا پانی بڑا صاف و شفاف تھا جیسے اس کی صفائی کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ مجھے پانی میں اپنا عکس نظر آیا تھا۔

میں کنارے بیٹھ گیا۔ میں نے ایک منتر پڑھ کر پانی کی سطح پر اپنے قریب ہی پھونکا۔ ٹی وی جیسے آن ہو گیا تھا اور ایک چینل جو سورج کے ٹھکانے کا تھا وہ ابھر آیا تھا۔ ایک گھر کے بہت بڑے کمرے میں سورج، منوہر اور گوتم کے علاوہ چھ سات مسلح ڈاکو بھی کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے گوتم کو اس لئے اور ایسے پہچان لیا تھا کہ کرن نے مجھے اس کی ایک تصویر دکھائی تھی اور ان دونوں کی ایک تصویر فریم میں بھی آویزاں تھی جوان کی شادی کی تصویر تھی۔ منوہر کو ایک تیس برس کی عورت لئے کھڑی ہوئی تھی۔ منوہر رو رہا تھا اور باپ کے پاس جانے کے لئے ضد کر رہا تھا اور بری طرح مچل رہا تھا۔ اس نے رو رو کر گھر کو سر پر اٹھایا ہوا تھا۔

گوتم جب بچے کو گود میں لینے کے لئے بڑھا تو سورج تیزی سے ان کے درمیان حائل ہو گیا اور عورت سے بولا۔

"سروجنی! اس سؤر کے پلے کو یہاں سے لے جاؤ...... اسے چپ کرانے کی کوشش کرو۔ یہ حرام زادہ کیسا گلا پھاڑ رہا ہے۔ اگر اس نے چپ ہونے کا نام نہ لیا تو اسے اتنا مارو کہ دماغ ٹھکانے آ جائے اور بے ہوش ہو جائے۔"

"سورج!" گوتم نے کہا۔ اس کی آواز میں دکھ سا بھرا ہوا تھا۔ "اس معصوم پر ایسا ظلم نہ کرو۔ اسے تھوڑی دیر کے لئے مجھے دے دو۔ میں اسے بہلا کر دے دوں گا۔ پھر یہ روئے گا نہیں...... میں جو اس کے

لئے کھلونے لے کر آیا ہوں وہ اسے دے دو۔ وہ ان سے کھیلتا رہے گا۔"

"یہ کوئی میرا مہمان ہے جو میں اس کے ناز نخرے اٹھاؤں......" سورج نے غصے سے کہا۔ "میں نے اسے تمہیں دکھانے کے لئے یہاں بلایا تھا کہ تمہارا بیٹا ہم یہاں لے کر آئے ہیں۔ تمہاری پتنی سے کہا تھا کہ یہ اس وقت تک رہن رہے گا جب تک تم گوتم کو ہمارے پاس بھیج نہیں دیتے...... ہم نے اسے چار دن کی مہلت دی کہ گوتم کو ہمارے پاس بھیج دو اگر ان چار دنوں میں گوتم نہ آیا تو پھر اس گاؤں کی خیر نہ ہوگی۔ گاؤں کی کنواری لڑکیاں اور جوان شادی شدہ عورتیں اٹھا کر لے آئیں گے۔ پھر رات کے وقت اس گاؤں کے ایک ایک گھر کو اس طرح جلا دیں گے کہ وہ اندھیرے میں ایسا روشن ہو جائے گا کہ میلوں تک اس کی روشنی، آگ اور شعلے دکھائی دیں گے۔ یہ نظارہ آتش بازی سے کہیں حسین ہوگا...... ہم تمہارے منوہر کو نہ لاتے اگر تمہاری پتنی نے زبان درازی نہ کی ہوتی۔ یوں تو اصولاً ہمیں اسے لانا تھا لیکن تمہاری دوستی کا خیال آ گیا۔ پھر ہم نے سوچا کہ سالی جائے گی کہاں...... آج نہیں تو کل ہمارے بستر کی زینت بن جائے گی اور ہم اس سے کہہ کر آئے کہ اگر گوتم چار دن کے اندر اندر ہم سے ملنے نہیں آیا تو ہم یہ سمجھیں گے کہ اس نے غداری کی ہے۔ پھر ہم نے ایک فیصلہ کیا کہ تمہاری اس غداری کی سزا اسے دیں گے۔ تمہیں جو سزا دینی ہے وہ بعد میں تجویز کریں گے۔ اسے پہلے سزا اس لئے دیں گے کہ تمہیں بچے کو نظروں کے سامنے مرتا دیکھ کر جو تڑپ، اذیت اور تکلیف ہوگی اس سے مجھے خوشی ہوگی۔ اس کا گلا گھونٹ کر ماریں گے۔ وہ مرتے وقت تکلیف سے کس طرح تڑپے گا یہ ایک خوبصورت منظر ہوگا۔

"سورج!" گوتم نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہا۔ "اب تو میں تمہارے سامنے ہوں۔ تم چاہتے کیا ہو؟"

"یہ محض اتفاق ہے کہ تمہارے گاؤں سے یہاں آتے ہوئے تم راستے میں گھر جاتے ہوئے مل گئے۔" سورج نے کہا۔ "میں تم سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تم بہروپ بدل کر بنگلور شہر کس لئے گئے؟ سچ بتاؤ۔"

"میں نے تمہاری اجازت سے ہی تمہارا ساتھ چھوڑا......" گوتم نے جواب دیا۔ "میں نے کوئی بغاوت نہیں کی اور نہ ہی تمہارے اصولوں کی خلاف ورزی کی۔ میں نے تم سے کہا بھی کہ میں بہت تھک گیا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اب محنت مزدوری کر کے دن اور زندگی گزاروں...... کرن بھی نہیں چاہتی۔ کرن ایک ایسی ہستی ہے جسے میں سب سے زیادہ چاہتا اور عزیز رکھتا ہوں۔"

"میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی تمہیں اجازت دے دی تھی۔" سورج بولا۔ "لیکن اس کے باوجود تم بہروپ بدل کر کیوں گئے؟"

"اس لئے کہ پولیس والوں کے پاس میری تصویر ہے۔" گوتم نے کہا۔ "کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے پہچان کر اندر نہ کر دیں۔"

"لیکن پولیس کے پاس تو تمہارا بڑا اصاف ریکارڈ ہے۔" سورج نے تکرار کی۔ "پھر یہ ڈرامہ اور

خوف کیسا......؟"

"تم جانتے ہو کہ پولیس کا کوئی بھی بھروسا نہیں۔" گوتم نے کہا۔ "اس کے باوجود کہ میرے خلاف ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے لیکن وہ یہ جانتے ہیں کہ میں تمہارے قریبی ساتھیوں میں سے ہوں۔ ایک بازو ہوں۔ حکومت نے تمہیں اور تمہارے کچھ ساتھیوں کو زندہ یا مردہ گرفتار کرنے پر لاکھوں روپے کا اعلان کیا ہوا ہے۔ وہ مجھے تمہاری گرفتاری کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی آنچ آئے۔ اس لئے میں نے بہروپ بدلا۔ اسے تم سچ جانو یا جھوٹ۔ یہ تم پر منحصر ہے۔"

"لیکن تم کام کی تلاش میں تین دن پہلے گئے تھے؟" سورج نے کہا۔ "اپنی پتنی سے یہ کہہ گئے تھے کہ میں ایک ماہ بعد آؤں گا لیکن تم تین دنوں میں ہی کیوں لوٹ آئے......؟" سورج یہ کہہ کر اسے مشکوک نظروں سے گھورنے لگا۔

"اس لئے کہ مجھے کام نہیں ملا اور چلتے چلتے وقت میں اتنی رقم لے جانا بھول گیا جو دس پندرہ دن کام دے سکے۔"

"گوتم! کیا میں کوئی دس بارہ برس کا چھوکرا ہوں جو تم مجھے بے قوف بنا رہے ہو؟" سورج نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "کیا تم نہیں جانتے کہ میں نے پولیس کے محکمے میں جو کالی بھیڑیں ہیں انہیں اور ان کے ضمیر خرید رکھے ہیں، ان میں صرف عام سپاہی ہی نہیں بلکہ سب انسپکٹر، انسپکٹر اور ڈی ایس پی ہیں۔ گو کہ یہ چند لوگ ہیں، لیکن بڑے کام کے ہیں۔ ان کی اطلاعات غلط نہیں ہوتی ہیں۔ میں ان کے آگے ہڈیاں ڈالتا رہتا ہوں جو پیسے، شراب اور شباب کی صورت میں ہوتی ہیں۔ جب میں کہیں ڈکیتی کی واردات کرنے جاتا ہوں یہ مجھے تحفظ دیتے ہیں، رکاوٹیں دور کر دیتے ہیں، ان سے پل پل کی خبریں ملتی رہتی ہیں، اس لئے مجھے بڑے گھروں اور بینکوں میں ڈاکے مارتے ہوئے کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ دہشت گردی میں بھی ان لوگوں نے ساتھ دیا۔ اگر ان کا تعاون نہ ہوتا تو کبھی اتنی کامیابیاں نصیب نہیں ہوتیں۔"

"سنو سورج!" گوتم بولا۔ "وہم کا علاج کسی کے پاس نہیں ہے۔ میرے خلاف تمہارے پاس کوئی ثبوت ہو تو پیش کرو۔"

"ڈی ایس پی ساجن نے آج صبح ہی موبائل فون پر تمہارے بارے میں بہت ساری اطلاعات دی ہیں۔" سورج کہنے لگا۔ "اس لئے تو میں سویرے ہی تمہارے گاؤں پہنچ گیا تھا۔ اس نے سب سے پہلی بات جو بتائی یہ تھی کہ تم کل رات رام سروپ کے نام سے ہوم سیکریٹری سے ملے تھے۔ یہ ملاقات اس کے گھر پر پولیس کمشنر اور ڈی آئی جی اور اس کی موجودگی میں ہوئی تھی۔ تم نے جب انہیں بتایا کہ سورج کے ٹھکانوں تک پولیس کی رسائی اور کامیابی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک رمنا جادوگر کا توڑ نہ کیا جائے۔ رمنا جادوگر اور اس کے جادو کی حقیقت کو تسلیم کیا جائے۔ جب بھی فوج اور پولیس اس علاقے میں گئی جہاں سورج کے ٹھکانے ہیں وہ کامیاب نہ ہو سکی۔ وہ سفلی علوم کا ماہر ہے۔ کالا جادو بھی جانتا ہے۔ وہ

اپنے جادو اور موکلوں اور بلاؤں سے کام لیتا ہے۔ جب پولیس، اس کے دشمن یا اجنبی وہاں سے گزرتے ہیں۔ تم نے انہیں بہت ساری مثالیں اور واقعات بتا کر قائل کرلیا۔ پھر ہوم سیکریٹری نے اس وقت کول کتہ اور دہلی فون کر کے وہاں کے ہوم سیکریٹری سے بات کی اور انہیں صورت حال بتا کر پوچھا کہ کیا کوئی ایسا جادوگر ہے جو کالے جادو کا توڑ کر سکے۔ وہاں سے جواب ملا کہ وہ ایک دن میں بتائیں گے۔

پھر تم نے ان پولیس افسران کے نام بتائے جو میرے ساتھی ہیں اور مجھ سے ہر قسم کی واردات کے مواقع پر مدد اور تعاون کرتے ہیں۔ اتفاق سے تمہیں ساجن کا نام یاد نہیں رہا۔ تم نے جن افسران کا نام لیا ان کا دوسرے دن دور دراز اور ایسی جگہوں پر تبادلہ کر دیا جہاں میں کوئی واردات نہیں کر سکتا۔ ان کے تبادلوں سے مجھے کتنا نقصان ہوا ہوگا تمہیں بھی اس بات کا اندازہ ہے۔ ایک طرح سے تم نے میرا بازو کاٹ کر رکھ دیا۔ یہ ایسی چوٹ ہے جس کی جلن میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔

اور پھر تم نے ایک نقشے کی مدد سے میری رہائش اور ٹھکانوں کے بارے میں بتایا کہ فلاں گاؤں میں میں نے اپنی دنیا بسا رکھی ہے۔ ایک گودام ہے جس میں کروڑوں کی مالیت کا اسلحہ، سونا اور کرنسی بھی رکھی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ ایک نجی جیل بھی ہے جس میں وہ تین پولیس افسران جو پراسرار طور پر لاپتہ ہو گئے تھے اس میں قید ہیں۔ اس کے علاوہ دو صنعت کار بھی ہیں جن سے میں دس دس کروڑ تاوان وصول کرنا چاہتا ہوں۔ ان پولیس افسران کا جرم یہ ہے کہ انہوں نے رام دیال پر تشدد کیا تھا کہ میرے بارے میں معلومات فراہم کرے۔ اب رام دیال روزانہ نہ صرف ان پر تشدد کرتا ہے بلکہ سخت ایذائیں بھی دیتا ہے۔ وہ بھی سورج کی طرح بے رحم ہے اور شقاوت کا مزاج رکھتا ہے۔ ان صنعت کاروں نے اس سے کہا کہ وہ دس نہیں دو کروڑ تاوان سے زیادہ ادا نہیں کر سکتے۔ لیکن سورج دس کروڑ سے کم لینے پر تیار نہیں ہے۔

تم نے یہ بھی بتایا کہ سورج ایک انسان نہیں بلکہ درندہ صفت ہے۔ ایک خون آشام بھیڑیا...... وہ انسانوں کو تڑپ تڑپ کر مرتے ہوئے دیکھتا ہے تو ایک عجیب سی لذت اور کیف محسوس کرتا ہے۔ اس کی روح کو بڑی شانتی ملتی ہے۔ جب وہ سفاک شخص اپنے کسی دشمن کو ہلاک کرتا ہے گولی نہیں مارتا ہے بلکہ ایذائیں دیتا ہے۔ اسے کسی ستون سے باندھ دیا جاتا ہے۔ پھر وہ کسی تیز چاقو، خنجر یا چھرے سے اس کے جسم کے مختلف اعضاء کاٹتا ہے۔ جسم میں شگاف ڈالتا ہے جب وہ دل خراش چیخیں مارتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ کیا سر ہے، سات سروں کا سر ہے، اور پھر اس کے کچھ کم سن بچوں کے خون سے بھی ہاتھ رنگے ہیں۔ ان کا قصور یہ تھا کہ گھروں پر ڈکیتی کے دوران انہوں نے مزاحمت کی تھی۔

تم نے مبالغہ آمیزی اور غلط بیانی سے کام نہیں لیا۔ لیکن اس سے کیا حاصل ہوا گوتم! میں نے رمنا جادوگر سے بات کی تھی اور اس سے کہا تھا کہ پولیس افسران کسی ایسے جادوگر کو تلاش کر رہے ہیں جو تمہارے جادو کا توڑ کر سکے...... رمنا جادوگر یہ بات سن کر بڑے زور سے ہنسا تھا۔ اس نے کہا کہ ہندوستان اور آسام میں یقیناً بہت سارے جادوگر ہیں لیکن ان میں ایک بھی میرے پائے کا نہیں ہے۔ میں سب سے بڑا جادوگر ہوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ وہ کون مائی کا لال ہے جو مجھ سے مقابلہ کرے۔

گوتم! اب تم نہ تو میرے دوست ہو اور نہ ہی ساتھی...... بلکہ غدار ہو۔ تم جانتے ہو کہ غدار کی سزا کیا ہوتی ہے۔ میں غداروں کو کیا سزا دیتا ہوں۔ یہ تم بہت اچھی طرح جانتے ہو۔ میں نے جو خون خوار شکاری کتے پال رکھے ہیں وہ آدم خور بن چکے ہیں۔ وہ اب تک تین غداروں کو کھا چکے ہیں۔ انہیں ایک برس سے انسان کا گوشت نہیں مل سکا۔ وہ مویشیوں کا گوشت کھا کھا کر بیزار ہو چکے ہیں۔ لیکن میں تمہیں ان کی خوراک بنانے میں کوئی جلدی نہیں کروں گا۔ اس لئے کہ ڈی ایس پی ساجن کل شام آئے گا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ تمہارے سامنے ان باتوں کی تصدیق کرے۔ اس ثبوت کے بعد دوسرے دن جب وہ یہاں سے چلا جائے گا تب میں تمہیں تمہاری غداری کی سزا دوں تاکہ پھر کوئی اور غداری کی ہمت نہ کرے۔ حیرت کی بات ہے کہ ان تین غداروں کے انجام سزا سے بھی تم نے سبق حاصل نہیں کیا۔ اس لئے کہ تم پینتالیس لاکھ کی انعامی رقم حاصل کر سکو۔

اور ہاں میں نے اپنے پروگرام میں کچھ تبدیلی کر دی ہے۔ پہلے میں نے یہ پروگرام بنایا تھا کہ تمہارے چار دن کے اندر اندر یہاں نہ پہنچنے کی صورت میں، میں منوہر کا گلا گھونٹ کر اسے موت کی نیند سلا دیتا۔ پھر میں منوہر کی لاش لے جا کر کرن کے قدموں میں ڈال دیتا۔ گاؤں کی کنواری حسین لڑکیوں اور شادی شدہ عورتوں کو بھی اٹھا لاتے۔ پھر گاؤں کو آگ لگا دیتے۔ کرن جو غم وصدمے سے نڈھال ہوتی تو میں اس کا سارا دکھ اور غم غلط کر دیتا۔

لیکن اب تمہارے اچانک اور غیر متوقع طور پر ہاتھ لگنے سے صورت حال یکسر مختلف ہو گئی ہے۔ اب تمہیں میں جیل میں ڈال رہا ہوں۔ جیل میں اب تم اپنی موت کا انتظار کرو۔ تمہاری اور منوہر کی لاشیں کرن کو پہنچا دی جائیں گی۔ پھر میں اس بدنصیب عورت کو دو چار دن بعد یہاں لے آؤں گا۔ کیوں کہ تین چار دن تک رونے دھونے سے اس کے دل کی بھڑاس نکل جائے گی اور غم بھی کم ہو جائے گا۔"

"اب جب کہ تمہیں تمام باتوں کا علم ہو چکا ہے تو میرا خیال ہے کہ اب جھوٹ بولنے اور جرم جو تمہاری نظر میں ہے اس سے انکار نہیں کروں گا۔" گوتم کہنے لگا۔ "میں نے غداری نہیں کی بلکہ اپنا فرض ادا کیا ہے۔ مجھے اس غداری پر فخر ہے۔ میں نے اس لئے غداری کی کہ تم اس دور کے ہلاکو خان بن گئے ہو بلکہ اس سے بھی دو ہاتھ بڑھ گئے ہو...... میں موت سے نہیں ڈرتا ہوں۔ ایک دن سب کو مرنا ہے۔ تم بھی مر جاؤ گے سورج! لیکن تمہاری موت کتے سے بھی بدتر ہوگی۔ میری یہ بات نہیں بھولنا۔ لیکن تم نے یہ سوچ رکھا ہے کہ میں کبھی نہیں مروں گا۔ یہ تمہاری بھول اور خود فریبی ہے۔ اچھا ہی ہے کہ تم اس خود فریبی میں مبتلا ہو۔

میں تم سے زندگی کی بھیک نہیں مانگوں گا۔ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ میری غداری کی سزا تم میری معصوم پتنی اور اس بچے کو نہ دو۔ میں تمہارا اصل مجرم ہوں۔ یہ کون سا اصول اور انصاف ہے کہ کرے کوئی بھرے کوئی...... اچھا ایک بات اور سن لو۔ اب تم موت سے قریب ہوتے جا رہے ہو۔ میں نے ہوم سیکریٹری اور اعلیٰ پولیس افسران کو بتا دیا ہے کہ سورج پر اس صورت میں قابو پایا جا سکتا ہے کہ رمنا جادوگر پر قابو پا لیا جائے۔ ہوم سیکریٹری نے کہا کہ رمنا جادوگر اور تمہارے علاقے پر ہیلی کاپٹروں سے بمباری اور فائرنگ

کر کے سورج اور اس کے ساتھیوں اور رمنا جادوگر کو ختم کر دیا جائے۔ لیکن میں نے اس تجویز کی سختی سے مخالفت کی۔ کیوں کہ اس گاؤں اور سورج کا جو گاؤں ہے اس میں دیہاتی اور قیدی بھی ہیں۔ وہ بھی فائرنگ اور بمباری کی زد میں آ جائیں گے۔ میں تو مر جاؤں گا لیکن اب تم قانون کے ہاتھوں سے بچ نہیں سکتے۔ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ کیا مجرم قانون کے ہاتھوں سے کبھی بچا ہے جو تم بچ جاؤ گے......؟"

"اس حرام زادے کو جیل میں لے جا کر ڈال دو۔" سورج گرجا اور اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ سینے میں سانس پھولنے لگی۔

پھر میں نے جیسے چینل بدل دیا۔ منوہر مسلسل روئے جا رہا تھا۔ چپ ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ سروجنی کا غصے سے برا حال ہو رہا تھا۔ ادھر بچے کا بھوک سے برا حال تھا اور پھر وہ سروجنی کی شکل دیکھ کر بھی روئے جا رہا تھا۔ سروجنی کے دل میں آیا کہ اسے اٹھا کر فرش پر پٹخ دے۔ پھر اس کا گلا دبا دے۔ اس سے پہلے کہ وہ منوہر کو اٹھا کر فرش پر پٹختی میں نے اسے کرن کا بہروپ دے دیا۔ منوہر نے اسے جیسے ہی ماں کے روپ میں دیکھا ایک دم سے اس نے رونا موقوف کر دیا۔ پھر وہ اس کے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے توتلی زبان میں بولا۔ "ماں! دودھ......"

سروجنی ایک دم سے اس کا رونا بند ہوتا دیکھ کر حیران ہوئی۔ مزید حیرت بچے کے ماں کہنے پر ہوئی تھی۔ پھر وہ اسے چارپائی پر پھینک کر بولی تو اس کی آواز بھی کرن جیسی ہی تھی۔ "تو ادھر بیٹھ...... میں تیرے لئے دودھ لے کر آتی ہوں۔"

پھر وہ گرم گرم کھولتا ہوا دودھ ایک بڑے گلاس میں ساڑی کے پلو سے پکڑ کر تھوڑی دیر میں باورچی خانے سے لے کر آئی۔ گلاس اس کی طرف بڑھا دیا۔ منوہر نے دودھ کا گلاس ننھے ننھے ہاتھوں میں اس طرح تھام لیا جیسے وہ ٹھنڈا ہو۔ سروجنی نے اس میں چینی نہیں ڈالی تھی بلکہ اس میں نمک ڈال دیا تا کہ دودھ زہر آلود بن جائے۔ منوہر پی نہ سکے۔ تھوڑا پینے سے بھی وہ مر سکتا تھا۔ دودھ پیٹ میں جاتے ہی پھٹ جاتا۔ سروجنی یہ دیکھ کر بھونچکی ہو گئی کہ منوہر نے بڑے مزے سے سارا دودھ اس طرح پی لیا جیسے یہ ٹھنڈا اور میٹھا ہو۔ ایک ہی سانس میں اس نے سارا دودھ پی لیا تھا۔ کیوں کہ وہ بہت بھوکا ہو رہا تھا۔

سروجنی یہ سمجھی کہ گلاس شاید ٹھنڈا ہو چکا ہے۔ جب اس نے منوہر کے ہاتھ سے خالی گلاس لیا تو اس کے ہاتھ میں آتے ہی انگارہ بن گیا اور ہاتھ جھلس گیا اور گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گرا تو ایک چھناکا ہوا اور اس کی کرچیاں بکھر گئیں۔

سروجنی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ اس نے دوڑ کر کمرے سے باہر آ کر اپنا ہاتھ ٹھنڈے پانی میں ڈال دیا اس کی جلن ایسی تھی کہ کم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ وہ بری طرح تڑپ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ یہ انسان کا بچہ ہے یا شیطان کا......

میں نے سروجنی کو ایسی سزا دی تھی کہ وہ کبھی نہیں بھول سکتی تھی لیکن اسے اور سخت ترین سزا دینی تھی ابھی اس کا وقت نہیں آیا تھا۔ اس نے دودھ میں نمک سمجھ کر جو ملایا تھا اصل میں وہ نمک نہیں شکر تھی۔ شکر

اسے نمک لگا تھا۔ منوہر نے جیسے ہی گلاس دونوں ہاتھوں سے تھاما میں نے گلاس اور دودھ کو فوراً ہی ٹھنڈا کر دیا تھا۔ اس لئے وہ مزے مزے لے کر پی گیا تھا۔ سروجنی نہ صرف اس کا ہاتھ اور منہ جلا دینا چاہتی تھی بلکہ اسے مار بھی دینا چاہتی تھی۔ میں نے منوہر کی نظروں کو ایسا کر دیا تھا کہ سروجنی اسے ماں کی طرح دکھائی دیتی رہے اور وہ بہلا رہے۔ سروجنی کیا کسی کو بھی وہ کرن نہیں دکھائی دیتی۔

پھر مجھے سورج کی جیل کا خیال آیا جس میں کچھ لوگ قید تھے اور اس میں گوتم کو لے جا کر بند کر دیا گیا تھا۔ میں نے جیل کا چینل لگایا تو جیل کا منظر میرے سامنے تھا۔ ایک بڑا سا کمرہ تھا جو ایک گھر کے تہہ خانے میں بنا ہوا تھا۔ اس میں گوتم کو بھی لے جا کر قید کیا ہوا تھا۔ دوسرے قیدی جو تھے وہ بھوک سے نڈھال پڑے تھے۔ ان کے لئے پینے کا پانی بھی موجود نہیں تھا۔ انہیں دن میں صرف دوپہر کے وقت کھانا دیا جاتا تھا۔ کھانے میں باسی روٹی، چاول اور دال دی جاتی تھی جو کئی دن کی باسی ہوتی تھی۔ وہ جان بلب ہو رہے تھے۔ ان میں اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ اپنی جگہ سے ہل سکیں۔ اس وقت سورج اور اس کے تمام ساتھی مرغن کھانے کھا رہے تھے اور شراب سے بھی شغل کر رہے تھے۔ کھانے کی میز پر بڑا ہی پرتکلف کھانا چنا ہوا تھا۔ جیل میں اس وقت گوتم کا بھی بھوک پیاس سے برا حال ہو رہا تھا۔

ان کی حالت بڑی قابل رحم تھی۔ مجھ سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ اس وقت باورچی خانے میں وہ پہرے دار تھا جو ان کے لئے کھانے لے جاتا تھا۔ اس نے ایک بہت بڑی ٹرے میں بدمزہ، بدبودار اور باسی کھانا اور ایک جگ میں پانی رکھا۔ پھر اسے اٹھا کر جیل میں پہنچ گیا۔ اس کمرے میں رکھ کر دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ گوتم نے اس پہرے دار کی چاپیں سن کر آنکھیں کھولیں اور بند کر لی تھیں۔ اس کے جانے کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں۔ اس نے ٹرے کی طرف دیکھا تو اسے یقین نہ آیا۔ اس ٹرے میں کیا کچھ موجود نہ تھا۔ اس نے ایک گلاس اٹھایا جس میں دوا سی بھری ہوئی تھی اس کے جی میں جانے کیا آیا کہ اس نے ایک چمچ یہ دوا ہر قیدی کے منہ میں ڈال دی پھر وہ خود بھی پی گیا جس نے اس کے سارے بدن میں ایک توانائی اور جان سی پھونک دی تھی۔ اس کی ساری تھکن اور نڈھال پن یک لخت دور ہو گیا۔

چند لمحوں کے بعد وہ سب ایک ایک کر کے اٹھ بیٹھے۔ اب وہ جاں بلب نہ تھے۔ اپنے اندر ایک نئی طاقت اور توانائی محسوس کر رہے تھے۔ انہوں نے ٹرے کی طرف دیکھا تو انہیں یقین نہیں آیا۔ آج جو کھانا آیا تھا وہ خواب میں بھی نہیں آیا تھا۔ کھانے کی مقدار دس بارہ آدمیوں کے لئے بھی بہت تھی۔ وہ سب کھانے پر ٹوٹ پڑے لیکن آپس میں چھینا جھپٹی نہیں کی۔ کیوں کہ کھانا بہت سارا تھا۔ اس کے علاوہ پانی اور دودھ بھی اتنا تھا کہ پیٹ بھر کے پیا۔ خوب سیر ہو کر کھایا تھا۔ اب وہ سب اپنے آپ کو تازہ دم اور بڑا جاندار محسوس کر رہے تھے۔ دوسری طرف کھاتے ہوئے حیران بھی تھے کہ سورج نے آخر کس لئے ان پر اتنی مہربانی کی۔

یہ وہی کھانا تھا جو سورج اور اس کے ساتھی کھا رہے تھے اور میز پر چنا ہوا تھا۔ میز پر سے اس کی مقدار رفتہ رفتہ غیر محسوس انداز سے کم ہوتی ہوئی اس ٹرے میں آ گئی تھی۔ یہ بدبودار اور بے مزا کھانا جو لایا گیا تھا وہ غائب ہو گیا تھا۔ جب پہرہ دار برتن لینے آیا تو ان کی حالت دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ کیوں کہ

ٹرے ایک تو بالکل صاف تھی اور سارے قیدی چاق و چوبند، بے حد صحت مند اور تازہ دم دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی کمزوری غشی اور لاغرپن کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ وہ سمجھا کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہے۔ وہ انہیں آنکھیں مل مل کر دیکھنے لگا تو گوتم نے اس سے کہا۔ ”سجن یار! تم کتنے اچھے آدمی ہو...... کب سے قیدیوں کو ایسا پرتکلف کھانا دیا جانے لگا ہے۔ مچھلی بہت اچھی اور لذیذ تھی۔ یہ کھانے کون پکار ہا ہے؟ ہم لوگوں نے تو انگلیاں چاٹ لیں۔“

”مچھلی......؟ کیسی مچھلی......؟“ وہ ششدر ہو گیا۔ اس کا چہرہ اور آنکھیں سوالیہ نشان بن گئیں۔

”نہ صرف مچھلی بلکہ آلو کے کٹلس اور سبزی ترکاری، مونگ کی دال کی کھچڑی اور پودینہ کی چٹنی بھی خوب تھی۔“ گوتم نے کہا۔

”دودھ بھی تازہ تھا اور مکھن بھی......“ ایک قیدی بولا۔ ”میں نے پراٹھے ماش کی دال کے ساتھ کھائے تو جی خوش ہو گیا۔“

”چائے بھی بہت اچھی تھی۔“ دوسرے قیدی نے کہا۔ ”روزانہ ایسا کھانا مل جائے تو پھر کیا بات ہے۔“

پہرہ دار سمجھا کہ یہ لوگ پاگل ہو گئے ہیں اس لئے بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں وہ سر ہلاتا ہوا چلا گیا۔ ان قیدیوں میں سے کسی کو بھی یقین نہیں آیا تھا کہ انہیں اتنا اچھا، عمدہ اور لذیذ کھانا بھی دیا جا سکتا ہے؟ کہیں انہوں نے سپنا تو نہیں دیکھا تھا۔ ایک طرح سے بھوک سے سسکا سسکا کر مارا جا رہا تھا۔ ہر طرح کی اذیت بھی دی جا رہی تھی۔ ان پر تشدد بھی ہوتا تھا۔ ایذائیں دی جاتی تھیں۔ انہوں نے کئی بار پہرہ داروں سے سورج سے کہلوایا تھا کہ وہ اب مزید یہ ظلم و تشدد سہہ نہیں سکتے۔ انہیں گولی مار دی جائے۔ زہر دے دیا جائے۔ لیکن سورج نے اس کے جواب میں خود آ کر کہا تھا کہ وہ انہیں آسان موت سے ہم کنار نہیں کرے گا۔ لیکن آج جو کھانا دیا گیا تھا وہ کیوں اور کس لئے تھا۔ انہوں نے اپنے اپنے جسموں میں چٹکی لے کر دیکھ لیا تھا یہ سپنا نہیں تھا۔ انہیں پہلے جو تریاق دیا گیا تھا اس نے ایسی توانائی اور طاقت دی تھی جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ کھانے سے بھی وہ توانائی حاصل نہیں کر سکتے تھے جو اس تریاق سے ملی تھی۔ انہوں نے یہ بھی سوچا تھا کہ یہ سب کچھ گوتم کے کارن تو نہیں تھا۔

گوتم بھی حیران تھا اور سوچ سوچ کر چکرا رہا تھا کہ قیدیوں کو اتنا عمدہ، لذیذ اور وہ کھانا کیوں دیا گیا جو سورج اور اس کے ساتھی کھاتے ہیں اور پھر ایک شیشی میں تریاق جیسی دوا جو تھی اسے اس کے بارے میں یہ خیال کیوں کر اور کیسے آیا کہ اسے ان نیم جان قیدیوں کو پلانے سے ان میں جان پڑ جائے گی۔ کیا یہ تریاق سورج نے اس لئے بھیجا کہ ان قیدیوں کو نئی زندگی مل جائے؟ دفعتاً اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ سورج کہیں اس لئے تو ان قیدیوں کے ساتھ یہ سلوک کر رہا ہے کہ وہ صحت مند ہو جائیں تاکہ انہیں خون خوار کتوں کے آگے ڈال دیا جائے۔ سورج کو وحشیانہ اور درندگی کے کھیل بہت پسند تھے۔ وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔

میں نے ایک آہٹ اپنے عقب میں سنی تو میں نے فوراً ہی ٹی وی کا سوئچ آف کر دیا۔ اب وہاں

پانی کی سطح کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ پانی کی اسکرین تھی جس پر کوئی منظر نہیں تھا۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ ایک جوان اور خوبرو عورت میری طرف آ رہی تھی۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ قدرے نامناسب اور ایسے لباس میں تھی جو ایک عورت کو زیب نہیں دیتا ہے۔ ایک اچھی اور گھریلو عورت کو، ایک طرح سے یہ لباس مرد کے لئے مہلک ہتھیار تھا۔ وہ لچکتی، تھرکتی اور بجلیاں گراتی ہوئی میرے پاس آ کر رکی۔ پھر اس نے مجھے اپنی نظروں کی گرفت میں جکڑ لیا۔

”آپ کون ہیں اور یہاں کیا کر رہے ہیں؟“ اس نے اپنی پلکیں جھپکاتے ہوئے رسیلی آواز میں پوچھا۔

”دراصل میں ایک سیاح ہوں۔“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہیں مرکوز کر کے جواب دیا۔ ”اس جگہ حسین نظاروں کو دیکھنے آ گیا۔“

”اتنے حسین نظارے بھی نہیں ہیں کہ ایک مسافر یا کوئی اس طرف چلا آئے؟“ وہ بولی۔ ”یہ ایک ویران اور پرسکون جگہ ہے۔“

”کیوں نہیں ہے......؟“ میں نے اسے اپنی نظروں میں جذب کرتے ہوئے شوخی سے کہا۔ پھر میں نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ ”تم بھی تو ایک دل کش نظارہ ہو۔ سچ پوچھو...... میں نے اب تک ایسا حسین نظارہ نہیں دیکھا۔“

”اچھا۔“ وہ سرخ ہو گئی اور وہ میرے قریب آ گئی۔ ”آپ سیاح کم شاعر زیادہ معلوم ہوتے ہیں؟“

”ہاں...... جب ایک شخص کسی حسین، جوان اور دلکش عورت کو دیکھتا ہے تو وہ شاعر ہو جاتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم میرے اتنے قریب نہ آؤ؟“

”وہ کس لئے......؟“ اس نے ہنس کر مجھے پیاسی نظروں سے دیکھا۔ ”کیا میں کوئی چڑیل ہوں جو آپ میرے قریب آنے سے ڈر رہے ہیں؟“

”اس لئے کہ میں بھسم نہ ہو جاؤں۔“ میں نے کہا۔ ”کون کیا ہے؟ اس کا ظاہر و باطن کیا ہے؟ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن تم ایک آتش فشاں محسوس ہو رہی ہو جو اندر سے دہک رہا ہے اور کسی بھی لمحے پھٹ سکتا ہے۔ وہ پھٹ گیا تو پھر میرا کیا ہو گا۔“

”نہیں...... نہیں...... ایسا نہیں ہو گا۔ آپ بھسم نہیں ہوں گے۔“ وہ یکایک کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ”آپ کسی بات کی چنتا نہ کریں۔“

”اچھا آپ یہ بتائیں کہ آپ کے کیا ارادے ہیں......؟“ میرے کہنے سے پہلے وہ دوبارہ بول اٹھی۔ ”کیا آپ آگے جائیں گے؟“

”تمہیں دیکھ کر میں سب کچھ بھول گیا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”دماغ پر نشہ بن پڑے ہی چھا رہا ہے۔ جب میں یہاں آیا ہوں تو قرب و جوار میں جاؤں گا۔ اس مندر کو بھی اندر سے دیکھوں گا جو بہت بڑا ہے۔ اتنا بڑا مندر اب تک میں نے اس علاقے میں نہیں دیکھا۔ اس کالے مندر کی عمارت بتا رہی ہے

کہ یہ بہت ہی قدیم ہے...... ایک بات تو بتاؤ کہ تم یہاں اکیلی کیا کر رہی ہو؟ جب کہ یہاں آس پاس اور دور تک کوئی آبادی اور بستی دکھائی نہیں دے رہی ہے۔"

"آپ بڑے رنگین مزاج ہیں۔" وہ ہنسی۔ اس کی ہنسی خاموش فضا میں جل ترنگ کی طرح کھنک گئی۔ اس نے مجھے نشیلی نظروں سے دیکھا اور بولی۔ "میں اس مندر میں جوگن بن کر اپنی زندگی گزار رہی ہوں۔ میرا گھر اس مندر کے احاطے میں ہے۔ تین میل پر یہاں سے مشرق کی سمت ایک گاؤں ہے۔ لوگ وہاں سے اس مندر میں کسی کسی دن پوجا پاٹ کرنے اور پرساد چڑھانے آتے ہیں۔"

"لیکن تمہیں یہاں ایک ہرنی کی طرح اکیلی گھومتے پھرتے کوئی ڈر اور خوف محسوس نہیں ہوتا؟" میں نے پوچھا۔

"کس بات کا ڈر اور خوف......؟" اس کے حسین چہرے پر ایک گہرا استعجاب سا چھا گیا۔

"اس لئے کہ یہ سارا علاقہ جنگل ہے۔" میں بولا۔ "کوئی درندہ، بھیڑیا شکار کی تلاش میں آ سکتا ہے۔"

"یہاں سے دس میل دور گھنا جنگل ہے۔" وہ کہنے لگی۔ "اب تک کوئی درندہ یا بھیڑیا ادھر نہیں آیا۔ دراصل اس جنگل کے اندر اتنا شکار ہے کہ اس طرف کوئی درندہ نہیں آتا ہے۔ دراصل یہ جنگل میسور کے جنگل سے جا ملتا ہے۔"

"لیکن انسان ایک بھیڑیے سے کم نہیں ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ تمہیں شکار کر سکتا ہے۔ وہ سب سے خطرناک ہوتا ہے۔"

"ابھی تک ایسا کوئی اتفاق تو نہیں ہوا۔" وہ ہنس کر بولی۔ "آپ کہتے تو سچ ہیں۔ لیکن مجھے اس حالت میں دیکھ کر کوئی بہک نہیں سکتا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "عورت کی جوانی اور شباب ایسی چیز ہے کہ ایک آدمی اپنے جذبات پر قابو نہیں پا سکتا۔"

"ایسا ہو سکتا ہے اور اس وقت بھی ہو رہا ہے۔" اس نے شوخ نظروں سے دیکھا۔ "آپ تو بہکے نہیں ہیں۔"

"اس لئے کہ مجھے عورتوں سے کبھی دلچسپی نہیں رہی ہے۔" میں نے کہا۔ "آدمی کا ایک بار پیر پھسل جاتا ہے تو پھر وہ ایسی غلاظت کے دلدل میں جا گرتا ہے کہ پھر وہ کبھی نہیں نکل سکتا۔ جتنا نکلنے کی کوشش کرتا ہے اتنا ہی دھنستا چلا جاتا ہے۔"

"آپ واقعی بڑے نیک اور اچھے آدمی ہیں۔" وہ کہنے لگی۔ "میں نے آپ سے جو کہا وہ غلط تھا کہ...... کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا۔ دو تین مرتبہ ایسا اتفاق ہو چکا ہے۔ دو تین بھیڑیے صفت مردوں نے مجھ سے اس ویرانے میں فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ بھگوان نے بڑی کرپا کی۔ میں نے کسی نہ کسی طرح اپنی عزت بچالی۔ مجھ پر کوئی آنچ نہیں آئی۔ میں نے انہیں ایسا سبق دیا کہ وہ بھولے نہ ہوں گے۔ اب وہ اپنی زندگی میں کسی لڑکی کی عزت سے کبھی کھیل نہیں سکتے۔"

"لیکن اس کے باوجود تم اس لباس اور اس حالت میں کیوں نکلتی ہو۔" میں نے کہا۔ "کیا تم نے ان واقعات سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا؟"

"اب مجھے اپنے آپ پر اعتماد ہو گیا ہے۔" وہ بولی۔ "مجھے بھیڑیا صفت مردوں سے اپنی عزت بچانے کی تدبیر آ گئی ہے۔"

"اس کے باوجود کسی خوش فہمی کا شکار نہ رہو۔" میں نے کہا۔ "کسی نہ کسی دن شکار ہو جاؤ گی اور ساری زندگی پچھتاؤ گی۔"

"اچھا اب ان باتوں کو رہنے دیں اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔" وہ بولی۔ "آپ میرے غریب خانے پر چلیں۔"

"وہ کس لئے......؟" میں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"اس لئے کہ آپ مہمان ہیں۔" اس نے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "یہاں جو بھی آتا ہے اس کی خاطر مدارت کی جاتی ہے۔ اس علاقے کی برسوں کی ریت ہے کہ مہمان کی سیوا کئے بغیر اسے جانے نہیں دیا جاتا ہے۔" اس نے میرا بازو تھام لیا۔ "چلئے......"

"شریمتی جی!" میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تم مجھے جانے کی اجازت دو۔ تم مجھے جانے دو۔ یہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔"

"کیا آپ کو میرے غریب خانے پر جاتے ہوئے کوئی ڈر اور خوف محسوس ہو رہا ہے؟" وہ حیرت سے بولی۔

"ہاں......" میں نے اثباتی انداز میں سر ہلایا۔ "تم نے خوب انداز لگایا اور محسوس کیا۔"

"میرے گھر جانے سے آپ ڈر کیوں رہے ہیں؟" وہ ہنس کر بولی۔ "کیا میں آپ کو کھا جاؤں گی؟"

"تم کھا تو نہیں جاؤ گی...... کھا بھی کیسے سکتی ہو۔" میں نے کہا۔ "تم کوئی بدروح یا چڑیل تھوڑی ہو۔"

"جب میں کوئی بلا نہیں ہوں تو پھر آپ میرے ہاں جانے سے کس لئے پریشان اور خوف زدہ ہو رہے ہیں؟" وہ پلکیں جھپکا کر بولی۔

"مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ کہیں میرا پیر پھسل نہ جائے۔" میں نے کہا۔

"نہیں...... نہیں...... ایسا نہیں ہوگا۔" وہ تکرار کے انداز میں بولی۔ "آپ بہت شریف آدمی ہیں۔ اس لئے تو گھر لے جا رہی ہوں۔"

"بہک جانے میں اس کا تعلق شرافت سے نہیں ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ انسانی جذبات ہیں جنہیں شیطان ورغلاتا اور برائی کی طرف اکساتا ہے اور پھر تم جس ہوش ربا حالت میں ہو وہ کب تک مجھے بے حس رکھ سکتی ہے۔ آخر میں بھی انسان ہوں۔"

"میں گھر چل کر ایسا لباس پہن لیتی ہوں کہ شیطان بھی آپ کو بہکا نہ سکے گا۔" اس نے پھر میرا ہاتھ تھام لیا۔ "اب تو چلیں۔"

اس کے ہاتھ کے لمس نے مجھے بری طرح سن سنا دیا تھا۔ وہ انگارہ تھا۔ دہکتا ہوا انگارہ...... چند لمحوں کے بعد ہم مندر کے احاطے میں داخل ہوئے۔ یہ احاطہ بہت بڑا تھا۔ کوئی دو ہزار کے رقبے پر ہوگا۔ اس میں گھنے، بوڑھے اور قدیم پیپل کے درخت تھے۔ کچھ درختوں کے نیچے اتنے بڑے چبوترے بنے ہوئے تھے کہ سات آٹھ افراد آسانی سے بیٹھ سکتے تھے۔ مندر کے داخلی دروازے کے باہر برگد کے بھی بوڑھے درخت تھے۔ ان کے سائے بھی بہت گھنے تھے۔ ان کے نیچے تو اتنے لمبے چوڑے چبوترے تھے کہ چار چار آدمی لیٹ اور سو سکتے تھے۔ یہاں بڑا فرحت بخش سکون تھا۔ خوش گوار ہوا نے موسم اور سہانا کر دیا تھا۔

اس احاطے کے ایک کونے میں بہت بڑا مکان بنا ہوا تھا جس کی چھت کھپریلوں کی تھی۔ اس میں تین چار کمرے بظاہر معلوم ہوتے تھے۔ لیکن وہ کل دس بڑے بڑے کمروں پر مشتمل تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا کر اس سے کہا۔

''اس درخت کے نیچے میں چبوترے پر بیٹھ جاتا ہوں یہاں بہت اچھی ہوا چل رہی ہے۔'' میں چبوترے پر بیٹھ گیا۔

''تھوڑی دیر بعد آپ اور میں یہاں آ کر بیٹھ جاتے ہیں......'' اس نے پھر میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''چلئے...... جلدی سے اندر چلئے۔''

ایسا لگ رہا تھا کہ وہ مجھ پر مہربان ہونے کے لئے مری جا رہی ہے اور میری سیوا کرنے کے لئے بے چین ہو رہی ہے۔ شاید اس لئے کہ میں ایک شریف آدمی تھا۔ اسے میری ذات سے کوئی خطرہ، ڈر اور خوف نہیں تھا۔

''تھوڑی دیر بعد کیوں......؟ ابھی کیوں نہیں ہوئی؟'' میں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''اس لئے کہ سورج اور اس کے آدمی تھوڑی دیر میں یہاں سے گزرنے والے ہیں۔'' اس نے تشویش سے جواب دیا۔

''یہ سورج کون ہے......؟'' میں نے انجان بن کر پوچھا۔ ''وہ یہاں سے کیوں گزرنے لگا؟''

''کیا آپ سورج کے بارے میں نہیں جانتے ہیں......؟'' اس کا لہجہ تحیر زدہ تھا۔ ''اس کے بارے میں کسی سے کچھ سنا نہیں؟''

''میں بالکل بھی نہیں جانتا کہ یہ سورج کیا چیز ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اس لئے کہ میں سیاح ہوں۔ مجھے یہاں آئے صرف دو دن ہوئے ہیں۔ میں بنگلور سے الور کا میلہ دیکھنے گیا تھا۔ آج واپس جاتے ہوئے اتفاق سے یہاں آ نکلا...... سورج سے ڈرنے اور چھپنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا تمہیں ڈر اور خوف ہے کہ وہ تمہاری عزت کا دشمن نہ بن جائے۔''

''سورج اس علاقے کا بہت ہی خطرناک اور بے رحم ڈاکو ہے۔'' وہ کہنے لگی۔ ''یہ سارا علاقہ اس کا ہے۔ یعنی وہ اسے اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔ کسی کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ اس کے علاقے میں اس کی اجازت کے بغیر کوئی قدم رکھے۔ پولیس اور فوج کئی مرتبہ اسے گرفتار کرنے آئی بھی تھی لیکن وہ اسے گرفتار

نہ کر سکی۔ سورج نے ان کے کئی آدمی سلا دیئے۔ وہ مندر سے آگے جا نہ سکے۔ اس کا جو ٹھکانہ ہے وہ یہاں سے تین میل پر ہے۔''

''کیا وہ مجھے دیکھ لے گا تو زندہ نہیں چھوڑے گا......؟'' میں نے مصنوعی حیرت سے کہا۔ ''اس سے تمہاری ذات کو بھی خطرہ ہے۔''

''ہاں......'' وہ اپنا سر ہلا کر کہنے لگی۔ ''وہ آپ کو گرفتار کر کے لے جائے گا اور اپنی جیل میں ڈال دے گا یا پھر گولی مار دے گا...... میں آج تک اس کی اور اس کے کسی ساتھی کی نظروں میں نہیں آئی ہوں۔ اگر میں آ گئی تو میری اور میری عزت کی خیر نہ ہوگی۔ وہ حسین لڑکیوں کا بڑا رسیا ہے۔

میں اس کے ساتھ گھر میں داخل ہو گیا۔ جس کمرے میں مجھے لے کر آئی تھی وہ کمرہ ہال نما تھا۔ اس میں ایک طرف قالین بچھا ہوا تھا۔ دوسری طرف بہت بڑی مسہری تھی۔ اس نے مجھے مسہری پر بٹھا کر یہ کہہ کر چلی گئی کہ وہ کپڑے بدل کر آ رہی ہے۔ سامنے ایک کمرہ تھا۔ اس کمرے میں گھس کر اس نے دروازہ بند کر لیا۔ دوسرے لمحے مجھے اس کمرے میں باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ صاف اور واضح نہیں تھیں۔ سرگوشی میں باتیں ہو رہی تھی۔

وہ کس سے باتیں کر رہی ہوگی......؟ میں نے سوچا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ اکیلی اس مکان میں رہتی ہے۔ ایک حسین اور جوان لڑکی کا اتنے بڑے مکان میں رہنا تعجب خیز بات تھی اور پھر اس نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ جوگن بن گئی ہے۔ لیکن جوگن کا ایسا لباس نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی وہ ایسی حالت میں ہوتی ہے۔ یہ کیا چکر چلا رکھا ہے اس نے......

وہ تھوڑی دیر بعد کمرے سے باہر آئی۔ وہ لباس تبدیل نہیں کرتی تو زیادہ بہتر ہوتا۔ کیوں کہ جو لباس وہ پہن کر آئی تھی اس لباس کے مقابلے میں اور بھی نامناسب اور خطرناک تھا۔ وہ شاید میرا امتحان لینے پر تلی ہوئی تھی۔ وہ میرے پاس آ کر بولی۔ ''میں آپ کے لئے تازہ پھلوں کا رس بنا کر لے آتی ہوں۔ آج کل آم کا موسم ہے۔''

پھر وہ میرے جواب کا انتظار کئے بغیر سامنے والے کمرے کا دروازہ کھول کر غڑاپ سے گھس گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک بڑے گلاس میں جو کانچ کا تھا آم کا رس لے آئی۔ وہ گلاس میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''آپ یہ پئیں...... میں اپنا گلاس لیتی آؤں......'' اتنا کہہ کر وہ چلی گئی۔

اس نے مجھے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ میں اس سے یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ تم جس کمرے میں کپڑے تبدیل کرنے گئی تھیں وہاں کس سے باتیں کر رہی تھیں اور پھر یہ کیسا لباس پہن کر آئی ہو۔ کیوں اور کس لئے...... جبکہ تم نے کہا تھا کہ مناسب لباس پہنوں گی۔

میں نے اس آم کے رس بھرے گلاس پر منتر پڑھ کر پھونک ماری تو ایک دم سے اس کی رنگت بدل گئی۔ وہ انسانی خون تھا۔ آم کا رس نہیں تھا اور پھر دوسرے لمحے دو انسانی آنکھیں اس کی سطح پر ابھریں...... وہ کہنے لگی۔ ''مجھے بچاؤ......''

آنکھوں کی زبان ہوتی ہے لیکن ان کی کوئی آواز نہیں ہوتی ہے۔ وہ جب کہنے پر آتی ہیں تو ایک پل میں اتنا کچھ کہہ جاتی ہیں کہ کئی گھنٹوں میں بھی کوئی نہیں کہہ پاتا۔ آج پہلی بار میں نے انسانی آنکھوں کو بولتے سنا تھا۔ وہ آنکھیں زندہ تھیں، متحرک تھیں، بول رہی تھیں...... یہ ناقابل یقین بات تھی۔ ان آنکھوں کی آواز اتنی ہلکی، اتنی مدھم تھی کہ صرف مجھے ہی سنائی دی اور سنائی دے سکتی تھی۔ کمرے میں یا میرے قریب کوئی اور بھی ہوتا تو اسے میرے سوا آواز سنائی نہیں دیتی۔ یہ جملہ اس کے پلے نہیں پڑتا۔

”تم فکر نہ کرو...... میں تمہیں بچالوں گا۔“ میں نے ان آنکھوں میں جھانکتے ہوئے دلاسا دیا۔

”آپ کی بڑی کرپا ہوگی۔“ اس کی آواز میں التجا بھری تھی۔ ”میں آپ کی یہ دیا کبھی نہیں بھولوں گی۔“

”لیکن تم ہو کون......؟“ میں نے پوچھا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”میں ایک بدنصیب عورت ہوں۔“ اس نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ ”میرا نام درشنا ہے۔“

”تمہاری آنکھیں اس شربت کے گلاس میں کیسے آگئیں؟“ میرے لہجے میں حیرت تھی۔ ”کیا تمہاری آنکھیں نکال دی گئیں؟“

”روپا نے مجھے صرف آنکھیں بنا کر رکھ دیا۔“ آنکھوں نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ ”پھر اس نے مجھے شربت میں ملا دیا تاکہ مجھے آپ پی جائیں۔ اگر آپ منتر پڑھ کر شربت کے گلاس پر نہ پھونکتے تو میں آنکھوں کی صورت میں ظاہر نہ ہو پاتی۔ آپ مجھے پی جاتے اور میرا جیون بھی ختم ہو جاتا۔“

”یہ ذلیل روپا کون ہے......؟“ میں نے سوال کیا۔ ”کہاں رہتی ہے؟“

”یہ ایک جادوگرنی ہے۔“ آنکھوں نے جواب دیا۔ ”اس کالے مندر میں رہتی ہے۔ یہ رمنا جادوگر کی شاگرد ہے۔ آلہ کار ہے۔ اسے رمنا جادوگر نے یہاں اس لئے رکھ چھوڑا ہے کہ کوئی بھی سورج ڈاکو اور اس کے علاقے میں داخل نہ ہو سکے۔“

”لیکن اس روپا جادوگرنی نے تمہارے ساتھ کیا کیا؟“ میں نے پوچھا۔ ”اس نے تمہیں کس مصیبت میں ڈال دیا ہے؟“

”یہ رمنا جادوگر اور روپا جادوگرنی دونوں ایک ہی فطرت اور مزاج کے ہیں۔“ وہ بولی۔ ”روپا حسین اور جوان لڑکیوں کو شکار کرتی ہے۔ کیوں کہ رمنا جادوگر کی عورت بہت بڑی کمزوری ہے۔ وہ رمنا جادوگر کو پیش کر دیتی ہے اور رمنا جادوگر مردوں کو شکار کر کے اس کے پاس بھیج دیتا ہے یا پھر وہ خود شکار کرتی ہے۔ جب تک مردوں سے اس کا جی نہیں بھر جاتا وہ اس وقت تک انہیں جادو کے زور پر کھلونا بنائے رکھتی ہے۔ پھر اس کا سارا خون جسم سے نکال کر ایک بہت بڑے مرتبان میں جمع کرتی ہے۔ تاکہ اسے پیا جائے۔ اسے سو آدمیوں کے خون کی ضرورت ہے۔ رمنا جادوگر کا کہنا ہے کہ جب تک وہ سو آدمیوں کا خون نہ پی لے اس وقت تک وہ مہان جادوگرنی نہیں بن سکتی وہ چالیس آدمیوں کا خون جمع کر چکی ہے۔ میرا پتی رام داس بہت خوب صورت اور پرکشش شخصیت کا مالک ہے۔“ اس نے کچھ دیر توقف کیا تاکہ سانس لے سکے۔

”ایک دن میرا پتی ادھر شکار کے لئے آنکلا۔ روپا نے اسے اپنے جال میں پھانس لیا۔ جب اسے

گئے ہوئے دو دن ہو گئے اور وہ واپس گھر نہ آیا تو مجھے بڑی پریشانی اور تشویش سی ہوئی۔ میں نے ایک دو دن تلاش کیا لیکن وہ کہیں نہ ملا۔ پھر میں ایک روز گاؤں کے سادھو مہاراج کے پاس گئی جن کی کٹیا تالاب کے پاس ہے۔ وہ اس میں دس برسوں سے رہ رہے ہیں۔ جب میں ان کے پاس گئی تو انہوں نے مجھے روپا اور رمنا جادوگر کے بارے میں بتایا۔ انہوں نے روپا پر شک ظاہر کیا۔ لیکن کسی قسم کی مدد سے معذوری ظاہر کر دی۔ انہوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ میرا پتی کالے مندر کی کس کوٹھڑی میں قید ہوگا۔ کوئی ضروری نہیں کہ وہ اپنی اصل حالت میں ہو۔ روپا نے اسے پرندہ یا حیوان بنا رکھا ہوگا۔ وہ اگر کسی اور شکل وصورت میں ہو تو اس صورت میں واپس اپنی اصل حالت میں آسکتا ہے کہ روپا کا خون کر دیا جائے۔ لیکن اس کا خون کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ اس کے لئے بڑی ہوشیاری اور ذہانت کی ضرورت ہے۔ کیونکہ وہ اپنے دشمن کو معاف کرنا نہیں جانتی ہے۔ خصوصاً اپنے جانی دشمن کو وہ بڑی بے رحمی و بے دردی اور سفاکانہ اور ظالمانہ طریقے سے ختم کرتی ہے۔ میں اس دن اپنے پتی کی تلاش میں اکیلی ہی اس کالے مندر کی طرف چل پڑی۔ سادھو مہاراج نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ مندر کتنی دور اور کہاں پر واقع ہے۔ میرے پاس ایک تیز دھار خنجر تھا جسے میں نے کپڑوں میں چھپایا تھا۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ روپا کو قتل کئے بغیر نہیں رہوں گی۔ میں اپنے پتی سے بہت محبت کرتی ہوں۔ اس کے بنا اپنا جیون نہیں گزار سکتی۔ وہ میرا سب کچھ ہے۔ جب میں کالے مندر کی طرف جا رہی تھی تب سوچ رہی تھی کہ کیا میں اسے قتل کر سکوں گی۔ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ کوئی مجھے پرندہ یا مرغی ذبح کرنے کو کہے تو شاید نہ کر سکوں۔ لیکن میں اپنے پتی کو پانے کے لئے روپا کیا دس روپاؤں کو بھی قتل کر دوں گی۔ میرا سارا جسم نفرت اور غصے سے ابل رہا تھا۔ اسے کیا حق تھا کہ میرے پتی کو قیدی بنا لے۔

میں ابھی یہ سب کچھ سوچتی ہوئی جا رہی تھی کہ اچانک دو آدمی جھاڑیوں کے پیچھے سے نکل کر میرے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔ وہ اپنی وضع قطع اور چہرے مہرے سے ایک نمبری بدمعاش دکھائی دے رہے تھے اور ان کی لال لال آنکھوں میں بھوکے درندوں جیسی وحشیانہ چمک تھی...... وہ مجھے ان بھیڑیوں کی طرح دیکھنے لگے جیسے میں کچا گوشت ہوں۔

ان دونوں بدمعاشوں کو اس سناٹے اور ویرانے میں دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ رگوں میں لہو سرد ہونے لگا۔ لیکن میں نے جلد ہی خود پر قابو پا لیا۔ ان کے کیا ارادے ہیں۔ ان کے چہروں اور آنکھوں سے صاف ظاہر تھا۔ ”دل جانی! اس سمے اس طرف اکیلی کہاں جا رہی ہو؟“ ایک بدمعاش نے پوچھا۔ ”یہ راستہ تو جنگل کو جاتا ہے۔“

”میں کالے مندر کو جا رہی ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میرے راستے سے ہٹ جاؤ، مجھے جانے دو۔“

”کالے مندر......؟“ دوسرے بدمعاش نے حیرت سے کہا۔ ”کیا گاؤں میں مندر نہیں ہے جو تم وہاں جا رہی ہو؟“

”میں وہاں پوجا پاٹ کرنے جا رہی ہوں۔“ میں نے تنک کر کہا۔ ”میری مرضی، میں کہیں بھی جا کر پوجا پاٹ کروں۔“

”مگر وہ مندر تو برسوں سے ویران اور سنسان پڑا ہوا ہے۔“ پہلے بدمعاش نے کہا۔ ”وہاں نہ کوئی پجاری ہے اور نہ ہی پنڈت...... صرف کچھ مورتیاں ہیں۔ یہ بھی سنا ہے کہ سانپ اور ناگوں نے اسے اپنا ڈیرا بنا لیا ہے۔“

”میں جانتی ہوں...... بتانے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے غصے سے کہا۔ ”ہٹ جاؤ۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔“

”سنورانی!“ دوسرا بدمعاش تمسخرانہ انداز سے بولا۔ ”وہاں جا کر کیوں وقت برباد کرو گی، تم کتنی سندر اور جوان ہو...... تم خود ایک مندر ہو۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم اپنے دل کے مندر میں ہمیں پوجا کرنے دو۔ ہمارے ساتھ دو گھڑی پریم کی گزار کر چلی جانا...... اگر تم سوچتی ہو کہ بھاگ کر ہمارے ہاتھوں سے بچ جاؤ گی تو یہ تمہاری بھول ہے۔“

اس وقت مجھے اپنا چاقو یاد آیا۔ وہی میرا محافظ تھا اور میری عزت بھی بچا سکتا تھا۔ لیکن اس کے لئے مجھے ہوشیاری اور ذہانت سے کام لینا تھا۔ ان دونوں بدمعاشوں پر قابو پانے کے لئے اور پھر یہ دونوں نہتے بھی تھے۔ تاہم میں نے حوصلے سے کام لیا اور ان سے کہا۔

”تم لوگ ٹھیک کہتے ہو، میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ تم دونوں کی بات مان لوں۔“

”یہ کی تم نے عقل مندی کی بات......“ پہلا بدمعاش خوش ہو گیا۔ ”تم خوب صورت ہی نہیں ذہین اور سمجھ دار بھی ہو۔“

”لیکن میری ایک شرط ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ پوری کرنے کی صورت میں ہی تم دونوں کی ہر بات مان سکتی ہوں۔“

”میری جان کیا شرط ہے تمہاری......؟“ دوسرے بدمعاش نے تجسس بھرے لہجے میں پوچھا۔

”میں نہ صرف ایک شریف عورت ہوں بلکہ کسی کی بیوی ہوں اور اس کے گھر کی عزت بھی ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”تم کہنا کیا چاہتی ہو......؟“ پہلے بدمعاش نے کہا۔ ”میں تمہاری بات سمجھا نہیں۔“

”ایک عورت کے لئے یہ ویرانہ اور کھلی جگہ کسی بھی لحاظ سے مناسب نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے یہاں لاج آئے گی۔ اس لئے میں چاہتی ہوں کہ مجھے کسی کوٹھڑی یا گھر میں کسی ایسی جگہ لے چلو جہاں ہمیں کوئی دیکھ نہ سکے۔“

”تمہاری شرط اور بات بڑی معقول ہے۔“ دوسرا بدمعاش بولا۔ ”وہ سامنے والے کھیت کے پاس ایک کوٹھڑی بنی ہوئی ہے جس میں کسان اپنا سامان رکھتے ہیں۔ آج کھیت پر کام کرنے کوئی نہیں آیا ہے۔ چلو وہیں چلتے ہیں۔ کوٹھڑی کافی بڑی ہے۔“ میں ان کے ساتھ خاموشی سے چل پڑی۔ چلتے چلتے میں نے ان دونوں کو بے وقوف بنانے اور اعتماد میں لینے کے خیال سے کہا۔

”مجھے اس بات سے بڑی خوشی ہو رہی ہے کہ تم دونوں بہت خوب صورت، جوان اور مضبوط جسم

کے اور دراز قد بھی ہو...... میرے سپنے کے راجہ کی طرح...... خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا کہ مجھے راج کمار مل جائیں گے۔“

”کیا تمہارا پتی خوب صورت اور جوان نہیں ہے......؟“ پہلے بدمعاش نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں......“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

”اب تم دنیا کی خوش نصیب ترین عورت ہو۔“ پہلے بدمعاش نے چلتے چلتے میری کمر میں ہاتھ ڈال کر مجھے قریب کر لیا۔ ”تم کسی بات کی چنتا نہ کرو۔ ہم تمہیں ایسی محبت دیں گے جو تم ساری زندگی بھول نہ سکو گی۔ ہماری محبت ہماری یاد دلاتی رہے گی۔“

تھوڑی دیر بعد ہم اس کوٹھڑی کے پاس پہنچ کر رک گئے جو کھیت کے پاس ایک گھنے درخت کے نیچے تھا۔ یہ کوئی عام قسم کی کوٹھڑی نہ تھی۔ خاصی بڑی اور مضبوط قسم کی بھی تھی۔ اس کا دروازہ بھی بڑی مضبوط لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ باہر سے کنڈی لگی ہوئی تھی لیکن اس میں کوئی تالا نہ تھا۔ پہلے بدمعاش نے کنڈی کھولی اور کوٹھڑی میں گھس گیا۔ اس کے پیچھے ہم دونوں تھے۔

کوٹھڑی میں ایک چارپائی ایک طرف رکھی ہوئی تھی ایک طرف خالی بوریوں کا ڈھیر تھا اور اس کے ساتھ ہی گھاس کا ڈھیر پڑا تھا۔ اس پر ایک لاٹھی رکھی ہوئی تھی۔ پہلے بدمعاش نے مجھے دبوچنا چاہا تو میں نے اسے ایک طرف دھکیل دیا۔

”سنو...... میں نے تم سے کیا کہا تھا۔ تم دونوں باہر نکلو۔ تھوڑی دیر بعد تم دونوں آپس میں طے کر کے پہلے کوئی ایک آئے۔“

میری بات سنتے ہی دونوں باہر نکل گئے۔ دروازے کے اندر ایک چٹخنی لگی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد پہلا بدمعاش مونچھوں پر تاؤ دیتا مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا۔

جس وقت وہ دروازے کی چٹخنی لگا کر گھوما تو بھونچکا سا ہو کر رہ گیا۔ بری طرح اچھل پڑا اس کی آنکھیں خوف و دہشت پھیل گئیں۔ میرے ہاتھ میں ایک خوف ناک قسم کا کھلا چاقو دیکھ کر اس پر جیسے بجلی سی آگری تھی۔ ”یہ کیا مذاق ہے......؟“ وہ ہکلایا۔ ”اسے ایک طرف پھینک دو۔ میرا دوست باہر کھڑا ہے...... تم کچھ نہیں کر سکتیں؟“

”یہ مذاق نہیں ہے کمینے...... لٹیرے۔“ میں نے نفرت اور حقارت بھرے لہجے میں کہا۔ ”یہ میرا محافظ ہے۔ ہر عورت اپنی عزت کی حفاظت کے لئے ہتھیار رکھتی ہے۔ کوئی نہ کوئی ہتھیار۔ لٹیروں اور درندوں کو یہ بات معلوم نہیں ہوتی ہے۔“

”میں کہتا ہوں کہ تم یہ چاقو پھینک دو۔“ اس نے کرخت لہجے میں کہا۔ ”اس سے کچھ نہیں ہوگا...... تم نہیں جانتیں۔ میں کتنا بڑا بدمعاش ہوں۔“

”نہیں......“ میں نے بھی سخت لہجے میں کہا اور ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ ”یہ تمہاری موت کا فرشتہ ہے...... تم بڑے بدمعاش ہو یا چھوٹے بدمعاش میرے لئے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں تمہیں

بخشوں گی نہیں۔"

وہ مجھ سے چاقو چھیننے اور دبوچنے کے لئے برق سرعت سے جھپٹا۔ میں پہلے ہی سے ہوشیار اور چوکنا تھی۔ میں نے چاقو اس کے پیٹ میں پوری قوت سے گھسیڑ دیا...... اس کی انتڑیاں باہر آگئیں۔ وہ ایسا بھونچکا ہوا کہ اس کے منہ سے آواز بھی نہیں نکلی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی انتڑیاں پکڑلیں اور لڑکھڑاتا ہوا دو قدم چلا۔ پھر فرش پر گر کر بے ہوش ہوگیا۔

اس کے زخم سے لہو جو ابل رہا تھا وہ فرش پر پھیلنے لگا۔ فرش سرخ اوڑھنی کی طرح لگ رہا تھا۔ میں نے چاقو کا پھل اس کے کپڑوں سے صاف کیا اور اسے بند کر کے کپڑوں میں چھپالیا۔ پھر میں نے لپک کر وہ لاٹھی اٹھائی جو گھاس کے ڈھیر پر رکھی ہوئی تھی۔ اس کا ساتھی دروازہ بری طرح پیٹنے لگا۔ "یار رامو! دروازہ جلدی سے کھول۔ میرا باہر کھڑا رہنا ٹھیک نہیں۔"

میں دروازے پر لاٹھی لے کر پہنچی۔ یہ لاٹھی اس لئے رکھی ہوئی تھی کہ سور جو کھیت میں گھس آتے تھے انہیں مارا اور بھگایا جاسکے۔ میں نے چٹخنی گرادی لیکن دروازہ پوری طرح نہیں کھولا۔ میں دروازے کے ایک پٹ کے پیچھے کھڑی ہوگئی اور لاٹھی کے ایک سرے کو مضبوطی سے پکڑلیا۔ دوسرے لمحے وہ دروازے کے دونوں پٹ کھول کر اندر آگیا اور ایک دم سے ٹھٹک کر رک گیا۔

وہ اپنے ساتھی کی خون میں لت پت لاش کو دیکھ رہا تھا۔ حیرت اور خوف کی حالت میں۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا اور مجھے متلاشی نظروں سے دیکھتا، میں نے اس کی کھوپڑی بجادی۔ دوسرے لمحے وہ بھی لڑکھڑاتا ہوا بے ہوش ہوکر اپنے دوست کی لاش پر گر پڑا۔

میں نے وہاں ایک لمحے کے لئے بھی رکنا اور اپنے کارنامے کا جائزہ لینا پسند نہیں کیا۔ جتنا جلد ہوسکے یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی آجائے یا مجھے کوٹھڑی سے نکلتا دیکھ لے۔ میں نے کوٹھڑی سے باہر آکر اس کا دروازہ بند کیا اور کنڈی لگادی۔ پھر چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ کسی سمت مجھے کوئی بھی دور دور تک دکھائی نہ دیا۔ پھر میں تیزی سے چل پڑی۔

اس واقعے نے ایک طرح سے مجھے لرزادیا تھا کہ اگر میری عزت بدمعاشوں کی بھینٹ چڑھ جاتی تو کتنا برا ہوتا۔ بھگوان نے مجھے ان درندوں کے ہاتھوں سے بچالیا تھا۔ میں نے حوصلے اور تدبیر سے کام نہ لیا ہوتا تو مجھے کامیابی نہ ہوتی۔ لیکن دوسری طرف اس کارنامے نے میرا حوصلہ بڑھادیا تھا۔ اب میں پارو کو بہ آسانی قتل کرسکتی تھی۔ اب کوئی مشکل نہ تھی۔

دو گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد جب میں کالے مندر کے قریب پہنچی تو بے حد تھک چکی تھی۔ ستانے اور پانی پینے کی غرض سے میں تالاب کے کنارے پہنچی۔ پہلے میں نے پانی پیا۔ پھر منہ دھویا اور گھاس پر لیٹ گئی۔ چند لمحوں کے بعد میری آنکھ لگ گئی۔ کسی نے میرا شانہ پکڑ کر ہلایا۔ میں بیدار ہوگئی۔ دیکھا کہ ایک ساٹھ برس کی خوب صورت اور صحت مند عورت مجھ پر جھکی ہوئی ہے۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

اس بوڑھی عورت نے مجھ سے بڑے پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔

"بیٹی...... تم کون ہو؟ کہاں سے اور کس لئے یہاں آئی ہو؟ پریشان بھی دکھائی دیتی ہو۔"

"میں ایک بدنصیب عورت ہوں اور اپنے پتی کی تلاش میں یہاں آئی ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"تمہارا پتی......؟" اس کے چہرے پر استعجاب سا چھا گیا۔ "وہ یہاں کس لئے آیا تھا؟"

"وہ شکار کے لئے ادھر آنکلا تو روپا جادوگرنی نے اسے اغوا کر کے قیدی بنالیا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"لیکن تم اپنے پتی کو روپا جادوگرنی کی قید سے کیسے رہائی دلاؤ گی؟" بڑھیا نے پوچھا۔

"کیا میں اسے رہائی نہیں دلاسکتی؟" میں نے جواب دیا۔ "میں کسی نہ کسی طرح اسے رہائی دلا کر رہوں گی۔"

"اس لئے کہ وہ جادوگرنی ہے۔" بڑھیا بولی۔ "عام قسم کی جادوگرنی نہیں ہے وہ۔ بڑی خطرناک ہے۔ جب کہ تم اس کے مقابلے میں ایک عام قسم کی عورت ہو۔ تم جادوگرنی ہوتیں تو شاید اس سے مقابلہ کرلیتیں۔"

"میں ایک عام عورت ہوں اور جادو وغیرہ نہیں جانتی ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں اسے جان سے ختم کرسکتی ہوں۔"

"لیکن تم اسے کیسے جان سے ماردوگی؟" بڑھیا نے متعجب لہجے میں پوچھا۔ "تمہارے پاس کیا ایسی کوئی چیز ہے؟"

"میں اسے قتل کرنے کے لئے...... چاقو لے کر آئی ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ پھر مجھے اچانک خیال آیا تو میں نے پوچھا۔ "آپ ہیں کون؟ آپ یہاں کیا کررہی ہیں؟ آپ یہ سب کچھ مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہیں؟"

"میں بھی اپنے بیٹے کی تلاش میں یہاں آئی ہوں۔" اس نے بتایا۔ "میرے خوب صورت اور جوان بیٹے کو اس نے جادو کے زور سے قید کر کے رکھا ہوا ہے۔ اس مندر کی کسی کوٹھڑی میں اسے قید کیا ہوا ہے۔ اچھا ہوا تم مل گئیں۔ چلو...... ہم دونوں چل کر انہیں تلاش کرتے ہیں۔ تم اپنے پتی کو تلاش کرنا اور میں اپنے بیٹے کو...... وہ مل گئی تو ہم دونوں مل کر اس کا گلا دبادیں گے۔"

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے لیے مندر کی عمارت کے اندر داخل ہوگئی۔ دائیں اور بائیں جانب بہت ساری کوٹھڑیاں اور کمرے تھے۔ ان کے دروازے بند تھے۔ جب وہ مجھے ایک بہت بڑی کوٹھڑی کے اندر لے کر گھسی تو تب بھی اس نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھاما ہوا تھا۔ اس کا ہاتھ دیکھتے ہی میں بڑے زور سے چونکی۔ پھر میں نے اس کی جلد اور چہرہ دیکھا۔ یہ ہاتھ، جلد اور چہرہ ایک ساٹھ برس کی عمر کی عورت کا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ بیس بائیس برس کی عورت کا تھا۔ صرف سر کے بال سفید براق تھے۔

یک بیک مجھے احساس ہوا کہ یہ روپا جادوگرنی ہے اور اس نے مجھے فریب دینے کے لئے بڑھیا کا روپ دھار لیا ہے۔ مجھے دیر ہوچکی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ غیر محسوس انداز سے چھڑایا اور

جاتو تکنے لگی۔ اس نے دیکھ لیا اور مجھ پر کوئی منتر پڑھ کر پھونکا تو میں ایک دم سے اپنی جگہ ساکت و جامد ہوگئی۔ مجھ میں جنبش تک کرنے کی سکت نہیں رہی۔ دوسرے لمحے وہ اپنی اصلی حالت میں آگئی۔ پھر اس نے استہزائی لہجے میں کہا۔ ''آج تک کوئی بھی روپا کو نیچا نہیں دکھا سکا۔ مار نہیں سکا۔ جو بھی میری جان لینے آیا۔ میں نے اسے ختم کردیا اور احمق عورت! تو مجھ سے ٹکر لینے آئی تھی...... اونہہ...... تو ہے کیا چیز! میں تجھے چیونٹی کی طرح مسل دوں گی۔''

میرا خیال تھا کہ اس نے مجھے پتھر کا بت بنا دیا ہے۔ لیکن ایسا نہ تھا۔ اس نے میرا سارا جسم سن اور ساکت و جامد کردیا تھا تاکہ میں اس پر حملہ نہ کرسکوں۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ میں سن اور بول سکتی ہوں۔ اب مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا کہ میں نے اس بڑھیا پر وشواس کیوں کیا۔ اسے سب کچھ بتا کیوں دیا؟ اس کے فریب میں کیوں آگئی۔ جب کہ سادھو مہاراج نے مجھے صاف طور پر بتا دیا تھا کہ روپا مجھے کسی بھی بہروپ میں مل سکتی ہے۔ یہ بات میرے ذہن سے نکل گئی تھی۔ پھر میں نے ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں سوچا کہ اب میں بے بس اور لاچار ہوں۔ اس سے لڑ نہیں سکتی بہتر ہے کہ میں نرمی اور خوشامد سے کام لوں۔ اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔ اس لئے میں نے کہا۔

''روپا بہن! مجھے معاف کردو...... پتی کی جدائی کے غم اور غصے نے مجھے اندھا کردیا تھا۔''

''تمہیں معاف کردوں؟ نہیں...... نہیں...... ایسا نہیں ہوگا۔ تمہیں اس کی بہت بڑی سزا ملے گی۔''

''روپا بہن!'' میں نے بڑی لجاجت سے کہا۔ ''میں اپنے پتی سے اور پتی مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ ہم ایک دن ایک دوسرے سے جدا نہیں رہ سکتے۔ تم میرا پتی مجھے دے دو۔ میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔''

''کیا کہا......؟'' وہ قہقہہ مار کر بڑے زور سے ہنسی۔ ''تمہارا پتی تم سے بہت محبت کرتا ہے؟ تم جھوٹ بول رہی ہو؟''

''یہ جھوٹ نہیں بلکہ سچ ہے......'' میں نے تکرار کی۔ ''تم کیا جانو کہ ہم آپس میں کتنی محبت کرتے ہیں۔''

''تمہارے پاس اس محبت کا کیا ثبوت ہے؟'' اس نے میرے قریب آکر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''ثبوت......؟'' میں نے جواب دیا۔ ''تم میری محبت کی ثبوت چاہتی ہو تو مجھے میرے پتی کے پاس لے چلو......''

''ٹھیک ہے......'' روپا نے اثبات کے انداز میں سر ہلایا۔ ''میں تمہیں لئے چلتی ہوں۔ ایک شرط پر......''

''کیا شرط ہے تمہاری......؟'' میں نے ساکت پلکوں سے اسے گھورا۔ ''میں تمہاری دس شرطیں ماننے کو تیار ہوں۔''

''دس نہیں...... صرف ایک ہی شرط ہے۔ ایک پوری کردو۔'' روپا نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''اگر تمہارے پتی نے یہ کہہ دیا کہ وہ تم سے محبت نہیں کرتا ہے اور نہ ہی تمہارے ساتھ جانے پر تیار ہے پھر تم

جس طرح آئی ہو اسی طرح واپس چلی جاؤ گی...... اپنے پتی کو اب بھول جاؤ گی۔ پھر کبھی بھی ادھر کا رخ نہیں کرو گی۔''

''مجھے منظور ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اگر اس نے میرے ساتھ چلنے پر آمادگی ظاہر کردی تو تم روکو گی نہیں......''

پھر وہ مجھے ایک بڑے کمرے میں لے آئی۔ جس میں ایک بڑی سی مسہری تھی۔ اس پر بڑا صاف ستھرا اور گداز بستر بچھا ہوا تھا۔ تکیے اور گاؤ تکیے بھی تھے۔ سرہانے جو میز تھی اس پر ایک بہت بڑا شمع دان رکھا ہوا تھا۔ ایک طرف بہت بڑا تخت رکھا تھا جس پر سات مرد بیٹھے چوسر کھیل رہے تھے۔ ان میں میرا پتی بھی تھا۔ ان سب نے دروازہ کھلنے کی آواز سن کر ہماری طرف دیکھا اور پھر چوسر کھیلنے میں مصروف ہوگئے۔ یہ دیکھ کر میرے دکھ اور حیرت کی انتہا نہ رہی۔ میرے پتی نے مجھے دیکھا اور مجھے نظر انداز کردیا۔ اس نے میری کوئی پروا نہیں کی۔ ''جگدیش...... جگدیش......!'' میں نے کمرے کے وسط میں کھڑے ہوکر اسے پکارا۔ جگدیش نے اپنا نام سن کر میری طرف بے یقینی سی نظروں سے دیکھا۔ ''کون ہو تم......!'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

''جگدیش...... میں ہوں...... تمہاری پتنی درشنا...... میں تمہیں ساتھ لے جانے آئی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''کون...... تم میری پتنی......؟'' وہ حیرت سے بولا۔ ''نہیں...... تم میری پتنی نہیں ہو۔ میری پتنی روپا ہے۔''

''یہ تمہیں کیا ہوگیا ہے جگدیش......!'' میں نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ ''تم مجھے بھول گئے ہو۔ اپنی پتنی کو جسے تم سب سے زیادہ چاہتے ہو...... پریم کرتے ہو...... ہم تین برس سے ایک دوسرے کے جیون ساتھی ہیں۔''

جگدیش نے میری بات کا جواب نہیں دیا تو روپا نے اس سے کہا۔ ''جگدیش! ادھر آؤ۔ میرے پاس آؤ۔''

جگدیش کھیل چھوڑ کر تخت سے اترا۔ اس کے ساتھ اور جو بھی مرد تخت پر بیٹھے تھے وہ بھی جوان، خوب صورت اور گبرو تھے۔ وہ ہم دونوں کے سامنے آکھڑا ہوا تو میں اس کی طرف بڑھی۔ ''جگدیش...... میرے جگدیش......''

جگدیش نے مجھے بری طرح جھڑک دیا۔ اس بری طرح دھکا دیا کہ میں اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی۔ فرش پر گر کر بکھر گئی۔ جگدیش اور روپا اور تخت پر بیٹھے مرد زور سے ہنسنے اور تالیاں بجانے لگے۔

''بے وقوف عورت!'' جگدیش نے کہا۔ ''پارو ہم سب کی پتنی ہے اور ہم سب اس کے پتی ہیں۔''

پھر روپا جگدیش کی طرف بڑھی۔ جگدیش نے اسے اپنے بازوؤں میں بھرلیا۔ پھر وہ روپا کے چہرے پر جھک گیا۔ دوسرے لمحے وہ دونوں دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہوگئے۔ روپا نے مجھے جلانے کے لئے یہ حرکت کی تھی۔

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ رگوں میں لہوا بلنے لگا۔ میں سمجھ گئی کہ میرا پتی اور دوسرے تمام مرد بھی روپا کے جادو کے زیر اثر ہیں۔ اس لئے جگدیش نے مجھے پہچاننے اور مجھے اپنی پتنی ماننے سے انکار کردیا۔ وہ دونوں چوں کہ جذباتی کیفیت میں کھو گئے تھے اس لئے میرے لئے یہ سنہرا موقع تھا کہ میں اس سے فائدہ اٹھاؤں اور روپا کی پشت میں چاقو گھونپ دوں۔ میں نے چاقو نکالا اور اس کی پشت پر بے آواز قدموں سے پہنچی۔ میں نے چاقو کا دستہ مضبوطی سے پکڑلیا۔ پھر سارے جسم کی طاقت جمع کی۔ پھر پوری طاقت کو استعمال میں لاتے ہوئے چاقو اس کی پیٹھ میں گھونپ دیا۔ روپا کی پشت دیکھنے میں تو گوشت پوست کی تھی لیکن وہ فولاد سے کہیں سخت تھی۔ چاقو اس کی پشت میں خاک پیوست ہوتا۔ اس کا پھل ٹوٹ گیا مجھے ایسا لگا چاقو فولاد کی چادر سے ٹکرایا ہو۔ روپا دوسرے لمحے میرے پتی سے الگ ہو کر میری طرف گھوم گئی۔ پھر وہ تمسخر سے بولی۔ ''آخر تم نے مجھے جان سے مارنے کی کوشش کی نا؟ آخر تم نے کمینگی دکھائی نا......؟''

''میں اور کیا کرتی......'' میں نے کہا۔ ''تم نے جادو کے زور پر میرے پتی کو چھین لیا......کوئی عورت یہ برداشت نہیں کرسکتی کہ کوئی اس کا گھر اجاڑ دے۔ تم نے پیار و محبت سے بھرا گھر اجاڑ کر اچھا نہیں کیا......کاش! تم میرے ہاتھوں مر جاؤ۔''

''اگر تم مجھے جان سے مارنے کی کوشش نہ کرتیں تو میں تمہیں جانے دیتی۔'' روپا غصے سے بولی۔ ''لیکن اب میں ایسا نہیں کروں گی۔ میں تم سے انتقام لوں گی۔ تمہیں ایسی سخت سزا دوں گی کہ تم سوچ بھی نہیں سکتی ہو۔''

پھر وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کھینچتی ہوئی دوسرے کمرے میں لے گئی۔ اس کمرے میں ایک بہت بڑا مرتبان خون سے بھرا ہوا تھا۔ اس مرتبان میں میں نے دس بارہ آنکھیں دیکھیں جو مچھلیوں کی طرح تیر رہی تھیں۔ یہ انسانی آنکھیں تھیں۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ یہ عورتوں کی آنکھیں ہیں۔ یہ آنکھیں بولتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ چوں کہ مرتبان بند تھا اس لئے ان کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

''یہ آنکھیں نہیں ہیں بلکہ چھ عورتیں ہیں۔ جنہیں میں نے آنکھیں بنا کر اس مرتبان میں بند کردیا ہے۔'' روپا کہنے لگی۔ ''یہ ان عورتوں کی آنکھیں ہیں جن کے پتی تمہارے پتی کے ساتھ چوسر کھیل رہے تھے۔ یہ بھی تمہاری طرح اپنے پتی کی تلاش میں آئی تھیں اور میری جان لینے پر تلی ہوئی تھیں......تم دیکھ رہی ہو نا یہ مرتبان خون سے بھرا ہوا ہے۔ یہ جانوروں کا نہیں بلکہ انسانوں کا خون ہے۔ میں نے آج ہی فیصلہ کیا کہ ان آنکھوں کو شربت میں ملا کر مردوں کو پلا دوں۔ پھر جب مرد شربت پئیں گے انہیں پتا بھی نہیں چلے گا کہ انہوں نے عورتوں کی آنکھیں پی ہیں۔ اس طرح تم اور باقی دوسری عورتیں موت سے ہم کنار ہو جائیں گی۔''

پھر اس نے کوئی منتر پڑھ کر مجھ پر پھونکا تو میں چند لمحوں میں آنکھیں بنی فرش پر پڑی تھی۔ پھر اس نے مجھے فرش سے اٹھا کر مرتبان میں ڈال دیا۔ پھر وہ چلی گئی۔ آج اس نے آپ کو دینے کے لئے شربت بنایا تو سب سے پہلے مجھے نکال کر آم کے شربت کے گلاس میں ڈال دیا اور پھر منتر پڑھ کر اس نے میری آنکھیں اس طرح کھول دیں کہ میں پینے والے کو نظر نہ آسکوں۔ آپ نے منتر پڑھ کر پھونکا تو پھر میں ظاہر

ہوگئی......آپ ہیں کون......؟''

ان آنکھوں نے جو کہانی سنائی اس میں خاصا وقت لگ گیا تھا۔ روپا یہ کہہ کر گئی تھی کہ وہ اپنے لئے آم کا شربت بنا کر لا رہی ہے۔ لیکن وہ اب تک لے کر نہیں آئی تھی۔ میں نے شربت کے گلاس میں سے ان آنکھوں کو نکال کر فرش پر رکھا۔ پھر اس پر منتر پڑھ کر پھونکا۔ دوسرے لمحے میری نظروں کے سامنے ایک خوبرو اور جوان عورت کھڑی تھی۔

اس نے مجھے حیرت بھری نظروں سے دیکھا۔ دوسرے لمحے اس کا چہرہ دمک اٹھا اور پھر اس کی آنکھوں سے خوف جھانکنے لگا۔ ''وہ کمینی آگئی تو بہت برا ہوگا۔'' درشنا نے کہا۔ ''وہ آپ کو نقصان پہنچائے گی۔ چلیں جلدی سے کہیں چھپ جائیں۔''

''تم اس کی کوئی فکر نہ کرو۔'' میں نے اسے دلاسا دیا۔ ''اس سے ڈرنے اور خوف زدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

''کیا آپ بھی کوئی مہان جادوگر ہیں......؟'' درشنا نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں......'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''وہ میرے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔''

''پھر تو آپ میرے پتی کو اس کے جادو کے اثر سے نکال دیں۔'' وہ بولی۔ ''میں چاہتی ہوں کہ میرا پتی مجھے مل جائے۔''

''نہ صرف تمہیں تمہارا پتی مل جائے گا بلکہ ان عورتوں کو بھی جنہیں اس نے آنکھیں بنا کر رکھا ہوا ہے۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

''وہ کمینی ادھر آتی ہوگی۔'' درشنا نے ایک دم سے گھبرا کر کہا۔ ''اس نے مجھے اس حالت میں دیکھ لیا تو ہم دونوں کی شامت آجائے گی۔ وہ پھر سے مجھے آنکھیں بنا دے گی یا جان سے مار دے گی۔ شاید آپ کو بھی زندہ نہ چھوڑے۔''

''میں نے کہا نا کہ وہ ہم دونوں میں سے کسی کا بال تک بیکا نہیں کرسکتی۔'' میں نے کہا۔ ''جب تم اس کی چاپیں سنو تو ایک طرف کونے میں خاموش کھڑی ہو جانا۔ کوئی آواز نہیں نکالنا۔ صرف تماشا دیکھتی رہنا۔''

''کیا وہ مجھے اپنی اصلی حالت میں دیکھ کر حیران نہیں رہ جائے گی......؟'' درشنا بولی۔ ''پھر غصے میں آکر جانے کیا کرے؟''

''نہیں......'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہ تو وہ حیران ہوگی اور نہ تمہارے خلاف کچھ کرسکے گی۔ کیونکہ تم اسے نظر نہیں آؤ گی۔''

''میں اسے نظر نہیں آؤں گی یہ کیسے ممکن ہے؟'' درشنا کے حسین چہرے پر گہرا استعجاب چھا گیا۔

''دنیا میں کیا چیز ممکن نہیں ہے......'' میں نے کہا۔ ''جب وہ تمہیں آنکھیں بنا سکتی ہے تو میں بھی اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال سکتا ہوں۔ میرے لئے یہ ایک معمولی سا جادو ہے۔ اسے تمہاری موجودگی کی کوئی

خبر نہ ہوگی۔"

قدموں کی چاپیں سنائی دیں تو میں نے اسے اشارہ کیا۔ وہ سرعت سے ایک کونے میں جا کھڑی ہوئی۔ میں نے شربت کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ خالی گلاس میز پر رکھ دیا۔ چند لمحوں کے بعد دروازہ کھلا اور وہ اپنے ہاتھ میں شربت کا گلاس لئے داخل ہوئی۔

"شریمتی جی! یہ آپ کہاں غائب ہوگئی تھیں؟" میں نے کہا۔ "آپ شربت لانے گئی تھیں یا امرت پانی...... اتنی دیر لگادی۔"

"مجھے ایک بہت ضروری کام یاد آگیا تھا۔" وہ ہنس کر بولی۔ "اس لئے مجھے اتنی دیر ہوگئی...... ہاں، آپ کو شربت کیسا لگا؟"

"شربت......؟ بہت زبردست تھا۔" میں نے کہا۔ "اتنا میٹھا، ایسا رس بھرا، لذیذ کہ میں نے کبھی زندگی میں نہیں پیا...... لیکن یہ شربت آم کا معلوم نہ ہوتا تھا۔ کیونکہ اس کا ذائقہ کسی اور ہی چیز کا لگا تھا۔"

"کس چیز کا لگا تھا......؟" اس نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔ "میں نے تو اسے آم سے بنایا تھا...... یہ آم کا شربت تھا۔"

"مجھے تو یہ رس بھرے ہونٹوں کا شربت لگا۔" میں نے شوخی سے کہا۔ "شاید اس لئے اتنا میٹھا تھا۔"

"یہ ان کا نہ تھا لیکن آپ کو ان کا شربت بھی پلادیں گے۔" وہ لجا کر اور شوخی سے بولی۔

"ابھی کسی شربت کی یا آم کے شربت کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "کیوں کہ یہ شربت پیتے ہی مجھے صرف آنکھیں ہی آنکھیں دکھائی دے رہی ہیں۔ بہت ہی خوب صورت اور بڑی بڑی آنکھیں...... کسی عورت کی آنکھیں۔ اب اجازت دیں۔"

"آنکھیں......؟" وہ انجان سی بن کر بولی۔ "میں نے اس میں کوئی بھنگ تھوڑی ملائی جو آپ کو آنکھیں دکھائی دے رہی ہیں۔"

"آپ نے کیا ملایا کیا نہیں ملایا...... یہ آپ جانتی ہیں۔" میں نے کہا۔ "اب مسافر کو جانے کی اجازت دیں۔"

"نہیں......" اس نے مجھے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "میں آپ کو جانے نہیں دوں گی۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ دو دن تک تو رہیں۔"

"میں یہاں دو دن رہ کر کیا تمہاری شکل دیکھتا رہوں۔" میں نے کہا۔ "میں مسافر ہوں۔ کہیں بھی دو ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں رکتا ہوں...... میں نے تمہیں بتایا کہ میں ایک سیاح ہوں۔ ابھی تو مجھے بہت دیکھنا ہے۔"

"عورت سے زیادہ حسین چیز دنیا میں اور کوئی نہیں ہے۔" وہ بولی۔ "میں دو دن تک آپ کی ایسی سیوا کروں گی کہ آپ یہاں دو مہینے رہنے پر مجبور ہو جائیں گے۔"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ تم کسی اپسرا سے کم نہیں ہو۔" میں نے کہا۔ "مگر میں ایسا شخص ہوں جو

عورتوں سے دور رہتا ہوں۔"

"آپ پہلے مرد ہیں جو میری محبت کو ٹھکرا رہے ہیں۔" وہ تحیر زدہ لہجے میں بولی۔ "کبھی ایسا نہیں ہوا۔ یہ میری تذلیل و توہین ہے۔ کوئی عورت سب کچھ برداشت کرسکتی ہے لیکن توہین و تذلیل نہیں......"

اس کے سینے میں سانسوں کا طلاطم ہچکولے کھانے لگا۔ "میرا جادو ایسا ہے کہ اس سے کوئی نہیں بچ سکتا اور نہ ہی کوئی بھی بچ سکا۔ آپ کیسے بچ جائیں گے۔"

"اگر تمہارے دل میں مجھ پر جادو چلا کر مجھے اسیر کرنے کی آرزو ہے تو اسے بھی پوری کر کے دیکھ لو۔" میں نے کہا۔

"میں تم کو اپنا ایسا جلوہ دکھاؤں گی کہ تم اپنے آپ کو قابو میں نہ رکھ سکو گے۔" وہ ہنس کر بولی۔ "تم جل کر خاکستر ہو جاؤ گے۔"

"سنو۔" میں نے اسے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ "لباس کو تم اپنے بدن پر ہی رہنے دو۔ اس میں تم بہت پیاری اور اچھی لگ رہی ہو۔ انسان اور حیوان میں یہی ایک فرق تو ہے جو اوپر والے نے قائم کر رکھا ہے۔ انسان کا اصل حسن اور اس کی زینت بس یہی ہے۔ انسان بے لباس ہو تو وہ حیوان سے بھی بدتر لگتا ہے۔ بہت بدصورت ہو جاتا ہے۔"

روپا نے اپنا لباس اتارنے کی کوشش کی لیکن اس میں وہ کامیاب نہ ہوسکی۔ جس نے اسے حیران کردیا۔ وہ بری طرح چکرا سی گئی۔ اس نے کتنی ہی کوششیں کیں، بڑا زور لگا دیا۔ وہ بڑبڑائی۔ "یہ کیا ہو رہا ہے۔ میرا لباس کیوں نہیں اتر رہا ہے۔"

"اس لئے کہ اوپر والے کو یہ بات پسند نہیں کہ ایک عورت ایک غیر مرد کے سامنے اپنے آپ کو بے حجاب کر کے اپنے آپ کو دنیا والوں کی نظروں میں گرالے۔ عورت کا ایک تقدس ہوتا ہے۔ اسے پامال نہ کیا جائے۔" میں نے کہا۔

"روشی...... مالا......" روپا نے دروازے کی طرف منہ کر کے زور زور سے پکارا۔ "جلدی سے ادھر آؤ۔ یہاں آؤ۔" چند لمحوں کے بعد دروازہ کھلا۔ دو انتہائی بدصورت عورتیں اندر داخل ہوئیں۔ وہ بدروحیں تھیں جو روپا کی تابع تھیں۔ درشنا ان کی صورتیں دیکھ کر ڈر گئی۔ لرز اور سہم گئی تھی۔ شاید اسے اب تک یہاں ان بدروحوں سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ "تم دونوں مل کر میرا لباس اتار دو۔" روپا نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "جانے کیوں میرے ہاتھ سے لباس نہیں اتر رہا ہے۔" ان دونوں نے روپا کے قریب جا کر اسے بے لباس کرنے کی بہت کوشش کی۔ کپڑا تھا کہ ان کے ہاتھ سے پھسل پھسل جاتا تھا۔ وہ بھی بڑی حیران اور پریشان تھیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ بڑی عجیب و غریب سی بات تھی۔

"ایسا کرو......" روپا نے ایک دم سے بھنا کر کہا۔ "میرے کپڑے پھاڑ دو۔ لباس تار تار کردو۔"

ان دونوں نے لباس تار تار کرنے کی کوشش کی۔ وہ اتنا سخت ہوگیا تھا جیسے لوہے سے بنا ہوا ہو۔ "روپا راجکماری جی!" ایک بدروح بولی۔ "مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ آپ کے لباس پر کسی نے جادو کردیا ہے؟"

"جادو......؟ میرے لباس پر کون جادو کر سکتا ہے؟" روپا نے تنک کر کہا۔

"ہو سکتا ہے کہ رمنا جی نے جادو کیا ہو......؟" دوسری بد روح نے جواب دیا۔

"رمنا جی کو میرے معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں اور نہ ہی انہوں نے کبھی دیا۔" روپا بولی۔ "وہ کس لئے میرے لباس پر جادو کر سکتے ہیں...... تمہاری بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی ہے۔"

"اس لئے کہ شاید انہیں پسند نہیں کہ آپ اس شخص کے ساتھ رنگ رلیاں منائیں۔" دوسری بد روح نے کہا۔

"یا تو پھر یہ ہو سکتا ہے کہ کسی نے رمنا جی کو آپ کے خلاف ورغلایا ہو۔" پہلی روح بولی۔

"ٹھیک ہے اب تم دونوں جاؤ۔" روپا بولی۔ "میں ابھی رمنا جی سے رابطہ کر کے معلوم کرتی ہوں۔"

ان دونوں روحوں کے جانے کے بعد روپا بھی کمرے سے نکلی اور اس نے دروازے کی باہر سے کنڈی لگا دی۔ روپا کے جانے کے چند لمحوں بعد درشنا نے میرے پاس آ کر پوچھا۔ "اب کیا ہوگا؟ وہ کمینی کہاں گئی ہے؟"

"وہ رمنا جادوگر سے موبائل فون پر رابطہ کرنے گئی ہوئی ہے۔" میں نے کہا۔ "رمنا جادوگر نے اسے ایک موبائل فون دے رکھا ہے۔ یہ جدید ترین دور میں ایک جادوئی کھلونا ہے۔ وہ رمنا جادوگر کو صورت حال سے آگاہ کرے گی۔"

"رمنا جادوگر......؟" درشنا بولی۔ "یہ تو بہت بڑا جادوگر ہے اور سورج ڈاکو کا گہرا دوست ہے۔ ان دونوں نے مل کر ہمارے اور آس پاس کے علاقے میں فتنہ و فساد اور دہشت گردی پھیلا رکھی ہے جس سے لوگوں کی زندگی عذاب ہو کر رہ گئی ہے۔"

"ہاں رمنا بہت بڑا اور خطرناک جادوگر ہے۔" میں نے اس کی تائید کی۔ "قانون کے محافظ اس کے اور سورج ڈاکو کے آگے بے بس ہو چکے ہیں۔"

"جب وہ رمنا جادوگر کو صورت حال سے آگاہ کرے گی تب کیا ہوگا؟" درشنا بولی۔ "کیا اسے پتا چل جائے گا کہ یہ آپ کے کارن ہوا ہے اور روپا کا جادو کچھ کام نہیں کر رہا ہے؟ تب سارا زلزلہ آپ کے سر پر گرے گا۔"

"اس کے فرشتوں کو بھی پتا نہیں چلے گا۔" میں نے کہا۔ "وہ بھی چکرا کر رہ جائے گا۔ اسے روپا کی بات کا یقین نہیں آئے گا۔"

"لیکن رمنا جادوگر تو بہت بڑا جادوگر ہے۔ اسے اس بات کی کیسے خبر نہیں ہو گی؟" درشنا نے تشویش سے کہا۔

"وہ یقیناً بہت بڑا جادوگر ہے لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں نے اسے دلاسا دیا۔ "بس خاموشی سے تماشا دیکھتی رہو۔"

"کیوں نہ ہم موقع سے فائدہ اٹھا کر نکل جائیں۔" درشنا نے کہا۔ "لیکن باہر نکلیں گے کیسے، وہ تو کنڈی لگا گئی ہے باہر سے......"

"ہم اس کمرے سے نکل جائیں گے لیکن مسئلہ یہ نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ کے پتی اور دوسرے قیدی مردوں اور عورتوں کو نجات دلانا ہے۔ روپا کو ایسی سزا دینی ہے کہ وہ اپنے جادو سے محروم ہو جائے تاکہ کسی کو ستا نہ سکے۔ تھوڑی دیر بعد وہ آئے گی اور مجھے اس کمرے میں لے جائے گی جس میں آپ کا پتی اور دوسرے لوگ موجود ہیں۔ آپ خاموشی سے ہمارے پیچھے چلی آئیں۔ بلا خوف و خطر...... کوئی بھی آپ کو دیکھ نہیں سکے گا۔"

تھوڑی دیر بعد روپا آئی تو وہ حیران اور پریشان تھی۔ کیوں کہ رمنا جادوگر بھی اس کی تسلی نہ کر سکا تھا اور نہ ہی اس کی کچھ سمجھ میں آیا تھا کہ یہ کیا چکر ہے۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہا۔ وہ مجھے اس کمرے میں لے آئی جہاں اس نے مردوں کو جادو کے زور پر قیدی اور اپنا تابع کر رکھا تھا۔ اس نے مجھے ایک دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ پھر وہ مجھ پر کچھ دیر تک منتر پڑھ کر پھونکتی رہی۔ میں بت بنا کھڑا رہا۔ اس کے چہرے پر نظریں مرکوز کئے اسے تکتا رہا۔

جب وہ مجھ پر منتر پڑھ کر پھونک چکی۔ تب اس نے سوال کیا۔ "اے مسافر! میں کون ہوں؟"

"تم ایک ڈائن ہو جو معصوم اور سیدھی اور حسین عورتوں کا گھر تباہ و برباد کرتی پھرتی ہو۔" میں نے جواب دیا۔

وہ میرا جواب سن کر بھونچکی ہو گئی۔ دوسرے ہی لمحے بولی۔ "یہ تم کیا بک رہے ہو؟ کیا میں تمہاری پتنی نہیں ہوں؟"

"میں نے جو کچھ کہا وہ بالکل سچ ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا تم نے مجھے پہچانا نہیں...... جو اول فول بک رہے ہو؟ میں روپا ہوں روپا...... تم آنند شرما ہو۔" وہ بولی۔

"تمہیں کیا تمہاری سات پشتوں کو پہچانتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم ششمیتا نامی عورت کی بدچلن بیٹی ہو۔ تمہاری ماں ایک بہت اچھی عورت تھی۔ لیکن رمنا جادوگر نے تمہیں غلط راستے پر ڈال دیا۔ تم بدکار عورت بن گئیں۔"

"یہ تمہارے اندر کون ہے چھپا ہوا جو بکواس کئے جا رہا ہے۔" روپا نے ایک لمحہ توقف کر کے منتر پڑھ کر پھونکا۔ پھر بولی۔ تم یہ کیسی باتیں کر رہے ہو۔ تم یہ بات سن لو مسافر! اب تم میرے غلام ہو۔ تم یہاں سے جا نہیں سکتے۔"

"میں کسی کا غلام نہیں ہوں۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "مجھے یہاں سے جانے سے کوئی روک نہیں سکتا؟"

"تم کیا تمہارا باپ بھی میرا غلام ہے۔" روپا خشونت بھرے لہجے میں بولی۔ "یہاں جو آیا وہ یہاں

سے کبھی واپس نہیں گیا۔ میں اسے اس وقت تک یہاں روکتی ہوں جب تک اس سے میرا دل نہیں بھر جاتا۔ جب دل بھر جاتا ہے تب میں اس کے خون سے مرتبان بھر دیتی ہوں۔ جادوگروں کے دیوتا کا کہنا ہے کہ میں سو آدمیوں کا خون جمع کر کے اس میں اشنان کروں گی تو میں دنیا کی سب سے بڑی جادوگرنی بن جاؤں گی...... میرے آگے رمنا جادوگر بھی کچھ نہیں ہوگا جو میرا گرو ہے بلکہ میں اس کی گرو بن جاؤں گی۔"

"تو نے اب بھی مجھے نہیں پہچانا؟" میں نے ترش لہجے میں کہا۔ "میں رمنا جادوگر کا بھی باپ ہوں...... وہ خون کا مرتبان کہاں ہے جس میں تو انسانوں کا خون جمع کرتی ہے اور جمع کر چکی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ انسانوں کا نہیں چوہوں کا خون ہو۔"

"تو رمنا جادوگر کا باپ ہے؟" روپا بڑے زور سے قہقہہ مار کر ہنسی۔ "میں تجھے وہ مرتبان ابھی دکھاتی ہوں جس میں انسانوں کا خون ہے چوہوں کا نہیں...... تجھے انسانوں اور حیوانوں کے خون کی تمیز ہے تو لے دیکھ اور پہچان لے۔"

روپا ملحق کمرے کے دروازے کی طرف بڑھی۔ اس کا خیال تھا کہ میں اس کے جادو کے زیر اثر آ کر بہکی بہکی باتیں کر رہا ہوں۔ صورت حال خاصی بدل گئی تھی۔ وہ مجھ پر مرمٹ چکی تھی۔ اس لئے مجھے بھی غلام بنانا چاہتی تھی۔ اپنا آلۂ کار بنا کر آلودہ کرنے کے لئے بے چین تھی۔ میں جلد سے جلد روپا کو سزا دے کر یہاں سے جانا چاہتا تھا کہ رمنا جادوگر اور سورج ڈاکو سے نمٹ سکوں۔

میں اور درشا اس کے پیچھے پیچھے اس کمرے میں گھس گئے۔ جس میں وہ مرتبان رکھا تھا جس میں وہ انسانی خون جمع کر رہی تھی۔ یہ اتنا بڑا مرتبان تھا کہ اس میں دو سو آدمیوں سے زیادہ کا خون با آسانی آ سکتا تھا۔ اس میں انسانی آنکھیں تیر رہی تھیں۔ مجھے اور درشا کو دیکھ کر وہ ساکت ہو گئیں اور ایک طرف ہو کر ہمیں دیکھنے لگیں۔ ان کی آنکھوں میں التجا بھری ہوئی تھی۔

"یہ کس کی آنکھیں ہیں روپا !" میں نے انجان بن کر پوچھا اور اس کی طرف گھوم گیا۔

"تم نے برابر کے کمرے میں جو مرد دیکھے نا یہ ان کی پتنیاں ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "میں نے انہیں آنکھیں بنا کر اس خون میں ڈال دیا۔ یہ اس خون کے دریا میں نہاتی، تیرتی اور گھومتی رہتی ہیں۔ زندگی کے دن پورے کر رہی ہیں۔"

"آخر تم نے ان پر یہ ظلم کیوں اور کس لئے کیا......؟" میں نے پوچھا۔ "ان کا جرم کیا ہے۔ یہ کس جرم کی سزا ہے۔"

"ان حرام زادیوں نے مجھے جان سے ختم کرنے کی کوشش کی تھی تاکہ اپنے پتیوں کو چھڑا کر لے جا سکیں۔" اس نے جواب دیا۔

"یہ بہت بڑا انیائے ہے۔ پاپ ہے۔" میں بولا۔ "تم ان بدنصیبوں کو رہا کیوں نہیں کر دیتی ہو؟"

"اس لئے کہ انہیں موت کی نیند سلانا ہے۔" وہ نخوت سے بولی۔ "میں نے کبھی اپنے دشمن کو معاف نہیں کیا انہیں کیوں معاف کروں۔"

"اگر تم انہیں رہا نہیں کرو گی تو میں رہا کر دوں گا۔" میں نے کہا۔ "یہ بڑی اذیت ناک سزا ہے۔"

"مرتبان سے ان آنکھوں کو نکالنا آسان نہیں ہے۔" وہ استہزائی لہجے میں کہنے لگی۔ "اس لئے کہ اس کا منہ میں نے جادو کے زور سے بند کیا ہوا ہے۔ اگر تم نے آنکھیں باہر نکال بھی دیں تو اس سے کیا حاصل...... وہ انسانی حالت میں کیسے آ سکیں گی؟"

"وہ انسانی حالت میں کیوں نہیں آ سکتیں؟" میں نے متعجب لہجے میں کہا۔ "کیا وہ باہر آتے ہی اپنی اصل حالت میں نہیں آ جائیں گی؟"

"اس لئے کہ جب تک میں ان پر منتر پڑھ کر نہیں پھونکوں گی اس وقت تک ایسا مشکل ہے۔" وہ بولی۔

"میں تم سے آخری بار کہہ رہا ہوں کہ ان بدنصیبوں کو مرتبان سے باہر نکالو...... ورنہ......" میرا لہجہ دھمکی آمیز تھا۔

"ورنہ کیا......؟" وہ تمسخرانہ لہجے میں بولی۔ "تم میرا کیا بگاڑ لو گے؟"

"دیکھو...... میں تمہارا کیا بگاڑ سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں وہ کچھ کر سکتا ہوں جس کا تم تصور تک نہیں کر سکتی ہو۔" پھر میں نے اس مرتبان کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ اس مرتبان کا ڈھکن کھل کر فضا میں بلند ہوا اور چھت سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا اور اس کی کرچیاں روپا پر بارش بن کر گریں۔ روپا نے جو یہ دیکھا تو وہ بھونچکی سی ہو گئی۔ اس کی آنکھیں خوف و دہشت سے پھٹ گئیں۔ اس پر سکتہ سا چھا گیا۔

پھر میرے دوسرے اشارے پر اس مرتبان میں سے ساری آنکھیں اچھل کر فرش پر گریں۔ پھر لوٹ پوٹ کر وہ انسانی شکل میں آ گئیں۔ اب چھ حسین اور جوان عورتیں کھڑی تھیں۔ پھر درشا بھی ظاہر ہو کر ان کے ساتھ آ کھڑی ہوئی۔

روپا نے سنبھل کر منتر پڑھنا شروع کیا تو میں نے کہا۔ "اب تم جادو اور منتروں سے بھی محروم ہو گئی ہو۔ اب تم ایک عام قسم کی عورت ہو۔ تمہارا گھناؤنا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ اب تم کسی کا بال تک بیکا نہیں کر سکتی ہو۔"

اس نے جانے جانے کیا کیا منتر پڑھے۔ پھر اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ اپنا منتر اور سارا جادو بھول چکی ہے۔ پھر اس نے گریبان سے موبائل نکالا تاکہ رمنا جادوگر سے رابطہ کر کے اسے صورت حال سے آگاہ کرے لیکن وہ پتھر کا ایک ٹکڑا بن گیا۔

"تم ہو کون......؟" وہ مجھے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتی ہوئی ہذیانی لہجے میں بولی تو اس کی آواز حلق میں پھنس گئی۔

"میں ایک مہان جادوگر ہوں......" میں نے کہا۔ "جادوگروں کے استادوں کا استاد...... میں ایک سیاح کے بہروپ میں گلی گلی، نگر نگر، شہر شہر اور ملک ملک گھومتا رہتا ہوں تاکہ مظلوم اور ستائے ہوئے لوگوں کی مدد کروں۔ میں رمنا جادوگر اور سورج ڈاکو کی سرکوبی کے لئے جا رہا تھا کہ تم راستے میں آ گئیں...... چلو یہ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا کہ تمہارا بھانڈا پھوٹ گیا۔"

"لیکن تمہیں ان آنکھوں اور درشنا کے بارے میں کیوں کر اور کیسے معلوم ہوا......؟" وہ اٹک اٹک کر بولی۔

"تم جو مجھے آم کا شربت دے کر چلی گئی تھیں اس سے معلوم ہوا۔" میں نے جواب دیا۔ "مجھے اس میں سے انسانی خون کی بو محسوس ہوئی تو میں نے اپنا شک دور کرنے کے لئے اس پر منتر پڑھ کر پھونکا۔ شربت لال ہو گیا اور اس کی سطح پر درشنا کی آنکھیں ابھر آئیں...... پھر درشنا نے رام کہانی سنائی۔ جو بڑی دکھ بھری تھی۔ میں اسے انسانی شکل میں لے آیا۔ تم جب کمرے میں آئیں تو تمہاری نظروں کے سامنے ایسا پردہ کھینچ دیا کہ تم درشنا کو دیکھ نہ سکو۔

اور پھر تم نے اس کمرے میں آ کر بے لباس ہو کر مجھے مائل اور اسیر کرنے کی کوشش کی۔ جو میں نے ناکام بنا دی۔ تم لباس نہ اتار سکیں۔ ان بدروحوں نے بھی کوشش کی۔ تم نے رمنا جادوگر سے بھی رابطہ کیا۔ اس کی کھوپڑی میں بھی نہ آ سکا کہ ماجرا کیا ہے۔ اس نے اپنے موکل سے معلوم کرنے کی کوشش کی تو وہ بھی اسے بتا نہ سکا۔ میں تمہیں جان سے ختم نہیں کروں گا لیکن ایسی کڑی سزا دوں گا کہ تم برسوں تڑپ تڑپ کر مرو گی۔ ایک اذیت ناک سزا...... تمہیں میں آنکھیں بنا کر اس خون کے مرتبان میں ڈال رہا ہوں اور ساتھ میں کیڑے مکوڑے بھی تاکہ وہ ڈنک مارتے رہیں۔ یہ سزا اس لئے بھی ہے کہ تم نے بہت سے مردوں اور عورتوں کو قتل کیا، اس سزا کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔"

"نہیں...... نہیں...... تم ایسا نہیں کر سکتے......" وہ ہیجانی لہجے میں چیخی۔ "روشی...... مالا......"

"تمہاری یہ بدروحیں کچھ نہیں کر سکتیں کیونکہ میں نے انہیں پہلے ہی مندر کے ایک گہرے کھڈ میں بند کر دیا ہے۔" میں نے کہا۔

"رمنا جادوگر کو کسی نہ کسی طرح پتا چل جائے گا۔" وہ نفرت اور غصے سے بولی۔ "تم اس کے ہاتھوں سے بچ نہیں سکتے۔"

"یہ میں دیکھوں گا کہ وہ میرا کیا کچھ کر سکتا ہے؟" میں نے کہا۔ "اب تم سزا بھگتنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

وہ چیختی چلاتی اور گالیاں بکتی رہی۔ میں نے اسے دو آنکھیں بنا دیا۔ وہ فرش پر تڑپنے اور اچھلنے لگیں۔ پھر میں نے اس کی آنکھوں کو اٹھا کر خون کے مرتبان میں ڈال دیا۔ پھر باہر سے کیڑے مکوڑے لا کر انہیں خون کے مرتبان میں ڈال کر منتر پڑھ کر پھونکا تاکہ یہ کیڑے مکوڑے نہ مریں اور اسے ڈنک مارتے رہیں۔

پھر میں درشنا اور دوسری عورتوں کو اس کمرے میں آیا جہاں ان کے پتی موجود تھے۔ روپا کا جادو ختم ہو چکا تھا۔ اس لئے تمام مرد اس کے سحر سے نکل آئے اور اپنی اپنی پتنیوں کو دیکھ کر ان کی حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی۔ پھر وہ ان کی طرف والہانہ انداز سے بڑھے۔ پھر ان پر جذباتی کیفیت کچھ ایسی طاری ہوئی کہ پھر انہیں کسی بات کا کوئی ہوش نہیں رہا۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر کیف و رنگوں

کے جہاں سے میں کھو گئے۔ جب وہ الگ ہوئے تو ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ ان پر ایک عجب سی سرشاری طاری تھی۔ ایک دوسرے کو پھر سے پا کر ان کی مسرت و خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔

درشنا نے ان سب کو بتا دیا کہ میں ان کا نجات دہندہ ہوں۔ ان سب نے باری باری میرا شکریہ ادا کیا اور اپنے ہاں آنے کی دعوت دی اور اس وقت ساتھ چلنے کو کہا۔ میں نے انہیں مختصر طور پر بتایا کہ میں کس مشن پر آیا ہوا ہوں۔ پھر میں نے ان سے کہا کہ وہ اسے راستے سے روانہ ہو جائیں تاکہ سورج اور اس کے ساتھیوں سے مڈبھیڑ نہ ہو۔ پھر وہ سب مجھ سے گرم جوشی اور محبت سے مل کر رخصت ہوئے۔ میں اس قافلے کو جاتا ہوا اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گئے۔ میں اس آبادی کی طرف بڑھ گیا جو رمنا جادوگر کی تھی۔ اس سے دو دو ہاتھ کرنے اور کیفر کردار تک پہنچانے کے بعد میں سورج سے نمٹنا چاہتا تھا۔ سورج سے زیادہ خطرناک رمنا جادوگر تھا۔ اس کا قصہ پاک ہو جانا زیادہ بہتر تھا۔ اس لئے بھی کہ وہ سورج ڈاکو کا دایاں ہاتھ تھا۔ اس کے بل بوتے پر اس نے خون خرابہ، دہشت گردی اور لاقانونیت کو ہوا دے رکھا تھا۔ جب میں رمنا جادوگر کی آبادی کے قریب پہنچا تو مجھے دو مسلح بدمعاشوں نے ایک سمت سے آ کر بندوقوں پر روک لیا۔ وہ اپنی وضع قطع اور چہرے مہرے سے خطرناک قسم کے ڈاکو لگ رہے تھے۔ انہوں نے اپنے آپ کو خطرناک اور خوفناک بنانے کے لئے لمبی لمبی اور گھنی مونچھیں اور داڑھی بھی رکھی ہوئی تھی۔ میں نے انہیں دیکھ کر پہچان لیا تھا۔ یہ سورج کے آدمی تھے۔ جب سورج ڈاکو گاؤں میں آیا تھا تب یہ ان کے ساتھ تھے۔

ان میں سے ایک نے غرا کر بدتمیزی سے بھونڈے لہجے میں پوچھ لیا۔ اس سے توقع بھی کیا کی جا سکتی تھی۔ "کون ہے بے تو...... او خچر کی اولاد...... تو کہاں جا رہا ہے......؟"

"میں ایک سیاح ہوں...... پڑوسی ملک سے تمہارا یہ ملک دیکھنے آیا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا یہاں تیرے ماں باپ کی قبریں ہیں جو دیکھنے آیا ہے؟" دوسرے بدمعاش نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

"میرے ماں باپ کی قبریں تو میرے ملک میں ہیں...... تمہارے ماں باپ کی قبریں ہوں گی۔" میں نے تڑ سے جواب دیا۔

"یہ سالا...... زبان چلا رہا ہے۔" پہلا بدمعاش مشتعل ہو گیا۔ "اس کی زبان کھینچ لو......"

"ابھی زبان کھینچنے والے پیدا نہیں ہوئے ہیں۔" میں نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔ "گالی نہ دو۔ تم دونوں اپنی شکل و صورت سے سؤر لگ رہے ہو۔ کیا تمہیں تمہارے ماں باپ نے نہیں سکھایا کہ کسی پردیسی سے کس طرح بات کی جاتی ہے۔"

"اچھا...... تو اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے...... ہمیں کیا سمجھتا ہے تو نہیں جانتا کہ ہم کون ہیں۔" دوسرے نے کہا تو اس کی آواز میں بے پناہ کرختگی اور حقارت بھری ہوئی تھی۔ "ہم سورج کے آدمی ہیں۔"

"میں تو اپنے آپ کو کچھ نہیں سمجھتا اور نہ تمہیں کچھ سمجھتا ہوں۔" میں بولا۔ "تم کیا آسمان کے سورج کے آدمی ہو؟"

”ابھی ہم تیرے کو سمجھائے دیں گے کہ ہم کون ہیں۔“ پہلے بدمعاش نے زمین پر تھوکتے ہوئے کہا۔ ”ہم آسمان کے سورج کے نہیں بلکہ زمین کے سورج کے آدمی ہیں۔ زمین کا سورج...... سورج ڈاکو ...... کیا تو نے اس کا نام نہیں سنا۔“

”نہیں...... میں کسی سورج ڈاکو نہیں جانتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں یہاں کے کسی بھی آدمی کو نہیں جانتا ہوں۔“

”میں بتاتا ہوں کہ سورج ڈاکو کون ہے......؟“ دوسرا بدمعاش کہنے لگا۔ ”کرناٹک صوبے کا بے تاج مہاراجا ہے۔ اس کا نام سن کر نہ صرف لوگ تھر تھر کانپتے ہیں بلکہ پولیس کو بھی پسینہ آجاتا ہے۔ وہ چھ سات برس سے مہاراجہ بنا ہوا ہے۔ پولیس اسے گرفتار کر سکی اور نہ کبھی کر سکتی ہے۔ وہ بہت طاقت ور ہے۔ پورے کرناٹک پر اس کا راج ہے۔“

”لیکن...... یہ سب کچھ مجھے کیوں بتا رہے ہو؟“ میں نے کہا۔ ”مجھے کیا لینا دینا ہے سورج ڈاکو سے۔“

”پہلے تو یہ بتا کہ تو یہاں کیوں اور کس لئے آیا ہے؟“ پہلے والے بدمعاش نے سوال کیا۔ ”تو کیا چاہتا ہے؟“

”میں یہاں جنگلات دیکھنے آیا تھا اور راستہ بھول کر کالا مندر کے راستے سے ہوتا یہاں آ گیا۔“ میں نے جواب دیا۔

”کیا کہا......؟“ دوسرے بدمعاش نے چونک کر حیرت سے پوچھا۔ ”تو...... تو کالے مندر سے ہو کر آ رہا ہے؟“

”اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”کیا وہاں سے کوئی گزر نہیں سکتا؟“

”کیا تجھے وہاں روپا کماری نہیں ملی......؟“ وہ تحیر زدہ لہجے میں بولا۔ ”اور کیا اس نے تجھے آگے جانے دے دیا؟ اس نے اپنا مہمان نہیں بنایا......؟ سیوا کئے بنا اس نے تجھے جانے دے دیا؟“

”کون روپا......؟ کیسی روپا......؟“ میں نے انجان بن کر پوچھا۔ ”میں نے وہاں کسی روپا کو نہیں دیکھا جس نے مجھے مہمان بنانے اور سیوا کرنے کے لئے روکا ہو......؟ میں مندر کے اندر گھوم پھر کے چلا آیا۔“

”ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ مندر کے آس پاس سے کوئی جوان مرد گزرے اور وہ روپا کماری کی نظروں سے بچ جائے۔“ پہلا بدمعاش بولا۔ ”تین برسوں میں آج تک ایسا نہیں ہوا لیکن آج کیسے ہو گیا...... تمہاری بات کا یقین نہیں آیا۔“

”کیا روپا کماری کوئی بوڑھی عورت ہے جو جوان مردوں کی سیوا کرتی ہے؟ دائی کی طرح؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ بائیس برس کی ایسی جوان اور حسین لڑکی ہے کہ مرد اسے دیکھ کر بے قابو ہو جاتے ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”اب مجھے آگے جانے اور جنگلات کی سیر کرنے دو۔“ میں نے کہا۔ ”واپسی میں تمہاری روپا مل گئی اور وہ واقعی بہت حسین اور جوان ہوئی تو پھر اسے اس وقت تک سیوا کرنے کا موقع دوں گا جب تک اس کا من چاہے گا۔“

”اب تم جنگلات کی نہیں بلکہ جیل کی سیر کرو گے۔“ پہلا بدمعاش بولا۔ ”ہم تمہیں رمنا جادوگر کے پاس لے جائیں گے۔“

”میں نے کیا جرم کیا ہے جو مجھے جیل میں لے جا کر ڈالو گے؟“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”یہ کمینہ کون ہے؟“

”تیرا جرم یہ ہے کہ تو اس علاقے میں گھس آیا؟“ دوسرا بدمعاش سخت غصے میں آ گیا۔ ”تو نے ہمارے رمنا جادوگر کو کمینہ کہا...... وہ تیری آنکھیں نکال ڈالے گا۔ تیری لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔“

”یہ علاقہ کیا سورج کے باپ کا ہے جو کوئی اور آ نہیں سکتا۔“ میں نے بھی کرخت لہجے میں جواب دیا۔ ”رمنا جادوگر تو کیا سورج بھی میرا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ یہ کھلونے ہٹاؤ۔ مجھے آگے جانے دو۔ مجھے آگے جانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔“

دوسرے بدمعاش نے آپے سے باہر ہو کر فضا میں بندوق گھما کر اس کا بٹ میرے کندھے پر بھرپور طاقت سے دے مارا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کا کندھا اور ہڈیاں چورا چورا ہو جاتیں۔ میری ہڈیاں اور کندھا کیا ٹوٹتا۔ البتہ اس کی بندوق کا بٹ کسی ٹہنی کی طرح ٹوٹ گیا۔ میں بڑے آرام و سکون سے کھڑا رہا۔ مجھے کچھ نہ ہوا تھا اور نہ ہی اس کی مار محسوس ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر دونوں ہی بھونچکے ہوئے۔ ان کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔ انہیں ایسا لگا تھا کہ بندوق کا بٹ انسانی جسم پر نہیں بلکہ کسی چٹان پر لگا تھا جس نے بندوق کے دو ٹکڑے کر دیئے۔

میں نے چشم زدن میں دستی بیگ زمین پر رکھ کر پہلے بدمعاش کے ہاتھوں سے بندوق چھین لی اور دوسرے بدمعاش کے منہ پر اس کا بٹ دے مارا جس سے نہ صرف اس کا جبڑا ٹوٹ گیا بلکہ اس کے سارے دانت باہر آ گئے اور منہ سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔ اس کی چیخیں نکل گئیں۔ وہ زمین پر گر کر درد اور تکلیف سے کسی زخمی پرندے کی طرح لوٹنے لگا۔ یہ دیکھ کر پہلے بدمعاش کے اوسان خطا ہو گئے اور اس کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ اس نے فوراً اپنی جیب سے وسل نکالی جو ریلوے کے گارڈ کے پاس ہوتی ہے۔ اس نے وسل کو زور زور سے بجانا شروع کر دیا۔ اس کے وسل بجانے کی دیر تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے چاروں طرف سے مسلح بدمعاش اُمڈ کر آئے اور مجھے نرغے میں لے لیا...... وہ اپنے ساتھی کی زخمی حالت اور درد و تکلیف سے تڑپتا دیکھ کر حیران تھے۔ مجھے اکیلا دیکھ کر بھی ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ بندوق کے ٹکڑوں نے بھی انہیں ششدر سا کر دیا تھا۔ ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ یہ ماجرا کیا ہے۔

یہ کل نو نفر تھے...... ان میں سے ایک نے پہلے والے بدمعاش سے پوچھا۔ جو ایک طرف سہما ہوا کھڑا تھا۔

”وشواناتھ......! یہ کون ہے؟ یہاں تک کیسے چلا آیا؟ یہ بندوق کیسے ٹوٹی......؟“

”سری ناتھ نے اس مسافر پر بندوق سے حملہ کیا تھا جو نہ جانے یہاں کیسے گھس آیا۔ یہ بندوق اس کے کندھے پر لگتے ہی دو ٹکڑے ہوگئی......“ وشواناتھ نے جواب دیا۔ ”اسے کچھ بھی نہ ہوا۔ دیکھو کیسے ٹھیک ٹھاک کھڑا ہے۔“

”کیا کہا...... بندوق ٹوٹ گئی اور اس کا کندھا نہیں ٹوٹا؟“ وہ تحیر زدہ لہجے میں بولا۔ ”تو مذاق تو نہیں کررہا ہے؟“

”اس میں مذاق کی کیا بات ہے؟“ اس نے کہا۔ ”یہ سب کچھ تمہارے سامنے ہے۔ یقین نہ آئے تو سری ناتھ سے پوچھ لو۔“

”لیکن یہ سری ناتھ کا حشر کس نے کیا......؟“ وہ بولا۔ ”یہ کس بری طرح تڑپ رہا ہے۔“

”اس مسافر نے میری بندوق چھین کر اس کے منہ پر دستہ مارا جس سے اس کا جبڑا ٹوٹ گیا اور سارے دانت باہر نکل آئے۔“

وشواناتھ نے اتنا کہہ کر اپنے آدمیوں سے بولا۔ ”تم لوگ...... دیکھ کیا رہے ہو۔ اسے گولیوں سے بھون دو۔“

”نہیں...... نہیں......“ وہ بولا۔ ”اسے رمنا جی کے پاس لے چلو۔ اس کے جرم کی سزا وہ دیں گے اور پھر یہ بھی دیکھنا ہے کہ کون ہے۔ کہاں سے آیا ہے۔ اس کا جسم کس چیز کا بنا ہوا ہے جس نے بندوق کے ٹکڑے کردیئے۔“

”اوئے میری بندوق مجھے دے دو۔“ پہلا بدمعاش جس کا نام وشواناتھ تھا۔ اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ اب وہ اپنے ساتھیوں کی وجہ سے شیر ہوگیا تھا۔ لیکن دل میں ابھی تک مجھ سے خوف زدہ تھا اور اس کے سینے میں میری ہیبت بیٹھ گئی تھی۔ میں ان تمام بدمعاشوں سے باآسانی نمٹ سکتا تھا اور وہ میرا بال تک بیکا نہیں کرسکتے تھے۔ میں انہیں اور ان کی بندوقیں جام کردیتا۔ اگر ان کے پاس اسلحہ اور اس کی طاقت تھی تو میرے پاس جادو تھا۔ میرے جادو کے آگے ان کا کوئی بس نہیں چلتا۔ میں چوں کہ رمنا جادوگر سے ملنا اور اس سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتا تھا، اس لئے خاموشی سے ان کے ساتھ چل پڑا۔ دو بدمعاش اس تڑپتے دوسرے بدمعاش کو سہارا دے کر دوسری سمت لے گئے۔ شاید اس کی مرہم پٹی کے لئے لے گئے تھے۔ باقی ان سب نے مجھے اپنے نرغے میں لیا ہوا تھا جبکہ میں نہتا تھا اور ان کی بندوقوں کی نالیں موت کے فرشتوں کی طرح مجھے گھور رہی تھیں۔ مجھے ہنسی بھی آرہی تھی کہ بندوق کے ہوتے ہوئے بھی یہ کس قدر بزدل اور ڈرپوک ہیں۔

اس آبادی میں سب سے اچھا، بڑا اور خوب صورت مکان رمنا جادوگر کا تھا۔ ایک بدمعاش نے ہم سے پہلے ہی جاکر شاید میرے بارے میں بتادیا تھا وہ ہال میں موجود تھا۔ ایک اونچی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ یہ ہال شاہی دربار سے مشابہہ تھا۔ اس کے دائیں اور بائیں دو نوجوان اور انتہائی حسین لڑکیاں بڑی افسردہ سی کھڑی تھیں۔ ان کی خوبصورت سیاہ آنکھوں سے حزن وملال جھانک رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ انہیں اغوا

کرکے لایا گیا ہے۔ شاید سورج اٹھا کر لایا ہو۔

میں نے اس رمنا جادوگر کو غور اور تنقیدی نظروں سے دیکھا۔ اس کی عمر چالیس برس کی ہوگی۔ بڑا صحت مند اور وجیہہ انسان تھا۔ دراز قد تھا۔ اس کا قد چھ فٹ سے کم نہیں زیادہ ہی ہوگا۔ اس کے چہرے پر جو خباثت چھائی ہوئی تھی اور آنکھوں سے جیسا کینہ پن جھانک رہا تھا۔ میں نے آج تک کسی شخص میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ آدمی نہیں پورا شیطان لگ رہا تھا۔

مجھے جب رمنا جادوگر کے سامنے لے جاکر کھڑا کیا گیا تب وشواناتھ نے مجھ سے سخت لہجے میں کہا۔

”یہ ہمارے مالک ہیں...... رمنا جادوگر...... تو انہیں جھک کر نمسکار کر ملعون......“

میں نے اس کی بات کا جواب ایک زوردار تھپڑ سے دیا۔ اس کے منہ پر ایسا زوردار تھپڑ رسید کیا کہ اس کا منہ ایک طرف گھوم گیا۔ نہ صرف رمنا جادوگر بلکہ اس ہال میں جتنے لوگ کھڑے تھے وہ لرز گئے اور سناٹے میں آگئے۔ البتہ دونوں لڑکیاں خوش ہوگئیں۔

”یہ کیا حرکت ہے؟“ رمنا جادوگر نے غصے سے کہا۔ ”تو نے اس کے منہ پر تھپڑ رسید کیوں کیا؟“

”کیا میں تمہارا اور اس کے باپ کا نوکر ہوں جو تمہیں جھک کر نمسکار کروں۔“ میں نے تیز لہجے میں کہا۔

”میں اس علاقے کا ایک طرح سے مہاراجا ہوں۔“ رمنا جادوگر بولا۔ ”جو بھی میرے سامنے آتا ہے وہ جھک کر نمسکار کرتا ہے۔“

”اگر تم راجا مہاراجا ہوگے تو اپنے گھر کے۔“ میں نے کہا۔ ”میں ایک سیاح اور مسافر ہوں۔ کسی کا نوکر نہیں ہوں اور نہ ہی میں کسی راجا مہاراجا کا نوکر ہوں۔ ہم لوگ آزاد منش ہوتے ہیں۔ لہٰذا مجھے احکامات سنانے کی ضرورت نہیں۔“

”تم بہت اکڑ کر بات کررہے ہو۔“ رمنا جادوگر بولا۔ ”تم جانتے ہو میں کون ہوں۔ کیا ان میں سے کسی نے تمہیں میرے بارے میں نہیں بتایا کہ میں صوبہ کرناٹک کا سب سے بڑا جادوگر ہوں۔ تمہیں ادب اور تمیز سے پیش آنا چاہئے۔“

”ان لوگوں نے تو نہیں بتایا۔“ میں نے کہا۔ ”البتہ میں نے لوگوں سے تمہاری بڑی تعریفیں اور چرچے سنے ہیں۔“

”تم نے کس سے کیا سنا وہ تو میں بعد میں پوچھوں گا۔“ اس نے کہا۔ ”پہلے یہ بتاؤ کہ تم یہاں آ کیسے گئے......؟“

”میں پیدل چلا آیا۔“ میں بولا۔ ”میں روزانہ تیں چالیس میل چل لیتا ہوں۔“

”میں تمہارے پیدل چلنے کے بارے میں نہیں بلکہ یہ پوچھ رہا ہوں کہ کالے مندر پر سے گزر کر کیسے آگئے؟“ وہ برہم سا ہوگیا۔

”کیا وہاں سے کوئی انسان گزر نہیں سکتا......؟“ میں نے پوچھا۔ ”کیا وہاں بھوت پریت چڑیلوں

کا بسیرا ہے؟"

"وہاں ایک حسین راج کماری روپا رہتی ہے جو وہاں سے کسی اجنبی کو گزرنے نہیں دیتی ہے۔" اس نے کہا۔ "وہ اسے اپنا مہمان بنا کر رکھتی ہے۔ کچھ دنوں تک سیوا کرنے کے بعد پھر اسے آگے جانے دیتی ہے۔"

"مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون تھی......؟" میں نے گپ ماری۔ "جب میں وہاں سے گزر رہا تھا تب میں نے مندر سے کچھ فاصلے پر جو تالاب تھا اس میں ایک بائیس برس کی بہت ہی حسین لڑکی کو بڑی آزادی اور بے فکری سے نہاتے دیکھا۔ میں درخت کے پیچھے چھپ کر کھڑا اسے نہاتے دیکھتا رہا۔ جب وہ نہا چکی تب مندر سے دو بدصورت عورتیں نکل کر تالاب کی طرف بڑھیں۔ تولیے سے اس کا بدن پونچھا اور ایک چادر میں اس کا بدن چھپا کر مندر میں لے گئیں۔"

"کیا اسے اور ان عورتوں کو اس بات کا احساس نہیں ہوا کہ ایک اجنبی مرد اسے چھپ کر اشنان کرتے دیکھ رہا ہے؟"

"اس کے متعلق میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "آپ اس سے پوچھیں۔ وہی یہ بات بتا سکتی ہے۔ لیکن آپ کو اتنی فکر اور پریشانی کیوں ہو رہی ہے......؟ اگر میں اس سے ملے بغیر آ گیا تو کیا قیامت ٹوٹ پڑی؟"

"یہ میرا اور اس کا معاملہ ہے میں اس سے نمٹ لوں گا۔" وہ تیز لہجے میں بولا۔ "اس نے پہلی بار ایسی غیر ذمے داری اور غفلت کی ہے۔ یہ ناقابل معافی جرم ہے...... اچھا یہ بتاؤ کہ میری کیا تعریفیں اور چرچے لوگوں میں ہوتے ہیں؟"

تعریف کی دو اقسام ہیں......" میں نے جواب دیا۔ "تعریف کی دوسری قسم یہ ہے کہ جب لوگ کسی سے نالاں اور بدظن ہو جاتے ہیں تو پیار میں اسے خوب گالیاں دیتے ہیں۔ تمہارے بارے میں کہتے ہیں کہ تم حرام کی اولاد ہو۔ تمہارے باپ کا کچھ پتا نہیں...... تم انسان نہیں شیطان ہو۔ تم جیسا خبیث اس دنیا میں کوئی نہ ہوگا۔ تم معصوم لڑکیوں کی عزت و آبرو سے کھیلتے ہو اور شریف اور نیک لوگوں کی زندگیاں غارت کی ہیں اور اب بھی کر رہے ہو...... دوسرا حرامی سورج ڈاکو ہے۔ اس نے تمہارے جادو کے کارن قانون کو بے بس کیا ہوا ہے۔ لاقانونیت پھیلا رکھی ہے۔ دہشت گردی کا راج ہے۔ تم دونوں کو ختم کر دیا جائے تو یہ قانون اور انسانیت پر بڑا احسان ہوگا...... اور سناؤ کہ اور کیا کیا چرچے......"

"بکواس بند کرو۔" رمنا جادوگر میری بات کاٹ کر بری طرح دہاڑا۔ "تم اس بہانے مجھے گالیاں دے کر دل کی بھڑاس نکال رہے ہو؟"

"مجھے تم سے بھلا کیا دشمنی ہے اور تم نے میرا کیا بگاڑا ہے جو میں تمہیں گالیاں دوں۔" میں نے کہا۔ "یہ ساری باتیں میں نے ہوٹلوں، چائے خانوں اور بسوں میں سفر کے دوران سنی تھیں...... اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں آ رہا ہے تو ایسا کرو کہ اپنے جادو کے زور سے معلوم کر لو۔ جادو کے ذریعے سے بہت کچھ معلوم کیا جا سکتا ہے۔"

"ہمارے مالک کے خلاف بھلا ایسی باتیں لوگ کیوں کہیں گے؟" وشواناتھ نے کہا۔ "یہ سب بکواس اور غلط ہے۔"

"اس لئے کہتے ہیں کہ تمہارے مالک اور سورج ڈاکو نے کب کسی کے ساتھ بھلائی اور اچھے کام کئے۔" میں نے کہا۔ "ان دونوں نے مل کر ظلم و ستم کا راج قائم کر رکھا ہے۔ ڈکیتی، عورتوں کا اغوا، آبروریزی کے واقعات اور خون خرابہ کیا اچھی بات ہے۔ سورج ڈاکو حسین اور نوجوان لڑکیاں گھروں میں گھس کر اٹھا لاتا ہے تاکہ رمنا جادوگر کو خوش رکھے۔ یہ اس کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اس کے عوض رمنا جادوگر قانون کے محافظوں کو بے بس کر دیتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس وقت کتنی لڑکیاں اس مکان میں یرغمال ہیں۔ بہر حال یہ جو دو کم سن لڑکیاں یہاں کھڑی ہوئی ہیں، انہیں بھی اٹھا کر لایا گیا ہے۔"

"وشواناتھ......!" رمنا جادوگر ہذیانی لہجے میں چیخا۔ "آج تک کسی کی مجال نہیں ہوئی کہ میرے خلاف اس قدر کھل کر ہرزہ سرائی کرے۔ یہ جانے اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے۔ اس کمینے کا منہ توڑ دو۔ گولیاں مار دو اس کمینے کو......"

"رمنا جی!" میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "میں نے تمہیں آئینہ اور اصل چہرہ دکھایا تو تم اتنا برا مان گئے ...... کیا یہ اچھی بات ہے کہ کسی کی بہو بیٹیوں کو تمہارے بستر کی زینت بنانے کے لئے اٹھا لیا جائے...... اگر کسی نے تمہاری نوجوان بیٹی آشا کو اٹھا لیا اور اسے اس طرح کھلونا بنا لیا جس طرح تم بناتے ہو تب تمہارے دل پر کیا گزرے گی......؟ کیا تم یہ سب کچھ ہنسی خوشی برداشت کرو گے...... تمہاری بیٹی بہت حسین ہے اور بڑی پرکشش بھی۔ کیوں ہے نا......؟ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں۔"

"ابے تو ہے کون......؟" اس کا چہرہ چقندر کی طرح ہو گیا۔ اس کی آنکھیں انگارے برسانے لگیں۔ "تو میرے بارے میں سب کچھ جانتا ہے۔ روپا سے تو میں بعد میں نمٹوں گا جو اس نے تجھے یہاں آنے دیا۔ پہلے میں تیری خبر لوں گا۔ وشواناتھ! تم نے اس کے منہ پر اب تک گولی کیوں نہیں ماری۔ کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ یہ مجھے ذلیل کر رہا ہے کمینہ......"

"میرا خیال تو یہ ہے کہ اسے سورج کے حوالے کر دیا جائے۔" وشواناتھ نے مشورہ دیا۔ "وہی اسے ٹھیک سزا دے سکتے ہیں۔"

"جاؤ جا کر سورج کو ابھی بلاؤ یا اس سے موبائل فون پر رابطہ کر کے کہو وہ ابھی اور اسی وقت یہاں پہنچے۔" رمنا نے کہا۔

"وہ بسنتی پور گئے ہوئے ہیں۔" ایک نے کہا۔ "ابھی وہ وہاں پہنچے نہ ہوں گے۔ راستے میں ہی ہوں گے۔"

"بسنتی پور کس لئے......؟" رمنا جادوگر بولا۔ "اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ یہ اچانک پروگرام کیا؟"

"بسنتی پور میں گھنشیام راؤ کے ہاں شادی کی تقریب ہے۔" وہی آدمی بولا۔ "گھنشیام راؤ کی شہر میں جیولری کی بڑی دکان ہے۔ اس کی بیٹی لاکھوں میں ایک ہے۔ سولہ سترہ برس کی اکلوتی بیٹی ہے۔ اس کا

باپ بیٹی کو نہ صرف دو سو تولے کے سونے کے زیورات دے رہا ہے بلکہ ہیرے جواہرات بھی...... جیسے ہی سورج مالک کو اطلاع ملی وہ فوراً ہی روانہ ہو گئے...... اس لئے آپ کو خبر نہ کر سکے۔ بستی پور میں ڈاکہ آسان کام ہے۔ وہ دو گھنٹے بعد لوٹ آئیں گے۔"

"جب تک اس کا کیا کریں......؟" رمنا جادوگر نے پوچھا۔ "میرا دل تو چاہ رہا ہے کہ اسے ابھی زندہ دفن کر دوں۔"

"آپ اسے جیل میں ڈال دیں جہاں اور بھی لوگ ہیں......" وشواناتھ بولا۔ "محافظوں سے کہیں کہ جب تک سورج واپس نہیں آ جاتے اس وقت تک مار مار کر اس کا بھرکس نکال دیں۔ اس کے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک کریں۔ جیسا کہ اور مرد اور عورتیں قیدیوں کے ساتھ کیا گیا...... شیورام اور دیال سنگھ اس کی خاطر تواضع کے لئے کافی ہیں۔"

وہ لوگ مجھے جیل میں لے آئے جو رمنا جادوگر نے اپنے مکان کے تہ خانے میں بنا رکھی تھی۔ یہ جیل نہیں تھی بلکہ عقوبت خانہ تھا۔ یہ ایک ہال نما کمرہ تھا۔ اس میں تین عورتیں اور چار مرد پابہ زنجیر تھے۔ ان کی حالت جانوروں سے بلکہ مردوں سے بھی بدتر تھی۔ وہ بھوک پیاس، تشدد اور ایذا رسانی کے باعث نڈھال، تھکن اور زخموں سے چور چور تھے۔ ان کی حالت بتا رہی تھی کہ بس اب وہ دو ایک دن کے مہمان ہیں۔ اس عقوبت خانے میں ایذا رسانی کا تمام سامان موجود تھا۔ اس میں چار ستون تھے جس سے قیدی کو باندھ کر کوڑے برسائے جاتے تھے۔ ایک آتش دان تھا۔ ایک بہت بڑی کڑاہی تھی جس میں تیل بھرا ہوا تھا۔ سلاخیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ ان سلاخوں سے جسم داغے جاتے تھے۔ اس کڑاہی میں آدمیوں کو زندہ حالت میں ڈال دیا جاتا تھا۔ اس وقت کڑاہی اور آتش دان بجھے ہوئے تھے۔ رمنا جادوگر اس قدر ظالم اور شقی القلب ہوگا اس کا مجھے بالکل بھی اندازہ نہ تھا۔

شیورام اور دیال سنگھ ساڑھے چھ فٹ سے کم نہ تھے۔ دیوزاد جسامت کے...... حرام کی کھا کھا کر سور ہو رہے تھے۔ وہ جلاد قسم کے تھے۔ وہ انسان کم خون آشام بھیڑیئے زیادہ معلوم ہوتے تھے۔ سفاک اور بے رحم جو جانتے نہیں تھے کہ رحم کیا ہوتا ہے کسے کہا جاتا ہے۔ عقوبت خانے کے باہر ایک کمرہ تھا جس میں وہ دونوں بیٹھے شراب سے دل بہلا رہے تھے۔ ایک تیس برس کی عورت انہیں شراب پلا رہی تھی۔ عورت دہشت زدہ تھی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کچھ دیر پہلے لائی گئی ہے۔

مجھے دیکھ کر شیورام اور دیال سنگھ خوش ہو گئے۔ دیال وشواناتھ سے بولا۔ "بڑا اچھا جانور لائے ہو۔ مزا تو اب آئے گا۔"

"ذرا اس کی اچھی طرح خاطر مدارت کرنا......" وشواناتھ بولا اور پھر اس نے مختصر طور پر سارا قصہ سنا دیا۔

"اوہ یہ بات ہے......" دیال سنگھ نے میری طرف تمسخرانہ نظروں سے دیکھا۔ "کسی بات کی چنتا نہ کرو۔ میں دیکھتا ہوں کہ یہ کتنے پانی میں ہے۔"

شیورام نے کھونٹی سے چابیاں نکال کر عقوبت خانے کا بھاری تالا کھولا۔ پھر مجھے اندر لے جایا گیا۔

میرا دستی بیگ چھین کر ایک طرف پھینک دیا گیا۔ پھر میرے کپڑے اتار دیئے گئے۔ صرف زیر جامہ رہنے دیا گیا۔ پھر مجھے ایک ستون سے زنجیروں سے باندھ دیا گیا۔ مرد اور عورتیں مجھے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں میرے لئے ہمدردی اور محبت کے جذبات موجزن تھے۔ ان کے چہروں سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے دل میں میری سلامتی اور زندگی کی دعا مانگ رہے ہیں۔

جب مجھے زنجیروں سے ستون سے اچھی طرح باندھ دیا گیا تب وشواناتھ اور اس کے ساتھی ہنستے ہوئے چلے گئے۔ انہوں نے زینے کے اوپر جا کر دروازہ بند کر لیا۔ پھر شیورام اور دیال سنگھ کوڑے لے کر میرے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ مجھے اس طرح گھور رہے تھے اور خوش ہو رہے تھے جیسے ایک شکاری اپنے شکار کو بے بس دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔

وہ عورت جوان دونوں کو شراب پلا رہی تھی، تڑپ کر اس کمرے سے نکل کر میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی اور ان دونوں کے آگے ہاتھ جوڑ کر بولی۔ "تمہیں بھگوان کی سوگند...... بھگوان کے لئے اسے نہ مارو۔ اسے سزا نہ دو......"

"یار دیال سنگھ......!" شیورام نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "یہ بھگوان کون ہے...... کیا تو جانتا ہے اسے......؟"

"سنا ہے کہ آسمان پر رہتا ہے......" دیال سنگھ نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "لوگ اسے مدد کے لئے بہت پکارتے رہتے ہیں۔ لیکن وہ آتا کیوں نہیں ہے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ کبھی اسے زمین پر آ کر کسی کی مدد کرتے نہیں دیکھا۔ پھر بھی اسے پکارتے ہیں۔ اس کی سوگند دیتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ آسمان تک آواز پہنچ نہیں پاتی ہے۔" شیورام ہنسا۔ "ایک آدمی کی آواز بھلا کتنی دور جا سکتی ہے۔"

"اصل بات یہ نہیں ہے۔" دیال سنگھ بولا۔ "دراصل وہ بہت ڈرپوک اور بزدل ہے اور پھر آسمان سے نیچے آتے ہوئے ڈرتا ہے کہ کہیں گر نہ جائے اور اس کے چوٹ نہ لگ جائے۔ زخمی نہ ہو جائے یا پھر مر مرا نہ جائے۔"

"حیرت کی بات ہے کہ لوگ پھر بھی اسے پکارتے ہیں۔" شیورام بولا۔ "اب دیکھو نا...... یہ عورت اس چھوکرے کو دیکھتے ہی اس پر مرمٹی اور اسے بچانے کے لئے آ گئی تاکہ اس کے ساتھ رنگ رلیاں منا سکے۔ کیوں کہ یہ جوان اور خوب صورت ہے۔"

"دو گھنٹے پہلے تو اسے شامو یہاں لایا ہے۔" دیال سنگھ بولا۔ "اس نے دو گھنٹے میں کیا کیا...... کمرے کی صفائی کی۔ اس کے بعد سے شراب پلا رہی ہے۔ اب یہاں چلی آئی۔ ابھی تو ہم نے اس کے ساتھ پریم نہیں کیا۔ دو میٹھے بول نہیں بولے۔ ابھی تو اسے ہمارے ساتھ بہت دور جانا ہے۔ اس سالی کو اس بات کا کوئی احساس ہی نہیں کہ شامو کو اس کے گھر سے یہاں لانے میں کتنی محنت کرنی پڑی۔"

"ارے کیا ہم اس چھوکرے کے مقابلے میں زیادہ جان دار، صحت مند اور خوب صورت نہیں

ہیں؟'' شیورام مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا بولا۔

''یہ بات نہیں......'' عورت نے ہذیانی لہجے میں کہا۔ ''تم دونوں مجھے غلط سمجھ رہے ہو۔ میں اس پر مرمٹی نہیں ہوں اس لئے میرے دل کے کسی کونے میں کوئی میل نہیں ہے۔ یہ بالکل میرے چھوٹے بھائی کی طرح ہے۔ اس کی جوانی پر رحم کرو۔ ترس کھاؤ۔''

''اچھا یہ بات ہے۔'' دیال سنگھ ہنسا۔ ''یہ تیرے بھائی کی طرح ہے۔ پھر تو کسی بات کی چنتا نہ کر۔ ہم جب اس کی مزاج پرسی کرلیں تب تجھے اس بات کی اجازت دیں گے کہ اسے دو گھونٹ پانی پلا دے۔ زخموں کو صاف کردے۔''

''کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ اسے شما کردو۔'' عورت گڑگڑائی۔ ''اس کا وہ حشر نشر نہ کرو جو تم لوگوں نے ان سب کا کیا ہوا ہے۔''

''ہم اس شخص کو کیسے چھوڑ دیں، میری جان راگنی!'' شیورام کہنے لگا۔ ''تو نے سنا نہیں، وشوا ناتھ نے اس کے بارے میں کیا بتایا تھا؟ یہ سورج اور رمنا جی کا بدترین دشمن ہے۔ اس نے ان دونوں کو خوب گالیاں دیں، بے عزتی کی۔ اس علاقے میں گھس آیا، جس میں کسی کو آنے کی اجازت نہیں...... اور اس نے ہمارے ایک ساتھی کا منہ توڑ دیا۔ ایسے شخص کو شما کردیں۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر ہم نے اسے شما کردیا تو جانتی ہو کیا ہوگا......؟ رمنا جی مجھے کتا اور دیال سنگھ کو بلی بنا دیں گے۔ وہ بہت سخت آدمی ہیں۔''

''پھر بھی اس پر دیا کرو۔'' وہ بولی۔ ''کہو تو میں رمنا جی کے پاس جاکر ان سے بنتی کروں کہ وہ تمہیں سزا دینے سے روک دیں۔''

''ایں...... تو رمنا جی کے پاس جائے گی۔ نہیں...... نہیں......'' دیال سنگھ جلدی سے بول پڑا۔ ''ایسی غلطی نہ کرنا۔ شامو تجھے ان کی نظروں سے بچا کر لایا ہے۔ وہ تجھے دیکھتے ہی تیری سندرتا پر مرمٹیں گے۔ وہ تجھ جیسی عورتوں کے بڑے رسیا ہیں۔ کیا ہم یہ سارا دن اور رات تیرے بغیر کاٹیں گے...... نہیں...... چل ہٹ۔ سامنے سے ہٹ کر ایک طرف کھڑی ہوجا...... ہم جلدی سے یہ شبھ کام کرلیں۔ تاکہ تیرے ساتھ وقت گزاریں۔ یہ پاپی آیا بھی کیسے وقت...... دو ایک گھنٹے بعد لایا جاتا۔''

''اس کے بے وقت آنے سے سارا مزا خراب ہوگیا۔'' شیورام نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑا۔ پھر اسے ایک طرف اتنے زور سے دھکا دیا کہ وہ دیوار سے بری طرح ٹکرا کر فرش پر گر پڑی۔ پھر اس نے راگنی کے قریب جاکر اس کی پسلی میں ایک ٹھوکر ماری۔ ''بھائی کے بہانے ہمیں بے وقوف بنانا چاہتی ہے۔ کمینی...... حرام زادی۔ یہیں پڑی رہ۔''

راگنی برداشت نہ کرسکی۔ بلک بلک کر رونے لگی۔ اسے بڑی سخت چوٹ آئی تھی۔ وہ آخر ایک نرم و نازک عورت تھی۔

''راگنی دیدی!'' میں نے اسے دلاسا دیا۔ ''تم کسی بات کی چنتا نہ کرو۔ اس حرام زادے نے جو تمہیں مارا ہے میں اس کا بدلہ لوں گا۔ میں اسے بخشوں گا نہیں۔ یہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ لیکن میں ان کا

بہت کچھ بگاڑوں گا۔''

''دیال سنگھ!'' شیورام بولا۔ ''سنا تو نے یہ کیا کہہ رہا ہے۔ یہ بدلہ لے گا۔ ہمیں بخشے گا نہیں۔ ہم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے لیکن یہ ہمارا بگاڑے گا۔ سالا...... یہ کیا بک بک کر رہا ہے۔ فلمی ہیرو کی طرح کیا ڈائیلاگ نہیں بول رہا ہے۔''

''دراصل خوف و دہشت سے اس کا دماغ چل گیا ہے۔'' دیال سنگھ نے کہا۔ ''اس لئے بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔''

''دو تین کوڑے کھاتے ہی کیا ہوگا؟'' شیورام نے قہقہہ لگایا۔ ''دماغ درست ہوجائے گا نا؟''

''مجھے لگتا ہے کہ دنیا سے ہی چل دے گا۔'' دیال سنگھ نے کوڑا فرش پر بڑے زور سے مارتے ہوئے کہا۔

پھر وہ دونوں بیک وقت مجھ پر پل پڑے اور میرے جسم پر کوڑے برسانے شروع کردیئے۔ میں بڑے سکون و اطمینان سے کھڑا کوڑے کھاتا رہا۔ ان دونوں کو ہی نہیں بلکہ جیل میں جو لوگ تھے، راگنی تھی۔ وہ سب حیرت سے اس طرح مجھے دیکھ رہے تھے، جیسے مجھے کوڑوں سے نہیں بلکہ پھولوں کی چھڑی سے مارا جارہا ہو۔ سب سے زیادہ حیرت اور غصہ ان دونوں بدمعاشوں کو آرہا تھا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہورہا ہے۔ میرے جسم پر زخم تو کیا ایک معمولی خراش تک نہیں آئی۔ میرا سکون اور اطمینان اور مسکرا کر دیکھنا جیسے جلتی پر تیل کی دھار بن کر گر رہا تھا۔ ان کے غصے میں اضافہ اور مارنے میں شدت پیدا ہوتی جارہی تھی۔ مارتے مارتے ان کے بازو شل ہوگئے۔ انہوں نے کوڑے ایک طرف پھینک دیئے اور اپنی پھولی ہوئی سانسوں پر قابو پانے لگے اور راگنی اور دوسرے قیدیوں کے چہرے دمک اٹھے تھے اور ان کی آنکھوں سے خوشی ناچنے لگی تھی۔

''اس کے جسم پر کوئی ایسا کیمیکل لگا ہوا ہے جس کی وجہ سے کوڑے کی مار اثر نہیں کر رہی ہے۔'' دیال سنگھ نے کہا۔

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' شیورام نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ ''اب یہ بتاؤ کہ کیا کیا جائے؟ اسے چھوڑنا تو نہیں ہے۔''

''سلاخیں گرم کرکے اس کا جسم داغ دیتے ہیں۔'' دیال سنگھ نے کہا۔ ''اس کے جسم پر کیسا ہی کیمیکل کیوں نہ ہو جسم جل جائے گا۔'' دیال سنگھ نے جیب سے ماچس کی ڈبیا نکالی۔ پھر اس نے انگیٹھی کے پاس جاکر دیا سلائی دکھائی تو اس میں آگ بھڑک اٹھی۔ شیورام نے دو سلاخیں اس میں رکھ دیں۔ آگ تیز ہوتی گئی۔ جس سے پورا کمرہ دہک اٹھا۔

راگنی مجھے جو دیکھ رہی تھی وہ اپنی جگہ سے اٹھی تاکہ میرے پاس آکر ڈھال بن کر کھڑی ہوجائے۔ میں نے اسے اشارہ کرکے منع کیا کہ وہ میرے پاس نہ آئے بلکہ اپنی جگہ خاموش رہے۔ کیونکہ وہ ان بدمعاشوں کو ایذا دینے سے باز نہیں رکھ سکتی۔

جب آگ پوری طرح دہک اٹھی۔ سلاخیں انگارہ ہوگئیں۔ وہ سلاخوں کو لے کر میری طرف بڑھے۔ ان کے چہروں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں درندوں جیسی چمک تھی۔ شیورام نے سب سے پہلے

میرے سینے پر سلاخ کی نوک رکھی۔ دیال سنگھ نے میری گردن پر...... دوسرے لمحے سلاخیں سرد ہو گئیں۔ لیکن مجھ پر خاک اثر ہوتا۔ البتہ ان کے ہاتھ سے سلاخیں چھوٹ کر فرش پر گر پڑی تھیں۔ کیونکہ وہ ایک دم سے انگارہ بن گئی تھیں۔ وہ بھونچکے سے ہو گئے۔

"یہ کوئی انسان نہیں، شیطان ہے۔" دیال سنگھ بولا۔ "اس لئے اس پر کوئی چیز اثر نہیں کر رہی ہے؟"

"ہم بھی بڑے شیطان ہیں۔" شیورام نے اکڑتے ہوئے کہا۔ "اس حرام زادے نے جسم پر ایسا کوئی کیمیکل لگایا ہے جس پر آگ بھی اثر نہیں کرتی ہے۔ اب دیکھتے ہیں اسے فرائی کر کے...... اس سے کیسے بچتا ہے۔"

شیورام نے کڑاہی کا چولہا جلا دیا۔ تھوڑی دیر بعد جب اس میں تیل کھولنے لگا۔ ان دونوں نے مجھے زنجیروں سے آزاد کیا اور میرے ہاتھ پکڑ کر مجھے اس طرف کھینچ کر لے جانے کی کوشش کی لیکن میں ٹس سے مس نہ ہوا۔

"اس سالے کو اٹھالو......" شیورام نے دیال سنگھ سے کہا۔ "اس کا وزن ہے ہی کیا۔ ایک بکرے کا وزن ہے۔"

"میں تو ایسے دو دو چھوکروں کو آسانی سے اٹھا لیتا ہوں۔" دیال سنگھ بولا۔ "یہ کیا چیز ہے؟"

وہ کہہ کر میری طرف بڑھا۔ اس نے مجھے اٹھانے کی کوشش کی۔ اٹھانا تو درکنار ہلا تک نہیں سکا۔ اس نے ایک بار نہیں دو تین مرتبہ کوشش کی۔ اس کے پسینے چھوٹ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اس کی سانسیں پھول رہی تھیں۔

دیال سنگھ نے کہا۔ "شیورام! یہ تو بیس من کا لگ رہا ہے۔ کہیں مجھے کچھ ہو تو نہیں گیا ہے۔ یہ اٹھ کیوں نہیں رہا ہے۔"

"ٹھہرو...... میں اسے اٹھاتا ہوں۔" شیورام نے بھی اپنی کوشش کر کے دیکھ لی۔ مجھے اٹھانا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

"یہ مجھ سے بھی اٹھایا نہیں جا رہا ہے۔" شیورام بولا۔ "آؤ...... ہم دونوں مل کر اسے اٹھاتے ہیں۔"

ان دونوں نے بھی مل کر اپنا پورا زور لگا دیا تب بھی وہ مجھے اٹھا نہ سکے۔ تھوڑی دیر بعد ایک طرف کھڑے ہو کر بری طرح ہانپنے لگا۔ ان کے چہروں پر حیرت اور خوف چھا گیا۔ وہ ششدر اور بری طرح چکرا رہے تھے۔

"تم لوگ مجھے اٹھا نہ سکے لیکن میں تمہیں اٹھا سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم دونوں نے کوشش کر لی اپنی اپنی......"

جس وقت یہ دونوں بدمعاش مجھ پر تشدد کرنے اور ایذائیں دینے، تیل سے کھولتی ہوئی کڑاہی میں ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے تب عقوبت خانے کی فضا بڑی دہشت ناک ہو گئی۔ ہر لحہ بدلتی صورت حال نے راگنی اور دوسرے قیدیوں کو خوش اور حیران کر دیا تھا۔ انہیں یقین نہیں آیا تھا کہ میں ان بدمعاشوں کے

ظلم وستم سے بچ جاؤں گا۔ ایک طرح سے یہ ناممکن بھی تھا۔ ان کی چیخیں نکلتی رہ گئی تھیں۔ جب میں نے ان سے کہا کہ میں انہیں اٹھا سکتا ہوں تو وہ دونوں ہنسنے اور مذاق اڑانے لگے۔ دیال سنگھ نے کہا۔

"ابھی نہیں...... بعد میں اٹھا لینا۔ پہلے تو میں رمنا جی کو بلا کر لاؤں اور ان سے پوچھوں کہ تم ہو کیا چیز......؟"

"یہ تو بعد میں پوچھتے رہنا۔" میں نے کہا۔ "رمنا جی کے پتا جی کو بھی بلا لینا۔ پہلے میں تم دونوں کی خبر لینا چاہتا ہوں۔ میں بھی تمہارے ساتھ وہی کچھ کرنا چاہتا ہوں جو تم نے میرے اور ان لوگوں کے ساتھ کیا ہے۔ تم دونوں نے جو کچھ کیا ہے وہ قابل معافی نہیں ہے۔"

"تو مجھے اٹھا سکتا ہے؟" شیورام سینہ تان کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ بڑے تکبر سے بولا۔ "کیا تو نے مجھے مرغی کا بچہ سمجھ رکھا ہے۔ ابے او...... میں دو ایک کلو وزن کا نہیں ہوں۔ پورا ساڑھے تین من کا ہوں۔ دیال سنگھ چار من کا ہے۔"

میں نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے چشم زدن میں اسے دونوں ہاتھوں سے اس طرح اٹھا لیا جیسے وہ تین چار برس کی عمر کا ہو۔ میں نے اسے فضا میں دو تین چکر دیئے تو وہ بھونچکا ہو کر چیخنے چلانے لگا۔ دیال سنگھ پر سکتہ سا چھا گیا۔ اسے یقین نہ آیا۔ وہ آنکھیں مل مل کر دیکھنے لگا جیسے خواب تو نہیں دیکھ رہا ہے۔ دوسرے لمحے اس کی سٹی ایسی گم ہوئی کہ وہ اپنی جگہ سے ہلنا بھی بھول گیا۔

میں نے شیورام کو دو تین چکر دینے کے بعد فرش پر دے مارا تو زمین دہل گئی۔ وہ درد اور تکلیف کی شدت سے تڑپنے لگا۔ اسے کافی چوٹیں آئی تھیں۔ جب میں دیال سنگھ کی طرف بڑھا تو وہ کمرے کے آہنی دروازے کی طرف بھاگا۔ میں نے لپک کر اسے پکڑ لیا۔ اس کا بھی وہی حشر کیا جو شیورام کا کیا تھا۔ اس کی بھی وہی حالت ہو رہی تھی جو شیورام کی ہو رہی تھی۔ وہ بھی زمین پر پڑا تڑپ رہا تھا۔

پھر میں نے ان دونوں کو دو ستونوں سے زنجیروں سے ایسا جکڑ دیا کہ وہ ہل بھی نہ سکیں۔ جتنے قیدی تھے وہ سب خوش ہو گئے۔ راگنی نے تو میرا ماتھا اس طرح چوم لیا جیسے وہ میری بڑی بہن ہو۔ نہ صرف اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے بلکہ تمام قیدیوں کی آنکھوں میں بھی...... میں نے راگنی سے کہا کہ وہ زینے پر جا کر دروازے کی چٹخنی لگا دے تاکہ کوئی بدمعاش یا پہرہ دار نہ آ جائے۔

راگنی نے بتایا کہ وہ ایک اسپتال میں نرس ہے۔ شادی شدہ ہے۔ اس کے دو بچے ہیں۔ اس کا پتی اس اسپتال میں ڈسپنسری میں کام کرتا ہے۔ پھر میں نے اپنا بیگ اٹھایا۔ پھر میں نے اور راگنی نے مل کر قیدیوں کے زخموں کو صاف کیا۔ ان کے زخموں پر مرہم لگایا۔ دو ایک مریضوں کو انجکشن کی ضرورت تھی انہیں انجکشن لگایا۔ مرہم پٹی کرنے سے ان زخموں کی حالت قدرے بہتر ہو گئی تھی۔ ان کی جان میں جان آ گئی تھی۔

دوسری طرف یہ بھوک پیاس سے سخت نڈھال تھے۔ ان کے کھانے کے لئے کچھ چاہئے تھا۔ شیورام اور دیال سنگھ کے کمرے میں کھانے پینے کے لوازمات جو تھے وہ ناکافی تھے۔ یہ دونوں بدمعاش ہوش میں تھے اور ساری کارروائی خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے مجھے دھمکیاں بھی دی تھیں کہ میں

ان کی زنجیریں کھول دوں۔ ورنہ میرا حشر برا کر دیا جائے گا۔ مجھے چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔

میں نے کہا۔ ”میرا حشر نشر جو ہوگا وہ بعد میں ہوگا۔ اب پہلے تم اپنے حشر کی فکر کرو۔ تم دونوں کو کوڑے بھی مارے جائیں گے۔ تمہارے جسموں کو سلاخوں سے داغا جائے گا...... پھر اس کے بعد کھولتے ہوئے تیل میں ڈال کر خوب اچھی طرح فرائی کیا جائے گا۔“

پھر میں نے ان دونوں کے منہ میں کپڑے ٹھونس دیئے۔ پھر راگنی کو لے کر تہہ خانے سے نکلا۔ میں نے راگنی سے کہہ دیا تھا کہ ہم کسی کو نظر نہیں آئیں گے۔ لیکن ہمیں سب نظر آئیں گے۔ اتفاق تھا کہ راستے میں کوئی نہیں تھا اور نہ ہی باورچی خانے میں...... ایک بڑی بالٹی دودھ سے بھری ہوئی رکھی تھی۔ پھل وغیرہ کے علاوہ حلوہ پوریاں اور ترکاری بھی اتنی بچی رکھی تھی جو آٹھ دس آدمیوں کے لئے کافی تھی۔ مکھن اور دو درجن انڈے بھی تھے۔ جو شاید دوپہر کے کھانے کے لئے تھے۔ پانی کی دو بوتلیں بھی تھیں۔ میں اور راگنی یہ سب کچھ لے کر تہہ خانے میں پہنچے۔ ان بھوکوں کو کھلایا تو ان میں توانائی آ گئی۔ دودھ پینے سے ان کی ساری کمزوری دور ہو گئی۔ میں نے سب کو طاقت کی ایک ایک گولی کھلائی۔

شیورام اور دیال سنگھ یہ سب کچھ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ انہیں غصہ بھی آ رہا تھا۔ وہ بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے کہ شاید کوئی آ جائے۔ پھر میں نے راگنی کو ان کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔ اس کے ہاتھ میں کوڑا دے کر کہا۔

”راگنی دیدی! ان دونوں بدمعاشوں نے کیا آپ کی عزت پر ہاتھ ڈالا...... اگر ایسا کیا ہے تو بتائیں؟“

”نہیں......“ راگنی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں دو تین گھنٹے پہلے یہاں لائی گئی ہوں۔ اس لئے عزت بچی رہی۔ البتہ دست درازیاں کی ہیں۔“

”آپ ان دونوں کو جتنے کوڑے مار سکتی ہیں ماریں۔“ میں نے کہا۔ ”ڈرنے اور خوف زدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ان کی مدد کو کوئی نہیں آئے گا اور نہ ہی بچانے والا...... آپ ان سے گن گن کر بدلہ لیں۔ ان شیطانوں کو بخشیں نہیں۔“

راگنی نے ان دونوں کو باری باری دس دس کوڑے مارے۔ ان کے منہ میں چونکہ کپڑا ٹھنسا ہوا تھا اس لئے ان کی چیخیں سنائی نہیں دی تھیں۔ پھر دوسرے قیدی مرد اور عورتوں نے انہیں کوڑے مارے۔ پھر ان کے جسم گرم گرم سلاخوں سے داغے گئے۔ جب ان سب نے ان دونوں بدمعاشوں سے گن گن کر بدلہ لے کر دل کی بھڑاس نکال لی تب میں ان سب کو عقوبت خانے سے لے کر نکلا۔ ایک عقبی راستہ تھا۔ اس راستے سے باہر کھلی فضا میں آئے۔ میں نے راگنی اور ان سب سے کہا کہ وہ شمال والے راستے سے نکل جائیں۔

راگنی نے مجھ سے پوچھا۔ ”آپ اتنا تو بتا دیں کہ آپ ہیں کون......؟ آپ آسمان سے اترے ہوئے اوتار تو نہیں ہیں؟“

”نہیں......“ میں نے ہنس کر جواب دیا۔ ”دراصل میں بھی ایک جادوگر ہوں جو رمنا جادوگر سے دو دو ہاتھ کرنے اور ظلم و ستم کے سورج، سورج ڈاکو کو سدا کے لئے غروب کرنے آیا ہوں۔ میرا مشن ہی ظلم کے

خلاف آواز اٹھانا اور ظلم کو مٹانا ہے۔“

وہ سب بڑے جذباتی انداز سے رخصت ہوئے۔ میں انہیں رخصت کرنے جھیل تک گیا۔ اس وقت تک وہاں کھڑا رہا جب تک وہ سب میری نظروں سے اوجھل نہ ہو گئے۔ پھر مجھے اچانک سورج ڈاکو کا خیال آیا جو بسنتی پور ڈاکہ مارنے اور دلہن کو اٹھا کر لانے گیا ہوا تھا۔ میں جھیل کے کنارے بیٹھ گیا۔ پھر میں نے پانی کی ساکت سطح پر منتر پڑھ کر پھونکا تو بسنتی پور کی حویلی کا منظر سامنے تھا۔

☆......☆......☆

سورج ڈاکو ابھی بسنتی پور پہنچا تھا۔ اس کے ساتھ پچیس مسلح ساتھی تھے۔ انہوں نے بسنتی پور کی حویلی کا محاصرہ کر لیا اور فضا میں ہوائی فائر کر کے بستی میں خوف و ہراس پھیلانے لگے۔ بستی کے تمام لوگ ڈر، خوف اور دہشت سے اپنے گھروں میں دبک گئے۔ دروازے بند کر لئے۔ کچھ دیر بعد سورج اپنے چار ساتھیوں کے ساتھ لڑکی کے باپ گھنشیام راؤ کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ وہ کرخت لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”گھنشیام راؤ ٹھاکر! تم نے مجھے پہچان لیا ہوگا کہ میں کون ہوں......؟ میں سورج ہوں...... میں جو کہوں اس پر بلاچون وچرا عمل کرو۔“

”سورج!“ ٹھاکر نے کہا۔ ”آج شام میری بیٹی کا بیاہ ہے۔ تم کسی اور دن آ جاؤ۔ تمہارا جو مطالبہ ہے وہ میں پورا کر دوں گا۔“

”میں ایک دن کیا ایک گھنٹہ انتظار کرنے کا عادی نہیں ہوں۔“ سورج ڈاکو نے تڑختے لہجے میں کہا۔ ”اور نہ ہی کبھی میں خالی ہاتھ واپس گیا ہوں۔“

”سورج! میری ایک ہی بیٹی ہے......“ ٹھاکر نے کہا۔ ”اس گھر میں اور ہماری زندگیوں میں پہلی بار انمول خوشیاں آئی ہیں۔“

”تمہاری ایک بیٹی ہو یا دس بیٹیاں......“ سورج نے سفاک لہجے میں کہا۔ ”مجھے تمہاری خوشیوں سے کوئی غرض نہیں ہے۔ مجھے اپنی خوشی سے غرض ہے...... یہ میرے لئے کتنی خوشی کی بات ہے کہ میں نہ صرف لاکھوں کے زیورات بلکہ تمہاری بیٹی موہنی کو بھی لے جاؤں گا۔“

”کیا کہا......؟“ ٹھاکر ایک دم سے اس طرح اچھل پڑا جیسے اسے زبردست برقی جھٹکا لگا ہو۔ ”تم میری بیٹی کو بھی لے جاؤ گے......؟ موہنی کو......؟“

”ہاں...... ہاں......“ سورج کی آواز اونچی ہو گئی۔ ”کیا میرے الفاظ صاف اور واضح نہیں ہیں۔ میں تمہاری دولت اور بیٹی کو لے جانے آیا ہوں۔“

”تم یہاں سے جو کچھ اور جتنا کچھ لے جانا چاہو لے جا سکتے ہو......“ ٹھاکر نے اس کی منت سماجت کی۔ ”لیکن میری بیٹی کو نہیں لے جانا۔ نا سورج نا۔“

”سنو ٹھاکر......! سورج جس بات کا فیصلہ کر لیتا ہے اور اس کی زبان سے جو نکلتا ہے وہ پتھر کی لکیر ہوتا ہے۔“ سورج نے خشونت سے کہا۔

"میں اپنی جان دے دوں گا لیکن بیٹی کو لے جانے نہیں دوں گا۔" ٹھاکر نے کہا۔ "اس وقت ہمارے جگر کا ٹکڑا عروسی لباس میں ملبوس اپنے کمرے میں دلہن بنی بیٹھی ہے۔ اس کی خوشیوں اور ارمانوں کو تار تار نہ کرو۔ تمہیں زیور اور رقم چاہئے نا...... وہ لے جاؤ۔"

"جب تم اپنی جان دے دو گے تو پھر تمہاری بیٹی کو لے جانا اور آسان ہو جائے گا۔" سورج نے تمسخر سے کہا۔ "ٹھاکر! ضد اور بے وقوفی کی بات نہ کرو۔ تمہاری بیٹی کا بیاہ ضرور ہوگا۔ وہ دلہن ضرور بنے گی۔ اس عروسی لباس میں ہی ہوگی جس لباس میں اس وقت اپنے کمرے میں موجود ہے۔ لیکن تمہارا داماد وہ نہ ہوگا جو برات لے کر آئے گا بلکہ سورج تمہارا داماد ہوگا۔ میں نے کبھی کسی اور کی عورت سے بیاہ نہیں کیا۔ بغیر بیاہ اور پھیروں کے میں نے سہاگ راتیں منائیں لیکن تمہاری بیٹی کے ساتھ بیاہ کروں گا۔ شہر کے سب سے بڑے پنڈت کو بلاؤں گا۔ منڈپ کے سات پھیرے کروں گا۔ یعنی اسے باعزت طور پر پتنی بناؤں گا۔ تمہیں خوش ہونا چاہئے کہ سورج تمہارا داماد بنے گا۔ کتنی عزت اور اعزاز کی بات ہے۔"

"سورج......!" ٹھاکر کا سارا جسم نفرت اور غصے سے کانپ گیا۔ اس نے سورج کے منہ پر تھپڑ مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا مگر کچھ سوچ کر رک گیا۔

"رک کیوں گئے ٹھاکر......!" سورج نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "یہ حسرت بھی پوری کر لو...... تم پہلے آدمی ہو جس نے سورج پر ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی۔ میں نے تمہیں معاف کر دیا...... سنو...... میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ گھر میں جتنی مہمان عورتیں ہیں انہیں اس کمرے میں جمع کرو۔ میرے آدمی تمہارے ساتھ کمرے میں جائیں گے۔ اپنی تجوری کھول دینا۔ اس میں جو کچھ ہوگا اور جتنا ہوگا وہ سب لے آئیں گے...... مزاحمت کرنے، فریاد کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ میں تم سب کو خون میں نہلا دوں گا۔ اگر کسی نے کوئی بھی گڑبڑ کی...... اور ہاں اپنی جان مفت میں نہ گنواؤ......"

پھر حویلی میں جتنی عورتیں تھیں ان تمام کو اس کمرے میں لایا گیا۔ سورج کے ایک ساتھی نے فرش پر چادر بچھا دی۔ ان عورتوں میں رشتہ دار اور مہمان عورتیں بھی تھیں۔ سورج نے ان تمام عورتوں کو حکم دیا۔ اپنے جسم کا ایک ایک زیور اتار کر اس چادر میں ڈال دیا جائے۔ عورتوں اور لڑکیوں نے فوراً ہی اس کے حکم کی تعمیل کی۔ بندے، چوڑیاں، ہار، کڑے اور انگوٹھیاں بھی نکال کر ڈال دیں۔ ٹھاکر نے بھی ایسا ہی کیا۔

پھر ایک ساتھی نے وہ گٹھری باندھی، وہ اتنی بڑی اور اتنی بھاری ہو گئی کہ اسے دو آدمی اٹھا کر لے گئے۔ آخر میں جب سورج اس کمرے میں گیا جس کمرے میں ٹھاکر کی بیٹی دلہن بنی ہوئی تھی۔ وہ فرط غم سے نڈھال بلکہ بے ہوش ہو چکی تھی اور اس کا چہرہ رنگین، لمبے گھونگھٹ میں چھپا ہوا تھا۔ سورج نے اس رنگین گٹھری کو گود میں اٹھا لیا۔ پھر وہ اسے اٹھا کر کمرے میں لایا تو ٹھاکر اور ٹھاکرانی بے ہوش ہو چکے تھے۔

سورج اس گٹھری کو لے کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ پھر اس کے تمام ساتھی ہوائی فائر کرتے ہوئے تیزی سے بسنتی پور سے نکل گئے۔

سورج ڈاکو بہت خوش تھا۔ اس نے ٹھاکر کی بیٹی کی بڑی تعریف سنی تھی کہ وہ بڑی حسین ہے۔

گھوڑے کی پیٹھ پر اس کے آگے وہ گٹھری رکھی ہوئی تھی اور وہ دوسری گٹھری بھی دیکھ رہا تھا جو سونے اور ہیرے و جواہرات کے زیورات سے بھری ہوئی تھی۔ کبھی اس نے اپنی زندگی میں اتنا لمبا ہاتھ نہیں مارا تھا۔

تھوڑی دیر بعد دور سے دھول اڑتی نظر آئی۔ سورج بسنتی پور سے واپس آ رہا تھا۔ پھر وہ کچے راستے سے گزرتا ہوا چلا گیا۔ وہ سیدھا اپنے اڈے کی طرف گیا۔ اس نے اپنی آبادی میں پہنچ کر دلہن کو گھوڑے سے اتارا۔ وہ اسے وہ اپنے کمرے میں لے گیا۔ دلہن اب تک بے ہوش تھی۔ اس نے رمنا دوگر کو دیکھا تو بڑی حیرت ہوئی۔ وہ کمرے سے نکل کر رمنا جادوگر کے پاس گیا جو بڑی بے چینی اور وحشت سے ٹہل رہا تھا۔

"کیا بات ہے رمنا جی......!" سورج نے حیرت سے دریافت کیا۔ "تم بہت حیران اور پریشان ہو رہے ہو۔ غصے کی حالت میں بھی ہو۔"

"کیا بتاؤں......؟" رمنا جادوگر نے کہا۔ "ایک نوجوان مسافر کے بھیس میں ایک جادوگر آیا تھا وہ مجھے نیچا دکھا گیا......"

"جادوگر......؟" سورج نے حیرت سے کہا۔ "کون ایسا جادوگر تھا جس نے تمہیں نیچا دکھا دیا۔ یقین نہیں آ رہا ہے رمنا! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"کیوں نہیں ہو سکتا......؟ لیکن جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔" رمنا نے مٹھیاں بھینچ کر کہا۔ پھر وہ اپنا ماتھا پیٹنے لگا۔ "وہ مجھے بے وقوف بنا گیا۔"

"لیکن رمنا جی! پورے صوبے کرناٹک میں کیا بلکہ ہندوستان میں تمہارے پائے کا کوئی جادوگر نہ ہوگا۔ آخر ہوا کیا......؟" سورج کے لہجے میں تجسس تھا۔

"کیا کچھ نہیں ہوا......" رمنا جادوگر کہنے لگا۔ "جب وہ کالے مندر کے پاس آیا تو روپا نے اسے گھیرا...... لیکن وہ اس کے چکر میں نہیں آیا۔ روپا نے کچھ مردوں کو دل بہلانے کے لئے اپنے طلسم میں قید کر رکھا تھا۔ ان کی عورتیں اپنے شوہروں کو چھڑانے آئیں تو اس نے انہیں آنکھیں بنا کر خون کے مرتبان میں ڈال دیا۔ روپا نے اس مسافر کو آم کا شربت بنا کر دیا تو اس میں ایک عورت کی آنکھیں ڈال دیں تاکہ وہ عورت ختم ہو جائے۔ مرد اس کا غلام ہو جائے۔ مگر سارا کھیل الٹا ہو گیا۔ وہ چوں کہ جادوگر تھا۔ اسے تمام باتوں کا علم ہو گیا تھا۔ اس نے بدروحوں کو ایک جگہ دفن کر دیا۔ روپا کو خون کے مرتبان میں ڈال دیا۔ اس نے ان تمام عورتوں کو خون کے مرتبان سے نکال لیا۔ پھر اس نے مردوں اور عورتوں کو ان کے گھروں کو روانہ کر دیا۔"

"یہ ساری کہانی تمہیں کس نے سنائی......؟" سورج بولا۔ "حیرت ہے روپا اس کے جال میں آ گئی۔"

"روپا کی روح نے...... وہ مرتبان میں دم توڑ گئی۔ میں نے کچھ دیر پہلے روپا کی روح کو بلایا تھا۔" رمنا نے کہا۔

"پھر وہ مسافر جادوگر کہاں گیا......؟" سورج نے پوچھا۔ "کیا تم نے اسے تلاش نہیں کیا؟"

"اسے میرے آدمی گرفتار کر کے میرے پاس لائے تھے۔" رمنا نے جواب دیا۔ "جانتے ہو اس نے کیا بکواس کی۔ اس نے میرے اور تمہارے خلاف بہت بکواس کی۔ اتنی گالیاں دیں کہ تم سنتے تو اسے

اسی وقت ختم کر دیتے......"

"تم نے کیا کیا؟ اسے جانے دیا۔ اس کی گالیاں اور بکواس سن لی؟" سورج کو غصہ آ گیا۔

"وشوا ناتھ نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اسے جیل میں ڈال دوں۔ جب تم بسنتی پور سے واپس آؤ، اسے تمہارے سامنے پیش کردوں تا کہ تم اسے سزا دو۔"

"وہ ہے کہاں......؟" سورج کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "اسے ابھی اور اسی وقت میرے سامنے لاؤ۔"

"میں نے اسے جیل بھیج دیا تھا کہ تمہارے آنے تک اس کی گستاخی اور بدتمیزی کی اسے سزا دی جا سکے......" رمنا کہنے لگا۔ "اسے ستون سے باندھ دیا گیا۔ شیورام اور دیال سنگھ نے اس کے ننگے جسم پر اتنے کوڑے برسائے کہ کوئی اور ہوتا تو وہ مر چکا ہوتا۔ لیکن اس کے جسم پر ایک خراش تک نہیں آئی۔ پھر اسے گرم سلاخوں سے داغا گیا۔ لیکن اس سے بھی کچھ نہ ہوا۔ پھر اسے کھولتے تیل میں ڈالنے کے لئے اٹھایا گیا۔ دونوں مل کر بھی اسے اٹھانا تو درکنار ہلا تک نہیں سکے۔ پھر اس نے دیال سنگھ اور شیورام کو اپنے ہاتھوں میں اس طرح اٹھا لیا جیسے وہ پلاسٹک کے گڈے ہوں۔ انہیں فرش پر دے مارا۔ پھر دونوں کو ستونوں سے باندھ کر ایک عورت اور دوسرے قیدیوں سے کہا کہ انہیں کوڑے ماریں۔ پھر ان کے جسموں کو داغا بھی گیا...... پھر اس نے جیل سے تمام قیدیوں کو نکال کر ان کے گھر پہنچا دیا......"

"یہ سب کچھ تمہیں کس نے بتایا؟" سورج نے حیرت اور غصے سے پوچھا۔

"شیورام نے...... وہ دونوں ابھی تک بے ہوش ہیں۔ ان کے بچنے کی امید نہیں۔ شیورام کچھ دیر کے لئے ہوش میں آیا تو اس نے بتایا......"

"یہ بہت برا ہوا رمنا!" سورج خوف زدہ لہجے میں بولا۔ "اپنے جادو سے معلوم تو کرو کہ وہ کہاں ہے تا کہ اسے قابو میں کیا جا سکے؟"

"میں نے اپنا سارا جادو صرف کر دیا...... تمام موکلوں کو دوڑا دیا۔ اس کا پتا نہیں چل رہا ہے۔" رمنا نے جواب دیا۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ واپس چلا گیا ہو......؟" سورج بولا۔

"نہیں......" رمنا بولا۔ "جانتے ہو وہ کس لئے آیا تھا...... ہم دونوں کا قصہ ختم کرنے......"

"کیا کہا......؟ ہم دونوں کا قصہ ختم کرنے......؟"

سورج اچھل پڑا۔ لمحے کے لئے اس کا چہرہ زرد سا پڑ گیا اور اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ پھر اس نے جلد ہی خود پر قابو پا لیا۔ لیکن اس کا دماغ بری طرح سن سنا رہا تھا۔ چکرا سا گیا تھا۔

"نہیں...... نہیں......" دوسرے لمحے وہ ہذیانی لہجے میں بولا۔ "یہ نہیں ہو سکتا رمنا......؟"

"کیوں نہیں ہو سکتا سورج......؟" رمنا جادوگر نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ "تمہیں میری اس بات پر یقین کیوں نہیں آ رہا ہے؟"

"اس لئے کہ اس دنیا میں ایسا مائی کا لال اب تک پیدا نہیں ہوا جو ہم دونوں کو موت کے گھاٹ

اتار دے۔" سورج نے بڑے گھمنڈ سے کہا۔ "اگر ایسا کوئی ہوتا تو اب تک اس دنیا میں ہم دونوں کا وجود ہی نہیں ہوتا۔"

"یہ بات تم کس بنا پر کہہ رہے ہو؟" سورج کے اس لب و لہجے پر چونک کر رمنا جادوگر نے دریافت کیا۔

"اس بنا پر کہ تمہارے پاس دولت ہے۔ جادو کی دولت جس سے تم جو چاہے کر سکتے ہو۔" سورج کا لہجہ اب بھی غرور سے بھرا ہوا تھا۔ "میرے پاس طاقت ہے۔ اسلحہ ہے۔ ایک سے ایک بہادر، سفاک اور نڈر آدمی ہیں جو موت سے نہیں ڈرتے۔"

"یہ کہہ کر تم اپنے دل کو فریب دے رہے ہو۔" رمنا جادوگر نے کہا۔ "زیادہ خوش فہمی اچھی نہیں ہوتی ہے۔"

"میں نے نہ تو کبھی اپنے آپ کو فریب دیا اور نہ ہی میں خوش فہمی میں مبتلا رہتا ہوں۔" سورج نے اکھڑ لہجے میں کہا۔ "مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے تم اس سے ڈر گئے ہو...... خائف ہو گئے ہو۔ اس لئے ایسی باتیں کر رہے ہو؟"

"میں ڈر نہیں گیا اور نہ ہی اس سے خائف ہوا ہوں۔" رمنا جادوگر نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ "دراصل میں اس کے مقابلے پر اپنے آپ کو کمزور اور بے بس پا رہا ہوں۔ کیوں کہ میرا جادو چل نہیں رہا ہے۔ کبھی بھی ایسا نہیں ہوا۔"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ تم کسی وجہ سے اپنا جادو بھول گئے ہو؟" سورج نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "تمہارا دماغ کام نہیں کر رہا ہو؟"

"میں کس وجہ سے اپنا جادو بھول سکتا ہوں......؟" رمنا جادوگر نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "ایسی کوئی بات نہیں۔"

"اس چودہ برس کی چھوکری کی وجہ سے جو کل میں اٹھا کر لایا تھا اور میں نے تمہیں اسے دان کر دیا تھا؟"

"نہیں سورج!" رمنا جادوگر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ وہ بے حد سنجیدہ ہو گیا۔ "تم اس بات کو مذاق میں مت لو...... میں جادو بھولا نہیں ہوں۔ نہ بھول سکتا ہوں۔ تمہیں شاید یقین نہ آئے...... یہ دیکھو۔"

پھر رمنا جادوگر نے سامنے بندھی ہوئی بکری کو کبوتر بنا دیا۔ کبوتر اڑ کر درخت کی ٹہنی پر جا بیٹھا۔ پھر اس نے سورج سے کہا۔ "اب تمہیں میری بات کا اور میرے جادو کا یقین آیا۔ تم نے میرے جادو کا یقین کر لیا کہ میں بھولا نہیں ہوں؟" سورج کے جواب دینے سے پہلے اس نے کبوتر کو درخت سے نیچے لا کر پھر سے بکری بنا دیا۔ "سوال یہ ہے کہ وہ جادوگر کون ہے۔ جس کے آگے تم بے بس ہو گئے۔ کیا واقعی وہ اتنا زبردست جادوگر ہے۔" سورج نے کہا۔

"ہاں......" رمنا جادوگر بولا۔ "اس نے روپا کا جو حشر کیا اور عقوبت خانے کے واقعے نے بھی

تمہاری آنکھیں نہیں کھولیں؟ اس سے ظاہر نہیں ہوتا ہے کہ وہ کیسا زبردست جادوگر ہے۔ اور دیکھو نا...... میں اس کا پتا ہی نہیں چلا پا رہا ہوں۔''

''ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے......؟'' سورج نے حیرت سے کہا۔

''وہ کیا......؟'' رمنا جادوگر نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''اب سمجھ میں نہ آنے والی کون سی بات رہ گئی؟''

''وہ یہ کہ وہ کیوں ادھر آ نکلا اور ہم سے کس لئے الجھ گیا ہے؟'' سورج نے کہا۔ ''یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے؟''

''میرے خیال میں وہ کسی اور وجہ سے ہماری سرکوبی کرنے آ رہا ہے؟'' رمنا جادوگر نے اپنا خیال ظاہر کیا۔ ''ایسا لگتا ہے کہ اسے کسی خاص بات یا واقعہ نے ہماری سرکوبی کرنے اور ہمیں مزا چکھانے کے لئے مجبور کیا ہے۔''

''کون سا ایسا واقعہ ہو سکتا ہے؟'' سورج کے چہرے پر حیرت سی چھا گئی۔ وہ اپنے ذہن پر زور دے کر سوچنے لگا۔ پھر اس نے چند لمحوں کے بعد کہا۔ ''برسوں سے جانے کیسے کیسے واقعات پیش آ چکے ہیں اور آ رہے ہیں۔ پولیس تک ہمارا بال بیکا نہیں کر سکی۔ جو بھی ہمارے مقابلے پر آیا، ہم نے اسے موت کی نیند سلا دیا۔ پولیس کو تم نے اپنے جادو سے نہ یہاں پہنچنے دیا اور نہ ہی انہیں کامیاب کیا۔ جب کہ انہوں نے کیا کچھ زور نہیں لگایا تھا۔ کیا کچھ نہیں کر لیا۔ لیکن انہیں ہر بار منہ کی کھانا پڑی۔''

''ہاں...... یہ بات تو ہے۔'' رمنا جادوگر نے سر ہلا دیا۔ پھر اس نے ایک دم سے چونک کر کہا۔ ''ذرا تم اپنے موبائل فون سے چک بالا پور جے راج سے دریافت کرو کہ کیا وہاں کوئی اجنبی آیا تھا۔ تمہارے وہاں سے آنے کے بعد کیا ہوا......؟''

''وہاں کیوں اور کس لئے گیا ہوگا، کوئی جادوگر......؟'' سورج نے کہا۔ ''تمہاری بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے؟''

''وہاں جے راج سے رابطہ کر کے معلوم کرنے میں کیا حرج ہے؟'' رمنا جادوگر بولا۔ ''تم وہاں سے گوتم کے بچے کو اٹھا کر لائے ہو۔''

سورج نے جیب سے موبائل فون نکالا۔ پھر اس نے اپنے مخبر جے راج سے رابطہ کیا۔ رابطہ قائم کرنے کے بعد وہ اس سے باتیں کرنے لگا۔ دس منٹ تک باتیں کرتا رہا۔ اس دوران اس کے چہرے کے تاثرات بدلتے رہے تھے۔ سورج نے رابطہ منقطع کر کے موبائل فون جیب میں رکھ لیا۔

''جے راج بتا رہا تھا کہ گاؤں میں اس وقت ایک سیاح آیا تھا، جب میں گوتم کی تلاش میں گیا تھا اور اسے موجود نہ پا کر اس کے بچے کو رہن رکھنے کے لئے اٹھا لایا تھا۔'' سورج، رمنا جادوگر کو تفصیلات بتانے لگا۔ سیاح نے گاؤں کے لوگوں سے مل کر بات کی تھی۔ کچھ لوگوں کے ساتھ ایک گھر میں بیٹھ کر اس نے میرے بارے میں پوچھا تھا۔ اسے میرے اور تمہارے بارے میں بتایا گیا۔ وہ ہم دونوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ وہ پڑوس ملک کا سیاح تھا۔ شاید بنگلہ دیش یا پھر پاکستان......

بچہ چھین کر لے جانے کی وجہ سے شدت غم سے نڈھال ہو کر بے ہوش ہو گئی تھی۔ کچھ عورتیں اسے اس کے گھر لے گئی تھیں۔ اس کے ہاں وہ سیاح خاصی دیر بعد پہنچا تو اس وقت وہ ہوش میں آ چکی تھی۔ لیکن غم سے برا حال تھا اور سینہ کوبی کر رہی تھی۔ اس شخص نے ان سے کچھ دیر باتیں کیں۔ وہ اس کی باتوں سے نہ صرف بہل گئی بلکہ خوش ہو گئی تھی۔

وہ سیاح ہی جادوگر ہوگا۔ وہ اس بچے کو رہائی دلانے کے لئے نکلا۔ اسے ہمارے ٹھکانوں کا پتا بھی بتا دیا گیا۔ وہ روپا سے نمٹا۔ اس نے مندر میں قید مرد اور عورتوں کو نجات دلا دی۔ اب راستہ اس کے لئے صاف ہو گیا۔ روپا کی وجہ سے کوئی آ نہیں رہا تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ سیاح جادوگر گیا کہاں......؟ وہ یہاں ہوتا تو اب تک آ چکا ہوتا...... میرا خیال ہے کہ وہ شاید واپس چلا گیا ہے۔ اس لئے اس کا کوئی پتا نہیں چل رہا ہے۔''

''وہ دنیا کے کسی بھی حصے میں کیوں نہ ہو، وہ میرے گولے میں نظر آ جاتا۔'' رمنا جادوگر نے کہا۔ ''ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنے جادو سے اپنے آپ کو چھپا لیا ہو۔ وہ تمہارے اور میرے مقابلے پر اس لئے نہ آیا ہو کہ اسے شاید میری طاقت کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔ لوگوں نے اسے بتایا ہوگا کہ میں کیسا جادوگر ہوں۔ وہ خوف زدہ ہو کر نکل گیا ہوگا۔ اس لئے بھی کہ روپا اور ہمارے دو آدمیوں کا حشر نشر کرنے کے بعد اس کی ادھر آنے کی ہمت نہ ہوئی۔ ورنہ وہ میرے مقابلے پر آ چکا ہوتا۔''

''مجھے تمہاری ان باتوں سے اتفاق ہے۔'' سورج نے کہا۔ ''پھر بھی تم محتاط رہنا اور موکلوں سے کہنا کہ وہ نظر رکھیں۔''

''ہاں...... میں نے کہہ دیا ہے۔'' رمنا جادوگر بولا۔ ''اچھا یہ بتاؤ کہ بسنتی پور کی حویلی پر تمہیں کیا کچھ ملا؟''

''وہ کچھ ملا ہے کہ خواب میں بھی نہیں مل سکتا۔'' سورج نے خوش ہو کر جواب دیا۔ ''نہ میں نے سوچا تھا اور نہ ہی تم تصور کر سکتے ہو...... بسنتی پور کے ٹھاکر نے بھی سوچا نہیں ہوگا کہ اس کی ساری دولت ایک گھنٹے میں لٹ جائے گی۔ ایسا اونچا ہاتھ نہ تو میں نے کہیں مارا اور نہ ہی مار سکتا ہوں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ قسمت کی دیوی ایسی مہربان ہو جائے گی۔''

''کیا تمہیں وہاں سے رقم اور زیورات ملے؟'' رمنا جادوگر نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''اندازاً کتنے ہوں گے؟''

''رقم کی گنتی تو نہیں کی......'' سورج نے کہا۔ ''البتہ زیورات جو گٹھری میں لائے ہیں وہ ایک من سے زیادہ ہی ہوں گے۔''

''ایک من سے زیادہ......؟'' رمنا جادوگر تحیر زدہ رہ گیا۔ اسے جیسے یقین نہیں آیا۔ ''اتنا زیور اس کے پاس کہاں سے آ گیا؟''

''اصل بات یہ ہے کہ وہ اپنی بیٹی کو جو زیورات دے رہا تھا وہ بیس پچیس کلو سے کم نہ ہوں گے۔'' سورج کہنے لگا۔ اس کے خاندان کی اور دوسری مہمان لڑکیاں اور عورتیں جو تھیں وہ سب کی سب زیورات سے لدی پھندی تھیں۔ ہم نے ان تمام کے زیورات بدن سے اتروا لئے۔ میرے نام اور موت کے خوف

نے ان کے اوسان خطا کر دیئے۔ ہم ان کی عزت پر بھی ہاتھ ڈالتے تو وہ چون چرا اور مزاحمت نہیں کرتیں۔ ان میں کچھ لڑکیاں بہت حسین تھیں۔"

"حیرت کی بات ہے کہ اتنی حسین لڑکیوں کے ہوتے ہوئے بھی اپنے لئے ایک لڑکی بھی نہیں لائے؟" رمنا جادوگر بولا۔

"کیا تم مجھے بے وقوف اور بدذوق کہتے ہو؟" سورج ہنس کر بولا۔ "میں جب کبھی کسی ایسی جگہ گیا جہاں حسین اور بہت ہی پرکشش عورت ہوئی اسے اٹھالایا۔ میں ایک ایسی سندر لڑکی لے کر آیا ہوں جو تم نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی ہوگی۔"

"پھر تو تم نے کمال کر دیا میرے دوست!" رمنا جادوگر نے کہا۔ "وہ لڑکی کون ہے؟ کس عمر کی ہے؟"

"وہ لڑکی ٹھاکر کی بیٹی ہے۔" سورج اسے بتانے لگا۔ "اس کی ایک ہی تو بیٹی ہے جو بلا کی حسین ہے۔ اس کے حسن کا چرچا میں جانے کب سے سنتا آ رہا تھا۔ موقع ہی نہیں مل رہا تھا کہ اسے اٹھا کر لے آؤں۔ آج اٹھالایا۔ وہ دلہن بنی بیٹھی تھی۔ اس کی عمر سولہ برس سے زیادہ کی نہیں ہے۔ تم اسے دیکھو گے تو دل تھام لو گے۔"

"میں نے بھی اس کی بیٹی کی بہت تعریف سنی ہے۔" رمنا جادوگر نے کہا۔ "جب اس سے تمہارا دل بھر جائے، اس سے سیر ہو جائے تو پھر تم اسے میرے حوالے کر دینا۔"

"تم چنتا نہ کرو!" سورج نے کہا۔ "کیا میں نے کبھی تمہارا خیال نہیں کیا...... تمہاری بات نہیں رکھی؟"

"کیا تم مجھے اس کی ایک جھلک ابھی اور اسی وقت دکھانا پسند کرو گے؟ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں......"

"کیوں نہیں...... کیوں نہیں......"

سورج، رمنا جادوگر کو اس کمرے میں لے آیا جہاں دلہن گٹھری بنی بستر پر بیٹھی تھی۔ اس نے لمبا سا گھونگٹ نکالا ہوا تھا۔ جس میں اس کی صورت چھپ گئی تھی۔ اس کے جسم کا کوئی حصہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہاتھ پیر، سرخ ساڑھی کی سلوٹوں میں گم تھے۔ پھر وہ دونوں بستر کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ سورج اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"میری جان!" سورج کہنے لگا۔ "میں نے تمہارے پتاجی سے کہا تھا کہ میں تمہیں بیاہ کرنے کے بعد ہی ہاتھ لگاؤں گا۔ میں نے ان تمام لڑکیوں اور عورتوں سے بیاہ نہیں کیا جو میری زندگی میں آئی تھیں۔ اب چوں کہ یہاں کوئی پنڈت نہیں ہے جو ہمارا بیاہ کرائے۔ اب اسے لانے میں دیر ہو جائے گی۔ مجھ سے صبر نہیں ہو رہا تھا، تمہاری موہنی صورت دیکھنے کے بعد...... یہ بیاہ اور اگنی کے سات پھیرے سب بکواس اور ڈھکوسلے ہیں۔ دکھاوے ہیں۔

دلہن کسمسانے لگی۔ دوسرے لمحے سورج نے دلہن کا گھونگٹ الٹ دیا۔ ایک لمحے تک وہ دونوں اسے للچائی ہوئی نظروں سے اس طرح دیکھتے رہے جیسے بھیڑیا کچے گوشت کو دیکھتا ہے۔ وہ بہت ہی سندر، پیاری پیاری اور پرکشش لگ رہی تھی۔ سرخ لباس نے اس کے حسن و شباب کو نکھار دیا تھا۔

دوسرے ہی لمحے وہ دونوں اتنے زور سے اچھلے جیسے انہیں برقی جھٹکا لگا ہو۔ ان کے سامنے حسین

دلہن نہیں، بلکہ رمنا جادوگر کی بیٹی بیٹھی ہو۔

"سورج!" رمنا جادوگر حیرت اور غصے سے بولا۔ "یہ تو میری بیٹی ہے۔ تم اسے اٹھالائے ہو۔ جب کہ تم میری بیٹی کو جانتے ہو...... اسے پہچانتے ہو...... مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی سورج......!"

"نہیں رمنا!" وہ تحیرزدہ لہجے میں بولا۔ "تم میرے آدمیوں سے پوچھ لو...... میں نے اسے حویلی سے اٹھایا ہے۔ وہ ٹھاکر کی بیٹی ہی تھی۔ کیا میں ایسی گری ہوئی حرکت کر سکتا ہوں کہ تمہاری بیٹی کو اٹھالاؤں۔"

"اگر ایسی بات ہے تو ٹھاکر کی بیٹی کہاں گئی......؟" رمنا جادوگر بولا۔ "یہ یہاں کیسے آ گئی......؟ یہ کیا قصہ ہے؟"

"یہ تم خود اپنی بیٹی سے پوچھو......" سورج نے کہا۔ "تمہیں یہی بتا سکتی ہے کہ اصل بات کیا ہے؟"

رمنا جادوگر نے اس کے اور قریب ہو کر پوچھا۔ "بیٹی! سچ سچ بتاؤ...... اصل بات کیا ہے...... ڈرنے کی ضرورت نہیں۔"

"میں خود نہیں جانتی ہوں پتاجی!" اس نے حیرت زدہ لہجے میں جواب دیا۔ "میں اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ جب میں بیدار ہوئی تو اپنے آپ کو اس کمرے میں دلہن کے روپ اور لباس میں پایا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اپنی جگہ سے حرکت کروں۔ جب آپ دونوں کمرے میں آئے تو میں نے آپ کی باتیں سنتے ہی گھونگھٹ اٹھانا چاہا۔ لیکن میرے ہاتھ شل اور زبان گنگ ہو گئی۔"

"سن لیا تم نے......؟" سورج بولا۔ "لیکن یہ سب کیا ہے؟ کیا چکر ہے......؟ یہ کیسے ہو گیا آپ ہی آپ......؟"

"میں سارا چکر سمجھ گیا۔" رمنا جادوگر نے کہا۔ "یہ ساری کارستانی اس کمینے جادوگر کی ہے۔ اس نے اپنا جادو دکھایا ہے۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اس قدر زبردست جادوگر ہے۔" سورج ششدر ہو کر بولا۔ "ٹھاکر کی بیٹی کہاں گئی؟"

"وہ اپنی حویلی میں ہوگی......" رمنا جادوگر حیران اور خوفزدہ سا نظر آ رہا تھا۔ "ایسا جادو تو میں نہیں دکھا سکتا۔"

"تو اس جادوگر نے اسے حویلی میں پہنچا دیا ہوگا" سورج بولا۔ "تو اس کا بیاہ ہو جائے گا۔ ہوگا کیسے...... زیورات تو ہمارے پاس ہیں...... میں اس کی ساری رقم بھی لیتا آیا ہوں۔ اب اس کے پاس رکھا ہی کیا ہے۔"

"اچھا تم مجھے وہ گٹھری دکھاؤ جس میں رقم اور زیورات بھر کے اور باندھ کر لائے ہو۔" رمنا جادوگر نے کہا۔ جب ان دونوں کے سامنے سورج کے آدمیوں نے گٹھری کھولی تو اس میں رقم اور زیورات نہیں تھے۔ ان کے بجائے پتھر تھے۔ سورج نے اپنا سر پیٹ لیا اور رمنا جادوگر کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

☆......☆......☆

میں ایک لمحے میں جھیل کے پاس سے غائب ہو کر ٹھاکر کی حویلی پہنچ گیا۔ وہاں تو ایک صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔ ٹھاکرانی بڑے ہال میں چوکی پر غم سے نڈھال پڑی تھی۔ ٹھاکر اپنا سینہ دبائے کرسی پر بیٹھا تھا۔ خاندان کے تمام مرد اور عورتیں اور مہمان اس ہال میں جمع تھے۔ لڑکیاں اور عورتیں رو رہی تھیں۔ سارے ماحول پر ایک وحشت چھائی ہوئی تھی۔ سسکیاں اور آہیں گونج رہی تھیں۔ کسی کو اپنا ہوش نہیں تھا۔ میں ہال کی دہلیز پر کھڑا ان سب کو دیکھ رہا تھا۔ ان میں سے اب تک کسی کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی۔

میں خاموشی سے کھڑا دیکھتا رہا۔ ٹھاکر کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کے چہرے پر درد اور کرب کی لکیریں تھیں۔ اس کی بند آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ آخر وہ باپ تھا اور اپنی بیٹی کو حد سے زیادہ چاہتا تھا۔ ایک ڈاکو نے اس کی خوشیوں کو تاخت وتاراج کر کے رکھ دیا تھا۔ صدمے سے اس کا کلیجہ منہ کو آ رہا تھا۔ وہ مرد تھا، غم کو برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ٹھاکرانی بے ہوشی کی حالت میں پڑی تھی۔ اس کا چہرہ سفید پڑا ہوا تھا۔ سانس دھیرے دھیرے چل رہا تھا۔ وہ اتنا رو چکی تھی کہ آنسوؤں نے نہ صرف اس کا چہرہ بلکہ بلاؤز بھی بھگو کر رکھ دیا تھا۔ وہ ایک لاش کی طرح لگ رہی تھی۔ اسے ہوش میں لانے کی کوشش نہیں کی جا رہی تھی۔ اس لئے کہ ہوش میں آتے ہی اس پر پھر غم کا جان لیوا دورہ پڑے گا۔

”نریش......!“ ٹھاکر نے غم زدہ لہجے میں پکارا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ آنکھیں کھول کر غم کا ماحول شاید دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی آواز ویران، کھوکھلی اور بہت دور سے آتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔

ایک شخص جس کی عمر تیس بتیس برس کی ہو گی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹھاکر کے پاس آیا۔ ”جی چاچا......“

”لڑکے والوں کو فون کر کے کہہ دو کہ وہ برات لے کر نہ آئیں۔“ ٹھاکر نے زخم خوردہ لہجے میں رک رک کر کہا۔ ”سورج ڈاکو نے نہ صرف حویلی میں ڈاکہ مارا ہے بلکہ وہ دلہن کو بھی اغوا کر کے لے گیا ہے۔ ہمارے پاس اب کچھ نہیں رہا۔“

”جی اچھا چاچا......!“ نریش نے جواب دیا۔ اس کی آواز گلے میں رندھ رہی تھی۔

”نہیں ٹھاکر صاحب!“ میں نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ”آپ اپنے سمدھیانے میں یہ مت کہلوائیں۔ برات آنے دیں۔“

ٹھاکر نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا۔ اس کے پاس بیٹھے ہوئے ایک بوڑھے نے کہا۔ ”اس لئے کہ ہماری ناک کٹ جائے۔“

”نہیں ناک نہیں کٹے گی......!“ میں نے کہا۔ ”موہنی عزت سے بیاہ کر اس گھر سے رخصت ہو گی۔“

”یہ کوئی پاگل معلوم ہوتا ہے۔“ اس بوڑھے نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ”اسے کچھ نہیں معلوم کہ کیا قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔“

”کون ہو تم نوجوان......!“ ٹھاکر نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔ ”کاش! ایسا ہی ہوتا...... بے شک وہ بدمعاش رقم اور زیورات لے جاتا...... میری بیٹی موہنی کو نہ لے جاتا۔ تب بھی اس کا بیاہ عزت سے ہو جاتا۔“

”میں ایک سیاح ہوں، ٹھاکر صاحب!“ میں نے جواب دیا۔ ”اس حویلی سے رونے کی آوازیں سنائی دیں تو جاننے کے لئے اندر چلا آیا۔ آپ شانتی رکھیں...... موہنی موجود ہے۔ وہ اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہی ہے۔ رات کو رت جگا تھا نا...... اس کی وجہ سے بہت تھک کر سو گئی ہے۔ رات کے آخری پہر تو وہ کہیں جا کر سوئی ہے۔“

”یہ ہمارے زخموں پر نمک چھڑکنے آیا ہے۔“ ایک جوان عورت نے رونا بند کر کے تیز لہجے میں کہا۔

”میں زخموں پر نمک چھڑکنے نہیں بلکہ آپ لوگوں کو خوش خبری سنانے اور خوشیاں دینے آیا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”میں نے کہا نا کہ یہ پاگل ہے۔“ اس بوڑھے نے کہا۔ ”اس کی بکواس کیا سن رہے ہو؟ اسے دھکے دے کر باہر کیوں نہیں نکالتے ہو؟“

”ٹھاکر صاحب!“ میں نے کہا۔ ”آپ لوگ میری بات کا یقین کیوں نہیں کر رہے ہیں۔ کوئی جا کر موہنی کے کمرے میں جھانکتا کیوں نہیں ہے۔ پھر معلوم ہو گا۔ پاگل کون ہے...... میں پاگل نہیں ہوں۔ یہ سب غم سے پاگل ہو رہے ہیں۔“

”تمہیں نہیں معلوم کہ یہاں ایک گھڑی پہلے کیا کچھ ہو چکا ہے۔“ ٹھاکر نے کہا۔ ”سورج ڈاکو نے ڈاکہ مارا...... مال و دولت نہیں بلکہ میری پیاری بیٹی کو بھی وہ درندہ لے گیا۔“ ٹھاکر اتنا کہہ کر سسک پڑا۔

”نہیں...... وہ موہنی کو نہیں لے گیا بلکہ یہ سب آپ کی نظروں کو دھوکا ہوا ہے۔“ میں نے کہا۔

”ارے تم لوگ...... اس پاگل کی بکواس سنے جا رہے ہو۔“ اس بوڑھے نے نوجوانوں سے کہا۔ ”اٹھا کر باہر پھینک دو۔“

تین چار نوجوان فوراً ہی اٹھ کھڑے ہوئے تا کہ اس بوڑھے کی بات پر عمل کریں۔ ٹھاکر نے انہیں اشارے سے اس حرکت سے باز رکھنے کی کوشش بھی کی۔ لیکن وہ میری طرف بڑھے لیکن مجھے اٹھا کر باہر پھینکنے کی نوبت نہیں آئی۔

اسی وقت موہنی اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر آنکھیں ملتی ہوئی باہر آئی۔ ”اوہ...... یہ کیا ہو رہا ہے؟“ موہنی کی رسیلی آواز کا زیر و بم فضا میں لہرایا تو سب نے چونک کر اور اپنی گردنیں گھما گھما کر اس کی طرف دیکھا۔

ٹھاکر حیرت اور خوشی سے اچھل پڑا۔ اس کے سارے جسم میں جیسے بجلی بھر گئی تھی۔ وہ فوراً اٹھ کر بیٹی کی طرف لپکا اور سینے سے لگا لیا۔ ”موہنی......! میری بیٹی......! تم آ گئیں......؟ تم ٹھیک تو ہو نا......؟“

”میں گئی کب تھی پتا جی!“ موہنی حیرت سے بول اٹھی۔ ”میں جا بھی کہاں سکتی تھی؟ میں...... میں تو اپنے کمرے میں سو رہی تھی...... مجھے کیا ہوا...... میں اپنے کمرے سے آئی ہوں۔ یہ ماں جی کو کیا ہوا......؟ یہاں کیا ہو رہا ہے؟“

موہنی اپنے باپ کے بازوؤں سے نکل کر ماں کی طرف سرعت سے لپکی۔

موہنی کو دیکھ کر ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ کسی کو یقین نہیں آیا تھا کہ موہنی کمرے میں موجود تھی۔ اسے ڈاکو نہیں لے گئے تھے۔ ہال کی فضا بدلنے لگی۔ دو عورتیں ٹھاکرانی کو جھنجوڑ کر ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"ماں جی... چچی... ٹھاکرانی... ہوش میں آؤ۔ موہنی آگئی ہے... یہ دیکھو موہنی ادھر کھڑی ہے۔"

میں نے اس بوڑھے سے جو مجھے پاگل کہہ رہا تھا اور جوانوں سے کہا تھا کہ مجھے اٹھا کر باہر پھینک دیا جائے، سے کہا۔ "اور چاچا جی... اب بتاؤ... پاگل کون ہے؟ آپ یا میں...؟ ان سے کہیں نا مجھے دھکے دے کر نکال دیں۔"

"ارے بیٹے...! میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔" وہ بوڑھا خجل ہو کر بولا۔ "مجھے شما کر دو۔ تم تو ہمارے لئے بھگوان بن کر آئے۔ تم نہ آتے تو ہم سارا دن روتے دھوتے ہی رہتے۔ یہ سمجھتے کہ موہنی کمرے میں نہیں ہے۔"

"میں بھگوان نہیں، انسان ہوں۔ انسان کبھی بھگوان نہیں بن سکتا۔" میں نے کہا۔ "یہ دیدی بھی یہی کہہ رہی تھیں کہ میں زخموں پر نمک چھڑکنے آیا ہوں... میں خوشیاں دینے آیا تھا۔ خوشیاں مل گئیں نا...؟"

"ہاں بھیا!" وہ عورت بولی۔ "مجھے بھی شما کر دو... سورج ہم سب کے سامنے موہنی کے کمرے میں گھسا تھا اور اس نے کمرے میں جا کر موہنی کو کچھ سنگھا کر بے ہوش کر دیا تھا یا پھر موہنی بے ہوش ہو گئی تھی خوف سے... وہ اسے کندھے پر ڈال کر لے گیا۔"

"اصل قصہ کیا ہے میں بتاتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "موہنی کے کمرے میں کسی کام سے نوکرانی گئی... موہنی کا عروسی جوڑا بڑے صوفے پر رکھا ہوا تھا۔ اس کے دل میں بڑی آرزو تھی کہ موہنی کا جوڑا پہنوں... اس لباس میں وہ کیسی لگتی ہے، دیکھنا چاہتی تھی۔ اس نے دیکھا کہ موہنی گہری نیند سو رہی ہے۔ کمرے میں کوئی نہیں ہے۔ اس نے جلدی سے عروسی جوڑا اور زیورات پہن لئے۔ وہ سنگار میز کے آئینے میں اپنا جائزہ لے رہی تھی کہ سورج کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے فوراً ہی زیورات اتار پھینکے۔ وہ خوف سے بے ہوش ہو گئی۔ سورج نے اسے ہی موہنی سمجھا اور اٹھا کر کمرے سے نکل گیا۔ موہنی سوتی رہی۔ اسے کچھ پتا بھی نہیں چلا۔"

"لیکن یہ ساری تفصیل تمہیں کس نے بتائی...؟" اس عورت نے پوچھا، جسے میں نے دیدی کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

"مالنی نے..." میں نے جواب دیا۔ "ورنہ مجھے ان باتوں کا علم کیسے ہو سکتا تھا؟"

"مالنی نے...؟" اس بوڑھے نے حیرت سے کہا۔ "جب ڈاکو اسے موہنی سمجھ کر لے گئے تھے تو اسے چھوڑ کیسے دیا؟"

"ہوا یہ کہ کچھ دور جانے کے بعد مالنی ہوش میں آ گئی... جب اس نے بتایا کہ وہ موہنی نہیں ہے تو انہوں نے اسے چھوڑ دیا۔" میں نے کہا۔

"لیکن ڈاکوؤں نے اس کی بات کا یقین کیسے کر لیا...؟" اس بوڑھے نے سوال کیا۔ "جب کہ وہ دلہن کے لباس میں تھی۔"

"اس لئے یقین کر لیا کہ انہیں احساس ہوا کہ یہ موہنی نہیں ہے، کیوں کہ موہنی بہت حسین ہے۔ وہ یہ بات جانتے تھے۔" میں نے کہا۔

"لیکن تمہیں مالنی ملی کہاں...؟" ٹھاکر نے پوچھا۔ "اس نے تمہیں یہ سب کچھ کیوں بتایا؟ کیا وہ تمہیں جانتی اور پہچانتی ہے؟"

"میں نے بتایا نا کہ میں ایک سیاح ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "میں ادھر بس سے اتر کر پیدل چلنے لگا۔ کیونکہ یہ جگہ مجھے بہت خوب صورت لگی۔ بڑے دل کش نظارے تھے۔ یہ ایک ویرانہ تھا۔ وہاں وہ ایک درخت کے پیچھے کھڑی ہوئی تھی۔ خوف زدہ ہو رہی تھی۔ کیونکہ دور سے دو بدمعاش اسے آتے دکھائی دیئے تھے۔ مالنی نے انہیں دیکھ لیا تھا لیکن ان کی نظر مالنی پر نہیں پڑی تھی۔ مالنی نے مجھ سے کہا کہ میں اسے اس کے گھر پہنچا دوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بدمعاش اس کی عزت کے دشمن بن جائیں۔ گھر جاتے وقت اس نے راستے میں سارا قصہ مجھے سنایا۔ پھر اس نے اپنے گھر پہنچ کر موہنی کا عروسی جوڑا نکال کر دیا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس نے سورج کو دیکھ کر زیورات اتار کر پلنگ کے نیچے پھینک دیئے تھے۔ ڈاکو کو اس کا خیال نہیں آیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں یہ عروسی جوڑا حویلی پہنچا دوں... لہٰذا میں یہ جوڑا لے کر آیا ہوں۔"

میں نے دستی بیگ سے عروسی جوڑا نکال کر ٹھاکر کی طرف بڑھا دیا۔ وہ بڑی نفاست سے تہہ کیا ہوا تھا۔

"مالنی کہاں ہے...؟" اس بوڑھے نے سخت لہجے میں پوچھا۔ "وہ تمہارے ساتھ آئی کیوں نہیں؟"

"اس لئے کہ وہ غریب یہاں آنے سے ڈر رہی تھی کہ کہیں ٹھاکرانی اس کی چمڑی نہ ادھیڑ دے۔" میں نے جواب دیا۔

"وہ میتی اس قابل ہے کہ اس کی چمڑی ادھیڑ دی جائے۔" اس بوڑھے نے برہمی سے کہا۔ "کم ذات، بدبخت..."

"اس کا سر منڈوا کر گدھے پر بٹھا کر پورے گاؤں میں گھمایا جائے..." ایک عورت نے کہا جو موہنی کی پھوپھی تھی۔

"آپ لوگ اس پر غصہ کیوں ہو رہے ہیں...؟" میں نے کہا۔ "اس غریب اور معصوم نے ایسا کون سا جرم کیا جو آپ لوگ اسے اتنی بڑی اور عبرت ناک سزا دینا چاہتے ہیں۔ وہ اس گھر میں پانچ برسوں سے سیوا کر رہی ہے۔ وہ اس گھر کو اپنا گھر سمجھ کر کام کرتی آ رہی ہے۔"

"اس نے کیا نہیں کیا...؟" وہ بوڑھا بھڑک اٹھا۔ "اس نے موہنی بیٹی کا شادی کا جوڑا پہن کر نجس اور پلید کر دیا... اس کمینی کی یہ جرأت اور مجال... کیا یہ جرم نہیں ہے؟ وہ نالی کا کیڑا... اپنی اوقات بھول گئی۔ اس کی سزا یہ ہے کہ اس کے منہ اور بدن پر تیزاب پھینک دیا جائے... اور اسے بستی سے نکال دیا جائے۔ اب وہ یہاں رہنے کے قابل نہیں رہی۔"

"اب اتنا قیمتی اور شان دار جوڑا کہاں سے آئے گا؟" موہنی کی پھوپھی بولی۔ "یہ خاص طور پر آرڈر دے کر سلوایا گیا تھا...... ساڑی بھی خاص طور پر آرڈر سے تیار ہوئی تھی...... پورے بیس دن لگے ہیں۔ یہ چالیس ہزار روپے کا ہے۔"

"تو کیا آپ لوگوں کے نزدیک مالنی کی سیوا کی قدر وغیرہ نہیں ہے؟" میں نے موہنی کی پھوپھی سے دریافت کیا۔

"نہیں......" پھوپھی نخوت سے بولی۔ "اس نے مفت میں تھوڑی سیوا کی ہے۔ وہ ہر ماہ پگار لیتی رہی ہے۔"

"اس نے یہ عروسی جوڑا پہن کر جو نیچ حرکت کی ہے۔ اس کے بارے میں کہو۔ بھاڑ میں ڈالو اس کی سیوا کو......؟" بوڑھا غصہ میں بولا۔

"سنئے......" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "آپ لوگوں کو شرم آنی چاہئے، ڈوب مرنا چاہئے، اس عظیم ہستی کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے۔"

"عظیم ہستی......؟" پھوپھی کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ "تم اس نیچ کو عظیم ہستی کہہ رہے ہو......؟ کہیں اس لئے تو نہیں کہ اس نے راستے میں تمہیں خوش کر دیا اور تم پر وہ مہربان اور عاشق ہو گئی۔ وہ کمینی ایک بلا ہے۔ کم حسین بھی نہیں ہے۔"

"شریمتی جی! آپ کو اس قسم کی باتیں کرتے ہوئے شرم آنی چاہئے۔" میں نے کہا۔ "آپ کی جگہ کوئی مرد ہوتا تو میں اس کا منہ توڑ دیتا......"

"اچھا......" مردوں میں سے ایک کڑیل اور دراز قد جوان آدمی میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ پھوپھی کا بیٹا تھا۔ عمر میں مجھ سے دو تین برس بڑا ہو گا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنکھوں میں درندگی ابھر آئی۔ "تم میرا منہ توڑ کر دکھاؤ......"

"میں یہاں لڑنے اور اس خوشی کے موقع پر بدمزگی پیدا کرنے نہیں آیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم جا کر اپنی جگہ خاموشی سے بیٹھ جاؤ۔"

"جگ دیش!" ٹھاکر نے ہذیانی لہجے میں کہا۔ "لڑائی جھگڑا نہ کرو۔ اس شخص نے یہاں آ کر ہم پر بڑی دیا کی ہے۔"

"نہیں...... میں اس نامرد کو سبق دینا چاہتا ہوں۔" جگ دیش نے کہا۔ "اس نے میری ماں کی تذلیل اور توہین کی ہے۔"

"تمہاری ماں کو ایسی بات نہیں کہنی چاہئے تھی......" میں نے قدرے نرمی سے کہا۔ "جب کہ میں ایک اجنبی اور سیاح ہوں اور تم نے مجھے نامرد کہہ کر یہ ثابت کر دیا کہ تم بھی ایک نیچ اور گھٹیا شخص ہو۔ کیا تمہارے ماں باپ نے تمہیں بات کرنے کی تمیز نہیں سکھائی کہ کس سے کیسے بات کی جاتی ہے۔ آدمی کی پہچان بات چیت سے ہوتی ہے۔ پیسے اور اچھے کپڑے پہننے سے نہیں......"

جگ دیش آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے جھپٹ کر میرا گریبان پکڑ لیا۔ پھر مجھے مارنے کے لئے اس نے اپنا مکا فضا میں بلند کیا۔ میں نے اس سے پہلے ہی ایک بھرپور مکا اس کے جبڑے پر رسید کر دیا۔ وہ الٹ کر لڑکھڑاتا ہوا کئی قدم دور جا کر مردوں پر گر پڑا۔

اس کا جبڑا نہ صرف سوج گیا تھا بلکہ دو دانت باہر آ گئے اور منہ سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔ میرے اس زوردار مکے نے اس کی عقل ٹھکانے لگا دی۔ اس کی آنکھیں خوف و دہشت سے پھیل گئیں۔ اسے یقین نہیں آیا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ جگ دیش برداشت نہ کر سکے گا۔ مشتعل ہو کر مجھ پر حملہ آور ہو گا۔ لیکن وہ بزدلوں کی طرح سہم کر رہ گیا تھا۔

"تم لوگ تماشا کیا دیکھ رہے ہو......؟" جگ دیش کی ماں بھڑک اٹھی۔ "اس کی یہ مجال کہ اس نے میرے بیٹے کا منہ توڑ دیا۔ جبڑا توڑ دیا...... دانت توڑ دیئے...... تم لوگ اس کا مار مار کر بھرکس نکال دو۔ یہ سمجھتا کیا ہے۔"

"سشما! بات کو ختم کرو، آگے نہ بڑھاؤ۔" ٹھاکر نے گرج دار آواز میں کہا۔ "جگ دیش کو کیا ضرورت تھی اس سے الجھنے اور نامرد کا طعنہ دینے کی۔ پہل جگ دیش نے کی اور اس نے ہاتھ اٹھایا۔ وہ ہر جگہ اپنی بدمعاشی دکھاتا پھرتا ہے۔ آج اسے اچھا سبق ملا ہے۔"

"بھیا! آپ اس کی حمایت بلاوجہ کر رہے ہیں۔" پھوپھی نے کہا۔ "سب کے سامنے بے عزتی ہو گئی۔ ہماری عزت کیا رہ گئی۔"

"جگ دیش نے خود اس خاندان کی بے عزتی کی ہے۔" ٹھاکر نے کہا۔ پھر وہ میری طرف مخاطب ہوا۔ "آپ کیا کہہ رہے تھے، مالنی کے بارے میں...... آخر آپ اس کی حمایت کیوں کر رہے ہیں؟ کیا کسی کی شادی کا جوڑا پہننا اچھی بات ہے؟"

"مالنی نے...... اس کا جوڑا پہن کر نہ صرف اس خاندان کی عزت بچا لی بلکہ اس نے ایک ایسا احسان کیا ہے کہ ساری زندگی اس خاندان کی عزت اور آپ لوگوں کا سر اس کے سامنے جھکا رہے گا۔ آپ لوگ کبھی اس کے آگے سر نہ اٹھا سکیں گے۔" میں نے کہا۔

"وہ کیسے......؟" بوڑھا غرایا۔ "ایسا لگ رہا ہے کہ اس کمینی نے تمہیں کچھ گھول کر پلا دیا ہے۔"

"یہ میں بعد میں بتاتا ہوں۔" میں نے بوڑھے سے کہا۔ "آپ یہ بتائیں کہ دولت کی اہمیت ہے یا ایک لڑکی کی عزت کی۔ موہنی کی عزت و آبرو کی......؟"

"موہنی کی عزت و آبرو کی......" بوڑھے نے جواب دیا۔ "اسے کچھ ہو جاتا تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے۔"

"اگر مالنی عروسی لباس نہ پہنتی تو پھر سورج، موہنی کو اٹھا کر لے جاتا۔" میں نے کہا۔ "وہ مالنی کو موہنی سمجھ کر لے گیا تھا۔ اس طرح موہنی اور اس خاندان کی عزت بچ گئی...... کیا مالنی نے اس طرح آپ لوگوں پر دیا نہیں کی......؟"

”ہاں......ہاں......اس نے واقعی دیا کی ہے۔“ ٹھاکر بول اٹھا۔”اس کی اس حرکت کی وجہ سے موہنی اور خاندان کی عزت بچ گئی......ہم مالنی کا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھولیں گے۔ اسے اتنا کچھ انعام دیں گے کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتی۔“

”اگر ایسی بات ہے تو سورج پھر موہنی کو لے جانے آسکتا ہے۔“ بوڑھے نے کہا۔”عورتیں اس کی کمزوری ہیں۔“

”اب وہ نہیں آئے گا......“ میں نے کہا۔”جب انہوں نے مالنی کو گھوڑے سے اتارا تو واپس دہلی جانے والے تھے کہ انہیں بہت دور سے پولیس آتی دکھائی دی تو وہ موہنی کا خیال چھوڑ کر اپنے اڈے کی طرف چلے گئے۔“

”کیا اب وہ کبھی اور کسی وقت واپس نہیں آسکتے ......؟“ بوڑھے نے خوف و خدشہ ظاہر کیا۔”سورج ایک مرتبہ جس چیز کو حاصل کرنے کا فیصلہ کرلیتا ہے پھر وہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتا ہے جب تک اسے حاصل نہ کرلے اور پھر موہنی تو حسین گڑیا ہے۔ وہ ایک اوباش اور ہوس پرست ہے۔ جنونی ہے۔ لہٰذا اس کی واپسی کا خطرہ اور امکان ہے۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ موہنی کی شادی نہیں ہوسکے گی؟“ ٹھاکر نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔”ہمیں بیٹی کی خوشیاں نصیب نہیں ہوں گی؟“

”وہ اتنی بڑی رقم اور من بھر کے قریب زیورات لے گیا ہے۔ کیا پھر وہ موہنی کے لئے آئے گا؟“ ایک عورت نے پوچھا۔

”اس کمینے کتے اور ذلیل کا کوئی بھروسا نہیں......“ ٹھاکر نے کہا۔”اس کا کام ہی کیا ہے۔ ڈاکے مارنا۔ جوان لڑکیوں اور عورتوں کو اٹھالینا...... مجھے تو اس بات کا بھی خوف، خدشہ اور خطرہ ہے کہ کہیں وہ برات کو راستے میں نہ لوٹ لے۔“

”آپ لوگ اس کی چنتا نہ کریں۔“ میں نے ٹھاکر کو دلاسا دیا۔”آپ پولیس کو فون پر صورت حال سے آگاہ کردیں۔ پولیس اور فوج اس راستے پر مورچہ بندی کرلے گی جو برات کے آنے کا ہے۔ شادی کے بعد دلہا دلہن اور برات شہر چلی جائے گی۔ سورج اس شہر میں صرف موہنی کے حصول کے لئے کوئی کارروائی نہیں کرے گا۔ اسے وہاں سے موہنی کو اٹھا کرلے جانا آسان نہیں۔“

”تمہاری بات دل کو لگتی ہے۔“ ٹھاکر نے کہا۔”میں ابھی اور اسی وقت پولیس کمشنر کو فون کردیتا ہوں۔“

”اور ہاں......“ میں نے کہا۔”مالنی نے آپ سب لوگوں پر اس خاندان پر ایک اور احسان عظیم کیا ہے؟“

”کیسا احسان......؟“ اس خرانٹ بوڑھے کا منہ بن گیا۔ اس کا لہجہ زہر آلود تھا۔”یہ کیا تم مالنی کی تعریف کئے جارہے ہو۔“

”تم اپنی چونچ بند رکھو......!“ مجھے غصہ آگیا۔”میں نے اب تک تمہارا بہت لحاظ کیا۔ اس لئے کہ تم بوڑھے اور اس خاندان کے معزز فرد ہو۔ میں ٹھاکر صاحب سے بات کررہا ہوں۔ تمہیں تو منہ لگانا بھی نہیں

چاہتا۔ تم مالنی سے اس لئے خار کھارہے ہو، اس سے نفرت کرتے ہو کہ دیوالی کے دن تمہارے بیٹے امرت نے تنہائی میں اس کی عزت پر حملہ کیا اور دست درازی کی تو مالنی نے اس کی ایسی درگت بنائی کہ اسے اسپتال جانا پڑا۔ اس نے اپنی عزت بچالی......اور اسے اس لئے حقیر سمجھتے ہو کہ وہ ایک نوکرانی ہے۔“

اس بوڑھے کا منہ بن گیا۔ زرد پڑگیا۔ محفل پر ایک سناٹا سا چھا گیا۔ کیوں کہ اس واقعہ کا علم کسی کو نہ تھا۔ اس کا بیٹا ایک جھٹکے سے کھڑا ہوا تاکہ میری خبر لے۔ پھر اس نے جگ دیش کی طرف دیکھا۔ جس کی مرہم پٹی ایک کونے میں کی جارہی تھی۔”یہ جھوٹ ہے......بکواس ہے......“ وہ ہیجانی لہجے میں چلایا۔”میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔ ہڈیاں توڑ دوں گا۔ تم میرے بیٹے پر سب کے سامنے گندگی اچھال کر ذلیل کرنا چاہتے ہو......؟“ بوڑھا غرایا۔”اس کمینی نے تم سے غلط بیانی کی ہے۔ میرے شریف اور معصوم بیٹے پر سراسر بہتان لگایا ہے۔ میں اس حرام زادی کو بعد میں دیکھوں گا۔“

”تم اپنی شرافت اپنے پاس رکھو اور معصوم بیٹے کے گن نہ گاؤ۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔”اس کے کرتوتوں سے تمہارا سارا خاندان واقف ہے۔ اس نے ایک اچھوت، کم سن لڑکی کو داغ دار کیا تھا۔ جیل چلا گیا تھا۔ کیا تم نے پولیس کو کھلا پلا کر معاملہ رفع دفع نہیں کروایا تھا......؟ تم کس منہ سے اسے شریف اور معصوم کہہ رہے ہو۔“

”کمینے ......ٹھہر تجھے مزا چکھاتا ہوں۔“ وہ دانت پیستا ہوا لوگوں کے درمیان راستہ بناتا میری طرف بڑھنے لگا۔

”سنو......“ میں نے اسے للکارا۔”ذرا سوچ سمجھ کر آنا۔ جگ دیش کے صرف دو دانت باہر آئے ہیں۔ تمہارے بتیس......؟“

”امرت!“ ٹھاکر نے تڑختے لہجے میں کہا۔”تم اپنی جگہ بیٹھو......خبردار! ان سے الجھنا نہیں...... ورنہ میں تمہیں دھکے دے کر نکلوادوں گا۔“

امرت رک گیا اور مجھے اس طرح گھورنے لگا جیسے کچا چبا جائے گا۔ اس کا چہرہ غصے سے چقندر کی طرح ہورہا تھا۔ ٹھاکر نے دوسرے لمحے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔”اس کا دوسرا احسان ہم لوگوں پر کیا ہے؟“

”میں اس شرط پر بتاؤں گا کہ آپ اسے ایک لاکھ روپے انعام دینے کا وعدہ کریں۔“ میں نے کہا۔”اسے بلا کر آج ابھی اور اسی وقت......وہ اس انعام کی مستحق بھی ہے۔ دیکھا جائے تو ایک لاکھ کیا، پانچ لاکھ روپے کا انعام بھی کم نہیں۔“

”اگر واقعی اس کا احسان ایسا ہوا تو میں انعام ایک لاکھ سے بڑھا کر دو تین لاکھ روپے کردوں گا۔“ ٹھاکر نے یقین دلایا۔

”اس کا احسان یہ ہے کہ آپ کی رقم اور آپ کے اور سب عورتوں کے زیورات جو سورج ڈاکو نے اتروا کر ایک گٹھری میں باندھے تھے، اس نے ان کی نشان دہی کی تھی اور ہم دونوں مل کر وہ گٹھری لے آئے

ہیں۔" میں نے کہا۔

"سچ!" ٹھاکر کا چہرہ دمک گیا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا اور سارے ہال میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اس وقت تک ٹھاکرانی ہوش میں آچکی تھی۔ وہ ساری باتیں سن رہی تھی۔ موہنی کو ڈاکے کے بارے میں بالکل بھی علم نہ تھا۔ کیونکہ دیر تک رات جاگنے کے باعث ایسی گہری نیند سوئی تھی کہ ڈاکا پڑنے پر بھی اس کی آنکھ کھل نہ سکی تھی۔ "کہاں ہے وہ گٹھری جس میں رقم اور زیورات رکھے ہوئے ہیں؟" ٹھاکرانی نے پوچھا۔ اس کا چہرہ دمکنے لگا۔

"وہ میں حویلی میں لے آیا ہوں......" میں تے کہا۔ "سب لوگ اپنی اپنی جگہ آرام سے بیٹھیں...... پہلے ٹھاکرانی اپنے اور اپنی بیٹی کے زیورات الگ کریں گی۔ ٹھاکر اپنی رقم اٹھالیں گے جو لاکھوں کی ہے۔ اس کے بعد ایک ایک عورت آئے گی اور اس میں سے اپنے اپنے زیورات الگ کر کے اٹھالے گی۔ کسی کو ہڑبونگ مچانے کی کوئی ضرورت نہیں......"

"اچھا اب میں سمجھی کہ مالنی کیوں نہیں آئی؟" موہنی کی پھوپھی بولی۔ "اس نے گٹھری میں سے یقیناً کچھ زیورات پار کیے ہوں گے؟"

"آپ لوگ بڑے پیسے والے ہیں لیکن ذہنیت اور فطرت کتنی گھٹیا ہے۔ اگر اسے زیورات چوری اور ہڑپ کرنے ہوتے تو وہ گٹھری اپنے گھر لے جاتی۔ پھر اس کے گھر والے اور وہ کسی دوسرے شہر میں جا کر بس جاتے۔ راتوں رات دولت مند بن جاتے...... اس نے اس گٹھری میں سے ایک روپیہ بھی نہیں نکالا اور انگوٹھی بھی نہیں لی۔ کیل اور بندہ بھی نہیں۔"

"لیکن یہ گٹھری اسے ملی کہاں......؟" ٹھاکر نے ششدر ہو کر پوچھا۔ "سورج اسے کیسے اور کہاں چھوڑ گیا؟"

سورج نے اس گٹھری کو ایک گھوڑے پر رکھ کر باندھ دیا تھا۔ جب انہوں نے مالنی کو رہا کیا تھا تب انہوں نے دور سے پولیس اور فوج کو اپنی سمت آتے دیکھ لیا تو تیزی سے گھوڑے دوڑا دیئے تھے۔ کسی وجہ سے وہ گٹھری اس گھوڑے سے گری اور ایک گڑھے میں لڑھک گئی، جس کی ان میں سے کسی کو خبر نہ ہو سکی۔ مالنی نے یہ سب کچھ دیکھ لیا تھا۔ وہ اس گٹھری کی وجہ سے وہاں کھڑی رہ گئی تھی۔ چوں کہ اس نے اس گھر کا نمک کھایا تھا، اس لئے وہ ایمان داری سے اس گٹھری کو اس کے مالک کو پہنچا دینا چاہتی تھی۔ وہ دو بدمعاشوں کو دیکھ کر ایک درخت کے پیچھے چھپی کھڑی تھی۔ پھر اس نے مجھے اعتماد میں لے کر سب کچھ بتا دیا۔ ہم گٹھری لے آئے۔"

میں نے توقف کر کے کہا۔ "اور یہاں مالنی بھی آئی ہوئی ہے۔ وہ ایک کمرے میں موجود ہے۔"

پھر میں باہر سے راہ داری سے گٹھری اٹھا کر لایا۔ اسے ٹھاکر کے سامنے رکھ دیا۔ پھر میں نے گٹھری کھول دی۔ نہ صرف ٹھاکر بلکہ سبھی خواب کی سی حالت میں رقم اور زیورات کو دیکھ رہے تھے۔ انہیں امید نہیں تھی کہ ان کے زیورات ڈرامائی انداز میں واپس مل جائیں گے۔ سب سے پہلے ٹھاکر نے نوٹوں کی گڈیاں اٹھائیں۔ پھر موہنی اور ٹھاکرانی نے مل کر اپنے اپنے تمام زیورات الگ کر کے اٹھا لئے...... اس

میں خاصی دیر لگ گئی تھی۔ ان کے زیورات زیادہ تھے۔

"تمام لڑکیاں اور عورتیں ایک قطار بنالیں۔" میں نے کہا۔ "ایک ایک کر کے گٹھری کے پاس آئیں اور اپنا زیور تلاش کر کے نکال لیں...... ایک بات یاد رکھیں۔ اگر کسی نے بے ایمانی کی اور کسی دوسرے کا زیور اٹھایا تو وہ سانپ بن جائے گا۔"

ٹھاکرانی نے میری تائید کی اور اس نے لڑکیوں اور عورتوں سے کہا تو وہ قطار بنانے لگیں۔ اس اثنا میں میں مالنی کو بلا لایا۔ پھر ٹھاکر سے کہا۔ "یہ کل رقم شاید بارہ لاکھ کی ہے...... اب آپ اپنی خوشی سے مالنی کو انعام دیں...... ایک لاکھ دیں یا دو لاکھ...... یہ آپ پر منحصر ہے۔ لیکن ایک لاکھ روپے سے کم نہیں دیں گے......"

"انعام...... کیسا انعام......؟" مالنی نے حیرت سے کہا۔ "میں نے آپ سے تو نہیں کہا کہ مجھے مالک سے انعام دلائیں......؟ مجھے انعام نہیں چاہئے......!"

"دیکھا ٹھاکر صاحب آپ نے......؟" میں نے کہا۔ "یہ آپ کے گھر کی ایک معمولی سی نوکرانی ہے۔ لیکن کتنی بڑی ہے۔ کتنی اونچی ہے۔ آپ میں سے اسے کوئی چھو بھی نہیں سکتا...... وہ لاکھوں روپے کے انعام کو ٹھکرا رہی ہے۔"

"واقعی یہ لڑکی بڑی دیالو ہے۔" ٹھاکر نے کہا۔ "مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ معمولی سی لڑکی اتنی بلند، فراخ دل اور ہمارے گھرانے سے اتنی محبت کرنے والی ہے۔ اس کے دل میں ذرہ برابر بھی لالچ نہیں ہے۔ یہ تو ہیرا ہے ہیرا...... اب ہمیں اس ہیرے کی قدر ہو رہی ہے۔ میرے خاندان میں کوئی اتنی محبت کرنے والی ہستی ہے ہی نہیں...... نہ بے غرض ہے۔ ہر کسی کی آنکھیں میری دولت پر ہی لگی رہتی ہیں۔ میں اسے ایک نہیں، دو نہیں بلکہ پورے تین لاکھ روپے دوں گا۔"

مالنی کی جگہ کوئی اور نوکرانی ہوتی تو وہ تین ہزار روپے پا کر بھی خوش ہو جاتی۔ لیکن مالنی تین لاکھ روپے لینے کو تیار نہیں تھی۔ آخر میرے اور ٹھاکر کے اصرار پر اس نے رقم لے لی۔ پھر وہ اسے ایک چادر میں لپیٹ کر پرنم آنکھوں سے اپنے گھر چلی گئی۔

موہنی اور ٹھاکرانی نے تھوڑی دیر میں ان زیورات کے ڈھیر میں سے اپنے تمام زیورات الگ کر لئے اور موہنی کے کمرے میں لے گئیں۔ ارملا اور سرملا نامی دو عورتیں اس ڈھیر میں سے اپنے زیورات تلاش کرنے لگیں۔ ایک ہار جو بہت خوبصورت اور بے حد قیمتی بھی تھا۔ وہ ہار ارملا کا تھا۔ اس پر سرملا کا دل آگیا اور اس کی نیت میں فرق آگیا۔ جب وہ ہار اٹھانے لگی تو ارملا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر وہ بولی۔ "دیدی! تم جانتی ہو کہ یہ ہار میرا ہے۔ تم کئی بار مجھے پہنے ہوئے دیکھ بھی چکی ہو۔"

"جھوٹ مت بولو ارملا!" سرملا ایک دم سے بگڑ گئی۔ "کبھی تم نے خواب میں بھی یہ ہار دیکھا ہے۔ یہ ہار میرا ہے۔"

"میرے پتا جی نے اس ہار کو میری شادی کے لئے بنایا ہے۔" ارملا نے نرم لہجے میں کہا۔ "بھگوان کے لئے میرا ہار نہ لو۔"

"تمہارے پتا جی کی اوقات ہی کیا ہے؟" سرلا نے اس کے ہاتھ سے ہار چھین لیا۔ "وہ ایسا ہار بنائیں۔ یہ منہ اور مسور کی دال......"

"بھگوان کی سوگند لے لو، سرلا دیدی!" وہ سسک پڑی۔ "ماں جی اور پتا جی تھوڑی دیر میں آنے والے ہیں۔ ان سے پوچھ لینا۔"

"یہ ہار میرا ہے...... میرے پتی نے مجھے شادی کی تیسری سالگرہ پر دیا تھا۔ یقین نہ آئے تو پوچھ لو...... ہر چرن ادھر تو آؤ......" سرلا نے اپنے آدمی کو آواز دے کر بلایا جو مردوں میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر آیا۔

سرلا کا پتی بھی ان کی باتیں سن رہا تھا اور دونوں کو آپس میں الجھا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اس نے ہار دیکھ لیا تھا۔ اس کے دل میں بھی لالچ آ گیا۔ جبکہ وہ روپے پیسے والا آدمی تھا۔ ارملا کے گھر والوں کے مقابلے میں اس کی حیثیت اچھی تھی اور پھر آپس میں رشتہ دار بھی تھے۔ سرلا کے اشارے سے بلانے پر وہ اس کے پاس گیا تو سرلا نے آنکھوں سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اسے بتادو کہ یہ ہار کس کا ہے اور اسے تم نے شادی کی تیسری سالگرہ پر بنایا تھا۔ یہ کہہ رہی ہے میرا ہے۔"

"ارملا بہن......!" ہر چرن نے عیاری سے کہا۔ "تمہاری دیدی ٹھیک کہہ رہی ہے۔ یہ ہار اس کا ہے۔ میں نے اسے بنایا تھا۔"

"بھگوان کی سوگند لے لیں۔ ہر چرن بھیا!" ارملا نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "یہ میرا ہار ہے...... آپ کا ہار شاید اس سے ملتا جلتا ہوگا۔ اسے تلاش کر لیں۔ ان زیورات کے ڈھیر میں کہیں دب گیا ہوگا۔ بھگوان کے لئے مجھے میرا ہار دے دیں۔"

"تم ایک ہار کے لئے بھگوان کی جھوٹی سوگند کھا کر اپنا ایمان کر رہی ہو ارملا۔" سرلا بگڑ گئی۔ "تمہیں شرم نہیں آتی۔ یہ میرا ہار ہے۔ میں کسی قیمت پر یہ ہار نہیں دوں گی۔ تمہارے پتا جی، ماتا جی بھی آکر کیوں نہ کہیں کہ یہ ہمارا ہار ہے۔"

"سرلا!" مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے کہا۔ "تم یہ ہار ارملا کو دے دو۔ یہ اس کا ہار ہے۔ تم اور تمہارا پتی جھوٹ بول رہے ہو۔"

"تم کون ہوتے ہو ہمارے معاملے میں دخل دینے والے......؟" سرلا برافروختہ ہوگئی۔ "ارملا جھوٹی ہے اور اس ماں باپ بھی جھوٹے اور ایک نمبر کے فراڈی ہیں۔ اس کا ہزار بارہ سو روپے کا ہار ہوگا۔ یہ میرا بارہ ہزار روپے کا ہار ہے۔"

"میں نے کیا کہا تھا۔ تم اس بات کو بھول رہی ہو۔" میں نے کہا۔ "اگر کسی نے لالچ میں آکر کسی دوسرے کا زیور ہتھیانے کی کوشش کی تو وہ سانپ بن جائے گا۔ یہ ہار ارملا کا ہے۔ ارملا کو دے دو۔ یہ تمہارے پتی کا ہے اور نہ تمہارے پتا جی کا......"

"اونہہ سانپ بن جائے گا......؟" سرلا نے بڑی حقارت سے کہا۔ پھر وہ ہار گلے میں پہننے لگی۔ دوسرے لمحے جب اس نے ہار پہن لیا تو وہ ہار سانپ بن گیا۔ اس کے گلے میں لپٹ کر اپنا پھن اٹھانے لگا۔

"سانپ...... سانپ......!" ہر چرن دہشت زدہ ہوکر چیخا اور تیزی سے دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی آواز حلق میں اٹک رہی تھی۔ "اسے نکال کر پھینک دو...... ورنہ یہ تم کو ڈس لے گا سرلا!"

سرلا کو ابھی تک کچھ خبر نہیں ہوئی تھی۔ وہ مفت کا اور چوری کا مال پہن کر خوش ہو رہی تھی۔

"سانپ...... سانپ......" ہال میں بیٹھے مرد اور عورتیں خوف زدہ ہوکر اور سہم کر چیخنے چلانے لگے۔ موہنی کی پھوپھی نے ایک دل خراش چیخ ماری۔ "سرلا! واقعی یہ ہار سانپ بن گیا ہے۔ اسے نکال پھینکو......"

اس لمحے اس سانپ نے سرلا کی نظروں کے سامنے اپنا پھن لہرا تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ اس کا بدن لرزنے لگا۔ پھر وہ خوف و دہشت سے بے ہوش ہوکر فرش پر گر پڑی۔ سانپ اس کے گلے میں لپٹا ہوا تھا۔

"میں نے کیا کہا تھا......؟" میں نے کہا۔ "لیکن میری بات کا کسی کو یقین نہیں آیا۔ اسے مذاق میں اڑا دیا گیا......"

"میری بچی کو بچاؤ......" سرلا کی ماں ہذیانی لہجے میں چیخی۔ "ورنہ یہ سانپ اسے ڈس لے گا۔ یہ مر جائے گی۔"

"اب کیوں اپنی بیٹی کا خیال آ گیا......؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اس وقت کیوں نہیں آیا جب تمہاری بیٹی ایک غریب کا مال ہڑپ کر رہی تھی...... اور تم چپ چاپ ایک طرف خاموش بیٹھی تماشا دیکھ رہی تھیں اور بڑی خوش ہو رہی تھیں کہ باپ کا مال ہے۔"

"ارے تم لوگ اٹھو...... سانپ کو مار دو...... دیکھ نہیں رہے یہ سانپ کتنا خطرناک ہے۔" وہ چیخی۔

"ہم اس سانپ کو کیسے ماریں؟" ایک آدمی نے کہا۔ "کس سے ماریں......؟ وہ تو سرلا کے گلے میں لپٹا ہوا ہے۔"

"ارملا......" میں نے کہا۔ "تم آگے بڑھو اور اس سانپ کو پکڑ لو۔ سرلا کو اچھی سزا مل گئی ہے۔"

"کون میں......؟" ارملا نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ "مم...... مم...... یہ مجھے ڈس لے گا۔ نہ۔ نہیں۔" وہ بوکھلا گئی۔

"سنو...... کچھ نہیں ہوگا۔" میں نے اسے دلاسا دیا۔

"یہ ہار چوں کہ تمہارا ہے۔ یہ تمہارے ہاتھ لگاتے ہی تمہارا ہار بن جائے گا۔"

"نہیں...... نہیں......" ارملا دہشت زدہ سی ہوگئی۔ "یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ جانے کس نے میرے ہار کو سانپ بنا دیا۔"

"جب میں اور مالنی اس گٹھری کو اٹھا کر لا رہے تھے تو راستے میں ایک سادھو ملا تھا۔ ہم نے اسے سارا واقعہ سنایا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس نے کہا تھا کہ اس گٹھری میں تو بہت سارے سونے کے زیورات

ہیں۔ معمولی بھی ہیں اور قیمتی بھی ہیں۔ عورتیں زیورات کے معاملے میں بڑی لالچی ہوتی ہیں۔ وہ قیمتی زیورات پر ہاتھ مارنے کی کوشش کریں گی۔ بے ایمانی اور ناانصافی ہوگی۔ اس لئے میں ایک کام کرتا ہوں۔ اس نے دو ایک منتروں کا جاپ کیا اور اس گٹھری پر دم کیا۔ پھر کہا۔ اگر کسی نے کسی دوسرے کے زیورات پر ہاتھ صاف کیا تو پھر وہ سانپ بن جائے گا۔ وہ اس صورت میں پھر سے زیور بن جائے گا۔ جب اس کا اصل مالک اسے ہاتھ لگائے گا۔

میں نے اسی لئے اس سادھو کی بات کہی تھی کہ اگر کسی نے کسی کا زیور اڑایا تو اسے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ لیکن میری بات کو اس نے مذاق سمجھا۔ سب نے دیکھ لیا کہ سرملا نے تمہارا زیور چھین لیا۔ وہ سانپ بن گیا۔ اب تم بلاخوف وخطر اس سانپ کو ہاتھ لگاؤ...... وہ پھر سے تمہارا زیور بن جائے گا۔ ڈرو نہیں ارملا......! آگے بڑھو۔"

"نہیں بھیا نہیں......" وہ حد درجہ خائف اور سراسیمہ ہو رہی تھی۔ "جانے کیوں مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔"

"اچھی بات ہے میں اسے پکڑتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "چونکہ میری نیت صاف ہے۔ یہ شاید پھر سے زیور بن جائے۔"

میں آگے بڑھا...... سرملا فرش پر بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔ اس کے قریب کوئی نہ تھا۔ اس کی ماں بھی نہ تھی۔ سب ڈرے اور سہمے ہوئے کھڑے تھے۔ ان کے چہرے سفید پڑے ہوئے تھے۔ کاٹو تو ان کے بدن میں لہو نہ تھا۔ ان کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ ساکت و جامد بت بنے ہوئے تھے۔ کسی میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ وہ وہاں سے نکل بھاگے۔

میں سرملا کے پاس جا کر دوزانو بیٹھ گیا۔ وہ سانپ خاصا لمبا اور موٹا بھی تھا۔ اس کا پھن بہت بڑا اور خوف ناک تھا۔ وہ اپنا پھن لہراتے ہوئے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔

جس وقت میں سانپ کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا رہا تھا تب مرد اور عورتوں کے جسموں پر سنسنی دوڑ گئی تھی۔ ان سب کا خیال یہ تھا کہ سانپ مجھے ڈس لے گا۔ سادھو نے جو بات کہی وہ غلط تھی۔ لیکن صحیح بھی مان رہے تھے کہ وہ ہار سانپ بن گیا تھا۔

میں نے جیسے ہی اس سانپ کے پھن کو پکڑا وہ ہار بن گیا۔ پورے ہال میں ایک بھن بھناہٹ سی گونجی۔ سرگوشیاں ہونے لگیں۔ وہ سب متحیر ہو گئے تھے۔ انہیں سادھو کی بات کا یقین آ گیا تھا جو میں نے انہیں بتایا تھا۔ پھر میں نے اس ہار کا ہک کھول کر سرملا کے گلے سے ہار نکالا۔ پھر اسے لے کر ارملا کے پاس گیا۔

"لو اپنا ہار پہن لو۔" میں نے اس کی طرف ہار بڑھاتے ہوئے کہا۔ "مبارک ہو کہ تمہیں یہ ہار واپس مل گیا...... شادی ہونے تک اتنا قیمتی ہار پہن کر کسی تقریب یا شادی میں آئندہ مت جانا اور تمہیں سادھو کی بات کا یقین بھی آ گیا؟"

"آپ کا بہت بہت شکریہ۔" ارملا ممنونیت سے بولی۔ "ایشور آپ کو سدا خوش رکھے۔ میں یہ واقعہ

اور آپ کا احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔ مجھے تو دکھ اس بات کا ہے، سرملا دیدی نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ ہار میرا ہے۔ پھر بھی انہوں نے ہڑپ کرنے کی کوشش کی...... کوئی اور ہوتا تو اتنا افسوس نہ ہوتا...... آخر انہیں اس سے کیا ملا؟ کیا انہوں نے خود کو اس طرح ذلیل و رسوا نہیں کیا؟"

"جب شیطان انسان کے شریر میں آ جاتا ہے تو پھر ایسا ہی ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ اپنی دیدی کو معاف کر دیں۔ کسی سے بدلہ لینے سے بہتر ہے کہ اسے معاف کر دیا جائے۔ وہ ساری زندگی آپ سے شرمسار رہے گی۔ نادم رہے گی۔"

سرملا نے جو حرکت کی تھی اس کا ایک طرح سے اچھا اثر ہوا تھا۔ پھر کسی نے کسی کے زیورات پر نظر نہیں ڈالی تھی۔ اپنا اپنا زیور اٹھا لیا تھا۔ پھر سبھی کے چہروں پر خوشی دوڑ گئی تھی۔ گھر کی فضا جو غمگین ہو گئی تھی۔ وہ پھر سے خوشی و مسرت میں تبدیل ہو گئی تھی۔

جب میں نے ٹھاکر سے رخصت چاہی تو اس نے بڑی محبت سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور محبت بھرے لہجے میں بولا۔

"معاف کرنا بیٹے......! ہم تمہاری کوئی سیوا نہ کر سکے اور اس ہنگامے میں تمہاری خاطر مدارت کا بھی خیال نہیں رہا۔ سچ پوچھو تو تم مسیحا بن کر آئے...... تم نہ آتے تو ہمیں خوشیاں نہ ملتیں...... غم و صدمے سے جانے کیا حال ہوتا...... تم ہمارے مہمان ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم بھی اس شادی کی خوشیوں میں شریک ہو کر ہماری عزت بڑھاؤ...... موہنی کا کوئی بھائی نہیں ہے۔ تم اسے ایک بھائی کی حیثیت سے رخصت کرو...... میں موہنی کو بلاتا ہوں...... وہ تمہارے ہاتھ پر راکھی باندھے گی۔"

"مجھے اور بھی بہت سارے کام کرنے ہیں اور وقت بھی بہت کم ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ مجھے اجازت ہی دے دیں۔ میں آپ کی اس محبت اور عزت کے لئے بہت ممنون ہوں۔ میں وعدہ تو نہیں کرتا لیکن کوشش کروں گا کہ شام کے وقت بیاہ کی تقریب میں شرکت کروں۔"

میں بڑی مشکل سے وہاں سے نکلا۔ حویلی سے باہر آ کر کچھ دور چلا تو ٹھنڈی سڑک آئی۔ ایک نسوانی آواز نے پکارا۔ "بھیا۔ بھیا...... ایک منٹ کے لئے رک جاؤ۔ آپ کہاں جا رہے ہو؟"

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ مالنی تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ میں رک کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ اس کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا۔ وہ میرے پاس آ کر رک گئی۔ تیز تیز چلنے کی وجہ سے اس کی سانس سینے میں بری طرح پھول رہی تھی۔ چہرے پر پسینہ پھوٹ پڑا تھا۔

"آپ مجھ پر اتنی بڑی دیا کر کے مجھ سے ملے بغیر ہی جا رہے ہیں۔" وہ شکایتی لہجے میں بولی۔ "میں کب سے آپ کا انتظار کر رہی تھی۔"

"بات یہ ہے مالنی بہن......!" میں نے کہا۔ "میں ایک پردیسی ہوں۔ مسافر ہوں۔ میں کہیں رکتا نہیں ہوں...... تم میرا انتظار کیوں کر رہی تھیں......؟"

"اس لئے کہ آپ نے ٹھاکر سے جو تین لاکھ کا انعام دلایا ہے اس میں سے آپ کو دو لاکھ روپے

دے دوں۔" وہ بولی۔

"دولاکھ روپے......؟" میں نے تحیرزدہ لہجے میں کہا۔ "وہ کس لئے......؟"

"اس لئے کہ آپ کے کارن مجھے اتنی بڑی رقم ملی۔" مالنی نے کہا۔ "ہم غریبوں نے کبھی اتنی بڑی رقم خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی اور نہ دیکھتے ہیں۔ ہمارے خواب بھی ہماری ہی طرح چھوٹے اور معمولی ہوتے ہیں۔"

"مالنی......!" میں ہنس پڑا۔ "معلوم نہیں بھگوان نے تمہیں کس مٹی سے بنایا۔ تم مجھے دولاکھ روپے اس طرح دینے آئی ہو جیسے یہ دوسو کی رقم ہو۔ تمہارے سینے میں کتنا بڑا، بھولا بھالا اور معصوم سا دل ہے، اچھا ہوا تم مجھے مل گئیں۔ سنو...... میں اس میں سے دو روپے بھی نہیں لوں گا۔ تم مجھے جس محبت اور جس جذبے سے یہ رقم دینے آئی ہو، یقین کرو ایسا لگ رہا ہے کہ مجھے دس لاکھ روپے مل گئے ہیں۔ کوئی دس لاکھ دیتا بھی تو اتنی خوشی نہ ہوتی جتنی تمہاری فراخ دلی سے ہورہی ہے۔ مجھے اوپر والے نے بہت کچھ دیا ہے۔ اس لئے مجھے دولت کی کوئی خواہش نہیں ہے۔ کسی کی محبت اور خلوص ہی میرے لئے سب سے بڑی دولت ہے۔"

"آپ یہ دولاکھ لے لیں تو میرا بوجھ ہلکا ہوجائے گا۔" مالنی نے کہا۔ "اتنی بڑی رقم کیسے سنبھلے گی نہ بھیا نہ......"

"ارے پگلی! میری ایک بات غور سے سنو......" میں نے بڑے پیار سے اس کا گال تھپتھپایا۔ "دو ایک دن میں رات کے وقت یہ رقم تم اپنے گھر والوں کے ساتھ لے کر کسی دور دراز شہر میں چلی جاؤ اور وہاں بس جاؤ۔ ہوسکے تو آج رات ہی......"

"وہ کس لئے بھیا......؟" مالنی کے چہرے پر گہرا استعجاب چھا گیا تو وہ بھولی بھالی اور موہنی سی لگی۔

"اس لئے کہ ٹھاکر نے تین لاکھ روپے دیئے تو سب کے سینوں پر سانپ لوٹ گئے ہیں۔" میں اسے بتانے لگا۔

"تمہیں کچھ خبر نہیں...... خاندان کے تمام افراد اور مہمانوں کے دلوں پر کیا گزری...... سب سے زیادہ خار تو جگ دیش کھائے ہوئے ہے۔ اس وقت اس کی آنکھیں ذلیل منصوبہ بندی نظر آتی تھیں۔ آج چوں کہ موہنی کی شادی ہے اس لئے وہ کوئی قدم نہیں اٹھائے گا۔ لیکن کل رات کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا...... اس بات کا امکان ہے کہ کل رات وہ بدمعاشوں کے ساتھ، بدمعاش کے بہروپ میں تمہارے گھر میں گھس آئے۔ تمہارے ماں، باپ اور اکلوتے بھائی کو قتل کردے۔ رقم سمیت تمہیں لے جائے۔ تم سے جی بھر کے ایک کھلونے کی طرح کھیلنے کے بعد تمہیں بھی قتل کردے۔ اس لئے آج کی شام اندھیرا ہوتے ہی اس کی دسترس سے نکل جاؤ...... کسی شہر میں جاکر بس جاؤ۔ اگر وہاں جگ دیش تلاش کرتا ہوا آ بھی گیا تو تم لوگوں کا بال تک بیکا نہیں کرسکتا۔ دوسرے کسی بڑے شہر میں تم لوگ ہر طرح محفوظ رہوگے۔"

"میرا خیال ہے کہ ہم لوگ کسی دوسرے شہر میں بھی جاکر ایک لاکھ روپے سے ایک نئی زندگی کا آغاز کرسکتے ہیں۔" مالنی بولی۔

"آج کے اس دور میں دو تین لاکھ روپے کی کوئی حقیقت نہیں۔" میں نے کہا۔ "تم اسے ایک بھائی کی طرف سے قبول کرلو۔"

میں نے مالنی کو سمجھا کر واپس بھیج دیا۔ میں اس غریب لڑکی کو اس وقت تک دیکھتا رہا، جس کا دل حاتم طائی کی طرح تھا، جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہوگئی۔ لیکن وہ میرے دل سے اوجھل نہ ہوسکی۔ اس دنیا میں آج بھی کیسی کیسی ہستیاں موجود ہیں۔

☆......☆......☆

اب مجھے سورج ڈاکو کا قلع قمع کرنا تھا۔ جس نے لاقانونیت اور دہشت گردی پھیلا رکھی تھی۔ اس کے آگے قانون بھی بے بس ہوگیا تھا۔ انسانیت مجروح ہورہی تھی۔ وہ انسانیت کو بڑی بے رحمی، سفاکی اور درندگی سے پامال کررہا تھا۔

اس نے موہنی کی جگہ رمنا جادوگر کی بیٹی کو پایا...... گٹھری میں رقم اور زیورات کے بجائے پتھر ملے تو وہ غصے سے پاگل ہوگیا تھا۔ رمنا جادوگر نے میرے بارے میں کھوج لگانے کے لئے ہر طرح سے کوشش کر ڈالی تھی۔ لیکن وہ بری طرح ناکام رہا تھا۔ اس کی دماغی حالت بھی درست نہیں تھی۔ سورج ڈاکو اپنے ساتھیوں سمیت کرن کے بچے کو لے کر گوتم کے گاؤں پہنچ گیا تھا۔ اس لئے کہ گوتم کے گاؤں والوں کی وجہ سے میں وہاں آیا تھا۔ میں نے روپا کو ختم کردیا تھا۔ اس کے عقوبت خانے سے نکل گیا تھا۔ رمنا جادوگر کو ناکارہ کرکے رکھ دیا تھا۔

سورج ڈاکو کرن دیوی کے بچے کو اس لئے لے گیا تھا کہ اس کی ماں کے سامنے بچے کو اذیت اور ایذائیں دے کر اس معصوم کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کردے۔ وہ خونی تماشا دکھانا چاہتا تھا۔ اس طرح اس کے انتقام کی آگ ٹھنڈی پڑسکتی تھی۔

جب میں وہاں پہنچا تو اس کے آدمیوں نے جو جدید ترین اسلحہ سے لیس تھے، انہوں نے پوری آبادی کو حصار میں لیا ہوا تھا۔ عورتوں کو گھروں سے نکال کر ایک طرح کھڑا کردیا گیا...... دوسری طرف تمام بوڑھے مردوں کو...... عورتوں اور مردوں کے درمیان نوجوان لڑکوں اور مردوں کو...... اس نے آج یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ جتنی حسین جوان لڑکیاں اور عورتیں ہیں، انہیں وہ لے جائے گا۔ پھر اس گاؤں کو نذر آتش کردے گا۔ تمام بوڑھے مردوں اور جوان لڑکوں کو گولیوں سے بھون کر ختم کردے گا۔ وہ اس گاؤں کو تہس نہس اور تاخت وتاراج کرنے آیا تھا۔

ان تمام راستوں پر اس کے آدمی پہرہ دے رہے تھے جو اس آبادی کو جاتے تھے۔ چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی تھی۔ گوتم ان کے ہاتھ نہیں لگا تھا۔ کرن عورتوں کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ دھلی چادر کی طرح ہورہا تھا۔

میں ان سب کی نظروں کے سامنے سے گزرا۔ لیکن مجھے کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا۔ میں دیکھ سکتا تھا۔ میں مردوں اور لڑکوں کے ہجوم میں سب سے پیچھے جاکر کھڑا ہوگیا۔ میں پھر اس طرح سے ظاہر ہوا کہ اس

مجمع میں کسی کو پتا بھی نہیں چل سکا تھا۔

سورج کے ہاتھوں میں کرن کا بچہ تھا۔ اس نے کئی دنوں بعد جو ماں کو دیکھا تو رونے لگا۔ کرن سے رہا نہیں گیا۔ وہ تڑپ کر سورج کی طرف لپکی، سورج بھی گھوڑے سے اتر آیا۔ اس کے چہرے پر درندگی تھی۔ وہ خون آشام بھیڑیا تھا۔

''لاؤ میرا بچہ مجھے دے دو......؟'' کرن نے اپنی باہیں پھیلا دیں۔ میرے جگر کے ٹکڑے کو دے دو......''

''بچہ تمہیں اس صورت میں مل سکتا ہے کہ اس شخص کو ہمارے حوالے کردو جسے تم نے میرے اڈے کی طرف بھیجا تھا کہ وہ بچے اور گوتم کو میرے ہاں سے لے آئے......؟'' اس نے خشونت بھرے لہجے میں کہا۔ ''وہ بچے کو لے جا نہ سکا لیکن گوتم کو نکال لے گیا۔ گوتم کہاں ہے؟''

''میں نے کسی کو نہیں بھیجا......'' کرن بے خوف ہو کر بولی۔ ''یہ تم کیسی بچوں کی سی باتیں کر رہے ہو؟ پولیس اور فوج تمہارا بال تک بیکا نہیں کر سکی......ایک آدمی کیا کر سکتا ہے اور پھر رمنا جادوگر بھی تمہارا دوست، ساتھی اور مددگار ہے۔''

''تم جھوٹ بول رہی ہو۔'' سورج دھاڑا۔ ''وہ شاید یہاں واپس آگیا ہے۔ مردوں میں سے وہ کون ہے اس کی نشان دہی کرو۔''

''میں نے کہا نا کہ ایسا کوئی شخص نہیں ہے۔'' کرن نے تکرار کی۔ ''بس تم میرے بچے کو میرے حوالے کردو۔ میرا لعل مجھے دے دو۔''

''میں تمہیں بچہ ضرور دوں گا......'' سورج نے جیب سے چاقو نکالا اور ایک جھٹکا دے کر اسے کھولا۔ چاقو بہت بڑا تھا۔ خوف ناک تھا۔ اس کا پھل دیکھ کر کرن کے بدن پر لرزہ طاری ہوگیا۔ ''پہلے اس بچے کے ہاتھ کاٹ کر دوں گا......پھر اس کے پیر......پھر اسے ذبح کروں گا......پھر اس کا سینہ چیر کر دل نکال کر تمہاری جھولی میں ڈال دوں گا تاکہ ماں تا خوش ہو جائے۔''

''تم اس قدر شقی القلب ہو کہ اس بچے کی لاش کے ٹکڑے اس کی ماں کے سامنے کرو۔'' کرن ایک دم سے بگڑ کر بولی۔

''اس میں کیا مشکل ہے......؟'' سورج قہقہہ مار کر بڑے زور سے ہنسا۔ ''اس چاقو کی دھار دیکھ رہی ہو......؟''

''ذلیل......کمینے......تو انسان ہے یا درندہ......؟'' کرن نے نفرت اور غصے سے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر تھوک دیا اور زناٹے کا تھپڑ دے مارا۔ سورج کا چہرہ لال ہوگیا۔ آج تک کسی نے اس کے منہ پر تھوکا نہیں تھا۔ تھپڑ نہیں مارا تھا۔ اس قدر اسے ذلیل عورت نے کیا، مرد نے نہیں کیا تھا۔ پھر وہ آپے سے باہر ہوگیا۔ اس نے بچے کو اٹھا کر گیند کی طرح پھینکا۔ میں جو اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے لپک کر بچے کو گود میں لے لیا۔ اسے گرنے نہیں دیا۔

سورج نے میرے اور بچے کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو کرن کی طرف متوجہ تھا۔ اس نے آگے

بڑھ کر کرن کو سر کے بالوں سے پکڑ لیا تاکہ چاقو اس کے سینے میں بھونک دے۔ کرن نے پھر اس کے منہ پر تھوک دیا تو وہ اور مشتعل ہوگیا۔ اس نے اپنا ہاتھ فضا میں بلند کیا۔

''سورج!'' میں نے کہا۔ ''تم کیسے مرد ہو......؟ ڈاکو ہو......ایک عورت پر ہاتھ اٹھا رہے ہو، مرد نہیں......تم نامرد ہو......''

سورج نے جو یہ سنا تو اس نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ کرن کے بالوں کو چھوڑ دیا۔ میری طرف دیکھا۔ کرن دوڑ کر آئی تو میں نے بچہ اس کے حوالے کردیا۔

''کرن......! اب تم وہاں جا کر کھڑی ہو جاؤ، جہاں پہلے کھڑی تھیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں ذرا اس بزدل اور نامرد سے نمٹ لوں......''

میرے الفاظ جلتی پر تیل کی دھار بن کر گرے۔ کرن نے اس کے منہ پر تھوکا تھا اور زوردار تھپڑ بھی رسید کیا تھا۔ جس نے اسے مشتعل کردیا تھا۔ اس کے تن بدن میں آگ بھڑک اٹھی تھی کہ......میں پہنچ گیا تھا۔ میں اس پر بم بن کر گرا تھا۔ اس کے جیسے پرخچے اڑا دیئے تھے۔

ایک طرف وہ سخت مشتعل تھا تو دوسری طرف حیران بھی تھا کہ میں کون ہوں جو اتنی بے خوفی اور جرأت اور دھڑلے سے اس کے سامنے آگیا ہے۔ اس شخص کے سامنے جس کا نام سن کر پولیس اور فوج بھی کانپ اٹھتی ہے۔ لوگ راتوں کو سوتے وقت اس کا نام بھی نہیں لیتے ہیں کہ کہیں وہ خوابوں میں نظر نہ آجائے......اور پھر اس کے مسلح آدمیوں نے چاروں طرف سے اس بستی کو اور لوگوں کو نرغہ میں لیا ہوا تھا۔

اور پھر میرے الفاظ اس کے وجود پر زہریلے ڈنک بن کر لگے۔ اس لمحے اس کا خیال اس شخص کی طرف نہیں گیا تھا جو عقوبت خانے سے گوتم اور دوسرے لوگوں کو نکال لایا تھا۔ روپا کو ملیا میٹ کردیا تھا۔ رمنا جادوگر کو بے بس اور ناکارہ کردیا تھا۔ اس نے مجھے اس بستی کا ایک نوجوان کہا جو جذباتی ہو کر اس کے مقابلے پر آگیا ہے۔ ایک عام سا نوجوان......

''تو......تو نے مجھے نامردی کا طعنہ دیا ہے......؟'' سورج غرایا۔ ''شاید تو مجھے نہیں جانتا ہے۔ اس لئے تو نے بے وقوفی کی......مجھ جیسا مرد اور بہادر اس پورے صوبے اور ہندوستان میں نہیں ہے۔ میرے نام سے فوج اور پولیس تھرا اٹھتی ہے۔''

''اس لئے کہ تو مرد ہوتا تو ایک عورت پر ہاتھ نہیں اٹھاتا۔ اس کا بچہ چھین کر نہیں لے جاتا اور اس کے ٹکڑے کرنے اور ذبح کرنے کی دھمکی نہ دیتا......مرد تو وہ ہوتا ہے جو مرد سے ٹکراتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم اس بات کا اعتراف کرلو کہ تم بزدل اور ڈرپوک ہو۔''

''اگر میں بہادر نہ ہوتا تو دنیا میرا نام سن کر کانپتی نہیں......'' سورج نے کہا۔ ''مائیں بچوں کو میرا نام لے کر ڈراتی ہیں۔''

''گویا تم......تم شیطان ہوئے......؟'' میں ہنسا۔

''یہ کیسی بہادری ہے کہ اپنے مسلح آدمیوں کے سنگ مخالف پر بہادری جماتے ہو۔ اگر تم بہادر ہو تو

مجھ سے لڑ کر دیکھ لو...... کیا تم میں ہمت ہے مجھ سے دو بدو لڑنے کی......؟"

"کیوں نہیں......" سورج خم ٹھونک کر میدان میں آ گیا۔ "لیکن ایک بات یاد رکھ، اگر تو ہار گیا تو تجھے ذبح کر دوں گا۔"

"تیرے دل میں جو آرزو ہے وہ پوری کر لینا۔" میں نے کہا۔ "تیرے ہارنے کی صورت میں تیرے ساتھیوں کو ہتھیار ڈالنے ہوں گے۔"

"منظور ہے......" اس نے سر ہلا دیا۔ "میں اپنے ساتھیوں سمیت واپس چلا جاؤں گا۔ پھر کبھی ادھر نہیں آؤں گا۔"

سورج جھوٹ بول رہا تھا۔ وہ جھوٹا مکار اور دغا باز تھا۔ صحرائی لومڑی کی طرح، اس کی کسی بات کا بھروسا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس نے مجھے ایک عام قسم کا نوجوان سمجھا تھا۔ دراصل وہ کرن سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ اس کے بچے کو اس کے سامنے ذبح کر کے اپنے انتقام کی آگ بجھانا چاہتا تھا۔ ایک عورت کی یہ مجال کہ اس کے منہ پر تھوکے...... اسے تھپڑ مارے۔ پھر وہ کرن کو بیچ میدان میں ڈال کر اپنے ساتھیوں سے کہنا چاہتا تھا کہ درندہ بن جاؤ...... اس کی عزت تار تار کر دو۔

وہ اندر سے جنون میں بہت کچھ اس کے لئے سوچ رہا تھا۔ اس کی رگوں میں لہو ابل رہا تھا۔ آنکھیں انگاروں کی طرح دہکنے لگی تھیں۔ وہ اچانک مجھ پر حملہ آور ہو گیا...... یہ دیکھ کر کہ میں نہتا ہوں۔ اس کے ہاتھ میں خوف ناک قسم کا چاقو تھا۔ میں چوکنا تھا۔ میں بجلی کی سی سرعت سے ایک طرف ہٹا تو وہ جھونک میں ایسا آگے نکلا کہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ منہ کے بل زمین پر آ رہا۔

وہ گرتے ہی فوراً ہی سنبھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں اپنی جگہ سکون واطمینان سے کھڑا رہا۔ اس کے حملے کا انتظار کرنے لگا۔ تیزی سے میرے قریب آ کر میرے سینے میں چاقو گھونپنا چاہا تو میں نے اس کی چاقو کے ہاتھ والی کلائی پکڑ لی اور اس کی پشت پر مروڑ کر لے گیا۔ اس کی کلائی اتنی زور سے مروڑی کہ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی اور چاقو زمین پر گر گیا۔ میں چاہتا تو چاقو اٹھا سکتا تھا مگر اسے اٹھایا نہیں۔

میرے دائیں ہاتھ میں اس کی کلائی تھی اور بائیں ہاتھ سے میں نے اس کے سر کے بال پکڑ لئے۔ پھر اس کی کمر پر گھٹنے سے ضربیں لگانے لگا۔ اس کے منہ سے دل خراش چیخیں نکلنے لگیں۔ بستی کے مرد اور عورتیں یہ تماشا دیکھ کر دل میں خوش ہو رہی تھیں۔ لیکن وہ بت بنے ہوئے تھے۔ اس لئے کہ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ یا ہنسی آ جاتی۔ چہرہ دمک جاتا تو ان کی خیر نہ ہوتی۔ یہ جو مسلح بدمعاش بندوقیں تانے کھڑے ہوئے تھے اور ان کی نگاہیں بھی بستی کے تمام لوگوں پر جمی ہوئی تھیں کہ ان میں سے کوئی بھی ہلا تو اسے بلا تامل اڑا دیا جائے۔ یہ سورج کا حکم تھا۔ جب میں مردوں کے ہجوم سے نکل کر سورج اور کرن کی طرف بڑھا تھا تب ان بدمعاشوں میں سے دو ایک نے مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی لیکن باوجود کوشش کے وہ مجھ پر گولی نہ چلا سکے۔ انہیں ایک نادیدہ ہستی نے باز رکھا تھا۔

سورج بہت طاقت ور تھا۔ وہ بڑی مضبوط کاٹھی کا تھا۔ اس کے ہاتھ بہت سخت اور مضبوط تھے۔

اونچا قد بھی تھا۔ اس میں اتنی طاقت تھی کہ وہ ایک بھاری بھر کم آدمی کو بچے کی طرح دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر کئی فٹ پر پھینک سکتا تھا اور پھر اس کا جسم اتنا بھاری تھا کہ ایک پہلوان ہی اٹھا سکتا تھا۔ لیکن دو ایک فٹ بھی نہیں پھینک سکتا تھا۔ حرام کی کھا کھا کر سور ہو گیا تھا۔

وہ سخت جان تھا۔ اگر اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ کب کا ادھ موا ہو جاتا۔ میرے گھٹنے کی ضربوں نے اس کی چیخیں نکال دی تھیں۔ وہ برداشت نہیں کر رہا تھا۔ اس کے تمام بدمعاش حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ صرف بستی کے لوگ ہی نہیں بلکہ تمام بدمعاش یہ دیکھ رہے تھے کہ ایک عام نوجوان کس طرح سے ایک سخت جان اور انتہائی طاقت ور بدمعاش کی درگت بنا رہا ہے۔

جب سورج بے حال ہو گیا تو میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ زمین پر کسی ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح گر پڑا۔ درد اور تکلیف کی شدت سے ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ ایک طرح سے اس کی کمر ٹوٹ کر رہ گئی تھی۔ اب اس میں اتنی ہمت نہیں رہی تھی کہ فوراً اٹھ سکے۔

"کہو سورج بیٹے! مزا آ گیا نا......؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "تم اس معصوم بچے کے ہاتھ پیر اور گلا کاٹنے والے تھے نا......؟" میں نے زمین پر سے اس کا چاقو اٹھا لیا۔ "کیا خیال ہے میں تجھے اس معصوم بچے کی ماں کے ہاتھوں سے ذبح کروا دوں......؟"

یہ سنتے ہی اس کے جسم میں جیسے طاقت اور جان سی آ گئی۔ وہ سرعت سے اٹھا اور ایک طرف تیزی سے دوڑنا چاہا تو میں نے پیچھے سے اس کی قمیص کا کالر پکڑ کر روک لیا۔ "یہ تم میدان چھوڑ کر کہاں بھاگ رہے ہو، سورج! یہ مقابلہ زندگی اور موت تک جاری رہے گا...... حرام زادے...... کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ میں تجھے چھوڑ دوں گا......؟ نہیں...... تیری زندگی کا آج آخری دن ہے۔"

"تو...... مجھے جانے دے۔" وہ پلٹ کر بولا۔ "تو دیکھ نہیں رہا ہے میرے چالیس مسلح آدمی کھڑے ہیں۔ وہ میرے ایک اشارے پر تجھے بھون دیں گے...... تیری لاش کا سرمہ بنا دیں گے۔ تو اب میرے اور میرے آدمیوں کے ہاتھوں سے بچ نہیں سکتا۔"

"وہ تو بعد میں دیکھا جائے گا۔" میں نے جواب دیا۔ "ابھی تو تیری اور خاطر مدارت کرنی ہے سورج......! تو نے معصوم اور بے گناہ لوگوں پر کیا کیا ظلم نہیں کیا...... انہیں بے رحمی اور درندگی سے قتل کیا۔ ان کا خون پانی کی طرح بہا دیا۔ تیرا کیا خیال ہے۔ تجھے اس کی سزا نہیں ملے گی...... جب تو نہیں جانتا ہے کہ رحم کیا ہوتا ہے اور اس کی رمق تک تیرے دل کے کسی کونے میں نہیں ہے تو پھر تو یہ کیوں سمجھتا ہے کہ تجھ پر رحم کیا جائے گا...... تو ایک خون آشام بھیڑیا ہے۔ میں تجھے معذور کر کے قانون کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔ کیوں کہ قانون تجھے پھانسی کی سزا دے گا۔ دو تین برس بعد...... کیوں کہ تجھ پر ایک نہیں کئی مقدمے چلیں گے۔ ان تین برسوں میں تو اس معذور اور اپاہج پن کے باعث تڑپتا رہے۔ تو موت مانگے گا بھی تو تجھے موت نہیں ملے گی...... عدالت جب تک اپنی کارروائی پوری نہیں کر لے گی، اس وقت تک پھانسی کی سزا نہیں سنائے گی۔ تو سسک سسک کر ایڑیاں رگڑتا رہے گا۔ تیری زندگی اور موت جیل میں کتے سے بھی

بدتر ہوگی۔تو نے بہت سارے قانون کے محافظوں کو موت کی نیند سلایا ہے نا......؟"

میں نے اپنی بات ختم کر کے اسے دونوں ہاتھوں پر اس طرح اٹھالیا جیسے وہ کوئی شیر خوار بچہ ہو۔ دیکھنے والے سارے میرے اسے اٹھانے پر ششدر ہو گئے تھے۔ میں نے اسے اس طرح خالی جگہ پر پھینک دیا جیسے فٹ بال کے کھیل میں فٹ بال کو ایک کھلاڑی باؤنڈری پر سے پھینکتا ہے۔ وہ گیند کی طرح فضا میں اڑتا ہوا کئی فٹ دور جا گرا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل کر اٹھ کھڑا ہوتا، میں اس کے سر پر پہنچ گیا۔ پھر اسے اٹھا کر زمین پر زور سے دے مارا۔ پھر تین چار بار مسلسل زور زور سے زمین پر دے مارا۔ پھر اسے ایک گیلی چادر کی طرح اٹھالیا۔ جس طرح ایک دھوبی چادر یا کپڑے کو پتھر پر دے مارتا ہے، اسے اس طرح مارنے لگا۔ اس وقت تک مارتا رہا، جب تک اس کے سارے جسم کی ہڈیاں ٹوٹ نہیں گئیں۔ جب میں نے اسے چھوڑا تو اس پر غشی طاری تھا۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ غشی کی حالت سے نکل آیا تو اس نے درد سے کراہتے ہوئے مجھے غلیظ گالیاں بکیں اور بدقت تمام ہاتھ اٹھا کر ساتھیوں کو اشارہ کرنا چاہا لیکن اس میں اتنی سکت کہاں رہی تھی کہ ہاتھ اٹھا سکے۔ اس کا بازو اور کلائی ٹوٹ چکی تھی۔ پھر وہ کسی نہ کسی طرح چیخنے میں کامیاب ہو گیا۔ "اسے مار دو...... سب کو مار دو...... بستی میں آگ لگا دو۔"

ان تمام بدمعاشوں نے مجھ پر فائر کھول دیا۔ اس نے اور سب نے بھونچکے ہو کر دیکھا۔ ایک عجیب و غریب تماشا...... ناقابل یقین سا۔ انتہائی حیرت انگیز...... وہ سب جیسے کوئی سپنا دیکھ رہے ہوں۔ مجھ پر گولیاں چلانے والے بھی......

مجھ پر گولیوں کی زبردست بوچھاڑ ہو گئی تھی۔ وہ گولیاں میرے جسم پر لگ کر پھول بن جاتی تھیں۔ سفید سفید پھول...... مجھ سے ٹکرا کر زمین پر گر رہی تھیں۔ میرے چاروں طرف پھول ہی پھول اس طرح بکھرے ہوئے تھے جیسے مجھ پر نچھاور کئے گئے ہوں۔

ان بدمعاشوں نے تھوڑی دیر تک حیرت اور سکتے کے عالم میں رہنے کے بعد پھر بندوقوں کو لوڈ کیا۔ ان میں سے کچھ نے گھروں کو آگ لگانے کے لئے ان پر آتش گیر مادہ پھینکا۔ آگ کیا لگتی۔ ایسا لگا جیسے آتش بازی ہو رہی ہو۔ فضا میں پھلجھڑیاں چھوٹ رہی ہوں۔ یہ دیکھ کر دو ایک بدمعاشوں نے دستی بم نکال کر گھروں پر پھینکے۔ وہ پٹاخے بن کر گرے اور بجھ گئے۔

تھوڑی دیر بعد اس سے بھی کہیں حیرت انگیز اور سنسنی خیز تماشا ہوا جو پھول میرے ارد گرد پڑے اور بکھرے ہوئے تھے وہ فضا میں پرندوں کی طرح اڑے۔ پھر وہ سنسناتی ہوئی گولیاں بن کر ان بدمعاشوں کے جا لگیں۔ کسی کے بازو میں، کسی کے سینے میں اور کسی کے پیروں میں...... وہ زخمی ہو کر گھوڑوں سے گر پڑے۔ وہ اس قابل نہیں رہے کہ گھوڑوں پر سوار ہو کر بھاگ جائیں۔

اس وقت یہ بستی اور اس کا میدان میدان جنگ کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ سورج کے تمام ساتھی زخمی حالت میں کراہ اور زمین پر پڑے تڑپ رہے تھے۔ گاؤں والوں کی حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی تھی۔ وہ

سمجھ گئے تھے کہ میں کوئی مہان جادوگر ہوں۔ رمنا جادوگر سے بھی کہیں مہان...... یہ سارا کھیل جادو کا ہے۔ جادو کے سوا ایسا کھیل کوئی اور دکھا نہیں سکتا۔

میں نے سورج سے کہا۔ "تم نے دیکھ لیا نا اپنا حشر اور انجام...... تمہیں بڑا ناز اور غرور تھا۔ گھمنڈ تھا۔ تم موت اور بھگوان کا بھی مذاق اڑاتے تھے...... تم راون بن گئے تھے۔ اب یہ سب کہاں ہے؟ اب تو تم ہل بھی نہیں سکتے......"

"تم...... تم وہی جادوگر ہو جو وہاں آئے تھے اور تم نے وہاں......" اس کی زبان لڑکھڑائی، اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

"ہاں...... ہاں...... میں وہی جادوگر ہوں......" میں نے جواب دیا۔ "اگر تم کرن کے بچے کو نہ لے جاتے تو میں اپنی راہ لیتا۔"

"رمنا جادوگر تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔" سورج نے مردہ لہجے میں رک رک کر کہا۔ "تم نہیں جانتے، وہ کتنا مہان جادوگر ہے۔"

"وہ ایک عام سا جادوگر ہے......" میں نے کہا۔ "وہ مجھے تلاش نہیں کر سکا۔ میرا اپنا نہیں چلا سکا...... جانتے ہو، وہ سب کچھ گولے میں دیکھ رہا ہے۔ لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ میرے مقابلے پر آسکے...... وہ ڈر گیا ہے۔ میں تم سے نمٹنے کے بعد اس سے نمٹوں گا۔ اسے بھی قانون کے حوالے کرنا ہے۔ وہ تو تم سے بھی بڑا اور خطرناک مجرم ہے۔ اس کے کارن تم قانون کے ہاتھوں سے بچتے رہے۔ اگر وہ تمہارے ساتھ نہ ہوتا...... اس نے قدم قدم پر تمہاری مدد نہ کی ہوتی تو تم کب کے قانون کے ہتھے چڑھ چکے ہوتے۔"

"نہیں...... تم اسے نہیں جانتے۔ تمہیں اس کے جادو اور طاقت کا کوئی اندازہ نہیں ہے۔" سورج کہنے لگا۔

"بس وہ آتا ہی ہوگا۔ اپنے جادو سے مجھے اور میرے ساتھیوں کو پل بھر میں ٹھیک کر دے گا۔ پھر دیکھنا...... میں تمہارا کیا حشر نشر کرتا ہوں۔ تمہیں کیسی موت مارتا ہوں...... تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے...... تم نے کسی کی ایسی موت کے بارے میں سنا نہیں ہوگا۔"

"تم زمین کے سورج ہو اور ہمیشہ کے لئے ڈوب چکے ہو اور اب تم کبھی طلوع نہیں ہو گے......" میں نے کہا۔

"ابھی پولیس کو اطلاع دی جائے گی کہ تمہاری کہانی ختم...... پولیس تمہارے اڈے پر چھاپہ مارے گی۔ تمہارا دولت خانہ، اسلحہ خانہ اور عقوبت پولیس کی تحویل میں آجائے گا۔ ایک پولیس پارٹی ادھر بھی آجائے گی۔ تمہیں اور تمہارے تمام ساتھیوں کو ایک ٹرک میں جانوروں کی طرح ڈال کر لے جائے گی۔ تمہیں حوالات اور جیل میں بھی اذیت دی جائے گی......

سورج! تم نے جس دولت کے لئے اتنا خون خرابہ کیا۔ معصوم لوگوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے...... عورتوں اور جوان کنواری لڑکیوں کی عزت و آبرو برباد کی...... تم نے ایک جرم نہیں کیا۔ تمہارے جرائم کی

فہرست بڑی لمبی ہے۔ آج تم ایک کوڑی کے بھی مالک نہیں...... تمہیں تمہارے پاپوں کی بڑی دردناک، عبرت ناک اور انتہائی اذیت ناک سزا ملے گی۔ تم ہو بھی اس قابل...... میں سوچتا ہوں کہ کیوں نہ تمہارے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جائے جو تم کرن کے بچے کے ساتھ کرنا چاہتے تھے۔ میں قانون کو ہاتھ میں لینا نہیں چاہتا۔ اگر میں ایک اشارہ کروں تو یہاں موجود لوگ یہ شبھ کام انجام دے دیں گے۔ کیوں کہ ان کے دل میں تمہارے خلاف اتنی نفرت بھری ہوئی ہے کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ ان کے سینوں میں انتقام کی آگ بھڑک رہی ہے۔ کرن حالاں کہ عورت ہے، لیکن وہ بھی تمہیں ذبح کرسکتی ہے۔ تمہارے جسم کے ٹکڑے کرسکتی ہے۔"

"نہیں...... نہیں...... کوئی بھی اب میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتا......" وہ غصے سے بولا۔ "رمنا جادوگر آرہا ہوگا۔ آتا ہی ہوگا۔"

"تم اب تک خوش فہمی اور خود فریبی میں مبتلا ہو۔" میں نے اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا آئینہ نکالا اور اس کی نظروں کے سامنے کردیا۔ "یہ دیکھو...... تم اپنے رمنا جادوگر کو...... وہ بزدلوں کی طرح منہ چھپانے کالے مندر کی طرف بھاگ رہا ہے۔"

سورج نے آئینے میں دیکھا۔ وہ واقعی اس وقت ایک گٹھری لئے کالے مندر کی طرف بھاگ رہا تھا۔ پھر میں نے آئینہ اس کی نظروں کے سامنے سے ہٹا کر جیب میں رکھ لیا۔ "اب تمہیں یقین آگیا......؟ تم نے دیکھ لیا اپنے رمنا جادوگر کو؟"

اس اثنا میں کرن، رام داس اور نارائن میرے پاس آکر کھڑے ہو گئے۔ ان دونوں نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ "سکندر صاحب!" نارائن نے تحیر زدہ لہجے میں کہا۔ "ہم خواب و خیال میں بھی نہیں سوچ سکتے تھے کہ آپ ایسے مہان جادوگر ہیں۔ اور نہ ہی ہمیں بتایا...... آپ نے بڑا کمال دکھایا۔ ایسے جادوگر اور اس کے کمالات کے بارے میں کہیں پڑھا اور نہ سنا۔"

"میں بتا کر کرتا کیا۔" میں نے کہا۔ "میں اسے کیفر کردار تک ہی پہنچا کر دم لینا چاہتا تھا۔ اس لئے میں خاموشی سے اپنے مشن پر چل دیا۔"

"آپ نے وہ کام کر دکھایا جو پولیس نہ کرسکی۔" رام داس نے کہا۔ "نہ ہی کبھی کرسکتی تھی۔ آپ تو مسیحا بن کر آئے۔"

"دراصل رمنا جادوگر کے جادو نے پولیس اور فوج کو گمراہ کیا۔ ان کے راستے کا پتھر بن گیا۔" میں نے کہا۔ "پولیس جادو پر یقین نہیں رکھتی ہے۔ حالانکہ ان کے علم میں یہ بات آئی تھی کہ سورج کی پشت پر رمنا جادوگر ہے۔ اگر وہ بنگال یا آسام کے کسی بڑے جادوگر کی خدمات حاصل کر لیتے تو یہ مردود کب کا اپنی سزا کو پہنچ چکا ہوتا، پھانسی ہو گئی ہوتی......"

"سکندر صاحب!" نارائن نے کہا۔ "بستی کے لوگوں میں ایک ہل چل سی مچی ہوئی ہے۔ وہ بے چین ہو رہے ہیں کہ سورج کے زخمی ساتھیوں کی کچھ خاطر مدارت کریں۔ کیوں کہ انہوں نے بستی والوں کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا۔ وہ دل کی بھڑاس نکالنا چاہتے ہیں۔"

"سب سے پہلے آپ جے راج کو پکڑ لیں۔" میں نے کہا۔ "وہی سورج کا مخبر تھا۔ پھر پولیس کمشنر کو فون پر یہاں کی صورت حال بتا دیں۔ انہیں یہ بھی بتا دیں کہ اب راستہ صاف ہے۔ رمنا جادوگر فرار ہو چکا ہے۔ سورج کے اڈے پر سورج کی ایک بہن اور دو ایک بدمعاش موجود ہیں۔ عقوبت خانے میں کچھ لوگ قید ہیں۔ اس عقوبت خانے اور اس دولت خانے کے بارے میں بھی سروجنی بتا دے گی جو خفیہ جگہ پر ہے۔ اس میں کروڑوں کی مالیت کے زیورات اور رقم بھی ہے۔ اسلحہ خانے میں اتنا اسلحہ ہے کہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا...... اس شبھ کام میں آپ اور پولیس دیر نہ کریں...... بستی کے لوگوں سے کہیں کہ وہ دل کی بھڑاس ضرور نکالیں لیکن اس بات کا خیال رکھیں کہ وہ مر مرا نہ جائیں۔ پولیس کے آنے سے پہلے ان کی خاطر مدارت کر ڈالیں......"

"اگر تم لوگوں نے پولیس کو اطلاع دی تو اچھا نہ ہوگا۔" سورج ہذیانی لہجے میں بولا۔ "رمنا جادوگر کالا مندر سے اور جادوگروں کو لے کر آنے والا ہے...... وہ بدروحوں کو بھی لے آئے گا۔ تم لوگ بچ نہ سکو گے۔"

نارائن اور رام داس اس کی بکواس سنتے ہی ہنس پڑے۔ اس علاقے میں دو مندر تھے۔ ایک کالا تھا...... ایک لال تھا۔ کالا مندر بدروحوں، ناگوں، اژدھوں اور زہریلے سانپوں کا مسکن تھا۔ اس مندر میں جادوگروں کی روحیں بھی منڈلاتی رہتی تھیں۔

"سکندر بھیا!" کرن نے بڑے جذباتی لہجے میں ممنونیت سے کہا۔ "آپ نے میری اور میرے بچے کی خاطر جو کچھ کیا وہ اتنا۔ "

"کرن!" میں نے اس کی بات کاٹ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ایسی باتیں نہ کرو۔ میں مظلوموں اور غریبوں کی مدد کرتا پھرتا ہوں۔ مجھے اس بات کی بڑی خوشی ہے کہ میرے ہاتھوں سورج اپنے انجام کو پہنچا...... اب لوگ سکون و آرام سے گھروں میں رہیں گے۔"

"پورے کرناٹک میں اس خبیث اور مردود کی گرفتاری پر زبردست جشن منایا جائے گا۔" کرن سورج پر نفرت اور حقارت سے تھوکتی ہوئی بولی۔ "بھیا! میں اس سے انتقام لینا چاہتی ہوں۔ آپ مجھے یہ چاقو دے دیں۔"

"تم کیا کرو گی...؟" میں نے چاقو کو بند کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا ذبح کرو گی اسے......"

"نہیں..." کرن نے سر ہلایا۔ "میں اب اس کی ناک کاٹنا چاہتی ہوں، جس ناک پر اسے بڑا غرور تھا۔ گھمنڈ تھا۔"

"اس سے کچھ حاصل نہیں۔" میں نے کہا۔ "تم نے اس کے منہ پر تھوک کر اور تھپڑ جو مارا تھا اس وقت اس کی ناک کٹ گئی تھی۔" اس وقت ایک شور سا فضا میں بلند ہوا۔ میں نے اور کرن نے پلٹ کر دیکھا کہ یہ کس چیز کا شور ہے۔

بستی کے بچے، جوان، مرد، لڑکیاں اور عورتیں اپنے اپنے گھروں سے لاٹھیاں، ڈنڈے، جھاڑو، جوتے اور چپلیں لے کر ان بدمعاشوں پر ٹوٹ پڑے تھے جو زخمی حالت میں پڑے تھے۔ وہ بڑے سخت

جان تھے۔ گولیوں سے زخمی ہونے پر ان میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ فرار ہو سکتے تھے۔ سورج کو شاید لے جاتے۔ اگر میں انہیں بے بس اور بے جان نہ کر دیتا۔

نارائن نے پولیس کو فون پر اطلاع دے دی تھی۔ پولیس کے پہنچنے سے پہلے ہی بستی والوں نے ان بدمعاشوں کی ایسی درگت بنادی اور حشر نشر کر دیا اور حلیے بگاڑ دیئے کہ ان کی مائیں بھی انہیں پہچان نہیں پاتیں۔ مار مار کر بھرکس نکال دیا تھا۔ چپلوں اور جوتوں سے بھی ایسی پٹائی ہوئی تھی کہ انہیں چھٹی کا دودھ یاد آ گیا تھا۔ ان پر تھوکا بھی گیا تھا۔ گائے کے گوبر سے ان کے منہ لیپ دیئے گئے۔ انہیں ایسی سزا ملی تھی کہ عدالت بھی ایسی سزا نہیں دے سکتی تھی۔ بستی والوں نے دل کی اچھی طرح سے بھڑاس نکال لی تھی۔ نارائن اور رام داس نہ روکتے تو دس بارہ بدمعاش عدم آباد جا چکے ہوتے۔

جب پولیس کی بھاری نفری آئی اور اس نے سورج کو اور اس کے تمام ساتھیوں کو گرفتار کر کے ان کی مشکیں کس کر ٹرک میں ڈالا تو تب انسپکٹر نے نارائن سے پوچھا۔ ”یہ کیوں کر اور کیسے ہوا......؟ کس نے سورج اور اس کے ساتھیوں سے مقابلہ کر کے قابو پایا؟“

نارائن اور رام داس نے جواب دینے سے پہلے مجھے ڈھونڈا تو میں غائب ہو چکا تھا۔ کالے مندر کے باہر کھڑا ہوا تھا۔ رام داس اور نارائن اور گاؤں کے کچھ لوگوں نے جب انہیں میرے اس جادو کے کمال کے بارے میں بتایا تو انسپکٹر کو یقین نہیں آیا۔ اسے تو جب یقین آیا تھا جب سورج اور اس کے ساتھیوں نے ان باتوں کی تصدیق کی تھی۔ وہ بڑا حیران ہوا تھا۔ پھر اسے یہ بات ماننا پڑی کہ جادو کے باعث ہی زمین کا یہ سورج ڈوب گیا اور اب کبھی نہیں ابھرے گا۔

کالے مندر میں روپا کا وجود نہیں رہا تھا۔ لیکن اس کی روح ضرور تھی۔ وہ مر چکی تھی، مندر کے احاطے میں منڈلا رہی تھی۔ وہ پھر ایک حسین و جمیل لڑکی کے روپ میں آئی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے نفرت اور غصے سے ایک چڑیل کا روپ دھار لیا۔

”تم......تم......رمنا کو قابو کرنے کے لئے آئے ہو......؟“ اس نے ہذیانی لہجے میں کہا۔ ”واپس چلے جاؤ۔ واپس جاؤ۔“

”میں رمنا کو ساتھ لئے بغیر نہیں جاؤں گا۔“ میں نے کہا۔ ”اسے قانون کے حوالے کرنا ہے۔ وہ مجرم ہے قانون کا......“

”رمنا جی کو تم تو کیا......تمہارے جیسے دس تیس مار خان جادوگر بھی آ جائیں گے تو یہاں سے نہیں لے جا سکتے۔“ وہ نفرت بھرے لہجے میں بولی اور اس کی آنکھوں سے شرارت جھانکنے لگی۔ ”وہ کوئی کھلونا یا بچہ نہیں ہیں۔“

”میں اسے کیوں نہیں لے جا سکتا......؟“ میں زیر لب مسکرا دیا۔ ”کیا تم اسے لے جانے نہیں دو گی......؟ میرا راستہ روکو گی...... میں نے تمہارا جو حشر کیا تھا اسے تم اتنی جلدی بھول گئیں۔ یہ آج ہی کی تو بات ہے۔“

”اس لئے کہ تم رمنا جی کی شکتی سے واقف نہیں ہو۔“ اس نے زہرناک لہجے میں جواب دیا۔ ”وہ بڑے مہان ہیں۔ صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں ان سے بڑا جادوگر کوئی نہیں ہے جو ان کے مقابلے میں آیا، اس کا نام و نشان تک نہ رہا۔“

”جب مجھے تمہارے مہان رمنا جی نے عقوبت خانے میں ڈال دیا تھا تب وہ میرا بال تک بیکا نہیں کر سکے......؟ میں وہاں سے نکل آیا۔ وہاں جو پہرے دار تھے ان کا جو حشر کیا، شاید تمہیں اس کا علم نہیں......“

”انہوں نے تمہاری جوانی پر اور اس لئے رحم کھا کر چھوڑ دیا کہ تم ایک غیر ملکی سیاح ہو۔“ وہ بولی۔ لیکن اب ہرگز ایسا نہیں ہو گا۔“

”وہ کیا کریں گے......؟“ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا میرا ملیدہ بنا دیں گے کہ تم کھا سکو......یا پھر مجھے کسی ایسے قید خانہ میں ڈال دیں گے کہ میں ساری زندگی اس میں سڑتا رہوں......یا پھر مجھے آنکھیں بنا کر خون کے مرتبان میں ڈال دیں گے۔“

”نہیں......وہ تمہیں بھسم کر دیں گے اور تمہاری راکھ مندر کے باہر والی جھیل میں ڈال دیں گے۔“ وہ پھنکاری۔

”جھیل کی مچھلیاں بہت عرصے سے انسان کی راکھ کے لئے بھوکی ہیں۔ ان کی اصل تمنا انسان کی راکھ ہے۔“

”اگر اتنے ہی مہان ہیں تمہارے رمنا جی تو وہ مجھ سے ڈر کر چوہے کی طرح اس مندر کے بل میں کیوں گھس گئے ہیں؟“ میں ہنس پڑا۔ ”چھپ کر بیٹھ گئے ہیں......کیا یہ شرم سے ڈوب مرنے والی بات نہیں ہے؟“

”وہ چھپے نہیں ہیں بلکہ اپنے گرو سے ملنے گئے ہوئے ہیں، جنہوں نے دنیا تیاگ دی ہے۔“ وہ بولی۔ ”رمنا جی کے گرو کے گرو، گرو مہاراج بھی ساتھ ہی ہیں۔ وہ ہر ماہ ان سے آشیرباد لینے جاتے ہیں۔ تم طعنہ مت دو۔“

”سنو چڑیل!“ میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ”میں ایک چھوٹا سا جادوگر ہوں۔ معمولی قسم کا...... مجھ جیسے جادوگر چھوکرے پورے ہندوستان میں ایسے بارہ ہزار ہوں گے۔ میں کچھ نہیں بیچتا......لیکن اس کے باوجود اپنے جادو کے زور سے اس چوہے رمنا جادوگر کو بل سے نکال کر لا سکتا ہوں۔ یہیں بیٹھے بیٹھے......مجھے وہاں جانے کی ضرورت بھی نہیں۔“

”اچھا......“ وہ چیلنج کے انداز میں بولی۔ ”تمہیں بڑا گھمنڈ ہے اپنے جادو پر......تم انہیں یہاں لا کر دکھاؤ تو میں مان جاؤں گی کہ تم واقعی مہان جادوگر ہو......تم ڈینگیں نہ مارو۔ تم ہو گے مہان جادوگر اپنے گھر کے......“

”میں نے کب کہا کہ میں مہان جادوگر ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”جو مہان ہوتے ہیں وہ کبھی اپنی زبان سے اپنی بڑائی نہیں کرتے ہیں۔ میں کسی وجہ سے رمنا جی کو یہاں بلانا نہیں چاہتا...... میں خود ان سے ملنے جا رہا ہوں۔“

”تمہاری بہتری اور زندگی کی سلامتی نہیں ہو گی اور تم وہاں کسی قیمت پر پہنچ نہیں سکتے۔“ اس نے

استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ”میں کیوں نہیں پہنچ سکتا؟“ میں نے کہا۔ ”مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ میں ہر قیمت پر جاؤں گا اور تم میری راہ میں آنے کی کوشش نہ کرنا۔ تم اگلے جنم میں دیکھ چکی ہو کہ میں نے تمہارا کیا حشر کیا اور اب تم چڑیل بن چکی ہو۔“

”تم نہیں جانتے کہ اس سرنگ میں کیا ہے۔“ وہ بولی۔ ”بظاہر ایک سیدھا سا راستہ ہے۔ لیکن قدم قدم پر تمہارے لئے مشکلات کھڑی ہوں گی۔ اتنی رکاوٹیں ہیں کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ راکھشش ہوں گے۔ خوف ناک بلائیں ہوں گی جو تمہیں ایک قدم بھی آگے جانے نہیں دیں گی۔ تمہارا خون پی جائیں گی۔ وہ انسانی خون کی پیاسی ہیں۔ جو شخص بھی بھولے سے اس سرنگ کے اندر گیا وہ واپس نہ آسکا۔ تم خود سرنگ میں جا کر اپنی موت کو دعوت دو گے اور پھر تم نہیں جانتے کہ وہ کہاں ہیں؟ تم انہیں ڈھونڈ بھی نہیں سکتے اور نہ ہی وہ تمہیں نظر آئیں گے۔“

”اس مندر سے یہ سرنگ لال مندر کو جارہی ہے۔ یہ میں جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کے ایک جانب بغلی کمرے بھی بنے ہوئے ہیں اور تمہارے رمنا جی اور ان کے گرو ان میں چوہوں کی طرح چھپے ہوئے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”تم اپنا یہ منحوس چہرہ لے کر نظروں کے سامنے سے دفع ہو جاؤ تاکہ میں ان چوہوں سے جلد سے جلد نمٹ لوں۔“

”تم سب جانتے ہو......“ وہ حیران رہ گئی۔ ”میں تمہیں جانے نہیں دوں گی۔ تمہیں یہیں پر نشٹ کردوں گی۔“ وہ غرائی۔ اس نے اپنا منہ کھول کر زبان نکالی۔ اس کی زبان باہر آئی جو دو گز لمبی تھی۔ پھر وہ زبان سانپ بن گئی۔ ایک زہریلا اور خوف ناک سانپ...... اس کی پتلی لکیر سی زبان ایک فٹ لمبی ہوگئی۔ وہ سانپ اپنی زبان بار بار نکال رہا تھا اور اس کی بڑی بڑی آنکھیں جو سانپوں کی ہوتی ہیں۔ بے حد چمک دار تھیں اور انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ پھر وہ سانپ اس کے منہ سے نکل کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ چشم زدن میں میرے گلے میں رسی کی طرح لپٹ کر پھندا بن گیا۔ پھر اس نے اپنا پھن میری گردن پر مارنا چاہا۔ میں نے اس کا پھن پکڑ کر اسے گلے سے نکالا اور اسے مروڑ کر اس کے منہ پر کھینچ مارا تو وہ اس سانپ سمیت یکا یک نظروں سے غائب ہوگئی۔

پھر میں مندر میں داخل ہو کر اس طرف بڑھا، جہاں سرنگ کا دہانہ تھا۔ یہ سرنگ لال مندر کو جاتی تھی۔ یہ سرنگ ایسی اور اتنی بڑی تھی کہ اس میں سے ایک ریل گاڑی با آسانی گزر سکتی تھی۔ بہت اونچی اور چوڑی بھی تھی۔ یہ سرنگ اس لئے بنائی گئی تھی کہ پنڈت، پجاری، جاگیردار اور زمین دار جو عیاش اور اوباش تھے، مندر میں آنے والی حسین اور نوجوان کنواری لڑکیوں کو ہی نہیں بلکہ شادی شدہ عورتوں کو اٹھا کر سرنگ کے بغل میں بنے ہوئے کمروں میں لے آتے تھے۔

پھر اسے جادوگروں اور سفلی علوم کے شعبدہ بازوں نے اپنا مسکن بنالیا تھا۔ پھر انہوں نے اپنے موکلوں کو بھی اس سرنگ میں محافظ بنادیا۔ وہ بھی اوباش اور عیاش قسم کے تھے۔ بدروحوں اور چڑیلوں کو بھی یہاں جگہ دے دی گئی تھی۔ جادوگر عملیات کرتے تھے۔ اپنے شاگردوں کو سفلی علوم سکھاتے تھے۔ کالا جادو سیکھنے کے لئے شاگردوں کو جن مراحل سے گزرنا پڑتا تھا وہ تمام مراحل یہاں طے کرائے جاتے تھے۔ اس

لئے یہاں سے ایک شخص بھی گزر نہیں سکتا تھا۔ بدروحیں جو مردوں کی ہوتی تھیں، چڑیلیں، ان مردوں کو، جو مندروں کے پاس سے گزرتے تھے، ورغلا کر حسین بن کر مردوں کو لبھا کر انہیں موت سے ہم کنار کردیتیں۔ وہ مردوں کو قید کر کے رکھتی تھیں۔ روپا نے بھی کالا جادو سیکھنے کے لئے مردوں کو اسیر بنا کر رکھ دیا۔ ان سے دل بہلاتی تھی اور ان کا خون جمع کرتی تھی۔ روپا کالا جادو سیکھنے کے لئے سب کچھ کر گزری تھی۔

اس سرنگ کے باہر جو مٹی کا ڈھیر تھا، اس پر جوتوں کے نشان تھے جو رمنا جادوگر کے تھے۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی یہاں سے گزرا تھا۔ جب میں اندر داخل ہوا تو سرنگ میں روشنی کا ہالا نظر آیا۔ جگہ جگہ مشعلیں جل رہی تھیں۔ یہ بہت بڑی تھیں اور ان کی روشنی اتنی تیز تھی کہ دن کا اجالا سا ہو گیا تھا۔ میں حیران تھا کہ بلاؤں اور بدروحوں کو روشنی سے کیا کام؟ میں جیسے ہی سرنگ میں داخل ہوا ایک عجیب سی وحشت اور نحوست نے میرا استقبال کیا۔ نادیدہ بلاؤں کے قہقہے سنائی دیئے۔ ان کی بھیانک اور دل خراش قسم کی آوازیں سرنگ میں گونجنے لگیں۔ جو گرم گرم سیسے کی طرح کانوں میں محسوس ہو رہی تھیں۔ لیکن مجھ پر ان کا اثر نہیں ہو سکتا تھا۔ کوئی عام سا آدمی ہوتا تو وہ خوف و دہشت سے بے ہوش ہو جاتا یا واپس چلا جاتا۔

میں چلتا گیا۔ چند قدم طے کئے تھے کہ تیز ہوا چلنا شروع ہوئی۔ لحہ بہ لحہ وہ تیز ہوتی اور سن سناتی گئی۔ یہ ہوا کے جھکڑ تھے۔ پھر طوفان کی شکل اختیار کرلی۔ پھر ایک زبردست طوفان آیا جس کی رفتار دو سو میل فی گھنٹہ ہوگی۔ اس رفتار کا طوفان ایسا خوف ناک تباہ کن ہوتا ہے کہ مکانوں اور ان کی چھتوں کو اڑا دیتا ہے۔ ہر چیز کو تہس نہس کردیتا ہے۔ بڑے بڑے بحری جہاز بھی اس کے سامنے تنکوں کی طرح لہرا جاتے ہیں۔ پھر وہ تاخت و تاراج کر جاتا ہے۔ یہ طوفان مجھے باہر دھکیل رہا تھا۔ اگر میں نے منتر پڑھ کر پھونکا نہ ہوتا تو وہ مجھے میلوں تنکے کی طرح اڑا کر لے جاتا۔ رفتہ رفتہ طوفان کا زور تیزی سے ٹوٹتا گیا۔ حیرت کی بات نہیں تھی کہ اس طوفان سے مشعلیں نہیں بجھی تھیں۔ کیوں کہ وہ جادو کے زور سے جل رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک گہرا سکوت طاری ہو گیا۔ پھر اچانک ایسا حبس ہو گیا کہ آدمی کا دم گھٹ جائے۔ یہ طوفان جو تھا اس کی ہوا گرم تھی۔ ایسی گرم جیسے آگ دہک رہی ہو۔ بھٹی سے آرہی ہو۔ اس گرم ہوا سے جلے بغیر میں نہ رہتا، اگر میں عمل نہ پڑھ لیتا۔ اس عمل نے اس گرم ہوا کو ٹھنڈا اور بے اثر کردیا تھا۔ یہ حبس ایسا تھا کہ آدمی کا دم گھٹ جائے۔ مر جائے۔ جب مجھ پر اس گرم ہوا کے طوفان کا اثر نہ ہو سکا تو اس کا کیا اثر ہو سکتا تھا۔

چند قدم چلنے کے بعد میں نے سوچا کہ کیوں نہ میں یہاں سے غائب ہو کر رمنا اور اس کے گرو کے سامنے ظاہر ہو جاؤں۔ میں ایسا کر سکتا تھا۔ میرے لئے پل بھر کی بات تھی۔ لیکن میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ میری راہ میں کیا مشکلات پیدا کرنا اور کس طرح سے راستہ روکنا چاہتے ہیں۔ اپنے کس کس جادو کا مظاہرہ کرنا اور مجھ سے مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ ذرا یہ تماشا بھی تو دیکھوں۔ وہ چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ اپنے منتروں اور جادو سے مجھے ایسا خوف زدہ اور ہراساں کرنے کی کوشش کریں گے کہ ان کے سامنے گھٹنے ٹیک دوں اور اس غار سے نکل بھاگوں۔ لیکن وہ تو میری جان لینے پر تلے ہوئے تھے۔ شاید وہ نہیں جانتے تھے کہ موت کس کے ہاتھ میں ہے۔ پھر میں نے مخالف سمت ایک سرخ آندھی اٹھتی ہوئی دیکھی۔ اس میں

کرکٹ کی گیند سائز کے انگارے دہک رہے تھے۔ یہ انگاروں کی آندھی تھی جو گزرے ہوئے طوفان کی رفتار سے بھی دگنی رفتار سے آرہی تھی۔ اس میں سینکڑوں نہیں ہزاروں انگارے بھرے ہوئے تھے۔ وہ آندھی تیزی سے مجھ سے قریب ہورہی تھی۔ فاصلہ کم ہوتا جارہا تھا۔ میں اس آندھی کو دیکھ کر رکا نہیں۔ واپس ہونے اور رک جانے کے بجائے آگے بڑھتا ہی گیا۔ پھر انگاروں کی آندھی میرے سر پر آکر چھا گئی۔ مجھ پر انگاروں کی بارش شروع ہوگئی۔ سینکڑوں انگارے اولوں کی طرح میرے سر پر گرنے لگے۔

میں نے پہلے سے ہی ایک منتر پڑھ رکھا تھا۔ آندھی جیسے ہی میرے سر پر آئی میں نے اس منتر کو اس پر پھونک دیا۔ مجھ پر جتنے انگارے گرے، وہ پھول بن گئے تھے۔ مجھ پر پھولوں کی بارش ہورہی تھی۔ ان کی خوشبو سے ساری سرنگ جیسے مہک اٹھی تھی۔ زمین پر پھول بکھرنے لگے۔ یہ تمام کے تمام پھول سفید تھے۔ دودھیا رنگت کے...... یہ رمنا جادوگر کا جادو نہ تھا۔ وہ اتنا بڑا جادوگر نہ تھا۔ وہ اندھوں میں کانا راجہ بنا ہوا تھا۔ یہ عام قسم کے جادوگر کے بس کی بات نہ تھی کہ وہ گرم ہوا کا طوفان بھیجے۔ یہ رمنا کے گرو کا جادو تھا جو اس نے کیا تھا جبس، گھٹن اور انگاروں کی آندھی بھی اس کا کیا دھرا تھا۔ یہ سب کوئی پائے کا جادوگر ہی کر سکتا تھا۔

ایک نہیں کل تین جادوگر میرے مقابلے پر آکر ڈٹ گئے تھے۔ جب کہ میں ان سے مقابلہ کرنے نہیں بلکہ رمنا کو گرفتار کرنے آیا تھا۔ میں جادو کے زور پر رمنا کو کہیں بھی لے جا اور ڈال سکتا تھا۔ میں نے دانستہ ایسا نہیں کیا تھا۔ رمنا کے دونوں گروہوں نے مجھے اس لئے خوف زدہ ہراساں اور پریشان کیا تھا کہ میں رمنا کو لے جانہ سکوں۔ رمنا نے انہیں میرے بارے میں بتا دیا تھا۔ میں نے تو تہیہ کرلیا تھا کہ رمنا کو ہر قیمت پر لے جاکر رہوں گا اور رمنا کے گروؤں نے بھی فیصلہ کیا ہوا تھا کہ وہ رمنا کو کسی صورت سے لے جانے نہیں دیں گے۔ اب یہ جنگ جادوگروں کی تھی۔ انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ میں ایک جادوگر ہوں۔ عام قسم کا نہیں ہوں۔

حقیقت یہ تھی کہ رستم جادوگر نے مجھے جو علوم سکھائے وہ دنیا کے کسی جادوگر کے پاس نہ تھے۔ وہ جادو کے تمام علوم کا ماہر تھا۔ وہ واقعی بہت بڑا اور عظیم ترین جادوگر تھا۔ جادوگروں کا بے تاج بادشاہ...... وہ جو جادو اور منتر جانتا تھا، دنیا کا کوئی جادوگر نہیں جانتا تھا۔ اس نے مجھے ہر طرح اور ہر قسم کے جادو سے بہرہ مند کیا تھا۔ اس لئے کہ میں انسانیت کی خدمت کروں۔ چوں کہ میری نیت صاف تھی اور ایک گہرا جذبہ تھا۔ اس لئے رستم نے مجھے جادو سکھایا تھا۔ میں رمنا کو اس لئے گرفتار کرنے آیا تھا کہ وہ سورج کی طرح ہی قانون اور انسانیت کا مجرم تھا۔

میں آگے بڑھنے لگا تو اچانک سامنے ایک بھیڑ سی نظر آئی۔ یہ سر بریدہ مرد تھے۔ کوئی چالیس سے زیادہ ہوں گے۔ وہ میری طرف بڑھنے لگے۔ ان کے ہاتھ بھی نہ تھے۔ ان کے جسموں پر سانپ لپٹے ہوئے تھے جو مجھے دیکھ کر پھنکار رہے تھے۔ یہ نظروں کی شعبدہ بازی تھی۔ جب میں نے منتر پڑھا تو وہاں کچھ نہ تھا۔ میں مسکراتا ہوا آگے بڑھا۔ جانے کہاں سے ایک ریشمی رومال چشم زدن میں آیا اور میرے چہرے سے چپک گیا۔ اس سے پہلے کہ میں اسے ہٹاتا اور کچھ کرتا، مجھ پر بے ہوشی طاری ہونے لگی۔ میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا گیا۔

میں بے ہوش تو ہو چکا تھا۔ میں نے اپنے اوپر بے ہوشی دانستہ طاری کرلی تھی۔ رمنا جادوگر اور اس کے گروؤں کو دکھانے کے لئے۔ یہ رومال کلوروفام جیسے محلول میں تر تھا، صرف اس کی خوشبو سے آدمی بے ہوش ہوجاتا تھا۔ ایسا محلول کسی جادوگر کے پاس موجود نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی اس کی کسی جادوگر کو ضرورت ہوتی تھی۔ کیوں کہ وہ جادو کے زور سے جسے بھی چاہے بے ہوش کرسکتا ہے۔ یہ بہت بڑے جادوگر اپنے پاس آخری حربے کے لئے رکھتے تھے۔

چوں کہ ان کی ہر تدبیر اور حربہ سخت ناکام ہو چکا تھا اور ان کے پاس کوئی اور تدبیر اور حربہ ایسا نہیں رہا تھا جس سے وہ مجھ پر قابو پاسکیں۔ زیر کرسکیں اور عدم آباد کی طرف رخصت کردیں۔ ایک طرف وہ سخت حیران و پریشان تھے کہ اتنا بڑا اور ماہر اور زبردست جادوگر کہاں سے آگیا۔ اس وقت دنیا میں جتنے بھی جادوگر موجود تھے، ان میں سے کوئی ایک جادوگر مجھ جیسا پہنچا ہوا مہان اور اونچا نہیں تھا۔ ایک اتم بابو تھے، لیکن وہ جانتے تھے کہ میں اتم بابو نہیں ہوں۔ اتم بابو بہت بوڑھا ہو چکا ہے اور آسام میں موجود ہے۔ ایک جادوگر کتنا ہی بڑا اور عظیم کیوں نہ ہو، وہ طبعی عمر سے لڑ نہیں سکتا ہے۔ بڑھاپے اور موت سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکتا تھا۔

انہوں نے مجھے اپنی دانست میں اس لئے بے ہوش کیا تھا کہ وہ بے ہوشی کی حالت میں مجھے بے دست و پا کر کے موت سے ہم کنار کرنا چاہتے تھے۔ وہ کیا ہر ظالم یہ بات بھول جاتا ہے کہ مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہوتا ہے۔ رمنا جادوگر کو کیا ایک ایسا جادوگر تھا کہ اسے حوالات یا جیل میں ڈالنے سے وہ غائب ہوسکتا ہے۔ وہ پولیس سے نہیں بلکہ مجھ سے خائف تھا۔ اس نے اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیا اور جان لیا تھا کہ میں اسے جادوئی طاقت سے محروم کرکے ایک عام انسان بنادوں گا۔

میں دوسرے لمحے اس جگہ سے غائب ہوکر لال مندر کے ہال میں ایک تخت پر بے ہوشی کی حالت میں پڑا ہوا تھا۔ میرے اردگرد رمنا جادوگر اور اس کے دو گرو کھڑے ہوئے مجھے اس طرح سے دیکھ اور گھور رہے تھے جیسے میں دنیا کا کوئی عجوبہ ہوں۔ انہوں نے اب تک ایسی کوئی چیز اپنی زندگی میں نہیں دیکھی تھی، نہ ہی کبھی نظر آسکتی ہے، نہ آئے گی۔

پہلا گرو جو دوسرے گرو کا بھی گرو تھا۔ اس کا نام انت کمار تھا۔ اس کے شاگرد کا نام بھی مہی پال تھا جو رمنا جادوگر کا گرو تھا۔ وہ تینوں اس پر سخت حیران تھے کہ میں جواں سال شخص ہوں۔ رمنا جادوگر تو مجھے دیکھ چکا تھا۔ مل چکا تھا اور اس نے مجھے عقوبت خانے میں ڈال دیا تھا۔ اس کے سینے میں میرے خلاف نفرت اور انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔

"رمنا داس!" انت کمار نے کہا۔ "اب تم یہ بتاؤ کہ اپنے اس دشمن کے خلاف کیا کرنا چاہتے ہو۔ اس وقت یہ بے ہوش پڑا ہوا ہے۔ ایک طرح سے میٹھی نیند سو رہا ہے۔ بے بس ہے، ہمارے رحم و کرم پر ہے، اپنی ناک پر سے مکھی بھی نہیں اڑا سکتا ہے، یہ اس وقت تک اس حالت میں رہے گا جب تک ہم چاہیں گے۔"

"میں یہ چاہتا ہوں کہ اس کی گردن سے سر الگ کرکے اسے سربریدہ لاش بنادوں۔" رمنا داس نے کہا۔

"ہاں ....." اس کے گرومہی پال نے سر ہلایا۔ "اس کی یہی سزا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرنا چاہئے۔"

"لیکن میں اسے ختم کرنے سے پہلے کچھ دیر کے لئے ہوش میں لانا چاہتا ہوں۔" اسنت کمار نے کہا۔ "تم دونوں کا کیا خیال ہے؟" اسنت کمار کی بات سن کر رمنا داس اور مہی پال بری طرح چونکے۔

"آخر آپ ایسا کس لئے چاہتے ہیں......؟" رمنا داس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ وہ خوف زدہ اور پریشان ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

"ہاں گرو!" مہی پال نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اسنت کمار نے فوراً جواب نہیں دیا۔ اس نے دونوں کے چہرے دیکھے۔ "میں کیوں اور کس لئے ایسا چاہتا ہوں تم دونوں میں سے کوئی بھی نہیں سمجھا؟"

رمنا داس کی بھی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا، تاہم نے اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "گرو! آپ بتا دیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میری عقل کام نہیں کر رہی ہے۔"

اسنت کمار نے مہی پال کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تاکہ وہ بھی کچھ کہے۔ "مہی پال! تم بھی کہو کہ یہ کیا مناسب ہوگا کہ نہیں؟ تم چپ کیوں ہو؟"

مہی پال نے جواب دینے سے پہلے اسنت کمار کو بے یقینی کی نظروں سے دیکھا۔ "اس کا ہوش میں آنا کسی بھی لحاظ سے مناسب نہیں بلکہ خطرناک ہوگا۔"

ہنت کمار مسکرایا جیسے اس کی بات بچکانہ لگی ہو۔ دوسرے لمحے ہو بولا۔ "آخر تم دونوں اس کے ہوش میں آنے سے اس قدر ڈر اور خوف کیوں محسوس کر رہے ہو؟ کیا وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا......؟"

رمنا داس نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے جیسے تائید کی۔ "گرومہاراج! آپ نے یہ دیکھ لیا کہ یہ کس قدر خطرناک اور زبردست جادوگر ہے۔ اسے ہوش میں لا کر خطرہ کیوں مول لینا چاہتے ہیں؟"

اسنت کمار اس کی بات سن کر چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر وہ بولا۔

"یہ کتنا ہی خطرناک اور زبردست جادوگر ہے لیکن اس وقت ہمارے رحم و کرم پر ہے۔ ہمارا بال تک بیکا نہیں کر سکتا۔"

رمنا داس نے جواب دینے سے پہلے مہی پال کی طرف دیکھا اور کہا۔ "گرومہاراج! گستاخی شما کریں۔ ابھی ہم سب نے دیکھا کہ ہمارا جادو کوئی کام نہیں آیا اور ہم اس کا بال تک بیکا نہیں کر سکے؟"

"شانتی رکھو رمنا داس!" گرومہاراج نے اسے دلاسا دیا۔ "اب ایسا نہیں ہوگا۔"

"وہ ہوش میں آتے ہی ہم پر حاوی ہو جائے گا۔" مہی پال نے کہا۔ "آپ برا نہ مانیں تو میں یہ کہوں گا کہ اسے ہوش میں نہ لائیں۔" گرومہاراج سوچنے لگا۔ رمنا داس اور مہی پال مجھ سے سخت ہراساں دہشت زدہ تھے، جیسے میں کوئی موت کا فرشتہ ہوں۔

"ٹھیک ہے۔" گرومہاراج نے اثباتی انداز میں سر ہلایا۔ "رمنا داس! تم جو جیسا اور جس طرح اس سے

انتقام لینا چاہتے ہو، لے لو۔" رمنا داس کے چہرے اور آنکھوں سے خوف و دہشت دور ہو گئی۔ وہ خوش ہو گیا۔

وہ مڑا اور اس دیوار کی طرف بڑھا جس پر راج کماروں اور مہاراجوں کی تلواریں ایک قطار میں بڑی تعداد میں لگی ہوئی تھیں۔ اس نے ان تلواروں میں سے ایک تلوار کا انتخاب کر کے نکال لیا۔

دوسرے لمحے اس نے میان سے تلوار باہر نکالی اور اسے ناقدانہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی دمک آ گئی۔ اس نے میان دیوار کے سہارے کھڑی کر دی اور میری طرف بڑھا۔ اسنت کمار اور مہی پال کی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"رمنا داس!" مہی پال نے کہا۔ "کیا تم اس کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر دو گے؟ یہ تلوار اور اس کی دھار کتنی تیز اور زہریلی ہے۔"

رمنا داس نے جواب دینے سے پہلے تلوار کی دھار پر انگلی پھیری۔ پھر مسکرایا۔ "ہاں......اس کی دھار اتنی تیز ہے کہ کسی بھی آدمی کو کسی بھی شیر، چیتا اور ہاتھی کو بھی گاجر، مولی کی طرح کاٹ سکتی ہے۔"

"بس اب تم جلدی سے اس کے ٹکڑے کر دو تاکہ ہم اس کا گوشت کوؤں اور جھیل کی مچھلیوں کو کھلا سکیں۔" مہی پال بولا۔

"لیکن میں صرف اس کا سر قلم کروں گا؟" رمنا داس نے بڑے سفاک لہجے میں کہا۔

"اس سے کیا حاصل ہوگا؟" مہی پال نے متعجب لہجے میں پوچھا۔ "سر کا کیا کرو گے؟"

رمنا داس کے چہرے پر درندگی سی چھا گئی اور آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ "یہ میرا بدترین دشمن ہے۔ انتہائی خطرناک اور خوفناک بھی۔ میں اس کا سر کمرے میں سجا کر اس سے باتیں کیا کروں گا؟" رمنا داس بولا۔

"یہ تم نے بہت اچھا سوچا۔" اسنت کمار نے کہا۔ "اس کے مرتے ہی ہم اس کی روح، اس کے سر میں سما دیں گے تاکہ تم باتیں کر سکو۔"

"میں اس سے پوچھا کروں گا کہ اس کا جادو اور اس کی شکتی گئی کہاں......؟" رمنا داس نے قہقہہ لگایا۔ "پھر میں اس کے منہ پر تھوک دیا کروں گا۔"

"چلو......شبھ کام میں دیر نہ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ یہ ہوش میں آ جائے۔" مہی پال بولا۔

"یہ اس وقت تک ہوش میں نہیں آ سکتا جب تک ہم نہ چاہیں۔ ہم نے اس کا دماغ بھی سن کر دیا ہے۔ وہ موت کی سی حالت میں ہے۔" گرومہاراج بولا۔

رمنا داس نے تلوار کا دستہ دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑا۔ پھر تلوار کو فضا میں بلند کیا اور پھر پوری قوت سے میری گردن پر دے مارا۔ میرا سر قلم کیا ہوتا، تلوار ہی ٹوٹ گئی۔ اس کے ایک نہیں، کئی ٹکڑے ہوئے۔ میرا بال تک بیکا نہیں ہوا۔ ایسا لگا تھا کہ پھولوں کی چھڑی سے کسی نے میری گردن پر پھریری کی ہے۔ تلوار بہت تیز دھار کی تھی۔ ایک ہی وار میں شیر کے بھی دو ٹکڑے ہو سکتے تھے۔

وہ تینوں بھونچکے ہو گئے۔ حیرت اور خوف سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ان کی آنکھیں پھیل گئیں اور ا

ن میں سے دہشت جھانکنے لگی۔ سب سے زیادہ بری حالت رمناداس کی تھی۔ اس کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔

"گرومہاراج!" چند لمحوں کے بعد رمناداس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ رمناداس کے گلے میں جیسے آواز پھنس گئی تھی۔ وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکا۔

"بولو رمناداس!" گرومہاراج نے کہا۔ "ڈرو نہیں۔ میں یہاں موجود ہوں۔"

"یہ کیا ہوگیا......؟ یہ بیس کلو وزنی تلوار کسی چھڑی کی طرح کیسے ٹوٹ گئی؟"

"میرا خیال ہے کہ چوں کہ تلوار تین سو برس پرانی تھی۔ بوسیدہ ہو چکی تھی۔" گرومہاراج نے کہا۔ "اب تم دوسری تلوار نکال لو۔"

"گرومہاراج!" مہی پال بولا۔ "یہ تلوار بوسیدہ نہیں ہو چکی تھی بلکہ اس کا جادو اس کی حفاظت کررہا ہے۔ اگر یہ ایک تلوار بوسیدہ ہے تو پھر ساری تلواریں بھی بوسیدہ ہوں گی۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ اس کے سینے میں خنجر گھونپ دیا جائے۔"

رمناداس لپک کر اس خنجر کے پاس پہنچا جو صرف ایک ہی تھا اور تلواروں کے درمیان تھا۔ پھر وہ خنجر لے کر میری طرف تیزی سے بڑھا۔ میرے سامنے رک کر اس نے میان سے خنجر نکالا۔ اسے اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھا اور پھر میرے سینے میں دل کی جگہ پوری قوت سے اتار دیا۔ اسے ایسا لگا تھا جیسے پورا خنجر میرے سینے میں پیوست ہو گیا۔ اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے ایک بڑے زور کا فاتحانہ قہقہہ لگایا اور ان دونوں کی طرف دیکھنے لگا۔

"میں نے اسے جان سے ختم کردیا ہے گرومہاراج! یہ مر گیا ہے......!"

"شاباش......! شاباش......!" مہی پال نے اس کے پاس آکر مبارک باد دی۔

"اس نے تو ہماری ناک میں دم کردیا تھا۔" گرومہاراج نے کہا۔ "سچ پوچھو تو آج تک کسی مہان جادوگر سے میرا واسطہ نہیں پڑا۔"

"لیکن ہم یہ جان نہیں سکے کہ یہ کون اور کہاں سے آیا تھا؟" مہی پال نے کہا۔

"ابھی اس کی آتما پرلوک سے ہو کر آتی ہوگی۔ اس سے معلوم کرلیں گے؟" رمناداس بولا۔ "اس کی آتما سب کچھ بتادے گی......"

"آتما کیا بتائے گی، میں بتائے دیتا ہوں......؟" میں ایک دم سے آنکھیں کھول کر اٹھ بیٹھا۔

مہی پال اور رمناداس قریب کھڑے تھے۔ مجھے ہوش میں دیکھ کر ایک دم سے اچھل پڑے۔ گرومہاراج بھونچکا ہو گیا۔ اس کا چہرہ زرد ہوا۔ پھر پیلا پڑتا چلا گیا۔

"یہ کیا مذاق ہے...... رمناداس......؟" میں نے خنجر سینے سے نکال کر اس کی طرف اچھال دیا۔ "یہ کھلونا خنجر تم لے کر آئے؟"

سب سے زیادہ بری حالت رمناداس کی تھی۔ اس کی سٹی گم ہو گئی تھی۔ اسے غش آرہا تھا۔ "تم تینوں نے اپنا اپنا جادو مجھ پر آزمالیا" میں نے کہا۔ "کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اگر اب کوئی حسرت اور جادو ہے تو

آزما کر دیکھ لو؟"

وہ تینوں اس طرح سے خاموش کھڑے تھے جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ ان کی زبان پر فالج گر گیا ہو۔ ان کی آنکھیں پھٹی پھٹی سی تھیں۔

"اب تم تینوں میرا جادو دیکھو۔" میں نے کہا۔ "رمناداس قانون کا مجرم ہے، اسے قانون سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ اسے سزا ضرور ملے گی۔ اس نے ناقابل معافی جرم کئے ہیں۔ میں اسے جادو کے زور سے تھانے پہنچا رہا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد وہ حوالات میں ہوگا۔"

"تم ایسا نہیں کرسکتے۔" گرومہاراج نے تیز لہجے میں کہا۔ "ہم تمہیں ایسا کرنے نہیں دیں گے۔ ہماری شکتی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ میں تمہیں......"

"مجھے ایسا کرنے سے کوئی روک نہیں سکتا......؟" میں نے درمیان میں اس کی بات کاٹی اور چیلنج کے انداز میں کہا۔ "تم کچھ نہیں کرسکتے ہو؟ تم نے کیا کچھ نہیں کرکے دیکھ لیا اننت کمار!" میں نے کہا۔ "میں اب بھی تمہارے سامنے موجود ہوں۔ اپنا جادو اور شکتی کیوں نہیں دکھا رہے ہو؟"

"تم کون ہو اور ہم سے تمہاری کیا دشمنی ہے؟" مہی پال اٹک اٹک کر بولا۔ "تم جہاں سے آئے ہو، چلے جاؤ۔ ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔"

"میں ایک سیاح جادوگر ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "میری تم دونوں سے کوئی دشمنی نہیں...... رمناداس جادوگر مجرم ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ لیکن اپنے ساتھ رمناداس کو لے جا رہا ہوں اور تم دونوں کو جادو سے محروم کرکے جا رہا ہوں۔ اب تم دونوں عام آدمیوں کی طرح ہو گے۔"

پھر میں نے منتروں سے ان دونوں کو جادو سے محروم کرکے عام انسان بنادیا اور رمناداس کا ہاتھ پکڑ کر ان کی نظروں سے غائب ہو گیا۔

☆......☆......☆

رمناداس کو قانون کے حوالے کرنے کے بعد میں بنگلور شہر واپس آگیا۔ اب وہاں رہ کر کیا کرتا؟ پھر میں دوسرے دن بنگلور شہر سے آن کی آن میں غائب ہو کر دہلی پہنچ گیا۔ میں نے کناٹ پیلس کے ایک اچھے ہوٹل میں کمرا کرائے پر لے لیا۔ میں جامع مسجد دیکھنے اور دہلی کے تاریخی مقامات دیکھنے کا پروگرام بنا رہا تھا کہ کسی نے دروازے پر بڑی شائستگی سے دستک دی۔ میں نے جا کر دروازہ کھولا تو دروازے پر ایک پچاس برس کا شخص کھڑا ہوا تھا۔ وہ بڑا مہذب اور باوقار سا لگا۔

"کیا میں اندر آسکتا ہوں؟" اس نے شائستہ لہجے میں کہا۔ "میں مخل تو نہیں ہوا۔"

"آجائیے......" میں نے ایک طرف ہٹ کر اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ "میں آرام کررہا تھا۔"

"میرا نام انوپ کمار ہے!" اس نے اپنا تعارف کرایا۔ "میں سامنے والے کمرا نمبر دو سو دس میں دو دن سے ٹھہرا ہوں۔"

"میرا نام سکندر ہے۔" اس نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو میں نے گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔"

آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔"

"جی...... مجھے آپ کا نام معلوم ہو چکا ہے۔" اس نے خوش دلی سے کہا۔ "ویٹر نے بتایا کہ آپ سیاح ہیں اور آج ہی آئے ہیں؟"

"تشریف رکھیں۔" میں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "آپ کیا پینا پسند فرمائیں گے؟"

"اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو میرے کمرے میں تشریف لے چلیں؟" اس نے کہا۔

"میں آپ کے کمرے میں اور آپ میرے کمرے میں بیٹھیں ایک ہی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ تکلف نہ فرمائیں، اسے اپنا ہی کمرا سمجھیں۔"

"اصل بات یہ ہے کہ میں ایک دوست کی تلاش میں جانا چاہتا ہوں۔" وہ بولا۔ "آپ چوں کہ سیاح ہیں، اس لئے آپ کی مدد اور رہنمائی درکار ہے۔ اچھی بات ہے۔ ایک منٹ ٹھہریں۔ میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد وہ آیا، اس کے ہاتھ میں ایک پھولا ہوا لفافہ تھا جو ڈاک سے موصول ہوا تھا۔ اس نے میری طرف اسے بڑھا دیا۔ پھر وہ کرسی پر دراز ہو گیا۔ میں نے لفافہ لے کر اس کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "یہ لفافہ جو ہے وہ میرے دوست کا ارسال کردہ ہے۔" اس نے کہا۔ "میں اس دوست کی تلاش میں جانا چاہتا ہوں۔"

"اس کی تلاش میں جانے میں کوئی قباحت ہے کیا؟" میں نے پوچھا۔

"اس لفافے میں میرے دوست آنند پال کا خط اور اس کی آپ بیتی موجود ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "آپ اسے پڑھ لیں۔ پھر میں آپ کو بتاؤں گا۔ مجھے کیوں تجسس اور اس کی تلاش ہے۔ میرے خیال میں آپ اسے رات کے وقت پڑھیں گے؟"

☆......☆......☆

میں رات کے کھانے کے بعد وہ لفافہ لے کر بیٹھ گیا۔ سب سے پہلے میں نے خط پڑھنا شروع کیا جو آنند پال کا تھا۔ آنند پال اس کا دوست تھا۔ آنند پال کی کتھا پڑھنے سے پہلے اس کا خط پڑھنا ضروری تھا جو ایک طرح سے تمہید تھی۔ "میرے عزیز دوست انوپ کمار! میں یہ خط چند در چند مجبوریوں سے مدت دراز کے بعد لکھ رہا ہوں۔ کچھ خیال نہ کرنا۔ جانے تم دل میں کیا سوچتے ہو کہ میں بھی کیا دوست ہوں۔ ویسے ایک اندیشہ اور وسوسہ ہے کہ اس طویل خاموشی کو تم میری بے پروائی، فراموشی، خود غرضی اور شاید سخت تر وجوہ سے منسوب کرو گے۔ بلکہ ممکن ہے کہ تم نے شاید یہ سوچ لیا ہو گا کہ میں اب اس جہان میں نہیں رہا اور میں سورگ باش ہو چکا ہوں۔ مگر میرا سارا حال سن کر امید ہے کہ میری معذوری کا سبب جان لو گے اور مجھے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے معاف کر دو گے۔

میں زندہ ہوتے ہوئے بھی اس دنیا میں سارے جہاں کے لئے مر چکا ہوں۔ تمہارے سوا کسی کو میری ہستی کا کوئی علم نہیں اور میں تم سے دوستانہ اور مخلصانہ درخواست کرتا ہوں کہ اس غلط فہمی کو یوں ہی

برقرار رہنے دینا۔ اس دوستی کی خاطر جو تمہیں مجھ سے تھی اور تمہاری دوستی جو میرے دل پر آج بھی نقش ہے۔ تم جانتے ہو کہ جب دوستی ایک بار من میں نقش ہو جاتی ہے تو پھر وہ کبھی نہیں مٹتی ہے۔ اس کے ازالہ کی ہرگز ہرگز کوشش نہ کرنا۔

ہماری آخری ملاقات جیسا کہ تمہیں یاد ہو گا کہ بمبئی کی بندرگاہ میں بحری جہاز میں ہوئی تھی۔ اس کا نام چندر بوس تھا۔

تم ان دنوں شادی کی فکر میں تھے۔ میں تب روزگار کی تلاش میں تھا۔ یہ ہم دونوں کے مسائل تھے۔ کیوں......؟ ہم دونوں اس جہاز سے سنگاپور سے آئے تھے۔ تم بمبئی سے کلکتہ چلے گئے۔ تب ان دونوں بڑے شہروں کے نام نہیں بدلے تھے۔ میں نے سنا ہے کہ ہندوستان کے کچھ شہروں کے نام بدل گئے۔ بمبئی، ممبئی، مدراس چنائے اور کلکتہ، کولکتا ہو گیا ہے۔ معلوم نہیں نام کیوں بدل دیئے جاتے ہیں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

تم کلکتہ اس لئے گئے تھے کہ کسی زلف بنگال سے بیاہ کر سکو۔ جب ہم سنگاپور سے بمبئی آ رہے تھے۔ ایک نو بیاہتا بنگالی جوڑا اس میں سفر کر رہا تھا۔ اس بنگالی لڑکی کے صندلی اور نمکین حسن، اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اور زلفوں اور سراپا نے بڑا متاثر کیا تھا۔ تم نے مجھ سے کہا تھا کہ میں شادی کروں گا تو بنگالی لڑکی سے......

سنگاپور میں تمہیں ایک مقامی دوشیزہ بہت پسند آئی تھی۔ تم دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے۔ وہ تم پر بہت مہربان ہو گئی تھی۔ دراصل وہاں کسی لڑکی کا محبت اور دوستی میں مہربان ہو جانا کوئی معیوب بات نہ تھی۔ وہ بڑی فیاض بھی تھی۔ غریب کی بیٹی تھی۔ ان دنوں سنگاپور نے بہت زیادہ ترقی نہیں کی تھی۔ حیثیت بھی مضبوط نہ تھی۔ جب تمہاری محبوبہ ایک روز ایک ہندوستانی ساہوکار کے ساتھ رات بھر کے لئے ہوٹل چلی گئی تو تم نے اس کا بہت برا منایا تھا۔ اس نے بڑی سادگی سے کہا تھا کہ آخر اس میں حرج ہی کیا تھا۔ جسم میری ملکیت ہے۔ میں چاہے کسی کو بھی پیش کروں۔ محبت الگ چیز ہے۔ ہمارے ہاں یہ کوئی معیوب بات نہیں ہے۔ میں گھر والوں کی اجازت سے گئی تھی۔ اب ایک ماہ تک ساہوکار کی دی ہوئی رقم سے گزر بسر ہو جائے گا۔ ہم غریب لوگ ہیں۔ اس کے سوا چارہ نہیں۔ محبت الگ چیز ہے۔ جسم فروشی الگ چیز ہے۔

ہندوستان، بنگال اور آسام میں ایسا نہیں ہے۔ آسام میں صرف مسلمان گھرانے اپنی لڑکیوں کی عزت و آبرو کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ لڑکیاں بھی...... دوسری قوموں میں یہ بات نہیں ہے۔ تم نے یقیناً بنگالی لڑکی سے شادی کر لی ہو گی جو سینکڑوں میں نہیں تو ہزاروں میں ایک ہو گی۔ بنگال میں غربت اور حسین لڑکیوں کی بہتات ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری ازدواجی زندگی پر مسرت اور پر سکون ہو گی۔ خوشگوار اور اطمینان کی...... پیارے پیارے بچے بھی...... میں یہ بات جانتا ہوں کہ تم ہر کسی سے بے پناہ محبت کرنے والے ہو۔ تمہاری پتنی تم سے بہت خوش رہتی ہو گی۔

حالانکہ میں...... میں جیسا تم دیکھو گے صدہا صعوبتوں سے جن کی یاد ہی زہرہ پاش ہے، گزرا اور گزر رہا ہوں۔ سنا ہے کہ تم ہندوستان کے دیہات میں زمین داری کرتے ہو۔ تم سے کسان بہت خوش

ہیں۔ آخر کیوں نہ ہوں۔ تم انسان دوست شخص جو ہو۔ زندگی کے نشیب وفراز سے گزرے ہو۔ حساس ہو۔ بہت ہی خوش حال ہو۔ بڑی آسودگی ہے۔ تمہاری بنگالی پتنی نہ صرف بہت حسین ہے بلکہ سگھڑ، سلیقہ منداور وفاشعار بھی ہے۔ اولاد بھی بڑی سعادت مند ہے۔ دولت، ساکھ عزت...... غرض سارے سکھ جو خوش نصیب انسان کے حصے میں آسکتے ہیں۔ وہ تمہیں حاصل ہیں۔ اب تم دنیا کے ہر لحاظ سے خوش نصیب ترین شخص ہو۔ اپنا اپنا نصیب ہے۔ میرے دوست! تم ہمیشہ سے ہی خوش نصیب تھے۔ بھگوان تمہیں سدا سکھی رکھے۔

میری جو کچھ حالت ہے، وہ آگے چل کر ظاہر ہو جائے گی۔ شکر ہے وہ اگلا دور بڑی ابتلا بڑی حد تک ختم ہو چکا ہے۔ اب آبادی سے دور ایک ویران مقام میں گم نام ہو کر رہتا ہوں۔ گو اس میں یہ اطمینان ضرور ہے کہ ایشور نے زندگی کی حصہ داری وہی رکھی ہے جو میرے حسب حال تھی۔ خانگی راحت...... جو دنیا کی سب سے بڑی نعمت سمجھی گئی ہے۔ وہ اس ویرانے میں بھی حاصل ہے۔ گزشتہ دو برسوں میں جو رنگ میں نے دیکھے تھے ان کے بعد اس کے سوا کسی چیز کی خواہش بھی نہیں......

مگر میں جیسا لکھ رہا تھا۔ سیاحت بحرالجنوب کے بعد میں اور تم جب ایک دوسرے سے جدا ہوئے تو میں نے کہاں کہاں دھکے نہ کھائے لیکن پیر نہ جمے۔ دو ایک دن سوچتا رہا۔ پھر مجھے نیوگنی کا خیال آیا۔ مگر چھ ماہ یہاں رہ کر کیا پایا۔ ملیریا کا تیز دورہ...... ایسا لگا کہ جیسے یہ جان لیوا ثابت ہوگا۔ موت نظروں کے سامنے ہنسنے اور رقص کرنے لگی۔ پھر میری ہمت اور قوت ارادی سے جان بچی تو پھر بورنیو پہنچا۔ اس کے بعد پھرتا پھراتا چین جا نکلا۔ چین جس کی تعریف میں نے بہت سارے لوگوں سے سنی تھی۔

چین کی نسبت تمہیں ابھی تک یقیناً یاد ہوگا۔ اس ملک سے ہم دونوں کو کتنی محبت تھی۔ اس زمانہ میں بھی جب ہم شہر ہانگ کانگ میں اکٹھے رہا کرتے تھے۔ چین اور اہل چین کی کشش میرے دل میں اتنی تھی کہ بارہا تمہاری فہمائش کے باوجود راتوں کو عجیب و پراسرار مقامات پر چلا جاتا...... آہ...... کیا معلوم تھا یہ کشش میرے حق میں کہیں زبوں ثابت ہونے والی ہے۔ مگر غیب کا حال انسان کو کبھی معلوم نہیں ہوا اور مجھ سے پوچھو اسے ایشور کی دیا سمجھنا چاہئے۔

اس خط کے ساتھ میں اپنی آخری چینی سیاحت کا پورا حال بیان کرتا ہوں۔ چوں کہ ہم ہمیشہ سے ہی مشرقی اسرار میں دل چسپی لیا کرتے تھے اور جو کچھ میں نے ان صفحات میں لکھا ہے، وہ اسرار ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ پس میں اس مسودے کو سب سے پہلے تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔ دلچسپ ہو...... سنسنی خیز لگے...... نہ ہو تو اسے ردی میں پھینک دینا۔ میرا مقصد اس تحریر سے اظہار خیالات تھا جو پورا ہو گیا۔

اور اب چند الفاظ اپنی سکوت اور معاشرت کے بارے میں تمہیں بتا دیا۔ کیونکہ تم میرے جگری دوست ہو، تم پر ظاہر نہ کروں گا تو اور کس پر ظاہر کروں گا۔ اور سچ جانو اس میں میری سلامتی بھی ہے۔ اشارتاً اتنا لکھ دیتا ہوں کہ میں ایک زرخیز اور شاداب ملک میں تقریباً پانچ ہزار ایکڑ زمین پر رہتا ہوں۔ گرد پہاڑ ہیں...... اور اب بھی جس وقت میں یہ خط لکھ رہا ہوں۔ کوہستان کی مغربی چوٹی پر سورج افقی بادلوں کو خونی رنگ دیتا ہوا غروب ہوتا جا رہا ہے۔ دامن کوہ میں وسیع سبزہ زار ہے جہاں رنگا رنگ کے پھول کھلے ہیں اور

ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ تہذیب وتمدن کی ہمہ گیر مصروفیتوں سے دور یہ ایک پرفضا مقام ہے جس میں قانع طبیعتوں کے لئے کافی سامان راحت موجود ہے۔ سال میں دو ایک بار وفادار نوکر جو انگریزی کا ایک لفظ تک نہیں جانتا، خچر پر سامان ضرورت لے آتا اور ڈیڑھ ماہ چالیس میل دور ایک ڈاک خانہ سے چٹھیاں آجاتی ہیں۔ اس دوران میں ہماری زندگی انتہائی سادگی سے بسر ہوتی ہے۔ یعنی میں خود اپنے آدمیوں کی مدد سے اناج بوتا اور کاٹتا ہوں اور اس کے علاوہ بھی جہاں تک ممکن ہے ہم اپنی ضرورتیں خود ہی پوری کئے لیتے ہیں۔

مگر اوقات بعید جب مغرب کی سرد ہوائیں گھاس کو سرسراتی ہوئی چلتی ہیں۔ جب موسمی تبدیلیوں پر سارس کے جھنڈ آسمان پر اڑتے ہوئے جاتے ہیں یا مہذب دنیا کے حالات کسی پرچہ اخبار میں نظروں سے گزرتے ہیں تو جی کو بے اختیار بے چینی ہوتی ہے۔ پھر دل کو قابو میں کرنے میں بڑی مشکل ہو جاتی ہے۔

پھر بھی ہم عام حالات میں آرام وقناعت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ تارک الدنیا ہونے کے بعد میں اپنی اکثر خواہشیں مٹا چکا ہوں...... وطن تو وطن ہی ہوتا ہے۔ وطن ماں ہوتی ہے۔ وطن میں ممتا ہوتی ہے۔ وطن کی مٹی میں کیسی عجیب اور سوندھی سوندھی خوشبو ہوتی ہے۔ ماں کی محبت کی خوشبو...... وطن کی یاد اس دور افتادہ ویرانہ میں بھی جی کو بے قرار کر دیتی ہے۔ خیر کچھ ہوا اور اب اس جنگل میں جیون ساتھی کے ساتھ مشرقی سنیاسیوں کی طرح زندگی گزارتا ہوں۔ ایشور نے گھر والی کو ماہر اور قناعت والی بنایا ہے۔ میری طرح وہ دنیا سے کنارہ کش ہونے کے بعد دل میں کسی چیز کی خواہش اور ارمان نہیں رکھتی ہے۔ کوئی سپنا نہیں دیکھتی ہے۔ وہ کون ہے اور کن حالات میں ہم ایک دوسرے کو ملے تھے۔ تمہیں اس کا حال اور تفصیل اس مسودے میں ملے گی۔ جس کی تیاری میں ہم نے لمبی سرما کی راتیں بسر کی ہیں۔ اب سردی گزر گئی۔ ہر طرف بہار کی آمد آمد ہے۔ درختوں میں ہری کونپلیں نکلی ہیں۔ بہتے ہوئے پانی کی آواز سے ملی ہوئی پرندوں کی راگنیاں کانوں میں امرت گھول رہی ہیں۔ چڑیاں گھروں اور فضاؤں میں مصروف نظر آتی ہیں۔ غرض کہ ساری کائنات خرم و مسرور ہے۔ میں اس حسین ماحول میں تمہارا خیال کر کے مسودہ تمہارے پاس روانہ کرتا ہوں۔

ایک شخص نکولا کا حال اس مسودہ میں کئی بار آئے گا۔ شاید تم پوچھو...... وہ کون ہے؟ اور وہ کہاں رہتا ہے؟ افسوس کہ میں اس کا جواب دے نہیں سکتا۔ کچھ عرصہ میں نے اس کے ساتھ رہ کر گزارا تھا۔ یہ اس کا انجام ہے کہ دنیا ترک کرنے پر مجبور ہوں۔ میرے لئے اس کی صحبت اتنی ہی ہے۔ کسی اور کو خواہش ہے تو اسے ڈھونڈ لے۔ بعض اوقات راتوں کو جب ہجوم فکر سے نیند نہیں آتی اور خیالات کا دھارا ہے کہ کہیں کہیں پھیل جاتا ہے تو بارہا سوچتا ہوں کہ میری زندگی کے یہ واقعات کیا اصلی ہو سکتے ہیں؟ کیا جو کچھ میں نے دیکھا وہ محض ایک سپنا تو نہ تھا۔ مگر نہیں وہ خوف جو اس زمانے سے ملا ہو، میرے دل میں گوشہ گیر ہو چکا ہے۔ وہ کسی سپنے کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ چاہے میری عمر سو برس کی بھی کیوں نہ ہو جائے۔ میں ان واقعات کو جو اس غیر معمولی آدمی سے مل کر پیش آئے تھے، نہ بھولوں گا۔

ایک زمانہ تھا...... جب میں اور تم مشرقی اسرار کی تہ تک جانے کی کوشش کرتے تھے۔ میں نے ان دریافتوں سے اپنے آپ کو بھر اپایا۔ پورا حال تم اس مسودہ میں پڑھو گے تو شاید اسے دل فریب افسانہ خیال

کرو۔ مگر ایک دیرینہ دوست کا بیان اگر کچھ معیت رکھتا ہے تو سچ کہتا ہوں۔ ان واقعات میں رتی بھر جھوٹ نہیں۔ ایک سیدھی سادی سی سرگزشت ہے۔ اس حیثیت سے میں نے اسے لکھا ہے۔

آخر میں ایک لفظ اور کہتا ہوں...... ان حالات کو پڑھنے کے بعد میری تلاش یا سعی ہرگز نہ کرنا...... سمجھ لینا اس میں بہتری ہے۔ گھر والی کو میرا پرنام پہنچا دینا...... اور اگر کبھی مصروفیتوں سے دم بھر کے لئے فرصت ہو تو اس کے حق میں پرارتھنا کرنا جو پہلے تمہارا دوست تھا اور اب بھی ہے۔

تمہارا صرف تمہارا دست

آفند پال

تمہید ختم ہوئی۔ مفلسی اور بے کاری...... اس عالم آفات میں یہ دو آزار ایسے ہیں، ان کا کرب اور اذیت وہی جانتا ہے جس کا واسطہ پڑتا ہے۔ ان سے ہر شریف آدمی کو سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے ہر وقت پناہ مانگنی چاہئے۔ اس کی حالت میں احتیاج واقعی موت سے بدتر ہے۔ کیوں کہ اس کی تکلیف عارضی ہے۔ ایک کا خوف وقتی ہے۔ دوسری کی دائمی...... ایشور اگر عزت دے تو دھن دولت میں دے۔ خوب پیسہ دے۔ اتنا کہ سنبھالے نہ سنبھلے۔ کیونکہ اصل عزت تو اس کی اپنی ہے۔ ورنہ بے زر شریف سے کنگلا رذیل ہزار درجے بہتر ہے۔ یہ سانپ کی طرح ڈستے ہوئے زہریلے خیالات تھے جو شنگھائی میں سڑک مالو کی سیر کرتے ہوئے میرے دل کے کسی کونے میں پیدا ہوئے تھے۔ ان خیالات سے چھٹکارا پانا آسان بھی تو نہ تھا۔ اس روز وہاں ٹھنڈے کنوئیں کے پاس چند دوڑیں تھیں اور میں ایک مرد بیکار نہ محتاج...... دن بھر کی پریشانیوں کے بعد محض تفکرات کے خیال سے اس طرف جا رہا تھا۔ آدمی دل کو سکون اور طمانیت پہنچانے کی غرض سے کوئی نہ کوئی تدبیر ضرور کرتا ہے۔

گھوڑا بازار تک پیدل جانے کے بعد میں نے رکشا کیا۔ کرایہ طے کیا۔ کرایہ طے نہ کریں تو رکشا والے پھیل جاتے ہیں۔ اس لئے کہ محض اپنی سفید پوشی برقرار رکھوں۔ بڑے شہروں میں سفید پوشی کو برقرار رکھنا سب سے زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ ورنہ سچ جانیئے میری جیب میں اتنی کم رقم تھی کہ وہ مجھ پر ہنس رہی تھی۔ اسراف کی کفایت رات کے کھانے میں کرنے پر مجبور ہوتا۔

تلاش روزگار میں کئی مقامات پر بھٹکنے اور جوتے گھسنے کے بعد تقدیر نے آخر شنگھائی میں لا ڈالا۔ لیکن یہاں بھی میری بدنصیبی میرے پرتپاک استقبال کے لئے موجود تھی اور مجھ پر ہنس رہی تھی۔ میں ہمت اور حوصلہ ہارنے والوں میں سے نہیں تھا۔ اور پھر جیسے زندگی اور موت کا سوال تھا۔ میں نے یہاں حصول ملازمت کے لئے بڑی کوششیں کیں۔ ایک کوڑی کا بھی روزگار نہ ملا۔ بڑے دھکے کھائے۔ بڑی امید تھی کہ یہاں کوئی نہ کوئی کام مل جائے گا۔ اخبار میں ضرورت کے جتنے اشتہارات نظر آئے، ان میں وہ اشتہارات چھانٹ لیتا تھا، جن کے لئے میں موزوں اور اہل ہوتا تھا۔ میں وہاں درخواست بھیجنے میں ایک دن، ایک گھنٹے کی بھی دیر نہ کرتا۔ مگر وہاں سے کورا جواب ملتا۔ پھر بھی میں مایوس اور نامراد نہ ہوتا۔

کسی بھی اعلیٰ ملازمت کے لئے جن سفارش، تعلقات اور اثر و رسوخ کی ضرورت ہوتی ہے، میں

اس سے محروم تھا۔ نہ ادنےٰ کی اہلیت...... اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں کوئی کام نہیں کر سکتا تھا۔ مسئلہ یہ ہے کہ اس غریبی میں بھی میرے اندر اتنی تمکنت اور غرور باقی تھا کہ وہ تعلق جو ایسے موقعوں کے لئے درکار ہوتا ہے وہ کسی صورت میں نہ کر سکتا تھا۔ مثال کے طور پر دیسی حصہ شہر میں یوروپیشین لوگوں کا ایک کلب تھا۔ جس کے لئے معتمد درکار تھے۔ میں اس لئے ناکام رہا کہ سب کو خوش کرنا مجھے نہ آتا تھا اور نہ ہی میں خوشامد پسند تھا۔ اپنے آپ کو گرانا مجھے کسی قیمت پر گوارا نہ تھا۔

یہ بات اکثر دیکھنے میں آئی ہے کہ آمدنی مسدود تو اخراجات خوب بڑھتے ہیں۔ میری حالت میں روپیہ واقعی پر لگا کر اڑ چکا تھا۔ کسی محبوب کی طرح روٹھ چکا تھا۔ روٹھی محبوبہ کو کسی نہ کسی طرح منایا تو جا سکتا ہے لیکن اس سنگ دل، بے رحم اور سفاک روپے کو منایا نہیں جا سکتا تھا۔ بہرحال اب بھی جس وقت میں ایک موٹا سا سگار منہ میں لئے اپنا ہاتھ شاہانہ انداز میں سگار تک لے جاتا تھا۔ میں بیٹھا ہوا بھی بڑے وقار اور دبدبے اور رعب سے تھا...... دل میں بے اختیار یہ خیالات اٹھ رہے تھے کہ رکشا کا کرایہ ادا کرنے کے بعد میرے پاس کتنی راتوں کا گزارہ باقی رہ جائے گا۔ حالت اتنی بگڑ جاتی تھی کہ اگر بہت جلد کسی طرف سے آمدنی کا ذریعہ پیدا نہ ہوا تو عنقریب کھلی ہوا میں سونے پر مجبور ہونا پڑے گا اور وہ وقت دور نہ ہوگا جب مجھے آوارہ گردی کے الزام میں گرفتار کر کے مجسٹریٹ کے روبرو پیش کر دیا جائے گا۔

اپنی حالت کو بہتر بنانے کی بہت کوششیں کیں اور کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ روزگار ملنے تک اخراجات کم کرنے کی کتنی ہی تدبیریں نہیں کیں۔ کیا کچھ نہ سوچا۔ مگر سب بے سود...... نہ آمدنی بڑھانے کی صورت پیدا ہوئی اور نہ اخراجات گھٹانے کی۔ ایک بات دائرہ مکان سے باہر تھی۔ دوسری خودداری کے خلاف...... اور سچ پوچھیے تو اس آدمی کے خلاف جو ہمیشہ سفید پوش رہا ہو۔ اسے کنگالوں کی صورت اختیار کرنا ممکن بھی نہیں ہوتا......

خیر تو جیسا بیان کیا گیا ہے کہ ہفتہ کی سہ پہر کو میں سوا چار بجے شہر کے باہر دوڑ کے میدان کی طرف جا رہا تھا۔ مالو کی سڑک جو شنگھائی میں سب سے خوب صورت اور فیشن ایبل کہی جاتی ہے۔ یہاں جو رونق ہوتی ہے وہ اس شہر کے کسی اور حصے میں نہیں ہوتی ہے۔ یہاں دل ربا اور عشق طراز اور حسن کی کرشمہ سازیاں جیسے حسیناؤں کے پیکروں کو لبھانے، برمانے اور جسموں میں خون کی گردش تیز کر دیتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔ ان کے انگ انگ سے جیسے مستی ابلی پڑتی تھی۔ پرشباب گداز جسموں کی نمائش دل تھامنے اور بار بار دیکھنے کی خواہش جنم لیتی تھی۔ عورت اس وقت اچھی اور حسین معلوم ہوتی ہے جب جیب بھری ہوئی ہو اور فکر معاش نہ ہو۔ میرا دل تو ان کی طرف دیکھنے کو بھی نہیں چاہ رہا تھا۔

اس وقت گاڑیاں، رکشاؤں، گھوڑوں اور بائیکوں سے یہ سڑک بھری ہوئی تھی۔ حسیناؤں کے دم سے بڑی رونق اور ایک عجیب سا سماں پیدا ہو گیا تھا۔ شہر کے تقریباً سارے یوروپی باشندے اور اکثر مقامی اور دیسی لوگ اس ہفتے کے آخری روز کا نظارا دیکھنے جا رہے تھے۔ ان مشرقی شہروں میں تو تفریح کے سامان کم تر اور نایاب بھی ہوتے ہیں۔

منزل پر پہنچ کر میں نے رکشا والے کو کرایہ دے کر رخصت کیا اور خود اس مقام کی طرف کھڑا ہو گیا۔

جہاں سے گھوڑوں کو گزرنا تھا۔ باقی دوڑیں ہو چکی تھیں۔ اب صرف ایک اور آخری دوڑ باقی تھی۔ میں وہاں پہنچا ہی تھا کہ گھوڑے دوڑتے ہوئے آئے۔ کچھ تو نکل گئے۔ بالکل صاف نکل گئے تھے۔ کچھ ناکام رہے اور کچھ ایسے بھی تھے۔ جنہوں نے درمیانی راستہ اختیار کیا تھا۔ یعنی پھاندے تو ضرور مگر اس انداز سے کہ سواروں کو دوسری جانب سر کے بل گرا دیا۔

نظارا بہت اعلیٰ اور دلچسپ تو نہ تھا۔ بہرحال لوگوں کو ہنسنے کا موقع مل گیا تھا۔

گھوڑے جا چکے تو میں اس خیال سے کہ دوڑ ختم ہوئی باڑ کے پاس ہو کر دوسری طرف جا رہا تھا کہ ناگاہ ہٹو بچو کی آوازیں سنائی دیں۔ دیکھتا ہوں کہ ایک تنہا سوار گھوڑا دوڑائے باڑ کی طرف آ رہا ہے۔ آدمی شاہسوار تھا اور غالباً کامیاب ہو جاتا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ گھوڑے کو ہم خیال نہ بنا سکا اور قابو اور دسترس میں نہ رکھ سکا۔ کوئی چھ گز دور ہی گھوڑے نے رفتار مدھم کی اور اس طرح چلنے لگا جیسے رکنے کی کوشش کر رہا ہو۔ سوار کے رکوانے اور زور لگانے سے وہ گھوڑا رکا تو سہی مگر اس بھدے پن سے کہ وہ خود بھی گرا اور سوار بھی۔ لیکن شکر ہے کہ چوٹ دونوں کو نہیں آئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے جو سوار مٹی میں لت پت تھا، کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھا۔ مگر میں اس کی تیز نظروں کی داد دیتا ہوں کہ اس نے اس حالت میں بھی مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا۔

رومال نکال کر پیشانی کا پہلا پسینہ پونچھتے ہوئے اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔

''اوہ...... یہ تو میرا دوست آنند پال ہے۔ اچھا ہوا دوست تم یہاں مل گئے۔ میں تمہیں صبح سے متواتر نہ جانے کہاں کہاں ڈھونڈتا رہا۔ پوچھتا رہا تھا۔ لیکن تمہیں کہیں نہ پایا۔ بڑا حیران بھی ہوا تھا کہ تم کہاں چلے گئے۔'' وہ بولا۔

''افسوس ہے کہ آپ کو میری خاطر اس قدر زحمت اٹھانا پڑی۔'' میں نے جواب دیا۔ ''آپ کو کہیں چوٹ تو نہیں آئی۔''

''نہیں...... نہیں بالکل نہیں۔'' اس نے نفی کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے جلدی سے کہا۔ پھر اس کے بعد وہ رومال سے کپڑے جھاڑنے کی کوشش کرتے ہوئے اس احمقانہ انداز سے جو گرنے کے بعد انسان میں پیدا ہو جاتا ہے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر اس نے چند لمحوں کے بعد گھوڑے کی طرف دیکھ کر کہا۔

''دوست! ذرا ٹھہرو...... میں اس وحشی کو بھیج دوں۔ پھر ہم دونوں گاڑی میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہوئے چلیں گے۔'' سائیس کو تلاش کرنے کے بعد اس نے گھوڑا سائیس کے حوالے کر دیا۔ پھر گاڑیوں کے ہجوم میں شکل سے اپنی بگھی کا سراغ لگایا۔ پھر ہم دونوں اس شاندار بگھی میں بیٹھ گئے۔ بگھی کا رخ شہر کی جانب رواں دواں تھا۔

ستیش بترا میرے دوست کا نام تھا۔ اس کے اور میرے درمیان دوستی اور بے تکلفی گزشتہ دس برسوں سے چلی آ رہی تھی۔ شنگھائی میں کیا چین میں ہندوستانیوں کی آبادی ساٹھ ستر برس سے تھی۔

ستیش بترا نے گھوڑے کو ایک ہلکی سی چابک لگائی اور چابک کو ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو آنند پال! ہماری بہت پرانی دوستی ہے جو اب تک چلی آ رہی ہے۔ کیا ہماری اس دوستی میں کبھی فرق آیا

دوست؟''

''نہیں۔'' میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''میں آپ کی دوستی اور محبت کی بڑی قدر کرتا ہوں۔ فی زمانہ کون اپنی دوستی اس طرح نبھاتا ہے۔''

''کیا تم اس بات کو تسلیم کرتے ہو کہ دوستوں کے درمیان کی بات کا پردہ نہیں ہوتا ہے؟'' اس نے لمحے کے لئے میری طرف دیکھا۔

''اگر دوستوں کے درمیان کسی بات کا پردہ اور تکلف یا حجاب ہو تو وہ دوستی نہیں کہلاتی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''میری معلومات دھوکا نہیں دیتیں...... اور پھر تمہارے بشرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم مالی طور پر بہت پریشان ہو؟''

میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ اپنا سر جھکا لیا۔ نظریں چرانے لگا۔ ستیش بترا نے اپنا ہاتھ میری پشت پر محبت بھرے انداز سے رکھ دیا۔

''تم آجکل تھوڑی بہت امداد کے محتاج ہو۔ امید ہے کہ تم اس کے اقرار سے انکار نہ کرو گے۔ یہ سچ ہے نا میرے دوست!''

میرا گلا دکھتا ہوا معلوم ہوا۔ مگر اس خیال سے میں ضبط کر گیا کہ یہ وقت بناوٹ اور انا کا نہیں ہے۔ ورنہ میں بھوکا مر جاؤں گا۔ میرے چاروں طرف اندھیرے ہی اندھیرے تھے۔ ان اندھیروں میں ایک کرن پھوٹی تھی۔

میں نے اپنا جھکا ہوا سر اوپر اٹھایا اور اس کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے دوستانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے جواب دیا۔ ''میں آپ کی اس محبت اور ہمدردی کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ بہت پرخلوص اور بے لوث انسان ہیں اور......''

''آنند پال!'' اس نے درمیان میں میری بات کاٹی۔ ''میں نے تم سے یہ نہیں کہا کہ میری تعریف کرو۔ ہم دوست ہیں آپس میں۔'' اس کی یہ بات سن کر میرا دل بھر آیا۔ پھر میں کہنے لگا۔

''آپ کی معلومات درست ہیں اور آپ نے میری حالت کا خوب اندازہ لگایا۔ مجھے اس بات سے انکار نہیں کہ حالات میرے ناموافق ہیں۔ سونے کو ہاتھ لگاتا ہوں تو وہ مٹی بن جاتا ہے۔ بیکاری دامن نہیں چھوڑتی ہے۔ وہ جونک کی طرح میرے نصیب سے چپک گئی ہے۔ اگر میں نے آج رات مالک مکان کو کرائے اور خوراک کے بیس ڈالر فوراً ادا نہ کئے تو پھر وہ مجھے عدالت کے کٹہرے میں لے جا کر کھڑا کر دے گا۔ میں نے بہت کوشش کی۔ فی الحال کوئی معمولی سی بھی ملازمت مل جائے۔ کاش! کوئی ایسا ذریعہ معاش ہو کہ روکھی سوکھی ہی کھانے کو مل جائے۔''

''میں تمہارا مطلب بہت اچھی طرح سمجھ گیا۔'' ستیش نے جلدی سے کہا۔ ''اور حسن اتفاق سے ایک ایسا ہی ذریعہ امداد آج کل موجود ہے۔ یعنی تمہارے لئے ایک ایسا ہی مناسب اور موزوں کام نظروں

میں ہے۔ جسے تم قبول کرلو تو میرے خیال میں تمہاری تنگ دستی فراخ دلی اور خوش حالی میں بدل جائے گی۔ زندگی آسودگی سے گزرنے لگے گی۔''

ستیش کی اس بات نے میرا رواں رواں خوش کردیا۔ پھر میں نے کہا۔

''میں یہ جانتا ہوں کہ آپ کو میرا کتنا خیال ہے اور آپ مجھے تلاش کرنے کی زحمت بھی اٹھا چکے ہیں۔ آپ کا جو حکم......''

''کچھ دن ہوئے کلب کے کمرہ تمباکو نوشی میں میری ایک شخص سے ملاقات ہوئی۔'' ستیش کہنے لگا۔ ''جس کی باتیں نہ صرف نہایت دل چسپ بلکہ عجیب بھی تھیں۔ یوں تو ان مشرقی ملکوں میں کئی طرح کے عجائبات دیکھنے میں آئے ہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ ایسا آدمی جس کا میں ذکر کررہا ہوں، بہت کم نظر آیا ہوگا۔ سب سے حیرت خیز اس کی آنکھیں تھیں۔ جو معلوم ہوتا تھا کہ دل وجگر کو گرماتی ہوئی جارہی ہیں۔

جس رات کا میں ذکر کررہا ہوں، ہم دونوں پاس بیٹھے ہوئے باتیں کررہے تھے کہ افسر بنویل...... غالباً تم اسے بھولے نہیں ہوگے۔ پاس آکر کھڑا ہوگیا۔

''ہیلو مسٹر ستیش!'' اس نے مجھ سے کہا۔ ''میرا خیال تھا کہ تم شاید جمی کپور کے ساتھ شکار کے لئے گئے ہوگے مگر اچھا ہوا تم یہاں موجود ہو اور اس وقت تم سے یہاں خوش قسمتی سے ملاقات ہوگئی۔ کیوں کہ......''

وہ اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ اس کی نظر اس عجیب آدمی پر پڑی جو میرے پاس بیٹھا مجھ سے باتیں کررہا تھا۔ وہ بولا۔ ''بس اسے دیکھتے ہی بنویل کا چہرہ متغیر سا ہوگیا۔ اس کی بدلتی ہوئی ہیئت نے مجھے چونکا دیا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک اس شخص کو گھورتا رہا۔ جیسے اسے کچا ہی چبا جائے گا۔ پھر وہ زیر لب بڑبڑایا۔ ایک لفظ میرے پلے نہیں پڑا۔ لیکن ایسا ضرور محسوس ہوا کہ وہ اسے گالیاں بک رہا ہے۔ چہرے کے تاثرات جو بدل گئے تھے وہ نفرت اور غصے کے تھے۔ پھر اس نے ایک عذر سا مجھ سے پیش کیا کہ اس کی محبوبہ ایک بار میں انتظار کررہی ہے۔ اسے دیر ہورہی ہے۔ پھر مجھ سے ہاتھ ملا کر فوراً ہی کمرے سے نکل گیا۔

قدرتی طور پر مجھے اس کی بدحواسی، نفرت اور غصے پر حیرت ہوئی۔ چند لمحوں تک میں بیٹھا رہا۔ پھر اس عجیب شخص سے فون کرنے کا بہانہ کرکے اٹھا اور اس کی تلاش میں پیچھے نکل گیا۔ وہ ہال میں کھڑا ٹوپی تلاش کرتا ہوا نظر آگیا۔

''یار بنویل!'' میں نے اس سے کہا۔ ''آخر معاملہ کیا ہے؟ کیا بات تھی جو مجھ سے ملتے ہی اس طرح وہاں سے بھاگ آئے جیسے اس کمرے میں کوئی عفریت موجود تھی۔ کہیں مجھ سے ایسی تو کوئی بات نہیں ہوگئی جس سے خفا ہوکر چلے آئے؟''

اس نے جواب دینے سے پیشتر ادھر ادھر دیکھا۔ پھر وہ مجھے اس وسیع ہال کے ایک گوشے میں لے گیا۔ یہاں صرف ہم دونوں تھے۔ وہ جو مجھے یہاں لے کر آیا تھا۔ میں نے اس سے یہ اندازہ لگایا کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے۔ بہت ہی اہم اور راز کی بات ہے۔

اس کی اس حرکت نے حیرت سے زیادہ تجسس پیدا کردیا۔ وہ پراسرار سا لگا۔

ایک ویٹر قریب سے گزرا تو وہ کہتے کہتے رک گیا۔ پھر وہ سرگوشی میں بولا۔

''سنو ستیش! میں کوئی بزدل شخص نہیں ہوں۔ تم بھی یہ بات بہت اچھی طرح جانتے ہو۔ میں نے اپنی نصف عمر عالم سیاحت میں گزار دی ہے۔ یوروپیوں کو جانے دو۔ دنیا میں ان کے مقابلے میں اور بھی سیاح ہیں۔ میں زولو، سامی، ملائی، جاپانی اور نیلا تک لوگوں سے مقابلہ کرچکا ہوں اور اب بھی کرسکتا ہوں...... مگر جب بھی نکولا کو دیکھ لیتا ہوں اور اس سے کہیں بھی ملنے کا اتفاق ہوتا ہے تو بچ جانو فرار ہی میں سلامتی نظر آتی ہے۔ لہٰذا میں تمہیں بھی مخلصانہ ہدایت کرتا ہوں کہ جہاں تک ممکن ہوسکے اس طرح اس آدمی کے سائے سے بچتے رہو، جیسے ایک آدمی شیطان سے بچتا ہے۔''

اس کی باتوں نے میری حیرت میں حد درجہ اضافہ کردیا۔ میرا تجسس بھی دو چند کردیا۔ میں اپنی جگہ بت بن کررہ گیا تھا۔

آخر یہ پراسرار شخص کون ہے......؟ میرے دل کے کسی کونے میں کئی سوال اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس سے ڈرنے کی کیا وجہ تھی؟ میں اس کے متعلق بنویل سے کچھ اور سوالات پوچھنا چاہتا تھا مگر اس نے اس کا موقع نہیں دیا۔ فوراً مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھادیا۔ اس نے کلب کے ملازم سے رکشا لانے کے لئے کہا اور اس کے پیچھے چلا گیا۔ پھر میں اسے رکشا میں جاتا دیکھتا رہا۔

میں جب واپس آیا تو وہ عجیب اور پراسرار آدمی جس کا نام نکولا تھا۔ وہ اب تک وہیں بیٹھا تھا جیسے میرا انتظار کررہا تھا۔ میں اس کے پاس سابق جگہ پر بیٹھ گیا۔ اس کے بارے میں صرف حیرت ہی نہیں بلکہ اب تجسس اور خوف سا لگ رہا تھا۔ اس عجیب وغریب آدمی نے سگریٹ کا لمبا سا کش لے کر کہا۔

''اگر میری یادداشت غلطی نہیں کرتی ہے تو میں نے آپ کے دوست کو اس سے پہلے شاید کہیں دیکھا ہے؟ چہرہ شناسا سا لگ رہا ہے؟''

''آپ نے اسے یقیناً کہیں نہ کہیں ضرور دیکھا ہوگا؟'' میں اور کیا کہہ سکتا تھا۔

''شاید اس کا نام بنویل ہے۔ یاد آگیا۔ دی جانگ میں کام کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے بھولا نہ ہوگا۔'' اس نے کہا۔

''جی نہیں...... وہ آپ کو بھولا نہیں ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''اور وہ بھی آپ کو بہت اچھی طرح اور قریب سے جانتا بھی ہے۔''

''آپ کی تصدیق سے معلوم ہوا کہ میرا اندازہ غلط نہ تھا۔'' اس شخص نے جس کا بنویل نے نکولا بتادیا تھا۔ اس نے کہا۔

''آپ کے دوست سے میری ملاقات ہائی تونگ میں ہوئی تھی۔'' اس نے توقف کرکے اپنے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ آئندہ وہ بھولے سے بھی کبھی بھی اس مقام کے پاس جانے کی کوشش نہیں کرے گا۔''

میں نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ خاموش ہوکر اس پر غور کرنے لگا۔

وہ تھوڑی دیر تک چپ رہا۔ پھر اس نے اپنی جیب سے ایک چٹھی نکالی۔ پہلے تو اسے بہ غور دیکھا۔ پھر اسے پڑھنے لگا اور اس کے بعد اس انداز سے گویا ہوا جیسے کسی اہم معاملہ پر اپنا ارادہ مضبوط کر چکا ہے۔ چند لمحوں تک چٹھی پڑھنے کے بعد اسے تہہ کر کے جیب میں بڑی احتیاط سے رکھ لیا جیسے کوئی قیمتی شے ہو۔ پھر اس نے کہا۔

”میں آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ غالباً آپ مسٹر آنند پال کو جانتے ہیں۔ وہ کسی زمانے میں سول سروس میں کام کیا کرتے تھے اور جنہیں چینی لباس اس خوبی سے پہننا آتا ہے کہ کوئی متجسس آدمی بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ غیر چینی باشندہ ہے۔ وہ ہندستانی ہیں اور رنگت اور قد و قامت کے باعث ان پر انگریز کا دھوکا ہوتا ہے۔“

”جی ہاں...... میں ان سے خوب واقف ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”جب وہ انگریزی میں گفتگو کرتے ہیں تو ان کا لب و لہجہ انگریزوں جیسا اور ان سے بہتر ہوتا ہے۔ اکثر لوگ انہیں انگریز سمجھتے ہیں۔ وہ میرے دیرینہ دوست ہیں اور اتفاق سے آج کل اس شہر میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ آج صبح مجھے ایک دوست نے ان کے بارے میں بتایا تھا۔“

”ہاں...... میں نے بھی سنا۔ میں نے یہ بھی ان کے بارے میں سنا ہے کہ وہ ان دنوں ملازمت کی تلاش میں ہیں۔“ نکولا نے کہا۔ ”اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو آپ انہیں میرے مکان پر بھیج دیں۔ کل رات بارہ بجے سے پہلے...... جب بھی ممکن ہو، وہ مجھ سے ملیں ضرور...... میں امید کرتا ہوں۔ ان کی ملازمت کا خاطر خواہ انتظام کر دوں گا۔“

”بس یہ قصہ ہے دوست!“ ستیش نے کہا۔ ”اور یہ اطلاع دینے کے لئے میں تمہیں ہر جگہ ڈھونڈتا رہا تھا۔“

میں نے اس کا رسمی الفاظ میں نہیں بلکہ خلوص سے شکریہ ادا کیا۔ ”کیا آپ کو علم ہے کہ یہ شخص نکولا کیا آدمی ہے؟“ میں نے کہا۔ ”وہ کیا ملازمت ہوگی جو مجھے پیش کرنا چاہتا ہے؟“

”افسوس کہ میں تمہارے ان سوالوں کا جواب نہیں دے سکتا؟“ ستیش نے معذرت خواہ لہجے میں جواب دیا۔ ”کیوں کہ اس کے حالات کا مجھے کوئی علم نہیں ہے۔ مگر میری سنو۔ تم اپنے کام سے کام رکھو۔ آم کھانے سے مطلب ہونا چاہئے۔ پیڑ گن کر کرنا کیا ہے۔ نکولا کون ہے؟ کیا ہے؟ اس سے کیا غرض ہے۔ وہ تمہیں ملازمت دلائے گا۔ یہ اچھی بات ہے۔“

”اچھا آپ اس کا حلیہ تو بتا دیں کہ وہ کیا آدمی ہے؟“ میں نے کہا۔

”وہ ایک دراز قد شخص ہے۔“ ستیش بتانے لگا۔ ”وہ ایسا بھی نہیں کہ اسے تم پہلوان سمجھو۔ چھریرا بدن، مگر خوب مضبوط، اعضا متناسب اور موزوں...... چہرہ صاف اور رنگت سبزی مائل زرد جیسے مینڈک کی ہوتی ہے۔ مجموعی طور پر اس کی ایسی صورت ہے کہ ایک بار دیکھنے کے بعد اسے کبھی نہیں بھول سکتا۔ آنکھیں اور سر کے بال گہرے سیاہ...... لباس صاف ستھرا اور بیش قیمت جس سے لباس کے معاملے

میں اس کے ذوق کا اندازہ ہوتا ہے مگر اس کے بعد کا سب سے حیرت خیز اور سنسنی خیز جو حصہ ہے وہ اس کی آنکھیں...... اگر وہ آنکھیں تمہاری طرف دیکھ رہی ہیں تو تم محسوس کرو گے کہ روح کو لرزاتی جا رہی ہیں۔ پھر اس کے چہرے میں ایسی جاذبیت اور کشش ہے کہ انسان چاہے یا نہ چاہے وہ اس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ایسی مقناطیسی کشش مردوں میں کہاں ہوتی ہے۔ جانے کیا بات ہے کہ میں اس آدمی کو پسند نہیں کرتا ہوں۔ چوں کہ اپنا کام نکالنا ہے، اس لئے گدھے کو بھی باپ بنا لینے میں حرج کیا ہے۔ یہ ساری دنیا غرض میں اندھی ہوتی جا رہی ہے۔“

میں اس کی بات کے پہلوؤں پر چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر کہا۔ ”یہ آپ نے جو کچھ بیان کیا ہے مجھے وہ کچھ موضوع نہیں لگتا اور پھر ایک اہم تر سوال یہ ہے کہ اسے میری کیا ضرورت ہوگی......؟“

”آخر کوئی حسب حال کام ہی دے گا۔“ ستیش نے ہنس کر جواب دیا۔ ”ایک گریجویٹ کو کوئی ملازمت اس لئے نہیں دیتا کہ اس سے لان کی گھاس چھلوائے یا برتن دھلوائے۔“

اس طرح ہم آپس میں اس موقع پر باتیں کرتے ہوئے ٹھنڈی سڑک سے آہستہ آہستہ گزر کر شہر کے قریب جا پہنچے۔ چند لمحوں تک ہمارے درمیان خاموشی رہی۔ پھر میں نے دفعتاً پوچھا۔

”آپ نے یہ نہیں بتایا کہ اس عجیب و غریب شخص سے میں کہاں جا کر ملوں گا؟ آپ نے اس کا پتا ہی نہیں بتایا؟“

”اس کا پتا تو مجھے بھی نہیں معلوم۔“ ستیش نے گھوڑے کی چال دھیمی ہوتے ہی اس کی پیٹھ پر ایک چابک لگائی۔ ”اس سے تمہاری ملاقات کلب ہی میں ہو سکتی ہے۔ بالفرض وہ وہاں نہیں ہوگا تو منیجر سے مل لینا۔ ممکن ہے کہ وہ تمہارے لئے کوئی پیغام چھوڑ گیا ہو۔ میں کلب ہی جا رہا ہوں۔ چل کر وہاں پتا کرتا ہوں۔“

”ہو سکتا ہے کہ اس نے میرے لئے کوئی ہدایت نہیں چھوڑی ہو؟“ میں نے مایوسی سے کہا۔

”وہ تم سے ملنے کے لئے بہت بے تاب نظر آتا تھا۔“ ستیش نے مجھے دلاسا دیا۔

کلب کے دروازے پر ستیش بگھی روک کر باگ میرے ہاتھ میں تھما دی۔

”تم ایک منٹ ٹھہرو۔ میں اندر جا کر پتا کر کے آتا ہوں۔“ ستیش یہ کہہ کر اترا اور اندر چلا گیا۔ میں اسے نظروں سے اوجھل ہونے تک دیکھتا رہا۔ پھر میری توجہ ان جوڑوں کی طرف ہو گئی جو کلب میں شام گزارنے کے لئے داخل ہو رہے تھے۔

وہ مجھے بھیجنے کے بجائے خود ہی اس لئے چلا گیا تھا کہ وہ جلد معلومات حاصل کر کے آ سکتا تھا۔ جب کہ میرے لئے بہت مشکل تھا۔ مجھے اس کا زیادہ دیر تک انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ وہ پانچ منٹ بعد ہی واپس آ گیا اور اس کے ہاتھ میں ایک خط تھا۔ اس نے میرے پاس آ کر مایوسانہ انداز سے سر ہلایا اور کہا۔

”تقریباً دس منٹ پہلے وہ یہیں تھا مگر اب وہ کسی ضروری کام سے چلا گیا ہے۔ حالانکہ اتنی جلدی جاتا نہیں ہے۔ مگر یہ خط چھوڑ گیا ہے۔ جس میں لکھا ہے کہ مسٹر آنند پال مل جائیں تو انہیں میرے بنگلے پر بھیج دینا۔“

"لیکن مجھے اس کے بنگلے کا پتا تو معلوم نہیں......؟" میں نے کہا۔ "اس کا پتا کس سے پوچھوں؟"

"تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" ستیش نے مجھے تسلی دی۔ "اس کا پورا پتا اس خط میں درج ہے۔ لکھا ہے کہ ردڈی لائٹ میں داہنی طرف تیسرا مکان ہے۔ جس میں ایک مفرور فرانسیسی نواب نے اپنی بے پناہ حسین اور نوجوان بیوی کو بڑی بے دردی اور سفاکی سے قتل کیا تھا، اس میں رہتا ہوں۔ یہ مکان شیطان کی طرح مشہور ہے اور ہر کوئی اس مکان سے واقف ہے...... آنند پال! تم چاہو تو میں اس کے نام ایک واقعہ لکھ دوں۔ اسے ساتھ لے جانا۔ اس سے ملنے جانے سے پہلے اچھی طرح سے غور کر لینا۔ تمہارے پاس خاصا وقت ہے۔ کھانے کے بعد ہو آنا۔ کیوں؟ کیا خیال ہے؟"

"بہت اچھا آپ کا مشورہ بڑا مناسب ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "میں اس عجیب آدمی سے ملنے سے پہلے اچھی طرح سوچنا چاہتا ہوں۔"

ستیش میری بات سن کر ایک بار پھر کلب میں گھس گیا۔ لیکن اس مرتبہ اتنی جلدی واپس نہیں آیا۔ اس نے خاصا وقت لگا دیا۔ میں نے سوچا شاید وہ اپنی محبوبہ کو ریسٹورنٹ میں لے گیا ہوگا۔ تنہائی میں بیٹھ کر باتیں کر رہے ہوں گے۔ اس کلب میں ایسے گوشے بھی تھے جہاں دو دل بڑی آزادی سے ملتے تھے۔ بہت دور تک چلے جاتے تھے۔ جب وہ واپس آیا، اس کا چہرہ بتائے دے رہا تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک خط بھی تھا۔ بگھی میں بیٹھ کر اس نے باگ اپنے ہاتھ میں لے لی۔ پھر اس نے وہ خط میری طرف بڑھا دیا تو میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

"تم کہو تو گھر تک چھوڑ کر آ سکتا ہوں۔" اس نے کہا۔ "تمہارا گھر یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔"

"نہیں...... نہیں......" میں نے فوراً ہی کہا۔ "میں چلا جاؤں گا۔ آپ تکلف نہ کریں؟"

میں نہ نہ کرتا رہا۔ ستیش نے دس دس ڈالر کے دس نوٹ میری جیب میں ٹھونس دیئے اور بڑی گرم جوشی سے محبت سے مجھ سے مصافحہ کیا اور پھر اپنی بگھی میں چلا گیا۔ وہ میرے لئے فرشتے سے کم نہیں تھا۔ اس نے ایک دوست کی مصیبت میں آ کر دوستی کا حق ادا کیا تھا۔ دنیا میں دوست بہت ہیں۔ دوستوں کی کوئی کمی نہیں ہوتی ہے۔ اصل دوست وہی ہوتا ہے جو دوست کی مصیبت میں کام آتا ہے۔ یہاں میرے بہت سارے دوست تھے۔ ان کے علم میں یہ بات تھی کہ میں بے روزگار ہوں اور سخت مالی مشکلات کا شکار ہوں، وہ مجھے دیکھتے ہی کنی کترا جاتے تھے یا سامنا ہو جاتا تو ہاتھ ملا کر بہانہ کر کے تیزی سے آگے بڑھ جاتے کہ کہیں میں ان سے کچھ رقم نہ مانگ لوں۔ ان دوستوں میں جو خوش حال تھے۔ ان کے لئے دس بیس ڈالر دینا کچھ مشکل نہ تھا۔ ان کی جیب پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لیکن ان کے دل چھوٹے تھے اور پھر میں نے ان سے کبھی کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

سو ڈالر بہت بڑی رقم تھی۔ میری جیب میں اس وقت صرف دو ڈالر تھے۔ سو ڈالر میں سے بیس ڈالر مالک مکان کو دے دیتا۔ اسی ڈالر میں بھی دو ماہ بڑے ٹھاٹ سے گزارہ کر سکتا تھا۔

ستیش کو ایشور نے خوب نوازا ہوا تھا۔ اس کا دل بھی بڑا تھا۔ عموماً مرغی جتنی موٹی ہوتی ہے، اس کا

انڈا چھوٹا ہوتا ہے۔ لیکن ستیش بڑا پرخلوص اور ایک طرح سے درد آشنا بھی تھا۔ اس لئے کہ وہ بھی زندگی کے نشیب و فراز اور سخت ترین مشکلات کے دور سے گزر چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ابتلا کا دور کیا ہوتا ہے؟ تنگ دستی اور فاقہ کیا ہوتا ہے۔ میں جس وقت مکان پر پہنچا تو مالک مکان کی بے حد حسین لڑکی کمرے میں گھس آئی۔ اس کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ منہ بنا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی ناگواری سی تھی۔ آنکھوں میں حقارت سی بھری ہوئی تھی۔ میں سمجھ گیا، ایسا کیوں ہے۔

"پپا! تمہیں بلا رہے ہیں۔" وہ نخوت سے بولی۔ "تم ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ چلو۔ ایک منٹ کی دیر بھی نہیں۔ جلدی سے چلو۔" میں جب اس کے ہاں پہنچا تو اس کا باپ سخت غصے کی حالت میں ٹہل رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر لاتعداد شکنوں کا جال تھا۔ چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں بھی صرف غصہ اور حقارت ہی نہیں بلکہ انگارے بھی دہک رہے تھے۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا۔ میری توہین و تذلیل کرتا، میں نے جیب سے سو ڈالر نکالے۔ اس میں سے بیس ڈالر اس کی طرف بڑھائے۔ بڑی انکساری سے معذرت کی۔ بیس ڈالر ہاتھ میں آتے ہی اس کی نفرت، غصہ اور حقارت جھاگ کی طرح بیٹھ گئے اور وہ سب محبت اور شائستگی اور اخلاق میں بدل گئے۔ چہرے اور آنکھوں کے انگارے یک لخت بجھ گئے۔

"یہ لیجئے پیشگی......" میں نے دس ڈالر کا ایک نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ اسے یقین نہیں آیا۔ اس نے نوٹ میرے ہاتھ سے لے کر بیٹی کو ڈانٹا۔

"یہ تم کھڑی منہ کیا دیکھ رہی ہو......؟ جاؤ، جلدی سے کوئی شراب لے آؤ۔"

"میں اس وقت کچھ پینے کے موڈ میں نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔ "بھوک لگی ہے۔ کھانا کھاؤں گا۔ کمرے میں جا رہا ہوں۔ کھانا لے آئیں۔"

میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ مالک مکان نے کوئی سات کمرے کرائے پر اٹھا رکھے تھے۔ ان میں سے چار میں تو خاندان رہتا تھا۔ باقی تین میں سے دو مرد تھے جو کہیں ملازمت کرتے تھے۔ تیسرا میں تھا۔ مالک مکان کی دو جوان لڑکیاں تھیں۔ بڑی لڑکی ایک بار میں ویٹرس تھی۔ وہ رات دس بجے تک ڈیوٹی دینے کے بعد بہت کم رات گھر آتی تھی۔ کئی کئی دنوں تک گھر نہیں آتی تھی۔ کیونکہ وہ کہیں اور ڈیوٹی پر چلی جاتی تھی۔ غیر ملکی اس کی بڑی قدر کرتے تھے۔ وہ ان کے ساتھ راتیں کالی کر کے امریکی ڈالر، برٹش پونڈ اور فرانسیسی فرانک کماتی تھی۔ غیر ملکی کرنسی کی بڑی قدر و قیمت تھی، مقامی ڈالر کے مقابلے میں...... ایک امریکی ڈالر کے عوض مقامی لڑکیاں تین راتیں بسر کرنے کے لئے تیار ہو جاتی تھیں۔ ان غیر ملکیوں کے نزدیک اپنی کرنسی کی کوئی خاص اہمیت اور قدر و قیمت نہ تھی۔ ان کے نزدیک ایک ڈالر، ایک پاؤنڈ اور ایک فرانک ہندوستانی ایک روپیہ تھا۔ وہ شراب اور شباب پر اس لئے پانی کی طرح بہاتے تھے کہ یہ بہت سستا تھا۔ ہندوستانی میں جس طرح عورت سستی ہے، اس سے کہیں ارزاں عورت تھی۔ اس کی دوسری بیٹی میانگ ماں کا سارا دن ہاتھ بٹاتی تھی۔ کیونکہ کرایہ داروں کو طعام کی بھی سہولت تھی۔ رات دس بجے کے

بعد ماں بیٹی گھر پر نہیں ہوتی تھیں۔ اس کی ماں بھی اس عمر میں بھی اتنی حسین اور پرکشش تھی کہ اسے بھی کوئی قدر دان مل ہی جاتا تھا۔ صرف ایک باپ تھا جو رات اکیلا گھر پر شراب اور ریڈیو سے دل بہلاتا تھا۔

جب وہ میرے لئے رات کا کھانا لے کر آئی تو ٹرے میں نہ صرف پر تکلف کھانا تھا بلکہ وہ خود بھی بہترین لگ رہی تھی۔ جب میں نے یہ کمرا لیا تھا تب لڑکی نے باتوں میں دریافت کرلیا تھا۔ میں اس شہر میں کس لئے آیا ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اس شہر ہی میں رہتا ہوں۔ رہتا تھا، ذریعہ معاش کی تلاش میں گیا ہوا تھا۔ ہر جگہ سے مایوس اور ناکام ہو کر آیا ہوں۔ تب سے اس کا رویہ بڑا خشک تھا اور سرد مہری سے پیش آتی تھی۔ کھانا لاتی اور میز پر رکھ کر اس تیزی سے کمرے سے نکل جاتی، کہ کہیں میں اسے دبوچ نہ لوں۔ حالانکہ میں اس قماش کا نہ تھا اور نہ ہی میں نے اپنی راتیں رنگین کرنے کے بارے میں سوچا۔

آج جو وہ کھانا لے کر آئی وہ ایسی حالت میں تھی کہ میں کھانے کے بجائے اس پر ٹوٹ پڑوں۔ اس کی آنکھوں میں خود سپردگی بھری ہوئی تھی۔ میز پر کھانا چننے کے بعد جب اس نے دیکھا کہ میں اس کی طرف متوجہ نہیں ہوں تو پاس آکر بولی۔

"میں کیا آج کی رات تمہارے ساتھ بسر کرلوں؟ تم بہت خوش ہو جاؤ گے؟"

"میں اپنی زندگی میں عورت اور شراب سے بہت دور رہا ہوں۔ لہٰذا تم زحمت نہ کرو، اگر میں ایسا ہوتا تو تمہیں سیوا کا موقع دیتا۔"

وہ میرا ٹکا سا جواب سن کر پیر پٹختی اور جھنجلاتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

میں مکان پر آنے سے پہلے کچھ سوچ کر مکان کے بجائے بند کی طرف جو اس شہر کا خاص تفریحی مقام ہے، ہولیا تھا۔ اس جگہ چنار کے درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ یہاں بڑا سکون تھا۔ میں اطمینان اور یکسوئی سے سوچنا چاہتا تھا۔ میں نے سارے حالات کے بارے میں غور کرنا شروع کیا تھا۔ معاملہ واقعی پراسرار تھا۔ گو کہ میں نے ستیش سے اس کا ذکر نہیں کیا۔ اس لئے بھی کہ اس سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ اور پھر اس غریب نے مجھے بہت سی جگہ تلاش بھی کیا تھا۔ اور پھر سو ڈالر کی مالی مدد بھی کی تھی۔ میرے لئے نکولا کا نام نیا نہیں تھا اور نہ ہی پہلی بار میں نے سنا تھا۔ میں اس کا نام سن چکا تھا۔ یہ اگر وہی ڈاکٹر نکولا ہے جس کی مشرقی ملکوں میں بڑی دھوم تھی اور بچہ بچہ بھی اس کے نام سے واقف تھا اور جس نے ایک ناچیز چھڑی حاصل کرنے کے لئے آسٹریلیا کے وزیر خارجہ کا ناک میں دم کر دیا تھا۔ یہ تو بھگوان ہی جانتا تھا کہ میں اس سے مل کر کیا رنگ دیکھوں گا۔ مگر ایک تجسس اور تامل کے ساتھ ہی اس عجیب اور پراسرار آدمی سے ملنے کی شدید خواہش پیدا ہوگئی۔ جس کا نام ہر جگہ تہلکہ برپا کرنے والا تھا۔ ویسے میں نے کبھی خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا کہ میری اس سے ایک دن ملاقات ہوگی۔

وہیں سے چل کر مکان پر آیا تھا۔ جب کھانا کھا کر نکولا سے ملنے جانے کے لئے نکلا تو اس وقت رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ میں اس مقام کی طرف روانہ ہو گیا۔ جس کا پتا ستیش نے دیا تھا۔ میں نے جو آخری فیصلہ کیا تھا، وہ یہ تھا کہ ایک بار اس سے مل لینا چاہئے۔ آخر وہ کیوں اور کس لئے مجھ میں دلچسپی لے

رہا ہے اور وہ مجھ سے واقف بھی تھا۔ غائبانہ ہی سہی۔

مجھے ان حالات سے جو میں نکولا کے بارے میں سن چکا تھا اور کچھ موسم کی ناگواری سے طبیعت بری طرح مکدر سی تھی اور اعصاب پر ایک ایسا بوجھ تھا جیسے کسی نے چٹان رکھ دی ہو۔ منوں بھاری ہو رہا تھا۔ کئی بار جی میں آیا کہ میں ناحق اس شخص سے ملنے جا رہا ہوں۔ لاحاصل ہے۔ کیوں کہ اس سے لوگ ڈرتے ہیں۔ اس سے کوئی بھی ملنا پسند نہیں کرتا۔ اس سے تو بہتر ہے کہ مالک مکان کی بیٹی کو ساری رات کے لئے بلا لوں......

اس شہر میں حسن و شباب کی کوئی کمی نہیں تھی۔ میں یہ بات جانتا تھا کہ جو ایک بار اس غلاظت کے دلدل میں گر جاتا ہے وہ کبھی بھی نکل نہیں پاتا ہے۔ اس میں گرنے کے بعد کوئی نکلنے کی کوشش کرتا تو وہ اور بھی دھنستا ہی چلا جاتا تھا۔

پھر مجھے اپنی ناداری کا خیال آیا۔ ستیش نے جو سو ڈالر دیئے وہ کب تک چل سکیں گے......؟ میرے دوستوں میں کوئی ایسا دوست نہیں تھا جو ایک ڈالر بھی قرض دے اور پھر میں ایسا خوددار تھا کہ کسی سے مدد یا قرض نہیں مانگتا تھا۔ میں خوددار تھا، مجھے بھوکا مر جانا پسند تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ وہ چاہے کیسا آدمی ہو۔ اگر اس نے کوئی ملازمت دے دی تو پھر میں اپنے کام سے کام رکھوں گا۔ آم کھانے سے مطلب ہونا چاہئے۔ پیڑ گن کر کرنا بھی کیا ہے۔

رات اندھیری اور آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ اولوں کی بوچھاڑ کا بھی اندیشہ تھا۔ لیکن بادل ابھی برسے نہیں تھے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد بادل برس پڑے تو میں ایک درخت کے سائے تلے کھڑا ہو گیا۔ خاصی دیر بعد بارش تھم گئی۔

روڈ سے گزر کر میں روڈیلا نائٹ میں داخل ہوا اور بہت جلد اس کے مکان کا پتا لگا لیا۔ واقعی اس کا مکان اس علاقے میں شیطان کی طرح مشہور تھا۔ میں نے جس سے اس کے مکان کا پتا پوچھا، اس نے چونک کر مجھے دیکھا ضرور تھا۔ میں جب اس کے مکان پر پہنچا تو دیکھا۔ مکان میں ہر طرف اندھیرا اور گہرا سکوت طاری تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مکان میں موجود نہیں ہے۔ شاید کہیں گیا ہوگا جو ابھی تک لوٹا نہیں۔ کیا کروں؟ اس کا انتظار کروں یا پھر کل آجاؤں۔ پھر خیال آیا کہ ہو سکتا ہے کہ وہ سو گیا ہو۔ کیوں نہ دروازہ کھٹ کھٹا کر دیکھ لوں۔ سو رہا ہے تو بیدار ہو جائے گا۔ اسے میری آمد ناگوار نہیں معلوم ہوگی۔ کیونکہ اس نے بلایا ہے کہ میں بارہ بجے رات سے پہلے آکر ملوں۔

میں نے پہلی بار دستک دی۔ چند لمحے انتظار کیا۔ جواب نہ ملا تو میں نے پہلے کی نسبت قدرے زور سے دروازہ کھٹ کھٹا دیا جواب نہ ملنے پر میں واپس جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ چاپیں سنائی دیں۔ دروازہ کھلا اور چینی لڑکا ہاتھ میں شمع تھامے نمودار ہوا۔ شمع خاصی بڑی تھی جس کی روشنی بھی بہت تیز تھی۔ اس لڑکے نے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو میں نے پوچھا۔

"کیا ڈاکٹر نکولا اس مکان میں رہتے ہیں اور وہ موجود ہیں؟"

لڑکے نے اثباتی انداز میں سر ہلا دیا۔ میں نے جیب سے ستیش بترا کا سفارشی خط نکال کر اس کی

طرف بڑھا دیا۔

"یہ میرے دوست کا خط ہے ان تک پہنچا دو۔ یہ ان کے نام ہے۔" میں باہر کھڑا رہا۔ وہ لڑکا خط لے کر دروازہ بند کر کے اندر چلا گیا تھا۔

میں باہر کھڑا مختلف خیالوں کے گرداب میں پھنسا رہا۔ اندیشوں اور وسوسوں کے زہریلے ناگ پھنکار رہے تھے۔ لڑکا دو تین منٹ بعد آیا۔ اس نے دروازہ کھول کر ایک طرف ہٹ کر کہا۔ "چلئے...... انہوں نے آپ کو یاد فرمایا ہے۔" میں نے جیسے ہی اندر قدم رکھا، اس نے باہر کا دروازہ بند کر کے اس کی چٹخنی لگا دی۔ جانے کیوں مجھے اس کی یہ حرکت پراسراری لگی۔ پھر وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر ایسے کمرے میں پہنچا جہاں کوئی دوسرا موجود نہ تھا۔ وہ لڑکا شمع رکھ کر اندر چلا گیا۔ اس کی آمد سے قبل مجھے اس کمرے کا جائزہ لینے کا اچھی طرح موقع مل گیا تھا۔ میں انتظار میں کرتا بھی کیا۔

کمرہ ایسا بڑا نہ تھا...... اور چند مستثنات کے سوا اس کے سامان ہی میں کوئی خوبی تھی۔ عام حالت مشرق کے بنگلوں سے ملتی تھی۔ بائیں جانب کھڑکی جس میں شتر اور سلاخیں لگی ہوئی تھیں اور اس کی کھڑکی اور دروازہ کے درمیان ایک بڑی الماری بے شمار کتابوں سے بھری ہوئی تھی۔ جن کے متعلق میں نے سرسری دیکھ کر اندازہ کیا کہ مبادیات اور کیمیا سے لے کر کنفیوشس کے مذہب تک ہر مضمون میں جمع کی گئی ہیں۔ فرش پر دبیز قالین اور میں جس دروازے سے داخل ہوا تھا۔ اس کے بالمقابل ایک اور دروازہ جس کے آگے ایک بھاری پردہ لٹکا ہوا تھا۔ دیواروں پر تصویریں آویزاں تھیں۔ مگر سب کی سب غیر معمولی اور نادر قسم کے شاہکار تھے۔ مثلاً ایک میں مصر کا انڈور کی جادوگرنیوں کے پاس جانا اور ان کا اپنے سحر سے صحرا کی خشک ہڈیوں کو صورت انسانی میں دکھانا واضح کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ قلو پطرہ...... فرعون کا اپنی ملکہ کے ساتھ جذباتی و رومانی منظر...... ایک اور تصویر میں ملکہ مصر اور یونان کے شہزادے کا رومانی منظر...... یونان کی حسیناؤں کا آفتابی غسل ...... اسپین کا مقبول عام اور وحشیانہ کھیل بل فائٹنگ...... رومی حسیناؤں کے عریاں رقص...... اور مختلف قوموں کی عورتوں کی عریاں تصاویر...... الماری پر رکھے ہوئے ایک کلاک سے ٹک ٹک کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ مگر اس کے سوا ہر طرف ایک کامل سکوت تھا جو بے حد پراسرار سا لگ رہا تھا۔

میں تقریباً پانچ سات منٹ تک کمرے میں تصویروں کو دیکھتا رہا۔ ان تصویروں نے میری ساری توجہ اپنی طرف مبذول کر لی تھی۔ میں نے فن مصوری کے ایسے نادر نمونے بہت کم دیکھے تھے۔ نگاہ تھی کہ ہٹنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ پھر مجھے پردے کے اس جانب کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ معاً پردہ ہٹا اور ایک آدمی اندر داخل ہوا جو ڈاکٹر نکولا کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا......

☆......☆......☆

شکل وصورت میں وہ ٹھیک ویسا ہی تھا جیسا کہ تینش نے بیان کیا تھا۔

شام کا بے داغ لباس پہنے جس کی سیاہی اس کے بالوں اور آنکھوں کی سیاہی سے ٹھیک ملتی تھی۔ وہ صرف خوب صورت ہی نہیں بلکہ وجیہہ بھی تھا۔ اس کی وجاہت میں اس کے دراز قد نے بے پناہ اضافہ

کر دیا تھا۔ اس کی صحت قابل رشک تھی۔ مضبوط سینہ جو چوڑا چکلا تھا اور گویا دی النظر میں یہ جاننا مشکل تھا کہ وہ کس سن کا آدمی ہے۔ اس کی وجاہت اور کاٹھی نے اس کی عمر چھپالی تھی۔ بعد ازاں مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ اڑتیس اور چالیس برس کی عمر کا تھا۔

وہ دروازے سے گزر کر سیدھا میرے پاس آیا۔ پھر اس نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

"آپ مسٹر آنند پال ہیں......؟" اس نے بڑی شائستگی سے مجھے مخاطب کیا۔

"جی ہاں...... یہی میرا نام ہے۔" میں نے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا۔ "آپ شاید ڈاکٹر نکولا ہیں۔ آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔"

"جی ہاں...... میں ڈاکٹر نکولا ہوں۔" اس نے سر ہلایا۔ "اور اب اس تعارف کے بعد ہمیں اصل معاملہ کی طرف آنا چاہئے۔"

وہ ایک عجیب انداز سے جو بعد ازاں میں نے ہمیشہ مخصوص دیکھا۔ اس دروازے کی طرف گیا جس کی راہ سے داخل ہوا تھا۔ اور پھر اس نے مجھے بھی آنے کا اشارہ کیا۔ یہ بیس بائی چالیس فٹ کا خاصا فراخ کمرا تھا۔ ایک سرے پر اونچی کھڑکی جس میں قیمتی رنگین شیشے لگے ہوئے تھے۔ دیواریں جاپانی شجر سے ڈھکی ہوئی اور ان پر تلواریں...... کلہاڑے اور راج پوتی اسلحہ کے بعض نایاب نمونے تھے۔ الماریوں میں بے انتہا کتابیں اور آتش دان پر چینی کے بیش قیمت برتن رکھے ہوئے...... روشنی کا انتظام تین زرنگار لیمپوں کے ذریعے کیا گیا تھا...... اور بے شمار کرسیاں اور دیوان قرینے سے سجے ہوئے تھے۔

"تشریف رکھیئے۔" ڈاکٹر نکولا نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اور میں حد درجہ حیرت میں ڈوب گیا کہ بھگوان جانے گفتگو کا رخ کیا ہوگا۔ کس نوعیت کی ہوگی۔ ماحول پراسرار سا ہو گیا تھا۔ میں بیٹھ گیا۔ وہ میرے سامنے رکھی ہوئی ایک اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھر وہ مجھے تیز اور متجسس نظروں سے دیکھنے لگا۔ دوسرے لمحے وہ بولا۔

"میں نے سنا تھا کہ آپ بہت عرصے تک اس ملک میں رہ چکے ہیں؟" لمحاتی توقف کر کے اس نے کہا۔ "کیا یہ بات صحیح ہے؟"

"جی ہاں۔" میں نے اثباتی انداز میں سر ہلا دیا۔ "میری عمر کا بڑا حصہ اپنے ملک سے باہر خصوصاً مشرقی ملکوں میں بسر ہوا ہے۔ آپ یوں سمجھ لیں کہ چین میرا دوسرا وطن ہے۔ یہاں کے حالات جو مجھے معلوم ہیں۔ وہ بہت کم کسی ہندوستانی اور انگریز کو معلوم ہوں گے۔"

"غالباً وہ آپ ہی تھے جو 23 اگست 1947 کو وان سین کے اس جلسہ میں شریک ہوئے جو کونگ شاہ کے مکان پر منعقد ہوا تھا۔" اس نے کہا۔ "اور آپ ہی نے ماہ پو کو امرائے چین کی گرفتاری سے رکنے میں مدد دی تھی......؟"

میں اس کی یہ بات سن کر نہ صرف چونک پڑا بلکہ اچھل سا گیا تھا۔ کیونکہ اس نے جو کچھ بیان کیا تھا وہ صحیح تھا۔ مگر میں نہیں جانتا تھا کہ اس واقعہ کا حال کسی اور کو بھی معلوم ہے۔ میں اندر ہی اندر سخت پریشان

ہوگیا تھا۔ تاہم میں نے سنبھل کر کہا۔

”جی ہاں...... میں انکار نہیں کروں گا۔ آخر آپ کو ان باتوں کا علم کیوں کر ہوا؟“

نکولا نے بڑے اطمینان سے داہنے گھٹنے پر ہاتھ پھیرا۔ پھر وہ مجھے متبسم نظروں سے دیکھتے ہوئے ٹھنڈے لہجے میں بولا۔

”میرے دوست! انسان مشرق میں رہ کر بہت ساری باتیں سیکھتا ہے۔ یہ دریافت جس کا میں نے ذکر کیا ہے۔ یہ تو نہایت معمولی اور عام سی بات ہے۔ اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ ایسی واقفیت تو ادنے حیوانوں سے بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔“

”معاف کیجئے۔“ میری بدحواس اور بڑھ گئی۔ میں نے بڑھتی ہوئی حیرت سے پوچھا۔ ”میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا۔“

”حالانکہ بات بہت سہل تھی۔“ وہ زیرلب مسکرا دیا۔ ”ٹھہریئے...... میں اپنا مطلب ایک واضح مثال سے وضاحت سے ثابت کرتا ہوں۔ مگر آپ مہربانی سے اسے اپنے تک ہی محدود رکھیں۔“

اس نے سفید کاغذ کا بڑا سا تختہ اٹھا کر سامنے رکھا اور پھر کوئلہ کا ایک ٹکڑا لے کر اس پر رکھ دیا۔ اس کے بعد اس نے ایک خاص انداز سے سیٹی بجائی تو میں سخت متعجب نظروں سے اس کی اس حرکت کو دیکھنے لگا۔

آن واحد میں ایک بڑی کالی بلی جس کے بالوں کی سیاہی ڈاکٹر نکولا کے کوٹ کو بھی مات کرتی تھی۔ کسی نادیدہ مقام سے کود کر فرش پر آرہی۔ ہم دونوں کی طرف باری باری دیکھتے ہوئے خرخر کر کے موٹی گچھے دار دم ہلانے لگی۔

نکولا نے اس کی پیٹھ پر شفقت کے انداز سے کئی بار ہاتھ پھیرا۔ پھر اس نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”دنیا میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کہیں گے کہ یہ بلی نہیں...... بس میں کیا ہوا کوئی کالا دیو ہے۔ جو ہر بات میں میرے حکم کی تعمیل کرتا ہے۔ مگر آپ ایسا ذی فہم امید ہے کہ ایسی باتوں پر نہیں جائے گا، نہ ہی کسی اور انداز سے سوچے گا۔ یہی ایک تجربہ آپ کو دکھاتا ہوں۔ اس کے ذریعہ آپ اگر چاہیں تو کچھ اور سوالوں کا جواب بھی دیا جاسکے گا۔“

اس نے کوئلہ اٹھا کر تختہ کاغذ پر ایک سے دس تک ہندسے لکھے۔ پھر ان کے نیچے ایک لمبی لکیر کھینچ دی اور پھر وہی ہندسے دوبارہ لکھے۔ بعدازاں بلی کو زانو پر رکھ لیا اور پھر تھوڑی دیر تک سابقہ انداز سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ اس نے دبی آواز میں اس سے کچھ کہا جس کا مطلب افسوس ہے کہ میں نہیں سمجھ سکا۔ وہ بلی فوراً ہی فرش زمین پر کود گئی اور اس تختہ کاغذ کے پاس جا کر پہلے داہنا اگلا پیر بالائی ہندسوں میں سے ایک پر رکھا پھر ثانیہ بھر بعد بایاں پیر نچلی قطار کے ایک ہندسے پر......

میں نے دیکھا۔ اس کے پیر دو اور چار کے ہندسے پر رکھے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر نکولا نے اس کا مطلب واضح کرتے ہوئے کہا۔ ”چوبیس۔ آپ سمجھ گئے نا؟“

پھر وہ کوئلہ ہاتھ میں لے کر اس نے کاغذ الٹا...... اور پھر اس پر اختصار کے ساتھ بارہ مہینوں کے نام لکھے۔ ڈاکٹر نکولا نے اس تختہ کاغذ کو لکھنے کے بعد رکھ دیا اور کہا۔ ”جون۔“

ڈاکٹر نکولا کی زبان سے ادھر لفظ جون نکلا۔ ادھر اس پراسرار بلی نے لمحے کی بھی دیر نہیں کی۔ اس نے اپنا پیر لفظ جون پر رکھ دیا۔ بعدازاں یہی عمل پھر کیا گیا۔ اب کی بار نکولا نے انگریزی ابجد کے سارے حروف لکھے اور بلی نے ایک ایک کر کے اے...... پی...... آئی...... اے پر پاؤں رکھا جن کو ملانے سے لفظ اپیا بنتا ہے۔

”معلوم ہوگیا۔“ ڈاکٹر نکولا نے پراسرار تبسم سے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ”آپ کے بارے میں۔“

”کیا......؟“ میں نے قدرے حیرت اور تجسس سے دریافت کیا۔ ”کیا معلوم ہوا؟“

ڈاکٹر نکولا نے بلی کے سر پر پھر ہاتھ پھیرا اور معنی خیز لہجے میں بولا۔

”24 جون 1946 میں آپ مقام اپیا میں تھے۔؟ کیا یہ غلط ہے؟“

میں انکار کیسے کرتا۔ یہ بات سولہ آنے سچ تھی۔ پھر میں نے اقرار کیا۔ ”بے شک تھا۔“

وہ میرا جواب سن کر مسکرا دیا۔ اس کی مسکراہٹ میں فاتحانہ انداز تھا۔ پھر وہ بولا۔ ”میں خوش ہوں کہ میری تحقیقات غلط نہیں ہوئی۔ اب آپ چاہیں تو میں یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ آپ اس جگہ کیوں اور کس لئے اور کیا کرنے گئے ہوئے تھے۔“

”نہیں۔“ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ ”آپ اس کی زحمت نہ کریں۔“

میں نے اسے اس لئے منع کیا تھا کہ...... اس کی معلومات کے بارے میں میرا اطمینان ہو چکا تھا۔ میں اس کی زبان سے یہ بات سننا نہیں چاہتا تھا کہ میری وہاں جانے میں کیا مصلحت تھی۔ اس کا پوشیدہ رہنا ہی بہتر تھا۔ ڈاکٹر نکولا کی آنکھوں میں خوشی بجلی کا کوندا بن کر لپکی۔ اپنی لمبی پتلی انگلیوں کے سرے جوڑ کر اس نے پھر کہا۔

”اب کہئے...... میری اس پراسرار بلی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟“

”بلی کیا...... میں تو اسے شیطان کی خالہ سمجھتا ہوں۔“ میں نے تیز لہجے میں کہا۔

”آہ...... شاید آپ کے دل میں بھی وہ خیالات پیدا ہونے لگے ہیں جو اور لوگ...... رکھتے ہیں ...... مگر آپ یقین فرمایئے۔ میں کوئی مبالغہ سے کام نہیں لے رہا ہوں اور پھر مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ مجھے کسی کا کوئی ڈر اور خوف نہیں ہے۔ کسی کے یقین کرنے یا نہ کرنے سے میری ذات پر کوئی اثر فرق نہیں پڑتا۔ یہ ایک عام بلی ہے۔ کوئی فوق الفطرت وجود نہیں۔ البتہ میں نے اس کی تربیت ایک خاص طریقے سے کی ہے...... یہ جو آپ دیکھ رہے ہیں اور جو کچھ دیکھا ہے، دراصل اسی تربیت کا نتیجہ ہے۔ دراصل حیوانات میں عموماً اور بلیوں میں خصوصاً ایک غیبی طاقت پائی جاتی ہے۔ جس کا حال بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ میں نے وہ طاقت دریافت کر لی ہے اور اس سے کام لیتا ہوں۔“ پھر اس نے لمحاتی توقف کر کے کہا۔ ”مسٹر آنند پال! آپ کو معلوم ہے کہ آدمی کی انسانی ذہانت کس حد تک پہنچ سکتی ہے یعنی عالم اسرار میں وہ کہاں تک رسائی حاصل کر سکتا ہے......؟ کبھی آپ نے اس پر غور و فکر کیا ہے؟“

''میں دوبارہ معافی چاہتا ہوں۔'' میں نے الجھ کر جواب دیا۔ ''اس پیچیدہ گفتگو کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آیا۔''

''تو لایئے ...... میں اپنے سوال کو زیادہ اور وضاحت سے بیان کرتا ہوں۔'' وہ کہنے لگا۔ ''یہ فرمایئے کہ اس عالم کے سلسلہ ہست ونیست کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟''

اس کے متعلق میں کہتا ہوں کہ آفرینش سے آغاز اور موت پر انجام ہے۔'' میں نے جواب دیا۔'' تمام مذہبی کتابوں میں ایک ہی بات لکھی ہے اور سبھی اس بات پر متفق ہیں کہ فنا کا دوسرا نام ہی قیامت ہے، جس کے سوا کچھ نہیں۔''

''مگر موت کے بعد......؟'' اس کے لہجے میں بڑی سنجیدگی سی تھی۔ ''آپ کا کیا خیال ہے؟''

''آہ موت کے بعد...... یہ ایک ایسا سوال ہے جسے پیشوایان مذہب ہی طے کر سکتے ہیں۔'' میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

مگر آپ کی ذاتی رائے ضرور کچھ ہو گی؟'' وہ بولا۔ ''میں وہ جاننا چاہتا ہوں۔''

''وہی جو بچپن میں قائم ہوئی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''اب تک اس میں ذرا بھی تبدیلی نہیں ہوئی۔''

''یعنی جب تار نفس ٹوٹا......اور آتما جسم سے جدا ہوئی تو انسان کے ختم ہوتے ہی آتما کسی نامعلوم مقام کو چلی گئی۔''

''جی ہاں...... یہی تعلیم تھی جو بچپن میں دی گئی تھی۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''بے شک...... آپ ممبئی کے جس علاقے میں پیدا ہوئے وہاں ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی رہتے ہیں۔ وہاں یہ تعلیم عام تھی۔ لاٹ پادری سے لے کر ہر ہندوستانی لڑکے اور ہر مذہب کے لڑکے جو گرجا، مندر اور مسجد میں عبادت کرنے اور نماز پڑھنے جاتے تھے۔ انہیں اس بات کی تلقین کی جاتی تھی۔ ہر اچھی بات جس کا تعلق کسی بھی مذہب اور آسمانی کتابوں سے ہو اسے اپنانے، اس پر عمل کرنے میں امتیاز نہیں برتا جاتا تھا۔ کیونکہ ہر مذہب اچھائی ہی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس معاملے میں...... میرا حافظہ اگر غلطی نہیں کرتا تو اس گاؤں میں جہاں آپ پیدا ہوئے تھے ایک پستہ قد، فربہ اندام آدمی تقریباً پینتالیس برس کا فادر ادراک رہا کرتا تھا، جس سے آپ کو یہ سوال پوچھنے کا اتفاق ہوتا تو وہ آپ سے روح کے بارے میں اور ہی حالات بیان کرتا۔ کسی قشقہ دار پنڈت یا کسی مسجد کے مولوی صاحب سے تبادلہ خیال کا اگر موقع ملتا تو وہ اور ہی کچھ بیان کرتے۔ غرض مذہبی تفریق کے ساتھ ساتھ انجام روح کے بارے میں لوگوں کے خیالات مختلف ہیں اور ہر شخص اپنے آپ کو سچا اور دانا سمجھتا ہے اور اس سچائی کو اوروں کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان کے پہلو بہ پہلو کچھ ماہران علوم ہیں جن کی دریافتوں پر شک کرنا دشوار ہے جو بڑے ہوشیار اور فہمیدہ لوگ ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ جسد کثیف سے رخصت ہونے کے بعد روح کے فنا ہو جانے کا خیال نادرست ہے...... مگر ان تمام باتوں سے قطع نظر آپ اپنے خیالات...... اگر میرا اندازہ غلط نہیں یہ ہیں کہ...... آدمی کو زندگی تک سے واسطہ رکھنا چاہیئے۔ مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے۔ کیا نہیں ہوتا اور کیا ہوگا

......اس کی بحث لاحاصل ہے۔ بالفرض میں یہ بتاؤں کہ روح جو اس جامہ خاکی میں رہتے ہوئے سوچتی، سمجھتی اور راحت و تکلیف سے بہرہ اندوز ہوتی ہے۔ وہ درحقیقت موت کے بعد بھی زندہ رہتی ہے اور عرصہ لامحدود تک اپنے اعمال نیک و بد کا ثمر حاصل کرتی ہے...... تو اب آپ کھل کر فرمایئے کہ آپ کا موت کے بارے میں کیا خیال ہو گا؟''

''مگر سب سے پہلے یہ تو ثابت ہونا چاہیئے کہ آدمی کی موت پر روح واقعی زندہ رہتی ہے کیا؟'' میں نے سوال کیا۔

''یہی وہ بات ہے جسے میں ثابت کرنا چاہتا ہوں۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ''اور اسی مطلب کے لئے تو میں نے آپ کو تلاش کیا۔ ستیش نے بڑی زحمت کی اور اپنا قیمتی وقت مجھے دیا۔ کیا ان دنوں آپ کچھ مصروف ہیں۔''

میرے لبوں پر ایک بے جان سا تبسم پیدا ہوا۔ میں کیا کہتا۔ خاموش ہی رہا۔

''میں سمجھ گیا......'' اس نے کہا۔ ''خیر میں ایک تجویز آپ کے روبرو پیش کرتا ہوں۔ کئی برس گزرے۔ جب موت و حیات کا مسئلہ باراول میری نظروں میں آیا تو میری ملاقات ایک غیر معمولی آدمی سے ہوئی تھی...... جو کسی زمانہ میں آکسفورڈ یونیورسٹی میں پروفیسر تھا۔ فلسفہ حیات کے بارے میں اس کے خیالات بڑے عجیب و غریب تھے۔ بعض اختلافات کی وجہ سے وہ ملازمت ترک کر کے جنوبی امریکہ چلا گیا اور جنگ چلی میں مقام سینٹ گو پر ہلاک ہوا۔ مجھے اس کی زبانی کئی طرح کی حیرت انگیز اور ناقابل یقین سی باتیں معلوم ہوئیں اور اس نے اپنی ہر بات کے واضح اور ٹھوس ثبوت مہیا کئے۔ میں تب اپنی کم علمی کی وجہ سے اس کی باتوں کو جادو سمجھتا تھا۔ میرا خیال یہ ہے کہ آپ بھی میری جگہ ہوتے تو اس کی باتوں کو جادو سمجھا کرتے۔ آپ کی رائے بھی شاید یہی ہوتی۔ غرض کچھ اس آدمی اور کچھ ایک مال خوردہ بودھ پجاری کی صحبت سے جو لنکا میں ہوئی تھی۔ بعض ایسے روحانی حقائق معلوم ہوئے جنہوں نے میری آنکھیں کھول دیں۔ اس کے بعد میں بڑی احتیاط اور محنت کے ساتھ متواتر آٹھ برس تک ان دریافتوں کا کھوج لگانے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ اور اب اس مدت کے بعد اس قابل ہوا ہوں کہ صحیح راستہ جان سکوں۔ گویا وہ کنجی اب میرے ہاتھ میں ہے جسے گھمانے سے وہ انکشافات ممکن ہیں جو مغربی دنیا میں تہلکہ مچا دیں۔ اہل مغرب آج تک امکان روح سے بے خبر ہیں۔ ان کا دماغ ان باتوں تک نہ پہنچا ہے اور نہ ہی کبھی پہنچے گا۔ میں ایک طرح سے طبعی طور پر دلیر واقع ہوا ہوں۔ یہ دلیری اور بے خوفی مجھ میں بچپن سے ہی موجود ہے۔

مگر میں نے جو کام اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔ اس کے خطرے سوچ کر میں ڈرتا ہوں۔ آپ اس کام کی نوعیت پوچھیں گے...... سنئے...... مختصر طور پر میرا ارادہ بعض خفیہ چینی سوسائٹیوں کی مدد سے علوم روحانی کے اس حیرت خیز مرکز تک پہنچنا ہے۔ جس کا حال آپ نے کیا کسی مغربی آدمی نے بھی نہیں سنا۔ بڑی مشکل سے تو وہاں تک رسائی حاصل کی ہے۔ یہ حل ہو گئی تو دوسری ان اسرار عجیب کو جو قدیم سے اس میں دفن ہیں، حاصل کرنی ہو گی۔ اس کے لئے منت، دھمکی اور چوری اور کسی ترکیب سے دریغ نہ کیا جائے گا۔ لیکن دقت یہ

ہے کہ میں اکیلا نہیں جاسکتا۔ اس کی کئی ایک وجوہ ہیں۔ جن کے بیان کی سردست حاجت نہیں۔

بس ایک آدمی درکار ہے جو بے خوفی اور شجاعت میں یکتا ہو۔ چین اور اہل چین کے بارے میں معلومات رکھتا ہو، اور اس ملک کا لباس اس خوبی اور مہارت سے پہنے کہ کسی کو ہندوستانی یا غیر ملکی معلوم نہ ہو۔ سب یہی جانیں کہ چین کا باشندہ ہے۔ اور وہ جب میرے ساتھ جائے تو من میں سوچ لے کہ جیتے جی واپس آنا شاید نصیب ہو یا نہ ہو۔ اسے میں نہایت اور معقول معاوضہ دینے کے لئے تیار ہوں کہ وہ خواب وخیال میں بھی نہیں سوچ سکتا۔ یعنی پانچ ہزار انگلش پونڈ روانگی سے پہلے اور پانچ ہزار واپس آنے کے بعد...... کہئے آپ کو یہ سودا منظور ہے؟"

میں اس سوال کا جواب کیا دیتا......؟ بلاشک وشبہ معاوضہ انتہائی شان دار تھا۔ منہ میں پانی آجائے۔ مگر کام کتنا سنگین تھا مگر اس کے باوجود دس ہزار پاؤنڈ کے ذکر نے دل کو بے چین کر دیا تھا۔ اتنی بڑی رقم تو مجھے خواب میں بھی کبھی دکھائی نہیں دی تھی۔ میں دو برس تک گھر بیٹھے شاہانہ زندگی گزار سکتا تھا۔ ایسا عیش امراء کو نصیب نہیں تھا۔ سیر وسیاحت سے مجھے کبھی بھی کوئی ڈر اور خوف محسوس نہ ہوا۔ میں دنیا کے اکثر خطرناک مقامات سے بھی گزر چکا ہوں۔ مگر وہ پراسرار تجویز جو ڈاکٹر نکولا نے پیش کی اور اس کے ساتھ ساتھ وہ الفاظ جو اس نے تنبیہ کے طور پر کہے وہ بے شک روح فرسا تھے۔ میں تھوڑی دیر تک خاموش سا رہا۔ پھر میں نے کہہ ہی دیا۔ جواب دینا ہی ضروری تھا۔

"آپ کی تجویز انتہائی عجیب ہے...... میں نہیں جانتا کہ کیا جواب دوں۔"

"کام واقعی بہت مشکل اور کٹھن ہے۔" وہ کہنے لگا۔ "مگر دو آدمی برابر کے جوان ہوں تو کوئی دشواری باقی نہیں رہتی۔ آپ کے بجائے کوئی اوسط درجہ کا آدمی ہوتا تو میں اس سے یہ ذکر ہی نہ چھیڑتا۔ شنگھائی میں ہر عقیدہ اور ہر خیال کے بے شمار آدمی موجود ہیں۔ مگر جیسا آدمی مجھے درکار ہے ایک نہیں ملتا۔ آپ کو میری نظر انتخاب کر گئی تھی۔ آپ میں وہ سارے اوصاف موجود ہیں جو میرے ساتھی اور مددگار میں ہونے چاہئیں اور پھر......" پھر وہ مسکرا دیا۔ "آپ حاجت مند بھی ہیں۔ اگر آج اقرار نہ کیا تو کل ضرور کرنا پڑے گا۔ اس لئے...... سوچ لیجئے...... اب بھی وقت ہے۔"

آخری الفاظ اس نے اس بھولپن سے کہے کہ اس وقت مجھے خیال ہی نہیں آیا کہ اسے میرے اندرونی حالات کا علم کیوں کر ہوا۔

مجھے چپ اور گہری سوچ میں غرق پا کر کچھ دیر جواب کا انتظار کیا۔ اس کی نگاہیں میرے چہرے پر تھیں۔ آخر اس نے اس گہرے سکوت کو توڑا۔

"فرمائیے...... آپ نے کیا فیصلہ کیا...... آپ کے کیا ارادے ہیں؟" سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"میں اس معاملے کے ہر پہلو پر غور کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اس لئے میں فی الحال آپ کے اس سوال کا جواب نہیں دوں گا۔ البتہ سارے پہلو سوچ کر جیسا مناسب ہوگا، عرض کروں گا۔ آپ کوئی خیال نہ کریں۔ میں کوئی بھی کام کرنے سے پہلے سوچتا ضرور ہوں۔ جب کوئی فیصلہ کر لیتا ہوں تو پھر پیچھے

ہٹتا نہیں ہوں۔"

"بہت اچھا جیسے آپ کی مرضی۔" اس نے میری بات کا کچھ خیال کئے بغیر بڑے خوش گوار لہجہ میں کہا۔ "اگر آپ اچھی طرح سے غور کر کے کوئی فیصلہ کرنا چاہتے ہیں تو گھر جا کر اطمینان سے کیجئے۔ کل کا دن، آج کی رات...... میں آپ کو چوبیس گھنٹے کی مہلت دیتا ہوں۔ کل رات اسی وقت اپنے آخری فیصلے سے آگاہ کر دیجئے گا۔ میں آپ کے فیصلے کا انتظار کروں گا۔ اور ہاں...... آپ سے ایک درخواست ہے کہ اس اثنا میں بہتر ہوگا کہ اس گفتگو کا حال کسی پر ظاہر نہ کیا جائے؟"

میں جب اس کا اطمینان کر چکا تو وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس سے یہ سمجھ لینا چاہئے تھا کہ ملاقات ختم ہو چکی ہے لہٰذا اب چل دینا چاہئے۔ وہ مجھے ڈیوڑھی تک چھوڑنے آیا۔ وہ خوف ناک سیاہ بلی جسے دیکھ کر میرے سارے بدن پر سنسنی دوڑ گئی تھی اور اب اس کی طرف دیکھتے ہوئے سنسنی سی محسوس کر رہا تھا، دروازے تک آئی تھی۔

برآمدے میں پہنچ کر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے شیریں آواز میں وہ بڑی گرم جوشی سے کہنے لگا۔ "مسٹر آنند پال! آپ میری اس تجویز کو منظور کر لیں تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ میرے نزدیک منہ پر تعریف کرنا عیب سمجھتا ہوں۔ مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ سارے چین میں آپ اکیلے آدمی ہیں جو مجھے اس کام میں مدد دے سکیں گے۔ شب بخیر...... میں امید کرتا ہوں کہ کل آپ کا جواب ضرور اثبات ہی میں ہوگا۔"

شاید ان لفظوں کی تائید میں اس کی سیاہ بلی نے جو پاس کھڑی میری طرف متجسس نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اپنا سر میری ٹانگ کے ساتھ رگڑنا اور نرم آواز سے خرخر کرنا شروع کر دیا۔ میرے لئے یہ بھی اس کی سنسنی خیز حرکت تھی۔ "میرا جو بھی آخری فیصلہ ہوگا وہ میں کل اسی وقت عرض کر سکوں گا۔" میں نے گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا اور پھر چلا آیا۔

☆......☆......☆

ڈاکٹر نکولا کے مکان سے نکل کر میں نے جب گھڑی دیکھی تو پونے گیارہ بج رہے تھے۔ ملاقات نے خاصا وقت لے لیا تھا۔ رات بھی خاصی بیت چکی تھی۔ اس لئے بازاروں کی سیر کرتے ہوئے ساتھ ساتھ اس تجویز پر غور کرنے کے خیال سے پیدل چلنے لگا۔ بہت سی باتیں اس تجویز کے حق میں اور اکثر اس کے خلاف بھی تھیں۔ میں دنیا میں یک وتنہا تھا۔ والدین کئی برس ہوئے سورگ باش ہو چکے تھے۔ بہن بھائی اور قریبی اور دور کے رشتہ دار بھی نہ تھے۔ ہندوستان میں البتہ دو ایک دور کے رشتہ دار تھے اور وہ شاید مجھے بھول بھی چکے تھے۔ گویا میں اس مہم پر جا کر اگر واپس نہ آیا تو میری قبل از وقت موت کا رنج وغم دنیا میں کسی کو نہ ہوگا۔ جو دوست ہیں وہ ہندوستان میں ہیں۔ انہیں میری موت کی خبر دینے والا بھی کوئی نہیں ہے۔ اور پھر سیر وسیاحت میری گھٹی میں پڑی تھی۔ اس سے بڑی میری کوئی اور کمزوری نہ تھی۔ پندرہ برس کی عمر میں پہلی بار دیار کا سفر اختیار کیا۔ اس کے بعد تین برس ایک ایسے مقام پر گزارے جہاں تندخو وحشی آباد تھے۔ پانچ برس صحرائے آسٹریلیا کی سرحد پر بسر کئے۔ دو برس کیمپ میں پولیس کی ملازمت کی۔ مدتوں ہانگ کانگ میں

رہا۔ اس دوران میں اچھی بری متوسط درجے کی بہت ساری ملازمتیں کیں۔ اب میری عمر پینتیس برس کی تھی۔ نیوگنی کے اس ایک دورہ بخار کے سوا کبھی کوئی جسمانی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ خودستائی میں داخل نہ ہو تو دراز قد چھ فٹ، وزن ایک سو چالیس پونڈ بال سیاہی مائل بھورے، آنکھیں روشن...... آپ اس کی تفصیل لاحاصل نہ سمجھیں تو عرض کردوں کہ دوستوں میں خاصا قبول صورت سمجھا جاتا تھا۔

میں پھر ہندوستان نہیں گیا۔ ایک طرح سے یہیں کا باشندہ بن گیا۔ پس بہت سارے دوست بھی بن گئے تھے۔ لیکن ہندوستان میں دو ایک دوست تھے جو بہت یاد آتے تھے۔ میں انہیں نہیں بھولا تھا۔ شاید وہ بھی مجھے نہیں بھولے تھے۔

جیسا کہ میں پیش تر بتا چکا ہوں۔ بیان کر چکا ہوں۔ ان دنوں میری مالی حالت بالکل خراب تھی۔ کئی مقامات پر حصول ملازمت کی کوشش کی مگر کامیابی کہیں نصیب نہیں ہوئی۔ ہر جگہ ایک ہی جواب ملتا کہ آپ کے آنے سے تھوڑی دیر پہلے ایک اور آدمی رکھ لیا گیا ہے۔ تازہ واقعہ اس مال دار تاجر کا تھا جسے ایک محاسب کی خدمات درکار تھیں۔ مگر وہی کورا جواب اس نے بھی دے دیا۔ ایسے حالات میں اگر میں ڈاکٹر نکولا کی پیش کی ہوئی تجویز جس کی بدولت پانچ ہزار برٹش پاؤنڈ نقد اور پیشگی۔ لتے اور پانچ ہزار کی آئندہ امید تھی۔ نامنظور کرتا تو مجھ سے بڑا احمق کون ہوتا...... جو سنتا مذاق اڑاتا اور میں خود بھی اپنی اس کوتاہی پر کف افسوس ملتا اور پچھتاتا۔ غرض سارے پہلو سوچ کر میں نے ہاں کہنے کا ہی فیصلہ کرلیا۔

جیسا کہ بتا چکا ہوں کہ مجھ میں سیاحت کا شوق ازل سے ہے۔ یہ میری سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اسے جنون کا نام دیا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ یہ جنون ہی ہے جو صحرا صحرا بھٹکاتا رہتا ہے۔ پھر یہ خیال بھی میرے لئے سرور بخش ہی تھا کہ نادیدہ مقامات کی سیر کا خوب موقع ملے گا۔ ایسا سنہرا موقع جانے پھر کبھی میسر ہوگا کہ نہیں اور پھر لمبی پراسرار سیاحت جس کا خاکہ نکولا نے پیش کیا تھا اور یہ سیاحت اور بھی دلچسپ معلوم ہوتی تھی۔ ایک اور بات جو اس تجویز کے حق میں نظر آئی وہ ڈاکٹر نکولا کی زبردست شخصیت تھی۔ اس کی صورت کہے دیتی تھی کہ وہ اوروں سے کام لینے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ ایسے آدمی کے ماتحت کام کرنا ہمیشہ باعث فخر ہے۔

موت کا خطرہ بے شک اس نے ظاہر کیا تھا مگر جب میں نے اس پر ٹھنڈا بہت غور کیا تو احساس ہوا کہ یہ ایک فضول سا اندیشہ ہے۔ اجل تو ایک دن ضرور سب کو آنی ہے۔ اس کے لئے جو وقت مقدر ہو چکا ہے کوئی اسے ٹال نہیں سکتا۔ پس موت کے وہمی خطرہ سے ڈر کر دس ہزار پاؤنڈ کی یہ گراں قدر رقم ہاتھ سے دھو دینا صاف نادانی تھا۔ دس ہزار پاؤنڈ سے اگر میں سادگی اور قناعت سے بسر کروں تو دس برس گزر سکتے تھے۔ ورنہ پر تعیش زندگی کے لئے بھی دو برس بھی بہت تھے۔

خیالات کے اس سلسلے میں مالک مکان کی تصویر اور اس کی نوجوان حسین اور پرشباب بیٹی بھی...... جس کا تقاضا بہت شدید ہو چکا تھا۔ ستیش نے سو ڈالر نہیں دیئے ہوتے تو آج کی رات باہر بسر ہوتی۔ جب میں نے مالک مکان کو تیس ڈالر دیئے تو اس کا اور اس کی بیٹی کا رویہ کس طرح بدلا۔ وہ تو مجھ پر ساری رات مہربان ہونے اور فیاض ہونے پر تل گئی تھی۔ یہ پیسہ کیا چیز ہے۔ میں مالک مکان کی سخت کلامی

برداشت کرتا آیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ایسا وقت میری زندگی میں پھر سے آئے۔ اس لئے ڈاکٹر نکولا کی تجویز منظور کرلینا ہی ہر لحاظ سے بہتر تھا۔

جب میں گھر پہنچا تو مالک مکان کی بیٹی بستر میں ایسی حالت میں لیٹی میری منتظر تھی کہ میں پھسل پڑوں۔ میں نے اس سے کہا کہ بہتر ہے کہ وہ چلی جائے۔ اگر اسے رقم کی ضرورت ہے تو ایک ڈالر لے اور چلی جائے۔ پھر اس نے ایک ڈالر لیا اور چلی گئی۔ اس نے جانے کے بعد میں گہری نیند سو گیا۔

☆......☆......☆

اگلے دن جب میں بیدار ہوا تو جرأت غائب اور دور اندیشی دامن پکڑے ہوئے بیٹھی تھی۔ اس رات میں نے کئی طرح کے بھیانک خواب دیکھے۔ ایک بار ایسا معلوم ہوا کہ میں کسی چینی خانقاہ میں زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا۔ ایک اور موقع پر یہ منظر دکھائی دیا کہ چینی جلاد فصیل شہر کے باہر تیغہ ہاتھ میں لئے چوٹی پکڑے کھڑا ہوا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ڈراؤنے خواب محض ہجوم تفکرات کا نتیجہ تھا۔ پھر بھی اس خیال کو جی سے نکالنا ناممکن تھا کہ ایسے واقعات اس سفر میں پیش آسکتے ہیں۔ کیونکہ جب ایک بار چینی لباس پہن لیا اور چہرہ رنگ کر اور لمبی سی چوٹی سر کے ساتھ باندھ لی تو لوگوں کی نظروں میں پورا چینی بن گیا۔ اس کے بعد میں چینی قوانین اور تعزیرات کا پابند سمجھا جاؤں گا۔ یہ پہلا اندیشہ تھا جو دل میں پیدا ہوا۔ یہ ایک فطری امر تھا۔

اور پھر اس کے بعد خیال آیا کہ معلوم نہیں یہ ڈاکٹر نکولا کیا آدمی ہے؟ راستہ میں کیوں کر نباہ ہوگا؟ کیا خطرات اور مشکلات میں ساتھ دے گا......؟ یا کہیں مبتلائے مصیبت ہونے کے بعد صرف ایک آدمی کے فرار کا امکان ہوا تو مجھے چھوڑ کر فرار تو نہیں ہو جائے گا؟ ایسی حالت میں ایڈوانس پانچ ہزار پاؤنڈ اس سے لے کر شنگھائی بینک میں جمع کرانا چاہتا تھا۔ بقایا پانچ ہزار واپسی میں ملیں گے یا نہیں...... اس کی کوئی ضمانت نہیں تھی۔ میرے دل کے کسی کونے میں ایک اور سوال یہ بھی پیدا ہوا کہ یہ شخص نکولا کیا واقعی اتنا مال دار ہوگا؟ یہ سوال جو پیدا ہوا تھا وہ فطری تھا۔ میں محتاط پسند واقع ہوا تھا۔ یہ جو دس ہزار پونڈ کا وعدہ کرتا ہے دے سکے گا؟ ساری باتیں قابل غور تھیں اور میرے کسی نتیجہ پر پہنچنے سے پہلے ان سوالوں کا جواب حاصل کرنا اشد ضروری بھی تھا۔

ہر چند کہ ستیش بترا نے اطلاع دی تھی کہ نکولا کا نام مشرقی ملکوں میں ہر جگہ مشہور ہے اور محکمہ مال کے افسر بنویل نے کلب میں اس عجیب شخص سے مل کر خوف اور گھبراہٹ ظاہر کیا تھا۔ جیسے وہ کوئی بلا ہو اور ان کے علاوہ میں بھی سیگون اور منیلا میں اس کی نسبت عجیب روائتیں سن چکا تھا۔ ستیش بترا نے بھی اتنا کچھ ہی بتایا بھی تھا۔

لیکن ستیش بترا نے اس کی مالی حالت کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا اور نہ تفصیل بتائی تھی۔ اس لئے میں نکولا کی مالی حالت کے بارے میں اندھیرے میں تھا۔ رفع شک کی غرض سے میں نے کسی اور سے اس کی حیثیت کے بارے میں پوچھنے کا ارادہ کرلیا۔ پھر خیال آیا کہ ایسا کون ہوگا؟ جو اس کے حالات سے واقف ہو؟ بہت دیر تک اس سوال پر سوچ وبچار کرتا رہا۔ آخر کار ایک سوداگر کا خیال آیا جو شہر کے پاس ایک شاندار کوٹھی میں رہتا تھا۔ اس کی معلومات بہت ہی وسیع تھیں۔ وہ اپنی معلومات کے بارے میں بڑا پُر

اعتماد تھا اور کہا کرتا تھا۔

”چین کا کوئی قابلِ ذکر آدمی ایسا نہیں ہے جس کا حال مجھ سے پوشیدہ ہو۔ میں اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔“ میں نے سوچا کہ اس شخص سے مل لینا چاہئے۔ یہ شخص مجھے یقیناً ڈاکٹر نکولا کے بارے میں تفصیل سے بتا سکتا ہے۔

ناشتا مالک مکان کی بیٹی لے کر آئی تھی۔ وہ پھر بھی اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئی تھی۔ وہ یہ چاہتی تھی کہ میرا پیر پھسل جائے لیکن میں جو برف کا تودہ تھا۔ وہ میری جیب گرم دیکھ کر آتش فشاں بنی ہوئی تھی۔ میں نے ناشتا کیا اور اس کی طرف بالکل بھی توجہ نہیں دی۔ وہ جس حالت میں آئی تھی، ایک عورت کو زیب نہیں دیتی تھی۔ لیکن وہ عورت کہاں تھی۔ عورت کے تقدس پر داغ تھی۔ اتفاق سے اس وقت اس کا باپ دس اور بیس ڈالر کی رسید دینے آ گیا۔ یوں اس سے جان چھوٹی۔

اس کا باپ بڑی عزت سے پیش آیا۔ میں یہ بات جانتا تھا کہ جب تک میری جیب میں ستر ڈالر موجود ہیں۔ اس وقت تک اس کے دل میں میری عزت ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ اس کی بیٹی کسی نہ کسی طرح دس بیس ڈالر مجھ سے ہتھیا لے۔ میں نے رسید لے کر سگار سلگایا اور کسی رئیس زادے کی طرح اس کے مکان سے نکل کر کش لیتا ہوا شہر کی جانب روانہ ہوا۔

میں بند کے پاس پہنچا۔ مجھے وہاں اپنے تاجر دوست کا مکان تلاش کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ کیونکہ ایک شاندار عمارت عین لبِ ساحل پر واقع تھی۔ ملازم نے بتایا کہ اس وقت وہ فارغ ہیں۔ جب میں نے اس سے کہا کہ...... وہ اپنے مالک سے کہے کہ ستیش بترا کے دوست آنند پال ملنا چاہتے ہیں۔ کیا وہ اسے وقت دے سکتے ہیں؟ تھوڑی دیر بعد وہ آیا اور اس نے کہا کہ مجھے بلایا جا رہا ہے۔ پھر وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر ان کے کمرے میں پہنچا۔

☆......☆......☆

مجھے اپنے تعارف کے لئے ستیش بترا کا حوالہ دینے کی ضرورت نہ تھی۔ میں نے اس لئے حوالہ دیا تھا کہ دو ایک اور میرے نام بھی تھے اور ان کی شہرت اچھی نہ تھی۔ الیگزینڈر میک اینڈریو میرا بہت پرانا دوست شمالی اسکاٹ لینڈ کا باشندہ اور چین کا متمول تاجر تھا اور یہ دو باتیں ایسی تھیں جنہیں کوئی شخص جسے اس سے ملنے کا اتفاق ہو، صرف چند لمحوں میں معلوم کر سکتا ہے، نہایت آسانی سے۔

کسی زمانہ میں اس شخص کا باپ گلاسگو کے ایک بینک میں چوکی داری کرتا تھا۔ ایک چوکی دار کو تنخواہ کیا ملتی ہوگی۔ اس لئے وہ نہ تو اس کی تعلیم کا بندوبست کر سکا اور نہ ہی تربیت کا۔ تنگ دستی اور بدحالی بھی تھی۔ وہ چھوٹی عمر میں اس طرح بازاروں میں پھرا کرتا تھا کہ کپڑے پھٹے ہوئے پاؤں میں جوتا ندارد اور صحبت شہر کے غریب اور بہت ہی معمولی قسم کے بچوں سے اس کا ملنا جلنا اور اٹھنا بیٹھنا تھا۔ ان میں کچھ ہی اچھے بچے تھے۔ بعض آوارہ قسم کے بھی تھے۔ مگر تقدیر یاور ہو تو سارے عیب ہنر بن جاتے ہیں۔ مجھے اس بات کا کوئی علم نہیں اور نہ ہی میں نے کبھی کھوج لگانے کی کوشش کی تھی کہ اس کی ترقی کا آغاز کب اور

کیسے ہوا۔ بہرحال اب وہ اتنا مال دار تھا کہ شنگھائی میں بہت کم دولت منداس کی برابری کر سکتے تھے۔ دو تین جو بہت بڑے دولت مند تھے، وہ ان میں سے ایک تھا۔

غریب کے ہاتھ پیسہ آ جائے تو مشکل سے ہضم کر سکتا ہے۔ مگر میرا یہ دوست الیگزینڈر میک اینڈریو غربت وافلاس، احساس محرومیوں اور فاقوں سے نکل کر دولت مند بنا تو اس میں ذرہ برابر بھی غرور و تکبر پیدا نہ ہوا۔ وہ اپنے اس کڑے وقت کو بھلا نہ سکا تھا۔ دوستوں کی محفل میں وہ ہمیشہ اپنی غربت کا ذکر بڑے فاخرانہ انداز سے کیا کرتا تھا۔ جب سرما کی ایک مرطوب صبح کو معمولی زندگی کی مشکلات سے تنگ آ کر اس نے مشرقی سمت میں جا کر ہمت آزمائی کا فیصلہ کیا تو یہاں اس کی قسمت، محنت اور منصوبہ بندی نے خوش حالی کی بنیاد ڈالی۔ وہ ایک خوش قسمت شخص بن گیا۔

آدمی دولت مند ہی نہ تھا بلکہ بااخلاق اور بڑا پُرتپاک بھی تھا۔ میں جب اس کے سامنے گیا تو ایک دم سے کھڑا ہو گیا۔ اس کی اس عزت نے میرا دل خوش کر دیا۔ اس نے بڑی محبت اور گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔

”اوہ مسٹر آنند پال! آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ ان دنوں شنگھائی میں ہیں۔ آپ نے اپنی آمد کی اطلاع نہیں دی۔ ورنہ میں خود حاضر ہو جاتا۔ کہیئے...... آپ کا یہاں آنا کب سے ہوا؟“

”خاصی مدت ہو گئی۔“ میں نے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”دراصل کچھ ایسا مصروف رہا کہ ملاقات کے لئے حاضر نہ ہو سکا۔“

”آخر ایسی کیا بات تھی جو آپ آج تک مجھ سے ملنے نہیں آئے؟“ وہ شکایتی لہجے میں بولا۔ ”دوستوں سے یہ بے نیازی، بے دردی اور سرد مہری اچھی بات نہیں۔ کیونکہ دولت کی محبت اور قرب سب سے بڑی دولت ہوتی ہے۔“

”میں تہہ دل سے معافی چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اصل واقعہ یہ ہے کہ شنگھائی آنے کے بعد حالات نے ایسا پلٹا کھایا۔ ایسے نشیب و فراز آئے کہ میں آپ سے کیا کسی آدمی سے بھی ملنے نہیں گیا۔ بس اس کے علاوہ اور کوئی خاص وجہ نہ تھی۔“

”مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوا کہ آپ گردش میں مبتلا ہو گئے۔“ اس نے کہا۔ ”میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بلا تامل کہہ دیں۔ جہاں تک میرے امکان میں ہے کسی قسم کی بھی مدد کرنے سے دریغ نہیں کروں گا۔“

”میں آپ کی اس محبت اور خلوص کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں کم ہے۔“ میں نے اس کی اپنائیت سے متاثر ہو کر ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔ ”میں آپ کے پاس ایک غرض سے حاضر ہوا ہوں۔ دراصل ایک نہایت ضروری معاملہ پر آپ سے مشورہ لینا چاہتا ہوں۔“

”کہیئے...... کیا معاملہ ہے؟“ اس نے پوچھا۔ ”میں سارا حال سن کر اپنی مخلصانہ اور بے لاگ رائے پیش کروں گا۔“

”اصل بات یہ ہے کہ مجھے ان دنوں ایک شان دار قسم کی ملازمت کی پیش کش کی گئی ہے۔“ میں

نے جواب دیا۔ ”جس کا مشاہیرہ دس ہزار برٹش پاؤنڈ طے کیا گیا ہے۔ آپ کے خیال میں یہ ملازمت کیسی ہوگی؟“

”یہ تو بڑی مبارک اور بہت ہی اچھی خبر ہے۔“ اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ”اس لئے بھی کہ آپ ابھی زمانے کی بے مہری اور نشیب و فراز کا ذکر کر رہے تھے...... یہ کس نوعیت کی ملازمت ہے، بتانا پسند کریں گے؟“

”سر دست میں اس کی نوعیت اور تفصیل کسی وجہ سے ظاہر نہیں کرسکتا۔ آپ اس کا کچھ خیال نہ کریں۔“ میں نے کہا۔

”تو پھر ایسی صورت میں کس قسم کا مشورہ لینا چاہتے ہیں؟“ اس نے مجھے پُرخیال نظروں سے دیکھا۔

”دراصل میں آپ سے اس آدمی کے بارے میں جس نے یہ ملازمت پیش کی ہے بعض حالات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔“

”میں اسی صورت میں یقین سے اس کے بارے میں پورے حالات بیان کرسکوں گا، جب آپ اس کا نام بتائیں گے۔“ اس نے فاخرانہ لہجے میں کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ ان نواحات میں نوے فیصد آدمی ایسے ہوں گے جن سے میں پوری واقفیت رکھتا ہوں۔“

”تو آپ سنیں۔“ میں نے کہا۔ ”اس شخص کا نام ڈاکٹر نکولا ہے۔“

”ڈاکٹر نکولا......؟“ وہ بری طرح چونک گیا۔ پھر وہ بدحواس سا ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔ پھر اس نے دوسرے لمحے کہا۔ ”آخر وہ کیا کام ہوگا جس کے لئے آپ کو ڈاکٹر نکولا دس ہزار کی ملازمت دیتا ہے......؟“

”اس طرح کا جس میں زندگی اور موت کا سوال درپیش ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”مگر معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس شخص ڈاکٹر نکولا کو بہت اچھی طرح سے جانتے ہیں۔ میں چوں کہ اس کی بابت کچھ نہیں جانتا ہوں اس لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔“

میرا دوست جو مجھ سے دو فٹ پر بڑے صوفے پر بیٹھا ہوا تھا، ذرا آگے ہو کر اور سرگوشی میں آہستگی سے کہنے لگا۔

”آنند پال......! آپ میرے دیرینہ دوست ہیں۔ میں اس آدمی کے حالات اتنے مفصل جانتا ہوں کہ شاید گھنٹوں تک میں بیان نہ کرسکوں۔ مگر وہ ملازمت جس کا آپ ذکر کر رہے تھے، وہ اگر ڈاکٹر نکولا کی طرف سے ہی پیش ہوئی ہے تو میں دوستانہ مشورہ دیتا ہوں کہ صاف انکار کر دو...... دوبارہ کہتا ہوں کہ صاف انکار کر دو۔ اگر کسی وجہ سے نہیں کرسکتے ہو تو پھر الگ بات ہے۔ مجبوری ہے تو میں یہ کہوں گا کہ جو معاملات اس کے ساتھ طے کرو، اس میں خبردار...... اس میں پوری احتیاط پیش نظر رکھنا......“ اس کے سنجیدہ اور تشفی آمیز لفظوں نے میرے دل پر گہرا اثر ڈالا۔ میرے دل کو ڈھارس سی ہوئی۔ آہستہ سے میں نے کہا۔

”آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا...... کیا اس شخص کی مالی حیثیت ایسی نہیں ہے کہ وہ دس ہزار پونڈ

ادا کرسکے......؟“

”آہ! تم رقم کا ذکر کر رہے ہو۔“ اس نے کہا۔ ”اس کے نزدیک دس ہزار کیا دس لاکھ بھی کوئی چیز نہیں...... ڈالر، پونڈ، فرانک اور دنیا کی کوئی سی بھی کرنسی کوڑیاں ہیں کوڑیاں...... وہ تو شاید خزانوں کا روں کا مالک ہے۔“

”کیا وہ آج بھی مال دار ہے......؟“ میں ششدر سا ہو کر رہ گیا۔ ”جانے کیوں یقین نہیں آتا۔“

”اس کے پاس اتنا کچھ ہے کہ اس کا حساب نہیں کیا جاسکتا......؟“ وہ بولا۔

”آخر اس کی آمدنی کا ذریعہ کیا ہے جو اس کے پاس بے پناہ دولت موجود ہے؟“ میں نے تعجب آمیز لہجے میں پوچھا۔

”افسوس کہ میں اس کا کچھ جواب نہیں دے سکتا۔“ اس نے قدرے تاسف بھرے انداز میں کہا۔ ”اس کی آمدنی کا ذریعہ چاہے کچھ ہو اور کتنا ہی مال دار کیوں نہ ہو...... آپ کو میرا پہلا اور آخری مشورہ یہ ہے کہ ہرگز ہرگز کوئی واسطہ مت رکھنا۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اس کی پراسرار فطرت کا مقابلہ کرسکیں گے۔ میں خود بھی دنیا میں کسی سے ڈرتا نہیں۔ مگر ڈاکٹر نکولا سے ڈرتا ہوں۔ میرا یہ خوف بلاوجہ نہیں ہے۔“ وہ اتنا کہہ کر ایک دم سے خاموش ہو گیا اور پھر مجھے پُرخیال نظروں سے دیکھا۔

وہ اپنی جگہ سے اس طرح اٹھا جیسے اسے کچھ یاد آگیا ہو۔ وہ لکھنے کی میز کے پاس گیا۔ اس کی دراز کھول کر ایک خط نکالا۔ یہ پرانا اور تہہ کیا ہوا تھا۔ اسے میز پر سیدھا کرتے ہوئے میری طرف دیکھا اور کہنے لگا۔ ”یہ چٹھی میرے دوست آنریبل سلومسٹر ویدرل سابق وزیر آبادیات نیو ساؤتھ ویلز نے عرصہ گزرا میرے نام لکھی تھی۔ اس کا ابتدائی حصہ میں قصداً چھوڑتا ہوں۔ کیونکہ وہ ذاتیات کے متعلق ہے۔ مگر سنیے...... آخری حصہ میں وہ کیا لکھتا ہے۔“

گزشتہ جون میں جو خط میں نے لندن سے آپ کو لکھا تھا، اس کے بعد کئی ایک مشکلوں کا سامنا رہا۔ جیسا میں نے پیشتر تحریر کیا تھا۔ میرا واسطہ اتفاقی بعض خاص حالات میں ایک شخص ڈاکٹر نکولا سے پڑ گیا۔ قصہ یہ ہے کہ چند برس گزرے جب میں وکالت کیا کرتا تھا تو یہاں کی عدالت فوج داری میں ایک انگریز چینا پیٹ پر ایک چینی ملاح کے قتل کا مقدمہ چلا تھا۔ اس نے اپنی صفائی کے لئے میری خدمات حاصل کیں اور خواہ آپ اسے میری کوشش کا نتیجہ سمجھیں یا ملزم کی خوش نصیبی...... بہر حال وہ اس مقدمے میں صاف بری ہو گیا۔ آدمی نادار تھا اور گو میرا محنتانہ ادا نہ کرسکا تھا۔ تاہم میں نے کبھی شکایت یا تقاضا نہیں کیا۔ مگر کچھ عرصہ بعد وہ جب قریب المرگ ہوا تھا تو مجھے اپنے مکان پر بلوا کر ایک چھوٹی سی عجیب ساخت کی لکڑی مجھے بطور یادگار دی جس پر بے شمار چینی حروف کندہ تھے۔ اسے میرے حوالے کرتے ہوئے مرنے والے نے کچھ عجیب و غریب دعوے پیش کئے تھے۔ اس نے کہا کہ یہ وہ کنجی ہے جس سے دولت اور طاقت کے خزانے کھولے جاسکتے ہیں۔ یہ وہ طلسم ہے جس سے لامحدود عظمت و صولت حاصل کرنا ممکن ہے۔ مگر میں نے دیکھا کہ اس طاقت و عظمت، صولت و ثروت کے بدلے مجھے پریشانی اور تباہی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ کسی

نامعلوم وجہ سے یہ شخص ڈاکٹر نکولا اس لکڑی پر قبضہ کرنا چاہتا تھا اور جب میں نے اسے دینے سے انکار کیا تو اس نے مجھے وہ وہ اذیتیں دیں کہ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ کبھی کا پاگل خانہ پہنچ گیا ہوتا۔ اس ناچیز لکڑی کو حاصل کرنے کے لئے وہ کون سا طریقہ تھا جو اس ظالم نے نہیں برتا۔ میری مصیبتوں کا حال کچھ اس سے معلوم ہوگا...... کہ دو بار چینیوں نے میرے مکان میں نقب لگائی۔ ایک بار میرے مکان سے سو گز کے فاصلہ پر کسی نے میری گردن میں پھندا ڈال کر میرا گلا گھونٹنے کی کوشش کی۔ پھر میری بیوی اور بیٹی کے نام سینکڑوں تہدیدی خطوط لکھے گئے اور میری خود پریشانیاں اتنی بڑھیں کہ اپنی بیوی کے انتقال پر میں آسٹریلیا سے لندن جانے پر مجبور ہوگیا۔ انگلستان پہنچ کر لندن یا کسی بھی شہر میں مستقل قیام کر سکتا تھا۔ انگلستان آ کر میں سکون کا سانس نہ لے سکا۔ مگر نکولا وہاں بھی سایہ کی طرح پہنچ گیا اور اب اس نے ایک ایسی وسیع سازش سوچی جو میرے علاوہ ڈیوک آف گلن کے بیٹے مارکوئین آف بیکنہم میرے داماد سر جرڈ ہیٹی راس، ہمارے سابق گورنر آف ایمرے اور دس بارہ شخصوں پر محیط تھی۔ بندر سعید میں اس آدمی نے بیکنہم اور ہیٹی راس دونوں کو پکڑ کر اس مکان میں تین ہفتے تک بند رکھا۔ اور...... اس کی عیاری بیکنہم کے بدلے ایک اور آدمی کو وہی نام دے کر اس لئے منڈفی بھیجا کہ میری بیٹی سے تعلقات پیدا کر کے شادی کی کوشش کرے۔ وہ تو میری خوش قسمتی تھی کہ سر جرڈ ہیٹی راس اور اس کے دوست نے بچاؤ کی صورت پیدا کر لی اور وہاں سے بھاگ کر سڈنی آپہنچے۔ ورنہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا سے کیا ہو جاتا۔ میرے وقت پر خبردار ہونے سے وہ سازش تو خیر ناکام رہی مگر نکولا ایسا آدمی نہ تھا جو اپنی ناپاک کوششوں سے یوں آسانی کے ساتھ دست بردار ہو جاتا۔ اب جو اس نے نئی تدبیر سوچی تو وہ خطرناک تھی۔ میری بیٹی فلس کو گورنمنٹ ہاؤس محفل رقص سے اڑایا اور بحر الکاہل جنوب کے ایک ویران جزیرے میں پہنچایا۔ یہیں سے بعد خرابی بسیار ہم اس غریب کو بچانے میں کامیاب ہو سکے۔ مگر یہ بات کہ ہم پھر بھی کامیاب ہوتے یا نہ ہوتے اگر وہ منحوس لکڑی اتفاقاً میری جیب سے گر کر نکولا کے ہاتھ میں نہ آجاتی۔ یہ میں اب بھی یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا۔ خیر کچھ ہو، وہ لکڑی نکولا کے پاس پہنچ گئی اور اس دن سے سلسلہ آزار ختم ہوا۔ اس کے بعد میری بیٹی نے سر جرڈ سے شادی کر لی اور وہ دونوں انگلستان میں بڑے اطمینان کی پُرمسرت ازدواجی زندگی بسر کرتے ہیں۔ آپ یہ سارے حالات پڑھ کر سوال کریں گے۔ کیونکہ میں نے اس شخص ڈاکٹر نکولا کے خلاف قانونی چارہ جوئی نہیں کی۔ مگر صاحب ایمان کی سننا چاہتے ہو تو میں سمجھتا ہوں ہم اتنے پر بھی ایک طرح سے سستے ہی چھوٹے۔ وہ منحوس لکڑی ہاتھ سے گئی تو جانے دو۔ بلا گئی۔ میری عزیز بیٹی تو واپس آگئی۔ اس کا سلسلہ اذیت تو ختم ہوا۔ اب یہ خدا جانتا ہے کہ میں اس آدمی سے بہت ڈرتا ہوں...... اور شب و روز دعا کرتا ہوں کہ زندگی میں پھر خدا اس سے سابقہ نہ ڈالے۔ اس کے علاوہ ایک بات اور ہے۔ میں بے شک قانون کا کیڑا ہوں۔ جس پیرائے میں نکولا نے یہ ساری کارروائی کی، اسے دیکھتے ہوئے میں بھی یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوں کہ قانون اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ اس نے بے بس کر کے رکھ دیا۔ مجھے اپنی زندگی میں کسی ایسے شخص سے واسطہ نہیں پڑا۔"

اتنا پڑھ کر سنانے کے بعد اس نے خط کو تہہ کیا اور مجھ سے اپنائیت کے لہجے میں کہنے لگا۔

"اب میرے دوست! بالکل سچ کہنا۔ یہ کہانی سن کر آپ کے ذہن میں ڈاکٹر نکولا کے بارے میں کیا خیالات پیدا ہوئے ہیں؟"

"یہ حالات اور واقعات میں نے اختصار کے ساتھ شاید کسی اخبار میں پڑھے تھے۔" میں نے جواب دیا۔ "بہر حال تفصیل اب اس خط کے توسط سے معلوم ہوئی ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر نکولا کوئی خوفناک آدمی ہے...... مگر!"

"آپ جو کچھ بھی کہنا چاہتے ہیں بغیر کسی جھجک کے صاف گوئی سے کہہ دیں۔" وہ بولا۔ "رک کیوں گئے......"

"آخر دس ہزار پونڈ دس ہزار ہیں جو بہت ہی بڑی رقم ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"ایک طرح سے میں دولت مند بن جاؤں گا۔ مجھے کبھی اتنی بڑی رقم یک مشت زندگی میں ملی اور نہ ہی خواب میں ملی۔ میں کوئی دو برس سے بڑا خوار ہو رہا ہوں۔ میں نے کہاں کہاں قسمت آزمائی نہیں کی۔ نشیب و فراز سے گزرتا ہی رہا ہوں۔ صرف اتنی آمدنی ہوتی رہی کہ گزارہ ہوگیا۔ قناعت نہ کرتا تو فاقوں کی نوبت آجاتی اور فٹ پاتھ پر سونا پڑتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اتنی بڑی رقم حاصل کرنے کا ایسا سنہرا موقع پھر کبھی نہیں مل سکے گا۔ میں اسے کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتا ہوں۔"

"آپ جانیں۔" وہ بے حد سنجیدہ ہوگیا۔ "آپ جو بہتر سمجھیں۔ اگر آپ میری رائے پوچھتے ہیں تو وہ یہ ہے کہ ایسا خطرناک آدمی دس چھوڑ پچاس ہزار پونڈ بھی دے تو اس انسان کو اس سے گریز کرنا چاہئے۔"

"کیا اس حالت میں بھی......" میں نے صرف ایک جیب الٹ دی۔ اس جیب میں جو نقدی تھی وہ میز پر ڈال دی۔ میں ساٹھ ڈالر گھر میں خفیہ جگہ رکھ آیا تھا۔ اس لئے کہ شراب اور شباب مجھے بہکا کر کسی عشرت کدے پر نہ لے جائے اور میں اس رقم سے ہاتھ دھو بیٹھوں۔ گو کہ میں شباب اور شراب سے حتی الامکان دور ہی رہتا تھا۔ لیکن شنگھائی میں ایسے ایسے عشرت کدے اور پُرشباب اور حسین کم سن دوشیزائیں شکار کی تلاش میں نظر آتی تھیں کہ دل قابو میں نہیں رہتا تھا۔ آخر میں بھی انسان ہی تھا۔ پتھر کا نہ تھا۔ جیب گرم ہوتی تو پھر ہری ہری ہی سوجھتی ہے۔ اس لئے میں نے ستیش بترا کی رقم گھر پر رکھ دی تھی۔ جیب میں صرف چھ شلنگ اور دس پنس تھے۔ میں نے واپسی میں ایک ہوٹل میں ناشتا کیا اور چائے پی اور ڈالر دیا تو چھ شلنگ اور پنس میں اس نے کھلا دیا تھا۔

"پھر بھی میں اس آدمی کی صحبت سے منع ہی کروں گا۔" اس نے بڑے پُراسرار انداز سے سر ہلا کر کہا۔ "میری مانو تو کہیں اور گزارہ کے لئے تنخواہ پر نوکری کر لو۔ خود کو تنہا نہ سمجھو۔ میں خود بھی جہاں تک ممکن ہوگا تمہاری ہر طرح سے مدد کروں گا۔ آج کل میرے ایک دوست ولیسٹر کے ہاں ایک آدمی کی ضرورت ہے۔ تنخواہ اتنی معقول ہے کہ آسانی سے گزارہ کر کے پس انداز بھی کر لو گے...... کام بھی تھوڑا ہے۔ آپ کہیں تو اس کے نام ایک سفارشی خط لکھ دوں؟"

"میں آپ کی اس محبت، خلوص اور عنایت کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔" میں نے ممنون

نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں صرف فقط مجبوری اور بے روزگاری کے باعث ڈاکٹر نکولا کی نوکری پر آمادہ ہوا تھا۔ اس کے بجائے کوئی اور سبیل بن جائے تو اس سے بہتر اور کیا بات ہوسکتی ہے۔ کیا وہ سفارشی خط آپ آج، ابھی اور اسی وقت لکھ کر دے سکتے ہیں؟“

”کیوں نہیں دوست!“ اس نے بڑے اپنائیت کے لہجے میں کہا۔ ”فوراً ہی لکھے دیتا ہوں۔ بس تم اتنی دیر میں یہ اخبار پڑھو۔“ یہ کہہ کر وہ میز پر گیا اور اس نے بیٹھے بیٹھے ایک خط لکھ دیا۔

میں نے اس کے ہاتھ سے لفافہ لے کر اس کا شکریہ ادا کیا۔ چونکہ شبھ کام میں دیر نہیں کرنی تھی، اس لئے سیدھے ویلسٹر کی کوٹھی کی طرف روانہ ہوا تو میں اپنے اندر خوشی کی لہر محسوس کر رہا تھا۔ میرے اس دوست نے دوستی کا حق ادا کیا تھا۔

☆......☆......☆

وہ جگہ زیادہ دور نہیں تھی۔ بند کے پرلے سرے پر واقع تھی۔ میں پیدل چلتا ہوا پہنچا۔ سات منٹ کی مسافت تھی۔ میں نے وہاں پہنچ کر مسٹر ویلسٹر کی نسبت دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ دفتر ہی میں موجود ہیں۔ مصروف ہیں۔ مجھے انتظار کرنا ہوگا۔ لیکن مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک آدمی مجھے ان کے پاس لے گیا۔

میں نے تنقیدی نظروں سے ان کا جائزہ لیا۔ مسٹر ویلسٹر ہر لحاظ سے میک اینڈریو کے مدمقابل تھے۔ پُرکشش شہزادے کی طرح دراز قد، فربہ اندام اور چہرے پر انتہائی سنجیدگی کے آثار لئے ہوئے۔ بہت کم ہنستے مگر اتفاقاً ایسا کرتے تو ہنسی کی آواز بے حد سپاٹ اور سخت ہوتی تھی۔ مجھے ایسا لگا یہ شخص ایک خول میں بند ہے۔ بڑے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ میں نے ان سے مصافحہ کیا۔ ان کا رسمی سا انداز تھا۔ انہوں نے اپنے دوست کا سفارشی خط بھی اسی انداز سے پڑھا اور فرمایا۔

”مسٹر آنند پال! مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو رکھ نہیں سکتا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ آسامی جو خالی تھی، ایک گھنٹہ ہوا پُر ہوگئی۔ اگر ڈیڑھ گھنٹہ قبل آجاتے تو مایوسی نہ ہوتی۔ مجھے اپنے دوست کی خاطر ہرگز انکار نہ ہوتا۔ مگر کیا کیا جائے۔ مجبوری ہے۔“

ان کی بات سن کر میرے منہ سے ایک سرد آہ ہی نکل گئی۔

”یہ میری بدنصیبی ہے۔“ میں کہے بغیر نہ رہ سکا۔ ”شنگھائی آنے کے بعد میرے ساتھ ایسا پہلی بار نہیں ہوا۔ یہ تیرہواں موقع ہے کہ جہاں میں آس اور امید لے کر جاتا ہوں، وہاں سے ایسا ہی جواب ملتا ہے۔ میں کسی کو نہیں اپنی تقدیر کو دوش دیتا ہوں۔“

ان کے بشرے سے ایسا لگا کہ میری یہ جذباتی بات ان کے دل پر بہت اثر کر گئی ہے۔ تھوڑی دیر تک سوچنے کے بعد وہ یکایک بولے۔ ”میں آپ کی طرح تقدیر کا قائل نہیں ہوں۔ مگر میرا خیال ہے کہ مسلسل کوشش کرنے سے آدمی ایک نہ ایک دن ضرور کامیاب ہوتا ہے۔ اگر آپ تیرہ جگہ ناکام ہوئے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ چودھویں جگہ کامیاب نہ ہوں۔ اتفاق سے ایک اور ملازمت میری نظروں میں ہے۔ یہاں

ایک جہاز کمپنی کا ڈائریکٹر میرا دوست ہے اور وہ کل شام مجھ سے کہہ رہا تھا کہ دفتر میں اتفاقاً ایک آسامی خالی ہے۔ آپ اگر میرے دفتر میں جانا پسند کریں تو جہاں تک ممکن ہے کوشش سے دریغ نہ کروں گا۔“

میرا جی تو اب بھی مایوس تھا مگر انکار مناسب نہ معلوم ہوا۔ کیونکہ یہ بڑی بات تھی کہ وہ مجھے ساتھ لے جا رہے تھے۔ بھلا ایسا کون کرتا ہے۔ وہ اپنے دوست کا خیال کر رہے تھے۔ میں ان کے ساتھ جہاز کمپنی کے دفتر تک جانے کے لئے آمادہ ہوگیا۔

وہ اپنے ملازم کو ہدایت دے کر تیار ہو چکے تھے۔ ہم اکٹھے دفتر مذکور کی طرف روانہ ہوئے۔ لیکن یہاں بھی بڑی مایوسی ہوئی۔ جس کا میرے دل کو بڑا کھٹکا تھا۔ یعنی وہ آسامی بھی چند گھنٹے پہلے پُر ہو چکی تھی اور جب ہم وہاں پہنچے تو وہ نیا کلرک اپنی میز پر بیٹھا ہوا تھا اور اپنی عینک ناک پر بار بار درست کرتا ہوا کھاتوں میں اندراج کر رہا تھا۔

دفتر سے نکل کر میں نے ویلسٹر کو الوداع کہی اور پژمردہ مکان کی طرف روانہ ہوا۔ مالک مکان مجھے دیکھتے ہی اندر چلا آیا۔ اس نے مجھ سے پچاس ڈالر ادھار مانگے۔ کیونکہ اسے کسی کام کی وجہ سے رقم کی اشد ضرورت تھی۔ یہ رقم بہت بڑی تھی۔ میں اسے کیسے دے سکتا تھا۔ مجھے بھی جھوٹ بولنا اور ریاکاری سے کام لینا پڑا۔ میں نے اسے جیب الٹ کر دکھائی اور اس سے کہا کہ میں چونکہ کئی لوگوں کا مقروض تھا اس لئے وہ رقم قرض کی ادائیگی کی نذر ہوگئی ہے۔ یہ سن کر اس کا چہرہ اتر گیا۔ اس نے جیسے میری بات کا یقین نہیں کیا۔ وہ مجھے اور کمرے کو قہر آلود نظروں سے گھورتا رہا۔ پھر کمرے سے نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد اس کی بیٹی جو بڑی تھی اور ویٹرس تھی، میرے لئے کافی لے کر کمرے میں آئی۔ اس کے حسن وشباب اور اس کی کرشمہ سازیاں واضح تھیں۔ وہ اپنی چھوٹی بہن سے کہیں حسین اور پُرکشش تھی۔ اس کے باپ نے اسے کس لئے اس انداز میں بھیجا تھا میں سمجھ گیا تھا۔ آج وہ گھر پر تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کا جادو چل جائے گا۔ وہ مجھے زیر کرلے گی اور میں رقم اس کی جھولی میں ڈال دوں گا۔ میں نے اس کی ناقدری نہیں کی۔ بات صرف من مانی تک رہی اور نہ ہی اسے میں نے حد سے تجاوز کرنے دیا۔ وہ کافی میں نشے کی دوا ملا کر لائی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ میں کافی پی کر بہک جاؤں گا۔ غلاظت کے دلدل میں گر جاؤں گا اور ستر ڈالر کے بارے میں بتادوں گا۔ میں نے اس کی نظریں بچا کر کافی پھینک دی تھی۔ پھر اس سے کہہ کر اپنا دامن بچایا کہ مجھے ایک جگہ انٹرویو دینے جانا ہے اور شاید وہاں سو ڈالر ایڈوانس مل جائیں۔ پھر میں وہاں سے آکر جشن مناؤں گا۔ اس وقت کوئی اسے لینے آیا۔ وہ اس نامناسب لباس میں اس کے ساتھ چلی گئی تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ وہ جاتے جاتے اپنی سوندھی سوندھی مہک کمرے اور مجھ میں چھوڑ گئی تھی۔

اگر اس وقت میں پریشان کن خیالات کے حصار میں نہ ہوتا تو شاید غلاظت کے دلدل میں گر جاتا۔ مالک مکان کی بیٹی بڑی دانا اور فاحشہ تھی۔ اسے مردوں کو زیر کرنا، فتح کرنا اور لمحوں میں اسیر بنانے کا فن آتا تھا۔ میں اس کے جانے کے بعد گھر سے نکل کر ایک قریب ہی چائے خانے میں آگیا۔ دو تین کپ چائے پی لی لیکن بڑی دیر تک حالت فکر میں اس جگہ بیٹھا رہا اور اپنے مستقبل کے بارے میں

سوچتا رہا۔ میں سخت حیران، پریشان اور متفکر تھا۔ دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ تقدیر اصلاح کے سب رستے بند کر رہی تھی۔ اب ایک پل آرام سے بسر کرنا ناممکن نظر آتا تھا۔ ملازمتیں اور بھی تلاش کی جاسکتی تھیں۔ میرے پاس چھ سات ماہ گزارہ کرنے کے لئے رقم بھی موجود تھی۔ مگر کیا عجب کہ بدبختی وہاں بھی روڑا اڑانے جا پہنچے۔ کیا خبر ان کوششوں میں برسوں کوئی کامیابی نہ حاصل نہ ہو۔ اس اثنا میں بھاری سوال یہ تھا کہ روح اور تن کا رشتہ کیسے قائم رکھا جائے۔

وہ وقت دور نہ معلوم ہوتا تھا کہ میں گردش دوراں کا اسیر بن جاؤں۔ ستر ڈالر ختم ہو جائیں۔ پھر اس کے بعد مالک مکان کے مطالبات پورا کئے بغیر گھر میں رہنا دشوار اور زادراہ نہ ہونے سے سفر غیر ممکن...... آخر میں وہ صورت جس سے جی گھبراتا تھا۔ یعنی عدالت اور پھر جیل...... یہ نوبت آنے سے پیشتر مکان چھوڑوں تو پھر فٹ پاتھ پر بے سروسامانی کی حالت میں زندگی گزارنا۔

معاملات کی بڑی ابتر حالت تھی۔ ادھر ڈاکٹر نکولا کے پیش کردہ دس ہزار پونڈ...... اس وقت پونڈ کرنسی بڑی قیمتی تھی۔ ایک پونڈ کے عوض دس امریکی اور دو سو ہانگ کانگ ڈالر مل جاتے تھے۔ چشم تصور میں دس ہزار پونڈ دنیا کے سب سے حسین اور جاذب نظر اور انمول دکھائی دے رہے تھے۔ وہ ایک بیش بہا خزانہ کے مانند تھے۔ ایک کا ہندسہ بہت بڑا اور اس سے پہلے چار جلی نقطے...... آتشی تحریر کے مانند نظروں میں رقصاں تھے۔ دس ہزار پونڈ جو میرے لئے دس برسوں کی پرتعیش زندگی کے لئے بھی بہت تھے۔

انتہائی صورت یہی تھی اور اس کے سوا چارہ بھی نہیں رہا تھا کہ ڈاکٹر نکولا کی تجویز منظور کی جائے۔ اگر اس نے پانچ ہزار پونڈ میرے حساب میں جمع کرا دیئے تو پھر مجھے کسی بات کی فکر نہیں رہتی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مشکلات کا خاتمہ ہو جائے گا۔ نکولا کے بارے میں جو حالات میں نے سنے تھے، ان کے بعد طبیعت ہرگز اس کی ملازمت پر مائل نہ ہوتی تھی۔ مگر مجبوری تھی کہ کسی ضدی بچے کی طرح تنگ اور پریشان کر رہی تھی۔ میں ہوٹل کے ایک پرسکون گوشے میں بیٹھا تھا۔ آس پاس کی کرسیاں خالی پڑی تھیں۔ ذہن کو یکسوئی بھی تھی...... جب میں فیصلہ کر کے اٹھا تو اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ فیصلہ یہ تھا کہ نکولا کی ملازمت کر لوں گا۔ اس کے سوا چارہ نہیں۔

☆......☆......☆

اس رات آٹھ بجے کے قریب میں نے دھڑکتے دل سے نکولا کے مکان کا دروازہ بڑی آہستگی اور شائستگی سے کھٹکھٹایا۔ وہی چینی لڑکا جس نے پہلی بار دروازہ کھولا تھا، سایہ کی طرح نمودار ہوا اور مجھے اپنی رہنمائی میں اندر لے گیا۔ وہی کمرا تھا جس میں مجھے کل رات ٹھہرایا گیا تھا۔ اس طرح مجھے اس کمرے میں پانچ منٹ انتظار کرنا پڑا۔ وہ نکولا کو اطلاع دینے گیا تھا۔ نکولا کمرے میں داخل ہوا۔

''آپ کیسے ہیں۔ مسٹر آنند پال!'' اس نے آتے ہی کہا۔ ''میں آپ کو اس قدر پابند دیکھ کر بہت خوش ہوا ہوں۔ عین الوقتی کامیابی کی کنجی ہے۔ آیئے...... ساتھ والے کمرے میں چل کر باتیں کرتے ہیں۔ وہاں زیادہ مناسب اور بہتر رہے گا۔''

میں اس کے ساتھ دوسرے کمرے میں گیا اور اس کی درخواست پر اس کرسی پر بیٹھ گیا، جس پر کل رات بیٹھا تھا۔ تقریباً دوسرے ہی لمحے کالی بلی کہیں سے نمودار ہوگئی۔ مجھے پہچان کر اپنا سر میری ٹانگوں سے ملنے لگی۔ اس میں پیار کا سا انداز تھا۔

ڈاکٹر نکولا نے بلی کی جو یہ حرکت دیکھی تو اس نے مسکرا کر کہا۔ ''دیکھئے...... مسٹر آنند پال! میں کیا میری بلی بھی آپ کو آمادہ کرنے پر تلی ہوئی ہے...... ساری دنیا میں مشکل سے پانچ آدمی ایسے ہوں گے جن سے یہ اتنا پیار کرتی ہو۔ مگر آپ کو تھوڑی واقفیت میں ہی چاہنے لگی ہے۔ فرمایئے...... آپ نے آخری فیصلہ کیا کیا...... میری فراخ دلانہ پیش کش آپ کو منظور یا نامنظور......؟''

''میں ایک شرط پر آپ کی تجویز منظور کرتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''مگر وہ شرط ذرا کڑوی ہے۔ شاید آپ کو تامل ہو۔''

''کم از کم مجھے بھی معلوم ہو کہ وہ کیا شرط ہے؟'' نکولا نے کہا۔ ''مجھ سے جہاں تک ممکن ہوگا، اسے منظور کرنے کی کوشش کروں گا۔ بشرطیکہ وہ سراسر ناقابل عمل نہ ہو۔ وہ شرط کیا ہے بیان فرمائیں۔''

''تو سنیئے...... آپ نے پانچ ہزار پونڈ پیشگی دینے کا وعدہ کیا تھا۔ باقی پانچ کی ہنڈی میعادی ایک برس لکھ دیں۔'' میں نے بغیر کسی جھجک کے کہا۔ ''اگر آپ کو یہ شرط منظور ہے تو میں حاضر ہوں۔''

''کیا بس یہی شرط ہے جو آپ منوانا چاہتے تھے۔'' نکولا نے جلدی سے کہا۔ ''پانچ ہزار کیا...... آپ حکم فرمائیں تو دس ہزار کی ہنڈی لکھ دوں۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ کی شرط خالی روپے سے تعلق رکھتی ہے۔''

وہ کمرے کے پرلے سرے پر میز کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور کچھ لکھنے لگا۔ دو تین منٹ کے بعد جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ جیسا کہ چند لمحوں کے بعد پتا چلا کہ وہ دس ہزار پونڈ کا چیک تھا۔

''یہ لیجئے......'' اس نے چیک میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ ایک برس کی مہلت چاہتے تھے لیکن میں پوری رقم ادا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ اب آپ کا اطمینان بحال ہو جائے گا۔'' میں نہ صرف متاثر ہوا بلکہ جھینپ سا گیا اور پھر کچھ سوچ کر بولا۔

''آپ نے مجھ پر جو فیاضی برتی ہے، اس کے بعد لازم ہے میں بھی پوری صفائی سے کام لوں تاکہ بات اور معاملہ بالکل صاف رہے۔''

''کہیئے...... آپ اور کیا چاہتے ہیں۔'' وہ مجھے حیرت سے دیکھنے لگا۔ ''اگر کوئی نئی شرط یاد آئی ہے تو وہ بھی کہہ ڈالیے......؟''

''جی نہیں...... شرطیں سب ختم ہوئیں۔ اب کوئی شرط نہیں ہے۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں صرف یہ بات دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ ایک شخص ویدرل کو جانتے ہیں......؟'' میرا خیال تھا کہ شاید وہ مکر جائے۔

''بہت اچھی طرح......'' اس نے جواب دیا۔ ''کچھ عرصہ پہلے وہ نیو ساؤتھ ویلز کا وزیر نو آبادیات تھا۔ اسے خوب جانتا ہوں۔ سڈنی میں ایک بار اس کی بہت ہی حسین، نوجوان اور پرشباب لڑکی کو بھگا کر

لے گیا تھا۔ جب تک کوئی لڑکی کہیں بھاگنے میں تیار نہ ہو، اسے آسانی سے لے جایا نہیں جا سکتا۔ ایک رقص کی محفل میں ہم دونوں ایک گوشے میں آ گئے تھے۔ وہاں ہم دونوں کے سوا کوئی نہ تھا۔ تنہائی تھی۔ وہ مجھ پر فریفتہ تھی۔ مہربان بھی تھی۔ میں اسے اس کی مرضی سے لے آیا تھا۔ وہاں ہم نے بہت اچھا، پُر لطف اور نشاط انگیز وقت گزارا۔ وہ آج بھی یادگار اور ناقابل فراموش ہے۔ جتنے دن ساتھ رہی، اس نے مجھے بہت خوش کیا۔ میں کبھی کفرانِ نعمت کو ٹھکرانے کا قائل نہیں رہا ہوں...... اور ایک بار ایک موقع پر بندر سعید میں میں نے ایک شخص کو زیر حراست بھی رکھا تھا۔ بعد ازاں وہ اس کا داماد بن گیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ فلس میرے ساتھ بہت دنوں تک دن رات ساتھ رہی۔ فلس کا حسن و شباب ہی ایسا ہے کہ اسے کوئی قبول کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس نے اس آلودلڑکی کو شریک زندگی بنالیا۔ وہ دونوں بہت خوش ہیں۔ دیکھئے میں نے آپ سے کوئی بات نہیں چھپائی۔ وہ بات بھی بتادی جو ویڈرل نہیں جانتا ہے۔“

”آپ کی صاف بیانی قابل قدر ہے۔“ میں نے بڑی صاف گوئی سے کہا۔ ”مگر مجھے یہ کہنے کے لئے معاف کیجئے کہ اس طرح کا سلوک آپ نے ایک ایسے شخص کے ساتھ کیا جو معزز تھا۔ کیا اسے کسی بھی لحاظ سے جائز اور مناسب کہا جا سکتا ہے؟“

میرا خیال تھا کہ میری صاف گوئی اسے تلخ محسوس ہوگی اور وہ مجھ سے ناراض ہو جائے گا۔ لیکن وہ زیرلب مسکرانے لگا۔

”میرے دوست!“ اس نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ ”کسی کا فعل مناسب اور جائز ہونا ذہن انسانی کے فیصلے پر منحصر ہے۔ ان دو لفظوں کے بارے میں آپ کے خیالات کچھ اور ہو سکتے ہیں۔ میرے کچھ اور علاوہ بریں...... میرا معیار اخلاق سب سے جدا ہے۔ میں اپنی ضرورت کے لئے جو کام کرتا ہوں، وہ میرے نزدیک ہر طرح جائز اور مناسب ہے۔ ویڈرل سمجھدار ہوتا تو اتنی مصیبت کیوں مول لیتا......؟ میں فقط اس سے وہ لکڑی مول لینا چاہتا تھا نہ کہ...... جو ایک تباہ حال انگریز چیپا پیٹ نے مرتے وقت اسے دی تھی۔ پوری تفصیل، امید ہے کہ آپ کو اس خط سے معلوم ہو گئی ہوگی جو ویڈرل نے ایک اینڈریو تاجر کے نام لکھا تھا۔ جس کا مضمون آج صبح ہی اس نے پڑھ کر سنایا تھا۔ ابھی آپ کے ذہن میں وہ اس خط کا مفصل مضمون تازہ ہوگا۔“

میں حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا۔ میں نے تحیر زدہ لہجے میں کہا۔ ”آپ کو کیسے معلوم ہوا......؟“

نکولا نے بڑی بے پرواہی سے اپنا سیدھا ہاتھ ہلایا اور کہا۔ ”آپ ایسے بے تکے سوالات مجھ سے ناحق پوچھتے ہیں۔ دراصل میرے ذرائع خاص ہیں۔ یہ بات آپ نے ایک سے زیادہ موقعوں پر دیکھ لی ہے کہ میں سب کچھ معلوم کئے لیتا ہوں اور وہ غلط نہیں ہوتا ہے۔ اس چٹھی کا مضمون یقیناً آپ کو سنایا گیا تھا اور اب اگر آپ ایک لمحہ میری طرف دیکھیں تو میں بتا سکتا ہوں کہ اس موقع پر آپ دونوں کے درمیان کیا گفتگو ہوئی تھی۔“

مگر اس کی بات سے ہی اطمینان ہو چکا تھا۔ اس نے جو کچھ کہا تھا وہ غلط نہ تھا اور نہ ہی وہ اندازہ ہو سکتا تھا۔

”اس کی کیا حاجت ہے؟“ میں نے سرسری طور پر کہا۔ ”میں آپ کی بات کی نفی نہیں کر رہا ہوں۔“

نکولا نے ایک سگریٹ جلایا۔ ایک کش لینے کے بعد اسے انگلیوں میں دبائے ہوئے کہنے لگا۔

”امید ہے کہ اس توضیح سے آپ کا اطمینان ہو گیا ہوگا۔ میں یہی چاہتا ہوں کہ آپ مطمئن ہو جائیں۔“

پھر اس نے مسکرا کر بلی کو زانو پر رکھ لیا اور اپنی لمبی پتلی انگلیاں اس کی جسم پر پھیرتے ہوئے نیم باز آنکھوں سے میری طرف دیکھنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر تک، ہم دونوں کے درمیان سکوت رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس سے مزید کیا کہوں۔ آخر اس نے سکوت توڑا۔

”میں آپ کو بہت چاہتا ہوں۔ آپ بڑے سمجھدار آدمی ہیں۔ جب آپ منہ کھولتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ضرور کوئی معمولی بات کہیں گے۔“

”میں آپ کی اس تعریف کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔“ میں نے رسمی انداز سے کہا۔

”مگر جملہ کا انجام امید کو باطل کر دیتا ہے۔“ اس نے فقرہ تمام کرتے ہوئے کہا۔

میں شرمندہ سا ہو گیا۔ مجھے واقعی اپنی تعریف سن کر یہ الفاظ نہیں کہنے تھے۔ ”آپ کی اس بات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ میری نسبت اچھی رائے نہیں رکھتے؟“ میں نے کہا۔

”ایسی بات نہیں۔“ وہ بولا۔ ”مطلب فقط یہ ہے کہ آپ کام کرنا خوب جانتے ہیں۔ لیکن باتیں بنانا بالکل نہیں آتا...... اتفاق سے میرے ساتھ رہتے ہوئے آپ کو بولنے کی حاجت بہت کم ہوگی۔ کہنے کا فرض میرے ذمے رہے گا۔ کرنے کا آپ کے ذمے...... اس سے کام بھی نبٹ جائے گا۔ فرمائیے...... آپ میرے ساتھ چلنے کو تیار ہیں یا کچھ اور تامل باقی ہے؟“

”میں تیار ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”تو لائیے اپنا ہاتھ......“ یہ کہتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھا کر بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ پھر اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں صرف ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ آپ جب تک ایمان داری کے ساتھ میرا کام کرتے رہیں گے۔ ہرگز ہرگز آپ کا ساتھ نہ چھوڑوں گا اور ہر قسم کی مشکلات میں مدد دوں گا۔ لیکن اگر آپ نے کام سے پہلوتہی کی تو پھر انجام جو کچھ ہوگا، اس کے ذمے دار آپ ہوں گے...... غالباً یہ تنبیہ کافی ہوگی...... عقل مند کو اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔“

”یہ بہت کافی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اور اب مہربانی سے یہ فرمائیے وہ کیا کام ہے جس میں آپ میری مدد چاہتے ہیں اور کب تک اس مہم پر روانہ ہونے کا ارادہ ہے۔ آپ نے ابھی تک کام کی نوعیت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟“

☆......☆......☆

ڈاکٹر نکولا میری بات کا جواب دینے کے بجائے کرسی پر جھک گیا۔ پھر سگریٹ نکال کر اسے جلا کر کہنے لگا۔ ”اب وقت آ گیا ہے کہ میں آپ کو اس مہم کے پورے حالات سے خبردار کر دوں۔ جو میں اختیار

کرنا چاہتا ہوں۔ شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جو کچھ میں آپ سے بیان کروں، اسے مہربانی سے اپنے تک ہی رہنے دیں۔ کسی پر بھول کر بھی ظاہر نہ کیجئے۔ کیوں کہ صرف میری بلکہ آپ کی سلامتی بھی جو میری ذات سے وابستہ ہوگی، اس میں ہے۔ راز کی حفاظت ہم دونوں کا ہی فرض ہے۔"

اس نے کش لینے کے لئے توقف کیا اور چند لمحوں تک مجھے پُر خیال نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

"ممکن ہے کہ سارا حال سن کر آپ یہ سمجھیں کہ میں ایک بے حقیقت اور غیر اہم معاملہ کو حد سے زیادہ اہمیت دے رہا ہوں۔ مگر یہ بات کہ اس شہر میں کچھ ایسے آدمی آباد ہیں جن کو افواہاً بھی یہ بات معلوم ہو گئی کہ وہ لکڑی جس کا حال آپ نے ویدرل کی چٹھی میں سنا تھا، اب میرے پاس آ گئی ہے تو شنگھائی میں میری زندگی کی دو کوڑی کی قیمت بھی نہیں رہے گی۔ اس لئے میں اس بات کو راز رکھنے پر زور دے رہا ہوں۔ احتیاط کے مضمون پر میں اس سے زیادہ کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ آپ ایک سمجھ دار اور ذمہ دار شخص ہیں۔

رہ گیا کام...... اس کے متعلق میں شروع میں ہی بیان کر دیتا ہوں کہ ایسے معاملات کی نسبت میرا شوق تحقیق، تفریحی یا عارضی ...... نہیں ...... مدت العمر کے مطالعہ اور مشاہدہ سے وابستہ ہے۔ میری وسعت تحقیقات کا اندازہ آپ اس بات سے کر سکتے ہیں کہ کچھ واقفیت حاصل کرنے کے لئے جس کی مجھے ضرورت تھی۔ میں نے بعض شخصوں کا دنیا کے طول و عرض میں پیچھا کیا۔ چنانچہ جن دنوں میں ویدرل کو اس لکڑی کی واپسی کے متعلق بار اول تحریک کر رہا تھا تو ایک آدمی کے تعاقب میں برازیل کی سرحد بولیویا پر کویا یہ تک جانا پڑا۔ یہ شخص جس کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ مغربی چین میں سونے کے پترہ کا بیوپار کرتا تھا۔ اتفاقاً اسے ایک عجیب قصہ تبت کے لاماؤں کی نسبت معلوم ہوا جن کی خانقاہ ایک دشوار گزار مقام پر واقع ہے۔ محض اس آدمی سے معلومات حاصل کرنے کے لئے میں نے چھ ماہ متواتر سفر کیا اور ایک ہزار پونڈ کے اخراجات برداشت کئے۔ حالانکہ وہ حالات جو اس سے معلوم ہوئے دس بارہ فقروں سے زیادہ نہ تھے۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ میں نے وہ واقفیت جس کی قیمت عام حالات میں شاید دس پنس بھی نہ ہوتی۔ دس پونڈ فی لفظ خرچ کر کے حاصل کی۔ مگر بات یہ ہے کہ میں ایسی معلومات کی قدر و قیمت خوب جانتا ہوں۔ ایک اور موقع پر میں ایک چھوٹے سے چینی گاؤں کا حال تحقیق کرنے مونٹی وڈیو گیا اور ایک بار کسی پجاری کا حال معلوم کرنے گولڈ گوسٹ گیا۔ اس مقام تک جانے کے لئے لمبا سفر اختیار کرنا پڑا۔ ایک روسی، یہودی کا تعاقب یعنی ناگوراڈ تک اس لئے کیا کہ میں اس سے وہ نشان حاصل کرنا چاہتا تھا جو اس کی گھڑی کی زنجیر میں لگا ہوا تھا۔ جس کی قیمت کا حال اس بے چارے کو قطعاً معلوم نہ تھا۔ اس طرح مختلف ذریعوں سے ہر قسم کی معلومات حاصل کرنے کے بعد میں نے ان کو اپنے ذہن میں جمع کیا۔ کچھ اور باتیں خط و کتابت سے معلوم کیں۔ جب ساری تفصیل سنا کر تحقیقات مکمل کر چکا تو حالت یہ تھی کہ تین آدمیوں کے سوا جن کو کوئی بات ظاہر کرنے کا اختیار نہیں اور جن کو شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کی خانقاہ کے باہر کوئی اور دنیا بستی ہے۔ کسی تنفس کو ایک حروف تک معلوم نہ تھا۔ ساری واقفیت مجھ تک محدود تھی۔ یہ سارے

حالات میں نے آپ سے اس لئے بیان کئے ہیں کہ آپ معلوم کر لیں اور احساس ہو کہ اپنی تحقیقات مکمل کرنے کے لئے میں نے روپیہ یا محنت سے کبھی دریغ نہیں کیا نہ کرتا ہوں اور نہ کروں گا۔ اب اس تمہید کے بعد میں اس معاملہ کی طرف جس کے لئے میں نے آپ کی خدمات حاصل کی ہیں، آتا ہوں۔

"288ق۔م میں یا اس کے قریب لنکا میں انو مادھ پور کے پاس بودھی کا ایک درخت بویا گیا تھا۔ تین پجاری جو اپنی ریاضت اور تحقیقات کے لئے خاص طور پر مشہور تھے، لنکا سے چل کر براعظم ایشیا میں گئے اور اس خطہ کو عبور کر کے جو آج کل برہما کہلاتا ہے، کئی طرح کی صعوبتیں اٹھاتے ہوئے اس ملک میں جا پہنچے۔ جس کا نام اب تبت مشہور ہے۔ اس جگہ پہنچ کر وہ دونوں مر گئے۔ مگر ایک جو باقی تھا اس نے کچھ اور لوگوں کو اپنے گرد جمع کر کے ایک خانقاہ کی بنیاد ڈالی اور بہت سے چیلے شامل کرنے کے بعد تحقیقات کا سلسلہ جاری رکھا۔ ہر چند کہ کام بڑی احتیاط اور راز داری کے ساتھ ہوتا تھا لیکن وہ ناکام رہا۔ ان لوگوں کا چرچہ بہت جلد دور اور نزدیک پھیلنے لگا۔ اس کی ایک بڑی وجہ عام لوگوں کا تجسس تھا۔ جس کی جتنی راز داری اور پردہ داری کی جائے، اتنی ہی یہ بات عام ہونے لگتی ہے۔ اس کی تصدیق کئی چینی مؤرخوں سے ہوتی ہے۔ جن میں سے ایک کا خلاصہ میں آپ کو پڑھ کر سناتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور کمرے کے دوسرے گوشے میں ایک پرانی نقش و نگار اور قدیم طرز کی ایک الماری کے پاس جو دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھی گیا، پھر اسے کھولا۔ اس میں کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ اس نے ان کتابوں کے درمیان سے ایک بہت بڑی اور ضخیم اور مجلد کتاب نکال کر جس پر البم کا دھوکہ ہوتا تھا، جس میں متفرق یادداشتیں جمع کی گئی ہوں۔ میں نے دیکھا کہ اس میں بے شمار مسودے اور کٹے پھٹے ہوئے مضمون چسپاں تھے۔ پھر وہ کتاب کو ہاتھ میں لے کر آیا اور اپنی کرسی پر براجمان ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک کتاب دیکھ کر الٹ پلٹ کرنے کے بعد کہنے لگا۔

"یہ مسودہ جس کا ترجمہ آپ کو پڑھ کر سناتا ہوں۔ جس کا ہر لفظ بڑی احتیاط سے انگریزی میں منتقل کیا گیا ہے۔ اس برس اور اس مہینہ میں لکھا گیا تھا۔ جب ولیم انگلستان پر حملہ آور ہوا اس نے کیا لکھا ہے۔

"میں اس جماعت کے کشف و کرامات کا حال بڑے ادیب و احترام کے ساتھ لکھتا ہوں۔ کہتے ہیں کہ ان لوگوں کو شفا کی وہ عظیم قوت حاصل ہے جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی ہے۔ حتیٰ کہ جتنے سحر اور جادو آج تک معلوم ہیں ان میں سے کسی میں وہ تاثیر نہیں جو ان کی قوت شفا میں پائی جاتی ہے۔ انتہا یہ کہ وہ لوگ مردہ کو زندہ کر دیتے ہیں۔ شاید اس میں ممکن ہے، مبالغہ ہو کیوں کہ مردے کو صرف خدا ہی دوبارہ زندہ کر سکتا ہے اور جیسا کہ روز قیامت سارے مردوں کو زندہ کیا جائے گا۔ اس کا ذکر مسلمانوں کی الہامی مقدس کتاب میں موجود ہے۔ لیکن یہ بات پورے وثوق اور اعتماد اور ثبوت سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ آدمی کی عمر اس درجہ بڑھانا جانتے ہیں کہ وہ صدہا برس رہ سکتا ہے۔ مگر میں یہ سارا حال محض شنید پر لکھتا ہوں۔"

نکولا نے سانس لینے کے لئے توقف کیا اور پھر اگلا ورق پلٹ کر بڑی روانی سے پڑھنے لگا۔

"تقریباً پانچ سو برس کے بعد ہم ان باتوں کا ذکر ایک اور چینی مؤرخ فنگ لاڈلان کی کتاب میں

دیکھتے ہیں جو 1500 کے قریب لکھی گئی تھی۔ اپنی تاریخ میں ان لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے اس نے لکھا ہے کہ اب وہ حکومت کے لئے باعث تکلیف دہ اور پریشان کن ہو رہے ہیں۔ پہلے وہ رہبانیت کی زندگی بسر کرتے اور وسط تبت کی ایک ویران خانقاہ میں رہا کرتے تھے۔ مگر اب مشرق کی ایک خفیہ جماعت بن چکے ہیں۔ لیکن وہ پراسرار قوتیں جوان سے پیشتر منسوب کی جاتی تھیں۔ اب بھی تین سرکردہ مصلحوں تک محدود ہیں۔ سولھویں صدی کے آخر میں ان لوگوں کی سیاسی اہمیت اتنی بڑھی کہ حکومت کو ان کے استحصال کی تدبیریں سوچنی پڑیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ زبردست چینی سوسائٹی جس کا مقولہ ہون پنگ کی جنگ مشہور تھا جو مدت دراز تک چین میں غیر معمولی اختیارات رکھتی تھی۔ دراصل اس جماعت کی ایک شاخ تھی جس کی تحقیقات میں کر رہا ہوں۔ مجھے اس بات کا پورا یقین ہے کہ وہ علمی اور سحری معلومات جو عرصہ دو ہزار برسوں سے اس جماعت کے پاس محفوظ تھے، اب قائم چلے آئے ہیں اور مجھے اس تحقیقات میں کتنی بھی کوشش کرنی پڑے، میں ان کے اندرونی حالات ہر قیمت پر معلوم کر کے رہوں گا۔ مہذب ملکوں میں ہمیشہ سے دستور ہے کہ جس بات کو اوسط تعلیم کے لوگ قابل یقین نہ کہیں، وہ اس کا مضحکہ اڑاتے ہیں اور استہزا کرتے ہیں۔ حقارت سے دیکھتے ہیں۔ انگریزوں کو دیکھئے۔ وہ روحانیت سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتے ہیں مگر اس کے باوجود کہتے ہیں کہ موت کے بعد جب یہ تن خاکی بے جان رہ جائے تو روح آسمان پر چلی جاتی ہے۔ مگر وہ کون سا مقام ہے جہاں روح جاتی ہے اور وہاں اس سے کیا سلوک ہوتا ہے۔ اس کا حال انہیں قطعاً معلوم نہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو دوسرے مذاہب میں جنت، برزخ، نروان، سورگ اور ولہالہ کے خیالات موجود ہیں۔ اسی طرح ہم میں بھی ہیں۔ مگر روحانی تعلیم نہ ہونے کے باعث مبہم ضرور ہیں۔ دوسرے لفظوں میں گو اہل مغرب علوم روحانی کے قائل نہیں، تاہم اتنا وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ موت کے بعد روح کو کوئی واقعہ پیش آتا ہے۔

آپ یہ سوچ کر حیران ہوں گے کہ میں روحانیت پر یہ لمبی چوڑی تقریر کیوں کر رہا ہوں۔ مگر اس میں ایک راز ہے جو عنقریب واضح ہو جائے گا۔ آپ سے میں ان عجائبات کا حال بیان کروں جو میں نے مشرق میں رہتے ہوئے دیکھے ہیں اور ان حیرت خیز معلومات کا حال کہوں جو میں نے دوسروں سے حاصل کی ہیں تو میرا خیال ہے آپ یا مجھے جادوگر کہیں گے یا ایک سادہ لوح آدمی...... حالاں کہ میں ان دونوں میں سے ایک بھی نہیں ہوں۔ البتہ اپنی سیاحت کے دوران میں کچھ ایسی عجیب باتیں دیکھ چکا ہوں جو قدرت کے ہر قانون کو تہ و بالا کرتی ہیں اور اسرار و خوارق سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ گاہ بگاہ ان باتوں میں شعبدہ بازی سے بھی کام لیا گیا ہو۔ مگر میرا پختہ یقین ہے کہ کثیر التعداد حالتوں میں میں نے جو کچھ دیکھا ایک اصل واقعہ تھا۔ اور یہاں ایک بڑی مشکل اس سوال کے حل میں پیدا ہوتی ہے کہ شعبدہ بازی کیا ہے؟ نوے فیصد حالتوں میں آپ اسے کالا جادو خیال کریں گے۔ مگر ٹھہریئے۔ میں اپنے خیالات کو واضح کرنے کے لئے ایک مثال آپ کو دکھاتا ہوں جو شاید ہی آپ نے کبھی دیکھی ہو۔"

ایک الماری کے پاس جا کر اس نے شیشہ کا معمولی گلاس اور کانچ کی پانی سے بھری ہوئی صراحی نکالی اور دونوں کو پاس پاس میز پر رکھ دیا۔ پھر ایک کرسی پر بیٹھ کر گلاس میں اتنا پانی بھرا کہ وہ لبریز ہو گیا۔

میں حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ مگر کچھ معلوم نہ تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔

گلاس کو پر کرنے کے بعد وہ میری طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"آپ دیکھتے ہیں اس برتن میں اوپر تک پانی بھرا ہوا ہے۔ مہربانی سے اچھی طرح سے اطمینان کر لیں۔" میں نے اٹھ کر غور سے دیکھا۔ گلاس اتنا بھرا ہوا تھا کہ ذرا بھی جنبش دی جاتی تو پانی ضرور گر جاتا۔ میں نے ہر طرح سے اپنا اطمینان کرنے کے بعد تسلیم کیا۔

"بے شک اس میں اوپر تک پانی بھرا ہوا ہے۔ ذرا برابر بھی پانی کم نہیں ہے۔"

"اچھا تو دیکھئے...... میں ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ قوت ذہن کے مقابلہ میں مادہ کی ہستی بے حقیقت ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔"

اس نے دیا سلائی کی ڈبیا نکال کر شمع روشن کی...... اور جب وہ اچھی طرح جلنے لگی تو اسے اٹھا کر اس طرح پانی پر الٹایا کہ پگھلی ہوئی موم کا ایک قطرہ پانی پر گر پڑا۔

اس عمل کے بعد نکولا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اب میں ایک سے لے کر بیس تک گنوں گا۔ آپ اس عرصہ میں اس جمے ہوئے موم کے قطرہ کو غور سے دیکھتے رہیں۔" میں نے ایسا ہی کیا اور نگاہ موم کے اس دانہ پر جمالی جو سطح آب پر تیر رہا تھا۔ اس اثنا میں نکولا ہموار آواز سے اعداد گننے میں مصروف رہا۔

میرے دیکھتے دیکھتے پانی جو اوپر تک بھرا ہوا تھا، آہستگی سے نیچے اترنا ہی شروع ہوا۔ حتیٰ کہ پانی پیندے سے لگ کر غائب ہو گیا۔

ڈاکٹر نکولا جو گنتی ختم کر چکا تھا۔ گلاس سے نظریں ہٹا کر بولا۔ "اب ذرا اٹھ کر گلاس کو دیکھئے کیا اس میں پانی ہے یا نہیں؟ مگر اسے چھونے کی ہرگز کوشش نہ کیجئے۔"

میں نے جھک کر گلاس کو بہ غور دیکھا۔ ایمانداری سے کہتا ہوں کہ اب اس میں ایک بوند پانی بھی نہ تھا۔ یہی بات میں نے ڈاکٹر نکولا سے تسلیم کی۔ اس نے واقعی کمال دکھایا تھا۔

"بہت اچھا۔" ڈاکٹر نکولا نے کہا۔ "اب مہربانی سے بیٹھ جایئے اور دوبارہ گلاس کی طرف دیکھئے۔"

اس نے پھر وہی گنتی شروع کی اور میرے دیکھتے دیکھتے پانی جو گلاس سے ہو چکا تھا، دوبارہ نمودار ہو کر چڑھنے لگا۔ حتیٰ کہ سابقہ حالت میں پانی سے لبریز ہو گیا۔ ایسا لگا کہ اب چھلکا کہ اب......

میں نے دیکھا کہ پانی کی سطح پر موم کا وہ منجمد دانہ اسی طرح تیر رہا تھا۔

تھوڑی دیر تک کمرے میں ایک گہرا سکوت سا طاری رہا۔ پھر ڈاکٹر نکولا نے آگے بڑھ کر گلاس اٹھایا اور اس کا سارا پانی گرا دیا۔ پھر اس نے خالی گلاس میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"آپ اسے ذرا غور سے دیکھئے...... شاید آپ کا خیال ہو جو کچھ ہوا وہ معمولی سا شعبدہ تھا۔ مگر اچھی طرح سے دیکھئے کہ کیا گلاس میں کوئی خفیہ کل ایسی ہے جس سے پانی غائب کیا جا سکے؟ کیا جا سکتا ہے؟"

میں نے گلاس کو خوب اچھی طرح الٹ پلٹ کر دیکھا۔ مگر اس میں ایسی کوئی بات نہ تھی جس سے

شعبدہ کا گمان ہوتا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا۔" میں نے حیران ہو کر کہا۔ "یہ کیا اسرار تھا؟ مگر امید ہے کہ آپ اس راز کو آسانی سے حل کر سکیں گے..... جب تک یہ حل نہیں ہوگا میری طبیعت بے چین سی رہے گی۔"

"میرا خیال ہے استاد یکھنے پر بھی آپ کا اطمینان نہ ہوا ہوگا...... آپ اب تک یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ یہ ایک ویسا ہی کھیل ہے جیسے لندن کے میکلین یا ڈیوانٹ تھیٹروں میں دیکھے جاتے ہیں۔ اس لئے ٹھہریئے۔ میں دو ایک چیزیں اور دکھانا چاہتا ہوں۔ اس وقت گھڑی میں نو بج کر اٹھائیس منٹ ہوئے ہیں۔ پورے ساڑھے نو پر گھنٹہ بجے گا۔ اس دو منٹ کے عرصے میں نظریں جما کر صرف میری طرف دیکھتے رہیئے گا۔"

میں نے اس کی بات کی تعمیل کی اور نکولا نے اپنی تیز متجسس آنکھیں میرے چہرے پر جما دیں۔ میں نے بارہا سنا تھا کہ وہ لوگ جو مسمریزم کی طاقت رکھتے ہیں۔ غیر معمولی تیز نظروں سے دیکھا کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ دوسرے آدمی کو معلوم ہوتا ان کی نگاہ سر کے پار گزری جا رہی ہے۔ اپنے متعلق میں کہہ سکتا ہوں کہ نکولا کی نظر اتنی تیز تھی کہ میں بہت جلد کرنے لگا کہ میرا سر ہی غائب ہو چکا ہے۔ میں سر بریدہ ہو گیا ہوں۔ صرف دو منٹ کی بات تھی۔ لیکن دو منٹ کا یہ عرصہ دو گھنٹوں کے برابر طویل اور چٹان کی طرح بھاری ہو گیا تھا۔

آخر جب گھڑی کی آواز سنائی دی تو نکولا نے سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔

"بائیں آستین کو اٹھا کر اپنے بازو کو غور سے دیکھئے اور بتایئے کیا نظر آیا؟"

میں نے آستین کے کف کے بٹن کھولے۔ میں نے ایسا ہی کیا جو اس نے کہا تھا۔

کیا دیکھتا ہوں کہ سرخ حرفوں میں لکھا ہوا میرا نام میرے ہی دستخطوں سے ملتا بازو پر موجود ہے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ نشان غائب ہو گیا۔ حتیٰ کہ نصف منٹ بعد ایسا معلوم ہوا کہ وہ کبھی موجود ہی نہ تھا۔

"دیکھئے...... اس کا نام ہپناٹزم ہے۔" نکولا نے کہا۔ "دونوں حالتوں میں جو کچھ آپ نے دیکھا ،اس کی حقیقت کچھ نہ تھی۔ سب میری قوت ارادی کا نتیجہ تھا۔ پہلی صورت میں پانی گلاس سے باہر نہیں گیا۔ شروع سے آخر تک بدستور موجود رہا۔ مگر میں نے اپنی قوت ارادی سے آپ کو یہ دیکھنے اور ماننے پر مجبور کر دیا کہ وہ غائب ہو چکا ہے۔ یہی بات دوسرے موقع پر پیش آئی...... جو شخص روحانیت سے تھوڑا سا بھی لگاؤ رکھتا ہو وہ ان باتوں کی تشریح بڑی آسانی سے کر سکتا ہے۔ اہل مغرب ان باتوں کو ہپناٹزم کہہ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مگر کیا آپ کو معلوم ہے کہ ہپناٹزم کے معنی کیا ہیں......؟"

"میرے خیال میں آپ کا ذہن میرے ذہن سے زیادہ طاقت ور تھا۔" میں نے جواب دیا۔ "اس لئے وہ مجھ پر غالب آ گیا۔"

"بے شک...... عام لوگ یہی کہتے ہیں۔ مگر سچ پوچھئے تو یہ جواب صحیح نہیں ہے۔ بالفرض میرا ذہن آپ کے ذہن سے بھی مضبوط ہو تو سوال یہ ہے کہ میرے خیالات آپ کے ذہن تک کیوں کر پہنچے؟" اس نے کہا۔

میرے پاس اس کی اس بات کا کوئی جواب نہ تھا۔ مجبور ہو کر میں نے کہا۔ "شاید اسے نقل خیالات کہتے ہیں۔" ڈاکٹر نکولا نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے میرا جواب نظر انداز کر کے کہا۔

"آپ کے بیان سے پایا جاتا ہے کہ ہپناٹزم کا لفظ ان دونوں صورتوں پر حاوی ہے۔ مگر حقیقت میں یہ دو مثالیں میں نے ایک تیسری مثال پیش کرنے کی غرض سے دکھائی تھیں۔ اس کے بعد امید ہے کہ ہم اصل مدعا کے قریب تر پہنچ جائیں گے۔ اب مہربانی سے میری طرف دیکھئے اور سب سے زیادہ میری انگلی پر نظر رکھیں۔"

یہ کہہ کر اس نے داہنے ہاتھ کی پہلی انگلی ہوا میں اس طرح ہلانی شروع کی گویا اس سے آٹھ کا ہندسہ تیار کر رہا ہے۔ میں نے پوری طرح نظر جمانے کی کوشش کی مگر تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ انگلی کے سرے پر ایک چھوٹا نیلگوں شعلہ خارج ہو رہا ہے۔ اس کے ایک منٹ بعد ایسا نظر آیا کہ کمرے کے پرلے سر پر ایک ننھا سا بادل نمودار ہوا۔ جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تو وہ فرش زمین کے پاس تھا۔ اس کے بعد ایک گز اونچا اٹھ کر میری طرف آنے لگا اور اس کے ساتھ ہی رفتہ رفتہ بڑھتا چلا گیا۔ قریب آ جانے پر مجھے معلوم ہوا کہ وہ کسی آدمی کا دھندلا سایہ تھا۔ تھوڑی دیر میں اس کا سر اور دھڑ بھی اچھی طرح نظر آنے لگا۔ اس کا بدن متناسب اور دراز قد تھا۔ سر پیچھے جھکا ہوا اور آنکھیں متجسس انداز سے میری طرف دیکھتی تھیں۔ انسانی جسم کی ہر ایک تفصیل اس سایہ میں مکمل تھی۔ حتیٰ کہ میں نے اس کے ایک ہاتھ کی انگلی میں انگوٹھی بھی دیکھی۔ اس کا چہرہ اتنا صاف نظر آیا کہ دوسرے دن وہ اتفاقاً بازار میں مل جاتا تو میں یقیناً اسے فوراً ہی پہچان لیتا۔ ایک عجیب زعفرانی دھند اس کے گرد چھائی ہوئی تھی۔ مگر اس کے اندر اس کی صورت صاف اور واضح نظر آتی تھی۔

چند لمحوں تک یہ حالت رہی۔ اس کے بعد وہ پیچھے کو ہٹنا شروع ہوا اور چھوٹا ہوتے ہوئے آخر بالکل ہی نظروں سے غائب ہو گیا۔ وہ زعفرانی دھند بھی اس کے ساتھ ہی غائب ہو گئی تھی۔

میں نے اس طرح کانپتے ہوئے آنکھیں کھولیں۔ گویا کوئی بھیانک خواب دیکھا ہو اور پھر نکولا کی طرف مڑا جو نیم باز آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا اور میرے جسم پر سنسنی دوڑ گئی تھی۔ اس آدمی کو دیکھ کر......

میرے سنبھل جانے پر اس نے میز پر رکھا ہوا تصویروں کا البم اٹھا کر سامنے رکھ دیا اور کہنے لگا۔

"ذرا دیکھئے...... اس آدمی کی تصویر جو آپ کو ایسا نظر آیا تھا کہ اس میں ہے یا نہیں......؟"

میں نے پر شوق اور پر تجسس ہاتھوں سے اس کی ورق گردانی کی کئی لمحوں بعد تقریباً وسط میں ایک آدمی کی چھوٹی سی تصویر نظر آئی۔ وہی صورت، وہی چہرہ انداز تک وہی...... حتیٰ کہ ویسی ہی انگوٹھی اس کی انگلی میں موجود تھی۔ میں ششدر رہ گیا۔ اس تصویر والے آدمی اور اس آدمی میں ذرہ برابر فرق نہ تھا۔

"کہیے......" نکولا نے پوچھا۔ "اس تجربے کی نسبت آپ کی کیا رائے ہے؟ آپ اس کے متعلق کیا توضیح پیش کرتے ہیں......؟ آپ کو اس تجربے کا یقین تو آیا ہے نا؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے سر ہلا دیا۔ "مگر آپ نے جیسا ابھی کہا تھا۔ یہ بھی شاید ہپناٹزم ہوگا۔ کیوں؟"

”ٹھیک ہے۔“ نکولا نے کہا۔ ”مگر آپ نے معلوم کیا۔ میں نے کسی جادو کے بغیر ایک آدمی کی مکمل تصویر جو ہر طرح اصل کے مطابق تھی پیش کر کے دکھادی۔ پس سوال پیدا ہوتا ہے۔ میں نے اس تصویر کو جو میرے ذہن میں تھی۔ اسے میں نے کیوں کر آپ کی آنکھوں میں منتقل کیا؟ تینوں مثالوں کو دیکھئے۔ پانی ہر وقت گلاس میں موجود تھا۔ مگر آپ کی نظروں سے غائب ہو گیا۔ آپ کا نام ہرگز بازو پر لکھا ہوا نہ تھا۔ مگر آپ نے اسے صاف دیکھ لیا اور وہ ہیولا صورت جو آپ نے اس کمرے میں دیکھی۔ واقعی میں اس جگہ ہرگز نہ تھی۔ مگر آپ کو اس کی موجودگی سے انکار نہیں ہو سکتا۔ ان حالات میں یہ کب غیر ممکن ہے کہ میں آدھی رات کو وہ آدمی آپ کے سامنے لاکر کھڑا کر دوں۔ جسے مرے ہوئے ایک عرصہ گزر گیا ہے؟ آپ چاہیں تو میں اس کا بھی تجربہ کر کے دکھا سکتا ہوں اور ایک تجربے پر کیا موقوف ہے۔ آپ کو بادلوں تک لے جانا یا سمندر کے عمق میں پہنچانا، نرک اور سورگ کی سیر کرانا یہ سب میرے اختیار میں ہے۔ ان میں سے جو نظارہ آپ چاہیں ابھی اور اس وقت دکھا سکتا ہوں۔ مگر سچ پوچھئے تو میں ان باتوں کو وقعت نہیں دیتا۔ میرے نزدیک یہ بھی ایک ادنیٰ شعبدہ بازی ہے۔ کیونکہ ہپناٹزم جس کی مدد سے سب کچھ کیا جاتا ہے۔ علوم روحانی میں جو قوتیں ہیں ان سے، جن کا حال اس پُراسرار جماعت کو معلوم ہے۔ جس کی تلاش میں آپ کو ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ کیا کچھ نہ کیا جاسکے گا۔ کیونکہ ہپناٹزم روحانیت کا آغاز ہے اور وہ انجام...... دونوں میں جو فرق ہوتا ہے اس کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں۔ بس اتنا سمجھ لیجئے کہ جو نسبت مٹی کے ڈھیر کو اونچے پہاڑ سے ہو سکتی ہے وہی میرے دکھائے ہوئے نظاروں کو ان معلومات سے ہے جو میں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ میں انہیں پانے کا عہد کر چکا ہوں اور پا کر میں رہوں گا۔ کہئے کام جوکھم کے لائق ہے یا نہیں......؟“

”ہے...... کیوں نہیں ہے......؟“ میں نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ میری آواز سے بے پایاں خوشی کا بھی اظہار ہو رہا تھا۔ اگر میرے دل کے کسی کونے میں کوئی تامل تھا تو وہ اس کی باتوں سے اب پوری طرح مٹ گیا تھا۔ نہ تو اس کی کوئی رمق رہی اور نہ ہی نام ونشان...... میں جو چاہتا تھا۔ میری آرزو اور جو خواب تھا وہ مہم جوئی ہی تو تھا۔

مجھے ایسی خوشی ہوئی تھی کہ میں چند لمحوں تک بول نہ پایا تو نکولا نے کہا۔ ”کیا سوچنے لگے میرے دوست......؟“

”میں اپنی خدمات آپ کے حوالے کرتا ہوں۔“ میری آواز خوشی کی شدت جذبات سے مغلوب ہو گئی۔ ”آپ جہاں جہاں کہیں گے میں وہاں وہاں ساتھ چلنے کے لئے تیار ہوں۔ مگر ایک سوال ہے کہ وہ پوچھنے کی اجازت ہے؟“

”آپ ایک نہیں سینکڑوں سوالات پوچھ سکتے اور دل کی تسلی کر سکتے ہیں۔“ نکولا نے کہا۔ ”اس کے لئے کسی اجازت کی ضرورت نہیں۔“

”وہ سوال صرف یہ ہے کہ وہ لکڑی جو آپ نے مسٹر ویدرل سے حاصل کی تھی۔ جس سے آپ کی بڑی حسین اور رنگین یادیں بھی وابستہ ہیں۔ اس کا ان دریافتوں سے کیا تعلق ہے آپ نے بتایا نہیں؟“

میں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

یہ سوال سنتے ہی نکولا کے چہرے نے ایک عجیب پُراسرار اہمیت اختیار کر لی۔ وہ بڑی سنجیدگی سے کہنے لگا۔

”میرے دوست......! وہ لکڑی......؟ آہ تم نہیں جانتے۔ وہ سارے اسرار کی کنجی ہے۔ ابتدا میں ایسی تین لکڑیاں اس جماعت کے تین سرگروہوں کے پاس تھیں۔ ان میں ایک کسی کام سے تبت سے چین آیا اور یہاں اس کی موت بعض پُراسرار حالات میں واقع ہوئی۔ اس کی موت کے اسباب کوئی بھی کوشش اور جدوجہد کے باوجود جان نہ سکا تھا۔

اس کے مرنے پر وہ لکڑی پیکن کے ایک خانقاہ ینگ ہوگنگ کے مجاور کے ہاتھ لگی اور اس سے ایک انگریز جس کا نام عرف عام میں چیناپیٹ مشہور تھا۔ وہ تبتی فقیر کے بھیس میں اسے بے وقوف بنا کر لے اڑا۔ اس وقت یہ آدمی میرا تنخواہ دار تھا اور میرے ہی ایما سے لکڑی لینے گیا تھا۔ مگر اسے پا کر اس کی نیت میں فتور آ گیا اور پھر وہ وہاں سے آسٹریلیا بھاگ گیا اور اس جماعت کو جو تبت کی پُراسرار خانقاہ میں رہتی ہے۔ اس چوری کا حال معلوم ہوا۔ اس نے پے در پے کئی آدمی اس لکڑی کی تلاش میں بھیجے۔ اس کو حاصل کرنے کی کوشش میں ایک چینی مارا گیا اور چیناپیٹ سڈنی پہنچ کر الزام قتل میں گرفتار ہوا۔ ویدرل نے اس مقدمے میں اس کی وکالت کی جس میں وہ عدم ثبوت اور عینی شہادت نہ ہونے کے باعث انجام کار رہا ہو گیا۔ اس احسان کے بدلے اس نے مرنے سے پہلے وہ لکڑی ویدرل کو دے دی تھی۔ ایک طرح سے اس کا مقدمہ لڑنے کی فیس بھی تھی۔

چیناپیٹ کے فرار ہونے کے کوئی ایک ماہ بعد میں اس کے تعاقب میں سڈنی جا پہنچا۔ مگر چینی جاسوس مجھ سے بھی پہلے پہنچ گئے تھے۔ اپنے اپنے طریق پر ہم دونوں اس لکڑی کو حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ مگر ویدرل کی ضد سے ناکام رہے۔ اس خیال سے کہ چینی قبضہ پانے میں کامیاب نہ ہو جائیں۔ میں نے ویدرل کو اس کی منہ مانگی قیمت کی پیش کش کی مگر نہ مانا۔ دلیلیں، دھمکیاں اور التجائیں سب بے کار ثابت ہوئیں۔ میں جب کسی چیز کو حاصل کرنے کا سوچ لیتا ہوں تو پھر اسے حاصل کر کے رہتا ہوں۔ میں نے حوصلہ نہیں ہارا تھا اور نہ ہی میرا راستہ روک سکتا تھا۔ میں نے اس پر قبضہ پانے کی ایک نادر تدبیر سوچی۔ اس کی حسین وجمیل اور پُرشباب بیٹی فلس سے راہ ورسم بڑھائی۔ آپ میک اینڈریو کے خط میں اور کچھ میری زبانی بھی سن چکے ہیں۔ آپ کو میری کامیابی کا حال معلوم ہی ہے۔ جب چھ ماہ گزرے تب یہ واقعات پیش آئے تھے۔ تب سے میں باقی معلومات حاصل کرنے اور اس لکڑی کی مدد سے اصل راز جاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

”مگر وہ لکڑی اب ہے کہاں......؟“ میں نے پوچھا۔ ”وہ کس کے پاس ہے۔ کہیں چینی جاسوس تو نہیں لے گئے؟“

”نہیں...... وہ میرے پاس ہی بحفاظت موجود ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اگر آپ چاہیں تو اسے دیکھ سکتے ہیں؟“

"کیوں نہیں...... ضرور دکھایئے۔" میں نے تجسس آمیز اشتیاق سے کہا۔ "اس نادر چیز کو ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔"

وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں اس عرصہ میں اس کی حیرت انگیز کہانی کے بارے میں جو دلچسپ اور سنسنی خیز تھی، سوچنے لگا۔ یہ شخص بھی کیا باکمال اور حیرت انگیز شخصیت کا مالک تھا۔ فلس جیسی لڑکی یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اس کے باپ سے لکڑی کے حصول کے لئے آیا ہے اس پر فریفتہ ہوگئی۔ دل دے بیٹھی۔ مہربان ہوگئی اور اس کے ساتھ چلی بھی گئی جہاں دونوں نے میاں بیوی کی طرح وقت گزارا۔ حالانکہ نکولا اسے اس مقصد کے لئے نہیں لے گیا تھا کہ بستر کی زینت بنائے۔

میں ابھی اس کے اور فلس کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ واپس کمرے میں آیا۔ اسے پانچ منٹ بھی نہیں لگے تھے۔ اس نے جیب سے ایک چرمی کیس نکالا۔ اسے کھول کر، اس نے ایک چھوٹی سی لکڑی جو بہ مشکل تین انچ لمبی ہوگی نکالی۔ معمولی سیاہ لکڑی جس پر سنہرے حرفوں میں چینی الفاظ کندہ تھے۔ اس کے ایک سرے پر شکن آلود طلائی فیتہ میلا اور کئی ہاتھوں سے گزرا ہوا بندھا تھا۔

میں نے اس کے ہاتھ سے لے کر اس کا بہ غور معائنہ کیا اور پھر کہا۔ "اگر یہ لکڑی جیسا آپ بیان کرتے ہیں تبت کی اس خفیہ جماعت کے ایک آدمی سے ہی چرائی گئی تھی اور ان لوگوں کو اب تک اس کی تلاش ہے تو اسے لے کر انہی کے پاس جانا کتنا خطرناک ہوگا۔ میں تو اسے موت مول لینے کے برابر سمجھتا ہوں۔"

"اور یہ سنگین اور جان لیوا خطرہ ہی مدنظر نہ ہوتا تو کیا میرا سر پھرا تھا کہ دس ہزار پونڈ کی خطیر رقم آپ کو پیش کی......؟" اس نے مجھے پُرخیال نظروں سے دیکھا۔ "کام واقعی بے حد خطرناک ہے اور جیسا میں نے پہلے بھی کہا تھا، اس مہم سے زندہ واپسی کی امید بہت کم رکھنی چاہئے۔ یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ہم موت کی وادی میں قدم رکھیں گے۔ ہمیں موت کا خوف دل سے نکال کر اس مہم پر جانا ہے...... بہر حال اس جوکھم میں یہ اطمینان کیا کم ہے کہ اگر ہم کامیاب ہوگئے تو وہ راز دریافت کر کے آئیں گے جس سے دنیا میں تہلکہ مچ جائے گا۔ اس لکڑی کو ساتھ لے جانے میں یقیناً خطرہ ضرور ہے اور موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے مگر اس کے بغیر وہاں رسائی بھی تو ممکن نہیں...... اس لئے کچھ ہو۔ میں اس خفیہ جماعت تک جانے اور پورا حال دریافت کرنے کا مصمم قصد کر چکا ہوں او۔ اب یہ کام ہر قیمت پر کر کے رہوں گا۔ اگر آپ اب بھی میرے ساتھ جانے سے ڈر رہے ہیں تو کچھ بات نہیں۔ میں جبر و زیادتی اور مجبور کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ اتنا حال بیان کرنے کے بعد بھی میں آپ کو اس مہم پر ساتھ لے جانے سے سبک دوش کر سکتا ہوں۔"

"نہیں......" میں نے فوراً سر ہلایا۔ میں نے استقلال کے لہجے میں جواب دیا۔ "میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو موت اور خطرات سے ڈرتے ہوں۔ میں نے آپ کا ساتھ دینے کا جو وعدہ کیا ہے، اسے ضرور پورا کروں اور آخری سانس تک اس پر کاربند رہوں گا۔ مجھے دعویٰ شجاعت تو نہیں ہے لیکن اس مہم میں قدم قدم آپ کا ساتھ دوں گا۔"

"میں آپ کے وعدے، ثابت قدمی اور استقلال کی داد دیتا ہوں۔ آپ نے میرا دل باغ باغ

کر دیا۔"

پھر اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بڑی محبت اور گرم جوشی سے دبایا۔ "اچھا تو اب پروگرام بیان کیجئے تاکہ عمل کی تیاری شروع کی جائے۔" میں نے کہا۔ "اب کس دن روانگی ہوگی؟"

"سنیے......" نکولا نے جواب دیا۔ "سر دست مجھے پیکن سے ایک آدمی کا انتظار ہے جس سے اس جماعت کے اور حالات جانے جائیں گے۔ وہ جب آ گیا تو ضروری معلومات حاصل کرنے کے بعد ہم چینی لباس پہن لیں گے۔ میں کسی ساحلی صوبے کا حاکم بن جاؤں گا اور آپ میرے معتمد خاص...... اس طرح ہم دونوں ساتھ ساتھ سفر کریں گے۔ لاماسرائے پہنچ کر جو مہذب دنیا کی آخری حد فاصل ہے ہم کسی طرح اس میں داخل ہونے اور ایسی واقفیت جو باقی سفر میں ذریعہ امداد ہو، حاصل کرنے کی کوشش کریں گے...... پھر جیسے حالات اجازت دیں۔ اب آپ ہر صورت حال کے لئے ذہنی طور پر تیار رہیں۔"

"اس شخص کے آنے کے بعد آپ کے نزدیک کب روانگی ہوگی؟" میں نے پھر سابقہ سوال دہرایا۔

"اس آدمی کے آتے ہی۔" نکولا نے جواب دیا۔ "مجھے ہر لحظہ اس کا شدت سے انتظار ہے۔ شاید آج رات وہ ضرور آ جائے گا۔"

"تبدیلی لباس کا سامان......؟" میں نے پوچھا۔ "کیا آپ کے پاس رکھا ہوا ہے یا اس کا بندوبست کل آپ کسی وقت کریں گے؟"

"آپ اس کی فکر نہ کریں۔" نکولا نے جواب دیا۔ "اس کی چیزیں میں نے پہلے سے تیار رکھی ہوئی ہیں۔"

"گویا اس آدمی کے آنے تک میرے لئے کوئی کام نہیں ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں......" نکولا بولا۔ "آپ یہ سمجھیں اس کے آنے تک چھٹی پر ہیں۔"

"تو پھر میں آپ سے رخصت کی اجازت چاہوں گا۔" میں نے کہا۔ "اگر آپ نے کل صبح تک کوئی اطلاع نہیں بھیجی تو پھر مجھے کب حاضر ہونا پڑے گا...... یا میں صبح ناشتے کے بعد آپ کے ہاں کا ایک چکر لگا لوں......؟"

"میری طرف سے کچھ نہ کچھ اطلاع صبح ناشتے سے پہلے ضرور آپ کو ملے گی۔" نکولا نے جواب دیا۔ "اور ہاں دیکھئے...... سنیے۔ آپ آخری بار سوچ لیں۔ اگر آپ کو ابھی بھی کوئی خوف اور تامل ہو تو ابھی انکار کر سکتے ہیں۔ انکار میں کوئی حرج نہیں۔"

"میں نے آپ سے پہلے ہی عرض کر دیا تھا کہ مجھے کسی بات کا خوف اور ڈر نہیں ہے۔" میں نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

"تو پھر آپ وعدہ کیجئے کہ اس معاملہ کا کسی سے ہرگز ذکر نہیں کریں گے؟" نکولا نے وعدہ چاہا۔

"میں تو اس بات کا وعدہ پہلے ہی آپ سے کر چکا ہوں۔" میں نے کہا۔ "آپ مجھ پر بھروسا رکھیں۔"

"خواہ آپ کو کتنا ہی، کیسا ہی لالچ کیوں نہ دیا جائے۔" وہ بولا۔ "کیسا ہی خطرہ کیوں نہ درپیش ہو؟"

”آپ اطمینان رکھیے...... میں اپنے وعدے سے پھرنے والا نہیں ہوں۔“ میں نے اسے پھر یقین دلایا۔ میں دل میں حیران تھا کہ وہ بار بار مجھ سے کیوں اس بات کا عہد لے رہا ہے کہ میں وعدے کا پاس کروں۔

وہ مجھے دروازے تک رخصت کرنے آیا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ میں جب اس کے مکان سے باہر آیا تو رات خاصی بیت چکی تھی۔ میں تنہا اندھیری رات میں اپنے مکان کی طرف چلا۔

جب میں سڑک کے موڑ پر پہنچا تو ایک دم چونک گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ اندھیرے میں ایک لمبا سایہ جو کسی دراز قد چینی کی صورت سے ملتا تھا، تاریکی سے نکل کر میرے پیچھے چلنے لگا۔ تقریباً تین فرلانگ تک ہم اس طرح چلتے گئے۔ وہ میرا غیر محسوس انداز سے تعاقب کر رہا تھا اور مجھ سے کوئی سو گز کے فاصلے پر تھا۔ ہم جب ایک چوراہے سے نکل رہے تھے تو ایک آدمی اور اس سے آملا۔ اب ایک کے بجائے دو آدمی میرے پیچھے ہو لئے۔

پہلے تو میں اس شش و پنج میں رہا کہ یہ لوگ محض اتفاقاً میرے پیچھے آرہے ہیں یا میرے خلاف کسی طرح کی جاسوسی مقصود ہے مگر جب کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد ان دو میں تیسرا شامل ہو گیا اور وہ فاصلہ بھی جو اب تک ہمارے درمیان مائل تھا، بتدریج کم ہونے لگا تو میرا ماتھا ٹھنکا اور میری پریشانی کا بڑھنا قدرتی تھا۔ میں ان سے کسی نہ کسی طرح پیچھا چھڑانے کی تدبیر سوچنے لگا۔ تین آدمیوں کا بیک وقت تعاقب کرنا تشویش کی بات تھی۔

شہر کے آباد حصے میں پہنچ کر میں نے اپنے چلنے کی رفتار تیز کر دی اور پھر ایک موقع پا کر ایک تنگ گلی میں گھس گیا۔ جہاں ایک چکردار رستہ پر ہوتا ہوا میں اپنے دوست میک اینڈریو کے مکان پر پہنچ گیا۔

مکان میں روشنی ہو رہی تھی جس سے لگ رہا تھا کہ رہنے والے ابھی تک سوئے نہیں ہیں۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میں نے جب دستک دی تو ایک آدمی دائیں طرف کے کمرے سے نکل کر ڈیوڑھی میں آتا دکھائی دیا اندھیرے کے باعث میں اس کی شناخت نہیں کر سکا۔ جب اس نے دوسرے لمحے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ وہ خود میک اینڈریو ہے۔

”کون آنند پال!“ اس نے مجھے دیکھ کر حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ”اتنی رات گئے! خیریت تو ہے۔ شاید کوئی بڑا ہی ضروری کام ہو گا کہ اتنی رات گئے تکلیف کی۔ آیئے...... اندر آجایئے۔“ پھر وہ مجھے اپنے ساتھ کمرے میں لے گیا۔ جس سے دروازہ کھولنے آیا تھا۔ اس کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔

یہ کھانا کھانے کا کمرہ تھا۔ فرنیچر کا سامان بھاری مگر سلیقہ اور اہتمام سے رکھا ہوا تھا۔ ایک لمبی سیاہ میز کے پاس کرسی پر ایک ادھیڑ عمر کی پستہ قد عورت جو اس کی بیوی تھی۔ اخبار لئے بیٹھی تھی اور اس کے مقابل اس کی سب سے چھوٹی بیٹی جو تقریباً سولہ برس کی ہو گی سوزن کاری میں مصروف تھی۔ انہیں بھی میری غیر متوقع آمد پر بڑی حیرت ہوئی تھی۔ بہر حال چند رسمی الفاظ میں گفتگو کرنے کے بعد وہ دونوں شب بخیر کہہ کر چلی گئیں۔ ان دونوں کے جانے کے بعد اب میں اور میرا دوست میک اینڈریو ہی باقی رہ گئے۔

میں خود بھی چاہتا تھا کہ ماں بیٹی کمرے میں موجود نہ ہوں۔

میک اینڈریو نے ایک روسی سگاروں کا ڈبا اٹھا کر میری طرف بڑھایا۔ جب میں نے ایک سگار اٹھا لیا تو اس نے بھی ایک سگار نکال کر اسے جلایا۔ روسی سگار بہت اچھے ہوتے تھے اور نایاب بھی تھے۔ اس نے کش لگاتے ہوئے پوچھا۔ ”اب کہئے کیا معاملہ ہے؟ کیا کوئی نئی ملازمت مل گئی؟ اور ہاں...... نکولا کے بارے میں کیا کسی اور واقفیت کی ضرورت ہے......؟“

”جی نہیں۔“ میں نے ہنس کر جواب دیا۔ ”میں بے وقت آنے کی اور زحمت دینے کی معذرت چاہتا ہوں...... بات دراصل یہ ہے کہ میں کل سویرے بینک کھلنے سے پہلے ایک ضروری کام سے شنگھائی جا رہا ہوں اور آپ کو محض یہ تکلیف دینے کے لئے آیا ہوں کہ مہربانی کر کے میرا یہ چیک اپنے پاس رکھیں۔“

میں نے اپنی بات کہہ کر نکولا کا چیک اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے چیک لے کر اس پر ایک نظر ڈالی۔ پھر اسے غور سے دیکھا۔ پھر وہ سیٹی بجاتے ہوئے مجھے ایک ٹک دیکھنے لگا۔

”یہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا کام بن گیا۔“ آخر کار اس نے خوشی سے کہا۔

”گو خود مجھے بھی ابھی تک یقین نہیں آیا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں دس ہزار پونڈ کا مالک بن گیا ہوں، خواب سا لگ رہا ہے۔“

”میں آپ کو اس کامیابی پر مبارک باد دیتا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”فرمایئے۔ آپ یہ چیک مجھے کس لئے دے رہے ہیں......؟ میں اس چیک کا کیا کروں؟ کیا اسے سنبھال کر رکھوں آپ کے واپس آنے تک؟“

میک اینڈریو نے اس کاغذ کو کئی بار الٹ پلٹ کر دیکھا۔ گویا اس کی کوئی طلسماتی تحریر تھی، جسے وہ سمجھتا تھا۔ ”میری یہ خواہش ہے کہ آپ اس چیک کی رقم وصول کر کے میرے حساب میں جمع کرا دیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں ایک ضروری کام پر باہر جا رہا ہوں۔ نہیں معلوم کہ کب تک واپس آؤں۔ شاید چھ ماہ لگ جائیں یا ایک برس سے بھی زیادہ عرصہ لگ سکتا ہے۔ اگر میں زندہ سلامت واپس آ گیا تو میں اپنی امانت لے لوں گا۔“

”میری دعا ہے کہ آپ سلامتی سے واپس آئیں۔“ میک اینڈریو نے کہا۔ ”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آپ کسی وجہ سے نہ آنے پائیں...... دونوں باتیں ممکن ہیں۔ اگر آپ نہ آئے تو پھر میں کیا کروں؟“

”تو پھر آپ اس کے مالک ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”مگر اس اثنا میں زحمت نہ ہو تو مہربانی کر کے بیس پونڈ سقا دیجئے۔ آپ اس رقم کو میرے چیک کی رقم سے منہا کر سکتے ہیں۔“

”بیس کیا...... سو درکار ہوں تو لے لیں۔“ اس نے کہا۔ ”میں یہ چاہتا ہوں کہ سب باتیں تحریر میں آجائیں تاکہ بعد میں کچھ ضابطہ نہ ہو۔ یہ بات ہم دونوں میں سے زیادہ آپ کے حق میں مفید جاتی ہے۔ آپ کو اعتراض تو نہیں دوست!“

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے میز کی دراز کھول کر چٹھی لکھنے کا کاغذ نکالا۔ اس پر چند سطریں لکھنے کے بعد اس کاغذ پر میرے دستخط کرا لئے۔ پھر اس نے اپنے بیٹوں میں سے ایک کو بلایا۔ میک

اینڈریو کا کنبہ وسیع ہے۔ گھر کے بارہ افراد سے کم نہ ہوں گے۔ اس نے اپنے بیٹے کے بطور گواہ دستخط لئے۔ یہ بھی ہو چکا تو اس نے بیس پونڈ کے نوٹ اور طلائی سکے میرے آگے رکھ دیئے۔ جس کے بعد میں رخصت ہونے کے لئے اٹھا۔ میک اینڈریو بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ مشفقانہ انداز سے میرے کندھے پر رکھ دیا اور خلوص سے کہنے لگا۔

"عزیز دوست! میں نہیں جانتا کہ تم کس کام پر جاتے ہو اور نہ میرے خیال میں یہ پوچھنا مناسب ہی ہوگا۔ مگر اتنا اچھی طرح واضح ہو چکا ہے کہ تم بے روزگاری اور مالی مشکلات سے تنگ اور پریشان ہو کر کوئی خطرناک راستہ اختیار کر رہے ہو اگر امداد درکار ہے تو اس سے مجھے حتی الامکان تامل اور دریغ نہیں۔ بہر حال تم سوچ لو جو کام تم کرنا چاہتے ہو، اس پر بعد میں پچھتاوا نہ ہو اور متاسف نہ ہونا پڑے۔ بارہا ایک لمحے کی غلطی عمر بھر کی پریشانیوں کا موجب ہو جایا کرتی ہے۔"

"مجھے آپ کی اس بات سے ذرہ برابر بھی انکار نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ اطمینان رکھیں۔ میں سب کام سوچ سمجھ کر کرتا ہوں۔ جو آپ نے نیک اور مخلصانہ مشورہ دیا ہے۔ میں اس کے لئے آپ کا بے حد ممنون ہوں۔ میں آپ کی اس محبت اور مشفقانہ سلوک کو عمر بھر نہیں بھولوں گا۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے آپ جیسا مخلص دوست ملا۔"

پھر میں اس سے ہاتھ ملا کر اس کے مکان سے باہر نکل آیا۔ میں نے اس مکان سے نکل کر پچاس قدم طے کئے ہوں گے میں نے اپنے عقب میں آہٹ سنی تو ٹھٹک کے کھڑا ہو گیا۔ مڑ کر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ ایک آدمی جو شاید میرے انتظار میں سڑک کے ایک جانب بیٹھا تھا، اٹھ کر میرے پیچھے چلنے لگا ہے۔ میں سمجھ گیا۔ یہ وہی جاسوس ہے جو نکولا کے مکان سے میرے ساتھ ہو لیا تھا۔ میں اسے اور اس کے ساتھیوں کو چکر دے گیا تھا۔

اس بات میں اب کوئی شک و شبہ نہیں رہا تھا کہ وہ میرا ہی پیچھا کر رہا ہے۔ کیونکہ وہ سائے کی طرح لگا ہوا تھا۔ میں داہنے ہاتھ کی ایک بغلی گلی میں تیزی سے مڑ گیا تو وہ بھی اس تیزی سے مڑا تھا۔ میں نے کچھ اور چکر کاٹے۔ اس نے بھی ویسا ہی کیا۔ پھر ایک کھلے بازار میں پہنچ کر میں تیز رفتاری سے چلنے لگا۔ اس نے بھی اپنی چال تیز کر دی تھی۔ میں نے اس طرح سے تحقیق کی تھی۔ وہ بڑے محتاط انداز سے تعاقب کر رہا تھا اور غیر محسوس طریقے سے بھی لیکن وہ مجھے بے وقوف نہ بنا سکا تھا۔

اس کے اس طرح سے تعاقب کرنے سے میرے دل کو ایک عجیب سی وحشت ہو رہی تھی۔ وہ محتاج بیان نہیں۔ بہر حال میں نے اپنے چلنے کی رفتار میں کمی نہیں کی۔ پھر میں ناچار ایک گلی میں گھس گیا۔ جس کے ایک جانب اونچی باڑ تھی۔ باڑ کے ساتھ چلتا ہوا پھاٹک تک گیا اور پھر میں تیزی سے دوڑتا اور لپکتا ہوا اندر گھس گیا۔ میں نے اس گلی کی تاریکی سے فائدہ اٹھایا تھا۔

اس جگہ ایسی تاریکی تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ میں ایک سایہ میں جھک کر کھڑا ہو گیا۔ چند لمحوں کے بعد میرا جاسوس بھی اس تاریکی میں تلاش کرتا ہوا ادھر آ نکلا۔ وہ ایک کائیاں تھا۔ میرا یہ خیال

غلط نکلا کہ وہ کسی اور طرف نکل جائے گا۔

تھوڑی دیر تک اس نے چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ اچھی طرح سے اپنا اطمینان کرنے کے بعد وہ باڑ کے مختلف حصے دیکھنے لگا اور پھر اس جگہ جہاں میں دبکا ہوا بیٹھا تھا۔ پھر وہ اس سے چند قدم فاصلہ پر آ پہنچا۔ لیکن شکر ہے کہ اس نے مجھے پھر بھی نہیں دیکھا۔ لیکن وہ چند لمحوں تک آنکھیں پھاڑے دیکھتا رہا تھا۔ ادھر میری حالت بڑی غیر تھی اور دل اس تیزی سے دھڑک رہا تھا کہ اس کی صدا سنائی دے رہی تھی۔ پھر وہ یہ سمجھ کر میں اس اندھی گلی میں جو ایک جانب تھی چلا گیا ہوں، وہ اس طرف ہو لیا۔

میں نے تھوڑی دیر تک اس کا انتظار کیا کہ شاید وہ لوٹ کر آ سکتا ہے۔ لیکن گہرا سکوت طاری رہا۔ کوئی آہٹ سنائی نہیں دی۔ لیکن جب اس بات کا پورا یقین ہو گیا کہ وہ نامراد ہو کر رخصت ہو چکا ہے تو میں اس جگہ سے نکلا۔ پھر پھاٹک کی راہ سے دبے پاؤں نکل آیا۔ پھر بھی میں محتاط تھا۔ پھر میں نے سانسیں درست کیں اور جس قدر جلد ممکن تھا تیز چلتا اپنے مکان کی سمت روانہ ہوا۔

لیکن معلوم ہوتا تھا کہ میرا پراسرار حریف اس آسانی سے پیچھا چھوڑنے والا نہیں ہے۔ کیونکہ جب میں مکان کے احاطے سے گزر رہا تھا، وہ بھی کہیں سے آ دھمکا تھا، جس کی مجھے توقع نہیں تھی۔ وہ میری گھات میں تھا۔ کہاں تھا میں اس کا اندازہ نہ کر سکا تھا۔ وہ بڑا چالاک جو تھا۔

میں لپک کر مکان کے اندر کسی سن سناتے ہوئے تیر کی طرح داخل ہو گیا اور میرا خیال یہ تھا کہ اس نے مجھے اندر جاتے ہوئے نہیں دیکھا اور نہ ہی اسے اس بات کا علم ہوگا کہ میں کسی مکان میں رہتا ہوں۔ اس کی تصدیق اس وقت ہو گئی، جب میں نے کھڑکی میں چھپ کر باہر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ وہ سڑک کے وسط میں کھڑا پریشانی سے چاروں طرف دیکھ رہا ہے کہ وہ کون سا مکان ہو سکتا ہے جس میں میں گھسا تھا۔

تھوڑی دیر اس حالت میں رہنے کے بعد وہ جس راہ سے آیا تھا اس پر چلا گیا۔ جب مجھے اچھی طرح سے اس بات کا اطمینان ہو گیا کہ اس سے پیچھا چھوٹ گیا تو میں اپنی خواب گاہ میں داخل ہو گیا۔ اس وقت ایسا لگا جیسے میں پھول کی طرح ہلکا پھلکا ہو گیا ہوں۔

میرے کمرے میں روشنی دیکھ کر مالک مکان کی چھوٹی بیٹی آ گئی۔ گو اس وقت وہ نامناسب لباس میں تھی لیکن اس کے چہرے پر نخوت تھی۔ اس نے کمرے میں گھستے ہی سب سے پہلے جو بات کہی، وہ ستر ڈالر کے بارے میں تھی۔ "سنا ہے کہ تم نے ستر ڈالر کی رقم قرض خواہوں کو دے دی......؟" وہ بولی۔ کیا اب تمہارے پاس دو ڈالر بھی نہیں ہیں؟"

"میرے پاس اس وقت تین شلنگ اور پانچ پنس ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "اگر تم اس کے عوض مہربان ہو جاؤ تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا...... کیا خیال ہے؟" میں نے اسے خود سپردگی سے دیکھا۔ میں دل ہی دل میں ڈر گیا کہ کہیں وہ میری بات مان کر رک نہ جائے۔ وہ جانے کب سے مجھے شکار کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ لیکن میں نے کبھی اسے گھاس نہیں ڈالی۔ لیکن وہ آبرو باختہ تھی۔ میں نے جیسے ہی اسے بتایا کہ میرے پاس اتنی رقم ہے وہ جھن جھلاتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

میں نے دروازہ بند کر کے اندر سے چٹخنی لگالی۔ میں عموماً دروازہ بند نہیں کرتا تھا۔ میرے پاس تھا ہی کیا جو کسی چور کا خطرہ ہو۔ میں نقدی جیب میں رکھتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ آدھی شب میرے کمرے میں آئی تھی اور اس نے میرے لباس کی تلاشی لی تھی۔ میری جیب میں بیس پونڈ تھے۔ اس بات کا ڈر اور خوف تھا کہ کہیں وہ مجھے کلوروفارم سنگھا کر جامہ تلاشی نہ لے۔ اس سے کوئی بات بعید نہ تھی۔

میں چونکہ بے حد تھکا ہوا تھا، اس لئے بستر پر دراز ہوتے ہی میری آنکھ لگ گئی۔ مگر رات بھر جو عجیب اور متوحش خواب نظر آتے رہے تھے وہ سب کے سب نکولا سے متعلق تھے۔ ایک بار تو ایسا معلوم ہوا کہ اس نے اپنی پراسرار طاقت سے مجھے انسان سے ہاتھی بنادیا ہے۔

یاد نہیں کہ میں کب تک سویا تھا۔ آدھی رات کو ایک ڈراؤنے خواب سے میری آنکھ کھل گئی تھی۔ میں تھوڑی دیر تک مکان سے باہر احاطے میں تازہ ہوا میں سانس لے کر آیا۔ مجھے بعد میں یاد آیا کہ میں نے دروازہ بھیڑ دیا تھا۔ اندر سے چٹخنی نہیں لگائی۔ جب بیدار ہوا تو دل بڑے زور زور سے دھک دھک کر رہا تھا۔

بیداری کے بعد پہلا احساس جو ہوا وہ یہ کہ کوئی میرے کمرے میں موجود ہے۔ میں گھبرا کر اٹھا۔ تب معلوم ہوا کہ واقعی ایک آدمی چینی تھا جو پائنتی کے پاس کھڑا ہوا ہے۔

ابھی صبح نہیں ہوئی تھی۔ چاند کی مدہم روشنی کھڑکی سے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی چینی تھا جو میرا تعاقب کر رہا تھا۔

میں نے فوراً ہی خود پر قابو پا کر تیز لہجے میں اس سے پوچھا۔ ”تم کون ہو......اور کس کی اجازت سے اندر آئے ہو؟ چلو......باہر نکلو۔ دفع ہو۔“

اس نے ہاتھ کے اشارے سے چپ رہنے کا حکم دیا۔ اس کے چہرے پر سفاکی سی تھی اور آنکھوں میں وحشیانہ چمک......وہ چینی زبان میں بولا۔

”خاموش رہیں......شور مچانے کی ضرورت نہیں۔ میں جو کہتا ہوں وہ خاموشی سے سنیں اور اس پر عمل کریں۔“ میں نے اپنا ہاتھ فوراً ہی سرہانے کی طرف بڑھایا، جہاں رات کو سوتے وقت اپنا بھرا پستول رکھتا تھا۔ لیکن معلوم ہوا کہ وہ غائب ہے یا تو اس پراسرار ملاقاتی نے اسے چرا لیا تھا یا پھر میں رکھنا ہی بھول گیا تھا۔ بہر حال وہ چیز جس پر مجھے سب سے زیادہ اعتماد تھا وہ موجود نہ تھی۔

میں ادھر سے حیران اور مایوس ہو کر پھر اپنے اس پراسرار اور خوفناک ملاقاتی کی طرف مڑا اور تلخ لہجے میں اس سے بولا۔ ”تم مہربانی کر کے اپنا مدعا بیان کرو۔ آدھی رات کے وقت، کسی شریف آدمی کے مکان میں بلا اجازت گھس آنا جانتے ہو اسے کیا کہتے ہیں......؟“

”میں آپ کو ڈاکٹر نکولا کے حکم سے لینے آیا ہوں۔“ اس نے متانت سے جواب دیا۔

میں نے حیرت سے کہا۔

”آخر اتنی جلدی بلانے کی کیا حاجت تھی......؟“

”میں اس بارے میں افسوس کہ کچھ نہیں جانتا۔“ اس نے کہا۔ ”میرا کام ان کے حکم کی تعمیل ہے۔ مگر

کوئی خاص کام ہی ہوگا۔ جس کے لئے انہوں نے آپ کو یاد کیا ہے۔ انہوں نے بڑی تاکید کے ساتھ آپ کے پاس بھیجا ہے۔ رات انہوں نے کہا تھا کہ آپ کا مکان دیکھ آؤں۔ اس لئے آپ کے پیچھے آیا تھا۔“

ناچار میں نے اٹھ کر کپڑے پہننے شروع کئے۔ خیال آیا کہ وہ آدمی جس کا بیکن سے انتظار تھا شاید وہ آ گیا ہے۔ نکولا نے مجھ سے کہا تھا کہ ناشتے سے قبل بھی وہ بلا سکتا ہے۔ چونکہ وہ آ گیا ہوگا اس لئے اس کی موجودگی میں میری حاضری ضروری ہو گئی ہوگی۔

پھرتی سے کپڑے پہن کر میں اس آدمی کے ساتھ مکان سے باہر آ گیا جو مجھے ساتھ لے جانے آیا تھا۔ پھر ہم دونوں تیزی سے ایک سمت چل پڑے۔ چند قدموں کی مسافت طے کرنے کے بعد ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں کچھ لوگ ڈانڈی لئے کھڑے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ میرے انتظار میں ہیں۔

”مالک کو بہت جلدی تھی اس لئے انہوں نے ڈانڈی آپ کے لئے بھیج دی۔“ اس نے کہا۔ ”تاکہ آپ جلد سے جلد اس کے پاس پہنچ جائیں۔“

”خیر کوئی بات نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”تم لوگ جس قدر جلدی ممکن ہے لے چلو......میں بالکل تیار ہوں۔“ میں یہ کہہ کر ڈانڈی پر بیٹھ گیا۔ بہت سے چینی قلی ڈانڈی کو اٹھا کر تیزی کے ساتھ ایک طرف کو چلنے لگے۔ ان کی رفتار لحہ بہ لحہ تیز ہونے لگی۔

پچھلی رات کا وقت تھا اور ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ آسمان پر آخری دنوں کا چاند تھا، جس کی زرد اور بے جان روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ کسی اکے دکے سکھ سپاہی یا گھروں کو واپس جاتے ہوئے رکشا کے سوا راستہ میں کوئی متنفس نہیں نظر آیا۔ البتہ ایک قحبہ خانہ کے باہر دو ایک آدمی نشے کی حالت میں بے لگام ہو رہے تھے۔ ایسے نظارے بعض ہوٹلوں کے باہر بھی نظر آتے تھے۔ منزل مقصود پر پہنچنے میں تقریباً ایک گھنٹہ لگ گیا تھا۔ قلیوں نے جیسے ڈانڈی کو زمین پر رکھا، میں جھٹ سے نیچے اتر آیا۔ مگر یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ یہ مکان وہ نہ تھا جہاں اس سے پیشتر ڈاکٹر نکولا سے ملاقات ہوئی تھی۔ ایک بہت بڑا بنگلہ جس کے سامنے بہت وسیع وعریض احاطہ بنا ہوا تھا۔ اس میں جا بجا اونچے گھنے درخت موجود تھے۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ میرا چینی رہبر مکان کے اندر ہو کر آ گیا۔

”جناب آنند پال! اندر تشریف لے چلیں۔ مالک آپ کا بڑی دیر سے انتظار کر رہے ہیں۔“

مکان میں ہر طرف بھیانک اندھیرا اور قبرستان کی سی ہولناک خاموشی چھائی ہوئی تھی، جس سے وحشت سی برس رہی تھی۔ جب میں برآمدے سے گزر کر ایک بند دروازے کی طرف جا رہا تھا کہ بے خبری میں یکایک چند آدمی مجھ پر ٹوٹ پڑے۔

پہلے انہوں نے گردن سے پکڑا۔ پھر دونوں ہاتھ پیٹھ کے پیچھے لے جا کر مضبوطی سے باندھ دیئے۔ پھر میرے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ پھر ہاتھوں میں اٹھا کر ایک کمرے میں لے گئے۔ جس میں اتنی تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی کہ دن کا دھوکا ہو رہا تھا۔

کیا دیکھتا ہوں کہ تین آدمی چینی امرا کا لباس تن زیب کئے ایک اونچی مسند پر عدالتی انداز سے

براجمان تھے۔ سب کے بدن پر بیش قیمت ریشمی جبے اور آنکھوں پر گول شیشہ کے کماندار چشمے لگے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر ایک نے میرے چینی محافظوں کو چینی زبان میں کرخت لہجے میں حکم دیا۔ ”اس کے منہ سے کپڑا نکال دو۔“

پھر وہ جوتیوں میں زیادہ سن رسیدہ تھا، جس کی سفید براقی ایک فٹ لمبی داڑھی تھی۔ اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ہاں مسٹر آنند پال! فرمایئے...... جناب کے مزاج کیسے ہیں؟ ٹھیک ہیں نا؟“

میں نے جواب دینے میں بڑے ضبط سے کام لیا۔ پھر بھی میرے لہجے میں تلخی عود آئی۔ ”شکر ہے کہ میں زندہ ہوں۔ آپ کے سامنے بے دست و پا کھڑا ہوں۔“

”اچھا یہ بتاؤ کہ تم کس ملک سے آئے ہو؟“ اس چینی بڈھے نے سوال کیا۔ ”اور تم کیا کام کرتے ہو؟“

میں نے بہانہ بنانے کے لئے ان سے کہا کہ ہندوستان سے آیا ہوا ہوں اور یہاں چھوٹا موٹا کاروبار کرتا ہوں۔ ان کے چہروں پر جو تاثرات تھے اس سے ایسا لگ رہا تھا کہ میری بات سے ان کا اطمینان نہیں ہوا۔ ان کے چہرے پر سختی سی آ گئی تھی۔ مجھے قہر آلود نظروں سے گھورے جا رہے تھے۔ آخر وہ جوتیوں میں دائیں طرف بیٹھا تھا، ذرا آگے جھک کر بولا۔

”سنو...... جو تم کہہ رہے ہو، وہ صحیح نہیں ہے۔ ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ڈاکٹر نکولا سے تمہیں کیا کام تھا؟ سچ سچ بتاؤ۔“

میں اس کی زبان سے ڈاکٹر نکولا کا نام سنتے ہی گھبرا گیا۔ میں نے خود پر فوراً ہی قابو پا لیا اور بھولے پن سے کہا۔ ”ڈاکٹر نکولا...... ؟ یہ کون ہے...... ؟ میں نہیں جانتا کہ کون ہے...... ؟ پہلی بار اس کا نام سن رہا ہوں۔“

”تم بکتے ہو؟“ وہ دھاڑا۔ پھر اس نے پہلے سے بھی زیادہ سخت لہجے میں کہا۔ ”تم متواتر دو دن سے اس کے مکان میں جاتے رہے ہو۔ ہم جاننا چاہتے ہیں کہ...... وہ کیا منصوبہ ہے جو تم دونوں مل کر سوچ رہے ہو۔ دیکھو...... ہمیں بے وقوف مت سمجھو۔“

”نکولا سے میرا تعلق محض کاروباری ہے۔ ہم اس جگہ چائنا بوسکی کا بیوپار کرنے آئے تھے جس کی ایشیا میں بڑی مانگ ہے۔“

مگر سننے والوں کا اس سے بھی اطمینان نہ ہو سکا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ میرے اس بیان کو نا قابل یقین سمجھ رہے ہیں۔ ”دیکھو۔“ اس آدمی نے جو چوڑے شیشہ کی عینک لگائے بیٹھا تھا، وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔ ”تمہاری سلامتی اسی میں ہے کہ سب بات ٹھیک ٹھیک بتا دو۔“

”افسوس ہے کہ آپ میری بات کا یقین نہیں کر رہے ہیں۔ حالانکہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، وہ سچ ہے۔ جھوٹ بالکل نہیں ہے۔“

”تم چونکہ جھوٹ بول رہے ہو۔ ہٹ دھرمی سے کام لے رہے ہو، اس لئے اب تم پر سختی کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔“ وہ بولا۔

اس نے نوکروں میں سے ایک کو اشارے سے کچھ کہا۔ وہ فوراً کمرے سے نکل گیا۔ جب وہ واپس آیا تو ایک موٹی لوہے کی زنجیر اور کچھ عجیب وضع کی لکڑیاں تھیں۔ میری پیشانی عرق آلود ہو گئی اور رگوں میں لہو منجمد ہونے لگا۔ مجھے نظروں کے سامنے موت کا فرشتہ کھڑا مسکراتا ہوا لگ رہا تھا۔

چینی تشدد ساری دنیا میں مشہور ہے۔ وہ ایسی ایذائیں دیتے ہیں کہ ایک کیسا ہی مضبوط اعصاب، طاقت ور اور مضبوط جسم کا پہلوان ہی کیوں نہ ہو، برداشت نہیں کر سکتا۔ میں ان کی عقوبت کی اکثر مثالیں دیکھ چکا تھا۔ رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے اور ان چیزوں کو دیکھ کر میرا جی خوف سے کانپنے لگا۔ میری روح فنا ہوئی جا رہی تھی۔ پیروں پر کھڑا ہونا بڑا دشوار سا لگ رہا تھا۔

”اب بھی وقت ہے۔“ اس آدمی نے جو شاید اس جماعت کا سرغنہ تھا، کہا۔ ”صاف صاف کہہ دو۔ نکولا کے بارے میں تمہیں کچھ معلوم ہے۔ اس سے تمہارے تعلقات کب سے ہیں...... ؟ کس نوعیت کے ہیں...... ؟ اور تم دونوں کیا ساز باز کرتے رہتے ہو؟“

”مجھے جو کچھ بیان کرنا تھا وہ میں کر چکا ہوں۔“ مجھے اس خوف کی حالت میں ضد سی آ گئی۔ ”مجھے اس سے زیادہ کچھ معلوم ہے اور نہ کہنا چاہتا ہوں۔“

اس نے تڑختے لہجے میں پھر ایک بار سابقہ سوال دہرایا اور مجھے انگارے برساتی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا۔ ”تم سچ سچ کہو۔“

میرا جواب اب بھی وہی تھا۔ ”میں تم لوگوں سے جھوٹ نہیں کہہ رہا ہوں۔ تم میری باتوں کو جھوٹ کہتے ہو تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔“

”میں تمہیں ایک آخری موقع دیتا ہوں۔“ اس نے غصے سے بھر کر کہا۔ ”ڈاکٹر نکولا کے بارے میں تم جس قدر اور جتنا بھی جانتے ہو، وہ سب بتا دو۔ تم ضد پر اڑے رہے تو اس سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ تم نہ کہو گے تو ایسی سختی کی جائے گی کہ اسے انسانی طاقت کم برداشت کر سکی ہے۔“

میں اندر ہی اندر لرز گیا۔ مگر چوں کہ میں ڈاکٹر نکولا سے وعدہ کر چکا تھا، اس لئے اسے توڑنا کسی حال میں منظور نہ تھا۔ پھر میں نے کہا۔ ”میں آپ کے ہر سوال کا جواب دے چکا ہوں اور میں اب کسی سوال کا جواب دینا اور مزید کچھ کہنا نہیں چاہتا ہوں۔“

چینی سرغنہ نے اس آدمی کو جو دروازے کے پاس کھڑا تھا، اسے اشارہ سے کچھ سمجھایا۔ فوراً ہی تین آدمی مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ مجھے پیٹھ کے بل فرش پر لٹا دیا۔ پھر میں اس سے پہلے کہ کچھ کہتا یا جدوجہد کر سکتا، انہوں نے ایک عجیب وضع کا چوبی پٹہ میری گردن میں ڈال کر اس میں لگا ہوا پیچ اس انداز سے گھمانا شروع کیا کہ ہر گردش کے ساتھ گلا تھا کہ گھٹتا گیا اور میں اذیت اور تکلیف سے تڑپنے لگا۔

اسی حالت میں اس چینی بڈھے کی تیز و تند آواز میرے کانوں میں آئی۔ ”اب بھی کہہ دو...... ڈاکٹر نکولا سے تمہارے کیا تعلقات ہیں۔ تم موت سے قریب ہو رہے ہو۔ اب صرف چند لمحوں کے مہمان ہو......“

میں پھر وہ سابقہ جواب دینا چاہتا تھا۔ لیکن دم بند ہونے سے الفاظ ادا نہ کر سکا۔ جانے کیوں میں

سخت جان بن گیا۔ موت کی پروا نہ رہی۔

دفعتاً وہ آدمی جو اس جماعت کے وسط میں بیٹھا ہوا تھا اٹھا۔ میرے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ اس کا اشارہ پاتے ہی نوکروں نے سارے بندھن کھول دیئے۔ گردن سے آلہ اذیت بھی اتار لیا اور پھر ایک مانوس سی آواز میرے کانوں میں گونجی۔

''مسٹر آنند پال! آپ اٹھیے...... امتحان ختم ہوا۔ شکر ہے کہ آپ اس کڑے امتحان میں کامیاب رہے۔'' میں نے حیرت سے آنکھیں کھول دیں۔ ایک لمبا سا سانس لیا۔ پھر ایک اور سانس لی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ چینی سردار کے بھیس میں ڈاکٹر نکولا کھڑا مسکراتا ہوا مجھے دیکھ رہا تھا۔

☆......☆......☆

تھوڑی دیر مجھے اپنے حواس پر شک رہا۔ بھیس اس خوبی سے بدلا ہوا تھا کہ شاید اپنا صحیح لب ولہجہ اختیار نہ کرتا تو میں کبھی بھی اسے پہچان نہیں سکتا۔ اپنے موجودہ لباس میں وہ ہر لحاظ سے چینی نظر آتا تھا۔ وہی صورت، وہی انداز، آواز تک وہی تھی۔ میں کیا کوئی سخت نکتہ چیں بھی اس بہروپ پر عیب جوئی نہیں کر سکتا۔ جب میں جو اسے پاس رہ کر دیکھ چکا تھا۔ اس طرح دھوکا کھا گیا تو ناممکن تھا کہ کوئی اور آدمی اسے سطحی نظر سے پہچان لیتا۔ آخر جب نوکروں نے ہاتھ پیر کھول دیئے تو میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ جی کر اس خوفناک چینی عقاب سے بچ جانے کی بڑی خوشی تھی۔ سینکڑوں اندیشے جو کچھ پیشتر دل میں پیدا ہو رہے تھے۔ یہ جان کر مٹ گئے کہ میں اب دوستوں کے پاس ہوں۔

''سب سے پہلے میں آپ سے اس سلوک کی معافی چاہتا ہوں۔'' ڈاکٹر نکولا نے کہا۔ ''دراصل روانگی سے قبل میں آپ کا ایک امتحان لینا چاہتا تھا۔ اس لئے کہ اس سفر میں بہت ساری صعوبتیں اٹھانا پڑیں گی اور آپ انہیں برداشت کر سکیں گے کہ نہیں، اس کے لئے جس قوت برداشت کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ آپ میں موجود ہے یا نہیں...... آپ میں میری توقع سے کہیں بڑھ کر قوت برداشت ہے جو میرے لئے خوشی کا باعث ہے۔ آپ ایک غیر معمولی آدمی ہیں...... اچھا اب کہئے۔ میرے تبدیلئ لباس کے بارے میں کیا رائے ہے؟''

''میں اسے ہر لحاظ سے مکمل خیال کرتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''حیرت ہے کہ آپ نے ایسی زبردست شخصیت اس آسانی کے ساتھ چھپالی...... اچھا یہ تو بتائیں کہ ہم اس وقت کہاں ہیں اور یہ کس کا مکان ہے؟''

''یہ بنگلہ میں نے خاص ضرورتوں کے لئے کرایہ پر لیا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''مگر یہ باتیں پھر ہوتی رہیں گی۔ سردست ہمیں اب اصل معاملہ کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ جس آدمی کو آپ نے میرے دائیں جانب بیٹھے دیکھا تھا لا دان اس کا نام ہے اور اس کے پیکن سے آنے کا انتظار تھا۔ وہ آپ کے جانے کے آدھا گھنٹہ بعد ہی آ گیا تھا۔ اس سے مجھے تمام ضروری واقفیت ہو گئی ہے۔ اب ہماری روانگی میں فقط آپ کی تیاری کی دیر ہے۔ میرے خیال میں اب دیر کرنا فضول ہی ہے۔''

''تو بس تھوڑی دیر کے لئے اجازت دیجئے۔'' میں نے کہا۔ ''میں بس گھر جا کر اسباب باندھ لوں۔ پھر حاضر ہوتا ہوں۔''

''ہو آیئے۔'' نکولا نے کہا۔ ''میرا ایک آدمی ساتھ جائے گا۔ اس کو اپنا بیگ دے دیں۔ امید ہے کہ آپ زیادہ دیر نہ کریں گے۔''

نکولا کے آدمی کو ساتھ لے کر میں اپنے مکان کی طرف روانہ ہوا۔ اس جگہ نوکر کو باہر کھڑا کیا اور پھر آپ اندر جا کر اس قسم کا سامان جو رستہ میں درکار ہوتا ہے، جمع کرنے لگا۔ میں نے وہ ستر ڈالر بھی اس جگہ سے نکال لئے جہاں چھپا کر رکھے تھے۔ جس کے لئے مالک مکان اور اس کی دونوں بیٹیاں دیوانی ہو رہی تھیں۔ باقی چیزوں کو ٹرنکوں میں بھر کر تالا لگا دیا۔ مالک مکان سے مل کر اسے دس ڈالر دیئے اور اس کی رسید لی۔ میں نے ستیش بترا کے نام ایک چٹھی لکھی کہ ان صندوقوں کو میری واپسی تک رکھنا۔ پھر ایک گاؤں والے کو دو ڈالر دے کر سامان ستیش بترا کے ہاں چٹھی کے ساتھ روانہ کر دیا۔ پھر میں اس چینی لڑکے کے ساتھ جو میرے ساتھ آیا تھا۔ اس جگہ پہنچا، جہاں تھوڑی دیر پہلے نکولا کے عجیب امتحان نے دہلا دیا تھا۔

آدھی رات کب کی بیت چکی تھی۔ مگر جوش اشتیاق میں، میں نے ذرا بھی تھکن محسوس نہیں کی۔ اس پراسرار کام کی نوعیت جس پر میں نکولا کا شریک ہو کر جا رہا تھا۔ یہ سفر جی میں عجیب امنگیں پیدا کر رہا تھا۔ غیر محسوس انداز میں یہ بات ذہن نشین ہو گئی تھی کہ اس مہم سے خوب فائدہ ہوگا۔ نکولا نے فائدے میں سے حصہ دینے کی پیش کش کی تھی۔ نہ بھی دے۔ دس ہزار پونڈ بہت زیادہ بھی تو تھا۔

میں جب بنگلہ میں داخل ہوا تو نکولا اس کمرے میں بیٹھا انتظار کر رہا تھا، جس میں میرے امتحان کے واقعات پیش آئے تھے۔ اس نے اب بھی وہی چینی لباس پہن رکھا تھا۔ اب دوسری بار اس کی صورت دیکھ کر مجھے اس خیال سے حیرت ہوئی کہ اس بھاری بھرکم چینی کے بھیس میں وہ نازک اندام یوروپین کیسے چھپ سکتا ہے جو دنیا میں ڈاکٹر نکولا کے نام سے مشہور تھا...... مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر دمک اور آنکھوں میں جیسے برقی قمقمے جل اٹھے۔ پھر وہ زیر لب مسکرا دیا۔

''شکر ہے آپ بہت جلد تشریف لے آئے۔'' اب اگر آپ میرے ساتھ دوسرے کمرے میں چلتے ہیں تو وہ چیزیں دکھادوں جو صرف آپ کی خاطر مہیا کی گئی ہیں۔ چوں کہ آپ کو چینی لباس تبدیل کرنا خوب آتا ہے اور آپ ایک طرح سے اس میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ اس لئے یقین ہے کہ آپ بڑی خوبی سے بھیس بدلیں گے۔''

میں نے پاس والے کمرے میں جا کر لباس اتارا جو مغربی تھا اور پھر وہ کپڑے پہنے جو میرے لئے اس جگہ رکھے ہوئے تھے۔ پھر اس مرکب سے جو ایک بوتل میں رکھا ہوا تھا چہرہ، گردن اور ہاتھوں کو رنگا، سر پر چینی وضع کی چوٹی باندھ لی اور پھر چشمہ لگا کر پورا چینی بن گیا۔ کوئی چینی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس بھیس میں کوئی ہندوستانی چھپا ہوا ہے۔ بوٹوں کی جگہ سینڈل، سر پر چینی وضع کی گول ٹوپی، گلے میں زرد ریشم کی دہری عبا...... ان تبدیلیوں نے میری صورت میں خاصا وقار پیدا کر دیا تھا۔ میں نے بڑے آئینے

میں جو سنگھار میز کا تھا۔ سنگھار میز ایک کونے میں تھا۔ اس میں جائزہ لیا اور مطمئن ہو گیا۔

اس کے تھوڑی دیر بعد جب ڈاکٹر نکولا اندر داخل ہوا تو اس نے میرا تنقیدی نظروں سے جائزہ لیا۔ اس کے چہرے پر جو اطمینان کی لہر دیکھی تو اس سے میں نے اندازہ کیا۔ وہ دل میں خوش اور مطمئن ہے اور جب ہم نے ایک دوسرے کو چینی طریق سے سلام کیا تو وہ کوئی بڑا ہی ہوشیار آدمی ہوتا جو اس حالت میں ہمارے ہندوستانی اور مغربی ہونے سے واقف ہو سکتا۔

"ضرورت فقط یہ دیکھنے اور جاننے کی ہے کہ ہمارے اس تبدیلی لباس میں کوئی نقص تو نہیں۔" ڈاکٹر نکولا نے کہا۔ "اس کا ایک طریقہ میرے ذہن میں آتا ہے۔ آدھے گھنٹے تک لونگ نامی ایک شخص کے مکان پر جلسہ ہوگا جس میں اس خفیہ سوسائٹی کے ممبر جو خاندان منچو کو معزول کرنا چاہتی ہے۔ جمع ہو کر تبادلہ خیالات کریں گے۔ میرا دوست لادوان ہم سے پہلے وہاں پہنچ چکا ہوگا۔ وہ چوں کہ اس سوسائٹی کا رکن ہے۔ اس لئے باقی ممبروں سے اس بہانہ ہمارا تعارف کرا دے گا کہ ہم اندرون ملک کے مال دار تاجر ہیں اور اس سوسائٹی کے مقاصد سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ جلسہ کا خفیہ لفظ میرے علم میں ہے اور میں اس سوسائٹی کے مقاصد کو بھی معلوم کر چکا ہوں۔ میرے نزدیک ہمارے امتحان کا یہ موقع خوب ہوگا۔"

مجھے اس کی اس تجویز اور اس پیرائے سے جو اس نے پیش کیا۔ سخت حیرانی ہوئی۔ "کیا عین اس وقت جب ہم سفر کی تیاری کر چکے ہیں۔ آپ کا ایک خفیہ سوسائٹی کے اجلاس میں جانا داخل مصلحت ہوگا؟" میں نے کہا۔

"میرے نزدیک تو اس میں بڑا خطرہ ہے۔ اگر آپ کو ضروری شامل ہونا ہے تو کیوں نہ ہم چند روز تک اس لباس کی عادت ڈالتے رہیں...... اس کی مشق کرتے رہیں۔"

مگر ڈاکٹر نکولا نے میرے اس اعتراض کو کوئی اہمیت نہیں دی اور اسے سرسری سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ "میرے خیال میں خطرہ کچھ نہیں ہے۔" اس نے جیسے مجھے دلاسا دیا۔ "البتہ امتحان کا ایسا اچھا موقع پھر نہ ملے گا اور اگر ان لوگوں نے واقعی ہمیں پہچان لیا تو ہم وقت پر سارے نقص معلوم کر کے انہیں آسانی سے رفع کر سکیں گے۔ علاوہ بریں اس اجلاس میں ایک آدمی ایسا بھی ہوگا جو ان کے اندرونی حالات سے اچھی طرح واقفیت رکھتا ہے۔ جہاں ہم کو جانا ہے۔ اس سے کچھ ایسی معلومات حاصل ہو جائیں گی، جن سے رستہ میں بہت مدد ملے گی اور اس کی بڑی امید بھی ہے۔ پس اب ہمیں دیر نہیں کرنی چاہئے۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا اور مجھے مجبوراً اس کے ساتھ جانا پڑا۔ دروازے کے باہر بہت سے چینی مزدور ڈانڈیاں لئے کھڑے تھے اور ہم ان پر بیٹھ کر اجلاس والے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ آدھی رات کبھی کی جا چکی تھی مگر ہم نے جوش اشتیاق اور تحسین میں ذرا بھی تھکن محسوس نہیں کی۔

اس پراسرار کام کی نوعیت جس میں ڈاکٹر نکولا شریک ہونے جا رہا تھا۔ جی میں عجیب امنگیں پیدا کرتی تھیں۔ ویسے میں نے یہ بات محسوس کر لی اور اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ اس مہم سے خوب فائدہ ہوگا۔

تقریباً بیس منٹ کی مسافت کے بعد کہاروں نے ایک جگہ ٹھہر کر ڈولیاں رکھ دیں اور ہم اتر کر کھڑے ہو گئے۔ قلیوں کو رخصت کرنے کے بعد جب ہم دونوں رہ گئے تو ڈاکٹر نکولا نے سرگوشی میں آہستگی سے کہا۔

"اس سوسائٹی کا خفیہ لفظ آزادی ہے۔ جسے کہتے ہوئے دائیں ہاتھ کی انگلیاں جوڑ کر بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھ لینی چاہئیں اگر ان لوگوں نے کچھ اور سوالات پوچھے تو جیسا موقع محل ہو ویسا جواب دے دینا۔"

مکان کا دروازہ ایک تنگ گلی کے سرے پر واقع تھا۔ پاس جا کر ڈاکٹر نکولا نے ایک موٹی سی انگوٹھی کی مدد سے جو اس نے داہنے ہاتھ کی پہلی انگلی میں پہنی ہوئی تھی۔ دروازے کو کھٹ کھٹایا۔ فوراً ایک تنگ دریچہ کھلنے کی آواز آئی۔ پھر کسی نے قدرے تلخ لہجے میں چینی زبان میں سوال کیا۔

"کون ہے جو اس وقت شریف آدمیوں کے آرام اور نیند میں خلل ڈالنا چاہتا ہے؟ کیا اسے یہ خیال نہیں ہے؟"

"ہم ستر پوآن کے سوداگر آزادی کی تلاش میں اس جگہ آئے ہیں۔" ڈاکٹر نکولا نے فوراً ہی ہاتھ سے وہ اشارہ کرتے ہوئے کہا جس کا مطلب اس نے مجھے پہلے ہی سمجھا دیا تھا۔

فوراً دروازہ کھول دیا گیا۔ پھر ہم دونوں اندر داخل ہو گئے۔ ڈیوڑھی میں گھپ اندھیرا تھا۔ ہمارے اندر داخل ہوتے ہی دوبارہ باہر کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ یہ لوگ بڑے چوکنا اور محتاط تھے۔

پھر اندھیرے اور خاموشی میں ایک آواز جو بڑی بارعب تھی، سنائی دی۔ "سیدھے آگے کی طرف چلتے جاؤ...... ادھر ادھر جانے کی کوشش نہ کرنا۔"

کوئی ایک لمحے کے بعد ڈیوڑھی کے سرے پر دوسرا دروازہ کھلا تو اس کی راہ سے تیز روشن داخل ہونے لگی۔ جس آدمی نے دروازہ کھولا تھا ہمیں اندر آنے کا اشارہ کیا۔ ہم دونوں مسکین صورتیں بنائے چینی انداز سے دونوں ہاتھ آگے کی طرف جوڑے ایک فراخ کمرے میں داخل ہوئے، جس میں تقریباً بیس بائیس آدمی جمع تھے اور وہ ہمیں دیکھنے لگے۔

کسی سے مخاطب ہوئے بغیر ہم کمرے سے گزر کر سامنے والی دیوار کے پاس جو دو چوکیاں تھیں، ان پر بیٹھ گئے۔ اس عظیم خاموشی میں جو کمرے میں چھائی ہوئی تھی، اس سے میرے دل کو جو اضطراب ہوا۔ اس کا حال بیان کرنا غیر ضروری ہوگا۔ میرے خیالات خواہ جو کچھ ہوں، میں نے اس موقع پر بڑے ضبط سے کام لیا تھا۔ اپنے بشرے اور حرکات و سکنات سے کسی بے چینی کا اظہار ہونے نہیں دیا تھا۔ صبر و ضبط کا امتحان بڑا سخت اور کڑا ہوتا ہے۔ اس میں کامیاب ہونا آسان نہیں ہوتا ہے۔"

اتنے میں ایک سن رسیدہ چینی جو ہمارے داہنی جانب بیٹھا ہوا تھا اور جس کی نسبت میرا خیال ہے کہ اس جماعت کا سرکردہ ہوگا۔ وہ ڈاکٹر نکولا سے مخاطب ہو کر اس کے شنگھائی آنے کے سوال پر گفتگو کرنے لگا۔ ڈاکٹر نکولا نے جیسا کہ چین کا قاعدہ ہے، اس کے تمام سوالوں کا جواب بڑی آہستگی اور وقار سے دیا اور آخر میں کہا۔

"دراصل میرا آنا کسی ذاتی منفعت کے خیال سے نہیں۔ محض آپ لوگوں کی زیارت کرنے کی غرض

سے تھا۔" ڈاکٹر نکولا کے بعد مجھ سے بھی یہی سوال کیا گیا۔ میں نے بھی اس پیرایہ میں جواب دیا اور اس وقت چینی زبان میں کچھ ایسی گڑبڑ شروع ہوئی کہ میں اس گفتگو کا ایک لفظ تک سمجھ نہ سکا۔ مگر میں نے دیکھا۔ اس موقع پر ڈاکٹر نکولا نے حاضر جوابی کا اچھا ثبوت دیا۔ اس نے برسر حکومت خاندان کے تنزل کی عجیب وغریب تجویزیں پیش کیں جو ایک طرح سے حیرت انگیز بھی تھیں۔ بارہ سربرآوردہ اہل کاروں کے قتل کا بھی مشورہ دیا اور پھر یہ بھی بتایا کہ قتل کے بعد ان کی لاشوں کے بارے میں کیا کرنا چاہئے۔

آخر ہم دونوں کو اس کمرے میں بیٹھے ہوئے تقریباً آدھا گھنٹہ گزر گیا اور میں حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بار ہا سوچتا...... کیا یہ شخص بھی جو اس خوبی سے چینی زبان میں گفتگو کر رہا ہے۔ ڈاکٹر نکولا ہو سکتا ہے۔ بہر حال اس دلچسپ بحث کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک گھنٹے کے اندر اندر اس نے حاضرین کی نظروں میں ایک خاص اہمیت حاصل کر لی۔

میرے خیال میں وہ چاہتا تو حاضرین سے اپنی ہر بات بڑی آسانی سے منوا سکتا تھا۔ وہ سب اس سے متاثر اور مرعوب ہو گئے تھے۔ مجھ سے جہاں تک ممکن ہوا اس کی تائید کرتا اور اس کے مشوروں کو سراہتا اور کہتا بھی گیا کہ یہ گراں قدر ہیں۔ آخر جب رات کے تین بجے اس اجلاس کا اختتام ہوا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد مختلف اراکین ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے۔ کچھ دیر بعد اس کمرے میں میرے اور ڈاکٹر نکولا کے سوا فقط دو آدمی رہ گئے۔ ایک ڈاکٹر نکولا کا ساتھی لادوان اور دوسرا وہی عمر رسیدہ چینی جس کی ڈاکٹر نکولا سے باتیں اور سوالات اور جوابات ہوئے تھے۔ وہ ڈاکٹر نکولا سے بڑا متاثر نظر آتا تھا۔

اب بڑی آہستگی اور غیر محسوس انداز سے ڈاکٹر نکولا نے گفتگو کا رخ ان معاملات کی طرف پھیرا جو اس کے نزدیک خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس نے یہ بات کیوں کر معلوم کی کہ بڈھا چینی معاملات تحقیق سے آگاہ ہے۔ میں نے یہ دیکھ لیا، جان لیا اور محسوس کر لیا کہ یہ شخص بعض حالات سے پوری واقفیت رکھتا تھا۔ تھوڑی ترغیب سے اسے ان کے انکشاف پر آمادہ کیا جا سکے گا۔ کیوں کہ یہ سن رسیدہ چینی بظاہر سیدھا سادا سا دکھائی دیتا تھا۔

ڈاکٹر نکولا جب تھوڑی دیر اس سے مختلف موضوعات ہر بات کر چکا تو چینی نے سرسری انداز سے کہا۔

"میرے خیال میں یہ باتیں ہر شخص کے لئے نہیں ہیں۔ میرے معزز دوست! آپ کو اوروں کے تجربے سے فائدہ منظور ہو تو میں آپ کو یہ مخلصانہ رائے دوں گا کہ اس مسئلے کو یہیں چھوڑ دینا چاہئے۔ اس پر مزید گفتگو میرے خیال میں کسی کے لئے مفید نہیں ہے۔"

"میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ...... افسوس میں اس بات سے اتفاق نہیں کر سکتا۔" ڈاکٹر نکولا نے بڑے اطمینان سے پائپ سے کش لگاتے ہوئے جواب دیا۔ "میرا یہ اعتقاد ہے کہ علم کا سمندر ان تمام لوگوں کے لئے کھلا ہونا چاہئے جو اس میں تیرنا چاہتے ہیں۔ کچھ حال میں پہلے ہی سن چکا ہوں۔ اب اس بارے میں پوری تحقیق کرنا منظور ہے...... میں لوزازلی کے نام پر سوال کرتا ہوں...... کیا آپ میری باتوں کا جواب دے سکیں گے......؟"

یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر نکولا نے کوٹ کی اندرونی جیب سے وہی پراسرار لکڑی نکالی، جسے اس نے بڑی مشکل، مصائب اور زحمتوں کے بعد ویدرل سے حاصل کیا تھا۔ اس لکڑی کو دیکھتے ہی اس بڈھے چینی کا انداز بالکل ہی بدل گیا...... اس لکڑی نے اس پر جیسے عجیب وغریب اور حیرت انگیز اور ناقابل یقین اثر کیا۔ اس نے وہیں ڈاکٹر نکولا کے قدموں میں گر کر اپنے تامل کے لئے معافی مانگی اور پھر کہا۔

"اگر اس خادم کو آپ کی شخصیت کا علم ہوتا تو سارے سوالوں کا جواب فوراً ہی دے دیتا...... اب جس قدر حالات و واقعات مجھے معلوم ہیں ان کے بیان سے قطعاً عذر نہ ہوگا۔ میں ہر بات بتانے کے لئے بالکل تیار ہوں......"

"میں اس کے سوا جس کا انتظام پہلے ہو چکا ہے اور کچھ نہیں چاہتا۔" ڈاکٹر نکولا نے کہا۔ "اس کا حال فوراً معلوم ہونا چاہئے۔"

"سرکار کے ہر حکم کی تعمیل بلاچوں وچرا کی جائے گی......" بڈھے نے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔ "میری کیا مجال کسی بات سے انکار کروں۔"

"اگر ایسی بات ہے تو پھر دیر نہ ہو...... اور اس بات کا بھی خیال رہے کہ اس بارے میں کوئی لفظ کسی اور کے روبرو زبان سے نہ نکلے...... مکمل احوال اس پتے پر بھیج دیں تا کہ اخراجات ادا کئے جا سکیں۔"

ڈاکٹر نکولا نے یہ بات کہتے ہوئے ایک چھپا ہوا کارڈ جیب سے نکال کر بڈھے کے ہاتھ میں تھما دیا اور پھر رخصت ہونے کے لئے اٹھا۔ تھوڑی دیر میں، میں اور ڈاکٹر نکولا ڈانڈیوں میں بیٹھے ہوئے گھر کی طرف جا رہے تھے۔

☆......☆......☆

اس مکان پر پہنچ کر جہاں سے ہم چلے تھے، ڈاکٹر نکولا مجھے لباس تبدیل کرنے کے کمرے میں لے جا کر کہنے لگا۔ "آپ نے اس عجیب وغریب لکڑی کی تاثیر دیکھی...... یہ بات کہ یہ آدمی اس سوسائٹی کا ممبر ہے، جس سے ہمیں واسطہ پڑے گا۔ لادوان نے معلوم کر لیا تھا۔ درحقیقت منچو خاندان کی تباہی کی گفتگو محض ایک پردہ تھی۔ جس کی آڑ میں کچھ اور باتیں طے ہوئی تھیں۔ اب سب کام توقع کے مطابق ٹھیک ہو گیا...... تو ہماری راہ میں پہلا دروازہ اس بڈھے کے ہاتھ سے کھل جائے گا۔ اس کے بعد جیسا موقع ہوا کریں گے۔ اب ہمیں کپڑے بدل کر اس پہلے مکان پر چلنا چاہئے۔ ناشتے کے وقت تک اس جگہ سے روانہ ہو جانا پڑے گا۔"

آخر جب ہم سابق لباس پہن چکے تو اس بنگلہ سے رخصت ہو کر اس مکان پر گئے، جہاں ڈاکٹر نکولا سے پہلے ملاقات ہوئی تھی۔

افق مشرق پر قدرت کی نورانی کرن دامن شب کو چاک کر رہی تھی کہ ہم ڈاکٹر نکولا کے مکان پر جا پہنچے اور سیدھے اس کمرے میں داخل ہوئے جہاں پہلے ہی ملازموں نے سامان اکل و شرب مہیا کر رکھا تھا۔

ہم ابھی کھانے میں مصروف تھے کہ ایک لڑکا پیغام لایا کہ ایک چینی ڈیوڑھی میں ملاقات کا منتظر ہے۔

ڈاکٹر نکولا نے لڑکے سے کہا کہ انہیں بلا لاؤ۔ جب وہ آیا تو معلوم ہوا کہ اس کا دوست لادوان

ہے۔ ”کہو...... اس بڈھے نے کیا پیغام بھیجا ہے؟“ ڈاکٹر نکولا نے اسے دیکھتے ہی دریافت کیا۔

اس کے جواب میں لادوان نے جس کی نسبت میں نے جلد ہی معلوم کرلیا تھا کہ وہ نہایت کم گو آدمی ہے۔ اپنی ڈھیلی آستین سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نکال کر ڈاکٹر نکولا کی طرف بڑھایا۔ جس کو ڈاکٹر نکولا نے کھولا۔ اس پر چینی الفاظ میں کچھ حروف تحریر تھے۔ ڈاکٹر نکولا نے اس تحریر پر ایک نظر ڈالی۔ پھر پڑھ کر میری طرف بڑھا دیئے۔ فقط یہ الفاظ تحریر تھے۔

کونگ شا کا مکان...... سوآفات کے محلہ میں شہر ٹینس...... بس اتنا ہی لکھا ہوا تھا۔

اپنے دوست سے مخاطب ہوکر نکولا نے پوچھا۔ ”کیا تمہیں یہ پتا ہے کہ شمال کو جانے والا جہاز کب روانہ ہوگا؟“

”پورے ساڑھے چھ بجے......“ لادوان نے جواب دیا۔ ”اس کا یہی وقت مقرر ہے۔“

ڈاکٹر نکولا نے گھڑی دیکھی۔ پھر ایک لمحہ چپ چاپ کچھ سوچتا رہا۔ اس کے بعد اس سے کہا۔

”تم ابھی اور اسی وقت جاکر اس جہاز میں نشستیں مخصوص کرادو...... ہم روانگی سے پہلے پہنچ جائیں گے۔ مگر ایک بات یاد رکھنا دوست! ٹینس پہنچنے تک تمہارے طرز عمل سے ہرگز ظاہر نہ ہو کہ تم نے اس سے پہلے ہمیں کہیں دیکھا ہے۔“

”بےفکر رہو...... ایسا ہی ہوگا۔“ لادوان نے جھک کر سلام کیا اور چلا گیا۔

”اب اس مقام سے اصل واقعہ شروع ہوتا ہے۔“ ڈاکٹر نکولا نے سیاہ قہوہ کی پیالی بھرتے ہوئے کہا۔ ”اس وقت پونے پانچ بجے ہیں۔ آدھے گھنٹے تک بندرگاہ پہنچ کر جہاز پر سوار ہوجائیں گے۔ وقت کی پابندی ضروری ہے۔ ویسے ابھی ہمارے پاس وقت ہے۔“

کھانے سے فارغ ہوکر ہم سب آرام کرسیوں پر بیٹھ گئے اور سگار پینے لگے۔ تھوڑی دیر گزشتہ شب کے واقعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ پھر مستقبل کی تجویزیں زیر غور آئیں۔ ٹھیک سوا پانچ بجے ہم چلنے کے لئے تیار ہوگئے۔ ڈاکٹر نکولا نے گھنٹی بجائی تو دوسرے ہی لمحے ایک نوکر داخل ہوا تو ڈاکٹر نکولا اس سے کہنے لگا۔

”میں ایک کام پر باہر جارہا ہوں...... میں کچھ کہہ نہیں سکتا کہ کب واپس آؤں گا۔ میری واپسی ممکن ہے ایک ہفتہ تک ہو یا پھر ایک برس بعد...... اس اثنا میں تمہارا یہ فرض اور ذمے داری ہوگی کہ گھر کی حفاظت کرتے رہو اور کوئی چیز ضائع نہ ہونے دو۔ اگر میں نے واپسی پر کسی کھڑکی کا ایک شیشہ بھی ٹوٹا ہوا دیکھا یا ایک پن بھی گم ہوگئی تو یاد رکھو...... اس کی سزا بڑی خوف ناک ہوگی۔ رہ گئی تنخواہ تو وہ مسٹر میک اینڈریو ہر مہینہ پر ادا کرتے رہیں گے اور جس چیز کی بھی ضرورت ہو تم ان سے لاسکتے ہو۔ کیا سمجھ گئے؟“

ملازم لڑکے نے اثبات کے انداز میں مؤدبانہ سر ہلادیا۔ ”میں سمجھ گیا جناب!“

”تو جاؤ......“ ڈاکٹر نکولا نے کہا۔ ”مجھے امید ہے کہ تم مجھے شکایت کا کوئی موقع نہیں دوگے۔“

ملازم جب رخصت ہوگیا تو اس پراسرار شخص نے عجیب انداز سے سیٹی بجائی۔ فوراً ہی کالی بلی اطمینان سے چلتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ پہلے وہ اچک کر ڈاکٹر نکولا کے گھٹنے پر بیٹھی اور پھر اس کے

شانہ پر چڑھ گئی۔

ڈاکٹر نکولا نے اس پر ہاتھ پھیرا۔ پھر میری طرف دیکھا اور کہا۔ ”اگر میں پانچ برس بعد بھی آؤں تو یہ بلی مجھے فوراً ہی پہچان لے گی۔ سچ کہتا ہوں۔ ایسی وفا کسی عورت میں پائی جاتی ہے۔“

اس کی یہ بات سن کر مجھے بےاختیار ہنسی آگئی۔ عورتوں کے متعلق نکولا کے خیالات یقیناً بہت اونچے نہ تھے۔ پھر اس نے بلی کو اتار کر اپنے آگے میز پر رکھ لیا۔ پھر اس سے مخاطب ہوکر بڑے حسرت بھرے لہجے میں بولا۔

”اپہویون! آج ہم سال بھر کے لئے تم سے جدا ہوتے ہیں...... الوداع پیاری بلی الوداع......“

اس نے دو تین بار بلی کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ پھر جلدی سے میری طرف مڑ کر بولا۔

”اب ہمیں فوراً ہی چل دینا چاہئے...... وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم جہاز میں سوار نہ ہوسکیں۔“

اس اثنا میں بلی وہیں میز پر بیٹھی، اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے ہر لفظ کو اچھی طرح سمجھتی ہے۔ ڈاکٹر نکولا نے اسے آخری بار پیار کیا اور پھر تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔ پھر ہم اکٹھے بیرونی دروازے سے نکل کر بازار میں پہنچے۔

خلقت کی آمد ورفت اچھی طرح شروع ہوگئی تھی۔ ہر طرف ایک گہما گہمی شروع ہوگئی تھی۔ سڑکوں پر سواریاں بھی نظر آنے لگیں۔ سواری حاصل کرنے میں کسی طرح کی دقت پیش نہیں آئی۔ قلیوں نے سامان اٹھا رکھا تھا۔ ڈاکٹر نکولا نے قلیوں کو گھاٹ پر چلنے کا حکم دیا۔ وہ لوگ حکم پاتے ہی تیز رفتاری سے دریا کی طرف ہو چلے۔ اس کے پاؤ گھنٹہ بعد ہم دریائے ہوانگ پو کے گھاٹ پر جاپہنچے۔ جہاز منجدھار میں لنگرانداز تھا۔ ہمیں سامپان پر چڑھ کر وہاں تک جانا پڑا۔

ہم نے جہاز کے خزانچی سے ملاقات کی۔ پھر جب کرایہ ادا کرچکے تو اس نے ہمیں رہنے کے کیبن دکھائے۔ جہاز دیکھنے میں بہت بڑا نہ تھا۔ اس میں صرف چند مسافر سوار ہوسکتے تھے۔ اتفاق سے آج بہت کم آدمی سوار تھے۔ اس لئے جگہ کی تنگی کی شکایت پیدا نہ ہوئی۔

اسباب قرینہ سے رکھنے کے بعد تھوڑی دیر کے لئے میں جہاز کے عرشہ پر گیا۔ میں نے عرشہ پر قدم رکھا ہی تھا کہ ایک ایسے آدمی سے ملاقات ہوگئی جس سے مدت ہوئی ساحل آسٹریلیا پر واقفیت ہوئی تھی اور اب اس جگہ ملنے کی ہرگز امید نہ تھی۔

”کون آنند پال......؟“ اس نے حیرت اور خوشی سے کہا۔ ”کسے خیال تھا کہ آپ سے اس جہاز پر ملاقات ہوگی؟“

”جم ڈاؤننگ!“ میں نے پرجوش انداز سے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ ”کہیے چین میں آئے کتنی مدت ہوئی آپ کو......؟“

”تقریباً ایک برس ہوگیا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں ایک برٹش جہاز میں ملازمت کے سلسلہ میں

آیا تھا۔ مگر کپتان سے کسی بات پر لڑائی ہوگئی تو میں ہانگ کانگ میں اتر گیا۔ تب سے اس لائن پر کام کر رہا ہوں۔ گو میری طبیعت کو اہلِ چین سے زیادہ لگاؤ نہیں۔ اس کے باوجود اپنے کام سے ہر طرح مطمئن ہوں...... آپ کہیں...... آپ کا کیا حال ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ پہلے سے آپ بہت سنولا ہو گئے۔"

"جی ہاں بہت زیادہ چاول کھانے کا نتیجہ ہے۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ "مقامی غذائیں اثر انداز ہوتی تو ہیں۔"

ڈاؤ نگ پہلے دن سے نبوڑ مشہور تھا۔ زور کا قہقہہ لگا کر ہنسا۔ اس طرح ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے جہاز کی چھت پر ٹہلنے لگے۔ مڑ کر آئے تو ڈاکٹر نکولا کھڑا ہوا تھا۔ میں نے ڈاؤ نگ کا اس سے تعارف کرایا۔ پانچ سات منٹ میں ان کے درمیان اتنی بے تکلفی ہو گئی۔ گویا برسوں کی پہچان تھی۔ پھر کوئی تیس منٹ کے بعد ڈاکٹر نکولا اس سے خوب گھل مل کر باتیں کر رہا تھا۔

جہاز بندرگاہ سے روانہ ہو چکا تھا۔ اس اثنا میں سفر جاری رہا۔ کھانے کے وقت تک جہاز کافی دور پہنچ چکا تھا اور دوپہر کے بعد ہم شنگھائی کو بہت دور پیچھے چھوڑ چکے تھے۔

☆......☆......☆

میں نے دیکھا کہ اس سفر کے دوران میں ڈاکٹر نکولا ہر طرح مطمئن اور مسرور تھا۔ اس میں کوئی ہیجان نہیں تھا۔ نہ ہی اس نے کوئی الجھن ذہن میں پال رکھی تھی۔ وہ ساری تفریحوں میں حصہ لیتا اور نئے نئے کھیل تماشے اختراع کیا کرتا تھا۔ اس سلسلہ میں، میں اس مرد پر اسرار کی ایک عجیب خاصیت بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو اس وقت میں میرے دیکھنے میں آئی تھی۔ یعنی ننھے بچوں سے اسے بے حد محبت تھی۔ ہمارے جہاز پر ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ اس کی عمر بمشکل چار برس کی ہوگی۔ اس سے ڈاکٹر نکولا کو گہری محبت ہو گئی تھی۔ وہ گھنٹوں اس کے ساتھ کھیلا کرتا اور میں بیٹھا ہوا دیکھتا تو یقین نہ آتا کہ یہ وہی آدمی ڈاکٹر نکولا ہو سکتا ہے جو ایک عظیم الشان مہم سر کرنے جا رہا ہے۔ یہ آدمی اطمینان سے بیٹھا ہوا کاغذ کی کشتیاں بناتا اور نارنگی کے چھلکے سے چھوٹے چھوٹے کھلونے کاٹتا۔ کیا یہ وہی مرد ہیبت ناک ہے۔ جس سے ڈر کر نیو ساؤتھ ویلز کا سابق وزیر نو آبادیات آنریبل سلوسٹر ویڈرل لندن بھاگا اور جسے دیکھ کر چین کے محکمہ مال کا افسر بنویل روپوش ہو گیا تھا!

مگر بعد کے واقعات سے معلوم ہوا کہ نکولا کی طبیعت کا یہ بھی ایک خاصہ تھا۔ چاہے وہ کوئی کام کرتا۔ یعنی خواہ وہ کاغذ کی کشتی بناتا یا بچوں کے لئے کھلونے کاٹتا یا اس کے برعکس کسی عظیم الشان ہستی کے خلاف زبردست سازش عمل میں لاتا۔ بہر حال میں وہ اس کام کو پوری توجہ اور سرگرمی سے کیا کرتا تھا۔ ہاں کسی موقع پر یہ بات اس کے ذہن میں بیٹھ جائے کہ اس کام کو جاری رکھنا فضول ہے تو وہ اسے فوراً ہی ترک کر دیتا اور پھر وہ کبھی اس کام پر توجہ نہ دیتا۔

اثنائے سفر میں ہمارے دوست لادوان نے ہرگز کسی اشارہ یا کنایہ سے یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ ہمیں جانتا ہے۔ وہ جہاز کے دوسرے حصے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ جہاں تک میں نے غیر محسوس انداز سے معلوم کیا کہ اس کے وقت کا بڑا حصہ چینی مسافروں کے ساتھ نان ٹان کھیلنے میں بسر ہوتا تھا۔ چین میں تاش کا یہ

کھیل بڑے شوق اور دلچسپی سے کھیلا جاتا تھا۔

جہاز دریا کے کنارے چلتا گیا اور راستے میں کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔ حتیٰ کہ ایک روز غروب آفتاب کے قریب ہم شہر جا پہنچے جو نمبر یو ہوا اور دریائے چے ہو کے مقام اتصال پر واقع ہے۔ جہاز کے لنگر ڈالتے ہی ہم اپنا سامان اٹھا کر کے ساحل پر اتر گئے اور اس جگہ ایک اور عجیب بات یہ دیکھنے میں آئی کہ شنگھائی کی طرح یہاں بھی ہر شخص ڈاکٹر نکولا کو جانتا تھا۔ بند کے پاس ہم نے دو رکشائیں لیں اور انہیں کھینچنے والے قلی بغیر استفسار کے ہم کو یوروپین آبادی میں ایک شخص مسٹر ولیمز کے مکان پر لے گئے۔

ایک کوارٹر نما سا مکان جو مشرقی وضع پر بنا ہوا تھا۔ بہت خوب صورت سا لگا۔ ہم جب رکشاؤں سے اترے تو ایک دراز قد، سن رسیدہ آدمی جس کے چہرہ پر اس کہن سالی میں بھی آثار وجاہت نمودار تھے۔ برآمدے میں کھڑا نظر آیا۔ نکولا کو دیکھ کر اسے عجیب حیرت ہوئی۔

"کیا یہ حقیقت ہے کہ میں ڈاکٹر نکولا کو دیکھ رہا ہوں۔" اس نے بے اعتباری سے کہا۔ "کیا ایسا ممکن ہے۔"

"یقینی طور پر...... اسی کو۔" ڈاکٹر نکولا نے جواب دیا اور پھر قلیوں کو سامان اتارنے کا اشارہ کر کے باہر کی سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔

"مسٹر ولیمز! آپ سے ملے دو برس کا عرصہ تو ہو گیا۔" ڈاکٹر نکولا کہنے لگا۔ "اور اب میں جو آپ کو دیکھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے اس وقت کے بعد جب سیول میں ہم دونوں نے ماہ فنگ کو سبق دیا تھا۔ آپ کی حالت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی...... ذرہ برابر بھی فرق نہیں پڑا۔ ایسا لگ رہا ہے کہ میں آپ کو دو برس بعد نہیں بلکہ دو دن بعد دیکھ رہا ہوں۔"

"اوہ! آپ اس واقعہ کو بھولے نہیں......؟" ولیمز نے حیرانی سے کہا۔ "حیرت کی بات ہے۔"

"اور نہ اب تک ماہ فنگ ہی اسے بھولا ہوگا۔" نکولا نے ہنس کر جواب دیا۔ "سنگاپور میں جب وہ ملا تھا تو اسے سارے واقعات اس طرح سے یاد تھے جیسے کل کی بات ہو......"

"فرمایئے...... میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" ولیمز نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "چند دنوں کے لئے میری میزبانی قبول کیجئے۔" ڈاکٹر نکولا نے کہا۔ "یہ میرے دوست مسٹر آنند پال ہیں اور ہم دونوں آج کل ایک نہایت ضروری کام میں مصروف ہیں۔ آپ کو ان سے مل یقیناً خوشی ہوگی۔"

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔" مسٹر ولیمز نے مجھ سے بڑے تپاک سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا اور اس کے بعد ہمیں مکان کے اندر لے گیا۔ اس کے دس منٹ بعد ہم اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے لادوان کے پیغام کا انتظار کر رہے تھے۔

ڈاکٹر نکولا کی ذات میں، میں نے کئی خوبیاں دیکھیں۔ مگر ان سب میں قابل ذکر بات یہ تھی کہ جو کام پیش نظر ہو وہ ساری توجہ اس پر مرکوز کر سکتا تھا۔ ہر چند اس وقت ہم لادوان کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ مگر اس اضطراب میں بھی ڈاکٹر نکولا فن کیمیا کی ایک ضخیم کتاب بڑی دل چسپی سے پڑھ

رہا تھا۔ میں نے اس کے انہاک کا یہ عالم دیکھا کہ جب لادوان پیغام لے کر آ بھی گیا تو اس نے فوراً ہی کتاب ہاتھ سے نہیں رکھی بلکہ کچھ یادداشتیں جنہیں وہ کاغذ پر لکھ رہا تھا اور انہیں ہر طرح مکمل کرنے کے بعد نظر اٹھائی۔ پھر اس نے کہا۔ ”ہاں...... لادوان تم کیا پیغام لائے؟“

”آپ کی تشریف آوری کا شکریہ......“ اس نے جواب دیا۔ ”انتظار کیا جاتا ہے اور گو میں خود مکان پر نہیں گیا۔ تاہم معلوم ہوا ہے۔ آپ کے استقبال کی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔“

”تو بس تم گھوڑے خرید کر آدمیوں کو تیار رکھو۔“ ڈاکٹر نکولا نے کہا۔ ”ہم کل سویرے پیکن روانہ ہو جائیں گے۔“

”آپ کا ارادہ کب اس مکان پر تشریف لے جانے کا ہے؟“ لادوان نے پوچھا۔

”رات کو ساڑھے دس اور گیارہ کے درمیان۔“ نکولا نے جواب دیا۔ جس کے بعد یہ وفادار نوکر رخصت ہو گیا۔

شام کے سات بجے کھانا کھانے کے بعد میں برآمدہ میں کھڑا پائپ پینے لگا۔ ڈاکٹر نکولا میزبان سے بات کرنے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ وہ واپس آیا تو رخصت کا وقت ہو چکا تھا۔ اپنے اپنے کمروں میں جا کر ہم نے وہی چینی لباس پہنے۔ پھر عقبی دروازے سے نکل کر شہر کی طرف روانہ ہو لئے۔ عقبی دروازہ سے نکلنے میں احتیاط اور معلومات بھی تھیں۔ پورے ساڑھے دس بجے تھے، جب ہم منزل پر پہنچ گئے۔ مگر چند در چند وجوہ سے فوراً ہی مکان کے اندر نہیں گئے تا کہ جن کے پاس ہمیں جانا تھا۔ انہیں یہ گمان نہ ہو کہ ہمیں کسی طرح کی عجلت یا بے چینی ہے۔

وہ لوگ جنہوں نے شہر ٹینس دیکھا ہے۔ میرے بیان کی تائید کریں گے کہ یہ دنیا کے نہایت کثیف اور ناپاک شہروں میں سے گندہ اور غلیظ مقام بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ اس شہر میں کیا کچھ برائیاں نہیں ہیں۔ ایک تو بازار تنگ اور بے ڈھنگے، کسی بھی شہر کی دیہاتی گلیوں سے کم چوڑے اور اس قدر پیچ در پیچ واقع ہیں کہ آدمی کو ان کی بھول بھلیوں میں پڑ کر نکلنا دشوار ہو جاتا ہے۔ بالائی منزلیں، سائن بورڈوں اور جھنڈوں سے لدی ہوئی ایک دوسرے سے ملتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ جس سے دوپہر کو بھی روشنی بہت مدھم ہوتی ہے اور رات کو گھپ اندھیرے میں ہاتھ کو ہاتھ نظر نہیں آتا۔ دن اور رات میں ہر وقت ان بازاروں سے متعفن اور غلیظ بو خارج ہوتی رہتی ہے۔ آدمی یہاں سے گزرنے پر مجبور ہے۔

کرائم اور جسم فروشوں کی کمی نہیں ہے۔ رہزن، چور، ڈکیت اور ٹھگ دن رات شکار کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ اغوا اور آبروریزی کے واقعات روز کا معمول ہیں۔ غربت و افلاس چوں کہ پورے چین میں ہے، اس لئے اس شہر میں بھی ہے۔ حسن و شباب کہاں نہیں ہوتا ہے۔ یہ کسی قوم کی جاگیر نہیں ہے۔ چینی عورتیں بھی یورپی، امریکی اور مغربی عورتوں کی طرح سفید رنگت کی ہوتی ہیں۔ ان میں اور چینی عورتوں میں فرق صرف یہ ہے کہ وہ یورپی عورتوں کی طرح دراز قد نہیں ہوتی ہیں۔ ان کی ناک ستواں نہیں ہوتی ہے۔ وہ پھولوں کی طرح نرم و نازک ہوتی ہیں جب کہ مغربی اور یورپی عورتوں میں وہ نزاکت

نہیں ہوتی ہے جو ایشیائی عورتوں میں ہوتی ہے۔ ان کے جسم سخت ہوتے ہیں۔ ایک کرختگی سی ہوتی ہے اور پھر یہ چینی عورتیں اور لڑکیاں، درمیانہ اور چھوٹے قد کی ہوتی ہیں۔ یورپی، مغربی اور غیر ملکی سیاحوں کو یہ بہت بھاتی ہیں۔ یہ دراز قد مردان چھوٹے قد کی عورتوں کو اور یہ عورتیں ان دراز قد مردوں کو پسند کرتی ہیں۔ ان غیر ملکیوں نے بردہ فروشی میں اضافہ کیا ہے۔ قحبہ خانوں کے علاوہ گھروں میں بھی قحبہ خانے موجود ہیں۔

جس محلے کا پتا دیا گیا تھا ہم اس کے سرے پر پہنچ کر رکشا سے اترے اور باقی راستہ پیدل طے کیا۔ گلی کے وسط میں ہمیں لادوان انتظار کرتا ہوا مل گیا اور وہی ہمیں اس مکان پر لے گیا، جس کی ہمیں تلاش تھی۔

ظاہری صورت کے اعتبار سے مکان ایسا نہ تھا جسے اچھا کہا جا سکے۔ فقط ایک منزل اونچا اور محرابی وضع کا دروازہ عشق پیچے کی بیلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ہمارے چینی رہبر نے دو تین بار دستک دی تو پھر کسی نے دروازہ کھولا۔ لادوان نے دبی آواز میں کچھ کہا تو ہمیں اندر داخل ہونے دیا گیا۔

ڈاکٹر نکولا مجھ سے آگے تھا۔ دربان نے جب اسے مخاطب کیا تو اس کے لہجے میں بڑی انکساری تھی۔ ”سورج فقط ایک ہے۔“

”لیکن ستارے تو بہت......“ ڈاکٹر نکولا نے اس کے پراسرار اشارے کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ یہ جواب سننے کے بعد وہ آدمی ہمیں چپ چاپ ڈیوڑھی کے سرے پر لے گیا۔

اس جگہ ایک اور دروازہ تھا۔ ہم جب اس کے اندر گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی ایک عجیب وضع کا لیمپ ہاتھ میں لئے کھڑا ہوا ہمارا منتظر ہے۔ اس نے کوئی سوال نہیں کیا اور ہمیں ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور ہم ایک لمبی ڈیوڑھی سے گزر کر تیسرے دروازے کے پاس جا پہنچے جو پردہ کے اندر چھپا ہوا تھا۔ اس نے پردہ ہٹا کر ہمیں داخل کیا اور پھر وہ سابقہ حالت میں کر دیا۔

آگے ایک کشادہ کمرہ نظر آیا۔ جس کا فرش، دیواریں اور چھت کسی سیاہ لکڑی غالباً ساگوان کی بنی ہوئی تھی۔ کمرے میں کسی طرح کا سامان نہ تھا۔ دیواروں پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر جھنڈیاں لٹک رہی تھیں اور ایک کونے میں چند تکئے رکھے ہوئے تھے۔ اندر تو کوئی نہ تھا مگر ہمیں زیادہ دیر تک انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ڈاکٹر نکولا بائیں طرف پر ایک پھریرے کو دیکھ رہا تھا اور میں اس سے کچھ کہنے کے لئے مڑا ہی تھا کہ میں پشت پر ہلکی چاپ سن کر رہ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بہت ہی بوڑھا چینی جس کی عمر اسی برس سے کم نہ ہو گی۔ ہماری طرف آ رہا ہے۔ چہرے پر بے شمار جھریاں تھیں۔ بال سفید براق اور شدت ضعف سے لاٹھی کے سہارے چلتا تھا، اس کی صورت میں مجھے ایک خاص بات عجیب سی نظر آئی۔ یعنی ہر چند اس کے گھر میں آثار تو می موجود تھے۔ تاہم یہ آدمی جو اس کے رہنے والوں میں سے ایک ہو گا، نہایت ادنیٰ لباس پہنے ہوئے غربت و افلاس کی تصویر دکھائی دیتا تھا۔ وہ ڈاکٹر نکولا کے پاس آ کر مؤدبانہ انداز سے سلام کرتا ہوا گفتگو کرنے لگا۔

”آپ کی تشریف آوری کا انتظار تھا۔ اگلے سفر کے متعلق سارے انتظامات ایک ہفتے سے مکمل ہو چکے ہیں۔“

”میں ایک ضروری کام کی وجہ سے سانچو میں رہ گیا تھا۔“ ڈاکٹر نکولا نے جواب دیا۔ ”مگر یہ بتاؤ کہ

اب تک کیا کارروائی ہو چکی ہے۔"

"پیکن کو اطلاع بھیج دی گئی ہے۔" بڈھے نے جواب دیا۔ "لاما سرائے کا پجاری آپ کے انتظار میں ہوگا...... میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا...... اس لئے کہ میں مزید کچھ نہیں جانتا۔"

"اور میری آمد کے بارے میں کیا کہا جا چکا ہے؟" ڈاکٹر نکولا نے دریافت کیا۔

"فقط یہ کہ جو کچھ کیا گیا وہ نہایت عقل مندی سے کیا گیا......" بڈھے نے کہا۔

"خیر...... اب تم جا سکتے ہو۔" ڈاکٹر نکولا نے کہا۔ "میں بھی بہت تھکا ہوا ہوں، آرام کروں گا۔ رات ہم اس جگہ رہیں گے۔ صبح ہوتے ہی فوراً ہی رخصت ہو جائیں گے۔ خیال رکھنا ہمیں کوئی تکلیف نہ ہو اور کوئی پریشان نہ کرے۔"

بڈھے نے مؤدبانہ سلام کیا اور اس نے بڑی شائستگی سے کہا۔ "آپ کے ارشاد کی تعمیل ہوگی۔" پھر وہ رخصت ہو گیا۔

اب تک معاملات جس سست روی سے جا رہے تھے، میں ذرا الجھ گیا تھا۔ اب تک اس مہم میں ایسی بات نظر نہ آئی تھی جو سنسنی خیز اور خوف زدہ کرنے والی بات ہو۔ ایک سپاٹ سا سفر ہو گیا تھا۔ ابھی ہم ابتدائی مرحلے ہی میں تھے۔ اس بڈھے کے جانے کے بعد ڈاکٹر نکولا میرا بازو پکڑ کے کمرے کے دوسرے سرے پر لے گیا اور سرگوشی میں کہنے لگا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ قدرت ہم پر مہربان ہے۔ اب اگر وہ دو آدمی جن کی مجھے تلاش ہے وہ مل جائیں تو پھر اس کام کی تکمیل میں کوئی شبہ نہ رہے گا...... پھر یا وہ راز معلوم کروں گا جس کی تلاش ہے یا پھر اس کی کوشش میں جی جان سے گزر جاؤں گا۔ آج جب ہم مسٹر ولیمز سے ملے تھے تو اس واقفیت کی بنا پر جو اسے چین کے اندرونی حالات کے بارے میں ہے۔ معلوم ہو گیا تھا کہ وہ بات جس کا مجھے شک تھا ہو چکی ہے۔ اس آدمی کی جگہ جسے چینا پیٹ نے جادو کی لکڑی حاصل کرنے کے لئے لاما سرائے میں قتل کیا تھا۔ اب دوسرے کا انتخاب عمل آ چکا ہے اور وہ آدمی جس نے یہ جگہ دی ہے، ہنکاؤ کے مندر کا بڑا پجاری اور ایک مشہور آدمی ہے۔ اس ہفتہ یا آئندہ ہفتہ میں اس کے پیکن پہنچنے کی امید کی جاتی تھی۔ مگر اب لادوان کے بہکانے سے یہ لوگ مجھے ہنکاؤ کا پجاری سمجھنے لگے ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ ان کی یہ غلط فہمی اس طرح قائم رہے۔ خدا نہ کرے۔ یہ بات ان کو معلوم ہو گئی کہ ہم نے انہیں دھوکا دیا ہے تو سمجھ لو کہ کوئی طاقت ہمیں زندہ نہیں رکھ سکتی اور اگر وہ اس راز سے واقف نہ ہوں تو پھر ہم اس آدمی کو جس کی جگہ میں لے چکا ہوں، باآسانی رستے سے ہٹا سکتے ہیں۔ جس حالت میں ان لوگوں سے تمام ضروری واقفیت حاصل کر لینا سہل ہوگا۔ خطرہ بہت ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی امر واقع ہے کہ ایسے موقعے بار بار ہاتھ نہیں آتے۔ پس ہمیں اس رعایت سے پوری طرح فائدہ اٹھانا ہوگا۔ اب میں جو کہتا ہوں، اسے بہ غور سنو...... آج رات میں اس مکان سے نکل کر کہیں نہیں جا سکتا۔ مگر ایک ضروری اطلاع ولیمز کو بھیجنا چاہتا ہوں۔ پس میں ایک خط لکھ دیتا ہوں۔ آپ اسے لے کر اس کے پاس جاؤ۔ خط میں لکھا جائے گا کہ وہ کل سویرے پہلی فرصت میں دو بحری تار روانہ کر دے......"

کوٹ کی چوڑی سی آستین سے چھوٹی بک نکال کر وہ اسی جگہ فرشی زمین پر بیٹھ گیا اور فونٹین پین سے لکھنے لگا۔ تقریباً پانچ منٹ کمرے میں گہری خاموشی طاری رہی۔ اس کے بعد ڈاکٹر نکولا نے نوٹ بک سے دو تین ورق پھاڑے اور مجھے دیتے ہوئے کہا۔

"انہیں ولیمز کے پاس لے جانا بہت ضروری ہے۔ اس دوسرے آدمی کا پتا کیا جائے اور وہ دو شخص جن کے نام میں تار بھیج رہا ہوں۔ ہنکاؤ کی لاما سرائے کے پجاری کو جس کے یہاں آنے کی ہر گھڑی امید ہے پکڑ کر سمندر کی طرف لے جائیں اور اس وقت تک زیر حراست رکھیں۔ حتیٰ کہ ہم اپنے کام سے فارغ ہو کر بہ حفاظت شنگھائی پہنچ جائیں۔"

"مگر وہ تار جن کا آپ ذکر کر رہے ہیں، کس کے نام بھیجے جائیں گے؟" میں نے دریافت کیا۔

"دو شخصوں کو جن پر مجھے پورا اعتماد ہے۔" ڈاکٹر نکولا نے بغیر کسی تامل کے بتایا۔ "ایک کا نام الیت اور دوسرے کا پرنڈرگاٹ ہے۔ ولیمز ان دونوں کے نام تار روانہ کر دے گا۔"

یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر نکولا نے کاغذ کا ایک اور پرزہ میرے ہاتھ میں دے دیا، جس پر لکھا ہوا تھا۔

بنام پرنڈرگاٹ والیٹ اوور معرفت گریگن ہانگ کانگ۔

ڈاکٹر نکولا۔

میں جب باہر نکلا تو وہی دربان جس نے دروازہ کھولا تھا۔ ڈیوڑھی میں نظر آیا اور مجھے بازار تک چھوڑ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں۔ اس تھوڑی سی دیر میں رات کی حالت بالکل بدل گئی ہے۔ ہم جب ولیمز کے مکان سے روانہ ہوئے تو نکھرے ہوئے آسمان پر تارے جھل ملاتے تھے۔ مگر اب مطلع تاریک تھا اور سیاہ بادل کے ٹکڑے آسمان میں ادھر ادھر تیرتے پھر رہے تھے۔ چند ہی قدم آگے گیا تھا کہ بجلی بڑے زور سے چمکی اور پھر اس طرح کڑکی...... گویا فاصلہ پر توپوں کی باڑ چل رہی ہو۔

رات زیادہ نہیں گزری تھی۔ یعنی تقریباً رات کے گیارہ بجے کا سماں تھا۔ مگر ابھی سے شہر پر ایک عجیب سناٹا چھایا ہوا تھا۔ راستے میں کچھ چینی دیکھے۔ ان کے چہرے حواس باختہ تھے اور بعض مقامات پر چند آدمیوں کو جمع ہو کر باتیں کرتے سنا۔ کچھ اس طرح کے الفاظ میرے کانوں میں گونجے جن سے ایسا لگتا تھا، شہر میں کوئی خطرناک ہنگامہ پیش آنے والا ہے۔

مگر میں نے ان باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی۔ کیوں کہ مجھے ولیمز کے مکان پر خط پہنچانا تھا۔ اس کے بعد میں جس تیز رفتاری سے واپس ڈاکٹر نکولا کے پاس جا سکتا تھا، جانا تھا۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ اس لئے میں بھی بے دھیانی میں چلتا گیا۔

مسٹر ولیمز کے مکان پر پہنچا تو ایک کھڑکی میں تیز روشنی نظر آئی۔ پاس جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک چوڑی میز پر بیٹھا ہوا کچھ لکھ رہا ہے۔ مجھے دو تین بار کھڑکی کا شیشہ کھٹ کھٹانا پڑا تھا۔ پھر اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا تھا۔ اس کا چہرہ سوالیہ نشان تھا جس سے یہ اندازہ ہوا کہ وہ مجھے چینی لباس میں پہچان نہیں سکا۔

"کون ہو تم......؟" اس نے قدرے خشک لہجے میں چینی زبان میں پوچھا۔ "کیا چاہتے ہو؟"

میں چوں کہ اس وقت مذاق کے موڈ میں تھا اور اس سے کچھ مذاق کرنا چاہتا تھا، اس لئے آگے جھک کر دبی آواز میں جواب دیا۔ ”میں آپ سے صرف ایک چھوٹا سا سوال پوچھنا چاہتا ہوں...... اگر آپ اس کا......“

”یہ وقت سوال پوچھنے کا نہیں ہے۔“ اس نے بے رخی سے جواب دیا۔ ”تم صبح آ کر جو پوچھنا چاہو پوچھ سکتے ہو۔“

”تب یہ معاملہ بعد از وقت ہو جائے گا۔“ میں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”اس لئے میں آپ کو آپ کے بزرگوں کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ مجھے جو کچھ کہنا ہے وہ آپ ابھی اور اسی وقت سن لیں۔“

”اگر ایسی بات ہے تو پھر ایسا کرو کہ جو بیان کرنا ہے وہ اندر آ کر جلدی سے کر دو۔“ اس نے مضطربانہ لہجے میں کہا اور پھر اس نے ایک طرف ہٹ کر مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

میں کمرے میں داخل ہو کر ایک اونچے اسٹول پر بیٹھ گیا اور جیسا کہ اہل چین کا شیوہ ہے کہ دونوں ہاتھ ڈھیلی آستینوں کے اندر چھپالیں۔ پھر اس خیال سے کہ چینی ہر بات کو بڑے اطمینان اور آہستگی سے بیان کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ میں نے گفتگو کو طول دینا شروع کیا۔ میں نے ان کے بشرے سے محسوس کیا کہ وہ میری بے سروپا باتوں سے بے زار اور تنگ آ چکے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ اتنی دیر میں انہوں نے مجھے پہچانا نہیں تھا۔ دراصل میں نے بہروپ ہی ایسا بھرا تھا۔ پھر میں نے کچھ دیر بعد آگے جھک کر سرگوشی میں آہستگی سے کہا۔

”کیا آپ کو اس بات کا علم ہے یا آپ نے محسوس کیا ہے کہ غروب آفتاب سے اب تک آپ کے مکان کی نگرانی ہو رہی ہے؟“

”کیوں......؟“ اس نے مضطربانہ لہجے میں سوال کیا۔ ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ”وہ کس لئے؟“

”اس لئے کہ آج شام دو اجنبی بحری جہاز سے آپ کے پاس آئے تھے اور شاید اس مکان میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”کون اجنبی......؟ تم کن کا ذکر کرتے ہو۔“ انہوں نے بھولپن سے پوچھا اور پھر وہ مجھے متجسس نظروں سے دیکھنے لگے۔

”ایک وہ جسے لوگ شیطان آنکھوں والا کہتے ہیں اور جس کا صحیح نام نکولا مشہور ہے اور دوسرا اس کا ساتھی......“ میں نے کہا۔ میں نے نکولا کا نام اس انداز سے لیا تھا جس طرح چینی لیا کرتے ہیں۔ اس کے بعد میں اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ اس پر اس بات کا کیا اثر ہوتا ہے۔ وہ مضطرب اور بے حد پریشان تھے۔ مگر اس کے باوجود وہ اس بات کا کچھ جواب دینے پر آمادہ نہ تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے ٹالنا چاہتے ہیں۔ اب میں نے اس مذاق کو جاری رکھنا مناسب نہیں سمجھا۔ پھر صاف اور شستہ لہجے میں انگریزی میں کہا۔

”مسٹر ولیبز معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے مجھے اب تک نہیں پہچانا......؟“

ولیبز چونک گئے۔ انہوں نے مجھے اوپر سے نیچے تک گہری نظروں سے دیکھا۔ ”ہاں...... اب میں

نے آپ کو پہچان لیا...... آپ نکولا کے ساتھی مسٹر آنند پال ہیں۔“

”جی...... میں وہی آپ کا خادم ہوں۔“ میں نے ہنس کر جواب دیا۔ ”اور اب سنیے...... میں ایک ضروری کام سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں......“ اور میں نے ڈاکٹر نکولا کی دی ہوئی پرچی نکال کر ان کی طرف بڑھا دی۔ مسٹر ولیبز نے یہ غور سے پڑھا۔ میں نے ان کے بشرے سے محسوس کیا کہ ایک بار پڑھ کر ان کا اطمینان نہیں ہوا۔ پھر انہوں نے اسے دوبارہ اور سہ بارہ پڑھا۔ حتیٰ کہ اس کا مضمون انہیں از بر ہو گیا تو وہ ایک تجوری کی طرف گئے جو کمرے کے ایک کونے میں تھی۔ اسے کھول کر چٹھی کو اس میں رکھ دیا۔ پھر اپنی جگہ آ کر بیٹھ گئے۔ مگر میں نے دیکھا کہ ان کی پیشانی فکر آلود تھی۔ اب وہ بشرے سے اضطراب اور پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے کہا۔

”مسٹر آنند پال! میں جانتا ہوں کہ آپ ڈاکٹر نکولا کے معتمد ہیں۔ بہر حال یہ بتایئے۔ اس خط کے مضمون کو آپ نے پڑھا ہے؟“

”کیا یہ اس آدمی کے متعلق نہیں جس سے ایک طلسمی لکڑی کو حاصل کرنے کے بعد میں پیکن آنے کی امید کی جاتی ہے؟“ میں نے جواب دیا۔

”ہاں...“ انہوں نے بے چینی سے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اس خط کا آدمی سے واقعی کچھ تعلق تو ہے؟“

”اور آپ سوچ رہے ہیں...... کیا ڈاکٹر نکولا کی تحریک پر اس آدمی کو بھگا لے جانے کی تجویز پر عمل کیا جائے۔“ میں نے پوچھا۔

”آپ نے ٹھیک کہا......“ ولیبز نے کہا۔ ”مگر ڈاکٹر نکولا شاید اس بات سے واقف نہیں کہ جس کے بارے میں اس نے یہ تحریک کی ہے وہ ہنکاؤ کے سب سے بڑے مندر کا پجاری ہے۔“ وہ اپنی بات ختم کر کے مجھے دیکھنے لگے۔

”اس آدمی کے بارے میں انہیں علم ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”مگر آپ اس آدمی کا صیغہ ماضی میں کرتے ہیں۔ کیا اب وہ اس عہدہ پر نہیں ہے؟“

”نہیں......“ ولیبز نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”یہ مصدقہ اطلاع ہے۔ یہ غلط نہیں ہو سکتی۔“

”تب میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس کام کی مشکلات بہت گھٹ جائیں گی۔ کیوں!“ میں نے کہا۔

”بے شک اس کام کی مشکلات ایک طرح سے بہت گھٹ جائیں گی...... مگر دوسری طرف سے ان میں اضافہ بھی ہو جائے گا۔“ وہ کہنے لگے۔ ”اگر وہ شخص اب تک پجاری ہوا اور ہم اسے بھگانے کی کوشش کریں تو ہمارا مقابلہ حکومت اور اس کی مذہبی جماعت سے ہوگا۔ لیکن دوسری صورت میں اگر کسی طرح ہمارے ارادے ظاہر ہو جائیں تو پھر ہمارا مقابلہ اس زبردست جماعت سے ہوگا جو دنیا بھر کی حکومتوں اور مذہبی جماعتوں سے زیادہ طاقت ور اور بارسوخ بھی ہے۔“

”مگر اس معاملے میں ڈاکٹر نکولا نے آپ کو کچھ نہ کچھ ہدایات ضرور بھیجی ہوں گی۔“ میں نے کہا۔

”وہ ایک دور اندیش شخص ہے۔“

"بھیجی ہیں اور مجھے اس کی تعمیل سے کوئی انکار بھی نہیں ہے۔" ولیمز کہنے لگے۔ "میرے لئے پاور فل خفیہ اور جرائم پیشہ تنظیموں سے مقابلہ کرنا بہت سہل ہے مگر ڈاکٹر نکولا کے حکم کی خلاف ورزی بہت مشکل ہے۔ اس کے باوجود میں یہ کہنا چاہوں گا کہ اگر ڈاکٹر نکولا نے اس تلاش کو جاری رکھا تو اس کی اور آپ کی جانوں کا خدا حافظ...... ذرا اس معاملہ پر سنجیدگی سے غور کر کے دیکھئے اور اچھی طرح سے جائزہ لیں۔ وہ جس جماعت کے اسرار معلوم کرنا چاہتا ہے۔ دنیا کی سب سے زبردست تنظیم ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اس کے دو کروڑ ممبر اطراف عالم میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے ارکان نہ صرف انڈونیشیا، ملائشیا، ہندوستان اور آسٹریلیا میں بلکہ امریکا اور وسطی یورپ میں بھی پائے جاتے ہیں اور پھر اس کے قواعد اتنے سخت ہیں کہ بیان نہیں ہو سکتے۔ ایسے حالات میں جو شخص اس جماعت کے تین لیڈروں میں سے ایک کا بھیس اختیار کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی مشکلات کا اندازہ کرنا دشوار نہیں...... خصوصاً اس حالت میں کہ افشائے راز کا خوف ہر قدم پر موجود ہوگا۔ اس سے کیسے محفوظ رہا جا سکتا ہوگا۔"

"آپ نے جو کچھ بھی فرمایا مجھے اس سے انکار نہیں وہ سو فیصد درست ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کے باوجود وہ بھی اپنے نام کا نکولا ہے۔ اس کی قابلیت اور صلاحیتیں حیرت انگیز ہیں اور وہ ایک ناقابل تسخیر انسان ہے۔"

"ہاں...... بے شک میں بھی اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ اس کی ذہانت غیر معمولی ہے۔" ولیمز نے کہا۔ "اس کی ذہانت نے بڑے بڑے معرکے انجام دیئے اور اس ایک لفظ نکولا میں بہت کچھ آ جاتا ہے۔"

"تو اب آپ کیا فرماتے ہیں مسٹر ولیمز!" میں نے پوچھا۔ "میں اس خط کا کیا جواب لے جاؤں؟"

"میں اس کام کو فوراً شروع کر دوں گا۔" انہوں نے جواب دیا۔ "میں اس کا جواب لکھے دیتا ہوں تا کہ مغالطہ نہ ہو۔"

پھر اس نے میز پر بیٹھ کر ایک لمحے میں کچھ لکھا۔ پھر اس خط کو تہہ کر کے میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے وہ خط بڑی احتیاط سے جیب میں رکھ لیا۔ پھر میں جانے کے لئے اٹھا اور پوچھا۔

"ان تاروں کے متعلق...... کیا ارادہ ہے؟ ڈاکٹر نکولا سے کیا کہوں؟"

"میں سویرے تار گھر کھلتے ہی روانہ کر دوں گا۔" ولیمز نے جواب دیا۔ "میں نے اس خط میں پورا حال لکھ دیا ہے۔"

"ہم چوں کہ دن کے طلوع ہوتے ہی پیکن روانہ ہو جائیں گے۔ لہٰذا میں آپ کو الوداع کہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"غالباً آپ کو یقیناً اس بات کا اچھی طرح سے اطمینان ہو گیا ہوگا کہ یہ کام کتنا خطرناک ہے۔" ولیمز نے کہا۔ "یہ خدا جانتا ہے کہ آپ دونوں اس مہم سے زندہ بچ کر آئیں یا نہ آئیں۔ ڈاکٹر نکولا شیر کی دم پر پیر رکھے گا۔"

"یہ میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "ڈاکٹر نکولا نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ

زندگی کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔"

"تو آپ اس کے باوجود بھی اس کے ساتھ جانے پر تیار ہیں۔" ولیمز نے کہا۔ "تو پھر آپ کی حوصلہ مندی کی جتنی تعریف کی جائے، کم ہے۔"

"آپ اسے میری حوصلہ مندی کہہ لیں یا کوئی انتہائی مجبوری۔" میں نے کہا۔

"خیر جو کچھ بھی ہو، آپ کی یہ ہمت اور جرأت بہت خوب ہے۔" ولیمز نے میرا شانہ تھپتھپایا۔

پھر میں نے ان کے ساتھ گرم جوشی سے الوداعی مصافحہ کیا۔ وہ مجھے دروازے کے باہر تک رخصت کرنے آئے۔ جب میں وہاں سے آیا تو کچھ فاصلہ پر جو گھڑیال تھا، اس نے بارہ بجائے۔ آسمان جو پہلے بادلوں سے گھرا ہوا تھا، اب وہاں بادل نہ تھے بادل منتشر ہو چکے تھے اور جگہ جگہ روشن تارے جگمگا رہے تھے۔

جس وقت میں شہر میں داخل ہوا تو میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔ میری چھٹی حس نے ایک ان جانے خطرے سے آگاہ کیا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آنے والا ہے۔ وہ بالکل صحیح تھا۔ چھٹی حس کی آگاہی غلط نہیں ہوتی ہے، عموماً درست ہوتی ہے۔ میں نے کوئی سو قدم کی مسافت طے کی تھی کہ غضب ناک آوازوں کا شور جو طوفانی سمندر کی خوف ناک آواز سے ملتا ہوا تھا، میرے کانوں میں پہنچا اور پھر رفتہ رفتہ بڑھتا گیا۔ اس کے فوراً بعد ایک بھاری ہجوم دریا کے سیلاب کی مانند اس بازار میں داخل ہوا۔ جس میں، میں چل رہا تھا۔ مجھے بھی اپنے ساتھ بہا کر لے گیا۔ میں اس کی زد میں آنے سے اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکا۔ اس وقت ممکن ہوتا تو میں شاید پیچھے ہٹنے کی کوشش کرتا مگر اس کا کوئی موقع ہی نہ تھا۔ چاروں طرف سے ہجوم میں گھر کر طوعاً و کرہاً اس کے ساتھ ساتھ ہولیا۔ میں مجبور ہو گیا تھا۔ کوئی چھوٹا ہجوم ہوتا تو میں نکل آتا۔ یہ سمندر کی اس بڑی موج کی لہر کی طرح تھا، جس کی زد میں لانچیں اور چھوٹے جہاز بھی ڈگمگا جاتے ہیں۔

تقریباً آدھا میل ہم اس طرح چلتے گئے اور اس اثنا میں خلقت کا جوش بڑھتا ہی گیا۔ اس کے بعد دفعتاً وہ لوگ ایک گلی میں مڑ کر ایک متوسط مکان کے پاس کھڑے ہو گئے۔ مجھے اب تک معلوم نہ تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ اس دھارے میں، میں کس سے اور کیسے پوچھتا۔ اب موقع تھا۔ ایک چینی نوجوان کے پاس جا کر جو ذرا ہٹ کر کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ اس جلوس اور اس جوش و خروش کا کیا مطلب ہے؟"

"کویڈوز......" اس نے بڑا مختصر سا جواب دیا۔ اس کے معنی تھے چینی زبان میں شیطان کے۔

اس نے مجھے جواب دینے کے بعد ایک پتھر اٹھا کر اس مکان کی ایک کھڑکی کی طرف پھینکا۔

ایک اور نے بتایا کہ یہ کس کا مکان ہے اور یہ لوگ جوش جہالت میں اس کے آزار کے درپے ہو رہے ہیں۔ حسن اتفاق سے وہ اس وقت گھر پر موجود نہیں تھا۔ پہلے تو میرے جی میں آیا کہ میں ان لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کروں۔ مگر چوں کہ ہجوم حملہ کرنے پر تلا ہوا تھا اور مشتعل ہو رہا تھا، اس لئے فہمائش بے سود اور ٹھہرنا لاحاصل تھا۔ لہٰذا انہیں ان کی حالت میں چھوڑ کر چلا آیا۔

مگر اس رات کے عجیب واقعات کا سلسلہ ختم نہ ہوا تھا۔ چند قدم آگے جا کر میں جب دوسرے بازار

میں مڑا تو کسی عورت کی دل دوز چیخ سنائی دی جس نے رات کی گہری خاموشی کو چیر دیا تھا اور میرے کانوں میں گونجی تو میرے بدن پر سنسنی دوڑ گئی۔

میں عورت کی چیخ سنتے ہی ٹھٹک کے رک گیا۔ ایسا لگا کوئی درندہ صفت آدمی عورت کی بے حرمتی کرنے پر تلا ہوا ہے۔ وہ غریب اپنی عزت بچانے کے لئے مدد کے لئے پکار رہی ہے اور شاید مزاحمت بھی کرتی جا رہی ہے۔ درندہ اسے قابو میں کر کے بے بس کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اگر وہ عورت اس درندے کے ہاتھوں بے بس ہو گئی ہوتی تو پھر اس کی آواز سنائی نہیں دیتی۔

میں رک کر یہ اندازہ کر رہا تھا کہ یہ آواز کہاں سے آئی تھی۔ کسی مکان سے یا کسی دکان کے برآمدے سے...... وہ عورت اس بازار سے نیم اندھیرے میں گزر رہی ہو گی کہ کسی درندہ صفت نے اسے دیکھا اور پھر دبوچ لیا ہو گا۔ کچھ اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ ایسا لگا تھا کہ اس درندہ صفت نے اس عورت کا منہ بند کر دیا اور اس کی بے بسی سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ مگر دوسرے لمحے پھر اس عورت کی دل خراش چیخیں پے در پے سنائی دیں۔ اب اندازہ ہو گیا کہ وہ دائیں ہاتھ کی تنگ گلی سے آ رہی ہیں۔ میں نے انجام کی پرواہ نہیں کی۔ میں اس بات کو کیسے پسند کرتا کہ کوئی درندہ صفت کسی کی بے حرمتی کرے۔ میں نے چشم تصور میں ایسا محسوس کیا کہ وہ عورت اس درندے کے ہاتھوں مجبور ہوتی جا رہی ہے۔ میں بے تحاشا اس تنگ گلی کی جانب لپک گیا۔ اس گلی میں ایک جگہ ملگجا سا اندھیرا تھا۔ پہلے تو کچھ صاف نظر نہیں آیا۔ صرف تین ہیولے دکھائی دیئے۔ کچھ ایسا محسوس ہوا کہ دو مرد مل کر عورت کے ساتھ دست درازی اور اسے بے لباس کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کچھ اور قریب ہوا تو تین صورتیں واضح ہو گئیں۔

ایک تو عمر رسیدہ انگریز تھا۔ دوسری ایک بہت ہی خوبصورت اور جوان اور پر شباب لڑکی جو بہت پر کشش تھی۔ اس کا لباس دو ایک جگہ سے پھٹا ہوا تھا، تیسرا ایک ادنیٰ حیثیت کا کوئی چینی جو ایک طرح سے اوباش لگ رہا تھا، اس کے ہاتھ میں ایک کھلا ہوا چاقو تھا۔ فرش پر گرے ہوئے مرد کے پہلو میں کھڑی لڑکی کو دھمکا رہا تھا اور اس سے کہہ رہا تھا۔ "اگر تمہیں اپنی جان پیاری ہے تو اس دکان کے عقب میں چلو...... تم مجھے خوش کر دو تو میں تمہیں گھنٹے بعد جانے دے دوں گا۔"

میں نے اس وقت پیر میں چڑی چپل پہنی ہوئی تھی۔ گلی میں نیم اندھیرا تھا۔ اس لئے میرے دوڑنے سے نہ تو آہٹ ہوئی تھی۔ اس لئے میرے آنے کا حال اس وقت ان دونوں کے علم میں نہ آ سکا جب تک میں قریب نہ پہنچ گیا۔ جب اس لڑکی نے جو میری آمد سے بے خبر تھی، وہ غضب ناک ہو کر اس درندہ مرد کی طرف بڑھی جو اس کا لباس پھاڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس لڑکی نے اس درندے کے منہ پر تھوک دیا۔ وہ اس درندے پر جھپٹ کر شاید اس کی آنکھیں پھوڑ دینا چاہتی تھی۔ اس لڑکی کا اس کے منہ پر تھوکنا تھا کہ وہ بری طرح مشتعل ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ میں اس لڑکی کی کوئی مدد کرتا اور اس درندے کے ہاتھ سے چاقو چھینتا، اس درندے نے لڑکی کے شانے میں چاقو بھونک دیا۔ اس نے اس بات میں بڑی ذلت اور توہین محسوس کی تھی، اس لئے وہ برداشت نہ کر سکا۔

مجھے اس درندے کے پاس پہنچنے میں ایک لمحہ کی تاخیر ہو گئی تھی۔ میں نے اپنی پوری طاقت جمع کر کے اس کے جبڑے پر ایک ایسا زبردست مکا رسید کیا کہ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑا۔ چند لمحوں تک بے حس و حرکت رہا۔ پھر جلد ہی ہوش میں آ کر اٹھا۔ اور "کویڈوز...... کویڈوز...... کویڈوز......" ہذیانی لہجے میں چلاتا ہوا اس بازار کی طرف اندھا دھند دوڑنے لگا جہاں سے میں آیا تھا۔ شاید وہ اس ہجوم کو اپنی مدد کے لئے بلانے کے لئے دوڑا تھا۔

اس کے نظروں سے اوجھل اور اندھیرے میں غائب ہوتے ہی میں اس لڑکی کے پہلو میں جو زخمی ہو کر اور خوف و دہشت سے بے ہوش ہو گئی تھی، دوزانو ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کا بایاں کندھا خون سے تر تھا۔ لیکن میں نے غور سے دیکھا۔ زخم زیادہ گہرا نہ تھا۔ اس نے چاقو سے وار دہشت زدہ کرنے کے لئے کیا تھا۔ شانے پر زخم ٹھیک سے نہ لگا تھا۔

پھر میں نے اس بوڑھے شخص کی طرف دیکھا جو قریب ہی پڑا ہوا تھا۔ وہ دراز قد، سن رسیدہ آدمی تھا۔ لباس عمدہ اور چہرے پر نور اور داڑھی تھی۔ مگر وہ جس حالت میں فرش پر پڑا ہوا تھا، اس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ مر چکا ہے۔ پھر میں نے اس کی نبض دیکھی کہ کیا معلوم اس میں زندگی موجود ہو۔ لیکن میرا خیال درست ثابت ہوا۔ دل کی دھڑکن بند ہو چکی تھی۔

جب میں نے اپنی اچھی طرح سے تسلی کر لی کہ یہ آدمی اس دنیا سے جا چکا ہے۔ میں نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ بے حس و حرکت تھی۔ میں اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ اس نے آنکھیں کھول دیں اور کراہنے لگی لیکن اس پر ایک مدہوشی سی طاری تھی۔ پھر اس نے بڑی نحیف آواز میں مجھے اپنے پاس دیکھ کر انگریزی زبان میں پوچھا۔

"میں کہاں ہوں...... میری یہ حالت کیا ہو رہی ہے...... مجھے کیا ہو گیا ہے؟"

"آپ نہ گھبرائیں۔" میں نے اسے دلاسا دیا۔ "آپ کو ایک بدمعاش زخمی کر کے فرار ہو گیا۔ آپ مجھے اپنا دوست سمجھیں......"

"میرے والد......؟" اس نے رندھی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "وہ کیسے ہیں...... انہیں اس بدمعاش......"

"آپ کے والد......؟" میں نے درمیان میں تیزی سے کہا۔ اب چونکہ اسے اندھیرے میں رکھنا لاحاصل تھا۔ اس لئے میں نے کہا۔

"میں آپ کو نہایت افسوس ناک خبر سنانے پر مجبور ہوں۔ وہ اس بدمعاش کے ہاتھوں قتل ہو چکے ہیں۔"

یہ سنتے ہی اس لڑکی نے ایک دردناک چیخ ماری اور اس کے حواس جواب دے گئے تھے۔ اس پر پھر بے ہوشی طاری ہو گئی۔

میں نے اس کے باپ کی لاش کو اٹھا کر ایک دکان کے سائبان میں لٹا دیا۔ وہاں اندھیرا تھا۔ اس کی لاش سڑک سے نظر نہ آتی تھی۔ پھر میں تیزی سے لڑکی کی طرف آیا۔ اس بات کا امکان تھا کہ وہ بدمعاش اپنے ساتھیوں کے ساتھ آ کر اسے لے جا سکتا تھا۔ ایسی حسین اور پرکشش لڑکی سے وہ کسی قیمت پر ہاتھ دھونا

پسند نہیں کرتا۔ میں نے اس لڑکی کو گود میں اٹھایا اور کندھے پر ڈال کر اس سمت چلنے لگا جدھر جانا تھا۔

قدرے فاصلے پر بپھرے ہوئے ہجوم کے پرجوش نعرے جو بدنصیب مقتول کے مکان کے ساتھ ساتھ لگائے جا رہے تھے۔ وہ مدھم سے سنائی دے رہے تھے۔ مگر وہ خوف ناک تھے۔ مگر برابر سنائی دے رہے تھے۔

تقریباً دس منٹ کے بعد میں اسے لے کر اس مکان پر پہنچا جس میں ڈاکٹر نکولا مقیم تھا۔ میں نے اس پر اس انداز سے دستک دی۔ جس طرح لادوان نے دی تھی اور طرح کی دستک پر دروازہ کھولا نہیں جاتا۔ دروازہ فوراً ہی کھول دیا گیا۔ میں نے خفیہ لفظ ادا کیا۔ جس کی بنا پر مجھے اندر داخل ہونے دے دیا گیا۔

اس دربان کو میرے کندھے پر ایک حسین اور جوان لڑکی کو بے ہوشی کی حالت میں دیکھ کر یقیناً حیرت ہوئی ہوگی لیکن اس نے اپنی حیرت کا اظہار نہیں کیا اور اس کا چہرہ سپاٹ اور ہر قسم کے جذبات سے عاری رہا۔ پھر بھی اس نے مجھے روک لیا اور پھر بے ہوش لڑکی کو دیکھ کر اس نے پوچھا۔ ''یہ آپ کے ساتھ کون ہے؟''

یہ میرے لئے بڑا مشکل وقت تھا اور اس کا سوال مجھے بڑا ناگوار سا لگا تھا۔ میں نے سوچا کہ نرمی سے کام نہیں لے چلے گا۔

''کیا تمہیں اس طرح سوال پوچھنے کا حق ہے......؟ کیا یہ تمہاری ذمے داری ہے۔ فرائض میں شامل ہے؟'' میں نے تیز و تند لہجے میں کہا۔

''میں نے اپنے آقا کے حکم کی تعمیل کی . انہوں نے مجھے اس غیر ملکی شیطان لڑکی کو یہاں لانے کا حکم دیا تھا۔ جب میں نے اسے چلنے پر کہا تو وہ نہ مانی۔ پھر مجھے جبر و زبردستی کرنی پڑی، جس پر ڈر کر بے ہوش ہو گئی ہے۔ لیکن تم حجت کرنے والے کون ہو؟ تمہاری بہتری اس میں ہے کہ ایک طرف ہٹ جاؤ۔ ورنہ اس بے جا مداخلت پر تمہیں جلد ہی تاسف ہوگا۔''

میری دھمکی کارگر ثابت ہوئی۔ وہ قدرے پریشان ہو گیا۔ آخر لمحہ بھر تامل کر کے اس نے مجھے جانے کا راستہ دے دیا۔ پھر میں اس لڑکی کو لئے کمرے میں داخل ہوا۔ جہاں نکولا انتظار کر رہا تھا۔

''کیا وجہ تھی جو آپ نے اتنی دیر کر دی......؟'' مجھے دیکھ کر وہ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ ''میں آدھے گھنٹے سے برابر انتظار کر رہا ہوں......ایں......یہ آپ کسے اٹھا لائے ہیں......؟'' اس کے چہرے پر حیرت نمودار ہوئی۔

''ایک انگریز لڑکی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اس بدنصیب کو ایک بلوائی بدمعاش نے چاقو کے زور پر بے حرمتی کرنا چاہی تھی۔ اس نے مزاحمت کی تو اسے زخمی کر دیا۔ اگر میں بروقت نہ پہنچتا تو پھر یہ لڑکی اس درندے کی زیادتی کا نشانہ بن جاتی۔''

''مگر اسے یہاں لانے کی ضرورت کیا تھی؟'' ڈاکٹر نکولا نے گھبرا کر پوچھا۔ ''آپ نے اسے اس کے گھر پہنچا دیا ہوتا؟''

''اس لڑکی کو یہاں لانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اس بلوائی نے جو

اس لڑکی کی حرمت کے درپے تھا۔ اس کے باپ کو چاقو گھونپ کر ہلاک کر دیا۔ میرا اندازہ غلط نہیں۔ بلوائیوں نے اس کا مکان بھی تباہ و برباد کر دیا ہے۔ یہ لڑکی بے ہوش ہے اور زخمی بھی ہے۔ اس بدمعاش نے لڑکی پر چاقو سے وار کیا تھا لیکن گہرا زخم نہیں آیا۔''

''خیر......اس جگہ لٹا دو......'' ڈاکٹر نکولا نے بستر کی طرف اشارہ کیا۔ ''میں اس کا زخم ایک نظر دیکھ تو لوں۔''

جب میں نے اسے بستر پر لٹا کر اس کا لباس اور بے حجاب حصہ ٹھیک سے ڈھک دیا تو ڈاکٹر نکولا نے جھک کر اس کے زخم کا بہ غور معائنہ کیا اور احتیاط سے دھویا اور صاف کیا۔ پھر دوائیوں کا ایک چھوٹا سا صندوق جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتا تھا، کھول کر اس میں سے مرہم نکالا اور زخم پر لگایا۔ اس پر کپڑا باندھ دیا۔ پھر اس نے لباس کے پھٹے حصے پر کپڑے کا ٹیپ لگا دیا، جس سے اب وہ حصے بے حجاب نہیں تھے۔ پھر اس نے فارغ ہو کر کہا۔

''اب آپ اس لڑکی کو سہارا دے کر اس کا سر اونچا اٹھاؤ...... میں اس دوا کا اثر آزمانا چاہتا ہوں۔''

اس نے اس صندوقچہ سے ایک چھوٹی کٹ گلاس کی شیشی، جیسی عورتیں خوشبو کے لئے استعمال کیا کرتی ہیں نکالی۔ پھر اس لڑکی کا دہانہ کھول کر کسی بے رنگ سیال کے چند قطرے اس کی زبان پر ٹپکا دیئے۔ اس پر چند لمحوں کے بعد لڑکی نے آنکھیں کھول دیں۔ پہلے مضطربانہ انداز سے چاروں طرف دیکھا۔ پھر دو چینیوں (کیوں کہ ابھی تک ہم دونوں چینی لباس میں ملبوس تھے) کو جھکا ہوا دیکھ کر خوف سے اٹھ کر پیچھے ہٹ گئی۔

ڈاکٹر نکولا نے جو اس کے پاس دوزانو بیٹھا ہوا تھا، اس نے فوراً ہی لڑکی سے انگریزی زبان میں کہا۔

''ڈرو نہیں......اب تم ہر طرح محفوظ ہو اور کوئی خطرے والی بات نہیں ہے۔'' ان لفظوں نے شاید اس لڑکی پر ان واقعات کی یاد تازہ کر دی جو گلی میں پیش آئے تھے۔

''میرے والد......؟'' اس نے پریشان ہو کر میری طرف دیکھا۔ ''خدا جانے ان کا کیا حال ہوا ہوگا؟''

''آپ کی عزت اور جان بچانے کے لئے میں ان کی لاش وہیں چھوڑ آنے پر مجبور تھا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں نے ان کی لاش ایک ایسی جگہ رکھ دی کہ بلوائیوں کی ان پر رات کے وقت نظر نہیں پڑ سکتی۔ وہ اس جگہ ہر طرح محفوظ رہے گی۔''

''مجھے جانے دیں......'' لڑکی تڑپ کر بولی۔ ''میں ان کے پاس جانا چاہتی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے لڑکی نے اٹھنے کی کوشش کی تو ڈاکٹر نکولا نے اسے روک دیا اور کہا۔

''آپ کی یہ حرکت خطرناک ہوگی......اس وقت بلوائی جنون کی حالت میں اندھے ہو رہے ہیں اور پھر وہ بدمعاش جو آپ کی عزت کے درپے تھا، وہ کسی وحشی اور بھوکے درندے کی طرح اپنے ساتھیوں کے ساتھ آپ کی تلاش میں خوار ہو رہا ہوگا۔ انہوں نے دیکھ لیا تو آپ کسی قیمت پر ان کی درندگی سے بچ نہیں سکیں گی۔ اس لئے سر دست آپ آرام کریں۔ میں ایسا انتظام کر دوں گا جس سے ان کی لاش ہر طرح محفوظ رہے گی......بلوائی ان کی لاش کی بے حرمتی نہیں کر سکیں گے۔''

”میں...... میں اپنے گھر جانا چاہتی ہوں......“ لڑکی سسک کر بولی۔ ”مجھے جانے دیں۔“

”عزیز لڑکی......“ ڈاکٹر نکولا نے اسے نرمی سے سمجھایا۔ ”افسوس کہ آپ پورے حالات سے واقف نہیں ہیں۔ میں صورت حال بتاتا ہوں۔ آپ کے گھر کی بلوائیوں نے اینٹ سے اینٹ بجادی ہے۔ اب آپ کہاں جاسکتی ہیں؟“

”ہائے افسوس...... اب میرا کیا ہوگا؟“ وہ سسک کر بولی۔ ”ان ظالموں نے میرے بے قصور اور معصوم باپ کو مار دیا...... صرف یہی نہیں بلکہ میرے گھر کو بھی تباہ و برباد کردیا۔ حالاں کہ انہیں یہاں کے مقامی لوگوں پر بڑا بھروسا تھا لیکن انہوں نے ان کی پشت میں چھرا گھونپ دیا...... وہ آستین کے سانپ نکلے...... میں نے کئی بار اپنے باپ سے کہا تھا کہ آپ ان پر اتنا بھروسا نہ کیا کریں۔“

نہ میں نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ کیا اور نہ ہی ڈاکٹر نکولا نے...... باپ کی موت سے اس کے دل کو گہرا صدمہ پہنچا تھا، وہ باپ کو یاد کر کے رونے لگی تو ڈاکٹر نکولا چپ چاپ اٹھا اور کمرے سے نکل گیا۔ میں نے اسے چپ نہیں کرایا۔ رونے دیا تاکہ دل کی بھڑاس نکل جائے۔ اس سے جی اور غم بھی ہلکا ہو جائے۔ وہ زاروقطار رو رہی تھی اور اس کی خوب صورت وغزالی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر نکولا تھوڑی دیر بعد کمرے میں آیا اور پھر اس نے لڑکی سے کہا۔ ”میں نے چند آدمی بھیج دیئے ہیں جو آپ کے والد کی لاش اٹھا لائیں گے اور آدھے گھنٹے کے اندر اندر سفارت خانے کی طرف سے قاتل کی تلاش شروع ہو جائے گی۔ اس اثنا میں مناسب سمجھو تو وہ حالات بیان کرو، جن کے باعث یہ واقعہ پیش آیا؟“

”اس وقت میرا دماغ بڑا ماؤف ہو رہا ہے۔“ اس نے رونا موقوف کر کے اپنے آنسو پونچھے۔ ”مجھے جو کچھ بھی یاد ہے بتائے دیتی ہوں۔ مگر حیرت ہے کہ اتنی سی بات کا اس قدر بھیانک نتیجہ پیش آیا۔ شام کو ساڑھے سات بجے میں اور میرے والد گرجا گئے۔ میں کئی دنوں سے ایسا محسوس کر رہی تھی کہ کچھ ہونے والا ہے۔ ایک ان جانا سا خوف محسوس ہونے لگتا تھا۔ جب ہم آج گرجا میں تھے تب میں نے محسوس کیا کہ آج فضا کچھ بگڑی ہوئی ہے۔ میں نے والد سے کہا کہ رات گرجا میں گزارتے ہیں۔ باہر کسی بات کا خطرہ ہے۔ والد نے جواب دیا کہ یہ تمہارا وہم ہے۔ مقامی لوگ بہت اچھے ہیں۔ ہم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ میں اور والد گرجا میں نماز ادا کرنے گئے تھے۔ کافی دیر عبادت میں مصروف رہے تھے۔ بہر حال جب ہم باہر آئے تو میرے احساس کی تصدیق ہوگئی۔ باہر ایک بھیڑ جمع تھی اور اس میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ مگر میں نہیں جانتی تھی کہ یہ لوگ ہمیں نشانہ بنائیں گے۔ میں نے ایک شخص کو دیکھا جو ایک طرف اور بھیڑ سے قدرے دور کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو اس کی نظروں کی گرفت میں پایا۔ میں نے اس کی نگاہوں میں دیکھی تو اسے یہ خیال کر کے نظر انداز کر دیا کہ میں چوں کہ بہت حسین اور پرکشش ہوں۔ اس لئے وہ مجھے ایسی نگاہوں سے دیکھنے پر مجبور ہے۔ اس بھیڑیئے نے اشتعال انگیز قسم کی نعرے بازی شروع کردی۔ پھر یہ ہجوم اس راہ پر چل پڑا جو ہمارے گھر کو جاتا تھا۔ پھر ہم نے ڈر کے مارے دوسرے راستے کا انتخاب کیا جو بازار سے گزرتا تھا۔ مگر جس وقت ہم ہٹ کر اس گلی میں پہنچے تو وہی بدمعاش جو گرجا

کے باہر کھڑا مجھے دیکھتا رہا تھا، دوڑتا ہوا آیا۔ لوہے کی سلاخ کی ضرب سے مار گرایا۔ اندھیرے میں واضح نہ ہوسکا یا اس نے چاقو گھونپا ہوگا۔ میں والد کی طرف متوجہ ہوئی تھی کہ اس نے مجھے فوراً ہی دبوچ لیا اور میرے گلے کے نیچے چاقو رکھ دیا اور کہا کہ میں تمہارے حصول کے لئے کئی دنوں سے ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا ہوں۔ تم میرے ساتھ چلو...... میری آرزو پوری کردو تو میں تمہاری جان بخش کردوں گا۔ تمہیں جانے دے دوں گا۔ اس نے من مانی کی کوشش کی تو میں اس کی گرفت سے نکل آئی۔ اس نے فضا میں چاقو لہرا کر مجھے ایک دکان کے عقب میں چلنے کے لئے کہا اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ تم کوڈوز کی بیٹی ہو...... تمہاری عزت پامال کرنا نیکی ہے۔ میں اس پر جھپٹی تھی کہ اس نے چاقو کا وار کیا اور مجھے ایسا لگا جیسے میرے شانہ میں انگارے بھر گئے ہیں۔ جس وقت اس نے میرے شانے میں چھرا گھونپا تھا کہ انہوں نے آکر مجھے بچالیا۔ یہ مسیحا بن کر آئے تھے۔ یہ نہ آتے تو وہ بدمعاش مجھ سے ایک کھلونے کی طرح کھیلتا......“

اپنی رام کہانی سنانے کے بعد اس نے اپنا ہاتھ میرے بازو پر رکھا اور بولی۔ ”اس احسان کا بدلہ جو آپ نے مجھ پر کیا ہے میں کیوں کر ادا کرسکتی ہوں۔“

”آپ ناحق اس کا ذکر کرتی ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”کاش! میں تھوری دیر پہلے مدد کے لئے پہنچ جاتا تو شاید آپ کے والد کو موت کے منہ میں جانے سے بچالیتا اور آپ کو زخمی ہونے سے بچالیتا...... اب جو نہیں ہونا تھا وہ ہو چکا۔ کیا کیا جائے۔“

”مگر میں نہیں جانتی کہ اب کیا کروں، کیا مر جاؤں؟“ وہ دل گرفتہ لہجے میں بولی۔

”کیا آپ کا اس شہر میں کوئی واقف کار نہیں ہے؟“ ڈاکٹر نکولا نے دریافت کیا۔ ”کیا آپ کسی واقف کار کے ہاں نہیں رہ سکتیں؟“

”افسوس کہ نہیں......“ لڑکی نے جواب دیا۔ ”میں اس شہر میں کسی کو نہیں جانتی۔ البتہ پیکن میں میری ایک بہن رہتی ہے، جس کی شادی ایک مشنری سے ہوئی تھی۔ اگر آپ لوگ مجھے وہاں پہنچادیں تو یہ بڑی عنایت ہوگی۔“

”میں خود تو نہیں لے جاسکتا۔“ ڈاکٹر نکولا نے جواب دیا۔ ”مگر ہاں ایسا انتظام کردوں گا کہ جس سے آپ وہاں پہنچ جائیں گی۔ اس اثنا میں آپ اس مکان میں ٹھہریں یہاں کسی طرح کا خطرہ نہیں ہے۔ نہ ہی آپ کو کوئی تکلیف ہوگی۔“ اتنا کہہ کر ڈاکٹر نکولا باہر چلا گیا۔

”میرے سب سے بڑے محسن آپ ہیں۔“ دفعتاً اس نے اپنی لانبی لانبی سرمگیں پلکیں جھپکا کر دزدیدہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

”آپ اسے احسان کا نام نہ دیں۔ کیوں کہ میں نے ایک انسانی فرض ادا کیا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اگر پھر کبھی کسی اوباش سے واسطہ پڑے تو دیدہ دلیری سے اس موقع پر کام لیں۔ کیا آپ اپنا تعارف کرانا پسند کریں گی۔ میں ابھی تک آپ کے نام سے ناواقف ہوں۔“

”میڈون میرا نام ہے......“ وہ کہنے لگی۔ ”گلیڈیز میری میڈون پورا نام ہے...... اور آپ کا......؟“

”اس لباس میں تو میرا نام ماہ پویا ہے۔ اس انداز کا کوئی اور ہونا چاہئے۔“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”میرا اصل نام آنند پال ہے۔“

”حیرت ہے..... آپ ہندوستانی ہو کر چینی لباس استعمال کرتے ہیں؟“ وہ مترنم آواز میں بولی۔ ” آخر اس کا سبب کیا ہے۔“

”افسوس ہے کہ میں سردست آپ کے اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔“ میں نے معذرت خواہاں لہجے میں کہا۔ ”اور یہ حقیقت ہے کہ مجھے آئندہ زندگی میں آپ جیسی کسی اور لڑکی کی دید نصیب نہ ہوگی۔ بنانے والے نے آپ کو بڑی توجہ سے بنایا ہے۔“

اس نے مجھے حیرت اور ساکت نظروں سے دیکھا اور پھر بولی۔ ”معاف کیجئے گا..... میں کچھ نہیں سمجھی..... کیا آپ اس کی وضاحت کریں گے؟“

”دراصل میں چند گھنٹوں کے بعد ایک ایسی مہم پر جا رہا ہوں۔ جس سے شاید ہی زندہ واپس آسکوں۔“ میں نے قدرے جذباتی لہجے میں کہا۔

”میں نہیں جانتا کہ میں آپ سے ایسی باتیں کیوں اور کس لئے کر رہا ہوں۔ یہ کوئی جذبہ ہے۔ جس نے ابھی ابھی جنم لیا ہے۔ جب کہ آپ سے واقفیت صرف دو ایک گھنٹے کی ہے۔ تاہم وہ اتنی مضبوط ہو چکی ہے۔ شاید برسوں میں بھی نہ ہوتی۔ ہم جیسے جنم جنم کے ساتھی رہے ہوں۔ آپ نے میرے احسان کا ذکر کیا تھا۔ جس طرح خون کا بدلہ ہوتا ہے اس طرح احسان کا بدلہ بھی احسان ہی ہوگا؟ کیوں؟“

”کہئے..... مجھ سے جو کچھ بھی ممکن ہوگا، دریغ نہ کروں گی۔“ اس نے اپنا مرمریں سڈول اور خوبصورت ہاتھ میرے شانہ رکھ دیا۔ اس کے ہاتھ کے حسن میں ایک انوکھا اور لطیف سا گداز تھا جو میرے سارے بدن میں ایک عجیب سا گداز اور فرحت بن کر اتر گیا۔ جس وقت میں اسے اٹھا کر لایا تھا تب میں نے ایسا محسوس نہیں کیا تھا جب کہ اس کے سارے جسم کا بوجھ مجھ پر لدا ہوا تھا۔

”یہ انگوٹھی..... میری محترم اور پیاری ماں نے مرتے وقت مجھے دی تھی۔“ میں نے اپنی انگلی سے انگوٹھی نکال کر اسے دکھائی۔ ”مگر اب میں جس جگہ جا رہا ہوں میں وہاں اسے کسی وجہ سے لے جانے کی جرأت نہیں کر سکتا ہوں۔ اس لئے آپ سے میری درخواست ہے کہ اسے میری امانت سمجھ کر اپنے پاس رکھیئے۔ اگر میں زندہ سلامت واپس نہ آیا تو میری خدمت اور میرے فرض کو جسے آپ احسان کہتی ہیں، اسے بہ غور یادگار پہنے رکھیئے گا۔ اس سے میرے قلب کو یہ اطمینان ہوگا اور پھر میں اسے ایک اعزاز سمجھوں گا کہ اس دنیا میں ایک ہستی ایسی ہے جو مجھے یاد رکھتی ہے..... اس کے پاس میری حقیر سی نشانی موجود ہے۔“

”میں اسے اپنے پاس ایک امانت کے طور پر بہت سنبھال کر رکھنے کا وعدہ کرتی ہوں۔“ اس نے ترنم خیز لہجے میں کہا۔ ”مگر وہ مہم جس پر آپ جا رہے ہیں کیا وہ اتنی ضروری اور اس قدر اہم ہے کہ اس کے لئے زندگی اور موت کا خطرہ مول لیا جا سکے؟“

میں نے جواب دینے کے بجائے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر وہ انگوٹھی اس کی مخروطی انگلی میں

پہنا دی۔ ”بس..... ایسا ہی سمجھئے.....“ میں نے مبہم طور پر جواب دیا۔ ”زندگی رہی۔ میں بچ کر آ گیا تو یہ انگوٹھی لینے ضرور آؤں گا۔“

”بہت اچھا.....“ اس نے اپنا خوش نما سر ہلایا۔ ”اس دوران میں بھی آپ کو دل میں بسائے رکھوں گی۔“

پھر چشم زدن میں جو کچھ ہوا وہ میرے لئے غیر متوقع تھا۔ اس نے میرے قریب آ کر میرا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں بھر لیا۔ اس کے حسین چہرے اور بھرے بھرے سرخ گداز ہونٹوں پر ایک دل کش سا تبسم تھا اور اس کی نشیلی آنکھوں میں خود سپردگی تھی۔ پھر وہ میرے چہرے پر جھک گئی۔ جیسے وہ مہر محبت ثبت کرنا چاہتی ہو۔

ہم دونوں دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو گئے۔ یہ لمحات شاید اور طویل ہو جاتے اگر کمرے کے باہر آہٹ سنائی نہ دیتی۔ ہم کیف و جہاں سے نکل آئے۔ جس میں ہر سمت دھنک کے رنگ ہی رنگ تھے۔ ہم دونوں ایک دم سے الگ ہو گئے۔ اس نے فوراً ہی بال درست کئے اور ایک طرف بیٹھ گئی اور پرسکون اور طمانیت کی حالت میں نظر آنے لگی۔

چند لمحوں کے بعد ڈاکٹر نکولا کمرے میں داخل ہوا اور مس میڈون سے بولا۔ ”لیجئے..... میں نے آپ کو بہ حفاظت ایک دوست کے مکان پر پہنچانے کا بندوبست کر دیا ہے۔ وہ ہر طرح آپ کی خدمت گزاری کرے گا۔ خیال بھی رکھے گا۔ پھر جب موقع محل ہوگا تو آپ اپنی بہن کے پاس جا سکتی ہیں۔ چلئے..... سواری دروازے پر حاضر ہے..... مسٹر آنند پال! آپ مس میڈون کو باہر تک چھوڑ آئیں۔“

یہ سنتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر وہ ڈاکٹر نکولا سے ممنونیت سے بولی۔ ”میں آپ کی اس زحمت اور عنایت کا بہت بہت شکریہ ادا کرتی ہوں۔“

ڈاکٹر نکولا نے فوراً ہی ہاتھ اٹھا کر ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ ”میرے خیال میں کسی شکریہ کی ضرورت نہیں۔“ ڈاکٹر نکولا نے کہا۔ ”البتہ ایک بات کی میں آپ سے درخواست ضرور کروں گا۔“

”فرمائیے.....“ اس نے اپنی پلکیں جھپکائیں۔ ”شرمندہ نہ کریں۔ آپ درخواست نہیں بلکہ حکم دیں۔“

”مہربانی سے آج کی ملاقات کا حال کسی سے ظاہر نہ کیجئے گا۔“ ڈاکٹر نکولا بولا۔ ”بس آپ اتنا سمجھ لیں کہ ہماری جانوں کی حفاظت کا راز آپ کی خاموشی اور راز داری میں پوشیدہ ہوگا۔“

”آپ بے فکر اور مطمئن رہیں۔“ اس نے یقین دلایا۔ ”میرے منہ سے اس بارے میں ایک لفظ تک نہیں نکلے گا۔“

میڈون نے آگے بڑھ کر ڈاکٹر نکولا سے ہاتھ ملایا۔ پھر ڈاکٹر نکولا نے اسے جانے کے لئے ایک طرف ہٹ کر راستہ دیا۔ میں نے اس بت طناز کو ساتھ لیا۔ جب ہم ڈیوڑھی میں آئے تو وہاں کوئی نہ تھا۔ وہ چند لمحوں کے لئے پھر جذباتی ہو گئی۔ یہ الوداعی رخصتی تھی۔ اس نے اپنی مہر محبت میرے ہونٹوں پر پھر ثبت کر دی تھی۔ دل تو نہیں چاہا کہ اسے بازوؤں کے حصار سے نکال دوں۔ لیکن ہم دونوں ہی مجبور تھے۔

پھر میں اسے گلی سے باہر لے آیا جہاں سے بازار شروع ہوتا تھا۔ ایک خوش نما ڈانڈی اس کی منتظر تھی۔ میں نے مس میڈون کو اس میں بٹھا کر دبے لفظوں میں الوداع کہی اور پھر کہا۔

"اگر میں اس مہم سے زندہ بچ کر آ گیا تو پھر آپ کو اس مکان میں تلاش کروں گا جہاں آپ اس وقت جا رہی ہیں۔"

"الوداع...... میرے محسن!" اس کے لہجے میں ہلکی سی افسردگی تھی۔ "خدا آپ کو محفوظ رکھے۔"

پھر اس نے اپنا مرمریں سڈول اور خوبصورت ہاتھ مصافحے کے لئے بڑھایا۔ پھر اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر اسے دبایا۔ ایسا محسوس ہوا گویا اس نے کوئی شے میری مٹھی میں رکھ دی ہے۔ میں نے مٹھی مضبوطی سے بند کر لی۔

پھر میں اس کا ہاتھ چھوڑ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ پھر اس وقت تک وہاں کھڑا رہا۔ جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔ میں نے وہ چیز جو اس نے رخصت ہوتے وقت دی تھی، اسے دیکھے بغیر جیب میں رکھ لیا۔ کیونکہ وہاں اندھیرا تھا۔ میں چلا آیا۔ جب میں اندر گیا تو ڈاکٹر نکولا دونوں ہاتھ باندھے سرنگوں ٹہلتا پھر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگا۔

"روانگی کے گھوڑے ایک گھنٹہ تک تیار ہو جائیں گے۔ چلنے سے پہلے آرام کرنا ہے تو کر لو...... میں اس بڈھے سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ جس سے کچھ دیر پہلے ہم ملے تھے۔ میری خواہش یہ ہے کہ اس سے مزید کچھ اور واقفیت حاصل کر لوں...... جو مفید ہو گی اور راستے میں کام آئیں گی۔ آپ میری واپسی تک یہیں رہیں۔ لیکن اس بات کا خاص خیال رکھنا کہ میں چوں کہ پجاری کے بھیس میں ہوں، اس لئے ہر لحاظ سے ہر معاملہ میں پورا پورا احترام ہو۔ یاد رہے کہ ان باتوں میں ذرا سی غلطی اور کوئی کمی کوتاہی سارے انتظام کو درہم برہم کر سکتی ہے۔ جس کے بعد ہماری سلامتی کا خدا ہی حافظ......"

"میں یہ سنہری باتیں اچھی طرح یاد رکھوں گا۔ آپ بے فکر رہیں۔" میں اسے جواب دے کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ چیز نکالی جو مس میڈون نے مجھے دی تھی، جب وہ رخصت ہوئی تھی اور وہ بات جو میں نے اپنے وجود میں محسوس کی تھی، وہ یہ کہ سوندھی سوندھی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ یہ ایک ایسی بھینی بھینی خوشبو تھی جو میں نے کسی سینٹ میں نہیں پائی تھی اور نہ ایسی خوشبو کا کوئی سینٹ بازار میں دستیاب تھا۔ میں کچھ دیر تک حیران رہا کہ یہ خوشبو کہاں سے آ گئی۔ میرا وجود اس سے کیسے مہک رہا ہے۔ جب میں نے وہ چیز نکالی تو خیال آیا کہ یہ خوشبو تو مس میڈون کے بدن کی تھی۔ جب وہ میرے بازوؤں میں سمٹی تھی۔ اس نے میرے وجود کو مہکا دیا تھا اور اپنی مہک چھوڑ گئی تھی۔

میں نے اس چیز کو بغور دیکھا۔ معلوم ہوا کہ ایک چھوٹا سا عجیب ساخت کا تعویذ ہے بلکہ لاکٹ کہیں تو زیادہ مناسب ہو گا۔ مگر افسوس کہ اس میں اس کی تصویر نہ تھی۔ شاید وہ اسے گلے میں پہنا کرتی تھی۔ کیوں کہ بے رنگ فیتہ کا اب تک اس کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ شاید اس نے یادگار کے طور پر مجھے اپنی

نشانی دی تھی۔ شاید اس لئے بھی کہ میں نے بھی تو اسے نشانی دی تھی۔

میں نے ایک لحظہ اسے تعریفی نظروں سے دیکھا۔ پھر اسے اپنے گلے میں ڈال لیا۔ کیونکہ یہ قیمتی یادگار اس طرح محفوظ رہ سکتی تھی اور پھر اس میں سے اس کے چندن سے بدن کی خوشبو پھوٹ رہی تھی۔ بعد ازاں ایک کونے میں چٹائی پر دراز ہو گیا۔ میں گہری نیند میں تھا کہ ڈاکٹر نکولا نے مجھے زور زور سے ہلا کر جگایا اور کہا۔

"وقت ہو گیا ہے...... گھوڑے منتظر کھڑے ہیں۔ اب ہمیں چل دینا چاہئے۔"

نیند کا شدید غلبہ تھا۔ میں نے سر کو جھٹکا دیا اور بہ مشکل اٹھ بیٹھا نیند بھی کیا ظالم چیز ہوتی ہے۔ وہی سن رسیدہ آدمی جسے ہم نے رات دیکھا تھا ٹرے میں کھانا لئے داخل ہوا۔ مرغی کا ابلا ہوا گوشت، چاول اور جوار کی خستہ ٹکیاں تھیں۔ جنہیں ہم نے چائے کے ساتھ نوش کیا۔ پیٹ بھر کے کھا لیا تا کہ راستے میں بھوک نہ لگے۔

کھانے سے فارغ ہوئے تو ڈاکٹر نکولا اس بڈھے کو ایک طرف لے جا کر سرگوشی میں باتیں کرنے لگا۔ ساتھ ساتھ زوردار اشارے بھی کرتا جا رہا تھا۔ پھر جب ہم رخصت ہونے لگے تو اس گھر کے تمام لوگ باہر تک چھوڑنے ساتھ آئے تھے۔ دروازہ پر پانچ گھوڑے لئے لادوان کھڑا تھا۔ وہ ہمارا منتظر تھا۔ دو پر اسباب لادا۔ ایک ایک میرے اور ڈاکٹر نکولا کے حصے میں آیا اور پانچویں پر لادوان سوار ہوا اور اس طرح نوکروں کے مؤدبانہ ملازموں سلام کے ساتھ اس مقام سے روانہ ہوئے۔ ہماری پر اسرار مہم اب نئی منزل میں داخل ہو چکی تھی۔

☆......☆......☆

شفق کی سرخی پھیلی ہوئی تھی اور سورج مشرق سے نمودار ہو رہا تھا کہ ہم شہر ٹینس کی اونچی فصیل چھوڑ کر پیکن کی سڑک پر عازم سفر ہوئے۔ اس رو[illegible] اوروں کے خیالات چاہے کچھ ہوں۔ میں اس غلیظ شہر کو الوداع کہہ کر بہت خوش تھا۔ یہاں بدکاری اور فحاشی کا دور دورہ تھا۔ میں نے کچھ دنوں کے قیام میں بڑے عجیب اور خوف ناک واقعات دیکھے تھے۔ جنہیں میں شاید ہی بھلا سکتا تھا اور ایک حسین لڑکی سے ملاقات ہوئی تھی۔

شروع میں دو تین میل سڑک کچھ ناہموار تھی۔ خشک کیچڑ کا غبار چھوٹے سنگ ریزوں سے ملا جھکڑوں کے زور سے منہ پر لگتا تھا۔ اس لئے آپس میں گفتگو کا موقع بہت کم ملتا تھا۔ یا یوں سمجھ لیں کہ ڈاکٹر نکولا چوں کہ ایک مقدس پجاری کے بھیس میں تھا اور وہ اپنی مفروضہ وجاہت قائم رکھنے کو چند گز آگے بڑے رعب، وقار اور دبدبے سے چل رہا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے میں تھا۔ میرے پیچھے لادوان اور ان سب کے آخر میں سامان سے لدے گھوڑے چینی بال گیروں کی حفاظت میں جن کو اطراف میں مانو کہا جاتا تھا۔ وہ قدم بہ قدم چل رہے تھے۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ اس وقت ڈاکٹر نکولا کیا سوچ رہا ہو گا۔ اس وقت اس کے کیا خیالات ہوں گے۔ وہ کن خیالات کے نرغے میں ہو گا۔

مگر میرا دھیان رہ رہ کر مس میڈون کی طرف جا رہا تھا جسے میں نے گزشتہ ایسے پر اسرار اور سنگین حالات سے بچایا تھا۔ جس میں اس کی عزت اور جان کو خطرہ تھا۔ بلوائی اس کی بے حرمتی کرنے کے بعد

اسے قتل کر کے کہیں پھینک دیتے۔ اس شہر میں قانون کی حکمرانی مفقود تھی۔ لاقانونیت کا دور دورہ تھا۔ ایک انار کی پھیلی ہوئی تھی۔ میرا اسے بچانا کام آیا تھا۔ وہ میری بے حد ممنون ہوئی تھی۔ اس کا چاند سا چہرہ جو راحت افروز تھا جسے رات میں نے تھوڑی دیر کے لئے دیکھا تھا۔ رہ رہ کر نظروں میں پھر رہا تھا اور بے اختیار اپنی طرف کھینچتا تھا۔

میں نے بارہا اس کے اور تصور سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی تھی۔ میں جس مہم پر جا رہا تھا، اس کے لئے ضروری تھا کہ اس پر اپنی توجہ مرکوز رکھوں۔ مگر اس کی سیاہ آنکھوں کی خوبصورتی اور گہرائی...... خوش نما اور ریشمی بال، اس کے گلابی عارض اور حسن کی دلکشی اور پھر اس نے جو دو مرتبہ بڑے جذباتی اور خود سپردگی کے سے انداز میں مہر محبت ثبت کی تھی اور جس کی مٹھاس سے ابھی تک میرے ہونٹ بندھے ہوئے تھے اور پھر اس کے بدن کی مست کر دینے والی سوندھی سوندھی خوشبو کی مہک کے گرداب میں ایسا پھنسا تھا کہ میں خود کو نکالے نکل نہ سکا تھا۔ لیکن میں خود فریبی کا شکار ہونا نہیں چاہتا تھا۔ میں اس حقیقت سے آشنا تھا کہ مس میڈون سے دوبارہ ملنا میرے نصیب میں نہیں ہے۔

یہ خیال میرے لئے روح فرسا تھا کہ وہ اب میرے لئے ایک ایسا خواب ہے جس کی تعبیر میں کبھی نہیں پا سکتا۔ اس احساس محرومی سے دل کی کسک گھٹنے کے بجائے اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔ ناامیدی آغاز میں بہت باعث اشتیاق ہوا کرتی ہے۔

اس داستان میں، میں یہ بھی لکھ دینا چاہتا ہوں کہ مجھے کبھی کبھی پچھتاوا ہوا کہ یہ میں نے کیا کیا۔ ایک سے زیادہ موقعوں پر میں نے اس خیال سے اپنے آپ کو ملامت کی کہ کیوں میں نے ڈاکٹر نکولا کی ملازمت قبول کر لی۔ نہ اس کے ساتھ نامعلوم منزل کی طرف جانا پڑتا، نہ ہی مس میڈون کا صدمہ فراق اٹھاتا۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی فوراً پیش نظر ہوتی کہ اگر ڈاکٹر نکولا سے ملنے کا اتفاق نہ ہوتا تو اس بت طناز کی دید کیوں کر میسر ہوتی اور شاید اس سے ملاقات عام حالات میں ہوتی اور محبت کا کوئی تصور نہ ہوتا۔ دیکھو اب حالات کیا رخ اختیار کرتے ہیں۔

آخر کوئی پانچ میل سفر طے کرنے کے بعد ڈاکٹر نکولا نے مجھے اشارے سے پاس بلایا۔ اس دوران تو اس نے مجھے ایک بار بھی پلٹ کر نہیں دیکھا اور نہ ہی میں نے اس کی ضرورت بھی محسوس کی تھی۔ جب میں ایڑ لگا کر گھوڑا اس کے پاس لے گیا تو وہ بولا۔

وہ تار جو ولیمز نے پرنڈر گاسٹ اور الیت اوور کے نام روانہ کئے تھے۔ وہ اب تک یقیناً ان لوگوں کو پہنچ چکے ہوں گے۔ میں ان کی ذمے داری اور مستعدی سے خوب واقف ہوں۔ اس لئے مجھے پورا یقین ہے کہ وہ اس کام میں یعنی اس کی تکمیل میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کریں گے۔ میرے حساب سے اگلے ہفتے کے وسط تک ہنکاؤ کا اصل پجاری ضرور ان کی حراست میں آ جائے گا۔ جس کے بعد تین دن اطلاع رسانی کے گن لو۔ گویا لاما سرائے جانے سے پہلے پیکن میں ہمیں دس دن انتظار کرنا ہوگا۔ پس میرا ارادہ یہ ہے کہ پیکن جا کر ایک تنہا مکان میں سکونت رکھوں اور لوگوں میں یہ مشہور کرا دوں کہ میں یعنی ہنکاؤ کا

پجاری نئے عہدہ پر فائز ہونے سے پہلے عبادت و ریاضت کر رہا ہوں۔ دس دن کے اندر اندر پرنڈر گاسٹ کی طرف سے کوئی اطلاع موصول ہو جائے گی اور پھر اس کے بعد بالکل سہل ہوگا۔"

"جب وہ لوگ ہنکاؤ کے اصل پجاری کو اغوا کر کے لے جائیں گے تو کیا آپ کے نزدیک اس سے کسی طرح شک و شبہ پیدا نہ ہوگا؟"

"ہاں...... اس کا احتمال ضرور ہے۔" ڈاکٹر نکولا نے اثبات میں سر ہلا کر اقرار کیا۔ "مگر ہماری سلامتی کی خاطر انہیں بڑی احتیاط اور ایسا انتظام کرنا پڑے گا جس سے یہ راز کسی پر ظاہر نہ ہو جائے۔ مجھے ان لوگوں پر پورا اعتماد ہے۔ وہ آزمودہ ہیں اور میں کامل یقین رکھتا ہوں کہ ان کے لئے کوئی سا بھی کام کتنا مشکل، دشوار اور ناممکن سا کیوں نہ ہو۔ وہ اس کی تکمیل سے پہلو تہی نہیں کریں گے۔ یہ تو ان کے لئے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ کیا بات ہے تم کچھ مضمحل سے نظر آ رہے ہو؟"

"میں اس وقت اچھا نہیں ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ میں اسے کیا بتاتا کہ مس میڈون کی یاد مجھے کیسی تڑپا رہی ہے۔ اس کے ساتھ جو لمحات گزرے، وہ کیسے شیریں تھے۔ "سر بہت دکھتا ہے۔ کوئی بات نہیں۔ امید ہے کہ جلد ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

"ہمیں اپنی رفتار بہت تیز کرنی چاہئے۔" اس نے کہا۔ "رات جس پڑاؤ پر ٹھہرنا ہے...... اس جگہ پہنچنے کے لئے چالیس میل اور طے کرنا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم وقت مقررہ سے پہلے پہنچ جائیں گے۔"

چینی گھوڑے ہر چند دیکھنے میں خوش نما اور زیادہ طاقت ور اور تیز رفتار نہیں معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ان میں جو استقلال اور برداشت ہے وہ دنیا بھر کے گھوڑوں پر فائق سمجھے گئے ہیں۔ ہمارے موجودہ گھوڑے زین و ساز سمیت شاید بیس پونڈ میں خریدے گئے ہوں گے۔ مگر میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ محنت میں ان سے دس گنا قیمت کے عراقی گھوڑے ہرگز ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یہ بات میرے مشاہدے کی ہے۔

دوپہر کو دو گھنٹے ہم نے ایک سرسبز و شاداب میدان میں پڑاؤ ڈالا۔ پھر کھانا کھا کر آرام کر کے روانہ ہوئے تو دو گھنٹے گزر گئے۔ ہم لوگ غروب آفتاب سے پہلے پیکن کا آدھا سفر طے کر چکے تھے۔ حتیٰ کہ دونوں وقت ملتے ایک چھوٹے سے گاؤں میں جا پہنچے اور رات وہیں بسر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

گاؤں میں چینی انداز کی ایک چھوٹی سی سرائے واقع تھی۔ بہت خستہ اور خراب حالت میں تھی۔ کمرے تنگ اور ہر قسم کے اسباب سے عاری...... اور سرائے کے اردگرد سے تعفن پیدا ہو رہا تھا۔

صحن میں پہنچ کر ہم گھوڑوں سے اتر پڑے تو ایک چینی سرائے دار نے ہمارا استقبال کیا۔ جیسا دکان ایسا دکان دار...... پھر بھی ڈاکٹر نکولا کی ظاہری وجاہت سے مرعوب ہو کر اس نے اس قدر جھک کر تعظیم کی کہ جتنا جھک سکتا تھا۔ پھر ساتھ جا کر کمرے دکھانے پر آمادہ ہو گیا۔ اس انتخاب کے بعد اس نے صفائی کروائی۔ ہم کھانا کھانے کا حکم صادر کر کے وہیں فرش پر بیٹھ گئے۔

کوئی آدھے گھنٹے کے بعد کھانا آ گیا۔ انڈے، دو مرغ جن کے گوشت لی سختی سرائے دار کے مزاج اور ایک عجیب قسم کا ملا جلا گوشت تھا جو اہل چین کی عام غذا سمجھا جاتا ہے۔

تقریباً ایک گھنٹے تک ہم باتیں کرتے رہے۔ پھر رات بسر کرنے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ سرائے کی طرف آتے ہوئے میں نے ایک تالاب دیکھا تھا جو درختوں سے گھرا ہوا تھا۔ نہانے کی خواہش ہوئی تو میں ایک تولیا لے کر اس جانب خاموشی سے چل دیا۔ آسمان پر بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ چاند کبھی کسی ٹکڑے کی آغوش سے نکلتا تو چند لمحوں کے بعد اسے دوسرا ٹکڑا اپنی آغوش میں لے لیتا۔ یہ آنکھ مچولی جاری تھی۔

میں تالاب سے چند قدم پر ایک بوڑھے اور گھنے درخت کے نیچے رک گیا تاکہ کپڑے اتار کر نہا لوں۔ تالاب پر کوئی نہیں تھا۔ اتنی رات وہاں کون آسکتا تھا۔ میں ابھی کپڑے اتارنے والا ہی تھا کہ اس گہرے سناٹے میں چاپیں سنائی دیں جو دو آدمیوں کی لگ رہی تھی۔ وہ بھی اس تالاب کی سمت آرہے تھے۔ میرے سارے جسم پر سنسنی دوڑ گئی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس بستی کا کوئی بدمعاش میرے تعاقب میں غیر محسوس انداز سے آیا ہو۔ شاید اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔ وہ شاید سرائے کے باہر کہیں کھڑے ہوں گے۔ مجھے باہر آتا دیکھ کر اور تالاب کی سمت جاتا دیکھ کر سمجھ گئے ہوں گے کہ میں نہانے جا رہا ہوں۔ میرے نہانے سے فائدہ اٹھا کر میرے کپڑے لے کر بھاگ جائیں۔ انہیں لباس اور رقم بھی مل جائے گی۔

چند لمحوں کے بعد فضا میں دو نسوانی آوازیں کھنک گئی تھیں۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ پھر خیال آیا کہ یہ عورتیں اس وقت نہانے اس لئے آئی ہیں کہ آزادی اور سکون سے نہایا جاسکے۔ جب وہ اس درخت کے سامنے سے گزریں جس کے تنے کے عقب میں، میں چھپا ہوا کھڑا تھا، اس وقت چاند ایک بادل کے ٹکڑے کی آغوش سے نکلا۔ ایک بادل کا ٹکڑا جو اس کی طرف بڑھ رہا تھا، وہ قدرے فاصلے پر تھا۔ میں نے اس چاندنی میں انہیں دیکھا۔ وہ دو جوان بھکارنیں تھیں۔ ان کی عمر پندرہ سے سولہ برس کی ہوگی۔ وہ بہت حسین تھیں۔ ان کے ایک ہاتھ میں گٹھری تھی چھوٹی سی...... جانے اس میں کیا تھا۔ وہ قریب کے درخت کے نیچے رک گئیں۔

ان میں ایک کی آواز فضا میں لہرائی۔ وہ قدرے تیز آواز میں بولی۔ ”یہ شہری مسافر لوگ بڑے صفائی پسند ہوتے ہیں۔ انہوں نے ہماری نظروں کے پیام کا کوئی جواب اس لئے نہیں دیا تھا کہ ہماری حالت کیسی خستہ تھی۔ اب ہم نہا کر جائیں گے تو وہ ہمیں صاف ستھرا دیکھ کر پھسل جائیں گے۔ پھر ہماری مٹھی گرم کردیں گے۔“

”جب ہم ان کے کمروں میں جائیں گے تب وہ سو رہے ہوں گے۔ انہیں جگانا پڑے گا۔“ دوسری بولی۔ ”کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ہمیں نکال باہر کریں...... پھر ہماری ساری محنت اکارت جائے گی۔ ان کا سربراہ پیشوا ہے۔“

”وہ چاہیں جو کچھ بھی ہوں۔“ پہلی والی ہنس کر بولی۔ ”جوان مرد ہیں۔ ہم چادر نکال کر پھینک دیں گی۔ رات کے وقت وہ ہمیں اس حالت میں دیکھ کر بہک جائیں گے۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ ہمیں کمرے سے نکال دیں۔“

جب وہ کپڑے اتار کر تالاب کی طرف بڑھیں تو میں واپسی کا ارادہ کر رہا تھا کہ اس وقت چاند

بادلوں سے نکل آیا تھا۔ میں نے چاندنی میں ان دونوں کو تالاب میں ڈبکیاں لگاتے دیکھا۔ اس وقت جانے کہاں سے دو مرد نکل آئے اور تالاب کی طرف بڑھے۔ ان لڑکیوں نے جب انہیں دیکھا تو وہ ہذیانی انداز سے چیخنے لگیں۔ مردوں نے ان چیخوں کی پرواہ نہیں کی وہ بھی تالاب میں کود گئے اور ان لڑکیوں کو دبوچ لیا اور پھر وہاں سے میں چلا آیا۔ اب وہ لڑکیاں سرائے آنے سے رہیں۔ کیوں کہ یہ مرد مال مفت کو ساری رات مہمان رکھنے والے تھے۔

☆......☆......☆

میں نے ہر چند کہ سونے کی کوشش کی مگر نیند تو اچاٹ ہو کر رہ گئی تھی۔ بہت دیر تک کروٹیں لینے کے باوجود آنکھ نہ لگ سکی۔ ایک عجیب سی بے چینی دل کو پریشان کر رہی تھی۔ عموماً ہوتا ہے کہ جب رات میں نیند نہیں آتی ہے تو رات کے سناٹے میں طرح طرح کے ہولناک خیالات دل میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

رفتہ رفتہ بے شمار اصلی اور فرضی آوازیں کانوں میں آنے لگیں۔ وہ عجب سا شور جو رات کے سناٹے میں مخصوص ہے، سنائی دینے لگا۔ ہر بے حقیقت آواز نے خاص اہمیت حاصل کرنی شروع کی۔ باہر کسی راہ گیر کی ہلکی چاپ، بہت دور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں، سرائے کے کسی حصہ میں چوبی تختوں کا چرچرانا...... حتیٰ کہ جھینگروں کا شور بھی میرے لئے باعث اضطراب ہونے لگا۔

میں بہت دیر تک اسی حالت میں رہا۔ آخر بے چین ہو کر اٹھا اور کھڑا ہو گیا۔ پھر کمرے میں ٹہل ٹہل کر نیند کی دیوی سے کہہ رہا تھا...... ”اب تو آجاؤ...... اس طرح تو نہ ترساؤ۔“

میں کمرے میں ٹہل ہی رہا تھا کہ غلام گردش میں عجیب طرح کی مدھم چاپ سن کر میں چونک گیا۔ کیسی آواز ہے، کان لگا کر سننے کی کوشش کی مگر اس حالت میں کہ بدن کا رگ و ریشہ فکر و اضطراب میں ڈوبا ہوا تھا۔ اتنے میں پھر وہی آواز آئی مگر اب وہ دروازے کے قریب تھی۔ وہ آدمی کی چال سے زیادہ کسی حیوان کی حرکت سے ملتی تھی۔ ایک عجیب قسم کی مبہم آواز جو کسی بہت بڑے چوپائے کے بھد بھد کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ میں تھوڑی دیر حیران و ششدد سوچتا رہا۔ پھر یاد آیا کہ ایسی آواز ایک بار جزائر منیلا میں سنی تھی۔ جہاں میرے ہوٹل میں صبح ایک آدمی مقتول پایا گیا تھا۔ صریحاً یہ کوئی آدمی تھا جو...... چوہے کی مانند ہاتھوں اور پاؤں سے چل رہا ہوگا؟ دل میں سوال اٹھا۔

اس جگہ ہمارا دشمن کون ہوسکتا ہے......؟ باہر کی دیوار اونچی نہ تھی۔ فقط دو فٹ کی تھی۔ غالباً کوئی چور اسے بڑی آسانی سے پھاند کر اندر آ گیا ہوگا۔ میں فوراً ہی ایک کونے میں چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ تیز شکاری چاقو جسے میں ہر وقت اپنے پاس رکھا کرتا تھا۔ اسے ہاتھ میں تھام کر واقعات کا انتظار کرنے لگا۔

آواز برابر آرہی تھی۔ کوئی میرے دروازے کے ساتھ ہو کر گزرا۔ لمحے کے انتظار کے بعد میں نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ دروازہ بے آواز کھولا۔ اتنا سا کھولا کہ ایک جھری سی بن گئی۔

برآمدہ خالی تھا۔ مگر اس آدمی کا برقی سرعت سے راستہ طے کر کے نکل جانا ممکن تھا۔ مجھے شک گزرا کہ وہ یقیناً کسی کمرے میں چھپ گیا ہوگا۔ پاس والا کمرا انکولا کا تھا اور تعجب نہیں کہ دن بھر کی تھکن کے

بعد وہ اس وقت بے خبر سو رہا ہوگا۔ آنے والے کی نیت اور ارادے صریحاً فاسد تھے۔ ورنہ وہ کیوں رات کے وقت یوں دبے پاؤں آتا۔ مجھے فوراً ہی یہ خیال آیا کہ ڈاکٹر نکولا کی زندگی خطرے میں ہے۔ اسے بچانے کی کوشش کرنا چاہئے۔

اس کے کچھ ثانیے کے بعد میں باہر نکل آیا۔ نکولا کے دروازہ پر پہنچ کر میں قدرے شش و پنج میں مبتلا ہوگیا۔ مگر یہ دیکھ کر کہ دروازہ بند نہیں بھڑا ہوا سا ہے، میں پھر بغیر کسی تامل کے اندر گھس گیا۔ یہ تو معلوم ہی تھا کہ ڈاکٹر نکولا کس جگہ سویا ہے۔ میں جب اس کے بستر کی طرف بڑھا تو ایک ننگ دھڑنگ آدمی دوڑ کر میری طرف آیا۔ پھر ہم دونوں گتھم گتھا ہوگئے۔

کمرے کے گھپ اندھیرے میں ہم دونوں کی کشتی کتنی عجیب، سنسنی خیز اور زبردست نوعیت کی تھی۔ کبھی میں اس پر غالب آتا اور کبھی وہ مجھ پر...... اس مقابلہ کا شور سن کر ڈاکٹر نکولا کی بھی آنکھ کھل گئی۔ وہ بستر سے نکل کر دروازے کی طرف گیا اور اس نے نوکروں کو آواز دی۔ مگر اس سے پہلے کہ نوکر آتے اور روشنی کا انتظام ہوتا۔ میں نے اپنے نادیدہ دوست کو زیر کرلیا تھا۔ اسے فرش پر گرا کر اس کی چھاتی پر سوار ہوگیا تھا۔ اس طرح میں نے اسے بے بس کرلیا تھا۔

سب سے پہلے کمرے میں لادوان داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک جلتی ہوئی مشعل تھی۔ وہ اسے لے کر ڈاکٹر نکولا کے پاس گیا۔ ڈاکٹر نکولا میرے پاس آیا۔ مجھے الگ کرکے اس آدمی کا چہرہ دیکھنے لگا۔

''اوہ......'' ڈاکٹر نکولا نے متحیر زدہ لہجے میں کہا۔ ''یہ چوری کے ارادے سے ہرگز نہیں آیا۔ انتقام کے ارادے سے آیا تھا۔ پاجی...... یہ بدمعاش...... تو کیا اس مار کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ شکر ہے بروقت خبر ہونے سے میری جان بچ گئی۔''

یہ تو وہی فقیر تھا جسے ڈاکٹر نکولا نے سرِ شام پٹوایا تھا۔ ''اسے کیا سزا دی جائے......؟'' لادوان نے ڈاکٹر نکولا سے دریافت کیا۔ ڈاکٹر نکولا نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ فقیر کو کھڑے ہونے کا اشارہ کیا۔

''جلدی اٹھ کھڑے ہو۔'' ڈاکٹر نکولا اسے چند لمحوں تک گہری نظروں سے گھورتا رہا۔ پھر تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''اچھا اب منہ کھولو۔''

اس فقیر نے قدرے تذبذب کے بعد منہ کھول دیا۔ اس کے چہرے پر حیرت اور آنکھوں سے خوف جھانکنے لگا۔ ''اب تم اسے بند نہ کرسکو گے۔'' ڈاکٹر نکولا نے سخت لہجے میں کہا۔ ''خواہ تم بند کرنے کی لاکھ کوشش کرو۔'' اس بدنصیب فقیر نے منہ بند کرنے کی بہت کوشش کی۔ لاکھ جتن کئے۔ اس کے جبڑے لکڑی کی طرح سخت ہوگئے تھے۔ وہ خوف اور دہشت کی حالت میں کمرے میں لٹو کی طرح گھومنے لگا۔ اسے سخت تکلیف ہو رہی تھی جو ناقابل برداشت تھی۔ اس کی پیشانی عرق آلود ہوگئی تھی اور اس کی ہولناک چیخوں سے کمرا گونجنے لگا۔

''ادھر آؤ......'' ڈاکٹر نکولا کو جیسے اس پر رحم آگیا۔ اس نے حکم دیا۔ ''میرے سامنے کھڑے ہوکر منہ بند کرلو۔''

اس نے منہ بند کیا تو اس کا منہ فوراً بند ہوگیا۔ اس کی جیسے جان میں جان آئی۔ اس نے گہرا سانس لیا۔ ''اچھا اب اپنی آنکھیں بند کرلو۔'' ڈاکٹر نکولا نے پھر تحکمانہ لہجے میں کہا۔ اس بدنصیب کو چارہ بھی نہیں تھا، آنکھیں بند کرنے کے سوا...... اس نے آنکھیں بند کرلیں۔

''اب تم اندھے اور گونگے ہوگئے ہو۔'' ڈاکٹر نکولا نے تیز لہجے میں کہا۔ ''اور نہ ہی تم منہ سے بول سکتے ہو۔ صرف سن سکتے ہو؟''

فقیر نے بہتری کوشش کی مگر لاحاصل اور نہ تو منہ سے باوجود کوشش کے بول سکا اور نہ ہی آنکھیں کھول سکا۔ آنکھیں اس طرح بند تھیں جیسے گوند سے چپکادی گئی ہوں یا سلائی کردی گئی ہوں۔ اس نے جب بولنے کی کوشش کی تو اس کے حلق سے غراہٹ سی ہی نکل سکی۔ اس نے پوری طاقت جیسے بولنے اور آنکھیں کھولنے میں صرف کردی تھی۔ اس کا اندازہ اس کے چہرے کے تاثرات سے ہو رہا تھا۔ وہ بینائی اور قوت گویائی سے پوری طرح محروم ہوچکا تھا۔

اب اس کا خوف اور دہشت اس قدر بڑھ گیا تھا کہ اس کا جسم لرزنے لگا۔ وہ مجنوں کی طرح کانپ رہا تھا۔ اس کا چہرہ سفید پڑتا چلا گیا۔ لہو کی ایک بوند بھی نظر نہ آتی تھی۔ پھر وہ ایک اندازے سے ڈاکٹر نکولا کی طرف بڑھا اور ڈاکٹر نکولا کے قدموں میں گرا۔ ناک کی بے معنی آوازوں اور اس کے پیر دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر ان پر اپنا سر مارنے لگا۔ گویا معافی اور جان بخشی کی التجائیں کرنے لگا ہو۔ کئی لوگ جو سرائے کے مختلف حصوں میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس کی آہ و بکا سن کر کمرے میں آگئے تھے۔ اس عجیب منظر کو حیرت اور خوف سے دیکھنے لگے۔ وہ سب اس فقیر سے واقف تھے۔

''اٹھو......'' ڈاکٹر نکولا کو جیسے اس پر رحم آگیا تھا۔ ''اب تم اپنا منہ اور آنکھیں کھول دو۔ تم مجھے ہلاک کرنے آئے تھے۔ موت کا بدلہ موت ہوتا ہے لیکن میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔ مگر یاد رکھو۔ پھر کبھی ایسی جرأت کی تو پھر میں تمہیں معاف نہیں کروں گا۔ ساری زندگی کے لئے نہ صرف اندھا، بہرہ اور گونگا کردوں گا بلکہ ہاتھ پیروں سے معذور بھی کردوں گا۔''

دوسرے ہی لمحے نہ صرف اس کی آنکھیں کھل گئیں بلکہ وہ بولنے کے قابل بھی ہوگیا۔ اسے اتنی خوشی ہوئی جیسے دوبارہ زندگی مل جانے سے ہوتی ہے۔ اس پر ایک سرشاری سی طاری ہوگئی۔ وہ اپنی زندگی میں اتنا خوش نہ ہوا ہوگا۔ جتنا اس کی خوشی سے اندازہ ہو رہا تھا۔ اس نے سر جھکا کر ڈاکٹر نکولا کا شکریہ ادا کیا۔ پھر تیزی سے مڑا۔ اور ہجوم کو چیرتا ہوا اس طرح بھاگا جیسے کوئی عفریت اس کے تعاقب میں ہو۔

اس کے جانے کے بعد ہجوم منتشر ہوگیا۔ اب اس کمرے میں، میں ڈاکٹر نکولا اور لادوان باقی رہ گئے۔ یعنی ہم صرف تین۔ ڈاکٹر نکولا نے لادوان کی طرف مڑ کر کہا جو ایک طرف ہاتھ میں مشعل لئے بت بنا ہوا کھڑا تھا۔ گونگا سا بنا ہوا۔

''کیا تم جانتے ہو کہ آج میری زندگی فقط مسٹر آنند پال کی بروقت امداد اور بہادری کی وجہ سے بچی ہے۔'' ڈاکٹر نکولا کا چہرہ سپاٹ اور لہجہ کرخت ہوگیا۔ ''تم کونے والے کمرے میں سوتے تھے۔ یہ تمہارا

فرض بنتا تھا کہ میری حفاظت کرتے اور کسی کو آنے نہ دیتے۔لیکن تم اپنا فرض ادا کرنے سے قاصر رہے، اب بتاؤ تمہارے لئے کیا سزا تجویز کی جائے؟"

لادوان نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔وہ ایک مجرم کی طرح کھڑا تھا اور اس کے چہرے پر ندامت کی سرخی تھی۔وہ ایک قدم آگے بڑھ کر ڈاکٹر نکولا کے قدموں میں دوزانو ہو گیا۔پھر بھی اس کی زبان گنگ سی رہی۔

"چپ کیوں ہو......؟" ڈاکٹر نکولا نے تڑختے ہوئے لہجے میں کہا۔"میرے سوال کا جواب دو...... کیا میں یہ سمجھ لوں کہ تم پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا......؟ کیا تم نے میرے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی......؟"

لادوان کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔اس کے بشرے سے لگا کہ اس کے دل کو ڈاکٹر نکولا کی بات سے سخت صدمہ پہنچا۔وہ رک رک کر کہنے لگا۔"میں اپنے بزرگوں کی روحوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے اس آدمی کے آنے کی بالکل بھی خبر نہ ہو سکی ورنہ......"

"یہ کوئی جواب نہیں ہوا۔" ڈاکٹر نکولا نے اسے قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔"تم اپنا فرض ادا کرنے سے قاصر رہے ہو۔یہ ایک ایسی غیر ذمہ داری اور قصور ہے کہ جسے میں کسی حال میں معاف نہیں کر سکتا۔حالاں کہ تم جب سے میرے ساتھ رہے ہو، پورے وفادار رہے ہو۔اس لئے تمہیں نہ تو کوئی سخت سزا دوں گا اور زیادہ سختی بھی نہیں کروں گا۔تم ایک گھنٹے کے اندر اندر گھوڑے پر سوار ہو کر ٹینڈس واپس جاؤ۔مسٹر ولیمز سے مل کر کہو کہ چوں کہ اپنا فرض صحیح ادا نہ کر سکا اس لئے مجھے واپس بھیج دیا گیا۔مزید احکام وہیں بھیجے جائیں گے۔لیکن ایک بات یاد رکھو کہ اگر تم اس کے پاس نہ گئے یا اسے اپنی نالائقی اور قصور سے آگاہ نہ کیا تو پھر تم دو دن کے اندر اندر سفاکی سے ہلاک کر دیئے جاؤ گے۔"

لادوان نے منہ سے کچھ نہ کہا۔اس نے سر کے اشارے سے ہاں کہا۔اس کا سر ایک مجرم کی طرح جھکا رہا۔"بس اب تم جاؤ......" ڈاکٹر نکولا نے کہا۔"مجھے اب تمہاری صورت دیکھنا گوارا نہیں۔کاش! تم نے غیر ذمہ داری نہ کی ہوتی۔" پھر وہ سلام کر کے دروازے کی طرف بے جان قدموں سے بڑھا۔پھر باہر نکل گیا۔

بھگوان جانتا ہے کہ مجھے اس واقعہ اور ڈاکٹر نکولا نے اس کے لئے جو سزا تجویز کی تھی، اس پر بڑا رنج ہوا۔ٹھیک ہے کہ اس کے فرض میں کوتاہی ہوئی تھی۔اس نے غفلت برت کر بڑی غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا تھا۔ڈاکٹر نکولا اپنے اصولوں پر اس قدر سختی سے عمل پیرا ہو گا مجھے اس کا اندازہ نہ تھا۔وہ ایک سخت گیر شخص تھا۔ڈاکٹر نکولا اس سے یہ تو پوچھتا کہ آخر اس کا سبب کیا تھا۔اسے اپنی صفائی میں کچھ کہنے کا موقع تو دیتا......؟ اس نے یہ بھی نہیں کیا۔

میں نے اس کے جانے کے بعد ڈاکٹر نکولا سے اس کی سفارش کی اور اس سے یہاں تک کہا کہ ایک ایسا آدمی جو کہ ہمارے تمام رازوں سے واقف ہے اور ہماری جانوں تک کو مٹھی میں رکھتا ہے، اسے دشمن بنانا تو عین مصلحت نہیں ہو سکتا۔

ڈاکٹر نکولا نے میری بات اور سفارش غور سے سنی تھی۔مگر اس کی منطق ایسی تھی جس نے مجھے

لاجواب کر دیا۔

"میرے دوست!" ڈاکٹر نکولا نے بڑی نرمی سے کہا۔"ہندوستان میں ایک ضرب المثل مشہور ہے کہ نا قابل اعتبار ایک ٹوٹے ہوئے قفل کی مانند ہوتا ہے۔دونوں سے سے کوئی فائدہ نہیں بلکہ ایک طرح کا نقصان ہی ممکن ہے۔لادوان سے میرے تعلقات آج سے نہیں بلکہ عرصہ دراز سے چلے آ رہے ہیں اور وہ میرے مزاج سے بخوبی واقف ہے۔وہ اپنے بدن کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا منظور کر لے گا مگر اس میں راز فاش کرنے کی جرأت نہ ہو گی۔وہ گھوڑے اور کتے کی طرح وفادار ہے۔

لیکن افسوس کہ اس خدمت میں، میں آپ کا شکریہ ادا کرنا بھول گیا۔آپ بروقت اس بدمعاش فقیر کو دیکھ نہ لیتے تو میری زندگی کا خاتمہ ہو چکا ہوتا۔میں آپ کے اس احسان عظیم کے متعلق اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں کہ جب بھی کوئی موقع پیش آیا تو مجھے ناشکر گزار نہیں پائیں گے۔میں آپ کی مدد کے لئے جان کی بھی بازی لگا دوں گا۔آپ میرے محسن ہیں۔"

"میں اسے حسن اتفاق ہی سمجھتا ہوں کہ اس وقت میں جاگ رہا تھا۔" میں نے کہا۔"وہ نہ صرف آپ کو بلکہ مجھے بھی ختم کر دیتا۔"

"حیرت کی بات ہے کہ دن بھر کی تھکن کے باوجود آپ ایک پل کے لئے بھی اس وقت سوئے نہیں۔" ڈاکٹر نکولا نے متعجب لہجے میں کہا۔"لیکن مجھے تھکن نے نیند کی آغوش میں پہنچا دیا اور میں ایسا بے خبر سویا جیسے کوئی گھوڑے بیچ کر دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر سو جاتا ہے......" اس نے توقف کر کے میرا چہرہ دیکھا۔"آپ کا چہرہ زرد کیوں ہے؟ ہاتھ تو لائیں، آپ کی نبض تو دیکھوں؟"

اس نے میری کلائی ہاتھ میں لے کر دیکھی۔پھر اس نے اپنے سفری بیگ سے جو چھوٹا سا تھا، ایک شیشی نکالی۔اس نے چند قطرے گلاس بھر پانی میں ڈالے۔پھر مجھ سے کہا کہ میں پورا پانی تین سانسوں میں پی جاؤں۔میں نے پانی پی لیا تو تھوڑی دیر تک میرے پاس بیٹھا رہا۔میں یہ کہہ کر اپنے کمرے میں سونے چلا گیا کہ اب میں بہتر ہوں۔

ڈاکٹر نکولا کی شخصیت نہ صرف بے حد پراسرار تھی بلکہ وہ ذہنی طور پر پراسرار قوتوں کا مالک بھی تھا۔جس کا ایک مظاہرہ فقیر کے ساتھ دیکھنے میں آیا تھا۔اس نے اس فقیر بدمعاش کو ایسا بے بس اور لاچار کر دیا تھا کہ وہ کسی قابل نہیں رہا تھا۔

لادوان کے ساتھ ایسا ہوا تھا کہ اس فقیر کی ایک بہن تھی۔جو نوجوان اور بہت حسین تھی۔اس کی عمر سولہ سترہ برس سے زیادہ نہ تھی۔اس نے اپنی بہن سے کہا کہ یہ جو تین مسافر سرائے میں ہیں جس نے میری پٹائی کی تھی، ان کے پاس مال و زر بہت معلوم ہوتا ہے۔وہ مل سکتا ہے لیکن یہ اس صورت میں ممکن ہے کہ ان تینوں کو ختم کر دیا جائے۔پھر اس نے اپنی بہن کو منصوبہ بتایا کہ وہ ڈاکٹر نکولا کے ملازم خاص لادوان کو قابو میں کر لے۔وہ ایسی حالت میں جائے کہ اسے کسی بات کا ہوش نہ رہے۔وہ بہک جائے۔تم اسے اپنے جال میں پھانسے رکھو۔میں اتنی دیر میں اس کے مالک کو ختم کر کے ان کی دولت لے کر نکل

جاؤں گا۔ پھر تم بھی وہاں سے چلی آنا۔ پھر مجھے بتا دینا۔ رات کے آخری حصے میں، میں ان کے ملازم کو بھی ختم کر دوں گا اور کسی کو ہم پر شک نہ ہوگا۔

جس وقت فقیر کی بہن لادوان کے کمرے میں گھسی، اس کے کمرے میں مشعل روشن تھی۔ پورے کمرے میں ایسا اجالا ہو رہا تھا کہ ذرہ ذرہ تک صاف اور واضح نظر آتا تھا۔ فقیر کی بہن بہت حسین تھی۔ وہ ایسی حالت میں آئی تھی کہ لادواں انکھیں جھپکانا بھول گیا تھا۔ وہ اس کے قریب آئی تو جیسے جلتی پر تیل گر گیا اور پھر وہ جذبات پر قابو نہ پا سکا۔ فقیر کی بہن تو اپنا کام یہ خیر وخوبی کر کے نکل گئی۔ اس دوران فقیر اپنا کام پورا نہ کر سکا۔ لادوان پر کچھ ایسا نشہ طاری تھا کہ اسے ہوش ہی کہاں تھا جو اپنے آقا کا خیال رکھتا اور اسے تب ہوش آیا، جب اسے طلب کیا گیا تھا۔

یہ قصہ مجھے سرائے کے ایک ملازم نے سنایا تھا جب میں نے لادوان کو رخصت کیا تھا۔ پھر میں اپنے کمرے میں آیا۔ بستر پر دراز ہوا اور گہری نیند میں ڈوبتا چلا گیا۔ نیند آنے سے پہلے یہ سوچ رہا تھا کہ لادوان کا جرم قابل معافی تھا۔

☆......☆......☆

......میں یہاں اپنے قارئین سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ ”معزز قارئین میرے بارے میں آپ یقیناً یہ بات سوچ رہے ہوں گے کہ جادوگر سکندر گئے کہاں......؟ اس کہانی میں ان کا کوئی ذکر اور کارنامہ نہیں ہے۔ میں یہ عرض کرتا چلوں کہ میں جس ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ اس ہوٹل میں انوپ کمار بھی مقیم تھا۔ اس نے مجھے سیاح کہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ اپنے دوست آنند پال کو تلاش کرنا چاہتا ہے۔ اس نے درخواست کی تھی کہ میں اس کے دوست آنند پال کی کہانی پڑھ لوں۔ میں نے جو کہانی پڑھی وہ آپ کو بھی پڑھا رہا ہوں۔ یہ کہانی بہت ہی پراسرار، سنسنی خیز اور تحیر انگیز واقعات سے بھری پڑی ہے۔ دل چسپ بھی ہے۔ آپ نے شاید ہی ایسی حیرت ناک کہانی پڑھی ہوگی۔ اس میں ایک کردار ڈاکٹر نکولا کا ہے۔ یہ ایک حیرت انگیز اور ایسا پراسرار اور ایسی پراسرار ذہنی قوتوں کا مالک ہے۔ جس کا آپ تصور نہیں کر سکتے۔ چوں کہ یہ ایک سچی کہانی ہے۔ اس لئے آپ کو وہ سنسنی خیز، خوف ناک اور دہشت ناک واقعات نہیں ملیں گے جو دیومالائی کہانیوں میں دلچسپ بنانے کے لئے ملتے ہیں۔ ڈاکٹر نکولا تلاش اکسیر کے لئے نکلا ہے۔ جب یہ کہانی ختم ہوگی تب میری کہانی شروع ہوگی۔ ڈاکٹر نکولا اور آنند پال کو تلاش کرنے کے لئے۔“

☆......☆......☆

میں جب بیدار ہوا تو چھ بج چکے تھے۔ ڈاکٹر نکولا نے رات جو دوا دی تھی۔ اس سے بڑا افاقہ ہوا تھا۔ میں اپنی حالت بھی بہت بہتر محسوس کر رہا تھا۔ لیکن پوری طرح صحت یاب نہیں ہوا تھا۔ میں سخت حیران تھا کہ مجھے یہ یکا یک کیا ہو گیا ہے۔

سات بجے ناشتا کرنے بیٹھے۔ جب ساڑھے سات بجے تب گھوڑے لائے گئے۔ ہم دوبارہ سفر پر روانہ ہوئے۔ سرائے سے نکل کر میں نے چاروں طرف دیکھا کہ کہیں لادوان واپس تو نہیں آ گیا۔

لیکن وہ کہیں نظر نہ آیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ غریب ڈاکٹر نکولا کے حکم کی تعمیل میں ٹیٹنس چلا گیا تھا۔

پہلے کی طرح ڈاکٹر نکولا اب بھی سب سے آگے تھا اور جس ہیبت اور احترام سے لوگ اسے دیکھ رہے تھے۔ اس کا میں نے اندازہ کر لیا تھا۔ اس فقیر نے گزشتہ شب جو قاتلانہ حملہ کیا اور ڈاکٹر نکولا نے اپنی پراسرار طاقت سے اس کی جو درگت بنائی تھی۔ سرائے کے ملازموں اور سرائے میں ٹھہرے ہوئے مسافروں نے بھی دیکھا تھا۔ وہ واقعہ جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکا تھا۔ سڑک کے کنارے کھڑے اور چلتے ہوئے ہر شخص نے اس کی تعظیم کی۔ میں ڈاکٹر نکولا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی شان استغنا ان سب باتوں سے بالا تر تھی۔

دوپہر کے بعد ہم گھوڑوں کو زیادہ تیزی سے دوڑانے لگے اور چار بجے کے قریب شہر پیکن کا نظارہ پہلی بار دکھائی دیا۔ بہت دور چٹیل میدان میں شہر اونچی صورت کہسار نظر آتی تھی اور اس سے پرے حد نگاہ تک چینی وضع کے مکان تھے۔ جیسے جیسے منظر قریب ہوتا گیا ویسے ویسے منظر اور دل کش ہوتا گیا۔ ایک عالی شان برج جس میں گولندازی شگاف نظر آنے لگا۔ جب شہر کے پاس پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہ نظروں کا فریب تھا جو اس برج کی ساخت سے پیدا ہوا۔

ایک چھوٹے تنگ دروازہ سے گزر کر جو افغانستان کے کسی ادنا گاؤں کے پھاٹک سے ملتا تھا، گزر کر اس شہر میں داخل ہوئے اور محصولات ادا کر کے اس مکان کی طرف ہو لئے جس کا پتا ڈاکٹر نکولا کو ٹیٹنس میں بتایا گیا تھا۔ ایک چینی نوجوان کو رہبر بنا کر ہم بے شمار تنگ وتاریک گلیوں سے گزرتے ہوئے شہر کے غیر آباد حصہ میں ایک معمولی مکان کے پاس جا پہنچے۔ اس وقت ہر طرف اندھیرا چھا چکا تھا۔ دیر تک دستک دینے کے بعد ایک فربہ اندام چینی نے دروازہ کھولا۔

”آپ کیا چاہتے ہیں؟“ اس نے یہ سوال ڈاکٹر نکولا سے کیا تھا جو سب سے آگے کھڑا تھا۔

”وہ جس سے امن حاصل ہوتا ہے۔“ ڈاکٹر نکولا نے پرانے الفاظ میں کہا۔

یہ سنتے ہی فربہ اندام چینی نے بڑے ادب سے سر جھکایا اور پھر کہا۔ ”تشریف لے آئیے۔ آپ کا انتظار تھا۔ جو کچھ اس غریب خانے میں موجود ہے۔ اس سے آپ کی خدمت گزاری کی جائے گی۔“

ہم دونوں آگے پیچھے مکان کے اندر داخل ہوئے۔ پھر ایک کمرے میں پہنچ کر ڈاکٹر نکولا نے گھوڑوں کے مالک کو بلایا۔ اب چوں کہ گھوڑوں کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس لئے اس نے اس کا حساب چکتا کر کے شکریے کے ساتھ رخصت کر دیا۔ ہم دونوں اس کے جانے کے بعد تنہا رہ گئے۔ ڈاکٹر نکولا نے کہا۔

”میرے دوست! اب ہم پیکن پہنچ گئے اور یہ بہت ضروری اور لازم ہے کہ آئندہ ہر بات میں اور زیادہ احتیاط سے کام لیں۔ یاد رکھیں......ایک پجاری کی حیثیت سے میری ذات قابل احترام ہے۔ اس لئے مجھے ایسا ہی طریق زندگی اختیار کرنا پڑے گا۔ ایک اور کمرہ اس کمرے سے ملحق ہے۔ ہم دونوں پاس ہی رہیں گے اور آپ کا فرض ہوگا کہ کسی کو بلا اجازت میرے پاس نہ آنے دیں بلکہ میری نسبت یہ بات مشہور کر دیں کہ ان کا سارا وقت عبادت وریاضت میں گزرتا ہے۔ اخراجات کا حساب اب آپ کے ذمے ہوگا۔ جو بھی اور جس قسم کا بھی لین دین ہوگا وہ آپ کیا کریں گے۔“

کوئی آدھا گھنٹہ بعد کھانا چن دیا گیا تھا۔ کھانا بہت مزے دار اور ذائقہ دار تھا۔ کسی عورت کے ہاتھ کا پکا ہوا لگتا تھا۔ لیکن مکان کے اندر کوئی عورت موجود ہے یا نہیں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ نہ تو اس کی کوئی آواز نہ ہی خوشبو...... عورت کی موجودگی کی خوشبو تو آہی جاتی ہے۔ جیسے کھانوں سے محسوس ہو رہی تھی۔ شاید میزبان نے کسی عورت کو بلایا اور وہ پکا کر چلی گئی۔

ہم آرام کرنے کے لئے اپنے اپنے کمرے میں جا کر بستر پر دراز ہو گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد آنکھ لگ گئی۔ پھر میں نے کسی آہٹ سے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ پلکیں منوں بھاری ہو رہی تھیں۔ پھر میں نے سوندھی سوندھی سی خوشبو محسوس کی۔ میں نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ یہ کس کی خوشبو ہے؟ پھولوں کی، کلیوں کی یا پھر کسی عطر کی...... لیکن ان میں تو ایسی خوشبو نہیں ہوتی تھی۔ لیکن دوسرے لمحے سمجھ گیا کہ یہ عورت کی خوشبو ہے جو اس کے بدن سے پھوٹتی ہے۔ میں نے کسی نہ کسی طرح آنکھیں کھول دیں اور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

میں نے جو کچھ دیکھا وہ ناقابل یقین تھا۔ میرے بستر کے قریب ایک عورت کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی عمر اٹھائیس تیس برس کے درمیان ہو گی۔ چینی عورت کی عمر کا صحیح اندازہ ہر کوئی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ایک تو پستہ اور درمیانہ قد کی ہوتی ہے۔ نازک اور متناسب اور چھریرا بدن ہوتا ہے۔ چہرے پر عمر کی چھاپ بہت کم محسوس ہوتی ہے۔ جب وہ پچاس ساٹھ برس کی ہو جاتی ہے تو اس کے سفید بالوں اور چہرے کی جھریوں سے اس کی عمر کا اندازہ ہوتا ہے۔ چالیس پینتالیس برس کی عورتیں سولہ سترہ برس کی لڑکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ جو سیاح پہلی بار چین کی سیاحت پر آتے ہیں، وہ دھوکا کھا جاتے ہیں۔ کیونکہ میں نے چین میں خاصا وقت گزارا تھا اور گزار رہا تھا۔ اس لئے عورت کی عمر کا خاصا تجربہ تھا۔ میں اسے دیکھ کر ایسا مدہوش ہوا تھا کہ گنگ سا ہو گیا اور اپنی پلکیں جھپکانا بھول گیا۔ اس پر سے نظریں ہٹنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ جیسے وہ کوئی دنیا کا عجوبہ ہو۔ میں نے کبھی کسی عورت کو اس طرح دیکھا تھا اور نہ اس سے اس طرح متاثر ہوا تھا۔

"یہ آپ مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں؟" اس نے نہایت شائستہ اردو زبان میں مجھے مخاطب کیا تو بڑی حیرت ہوئی۔ اس لئے کہ وہ چینی لڑکی تھی۔ ہندوستانی نہیں تھی۔ چین میں ہندوستانی آباد تھے اور ان کی آمد و رفت رہتی تھی۔ ہانگ کانگ میں تو چینی لڑکیاں تھیں۔ ان میں کسی کسی نے بولنا سیکھ لیا تھا۔ لیکن روانی سے نہیں بول سکتی تھیں۔ لیکن یہ تو اس طرح بول رہی تھی جیسے اس کی مادری زبان ہو۔ "کیا آپ نے کبھی کسی عورت کو نہیں دیکھا......؟ یا پھر آپ مجھے کوئی بد روح سمجھ رہے ہیں؟"

میں ایک دم چونک پڑا۔ میری محویت ختم ہو گئی۔ لیکن اس کا سحر برقرار رہا۔ میں نے قدرے سنبھل کر کہا۔ "آپ کون ہیں اور آپ یہاں کس لئے آئی ہیں؟ اندر کیسے آ گئیں۔ جب کہ دروازہ بند ہے اور اندر سے چٹخنی لگی ہوئی ہے۔"

"میں ایک لڑکی ہوں اور اس لئے آئی ہوں کہ مہمان کی سواگت کروں۔ اس کی ہر طرح سے ایسی سیوا کروں کہ وہ خوش ہو جائے۔" اس نے اپنی ترنم خیز آواز میں جواب دیا۔ "دروازہ بند ہو یا کوئی تہہ خانے میں، قید خانے میں، مجھے کوئی بھی کہیں جانے سے روک نہیں سکتا۔ محلوں میں کیسا سخت پہرہ ہوتا ہے

لیکن میں پہنچ جاتی ہوں۔ اس کمرے میں جو بھی ٹھہرتا ہے، میں صرف اس کی سیوا کرتی ہوں۔"

"کیا آپ کوئی روح ہیں جو اس کمرے میں غائبانہ چلی آئیں؟" میں نے کہا۔ "سچ سچ بتائیں۔ مجھ سے یہ بات نہ چھپائیں۔"

"نہیں...... میں کوئی روح نہیں ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "مجھے ایک ایسی قوت حاصل ہے جس سے میں کہیں بھی جا سکتی ہوں۔"

"آپ ہندوستانی زبان کیسے جانتی ہیں جب کہ آپ چینی ہیں۔ آپ اس طرح بول رہی ہیں جیسے آپ کی مادری زبان ہو۔"

"میں ہندوستانی کیا دنیا کی ہر زبان اس طرح بولتی ہوں جیسے وہ مادری زبان ہو۔" اس نے کہا۔ "میرے لئے یہ کوئی مسئلہ نہیں؟"

"آپ صرف اس کمرے میں ٹھہرنے والے کا سواگت اور سیوا کیوں کرتی ہیں......؟" میں نے پوچھا۔ "کیا اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟"

"اس لئے کہ اس کمرے میں میرا محبوب ٹھہرتا تھا۔" اس نے جواب دیا۔ "جو بھی اس کمرے میں ٹھہرتا ہے وہ میرے محبوب کا ہم شکل ہو جاتا ہے۔"

"کیا......؟" میں نے حیرت سے اس کی شکل دیکھی۔ "یہ کیسے ممکن ہے؟ مجھے آپ کی بات کا یقین نہیں آیا۔ آپ شاید......"

"سب کچھ ممکن ہے......" وہ سر ہلا کر بولی۔ "آپ کو میری بات کا یقین نہیں آیا ہے تو آئینہ دیکھ لیں۔ دیوار پر آئینہ لگا ہوا ہے۔"

میں نے بستر سے نکل کر دیوار گیر آئینے میں اپنی صورت دیکھی تو میں اچھل پڑا۔ آئینے میں میری صورت جو نظر آ رہی تھی وہ میری نہیں تھی۔ بلکہ ایک بہت ہی خوبصورت چینی جوان مرد کا چہرہ تھا۔ وہ کسی چینی شہزادے کی طرح لگ رہا تھا۔

میں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک دل کش تبسم رقصاں تھا اور آنکھوں میں چمک تھی۔ "اب آپ کو یقین آیا میرے محبوب!" وہ شگفتگی سے بولی۔ "میں نے آپ سے غلط بیانی نہیں کی تھی؟ آئینے نے جھوٹ نہیں کہا تھا؟"

"لیکن یہ کیا ماجرا ہے؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "کیا آپ نے مجھے جادو سے اپنے محبوب کی شکل و صورت کا بنا دیا؟ کیوں......؟"

وہ میرے قریب آئی۔ پھر اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے بستر پر بٹھا لیا۔ اس کے ہاتھ کے لمس سے میرے سارے جسم میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ "میں آپ کو بتاتی ہوں کہ ماجرا کیا ہے؟" وہ شعلہ مجسم بن کر میرے پاس بیٹھی مجھے جیسے مدہوش کر رہی تھی۔

"میرے محبوب کا نام مہومان تھا۔ وہ ٹیٹنس شہر میں رہتا تھا۔ پیکن میں ہر سال ایک میلہ لگتا ہے۔ دس

برس پہلے کی بات ہے کہ وہ اس میلے میں شرکت کرنے کی غرض سے تجارتی سامان لے کر آیا تھا۔ اس نے اس سرائے میں اس کمرے میں قیام کیا تھا۔ جب میں اس میلے میں اس کی دکان پر گئی تو ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ میں اسے دل دے بیٹھی اور وہ مجھ پر ریشہ خطمی ہو گیا۔ اس روز میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر رات کے وقت چوروں کی طرح اس کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ مجھے کسی نے دیکھا نہیں تھا۔ میرا باپ کسان تھا اور ایک جادوگر بھی۔ اس نے مجھے کچھ معمولی سا جادو بھی سکھایا تھا تا کہ میں اپنی جان اور عزت کی حفاظت کر سکوں۔ اس لئے کہ میں بہت حسین تھی۔ حسین لڑکیاں مردوں کی دست برد سے محفوظ نہیں رہ پاتی تھیں۔ کئی حسین لڑکیاں درندگی کا نشانہ بن چکی تھیں اور بنتی رہتی تھیں۔ میں ایسا جادو جانتی تھی کہ مردوں سے اپنی عزت محفوظ رکھ سکوں۔ آج اب بھی میں یہ جادو جانتی ہوں۔ میرے محبوب کو یقین نہیں آیا، اس نے اپنے نصیب پر ناز کیا۔ ہمارے دل، زبان نے اور آنکھوں نے اپنی محبت کا اقرار کر لیا۔ میں پو پھٹنے تک اپنے محبوب کے ساتھ رہی۔ محبت کے طوفان میں ہم اتنے بے بس ہو گئے تھے کہ خود پر قابو نہ پا سکے اور بہت دور نکل گئے۔

ہماری ملاقاتوں کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ ہم دونوں راتیں میاں بیوی کی طرح گزارتے تھے۔ میں نے اپنا سب کچھ اپنی مرضی اور خوشی سے اس پر لٹا دیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ایک اور لڑکی اس پر فدا ہو چکی ہے اور وہ اس کی محبت اور قرب حاصل کرنے کے لئے کوشاں ہے۔ وہ چھپ چھپ کر ہم دونوں کو ملتے اور پیار و محبت کی باتیں کرتے ہوئے دیکھتی ہے۔ ہماری ملاقاتوں نے نہ صرف اس کے جذبات کو بھڑکا دیا تھا بلکہ حسد و جلن میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ لڑکی میرے پڑوس میں رہتی تھی۔ ایک روز کسی وجہ سے میری طبیعت اچانک رات کے وقت خراب ہو گئی۔ اس لڑکی کو پتا چل گیا تو وہ میرے محبوب سے ملنے پہنچ گئی۔ وہ بھی بلا کی حسین اور جوان تھی۔ کوئی مرد تنہائی میں اس کے قرب سے مسحور ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ اسے اسیر بنا لیتی تھی۔ وہ ایک اچھی لڑکی نہیں تھی۔

وہ جس حالت میں اس کے سامنے گئی تھی۔ کوئی اور مرد ہوتا تو بہک جاتا۔ وہ چوں کہ میری محبت کا اسیر تھا۔ اس لئے اس پر اس لڑکی کا کوئی جادو نہ چل سکا۔ اس نے کیا کچھ حربے نہیں کئے تھے۔ کس کس طرح ورغلانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ ناکام رہی تھی۔

اس میں اس نے اپنی توہین محسوس کی۔ پھر وہ انتقام لینے پر تل گئی۔ پھر اس نے ایک روز ایسا کیا کہ دوپہر کے وقت وہ سرائے میں اس کی غیر موجودگی میں گئی۔ اس کی شراب کی بوتل میں زہر ملا کر چلی آئی۔ اسے کسی نے آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ جب میں رات کے وقت اس سے ملنے سرائے پہنچی تو وہ ایک گھڑی کا مہمان تھا۔ پھر اس نے مرتے وقت اس بدچلن لڑکی کے بارے میں بتایا۔ اس نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اسے زہر اس لڑکی نے دیا ہے۔ پھر میرے محبوب نے میری گود میں جان دے دی۔ میرے محبوب کی اس اچانک موت سے مجھے بہت گہرا صدمہ پہنچا۔ میرے دل سے اس کی یاد نہیں جاتی تھی۔ میں نے اس لڑکی سے اپنے محبوب کی موت کا انتقام لے لیا۔ اس کے کھانے میں زہر ملا دیا۔ پھر وہ مر گئی۔ اس کی موت سے کتنی خوشی ہوئی، میں بتا نہیں سکتی۔

چوں کہ میں اپنے محبوب سے بہت محبت کرتی تھی اور یہ محبت آج بھی زندہ ہے۔ پھر میں نے اپنے محبوب سے ملنے کی ایک تدبیر کی۔ جو بھی جوان مسافر اس سرائے کے اس کمرے میں آیا۔ میں نے اسے اپنے محبوب کے روپ میں ڈھال دیا۔ اس کے ساتھ صبح تک رہی۔ پرانی یادوں کو تازہ کرتی رہی۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ اس وقت تک جاری رہے گا۔ جب تک میں زندہ ہوں، مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ میرا محبوب ہے۔ مجھ سے باتیں کر رہا ہے۔ ہم محبت کی وادی میں دور نکل جاتے ہیں۔"

"تمہاری کہانی بڑی عجیب و غریب ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن تم نے شادی کیوں نہیں کی؟ یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہے کہ تم غیر مردوں سے اس بہانے دل بہلاؤ۔ تم اپنے شوہر کو رات کے وقت محبوب بنا سکتی ہو۔ وہ تمہاری ہر خواہش پوری کرے گا۔"

"میں نے ایک نہیں دو شادیاں کیں۔" اس نے جواب دیا۔ "لیکن انہیں منظور نہیں تھا کہ میں راتوں کو انہیں محبوب کے روپ میں ڈھال دوں...... پھر ان دونوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ پھر میں نے شادی نہیں کی۔ یہ سلسلہ جاری رکھنے کے سوا چارہ نہیں رہا۔"

جب میں صبح بیدار ہوا تو مجھ پر ایک نشہ سا طاری تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں نے کوئی خواب دیکھا تھا۔ ہم دونوں رات بھر بیدار رہے وہ مجھ پر مہربان رہی اور پو پھٹنے تک راز و نیاز ہوتا رہا تھا۔ اگر چادر میں خوشبو بسی نہ ہوتی تو میں اسے سپنا ہی سمجھتا۔ یہ ایک حقیقت تھی۔ اس کا ثبوت موجود تھا۔ جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔ رات بڑی نشاط انگیز تھی۔

لیکن معلوم ہوتا تھا کہ ڈاکٹر نکولا کی مدد کرنا میری تقدیر میں نہ لکھا تھا۔ کیونکہ صبح جب میں بیدار ہوا تھا، میری حالت بڑی ناگفتہ سی تھی۔ وہ عورت شاید روح ہی تھی اور اس نے مجھے ساری رات جگا کر بے حال کر دیا تھا۔ سر میں شدید درد تھا۔ میں نے ڈاکٹر نکولا کو ناشتے پر رات کے بارے میں بتایا نہیں۔ صبح کا ناشتا بھی میں ٹھیک سے نہیں کر سکا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد میں ہوا خوری کے لئے نکل گیا تا کہ طبیعت بحال ہو سکے۔ لیکن گرانی پھر بھی رفع نہ ہو سکی۔ تھوڑی دور جا کر واپس آ گیا۔ طبیعت سنبھل نہ سکی۔ سفر کی تھکن اور رات کی بیداری نے نڈھال کر دیا تھا۔ سہ پہر تک جس طرح ممکن تھا، ضبط کیا، لیکن شام تک برداشت نہ ہو سکا۔ آرام کرنے کے لئے بستر پر دراز ہی ہوا تھا کہ بے ہوش ہو گیا۔

☆......☆......☆

جب میری آنکھ کھلی تو دن کافی نکلا ہوا تھا۔ سورج کی کرنیں کھڑکی سے اندر داخل ہو رہی تھیں۔ خوش رنگ پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں کانوں میں کسی نغمے کی طرح گونج رہی تھیں۔ جس سے صبح بڑی سہانی سی محسوس ہو رہی تھی۔ بیداری کے بعد پہلا احساس جو تھا وہ حیرت کا تھا۔ ناقابل یقین سا تھا۔ مجھے بہت اچھی طرح یاد تھا کہ جب میں سویا تھا تو بستر فرش پر بچھا ہوا تھا۔ یہ چینی انداز کا بستر تھا۔ چینی تہذیب کا نمونہ...... چینی قوم کی ہر چیز اپنی اور بے حد مختلف نوعیت کی ہوتی ہے۔ یہ اس قوم کی تہذیب اور شناخت ہے۔ مگر اب جو دیکھتا ہوں، کیا دیکھتا ہوں کہ یہ بستر انگریزی طرز کا نمونہ ہے۔ یعنی بے حد کشادہ

پلنگ پر جو بستر تھا، وہ نرم اور گداز اور بے حد آرام دہ تھا۔ کمرہ بھی وہ نہیں تھا جس پر رات سویا تھا۔ وہاں زمین کھردری تھی اور اس پر قالین بچھا ہوا تھا۔ پھر اس کے علاوہ متعدد تصویریں بھی دیواروں پر سجی ہوئی تھیں۔ یہ انکشاف ہوا تھا کہ یہ کمرہ وہ نہیں جس میں سویا تھا۔ شدت ضعف نے اٹھ کر کسی بات کی کسی چیز کی تحقیق کرنے نہیں دی۔ میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ کہیں یہ بھی وہ رنگین اور حسین خواب تو نہیں جو میں نے گزشتہ رات دیکھا تھا۔ لیکن وہ خواب ہرگز نہ تھا۔ لیکن کیا یہ بھی خواب ہے۔ مجھ پر غنودگی طاری تھی۔ اتنی سکت نہ رہی تھی کہ نیند کا مقابلہ کرتا۔ میں نے تھک ہار کر آنکھیں بند کرلیں۔ نیند مجھے اپنی آغوش میں لینے کے لئے تڑپ رہی تھی۔ پھر تھوڑی ہی دیر بعد نیند آ گئی۔ اور جب آنکھ کھلی تو شام ہو چکی تھی۔

اس وقت کیا دیکھتا ہوں کہ ایک دلکش نازنین کھڑکی کے پاس بیٹھی کتاب دیکھ رہی ہے۔ سب سے پہلا خیال جو آیا وہ یہ تھا کہ یہ بھی کہیں خواب کا حصہ ہے۔ تب میں نے سوچا کہ میں جلد ہی بیدار ہو کر ڈاکٹر نکولا کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ اس خیال کی فوراً ہی نفی ہو گئی اور پھر اب اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں رہا کہ یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔ اس لڑکی نے شاید محسوس کرلیا تھا کہ میں بیدار ہو چکا ہوں۔ اس نے دفعتاً کتاب ایک طرف رکھ دی۔ پھر اٹھ کر وہ میرے پاس آئی۔ آپ میری حیرت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ یہ وہی مس میڈون تھی جسے میں نے ٹینٹس میں بلوائیوں سے بچایا تھا۔ میں اسے خواب کی اس حالت میں دیکھنے لگا۔ یقین نہیں آیا کہ یہ مس میڈون ہے۔

اس نے میرا بازو اپنی مخروطی لمبی سرد انگلیوں سے چھوا جس سے میں نے یہ محسوس کیا کہ وہ میری طبیعت معلوم کر رہی ہے کہ کیسی ہے۔ پھر اس نے گلاس میں کوئی دوا ڈال کر اسے میرے منہ سے لگا دیا۔ میں نے دوا پی لی اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔

مگر سچ جانیئے...... یہ خوف بھی دامن گیر تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بولنے سے یہ منظر باطل نہ ہو جائے......"مس میڈون!" میں نے ڈرتے ڈرتے اتنا ہی کہا۔ "آپ پلیز! مجھے تنہا چھوڑ کر نہ جائیں۔"

"آپ بے فکر رہیں، میں نہیں جاؤں گی۔" اس نے دلاسا دیا۔ "مگر اب آپ کی حالت بہتر ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ مجھے پہچاننے کے قابل ہو گئے۔ میں تو بڑی ناامید اور مایوس سی ہو گئی تھی۔ پریشان بھی ہو رہی تھی۔"

"میں نہیں جانتا ہوں، مجھے کیا ہو گیا تھا......؟" میں نے کمزور لہجے میں کہا۔ "کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ میں کہاں ہوں؟"

"آپ سخت بیمار تھے۔" میڈون نے مجھے بتایا۔ "مگر اب کافی افاقہ ہے اور آپ میرے بہنوئی کے مکان پر ہیں۔" اس کی بات سن کر یقین نہیں آیا۔ میں حیران اور ششدر ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"آپ کے بہنوئی کے مکان پر......؟" میں نے کہا۔ "آخر میں اس جگہ کیسے آ گیا......؟ مجھے یہاں آئے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے......؟ ڈاکٹر نکولا جو میرے ساتھی تھے وہ کہاں ہیں؟ آپ جانتی ہیں تو بتائیں؟"

"آپ کو آئے ہوئے بارہ دن ہو گئے۔" اس نے جواب دیا۔ "آپ چوں کہ ایک مہلک اور

خطرناک بیماری میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اس لئے ڈاکٹر نکولا نے آپ کو یہاں بھجوا دیا۔ میں نہیں جانتی، وہ آج کل کہاں ہیں۔ ہم نے فقط ان کو صرف ایک دفعہ دیکھا تھا۔ میرے خیال میں وہ کہیں چلے گئے ہیں۔ مگر کہاں اور کب واپس آئیں گے۔ اس کا جواب افسوس ہے کہ میں آپ کو دے نہیں دے سکتی۔ اب میرے خیال میں آپ نے بہت باتیں کر لی ہیں۔ اس لئے آپ آرام کیجئے۔"

میرے لئے اپنی کمزور حالت میں اعتراض کی گنجائش نہ تھی۔ میں نقاہت بھی محسوس کر رہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور سو گیا۔ اگلے دن میری حالت زیادہ بہتر تھی۔ اب میں بیٹھنے کے قابل ہو گیا تھا اور کھانا بھی کھایا تھا۔ اس کے علاوہ دیر تک مس میڈون سے باتیں کرتا رہا۔ اس کا قرب، اس کی دل کش باتیں، لہجے کی مٹھاس اور حسین چہرہ میری بیماری کے احساس کو زائل کرتا رہا۔

میڈون نے میرا بہت خیال رکھا۔ ہوانڈیاں میں سیر و تفریح نے دوا سے کہیں بہتر کام کیا۔ میری صحت بتدریج بہتر ہونے لگی۔ میڈون اب تک اپنے باپ کے قتل پر افسردہ تھی۔ دل گرفتہ تھی۔ اس کا ذکر آتے ہی اس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی تھیں اور ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگتے جو صاف و شفاف موتیوں کی طرح ہوتے۔ اس کے رخسار بھیگ جاتے۔ میں اسے دلاسا دیتا اور صبر کی تلقین کرتا۔ اس نے بتایا کہ برطانوی قونصل ٹینٹس نے اس معاملے میں فوری کارروائی کی تھی۔ اس نے نہ صرف بلوائیوں کو گرفتار کرا دیا جنہوں نے مکان کو تباہ کر دیا تھا بلکہ باپ کے قاتل کو بھی سولی پر چڑھا دیا گیا تھا۔

میڈون نے میرے ان احسانات کا بڑے محبت بھرے اور جذباتی انداز سے شکریہ ادا کیا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ ڈاکٹر نکولا کی بھی ممنون و احسان مند تھی۔ اس نے بتایا کہ نکولا کے زیر ہدایت ولیمز نے میڈون کو پناہ دی۔ برطانوی قونصل خانہ گیا۔ میڈون کی بات پر اس کے باپ کی میت انگریزوں کے قبرستان میں دفن کر دی گئی۔ جب ضابطہ کی کارروائی مکمل ہو گئی تو چند معتبر نوکروں نے اسے پیکن پہنچا دیا۔ نوکروں نے اسے بڑے آرام اور حفاظت سے اس کے بہنوئی کے ہاں پہنچا دیا تھا۔

دوسرے دن نوکر میرے لئے ایک پیالے میں مرغی کا شوربہ لے آیا۔ جب میں پینے لگا تو میڈون مجھ سے باتیں کرنے لگی۔ "آنند پال!" وہ رسیلی آواز میں بولی۔ "آج آپ بہت بہتر دکھائی دے رہے ہیں۔ کیوں نہ آج چہل قدمی کر کے دیکھیں۔"

"یہ تو آپ نے میرے دل کی بات کہہ دی۔" میں نے کہا۔ "مجھے اس بات کی کوشش کرنا چاہئے کہ میں جتنا صحت یاب ہو جاؤں، اچھا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں کیسا بے وقت بیمار ہوا۔ ڈاکٹر نکولا میرے انتظار میں بے چین و پریشان ہوں گے۔"

لیکن مجھے اس وقت یہ بات ایک دم سے یاد آئی کہ اس رات میرے ساتھ جو واقعہ پیش آیا تھا وہ سرائے کے کمرے میں جب کہ میں پیکن کے مکان میں تھا اور سرائے کے کمرے میں کیسے پہنچ گیا۔ جہاں رات وہ لڑکی آئی اور مجھ پر مہربان ہو گئی۔ صبح میں بیدار ہوا تو سرائے میں نہیں تھا بلکہ اس بوڑھے میزبان کے گھر کے کمرے میں تھا۔ یہ بڑا عجیب اور پراسرار سا واقعہ تھا۔ جانے مجھے اس بات کا خیال کیوں نہیں آیا کہ وہ

لڑکی روح تھی۔ جو مجھے اس سرائے کے کمرے میں لے گئی۔ رات بھر کی وقت گزاری سے میں اتنا تھک گیا تھا کہ بیمار ہو گیا تھا۔ میڈون نے کہا تھا کہ میں خطرناک بیماری میں مبتلا ہو گیا...... یہ کیسی روح تھی؟

میں نے میڈون کی طرف اس خیال سے نگل کر دیکھا۔ ایک لمحے میں بہت کچھ یاد آ گیا تھا۔ میں اس عورت کی روح کا حسن، بدن اور اس کی حشر سامانیاں کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ میڈون ایسی باتیں سن کر کچھ آزردہ سی نظر آنے لگی۔ مجھے بڑی ندامت سی ہوئی کہ میں نے ایسی بات کیوں کہی جس سے اس کے دل کو تکلیف پہنچی۔ وہ میری جدائی کے خیال سے افسردہ سی ہو گئی تھی۔ جس طرح اس نے میری تیمارداری کی وہ اس کا ایک طرح سے احسان عظیم تھا۔

"آپ شاید مجھے ناشکرا تصور کریں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "مگر حقیقت جو ہے وہ جداگانہ ہے۔ جو کچھ میں نے کہا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ حالات اور واقعات نے مجھے ایک ایسے وقت بیمار کر دیا جب کہ مجھے بہت سارے کام کرنا تھے۔ آپ اس سے ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ میں آپ کی عنایتوں کو بھول سکتا ہوں۔ آپ تیمارداری نہ کرتیں تو شاید مجھے نئی زندگی نہیں ملتی۔"

میں نے اپنی بات پوری کر کے اس کا خوبصورت، سرخ و سفید، سڈول اور مرمریں ہاتھ جو کرسی کے ہتھے پر رکھا ہوا تھا۔ اسے اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ اس نے اپنی آنکھوں پر پلکوں کی چلمن گرائی تو اس کا چہرہ اور سرخ ہو گیا۔ "یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ آپ کی خدمت گزاری کا موقع مل گیا۔" اس نے لانبی لانبی پلکیں اوپر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ "میری بہن نے آپ کی بروقت امداد کا حال سنا تھا۔ جس سے میری عزت اور جان بھی بچ گئی تھی۔ وہ آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لئے بے تاب تھی اور اس ملاقات کا کوئی بھی امکان دور دور تک دکھائی نہ دیتا تھا۔ اتفاقات بھی کیسے عجیب وغریب ہوتے ہیں...... آنند پال! میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔ ٹینٹس میں گفتگو کرتے ہوئے آپ نے کہا تھا کہ میں ایک ایسے کام پر جا رہا ہوں جس سے شاید زندہ واپس آنا نصیب نہ ہو۔ میں نے آپ سے دریافت نہیں کیا تھا کہ وہ کیا کام ہے...... مگر کیا وہ ایسا ہی ضروری ہے کہ آپ اپنی زندگی کو خطرہ میں ڈالیں۔"

"افسوس ہے کہ میں آپ کو بتانے سے قاصر ہوں۔" میں نے اس کے ہاتھ کو تھام رکھا تھا۔ اس لئے کہ اس کا لمس بڑا ہی فرحت بخش تھا۔ میں نے شوربہ کا پیالہ میز پر رکھ دیا تھا۔ اس نے بھی اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں رہنے دیا جیسے اسے بھی اس کا لمس لطیف سا محسوس ہو رہا ہو۔ "کام بہت ضروری ہے اور میں اس کے لئے قول ہار چکا ہوں۔ میں خود کس قدر شش و پنج میں ہوں۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔ چوں کہ آپ کو کچھ پتا نہیں ہے، اس لئے آپ یہ سوال نہ کرتیں۔"

"کیا ایک آدمی کو یوں اپنی قیمتی زندگی برباد کرنا اچھا سمجھا جا سکتا ہے۔" میڈون نے کہا۔

"مس میڈون!" میں نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ "میں دراصل اپنی ساری زندگی برباد کر رہا ہوں۔ میں اندر سے ایک ٹوٹا پھوٹا ہوا انسان ہوں۔ آپ میرے صحیح حالات سے بے خبر ہیں۔ میں کیسے کیسے نشیب و فراز سے گزرا ہوں اور کتنا دکھی ہوں۔ کیا بتاؤں کہ میں نے اپنی زندگی میں پہلا یہ کام

ہے جو اپنے ذمہ لیا تو سخت افلاس کی حالت میں تھا۔ وہ محض اپنی حماقت سے...... کیوں کہ میں ایک ناعاقبت اندیش آدمی ہوں جو آئے دن کی نئی مصیبت اور مشکل میں مبتلا ہوتا رہتا ہے اور پھر اس جدوجہد میں اس کی زندگی گزر جاتی ہے۔ دنیا میں افلاس سے بری چیز کوئی نہیں ہے۔"

"بس...... بس کسر نفسی نہ کیجئے۔" وہ دل کش انداز سے مسکرا دی۔ اس کے لہجے میں شوخی تھی اور آنکھوں میں پیار کی سرخی تھی۔ "خیر آپ ایسے سادہ لوح بھی تو نظر نہیں آتے ہیں۔ جیسا کہ ظاہر کر رہے ہیں۔" پھر میں بھی مسکرا دیا۔ اسے بازوؤں میں بھر لیا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اس کے چہرے پر جھکتا چلا گیا۔ چند لمحوں کے بعد دروازہ کسی نے بڑی آہستگی سے کھٹکھٹایا تو وہ میرے بازوؤں سے الگ ہو گئی۔ جس نے بھی دستک دی جو بھی آیا، مجھے اس کا آنا ناگوار سا لگا۔

"پلیز! اندر آ جائیں۔" میڈون نے فوراً ہی کرسی پر بیٹھ کر دروازے کی جانب منہ کر کے کہا۔

مس میڈون کی اندر آنے کی اجازت دینے کے بعد ایک شخص اندر داخل ہوا۔ وہ ایک شکیل و وجیہہ، دراز قد شخص تھا جو دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ وہ اپنی وضع قطع اور چہرے مہرے سے مشنری معلوم ہوتا تھا۔ اس کی عمر تیس بتیس برس کی ہوگی۔ میڈون نے اس انداز سے تعارف کرایا۔ وہ میڈون کا بہنوئی مسٹر بن فلیٹ تھا۔ "کہیے...... مسٹر آنند پال! آج آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" اس نے خوش دلی سے فضا میں ہاتھ پھیلا کر میری طرف آتے ہوئے کہا۔ "آپ کو بہت تیز بخار تھا۔ لیکن شکر ہے، خدا نے آپ کو صحت دی۔ آج آپ کو بہتر حالت میں دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے۔"

"میں آپ لوگوں کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔" میں نے اس سے گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ "اس نازک وقت میں آپ نے میری خبر گیری کر کے جو احسان کیا اسے میں تاحیات نہیں بھولوں گا۔ آپ لوگ مسیحا بن گئے تھے میرے......"

"آپ مہربانی کر کے ان تکلفات کو رہنے دیں اور شکریہ ادا کر کے شرمندہ نہ کریں۔" مسٹر بن فلیٹ نے مسکرا کر کہا۔ "یہاں پیکن میں صرف مٹھی بھر انگریز اور ایشیائی بستے ہیں۔ وہ بھی آپس میں دکھ سکھ میں شریک نہ ہوں گے تو کون ہوگا......؟"

اس وقت میں نے غیر ارادی طور پر اپنے سر پر ہاتھ پھیرا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ چینی وضع قطع کی لمبی چوٹی جسے میں نے لباس تبدیل کرتے وقت سر سے باندھا تھا، وہ غائب ہے۔ حالاں کہ جب میں بیمار ہوا تھا وہ نہ صرف موجود تھی بلکہ میں نے اپنے چہرے پر بھی گندمی رنگ پھیرا تھا۔ مجھے اس خیال سے بڑی ندامت ہوئی کہ میں نے اپنے چہرے پر بھی گندمی رنگ پھیرا تھا۔ ان لوگوں نے مجھے چینی وضع قطع میں دیکھ کر کیا خیال کیا ہوگا۔ جب کہ چینیوں اور انگریزوں کے مابین سخت کشیدگی تھی۔

بعد ازاں میرے علم میں یہ بات آئی تھی کہ ڈاکٹر نکولا نے مسٹر اور مسز بن فلیٹ کو میری بیماری کی اطلاع بھیجنے سے قبل چوٹی اتار کر جلد صاف کر دی تھی اور پھر انگریزی لباس بھی پہنا دیا تھا۔ اس واقعہ سے آپ ڈاکٹر نکولا کی دور رس طبیعت کا اندازہ کر سکتے ہیں اور پھر یہ کہ وہ کتنا محتاط اور ذمے دار شخص تھا۔

"میڈون سے یہ سن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ آج سہ پہر کے وقت چہل قدمی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔" مسٹر بن فلیٹ نے کہا۔ "اس سے میرے خیال میں بہت فائدہ ہوگا۔ لباس بدلنے کے لئے میری ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ جس کے بعد وہ کسی کام کے لئے مشنری ہاؤس چلا گیا۔ پھر ہم دونوں کمرے میں رہ گئے۔ "کیوں نہ وہ سلسلہ جو جہاں سے ٹوٹا تھا وہاں سے جوڑا جائے؟" میں نے اسے دزدیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ میں ذرا سی توانائی کیا آ گئی، آپ مچلنے لگے۔" وہ سرخ ہو کر بولی۔ وہ اتنی پیاری لگی کہ میرا دل چاہا کہ اسے پھر بازوؤں میں بھروں۔ چوں کہ اس نے میرے بشرے سے میرے تیور بھانپ لئے تھے۔ اس لئے اس نے کرسی قدرے پیچھے کھسکالی۔ "مجھ غریب پر یہ ظلم تو نہ کرو۔"

میں نے کہا۔ "آپ کو کیا معلوم ان چند لمحوں نے کیسی توانائی بخشی۔"

"بس اب رومانی منظر اور بہت باتیں بھی ہو چکیں۔" اس نے مجھے تیکھی نظروں سے گھورا۔ "میں من مانی اور زیادہ باتوں کی اجازت نہیں دے سکتی۔ میں آدھا گھنٹہ کچھ پڑھ کر سناتی ہوں۔ اس کے بعد لنچ تک آرام کریں۔ پھر سہ پہر کو چہل قدمی کرتے ہیں۔"

"کتاب پڑھ کر سنانے کی کیا ضرورت ہے؟" میں نے شوخ لہجے میں کہا۔ "آپ خود ایک ایسی کتاب ہیں جو پڑھنے کی نہیں، دیکھنے کی ہیں۔ میں اس کتاب کو سامنے صدیوں بھی دیکھتا رہوں تو جی نہ بھرے۔ کیسی رنگین، دیدہ زیب اور جاذب نظر کتاب ہے جو......"

"اوہ تو شاعر بھی ہیں آپ......؟" وہ ہنس پڑی۔ "میں آپ کی باتوں کے فریب میں نہیں آنے کی۔ اب آپ خاموشی سے سنیں۔"

وہ پہلے جو کتاب پڑھ رہی تھی۔ اسے اٹھا کر اور کرسی کھڑکی کے پاس لے جا کر اس پر بیٹھ گئی تاکہ میں اسے قریب پا کر بہک نہ جاؤں۔ پھر وہ کتاب پڑھنے لگی۔ کیا سریلی اور دل فریب آواز تھی۔ وہ کسی دل نشین انداز اور کسی خوبی سے کتاب کی تحریر پڑھتی جا رہی تھی۔ سچ پوچھئے تو میں اس کتاب کے مضمون سے زیادہ مس میڈون کے حسن جہاں سوز کی دید میں محو تھا۔ دفعتاً وہ کتاب پڑھتے پڑھتے کسی خیال اور کسی احساس کے پیش نظر رک گئی۔ کتاب بند کر کے رکھ دی اور ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بس اب میں جاتی ہوں۔" اس نے کہا۔ "بہن اکیلی کام کر رہی ہوگی۔ میں جا کر اس کا ہاتھ بٹاؤں۔"

"میں تہہ دل سے ممنون ہوں کہ آپ نے میری دلچسپی کے لئے اتنا وقت صرف کیا اور میرا بہت خیال رکھا۔" میں نے کہا۔ "وقت کس تیزی سے گزر جاتا ہے۔ آپ نے جو کچھ سنایا وہ بے حد دلچسپ تھا۔ لیکن اس کے قطع نظر آپ کی قربت بہت خوب تھی۔"

میں نہیں جانتا، اس نے میری باتوں کا کیا اثر لیا۔ بہر حال رخصت کے وقت وہ اس انداز سے مسکرائی جیسے میرے دل کی حالت کو خوب سمجھتی ہے۔ اس کے جانے کے بعد میں تقریباً ایک گھنٹہ تنہا رہا۔

لیکن اس کی خوشبو ساتھ رہی تھی۔ اس اثنا میں طرح طرح کے خیالات دل میں پیدا ہوتے رہے تھے۔ بعض خوشگوار...... بعض اس کے برعکس، مگر ایک بات جسے دونوں حالتوں میں نظر انداز نہ کر سکا۔ وہ یہ تھی کہ دنیا بھر کی پری جمال حسینوں میں مس میڈون سب سے بڑھ کر حسین و جمیل ہے۔ انداز داد کی جو خوبیاں قدرت نے اپنی نازک تر تخلوق میں ودیعت کی ہیں۔ سب اس کی ذات میں موجود تھیں۔ میرے والہانہ پن اور وارفتگی کی انتہا یہ تھی کہ بارہا میں اپنی بیماری میں اس خیال سے خوش ہوتا کہ اس کی بدولت میڈون سے دوبارہ ملنے کا حسین اتفاق ہوا۔ مگر اب سوال یہ تھا کہ اور کتنا عرصہ اس کے پاس رہ سکوں گا۔ بھگوان جانے کب ڈاکٹر نکولا آموجود ہو۔ مجھے اس خواب راحت کو چھوڑ کر اس کے ساتھ جانے پر مجبور ہونا پڑے۔ یہ تصور ایسا ہی وحشت انگیز اور تکلیف دہ تھا جیسے ناخن کا گوشت سے جدا کر دینا۔

کھانے کے بعد میں نے لباس بدلا اور مسٹر بن فلیٹ کا سہارا لے کر پچھواڑے باغ میں چلا گیا تاکہ سیر کی جا سکے۔ خیال تھا کہ میڈون بھی آ جائے گی مگر اس کی صورت نظر نہیں آئی اور جب کرب ناک انتظار کے بعد آئی تو میرے پاس آنے کے بجائے وہ اس ننھے کتے سے پیار کرنے لگی جو ایک سنگی مورت کے سایہ میں لیٹا ہوا تھا۔ یہ بات کہ وہ اس کتے سے ہمیشہ اس طرح پیار کیا کرتی تھی یا پھر میرا جی جلانے کو کرنے لگی تھی۔ بھگوان ہی بہتر جانتا ہے۔ میں اپنی طرف سے صرف اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں کہ انتہائی نرم مزاج ہونے کے باوجود میں اس نظارے کو دیکھ کر اتنا بگڑا کہ اگر وہ کتا ٹہل جاتا اور اگر ڈنڈا میرے پاس ہوتا تو اس کی زندگی کا بھروسا نہیں ہوتا۔ میں دل میں حیران بھی تھا کہ ایسی بے اعتنائی کیوں؟ اس نے دو ایک مرتبہ مجھے من مانی کرنے دی اور بڑی محبت اور شوخی سے بھی پیش آئی تھی۔ وہ کوئی ہندوستانی لڑکی نہیں تھی جو ایک مرد کی موجودگی میں دور دور رہتی۔ بات کرتے ہوئے ہچکچاتی بھی۔

تھوڑی دیر بعد کتے سے کھلاڑیاں کر کے وہ میرے پاس آئی۔ چند سرسری باتیں کیں۔ لیکن مجھ سے بات کرنے میں رکھی اور سرد مہری سی تھی لیکن وہ اپنے بہنوئی سے کھل کر زیادہ دیر باتیں کرتی رہی۔ پھر معذرت کر کے چلی گئی۔ یہ کہنا کہ اس سلوک سے افسردہ و مایوس ہو گیا۔ یہ تو خیر غلط نہ ہوگا۔ میں اس کی بے رخی پر جذباتی ہو گیا تھا تو یہ ایک فطری امر تھا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ یہ حال مسٹر بن فلیٹ کو بھی معلوم تھا یا نہیں...... مگر دونوں صورتوں میں انہوں نے اپنے طرز عمل سے ظاہر نہیں کیا۔ البتہ ہر قسم کے دعویٰ ضبط کے باوجود مس میڈون کے جانے کے بعد میں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور وہ کوئی بڑا ہی احمق ہوتا جو ان آثار سے میرے حال کا صحیح اندازہ نہ کر سکتا۔ خیر جو کچھ بھی ہو، جب میں چہل قدمی سے مکان میں واپس آیا تو اتنا برہم تھا کہ بیان نہیں کر سکتا۔

مگر صنف نازک عجوبہ نمائی کا ایک کرشمہ ابھی دیکھنا باقی تھا۔ گھر آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ رنگ ہی بدلا ہوا ہے۔ وہی معشوق جو تھوڑی پہلے مجھ سے بے رخی کر رہا تھا۔ اب مہربان ہے کیا کہئے۔ کبھی مزاج پوچھا جاتا ہے اور کبھی میرے بالوں کو مخروطی انگلیاں سہلا رہی ہیں اور میری آنکھوں میں خود سپردگی سے جھانکا جا رہا ہے۔ رخساروں پر سرخی بھی تھی۔ جب اس نے دونوں ہاتھ معذرت خواہانہ انداز سے جوڑے تو میں نے انہیں اس

طرح سے چوم لیا جیسے پیارے بچوں کو چوما جاتا ہے اور پھر ایک بار گھل مل کر باتیں ہونے لگیں۔

دوسرے دن میری صحت جیسے پوری طرح بحال ہو چکی تھی۔ اس کی ایک وجہ میڈون تھی۔ اس کی محبت، مہربانی اور بھرپور چاہت تھی۔ اس سے بڑی دوا کیا ہو سکتی تھی۔ وہ مسیحا تھی۔ میں نے وہ سارا دن پائیں باغ میں بسر کیا۔ اس دن مسٹر اور مسز بن فلیٹ کسی کام میں مصروف تھے اور ان کی شکل تک دکھائی نہیں دی۔ ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ ہر طرح کی آزادی اور سکون تھا۔ اب میرے دل میں میڈون کے بارے میں کوئی کدورت نہیں تھی۔ ہم باغ میں بھی محبت بھری باتوں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد ہم نے آپس میں طے کیا کہ کیوں نہ مشہور و معروف دیوار چین تک سیر کرنے جائیں جو اس مقام سے کوئی تین فرلانگ پر واقع تھی۔ تجویز میڈون کی تھی اور آمادگی میری تھی۔ پھر سب تیاری مکمل ہو گئی۔ ہم دونوں پیدل ہی اس مقام کی طرف روانہ ہو گئے۔

اس عظیم الشان تاریخی فصیل کا حال میرے ہاتھوں محتاج تفصیل نہیں۔ اس عظیم دیوار چین کے بارے میں برسوں سے صدیوں سے بیان کیا جاتا رہا ہے اور کیا جاتا رہے گا۔ اس کی فن تعمیر کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ یہ ایک عظیم قوم کی شناخت ہے، پہچان ہے۔ اس کی عظمت سے کسی نے انکار نہیں کیا۔ ایک برج پر چڑھ کر شہر کی جانب دیکھا۔ ایک عجیب سا نظارہ دیکھا۔ چی ان من یعنی بڑا دروازہ عین سامنے اور اس سے پرے پیکن کا مشہور تاتاری شہر دور تک پھیلا ہوا ہے۔ سڑکوں پر اونٹ اور چھکڑے ،گھوڑے، خوانچہ والے اور بھیک منگے، دائیں بائیں حد نگاہ تک شہر کے مکانوں کی چھتیں، خشک گھاس یا چھوٹے سبز پتوں سے ڈھکی ہوئی نظر آتی تھیں۔ ان سے پرے دور افق پر قصر ممنوع یعنی شاہی محل واقع تھا۔ پاس ہی گھنٹہ گھر اور نوبت خانہ کی چوٹیاں نظر آتی تھیں اور ان سے کچھ فاصلے پر لاما سرائے کی چھت مدھم اور ہیولا دکھائی دیتی تھی۔ میرے لئے چوں کہ اس کا نظارہ کشش رکھتا تھا۔ اس لئے بڑی دیر تک نظر جمائے اس طرف دیکھتا رہا۔ اس عظیم جگہ نے ہم دونوں کو بے حد جذباتی اور رومان پسند بنا دیا تھا۔ ہم دونوں کافی دیر تک بیٹھے رہے اور لطف اندوز ہوتے رہے۔ میں نے سوچا کہ اب واپس چلنا چاہئے۔ میڈون بھی واپس جانے کے موڈ میں تھی۔ میں نے واپس جانے کو تیار ہوتے ہوئے کہا۔

”میڈون! اب چوں کہ میری صحت خاصی بحال ہو گئی ہے اور اب میں پورے جسم میں توانائی محسوس کرنے لگا ہوں۔ اس لئے بہت جلد روانگی کی فکر کرنی پڑے گی۔ میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر نکولا کسی بھی وقت مجھے لینے آ سکتا ہے۔“

”ڈیئر!“ وہ مجھے پیار بھری نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی۔ ”اگر میں ایک بات کہوں تو آپ برا تو نہیں منائیں گے؟“

”آپ ایک کیا دس باتیں کہیں، میں آپ کی کسی بھی بات کا برا نہیں مانوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”آپ بلا جھجک کہہ دیں۔“

”نہ جانے کیا بات ہے کہ آپ کے دوست ڈاکٹر نکولا مجھے بالکل بھی پسند نہیں آئے۔“ وہ بولی۔

میں انہیں ایک خطرناک آدمی سمجھتی ہوں...... میرا اندازہ کبھی غلط ثابت نہیں ہوا، کسی کے متعلق......“

”آخر کیوں......؟ کس لیے......؟ آخر آپ کے دل میں یہ خیال کیسے بیٹھ گیا؟“ میں نے بھولپن سے پوچھا۔ باطن میں، میں بھی اس کا ہم خیال تھا اور بھی وہ لوگ جو نکولا سے واقف تھے اسے پسند نہیں کرتے تھے۔

”افسوس کہ میں اس کی وجہ بیان نہیں کر سکتی لیکن میں نے جو محسوس کیا وہ یہ کہ عام آدمیوں سے مختلف ہے۔“ وہ بولی۔

آپ شاید میری ہنسی اڑائیں، میری بات سن کر...... مگر سچ جانیے...... اس کی آنکھیں دیکھ کر سانپ کی آنکھیں یاد آتی ہیں۔ ایسی ہی تیز، سرد اور کرب انگیز سی...... میں نے اپنی عمر میں کبھی کسی شخص کی ایسی خوف ناک آنکھیں نہیں دیکھیں۔ نہ دیکھنے کی خواہش ہے۔ جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا میرے جسم پر جھرجھری سی آ گئی تھی۔“

حالاں کہ اس کا سلوک آپ کے ساتھ نہایت عنایت آمیز تھا۔ میں نے کہا۔ ”آپ ان کے حسن و اخلاق کو بھولی تو نہ ہوں گی؟“

”میں اس کے خلوص اور عنایتوں کو نہیں بھولی۔“ میڈون کے چہرے پر ندامت کی سرخی ابھر آئی۔ ”اس کے بارے میں منفی انداز سے سوچ کر میرے جی کو ندامت ہوتی ہے کہ میں اس کے بارے میں ایسے خیالات کیوں رکھتی ہوں۔ مگر کیا کیا جائے...... میں اس کے بارے میں اس انداز سے سوچنے پر مجبور ہوں۔“

پھر میں بولا۔ ”مس میڈون! آپ بالکل سچ سچ کہئے گا۔ میں صاف گو اور ایسے لوگوں کی بڑی قدر کرتا ہوں جو بغیر کسی لگی لپٹی کے دل کی بات زبان پر لے آتے ہیں۔ یہ نفرت انگیز خیالات کہیں میرے خلاف تو نہیں ہیں؟“

اس کے ہاتھ میں جو رومال تھا وہ گر گیا۔ وہ اسے اٹھانے کو جھکی۔ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”نہیں...... یہ کیوں کر ممکن ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو کیا، میں آپ کے قریب ہو جاتی اور آپ کو قریب آنے دیتی۔“

”ہاں...... یہ میرے لئے خوشی اور اعزاز کی بات ہے۔“ میں نے کہا۔ ”آپ نے ایک ناچیز کو اس قابل تو سمجھا۔“

”میں آپ کو ناچیز نہیں بلکہ اپنا محسن سمجھتی ہوں۔“ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”غور کیجئے...... آپ کا مجھ پر کتنا بڑا احسان ہے۔ اس منحوس رات کے خوف ناک واقعات کو کیا میں بھول سکتی ہوں؟ آپ میرے لئے فرشتہ ہیں۔ فرشتہ۔“

”میں اس کی بات کی تہہ میں پہنچ گیا کہ کون سا جذبہ کارفرما ہے۔ وہ گفتگو کو اور پیرائے میں لے جانا چاہتی تھی۔ موضوع اس لئے اس نے بدل بھی دیا تھا۔ میں مگر موضوع بدلنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے بہ غور اس کی طرف دیکھا۔ وہ گرد و غبار کے اس بادل کو دیکھ رہی تھی جو میدان میں اٹھتا نظر آ رہا تھا اور اس کے

رخساروں پر سرخی اور گہری نظر آئی۔

"میڈون!" میں نے چند لمحوں کے بعد کہا۔ "ہر ایک آدمی کی قسمت پر جلدی یا دیر میں کسی صورت میں کسی کی پاک ہستی سایہ فگن ہوتی اور اسے نئی راہ پر ڈالتی ہے...... اگر میری زندگی اور ذات میں کوئی ہستی محترم ہے تو وہ صرف اور صرف آپ ہیں۔"

اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ چپ رہی۔ مگر اس کے پاؤں کی بے چین حرکت سے صاف ظاہر ہوتا تھا۔ اس کے اندر سخت جدوجہد ہو رہی ہے۔ مگر وہ اپنے بشرے سے کچھ ظاہر ہونے نہیں دے رہی تھی۔ "مس میڈون!" میں نے اس کا جواب نہ پا کر آہستگی سے کہا۔ "کیا آپ میری زندگی کا ہم سفر بننا پسند کریں گی؟"

"آہ...... میں اس کا کیا جواب دے سکتی ہوں؟" اس نے چند لمحوں کے توقف کے بعد کہا۔ پھر اس نے ایک لمبی گہری سانس لی۔

"آپ نہیں تو کون دے گا میڈون!" میں نے کہا۔ "آپ وہ عورت ہیں جو میری زندگی میں بہار بن کر آئی ہیں۔ میں نے جب آپ کو پہلی بار دیکھا تو میں آپ پر پریشہ تخطی ہوگیا تھا۔ آپ مجھے دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر عزیز ہیں۔ محبت اندھی ہوتی ہے۔ وہ مذہب، رنگ و نسل نہیں دیکھتی ہے۔ آپ کے دل میں جو کچھ ہے وہ صاف صاف کہہ دو۔ میرے ہر سوال کا جواب دیں۔ میں آپ کا ہر فیصلہ منظور کرنے کا وعدہ کرتا ہوں۔"

وہ زور زور سے کانپ رہی تھی۔ چہرہ زرد اور سانس رک رک کر آ رہی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ جو چھوڑ دیا تھا۔ اسے میں نے پھر سے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ بے حد سرد ہو رہا تھا۔ "جان من!" میں نے اس کے ہاتھ کی پشت پر بوسہ دے کر کہا۔ "جلدی سے بولیں۔ آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں آنند پال!" میڈون کے لہجے سے بے بسی ٹپک رہی تھی۔

"آپ اس بات کا تو اعتراف کر لیں کہ آپ مجھ سے محبت کرتی ہیں؟" میں نے کہا۔ "بے پایاں محبت...... یوں تو ہم دونوں میں اقرار محبت ہو چکا ہے۔ لیکن پھر بھی میں آج ابھی اور اسی وقت پھر سے آپ کی زبان سے اقرار محبت سننا چاہتا ہوں۔"

"میں آپ کو بے شک بہت چاہتی ہوں......" میڈون نے کہا۔ "کیا میں نے پہلی ہی ملاقات میں اپنی محبت کا اظہار آپ سے نہیں کیا تھا؟"

دن ڈوب چکا تھا اور شام کے دھندلکے گہرے ہونے لگے تھے۔ تاریکی چاروں طرف چھا رہی تھی۔ بہت سے سیاح جن کے ساتھ مقامی لڑکیاں اور ان کی ساتھی عورتیں تھیں۔ ان کے ساتھ رومانی اور جذباتی منظر میں کھوئے ہوئے تھے۔ ان کے اور ہمارے درمیان خاصے فاصلے تھے۔ وہاں سے روانہ ہونے سے پہلے ہم نے پھر مہر محبت کا اعادہ کیا۔

ہم واپس جانے کے لئے اٹھے۔ میں شاید اس پرفضا اور راحت افزا مقام سے رات گئے تک منظور کرتا۔ مگر اندھیرے میں پیکن کے بازار خطرناک سمجھے گئے ہیں۔ اس لئے میں نہیں چاہتا تھا کہ ایک

عورت کو ساتھ لے کر رات کے اندھیرے میں ان سے گزرنے کی جرأت کرتا۔ ایک تو میڈون بہت حسین، پرکشش اور پر شباب بدن کی تھی۔ دوسرا یہ کہ وہ انگریز قوم کی تھی۔

تقریباً ہم کوئی چالیس منٹ کے بعد مسٹر بن فلیٹ کے مکان پر جا پہنچے۔ مگر راستہ ہی میں، میں دو باتوں کا عہد مصمم کر چکا تھا۔ اول یہ کہ ایک عزت دار شخص کی حیثیت سے مسٹر بن فلیٹ کو میڈون کو پسند کرنے کے بارے میں آگاہ کرنا ہے تاکہ وہ جان جائیں کہ مجھے میڈون سے محبت ہوگئی ہے۔ ہم دونوں ہی محبت کی ڈور میں بندھ گئے ہیں۔ دوسری بات جو میڈون سے کہنی ہے کہ میں چوں کہ ایک خطرناک مہم پر جا رہا ہوں۔ اس لیے وہ واپسی تک میرے کسی وعدہ و پیمان کی اپنے آپ کو پابند نہ سمجھے۔ اگر کوئی اس کی زندگی میں آتا ہے تو وہ اس کا ہاتھ تھام لے۔ مجھے کوئی شکوہ اور شکایت نہ ہوگی۔

رات کے کھانے سے فراغت پانے کے بعد میں نے مسٹر بن فلیٹ سے کہا کہ میں آپ سے تنہائی میں چند لمحے انتہائی ضروری گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ نشست گاہ مکان کے دوسرے حصے میں واقع تھی۔ ہم دونوں وہاں چلے آئے۔ "ہاں...... مسٹر آنند پال!" مسٹر بن فلیٹ نے کہا۔ "فرمایئے...... آپ مجھ سے کیا ضروری گفتگو کرنا چاہتے ہیں؟"

ایک مرد جہاں دیدہ کی طرح میں بھی پہنچا ہوا تو نہیں ہوں۔ پھر بھی میڈون سے محبت کے بارے میں بتاتے ہوئے ایک عجیب جھجک سی ہو رہی تھی کہ اس حال عشق کو کیسے بیان کروں۔ کیا تمہید باندھوں۔ کیا الفاظ ہونے چاہئیں۔ چند لمحوں تک ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکلا۔ ذہن میں ایک عجیب سی کش مکش ہو رہی تھی کہ کس پیرائے میں آغاز کروں؟ آخر میں نے جی کڑا کے کہا۔ آخر کب تک سوچتا اور خاموشی اختیار کئے رہتا۔

"مسٹر بن فلیٹ! آپ کو شاید میرے حالات کا بہ خوبی علم نہیں ہے؟"

"جی ہاں۔" انہوں نے اثباتی انداز میں سر ہلاتے ہوئے تسلیم کیا۔ "میں آپ کے حالات سے بہت کم واقف ہوں۔"

"میرے خیال میں یہ زیادہ مناسب ہوتا کہ کاش! آپ میرے تمام حالات سے پوری طرح آگاہ ہوتے۔" میں نے کہا۔

"وہ کس لئے......؟" مسٹر بن فلیٹ کے چہرے پر استعجاب سا چھا گیا۔

"اس لئے کہ میں آپ کی سالی مس میڈون کو چاہتا ہوں اور وہ بھی مجھے پسند کرتی ہیں۔ میں ان سے شادی کی درخواست بھی کر چکا ہوں۔"

"خوب......" مسٹر بن فلیٹ نے کہا۔ "مجھے اس کا اندازہ ہو چکا تھا۔ میں اور میری بیگم کا بھی یہی خیال ہے۔ میں اور میری بیگم اپنے ملک کی تہذیب سے دور اس ملک میں رہتے ہیں۔ مگر ان علامات کو نہیں بھولے جو ایسے موقعوں پر دیکھی جاتی ہیں۔"

"کیا میں اس بات کی امید کروں کہ آپ ہم دونوں کی پسند کو ناپسند نہ کریں گے۔" میں نے کہا۔

"اگر میں آپ سے صاف بیان کروں تو آپ برا تو نہیں مانیں گے؟" مسٹر بن فلیٹ بولے۔

میں ایک صاف گو شخص ہوں۔"

"جی نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "چوں کہ میں خود ایک صاف گو شخص ہوں اس لئے صاف گو لوگوں کی بڑی قدر کرتا ہوں۔"

"میں ذاتی طور پر آپ دونوں کی محبت اور شادی کو پسند نہیں کرتا ہوں۔" مسٹر بن فلیٹ نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"میں آپ کی اس ناپسندیدگی پر اعتراض نہیں کروں گا۔" میں نے کہا۔ "صرف اس کی وجہ جاننا چاہوں گا۔"

"ہاں...... اس کی وجہ ہے۔" مسٹر بن فلیٹ نے سر ہلایا۔ "میں تسلیم کرتا ہوں۔ وہ وجہ اثرات زمانہ اور بہتر شناسائی سے رفع ہو سکتی ہے۔ تاہم سر دست اس کی مزاحمت میں شک نہیں۔ ذرا خیال فرمائیں۔ آج سے پندرہ دن پہلے آپ مس میڈون سے واقف تھے اور نہ مس میڈون آپ سے...... پھر جن حالات میں آپ کا ایک دوسرے سے واسطہ پڑا وہ بھی ایسے جو فریقین کی سابقہ حالتوں پر کچھ روشنی نہ ڈال سکے۔ اس پر مستزاد آپ کی صحبت اور لباس کی تبدیلی یعنی آپ کا چینی پوشاک میں ایک ایسے آدمی کے ساتھ پھرنا جس سے ہر شخص خوف کھاتا ہے یقیناً یہ باتیں ایسی نہیں کہ انہیں کسی سفارش کے قابل سمجھا جائے۔ اس کے باوجود میں طبعاً متعصب نہیں ہوں اور میرا یہ اعتقاد ہے کہ جس آدمی کے مزاج میں وحشت ہو اس کی اصلاح کوئی مرد اس خوبی سے نہیں کر سکتا جیسی ایک عورت کر سکتی ہے۔ پس میں جو کہنا چاہتا ہوں، یہ کہ اگر آپ کو واقعی مس میڈون سے سچی محبت ہے تو اس کے دل پر فتح پانے کی کوشش کیجئے۔ تو میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ فتح ہر طرح قابل رشک ہو گی۔ محض انتظار سے حاصل کی جا سکتی ہے...... اگر آپ کی رائے میں مس میڈون اس قابل ہے کہ آپ اسے پانے کی کوشش میں عمل اور انتظار دونوں باتیں کر لیں۔ اگر آپ اس کے لئے تیار ہیں تو میں آپ کے لئے دعا کرتا ہوں کہ آپ اس میں کامیاب ہوں۔ نہ ہوں تو آج سے ان ملاقاتوں کا سلسلہ ختم کر دیں۔ بہر حال ایک بات کی دونوں صورتوں میں درخواست کروں گا۔ خواہ اس کے لئے آپ مجھے معتوب ہی کیوں نہ کریں۔ یعنی کل صبح ہی آپ یہاں سے تشریف لے جائیں۔ میں اس صاف گوئی اور تلخ لہجے پر معذرت خواہ ہوں۔"

"یہ آپ کی انکساری اور اخلاق ہے جو معذرت چاہ رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "میں نے خود صبح رخصت ہو جانے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔"

"آپ واقعی ایک دور اندیش شخص ہیں۔" مسٹر بن فلیٹ بولے۔ "آپ اس کی مصلحت اچھی طرح کہتے ہوں گے۔"

"جی ہاں۔" میں نے سر ہلا دیا۔ "میں جو ایک بار فیصلہ کر لیتا ہوں اس پر عمل کرتا ہوں۔"

"تو بس آخری فیصلہ یہ ہے کہ اس تعلق پر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" مسٹر بن فلیٹ کہنے لگے۔ "اگر چہ میں منظوری اس وقت نہیں دے سکتا جب تک آپ کے حالات سے بہتر واقفیت حاصل نہیں ہو جاتی۔ جب آپ گھر چلانے اور اخراجات برداشت کرنے اور ایک معقول آمدنی ہر ماہ پیدا کرنے لگیں تو

پھر آپ بلا جھجک شادی کی درخواست لے کر آئیں۔ پھر باقی گفتگو کی جائے گی۔ اس اثنا میں یہ معاملہ التوا میں رہ جائے تو اچھا ہے۔ میرے خیال میں میڈون کے والد آج حیات ہوتے تو وہ بھی اس معاملے میں یہی رائے دیتے جو میں نے دی ہے۔"

"آپ نے بڑا دور اندیشانہ فیصلہ کیا ہے۔" میں نے ان کے خیال کو سراہتے ہوئے کہا۔ "اور میں اس کے لئے شکریہ ادا کرنا چاہوں گا۔"

"خوشی کی بات یہ ہے کہ آپ میرے ہم خیال ہیں۔" مسٹر بن فلیٹ خوش ہو کر بولے۔ "اور اب میں چند الفاظ اس کام کی نسبت کہنا چاہتا ہوں جو آپ کو درپیش ہے۔ میں اس کی حقیقت معلوم کرنا نہیں چاہتا۔ مگر اس کا اطمینان ہو جانا چاہئے کہ اس میں کوئی مذموم بات تو نہیں......؟"

"آپ خاطر جمع رکھیں۔" میں نے انہیں دلاسا دیا۔ "کام بذات خود برا نہیں ہے۔ اخفا راز داری محض اس لئے اختیار کئے گئے ہیں کہ اس علمی تحقیقات کا حال جو مد نظر ہے، کسی پر ظاہر نہ ہوا ہے۔ بے شک جو خطرات درپیش ہیں وہ اس مہم کا حصہ ہیں۔ مگر مجھے اس کا معقول معاوضہ دیا گیا ہے۔ میں اس سے زیادہ آپ کو کچھ بتا نہیں سکتا۔"

"کیا آپ اس معاملے میں سخت راز داری کا وعدہ کر چکے ہیں؟" مسٹر بن فلیٹ نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"جی ہاں......" میں نے جواب دیا۔ "بہت ہی سخت وعدہ...... میں کسی اور کو اس معاملے میں اعتماد میں نہیں لے سکتا۔"

"اگر ایسی بات ہے تو پھر میں آپ کو مجبور نہیں کروں گا۔" مسٹر بن فلیٹ اٹھ کھڑے ہوئے۔ "اب آیئے واپس چلیں۔"

جب ہم لوگ گول کمرے میں گئے تو میڈون مجھے امید و بیم کی نظروں سے دیکھنے لگی۔ میں نے زیر لب تبسم سے اسے اطمینان دلایا اور پھر اسے دزدیدہ نظروں سے دیکھا۔ اس کی بڑی بہن جس کے بارے میں، میں نے کسی تفصیل سے ذکر نہیں کیا۔ وہ کمرے میں موجود تھی۔ وہ بھی ایک دلکش اور دیدہ زیب عورت تھی۔ میڈون کی طرح حسین تو نہ تھی لیکن بے حد پر کشش تھی اور مزاج کی بھی سادہ تھی۔ ایک پر خلوص اور ہمدرد عورت۔ مسٹر بن فلیٹ بیوی کے معاملے میں بڑے خوش نصیب تھے۔ وہ بڑی سمجھ دار بھی تھی۔ ایک تو اس نے عورت ہونے کے ناطے ہماری محبت کا اندازہ کر لیا تھا۔ اس نے بھی محبت کی شادی کی ہوئی تھی۔ محبت چھپائے کب چھپتی ہے۔ وہ مشک کی خوشبو کی طرح ہوتی ہے۔ اس نے شاید اپنی محبت کے بارے میں بہن کو بتا دیا ہو گا۔ وہ اپنی بڑی بہن کو نہ صرف ماں کی طرح سمجھتی تھی بلکہ اپنی دوست بھی۔ وہ کسی بہانے سے کھسک کر اپنی خواب گاہ میں چلی گئی۔ پھر میں نے میڈون کو میرے اور مسٹر بن فلیٹ کے درمیان ہونے والی گفتگو سنا دی۔

"کاش!" جب میں اپنی بات کہہ چکا تو میڈون بولی۔ "کاش! میں جان سکتی کہ آپ کس کام پر جا رہے ہیں؟"

”میڈون! کاش! ایسا کرنا میرے اختیار میں ہوتا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں چوں کہ رازداری کا وعدہ کر چکا ہوں، اس لئے مجھے اس کا ہر صورت اور ہر قیمت پر پاس کرنا ہے۔ آپ کو مجھ پر اعتبار کرنا چاہئے۔“

”آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں آپ پر اعتبار نہیں کرتی۔“ میڈون نے بڑے افسردہ لہجے میں کہا۔ ”دراصل خیال ان خطرات کا آرہا ہے جو وہاں آپ کو پیش آئیں گے اور پھر اس مدت دراز کا جو ہماری آئندہ ملاقات میں حائل ہوگی۔“

”یہ سب کچھ مجبوری ہے۔“ میں نے اس کے نرم و نازک اور ملائم ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ”البتہ اس عجیب اور پراسرار مہم میں شریک ہونے سے پہلے آپ سے ملاقات نہ ہوتی تو معاملہ بالکل ہی مختلف ہوتا۔“

”اس کے علاوہ جیسا کہ میں نے پہلے آپ سے کہا تھا کہ یہ آدمی ڈاکٹر نکولا خطرناک آدمی ہے۔“ میڈون نے میرے گلے میں اپنی سڈول مرمریں باہیں حمائل کر دیں۔ میرے چہرے پر نگاہیں مرکوز کر دیں۔ ”آپ احتیاط برتیں۔ محتاط رہیں اس سے۔“

”کوئی بات نہیں۔ میں اس سے بھگت لوں گا۔ اگر میں نے اس سے کوئی فریب نہ کیا تو وہ بھی مجھ سے کوئی بدسلوکی نہیں کرے گا اور نہ ہی نقصان پہنچائے گا۔ وہ صرف ایسے لوگوں کے حق میں برا ہے جو اس کے ساتھ فریب اور برائی کرتے ہیں۔ وہ ایسا نہیں ہے جیسا نظر آتا ہے۔“

”تو آپ کل رخصت کی تیاری کریں گے۔“ اس کی آنکھوں میں بدلی سی چھا گئی۔ ”کل کا دن جدائی کا پیغام لا رہا ہے۔“

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”آپ دعا کریں کہ وہ وقت جلد آئے کہ میں بہتر حالات میں آپ کے پاس واپس آؤں۔ اب مہربانی کر کے وہ انگوٹھی لے آؤ جو میں نے تحفہ میں دی تھی تا کہ اپنے ہاتھ سے اسے پہنا دوں۔“

وہ چند لمحوں میں وہ انگوٹھی لے کر آ گئی۔ میں نے اس کی مخروطی انگلی میں پہنائی۔ پھر دست حنا پر جوش بوسہ دیا۔ چند لمحوں کے بعد باہر کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ میں اس چاپ کو ہزاروں آدمیوں کی چاپوں میں بھی پہچان سکتا تھا۔ میں اس سے پہلے میڈون سے کچھ کہتا۔ ڈاکٹر نکولا کمرے میں داخل ہوا۔ میڈون اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔

ڈاکٹر نکولا کی اچانک اور غیر متوقع آمد سے مجھے جو وحشت اور اضطراب ہوا وہ محتاج بیان نہیں۔ اس وقت کے بعد میں نے بار بار سوچا کہ وہ کیا خصوصیت تھی جو ڈاکٹر نکولا سے ملنے والوں کے دلوں میں ہیبت پیدا کرتی اور اس کی طرف سے خوف زدہ بتاتی ہے۔ کیوں کہ میں نے دیکھا ہے کہ یہ احساس اوروں کے دل میں بھی پیدا ہوئے ہیں۔ مگر اس کا تسلی بخش جواب افسوس کہ نہیں مل سکا۔ شکل و صورت میں وہ بھی میری یا آپ کی طرح ایک معمولی انسان تھا۔ وہ کوئی خوف ناک دکھائی نہیں دیتا تھا اور نہ ہی چہرے مہرے اور وضع قطع سے جرائم پیشہ لگتا تھا۔ پھر بھی اس کے نام سے لوگ خوف کھاتے تھے۔

البتہ اس میں کچھ ایسے خصائص تھے جو اس کی ذات میں بھی شامل تھے جو بہت کم لوگوں میں پائے

جاتے ہیں۔ جب وہ کسی کو مخاطب کرتا یا کسی سے کچھ پوچھتا تو دوسرا آدمی اس کے سوالوں کا صاف اور سادہ جواب دینے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ ڈاکٹر نکولا کی موجودگی میں اس کی بات کو ٹالنے کی کوشش ناکام ہو جاتی تھی۔ اسے کوئی بے وقوف بنانا چاہتا تو وہ اس میں ہرگز ہرگز کامیاب نہ ہوتا۔ وہ ان آقاؤں میں سے تھا جو نوکروں اور ہر طرح کے آدمیوں سے کام لینے کا فن جانتے تھے۔ ایسی خاص قابلیت ہر کسی میں نہیں ہوتی تھی۔ میرا اپنا تجربہ یہ ہے کہ اس کے دیئے ہوئے ہر کام کو حسن و خوبی سے انجام دینے پر مجبور ہونا پڑتا تھا۔ آپ اس کے ذہن کا اندازہ اس بات سے بہ خوبی کر سکتے ہیں کہ کیسا ہی ضدی آدمی ہو، کیسی ہی ہٹ دھرمی پر اتر آیا ہو، اسے منٹوں میں سیدھا کر کے اس سے وہ بات جس کی امید رکھنا عام حالتوں میں ناممکن ہو، آسانی سے منوا سکتا تھا۔

ایک اور عجیب بات جو میں نے اس مرد پراسرار میں دیکھی وہ یہ تھی کہ وہ کسی نامعلوم ذریعہ سے پہلے ہی جان لیتا تھا۔ کہ اُس کے سوال کا کیا جواب دیا جائے گا۔ خود میں نے جلد ہی یہ بات معلوم کر لی تھی کہ اس کے سوالوں کا جواب دینا ہی فضول ہے۔

وہ کمرے میں داخل ہو کر سیدھا اس طرف بڑھا جہاں میڈون بیٹھی تھی اور اس کا نازک اور خوبصورت ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر مؤدبانہ انداز سے سلام کیا۔ انگریزوں میں اس کی روایت ہے۔ پھر میری طرف مڑ کر مخصوص تبسم کے ساتھ اس نے کہا۔

”مسٹر آنند پال! خوشی کی بات ہے کہ آپ صحت یاب ہو گئے۔ بیماری کی حالت میں جس تیزی سے آپ صحت یاب ہوئے ہیں۔ حیرت کی بات ہے۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ کہئے کب تک سفر شروع کرنے کا ارادہ ہے؟“

”میں آپ کے احکام کا منتظر ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”آپ جب کہیں مجھے تیار پائیں گے۔“ یہ کہتے ہوئے میری نگاہ غیر ارادی طور پر میڈون کی طرف اٹھ گئی۔ اس خیال سے جی بیٹھ گیا کہ رخصت کا وقت اتنی جلدی آ پہنچا۔

”میں آپ کے اس جواب سے بہت خوش ہوا ہوں۔“ ڈاکٹر نکولا نے کہا۔ ”کیوں کہ ہمارے وقت کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ کیا تھوڑی دیر بعد چلنے کے لئے تیار ہیں......؟ بس ٹھیک ہے۔ اب میں تھوڑی دیر مسٹر بن فلیٹ سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں اس کے بعد ہم روانہ ہو جائیں گے۔“

ڈاکٹر نکولا میڈون کی بڑی بہن کے ساتھ اس کے شوہر مسٹر بن فلیٹ کے ساتھ کمرے میں چلا گیا۔ تقریباً دس منٹ میں اور میڈون اس کمرے میں تنہا رہے۔ مگر اس موقعہ پر جو باتیں ہوئیں ان کا حال بیان کرنا غیر ضروری ہے۔ دس منٹ کے بعد جب میں باہر نکلا تو ڈاکٹر نکولا برآمدہ میں میرا منتظر تھا۔ ہم دونوں چپ چاپ نکلے۔ باہر کا دروازہ بند ہونے کے ساتھ ایسا معلوم ہوا گویا مجھ پر راحت کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔

☆......☆......☆

تقریباً پانچ منٹ تک ہم اسی طرح خاموشی سے چلتے رہے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ڈاکٹر نکولا کیا سوچ رہا ہے۔ بہر حال میرے خیالات تو میڈون کی طرف لگے ہوئے تھے۔ جس سے بھگوان جانے دوبارہ

کب ملاقات ہو۔ اس کی خوشبو اور پر کیف لمحات میرے ذہن پر پرانی شراب کے خمار کی طرح چھائے ہوئے تھے۔ اس کے سوا کوئی خیال اور تصور نہ تھا اور پھر یہ ملاقات جو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ وہ جیسے میری سانسوں میں بس گئی تھی۔ ڈاکٹر نکولا نے میرے دل کا حال اور ذہنی کشمکش کو بشرے سے جیسے بھانپ لیا تھا۔ میں اس سے ایک قدم پیچھے تھا۔ وہ میری طرف مڑا اور کہنے لگا۔

''مسٹر آنند پال! آپ اس قدر اداس اور پریشان کیوں ہیں؟ مرد ہو، حوصلہ کرو۔ ہم جلد واپس آجائیں گے۔ اس وقت آپ کتنے مال دار ہوں گے۔ آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ مس میڈون کے لئے انتظار داخل راحت ہے۔ انتظار میں بھی بڑا کیف ہے۔ عورت کو جو لذت محسوس ہوتی ہے۔ اس کا مزا وہ خود جانتی اور محسوس کرتی ہے...... میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں کہ مس میڈون آپ کی طرف مائل ہیں۔ آپ بڑے خوش نصیب ہیں۔''

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر چند لمحوں کے بعد پوچھا۔ ''آپ کو یہ سب کچھ کیسے اور کس سے معلوم ہوا؟ جب کہ ہم نے اس بات کو......''

ڈاکٹر نکولا مسکرا دیا۔ پھر اس نے قدرے توقف کے بعد جواب دیا۔ ''آپ بھول رہے ہیں...... یا میں مسٹر بن فلیٹ سے مل کر نہیں آیا؟''

''لیکن مجھے یقین نہیں آتا کہ انہوں نے اس موضوع پر آپ سے بات کی؟'' میں نے کہا۔ ''اگر بات کی تو حیرت کی بات ہے۔''

''کیسے نہیں ...... بات تو ہوئی...... میں ان سے پوچھنے ہی تو گیا تھا...... آپ چوں کہ میرے دوست ہیں اور آپ نے ایک موقع پر میری جان بچائی ہے۔ اس لئے میں اس کا صلہ دینے کے لیے مسٹر بن فلیٹ سے مل کر آپ کی سفارش کرنا چاہتا تھا...... مجھ سے پوچھیں تو یہ بہت اچھا ہی ہوا کہ آپ کو میڈون سے محبت ہو گئی۔ حالاں کہ میں ایسی باتوں کا قائل نہیں ہوں۔ تاہم یہ عام قائدہ ہے کہ مبتلائے عشق ہونے کے بعد انسان اپنے افعال کے بارے میں زیادہ محتاط ہو جاتا ہے۔''

''میں آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے میرے معاملات میں اتنی دل چسپی لی۔'' میں نے ممنون لہجے میں کہا۔

''شکریہ کی ضرورت نہیں۔'' ڈاکٹر نکولا نے کہا۔ ''یہ ایک عام انسانی فرض تھا جو میں نے ادا کر دیا۔ مگر اب جلدی کریں۔ مجھے آپ سے بہت ساری باتیں کہنی ہیں اور کل صبح روانگی سے پہلے کئی ایک تیاریاں کرنی ہیں۔''

''مگر آپ اس وقت کدھر لئے جا رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔ ''غالباً یہ اس مکان کا راستہ نہیں ہے جس میں ہم ٹھہرے ہوئے تھے۔''

''بے شک نہیں ہے۔'' ڈاکٹر نکولا نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''ہم دوسرے مکان پر جا رہے ہیں۔ جہاں ایک انگریز دوست رہتا ہے۔ اس جگہ پہنچ کر ہم پھر سے چینی لباس پہن لیں گے۔ یہ نہایت

ضروری ہے۔''

''گویا ہمارے لئے انگریزی لباس میں ملبوس رہنے کا یہ آخری موقع ہے......؟'' میں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''ہاں۔'' ڈاکٹر نکولا بولا۔ ''چند ماہ تک ہمیں چینی لباس میں رہنا ہوگا۔ پھر اس کے بعد اس کی ضرورت نہ ہوگی۔''

اس کے بعد ہم چپ چاپ چلنے لگے...... ہمارے درمیان سکوت طاری ہو گیا۔ میں نے سوچا۔ ڈاکٹر نکولا شاید اس وقت ان لاتعداد سازشوں پر غور کر رہا ہوگا جو ہر وقت اس کے پیش نظر رہتی تھیں اور میں میڈون کے حسین تصور میں کھویا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہم اس مکان پر جا پہنچے جو اس کے انگریز دوست کا تھا۔ ڈاکٹر نکولا نے دروازے پر دستک دی۔ جب دروازہ کھلا تو میں نے دیکھا کہ ایک چھوٹا سا مکان ہے۔ جو بازار سے ایک طرف ہٹ کر بنا ہوا تھا۔ اس کا مالک ایک انگریز تھا جو گاہ بہ گاہ نامعلوم کاموں کے سلسلے میں اندرون ملک لوچلا جاتا تھا۔ ڈاکٹر نکولا کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ کنوارا اور مجلسی تعلقات کے بارے میں غیر محتاط ہے۔ پیکن میں لوگ اسے صاحب عزت نہیں جانتے۔ پانچ منٹ اس آدمی کے پاس رہنے کے بعد میں اس کے خصائل سے پوری طرح واقف ہو گیا اور یہ سوچ کر مجھے سخت حیرت ہوئی کہ ڈاکٹر نکولا کیوں ایسے آدمی کی صحبت کو پسند کرتا ہے۔ بہر حال دو باتیں جلد ہی واضح ہو گئیں...... ایک یہ کہ وہ ڈاکٹر نکولا سے بہت ڈرتا ہے۔ دوسرا یہ کہ ڈاکٹر نکولا خود بھی اسے خوف زدہ رکھنا چاہتا ہے۔ ڈاکٹر نکولا کی موجودگی میں یہ شخص جس کا نام ایچ ہل معلوم ہوا اپنے اضطراب پر بہ مشکل قابو پایا ہوا تھا اور شاید اس پر پردہ ڈالنے کی غرض سے وہ ہر بات میں مذاقیہ لہجہ اختیار کر لیتا تھا۔

تعارف کے تھوڑی دیر بعد وہ مجھ سے بے تکلف ہو گیا اور کہنے لگا۔ ''مسٹر آنند پال! کیا بات ہے۔ آپ کچھ افسردہ افسردہ سے نظر آتے ہیں۔'' پھر اس نے توقف کر کے سرکس کے ایک جوکر کے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔ ''یہ چڑھی ہوئی آنکھیں...... لرزاں ہاتھ زرد چہرہ مے نوشی کا نتیجہ تو نہیں دوست؟''

مجھے اس کی یہ بے باکانہ گفتگو بالکل بھی پسند نہیں آئی۔ میرے دل کو رنج ہوا۔ مگر میں نے ضبط کر کے سرسری جواب دیا۔ ''میں دراصل کئی روز شدید بخار میں مبتلا رہا تھا۔ یہ اس کا نتیجہ ہے۔''

''بے شک...... بے شک...... یہ شہر پیکن کی گندی ہوا کا اثر ہے۔'' وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس غربت زدہ ملک میں زندہ انسان تو کیا مردہ لاشیں آئیں تو بیمار ہو جائیں۔ مگر کچھ ڈر نہیں...... ان تمام باتوں کا کوئی خیال نہ کریں۔ ہمت اور حوصلے سے کام لیں۔ آپ جلد صحت یاب ہو جائیں گے۔''

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ڈاکٹر نکولا کی طرف مڑا۔ جو ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھا ہوا دونوں ہاتھوں کی انگلیاں جوڑے ایچ ہل کی طرف قہر آلود نظروں سے گھور رہا تھا۔ جیسے کچا چبا جائے گا۔ معلوم ہوتا تھا کسی نامعلوم وجہ سے بے چین ہے اور پھر جب بولا تو اس کی آواز میں سختی اور سنجیدگی پائی جاتی تھی۔ گویا ہر ایک لفظ کو پوری طرح واضح کرنا چاہتا تھا۔

"مسٹر ایچ بل!" اس نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ ہر قسم کی تنبیہہ کے باوجود تم نے اپنے چینی دوستوں سے میرے آنے کا حال کہہ دیا۔"

میں نے دیکھا ایچ بل ان لفظوں کو سن کر تلملا گیا۔ چہرے کی رنگت، پہلے سرخ اور پھر زرد ہوگئی۔ اس نے اپنا ہاتھ دیوار کی طرف اس طرح بڑھا دیا جیسے کسی چیز کا سہارا لینا چاہتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔

"تمہارے ان چینی دوستوں نے......" ڈاکٹر نکولا نے اپنی بات جاری رکھی۔ "تم نے اس واقفیت کو بڑا ہی قیمتی سمجھا ہوگا کہ اس کے لئے اتنی گراں قیمت ادا کرنے کو تیار ہوگئے۔"

ایچ بل نے جواب دینے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اب اس کی اگلی خوش طبعی مفقود ہو چکی تھی۔ زور زور سے کانپتا ہوا اس کا ساکن و بے رحم چہرہ میں دیکھ رہا تھا۔ اس سے نظریں ہٹانا ناممکن نظر آتا تھا۔

دفعتاً ڈاکٹر نکولا کا انداز بدل گیا۔ وہ برقی سرعت سے اٹھا اور پر جوش لہجے میں کہنے لگا۔

"بدمعاش کتے......تو کیا مجھے دھوکا دینا چاہتا تھا......؟ تو شاید میرے مزاج سے واقف نہیں ہوا اور جو میں کہتا ہوں وہ یاد رکھ......کیوں کہ میں کسی بات کو دوبارہ کہنا پسند نہیں کرتا۔ آج جس طرح کہتا ہوں۔ ایک خط اپنے چینی دوستوں کے نام لکھنا اور کل صبح چھ بجے گھوڑے پر سوار ہو کر ٹینٹس چلے جانا......اس جگہ مسٹر ولیمز سے ملنا۔ جس کا پتہ تمہیں معلوم ہے اور اس سے مل کر کہنا کہ ڈاکٹر نکولا نے مجھے بھیجا ہے اور حکم دیا ہے کہ میں اس مکان میں ایک ماہ تک زیر حراست رہوں۔ اس کے ساتھ ہی یاد رکھ۔ اگر تو نے میرے یا میرے معاملات کی نسبت کسی سے گفتگو کی تو میں غائبانہ سارا حال معلوم کر کے آدھے گھنٹے کے اندر اندر تیری گردن کٹوا دوں گا۔ بے وقوف......احمق......تو نے کیا مجھے ایسا حقیر سمجھا تھا کہ مقابلے کو تیار ہوگیا۔ اب بھی خدا کا شکر گزار ہو کہ تجھے موت کی سزا نہیں دی۔ جس کا تو جس واقعہ میں مستوجب تھا۔ ٹاٹ کا حال تو بھولا نہ ہوگا۔ اس کی مثال یاد رکھ اور عبرت حاصل کر......تیری طرح وہ بھی تھا۔ اپنے آپ کو ہوشیار سمجھتا تھا......مگر انجام کار......تاب مقابلہ نہ لا کے خودکشی کر گیا۔ یہی حشر تیرا ہوگا۔ اگر اب بھی تو نے چالاکیوں سے توبہ نہ کی۔ بس جا......جا کر سفر کی تیاری کر......میں اس کی اطلاع ولیمز کو بھیج دوں گا۔ اگر تو جمعرات کی صبح تک اس جگہ نہ پہنچا تو سمجھ لے کہ دنیا کی کوئی طاقت تجھے میرے عتاب سے بچا نہیں سکتی۔"

ڈاکٹر نکولا کی اس لمبی تقریر نے اس کی جیسے اوسان خطا کر دیئے۔ اس نے زبان سے ایک لفظ نہیں کہا۔ اس کا چہرہ سفید دھلی چادر کی طرح پڑتا چلا گیا۔ پھر وہ سراسیمہ اور حد درجہ خائف سا اٹھا اور رخصت ہوگیا۔

میں اس عجیب منظر کو دیکھ کر متحیر تھا۔ اس کے کمرے سے باہر جانے کے بعد میں نے نکولا کی طرف دیکھا اور کہا۔ "آخر آپ کو اس بات کا کیوں کر پتہ چلا کہ اس نے بے وفائی کی......؟"

"کیوں کر......؟" ڈاکٹر نکولا نے طنز سے کہا اور جھک کر فرشی زمین پر سے دو چینی سگریٹوں کے ادھ جلے ٹکڑے اٹھا لیے اور پھر ایک الماری کے پاس جا کر اس سے برانڈی کی بوتل نکالی۔ تین میلے استعمال شدہ گلاس اس بوتل کے پاس پڑے تھے۔ بوتل خالی پڑی تھی۔ یہ چیزیں مجھے دکھانے کے بعد وہ

پھر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

"ایچ بل اس وقت شراب پیتا ہے۔ جب عورت اور آدمی اس کے ساتھ ہوں۔ نوجوان چینی، فلپائنی یا تھائی لڑکیاں اور عورت اس کی کمزوری ہیں۔ جب میں ہوتا ہوں تو پھر وہ کسی عورت کو گھر نہیں لاتا ہے۔ لیکن ان تینوں گلاسوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لڑکیاں نہیں مرد تھے۔ وہ دو تین لڑکیاں لانے سے رہا۔ وہ اکیلا کبھی نہیں پیتا۔ میری موجودگی میں کم پیتا ہے۔ میں جب آپ کو لینے نکلا تو یہ بوتل تین حصوں میں پرتھی اور سگریٹوں کے ٹوٹے فرش پر کہیں موجود نہ تھے۔ اس کے علاوہ جب میں جانے لگا تو دو آدمی چھپ کر اس مکان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہیں اس جگہ سگریٹ کا ایک ٹوٹا مل گیا جو پھینکا ہوا تھا جسے میں نے کسی خیال کے پیش نظر اٹھا لیا اور احتیاط سے اپنے پاس رکھ لیا۔ آپ اسے فرش کے ٹوٹوں سے ملا کر دیکھ سکتے ہیں۔ رہا سہا شک ایچ بل کے رویہ اور اس کی صورت سے ہوگیا۔ یہ صحیح ہے کہ میں نے اس پر جو الزام لگایا محض میرا قیاس تھا۔ مگر میں بے وجہ قیاسات کسی پر نہیں کرتا۔ موجودہ حالت میں آپ نے دیکھ لیا، میرا اندازہ کتنا صحیح تھا۔"

"آپ کی رائے میں وہ کیا حالات اور باتیں ہیں جو اس نے ان پر ظاہر کر دی ہوں گی؟" میں نے پوچھا۔ "اور یہ پراسرار لوگ کون تھے جو یہ باتیں معلوم کرنے کے لئے آپ کی غیر موجودگی میں اس مکان میں آئے تھے؟"

"یہ تو میں بالکل بھی نہیں جانتا کہ وہ کون لوگ تھے؟" ڈاکٹر نکولا نے جواب دیا۔ "ویسے ایچ بل انہیں کوئی خاص معلومات نہ بتا سکا ہوگا۔ کیوں کہ خود اسے بہت کم علم تھا۔ میں نے اس کے ساتھ جو کچھ اصولاً کیا اس لئے کہ اسے سخت ناپسند کرتا ہوں۔"

"اسے آپ نے ولیمز کے ہاں جو بھیجا ہے کیا اس میں کوئی مصلحت تھی؟"

"صرف اس لئے کہ وہ کوئی ایسی حرکت اور شرارت نہ کر سکے جو پریشان کرنے والی بات ہو......اس کے علاوہ میں اسے سبق سکھانا چاہتا تھا۔ چوں کہ آدمی کام کا ہے اور اس سے آئندہ موقعوں پر کام لیا جا سکتا ہے۔ اس لئے تھوڑا سا ضبط اور انتظام بے جا نہ ہوگا۔ مگر اب میرے خیال میں اس ضمن میں کافی بات ہو چکی ہے۔ اب میں آپ سے ایک اور موضوع پر بات کرنا چاہتا ہوں۔ لہٰذا آپ پہلے یہ تو دیکھ لیں کہ باہر تو کوئی نہیں ہے؟ پھر میرے پاس کرسی لے آئیں۔"

میں دبے پاؤں دروازے تک گیا۔ دوسرے لمحے دفعتاً میں نے دروازہ بے آواز کھولا اور پھر باہر جھانک کر چاروں طرف اچھی طرح سے دیکھا۔ کوئی نظر نہ آیا۔ پھر میں ایک کرسی اٹھا کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے جیب سے ایک تہہ کیا ہوا خط نکالا اور اسے پڑھنے کے لئے کھولا۔ مگر مضمون سنانے سے پہلے اس نے سرگوشی میں کہا۔

"یہ خط پرنڈر کاسٹ نے بھیجا ہے۔ آج دوپہر کو ایک قاصد لایا تھا۔ ذرا غور سے سنیئے گا۔ مقام روانگی ٹینٹس درج ہے۔" بنام ڈاکٹر نکولا۔ پیکن۔

"جناب والا! جمعرات کو میرے نام مسٹر ولیمز کا ایک ت... ل ہوا تھا کہ ایک نہایت ضروری کام

کے لئے اس جگہ چلے آئیں۔ میں اس تار کو پڑھ رہا تھا کہ ایسٹ اوور بھی آ گیا اور کہنے لگا۔ اس مضمون کا ایک تار میرے نام بھی آیا ہے۔ چوں کہ دونوں کو سخت تاکید کی گئی تھی اس لئے روانگی کی فوراً تیاری کی گئی۔ حتیٰ کہ دو گھنٹے کے اندر ہم جہاز جیمز سونا ہن پر سوار ہو کر ٹینٹس روانہ ہو گئے۔

اس جگہ پہنچ کر اپنی آمد کی اطلاع مسٹر ولیمز کو دی اور ان سے اس کام کی نوعیت معلوم ہوئی جو ہمارے سپرد کیا جانا تھا۔ کام بہت مشکل اور خطرناک تھا اور میں اعتراف کرتا ہوں کہ بادی النظر میں اس کی دشواریاں ناقابل عبور معلوم ہوتی تھیں۔ ہنکاڈ کا بڑا پجاری ایک مشہور اور ہر دل عزیز آدمی ہے اور جب کبھی اسے کہیں جانا ہو، اس کے مداحوں اور پیروؤں کی خاص تعداد اس کے ساتھ رہی اور اب بھی رہا کرتی ہے۔ گویا یہ حالت سفر میں اسے گرفتار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ رہ گیا شہر میں زیر حراست کرنے کا سوال تو یہ اس لئے ناممکن تھا کہ ایسا کرتے ہی چین کے جاہل لوگ شیطان کی طرح چیختے چلاتے اور وہ اودھم مچاتے کہ نا صرف ہمارے لئے جانیں بچانا بلکہ آپ کے لئے اس کام کو انجام دینا بھی مشکل ہو جاتا، جس کا یہ پیش خیمہ تھا۔ بہت غور و خوض کے بعد میں نے چک چین سے خط و کتابت کی تھی جو ہنکاڈ میں تھا۔ اس کی وساطت سے معلوم ہوا کہ ہنکاڈ کا بڑا پجاری اپنے عہدے سے مستعفی ہو کر ایک لمبے سفر پر جانے کی تیاری کر رہا ہے۔

یہ معلوم کرنے کے بعد میں نے چنگ ین کو وہ راستہ دریافت کرنے کے لئے کہا۔ جس پر ہنکاڈ کے پجاری کو روانہ ہونا تھا۔ اس نے بتایا کہ سفر ہنگ چو اور فون چنگ کے رستہ سانچو تک اور پھر اس کے بعد رستہ تنگ ہائی ہوتے ہوئے ٹینٹس اور وہاں سے پیکن میں طے کیا جائے گا۔ میں نے اس ملک کا نقشہ حاصل کر کے اس کا مطالعہ کیا اور مسٹر ولیمز اور ایسٹ اوور کے مشورہ سے یہ بات طے کی کہ جو کچھ کرنا ہے۔ سانچو میں کرنا چاہئے۔ اس کی نسبت آپ کو معلوم ہوگا، اس مقام کے پاس ایک چھوٹا سا شہر ہے جہاں نہر نان فنگ سے گزر کر دریائے جون لیا نگ سے جا ملتی ہے۔

یہ طے ہو چکا تو دوسرا سوال پجاری کو اس ترکیب سے بھگانے کا تھا۔ جس میں شور و شر مشکل نہ ہو۔ ضرورت ایسی ترکیب اختیار کرنے کی تھی۔ جس سے اس کے پیرو خیال کریں کہ وہ اپنی مرضی سے کسی طرف چلا گیا ہے۔ مگر سوال یہ تھا کہ ایسا کیوں کر اور کس لئے ہوا۔ آدمی سن رسیدہ اور شکی ہے اور کبھی کسی پر بھروسا نہیں کرتا۔ پس جب تک کوئی خاص ترکیب سوچی نہ جائے کامیابی محال تھی۔ میں نے اس معاملے میں بھی چنگ ین کی امداد طلب کی۔ میں نے سمجھایا جس طرح ممکن ہو پجاری کی ملازمت حاصل کر لو اور جب ایک بار کامیابی حاصل ہو جائے۔ پھر اس کا پورا اعتماد حاصل کر لو۔ وقت چوں کہ کم تھا۔ اس لئے اچھے موقعوں کا انتظار غیر ممکن ہوا۔ سب کام کو اتفاقات پر ڈالنا پڑا تھا۔ سو طرح کے خطروں کو نظر انداز کر کے چنگ ین آخر کار اس عملہ میں شریک سفر ہوا اور اس کے ساتھ جانا پڑا تھا۔ آدمی چوں کہ ہوشیار ہے۔ اس لئے جلد ہی نئے آقا کی نظروں میں اہمیت اختیار کر گیا۔ اس کے بعد باقی کام آسان تھا۔

چنگ ین کے ملازم ہونے کے تین دن بعد پجاری نے بڑے عملے کے ساتھ روانگی کی تیاریاں کیں۔ جیسا خیال تھا۔ چنگ ین نے توقع سے کہیں زیادہ کامیابی حاصل کر لی۔ حتیٰ کہ ایک سو میل کے سفر

میں نئے آقا کی عادتوں سے واقف ہو گیا۔ اس نے وہ تمام باتیں معلوم کر لیں۔ جس سے پجاری کو آرام پہنچایا جا سکتا تھا اور کام اس تندہی سے کیا کہ ہر بات میں معتمد سمجھا جانے لگا۔ فون چنگ پہنچتے پہنچتے اسے سکریٹری کا عہدہ دے دیا گیا اور اب اس سازش کو عمل میں لانے کا وقت بھی آ پہنچا جو میں نے اس موقع کے لئے سوچ رکھا تھا۔

آہستہ آہستہ بڑی موثر مگر سرگوشی کے انداز میں چنگ ین نے پجاری کو ایک بہت بڑے خزانے کا حال سنانا شروع کیا۔ جسے اقل تر خطرہ سے حاصل کیا جا سکتا تھا۔ پجاری چوں کہ حریص تھا اس لئے باتوں میں آ گیا اور اس کے بعد جب اسے ان چھٹیوں کے مضمون سے واقف کیا گیا جن کی نسبت بیان کیا گیا کہ چنگ ین کے چچازاد بھائی کونگ کا نے سانچو سے لکھی ہیں تو اس دام فریب کی تکمیل میں کوئی دقیقہ باقی نہ تھا۔

آٹھ دن بعد یہ جماعت نہر کے دہانہ پر جا پہنچی۔ ادھر میں اور ایسٹ اوور بھی ٹینٹس سے روانہ ہو چکے تھے اور اس جماعت سے ملنے کے لئے تیزی سے سفر کرنے لگے۔ چنگ ین بھی اپنے فرض سے غافل نہ تھا۔ جوں ہی وہ لوگ سرائے میں قیام کر چکے۔ وہ سیدھا میرے پاس آیا۔ معلوم ہوا اس نے سارا انتظام حسن و خوبی سے کر دیا ہے۔ حتیٰ کہ پجاری کے نوکروں میں بھی یہ بات مشہور کر دی کہ سانچو سے چلنے کے بعد تقدس مآب کا ارادہ عملہ کو برخاست کر کے تنہا سفر کرنے کا ہے۔ اب ضرورت فقط پجاری جی سے ملنے اور کوئی ایسا طریق اختیار کرنے کی تھی جس سے ان کو زیر حراست کر کے چالیس میل کا فاصلہ جو سانچو چی کاہویں میں حائل ہو بہ حفاظت طے کیا جا سکے اور آخری مقام پر پہنچ کر پجاری جی کو جہاز میں سوار کرا دیا جائے جو پہلے سے ان کے لئے تیار تھا۔ یہ طے کر کے میں نے سفر کا انتظام اپنے ذمہ لیا اور پجاری کی حراست ایسٹ اوور کے سپرد کر دی۔

یوں تو پجاری جی کو ورغلانے کے لئے ہم نے دو ایک تدبیریں اختراع کی تھیں۔ پہلی تدبیر یہ تھی کہ کسی نوجوان اور حسین لڑکی جس کی عمر اٹھارہ برس سے زیادہ نہ ہو، اس کو چارہ ڈالا جائے۔ عورت ایک ایسا جادو ہے جس سے ایک مرد چاہے کتنا ہی بوڑھا اور کیسا ہی پجاری کیوں نہ ہو، بچ نہیں سکتا۔ پجاری عورتوں سے بہت دور بھاگتے ہیں۔ چاہے وہ کیسی ہی حسین اور نوجوان کیوں نہ ہو۔ جب پجاری کو دولت کی حرص تھی تو عورت کی بھی ہوس ہو سکتی تھی۔ پجاری کی عمر بہت زیادہ نہیں تھی۔

پہلی تدبیر زیادہ بہتر معلوم ہوئی تو دوسری تدبیر مؤخر کر دی گئی اور اس کے بارے میں غور و خوض نہیں کیا تا کہ پہلی تدبیر کا حشر دیکھ لیا جائے وہ ناکام یاب ہوتی ہے یا نہیں...... اس میں کوئی حرج بھی نہیں تھا۔ پھر ایسٹ اوور نے ایک ایسی نوجوان لڑکی تلاش کی جس کی عمر اٹھارہ برس کی تھی۔ وہ بے حد حسین و جمیل تھی۔ وہ مردوں کو شیشے میں اتارنے کا فن جانتی تھی۔

پھر ایک رات پجاری جی کو ایک بہانے سے ایک مکان میں لے جایا گیا۔ جس خواب گاہ میں انہیں لٹایا گیا۔ اس میں شراب بھی رکھ دی گئی۔ یہ پرانی شراب تھی جس کا نشہ گہرا اور تیز ہوتا ہے۔ مرد کیا عورت بھی بہک جائے اسے پی کر...... پھر اس لڑکی کو اچھی طرح سمجھا دیا گیا تھا کہ پجاری جی کو اپنے حسن کے ناز

وانداز دکھا کر پاگل کردے۔ ساری رات گزارے۔

ایسٹ اودر، پجاری جی کو کمرے میں بٹھانے کے بعد اس لڑکی کو جو دوسرے کمرے میں بیٹھی تھی باہر لائے۔ وہ فلپائنی حسینہ تھی۔ ہزاروں میں ایک تھی۔ وہ ایسے لباس میں تھی کہ اس کے بدن پر لباس ہی محسوس نہ ہوتا تھا۔ پجاری جی کا حسینہ کے جال سے نکلنا آسان نہ تھا۔ ایسا خطرناک اور مہلک ترین ہتھیار دنیا میں نہ ہوگا۔ ایسٹ اودر نے لڑکی کو کمرے میں جانے کا اشارہ کیا۔ وہ جیسے ہی کمرے میں گھسی، ایسٹ اودر نے اس طرح دروازہ بند کرلیا جیسے اس نے کمرے میں بم پھینکا ہو اور وہ فوراً ہی پھٹنے والا ہو۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ پجاری جی شاید اس بم کو باہر پھینک دیں اور ہم نے دروازے پر نگاہیں مرکوز کردیں......

لیکن ہمارا یہ خیال تھا کہ دروازہ اب کھلا کہ اب کھلا۔ پجاری جی دولت اور کسی بھی خزانے کے اسیر ہو سکتے تھے۔ لیکن ایک عورت کے نہیں...... ایک گھنٹہ بیت گیا۔ پجاری جی غلاظت کے دلدل میں جا گرے تھے اور اس لڑکی نے انہیں اپنا ایسا اسیر بنایا تھا کہ وہ خود پر قابو نہ پاسکے چت ہوگئے تھے اور پھر لڑکی نے کلوروفارم والا رومال سونگھا کر انہیں بے ہوش کردیا تھا۔

لڑکی کو رخصت کرنے کے بعد پجاری کے جو ساتھی تھے اب انہیں رخصت کرنے کا مسئلہ تھا۔ جو کہ آسان نہ تھا۔ کیوں کہ اس کے پیروکاروں کو اس سے بڑی عقیدت تھی۔ اس کے ایک ادنیٰ سے اشارے پر وہ کٹ مرنے کے لئے تیار ہوجاتے تھے۔ اگر انہیں ہوا لگ جاتی کہ ان کے پجاری کو اغوا کرنے کی منصوبہ بندی کی گئی ہے تو پھر وہ ہمارا قیمہ بنا دیتے۔ انہیں پجاری جان سے بھی عزیز تھا۔

چنگ ین نے ان کے پیروکاروں سے طلوع آفتاب کے بعد جا کر کہا کہ...... پجاری جی نے تین دنوں کے لئے مرن برت کیا ہے اور انہوں نے حکم دیا ہے کہ تم سب کو رخصت کردیا جائے، اجرت دے کر، پھر اس نے ان سب کو اجرت دے کر رخصت کردیا۔ ان کے جانے کے کوئی ایک گھنٹہ بعد چنگ ین نے اس کی داڑھی اور مونچھیں اور سر کے بال صاف کر کے چٹیل میدان بنادیا۔ اب تو اس کے فرشتے بھی اسے پہچان نہیں سکتے تھے۔ وہ چیخ چیخ کر بھی کہتا کہ وہ پجاری ہے تو کوئی اس کی بات کا یقین نہ کرتا۔ پھر اسے ایک گھوڑے پر لاد کر جس طرح اناج کی بوری لادی جاتی ہے اسے لے جایا گیا۔ پھر اسے جہاز پر سوار کرادیا گیا۔ پھر جہاز روانہ ہوگیا۔

''بس اب میدان صاف ہے۔'' ڈاکٹر نکولا نے کہا۔ ''آج سے ہنکاؤ کا بڑا پجاری میں ہوں۔ آپ کی علالت کے دنوں میں مجھے جو معلومات حاصل ہوئی ہیں اس کی بنا پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہمیں فراغت واطمینان ہوجائے گا۔ کل ہم لاماس پہنچ جائیں گے جس کے بعد ہماری عقل وفراست کا امتحان ہوگا...... اس کے علاوہ بڑی مشکلات اور مصائب اور ایسے خوف ناک اور خطرناک حالات سے گزرنا ہوگا جن کا ہم تصور نہیں کر سکتے...... لیکن اس کا اندازہ بڑا روح فرسا ہے۔ وحشت ناک ہے۔''

''یہ سب کچھ درست ہے اور میں اس کے لئے تیار بھی ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن یہ تو بتائیں کہ یہ سب کچھ کس کے لئے ہے......؟ آپ نے اب تک اس مہم کی منزل نہیں بتائی۔ میں اندھیرے میں ہوں۔ آپ

نے مجھ سے صرف اتنا کہا تھا کہ کامیابی کی صورت میں میں مالا مال ہوجاؤں گا اور آپ نے ایک خطیر رقم پیشگی بھی دی ہے۔ کوئی حرج نہ ہو تو آپ مجھے اعتماد میں لیں۔ میں آپ کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔''

''ہماری منزل مراد ایک ہیرا ہے۔'' ڈاکٹر نکولا نے جواب دیا۔ ''اس کے حصول کے لئے ہم پاپڑ بیلنے اور جان خطرے میں ڈالنے نکلے ہیں۔''

''اس ہیرے میں ایسی کیا خوبی ہے؟'' میں نے کہا۔ ''کیا وہ دنیا کا سب سے قیمتی ہیرا ہے کوہ نور ہیرے سے کہیں قیمتی......؟''

''اس ہیرے میں صرف کوئی ایک خوبی نہیں ہے۔'' ڈاکٹر نکولا بولا۔ ''اس میں بہت ساری خوبیاں ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ دنیا کا سب سے انمول اور نایاب اور انوکھا ہیرا ہے جس کی صفات نہ تو کسی ہیرے میں موجود ہیں اور نہ ہوسکتی ہیں۔ رہی اس کی قیمت...... یہ ایک کھرب روپے نہیں بلکہ ایک کھرب برٹش پاؤنڈ یا ڈالر سے بھی بڑھ کر ہے۔''

''کیا......؟'' میں بھونچکا سا ہوگیا اور لمحے کے لئے سناٹے میں آ گیا۔ ''ایک کھرب ڈالر یا پاؤنڈ......؟ آپ مبالغہ تو نہیں کررہے ہیں؟''

''میں مبالغہ نہیں کر رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''دیکھا جائے تو اس کی خصوصیات ایسی ہیں کہ ایک کھرب قیمت بھی کم ہے۔''

''میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ آپ مبالغہ نہیں کر رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''آخر اس میں ایسی کیا خصوصیات موجود ہیں؟''

''میں نے ان کی ایک خوبی یا خصوصیت آپ کو بتادی۔'' ڈاکٹر نکولا نے کہا۔ ''دوسری خصوصیت یہ ہے کہ جس کے پاس یعنی اس کی جیب میں یہ ہیرا ہو اس پر کوئی چیز اثر نہیں کرسکتی مثلاً آگ تلوار...... بندوق یا پستول کی گولی...... بم...... چاقو چھری اور نیزہ وغیرہ اور پھر اس ہیرے کو ایک گلاس پانی یا دودھ میں ڈال کر چند لمحوں بعد پی لیا جائے تو پینے والے میں ایسی توانائی آجاتی ہے کہ وہ شیر کے جبڑے چیر سکتا ہے۔ شیر، گینڈے اور گھوڑے کو ایک نوزائیدہ بچے کی طرح اٹھا کر دس فٹ دور پھینک سکتا ہے۔ اس ہیرے کی تیسری خوبی یہ ہے کہ ایک نوجوان لڑکی، پرشباب عورت اور کتنی ہی پاک دامن اور کسی کی ہم سفر دوشیزہ کیوں نہ ہو اس پر مرمٹ جائے گی۔ اس ہیرے کی ملکیت والا شخص چاہے گا تو اس ہیرے کی بدولت ہر عورت کو پاسکتا ہے۔

اس ہیرے کو مٹی میں یا کسی بھی چیز سے رگڑا جائے تو وہ سونا بن جاتی ہے۔ خالص سونا، ایسا سونا جو ایک دم کھرا ہو۔ اس کے علاوہ اس ہیرے میں آپ جھانک کر کسی کا بھی خیال کریں...... مثلاً کسی دوست، لڑکی، مرد، ملک، شہر، دشمن کا تصور وہ اس ہیرے میں فوراً ہی ابھر آئے گا۔ انسان یا حیوان اور جان دار حرکت میں دکھائی دے گا۔

اور پھر اس ہیرے میں اتنی روشنی ہے۔ چمک دار ہے کہ اس کی روشنی میں کئی فٹ تک کے فاصلے کی

چیز صاف، واضح اور نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ یہ اس صورت میں کہ اس پر تین مرتبہ پھونکا جائے۔ روشن ہونے کے بعد صرف ایک بار پھر پھونکا جائے تو اس کی روشنی گل ہو جاتی ہے۔ ایک مرتبہ جب یہ روشن ہو جائے اور کسی شخص کی آنکھ میں اس کی روشنی ڈالی جائے تو اس کی آنکھیں ایسی چکا چوند ہو جائیں گی کہ وہ تین دن تک کوئی چیز دیکھنے کے قابل نہیں رہے گا۔

اور پھر ایک طرح سے یہ دوا ہے۔ علاج ہے۔ اکسیر ہے۔ کسی پیدائشی نابینا کی آنکھوں پر لگائیں تو اسے بینائی مل جائے، اپاہج، معذور کو بھی ایک صحت مند انسان بنا دے۔ ایک شخص کچھ دنوں سے بیمار ہو یا برسوں سے...... ہیرے کو اس کی نبض پر رکھا جائے تو فوراً ہی تندرست اور ایسا ہو جائے گا جیسے وہ کبھی بیمار ہی نہ رہا ہو۔ اس کی میں اور کیا کیا خوبیاں بیان کروں۔ ان گنت خوبیوں کا حامل ہے۔ کیا یہ ایک کھرب مالیت کا نہیں ہو سکتا؟"

ڈاکٹر نکولا کی زبانی اس کی خوبیاں اور خصوصیات سن کر میں دنگ رہ گیا۔ یقین نہیں آتا تھا کہ ایسے ہیرے کا وجود ہو سکتا ہے۔ یہ مافوق الفطرت جیسا تھا۔ ایسی کوئی چیز دنیا میں نہیں تھی۔ نہ میں نے سنا اور نہ پڑھا تھا۔ قصہ کہانیوں میں بھی نہیں ہے۔

"یہ طلسماتی ہیرا......" آخر میں نے چند لمحوں کے بعد زبان کھولی۔ "اس کے بارے میں آپ نے کس سے سنا......؟ آپ نے جس کسی سے بھی اس ہیرے کے بارے میں سنا کیا وہ معتبر شخص تھا؟ کہیں اس نے گپ ہانکی اور داستان طرازی تو نہیں کی تھی؟"

"اسے طلسماتی ہیرا کہنا ہی مناسب اور درست ہوگا" ڈاکٹر نکولا نے جواب دیا۔ "میں اس کا پس منظر بتاتا ہوں۔ میں ایک بار چینی سرحد پر ایک ایسی جڑی بوٹی کی تلاش میں گیا جو بانجھ عورتوں کے علاج کے لئے تیر بہدف ہوتی ہے۔ میں ایک سرائے میں ٹھہرا۔ وہ سرائے تو نہیں تھی۔ ایک مکان تھا۔ اس سرائے کا مالک ایک بوڑھا شخص تھا۔ اس کی ایک سولہ برس کی لڑکی تھی جو بلاشبہ بہت حسین تھی۔ وہ شخص بہت غریب تھا۔ کیوں کہ اس کی سرائے میں بہت کم مسافر ٹھہرتے تھے۔ وہ غریب کسان تھا۔ اس نے مویشی اور مرغیاں پال رکھی تھیں اور وہ شراب بھی کشید کرتا تھا۔ اس طرح باپ بیٹی کی گزر اوقات ہو جاتی تھی۔ جب اس کی بیٹی سیانی ہوئی تو وہ مسافروں کو شراب کے ساتھ پیش کرتا تھا لیکن وہ اس لڑکی کی اتنی قیمت طلب کرتا تھا کہ اس کی ادائیگی ہر مسافر کے بس کی بات نہ ہوتی تھی۔ میں نے بہت کم اس عمر کی حسین اور بھرپور لڑکیاں چینی قوم میں دیکھی تھیں۔ عورت چاہے کتنی ہی حسین کیوں نہ ہو۔ میری کمزوری نہیں رہی ہے۔ تاہم میں نے اس کا سودا کر لیا۔ اس لئے نہیں کہ اس کی عزت سے کھیلوں۔ بلکہ اس لئے کہ رات میں اس سے باتیں کروں۔ اس کے ہاتھ سے جام پیئوں۔ اس سے راگ گیت سنوں۔ عورت کا قرب اور اس کی رفاقت میں بھی بڑا حسن اور دل کشی ہوتی ہے۔

رات کھانے سے فراغت پانے کے بعد وہ میرے لئے قہوہ بنا کر لے آئی۔ اس کی آنکھوں میں نشہ اور خود سپردگی بھری تھی۔ جب میں نے اسے بتایا کہ رات کا ایک حصہ کس طرح سے گزارنا چاہتا ہوں تو

اسے یقین نہیں آیا اس نے مجھ سے کہا کہ میں پہلا شخص ہوں جو اس کے حسن میں دلچسپی نہیں لے رہا ہے۔ اسے بڑی حیرت ہوئی تھی۔ دوسری طرف خوشی بھی۔

اس نے جب مجھے بتایا کہ اسے رقص آتا ہے تو میں نے اس کی فرمائش کی مجھے بینجو بجانا آتا تھا اس کے پاس ایک پرانا بینجو تھا۔ میں نے جب اسے بجایا تو اس نے اس کی دھن پر رقص پیش کیا۔ لیکن وہ ایسا ہیجان خیز اور ہوش ربا تھا کہ وہ کچھ دیر اور جاری رہتا تو میں خود پر قابو نہیں پا سکتا تھا۔ اس کے دل میں یہ ارمان تھا کہ میں بہک جاؤں۔ کچھ دیر ستانے کے بعد اس نے گانا سنایا۔ چاندنی رات تھی۔ اس کی آواز اس کی طرح خوب صورت تھی۔ میں کچھ دیر تک گیت سنتا رہا۔ چوں کہ مجھے چینی زبان پر دسترس تھی اس لئے یہ گیت مجھے بہت اچھا لگا۔

جب وہ گیت سنا چکی تو میں نے اس سے کہا کہ چاندنی رات ہے۔ آؤ ہم باہر چل کر قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس نے تب مجھ سے کہا کہ جھیل پر چلو گے...... آج چاندنی رات ہے جھیل پر چاندنی راتوں میں کوہ قاف کی پریاں نہانے آتی ہیں۔ مردوں کے لئے یہ منظر بڑا ہی رنگین، حسین اور ہیجان خیز ہوتا ہے۔ مجھے اس کی بات کا یقین نہیں آیا۔ میں اس کے ہم راہ چل دیا۔

اس نے مجھے ایک کنج میں لے جا کر چھپا دیا اور خود مجھ سے ہٹ کر بیٹھ گئی۔ یہاں سے ہم جھیل کا منظر دیکھ سکتے تھے لیکن جھیل سے ہمیں کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا۔ جھیل چاروں طرف سے گھنے درختوں سے گھری ہوئی تھی۔ چاندنی درختوں سے چھن چھن کر آ رہی تھی لیکن وہاں اندھیرا سا تھا۔ اس اندھیرے میں پریاں نہانے کی صورت میں نظر نہیں آ سکتی تھیں۔ صرف ان کے ہیولے نظر آ سکتے تھے۔

میرا تجسس اور اشتیاق ان پریوں کا عریاں بدن اور نہاتے ہوئے دیکھنے کا نہ تھا۔ میں صرف پریوں کو دیکھنا چاہتا تھا۔ جن، بھوت، پریوں اور چڑیلوں کی بہت ساری کہانیاں سنی تھیں لیکن انہیں دیکھا نہیں تھا۔

میں نے اس حسینہ سے پوچھا تھا کہ پریاں کہاں ہیں؟ وہ جھیل پر موجود کیوں نہیں ہیں؟ اتفاق سے چاند کی چودھویں تاریخ ہے۔ چاند اپنے شباب کی آخری منزل پر ہے! اس نے آسمان پر مسکراتے اور چاروں اطراف دودھیا کرنیں بکھیرتے ہوئے چاند کو دیکھا۔ چاندنی کا دریا منجمد تھا۔ چاند کو ایک ٹک دیکھنے کے بعد بولی کہ ابھی تھوڑی دیر اور انتظار کرنا ہوگا۔ وہ ایک مخصوص وقت پر آتی ہیں۔

مجھے اب بھی اس کی بات کا یقین نہیں آیا تھا نہ ہی پریوں کے وجود کا یقین تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ پریوں کے بہانے مجھے اس لئے یہاں لائی ہے کہ میں بہک جاؤں، یہ سماں ایسا پیارا تھا کہ مرد کیا ایک پجاری، پنڈت اور زاہد بھی ایک بھرپور جوان لڑکی کے قرب میں بہک سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اب چل دینا چاہئے کیوں کہ اس چاندنی رات کے دلکش سماں نے ماحول کو خطرناک بنا دیا تھا۔ ایک نشہ سا دل و دماغ پر طاری کر رہا تھا۔ میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ لڑکی نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک طرف افق پر پریاں نمودار ہو رہی ہیں اور پرواز کرتی ہوئی جھیل کی سمت آ رہی ہیں۔ دور ہونے کے باعث اندازہ نہ ہو سکا تھا کہ کل کتنی پریاں ہیں۔ ان کی کیا تعداد ہے۔ جیسے جیسے وہ قریب آتی گئیں ان کی

تعداد کا اندازہ ہوتا گیا۔ وہ کل دس پریاں تھیں۔ وہ پرندوں کے غول کی شکل میں تھیں اور جھیل پر اتر گئیں۔

وہ ملگجے اندھیرے کی آغوش میں تھیں اس لئے میں ان کے چہرے صاف اور واضح نہ دیکھ سکا۔ وہ سفید براق لباس میں تھیں اور ان کے پر بھی جو بہت خوب صورت اور پیارے پیارے سے تھے وہ اندھیرے میں بڑے بڑے جگنوؤں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ پھر وہ جھیل کے کنارے کھڑی ہوگئیں۔

ایک پری نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر کوئی چیز نکالی اور اس پر پھونک ماری تو اس میں سے ایک دم سے روشنی پھوٹ پڑی۔ اس نے جھٹ سے ساری جھیل اور اس کے اردگرد کو ایسا منور کر دیا کہ جھیل کے کنارے جو تنکا تھا وہ تک نظر آنے لگا۔ جھیل کا پانی اور تمام درخت تک اس روشنی میں نہا گئے۔ وہ ایک ہیرا تھا۔ اس کی روشنی طاقت ور دس برقی سرچ لائٹوں سے زیادہ تھی۔ اس پری نے اس ہیرے کو ایک اونچے اور ایسے پتھر پر رکھ دیا تھا کہ جس سے چاروں طرف روشنی ہونے لگی تھی۔

مجھے ایسا لگا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ میں نے جو قصہ کہانیوں میں پریوں کے بارے میں پڑھا تھا اور مصوروں کی جو خیالی تصویریں دیکھی تھیں وہ ان سے کہیں حسین و جمیل تھیں۔ میں نے خواب میں کسی ملک، شہر اور خطے میں ایسا حسن نہیں دیکھا تھا نہ ہی ایسا شباب، وہ دل کشی، جاذبیت اور کشش کا ایسا مرقع تھیں کہ ایک مصور تصور تک نہیں کر سکتا۔ ایسا لگتا تھا کہ انہیں بنانے والے نے بڑی فرصت میں انہیں بنایا ہو۔ ان میں کوئی عیب اور کمی نہیں تھی۔ میں ان کی کس کس چیز کی تعریف کروں۔ قدرت کی ایسی صناعی کا نمونہ دنیا میں موجود نہیں تھا۔

میں نہ صرف انہیں دیکھ کر تحیر زدہ تھا بلکہ اس ہیرے کو بھی دیکھ کر...... یہ ہیرا نہیں بلکہ دنیا کی سب سے طاقت ور ترین سرچ لائٹ تھا۔ جدید ترین...... لیکن بغیر تار اور کنکشن کے...... میں نے اپنی زندگی میں بڑے نایاب، انمول اور قیمتی ہیرے دیکھے تھے۔ کوہ نور ہیرا بھی دیکھ چکا تھا۔ لیکن کسی ہیرے میں اتنی روشنی نہیں ہوتی تھی۔ وہ چمکتا ہوا ہوتا تھا۔ اس کے گرد ایک ہالا سا ہوتا تھا بس......

یہ پریاں جتنی حسین تھیں اتنی ہی معصوم تھیں۔ ان کی صورتیں بڑی موہنی تھیں جو میری آنکھوں میں جذب ہو کر سیدھی میرے دل میں اتر گئی تھیں۔ اس روشنی میں بہت واضح، نمایاں اور بہت صاف اور اس طرح دکھائی دے رہی تھیں جیسے میری نظروں کے سامنے دو ایک قدم پر ہوں۔ ایک قد اور ایک ہی جسامت تھی۔ وہ ساڑھے پانچ فٹ سے زیادہ کی نہیں ہوں گی۔ ان کے جسم متناسب اور چھریرے تھے۔ وہ جوانی کے خمار سے بھری ہوئی تھیں۔ ان کے انگ انگ میں جیسے مستی بھری ہوئی تھی۔ نشیب و فراز میں ایک ایسی جاذبیت تھی کہ نگاہ ہٹنے کا نام نہیں لیتی تھیں۔ ہماری دنیا میں ایک ایسی پری بھی آ جائے تو مرد پاگل ہو جائیں اور اس کے حصول کے لئے کشت و خون ہونے لگے۔

یہ پریاں جھیل کے کنارے رقص کرنے لگیں۔ صرف سات پریاں رقص کر رہی تھیں۔ تین پریاں ایک طرف کھڑی ہو کر تالیاں بجا بجا کر گیت گانے لگیں۔ ان کے رقص میں ان کے جسموں کی لچک کسی شاخ کی سی تھی۔ جوان کے جسموں میں ایک عجیب سا حسن اور دل کشی پیدا کر رہی تھی۔ ان کی نازک کمر کی

نوک میں بڑی ہیجان خیزی تھی۔ لیکن یہ رقص جو دائرہ بنا کر کر رہی تھیں ان میں سطحی پن نہیں تھا اور نہ ہی جذبات کو بھڑک رہے تھے۔ میں ستائشی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور دل میں اش اش کئے جا رہا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے کبھی ایسا دل فریب رقص نہیں دیکھا تھا۔ ہماری دنیا میں جو رقص پیش کئے جاتے تھے وہ رقص کم اور جسم کا مظاہرہ زیادہ ہوتا تھا۔ اس میں جنسیت بھری ہوتی تھی۔

وہ اپنے پرستان کا کوئی گیت گا رہی تھیں۔ ان کی زبان کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ معلوم نہیں کون سی زبان تھی۔ نہ تو عبرانی تھی اور نہ ہی عربی، نہ ہندی نہ اردو اور نہ اطالوی، ہسپانوی اور فرانسیسی اور افریقی...... جو بھی زبان تھی وہ بالکل سمجھ میں نہیں آئی۔ اس کے بول اچھے لگے...... اور پھر ان پریوں کی آواز کیا تھی...... سات سروں کی دنیا...... ہر سر قوس قزح کا ایک رنگ تھا۔ آوازیں جل ترنگ کی سی تھیں۔ اتنی مٹھاس اور اتنا رس تھا اور ایسا جادو تھا کہ دل کو چھو لیتا تھا۔ جی کرتا تھا کہ وہ اسی طرح گاتی رہیں۔ میں سنتا رہوں۔ صدیاں بیت جائیں۔ یہ گیت ختم نہ ہو۔ قدرت نے انہیں جو آواز دی تھی وہ میں نے سنی نہیں تھی۔ اس میں جانے کیا بات تھی کہ فرحت اور راحت اور قلب کو طاقت سی محسوس ہوتی تھی۔ میں ایک ڈاکٹر بھی ہوں۔ میرا یہ دعویٰ ہے کہ اگر ایک مریض اس آواز کو سن لے تو وہ صحت یاب ہو جائے۔ مریض کا علاج صرف دوا سے نہیں آواز سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ جب کہ موسیقی سے بھی کیا جاتا رہا ہے۔ موسیقی جو روح کی غذا ہوتی ہے اس آواز میں موسیقی تھی۔ کاش! میرے پاس ٹیپ ریکارڈر ہوتا، میں اسے ٹیپ کر کے محفوظ کر لیتا۔

وہ رقص ختم ہوا۔ ان پری لڑکیوں نے گانا بند کر دیا۔ وہ سب ایک جگہ بیٹھ کر ستانے اور آپس میں ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ کرنے لگیں۔ رقص کا دورانیہ ایک گھنٹے کا تھا، اس لئے وہ تھک گئی تھیں۔ وہ بھی گوشت پوست کی تھیں، نازک اندام تھیں۔ ان کے سینوں میں سانسوں کا زیروبم تھا۔ سانسیں ہچکولے کھا رہی تھیں اور چہرے سرخ ہو گئے اور تمتمانے لگے تھے۔

کچھ دیر بعد وہ اٹھیں اور جھیل کے کنارے کھڑی ہو گئیں اور بے لباس ہو کر دوسرے ہی لمحے ان سب نے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ وہ تیرنے اور نہانے لگیں۔ امریکہ اور یورپ کے نائٹ کلبوں میں رقص کے دوران رقاصائیں بے حجاب ہو جاتی تھیں ان میں فحاشی ہوتی تھی لیکن یہ فحاشی نہ تھی۔ بہر کیف مجھے اچھا نہیں لگا۔ میں ان کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گیا اور اپنی ساتھی لڑکی کو دیکھنے لگا۔

وہ بڑی محویت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں حسرت اور احساس محرومی تھا۔ شاید اس میں پری کی طرح بننے کی آرزو اور تمنا ہو گی۔

"یہ آپ نے اس طرف پیٹھ کیوں کر لی ہے؟" وہ محویت سے چونک کر نکلی اور بولی۔ "مردوں کے لئے بڑا رنگین نظارہ ہے۔"

"اس لئے کہ ان پریوں کو بے حجاب دیکھ کر مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگا۔" میں نے کہا۔ "میں نے بے حجابی کی حالت میں انہیں دیکھا تو ہے بس یہ کافی ہے۔"

"آپ پہلے آدمی ہیں جو جوان اور حسین پریوں کو اس حالت میں دیکھنا نہیں چاہ رہے ہیں۔" وہ

تحیر زدہ لہجے میں بولی۔

''کیا اس علاقے اور بستی کے لوگ چاندنی راتوں میں آ کر ان پریوں کو بے حجابی کی حالت میں اور نہاتے ہوئے دیکھتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''پہلے دیکھا کرتے تھے لیکن اب کوئی نہیں دیکھتا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''وہ دیکھتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ شاید کوئی کبھی کبھی آتا ہو۔''

''کیوں نہیں دیکھتے ہیں؟'' میری نگاہیں حیرت بھرے انداز سے سوالیہ نشان بن گئیں؟ ''کیا ان کے لئے یہ بات مناسب نہیں؟''

''اس لئے کہ یہاں کے لوگوں کو سبق مل چکا ہے۔'' وہ بتانے لگی۔ ''ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ دو ایک مردوں نے انہیں چھپ کر دیکھا تھا۔ جب وہ بے حجاب ہو کر جھیل میں نہانے لگیں تو وہ خود پر قابو نہ پا سکے۔ انہیں قابو میں اور بے بس کرنے کے لئے لپکے۔ جب ان پریوں نے دیکھا تو ایک پری فوراً ہی جھیل سے نکل کر ہیرے کے پاس پہنچی اس نے ہیرے پر کچھ پڑھ کر پھونکا اور ہیرا اٹھا کر ان کی طرف رخ کر لیا۔ پھر اس ہیرے میں سے نیلی نیلی شعاعیں نکلیں۔ اور ان کی آنکھوں کو چکا چوند کر گئیں۔ پھر وہ سدا کے لئے اندھے ہو گئے وہ تین دن بے ہوش رہے۔ ایسے دو ایک واقعات ہوئے تو پھر مردوں نے ادھر کا رخ کرنا بند کر دیا۔ اب کوئی اس طرف نہیں آتا۔ آپ کمال کے آدمی ہیں جو قابو میں ہیں۔''

کوئی ایک گھنٹہ تک نہانے کے بعد وہ جھیل سے باہر آئیں۔ اپنا جسم خشک کیا۔ کپڑے پہنے، پھر وہ ہیرا لے کر پرندوں کی طرح پرواز کرتی ہوئی پرستان لوٹ گئیں۔ ہیرا اب چونکہ نہیں تھا اس لئے جھیل اندھیرے کی آغوش میں ڈوب گئی۔

میں نے گھر آ کر اس سے اس ہیرے کے بارے میں اپنی حیرت کا اظہار کیا تو اس نے کہا کہ ایک ہیرا انسان کے ہاتھ لگ چکا ہے۔ یہ بیس برس پہلے کی بات ہے کہ چین کا سب سے بڑا جادوگر سام شونگ اس جھیل اور پریوں کے بارے میں سن کر ادھر آیا تھا۔ پھر وہ جادو کے زور سے اس ہیرے کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر وہ اس ہیرے کو لے کر چلا گیا۔ یہ ہیرا حاصل کرنے کے بعد اس نے اس علاقے کے لوگوں کو اس ہیرے کی خصوصیات اور خوبیاں گنائیں۔ یہ ہیرا وہ وادی چواین لا مالے گیا جو پیکن سے ایک سو تیس میل پر واقع ہے۔ اس وادی کے ایک مندر میں ایک گوتم بدھ کا مجسمہ ہے۔ اس مجسمے کی ایک آنکھ میں اس نے ہیرے کو نصب کر دیا ہے۔ وہ آج بھی وہاں موجود ہے۔''

''کیا اس ہیرے کی اتنی خوبیاں معلوم ہونے پر کسی نے اس ہیرے کے حصول کی کوئی کوشش نہیں کی؟'' میں نے اس سے سوال کیا تھا۔

''بہت سارے لوگ اس کے حصول کے لئے اس وادی کی طرف گئے تھے۔'' اس نے جواب دیا۔

''لیکن ان میں سے ایک بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ انہیں اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا تھا۔ گو کہ ابھی بھی کوئی نہ کوئی جاتا ہے لیکن وہ یا تو خالی ہاتھ لوٹ آتا ہے یا پھر موت کی نذر ہو جاتا ہے۔''

''کیا ان سب کی جانیں اس جادوگر نے لے لیں......؟'' میں نے دریافت کیا۔ ''وہ نہیں چاہتا ہوگا کہ کوئی اس طلسمی ہیرے کو حاصل کر لے؟''

''اس وادی کو وادیٔ موت کہا جاتا ہے۔'' وہ کہنے لگی۔ ''ہر کوئی اس وادی تک نہیں پہنچ سکتا...... کیوں کہ راہ میں اتنی بلائیں ملتی ہیں کہ اس کے قریب تک پہنچنا ناممکن ہے۔ چڑیلیں گھومتی پھرتی رہتی ہیں جو کہ انسانی خون کی پیاسی ہوتی ہیں، بھوت پریت...... عفریتیں...... اس جادوگر نے انہیں اس لئے رکھا ہے کہ اس ہیرے کی حفاظت ہو سکے۔ وہ جادوگر خود بڑا خبیث، سفاک اور بے رحم قسم کا ہے اور پھر اس نے راستے میں اپنے آدمی بھی بٹھا رکھے ہیں جو کسی اجنبی کو جانے نہیں دیتے ہیں۔ انہیں کسی نہ کسی بہانے سے گرفتار کر کے زندان میں ڈال دیتے ہیں اور پھر انہیں قتل کر دیتے ہیں۔ ان میں بہت سارے لوگ انہی کے ہاتھوں لقمہ اجل بنے ہیں۔ اس نے جادو کے زور پر کئی پروہتوں اور پجاریوں کو اپنا غلام بنا رکھا ہے وہ کٹھ پتلی ہیں۔ بہت سارے لوگوں کو اس جادوگر کے نام سے ہی خوف آتا ہے۔''

اس ہیرے کی خصوصیت اور خوبیوں نے اس کے حصول کے لئے میرے سینے میں ایک آگ سی لگا دی۔ میں ایک عرصے سے منصوبہ بنا رہا تھا۔ مجھے ایک جری، بہادر، بے غرض، پرخلوص اور ایسے دوست شخص کی تلاش تھی جس کے دل میں دولت کی ہوس نہ ہو اور لالچی نہ ہو، میں نے غیر محسوس انداز سے آپ کو اس طرح سے پرکھا جس طرح سے کوئی سنار سونا پرکھتا ہے۔ ہیرے کو حاصل کرنے کی صورت میں آپ کو اتنا سونا دوں گا جو ایک کروڑ پاؤنڈ کی مالیت کا ہوگا۔ آپ کو جو دس ہزار ڈالر دے چکا ہوں اس میں سے اس رقم کو وضع نہیں کروں گا۔ اب آپ بتائیں اس ہیرے کے حصول کے لئے جان کی بازی لگائیں گے نا...... آپ کا ارادہ متزلزل تو نہیں ہو رہا ہے؟''

''میرا ارادہ کیوں اور کس لئے متزلزل ہوگا......؟'' میں نے کہا۔ ''میں نے کیا آپ کو قول نہیں دیا؟ آپ سے عہد نہیں کیا؟''

''اس لئے کہ ہمارا مقابلہ اب جادوگر سام شونگ سے ہوگا......'' ڈاکٹر نکولا نے کہا۔ ''وہ تو ہمیں مندر پر ملے گا لیکن ہم وادیٔ موت سے گزریں گے تو راستے میں نہ صرف صعوبتیں بلکہ بلائیں، عفریتوں، سفاک اور بے رحم قاتلوں سے واسطہ پڑے گا۔ یہ بڑا پرخطر اور خوف ناک اور روح فرسا سفر ہوگا۔ آپ کو دولت کے لئے بہت بڑا خطرہ مول لینا ہوگا۔ دولت طشتری میں رکھ کر نہیں ملتی ہے۔''

''سچ پوچھئے تو میرے دل کے کسی کونے میں اب دولت کی کوئی ہوس اور خواہش نہیں رہی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اب میری دلچسپی صرف اور صرف اس دنیا کے نادر و نایاب انوکھے اور پرستان کے ہیرے سے ہے۔ جو نہایت حیرت انگیز، عجیب و غریب خوبیوں کا مالک ہے۔ میں اسے صرف دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ جو دنیا کا آٹھواں عجوبہ کیا سارے عجوبوں سے بھی بڑھ کر ہے۔ جس کے لئے ایک کھرب کی مالیت بھی کم ہے۔''

''بہت خوب، شاباش......'' ڈاکٹر نکولا نے میری طرف گرم جوشی سے ہاتھ بڑھایا۔ پر جوش انداز سے ہاتھ ملایا۔

"اس نوجوان چینی لڑکی نے اس ہیرے کے حصول کے لئے جانے والوں کے بارے میں یہ بتایا تھا کہ جو بھی اس کے حصول کے لئے گیا کوئی بھی زندہ بچ نہ سکا۔" میں نے کہا۔ "اس طرح تو ہم بھی زندہ نہیں بچ سکیں گے۔ کیوں کہ ہمارا مقابلہ جادوگر کے موکلوں سے ہوگا۔ اس کے موکلوں میں نہ صرف چڑیلیں بلکہ بھوت اور بدروحیں بھی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان چڑیلوں اور بدروحوں نے ان لوگوں کو موت کی بھینٹ چڑھا دیا جو ہیرے کے حصول کے لئے نکلے تھے۔ کیا ہم ان بلاؤں سے مقابلہ کر سکیں گے......؟ آپ نے اس پہلو پر بھی غور کیا......؟"

"کیوں نہیں دوست......!" ڈاکٹر نکولا مسکرا دیا۔ "میرے پاس ایک ایسی چیز ہے جس کے باعث ہم پر ان بلاؤں کا زور چل نہ سکے گا۔"

"وہ کیا چیز ہے......؟" میں نے تجسس اور حیرت آمیز لہجے میں دریافت کیا۔ اس کی یہ بات سن کر میرے دل کو خوشی بھی ہوئی۔

"وہ چھوٹی سی عجب ساخت کی لکڑی ہے جس کے لئے میں نے بڑے پاپڑ بیلے اور جس پر بے شمار چینی حروف کندہ ہیں۔" ڈاکٹر نکولا نے جواب دیا۔ "جس کے پاس یہ لکڑی ہوگی اسے صرف طبعی موت ہی آئے گی۔ بشرطیکہ اس کی موت کا دن معین ہوا اس وقت۔"

"لیکن لکڑی جس کی جیب میں ہوگی وہی موت سے محفوظ رہے گا۔" میں نے کہا۔ "اسے آپ رکھیں گے......میں کس طرح سے بچ سکوں گا۔"

"آپ فکرمند اور پریشان نہ ہوں۔" ڈاکٹر نکولا نے مجھے دلاسا دیا۔ "اس کا حل میرے پاس ہے۔ میں آپ کو بلاؤں کے رحم و کرم پر ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔ آپ کی جان کی حفاظت میرا فرض ہے۔ آپ دو مرتبہ میری جان بچا چکے ہیں۔"

اس نے اپنی جیب سے وہ عجیب ساخت کی لکڑی نکالی جو چھ انچ کی تھی۔ اس نے درمیان سے توڑا۔ اس لکڑی کے دو حصے ہو چکے تھے۔ ایک حصہ تین انچ کا تھا۔ اس نے ایک حصہ میری طرف بڑھایا۔

"آپ اسے رکھ لیں، ہم اب ان بلاؤں کا مقابلہ کر سکیں گے۔"

ڈاکٹر نکولا نے اندرونی جیب سے ایک کاغذ نکالا جو تہہ کیا ہوا تھا۔ یہ نقشہ تھا جو اس نے چینی لڑکی کی مدد سے بنایا تھا۔ یہ وادیٔ موت کو جانے کا راستہ تھا۔ اس نے نقشہ میرے سامنے پھیلا دیا۔ پھر اس نے ایک اور کاغذ پر نقشے کی نقل بنا کر میرے حوالے کر دی۔ اس لئے کہ حالات نے اگر ہمیں جدا کر دیا تو ہم اپنا سفر جاری رکھ سکیں اور منزل پر پہنچنے کی کوشش کریں۔

"کل ہم لاماس چلے جائیں گے اور شام تک پہنچ جائیں گے۔" ڈاکٹر نکولا نے کہا۔ "پھر ہم مہم پر روانہ ہوں گے۔ لیکن ہمیں ایک رات لاما کے سرائے میں قیام کرنا ہوگا۔ میں نے اس لڑکی کی زبانی سنا تھا کہ وہ سرائے بڑی پراسرار قسم کی ہے۔ جو وادیٔ موت کی طرف جاتا ہے اس کا پہلا قیام لاما میں ہوتا ہے۔ اس سرائے میں ایسا مسافر جو ہیرے کے حصول کے لئے نکلتا ہے ٹھہرتا ہے وہ یا تو غائب ہو جاتا ہے یا پھر

صبح مردہ حالت میں کمرے میں پایا جاتا ہے۔ اس لئے سرائے کے مالک کو نہ بتایا جائے کہ ان کی منزل کون سی ہے اور کہاں جا رہے ہیں، سرائے کا مالک اس جادوگر کا چیلا ہے، ہمیں محتاط رہنا اور جھوٹ بولنا ہوگا۔ لڑکی نے بتایا کہ لاڈس نامی ایک گاؤں ہے۔ یہاں ایک عورت قحبہ خانہ چلاتی ہے اور اس کے قحبہ خانے میں حسین نوجوان لڑکیاں ہوتی ہیں۔ سرائے کے مالک کو اس وقت کہا جائے کہ وہ قحبہ خانہ جا رہے ہیں۔ اس طرح سے خیریت ہوگی۔"

پھر ہم دونوں تازہ دم گھوڑوں پر لاما سرائے کی جانب روانہ ہوئے۔ شام کے قریب دور سے ہی لاما سرائے کی عمارت نظر آنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ یہ ایک عام سی سرائے ہوگی۔ یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ سرائے شہر کے کسی بڑے ہوٹل کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ جب قریب پہنچے تو وہ ایک عظیم الشان عمارت تھی۔ اس عالی شان عمارت کی نسبت ڈاکٹر نکولا نے بتایا کہ چینیوں کے سوا کسی اور قوم کے لوگوں کو چاہے وہ جاپانی، کوریائی اور فلپائنی اور ویت نام کے سیاح ہی کیوں نہ ہو یہاں ٹھہرنے کی اجازت نہیں ہے۔ یہ شہر سے کوئی پانچ میل کے فاصلے پر واقع تھی۔ ہم دونوں چینی لباس میں تھے اور پھر چینی زبان بڑی روانی اور مادری زبان کی طرح بولتے تھے۔ لب و لہجے سے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس بھیس میں ایک ایشیائی اور دوسرا یورپی باشندہ ہے، اس کے اندر داخل ہونا جتنا خطرناک تھا اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دل اس خیال سے دھڑک رہا تھا اور پسینے آ رہے تھے کہ بھگوان جانے کیا خطرہ پیش آئے گا۔ ذرا سا بھی شک و شبہ ہمیں موت کے منہ میں لے جا سکتا تھا عین ممکن تھا کہ ہماری زندگیوں کا خاتمہ اس سرائے کی چار دیواری میں ہی کر کے ہمارے گوشت کے ٹکڑے جانوروں کو کھلا دیئے جائیں۔ یہ اندیشے جس قدر افسردہ اور پریشان کر دینے والے تھے اس کا اندازہ با آسانی کیا جا سکتا ہے۔ بار بار توجہ ہٹانے اور دل کو ڈھارس دینے کے باوجود دھیان پھر انہی خطروں کی طرف لگ جاتا تھا۔

ہم اس سرائے کے دروازے پر پہنچے جو بے حد مضبوط لکڑی کا بنا ہوا تھا اور کوئی بارہ فٹ اونچا اور اتنا ہی چوڑا بھی تھا۔ پہلے دو دروازوں سے گزرتے وقت کسی قسم کی دشواری اور دقت کا سامنا کرنا نہیں پڑا۔ کوئی تکلیف دہ بات ہی پیش نہیں آئی۔ یہ دونوں دروازے کھلے ہوئے تھے اور کوئی پہرہ دار بھی نہیں تھا جو ہمیں روکتا اور پوچھتا اور ہماری رہنمائی کرتا۔ جب تیسرے دروازے پر پہنچے تو وہ بند تھا۔ میں نے ایک عجیب سی مست کر دینے والی بھینی بھینی خوشبو اپنے نتھنوں میں محسوس کی۔ ایسی سوندھی سوندھی خوشبو عورت کے بدن سے پھوٹتی تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے کوئی جوان عورت میرے پاس کھڑی مہک رہی ہو۔ میں صرف اس کی خوشبو ہی نہیں بلکہ اس کے پرشباب گداز بدن کی تپش بھی محسوس کر رہا ہوں۔ وہ نادیدہ ہستی جیسے میرے، بہت ہی قریب موجود ہے۔ اس وقت ڈاکٹر نکولا کو یہ بتانے کا موقع نہیں تھا۔ وہ شاید اس بات کا یقین نہیں کرتا۔ اسے میرا واہمہ قرار دیتا۔

ہر چند کہ سرائے کے لوگوں نے ہمیں دور سے اس طرف آتے دیکھ لیا ہوگا۔ یہ بھی دیکھا ہوگا کہ یہ مسافر چینی ہیں۔ پھر بھی کوئی دروازہ کھولنے نہیں آیا۔ ہر طرف موت کی سی بھیانک خاموشی طاری تھی اور

اندر اور باہر کوئی متنفس نظر نہ آتا تھا۔ میں اور ڈاکٹر نکولا باری باری اور وقفے وقفے سے دروازہ کھٹ کھٹاتے رہے تھے مگر بے سود کوئی جواب نہیں ملا۔ ایسا لگا جیسے اندر آدمی نہیں ہیں۔ صرف بدروحیں ہیں اس لئے وہ دروازہ نہیں کھول رہی ہیں۔ ماحول جو بڑا پراسرار تھا وہ اور پراسرار سا ہو گیا۔

"شاید اندر بدروحیں ہوں گی۔" میں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔ "اس لئے دروازہ کھولا نہیں گیا۔ کیوں نہ ہم چل کر کوئی اور سرائے تلاش کر لیں۔ آخر ہم یہاں کھڑے کب تک دروازہ کھٹکھٹاتے رہیں گے۔ بیس منٹ تو ہو گئے ہیں...... کیوں؟"

"بدروحیں ہوتیں تو وہ اب تک دروازہ کھول چکی ہوتیں۔" ڈاکٹر نکولا نے کہا۔ "ہم تھوڑی دیر اور دستک دے کر دیکھ لیتے ہیں۔" ڈاکٹر نکولا نے اپنی بات پوری ہی کی تھی کہ دروازے میں جو تنگ دریچہ تھا وہ کھلا، ہماری مایوسی دور ہو گئی۔

ایک منڈا ہوا سر جو قدرے انسانی مخلوق کے سر سے بڑا تھا نمودار ہوا۔ اس سر میں ایک لمبی سی چوٹی تھی۔ آنکھیں درندوں جیسی خوں خوار تھیں۔

دوسرے لمحے ایک کرخت آواز گونجی یوں لگا کہ کان کے پردے پھٹ جائیں گے۔ "کیوں...... ؟ کون...... ؟ کیا بات ہے؟"

اس کا جواب ڈاکٹر نکولا نے بڑھ کر دیا جو میں پوری طرح ٹھیک سے سمجھ نہ سکا۔ اس نے سرگوشی کے انداز میں کچھ کہا تھا۔ میرا گھوڑا اس سے پیچھے تھا۔ میں دروازہ دو ایک مرتبہ کھٹ کھٹانے کے بعد اسے ڈاکٹر نکولا کے گھوڑے سے پیچھے لے آیا تھا۔

اس پہرہ دار یا وہ جو کوئی بھی تھا اس کی بات درست تھی یا غلط...... ڈاکٹر نکولا نے اس کی بات کا جو جواب دیا تھا وہ اطمینان بخش تھا یا نہیں...... بہر حال اس آدمی نے اب بھی دروازہ نہیں کھولا۔ پھر ڈاکٹر نکولا نے اپنے گھوڑے کو دو قدم بڑھایا تو وہ دروازے سے اور قریب ہو گیا۔ پھر اس نے کاٹھی پر جھک کر اس شخص سے دبی آواز میں کچھ کہا تو اس کا اثر بجلی کی طرح ہوا ایک طرح سے معجزانہ ثابت ہوا تھا۔ اس شخص نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا۔ پھر ہم دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔ ایک آدمی نے آگے بڑھ کر ڈاکٹر نکولا کو گھوڑے سے اترنے میں مدد دی۔ پھر اس کا اشارہ پا کر میں بھی اتر آیا۔ اتنے وہ آدمی تعظیم سے گردن جھکائے کھڑا ہوا تھا دونوں ہاتھ جوڑے اور نیچی نگاہ کئے۔ پھر اس نے دبی آواز میں کچھ کہا جس کا ڈاکٹر نکولا نے بھی اسی انداز سے جواب دیا۔ سرائے میں چھ سات پہرہ دار تھے وہ ایک سمت چلے گئے۔

اب اس ڈیوڑھی میں ہم تین افراد رہ گئے۔ میں، ڈاکٹر نکولا اور وہ گنجا، شاید وہ اس سرائے کا منتظم تھا۔ ڈاکٹر نکولا نے میری طرف اشارہ کیا۔

"یہ شخص میرا دوست اور معتمد خاص ہے اور میں اسے ہر جگہ ساتھ لئے پھرتا ہوں۔ تم اجازت دو تا کہ وہ سرائے میں ٹھہر سکے۔"

اس نے ڈاکٹر نکولا کی درخواست منظور تو کر لی تھی لیکن مجھے یہ شخص بے حد پراسرار اور خطرناک لگا۔

اس سے ایک انجانے خطرہ کی بو آ رہی تھی۔ اس سرائے کا ماحول اس قدر وحشت ناک اور بھیانک سا لگ رہا تھا کہ یہاں سے ابھی اور اسی وقت جانے کو جی چاہ رہا تھا۔ معلوم نہیں ڈاکٹر نکولا کے کیا محسوسات تھے۔ وہ بڑا بے فکر اور بے پروا اور قدرے مطمئن سا لگ رہا تھا۔ جس پر مجھے بڑی حیرت ہوئی تھی۔

ہم تیسرے پھاٹک سے گزر کر اندر چلے گئے۔ اس جگہ پتھر کا بنا ہوا فراخ زینہ تھا اس پر چڑھ کر ایک چوڑے صحن پر پہنچے جس کے چاروں طرف پتھر کی بنی ہوئی متعدد کوٹھریاں یا حجرے سے تھے۔ وسط صحن میں بدھ کا ایک مہیب بت تھا۔ تقریباً ستر فٹ اونچا رکھا ہوا تھا۔ جس کے دونوں ہاتھوں میں کنول سے ملتے ہوئے دو بہت بڑے پھول تھے۔ سر پر سونے کا تاج اور گلے میں زمانہ جاہلیت کی یادگار عجیب طرح کے زیور...... اس عالی شان بت کے دونوں طرف اس نمونہ کی چھوٹی تصویریں اور بھی تھیں۔ جو خوف ناک شکل کا پہرہ دار تھا وہ رک گیا۔ پھر اس نے کہا کہ ہم یہاں انتظار کریں۔ جب تک ان کا سردار اجازت نہیں دے گا ہم قیام نہیں کر سکتے۔ وہ سردار کو بلانے جا رہا ہے۔

ہم دونوں اس جگہ کھڑے سردار کا انتظار کرنے لگے۔ ہر طرف ایک عجیب وحشت ناک ویران اور گہرا سناٹا طاری تھا۔ جس کے بھیانک اثرات میں اضافہ بادصبا کر رہی تھی۔ وہ سائیں سائیں کرتی چل رہی تھی۔ اس پر مستزاد ہماری اپنی پریشانی جو اس دور افتادہ مقام پر یکہ و تنہا نامعلوم خطروں میں گھرے ہوئے محض اپنی فہم و فراست کے بل پر کامیابی متوقع تھی۔ اگر سردار نے اجازت نہیں دی اور اس نے سرائے میں قید کر دیا تو...... ؟ اس سرائے کے متعلق ڈاکٹر نکولا نے بہت سارے پراسرار واقعات سنائے تھے۔

ہم اس حالت میں کھڑے حیرت آمیز نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا بدروحیں ہمیں نرغے میں لئے کھڑی ہیں۔ تمسخر سے دیکھ رہی ہیں۔ ہمارے خون کی پیاسی ہو رہی ہیں۔ کسی بھی لمحے ہمیں دبوچ لیں گی...... تھوڑی دیر پہلے کا واقعہ جو میرے ساتھ پیش آیا تھا۔ میں نے بھینی بھینی مست کر دینے والی خوشبو محسوس کی تھی جیسے کہ میں پھولوں کے باغات میں ہوں۔ اس بدروح نے مجھے تنگ اور پریشان نہیں کیا۔ نہ میرا خون پیا...... شاید اسے سردار کا حکم نہ ملا ہو۔ یہ سب حکم کی تابع ہیں۔

مجھے اس لمحے اپنی محبوبہ یاد آئی۔ اس کے ساتھ بیتے شیریں لمحات، اس کے ہونٹوں کی مٹھاس اور میں نے جو من مانیاں کی تھیں وہ ایک خواب معلوم ہوتی تھیں اور پھر میرے مالک مکان کی نوجوان لڑکیاں جنہوں نے میری پارسائی کو خاک میں ملانا چاہا تھا۔ انہوں نے کیا کچھ کوشش نہیں کر ڈالی تھی لیکن میں ان کے حسن، جوانی اور جسم کی کرشمہ سازیوں کا شکار نہیں ہوا تھا۔ انہیں میرے فکر و اضطراب کی کیا خبر ہو سکتی تھی۔ اب مجھے یہ احساس اور پچھتاوا ہو رہا تھا کہ میں نے ان کی مہربانیوں سے فائدہ کیوں نہیں اٹھایا۔ کاش! زندگی کے مزے لے چکا ہوتا۔ اوراق تاریخ ان لوگوں کے حالات عجیب سے پر ہیں۔ جنہوں نے جوش جنون میں ناممکنات پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی۔ عصر قدیم کے اس جدید دور سے لے کر جس نے پر لگا کر اڑنے کی کوشش کی تھی۔ عہد حال کے ان لوگوں تک جو مہم جو تھے۔ اگر دیکھیں تو ہمارے حالات ان سے کہیں زیادہ یاس انگیز تھے۔ اب ہم موت کے منہ میں تھے۔ کولمبس قلاش ہندوستان کی دھن میں

امریکہ کے ناپید کنار سمندروں کو کوندتا ہوا جارہا تھا۔

میں خوف کی حالت میں کھڑا ہوا تھا کہ ناگاہ کسی دور افتاد مقام سے گھنٹہ بجنے کی گہری آواز ہوا کو مرتعش کرتی ہوئی کانوں میں پہنچی۔ کوئی بیس منٹ بعد میرے کانوں کو جن کی سماعت فرط خوف سے تیز ہو چکی تھی۔ کسی کے سنگی زینہ سے اترنے کی مدہم چاپ کی آواز سنائی دی اور اس کے ایک لمحے بعد تین صورتیں...... دو صورتیں ایک کو سہارا دیئے ہوئے ہماری طرف آتی نظر آئیں۔ وہ جو دونوں طرف چل رہے تھے وہ جوان تھے۔ لیکن جسے وہ سہارا دیئے ہوئے تھے وہ نوے برس کا بڈھا تھا۔ میں نے ایک ہی نظر میں جان لیا تھا کہ وہ خالص منگول نہیں بلکہ اپنی رگوں میں تین خون رکھتا تھا۔ ان تینوں کا لباس بودھ پجاریوں کی وضع کا تھا۔ موٹا لباس...... ان کے سروں پر بالوں کا وجود نہیں تھا...... وہ چٹیل میدان جیسے لگ رہے تھے۔ میں اور ڈاکٹر نکولا ان کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگے۔

زینہ سے اتر کے وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہمارے پاس آئے۔ ان جوانوں کے سہارے آنے کا عقدہ کھلا کہ وہ ضعیف اور سن رسیدہ ہونے کے علاوہ اندھا بھی تھا۔ لیکن اس کے اندھے پن سے کیا ہوتا تھا۔ اس میں بڑا عزم اور رعب تھا۔

''صاف صاف بیان کیجئے۔'' اس کی آواز میں بڑی کرختگی تھی۔ ''آپ لوگ کون ہیں؟ کس لئے ادھر کا رخ کیا۔''

''ہم لوگ ادھر سیر و سیاحت اور تفریح کی غرض سے آئے ہیں۔'' ڈاکٹر نکولا نے جواب دیا۔ ''ہم سیاح ہیں اور آپس میں دوست ہیں۔''

''کیا سیر و سیاحت اور تفریح کے لئے یہی جگہ رہ گئی تھی؟'' اس کا لہجہ مشکوک سا تھا۔ اسے جیسے ہماری بات کا یقین نہیں آیا تھا۔

''ہم سیاح ہیں۔'' ڈاکٹر نکولا نے کہا۔ ''چوں کہ ہم صاحب حیثیت ہیں اس لئے سیر و سیاحت کرتے پھرتے ہیں تاکہ وقت گزاری ہو۔''

''لیکن تم لوگ جا کہاں رہے ہو......؟'' اس کا لہجہ بدستور مشکوک اور کرخت بھی تھا۔ ''آ کہاں سے رہے ہو؟''

''ہم لاڈس جارہے ہیں......'' ڈاکٹر نکولا نے جواب دیا۔ ''شنگھائی سے آرہے ہیں اور اس شہر کے باشندے ہیں۔''

''لاڈس...... لاڈس...... لاڈس......'' اس نے کوئی تین مرتبہ استہزائیہ انداز سے کہا۔ ''وہاں کیا رکھا ہے؟''

''ہم نے سنا ہے کہ لاڈس میں جو تفریح اور رنگینی اور حسن ہے وہ چین میں کہیں بھی نہیں ہے۔ اس لئے وہاں جارہے ہیں۔''

''لاڈس میں صرف عورت کی تفریح ہے۔'' وہ بولا۔ ''آج سے نہیں تین صدیوں سے۔ چودہ برس

سے بیس برس کی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ وہ قحبہ خانے میں ہوتی ہیں پہلے ایک ہی قحبہ خانہ تھا جو نسل در نسل چلا آرہا تھا۔ لیکن تیس برس پہلے ایک اور قحبہ خانہ جو کھلا وہ بھی ہے۔ اگر صرف عورت اور اس کے جسم کی تفریح مقصود تھی تو کیا شنگھائی شہر کم ہے......؟ وہاں ہر عمر کی لڑکی اور عورت ہے۔''

''گاؤں...... دور افتادہ بستیوں اور آبادیوں اور بڑے شہروں کی لڑکیوں اور عورتوں میں بڑا فرق موجود ہے۔'' ڈاکٹر نکولا نے کہا۔

''کیا فرق......؟'' اس بوڑھے سردار نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ اس کے جھریوں بھرے چہرے پر دمک سی آگئی۔ جیسے اس کے ذہن میں کوئی ایسی بات آگئی ہے جس نے اسے اس طرح سے تازہ کر دیا ہے جیسے کل کی بات ہو۔ آخر وہ مرد تھا۔ اندھا ہوا تو کیا ہوا۔ جوانی میں جانے کن کن راستوں سے گزرا ہوگا۔ وہ اندھا شاید بعد میں یا کچھ عرصہ پہلے ہوا ہوگا۔ اگر وہ پیدائشی اندھا ہوتا تو اسے سردار کون بناتا۔ ممکن ہے اندھا نہ ہو اور اندھے پن کی اداکاری کر رہا ہو۔ بہر حال ہمیں چوکنا، ہوشیار اور محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔

''بڑے شہروں میں خصوصاً شنگھائی میں دنیا کے کونے کونے سے ہر قوم کے کاروباری لوگ اور سیاح آتے رہتے ہیں۔'' ڈاکٹر نکولا کہنے لگا۔ ''آپ کے علم میں یہ بات ہوگی۔ آپ جانتے ہیں کہ دنیا میں سب سے زیادہ آبادی چین کی ہے۔ یہاں جتنا غربت و افلاس ہے شاید ہی دنیا کے کسی خطے میں ہوگا۔ یورپی اور امریکی لوگ بھی کثرت سے کسی نہ کسی کام سے آتے ہیں اور یہ لوگ بھی یہاں آباد ہیں ہمارے وطن کی بدنصیبی یہ ہے کہ یہاں سب سے سستی چیز عورت ہے۔ لہٰذا بڑے شہروں کی ہر عمر کی لڑکیاں اور عورتیں نہ صرف مقامی بلکہ غیر ملکی مردوں کے بستر کی روزانہ زینت بنتی رہتی ہیں ان کی ہر رات کالی ہوتی ہے۔ انہیں صرف زر چاہئے۔ وہ جوان بن جاتی ہیں۔ ان میں وہ شرم و حیا نہیں ہوتی ہے اور نہ ہی وہ عورت پن ہوتا ہے جس کی مرد خواہش کرتا ہے۔

لیکن شہروں سے باہر گاؤں اور سرائے میں جو لڑکیاں اور عورتیں مردوں کی دل بستگی کا سامان کرتی ہیں ان میں عورت پن ہوتا ہے ایک مرد صرف عورت کے جسم، حسن اور اس کی جوانی کا بھوکا نہیں ہوتا ہے۔ وہ عورت کی رفاقت کا تمنائی ہوتا ہے اس سے صرف باتیں بھی کرنا چاہتا ہے اسے دل کا حال سناتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتا ہے۔

ہم نے لاڈس کے ایک قحبہ خانے کے بارے میں جو ایک عورت چلا رہی ہے اس کی نسبت یہ سنا ہے کہ اس قحبہ میں چین کی حسین ترین لڑکیاں ہوتی ہیں یہ لڑکیاں خوب صورتی میں اپنی مثال آپ ہوتی ہیں۔ ان قحبہ خانوں میں بہت کم مرد جاتے ہیں۔ کیوں کہ وہ ان کی جو قیمت طلب کرتی ہیں۔ اس کی ادائیگی ہر کسی مرد کے بس کی بات نہیں ہے۔ ان لڑکیوں کے حسن کی تعریف ہمیں یہاں کھینچ لائی ہے۔ ہم اس سرائے میں ایک رات بسر کر کے کل دن میں کسی وقت لاڈس روانہ ہو جانا چاہتے ہیں۔ لہٰذا ایک شب گزارنے کی اجازت درکار ہے۔''

''تم نے جو کچھ اس قدر تفصیل سے بیان کیا ہے میں اس کا یقین کئے لیتا ہوں۔'' سردار نے

اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کہیں تم ہمیں دھوکا تو نہیں دے رہے ہو..... طلسماتی ہیرے کے چکر میں تو نہیں آئے ہو.....؟ سچ سچ بتاؤ..... ہم سے جھوٹ نہ بولو......''

''طلسماتی ہیرا.....؟'' ڈاکٹر نکولا نے چونک کر اور انجان بن کر حیرت کا اظہار کیا۔ ''جی نہیں...... میں کسی ہیرے کے بارے میں نہیں جانتا ہوں۔ اگر کوئی ہیرا ہے تو مجھے اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ مجھے اور میرے دوست کو صرف لڑکیوں سے دلچسپی ہے۔ وہ ہماری کمزوری ہیں۔''

''تمہیں دلچسپی ہو یا نہ ہو..... تم دونوں ہیرے کے یا لڑکیوں کے چکر میں آئے ہو۔ لیکن میری ایک بات سن لو۔'' اس کا لہجہ زہر خند ہو گیا۔ ''وہ ہیرا ایک ایسی جگہ ہے کہ جہاں کسی کے فرشتے بھی نہیں پہنچ سکے..... جس نے بھی پہنچنے کا سوچا اور اس راستے پر چلا اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا..... یہاں تک اس سرائے میں صرف چینی عوام کے افراد ہی آ سکتے اور ٹھہر سکتے ہیں۔ ایک بار ویت نامی چینی کا روپ بھر کے آیا تھا..... وہ بڑا چال باز اور دھوکا باز تھا۔ ہم اس کے فریب میں آ گئے تھے۔ لیکن جلد ہی اس کی اصلیت معلوم ہو گئی۔ ہم کسی کی بھی اصلیت معلوم کر لیتے ہیں..... جانتے ہو اس ویت نامی کا کیا حشر کیا گیا..... تہہ خانے میں ہم نے دس آدم خوروں کو رکھا ہوا ہے۔ اسے ہم نے ان آدم خوروں کے سامنے ڈال دیا۔ ہم اپنے دشمن کو ان آدم خوروں کی نذر کر دیتے ہیں۔ یہ بھوکے آدم خور لمحوں میں آدمی کو چٹنی کی طرح کھا جاتے ہیں۔ اس ویت نامی کو بھی اس طرح دیکھتے ہی دیکھتے چٹ کر گئے۔''

اس کی یہ بات سن کر میری حالت دگرگوں ہو گئی اور رگوں میں لہو منجمد ہو گیا۔ میں نے دہشت زدہ ہو کر سوچا..... کیا اس اندھے سردار نے محسوس کر لیا ہے کہ ہم چینی نہیں ہیں۔ شاید اس لئے اس قدر تفصیل سے بتا رہا ہے کہ ہم اگر کوئی اور قوم کے نکلے تو ہمارا حشر ویت نامی جیسا ہو گا۔ وہ ہمیں بھی آدم خوروں کے سامنے ڈال دے گا۔ دولت بھی کتنی بری بلا ہے۔ اس کی ہوس کے جنوں میں انسان کیسے اندھا ہو جاتا ہے۔

''آپ کو ہم پر اگر اس بات کا شک ہے کہ ہم چینی نہیں کسی اور قوم سے تعلق رکھتے ہیں تو آپ جس طرح سے چاہیں اپنا شک دور کر سکتے ہیں۔'' ڈاکٹر نکولا نے کہا۔ ''ہم ہر طرح سے آپ کی تسلی کرنے، شک رفع کرنے اور امتحان دینے کے لئے تیار ہیں۔''

''ہم ماضی میں بہت دھوکا کھا چکے ہیں۔'' بڈھے سردار نے کہا۔ ''اس نایاب اور انمول ہیرے کے چکر میں امریکی، یورپی اور کوریائی باشندوں نے چینیوں کا بہروپ بھرا۔ ایسا کامیاب کہ ہم دھوکا کھا چکے ہیں۔ مجھے کیوں کر یقین ہو سکتا ہے کہ آپ واقعی چینی ہیں۔''

''کیا چاند ان لاتعداد ستاروں سے بے خبر ہے جو ہر وقت اس کے گرد حلقہ زن رہتے ہیں۔'' ڈاکٹر نکولا نے چینی لہجے کی ایسی زبردست نقل اتاری کہ میں دل میں عش عش کئے بغیر نہیں رہ سکا۔ ''کوئی بھی چینی کا بہروپ بھر کر آپ جیسے شخص کو کیا دھوکا دے سکتا ہے؟''

''سچ ہے۔'' بڈھے سردار نے تسلیم کیا۔ ''مگر صبح صادق کا نور ان سب کو ماند کر دیتا ہے۔ آپ دونوں واقعی قحبہ خانے جا رہے ہیں جہاں نورس کلیاں جیسی لڑکیاں ہیں تو ضرور جائیں۔ وقت گزاری

کریں۔ واقعی وہ لڑکیاں نہیں ہیں بلکہ نگینے ہیں..... نگینے..... میں ان کی بہت تعریف سن چکا ہوں۔ سنتا رہتا ہوں۔ آپ دونوں سے کیا چھپانا۔ میں نوے برس کا ہو چکا ہوں۔ بڈھا ہوں۔ جانے کس وقت مجھے موت آ کر دبوچ لے۔ مرد کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ اس کا دل جوان رہتا ہے۔ میرا دل آج بھی جوان ہے۔ اس قحبہ خانے میں چودہ برس سے لے کر بیس برس کی عمر کی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ جب کوئی لڑکی بیس برس کی ہو جاتی ہے اسے قحبہ خانے سے نکال دیا جاتا ہے۔ اس طرح تین صدیوں سے ہو رہا ہے۔''

''اچھا..... اب کیا اجازت ہے کہ ہم سرائے میں ٹھہر جائیں؟'' ڈاکٹر نکولا نے کہا۔ ''ہم اور ہمارے گھوڑے میلوں کی مسافت طے کر کے آئے ہیں۔ ہم سب بے حد تھکے ہوئے ہیں، آپ سے کل بھی گفتگو ہو سکتی ہے......''

''کل کس نے دیکھا ہے۔'' اس بڈھے سردار کا لہجہ ایسا معنی خیز تھا کہ میں چونکے بغیر نہ رہ سکا اور میرے جسم پر سنسنی دوڑ گئی۔ ''میرے دل کے کسی کونے میں شک کی ایک رمق موجود ہے کیا آپ اسے کسی ذریعے سے ختم کر سکتے ہیں؟''

ڈاکٹر نکولا نے اپنی جیب سے وہ چھوٹی سی لکڑی نکالی جس کا ایک حصہ اس کے پاس اور دوسرا حصہ میرے پاس تھا۔ اس نے بڈھے سردار کے پاس جا کر لکڑی اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔ ''یہ ہے، ہمارے چینی ہونے کا ثبوت...... آپ تسلی کر لیں۔ یہ مقدس لکڑی ہے۔ صرف چینیوں کے پاس ہوتی ہے۔ ان چینیوں کے پاس جو صرف چینی ہوتے ہیں۔''

اس نے لکڑی ہاتھ میں لے کر اسے دیکھا۔ اس پر ہاتھ پھیرا۔ اسے ٹٹولا۔ پھر اس نے ڈاکٹر نکولا کی طرف لکڑی بڑھا دی۔

ایک آدمی نے ہمیں اپنے ساتھ لے جا کر ہمارے کمرے دکھائے۔ ایک اور شخص گھوڑوں کو لے گیا تاکہ چارہ پانی دے سکے۔ جب وہ آدمی کمرے دکھا کر چلا گیا تو ڈاکٹر نکولا نے مجھے روک لیا جب میں اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا۔ وہ دروازہ بند کرنے سے پہلے راہ داری میں جھانک کر آیا اور اس نے سرگوشی میں آہستگی سے کہا۔

''سنو......! سردار اندھا نہیں ہے۔ وہ بڑا مکار ہے۔ اندھا بن کر ساری دنیا کو بے وقوف بنا رہا ہے۔''

''آپ نے کیوں کر اور کیسے جانا کہ وہ اندھا نہیں ہے؟'' میں نے متعجب نظروں سے ڈاکٹر نکولا کو دیکھا۔ ''شک کیسے ہوا؟''

''جب میں نے اس کی طرف لکڑی کو بڑھایا تھا اس کا رخ اس کی طرف نہیں تھا۔'' ڈاکٹر نکولا نے جواب دیا۔ ''میں نے یہ حرکت دانستہ کی تھی۔ کیوں کہ مجھے شک ہو گیا تھا۔ اس نے اس طرح سے ہاتھ بڑھایا جیسے اس نے وہ لکڑی دیکھ لی ہو۔''

''مجھے بھی شک سا ہوا تھا لیکن میرا شبہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''اچھا کیا آپ نے بتا دیا۔ میں محتاط اور چوکنا رہوں گا۔''

اس بڈھے سردار نے وہ لکڑی لے کر جیسے ہی اس کے نقوش پر ہاتھ پھیرا تھا اس میں دفعتاً ایک عظیم تغیر پیدا ہو گیا تھا۔ وہ جو اتنی دیر سے سرد مہری اور اکھڑ پن سے پیش آ رہا تھا دفعتاً اس کی حالت میں عظیم تغیر پیدا ہوا تھا۔ اس نے لکڑی کو بوسہ دیا تھا۔ پھر اس نے کہا تھا۔

''معزز مہمانوں! آپ نے یہ لکڑی پہلے ہی دکھادی ہوتی۔'' اس نے کہا۔ ''میں سخت نادم ہوں اپنے رویے پر...... آپ یہاں جتنے دن قیام کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔ قحبہ خانے سے لڑکی اپنی خدمت کے لئے چاہے تو لا بھی سکتے ہیں۔

اس گفتگو کے بعد ہی ہم اپنے اپنے کمروں میں آئے تھے۔ جب میں اپنے کمرے میں پہنچا تو اس سرائے کے ایک ملازم نے آ کر مجھ سے کہا کہ حمام میں نیم گرم پانی رکھ دیا گیا ہے۔ آپ نہا کر تازہ دم ہو کر کھانے کے کمرے میں آ جائیں۔ کھانا لگا دیا جائے گا۔

میں حمام میں پہنچا۔ میں نے دروازہ بند کر کے کپڑے اتارے اور کھونٹی سے لگا دیئے۔ اس سفر سے بے حد تھکن ہو گئی تھی۔ جسم چور چور ہو رہا تھا۔ جوڑ جوڑ ٹوٹ رہا تھا۔ ایسے میں گرم پانی سے نہانے کی حاجت محسوس ہو رہی تھی۔ گرم پانی ہی تھکن اتار سکتا تھا۔ میں نے دو تین لوٹے پانی سر اور جسم پر بہا دیئے۔ صابن کی ٹکیہ اٹھانے کے لئے میں نے ہاتھ بڑھایا تھا کہ وہ فضا میں بلند ہو گئی۔ جیسے کسی نے اٹھا لیا ہو۔ مجھے یقین نہیں آیا۔ میں نے اس دم وہی بھینی بھینی سوندھی سوندھی خوشبو محسوس کی جیسی خوشبو میں نے سرائے کے باہر محسوس کی تھی۔ پھر وہ صابن کی ٹکیہ میری گردن پر آئی۔ یہ ٹکیہ کسی نادیدہ ہاتھ میں تھی۔ اسے میں پکڑ نہ سکا۔ صابن کی ٹکیہ نے میرے سارے جسم اور سر کے بالوں میں صابن لگا دیا۔ پھر میں نے نازک نازک انگلیاں اور سڈول ہاتھ محسوس کیا یہ عورت کا ہاتھ تھا۔ باوجود کوشش کے میں ٹکیہ کو اپنی گرفت میں نہیں لے سکا۔ میں ششدر تھا۔ یہ کسی عورت کی روح تھی جو مجھے نہلا رہی تھی۔ اس نے مجھے اس طرح نہلایا تھا جیسے ایک عورت اپنے بچے کو نہلاتی ہے۔ اس نے میرے سر اور جسم پر پانی بہایا تھا۔ اس کے ہاتھ نے میرے جسم پر سنسنی دوڑا دی تھی۔ میں نے اسے ایک دو مرتبہ آغوش میں لینے کی کوشش کی لیکن میں ناکام رہا۔ صرف ایک بار میرا ہاتھ اس کے جسم کے کسی حصے سے ٹکرایا تھا۔ ایسا لگا جیسے میں نے جلتے توے پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ اس نے اچھی طرح نہلانے کے بعد صرف میرے سر کے بال بلکہ پورا جسم بھی تولیا سے اچھی طرح پونچھ دیا۔ اس کے بعد وہ نادیدہ اور پراسرار ہستی اپنی خوشبو کے ساتھ چلی گئی۔

میں باوجود کوشش کے یہ جان نہ سکا کہ یہ ہستی کون تھی...... کس لئے مجھ پر اتنی مہربان ہے، جب وہ میرے جسم کے تمام حصوں پر صابن ملنے کے بعد اپنے ہاتھوں سے صابن کا جھاگ ملنے لگی تو میں خوف زدہ سا ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھ کی ریشم جیسی نرمی اور گداز نے میرے جسم میں بجلی ہی نہیں فرحت بھر دی تھی۔ نہانے میں ایک عجیب قسم کی لذت پوشیدہ ہوتی ہے۔ جب کوئی عورت نہلائے تو پھر آپ کیا محسوس کریں گے؟ میری ساری تھکن اور کسل مندی دور ہو گئی۔ میں اس طرح سے تازہ دم ہو گیا جیسے میں گہری اور میٹھی نیند سے بیدار ہوا ہوں اور میں کوئی سندر سا سپنا دیکھتا رہا ہوں اور اس کا خوش گوار تاثر میرے ذہن پر پرانی

شراب کے خمار کی طرح چھا گیا ہے۔

جب میں ڈاکٹر نکولا کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ میرا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ یہ واقعہ صرف میرے ساتھ پیش آیا تھا۔ اس کے ساتھ نہیں...... اگر اس کے ساتھ یہ واقعہ یا کوئی سا بھی واقعہ پیش آیا ہوتا تو وہ مجھ سے ضرور بیان کرتا۔ میں نے دانستہ یہ واقعہ بھی اس لئے بیان نہیں کیا تھا کہ وہ اس کا یقین نہیں کرتا۔ ایک بات کا مجھے خیال نہیں رہا کہ میں نے اس ہستی سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اب اس بات کا خیال آیا تو بڑا افسوس ہوا تھا۔ شاید وہ میری کسی بات کا جواب دے دیتی اگر میں اس سے باتیں کرتا۔

''آپ نے نہانے میں بڑا وقت صرف کر دیا۔'' ڈاکٹر نکولا نے کہا۔ ''مجھے ایسا لگ رہا تھا آپ کو نہانے میں بڑا لطف آ رہا ہے اس لئے آپ حمام سے نکل نہیں پا رہے ہیں......؟ کیا ایسی ہی کوئی بات تھی؟ تھوڑی دیر اور نہ آتے تو میں حمام کے دروازے پر دستک دیتا!''

''جی ہاں......'' میں نے اثبات میں سر ہلا کر اقرار کیا۔ ''میں نے کبھی اتنا وقت نہانے میں صرف نہیں کیا...... تاخیر کے لئے معذرت خواہ ہوں۔''

''ایسی کیا خاص بات تھی جو آپ نے اتنا وقت لے لیا......؟'' ڈاکٹر نکولا ہنس کر بولا۔ ''کہیں اس میں امرت پانی تو نہیں ملا ہوا تھا......''

میں اسے کیا بتاتا کہ میں نے اتنا وقت کیوں لیا۔ ایک نادیدہ ہستی جو عورت تھی اس نے مجھے بڑے پیار سے اپنے ہاتھوں سے نہلایا۔ اگر وہ برسوں کیا صدیوں تک اس طرح نہلاتی رہتی تو میں نہاتا ہی رہتا۔ اس کے ہاتھوں میں کوئی جادو ہی تھا۔ اس نے نہلانے کے دوران چھیڑ خانی اور شوخیاں بھی کیں۔

اس وقت ہم نے تنقیدی نظروں سے سرائے کو نہیں دیکھا تھا۔ اب اپنے کمروں سے نکلے۔ وہ بڈھا سردار اکیلا اندھوں کی طرح اس وقت رستہ ٹٹولتا زینے کی طرف چلا گیا تھا۔ وہ جن کے ساتھ آیا تھا وہ ہمارے گھوڑے لے گئے تھے اب میں نے دیکھا کہ سرائے کی عمارت غیر معمولی طور پر مضبوط تھی۔ چینی قوم کو فن تعمیرات میں جو مہارت اور عبور حاصل تھا وہ شاید ہی کسی قوم کو ہوگا۔ دیوار چین سے بڑی مثال کیا ہو سکتی ہے۔ اس عمارت کو اس قدر مضبوط بنایا گیا تھا کہ اسے طاقت ور بم بھی بہ مشکل ہی اڑا سکتے تھے۔

کچھ باتوں کا خاص طور پر خیال رکھا گیا تھا۔ اس کی دیواریں جو تین تین فٹ موٹی بنائی گئی تھیں وہ محض اس لئے تھیں کہ محاصرہ کی صورت میں یہ لوگ دشمن سے ایک لمبی مدت تک مقابلہ کر سکیں۔ دو فٹ سے کم تو کوئی دیوار نہ تھی۔ یہ دور اندیشی چینیوں کی فطرت میں شامل تھی۔

زینہ سے گزر کر ہم ایک لمبی غلام گردش میں داخل ہوئے جس کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں تھیں۔ انہیں بھی چھوڑ کر ایک اور زینہ پر چڑھے جو عمارت کی بلند ترین منزل کی طرف جاتا تھا۔ اس جگہ ایک کھلے برآمدہ کے سرے پر خاصا فراخ کمرا نظر آیا جس کے دروازوں پر سیاہی مائل ریشمی پردے پڑے تھے۔ اس سے آگے ایک کمرا اور تھا تقریباً دگنا بڑا ہوگا اور اس میں روشنی کے لئے تین چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں بنی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک کھڑکی سے جھانکا تو یہاں سے ایک بستی نظر آ رہی تھی۔

اس سرائے میں مندر بھی تھا۔ جو اس کھڑکی سے نظر آ رہا تھا۔ ڈاکٹر نکولا نے اپنے آپ کو ہنکاؤ کا بڑا پجاری بھی ظاہر کیا تھا۔ وہ منقش لکڑی کی وجہ سے اس کے بیان کے ایک ایک لفظ کو سچ تسلیم کیا گیا تھا۔ پجاریوں کے عیش و عشرت پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ انہیں ہر بات کا اختیار تھا۔ کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ وہ چاہے تو کسی کی بیوی، بہن اور بیٹی اور کوئی ماں جوان ہو تو بستر کی زینت بنا سکتا تھا۔

''آپ اس جگہ تشریف رکھیں۔ سرائے میں جو کچھ بھی حاضر ہے آپ ہی کا ہے۔ اپنا گھر سمجھ کر جس چیز کی ضرورت ہو طلب کریں۔''

''اس سے کہو کہ ہمیں سبزی ترکاری اور دال اور چاول مرغوب ہے اور ساتھ میں پاپڑ بھی ہونا چاہئے۔'' میرے کانوں میں ایک نسوانی نادیدہ آواز گونجی۔ ''یہاں جب تک رہو اور کھانا کھاؤ گوشت کو ہاتھ مت لگانا۔ کیوں کہ وہ تمہیں ناگ کا گوشت کھلائیں گے...... اس گوشت کو جو بھی غیر چینی کھاتا ہے وہ الٹی کرتے کرتے دم توڑ دیتا ہے۔ اس طرح مسافروں کی آزمائش کی جاتی ہے۔''

آواز دلکش تھی آواز نہیں تھی نغمہ تھا کوئی...... یہ وہی ہستی تھی جس کے بدن کی میں نے پہلے خوشبو محسوس کی تھی۔ اس نے مجھے نہلایا بھی تھا۔

''سنو......'' میں نے خدمت گار کو مخاطب کیا۔ ''لوبیا کا سوپ، دال، چاول اور پاپڑ لے آنا۔ ہمیں گوشت بالکل پسند نہیں ہے......''

''پرندوں کا گوشت تل کر لے آئیں......؟'' اس نے دریافت کیا۔ ''بغیر گوشت کے کھانے کا لطف نہیں آئے گا۔ آپ کون سا پرندہ......''

پھر میرے کانوں میں وہ نادیدہ نسوانی آواز گونجی۔ ''اس سے کہو پرندے کا گوشت بھی نہیں چاہئے۔ یہ کوے کا گوشت کھلانا چاہتا ہے۔ ذرا ان سے سخت لہجے میں کہو کہ تم سے جو کہا جا رہا ہے وہ لے آؤ...... جب ہمارا دل گوشت کھانے کو کرے گا تب ہم بتا دیں گے۔''

میں نے اس نادیدہ آواز کی ہدایت پر عمل کیا۔ خدمت گار سے تیز لہجے میں کہا۔ ''تم سے جو کہا گیا ہے وہ لے آؤ...... بس۔''

وہ سر جھکا کر چلا گیا۔ ڈاکٹر نکولا نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ''آپ نے اسے گوشت کے لئے کیوں منع کیا......؟ آپ کو پرہیز تو نہیں ہے؟''

''آپ جانتے ہیں کہ یہ چینی کیا کچھ کھاتے رہتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''سانپ، بچھو اور چوہے اور بلیاں تک نہیں چھوڑتے ہیں۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔'' ڈاکٹر نکولا نے سر ہلایا۔ ''میں چوں کہ اس وقت کچھ اور سوچ رہا تھا اس لئے اس کا خیال نہیں رہا تھا۔''

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ڈاکٹر نکولا نے اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر جھانکا۔ پھر واپس آ کر بولا تو سرگوشی کا سا انداز تھا۔

''اب تک سارا کام خاطر خواہ ہوا ہے...... اور ان لوگوں کو اس لکڑی کے باعث ہم پر ابھی تک شبہ نہیں ہوا ہے۔ لیکن جانے کیوں اس سرائے کے ماحول میں بڑی پراسراریت سی ہے۔ میں کوشش کر کے غیر محسوس انداز سے اس بڈھے سردار سے یہ معلوم کئے لیتا ہوں کہ اس ہیرے کی حفاظت جادوگر کیوں کر رہا ہے......؟ اسے کس لئے رکھ چھوڑا ہے......؟ آخر وہ چاہتا کیا ہے......؟''

''مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ اس سرائے میں جو آدمی نظر آ رہے ہیں وہ شاید بھوت پریت ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''ایک خوف سا آ رہا ہے۔''

''میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں۔'' ڈاکٹر نکولا نے کہا۔ ''فکر کرنے اور گھبرانے کی ضرورت نہیں...... ہم یہاں دو ایک دن سے زیادہ نہیں رہیں گے۔''

کوئی نصف گھنٹہ میں اس خدمت گار نے دستر خوان پر کھانا چن دیا۔ وہ وہی کھانا لایا جو ہم نے طلب کیا تھا۔ میں نے کھانے کے دوران یہ بات محسوس کی کہ اس کمرے میں اور لوگ بھی کھانا کھا رہے تھے۔ گو کھانا، پلیٹیں اور ہاتھ نظر نہیں آئے تھے لیکن ان کی موجودگی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اس کو واہمہ سمجھ کر جھٹک دیا تھا۔ کیوں کہ میں یہ بات جانتا تھا کہ روحیں کھانا نہیں کھاتی ہیں صرف انسانوں کا خون پیتی ہیں۔ مجھے ایسا لگا تھا کہ ہم نے یہاں آ کر بڑی غلطی کی...... اس کی سنگینی کا اب احساس ہو رہا تھا اور یہاں سے نکلنا بھی دشوار سا تھا۔

رات کے کھانے سے فراغت پا کر ہم دونوں نے کچھ دیر چہل قدمی کی۔ پھر سونے کے لئے اپنی اپنی کوٹھریوں میں آ گئے۔ بڑے زور کی نیند آ رہی تھی۔ کیوں کہ ہم نے لمبے سفر سے آنے کے بعد اب تک آرام نہیں کیا تھا۔ بستر پر دراز ہوتے ہی میری آنکھ لگ گئی۔ میں گہری نیند میں غرق ہو گیا تھا اور پھر میں بے حد ڈراؤنا سا خواب دیکھنے لگا تھا۔

میں اچانک بیدار ہو گیا بیدار نہیں ہو گیا تھا بلکہ بیدار کیا گیا تھا۔ مجھے اس نادیدہ نسوانی ہستی نے بیدار کیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے بستر میں میرے پاس ہی موجود ہے۔ کسی آتش فشاں کی طرح دہک رہی ہے۔ وہ رات کی رانی کی طرح مہک بھی رہی تھی۔ کمرے میں ایسا گھپ اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نادیدہ ہستی نے مجھے جو بیدار کیا تو اب نیند کہاں آتی۔

''سنو......'' اس نے سرگوشی میں کہا۔ ''کل دوپہر کے کھانے کے بعد تم دونوں قحبہ خانے کے بہانے اس سرائے سے نکل جانا...... اس میں تم دونوں کی بہتری ہے۔ پھر وہاں سے یہاں نہیں آنا...... پھر تم دونوں کم کاؤ چلے جانا۔ وہاں سے وہ مندر قریب ہے جہاں ہیرا موجود ہے۔''

''لیکن تم یہ تو بتاؤ کہ...... تم ہو کون جو مجھ پر اتنی مہربان ہو رہی ہو؟'' میں نے کہا۔ ''تم ظاہر کیوں نہیں ہو جاتی ہو؟''

''میں ایک آتما ہوں......'' اس نے جواب دیا۔ ''پہلے جنم میں تمہاری محبوبہ تھی۔ تمہاری کسی وجہ سے نہ ہو سکی...... دوسرا جنم لیا تو تم تھے نہیں...... تم جانے کہاں تھے۔ آخر میں نے تمہیں تلاش کر لیا۔ دوسرے

جنم میں ایک حادثے میں موت کی بھینٹ چڑھ گئی...... اب میں پرلوک سے آئی ہوں تاکہ تمہاری مدد کرسکوں۔ تمہیں ہر مصیبت اور پریشانی سے بچا سکوں۔ مجھے آج بھی تم سے محبت ہے۔"

"میں تمہیں ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے بڑے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ "مجھے صرف اپنی ایک جھلک دکھا دو...... صرف ایک جھلک......"

"ابھی اس کا وقت نہیں آیا کہ تمہیں اپنے درشن کراؤں۔" وہ بولی۔ "جب اس کا وقت آئے گا تمہیں کہنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

"اچھا یہ بتاؤ کہ ہم ہیرا پانے میں کامیاب ہو جائیں گے......؟" میں نے پوچھا۔ "اس سلسلے میں تم ہماری کیا مدد کرسکتی ہو؟"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔" اس نے جواب دیا۔ "یہ حالات پر منحصر ہے۔ میں تمہاری ہر وہ مدد کرسکتی ہوں جو میرے بس میں ہوگا۔"

"کیا ہم دونوں ایک دوسرے سے جدا ہی رہیں گے؟" میں نے کہا۔ "کیا تم میری زندگی میں اسی طرح آتی رہو گی؟"

"ہاں......" اس نے کہا۔ "ہمارا ملن پرلوک میں ہی ہوسکتا ہے جب تم اس سنسار سے آجاؤ گے...... میں لمبی مدت تک اس دنیا میں نہیں رہ سکتی...... میں تم سے ملنے اور تمہیں دیکھنے کے لئے ماتا سے اجازت لے کر آئی ہوں۔ جب تک تم دونوں کو ہیرا نہیں مل جاتا میں اس دنیا میں رہوں گی...... اور ہاں۔ تم اپنے دوست کو میرے بارے میں بالکل بھی نہیں بتانا۔ ویسے وہ شخص اچھا نہیں ہے۔ بے حد پراسرار اور خطرناک ہے۔ خود غرض بھی ہے۔ ہیرا پانے کے بعد وہ طوطا چشم بن جائے گا۔ لیکن میں ایسا ہونے نہیں دوں گی کہ تمہارا حق مارے۔"

"اچھا...... مجھے تم اپنا نام تو بتاؤ......" میں نے کہا۔ "تاکہ میں تمہیں تمہارے نام سے یاد کرتا رہوں۔ تمہارا نام لے کر جیتا رہوں۔"

"میرا نام پدمنی ہے......" وہ بولی۔ "پہلے جنم میں میرا نام آشا تھا اور تمہارا نام راج کمار...... میں نے اس سنسار میں جنم لیا تو میرا نام پدمنی رکھا گیا...... تم ایک انگریز لڑکی سے محبت کرتے ہو...... وہ بھی تم سے...... وہ ایک اچھی لڑکی ہے۔ لیکن تم اس سے ضرور شادی اور محبت کرنا...... اس کے سامنے کبھی میرا نام لینا اور ذکر نہیں کرنا...... اس لئے کہ عورت کے لئے یہ سب کچھ ناقابل برداشت ہے۔"

میں نے محسوس کرلیا تھا کہ وہ میرے بے حد قریب تھی...... لیکن وہ تو آتما تھی...... آتما تو دھواں ہوتی ہے۔ لیکن مجھے ایک دم سے یاد آیا کہ اس نے مجھے نہلایا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ کا لمس ایک زندہ انسان کی طرح جسم پر محسوس کیا تھا۔ میں اسے چھو کیوں نہیں سکتا......؟"

میں اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرکے اندازہ کرنے لگا کہ میرے اور اس کے درمیان کتنا فاصلہ ہوگا۔ جب مجھے پوری طرح اندازہ ہوگیا تو میں نے جیسے شب خون مارا۔ ایک دم اچانک اس کی طرف

اندازے سے ہاتھ بڑھایا۔ دوسرے لمحے وہ میرے بازوؤں کی گرفت میں تھی۔ وہ کسمسانے لگی۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ غائب ہو جائے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔

"مجھے جانے دو......" وہ بولی۔ "مجھے چھوڑ دو...... میں تم سے محبت بھری باتیں کرنے آئی ہوں۔ اپنا شریر میلا کرنے نہیں آتی......"

"پہلے تم مجھے اپنی صورت دکھاؤ......" میں نے اس کے گرد بازوؤں کا حلقہ تنگ کرتے ہوئے کہا۔ "تاکہ میرے دل کو قرار آجائے۔"

"میں دس دن تک ظاہر نہیں ہوسکتی۔" پدمنی نے کہا۔ "یہ میرے بس میں نہیں ہے۔ ماتا کا حکم بھی نہیں ہے کہ آپ کی کوئی بات مانوں؟"

پھر میں اندازے سے اس کے چہرے پر جھک گیا۔ کچھ دیر بعد میں جیسے گہری نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ یہ غشی کی سی کیفیت تھی۔ میں نیند میں نہیں ڈوبا تھا بلکہ ایک طرح سے بے ہوش ہی ہوگیا تھا۔ پدمنی نے مجھے شاید اس لئے بے ہوش کردیا تھا کہ میں جذبات کی رو میں بہہ کر اسے بھی دور تک ساتھ نہ لے جاؤں۔ اسے میلا کردوں۔ گو کہ وہ نظر نہیں آرہی تھی لیکن میں اس کے ہونٹ چہرہ، جسم، ہاتھ پیر اور آنکھیں تو محسوس کررہا تھا۔ اس کے نظر نہ آنے سے مجھ پر کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

معلوم نہیں میں کتنی دیر تک اس حالت میں رہا تھا۔ جب مجھے ہوش آیا تھا تو کمرے میں گھپ اندھیرا مسلط تھا۔ رات زیادہ بیتی نہیں تھی۔ لیکن مجھ پر ایک عجیب سی سرشاری طاری تھی۔ میری نس نس میں خون جیسے رقص کررہا تھا۔ انگ انگ سے مستی ابلی پڑتی تھی۔ میرے جسم میں خوشبو بس گئی تھی۔ میرا جسم تھکن سے چور چور ہو رہا تھا جیسے میں کسی لمبے اور انجانے سفر سے واپس آیا ہوں۔ اس تھکن میں ایک عجیب سا کیف اور سرور بھی تھا۔ پرانی شراب کا سا خمار......

مجھے خیال آیا کہ وہ شاید بستر میں ہوگی۔ وہ بھی بے سدھ اور مدہوش سی پڑی ہوئی ہوگی۔ کیوں کہ بستر میں اس کے پرشباب گداز بدن کی خوشبو کی سوندھی سوندھی مہک بسی ہوئی تھی۔ لیکن جب میں نے بستر ٹٹولا تو وہ موجود نہیں تھی۔ وہ مجھ پر مہربان ہو کر اور مجھے سرفراز کرکے چلے گئی تھی۔ کیا ہم دونوں بہک گئے تھے......؟ جذبات میں پھسل پڑے تھے......؟ اس کا میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

میں اس وقت پدمنی کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ پہلے جنم میں میری محبوبہ تھی۔ مجھ سے بے انتہا محبت کرتی تھی۔ لیکن مجھے اپنا پہلا جنم یاد نہیں تھا۔ دوسرے جنم میں اس نے مجھے بہت تلاش کیا لیکن وہ ایک حادثے کی نذر ہوگئی۔ اس کی آتما پرلوک میں چلی گئی لیکن وہ پرلوک میں بھی جاکر میری محبت کی آگ میں جلتی رہی بے چین رہی۔ تڑپتی رہی۔ پھر وہ ماتا دیوی سے اس دنیا میں جانے اور مجھے تلاش کرنے کے لئے اجازت لے کر آئی اور آخر کار مجھے پالیا۔

اس کی محبت میرے لئے ایک بیش بہا دولت تھی۔ اسے مجھ سے اتنی شدید اور سچی محبت تھی کہ دوسرے جنم میں اس نے مجھے تلاش کیا اور مرنے کے بعد بھی اس کی آتما مجھے تلاش کرنے دنیا میں آگئ

وہ بڑے موقع سے آئی تھی۔ ان حالات میں اس کی مدد ضروری بھی تھی۔ بڑے سنگین حالات تھے اور پھر اس نے ڈاکٹر نکولا کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا وہ میرے لئے حیرت کا باعث تھے۔ تاہم میں نے اس کی ڈاکٹر نکولا کے متعلق رائے سن کر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ یہ بات میں نے جیسے اپنی گرہ میں باندھ لی۔ پدمنی کا کہنا یہ تھا کہ ڈاکٹر نکولا ہیرا پانے کے بعد خودغرض ہو جائے گا۔ لیکن اب تک اس کی خودغرضی سامنے نہیں آئی تھی اور پھر مجھے اس بات سے کوئی غرض تھی اور نہ ہی فکر تھی ہیرا پانے کے بعد وہ مجھے دوست بناتا ہے، سونا دیتا ہے یا نہیں۔ کیوں کہ میں دس ہزار کی رقم پیشگی طور پر اس سے لے چکا تھا۔ اس رقم سے میں کوئی کاروبار کر کے اپنا مستقبل بنا سکتا تھا۔

میں اس وقت پدمنی کے حسین قرب کے لمحات کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ دروازے پر ہلکی اور مخصوص انداز میں سے دستک ہوئی۔ پھر دروازہ کو اندر کی طرف دھکا دیا گیا۔ میں حیران تھا کہ اس وقت کون ہو سکتا ہے؟ کھڑکی کا پٹ بند نہیں تھا باہر جو اندھیرا تھا وہ شیطان کی طرح اندر جھانک رہا تھا۔ چند لمحوں کے بعد دوبارہ دستک ہوئی۔ میں نے اٹھنا چاہا تو تھکن اتنی تھی کہ اٹھا نہیں جا رہا تھا۔ پھر بھی میں اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ میں نے چٹخنی گرانے سے قبل پوچھا۔ ''کون......؟''

''ڈاکٹر نکولا......'' سرگوشی کے انداز میں جواب ملا۔ ''جلدی سے دروازہ کھولو۔'' ڈاکٹر نکولا کا لہجہ بڑا پراسرار سا تھا۔

میں نے چٹخنی گرا کر دروازہ کھول دیا۔ ڈاکٹر نکولا اندر آیا۔ اس نے دروازہ بھیڑ دیا۔ جیب سے ماچس نکالی اور شمع جلائی جو وہ ساتھ لایا تھا۔ اس کے جلتے ہی کمرا روشن ہو گیا۔ پھر اس نے مجھ سے کہا۔ ''جلدی سے کھڑکی بند کر دو۔''

جب میں نے کھڑکی بند کر کے دیکھا تو وہ میرے بستر کی طرف دیکھ رہا تھا جس کی چادر پر گہری شکنیں پڑی ہوئی تھیں جس سے ایسا لگ رہا تھا دو آدمی اس بستر پر سو رہے تھے۔ وہ بستر کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ کوئی چیز سونگھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''کیا بات ہے......؟'' میں نے سرگوشی میں آہستگی سے پوچھا۔ ''خیریت تو ہے......؟'' اتنی رات کو کیسے آنا ہوا......؟''

''پہلے آپ یہ بتائیں کہ یہ سوندھی سوندھی اور مست کر دینے والی خوشبو آپ کے کمرے میں کیسے......؟'' اس نے پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم......'' میں صاف مکر گیا۔ ''میں تو گہری نیند سو رہا تھا۔ آپ کی دستک پر بیدار ہوا ہوں۔''

''یہ خوشبو...... عورت کے بدن کی ہے۔'' ڈاکٹر نکولا نے کہا۔ ''اس کی خوشبو سے نہ صرف آپ بلکہ آپ کا بستر بھی مہک رہا ہے۔ بستر کی چادر کی شکنیں بتا رہی ہیں کہ عورت آپ کے ساتھ وقت گزاری کر کے گئی ہے۔''

''عورت کی خوشبو......؟'' میں ہنس پڑا لیکن اس کے اندازے پر دل میں ششدر رہ گیا تھا۔ مجھے

یقین نہیں آیا کہ ڈاکٹر نکولا اس بات کو جان لے گا۔ چوں کہ میں اقرار کرنا نہیں چاہتا تھا اس لئے میں انکاری رہا۔ ''عورت......؟ کیسی عورت؟ کون سی عورت......؟'' میں نے تکرار کے انداز میں کہا۔ ''اس سرائے میں ایک بھی عورت نہیں ہے...... ہم نے کوئی عورت دیکھی اور نہ سنی...... پھر کوئی عورت میرے کمرے میں کیسے آ سکتی ہے...... کہیں یہ بے خوابی کا اثر تو نہیں ہے؟''

''میں نے کبھی عورت اور لڑکی کی خوشبو میں دھوکا نہیں کھایا......؟'' وہ بولا۔ ''میں صرف خوشبو سے بتا سکتا ہوں کہ وہ لڑکی تھی یا عورت...... ان کی اپنی الگ خوشبو ہوتی ہے۔ کمرے میں اور اس کی فضا میں آپ میں اور بستر میں عورت کی خوشبو بول رہی ہے۔''

''عورت اور ایک لڑکی کی خوشبو میں کیا فرق ہوتا ہے......؟'' میں نے حیرت اور تجسس سے دریافت کیا۔ ''آپ بتائیں......؟''

''ایک کنواری لڑکی جب اپنا تن من کسی مرد پر نچھاور کر دیتی ہے تو اس کے کنوار پن میں جو خوشبو ہوتی ہے اس میں ایسی ہی خوشبو ہوتی ہے جیسے کلی میں ہوتی ہے۔'' ڈاکٹر نکولا کہنے لگا۔ ''اگر کنواری لڑکی نے اپنے آپ کو آلودہ ہونے سے محفوظ رکھا تو پھر خوشبو نہیں پھوٹتی ہے۔ عورت بہرحال ایک پھول کی مانند ہوتی ہے۔ وہ مہکتی ہی رہتی ہے۔ اس کا وجود بولتا اور مہکتا رہتا ہے۔''

''میں نہیں جانتا کہ یہ خوشبو کیسی ہے......؟'' میں نے صفائی پیش کی۔ ''دروازہ اندر سے بند کیا ہوا ہے۔ ایسا بھی نہیں کہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ کوئی عورت آئی۔ مجھے نیند میں پا کر میرے بستر میں گھس گئی ہو۔ پھر چلی گئی ہو۔''

''میرا خیال ہے یہ کوئی بدروح آئی تھی۔'' ڈاکٹر نکولا نے کہا۔ ''اس نے آپ کی نیند کی حالت سے فائدہ اٹھایا۔ وہ آپ کو سرفراز کر گئی ہے۔ آپ کو خبر بھی نہیں ہو سکی۔ لیکن رات رنگین، حسین اور نشاط انگیز گزر گئی۔''

''بدروح......'' میں اس کی پیشن گوئی پر بھونچکا سا ہو گیا۔ ''کیا اس سرائے میں بدروحیں بھی موجود ہیں......؟'' میرا لہجہ تحیر زدہ تھا۔

''کیا کچھ بلائیں نہیں ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''ان کا ایک اجلاس ہو رہا ہے۔ میں آپ کو وہ دکھانے لے جانے آیا ہوا ہوں۔''

ڈاکٹر نکولا اندھیرے میں میرا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے نکلا اور ایک سمت چل پڑا۔ وہ کسی درندے کی طرح اندھیرے اجالے میں ایک جیسا دیکھتا تھا۔ پھر وہ اس کمرے کی چھت پر آ گیا جس میں اجلاس ہو رہا تھا۔ اس کمرے میں دو روشن دان تھے۔ وہ قریب قریب ہی تھے۔ ہم ایک ایک روشن دان کے پاس بیٹھ کر باہر سے اندر جھانکنے لگے۔ گھپ اندھیرے نے ہمیں اپنی آغوش میں لیا ہوا تھا۔ کمرے میں موجود جو بھی تھے وہ ہمیں دیکھ نہیں سکتے تھے۔

میں نے ایسی بھیانک اور مکروہ صورتیں اپنی زندگی میں نہیں دیکھی تھیں نہ سنا تھا کہ کوئی ایسا

بدصورت بھی ہوتا ہے۔ یہ انسانوں کا اجلاس نہ تھا۔ یہ شیطانوں اور چڑیلوں کا اجلاس تھا۔ میں زندگی میں پہلی بار چڑیلوں کو دیکھ رہا تھا۔ ان کی مرغی کے انڈوں سے بڑی بڑی لال لال آنکھیں تھیں۔ ان میں خون بھرا ہوا تھا۔ چہرہ سیاہ لوہے کی طرح سخت تھا۔ ناک بہت ہی موٹی اور بھونڈی اور لمبی بھی تھی...... ہونٹ موٹے، بھدے اور بدنما...... زبان زیادہ لمبی تھی۔ ہاتھ اور پیر الٹے تھے۔ جسامت قدرے متناسب تھی...... ایک ایک چڑیل اس قدر مکروہ صورت کی تھی کہ مضبوط دل کا آدمی بھی دیکھے تو وہ بے ہوش ہو جائے...... ان بدروح عورتوں کو چڑیل بنا دیا جاتا تھا جن کے دنیا میں جیسے کرتوت ہوتے تھے...... انہیں یہ سزا دی جاتی تھی۔ دنیا میں انہیں بھیج دیا جاتا تھا بلکہ کالی ماتا انہیں اپنا تابع بنا کر رکھتی اور ان سے ہر طرح کے کام لیتی تھی۔ جو بھوت تھے وہ ان کی طرح کریہہ صورت تو نہ تھے لیکن پھر بھی انہیں دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ ان کے علاوہ عام قسم کے انسان بھی تھے جو ایک طرف بیٹھے ہوئے تھے۔ اسٹیج پر ایک شخص کھڑا ان سے جو کہہ رہا تھا وہ جادوگر سام تھا۔

سام جادوگر کو دیکھا گو کہ وہ ایک انسان ہی تھا لیکن اس کے چہرے پر ایسی خباثت تھی کہ جو میں نے کسی انسان کے چہرے پر کبھی اور آج تک بھی نہیں دیکھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کینہ بھرا ہوا تھا۔ وہ انتہائی مکار، عیار اور صحرائی لومڑی کی طرح نظر آتا تھا۔ کچھ اور بھی جادوگر موجود تھے۔ مگر ان کے چہروں پر بھی ایسی بات نہ تھی کہ جو عام لوگوں کے چہروں پر ہوتی تھی۔ سام جادوگر ایک اسٹیج نما جگہ پر کھڑا ہوا کہہ رہا تھا۔ ”میرے پاس جو ہیرا ہے جسے میں نے مندر میں رکھا ہوا ہے وہ بڑا مقدس ہے۔ آسمانی طلسماتی ہیرا ہے۔ اس کی کرامات تم لوگوں کو دکھا چکا اور تم لوگ بہت اچھی طرح جانتے ہو کہ یہ ہیرا دراصل ایک دیوتا ہے۔ اس ہیرے کے اندر دیوتا موجود ہے جو اپنی کرامات دکھاتا ہے۔ اس کی حفاظت میرا ہی نہیں ہم سب کا فرض ہے۔ اس ہیرے کے حصول کے لئے کتنے ہی لوگ کوشش کر چکے ہیں۔ تم سب نے میرا ساتھ دیا اور اس ہیرے کے حصول کے لئے آنے والے کو موت کی نیند سلا دیا۔ اس پر ذرا ترس نہیں کھایا۔ رحم نہیں کیا۔ ان ہوس کاروں کے لئے یہی سزا تھی۔ لیکن یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا بلکہ جاری ہے۔ ابھی بھی لوگ آتے جا رہے ہیں۔ وادی موت میں انہیں قدم نہیں رکھنے دیا جائے۔

یہاں جو یہ پانچ چڑیلیں موجود ہیں میں انہیں اب تک پچاس انسانوں کا خون پلا چکا ہوں۔ اس لئے کہ انہوں نے ہیرے کے حصول کے لئے آنے والوں کو روک دیا تھا۔ میں نے یہ اجلاس اس لئے بلایا ہے کہ دو اور آدمی اس ہیرے کی تلاش میں نکل پڑے ہیں۔ ان میں ایک ہندوستانی اور ایک انگریز ہے۔ کچھ پتا نہیں چل سکا کہ وہ کہاں ہیں اور کس بہروپ میں ہیں۔ ان کے بارے میں پتا چلانے میں میں اس لئے ناکام رہا ہوں کہ ان کے پاس کوئی ایسی مقدس چیز ہے جس کی وجہ سے میرا جادو ان کے بارے میں کچھ معلوم نہ کر سکا۔ ان کے بارے میں جتنا جلد ہو سکے معلوم کرنا ہے۔ جو مرد بدروح، جادوگر ان کا پتا چلائے گا میں چوچائی قحبہ خانہ کی چودہ برس کی لڑکی کو اس کے تابع کر دوں گا۔ وہ کیا کھلونا ہوتی ہیں۔ یہ تم سب جانتے ہو۔ ایک ایسا کھلونا جس سے کھیلتے ہوئے جی نہیں بھرتا۔ جب تک جی نہیں بھر جاتا وہ اس سے کھیلتا رہے گا۔ کسی

دوسری کی خواہش کرے گا تو وہ بھی اسے دے دوں گا۔ مرد روح کو میں ایک ایسا مرد بنا دوں گا بلکہ اسے منتر سکھا دوں گا کہ وہ جب اور جب تک چاہے اپنی اصلیت چھپا سکے۔ کسی کو بھی کبھی پتا نہیں چل سکے گا کہ اس کی اصلیت کیا ہے۔ جادوگروں کو بھی انعام میں نہ صرف لڑکی ملے گی بلکہ انہیں ایسے منتر سکھا دوں گا کہ ان کا جادو اور زوردار ہو جائے گا۔ وہ ایسے منتر ہیں کہ اس دنیا میں میرے سوا کوئی اور جادوگر نہیں جانتا ہے۔“

وہ سانس لینے کے لئے رکا تو ایک چڑیل نے اپنا منہ کھولا۔ وہ بولی تو اس کی آواز ایسی کرخت اور بھونڈی تھی کہ دماغ سن سنا گیا۔

”ہمارے لئے آپ نے کیا سوچا اور کیا حکم ہے؟“ اس کی آواز فضا میں گونجی۔ ”ہمیں کیا ملے گا؟ کیا انعام سوچا ہے دینے کے لئے؟“

”تم لوگوں کے لئے بھی میں نے بہت کچھ سوچا ہوا ہے۔“ سام جادوگر نے جواب دیا۔ ”میں نے کسی وجہ سے تم لوگوں کو حسین عورتوں کے روپ میں آنے سے جو محروم کیا ہوا ہے اب تمہیں وہ منتر بتا دوں گا تاکہ تم کسی بھی عمر کی لڑکی اور عورت بن کر ان دونوں بہروپیوں کا پتا چلا سکو اور جن مردوں پر تمہارا دل آئے اسے اسیر کر کے اپنا دل بہلاؤ۔ جب اس مرد سے دل بھر جائے اس کا خون پی جاؤ...... تم لوگ جس کا چاہے خون پی سکتی ہو...... لیکن اس بات کا خیال رہے کہ مرد حسین بھی خوب صورت اور عام مرد کے بہروپ میں ہوں گی۔ تم دونوں ایک دوسرے کے فریب میں مت آ جانا۔ ویسے تم دونوں اس وقت تک آپس میں میل جول رکھ سکتے ہو جب تک جی چاہے۔“

”اس سرائے میں دو سیاح ٹھہرے ہوئے ہیں۔“ ایک جادوگر نے کہا۔ ”آپ نے ان کے بارے میں کچھ معلوم کیا؟“

”میں نے نہیں سردار نے ان کے بارے میں اچھی طرح سے معلوم کر لیا ہے۔“ سام جادوگر نے جواب دیا۔ ”وہ ہنکاؤ مندر کا پجاری ہے۔ اس کا ساتھی اس کا ماتحت ہے۔ وہ دونوں قحبہ خانے میں وقت گزاری کے لئے آئے ہیں۔ انسان چاہے وہ پجاری ہو۔ سادھو ہو اور بھکشو ہو وہ عورت کے ساتھ وقت گزار سکتا ہے۔ عورت کو بیوی، محبوبہ اور داشتہ بھی بنا سکتا ہے۔ میں اجلاس برخاست کر رہا ہوں۔ اگر کسی کو کچھ پوچھنا، مانگنا اور اپنی تسلی کرنا ہے تو وہ سامنے آئے......“

”کیا وہ انگریز اور ہندوستانی اس قدر خطرناک ہیں کہ وہ آپ کو کوئی نقصان پہنچا سکتے ہیں؟“ ایک جادوگر نے سوال کیا۔

”ہاں......“ سام جادوگر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”وہ انگریز جو ہے وہ تھوڑے بہت جادو کے علم سے واقف ہے۔ بے حد ذہین ہے۔ ذہین شخص جادو سے کہیں خطرناک ہوتا ہے۔ دنیا میں ذہانت سے مہلک اور خطرناک ہتھیار کوئی نہیں ہے۔ اس کے آگے جادو ہی نہیں ایک فوج بھی ہار مان لیتی ہے۔ اگر وہ کسی طرح مندر تک آ گیا تو ... سے ہیرا لے جانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔“

”حیرت کی بات ہے کہ جادو کے زور سے آپ اس کا پتا نہیں چلا سکے؟“ دوسرے جادوگر نے کہا۔

"سردار نے بتایا تھا کہ جو دو سیاح کل اس سرائے میں آ کر ٹھہرے ہوئے ہیں ان کے پاس مقدس لکڑی موجود ہے۔ کیا یہ بہت ساری لکڑیاں ہیں؟"

"یہ صرف چار لکڑیاں ہیں...... جو پجاری اعظم کے پاس موجود ہیں۔" سام جادوگر نے جواب دیا۔ "یہ لکڑیاں ہر کسی کو نہیں دی جاتی ہیں۔ وہ صرف بڑے اور انتہائی معتبر پجاری کو جو چینی قوم کا ہو دیتا ہے۔ اگر وہ لکڑی لے گیا تو اس کی خیر نہیں ہوتی ہے۔ جب تک اسے حاصل نہ کر لیا جائے چین سے نہیں بیٹھا جاتا ہے۔ میں نے ایک اور جادوگر سے رابطہ کیا ہوا ہے وہ بتادے گا کہ وہ انگریز اور ہندوستانی کہاں ہیں؟ کس بہروپ میں ہیں کل سہ پہر کے بعد معلوم ہو جائے گا۔"

پھر وہ سام جادوگر مرد بدروحوں اور چڑیلوں کو منتر سکھانے لگا۔ جادوگر بھی وہاں بیٹھے رہے۔ ڈاکٹر نکولا نے میرے پاس آ کر واپس چلنے کا اشارہ کیا۔ پھر ہم زینے کی طرف بڑھے۔ جب ہم بڈھے سردار کے کمرے کے سامنے سے گزرے تو ایک نقرئی ہنسی اس کے کمرے میں گونجتی ہوئی سنائی دی۔ ہم ٹھٹک کے رک گئے۔ دروازے کے نیچے سے روشنی جھانک رہی تھی۔ اس روشنی سے ایسا لگا جیسے کمرے میں بیک وقت کئی مشعلیں روشن ہیں۔ ان کی روشنی نے کمرے کو جگ مگا دیا ہے ورنہ اتنی تیز روشنی دکھائی نہ دیتی۔

سردار کے کمرے کے دروازے پر دو تین روزن تھے۔ ایک روزن سے ڈاکٹر نکولا نے آنکھ لگا دی اور دوسرے روزن سے میں نے...... اس کے کمرے میں قحبہ خانے سے لائی ہوئی لڑکی ہی ہو سکتی تھی۔ اس کمرے میں اتنی روشنی تھی کہ اس کمرے کا ذرہ ذرہ اور تنکا تنکا صاف دکھائی دیتا تھا۔ چار مشعلیں روشن تھیں۔ ان مشعلوں نے کمرے کی ایک ایک شے کو جیسے عریاں کر دیا تھا۔

سولہ برس کی ایک حسین وجمیل، نازک اندام اور بھرپور لڑکی تھی۔ وہ ساقی بنی ہوئی تھی۔ بوڑھے سردار کو اپنے نازک، خوب صورت، سڈول اور گداز ہاتھوں سے شراب پلا رہی تھی۔ واقعی اس عمر میں یہ لڑکی ایک بھرپور پرشباب بدن کی عورت کی طرح تھی۔ اس کے بجلی بھرے بدن میں بڑا حسن اور جاذبیت تھی۔ یقین نہ آتا تھا۔ واقعی وہ ایک نایاب نمونے کی طرح تھی۔ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم تھی۔

وہ شخص یقیناً بڑا خوش نصیب ہوتا تھا جس کے بستر کی یہ زینت بنتی تھی۔ سردار بھی خوش نصیب تھا۔ وہ قبر میں پیر لٹکائے بیٹھا ہوا تھا لیکن وہ اپنے جذبات کا غلام ہو کر رہ گیا تھا۔ لیکن دیکھا جائے تو اس میں سردار کا کوئی قصور نہ تھا۔ اگر ایسے نگینے ہوں تو مرد چاہے وہ سو برس کا ہی کیوں نہ ہو ایسی لڑکی کو دیکھ کر جوان ہو جائے۔ اس وقت یہ سردار بوڑھا نہیں جوان دکھائی دیتا تھا۔

یہ سردار حقیقت میں اندھا نہیں تھا۔ وہ ہمارے سامنے اندھا بن کر آیا تھا۔ اب وہ جو شوخیاں اور باتیں کر رہا تھا اور اس کی حرکات وسکنات تھیں اس سے لگ رہا تھا کہ وہ اندھا نہیں ہے۔ وہ اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا اور پھر لڑکی اسے جام پلا چکی تو اس نے لڑکی کے ہاتھ سے خالی گلاس لیا۔ پھر اس نے کانچ کی صراحی اٹھائی۔ اس نے گلاس میں جام بھرا۔ پھر لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر اسے قریب کیا۔ پھر اس نے جام سے بھرا گلاس لڑکی کے نازک، سرخ اور رس بھرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ لڑکی مزے لے لے کر پینے لگی۔

کچھ دیر بعد جب ان پر نشہ طاری ہونے لگا تو لڑکی چہکنے اور سردار بہکنے لگا۔ دونوں آزادی کے لبادے میں تھے اور انجانے راستے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ تب ڈاکٹر نکولا نے میرا شانہ ہلایا۔ پھر ہم تھوڑی دیر بعد اپنے کمروں کے قریب پہنچ گئے۔ ڈاکٹر نکولا مجھے اپنے کمرے میں لے گیا۔ اس نے شمع روشن کرنے کے بعد دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دی۔

"آپ نے خبیثوں اور سام جادوگر کا اجلاس دیکھ لیا اور ان کی باتیں سن لیں۔" ڈاکٹر نکولا نے کہا۔

"یہ بھی دیکھ لیا کہ سردار حقیقت میں اندھا نہیں ہے۔ سہ پہر کے بعد سام جادوگر کے علم میں یہ بات آجائے گی کہ انہیں جن آدمیوں کی تلاش ہے وہ یہاں موجود ہیں۔ اگر ہم ان کے ہاتھ لگ گئے تو پھر وہ ہمیں آدم خوروں اور چڑیلوں کا نشانہ بنا دیں گے۔ بتائیں ہم کیا کریں؟"

مجھے اس لمحے پدمنی کی بات یاد آ گئی۔ میں نے کہا۔ "دوپہر کے کھانے کے بعد ہم قحبہ خانے جانے کے بہانے نکلیں...... انہیں ہم پر کوئی شک نہیں ہے اور نہ ہی ہوگا۔ اس کے علاوہ کوئی اور صورت نظر نہیں آتی ہے۔ کیا یہ مناسب نہیں ہوگا؟"

"ہاں......" ڈاکٹر نکولا نے سر ہلا دیا۔ "آپ کی تجویز بڑی مناسب ہے۔ اب آپ اپنے کمرے میں جا کر آرام کریں۔"

میں اپنے کمرے میں آ کر بستر پر دراز ہوا تو میری نظروں میں اس اجلاس کی بدروحیں گھومنے لگیں اور ان کی باتیں کانوں میں گونجتی رہیں۔ پدمنی نے بالکل صحیح کہا تھا کہ ہم سہ پہر سے پہلے یہاں سے نکل جائیں...... پھر قحبہ خانے کی وہ نوخیز عمر لڑکی جس سے سردار رات کالی کر رہا تھا۔ اس لڑکی کا حسن وحشی تھا۔ اس عمر میں اتنی زرخیز یقین نہیں آتا تھا...... ایک اور بات تھی۔ جنگلوں میں ایسی ایسی جڑی بوٹیاں ملتی ہیں جو سو برس کے بوڑھوں کو بھی جوان کر دیتی تھیں اور بوڑھی عورتوں کو بھی حسین اور کم عمر بنا دیتی تھیں۔ تیرہ چودہ برس کی لڑکیاں استعمال کرنے سے وہ پرشباب گداز بدن کی عورت جیسی بن جاتی ہیں۔ شاید قحبہ خانے میں چودہ برس سے لے کر بیس برس کی لڑکیوں کو ان جڑی بوٹیوں کا عرق پلایا جاتا ہوگا۔ اس لئے وہ لڑکی نگینہ کی طرح تھی۔

پھر مجھے پدمنی یاد آنے لگی۔ اس کی خوشبو سے بستر ابھی بھی مہک رہا تھا اور تن میں بھی اس کی مہک رچی بسی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر نکولا نے اس خوشبو سے محسوس کر لیا تھا کہ کوئی عورت میرے کمرے میں تھی۔ میرے بستر میں تھی۔ گو کہ میں نے تردید کر دی تھی لیکن اس بات سے انکاری تھا کہ عورت کمرے میں نہیں تھی میں بستر پر کروٹیں بدلنے لگا۔ پدمنی کی یاد ستانے لگی۔

نیند سولی پر بھی آجاتی ہے۔ مجھے بھی آگئی۔ لیکن میں نے نیند کی حالت میں محسوس کیا کہ پدمنی بستر میں میرے ساتھ ہی سو رہی ہے۔ میں باوجود لاکھ کوشش اور جتن کے بیدار نہ ہو سکا۔ پدمنی نے مجھ پر مدہوشی طاری کر دی تھی کہ میں بیدار ہو کر پھر نہیں جذبات کی رو میں نہ بہہ جاؤں۔ اس وقت تو وہ میرے رحم وکرم پر تھی لیکن اب وہ سابقہ لمحات دہرانا نہیں چاہتی تھی۔

صبح میں بیدار ہوا تو میرا بستر اسی طرح سے مہک رہا تھا۔ ایسا لگا پدمنی مجھے بیدار ہوتا دیکھ کر چلی گئی

ہے۔ میں تیار ہو کر ڈاکٹر نکولا کے کمرے میں گیا۔ وہ ناشتے پر میرا انتظار کر رہا تھا۔ ناشتا کرنے کے بعد ہم دونوں کمرے سے نکل کر مندر کی طرف آئے۔ اس کے صحن میں آکر مندر کا طواف کیا۔ پھر اندر جا کر بتوں کو سجدہ کیا۔ ہم زہد و ریاضت کی کوشش کرتے رہے۔ اس وقت صبح کی عبادت کے لئے سب بھکشوؤں کو جمع ہونا تھا۔ ہم بھی شریک ہوئے۔ یہ بھی ایک طرح سے مکروہ صورتوں کا ایسا ہجوم تھا جو کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ ان میں ہر عمر اور ہر طبقہ کے آدمی شریک تھے۔ سچی بات تو یہ تھی کہ ایک بھی صورت ایسی نہ تھی جس پر زہد و تقویٰ کی علامات موجود ہوں۔ سب کے چہروں پر شیطانیت تھی۔ بہ حیثیت مجموعی مکر و ریا، عیاری اور سیاہ کاری کی ایسی نمائش تھی جو میں نے لاما کے سرائے کے پجاریوں میں دیکھی۔ شاذ و نادر یک جا دیکھی گئی ہو گی۔ اس وقت بے اختیار خیال آیا کہ اگر کسی طرح یہ لوگ ہمارے راز سے واقف ہو جائیں تو کیا یہ جو لکڑی ہے وہ ہمیں اس مصیبت سے نجات دلا دے گی...... ڈاکٹر نکولا نے کہا تھا کہ جب تک یہ لکڑی موجود ہے کوئی ہمیں موت کے منہ میں دھکیل نہیں سکتا۔

جب ہم واپس کمرے میں آئے تو سردار کا ایک آدمی کمرے میں آیا اور ڈاکٹر نکولا کو بلا کر لے گیا کہ سردار نے طلب کیا ہے۔

اس کے جانے کے بعد میں بستر پر ستانے کے لئے دراز ہوا تھا کہ اچانک میں نے خوشبو کو نتھنوں میں محسوس کیا۔ بھینی بھینی سوندھی سوندھی مانوس سی خوشبو جو پدمنی کی تھی۔ جو اس کے بدن اور بالوں سے پھوٹ رہی تھی۔ پھر میں نے اس کے بدن کا لمس محسوس کیا۔ پھر وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ سہلانے لگی۔ گو وہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"پدمنی!" میں نے محبت بھرے لہجے میں شکایت کی۔ "یہ رات تم مجھے بے ہوشی کی آغوش میں ڈال کر کہاں چلی گئی تھیں......؟ یہ تم نے ایسا کیوں کیا پدمنی!...... کیا اب تمہیں مجھ سے پہلے جنم والی محبت نہیں رہی......؟ کیا مجھ سے دل بھر گیا؟"

"اس لئے کہ تمہاری من مانی حد سے تجاوز کر گئی تھی......" میں نے اس کے لہجے میں حیا سی محسوس کی۔ "یہ تم نے کیا کر دیا تھا...... تم مجھے اتنی دور کیوں لے گئے......؟ میں خود پر قابو نہ پا سکی۔ تمہاری محبت اور جذبات کے آگے بے بس ہو کر رہ گئی...... اگر میں تمہیں بے ہوشی کی نیند سلا نہ دیتی تو پھر ہمارے ملن کا راز ڈاکٹر نکولا پر ظاہر ہو جاتا۔ میں نہیں چاہتی ہوں کہ تم اسے ہمارے میل جول کے بارے میں بتاؤ...... میں نے تم سے کہا تھا نا کہ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔ خود غرض ہے دولت کی ہوس ہے اسے...... نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ جس آتما نے یہ بات بتائی تھی اس نے اپنی طرف سے کہی تھی۔ تم اس کی بات کا وشواس نہ کرو۔

میں نے تمہیں اس لئے بے ہوش کیا تھا کہ ڈاکٹر نکولا کمرے میں آنے والا تھا...... اس نے قیاس کر لیا تھا کہ اس کمرے میں اور تمہارے بستر میں ایک عورت تھی۔ اس نے عورت کی خوشبو سونگھ لی تھی۔ مجھ سے بھول ہو گئی تھی میں اپنی خوشبو ساتھ لے جا نہ سکی...... تم مجھے الزام مت دو۔ اگر مجھے تم سے محبت نہ ہوتی تو میں تم پر مہربان نہ ہوتی...... تمہاری ہر مشکل دور کرنے پر میں اس سن سنار میں رہ گئی ہوں...... میں اس وقت تک ہوں

جب تک تم ہیرا نہ پا لو...... اس مقدس لکڑی کو سنبھال کر اور بڑی حفاظت سے رکھو۔ یہ ہر مشکل میں کام آئے گی۔ اس لئے تو ڈاکٹر نکولا نے اسے حاصل کیا ہے۔ یہ لکڑی جس کی خوبی، اہمیت اور خصوصیت سے ڈاکٹر نکولا واقف تھا اسے حاصل کرنے کے لئے اس نے کیا کچھ نہیں کیا۔ یہ لکڑی ایک وزیر ویدرل کے پاس تھی۔ اس کی بیٹی نلس جو اٹھارہ برس کی تھی بہت حسین، طرح دار اور بلا کی پرکشش تھی۔ اس لکڑی کو حاصل کرنے کے لئے نلس کو اغوا کرنے کا منصوبہ بنایا۔ ایک تقریب میں جب ڈنر کے وقت نلس آئی اور بعد میں رقص کا دور شروع ہوا تو اس نے نلس کے ساتھ رقص کیا اور پھر اس سے کہا کہ اس کے لئے اچھی خبر نہیں ہے۔ رقص گاہ سے باہر آکر اس نے نلس کو بتایا کہ اس کے باپ کو اغوا کر کے ایک جزیرے پر بدمعاشوں نے تاوان کے لئے قید کر رکھا ہے۔ جب وہ اسے لے کر جس مکان پر پہنچا وہاں نلس کا باپ نہ تھا...... اس نے نلس سے کہا کہ بدمعاش اسے کہیں لے گئے ہیں۔ وہ انہیں تلاش کرے گا۔ تین دن تک وہ دو تین گھنٹے کے لئے نکل جاتا۔ ان تین دنوں میں اسے ڈاکٹر نکولا سے محبت ہو گئی۔ پھر محبت میں جنگ کی طرح ہر بات جائز ہو گئی۔ انگریز لڑکیاں محبت میں ڈوب کر اپنا تن من نچھاور کر دیتی ہیں۔ نلس نے اس کے ساتھ تین دن اور تین راتیں گزاریں۔ پھر اس کا باپ اور منگیتر آ گئے۔ اس کے باپ کے پاس یہ لکڑی تھی وہ بے دھیانی میں اس کی جیب سے گر گئی تو ڈاکٹر نکولا نے اس کو اٹھا لیا اور نلس کو جانے دیا۔ اس انمول، نایاب اور نادر اور حیرت انگیز ہیرے کے بارے میں سن چکا تھا۔ یہ کوہ قاف کا ہیرا ہے۔ کوہ قاف میں ایسے کل تین ہیرے ہیں۔ پرستان کی پریوں کو اس بات کا بڑا دکھ اور افسوس ہے کہ وہ ہیرا دنیا میں چلا گیا۔ اسے پرستان کے شہزادوں نے حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن سام جادوگر کے سامنے ان کا بس نہ چلا۔ تاہم وہ ابھی بھی اس کوشش میں ہیں کہ ہیرا کسی نہ کسی طرح حاصل کیا جا سکے۔ ہیرا پانے کے بعد اسے بڑی حفاظت سے رکھنا ہو گا......"

میں اس سے من مانی کرنے لگا تو وہ میری گرفت سے نکل کر بولی۔ "میں جا رہی ہوں۔ میں یہ بتانے کے لئے آئی تھی کہ سہ پہر سے پہلے اس سرائے سے نکل جاؤ اور ہیرے کے لئے مندر کی طرف کوچ کرو اور ڈاکٹر نکولا بھروسے کا آدمی ہے۔"

پھر وہ کمرے سے نکلی تو اپنے ساتھ اپنی خوشبو بھی لے گئی...... تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر نکولا آیا تو میں نے اس سے پوچھا۔ "سردار نے تمہیں کیوں اور کس لئے بلایا تھا......؟ کوئی خاص بات تھی کیا......؟ خیریت تو ہے نا......؟"

"اس لئے بلایا تھا کہ قحبہ خانہ کی وہ لڑکی جس کے ساتھ اس نے رات گزاری تھی وہ آج کی رات مجھے بطور تحفہ دینا چاہتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "تمہارے لئے بھی وہ قحبہ خانے سے سولہ برس کی لڑکی منگوائے گا۔ وہ مہمان نوازی کرنا چاہ رہا ہے۔"

"وہ کس لئے......؟" میں نے تحیر زدہ لہجے میں کہا۔ "اسے کس لئے ہماری مہمان نوازی کا خیال آ گیا...... دال میں کالا تو نہیں؟"

"اس لئے کہ وہ ہمیں اس بہانے سے روک رہا ہے۔" ڈاکٹر نکولا بولا۔ "دراصل اسے ہم پر شک

ہوگیا ہے۔ واقعی دال میں کالا ہے۔"

"آپ نے اسے کیا جواب دیا......؟" میں نے پوچھا۔ "اب ہم کیا کریں......اسے کس بات سے شک ہوگیا ہے......؟"

"میں نے اسے فریب دیا ہے......یعنی آمادگی ظاہر کی اور اس سے کہا کہ اس عزت افزائی کا شکریہ......ہمیں چونکہ یہاں سے فرار ہونا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ قحبہ خانہ جا کر دوسری لڑکی کو پسند کر کے لے آئیں گے......اسے اس لئے شک ہوا ہے کہ ایک جادوگر نے اس سے کہا ہے کہ ہم چینی نہیں ہیں۔ اس بات کی تصدیق بھی وہ شام کو کرے گا۔ سردار نے لڑکی پسند کر کے لانے کی اجازت دے دی ہے۔"

"کیا یہ وہی جادوگر ہے جس نے سام جادوگر کو سہ پہر کے بعد ہمارے بارے میں بتانے کے لئے کہا تھا؟" میں نے سوال کیا۔

"نہیں۔" ڈاکٹر نکولا نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ کوئی اور جادوگر ہے۔ یہ جادوگر یہاں مندر میں رہتا ہے......اور ہاں ایک اور مصیبت......ایک نہیں دو مصیبتیں......اصل پجاری جسے ہم نے اغوا کر کے جہاز پر سوار کرایا تھا وہ نہ جانے کس طرح سے یہاں آ گیا ہے۔ اس کے ساتھ وہ شخص بھی ہے جو میرے گھر میں گھسا تھا اور اس نے ہم دونوں کو چینی لباس میں بھی دیکھا تھا۔ وہ ابھی ابھی لمبے سفر سے پہنچے ہیں اور بے حد تھکے ہوئے ہیں اس لئے آرام کرنے چلے گئے ہیں۔ لہٰذا چلو، اٹھو، ابھی راستہ صاف ہے۔ تمام لوگ اس کمرے میں گئے ہیں جہاں بدروحوں اور جادوگروں کا اجلاس ہوا تھا۔ اس کمرے میں قحبہ خانے کی وہ لڑکی جس کے ساتھ سردار نے رات گزاری ہے وہ رقص پیش کرے گی۔ مجھے سردار کے آدمی نے بتایا کہ جب بھی سردار کسی قحبہ خانہ کی لڑکی کو بلاتا ہے اسے رقص کے لئے پیش کر کے لوگوں کا دل بہلانا ہوتا ہے۔ وہ ایسا ہیجان خیز رقص پیش کرتی ہے کہ لوگ کھو کر رہ جاتے ہیں۔ ابھی رقص کی محفل جمنے والی ہی ہے۔"

کچھ دیر بعد ہم کمروں سے باہر آئے تو پوری سرائے اور صحن میں سناٹا طاری تھا۔ ویرانی برس رہی تھی اور سرائے بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس سرائے میں کوئی متنفس نہیں ہے۔ یہ پوری عالی شان عمارت ویران پڑی ہے۔ جہاں گھوڑے بندھے ہوئے تھے وہ عقبی حصہ تھا۔ ہم زینہ پر پہنچے۔ سامنے وہ کمرہ آتا تھا جہاں رقص کی محفل جمی ہوئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس کمرے میں کوئی بھی نہیں ہے۔ جب ہم نے اس کمرے میں جھانکا تو دیکھا کہ وہ کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ لیکن سب گنگ بیٹھے تھے۔ ایسا لگا یہ سب مٹی کے بت ہیں۔ وہ منجمد آنکھوں سے سانس روکے رقاصہ کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی خاموشی اور محویت کی وجہ سمجھ میں آ گئی تھی۔ جو لڑکی ناچ رہی تھی وہ ایسی حالت میں تھی جیسے ابھی ابھی پیدا ہوئی ہو۔ اس کا لباس ایک کونے میں بے ترتیب سا پڑا ہوا تھا۔

ہم وہاں ایک لمحہ بھی نہیں رکے۔ اس لڑکی کی حالت اور رقص سے محظوظ ہونے کا وقت نہیں تھا۔ ہم عقبی حصے میں پہنچے۔ اصطبل میں ہمارے گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہم اڑے ہوئے جا رہے تھے۔ یہ تصور بڑا بھیانک اور لرزہ خیز تھا کہ ہمیں آدم خوروں کے آگے چارہ کی طرح ڈال دیا

جائے۔ ہمارے اعصاب پھول کی طرح ہلکے ہو چکے تھے۔

ہماری خوشی عارضی ثابت ہوئی۔ جب ہم ایک آبادی کے سامنے سے گزر رہے تھے جھاڑیوں کے عقب سے چار مسلح آدمی نکل آئے جو گھوڑوں پر سوار تھے۔ ان کے ہاتھ میں بندوقیں تھیں۔ انہوں نے ہمیں رک جانے کے لئے کہا اور حصار میں لے لیا۔

ان کا جو سردار تھا اس نے کرخت لہجے میں پوچھا۔ "کون ہو تم......؟ کہاں سے آ رہے ہو......؟ کہاں جا رہے ہو......؟"

"ہم دونوں ہنکاؤ کے پجاری ہیں۔" ڈاکٹر نکولا نے جواب دیا۔ "ہم لاما کے سرائے سے آ رہے ہیں اور تفریح کرنے نکلے ہیں......قحبہ خانہ جا رہے ہیں تاکہ وہاں کچھ دن رنگ رلیاں منائیں......ویسے ہم کل ہی لاما سرائے پہنچے تھے۔"

"یہ راستہ قحبہ خانہ کی طرف نہیں بلکہ چوپو مندر کی طرف جاتا ہے۔" اس کا لہجہ اور کرخت ہو گیا۔ "تم جھوٹ بول رہے ہو کہ ہم قحبہ خانے کی طرف جا رہے ہیں......کیا تم نہیں جانتے اس طرف جانا منع ہے۔ وہاں جانا جرم ہے۔"

"ہم شاید راستہ بھٹک گئے یا پھر جس نے بھی قحبہ خانہ کا ٹھکانہ بتایا وہ غلط تھا۔" ڈاکٹر نکولا نے بھی قدرے تیز لہجے میں کہا۔ "پجاریوں کو مندر جانے سے روکنا گناہ ہے۔ پاپ ہے۔ وہاں جانا منع کیوں ہے؟ جرم کیوں ہے......؟"

"اس لئے کہ وہ مندر سام جادوگر کی ملکیت ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "یہ بات ہر کوئی جانتا ہے کہ وہاں کوئی بھی نہیں جا سکتا ہے۔ وہ غلطی سے آئے یا دانستہ......اس کی سزا موت ہے۔ ایسی ویسی موت نہیں بلکہ انتہائی دردناک......ایسی دردناک موت کہ کوئی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا......تمیں آدم خور خونخوار کتے ایسے مجرموں کو سزا دینے کے لئے پال رکھے ہیں۔ وہ تہہ خانے میں قید ہیں۔ مجرموں پر انہیں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ انہیں دو دو دن بھوکا رکھا جاتا ہے تاکہ وہ ایک مجرم کی اچھی طرح سے تکابوٹی کر سکیں۔ تم دونوں اب کسی قیمت پر اس سزا سے بچ نہیں سکتے......تم بڑے بدنصیب ہو۔"

"مندر......کسی کے باپ کی ملکیت نہیں ہوتا ہے۔" ڈاکٹر نکولا بگڑ گیا۔ "وہاں عبادت کی جاتی ہے۔ عورتوں کے ساتھ رنگ رلیاں نہیں منائی جاتی ہیں......کہیں ایسا تو نہیں کہ سام جادوگر نے اسے اپنا عشرت کدہ بنا رکھا ہو۔"

"یہ سوال تم اس مندر کے بڑے پجاری سے کرنا......" اس نے کہا۔ "سام جادوگر لاما سرائے میں موجود ہے۔ وہ یہاں ہوتا تو تمہاری اس بات کا جواب دیتا لیکن اس نے اس مندر کے بڑے پجاری کو اس وادی موت کا حاکم بنایا ہوا ہے۔ وہی مجرموں کو سزا سناتا ہے۔ ہر بات کا فیصلہ کرتا ہے۔ اس کے سامنے تم دونوں کو پیش کیا جائے گا۔"

"آخر اس مندر میں جانا اور اس وادی موت میں داخل ہونا جرم کیوں ہے؟" ڈاکٹر نکولا نے

پوچھا۔ ”تم بتا سکتے ہو؟“

”اس لئے کہ اس مندر میں دنیا کا سب سے قیمتی، نایاب اور نادر ہیرا رکھا ہوا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اس ہیرے کے حصول کے لئے اب تک بہت سارے لوگ مر چکے ہیں۔ انہیں کتوں کے آگے ڈال دیا گیا۔ کیا تمہیں ان باتوں کا علم نہیں تھا؟“

”نہیں......“ ڈاکٹر نکولا صاف جھوٹ بول گیا۔ ”دنیا میں ایسا کون بے وقوف ہوگا جو ان باتوں کو جانتے ہوئے اپنے پیروں پر کلہاڑی مارے...... ہم صرف سیر و تفریح کے لئے اس علاقے میں آئے ہیں۔ یہ بات ہمیں لاما سرائے کے سردار نے بھی نہیں بتائی۔“

”اب تم اس وادی موت کے حاکم اور مندر کے بڑے پجاری کے پاس چلو......“ وہ تحکمانہ لہجے میں بولا۔ ہمارے گھوڑوں کے آگے سردار اور ایک آدمی اور ہمارے پیچھے پیچھے دو سوار تھے۔ ہم خاموشی سے چل پڑے۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ ان کے حکم کی تعمیل کریں۔ چند قدم چلنے کے بعد ڈاکٹر نکولا نے بائیں جانب اشارہ کیا۔ مشرق کی سمت ایک مندر کی عمارت نظر آئی۔ یہ عمارت زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ نصف فرلانگ طے کرنے کے بعد ہم ایک حویلی کے سامنے آ کر رکے۔ اس کے صدر دروازے پر کوئی چار مسلح دربان پہرہ دے رہے تھے۔ انہوں نے دیوہیکل پھاٹک کھول دیا۔ ہم اندر داخل ہو گئے۔

گو کہ یہ حویلی بہت قدیم تھی لیکن فن تعمیر کا ایک اعلیٰ نمونہ تھی۔ ہمیں اس وقت بڑے پجاری کے سامنے پیش کرنے کے بجائے تہہ خانے میں لے جایا گیا جو زنداں بنایا ہوا تھا۔ یہ ایک بہت بڑی کوٹھری تھی۔ فرش پر گھاس پھونس تھی۔ اس کا فرش کچا اور ہموار نہیں تھا۔ لیکن سوکھی گھاس اتنی ساری تھی کہ اس میں قالین کا سا نرم پن تھا۔ بیٹھنے اور لیٹنے میں کچا فرش جسم میں چبھتا نہیں تھا۔

اس افتاد کے بارے میں سوچا نہیں تھا لیکن یہ غیر متوقع بھی نہیں تھا۔ قدم قدم پر خطرات موجود تھے۔ اس سزا کے تصور نے لرزہ براندام کر دیا تھا کہ اس وادی کا حاکم اور مندر کا پجاری ہمیں خوں خوار اور بھوکے کتوں کے آگے ڈال دے گا۔ پھر مایوسی کے گھپ اندھیرے میں امید کی کرن چمکی...... پدمنی اور اس لڑکی کا خیال آیا۔ یہ دونوں ہی ہمیں اس مصیبت سے نکال سکتے تھے لیکن اس کے باوجود میری حالت بڑی غیر تھی۔ اگر عین وقت پر پدمنی نہیں آئی تو پھر کیا ہوگا۔ اس کا خیال آتے ہی دل ڈوبنے لگا۔

ڈاکٹر نکولا پریشان ضرور تھا لیکن ہراساں دکھائی نہ دیتا تھا۔ وہ فرش پر دیوار کے سہارے بیٹھ کر کچھ سوچنے لگا تھا۔ مسلح پہرہ دار ہمیں زنداں میں ڈال کر آہنی پھاٹک اور زینے کا دروازہ بند کر گئے تھے۔ ہم دونوں اب آزادی سے آپس میں بات کر سکتے تھے۔ لیکن اس وقت ڈاکٹر نکولا بات کرنے کے بجائے شاید یہاں سے نکلنے کی کوئی تدبیر سوچ رہا تھا۔

”آپ کیا سوچ رہے ہیں ڈاکٹر نکولا!......؟“ میں نے گہرے سکوت کو توڑتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا یہاں سے فرار ہونے کی......؟“

”ظاہر ہے اس کے سوا سوچا بھی کیا جا سکتا ہے؟“ ڈاکٹر نکولا نے سر اوپر اٹھا کر ایک گہرا سانس لیا۔

”ہمیں کتوں کی خوراک تھوڑی بننا ہے۔“

”وہ مندر کا پجاری ہے جو اس علاقے کا حاکم بنا ہوا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”آپ بھی پجاری ہیں۔ کوئی معمولی پجاری نہیں...... ہنکاؤ کے ایک بڑے پجاری...... کیا ایک پجاری دوسرے پجاری کا خیال کرتے ہوئے معاف نہیں کر سکتا......؟“

”کیوں نہیں کر سکتا......؟“ ڈاکٹر نکولا نے گردن ہلائی۔ ”لیکن وہ کسی صورت میں معافی اور رعایت نہیں دے گا۔ کیوں کہ وادی موت سام جادوگر کی ملکیت ہے اس نے بڑے پجاری کو حاکم بنایا ہوا ہے۔ سام جادوگر نے اسے جو ہدایات دے رکھی ہیں وہ ان پر عمل کرنے کا پابند ہے۔ وہ ان کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ آپ اسے بے بس اور مجبور سمجھیں۔“

”کیا ہم اپنی زندگی سے مایوس ہو جائیں......؟“ میں نے بجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”لاما سرائے میں کسی مجرم کو سزا دی جاتی ہے تو اسے آدم خور انسانوں کے درمیان ڈال دیا جاتا ہے۔ یہاں خوں خوار کتے پال کر رکھے ہوئے ہیں۔ اور پھر آپ بھی مایوسی کی باتیں کر رہے ہیں۔ ایسا لگ رہا ہے کہ اب ہمارے دن گنے جا چکے ہیں۔“

”دوست!“ ڈاکٹر نکولا نے دلاسا دیا۔ ”میں نا امید نہیں ہوا ہوں۔ ہمیں آخری سانس تک زندہ رہنے اور یہاں سے فرار ہونے کی ہر ممکن کوشش کرنا چاہئے۔ میں کوشش کروں گا کہ کسی نہ کسی طرح پجاری کو رہائی پر راضی کر لوں۔ آپ ہراساں نہ ہوں۔“

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ زینے کا دروازہ ایک شور کے ساتھ کھلا، وہی چار مسلح پہرہ دار آئے جو ہمیں یہاں گرفتار کر کے لائے تھے۔ ان میں سے ایک نے آ کر جیب سے چابیاں نکال کر پھاٹک کا تالا کھولا۔ پھر وہ اندر آئے۔ ان کے سردار نے غراتے اور ہمیں حقارت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کرخت لہجے میں کہا۔

”چلو...... حاکم پجاری نے تم دونوں کو اپنے دربار میں طلب کیا ہے تاکہ تم دونوں کو سزا سنائی جا سکے۔“ چند لمحوں کے بعد میں اور ڈاکٹر نکولا ان کے ساتھ خاموش اور بغیر کسی مزاحمت کے چل دیئے۔ اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔ کر بھی کیا سکتے تھے۔ ہم نہتے تھے۔ میرے پاس جو پستول تھا وہ میں شنگھائی میں چھوڑ آیا۔ بھول آیا تھا۔ آج اب اس وقت اس کی اشد ضرورت تھی۔ وہ اگر ہوتا تو شاید گرفتاری کی نوبت نہ آتی۔ اس ایک پستول سے ان چاروں بدمعاشوں پر قابو پایا جا سکتا تھا۔ میں چشم زدن میں ان چاروں کو آسانی سے نشانہ بنا سکتا تھا۔ مجھے پستول چلانے میں بڑی مہارت تھی۔ میں نے ماہر اور بہترین نشانہ باز کی سند اور انعام بھی حاصل کیا ہوا تھا۔

حیرت کی بات تھی کہ ڈاکٹر نکولا نے کوئی اسلحہ اپنے ساتھ کیوں نہیں لیا جب کہ اسے اس بات کا علم تھا کہ راستے میں کیسی کیسی مشکلات اور صعوبتوں سے واسطہ پڑے گا۔ ایسی خطرناک مہم پر نکلنے کی صورت میں کوئی سا بھی ہتھیار ہوتا تو وہ بڑا کام دیتا۔ اس سے ایسی حماقت سرزد ہوگی میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

ہم اس حاکم پجاری کے دربار میں پہنچے۔ دربار کیا تھا۔ ایک بڑا سا ہال نما کمرا تھا۔ وہ ایک لمبی اور چوڑی سی کرسی پر رعونت سے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی عمر ساٹھ برس کی ہوگی۔ سر اور داڑھی کے تمام بال سفید ہو چکے تھے۔ لیکن وہ بڑا صحت مند اور توانا دکھائی دیتا تھا۔ اس کی کاٹھی بڑی مضبوط تھی۔ اس کے چہرے پر سارے جہاں کی خباثت تھی اور آنکھوں سے درندگی جھانک رہی تھی۔ وہ اپنی سؤر جیسی آنکھوں سے ہمیں گھورنے لگا۔

اس ہال کا بغلی دروازہ کھلا۔ اس کمرے میں دو مسلح پہرہ داروں کے ساتھ جو شخص اندر داخل ہوا اسے دیکھتے ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ ہمارے سامنے ہنکاؤ کا اصل پجاری تھا۔ وہ جس کو ہم نے دھوکا دیا تھا۔ وہ لاما سرائے پہنچا تھا۔ لیکن وہ ہمارے پیچھے پیچھے تعاقب میں یہاں تک آ گیا تھا جس کی توقع نہ تھی۔

وہ حاکم پجاری کو بتانے لگا۔ ”اس نے میرے اغوا کا منصوبہ بنایا۔ ایک حسین و جمیل چودہ برس کی لڑکی میرے کمرے میں پہنچادی گئی۔ پہلے تو اس نے مجھے اپنے شیشے میں اتارا۔ پھر جام میں بے ہوشی کی دوا ملادی تاکہ میں بے ہوش ہو جاؤں۔ میں بے ہوش ہو گیا۔ پھر مجھے ساحل پر لے جا کر جہاز میں قید کر دیا گیا۔ پھر میں ایک بندرگاہ پہنچنے پر وہاں سے کسی طرح فرار ہو گیا۔ پھر میں لاما سرائے پہنچا۔ وہاں رقص کی محفل سے فائدہ اٹھا کر یہ دونوں فرار ہوئے۔ پھر میں ان کے تعاقب میں یہاں پہنچا ہوں۔ ہنکاؤ کا میں اصل پجاری ہوں یہ وہ آدمی ہے جس نے میری شخصیت چرائی...... اسے سزائے موت دی جائے۔“

”وہ تو ہم نے ان دونوں کو سزائے موت دینے کا حکم جاری کر دیا ہے۔“ حاکم پجاری نے کہا۔ ”اس لئے بھی کہ یہ دونوں چینی نہیں ہیں۔ ان میں ایک انگریز ہے اور دوسرا ہندوستانی ہے۔ ان کے بارے میں ہمیں پتا چل گیا ہے۔“

پھر اس نے اصل پجاری سے کہا۔ ”انہیں سزائے موت دو دن بعد دی جائے گی۔“

”دو دن کے بعد کیوں؟ کس لئے؟“ ہنکاؤ کے پجاری نے کہا۔ ”ابھی کیوں نہیں...... آج کس لئے نہیں......؟ اس کام میں دیر کس لئے......؟ میں نے سنا ہے کہ آپ کے ہاں شیر کی جسامت کے کتے موجود ہیں۔ خوں خوار اور آدم خور...... میں یہ تماشا دیکھنا چاہتا ہوں کہ کتے کس طرح انسان کی تکہ بوٹی کرتے ہیں......؟ یہ منظر تو بڑا دلچسپ اور دل فریب ہوتا ہوگا۔“

”اس لئے کہ کتوں کو آج صبح ہی پیٹ بھر کے کھلا دیا گیا ہے۔“ حاکم پجاری نے جواب دیا۔ ”ہم کتوں کو انسان پر اس وقت چھوڑتے ہیں جب وہ دو دن کے بھوکے ہوتے ہیں۔“

”کیا کتے اس وقت انسان کو کھاتے ہیں جب وہ سخت بھوکے ہوتے ہیں؟“ پجاری نے پوچھا۔

”نہیں...... ایسی بات نہیں۔“ حاکم پجاری نے جواب دیا۔ ”اس وقت بھی وہ انہیں کھا جائیں گے......؟ لیکن دو دن کے بھوکے ہونے سے بات ہی اور ہوتی ہے۔ جب وہ بھوک کی حالت میں ٹوٹ پڑتے ہیں تب یہ تماشا دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ادھر ان کی چیر پھاڑ اور ادھر مجرموں کی چیخ و پکار...... آپ دو دن صبر کریں۔ ہمارے مہمان رہیں۔ ہم یہ تماشا ضرور دکھائیں گے۔“

”اگر ایسی بات ہے تو پھر میں دو دن انتظار کیے لیتا ہوں۔“ ہنکاؤ کے پجاری نے کہا۔ ”میرا دل یہ چاہتا ہے کہ میں کسی خنجر سے اس کے اور اس کے ساتھی کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں...... لیکن اس حرکت کو اب سینے میں دبانا ہوگا۔“

”آپ کو اپنے ہاتھوں سے ان کا خاتمہ کرنے میں وہ مزا نہیں آئے گا جو کتوں کے چیر پھاڑ کرنے سے......“ حاکم پجاری نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ”ایسا تماشا کبھی آپ نے دیکھا نہیں ہوگا اور نہ آئندہ دیکھیں گے۔“ پھر اس نے ان پہرہ داروں سے جو ہمیں لے کر آئے تھے اشارہ کیا کہ ہمیں لے جائیں۔

وہ ہمیں کمرے سے باہر لے آئے۔ پھر وہ زندان کی طرف لے چلے۔ پھر ایک دم سے پہرہ داروں کا سردار رک گیا۔ پھر وہ دوسرے زینے کی طرف لے چلا۔ اوپر والے زینے پر پہنچ کر اس نے اپنے ایک ساتھی کو اشارہ کیا کہ اس کا دروازہ کھول دیا جائے۔

”میں نے سوچا کہ کیوں نہ تم دونوں کو موت کے فرشتوں سے ملا دوں......“ اس نے کہا۔ ”تم دونوں خوش نصیب ہو کہ دو دن کی مہلت مل گئی...... آج صبح انہیں کھانا نہیں دیا گیا ہوتا تو پھر ابھی تم دونوں کو ان کا نوالہ بنا دیا گیا ہوتا۔“

چند لمحوں کے بعد ہم دونوں اپنی موت کے فرشتوں کو دیکھ رہے تھے۔ وہ ایک دو نہیں پورے دس عدد خوں خوار کتے تھے۔ جسامت ان کی شیر سے زیادہ ہی تھی کم نہیں تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ سب سلاخوں کے پاس آ کر غرانے اور لال لال آنکھوں سے گھورنے لگے اور سلاخوں کے درمیان سے ہاتھ نکالنے لگے تاکہ ہمیں پکڑ لیں۔ ان کا ایک بہت بڑا کمرا تھا جس میں انہیں بند کیا گیا تھا۔ اس کمرے میں لوہے کا بہت ہی بڑا پنجرہ تھا۔ اس کی تین تین انچ موٹی سلاخیں تھیں۔

میں نے اپنی زندگی میں ایسے خوں خوار، خوف ناک اور ایسی جسامت کے کتے نہیں دیکھے تھے۔ میری رگوں میں لہو منجمد ہونے لگا۔ میرے ہاتھ پیروں میں جان نہیں رہی۔ پیروں پر کھڑا ہونا دشوار ہو رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ میں غش کھا جاؤں گا۔ ایک دم سے میرا سر چکرایا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیل گیا۔ میں تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ پھر مجھے پتا نہیں چلا......

جب مجھے ہوش آیا تو میں قید خانہ کے فرش پر پڑا ہوا تھا۔ میرے پاس ڈاکٹر نکولا بیٹھا ہوا تھا جو مجھے ہوش میں لانے کی تدبیریں کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تشویش تھی۔ جب میں نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا تو اس کے چہرے پر دمک سی نمودار ہوئی۔

”کیسے ہو آپ......؟“ ڈاکٹر نکولا نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا تو میں آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ ”یہ آپ کو کیا ہو گیا تھا؟“

”اب میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ان کتوں کو دیکھ کر میں خوف و دہشت سے بے ہوش ہو گیا تھا۔ دل ڈوبنے لگا تھا۔“

”ہاں۔“ ڈاکٹر نکولا نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ایسے خون خوار، خوف ناک اور ایسی جسامت کے کتے

میں نے زندگی میں کبھی دیکھے اور نہ سنے کہ وہ کہیں پائے جاتے ہیں۔ افریقہ کے جنگلات میں بھی میں نے ایسے کتے نہیں دیکھے۔ حالاں کہ وہاں بہت بڑے بڑے کتے ہوتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ کتے کہاں سے اور کیوں لائے گئے ہیں؟ کسی آدمی کو موت کی نیند سلانا مقصود ہو تو ایسی بربریت اور درندگی کی کیا ضرورت ہے؟ آدمی کتنا بے رحم اور شقی القلب ہو گیا ہے۔ وہ درندہ بن گیا ہے۔ ایک آدمی کی دردناک موت سے وہ لطف لینا اور خوش ہونا چاہتا ہے۔ انسان کو بے رحمی اور سفاکی سے ختم کرنے کے اور بھی طریقے ہیں۔"

"میں تو اس تصور سے لرزہ براندام ہوں کہ جب ہمیں ان کے سامنے ڈالا جائے گا اور جب وہ بیک وقت ہم پر حملہ آور ہوں گے تو اس وقت ہماری کیا حالت ہو گی......؟" میں نے کہا۔ "کیا اس سے بہتر یہ نہیں ہو گا کہ ہم خودکشی کر لیں۔ یہ موت کیا زیادہ آسان نہیں ہو گی؟"

"آپ ابھی سے کیوں حوصلہ ہار رہے ہیں؟" ڈاکٹر نکولا نے اپنی جگہ سے اٹھ کر گلاس میں صراحی سے پانی لا کر پلایا۔

"حوصلہ ہارنے کی تو بات ہے۔" میں نے کہا۔ "اس لئے کہ بچنے اور فرار کی کوئی صورت نظر نہیں آتی ہے۔ ہم موت کی گود میں بیٹھے ہیں۔"

"ابھی دو دن باقی ہیں۔" ڈاکٹر نکولا نے گویا مجھے تسلی دی۔ "ہمیں تیسرے دن کتوں کی خوراک بنایا جائے گا۔ آپ کیوں گھبراتے ہیں؟"

"دو دن باقی ہوں یا ایک دن۔" میں نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ "اس سے کیا ہوتا ہے؟ آخر تیسرے دن مرنا ہی مرنا ہے۔"

"بہت کچھ ہو سکتا ہے۔" ڈاکٹر نکولا نے بے پرواہی سے جواب دیا۔ "ہم یہاں سے فرار ہونے کی تدبیر تو سوچ سکتے ہیں؟"

"فرار......؟" میں نے اسے منجمد نظروں سے دیکھا۔ "ہم یہاں سے فرار ہو جائیں یہ ناممکن ہے۔ ہم خواب میں بھی فرار نہیں ہو سکتے۔"

"میرے ذہن میں ایک تدبیر آ رہی ہے۔" ڈاکٹر نکولا نے قدرے دھیمے لہجے میں کہا۔ "ہم اس پر عمل کر کے فرار ہو سکتے ہیں۔"

"کیا تدبیر ہے وہ......؟" میں نے بے دلی سے پوچھا۔ کیوں کہ میں یہ جانتا تھا کہ یہاں سے فرار ہونا ممکن تھا۔

"رات کو ہمارے لئے کھانا لے کر صرف ایک پہرہ دار آئے گا۔" ڈاکٹر نکولا نے کہا۔ "ہم اسے قابو کر کے فرار ہو سکتے ہیں۔"

"آپ کو اس بات کا کیسے علم ہوا کہ صرف ایک پہرہ دار کھانا لے کر آئے گا......؟" میں نے پلکیں جھپکائیں۔

"جب پہرہ دار تمہیں یہاں اٹھا کر لا رہے تھے ان کے سردار نے ایک پہرہ دار سے کہا تھا کہ تم رات

کا کھانا پہنچاؤ گے۔" ڈاکٹر نکولا نے کہا۔ "میرے خیال میں تھوڑی ہی دیر میں وہ کھانا لے کر آتا ہی ہو گا۔ لہٰذا تم فوراً ہی سنبھل جاؤ۔ ہوشیار رہو تا کہ ہم اسے قابو کر لیں۔"

تھوڑی دیر بعد جب وہ پہرہ دار کھانا لے کر آیا تو ہم نے اسے قابو میں کر لیا۔ اس کا سر دیوار سے ٹکرا کر اسے بے ہوش کر دیا۔ پھر باہر نکلے۔ دائیں جانب ایک آہنی دروازہ تھا۔ ہم اسے کھول کر اس میں داخل ہو گئے۔ یہ ایک سرنگ تھی۔ زینے پر قید خانے کے باہر جو ایک مشعل روشن تھی اسے سرنگ میں لے کر داخل ہوئے۔ کوئی نصف فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد یہ سرنگ ختم ہوئی۔ وہاں ایک دروازہ تھا۔ اسے کھولا تو دیکھا کہ یہ مندر کا حصہ ہے۔ ہم جب وہاں سے نکل کر اس طرف بڑھے جہاں ایک اور دروازہ تھا۔ دروازہ کھولا تو ہم نے اپنے آپ کو ایک بڑے ہال میں پایا جہاں ایک مورتی تھی۔ اس کی پیشانی میں وہ ہیرا نصب تھا۔ جس کی تلاش میں ڈاکٹر نکولا اس مہم پر نکلا تھا۔ ڈاکٹر نکولا نے وہ ہیرا نکال لیا اور ہم عقبی حصے پر آئے۔ وہاں ایک اصطبل تھا۔ اس میں چھ سات گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ ہم نے دو گھوڑوں پر زین کسی اور وہاں سے نکل کر بندرگاہ پر پہنچے۔ وہاں ایک جہاز روانگی کے لئے تیار تھا۔ وہ شنگھائی ہی جا رہا تھا۔ ہم اس پر سوار ہو گئے۔ جب صبح ہوئی۔ دن نکلا تو ہم دونوں عرشے پر آئے۔ اس وقت عرشہ پر دو ایک ملاحوں کے علاوہ کوئی اور نہ تھا۔ عرشہ کے کونے میں جا کر ڈاکٹر نکولا نے جیب سے ہیرا نکالا۔ اس وقت ایک عقاب آیا نہ جانے کس سمت سے آیا تھا۔ وہ سفید براق تھا۔ ہمارے سروں پر منڈلانے لگا۔ ہم نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ اس لئے کہ ہم ہیرا دیکھنے میں ایسے محو تھے کہ دنیا و مافیہا کی خبر نہیں رہی تھی۔ وہ ہیرا بہت خوب صورت تھا۔ ڈاکٹر نکولا نے اس کی جو خوبیاں بتائی تھیں۔ وہ دنیا کے کسی ہیرے میں نہ تھیں۔ کیوں کہ یہ طلسماتی ہیرا تھا۔ پھر چشم زدن میں اس عقاب نے ڈاکٹر نکولا کے ہاتھ پر جھپٹا مارا۔ وہ ہیرا اس کے ہاتھ سے چھین کر فضا میں انتہائی سرعت سے پرواز کر گیا۔ ڈاکٹر نکولا چیختا چلاتا رہ گیا تھا۔ دوسرے لمحے ہم نے ایک عجیب اور ناقابل یقین منظر دیکھا۔ آپ شاید اسے مبالغہ کہیں لیکن یہ حقیقت ہے۔ وہ عقاب ایک پری میں تبدیل ہو گیا۔ پھر وہ پری مخالف سمت تیزی سے آسمان کی طرف پرواز کرتی ہوئی بادلوں میں گم ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ ڈاکٹر نکولا پہلے اسے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتا رہا تھا۔ پھر سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔

ہم تین دن کے کرب ناک سفر کے بعد شنگھائی پہنچے۔ ڈاکٹر نکولا صدمے سے بے حال ہو رہا تھا۔ ماہی بے آب کی طرح تڑپتا رہا تھا۔ شنگھائی پہنچنے کے بعد ہم دونوں نے اپنی اپنی راہ لی۔ تیسرے دن مجھے پتا چلا کہ ڈاکٹر نکولا یہ شہر چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ کچھ پتا نہ چل سکا کہ کہاں گیا ہے؟ میں نے بھی اس کی تلاش میں وقت ضائع نہیں کیا۔ قصہ مختصر یہ کہ میڈون سے میری شادی ہو گئی۔ اسے والد کے ترکے میں بے پناہ دولت ملی۔ پھر ہم دونوں نے ملک چین چھوڑ دیا۔ ایک اور ملک میں آ کر زرعی فارم خرید لئے۔ ہمارے دو بچے ہیں۔ ہم دونوں خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں۔ ڈاکٹر نکولا کے سائے سے بھی ہم دور ہیں۔ تمہاری یاد آئی تو میں نے تمام حالات لکھ دیئے ہیں۔ تم بہت یاد آتے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم سے ملنے بیوی بچوں سمیت ہندوستان آؤں۔ لیکن میڈون تیار نہیں ہوتی ہے۔

اچھا دوست..... الوداع...... زندگی رہی حالات نے اجازت دی تو کبھی ضرور ملوں گا۔

تمہارا اپنا دوست آنند پال

❄......❄......❄

میں نے یہ طویل ترین خط پڑھنے کے بعد اپنے کمرے میں رکھے ہوئے ٹی وی کے اسکرین پر ایک منتر پڑھ کر پھونکا۔ دوسرے لمحے اسکرین پر آنند پال، اس کی انگریز بیوی میڈون اور دونوں بچے نظر آنے لگے۔ یہ سری لنکا تھا۔ کولمبو کے مشرق میں سو کلومیٹر پر جانا جزیرہ تھا۔ آنند پال وہاں آ کر آباد ہو گیا تھا۔ اس وقت وہ اپنے گھر میں بیوی اور بچوں کے ساتھ بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ پھر میں نے منظر بدلا...... مجھے ڈاکٹر نکولا دکھائی دیا۔ وہ لندن کے ایک ہوٹل میں جس میں شراب خانہ تھا۔ ایک عورت کے ساتھ بیٹھا تھا۔ یہ عورت اس کی بیوی تھی۔ وہ اپنی بیوی کو اس ہیرے کی کہانی سنا رہا تھا۔

صبح ناشتے کی میز پر میں نے انوپ کمار کو اس کے دوست آنند پال کا خط واپس کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا دوست..... آنند پال سری لنکا کے شہر جانا میں اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ زندگی گزار رہا ہے۔ اتفاق سے میں سری لنکا سیاحت کی غرض سے گیا تھا تو جانا بھی گیا تھا۔ جانا میں اس کا سب سے بہترین اور بہت بڑا زرعی فارم ہے۔ میری اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے مجھے اس مہم اور ڈاکٹر نکولا کے بارے میں مختصراً بتایا تھا۔ آپ جانا جا کر اس سے مل سکتے ہیں۔“

مجھے جھوٹ بولنے کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔ یہ سچ تھا کہ آنند پال جانا جزیرے پر تھا جو مثل ایک شہر کے تھا۔ میں نے اسے یہ بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا کہ میں نے اپنے جادو کے زور سے آنند پال کے بارے میں معلوم کیا ہے۔ انوپ کمار یہ جان کر بہت ہی خوش ہوا تھا۔ اس نے میرا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور کہا کہ وہ کل ہی سری لنکا جا کر اپنے دوست سے ملاقات کر کے سرپرائز دے گا۔

❄......❄......❄

اب میں نے سوچا کہ کیا کروں۔ میں نے بڑی دیر تک سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا کہ اب یہاں سے کولکتہ جاؤں۔ وہاں کچھ دن گزار کے بنگلہ دیش...... پھر وہاں سے جہاں دل چاہے گا چلا جاؤں۔ یا پھر کراچی پہنچ کر اپنا گھر بسا لوں۔ کیوں کہ میں محسوس کر رہا تھا کہ عورت کے بغیر زندگی ادھوری ہے۔ عورت میری زندگی کے خلا کو پر کر سکتی ہے۔ عورت کے بغیر مرد زندگی نہیں گزار سکتا اور نہ گزارنا چاہئے زندگی کا اصل حسن اور ہم سفر عورت کی ذات ہی ہے۔

میں نے کولکتہ جانے کے لئے ٹھان لی تھی اس لئے میں کولکتہ آ گیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ڈیڑھ ماہ کا عرصہ پر لگا کر اڑ گیا تھا۔ میں اس دوران میں پندرہ دن کے لئے بنگلہ دیش بھی گیا۔ پندرہ دن میں نے ڈھاکا، چٹاگانگ، رنگامانی اور کاکس بازار میں گزارے۔ پھر کولکتہ واپس آ گیا۔ نہ جانے کیوں یہ شہر مجھے بہت پسند آیا تھا۔ میں نے ایک ماہ اس لئے بھی یہاں گزارا تھا کہ میں نے بہت سارے لوگوں کی مدد کی تھی۔ ان کی مصیبت میں کام آتا رہا تھا۔ خصوصاً مسلمانوں کی بہت مدد کی تھی۔ ان کی حالت زار پر بہت افسوس ہوتا تھا۔

پھر میں نے محسوس کیا کہ میرا دل بھرتا جا رہا ہے۔ اب دو ایک دن میں واپس چل دینا چاہئے۔

ایک بہت ہی پرانی فلم کا مارننگ شو دیکھ کر نکلا تو اس وقت دن کا ایک بج رہا تھا۔ اس وقت بڑے زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ کیوں کہ میں نے ناشتا نہیں کیا تھا۔ صرف ایک کپ چائے پی تھی۔ میں اب تک تین چار پرانی فلمیں دیکھ چکا تھا۔ کوئی نئی فلم نہیں دیکھی تھی۔ اس لئے کہ نئی فلموں میں عریانی، لچر اور بے ہودہ ڈانس اور فحاشی کے سوا کچھ نہیں ہوتا تھا۔ انڈین فلموں نے امریکی فلموں کو بھی شرما دیا تھا۔ لغو مناظروں کی بھرمار ہوتی تھی۔ میں نے دہلی میں صرف دو ایک نئی فلمیں دیکھی تھیں۔ پھر میں نے کوئی نئی فلم نہیں دیکھی۔ ایک پرانی فلم میں ہیروئن کا ایسا رقص تھا کہ میں ساری رات اس رقص کے بارے ہی میں سوچتا رہا تھا۔ اس وقت بھی وہ میری نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس فلم کو اس رقص کے باعث پھر دیکھنا چاہئے۔

میں چلتے چلتے یک لخت رک گیا تھا۔ کیوں کہ سڑک پر تیز رفتار ٹریفک رواں دواں تھا۔ سڑک پار کرتا تو کسی گاڑی کے نیچے آ جانا یقینی تھا...... سامنے والے فٹ پاتھ پر ایک تیسرے درجے کا ہوٹل تھا۔ اس ہوٹل کے باہر فٹ پاتھ پر ہر عمر کے فقیروں کی ایک بھیڑ تھی۔ ان میں نوجوان اور معمر بھکارنیں بھی تھیں۔ ان میں جو نوجوان لڑکیاں تھیں وہ حسین اور پرکشش بھی تھیں۔ اس شہر میں فقیروں اور بھکارنوں کی بہتات بھی تھی۔ وہ اپنے حسن، جوانی اور کشش سے مردوں سے نہ صرف بھیک لیتی تھیں بلکہ فائدہ بھی اٹھاتی تھیں۔ یہ بھی ان کی آمدنی کا ذریعہ تھا۔ اس ہوٹل کے باہر فقیروں کی بھیڑ اس لئے بھی تھی کہ کوئی نہ کوئی شخص ہوٹل والے کو رقم دے جاتا تھا کہ انہیں ایک وقت کا کھانا کھلا دیا جائے۔ یہ ہوٹل مسلمان کا تھا۔

اس وقت ایک ادھیڑ عمر کی عورت جو سفید براق ساڑھی اور سفید بلاؤز میں ملبوس تھی اس نے تمام فقیروں کو ایک قطار میں بٹھایا ہوا تھا اور ہر ایک کو دس روپے کا نوٹ خیرات میں دے رہی تھی۔ اس عورت میں اس قدر دل کشی اور جاذبیت تھی کہ میں اس کی طرف دیکھنے اور دل میں اسے داد دینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ میری نظریں میلی نہیں پرستائش تھیں۔ اس کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی اور بردباری چھائی ہوئی تھی۔ اس میں تمکنت اور وقار سا بھی تھا۔ وہ سفید ساڑھی اور سفید بلاؤز میں تھی جس نے اس کی شخصیت کو مزید باوقار بنا دیا تھا۔ وہ اپنے چہرے مہرے اور وضع قطع سے امیر کبیر عورت دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی صراحی دار گردن میں سفید موتیوں کی مالا جگمگا رہی تھی۔

اگلے لمحے مجھے ایسا لگا کہ جیمز بانڈ کی کسی فلم کا کوئی سنسنی خیز منظر میری نظروں کے سامنے آ گیا ہے۔ ہوا یہ تھا کہ بھکاریوں کا ایک چھوٹا سا ٹولہ جو ایک سمت سے نمودار ہوا تھا اس نے اس عورت کو اپنے نرغے میں لے لیا۔ پھر یہ ہوا کہ نہ جانے کس سمت سے دو آدمی نمودار ہوئے۔ ان کی وضع قطع فقیروں جیسی نہ تھی۔ وہ چہرے مہرے سے بدمعاش دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں جو کھلے ہوئے چاقو تھے وہ بڑے خوف ناک تھے اور ان کی دھاریں بڑی تیز اور چمک دار تھیں۔ ایک عام آدمی ان چاقوؤں کو دیکھ کر اوسان کھو بیٹھتا۔ فقیروں میں سے جس نے بھی یہ چاقو دیکھا وہ خائف اور سراسیمہ ہو گیا تھا۔

ان بدمعاشوں نے بھکاریوں کی نظروں کے سامنے چاقو لہرا کے انہیں ایک طرف ہٹایا۔ میں ان کی نظروں اور چہروں سے بھانپ گیا تھا کہ وہ اس عورت کو نشانہ بنانا چاہتے ہیں۔ وہ اس عورت کے ہاتھ سے شاید پرس، گلے میں پڑی موتیوں کی مالا اور ہاتھ میں بندھی ہیرے والی دستی گھڑی جو بے حد قیمتی تھی چاقو کے زور پر چھین کر لے جانا چاہتے ہیں۔ رہزنی کی ایسی دلیرانہ اور خوف ناک وارداتیں دن دیہاڑے گنجان علاقوں میں بھی عام تھیں۔ یہ بدمعاش پیشہ ور ہوتے تھے اس لئے پولیس سے ڈرتے نہیں تھے۔

اس لمحے میری آنکھوں کے سامنے دھند سی چھا گئی اور دماغ چکرا سا گیا تھا۔ اب دھند چھٹی تو میں نے محسوس کیا کہ وہ رہزن نہیں ہیں بلکہ اس عورت کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔ بے رحمی اور سفاکی سے...... اگر ان کا مقصد رہزنی ہوتا تو وہ اب تک اس عورت کے ہاتھ سے پرس چھین چکے ہوتے۔ اس کے گلے سے مالا اور ہاتھ سے گھڑی اتار کر جا چکے ہوتے۔ وہ اس عورت کو نرغے میں لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ چوں کہ بھکاری ان کی راہ میں حائل تھے۔ دیوار بنے ہوئے تھے اس لئے انہیں دشواری اور رکاوٹ ہو رہی تھی۔

عورت کی نظر جیسے ہی ان بدمعاشوں اور کھلے ہوئے چاقوؤں پر پڑی تو وہ بھونچکی سی ہو گئی۔ پھر اس کے اوسان خطا ہونے لگے۔ اس کا چہرہ متغیر سا ہوا اور پھر سفید پڑتا چلا گیا۔ پھر وہ اس طرح سے سکتے کی سی حالت میں آ گئی جیسے اس پر کوئی بجلی سی آ گری ہو۔ پھر وہ بے حس و حرکت کھڑی دہشت بھری نظروں سے ان بدمعاشوں کو دیکھنے لگی۔ پھر وہ یک لخت بڑی زور سے چونکی اور سراسیمگی سے تیزی سے دو قدم پیچھے ہٹی اور پھر اس نے آس پاس اپنی مدد کے لئے دیکھا۔ ان دونوں بدمعاشوں کے ہاتھوں میں چمکتے ہوئے چاقو اور ان کی تیز اور چمکتی دھار دیکھ کر کسی کی ہمت نہ ہو سکی۔ ہر شخص اپنی جگہ دم بہ خود ہو کر یہ دیکھ رہا تھا کہ یہ بدمعاش اس عورت کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ یہ کوئی فلمی منظر نہیں بلکہ حقیقی منظر تھا جو اس طرح سے دیکھ رہے تھے۔ جیسے یہ کوئی فلمی منظر ہو۔

دن دیہاڑے اس سڑک پر جو یہ خونی واردات کرنے والے تھے ایسی دیدہ دلیری انہی کے بس کی بات تھی۔ کیوں کہ سڑک پر بڑی چہل پہل تھی اور پھر کسی بھی لمحے پولیس کی موبائل بھی گزر سکتی تھی۔ یوں بھی میں کولکتہ کے بدمعاشوں، پیشہ ور غنڈوں اور قاتلوں سے کوئی واقفیت نہیں رکھتا تھا۔ یہاں کی زیر زمین دنیا سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔ حالاں کہ یہ شہر اب میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔

میں کسی کے پھڈے میں پیر پھنسا کر کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن دوسری طرف میں یہ بھی نہیں دیکھ سکتا تھا کہ ایک بے بس اور معصوم عورت ان دونوں بدمعاشوں کے چاقوؤں کا نشانہ بن جائے اور پھر میں ان بدمعاشوں پر بڑی آسانی سے قابو پا سکتا تھا۔ لیکن ابھی میں اپنے جادو سے کام لینا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے بغیر بھی میں ان سے نمٹ سکتا تھا۔ اس لئے نہیں کہ میرے پاس بہت سارے منتر جنتر تھے۔ لیکن اس کا وقت اور ضرورت نہیں تھی۔ میں ان سے ہر موقع پر کام بھی نہیں لیتا تھا۔ میں نے فوراً ہی جیمز بانڈ کی طرح سڑک پار کی اور اپنی جان کی میں نے پروا نہیں کی۔ وہ عورت پوری طرح ان بدمعاشوں کے حصار میں آ چکی تھی۔ صرف ایک لمحہ کی دیر تھی کہ فرشتہ اجل اسے اپنا نشانہ بنانے کے لئے بڑھ رہا تھا۔

ایک بدمعاش میری آمد سے بے خبر تھا۔ شاید وہ اس علاقے کا کوئی خطرناک بدمعاش تھا۔ اسے اس بات کی توقع تھی کہ کوئی مائی کا لعل ایسا نہیں ہے جو اس کے مقابلے میں آنے کی جرأت کر سکے۔ میں نے اس کی پشت پر پہنچ کر فضا میں سرکس کے فنکار کی طرح اچھل کر اس کی کمر پر ایک لات رسید کر دی۔ اس ناگہانی اور اچانک حملے سے وہ اپنا توازن قائم نہیں رکھ سکا۔ کسی تناور درخت کی طرح زمین بوس ہو گیا۔ اس کے منہ سے ایک دل خراش کراہ نکلی۔ وہ سنبھل کر اٹھ نہ پایا تھا کہ قریب کھڑے ہوئے بھکاری انعام کے لالچ میں اس بدمعاش پر ٹوٹ پڑے۔ جانے کس نے دوسرے بدمعاش کی کھوپڑی پر پتھر دے مارا تھا۔ اس بدمعاش کے سر پر پتھر لگتے ہی اس کے ہاتھ سے چاقو چھوٹ کر زمین پر گر پڑا تھا۔ اس کا ماتھا جیسے گھوم گیا۔ اس نے دو تین قلابازیاں کھائیں۔ پھر وہ کٹی پتنگ کی طرح زمین پر گر پڑا۔ قریب کھڑے اور چلتے راہ گیر جو ایک طرف رک کر تماشا دیکھ رہے تھے۔ وہ اس بدمعاش پر بری طرح پل پڑے تھے۔

اس عورت پر اس قدر خوف و دہشت طاری تھی کہ اس کی حالت ایک مردے سے بھی بدتر ہو رہی تھی۔ اس کی خوب صورت اور بڑی بڑی آنکھوں میں موت کی پرچھائیاں صاف نمایاں تھیں۔ اس کے حواس معطل تھے۔ وہ اپنی دانست میں یہی سمجھی تھی کہ میں نے تنہا ہی ان دونوں بدمعاشوں کو زیر کیا ہے۔ تب ہی وہ لڑکھڑاتی ہوئی میرے پاس آئی اس کی سانس سینے میں اس طرح سے پھول رہی تھی جیسے وہ بہت دور سے بھاگتی ہوئی آئی ہو اور کوئی عفریت جیسے اس کے تعاقب میں ہو۔ وہ اپنی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ جب اس نے اپنے حواس اور سانسوں پر کسی حد تک قابو پا لیا تو اس نے ان بدمعاشوں کی طرف دیکھا جن کی درگت بنائی جا رہی تھی۔

"کیا تم مجھ پر ایک اور احسان کر سکتے ہو......؟" اس نے کانپتی ہوئی آواز میں مجھ سے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ میں اس کی یہ بات کچھ سمجھا نہیں۔ میں اس کے جملے کی تہ میں پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ مجھے ممنونیت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"مسٹر!" اس نے چند لمحوں تک میرے جواب کا انتظار کیا تھا۔ پھر مجھے خاموش پا کر اس نے کہا۔ "میں یہ چاہتی ہوں کہ تم مجھے میرے گھر تک پہنچا دو۔ میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گی...... اس وقت میں اپنی جان خطرے میں محسوس کر رہی ہوں۔"

اس واقعے کی اس پر ایسی دہشت طاری تھی کہ اس کے اعصاب ابھی تک پرسکون نہیں ہوئے تھے۔ وہ اس قدر خائف تھی کہ اس کے نازک بدن کی تھرتھراہٹ رک نہیں پا رہی تھی۔ وہ لرزہ براندام تھی اور قابو پانے کی جدوجہد اس نے ترک نہیں کی تھی۔

ہم دونوں کے گرد ایک بھیڑ سی لگتی جا رہی تھی، کتنی ہی نگاہیں سوالیہ نشان بن کر ہماری جانب اٹھی ہوئی تھیں۔ کسی نے بلند آواز میں پوچھا بھی تھا۔ آخر یہ سب کیا ہے......؟ یہ کیا ہوا ہے......؟ یہ بدمعاش کون ہیں......؟ یہ اس عورت کو قتل کیوں کرنا چاہتے تھے......؟ عورت شاید نہیں چاہتی تھی کہ وہ ان کی نگاہوں کا سامنا کرے اور سوالوں کے جواب دے۔

اس ہجوم میں دفعتاً کسی نے نعرہ بلند کیا۔ "ارے کوئی پولیس کو بلا کر ان بدمعاشوں کو ان کے حوالے کردو۔"

یہ سنتے ہی عورت کی سراسیمگی مزید بڑھ گئی۔ وہ شاید نہیں چاہتی تھی کہ پولیس تک بات پہنچے۔ کیوں کہ وہ کسی بڑے گھرانے کی عزت دار عورت تھی۔ عزت دار لوگ پولیس اور اخبار میں خبروں کی سرخیاں بننے سے دور بھاگتے تھے۔ یہ بدنامی اور رسوائی کا باعث بن جاتا تھا۔ میں خود بھی نہیں چاہتا تھا کہ پولیس والوں سے الجھا جائے اور مجھے بہادری کا انعام لینا نہیں تھا۔ اس لئے میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ "چلئے......"

اس عورت نے بغلی گلی کی سمت تیزی سے بڑھتے ہوئے کہا۔ "میں نے اس گلی میں اپنی گاڑی پارک کی ہوئی ہے۔" میں فوراً ہی اس عورت کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ میں نے تیزی سے چلتے ہوئے یک بارگی پلٹ کر دیکھا تھا۔ راہ گیروں اور بھکاریوں کو شاید بڑے عرصے کے بعد اپنی طاقت آزمانے کا موقع ملا تھا۔ وہ جوتوں، لاتوں اور گھونسوں سے ان دونوں بدمعاشوں کی خوب خاطر تواضع کر رہے تھے۔ ہر گزرتا ہوا شخص ماجرا دریافت کرتا اور ان بدمعاشوں کو دیکھ کر اپنا فرض ادا کرنے لگ جاتا۔ جیسے یہ ایک کار خیر ہو اور کوئی بھی ثواب سے محروم ہونا نہیں چاہتا ہو۔ معلوم نہیں پھر ایسا سنہرا موقع ملے یا نہ ملے۔

ایک ملباری کے ہوٹل کے فٹ پاتھ کے پاس ایک نئے ماڈل کی گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ جو کسی نئی نویلی دلہن کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ اس گاڑی کے پاس پہنچتے ہی عورت نے فوراً ہی اپنے پرس سے گاڑی کی چابیاں نکالیں۔ پھر اس نے اسٹیئرنگ پر بیٹھ کر اپنے پہلو کا دروازہ کھول دیا۔ مجھے اس شرف کی توقع نہیں تھی۔ کیوں کہ یہ دولت مند عورت تھی۔ اس نے مجھے عام سا شخص سمجھا ہوا تھا۔ اس لئے اس نے مجھے تم سے مخاطب بھی کیا تھا۔ میں نے اس بات کا کوئی خیال نہیں کیا تھا۔ کیوں کہ یہ عورت عمر میں مجھ سے بڑی تھی۔ اس کے لہجے میں اپنائیت بھی تھی۔ میں بغیر کسی تامل کے بیٹھ گیا۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کرنے میں پل بھر کی تاخیر نہیں کی۔ اس نے بجلی کی سی تیزی دکھائی تھی۔

وہ گاڑی کو بڑی تیزی سے اس طرح اڑا کے لے جا رہی تھی جیسے گاڑی چوری کر کے لے جا رہی ہو۔ حالاں کہ اس رفتار کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ ہم اس سڑک اور علاقے سے بہت دور نکل آئے تھے اور اب ان بدمعاشوں کے تعاقب کا دور دور تک کوئی خطرہ نہیں رہا تھا۔ کیوں کہ راہ گیروں نے اپنے ہاتھوں اور لاتوں سے ان کا جو حشر کیا تھا اس کے پیش نظر وہ اس قابل ہی نہیں رہے تھے کہ اپنی جگہ سے ہل بھی سکیں۔ انہیں ادھ موا کر دیا تھا۔ وہ ایک دو مہینے تک بستر سے اٹھنے کے قابل بھی نہیں رہے تھے۔ ان کا یہ حشر نشر اس عورت نے بھی دیکھا تھا لیکن اس عورت پر ابھی تک بوکھلاہٹ سوار تھی اور چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا اور آنکھوں سے خوف جھانک رہا تھا۔ اس پر کچھ ایسی سراسیمگی طاری تھی کہ اس کے خوب صورت سڈول ہاتھ اسٹیئرنگ پر کانپ رہے تھے۔ ایک مرتبہ تو سنگین حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ آخر مجھے اسے ٹوکنا پڑا۔ کیوں کہ اس کے سوا چارہ بھی نہیں رہا تھا۔

"بیگم صاحبہ! گاڑی ذرا احتیاط سے چلائیں۔ ایک مرتبہ تو ہم بچ گئے لیکن دوسری مرتبہ ہم گھر کے بجائے اسپتال پہنچ جائیں گے۔" میں جب بھی اس عورت کو ٹوکتا اس کی اضطراری کیفیت اور گاڑی کی

رفتار میں قدرے کمی تو آجاتی تھی لیکن اگلے لمحے اس پر پھر سے وہی کیفیت طاری ہو جاتی۔ میں سمجھ نہیں سکا کہ وہ اس قدر خوف زدہ اور سہمی ہوئی سی کیوں تھی۔ آخر ایسا کون سا ڈر اس کے دل میں جاگزیں ہو گیا تھا جو وہ اب تک اس پر قابو نہیں پا سکی تھی۔ میں نے اسے متوحش دیکھ کر خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ تاہم میں نے اتنا اندازہ ضرور لگا لیا تھا کہ ان دونوں بدمعاشوں نے اس عورت کے کسی دشمن کے اشارے پر قتل کا منصوبہ بنایا تھا جو میری بروقت مداخلت کے باعث ادھورا رہ گیا تھا۔ مجھے اس وقت جادو سے کام لینے کی ضرورت بھی نہیں پڑی تھی۔ بغیر جادو کے ہی کام چل گیا تھا۔

اس عورت کی ظاہری وضع قطع اور اس کی گاڑی بتا رہی تھی کہ وہ ڈیفنس جیسے علاقے میں بودوباش رکھتی ہے۔ اس علاقے کے کسی بھی مکین کو ایک ہی نظر میں دیکھ کر آسانی سے پہچانا جا سکتا تھا۔ دولت مندوں کی مخلوق کسی نہ کسی طور نمایاں ہو ہی جاتی تھی۔ ان کی دنیا ہی اور ہوتی ہے۔ ان کی سوچ، لباس اور رہن سہن بھی عام لوگوں سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔ اپنے علاوہ وہ دوسری دنیا یعنی غریب اور متمول اور متوسط طبقے کو کم تر اور حقیر سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ دیکھا جائے تو وہ ان کے محتاج ہوتے ہیں ایک طرح سے...... اگر یہ کم تر لوگ ان کے کام نہیں کریں گے تو پھر یہ کیا کریں گے۔ ان کی ساری دولت، آرام اور سکون دھرا رہ جائے گا۔

کچھ دیر بعد گاڑی ڈیفنس کے علاقے میں داخل ہو گئی۔ یہ علاقہ پہلے صرف فوجیوں کے لئے مخصوص تھا لیکن اب سول لوگ بھی رہ رہے تھے۔ اس نے دو ایک گلیوں سے گزرنے کے بعد اپنی گاڑی ایک وسیع و عریض کوٹھی کے سامنے روکی اور ہارن بجایا تو چوکی دار نے گیٹ کھولا۔ پھر گاڑی کوٹھی کے وسیع احاطے میں داخل ہو کر برساتی میں رکی تو ایک گورکھا ملازم دوڑتا ہوا آیا اور عورت کی جانب کا دروازہ کھول کر ایک جانب مؤدبانہ انداز سے کھڑا ہو گیا۔

کوٹھی کے اندر گاڑی داخل ہوتے ہی عورت کے اعصاب کسی قدر پرسکون دکھائی دینے لگے تھے۔ اس نے گاڑی روکتے ہی اپنا سر کسی نڈھال مریض کی طرح اسٹیئرنگ پر ٹکا دیا پھر چند لمحے بعد اسٹیئرنگ پر سے اپنا سر اٹھایا تو اس کے چہرے پر سے طمانیت جھلک رہی تھی۔ لیکن اس کی بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں میں اب بھی اضطراب سا جھانک رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرانے کی کوشش کی۔

"مسٹر...... اب تم نیچے اتر آؤ......" نرم لہجے کے پیچھے تحکمانہ انداز بھی تھا جیسے وہ کہیں کی رانی ہو۔

میں گاڑی سے نیچے اتر کے اس عورت کے پاس پہنچ گیا۔ عورت اس ملازم سے پوچھ رہی تھی۔ "رانی کہاں ہے؟"

"مس صاحبہ...... اندر موجود ہیں جی۔" اس نے مؤدب ہو کر جواب دیا۔ "وہ بڑی دیر سے آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔"

"اچھا اب آپ مجھے اجازت دیں۔" میں نے کہا۔ "میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔ آپ خیریت سے گھر پہنچ گئی ہیں۔"

عورت میری بات سن کر بڑے زور سے چونکی۔ اس کی بڑی بڑی خوب صورت آنکھیں حیرت سے

پھیل گئیں۔ اس کے حسین چہرے پر وہی سنجیدگی اور وقار سا چھا گیا جو اس کی فطرت کا خاصا تھا۔ اس نے اپنی لانبی لانبی پلکیں جھکائیں۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے بیٹے!" یکایک اس کے لہجے میں تبدیلی آ گئی۔ وہ شائستگی اور بڑے مہذب انداز سے بولی۔ "تم نے اپنی جان پر کھیل کر میری زندگی بچائی۔ آج مجھے تمہارے طفیل نئی زندگی ملی ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اپنے محسن کو صرف شکریے پر اکتفا کرتے ہوئے جانے دوں، کیا مجھ سے بھی بڑا کوئی خود غرض ہو سکتا ہے۔" اس عورت کے نرم و نازک اور شفیق لہجے نے میرے سینے میں ایک ایسا انمٹ جذبہ بھر دیا کہ میں کسی طور پر اپنے اس جذبے کا اظہار کرنے کے لئے موزوں الفاظ تلاش نہیں کر پایا۔ میں نے بغیر کسی غرض کے اس عورت کی مدد کی تھی۔ مجھے جیسے اس کا صلہ مل گیا تھا۔ اس نے مجھے بیٹا کہہ کر جیسے آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیا تھا۔ اس نے صرف شکریے کے طور پر تو ایسا نہیں کہا تھا۔ اس میں خلوص بھی تھا۔

وہ گورکھا ملازم حیرت بھری نظروں سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اس کی مالکن نے مجھے نا صرف بیٹا کہا ہے بلکہ یہ بھی کہا ہے کہ میں نے اس کی جان اپنی جان پر کھیل کر بچائی ہے۔ آخر اس کی مالکن کو ایسا کیا واقعہ پیش آیا جس میں جان کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ اور پھر میں اجنبی بھی تھا اور وہ مجھے پہلی بار اپنی مالکن کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ وہ الجھ سا گیا تھا۔

عورت نے اپنے ملازم کی طرف دیکھتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "رنجیت! تم انہیں نشست گاہ میں لے جا کر بٹھاؤ۔ انہیں ٹھنڈا پلاؤ۔"

پھر وہ اتنا کہہ کر میری طرف متوجہ ہوئی اور بولی۔ "تم نشست گاہ میں میرا انتظار کرو...... میں کچھ دیر میں آتی ہوں۔"

وہ بائیں جانب کے زینے سے بالائی منزل پر چلی گئی۔ میں رنجیت کی رہنمائی میں ملاقاتی کمرے میں آیا۔ اس کمرے میں پہنچ کر ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر اس شان دار کمرے کی زیبائش کا جائزہ لینے لگا۔ یہ کمرا خصوصی طور پر آراستہ کیا ہوا تھا۔ اس میں ایک حسن سا پیدا ہو گیا تھا۔

رنجیت نے مجھ سے بڑے مؤدبانہ لہجے میں پوچھا۔ "سرکار! ٹھنڈے میں لسی یا کولڈ ڈرنک...... گرم میں چائے یا کافی لینا پسند کریں گے۔"

میں اس ملازم کے انداز تخاطب پر چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ میں اپنے دل میں اس زمانہ شناس ملازم کو داد دیئے بغیر نہیں رہ سکا۔ چند لمحوں پیشتر اس عورت نے میرے احسان کا ذکر کر کے مجھے بیٹا بنا لیا تھا جس نے اس ملازم کو حیرت زدہ اور متاثر کر دیا تھا۔ مجھے اس وقت سخت پیاس لگی تھی۔ لسی، شربت یا کولڈ ڈرنک پیاس کی حالت میں اچھی لگتی تھی۔ لیکن جو بات پانی میں تھی اس میں کہاں آ سکتی تھی۔

میں نے خوش دلی سے کہا۔ "سخت پیاس لگی ہے۔ ایک گلاس پانی کے بجائے دو گلاس ٹھنڈا پانی لیتے آنا...... پانی کے علاوہ کسی چیز کی ضرورت نہیں۔" وہ چند لمحوں کے بعد واپس آیا تو ٹرے میں نہ صرف ایک گلاس ٹھنڈا پانی تھا بلکہ سکنجبین سے بھرا گلاس بھی تھا۔ میں نے پانی والا گلاس اٹھا کر منہ سے لگایا اور ایک ہی

سانس میں پی گیا۔ یہ پانی نہیں تھا بلکہ امرت پانی تھا جس نے ساری پیاس یک لخت مٹا دی۔

"آپ یہ سکنجبین بھی پی لیں۔" اس نے سکنجبین والا گلاس ٹرے سے اٹھا کر میری طرف بڑھایا۔ "یہ گرمی کو مارتا ہے۔ دور کرتا ہے۔ پی لیں۔" اس نے اصرار کیا۔

میں نے اس ملازم کے اصرار کرنے پر سکنجبین کا گلاس پی لیا۔ دوسرے لمحے بڑی فرحت اور تازگی سارے بدن میں بجلی کی رو کی طرح اتر گئی۔ بڑا سکون سا ملا۔

میں نشست گاہ میں تن تنہا بیٹھا ہوا تھا۔ تپائی پر ایک رسالہ رکھا ہوا تھا۔ میں نے اسے اٹھا لیا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ یہ انگریزی فلمی رسالہ تھا۔ اس میں چھپی ہوئی رنگین تصویریں نہ صرف بنگال اور ہندوستانی بلکہ ہالی ووڈ کی ہیروئن کی بھی تھیں۔ جس میں ان بے حجابی کی تصویریں شائع کی گئی تھیں۔ میں ان کے سحر میں کھو گیا۔ میں کوئی زاہد اور برف کا تودہ نہیں تھا جو آنکھیں بند کر لیتا۔ ان سے محظوظ ہو رہا تھا۔

جب ہی معاً مجھے چمپا کا خیال آیا۔ وہ میرے ذہن کے پردے پر اچانک ابھر آئی تھی۔ میں نے چمپا سے کوئی فرمائش کی تھی۔ اس نے میری فرمائش پوری کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس شہر میں آج میرا آخری دن تھا۔ اگلے دن پو پھٹنے سے پہلے مجھے یہ شہر چھوڑ دینا تھا۔ میں نے کل رات ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ آج کا سارا دن خریداری میں گزاروں گا۔ کیوں کہ رات کا ایک ایک لمحہ اس سے باتیں کرنے اور اس سے گیت اور گانے سننے میں گزارا تھا۔ وہ گاتی بہت اچھا تھی۔ اس کی آواز میں بڑا سوز و ساز تھا۔ جو اس کی دکھ بھری زندگی نے اس کے گلے میں جنم دے دیا تھا۔ وہ ایک اچھی گلوکارہ بن سکتی تھی شاید اس نے کوشش بھی کی تھی۔ لیکن وہ گلوکارہ کیا بنتی...... بستروں کی زینت سبز باغ دکھا کر اور فریب دے کر بنائی جاتی رہی تھی۔

میں نے صبح اس کے ہاں سے نکلتے وقت اس کے ہاں رات کا کھانا کھانے کا وعدہ کیا ہوا تھا۔ وہ مچھلی کا سالن بڑا لذیذ اور ذائقہ دار بناتی تھی۔

میں جس روز کولکتہ آیا تھا اس روز سے چمپا کا ایک مخلص اور ہمدرد دوست تھا۔ وہ میری اسیری تھی۔ میں اس روز شام کے وقت کولکتہ کے قدیم بازار حسن میں محض یہ دیکھنے کے لئے آیا تھا کہ اس میں کیسی لڑکیاں اور عورتیں ہوتی ہیں۔ ان کی عمریں کیا ہیں۔ ان کا کہاں کہاں سے تعلق ہے۔ صرف ایک تجسس اور اشتیاق لایا تھا۔ مقصد جسم کی طلب اور عورت کے ساتھ وقت گزارنے کی خواہش کی رمق بھی دل کے کسی کونے میں نہیں تھی۔ جب میں اس کی کوٹھری کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ تب وہ دہلیز پر کھڑی ہوئی تھی۔ جانے اس میں ایسی کیا کشش اور جادو تھا کہ میں بے اختیار اس سے متاثر ہو گیا اور اس کی طرف کھنچ گیا تھا۔

میں چمپا کی طرف بڑھا تو لمحے کے لئے اس کا چہرہ دمک اٹھا اور میرا ہاتھ پکڑ کے کوٹھری میں لے گئی۔ دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دی۔ کمرے میں بیس وولٹ کا بلب تھا اسے بجھا دیا۔ ٹیوب لائٹ کا سوئچ آن کر کے ٹیبل فین بھی آن کر دیا۔

"تمہارا نام کیا ہے......؟" میں نے اسے ٹیوب لائٹ کی تیز روشنی میں ناقدانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میرا نام......'' اس کے لہجے میں دکھ بھر گیا۔ ''عورت کے کئی نام ہوتے ہیں، ماں، بہن، بیوی اور طوائف......''

''یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''تمہارا وہ نام کیا ہے جو لوگ اور جاننے والے پکارتے ہیں۔''

''چمپا......'' اس نے بتایا۔ ''لیکن نام میں کیا رکھا ہے۔''

''میں نے نام اس لئے پوچھا کہ تم بہت حسین ہو، سندر ہو۔'' میں نے کہا۔ ''تمہاری سادگی میں جو سندرتا ہے وہ میرے من کو بھائی ہے۔''

''اچھا......'' وہ ہنسی۔ اس کی ہنسی میں بڑا دکھ بھرا تھا۔ ویران اور کھوکھلی ہنسی تھی۔

''یہ تو بتاؤ کہ تم وقت گزاری کے لئے کیا پیسے لیتی ہو؟''

''سنو...... میں تمہیں دوسو روپے دوں گا۔''

وہ ایک دم سے خوش ہوگئی۔ ''آپ دوسو روپے دیں گے؟ معلوم نہیں کیوں مجھے یقین نہیں آرہا ہے؟''

''یہ لو پیشگی......'' میں نے جیب سے سوسو کے دو نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔ ''اب یقین آیا؟''

وہ سوسو کے دو نوٹ لے کر بہت خوش ہوگئی۔ ''آپ بڑے دیالو ہیں۔ بھگوان آپ کو سدا سکھی رکھے۔''

''لیکن میری ایک شرط ہے؟''

''شرط......؟'' اس نے اپنی خوب صورت منجمد آنکھوں سے مجھے دیکھا اور پلکیں جھپکائیں۔ اس کے چہرے پر استعجاب چھا گیا۔ ''کیا شرط ہے؟''

''شرط تو خیر نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ میں نے جو دوسو روپے دیئے وہ تمہارے جسم کی قیمت نہیں ہے نہ مجھے جسم کی طلب ہے۔''

''پھر یہ دوسو روپے کس بات کے ہیں۔'' اس کے چہرے پر استعجاب اور گہرا ہوگیا۔ وہ میری آنکھوں میں جھانکنے لگی۔

''میں ساری رات تم سے باتیں کروں گا...... صرف باتیں...... تم باتیں بھی کرو گی اور گانا بھی سناؤ گی...... کیا تمہیں گانا آتا ہے؟''

''آپ نے صرف باتیں کرنے اور گانا سننے کے لئے دوسو روپے دیئے ہیں۔'' وہ ششدر سی ہو کر کہنے لگی۔ ''آج تک میری زندگی میں آپ جیسا مرد نہیں آیا جس نے جسم کی نہیں صرف بات کرنے اور گانا سننے کی خواہش کی ہو۔ آپ پہلے مرد ہیں۔ ورنہ ہر مرد جو آتا ہے وہ ایک بھیڑیئے سے کم نہیں ہوتا ہے۔ وہ باتوں کا نہیں صرف جسم کا بھوکا ہوتا ہے...... ہاں مجھے گانا آتا ہے۔ میں فلموں میں گانے کے لئے گھر سے بھاگ کر آئی تھی۔ میں فلمی لٹیروں کے ہتھے چڑھ کر لٹتی رہی۔ پھر یہاں آگئی۔''

''تمہاری زندگی بڑی دکھ بھری اور افسوسناک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم کسی بات کی چنتا نہ کرو۔ اچھا وقت ضرور آئے گا۔'' اس نے بستر کے نیچے سے میرے دیئے دوسو روپے میں سے ایک نوٹ نکالا اور

دوسرا نوٹ بستر کے نیچے رکھ دیا اور بولی۔

''میں نے صبح سے کچھ کھایا پیا نہیں ہے۔ پیسے نہیں تھے کیوں کہ دھندا نہیں ہوا تھا۔ میں بازار سے کھانا لے آؤں۔ بڑے زور کی بھوک لگی ہے...... بھوک سے برا حال ہو رہا ہے۔ کھانا کھالوں۔ پھر بات بھی کروں گی اور گانا بھی سناؤں گی۔''

پھر میں نے خود ہی اس کے لئے ہوٹل سے کھانا لا کر دیا۔ پھر میں نے وہ رات اس کے ہاں گزاری تھی۔ اس سے دنیا جہاں کی باتیں کیں۔ گانا بھی سنا۔ اس کی آواز بہت اچھی تھی۔ وہ ایک اچھی گلوکارہ بن سکتی تھی۔ پھر میری اس کے ہاں آمد و رفت رہی تھی۔ اس پر تین ماہ کا کرایہ اور بجلی کا بل چڑھا ہوا تھا۔ پرچون کی دکان کا ادھار اور دودھ والے کے جو پیسے تھے وہ سب میں نے ادا کر دیئے۔ اسے دو ہزار روپے بھی دیئے تاکہ وہ جسم فروشی نہ کرے۔ میں نے اس کے ہاں جب رات گزاری اسے ہاتھ لگایا اور نہ ہی کبھی میرے دل میں کوئی میل آیا۔

وہ بھی بہت ہی اچھے گھرانے کی لڑکی رہی تھی۔ اونچی اڑان اور رنگین سپنوں نے اسے سوناگاچھی پہنچا دیا تھا۔ چمپا پہلے ہی دن سے میرے ساتھ ایک اچھی عورت کی طرح پیش آتی رہی تھی۔ میری زندگی میں وہ پہلی عورت تھی جس نے مجھے ایک عجب سے گداز سے آشنا کیا تھا۔ مجھے بہت سی لڑکیوں اور عورتوں سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا لیکن مجھے ان میں سے کسی نے اس کی طرح متاثر نہیں کیا تھا۔ اس ملاقات کے بعد اکثر میں اس کے پاس جاتا رہا وہ اکثر میرے پیروں پر اپنا سر رکھ دیتی تھی اور کہتی تھی۔

''سکندر! تم میرے دیوتا ہو...... میرے من مندر میں بس گئے ہو۔ میں تمہاری داسی ہوں۔ مجھ سے ناراض نہ ہوا کرو۔''

میں اس سے کہتا۔ ''چمپا! تم مجھ سے محبت نہیں کرنے لگنا۔ اس لئے کہ میں ایک سیاح ہوں۔ مسافر ہوں۔ پردیسی ہوں۔''

میں نے بہت سوچ بچار کے بعد اس کی مدد کے لئے ایک راہ نکالی تھی۔ میں اس کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور لے جاتا۔ میں نے اس کے لئے دس بارہ نئے جوڑے خریدے۔ سینڈلیں لا کر دیں۔ بستر اور چادریں اور کچھ برتن بھی لا دیئے۔ اس ایک مہینے میں اس کا حسن نکھر گیا۔ چہرے پر شادابی اور سرخی آگئی اور جسم میں بھی بڑی دلکشی اور جاذبیت پیدا ہوگئی تھی۔ میں نے راشن بھی بھر دیا تھا۔ اس نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ اب دروازہ صرف میری دستک پر کھلتا تھا۔

آج صبح میں اس کے گھر ہلسا مچھلی، دس کلو چاول اور کچھ سودا سلف د یا تھا۔ اس لئے آج مجھے اس کے ہاں ہر قیمت پر پہنچنا تھا۔

میں رسالہ اپنی گود میں رکھ کر چمپا کے تصور میں کھویا اس کی کسی بات پر مسکرانے لگا۔ میری محویت کا یہ عالم تھا کہ مجھے احساس ہی نہیں ہو سکا کہ کون میرے سامنے آ کر کھڑا ہوگیا ہے اور میری اس کیفیت سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ مجھے ایک بھینی بھینی خوشبو کی مہک نے کسی کی موجودگی کا احساس دلایا۔ بڑی پیاری

سی خوشبو تھی۔ میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

میرے سامنے وہی عورت کسی مہارانی کے انداز میں تمکنت سے کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے جاذبیت سے بھرے چہرے پر تازگی تھی اور اس کے بھرے بھرے سرخ گداز ہونٹوں پر تبسم کی فیاضی تھی جو گوشوں تک اتری ہوئی تھی۔ وہ بڑے نفیس اور شستہ لہجے میں بولی۔

"تم دھوپ اور تھکن سے چور ہو گئے ہونا......؟ تمہیں بھوک بھی لگ رہی ہوگی۔ چلو۔ میرے ساتھ آؤ۔"

پھر وہ مجھے اپنی رہنمائی میں لے کر اس کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے کی طرف بڑھی۔ یہ کھانے کا کمرہ تھا جس میں ایک لمبی میز تھی جس کے گرد بارہ کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کھانے کی میز پر کھانا لگا ہوا تھا۔ کھانے کی میز پر اس عورت کے علاوہ ایک نوجوان لڑکی رانی بھی موجود تھی۔ وہ سترہ اٹھارہ برس کی ایک پرکشش لڑکی تھی۔ اس کے بال گردن تک کٹے ہوئے تھے۔ چہرے کے خدوخال بڑے تیکھے سے تھے۔ چہرے پر بڑی تازگی اور شادابی تھی۔

رانی کی ماں کا نام نجم النساء تھا۔ میں نجم النساء کا محسن تھا۔ وہ اپنی ایک رشتے دار بہن سلطانہ جہاں کے ہاں ٹھہری ہوئی تھیں۔ سلطانہ جہاں اور اس کی تیرہ سالہ بیٹی بلبل بھی کھانے کی میز پر موجود تھی۔

نجم النساء نے میری دیدہ دلیری اور بہادری کا ذکر اس انداز اور ایسے الفاظ سے کیا تھا کہ میں ان سب کی نگاہ کا مرکز بن گیا۔ وہ سب مجھے پرستائش نظروں اور داد بھرے انداز سے دیکھ رہی تھیں۔ میں ان کے نزدیک ایک قابل رشک ہستی بن گیا تھا۔ سبھی نے دل کھول کر میری بہادری اور اس کارنامے کو سراہا تھا جس کی مجھے ایسی توقع نہ تھی۔

رانی جب کھنکتی اور رسیلی آواز میں مجھ سے ہم کلام ہوتی تو میں آسمان کی بلندیوں پر پرواز کرنے لگتا۔ بلبل نے بھی بہت تعریف کی تھی۔ سلطانہ جہاں بھی خاموش نہیں رہی تھیں۔ جب میں نے اپنا نام سکندر بتایا تو رانی نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"آپ کے ماں باپ نے جو نام تجویز کیا ہے۔ وہ بالکل صحیح ہے۔ آپ صرف نام ہی کے نہیں بلکہ کام کے بھی سکندر ہیں۔ ورنہ اس زمانے میں کون ایسا بے غرض، مخلص ہے جو تن تنہا اور جان کی پروا کئے بغیر مسلح بدمعاشوں سے بھڑ جائے۔"

یہ تعریف اور توصیف اور باتیں میرے دل میں ایک سحر انگیز گداز پیدا کر رہی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ میں عمدہ اور خوش ذائقہ کھانوں سے لطف اندوز بھی ہو رہا تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی اتنے لذیذ اور اتنے اقسام کے کھانے نہیں کھائے تھے۔ بھوک کھل اٹھی تھی اور پھر رانی بھی بڑے اصرار سے کھلا رہی تھی۔

ایک گھر جیسا ماحول بن گیا تھا۔ کھانے کی میز پر جو رسمی طور پر تعارف ہوا تھا اس میں اتفاقی طور پر ایک بات مشترک نکلی کہ وہ ڈھاکا شہر سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہاں کچھ دنوں کے لئے آئی تھیں اور کل واپس جا رہی ہیں۔ ویزے پر وہ اپنی بہن سے ملنے کولکتہ آئی ہوئی تھیں۔ کھانے سے فراغت پانے کے بعد میں نے رخصت چاہی تو مجھے اجازت نہیں مل سکی۔ نجم النساء مجھے دوسرے کمرے میں کسی اہم گفتگو کے بہانے

لے آئی۔ اس کمرے میں ہم دونوں کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ رانی بھی نیچے رہ گئی تھی۔ میں سمجھ نہیں سکا کہ آخر ایسی کون سی بات ہے۔ جس کے لئے وہ مجھے اپنے کمرے میں لے آئی تھیں۔ آخر اس قدر احتیاط اور راز داری برتنے کی کیا ضرورت تھی۔

انہوں نے اپنی منجمد آنکھیں میرے چہرے پر مرکوز کر کے سرگوشی کے انداز میں بڑی آہستگی سے کہا تو وہ بڑی پراسرار سی لگیں۔

"مجھے تم اپنے بارے میں صاف صاف بتاؤ کہ تم کون ہو اور کیا کرتے ہو؟ تمہاری مصروفیت وغیرہ کیا ہے۔"

اس لمحے میں ان کے سوالات کا جواب دینے سے گریز کرنے لگا۔ میں انہیں یہ بتانا نہیں چاہتا تھا کہ میں ایک سیاح ہوں اور جادوگر بھی ہوں۔ اب تک میں نے اپنے جادو سے کوئی کام نہیں لیا تھا۔ ہر کس و ناکس کو بتایا بھی نہیں تھا۔ نہ بتانا چاہتا تھا۔ اگر میں بتا دیتا تو ان کی نظروں میں میری عزت دو کوڑی کی ہو کر رہ جاتی۔ پھر وہ یہ سمجھتی کہ میں نے جادو کے زور پر ان بدمعاشوں پر قابو پایا تھا اور پھر جادوگروں کو اچھی نظروں سے دیکھا بھی نہیں جاتا ہے۔ وہ مجھے متذبذب دیکھ کر بولیں۔

"سکندر بیٹے! تم جو کوئی بھی ہو میرے لئے ایک عظیم انسان ہو۔ میں مرتے دم تک تمہیں اپنا محسن کہتی رہوں گی..... تم بغیر کسی جھجک اور تکلیف کے اپنے بارے میں سچ سچ بتاؤ۔ میں سچ بولنے والوں کی بڑی عزت کرتی ہوں۔ انہیں بہادر مانتی ہوں۔"

بیس دن قبل میری ڈھاکا کے ایک شخص رستم سے دوستی ہوئی تھی۔ وہ شخص کولکتہ سے بنگلہ دیش، بنگلہ دیش سے کولکتہ، غیر قانونی طور پر لوگوں کو لاتا لے جاتا تھا۔ یہ اس کا کاروبار تھا۔ میں دو ایک مرتبہ اس کے ساتھ جا آ چکا تھا اور میں تمام رستوں اور ان لوگوں سے بھی واقف ہو چکا تھا جن سے واسطہ پڑتا تھا میں بھی لا لے جا سکتا تھا۔ چوں کہ جواب دینے اور کچھ اور بتانے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ میں نے انہیں یہ تو نہیں بتایا تھا کہ میں جادوگر ہوں۔ البتہ میں نے انہیں تفصیلی طور پر بتایا کہ...... میں بنگلہ دیش اور ہندوستان کی سرحد پر غیر قانونی طور پر لوگوں کو لاتا لے جاتا ہوں۔ یہی میری آمدنی کا ذریعہ ہے۔ میں نے اس کام کو نیا نیا شروع کیا ہے۔ مردوں کے علاوہ لڑکیوں اور عورتوں کو بھی لاتا لے جاتا ہوں۔

اپنے بارے میں بتا کر میں ان کا چہرہ دیکھنے لگا کہ ان کا کیا ردعمل ہوتا ہے۔ میں اپنے دل میں نادم اور پریشان ہوا کہ میں نے انہیں اپنے بارے میں سچ سچ کیوں نہیں بتا دیا۔ اب پچھتانے سے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ کیوں کہ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ آج کا دور تو جھوٹ، ریاکاری اور منافقت کا ہے۔ سچائی کی کوئی عزت اور قدر نہیں۔ لیکن یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ان کے چہرے پر ناگواری اور حقارت کے بجائے یک لخت روشنی ابھر آئی۔ ان کی خوب صورت آنکھیں کسی ان جانے خیال سے چمک اٹھیں۔ وہ اس طرح خوش دکھائی دے رہی تھیں جیسے انہیں کوئی دولت مل گئی ہو۔ وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بشاشت سے کہنے لگیں۔ "قدرت نے مجھے بن مانگے بیٹا دے دیا۔ کیا تم مجھے بیٹا بن کر دکھاؤ گے......؟"

’’کیوں نہیں۔‘‘ میں ان کی اس عزت افزائی پر اپنی ذات کو بھول بیٹھا تھا۔ ’’میں آپ کے لئے اپنی جان تک نچھاور کر سکتا ہوں۔‘‘

’’خدا تمہاری زندگی سلامت رکھے۔‘‘ وہ دعائیہ انداز میں بڑی اپنائیت اور خلوص سے بولیں۔ ’’میں تم سے ایک بہت ہی اہم کام لینا چاہتی ہوں۔ اگر چہ وہ کام تمہارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتا لیکن اس کام میں خطرات بھی پیش آسکتے ہیں۔‘‘

’’لیکن میں خطرات سے ڈرنے اور گھبرانے والا نہیں ہوں۔‘‘ میں نے مضبوط لہجے میں انہیں یقین دلایا۔ ’’آپ فکر نہ کریں۔‘‘

’’مجھے تم پر بھروسا ہے۔ تم ہی یہ کام انجام دے سکتے ہو۔ دوسرا کوئی یہ کام نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس پر میں بھروسا کر سکتی ہوں۔‘‘

’’کام کیا ہے.....؟‘‘ میں نے انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ میں نے اس وقت جادو کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔

نجم النساء بیگم نے سرگوشی میں بہت ہی آہستگی سے کہا جیسے کوئی سن نہ لے۔ ’’میں رانی کو غیر قانونی طور پر سرحد پار کر کے ڈھاکا بھیجنا چاہتی ہوں۔‘‘

میں نے حیرت بھری نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ ’’کیا رانی ویزے پر یہاں نہیں آئی ہوئی ہیں؟‘‘

’’وہ ویزے پر ہی میرے ساتھ آئی ہوئی ہے۔ لیکن میں کسی وجہ سے اسے تمہارے ساتھ بھیجنا چاہتی ہوں۔‘‘ وہ پریشان سی نظر آنے لگیں۔ ’’مجھے تمہارے جیسے بہادر اور بھروسے کے آدمی کی ضرورت تھی۔ جانے کیوں مجھے اس بات کا یقین آ گیا ہے کہ مجھے تم سے بہتر آدمی نہیں مل سکتا۔ قدرت نے ایک اتفاقی حادثے کی صورت میں تم سے ملا دیا اور میری بہت بڑی مشکل حل ہو گئی.....لیکن میں ایک شرط پر تمہارے ساتھ رانی کو بھیجوں گی۔‘‘

’’کیا شرط ہے آپ کی.....؟‘‘ میں نے تعجب بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔ مجھے ان کی بات کچھ عجیب سی لگی۔

’’وہ یہ کہ تم اپنے ساتھ صرف رانی کو لے کر جاؤ گے۔‘‘ وہ بولیں۔ ’’کوئی اور تمہارے ساتھ نہیں جائے گا۔‘‘

’’آپ آخر ایک سیدھا اور آسان راستہ اختیار کرنے کے بجائے اس قدر کٹھن اور مشکل راہ کیوں اپنا رہی ہیں۔‘‘ میں نے نجم النساء بیگم کو سمجھانا چاہا۔ ’’آج کل ہندوستان اور بنگلہ دیش کے درمیان بڑی کشیدگی ہے۔ روز دو ایک چھوٹی موٹی سرحد پر جھڑپیں ہو جاتی ہیں۔ بالفرض محال ہم دونوں سرحد عبور کرتے ہوئے پکڑے گئے تو میرے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے سنا ہے کہ اکثر لوگ دھر لئے جاتے ہیں۔ لیکن رانی کا کیا بنے گا۔ کیا وہ جیل کی ذلت اور سختیاں سہ لے گی؟‘‘

’’مجھے سب کچھ معلوم ہے اور میں اپنا اچھا برا خوب سمجھتی ہوں۔‘‘ نجم النساء بیگم جز بز ہو کر بولیں۔

’’میں نے جو کہا ہے اس پر عمل کرنا تمہارا کام ہے۔ تمہیں ہر وقت اسے قانون کی نظروں کی گرفت میں آنے سے بچانا ہوگا۔‘‘

’’لیکن.....؟‘‘ میں نے متذبذب ہو کر ان کے چہرے کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ میں اصل بات زبان پر کیسے لاؤں وہ میری دلی کیفیت بھانپ کر پوچھنے لگیں۔ ’’کیا روپے پیسے کا کوئی مسئلہ ہے؟‘‘

’’جی ہاں.....‘‘ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ’’میں کل بیس آدمیوں کا گروپ لے کر جیسور جا رہا تھا۔ میں نے ان سے پیشگی رقم وصول کر لی تھی اور اس میں سے نصف خرچ کر چکا ہوں۔ اب میں ان لوگوں سے کیا بہانہ کروں میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ ایک تو انہیں نہ لے جانا وعدہ خلافی ہوگی اور پھر رقم کی ادائیگی بھی ایک مسئلہ ہے۔‘‘

رستم کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اس کے بیس آدمیوں کو ہندوستان اور بنگلہ دیش کی سرحد پار کروا کر انہیں جیسور شہر پہنچا دوں۔ اس نے مجھے رقم بھی دی ہوئی تھی کہ سرحدوں پر خرچ کرنا پڑے تو خرچ کر دینا۔ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ مخصوص لوگوں سے معاملہ طے تھا۔ انہیں دینا ضروری بھی تھا۔ میں اس میں سے کچھ رقم خرچ کر چکا تھا۔ یوں تو میرے پاس رقم کی کوئی کمی نہیں تھی لیکن میں ان سے رقم وصول کرنا چاہتا تھا تا کہ راستے میں ان کی بیٹی پر خرچ کر سکوں۔ میں اپنے جادو کے زور سے پل بھر میں ان کو ڈھاکا پہنچا سکتا تھا لیکن ایسا دانستہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کیوں کہ میں نے مہم جو طبیعت پائی تھی اس لئے رستم کے ساتھ دو ایک مرتبہ آ چکا تھا اور اب تنہا رانی کو لے کر جانے پر تیار ہوا تھا۔

’’اس میں اس قدر پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔‘‘ انہوں نے مجھے دلاسا دیا۔ ’’تمہارا مسئلہ میں حل کئے دیتی ہوں۔‘‘

پھر وہ یکا یک اپنی جگہ سے اٹھ کر الماری کے پاس گئیں اور اسے کھولا۔ جب وہ میرے پاس آئیں تو نوٹوں کی ایک نئی گڈی ان کے ہاتھ میں تھی۔ وہ گڈی میری طرف بڑھا کر سرسراتی ہوئی آواز میں بولیں۔

’’کیا ان دس ہزار روپوں سے کام چل سکتا ہے؟ میرے خیال میں یہ رقم کافی ہوگی۔ اگر اور ضرورت ہے تو میں مزید دے سکتی ہوں۔ رانی کے خیریت سے ڈھاکا پہنچنے پر تمہیں بیس ہزار روپے بطور انعام دوں گی۔‘‘

میں نے دس ہزار روپے کی گڈی کو حیرت سے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ یقین نہیں آیا تھا کہ وہ اتنی بڑی رقم دیں گی۔ پھر میں نے تنبیہ بھرے لہجے میں کہا۔ ’’آپ نے اتنی جلدی مجھ پر کیسے بھروسہ کر لیا؟ میں یہ رقم لے کر بھاگ بھی تو سکتا ہوں۔‘‘

’’میں جانتی ہوں کہ تم ایسا ہرگز نہ کرو گے؟‘‘ نجم النساء نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ’’تم ایک معتبر آدمی ہو۔‘‘

’’کسی اجنبی شخص پر بھروسا کرنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’کل آپ نقصان اٹھا سکتی ہیں۔‘‘

’’بہادر آدمی بے ایمان، جھوٹا اور دھوکے باز نہیں ہوتا ہے۔‘‘ نجم النساء بیگم نے ایک سرد آہ بھری۔

”تم سچ کہتے ہو میں نے اپنی اس کمزوری سے ہمیشہ نقصان اٹھایا ہے اور آج اس کی سزا بھگت رہی ہوں۔ رانی آج اس کمزوری کی ایک لڑی بن گئی ہے۔ کوئی بات نہیں...... اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ میں ناامید اور مایوس نہیں ہوئی ہوں۔“

”میں رانی کو لے کر یہاں سے کب روانہ ہو جاؤں؟“ میں نے پوچھا۔ ”کیا دو تین دن اور انتظار کرنا ہو۔“

”کل ہی......“ نجم النساء بیگم مضطرب لہجے میں بولی۔ ”رانی کے لئے یہاں دو ایک دن بھی رکنا موت کو دعوت دینا ہے۔ تم کل ہی دن کے اجالے سے پہلے رانی کو اپنے ہم راہ لے کر نکل جانا۔ یہاں میری زندگی کو بھی خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ اگر میں یہاں دو ایک دن بھی رکی رہی تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“ انہوں نے آخری جملہ بے دھیانی سے ادا کیا تھا۔

”وہ کون لوگ ہیں جو آپ کی جان کے دشمن ہیں؟“ میں نے غیر ارادی طور پر پوچھا۔ ”کیا آپ بتانا پسند کریں گی......؟“

وہ ایک دم سے بڑے زور سے چونکیں اور اپنی پلکیں جھپکاتے ہوئے سر جھکا لیا۔ وہ مجھے مزید بتانے سے احتراز کر رہی تھیں۔

پھر وہ موضوع بدلتے ہوئے بولیں۔ ”تم آج کی رات یہیں گزار لو۔ ابھی رات میں کافی دیر ہے۔ رانی اور بلبل تمہیں کمپنی دیں گی۔“

مجھے ایک نہیں بہت سارے کام نمٹانے تھے۔ ایک تو رستم سے مل کر اس کی دی ہوئی رقم لوٹانی تھی اور اس سے یہ بھی کہنا تھا کہ وہ ان لوگوں کو کسی اور کے ہاتھ بھیج دے۔ یہ کام اور بھی لوگ کرتے تھے۔ میں کسی قیمت پر چمپا کی دعوت ٹھکرانا نہیں چاہتا تھا۔ یہ آخری اور الوداعی ملاقات تھی۔ اور آج میں اسے ایک بڑی رقم دے کر اس گندگی کے غلاظت سے نکالنا چاہتا تھا اور پھر جادو کے زور سے اس کی آواز ایسی مدھ بھری بنانا چاہتا تھا کہ اسے فلم انڈسٹری اور ٹی وی پر چانس مل جائے اور وہ راتوں رات ایک بڑی اداکارہ اور گلوکارہ بھی بن جائے۔ وہ میری بہت اچھی دوست اور ساتھی رہی تھی۔ اس نے مجھے جو رفاقت دی تھی میں اسے اس لئے کبھی نہیں بھول سکتا تھا کہ اس میں پاکیزگی تھی۔ کبھی دل میں میل نہیں آیا تھا اور نہ چاہا کہ اسے اوڑھ بستر کو میلا کروں۔ اس بات نے چمپا کے دل میں میری جگہ بنا دی تھی۔ وہ مجھے دیوتا سمجھنے لگی تھی۔ میں نے اسے کہا تھا کہ انسان کبھی دیوتا نہیں بن سکتا۔ البتہ وہ بہت اچھا ضرور بن جاتا ہے۔

میں نے نجم النساء بیگم کو بتایا کہ مجھے چند بے حد اہم کام ہیں جو میں آج ہی انجام دینا چاہتا ہوں۔ لہٰذا آپ مجھے اجازت دیں تاکہ میں اسے نمٹا لوں۔ چوں کہ کل صبح روانہ ہونا ہے اس لئے دیر لگ جائے گی۔ میں صبح ٹھیک چار بجے یہاں پہنچ جاؤں گا۔

”نہیں......“ وہ بے چین اور مشکوک سی ہو گئیں۔ ”تم ایک بجے تک سارے کام ختم کر کے آ جاؤ۔ میں اور رانی جاگتی رہیں گی۔ یوں بھی ہم دونوں دو بجے تک جاگتی رہتی اور ٹی وی دیکھتی رہتی ہیں اور آج رات یوں بھی ہمیں نیند کہاں آئے گی؟“

میں نے تھوڑی دیر تک سوچنے کے بعد سر ہلا دیا۔ ان سے اجازت لے کر کمرے سے نکلا تو وہ مجھے رخصت کرنے برساتی تک آئیں۔

میں ٹیکسی میں بیٹھ کر بار بار اپنی پھولی ہوئی جیب کی طرف دیکھتا۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا۔ رستم اور دوسرے لوگ جو مسافروں کو غیر قانونی طور پر سرحد پار کرا دیتے تھے وہ فی کس ایک طرف کے دو سو یا تین سو روپے لیتے تھے۔ جبکہ نجم النساء بیگم نے دس ہزار کی رقم دی تھی۔ یہ کام میرے لئے بہت معمولی سا تھا۔ بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ لیکن میں رانی کو اس طرف اور ان راستوں ہی سے لے جانا چاہتا تھا جہاں سے رستم لے جاتا تھا۔ میں رستم کے ساتھ جانے آنے سے ان راستوں اور ان لوگوں سے خوب واقف ہو چکا تھا جن سے سابقہ پڑتا تھا اور وہ لوگ مجھ سے...... میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ نازو نعم میں پلی لڑکی یہ کٹھن راستہ کیسے طے کرتی ہے۔

میں رستم کے پاس پہنچا تو اس کا ایک اور دوست بھی موجود تھا جو اس کی طرح لوگوں کو لاتا لے جاتا تھا۔ میں نے ایک معقول بہانہ بنا کر اس کی رقم واپس کر دی۔ رستم نے اپنے اس دوست کو اپنے آدمی لے جانے کے لئے دے دیئے اور اس سے کمیشن کی رقم بھی لے لی۔ میرے سر سے ایک بوجھ اتر گیا۔ میں نے بازار جا کر کچھ خریداری کی جو چمپا کے لئے تھی۔

جب میں چمپا کی کوٹھری پر پہنچا تو اس پر تالا لگا ہوا تھا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ چمپا گھر پر تالا لگا کر گئی ہو۔ وہ بازار یا کسی کام سے باہر جاتی تو صرف کنڈی لگا کر چلی جاتی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ اب اس کے پاس رکھا ہی کیا ہے جو ڈاکو اور چور لے جائے۔ وہ ہر طرح سے لٹی ہوئی عورت ہے۔ میں نے برابر کی کوٹھری کے دروازے پر دستک دی۔ اس میں لاجونتی رہتی تھی۔ وہ مجھے جانتی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی۔

”بابو جی...... اچھا ہوا آپ آ گئے۔ بڑا غضب ہو گیا۔ پولیس چمپا کو پکڑ کر لے گئی ہے۔“

”کیوں......؟“ میں حیرت سے اچھل پڑا۔ مجھے اپنی سماعت پر اعتبار نہیں آیا۔ اس نے کیا قصور کیا ہو گا جو پولیس لے گئی تھی۔

”سہ پہر کے وقت ایک بندہ آیا تھا اور وہ اسے ہر قیمت پر ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔“ لاجونتی کے چہرے پر وحشت سی چھا گئی۔ وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بتانے لگی۔ ”چمپا کے انکار پر اس کے دماغ میں گرمی چڑھ گئی۔ وہ شخص نشے میں دھت تھا۔ جب اس شخص نے زبردستی کی اور اسے کھینچ کر لے جانا چاہا تو دونوں میں ہاتھا پائی کی نوبت آ گئی۔ اس نے آپ کو اور چمپا کو گالیاں بکیں۔ چمپا نے شاید اس سے کہا تھا کہ آج میرے ہاں مہمان آنے والا ہے۔ میں نے اب کچھ دنوں کے لئے یہ دھندا بند کر دیا ہے۔ میں کسی کے ساتھ نہیں جا سکتی۔“ وہ سانس لینے کے لیے رکی اور اس نے اپنی بات جاری رکھی تو اس کی آواز گلے میں رندھ گئی۔ ”چمپا گالیاں سن کر برداشت نہ کر سکی۔ پھر اس نے اندر سے چھری لا کر نفرت اور غصے سے اس کی توند میں بھونک دی۔“

ایک نئی چمپا نے میری نظروں کے سامنے جنم لیا...... ”ایں......“ میں بھونچکا سا رہ گیا۔ مجھ پر چند لمحوں تک سکتے کی سی کیفیت طاری رہی۔ چمپا نے اس شخص کو اس لئے چھری ماری تھی کہ اس نے مجھے

گالیاں دی تھیں۔ وہ بہ ظاہر جتنی اچھی اور باطن میں کتنی ہی بری عورت کیوں نہ سہی۔ اس نے مجھ سے محبت کی تھی اور میری محبت میں ڈوب گئی تھی۔ وہ اپنی محبت کو اس قدر صاف وشفاف سمجھتی تھی کہ اس نے اس پر بال تک آنے نہیں دیا تھا۔ وہ میرے خلاف ایک لفظ تک سننے کی روادار نہ تھی۔

"کیا وہ شخص مر گیا؟" میں نے گھبرا کر دریافت کیا۔ میرے دل کو چمپا کی گرفتاری سے صدمہ ہوا تھا۔

"نہیں۔" لاجونتی نے نفی کے انداز میں سر ہلایا۔ "وہ بس زخمی ہوا تھا۔ جب پولیس چمپا کو گرفتار کرنے آئی تھی وہ بھی ساتھ ساتھ چمپا کی نشان دہی کرنے آیا تھا اور اس نے اس واقعے کو خوب بڑھا چڑھا کر پیش کیا تھا۔ خوب رنگ دیا تھا۔"

پھر میں رستم کو ساتھ لے کر پولیس اسٹیشن پہنچا۔ چمپا حوالات میں بند تھی۔ تھانے دار بہت ہی کرو قسم کا تھا۔ وہ تین ہزار روپے سے کم پر راضی نہ تھا۔ مقفل الماری میں رشوت کی چار ہزار کی جو رقم تھی میں نے جادو کے زور سے اپنی جیب میں منتقل کر لی۔ تھانے دار کو تین ہزار اور زخمی کو ایک ہزار روپے دے کر رام کیا۔ تب میں چمپا کو لے کر اس کے ہاں آیا۔ میں نے پولیس اسٹیشن جاتے وقت رستم سے بات کی تھی کہ چمپا رہائی کے بعد باعزت زندگی گزارے گی۔ میں اسے وہاں سے آج رات ہی نکال کر کسی اور جگہ ٹھہرانا چاہتا ہوں تاکہ وہ نئی اور باعزت زندگی کا آغاز کرے۔ رستم نے اپنے برابر والے مکان کے بارے میں بتایا کہ وہاں ایک بوڑھی عورت شکنتلا رہتی ہے۔ اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ وہ گھروں میں برتن مانجھ کر گزر بسر کرتی ہے۔ وہ چمپا کو اپنی بیٹی بنالے گی۔ میں نے چمپا کو دس ہزار کی رقم دی اور اس سے کہا کہ وہ کل ہی کسی موسیقار سے رابطہ کرے۔ اسے چانس مل جائے گا۔ وہ شکنتلا کے ہاں رہ کر زندگی گزارے اور اسے اپنی ماں سمجھے۔ چمپا تیار ہو گئی۔ میں اسے شکنتلا کے ہاں رستم کو ساتھ لے کر پہنچا۔ شکنتلا بہت اچھی اور مخلص عورت تھی۔ وہ چمپا کو پا کر بہت ہی خوش ہوئی۔ کیوں نہ ہوتی اسے ایک سہارا اور بیٹی مل گئی تھی۔

جب میں وہاں سے رخصت ہوا تو بارہ بج رہے تھے۔ میں نے چمپا کو بتا دیا تھا کہ میں ایک ضروری کام سے کل ڈھاکا جا رہا ہوں۔ جب میں نجم النساء کے ہاں پہنچا تو ماں بیٹی میری آمد کی بے چینی سے منتظر تھیں۔ رانی میرے لئے چائے بنا کر لے آئی۔ کوئی نصف گھنٹے تک نجم النساء بیگم اور رانی اس غیر قانونی سفر اور راہ کی مشکلات کے بارے میں تفصیل سے دریافت کرتی رہی تھیں۔ میں نے ان دونوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ میں کل شام رانی کو ڈھاکا لے کر ہر صورت میں پہنچ جاؤں گا۔ جو وقت لگے گا صرف جیسور پہنچنے میں لگے گا۔ پھر بھی حالات پر منحصر ہے۔ ایک دن کی تاخیر ہو جائے تو پریشان نہ ہوں۔

ماں بیٹی کی سمجھ میں تمام باتیں آ گئیں۔ کچھ دیر کے بعد نجم النساء بیگم اٹھتی ہوئی کہنے لگیں۔

"سکندر بیٹے! تم جا کر دو تین گھنٹے آرام کرو۔ یہاں سے صبح ٹھیک پانچ بجے نکل جانا۔ آرام کرنے سے طبیعت کسی قدر تر وتازہ رہے گی۔"

پھر رانی مجھے اپنے ساتھ ایک کمرے میں لے آئی۔ کمرہ کیا تھا جنت کا جیسے کوئی گوشہ تھا۔ بہت کشادہ، صاف ستھرا اور ہوا دار بھی تھا۔ نرم وگداز بستر پر دودھیا چاندنی سی ہوئی تھی جیسے موتیا کے پھول

بکھرے ہوں۔ اس قدر صاف وشفاف بستر پر دراز ہوتے ہوئے میں جھجکا۔ خوف ہوا کہ کہیں میرے وجود سے میلا نہ ہو جائے۔ جب میں اس نرم وگداز بستر پر لیٹا تو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے بستر نہ ہو پھولوں کی آغوش ہو۔ بستر پر لیٹتے ہی گہری نیند میں جلد ہی غرق ہو گیا تھا۔

میں گہری نیند کی آغوش میں تھا کہ یکا یک میری نیند ٹوٹنے لگی۔ میرے نتھنوں میں ایک بھینی بھینی خوشبو مہکنے لگی۔ جب میں بیدار ہوا تو میں نے رانی کو اپنے سامنے پایا۔ وہ مجھے جگانے آئی تھی۔ اس وقت وہ اور حسین دکھائی دی تھی۔ وہ مجھے بیدار دیکھ کر میرے چہرے پر جھکی تو اس کی گرم گرم مہکتی سانسیں چہرے کو جھلسانے لگیں۔ اس نے سرگوشی میں اور بڑے پراسرار انداز میں آہستگی سے کہا۔ "آپ جلدی سے تیار ہو لیں۔ ہمیں روانگی کی تیاری کرنی ہے۔"

رانی یہ کہہ کر کمرے سے نکل گئی لیکن جاتے جاتے وہ اپنی خوشبو چھوڑ گئی تھی۔ چند لمحوں کے بعد اس کمرے سے ملحق شان دار اور کشادہ غسل خانے میں گھس کر میری آنکھیں حیران رہ گئیں۔ بھلا میں نے کب ایسا غسل خانہ دیکھا تھا۔ اس میں کیا کچھ موجود نہیں تھا۔ میں دل کھول کر نہایا۔ شیمپو اور صابن کا بھی فراخ دلانہ استعمال کیا۔ ٹرکش تولیے سے خوب رگڑ کے بدن صاف کیا۔ جب میں غسل خانے سے باہر آیا تو کسی قدر ہلکا پھلکا اور تازہ دم ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ نجم النساء بیگم کی مجھ پر ایسی عنایتیں رہیں تو میں یک سر بدل جاؤں گا۔ ناشتے کی میز پر بیگم نجم النساء کے میزبان کے گھر کے افراد میں سے کوئی نہیں جاگا تھا۔ ہم تینوں ہی جاگ رہے تھے۔ ناشتا کرتے ہوئے یہ طے پایا تھا کہ میں سیال دہ ریلوے اسٹیشن پہنچ کر رانی کا انتظار کروں گا۔ نجم النساء بیگم نے مجھے تاکید کی تھی کہ میں تیسرے درجے کا ٹکٹ لوں۔ فرسٹ کلاس میں سفر کرنے سے آدمی خواہ مخواہ نظروں میں آ جاتا ہے اس لئے احتیاط ضروری تھی۔

میں سیال دہ ریلوے اسٹیشن پہنچ کر بے چینی سے رانی کا منتظر تھا۔ کیوں کہ بون گاؤں جانے والی گاڑی روانگی کے لئے تیار کھڑی تھی۔ اور اس کی روانگی میں دس پندرہ منٹ باقی تھے۔ رانی کا دور دور تک نام ونشان نہیں تھا۔ سینکڑوں لڑکیوں اور عورتوں کے ہجوم میں اسے تلاش کیا۔ پھر یہ خیال اچانک ذہن میں آیا کہ نجم النساء بیگم نے کسی وجہ سے اچانک یہ پروگرام تبدیل تو نہیں کر دیا۔ میں خود بھی دل سے یہ چاہتا تھا کہ یہ پروگرام دو ایک دن کے لئے ملتوی ہو جائے تو اچھا ہے تاکہ یہ دو دن چمپا کے ساتھ گزاروں اور اسے فلم اسٹوڈیو لے جاؤں اور کسی فلم میں جادو کے زور سے کام دلا دوں۔ میں نے اس کی آواز اتنی دل کش اور مدھ بھری کر دی تھی کہ وہ خود سفارش تھی۔ لیکن میری یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ گاڑی کی روانگی سے پانچ منٹ قبل رانی ایک ٹیکسی سے اتر کر ریلوے اسٹیشن کی عمارت میں تیزی سے داخل ہو رہی تھی۔ اس نے پلیٹ فارم پر رک کر مجھے متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔

میں یہ دیکھ کر متعجب اور خوش بھی ہوا کہ اس نے اپنی وضع قطع ایک بے پرواہ نوجوان جیسی بنائی ہوئی تھی۔ کھدر کے ڈھیلے ڈھالے کرتے اور پاجامے میں وہ بالکل لڑکا لگ رہی تھی۔ ایک چاکلیٹی نوجوان لڑکا...... اس نے گردن تک ترشے ہوئے بالوں کو ایک بے پروا لڑکے کی طرح بے ترتیب کیا ہوا تھا۔ اس

نے اپنے گلے میں ایک رومال دوپٹے کی طرح ڈال رکھا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ میرے قریب آ کر میرے چہرے پر نظریں جما کر آہستگی سے بولی۔ ”میرا نام اکبر منٹو ہے۔“

❁......❁......❁

بون گاؤں اسٹیشن منزل تھی جو ڈھائی گھنٹے کے سفر کے بعد آئی تھی۔ اس اسٹیشن کی عمارت سے باہر نکلتے ہوئے میں نے رانی کا چہرہ دیکھا تو اس پر سفر کی تھکن سی چھائی ہوئی تھی۔ وہ بے حد تھکی تھکی سی دکھائی دے رہی تھی۔ اسے کتنے میل پیدل مسافت طے کرنا تھی اسے اس کا اندازہ نہ تھا۔ وہ ریل گاڑی میں ڈھائی تین گھنٹے بیٹھے بیٹھے ہی تھک گئی تھی۔ لیکن تین چار گھنٹے مسلسل چلنے سے کیا حال ہوگا اس کا، میں نے اندازہ کر لیا تھا۔ بیاباں میں سواری کا کیا کام۔ میں نے یہ بات بتا بھی دی تھی۔

میں یہ سوچ کر پریشان بھی ہوا۔ میں نے اپنے دل کو تسلی دی کہ رانی نے اگر کسی سستی اور تھکن کا اظہار کیا تو اس کے ڈھاکا پہنچنے میں تاخیر ہو جائے گی۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہوگا۔ یہ افتاد تو دانستہ ماں اور بیٹی نے مول لی تھی۔ ماں نے اپنی نہ صرف بے حد حسین بلکہ نوجوان اور بلا کی پرکشش لڑکی کو ایک اجنبی مرد کے حوالے کر دیا تھا۔ مجھ پر بے حد اعتماد کیا تھا جو کہ ایک طرح سے غلط تھا۔ گو کہ میرے دل میں کوئی میل نہیں تھا اور نہ ہی نیت میں فتور پیدا ہو سکتا تھا۔ انہوں نے بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ اس بیاباں کی تنہائی میں فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ رانی بے بس ہو جاتی۔ پس پردہ کیا محرکات تھے۔ میں اس کا کچھ اندازہ نہ کر سکا۔ میں اندھیرے میں تھا اور نہ مجھے جاننے کا اشتیاق تھا اور نہ ہی تجسس۔ میں چاہتا تو ایک لمحے میں معلوم کر سکتا تھا۔ لیکن اس کی کوئی ضرورت بھی نہ تھی۔ مجھے اس بات کی فکر نہ تھی۔ کیوں کہ مجھے توقع سے زیادہ رقم ملی تھی اور مزید رقم ملنے والی تھی۔ میں نے دس ہزار کی پیشگی رقم چمپا کو دے دی تھی۔ اسے دے کر جو مسرت ملی تھی اسے صرف میں ہی محسوس کر سکتا تھا۔ مجھے یوں بھی آم کھانے سے مطلب تھا نہ کہ پیڑ گننے سے......

ریلوے اسٹیشن کی عمارت سے باہر آتے ہی میں ایک جگہ ٹھہر کر رستم کے رکشا والے کو تلاش کرنے لگا۔ وہ اس کا خاص آدمی تھا اور اس سے میری بھی شناسائی ہو گئی تھی۔ رکشے والوں کی دو طرف قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ میں اتم کمار کو دیکھ نہیں پایا البتہ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ میرے پاس لپک کر آیا تو اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ اس نے رانی کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر حیرت چھا گئی تھی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا اور متعجب لہجے میں کہا۔ ”رستم بھیا کہاں ہیں؟...... صرف ایک......؟“

”ہاں......“ میں نے اس سے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ ”یہ میرا دوست منٹو ہے۔ رستم کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے...... اور ہاں بڑے صاحب کا کیا حال ہے۔“ یہ رستم کا مخصوص اشارہ ہوتا تھا۔ میں نے بھی اس اشارے سے کام لیا تھا۔

”کل تک ان کی طبیعت تو ٹھیک نہیں تھی لیکن آج افاقہ معلوم ہوتا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”جو ہوگا وہ دیکھا جائے گا۔ فکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر میں رانی کو ساتھ لے کر اس کے رکشا کی طرف بڑھا۔

اتم کمار نے مجھے اس گاؤں کے ایک ویرانے میں اتار دیا جہاں سے ہم دونوں کو اپنے سفر کا آغاز کرنا تھا۔ میں نے اسے سو روپے کا نوٹ دیا تو وہ خوشی خوشی لوٹ گیا۔ رانی حیرت اور خوف سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ کھیتوں میں کہیں کہیں آم کے پیڑ بھی تھے۔ پگ ڈنڈیاں، لکڑی کے پل اور سانپ کی طرح بل کھاتے ہوئے ٹیڑھے میڑھے راستے صاف نظر آ رہے تھے۔ بہرحال ایک بیابان تھا۔

”اب چل پڑیں۔“ میں نے رانی سے کہا۔ ”ہمیں مغرب کی سمت چلنا ہے...... یہاں رکنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔“

کوئی ایک میل کی مسافت طے کرنے کے بعد رانی تھک کر ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ گئی۔ اس کا حسین چہرہ دھوپ کی تمازت سے سرخ ہو گیا تھا۔ وہ نڈھال اور پیاسی لگ رہی تھی۔ میں نے ایک فرلانگ کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہوئی جھونپڑی کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں چل کر کچھ دیر ستا لیں۔ وہاں کھانے پینے کے لئے کچھ نہ کچھ مل جائے گا۔“

رانی نے کھڑے ہو کر جھونپڑی دیکھی اور حوصلہ کر کے میرے ساتھ چل پڑی۔ اس نے چلتے چلتے بڑی بے دلی سے کہا۔ ”پیدل چلنا اور خاص کر تیز دھوپ میں چلنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ تیز دھوپ برداشت نہیں ہوتی ہے۔“

میں نے جواب نہیں دیا۔ میں نے پہلے ہی ماں بیٹی پر واضح کر دیا تھا کہ میلوں پیدل چلنا ہوگا۔ ہم دونوں خاموشی سے چلتے رہے۔ اس جھونپڑی میں گپتا موجود تھا مجھے دیکھ کر اس کا چہرہ یک بارگی کھل اٹھا۔ اس کے فی کس پچاس روپے پکے ہوتے تھے۔ اس نے رستم اور قافلے کو نہ دیکھ کر صرف ایک رانی کو دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا۔ سب سے پہلے میں نے رانی کو مٹکے کا پانی پلایا اور وہ ایک چوکی پر جا کر لیٹ گئی۔ میں گپتا کو باہر لے آیا اور ہم دونوں پیپل کے گھنے درخت کے نیچے بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ گپتا نے مجھے مشورہ دیا کہ میں رات کے وقت سفر کروں۔ کیوں کہ آج کل بڑی پکڑ دھکڑ ہو رہی ہے۔ کچھ دیر بعد میں نے رانی کو خطرات سے آگاہ کیا تو وہ بادل نخواستہ تیار ہو گئی جس کی مجھے توقع نہیں تھی۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ تیار نہ ہو اور صاف انکار کر دے گی۔

میں سہ پہر کے وقت گپتا کے ساتھ ریلوے لائن کی جانب چلا گیا تاکہ وہاں حالات کا جائزہ لیا جا سکے۔ چوہدری سے مل کر رات کے سفر اور گشتی فوج کی سرگرمیوں کے بارے میں اطلاعات حاصل کرنا تھیں۔ چوہدری کی جھونپڑی کسی قدر محفوظ جگہ پر واقع تھی۔ شام ہوتے ہی مجھے رانی کو لے کر اس کی جھونپڑی میں منتقل ہونا تھا تاکہ وہاں سے رات کے وقت سفر کا آغاز کیا جا سکے۔ جب ہم دونوں واپس پہنچے تو جیمز بانڈ کی فلم سے کہیں سنسنی خیز اور ناقابل یقین منظر دیکھنے میں آیا۔ وہ گپتا کی جھونپڑی میں بیک وقت دو مردوں سے تن تنہا مقابلہ کر رہی تھی۔ تب مجھ پر یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ رانی جوڈو کراٹے میں بڑی مہارت رکھتی ہے۔ اس لئے نجم النساء بیگم نے پورے اعتماد کے ساتھ اپنی نوجوان بیٹی کو ایک اجنبی مرد کے ہمراہ بھیج دیا تھا۔ رانی فضا میں اچھل اچھل کر ان دونوں بدمعاشوں کی فلائنگ کک سے تواضع کر رہی

تھی۔ان کے چہرے کے جغرافیے بدل چکے تھے اور چہرے لہولہان بھی ہو گئے تھے۔ وہ مجھے اور گپتا کو دیکھ کر بھاگ نکلے۔ میں نے ان کے تعاقب میں جانا چاہا تو رانی نے فوراً ہی میرا ہاتھ تھام کر مجھے روک لیا۔

''سکندر نہیں جانے دو۔'' وہ پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بولی۔ ''وہ دونوں چور تھے اور چوری کی نیت سے داخل ہوئے تھے۔''

گپتا رانی کی نسوانی آواز سن کر حیرت سے بولا۔ ''ایں...... یہ کیا لڑکی ہے سکندر صاحب!......؟'' اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ گپتا سے میں رانی کی شخصیت کو راز رکھنا چاہتا تھا لیکن رانی کی آواز نے بھانڈا پھوڑ دیا تھا۔ مجھے گردن ہلا کر اقرار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

''کیا کیا وہ چور تھے......؟'' گپتا کی حیرت دو چند ہو گئی۔ اس نے مجھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا۔ ''اس ویرانے میں چوروں کا کیا کام ہو سکتا ہے۔ ہر کس و ناکس کو یہ معلوم ہے کہ میری جھونپڑی میں مٹی کے دو برتن، دو تین چوکیاں اور ایک زنگ آلود چھوٹے صندوق کے سوا کچھ نہیں ہے۔''

''پھر وہ دونوں بدمعاش یہاں کس لئے آئے تھے؟'' رانی نے گھبرا کر پوچھا۔ اس کا چہرہ ایک دم سے زرد پڑ گیا۔

''میری سمجھ میں خود نہیں آ رہا ہے۔'' گپتا نے تشویشناک لہجے میں کہا۔ ''وہ بدمعاش اس علاقے کے بھی نہیں ہیں۔ میں یہاں کے چوروں اور بدمعاشوں کی شکل وصورت سے خوب واقف ہوں۔ کبھی ایسا واقعہ نہ تو اپنے ہاں دیکھا اور نہ کسی کے ہاں سنا؟''

''جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔'' رانی کے بدن پر ایک جھرجھری سی آئی۔ پھر وہ بے پروائی سے بولی۔ ''اب فکر میں پڑنے سے کیا حاصل ہوگا؟''

''میں نے تم جیسی بہادر اور دلیر لڑکی آج تک نہیں دیکھی۔'' گپتا نے سحر زدہ لہجے میں کہا۔ ''کہیں تم پھولن دیوی تو نہیں ہو؟''

رانی اس کی بات سن کر مسکرا دی۔ اس نے اپنی حالت پر قابو پا لیا تھا۔ وہ قدرے شوخ لہجے میں بولی۔ ''اب پھولن دیوی اس دنیا میں کہاں ہے۔ اس نے اپنا پیشہ اور دنیا بھی چھوڑ دی۔ وہ ایک ڈاکو تھی اور میں شریف زادی ہوں۔''

''ایک گھریلو شریف لڑکی تن تنہا بیک وقت دو بدمعاشوں سے مقابلہ کر سکتی ہے؟'' اس کے چہرے پر ابھی تک حیرت چسپاں تھی۔

''کیوں نہیں......!'' رانی نے بڑی بے نیازی سے اپنے کندھے اچکائے۔ ''جب ایک لڑکی کی عزت پر بن جاتی ہے تو پھر وہ اپنی جان پر کھیلنے اور جان لینے سے بھی دریغ نہیں کرتی۔ اس وقت وہ یہ نہیں دیکھتی ہے کہ اس کے مقابلے پر کتنے بدمعاش ہیں۔ وہ کیسے ہی خطرناک کیوں نہ ہوں۔'' پھر اس نے توقف کر کے میری طرف دیکھا۔ ''ہم لوگ یہاں سے کب چلیں گے......؟'' پھر اس کے لہجے سے خوف ظاہر ہونے لگا۔ ''اب یہاں ایک لمحہ بھی رکنا حماقت ہے۔ جانے کیوں میرا دل گھبرا رہا ہے جیسے کوئی

ناگہانی آفت نازل ہونے والی ہے۔ شام ہونے میں زیادہ وقت بھی نہیں ہے۔''

''آج کل دونوں ملکوں کے درمیان سرحدی تنازعات بڑھتے جا رہے ہیں۔'' گپتا نے میرے بجائے خود ہی رانی کو سمجھایا۔ ''قدم قدم پر خطرات موجود ہیں۔ پولیس گشت پر ہوتی ہے تو سو پچاس روپے میں کام بن جاتا ہے...... بلکہ کوئی گرفتاری بھی عمل میں نہیں آتی۔ مگر فوج کے سپاہی بڑی سختی برتتے ہیں...... وہ خود تو چپ رہتے ہیں مگر ان کی نالیں بات بات پر بولتی ہیں۔''

رانی کے بدن میں خوف سے جھرجھری سی آ گئی تھی۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ یک لخت اس کے چہرے کی چاندنی زرد پڑ گئی تھی۔ وہ بار بار دانتوں سے اپنے ہونٹ دبا لیتی تھی۔ میں نے اس کے چہرے سے بھانپ لیا کہ وہ دل میں بہت خوف زدہ ہے۔ وہ مجھ سے کوئی بات چھپانے کی کوشش کر رہی ہے یا پھر وہ گپتا کی موجودگی میں کچھ کہنا نہیں چاہتی۔ اب جو واقعہ پیش آیا تھا اس کا رانی کی ذات سے گہرا تعلق ظاہر ہو رہا تھا۔ وہ بدمعاش اسے یہاں قتل کرنے کے ارادے سے آئے تھے جیسا کہ اس کی ماں کو بھی ہوٹل کے باہر ہی ارادے سے گھیر لیا تھا۔ رانی شاید اس لئے بھی دہشت زدہ ہو رہی تھی کہ کہیں وہ دونوں اسے دوبارہ قتل کرنے کی نیت سے نہ آ دھمکیں۔ شاید اس لئے وہ گپتا کے ہاں ایک پل بھی رکنے کے لئے تیار نہ تھی۔

میں نے اسے بہت سمجھانے کی کوشش کی پھر بھی اس کا خوف کم نہ ہوا۔ شام کے سائے گہرے ہوتے ہی میں رانی کو ساتھ لے کر چوہدری کی جھونپڑی کی طرف چل پڑا۔ میں نے راستے میں غیر محسوس انداز سے اس واقعے کے بارے میں رانی کو ٹٹولا لیکن وہ انجان بنی رہی تو میں نے یہ مناسب نہیں سمجھا...... اور میں آسمان پر اچانک چھائے ہوئے گہرے گہرے سیاہ بادلوں کو دیکھ کر پریشان ہونے لگا۔ ایک دم حبس ہو گیا تھا اور اندھیرا گہرا ہونے لگا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ آسمان کسی بھی لمحے بڑے زور سے برس اٹھے گا۔ جب میں نے رانی کو بارش کے قطرے کا احساس دلایا تو وہ ناہموار راستے، پگڈنڈیوں اور کھیتوں میں سے تیز رفتاری سے گزرنے لگی۔ جب ہم چوہدری کے ہاں پہنچے تو وہ ہمارا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہنا شروع کیا۔

''کچھ دیر پہلے میرا آدمی دو تین بری خبریں لے کر آیا تھا۔ سب سے پہلی خبر تو یہ ہے کہ انیل چوہدری اپنے آدمیوں سمیت بون گاؤں ریلوے اسٹیشن پر گرفتار کر لیا گیا ہے اور ان سب کو حوالات میں بند کر دیا گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ایف آئی آر کاٹنے کی نوبت نہ آئے مجھے اس کی رہائی میں شاید دو ایک دن لگ جائیں۔''

اس نے توقف کر کے گہرا سانس لیا اور رانی پر اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔ پھر وہ تشویشناک لہجے میں بولا۔ ''تم کو آج رات نہیں نکلنا تھا۔ کیوں کہ نہ صرف بارش کا خطرہ بلکہ چاروں اطراف فوج پھیلی ہوئی ہے کیوں کہ آج صبح گیارہ بجے دونوں طرف سے زبردست فائرنگ ہوئی ہے۔ ایک افواہ گرم ہے کہ ہندوستانی فوج کے بارہ سپاہی اور بنگلہ دیش میں چار سپاہی مارے گئے۔ دونوں طرف کے تیس سپاہی زخمی ہوئے ہیں۔''

چوہدری کی زبان سے یہ خبریں سنتے ہی رانی کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے پھیل گئے۔ چوہدری نے کھونٹی سے چھتری اتار کر بغل میں دباتے ہوئے مجھے تاکید کی کہ میں جلد

بازی کر کے کوئی خطرہ مول نہ لوں۔ اس کی جھونپڑی میں دو تین دن کا راشن، مٹی کا تیل، سرسوں کا تیل، پینے کا پانی اور لکڑیاں اور چولہا موجود ہے۔ اگر کل صبح کام بن گیا تو میں کل سہ پہر تک لوٹ آؤں گا۔ لیکن اس کے امکانات بہت کم ہیں۔ کیوں کہ پولیس سے زیادہ سخت چیز کوئی اور نہیں ہے۔

میں نے چوہدری کو سو کا ایک نوٹ دیا تو وہ بچوں کی طرح خوش ہو گیا۔ پھر وہ خوشامدانہ انداز میں بولا۔ ''تم پیسوں کے معاملے میں حاتم طائی سے کم نہیں ہو۔ تمہیں دوسروں کے مقابلے میں اسی لیے پسند کرتا ہوں۔ اور ہاں...... میں نے بھات اور ماس تیار کر کے رکھا ہوا ہے۔ وہ اتنا ہے کہ تم دونوں پیٹ بھر کے کھا سکتے ہو۔'' چوہدری بڑی تیزی سے نکلا اور اندھیرے میں گم ہو گیا۔ رانی چاروں طرف کے سناٹے اور جھونپڑی کی تنہائی میں خوف زدہ ہوئی جا رہی تھی۔ لال ٹین کی زرد روشنی میں اس کا چہرہ کسی لاش کی طرح سفید دکھائی دے رہا تھا۔ وہ چوکی کے ایک کونے میں سکڑ اور سمٹ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ ہر آہٹ پر ہرنی کی طرح چونک جاتی اور دہشت زدہ نظروں سے دروازے کی جانب دیکھنے لگتی تھی۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کس طرح سے اس کی دل جوئی کروں۔ خوف دور کروں۔ جب کہ وہ ایک نڈر لڑکی تھی۔ پھر کس لیے اس قدر ہراساں اور پریشان ہو رہی ہے۔ جب کہ میں بھی موجود ہوں اور اسے تحفظ دے سکتا ہوں۔ مجھے بڑے زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ رانی بھی کھانا کھا لے تو اس کا خوف کسی حد تک کم ہو جائے گا۔ بھوک اسے بھی لگ رہی ہو گی۔ میں نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''کیا خیال ہے۔ کیوں نہ ہم کھانا کھا لیں۔ کھانے کا وقت بھی ہو رہا ہے۔''

''مجھے بھوک بالکل بھی نہیں ہے۔'' وہ مرتعش لہجے میں بولی۔ ''پلیز! آپ کھا لیں۔ میری فکر نہ کریں۔ میں نہیں کھاؤں گی۔''

میں اس کا ڈر اور خوف دور کرنے کے خیال سے بڑے زور سے ہنسا تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ وہ متعجب سی ہوئی۔ ''آپ اس قدر بہادر ہو کر پریشان اور خائف سی ہو گئی ہیں؟ جب کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ اکثر ایسی مشکلات ایسے سفر اور مہم جوئی میں پیش آتی رہتی ہیں اور عجلت پسندی سے دھر بھی لئے جاتے ہیں...... اگر انتظار کی اذیت برداشت کر لی جائے تو ہم پھر آفت اور معیبت سے بچ سکتے ہیں۔ وقت کا کیا ہے۔ اس کے گزرتے کیا دیر لگتی ہے؟''

میں نے چوکی پر اخبار بچھا دیا جو ایک طرف رکھا ہوا تھا۔ دستر خوان تھا نہیں۔ یہ پرانا اخبار دستر خوان کا کام دے رہا تھا۔ میں نے اس پر کھانا چن دیا۔ رانی کے نوکر اس سے اچھا کھانا کھاتے ہوں گے۔ میرے اصرار پر رانی نے اپنی پلیٹ میں ایک مٹھی بھات، تھوڑا سا سالن اور ماس کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا رکھ لیا۔ پھر اس نے کڑوا سا منہ بنا کر پہلا نوالہ لیا۔ جیسے وہ کوئی کڑوی دوا پینے والی ہو۔ دوسرا نوالہ اس نے قدرے رغبت سے کھایا۔ اس نے تین چار لینے کے بعد مزید بھات اور سالن لیا۔ چوہدری نے واقعی خوش ذائقہ اور مزے دار کھانا پکایا تھا۔ جس کی مجھے توقع نہیں تھی۔ رانی کی دلچسپی اور رغبت کھانے میں بڑھتے دیکھ کر میں اندر ہی اندر بہت خوش ہو گیا۔ پھر اس نے سیر ہو کر کھایا تھا۔ ہم دونوں سارا کھانا کھا گئے۔ تھوڑا

بھی نہیں بچا۔

چوہدری کی جھونپڑی میں صرف ایک چوکی پڑی تھی۔ اس پر جو بستر بچھا ہوا تھا وہ صاف ستھرا تو نہیں تھا لیکن بہت میلا بھی نہیں تھا۔ میں رانی کو اس پر سونے کے لئے کہہ کر دوسرے کمرے میں آ گیا۔ ایک خاصی بڑی دری جو ایک طرف تہہ کر کے رکھی ہوئی تھی اسے فرش پر بچھا کر اس پر دراز ہو گیا۔ حبس اتنا تھا کہ بدن پر کپڑے کانٹے بن کر چبھ رہے تھے۔ رانی برابر کے کمرے میں جاگ رہی تھی۔ اسے بھی نیند نہیں آ رہی تھی اور وہ بار بار بستر پر کروٹیں بدل رہی تھیں۔ کروٹیں بدلتی تو چوکی چیں چیں کر اٹھتی تھی۔ بارش ابھی تک نہیں ہوئی تھی۔ بارش اگر ہو جاتی تو حبس کی یہ کیفیت ختم ہو جاتی اور مجھے بھی نیند آ جاتی۔ میں بھی بے حد تھکا ہوا سا تھا۔

میں کمرے میں پھیلے ہوئے گھپ اندھیرے میں گھورتا ہوا سوچ رہا تھا کہ آخر نجم النساء بیگم پہ ایسی کون سی افتاد آن پڑی تھی کہ اپنی حسین اور نوجوان بیٹی کو میرے ہمراہ بھیج دیا۔ ان کا دشمن کون ہے جو ان کی جان کے درپے ہو گیا ہے۔ اس کے علم میں کیسے اور کیوں کر آ گیا کہ رانی غیر قانونی طور پر سرحد عبور کر کے ڈھاکا جا رہی ہے اور گپتا کی جھونپڑی میں مقیم ہے۔ رانی اس وقت تک پرسکون اور اپنے پورے حواس میں تھی۔ جب تک ان دونوں بدمعاشوں نے اس پر حملہ نہیں کیا تھا۔ لیکن ان بدمعاشوں کے حملے کے بعد وہ اس قدر بوکھلا گئی تھی کہ اس پر دہشت کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر دہشت سی چھا گئی تھی۔ رانی اور نجم النساء بیگم نے مجھے اپنے اعتماد میں نہیں لیا تھا۔ دشمنی کی وجہ تک نہیں بتائی تھی۔ جانے وہ اپنے دشمن سے اس قدر خوف زدہ کیوں اور کس لئے تھیں......؟ یہ بات میری سمجھ سے بالاتر تھی، ایک طرح سے معمہ بن گئی تھی۔

جانے میں کتنی دیر تک جاگتا رہا اور مجھے نیند کب آئی کچھ خیال ہی نہیں رہا۔ میں نیند کی آغوش میں دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ اچانک ایک دل خراش چیخ نے مجھے گہری نیند سے جگا دیا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا...... رانی مجھے اپنے کمرے سے لرزیدہ آواز میں پکار رہی تھی...... ''سکندر...... سکندر......'' میں حیران اور پریشان ہو گیا کہ یہ اس طرح چیخ کیوں رہی ہے۔ میں اپنے بستر سے اٹھ کر رانی کے کمرے کی جانب سرعت سے لپکا۔

''سکندر......!'' وہ ہکلائی۔ ''کھڑکی میں سے کوئی جھانک رہا تھا۔ میں نے اندھیرے میں اس کی چمکتی ہوئی لال لال آنکھیں دیکھی تھیں...... وہ انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں...... کسی بھیڑیے اور درندے کی آنکھیں سی لگ رہی تھیں۔ لیکن وہ تھا کوئی آدمی ہی......''

رانی کے دھڑکتے دل کی صدا اور سانسوں کے زیر و بم کی گونج میرے کانوں میں سنائی دے رہی تھی۔ اس کا شاخ گل جیسا بدن کانپ رہا تھا۔

''یہ تمہارا واہمہ ہے۔'' میرے منہ سے غیر ارادی طور پر نکل گیا۔ مگر مجھے فوراً ہی احساس ہوا تو میں نے جلدی سے کہا۔ ''آپ کو وہم ہوا ہو گا۔ یہاں کون آ سکتا ہے؟''

''وہم نہیں ہے۔'' رانی نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''مجھے نیند کہاں آئی تھی۔ میں جاگ رہی تھی اور میری نگاہ کھڑکی پر جمی ہوئی تھی۔ اچانک میں نے کالے رنگ کے خوف ناک چہرے کو دیکھا۔ اس کی

آنکھیں کسی درندے کی مانند لگ رہی تھیں۔ اف...... کیسی خوف ناک آنکھیں تھیں۔''

''میں باہر جا کر دیکھتا ہوں......'' میں نے دروازے کی طرف قدم بڑھایا تو رانی نے لپک کر میرا بازو مضبوطی سے تھام لیا۔

''نہیں...... خدا کے لئے باہر مت جائیں۔'' اس کی آواز میں تھرتھراہٹ اور التجا بھری تھی۔ ''باہر گھپ اندھیرا ہے۔ دشمن فائدہ اٹھا سکتا ہے۔''

''میں تنہا نہیں ہوں......'' میں نے اسے دلاسا دیا۔ ''میرے پاس اپنا چاقو ہے۔ چلتے وقت میں نے خرید لیا تھا کہ شاید یہ کچھ کام دے جائے۔''

''نہیں...... نہیں......'' رانی خوف زدہ ہو کر بولی۔ ''میری جان خطرے میں ہے۔ خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو......''

اس لمحے باہر تیز ہواؤں کے جھکڑ چلنے لگے۔ اچانک بڑے زور کی بجلی کڑکی تو رانی ایک دم سے سہم کر مجھ سے لپٹ گئی۔ دفعتاً بڑے زوروں کی بارش شروع ہو گئی۔ پھر کہیں بجلی گری۔ اس خوف ناک بارش میں ہم دونوں بہہ گئے۔ ڈوب گئے۔ ہمیں قابو اور اختیار نہیں رہا۔ بے بس ہو گئے تھے۔ کوئی فرق، کوئی فاصلہ نہیں رہا۔ یہ سب کیسے ہو گیا۔ آج بھی سوچتا ہوں تو بڑی حیرت ہوتی ہے۔ یقین نہیں آتا ہے۔ ایک سہانا خواب سا لگتا ہے۔ آسمان رات بھر برستا رہا۔ بجلی کڑکتی اور گرتی بھی رہی تھی۔ یہ ایک طوفانی رات تھی۔ طوفان تو ایسا آیا تھا کہ اس نے سب کچھ تہس نہس کر کے رکھ دیا تھا۔ رات کے آخری حصے تک ہم طوفانوں کی زد میں ہی رہے تھے۔ ہمیں نیند کب آئی کچھ خبر نہیں ہوئی۔ جب میں بیدار ہوا تو دن نکل آیا تھا۔ بارش تھم چکی تھی۔ کھڑکی میں سے نکھرا اور صاف وشفاف آسمان دکھائی دے رہا تھا۔ کسی افق پر بادل کا ایک ٹکڑا بھی نہ تھا۔ میری نگاہ رانی پر پڑی۔ وہ گہری نیند کی آغوش میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جانے کیوں مجھے ضمیر ملامت کرنے لگا کہ رات جو کچھ ہوا وہ اچھا نہیں ہوا۔

اس میں ایک طرح سے میرا کوئی دوش نہ تھا۔ کیوں کہ رانی نے پیش قدمی کی اور جذبات کے طوفان میں بہا کر لے گئی تھی۔ لیکن سارا الزام میری ذات پر دھرا جا سکتا تھا۔ نجم النساء بیگم کے علم میں آنے کی صورت میں مجھ پر عتاب نازل ہو سکتا تھا۔ وہ دولت کے بل بوتے پر میرا بہت کچھ بگاڑ سکتی تھیں۔ جانے کیوں میں لرز سا گیا۔ پھر خیال آیا کہ ایسی کوئی صورت حال پیدا ہوئی تو میں اپنے جادو سے بچاؤ کر سکتا ہوں...... پھر میں نے سوچا کہ رانی سے گڑگڑا کے معافی مانگ لوں گا۔ اس کے حضور شرمسار ہو جاؤں گا۔ چوں کہ اس میں رانی ہی کا سارا عمل دخل ہے شاید وہ مجھے معاف کر دے۔

میں لیٹا ہوا ایک نیا پروگرام ترتیب دے رہا تھا۔ مجھے گپتا کا بھی انتظار تھا۔ گپتا نے چلتے وقت مجھ سے کہا تھا کہ اگر سرحد پر حالات سنگین ہونے کی اطلاع ملی تو وہ فوراً پہنچا دے گا۔ لیکن گپتا کا یہاں جلد پہنچنا دشوار تھا۔ میں نے سوچا۔ ساری رات کی موسلا دھار بارش نے نشیب وفراز، راستوں اور پگڈنڈیوں کو ندی نالا بنا دیا ہو گا۔ اب ہمیں ایک رات اور انتظار میں کاٹنا ہو گی۔ رانی اس بات کے لئے تیار نہ ہوئی تو میں کیا کروں؟ شاید

وہ یہ کہے کہ میں پھر سے رات جذبات کے طوفان کی نذر کرنے کے خیال سے بہانہ بنا رہا ہوں جبکہ ایسا کوئی خیال اور ارادہ دل کے کسی کونے میں نہیں تھا۔ لیکن رات شیطان ہمارے درمیان آ گیا تھا۔ رانی کی خود سپردگی نے میرا دامن آلودہ کر دیا تھا جسے میں نے اب تک نہ جانے کتنی عورتوں سے بچایا ہوا تھا۔

میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ کیوں نہ میں اسے سہ پہر کے وقت لے کر چل پڑوں۔ اس وقت تک پانی بہہ چکا ہو گا۔ سرحد پر پہنچتے پہنچتے رات ہو جائے گی۔ ہم دونوں اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر سرحد پار کر جائیں گے۔ رات کسی ہوٹل میں بسر کر کے صبح کی فلائٹ سے ڈھاکا چلے جائیں گے پھر میں دوسرے کمرے میں آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں رانی کو آتا دیکھ کر ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ میرا خیال تھا کہ رات کے واقعے کا اس نے اثر لیا ہو گا۔ وہ مجھے مورد الزام ٹھہرائے گی۔ بھیڑیا، درندہ اور ذلیل اور کمینے کے الفاظ سنا کر دل کی بھڑاس نکالے گی۔ لیکن میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ رات کے واقعے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس کی نگاہ میں میرے لئے کوئی ملامت اور نفرت نہیں تھی۔ نہ ہی سب کچھ کھو دینے، لٹنے اور آلودہ ہونے کا احساس اور پچھتاوا جیسے وہ اس منزل سے پہلے بھی گزر چکی ہو۔ جس اونچے طبقے سے اس کا تعلق تھا وہاں ایسی بات بعید نہیں تھی۔

''مسٹر سکندر......!'' وہ رسیلی آواز میں بولی۔ اس کی آنکھوں میں رات اور جوانی کا خمار بھرا ہوا تھا۔ ''کیا آپ ناشتہ تیار کر سکتے ہیں؟ میں تو ایک کپ چائے بھی نہیں بنا سکتی۔''

جس وقت میں چوہدری کے باورچی خانہ کا جائزہ لے رہا تھا تب وہ میرے پیچھے کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے صرف بھات دیکھا تو وہ بولی۔

''میں ناشتے میں بھات نہیں کھاتی ہوں۔ یہاں پاؤ روٹی (ڈبل روٹی) ملنے سے رہی...... کیا کیا جائے؟''

میں نے سوچ کر کہا۔ ''یہاں سے ایک میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ وہاں ایک ہوٹل بھی ہے۔ میں وہاں دو ایک بار ناشتا کر چکا ہوں۔ وہاں قیمہ پراٹھا، مکھن، ملائی اور انڈوں کا آملیٹ ملتا ہے کہیں تو وہاں سے ناشتا وغیرہ لیتا آ ؤں؟''

''نہیں نہیں...... ایک میل تو بہت فاصلہ ہوتا ہے۔'' رانی گھبرا سی گئی۔ ''میں بھوک برداشت کر لوں گی لیکن میں آپ کو ایک لمحے کے لئے بھی یہاں سے جانے نہیں دوں گی۔''

''میں یوں گیا اور یوں آیا۔ صرف پلک جھپکنے کی دیر ہے۔'' میں نے اسے سمجھایا۔ ''کوشش کروں گا کہ آدھے گھنٹے میں واپس آ جاؤں۔''

اس کی حسین سیاہ آنکھیں حیرت اور دہشت سے پھیل گئیں۔ ''رات میں دشمن کا جو خوف ناک چہرہ دیکھا تھا اس کی ہیبت میرے دل میں بیٹھی ہوئی ہے۔ میری چھٹی حس بتا رہی ہے کہ وہ دوبارہ آئے گا اور ہم کسی بہت بڑی مصیبت میں گھرنے والے ہیں۔''

''خوف اور گھبراہٹ کی کیفیت میں پریشان خیالات اور طرح طرح کے وسوسے دماغ کو گھیر لیتے

ہیں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ '' آپ تو بڑی بہادر لڑکی ہیں...... جوڈو کراٹے میں مہارت بھی ہے۔ کل ہی دو خطرناک بدمعاشوں کی پٹائی کر کے جو درگت بنا چکی ہیں۔ وہ ساری زندگی بھول نہیں سکتے۔ ایک تن تنہا شخص کی مجال ہی کیا ہے کہ وہ آپ پر ہاتھ اٹھا سکے۔ وہ ایسی جرأت نہیں کر سکتا۔''

میری باتوں نے رانی کا حوصلہ بڑھایا جس سے اس کے چہرے پر ایک سکون سا چھا گیا۔ پھر وہ پر اعتماد لہجے میں بولی۔

'' کیا آپ اور جلدی لوٹ کر نہیں آ سکتے......؟ وہاں زیادہ دیر نہ لگائیں۔ صرف پراٹھا قیمہ اور آملیٹ لے آئیں۔''

'' کوشش کروں گا کہ جتنا جلد ہو سکے آ جاؤں۔'' میں نے جواب دیا۔ '' بارش کی وجہ سے راستہ بہت خراب ہو گیا ہے۔ ورنہ بیس منٹ میں واپس آ جاتا۔''

'' ٹھیک ہے جلدی سے ہو آئیں۔'' وہ میری آنکھوں میں جھانکتی ہوئی بادل نخواستہ بولی۔ '' میں دعا کروں گی آپ خیریت سے آ جائیں۔''

جب میں جھونپڑی سے نکل کر اس گاؤں کی جانب برق رفتاری سے چل پڑا تو یوں محسوس ہوا کہ رات آسمان جیسے پھٹ پڑا تھا۔ میرے اندازے سے کہیں زیادہ جگہ جگہ پانی اور کیچڑ جمع تھا۔ راستے میں اس قدر پھسلن تھی کہ میں دو ایک مرتبہ گرتے گرتے بچا تھا۔ اب پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑ رہا تھا۔ راستہ صاف ہوتا تو یہ مسافت دس منٹ سے زیادہ نہ ہوتی۔ پھر میں جادو کے زور سے ایک پل میں غائب ہو کر پہنچ گیا تھا۔ پہلے خیال آتا تو میں یہاں آن واحد میں پہنچ جاتا۔

مجھے گاؤں کے ہوٹل میں آدھا گھنٹہ سے زائد وقت لگ گیا۔ قیمہ، آٹھ پراٹھا اور آٹھ انڈوں کے آملیٹ بنوائے۔ اس کے علاوہ آٹا، گھی اور چائے کی پتی خریدی۔ پھر خیال آیا تو ایک مرغی خرید کر ذبح کروائی۔ صفائی کروا کے اس کا گوشت بنایا تا کہ سالن پکایا جا سکے۔ جب واپس پہنچا تو مجھے گھنٹے کی تاخیر ہو چکی تھی۔ جب میں جھونپڑی کے دروازے پر پہنچا تو وہ کھلا ہوا نظر آیا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ دل کے ہر کونے میں وسوسے پھنکارتے ہوئے زہریلے سانپوں کی طرح سر اٹھانے لگے۔ معاً میری نگاہ دروازے کے کچے فرش پر پڑی۔ ننگے پیروں کے نشان تھے۔ پیروں کے پنجے بہت بڑے تھے۔ جو بھی بدمعاش آیا تھا وہ مجھ سے چوڑے قد کا تھا۔ میرا دماغ اور میری رگیں سن سنا گئی تھیں۔ میں بڑی تیزی سے اندر داخل ہوا۔ اس کمرے میں بھی اس بدمعاش کے کیچڑ بھرے پیروں کے نشان موجود تھے۔ میں دیوانہ وار چلایا۔ '' رانی!...... رانی!''

دوسرے کمرے کے اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ ایک گہری اور پر ہیبت خاموشی طاری تھی...... میں نے اس کمرے کی دہلیز کے اندر جھانکا۔ کمرا خالی پڑا ہوا تھا اور فرش پر اس کے سینڈل نظر آ رہے تھے۔ میں سن ہو کر رہ گیا۔ اگر میں نے سامان چوکی پر نہ رکھا ہوتا تو وہ چھوٹ کر گر پڑتا۔ میں کئی لمحوں تک بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ میں بت بنا ہوا تھا اور دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔

میں نے اپنے آپ کو کوسا اور کف افسوس ملنے لگا۔ رانی نے رات جس بدمعاش کو دیکھا تھا اس کا

واہمہ نہیں تھا۔ وہ ایک پڑھی لکھی اور بے حد سمجھ دار لڑکی تھی۔ لیکن میں نے اس کی بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ رانی کا ڈر اور خوف اور اندیشہ بجا تھا۔ آخر وہی ہوا جس کا دھڑکا رانی کو تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں رانی کو کہاں اور کس جگہ تلاش کروں۔ بفرض محال وہ نہیں ملی تو پھر اس کی ماں نجم النساء بیگم کو کیا منہ دکھا سکوں گا۔ پریشان کن خیالات نے مجھے دہلا کر رکھ دیا۔ حواس ایسے معطل ہوئے کہ میں بھول گیا تھا کہ میں جادو سے معلوم کر سکتا ہوں۔

میرے ذہن میں ایک کوندا لپکا تو میں باہر آ گیا۔ گو دھوپ میں بڑی تمازت تھی لیکن زمین ابھی پوری طرح خشک نہیں ہوئی تھی۔ میں پیروں کے نشان دیکھتا ہوا چل پڑا۔ بعض جگہ ایسا لگا رانی کی مزاحمت پر اسے بری طرح گھسیٹا گیا ہے۔ ایک جگہ رانی کے پیر کے نشان موجود نہیں تھے۔ صرف بدمعاش کے پیر کے نشان دکھائی دے رہے تھے جیسے اس نے رانی کو اٹھا کر کندھے پر ڈال لیا ہو۔

کوئی ایک میل کی مسافت کے بعد یہ نشان ان درختوں کے پاس پہنچ کر رک گئے جو ایک دائرے کی شکل میں چاروں طرف کھڑے تھے۔ ان درختوں کے بیچ ایک جھونپڑی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ رانی کو یہاں لایا گیا ہے۔ میں دبے قدموں جھونپڑی کے احاطے میں داخل ہو گیا۔ میں نے بہت ساری آوازیں سنیں۔ یہ آوازیں سامان گرنے اور توڑ پھوڑ کی تھیں۔ پھر رانی کی دہشت زدہ سی آواز گونجی۔

''خبردار......! میرے نزدیک مت آنا...... مجھے ہاتھ مت لگانا؟'' ایک استہزائیہ آواز کرخت لہجے میں اس کمرے میں گونجی تو باہر تک سنائی دی۔

پھر فضا پر چند ثانیوں کے لئے ایک ابدی سناٹا چھا گیا۔ اگلے لمحے ایک ایسی دل خراش چیخ فضا میں گونجی کہ ایک لحظہ کے لئے میرے دل کی حرکت بند ہو گئی۔ پھر دوسرے لمحے میں چونکا اور اندر کی طرف کوندا بن کر لپکا۔ میں اندر داخل ہو کر اس کمرے کی دہلیز پر ٹھٹک کر رک گیا۔ وہ بدمعاش خون میں لت پت دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ پکڑے اوندھے منہ پڑا ہوا تھا۔ اس کا دم نکل گیا تھا۔ رانی اپنے ہاتھ میں بندوق لئے کھڑی ہوئی تھی۔ وہ میرے پیروں کی آہٹ سن کر چوکنا ہو گئی اور اس نے نال کا رخ دروازے کی طرف کر لیا تھا۔ نال میری جانب اٹھ گئی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف لپکی۔ بندوق فرش پر پھینک کر میرے سینے سے آ لگی اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ میں نے اسے بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اس کے آنسوؤں کو رخساروں سے ہونٹوں میں جذب کرتے ہوئے بڑے پیار سے سمجھاتے ہوئے اس کے سر کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔

'' رانی!...... تم نے کوئی جرم نہیں کیا ہے...... تم بے قصور ہو......'' پھر میری نگاہ اس بدمعاش کی جانب اٹھ گئی۔ میں اسے دیکھتے ہی یک بارگی چونک پڑا۔

مجھے جیسے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا۔ میرے کان بھی جاگ اٹھے تھے۔ میں نے کچھ دیر پہلے جو استہزائیہ لہجہ سنا تھا اس پر مجھے شک ہوا تھا کہ یہ آواز مانوس سی ہے۔ اس وقت میں نے دھیان نہیں دیا تھا۔ میں نے تڑپ کر رانی کو بازوؤں کے حصار سے نکالا اور لاش کے پاس گیا۔ میں اپنے جوتے کی نوک سے اس

بدمعاش کی لاش کو سیدھا کرنے والا تھا کہ رانی فوراً ہی بول اٹھی۔ "سکندر! یہ آپ کا دوست چوہدری ہے......"

"چوہدری......؟" مجھے سن سا دینے والا بجلی کا جھٹکا لگا۔ مجھے اپنی سماعت پر فتور کا سا احساس ہوا۔

یہ حقیقت تھی۔ یہ چوہدری ہی تھا۔ میرے جسم میں لہو سرد ہو گیا۔ میں نے اپنے چکراتے ہوئے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ مجھے چوہدری سے ایسی امید ہرگز نہیں تھی۔ مگر میں یہ بات بہت اچھی طرح جانتا تھا اور رستم نے بتایا کہ چوہدری ایک بدکار شخص ہے۔ وہ ان مجبور اور بے بس بنگلہ دیشی لڑکیوں سے ناجائز فائدہ اٹھاتا رہتا ہے جو بنگلہ دیش سے چوری کے راستے کولکتہ جاتی ہیں اور وہاں سے پاکستان جانے کے لئے امرتسر کا یا راجستھان کا رخ کرتی ہیں۔ لیکن میرے لئے حیرت کی یہ بات تھی کہ اس کے علم میں کیسے آ گیا کہ رانی لڑکی ہے۔ شاید اس کی نگاہوں نے تاڑ لیا تھا۔ رانی نے جو بہروپ بھرا تھا اسے صرف تیز و تند نظریں ہی تاڑ سکتی تھیں۔ شاید رانی کی نسوانیت، مکھن جیسے ہاتھ پیر اور رنگت اور رخساروں نے اسے بے نقاب کر دیا تھا اور اس کا بدن بھی شاخِ گل جیسا تھا۔

چوہدری رستم کا برسوں پرانا اور قابلِ اعتماد دوست تھا۔ میں نے ایک ماہر جادوگر ہوتے ہوئے کبھی بھی کسی لڑکی سے فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔ نہ تو ان کی مجبوریوں اور کمزوریوں نے مجھے ورغلایا تھا بلکہ میں ان سے کوسوں دور بھاگتا رہا تھا۔ ناہی میں مارِ آستین ثابت ہوا تھا۔ چوہدری کی اس کمینگی پر سخت غصہ آیا اور اس کی موت سے دل کو دکھ بھی پہنچا تھا۔ کیوں کہ وہ رستم کا دوست تھا۔ پھر مجھے رانی نے بتایا کہ چوہدری اسے بندوق کے زور پر یہاں لایا تھا۔

میں رانی کو لے کر چوہدری کی جھونپڑی میں آ گیا تھا۔ رانی نے جلد ہی خود پر قابو پا لیا تھا۔ اس لئے کہ میں نے اسے دلاسا دیا، دل جوئی کی اور کافی دیر تک ہم دونوں محبت کی دنیا میں ڈوبے رہے تھے۔

میں سارا راستہ سوچتا رہا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ رانی کیف کے جہاں سے نکل کر اس قدر خوف زدہ ہو گئی تھی کہ وہ اسی وقت چل پڑنے پر اصرار کرنے لگی۔ اس لئے کہ کہیں وہ قتل کرنے کے الزام میں دھر لی نہ جائے۔ میں نے اسے بڑی مشکل سے سمجھایا کہ چوہدری کی موت کا علم دو ایک دن بعد ہی ہو سکے گا۔ ہم تو اس وقت بنگلہ دیش میں ہوں گے۔ ہمارے خلاف کوئی ثبوت اور عینی گواہ نہیں ہے۔ ہم لوگ آج سہ پہر کے وقت یہاں سے چل پڑیں گے۔ چاہے ایک سو بیس میل کی رفتار سے طوفان کیوں نہ آ جائے۔ اگر ہم اس وقت نکل پڑے تو گشتی فوج کے ہتھے چڑھ سکتے ہیں۔ وہ ہمیں دشمن کے جاسوس سمجھ کر گرفتار کر لیں گے۔ اور رانی کو پھول کی مانند مسلتے اور روندتے رہیں گے۔

❃......❃......❃

میں جو انڈوں کا آملیٹ، قیمہ اور پراٹھا لایا تھا وہ ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ ہم دونوں نے مل کر چولہا جلایا۔ قیمہ، آملیٹ اور پراٹھے گرم کئے۔ مرغی کا گوشت دھو کر دوپہر کے لئے رکھ دیا۔ رانی کھانا پکانے کے معاملے میں بالکل کوری واقع ہوئی تھی۔ ظاہر تھا اس کے ہاں نوکروں کی ایک فوج ہمہ وقت چوکس اور تیار رہتی تھی اس لئے وہ باورچی خانے میں جھانکتی بھی نہیں تھی جیسا کہ اس نے مجھے ناشتے کے دوران بتایا کہ وہ

رقص، موسیقی، تیراکی، جوڈو کراٹے، سیاحت اور انگریزی فلموں کی بہت زیادہ دل دادہ ہے۔ انگریزی ناول روز ہی پڑھتی ہے۔ رات گئے تک ڈی وی ڈی پر انگریزی کی رومانی فلمیں دیکھتی رہتی ہے۔ اس لئے اسے دیر سے نیند آتی ہے۔ اس کے دوستوں میں لڑکیوں، لڑکوں کی تعداد زیادہ ہے۔

اس نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ "آپ نے کہاں تک تعلیم حاصل کی ہوئی ہے؟"

"میں نے گریجویشن کیا ہوا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "میرے خیال میں یہ تعلیم کافی ہے۔"

"میں نے آپ کی گفتگو اور لب و لہجے سے اندازہ لگا لیا تھا کہ آپ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص ہیں۔"

رانی نے اپنی لانبی لانبی پلکیں جھپکائیں۔ "لیکن آپ نے یہ پیشہ کیوں اور کس لئے اختیار کیا ہوا ہے......؟"

"تاکہ آپ سے ملاقات ہو جائے۔" میں نے اس کے حسین چہرے پر نگاہیں مرکوز کر کے شوخ لہجے میں کہا۔

"جی......" اس نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ وہ میری بات پہلے تو نہیں سمجھی تھی۔ دوسرے لمحے اس کے رخساروں کی گلابی رنگت اور گہری ہو گئی۔ اس نے پھر لجا کر اپنا سر جھکا لیا۔

"آپ یہ پیشہ چھوڑ کیوں نہیں دیتے......؟"

"میں خود بھی اس پیشے سے بہت بیزار اور تنگ آ چکا ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ میں اسے اپنے بارے میں بتانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے بھی کہ میں ایک پردیسی جو تھا۔ "حالات کی مجبوریوں کے باعث اس دلدل میں گر چکا ہوں۔ اس میں سے جتنا نکلنے کی کوشش کرتا ہوں اتنا ہی دھنس جاتا ہوں۔ نکلنے کے لئے تنکے کا سہارا بھی تو نہیں ہے۔"

"میں ممی سے کہہ کر آپ کو کسی اور اچھی فرم میں ملازمت دلوا دوں گی۔" رانی نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "ممی چاہیں تو آپ کو اپنا بزنس پارٹنر بھی بنا سکتی ہیں یا پھر فرم میں کوئی عہدہ بھی سونپ سکتی ہیں۔ ان کا بڑا اثر و رسوخ اور ہر جگہ پہنچ بھی ہے۔"

"میں پیشگی طور پر آپ کا اور آپ کی ممی کا بے حد ممنون ہوں۔" میں نے اس کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھا۔

دفعتاً میں نے ایک آواز سی جو بہت دور سے سنائی دے رہی تھی۔ رانی بھی بری طرح چونک پڑی تھی۔ جب ہم دونوں نے اپنے کان لگائے تو اس آواز کو پہچاننے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ کیوں کہ جو بھی گاڑی تھی وہ ہماری ہی جانب آ رہی تھی۔ رانی کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ یہ گشتی فوج کی جیپ بھی ہو سکتی تھی جو ریلوے لائن کے پاس سے بڑی تیزی سے آ رہی تھی۔ "گھبراؤ نہیں۔" میں نے رانی کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ بے حد سرد ہو رہا تھا۔ میں نے اسے دلاسا دیا۔ "بفرضِ محال وہ لوگ اندر آئے تو اپنے آپ کو حتی الامکان پرسکون ظاہر کرنا۔ میں ان سے کہوں گا کہ ہم چوہدری کے مہمان ہیں۔"

رانی کی آواز حلق میں پھنسنے لگی۔ "اگر ان لوگوں نے مجھے آواز سے پہچان لیا تو میں ان سے کیا کہوں گی؟"

”کہہ دینا کہ ہم میاں بیوی ہیں۔“ میں نے اس کی پشت تھپ تھپائی۔ ”وہ چوہدری کو جانتے ہوں گے۔“

”اگر انہوں نے چوہدری کے بارے میں پوچھ لیا۔ فرض کریں کہ وہ اس کی لاش کو دیکھ کر آ رہے ہوں تو پھر ہمارا دھر لیا جانا یقینی ہے۔“ رانی کی وحشت میں جیسے اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ”کہیں وہ ہم دونوں کو قتل کے الزام میں گرفتار نہ کر لیں......؟“

”جیپ یا گاڑی اس طرف جا نہیں سکتی کیوں کہ ادھر کا راستہ نالے سے گزرتا ہے اور وہاں کوئی ایسی پلیا بھی نہیں ہے کہ گاڑی اس پر سے گزر سکے۔“ میں نے اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”آپ طرح طرح کے اندیشوں سے اپنے آپ کو خائف نہ کریں۔“

رانی بے جان سی ہو کر چوکی پر بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ سفید چادر کی طرح ہو رہا تھا۔ میں نے اس کے پاس بیٹھ کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو وہ نہ صرف ابھی تک سرد تھا بلکہ مرتعش بھی ہو رہا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ کی پشت تھپ تھپاتے ہوئے دلاسا دیا۔

”رانی!“ نہ جانے کیوں میرا لہجہ جذباتی ہو گیا۔ ”اگر ان لوگوں نے ہمیں چوہدری کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا تو میں اس کی ساری ذمے داری اپنے سر لے لوں گا۔ میں ان لوگوں سے کہوں گا کہ وہ میری بیوی کو سیر کے بہانے اس مکان میں لے گیا اور گن پوائنٹ پر اس کی بے حرمتی کی۔ میں اپنی بیوی کی بے عزتی برداشت نہیں کر سکا اور اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔“

رانی میرے اس جذبے سے یک لخت چونک پڑی۔ اس کے لئے یہ سب کچھ غیر متوقع اور ناقابل یقین تھا۔ وہ شاید سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میں اس کے جرم کا الزام اپنے سر بھی لے سکتا ہوں۔ شاید اس کا کوئی اپنا بھی ہوتا تو اس ایثار کا مظاہرہ نہیں کرتا۔ کیوں کہ اس جرم کی سزا معمولی نہیں تھی۔ عمر قید یا پھانسی بھی ہو سکتی تھی۔ اس نے حیرت سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری آنکھوں میں جھانکا۔ وہ اپنی جگہ دم بخود تھی۔ اس کے سینے میں سانسوں کا تلاطم ہچکولے کھا رہا تھا۔ پھر معاً اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں حیرت کی جگہ ممنونیت نے لے لی۔

”سکندر!“ اس نے اپنا خوش نما اور سوندھی سوندھی خوشبو سے مہکتا ہوا سر میرے شانے پر رکھ دیا۔

”آپ نے میری ماں کی جان بچا کر انہیں ایک نئی زندگی دلائی ہے۔“ وہ شدت جذبات سے مغلوب ہو کر بولی تو اس کی آواز بھرا سی گئی۔ ”اور آج مجھے آپ کے طفیل ایک نئی زندگی مل رہی ہے کیا ہم آپ کے ان عظیم احسانات کا بدلہ چکا سکیں گے؟“

”میں یہ سب کچھ کسی صلے کی غرض سے نہیں کر رہا ہوں۔“ میں نے اس کے ریشمی سیاہ بالوں کو سہلایا۔ ”آپ میری فکر نہ کریں۔ میں اپنے آپ کو انسان کے بنائے ہوئے قانون سے بچا لوں گا۔ بہت سارے راستے موجود ہیں۔ لہٰذا آپ میری فکر نہ کریں۔“

”سکندر!......سکندر!......“ وہ اپنا چہرہ میرے سینے میں چھپا کر بلکنے لگی۔

میں نے اس کا پھول سا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں بھر لیا۔ پھر میں نے ایک ہاتھ سے اس کی

شہابی رخساروں پر بہتے ہوئے آنسو پونچھے تو وہ جذباتی ہو کر میرے چہرے پر جھک گئی۔ اس وقت اسے جیسے کسی بات کی پروا اور فکر نہ رہی تھی۔

”وہ جیپ قریب آتی جا رہی ہے۔ رانی! اپنے آپ کو سنبھالو۔ ورنہ یہ فوجی ذرہ برابر شک پر بھی بخشنے والے نہیں ہیں۔ ہمیں اپنے آپ کو ایک خوش مزاج جوڑا ثابت کرنا ہوگا۔ وہ آپ کی آنکھوں میں آنسو اور زرد سا چہرہ دیکھ کر مشکوک ہو جائیں گے۔ پھر وہ ہماری کسی بات کو سچ تسلیم نہیں کریں گے۔“

کچھ دیر بعد محشر کی گھڑی آ ہی گئی۔ دیر سویرا سے آنا ہی تھا۔ وہ جیپ بڑی تیزی سے آ کر جھونپڑی کے سامنے رکی۔ اس کے انجن کی گڑگڑاہٹ گونجتی رہی۔ انجن شاید اس لئے بند نہیں کیا گیا تھا کہ انہیں واپسی میں جلدی ہوگی۔ یہ احساس فرحت بخش تھا۔ لیکن پھر بھی مجھے یوں محسوس ہوا کہ زہر میں بجھی ہوئی برچھی میرے سینے میں اترتی چلی جا رہی ہے۔ حلق خشک ہو گیا تھا۔ میں نے رانی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ سفید پڑتا چلا گیا۔ اور وہ تھر تھر کانپتی جا رہی تھی۔ وہ خود پر جو قابو پانے کی جدوجہد کر رہی تھی وہ بے سود ثابت ہو رہی تھی۔

”رانی!“ میں نے سرگوشی کی تو میری آواز کانپ رہی تھی۔ ”پلیز! اپنے آپ کو سنبھالیں۔ ہراساں نہ ہوں......“

جیپ سے کئی آدمی ایک ساتھ کودے تھے۔ دھپ دھپ کی وحشت ناک آوازیں ذہن پر ہتھوڑے برسانے لگیں۔ میری حالت بھی غیر ہونے لگی تھی مجھے اپنے آپ کو سنبھالنا بے حد دشوار سا لگا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر یکایک کسی نے ایک لات دروازے پر رسید کی کمزور دروازہ اس حملے کی تاب نہ لا سکا۔ وہ دم توڑ گیا۔ یکے بعد دیگرے چار آدمی دندناتے ہوئے اندر گھس آئے۔ یہ دیکھ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ وہ فوجی نہیں ہیں۔ ان کے جسموں پر شہری لباس تھے لیکن چاروں اپنے چہروں سے پراسرار دکھائی دے رہے تھے۔ اندر داخل ہونے کے جارحانہ انداز نے انہیں خطرناک بنا دیا تھا۔

متعدد آدمی پہرے دار بن کر دروازے پر کھڑے ہو گئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں خوف ناک قسم کے ریوالور تھے۔ وہ اپنی وضع قطع سے بدمعاش لگ رہے تھے لیکن جو دو آدمی ہمارے مقابل تھے ان میں سے ایک شخص میری جسامت اور بلند قامت تھا۔ دوسرا شخص پستہ قد، موٹا اور بھدا تھا۔ وہ دونوں مہذب، دولت مند اور بڑے آدمی لگتے تھے لیکن پستہ قد آدمی کے چہرے پر ایک عجیب سی کمینگی چھائی ہوئی تھی اس نے اپنے بلند قامت ساتھی سے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”یہ رہی نیلوفر مصباح الدین جسے عرفیت میں رانی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔“

رانی نے ان لوگوں کو پہچان لیا تھا۔ وہ حواس باختہ ہو کر میری پشت پر آ گئی۔ اس نے جیسے اپنے آپ کو میری پناہ دے دیا تھا۔ اس نے میری پشت پر سرگوشی کی۔ ”سکندر! یہ ذلیل مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

پھر اس پستہ قد شخص نے بلند قامت والے شخص کی توجہ میری جانب مبذول کرائی۔ ”یہ وہی جیمز بانڈ ہے جس نے رانی کی ماں نجم النساء بیگم کو ہمارے آدمیوں کے ہاتھوں نشانہ بننے سے بچایا تھا۔ ورنہ آج اس عورت کا سوئم ہوتا......“

پستہ قد شخص جو کسی وحشی درندے کی طرح لگ رہا تھا۔ اس نے سفاک لہجے میں ہم دونوں کو حکم دیا۔

"ہمارے ساتھ خاموشی سے چلے آؤ۔ یہاں کسی بہادری کے مظاہرے کی ضرورت نہیں...... یہ کولکتہ کی سڑک نہیں ہے۔"

میں کسی حد تک اس معاملے کی تہہ میں پہنچ گیا تھا۔ یہ لوگ نجم النساء بیگم کے خاندان کے دشمن ہیں۔ کسی وجہ سے ان دونوں کی جان کے درپے ہیں۔ وہ وجہ کیا ہے......؟ میں اب بھی اندھیرے میں تھا۔ نجم النساء بیگم نے مجھے ایک خطرے کی جانب اشارہ کیا تھا۔ مگر رانی نے بتانا گوارا نہیں کیا۔ جب کہ وہ میرے قریب آ گئی تھی اور ہم دونوں کے درمیان کوئی حجاب اور اجنبیت نہیں رہی تھی۔ اگر مجھے کچھ معلوم ہوتا تو شاید یہ نوبت نہیں آتی۔ میں کوئی اور راہ اختیار کر لیتا۔ رانی کو اس کے دشمنوں سے صاف بچا کر لے جاتا لیکن اب کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا ایک طرح سے تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ میں دانستہ ابھی جادو سے کام لینا نہیں چاہتا تھا۔ تیل کی دھار دیکھ رہا تھا۔

میں نے بغیر کسی تاخیر کے اس پستہ قد شخص کے حکم کی تعمیل کی۔ مجھے انکار کرنے کی صورت میں حشر کا اندازہ تھا۔ جب میں نے بیرونی دروازے کی جانب بڑھنے کے لیے قدم اٹھایا تو رانی نے پیچھے سے میرا بازو پکڑ لیا اور آگے جانے سے روکا۔ میں نے مڑ کے اس کے ہاتھ سے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے اس کی دہشت زدہ آنکھوں میں جھانکا اور اس کے کان کے پاس منہ لے جا کر سرگوشی کی۔ "چلنا ہمارے حق میں بہتر ہوگا۔"

رانی نے سر جھکا کر اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ میں اسے سہارا دیتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا۔ اس کی حالت اس مجرم کی سی ہو رہی تھی جسے تختہ دار کی طرف لے جایا جا رہا ہو۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی سی چلنے لگی تو پستہ قد اور بلند قامت آدمی ایک طرف ہو گئے اور مسلح بدمعاش باہر نکل گئے۔ پستہ قامت نے تمسخرانہ لہجے میں رانی پر فقرہ کسا۔ "کل تم نے تن تنہا میرے آدمیوں کا کچومر نکال دیا تھا۔ آج ابھی سے تمہارا کچومر کیوں نکلا جا رہا ہے۔" رانی یک لخت رک گئی جیسے وہ اس کی بات کا جواب دینا چاہتی ہو۔ "پٹیل صاحب!" رانی نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ "تم جیسے حرام زادے، غدار اور نمک حرام ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔"

پٹیل کے تن بدن میں جیسے آگ لگ گئی۔ اسے شاید توقع نہیں تھی کہ رانی اس کے منہ پر جوتا مارے گی۔ وہ سرخ ہو کر رانی کی طرف بڑھنے لگا تو بلند قامت شخص نے اس کا بازو پکڑ کر روک لیا۔ "ایسی جلدی کیا ہے پٹیل صاحب! وہاں چل کر گن گن کر بدلہ لے لینا۔"

"آرائیں صاحب!" رانی نے تڑاخ سے جواب دیا۔ "سنا ہے آپ کی صاحب زادی! ثمرین فلم کی ہیروئن بننے کے شوق میں بڑی تیزی سے فلم سازی اور ہدایت کاروں میں تقسیم ہو رہی ہے......؟"

"زبان کو لگام دے گستاخ لڑکی!" آرائیں صاحب کا پارہ چڑھ گیا۔ ان کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہکنے لگیں۔ "تو کیا چاہتی ہے؟"

"آپ دونوں بھی اپنی گندی زبانیں بند رکھیں۔" رانی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "میں نے آپ دونوں کی گھر کی عزت کو......"

رانی نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ آرائیں ڈرائیور کی نشست پر جا بیٹھا اور اس نے اسٹیرنگ سنبھال

لیا۔ پٹیل اس کے پہلو میں جا کر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں مسلح بدمعاش ہمارے بالکل سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے ریوالور کا رخ ہماری جانب تھا۔ وہ اپنی جگہ پوری طرح چوکس تھے۔ ان کی کھردری اور سخت انگلیاں لبلبی پر رکھی ہوئی تھیں۔ اگر ہم دونوں میں سے کوئی بھی فرار کی کوشش کرتا تو شاید وہ فائر جھونکنے میں تامل نہیں کرتے۔ یہ ان کے تیور سے ظاہر تھا۔ پٹیل بار بار ہم دونوں کی طرف مڑ کے دیکھتا تو اس کے چہرے پر تمسخرانہ پن گہرا ہو جاتا اور اس کی آنکھوں میں میلا پن بھر جاتا اور اس کی گرسنہ نگاہیں رانی کے جسم کے نشیب و فراز پر پھسلنے لگتیں۔ رانی کا چہرہ سرخ ہو جاتا۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ کسی بدمعاش سے ریوالور چھین کر پٹیل کی دونوں آنکھیں پھوڑ دیتی۔ وہ اندر ہی اندر کھول جاتی تھی۔

ایک مرتبہ پٹیل نے رانی کا منہ چڑایا تو اس سے برداشت نہ ہو سکا۔ اس نے پٹیل کے منہ پر تھوک دیا۔ پٹیل نے طیش میں آ کر گاڑی رکوانا چاہی۔ شاید وہ رانی کو جیپ سے اتار کر کوئی ایسی سزا دینا چاہتا تھا جس سے اس کے دل کی حسرت پوری ہو۔ شاید دست درازی کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔ کیوں کہ رانی نے اس کے منہ پر تھوک کر اس کی بے عزتی اور ذلیل بھی کیا تھا۔ آرائیں نے اسے سمجھایا۔ "صبر کرو میرے یار! جلد بازی نہ کرو۔ یہ ہمارے ہاتھ سے بچ کر جائے گی کہاں......؟ اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے۔ عورت کی نفرت میں بھی محبت چھپی ہوتی ہے؟ وہ تم پر سو جان سے عاشق ہو گئی ہے۔ جب ہی تم پر ڈورے ڈال رہی ہے۔ نازنینوں کی ادائیں ہی نرالی ہوتی ہیں۔ وہ دیکھو غصے میں وہ کتنی حسین اور پیاری سی لگ رہی ہے۔"

رانی نے کچھ کہنا چاہا تو میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں بات بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ اس سے کچھ حاصل نہ تھا۔ یہ بدمعاش تھے۔ ان سے کوئی بات بعید نہیں تھی۔ خاموشی بہتر تھی۔ جیپ کہاں جا رہی تھی میں اس کی سمت سے کوئی اندازہ نہیں کر سکا۔ میں اندر سے پرسکون تھا۔ اطمینان سے یہ سارا کھیل دیکھ رہا تھا۔ وہ نہ تو بون گاؤں کی جانب جا رہے تھے اور نہ ہی سرحدی چوکی کی طرف گاڑی لے جا رہے تھے۔ ادھر رانی اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کا سینہ دھڑک رہا تھا۔

کوئی ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت کے بعد گاڑی ایک حویلی نما مکان کے سامنے جا کر رکی۔ اس کی حالت ایک کھنڈر کی سی ہو رہی تھی۔ اس کے قرب و جوار میں دور دور تک کوئی آبادی نہیں تھی۔ زمین بھی ویران پڑی ہوئی تھی اور لمبی لمبی گھاس قدم قدم پر اگی ہوئی تھی۔ ایک گہرا سناٹا چاروں طرف چھایا ہوا تھا۔

ہم دونوں کو وہ دونوں بدمعاش ریوالور کی زد پر حویلی کے اندر لے آئے۔ داخل ہوتے ہی ہم ایک بڑے کمرے میں آ گئے تھے۔ آرائیں اور پٹیل نے ان دونوں بدمعاشوں کے ہاتھوں سے ریوالور لے لئے تھے۔ پھر آرائیں نے ان سے کہا کہ وہ باہر جا کر گاڑی میں بیٹھیں۔ اس دوران میں نے موقع پا کر رانی کے کان میں سرگوشی کی۔ "ان دونوں کے پاس صرف دو ریوالور ہیں۔ آپ مہارت سے ان پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ ادھر میں بھی چاقو چلانے کا فن دکھاؤں گا اور انہیں زیر کر لیں گے۔ صرف حوصلے کی ضرورت ہے، کامیابی قدم چوم لے گی۔"

رانی نے میری بات سن کر سر ہلایا اور آنکھوں سے یہ اشارہ دیا کہ وہ اس کے لیے تیار ہے۔ پٹیل نے

مجھے سرگوشی کرتے دیکھ لیا تھا۔ اس لیے اس نے چیخ کر تیز و تند لہجے میں پوچھا۔ ”گدھے کے بچے! تم اس لڑکی کو کیا سبق پڑھا رہے ہو؟“

میں اس سے الجھنا نہیں چاہتا تھا لیکن اس نے گدھے کے بچے کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ غصہ بہت آیا۔ پھر میں ضبط کر کے جواب دیا۔ ”میں آج کی پھولن دیوی سے کہہ رہا ہوں کہ پٹیل صاحب کی ہر بات مان لو...... انکاری ہونے کی صورت میں سراسر ہمارا اپنا نقصان ہے۔ اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ یہ وقت ہٹ دھرمی اور بے جا ضد کا نہیں ہے۔“

”یہ لڑکا تو سمجھ دار دکھائی دیتا ہے۔“ پٹیل نے آرائیں کی طرف دیکھتے ہوئے استہزائیہ لہجے میں کہا اور ایک بھونڈا سا قہقہہ لگایا۔ آرائیں نے اپنے ریوالور کا رخ رانی کی طرف کرتے ہوئے تیز و تند لہجے میں پوچھا۔ ”مس رانی! وہ ہیرے کہاں ہیں؟“

”ہیرے......؟ کون سے ہیرے......؟ کیسے ہیرے......؟“ رانی بڑے زور سے چونکی اور اس کے چہرے پر استعجاب سا چھا گیا۔

”انجان مت بنو اور مجھے بے وقوف نہ بناؤ۔“ آرائیں نے حقارت بھرے لہجے میں کہا۔ ”وہی ہیرے جو دو کروڑ کی مالیت کے ہیں۔“ میں ششدر ہو کر رہ گیا۔ دو کروڑ کی مالیت کے ذکر سے میری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ لمحے کے لیے مجھے اپنی سماعت پر فتور کا احساس ہوا۔ دوسرے لمحے سارا کھیل میری سمجھ میں آ گیا لیکن وہ ہیرے رانی کے پاس نہیں تھے۔ اگر ہوتے تو وہ میری نظروں میں آ جاتے اس رات اس نے مجھے اپنا تن من سونپ دیا تھا۔ اس کے لباس میں چھپے ہوتے تو وہ ظاہر ہو جاتے۔

”ہماری معلومات غلط نہیں ہیں جانِ من!“ پٹیل نے اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھا۔ ”وہ ہیرے بنارس کے مندر سے اٹھائے ہوئے ہیں۔ جو تمہاری پیاری پیاری ممی نے صرف ایک لاکھ روپے میں حاصل کیے تھے۔ ہم بھی اس کاروبار میں برابر کے شریک تھے۔ تمہاری ماں نے معاہدہ کیا تھا۔ تمہاری ماں نے دھوکے بازی سے وہ ہیرے حاصل کر لیے۔ بڑی مکار اور عیار عورت ہے نے اپنا رنگ دکھایا لیکن ہم انہیں آسانی سے ہضم ہونے نہیں دیں گے۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ تم ہیرے اپنے ساتھ لے جا رہے ہو؟“

”بے ایمان...... فر ؛ ئ آپ دونوں ہی نکلے۔“ رانی نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”آپ لرگ وہ ہیرے لے کر بنکاک جا رہے تھے۔ وہ تو ممی کے نصیب اچھے تھے کہ وہ ہیرے ممی کے ہاتھ لگ گئے۔ اگر وہ بروقت ہوشیاری سے کام نہ لیتیں تو پھر ہاتھ دھونا پڑتے۔“

”یہ سب اس گدھے کی وجہ سے ہوا ہے۔“ آرائیں نے استہزائیہ انداز سے پٹیل کی طرف دیکھا۔ ”تمہاری ماں کے حسن و شباب قرب اور بے حجابی نے اس گدھے کو اندھا بنا دیا۔ اسے اس قدر شراب پلا دی کہ وہ نشے میں دھت ہو گیا۔ احمق یہ سمجھا تھا کہ تمہاری ماں اس پر مہربان ہو جائے گی۔ وہ ہیرے لے کر اڑ گئی۔ یہ ہیروں اور تمہاری ممی سے بھی محروم ہو گیا لیکن بے بی...... یہ مت بھولو کہ ہم وہ ہیرے حاصل نہیں کر سکیں گے۔ ہم ہر قیمت پر حاصل کر کے رہیں گے۔ تم دیکھ لینا۔“

”میری ماں ایسی نہیں تھی کہ وہ اس شخص کو پھانسنے کے لیے بے حیا بن جاتی۔“ رانی تنک کر بولی۔ ”تم انہیں میرے سامنے ذلیل نہ کرو۔“

”یہ حقیقت ہے کہ تمہاری ماں نے مجھ سے کچھ دیر تک دل بہلایا۔ محبت کا ڈراما کیا۔ مجھ سے یہ بھی کہا کہ میں تم سے شادی کر لوں گی اور مجھے خوب من مانی کرنے دیا اور شراب پلا کر مدہوش کر دیا۔ پھر کلوروفارم سونگھا دیا۔ ہیرے الماری کی تجوری سے نکال کر چلی گئی۔ یہ میری بے وقوفی نہیں تھی بلکہ تمہاری ماں کا حسن تھا جس کے جال میں میں پھنس گیا۔ واقعی تمہاری ماں اس عمر میں بھی کیا لاجواب چیز ہے۔ وہ تمہاری ماں نہیں بڑی بہن لگتی ہے۔ میں اس سے شادی کرنے پر بھی تیار ہوں۔ یہ رشتے ناتے تو بعد میں بھی طے ہو سکتے ہیں لیکن تم نے میرے سوالوں کا جواب نہیں دیا۔“ پٹیل نے آرائیں کے استہزائیہ انداز کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا تم نے از ہیروں کو لے جانے کے لیے یہ راستہ اختیار نہیں کیا؟ صرف اس لیے کہ ہمیں دھوکے میں رکھا جا سکے اور ہم ڈھاکا ایئر پورٹ پر ربوٹوں کی طرح کھڑے رہیں۔ تمہاری ماں کو اغوا کر کے اس کی تلاشی لی جائے تو ہیرے برآمد نہ ہو سکیں۔ تلاشی کا سنہرا موقع بھی ہاتھ سے نکل گیا۔“

”میں ایک ذلیل شخص کو منہ لگانا نہیں چاہتی جو میری شریف ماں کی کردار کشی کر ر ہے۔“ رانی کا پارہ چڑھ گیا۔ اگر اس کا بس چلتا تو پٹیل کا منہ نوچ لیتی۔ ”تم دونوں کان کھول کر سن لو میرے پاس ہیرے نہیں ہیں۔ نہیں ہیں...... نہیں ہیر ے۔“

”اگر تمہارے پاس ہیرے نہیں ہیں تو تم اس شخص کے ساتھ چوری چھپے اور اس راستے سے ڈھاکہ کیوں جا رہی ہو؟“ ا رائیں نے پوچھا۔

”یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔“ رانی نے تنک کر جواب دیا۔ ”میں تمہاری نوکر نہیں ہوں۔ کون ہوتے ہو تم یہ سوال پوچھنے والے......؟“

”ہماری تسلی جبھی ہو سکتی ہے کہ تم ہمیں اپنی تلاشی دو۔“ پٹیل مسکراتے ہوئے معنی خیز لہجے میں بولا۔ ”میں خود تمہاری تلاشی لوں گا۔“

”گدھے...... سور...... کمینے۔“ رانی کی آنکھیں شعلے برسا ۔ ا۔ ”خبردار جو تم نے میرے بدن کو ہاتھ لگایا۔ اگر تمہیں ایسا ہی شوق ہے تو اپنی ماں بہن کی تلاشی لو منشیات اسمگل کرتی ہیں بیرون ملک جا کر اور غیر مردوں کے ساتھ سوتی بھی ہیں“

میرا خیال تھا کہ رانی کے اس ریمارکس پر پٹیل کو غصہ آ جائے گا۔ وہ یہ توہین اور بے عزتی برداشت نہیں کرے گا اور رانی کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کرے گا۔ اس نے ایسا نہیں کیا کیوں کہ وہ انتہائی بے غیرت شخص تھا اور وہ یہ جانتا تھا کہ رانی کیسی خطرناک لڑکی ہے۔ جوڈو کراٹے کی ماہر بھی ہے۔ وہ بھونڈے پن سے بے تحاشا ہنسنے لگا اور ہنستے ہوئے بولا۔

”رانی! تم بھی بڑی دل لگی کرتی ہو۔ کیا میں تمہارے متعلق نہیں جانتا کہ صرف ڈھاکا ہی میں نہیں بلکہ کولکتہ میں بھی تمہارا بڑا چرچا ہے۔“

"ڈرامے بازی بند کرو۔" آرائیں نے سخت لہجے میں رانی کو مخاطب کیا۔ "ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے کہ تمہارے نخرے سہیں۔ تم تلاشی نہ دینا چاہتی ہو نہ دو لیکن ہیرے تو دے دو۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے عوض ہم تمہاری جان بخشی کر دیں۔ ورنہ بصورت دیگر نہ صرف تمہاری تلاشی لیں گے بلکہ دل کے سارے ارمان ہم دونوں پورے کریں گے اور اس حویلی میں زندہ دفن کر دیں گے۔"

"آپ کو تلاشی لینا ہی تھا تو چوہدری کے ہاتھ تلاشی لے لیتے۔" میں نے آرائیں کی دھمکی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ دراصل وہ مجھ سے واقف نہیں تھا اور نہ ہی میں اسے جتانا چاہتا تھا۔ "ہم دونوں کو یہاں لانے کا مقصد کیا ہے؟ کیا آپ لوگوں نے وقت ضائع نہیں کیا؟"

"آرائیں نے بتایا تھا کہ رانی سے دل بہلانا اور اس کی ماں نے میرے ساتھ جو کچھ کیا اس کا بدلہ لینا اور پھر تم دونوں کی تدفین۔"

پٹیل دانت کچکچا کر بولا۔ "پھر تم دونوں کی تدفین کے بعد نجم النساء بیگم کو موت کے گھاٹ اتارنا ہے تاکہ وہ ہیروں کا راز اپنی زبان پر نہ لا سکے۔"

"میں نے کہہ دیا ہے نا کہ ہیرے میرے پاس نہیں ہیں ممی نے...... تم دونوں کو بے وقوف بنانے اور الجھانے کے لیے اس راستے سے روانہ کیا ہے۔ اس بار وہ تم دونوں کو الو بنا گئیں اور تم دونوں گدھے بھی ہو۔" رانی ہذیانی لہجے میں مٹھیاں بھینچ کر بولی۔

"میں بھی رانی کی بات کی سچائی کا یقین دلاتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اگر ایسی بات ہوتی تو بیگم بھی مجھے اعتماد میں ضرور لیتیں۔"

"تم اپنی چونچ بند رکھو۔" پٹیل دھاڑا۔ "ابھی معلوم ہوا جاتا ہے کہ رانی کے پاس ہیرے ہیں یا نہیں...... گورکھا چوکی دار کی اطلاع غلط نہیں ہوسکتی۔ وہ ہمارا آدمی ہے...... تم لباس اتار دو۔ ورنہ میں تمہارے کپڑے پھاڑ دوں گا۔"

"خبردار...... کتے کی اولاد، میرے قریب نہ آنا۔" رانی ہیجانی لہجے میں چیخی۔ "تمہاری آنکھیں پھوڑ دوں گی۔ کمینے......"

"رانی......!" میں رانی کو سمجھانے کی غرض سے اس کے سامنے آ گیا۔ میری پیٹھ ان دونوں بدمعاشوں کی طرف ہوگئی۔ میں نے رانی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے اپنا مشورہ سمجھایا اور بلند آواز میں انہیں سنانے کے لیے کہا۔ "انہیں اپنی تسلی کر لینے دو۔ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔ یہ موٹے صاحب تلاشی لے لیں گے تو اس میں ناراض یا برہم ہونے کی ضرورت ہی کیا۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسا موٹا اور صحت مند گدھا نہیں دیکھا۔"

میں نے جو آخری جملہ کہا تھا وہ اشتعال دلانے کے لیے پٹیل کا چہرہ غصے سے آلو بخارا ہوگیا۔ اس نے مجھے خون خوار نظروں سے گھورتے ہوئے نفرت اور طیش سے کہا۔ "پہلے میں اس کتیا سے نمٹ لوں۔ ذرا اس کا خوب صورت اور نازک بدن دیکھ لوں۔ جو اس لباس میں چھپا ہوا ہے۔ پھر میں تم سے حساب

کتاب کرتا ہوں۔ پھر تیری کھال ادھیڑ کر اس میں بھس بھرتا ہوں۔"

پٹیل نے اپنا ریوالور آرائیں کی طرف بڑھایا۔ جب وہ ریوالور اس کے حوالے کر کے رانی کی طرف بڑھنے لگا تو میں دانستہ تیزی سے ہٹ گیا تاکہ رانی کی توجہ پٹیل پر اور آرائیں کی توجہ رانی پر مرکوز رہے۔ یہی وہ لمحہ تھا جس سے میں بھرپور فائدہ اٹھا سکتا تھا اور ہوا بھی یہی پٹیل اور آرائیں مجھ سے غافل ہوگئے تھے۔ میں نے بڑی پھرتی اور غیر محسوس انداز سے جیب سے چاقو نکال لیا۔ پھر چاقو کو پیچھے لے جا کر ایک جھٹکے سے کھول دیا۔

ادھر پٹیل صاحب کسی مست ہاتھی کی طرح جھومتے جھامتے اور تلاشی لینے اور اس کا بے لباس جسم دیکھنے کی خوش کن تصور میں پہنچے۔ رانی بڑے سکون واطمینان سے کھڑی رہی۔ وہ یہ سمجھے کہ رانی کو تلوار کی طرح نیام سے باہر نکال دیں گے۔ رانی نے میری بات مان لی ہے۔ انہوں نے رانی کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ رانی نے ان کے منہ پر تھوک دیا۔ رانی کا اس کے منہ پر تھوکنا تھا کہ پٹیل کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ غصے کی آگ جو بھڑک اٹھی تو اس کا چہرہ تمتما گیا۔ وہ غراتا ہوا رانی پر کسی وحشی درندے کی طرح جھپٹا جیسے اس کا لباس تاراج کر کے رکھ دے گا۔ رانی بجلی کی سی سرعت سے بیٹھ گئی۔ پٹیل کسی گینڈے کی مانند سامنے والی دیوار سے ٹکرایا۔ دیوار سے ٹکراتے ہی شاید اسے چھٹی کا دودھ یاد آ گیا تھا۔ وہ ایک زوردار کراہ کے ساتھ فرش پر آ رہا۔ ایسا لگا جیسے کوئی گینڈا لڑھک گیا ہو۔ اس کے بے ہوش ہونے میں چند ثانیے بھی نہیں لگے۔

آرائیں نے اپنے ساتھی کا جو یہ عبرت ناک حشر دیکھا تو وہ ششدر رہ گیا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس طرح سے ہوشیاری اور پھرتی کا مظاہرہ کر سکتی ہے۔ میں تو اس سنہرے لمحے کا منتظر تھا۔ میرا سنسناتا ہوا چاقو تیر کی طرح گیا اور اس کے دائیں بازو میں دھنس گیا۔ آرائیں نے خواب وخیال میں بھی نہیں سوچا ہوگا کہ اس کا واسطہ ایسے شخص سے پڑے گا۔ جب بھی اسے یہ واقعہ یاد آئے گا وہ لرز کر رہ جائے گا۔ اس کے دائیں ہاتھ سے ریوالور چھوٹ کر زمین پر گر پڑا اور اس کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکلی۔ وہ ناقابل برداشت درد کی تکلیف سے تڑپ گیا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں ریوالور کانپنے لگا۔ وہ اس پر اپنی گرفت مضبوط کر کے ہمیں نشانہ بنانا چاہتا تھا لیکن رانی نے اس کا موقع ہی نہیں دیا۔ وہ بجلی بن کر آرائیں پر گری۔ وہ کسی چیتے کی مانند فضا میں اچھلی اور اپنی ٹانگیں آرائیں کے سینے پر جما دیں۔ آرائیں چکراتا ہوا دیوار سے ٹکرایا اور فرش پر گر کر درد سے تڑپنے لگا۔ اس کے بائیں ہاتھ سے ریوالور چھوٹ کر فرش پر گر پڑا تھا۔ رانی نے پل بھر کی بھی دیر نہیں کی۔ اس نے فوراً ہی دونوں ریوالوروں پر قبضہ کر لیا اور ایک میری طرف اچھال دیا۔ اب بازی پلٹ چکی تھی۔ اب ہم ان کے رحم وکرم پر نہیں رہے تھے۔

باہر گاڑی میں بیٹھے ہوئے دونوں بدمعاش چیخوں کی آوازیں سن کر دوڑتے ہوئے اندر داخل ہوئے اور اندر آ کر انہوں نے پانسہ ہی پلٹا دیکھا تو خوف زدہ ہو کر مڑے اور بھاگ جانا چاہا۔ رانی نے ایک ماہر نشانہ باز کی طرح ان دونوں پر گولیاں چلا دیں۔ اس نے اس تیزی سے مشاق کا مظاہرہ کیا کہ میں اپنی جگہ دنگ ہو کر رہ گیا۔ رانی کی صلاحیتیں ایک ایک کر کے میرے سامنے آ رہی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ

آخر وہ کس وجہ سے آنے والے خطرات سے اس قدر خائف اور پریشان تھی۔" دونوں بدمعاش کمرے کی دہلیز پر زخمی ہو کر گر پڑے۔ ان کی ٹانگیں لہولہان تھیں۔ وہ اپنی پنڈلیاں پکڑے فرش پر لوٹ رہے تھے۔

میں آرائیں کے قریب پہنچ کر اسے تڑپتے ہوئے دیکھنے لگا۔ پھر اس پر جھک کر اپنے چاقو کے دستے پر ہاتھ رکھ کر اسے کھینچ لیا۔ آرائیں درد کی شدت سے بلبلا کر اچھلا اور ایک چیخ مار کر بے ہوش ہو گیا۔ رانی اس وقت ایک زخمی شیرنی کی طرح غضب ناک ہو رہی تھی۔ وہ پٹیل کے سینے پر اپنا پیر رکھ کر اس کی کھوپڑی کا نشانہ لینے لگی۔ اس کے حسین چہرے پر اس وقت ایک پیشہ ور قاتل کی سی سفاکی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے بجلی کی سی سرعت سے لپک کر اس کا ہاتھ اوپر اٹھا دیا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو گولی پٹیل کی کھوپڑی میں سوراخ کر کے نکل جاتی۔ رانی مزاحمت کر کے اپنا ہاتھ چھڑانے لگی۔ اس پر دیوانگی طاری ہو گئی تھی۔ وہ ہذیانی لہجے میں بولی۔ "میں اس کمینے کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ اس نے میری ماں کی بے حرمتی کرنے کی کوشش کی تھی اور مجھے بھی بے آبرو کرنا اور بے لباس دیکھنا چاہتا تھا اور ہم ماں بیٹی کو قتل بھی کرنا چاہتا تھا۔ میں اس سے اپنی ماں کی توہین کا بدلہ لینا چاہتی ہوں...... اس سے اچھا موقع نہیں ملے گا۔ مجھے چھوڑ دو، اس شیطان کو شوٹ کرنے دو۔"

"رانی......!" میں اس کا ہاتھ چھوڑ کر اس کی راہ میں حائل ہو گیا۔ "وہ آپ کی ایک ہی گولی سے مر جائے گا۔ یہ موت اس کے لیے بڑی پرسکون ہو گی لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ آج کا دن اسے ساری زندگی یاد رہے۔ سسکتا رہے اور تڑپ تڑپ کر مر جائے۔"

رانی کی سمجھ میں میری بات آ گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ پھر وہ ہچکیوں کے درمیان بولی۔ "ان کمینوں نے ہماری زندگی اور سکون حرام کر رکھا ہے کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں ان زہریلے سانپوں کو زندہ چھوڑ دوں؟"

"ہمارے یہ ایک ایک لمحہ قیمتی ہے، ہم اسے انتقام کی نذر نہیں کر سکتے۔" میں نے سمجھایا۔ "اب ہمیں یہاں سے فوراً نکل جانا چاہیے۔ یہاں قریب میں یقیناً کوئی گاؤں یا آس پاس کوئی آبادی ضرور ہو گی۔ گولیوں کی آواز سن کر گشتی فوج کی کوئی گاڑی آ سکتی ہے۔ اس سے چھٹکارا کسی قیمت پر نہیں پایا جا سکتا...... سوچو...... کیا کرنا ہے۔"

رانی آنے والے خطرے کا احساس کر کے ایک دم سرد پڑ گئی۔ وہ متوحش ہو کر چاروں طرف گھوم کر دیکھتی بدحواسی سے بولی۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں...... چلیں...... فوراً چل پڑیں۔ کوئی نئی افتاد نازل ہو سکتی ہے۔"

میں نے اپنا خون آلود چاقو پٹیل کی قمیص کے دامن سے صاف کیا۔ رانی نے میرا بازو پکڑا ہوا تھا۔ راہ داری سے گزرتے ہوئے ہم دونوں نے ان دونوں بدمعاشوں پر نگاہ ڈالی۔ ان پر غشی طاری تھی اور وہ شدید زخمی حالت میں کراہ رہے تھے رانی نے حویلی سے باہر آتے ہی جیپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بڑے سپاٹ سے لہجے میں پوچھا۔ "کیا اس جیب سے ہم واپس جائیں گے۔ جیپ بڑی اچھی حالت میں بھی نظر آ رہی ہے۔ اس میں پیٹرول بھی ہو گا؟"

"نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلا کر جواب دیا۔ "ہم چوہدری کی جھونپڑی میں واپس جانے کے بجائے آگے بڑھیں گے...... اب ہمیں وہاں جا کر کرنا کیا ہے...... اگر آپ آرام کرنا چاہتی ہیں تو آرام کا نہیں بلکہ چلتے رہنے کا وقت ہے۔"

رانی کشمکش و پیچ میں پڑ گئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے کوئی ذہنی کشمکش ہو رہی ہو۔ وہ قدرے پس و پیش کے بعد بولی۔ "اب میں آپ پر پورا بھروسا کر سکتی ہوں۔ مجھے یہ بتانے میں کوئی تامل نہیں کہ میں نے وہ ہیرے چوہدری کے گھر میں ایک ہانڈی میں چھپا کر رکھ دیے تھے تاکہ چلتے وقت اسے لے لوں گی۔ لہٰذا وہیں چلنا ہو گا۔"

میں اس کی بات سن کر بے حس و حرکت ہو گیا۔ میں نے چند لمحوں کے بعد پوچھا۔ "کیا واقعی آپ کے پاس دو کروڑ کی مالیت کے ہیرے موجود ہیں؟"

"جی ہاں۔" رانی نے جھجک کر اقرار کیا۔ "وہ ہندوستان کی کرنسی میں دو کروڑ کی مالیت کے ہیں جب کہ بنگلہ دیش کی کرنسی میں چار کروڑ...... اور پھر ہانگ کانگ میں اس کی بہت اچھی قیمت مل سکتی ہے۔ وہاں ان کی بڑی مانگ ہے۔"

میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس نے مجھے متحیر پا کر پوچھا یہ کہیں آپ کی نیت میں فتور اور منہ میں پانی تو نہیں آ رہا ہے؟"

"ہاں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے شوخی سے کہا۔ "مگر ان ہیروں پر نہیں بلکہ اس ہیرے پر جو ان سے زیادہ انمول، نایاب اور قیمتی ہے۔ ایسا ہیرا تو ساری دنیا میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔" میں نے اس کی طرف اشارہ کیا۔

رانی گلابی ہو گئی۔ پھر اس نے اپنے ہاتھ میں تھامے ہوئے ریوالور کو انگلیوں پر نچاتے ہوئے کہا۔

"کیا خیال ہے......؟ آپ کیا فرماتے ہیں۔ کیوں نہ حفظ ماتقدم کے طور پر جیپ کا ایک ٹائر جہنم رسید کر دیا جائے؟"

"خیال تو نیک ہے......" میں نے جواب دیا۔ "ایسے نیک کاموں میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔"

پھر رانی نے بغیر کسی توقف کے اگلے پہیے پر گولی داغ دی۔ ہم دونوں چند قدم آگے بڑھے تھے کہ معاً میری نگاہ ایک کھڈ پر پڑی۔ اس کی باہر نکلی ہوئی مٹی بتا رہی تھی کہ اس کی کھدائی کو دو تین گھنٹے سے زیادہ نہیں ہوا۔ جب میں نے رانی کو وہ کھڈ دکھایا تو اس کے جسم پر جھرجھری سی آ گئی۔ اس نے میری طرف دیکھا اور خوف زدہ لہجے میں بولی۔

"یہ قبر ہمارے لیے تیار کی گئی تھی۔ اس لیے تو یہ کمینے ہمیں یہاں لے کر آئے تھے۔ خدا نے ہمیں زندہ دفن ہونے سے بچا لیا۔" میں رانی کی بات سے انکار نہ کر سکا۔ پٹیل نے بھی یہ بات کہی تھی۔ اس کا اندازہ سو فیصد درست تھا۔ ان کے ہاتھ میں ریوالور کی موجودگی خطرے کا باعث بن سکتی تھی۔ ایک الزام تو غیر قانونی اور بغیر پاسپورٹ کے سرحد پار کرنا، دوسرا بغیر لائسنس کے اسلحہ اور تیسرا الزام چوری کا بھی آ سکتا

تھا۔ اگر میں اس سے یہ کہتا کہ یہ ریوالور کسی ندی نالے میں پھینک دو تو وہ مشکوک ہو جاتی کہ میں اس کے ہیروں پر ہاتھ صاف کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے چپ رہنے میں عافیت سمجھی لیکن کروڑوں کی مالیت کے ہیرے میرے بدن پر سنسنی پھیلا رہے تھے۔ میں نے چلتے چلتے اس سے وہ سوال پوچھ ہی لیا جو میرے دل کے کونے میں بار بار اٹھ رہا تھا۔ ”آپ اس قدر نڈر اور بہادر ہو کر اتنی جلدی دہشت زدہ کیوں ہو جاتی ہیں؟ کیا موت سے ڈر لگتا ہے آپ کو......؟“

”ہاں۔“ رانی نے اپنا سر اثبات میں ہلاتے ہوئے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ ”مجھے اپنی زندگی سے بہت پیار ہے۔ میں ایک آزاد خیال لڑکی ہوں۔ میں اپنی زندگی میں دنیا کی رنگینیوں کے پیچھے دوڑنا پسند کرتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ جوانی چار دن کی چاندنی ہوتی ہے۔ اس لیے میں چاہتی ہوں زندگی کا جتنا لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔ لہٰذا میرے ذہن میں کوئی الجھن نہیں اور نہ ہی میں کسی سماجی، مذہبی اور معاشرتی بندھن کو پسند کرتی ہوں۔ جب میں اپنے اردگرد موت کو منڈلاتا ہوا دیکھتی ہوں تو مجھ پر ایک لرزہ سا طاری ہو جاتا ہے۔“

میں نے چلتے چلتے رانی کو کسی اور خیال میں کھویا ہوا دیکھا تو اس کے ہاتھ سے ریوالور جھپٹ لیا۔ میں نے بڑی آسانی سے اس کے ہاتھ سے ریوالور چھین لیا تھا۔ وہ میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر سکتے میں آ گئی۔ اسے اس بات کی توقع نہیں تھی کہ میں اس کے ساتھ دغا بازی کروں گا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔ پھر چہرہ سفید پڑتا چلا گیا۔ ”آپ؟“ اس کی آواز میں دکھ سا بھر گیا۔ پھر اس کی آنکھوں میں صاف و شفاف موتی دمکنے لگے۔ ”مجھے آپ سے ایسی امید نہیں تھی۔“

”کیوں......؟“ میں نے معنی خیز لہجے میں دریافت کیا۔ ”کیا میں انسان نہیں ہوں۔ جس طرح آپ دولت کی بے پناہ خواہش رکھتی ہیں کیا اس طرح میرے دل میں پیدا نہیں ہو سکتی۔ دنیا میں دولت کے بغیر آدمی کچھ بھی تو نہیں ہے۔“

”آپ نے مجھے دھوکا دیا۔“ وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔ ”میں نے آپ اندھا اعتماد کیا۔ آپ پر مہربان ہو گئی۔ میں تو آپ کو فرشتہ سمجھ رہی تھی۔“

”یہی تو آپ سے بڑی بھول ہوئی ہے۔“ میں نے بڑے طمطراق لہجے میں کہا۔ ”اب میں ان کروڑوں کی مالیت کے ہیروں کا اکیلا مالک ہوں۔ اب میری قسمت پلٹ جائے گی اور میں دولت مند بن جاؤں گا اور میرا شمار بنگلہ دیش کے رئیسوں میں ہوگا۔ لڑکیاں میرے آگے پیچھے ہوں گی۔“

رانی کا چہرہ سفید پڑتا چلا گیا۔ اس کے چہرے پر لہو کی بوند تک نہ رہی۔ وہ مجھے اپنی جگہ ساکت ہو کر پتھرائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میں چوکنا ہو کر اس سے کسی قدر دور کھڑا ہوا تھا کہ کہیں وہ اپنے فن اور اپنی مہارت کا مظاہرہ نہ کر دے۔ میں اس کی ابتر ذہنی کیفیت دیکھ کر لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میں نے چند لمحوں کے بعد قدرے نخوت سے پوچھا۔ ”جانِ من رانی......! آپ نے ان ہیروں کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے......؟ کیا بتانا پسند فرمائیں گی؟“

وہ ذہنی انتشار سے دوچار تھی اور اس کے بشرے پر ایک اضطراب سا کانپ رہا تھا۔ اب چوں کہ وہ بری طرح شکست کھا چکی تھی لہٰذا وہ مجھے لعن طعن کرنا نہیں چاہتی تھی۔ شاید اس لیے بھی اسے اپنے حشر کا احساس ہو چکا تھا۔ وہ میرے رحم و کرم پر تھی۔ وہ اس مفتوحہ علاقے کی طرح تھی جسے بغیر جنگ کے فتح کر لیا گیا ہو۔ وہ میری بات سن کر بڑے زور سے چونکی اور تھوک نگلتے ہوئے کہنا چاہا تو اس کی آواز حلق میں پھنس گئی اور پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ اس نے بدقت تمام کہا۔ ”اب آپ سے کیا پردہ......؟ کیوں نہ ہم ان ہیروں کو ففٹی ففٹی کر لیں......؟ آپ کو اعتراض تو نہیں......؟“

”اعتراض......؟ سخت اعتراض ہے اور پھر مجھے اس حماقت کی ضرورت ہے کیا ہے۔“ میں نے سفاک لہجے میں کہا۔ ”کیوں کہ میں بڑی آسانی سے ان ہیروں کا تن تنہا مالک بن سکتا ہوں۔ ففٹی ففٹی کا خیال دل سے نکال دیں۔ اب یہ ہیرے خواب میں بھی نہیں مل سکتے۔“

”وہ کیسے......؟“ وہ اچھل سی پڑی اور اس کے منہ سے جیسے غیر ارادی طور پر نکل گیا۔ وہ مجھے ساکت پلکوں سے گھورنے لگی۔

”وہ ایسے......؟“ میں نے ریوالور کا رخ اس کی طرف کر دیا اور لبلبی پر انگلی رکھ دی۔ ”صرف ایک گولی صرف ایک فائر...... مجھے ان ہیروں کا مالک بنا دے گا۔ اس طرح سے میرے راستے کا پتھر بڑی آسانی سے ہٹ جائے گا۔“

”نہیں...... نہیں......“ اس نے فضا میں اپنا مرمریں۔ خوب صورت اور سڈول ہاتھ بلند کیا۔ وہ تھر تھر کانپنے لگی تھی۔ ”آپ...... آپ ہیرے لے لیں...... خدا کے لیے میری زندگی نہ چھینو...... مجھ پر رحم کھاؤ اور پھر میں ہر بات ماننے اور ہر طرح سے خوش کرنے کو تیار ہوں۔“

”آپ کو یہ زندگی عزیز ہے یا ہیرے......؟“ میں نے ریوالور کو انگلیوں پر نچاتے ہوئے کہا۔ ”ہیرے ویسے بہت قیمتی ہیں۔“

”زندگی......“ وہ مردہ لہجے میں بولی۔ ”مجھے اس لمحے احساس ہو رہا ہے کہ زندگی ہیروں سے کہیں قیمتی ہے۔“ میں رانی کے پاس جا کر اکڑوں بیٹھ گیا۔ اس کی حالت بڑی غیر ہو رہی تھی اور ریوالور اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

”آپ کی دولت آپ ہی کو مبارک ہو۔ میں اس دولت کو لے کر کیا کروں گا جو زندگی جیسی عزیز شے دے نہیں سکتی بلکہ چھین لیتی ہے۔ پلیز!“ میں نے التجا کے انداز میں کہا۔ ”آپ مجھے معاف کر دیں۔ میں نے آپ کے ساتھ جو زیادتی کی اور ہراساں کیا وہ کچھ زیادہ ہی ہو گیا۔“

رانی چونک پڑی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا اور سماعت پر بھی جیسے اعتبار نہیں آیا تھا۔ خوف و دہشت کے عالم میں اس پر جو کچھ بیتی تھی اس نے اس کے اوسان خطا کر دیئے تھے۔ جیسے ہی اس کی سمجھ میں یہ ڈراما آیا اسے جیسے ایک نئی زندگی مل گئی۔ وہ جو کسی پھول کی طرح مرجھائی جا رہی تھی گلاب کی طرح کھل اٹھی تھی۔ اس کا چہرہ پسینے میں تر ہو رہا تھا۔ میں نے اپنی جیب سے رومال نکال کر پسینہ پونچھا۔ اس

کے دل کی عجیب سی حالت ہو رہی تھی۔ اس کا سینہ دھک دھک کیے جا رہا تھا۔

"سکندر...... اگر میرا ہارٹ فیل ہو جاتا تو......؟" وہ اپنے دھڑکتے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی اور پھر وہ مجھے پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔

"جو زندگی سے اس قدر پیار کرتا ہے وہ ایسی گیدڑ بھبکیوں سے مرتا نہیں ہے۔" میں نے اس کی حسین آنکھوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر میں نے اسے بازوؤں میں بھر لیا۔ کسی سمت بھی دور دور تک کسی کا نام ونشان نہ تھا میں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ میں اس کے چہرے پر جھک گیا۔ ہم دونوں محبت بھرے جذبات میں ڈوب کر تھوڑی دیر تک ساری دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو گئے۔ اس کی محبت میں بڑا والہانہ پن تھا۔ جب ہم دونوں تیزی سے چوہدری کی جھونپڑی کی جانب چل پڑے تو رانی دھوپ کی تمازت سے پریشان ہو کر بولی۔

"کاش! ہم اس جیپ سے یہاں پہنچ جاتے۔ میرا چلتے چلتے برا حال ہو گیا ہے۔ پیر شل ہو رہے ہیں۔"

"جیپ ہمارے لیے خطرے اور پریشانی کا باعث بن جاتی اس طرح ہم فوج یا پولیس کی نظروں میں آ جاتے۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ پولیس اور فوج سے مسلسل ڈرتے چلے آ رہے ہیں۔" رانی روہانسی ہو کر بولی۔ "میں نے اب تک راستے میں نہ تو کسی آدم زاد کو دیکھا اور نہ ہی کسی فوجی اور پولیس والے کو اگر واسطہ پڑا ہے تو صرف بدمعاشوں سے...... یہ بدمعاش جو میری ماں اور میرے دشمن تھے۔ ہم دونوں ماں بیٹی کی عزت اور جان کے کب سے درپے ہو رہے تھے۔"

"آپ کی خوش نصیبی کہ راستے میں کوئی نہیں ملا۔ ورنہ راستے میں جو بھی سپاہی ٹکراتا وہ تلاشی لے کر سارا سامان ہتھیا لیتا اور یہ کمینے تلاشی کے بغیر نہیں رہتے اور پھر تلاشی لیتے بھی کس طرح ہیں۔ بدن پر ایک کپڑا تک رہنے نہیں دیتے ہیں۔ ایسی صورت سے آپ کس طرح بچتیں؟ انہیں جب معلوم ہو جاتا کہ آپ لڑکی ہیں تو پھر وہ درندے بن جاتے۔"

تلاشی کے ذکر نے رانی کو خوف زدہ کر دیا اور اس کا چہرہ اس تصور سے فق ہو گیا کہ سپاہی اسے اصل روپ میں دیکھ کر درندے بن جاتے۔ وہ سراسیمگی سے بولی۔ "اگر کوئی مل گیا اور میرے پاس ہیرے ہوئے تو اس کا کیا بنے گا۔ میں تلاشی لینے سے پہلے ہیرے دے دوں گی۔"

"ہونا کیا ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ان ہیروں پر فاتحہ پڑھنا ہوگی۔ ویسے ہیرے دینے سے آپ تلاشی سے بچ جائیں گی۔"

"میری جان نکلی جا رہی ہے اور آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے۔" رانی کا منہ بن گیا۔ "چوں کہ وہ آپ کی ملکیت نہیں ہیں اس لیے آپ کو اس کے چلے جانے کا کیا دکھ ہوگا...... یہ دو ایک ہزار کے نہیں کروڑوں کی مالیت کے ہیں۔"

"آپ اس قدر پریشان اور ہراساں کیوں ہو رہی ہیں۔ میں ایسی نوبت ہرگز آنے نہیں دوں گا۔ بے فکر رہیں۔" میں نے سنجیدہ ہو کر اسے دلاسا دیا۔ "اگر آپ میرا ایک مشورہ قبول کر لیں گی تو بڑی نوازش ہوگی۔"

"مشورہ......؟" اس نے حیرت سے اپنی لانبی لانبی پلکیں جھپکائیں۔

"یہ ریوالور سامنے والے تالاب میں پھینک دیں۔" میں بانسوں سے بنی ہوئی پلیا پر چلتے چلتے رک گیا۔

"وہ کس لیے......؟" اس کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا اور وہ تالاب کو دیکھنے لگی۔

"اس لیے کہ پولیس یا کسی بھی سرکاری آدمی کی نظر ریوالور پر پڑ گئی تو ہمارے لیے ایک نئی مصیبت کھڑی ہو سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ رانی نے بڑے غور اور سنجیدگی سے میری بات سنی تھی۔ وہ لمحہ بھر کے لیے جانے کیا سوچتی رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شک کی پرچھائیاں پھیل گئیں۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ فضا میں بلند کر کے ریوالور کو تالاب میں پھینک دیا۔ ریوالور نظروں سے اوجھل ہو گیا تو وہ میری طرف گھوم کر بولی۔ "یہ ایک اچھا دوست اور محافظ ثابت ہو سکتا تھا۔ جانے راستے میں کیا خطرات پیش آئیں۔ یہ بہت کام دیتا۔"

"اس کی نوبت نہیں آئے گی۔" میں نے اسے دلاسا دیا۔ "ہمیں اللہ پر اور اپنے بازوؤں پر بھروسا کرنا چاہیے۔"

چوہدری کی جھونپڑی تک پہنچتے ہیں خاصا وقت لگ گیا، حالانکہ میں رانی کو شارٹ کٹ راستے سے لے کر چلا تھا۔ ایک تو رانی کے چلنے کی رفتار بڑی سست تھی وہ کچھ دور چل کر کسی پیڑ کو دیکھتی تو اس کے نیچے جا کر کھڑی ہو جاتی اور ستانے لگتی تھی۔ کئی جگہ نشیب آئے اور اس میں چوں کے پانی کھڑا ہوا تھا اس لیے گھوم کر جانا پڑا۔ دھوپ کی تمازت نے پیاس کی شدت بڑھا دی تھی کہ اس سے طبیعت نڈھال ہونے لگی تھی۔ جھونپڑی کو جیسے قریب پایا۔ جسم میں نئی جان آ گئی چال میں بڑی تیزی آ گئی۔ ہم دونوں بجلی کی سی تیزی سے جھونپڑی کی طرف لپک گئے اور دوڑتے ہوئے جھونپڑی میں گھس گئے۔ رانی اس ہانڈی کے پاس پہنچی جس میں اس نے ہیروں کی پوٹلی چھپائی تھی۔ وہ بھوک پیاس بھول چکی تھی۔ اسے اپنے ہیروں کی فکر تھی۔ میں اس کی بے تابی پر مسکرا دیا۔ وہ اس ہانڈی پر سے ڈھکنا ہٹانے لگی۔ میں مٹکے سے پانی گلاس میں بھر کے حلق سے انڈیلنے لگا۔ ٹھنڈا ٹھنڈا پانی امرت بن کر میری رگوں میں گھل رہا تھا۔ اس وقت پانی ہیروں سے کہیں قیمتی تھا۔

دفعتاً رانی ہذیانی لہجے میں زور زور سے چیخنے لگی۔ "سکندر......! سکندر......!"

میرے ہاتھ سے گلاس چھوٹ کر فرش پر گر پڑا۔ میں نے سراسیمہ ہو کر اس کی جانب دیکھا۔ جب وہ میری طرف پلٹی تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں جیسے اس نے ہانڈی میں کوئی زہریلا سانپ دیکھ لیا ہو۔ "سکندر......!" وہ بولی تو اس کی آواز گلے میں پھنس رہی تھی۔ "ہانڈی میں ہیروں کی تھیلی نہیں تھی۔"

"کیا کہا......؟ ہیرے نہیں ہیں......؟" میں سناٹے میں آ گیا اور دوسرے لمحے دوڑ کر اس کے پاس پہنچا۔ "کیا کہہ رہی ہو؟"

"آپ خود ہی دیکھ لیں......" اس کے سینے میں سانسوں کا تلاطم ہچکولے کھا رہا تھا۔ "میں نے اس ہانڈی میں رکھا تھا۔" میں نے اس ہانڈی میں جھانکا۔ وہ خالی پڑی تھی۔ ہیرے گئے کہاں......؟ اگر کوئی چور آیا تھا تو اس کے علم میں یہ بات کیسے آئی کہ اس ہانڈی میں ہیرے چھپائے ہوئے ہیں۔ میں نے اپنا یہ خیال رانی پر ظاہر کیا۔ ہم دونوں نے مل کر ایک ایک برتن اور چھوٹے بڑے ڈبوں کی تلاشی لے لی۔

چوہدری کا سامان بڑا ہی مختصر تھا۔ میں نے چوہدری کا بستر بھی الٹ پلٹ کر دیکھا۔ بستر کے نیچے سرہانے سے ایک چھوٹی سی کلہاڑی نکلی جس کا پھل چھوٹا سا تو تھا لیکن انتہائی تیز اور خطرناک تھا۔ میں اس کا جائزہ لینے کے بعد اسے بستر پر رکھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ تلاشی کی غرض سے۔ میں کسی آئینے میں یا ایک گلاس پانی یا کسی تالاب میں منتر کے زور سے ان ہیروں کی موجودگی کا پتا چلا سکتا تھا لیکن میں یہ عمل رانی کے سامنے کس وجہ سے کرتا اور اپنے آپ کو جادوگر ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ایسے عمل کی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی۔ جب میں واپس کمرے میں آیا تو رانی اپنے ہاتھ میں کلہاڑی لیے کھڑی مجھے مشکوک نظروں سے گھور رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں درندگی تھی۔ اس کے تیور بدلے ہوئے اور بے حد خطرناک نظر آ رہے تھے۔ وہ کسی زہریلی ناگن کی طرح غضب ناک ہو رہی تھی۔

''سکندر!'' رانی پھنکاری۔ ''تم نے مجھے بے وقوف بنالیا لیکن میں ایسی احمق بھی نہیں ہوں کہ تم میری آنکھوں میں دھول جھونک سکوں۔''

''کیا کہا......؟'' میں حیرت سے اچھل پڑا۔ ''آپ کے خیال میں میں نے وہ ہیرے چرائے ہیں؟ عقل ٹھکانے تو ہے؟''

''ہاں تم نے......؟'' رانی کے لہجے میں خشونت تھی اور اس کے چہرے پر سفاکی ابھر آئی۔ ''تم نے اس کمرے میں سے رات کو دیکھ لیا تھا کہ میں کوئی چیز چھپا رہی ہوں رات میں خوف زدہ اور دہشت زدہ ہو کر تمہارے کمرے میں آئی تو تم نے اس سے فائدہ اٹھایا اور جذبات کی رو میں مجھے بہا کر لے گئے جس سے میں تھکن سے ایسی چور اور نڈھال ہوئی کہ مدہوشی کی نیند سو گئی تھی۔ پھر تم نے مجھ سے پہلے بیدار ہو کر وہ ہیرے غائب کر دیئے۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہیرے میرے حوالے کر دو؟''

''کیا آپ پاگل ہو گئی ہیں؟'' میں نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔ ''اگر میری نیت خراب ہوتی اور وہ ہیرے میں نے چرا لیے ہوتے تو میں آپ کو کسی صورت میں نہیں بخشتا۔ جب کہ مجھے کئی موقع ملے تھے میں آپ کا کام تمام کر سکتا تھا۔''

''میں جانتی ہوں تم نے ایسا کیوں نہیں کیا؟'' وہ برہمی سے بولی۔ ''تم مجھے دونوں ہاتھوں سے لوٹنا چاہتے تھے۔ تم نے رات کے آخری پہر تک مجھے کھلونا بنائے رکھا۔ آج صبح بھی تم نے میری مجبوری سے فائدہ اٹھایا۔ تم ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے ہو۔''

''کوئی خود غرض اور ہوس کار شخص ایسی حماقت نہیں کر سکتا کہ وہ ہیرے یا آپ سے کھیلتا رہتا۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''کسی شخص کی جیب میں بے پناہ دولت ہو تو اس کے لیے حسین لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں ہوتی ہے۔ کئی حسین اور جوان لڑکیاں دولت مند کے صرف ایک اشارے کی منتظر ہوتی ہیں اور پھر آپ مجھے کوئی دوش مت دیں۔ آپ خود ہی میری جھولی میں پکے پھل کی طرح گریں اور بڑی فیاضی سے مہربان ہوئیں۔ میں جوان ہوں۔ کفرانِ نعمت کیوں کرتا؟''

''زیادہ باتیں مت بناؤ۔ ہیرے میرے حوالے کر دو۔'' رانی نے کلہاڑی فضا میں لہرائی۔ ''جب

میں ایک خون کر سکتی ہوں تو دوسرا خون کرتے ہوئے کسی قسم کی جھجک اور کوئی خوف نہیں ہوگا۔ اب میرے دل سے ہر قسم کا ڈر اور خوف نکل چکا ہے۔ اب میں دوسری لڑکی ہوں جو پہلے سے یکسر مختلف ہوں۔ تم یہ مت سمجھنا کہ میں صرف تمہیں دھمکی دے رہی ہوں۔''

''پاگل پن کی باتیں نہ کریں۔'' میں نے اسے بری طرح ڈانٹا۔ ''یہ سوچو کہ ہیرے کون چرا کے لے گیا ہوگا......؟''

''آسمان سے کوئی فرشتہ آیا تھا وہ اٹھا کر لے گیا۔'' اس کے لہجے میں شدید نفرت بھر گئی۔ ''کیا تم یہی کہنا چاہتے ہو؟''

''میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ احمقانہ باتیں نہ کریں۔'' میں نے طیش میں آ کر کہا۔ ''تم اپنی تسلی کرنا چاہتی ہو تو میری تلاشی لے سکتی ہو؟''

''تلاشی......؟ وہ تو مجھے لینا ہے لیکن اس طرح نہیں کہ تم مجھے دبوچ کر قابو میں کر لو اور پھر بے بس......'' رانی نے حقارت سے میری جانب دیکھا۔ ''رات تم نے یہی کیا تھا۔ مجھے مجبوری نہ ہوتی میں اپنے آپ کو تمہارے رحم و کرم پر نہ چھوڑتی۔ تم مرد لوگ ناگ ہوتے ہو ناگ۔ آخر ان ہیروں کو دیکھ کر تمہاری نیت میں فتور کیوں نہیں آ سکتا۔ دولت کی ہوس تم جیسے لوگوں کو کہیں زیادہ ہوتی ہے۔''

''آخر آپ کس طرح سے میری جامہ تلاشی لینا چاہتی ہیں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''اپنے کپڑے ایک ایک کر کے میرے پاس پھینک کر کمرے سے نکل جاؤ۔'' رانی نے تنک کر کہا۔

''میں تمہارے کپڑوں کی......''

اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ یکایک مجھے ایک خیال آیا تو میرے لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی تو رانی نے چونک ہو کر مجھے تیز و تند نظروں سے گھورا۔ میری معنی خیز مسکراہٹ کی تہہ میں وہ پہنچ گئی تھی۔ اسے بھی رات کی بات یاد آ گئی تھی۔ میں نے بڑے اطمینان سے اپنی قمیض اتاری۔ پھر میں نے رانی کے چہرے کا نشانہ لیا اور قمیض کو گولا بنا کر اس انداز سے اس کے منہ پر پھینکا جیسے میں شکار پر کوئی جال ڈال رہا ہوں۔ میری قمیض پوری طرح کھل کر کسی جال کی طرح اس کے منہ پر جا پڑی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں کلہاڑی تھی۔ وہ اپنے منہ پر قمیض کے اچانک حملے سے بدحواس سی ہو گئی۔ اس نے بوکھلا کر اپنے بائیں ہاتھ کی مدد سے قمیض کو چہرے سے ہٹانے کی کوشش کی۔ میں نے اس لمحے سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور برق رفتاری سے اس کے سر پر جا پہنچا مجھے رانی کو دبوچ کر اس کے ہاتھ سے کلہاڑی چھین کر قابو میں کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ جیسے ہی کلہاڑی میرے ہاتھ میں آئی میں نے اسے اپنی گرفت سے آزاد کیا۔ پھر میں فوراً ہی تیزی سے کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ کہیں رانی جوڈو کراٹے کے فن کی مہارت کا مظاہرہ نہ کر بیٹھے۔ جب قمیض رانی کے چہرے سے ہٹی تو اس کا چہرہ متغیر سا تھا۔ آنکھیں خوف سے پھٹ گئی تھیں۔ اس کے بشرے سے بے بسی جھلکنے لگی۔ وہ یک لخت اپنی شکست پر بری طرح جھلا گئی اور اس نے میری قمیض مروڑ کر فرش پر دے ماری۔ وہ چند ثانیوں تک دانتوں

سے نچلا ہونٹ چبھاتی رہی۔ پھر اس نے جھنجلاتے ہوئے کہا تو اس کی آواز تیز تھی۔ ”تمہارے پاس ہیرے ہیں تو انہیں اپنے ساتھ لے کر میری نظروں کے سامنے سے دفع ہو جاؤ۔ مجھے نہیں چاہیے یہ منحوس ہیرے جو میری جان لے کر چھوڑیں گے۔ میں تو پاگل ہو جاؤں گی۔ یہ ہیرے تو میرے لیے عذاب اور اذیت بن گئے ہیں۔“

میں نے کچھ سوچ کر اور اس کا شک دور کرنے اور اسے اعتماد میں لینے کے لیے کلہاڑی اس کے پیروں کے پاس ڈال دی۔ ”آپ ہوش وحواس میں آجائیں تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ خوامخواہ مجھ پر شک کرنے لگی ہیں۔“ میں نے نرمی سے کہا۔ پھر میں اس کے بالکل قریب پہنچ گیا اور اس کے چہرے پر نگاہیں جما کر دونوں ہاتھ اٹھا کر بلند کر کے کہا۔ ”آپ میری تلاشی لے سکتی ہیں۔ میں خودغرض اور فریبی شخص ہوتا تو ہیرے لینے کے بعد راتوں رات فرار ہو جاتا۔“ دفعتاً رانی کی خوب صورت اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں چھلک پڑیں۔ پھر وہ روتی ہوئی چوکی پر جا بیٹھی آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

”میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔“ وہ سسکیوں کے درمیان ندامت سے بولی۔ ”آپ میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے...... میرا شک آپ کے سوا کس پر جاتا۔ ہم دونوں کے سوا یہاں کوئی نہیں تھا۔ ہم نے ساری رات جاگ کر اس کمرے میں گزاری تھی۔“

”میں آپ کی جگہ ہوتا تو ایک لمحے کے لیے ٹھنڈے دل سے یقیناً سوچتا۔“ میں اس کے پاس چوکی پر جا بیٹھا۔ ”کون ایسا احمق ہوگا کہ ہیرے چرا کر آپ کے ساتھ ہی رہے۔ کیا اس بات کا امکان نہیں ہے کہ ہیرے چوہدری نے چرائے ہوں۔“

”چوہدری نے......؟“ اس کے چہرے پر گہرا استعجاب سا چھا گیا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اسے کیا معلوم میرے پاس ہیرے بھی ہیں؟“

”کیوں نہیں ہو سکتا۔“ میں نے اس کمرے کی جانب اشارہ کیا جس میں ایک بڑی سی کھڑکی تھی ”اس میں سے ایک آدمی باآسانی اندر آ سکتا ہے تو باہر بھی جا سکتا ہے۔ چوہدری کی باتوں سے آپ نے یہ اندازہ نہیں لگایا کہ وہ ساری رات بارش میں کھڑا بھیگتا رہا تھا۔ کیوں؟ صرف اسی لیے نہیں کہ اس نے ہم دونوں کو محبت اور جذبات میں ڈوبے دیکھتا رہا تھا۔ صرف اس لیے موقع پا کر ہیرے اڑا لیے۔ اس نے آپ کو ہیرے چھپاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ جیسے ہی اسے موقع ملا اس نے فائدہ اٹھایا۔“

”کیا وہ ہیرے چوہدری کے پاس ہوں گے؟“ رانی کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ ”میں نے تو یہ بات سوچی نہیں تھی۔ یہ کیسے ممکن ہے؟“

”ہاں ..... اس کے پاس ہوں گے۔“ میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”لیکن کیوں نہیں۔ آپ میرے کمرے میں تھیں۔ جب ہم دونوں رات کے آخری پہر تھکے ماندے گہری نیند سو گئے تب وہ اس کمرے میں کھڑکی سے اندر آیا اور اس نے ہنڈی سے ہیرے نکال لیے۔ ہمیں وہاں فوراً پہنچ کر اس کی تلاشی لینا ہوگی۔ اس نے وہ ہیرے یقیناً اپنے لباس میں چھپائے ہوئے ہوں گے۔“

”چلیں.....“ رانی بھی چوکی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے لپک کر فرش سے کلہاڑی اٹھائی اور

واپس بستر کے نیچے چھپادی۔ پھر ہم دونوں گرتے پڑتے اور تیز تیز چلتے ہوئے اس مکان پر پہنچے۔ جس میں چوہدری کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ مکان کے اندر داخل ہو کر اس کمرے میں پہنچے تو ہم پر وہاں کوئی بجلی سی نہ گری۔ ہماری آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں اور منہ کھلے رہ گئے۔ چند ثانیوں تک سکتہ سا چھایا رہا۔ اس کمرے میں تو کیا مکان کے اندر کسی بھی کمرے اور گوشے میں چوہدری کی لاش کا کوئی نام ونشان نہیں تھا جیسے لاش خود ہی غائب ہو گئی یا اسے غائب کر دیا گیا ہو۔

میرے جسم پر سنسنی دوڑ گئی۔ میں نے پتھرائی آنکھوں سے اس جگہ کو دیکھا جہاں بہت سارا خون بکھرا پڑا تھا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر چوہدری کی لاش گئی کہاں؟ اس کی لاش کون اور کس لیے لے گیا ہوگا......؟ کیا اس کے بھائی یا کسی دوست نے آ کر اس کی لاش کو یہاں سے ہٹا دیا؟ یکایک مجھے اس کے ایک دوست جانو کا خیال آیا جو اکثر اس کے مکان پر کسی لڑکی کے ساتھ وقت گزاری اور رنگ رلیاں منانے کے لیے آیا کرتا تھا۔ یا تو شاید ادھر آیا ہو تو اس لاش کی موجودگی سے گھبرا گیا ہو۔ اس خوف وڈر سے کہ کہیں قتل کا الزام اس کے سر نہ آ جائے اس نے لاش کو ٹھکانے لگانے کے بارے میں سوچا ہوگا۔ جب اس نے چوہدری کی تلاشی لی ہوگی تو ہیروں کی پوٹلی دیکھ کر وہ اور خوش ہوا ہوگا۔ اس نے چوہدری کو کہیں دفن کر دیا یا پھر اس کی لاش کہیں چھپادی ہوگی؟ اب ہمیں چوہدری کی لاش کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ہر قیمت پر جانو کو تلاش کرنا ہوگا۔ اگر کسی وجہ سے جانو نہیں ملا تو پھر ہیرے بھی نہیں ملیں گے۔

میں نے رانی کی طرف دیکھا۔ وہ دروازے سے لگی سسکیاں بھر رہی تھی۔ میں نے اس کے پاس پہنچ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”میرے ساتھ چلو۔“ میں نے بڑے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ ”رونے سے کیا حاصل۔ میں جانتا ہوں کہ ہیرے کون لے گیا ہے اور چوہدری کا کیا حشر ہوا ہے۔ اللہ نے چاہا تو ہیرے مل جائیں گے۔ مایوس اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“

رانی سسکیاں بھول کر مجھے دیکھنے لگی۔ ”سچ!“ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں اور بے اختیار میرے سینے سے آ لگی۔ پھر اس نے اپنے ہونٹوں سے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ پھر ہم دونوں جلد ہی کیف وسرور کے لمحات سے نکل آئے۔ گھر سے باہر نکلتے وقت میں فرش پر نگاہ ڈالتے ہوئے باہر آیا۔ چوہدری کی لاش کو گھسیٹ کر باہر لے جایا گیا تھا۔ فرش پر خون کے دھبے اور دھاریاں پڑی ہوئی تھیں۔ دہلیز سے پار نشانات بتا رہے تھے کہ لاش کو پچھواڑے کی طرف لے جایا گیا ہے۔ میں بادل نخواستہ مکان کے عقب کی طرف چل دیا۔ چوہدری کی لاش دیوار کے پاس پڑی ہوئی تھی اور اس پر ایک چادر ڈال دی گئی تھی۔ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے ایک غیر مانوس سی آواز سنی۔ میں خطرے کی بو سونگھنے لگا۔ رانی چوہدری کی لاش دیکھتے ہی اس کی طرف دوڑی اور اس کے قریب پہنچ کر چادر لاش سے ہٹا دی۔ پھر اس نے بڑی تیزی سے جیبوں کی تلاشی لینی شروع کی تو میں اس کی طرف متوجہ ہو گیا لیکن میرے کان دوسری جانب لگے ہوئے تھے۔ رانی اس آہٹ سے بے خبر تھی۔ اس کا چہرہ مایوسی سے لٹک گیا اور اس کی آنکھوں میں اداسی کے بادل چھا گئے۔

چند ثانیوں کے بعد رانی نے رندھی ہوئی آواز میں گہری سانس لیتی ہوئی بولی۔ ”ہیرے چوہدری

کے پاس نہیں ہیں۔"

"وہ ہیرے تو ہمارے پاس ہیں جو آپ ڈھونڈ رہی تھیں...... کیا آپ اسے ملاحظہ فرمانا پسند کریں گی؟" ایک بے رحم سی آواز سن سناتے ہوئے تیر کی مانند ہمارے کانوں میں اتر گئی۔

میں اپنی ایڑیوں پر اس آواز کی سمت گھوم گیا۔ میں خوف زدہ تو نہیں ہوا۔ اس آواز نے حیران و ششدر کر دیا۔ ہمارے سامنے دو سپاہی جو بندوقوں سے مسلح تھے کھڑے ہوئے تھے۔ وہ دونوں پستہ قد اور چھریرے بدن کے تھے۔ ان میں ایک کی لمبی لمبی اور گھنی گھنی مونچھیں تھیں۔ وہ رانی کو گھورتا ہوا اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتا چلا آ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں شیطنت بھری ہوئی تھی۔ اس نے رانی کی آواز سے جیسے تاڑ لیا تھا کہ اس بہروپ میں ایک حسین اور نوجوان لڑکی چھپی ہوئی ہے۔ اس کے چہرے پر کمینگی برس رہی تھی۔ اس کے ساتھ دوسرا سپاہی چھٹا ہوا بدمعاش دکھائی دیتا تھا اور اس کی آنکھوں میں ہوس ناچ رہی تھی اور اس کی بندوق کا رخ ہماری طرف تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے رانی کو کپڑے اتارنے کا حکم دے سکتا ہے تاکہ اپنی تسلی کرے کہ رانی لڑکی ہے یا لڑکا۔ صرف یہ بدمعاش ہی ہو سکتی تھی۔ کیوں کہ رانی کی آواز سے صاف ظاہر تھا کہ یہ لڑکی ہے۔ رانی اس ناگہانی بلا کو دیکھ کر سراسیمہ ہو گئی لیکن اس نے جلد ہی اپنی سراسیمگی پر قابو پا لیا تھا۔

میں نے رانی کے چہرے سے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس کا ذہن بڑی تیزی سے کوئی منصوبہ سوچ رہا ہے۔ اگر میرا قیاس درست تھا تو وہ ایک نڈر اور حقیقت پسند لڑکی بن گئی تھی۔ اس نے لڑکی ہونے کے ناتے محسوس کر لیا تھا کہ یہ آدمی نہیں درندے ہیں وردیوں میں اور وہ اس کے بے حرمتی کر سکتے ہیں۔ کیوں کہ ان کے پاس اسلحہ ہے اور ہم غیر قانونی طور پر یہاں موجود ہیں۔ عزت اسی صورت میں وہ بچا سکتی ہے کہ ان پر قابو پایا جائے۔ اس لیے اس نے اپنے آپ کو لڑنے بھڑنے پر آمادہ کر لیا تھا۔ جانے کیوں اس احساس سے مجھے خوشی ہوئی تھی کہ ایک لڑکی نے درندوں سے نہتے ہو کر خود کو لڑنے کے لیے آمادہ کر لیا تھا۔ "کون ہو تم......؟" مونچھوں والے نے کڑک کر مجھ سے پوچھا۔ پھر وہ اگلے لمحے چونک گیا۔ پھر وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ "کہیں تم رستم کے دوست تو نہیں ہو......؟ تم مجھے پہچانتے ہو......؟ تمہارا نام شاید سکندر ہے؟"

مجھے اس مردود کو پہچاننے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اس کا نام راجہ تھا۔ اس کتے نے اپنی داڑھی صاف کر لی تھی جس سے اس کا چہرہ یکسر بدل گیا تھا۔ راجہ نے اپنے ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے اس سے میرا تعارف کرایا۔ "سردار! یہ رستم کا قریبی دوست ہے۔ تم جانتے ہو نا رستم کتنا بڑا ایجنٹ ہے۔ ہر ماہ سو دو سو آدمیوں کو ادھر ادھر کرتا رہتا ہے۔ دل کا بڑا سخی ہے۔ دیکھنا ہے کہ یہ کتنا سخی ہے۔ آج دیکھتے ہیں کہ یہ حاتم طائی کی اولاد ہمارے لیے کیا کرتا ہے؟" یہ کمینہ شاید رانی کا ان جانا خواب دیکھ رہا تھا کہ میں رانی کو پلیٹ میں حلوے کی طرح پیش کر دوں گا۔ میں نے اسے دل میں مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میں حاتم طائی نہیں اور نہ ہی اس کی اولاد ہوں بلکہ تمہارا فرشتہ اجل......!

"یہ لڑکی کون ہے جو لڑکے کے لباس میں ہے؟" اس نے رانی کو گرسنہ نگاہوں سے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ "بڑی پیاری ہے۔" پھر وہ زبان کو خشک ہونٹوں پر پھیرنے لگا۔ وہ ایک بھیڑیے کی طرح رال

ٹپکانے لگا تھا۔ اس کا بس چلتا تو شاید وہ رانی پر ٹوٹ پڑتا۔ میں نے رانی کی طرف دیکھتے ہوئے شوخی سے جواب دیا۔ "تم نے انہیں پہچانا نہیں؟ یہ پھولن دیوی کی چھوٹی بہن کانا دیوی ہے۔ اپنی بڑی بہن کی موت کے بعد یہ بھی اپنی بہن کے نقش قدم پر چل پڑی ہے۔ جانے کتنے قتل کر چکی ہے؟"

"کیا......؟" راجہ نے میری بات کو سچ سمجھا۔ وہ یکبارگی دہشت زدہ ہو کر اچھل پڑا۔ اس کے ہاتھ سے بندوق چھوٹ کر گر پڑی۔ پھر اس نے پھٹی پھٹی نظروں سے رانی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ زرد سا ہو گیا تھا۔ اس کا ساتھی سردار میرے اس مذاق پر محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ اس نے ایک قہقہہ لگا کر راجہ سے کہا۔

"یہ پھولن دیوی کی بہن کیسے ہو سکتی ہے۔ اس کی کوئی بہن نہیں تھی۔ یار! کیا تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ یہ چھوکری کتنی پیاری اور غضب کی ہے۔ اس نے جو قتل کیے اور کر رہی ہے وہ اپنے حسن و شباب اور بدن کے ہتھیاری سے......" راجہ پہلے تو جھینپ سا گیا۔ اگلے لمحے اس کی آنکھوں میں چنگاریاں چٹخنے لگیں۔ پھر اس کے چہرے پر درندگی ابھر آئی۔

"فکر نہ کرو سکندر کے بچے!" اس نے خشونت سے کہا۔ "ہم اسے بستر کی دیوی بنا کر چھوڑیں گے۔ یہ ہمیں ساری زندگی یاد کرے گی۔" یک لخت رانی نے تیزی سے کہا۔ "تمہارے پاس جو ہیرے ہیں وہ میرے حوالے کر دو میں اس کی مالک ہوں۔"

راجہ نے چونک کر پوچھا۔ "تمہارے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ یہ ہیرے تمہارے ہیں اور تم ان کی مالک ہو؟"

"چوہدری اگر زندہ ہوتا تو اس کا ثبوت اور گواہی بھی مل جاتی!" رانی نے تنک کر جواب دیا۔ "اس کمینے نے ہمیں رات جھونپڑی میں ٹھہرایا تھا اور اس نے ہمارے سوتے ہی وہ ہیرے چرا لیے۔ اس نے دھوکے بازی سے کام لیا۔"

"لیکن تمہیں چوہدری کا یہ ٹھکانہ کیسے معلوم ہوا؟" سردار نے چونک کر اچانک پوچھا۔ "چوہدری کو قتل کس نے کیا ہے......؟"

"تم دونوں نے......" رانی نے بے ساختہ جواب دیا اور الزام ان کے سر بڑی خوب صورتی سے تھوپ دیا۔

"ہم نے......؟" سردار اپنی جگہ سے اچھل پڑا اور راجہ کی طرف دیکھا۔ "سنا تم نے پیارے! یہ چھوکری کیا کہہ رہی ہے؟"

"ہاں......" رانی نے اثباتی انداز میں سر ہلاتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔ "تم دونوں نے چوہدری کے پاس ہیرے دیکھے تو تمہاری نیتوں میں فتور آ گیا۔ اس لیے تم دونوں نے مل کر اسے قتل کر دیا وراس کی لاش یہاں چھپا دی۔]]

"یہ جھوٹ ہے۔" راجہ زمین پر اپنی بندوق کا دستہ پٹختے ہوئے گرجا۔ "ہمیں قاتل قرار دے رہی ہو؟"

"تو بڑی تیز اور حرافہ ہے۔" سردار کے لہجے میں ایک دم سے تبدیلی آ گئی اس نے نفرت بھری

نظروں سے رانی کو گھورتے ہوئے بڑے سرد اور سفاک ترین لہجے میں کہا۔ "سچ سچ بتا کہیں تو نے تو چوہدری کو قتل نہیں کیا؟" رانی اس کی بات سن کر بڑی پرسکون سی رہی اور پھر اس نے سردار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ پھر اس نے بڑی بے خوفی سے جواب دیا۔ "اگر میں اسے قتل کرتی تو کیا اس کی جیب میں تمہارے لیے ہیرے چھوڑ جاتی......"

سردار لاجواب ہو کر بغلیں جھانکنے لگا۔ میں دل ہی دل میں رانی کی ذہانت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے بڑی خوب صورتی اور چالاکی سے راجہ اور سردار کے گرد ایک جال بن دیا تھا کہ وہ نکل نہیں سکتے تھے۔ ہم پر چوہدری کے قتل کا الزام آ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ دونوں خود ہی اپنے ہی بچھائے ہوئے جال میں پھنس گئے تھے۔ فرار کا راستہ نہیں رہا تھا۔ راجہ نے سردار کو چند قدم پیچھے لے جا کر کانا پھوسی شروع کر دی۔ رانی نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میرے کان میں سرگوشی کی۔ "کسی بھی صورت اور حیلے بہانے سے ان کتوں کو چوہدری کے مکان میں لے چلو......اب یہاں رکنا فضول ہے۔"

رانی نے کیا منصوبہ بنایا میرے ذہن میں نہیں آسکا۔ ان دونوں مسلح افراد پر بغیر کسی ہتھیار اور جادو کے پانا آسان نہیں تھا۔ ایک لمحے کے لیے دل کے کسی کونے میں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ میں جادو کے زور سے ان کی جیب سے ہیرے غائب کر دوں۔ انہیں پرندے بنا کر اڑا دوں۔ پھر سوچا کہ دیکھوں تو رانی کیا کرتی ہے۔ قسمت تو ہمیشہ ساتھ بھی نہیں دیتی ہے۔ اس پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے تو اس وقت نجم النساء بیگم پر سخت غصہ آرہا تھا۔ اگر وہ مجھے اعتماد میں لے کر ان ہیروں کی بات بتا دیتیں تو میں کوئی اور صورت اختیار کرتا۔ ان کی بیٹی اتنی مصیبتیں نہ جھیلتی اور مجھے تو اپنی کوئی فکر نہ تھی۔ رہی رانی کا آلودہ ہونا۔ ایسی کوئی اہم بات نہ تھی۔ کیوں کہ اس کے لیے یہ نئی بات نہیں تھی۔ وہ اس منزل سے گزر چکی تھی۔ تاہم یہ میرے لیے دکھ اور صدمے کا باعث تھا جو میں اس دلدل میں غیر محسوس انداز سے گر گیا تھا اور پھر ایک جوان مرد برف کا تودہ نہیں، اور پھر وہ کفران نعمت کیسے کرے۔ جانے اس لمحے نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا جو میں نہ چاہتے ہوئے بھی پھسل پڑا تھا۔ جو کچھ ہوا وہ اس کا کیا دھرا تھا۔ ان کی کانا پھوسی اور ان کے چہروں کی خباثت اور درندگی سے یہ خطرہ لاحق ہو گیا کہ وہ ہمیں ہلاک کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ کیوں کہ وہ ہمیں کسی قیمت پر گرفتار کر کے قانون کے حوالے نہیں کر سکتے تھے۔ کیوں کہ انہیں اس بات کا خطرہ تھا کہ اس صورت میں وہ ان ہیروں سے محروم ہو جائیں گے۔ وہ دونوں ہی کالی بھیڑیں تھیں۔ وہ قانون شکن تھے۔ ان سے کوئی اچھی توقع رکھی نہیں جا سکتی تھی۔ چند لمحوں کے بعد وہ ہم دونوں کے سامنے آکر رکے تو ان کے چہروں پر سپاٹ پن اور آنکھیں خون خوار کتوں کی سی ہو رہی تھیں۔ "ہم تم دونوں کو غیر قانونی طور پر سرحد پار کرتے کے الزام میں گرفتار کرتے ہیں۔" راجہ نے تحکمانہ لہجے میں کہا اور باری باری ہم دونوں کو دیکھا۔ "تم دونوں جاسوس اور تخریب کار ہو اور تم دونوں پر ایک بے گناہ شخص کے قتل کا الزام عائد کیا جاتا ہے۔"

"گڈ......ویری گڈ......" رانی نے شوخ لہجے میں کہا۔ پھر اس نے اپنا نازک جسم لچکاتے ہوئے بچوں کے انداز میں تالیاں بجائیں۔ تم اپنا یہ فیصلہ سناتے وقت کتنے خوب صورت اور ایک بادشاہ کی طرح

لگ رہے ہو۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی سور بول رہا ہو۔" راجہ نے غیر متوقع طور پر رانی کے منہ سے اپنے بارے میں ریمارکس سنے تو وہ بھونچکا سا ہو گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک بے بس اور اس کے رحم و کرم پر پڑی ہوئی لڑکی ایسی ہتک اور گستاخی بھی کر سکتی ہے۔ دوسرے لمحے اس کا چہرہ زخمی سور کی طرح ہو گیا۔ اس نے کسی وحشی قاتل کی طرح بپھر کر اپنی بندوق رانی پر تان لی اور اس کی سنگین رانی کے جسم میں گھونپنے کے لیے بڑھا۔ میں نے فوراً ہی رانی کی بانہیں پکڑ کر اسے پشت پر کر لیا اور ڈھال بن گیا۔ میں نے اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے منت کے انداز میں التجا کی۔ "راجہ صاحب! اسے معاف کر دیں۔ کیوں کہ یہ لڑکی کچھ سرپھری اور نادان ہے۔ ہیروں کے غم نے اسے پاگل کر دیا ہے۔"

"میں اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دوں گا۔" اس نے فرعونیت بھرے لہجے میں کہا۔

"یہ کمینی اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے؟" میں نے راجہ کے قریب پہنچ کر اس کا بازو نرمی سے پکڑ لیا۔ وہ آپے سے باہر ہو رہا تھا اور اس پر جنون سوار تھا۔

"راجہ صاحب! میں خود ہی اسے اس گستاخی کی سزا دوں گا۔" میں نے خوشامد کے انداز میں کہا۔

"آپ اس کی کوئی فکر نہ کریں بس ہم پر ایک احسان اور کریں۔"

"کیا احسان......؟" راجہ نے میری آنکھوں میں اپنی لال لال آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ "تم کیا اب ہم سے احسان کی امید رکھتے ہو؟"

"آپ ہم دونوں کو ابھی اسی وقت یہاں سے جانے دیں۔" میں پھر گڑگڑاتے ہوئے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ "ہیرے آپ رکھ لیں۔ ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہو گا اور نہ ہی ہم اس کے متعلق کسی سے کچھ کہیں گے۔ آپ کا بڑا کرم ہو گا۔"

"نہیں......" اس نے اکڑ کر سینہ تان لیا۔ "میں کسی قیمت پر اس چھوکری کو معاف نہیں کروں گا۔ میں اس سے اپنی توہین کا بدلہ لے کر رہوں گا۔"

"راجہ صاحب! راجہ صاحب......!" میں نے اسے پکارا۔ "پلیز! نادان لڑکی ہے۔ ابھی بچی ہے۔"

راجہ نے بڑی بے رحمی سے میرا ہاتھ جھٹک دیا پھر وہ خشونت آمیز لہجے میں بولا۔ "میں اسے معاف کر دوں؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" اس بلبل کو میں ایسا مزا چکھانا چاہتا ہوں کہ ساری زندگی وہ مجھے یاد کرتی اور میرے لیے تڑپتی رہے۔ آہیں بھرتی رہے۔" راجہ کی بے ہودہ باتوں سے خون کھول اٹھا۔ یوں تو میں اس کا منہ توڑ جواب دے سکتا تھا۔ اسے اور اس کے ساتھی کو صرف ایک پل میں ایسا مزا چکھا سکتا تھا کہ اسے ساری زندگی نہیں بھول سکتا تھا۔ اب یہ دیکھنا تھا کہ حالات کیا رخ اختیار کرتے ہیں۔ سر سے پانی نہیں گزرا تھا۔ میں اپنا غصہ ضبط کر گیا۔ میں راجہ کی باتوں کی تہہ میں پہنچ گیا۔ کون سا جذبہ کارفرما تھا۔ وہ صاف ظاہر ہو گیا تھا۔ وہ کیا چاہتا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے اس کی آنکھیں کہے دے رہی تھیں۔ بدنیت، بدکردار اور درندہ صفت شخص تھا۔ رستم مجھے اس کی فطرت کے بارے میں بتا بھی چکا تھا۔ وہ اس سے خوب واقف تھا۔ کیوں کہ رستم کا اس سے واسطہ پڑتا رہتا تھا۔ "کیا آپ ہمیں کسی قیمت پر معاف نہیں کریں

گے؟" میں نے چاپلوسی کے انداز میں پوچھا۔ "خدارا...... کچھ رحم تو فرمائیں جناب!"

"نہیں...... نہیں......" راجہ نے درشت لہجے میں جواب دیا۔ "معافی کی کوئی صورت اور قیمت نہیں ہے، سمجھے۔ کمینو!" اس کی نگاہیں رانی کے سراپا پر جمی ہوئی تھیں، وہ اسے بھیڑیے کی طرح دیکھے جارہا تھا جس کے سامنے گوشت پڑا ہو۔ اس نے لمحاتی توقف کے بعد پھر کرخت لہجے میں کہا۔ "میں تم دونوں کو معاف کردوں اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حوالات میں بند کرکے ایسی سزا دوں گا تمہارے رشتہ داروں کو بھی ہوا نہیں لگے گی۔ اور پھر یہ چھوکری دن رات میری داسی اور باندی بیوی کی طرح میری سیوا کرے گی۔ اسے مجھے ہر طرح سے خوش کرنا ہوگا۔ انکار اس کی دردناک موت ہوگی۔" "تم نہیں جانتے کیا میں کس قدر کمینہ، بدمعاش اور حرامی قسم کا شخص ہوں۔ میں ایسی چھوکریوں کا رسیا ہوں۔"

میں نے دل میں کہا کہ...... راجہ! بھلا اس میں کیا شک ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں تم جیسا خبیث اور ذلیل شخص نہیں دیکھا نہ ہی تم سے بڑا حرامی...... تمہاری ماں تمہیں جنم دے کر روتی رہی ہوگی کہ میں نے آدمی کو نہیں ناگ کو جنم دیا۔ میں نے جب اسے رانی کی طرف بڑھتے دیکھا تو بری طرح سٹپٹا گیا۔ وہ رانی کو دبوچ کر سب کے سامنے من مانی کرنے کے ارادے سے بڑھا تھا۔ میں نے فوراً ہی ان کے درمیان آ کر اس کا بازو پیچھے سے پکڑ کر روک لیا۔ "راجہ صاحب! اگر آپ کو ایسے ہی مزید ہیرے دے دیئے جائیں تو کیا آپ ہمیں معاف فرما سکتے ہیں؟"

راجہ یک لخت رک کر میری جانب گھوم گیا۔ "کتنے اور ہیرے ہیں تمہارے پاس؟" اس کی کینہ پرور آنکھیں چمک اٹھیں۔ "تین ہیرے اور ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "ان کی اہلیت لاکھوں کی ہیں۔ وہ نایاب اور بڑے انمول ہیرے ہیں۔"

"تین ہیرے؟ تین ہیرے اور ہیں۔" سردار اپنی خشخشی داڑھی پر ہاتھ پھیرتا ہوا ہمارے پاس آ گیا۔

"نہیں...... نہیں...... میں وہ ہیرے ہرگز نہیں دوں گی۔" رانی ہیجانی لہجے میں پوری قوت سے چیخی۔ "سکندر! وہ ہیرے میرے ہیں۔ تمہارے باپ کے نہیں جو تم ان؟؟ کو دے دو گے...... خبردار! جو کسی نے ان ہیروں کو ہاتھ تک لگایا۔"

"وہ ہیرے کہاں ہیں......؟" راجہ نے تجسس سے پوچھا۔ اس کی رال ٹپک پڑی تھی۔ "اس چھوکری کے پاس تو نہیں ہیں؟"

"چوہدری کی جھونپڑی میں چھپا کر رکھے ہوئے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "تم دونوں کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔ میں اس شرط پر تمہیں وہ ہیرے دوں گا کہ تم ہم دونوں کو یہاں سے جانے دو گے۔ پھر ہمیں ہراساں اور پریشان نہیں کرو گے؟"

"لیکن میری بھی ایک شرط ہے۔" راجہ کی نگاہ رانی کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ وہ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔

"کیسی شرط......؟" میں نے انجان بن کر بڑی سادگی سے پوچھا۔ "آپ صاف صاف بتادیں

تاکہ ہم اسے پوری کرسکیں؟"

"یہ لڑکی ہماری ہر بات بلا چوں و چرا مانے گی۔" راجہ نے کہا۔ "ہم دونوں اسے صرف ایک گھنٹے کے لیے باندی بنائیں گے۔"

"راجہ صاحب! آپ بے فکر رہیں۔ وہی ہوگا جو آپ دونوں چاہیں گے۔" میں نے ایک مجرم کی طرح گردن جھکالی۔

"ایسا نہیں ہوسکتا......" رانی ایک دم سے پھٹ پڑی۔ اس کی اداکاری اپنے پورے عروج پر تھی۔ "میں سب کا منہ نوچ لوں گی...... آنکھیں پھوڑ دوں گی۔ تم کمینوں نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے۔ میں کوئی بدچلن لڑکی نہیں ہوں۔"

"ہمیں تم جیسی شریف لڑکی کی ہی ضرورت ہے۔" راجہ نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ "بدچلن لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔" پھر راجہ اور سردار رانی کے غضب ناک ہونے اور چیخنے چلانے پر قہقہہ لگانے لگے۔ میں نے رانی کی بانہہ پکڑ لی اور اسے قربانی کے جانور کی طرح کھینچتا ہوا چوہدری کی جھونپڑی کی طرف لے کر چل پڑا۔ میرا ذہن بڑی تیزی سے منصوبے بنا رہا تھا، لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اور رانی ان دونوں پر کس طرح قابو پاسکتے ہیں؟ رانی کے ذہن میں کیا تدبیر ہے؟ میں اس سے بالکل بے خبر تھا۔ ایک موقع پر رانی نے سرگوشی میں آہستگی سے مجھ سے کہا کہ جھونپڑی کے اندر راجہ کو میرے ساتھ بھیج دینا اور اس کے ساتھی کو باہر روک لینا۔ اسے اندر آنے کسی صورت میں بھی نہیں دینا۔ دیکھوں تو راجہ کے دل میں کیا ارمان ہیں۔ جب ہم چوہدری کی جھونپڑی کے قریب پہنچے تو میں نے رانی کے منصوبے راجہ کو ایک طرف لے جا کر کھڑا کردیا۔

"آپ پہلے رانی کو اندر لے جائیں۔ وہ ہیرے بھی دے دے گی۔" پھر میں نے اسے آنکھ ماری۔ "پھر آپ کی ہر بات اور ہر حکم مان لے گی۔"

راجہ میری بات سمجھ کر مسکرادیا۔ وہ کسی فاتح جرنیل کی طرح اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا رانی کے پاس پہنچا اور اس کی بانہہ پر اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کرکے اسے اپنی طرف کھینچا۔ رانی مزاحمت کرنے لگی۔ اس نے اپنی بانہہ چھڑانے کے لیے پورا زور صرف کردیا۔ راجہ نے اسے چومنا چاہا تو اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ رسید کردیا۔ میں یہ دیکھ کر رانی کی طرف لپک گیا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ راجہ غصے میں آ کر اس کے کپڑے پھاڑ دے۔ وہ ایسا کرتا بھی۔ "رانی!" میں نے اسے سمجھایا۔ "ان کی مرضی اور بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ یہ تم سے محبت بھری باتیں کرنا اور کچھ دیر وقت گزارنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم جیل گئے تو میں تشدد برداشت کروں گا، لیکن وہاں تمہیں دن رات کئی بھیڑوں سے واسطہ پڑے گا۔"

"رانی نے قربانی کے جانور کی طرح میری طرف بے بسی سے دیکھا اور اپنا ایک ہاتھ فضا میں اٹھادیا۔ جیسے التجا کررہی ہو۔ میں نے دوسری طرف منہ پھیر لیا تو راجہ نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور پھر وہ تیزی سے جھونپڑی میں گھس گیا۔ پھر اس نے اندر پہنچ کر لات مار کر دروازہ بند کردیا اور چند ساعتوں کے بعد چیخنی لگالی۔ میرا دل کسی زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑانے لگا۔ میں لحہ بہ لحہ بڑھتی ہوئی وحشت اور اضطراری کیفیت

پر قابو نہ پاسکا تو بے چینی سے سایہ دار درخت کے نیچے ٹہلنے لگا اور سوچا کہ کیا میں اپنے جادو سے کام لوں۔ دوسرے لمحے میرے ذہن میں رانی کا منصوبہ آچکا تھا اور اب کسی جادو منتر کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے اپنی دانست میں ایک خطرناک قدم اٹھایا تھا اور ایسا خطرہ مول لیا تھا کہ اس کی ذراسی غلطی اور حماقت نہ صرف اس کی موت کا باعث بن سکتی تھی اور میں بھی ان درندوں کے عقاب کا نشانہ بن سکتا تھا لیکن جادو کے زور سے اپنی جان ان سے بچالیتا۔ مجھے یک لخت یاد آیا کہ رستم نے راجہ کے متعلق بتایا تھا کہ اسے کسی جرم کی پاداش میں ڈیڑھ دو برس پہلے پولیس کی ملازمت سے نکال دیا گیا تھا۔ وہ پولیس کی وردی پہن کر اور اس شخص کے ساتھ مل کر اور اس کی مدد سے غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث ہو کر نہ صرف بھتہ وصول کرتا تھا بلکہ لڑکیوں اور عورتوں کی عزت سے بھی کھیلتا تھا۔ مجھے تو ان کے پاس جو بندوقیں تھیں وہ چرائی ہوئی لگ رہی تھیں۔

مجھے بھی ہر لحہ چوکس رہنا تھا۔ رانی ایک محاذ پر اور میں دوسرے محاذ پر...... میں سردار کو اعتماد میں لینے کی غرض سے اس کے پاس پہنچا۔ وہ درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بڑے اطمینان سے کھڑا ہوا تھا اور اسکی نگاہ دروازے پر جمی ہوئی تھی اور وہ کسی ان جانے تصور میں ڈوبا ہوا اپنی خشخشی داڑھی پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ جب ہی اس کا چہرہ کسی تر و تازہ پھول کی طرح چمک اور دمک رہا تھا۔ وہ ابھی سے بہت خوش اور سرشار دکھائی دیتا تھا۔ ”سردار صاحب!“ میں نے خوشامدانہ انداز سے کہا۔ ”آپ کے پاس سگریٹ تو ہوگا۔ مجھے بڑی طلب ہو رہی ہے۔“

سردار صاحب شیریں خیالوں کی رنگین دنیا سے چونک کر نکلے۔ میری جانب ایک معنی خیز مسکراہٹ پھینکی اور پھر بولے۔

”میں بیڑی پیتا ہوں۔ اس لیے کہ سگریٹ اچھا نہیں لگتا۔ میرے پاس بیڑی ہے۔ پئیں گے؟“

”جی ہاں۔“ میں نے سر ہلا دیا۔ ”میں بھی کبھی کبھی بیڑی سے شوق کر لیتا ہوں۔ مجھے بیڑی بھی بہت اچھی لگتی ہے۔“ اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر بیڑی کا بنڈل نکالا۔ پھر ماچس نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ دی۔ میں نے ایک بیڑی نکال کر منہ سے لگائی اور اسے چلا کر بنڈل اور ماچس واپس کر دی۔ سردار صاحب پھر رنگین سپنوں کی دنیا میں ڈوب گئے۔ میں نے اس کی پشت پر کھڑے ہو کر اپنا چاقو باہر نکالا اور پھر اسے کھول کر جیب میں رکھ لیا۔ ایک ایک لحہ مجھ پر صدی بن کر گزر رہا تھا۔ دس منٹ گزر گئے۔ میں مایوسی کے اندھیرے میں ڈوبنے لگا۔ رانی شاید راجہ کے ہاتھوں بے بس ہو چکی تھی۔ آخر راجہ ایک کڑیل مرد تھا۔ بدکار اور سیاہ کار تھا۔ جانے اب تک کتنی لڑکیوں اور عورتوں کو قابو میں کر کے انہیں بے بس کر چکا تھا۔ اس کے لیے کسی بھی سرکش لڑکی کو زیر کرنا کچھ مشکل نہ رہا تھا۔ مجھ پر وحشت سوار ہونے لگی۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ میں سردار کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر اس کا کام تمام کر دوں۔ اس کی بندوق میرے ہاتھ لگ جائے تو راجہ سے دو دو ہاتھ کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔

میں نے جیب سے چاقو نکالا اور اس کے دستے پر اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کر لی۔ منہ میں بیڑی چباتا ہوا آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھا۔ اس کے پاس پہنچا ہی تھا کہ جھونپڑی کے اندر ایک دھماکا سا ہوا۔ یہ کسی کے فرش پر زور سے گرنے کی آواز تھی۔ جو بھی گرا تھا وہ برتنوں پر اور پر فرش پر...... فضا میں ایک دل خراش چیخ

بلند ہوئی مگر یہ چیخ رانی کی نہیں تھی۔ یکے بعد دیگرے کئی چیخیں بلند ہوئیں۔ سردار یک لخت چونکا اور اس نے اپنا ایک پیر آگے کی جانب بڑھایا ہی تھا کہ میں نے سرعت سے لپک کر اس کی پشت پر پہنچ کر اس کی گردن ناپی۔ وہ اس اچانک اور غیر متوقع حملے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی مزاحمت کرتا میں نے اس کے دائیں بازو میں چاقو گھونپ دیا۔ وہ چند لمحوں کے بعد زمین پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔ جی میں آیا کہ اسے عدم آباد بھیج دوں۔ لیکن اس خیال سے رک گیا کہ یہ قتل ہوگا۔ حالانکہ وہ دونوں مل کر مجھے اور رانی کو قتل کرنے والے تھے۔ پھر میں نے ایک سخت بڑا پتھر اٹھا کر اس کی کھوپڑی بجا دی کہ دو تین دن تک بے ہوشی کی حالت میں رہے۔ اندرونی دماغی چوٹ پر کسی کا جلد ہوش میں آنا ممکن نہیں ہوتا ہے۔

جب ہی میں نے دروازے پر دھکا دے کر ہذیانی لہجے میں پکارا۔ ”رانی!...... رانی...... جلدی سے دروازہ کھولو۔“ رانی نے دوسرے ہی لمحے اندر کی چٹخنی گرا دی اور دروازے کے پاس سے ہٹ کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ اندر داخل ہوتے ہی سب سے پہلے میری نگاہ راجہ کی لاش پر پڑی۔ اس کی آنکھیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ اس کا ایک بازو کٹ کر الگ ہو چکا تھا۔ اس کے جسم پر رانی نے بڑے سفاکانہ حملے کیے ہوئے تھے۔ راجہ، رانی کے وحشیانہ پن کا شکار ہو گیا تھا۔ فرش پر چاروں طرف خون ہی خون بکھرا ہوا تھا۔ کلہاڑی بھی خون میں نہا رہی تھی۔ رانی نے راجہ کے کپڑوں کی تلاشی لینی شروع کی جو فرش پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ انہیں ایک طرف پھینکتی ہوئی وحشت زدہ لہجے میں بولی۔

”سکندر...... اس کے پاس ہیروں کی پوٹلی تو نہیں ہے...... کہاں گئی......؟“

”ایں...... اس کے پاس ہیرے نہیں ہیں......؟“ میرا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا اور سر چکرا گیا۔ رانی کا دماغ بھی چکرا رہا تھا۔ وہ چکر کھا کر بستر پر گر پڑی اور زار و قطار رونے لگی۔ میں سٹ پٹا گیا۔ آخر ہیرے کہاں گئے......؟ دوسرے لمحے باہر کی جانب بھاگا اور سردار کی لاش کو گھسیٹتے ہوئے اندر لے آیا۔ جب میں نے اس کی تلاشی لی تو اس کی ایک جیب سے ہیروں کی پوٹلی نکل آئی۔ سردار نے اسے اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔ رانی اتنی دیر میں روتے ہوئے لباس پہن چکی تھی۔ میں نے اس کے پاس پہنچ کر کہا۔ ”رانی! یہ رہے تمہارے ہیرے......!“ رانی جو کپڑے پہن کر بھی رو رہی تھی اس نے جیسے ہی میرے ہاتھ میں ہیرے کی پوٹلی دیکھی اس نے رونا موقوف کر دیا۔ اس کا چہرہ گلاب کی طرح کھل اٹھا اور اس نے خوشی سے لڑکھڑاتی آواز میں پوچھا۔ ”کہاں تھے یہ ہیرے؟“

میں نے سردار کی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ”اس مردود اور کمینے کی جیب سے نکلے ہیں۔“ رانی نے پوٹلی کا منہ کھول کر وہ ہیرے ہتھیلیوں پر ڈال لئے۔ میری نظروں کے سامنے چھ عدد ہیرے تھے۔ جگ مگ جگ مگ کرتے ہوئے ہیرے...... ان کی چمک سے میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ بنگلہ دیش میں ان کی مالیت پانچ کروڑ کی تھی۔ میری دو مٹھیوں میں پورے پانچ کروڑ کی دولت تھی۔ تھوڑی دیر کے لیے میں کروڑ پتی بن گیا تھا۔ ”چلو...... انہیں رکھ دو۔“ میں نے اس کی طرف ہیرے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اب ہمیں جلد سے جلد اس منحوس علاقے سے نکل جانا چاہئے۔“

میں نے بے ہوش سردار اور راجہ کی لاش لے جاکر جھونپڑی کے عقب میں جو جھاڑیاں تھیں وہاں ڈال دی۔ رانی نے میرے واپس آنے تک فرش صاف کردیا تھا۔ پھر ہم نے ہیرے پانے کی خوشی میں زبردست جشن منایا۔ رانی نے جس محبت اور والہانہ پن کا ثبوت دیا تھا اس کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ گو دو ایک مرتبہ ہم دونوں جذبات کے طوفان کی زد میں خود کو محفوظ نہ رکھ سکے تھے۔ لیکن یہ ایسا طوفان تھا جس نے تہس نہس اور تاخت و تاراج کردیا تھا۔ رانی کو کسی بات کا ڈر اور خوف نہ رہا تھا۔ نہ پولیس کا اور نہ ہی گشتی فوج کا۔ بس وہ تو دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہوگئی تھی۔

جب ہم وہاں سے نکلے تو ہیرے پانے کی خوشی اور سرشاری بھی ایسی تھی کہ وہ بھی شباب اور پرانی شراب کے نشے کی طرح ذہنوں پر چھایا ہوا تھا۔ اس سے اب تھکن کا احساس بھی نہیں ہورہا تھا۔ ہم چلتے چلتے تھک جاتے۔ کسی درخت یا پیڑ کے نیچے کچھ دیر ستانے کے لیے رک جاتے۔ راستہ صاف تھا۔ اتفاق تھا یا خوش قسمتی کہ کوئی بھی نظر نہ آیا۔ ہم جتنی دیر بھی بیٹھتے جذبات کی فراوانی سے سرشار ہوتے اور پھر چل پڑتے۔ یہ سفر رانی کی معیت میں گزرتا ہوا ایک ایک لمحہ نشہ انگیز اور یادگار بنتا چلا گیا۔ اس وقت ہم دونوں صرف اور صرف مرد اور عورت تھے۔ کوئی طبقاتی فرق نہ تھا۔ ہم دونوں اپنی اپنی عمریں بھول چکے تھے اور اپنے آپ کو بھی فراموش کرچکے تھے۔ محبت کا یہ سفر جیسے سپنوں کی رنگین وادی میں جاری تھا۔

میں اور رانی کوئی تین گھنٹے کی مسافت کے بعد ایک گاؤں میں پہنچے۔ اس وقت رات ہوچکی تھی۔ ہم دونوں کا بھوک سے برا حال تھا۔ ایک بھٹیار خانے میں دال اور لال موٹا موٹا بھات ملا اس کو خوب سیر ہوکر کھایا۔ دال میں بڑا ذائقہ تھا۔ جیسور شہر اب کوئی دو میل کے فاصلے پر واقع تھا، لیکن دو سو میل کے فاصلے پر لگ رہا تھا۔ ہم اس گاؤں کے کھیتوں سے ہوتے ہوئے ہندوستان کی سرحد پار کرکے بنگلہ دیش کی حدود میں جا پہنچے۔ انتظار اگر تھا تو رات کے دس بجنے کا۔ بھٹیار خانے کا مالک جگ دیش بڑے اچھے دل کا مالک اور با اخلاق بھی تھا۔ رات گیارہ بجے میں اور رانی جی ٹی روڈ پر پڑے ہوئے بنگلہ دیش کی کھلی فضا میں سانس لے رہے تھے۔ اس وقت کسی سواری کا ملنا ممکن نہیں تھا۔ اتفاق سے ایک خالی ٹیکسی نظر آگئی۔ وہ رستم کا دوست جعفر نکلا۔ میری بھی اس سے شناسائی رستم کی بدولت ہی ہوئی تھی۔ اس نے ہم دونوں کو خیر و عافیت سے عزیز ہوٹل پہنچا دیا جو کورٹ کچہری کے پاس تھا۔

عزیز ہوٹل میں ڈبل بیڈ کا کمرا خالی نہیں تھا۔ سنگل بیڈ لینا پڑا۔ میں اپنی اس کامیابی پر بے حد مسرور ہوا۔ رات بھر محبت بھری باتیں کرنے اور جاگنے کا فیصلہ کرلیا۔ ڈھاکا پہنچنے کے بعد رانی میرے ہاتھ کہاں لگتی۔ وہ اپنی سوسائٹی اور بڑے بڑے گھرانوں کے لڑکوں میں گم ہوکر رہ جاتی۔ میری اس کی نظروں میں وقعت ہی کیا تھی؟ محض اپنی غرض اور مجبوری کے ناتے مجھ پر مہربان ہوگئی تھی۔ کوئی حجاب اور فاصلہ نہیں رہا تھا۔ یوں بھی دولت مند لوگ بڑے خود غرض ہوتے ہیں۔ ہم دونوں میاں بیوی کی حیثیت سے ٹھہرے تھے اور اس رشتے کو رات آخری پہر تک نبھایا تھا۔ صبح جب میری آنکھ کھلی تو میں بستر پر اکیلا تھا۔ رانی بستر میں نہیں تھی بلکہ وہ ایک کرسی پر براجمان تھی۔ اس کے بالوں سے ٹپکتے موتی بتا رہے تھے کہ وہ ابھی نہا کر نکلی ہے۔

اس کے چہرے پر شادابی اور تازگی اور شگفتگی چھائی ہوئی تھی۔ اس میں ایک عجیب سا نکھار پیدا ہوگیا تھا۔ سفر اور شب بیداری کی تھکن جیسے دور ہوگئی تھی۔ وہ صبح کا اخبار پڑھنے میں منہمک تھی۔ اس نے مجھے جاگتے دیکھا تو مسکرانے کی کوشش کی۔ انداز میں بے پناہ حسن کی جھلک تھی۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ جب میں بستر سے نکل کر اسے محبت بھری نظروں سے دیکھتا ہوا اس کی جانب بڑھا تو وہ میرے ارادوں کو بھانپ کر بے حد سنجیدہ ہوگئی۔ جب اس نے مجھے مخاطب کیا تو اس کی آواز میں اجنبیت اور تحکم سا تھا۔ ”مسٹر سکندر! آپ فوراً تیار ہوجائیں...... ہمیں بہت سارے کام نمٹانے ہیں۔“

میں فوراً ہی اپنی جگہ ٹھٹک کر رک گیا۔ یک لخت مجھے احساس ہوا کہ میں نے بڑی جلدی اپنی حیثیت کو فراموش کردیا۔ آخر میرے اور رانی کے درمیان رشتہ ہی کیا ہے؟ پھر بھی جانے کیوں میرا دل اندر سے دکھ گیا۔ رانی کی بے رخی اور اس کا اجنبی لہجہ مجھے ناگوار سا لگا۔ میں اس کے رویے کو پی گیا۔ کرتا بھی کیا۔ اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ میں نے اس سے بے دلی سے پوچھا۔ کیا ہوائی جہاز کے ٹکٹ کا بندوبست کرنا ہے......؟ ایئر پورٹ سے یا شہر میں جو بکنگ آفس ہے اس سے؟“

رانی نے اخبار تہہ کرکے گود میں رکھا اور اس نے اپنے ہاتھ اخبار پر رکھ کر کہنے لگی۔ ”سب سے پہلے تو ہم پرتکلف ناشتا کریں گے۔ ناشتے کے فوراً بعد آپ بازار جاکر میرے لیے ایک زنانہ جوڑا خرید یں گے۔ کیوں کہ اب میں لڑکی بن کر سفر کروں گی اور ہاں...... اور ہاں آپ میرے لیے ایک پرس اور سینڈل بھی خرید لیں۔“ میں نے ناشتے کے دوران اندازہ لگایا کہ رات کے آخری پہر جب ہم سوئے تھے اس وقت تک وہ بڑی مہربان اور فیاض رہی تھی۔ لیکن اب صبح ہوتے ہی وہ یکسر بدلی ہوئی تھی۔ اس کا لہجہ سرد ہے اور اس میں رعونت ہی جھلک رہی ہے۔ اب ہم دونوں کے درمیان طبقاتی دیوار کھڑی ہوئی تھی۔ جب تک اس کی غرض پوری نہیں ہوئی تھی اس وقت تک اس نے مجھے بڑی محبت، خودسپردگی اور والہانہ انداز سے خوش کیا تھا۔ اپنی غرض پوری ہونے اور بہ حفاظت اپنے دیش کی سرزمین پر پہنچنے تک اب اس کی نظروں میں، میں اب ایک عام سا شخص تھا اور میری کوئی وقعت نہیں رہی تھی۔ آج مجھے اندازہ ہوا تھا کہ دولت مند کس قدر خود غرض اور مطلب پرست ہوتے ہیں۔ وہ مجھ پر سفر کے دوران اور ہوٹل پہنچنے تک بدلی بن کر برستی رہی تھی۔

میں نے کپوریا پٹی بازار جاکر اکبر اینڈ سنز سے اس کے لیے ایک سفید سوتی ساڑی اور سفید بلاؤز خریدا۔ یہ بلاؤز یہاں کے نئے فیشن کے مطابق تھا۔ پھر سیاہ چرمی پرس اور سینڈل بھی خریدے۔ پھر میں یہ سامان رانی کے حوالے کرکے جیسور ایئر پورٹ ٹیلی فون کیا۔ ٹکٹ مل گئے۔ جب میں کمرے میں داخل ہوا تو وہ اس سفید لباس میں کمرے میں چاند کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ بہت قیامت کی ہوگئی تھی۔ اسے اس عالم میں دیکھ کر میرا دل بجھ سا گیا لیکن میں نے اپنے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ آخر میں ایک پردیسی اور مسافر جو تھا۔ میں نے اسے روانگی کے بارے میں بتایا تھا۔ رانی نے روانگی سے قبل ٹیلی فون پر اپنی ممی کو ہم دونوں کی آمد کی اطلاع دے دی تھی۔ ڈھاکہ ایئر پورٹ پر نجم النساء بیگم ہم دونوں کا بے چینی سے انتظار کررہی تھیں۔ رانی فرط جذبات سے مغلوب ہوکر ماں کے سینے سے جا لگی۔ وہ ہمارے دو دن تاخیر سے پہنچنے پر بہت پریشان دکھائی

دے رہی تھیں۔ انہوں نے سب سے پہلے جو جملہ ادا کیا وہ یہ تھا۔ ”کیا سب خیریت ہے؟“

رانی نے ماں کو آنکھوں ہی آنکھوں میں پرس کی طرف اشارہ کر کے جواب دیا۔ ”بالکل خیریت ہے فکر نہ کریں۔“ معاً میری نگاہ ان چار آدمیوں پر پڑی جو ایئر پورٹ کی عمارت کے ایک گوشے میں کھڑے ہوئے بڑے پراسرار دکھائی دے رہے تھے۔ وہ معنی خیز نظروں سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ ایک خیال جو میرے ذہن میں آیا وہ یہ کہ کہیں یہ لوگ اس کے گروہ کے تو نہیں ہیں جن سے پٹیل اور آرائیں کا تعلق ہے لیکن اس کے زخمی ہونے کی خبر میں اتنی جلدی ڈھاکا نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ میں نے اپنا واہمہ سمجھ کر ذہن سے ان خیالات کو جھٹک دیا۔ وہ چاروں آدمی ریسٹورنٹ کی جانب چلے گئے۔ پھر ہم نجم النساء بیگم کے ساتھ عمارت سے باہر آئے۔ میں نے رانی کی ممی سے اجازت چاہی تو وہ ایک دم سے چونک پڑیں اور میرا بازو تھام کر بولیں۔ ”نہیں بیٹے......! تم ہمارے ساتھ چلو گے۔ تمہارا کام ختم ہو گیا ہے لیکن میرا کام باقی ہے۔ میں دونوں کی روداد سننا چاہتی ہوں۔“

میں نے ان کے خلوص و اصرار اور محبت کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ انہوں نے جو ڈھاکہ پہنچنے پر بیس ہزار کی رقم دینے کا وعدہ کیا تھا وہ ڈالر کی شکل میں اس وقت دے دیا۔ عمارت سے باہر آئے تو پارکنگ روٹ پر ان کی نئے ماڈل کی سفید مرسڈیز کھڑی ہوئی تھی۔ ان کا وردی پوش ڈرائیور جو جانے کہاں غائب ہو گیا تھا وہ دوڑا ہوا آیا اور اس نے مودب ہو کر دروازہ کھولا۔ میں اگلی نشست پر ڈرائیور کے پہلو میں جا بیٹھا۔ ماں اور بیٹی پچھلی نشست پر بیٹھ گئیں۔ پھر گاڑی چل پڑی۔

نجم النساء بیگم کی کوٹھی سندنی کالونی میں تھی جو اس شہر کا سب سے اعلیٰ اقامتی علاقہ تھا۔ گاڑی کے اندر خاموشی طاری تھی۔ ڈرائیور کی موجودگی کے باعث وہ اس موضوع پر جیسے کوئی بات کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ جب گاڑی سندنی کالونی کے علاقے میں داخل ہوئی تو ایک ویران اور سنسان سڑک پر ایک جھٹکے سے رک گئی۔ جانے کیا ہوا کہ اس کا انجن ہی بند ہو گیا۔ ڈرائیور نے گاڑی سے اتر کے انجن کا معائنہ کر کے بتایا کہ اس میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ اسے ٹھیک ہونے میں ایک گھنٹہ بھی لگ سکتا ہے۔

نجم النساء بیگم یہ سنتے ہی اس پر بری طرح برس پڑیں۔ ایک بالکل نئی گاڑی میں اچانک یہ خرابی کیسی......؟ کچھ سمجھ میں آنے والی بات بھی نہیں تھی۔ ہم تینوں گاڑی سے اتر گئے تاکہ کوئی ٹیکسی یا لفٹ لے کر چلے جائیں۔ گھر زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ ہم سڑک کے کنارے کھڑے ہو گئے۔ ایک سرخ رنگ کی ٹویوٹا بڑی تیزی سے ہماری سمت آتی دکھائی دی۔ چند ثانیوں بعد وہ گاڑی ایک جھٹکے سے ہمارے سامنے رک گئی۔ میں گاڑی کے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر چونک پڑا۔ یہ وہی پراسرار لوگ تھے۔ جنہیں میں نے ایئر پورٹ کی عمارت میں دیکھا تھا۔ اس میں سے دو آدمی ریوالور لے کر اترے اور ہمیں گھیر لیا۔ اندر جو ایک آدمی اگلی نشست پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا اس کے ہاتھ میں ایک اسٹین گن تھی جس کا رخ ہماری طرف تھا۔ ایک شخص نے آگے بڑھ کر نجم النساء بیگم کے دھڑکتے سینے پر ریوالور رکھ دیا اور اس نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھورا۔ ”براہ کرم! یہ ہیرے ہمارے حوالے کر دو۔“ اس کے لہجے میں بلا کی کاٹ تھی۔

”ہیرے......؟“ رانی ایک دم سے اچھل پڑی اور اس نے جلدی سے اپنا پرس پیچھے کر لیا۔ وہ منمنائی۔ ”کیسے ہیرے؟“

”میں صرف رانی لینے آیا ہوں۔“ اس شخص نے دھمکی آمیز لہجے میں نجم النساء بیگم سے کہا۔ ”اگر مزاحمت اور بہادری دکھانے کی کوشش کی تو تین لاشیں یہاں خون میں نہائی ہوئی نظر آئیں گی۔ کیا یہ منظر بہت خوب صورت ہوگا؟“

”سکندر......! سکندر......!“ رانی نے مجھے ڈھال بنا کر ہذیانی لہجے میں کہا۔ ”ان بدمعاشوں سے بچاؤ۔“ میرا ان بدمعاشوں سے بھڑ جانا اور ان دونوں کو بچانا کوئی مشکل نہ تھا۔ میرے پاس جادو تھا۔ میں منتروں سے دشمن کو بھگا سکتا اور قابو میں کر کے بے بس کر سکتا تھا۔ وہ بال تک بیکا نہیں کر سکتے تھے لیکن میں ایسا کیوں کرتا......؟ رانی کے خود غرضانہ رویے نے میرا دل بجھا دیا تھا۔ اس لیے میں بے حس و حرکت کھڑا تماشا دیکھنے لگا۔ نجم النساء بیگم نے رانی کی طرف دیکھتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”رانی......! اسے ہیرے دے دو۔“

”لیکن ممی......؟“ رانی پس و پیش کرنے لگی۔ ”کیوں دے دوں۔ یہ ان کے باپ کے نہیں ہیں اور پھر میں نے......“

”رانی!“ وہ غصے سے اس کی بات کاٹ کر بولیں۔ ”ان منحوس ہیروں کو ان کے حوالے کر دو۔ یہ زندگی سے زیادہ قیمتی نہیں۔“

”لیکن ممی......؟“ رانی تذبذب میں پڑ گئی۔ اس کے شہابی رخساروں پر زردی سی تیرنے لگی۔ اس کا سراپا۔ مرتعش ہو گیا۔ اس نے کسی قدر پس و پیش کے بعد پرس اس بدمعاش کی جانب پھینک دیا جس نے اس کی ماں کو ریوالور کی زد میں لیا ہوا تھا۔ اس شخص کے چہرے پر جو سفاکی تھی وہ بتا رہی تھی کہ اگر رانی نے اس کے حکم کی تعمیل نہیں کی تو وہ ہم تینوں کو قتل کرنے سے دریغ نہیں کرے گا۔ پرس اس کے قدموں میں جا گرا۔ اس شخص نے فوراً ہی جھک کر پرس اٹھا لیا۔ اسے کھول کر اندر سے ہیروں کی پوٹلی نکالی۔ پھر اس کی زپ کھول کر اس کے اندر جھانکا اور ہیرے عجلت میں چیک کیے۔ پھر اس نے خالی پرس رانی کی طرف اچھال دیا۔ پھر اس نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔ ”نیک بی بی......! تم بڑی سیانی ہو...... سمجھ دار بھی ہو وقت شناس بھی......“

اس نے رانی کے بارے میں جو کچھ بھی کہا تھا وہ غلط نہ تھا۔ وہ نہ صرف وقت شناس بلکہ موقع پرست بھی تھی۔ پھر چند ثانیوں کے بعد وہ لوگ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر ہوا ہو گئے۔ ان لوگوں کے جاتے ہی رانی اپنے آپ کو سنبھالتی ماں کی طرف بڑھی اور ان کے کندھے پر اپنا سر رکھ کر زار و قطار رونے لگی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ جس نے نجم النساء بیگم کا گریبان بھگو دیا۔ وہ اپنی بیٹی کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتی ہوئی اسے دلاسا دینے لگیں۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ وہ اس قدر حوصلہ مند خاتون ہیں۔ ان ہیروں کے چھن جانے سے ان کے ماتھے پر بل تک نہیں پڑا تھا۔ وہ اپنی تمام تر کیفیت پر قابو پائے ہوئے تھیں۔ میں نے ڈرائیور کے پاس جا کر اسے اٹھایا جو ان مسلح بدمعاشوں کے خوف سے زمین پر لیٹا

تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ”چلو اٹھو......“ میں نے کہا۔ ”وہ بدمعاش چلے گئے ہیں۔ ان کی ذات سے کوئی خطرہ نہیں رہا ہے۔ اپنے آپ کو سنبھالو۔“

ایک ٹیکسی کر کے جب ہم نجم النساء بیگم کی کوٹھی پر پہنچے تو رانی غم سے نڈھال ہوئی جا رہی تھی۔ انہوں نے ایک گلاس ٹھنڈا پانی منگوا کر پلایا تو وہ کسی قدر پرسکون سی ہوگئی لیکن چہرے پر یاسیت اور آنکھوں میں غم کی گھٹا چھائی رہی۔ اس کے اعصاب معمول پر آ گئے۔ وہ بڑے صوفے پر ایک طرح سے نیم دراز ماں کے پاس ہی بیٹھی رہی۔ میں سوچ رہا تھا کہ عورت کے کھیل بھی کس قدر عجیب و غریب اور نرالے ہوتے ہیں۔ ان ہیروں کے باعث ہم دونوں ایک خوف ناک طلسم میں پھنس گئے تھے۔ ایک ایسی افتاد سر پر آن پڑی تھی اس سے نکلنے کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ان ہیروں کے کھو جانے کے بعد انہیں دوبارہ پانے کے لیے کیا کچھ پاپڑ بیلنے نہیں پڑے تھے۔ کتنی جانیں ضائع ہوئیں۔ خون خرابے ہوئے۔ ان تمام کی نجم النساء بیگم کو خبر نہیں تھی۔ ہم ایک پل صراط سے گزرے تھے۔ انہیں یہ کہانی ابھی سنانا تھی۔ ایک بات قدرت نے طے کر دی تھی کہ وہ ہیرے ان کی قسمت میں نہیں تھے۔ کروڑوں کے ہیرے انہوں نے صرف ایک دو لاکھ روپے میں حاصل کیے تھے۔ پٹیل کی باتوں سے یہ اندازہ ہوا تھا کہ انہوں نے یہ ہیرے پانے کے لیے اپنے آپ کو کھویا بھی تھا۔ رانی نے کہا تھا کہ پٹیل نے ان کی بے حرمتی بھی کی تھی۔ اس دولت کے لیے جو انسان قبر میں نہیں لے جا سکتا اپنے آپ کو کتنا سستا کر دیتا ہے گرا دیتا ہے۔

ایکا ایکی رانی مجھ پر برس پڑی۔ ”اگر آپ ہمت اور کوشش کرتے تو بدمعاش وہ ہیرے لے جا نہیں سکتے...... آپ کو اس وقت کیا ہو گیا تھا۔ بت بنے کھڑے ہو گئے تھے۔ ایسے دیکھ رہے تھے جیسے کسی فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہو۔ آپ اس قدر بزدل کیوں ہو گئے تھے؟“

”تم پاگل تو نہیں ہو گئیں؟“ نجم النساء بیگم نے تیزی سے کہا۔ ”ایک تنہا آدمی کس کس سے لڑ سکتا ہے؟ وہ تینوں کیا مسلح نہیں تھے......؟ ایک گاڑی کے اندر بیٹھا ہوا تھا۔ باقی دو باہر کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں بھی کھلونے نہیں تھے۔“

”تم ان ہیروں کی فکر نہ کرو۔“ نجم النساء بیگم بے پروائی سے بولیں۔ ”مجھے ان کی ذرہ برابر بھی فکر نہیں ہے۔ کیا یہ کافی نہیں ہے کہ ان خطرناک لوگوں سے نجات مل گئی اور ہماری جانیں بچ گئیں۔ یہی بہت ہے۔“

”کیا......؟“ رانی کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ ”آپ ان کروڑوں کی مالیت کے ہیروں کو آسانی سے چھوڑ دیں گی ممی......؟“

”وہ ہیرے نقلی تھے......“ نجم النساء بیگم بے اختیار مسکرا کر دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھیں منجمد اور پلکیں ساکت ہو گئیں۔

نجم النساء بیگم نے ہم دونوں پر ہی جیسے کوئی بجلی سی گرا دی تھی۔ میں اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا۔ میری رگوں میں سن سناہٹ دوڑتی چلی گئی۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ لمحے کے لیے میں نے سوچا کہیں یہ میری

سماعت کا فتور تو نہیں......؟ میں تو یہ سمجھا تھا کہ اتنے قیمتی ہیروں سے ہاتھ دھونے کے بعد وہ اوسان کھو چکی ہیں۔ لیکن وہ اپنے حواس میں تھیں۔ زیر لب مسکرا رہی تھیں۔ ایک فاتح کی طرح مسرور تھیں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ عورت اندر سے اتنی گہری اور ہوشیار ہے۔ آخر کیوں نہ ہوتی۔ اس عورت نے ان ہیروں کے حصول کے لیے اپنی عزت و آبرو کی پروا نہیں کی تھی۔ رانی نے مجھے چلتے چلتے بتایا تھا کہ ان کی جائیداد لندن میں بھی ہے جس سے ماہانہ بیس ہزار پاؤنڈ وصول ہوتے ہیں اور بینک بیلنس بھی لاکھوں کا ہے اور بنگلہ دیش میں بھی کروڑوں کی جائیداد اور بینک بیلنس بھی ہے۔ اتنی دولت ہونے کے باوجود پھر بھی دولت کی اتنی ہوس......؟ یہ بات سمجھ سے بالاتر تھی، آخر وہ اتنی دولت کا کیا کریں گی؟ جب کہ ان کی ایک بیٹی بھی ہے۔

رانی کی کیفیت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی۔ وہ کئی ساعتوں تک سناٹے کا شکار رہی۔ جیسے اس کی نظریں سفر کی صعوبتیں اور ان بدمعاشوں کی لاشیں گھوم رہی ہوں جنہیں اس نے قتل کیا اور پھر اسے ان ہیروں کی خاطر مجھ پر مہربان بھی ہونا پڑا۔ اسے اپنا سب کھو دینے کا غم نہیں تھا کیوں کہ وہ لندن کے آزادانہ ماحول میں دس برس بھی رہی تھی۔ وہاں کی لڑکیوں اور ہائی سوسائٹی کی لڑکیاں اس بات پر فخر کرتی ہیں اور اسے اعزاز سمجھتی ہیں کہ ان کی زندگی میں سب سے زیادہ لڑکے آئے۔ اس معاملے میں لڑکیاں نسبت لے جانے کی کوشش کرتی ہیں۔ یہ شرم ناک امران کے نزدیک نہیں ہوتا ہے۔ رانی نے یک لخت چونک کر اپنی ماں کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا جو سرشاری کے عالم میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

”ممی!“ رانی نے قدرے سرد سفاک لہجے میں کہا۔ ”اگر وہ ہیرے نقلی تھے تو مجھے اس جہنم میں جھونکنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”یہ سب کچھ میں نے پٹیل کے گروہ کو بے وقوف بنانے اور پٹیل سے بدلہ لینے کے لیے کیا۔“ نجم النساء بیگم کہنے لگیں۔ ”کولکتہ کے مکان میں جو چوکی دار رنجیت ہے نا وہ ہمارے دشمن کے ہاتھوں بکا ہوا ہے۔ وہ ہر لمحے ہماری ٹوہ میں لگا رہتا تھا۔ ایسی صورت میں ان ہیروں کو بنگلہ دیش لے جانا آسان نہیں رہا تھا۔ پٹیل میری جان کا دشمن بنا ہوا تھا۔ کیوں کہ میں نے اسے فریب دے کر بے وقوف بنا کر وہ ہیرے دوبارہ حاصل کر لیے جو بنارس کے مندر کے پجاری سے حاصل کیے تھے۔ کس طرح حاصل کیے اور اس پجاری کو کس طرح بے وقوف بنایا یہ الگ کہانی ہے۔ وہ کمینہ حسن و شباب کا پجاری بھی تھا اور اسے دولت کی بھی ہوس تھی۔ دو لاکھ کی رقم میں کام بن گیا تھا۔ پٹیل اور اس کے گروہ کے آدمیوں کا خیال تھا کہ میں ان ہیروں کو ہمہ وقت ساتھ لیے پھرتی ہوں۔ اس لیے وہ مجھے سر راہ قتل کرنے کے درپے تھے۔ میں نے اپنے دشمن کو غلط راہ پر ڈالنے کے لیے اس چوکی دار کو اپنے اعتماد میں لے کر بتایا کہ میں اپنی بیٹی کے ہاتھوں ہیرے اسمگل کروا رہی ہوں۔ میں نے اپنی دشمن کی توجہ ہٹانے کے لیے یہ کیا تھا۔ میں ان ہیروں کو ہوائی جہاز سے لے کر ڈھاکا پہنچ گئی۔ اب وہ ہیرے میری خواب گاہ کی تجوری میں محفوظ ہیں۔ تین دن بعد میں اور رانی ان ہیروں کو بنکاک لے جا کر فروخت کر دیں گی۔ میری بڑی تمنا ہے کہ میں بنگلہ دیش کی سب سے امیر کبیر عورت بن جاؤں۔ مجھے وہاں ان ہیروں کے اچھے خاصے امریکی ڈالر با آسانی مل جائیں

گے۔ یہ ہیرے سو برس قدیم ہیں اور نایاب ہیں۔ اس لیے میں نے یہ کھیل کھیلا اور جیت گئی۔''

''اوہ ممی!'' رانی نے اپنا سر پیٹ لیا۔ ''آپ نے کم از کم مجھے تو ان ہیروں کے بارے میں بتا دیا ہوتا؟''

''اگر میں بتا دیتی تو تم اس سفر پر ہرگز نہیں جاتیں۔'' نجم النساء بیگم نے جواب دیا۔ ''شکر ہے تم خیریت سے پہنچیں۔'' رانی نے انہیں بڑی تفصیل سے رام کہانی سنائی۔ نجم النساء بیگم بڑی توجہ اور انہماک سے سنتی رہی تھیں۔ انہیں یقین نہیں آیا کہ یہ سفر اس قدر پرخطر اور حیرت سے ہم کنار کر دینے والا خونی تھا۔ ان کی رگوں میں جیسے لہو منجمد ہو کر رہ گیا۔ ان پر بڑی دیر تک سکتے کی کیفیت طاری رہی۔ جب رانی نے اس کہانی کا اختتام کیا تو ان کی آنکھیں بھر آئیں۔

''بیٹے......!'' نجم النساء بیگم نے بڑے خلوص سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''میں تمہارے جذبے کی جس قدر بھی تعریف کروں وہ کم ہے۔ ایسی جاں نثاری اور اس قدر تکلیفیں تو ہمارے خاندان کا کوئی فرد بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ تم نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہمیں خرید لیا ہے۔ ہم زندگی بھر تمہارا احسان نہیں بھول سکتے۔''

میں ان جذبات کے آگے جن میں ممنونیت بھری ہوئی تھی رسمی انکساری کا اظہار ہی کر سکتا تھا۔ اس لیے خاموش رہا۔ ''امی...... پلیز......!'' رانی نے کہا۔ ''آپ کیا وہ اصلی ہیرے دکھانا پسند کریں گی جو نایاب اور قیمتی بھی ہیں۔'' نجم النساء بیگم اٹھ کر اپنی خواب گاہ کی طرف بڑھ گئیں ہیرے لا کر دکھانے کے لیے...... میں اور رانی اکیلے رہ گئے تھے۔

''رانی!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس سے کہا۔ ''اس سفر کے دوران جو کچھ ہوا۔ ہم بہک گئے۔ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ اس کی تلافی کر دوں۔ کفارہ کر دوں۔ کیوں نہ ہم دونوں گھر بسا لیں۔ غیر قانونی میاں بیوی بن چکے تھے اب اسے قانونی بنا دیں۔''

''تم نے یہ بات کہنے سے پہلے اپنی اوقات دیکھی اور اس کے بارے میں سوچا۔'' وہ نخوت سے بولی۔ ''سفر میں جو کچھ ہوا اس سے میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا......؟ تم پہلے آدمی نہیں ہو جو میری زندگی میں آئے...... میرا منگیتر امریکہ میں ہے۔ میں اس سے شادی کروں گی۔ وہ بھی ایک کروڑ پتی شخص ہے۔ آئندہ ایسی بات زبان سے نہ نکالنا۔''

رانی کے کہنے کا یہ انداز مجھے بہت ناگوار لگا۔ وہ کسی اور انداز سے یہ بات کہہ سکتی تھی۔ میری دل آزاری نہ ہوتی اور نہ ہی مجھے صدمہ ہوتا اور پھر میں نے سوچا کہ میں ایک دوت مند اور آبرو یافتہ لڑکی سے شادی کیسے کر سکتا ہوں؟ نجم النساء بیگم تھوڑی دیر بعد ہیروں کی چرمی پوٹلی لے کر آئیں۔ انہیں تپائی پر پوٹلی سے نکال کر رکھا۔ نجم النساء بیگم کو اصلی ہیروں کا تجربہ اور پہچان تھی۔ کیوں کہ وہ ایک جوہری باپ کی بیٹی تھیں اور ان کے باپ کی جیولری شاپ تھی جسے آج بھی ان کا بھائی چلا رہا تھا۔ میں ان اصلی ہیروں کو دیکھتا رہا جو انمول اور نایاب تھے۔ پھر انہوں نے ہیروں کو پوٹلی میں رکھا اور تجوری میں رکھ کر کمرے میں آئی تھیں کہ بن بلائے چار مہمان جو مسلح تھے وہ آدھمکے یہ وہی تھے جنہوں نے ہمیں راستے میں روک لیا تھا۔ ان

کے سرغنہ نے رانی اور انہیں نرغے میں لے کرختہ لہجے میں کہا۔

''تم نے ہمیں نقلی ہیرے دے کر بے وقوف بنا دیا۔ اصلی ہیرے کہاں ہیں۔ جلدی سے لاؤ۔''

''میں نے وہ ہیرے بنکاک جا کر فروخت کر دیئے اور کل رات کی فلائٹ سے تو واپس آئی ہوں۔'' انہوں نے جواب دیا۔

''سنو...... بے وقوف بنانے کی ضرورت نہیں۔'' وہ دہاڑا۔ ''اگر تم نے ہیرے نہیں دیئے تو ہم تمہیں اور تمہاری بیٹی کو کھلونا بنائیں گے۔ پھر تجوری سے ہیرے نکال کر تم تینوں کو موت کی نیند سلا دیں گے۔ تم آج اب بھی دوشیزہ معلوم ہوتی ہو۔''

''بیگم صاحبہ!'' میں نے کہا۔ ''ان صاحب کو خواب گاہ میں لے جائیں اور تجوری میں سے ہیرے کی پوٹلی نکال کر دے دیں۔ اس پوٹلی میں جو قیمتی پتھر ہیں دیکھ کر یقین آ جائے گا کہ آپ نے اصلی ہیرے فروخت کر دیئے اور وہاں سے پتھر لے آئیں۔ اس کے سوا چارہ نہیں۔ ضد اور ہٹ دھرمی نہ کریں۔ اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔'' نجم النساء بیگم اور رانی کی حالت مردے سے بدتر ہو رہی تھی۔ وہ اس سرغنہ کے ساتھ گئیں۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئیں تو سرغنہ کے ہاتھ میں ہیروں کی پوٹلی تھی۔ وہ بہت خوش ہو رہا تھا اور پوٹلی کو فضا میں اچھال رہا تھا۔ ''آپ پوٹلی کھول کر چیک کر لیں۔'' میں نے کہا۔ ''اس میں ہیرے نہیں ہیں۔ پتھر ہیں۔ زمرد نیلم اور پکھراج۔''

''یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' اس کے ساتھی نے کہا۔ ''ابھی پتا چل جاتا ہے کہ اس عورت نے جھوٹ کہا یا سچ......؟'' سرغنہ نے پوٹلی کا منہ کھول کر اسے تپائی پر الٹ دیا۔ اس میں سے ہیروں کے بجائے پتھر نکلے۔ اس سرغنہ اور اس کے ساتھیوں نے ہی نہیں بلکہ رانی نے حیرت اور غیر یقینی نظروں سے دیکھا۔ سرغنہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''اب تمہیں بیگم صاحبہ کی بات کا یقین آیا۔'' میں نے کہا۔ ''وہ ہیرے بنکاک میں فروخت کر کے وہیں کے بینک میں جمع کر کے آئی ہیں۔'' تھوڑی دیر تک تناؤ کی سی کیفیت رہی۔ ان کے تیور اور ارادے اچھے نہیں تھے لیکن میں نے جادو کے زور سے انہیں واپس جانے پر مجبور کر دیا۔ جب وہ چلے گئے تو نجم النساء بیگم نے ان پتھروں کو دیکھا۔ ''ابھی! ہیرے کہاں گئے......؟ یہ پتھر کیسے بن گئے؟'' میں نے ان پتھروں کو پوٹلی میں ڈال کر ان سے کہا۔ ''یہ اصلی ہیرے پھر سے بن سکتے ہیں۔ ایک شرط پر......''

''کس شرط پر......؟ اور کیسے......؟'' وہ بری طرح چکرا رہی تھیں۔ ان کا چہرہ ہلدی کی طرح ہو رہا تھا۔ آواز حلق میں اٹک رہی تھی۔

''آپ مجھے دو لاکھ پاؤنڈ کی رقم دیں۔'' میں نے خالص کاروباری لہجے میں کہا۔ میں اس دولت کی پجاری عورت کے ساتھ کوئی رعایت کرنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ ایک ارب پتی عورت تھی۔ رانی جس طرح میرے ساتھ پیش آئی تھی۔ اس کی یہی سزا تھی۔

''دو لاکھ پاؤنڈ......؟'' نجم النساء بیگم ایک دم سے اچھل پڑیں۔ ''دو لاکھ بنگلہ دیشی ٹاکا لے لو۔''

"نہیں۔" میں نے سر ہلا دیا۔ "میں جا رہا ہوں۔ یہ گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔ آپ دو لاکھ سے ہیروں پر پانچ چھ کروڑ کمائیں گی..... اگر میں نے دو لاکھ پاؤنڈ طلب کئے ہیں تو کیا قصور کیا۔ یہ تو سو روپے کے پتھر بھی نہیں ہیں۔"

وہ بادل نخواستہ تیار ہو گئیں۔ اندر سے ایک لفافے میں دو لاکھ پاؤنڈ کی رقم لے آئیں جو بڑے نوٹوں کی شکل میں تھی۔ جب انہوں نے میز پر پوٹلی کھول کر انڈے ملے تو اس سے وہ ہیرے نکل آئے جو اصل تھے۔ ماں اور بیٹی حیرت اور فرش سے ان ہیروں کو دیکھ رہی تھیں۔ میں چپکے سے نکل آیا۔ آخر میں نے اپنے جادو کا کمال دکھا دیا تھا۔ جب میں کراچی میں اپنے گھر پہنچا تو میرے گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس کی چابی پڑوس میں زینب خالہ کو دے گیا تھا۔ اب میں لاکھوں کی رقم کا مالک تھا۔ میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اب جادو کی طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھوں گا۔ محنت اور عزت کی روٹی کماؤں گا۔ اس رقم سے کاروبار بھی کروں گا اور ضرورت مندوں اور محتاجوں کی مدد بھی......

میں گھر میں داخل ہوا۔ زینب خالہ کی لڑکی عابدہ نے گھر کی صفائی کر کے اسے آئینے کی طرح چمکایا ہوا تھا۔ وہ میرے بچپن کی ساتھی تھی۔ بہت خوب صورت نہ سہی لیکن پرکشش تھی۔ سگھڑ، سلیقہ مند، اور سینے پرونے میں ماہر یک لخت مجھے احساس ہوا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ وہ بھی لیکن ہم نے کبھی اظہار محبت نہیں کیا تھا۔ وہ غریب ماں باپ کی بیٹی تھی۔ باعزت لڑکی...... اس نے میری چاپیں سن کر مڑ کر دیکھا۔ وہ حیرت اور خوشی سے بھرپور لہجے میں بولی۔ "آپ آ گئے۔ جادوگر بن کر؟"

"جادوگر نہیں بن سکا۔" میں نے کہا۔ "جو جادو سیکھا تھا وہ بھول گیا۔"

"کیسے بھول گئے......؟"

"ایک جادوگرنی کو سامنے پا کر......؟"

"کون سی جادوگرنی کے سامنے......؟"

"وہ جادوگرنی تم ہو......؟" میں نے اس کے قریب جا کر کہا۔ "ہاں سنو...... اب تم کچھ دنوں تک گھر کی صفائی نہیں کرو گی؟ اس لیے کہ میں نے فیصلہ کیا ہے تمہیں اس گھر میں سدا کے لیے لے آؤں صاف صفائی کرنے، کھانا پکانے اور محبت بھری باتیں کرنے اور میرے بچوں کی ماں بننے کے لیے...... کیا تمہیں منظور ہے......؟"

اس نے جواب نہیں دیا۔ وہ گلابی ہو کر کمرے سے نکل گئی......

(ختم شد)

دلخراش اور روح فرسا نظاروں سے بھرپور
رگوں میں سنسنی دوڑاتی دلچسپ و عمدہ تحریر



دلخراش اور روح فرسا نظاروں سے بھرپور
رگوں میں سنسنی دوڑاتی دلچسپ و عمدہ تحریر

جادوگر

مکمل ناول

ایم الیاس



جادوگر

مکمل ناول

ایم الیاس

ڈر پبلی کیشنز
کتاب مارکیٹ نیو اردو بازار کراچی



جادوگر

مکمل ناول

ایم الیاس

ڈریپبلی کیشنز

کتاب مارکیٹ نیو اردو بازار کراچی